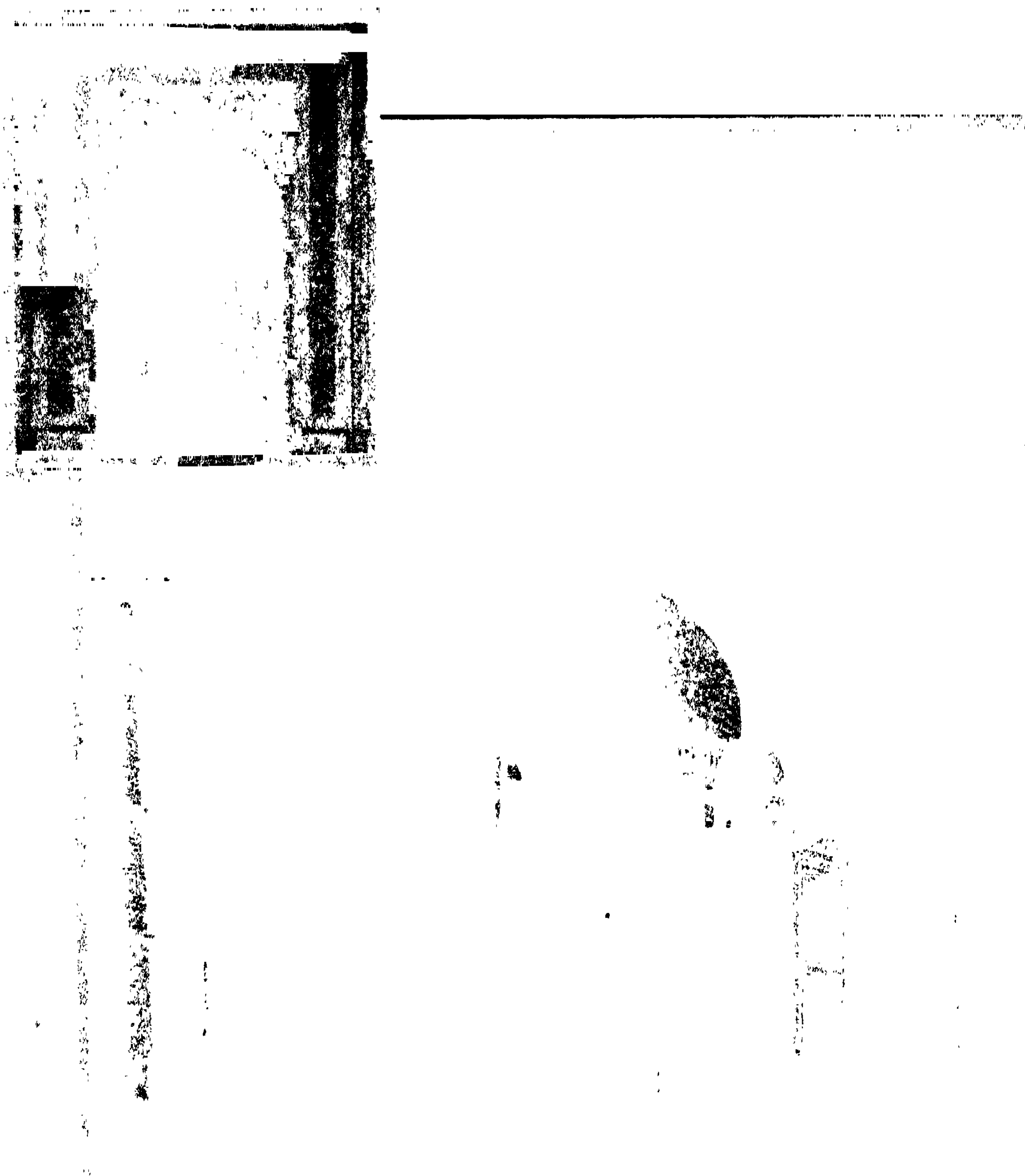
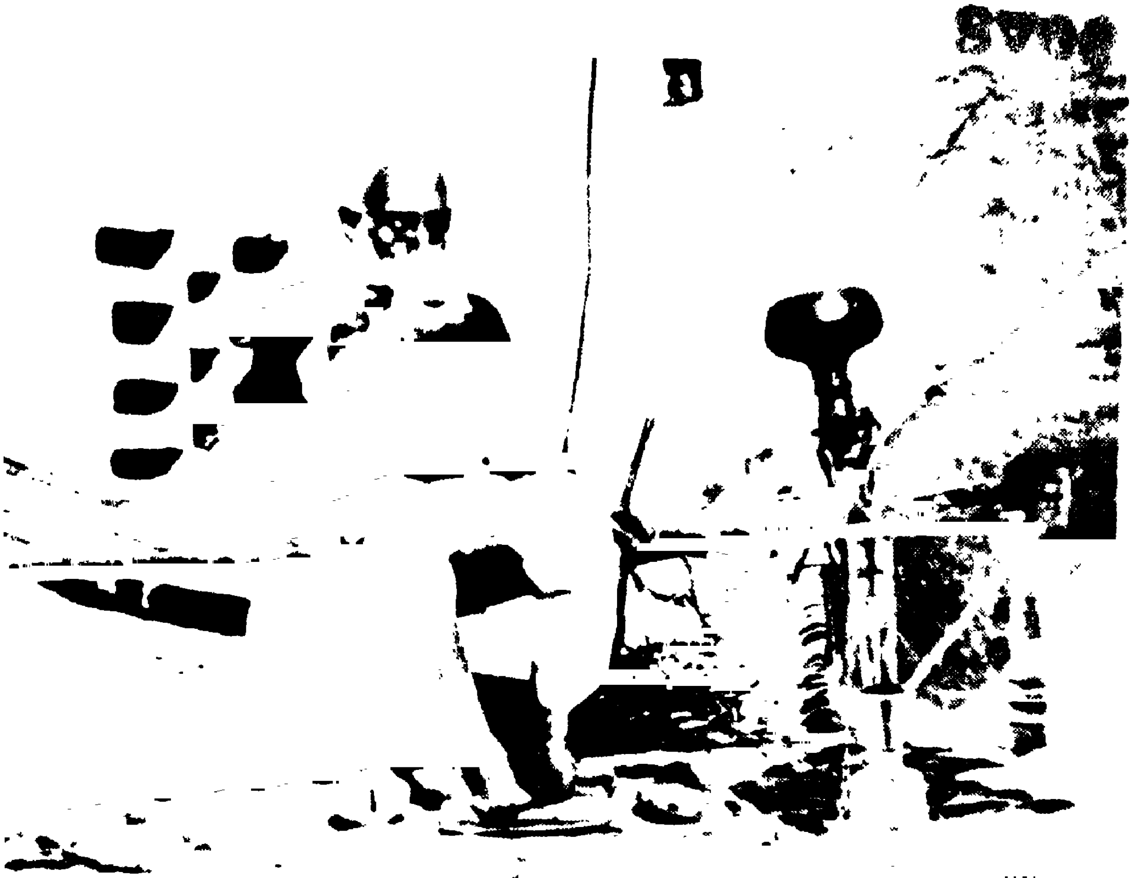
DUE DATE

Cl. No. __________ *Acc. No.* __________

Late Fine Ordinary books 25 p. per day, Text B
Re. 1/- per day, Over night book Re. 1/- per day.

ایوان اردو
دہلی





اس تصویر کے لیے کوئی مناسب شعری یا نثری عنوان تجویز کیجیے۔ نثری عنوان کسی مشہور شاعر کی نظم یا افسانہ نگار کے افسانے ہو تو بہتر ہے۔ پسندیدہ عنوانات اگلے شمارے میں ارسال کنندگان کے شکریے کے ساتھ شائع کیے جائیں گے۔ عنوان افسانہ نگار کا نام لکھنا نہ بھولیں۔

اس صفحے کے لیے قارئین بھی ہمیں ایسی تصویریں بھیج سکتے ہیں جو ہندستان کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کو پیش کرتی ہو تصاویر بھیجنے والوں کے نام سے شائع ہوں گی اور انھیں ان کا معاوضہ بھی پیش کیا جائے گا۔

فون نمبر:
۲۷۹۲۱۱ اور ۲۹۳۳۴۸

اُردو اکادمی دہلی کا ماہانہ رسالہ

ایوانِ اُردو دہلی

ادارۂ تحریر
سید شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی

جلد: ۳ — شمارہ: ۱ ● فی کاپی ۲٫۵۰ روپے، سالانہ قیمت ۲۵ روپے ● مئی ۱۹۸۹ء

ماہنامہ "ایوانِ اُردو دہلی" میں شائع ہونے والے افسانوں میں نام، مقام اور واقعات سب فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مطابقت کے لیے ادارہ ذمہ دار نہیں۔
مضمون نگاروں کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ:
ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی
اُردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

تزئین: ارشد علی خاں
خوشنویس: تنویر احمد

سید شریف الحسن نقوی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے سیما آفسیٹ پریس، دہلی ۱۱۰۰۰۶ سے چھپوا کر دفتر اُردو اکادمی، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا

حرفِ آغاز

دوسرے تعصبات کی طرح لسانی تعصب بھی قوموں کی زندگی میں بالعموم منفی کردار کا حامل رہا ہے۔ اپنی زبان کی خوبیوں کا احساس ولدا گ اسس کے تحفظ و ترقی کی خواہش کوئی بُری بات نہیں ہے۔ لیکن ہماری یہی سوچ دوسری زبانوں کے بارے میں بھی ہونی چاہیے۔ ہندوستان ا عریض ملک ہے، یہاں بہت سی بولیاں اور زبانیں ہیں جن کے بولنے والے مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان سب بولیوں اور زبانوں کو پھلے کے یکساں مواقع ملنے چاہئیں اور ہمارے جمہوری آئین میں اسس امر کی ضمانت بھی دی گئی ہے۔

دو زبانیں ——— ہندی اور اُردو ——— ایسی ہیں جنھیں ملک گیر حیثیت حاصل ہے اور یہ ملک کے ہر حصے میں کسی نہ کسی سطح پر را ہندی کو سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے، اُردو کو کشمیر اور بہار کو چھوڑ کر، کسی اور صوبے میں اور خود مرکز میں بھی کوئی سرکاری حیثیت حا لیکن اسس کا چلن ہر جگہ ہے۔ ماہرین لسانیات اس پر متفق ہیں کہ اُردو اور ہندی ایک ہی ماں کی دو بیٹیاں ہیں۔ یہ دونوں کھڑی بولی سے نکلی ہ جداگانہ تہذیبی اور ادبی پس منظر میں پروان چڑھنے کی وجہ سے دو مختلف زبانیں بن گئی ہیں۔ دونوں کے درمیان سب سے بڑا فرق رسم الخط کا ہے اسس اختلاف اور فرق کے باوجود یہ دونوں زبانیں جتنی ایک دوسرے سے قریب ہیں ہندوستان کی دوسری کوئی دو زبانیں باہم گر اتنی نہیں۔

اسس صورت میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ آپس میں مل جل کر رہیں اور ایک دوسرے کی ترقی میں مددگار و معاون ہوں لیکن ملک کے حا ایک خاص وقت میں ایسے رہے کہ ان کے آپسی رشتے کو رقابت کی شکل دے دی گئی ——— جہاں تک اردو والوں کا تعلق ہے مقامِ شکر ان کے دلوں میں ہندی کے خلاف کوئی جذبہ نہیں ہے اور انھوں نے اس بات کو بخوبی سمجھ لیا ہے کہ ہندی کی ترویج و ترقی سے اردو کو کوئی نقا پہنچنے والا نہیں بلکہ بالواسطہ طور پر کچھ فائدہ ہی پہنچ سکتا ہے۔ ہندی دوستوں کے بعض حلقوں میں یہ بدگمانی اب بھی پائی جاتی ہے کہ اردو کی ترقی ہندی کے راستے کا روڑا بن سکتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ گزرتا ہوا وقت ایک نہ ایک دن اس غلط فہمی کا خود ہی ازالہ کر دے گا لیکن ہم کہ اُردو کے دانشوروں اور ادیبوں کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ اسس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ اس کے لیے ہندی کے غلط اندیش بہی خواہو ساتھ براہِ راست رابطہ اور گفتگو بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ دوسرا طریقہ یہ بھی ہے کہ وہ ہندی اور انگریزی کے اخبارات و رسائل میں ا مضامین اور مراسلات لکھیں جو ان دونوں زبانوں کی مشترک بنیادوں اور مشترکہ مسادات کو سامنے لانے والے ہوں۔ یہ نہ صرف ان دونوں قوم کی خدمت ہوگی بلکہ اسس سے ملک کے اتحاد اور یک جہتی کے عمل کو تیز تر بنانے میں بھی مدد ملے گی۔

ہمارے اعلان کے مطابق "ایوانِ اُردو" کے مولانا آزاد نمبر کا دوسرا ایڈیشن اب تک چھپ جانا چاہیے تھا لیکن ہمیں افسوس ہے کہ کاغ نہ ہونے کی وجہ سے اسس کی اشاعت معرضِ التوا میں پڑی ہوئی ہے۔ جن ایجنسیوں کے آرڈر ہمیں ملے ہیں، ہم ان سے معذرت خواہ ہیں کہ ان کے آ کی تعمیل میں خاصی تاخیر راہ پا گئی تاہم انھیں ہم یقین دلاتے ہیں کہ جیسے ہی کاغذ دستیاب ہوا، نمبر چھپنے کو پریس میں دے دیا جائے گا۔ وہ تھوڑا انتظ کر لیں۔

سید شریف الحسن



شمس الرحمٰن فاروقی

ہک تھی آسماں جنابی سب
موت کی ہی تھی ہم رکابی سب
ل کی تفسیر پڑھ لوں آنکھوں میں
اور چہرہ لکھوں کتابی سب
ط میں بھیجوں اسے یہ بہت سراج
چشم و دل کی کہوں خرابی سب
خونِ دل آنسوؤں میں صرف ہوا
مر گئی یہ بھری گلابی سب"
باندنی رات کی ہوائے سرد
لے گئی اس کی بے حجابی سب
اغ میں ہے گئے دنوں کی مہک
اڑ گئی گرچہ شوخ تابی سب

یہ سراج اورنگ آبادی

ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل (ڈی) کمرہ نمبر ۷۲۲ ڈاک بھون نئی دہلی ۱

(۱)

خوابِ آشوب گر تمام ہوا
ریگ و آتش سفر تمام ہوا
ہوگئے رفتہ رفتہ کوہ گراں
موسموں کا اثر تمام ہوا
منتظر کس کے ہو سرِ منزل
وہ سرِ رہ گزر تمام ہوا
اب نہیں کوئی گوش بر آواز
قصۂ چشمِ تر تمام ہوا
ہے نگاہوں میں عالمِ اسرار
رقصِ دود و شرر تمام ہوا
اب یہی بے گیہہ کہستاں ہیں
طائروں کا سفر تمام ہوا

(۲)

کوئی نقشِ قدم ہوا میں ہے
رہگزارِ عدم ہوا میں ہے
رگ و ریشہ میں آگ بہتی ہے
کیسا یخ بستہ نم ہوا میں ہے
جان و تن پارہ پارہ ہوتے ہیں
کوئی تیغِ دو دم ہوا میں ہے
ایک صورت ہے، حبسِ دم کر لو
شہر و دیہات، سم ہوا میں ہے
چہرۂ لالہ مسخ ہوتے ہیں
کوئی دستِ ستم ہوا میں ہے
رقص میں ہیں لحد کے پنجر بھی
اک عجب زیر و بم ہوا میں ہے

حامدی کاشمیری



شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی، حضرت بل، سری نگر ۱۹۰۰۰۶

گیان چند

اقبال کے چند منسوخ اشعار کا وزن

اس تحریر کے ذریعے کمال احمد صدیقی صاحب کے مضمون عروضِ معروض (ایوانِ اُردو' فروری ۸۹ء) سے متعلق کچھ صراحتیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ان کا مضمون میرے مضمون 'اقبال کے چند منسوخ اشعار کا وزن' (ہماری زبان' ۸ جنوری ۱۹۸۸ء) سے متعلق ہے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے ۲۲ دسمبر ۱۹۸۶ء کو مجھے ایک طویل خط لکھ کر پوچھا کہ علامہ اقبال نے اپنی بعض اُردو فارسی نظموں اور غزلوں میں ایک وزن میں بہت سے اشعار کہے ہیں۔ بعد میں ان میں ترمیم کر دی اور کہا کہ بیشتر کی صورت میں بحر درست نہیں تھی۔ آزاد صاحب نے اُردو' فارسی کی یہ نظمیں غزلیں تفصیل سے نقل کر کے پوچھا کہ نشان شدہ مصرعے موزوں ہیں کہ نہیں؟

آزاد صاحب کا خط ملنے سے پہلے میرا عام تاثر یہ تھا کہ اقبال کے منسوخ مصرعے عروض کے لحاظ سے درست تھے۔ جب ماہر عروض اقبال نے یہ لکھ دیا کہ وہ بحر سے خارج تھے تو میں سوچ میں پڑ گیا۔ بحر منسوخ میں تو مفتعلن کی جگہ مستفعلن لانے کی مثالیں ملیں لیکن بحر رجز کے تعلق سے نہ کسی کتاب میں صریح بیان ملا کہ اس میں مفتعلن کی جگہ سالم رکن لایا جا سکتا ہے نہ کسی شعر میں اس کی مثال ملی میں نے سوچا کہ عروض کے ماہرین سے رہبری حاصل کروں۔ اس زمانے میں دو حضرات عروض کی نزاکتوں پر ڈٹ کر لکھتے رہے ہیں: ڈاکٹر عنوان چشتی اور جناب کمال احمد صدیقی۔ میرا خیال تھا کہ یہ حضرات صحیح صورت حال سے آگاہ کر سکیں گے میں نے ان کا نام لیے بغیر رمزیہ انداز میں انھیں مخاطب کیا تھا۔ مجھے کمال صاحب کا قلمی نام 'معروض' پسند ہے کیونکہ اس میں عرض اور عروض دونوں کی رعایت ہے۔ حیرت ہے کہ میں نے از راہِ قدر شناسی ان کی طرف روئے سخن کیا' وہ اسے تعریض و تضحیک سمجھے۔ چوں کہ تحریر میں قائل کے لہجے کی صحیح نمائندگی نہیں ہوتی' اس لیے غلط فہمی کا امکان رہتا ہے۔

ان کے مضمون کے چند اہم نکات کے سلسلے میں صراحتیں اور اعترافات پیش کرتا ہوں۔

مرفوع رکن فاعلن کے سلسلے میں وہ مطالبہ کرتے ہیں کہ میں مستند کتبِ عروض سے حوالے پیش کروں۔ لیکن حوالے تو مضمون ہی میں دیے ہیں 'ہماری زبان' کے کاتب نے حوالوں کے نمبر میں غلطی کر دی ہے۔ متنِ مضمون میں حوالے کے چھے نمبر ہیں لیکن فٹ نوٹ میں محض پانچ ہی کے مآخذ دیے ہیں۔ ایک درج ہونے سے رہ گیا۔ رفع سے متعلق میرے بیان کے آگے حوالہ نمبر ۵ درج ہے ... جب کہ مضمون کے آخر میں مندرج حوالہ نمبر ۴ اس سے متعلق ہے۔ میں عبارت کو مزید تفصیل سے ایک بار پھر لکھتا ہوں۔ یاس یگانہ ناسخ کا شعر 'ناسخ قول ہے بجا ... الخ' درج کر کے لکھتے ہیں:

"پہلے مصرعے کا رکنِ اول تسکینِ اوسط سے مفعولن ہو گیا۔ خلاصہ یہ کہ تسکینِ اوسط سے زحافاتِ عامہ میں سے ہے ہر بحر میں ہر مقام پر آ سکتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ بحر رجز مطوی مخبون میں بعض ارکان مرفوع بھی آتے ہیں۔ رفع بھی زحافاتِ عامہ میں سے ہے۔ بیت میں کسی خاص مقام سے مخصوص نہیں ہے۔ مختصر یہ ہے کہ بحر رجز میں خبن۔ طے۔ رفع۔ تسکین سے ہر جگہ پر کام لیا جا سکتا ہے۔

رکنِ مرفوع کے جواز کے ثبوت میں مرزا اوج صاحب مرحوم و مغفور نے مقیاس الاشعار میں یہ شعر پیش کیا ہے:

پیام کردہ است بہ من بوالہوسے ملنے
مفاعلن مفتعلن مفتعلن فاعلن
کہ تو بمدحِ ملکاں نہ از قیاسِ منے
مفاعلن مفتعلن مفاعلن فاعلن

(یاس: چراغِ سخن۔ نول کشور پریس دسمبر ۱۹۲۱ء ص ۹۶)

'ہماری زبان' میں پہلے مصرعے کے ابتدائی تین الفاظ غلط چھپ گئے تھے۔ میری رائے میں انھیں 'پیام کردست' لکھنا چاہیے۔ میں مرزا اوج کی ... مقیاس الاشعار اور یاس یگانہ کی چراغِ سخن کو عروض کی مستند کتابیں مانتا ہوں۔ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ فارسی اُردو کے اہم مصنفین میں بھی بعض اوقات اختلاف پایا جاتا ہے کہ کوئی مخصوص زحاف کسی بحر میں کسی مخصوص مقام پر آ سکتا ہے کہ نہیں۔ قدر بلگرامی نے اپنی ضخیم کتاب قواعد العروض میں کئی جگہ محقق طوسی کی تقطیعِ شعر سے اختلاف کیا ہے۔ کمال صاحب فرماتے ہیں کہ مرفوع رکن عروض و ضرب میں لانے پر امتناع ہے۔ بعض عروضیوں کے مطابق ضرور ہو گا۔ بعض دوسروں کے مطابق نہیں میرے نزدیک اُردو میں عروض کی مستند ترین کتابیں دو



شعبہ اُردو' سینٹرل یونیورسٹی۔ حیدر آباد۔ ۵۰۰۱۳۴

یں۔ مرزا اوج کی مقیاس الاشعار اور قدر بلگرامی کی قواعد العروض۔

کمال صاحب اُمید کرتے ہیں کہ میں کاتب کو قربانی کا بکرا نہیں بناؤں گا۔ انھوں نے ارتکاب جرم سے پہلے ہی مجھے ایک جرم کا ملزم قرار دے دیا۔ اگر میں غلطی کروں گا تو اس کی غلط تاویل کرکے کاتب کے سر نہ منڈھوں گا کیوں کہ مجھے کسی عدالت میں غلطیوں سے ماورا، کامل و اکمل بن کر آنے کی تمنا نہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ میں اپنی تحریروں پر دوسروں کے اعتراضات اور اپنی غلطیوں کو کھلے دل سے تسلیم کر لیتا ہوں۔

مطلعوں کی بات۔ شاید کمال صاحب اتنا تسلیم کرلیں کہ میں مطلع کے معنی سمجھتا ہوں۔ مثال کے دو شعروں میں پہلا مطلع نہیں تھا، دوسرا تھا۔ 'ہماری زبان' کو جو مضمون بھیجا تھا اس کی ایک دستی نقل میرے پاس آج بھی محفوظ ہے۔ مطبوعہ مضمون کے دونوں اشعار میں سہوِ کتابت ہے۔ پہلے شعر کا پہلا مصرع: "پیراہنِ وجود چو آتشِ جنوں گرفت" چھپا ہے میں نے "پیراہنِ وجودِ من چہ آتشِ جنوں گرفت" لکھ کر بھیجا تھا۔ دوسرے شعر کا مصرعِ ثانی "تو ہم زخاکِ ایں چمن مانندِ مار سیدۂ" دمیدۂ ہے، نہ کہ رسیدۂ۔ اس طرح یہ شعر درست مطلع بن جاتا ہے۔ پہلے شعر کو مطلع کہنے پر مجھے اپنے سہو کا اعتراف ہے۔

کمال صاحب نے لکھا ہے کہ جب نقل کردہ چاروں مصرعوں میں سے ہر ایک کا وزن مستفعلن، مفاعلن، مستفعلن مفاعلن ہی تھا تو ہر مصرعے کے نیچے ارکان لکھنے کے تکلف کی وجہ؟ لیکن 'ہماری زبان' میں چاروں مصرعوں کے نیچے یہی ایک وزن کہاں لکھا ہے؟ دوسرے شعر کے پہلے مصرعے کا پہلا رکن اور دوسرے مصرع کا تیسرا رکن مفتعلن چھپ ہے۔ جس طرح کمال صاحب کی نظر چوک گئی، اسی طرح میری نظر بھی خطا کر سکتی ہے۔ "پیام اور" کا وزن مفاعلان اتنا بدیہی ہے کہ اسے مفاعلن کہنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ میں نے اپنی دستخطی نقل میں دیکھا۔ وہاں بھی مفاعلن لکھا ہے۔ یہ غائب دماغی کا نتیجہ ہے۔

یہ درست ہے کہ جہاں میں نون کا اعلان چاہیے اور 'لذتِ فراغ' میں اضافت نہیں ہونی چاہیے۔ یہ دونوں کاتب کی تحریفات ہیں میری دستی نقل میں ان پر نقطہ لگا ہے اور لذت کے نیچے زیر نہیں۔ میری کتاب 'ابتدائی کلامِ اقبال' میں یہ غزل ص ۹۴۔ ۲۹۳ پر چھپی ہے اور وہاں دونوں لفظ اسی طرح صحیح لکھے ہیں۔

خاقانی کے دو اشعار سے متعلق حوالہ 'ہماری زبان' میں غلط چھپا ہے۔ فٹ نوٹ کے مطابق یہ اشعار قواعد العروض سے نقل کیے گئے ہیں لیکن دراصل زرِ کاملِ عیار ترجمۂ معیار الاشعار ص ۱۶۳ سے منقول ہیں۔ فٹ نوٹ میں یہ حوالہ درج ہونے سے رہ گیا ہے۔ میری نقل میں جملہ حوالے صحیح درج ہیں۔ 'ہماری زبان' کا کاتب مضمون کے آخر میں ایک حوالہ حذف کر گیا۔ محقق نے اُنھیں قصیدے کے اشعار کہا ہے۔ یہ مطالبہ زیادتی ہے کہ محقق جیسے مصنف کی شعری مثالوں کو شاعروں کے دیوان سے ملا کر دیکھا جائے۔ میں کوئی خاقانی پر تو تحقیق کر نہیں رہا تھا۔ کمال صاحب خاقانی کے عالم ہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے کبھی دیوان خاقانی نہیں دیکھا فارسی ادب کبھی میرا موضوعِ مطالعہ نہیں رہا۔ میں نے کبھی فارسی کے کسی ادیب پر کوئی مضمون نہیں لکھا امیر خسرو پر لکھا تو محض کھڑی بولی کی شاعری پر۔

'ہماری زبان' میں تین مصرعے بالکل زرِ کامل عیار کے مطابق چھپے ہیں۔ کمال صاحب لکھتے ہیں کہ پہلے مصرعے میں 'قوی دلیم' نہیں 'قوی دلم' ہونا چاہیے' لیکن 'ہماری زبان' میں 'قوی دلم' ہی تو چھپا ہے 'قوی دلیم' نہیں۔ دوسرا اور چوتھا مصرع زرِ کامل عیار کے مطابق درج ہوا ہے۔ اگر محقق نے یا لول کشوری کاتب نے غلط متن دیا ہے تو اس کے لیے مجھے ماخوذ نہ کیا جائے۔ ہماری زبان میں تیسرا مصرع یوں چھپا ہے: گرچہ بہ موقعِ لقب مفتعلن دو بار شد۔ زرِ کامل عیار میں موقع کی جگہ موضع اور دو بار کی جگہ دوبارہ ہے۔ عرصے سے یہ مصرع زرِ کامل عیار کے متن کے مطابق میرے ذہن میں بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے اپنی دستی نقل میں دیکھا، اس میں دو بار کی جگہ دوبارہ ہے لیکن موضع کی جگہ موقع ہی لکھا ہے۔ میں نے زرِ کاملِ عیار سے نقل کرنے میں غلطی کی ہوگی لیکن بعد میں کئی بار زرِ کامل عیار میں یہ مقام دیکھنے کا اتفاق ہوا اور ذہن میں صحیح لفظ یاد رہ گیا۔ کمال صاحب نے کسی ایرانی ایڈیشن کی بنیاد پر لکھا ہے کہ صحیح لفظ لقب نہیں لبت ہے۔ مجھے لبت کے معنی معلوم نہیں۔ اتفاق سے یہ شعر قدر بلگرامی کی قواعد العروض میں بھی ہیں۔ انھوں نے تخلص خاقانی ہی لکھا ہے۔ دوسرے شعر کے بعد لکھتے ہیں۔

"لقب سے مراد تخلص اور موضعِ لقب سے غرض مصرعِ دوم کا حشوِ اوّل"۔ (ص ۱۵۷)

بہر حال جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے میں نے دیوانِ خاقانی نہیں دیکھا۔ شعر کے صحیح متن کے بارے میں فیصلہ نہیں کر سکتا۔ میں نے محقق طوسی اسیر لکھنوی اور قدر بلگرامی پر بھروسا کر کے تخلص 'خاقانی' اور لفظ 'لقب' لکھا۔

میرا بنیادی استفسار یہ تھا کہ کیا کسی کتاب میں اس وزنِ مخصوص میں مفتعلن کی جگہ مستفعلن لانے کی اجازت ملتی ہے اور کیا اس کی مثال میں کوئی شعر ملتا ہے؟ مجھے دونوں میں سے کسی کا پتا نہ تھا۔ کمال

صاحب نے عروض کی کسی کتاب سے اس کا جواز تو نہیں دیا لیکن خاقانی کے یہاں سے میری مفید مطلب ایک بات درج کردی ہے جس کے لیے میں مشکور ہوں۔ میری صاف گوئی اور اعترافات سے شاید کمال صاحب کو اطمینان ہو گیا ہو گا کہ میں نہ کامل بننے کی کوشش کرتا ہوں نہ اپنی غلطیاں کاتب کے سر منڈھتا ہوں۔

آخر میں عروض کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر درج کرتا ہوں۔ فارسیوں نے جب عربی عروض کو لیا تو اپنی ضروریات کے مطابق اس میں کثرت سے حذف و اضافہ کیا۔ اہلِ اُردو نے جب فارسی عروض کو لیا تو اس میں اُردو کے مزاج کے مطابق حذف و اضافہ نہیں کیا حالاں کہ ہماری موسیقی اور ہمارا احساسِ آہنگ فارسی سے مختلف ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اپنے قیامِ پیرس ۱۹۵۲ء کے ایک تجربے کا ذکر کیا ہے کہ ایک عرب، ایک ایرانی اور خود انھوں نے بحرِ ہزج مثمن سالم (مفاعیلن ۴ بار) میں بالترتیب ایک ایک عربی، فارسی اور اُردو شعر تحت اللفظ پڑھا۔ ہر شخص کی قرأت پر بقیہ دو کہتے کہ تم وزن سے خارج کر کے شعر پڑھ رہے ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تینوں زبانوں کا لسانی مزاج اور صوتی آہنگ مختلف ہے۔[1]

اُردو شعرا نے فارسی شعرا کے متعدد مختارات کو قبول نہیں کیا۔ انھوں نے فارسی کے بہت سے اوزان کو نہیں لیا اور ہندی کے کئی اوزان کو استعمال کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ اہم نہیں کہ عربی اور فارسی کتبِ عروض میں کن کن زحافات کو اجازت دی گئی ہے۔ اہم یہ ہے کہ ہم یہ پرکھیں کہ وہ زحافات اہلِ اُردو کے احساسِ ترنم کے مطابق ہیں کہ نہیں؟ اقبال نے اپنی نظموں اور غزلوں میں اسی لیے مستفعلن کو خارج کر کے مفتعلن میں تبدیل کیا۔ اُردو کے اچھے شاعروں نے اوزان میں جو جو ترمیمات روا رکھی ہیں اور عروض میں ان سب کو تسلیم کر لیا جائے تاکہ اُردو عروض اردو شاعری کی صحیح آئینہ داری کر سکے۔

۱۔ مسعود حسین خاں: مقدمہ، اُردو اور ہندی کے جدید مشترک اوزان از ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی (علی گڑھ ۱۹۸۴ء) ص۔ ۶۔

اُردو صحافت

اُردو صحافت کو وجود میں آئے تقریباً ۱۶۵ سال ہو گئے ہیں۔ اس مدت میں اُردو صحافت نے ہندوستانی سماج میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستان کی تمام زبانوں کے اخباروں نے آزادی کی جنگ میں نمایاں حصہ لیا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس میدان میں اُردو اخبارات سب سے آگے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ برطانوی حکومت نے جن اخباروں کی طباعت پر پابندی عائد کی، جن کی ضمانتیں ضبط کیں، یا جن کی کچھ مخصوص اشاعتوں کو ضبط کیا، ان میں سب سے زیادہ تعداد اُردو اخباروں کی تھی۔ اس طرح ہندوستانی اخباروں کے جن مدیروں کو باغیانہ تحریروں کے جرم میں قید و بند کے مرحلوں سے گزرنا پڑا، ان میں سب سے زیادہ تعداد اُردو اخباروں کے مدیروں کی تھی۔

اُردو اکادمی، دہلی نے اُردو صحافت پر سہ روزہ سیمینار منعقد کیا تھا جس کے ڈائرکٹر انور علی دہلوی صاحب تھے جو خود ایک تجربہ کار صحافی ہیں۔ انھوں نے اس سیمینار کے لیے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جن میں اُردو صحافت کی تاریخ، اس کی خصوصیات، سیاست اور ادب میں اس کا رول اور اس کے مسائل پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ کئی ایسے موضوع ہیں جن پر پہلی بار لکھا گیا ہے۔ اس طرح مقالوں کا یہ مجموعہ اُردو صحافت پر ایک اہم دستاویز بن گیا ہے۔

اُردو صحافت کی ابتدا، اس کے عہد بہ عہد ارتقا اور اس کی مزاجی خصوصیات کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

مرتب : انور علی دہلوی
صفحات : ۳۲۲
قیمت : ۳۲ روپے

دیوانِ حالی

مولانا حالی کے دیوان کی یہ اشاعت ان لوگوں کے لیے ایک نئی بشارت کا حکم رکھتی ہے جو نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، مگر کلاسکی رنگِ تغزل کے مانے ہوئے ہیں اور آج بھی یعنی سائنس اور ٹکنالوجی کے اس عافیت آشوب زمانے میں بھی غزلیہ شاعری کو حصولِ مسرت کا اور جمالیاتی احساس کی تسکین کا بے مثال وسیلہ سمجھتے ہیں۔

مولانا حالی کا یہ دیوان ایک اور اعتبار سے بھی ہماری توجہ کا طلب گار ہے۔ اس مجموعے میں رنگِ جدید کی ترجمان جو غزلیں ہیں، ان کی سطحیت اور بے رنگی اس پر دلالت کرتی ہے کہ غزلیہ شاعری کو جب سماجی افادیت اور قومی اصلاح کے مضامین سے گراں بار کیا جائے گا اور اسے وعظ و پند کا ترجمان بنایا جائے گا تو یہ مقاصد خواہ حاصل ہوں یا نہ ہوں، غزل اس لطافت اور نفاست سے محروم ہو جائے گی جو اس کی امتیازی صفت بھی ہے۔ اس میں نہ تہ داری ہوگی نہ تاثیر۔

مولانا حالی کے اس دیوان میں غزلوں کے ساتھ ساتھ کچھ اور اصنافِ سخن بھی ہیں مگر ان کی حیثیت ضمنی ہے، اصل حیثیت غزلوں کی ہے اور یوں صحیح معنوں میں اس کو غزلوں کا مجموعہ کہنا چاہیے۔

اس دیوان میں مرثیۂ غالب بھی شامل ہے اور یہ واقعہ ہے کہ شخصی مرثیوں میں یہ بے مثال اور منفرد مرثیہ ہے۔ حالی نے گویا کاغذ پر کلیجا نکال کر رکھ دیا ہے۔ اُن کی طبیعت کا گداز اس کے ہر شعر میں سما گیا ہے۔

دیوانِ حالی کا مقدمہ رشید حسن خاں نے لکھا ہے جو حالی کی شاعری کے مختلف پہلوؤں اور اُن کے فنی نظریات پر سیر حاصل روشنی ڈالتا ہے۔

مصنف : مولانا الطاف حسین حالی
مقدمہ : رشید حسن خاں
صفحات : ۲۲۲
قیمت : ۲۴ روپے

اُردو اکادمی دہلی سے طلب کریں

جگن ناتھ آزاد



ہندوستاں ہمارا

(زیرِ تصنیف طویل نظم "جمہور نامہ" کا ایک باب)

جگن ناتھ آزاد

اے – ۲۵ گورنمنٹ کوارٹرس، گاندھی نگر، جموں توی ۱۸۰۰۰۴ (جموں و کشمیر)

حضرت خواجہ سید نظام الدین اولیاء محبوبِ الٰہیؒ

حقیقت فاش ہے یہ اہلِ معنی کی زبانوں سے
کہ خاکِ ہند کا رُتبہ ہے اُونچا آسمانوں سے
یہ ہے خاکِ مُقدس، اس کے ذرّوں کی درخشانی
ستاروں کے لیے اکثر بنی سامانِ حیرانی
محبّت کی یہاں شمعیں جلیں اِس جانگدازی سے
کہ واقف ہوگیا انسان رسمِ دلنوازی سے
انھی شمعوں میں کچھ ایسی ہیں جو اب تک فروزاں ہیں
کئی گوشے ہماری زندگی کے ان سے تاباں ہیں
اِک ایسی ہی محبت پاش لَو دہلی میں روشن ہے
جمالِ زندگی کی پاک ضو دہلی میں روشن ہے
یہ ضو کیا ہے؟ فروغِ صدق ہے تنویرِ ایماں ہے
یہ ضو کیا ہے شعاعی خط میں اک تفسیرِ ایماں ہے
یہ ہے درگاہِ محبوبِ الٰہی کی درخشانی
جو ہے اہلِ نظر کے واسطے تنویرِ روحانی
یہ وہ درگاہِ اقدس ہے یہ وہ دربارِ عالی ہے
کہ حاجت سے ہے مستغنی جو اس در کا سوالی ہے
یہ درگاہِ نظام الدین محبوبِ الٰہی ہے
یہاں کی حاضری دونوں جہاں کی بادشاہی ہے
یہاں آکر دلوں کے آئینے اشکوں سے دُھلتے ہیں
یہاں آکر حضور و غیب کے اسرار کُھلتے ہیں
یہاں زائر جب آتا ہے سکونِ قلب پاتا ہے
یہاں ہر طالبِ حق ذاتِ حق سے لو لگاتا ہے
یہاں آکر بلند و پست کا جھگڑا نہیں رہتا
یہاں آکر کوئی اُونچا کوئی نیچا نہیں رہتا
یہاں آکر بشر کی زندگی مسرور رہتی ہے
کہ پرچھائیں تعصب کی یہاں سے دور رہتی ہے
یہاں تفریقِ مذہب راہ پا سکتی نہیں ہرگز
کدورت اِس مقدس گھر میں آسکتی نہیں ہرگز
یہاں دو پھول ہیں ہندو مسلماں اک گلستاں کے
یہ دونوں ہیں دِیے اِس ایک ہی جشنِ چراغاں کے
یہاں ہر ایک جانب بادۂ عرفاں کی مستی ہے
یہاں شام و سحر افلاک سے رحمت برستی ہے
خلوصِ دل سے اِس درگاہِ عالی پر جو آتے ہیں
دُعا کو ہاتھ اُٹھاتے ہیں دُرِ مقصود پاتے ہیں

حرفے از خاندانِ چشتیہ

یہ چشتی خانداں نازاں ہے جس پر رُتبۂ عالی
بِنا خواجہؒ نے اس کی وادیِ اجمیر میں ڈالی
پھلا پھولا بڑھا یہ خانداں اک پیڑ کی صورت
زمیں پر اس کا پھیلا سایباں اِک پیڑ کی صورت
تناور پیڑ ہے یہ اور شاخیں ہیں کئی اس کی
ہزاروں دَور گزرے پھر بھی صورت ہے نئی اس کی
مگر اک شاخ نے اوروں سے بڑھ کر نام پایا ہے
کہ اس کا آج تک انسانیت کے سر پہ سایا ہے

نظامی سلسلہ اِس شاخِ حق کا نامِ نامی ہے
کہ اِس کا منبع و مخرج وہی ذاتِ گرامی ہے
نظام الدّین محبوبِ الٰہی جن کو کہتے ہیں
یہاں کی اور وہاں کی بادشاہی جن کو کہتے ہیں
جُنید و بایزیدِ وقت اُنھیں تاریخ کہتی ہے
وہ جن کی یاد سے یادِ مسیحا زندہ رہتی ہے
زبانِ حضرتِ اقبال پر ہے داستاں جن کی
اُنھیں دہلی میں لائی آرزوئے آستاں جن کی
وہ محبوبِ الٰہی بھی ہیں محبوبِ زمانہ بھی
وہ دینِ حق کا نغمہ بھی ہیں دُنیا کا ترانہ بھی
اُنھی کا سلسلہ ہے یہ نظامی سلسلہ اے دل!
وطن کی آبرو ہے یہ گرامی سلسلہ اے دل!
نظامی سلسلہ عالم میں ہے اک نور کی دُنیا
اندھیرے کی تہوں میں ہے چراغِ طور کی دُنیا
اسی کے نور سے ہیں دونوں عالم کے طبق روشن
اسی کی ضو سے ہیں جمہور نامے کے ورق روشن
مگر اب پھر نہیں چھیڑوں گا میں یہ ذکرِ روحانی
کہ ہے اِس باب میں موجود اُس کی جلوہ سامانی
ضرورت اب نہیں ہے پھر مِری شیریں مقالی کی
کہ پہلے کر چکا ہوں بات اُس درگاہِ عالی کی

سُلطان المشائخ حضرت خواجہ سیّد نظام الدّین اولیا محبوبِ الٰہیؒ
کے سینکڑوں سال بعد

امام الاولیا، قطبِ زماں، فانی فی اللہ، باقی باللہ حضرت شیخ کلیم اللہ دہلی جہاں آبادی قدس سرّہٗ

اب اس خورشیدِ معنی کی شعاعیں جلوہ ساماں ہیں
زمینِ ہند کے ذرّے درخشاں ہیں فروزاں ہیں
نصیر الدّین سے دہلی کی دُنیا جگمگاتی ہے
یہ خاک اُس نامِ نامی سے بڑا اعزاز پاتی ہے

دکن کی سرزمیں ہے نامِ فخر الدّین پر نازاں
فضا پنجاب کی نورِ محمدؐ سے ہوئی تاباں
اور ان کے ساتھ اک ایسا مقدس نام آتا ہے
بشر کے نام گویا عرش سے پیغام آتا ہے
وہ ایسا نام ہے حاصل ہے جس کو اک مقام اب تک
اسے کہتی ہے دُنیا نائبِ خیرالا نام اب تک
وہ ہے مجموعۂ عرفان و فیضان و کرامت بھی
بشر کے واسطے گنجینۂ لطف و عنایت بھی
وہ نامِ صدق ہے، نامِ یقیں ہے، نامِ عالی ہے
وہ ایسا نام ہے جس پر فدا گوہر مقالی ہے
امام الاولیا، قطبِ زماں خواجہ کلیم اللہ
وقار و نازشِ ہندوستاں خواجہ کلیم اللہ
حجازی خاک کی تقدیس کا اعجاز کیا کہیے
ہے اس کا ذرّہ ذرّہ کتنا سرافراز کیا کہیے
ذرا دیکھو تو اس خاکِ مقدس کی درخشانی
کہ پھیلی ہے جہاں میں چار جانب اِس کی تابانی
یہ ریگستان نہ ہو کیوں رُتبہ و اقبال کی دُنیا
کہ اِک دن رہ چکا ہے آمنہ کے لال کی دُنیا
نہ کیوں یہ خاکِ تابندہ ہو گردوں سے کہیں بڑھ کر
چلا ہے جب کہ دانائے سُبُل، ختم الرسل اِس پر
اسی مٹّی نے اپنی روشنی جب عام فرمائی
تو اِس سے حضرت یحیٰیؒ نے اپنی روح چمکائی
امام الاولیا کی ذات تک پھر اس کا نور آیا
یہ نور آیا تو اُن کی زندگی میں اِک سُرور آیا
سُرورِ زندگی بھر نطقِ گوہر بار میں چمکا
یہ اپنے دَور کی ہر ظلمتِ پیکار میں چمکا
دُھلا اِس آبِ حق سے قلبِ انساں کا غبار اکثر
اِسی کے فیض سے فاسق بنے پرہیزگار اکثر
بیاں میں تھی وہ نُدرت گفتگو میں تھی وہ شیرینی
کہ ہوتی تھی بشر سے دور دلگیری و غمگینی

انساں میں بات اُن کی عجب اک کیف بھرتی تھی
وہ دل ہی سے نکلتی تھی وہ دل ہی میں اُترتی تھی
یہی تعلیم تھی دراصل کالی کملی والے کی
کہ جس کے فیض سے دُنیا نے دیکھی شکل اُجالے کی
دریا تھا روانی کا، بلاغت کا، فصاحت کا
معارف کا سمندر اور چشمہ تھا طلاقت کا
ی چشمے پہ اک دُنیا نے پیاس اپنی بجھائی ہے
اسی چشمے کو حاصل روحِ انساں تک رسائی ہے
تے سیراب اِس چشمے سے ہندو بھی، مسلماں بھی
دلِ نامطمئن بھی اور افکارِ پریشاں بھی
"یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی"
ام الاولیا جب مائلِ تقریر ہوتے تھے
کبھی خوشبو گلستاں کی، کبھی شمشیر ہوتے تھے
طابت میں جلالی شان بھی جلوہ دکھاتی تھی
معانی میں جمالی کیفیت بھی جھلملاتی تھی
جناب شیخ کی سحر آفریں آواز کیا شے تھی
بشر کی روح پر اک وجد طاری تھا یہ وہ مے تھی
یہی تقریر کا عالم اگر تحریر بنتا تھا
انوکھی شان کی اک دلنشیں تنویر بنتا تھا
شرابِ علم کا جاری ہوا گویا وہ میخانہ
کہ ہر تصنیف تھی روحانیت کا ایک پیمانہ
کہیں تفسیرِ قرآنی کا جلوہ آشکارا ہے
کہیں "کشکول" نے عرفاں کی محفل کو سنوارا ہے
"مرقع" ہے کہیں ضوبار ایماں کے تفکر کا
کہیں ہیں ان کے مکتوبات مجموعہ تاثر کا
ٹھکانا ہی نہیں اِس بحرِ عرفاں کی روانی کا
کہ جو بھی لفظ ہے وہ ایک گوہر ہے معانی کا

سادگی

جو اُن کی سادگی تھی اک عجب شے تھی زمانے میں
حقائق کم ہیں ایسے، زندگی! تیرے فسانے میں

کبھی قحط آگیا یا اتفاقی صرف آ پہنچا
تو گھر کا خرچ اپنی حد سے کچھ آگے کو جا پہنچا
اُنھیں اِس حال میں مقروض ہو جانا گوارا تھا
مگر دربارِ شاہی کا عطیہ ناگوارا تھا
"دوا ہر دُکھ کی ہے مجروحِ تیغِ آرزو رہنا
علاجِ زخم ہے آزادِ احسانِ رفو رہنا"

اخلاق

عجب اخلاق کی تصویر تھی زرّیں حیات اُن کی
مزیّن علم و صبر و ضبط سے تھی کائنات اُن کی
اگر دُشمن کبھی اُن کو کوئی تکلیف پہنچاتے
تو یہ اشعار اُن کے نطقِ گوہر بار پر آتے
"ہر کہ مارا رنجہ دارد راحتش بسیار باد
ہر کہ مارا یار نبود ایزد اور ایار باد
ہر کہ خارے برنہد در راہِ ما از دشمنی
ہر گلے کز باغِ عمرش بشگفد بے خار باد!"
دکن والوں سے جب تکلیف بے حد پائی حضرت نے
دُعائے خیر اُن کے واسطے فرمائی حضرت نے
غرض اک چشمۂ صدق و صفا تھی ذاتِ پاک اُن کی
ورق اک نور کا تھا زندگی تابناک اُن کی
یہ نازک دور تھا ہندوستاں کی زندگانی میں
خزاں جھلکی ہوئی تھی اِس بہارِ بوستانی میں
امیروں کی خوشامد، مدح خوانی، عام شیوہ تھا
یہ شیوہ تھا کہ شاید زندگی کا اک فریضہ تھا
دلوں سے ہو چکا تھا محو نقشِ صدق و دینداری
مشاغل رہ گئے تھے صرف بدکاری و مے خواری
چلایا آپ نے وہ سلسلہ رُشد و ہدایت کا
کہ دل انساں کا پھر قائل ہوا زہد و عبادت کا
ہر اک سو راستی، ایثار کی تلقین فرمائی
عمل سے عظمتِ کردار کی تلقین فرمائی
دکھائی راہِ حق اِن کو جو سیدھی راہ بھولے تھے
بنایا راست باز اُن کو جو گمراہی پہ پھولے تھے

میں آپ نے نورِ ہدایت عام فرمایا
تو منزل کا نشاں گم گشتگانِ راہ نے پایا
اِسں نورِ معانی سے ستاروں کی طرح چمکے
جو ذرّے تھے، فلک پر ماہ پاروں کی طرح چمکے

"چہ باید مرد را طبعِ بلندے، مشربِ نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بے تابے"

حواشی:

۱ خواجہ معین الدّین چشتیؒ۔

۲ مشہور مورّخ ضیا الدّین برنی نے آپ کو جنید و بایزیدِ وقت کہا ہے۔

۳ حضرت خواجہ امیر خسرو نے اپنے بعض قصائد کے عنوانات میں حضرتِ محبوبِ الٰہی کو مسیحائے وقت کے نام سے یاد کیا ہے۔

۴ وہ شمعِ بارگہِ خاندانِ مرتضوی
رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو

۵ مولانا نور محمد مہاروی۔

۶ حضرت شیخ یحییٰ مدنیؒ اپنے زمانے کے مشہور اکابر صوفیہ میں سے تھے۔ ۲۰ رمضان [illegible] ہجری کو احمد آباد میں پیدا ہوئے ..... آپ آخر عمر میں ایک روحانی اشارے پر مدینہ طیبہ تشریف لے گئے اور وہیں ۲۸ صفر ۱۱۰۱ ہجری کو وصال فرمایا اور امیر المومنین سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے مقبرے کے متّصل دفن ہوئے (" حیاتِ کلیم" مصنفہ شبیّر حسن چشتی نظامی)۔

۷ تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت کا ایک مہینے کا خرچ دو روپے آٹھ آنے سے کبھی آگے نہیں بڑھا۔

(ڈاکٹر) سلیم اختر ________

مُردہ دھار کی مقراض

بستی کے تمام مرد دائرہ در دائرہ مانندِ تصویر تھے۔ لب خاموش مگر آنکھیں نفرت و حقارت کی زبان، گردنوں کی پھولی رگوں میں رُکے ہوئے غیض و غضب کا تناؤ، بعض ماتھے شکنوں کے جال تو کچھ مٹھیوں میں کھنچاؤ۔ یوں کہ پوروں میں خون اتر آیا۔ اور بازوؤں کی رگیں رسّیوں میں تبدیل ہو گئیں۔

جب خشونت بھری آنکھوں، خاموش لبوں کی حقارت اور سختی سے بھنچے جبڑوں کے غیض سے بننے والے دائرے میں اُسے لایا گیا تو تنے اعصاب میں کراہت کی لہریں دوڑ گئیں یوں کہ عضلات اور بھی تن گئے۔ غصّے نے سب پر کپکپی طاری کر دی۔ پُرخشونت نظروں کی گرم سلاخوں سے داغے جانے والے جسم میں لرزش تھی، وہ سہمی چڑیا کی مانند تھی، جسم چُرائے، نظریں جھکائے اپنے خوف کی اسیر ________ گرم بھوک کی جوالا نظروں میں کانپتی، جلتی لکڑی کی مثال!

وہ خاموش، مرد خاموش، فضا خاموش

آنکھوں کے قفس سے پلکوں کے پٹ ہٹے تو سہمی چڑیا جیسی نظروں نے مردوں کی فصیل سے اونچا اُڑنا چاہا۔ نظریں دائرے میں کھڑے مردوں کے چہرے ٹٹول رہی تھیں مگر تنے جبڑوں، بھنچے ہونٹوں اور شکنوں بھری پیشانیوں میں اس کے لیے رحم نہ تھا، نفرت نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی تھی، جس سے بھی آنکھیں چار ہوتیں اس کی آنکھوں میں خون اُتر آتا۔ زخمی پروں والی سہمی چڑیا جیسی نظریں پناہ کے لیے چہروں کے پتھریلے نقوش پر منڈلاتی رہیں اس سرے سے اس سرے تک ________ بے سود ارحم تا آشنا آنکھوں کی سرد خشونت سے جسم میں جھرجھری دوڑ گئی۔

بستی کے تمام مرد دائرہ در دائرہ تھے مگر اس کا باپ اور بھائی نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ اس کی بے حیائی کے کیسے شاہد بن سکتے تھے۔

تب بستی کا معتبر ترین اور اسی لیے معتبر مرد آگے بڑھا، اس کے ساتھ چوبی صندوق اُٹھائے ایک اور معزز مرد تھا۔ گئے زمانوں کی گرد اور گزرے مردوں کے ہاتھوں کی میل نے مل کر چوبی صندوق کو جو رنگت دی تھی وہ اور کسی صندوق کو نہیں مِل سکتی تھی۔ صندوق دائرے کے درمیان رکھ دیا گیا ایک اور سال خوردہ مرد نے اپنے لباس کی تہوں سے ایک زنگ آلودہ چابی برآمد کی، یہ چابی بڑے احترام کے ساتھ بستی کے معتبر ترین اور اسی لیے معتبر مرد کو پیش کی گئی جس کے ہاتھ وفورِ جذبات (یا پھر رعشہ) سے کانپ رہے تھے۔ وہ جھک کر چوبی صندوق کا سال خوردہ قفل کھولنے لگا۔

لڑکی کی خوف سے پھیلی پتلیاں قفل کھولنے میں کانپتے ہاتھوں پر جمی تھیں جن پر ابھری ہوئی موٹی موٹی اور نیلی رگوں کا جال بنا تھا۔ دائرہ در دائرہ مرد بھی جیسے مسحور ہو کر صندوق، قفل، چابی اور کھولنے والے ہاتھ دیکھ رہے تھے۔ ہاتھ کی لرزش کی وجہ سے چابی قفل کے بند سوراخ میں داخل ہوتے ہوتے رہ جاتی۔ مردوں کی سانسیں رُکی ہوئیں، لڑکی کا دل یوں دھڑک رہا تھا گویا چابی دل کے سوراخ میں داخل ہو رہی ہو۔

________ بالآخر قفل کھُل گیا۔

سب کے سینوں میں رکی سانسوں کی آبشار جاری ہو گئی۔ زنگی قبضوں کی چرچراہٹ کی نامانوس آواز کے ساتھ صندوق کا ڈھکن اٹھتے ہی سب نے گردنیں آگے کر کے گویا صندوق میں جھانکنا چاہا۔ پچھلے دائرے والے پنجوں کے بل اور اونچے ہو گئے ان کے پیچھے کھڑے مردوں نے اور اونچا ہونے کی کوشش کی۔ ان کے پیچھے کھڑوں نے ان سے بھی زیادہ اور ان کے پیچھے کھڑوں نے ان سے بھی زیادہ۔

ہزاروں نظریں صندوق پر مرکوز تھیں۔ ان نظروں کی گرمی سے صندوق پگھل نہ گیا تو صرف اس لیے کہ یہ گوشت پوست کا نہیں محض لکڑی کا بنا تھا۔

اب رعشہ دار ہاتھ صندوق میں تھا، وہ کچھ ٹٹول رہا تھا اور جب وہ باہر نکلا تو اس میں پرانی وضع کی ایک بہت بڑی مقراض تھی۔ یہ اگر بڑی تھی تو صرف اس لیے کہ یہ بھیڑوں کی اون کاٹنے والی تھی اب یہ الگ بات ہے کہ عرصہ دراز سے اس سے کسی بھیڑ کی اون نہ کٹی تھی۔

اب تک لڑکی کا جسم کپکپا رہا تھا مگر مقراض دیکھتے ہی وہ گویا مجسمے کی طرح بے حرکت ہو گئی۔ سب کی نظریں مقراض پر مرکوز تھیں۔ جس کا زنگ کھایا دستہ اور مردہ دھار دھوپ میں لرز رہی تھی۔

ایک مرتبہ پھر کانپتا ہاتھ صندوق میں گیا اور

شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج، لاہور (پاکستان)

رکی سانسوں کے شور میں جو برآمد کیا اسے دیکھ کر لڑکی چیخی . . .

اسے رسّہ کہیں یا طویل چُٹیا؟ سنہری بال، سیاہ بال، سفید بال، سرخ بال، اخروٹ کے رنگ کے بال، کھچڑی بال، ہر رنگ کے بالوں سے گندھا رسّا یا گندھی چٹیا ـــــ؟ لڑکی ایک مرتبہ پھر چیخی۔ یہ رسّا تھا یا چُٹیا، جو بھی تھی اب کپکپاتے ہاتھوں میں مردہ سانپ تھی۔

لڑکی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس رعشہ خوردہ ہاتھ کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر وہ دو تین قدم پیچھے ہٹ گئی۔ پھیلے نتھنوں میں سانس نہ تھی خنجر کی نوک تھی، نیم وا ہونٹوں میں سے دو تین دانت نظر آرہے تھے، اس نے چیخنے کو منہ کھولا مگر کھلے مُنہ سے چیخ نہ نِکل سکتی تھی کہ طاقت ور ہاتھ اُسے زمین پر گرا چکے تھے اس کی چلتی ٹانگیں دو مضبوط ہاتھوں کے شکنجے میں تھیں، ہلتے بازو کسی اور کے بازوؤں میں بے بس تھے، منہ میں کپڑا ٹھونسا گیا اور پھر بڑی مشاقی اور مہارت سے ہاتھ اور پاؤں رسّی سے باندھ دیے گئے۔

رعشہ زدہ ہاتھوں نے مردہ دھار والی مِقراض سنبھالی اور لڑکی کے بال کاٹنے شروع کیے رات کے دل جیسے سیاہ بالوں کی لٹیں گر رہی تھیں، ایک کے بعد ایک۔ رُکی ہوئی سسکیوں سے لڑکی کا سارا جسم بری طرح کانپ رہا تھا مردہ دھار کی کچ کچ جوانی کے رس میں ڈوبی چمکیلی لٹوں کا ڈھیر لگا رہی تھی۔

بالآخر یہ نیک کام ختم ہوا۔

ایک اور معتبر نے یہ لٹیں جمع کیں اور انھیں بالوں کے رسّے میں گوندھنے لگ گیا۔

لڑکی مردوں کے نرغے میں تھی جو اسے جنگل کے اس حصّے کی جانب ہانک رہے تھے جہاں درختوں کی شاخوں نے باہم مل کر پتوں کی جو چھت بنائی تھی وہ اتنی گھنی تھی کہ دوپہر کے سورج کی کرنیں بھی پار نہ ہو سکتی تھیں اور اس کی چھت کی زینت بڑھانے کو چیلوں جتنی چمگادڑیں تھیں اس مسلسل اندھیرے میں اُگنے والی بیلوں پر مردہ پرندوں کے ڈھانچوں کے پھول کھِلے تھے کہ ان بیلوں کے جال میں جو پرندہ پھنسا وہ پھر اُڑ نہ سکا۔ ان بیلوں سے جو جگہ بچی وہاں زہریلی مکڑیوں کے جالے تھے۔ تنوں اور زمین پر غیر معمولی جسامت کی چھپکلیوں کا راج تھا ایسی خونخوار کہ سانپوں سے بھڑ جائیں۔ اس ملگجے اندھیرے میں ایسے پودے بھی تھے جن کی مہک پر جانور آتے تو شاخیں انسانی بازوؤں کی مانند انھیں جکڑ لیتیں۔ تب پودے سے ایسا لیس دار لعاب خارج ہوتا کہ وہ اس میں تحلیل ہو کر پودے کی رگ رگ میں سما جاتے، اجڑے درختوں کی جڑ میں سیاہ اور سرخ چیونٹیوں کا گھمسان کا رن پڑتا۔ فاتح چیونٹیاں کھوکھلے تنے پر قابض ہو جاتیں۔

اور ایک اندھا گدھ اس منظر کا پہرے دار تھا۔

(۲)

وہ نیک اور پاک لوگوں کی بستی تھی وہاں کے نیک اور پاک تھے کہ وہاں سے گزرنے کے دوران ہوا اپنی آلودگی سے پاک ہو جاتی۔ باکردار لوگوں کی اس بستی میں آسمان زیادہ چمکیلا تھا۔ پھول زیادہ مہکار والے اور ہوا زیادہ مفرح تھی اور فِضا بیماروں کے لیے صحت بخش۔

وہ اپنے بزرگوں کا احترام کرتے، بچوں سے پیار کرتے۔ جانوروں پر ظلم نہ ڈھاتے۔ بھٹکے مسافروں کی دلجوئی کرتے۔ اجنبی کے لیے گھر کے دروازے کھول دیتے۔ بھوکوں کو کھانا کھلاتے اور ان سب خوبیوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو ان کی اوقات پر رکھتے۔ بستی کے مردوں کے اجتماعی سکون کے لیے یہ بہت ضروری تھا۔ اگرچہ عورت کے بغیر گزارا بھی نہ تھا مگر اس کے مکرِ فریب سے بچنا بھی لازم تھا۔ دراصل وہ لازمی شر تھی اس لیے اس کے ساتھ برتاؤ میں بھی اسی احتیاط کی ضرورت تھی جو آگ کے کھیل کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ گھر سے باہر نکلتے تو شئے مسروقہ کی مانند اسے تالے میں بند کر کے جاتے اور پھر گھر میں داخل ہونے سے پہلے ساتھ چابک لے جانا نہ بھولتے، لیکن اتنی سختی اور احتیاط کے باوجود بھی بعض عورتوں میں اتنا شر بھرا ہوتا کہ وہ کسی نہ کسی بھولے مرد کو شرافت کی راہ سے بھٹکا کر اپنے جسم کا غلام بنا لیتیں۔ شر کے رس میں ڈوبی ایسی عورتوں سے باکردار مرد کو بچانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ شر کو فوراً کچل دیا جائے اور وہ بھی عبرت انگیز طریقے سے۔

ان کے پُرکھوں نے عظیم دانائی سے کالے کرسنا کا جو طریقہ وضع کیا وہ اس صندوق اور مِقراض کی صورت میں نسلوں کے اجتماعی انصاف کا مظہر تھا اب یہ الگ بات ہے کہ اس کے باوجود بھی عورت اپنے جسم کا زہر پھیلانے سے باز نہ آتی لیکن یہ بھی طے ہے کہ ایسا بہت کم ہوتا کبھی کبھار ایک نسل میں شاید ایک یا دو بار۔

الغرض! وہ باکردار، باشعور اور انصاف پسند لوگوں کی بستی تھی اس لیے وہاں بارش وقت پر ہوتی، سورج صرف اتنی گرمی دیتا جتنی فصلوں کے پکنے کے لیے ضروری ہوتی۔ ہوائیں صرف اتنی خنکی ہوتی جتنی انسانی جسم کے لیے فرحت بخش ہو۔ آندھی حدِ اعتدال سے نہ بڑھتی اور یہ برکتیں صرف اور صرف اسی لیے تھیں کہ وہ عورت کے شر کو سمجھتے تھے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اس کے جسم کے زہر کو وبا کی طرح پھیلنے سے روکنے پر قادر بھی تھے۔

چھا اور قاتل کے لیے شاید عفو ہو سکتا مگر مرد کو جسم کی دلدل میں پھنسا لینے والی عورت کے لیے فوری موثر اور عبرت انگیز سزا تھی۔

(۳)

کل پھر ناشدنی کی سزا کا دن تھا۔

بستی کے تمام مرد دائرہ در دائرہ مانندِ تصویر تھے، لب خاموش مگر آنکھیں نفرت و حقارت کی زبان، گردنوں کی پھولی رگوں میں رُکے ہوئے غیظ و غضب کا تناؤ، بعض ماتھے شکنوں کے جال تو کچھ غصیل مٹھیوں میں کھنچاؤ ـــــــ لیل کہ پوروں میں خون اُتر آیا اور بازوؤں کی رگیں رسیلد میں تبدیل ہو گئیں۔

سب سے مدبر مرد کے خارشی ہاتھوں نے مردہ دھار والی مقراض سنبھالی اور بال کاٹنے شروع کیے اور جلد ہی مٹی کے جھُنتے جیسے کومل اور سنہری بالوں کا آبشار زمین پر بہہ گیا۔

بالآخر یہ نیک کام ختم ہوا۔ سب نے اطمینان کی طویل سانس خارج کی۔ تنے عضلات اب ڈھیلے پڑ رہے تھے کہ اچانک انھوں نے خوف اور بے چارگی سے روتی لڑکی کی آنکھوں میں عجب رنگوں کی پھلکاریاں چلتی دیکھیں، لڑکی کے لبوں پر مسکراہٹ کی شرمیلی کرن نے گرد آلود اور آنسو بھرا چہرہ منور کر دیا۔

اور تب دائروں میں کھڑے مردوں کو اپنی پشت پر شور کا احساس ہوا اور مڑ کر دیکھنے پر ان سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بستی کی تمام عورتیں لہر در لہر اُمڈی چلی آ رہی تھیں اور ان سب کے مُنڈے ہوئے سروں پر سورج جس طرح چمک رہا تھا وہ آج تک کسی اور شے پر یوں نہ چمکا ہوگا۔

شیخ سلیم احمد

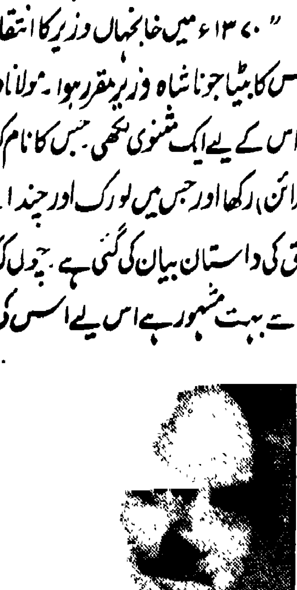
ایک گھر جو تقسیم ہو گیا

ایک گھر جو تقسیم ہو گیا۔ (A HOUSE DIVIDED) پریم چند کے بیٹے امرت رائے کی کتاب ہے۔ اس کتاب کے لکھنے یا لکھوانے کا محرک (نہرو فیلوشپ کے تحت لکھوائی گئی ہے) یہ دعویٰ ہے کہ آج جن زبانوں کو ہم ہندی اور اُردو کہتے ہیں۔ وہ دراصل ایک ہی زبان تھی جس کا نام ہندی یا ہندوی تھا۔ اس زبان کی ابتدا کا زمانہ ۱۰۰۰ء ہے۔ یہی زمانہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کا ہے۔ اس زبان کی اصل اپ بھرنش (پنجاب کے ایک قبیلے ابھیراہ کے نام پر) ہے۔ سنسکرت اور فارسی کی آمیزش سے یہ ہندوی بنی۔ چھ سو سال تک یہ زبان ایک مشترکہ ادبی اور تہذیبی زبان کی حیثیت سے مختلف علاقوں میں مختلف ناموں سے فطری طور پر ارتقائی منزلیں طے کرتی رہی۔ اس کے مختلف روپ تھے۔ شمال مغرب میں اگرا سے مغربی ہندی، کھڑی بولی، برج بھاشا، ہریانوی، گجراتی اور راجستھانی کہتے تھے تو پورب میں پوربی، اودھی، میتھلی اور بھوج پوری۔ دکن میں یہی زبان دکنی کہلائی۔ ان تمام زبانوں یا بولیوں کی شاعری پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سب ایک ہی ماں کی سگی بیٹیاں ہیں اور ان کی ماں کا نام ہندی یا ہندوی تھا۔

حضرت امیر خسرو ہندوی زبان کا نقطۂ آغاز سمجھے جاتے ہیں اور ان ہی کے مطابق زیادہ سے زیادہ لاہور کے سعد بن سلمان کو ہندی کا پہلا شاعر کہہ سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ابھی تک ہمارا علم یہیں تک محدود تھا۔ امرت رائے کی کتاب نے علم کی ان حدود کو مزید آگے بڑھایا ہے۔ حضرت امیر خسرو سے بھی دو سو سال پہلے ایک صوفی شاعر تھا جس کا نام تھا گورکھ ناتھ (اسی شاعر کے نام پر گورکھپور شہر آباد ہوا۔) وہ ہندی کا پہلا شاعر تھا اور اس کی شاعری کے نمونے موجود ہیں۔ اس زمانے میں ناتھ پنتھ — ایک بھگتی تحریک —— زوروں پر تھی۔ یہ روحانی تحریک کابل، پنجاب، اتر پردیش، بہار، بنگال، مہاراشٹر اور گجرات جیسے علاقوں میں اپنا اثر قائم کیے ہوئے تھی۔ ناتھ پنتھیوں نے ہندی میں بڑا ادب تخلیق کیا۔ چوں کہ اس زمانے میں یہی ایک عوامی زبان تھی۔ اور صوفیا عوامی زبانوں کو اپنے پیغام کی ترسیل کے لیے استعمال کرتے آئے ہیں۔ گورکھ ناتھ اس تحریک کا بڑا علمبردار بلکہ پیشرو تھا۔ بقول امرت رائے ناتھ پنتھیوں اور ان کے ادب کے بارے میں پہلی بار ۱۹۳۰ء میں لوگوں کو علم ہوا جب ایک پتامبر دت بارتھوال نے "گورکھ بانی" نام کی کتاب لکھی جس میں اس نے گورکھ ناتھ کے علاوہ اس صوفی تحریک سے تعلق رکھنے والے دوسرے شعرا کا بھی ذکر کیا جیسے کنیرپا، گوپی چند، کورنگی ناتھ، دتاترے، کارنیتھ ناتھ وغیرہ۔ اس نے ان شعرا کے کلام کے نمونے بھی پیش کیے ہیں۔

ناتھ پنتھیوں کے بعد امرت رائے نے اپنی کتاب میں مسلم صوفی شعرا کا ذکر کیا ہے۔ جن میں حضرت بابا فرید (۱۲۶۷-۱۱۷۳ء) شیخ شرف الدین بو علی قلندر (وفات ۱۳۲۳ء) حضرت حمید الدین ناگوری (۱۲۷۴-۱۱۸۳ء) حضرت یحییٰ منیری (وفات ۱۳۷۰ء) شامل ہیں۔ یہ ناتھ پنتھیوں کے بعد کا دور ہے مگر انھیں کی روایت کا تسلسل ہے۔ دونوں کا پیغام اور زبان ایک ہی ہے۔ ثبوت میں نمونۂ کلام پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد حضرت امیر خسرو کا دور آتا ہے ان کے یہاں بھی انھیں لوگوں کے پیغام کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اس روایت کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ مہاراشٹر میں سنت کوی نام دیو، گیانیشور اور مہانو بھو پیدا ہوئے ہیں۔ گیانیشور نے ہندی میں گیتا کا ترجمہ کیا۔ اس کے بعد مولانا داؤد آتے ہیں جنھوں نے مشہور رومانی مثنوی چندائن (۱۳۷۰-۵ء) لکھی۔ عہد اکبری کے مشہور مورخ ملا عبدالقادر بدایونی نے اپنی تاریخ منتخب التواریخ میں چندائن کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

" ۱۳۷۰ء میں خان جہاں وزیر کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا جونا شاہ وزیر مقرر ہوا۔ مولانا داؤد نے اس کے لیے ایک مثنوی لکھی۔ جس کا نام کندائن (چندائن) رکھا اور جس میں لورک اور چندا کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ چوں کہ کتاب پہلے سے بہت مشہور ہے اس لیے اس کی مزید



۱۵۰/ بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

ریف کی ضرورت نہیں "
بعد میں چندائن کے طرز پر کئی مثنویاں جیسے طبن کی مرگیہ وتی. جائسی کی پدماوت منجھن کی دھومتی، عثمان کی چترادلی وغیرہ لکھی گئیں۔

اس کے بعد بھکتی تحریک کے عظیم شاعر بیر کا دور ہے۔ اس عہد میں نرگن شاعروں کا ایک ورا طبقہ پیدا ہوتا ہے۔ دو سو سال تک اس فریک کا عروج رہا۔ بھکتی تحریک مزید آگے ڑھتی ہے اور اس کے پیغام کی بازگشت یک دوسرے بھکت شاعر رائے داس کے لام میں سنائی دیتی ہے۔ اس روایت کی اگلی کڑی ضرت عبدالقدوس گنگوہی رح ہیں جن کا زمانہ بندرہویں صدی کا وسط اور سولہویں صدی کا غاز ہے۔ بقول امرت رائے وہ ناتھ پنتھیوں اور بیر سے کسی بھی طرح مختلف نہ تھے۔ شاعری میں لکھ داس نام اختیار کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے آشرم (خانقاہ) میں ہر روز پرانیام (یوگا) ہوتا تھا۔ گرونانک منظرِ عام پر آتے ہیں۔ ان کا زمانہ بھی یہی ہے۔ وہ مولانا داؤد کے ہم عصر ہیں۔

اس عہد تک ہندی شاعری امرت رائے کے بقول ایک ہی قومی دھارے میں بہتی نظر آتی ہے۔ نہ یہاں ہندو کی تمیز ہے نہ مسلمان کی نہ فارسی، سنسکرت اور عربی میں کوئی امتیاز اس پورے زمانے میں محبت، بھائی چارے اور رواداری کے گیتوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ ہندو جگت گوی کثرت سے فارسی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور مسلمان صوفیوں کے یہاں ہندی اور سنسکرت کے لفظوں سے کوئی پرہیز نہیں۔ امرت رائے کہتے ہیں کہ اس زمانے میں یہ زبان کتنی مقبول اور مروج ہوگی اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ غوری اور غزنوی سلاطین اپنے سکوں پر جہاں عربی رسم الخط میں نام لکھاتے تھے وہاں دوسری طرف سنسکرت کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ سکے کے ایک طرف گھوڑے کی شبیہہ ہے تو دوسری طرف نندی بیل کی جو ہندو اساطیر کا حصہ ہے۔

اردو کے کسی محقق نے ان مآخذ پر نظر نہیں ڈالی۔ وہ متذکرہ بالا دور کو لسانی اعتبار سے ایک خلا سے تعبیر کرتے رہے یا یہ کہتے رہے کہ اس دور میں ایک لسانی آثار کی تھی اور کوئی واضح صورتِ حال سامنے نہیں آتی۔ رائے صاحب نے پروفیسر مسعود حسین کو استثنیٰ قرار دیا ہے کہ وہ اس عہد پر نظر رکھتے ہیں اور انھوں نے ناتھ پنتھیوں کا ذکر کیا ہے۔ اردو مورخین کا ایک اور تضاد رائے صاحب کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ معدودے چند صوفی شاعروں جیسے بابا فرید یا حمید الدین ناگوری اور دکن میں شمس العشاق اور برہان الدین جانم کو تو اردو سرمایہ میں شامل کرتے ہیں لیکن ہندو شعرا جو انہی صوفیوں جیسی زبان لکھ رہے تھے اور ان کا پیغام بھی وہی تھا جیسے کبیر، رائے داس اور مہاراشٹر میں نام دیو، گیانیشور وغیرہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور انھیں تسلیم نہیں کرتے۔ آخر ایسا کیوں؟

زبان کے لیے سب سے پہلے اردو لفظ مصحفی نے اپنے ایک شعر میں استعمال کیا ہے۔

خدا رکھے زباں ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفیؔ اُردو ہماری ہے

اسی زمانے میں میر تقی میرؔ بھی اپنے تذکرے "نکات الشعرا" میں اردو کو اردوئے معلّیٰ کا نام دے چکے ہیں لیکن بہت بعد تک اردو شعرا اُردو کو ہندی ہی لکھتے رہے۔ جیسے میر حسن دہلوی نے اپنے تذکرے کو "تذکرۂ سخن آفرینانِ ہندی زبان" لکھا ہے۔

مصنف نے رسم الخط کی بحث بھی اُٹھائی ہے۔ ان کی نظر میں فارسی رسم الخط ایک مصنوعی رسم الخط ہے جس میں ہندوی زبان نہ ٹھیک ٹھیک لکھی جاتی ہے اور نہ پڑھی اور یہ کہ زبان رسم الخط سے نہیں بنتی اردو کو ہندی سے علاحدہ زبان بنانے میں رسم الخط کا اہم رول ہے۔ عبدالحق نے بھی کہا ہے کہ جو چیز اردو کو ہندی سے الگ کرتی ہے وہ اس کا رسم الخط ہے۔ (رسم الخط بدل دو۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری)

کہا جاتا ہے کہ اُردو اور ہندی کو دو الگ الگ زبانیں بننے میں فورٹ ولیم کالج نے بھی رول ادا کیا۔ امرت رائے نے اس رائے سے اختلاف کیا ہے اور لکھا ہے کہ انگریزوں کے پیش نظر اپنی انتظامی ضروریات اور سیاسی مصلحتیں تھیں اور انھوں نے ہندی کو دو زبانوں میں تقسیم نہیں کیا۔ یہ تقسیم تو پہلے ہو چکی تھی۔ البتہ انھوں نے زبان کے جھگڑے کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال ضرور کیا۔ انگریزوں میں ہندوستان کے کلچر اور یہاں کی زبان کے بارے میں جاننے کی مخلصانہ خواہش تھی۔ اس طرح سے وہ ہندوستانیوں کے دلوں پر بھی حکومت کرنا چاہتے تھے۔

چھ سو سال تک ہندی/ہندوی زبان ایک مشترکہ کلچر کی علامت کے طور پر پھلتی پھولتی رہی مگر سترھویں صدی کے اختتام اور اٹھارویں صدی کے آغاز میں اُردو اور ہندی دو الگ الگ زبانوں میں تقسیم ہونے لگیں۔ امرت رائے کہتے ہیں کہ اس کے پیچھے ایک سوچی سمجھی اسکیم تھی۔ اردو کے چند مسلمان مشاہیر نے اس زبان سے ہندی اور سنسکرت الفاظ کو نکال کر اسے فصیح

بنانے کی مہم کا آغاز کیا۔ اس زبان میں فارسی اور عربی کے زیادہ سے زیادہ الفاظ داخل کیے۔ ہندوی کو فصیح فارسی آمیز اردو بنانے کی اس مہم کو چلانے والوں میں شاہ حاتم۔ خان آرزو۔ مظہر جانِ جاناں اور ناسخ کے نام سرِ فہرست ہیں۔ ولی اورنگ آبادی ۱۷۰۲ء میں جب پہلی بار دلّی آئے تو اردو کو فصیح بنانے کی تحریک زوروں پر تھی۔ دلّی میں ولی کی ملاقات شاہ گلشن سے ہوئی۔ موخرالذکر نے اوّل الذکر کو مشورہ دیا کہ بھئی یہ دکنی میں شاعری کرنا چھوڑو۔ شاہجہاں آباد کی فصیح زبان ریختہ میں شعر لکھو۔ عزت بھی ملے گی اور دولت بھی۔ ولی نے نصیحت کو گرہ میں باندھ لیا۔ انھوں نے اپنی روِش بدل دی۔ دلّی سے پہلے اگر وہ یہ زبان لکھ رہے تھے:

پرتی جو کنٹھا پہنے اسے گھر بار کرنا کیا
ہوئی جو گن جو کو کی پی کا اسے سنسار کرنا کیا
جی ہیوے نیر منیاں کا اسے کیا کام پانی سوں
جو کچھو تن موکھ کا کرتے ہیں اسے اہار کرنا کیا

تو دلّی کے سفر کے بعد لکھنا شروع کیا:

رُو برو ہونے میں اس کے حالِ دل ظاہر کیا
جلوۂ آئینہ رویاں کاشفِ ہر راز ہے
دردمندوں کو سدا ہے قولِ مطرب دل نواز
گرمئ افسردہ طبعاں شعلۂ آواز ہے

جب ولی دوبارہ دلّی گئے تو محمد شاہ کا دورِ حکومت تھا جیسا کہ ولی نے ایک شعر میں ذکر کیا ہے۔

دل ولی کا لے لیا دلّی نے چھین
جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

اس بار دلّی میں ولی کی خوب آؤ بھگت ہوئی کیوں کہ اس مرتبہ ان کے ترکش میں نئے قسم کے تیر تھے۔

رائے صاحب کا کہنا ہے کہ جب ہندی اور اردو کے دو الگ الگ دھارے بن گئے تو ہندی کو ہندوؤں کی زبان سمجھا جانے لگا اور اُردو مسلمانوں کی زبان بن گئی۔ سر سید احمد خاں، مولانا سفیر، شیرانی، مولانا حالی، سید مصطفیٰ بریلوی وغیرہ کی تحریروں سے اقتباسات پیش کرکے اس بیان کی تائید کرائی گئی ہے۔ اس طرح زبان کی وجہ سے ہندو اور مسلمانوں کے بیچ منافرت کی خلیج پیدا ہونے لگی۔ اور جب یہ زبان دو حصّوں میں تقسیم ہوگئی تو اس کا نتیجہ ملک کی تقسیم کی صورت میں برآمد ہوا۔ یہ محض ہندی گھڑنے کی تقسیم نہ تھی۔ بلکہ ملک کی تقسیم تھی۔ امرت رائے نے اپنی پوری بحث کا اختتام بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی ایک تقریر کے اقتباس پر کیا ہے۔ جو انھوں نے کراچی میں ۱۵ فروری ۱۹۶۱ء کو یومِ غالب کے موقع پر کی تھی۔ پاکستان میں اردو کے ساتھ ہو رہی بے انصافی کی شکایت کرتے ہوئے انھوں نے کہا "پاکستان جناح نے نہیں بنوایا اور نہ اقبال نے بنوایا۔ پاکستان اردو کی وجہ سے وجود میں آیا۔ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف کی بنیادی وجہ اردو زبان تھی۔ دو قومی نظریہ اور اس سے متعلقہ تمام اختلافات محض اُردو کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ اس لیے پاکستان اپنے وجود کے لیے اردو زبان کا رہینِ منت ہے"۔

امرت رائے کی پوری بحث سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ زبان کو فصیح بنانے کی کوشش میں مسلمان قومی دھارے سے کٹ گئے۔ اس کی وجہ سے ہندو مسلمانوں کے درمیان منافرت پیدا ہوئی اور جس کے نتیجے میں ملک تقسیم ہوا۔ اور اس سب کی یکطرفہ طور پر ذمے داری مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔ بات بہت سلیقے سے کہی گئی ہے۔ دلائل و براہین کے ساتھ کہی گئی ہے۔ بیشتر حوالے ایسی کتابوں سے دیے گئے ہیں جن کے ناموں سے ہم بخوبی واقف ہیں۔

لیکن بات بہت سنگین اور بنیادی ہے۔ اس سے یوں ہی صرفِ نظر ممکن نہیں۔ مسئلہ زبان کا ہے لیکن اس سے ہندوستانی مسلمانوں کی جڑوں پر ضرب لگتی ہے۔ اگر رائے صاحب کا دعوا درست ہے تو ہندوستانی مسلمانوں کو تاریخ سے سبق سیکھنا چاہیے۔ اگر درست نہیں ہے تو اس کتاب کا جواب لکھا جانا چاہیے اور اسی موثر انداز سے لکھا جانا چاہیے جس موثر انداز سے امرت رائے نے اپنی بات کہی ہے۔ مگر جواب کون لکھے اور کیسے لکھے جبکہ اندازہ یہ ہو رہا ہے کہ اُردو والوں کو تو اس کتاب کے وجود تک کا علم نہیں۔ ۱۹۸۴ء میں یہ کتاب شائع ہوگئی تھی۔ مگر ابھی تک اُردو والوں کی طرف سے کوئی ردِ عمل سامنے نہیں آیا۔ کوئی رائے یا تبصرہ ابھی تک نظر سے نہیں گزرا۔ اُردو والوں کی اپنی مجبوریاں بھی ہیں۔ کتاب انگریزی زبان میں ہے۔ اور ہمارا مطالعہ تو اردو زبان میں بھی صرف اپنی تحریروں تک محدود رہا ہے۔

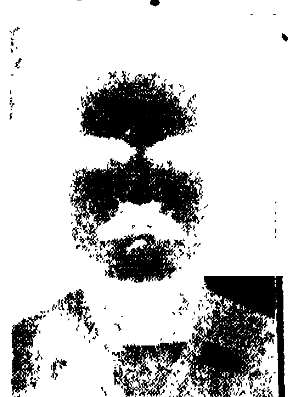
(۱)

بدنام ہو رہا ہوں
میں صاف گو رہا ہوں
اُمید کی ندی میں
خود کو ڈبو رہا ہوں
اپنے ہی گھر میں، اپنی
پہچان کھو رہا ہوں
پھولوں کی انجمن میں
کانٹوں پہ سو رہا ہوں
تاریکیوں کی چادر
کرنوں سے دھو رہا ہوں
خاموشیوں میں، ساجد
آواز بو رہا ہوں

(۲)

چلی تلخ لمحوں کی جلّاد لو
رگڑنے لگی ایڑیاں آرزو
سیاہی کی جھنکار نے چھین لی
اُجالوں کے سنگیت کی آبرو
جو لفظوں کی پونجی سے محروم ہیں
اُبھرتی ہے اُن کو مری گفتگو
ہوا، ڈوبتی نبض کا مرثیہ!
دھواں چوستا ہے فضا کا لہو
اُمیدوں کا شاہی خزانہ ملا
مری زندگی ہو گئی سُرخرو!
اثرؔ! جو بہر حال ملتی نہیں
اُسی چیز کی ہے مجھے جستجو!

ساجد اثر



دیوان بازار، کٹک ۷۵۳۰۰۱ (اڑیسہ)



حسن نجمی سکندرپوری

غروب ہوگیا سورج گھنے ہوئے سائے
یہ بے مکاں جو اُٹھے بھی تو کس کے گھر جائے

گذشتہ سال جو بیتی تھی موسمِ گل میں
خدا کرے کبھی ایسی نہ پھر بہار آئے

مری بسر ہوئی، ایسے مسافروں کی طرح
جو پہنچیں بیچ ندی میں تو ابر چھا جائے

فضا میں پھیلی جو بارود، رُت بدل سی گئی
نہ پھولی سرسوں نہ آموں پہ اب کے بور آئے

حسین پھول، یہ معصوم تتلیاں نجمیؔ
ہماری حرص نے کس پر ستم نہیں ڈھائے

بی ۱۱۶، ووِیک وہار، دہلی ۱۱۰۰۳۲

م۔ رم۔ راجندر

روشنی کا سفر

جب میرا تبادلہ ایک چھوٹے سے غیر معروف قصبے رضا پور ہوگیا تو مجھے یہ خیال کھائے جارہا تھا کہ اس جگہ پر کوئی بھی علمی اور ادبی سرگرمی ممکن نہیں ہوگی۔ ایک تو میری ڈاک خانے کی بے کیف اور غیر دلچسپ ملازمت اور پھر رضا پور کا غیر ادبی ماحول۔ مَیں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ میرے رضا پور جانے سے دو دن قبل میرے ایک شاعر دوست نے ایک صاحب 'منظور علی' کا پتہ لکھ کر دے دیا کہ رضا پور میں اِن سے مل لینا۔ یہ پتہ مَیں نے منظور علی صاحب کے بارے میں مزید کچھ دریافت کیے بغیر جیب میں رکھ لیا۔

رضا پور پہنچ کر دو تین دن تو مکان ڈھونڈنے اور ڈاکخانے کا چارج لینے اور سنبھالنے میں لگ گئے۔ مکان مل گیا تو بیوی بچوں کو لے آیا۔ چند دن اور مصروفیت میں گزر گئے مگر پھر رضا پور کا گھٹا گھٹا سا ماحول کھلنے لگا۔ یہ اتنا چھوٹا قصبہ تھا کہ اس میں صرف ایک ہائی اسکول تھا اور وہ بھی اسی سال شروع ہوا تھا۔ اس اسکول کے اُستادوں کو چھوڑ کر، یہاں کسی زیادہ تعلیم یافتہ باذوق آدمی سے ملاقات محض ایک اتفاق تھی۔

ایک روز ڈاک خانے میں ڈاکٹر منظور علی کے نام تین رسالے آئے۔ ان میں سے دو فارسی کے تہران سے اور ایک اُردو کا دینی رسالہ تھا۔ پتہ وہی تھا جو میرے یہاں آنے سے پیشتر میرے شاعر دوست نے مجھے دیا تھا مگر میری معلومات میں مزید اضافہ یہ ہوگیا کہ منظور علی تو علمیات میں ڈاکٹر یعنی پی۔ ایچ۔ ڈی ہیں۔ مَیں نے سوچا کہ رضا پور کے رہنے والے کوئی ریٹائرڈ پروفیسر ہوں گے۔

اگلے دن اتوار تھا اور مَیں نے منظور علی صاحب سے ملنے کا پروگرام بنالیا۔ مَیں ٹھیک دس بجے صبح ان کے مکان پر پہنچ گیا۔ یہ مکان بلاشبہ جہاں تک رقبے کا تعلق تھا، رضا پور کا سب سے بڑا مکان ہوگا۔ مکان میں بجلی تھی اور ریڈیو کا ایریل چھت پر لگا ہوا تھا۔ مکان کے چاروں طرف پکّی دیوار تھی اور لکڑی کے ایک بوسیدہ سے پھاٹک پر ایک بورڈ لٹکا ہوا تھا جس پر اُردو اور انگریزی حروف میں ان کا نام لکھا ہوا تھا۔ بادو باراں میں یہ حروف بہت دُھندلا گئے تھے۔ پھاٹک سے پرے اندر کھلی جگہ پر کوئی دس پندرہ، طرح طرح کے کبوتر غٹرغوں کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ تمام مکان میں گہری خاموشی تھی جیسے یہاں کوئی نہ رہتا ہو یا اس کے مکین کہیں باہر گئے ہوئے ہیں یا پھر اس گھر میں مستورات اور بچے نہ ہوں۔ اتنے میں ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ایک گلاس میں دُودھ اور دو بند لیے ہوئے باہر سے آیا اور مجھ سے بڑے ادب سے اور شستہ اُردو میں دریافت کیا کہ مَیں کس سے ملنا چاہتا ہوں۔ مَیں نے ڈاکٹر منظور علی کا نام لیا تو وہ بولا:

"میرے ساتھ تشریف لے آیئے۔ مَیں اُن کا خادم شاکر علی ہوں۔"

شاکر علی نے پچھواڑے کی طرف اندر جا کر بیرونی دروازہ کھول کر مجھے کمرہ میں اندر آنے اور ایک صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا چونکہ ایک کرسی بھی پاس پڑی تھی، مَیں اس پر بیٹھ گیا۔ یہ کمرہ بہت بڑا اور نہایت عمدہ طریقے سے سجا ہوا تھا۔ اس میں رکھی ہوئی کوئی بھی شے رضا پور کی بنی ہوئی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ دو مزیّن بھاری اور قیمتی صوفے، ایک بہت بڑا ایرانی یا کشمیری قالین، کتابوں سے بھری ہوئی نصف درجن شیشے دار الماریاں، گدّے دار کرسیاں اور چرمی موڑھے، لکھنے پڑھنے کے لیے ایک میز بھی لگی ہوئی تھی۔ ایک پُرانے زمانے کا مگر قیمتی کلاک اور دیواروں پر غالباً خاندان کے بزرگوں کی سُنہری فریموں میں جڑی ہوئی بہت بڑی بڑی تصویریں۔ کمرہ چونکہ ہال کافی بڑا تھا، بجلی کے چھت کے پنکھے ایک یا دو کی بجائے تین تھے۔ مَیں ایک کاغذ کے پُرزے پر اپنا نام لکھ لایا تھا۔ وہ پُرزہ مَیں نے شاکر علی کو دے دیا کہ ڈاکٹر صاحب کو دے دے اور وہ اندر لے گیا۔ چند منٹ میں ہی ڈاکٹر منظور علی کمرے میں داخل ہوگئے اور مَیں تعظیماً کھڑا ہوگیا۔

دراز قامت، فربہ جسم، پُروقار چہرہ ڈاکٹر منظور علی ہر طرح سے بڑی وجیہہ شخصیت کے



۶۸، چتر وہار، نئی دہلی ۱۱۰۰۹۲

مالک تھے۔ عمر ستر بہتر سال سے کم نہیں ہوگی۔ داہنی طرف کو قدرے جھک کر چلتے تھے۔ آواز میں حد درجے شائستگی کے ساتھ ساتھ ایک دبدبہ اور گونج بھی تھی۔ کالی شیروانی اور گھٹنے پائنچوں کا پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ مجھے بیٹھنے کو کہا اور میرے بالمقابل بیٹھ کر بار بار میری آمد پر مسرت کا اظہار کیا۔ خلوص اور محبت ان کے ہر فقرے سے عیاں تھی۔ میری چند نظمیں اور غزلیں بھی رسائل میں ان کی نظر سے گزری تھیں۔ ان سے چند منٹ کی گفتگو میں ہی یہ ظاہر ہوگیا کہ وہ ایک جیّد عالم تھے۔ انھوں نے دو مضامین میں ایم۔ اے کرنے کے بعد فارسی میں ڈاکٹریٹ کی تھی اور منطق، مشرقی علوم اور فلسفے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ وہ ملک کے نامور کالجوں اور درس گاہوں میں مشرقی علوم کے اُستاد اور پروفیسر رہ چکے تھے اور پینسٹھ سال کی عمر میں درس و تدریس کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کر رضا پور میں، جس کے وہ رہنے والے تھے، سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ مشرقی فلسفے، ادبیات اور لسانیات پر کوئی پچیس کتابوں کے مصنّف تھے جن میں سے کئی غیر ملکوں میں چھپی تھیں۔ داہنے ہاتھ میں اب شدید لرزہ آچکا تھا اور اسی وجہ سے مزید لکھنے سے معذور رہتے لیکن مطالعہ ابھی جاری تھا۔ میں نے اتنے بڑے عالم کا رضا پور جیسے چھوٹے اور غیر معروف قصبے میں رہنے کا سبب پوچھا تو بولے:

"عزیز میں اسی گاؤں اور مکان میں پیدا ہوا تھا۔ سارا بچپن اسی کی گلیوں کی خاک چھانتے گزرا ہے۔ اس گھر کے ستّر افراد میں سے صرف دو بچے ہیں۔ ایک میں اور ایک میرا لڑکا۔ لڑکا امریکہ میں ہے اور وہیں کا ہو گیا ہے۔ چنانچہ وہ شاخ بھی کٹ گئی ہے۔ اب جذبات کی وابستگی اس گاؤں سے اور اس مکان سے ہے یا شاکر علی سے جو گزشتہ پینتیس برس سے میرے ساتھ رہ رہا ہے۔ باہر کی دُنیا سے تھوڑا بہت تعلق صرف آنے والے خطوط، رسائل اور کتب کی صورت میں ہے۔ میں چونکہ اب خطوط کا جواب بھی بعد مشکل سے نہایت شکستہ خط میں دے سکتا ہوں یہ تعلق بھی بتدریج ختم ہو رہا ہے۔"

میں ڈاکٹر منظور علی کے پاس کوئی ایک گھنٹے بیٹھا رہا۔ اس اثنا میں شاکر علی نے چائے بنائی تھی اور وہ ایک خوبصورت ٹرے میں چائے لے آیا تھا۔ چائے پینے کے بعد میں نے ان کی تصنیف کردہ چند کتب کو دیکھنے کی آرزو کی تو وہ میز پر سے دو تین کتابیں اُٹھا لائے۔ یہ کتابیں بڑی ضخیم تھیں اور بلاشبہ علمی اور ادبی اعتبار سے ایک ایسا گنج گراں مایہ تھیں جن کا سمجھنا ہر کس و ناکس کی فہم و فراست سے باہر تھا۔ میں اپنے دل پر ان کی دل پذیر شخصیت اور علمی استعداد کی ایک گہری چھاپ لیے گھر لوٹا۔

اب میرا یہ معمول ہو گیا تھا کہ اتوار کو ڈاکٹر منظور علی کے یہاں پہنچ جاتا اور ایک دو گھنٹے ان کی صحبت میں گزار دیتا۔ ایک روز ہم ان کے آنگن میں کبوتروں کے جھنڈ کے پاس کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ اس لمبے چوڑے مکان کی قبر کی سی خاموشی کو صرف کبوتروں کی غٹر غوں توڑ رہی تھی۔ ڈاکٹر منظور علی کچھ لمحوں سے کسی سوچ میں غرق بیٹھے تھے۔ اچانک بولے:

"جانوروں اور پرندوں میں محبت اور شناخت کا مادّہ انسانوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ دیکھیے ہم دونوں ان کبوتروں سے صرف دو فٹ کے فاصلے پر بیٹھے ہیں اور یہ بڑے اطمینان اور بے فکری سے دانہ کھا رہے ہیں۔ آپ ایک بات آزمائیے۔ میں یہاں سے اُٹھ کر چلا جاتا ہوں اور آپ یہیں بیٹھے رہیے اور دیکھیے کہ کبوتروں پر کیا ردّ عمل ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر منظور علی اُٹھ کر چلے گئے اور میں اکیلا رہ گیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ان کے جاتے ہی سارے کبوتر اُڑ کر اُونچی منڈیر پر بیٹھ گئے! ڈاکٹر منظور علی نے مجھے اپنے پاس بلایا اور ہنس کر بولے،

"دیکھا آپ نے۔ یہ کبوتر آپ کو نہیں جانتے جب تک میں آپ کے ساتھ تھا ان کا احساس تحفظ قائم رہا لیکن میں اُٹھ گیا تو وہ فوراً پر پھڑپھڑا کر اُڑ گئے۔ مگر میں نے پرندوں اور بے زبان جانوروں سے جو سبق سیکھا ہے، وہ کچھ اور ہے۔"

"فرمائیے" میں نے کہا:

"وہ ہے بے غرض محبت، بھائی چارہ، عجز اور انکسار اور اتفاق! جی ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں، اگر ہم ان پنچھیوں اور جانوروں کا مطالعہ کریں یعنی ان کے رہن سہن اور آپس کے برتاؤ کو غور سے دیکھیں تو ہم بہتر انسان بنیں گے۔ اپنی دھرتی سے محبت اور انسانی بھائی چارے کا ابتدائی سبق میں نے اس بے زبان مخلوق سے ہی سیکھے ہیں!"

میں نے ذرا سوچا تو مجھے ان کی بات میں بڑی صداقت نظر آئی اور میں گھر پہنچ کر بھی ان کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ مجھے ڈاکٹر منظور علی کی مقناطیسی شخصیت زیادہ سے زیادہ اپنی طرف کھینچتی گئی اور میں اب اتوار کے علاوہ اور دنوں میں بھی شام کو ان کے پاس جانے لگا۔ وہ بڑے متین اور سنجیدہ تو تھے ہی مگر ظرافت کے دلدادہ بھی تھے۔ بات کرتے کرتے چٹکلے چھوڑتے جاتے اور ہنستے اور ہنساتے رہتے تھے۔ ایک اور بات جو میں نے اُن کے بارے میں محسوس کی وہ یہ تھی کہ مذہب

بڑے پابند تھے۔ کہا کرتے تھے کہ عبادت پروردگار ساتھ رشتہ قائم کرنے کا واحد ذریعہ ہے اور تعلق حیاتِ انسانی کا محور ہے۔

مجھے رضاپور سے ڈاکخانے میں کام کرتے تین سال ہوگئے۔ اس عرصے میں شاید ہی کوئی اتوار ایسا گزرا ہو جو میں نے ڈاکٹر منظور علی کے ساتھ نہ گزارا ہو۔ اب ان سے ایک ایسا تعلق پیدا ہوگیا تھا جیسے میں انھیں بڑی مدت سے جانتا تھا۔ ایک روز میں ڈاکخانے میں بیٹھا ہوا آئے ہوئے منی آرڈروں کی رقم نکال کر ڈاکیے کے حوالے کر رہا تھا کہ شاکر علی زار و قطار روتا ہوا پہنچا کر جلدی چلیے پروفیسر صاحب تو شاید ختم ہوگئے ہیں۔ مجھ پر بجلی سی ٹوٹ پڑی۔ میں نے جلدی سے منی آرڈر والے ڈاکیے کو روپے دیے، اپنی الماری کو تالا لگایا اور دوسرے بابو کو اپنی جگہ بٹھا کر فوراً شاکر علی کے ساتھ ہولیا۔

کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ کبوتر خاموشی سے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے اور چند کبوتر تو کمرے کے اندر تک گھس آئے تھے۔ شاید آج انھیں دانہ نہیں ملا تھا یا شاید انھیں بھی پتہ لگ گیا تھا کہ ان کا انسانی رفیق جس کی محافظت میں وہ پل رہے تھے اُن سے چھوٹ گیا تھا۔ میں اندر داخل ہوا اور میں نے کمرے کی بتی جلادی۔ ڈاکٹر منظور علی صوفے پر لیٹے ہوئے تھے اور اُن کا سر اور ایک بازو نیچے کو ڈھلکا ہوا تھا۔ ایک ضخیم کتاب ان کے ہاتھوں سے گر کر نیچے پڑی ہوئی تھی۔ میں نے پاس پہنچ کر دیکھا اور ہاتھ لگا کر محسوس کیا، مگر مرغِ انفاس تو کب کا پرواز کر چکا تھا۔ پھر بھی شاکر علی کو بھیج کر ڈاکٹر بلوایا جس نے آتے ہی اس کی تصدیق کر دی۔ میں سر جھکا کر کھڑا ہوگیا۔ دُنیا ایک بلند پایہ عالم، دانشور، راستی اور دیانت کے پتلے سے محروم ہوگئی تھی۔

عظیم الشان صدیقی

پریم چند کے تاریخی افسانے

"سوزِ وطن" کا واقعہ پریم چند کی زندگی اور فن کے لیے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے جس نے نہ صرف ان کا نام نواب رائے سے بدل کر پریم چند کر دیا بلکہ ان کی فکر اور فن کو بھی نئی سمت و رفتار عطا کر دی۔ مقصد کو فن کے قالب میں ڈھالنے اور موضوع کی گہرائیوں میں اترنے کا ہنر سکھایا۔ حب الوطنی کے وہ جذبات جن کو بیدار کرنے کے لیے پریم چند کو فرضی قصوں اور داستانی اسلوب کا سہارا لینا پڑا تھا۔ اب تاریخ کا پیراہن اور ماضی کا پیرایہ اختیار کر کے زیادہ مؤثر بن گئے۔ تاریخ کو بیانیہ نثر کا موضوع بنانے کی روایت اگرچہ عبدالحلیم شرر کے ناولوں کی شکل میں پہلے سے موجود تھی لیکن افسانے میں اس روایت کی داغ بیل ڈالنے کا سہرا پریم چند کے سر ہے۔ البتہ ان دونوں کے مآخذ مختلف ہیں۔ عبدالحلیم شرر نے تاریخ کے جس عہد اور ماحول کو ناولوں کا موضوع بنایا تھا وہ وطن سے کوسوں دور صلیبی جنگیں، عربوں اور عیسائیوں کے مابین تصادم اور مغربی ایشیا و یورپ کی تہذیب و معاشرت تھی جس میں فضیلت عربوں کو حاصل تھی۔ پریم چند کے وسائل اور مطالعہ دونوں محدود تھے ان کے سامنے سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی کا وہ زمانہ تھا جب مغل اور راجپوت کبھی متحد ہو جاتے تھے اور کبھی ان کی سیاست، سپاہیانہ شان اور علاحدہ شناخت کا مسئلہ ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہونے کے لیے مجبور کر دیتا تھا۔

ان ہی واقعات کا کچھ حصہ عوامی روایات کی شکل میں پریم چند تک بھی پہنچا تھا۔ لیکن برطانوی سامراج کے استحکام کے بعد ان کی نوعیت ہی بدل چکی تھی۔ سامراجی مقاصد تو اسی صورت میں تکمیل پاتے تھے، جب مغل اور راجپوت تصادم کو سیاست کے بجائے مذہب، قوم اور نسل کا رنگ دیا جائے تاکہ تعصب و تنگ نظری کی فضا گہری ہو کر ہندوستانی سماج کا شیرازہ بکھیر سکے اور ان مقاصد میں انھیں کسی حد تک کامیابی بھی ملی تھی۔ پریم چند کا فن بھی اپنے ابتدائی دور میں کہیں کہیں اس سازش کا شکار ہو گیا ہے لیکن ان کے بیشتر افسانے ان عیوب سے پاک ہیں۔ پریم چند نے ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے جو راستہ اختیار کیا وہ اگرچہ عبدالحلیم شرر اور تاریخی افسانہ نگاری کے فن سے کسی قدر مختلف تھا لیکن عصری زندگی کے تقاضوں سے زیادہ قریب تھا۔ عبدالحلیم شرر کے ناولوں میں تاریخی واقعات اور کردار خود مقصد بھی ہیں اور شجاعت، بہادری، اخلاقی اقدار اور اعتماد کو بحال کرنے کا ذریعہ بھی بنے ہیں جبکہ پریم چند کے افسانوں میں تاریخی واقعات اور کردار خود مقصد نہیں ہیں بلکہ حب الوطنی، جذبۂ آزادی، اخلاقی اقدار، سپاہیانہ اوصاف غیرت حمیت اور انصاف پسندی کے جذبات کو بیدار کرنے کا صرف ذریعہ ہیں اس لیے انھیں نہ تو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ ہی ان پر تاریخ کے مسخ کرنے کا الزام عائد ہوتا ہے۔ پریم چند نے کہا تھا۔

"کہانی میں نام اور سن کے سوا باقی سب کچھ سچ ہوتا ہے اور تاریخ میں نام اور سن کے سوا کچھ بھی حقیقت نہیں ہے"

پریم چند کے افسانے اسی قول اور افسانوی صداقت کے امین ہیں ان میں اگر تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کا کوئی تصور موجود ہے تو صرف اتنا ہے کہ افراد اور اقوام جب اخلاقی اقدار، سپاہیانہ اوصاف اور علم و ہنر سے محروم ہو جاتی ہیں تو اپنی آزادی کھو دیتی ہیں اور یہ ایسی ہمہ گیر صداقت ہے جس کے لیے کسی سند کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پریم چند کے تاریخی افسانے پڑھتے وقت نہ تو تاریخ کی گہرائیوں میں اترنے کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ ہی وہ متعصبانہ جذبات کو ہوا دیتے ہیں۔ تاریخ کے بارے میں پریم چند کا رویہ ایک فنکار کا رویہ ہے۔

پریم چند نے اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے مختلف طریقوں کو اپنایا ہے اور حسن و عشق کی چاشنی کے علاوہ کمزور روایتوں کا بھی سہارا لیا ہے۔ گناہ کا اگن کنڈ (۱۹۱۰ء) پریم چند کا پہلا تاریخی افسانہ ہے جس کی بنیاد صرف ایک گائے ہے جس پر تحفظ کی خاطر اتفاقاً حملہ اس کے مالک راجپوت جاگیردار کے قتل کا سبب بن جاتا ہے جس کا انتقام لینے کے لیے برج بالا در بدر بھٹکتی ہوئی آخرکار دھرم سنگھ کی بیوی راج نندنی کے پاس جودھپور پہنچ جاتی ہے۔ راج نندنی کی رحم دلی اس کے لیے

شعبۂ اُردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

یارانگی ہے جسے دونوں کا شوقِ علم اور سنسکرت ں مہارت دوستی میں بدل دیتا ہے۔ لیکن جب نیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ قاتل دھرم سنگھ ہی ہے یہ دوستی، انتقام و احسان، سہاگ اور انصاف ے درمیان کشمکش کا سبب بن جاتی ہے لیکن دھرم سنگھ کا احساسِ گناہ اور جان کی شکل میں پرائشچت یں آزمائش کا موقع نہیں دیتا۔ پریم چند کا فن ذبوں کی کشمکش سے احساس کو بیدار تو کرتا ہے یکن انھیں عمل کی شکل دے کر منفی رویّوں کو تقویت ہیں پہنچاتا ہے۔

پریم چند کا یہ تاریخی افسانہ اگرچہ مختصر اور فنی عتبار سے کمزور ہے جس میں ایک معمولی واقعے کا سہارا لے کر راجپوتی کردار کے مختلف پہلوؤں، راجپوتی ان، جذبۂ انتقام، انصاف پسندی، شوقِ علم، احساس ناہ، پرائشچت اور تکمیل وغیرہ اوصاف کو الگ لگ کرداروں کے ذریعے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ البتہ ان کے دوسرے افسانے "رانی سارندھا" (۱۹۱۰ء) میں یہ کمزوریاں نہیں ہیں۔ یہاں واقعات کا نشیب و فراز اور کردار کے نرم و گرم گوشے، پلاٹ کی فنکارانہ تعمیر، افسانے کو دلکش بنا دیتے ہیں۔ اس افسانے کا مرکزی کردار بھی ایک راجپوت عورت ہے جس میں تمام سپاہیانہ اوصاف موجود ہیں۔

افسانے کا پس منظر شاہجہانی عہد کا وہ آخری زمانہ ہے جب بادشاہ کی بیماری حصولِ اقتدار کے لیے شہزادوں میں تصادم کا سبب بن جاتی ہے اور سرداروں کو وفاداریوں کی کشمکش میں مبتلا کر دیتی ہے۔ پریم چند نے اس بحران میں سبقت اور فرازی کے بجائے سپاہیانہ مسلک کو اپنایا ہے یعنی جو پہلے دستِ سوال دراز کرے وہی مدد کا حق دار ہے۔ اور چھا کا راجہ چمپت رائے جو کسی زمانے میں شاہجہاں کا حلقہ بگوش تھا اسی اصول پر عمل کرتے ہوئے اورنگ زیب کی مدد کرتا ہے اور جاگیر و منصب پاتا ہے لیکن رانی سارندھا کی آزاد روح اس انعام سے خوش نہیں ہے وہ اس عیش و عشرت میں خود کو غلام محسوس کرتی ہے۔ پریم چند نے رانی سارندھا کے حریت پسندانہ جذبات کی کیسی موثر تصویر کشی کی ہے۔ اقتباس:

"سارندھا کا چہرہ سرخ ہو گیا بولی' میں کچھ کہوں آپ ناراض تو نہ ہوں گے؟"

چمپت رائے: نہیں شوق سے کہو۔

سارندھا: اور چھا میں میں ایک راجہ کی رانی تھی یہاں میں ایک جاگیردار کی لونڈی ہوں۔ اور چھا میں میں وہ تھی جو اودھ میں کوشلیا تھیں مگر یہاں میں ایک شاہی نمک خوار کی کنیز ہوں۔ جس بادشاہ کے رُو برو آپ آج سرِ نیاز خم کرتے ہیں وہ کل آپ کا نام سُن کر تھرّاتا تھا۔ رانی سے باندی ہو کر خوش رہنا میرے بس میں نہیں آپ نے یہ فراغت اور یہ محفلیں بڑی گراں قیمت دے کر خریدی ہیں۔"

(رانی سارندھا)

غلامی میں روح کا جوئے کم آب کی طرح سمٹ کر رہ جانے کا یہ تصور اگرچہ نیا نہیں ہے اور پریم چند کو اس کے عملی اظہار میں کوئی روشن کرن بھی نظر نہیں آتی ہے لیکن آزادی اور اس کی جدوجہد میں مردانہ وقار اور ایک آن تو موجود ہے۔ پریم چند نے اسی شان اور آن کو رانی سارندھا کی شکل میں مجسم کیا ہے اور اس کے تیور، عزم اور گفتگو میں حریت پسند مجاہد کی روح کو سمو دیا ہے جو آن کی خاطر شان کو اور آزادی کی خاطر عیش و عشرت کو اور عزتِ نفس کی خاطر جان کی پروا نہیں کرتا۔ اس کے لیے میدانِ جنگ اور شاہی دربار یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ پریم چند نے ایسے مجاہد کے تیکھے نقوش کو واضح کرنے کے لیے ایک ڈرامائی منظر کا سہارا لیا ہے اور اسے بادشاہ، سپہ سالار اور رانی سارندھا کے کرداروں سے سجایا ہے جن کے درمیان گفتگو نے افسانے کی روح اور اپنے عہد کے تقاضوں کو اسیر کر لیا ہے۔ یہ تقاضے خوف اور لالچ سے بے نیاز ہو کر اپنے مکمل وجود کی سالمیت اور تحفظ کی خواہش ہیں جس کے اظہار کے لیے پریم چند نے ایک گھوڑے کو وسیلہ بنایا ہے جو خود افسانے کے پس منظر میں قوت و وفاداری کی علامت ہے اور اس جاگیردارانہ نظام میں عروج و زوال کا ایک استعارہ بھی ہے جہاں معمولی سا واقعہ بھی افراد کی قسمتوں کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ اس افسانے کا یہ خوبصورت منظر ملاحظہ کیجیے:

"سارندھا نے بلند آواز میں کہا۔ خاں صاحب! بڑے شرم کی بات ہے کہ آپ نے وہ مردانگی جو دریائے چمبل کے کنارے دکھانی چاہیے تھی آج ایک طفلِ شیرخوار کے مقابلے میں دکھائی ہے کیا یہ مناسب تھا کہ آپ لڑکے سے گھوڑا چھین لیتے۔"

ولی بہادر خاں کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں تند لہجے میں بولے: کسی غیر کو کیا اختیار ہے کہ میری چیز اپنے تصرف میں لائے۔

رانی: وہ آپ کی چیز نہیں، وہ میری چیز ہے اسے میں نے رن بھومی میں پایا ہے اور اتنی آسانی سے آپ اسے میرے ہاتھ سے نہیں چھین سکتے ہیں۔ اس کے پیچھے ایک ہزار سواروں کا خون بہا دوں گی۔

خان صاحب: وہ گھوڑا میں نہیں دے سکتا اس کے عوض میں اپنا اصطبل خالی کر سکتا ہوں۔

رانی: میں اپنا گھوڑا لوں گی۔

خان صاحب: میں اس کے ہم وزن زر و جواہر دے سکتا ہوں مگر گھوڑا نہیں دے سکتا۔

رانی: اس کا فیصلہ تلواریں کریں گی۔

بندیلے نوجوانوں نے میان سے تلواریں کھینچیں اور قریب تھا کہ کشت و خون کا بازار گرم ہو۔ عالمگیر نے بیچ میں آکر فرمایا۔ رانی صاحبہ آپ اپنے سپاہیوں کو روکیں۔ گھوڑا آپ کو مل جائے گا مگر اس کی قیمت بہت گراں ہوگی۔

سارانی: میں اس کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں۔

عالمگیر: جاگیر اور منصب بھی۔

سارانی: جاگیر اور منصب کوئی چیز نہیں۔

عالمگیر: اپنا راج بھی۔

سارانی: اس کی بھی میرے نزدیک کچھ ہستی نہیں۔

عالمگیر: ایک گھوڑے کے مقابلے میں۔

سارانی: جی نہیں! اس چیز کے مقابلے میں جو دنیا میں سب سے زیادہ پیاری ہے۔

عالمگیر: وہ کیا؟

سارانی: اپنی آن۔

اس طرح رانی سارندھا نے ایک گھوڑے کے لیے اپنی وسیع جاگیر اونچا اور شاہی اعزاز سب ہاتھ سے کھو دیا اور صرف اتنا ہی نہیں آئندہ کے لیے شاہی عتاب کا بیعانہ دیا۔" (رانی سارندھا)

مذکورہ اقتباس میں سپاہیانہ چشمک، غیرت و آن اور شاہی تدبر کے علاوہ شدتِ جذبات، زورِ بیان اور اختصار کے وہ پہلو موجود ہیں جو تاریخی افسانے کو موثر اور دلکش بناتے ہیں۔ یہ واقعہ اگرچہ خود اپنی جگہ مکمل تاثر ہے جس کو مزید تقویت پہنچانے کے لیے پریم چند نے کچھ اور واقعات کا پیوند لگایا ہے جس میں راجہ چمپت رائے اور شاہی فوجوں کے درمیان تصادم، اپنوں ہی سے مقابلہ، رعایا کی حفاظت کے لیے ان کی قربانی اور آخر غلامی کی ذلت سے بچنے کے لیے اپنے ہی ہاتھوں عزت کی موت کے واقعات شامل ہیں جن کی تصویر کشی میں پریم چند نے جزئیات کے استعمال سے اندرونی فضا کو جگانے اور زندگی کی حرارت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ پریم چند نے افسانے کے انجام کو بھی اس کے آغاز سے پیوست کر کے مجموعی تاثر کو مزید ابھارا ہے لیکن افسانے کا یہ انجام کچھ غیر فطری معلوم ہوتا ہے۔ سپاہی کا انجام خود کشی نہیں بلکہ میدانِ جنگ میں بہادری کی موت ہی ہو سکتا ہے۔ پریم چند نے رانی سارندھا میں تاریخ ساز قوتوں اور سپاہی اور سپہ سالار کے فرق کو بھی نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ فرق کیا ہے ملاحظہ کیجیے۔

"دنیا ایک معرکہ کارزار ہے اس میدان میں اس سپہ دار کو فتح نصیب ہوتی ہے جس کی آنکھیں موقع شناس ہوتی ہیں جو موقع دیکھ کر جتنی سرگرمی اور جوش سے آگے بڑھتا ہے اتنے ہی جوش اور سرگرمی سے خطرے کے مقام پر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ سلطنتیں قائم کرتا اور قومیں بناتا ہے اور تاریخ اس کے نام پر عظمت کے پھول چڑھاتی ہے۔

مگر اس میدان میں کبھی کبھی ایسے سپاہی بھی آجاتے ہیں جو موقع پر قدم بڑھانا جانتے ہیں مگر خطرے پر پیچھے ہٹنا نہیں جانتے۔ یہ فتح کو اصولوں پر قربان کر دیتا ہے ــــــ"

پریم چند نے اگرچہ سپاہیانہ اوصاف کے ساتھ موقع شناسی کو بھی تاریخ ساز قوتوں میں شامل کر دیا ہے لیکن ان کا ہیرو آن پر جان نثار کر دینے والا سپاہی ہی ہو سکتا ہے۔

پریم چند کے افسانوں میں خیال اور زندگی کی حقیقتیں بتدریج ارتقائی مدارج طے کرتی ہیں اور آہستہ آہستہ ان کی پرتیں کھلتی ہیں۔ ابتدا میں ان کے صرف بدیہی اور خارجی پہلو ہی سامنے آتے ہیں لیکن جیسے جیسے موضوع پر گرفت مضبوط ہوتی جاتی ہے اور اس کے باطن میں جھانکنے کا موقع ملتا ہے۔ خارجی اور مثبت پہلوؤں کے ساتھ اس کے باطنی اور منفی پہلو بھی سامنے آنے لگتے ہیں۔ پریم چند نے اگرچہ سپاہیانہ اوصاف، اخلاقی اقدار اور جذبۂ حریت کو تقویت پہنچانے کے لیے راجپوتوں کی زندگی اور ان کی تہذیب و معاشرت کو تاریخی افسانوں کا موضوع بنایا تھا لیکن عسکری قوت اور سپاہیانہ جذبوں کے کچھ اپنے تضادات اور کمزوریاں بھی ہیں جن کی نشاندہی کے بغیر موضوع کے ساتھ انصاف ممکن نہیں ہے۔ پریم چند نے اپنے افسانوں میں ان تضادات کو بھی موضوع بنایا ہے۔ وکرمادت کا تیغہ (۱۹۱۱ء) ایسا ہی افسانہ ہے۔ وکرمادت کا تیغہ تحفظ و انصاف اور رعایا پروری کی علامت ہے۔ اور ان ذمے داریوں کو پورا کرنے کے بعد ہی کوئی راجہ وکرمادت کہلانے کا مستحق ہوتا ہے لیکن عام طور پر صرف عسکری قوت اور ریاست کی حدود کو وسعت دے کر اس لقب کو اختیار کرنا چاہتے تھے۔ جبکہ ان کے سپاہی رعایا کے جان و مال اور عورتوں کی عزت و آبرو سے کھیلتے رہتے ہیں۔ پریم چند نے مہاراجہ رنجیت سنگھ وکرمادت کے پس منظر میں عسکری قوت کے اس تضاد کو واضح کیا ہے۔

زندگی کا یہ کیسا تضاد ہے۔ جو انسانی جذبہ جتنا زیادہ پرشکوہ اور طاقتور ہوتا ہے اسی قدر شدت سے کمزور لمحوں میں زوال کے اثرات کو قبول کرتا ہے وہ سپاہی جو دنیا کو فتح کرنے کا خواب دیکھتا ہے ظلم و تشدد کے خلاف اپنا خون بہاتا ہے وہی طاقت اور فتح کے نشے میں چور ہو کر معصوم اور بے گناہ عورتوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے اسی کے یہاں شک و شبہات اور توہمات کے انکر جلد نمو پاتے ہیں۔ "راجہ ہردول" بھی ان ہی منفی سپاہیانہ رویوں کا شکار ہے۔ پریم چند نے ان

منفی و مثبت رویّوں کے اثرات اور تصادم کی عکاسی کے لیے راجپوتوں کی روایت کو سہارا بنایا ہے۔

راجپوت معاشرے میں راجہ کی تلوار اور ڈھال شوکت اور وفاداری کی مخصوص علامتیں تصور کی جاتی ہیں جس کی امین رانی ہوتی ہے اور ان دونوں کا کسی غیر شخص کے تصرف میں آنا ذلت اور بے وفائی کے مترادف ہے جس کا فیصلہ تلوار ہی کرتی ہے۔ پریم چند نے افسانے میں حسن پیدا کرنے کے لیے راجہ ہردول کے کردار کو حسنِ اخلاق، فیاضی، انصاف پسندی، رعایا پروری، علم و ہنر کی قدردانی اور غیر معمولی شجاعت سے آراستہ کیا ہے اور تلوار کو حاصل کرنے کے سلسلے میں راجپوتی آن اور قادر خان سے مقابلے کا جواز بھی پیدا کیا ہے۔ اس کے باوجود وہ سپاہیانہ رویّوں کے مثبت اظہار کی مثال ہے۔ وہ طاقت کے ذریعے ریاست پر قبضہ کر کے اپنے بڑے بھائی جوجھار سنگھ کے منفی رویّوں کا جواب نہیں دیتا بلکہ ایثار و قربانی کی مثال قائم کرتا ہے۔

پریم چند کا یہ افسانہ "راجہ ہردول" ان ہی سپاہیانہ جذبوں کے منفی و مثبت پہلوؤں کے تصادم کو پیش کرتا ہے جس میں وقتی فتح تو منفی رویّوں کو حاصل ہوتی ہے لیکن شہادت کا منصب راجہ ہردول کے حصے ہی میں آتا ہے۔

پریم چند کا افسانہ آلہا (۱۹۱۲ء) بھی اسی بندیل کھنڈ کی راجپوت روایات کا حصہ ہے جو آلہا اودل کی غیر معمولی شجاعت اور وطن پرستی کے کارناموں پر مشتمل ہے لیکن یہ دونوں بھائی اپنوں ہی کی سازش کا نشانہ بن کر وطن سے نکالے جاتے ہیں اور پھر وقت پڑنے پر وطن کی پکار کو سن کر واپس بھی آجاتے ہیں۔ پریم چند نے جاگیردارانہ نظام اور راجپوت ریاستوں کے عروج و زوال کے پس منظر کو آلہا کے ذریعے پیش کیا ہے جو اتحاد اور بہادروں کی قدردانی سے تقویت پاتی ہیں اور آپسی نفاق، سازشوں، نفس پرستی اور انتشار کے باعث ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتی ہیں۔

"راج ہٹ" کو بھی اگرچہ پریم چند کے تاریخی افسانوں میں شامل کیا جاتا ہے اس کا تہذیبی اور معاشرتی پس منظر بھی راجپوت ریاست ہے لیکن یہ بیسویں صدی میں دیسی ریاستوں میں جدید تعلیم سے پیدا ہونے والے مثبت اثرات کو نمایاں کرتا ہے اس لیے راج ہٹ کو پریم چند کے تاریخی افسانوں میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس کے بعد پریم چند نے تین خوبصورت تاریخی افسانے عفو (۱۹۲۴ء)، شطرنج کی بازی (۱۹۲۴ء) اور ستی (۱۹۲۷ء) لکھے تھے۔

عفو یا معافی میں پریم چند نے مذہب اور سیاست کے تصادم کو موضوع بنایا ہے۔ مذہب اور سیاست اگرچہ فلسفۂ زندگی کی دو الگ الگ شاخیں ہیں لیکن اکثر سیاست نے مذہب کی آڑ لے کر جارحانہ رویّوں کو تقویت پہنچائی ہے جب کہ مذہب کے مثبت پہلوؤں نے ہمیشہ تعصب اور تشدد کے مقابلے میں رحم و انصاف اور انسانیت کی حمایت کی ہے۔ پریم چند اگرچہ سماج کو تشدد سے بچانے کے لیے سیاست پر مذہب اور اخلاق کے اثرات سے انکار نہیں کرتے لیکن ان کے یہاں مذہب اور سیاست دو علاحدہ شعبے ہیں افسانہ عفو اسی فرق کو واضح کرتا ہے۔

کسی ملک کی تحریکِ آزادی اگرچہ بنیادی طور پر حکمراں طبقے کے ظلم و استحصال کے خلاف بحالیِ حقوق کی جد و جہد ہوتی ہے لیکن فریقین کے اختلافِ مذہب نے اکثر غلط فہمیوں کو ہوا دے کر نفرتوں کو فروغ اور مذہب کو بدنام کیا ہے۔ عفو کا تاریخی پس منظر اسپین کا وہ زمانہ ہے جب کہ مقامی آبادی اپنے مسلمان حکمرانوں کے خلاف جد و جہد میں مصروف تھی جس کا پُرجوش رہنما ایک مذہب پرست عیسائی داؤد تھا اسی کے ہاتھوں شیخ حسن کے بیٹے جمال کا قتل ہوا تھا لیکن شیخ حسن کی مذہبیت خیمے میں پناہ مانگنے والے دشمن داؤد سے انتقام لینے کے بجائے نہ صرف اس کی حفاظت کرتی ہے بلکہ سلامتی اور فرار میں مدد پہنچانے کے لیے اپنی سانڈنی بھی اس کے حوالے کر دیتی ہے۔ داؤد کو رخصت کرتے وقت شیخ حسن کہتا ہے۔

"میں جانتا ہوں کہ مسلمانوں کے ہاتھوں عیسائیوں کو بہت سی تکالیف پہنچی ہیں۔ ان کی آزادی چھین لی ہے لیکن یہ اسلام کا نہیں، مسلمانوں کا قصور تھا۔ ہمارے مقدس نبی نے یہ تعلیم نہیں دی تھی جس پر ہم آج کل چل رہے ہیں وہ خود رحم اور فیض کا معیار ہیں۔" (عفو)

کسی سماج کو رحم اور انسانیت کا جذبہ ہی مہذب بناتا ہے۔ پریم چند نے یہ افسانہ ایسے دور میں لکھا تھا جب کہ عیسائی حکمراں طبقے کے خلاف ہندوستان میں تحریکِ آزادی قوت پکڑ چکی تھی جس میں اگرچہ تمام مذاہب کے لوگ شامل تھے لیکن مذہب کی بے جا مداخلت نے تحریک کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا جس کا سدِ باب ہر حساس محبِ وطن کے لیے ضروری تھا۔ عفو اسی فنکارانہ شعور اور آرزومندی کا مظہر ہے۔

اسی زمانے میں پریم چند نے "شطرنج کی بازی" افسانہ بھی لکھا تھا جو اودھ کے سیاسی زوال کے پس منظر میں قومی حمیت و غیرت کا مرثیہ ہے اس زوال پذیر معاشرے کی المناک تصویر کا پہلا ہی منظر یہ ہے:

"نواب واجد علی شاہ کا زمانہ تھا۔ لکھنؤ عیش و عشرت کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ چھوٹے بڑے امیر و غریب سب رنگ رلیاں منا رہے تھے کہیں

نشاط کی محفلیں آراستہ تھیں تو کوئی افیون کی پینک کے مزے لیتا تھا۔ زندگی کے ہر ایک شعبے میں رندی و مستی کا زور تھا اور سیاست میں، شعر و سخن میں، طرزِ معاشرت میں، صنعت و حرفت میں، تجارت و تبادلے میں سبھی جگہ نفس پرستی کی دہائی تھی۔"
(شطرنج کی بازی)

جہاں اخلاقی پستی کا یہ رنگ ہو وہاں افراد سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ میر اور مرزا بھی اسی معاشرے کے دو نمائندہ کردار ہیں۔ جن کے پاس اگرچہ آمدنی کے پرانے وسائل موجود ہیں لیکن ذمے داریوں سے محروم کر دیے گئے ہیں جس کا نتیجہ جذبوں اور قوتوں کا زوال اور ایسے جا اظہار ہو سکتا تھا جہاں مشاغل ذہن کو مصروف تو رکھ سکتے تھے لیکن مثبت نتائج کے ضامن نہیں بن سکتے تھے۔

انسانی جذبے ان خودرو اور سرکش پہاڑی نالوں کی طرح ہوتے ہیں جو اپنے اظہار کی صحیح سمت اور رفتار نہ پا کر بے راہ رو ہو جاتے ہیں خود بھی خراب ہوتے ہیں اور سماج کو بھی خراب کرتے ہیں۔ میر اور مرزا کے بگڑے ہوئے جذبے اور مجروح انانیت بھی جب عملی زندگی میں بامعنی اظہار کی کوئی راہ نہیں پاتی تو خود فراموشی کے اسباب تلاش کر لیتی ہے۔ ہنرمندیوں کو بازیوں میں تبدیل کر دینا اور زوال پذیری کے مقابلوں میں سبقت لے جانے کی کوشش کرنا انہی بے بس اور مریضانہ ذہنوں کے مظاہر ہیں۔ میر اور مرزا بھی اسی میدان کرب و بلا اور درازیٔ شب کے شہ سوار ہیں جو اگر تاریخ اور تاریخ ساز قوتوں کا حصہ نہیں بنتے تو وقت کے بہاؤ میں بہہ جانے سے انکار کی جرات بھی نہیں کرتے۔

پریم چند شطرنج کی بازی میں المیہ اور طنزیہ دونوں کے عناصر کو شامل کر دیا ہے۔ ان المناک حالات کا بیجہ میر اور مرزا نہیں ہیں بلکہ پورا معاشرہ ہی اس سیاہ چادر میں لپٹا ہوا ہے لیکن واجد علی شاہ کی بے عذر معزولی اور گرفتاری اور چوبی مہروں کی خاطر آپس میں تکرار اور قتل کے پس منظر نے اسے قومی بے حمیتی اور بے غیرتی کے اجتماعی رویوں پر بھرپور طنز کا نمونہ بنا دیا ہے۔ جس میں عصری معنویت کا پہلو بھی موجود ہے۔ ملک کی غلامی قوم کی غلامی بھی ہوتی ہے اور افراد کی بھی، جس کے مضر اثرات سے کوئی فردِ واحد محفوظ نہیں رہ سکتا اور اسی طرح حالات سے فرار بھی موت کی علامت ہے۔ میر اور مرزا بھی اسی فطری انجام کو پہنچتے ہیں۔

پریم چند کے تاریخی افسانوں میں "ستی" کو خصوصی اہمیت حاصل ہے جو دو قوی اور متضاد انسانی جذبوں کی ہم آہنگی سے نکھرتا اور سنورتا ہے اور تصادم سے بکھر جاتا ہے یہ جذبۂ مبارزت اور جذبۂ محبت ہے یہ دونوں جذبے جب ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے ہیں تو مفید نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اور تصادم کی صورت میں ان کے مضر اثرات کا دائرہ بہت دور تک پھیل جاتا ہے۔ افسانہ ستی کا حُسن چنتا دیوی کے شجاعانہ کارناموں میں نہیں ہے بلکہ سپاہیانہ اوصاف سے پیدا ہونے والے مثبت تصورات اور انسانی نفسیات اور جذبوں کے نرم و گرم گوشوں کے فطری عمل میں ہے۔ چنتا نے رتن سنگھ کو اس لیے قبول کیا تھا کیوں کہ اس میں ایک سپاہی کی شان اور آئیڈیل کی جھلک موجود تھی وہ خاموش طبع، بہادر، ایثار اور اصول پسند عاشق تھا اس نے ان اوصاف اور کردار کے حوالے سے جسم کا رشتہ قائم کیا تھا لیکن جب یہ وسیلہ باقی نہیں رہتا تو رتن سنگھ بھی اس کی نظروں سے گر جاتا ہے۔

جس طرح سپاہیانہ جذبوں کے مثبت پہلو انسانی سماج کو تقویت پہنچاتے ہیں اور ان کے منفی پہلوؤں سے انسانیت کو داغ لگتا ہے اسی طرح بے غرض جذبۂ محبت سے جوانمردی اور سپاہیانہ اوصاف کو تقویت ملتی ہے اور محبت میں جنسی جذبوں کی شمولیت اور تشنگی سے ان میں کمزوری آتی ہے یہ جذبے کس قدر شدید ہو سکتے ہیں اور انسانی حواس پر کس طرح غلبہ حاصل کر لیتے ہیں پریم چند نے چنتا اور رتن سنگھ کی جذباتی کشمکش اور عمل کے ذریعے "ستی" میں ان کی نہایت موثر تصویر کشی کی ہے۔

پریم چند نے اگرچہ مثالی تصورِ محبت کے باوجود جسم اور جنسی تقاضوں سے انکار نہیں کیا ہے لیکن یہ جذبے حالات جنگ میں ایک سپاہی کی زندگی میں کس قدر قاتل ثابت ہو سکتے ہیں۔ ستی میں انہی پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ پریم چند کی نظر میں جنسی جذبے ایسی ہوا کا گرم جھونکا اور لمحات کا کھیل ہیں کہ جب یہ لمحے گزر جاتے ہیں تو یہ جذبے بھی پُرسکون اور مغلوب ہو جاتے ہیں اور احساسِ فرض پھر غالب آ جاتا ہے۔ چنتا دیوی بھی جب وقتی بہاؤ سے نکلتی ہے تو رتن سنگھ کی شکل میں اپنے آئیڈیل اور تصورات کی شکست دیکھ کر خود بھی شکست خوردہ ہو جاتی ہے۔ انسان صرف جسم سے نہیں پہچانا جاتا بلکہ جسم میں رہنے والی روح اور اس کے خارجی مظاہر انسان کی شناخت قائم کرتے ہیں ان ہی کے حوالے سے دوسرے رشتے قائم ہوتے ہیں اور جب یہ شناخت باقی نہیں رہتی تو حقیقی معنوں میں یہ رشتے بھی منقطع ہو جاتے ہیں۔ "ستی" بھی ان ہی رشتوں کے اعتراف اور انحراف کی روداد ہے۔ چنتا اور رتن سنگھ بھی اپنے اپنے آئیڈیل کی موت کے غم میں خود کو بھی موت کے سپرد کر دیتے ہیں اور یہی پریم چند کے فن اور انسانیت کی معراج ہے جہاں روح جسم پر اور فرض جذبے پر فتح پاتا ہے۔

پریم چند کے تاریخی افسانوں میں پلاٹ کے فنکارانہ شعور، منظر نگاری، جذبات نگاری کے

بھی موثر اور دلکش نمونے ملتے ہیں اور زبان و بیان کی شگفتگی و سلاست بھی آخر تک برقرار رہتی ہے۔ مجموعی اعتبار سے اگر پریم چند کے تاریخی افسانوں کا جائزہ لیں تو تاریخ کے بارے میں پریم چند کا رویہ ایک فن کار کا رویہ ہے جو تاریخ کے ذریعے انسان کو عظمت تو دینا چاہتا ہے اسے کہیں رسوا یا ذلیل نہیں کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پریم چند کے تاریخی افسانوں میں انھی انسانی اوصاف اور اخلاقی اقدار کو نمایاں کیا گیا ہے جو کسی عہد، ملک اور قوم سے وابستہ نہیں ہیں بلکہ ہر حساس، باعزت اور غیرت مند دل کی پکار ہیں جس کے پس منظر تو بدل سکتے ہیں لیکن اقدار وہی رہتی ہیں۔ اس اعتبار سے پریم چند کے تاریخی افسانے ان کے ہم عصروں کے مقابلے میں ممتاز نظر آتے ہیں جن کی دلکشی زیادہ دیر تک باقی رہے گی۔



نعمان شوق

ن ڈھلے تو خواب کے ٹوٹے پروں پر کچھ لکھیں
ویرانے ہو چکے ان منظروں پر کچھ لکھیں

ب تک اس کے دل میں روشن ہوں مراہی وصف ہے
ہنر سب میں کہاں ہے پتھروں پر کچھ لکھیں

وف ہے ٹوٹے نہ پیلے، نیلے رنگوں کا طلسم
ور یہ خواہش بھی کہ تتلی کے پروں پر کچھ لکھیں

وتلی باتیں، فرشتوں کی ہنسی، معصومیت
ہم جہاں چھوڑ آتے ان کچے گھروں پر کچھ لکھیں

ہ سمجھ لے آنے والی نسل ہم بزدل نہ تھے
پنے خوں سے دشمنوں کے خنجروں پر کچھ لکھیں

بلکی محلہ، آرہ ۸۰۲۳۰۱

یہ سعیِ فروزاں کا اثر دیکھ رہا ہوں
ہر گام پہ تابندہ سحر دیکھ رہا ہوں
رکھ دی ہے مرے ذوق نے ہر شے میں تجلّی
خود اپنا ہی میں حُسنِ نظر دیکھ رہا ہوں
پھر پیرویِ کاوشِ فرہاد ہوتی ہے
پھر چاک چٹانوں کا جگر دیکھ رہا ہوں
کس درجہ عجب تر ہے ترے حُسن کا عالم
ہر جلوہ بہ اندازِ دِگر دیکھ رہا ہوں
اُن ریشمیں پلکوں پہ لرزتے ہوئے آنسو
میں ڈوبتے تاروں کی سحر دیکھ رہا ہوں
ہیں ساتھ مرے، اُن کے خیالوں کی فصیلیں
شوکت میں بیاباں میں بھی گھر دیکھ رہا ہوں

شوکت علی شوکت

X/34C، نیو رنجیت نگر، ڈی. ڈی. اے. کالونی، نئی دہلی ۸

شمس رمزی

جرأتیں کس میں ہیں ایسی، ایسے منظر دیکھنا
دیکھنا اپنا تماشہ اور جم کر دیکھنا

شبنمی قطروں کی جرأت لائقِ تحسین ہے
تمتماتے گُل کے عارض آپ چھوکر دیکھنا

کون سا پتھر تمھارے سر کا اچھا دوست ہے
امتحاناً بھیڑ سے باہر نکل کر دیکھنا

کیسے آہٹ پر سمٹ آتی ہیں ساری مچھلیاں
پھینک کر دریا میں اک دن تم بھی پتھر دیکھنا

پھیکے پڑ جائیں گے پل بھر میں سبھی نقش و نگار
بھول کر بھی تتلیوں کے پر نہ چھوکر دیکھنا

سی ۱۰۳، ویلکم، دہلی ۱۱۰۰۵۳

عبدالحق پٹھان

تبصرہ نگاری کا فن

کچھ فن ایسے ہوتے ہیں جن میں فنّی مہارت تو کیا معمولی شُدبد کی بھی ضرورت نہیں ہوتی، مثلاً کیرم کھیلنے کا فن۔ بس اسٹول یا کُرسی پر بیٹھنا آنا چاہیے آپ کھلاڑی کہلائیں گے اور کسی بھی کلب میں جاکر کھیلنے کے مجاز سمجھے جائیں گے۔ لیکن کرکٹ کو کیرم کی صف میں شامل نہ کیجیے گا ورنہ ہوسکتا ہے کہ شناختی کارڈ کا فوٹو بدلنا پڑجائے۔ ہاں تبصرہ نگاری کو کیرم کی قبیل کا سمجھا جاسکتا ہے۔ بس چند گُر یاد رکھیے۔ ہم نے یہ گُر ابھی حال ہی میں ایک مخلص کرم فرما سے سیکھے ہیں۔ انھوں نے ہمیں اپنا سمجھ کر بتادیے ہم آپ تک پہنچانا اپنا ادبی فرض سمجھتے ہیں۔

ہر ہفتے کسی بڑے بُک اسٹال پر ضرور جایا کیجیے۔ کتابیں خریدنے کے لیے نہیں صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ کون سی نئی کتاب یا خاص نمبر بازار میں آیا ہے۔ جب آپ "گوہرِ مطلوب" کو اسٹال پر دیکھ لیں تو اسے کسی نہ کسی طرح حاصل کرنے کی کوشش کریں، کچھ گھنٹوں کے لیے ہی سہی۔

اب آپ اس کا طبیعی مطالعہ (Phy-sical Inspection) کرنا شروع کریں۔ معائنہ سرتاپا کیا جانا چاہیے یعنی پہلے سرورق دیکھیں۔ وہ دیدہ زیب، جاذبِ نظر ہے تو کوئی بات نہیں۔ اگر وہ پھیکا، بدمزہ، بھدّا اور ناقابلِ فہم ہو تو سمجھ لیجیے کہ فنونِ لطیفہ کی کسی صنف کا شاہکار ضرور ہے (موسیقی کے علاوہ، کیوں کہ کہا جاتا ہے کہ موسیقی دیکھنے کی نہیں سُننے کی چیز ہوتی ہے)۔ آپ ایک آدھ سطر اس کی تعریف میں اس طرح لکھیے کہ آپ خود نہ سمجھ سکیں کہ آپ نے فنونِ لطیفہ کی کس شاخ سے سرورق کو منسلک کیا ہے۔

اس کے بعد "گوہرِ مطلوب" کو پوری طرح اُلٹ دیجیے۔ اب اس کی پشت کا معائنہ کیجیے۔ "پُشت" پر آنے کے بعد آپ کو پتہ چلے گا کہ معائنے کے ساتھ ساتھ مطالعے کی بھی ضرورت ہے۔ پُشت پر اکثر مصنّف کی تصویر چھپتی ہے تاکہ قارئین سیرت ہی نہیں صورت سے بھی آشنا ہوجائیں۔ پُشت پر ہی یہ بھی لکھا ہوتا ہے کہ مصنّف عالمِ بالا سے عالمِ اسفل کی جانب کب اور کس جرم کی پاداش میں بھیجا گیا۔ اور یہاں اس نے کتنی سزا کاٹ لی ہے اور اس قیدِ بے اختیار میں رہ کر اب تک کیا کیا کرچکا ہے اور آئندہ کیا کرنے کا ارادہ ہے۔ مبصّر کو چاہیے کہ اس صفحے کی معلومات کو ذہن میں رکھے تاکہ لکھی جانے والی سطروں میں جابجا استعمال کرسکے۔ اگر رسالے کا خاص نمبر ہو تو پُشت پر کسی شاعر کی بڑھاپے کی تصویر اور جوانی کی پھڑکتی ہوئی سی غزل ہوگی۔

اب اطمینان سے کتاب یا رسالے کا پہلا صفحہ کھولیے۔ مبصّر کی نظر میں اس صفحے کی وہی اہمیت ہونی چاہیے جو مفسّر کی نظر میں سورۃ فاتحہ کی ہوتی ہے۔ کہنہ مشق مبصّر پوری کتاب کا تجزیہ اس صفحے سے کرلیتا ہے کیونکہ پوری کتاب کے مطالعے سے حواسِ خمسہ کو ضرر پہنچنے کا خطرہ رہتا ہے۔

اس صفحے پر تبصرے کا سارا مسالہ بکھرا پڑا ہوتا ہے۔ آپ پُڑیاں بنا بنا کر رکھتے جائیے۔ جیسے رسالے کے صفحات، سالِ اشاعت، تعداد (جو چھپی ہے) صفحات کا سائز (سائز ہمیشہ علمِ ریاضی کی زبان میں لکھیے تاکہ پڑھنے والوں پر اثر پڑے)۔ کاغذ کی قسم (اگر معلوم نہ ہو تو کسی جلد ساز سے باتوں باتوں میں پوچھ کر لکھیں) قیمت (نہ صرف ملکی سکّۂ رائج الوقت میں بلکہ غیر ملکی کرنسی میں بھی لکھیں تاکہ معلوم ہو کہ کتاب اور صاحبِ کتاب دونوں نیشنل نہیں انٹرنیشنل ہیں)۔

مُصنّف اور ناشر کا پورا نام مع پتے اور ٹیلیفون نمبر کے لکھیے۔ پریس کا نام نوٹ کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کتاب آفسیٹ پر چھپی ہے۔ کاتب کا نام ضرور لکھیے کیونکہ آگے چل کر مُصنّف کی بہت سی نااہلیوں کو اسی کے سر منڈھنے کی ناکام کوشش کی

۲۴/۲۹۳، ای۔ آر۔ روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

ے گی۔

ان سب پُرزیوں کو ایک بڑے کاغذ
نقل کر دیجیے پھر دیکھیے تبصرے کا قد
لمبا ہوگیا ہے۔ آپ کی زحمت کتاب کی
ستی کے لیے رحمت بن گئی۔ اس کو کہتے
ایک پنتھ دو کاج! تبصرے کا تبصرہ
بار کا اشتہار۔

اب آپ فہرست سے مضامین کی نوعیت
م کر لیجیے، اس مصرع کی رہنمائی میں
ا کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر"

بس اتنا کافی ہے۔ باقی تبصرہ دیباچے اور تعارفی مضمون سے مکمل کر لیجیے۔ احتیاط یہ برتیے کہ الفاظ آپ کے ہوں اور بات گول نہیں گول مول ہو۔ اگر کتاب کے کسی سڑے گلے حصّے پر نظر پڑ بھی جائے تو اس کا آپریشن ہرگز نہ کریں، صرف پھایہ لگا دیں تاکہ زخم سنگین نہ معلوم ہو۔ تبصرے کے آخر میں یہ ضرور لکھیں کہ اس کتاب کی تصنیف یا تالیف کر کے مُصنّف یا مؤلف نے قوم و ملّت پر بڑا احسان کیا ہے جس کا اعتراف برسوں تک کیا جانا چاہیے۔

لیجیے تبصرہ تیار ہوگیا، اس کی دو زیروکس کاپیاں نکلوائیے۔ ایک اپنے رکارڈ فائل میں (اگر ہے تو) لگا لیجیے۔ دوسری مُصنّف کو بھیج دیجیے تاکہ وہ آپ کو شکریے کا خط لکھنے پر مجبور ہو جائے۔ اور مسودہ کسی اخبار کے ایڈیٹر کو روانہ کر دیجیے۔

○

مجیب الاسلام

دلی کے اردو لوک گیت

لوک گیت عوامی ادب کی وہ مشہور صنف ہے جو انسانی پیدائش سے ہی ظہور میں آئی ہے۔ اس میں جغرافیائی حد بندیاں تو ضرور ہیں لیکن اس کے باوجود یہ عوام کے ذہنوں میں محفوظ رہنے والا وہ قیمتی سرمایہ ہے جسے ضبطِ تحریر میں نہیں لایا جاتا تھا۔ یہ ان پڑھ عوام کے داخلی جذبات کا فطری اظہار ہیں۔ ان کا خاص کام خواتین کے جذبات کا بے اختیار اظہار اور ان کے بھرپور احساسات کا بیان ہوتا ہے۔ لوک گیتوں کا تعلق ان طبقوں سے ہوتا ہے، جن کی زبان، روٹی روزی اور رہنے سہنے کے طریقے ایک سے ہوتے ہیں۔ لوک گیت کسی ایک شخص، گروہ یا برادری کے نہیں ہوتے بلکہ یہ سارے سماج کا مشترکہ سرمایہ بن جاتے ہیں۔ اسی لیے ہر گھر میں بلاتفریق کے گائے جاتے ہیں۔ لوک گیت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ داخلیت اور خارجیت دو قالب ہوتے ہوئے بھی ایک روح ہو کر گیت میں ڈھلتے ہیں۔ یہ قلبی واردات کے ساتھ بعض خارجی عناصر کو بھی اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں جس سے ایک دل نشین غنائی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ انگریزی ادب کی تاریخ میں C.D. LEWIS' F.T. PLAYGRAVE, GEORGE SAMPSON. اور WILLIAM FRANK نے غنائی شاعری کی جو خصوصیات بتائی ہیں ان میں تخیل، ترنم، جذبات کی یکرنگی، اختصار اور شدتِ جذبات کے عناصر لازمی قرار دیے ہیں۔ ان میں سے چند خصوصیات اردو لوک گیت کی جان ہیں۔

دلی میں لوک گیت اتنا ہی قدیم ہے جتنی یہاں کی تہذیب۔ دلی میں لوک گیت کا آغاز کب ہوا۔ اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ایک اندازے کے مطابق دلی کے اردو لوک گیت ممکن ہے خسرو کے زمانے سے متعلق ہوں۔ لیکن جہاں تک موجودہ لوک گیتوں کا رشتہ ہے ان کا تعلق عہد شاہجہانی سے ہونا چاہیے۔ شاہجہان نے جب دلی کو آباد کیا اور مختلف قسم کے پیشہ وروں کو یہاں بسایا تو اس کی سماجی روایت میں نیا آب و رنگ شامل ہوتا گیا۔ دلی کے لوک گیتوں کو پیش کرنے سے پیشتر اس نگری کے دل والوں کی چند خصوصیات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر یہاں کے لوک گیتوں سے حظ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

مرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست' فراق کا زبان زد عام شعر دلی کی تہذیب کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ جب جب دلی اجڑی اس کے بسنے والوں میں نئی زندگی پیدا ہوتی گئی ہر بار اجڑنے کے بعد دوبارہ بسنے میں اس کے شباب کی دوشیزگی نکھرتی گئی۔ اسی لیے دلی کے لیے کہا جاتا تھا کہ یہاں آٹھ دن نو میلے تھے۔ قومی اور مذہبی تہواروں کے علاوہ زچگی شادی غمی کے بہانے ہر روز ایک نت نئی محفل آراستہ کی جاتی تھی۔ خاص طور پر ایسی محفلیں جن میں خواتین کا جمگھٹا ہو۔ بات بے بات کنبے کو جوڑنا، کھانا اور گانا ان کے گھریلو مشاغل کا ایک ضروری حصہ تھا۔ دولت کی فراوانی شامیں سہانی اور صبحیں مستانی تھیں۔ اسی لیے دوسری جگہوں کے مقابلے میں یہاں کے لوک گیتوں میں ایک خاص طرح کی دلکشی پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر بچے کی پیدائش کے وقت جو زچہ گیریاں گائی جاتی تھیں بعض گھرانوں میں اب بھی گائی جاتی ہیں۔ ان میں سے تین یہاں پیش کی جاتی ہیں۔ پہلے لوک گیت میں شوہر بیوی سے چند سوال پوچھتا ہے اور بیوی اس کا جواب دیتی ہے:

اری آیا ری میرا بھولا سا راجا
اری آیا ری میرا بھولا سا راجا
میاں: کوٹھے اوپر کاہے کو چڑھی تھی۔
بیوی: راجہ میں نے چاند دیکھا تھا۔
میاں: کونے میں پردے کاہے کو ڈلے تھے۔
بیوی: اے راجہ میری آنکھ دکھی تھی۔
میاں: ہری ہری چوریاں کاہے کو پہنی تھیں۔
بیوی: اے راجہ میرے بھائی کا بیاہ تھا۔
میاں: ہولک بچہ کاہے کو رویا تھا۔
بیوی: اے راجہ وہ پڑوسن کا جایا تھا۔
میاں: اتنے چھیل بل کاہے کو کیے تھا۔
بیوی: اے راجہ تیرا خرچ بچایا تھا۔

مکان نمبر ۴۲۴۲، گلی کبابیان، جامع مسجد دہلی ۶۰۰۰…

اری آیا ری میرا بھولا سا راجا
اری آیا ری میرا بھولا سا راجا

۱

دھیرے بولو دھیرے بولو کوئی اور سُنے گا
اور سُنے گا سارا بگڑ سُنے گا
دھیرے بولو دھیرے بولو کوئی اور سُنے گا
ساس سُنے گی میری وہ بھی دوڑی آئے گی
مانگے گی پلنگ بچھائی میرے بھولے راجا
دھیرے بولو دھیرے بولو کوئی اور سُنے گا
نند سُنے گی میری وہ بھی دوڑی آئے گی
مانگے گی دودھ دھلائی میرے بھولے راجا
دھیرے بولو دھیرے بولو کوئی اور سُنے گا
جٹھانی سُنے گی میری وہ بھی دوڑی آئے گی
مانگے گی بچہ نلائی میرے بھولے راجا
دھیرے بولو دھیرے بولو کوئی اور سنے گا
میری بہن سُنے گی وہ بھی دوڑی آئے گی
مانگے گی پھول مٹھائی میرے بھولے راجا
دھیرے بولو دھیرے بولو کوئی اور سُنے گا
اور سُنے گا سارا بگڑا سُنے گا

۲

اتنا کہا سیاں میرا کیجو
بھر کے کڑھائی حلوے کی کیجو
ارجن کھٹر جن باقی رکھیو
اور تم ہی چاٹیو کڑھائی میرے بھولے راجا
چاٹ چوٹ کے وہ پیچوں میں بیٹھا
مونچھوں پہ لڑ گئی بلائی میرے بھولے راجا
تم کیوں لڑو میری سوت بلائی
میرے گھر میں ہے بہتر رگائی بھولے راجا

دلّی میں پیش کیے گئے لوک گیت کو خواتین کی ہوشیاری یا چالبازی سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ گیت اس معاشرے کی عکاسی کرتا ہے جہاں خواتین کھل کر اپنے شوہروں سے کبھی کچھ نہیں کہتی تھیں۔ یہ پروردہ تھی اس تہذیب کی جس میں بیوی شوہر سے یہ کہتے ہوئے بھی شرم محسوس کرتی ہے کہ اس کے دن قریب ہیں اور یہ خیال کرتی ہے کہ چاند چڑھے گا تو کل عالم دیکھے گا۔ اس معاشرے میں بیوی کی رازدار اس کی ساس نندیں ہوا کرتی تھیں جو اس کے دکھ درد میں شریک رہا کرتی تھیں۔ شوہر کا کام صرف کمانا اور گھر بار کا پورا خرچ اٹھانا ہوتا تھا۔ ہر گھر کی اپنی دائیاں تھیں اور خاص بات یہ ہے کہ اس پڑوس میں بھی حلال خوری سے معلوم ہوتا تھا کہ کس گھر میں بچہ پیدا ہوا ہے۔ پورے دنوں کے قریب لڑکی کی ماں رات رات بھر گھر کے دروازے وار کھتی تھی کہ معلوم نہیں کس وقت داماد آ کر اطلاع دے اور گھر کا دروازہ کھلوانے کے لیے اونچی آواز سے کام لے یا دروازہ پیٹے اور سارا محلہ جاگ پڑے۔ شادی کے چھ ماہ بعد دلہن کا گھر سے نکلنا بند اور جانے آنے پر پابندی لگادی جاتی تھی دلہن کے میکے والوں میں سے بھی صرف خواتین آیا جایا کرتی تھیں۔

دوسرے گیت میں جن خونی رشتوں کی جانب اشارے کیے گئے ہیں دلّی کیا پورے ہندوستان میں ان ہی رشتوں کی بدولت انسان کی شناخت ہوتی ہے اور یہی رشتے بچوں کی تربیت میں معاون ہوتے ہیں۔ جس طرح جنگل میں کسی شیر خوار کو مدتوں چھوڑ کر ہم یہ امید نہیں کر سکتے کہ وہ تہذیب و معاشرت سے واقف ہوگا اسی طرح گھر کی چار دیواری میں ان رشتوں کے بغیر بچوں کی نہ تو نگہداشت ہو سکتی ہے اور نہ ہی آگے چل کر ذہنی طور پر ان کے خاندانی رشتے مضبوط ہو سکتے ہیں۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو یہی خون کے رشتے غم اور خوشی کا سرچشمہ ہیں۔ گھر کو آگ گھر کے چراغ سے لگتی ہے لیکن اپنا اگر مارتا بھی ہے تو چھاؤں میں بٹھاتا ہے۔

جس زمانے کے یہ گیت ہیں اس وقت نیا مہمان اگر لڑکا ہوتا تو . . . . چھوٹا موٹا زیور انگوٹھی چھلا یا کانوں کی بالیاں نیگ میں دی جاتی تھیں۔ پیدائش کے بعد چھٹی، چِلّہ اور عقیقہ وغیرہ کی رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔ چھٹی کے دن لڑکی کے میکے سے بچے کے کھلونے کپڑے اور کچھ ضروری سامان کے ساتھ پالنا ضرور آتا تھا۔ زچہ کو ایک بار پھر سہاگ کا جوڑا پہنایا جاتا تھا شام کو ڈومنیاں آتی تھیں اور جھولے کے گیت جنھیں پالنا بھی کہتے ہیں پیش کرتی تھیں۔

پالنا بناؤں گی رے میں تو پالنا بناؤں گی
پالنا بناؤں گی رے میں تو پالنا بناؤں گی
لالا کا پالنا بناؤں گی میں تو پالنا بناؤں گی
اگر چندن کا میں پالنا بناؤں گی
ہیرا موتی لعل لگاؤں گی
میں تو پالنا بناؤں گی رے میں تو پالنا بناؤں گی
گھی کھچڑی تیرے میکے سے آئی
سگھڑ زچہ کو میں تاروں دکھاؤں گی
میں تو پالنا بناؤں گی رے میں تو پالنا بناؤں گی

۲

نارنجی جوڑے والیاں میری زچہ رانیاں
اری زچہ رانیاں میری زچہ رانیاں
تاج کا جوڑا پہن سہاگن موتیوں مانگ بھرا
اری ہنس ہنس کے بچہ لے سہاگن میری زچہ لنیاں
نارنجی جوڑے والیاں میری زچہ رانیاں

بچہ جب بڑا ہونے لگتا ہے تو ماں اسے

سُلاتے وقت اپنی آغوش میں بھینچ بھینچ کر پیار کرتی جاتی ہے۔ ان لوریوں میں ماں کی ممتا سے بھرے جذبات اور احساسات ہوتے ہیں ایسے ایک دو لوک گیت یہ ہیں۔

۱

چوموں تیرے نین
میرے دل کو آئے چین
چوموں تیرا مکھڑا
بھولوں سارا دُکھڑا
چوموں تیرے گال
تو دل ہو مالا مال
چوموں تیرا سینہ
تو دل کا ہے نگینہ

۲

تو سوتا سوتا جاگ
تیرے ماتھے لاگیں بھاگ
تو سو جا میرے لال
تیری اماں ہو نہال
تو سو جا میرے چندا
تجھے کیا کرنا ہے دھندا
تو سو جا میرے پھول
اور سکھ سے پالنا جھول
تو سو جا میرے جانی
تیری بھاگ بھری پیشانی
تو سو جا میرے چاند
تیرے آگے ہیرا ماند
تو سو جا میرے بالے
تو سو جا راج دُلارے

خاص طور پر یہ لوری دوسرے علاقوں کی طرح دلی میں بھی رائج تھی اور ہے۔ [illegible]

میرے بچے کی آنکھوں میں گھُل مل جا
آتی ہوں بی بی میں آتی ہوں
دو چار بچے سُلاتی ہوں
دو چار بچے تو پیچھے سُلا
پہلے میرے بچے کی آنکھوں میں گھُل مل جا

ان گیتوں میں بچے کے سکھ اور چین، درازیٔ عمر، روشن مستقبل اور بدی سے بچنے کی تمنا ہوتی ہے۔ یہ لوریاں تمناؤں کا اظہار ہوتی ہیں اور بچے کو بڑا ہو کر نیک اور عظیم بننے کے خواب پر مشتمل آرزوئیں ان کے پس منظر میں مسکراتی ہیں ماں زمانے کے ہر گرم و سرد سے اپنے لاڈلے کو محفوظ رکھنا چاہتی ہے یہی ماں کی ممتا ہے۔ جسے معصوم ذہن سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے لیکن جس طرح بچے کی پیدائش کے فوراً بعد ایک کان میں اذان اور دوسرے میں تکبیر کہی جاتی ہے اسی طرح یہ لوریاں نیک اور صالح عمل کی ترغیب دیتی ہیں جن سے بچے کے کان بچپن ہی سے آشنا ہو جاتے ہیں۔

دلی میں شادی کی رسمیں بہت ہیں اور ان رسموں میں گائے جانے والے گیتوں کو سہاگ گھوڑیاں کہتے ہیں۔ شادی سے ایک ہفتہ قبل دُلہن کے گھر سے دُلہا کی ماں کے لیے ایک جوڑا، چوڑیاں، پان، پھل، مٹھائی اور بتاشے جاتے تھے اس وقت پہلے دُلہن کے گھر یہ لوک گیت گایا جاتا تھا:

اس بنڑی کے جاگے ہیں بھاگ
گاؤ بجاؤ اور رچاؤ کار
اس بنڑی کے جاگے ہیں بھاگ
سب سکھین ملے کار رچاؤ
بنو کے رنگاؤ سوئے بھاگ
اس بنڑی کے جاگے ہیں بھاگ

یہ سامان جب دلہا کے گھر پہنچ جاتا تھا تو یہ گیت گایا جاتا تھا:

رنگ لاگا ہرا لے بنڑے سے
اے ہو رنگ لاگا اے ہو رنگ لاگا
بنڑے کے سر پہ اچھے رنگ کا بھینا
صندل چھڑکوں تیرا باگا
میرے گھر آیا رے نویلا بنڑا
ہاتھوں تیرے جڑاؤ دا کنگنا
مہندی عطر میں بسا مورا بنڑا
ہیرا موتی لعل میرا بنڑا
رنگ تیرے گگرو ندی جاما
اچکن میں لگی ہے بہار میرا بنڑا
اے بنڑے ہیرے لعل میرا بنڑا
میرے گھر آیا رے رنگیلا بنڑا
میرے گھر آیا ری نویلا بنڑا
میرے گھر آیا ری نویلا بنڑا

شادی سے ایک دو روز قبل سانچق کی رسم ہوتی ہے جس میں پہلے لڑکے والوں کے ہاں سے دُلہن کے لیے زیور، کپڑے، عطردان، سنگار بکس، ہار پھول اور بری کا سامان جاتا ہے سامان کے ساتھ دُلہا کی بہنیں، بھاوجیں، بھانجیاں، بھتیجیاں جاتی ہیں۔ یہ رسم عام طور پر رات کے وقت ہوتی ہے۔ اس موقع پر ڈومنیاں یا میراثنیں جو لوک گیت گاتی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

ہریالی بنو ہووے شادی مبارک
بنے کی بنو ہووے مبارک شادی
جُگ جُگ نت نت ہووے آبادی
بنے کی بنو ہووے مبارک شادی
ہریالی بنو ہووے مبارک شادی

دُلہا دُلہن کے مہندی لگاتے وقت یہ گیت گایا جاتا تھا۔ اگر دُلہا ہے تو:

ہریالے بنے کو بنا بنائیں گے آج

اور اگر دلہن کے مہندی لگائی جا رہی ہے تو:

ہریالی بنی کو بنی بنائیں گے آج

برے اور لعل لگے پتے لگے ہیں سارے
ہرے میں گج موتی پروئیں گے آج
ن کے سہرے میں گج موتی پروئیں گے آج
اری رات کا جاگا میرا ہریالا بنا
اری رات کی جاگی میری ہریالی بنی

یگ رہی ہے ساری رات
خواجہ جی کے دربار مولا جی کے دربار
یگ رہی ہے رنگ لال
خواجہ جی کے دربار مولا جی کے دربار
ے رتیا بچھلا پہروا
کو کے ساری رات
خواجہ جی کے دربار مولا جی کے دربار
کو کے ساری رات
کو کے ساری رات
مہندی بھیگ رہی ہے ساری رات
مہندی بھیگ رہی ہے ساری رات

ے کانگن اری کرے کانگن
میندھاری لاؤ میندھاری لاؤ
ہندی واری رے
تیل چڑھاؤ رے تیل چڑھاؤ
انگ سوں لگاؤ
بنے کے انگ سوں لگاؤ
ے کانگن اری کری کانگن

دُلہا بناتے وقت مردانے میں یہ گیت
تھا:
لاری مالن پھولوں کا سہرا
آج بنا بنڑی کو مبارک
جی نے کنگنا بندھایا
حوُروں نے سب ملے منگل گایا
گوندھ لاری مالن پھولوں کا سہرا

یا یہ گیت:

ہریالے ہمارے بنے کے لیے سہرا گوندھ لاری موری مالنیا
بیلے چنبیلی کی کلیاں سہرا گوندھ لاری موری مالنیا
آؤ موری مالن بیٹھو مورے آنگن کر سہرے کا مول
سات لکھ سہرے کا مول اس کی عطر میں بسی لڑیاں
ہریالے بنے کے لیے سہرا گوندھ لا موری مالنیا

برات جب دُلہن کے گھر پہنچ جاتی تو نکاح سے قبل یہ گیت گایا جاتا تھا۔

اری اری ماں بنڑا بیاہنے آیا
آج بنڑا بنڑی کو مبارک
بنڑا بیاہنے آیا
اری اری ماں بنڑا بیاہنے آیا
اولیاؑ انبیا سارے براتی
عثمان نے باندھا ہے سہرا
اری اری ماں بنڑا بیاہنے آیا
نظام الدین کے لاڈلے بنڑے
فقیر نام دھرایا
اری اری ماں بنڑا بیاہنے آیا
آج نول بنا بنڑی کو مبارک
بنڑا بیاہنے آیا
اری اری ماں بنڑا بیاہنے آیا

ایجاب و قبول کے بعد جب دولہا کو زنان خانے میں بلایا جاتا ہے تو اس کی بہنیں بھانجیاں وغیرہ اس کے سر پر دروازے سے دوپٹہ ڈال کر اندر لاتی ہیں اور جب تک دلہن کو وہاں نہیں لایا جاتا اس وقت تک دُلہا کو کھڑا رکھا جاتا ہے۔ شور و غل میں کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی اس وقت ڈومنیاں یہ گیت پیش کرتی ہیں۔

ارے کھڑا رہیو کھڑا رہیو
جا دوا میں ہی کروں گی
ایک ٹونا تیرے جوڑے پہ بھیجوں
جا دوا میں ہی کروں گی
اچکن میں لعل میں ہی جڑوں گی
جا دوا میں ہی کروں گی
ایک ٹونا تیرے سہرے پہ بھیجوں
جا دوا میں ہی کروں گی
لڑیوں میں لعل میں ہی جڑوں گی
جا دوا میں ہی کروں گی

۲

ٹونا مانگے سہاگ ٹونا مانگے سہاگ
جب ٹونا کرنے کو آئی سکھی
بیو منگل کی ہے رات
ٹونا مانگے سہاگ ٹونا مانگے سہاگ

۳

بنّو میں تیرے کارن آیا
بنّو میں تیرے کارن آیا
تیری اماں کے مَن بھایا
بنّو میں تیرے کارن آیا
دروازے سے بول سُنایا
بنّو میں تیرے کارن آیا
کشمیر سے دوشالہ لایا
بنّو میں تیرے کارن آیا
بمبئی سے سونا لایا
بنّو میں تیرے کارن آیا
گنگا پار کے موتی لایا
بنّو میں تیرے کارن آیا
پٹنہ ہٹی کا جوڑا لایا
بنّو میں تیرے کارن آیا
اسے جوہری سے جھومر لایا
بنّو میں تیرے کارن آیا

تے وقت اپنی آغوش میں بھینچ بھینچ کر پیار
ی جاتی ہے۔ ان لوریوں میں ماں کی ممتا سے
ے جذبات اور احساسات ہوتے ہیں ایسے
، دو لوک گیت یہ ہیں۔

۱

دل تیرے نین
ے دل کو آئے چین
چوموں تیرا مکھڑا
بھولوں سارا دکھڑا
دل تیرے گال
دل ہو مالا مال
چوموں تیرا سینہ
تو دل کا ہے نگینہ

۲

سوتا سوتا جاگ
رے ماتھے لاگیں بھاگ
تو سو جا میرے لال
تیری اماں ہو نہال
سو جا میرے چندا
ے کیا کرنا ہے دھندا
تو سو جا میرے پھول
اور سکھ سے پالنا جھول
سو جا میرے جانی
ری بھاگ بھری پیشانی
تو سو جا میرے چاند
تیرے آگے ہیرا ماند
سو جا میرے بالے
سو جا راج دلارے

س طور پر یہ لوری دوسرے علاقوں کی طرح دلی میں ی رائج تھی اور ہے۔

میرے بچے کی آنکھوں میں گھل مل جا
آتی ہوں بی بی میں آتی ہوں
دو چار بچے سلاتی ہوں
دو چار بچے تو پیچھے سلا
پہلے میرے بچے کی آنکھوں میں گھل مل جا

ان گیتوں میں بچے کے سکھ اور چین، درازیٔ عمر، روشن مستقبل اور بدی سے بچنے کی تمنا ہوتی ہے۔ یہ لوریاں تمناؤں کا اظہار ہوتی ہیں اور بچے کو بڑا ہو کر نیک اور عظیم بننے کے خواب پر مشتمل آرزوئیں ان کے پس منظر میں مسکراتی ہیں۔ ماں زمانے کے ہر گرم و سرد سے اپنے لاڈلے کو محفوظ رکھنا چاہتی ہے یہی ماں کی ممتا ہے۔ جسے معصوم ذہن سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے لیکن جس طرح بچے کی پیدائش کے فوراً بعد ایک کان میں اذان اور دوسرے میں تکبیر کہی جاتی ہے اسی طرح یہ لوریاں نیک اور صالح عمل کی ترغیب دیتی ہیں جن سے بچے کے کان بچپن ہی سے آشنا ہو جاتے ہیں۔

دلی میں شادی کی رسمیں بہت ہیں اور ان رسموں میں گائے جانے والے گیتوں کو سہاگ گھوڑیاں کہتے ہیں۔ شادی سے ایک ہفتہ قبل دلہن کے گھر سے دلہا کی ماں کے لیے ایک جوڑا، چوڑیاں، پان، پھل، مٹھائی اور بتاشے جاتے تھے اس وقت پہلے دلہن کے گھر یہ لوک گیت گایا جاتا تھا:

اس بنڑی کے جاگے ہیں بھاگ
گاؤ بجاؤ اور رچاؤ کار
اس بنڑی کے جاگے ہیں بھاگ
سب سکھین ملے کار رچاؤ
بنو کے رنگاؤ سوئے بھاگ
اس بنڑی کے جاگے ہیں بھاگ

یہ سامان جب دلہا کے گھر پہنچ جاتا تھا تو یہ گیت گایا جاتا تھا:

رنگ لاگا ہرالے بنڑے سے
اے ہو رنگ لاگا اے ہو رنگ لاگا
بنڑے کے سر پہ اچھے رنگ کا بھینا
صندل چھڑکوں تیرا باگا
میرے گھر آیا رے نویلا بنڑا
ہاتھوں تیرے جڑاؤ دا کنگنا
مہندی عطر میں بسا مورا بنڑا
ہیرا موتی لعل میرا بنڑا
رنگ تیرے گکرو ندی جاما
اچکن میں لگی ہے بہار میرا بنڑا
اے جڑے ہیرے لعل میرا بنڑا
میرے گھر آیا رے رنگیلا بنڑا
میرے گھر آیا ری نویلا بنڑا
میرے گھر آیا ری نویلا بنڑا

شادی سے ایک دو روز قبل ساچق کی رسم ہوتی ہے جس میں پہلے لڑکے والوں کے ہاں سے دلہن کے لیے زیور، کپڑے، عطردان، سنگار بکس، ہار پھول اور بری کا سامان جاتا ہے سامان کے ساتھ دلہا کی بہنیں، بھاوجیں، بھانجیاں، بھتیجیاں جاتی ہیں۔ یہ رسم عام طور پر رات کے وقت ہوتی ہے۔ اس موقع پر ڈومنیاں یا میراثنیں جو لوک گیت گاتی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

ہریالی بنو ہووے شادی مبارک
بنے کی بنو ہووے مبارک شادی
جُم جُم نت نت ہووے آبادی
بنے کی بنو ہووے مبارک شادی
ہریالی بنو ہووے مبارک شادی

دلہا دلہن کے مہندی لگاتے وقت یہ گیت گایا جاتا تھا۔ اگر دلہا ہے تو:

ہریالے بنے کو بنا بنائیں گے آج

اور اگر دلہن کے مہندی لگائی جا رہی ہے تو:

ہریالی بنی کو بنی بنائیں گے آج

ہیرے اور لعل لگے تِنے لگے ہیں سارے
سہرے میں گج موتی پروئیں گے آج
بنّی کے سہرے میں گج موتی پروئیں گے آج
ساری رات کا جاگا میرا ہریالا بنّا
ساری رات کی جاگی میری ہریالی بنّی

بھیگ رہی ہے ساری رات
خواجہ جی کے دربار مولا جی کے دربار
ی بھیگ رہی ہے رنگ لال
خواجہ جی کے دربار مولا جی کے دربار
ے رتیا پچھلا پہروا
ل کوکے ساری رات
خواجہ جی کے دربار مولا جی کے دربار
ل کوکے ساری رات
ل کوکے ساری رات
مہندی بھیگ رہی ہے ساری رات
مہندی بھیگ رہی ہے ساری رات

کرے کانگن اری کرے کانگن
میندھاری لاؤ میندھاری لاؤ
نا مہندی واری رے
تیل چڑھاؤ رے تیل چڑھاؤ
کے انگ سوں لگاؤ
بنّے کے انگ سوں لگاؤ
ی کرے کانگن اری کری کانگن

کے کو دولہا بناتے وقت مردانے میں یہ گیت
یا جاتا تھا:
گوندھ لاری مالن پھولوں کا سہرا
آج بنّا بنڑی کو مبارک
آج بنّی جی نے کنگنا بندھایا

حوروں نے سب مل منگل گایا
گوندھ لاری مالن پھولوں کا سہرا

بیاہ گیت:

ہریالے ہمارے بنّے کے لیے سہرا گوندھ لاری موری مالنیا
بیلے چنبیلی کی کلیاں سہرا گوندھ لاری موری مالنیا
آؤ موری مالن بیٹھو مورے آنگن کر سہرے کا مول
سات لکھ سہرے کا مول اس کی عطر میں بسی لڑیاں
ہریالے بنّے کے لیے سہرا گوندھ لا موری مالنیا

برات جب دُلہن کے گھر پہنچ جاتی تو نکاح سے قبل یہ گیت گایا جاتا تھا۔

اری اری ماں بنڑا بیاہنے آیا
آج بنڑا بنڑی کو مبارک
بنڑا بیاہنے آیا
اری اری ماں بنڑا بیاہنے آیا
اولیا انبیا سارے براتی
عثمان نے باندھا ہے سہرا
اری اری ماں بنڑا بیاہنے آیا
نظام الدین کے لاڈلے بنڑے
فقیر نام دھرایا
اری اری ماں بنڑا بیاہنے آیا
آج نول بنّا بنڑی کو مبارک
بنڑا بیاہنے آیا
اری اری ماں بنڑا بیاہنے آیا

ایجاب و قبول کے بعد جب دولہا کو زنان خانے میں بلایا جاتا ہے تو اس کی بہنیں بھانجیاں وغیرہ اس کے سر پر دروازے سے دوپٹہ ڈال کر اندر لاتی ہیں اور جب تک دلہن کو وہاں نہیں لایا جاتا اس وقت تک دُولہا کو کھڑا رکھا جاتا ہے۔ شور وغل میں کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی اس وقت ڈومنیاں یہ گیت پیش کرتی ہیں۔

ارے کھڑا رہیو کھڑا رہیو
جا دوا میں ہی کروں گی
ایک ٹونا تیرے جوڑے پہ بھیجوں
جا دوا میں ہی کروں گی
اچکن میں لعل میں ہی جڑوں گی
جا دوا میں ہی کروں گی
ایک ٹونا تیرے سہرے پہ بھیجوں
جا دوا میں ہی کروں گی
لڑیوں میں لعل میں ہی جڑوں گی
جا دوا میں ہی کروں گی

۲

ٹونا مانگے سہاگ ٹونا مانگے سہاگ
جب ٹونا کرنے کو آئی سکھی
بیو منگل کی ہے رات
ٹونا مانگے سہاگ ٹونا مانگے سہاگ

۳

بنّو میں تیرے کارن آیا
بنّو میں تیرے کارن آیا
تیری اماں کے من بھایا
بنّو میں تیرے کارن آیا
دروازے سے بول سنایا
بنّو میں تیرے کارن آیا
کشمیر سے دوشالہ لایا
بنّو میں تیرے کارن آیا
بمبئی سے سونا لایا
بنّو میں تیرے کارن آیا
گنگا پار کے موتی لایا
بنّو میں تیرے کارن آیا
پٹنہ کا جوڑا لایا
بنّو میں تیرے کارن آیا
اے جوہری کے جھومر لایا
بنّو میں تیرے کارن آیا

سُنار سے سونا گھڑوایا
بنّو میں تیرے کارن آیا
میں متھرا کے پیڑے لایا
بنّو میں تیرے کارن آیا
تیرا سونا شہر جگایا
بنّو میں تیرے کارن آیا

اس طرح کے لوک گیتوں میں انواع و اقسام کی اشیائے ذکر سے یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ لڑکے اور لڑکی والوں نے اپنی حیثیت سے زیادہ ہر چیز کی ہے۔ ہندوستان کا ہر شہر کسی ایک جنس کے لیے مشہور ہے والدین کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ بری اور جہیز میں وہ چیزیں ضرور شامل ہوں جو کسی بھی بڑے یا چھوٹے شہر سے منگوائی جاتی ہیں ڈھاکے کی ململ آج بھی مشہور ہے۔ فرید آباد کی مہندی کے خواتین آج بھی گُن گاتی ہیں۔ چنا پٹی کے کپڑے آج بھی بھری محفل میں جھلمل جھلمل کرکے آنکھوں کو لبھاتے ہیں۔ حیدرآباد کے موتیوں کے گڑے آج بھی خواتین کے ہاتھوں کی نزاکت کو زینت بخشتے ہیں اور بریلی کا سرمہ نینوں کی دلکشی میں اور تراوٹ میں اضافہ کرتا ہے۔

آرسی مصحف کی رسم کے بعد دولہا کی مُنہ دکھائی ہوتی ہے اور دوسری طرف سمدھنوں کے استقبال میں جہاں نکاح سے قبل پھولوں، عطر، پان سے شاندار استقبال کیا گیا تھا اور دالانوں میں سوزنیاں بچھا کر گاؤتکیوں سے لگا کر بٹھایا گیا تھا۔ شادیانے گائے تھے وہاں اب میراثنیں گالیوں سے بھرے ہوئے گیت گانے شروع کر دیتی ہیں:

ماری تو گالی کا سمدھن بُرا مت مانو
آجا میری گود میں تو آجا میری گود میں
کھیرا تیری گود میں ککڑی تیری گود میں
بیگن تیری گود میں کدو تیری گود میں
گاجر تیری گود میں مولی تیری گود میں
کیلا تیری گود میں کریلا تیری گود میں
ماری تو گالی کا سمدھن بُرا مت مانو
آجا میری گود میں تو آجا میری گود میں

۲

مدھو بھرے اری تورے نین
اے نخرے والی سمدھن
اری یہ تو سمدھن واری
رفیع اللہ سے ہے راضی
وہی بچھائے تیری سیج
وہی بچھائے تیری سیج
اے نخرے والی سمدھن
اے نخرے والی سمدھن

۳

بنگلے میں راضی رہیو، رہیو میری جان
باغ جانا نیبو لانا نیبو لانا چار
اے سمدھن واری جو سن لاگی سمدھی تیرا یار
بنگلے میں راضی رہیو، رہیو میری جان

۴

کھالے میری سمدھن مسالے والی دال
تو کھالے میری سمدھن مسالے والی دال
اس سمدھن کے ڈال دیا ری بھر بھر زیرہ
چھنانا نا ہوئے ساری دال
کھالے میری سمدھن مسالے والی دال
تو کھالے میری سمدھن مسالے والی دال

اس طرح کے لوک گیت ذو معنی ہوتے ہیں ان کے ایک پہلو سے تہذیب اور دوسرے سے بد تہذیبی ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے باوجود پورا ماحول قہقہوں کی گونج اور ہنسی کے فواروں سے لبریز ہو جاتا ہے۔ خواتین ایک دوسرے کے کپڑوں میں مُنہ چھپاتی لوٹ پوٹ ہو جاتی ہیں۔ اس طرح کے گیت گانے کا ایک خاص مقصد ہوتا تھا۔ شادی کے ہنگاموں میں تھکن اور رت جگے کے باعث خواتین ہلکان ہوتی تھیں ان کی طبیعتوں کو بحال کرنے کے لیے ہلکے پھلکے پُر مذاق گیت گا کر محفل کو پُر رونق کیا جاتا تھا۔ دوسری طرف دو اجنبی خاندان (جن میں خاص طور پر خواتین) جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ہلکے پھلکے ہنسی مذاق سے بہت جلد اجنبیت دُور ہو جاتی ہے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ایسے ہی گیتوں سے بھری محفلوں میں خواتین کی زندگی کی گھٹن دُور ہو جاتی تھی کیونکہ اپنے گھروں میں خواتین کو نہ تو اس طرح کی باتیں کرنے کا موقع ملتا تھا اور نہ ہی ان کی تہذیب اس کی اجازت دیتی تھی۔

سہاگ گھوڑیوں کے بعد رخصتی کے جو گیت گائے جاتے ہیں انہیں منڈھا کہتے ہیں۔ آج سے تقریباً پچاس برس قبل تک حضرت امیر خسرو کا منڈھا گایا جاتا تھا گو آج بھی کہیں کہیں یہ گایا جاتا ہے:

کاہے کو بیاہی بدیس سُن بابل میرے
ہم تورے بابل پھاندے کی چڑیاں
رین بسے اڑ جائیں رے
سُن بابل مرے
ہم تورے بابل بیلے کی کلیاں
گھر گھر مانگی جائیں رے
سُن بابل مرے
ہم تورے بابل جنگل کی گیاں

بدھر بانکو ہنک جائیں رے
سُن بابل میرے

اس وقت پتھر کا کلیجہ بھی پگھل جاتا ہے کیونکہ یہ گیت رقّت آمیز، پُر درد ہوتے ہیں۔ ان میں والدین کی طرف سے کچھ نصیحتیں بھی ہوتی ہیں اور بیٹی سے لی گئی خدمات کا اعتراف بھی اور ایک اجنبی ماحول میں خود کو ڈھالنے کی تلقین بھی۔ گزشتہ بیس پچیس برسوں میں دلّی میں خسرو کا گیت کم اور حبیب پینٹر قوال کی رخصتی زیادہ گائی جاتی ہے " نکاح کے بعد رخصت کے وقت باپ کی نصیحت بیٹی کو" اس کا آخری شعر ہے:

حبیب اب کہوں کیا یہ ہے حکم قدرت
کہ پالے کوئی اور لے کوئی خدمت

لوک گیتوں میں موسم کے گیتوں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ خاص طور پر برسات کے موسم میں جب ساون کی گھٹائیں اُمڈیں، سر پر بوندیں پڑیں اور دلّی والے اپنا کام دھندا طاق میں رکھ کے مہرولی کی سیر کو نکلتے۔ دلّی والے شروع سے ہی سیر سپاٹے کے شوقین رہے ہیں۔ خاندان کے خاندان اکٹھے ہوتے اور مرغزاروں میں دکھائی پڑتے۔ وہاں کھانے پینے کا انتظام تو مرد کرتے اور خواتین جھولے ڈال کر گیت گاتیں:

پیارے بدیسی گھر آجا ساون میں
ارے ہاں ساون میں
دل کی تلیا سوکھی پڑی ہے
ایک بوند برسا دے ساون میں
جوبن ٹوٹا ڈٹتا ہی نہیں
جوبن کی ہوک سُنا جا ساون میں
بادل گرجے بندیاں برسیں
بجلی چمک کے ڈرا جاتی ساون میں
پیارے بدیسی گھر آجا ساون میں
ارے ہاں ساون میں ارے ہاں ساون میں

۲

ایسا بے دردسیاں پنیاں بھرن نہیں دے
کوئیں کی مینڈھ پر پیارے جھگڑا نہ ڈال
گوری گوری بیاں پیارے ہری ہری چوڑیاں
ایسا بے دردسیاں بیاں ہلانے نہیں دے
ارے ہاں ساون میں ارے ہاں ساون میں
بڑی بڑی اکھیاں پیارے جھینا جھینا سرمہ
ایسا بے دردسیاں نین چلانے نہیں دے
اُجلی تیسیں پیارے اودی اودی مستی
ایسا بے دردسیاں لالا کھا جمانے نہیں دے
اُودا اُودا سلما دردکسنا را پلو کا
ایسا بے دردسیاں پلّا ہلانے نہیں دے

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے گیت ساون میں گائے جاتے ہیں۔ ان گیتوں میں زیادہ تر برہن کے تڑپنے کی دل سوز کیفیات بیان کی جاتی ہیں۔

ان لوک گیتوں کو سننے اور اوراق پر دیکھنے پڑھنے کے بعد یہ خیال آتا ہے کہ ان میں وہ چستی بھرتی یا موزونیت نہیں جو اُردو شاعری کی جان اور غزل کی آن سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن لوک گیتوں کی تخلیق کسی اصول یا نظریے کی پابند نہیں ہوتی۔ یہ صرف اس وقت اور ماحول کی پابندی کو شرفِ قبولیت بخشتے ہیں جن میں رنج یا خوشی کے جذبات بیدار ہوتے ہیں۔ جب غم اور خوشی کے جذبات اُمڈتے ہیں لوک گیت جنم لیتے ہیں۔ یہ غیر شعوری طور پر خواتین کے ذہنوں میں پیدا ہو کر ان ہی کی یادداشت اور زبان میں محفوظ ہو جاتے ہیں اسی لیے ان میں عام طور پر وزن یا بحر کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ گیت گاتے وقت جو حالت یا کیفیت ہوتی ہے یہ اسی کے مطابق ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ ان میں استعمال ہونے والی تشبیہات برجستہ عام فہم اور سادہ اور کنائے لطیف ہوتے ہیں جو ان گیتوں کو شاعرانہ حسن سے آراستہ کرتے ہیں۔ گلو کار اپنے گلے کو کھینچ تان کر ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ سروں کو پورا کرتی ہے اور اس کا ترنم ایک خاص کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ لوک گیتوں کا خاص مقصد تفریحِ طبع ہے۔ لیکن ان میں چھیڑ چھاڑ کے ساتھ ہنسی ہنسی میں نصیحتیں بھی ہوتی ہیں۔ خود نمائی، تکلف اور تصنع کا ان گیتوں میں گزر نہیں ہوتا۔ خواتین جو کچھ دیکھ کر برت کر محسوس کرتی ہیں۔ اپنی آپ بیتی کو جوں کا توں بیان کر دیتی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں جب عورت کو مرد کے ساتھ ساتھ چلنے کی آزادی نہیں تھی تو نابرابری کے احساس نے اس کے جذبات کو مجروح کیا سماج کے رشتوں نے جو دُکھ پہنچائے یا جو خوشی اس کو میسر آئی۔ ان سب کا اظہار ان گیتوں میں کیا گیا ہے۔ لوک گیت آس پاس کے ماحول کا اثر بھی جلد ہی قبول کر لیتے ہیں۔ ان گیتوں کی کوئی تاریخ نہیں ہوتی کون سا گیت کب لکھا گیا اس کا کہیں بھی کسی کے پاس کوئی حوا نہیں ملتا۔ ان کا سفر انسانی زندگی کی طرح جاری و ساری رہتا ہے۔ ایک لوک گیت میں پیش کیے گئے انسانی جذبات دوسری قوموں یا ملک کے دوسرے علاقے کے لوک گیتوں میں بھی ہوتے ہیں۔ کیوں کہ بنیادی طور پر یہ گیت انسانی تہذیب اور تجربوں بڑھتی ہوئی سطح سے نکلتے ہیں۔ ان گیتوں کی تہذیبی شناخت انسان سے انسان اور تہذیب سے تہذیب تک سفر کرتی ہے۔ انسان آگے بڑھنے لیے سماج کا سہارا لیتا ہے۔ جب سماج میں کوئی چیز ایجاد ہوتی ہے تو اس کا اثر تہذیب پر پڑتا اور اس سے لوک گیت بھی متاثر ہوتے ہیں سما اور تہذیبی زندگی میں تبدیلیوں سے لوک گیتوں بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں یہ ایک نسل کو اپنی پشتہ سے ورثے میں ملتے ہیں اور اپنا خاص فنکشن رکھتے عام طور سے یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ اُردو

ت یالوک ادب نہیں ہے یا ہے تو نہیں
ہے۔ اس مقالے کے راقم کا خیال
بالکل برعکس ہے۔ پچھلی سطور میں صرف
اُردو لوک گیتوں کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ بھی
تصر۔ اگر تھوڑی سی کاوش کی جائے تو دِلّی
کے لوک گیتوں پر ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے
دلی میں آج بھی ایسے عمر رسیدہ مرد اور عورتیں موجود
ہیں جن کو سینکڑوں لوک گیت یاد ہیں۔

آخر میں یہ بات بھی عرض کرتا چلوں کہ لوک گیت یا لوک ادب پر جو بھی تحقیقی کام ہوئے ہیں
اُردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں بالخصوص وہ
ضرورت کے تحت نہیں بلکہ شوق کی بنا پر ہوئے
ہیں۔ اُردو میں یہ در اَب وا ہوا ہے۔ اس لیے کہا
جا سکتا ہے کہ اردو لوک گیتوں کی بازیافت اب
ممکن ہو گی۔ ○

حواشیِ ابوالکلام آزاد

و لوگ مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے واقف ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ مولانا کو اوائلِ عمر
پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ عمر کا جو حصہ بچے کھیل کود میں گزارتے ہیں، مولانا نے کتابوں
لعے میں صرف کیا اور ان کا یہ ذوق آخر عمر تک ان کے ساتھ رہا۔ مولانا نے کسی مدرسے
نہیں پائی، گھر پر ہی پڑھا اور پھر انھیں ایسے مواقع ملے کہ اُردو، فارسی اور عربی کے
ھوں نے انگریزی اور فرانسیسی سے بھی واقفیت حاصل کی اور ان زبانوں میں قدیم و
م کا جو سرمایہ تھا اسے اپنی شخصیت میں سمو لیا۔

یہ کتاب ان حواشی کا مجموعہ ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد نے دورانِ مطالعہ مختلف
پر لکھے ہیں۔ یہ کتابیں مختلف زبانوں کی ہیں اور مختلف علوم سے تعلق رکھتی ہیں۔ مولانا
، وہ حکومتِ ہند کے وزیرِ تعلیمات تھے، انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کے نام
ادارہ قائم کیا تھا اور اپنا ذاتی کتب خانہ جو کئی ہزار کتابوں پر مشتمل تھا، اس
کو دے کر ایک لائبریری قائم کر دی تھی۔ سید مسیح الحسن صاحب نے، جو برسوں تک
بریری میں کام کرتے رہے ہیں، ان تمام کتابوں کو غائر نظر سے دیکھا ہے اور ان پر
کے قلم سے جو حواشی درج ہیں وہ اس کتاب میں یکجا کر دیے ہیں۔ ایک اور اہم کام
نے یہ کیا ہے کہ جن کتابوں پر یہ حواشی درج تھے، ان کے بارے میں بھی تمام
معلومات فراہم کر دی ہیں۔

مصنف : مولانا ابوالکلام آزاد
مرتب : سید مسیح الحسن
صفحات : ۵۰۹
قیمت : ۶۲ روپے

دِلّی کے آثارِ قدیمہ
(فارسی تاریخوں میں)

ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی تاریخ کا سب سے بڑا مآخذ وہ فارسی تاریخیں ہیں جو اُس عہد میں لکھی گئیں۔ یہ ہماری محرومی ہے کہ ہمارے زمانے میں فارسی کا چلن کم ہو گیا ہے۔ اس لیے ہمارے مورخین اور عام لوگ فارسی تاریخوں سے استفادہ نہیں کر پاتے۔ اُردو اکادمی کی تحقیقی و اشاعتی کمیٹی نے جب فیصلہ کیا کہ دِلّی کی تہذیبی اور سماجی زندگی پر کتابیں تیار کرا کے شائع کی جائیں تو دِلّی کے آثارِ قدیمہ میں خلیق انجم صاحب کی دل چسپی کے پیشِ نظر اُن سے فرمائش کی گئی کہ وہ فارسی تاریخوں میں دِلّی کے آثارِ قدیمہ کا جو ذکر آیا ہے اُسے اردو میں ترجمہ کر کے کتابی صورت میں مرتب کر دیں۔ ان کتابوں تک رسائی کے لیے اور پھر مطلوبہ مواد کی تلاش میں خلیق انجم صاحب کو کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا، اس کا اندازہ محقق حضرات ہی کر سکتے ہیں۔

یہ خوشی کا مقام ہے کہ خلیق انجم صاحب نے فارسی تاریخوں کے ان اہم اقتباسات کا اُردو میں ترجمہ کر کے ایک ایسی کتاب مرتب کر دی ہے جو دِلّی کے آثارِ قدیمہ کے موضوع پر غیر معمولی افادیت کی حامل ہے۔

دِلّی کے آثارِ قدیمہ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن اس نوعیت کا کام اُردو میں پہلی بار ہوا ہے۔ یقین ہے کہ دِلّی کے آثارِ قدیمہ پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب مددگار اور معاون ثابت ہوگی اور عام پڑھنے والے بھی اس سے استفادہ کریں گے۔

مترجم اور مرتب : ڈاکٹر خلیق انجم
صفحات : ۲۹۶
قیمت : ۴۸ روپے

اُردو اکادمی دہلی سے طلب کریں

جی۔ اے۔ کلکرنی / ترجمہ: سلام بن رزاق

(مراٹھی کہانی)

سادھو

وہ تھکا ماندہ سادھو اس گاؤں میں پہلی بار داخل ہوا تھا۔ مگر اس نے گاؤں کی حدود میں اس اعتماد سے قدم رکھا جیسے گاؤں کے سارے گلی کوچے اس کے دیکھے بھالے ہوں۔

گاؤں کے کنارے ایک کنویں پر بہت ساری عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ جن میں بوڑھی، جوان سبھی شامل تھیں۔ ان مختلف العمر عورتوں پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹک گیا۔ اُس کے بوڑھے چہرے کی جھریاں مزید گہری ہوگئیں۔ اور ماتھے پر اندرونی کرب کی ایک لکیر سی اُبھر آئی۔ زمانۂ حال کی لمحہ لمحہ بدلتی بساط پر جینے والے ان بے بضاعت لوگوں پر اسے بڑا ترس آیا۔ ان میں سے ایک ایک کے مستقبل کا احوال وہ کھلی کتاب کی طرح پڑھ سکتا تھا۔ خصوصاً اس کی نگاہیں اس دوشیزہ پر جم کر رہ گئیں جو کنویں کی مینڈ پر جھکی ڈول سے پانی کھینچ رہی تھی۔ اس کے جھل مل کرتے لباس سے پتا چلتا تھا کہ وہ ایک نو بیاہتا دُلہن ہے اس کا جسم ہلدی کی گانٹھ جیسا چمکدار اور پُرکشش تھا۔ وہ اتنی نوعمر تھی کہ شباب کی آمد آمد کے باوجود اس کے چہرے پر بچوں جیسی معصومیت باقی تھی۔

سادھو کے دیکھتے ہی دیکھتے اس کا چہرہ مسخ ہوگیا۔ اور ہلدی کی گانٹھ جیسا پُرکشش بدن مردہ ڈھور کی مانند پھولنے لگا۔ سادھو نے گھبرا کر چہرہ دوسری جانب پھیر لیا ___ اور بھرائی آواز میں ایک راہ گیر سے بولا:

"اُس لڑکی کو دیکھتے ہو، وہ ابھی کنویں میں ڈوب کر مر جائے گی۔"

پھر بغیر رُکے تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا۔ ابھی وہ سڑک کے موڑ پر پہنچا تھا کہ عقب سے عورتوں کے بے تحاشا چیخنے چلّانے کی آوازیں آنے لگیں۔ مگر اُس نے مڑ کر نہیں دیکھا، دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہاں جو کچھ ہونا تھا اس نے اپنی نگاہِ پیش بیں سے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔

تھوڑی دُور چلنے کے بعد اُسے ایک خستہ حال جھونپڑی دکھائی دی، جس میں ایک سیاہ فام لوہار اپنے وزنی ہتھوڑے سے لوہا کوٹ رہا تھا۔ سامنے بڑا سا الاؤ دہک رہا تھا جس میں آگ کی چنگاریوں کا فوارہ سا اُڑ رہا تھا۔ الاؤ کی سُرخ روشنی میں وہ لوہار یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی ابھی سمندرِ منتھن کے بعد اُسی آگ سے کسی سیاہ فام مورتی کی طرح برآمد ہوا ہو۔

پاس ہی ایک چھوٹا بچہ بڑے انہماک سے شعلوں کی لپلپاتی زبانوں سے اُڑنے والی چنگاریوں کا رقص دیکھ رہا تھا۔ سادھو نے یہ سب دیکھا، مگر اُسے بڑا تاسف ہوا کہ اس نے، اس طرف کیوں نگاہ کی۔ پیش آنے والے حادثے نے اُسے ایک بار پھر مضطرب کر دیا اور اُس نے پاس کھڑے ہوئے شخص سے کہا۔

"آہ! اب یہ بچہ جھلس کر مر جا[ئے گا]"

اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ شخص سادھ[و کی] اس بات پر پہلے تو چونکا پھر ڈور جا[کر] سادھو کو کوئی سِڑی سمجھ کر اس پر ایک [...] نگاہ ڈالی اور استہزائیہ انداز میں ہن[سا]۔ بچہ اسی شخص کا تھا اور پچھلے کئی روز سے [اسی] طرح روزانہ وہاں جاکر بیٹھتا تھا اور لپ[کتے] شعلوں کا تماشا دیکھتا رہتا تھا۔ کبھی کو[ئی] ویسی بات نہیں ہوئی۔ اتنے میں لوہار اُ[ٹھا] اس نے انگلی سے پیشانی اور گردن کا پ[سینہ] صاف کیا اور اکڑی ہوئی شریانوں کو ڈھیلا [کرتا] ہوا پانی پینے کے لیے اندر چلا گیا۔ سادھو تی[ز] قدم اُٹھاتا کسی ان دیکھی انجان زنجیر سے [بندھا] چلا جا رہا تھا۔ سامنے نکڑ پر املی کا پیڑ [تھا۔ وہ] جانتا تھا کہ اس درخت کے سر سبز س[ایے] تک پہنچتے پہنچتے بچے کی چیخ سُنائی د[ے] گی اور ویسا ہی ہوا۔ جونہی اُس نے در[خت] کی ٹھنڈی چھاؤں میں قدم رکھا پشت [سے] ایک دلدوز چیخ سُنائی دی۔ سادھو [کے] قدم رُکے نہیں۔ وہ چلتا رہا۔ اب وہ گا[ؤں] کے باہر آچکا تھا اور اسی کا اعصابی تناؤ [کم] ہوگیا تھا، اسے یقین تھا کہ اُس سامنے



۱/۹، ایل۔ آئی۔ جی۔ نگر، ویسٹ بمبئی۔

بکری کے دامن میں وہ مندر ضرور ہوگا۔ چند قدم طے کرتے ہی اس کی نظر مندر پر پڑی۔ وہ ایک پرانا بوسیدہ مندر تھا جس کے ستون ڈھے چکے تھے، مورتی ٹوٹی پڑی تھی اور چاروں طرف تاراجی کا راج تھا۔

اُس نے سوچا۔ اب اس مندر کے ایک گوشے میں مرگ چھالا بچھائے وہ سکون اور اطمینان سے اس کی راہ دیکھتا رہے گا۔ وہ اس مسافر کی سی طمانیت محسوس کر رہا تھا جو ایک طویل مسافت کے بعد کسی گھنے درخت کے سایے میں پہنچ گیا ہو۔

اس نے مرگ چھالا فرش پر بچھایا اور اس پر اطمینان سے آسن جما کر بیٹھ گیا۔ اب باہر درخت کے پتّوں کی سرسراہٹ کے سوا وہاں کسی بھی قسم کی آواز سُنائی نہیں دے رہی تھی۔

غالباً اس ویران مندر میں ایک عرصے سے کسی متنفّس کا گزر نہیں ہوا تھا۔ فرش پر دھول کی دبیز چادر بچھی تھی جس پر دروازے سے مرگ چھالا تک صرف اسی کے قدموں کے نشان دکھائی دے رہے تھے۔ وقت دبے پاؤں گزر رہا تھا۔ سادھو دروازے پر نظریں جمائے خاموش بیٹھا رہا۔ وہ اس حقیقت سے بہت پہلے آگاہ ہو چکا تھا کہ آنے والا لمحہ اپنے وقت پر ہی آتا ہے۔ خواہ مخواہ کی بےصبری سے، ہونے والا واقعہ اپنے مقررہ وقت سے پہلے ظہور میں نہیں آتا۔ اور نہ ہی کسی کے ڈرنے گھبرانے سے وہ پل بھر کے لیے ٹل سکتا ہے۔

بڑی دیر کے بعد باہر خشک پتّوں پر کسی کے قدموں کی چرچراہٹ سُنائی دی۔

دوسرے ہی لمحے ایک خونخوار قسم کا نوجوان ہاتھ میں چمک دار خنجر لیے دروازے میں کھڑا دکھائی دیا۔ نوجوان دروازے میں کھڑا اندر مندر کے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔

"بھرت اندر آجا۔ مَیں یہاں اس کونے میں بیٹھا ہوں مجھے تیرا ہی انتظار تھا۔" مندر کے سنّاٹے میں سادھو کی آواز گونجی۔

نوجوان اپنا نام سن کر پہلے تو چکرایا پھر سادھو پر اس کی نظر پڑی اور وہ نپے تُلے قدم اُٹھاتا سادھو کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر اب بھی حیرت کے آثار تھے۔ سادھو کو اس کا نام کیونکر معلوم ہوا؟ آخر اس نے کرخت آواز میں پوچھ ہی لیا۔

"تو کیسے جانتا ہے کہ میرا نام بھرت ہے؟"

وہ جانتا تھا کہ بھرت اس سے یہ سوال ضرور پوچھے گا۔ وہ دل ہی دل میں مُسکرایا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جواب میں اُسے بالکل خاموش رہنا ہے۔

مگر اس سوال نے اس کی یادوں کے پُرسکون تالاب میں ایک ہلچل سی مچا دی۔ جس طرح وہ حال کے بطن میں چھپی مستقبل کی کی تصویر دیکھ لیتا ہے اسی طرح اب ماضی بھی ساکار ہو کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

جب گھر میں بچّہ ہوا تھا تو اُسی نے اس کا نام 'بھرت' رکھا تھا۔ مگر بچّے کی پیدائش کے چند روز بعد ہی اس کی بیوی گھر اور خاندان کی پروا کیے بغیر بچّے کو چھوڑ کر کہیں چلی گئی گھر کا پورا شیرازہ بکھر گیا۔ تب سے وہ اپنے بیٹے کی تلاش میں جنگل جنگل بھٹک رہا تھا۔

اس نے مستقبل کی آنکھ سے بارہا اپنے بیٹے کی جگہ اسی خونخوار نوجوان کو اسی بوسیدہ مندر میں اسی حالت میں خنجر بکف دیکھا تھا۔ یہ منظر دیکھتے دیکھتے اس کی رگوں میں برف جم چکی تھی۔

وہ انجانے میں اس گاؤں کے پاس سے کتنی ہی بار گزرا ہوگا، مگر کبھی اسے یہ مندر دکھائی نہیں دیا اور نہ ہی کبھی اس گاؤں میں داخل ہونے کی اُس کے دل میں کوئی خواہش جاگی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ واقعات اپنے وقت پر ہی رونما ہوتے ہیں نہ ایک پل اِدھر نہ ایک پل اُدھر۔ جیسے ہر نقش پتھر پر کندہ کر دیا گیا ہو اس نے تصور میں اس نوجوان کے ہاتھ میں خنجر بھی دیکھا تھا مگر ایک عجیب ناگزیر طاقت اسے وہاں کھینچ لائی تھی۔ وار کرنے والا اور وار سہنے والا دونوں وقت کے اس بیکراں جال میں کسی قدر بے بس ہیں؟ بےبس ہیں اس لیے دونوں ہی بےقصور ہیں۔

سادھو کو خاموش دیکھ کر بھرت بولا:

"تو جانتا ہے اس بستی پر میری حکمرانی ہے۔ میرے عتاب سے لوگ کانپتے ہیں اور میری ذرا سی چاہت انھیں نہال کر دیتی ہے۔ تو شاید نہیں جانتا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟"

سادھو ایک بات جانتا تھا۔ پچھلے کتنے ہی برسوں سے مستقبل کا ایک ایک راز اس پر افشا ہو چکا تھا۔ جب وہ اپنے سفر پر گھر سے نکلا۔ یا تھا بھی، یا اس سے پہلے اس وقت جب وہ اپنے بیٹے بھرت کا نام تجویز کر رہا تھا، یا اس سے بھی پہلے جب وہ خود پیدا ہوا تھا، یا اس سے بھی

ب اس کے باپ کا جنم ہوا تھا' یا اس
، جب پہلا انسان وجود میں آیا تھا۔ وہ
ر کو عجیب بے تعلقی سے دیکھتا آیا تھا جیسے
ٹک دیکھ رہا ہو — اُس کے بعد پانی
لبوں کی طرح بے شمار انسانوں کی پیدائش
ں کی قسمتوں کی ناگزیریت کے ساتھ کھینچی
ایک ایک لکیر — زندگی کا ہر بھید اس
ں چکا تھا۔ اور اب جو کچھ ہونے والا تھا
حقیقت صرف اتنی تھی کہ متواتر مستقبل
اقب کرنے والا لمحۂ موجود ایک جست میں
بل کی حدود پار کر جانے والا تھا۔ وقت
ہاؤ میں لمحہ بھر کو ایک گرہ پڑنے والی تھی
پھر سب کچھ پہلے کی طرح شانت اور پُرسکون
بانے والا تھا۔

"تجھ جیسے شخص کا زندہ رہنا بے حد
رناک ہوگا۔" بھرت نے کہا۔
"میں تجھے قتل کرنے کے لیے آیا ہوں۔
بان سے موت بولتی ہے۔ تیرے الفاظ
ہی اور نحوست کا علامیہ ہیں۔"

سادھو نے نہایت اطمینان سے کہا۔
"تو جو کچھ کہہ رہا ہے سچ ہے مگر سچ
ف یہی نہیں ہے۔ لفظ کو واقعہ بنا دینے
اختیار کسی کو نہیں۔ میرے الفاظ کسی وقوعے کا
لامیہ بن ہی نہیں سکتے۔ تیرا یہ سوچنا غلط
کہ میں جو بولتا ہوں اُسی کے مطابق ہوتا ہے۔
قیقت اس کے برعکس ہے' دراصل جو
ونے والا ہوتا ہے وہ مجھے قبل از وقت
کھائی دے جاتا ہے اور میں اُسے لفظوں میں
ض بیان کر دیتا ہوں۔ میرا بولنا ناگزیر
ہے۔ یہی میرا شراپ ہے۔"

مندر کی شکستہ دیوار سے دُھوپ کی ایک کرن اندر رینگ آئی اور فرش پر دُھوپ کا بالشت بھر ٹکڑا کُندن ہوگیا۔ تاریکی کچھ کم ہوئی۔ سادھو کہہ رہا تھا۔

"اور سُن! اپنے اس شراپ کے کارن میں دوسروں کے مقابلے میں زیادہ بدنصیب ہوں۔ کیونکہ اسی کے سبب میں امید اور خواب کی فریب خوردہ مسرتوں سے حظ نہیں اُٹھا سکتا۔ مگر میں دوسروں کے مقابلے میں بے حد مطمئن ہوں۔ کیونکہ میں نے خواہشات کی نفی کر دی ہے۔ اس لیے دُکھوں کی بھی نفی ہو چکی ہے۔ جب لاگ ہی نہیں تو لگاؤ بھی نہیں۔ اور جب لگاؤ نہیں تو دُکھ بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں تو مجھے قتل کرنے آیا ہے۔ مگر میں موت سے قطعی خوف زدہ نہیں ہوں حتّٰی کہ میرے دل میں تیرے تعلق سے بھی کوئی میل نہیں۔ اس دُھوپ کے ٹکڑے کو غور سے دیکھ کیسا سنہرا رنگ ہے اس کا۔ تھوڑی دیر میں یہ میری زندگی کے آخری لمحے کی طرح لہو رنگ ہو جائے گا۔ اُس کے سُرخ ہوتے ہی تجھے میرا وقت بھی آن پہنچا۔ البتہ نہ میں تجھ سے یہ کہوں گا کہ تو جلدی سے اپنا کام ختم کر اور نہ ہی زندگی کے چند لمحے تجھ سے مستعار مانگنے کا میرا کوئی ارادہ ہے۔ نہ تیرے چاہنے سے قتل مقررہ وقت سے قبل عمل میں آسکتا ہے۔ نہ میرے چاہنے سے ایک پل کے لیے ٹل سکتا ہے۔"

سادھو بولتے بولتے رُک گیا۔ اس کی نگاہیں بھرت پر گڑی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے بھرت کا چہرہ سیاہ' بے جان اور بے رونق ہوگیا۔ اس کی گردن کے گرد کالے ناگ کی کنڈلی جیسی پھانسی کی رسّی کے نیل پڑنے لگے۔ سادھو نے بہت پہلے جب بھرت ابھی بچہ تھا اپنے ہاتھوں سے اس کے گلے میں سیاہ موتی باندھا تھا کہ اسے نظر نہ لگے اور اب اسی گردن میں پھانسی کا پھندہ دکھائی دے رہا تھا۔ اور المیہ یہ کہ اس پھانسی کا سبب وہ خود بننے والا تھا۔ وہ لمحے بھر کو مضطرب ہوگیا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ سب کچھ ناگزیر ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ پہلے ہی سے مقدر ہے اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے۔ تبھی اُس نے کمالِ ضبط سے آنسوؤں پر قابو پالیا اور انھیں پلکوں کے اندر ہی قید کر لیا۔

سادھو کی بات بھرت کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اس کا غصہ اب اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا اس کا چہرہ لال ہوگیا۔ آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا دوسرے ہی لمحے اس کا خنجر والا ہاتھ سر سے بلند ہوا۔ بجلی سی کوندی اور پورا خنجر آنکھیں موندے' شانت بیٹھے اس سادھو کے سینے میں دستے تک پیوست ہوگیا۔ سادھو کے سینے سے خون کا چشمہ اُبل پڑا۔ اور فرش پر بہتی خون کی لکیر اس سُرخ ہوتے دُھوپ کے ٹکڑے کو مزید سُرخ بنانے لگی۔



جمیل قریشی

فنا، بقا کے طلسموں کو اپنے سر سے نکال
جو میہمان پریشاں کرے تو گھر سے نکال

نہ ہوگی سر کبھی یوں تجھ سے رفعتِ افلاک
عقاب ہے تو تھکن اپنے بال و پر سے نکال

ہیں اُس کی کور نگاہی سے ظلمتیں انبار
اک آفتاب کسی چشمِ دیدہ ور سے نکال

وثوق شرط سمجھ عرضِ مدعا کے لیے
گماں کا رنگِ حزیں حرفِ معتبر سے نکال

جو اضطراب کا عفریت ہے دلوں میں جمیلؔ
اُسے کسی نئی تدبیرِ کارگر سے نکال

معرفت اسسٹنٹ انجینئر ویسٹرن ریلوے رانا پرتاپ نگر اودے پور (راجستھان)

پہلے ہم دیکھیں اپنے گھر کا ماحول
پھر سوچیں کیسا ہے باہر کا ماحول

جتنا آج ہے اُتنا زہر آلود نہ تھا
میرا کا سقراط کا شنکر کا ماحول

دل میں کتنے طوفاں ہیں یہ جانے کون
ہے یوں تو خاموش سمندر کا ماحول

گھر گھر ہے سہما سہما سا جانے کیوں
گلیوں گلیوں کیوں ہے اک ڈر کا ماحول

لوگ شررؔ بارود پہ بیٹھے ہیں سارے
شعلہ جیسا ہے دُنیا بھر کا ماحول

انعام شرر ایوبی



۱۰۲۳ چار دروازہ گنگا پول روڈ جے پور



معظم علی خاں

پتھروں کے درمیاں بہتی ندی اچھی لگی
جب حصارِ غم میں گزری زندگی اچھی لگی

شب کی تنہائی میں دروازے پہ دستک دفعتاً
گھپ اندھیرے میں اچانک روشنی اچھی لگی

بخشتی ہے چاندنی کہرے کو بھی رخشندگی
اس کے چہرے پر اُداسی ہی سہی اچھی لگی

درمیاں کانٹوں کے بھی شاداب تھے مسرور تھے
جانے کیوں پھولوں کی یہ شائستگی اچھی لگی

اب کے ہم بھٹکے تو راہِ راست پر آجائیں گے
سیدھے رستے سے معظمؔ گمرہی اچھی لگی

۴/۸ ذہیرہ باغ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ (یو۔پی)

محمد برہان حسین

ملیریا کی تحقیق کے سو سال

آج ہم بخوبی یہ جانتے ہیں کہ ملیریا مچھروں سے پھیلتا ہے، لیکن آج سے ایک صدی قبل بڑے سے بڑا سائنسداں حیران تھا کہ یہ موذی مرض کیا ہے اور کیوں ہوتا ہے؟ ملیریا انسان کا پیچھا اس وقت بھی کرتا تھا جب وہ غاروں میں رہتا تھا اور اس وقت بھی ملیریا اُس کا سب سے بڑا دشمن تھا جب وہ شہروں میں رہنے لگا اور بڑی بڑی صنعتیں قائم کرنے لگا۔ ملیریا کا ذکر تین ہزار سال قبل (۱۵۰۰ قبل مسیح) کی تحریروں میں ملتا ہے۔ اس وقت انسان نے اس موذی مرض کے آگے گھٹنے ٹیک دیے تھے اور یہ مان لیا تھا کہ ملیریا خدائی قہر ہے۔

قرونِ وسطیٰ میں ملیریا کے علاوہ کئی اور وبائیں تھیں جن کو مجموعی طور پر جاڑا، بخار یا "اگیو" کا نام دیا گیا تھا۔ سترہویں صدی میں لوگ امریکہ سے ایک درخت کی چھال "سنکونا" بطور ملیریا کی دوا کے یورپ لے آئے۔ ان کا لیڈر کارڈینل جان لیوگو تھا چنانچہ بعد میں اس چھال کا نام یورپ میں "کارڈینل بارک" اور "جی سوٹ بارک" پڑ گیا تھا۔ یورپ میں سنکونا بڑی قیمتی شے تھی اور سونے کے برابر تول کر فروخت کی جاتی تھی۔ اور اس طرح عام انسانوں کی پہنچ سے باہر تھی۔ بعض ڈاکٹر اِس کے بُرے اثرات (جیسے اس کا سماعت پر بُرا اثر ہوتا ہے) کی وجہ سے اس کو استعمال کرانے سے ڈرتے تھے۔ ویسے بھی اس کے گراں ہونے کی وجہ سے اس میں لوگ دوسری چھالوں کو ملا دیتے تھے اور اصلی سنکونا کا ملنا بھی ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ چونکہ یہ بخار عام طور پر ایسی جگہوں پر پھیلتے تھے جہاں دلدل ہوتی تھی اور اطالوی زبان میں مال کے معنی ہیں "بُری" اور ایریا کے معنی ہیں "ہوا" یعنی بُری ہوا سے پھیلنے والا مرض یا وبا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا نام اس وقت ملیریا پڑ گیا۔ اگر ہم اس بیماری کی گذشتہ برسوں میں کی گئی تحقیقات کا ایک جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۸۰ء تک ملیریا کی اصل وجوہ معلوم نہ ہو سکی تھی حتیٰ کہ ایک فرانسیسی طبیب جو الجیریا (شمالی افریقہ) میں تعینات تھا ــــ الفونس لیوران نے اپنی خوردبینی تحقیقات کے ذریعہ اس کے جراثیم کا پتہ چلا لیا۔ یہ جراثیم طفیلی (پیراسائیٹ) تھے جو انسانی خون پر گذارا کرتے تھے اس دریافت کے بعد کئی اہم سوالات خود بخود سامنے آگئے مثلاً یہ کہ طفیلی جراثیم انسانی خون میں کس طرح پہنچتے ہیں اور ایک انسان کے خون سے دوسرے انسان کے جسم میں کس طرح پہنچ جاتے ہیں؟

چارلس الفونس لیوران ۱۸۴۵ء میں پیرس میں پیدا ہوئے تھے ان کے والدِ محترم بھی ڈاکٹر تھے اور وہ بھی الجیریا کی فرانسیسی فوج کے ساتھ کام کر چکے تھے۔ لیوران ۱۸۷۸ء میں الجیریا کی فرانسیسی فوج میں تعینات تھے۔ اُنھیں پہلے "بُونے" نامی جگہ پر اور پھر کانسٹن ٹائن نامی شہر میں تعینات کیا گیا۔ اسی شہر کے قیام کے دوران اس نے ملیریا کے طفیلی جراثیم کی معرکۃ الآرا دریافت کرکے شہرت پائی۔ انھوں نے اگرچہ اپنے کام کی رپورٹ اکیڈمی آف میڈسن کو بھجوائی تھی لیکن اس کو دیر سے شائع کیا گیا پھر مشہور سائنسی رسالہ لینسیٹ نے ۱۲ نومبر ۱۸۸۱ء کی اشاعت میں اس کو تفصیل سے شایع کیا۔

لیوران نے ۱۹۲، بخار زدہ مریضوں کے خون کے نمونوں کا گہرا خوردبینی مطالعہ کیا اور ان میں سے ۱۸۰ نمونوں میں ملیریا کے طفیلی جراثیموں کو پہچانا اور ان کی شکل وصورت اور جسامت کا تعین ہوگیا۔ لیکن لیوران کی اس غیر معمولی سائنسی دریافت کا عالمی سائنسی حلقے میں بڑی سرد مہری سے استقبال کیا گیا اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس دَور میں ہر طرف جراثیموں کے خوردبینی مطالعہ کا ایک عام رواج سا ہوگیا تھا۔

بیکٹیریا (جراثیم) کے اصلی موجد اور اس کی تحقیق کے بابا آدم جرمن سائنسداں رابرٹ کاچ نے ۱۸۸۰ء میں کہا تھا ـــ "اور دوسری وجوہ کے ساتھ ساتھ ملیریا کے بُخار کی ایک وجہ بیکٹیریا بھی ہو سکتے ہیں" لیکن اس کے شاگردوں نے اس کے بیان کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس ناقدری کی ایک وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ ملیریا کے طفیلی جراثیموں کو خون کے نمونوں میں پہچاننا بڑا مشکل کام تھا چنانچہ کوچ اور لیوران کے اس قدر اہم سائنسی کارناموں کو سراہا نہیں گیا۔ یہاں تک کہ لیوران کو ملیریا کی تحقیقات سے ہٹا کر دوسرے تحقیقی منصوبوں پر لگا دیا گیا۔ اور اس کے بعد دس سال تک ملیریا کی تحقیقات پسِ پشت ڈال دی گئیں لیکن لیوران کو اس کام کی اہمیت کا پورا اندازہ تھا چنانچہ جب انھیں انتظامی عہدوں پر متعین کیا جانے لگا اور وہ تحقیقاتی کاموں سے دُور کر دیے گئے تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ انھیں فوج کی ملازمت ترک کرکے مکمل طور پر سائنسی تحقیقی کاموں میں لگ جانا چاہیے اور آخرکار انھوں نے ۱۸۹۶ء میں فوج کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور "پاسچر انسٹی ٹیوٹ" میں داخل ہوگئے اور اُن امراض پر تحقیقی کام شروع کر دیا جو طفیلی جراثیموں سے پھیلتے ہیں۔ لیکن اس دوران عالم سائنس نے لیوران کے اس غیر دلیل تحقیق کو قبول کر لیا کہ ملیریا کی وجہ طفیلی جرثومہ ہی ہے اور ۱۹۰۷ء میں ان کو اس عظیم انسانی خدمت اور سائنسی کارنامہ پر "نوبل انعام" سے نوازا گیا۔ لیوران نے اس انعام کی رقم کو "پاسچر انسٹی ٹیوٹ"

سائنسداں، ریجنل ریسرچ لیبارٹری، حیدرآباد

میں گرم ممالک میں بیماریوں کی تحقیقات کے لیے ایک علیحدہ شعبہ کے قیام کے لیے بطور عطیہ دے دیا اور "لیورآن لیبارٹری" کا قیام عمل میں آیا۔

اپنی تحقیقی کوششوں سے لیورآن نے یہ دریافت کر لیا کہ ملیریا ایک طفیلی جرثومہ کے ذریعے پھیلتا ہے۔ اب دوسرے سائنسدانوں کے لیے یہ کام تھا کہ وہ یہ دریافت کریں کہ یہ طفیلی جرثومے کس ایجنٹ کے ذریعہ ایک انسانی خون سے دوسرے انسانی خون تک پہنچتے ہیں۔

اس دوران رونالڈ راس نے پہلے ہی سے اس تحقیقی موضوع پر جس کی نشاندہی لیورآن نے کی تھی اور اُسے وہ غیر مکمل طور پر چھوڑ گئے تھے، پورا کرنے میں مصروف تھے۔ رونالڈ راس ۱۸۵۷ء میں ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ اُس وقت اُن کے والد انگریزی فوج میں ڈاکٹر کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ اس سے پہلے وہ بھی الجیریا میں ڈاکٹر رہ چکے تھے۔ راس ملیریا کی تحقیق پر اس لیے متوجہ ہوئے کہ خود ان کے والد ہندوستان کے قیام کے دوران بُری طرح ملیریا سے متاثر ہوئے تھے اور قریب المرگ ہو گئے تھے اُن کی ماں نے اس خیال سے کہ کہیں اُن کے بخار کے وبائی اثرات راس کو نہ لگیں اُن کو ۱۸۵۶ء میں اُن کے چچا کے پاس انگلستان بھیج دیا۔ راس کو انگریزی ادب، موسیقی اور مصوری سے بیحد لگاؤ تھا۔ ان کو بہترین ادبی انگریزی زبان میں بات کرنے کا جنون تھا، اور انگلستان کے پہاڑوں، اور جانوروں سے بھی کچھ کم عشق نہ تھا۔ اُن کو قدرتی مناظر اور جانوروں کی وجہ سے ہندوستان سے بڑی محبت تھی۔ صرف ہندوستان میں رہنے کی خاطر انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ "انڈین میڈیکل سروس" میں داخل ہو جائیں گے اور اس کے لیے میڈیکل کورس کرنا ضروری تھا اس لیے انھوں نے میڈیکل میں داخلہ لے لیا، لیکن چونکہ میڈیکل ڈگری ان کے لیے منزل نہیں تھی بلکہ منزل تک پہنچنے کا راستہ تھی اس لیے وہ اپنی تعلیم میں لاپروا ہو گئے۔ اور انگلستان میں ڈرامہ اور موسیقی سے دلچسپی لیتے رہے۔ حتیٰ کہ جب اُن کے والد کو ہندوستان میں یہ خبر ملی تو اُن کو بڑی تکلیف ہوئی اور انھوں نے بڑے دُکھ بھرے انداز میں اپنے احساسات کا اظہار راس کو خط لکھ کر کیا اور التجا کی کہ وہ میڈیکل کورس پر توجہ دیں اور جلد ہی مکمل کر کے ہندوستان آجائیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ راس جب اس خط سے جاگے تو بہت دیر ہو چکی تھی اور امتحان میں صرف چند دن باقی تھے۔ راس نے سوچا کہ اتنی کتابوں کا مطالعہ چند دنوں میں ممکن نہیں، وہ اپنے ایک میڈیکل طالب علم دوست کے پاس گئے اور اُس سے مدد کرنے کے لیے کہا۔ اُس نے مذاق اُڑایا کہ کس طرح چند دن کی پڑھائی سے راس ڈاکٹر بننے کی امید کر رہے ہیں۔ آخر راس نے کہا کہ وہ اپنے دوست کی رپورٹوں کو صرف سُن لے گا اور اس طرح جو بھی اس کے سمجھ میں آئے گا۔ اسی کے سہارے امتحان میں بیٹھے گا۔۔۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا لیکن جب امتحان کا نتیجہ نکلا تو اس کا دوست فیل ہوا اور خود راس کامیاب ہو گیا تھا۔

اس طرح ۱۸۸۸ء میں راس تعلیم مکمل کر کے جب ہندوستان پہنچا۔ تو نوکری کے دوران اُن کا تبادلہ مدراس، میسور، بنگلور، اُوٹی، کوئٹہ، انڈمان اور برما کے فوجی دواخانوں میں ہوتا رہا۔ اس دوران انھوں نے چند کہانیاں اور ناول لکھ ڈالے —————— لیکن ایسے کاموں سے اس کو تسکین نہیں ہوئی تھی۔ وہ انگلستان لوٹ گیا اور دو سال تک وہیں رہا اس دوران اُس نے دو مضامین کا مطالعہ کیا۔

۱۔ اصولِ صحت وصفائی

۲۔ علم جرثومہ

فرانسیسی سائنسدان "لوئس پاسچر" نے جراثیم کو دریافت کیا اور جرمن "تھالوجسٹ کوچ" نے اس کا ثبوت مہیا کیا اور یہ نظریہ پیش کیا کہ بیماریاں بد دُعاؤں اور خدائی قہروں سے نہیں پھیلتیں بلکہ ان کی وجہ صرف جراثیم ہیں۔ اس نظریہ کی روشنی میں راس نے فیصلہ کیا کہ ضرور ملیریا کی وجہ بھی جراثیم ہیں اور وہ ان کا پتہ لگائے گا۔

لیورآن نے بتایا کہ اس کے خوردبینی مطالعہ نے یہ ثابت کیا ہے کہ ملیریا زدہ انسان کے خون میں خاص شکل وجسامت کے جرثومے ہوتے ہیں جو صحتمند انسان کے خون میں نہیں ہوتے۔

رونالڈ راس کا نظریہ تھا کہ ہندوستان میں پیچش اور ٹائیفائڈ جیسے امراض صرف غلاظت وگندگی کی وجہ سے پھیلتے ہیں اور اصولِ صحت و صفائی کو اپنانے سے اِن سے چھٹکارہ ممکن ہے۔ چونکہ اس وقت وہ اِن بیماریوں کو پیٹ کی بیماریاں سمجھتا تھا۔

ہندوستان لَوٹنے کے بعد وہ مدراس سے اُوٹی گیا اور اس سات ہزار فٹ سے زیادہ اُونچے مقام سے لَوٹتے ہوتے جب وہ "میٹو پالیم" نامی وادی میں پہنچا تو اس کو ایک عجیب مشاہدہ کا موقع ملا۔ پہلے تو یہ کہ اُوٹی کی بلندیوں پر مچھر ناپید تھے اور میٹو پالیم میں اُس نے رات مچھردانی میں گذاری جبکہ اس کا دوست بغیر اس کے سو گیا اس کا دوست ملیریا کے بخار میں مُبتلا ہوا لیکن خود اس کو ملیریا نہیں ہوا۔

رونالڈ راس چار سال ہندوستان میں رہنے کے بعد جب انگلستان لَوٹے تو انھوں نے انگلستان میں ملیریا کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش شروع کر دی — وہ نامی گرامی سائنسداں سر پیٹرک مین سن سے ملے دَورانِ گفتگو مین سن نے کہا کہ "شاید مچھر ہی ملیریا کے جراثیم کا ایجنٹ ہے"۔ راس نے ہندوستان لَوٹ کر اس نظریہ پر پھر کام کرنے کا ارادہ کیا۔ بالآخر ۱۸۹۵ء میں راس کو ملیریا کی تحقیق کی خدمات کے سلسلے میں "پارکس گولڈ میڈل" عطا کیا گیا۔

ہندوستان لوٹنے پر راس کو سکندرآباد (حیدرآباد دکن کا کنٹونمنٹ شہر) میں ایک رجمنٹ سے منسلک کر دیا گیا۔ یہاں اس نے اپنی توجہ ملیریا پر مرکوز کر دی۔ (اب اس جگہ کا

...س روڈ کے نام سے منسوب ہے)۔
...کے دوران اتفاقیہ طور پر راس کو
...اس وقت ملی جب اُس نے دیوار
...نماز کی بنیاد پر مچھروں کو دو گروہوں
...ایک قسم کا مچھر دیوار پر' دیوار کے
...ہے جس طرح پرندے بیٹھتے ہیں اور
...مچھر اس طرح بیٹھتا ہے کہ اس کی دُم
...ہوئی اور دیوار کی سطح سے زاویہ (اینگل)
... اس طرح دوسرے قسم کے مچھر
...انافولیس کا نام دیا۔ اس کے بعد
...روں کو پکڑنے اور ان کو چیر کر خوردبین
...ناہدہ کرنے کا ایک سلسلہ شروع کیا۔
...اروں مچھر چیر ڈالے اور شب و روز
...ردبینی مطالعہ جاری رکھا۔ اس نے غیر معمولی
...پر مچھر اور اُس کے "لاروی" لوگوں سے
...یے — وہ سکندر آباد کے فوجی دواخانہ
...نے کام کے بعد گرم دوپہر میں بس اسی
...میں اپنا وقت گذارتے تھے۔
جبکہ سر پٹن سن اس نظریہ پر قائم تھے کہ
...ے "جراثیم غلیظ پانی کے پینے سے انسان
...ٹ میں پہنچتے ہیں" اور یہی ملیریا کے پھیلنے
...ریعہ ہے۔ ۔ ۔ ظاہر ہے کہ یہ نظریہ بالکل
...ثابت ہونے والا تھا لیکن سر پٹن سن جیسی
...یت کے نظریہ کو راس فطری طور پر وزن
...پر مجبور تھا اور اس کے پیچھے پڑ کر راس
...اپنے کئی قیمتی سال ضائع کیے۔
۱۸۹۶ء میں راس نے ایک کلیدی نتیجہ
...صل کیا کہ جب صحت مند مچھر' ملیریا زدہ انسان
...کو کاٹتے ہیں اور خون چوستے ہیں تو مچھروں کے
...یٹ میں ملیریا کے جراثیم داخل ہو جاتے ہیں۔ ۔ ۔
...گویا یہ بات تحقیق سے سامنے آئی کہ ملیریا
...مچھروں سے ہی پھیلتا ہے۔
سکندر آباد کے دواخانہ میں رونالڈ راس
...نے ایک غیر معمولی تجربہ کیا۔ اس کو ایک سمجھ دار
...ملیریا کا مریض حسین خان ملا۔ اُس کی رضامندی
...سے راس نے اٹھارہ صحت مند مچھروں کو اس

کی مچھر دانی میں چھوڑا اور حسین خاں کا خون چوسنے کے بعد انھیں نکال کر محفوظ کر لیا۔

دوسرے دن اس نے انھیں چند مچھروں کو چیرا اور خوردبینی مشاہدہ کیا۔ تیسرے دن پیٔ ورد مچھروں کو چیرا اور مشاہدہ کیا۔ چوتھے دن کے مشاہدے سے یہ بات سامنے آئی کہ ہر مچھر کے پیٹ میں ۱۲/ گول خلیے تھے جن پر دھبے بھی تھے جو اصل میں ملیریا کے جراثیم تھے۔ پانچویں دن اس نے آخری ایک مچھر کو چیرا تو اس کے پیٹ میں ویسے ہی ۲۱ خلیے تھے لیکن مقابلتاً جسامت میں بڑے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ملیریا کے جراثیم مچھر کے پیٹ میں نشو و نما پاتے ہیں یا افزائشِ نسل کا پورا سلسلہ مچھر ہی کے پیٹ میں پورا ہوتا ہے۔

راس نے اس سلسلے کے مختلف مدارج کے نام رکھے اور یہ نظریہ پیش کر دیا کہ ملیریا کی وجہ مچھر ہیں۔ ۔ ۔ مچھر ہی ملیریا کے پھیلانے کا ایجنٹ ہے۔ اور گندہ پانی یا دلدل یا اُس کی خراب ہوا اس کے قطعی ذمہ دار نہیں ہیں۔ اس نے یہ بھی نشاندہی کی کہ مچھر سمندری پانی میں نہیں پنپ سکتے اور میٹھا پانی کا ذخیرہ ان کی رہائش گاہ ہوتی ہے۔

راس نے اپنے اس نظریہ کی وضاحت کے لیے ثبوت کے طور پر "اصولِ صحت و صفائی" اپنے سینی ٹیشن کے علم کو استعمال کیا اور دُنیا کے کئی ممالک میں جہاں ملیریا ایک عذاب بنا ہوا تھا۔ پانی کے جمع ہونے کی جگہوں کو صاف کیا گیا جس کے نتیجے میں بہترین نتائج سامنے آئے۔

۱۹۱۱ء میں رونالڈ راس کو اس کی اس اہم انسانی خدمات کے سلسلے میں برطانوی حکومت نے انھیں "سر" کا خطاب دیا اور اسی سال کے آخیر میں انسانی علم میں اضافہ کرنے کے لیے اُن کو میڈیسن میں اعلیٰ ترین انعام نوبل انعام سے نوازا گیا۔

ملیریا کے سلسلے میں چند حقائق حیرت ناک ہیں۔ جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ صرف مادہ انافولیس مچھر ہی انسانوں کو کاٹتی ہے۔ ورنہ نر مچھر انافولیس بھی اور اقسام کے مچھروں کی طرح سبزی خور ہے اور خون نہیں چوستا۔

۲۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس دریافت کے پون صدی گذرنے کے بعد بھی آج انسان ملیریا پر پوری طرح قابو نہیں پا سکا ہے۔

۳۔ اور آج بھی ملیریا بخار کی کامیاب دوا کونین ہی ہے۔

اگرچہ کونین کو اب سنکونا چھال سے نہیں حاصل کیا جاتا بلکہ کیمیائی مرکب کے بطور بنایا جاتا ہے۔ کونین کو مصنوعی طور پر کیمیائی مرکب کی شکل میں اس صدی کے بہترین کیمسٹ آر۔ بی۔ وڈوارڈ نے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کے لیے تیار کیا تھا۔

رونالڈ راس وہ خوش قسمت سائنسداں تھے جنھوں نے قریب ایک صدی کی عمر پائی اور اپنی ملیریا کی کامیاب تحقیق کے بعد بڑی شہرت حاصل کی۔

نئی مطبوعات

تلاش و تعبیر
مُصنّف: رشید حسن خاں
صفحات: ۳۰۴
قیمت: ۴۵ روپیے
ناشر: مصنّف بہ تعاون دِلّی اُردو اکادمی
مِلنے کا پتا: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

رشید حسن خاں صاحب اُردو کے محتاط ترین اور سخت گیر محقق ہی نہیں، نقّاد بھی ہیں۔ خاں صاحب کے بعض تنقیدی مضامین مثلاً "فیضؔ کی شاعری کے چند پہلو" اور "جوشؔ کی شاعری میں لفظ اور معنی کا تناسب" اس دہے کے مقبول ترین تنقیدی مضامین کہے جاسکتے ہیں دونوں ہی مضامین ہند و پاک میں اتنی مرتبہ شائع ہوئے ہیں کہ شمار کرنا مشکل ہے۔

جیسا کہ مَیں نے عرض کیا رشید حسن خاں کا اصل میدان تو تحقیق ہے مگر بعض دوسرے موضوعات پر بھی ان کی تحریریں بڑی اہمیت رکھتی ہیں مثلاً رسم الخط کے موضوع پر ان کی کتاب "اُردو اِملا" اپنے موضوع پر پہلی مفصل کتاب ہے۔

تلاش و تعبیر رشید حسن خاں کے مضامین کا مجموعہ ہے اِس مجموعے کے بیش تر مضامین تنقیدی ہیں۔ خاں صاحب کی تنقیدی تحریریں کہیں بھی ابہام کے دھندلکوں میں پناہ نہیں لیتیں۔ وہ ادب میں کسی غیر ادبی نظریے کے قائل نہیں اور ان کے خیال میں نظریے کی پابندی فضائے فکر کو محدود و مختصر کر دیتی ہے حرفِ آغاز میں اپنے خیال کی وضاحت کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں:

"سخن فہمی اور طرف داری میں تضاد کی نسبت تو نہیں، مگر یہ بھی سچ ہے کہ طرف داری انصاف کی دُشمن ہوتی ہے۔۔ طرف دار بنانے میں سب سے زیادہ موثر حصّہ ہوتا ہے کسی خاص نظریے کی پابندی کا۔ نظریے میں قطعیت ہوتی ہے کہ اس کو ماننے کے بعد، ہر چیز کو اُسی کی روشنی میں دیکھنا پڑتا ہے اور یوں تنقید نگار گویا اکثر مولوی بن کر رہ جاتا ہے۔۔۔ جب ایک ترقی پسند ناقد نے یہ لکھا تھا کہ: فانیؔ اور اصغرؔ کا ذکر میں اس لیے نہیں کروں گا کہ ایک نے اپنی شاعری کو قنوطیت کا گھُن لگا لیا، اور دوسرے کا تصوّف بے وقت کی راگنی تھا، تو اس کا اعلان کیا تھا کہ نظریے کی پابندی، انصاف کی دُشمن ہے۔"

رشید حسن خاں صاحب کی تحریریں ہمیں بتاتی ہیں کہ وہ اساتذہ خصوصاً اُردو اساتذہ کے غیر علمی رویّوں، سیاسی گروہ بندیوں اور کردار کے دہرے پن کے سخت مخالف ہیں اس کتاب میں اس موضوع پر ان کا ایک پورا مضمون شامل ہے۔ ایک اقتباس دیکھیے:

"دہرے کردار کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے اظہار کے لیے بھی مگر فریب انداز اختیار کرتا ہے۔ تنقید میں جو بعض لوگوں کے یہاں انشائیہ طرزِ نگارش کی جلوہ گری ہے، اس کی وجہ یہی اُن کے مزاج کی منافقت ہے۔ انشائیہ اسلوبِ ادا کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ایسی وضاحت کی نوبت آ ہی نہیں پاتی جس سے قطعیت کے ساتھ ذِمّے داری کا انتساب کیا جاسکے۔ ہر بات کو ایسے پہلو دار انداز سے کہا جاسکتا ہے کہ مختلف اوقات میں اُس کی مختلف تعبیریں کی جاسکیں۔۔ مشہور شاعروں کے بولتے ہوئے مصرعے، مصرعوں کے چمکتے ہوئے ٹکڑے، دل فریب ترکیبیں، گویا مجموعی طور پر رنگ و نور کی برسات۔ یہ انداز منافقانہ صفت رکھنے والوں کو خوب راس آتا ہے۔ چونکہ یہ بھی ڈر رہتا ہے کہ اس اسلوب پر اعتراض بھی کیا جاسکتا ہے، اس لیے کہا یہ جاتا ہے کہ تنقید کو خشک، غیر دلچسپ اور بے آب و گیاہ ریگستان بنانے کے بجائے، دلچسپ بنایا گیا ہے اور یہ 'تخلیقی تنقید' ہے۔" (ص ۱۲)

ادب سے قطع نظر معاشیات، سیاسیات، اقتصادیات یا لسانیاتی مسائل کے سیاسی پہلو پر ہمارے اکثر دانشور اگر کبھی مُنہ کھولتے ہیں تو لمحوں میں ہی ان کا بھرم ٹوٹ جاتا ہے اور واضح ہو جاتا ہے کہ اس موضوع پر یہ اس لیے گفتگو کر رہے ہیں کہ ان کا مسلک ہی بولنا ہے، مگر رشید حسن خاں صاحب کی نظر معاشیات اور سیاسیات پر بھی ہے اس کا ثبوت اس مجموعے میں شامل ان کا مضمون "مولانا محمد علی جوہر، ایک جذباتی رہنما" ہے:

"مسلمانوں کے لیے تحریکِ خلافت خالص مذہبی مسئلہ تھی۔ علمائے کرام کا یہی کہنا تھا اور ان کا سارا استدلال اسی پر مبنی ہوا کرتا تھا۔ بقولِ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم: 'ہم لوگوں کے لیے یہ کوئی سیاسی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ خالص مذہبی مسئلہ ہے' لیکن اس تحریک کا یہ دلچسپ پہلو ہے کہ اس کی قیادت میں بہت بڑا حصّہ گاندھی جی کا تھا۔ مہاتما گاندھی اس اعلان کے ساتھ تحریکِ خلافت میں شریک ہوئے تھے کہ 'یہ مسلمانوں کا مذہبی مسئلہ ہے' اور جب ہمارے مسلمان بھائی بے چین ہیں، تو ہم کیسے خاموش رہ سکتے ہیں۔" (تحریکِ خلافت ص ۱۷)

گاندھی جی بہت ٹھنڈی طبیعت کے سیاستداں تھے اور ایک اچھے سیاستداں کی طرح حال سے زیادہ مستقبل پر اُن کی نظر رہا کرتی تھی۔ انھوں نے یہ سمجھ لیا تھا اور بالکل صحیح طور پر سمجھا تھا کہ اس تحریک کے وسیلے سے وہ مسلم عوام کو اپنے سے قریب تر لا سکتے ہیں اور سیاسی سطح پر اُن کی بے گانگی کو دُور کر سکتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ 'سرسید تحریک' کے اثرات کو کمزور کرنے کا وسیلہ بھی یہ تحریک بن سکتی ہے کیونکہ اس میں انگریز دشمنی کو اہم حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ بعد کو واقع ہونے والے حالات نے ثابت کر دیا کہ گاندھی جی صحیح نتیجے پر پہنچے تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کی جو لہر اس زمانے میں اُٹھی تھی، اس کی مثال ڈھونڈ نکالنا مشکل ہے۔ مسلم عوام گاندھی جی سے اور اس طرح کانگریس سے جس طرح قریب آئے، وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ اس طرح گاندھی جی نے اس تحریک میں شریک ہوکر وہ سیاسی فائدہ حاصل کیا جو اس زمانے میں شاید کسی اور طرح حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

اس کے مقابلے میں دوسرے عمائدین نے، جن میں محمد علی جوہر کی حیثیت بہت زیادہ نمایاں تھی، اس تحریک کو صرف مذہبی مسئلہ بنا کر رکھا اور اسی محدود دائرے میں گردش کرتے رہے۔ اس سے فریقین کے سیاسی شعور کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ (ص ۲۲، ۲۳)

جوشؔ اور فیضؔ سے متعلق جن مضامین کا ذکر میں نے کیا ان کے علاوہ بھی اس مجموعے میں ایسے مضامین شامل ہیں جن کا مطالعہ غور و فکر کی نئی راہیں ہموار کرتا ہے مثلاً "فانیؔ شہیدِ احساس"، "چکبستؔ بہ حیثیت نثر نگار اور نقاد"، "مومنؔ کی پیچیدہ بیانی" اور "زبان و بیان کے بعض پہلو"۔ نصابی کتابوں کی ترتیب میں املا، رموزِ اوقاف اور علامات کا مسئلہ" بھی اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے نئے زاویے فراہم کرتا ہے۔

—— اطہر فاروقی

مطلعِ حیات (مجموعۂ مراثی)
مصنّف : احسن رضوی داناپوری
صفحات : ۲۳۲
قیمت : ۴۵ روپیے
ناشر : ایڈ شارٹ پبلیکیشنز، بمبئی

بقول رشید احمد صدیقی قصیدہ اُستادوں کا فن ہے لیکن میرے نزدیک قصیدہ اور مرثیہ دونوں ہی استادوں کے فن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس جانب ہر شاعر نظر اُٹھا کر نہیں دیکھ پاتا۔ اس فن میں طبع آزمائی کرنے والا استادانہ مرثیے کا مالک ہوتا ہے اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جس طرح غزل کے شاعروں کی بھیڑ ہوتی ہے اس طرح قصیدہ یا مرثیہ کہنے والوں کی نہیں ہوتی عہدِ حاضر میں نسیم امروہوی، مہدی نظمی اور احسن رضوی داناپوری کے نام ایسے ہیں جنھوں نے مرثیہ نگاری کے کارواں کو آگے بڑھایا ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب "مطلعِ حیات" احسن رضوی داناپوری (مرحوم) کے مراثی کا مجموعہ ہے اس مجموعے کو چودہ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے ہر مرثیے کو ایک ہی مجلس میں مکمل کرنے کے ارادے سے ایسا کیا۔ پہلا مرثیہ مجموعی طور پر واقعاتِ کربلا پر ہے اس کے بعد حضرتِ علیؓ حضرتِ حُرؓ، حضرت امام حسینؓ، حضرت آلِ محمدؐ، حضرت قاسمؓ حضرت علی اصغرؓ، حضرت علی اکبرؓ اور شامِ غریباں کے عنوانات پر مبنی ہیں ان تمام مرثیوں میں جو چیز مشترک ہے یا جو انھیں ایک ڈوری میں باندھتی ہے وہ ہے کردار نگاری۔ باوجود اس کے کہ انھوں نے مرثیے کے تمام اجزائے ترکیبی کا خیال رکھا ہے لیکن ان کی زیادہ توجہ کردار نگاری اور منظر نگاری پر رہتی ہے ان کے مرثیوں میں جو زور ملتا ہے وہ ان کی زبان پر قدرت کا ثبوت ہے دو مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

زندگی راز بھی ہے پردہ درِ راز بھی ہے
یہ مشیّت کی کرامت بھی ہے اعجاز بھی ہے
سازکا سوز بھی ہے گرمیِ آواز بھی ہے
نارِ انجام بھی ہے زخمۂ آغاز بھی ہے
نقش بہتر جو رنگِ بقا بھرتی ہے
لوحِ تخلیق کی یہ خانہ پُری کرتی ہے

کربلا میں جل چکا تھا فاطمہؓ زہرا کا گھر
کربلا میں لُٹ چکی تھی دولتِ خیر البشر
کربلا میں مصطفیٰؐ کی بیٹیاں تھیں ننگے سر
کربلا میں چھن گئے بچی کے کانوں سے گہر
کربلا میں ہو گئے تاراج مہماں کس طرح
کربلا میں آئی تھی شامِ غریباں کس طرح

ان مراثی کو احسن رضوی داناپوری مرحوم کے فرزند مشہود احسن رضوی نے پورے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ کتابت و طباعت بہت عمدہ اور صاف ستھری ہے جس کے لیے میں مرتب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

صبائے سنگ

مصنف : محمد سالم
صفحات : ۱۰۴
قیمت : ۳۰ روپیے
ناشر : کاشانۂ اختر، محلہ مہدولی، دربھنگہ

غزل نے اپنی اہمیت کا اعتراف ہر عہد میں کرا لیا ہے۔ موجودہ عہد میں زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو اپنے دامن میں سموتے ہوئے غزل نے اپنا وجود نہ صرف برقرار رکھا ہے بلکہ اپنے امتیاز اور وقار کو ثابت کیا ہے ساتھ ہی سائنسی زندگی سے بھی نئی غزل نے اپنے آپ کو ہم آہنگ رکھا ہے۔

شاعری کا فن ایک خداداد فن ہے اور یہی وہ وصف ہے جو شاعری کو آفاقی درجہ عطا کرتا ہے اس کے برعکس محمد سالم صاحب نے سب سے پہلے غزل کہی نہیں بلکہ بنائی ہے یعنی کہتے ہیں:

"اپنے دوست سید احمد شمیم کے اصرار پر ایک غزل لکھنی پڑی۔" (ص ۱۹)

اس کے علاوہ محمد سالم صاحب کی پہلی ادبی پیش کش تنقیدی کتاب "زاویۂ خیال" ہے اس کے علاوہ بھی ایک تنقیدی کتاب زیرِ ترتیب ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موصوف کا رجحان تنقید کی جانب زیادہ ہے اور شاعری ان کے لیے ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے لکھا ہے کہ "پرانے احباب مجھے ادبی دُنیا میں کھینچ لائے لیکن افسانہ نگاری کے بجائے شعر گوئی کی جانب مجھے رغبت ہوئی ساتھ ہی تنقیدی مضامین لکھنے کا ذوق بھی میرے اندر پیدا ہوا۔"

مندرجہ بالا بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ موصوف نے جب بھی کسی ادبی میدان میں قدم رکھا ہے تو اس میں ان کے دوستوں کا ہاتھ رہا ہے اسی لیے انھوں نے وقت کے ساتھ ساتھ اصنافِ سخن میں بھی تبدیلیاں کی ہیں۔

زیرِ تذکرہ مجموعے کا جہاں تک تعلق ہے سالم صاحب نے اپنے تجربات کو شعری پیکروں میں ڈھالنے کی بھرپور کوشش کی ہے ان کی غزل کی زبان سادہ اور عام فہم ہے اس لیے قاری آسانی سے سمجھ لیتا ہے اور لطف حاصل کرتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

سانحہ فکر کی منجدھار میں گو لکھ نہ سکا
میں نے ساحل پہ مگر شوق کی لکھی تو کتاب

درد بن کر وہ اگر دل میں اُتر جائے گا
رنگ خوشبوؤں کا ذرا اور نکھر جائے گا

پیاسے پرندے اُڑ گئے آخر پہاڑ سے
[illegible]

ہرے پیڑوں پر جب اولے پڑے ہیں
پھلوں کے زخم تازہ ہو گئے ہیں

ابھی نکلے ہیں طوفاں سے گذر کر
نہ جانے اور کیا کیا مرحلے ہیں

اس مجموعے میں ۴۱ غزلیں اور ۱۳ نظمیں شامل ہیں تمام کی تمام نظمیں سادہ ہیں کتاب کی ابتدا میں جناب حامدی کاشمیری کے علاوہ نظام صدیقی کی رائے بھی شامل ہے جو ان کی علمیت کا تو پتہ دیتی ہے لیکن شاعر کے غزلیہ اسلوب سے زیادہ مطابقت نہیں رکھتی۔ سالم صاحب کو دھیمے جذبات کا شاعر کہنا مناسب ہوگا کتاب کا سرورق سادہ مگر دلکش ہے۔

—— جلال انجم

قلمکار حضرات سے گزارش

دفتر میں مضامینِ نثر و نظم کثیر تعداد میں جمع ہو گئے ہیں اس لیے اعلانِ ثانی تک اپنی نگارشات بلا طلب بھجوانے کی زحمت نہ فرمائیں۔

اُمید ہے اس گزارش کو گستاخی پر نہیں ہماری مجبوری پر محمول کیا جائے گا۔

—— ادارہ

ہم طرح اشعار

اپریل کے شمارے میں دیے جانے والے مصرعے پر ہمیں ہمیشہ کی طرح کافی تعداد میں شعر موصول ہوئے ان میں جو شعر صحیح بحر اور درست ردیف قافیے میں ہیں ان کا انتخاب درج ذیل ہے۔ گلدستہ ان حضرات کو ارسال کیا جائے گا جن کے بھیجے ہوئے اشعار چوکھٹے میں دیے جا رہے ہیں۔ بہتر ہو کہ اشعار پوسٹ کارڈ پر لکھ کر بھیجے جائیں۔ ایک پوسٹ کارڈ پر صرف ایک ہی شعر لکھیں:

یہ حالت ہے تو کیا حاصل بیاں سے
کہوں کچھ اور کچھ نکلے زباں سے (مومن)

مرسلہ: افتخار فہیم، مرادآباد۔ محمد ثاقب انصاری ثاقب، بھاگلپور۔ محمد شاہ باش عالم، صاحب گنج۔

نہ ربط اُس سے نہ یاری آسماں سے
جفا بہرِ عدو لاؤں کہاں سے (مومن)

مرسلہ: نذیر احمد قریشی کارنجوی، منگرول پیر

قیامت مرتے دم آئی فغاں سے
جہاں لے کر چلے ہیں ہم جہاں سے (مومن)

مرسلہ: جمیل اختر، بھاگل پور

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے (مومن)

مرسلہ: محمد مقصود جالب، سکندرآباد۔ مقصود حسن خاں گمنام پہریموی، رائے بریلی۔ محمد عاصم، منگرول پیر۔ محمد فصاحت کوثر، سنبھل۔

رہی شب کی سی بیتابی تو ہر روز
چُرائیں گے ہم آنکھیں پاسباں سے (مومن)

مرسلہ: سلطان محمد خاں پٹھان، منگرول پیر۔ حسن حنا عرف رانی، صاحب گنج۔

شبِ وصل آپ کا عذرِ نزاکت
بجا ہے پر نہ مجھ سے نیم جاں سے (مومن)

مرسلہ: مشکور احمد، مرادآباد

اٹھے دیوار کیا جب خانۂ غیر
بنے میرے غبارِ ناتواں سے (مومن)

مرسلہ: محمد فیروز رضا، سنبھل

مرے گھر آپ یوں جاتے تھے کس دن
اٹھانا مدعا ہے آستاں سے (مومن)

مرسلہ: قیصر امام، بھاگلپور

خدا کی بے نیازی ہائے مومن
ہم ایماں لاتے تھے نازِ بتاں سے (مومن)

مرسلہ: ایم۔ صابر سرگم، صاحب گنج

نکالو داغ کو اپنے مکاں سے
چلا آیا یہ دیوانہ کہاں سے (داغ دہلوی)

مرسلہ: محمد یاسیم احمد، بھاگلپور

کہاں اے داغ اب اپنا ٹھکانا
اٹھا لینے ہیں دل رونق جہاں سے (داغ دہلوی)

مرسلہ: نوشابہ بیگم، بھاگلپور

> مٹاتے ہیں خطِ تقدیر کو ہم
> جبیں گھستے ہیں تیرے آستاں سے (فانی بدایونی)
>
> مرسلہ: خالد ندیم صدیقی، ۱۸ غالب نگر، فیروزآباد (یو۔پی)

بڑھے گی اور بھی اے شاہِ خوباں
تری خوبی مرے حسنِ بیاں سے (حسرت موہانی)

مرسلہ: محمد رضوان سید، بھوپال

وہیں سے رات کو ظلمت ملی ہے
چمک تارے نے پائی ہے جہاں سے (اقبال)

مرسلہ: فرح مبین، حیدرآباد۔ خورشید اختر، مظفرپور

ہوا پیری سے شیطاں کہنہ اندیش
گناہِ تازہ تر لائے کہاں سے (اقبال)

مرسلہ: وسیم الحق اصغر، بہار شریف

کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انساں
کہاں جاتا ہے، آتا ہے کہاں سے (اقبال)

مرسلہ: جمشید اختر آسی، مظفرپور

دعا نکلی ہے بیکس کی زباں سے
کہ گویا تیر چھوٹا ہے کماں سے (جوش)

مرسلہ: محمد ضیاء الحق ضیاء، صاحب گنج

نقاب اُٹھتی نہیں چہرے سے اُن کی
مجھے اُٹھنا پڑے گا درمیاں سے (جوش)

مرسلہ: سعید احمد قائد، دہلی

> عیاں ہے رنگِ روئے خستہ جاں سے
> وہ حالِ دل جو باہر ہے بیاں سے (میرزا ثاقب)
>
> مرسلہ: صبا ناز، ویلکم، منظرِ نور، صاحب گنج ۸۱۶۱۰۹ (بہار)

اثر بھی آفرازِ آسماں سے
اٹھا دے یہ بھی پردہ درمیاں سے (ماہر انصاری)

مرسلہ: رُوبینہ عابد حسین، مرادآباد

وہ جب کہہ دیں کہ اُٹھو آستاں سے
الٰہی تو اُٹھا لینا جہاں سے

(نامعلوم)

مرسلہ: محمد شمس الدین، آسنسول

زالی ہے ادا سارے جہاں سے
کوئی پیدا کرے تجھ سا کہاں سے (نامعلوم)
مرسلہ: محمد شکیب اسد زیدی، معرفت
محمد سعود عالم، "قلی پارہ"، صاحب گنج
۸۱۶۱۰۹ (بہار)

کوئی پوچھے یہ مرگِ ناگہاں سے
خفا کیوں ہے مریضِ ناتواں سے (نامعلوم)
مرسلہ: محمد امام حسن امام، صاحب گنج

فسانہ کیا کہوں دل کا زباں سے
کہ خود ظاہر ہے یہ اشکِ رواں سے (نامعلوم)
مرسلہ: اشیش کمار گپتا، صاحب گنج

نہ ہوں گو آشنا رنگِ بیاں سے
مگر واقف تو ہوں اس داستاں سے
(کالی داس گپتا رضا)
مرسلہ: اسیر الدین شاذ، صاحب گنج

اُداسی کی جہاں تھی حکمرانی
مسرت لے کے ہم آتے وہاں سے (شہریار)
مرسلہ: راشد مرزا، حیدرآباد

تصور میں بھی وہ آئے کہاں سے
جو بالاتر ہے سرِ فکر و گماں سے (رئیس نعمانی)
مرسلہ: محمد راشد، علی گڑھ

چھڑا کر مجھ کو ان کے آستاں سے
مری قسمت کہاں لائی کہاں سے (ظریف تسوی)
مرسلہ: محمد آدم گردش، صاحب گنج

کمالِ عزم کی تصویر بن کر
گزر جائیں گے ہم ہر امتحاں سے (محمد عادل عقیل)
مرسلہ: محمد اعظم علوی، سہارنپور

نہ جانے برق کو کیا ضد ہے عادل
چمن میں صرف میرے آشیاں سے (محمد عادل عقیل)
مرسلہ: شہناز انجم سہارنپور

تمھیں جانے کی دے دے جو اجازت
قمر ایسی زباں لائے کہاں سے
(قمر انصاری)
مرسلہ: رفیع احمد اعظمی، بدایوں

جو ہم گذرے مقامِ لامکاں سے
فرشتے دیکھتے تھے آسماں سے
(کندن)
مرسلہ: محمد شوکت علی کندن، صاحب گنج

آئندہ مہینے کے لیے اس مصرعے پر
اپنی پسند کے شعر اس طرح ارسال کریں کہ ہمیں
۱۲ر مئی ۸۹ء تک مل جائیں:
آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں
قافیہ ردیف
یہ مصرع نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی غزل
کا ہے۔ اس غزل کا کوئی شعر مقابلے میں شامل
نہیں کیا جائے گا۔

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے موصولہ عنوانات

اپریل ۱۹۸۹ء کے "ایوانِ اُردو دہلی" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانوں میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوان ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں۔

شعری عنوانات

ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام
(اقبال)
مرسلہ: فیصل ہاشمی، گیا

درندو جنگلوں سے آؤ اور اس کی گواہی دو
کہ انساں نے نہیں پائی ہے انساں سے اماں اب تک
(جوش)
مرسلہ: ایم علی، بھارت ہارڈ ویئر
اسٹور، منڈی بازار، برہان پور
۴۵۰۳۳۱ (ایم۔پی)

یہ رنگ و بو ہیں کچھ دن کے نظاروں کا بھروسہ کیا
بہاریں کل کہاں ہوں گی، بہاروں کا بھروسہ کیا
(نسیم اختر نسیم)
مرسلہ: بیگم نکہت واحد، صاحب گنج

بہت حسین بہت دل کشا یہ منظر ہے
بشر ہیں ہم، مگر ایسا شعور ہم میں کہاں (افتخار فہیم)
مرسلہ: افتخار فہیم، کٹیہار

جیتے ہیں کس مزے سے وہ جنگل کے جانور
شہروں میں زندگی ہے سراسر لہو لہو (مقبول نصیرآبادی)
مرسلہ: مقبول نصیرآبادی، نصیرآباد

نثری عنوانات

"جنگل میں منگل" (عبدالشکور خاں میکش سنبھلی کی نظم)
مرسلہ: مقصود حسن خاں گمنام بہیڑوی، بہیڑے
متو ہاؤس، گرونانک نگر، رائے براے بریلی ۲۴۹۰۰۱

"صبحِ آوارگی" (ساغر کرناٹکی کی غزل)
مرسلہ: محمد ضیاء الحق ضیار، صاحب گنج

"اُجالوں کے سفیر" (تاریخ جنگ آزادی، حیات وارثی)
مرسلہ: محمد شہنشاہ عالم شہنشاہ، صاحب گنج

"گلدستہ" دوسرے نمبر پر درج شعری عنوان اور پہلے نمبر پر درج نثری عنوان بھیجنے والوں کو ارسال کیا جا رہا ہے۔

○ دو اہم کتابوں کا اجرا ○ محفلِ غزل ○ اُردو ڈراما فیسٹول ○ اکادمی کے سالانہ ایوارڈز ○ اُردو اساتذہ کو اعزاز ○ دہلی کے مصنّفین کی کتابوں پر انعامات ○ لفظ اور صدائیں

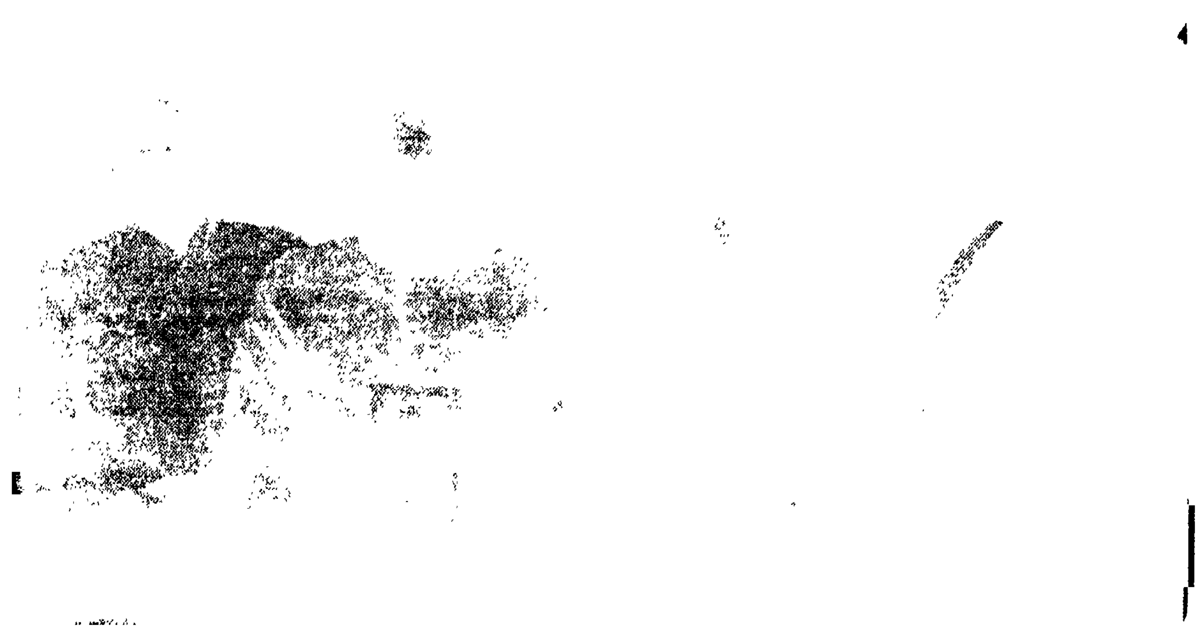
اُردو خبر نامہ



دو اہم کتابوں کا اجرا

۱۔ ۷ فروری ۸۹ء کو نائب صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے اپنی کوٹھی (۶۔ مولانا ابوالکلام آزاد روڈ) پر جنابِ ضیاء الحسن فاروقی کی کتاب "شہیدِ جستجو" کا اجرا کیا جو ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے سوانحی حالات اور ان کے فکر و عمل کے جائزے پر مشتمل ہے۔ اس تقریب کا اہتمام اُردو اکادمی، دہلی نے کیا۔ اس موقعے پر نائب صدر جمہوریۂ ہند نے ذاکر صاحب کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے ملک و قوم کی کی جو خدمات انجام دیں وہ سنہری حرفوں میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔ فاروقی صاحب کو مبارکباد دی جانی چاہیے کہ انھوں نے اس بڑے کام کی ابتدا کی ــــــ تصویر میں نائب صدر جمہوریہ کے ساتھ جناب خورشید عالم خاں اور سیکریٹری اکادمی دیکھے جاسکتے ہیں۔

۲۔ ۱۰ مارچ کو دہلی کے لیفٹننٹ گورنر جناب رومیش بھنڈاری نے راج نواس پر منعقدہ ایک پروقار تقریب میں اُردو اکادمی، دہلی کی شائع کردہ کتاب "حواشیِ ابوالکلام آزاد"



کا اجرا کیا۔ اس کتاب کے مرتب سید مسیح الحسن صاحب ہیں۔ بزرگ دانشور کرنل بشیر حسین زیدی نے کتاب اور مرتب کتاب کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ "جب مولانا آزاد کا انتقال ہوا تو ان کا ذاتی کتب خانہ آزاد بھون کو منتقل ہوا اور مسیح الحسن صاحب نے اس ذخیرے کی جملہ کتابوں کو منظم کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ علمی جستجو نے انھیں ان کتابوں کو بغور دیکھنے اور مولانا آزاد کے حاشیے پر لکھے نوٹس کو نقل کرنے پر اکسایا۔ شوق کے اس کاروبار کا نتیجہ آج ہمارے سامنے اس کتاب کی شکل میں ہے۔

'حواشی ابوالکلام آزاد' جس کا آج اجرا ہو رہا ہے اُردو، فارسی، عربی اور انگریزی کی تقریباً ۷۵ کتابوں کے کنارے پر لکھے ہوئے حواشی کا مجموعہ ہے۔

مولانا آزاد و طرزِ تحریر کے بے تاج بادشاہ تھے۔ بڑوں بڑوں نے اُن کا لوہا مانا انگریزی بڑے بڑے انگریزی دانوں سے اچھی جانتے تھے۔ لیکن انگریزی نہ کبھی لکھی نہ بولی۔ عربی اُن کی مادری زبان تھی مگر اُن کی کوئی مطبوعہ تحریر نثر میں موجود نہیں۔ ان حواشی میں کہیں کہیں عربی نثر ملتی ہے۔ مگر فارسی میں بہت کچھ ان حواشی میں لکھا ہوا موجود ہے۔ جن سے اُن کے فارسی طرزِ نگارش کا پتہ چلتا ہے۔ جن کتابوں پر مولانا نے یہ حواشی قلمبند کیے وہ مختلف موضوعات اور گوناگوں علوم و فنون سے تعلق رکھتی ہیں ان حواشی کی روشنی میں اُن علوم و فنون پر مزید تحقیق کی گنجائش ہے۔ ریسرچ سکالرز سیّد مسیح الحسن کے شکرگزار رہیں گے کہ انھوں نے یہ کتاب ترتیب دے کر ایک بڑی علمی خدمت انجام دی۔"

تصویر میں نظر آ رہے ہیں (دائیں سے) کرنل بشیر حسین زیدی، اکادمی کی تحقیقی اور اشاعتی کمیٹی کے چیرمین پروفیسر قمر رئیس، کتاب کے مرتب جناب سیّد مسیح الحسن، دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر اور اکادمی کے چیرمین جناب رومیش بھنڈاری (کتاب کی رونمائی کرتے ہوئے) اور سیکریٹری اکادمی۔

محفلِ غزل

۱۷ مارچ کی شام کو اکادمی نے غالب اکیڈمی کے آڈیٹوریم میں ایک محفلِ غزل کا اہتمام کیا جس میں پاکستان سے آئے ہوئے گلوکار بھائیوں جناب قمر الزماں اور



جناب بدرالزماں نے اُردو کے کلاسیکل شاعروں کی غزلیں اپنے خاص انداز میں پیش کیں۔ آڈیٹوریم غزل اور موسیقی کے شائقین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ یہ محفلِ غزل دو گھنٹے جاری رہی —— تصویر میں دونوں گلوکاروں کو اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔

اُردو ڈراما فیسٹول

۱۹ر مارچ سے ۲۵ر مارچ تک اکادمی نے اُردو ڈراما فیسٹول کا اہتمام کیا۔ یہ فیسٹول نئی دہلی کے شری رام سینٹر میں ہوا اور ہر شام ایک الگ گروپ نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ پہلا ڈراما تھا "کل کالج بند رہے گا" قلمکار اور ہدایت کار تھے چرنداس سدھو (پیشکش کالجیٹ ڈراما سوسائٹی) دوسری شام کا ڈراما تھا "صبح و شام" ڈراما نگار تھے ایم۔اے۔ ساگر اور ہدایت کار قیام الدین (پیشکش نرگس میموریل سوسائٹی) تیسرا ڈراما غلام عا... کلچرل گروپ کی پیشکش تھا "انل کپور عبدالغف... لکھا تھا غلام عاجز دہلوی نے اور ہدایت کا...



"مرزا غالب" کا ایک سین



بہترین اداکار، ہدایت کار اور اداکارہ کا اعزاز پانے والے ہمراہ جنرل بشیر حسین زیدی اور سیکریٹری اکادمی کے ساتھ

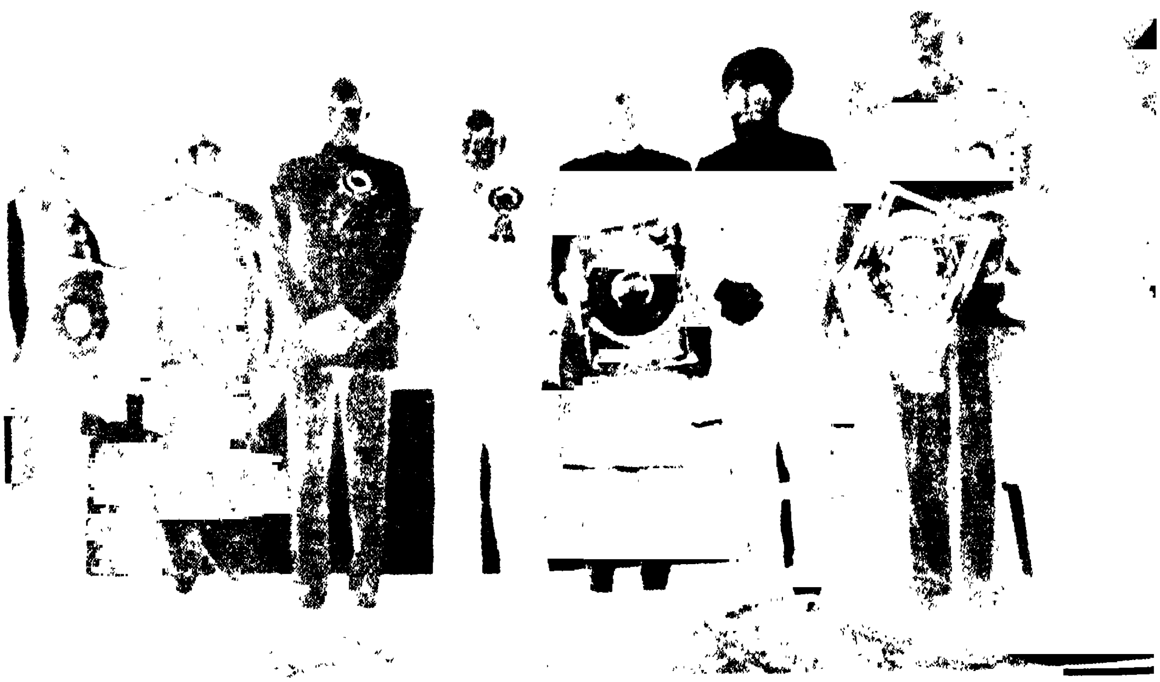
تھے شریف مرزا۔ چوتھی شام شیبا آرٹ گروپ نے "غالب کی واپسی" پیش کیا۔ ڈرامانگار اور ہدایتکار اے۔آر۔ کاردار تھے۔ "موٹے رام کا ستیہ گرہ" جو ۲۴ مارچ کی شام کو جن ناٹیہ منچ نے پیش کیا۔ منشی پریم چند کی کہانی پر مبنی تھا، اس کے ہدایت کار تھے حبیب تنویر جو اس کی تشکیل میں بھی صفدر ہاشمی مرحوم کے شریک رہے تھے۔ آخری ڈراما تھا "مرزا غالب" ڈرامانگار تھے ایس۔ ایم۔ مہدی۔ یہ محترمہ شیلا بھاٹیہ کی ہدایت میں ولی آرٹ تھیٹر نے پیش کیا۔ ان ڈراموں میں اداکاروں اور اداکاراؤں کے طور پر تقریباً ڈیڑھ سو فنکاروں نے حصہ لیا۔

اکادمی کے سالانہ ایوارڈز

۲۸ مارچ ۱۹۸۹ء کو نئی دہلی کے سپرو ہاؤس میں اکادمی کی طرف سے دیے جانے والے سالانہ ایوارڈز کی تقسیم دہلی کے لیفٹننٹ گورنر اور اکادمی کے چیرمین جنابِ رویش بھنڈاری کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ جلسے کی صدارت دہلی کے اُردو نواز چیف ایگزیکٹیو کونسلر جناب جگ پرویش چندر نے کی اور ایگزیکٹیو کونسلر برائے صحت جناب بنسی لال چوہان بہ حیثیت مہمانِ خصوصی شریک ہوئے۔ اکادمی کی ایوارڈ کمیٹی کے چیرمین جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کے خیر مقدمی کلمات اور لیفٹننٹ گورنر صاحب، چیف ایگزیکٹیو کونسلر اور چوہان صاحب کے خطاب کے بعد ایوارڈز کی تقسیم عمل میں آئی۔ سند توصیف اکادمی کے نشان اور شال کے علاوہ دہلی کی سطح پر دیے جانے والے انعامات کی رقم اس سال سے پانچ ہزار سے بڑھا کر گیارہ ہزار اور کُل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ کی رقم گیارہ ہزار سے بڑھا کر اکیس ہزار کر دی گئی ہے۔

افسانوی ادب کا سالانہ ایوارڈ اس سال جنابِ جوگندر پال کو دیا گیا، شاعری کا جناب رفعت سروش کو، صحافت کا سردار جنگ بہادر صاحب کو اور بہترین اُردو استاد کا محترمہ شمیمہ بیگم کو۔ کُل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ کسی شخص کی بجائے دہلی کے سرگرم علمی، ادبی اور ثقافتی ادارے غالب اکیڈمی کو دیا گیا جو جناب قاضی سجاد حسین نے وصول کیا۔

تصویر میں، دائیں سے: سردار جنگ بہادر، جنابِ جوگندر پال، جنابِ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، جنابِ رفعت سروش



جناب جگ پرویش چندر، جناب رویش بھنڈاری، جناب بنسی لال چوہان اور محترمہ شمیمہ بیگم۔

اُردو اساتذہ کو اعزاز

۲۹ مارچ کی شام کو غالب اکیڈمی کے آڈیٹوریم میں دہلی کے اُردو اسکولوں کے ۹ منتخب اساتذہ کو اُردو اکادمی کی طرف سے اعزازات پیش کیے گئے۔ یہ یہ اعزازات جو سند توصیف، اکادمی کے نشان اور شال پر مشتمل تھے ڈاکٹر سید ظہور قاسم کے ہاتھوں دلوائے گئے۔ تصویر میں اعزاز حاصل کرنے والے چند اساتذہ ڈاکٹر سید ظہور قاسم (بائیں سے تیسرے) کے ساتھ کھڑے ہیں۔



اُردو اکادمی، دہلی

کے

اغراض و مقاصد

(۱) دہلی کی لسانی تہذیب کے مشترکہ حصے کے طور پر اُردو زبان اور ادب کا تحفظ اور ارتقا۔
(۲) اُردو میں ادبی اور معیاری تصنیفات اور بچوں کی کتابوں کی اشاعت اور حوصلہ افزائی۔
(۳) اُردو میں ادبی اور سائنسی اور دوسرے موضوعات سے متعلق ایسی اہم کتابوں کے تراجم کا اہتمام کرنا جن کا ابھی تک اُردو زبان میں ترجمہ نہ ہوا ہو۔
(۴) اُردو میں حوالہ جاتی کتابوں کی تالیف و اشاعت۔
(۵) قدیم اُردو ادب کی صحیح ترتیب و تدوین کے بعد اشاعت۔
(۶) اُردو کے غیر مطبوعہ معیاری ادب پاروں کی اشاعت۔
(۷) اُردو کے مستحق مصنفین کی غیر مطبوعہ تصنیفات کی اشاعت میں تعاون۔
(۸) گذشتہ ایک سال کے دوران مطبوعہ اُردو تصنیفات کے مصنفوں کو انعامات کی تقسیم۔
(۹) اُردو کے عمر رسیدہ اور مستحق مصنفین کی ماہانہ مالی اعانت۔
(۱۰) اُردو اسکالروں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک مقررہ مدت کے لیے مالی اعانت کے ساتھ دوسری سہولتیں بہم پہنچانا۔
(۱۱) مشہور اسکالروں اور دوسری اہم شخصیتوں کو جلسوں کو خطاب کرنے کے لیے دعوت دینا۔
(۱۲) ادبی موضوعات پر سیمینار، سمپوزیم، کانفرنس اور نشستیں منعقد کرنا جن میں عالمی ادبی رجحانات کے پس منظر میں اُردو کے مسائل پر بحث و مباحثہ ہو اسی کے ساتھ اُردو کی تدریس اور اس کے استعمال سے متعلق سرکاری احکامات کی تعمیل و تکمیل کا جائزہ اور ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے مختلف ایسی ادبی اور تہذیبی تنظیموں کو مالی اعانت دینا جو کہ اسی طرح کی نشستیں منعقد کرتی ہیں لیکن یہ مالی اعانت ایک معاملے میں پانچ سو روپے سے زیادہ نہیں ہوگی۔
(۱۳) اُردو میں اعلیٰ معیار کے رسالے، جریدے اور اسی طرح کی دوسری مطبوعات کی اشاعت۔
(۱۴) اِن ضابطوں کے تحت مطبوعات کی فروخت کا اہتمام۔
(۱۵) اکادمی کے لیے منقولہ اور غیر منقولہ جائداد حاصل کرنا لیکن شرط یہ ہے کہ غیر منقولہ جائداد کے حصول سے پہلے دہلی انتظامیہ کی پیشگی منظوری ضروری ہوگی۔
(۱۶) اُردو کی تعلیم، اس کے استعمال اور سرکاری احکامات کی تکمیل میں حائل دشواریوں اور اُردو بولنے والوں کے مطالبوں کو دہلی انتظامیہ کے علم میں لانا۔
(۱۷) ایسے سبھی جائز اقدامات کرنا اور قانونی کارروائیاں کرنا جن سے مذکورہ مقاصد کے فروغ و تعمیل میں مدد مل سکتی ہو۔
(۱۸) سوسائٹی کی ساری آمدنی سوسائٹی کے اغراض و مقاصد کے حصول ہی کے لیے خرچ کی جائے گی۔

اُردو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

فون نمبر ۲۷۶۲۱۱، ۲۶۳۳۴۸

ایوانِ اُردو دہلی

ادارۂ تحریر

سید شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی

جلد: ۳، شمارہ: ۲ — فی کاپی ۵۰/۲ روپے، سالانہ قیمت ۲۵ روپے — جون ۱۹۸۹ء

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ

ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی

اُردو اکادمی، دہلی — گھٹا مسجد روڈ،

دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خوشنویس: تنویر احمد

حرفِ آغاز

غزل اُردو شاعری کی سدا بہار صنف ہے۔ اگرچہ مولانا الطاف حسین حالؔی سے لے کر موجودہ زمانے کے بعض ناقدین تک، اس کی مخالفت کا سلسلہ بھی جاری ہے لیکن یہ مخالفت کبھی موثر ثابت نہیں ہوئی۔ غزل ہر دور کے ذہنی اور جذباتی رویّوں کا ساتھ دیتی رہی اور اس کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔

آزادی کے بعد اُردو کی طرف سے جو ایک عمومی بدظنی بوجوہ پیدا ہو گئی تھی، اسے دور کرنے میں غزل نے ایک قابلِ لحاظ کردار ادا کیا۔ غزل کی اثر انگیزی اور دل نشینی ان لوگوں کو بھی اپنا قائل بناتی رہی ہے جو اُردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے لیکن اُردو سمجھ لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل دوسری اصنافِ سخن کے مقابلے میں کہیں زیادہ گائی جاتی رہی ہے، اس طرح دوسری اصناف جہاں اپنی ترویج و توسیع کے لیے تحریری وسائل کی محتاج رہی ہیں وہاں غزل نے ہوا کی لہروں پر اپنا سفر جاری رکھا ہے اور ملک کے گوشے گوشے میں اپنا دائرۂ اثر پھیلا دیا ہے۔ اُردو غزل کی مقبولیت اور پسندیدگی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اب ہندوستان کی دوسری بہت سی زبانوں میں بھی غزل کہی جانے لگی ہے اور اس کی لفظیات کا خاصا بڑا ذخیرہ بھی ان زبانوں میں منتقل ہو رہا ہے۔ یہ ایک تاریخی رول ہے جو غزل ادا کر رہی ہے اور ہندوستانی تہذیب و ثقافت پر اس کے دور رس اثرات مرتب ہوں گے۔

لیکن غزل کی اس مقبولیت اور محبوبیت کا ایک منفی پہلو بھی ہے جو پچھلے دس بارہ سال میں بہ طورِ خاص نمایاں ہوا ہے۔ غزل کی عام پسندیدگی کے پیشِ نظر ہمارے شعرا نے دوسری اصنافِ سخن کی طرف سے اپنی توجہ کلیتاً ہٹا لی ہے۔ مثنوی، مسدس، مخمس، رُباعی، قطعہ وغیرہ تو ایک طرف رہے، جدید طرز کی نظمیں بھی جو آزادی سے پہلے کثرت سے کہی جاتی رہی ہیں، اب بہت کم کہی جا رہی ہیں۔ یہ اُردو شاعری کے حق میں کوئی خوش آئند فال نہیں ہے۔ غزل کی افادیت اور اہمیت اپنی جگہ لیکن اس کے نتیجے میں دوسری اصناف کی اہمیت اور افادیت کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ ہمارے خیال میں اب وقت آ گیا ہے کہ دوسری اصنافِ سخن کے احیا اور فروغ کی طرف بھی ہمارے شعرا متوجہ ہوں اور اردو شاعری کے اُفق پر صرف ایک رنگ نہیں، دھنک کے ساتوں رنگ اس طرح پھیلا دیں کہ جس رنگ پر نظر پڑے، دیکھنے والے کہہ اُٹھیں:

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

——— سیّد شریف الحسن نقوی

محمد علوی

نظمیں

①

ندھیرا کم نہ ہوگا دِل جلا کے
بلو سو جائیں سارے غم بھلا کے

ہوں پر پھڑپھڑا کے رہ گئی ہے
بھی نکلے نہیں ہیں پر دُعا کے

دیکھو آتے جاتے کھڑکیوں میں
وئی چھپ جائے گا پاگل بنا کے

ی کا نام لے کر جی رہے ہیں
ت احسان ہیں ہم پر ہوا کے

الوں میں نظر آیا نہ علویؔ
ے دیکھا کیے بتّی بُجھا کے

②

اپنے اندر مر رہنا
میرا کام غزل کہنا

پتّے ، کانٹے ، کلیاں ، پھول
شاخوں نے کیا کیا پہنا

اُس سے ملنے جانا ہے
ندیا پیچھے کو بہنا

اور پرندے ایک اُڑان
پھر جنگل میں چھپ رہنا

کیوں اتنے خوش ہو علویؔ
بات ہے کیا سچ سچ کہنا

فرشتہ

خدا نے مجھ سے کہا
"عبادت بہت ہو چکی
زمیں پہ جا
اور دیکھ
آدمی کس حال میں ہے"
اور میں
آسمانوں سے اُتر کے
زمیں پہ آیا
لوگوں نے بتایا
"تم بہت دیر سے آئے
یہاں اب تمھارے لیے
نہ تو نانِ جویں ہے
نہ کوئی خدا ہے!!"

شیطان

جھوٹ اوڑھ کے سوتے ہوؤں کو
گہری نیند سلاتا ہوں
سچ کی چھاؤں میں پڑے ہوؤں کو
ساری رات جگاتا ہوں
وہ تھک ہار کے سو جائیں تو
اُن کے خواب میں جاتا ہوں
یہ مت پوچھو اُن لوگوں کو
کیسے کیسے ڈراتا ہوں

۹۔ سمرو وار، جوہا پورہ، سرخیز روڈ، احمد آباد ۵۵

راج نرائن رازؔ

شفا گوالیاری مرحوم

آج ادب میں کھینچ تان، پیروی خویش و اقربا پروری، حاضر باشی، منصب خواہی، مفاد پرستی اور مطلب برآری کا دور دورہ ہے۔ ممکن ہے آپ مجھ سے اتفاق فرمائیں کہ ان عوامل نے ایک نئی قسم کی تنقید کو جنم دیا ہے۔ اس تنقید کا تعلق اچھی بُری اوسط تخلیق سے کم اور اس کے اوسط، معمولی مگر ذی مرتبہ و بااثر خالق سے زیادہ ہوتا ہے۔ اسے مجلسی تنقید سے موسوم کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مجلسی تنقید قصیدے کی نثری شکل ہے۔ اس کا استاد ہونا ریختہ کا استاد ہونے سے کہیں آسان ہے تاہم یہ فنِ دقیق قصیدے سے کہیں زیادہ منفعت بخش ہے۔ ممدوح کا ذی مرتبہ ہونا شرط ہے۔ اس کاروبار میں مستعار موشگافیاں اور بہ ظاہر بامعنی الفاظ کے انبار سکۂ رائج الوقت ہیں۔ ممکن ہے تفصیل سے آپ بے مزہ ہوں۔ لہٰذا احتراز کرتا ہوں۔

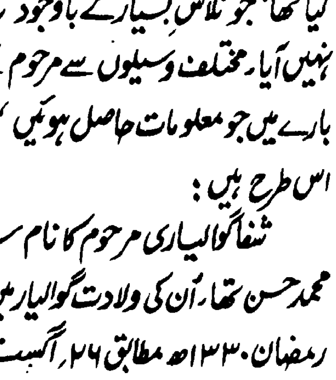
ایسی ادبی فضا میں شفا گوالیاری مرحوم جیسے شاعر پر مضمون لکھنا، ممکن ہے، اس اعتبار سے اہم معلوم نہ ہو کہ یہ کسی غرض کی کھونٹی سے جڑا ہوا نہیں ہے۔

قدرِ اول کا ادب آئے دن تخلیق نہیں ہوتا۔ تاہم قدرِ دوم کا اچھا ادب بھی ادب کی تاریخ میں اہم مقام کا حامل قرار پاتا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات ذہن نشیں رکھنی چاہیے کہ ایسے کسی شاعر کے مقام کے تعیّن اور اس کی تخلیقات کی تفہیم و تجزیہ خود اس کے زمانی و مکانی تناظر میں کیا جانا چاہیے۔ برعکس صورت میں محسوس ہوگا کہ نہ تو ہاتھ باگ پر ہیں اور نہ پاؤں رکاب میں ہیں۔

جب ہم شفا گوالیاری مرحوم کی زندگی اور شاعری پر نظر کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ بڑے حوصلہ شکن حالات تھے، جن میں موصوف نے زندگی اور شاعری کی۔ ایسے عوامل کی کارفرمائی عام تھی جو راہ کا روڑہ بنے رہے۔ اور وہ ایسی ترقی نہ کر سکے، جس کے امکانات کا ثبوت انھوں نے ابتداً اپنے اشعار میں فراہم کیا تھا۔ معاش اور روزمرہ کے مسائل کی جکڑبندیاں مستزاد تھیں۔ فکرِ سخن کے ایسے مواقع مفقود تھے، فن جن کا متقاضی تھا۔ رسائل میں اور ادبی حلقوں میں مقبولیت کے باوجود ان کے کلام پر ویسی توجہ نہیں ہو سکی جیسی کہ ہونی چاہیے تھی۔

شفا گوالیاری کی شاعری لگ بھگ نصف صدی کو محیط ہے۔ گو اہلِ بھوپال نے اُن کی کماحقہ پذیرائی کی، تاہم مجموعی اعتبار سے وہ ایک بے تعلق بے اعتنائی کا شکار رہے میں اُن کے حالات و کوائف سے کچھ زیادہ آگاہ نہیں، مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ میں اُن کی شاعری کا مطالعہ ایک اچھے طالب علم کی طرح نہیں کر پایا، مجھے اپنے کم توفیق ہونے کا احساس ہے تاہم گو شفا دوستوں سے بھی ہے۔ شفا کی موت کو بہ مشکل بیس برس ہوئے ہیں۔ ان کی زندگی میں کلام کے چھوٹے بڑے سات مجموعے شائع ہوئے۔ اگر یہ نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔ تلاش کے باوجود دستیاب نہیں ہوئے۔ اس ضمن میں بعض امور اور بھی توجہ چاہتے ہیں۔ شفا کا آخری مجموعہ "زخمِ گل" ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد سے ۱۹۶۸ء تک کا کلام منظرِ عام پر نہیں آسکا۔ کلام ضرور ہوا ہوگا! وہ کیا ہوا؟ شفا کے فکر و فن پر کوئی کتاب دیکھنے میں نہیں آئی۔ نہ مقالات کا کوئی مجموعہ ترتیب دیا گیا۔ سلطانپور کے رسالہ شمعِ ادب نے ایک خاص نمبر البتہ شائع کیا تھا، جو تلاشِ بسیار کے باوجود ہاتھ نہیں آیا۔ مختلف وسیلوں سے مرحوم کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئیں، وہ اس طرح ہیں:

شفا گوالیاری مرحوم کا نام سید محمد حسن تھا۔ اُن کی ولادت گوالیار میں ۱۲ ر رمضان ۱۳۳۰ھ مطابق ۲۶ ر اگست ۱۹۱۲ء کو ہوئی۔ اُن کا تاریخی نام مظہر علی تھا۔ اس سے ہجری سال برآمد ہوتا ہے۔ ان کے آباؤ اجداد کا تعلق اتر پردیش کے ضلع فرخ آباد کے قصبہ قائم گنج سے تھا۔ گوالیار کو



۲۹/۳۰، ایسٹ پٹیل نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۸

ہجرت ان کے جد امجد نے کی تھی۔ اب یہی ان کا وطن تھا۔ شفا گوالیاری مرحوم کے والد سید عوض علی اچھے طبیب' اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ وہ شفا گوالیاری کو عالمِ دین بنانا چاہتے تھے۔ تاہم اس نونہال کی سرشت میں شاعری بھی تھی۔ شفا چار برس کے تھے کہ ایک مولوی صاحب کے سپرد ہوئے۔ اور قرآن کا درس شروع ہوا۔ پھر فارسی کی تعلیم شروع ہوئی۔ وہ محض سات برس کے تھے' جب ان کے والد کا انتقال ہوا۔ اب وہ اپنے بہنوئی مولوی احمد زمان کی نگرانی میں آگئے۔ یہیں سے اُن کی باقاعدہ تعلیم کا آغاز ہوا۔ دسویں درجے کا امتحان لشکر گوالیار کے میونسپل اسکول سے پاس کیا اور سند پائی۔ حالات مساعد نہ تھے تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ طبی سند (H. A.) حاصل کی اور ریاست گوالیار کی ملازمت میں آگئے۔ گزر بسر کا سلسلہ یوں ہی چلتا رہا۔

ہجرت ان کا حصہ ٹھہری۔ وہ اگست ۱۹۴۹ء میں بھوپال میں آکر بس گئے۔ یہاں ایک چھوٹا سا مطب اور دواخانہ کھول لیا تھا۔ بظاہر عزت آبرو سے بسر ہونے لگی۔ تاہم حالات کبھی حسبِ دل خواہ نہ ہوئے۔ گھر گرہستی بڑی تھی۔ بڑے کنبے کی کفالت نے اکثر پریشان رکھا۔ صحت بگڑی تو امراض نے آگھیرا۔ پہلے ...نس' پھر سعال اور بالآخر آنتوں کی بیماری۔ جب حالت زیادہ خراب ہوئی تو علاج کے لیے بھوپال کے ٹی بی ہسپتال میں داخل کرا دیے گئے۔ موت کی دستکیں دروازے پر آپہنچی تھیں۔ ۹ جولائی ۱۹۶۸ء کو ہسپتال ہی میں انتقال اور وہ اپنے مالکِ حقیقی سے جاملے۔ رہے نام اللہ کا۔

O

شفا گوالیاری بڑے طباع اور ذہین واقع ہوئے تھے۔ شاعری بارہ برس کی عمر میں' ۱۹۲۴ء میں شروع کی۔ اُن کے کلام کو شروع ہی سے مقبولیت حاصل ہوئی۔ اُن کا پہلا مختصر سا مجموعہ 'گلدستۂ شفا' کے نام سے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ یہ کتابچہ ۲۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ۲۲ غزلیں شامل ہیں۔ اس مرحلے پر ایک عجیب سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ کیا طباع اور ذہین شفا واقعی اتنے کم گو شاعر واقع ہوئے تھے۔ کیا گیارہ برس کے عرصے میں انھوں نے صرف ۲۲ غزلیں تخلیق کی تھیں۔ کیا اس عرصے میں اُن کی توجہ بیشتر نظم پر مرکوز رہی؟ وہ نظمیں کیا ہوئیں؟ کب اور کہاں شائع ہوئیں؟ یہ اور ایسے متعدد سوال شفا دوستوں کی توجہ کے محتاج ہیں۔

پہلے مجموعے کی اشاعت تک وہ کسی اُستاد کے دامنِ فیض سے وابستہ نہیں ہوئے تھے۔ وہ اپنے ہی ذوقِ سلیم کی انگلی مضبوطی سے پکڑے' رہ گزارِ سخن پر آگے بڑھتے رہے تھے۔ انھوں نے وقتاً فوقتاً بعض شاعروں سے مشورہ البتہ کیا۔ لیکن ذوقِ تجسس کی سیری نہ ہوسکی۔ بالآخر وہ حضرت سیماب اکبر آبادی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوگئے۔ اُن کے انہماک' محنت اور لگن کا اندازہ ایک اسی امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرتِ سیماب اکبر آبادی جیسے استاد نے انھیں پانچ برس کی مختصر مدت میں فارغ الاصلاح قرار دے دیا۔ یہی نہیں' بلکہ انھیں دوسروں کے کلام پر اصلاح دینے کی اجازت بھی مل گئی۔ اُن کا اپنا حلقۂ تلامذہ خاصا بڑا تھا۔ اس میں چار سو شاعر شامل تھے۔ یہ دونوں باتیں اُن کے فطری شاعر ہونے کی دلیل ہیں۔

جب تک وہ گوالیار میں رہے' وہاں کوئی ادبی ماحول نہیں تھا۔ علمی' ادبی' شعری صلاحیتوں کو جلا دینے اور ترقی کرنے کے مواقع مفقود تھے۔ وہ اگست ۱۹۴۹ء میں منتقل ہوکر بھوپال آگئے۔ یہاں شاعروں' ادیبوں اور علم دوستوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ ان کی بدولت ادبی ماحول میں وہ گہما گہمی تھی کہ شفا صاحب کو اپنی صلاحیتوں کو صیقل اور نمایاں کرنے کے وافر مواقع ملے۔ یہاں ذکی وارثی (وفات ۱۹۵۰ء) اور محمد یوسف قیصر بھوپالی (وفات ۱۹۶۸ء) جیسے اُستاد موجود تھے۔ ان کی رفاقتوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ شفا صاحب کا اپنا بیان ہے کہ یہاں انھیں ذکی اور قیصر جیسے استادوں سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔

شفا گوالیاری مرحوم کی عروض پر اچھی نظر تھی۔ فنی معلومات لائقِ توجہ حد تک وسیع تھیں۔ اب ان کی شاعرانہ حیثیت بھی مسلّمہ تسلیم کرلی گئی تھی۔ بھوپال میں منتقلی شعر خیز ثابت ہوئی۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۸ء میں انتقال تک اُن کے پانچ شعری مجموعے شائع ہوئے۔

دوسرا مجموعہ 'آیاتِ شفا' ۱۹۵۱ء میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ تمام تر غزلیات پر مشتمل ہے غزلوں کا تیسرا مجموعہ 'نبضِ حیات' کے نام سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں ۳۴ رباعیات بھی شامل ہیں۔ اس کا پیش لفظ مشہور افسانہ نگار جناب کوثر چاند پوری کا لکھا ہوا ہے۔ یہ پیش لفظ گوالیاری

کی تفہیم میں بڑا معاون ثابت ہوتا ہے۔ رباعیات اور نظموں کا ایک مجموعہ شاخِ زیتون کے نام سے اور نظموں کا ایک مجموعہ 'رگِ حیات' کے نام سے شائع ہوا۔ ۱۹۶۳ء میں 'زخمِ گل' منظرِ عام پر آیا۔ یہ مجموعہ غزلیات کا ہے۔ شفا مرحوم نے ایک کتابچہ 'پرچمِ اُردو' جشنِ شاعر بمبئی کی یادگار کے طور پر چھاپا۔ اس میں انتساب اور نذرِ شاعر کے قطعات کے علاوہ اُردو سے متعلق چھ نظمیں ہیں، جو زبان کے تعلق سے شاعر شفا گوالیاری ہی کے نہیں، ہر اُردو داں کے جذبات کا آئینہ ہیں۔ یہ نظمیں ان صالح اقدار کی آئینہ دار بھی ہیں جو ہر اُردو داں کو عزیز ہیں۔ ان نظموں میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ شفا صاحب اُردو کی محبت میں جذبات اور جذباتیت کی رو میں بہہ نہیں گئے۔ اُردو زبان کی پوری تاریخ ان کی نظر میں ہے۔ صدیوں پر پھیلے ہوئے عرصے میں اُردو کا کیا کردار رہا ہے، وہ اس سے بہ خوبی آگاہ ہیں۔ مثلاً:

جاری ہے ہر اک ملک میں سکّہ اس کا
آفاقیت افروز ہے، جلوہ اس کا
صرف ایک علاقے پہ نہیں ہے موقوف
ہے سارا جہاں آج علاقہ اس کا

آج شاید ہی دُنیا کا کوئی حصّہ ایسا ہو، جہاں اُردو والوں نے اس کا پرچم بلند نہ کیا ہو؛ جہاں اس کے گیت نہ گائے جاتے ہوں۔ شفا اس ہمہ گیر زبان کی ایک بنیادی خصوصیت کو یوں الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں:

ہر جام دوئی توڑ دیا ہے اس نے
آئینۂ دل جوڑ دیا ہے اس نے
اے دوستو! تاریخ اٹھا کر دیکھو
تاریخ کا رُخ موڑ دیا ہے اس نے

تاریخ شاہد ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اُردو دلوں کو جوڑنے والی زبان ہے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ اس لشکرِ نصرت شعار نے فی الواقع تاریخ کا رُخ موڑ دیا ہے۔ نظم معمارانِ اُردوے ہند (موجودہ) کو شفا گوالیاری کی مشاقی اور ہنرمندی کی اچھی مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس میں پونے دو سو خادمانِ اُردو کے نام نظم ہوئے ہیں۔ نظم کے ابتدائی چھ مصرعے ملاحظہ ہوں:

خوشا عزم و عمل ان کا، یہ معمارانِ اُردو ہیں
بہارِ قوم ہیں، روحِ وطن ہیں، جانِ اُردو ہیں
نیاز و احتشام و زور و امن و خواجہ فاروقی
سرور و یوسف و ہوش و حیات اللہ انصاری
سلامت رضوی و عبدالوحید و ڈاکٹر خوشتر
و داؤد و شوکت و بوہیرے، عرش و عالم و نیّر

اور مثلاً یہ مصرعے:

علی جواد و محروم و تخلص، طالب و سندر
بمل جین و جمالی و خبیر و سیدہ اختر
روش، آزاد و ساغر، گوڑ و ساز و وجدی و جوہر
سلیمان و شجاعت جعفری، اسلام و فاروقی
فریدی و مظفر، دسنوی و مینکش و راہی

اور نظم کے اختتامی چار مصرعے:

نظر، غازی و چندر، رحیم، خلیل و قاضی و زاہد
حکیم احمد اثر مفتون و صہبا، ثروت و حامد
انھی کے حسن سے ہوگا درخشاں عالمِ اُردو
مہ و خورشید تک پہنچے گا بڑھ کر پرچمِ اُردو

ایسی ہی طباعی اور ہنرمندی کا ثبوت وہ رباعیاں ہیں، جو 'شاخِ زیتون' اور 'نبضِ حیات' میں شامل ہیں۔

طباعی اور ہنرمندی کے ذکر سے مقصد محض اُن کی مشاقی کی طرف اشارہ کرنا نہیں۔ یہ امر اپنی جگہ مسلم ہے کہ شفا صاحب کا رشتہ اُردو شاعری اور بالخصوص غزل کی روایات سے گہرا ہے۔ تاہم وہ روایات کے رسماً اسیر نہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ شفا نے مسائل اور مصائب سے گھبرا کر ذہنی فرار کی راہ اختیار نہیں کی۔ نامساعد حالات انھیں بے حوصلہ نہیں بنا پائے وہ پا در ہوا نہیں ہوتے۔ اُن کے اشعار آئینوں سے ظاہر ہے کہ اُن کے پیر ہمیشہ مضبوطی سے زمین پر جمے رہے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ وسیع تر قومی زندگی سے اُن کا ربط ضبط برائے نام رہا۔ جب شفا صاحب نے شاعری شروع کی، قومی افق آزادی کی تحریکوں سے اجلا اور روشن تھا۔ ہوائیں حریت اور آزادی کے جذبوں کو مہمیز کرنے والی تھیں۔ معاون اور مخالف جھگڑوں کی آویزشیں تھیں۔ لیکن اس کا کوئی عکس یا نقش ہمیں شفا صاحب کے کلام میں نظر نہیں آتا۔ ظاہر ہے، جن حالات میں اور ماحول میں شفا نے آنکھ کھولی، پرورش پائی اور پروان چڑھے وہ یقیناً ایسے نہ تھے کہ کسی مربوط اور ارتقائی فکر کی تشکیل میں معاون بنتے۔ فکر و نظر کی کشادگی کو ان کے ذہن و شعور کا حصّہ بناتے اور انھیں کسی وسیع تر آفاق سے روشناس کرا سکتے۔

مذہب اور مولوی کے محدود ذہنی اثرات نے اُن کی دُنیا کو محدود تر بنا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کاروبارِ زندگی میں سرگرم طور پر شریک نظر نہیں آتے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک مشاہد تھے: عمل اور ردِّ عمل کی کشاکش میں الجھے ہوئے۔ ایسے میں ان کا اپنا ردِّ عمل بیشتر ذہنی اور تمنّائی رہا۔ یہ اس بات کی دلیل اور

ت ہے کہ وہ داخلی دُنیا کے باسی تھے ،
ں غزل کی کارفرمائیاں ہی اُن کی رفیق و
س ہوسکتی تھیں ۔ تاہم یہ ان کی ہوشمندی
ں کہ انھوں نے دیدہ و دِل کی دُنیا کو روایتی
لیہ موضوعات تک محدود نہیں رکھا ۔ محض
ن و عشق کی قندیلیں روشن نہیں کیں
اپنی شخصیت میں شامل سوز و ساز کو
ار کے وسیلے سے دِلِ گداختہ کا آئینہ بنایا ۔
کا استفہامیہ انداز بالخصوص توجہ چاہتا
ہ :

ایوس کے، مجبور کے کیا دِل نہیں ہوتا

عر ملاحظہ ہوں :

ے غمِ عالم تری اِس دلنوازی کے نثار
یرے نزدیک آ گئے، جیسے ہر خوشی تک آ گئے

وئی غم ہو شفاؔ، فطرت کا اک انعام ہوتا ہے
ہ اس سے زندگی کے سارے امکاں جاگ اٹھتے ہیں

م دوراں نے بڑھ کر لو بڑھا دی شمعِ ہستی کی
مِ جاناں کے یہ بھٹکے ہوئے جانے کہاں جاتے

اِن اشعار سے ظاہر ہے کہ عصری رجحانات
ان کا تعلق ذہنی تھا ۔ یہ بھی اپنی جگہ کم اہم
، کہ یہ اپنے اندر ایک جہانِ عمل کی
راہٹیں رکھتا ہے ۔ میں آخر میں شفاؔ مرحوم
بض زندہ رہنے والے شعر آپ کی خدمت
پیش کرنا چاہتا ہوں ۔ ممکن ہے آپ اِن
اپنی جلوتوں اور خلوتوں میں اس سے
محظوظ ہوتے ہیں، ممکن ہے ان کی تکرار
دیدہ و دریافت کے نئے دریچے وا ہوں ۔
نظہ ہوں :

کیا ہوئی تیری نگاہِ مہر ساز
کیوں افق سے مانگتا ہے تو سحر

بھروسا شعلوں پہ تا کجا اے کارواں والو
خود اپنی روشنی میں کیوں نہ پہچانو مقام اپنا

خدا شاہد کہ دِل سے تو خدا کا نام لیتا ہوں
مگر لب پر جب آتا ہے تمھارا نام آتا ہے

وفا کی راہ میں ایسی بھی ایک منزل ہے
جہاں سے رک کے ذرا دو جہاں گزرتے ہیں

اِدھر تارے، اُدھر کلیاں ہیں مصروفِ گراں خوابی
اگر ایسے میں پیغامِ سحر آیا تو کیا ہوگا

شبِ فراق کچھ ایسے بھی حادثے گزرے
چراغ جلتے رہے اور روشنی نہ رہی

اے شفاؔ اپنی رات ہی اچھی
سحر آئے تو معتبر آئے

بلاشبہ ایسے بیسیوں شعر شفاؔ مرحوم کے کلام میں تلاش کیے جا سکتے ہیں ۔ میں طوالت کے اندیشے سے احتراز کر رہا ہوں، تاہم محسوس کرتا ہوں کہ شفاؔ شاعری کی دنیا میں منتر سدھ کرنے والا کوئی بڑا جوگی نہ سہی، ایسا جوگی بھی نہیں تھا کہ توجہ سے محروم رہے ۔

غزلیں

کرشن ادیب

ن کے پچھلے پہر، اُٹھ کے جو باہر دیکھوں
لمحہ میں بدلتا ہوا منظر دیکھوں
ں کو آوارہ پھروں، ریگِ رواں کی صورت
ن ڈھل جائے تو خوابوں میں سمندر دیکھوں
ں میں رہتی ہیں سدا، یاد کی پریاں رقصاں
ں جزیروں کو کبھی، کاش میں پل بھر دیکھوں
ر دزدیدہ سے لمحاتِ مسرّت کے لیے
ج وغم، درد والم، اپنا مقدّر دیکھوں
نعارف نہیں، اُس شخص سے اپنا، پھر بھی
یں آتا ہے، اُسے پاس بٹھا کر دیکھوں
م کی آگ میں جلتا رہوں، تنہا، تنہا
بھر رات گئے، برف سا بستر دیکھوں
گی اور بڑھے، ننھے سے پودوں کی ادیب
ں کی خواہش ہے کہ ہر پیڑ ثمرور دیکھوں

۱۹/۱۲، پی۔ اے۔ یو۔ لدھیانہ ۱۴۱۰۰۴

جو ہونا تھا وہ اب تک ہو چکا ہے
شجر کا آخری پتّہ گرا ہے
گیا تھا موسموں کو کھوجنے جو،
پرندہ، وہ ابھی تک لاپتا ہے
مرے ادراک میں ہیں لرزشیں سی
ترا مِلنا بھی گویا حادثہ ہے
یہ کیا سفاک لمحے بہہ رہے ہیں
یہ کیسی ساعتوں کا سامنا ہے
یہ کیسی جاں گُسل خاموشیاں ہیں،
یہ کیسا بے سماعت راستہ ہے
اسیرِ گردشِ سنگ و شرر میں،
تو میرے واسطے پاگل ہوا ہے
شجر کاری کے جس نے خواب دیکھے
وہ جلتے ریگزاروں میں کھڑا ہے
وہ کن طرفوں میں صورت یاب ہوگا
اسے کن منظروں میں دیکھنا ہے
لہو جذبات کی صورت گری کا
سلیقہ مظہری کو آگیا ہے

شکیل مظہری

ڈی۔ ایف۔ اے۔ ڈانڈیلی ۵۸۱۳۲۵ (کرناٹک)

رام پرکاش راہی

نہ اہتمام سے کُھلتا، نہ بند ہوتا ہے
گلی کے موڑ پہ اِک ادھ کُھلا دریچا ہے
یہ لوک لاج کے تیور، یہ انتظار کا کرب
توقعات کی دُنیا عجیب دُنیا ہے
یہاں گُماں ہی یقیں کی شعاعِ اوّل ہے
جنوں کے دشت میں سورج کچھ ایسے لگتا ہے
ہوا کے دوش پہ کب تک وہ کنمنائے گا
دُھویں کا حرف جو بُجھتے دِیے کا کتبا ہے
مرے وجود سے برہم ہے میری تنہائی
کوئی تو ہے جو مرے ساتھ ساتھ رہتا ہے
اسے نظر سے کھنگالو، رمق رمق دیکھو
وفا کی آنکھ کا آنسو بھی اک صحیفا ہے
یہ دُور دُور کی سوچوں کے سلسلے راہی
کسی کا قرب ہی شاید تمھارا منشا ہے

رخیاں

دِلبَر اور دِلبَر

دلبر بھائی سے ملاقات کے بعد میری
گی میں کئی دور اس تبدیلیاں ہوئیں۔ اچھے نمبروں
وجہ سے مجھے کالج میں داخلہ تو مل گیا تھا مگر کالج
پُررونق، ہنگامہ پرور زندگی میں میری سمجھ میں نہیں
تا تھا کیا کروں، کہاں جاؤں، کس سے ملوں، کس سے
ت کروں۔ آس پاس امیر یا خوشحال گھرانوں کے
کے لڑکیاں تھے جن کی اپنی گاڑیاں تھیں یا ٹیکسیوں
آتے جاتے۔ مجھ جیسے لڑکے خال خال ہی نظر
تے تھے اور وہ بھی اس صورتِ حال سے منہ چھپانے
لیے لائبریری میں گھس جاتے تھے۔ مجھے اٹ پٹا سا
ضرور لگتا تھا مگر لائبریری میں میرا دل نہیں لگتا
ا۔ کالج کی زندگی کے متعلق میں نے بہت کچھ
چ رکھا تھا۔ کالج کی رومان پرور اور کھلی فضا کے
لق اور وہ زندگی میرے اطراف ہی میں تھی۔ مگر
ھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس میں کیسے حصّہ لوں یا
س کا حصّہ بنوں۔ میری جیب میں صرف اتنے پیسے
تے تھے کہ بس سے آ جا سکوں اور دوپہر میں کچھ کھا
وں۔ اس کے بعد بس چائے کے لیے پیسے بچتے تھے۔
لج میں چائے پی لیتا تو شام کی چائے کا مسئلہ
جاتا۔ دوستوں میں بیٹھتا تو من ہی من میں سوچتا
ہتا کہ کہیں چائے کے پیسے ادا کرنے کے لیے مجھ
نہ کہا جائے۔ یہاں اگر میں نے غلطی تو نہیں کی۔
بھی کالج تھے جہاں مجھ جیسے بہت طالب علم تھے۔
اید وہاں میں زیادہ خوش رہتا۔ ٹرم بدلنے کے
م واقعی میں کالج تبدیل کر لیتا اگر میری ملاقات
ر بھائی سے نہ ہو جاتی۔

سچ بات تو یہ تھی کہ ایک روز انھوں نے کینٹین میں مجھے خود اپنی میز پر بیٹھنے کا شرف عطا کیا۔ ان کی میز ہمیشہ طالب علموں سے گھری رہتی تھی مگر اس روز شاید سب فٹ بال میچ دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ دلبر بھائی کا کسی لڑکی سے اپائنٹ منٹ تھا۔ اور وہ حسبِ معمول لنچ کے بعد سے ہی اپنی مخصوص میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں کینٹین میں داخل ہوا تو تمام میزیں خالی ہونے کی وجہ سے میری نظر سیدھے اُن پر پڑی اور اسی وقت انھوں نے مجھے کینٹین میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ وقت گذاری کی خاطر انھوں نے مجھے ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی جو میں نے بخوشی قبول کر لی۔ میں تو ویسے ہی شترِ بے مہار کی طرح کالج میں گھومتا رہتا تھا۔ کبھی باہر ریلنگ پر، کبھی کمپاؤنڈ میں، کبھی زینوں پر، کبھی لائبریری میں۔ کچھ رسمی باتیں ہوئیں۔ انھوں نے میرا ایک مختصر سا انٹرویو لیا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں اسی علاقے میں رہتا ہوں جہاں ان کی رہائش ہے اور اسی اسکول میں پڑھا ہوں جس کے وہ فارغ التحصیل ہیں تو وہ بہت خوش ہوئے اور مجھے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔

میں بیان نہیں کر سکتا کہ دلبر بھائی کی رفاقت نصیب ہونے کے بعد مجھے کس قدر سکون ملا۔ مجھے گویا اپنی منزل مل گئی ہو۔ اب میں کلاس سے چھوٹتا تو سیدھا کینٹین کا رخ کرتا۔ کالج کے تیز طرار لڑکوں اور خوبصورت لڑکیوں سے میری دوستی ہو گئی۔ پیسوں کے معاملے میں انھوں نے ہمیشہ مجھے کوَر کیا۔ دلبر بھائی نے دو تین زبردست قسم کے خوشحال لڑکے پال رکھے تھے جو ان سے کالج میں لمحہ بھر کے لیے بھی جدا ہونا گناہِ عظیم سمجھتے تھے۔ میں نے خود دلبر بھائی کو کبھی پیسے ادا کرتے نہیں دیکھا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا بلکہ دلبر بھائی ان لڑکوں سے پیسے خرچ کرواتے رہتے۔

"ہیمنت جاؤ ذرا نیلو کو شاپنگ کروا آؤ۔"

وہ اپنے مخصوص نرم مگر تحکمانہ لہجے میں ہیمنت شاہ سے کہتے اور وہ خوش خوش اُٹھ کھڑا ہوتا کہ مرشد نے اُسے نیلو کے ساتھ چند گھڑیاں تنہا بتانے کا شرف عطا کیا ہے۔ جس کا قرض وہ تمام عمر نہیں اُتار سکتا۔

چند مہینوں میں میرا حُلیہ بدل گیا۔ سر کے بال جو ملٹری جوانوں کی طرح تھے راک ہڈسن جیسے ہوگئے۔ کپڑوں کی وضع قطع، تراش خراش بدل گئی۔ کلاس کے ساتھی مجھ سے پوچھنے لگے کہ یار تم کپڑے کہاں سلواتے ہو۔ یہ سب دلبر بھائی کا کمال تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ ریڈی میڈ قمیص پتلون کہاں اچھے اور سستے داموں پر ملتے ہیں۔ کون سا ٹیلر انھیں اس خوبصورتی سے ٹھیک ٹھاک کر سکتا ہے کہ چراغ دین کے سلے ہوئے معلوم ہوں۔ جوتوں کی سیل کہاں عمدہ لگتی ہے۔ یہ تو خیر پہلا قدم تھا مگر جب انھیں معلوم ہوا کہ میں اسکول ٹیم سے کرکٹ کھیلتا تھا تو



۴۸/۲۲ شیخ بلڈنگ، قمرالدین اسٹریٹ، بمبئی، ۴۰۰۰۰۳

نے ذاتی دلچسپی لے کر مجھے کالج ٹیم میں داخل
ا۔ افتتاحی بلّے باز دو اور بھی تھے مگر انھوں
کے کپتان اور سکریٹری کو زبردست بریانی
دی اور مجھے پہلے ہی سال کالج سے کھیلنے کا اعزاز
ل ہوگیا۔

دلبر بھائی کی سرپرستی سے میں بہت خوش
مگر اس کا اندازہ بعد کو ہوا کہ گاڈ فادر کی طرح وہ
موقع آنے پر اپنی خدمات کا صلہ وصول کر لیتے
یوں بھی چھوٹے موٹے معاوضوں کی حقیقت
تھی ہم لوگ تو ان پر جان فدا کرنے کے لیے تیار
۔ پڑھنے کا شوق مجھے بچپن سے ہی تھا کالج جوائن
نے کے بعد میں برٹش کاؤنسل اور یو۔ ایس۔
ں۔ ایس لائبریریوں کا ممبر بن گیا۔ ہر ہفتے، پندرہ
ن میں پانچ چھ کتابیں لے آتا۔ میرے ساتھی موٹی
ٹی کتابیں بغل میں دیکھ کر مرعوب ہوتے تو مجھے
ہری خوشی ہوتی۔ افسوس یہ تھا کہ جتنا مجھے پڑھنے کا
وق تھا اتنی ہی بعض کتابیں میری سمجھ سے باہر
میں۔ لیکن اس بات سے میں کبھی بددل نہیں ہوا۔
ہاں بھی میرا رویہ افتتاحی بلّے باز کا ہی تھا کہ کچھ بھی ہو
کریز پر کھڑا رہنا چاہیے۔ جو کتابیں مجھے اہم معلوم
ہوتیں اور دل کو لگتیں میں اُنھیں بار بار پڑھتا۔
بھی ایسا ہوتا کہ چند دوسری کتابیں پڑھنے کے بعد
اندازہ ہوتا کہ جو کتاب میں پہلے پڑھ چکا اب دوبارہ
دیکھوں تو بہتر طور پر سمجھ سکتا ہوں۔ اور ایک بار
پھر میں وہ کتاب اپنے نام جاری کروا لیتا۔ بعض کتابیں
ایسی بھی تھیں جو کئی سال بعد سمجھ میں آئیں۔

دلبر بھائی کو میرا یہ شوق بہت پسند آیا۔ مزاجاً
وہ بڑا نفیس ذوق رکھتے تھے مگر پڑھنے سے زیادہ
انھیں سماعی علم سے دلچسپی تھی۔ بعض اوقات وہ
کسی کتاب کے متعلق یا اس کے موضوع کے متعلق

ایک کر، کچھ سوچ سوچ کر ان کے گوشش گزار کرتا۔
اگر کسی کتاب کی جلد خوبصورت ہوتی یا کتاب قیمتی
ہوتی تو وہ مجھ سے عاریتاً لے لیتے۔ وہ کتاب کئی
روز تک ان کے ساتھ رہتی۔ کالج میں، کھیل کے
میدان میں، کینٹین میں یہاں تک کہ شام کے وقت
جو وہ میرین ڈرائیو کے ساحل پر یا اس کے قریب
کسی ہوٹل میں گزارا کرتے تھے۔ مجھے بھی اپنی کتاب
ان کے ہاتھوں میں دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی۔ اگر وہ
کتاب میرے لیے ضروری ہوتی تو لائبریرین سے
کہہ کر تاریخ بڑھوا لیتا۔

ایک دن ہم کینٹین میں بیٹھے ہوئے تھے کہ
کسی بات پر میں نے کہا: "سطحِ سمندر پر جو اضطراب
ہے وہ لوگو یا دنیاوی کامیابی ہے لیکن سمندر کی
تہہ میں جو اضطراب ہے وہ ایک آرٹسٹ ہی محسوس
کر سکتا ہے۔"

"یہ جملہ کس کا ہے؟" دلبر بھائی نے پوچھا۔

"خاکسار کا" میں نے کہا۔

انھوں نے کچھ شک کی نگاہ سے مجھے دیکھا۔

"بہت اچھا جملہ ہے۔" دلبر بھائی نے کہا۔

"اسے تو نوٹ کرنا چاہیے۔"

میں نے دلبر بھائی سے کہا کہ ایسے کئی جملے
نہ صرف میرے بلکہ مشہور ادیبوں اور مفکروں کے
میں نے نوٹ کر رکھے ہیں۔

دلبر بھائی بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے
نوٹ بک مجھ سے عاریتاً لی اور اسے ایک خوبصورت
چرمی جلد کی ڈائری سمیت جس پر سنہری نقش و نگار
بنے ہوئے تھے اور اوراق سفید ولائتی کاغذ کے
تھے ایک اور ساتھی محمود کے حوالے کی۔ محمود کی
تحریر بہت اچھی تھی اس نے مرشد کا کام جان کر
میری ساری نوٹ بک چند ہی روز میں ڈائری میں

ڈائری مستقل دلبر بھائی کے ہاتھوں میں رہنے لگی۔

اس ڈائری کے ساتھ میں نے دلبر بھائی
میں ایک نیا جارحانہ انداز دیکھا وہ علمی ادبی گفتگو
سے یوں تو کوسوں دُور رہتے تھے مگر اب وہ ایک
نئی شان سے کالج میں اُبھرے۔ کالج کے سنجیدہ
طالبعلم بھی ان کے ساتھ دیکھے جانے لگے۔ کئی بار
وہ پروفیسروں سے بھی اُلجھے اور پروفیسر جو انھیں
محض ایک خوش لباس انسان سمجھتے تھے ان کا احترام
کرنے لگے۔ دلبر بھائی کے ساتھ ظاہر ہے کہ ہماری
اہمیت بھی بڑھتی چلی گئی۔ ان کی خواہش کے احترام
میں میں نے اُردو کے مختلف شاعروں کے مشہور
اور دلچسپ اشعار کا بھی ایک انتخاب تیار کر کے
دیا جسے انھوں نے محمود سے اسی ڈائری میں نقل
کروا لیا۔

ایک دن انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

"انڈین فلاسفی کے متعلق تمھارا کیا
خیال ہے؟"

ہندوستانی فلسفے سے بھلا دلبر بھائی کو کیا
دلچسپی ہو سکتی ہے۔ میں نے سوچا۔

"ایک پیپر ہے میرا، جونیر میں" میں نے
جواب دیا۔

"نوٹس تو ہوں گے، تمھارے پاس"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔

"کل لیتے آنا"

دلبر بھائی نے جس تندہی سے ہندوستانی
فلسفے کا مطالعہ کیا اس نے ہمیں حیرت میں
ڈال دیا۔ یہ سانکھیہ فلاسفی کیا ہوتی ہے لوگ
میمامسہ کا کیا مطلب ہے۔ شنکر اور رامانج میں کیا
فرق ہے۔ ویدانت کیا ہے۔ بدھ فلاسفی اور ویدانت
میں کیا فرق ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت کم
وقت میں بہت کچھ جاننا چاہتے تھے۔ دلبر بھائی

نے اسی پر بس نہیں کیا۔ انھوں نے باقاعدہ فلسفے کی کلاسیں اٹینڈ کرنا شروع کیں۔ فلسفے کے طالبعلموں سے وہ گھنٹوں بحث میں اُلجھے رہتے۔ ہم لوگوں نے اس تبدیلی پر بہت غور کیا مگر وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ تو سمجھ میں آتا تھا کہ اس گہرے شغف کے پیچھے کوئی لڑکی ہی ہو سکتی ہے۔ مگر اس کے کچھ آثار نہ تھے۔ یہ ضرور تھا کہ وہ اکثر دوپہر یا شام میں غائب ہو جاتے تھے جو ان کے اب تک کے معمول کے خلاف تھا۔ ہم نے کئی بار دلبر بھائی سے اشاروں کنایوں میں پوچھا بھی مگر وہ ٹال گئے۔ آخر ایک دن یہ عقدہ یوں کھلا کہ ایک سہ پہر ہم نے انھیں ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ ریشم بھون میں داخل ہوتے دیکھا۔ میرے ساتھ کالج کا ایک ساتھی اشوک تھا وہ میرے منع کرنے کے باوجود ان کے پیچھے ہوٹل میں داخل ہوا۔ یہ ہوٹل زیادہ تر گجراتی اور ہندی ادیبوں کے تصرف میں تھا۔ اس وقت بھی کئی میزیں ان سے گھری ہوئی تھیں۔ دلبر بھائی نے ایک گوشہ سنبھالا اور ہم لوگ بھی مورچہ مارتے ہوئے ان کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ دلبر بھائی ہمیں دیکھ کر بُری طرح چونکے پھر سنبھل کر اس لڑکی سے ہمارا تعارف کروایا۔

لڑکی خوبصورت تھی۔ اونچا قد، جسم معلوم ہوتا تھا اسٹین لیس اسٹیل کا بنا ہوا ہے۔ مگر غضب کی لچک تھی۔ چہرے کے نقوش سے اندازہ ہوا کہ پونا کے کسی برہمن خاندان کی ہوگی۔ گورا چہرہ جس پر جا بجا گلابی رنگ کے چھینٹے سے ڈوبتے اُبھرتے رہتے تھے۔ آنکھوں میں غضب کی چمک تھی۔ باتوں سے بہت تیز معلوم ہوتی تھی۔ دل ہی دل میں ہم نے دلبر بھائی کو داد دی۔ واقعی بہت اُونچا ہاتھ مارا تھا انھوں نے اور جب ہمیں معلوم ہوا کہ وہ ایک مقامی کالج میں لیکچرار ہے ایم۔ اے فلاسفی میں ٹاپ کیا ہے اور اسی کالج میں ملازم ہوئی ہے تو اور بھی حیرت ہوئی دلبر بھائی اتنا اونچا شکار کر سکتے ہیں ہم سوچ نہیں سکتے تھے۔

اگلے روز دلبر بھائی نے ہمیں تنبیہہ کی کہ آئندہ ہم ریشم بھون کا رُخ نہ کریں اور نہ کبھی سے روما کا ذکر کریں۔ ریشم بھون کا راستہ تو ہم نے چھوڑ دیا مگر پھر جلد ہی دلبر بھائی کو میری ضرورت پڑنے لگی۔ روما کا کالج آفس کامن روم سے خاصے فاصلے پر تھا۔ اکثر دفتر کے کلرک بے رُخی سے انکار کرتے یا دلبر بھائی سے کہتے کہ کوئی پیغام ہو تو دے دیں۔ ظاہر ہے دلبر بھائی کو بھی خاصی احتیاط سے کام لینا پڑتا تھا۔ پھر کبھی فون مسلسل انگیج آتا یا بگڑا ہوا ہوتا۔ اس لیے جب وہ کسی بنگالی فلم کے ٹکٹ لے آتے تو روما تک اطلاع پہنچانے کا کام میرے ہی ذمّے ہوتا۔ دلبر بھائی جب آرٹ فلم کی بات کرتے تو ان کا مطلب بنگالی فلم ہی ہوتا تھا۔ ان دنوں چترا سنیما اور لوٹس سنیما میں ہر اتوار کی صبح بنگالی فلم دکھائی جاتی تھی۔ ان تھیٹروں پر بڑی چہل پہل رہتی متوسط اور امیر گھرانوں کے لوگ گاڑیوں اور بسوں میں آتے۔ ستیہ جیت رے، رِت وِک گھٹک، مرنال سین وغیرہ کی فلمیں دیکھنے کے لیے ایسی جگہوں پر دیکھا جانا بھی کچھ اہمیت رکھتا تھا۔ دلبر بھائی شاید روما کے کہنے پر کمپنی کی خاطر کبھی کبھی مجھے بھی ساتھ لے جانے لگے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا کہ انٹرول میں آئس کریم اور بس کا ٹکٹ میرے ذمّے ہوگا۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ کئی بار روما پیسے ادا کرنے کے لیے پرس کھولتی مگر دلبر بھائی کی پٹھانی حمیت آڑے آجاتی۔ حقیقت یہ تھی کہ روما بڑے مالدار گھرانے کی لڑکی تھی اور تنخواہ کے سارے پیسے شاپنگ اور دوسری چھوٹی موٹی شوق کی چیزوں میں اُڑا دیتی تھی۔ دلبر بھائی کو مجھ پر پورا اعتماد تھا یا شاید وہ مجھے اپنے جوڑ کا نہیں سمجھتے تھے۔ بس ایک بات کی اُنھوں نے مجھے سخت تاکید کر رکھی تھی۔ وہ یہ کہ روما کو ہرگز نہ بتاؤں کہ وہ مسلمان ہیں۔ انھوں نے روما کو بتا رکھا تھا کہ ان کا اصل نام ونود چندر ہے۔ گھر والے پیار سے دلبر پکارتے تھے۔ اسی لیے وہی نام مقبول ہو گیا اور انھیں پسند بھی ہے۔ وہ پنجاب کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد اُردو، فارسی، کے زبردست اسکالر تھے۔ کیوں کہ پنجاب میں اُردو فارسی کا ہمیشہ سے زبردست چلن رہا ہے۔ دلبر بھائی کی یہ احتیاط میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیوں کہ مجھ سے تو روما یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں مسلمان ہوں بڑے تپاک سے ملتی تھی۔ شاید دلبر بھائی رسک لینا نہیں چاہتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ روما بڑی ذہین تھی اور زبردست اسکالر مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تعلیم کے علاوہ دوسرے معاملات میں وہ بالکل خام تھی۔ اکلوتی بیٹی تھی۔ باپ وکیل تھا اور ماں بنک میں افسر، روما کے لیے دونوں میں سے کسی کے پاس وقت نہ تھا۔ دلبر بھائی نے پہلی بار اُسے میرین ڈرائیو کے کسی ہوٹل میں دیکھا تھا اور دل دے بیٹھے تھے۔ روما شاید اُن کے رکھ رکھاؤ، نفاست، شائستہ باوقار انداز سے متاثر ہو گئی تھی۔ اگرچہ وہ بے حد دُبلے تھے، سر پر بال بھی برائے نام تھے جنھیں وہ بڑے اہتمام سے رکھتے تھے مگر ان کے چہرے سے ہی کچھ بزرگی اور دانشوری کا احساس ہوتا تھا دلبر بھائی نے جتنا کچھ بھی ہندوستانی فلسفہ سیکھ ہوگا روما کے غیر تجربے کار ذہن کو متاثر کرنے کے لیے کافی رہا ہوگا۔

روما اور دلبر بھائی کی شامیں ساتھ میر گزر رہی تھیں۔ مجھے دلبر بھائی پر بڑا رشک آتا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ زندگی اتنی خوش گوار بھی ہو سکتی ہے۔ اپنی ڈائری کے کئی جملے جو میں قریب قریب

چکا تھا میں نے روما سے گفتگو کے دوران
...ائی سے سُننے۔ یہ جملے دلبر بھائی کی زبان سے
...تے تو کچھ اور گہرے معلوم ہوتے۔ ایسا لگتا نہیں
یہ جملے میرے سوچے ہوئے ہیں۔ اس طرح وہ
ڈائری سے نوٹ کیے ہوئے مختلف مفکروں
...قوال دہراتے تو معلوم ہوتا کہ ان کے پیچھے ایک
...ں مطالعہ اور فکر بول رہا ہے۔ جب وہ
...دوستانی فلسفے پر گفتگو کرتے تو روما منہ کھولے
...ں باتیں توجہ سے سُنتی۔ روما جن اصطلاحات کو
...ول کی طرح دہراتی دلبر بھائی کی زبان سے ادا
...تے تو ان میں جان پڑ جاتی۔ 'بشکرم'، 'ویراگ'،
...اکرتی، رجس، تمس، یوگ، دھیان، آنند ایسے الفاظ جب
...استعمال کرتے تو ایک جہانِ معنی ان میں آباد نظر آتا۔

عشق کے سوز میں جیسے وہ الفاظ کی روح تک
...نچ گئے تھے۔ اسی طرح جب وہ ستیہ جیت رے
...درت واک گھٹک کا موازنہ کرتے یا کسی فلم پر
...ھرہ کرتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فلم کو ہم ایک
...ئے زاویے سے دیکھ رہے ہیں۔ جو مناظر ہمیں سرسری
...علوم ہوتے تھے ان کی گفتگو کے بعد کچھ نئی معنویت
...ختیار کر لیتے تھے۔ دلبر بھائی سے میں متاثر ضرور
...تھا لیکن ان کا یہ رُوپ خود میرے لیے بھی حیرت
...اک تھا۔ محبت نے شاید ان پر وہ عالم منکشف
...کر دیے تھے جو محض مطالعے یا مشاہدے سے
...روشن نہیں ہوتے۔

سال بھر گزر گیا۔ ہر آنے والا دن دونوں کو کچھ اور قریب کرتا چلا گیا۔ دلبر بھائی اس بار بے حد سنجیدہ تھے۔ یہ عشق آخر کیا رنگ لائے گا میں سوچنے لگا۔ دلبر بھائی نے اب تک روما کو بتایا نہیں تھا کہ وہ مسلمان ہیں۔ وہ کچھ خوف زدہ سے میں وہ اس قدر لین ہو چکے تھے کہ ہندو رسم و رواج کے مطابق بھی شادی کے لیے تیار تھے۔ مگر ان کا پٹھان باپ! میں نے ان سے کہا کہ چاہے جو کچھ بھی ہو مگر کم از کم روما کو اندھیرے میں نہ رکھیں ورنہ اُسے بے حد صدمہ ہوگا۔ کئی بار دلبر بھائی نے ارادہ بھی کیا مگر ان کی ہمت نہ پڑی۔

میرا بی۔ اے کا آخری سال تھا۔ کچھ سینیارٹی، کچھ تعلقات کی بنا پر میں یونیورسٹی کی ٹیم کے لیے منتخب ہو گیا۔ مجھے اپنے انتخاب پر بڑی خوشی ہوئی کہ اس طرح میں اپنے دوستوں میں کچھ اور سربلند ہو گیا تھا اور پہلی بار مجھے کئی شہروں کے مفت دورے کا موقع مل رہا تھا۔ میرا کھیل اب ایسا بُرا نہ تھا۔ یونیورسٹی ٹیم کے لیے میری کارکردگی ٹھیک ہی رہی۔ اب میں دفاعی انداز کا ماہر ہو گیا تھا جسم سے کام لینے کی ضرورت کم پڑتی تھی۔ دورے سے واپس آیا تو پتہ چلا کہ دو روز قبل دلبر بھائی کے والد گھر پر آئے تھے۔ ان کی آمد کا مقصد کیا ہو سکتا تھا؟ میرے گھر کا پتہ انھوں نے کیسے حاصل کیا ہوگا۔ کس کس سے پوچھا ہوگا۔ یہ سوالات میرے ذہن میں آئے۔

گھر والوں سے مختصر بات چیت کے بعد میں غسل سے فارغ ہو کر ناشتے پر بیٹھا ہی تھا کہ دلبر بھائی کے والد کے آنے کی اطلاع چھوٹی بہن نے دی۔ میں فوراً اٹھا اور خاں صاحب کو اپنے کمرے میں لے آیا۔ کمرہ بہت مختصر تھا اور کسی نجی گفتگو کا امکان نہ تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ چائے پلا کر خاں صاحب کو باہر لے جاؤں تاکہ اطمینان سے بات چیت ہو سکے۔ مگر خاں صاحب کا موڈ نہ تھا۔

"یہ چائے وائے رہنے دو' ام بہوت پریشان" انھوں نے کہا "تم دلبر کا دوست اے۔ تم کو معلوم دلبر کدھر اے؟"

"ام اس کو دو دن سے تلاش کرتا اے۔"

اس دوران چائے تیار ہو چکی تھی۔ امّی نے اصرار کر کے خاں صاحب کو چائے پلائی۔ میں نے انھیں یقین دلایا کہ ان کی تلاش میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھوں گا۔

خاں صاحب نے کندھے پر رکھے جھاڑی رومال کے ایک کونے سے اپنے اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھا۔ میرے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔ اور بغیر کچھ کہے بغیر گھر سے باہر نکل گئے۔

گھر سے نکل کر سب سے پہلے تو میں کالج پہنچا۔ پتہ چلا کہ دلبر بھائی کو گزشتہ پندرہ دن سے کسی نے نہیں دیکھا۔ ہفتے بھر پہلے ایک دوست نے اُنھیں فاؤنٹن کے کسی ہوٹل میں البتہ دیکھا تھا۔ محمود کو ساتھ لے کر میں ریشم بھون پہنچا۔ وِیٹر سے پتہ چلا کہ دو چار دن سے وہ وہاں بھی نہیں آئے۔ وِیٹر نے یہ بھی بتایا کہ چار پانچ روز قبل روما کسی بات پر ان پر بہت غصے ہو رہی تھی۔ دلبر بھائی سر جھکائے بیٹھے تھے اور ان کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ اس کے بعد سے ہی دونوں نظر نہیں آئے۔ ہم دونوں نے فاؤنٹن کا ایک ایک ہوٹل دیکھ ڈالا مگر ان کا کہیں پتہ نہ تھا۔ مجھے اب تشویش سی ہو گئی کہ دلبر بھائی کہیں کچھ ______

آخر میں نے محمود کو رخصت کیا اور روما کے کالج پہنچا۔ وہاں پتہ چلا کہ روما کالج نہیں آ رہی ہے۔ میں روما کے گھر چلا گیا۔ روما کے والدین خود حیران پریشان تھے۔ انھوں نے بتایا کہ گزشتہ کئی روز سے روما بہت اپ سیٹ ہے بس روتی رہتی ہے۔ روما کے گھر تو میں چلا گیا مگر اس کے والدین سے بات کرتے ہوئے خیال آیا کہ کہیں مجھ سے ملنے سے وہ انکار نہ کر دے۔ دلبر بھائی کے ساتھ میری بھی پوزیشن مشکوک ہو گئی تھی۔

وہ رو رہی تھی مگر دل تو اب بھی رنج سے بھرا ہوگا۔ دل کی بات وہ کس سے کہتی۔ سہیلیوں سے ملنا جلنا تو قریب قریب ختم ہی ہوگیا تھا۔

"کیسے آنا ہوا؟" اس نے کچھ انجان بن کر کہا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ میں دلبر کی طرف سے کچھ پیغام لے کر آیا ہوں۔

"دلبر بھائی گھر سے تین دن سے غائب ہیں۔"

"کیا؟" وہ کچھ گھبرا سی گئی۔ "تمھیں کیسے معلوم؟"

"ان کے فادر میرے گھر آئے تھے۔" میں نے کہا "میں فاؤنڈیشن کے سب ہوٹل، کالج ہر جگہ دیکھ چکا ہوں۔"

روما کے چہرے پر فکرمندی کے آثار اُبھرے اور مٹ گئے۔ اس کی جگہ پر چہرے پر کچھ سختی سی نظر آنے لگی۔

"تم نے مجھے کبھی بتایا نہیں؟" اس نے غصیلی آواز میں کہا۔

"کیا؟"

"تم سب ایک ہو۔" اس نے نفرت سے ہونٹ سکوڑا۔ "بھلا تم کیوں بتاتے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" میں جان کر انجان بن گیا۔

"آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔"

"کیا تم مجھے نہیں بتا سکتے تھے کہ دلبر مسلمان ہے۔" اس نے قریب قریب چیختے ہوئے کہا۔

"تو آپ کو واقعی معلوم نہیں تھا؟" میں نے بناوٹی حیرت سے پوچھا۔ "میں تو سمجھتا تھا کہ انھوں نے آپ کو بتا دیا ہوگا۔"

"بنومت۔" روما کی آواز بھر آگئی۔ "تم لوگوں نے مجھے بیوقوف بنایا۔ آخر میرے ساتھ اس مذاق کی تم لوگوں کو کیا ضرورت تھی۔"

اس نے مجھے بتایا کہ دلبر بھائی اور روما سہیلی شاردا نے انھیں دیکھا۔ شاردا ہمارے کالج کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اس نے روما سے پوچھا کہ دلبر سے اس کی دوستی کیسے ہوئی۔ اس طرح دلبر بھائی کا راز فاش ہوگیا۔ اگلے روز روما نے دلبر بھائی کو خوب جھاڑا اور گھر چلی آئی۔ اسے زبردست صدمہ پہنچا تھا جو یقینی تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ دلبر بھائی اس کے ساتھ اس طرح فریب کر سکتے تھے۔

روما پھر رونے لگی۔ میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی دلبر بھائی اُس سے بے حد محبت کرتے ہیں اور اسے کھونے کے ڈر سے ہی انھوں نے اسے نہیں بتایا مگر اُسے بے حد غصہ اور رنج تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ وہ دلبر کو کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ کبھی نہیں۔

آخر میں نے روما سے کہا۔

"روما جی، یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ مگر اس وقت تو سوال یہ ہے کہ وہ ہیں کہاں؟"

"مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔" روما نے کہا۔ "میں اب اُس کا مُنہ بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔"

"تو میں چلتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "آپ کو اختیار ہے۔ مگر مجھے ڈر ہے کہ کہیں انھوں نے آتم ہتیا نہ کر لی ہو۔"

"نہیں" روما چیخ سی اُٹھی۔

میں باہر آگیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کروں۔ تھکا ہارا گھر لوٹا۔ ابھی جوتے اتارے ہی تھے کہ دلبر بھائی کے والد پھر تشریف لائے۔ میں نے اُنھیں بتایا کہ دلبر بھائی کی تلاش میں اب تک کامیابی نہیں ہوئی۔ میں نے اُنھیں تسلی دی۔

دوپہر میں پھر دلبر بھائی کی تلاش میں نکلا پھر سارے ہوٹل دیکھ ڈالے۔ میرین ڈرائیو کا چپّہ چپّہ [illegible] ساحل پر بیٹھ گیا

اور موجوں کو بنتے بکھرتے دیکھنے لگا۔ پیروں کو آرام ملا۔ آگے کا لائحۂ عمل سوچ ہی رہا تھا کہ اشوک اور کالج کے کئی ساتھی نظر آئے۔

"تم یہاں بیٹھے ہو اور ہم کب سے تمھیں رہے ہیں۔" اشوک نے کہا۔

"کیوں کیا بات ہے؟"

"ارے۔" محمود نے کہا "تمھیں پتہ دلبر بھائی تین دن سے گھر نہیں پہنچے۔"

"ہاں یار۔" میں نے جواب دیا۔ "م انہی کو تلاش کرنے نکلا ہوں مگر کہیں پتہ چلا۔"

ایک ناریل والا ہمارے قریب سے گ نے اس سے ناریل کا پانی پلانے کے لیے کہ نے سر سے ٹوکرا اتارا اور ہمارے لیے ناریل لگا۔

ہم لوگ ناریل کا پانی پی رہے تھے کے اندر دُور تک چلی گئی تھی سڑک پر کوئ بہت دھیمے دھیمے چلتا نظر آیا۔ دُور سے اس دلبر بھائی کی طرح ہی تھی۔ ہم سب اس کی دوڑے۔ اس کی چال ایسی تھی کہ اب گر کپڑے میلے چیکٹ ہو رہے تھے۔ داڑھی بڑ تھی۔ نزدیک پہنچ کر ہم نے دیکھا۔ وہ دلبر ہی تھے۔

ہم نے انھیں سلام کیا مگر انھوں جواب نہیں دیا۔ اُنھوں نے شاید ہمیں پہچا میں نے جھجکتے ہوئے ان کا ہاتھ پکڑا۔

"دلبر بھائی۔"

میں نے انھیں پکارا مگر ہاتھ پکڑ احساس ہوا کہ ان کا بدن بخار سے جل ر

ہم انھیں ٹیکسی میں ڈال کر ہسپتا میں نے محمود کو دلبر بھائی کے گھر روانہ

والد کو اطلاع دے۔

دلبر بھائی کئی دن حیات و موت کی کشمکش ہے۔ اس دوران روما نے کئی بار مجھ سے رابطہ نے کی کوشش کی مگر ملاقات نہ ہوئی۔ کئی روز ار اُترا۔ دس روز بعد ڈاکٹر نے انھیں گھر نے کی اجازت دی۔ مگر تاکید کی کہ کم از کم مہینہ بستر سے نہ ہلیں۔

بستر پر لیٹے لیٹے وہ ہمہ وقت خلا میں گھورتے ۔ میں نے کئی بار اُن سے گفتگو کی کوشش کی انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

ایک روز وہ بستر پر لیٹے حسبِ معمول خلا میں رہے تھے اور میں اُن کے قریب کرسی پر بیٹھا ہوا انھوں نے بڑی کمزور آواز میں کہا۔

" روما سے ملے تھے ؟"

" ہاں" مجھے خوشی ہوئی۔ دس روز میں پہلی انھوں نے کچھ کہا تھا۔

" بہت ناراض ہے مجھ سے ؟"

" بہت "

" یار بڑی غلطی ہوئی۔ سوچ رہا تھا بتادوں۔ سے کئی بار گفتگو ہوئی تھی۔ پر ہمت نہ پڑی "

" ایک کام کروگے ؟" دلبر بھائی نے لجاجت کہا۔

دلبر بھائی اور اس طرح لجاجت سے کام ں میں کٹ گیا۔

" کہیے، میں ضرور کروں گا "

" روما سے ملو" دلبر بھائی نے کہا "اُس سے ا مجھے معاف کردے۔ جاؤ ابھی جاؤ۔ اسی وقت "

باہر آیا تو خان صاحب ساتھ ہولیے۔

" بیٹا ام تم سے بہوت کھوش " انھوں نے

میں بھلا کیا جواب دیتا۔

" ایدر آؤ۔ آج ام تم کو چائے پلائے گا"

میں سعادت مندی سے ان کے ساتھ ہولیا۔ ملباری کے ہوٹل میں انھوں نے دو خاص ملائی والی چائے کا آرڈر دیا۔ اور چائے پیتے ہوئے بولے۔

" دیکھو بچہ، ہم آج تک تم سے نئیں پوچھا کہ یہ سب کیا معاملہ ہے۔ ام تمھارے باپ کا مافک ہے۔ تم سچ سچ بتاؤ کیا بات ہے"

میں نے سوچا اچھا ہے خان صاحب کے ردِ عمل کا بھی پتہ چل ہی جائے۔ میں نے خان صاحب کو تمام باتیں بتائیں سوائے اس آخری بات کے جو دلبر بھائی نے کہی تھی۔ خان صاحب نے صبر و سکون سے میری پوری بات سنی پھر کچھ دیر کے لیے تفکر میں غوطہ زن ہوگئے۔ پھر کہا۔

" بیٹا اس کا حل کیا ہے۔ وہ چھوکری کو تم سمجھاؤ اتنا اچھا لڑکا اس کو زندگی میں نئیں ملے گا۔ شریف، اچھا خاندان کا، خوش شکل، تعلیم یافتہ۔ تم بتاؤ بچہ۔ اتنا اچھا لڑکا اس کو کہاں ملے گا؟"

" آپ کی بات درست ہے خان صاحب" میں نے کہا "مگر اس کا مذہب الگ ہے۔ اس کے والدین برہمن، وہ بھلا کب اجازت دیں گے"

خان صاحب سوچ میں ڈوب گئے پھر بولے۔

" بچہ تم ٹھیک بولتا۔ اس کا ماں باپ کہاں پسند کرے گا کہ اس کا بچی غیر مذہب میں شادی بنائے۔ لیکن یہ بچہ، اس کا زندگی ام کو جان سے زیادہ عزیز۔ ام تم کو سچ بولتا، یہ بچی، اس ذلیل

کرو۔ ام خدا سے دُعا مانگے گا کہ اللہ تعالیٰ دونوں کو راہِ ہدایت نصیب کرے۔ ام سچ بولتا ام اپنا بچے کے آڑے نہیں آئے گا۔ اس کا زندگی ہم کو جان سے زیادہ عزیز۔ تم کوشش کرو کہ دونوں مل جائیں۔ جیسا بھی ممکن ہو"

مجھے خان صاحب کے جذبۂ پدری پر حیرت ہوئی۔ باپ کی محبت بھی کہیں اس قدر شدید ہوسکتی ہے۔ شاید اپنے بچے کو اس حالت میں دیکھ کر وہ بالکل ٹوٹ گئے تھے۔

" امارا ایک ہی اولاد" خان صاحب آبدیدہ ہوگئے۔ "اب آگے جو خدا کا مرضی۔ اس کا مشیئت اس کو مالوم۔ ام تو ہار گیا۔ بچہ ام تو ہار گیا"

خان صاحب نے رومال کے گوشے سے آنسو پونچھے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

گھر آیا تو پتہ چلا کہ روما محمود کے ساتھ گھر آگئی۔ محمود اور گھر والوں نے اُسے بتا تو دیا تھا کہ دلبر بھائی اب خطرے سے باہر اور روبہ صحت ہیں۔ لیکن شاید وہ مجھ سے مل کر اطمینان کرلینا چاہتی تھی۔ خان صاحب سے مل کر تو میں اس قدر متاثر ہوا تھا کہ سوچا تھا فوراً روما سے ملوں گا۔ لیکن جب پتہ چلا کہ روما گھر آگئی تو پھر روما سے ملنے کو میرا جی نہیں چاہا۔ دلبر بھائی کا وہ لجاجت بھرا چہرہ میری نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ مجھے جیسے خود پر غصہ آنے لگا۔ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے یہ شکست دلبر بھائی کی نہ ہو میری اپنی ہو۔ دلبر بھائی کی معافی کی بات اگر میں کہہ دوں تو ان کا بھرم جو میری نظروں میں تھا ٹوٹ جائے گا۔ میں دو روز نہ روما سے ملا نہ دلبر بھائی سے۔ تیسرے دن دلبر بھائی سے ملا تو میں نے بہانہ بنایا کہ روما سے ملاقات نہیں

گفتگو کر رہے تھے۔ دو جملے کہتے تو ہانپنے لگتے۔ یر تک خاموش رہتے۔ ایسے ہی خاموشی کے بل وقفے میں میری نظر دروازے پر پڑی اور روما روازے میں کھڑی نظر آئی۔ اس کے پیچھے محمود کھڑا وا تھا۔ دلبر بھائی اُسے دیکھ کر سکتے میں رہ گئے۔ شاید ہ بھی دلبر بھائی کی اس حالت زار کو دیکھ کر گنگ ہ گئی۔

میں باہر نکل آیا اور محمود سے بات چیت کرنے لگا۔ بعد میں دلبر بھائی نے بتایا کہ روما شادی کے لیے راضی ہو گئی ہے۔

"تو آپ مذہب تبدیل کر رہے ہیں؟" میں نے ان سے پوچھا۔

"میں نے تو اس سے کہا کہ اگر وہ چاہے تو اس کے مذہبی طریقے سے بھی شادی کی رسم انجام دینے کے لیے تیار ہوں لیکن وہ سول میرج پر مصر ہے۔ اُسے بس اس بات کا غصہ ہے کہ میں نے اُس سے یہ بات کیوں چھپائے رکھی کہ میں مسلمان ہوں۔"

●

آج جب میں روما کو نشان پاڑہ کی تنگ گلیوں سے اپنی مخصوص انداز کی تو وار کی مراہٹی ساڑی میں، ماتھے پر بندیا لگائے اعتماد و تمکنت کے ساتھ خوش خوش بس اسٹاپ کی طرف بڑھتے دیکھتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ کوئی لڑکی پیڈر روڈ کے پانچ کمروں کے فلیٹ سے نکل کر اس کھولی میں بھی اس قدر خوش رہ سکتی ہے۔ خان صاحب اور روما میں بڑی اچھی سوجھ بوجھ ہے۔ دلبر بھائی ایک سگریٹ کمپنی میں سیلز آفیسر بن گئے ہیں۔ ان کی شامیں آج بھی میرین ڈرائیو کے کسی ہوٹل میں گزرتی ہیں۔ روما کے والدین شروع میں بہت ناراض ہوئے۔ دو ایک سال بعد غصہ ٹھنڈا ہوا تو دلبر بھائی کو کسی فرم میں ڈائریکٹر بنوانا چاہا مگر دلبر بھائی نے منظور نہیں کیا۔ وہ اپنی ملازمت میں خوش ہیں۔ ہندوستانی فلسفہ اور بنگالی فلمیں آج بھی انھیں محبوب ہیں۔ مجھے نہ ہندوستانی فلسفے سے رغبت تھی اور نہ بنگالی فلموں سے پھر بھی جب کبھی میرین ڈرائیو کی طرف جانا ہوتا ہے اور کبھی کبھی ہی ہوتا ہے۔ کیوں کہ میں خود ایک قومی بینک میں ملازم ہوں اور شادی کے جھمیلے میں گرفتار ہو چکا ہوں۔ میں دلبر بھائی اور روما سے ضرور ملتا ہوں اور ان کی پیچیدہ گفتگو کو خندہ پیشانی سے سنتا رہتا ہوں۔ ○

غزلیں

آرزوؤں کا نگر چھوڑ آئے
ناز تھا جس پہ وہ گھر چھوڑ آئے

اک تری یاد بچا کر رکھ لی
سارا سامانِ سفر چھوڑ آئے

مدّتوں یاد رکھے گی ..... دُنیا
ہم بھی اک ایسا ہنر چھوڑ آئے

تھک گئے جب کوئی کھڑکی نہ کھُلی
ہم وہیں دیدۂ تر چھوڑ آئے

اُس کو آئے ہی بنے گی رحمت
آج اک ایسی خبر چھوڑ آئے

حادثوں ہی میں زندگی جی ہے
ہم نے قسطوں میں خودکشی کی ہے

جھک کے جینا ہمیں نہیں آتا
اور آواز بھی کچھ اُونچی ہے

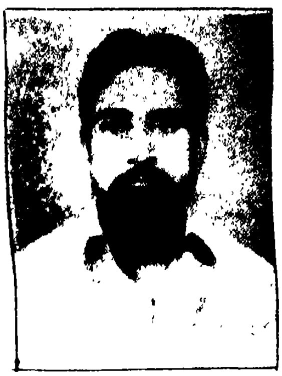
آپ سے کچھ گلا نہیں صاحب
اپنی تقدیر ہی کچھ ایسی ہے

چہرہ اُس کا کتاب جیسا ہے
اور رنگت گلاب کی سی ہے

ہم نے رحمت غزل کے لہجے میں
میر صاحب سے گفتگو کی ہے

رحمت امروہوی





صفدر

افق سے دُور بہت دُور دیکھ سکتا ہ
تری زمیں سے بڑی اک زمیں پہ تنہا ہو

وہ خوش ہوا ہے نہ غمگین اس خبر سے
ضرور تھا کہ کہوں خیریت ہے اچھا ہو

اگر ہو تیشۂ اندیشہ ہاتھ میں میر۔
یقین ہوتا ہے میں پربتوں سے اُونچا ہو

نہ اس میں رنگ ہے کوئی نہ کوئی چہرہ۔
میں آئینے کو مگر دُور سے پرکھتا ہ

وہ مہربان مربّی تو ہو گئے رخصت
اب اپنی ذات سے بے سود کیوں الجھتا ہ

ف۔ س۔ اعجاز

خوابوں کے اسرار سمجھیے

بہت سے لوگ خوابوں کو 'رات کے لطیفے' قسم کی کوئی چیز سمجھتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی دوست کارخانے یا دکان میں آتا ہے اور کہتا ہے: "میں نے کل رات ایک انتہائی عجیب خواب دیکھا" دراصل یہ ایک عمدہ کہانی کا دلچسپ آغاز ہوتا ہے۔ جس میں عموماً بڑے عجیب خیالات کا مجموعہ دیکھنے میں آتا ہے' غالباً اس داستان کو کوئی شریک کار یا رفیق بھی نظر آتا ہے جو انتہائی غیر ممکنہ حالات میں گھرا ہوتا ہے' یا یہ کہانی دہشت اور خوف سے اس قدر پُر ہوتی ہے کہ کوئی بھی اس کے وجوہ کو نہیں سمجھ سکتا۔ عام ردِّ عمل صرف یہ ہوتا ہے کہ اس کے عجوبے پن پر آدمی حد درجہ متعجب رہ جاتا ہے' اور پھر اسے بھول جاتا ہے۔ لیکن خوابوں سے آپ لطیفوں اور عجیب داستانوں کے علاوہ بھی کچھ حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کتنی دلچسپ حقیقت ہے کہ لوگ ہمیشہ اپنے خواب کسی سے کہنا چاہتے ہیں۔ جیسے یہ کوئی فطری خواہش ہو اپنے تجربے پر واپس جانے کی' اسے دہرانے اور ایسا سوچنے کی۔ تھوڑے سے علم اور تجربے کی مدد سے آپ اپنے بارے میں اور اپنے دوستوں کے بارے میں چند قیمتی باتیں معلوم کر سکتے ہیں ــــــ کردار' نظریات' عزائم و مقاصد اور اُن کے مسائل کے بارے میں جنھوں نے آپ کے لاشعور کو پریشان کر رکھا ہے۔

اہم ترین کام یہ سمجھنا ہے کہ خواب غیر منظم اور احمقانہ تو نہیں ہے۔ آپ کا دماغ آرام پذیر نہیں ہے اور خیالات اس میں گھٹنوں کے بل رینگتے ہوئے داخل ہوتے رہتے ہیں اور ہر چیز کو تہ و بالا کرتے رہتے ہیں اور یہ سب اس عرصے میں ہوتا ہے جب آپ کا جسم سُستا رہا یا آرام کر رہا ہوتا ہے۔ خواب دماغ کی تاریک دنیا کو خوفزدہ کر دینے والا کوئی نظارہ بھی نہیں ہیں۔ خواب دیکھتے رہنا کوئی خطرناک یا نقصان دہ عمل نہیں ہے' اور نہ آپ کو اس سلسلے میں وہم زدہ ہونے کی ضرورت ہے۔

نفسیات اور خواب

بہت سے لوگ سوچتے ہیں کہ خواب کی توضیح کے سلسلے میں 'دماغ' اور 'نظریہ لاشعور' سے متعلق یا تحلیلی نفسیات کے بارے میں جتنی بھی گفتگو ہوتی ہے وہ احمقانہ ہوتی ہے' لیکن آپ کو یہ سمجھنے کی غلطی نہیں کرنی چاہیے کہ یہ ایک نقلی علم ہے جو صرف برائے تفکر و تمسخر ہوتا ہے۔ مشہور معالجینِ امراضِ نفسیات مثلاً فرائڈ اور ژُنگ کی تحقیقات نے ہزاروں معتدل اور صحت مند لوگوں کو اپنے انتہائی درجے ذہنی خلل کے بارے میں خاموشی اختیار کرنے کا سلیقہ سکھا دیا ہے۔ ان کی تحقیقات کو کسی بھی فرد کے روزمرہ کے تجربات پر منطبق کیا جا سکتا ہے۔ نہ تو آپ کو اس کے لیے اعصابی بدنظمی کا شکار ہونا پڑے گا اور نہ وہمی اور حد درجہ سنجیدہ جس طرح ڈاکٹر سخت طبعی بیماریوں کا علاج معمولی طریقے پر کرتے ہوئے بھی دنیا کو بھی یا گھر صحت کے اصول سمجھا دیتے ہیں ٹھیک اسی طرح ماہرین نفسیات نے متوازن انسانوں کو یہ بھی دکھایا ہے کہ کس طرح وہ زیادہ سے زیادہ خود آگاہ ہو سکتے ہیں اور خوش ترین اور بھرپور زندگی گزار سکتے ہیں۔

خواب کیا ہیں؟

خواب دراصل ہوتے کیا ہیں؟ خوابوں کے معانی سے متعلق کئی نظریات ہیں لیکن ہر نظریہ بنیادی طور سے اس پر متفق ہے کہ یہ لاشعوری دماغ کی پیداوار ہیں۔ اس کی بہترین تشریح کے لیے ہم اس پر غور کریں کہ جب لوگ دن میں خواب دیکھتے ہیں تو کیا ہوتا ہے۔ دماغ بہت جاگا ہوا اور آگاہ یعنی باشعور ہوتا ہے۔ آپ چاہے شاپنگ کے لیے نکلیں یا بنائی کے کورس پر جائیں یا کچھ کاغذات فائل کرنے میں مصروف ہوں آپ کے افکار اپنے طور سے بھٹکتے رہتے ہیں۔ شاید آپ گذشتہ شب کی باتوں پر غور کر رہے ہوں یا یہ سوچ رہے ہوں کہ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے۔ کبھی کبھی یہ دن کے خواب حقیقت سے بالکل بے تعلق ہوتے ہیں۔ لوگ تصور کرتے ہیں کہ وہ کریبین CARRIBLEAN کے خوبصورت ساحلوں پر لطف اُٹھا رہے ہیں: ارب پتیوں سے ان کی شادی ہو گئی ہے۔ اس عرصۂ خیال میں دن کا خواب کتنا واضح اور سچا نظر آتا ہے

مدیر ماہنامہ 'انشار' ۶-۱ اے کمناتی سیل اسٹریٹ' کلکتہ ۱۳..

لیکن جہاں آپ اس سے باہر نکلے آپ کو یہ سب بُھلا دینا کتنا آسان لگتا ہے۔ ایسا ہی کچھ خوابوں میں بھی ہوتا ہے جب لوگ سوئے ہوئے ہوتے ہیں۔ شعور جو کہ دماغ کا نگراں ہوتا ہے راحت پذیر ہو جاتا ہے (اگرچہ اس کے تمام اختیارات معطل نہیں ہو جاتے) اور افکار، خیالات اور محسوسات کی ایک ڈوبی ہوئی سطح اُبھر آتی ہے۔ کیوں کہ دماغ یہ حصہ اپنی ہی منطق کے تابع ہوتا ہے۔ یہ تمام ں اپنے راست طریقے سے اپنی لفظی تصاویر اور اہر غیر عقلی روابط کے ذریعے بیان کرتا ہے۔ یہی بب ہے کہ لوگ خوابوں میں ناممکن کام کر گزرتے ں اور بڑی سرعت کے ساتھ ایک سے دوسرا ظر بدل جاتا ہے۔ لاشعوری ذہن اپنی منزل پر نچنے کے لیے اس منطقی سلسلے اور ترقی کا محتاج ہیں ہوتا جس کی ضرورت بیدار یا شعوری دماغ و پڑتی ہے۔

خوابوں کی دیگر خصوصیت جو ایک خواب بہرانے والا تسلیم کرتا ہے یہ ہے کہ اکثر یہ غیر معمولی ور پر واضح اور صاف ہوتے ہیں ـــــ مرئی طور سے ہوں یا مزاجاً۔ کبھی کبھار ان کے پیدا کردہ محسوسات تنے طاقتور ہوتے ہیں کہ خواب دیکھنے والے کے مزاج ر دوسرے دن تک چھائے رہتے ہیں۔ مثال کے طور سے ایک کامیاب کاروباری نے اپنے ابتدائی عہد ے خوابوں کو ترتیب دیا۔ جو سب کے سب ایک نگی صورتحال سے مشابہہ تھے (جنگ دباؤ یا نتشار کی کلاسیکی علامتوں میں سے ایک ہے) ابتدا جب وہ اپنے بل بُوتے پر کام کر رہا تھا اس کے خوابوں میں اس کی اپنی کوششیں ملوث تھیں جن کے ذریعے وہ کسی بے نام خوف یا ڈر سے گریز کرتا تھا اور یہ کئی بھیسوں میں نمایاں ہوا۔ اس کے شعبہ سنبھال لیا تو اس کا جنگی خواب صرف اس تبدیلی کے ساتھ جاری رہا کہ وہ حملہ آور ہونے کے لیے دیگر لوگوں کے بندوبست میں جُٹا ہوا ہے یا ایسی ہی مصروفیات میں اُلجھا ہوا ہے۔ بظاہر وہ ان خوابوں کی مرئی تفصیلات بیان نہیں کر سکا ـــــ سوائے جنگی اندازِ ترتیب کے ـــــ لیکن خوف، انتشار اور نا اُمیدی کے محسوسات جو ان خوابوں سے وابستہ تھے وہ بالکل واضح تھے۔

اس کا دل خوش کن پہلو یہ ہے کہ بڑی خوشی یا کامیابی کا خواب دیکھنا بھی بالکل عام ہے جس کے مسرت کے جذبات اُبھرتے ہیں۔ چھوٹے بچے عموماً اپنے آپ کو تحفہ پائے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ان میں فخر اور خوشی کے محسوسات بیدار ہو جاتے ہیں لیکن ان کا دل تھوڑا ہو جاتا ہے جب وہ سمجھ لیتے ہیں کہ انھوں نے صرف ایک خواب دیکھا تھا! ایک مثالی کہانی اس بچے کی ہے جس نے اپنی ماں کو پچھلی رات میں دیکھا ہوا خواب بتایا۔ ایک بھیڑیا خواب میں اس کے پیچھے لپک رہا تھا۔ اس نے بچنے کے لیے باورچی خانے کے دروازے سے گھر میں آنا چاہا۔ لیکن دروازہ نہیں کُھل رہا تھا۔ اس نے کوشش کی اور کرتا رہا بھیڑیا اس کے بالکل قریب آیا ہی تھا کہ دروازے کا ہینڈل سرک کر ڈھیلا ہو گیا۔ اور آخری لمحے میں لڑکا اندر داخل ہو کر بچ گیا۔ لڑکے کی ماں نے خواب سُن کر عادتاً اپنے بچے سے کہا "ارے چھوڑ نا۔ یہ تو خالی ایک سپنا تھا۔" اس پر بچے نے حجت کی "جو بھی ہو ممی اب کے میرے خواب دیکھنے سے پہلے تم دروازہ ضرور کُھلا رکھنا!" بچوں کو لاشعور کی اندرونی فضا اور شعور کی باہری فضا کے بیچ ایک فرق کو سمجھنا پڑتا ہے۔ بعض پُرانے قبیلے آج بھی ان دونوں کے فرق کو نہیں سمجھ پائے۔

ہے۔ اس سے یہ حقیقت بھی منسلک ہے کہ خواب ازخود وارد ہوتے ہیں اور ہم انھیں وارد ہونے پر مجبور نہیں کر سکتے اور نہ ان کے مختلف اجزاء پر قابو پا سکتے ہیں۔

خواب کیا کرتے ہیں؟

خواب کاہے کو ہوتے ہیں؟ بنیادی طور سے یہ ایک ذریعہ ہوتے ہیں جس کی مدد سے 'لاشعور دماغ' تجربات کو مُنتا اور چھانٹتا ہے۔ اگر آپ یہ محسوس کریں کہ آپ کا دماغ وصولیابی کا ایک بڑا محکمہ ہے جس میں تمام قسم کی اطلاعات روزانہ پہنچتی اور وصول کی جاتی ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ ایک اہم کام انجام دینا دماغ کا فرض ہے۔ دورانِ نیند جب دماغ کا شعوری حصہ بے عمل یا ساکت ہو جاتا ہے اس وقت لاشعور ایک وسیع مواد کی تیاری کرتا رہتا ہے ـــــ نئے حقایق، حالات، ماضی کے تجربات، غیر حل شدہ مسائل، قوت، خواہشات اور بہت کچھ۔ یہ دماغ کے عمیق ترین شگافوں میں سے جذبات کو برآمد کرتا ہے اور ان تمام نئی اطلاعات کو ملحوظِ خاطر رکھتا ہے جو شعور نے حاصل کی ہیں۔ اس کے بعد اپنے انوکھے طریقے سے یہ آپ کے سامنے ایک مرئی اور جذباتی شبیہہ پیش کر دیتا ہے جسے خواب کہتے ہیں۔ ممکن ہے کوئی ایسا مسئلہ ہو جسے آپ شعوری طور سے پسِ پشت ڈالے ہوئے ہوئے ہوں کیوں کہ آپ کو اس بارے میں سوچنا اور غور کرنا پسند نہیں ہے۔ تاہم یہ مسئلہ ہے تو اپنی جگہ برقرار۔ اور ایک خواب میں آپ کے سامنے اُبھر کر آ سکتا ہے۔ چھٹائی کا شعبہ ایک پیغام بھیج رہا ہے: "اسے نہ بھولو۔ اسے نظر انداز نہ کرو۔" کبھی کبھار ایک خواب اس مسئلے کا حل بھی تجویز

اشعور کی گہرائی سے جبلت، وجدان اور
پیدا ہوتے ہیں۔ چھنٹائی کھر (-SORT
ING -) کے عمل کے ذریعے یہ خواب میں
ے ہیں اور دماغ پر گہرا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔
ں طرح لوگ مسئلوں کو ارادتاً یک طرفہ بیان
ی طرح وہ حقیقی محسوسات کو بھی نظرانداز
۔ کتنی دلچسپ بات ہے کہ اکثر لوگ
ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں'
، یا یہ کہ "ہم تو اپنے دل کی گہرائیوں
کرتے ہیں اور ہمارا تو یہ خیال ہے"۔
میں وہ اپنے دماغ کے اس سب
ہ کو باہر لاکر پیش کرتے ہیں جہاں
ں محسوسات اپنے صحیح روپ میں

لینے کے بعد کہ یہ مواد آپ کے خوابوں
نا ہے آپ اپنی سرشت کے بارے
ل سے جاننا شروع کر دیتے ہیں اپنے
ر رویوں، محسوسات و ضروریات
ر کے نیز خوابوں کی تصویروں کو
سے مربوط کر کے اپنی زندگی کے
رفت کو مضبوط کر سکتے ہیں۔ تاہم تمام
ں پیدا کرنے والے نہیں ہوتے اور
ائل کُشا ہوتے ہیں؛ البتہ یہ آپ کی
قے کے آئینہ دار ضرور ہوتے ہیں' اکثر
ں سے آپ نمٹنے میں شاذ ہی کامیاب

نہیں دیکھتے

ں کے بارے میں سوچنا مفید ہے
نیں یاد کیوں نہیں کرتے ؟ کیا ان میں

طور سے خوش اور اوسط انسان ہیں اور ہمیشہ خواب دیکھنے والوں کے مقابلے میں ان میں کوئی عیب نہیں پایا جاتا۔ تجربہ گاہ ELECTRO ENCEP-HALOGRAPH (یعنی EEG) مشین کے ذریعے دماغی 'لہروں' کا ریکارڈ دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ جو لوگ خواب یاد نہیں کرتے ان کے ریکارڈ کردہ خاکوں کی ساخت ایسی ہے جیسی خواب یاد کرنے والوں کی ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہر شخص رات کو متواتر وقفوں میں خواب دیکھتا ہے۔ اور جو لوگ اس خیال میں مبتلا ہیں کہ وہ خواب کبھی نہیں دیکھتے وہ یا تو اپنے خواب بھول جاتے ہیں یا پھر رات میں "فکروں" میں گھرے رہتے ہیں جنھیں وہ خواب سے تعبیر نہیں کرتے۔ ان کی کیفیت دن کے خوابوں سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ اگر آپ کوئی 'خواب فراموش' ہیں تو بعض ایسے لوگوں سے خوابوں پر بحث کر کے دیکھیے جنھیں ان کے خواب نہیں بھولتے۔ اس کا کافی امکان ہے کہ آپ اپنے خوابوں کو یاد کرنا اور دہرانا شروع کر دیں گے۔

خواب آپ کو کیا بتا سکتے ہیں

جو لوگ خواب یاد رکھ سکتے ہیں ان کے لیے اگلا قدم یہ ہے کہ وہ خواب کے پیچھے چھپے ہوئے معنی کو بے نقاب کرنے کی کوشش کریں۔ اس مضمون کی کلید ایک امریکی ماہرِ نفسیات کیلوین ہال (CALVIN HALL) کی یہ رائے ہے کہ "خواب اپنے ہی نام لکھا گیا اپنا خط ہوتا ہے"؛ ایک بار آپ نے اس نجی خط کو پڑھنا سیکھ لیا تو چند دِلرُبا حقیقتیں آپ پر واضح ہو کر رہیں گی۔ یہ عقیدہ تو خیر آپ ہرگز نہ رکھیں کہ خواب آپ کے سبھی مسئلوں کا حل پیش کر دیں گے۔ کسی خواب نے کبھی خسارے کے بچے کو راج ہنس بنا سکا۔ تاہم یہ آپ کو یہ سمجھانے میں معاون ثابت ہو سکتا ہے کہ دولت ہی "کل اہم شے" نہیں ہے یا یہ کہ ایک حسین چہرہ یا پری پیکر ہی زندگی کا آغاز یا انجام نہیں ہے۔

اپنے خوابوں کے محاسبے کے لیے بہترین طریقہ یہ ہے کہ اگلے دن آپ انھیں یاد کریں۔ بے کار محض طور پر ہی کتنا ہی احمقانہ خواب کیوں نہ دیکھا ہو آپ اس کا جائزہ لیں۔ اس سے آپ کو مدد ملے گی۔ بعض اوقات اس غور و فکر کے نتیجے میں اچانک ایک خیال آپ کے دماغ میں اُچھل پڑے گا۔ بادی النظر میں آپ کو اس خیال کا خواب سے کوئی تعلق نظر نہیں آئے گا۔ لیکن ذرا زیادہ سوچنے سے اس کا تعلق آپ کی سمجھ میں آسکتا ہے۔ فرض کیجیے ایک دوست نے آپ کو کسی سے متعارف کرایا جس کا آپ نے بہت ذکر اور تعریف سُن رکھی تھی۔ لیکن اس سے مل کر تھوڑی سی دیر کے لیے اس کی طرف سے آپ کے دل میں کوئی شک پیدا ہوتا ہے۔ پھر بھی آپ بہت جلد اس خیال کو جھٹک دیتے ہیں اور اس سے گھُل مِل جاتے ہیں۔ آخر میں آپ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ ہستی "اتنی خراب نہیں" یہ قرینِ قیاس ہے کہ اس واقعے کے بعد آپ ایک خواب دیکھیں جس میں یہ پُرکشش اور کامیاب شخصیت ایک مضحکہ خیز پیکر یا ایک مخفی بلا یا ایک حقیر رینگنے والے کیڑے کی شکل میں نظر آئے۔ اس کا انحصار آپ کے اصل نظریے پر مبنی ہو گا۔ وہ پہلا "دبا دیا جھٹکا ہوا" ردِعمل آپ کے خواب میں ظاہر ہو گا اور اس سے ایک نیا ردِعمل پیدا ہو گا۔

اپنے خوابوں کو مندرج کرنا

خوابوں سے آگہی حاصل کرنے کا دوسرا

کیا جائے۔ ایک نوٹ بک رکھیں جس میں ہر خواب درج کر دیا جائے۔ اگر رات کو کسی پریشان کُن خواب سے آپ جاگ جائیں تو اسے قلمبند کرلیں (اس کے بعد آپ کو پُرسکون نیند بھی آجائے گی) یا یہ کہ صبح بستر سے اُٹھنے سے پہلے اسے لکھ ڈالیں۔ صرف معمولی طریقے سے خواب کی بنیادی صورتِ حال لکھنے پر ہی اکتفا نہ کریں۔ مثلاً اتنا لکھنا کافی ہوگا کہ آپ پہاڑ پر چڑھ گئے ہیں بلکہ ایک یا دو جملوں میں لازمی محسوسات کو بھی لکھیں: "میں پہاڑ پر چڑھا۔ بڑی کوشش کی۔ محسوس ہوا کہ کافی وقت لگ گیا اوپر چڑھنے میں لیکن چوٹی پر پہنچ کر بڑی مسرت ہوئی"۔ یہ لکھنا بھی ضروری ہے کہ خواب کے واقعات سے نتیجہ کیا برآمد ہوا۔ اکثر آپ کو معلوم ہوگا کہ جو کچھ آپ دیکھتے ہیں وہ بلا سبب نہیں ہوتا اور ان اسباب کو آپ بیدار زندگی میں بالکل غیر متعلقہ اور غیر منطقی سمجھتے ہیں۔ آئندہ جب آپ اپنے کسی دوست سے اپنا خواب بیان کریں تو اس کا خیال رکھیں کہ کتنی بار آپ یہ کہتے ہیں: "میں نے یہ کام اس وجہ سے کیا"۔ التزام کا یہ احساس اکثر عرصۂ خواب میں کافی مضبوط ہوتا ہے۔ ایک مثال لیجیے: "میں ایک مُنہ بند تنگ گلی اور قاتل راستے پر بھاگ رہا تھا۔ کیوں کہ ایک وزنی ٹنکی مجھ پر لدی ہوئی تھی"۔ واقعات کا تسلسل خواب کی مخفی زبان کا ایک جُز ہے جو آپ کے لیے ایک اطلاع ہے۔ فرض کیجیے ٹنکی ایک آدمی کے مقصد کا احساس ہے تو شاید خواب کا مقصد یہ ہوا کہ اگر کسی مقصد کا پیچھا اکھڑے ذہن سے کیا جائے، جس میں دوسرے امکانات کو لایقِ اعتنا نہ سمجھا جاتا ہو تو یہ ایک غلط خیال ہوگا۔ اس سے مرگ انجام صورتِ حال جنم لے سکتی ہے۔ کسی کام کو واقعات کی ترتیب کے مطابق کرنے کا پیغام دے کر یہ خواب آپ کی مدد کرنا چاہتا ہے۔

قسط وار خواب

اسی طرح خوابوں کی قسطیں بہت کچھ منکشف کر سکتی ہیں۔ اگرچہ خواب دیکھنے والا خود کو ہر جدا خواب میں مختلف دیکھ سکتا ہے لیکن جب ان خوابوں میں ترتیب قایم کی جائے گی تو ایسا نقش اُبھرے گا جو کم از کم اس کے غور و فکر کے علاقے کی نشاندہی کر سکے گا۔

بعض اوقات خوابوں کی قسطوں سے فکر کی ترقی کا پتا چلتا ہے۔ اگر آپ کسی رشتے دار وغیرہ کے ساتھ کوئی تنازع رکھتے ہیں تو خوابوں کا سلسلہ کئی شکلوں میں مثلاً بہت زیادہ جارحانہ یا چاہت اور سُپردگی کے رویے یا نفرت کی شدت میں قاتل بن جانے کے روپ میں نظر آسکتا ہے۔ جس شے کو ایک خواب میں پہچاننا مشکل ہوتا ہے وہ شاید دو یا تین خوابوں کو یکجا کرنے سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ اور ان خوابوں کے عام عناصر بھی نظر آجاتے ہیں۔

ترتیب کا یہ پہلو سمجھنا پہلی نظر میں شاید دشوار ہو۔ یہاں دو خوابوں کی تفصیل دی جارہی ہے:

(۱)

"میں اپنے گاؤں کے اس بڑے اور اجنبی گھر کو جارہی تھی جس میں میرا خاندان حال ہی میں منتقل ہوا تھا۔ لیکن گھر خالی تھا۔ میں رات کے لباس میں اور ایک کمبل میں لپٹی ہوئی تھی اور گاڑی کی اگلی مسافر والی سیٹ پر لے جائی جارہی تھی۔ لیکن ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی نہیں تھا۔ اچانک میں گھر پہنچ گئی کیسے پہنچی یہ یاد نہیں ——— اور ایک کمرے میں پہنچی جہاں ایک شخص دیواری کاغذ (وال پیپر) چسپاں کر رہا تھا۔ یہ ایک عجیب و غریب قسم کا وال پیپر تھا۔ تین حصّوں میں بٹا ہوا پہلا حصّہ ایک چمک دار کرسمس کارڈ تھا۔ دوسرا حصّہ ایک کشتی تھا سنہرے کاغذ سے بنا ہوا ہسپانوی سمندری جہاز نما —— اور تیسرا حصّہ ایسا تھا کہ اس میں کھلونے کا ریم ہوا تھا۔ یہ تقریباً دو فٹ اُونچا اور دوڑ —— پوزیشن میں تھا۔ میں خانہ آرا یعنی ڈیکوریٹر سے چیت کر رہی تھی۔ یاد نہیں پڑتا میں نے اسے کیا تھا؛ البتہ کچھ ایسی بات ہو رہی تھی کہ اس میں کاریگری کرنا پڑے گی جبکہ خانہ آرا بتا رہا تھا کام کتنا عجیب اور حیران کُن تھا۔ بس اسی لمحا میں نے اپنے تن پر دن کے کپڑے دیکھے۔ ستو ایک سہیلی ایک نئے قسم کا کوٹ پہنے نمودار ہوئی بولی "آج میرا سیکھنے جانے کا دن ہے" "مجھے خو سے باہر بھی معلوم تھا کہ وہ منگل کا دن تھا اور م دن وہ کالج جاتی ہے) پھر مجھے کاغذ کا ایک پر جس پر تحریر تھا" براہِ کرم کلائیو کو رات سا بج کر اُنتیس منٹ سے پہلے فون کر لیجیے گا" اس بعد فون کی گھنٹی بجی اور میں جاگ پڑی دوس طرف کلائیو بات کر رہا تھا۔

(۲)

"میں اس سفری تماشے میں شریک تھی۔ ا بہت سے کھلاڑی اس میں شریک تھے۔ لیکن اس مسخرے گُڈّے کے ساتھ تھی جو اس تما کا مالک تھا اور میں انہی باربی اور سِنڈی گڑ میں سے ایک لگ رہی تھی جو انسان تو قطعی نہ معلوم ہوتی تھیں۔ میں نے وہ سب عجوبہ کام کیے صرف ایک کٹھ پتلی یا پُتلا کر سکتا ہے اور جنھیں انسان زخمی کیے بغیر انجام نہیں دے سکتا۔ کیس آخر میں مجھے ایک دھات کا کنگھا ملا جسے مجھے ا مُنہ سے پکڑنا اور گول کرنا تھا جس سے میرا مُنہ سے لہولہان ہوگیا اور اس میں سے کافی خون بہ مجھے اپنے منہ میں اُنگلی داخل کرنا پڑی اور یوں رہنا پڑا تاکہ میں انھیں اپنا خون دکھا کر یہ باور ک

میں سچ مچ ایک انسان ہوں۔"

پہلی جھلک میں نظر آنے کے باوجود ان دونوں خوابوں میں بعض اجزا مشترک ہیں۔ آغاز میں دونوں حالتوں میں خواب دیکھنے والے کے گرد ایک جمود اور مجہولیت سی نظر آتی ہے۔ پہلے خواب میں وہ عورت گاڑی میں لے جائی جا رہی تھی برخلاف اس کے کہ وہ خود گاڑی چلائے اور تمام ڈھکی لپٹی ہوئی، ساکت، بے طاقت ایک ننھے سے بچے کی طرح بیٹھی ہے۔ یہ خیال دوسرے خواب میں ایک "گڑیا" یا "کٹھ پتلی" سے مشابہ ہے جسے اپنی حرکات کے لیے اپنے آقا سے حکم لینا پڑتا ہے۔ دوم یہ کہ دونوں خواب بچوں سے متعلق ہیں۔ گڑیا ایک شے ہے جس کا تعلق بچپن سے ہوتا ہے۔ پہلے خواب میں لڑکی ایک کمرے میں داخل ہوتی ہے جو ایک خوابناک بچہ خانہ (نرسری) ہے اس میں وال پیپر پر خوبصورت کرسمس کارڈ اور کھلونے کا ریچھ (ٹیڈی بیئر) بنے ہوئے ہیں۔ خواب دیکھنے والی شاید خواب کے اس حصے کو کچھ خاص معنی دے سکتی تھی۔ اگر اس کے حافظے پر زور ڈال کر کشتیوں، ریچھوں اور کرسمس سے جڑے ہوئے واقعات کو یاد کرنے کی کوشش کی ہوتی۔ عام معنوں میں یہ شبیہیں اس بات کا رمز ہیں کہ وہ اپنے بچپن کے عہد کی طرف لوٹ کر اس وقت کو تلاش کر رہی ہے جب ہر کام اس کے لیے کر دیا جاتا تھا اور جیسا کہ اس نے خود خواب میں بیان کیا کہ "اس میں کتنی کاریگری کرنا پڑے گی۔"

دوسرے خواب میں بظاہر بچپن کا تعلق گڑیوں پتلوں قسم کی چیزوں سے ہے۔ لیکن ان کا رشتہ حال سے ہے۔ لڑکی اپنے اوپر منحصر ہے لیکن کسی طور ایسے کسی سے وابستہ ہے جو اس کو شاطرانہ چالوں کا مہرہ بنائے ہوئے ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے بہت زیادہ تجزیاتی ذہانت کی ضرورت نہیں پڑے گی کہ حقیقی زندگی میں خواب دیکھنے والی لڑکی کسی ایسے فرد سے وابستہ ہے جو اسے اس کے محسوسات دبانے اور من کو مار کر زندہ رہنے پر مجبور کر رہا ہے۔ ایک عام امکان یہ بھی ہے کہ لڑکی کسی مرد سے کسی قسم کا تعلق رکھنے سے خائف ہو۔ البتہ یہ تو وہی بتا سکتی ہے۔ تاہم آپ بھی ایک باہری فریق کی حیثیت سے خوابوں کے اس سلسلے میں کافی دور تک جا کر کوئی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔ آپ یہ صاف دیکھ سکتے ہیں کہ ایک ہی مسئلہ دونوں خوابوں میں نمایاں ہے۔ گویا ایک لڑکی ہے جو اپنے گھر کے آرام و آسایش کے دنوں کو یاد کرتی ہے اور جسے اب ایک نئے طرزِ زندگی کا سامنا اور نئے لوگوں سے سابقہ ہے۔ لڑکی اپنے اوپر زندہ ہے لیکن اپنے نئے تجربوں اور سابقوں سے اس کا ذہن متذبذب اور دل دکھی ہے۔ پہلا خواب بچپن کی خوشگوار تصویر سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس میں ایک دوسری لڑکی پوشیدہ ہے جو کہتی ہے "میرا آج سیکھنے کا دن ہے" خواب والے کے لیے اس کا پیغام یہ ہے کہ "آگے بڑھو اور پیچھے نہ دیکھو۔ زندگی کے ساتھ چلتے رہو چاہے یہ کتنی بھی کٹھن کیوں نہ ہو۔" اس کی کڑی دوسرے سپنے کے انجام سے ٹھیک مل جاتی ہے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی ایک خارجی تنبیہ اور دباؤ ہے جس سے ذہن میں یہ بات پیدا ہوتی ہے کہ مسئلے کا "رقبہ" یا اس کی واقعیت کا علاقہ یکساں ہے۔ یعنی یہ کہ مردوں کا سامنا ایک بالغانہ سطح پر کرنے پر آمادہ ہوا جائے۔ خوش بختی سے یہ خواب اس لڑکی کو اس پیغام کے ذریعے اس بات پر اکسا رہا ہے کہ "آگے بڑھو اور کوشش کرو۔" دوسرا خواب بھی جو گڑیا سے متعلق ہے ایسے ہی حالات سے دوچار ہے لیکن ممکنہ نتائج کے بارے میں لڑکی کے خوف و اندیشے کو ظاہر کرتا ہے۔ [illegible]

استعمال کیے جانے اور دکھ جھیلنے اور چوٹ سہنے اتفاق سے خواب والی لڑکی اس تشریح کی درستگی پر حیران ہے کیونکہ معقول جواز کے لیے اس پس منظر سے صحیح معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔

وقت غیر اہم ہے

مختلف تصویروں والے ایسے خوابوں کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ محوِ خواب دماغ وقت کا کوئی لحاظ نہیں رکھتا۔ جبکہ وقت بیدار دماغ کے تجربے کا ایک جزو ہے۔ خواب دیکھنے والا دماغ وقت کا پاس رکھنا ضروری نہیں سمجھتا۔ ایک خواب جو آپ نے دس سال پہلے دیکھا ہو اس کا کوئی حصہ آپ کی موجودہ زندگی کے کسی حصے سے بھی تعلق رکھ سکتا ہے۔ واقعات میں مشترک رابطوں اور باتوں کی تلاش کیجیے اور صرف ایسے خوابوں کو رقم کرنے پر ہی زور نہ دیا کریں جو ایک دوسرے سے مربوط اور پیوستہ یا زندگی کے بہت زیادہ جیتے جاگتے اور حساس نظریوں کے ترجمان ہوں۔

اس کا یہ مطلب ہوا کہ اگر آپ کوئی ایسا واقعہ یا منظر خواب میں دیکھیں جو یک لخت آپ کو ماضی کی بات یاد دلا دے تو آپ اسے بھی ضرور ضبطِ تحریر میں لے آئیں۔ تحلیل نفسیات کے ماہرین نے تحقیق سے پتہ لگایا ہے کہ خواب کی بہترین تشریحات میں سے ایک تشریح تو وہ ہوتی ہے جو خود مریض بیان کرتا ہے۔ چنانچہ خوابوں کا غیر طبی مطالعہ کرتے وقت بھی واقعات کا یہ ربط اور پیوستگی آپ کے لیے بہت معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ اوپر جو مثالیں زیرِ بحث آئیں ان پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اگر لڑکی کی یادداشت میں وہ وقت ہوتا جب وہ بہت مغموم اور تنہا تھی تو ظاہر ہے خواب کا مدعا [illegible]

کہتے کہ "تم پھر چوٹ کھاؤ گی جس طرح پہلے کھائی تھی، لہٰذا محتاط رہو۔" بہرصورت مسئلہ یکساں ہے، یعنی ماضی کا حال سے وابستہ ہونا اور وقت کا ترقی کرنا۔

اپنے خواب کس طرح دہرائے جائیں

جو شخص شاید ہی کبھی اپنے خواب دہراتا ہو یا وہ جو دہرا ہی نہیں سکتا اکثر یہ سوچ کر مایوسی کے شکنجے میں پھنسا رہ جاتا ہے کہ وہ کبھی طور سے مستقبل کا حال جاننے سے رہ گیا ہے۔ اسے تھوڑی سی راحت مل سکتی ہے اگر وہ سوچے کہ "آج رات میں ایک خواب دیکھوں گا۔" بعض اوقات اس کے بڑے دلچسپ نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ این فیراڈے (ANN FARADAY) خوابوں کے مشہور برطانوی محقق نے لوگوں کو اپنے خواب یاد رکھنے کے لیے بعض اصول وضع کیے ہیں۔ اس نے سونے کے عام وقت سے دو دو گھنٹے کے وقفے پر الارم گھڑی سیٹ کرنے کی تجویز کی ہے۔ اس سے آپ کافی یقینی طور سے اپنے خواب کا عرصہ حافظے میں محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ نیند میں ایک بار کا خلل بھی کچھ نہ کچھ کارگر ثابت ہوگا۔ کئی بار الارم کے جھٹکے اذیت دہ بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اگر ایک بار الارم لگایا جائے تو یہ آزمائش رات کے پچھلے پہر ـــــ صبح ۳ تا ۵ بجے کے درمیان ـــــ کی جائے۔ یہ زیادہ بہتر ہوگا۔

اگر آپ اس طرح اٹھ گئے تو اس کا قوی امکان ہے کہ آپ اپنے خوابوں کی تفصیل درج کرلیں گے ورنہ اس کی یاد بہت جلد مندمل ہو جائے گی۔ یہ اور بھی بہتر ہوگا کہ آپ ایک کیسٹ ٹیپ ریکارڈر اپنے بستر کے قریب موجود رکھیں۔ یہ بھی ممکن نہ ہو تو اپنے بستر سے خواب کو بیان کردیں یا ذرا اونچی آواز [illegible]

تمام تفصیل آپ کے بیدار دماغ میں داخل ہوکر موجود یاد کا ایک حصہ بن کر محفوظ رہ جائے گی۔

آپ اپنے خوابوں سے خواہ کسی وقت بیدار ہوں، رات ہو یا صبح، یہ مشورہ یاد رکھیں کہ آپ کی حرکت دھیمی اور سست شروع ہونی چاہیے۔ اگر آپ خواب کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں تو حقیقت کے دائرے کے اندر بالکل داخل نہ ہوں۔ اگر آپ بستر سے اٹھ کر جھٹ سے کمرے میں کہیں رکھی ہوئی پنسل اٹھانے دوڑ پڑے تو حافظہ فوری طور سے خواب کے سلسلے میں مردہ ہو سکتا ہے جس سے ذہن میں تعطل یا خلا پیدا ہو جائے گا۔ بیٹھی ہوئی پوزیشن میں آہستہ آہستہ حرکت شروع کریں۔ بعض لوگ چند لمحوں کے لیے اپنی آنکھیں بند رکھتے ہیں اور اس

عرصے میں زیادہ سے زیادہ با...
ہیں۔ ایک خواب میں چھوٹی چھوٹی...
ہو سکتی ہیں بالخصوص ایک عرصہ...
تسلسل سے دیکھتے ہیں چھوٹی...
ثابت ہوتی ہے۔ کسی خواب ک...
دوسرے خواب کے مرکزی...
ہے۔ یا ایک تصویر کے جیسے...
خواب میں بھی پھیر ابھر سکتی...
ہے کہ آپ زیادہ سے زیادہ...
تاکہ غور و خوص کے لیے ہر...
فراہم رہے۔

غزلیں

چاندنی میں یک بیک بکھرے بقا کے دستخط
سطحِ دریا پر ابھر آئے فنا کے دستخط

ریشمیں دل، کھردرے حالات، بالیدہ شعور
کتنی تحریروں کے خالق اک خدا کے دستخط

صندلی احساس میں پھوٹے ہیں یادوں کے گلاب
ثبت ہیں سیمیں ہتھیلی پر حنا کے دستخط

باپ کی تنبیہہ کی حرمت مرے سینے میں ہے
میری پیشانی پہ ہیں ماں کی دعا کے دستخط

بادلوں کو بھی زمیں کی داستاں معلوم ہے
سبز تصویروں کے حامل ہیں ہوا کے دستخط

کرب کی تجسیم، اظہارِ مسرت کی صلیب
خونِ دل، حق گو قلم، جرأت وفا کے دستخط

اظہار مسرت

معرفت بھرتیا ہسپتال، فتح پور، شیخاواٹی ۳۳۳۳۰۱



سید شکیل دسنوی

اس قدر ٹوٹا ہوا ہے یہ کبھی سوچا نہ تھا
ہم نے جب تک پاس سے اس شخص کو دیکھا نہ تھا

چہرے چہرے پر چمکتا تھا، تبسم کا سراب
ذات میں ورنہ سمیٹے کون اک صحرا نہ تھا

کس قدر تشنہ ہیں کانٹے سنگریزے بے قرار
آج تک راہِ وفا سے کوئی کیا گزرا نہ تھا

زندگی بتصویر بنتی کیا نگاہوں میں تری
ہر طرف سائے تھے لرزاں ایک بھی چہرا نہ تھا

کیا خبر گزرا ہے اس پر حادثہ کیسا شکیل
ہم جہاں تک جانتے ہیں وہ کبھی ایسا نہ تھا

حسن منزل، اڑیہ بازار، کٹک ۷۵۳۰۰۱ (اڑیسہ)

جاگتی آنکھوں سے خوابوں ک
ہم نے دیکھا ماہتابوں ک

بیٹھ کر احساس کے سا
دیکھتا ہوں آفتابوں ک

چھن گئی عزم و عمل کی ر
بجھ گیا پھر انقلابوں ک

اپنی اپنی دھوپ سے کم
حسن کلیوں کا، گلابوں ک

تشنگی کو اور بھی چمکا
دھوپ کا لہرا، سرابوں ک

بجھ گئیں آنکھیں تقدس
ہوگیا اوجھل ثوابوں ک

نذیر فتح پوری

۲/۲۱ 'نیتا پارک' ایروڈا' پونا ۱۰۰۶

کہ "تم پھر چوٹ کھاؤ گی جس طرح پہلے کھائی ی، لہٰذا محتاط رہو" بہر صورت مسئلہ یکساں ہے، ی ماضی کا حال سے وابستہ ہونا اور وقت کا قی کرنا۔

اپنے خواب کس طرح دہرائے جائیں

جو شخص شاید ہی کبھی اپنے خواب دہراتا ہو یا وہ جو دہرا ہی نہیں سکتا اکثر یہ سوچ کر مایوسی کے شکنجے میں پھنسا رہ جاتا ہے کہ وہ بخی طور سے مستقبل کا حال جاننے سے رہ گیا ہے۔ اسے تھوڑی سی راحت مل سکتی ہے اگر وہ سوچے کہ "آج رات میں ایک خواب دیکھوں گا"۔ بعض اوقات اس کے بڑے دلچسپ نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ این فیراڈے (ANN FARADAY) خوابوں کے مشہور برطانوی محقق نے لوگوں کو اپنے خواب یاد رکھنے کے لیے بعض اصول وضع کیے ہیں۔ اس نے سونے کے عام وقت سے دو دو گھنٹے کے وقفے پر الارم گھڑی سیٹ کرنے کی تجویز کی ہے۔ اس سے آپ کافی یقینی طور سے اپنے خواب کا عرصہ حافظے میں محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ نیند میں ایک بار کا خلل بھی کچھ نہ کچھ کارگر ثابت ہوگا۔ کئی بار الارم کے جھٹکے اذیت دہ بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اگر ایک بار الارم لگایا جائے تو یہ آزمائش رات کے پچھلے پہر ـــــ صبح ۳ تا ۵ بجے کے درمیان ـــــ کی جائے۔ یہ زیادہ بہتر ہوگا۔

اگر آپ اس طرح اُٹھ گئے تو اس کا قوی امکان ہے کہ آپ اپنے خوابوں کی تفصیل درج کرلیں گے ورنہ اس کی یاد بہت جلد مندمل ہو جائے گی۔ یہ اور بھی بہتر ہوگا کہ آپ ایک کیسٹ ٹیپ ریکارڈر اپنے بستر کے قریب موجود رکھیں۔ یہ بھی ممکن نہ ہو تو اپنے ہمسفر سے خواب کو بیان کردیں یا ذرا اونچی آواز [illegible] تمام تفصیل آپ کے بیدار دماغ میں داخل ہو کر موجود یاد کا ایک حصہ بن کر محفوظ رہ جائے گی۔

آپ اپنے خوابوں سے خواہ کسی وقت بیدار ہوں، رات ہو یا صبح، یہ مشورہ یاد رکھیں کہ آپ کی حرکت دھیمی اور سست شروع ہونی چاہیے۔ اگر آپ خواب کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں تو حقیقت کے دائرے کے اندر بالکل داخل نہ ہوں۔ اگر آپ بستر سے اُٹھ کر جھٹ سے کمرے میں کہیں رکھی ہوئی پنسل اٹھانے دوڑ پڑے تو حافظہ فوری طور سے خواب کے سلسلے میں مردہ ہو سکتا ہے جس سے ذہن میں تعطل یا خلا پیدا ہو جائے گا۔ بیٹھی ہوئی پوزیشن میں آہستہ آہستہ حرکت شروع کریں۔ بعض لوگ چند لمحوں کے لیے اپنی آنکھیں بند رکھتے ہیں اور اس عرصے میں زیادہ سے زیادہ باتیں کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ایک خواب میں چھوٹی چھوٹی باتیں بھی اہم ثابت ہو سکتی ہیں بالخصوص ایک عرصۂ معینہ میں خوابوں کو تسلسل سے دیکھنے میں چھوٹی باتوں کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ کسی خواب کی معمولی سی تفصیل کسی دوسرے خواب کے مرکزی حصے میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ یا ایک تصویر کے جیسی معنی خیز تصویر دوسرے خواب میں بھی پھیر ابھر سکتی ہے۔ بہر حال یہ ضروری ہے کہ آپ زیادہ سے زیادہ باتیں تحریر کر ڈالیں تاکہ غور و خوض کے لیے ہر ممکن اور بھرپور مواد فراہم رہے۔

○

قلمکار حضرات سے گزارش

دفتر میں مضامین نثر و نظم کثیر تعداد میں جمع ہو گئے ہیں اس لیے اعلانِ ثانی تک اپنی نگارشات بلا طلب بھجوانے کی زحمت نہ فرمائیں۔ اُمید ہے اس گزارش کو گستاخی پر نہیں ہماری مجبوری پر محمول کیا جائے گا۔

ـــــ ادارہ

غزلیں

یک بیک بکھرے بقا کے دستخط
پہ ابھر آئے فنا کے دستخط
ں کھردرے حالات' بالیدہ شعور
روں کے خالق اک خدا کے دستخط
اس میں پھوٹے ہیں یادوں کے گلاب
یمیں ہتھیلی پر حنا کے دستخط
یہہ کی حرمت مرے سینے میں ہے
انی پہ ہیں ماں کی دعا کے دستخط
بھی زمیں کی داستاں معلوم ہے
روں کے حامل ہیں ہوا کے دستخط
سیم' اظہارِ مسرت کی صلیب
حق گو قلم' جرأت' وفا کے دستخط

اظہار مسرت

یا ہسپتال' فتح پور' شیخاواٹی ۳۳۲۳۰۱



سید شکیل دسنوی

اس قدر ٹوٹا ہوا ہے یہ کبھی سوچا نہ تھا
ہم نے جب تک پاس سے اس شخص کو دیکھا نہ تھا

چہرے چہرے پر چمکتا تھا' تبسم کا سراب
ذات میں ورنہ سمیٹے کون اک صحرا نہ تھا

کس قدر تشنہ ہیں کانٹے سنگریزے بے قرار
آج تک راہِ وفا سے کوئی کیا گزرا نہ تھا

زندگی تصویر بنتی کیا نگاہوں میں تری
ہر طرف سائے تھے لرزاں ایک بھی چہرا نہ تھا

کیا خبر گزرا ہے اس پر حادثہ کیسا شکیل
ہم جہاں تک جانتے ہیں وہ کبھی ایسا نہ تھا

حسن منزل' اڑیہ بازار' کٹک ۷۵۳۰۰۱ (اڑیسہ)

جاگتی آنکھوں سے خوابوں کا جمال
ہم نے دیکھا ماہتابوں کا جمال
بیٹھ کر احساس کے سائے تلے
دیکھتا ہوں آفتابوں کا جمال
چھن گئی عزم و عمل کی روشنی
بجھ گیا پھر انقلابوں کا جمال
اپنی اپنی دھوپ سے کملا گیا
حُسن کلیوں کا' گلابوں کا جمال
تشنگی کو اور بھی چمکا گیا
دھوپ کا لہرا' سرابوں کا جمال
بجھ گئیں آنکھیں تقدس کی نذیر
ہو گیا اوجھل ثوابوں کا جمال

نذیر فتح پوری

۳/۲۱ 'نیتا پارک' ایروڈا' پونا ۴۱۱۰۰۶

پرندے کا سایہ

ماہرِ نفسیات عزیز شریفی نے بیگم فردوس
ا پیپر کی فائل اُٹھائی اور کیس کا شروع سے
ہ کرنے لگے۔ گذشتہ کئی روز سے بیگم فردوس
ے زیرِ مشاہدہ تھیں۔ چنانچہ ان کی شخصیت
ں خصائل شریفی کی نگاہ میں آچکے تھے۔
ن النظر میں بیگم فردوس کا کیس پیچیدہ تو نہ
، مگر اس قدر ہموار بھی نہ تھا کہ غور و خوض
یر شریفی کی گرفت میں آجاتا۔

بیگم فردوس ایک اعلا تعلیم یافتہ
ون تھیں۔ لہٰذا وہ اپنے مسئلے کو خود بھی
ب سمجھتی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اِس
قیقت سے بھی واقف تھیں کہ بغیر کسی ماہرِ
فسیات کی مدد کے، اُن کی ذہنی گتھی سلجھ نہ
اے گی۔ چناں چہ اِسی غرض سے انھوں نے
شریفی سے براہِ راست رابطہ قایم کیا تھا۔

بیگم فردوس کو شکایت یہ تھی کہ دو دو،
چار چار روز کے وقفے سے اُنھیں ایک خواب
ہانٹ کیا کرتا تھا۔ یہ خواب جس رات
بھی انھیں دکھائی دیتا۔ اُس کی صبح بیگم فردوس
کے لیے شامِ غریباں ہوتی۔ اُداسی کا یہ عالم
ہوتا کہ وہ گھنٹوں بنا کچھ کھائے پیے، گُم صُم
رہا کرتیں۔ یہاں تک کہ اِسی کیفیت میں شام
ہو جاتی۔ اِدھر شام ہوتی، اُدھر اُن پر گریہ
طاری ہوتا۔ یہ کیفیت اِس قدر شدید ہوتی کہ
بیگم فردوس اس کی تاب نہ لا پاتیں اور بے ہوش
ہو جاتیں۔ مگر گھنٹے دو گھنٹے کے بعد جب

انھیں ہوش آتا، تو قدرتی طور پر ان کی ذہنی
کیفیت نارمل ہو چکی ہوتی۔

اِس عرصے میں شریفی نے بیگم فردوس
سے خواب کی جملہ کیفیات معلوم کرنے کی بہتیری
کوشش کی تھی، مگر افسوس کہ انھیں اپنے
مقصد میں کامیابی نہ ہو پائی تھی۔ ہوتا یہ تھا
کہ بیگم فردوس کی زبان سے ابھی خواب کے
ابتدائی جملے ہی ادا ہوتے کہ وہ نروس ہونے لگتیں۔
مزید کوشش کرتیں تو اُن کا دل بھر آتا، جس
کے نتیجے میں اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار
بندھ جاتا۔

شریفی کو یقین تھا کہ اگر خواب کی
ترسیل اُن تک ہو چکی ہوتی، تو عین ممکن تھا
کہ وہ اُس کی نفسیاتی تعبیر کر لیتے اور بعد ازاں
بیگم فردوس کو تحلیلِ نفسی کے عمل سے گزارتے
اور اپنی تعبیر کے سہارے بیگم فردوس کو اس
خواب کے قنوطی اثر سے باہر نکال لیتے۔ چوں کہ
شریفی کی اِس سلسلے کی تمام کوششیں ناکام
ہو چکی تھیں لہٰذا انھوں نے بیگم فردوس کو
اپنا خواب تحریر کرنے کا مشورہ دیا۔ ساتھ ہی
انھوں نے انھیں یہ ہدایت بھی دی تھی کہ وہ
اپنا خواب کسی تامّل کے بغیر بلا کم و کاست
تحریر کریں۔

اِس وقت بیگم فردوس کا خواب
تحریری صورت میں شریفی کے ہاتھوں میں
تھا، جس کی اِبتدا یوں ہوئی تھی۔

جزیرے پر گھرے سیاہ بادل چھائے ہوئے
تھے۔ ہوائیں سیٹیاں بجاتی چل رہی تھیں۔

"سُنو!"

میں چونکتی ہوں۔ یہ آواز کہاں سے
آئی۔ میرا وہم تو نہیں!

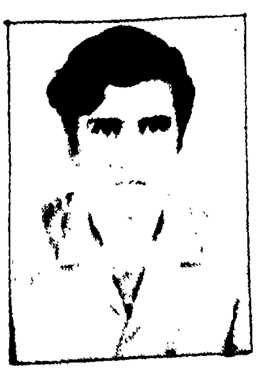
"اِدھر دیکھو۔ میں بول رہا ہوں۔"

میں آواز کے رُخ دیکھتی ہوں۔ صوفے
کی نرم کرسی پر بیٹھا ہوا پرندہ۔ اپنی ننھی مُنّی
آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا ہے۔

"تم ... ؟ تم کون ہو؟" میں سہم کر
پوچھتی ہوں۔

"مَیں ... مَیں ایک معمولی سا پرندہ
ہوں' اور تمھارا ممنون ہوں۔"

دو روز قبل یہ پرندہ مجھے زخمی حالت
میں سمندر کنارے ملا تھا۔ میں نہیں جانتی کہ
لمبی اڑان کی بنا پر اُس کے پَروں میں زخم
آئے تھے یا راستے میں کسی خون خوار پرندے
سے اُس کی مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ خون بازوؤں سے
بہہ کر اُس کے پنجوں تک آچکا تھا۔ لہٰذا
میں نے اُس کی تیمار داری کی، اُسے نرم نرم
اناج، پکا کر کھلایا، ساتھ ہی اُس کے لیے
گرم اور آرام دہ بستر بھی مہیا کیا۔
اب اُس کے زخم مندمل ہو چکے ہیں۔



۸-۳۲ گل اپارٹمنٹس B-۱۴۴ سینٹ اینڈریوز روڈ، باندرہ، بمبئی ۵۰

ں صاحب یہ پرندہ کون ہے؟ یہ کیوں کر
ہوا؟ مجھے حیرت ہے کہ میں نے پرندے
ںسینگ کی ہے؟ جب کہ آج تک میں نے
ںکی ڈریسنگ تک نہیں کی!!
"تم دو روز سے میرے ساتھ ہو اس
ہے میں کیوں نہیں بولے؟"
"سچ مانو تو کہوں... میں تمھاری
ں آویز شخصیت سے اس قدر متأثر ہوا
اکر حلق سے آواز ہی نکل نہ پا رہی تھی۔
"تو پھر اب کیوں بولے... کیا میرے
علق تمھارا خیال بدل چکا ہے؟"
"نہیں یہ بات نہیں" پرندہ گہری
سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر بولا:
"بات دراصل یہ ہے کہ مجھے آج ہی
سفر پر روانہ ہونا ہے۔"
"اتنی تیز ہوا میں... اِس قدر
گہری شام کو...!"
"ہاں، ہوائیں تیز بھی ہیں اور شام
بہت گہری، مگر پرندے کی زندگی میں اِس
سے بھی کڑا وقت آتا ہے... اِس سے بھی
بھاری شام آتی ہے... اِن سے بھی سوا
ہوائیں چلتی ہیں۔
جانے کیوں میں اُداس ہو جاتی ہوں۔
"لیکن یہ خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہیں"
شریفی صاحب! میں پرندے میں
اِس قدر دلچسپی کیوں لینے لگی ہوں؟ وہ
جاتا ہے تو جائے۔ شام گہری ہو یا ہوا بیش
تیز، مجھے اُن سے کیا سروکار؟
تعجب ہے کہ میں اُداس ہو جاتی ہوں؟
آخر کیوں؟
پرندہ کہتا ہے:

"خطرناک؟ جہاں میرے حق میں یہ
ہوائیں یقیناً خطرناک ہو سکتی ہیں، لیکن
جی جان کا خطرہ کب نہیں اور کہاں نہیں؟
شاید تمھیں یہ جان کر حیرت ہو کہ مجھے طوفانی رات
اور بھری برسات میں سفر کرتے ہوئے بڑا
لطف آتا ہے۔"
میں خفگی سے کہتی ہوں:
"لطف؟ کا ہے کا لطف... جب
جان جوکھوں میں پڑی ہو..."
پرندہ کہتا ہے:
"ہوا میری اُڑان کی سمتیں بدلتی ہے۔
برسات پروں کو تر کرکے بھاری کر دیتی ہے۔
سیاہی مجھے تقریباً اندھا کر دیتی ہے۔ لیکن
میں اپنے وجدان کے سہارے، اپنے حوصلوں
کی معرفت، اپنے ذہن کی آنکھ سے راستہ
ٹٹولتا ہوا سفر کرتا ہوں۔ مہم جوئی اور معرکہ
آرائی میں مجھے نامعلوم سی مسرت ہوتی ہے۔
ایسا سفر اپنی پوشیدہ قوتوں کے اظہار، اپنی
خفیہ صلاحیتوں کی تلاش اور خوشگوار نتیجے کی
اُمید میں کیا جانے والا سفر ہوتا ہے۔ میں نے
ایسے متعدد سفر کیے ہیں۔"
یہ کہتے کہتے وہ اپنی ننھی مُنّی آنکھوں سے
مسکرانے لگتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ
بھی دُکھی ہے۔
بجلی چمکتی ہے۔ بند کھڑکی تیزی سے
کُھل جاتی ہے۔ سرد ہوا کا جھونکا سمندری لہر
کی مانند اندر آتا ہے۔ میں جھٹ سے اُٹھ کر
کھڑکی بند کر دیتی ہوں۔
"شریفی صاحب اُس کی عالمانہ باتیں
سُن کر میں مسحور ہو چکی ہوں۔ آپ نے کیسا
غیر دلچسپ وضو، مجھ پر عائد کر رکھا ہے۔

بغیر سوچے سمجھے، لکھے چلی جا رہی ہوں۔
پرندہ کُرسی سے پھدک کر فرش پر
آ جاتا ہے۔ وہ ایک بار اپنے پر کھول کھول کر
سمیٹتا ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ اُس کے پروں پر
موم اور موتی کا ملمع چڑھا ہوا ہے اور اُن کی
نقرئی سطح پر جو سُرخی سی نظر آ رہی ہے وہ ممکن
ہے پرندے کی توانا خواہش کا مظہر ہو۔
"تو میں چلوں۔"
پرندہ اپنے پاکیزہ بازوؤں کو میرے
سر پر رکھ کر انتہائی شفقت سے کہتا ہے۔
میں گردن جھکائے سوچ رہی ہوں...
میں کس قدر اکیلی تھی۔ ایسے بھرے پُرے
ماحول میں، میری حیثیت گویا کسی بے جان
اور بے مصرف شے کی سی تھی۔ یہ پرندہ نہ
جانے کن سمتوں سے اُڑتا ہوا پہنچا.....
دو روز میرے ساتھ رہا..... اور اب اپنی
جُدائی کا ایسا صدمہ دیے جا رہا ہے کہ میرے
لیے جینا دوبھر ہوا جا رہا ہے کاش
کہ آج بھی یہ خاموش ہی رہتا۔ چپ چاپ
آیا تھا، چُپ چاپ چلا جاتا۔ لیکن اِس نے
تو کلام کیا ہے!
"میں جانتا ہوں تم کیا سوچ رہی ہو
اک... میں اپنے خیالوں سے لو
آتی ہوں۔
"انسان کی زندگی میں کلام کی بڑ
اہمیت ہے۔ میں تم سے بنا کوئی بات کیے
ہو سکتا تھا۔ تمھیں کبھی علم ہی نہ ہو پاتا کہ
بولنے والا پرندہ ہوں۔ لیکن تمھارے باطن
روشنی اور قلب کی حرارت نے مجھے مجبور کر
میں تم سے دو باتیں کروں۔ بعض اوقات
[illegible]

کنکر سمجھ کر جھیل کی نذر کر دیتا ہے۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ اُسے اپنی متاعِ عزیز کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ یا پھر وہ جس بازار میں پہنچتا ہے، اُس بازار پر ٹھگوں اور لٹیروں کی عملداری ہوتی ہے۔ چناں چہ نہ تو اُن کے ناپ صحیح ہوتے ہیں اور نہ ہی اُن کے تول۔ ایسی صورت میں کسی بے غرض کو اُس جنس کی قیمت کا صحیح صحیح تعیّن کر دینا چاہیے، جو کہ از بس ضروری ہے۔ ایسی آگاہی عموماً ہمیں جینے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ نامساعد حالات میں نبرد آزمائی کی قوت بخشتی ہے اور زمین پر ثابت قدمی سے سر اُٹھا کر چلنے کی ہمت پیدا کرتی ہے۔"

یہ کہہ کر پرندہ خاموش ہو جاتا ہے۔

گویا وہ اپنے خیالات کو سمیٹ رہا ہو۔

"اچھا . . . وقت بہت ہو چکا۔ دیکھو آسمان بالکل سیاہ ہو گیا۔

ہم مکان سے باہر آجاتے ہیں۔ سرد ہوا میں نمی پیدا ہو چکی ہے۔ میں جدائی کے بے پناہ کرب اور ماحول کی قاتلانہ سنگینی سے کانپنے لگتی ہوں۔ لیکن جلد ہی مجھے پرندے کی ہدایت یاد آجاتی ہے، اور پرندے کے دشوار سفر کا بھی خیال آتا ہے۔

پرندے نے دو تین دفعہ زور زور سے اپنے پر پھڑپھڑائے ہیں۔ وہ وقت آچکا ہے، جب جدائی دبے پاؤں سینے کے پنجر میں داخل ہوتی ہے اور پوری قوت سے دِل پر خنجر گاڑھ دیتی ہے۔ ایک چیخ ضرور نکلتی ہے، لیکن وہ حلق میں گھٹی کی گھٹی رہ جاتی ہے۔ الوداع . . . الوداع۔

"ال . . . و . . . داع" لفظ ادا نہیں ہو پاتا۔

پرندہ بازو پھیلائے نیچی اُڑان بھرتا ہوا۔ چند لمحوں میں سطحِ سمندر پر پہنچ جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس کا وجود روشن ہو جاتا ہے، گویا اُس کی پشت پر کوئی چاند اتر آیا ہو۔ وہ آہستہ آہستہ اُوپر اور اُوپر اٹھتا چلا جاتا ہے۔

شریفی صاحب اس کے بعد عموماً میری آنکھ کُھل جایا کرتی ہے۔ میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کسی نے مجھے ایک کھدّر کی چادر میں گٹھڑی کر دیا ہو۔

خواب میں چند ایسے واضح اشارے تھے، جن کی بنیاد پر شریفی نے اُن کی شخصیت کا تجزیہ کر لیا تھا۔ جس جبر و تبو میں وہ داخل ہو چکی تھیں اِن کا اُس سے باہر نکل آنا تقریباً ناممکن تھا۔ البتہ آٹو سجیسنز (Autosu-ggestions) کے ذریعے شریفی انھیں حالات سے سمجھوتا کر لینے اور اپنے کیے ہوئے فیصلے کی ندامت کے شدید احساس سے یقیناً چھٹکارہ دِلا سکتے تھے۔

اِس خیال سے وہ بیگم فردوس کو اگلے روز کا اپائنمنٹ (Appointment) دے چکے تھے۔ اُس روز وہ نہیں آئیں۔ شریفی نے سمجھا کہ گھریلو مصروفیات کی بنا پر وہ نہ آپائی ہوں، اگلے روز آجائیں گی۔ خلافِ توقع وہ اگلے روز بھی نہیں آئیں۔ یہ سُن کر آپ کو یقیناً تعجّب ہوگا کہ اِس واقعے کو مہینوں بیت چکے ہیں، لیکن آج تک نہیں آئیں۔

شریفی کا خیال تھا کہ بیگم فردوس کو اُس افسوس ناک خواب سے نجات مِل چکی ہوگی۔ ورنہ کوئی بھی شخص ایسے عذاب کا اِس مدّت تک ہرگز متحمّل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ ایک مرتبہ اُنھوں نے چاہا کہ بیگم فردوس کو فون کریں اور اُن کا حال معلوم کریں۔ لیکن پھر یہ سوچ کر اُنھوں نے اپنا اِرادہ منسوخ کر دیا کہ شہر میں اُن سے کہیں بہتر اور تجربے کار ماہرینِ نفسیات موجود ہیں؛ ممکن ہے کہ بیگم فردوس اُن میں سے کسی ماہرِ نفسیات سے رُجوع ہوئی ہوں اور اس کے زیرِ علاج ہوں۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اب تک مکمّل طور پر شفایاب ہو چکی ہوں۔ چناں چہ انھوں نے ایک نیک دل اور خدا ترس بندے کی طرح بیگم فردوس کے حق میں دُعا کی کہ وہ جہاں بھی ہوں، سُکھی ہوں، جیسی بھی ہوں، پر ذہنی طور پر نارمل ہو چکی ہوں۔

رفتہ رفتہ بیگم فردوس کا تصوّر شریفی کے شعور سے تحت الشعور اور تحت الشعور سے لاشعور میں جا بسا۔ ایک روز شریفی اپنی کلینک میں بیٹھے ڈاک دیکھ رہے تھے کہ خطوں میں بیگم فردوس کا خط پا کر بوکھلا گئے۔ قدرے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے انھوں نے لفافہ چاک کیا۔ لکھا تھا:

"شرمندہ ہوں کہ ایک عرصے کی غیر حاضری کے بعد آپ سے رُجوع ہو رہی ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ جن دِنوں اُس خواب سے دو چار تھی، اُن دِنوں کسی تنکے کا سہارا بھی میرے لیے بہت بڑا سہارا تھا۔ آپ نے نہ صرف میرے کیس میں دِلچسپی لی، میری جانب خصوصی توجّہ فرمائی۔ چناں آپ کی نیک نیتی کا کرشمہ تھا یا محض اِتفاق کہ اگلے ہی دِن سے اُس خواب کی یورش گئی۔ اور ایک مدّت تک وہ خواب تو کجا دوسرا خواب بھی مجھے نہیں آیا۔ چوں کہ

پشوں کی آماجگاہ ہے، سو میرے دل سے
حطرہ نہ ٹلا۔ مجھے بدستور رات میں سونے سے
، دھڑکا لگا رہا کہ اگلی صبح میں کہیں پھر اُسی
نور میں نہ جا پڑوں۔ پر ایک عرصے تک
یَ ایسا منحوس دِن طلوع نہ ہوا۔ میں کبھی کر
س بلانے کسی اور کا گھر دیکھ لیا ہے، سو اب
ںِ اُس عذاب سے محفوظ ہوں۔ لیکن یہ کیفیت
یادہ عرصے تک برقرار نہ رہ سکی۔ بلکہ سراسر
یری خوش فہمی ثابت ہوئی۔ سورج کو سوا
یزے پر جھیلنا میرے مقدر میں لکھا جا چکا
تھا۔ لہٰذا پچھلے ہفتے وہ بلا کیل کانٹے سے
دُرست ہوکر دوبارہ نازل ہوئی ہے، اور
اور اپنی نوکیلے منقار سے میرے تالو پر
مُسلسل ٹھوکے لگا رہی ہے۔ اب وہ خواب
اُس پرندے کی روانگی ہی تک محدود نہیں
رہتا بلکہ ایک واقعے کے اضافے کے بعد
ایک المیے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔
میں پرندے کی روانگی کے سیکوینس (Se-
quence-) میں دیکھتی ہوں:
سمندر کے ساحل پر دراز قد سائے،
جو تعداد میں کئی تھے، اچانک یوں نمودار
ہوتے ہیں، گویا تاریکی نے انھیں اپنی سُرنگ
سے اُگل دیا ہو۔ میرے اطراف گھوم پھر کر وہ
ایسی نظریں دوڑاتے ہیں جیسے کسی اہم چیز کو
کھوج رہے ہوں۔ اُن میں سے ایک کی نگاہ
اُفق میں اُٹھ جاتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ روشن
پرندہ لمحہ بہ لمحہ دور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ وہ
مسّرت سے چیخ کر اپنے تمام ساتھیوں کی
توجہ پرندے کی جانب مبذول کرتا ہے۔ پلک
جھپکتے ہی اُن میں سے ایک کسی وزنی آلے کو
اپنے شانے پر رکھتا ہے اور ایک زانو فرش پر

لیک کر نشست باندھتا ہے، دوسرے ہی
لمحے وہ آلہ بادل سی گرج کے ساتھ بارُود
اُگل دیتا ہے۔ چند ہی سیکنڈ بعد، پرندے
کا روشن وجود بکھر کے رہ جاتا ہے۔ مارے
وحشت کے میری سانس رُکنے لگتی ہے اور
ہچکی بندھ جاتی ہے۔ جس پُر اسرار صورت
میں وہ سائے آئے تھے، اُسی پُر اسرار صورت
میں وہ غائب ہو جاتے ہیں۔"
شریفی کے ہاتھ بدستور لرز رہے
تھے۔ انھیں یقین ہو چکا تھا کہ بیگم فردوس
کے خواب کی تعبیر انھوں نے جن نفسیاتی
اصولوں اور تحلیل نفسی کے جن نظریوں کی
بنیاد پر کی تھی؛ اب وہ تعبیر، خواب
میں اِس واقعے کے اِضافے کے بعد،
سراسر غلط ثابت ہو رہی تھی۔ لہٰذا،
شریفی بیگم فردوس کے خواب کی اِس
پُر اسرار عمارت میں، ایک نئے دروازے
سے داخل ہونے کے امکانات پر غور
کر رہے تھے۔

رشید مصطفٰے رضوی

دہلی میں ۱۸۵۷ء کی یادگاریں

پُرانی دہلی، جسے شاہجہاں نے 1058ھ مطابق 1648ء میں لال قلعے کی تعمیر کے تقریباً دس سال بعد 'شاہ جہاں آباد' کے نام سے بسایا تھا نصف دائرے کی شکل میں تھی۔ شہر بسلنے کی تاریخ میر یحییٰ کاشی نے "شد شاہجہاں آباد از شاہ جہاں آباد" نکالی تھی جس سے ۱۰۵۸ھ نکلتے ہیں۔ یہ بدرو بُرج سے، جو جنوب مشرق کے کونے میں ہے جمنا کے داہنے کنارے پر آباد ہے۔ ۱۸۵۷ء میں آبادی تقریباً دو لاکھ تھی۔ قلعے کے اندر کا رقبہ طول میں ایک ہزار گز اور عرض میں پانچ سو گز ہے۔ ۵۷ء کے بعد یہاں فوجی بارکیں بنا دی گئی ہیں۔ اور زیادہ تر محلات اور عمارتیں مسمار کر دی گئی ہیں۔ صرف چند بطور یادگار باقی ہیں۔ شہر کا اندرونی رقبہ صرف سوا تین میل ہے۔ شہر کی فصیل کے مختلف دروازے تھے۔ چنانچہ اگر ہم کشمیری دروازے سے چلیں جو شہر کے شمال میں ہے اور جو ۱۸۵۷ء میں معرکہ آرائی کا مقام رہا ہے۔ تو شہر کا چکر اس طرح لگا سکتے ہیں کہ سب سے پہلے شمالی رُخ پر موری دروازہ (جو ۱۸۶۷ء میں گرا دیا گیا) پھر مغرب میں کابلی دروازہ تھا، یہ بھی اَب باقی نہیں رہا۔ اس کے بعد لاہوری دروازہ، جنوب میں ترکمان دروازہ اور دلّی دروازہ۔ مشرق میں خیراتی دروازہ اور راج گھاٹ دروازہ۔ کلکتہ دروازہ شمال مشرق میں تھا۔ یہاں ایک راستہ بنا کر ایک کتبہ (۱۸۵۲ء) لگا دیا گیا ہے اور اب یہاں ریلوے پُل ہے۔ کیلا گھاٹ دروازہ شمال مغرب میں اور نگم بودھ دروازہ شمال مشرق میں دریا کی طرف ہیں بتھر گھاٹی دروازہ توڑ دیا گیا ہے۔ بَدرو دروازہ شمال مشرق میں تھا۔ یہ سب چودہ دروازے تھے ان کے علاوہ چودہ کھڑکیاں بھی تھیں۔ شہر دہلی بھوجلہ اور جھوجلا نام کی دو پہاڑیوں پر بسایا گیا ہے۔ بھوجلہ پہاڑی تو وسطِ شہر میں ہے اور جھوجلا شمال مغربی فصیل سے مِلی ہوئی ہے۔ پہلے ایک نہر کابلی دروازے سے داخل ہو کر شہر اور قلعے میں ہوتی ہوئی دریا میں جا مِلتی تھی۔ شہر کی فصیل چھ میل لمبی تھی اور اس کے گرد خندق تھی، جو جگہ جگہ سے گرا کر صاف کر دی گئی ہے لال قلعے کے لاہوری دروازے (متصل چاندنی چوک) کا فاصلہ جتنا کشمیری دروازے سے تھا تقریباً اتنا ہی اجمیری اور دہلی دروازے سے بھی تھا۔ شہر کے پُر رونق بازاروں میں خانم کا بازار اور خاص بازار اب نہیں ہیں یہ قلعے اور جامع مسجد کے درمیان تھے۔ ۱۸۵۷ء میں یہاں کے کاریگروں نے نئی ساخت کے ہتھیار تیار کر لیے تھے جو اُس زمانے میں انگریزی فوجوں کے ہتھیاروں سے بھی بہتر تھے۔ اسی لیے ان بازاروں کو انتقاماً ۵۷ء کے بعد مسمار کر کے اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ شہر کی شمالی فصیل کے باہر کشمیری اور موری دروازے سے نکل کر عیسائیوں کا قبرستان اور قدسیہ باغ وغیرہ ہیں جس کی مغربی حد ریج (RIDGE) اور مشرق میں جمنا ہے۔ پہاڑی سے اُدھر پُرانی چھاؤنی تھی (موجودہ دہلی یونیورسٹی کیمپس) جہاں جون سے ستمبر ۱۸۵۷ء تک انگریزی فوج محاصرہ کیے پڑی رہی۔ اسی جگہ مغربی رُخ پر نجف گڑھ کی جھیل سے نکالی گئی نہر ہے۔ جس کے کنارے پر ۵۷ء کا فوجی قبرستان ہے۔ اس سے آگے چل کر آزاد پور سے تقریباً میل دو میل کے فاصلے پر بادلی کا وہ میدان ہے جہاں ۸ جون ۱۸۵۷ء کو انقلابی فوجوں نے مقابلہ کیا اور یہیں سے انگریزی فوجیں داخل ہو کر ریج (پہاڑی) پر قابض ہوئیں۔ بادلی کا یہ مقام بُندیل کی سرائے کہلاتا ہے۔ کتبِ تاریخ میں "بادلی کی سرائے" کے نام سے مذکور ہے۔ اس کے سامنے شالامار باغ ہے جو تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ ۱۸۵۷ء کے چند اہم تاریخی مقامات کا تذکرہ اس طرح ترتیب دیا جا سکتا ہے۔

لال قلعہ

لاہوری دروازے پر سہ منزلہ عمارت میں قلعے کا انگریز عہدے دار یعنی کپتان قلعہ (یا صاحب کلاں) وغیرہ رہتے تھے۔ ۵۷ء میں ڈگلس کپتان قلعہ تھا۔ ۱۸۱۱ء سے یہاں فوجی گارڈ مقرر کیا گیا۔ جب اکبر شاہ کے بیٹے نے رزیڈنٹ سٹین پر گولی چلائی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں اسی دروازے کے سامنے سائمن فریزر اور ڈگلس، پادری جننگ، اُن کی لڑکی اور جینسن وغیرہ مارے گئے۔ دیوانِ خاص

مظہر قریشی۔ علی جان منزل۔ امروہہ ۲۴۴۲۲۱ (یو۔ پی)

وب میں سنگ مرمر کے چند کمرے ہیں، درمیان چبوترہ ہے۔ اس پر ایک دالان بنا ہوا ہے۔ جو بیح خانہ" کہلاتا ہے۔ جب میرٹھ سے انقلابی سپاہی ہا پہنچے تو بہادر شاہ یہیں موجود تھا۔ تسبیح خانے سے ں ڈوگلس (قلعہ دار) یا فریزر نے انقلابی سپاہی سے ت کی۔ اسی دوران ایک سپاہی نے گولی چلادی ظہیر ہلوی نے اپنی کتاب "داستانِ غدر" میں لکھا ہے ر سپاہی کی گولی تسبیح خانے کے ستون پر لگی اور اس کا یک ٹکڑا ٹوٹ کر گرا جو آج بھی اسی طرح ہے۔ اسی سے ملا ہوا برآمدہ نما جھروکہ ہے۔ یہ مثمن برج سے متصل ہے۔ اس پر جو گنبد ہے وہ ۱۸۵۷ء کے بعد کی تعمیر ہے۔ نیچے خضری دروازہ ہے جس سے چند سیڑھیاں اُتر کر جمنا کے کنارے میدان میں پہنچ جاتے ہیں۔ اسی دروازے سے کپتان ڈوگلس باہر جاکر انقلابیوں سے بات کرنا چاہتا تھا جو نیچے (زیرِ جھروکہ) کھڑے تھے۔ (۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء)

جامع مسجد

شاہجہاں نے ۱۰ رشوال ۱۰۶۰ھ مطابق ۶ راکتوبر ۱۶۵۰ء کو جامع مسجد کی بنیاد رکھی۔ یہ خاص بازار کے مغربی سرے پر بنی ہوئی ہے۔ ۱۸۵۷ء میں اس مسجد کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ مارچ ۱۸۵۷ء میں اسی مسجد کے دروازے پر ایک اشتہار چسپاں کیا گیا تھا جس میں آنے والی بغاوت کی طرف اشارے تھے۔ چنانچہ اس دور کے ایک اخبار "صادق الاخبار" مورخہ ۱۹ رمارچ ۱۸۵۷ء میں یہ خبر شائع ہوئی تھی، اصل عبارت کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"ایک اشتہار نام نہاد شاہِ ایران دہلی میں گزرگاہوں پر آویزاں کیا گیا ہے۔ ہمارے ایک دوست اس اشتہار کو کہ پُشت جامع مسجد پر آویزاں تھا نقل کرلائے تھے اکثر لوگوں نے اس کو دیکھا خلاصہ مضمون اس کا یہ ہے کہ اہلِ اسلام کو نصاریٰ (انگریزوں) کی مدد و معاونت سے پرہیز کرنا واجب ہے۔ ۔ ۔"

تحریک ۱۸۵۷ء کے دوران میں جنرل بخت خاں کے دہلی آنے کے بعد جہاد کا فتویٰ بھی اسی جامع میں مرتب کیا گیا جس پر اس دور کے تمام مشاہیر علماء اور فضلا کے دستخط ہیں۔ اس تاریخی فتوے کا اقتباس یہ ہے:

"کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ اب جو انگریز دلّی پر چڑھ آئے ہیں اور اہلِ اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں اس صورت میں اب اس شہر پر جہاد فرض ہے یا نہیں؟ ۔ ۔ ۔"

اس استفسار کا جواب علمائے کرام کی طرف سے یہ دیا گیا:

"درصورتِ مرقومہ فرضِ عین ہے اُوپر تمام اس شہر کے لوگوں کی اور استطاعت ضرور ہے اس کی فرضیت کے واسطے چنانچہ اس شہر والوں کی طاقت مقابلے اور لڑائی کی ہے۔ بسبب کثرتِ اجتماعِ افواج کے اور مہیا اور موجود ہونے آلاتِ حرب کے تو فرضِ عین ہونے میں کیا شک رہا ۔ ۔ ۔"

(اخبار "الظفر" دہلی، میں شائع ہوا)

تحریک ۵۷ء کے دوران جو مجاہدین دینی جذبے سے جہاد کے لیے دہلی آئے وہ جامع مسجد ہی میں مقیم تھے۔ یہ مجاہدین آخر تک جنگوں میں حصہ لیتے رہے لوٹ مار سے پرہیز کرتے رہے اور رُوکھی سُوکھی کھا کر گزارا کرتے رہے۔ ان کے بدن پر کپڑے بھی ثابت نہ تھے اور نہایت پھٹے حالوں میں تھے لیکن جذبۂ صادق اور جوش و خروش میں سب پر بازی لے گئے تھے۔ جامع مسجد کے شمالی دروازے پر شکستِ دہلی کے بعد ایک انگریزی فوج کے دستے سے ان مجاہدین نے باہر آکر مقابلہ کیا جس کا ذکر ظہیر دہلوی نے "داستانِ غدر" میں اس طرح کیا ہے:

"میں وہاں سے چاوڑی بازار میں جا پہنچا تو دیکھا کہ واقعی ہزاروں آدمی لاٹھی، پٹونگا، تلوار، گنڈاسا وغیرہ لیے ہوئے شہر میں پھرتے ہیں غرض کہ جامع مسجد کے نیچے ہو کر گھیروں کے بازار میں پہنچا تو وہاں عجیب تماشا نظر آیا۔ لاشوں کا ایک ایسا انبار تھا جیسے لکڑیوں کی ٹال ہوتی ہے۔ ۔ ۔"

(داستانِ غدر ۱۳۰۔۱۵۰)

جب انگریزی فوج کا دستہ جامع مسجد کے قریب آیا تو مجاہدین میں سے ایک شخص نے منبر پر چڑھ کر للکارا —— "تمہارے امتحان کا وقت آگیا ۔ ۔ ۔ تم میں کون ہے جو اپنی جان نچھاور کرنا چاہتا ہے۔ دشمن سامنے کھڑا ہے۔ جس کو مرنا ہو وہ شمالی دروازے کی طرف میرے ساتھ آئے اور جسے جان پیاری ہو وہ جنوبی دروازے سے چلا جائے کہ ادھر دشمن نہیں ہے ۔ ۔ ۔" یہ سنکر تمام مجاہدین تلواریں لے کر آمادۂ جنگ ہو گئے "اللہ اکبر" کے نعروں نے بام و در لرزا دیے، ایک بھی جنوبی دروازے کی طرف نہیں گیا۔ جیسے ہی وہ شمالی دروازے سے نکلے انگریزی فوج نے گولیوں کی باڑھ ماری تقریباً دو سو شہید ہو کر گرے مگر انگریزی فوج کو دوبارہ گراب مارنے کی مہلت نہ ملی اور یہ لوگ جن کے پاس صرف تلواریں تھیں، ان کے سر پر جا پہنچے۔ انگریزی فوج اس مجاہدانہ جذبے کی تاب نہ لا کر پیچھے ہٹی، انھوں نے پیچھا کیا اور کشمیری دروازے کے سینٹ جیمس گرجا تک نکال دیا۔ خواجہ حسن نظامی نے بھی اس واقعے کا ذکر کیا ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد جامع مسجد ضبط کرلی گئی یہاں فوجیوں کا اصطبل بنایا گیا۔ آخر کار ۷، ۱۸۶۲ء کو بہت کوشش کے بعد واپس

خورشید مصطفیٰ رضوی

دہلی میں ۱۸۵۷ء کی یادگاریں

پُرانی دہلی، جسے شاہجہاں نے 1058ھ مطابق 1648ء میں لال قلعے کی تعمیر کے تقریباً دس سال بعد 'شاہ جہاں آباد' کے نام سے بسایا تھا نصف دائرے کی شکل میں تھی۔ شہر بسانے کی تاریخ میر یحییٰ کاشی نے "شد شاہجہاں آباد از شاہ جہاں آباد" نکالی تھی جس سے ۱۰۵۸ھ نکلتے ہیں۔ یہ بدرو بُرج سے، جو جنوب مشرق کے کونے میں ہے جمنا کے داہنے کنارے پر آباد ہے۔ ۱۸۵۷ء میں آبادی تقریباً دو لاکھ تھی۔ قلعے کے اندر کا رقبہ طول میں ایک ہزار گز اور عرض میں پانچ سو گز ہے۔ ۵۷ء کے بعد یہاں فوجی بارکیں بنا دی گئی ہیں۔ اور زیادہ تر محلات اور عمارتیں مسمار کر دی گئی ہیں۔ صرف چند بطور یادگار باقی ہیں۔ شہر کا اندرونی رقبہ صرف سوا تین میل ہے۔ شہر کی فصیل کے مختلف دروازے تھے۔ چنانچہ اگر ہم کشمیری دروازے سے چلیں جو شہر کے شمال میں ہے اور جو ۱۸۵۷ء میں معرکہ آرائی کا مقام رہا ہے۔ تو شہر کا چکر اس طرح لگا سکتے ہیں کہ سب سے پہلے شمالی رُخ پر موری دروازہ (جو ۱۸۶۷ء میں گرا دیا گیا)، پھر مغرب میں کابلی دروازہ تھا' یہ بھی اَب باقی نہیں رہا اس کے بعد لاہوری دروازہ' جنوب میں ترکمان دروازہ اور دلّی دروازہ۔ مشرق میں خیراتی دروازہ اور راج گھاٹ دروازہ۔ کلکتہ دروازہ شمال مشرق میں تھا۔ یہاں ایک راستہ بنا کر ایک کتبہ (۱۸۵۲ء) لگا دیا گیا ہے اور اب یہاں ریلوے پُل ہے۔ کیلا گھاٹ دروازہ شمال مغرب میں اور نگم بودھ دروازہ شمال مشرق میں دریا کی طرف ہیں پتھر گھاٹی دروازہ توڑ دیا گیا ہے۔ بدرو دروازہ شمال مشرق میں تھا یہ سب چودہ دروازے تھے ان کے علاوہ چودہ کھڑکیاں بھی تھیں۔ شہر دہلی بھوجلہ اور جھوجلا نام کی دو پہاڑیوں پر بسایا گیا ہے۔ بھوجلہ پہاڑی تو وسطِ شہر میں ہے اور جھوجلا شمال مغربی فصیل سے ملی ہوئی ہے۔ پہلے ایک نہر کابلی دروازے سے داخل ہو کر شہر اور قلعے میں ہوتی ہوئی دریا میں جا ملتی تھی۔ شہر کی فصیل چھ میل لمبی تھی اور اس کے گرد خندق تھی، جو جگہ جگہ سے گرا کر صاف کر دی گئی ہے لال قلعے کے لاہوری دروازے (متصل چاندنی چوک) کا فاصلہ جتنا کشمیری دروازے سے تھا تقریباً اتنا ہی اجمیری اور دلی دروازے سے بھی تھا۔ شہر کے پُر رونق بازاروں میں خانم کا بازار اور خاص بازار اب نہیں ہیں یہ قلعے اور جامع مسجد کے درمیان تھے۔ ۱۸۵۷ء میں یہاں کے کاریگروں نے نئی ساخت کے ہتھیار تیار کر لیے تھے جو اُس زمانے میں انگریزی فوجوں کے ہتھیاروں سے بھی بہتر تھے۔ اسی لیے ان بازاروں کو انتقاماً ۵۷ء کے بعد مسمار کر کے اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ شہر کی شمالی فصیل کے باہر کشمیری اور موری دروازے سے نکل کر عیسائیوں کا قبرستان اور قدسیہ باغ وغیرہ ہیں جس کی مغربی حد ریج (RIDGE) اور مشرق میں جمنا ہے۔ پہاڑی سے اُدھر پُرانی چھاؤنی تھی (موجودہ دہلی یونیورسٹی کیمپس) جہاں جون سے ستمبر ۱۸۵۷ء تک انگریزی فوج محاصرہ کیے پڑی رہی۔ اسی جگہ مغربی رُخ پر نجف گڑھ کی جھیل سے نکالی گئی نہر ہے۔ جس کے کنارے پر ۵۷ء کا فوجی قبرستان ہے۔ اس سے آگے چل کر آزاد پور سے تقریباً میل دو میل کے فاصلے پر بادلی کا وہ میدان ہے جہاں ۸ جون ۱۸۵۷ء کو انقلابی فوجوں نے مقابلہ کیا اور یہیں سے انگریزی فوجیں داخل ہو کر ریج (پہاڑی) پر قابض ہوئیں۔ بادلی کا یہ مقام بُندیل کی سرائے کہلاتا ہے۔ کتبِ تاریخ میں "بادلی کی سرائے" کے نام سے مذکور ہے۔ اس کے سامنے شالامار باغ ہے جو تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ ۱۸۵۷ء کے چند اہم تاریخی مقامات کا تذکرہ اس طرح ترتیب دیا جا سکتا ہے۔

لال قلعہ

لاہوری دروازے پر سہ منزلہ عمارت میں قلعے کا انگریز عہدے دار یعنی کپتان قلعہ (یا صاحب کلاں) وغیرہ رہتے تھے۔ ۵۷ء میں ڈگلس کپتان قلعہ تھا۔ ۱۸۱۱ء سے یہاں فوجی گارڈ مقرر کیے گئے جب اکبر شاہ کے بیٹے نے ریذیڈنٹ سٹین پر گولی چلائی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں اسی دروازے کے سامنے سائمن فریزر اور ڈگلس، پادری جننگ، اُن کی لڑکی اور ہچنسن وغیرہ مارے گئے۔ دیوانِ خاص

محلہ قریشی۔ علی جان منزل۔ امروہہ ۲۴۴۲۲۱ (یو۔پی)

کے جنوب میں سنگِ مرمر کے چند کمرے ہیں، درمیان میں چبوترہ ہے۔ اس پر ایک دالان بنا ہوا ہے۔ جو "تسبیح خانہ" کہلاتا ہے۔ جب میرٹھ سے انقلابی سپاہی دہلی پہنچے تو بہادر شاہ یہیں موجود تھا۔ تسبیح خانے سے ہی ڈوگلس (قلعہ دار) یا فریزر نے انقلابی سپاہ سے بات کی، اسی دوران ایک سپاہی نے گولی چلادی ظہیر دہلوی نے اپنی کتاب "داستانِ غدر" میں لکھا ہے کہ سپاہی کی گولی تسبیح خانے کے ستون پر لگی اور اس کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر گرا جو آج بھی اسی طرح ہے۔ اسی سے ملا ہوا برآمدہ نما جھروکہ ہے۔ یہ مثمن بُرج سے متصل ہے۔ اس پر جو گنبد ہے وہ ۱۸۵۷ء کے بعد کی تعمیر ہے۔ نیچے خضری دروازہ ہے جس سے چند سیڑھیاں اُتر کر جمنا کے کنارے میدان میں پہنچ جاتے ہیں۔ اسی دروازے سے کپتان ڈوگلس باہر جاکر انقلابیوں سے بات کرنا چاہتا تھا جو نیچے (زیرِ جھروکہ) کھڑے تھے۔ (۱۱ مئی ۱۸۵۷ء)

جامع مسجد

شاہجہاں نے ۱۰ شوال ۱۰۶۰ھ مطابق ۶ اکتوبر ۱۶۵۰ء کو جامع مسجد کی بنیاد رکھی۔ یہ خاص بازار کے مغربی سرے پر بنی ہوئی ہے۔ ۱۸۵۷ء میں اس مسجد کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ مارچ ۱۸۵۷ء میں اسی مسجد کے دروازے پر ایک اشتہار چسپاں کیا گیا تھا جس میں آنے والی بغاوت کی طرف اشارے تھے۔ چنانچہ اس دور کے ایک اخبار "صادق الاخبار" مورخہ ۱۹ مارچ ۱۸۵۷ء میں یہ خبر شائع ہوئی تھی، اصل عبارت کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"ایک اشتہار نام نہاد شاہِ ایران دہلی میں گزرگاہوں پر آویزاں کیا گیا ہے۔ ہمارے ایک [illegible]

آویزاں تھا نقل کرلائے تھے اکثر لوگوں نے اس کو دیکھا خلاصہ مضمون اس کا یہ ہے کہ اہلِ اسلام کو نصاریٰ (انگریز) کی مدد و معاونت سے پرہیز کرنا واجب ہے۔۔۔"

تحریک ۱۸۵۷ء کے دوران میں جنرل بخت خاں کے دہلی آنے کے بعد جہاد کا فتویٰ بھی اسی جامع میں مرتب کیا گیا جس پر اس دور کے تمام مشاہیر علماء اور فضلا کے دستخط ہیں۔ اس تاریخی فتوے کا اقتباس یہ ہے:

"کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ اب جو انگریز دلی پر چڑھ آئے ہیں اور اہلِ اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں اس صورت میں اب اس شہر پر جہاد فرض ہے یا نہیں؟۔۔۔"

اس استفسار کا جواب علمائے کرام کی طرف سے یہ دیا گیا:

"درصورتِ مرقومہ فرضِ عین ہے اُوپر تمام اس شہر کے لوگوں کی اور استطاعت ضرور ہے اس کی فرضیت کے واسطے چنانچہ اس شہر والوں کی طاقت مقابلے اور لڑائی کی ہے۔ بسبب کثرتِ اجتماع افواج کے اور مہیا اور موجود ہونے آلاتِ حرب کے تو فرضِ عین ہونے میں کیا شک رہا۔۔۔"

(اخبار "الظفر" دہلی، میں شائع ہوا)

تحریک ۵۷ء کے دوران جو مجاہدین دینی جذبے جہاد کے لیے دہلی آئے وہ جامع مسجد ہی میں مقیم تھے۔ یہ مجاہدین آخر تک جنگوں میں حصہ لیتے رہے لوٹ مار سے پرہیز کرتے رہے اور رُوکھی سُوکھی کھا کر گزارا کرتے رہے۔ ان کے بدن پر کپڑے بھی ثابت نہ تھے اور نہایت پھٹے حالوں میں تھے لیکن جذبۂ صادق اور جوش و خروش میں سب پر بازی لے گئے تھے۔ جامع مسجد کے شمالی دروازے پر شکست ۔۔۔ ہار کر بعد ایک انگریزی فوج کے دستے سے

ان مجاہدین نے باہر آکر مقابلہ کیا جس کا ذکر ظہیر دہلوی نے "داستانِ غدر" میں اس طرح کیا ہے:

"میں وہاں سے چاوڑی بازار میں جا پہنچا دیکھا کہ واقعی ہزاروں آدمی لاٹھی، پھونگا، تلوار، گنڈاسا وغیرہ لیے ہوئے شہر میں پھرتے ہیں غ[...] کر جامع مسجد کے نیچے ہو کر خلیوں کے بازار میں پہ[...] تو وہاں عجیب تماشا نظر آیا۔ لاشوں کا ایک ا[...] انبار تھا جیسے لکڑیوں کی ٹال ہوتی ہے۔۔۔"

(داستانِ غدر ص ۱۱۳۔ [...])

جب انگریزی فوج کا دستہ جامع مسجد کے قری[ب ...] تو مجاہدین میں سے ایک شخص نے منبر پر چڑھ کر [...]

"تمہارے امتحان کا وقت آگیا۔۔ میں کون ہے جو اپنی جان نچھاور کرنا چاہتا ہے سامنے کھڑا ہے۔ جس کو مرنا ہو وہ شمالی در[وازے] کی طرف میرے ساتھ آئے اور جسے جان پیا[ری ہو] وہ جنوبی دروازے سے چلا جائے کہ ادھر [...] نہیں ہے۔۔۔" یہ سنکر تمام مجاہدین تلوا[ریں لے] کر آمادۂ جنگ ہو گئے۔ "اللہ اکبر" کے ن[عروں] نے بام و در لرزا دیے، ایک بھی جنوبی دروا[زے] کی طرف نہیں گیا۔ جیسے ہی وہ شمالی دروازے [سے] نکلے انگریزی فوج نے گولیوں کی باڑھ ماری دو سو شہید ہو کر گرے مگر انگریزی فوج کو بار گراب مارنے کی مہلت نہ ملی اور یہ لوگ [جن کے] پاس صرف تلواریں تھیں، ان کے سر پر [...] انگریزی فوج اس مجاہدانہ جذبے کی تا[ب نہ لا کر] پیچھے ہٹی، انھوں نے پیچھا کیا اور کشمیری د[روازے] کے سینٹ جیمس گرجا تک نکال دیا۔ خ[واجہ حسن] نظامی نے بھی اس واقعے کا ذکر کیا ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد جامع مسجد ض[بط ہوئی] یہاں فوجیوں کا اصطبل بنایا گیا۔ آخر کار ۱۸۶۲ء کو بہت کوشش کے بعد وا[گزار ...]

یہاں تک بے حرمتی کی گئی کہ جو انگریز بعد میں بھی مسجد دیکھنے آتے تو جوتے نہیں اتارتے تھے۔ لارڈ کرزن نے ۱۸۹۹ء سے اتنا کیا کہ جوتوں پر موزہ چڑھا کر مسجد میں آیا۔ اس مسجد کے مشرقی دروازے کے سامنے خاص بازار تھا۔ اس دروازے سے قلعے تک کی سڑک کو 'سڑکِ خاص' کہا جاتا تھا۔ خاص بازار سے خانم کے بازار اور خان دوران کی حویلی کو راستہ جاتا تھا۔ یہ بازار قلعے کی فصیل کے برابر سراوگیوں کے مندر تک چلا گیا تھا۔ اس جگہ کو مسمار کر کے بعد میں ایڈورڈ پارک (سبھاش پارک) بنایا گیا۔ خاص بازار سے آگے گلابی باغ تھا جہاں بعد میں ایک حوض لال ڈگی کے نام سے بنایا گیا تھا۔ اب یہ بھی نہیں ہے۔

دریا گنج

لال قلعے کے دلّی دروازے کے برابر والی سنہری مسجد کے سامنے ایک سڑک شہر پناہ دلّی دروازے تک چلی گئی ہے۔ اس سڑک کے مشرقی جانب ۱۸۵۷ء سے پہلے ایک ڈاک بنگلہ تھا جس کے مغرب میں اکبر آبادی مسجد تھی جسے مسمار کر دیا گیا۔ سنہری مسجد سے ایک سڑک راج گھاٹ دروازے کو گئی ہے اس سڑک کے جنوب میں فصیل کے پاس بہت سے مکانات زیادہ تر عیسائیوں کے تھے اور کچھ پادری رہتے تھے۔ ایک مکان گھوڑا گاڑی کے ٹھیکے دار کا تھا چوں کہ کشتیوں کا پل اس زمانے میں راج گھاٹ کی سڑک کے سیدھی طرف تھا اور یہیں بنگال کی سفر مینا پلٹن (سیپر مائنرز) جو ۱۸۵۲ء میں رڑکی چلی گئی، مقیم تھی، باغ کے مشرق کی طرف سڑک ایک دو منزلہ مکان کی طرف جاتی ہے جس میں نواب جھجر رہتے تھے یہی وہ مکان تھا جس میں پہلے فیروز پور کے نواب شمس الدّین رہتے تھے اور ان کے بعد علی بخش خاں رہتے تھے۔ قریب ہی زینت المساجد ہے۔ خیراتی دروازے کے آگے پلٹن کا ہسپتال تھا۔ اسی مقام پر ایک پرانی بارہ دری تھی اور یہاں راجہ کشن گڑھ رہتے تھے۔ یہی وہ مکان تھا جہاں ولیم فریزر دعوت میں آیا اور واپسی میں قتل ہوا جس کا الزام نواب شمس الدّین پر لگایا گیا۔ ۱۸۵۷ء میں یہاں مسٹر آلڈول گورنمنٹ پنشنر رہتا تھا۔ انقلابیوں نے یہاں حملہ کیا، دو رات مقابلہ ہوا، آلڈول اور اس کا لڑکا جان بچا کر بھاگے، باقی کا کام تمام ہوا۔ آلڈول کی بیوی کو قلعے میں پہنچایا گیا مگر جب نقار خانے کے سامنے سب کا قتل (۱۶ رمئی ۱۸۵۷ء) ہوا تو یہ وہاں سے بھی بچ نکلی۔ اسی مکان کے محاذ میں بلندی پر ایک اور مکان تھا جس میں راجہ بلبھ گڑھ مقیم تھا۔ فیض بازار ہی میں اکبر آبادی مسجد تھی جسے مسمار کر کے ایڈورڈ پارک بنا۔ دریا گنج ہی وہ مقام ہے جہاں سب سے پہلے قتلِ عام شروع ہوا۔ ظہیر دہلوی نے یہ نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

"(راج گھاٹ) دروازے کی سڑک جو کھائی پر جو بکی دریا گنج کی چوڑائی میں سنہری مسجد کے سامنے جا کر تمام ہوئی ہے وہاں سنہری مسجد کے نیچے چوراہا ہے۔ ایک سڑک تو لال قلعے کے نیچے ہوتی ہوئی لال ڈگی کو جاتی ہے اور ایک راستہ خاص بازار کو جاتا ہے اور یہیں سے قلعے کا میدان شروع ہے اور جنوب کی جانب دو سڑکیں برابر دہلی دروازے کو جاتی ہیں، نہر حائل ہے اور ایک سڑک کہ جو گوشۂ جنوب و مشرق میں دریا گنج کو جاتی ہے اس میں اوّل ہی سڑک کے کنارے پادری کا بنگلہ ہے۔ یہ پادری صاحب اوّل تو ہندو تھے پھر عیسائی ہو گئے اوّل انہی پر چوٹ ہوئی۔"

الٰہی بخش کا رنگ محل

محلہ گنج میر خاں میں ترا ہے پر ایک محل انگریز دوست الٰہی بخش کا تھا جو بعد میں اس کے بیٹے ثریا جاہ کے میں رہا پھر الٰہی بخش کی پوتیوں کے پاس رہا پھر کچہری بنا دیا گیا، مرزا جمشید بخت کا بنوایا ہوا۔ الٰہی بخش نے خرید لیا تھا۔ ثریا جاہ کو آٹھ سو روپے ماہانہ گویا باپ کی وفاداریوں کا انعام ملا کرتا

پھاٹک بدل بیگ، احسن اللہ کا مکان

حویلی بدل بیگ کا دروازہ لبِ سڑک با سرکی والان (لال کنواں) میں ہے اس کا دروا حکیم احسن اللہ نے بنوایا تھا جس نے یہ مکان تھا۔ احسن اللہ کا ایک مکان مہرولی میں بھی تھا۔ بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قلعے میں بھی رہتا ۱۸۵۷ء کی اہم شخصیت تھا۔

بیگم زینت محل کا مکان

لال کنویں پر اسی نام سے ہے، عالی ش پھاٹک لبِ سڑک ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مہار پٹیالہ کے قبضے میں آیا۔ ۱۲۶۲ھ میں بہادر شاہ غالباً زینت محل کے لیے بنوایا تھا۔ بہادر شاہ کو گر کے بعد کچھ دن اس جگہ بھی قید میں رکھا گیا تھا۔

شمرو بیگم کی کوٹھی

چاندنی چوک کے شمال میں ہے، اونچی کر دے کر بنائی گئی ہے۔ پُشت پر باغ بھی تھا۔ ا میں پہلے دلّی لندن بینک تھا جس میں انگریزوں کا روپیہ جمع رہتا تھا۔ یہیں بینک کے منیجر بر سفر اس کی بیوی اور لڑکیوں کو قتل کیا گیا اور بینک گیا۔

خونی دروازہ

[illegible]

میں واقع تھا اس کا تذکرہ ظہیر دہلوی نے "داستانِ غدر" میں کئی جگہ کیا ہے۔ نادر شاہ کے زمانے میں اس دروازے کے آگے قتلِ عام ہوا تھا اسی لیے خونی دروازہ مشہور تھا اب نہیں ہے۔

کوتوالی چبوترہ

چاندنی چوک میں سنہری مسجد سے ملحق کوتوالی کی عمارت ہے اب گردوارے میں شامل ہو گئی ہے میجسٹک سنیما کے سامنے یہاں ایک چبوترہ تھا، اب نہیں رہا، اسی پر ان مغل شہزادوں کے لاشے لٹکائے گئے تھے جنھیں ہڈسن نے قتل کر کے خون پیا تھا یہیں پھانسیاں نصب تھیں۔ نواب جھجر اور راجہ بلب گڑھ وغیرہ کو یہیں پھانسی پر لٹکایا گیا تھا۔ انگریز لوگ کرسیاں بچھا کر بیٹھتے اور پھانسیوں کا 'تماشا' دیکھتے تھے۔ چاندنی چوک کے سرے پر مسجد فتح پوری بھی بغاوت کے بعد انگریزی انتقام کا نشانہ بنی اور مع دکانوں کے ضبط کر کے دکانیں نیلام کر دی گئیں۔

نمک حرام کی حویلی

مسجد فتح پوری سے اسٹیشن کی سڑک یعنی مشن روڈ پر کوچہ گھاسی رام میں یہ عالی شان حویلی ہے۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ منشی بھوانی شنکر کو مرہٹوں کے دور میں ایک معزز عہدے پر فتح داری سپرد کی گئی مگر یہ منشی انگریزوں سے مل گیا اسی لیے لوگ 'نمک حرام' کی حویلی کہتے ہیں۔ منشی کو یہ بات ناگوار ہوئی، انگریز آقاؤں سے فریاد کی، احکام جاری ہوئے کہ کوئی اسے 'نمک حرام' نہ کہے مگر ہر شخص کی زبان پر یہی چڑھا رہا۔

(واقعاتِ دارالحکومت جلد ۲، ص ۲۴۷)

کشمیری دروازہ

تعمیر ۱۶۳۸-۳۹ء کی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے درمیان بہت اہمیت کا حامل رہا۔ گولہ باری سے در و دیوار چھلنی ہو گئے ہیں۔ یہ دروازہ ڈبل ہے یعنی دو پھاٹک ہیں۔ پہلے اس کے آگے ایک پل بنا ہوا تھا یہاں ایک پتھر ۱۸۷۶ء میں نصب کیا گیا جس پر یہ تفصیل درج ہے کہ ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو جب انگریزی فوج نے حملہ کیا تو شدید گولہ باری کا مقابلہ کرتے ہوئے پل پار کر کے چند انگریزوں نے بارود سے دروازے کا داہنا پٹ اڑا کر حملہ آوروں کے لیے راستہ بنایا اس میں چند انگریز کام آئے۔ اسی علاقے میں سینٹ جیمس گرجا اور عیسائیوں کا قبرستان ہے جہاں ولیم فریزر کی قبر ہے جو ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو قتل ہوا۔ ۱۸۵۷ء میں جو انگریز مارے گئے ان میں سے بھی بعض کی قبریں ہیں۔ گرجا کے شمال میں تھامس تھیافلس مٹکاف کا باپ تھا جو ۱۸۵۷ء میں دہلی کا جوائنٹ مجسٹریٹ تھا، بغاوت کے دوران میں پہاڑ گنج کے تھانے دار معین الدین کی مدد سے جان بچا کر بھاگا تھا اور ریاست جھجر میں جا کر پناہ لی تھی، بعد میں اسی مٹکاف نے معین الدین حسن کی تحریر کردہ یادداشت "خدنگِ غدر" کو انگریزی میں (TWO NATIVE NARR-ATIVES) شائع کیا جس کا ترجمہ خواجہ حسن نظامی نے "غدر کی صبح شام" کے عنوان سے کرایا۔

تار گھر

کلکتہ دروازہ سے نصف میل کے فاصلے پر تار گھر تھا۔ اسی مقام پر ایک ستون انگریزوں کی یاد میں بنا ہوا ہے جنھوں نے ۱۱ مئی کو بغاوت کی خبر تار سے انبالہ پہنچائی تھی۔ اس پر یہ تفصیلات اور تار کی نقل کندہ ہے۔ یہ ستون موجودہ جی۔ پی۔ او (جنرل پوسٹ آفس) کے سامنے ہے۔

میگزین

داراشکوہ کے محل کی جگہ پر میگزین تھا۔ اس ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو حملہ کیا گیا اور انگریزوں نے بارود سے اڑا دیا۔ اب صرف اس کے دروازے جی۔ پی۔ او کے سامنے موجود ہیں۔

مندر گھاسی رام

بمقام چھتہ شاہ جی، نائی واڑہ۔ گھاسی رام کھتری کا بنوایا ہوا ہے جس کے آبا و اجداد میں ج... مغل بادشاہ محمد شاہ کا معزز عہدے دار ... بغاوت ۱۸۵۷ء میں گھاسی رام نے انقلابیوں کا ساتھ دیا۔ لہٰذا یہ مندر ضبط ہو گیا۔

مندر گلاب رائے مہر چند

چاندنی چوک، کوچہ نٹھا مند میں ہے گلاب رائے کا بنوایا ہوا ہے جس کے باپ سہارن ... تھے جنھوں نے سہارن پور بسایا اور اکبر نے جاگیر دی تھی۔ ان کی چھٹی پشت میں سالگ رام مہاجن تھا جس کا ذکر بغاوت کے دوران جگہ جگہ آتا ہے۔ ... شاہی نوکری چھوڑ دی تھی اور ۱۸۲۵ء میں انگ... حکومت میں خزانچی مقرر ہوا تھا۔

مٹکاف ہاؤس

کشمیری دروازے کے باہر تقریباً ... میل کے فاصلے پر تھامس تھیافلس مٹکاف نے ... میں بنوایا۔ اس کے تہہ خانوں میں کچھ انگریز دورِ بغاوت چھپے رہے۔ یہاں جون مٹکاف رہتا تھا ... کے شمال میں ریج یعنی پہاڑی ہے جہاں انگریزی محاصرہ کیے پڑی رہی۔ یہیں پر باڑہ ٹوٹی یعنی فلیگ اسٹاف ٹاور ہے۔ اسی کے اطراف میں قدسیہ باغ ا...

ڈلو کیسل ہے جو کمشنر سائمن فریزر کی رہائش گاہ تھی۔ قدسیہ باغ میں ایک ٹوٹی پھوٹی مسجد بھی ہے جو بغاوت کے دوران گولہ باری سے اس حالت کو پہنچی۔ قدسیہ باغ کے ایک حصے میں نکلسن کا مجسمہ لگا ہوا تھا جو کابلی دروازے اور لاہوری دروازے کے درمیان کی ایک تنگ گلی میں ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو زخمی ہو کر فوت ہوا۔ یہ مجسمہ اب ہٹا دیا گیا ہے۔ قدسیہ باغ میں انگریزی توپ خانے پڑے ہوئے تھے۔ اسی باغ کے سامنے پانی برج اور کشمیری برج کے شگاف ہیں اور جنوب مشرق کے کونے میں وہ قبرستان ہے جہاں نکلسن دفن ہے۔

فتح گڑھ کا مینار

سبزی منڈی کے قریب چار درجے کی لال پتھر کی یہ لاٹ اس مقام پر بنائی گئی ہے جہاں ۱۸۵۷ء میں انگریزی فوج کا کیمپ تھا۔ یہ اسی یادگار کے طور پر بنی ہے۔ اس پر متعدد کتبے ہیں جن پر جنگوں کی تاریخیں، محاصرے کی تفصیلات اور ان میں حصہ لینے والوں کے نام کندہ ہیں۔ قریب ہی محلہ کشن گنج سبزی منڈی سے متصل ہے یہی وہ مقام ہے جہاں بغاوت کے دوران مورچہ بندی رہی اور مقابلے ہوئے ایک واقعہ یہ مشہور ہے کہ جب ۱۴ ستمبر کو انگریزی فوجیں دہلی میں داخل ہوئیں تو کشن گنج میں انقلابیوں نے شراب کا ذخیرہ جمع کر دیا جسے پی پی کر انگریز سپاہی مست ہو گئے اور انقلابیوں نے اچھی طرح ٹھکائی کر دی۔

چند خاص خاص معرکوں کی تاریخیں یہ ہیں:

۱۔ ہنڈن پر جنگ — ۳۰ مئی ۵۷ء
۲۔ بادلی سرائے پر — ۸ جون
۳۔ ہندو راؤ ہاؤس پر — ۹ تا ۱۱ جون
۴۔ کشن گنج پر حملہ — ۱۷ جون
۵۔ سبزی منڈی کا معرکہ — ۲۳، ۲۷، ۳۰ جون
۶۔ کشن گنج پر — یکم اگست
۷۔ قدسیہ باغ پر — ۱۲ اگست
۸۔ نجف گڑھ پر — ۲۵ اگست

نظمیں

اعجاز اعظمی

پورٹ ڈکسن کی ایک شام

یہ لب دریا سہانی شام، یہ رنگینیاں
گیلی گیلی ریت پر محوِ خرام
خوش دِلاں، خوش پوش، یارانِ ہوس
خواہشوں کی دھیمی دھیمی آنچ میں شعلہ بدن
بھینی بھینی سانس کی خوشبو سے مہکے جسم وجاں
قہقہوں، غمزوں، کنایوں کی برات
خواہشوں کے لمس سے ہر تارِ دل میں ارتعاش
سوچتا ہوں میں یہاں آیا ہی کیوں
ریت پر مِلتی ہوئی
تحریر پڑھ کر کیا ملا

گاؤں کامراوان پوسٹ نروعا، ضلع اعظم گڑھ (یو.پی)

آس

صبح کے آتے آتے
احساس ہوا تم آؤ گے
شرمیلی البیلی خواہش جاگ اٹھی
جوت بنی
آنکھوں میں آئی
دل میں اُتری
سرشاری کے عالم میں ہر لمحہ بیتا
آس کے بندھن میں بندھ کر ہم خود کو بھولے
بھول گئے کیا کہنا ہوگا
چپ بھی رہیں تو دل کی دھڑکن سب کہہ دے گی
بڑے رسان اور خوش خلقی سے باتیں کر کے
اُٹھ جائیں گے کھو جانے کو
جانی پہچانی دُنیا میں

آواز سُنی کچھ گرنے کی
سر کو اٹھایا ـــــ دیکھا
ہلکے پیلے رنگ کا پتّہ
پتھریلی دھرتی پہ لیٹا بوجھ رہا تھا
وقت کو پیکر میں ڈھلتے دیکھا ہے تم نے ؟
گذرے وقت کا میں ہرکارہ ـــــ دیکھو مجھ کو

ٹھہرو ......
گرنے کی آواز تو ہم کو دل کی زمیں سے بھی آئی تھی
شاید تم کو پہلے پہل وہاں دیکھا تھا
سورج چڑھتا، آس ٹھٹھرتی اوس بنی
دل سے نکل کر خواہش کوئی آنکھ میں آئی
شمع سی جلتی آنکھیں لے کر سو جائیں گے
پھر صبح ہوگی
گرتا پتّہ کچھ بھی کہے
ہم راہ تکیں گے

رعنا حیدری

معرفت بشیر نواز صاحب، محلہ گھاٹی، اورنگ آباد (ایم۔ایس)

اصغر

بدچلن

کمرے کے باہر چھوٹے سے برآمدے ہ پیروں جلی بلی کی طرح پھر رہی تھی۔ اور کمرے در آخری سرے پر پڑی اس کی فالج زدہ س اس کی سماعت پر گویا مسلسل ہتھوڑے ا رہی تھی:

" اٹھنے دے حرام خور اپنے خصم کو۔ پھر بتاتی ا تجھے۔"

" کھا کھا کے کمبخت سنڈی ہو رہی ہے اور کام نام سے جان نکلتی ہے۔"

بے جان جسم لیے پلنگ پر لیٹے لیٹے وہ تسلسل ساتھ بڑبڑا رہی تھی۔ اور صابرہ کا رہا سہا سکون ی اس کی متواتر آنے والی آواز کے سبب برباد و گیا تھا۔

صابرہ کا بے اختیار جی چاہا کہ وہ زور زور سے اماں کے ساتھ لڑے، انھیں خوب جی بھر کر گالیاں دے اور اٹھا کر زمین پر پٹخ دے پھر سینے پر چڑھ کر اتنی زور سے اچھلے کہ یہ آواز ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے۔

" کاش اماں! فالج تمھاری زبان پر پڑ جائے۔ تمھاری بولتی بند ہو۔" بے حد تڑپ کر اس نے دل ہی دل میں انھیں کوسا۔

مگر صابرہ کی بددعا بھی انھیں دعا ہو کر لگ رہی تھی شاید! اپاہج زندگی کی ڈوری تھی کہ تانت کی طرح کھنچی ہی چلی جا رہی تھی۔ تین برسوں سے وہ یوں ہی پلنگ پر پڑی اول فول بک رہی تھیں اور لفظوں کا خزانہ تھا کہ ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ ایک سے ایک نئے ڈیزائن کی گالیاں ان کے ہونٹوں سے آتشبازی کی طرح چھٹتی رہتی تھیں۔ جن کی حدّت گرمیوں کی دوپہر میں بھون ڈالتی اور سردیوں کی خنک راتوں میں بھی صابرہ پسینے سے نہا جاتی۔ اور سرور تھا کہ ماں کی ہر ناجائز بات کو بھی مقدس صحیفہ جان کر صابرہ کا بھرکس نکالنے اٹھ کھڑا ہوتا۔

پچھلے آٹھ برسوں سے وہ گھونٹ گھونٹ اس تلخی کو پی رہی تھی۔

ادھر سرور دفتر سے گھر آتا اور ادھر اماں صابرہ کی شکایتوں کی پٹاری کھول کے بیٹھ جاتی اور سرور یوں ہمہ تن گوش ہو کر سنتا جیسے جاہل ماں سے بیوی کی بدخوئیاں نہیں، کسی عالم کا وعظ سن رہا ہو۔

جانے وہ مرد کس مٹی کا بنا تھا۔ مٹی کا مادھو۔

" سارا دن دروازے پر کھڑی جانے اپنے کن یاروں کو تکے ہے۔"

اماں سرور سے کہتی ــــ اب وہ لاکھ سر مارے کہ دروازے پہ کھڑی تو میں محلے کے کسی آتے جاتے بچے کی راہ تک رہی تھی تاکہ ہنڈیا پکانے کے واسطے پاؤ بھر دال منگا سکوں۔ مگر سرور اس کی ایک نہ سنتا اور اٹھتے ہی ایک دھول جما دیتا۔ اس کے وزنی ہاتھ کے دھکّے کو صابرہ کا دھان پان جسم سہار نہ پاتا اور وہ دیوار سے جا ٹکراتی اور یوں دُہری چوٹوں کو سہلاتی اور آنسو بہاتی وہ کمرے سے باہر نکل آتی۔ سرور اطمینان اور سعادت مندی کے ملے جلے جذبے سے ماں کے بے جان پیر دابنے بیٹھ جاتا اور وہ حسبِ معمول مزید کان بھرنے لگتی ـــ

پلنگ پر اپاہج بنی لیٹے لیٹے اماں کی آنکھیں اور زبان، بس دو ہی چیزیں تھیں جو ان کے بس میں تھیں اور جنھیں وہ بے حد آزادی کے ساتھ صابرہ کے خلاف زہر اگلنے میں استعمال کرتی تھیں۔

" اے وہ مردوا جو ریڑھی پہ روز سبزی بیچے آوے ہے' ایسا ہنس ہنس کے باتیں کرے ہے صابرہ کے ساتھ اور یہ بھی گھنٹوں اس کے پاس کھڑی ٹھٹھول بازی کرے ہے۔ ادھر مجھ دکھیا پہ مکھیاں بھنکتی رہے ہیں۔" وہ سرور کو سناتی۔

" اماں کچھ تو خدا کا خوف کیا کرو ـــ" وہ احتجاج کرتی۔ " محلے کی سبھی عورتیں تو اس سے سبزی لیتی ہیں۔ مول تول میں آخر دیر تو لگتی ہے۔ محلے والیاں آپس میں ضرور ہنستی بولتی ہیں ـــ سبزی والے کو کیا مصیبت پڑی ہے کہ اپنا کام چھوڑ کر کسی ایک سے ٹھٹھول کرے گا؟"

" مگر تو نے اماں کے سامنے زبان کیوں کھولی' انھیں کیوں جھٹلایا ـــ؟" سرور تیزی سے اٹھ کر اسے ایک جھانپڑ رسید کرتا اور وہ چکرا کر زمین پر گر پڑتی یا دیوار سے جا ٹکراتی۔ یہ ڈراما تھوڑے بہت ردوبدل کے ساتھ روز ہی کھیلا جاتا۔ کہنے کو تو اماں صرف تین برسوں سے اپاہج ہو کر پلنگ پر پڑی تھیں مگر صابرہ کو تو ڈولی سے پیر اتارتے ہی

مکان نمبر ۸۹۴ ــ ۱۰/۴، جی۔ اسلام آباد (پاکستان)

پر چلنا پڑا تھا۔ وہ سسرال میں پہلے یوم سے لے
ے لوہے کے خاردار تاروں پر چلتی آئی تھی
ار ہی تھی۔
دوزخ کیا اس گھر سے بھی زیادہ خوفناک
وہ اکثر سوچتی
حالاں کہ شادی کی پہلی رات سرور نے اس
ٹ اُلٹ کر جو پہلا فقرہ بولا تھا۔ وہ آج بھی
ے کانوں میں امرت رس ٹپکا رہا تھا۔
تم کتنی حسین ہو صابرہ! میرا تو مقدر جاگ
؛
سرور کا فقرہ سُن کر صابرہ کا دل جھوم اُٹھا تھا
کا سر فخر سے اُونچا ہو گیا تھا۔ اور اس کے
مکتے تن کے اندر محبت کے بیشمار دیے
ٹھے تھے —— اس لمحے وہ اپنے بخت پر
نازاں ہوئی تھی۔ شاید یہی وہ فخر تھا جو
مدیر کو پسند نہیں آیا اور قسمت بنانے والے
کے نصیب کا سارا ٹھیکہ سرور کی ماں کو
تھا۔
چاہے بنایا بگاڑ ——" اور خود وہ بخت
تا۔
اس کی شادی کی وہ پہلی رات سرور کی ماں نے
روں پر لوٹ کے کاٹی تھی۔ اور پو پھٹتے ہی
بند دروازے کے پیچھے سے صابرہ کو
عد کرخت اور تلخ آواز سنائی دی تھی۔
ے ہئے عورت ہے یا سرِش کاٹن۔ میں
رور تو چپک گیا۔ اے نوج! کیسی بے حیا
ہے۔"
ور یہ اس کا پہلا تعارف تھا اپنی خوش دامن
بھی بات کی تہہ تک بھی نہ پہنچ پائی تھی
بے حیائی پر غور بھی نہ کر سکی تھی کہ کواڑوں کو
لے کر کسی نے سر ...

مسہری سے اُچھل کر یوں کھڑا ہو گیا جیسے کھیل کے میدان میں کھلاڑی کی ٹھوکر سے فٹ بال اُچھلتی ہے۔ دوسرے ہی لمحے اپنی ہتھیلیوں سے آنکھیں ملتا اور صابرہ سے نظریں چار کیے بنا وہ کمرے سے باہر نکل گیا ——

وہ رات صابرہ کی تاریک زندگی میں روشن دیے کی طرح ٹمٹماتی رہی کسی خوب صورت خواب کی مانند —— سرور کے چلے جانے کے بعد ہونے والی تمام کارروائی کو صابرہ نے حیرانی سے سنا اور بے حد سنجیدگی سے محسوس کیا۔ آنے والے کسی انجانے خطرے نے اس کے کانوں میں گھنٹیاں سی بجائیں اور وہ تکیے سے سر اُٹھا کر باہر سے آنے والی آوازیں غور سے سننے لگی —— کوئی کہہ رہا تھا۔

" اے لڑکے پہلے ہی دن جورو کے چلتر میں پھنس گیا تو تمام عمر ہاتھ پیر مارتے رہنا مگر اس جال کا پھندا روز بروز تنگ ہوتا جائے گا۔ یہ ٹوٹنے کا نہیں۔ میاں! شیر بن شیر بزرگوں نے کہا ہے "گربہ کشتن روزِ اوّل" —— پہلے ہی دن بیٹا بلی مار دے ——"

اسے سمجھنے میں مطلق دیر نہ لگی کہ یہ آواز اس کی ساس اور سرور کی ماں کی تھی۔ اپنی رونمائی میں ساس کی طرف سے اس جھٹکے دار آواز میں صابرہ کو یہی کچھ ملا تھا۔ پیلے رنگ کے کپڑے پہنے اور اُبٹن لے بیٹھی صابرہ کے پاس جب سکھیوں نے ڈھولک کی تھاپ پہ گایا تھا۔

تب صابرہ نے سوچا تھا: عجیب لوگ ہیں۔ لڑکی کے سسرال میں قدم دھرنے سے پہلے ہی لڑکی کے دل میں نفرت کے پہاڑ کھڑے کر دیتے ہیں: مگر آج اپنا نظریہ اسے بے حد بے وقعت اور بے حقیقت لگا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

حیثیت ہے۔ بیوی تو پیر کی جوتی ہے۔ ناپسند ہوئی اُٹھا کے پھینک دی گھر کے کسی کونے کھدرے میں یا کوڑے کے ڈرم میں —— ٹوٹ گئی تو دوسری لے لو:"

بیٹے کو کی گئی نصیحت سے جانے صابرہ کے اندر کون سا آبلہ پھوٹ بہا کہ ڈھیروں ڈھیر آنسو اس کی پلکوں کے ساحل پہ آکر جمع ہو گئے۔ وہ بے حد آہستگی کے ساتھ اپنے گوٹے لپکا گئے: دوپٹے کے پلو میں بیٹھی ان میں سمیٹتی اور چھپاتی رہی۔ کسی خزانے کی طرح۔ تبھی دھڑ سے دروازہ کھلا اور اس کی ساس کولہوں پہ ہاتھ جمائے اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ سہم کر وہ سنبھلی اور گردن جھکا کر دلہن بن کے بیٹھ گئی۔

" مہارانی جی اب اُٹھو اور نہا دھو کر تیار ہو جاؤ۔ یہ آبا جی کا گھر نہیں کہ دن چڑھے تک پڑی رہو —— مہمان آنے والے ہیں اور یہاں تمہیں سجانے سنوارنے کے لیے خادمائیں نہیں بیٹھیں۔"

آواز کی سختی اور لہجے کی کرختگی کے سبب اسے پہچاننے میں مطلق دیر نہیں لگی: "تو یہ ہے سسرال ——!" اس نے جیسے خود سے کہا۔

"اور آج سسرال میں میرا یہ پہلا دن ہے پہلا سواگت —— اور یہ میرا اپنا گھر ہے اور اب مجھے اپنی بقایا زندگی یہیں گزارنی ہے۔ اس چار دیواری کے اندر —— ان بیگانے لوگوں کے بیچ —— اور یہ واقعہ ہے کہ میں ایک شریف خاندان کی لڑکی ہوں۔ جو سسرال کی چوکھٹ سے مر کر ہی باہر نکلتی ہے:"

اس نے حسرت سے اس کمرے کے در و دیوار پر نظر ڈالی اور اجنبیت کے شدید احساس سے اس کا دم گھٹ سا گیا۔ تاہم اس نے اپنی سانس

اگرچہ اس کا دل بوجھل اور طبیعت کسل مند ہو رہی تھی۔ وہ اُٹھی اور اس نے اپنا بستر جھاڑ کر دوبارہ بچھایا مسلی ہوئی چادر کی سلوٹیں درست کیں اور تکیوں کو قرینے سے ان پر جمادیا۔ بے ترتیب پڑی چیزوں کو سمیٹ کر سلیقے سے رکھا اور کمرہ صاف کر کے باہر نکل آئی۔ لرزتی، کانپتی۔ پھول کی نازک پتی کی طرح۔ ایک رات کی دلہن۔ ادھورے سپنوں سے اس کی گھنیری پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ اس نے سہمی سہمی چور نظروں سے گھر کا جائزہ لیا۔ گھر کی چھوٹی سی انگنائی میں اس کی ساس ولیمے کے چاول تلوا رہی تھیں۔ اسے یہ سب بے حد عجیب سا لگا۔ حتیٰ کہ اپنا وجود تک ـــــ شادی والے اس گھر میں غیر معمولی خاموشی طاری تھی۔

اور اس دن مہمانوں کے سامنے، رونمائی کی رسم ادا کرتے ہوئے اس کی ساس کا مُنہ سوکھ سوکھ گیا اپنی نئی نویلی دلہن کی تعریفیں کرتے کرتے۔ بالکل یوں جیسے وہ جب رشتہ لینے آئی تھی تو کیا کرتی تھی۔ اور صابرہ گھونگھٹ کی اوٹ کے پیچھے بیٹھی سوچتی رہی ـــــ "سچ کیا ہے ـــــ؟ وہ تھا یا یہ ہے ـــــ؟"

مگر سچ وہی تھا جو پہلے ہی لمحے حنظل کی کڑواہٹ کی مانند اس کے گلے میں اُتر گیا تھا۔ اور ان آٹھ برسوں میں برابر اس کی کڑواہٹ بوند بوند کر کے صابرہ کے حلق میں ٹپکتی چلی گئی ـــــ اور اب تو چائے میں پڑی چینی کا ذائقہ بھی اُسے کڑوا کسیلا لگنے لگا تھا۔ کئی دفعہ الجھ کر اس نے سوچا تھا۔

"چلو مان لیا۔ اماں جاہل ہیں۔ پرانے وقتوں کی ہیں مگر سرور تو پڑھا لکھا اور آج کے دور کا باشعور انسان ہے۔ سرکاری دفتر میں افسر نہ سہی، اسسٹنٹ تو ہے نا۔ اچھے لوگوں میں اُٹھتا بیٹھتا [illegible]

تو نہیں ـــــ پھر کیا ہوا۔ یہ بدل کیوں گیا۔ کیا مجھی میں کوئی خامی ہے ـــــ؟ اور میں کب یہ کہتی ہوں کہ ماں سے محبت نہ کرے، ان کا احترام نہ کرے۔ میں تو خود ان کی خدمت کرتی ہوں۔ ان کی سیوا میں لگی رہتی ہوں ـــــ مگر مجھے بھی تو عزت کی، محبت کی اور توجہ کی ضرورت ہے۔ یہ کیا کہ کھونٹے سے بندھی گائے کی طرح جو ذبح ہونے کے لیے کھڑی ہو اور قصائی کے ہاتھ میں چھُرا دیکھ کر لرز اُٹھتی ہو، میں سرور کے دفتر سے گھر آنے پر یہی کیفیت خود پر طاری ہوتی محسوس کرتی ہوں۔"

وہ پیروں جلی بلی کی طرح کچن سے برآمدے اور برآمدے سے کچن میں چکر لگاتی پھرتی اور سوچتی رہتی۔ جانے کہاں کہاں سے خیالات غنیم کی فوج کی طرح آ آکر اس کے دماغ پر حملہ آور ہو رہے تھے۔ وہ کوشش کر رہی تھی کہ انہیں جھٹک دے ـــــ دور کر دے مگر وہ تو گھس بیٹھیے تھے۔ جانے کن کن گھاٹیوں اور چٹانوں کے پیچھے چھپے بیٹھے تھے۔ اس کے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مُنہ پر مارے۔ اپنے بے قرار، مچلتے تڑپتے دل پر فریج کے یخ پانی کا پھاہا رکھا مگر اس کے اندر دھیرے دھیرے کچھ سلگتا رہا۔

کام تھا کہ سمٹنے نہیں سمٹ رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو مجتمع کرنے کی بھرپور کوشش کی اور جلدی جلدی کام نمٹانے لگی۔ بچوں کے اسکول سے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ اماں کو یخنی دینا تھی اور پھر کچھ دیر بعد پھلوں کا رس ـــــ ذرا دیر ہوگئی تو پھر وہی نکا فضیحتی۔ اس نے روز روز کے جھگڑوں سے سخت بیزاری محسوس کی ـــــ اور اب تو اس کی آنکھوں کی جھیلیں بھی خشک ہو چکی تھیں۔ بس ایک دل کا تالاب تھا جو اندر ہی اندر اُتھل پتھل [illegible] زندگی کے اُفق پر [illegible] کا

چاند کبھی نہیں چڑھتا تھا۔ مگر دل کے سمندر میں جوار کے بھنور بنتے رہتے ہیں۔

سورج آسمان کے بیچوں بیچ آٹکا تھا او دھوپ برآمدے کے کناروں کو چھو رہی تھی۔ فض میں حدت تھی اور اس کے اندر بھی کچھ سُلگ رہا تھا۔ اور اسے اپنے ہاتھوں پیروں میں ٹھنڈک کا احساس ہو رہا تھا اور افسردگی کی شدت اس پور پور میں اتری جارہی تھی۔ وہ نڈھال سی ہو گئی۔

"میں یہ گھر چھوڑ کیوں نہیں دیتی ـــــ" اچانک اس نے خود سے پوچھا۔ اور سوال کے سا ہی اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔

"مگر یہ گھر چھوڑ کر کہاں جاؤں ـــــ" اپ نے پھر تسلط جمایا۔ "ماں باپ زندہ ہوتے تو ان کندھا حاضر تھا مگر وہ دونوں تو شاید میرے بیاہے جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے رخصت کرتے ہی خود بھی دنیا سے رخصت ہو گئے۔"

چولہے پر چڑھی یخنی کے اُبال کی طرح ا کے ذہن میں بھی اُبال اُٹھ رہے تھے۔ "مگر یہ بھی ذلالت ہے کہ سرور کے ٹکڑوں پر پڑی میں اس کی جوتیاں کھاتی رہوں اور اس کی بد دماغ کی گالیاں سُنتی رہوں۔ میں آخر پڑھی لکھی، ایک ڈپلومہ ہولڈر لڑکی ہوں۔ خود کما کے کھا سکتی ہ عزت کے ساتھ زندہ رہ سکتی ہوں ـــــ"

شاید پہلی مرتبہ اس کی عزتِ نفس جاگ

"مگر میرے بچے ـــــ؟" اسے خی آیا اور بچوں کا خیال آتے ہی اس کے کلیجے سے سی اُٹھی۔ وہ لرز کر رہ گئی۔ اور اس کی آنکھو خشک تلیا میں کنکر چبھنے لگے اور کناروں پر س کی بوندیں آکر ٹھہر گئیں۔

"توبہ کیا روح فرسا خیال ہے!" وہ کا

[redacted]

اور اس کے سینے پر کوئی دھم دھم کرتا گزر گیا۔ گھبرا
کر اس نے دونوں ہاتھوں سے دل پکڑ لیا۔
"نہیں اب نہیں سہا جاتا ــــ کب تک
آستین کے سنپولوں اولاد کی خاطر ــــ سانپ کے بچے
سنپولیے کہلاتے ہیں ــــ برداشت ــــ
برداشت ممکن نہیں۔
اور اس دن کی وہ شام بھی گزری ہوئی بہت
سی شاموں کی طرح اپنے تمام تر معمولات کے ساتھ
آئی اور گزر گئی ــــ اگلے دن کا سورج معمول کے
مطابق مشرق سے نکلا اور روشنی کی کرنیں دنیا پر پھیلانے
کرنے لگا۔ لیکن اگلے دن کی یہ صبح سود اور اس کے
گھر کے لیے غیر معمولی صبح تھی۔
گھر کا کونہ کونہ چھان مارا ــــ محلّے میں
چپکے چپکے ڈھونڈا ــــ جانے کمبخت کہاں غارت
ہو گئی تھی۔ تنگ آ کر سود نے رپورٹ لکھا دی۔
اور اس سے بھی اگلے دن۔ اخباروں میں دو کالمی
ایک خبر چھپی۔
"چار بچوں کی ماں، بچے چھوڑ کر اپنے آشنا
کے ساتھ فرار ہو گئی"

اُردو میں بارہ ماسے کی روایت

مطالعہ و متن

اُردو میں عوامی شعر و ادب کے سلسلے بھی کلاسیکی ادبیات کے ساتھ ساتھ چلتے رہے ہیں۔ ان شعری اصناف کی رنگا رنگی اور صدیوں تک ان کی روایتوں کا تسلسل، ان کی مقبولیت کا بیّن ثبوت ہے۔ ایسی عوامی شاعری اور اس کے مختلف نمونے، اور عام پسند قصّے کہانیاں اردو زبان میں لوک ساہتیہ کی موجودگی کی گواہی دیتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ہماری تنقید و تحقیق نے اس نثری اور شعری روایت پر وہ توجہ نہیں کی جس کی یہ مستحق تھی۔

اُردو میں کلاسیکی شاعری کی ابتدا، جہاں تک شمالی ہند کا تعلق ہے، افضل کے بارہ ماسے سے ہوتی ہے۔ بعد میں دوسرے کئی شعرا نے بھی بارہ ماسے لکھے۔ بعض نے ہندی دوہوں کو بھی ان میں شامل کیا جو کھڑی بولی کے علاقے میں خصوصیت کے ساتھ عوامی شاعری اور عوامی شعور کا حصّہ رہے ہیں۔ بارہ ماسوں کا مطالعہ اُردو زبان کے ارتقائی مراحل کو سمجھنے اور اس کے ثقافتی رشتوں کو جاننے میں بہت معاون ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے جو اُردو میں عوامی شعر و ادب کی روایت پر ایک مدّت سے کام کر رہے ہیں، ۱۲ بارہ ماسے اس کتاب میں یکجا کر دیے ہیں۔ متن قدیم مطبوعہ اور قلمی نسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہے۔ آغازِ کتاب میں مبسوط و مفصل مقدمے کے علاوہ ہر بارہ ماسے کا تعارف اور اس کا تنقیدی مطالعہ بھی فاضل مرتب نے پیش کیا ہے۔

مصنّفین : ۱۲ مختلف شعرا
مرتّب : ڈاکٹر تنویر احمد علوی
صفحات : ۳۸۰
قیمت : ۳۹ روپے

دِلّی کے آثارِ قدیمہ

(فارسی تاریخوں میں)

ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی تاریخ کا سب سے بڑا ماخذ وہ فارسی تاریخیں ہیں جو اُس عہد میں لکھی گئیں۔ یہ ہماری محرومی ہے کہ ہمارے زمانے میں فارسی کا چلن کم ہو گیا ہے۔ اس لیے ہمارے مورخین اور عام لوگ فارسی تاریخوں سے استفادہ نہیں کر پاتے۔ اُردو اکادمی کی تحقیق و اشاعتی کمیٹی نے جب فیصلہ کیا کہ دِلّی کی تہذیبی اور سماجی زندگی پر کتابیں تیار کرا کے شائع کی جائیں تو دِلّی کے آثارِ قدیمہ میں خلیق انجم صاحب کی دل چسپی کے پیشِ نظر اُن سے فرمائش کی گئی کہ وہ فارسی تاریخوں میں دِلّی کے آثارِ قدیمہ کا جو ذکر آیا ہے اُسے اُردو میں ترجمہ کر کے کتابی صورت میں مرتّب کر دیں۔ ان کتابوں تک رسائی کے لیے اور پھر مطلوبہ مواد کی تلاش میں خلیق انجم صاحب کو کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا، اس کا اندازہ محقق حضرات ہی کر سکتے ہیں۔

یہ خوشی کا مقام ہے کہ خلیق انجم صاحب نے فارسی تاریخوں کے ان اہم اقتباسات کا اُردو میں ترجمہ کر کے ایک ایسی کتاب مرتّب کر دی ہے جو دِلّی کے آثارِ قدیمہ کے موضوع پر غیر معمولی افادیت کی حامل ہے۔

دِلّی کے آثارِ قدیمہ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن اس نوعیت کا کام اُردو میں پہلی بار ہوا ہے۔ یقین ہے کہ دِلّی کے آثارِ قدیمہ پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب مددگار اور معاون ثابت ہوگی اور عام پڑھنے والے بھی اس سے استفادہ کریں گے۔

مترجم اور مرتّب : ڈاکٹر خلیق انجم
صفحات : ۲۹۲
قیمت : ۴۸ روپے

عظیم اقبال

داڑھی

ایک قاضی نے ایک کتاب میں پڑھا کہ وہ آدمی احمق ہوتا ہے جس کا سر چھوٹا اور داڑھی بڑی ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے قاضی کی داڑھی بڑی تھی اور سر چھوٹا تھا۔ سر کا بڑا کرنا ناممکن تھا، لیکن بڑی داڑھی چھوٹی کی جا سکتی تھی، لہٰذا، قاضی نے اپنی داڑھی کو ہاتھ سے پکڑ کر چراغ کے سامنے رکھا۔ جیوں ہی چراغ کی لپٹ ہاتھ تک پہنچی، قاضی جی نے داڑھی چھوڑ دی۔ پوری داڑھی جل کر راکھ ہو گئی۔ کتاب میں جو کچھ لکھا تھا، قاضی اس کی مثال بن گیا۔

داڑھی سے مراد ٹھوڑی اور رخساروں کے بال ہوتے ہیں۔ داڑھی ہندی لفظ ہے اور اُردو میں مستعمل ہے۔ داڑھی سے چند دلچسپ محاورے بنے ہیں۔ جیسے داڑھی پھٹکارنا، داڑھی پیشاب سے منڈھوانا، داڑھی پیٹ میں ہونا، داڑھی چھوڑنا، داڑھی کا ایک ایک بال کرنا، داڑھی کو کلپ لگانا، وغیرہ۔

داڑھی پر چند پھبتے ہوئے اشعار بھی سنتے چلیے۔

حنا لگا کے نکلتے ہیں گل رخوں میں ریاض
کچھ ان کی ریشِ مقدس کا اعتبار نہیں
—— ریاض

لمبی داڑھی نے آبرو رکھ لی
مفت پی آئے اِک دُکان سے آج
—— آغا

ارماں ہی ہیں تو حوریں ہیں ریشِ سفید کے
واعظ بھی ہانک جاتا ہے وہ بے تکی کہ بس
—— خیال

ویسے تو داڑھی کو مردانگی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اور کچھ لوگوں کے چہرے پر یہ پھبتی بھی خوب ہے، لیکن ہر زمانے میں، ہر ملک میں داڑھی کے دشمن موجود رہے ہیں، جو داڑھی اور داڑھی والوں کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔

جہاں تک داڑھی کی تاریخ کا سوال ہے، انگریزی اور فرانسیسی ادب میں تو داڑھی پر متعدد کتابیں لکھی گئی، لیکن ہندوستان میں داڑھی کے بارے میں کوئی کتاب نہیں ہے۔

ہندوستان کے زیادہ تر مسلم حکمراں داڑھی والے تھے۔ اس بات کی شہادت موجود ہے کہ پہلی بار شاہ آباد میں ہمایوں کی داڑھی پر استرے کا استعمال کیا گیا۔ مسلمانوں کے لیے یہ جشن کا موقع تھا، کیوں کہ بادشاہ کبھی داڑھی بناتے ہی نہ تھے۔ اکبر نے جب داڑھی نہ رکھنے کا فیصلہ کیا، تبھی سے داڑھی نہ رکھنے کا بھی چلن شروع ہو گیا۔

داڑھی کے دشمن ہر زمانے میں رہے ہیں۔ سکندرِ اعظم داڑھی نہیں رکھتا تھا اور اس کا کوئی سپاہی داڑھی نہیں رکھ سکتا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا کوئی سپاہی دشمنوں کے ہاتھوں میں پڑ کر اپنی داڑھی نچوائے۔ اس کی فوج میں متعدد حجام تھے، جو پوری فوج کی داڑھی بنایا کرتے تھے۔

روم کا ایک شہنشاہ بھی داڑھی سے خفا

اس نے پوری ریاست میں کسی بھی فرد کے دا بڑھانے پر پابندی لگا رکھی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ داڑھی سے چڑنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کا ا باورچی داڑھی والا تھا اور اسی وجہ سے اکثر ش کے کھانے میں داڑھی کے بال نکلا کرتے تھے بات پر ایک بار کھانا کھاتے وقت شہنشاہ اتن ناراض ہوا کہ اس نے فوراً باورچی کو بلوایا اور کی داڑھی میں آگ لگوادی۔ بعد میں اسے ملک کر دیا۔

زمانۂ بائبل میں تو محض داڑھی کی وجہ جنگ بھی ہوئی ہے۔ دراصل، ہوا یہ کہ شاہ دا کے سفیر شاہ حناط کے دربار میں پہنچے۔ ان کی دا بڑھی ہوئی تھی۔ حناط نے سوچا کہ یہ جاسوس لہٰذا، اس کی نصف داڑھی اس نے منڈوا د جب شاہ داؤد نے داڑھی کی یہ رسوائی دیکھی، انھیں بہت بُرا لگا اور انھوں نے حناط کے خلا جنگ چھیڑ دی۔

روس کے حکمراں پیٹر نے ۱۷۰۵ء میں اعلان کرا دیا تھا کہ روس میں جو بھی شخص داڑھی بڑ گا اُسے ٹیکس دینا ہوگا۔

زمانۂ وسطیٰ کے یورپ میں پادریوں داڑھی کے خلاف ایک تحریک چلائی تھی۔ انگل میں بورچیسٹر کا بشپ سینٹ وولفسٹان قبل نار

گنج نمبر ۱، بتیا ۸۴۵۴۳۸ (بہار)

زمانے میں اپنے ساتھ ایک تیز دھار کا چاقو لے کر چلتا تھا۔ جب بھی کوئی داڑھی والا شخص اس کی دعائیں لینے کی غرض سے نیچے جھکتا' بشپ فوراً چاقو سے اس کی داڑھی کا ایک حصّہ کاٹ لیتا تھا اور وہ حصّہ اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہتا کہ اپنی باقی داڑھی بھی کٹوا لو' نہیں تو جہنم میں جاؤ گے۔

۱۵۴۳ء میں انگلینڈ میں ایک قانون بنایا گیا کہ لندن کا کوئی بھی شہری داڑھی نہیں بڑھا سکتا۔ اگر کوئی داڑھی بڑھاتا' تو اس کی شہری آزادی کے سبھی حقوق چھین لیے جاتے۔

اس طرح ظاہر ہے کہ ہر زمانے میں داڑھی کے خلاف کئی قدم اٹھائے گئے۔ ویسے دنیا کی کئی عظیم ہستیوں نے داڑھی رکھی۔ ان میں ارج برنارڈ شا' شیواجی' کارل مارکس' ویندر ناتھ ٹیگور' ٹالسٹائی' ابراہم لنکن' نرالا' الب' لینن' ڈارون' رابرٹ براؤننگ' ی' ایچ' لارنس' فرانسس بیکن' چارلس ڈکنس' ن جانسن' ولیم شیکسپیر' گرو گو لوانکر' ونوبا بھاوے' اکٹر ذاکر حسین' ابوالکلام آزاد شامل ہیں۔ یہ امر ی دلچسپی سے خالی نہیں کہ تحریکِ پاکستان کا تصور ینے والے اور اسلامی نظریات کی تجرید کرنے والے اعرِ مشرق علامہ اقبال اور بانیِ پاکستان قائدِ اعظم د علی جناح داڑھی سے مبّرا تھے۔

جہاں تک داڑھی کی لمبائی کے عالمی ریکارڈ سوال ہے' سب سے لمبی داڑھی امریکہ کے ں۔ ایم۔ لانگ سیٹ کی تھی۔ ۱۹۲۷ء میں جب س کا انتقال ہوا' اس وقت اس کی داڑھی کی ائی تقریباً ساڑھے سترہ فٹ تھی۔ یہ داڑھی آج محفوظ ہے۔ داڑھی کے بارے میں ایک اور یے دار بات آپ کو بتاتے چلیں کہ امریکہ کے شہر میں ایک خاتون جینس ڈیویری کی بھی اچھی خاصی داڑھی تھی۔ اس کی داڑھی کی لمبائی ۱۸۸۴ء میں ۳۶ سینٹی میٹر تھی۔

سائنس دانوں کے بقول عمر کے ساتھ ساتھ داڑھی زیادہ تیزی سے بڑھتی ہے اور گزرنے وقت کے ساتھ داڑھی کے بال سخت ہو جاتے ہیں۔ ہمارے چہرے پر تیس سے چالیس ہزار بال ہوتے ہیں۔ ہر بال ہر دن ایک انچ کا پچاسواں حصہ بڑھتا ہے۔

داڑھی کو فارسی میں ریش کہتے ہیں۔ اس سے تشکیل شدہ اسم مرکب "ریشِ قاضی" ہے جس سے مراد شراب کے چھاننے کا وہ کپڑا ہے جو صراحی کے منہ پر لگا رہتا ہے۔ اس سے متعلق ناسخ کا ایک شوخ رنگ شعر بھی گوش گزار کر لیجیے۔

نہ پائی ریشِ قاضی تو لیا عمامۂ مفتی
مزاج ان مے فروشوں کا بھی کیا ہی لاابالی ہے

عظیم اقبال

داڑھی

ایک قاضی نے ایک کتاب میں پڑھا کہ وہ آدمی احمق ہوتا ہے جس کا سر چھوٹا اور داڑھی بڑی ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے قاضی کی داڑھی بڑی تھی اور سر چھوٹا تھا۔ سر کا بڑا کرنا ناممکن تھا، لیکن بڑی داڑھی چھوٹی کی جا سکتی تھی، لہٰذا، قاضی نے اپنی داڑھی کو ہاتھ سے پکڑ کر چراغ کے سامنے رکھا۔ جیوں ہی چراغ کی لپٹ ہاتھ تک پہنچی، قاضی جی نے داڑھی چھوڑ دی۔ پوری داڑھی جل کر راکھ ہو گئی۔ کتاب میں جو کچھ لکھا تھا، قاضی اس کی مثال بن گیا۔

داڑھی سے مراد ٹھوڑی اور رخساروں کے بال ہوتے ہیں۔ داڑھی ہندی لفظ ہے اور اُردو میں مستعمل ہے۔ داڑھی سے چند دلچسپ محاورے بنے ہیں۔ جیسے داڑھی پھٹکارنا، داڑھی پیشاب سے منڈھوانا، داڑھی پیٹ میں ہونا، داڑھی چھوڑنا، داڑھی کا ایک ایک بال کرنا، داڑھی کو کلپ لگانا، وغیرہ۔

داڑھی پر چند چٹپٹے ہوئے اشعار بھی سنتے چلیے۔

حنا لگا کے نکلتے ہیں گل رخوں میں ریاض
کچھ ان کی ریشِ مقدس کا اعتبار نہیں
—— ریاض

لمبی داڑھی نے آبرو رکھ لی
مفت پی کے اک دکان سے آج
—— ر۔ آخر

ارماں ہی میں گو حوریں ہیں ریشِ سفید کے
واعظ بھی ہانک جاتا ہے وہ بے تکی کہ بس
—— خیال

ویسے تو داڑھی کو مردانگی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اور کچھ لوگوں کے چہرے پر یہ پھبتی بھی خوب ہے، لیکن ہر زمانے میں، ہر ملک میں داڑھی کے دشمن موجود رہے ہیں، جو داڑھی اور داڑھی والوں کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔

جہاں تک داڑھی کی تاریخ کا سوال ہے، انگریزی اور فرانسیسی ادب میں تو داڑھی پر متعدد کتابیں لکھی گئی، لیکن ہندوستان میں داڑھی کے بارے میں کوئی کتاب نہیں ہے۔

ہندوستان کے زیادہ تر مسلم حکمراں داڑھی والے تھے۔ اس بات کی شہادت موجود ہے کہ پہلی بار شاہ آباد میں ہمایوں کی داڑھی پر استرے کا استعمال کیا گیا۔ مسلمانوں کے لیے یہ جشن کا موقع تھا، کیوں کہ بادشاہ کبھی داڑھی بناتے ہی نہ تھے۔ اکبر نے جب داڑھی نہ رکھنے کا فیصلہ کیا، تبھی سے داڑھی نہ رکھنے کا بھی چلن شروع ہو گیا۔

داڑھی کے دشمن ہر زمانے میں رہے ہیں۔ سکندرِ اعظم داڑھی نہیں رکھتا تھا اور اس کا کوئی سپاہی داڑھی نہیں رکھ سکتا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا کوئی سپاہی دشمنوں کے ہاتھوں میں پڑ کر اپنی داڑھی نچوائے۔ اس کی فوج میں متعدد حجام تھے، جو پوری فوج کی داڑھی بنایا کرتے تھے۔

روم کا ایک شہنشاہ بھی داڑھی سے خفا تھا۔ اس نے پوری ریاست میں کسی بھی فرد کے داڑھی بڑھانے پر پابندی لگا رکھی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے داڑھی سے چڑنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کا ایک باورچی داڑھی والا تھا اور اسی وجہ سے اکثر شہنشاہ کے کھانے میں داڑھی کے بال نکلا کرتے تھے۔ اس بات پر ایک بار کھانا کھاتے وقت شہنشاہ اتنا ناراض ہوا کہ اس نے فوراً باورچی کو بلوایا اور اس کی داڑھی میں آگ لگوا دی۔ بعد میں اسے ملک بدر کر دیا۔

زمانۂ بائبل میں تو محض داڑھی کی وجہ سے جنگ بھی ہوئی ہے۔ دراصل، ہوا یہ کہ شاہ داؤد کے سفیر شاہ حناط کے دربار میں پہنچے۔ ان کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ حناط نے سوچا کہ یہ جاسوس ہے، لہٰذا، اس کی نصف داڑھی اس نے منڈوا دی۔ جب شاہ داؤد نے داڑھی کی یہ رسوائی دیکھی، تو انھیں بہت برا لگا اور انھوں نے حناط کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔

روس کے حکمراں پیٹر نے ۱۷۰۵ء میں یہ اعلان کرا دیا تھا کہ روس میں جو بھی شخص داڑھی بڑھائے گا اُسے ٹیکس دینا ہوگا۔

زمانۂ وسطیٰ کے یورپ میں پادریوں نے داڑھی کے خلاف ایک تحریک چلائی تھی۔ انگلینڈ میں لورچیسٹر کا بشپ سینٹ وولفسان قبل نارمن

گنج نمبر ۱، بتیا ۸۴۵۴۳۸ (بہار)

ہیں اپنے ساتھ ایک تیز دھار کا چاقو لے کر چلتا
جب بھی کوئی داڑھی والا شخص اس کی دعائیں
غرض سے نیچے جھکتا' بشپ فوراً چاقو سے اس
اڑھی کا ایک حصّہ کاٹ لیتا تھا اور وہ حصّہ
ی طرف پھینکتے ہوئے کہتا کہ اپنی باقی داڑھی
شوالو' نہیں تو جہنم میں جاؤ گے۔

۱۵۴۲ء میں انگلینڈ میں ایک قانون بنایا
لندن کا کوئی بھی شہری داڑھی نہیں بڑھا سکتا۔
ئی داڑھی بڑھاتا' تو اس کی شہری آزادی
ھی حقوق چھین لیے جاتے۔

اس طرح ظاہر ہے کہ ہر زمانے میں داڑھی
خلاف کئی قدم اٹھائے گئے۔ ویسے دنیا کی
عظیم ہستیوں نے داڑھی رکھی۔ ان میں
ج برنارڈ شا' شیواجی' کارل مارکس'
ندرناتھ ٹیگور' ٹالسٹائی' ابراہم لنکن' نرالا'
ب' لینن' ڈارون' رابرٹ براؤننگ'
اتھ' لارنس' فرانسس بیکن' چارلس ڈکنس'
انسن' ولیم شیکسپیر' گرو گولانکر' ونوبا بھاوے'
ر ذاکر حسین' ابوالکلام آزاد شامل ہیں۔ یہ امر
دلچسپی سے خالی نہیں کہ تحریک پاکستان کا تصور
والے اور اسلامی نظریات کی تجرید کرنے والے
رِ مشرق علامہ اقبال اور بانیِ پاکستان قائدِ اعظم
ی جناح داڑھی سے مبرا تھے۔

جہاں تک داڑھی کی لمبائی کے عالمی ریکارڈ
ال ہے' سب سے لمبی داڑھی امریکہ کے
ی۔ ایم۔ لانگ سیٹ کی تھی۔ ۱۹۲۷ء میں جب
ی کا انتقال ہوا' اس وقت اس کی داڑھی کی
تقریباً ساڑھے سترہ فٹ تھی۔ یہ داڑھی آج
محفوظ ہے۔ داڑھی کے بارے میں ایک اور
ے وار بات آپ کو بتاتے چلیں کہ امریکہ کے
شہر میں ایک خاتون جینس ڈیویری کی بھی اچھی
خاصی داڑھی تھی۔ اس کی داڑھی کی لمبائی ۱۸۸۴ء
میں ۳۶ سینٹی میٹر تھی۔

سائنس دانوں کے بقول عمر کے ساتھ ساتھ
داڑھی زیادہ تیزی سے بڑھتی ہے اور گزرتے
وقت کے ساتھ داڑھی کے بال سخت ہو جاتے
ہیں۔ ہمارے چہرے پر تیس سے پینتیس ہزار بال
ہوتے ہیں۔ بہر حال ہر دن ایک انچ کا پچاسواں
حصّہ بڑھتا ہے۔

داڑھی کو فارسی میں ریش کہتے ہیں۔ اس
سے تشکیل شدہ اسم مرکب "ریشِ قاضی" ہے
جس سے مراد شراب کے چھاننے کا وہ کپڑا ہے
جو صراحی کے منہ پر لگا رہتا ہے۔ اس سے متعلق
ناسخ کا ایک شوخ رنگ شعر بھی گوش گزار
کر لیجیے۔

نہ پائی ریشِ قاضی تو لیا عمامۂ مفتی
مزاج ان نئے فرشتوں کا بھی کیا ہی لاابالی ہے

نئی مطبوعات

سالنامہ عالمی اُردو ادب
(۸۸-۱۹۸۷ء) جلد ۳
مرتبہ : نند کشور وکرم
صفحات : ۴۶۸
قیمت : ۸۰ روپے
ملنے کا پتہ : پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، جے۔۶، کرشن نگر، دہلی ۵۱۔

سالنامہ عالمی اُردو ادب میں ۸۸-۱۹۸۷ء کے منتخبہ افسانوں، غزلوں، نظموں اور مضامین کے علاوہ ادبی سرگرمیوں سے متعارف کرایا گیا ہے۔ یہ سالنامہ ۲۱ افسانوں، ۵۶ غزلوں، ۳۱ نظموں اور ۱۵ مضامین، اس مدت میں شائع ہونے والی کتابوں کی فہرست اور اُردو خبرنامے پر مشتمل ہے۔ اُردو لائبریریوں، ناشرین اور کتب فروشوں سے متعلق مختصر معلومات کے ساتھ ساتھ ۸۸-۱۹۸۷ء میں وفات پانے والے ادبا و شعرا کا مختصراً احوال بیان کیا گیا ہے۔ گذشتہ دو برسوں میں شائع ہونے والے ملکی و غیر ملکی اخبارات و رسائل اور اُن کے مدیران کے نام پتے بھی دیے گئے ہیں۔ بعض قلمکاروں کے مختصر سوانحی اشارے اور فوٹو بھی شائع کیے گئے ہیں۔

پیش لفظ میں آزادی کے بعد اُردو کو درپیش مسائل اور اس کے حال و مستقبل پر مختصراً روشنی ڈالی گئی ہے اور متعدد اُمید افزا حقائق سے واقف کرایا گیا ہے۔

افسانے، غزلیں، نظمیں اور مضامین مختلف ملکی و غیر ملکی اخبارات، رسائل، گلدستوں اور مجموعوں سے لیے گئے ہیں۔

افسانہ نگاروں میں خواجہ احمد عباس، سلام بن رزّاق، ظفر پیامی، غیاث احمد گدّی وغیرہ جیسے ممتاز افسانہ نگاروں کے افسانے، مظہر امام، ندا فاضلی، ڈاکٹر اجمل اجملی، کمال احمد صدیقی، رئیس امروہوی، شباب للت، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، شہریار، مظفر حنفی، محسن زیدی وغیرہ جیسے نامور شعرا کی نظمیں اور غزلیں نیز پروفیسر محمد حسن، راج نرائن رازؔ اور فکر تونسوی جیسے مشہور و معروف ادیبوں کے مضامین اس سالنامے میں شامل ہیں۔ بیشتر افسانے، غزلیں، نظمیں اور مضامین معیاری ہیں لیکن کچھ تخلیقات کا معیار پست بھی ہے۔ تاہم یہ تعجب کی بات ہے کہ بہت سے مستند اور باکمال ادیبوں کو نظر انداز کیوں کیا گیا۔ مثلاً پروفیسر عنوان چشتی، ڈاکٹر قمر رئیس، مخمور سعیدی، انور عظیم، مجتبیٰ حسین وغیرہ جیسے متعدد مستند ادیبوں، ناقدوں اور شاعروں کی کوئی تخلیق اس سالنامے میں شامل نہیں کی گئی۔ حالاں کہ ان سب حضرات کی نگارشات اُردو کے موقر اخبارات و رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اُمید ہے کہ وکرم صاحب آئندہ شمارے میں اس طرح کی شکایت کا موقع نہیں دیں گے۔ بعض قلم کاروں کی ایک سے زائد تخلیقات شامل کی گئی ہیں مثلاً انور سدید کے دو مضامین شائع کیے گئے ہیں۔ ایک نمائندہ دستاویز میں ایک ادیب کی ایک ہی تخلیق شامل کی جانی چاہیے تاکہ دیگر قلم کاروں کو بھی نمائندگی مل سکے۔

جناب نند کشور وکرم نے یہ سالنامہ نہایت جانفشانی سے مرتب کیا ہے اور اُن کی یہ محنت کافی حد تک کامیاب ہے۔ تاہم مستقبل کے سالنامے مرتب کرتے وقت اگر وہ اُردو کے ہر نمائندہ ادیب کی تخلیق اور اُس کی مختصر سوانح، یونیورسٹیوں اور کالجوں میں اُردو شعبوں سے متعلق اطلاعات کو شامل کریں تو بہتر ہوگا۔ ہندوستان میں اُردو زبان کی ترویج اور اس معتوب زبان کو اُس کا جائز حق دلانے کے لیے جہد کناں اُردو تنظیموں اور اُردو کے مجاہدین کے بارے میں بھی مختصر معلومات فراہم کی جانی چاہئیں۔

بہر حال مذکورہ بالا چند خامیوں کے باوجود سالنامہ عالمی اُردو ادب ایک اہم ادبی اور تاریخی دستاویز ہے جس کی اُردو کے صاحب ذوق قارئین اور تنظیموں کو پذیرائی کرنی چاہیے۔

—— اسد رضا

آبشارِ نغمہ

موضوع : شاعری
مُصنّف : پریم نرائن سکسینہ رازؔ
صفحات : ۱۲۰
قیمت : تیس روپے
ملنے کا پتہ : موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹، گولا مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۲

"آبشارِ نغمہ" پریم نرائن سکسینہ رازؔ کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جس کا بیشتر حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ چند نظمیں، قطعات اور رباعیات بھی اس مجموعے میں شامل ہیں جو شاعر کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی صلاحیت کا ثبوت ہیں۔ رازؔ کا یہ مجموعہ اگرچہ بہت ضخیم نہیں مگر اس میں ان کے ابتدائی دور کا کلام بھی شامل ہے جس سے ان کے فنی اور فکری ارتقا کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ ان کی ابتدائی دور کی شاعری میں بھی ایک پختگی ملتی ہے اور زبان و بیان کا حسن جو ان کی شاعری کا روشن ترین پہلو ہے ان کے ابتدائی کلام میں بھی موجود ہے۔ ان کا تعلق یو۔پی کے ایک معزز کایستھ خاندان سے ہے اور کایستھوں کی ادب پروری، اُردو نوازی اور ہندوستان کی مخصوص گنگا جمنی تہذیب کی نمائندگی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ خوش قسمتی سے رازؔ صاحب کو اُردو اور فارسی کے رام کرشن مضطرؔ جیسے بزرگ شاعر کے سامنے زانوے تلمذ تہ کرنے کا موقع ملا۔ رازؔ کے کلام میں کلاسیکی روایتوں سے آگاہی اور فنی باریکیوں کا جو شعور ملتا ہے وہ ان کی مسلسل مشق اور پیہم ریاض کے علاوہ حضرتِ مضطرؔ کی صحبتوں کا بھی نتیجہ ہے۔

رازؔ کی شاعری تغزل، احساسِ جمال، کلاسیکی روایتوں سے ہم آہنگی اور عصری آگہی سے عبارت ہے۔ حدود و ممکنات کو چھو لینے اور صوتِ جنبشِ نبضِ حیات سن سکنے کی جن تمناؤں کا اظہار انھوں نے مجموعے کی پہلی نظم "اے خدا" میں کیا ہے اس کا پرتو ان کی شاعری میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ ہمارے سماجی اور سیاسی نظام کے تضادات کے گہرے شعور نے ان کے لب و لہجے میں ایک دل پذیر دردمندی پیدا کی ہے مگر یہ لب و لہجہ قنوطیت سے پاک ہے جس کا سبب غالباً یہ ہے کہ انسان کی عظمت اور اس کے روشن مستقبل پر شاعر کا اعتماد و یقین اب تک باقی ہے:

مہر و ماہ و کہکشاں ہوں جیسے قدموں کے نشاں
آج ہیں وہ رفعتیں انسان کی پرواز میں

نگاہ انساں میں مہر و مہ کا وجود گرد و غبار سا ہے
فلک نشینوں کو سجدہ کرنا خرد کو اب ناگوار سا ہے
ہمارے تازہ لہو کے قطرے روش روش پر جو کل گرے تھے
سنا ہے اہلِ چمن کو کہتے انھیں سے رنگِ بہار سا ہے

دروں بینی اور داخلیت غزل کی اہم خصوصیات ہیں۔ رازؔ کی تقریباً تمام غزلوں میں ایسے اشعار ضرور مل جائیں گے جن میں یہ خصوصیتیں موجود ہیں۔ مگر یہ دروں بینی اور داخلیت شاعر کے صرف ذاتی کرب کا اظہار نہیں بلکہ اس میں عصری آگہی کی شدید آنچ بھی ہے۔ عصری مسائل کو غزل کے پیرائے میں اس طرح ادا کرنا کہ غزل کے فن پر حرف نہ آئے دشوار اور دقت طلب کام ہے۔ مگر رازؔ صاحب اس منزل سے بھی کامیاب گزرے ہیں۔ رازؔ نے ایسے اشعار بھی کثرت سے کہے ہیں جو خالص غزل کے اشعار ہیں اور جن میں زبان و بیان کی لطافت احساسِ جمال کی تازگی اور غزل کی کلاسیکی روایتوں سے ہم آہنگی ملتی ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

عجیب تاثیرِ برق سوزاں ہے نغمہ تازہ کی اس فضا میں
دھواں تباہی کا اٹھ رہا ہے چمن میں ہر شاخ آشیاں سے

دلوں کو پیاس ملی ان سے تپتے صحرا کی
چمن میں کل جو اٹھے تھے بشکلِ ابرِ بہار

چھپ چھپ کے اب رہوگے کہاں تم، مری نظر
اک اک حجاب ارض و سما سے گزر گئی

حسن کی ایک کافر ادا
میرا دیوانہ پن ہوگئی

آپ نے جراتیں بخش دیں
مجھ کو تابِ سخن ہوگئی

جھلملاتی چاندکی کرنوں سے بڑھ کر تھیں لطیف
جنبشیں ملبوسِ سیمیں کی خرامِ ناز میں

تجھ سے کبھی نہ آنے کا شکوہ نہیں مگر
میرا غریب خانہ ترے راستے میں تھا

رازؔ نے بعض ایسے مسائل کو بھی اپنی شاعری میں سمویا ہے جن کا تعلق دنیا کے

مستقبل اور اس کرۂ ارض پر نسلِ انسانی کی بقا سے ہے۔ یہ مسائل ان کی غزلوں میں بھی جا بجا ملتے ہیں۔ مگر خاص طور پر ان کی نظم انتباہ اس موضوع پر ایک خوبصورت نظم ہے۔

—— اشفاق محمد خاں

دوسرا زینہ
موضوع: بچوں کا ناول
مصنف: سراج انور
صفحات: ۱۵ روپے
تقسیم کار: طارق پبلی کیشنز، ۸۰۱، جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶۔

آج کا دور سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے۔ اس دور میں بچے مافوق الفطرت واقعات اور کرداروں میں بہت کم دلچسپی لیتے ہیں۔ سائنس، سراغ رسانی اور مہمات پر مشتمل ناول، بچوں میں بہت مقبول ہو رہے ہیں جن ناولوں میں ان موضوعات کے ساتھ تخیلات کی کارفرمائی اور مافوق الفطرت واقعات اور کرداروں کی آمیزش بھی ہو انھیں بچوں میں اور زیادہ مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ ناول "دوسرا زینہ" بھی اسی نوعیت کا ناول ہے۔ اس ناول میں محیر العقول واقعات سائنسی کرشمے، جزیرے کی سیر قدیم جنگلیوں کا رہن سہن وحشیوں کے حملے اور مہمات کی دلچسپ روداد نے مل کر ایسی پرکشش اور دلچسپ صورت اختیار کر لی ہے کہ بچے اسے از اول تا آخر ذوق و شوق سے پڑھیں گے۔

"دوسرا زینہ" ایک دلچسپ مہماتی ناول ہے۔ ناول کے کمسن کردار انجم اور ثروت اپنے والد کے ساتھ سمندری دنیا کی مہم سر کرتے ہیں۔ ناول تحیر و استعجاب، مہم جوئی، سراغ رسانی، سسپنس اور سنسنی خیز واقعات سے مزین ہے۔ ان واقعات کی پیش کش میں مصنف نے نفسیات اور تفریح دونوں کا خیال رکھا ہے۔ ناول میں پلاٹ اور اسلوب کو اس فنکاری کے ساتھ آمیز کیا گیا ہے کہ مقصدیت اور اصلاح پسندی کا احساس پڑھنے والوں کو نہیں ہو پاتا۔ پلاٹ، پندرہ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ناول کا آغاز انوکھے طریقے سے ہوتا ہے جس میں ایک اشتہاری کمپنی کی جانب سے انجم اور ثروت کے والد کو ایک انجان جزیرے میں رہنے کا موقعہ ملتا ہے —— ——

جزیرے میں، پرانا ڈبہ دو سو سال پرانی ڈائری، ڈوبا ہوا سامان، نامعلوم دشمن، بہت بولتا ہے، مریخا کی تحریر، تعاقب، خزانے کا راز، بھیانک جنگ، ڈائری کہاں گئی، خزانہ دشمنوں کے ہاتھ میں اور آخری معرکہ، اس ناول کے ابواب ہیں۔ وحشیوں سے جنگ، خون دہشت اور حیرت و استعجاب سے بھرے واقعات سے مزین پلاٹ، بچوں کی دلچسپی کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے۔ تمام واقعات کو زنجیر کی لڑیوں کی طرح دوسرے سے پیوست کیا گیا ہے۔ زبان روزمرہ اور عام بول چال کی ہے۔ جملے چھوٹے چھوٹے لیکن رواں دواں ہیں۔

—— خوشحال زیدی

اُردو زبان و ادب کا خاکہ
مصنف: ڈاکٹر خوشحال زیدی
صفحات: ۳۶۸ قیمت: ۴۰ روپے
ناشر: بزمِ خضرِ راہ، ۸۰ عفار منزل ایکسٹنشن، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

زیرِ نظر کتاب اُردو زبان و ادب کے متنوع موضوعات کے اعتبار سے اربابِ قلم کے لیے بالعموم اور پوسٹ گریجویٹ کلاسز کے طلبہ کے لیے بالخصوص ایک حوالہ کی کتاب کہی جا سکتی ہے کتاب کے مشمولات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو زبان و ادب کا فروغ مصنف کا ایسا مقصد ہے جس سے انھیں بمنزلہ عشق شیفتگی ہے۔

مصنف نے بچوں کے ادب پر جو درجنوں کتابیں لکھی ہیں اور تحقیقی کام کیا ہے وہ بچوں کے ذہنی اور لسانی ارتقا کے نقطۂ نظر سے اساسی حیثیت رکھتا ہے اس کتاب میں بھی اس کی جھلکیاں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔

کتاب کا ایک امتیازِ خاص یہ ہے کہ اس میں اُردو نظم و نثر کے تمام قدیم اور جدید معتبر اور نام آور اربابِ قلم کے مختصر حالات تاریخ ولادت و وفات یکجا کر دیے گئے ہیں جو نو واردانِ بساطِ سخن کے لیے خاصے کی چیز ہیں۔

زبان کی تخلیق تاریخ ارتقا اور عہد بہ عہد تغیرات کا بھی اس کتاب میں ذمہ دارانہ انداز سے جائزہ لیا گیا ہے فورٹ ولیم کالج کے قیام سے عصرِ حاضر تک زبان و ادب میں جو خوشگوار تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ان کو نمایاں کرنے میں مصنف نے اپنی وسعتِ مطالعہ کا ثبوت دیا ہے۔ —— تاباں نقوی امروہوی

امید کی کرن (بچوں کے لیے کہانیاں)
مصنف: تسکین زیدی
قیمت: دس روپے
ملنے کا پتا: بزمِ خضرِ راہ، ۱۲/۱۴۸ گوال ٹولی، کانپور

اُردو زبان میں عرصۂ دراز سے محسوس کی جا رہی ہے مکتبۂ جامعہ دہلی نے اگرچہ اس سلسلے میں قابلِ تحسین کام کیا ہے مگر انفرادی کوششوں سے طبع ہونے والی بچّوں کی کتابیں بہت کم ہیں۔ تسکین زیدی کی کتاب "امید کی کرن" اس سلسلے کی ایک عمدہ کوشش ہے جس کو سراہا جانا چاہیے۔

اس کتاب میں ۱۳ کہانیاں شامل ہیں جو آج کی سماجی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالتی ہیں۔ چند کہانیاں ایسی بھی ہیں جن میں انھوں نے بچّوں کو کہانی کے پیرایے میں ان پیشے وروں کے بارے میں بتایا ہے جو ماضی قریب میں ہمارے معاشرے کا اہم جز تھے مگر اب یہ خاندان، مثلاً بھشتی اور مراثی، معدوم ہوتے جا رہے تھے کیوں کہ سائنس اور الیکٹرانکس کے نئے سماج میں ان کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ گئی ہے۔

ایمانداری، محنت کا ثمر، اختری، بندیا، جھوٹا سچ اور وفادار کبوتر اس مجموعے کی نہایت دلچسپ اور موثّر کہانیاں ہیں۔ تسکین زیدی نے بچّوں کی ذہنی مناسبت سے زبان بھی سادہ اور سہل استعمال کی ہے اور ان کو بچّوں کے لیے زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور خیال انگیز بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کا سرورق نہایت خوش رنگ اور دیدہ زیب ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ نہ صرف بچّے بلکہ بڑے بھی ان کہانیوں کو دلچسپ اور قابلِ مطالعہ پائیں گے۔ کتاب کی طباعت جلی اور روشن ہے جس کی وجہ سے آٹھ دس سال کی عمر کے بچّے اس کو شوق سے پڑھیں گے۔

—— نامی انصاری

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے

موصولہ عنوانات

مئی ۱۹۸۹ء کے "ایوانِ اُردو دہلی" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی، اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانوں میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوان ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:

شعری عنوانات

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے (غالب)

مرسلہ: صابر نیازی، معرفت اودھ ایجنسی، سبزی منڈی روڈ، پھاٹک عبداللہ خاں، رائے بریلی (یو۔پی)

میری تصویر کے یہ نقش ذرا غور سے دیکھ
اس میں اِک دور کی تاریخ نظر آئے گی (نامعلوم)

مرسلہ: خلیق الزماں، معرفت محمد غالب، موضع کرولی، سرائے میر، اعظم گڑھ۔

گیا شباب تو اڑتی ہے خاک سی مُنہ پر
غبار چھوڑ گیا قافلہ جوانی کا (امیر مینائی)

مرسلہ: روبینہ عابد حسین، مرادآباد

سب مرحلے حیات کے طے کرکے اے فراق
بیٹھا ہوا ہوں موت میں تاخیر دیکھ کر (فراق)

مرسلہ: مقبول نصیرآبادی، نصیرآباد

بے کیف زندگی یہ جیسے جا رہا ہوں میں
خالی ہے شیشہ اور پیے جا رہا ہوں میں (جگر مرادآبادی)

مرسلہ: محمد سبحان حیدر، بیگو سرائے

شمیمہ خاتون، دہلی۔

دنیا نے تجھیں چھوڑ دیا جب مجھے چھوڑ دیں کیوں دنیا کو
دنیا کو سمجھ کر بیٹھے ہیں اب خواہشِ دنیا کون کرے (حافظ)

مرسلہ: سید افضل حسن، گیا

شکستہ سنسان سی حویلی میں لمحہ لمحہ بکھر رہا ہوں
میں اپنے اجداد کی وراثت کے بوجھ سے دب کے مر رہا ہوں (وقار روفانی)

مرسلہ: محمد عارف صدیقی، علی گڑھ

سینے پہ اس زمین کے ایسا درخت ہوں
جس کی جڑوں کو چاٹ گیا ماہ و سال نے (مقبول نصیرآبادی)

مرسلہ: صلاح الدین غازی، نصیرآباد

جذبۂ شوق کو اس درجہ بھی باطل نہ بنا
تھک کے بیٹھا ہے جہاں اب سے منزل نہ بنا (شمس فرخ آبادی)

مرسلہ: ایم۔ ذاکر حسین، صاحب گنج

ایک اِک سانس یہ ہو موت کا پہرہ جیسے
زندگی یہ ہے تو مخمور جیا کیا جائے (مخمور سعیدی)

مرسلہ: شاہد اختر رضوی، کلکتہ

نثری عنوانات

"تصویرِ درد" (علامہ اقبال کی نظم)

مرسلہ: ایم۔ ایم۔ عالم، پرانی کریم گنج، ضلع گیا (بہار)۔

"گوشۂ عافیت" (پریم چند کا ناول)

مرسلہ: ایم۔ صابر آزاد، صاحب گنج

"گلدستہ" پہلے اور دوسرے نمبر پر درج شعری عنوان اور پہلے نمبر پر درج نثری عنوان بھیجنے والوں کو ارسال کیا جا رہا ہے۔

ہم طرح اشعار

مئی ۱۹۸۹ء کے شمارے میں دیے جانے والے مصرعے پر ہمیں ہمیشہ کی طرح کافی تعداد میں شعر موصول ہوئے ان میں جو شعر صحیح بحر اور دُرست ردیف قافیے میں ہیں ان کا انتخاب درج ذیل ہے۔ گلدستہ ان حضرات کو ارسال کیا جائے گا جن کے بھیجے ہوئے اشعار چوکھٹے میں دیے جا رہے ہیں۔ بہتر ہو کہ اشعار پوسٹ کارڈ پر لکھ کر بھیجے جائیں۔ ایک پوسٹ کارڈ پر صرف ایک ہی شعر لکھیں۔

دیں عمرِ خضر موسمِ پیری میں تو نہ لے
مرنا ہی اس سے خوب ہے عہدِ شباب میں (میر تقی میر)

مرسلہ: قیصر امام، بھاگلپور

آپی تو دل کو لے گئے، آپی ہیں پوچھتے
کہیے میاں نظیرؔ، ہیں کس پیچ و تاب میں (نظیر اکبرآبادی)

مرسلہ: سعید احمد قائد، دہلی

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں (غالبؔ)

مرسلہ: شکیل ناداںؔ، صاحب گنج

کب سے ہوں، کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں (غالبؔ)

مرسلہ: کماری رینا پانڈے، صاحب گنج

جو منکرِ وفا ہو فریب اس پہ کیا چلے
کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں (غالبؔ)

مرسلہ: محمد ریحان حیدر، بیگو سرائے

[illegible]

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں (غالبؔ)

مرسلہ: ایم۔ قادر حسین، صاحب گنج۔

موتی لعل گپتا، صاحب گنج۔

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں (غالبؔ)

مرسلہ: کائنات مرزا، صاحب گنج

ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں (غالبؔ)

مرسلہ: آشا کرن گپتا، صاحب گنج

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں (غالبؔ)

مرسلہ: رتن لعل گپتا، صاحب گنج

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں (غالبؔ)

مرسلہ: صبا ناز، صاحب گنج

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں (غالبؔ)

مرسلہ: ایم۔ شاکر حسین، صاحب گنج

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں (غالبؔ)

مرسلہ: امین اختر، بھاگلپور

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں (غالبؔ)

مرسلہ: عبدالرزاق خاں، صاحب گنج۔

[illegible]

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں (غالبؔ)

مرسلہ: شفیق احمد سیفی، محلہ برامپور، پوسٹ آفس سیوہارہ، ضلع بجنور، ۲۴۶۷۴۶ (یو۔پی)۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں (غالبؔ)

مرسلہ: محمد سبحان حیدر، بیگو سرائے

غالبؔ ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیِ بو تراب میں (غالبؔ)

مرسلہ: محمد عاصم، منگرول پیر۔ محمد اختر، بدایوں۔

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں (مومنؔ)

مرسلہ: جمال اختر آرٹسٹ، نابر خاں سرائے، بدایوں (یو۔پی)۔ شاہد اختر رضوی، معرفت مون لائٹ پیلس، نمبر ۱، میکنزی روڈ، کمرہٹی، کلکتہ ۵۸

آنکھ اس کی پھر گئی تھی دل اپنا بھی پھر گیا
یہ اور انقلاب ہوا انقلاب میں (مومنؔ)

مرسلہ: شبینہ پروین، بھاگلپور

رہتے ہیں جمع کوچۂ جاناں میں خاص و عام
آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں (مومنؔ)

مرسلہ: افسانہ بانو، بھاگلپور

ہم کچھ تو بد تھے جب نہ کیا یار نے پسند
اے حسرت اِس قدر غلطی انتخاب میں (مومنؔ)

مرسلہ: نہال اختر، بدایوں

ڈوبی ہجومِ اشک سے کشتی زمین کی
ماہی کو اضطراب ہوا جوشِ آب میں (مومنؔ)

مرسلہ: شبانہ بیگم، بھاگلپور

ہے منتوں کا وقت شکایت رہی رہی
آئے تو ہیں منانے کو وہ پر عتاب میں (مومنؔ)

مرسلہ: مظہر مجاہدی، بھاگلپور

بے ہم سجود پائے صنم پر دمِ وداع
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں (مومنؔ)

مرسلہ: رضیہ سلطانہ، بدایوں

شوخی نے تم کو ڈال دیا اضطراب میں
کچھ تمکنت کا لطف نہ دیکھا شباب میں (داغؔ)

مرسلہ: شبانہ تبسم، بھاگلپور

کچھ شانِ مغفرت سے نہیں دور زاہدو
ڈوبیں گناہ بادہ کشوں کے شراب میں (داغؔ)

مرسلہ: قاسم علی، بھاگلپور

پیرِ مغاں کی دل شکنی کا رہا خیال
داخل ہوا ہوں توبہ سے پہلے ثواب میں (داغؔ)

مرسلہ: محمد ہاشم احمد، بھاگلپور

گر وہ نہ آئیں گے تو اجل آئے گی ضرور
تسکیں ملی ہوئی ہے مجھے اضطراب میں (داغؔ)

مرسلہ: محمد برکت علی، بھاگلپور

صوفی کو اجتناب ہے واعظ کو احتراز
کیا زہر گھل گیا ہے الٰہی شراب میں (ریاضؔ خیرآبادی)

مرسلہ: راشد مرزا، مکان نمبر ۲۱-۲-۶-۲۰
بازار روپ لال، چار مینار روڈ،
شاہ علی بندہ، حیدرآباد ۵۰۰۲۶۵۔

باقی نہ تابِ ضبط رہی شیخ و شاب میں
ان کی جھلک بھی تھی مری چشمِ پرآب میں (اصغرؔ گونڈوی)

مرسلہ: منظر امام، بھاگلپور

اُس دن بھی میری رُوح تھی محوِ نشاطِ دید
موسیٰ اُلجھ گئے تھے سوال و جواب میں (اصغرؔ گونڈوی)

مرسلہ: فرزانہ اعظمی، بھاگلپور۔
محمد شہنشاہ عالم شہنشاہ، صاحب گنج۔

میری ندائے درد پہ کوئی صدا نہیں
بکھرا دیے ہیں کچھ مہ و انجم جواب میں (اصغرؔ گونڈوی)

مرسلہ: جمیل اختر، بھاگلپور

وہ موت ہے کہ کہتے ہیں جس کو سکون سب
وہ عین زندگی ہے جو ہے اضطراب میں (اصغرؔ گونڈوی)

مرسلہ: اصغر امام، بھاگلپور

کیوں شکوہ سنجِ گردشِ لیل و نہار ہوں
اک تازہ زندگی ہے ہر انقلاب میں (اصغرؔ گونڈوی)

مرسلہ: محمد ضیاء الحق ضیاء، صاحب گنج

اب کون تشنگانِ حقیقت سے یہ کہے
ہے زندگی کا راز تلاشِ سراب میں (اصغرؔ گونڈوی)

مرسلہ: قلیم محمد واعظ الحق، صاحب گنج

دوزخ بھی ایک جلوۂ فردوسِ حُسن ہے
جو اس سے بے خبر ہیں وہی ہیں عذاب میں (اصغرؔ گونڈوی)

مرسلہ: محمد اسلم خاں، بھاگلپور

اصغرؔ غزل میں چاہیے وہ موجِ زندگی
جو حسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں (اصغرؔ گونڈوی)

مرسلہ: قمر سلطانہ، دہلی

ہر چیز پر بہار تھی ہر شے میں حسن تھا
دنیا جوان تھی مرے عہدِ شباب میں (سیمابؔ)

مرسلہ: ماسٹر عابد حسین، مراد آباد

کیا جانے دشمنوں نے انھیں کیا پڑھا دیا
ہوتی تھی اتنی دیر نہ خط کے جواب میں (نامعلوم)

مرسلہ: فرید مرزا، حیدرآباد

مشتاق ہوں میں دید کا وہ ہیں حجاب میں
اے برقِ حسن آگ لگا دے نقاب میں (نامعلوم)

مرسلہ: محمد امین چکی، مہسانہ

میں ہی سہی مگر تمھیں جلدی نہ چاہیے
ہر شخص آنا چاہتا ہے انتخاب میں (وقار وثقی)

مرسلہ: تنویر اعجاز صدیقی، احمدآباد

پوچھی تھی ہم نے وجہِ ملاقاتِ مدّعی
اک عمر ہو گئی انھیں فکرِ جواب میں (نامعلوم)

مرسلہ: ایم. صابر آزاد، صاحب گنج

دیکھا تھا ایک رات جسے ہم نے خواب میں
تصویر اُس کی مل گئی دل کی کتاب میں (ظفرؔ اعظمی)

مرسلہ: ایس. کے. آزاد، بھاگلپور

پرسش کے روز اور گنہگار بچ گئے
سب دن تمام ہو گیا میرے حساب میں (جلیسؔ)

مرسلہ: امام حسن امام، صاحب گنج

ہر شخص کو خلوصِ سراپا نہ جانیے
دیکھے تو ہوں گے آپ نے کانٹے گلاب میں (منوّر رانا)

مرسلہ: حامد مرزا، حیدرآباد

باقی ہے تیری خوشبو ابھی اُس گلاب میں
رکھا ہے مدّتوں سے جو میری کتاب میں
(غلام ربّانی خاں اخترؔ)

مرسلہ: رابعہ خاتون، علی گڑھ

ساقی یہ تیری شربتی آنکھوں کا فیض ہے
یا گھول دی ہے نیند سہانی، شراب میں (انور فرخ آبادی)

مرسلہ: صبیحہ پروین، بھاگلپور

آئندہ مہینے کے لیے اس مصرعے پر اپنی پسند کے شعر اس طرح ارسال کریں کہ ہمیں ۱۲، جون ۸۹ء تک مل جائیں:

رہے دل بستگیٔ غم سے بڑھے سوز و گداز اُس کا
(قافیہ: گداز — ردیف: اُس کا)

یہ مصرع سیّد علی محمد شادؔ عظیم آبادی کی غزل کا ہے۔ اس غزل کا کوئی شعر مقابلے میں شامل نہیں کیا جائے گا۔ ●

● افطار ● اردو افسانے پر یک روزہ سیمینار ● قلمزاد کی ادبی نشست ● عربی زبان کی اہمیت ● ادبی خدمات کا اعتراف ● علی گڑھ کی ایک ادبی شام

اُردو خبرنامہ

افطار

چودھویں روزے (۲۱ اپریل) کو دہلی کے لیفٹننٹ گورنر اور دہلی انتظامیہ اُردو اکادمی کے چیرمین جناب رومیش بھنڈاری نے اپنی اقامت گاہ ۱۸۵ اکبر روڈ پر افطار کا اہتمام کیا۔ اس پر وقار تقریب میں دہلی کے سینکڑوں روزہ داروں کے علاوہ اکادمی کے ارکان، ادیب، شاعر، اخبار نویس، دہلی کے چیف ایگزکٹو کونسلر جناب جگ پرویش چندر، دہلی میٹروپولیٹن کونسل کے چیرمین جناب پرشوتم گوئل، ایگزکٹو کونسلر (ترقیات) اور صدر دلی پردیش کانگرس (ا) کمیٹی چودھری پریم سنگھ، ایگزکٹو کونسلر (صحت) جناب بنسی لال چوہان، متعدد ممبران پارلیمنٹ اور غیر ملکی سفرا شریک تھے۔ روزہ کھلنے سے چند منٹ پہلے جب وزیر اعظم راجیو گاندھی تشریف لائے تو تقریب کی رونق اور بھی دوبالا ہوگئی۔ وزیر اعظم نے شرکا میں سے ہر ایک کے ساتھ فرداً فرداً مصافحہ کیا اور بہت خوشگوار موڈ میں ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے۔ انھوں نے افطار میں بھی شرکت کی۔





وزیرِ اعظم جناب راجیو گاندھی اور لیفٹننٹ گورنر جناب رومیش بھنڈاری روزہ داران دہلی کے ساتھ

اُردو افسانے پر یک روزہ سیمینار

۵ ، اپریل ۸۹ء کو مہاراشٹر اُردو اکادمی
ی جانب سے بمبئی کے نمائندہ افسانہ نگاروں
پشتمل " افسانہ ۸۸ " کے عنوان کے تحت
ب روزہ سیمینار انجمن اسلام اکبر پیر بھائی
ل میں منعقد کیا گیا ۔ ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ
لا' صدر اُردو اکادمی نے اپنی افتتاحی
ریر میں کہا کہ اکادمی نے صنفِ افسانہ کی
رویج و ترقی میں ہمیشہ ایک مثبت رول
جام دیا ہے ۔ ہمیں خوشی ہے کہ مہاراشٹر کے
سانہ نگاروں نے اس صنفِ سخن کو زندہ
ر باوقار رکھا ہے ۔ کرشن چندر' سعادت
سن منٹو' راجندر سنگھ بیدی' عصمت چغتائی
ر قرۃ العین حیدر اور سریندر پرکاش

(جو آج ہمارے درمیان موجود ہیں) نے فنِ افسانہ کی جو شمع روشن کی تھی بعد کو آنے والی نسل جس میں انور خاں' سلام بن رزاق' انور قمر' ساجد رشید' مشتاق مومن' علی امام نقوی' م ناگ' اور اسلم پرویز شامل ہیں' اس شمع کو روشن رکھا ہے ۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہندوستانی افسانہ کسی طرح پاکستانی افسانے سے پیچھے نہیں ہے ۔ ڈاکٹر اسحاق جمخانہ والا کے ہمراہ بمبئی کے سابق میر سد ھیر جوشی ایم ایل اے نے بھی اس اجتماع میں شرکت کی اکادمی کے ڈائریکٹر علی سردار جعفری نے ان کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ مہاراشٹر میں خاص طور سے بمبئی میں اہلِ اُردو کو کبھی کوئی مسئلہ درپیش نہیں رہا ' بمبئی میونسپل کارپوریشن نے اُردو کے نام پر باندرہ میں

کرشن چندر مارگ نام کی سڑک کی اجازت دی اب میری خواہش ہے کہ جو موتارا روڈ کو خواجہ احمد عباس کے نام سے منسوب کیا جائے ۔

سیکریٹری اُردو اکادمی ہارون رشید علیگ جو صبح کے سیشن کی نظامت کر رہے تھے انھوں نے اسلم پرویز کے نام سے اس پروگرام کا آغاز کیا ۔ اسلم پرویز نے بازارِ حسن اور اس ماحول میں رہنے والوں کی زندگی کے لیل و نہار پر افسانہ " سورلیہ نشان " پیش کیا ۔ اس کے بعد ساجد رشید نے کہانی " شام کے پرندے " سنائی کہانی دو بھائیوں کی نفرت اور محبت کے بیچ نئی نسل کے افکار و مسائل کو موضوع بنا کر لکھی گئی تھی ۔ مشتاق مومن نے کہانی " حاتم طائی کا جدید قصہ " سنائی ۔ کہانی کا موضوع ہندو مسلم فساد تھا حاتم نام کے Rounded

کیریکٹر سے انھوں نے کہانی کا تانا بانا بُنا تھا حاتم طائی نے تو سات سوال حل کیے تھے یہ کہانی ان گنت سلگتے ہوئے سوالات کو پیش کرتی تھی۔ انور قمر نے اپنا افسانہ "پرندوں کے سائے" پیش کیا افسانہ انسان کی نفسیاتی الجھنوں کی غمازی کر رہا تھا افسانے کے مرکزی کردار اور پرندے کی گفتگو سے ایک طلسماتی ماحول پیدا کیا گیا تھا۔

ان چار افسانوں کا تجزیہ جناب محافظ حیدر نے پیش کیا۔ آخیر میں سریندر پرکاش نے اپنے خطبۂ صدارت میں یہ اہم سوال پیش کیا کہ آخر آج کے دور میں بڑا فن کار کیوں پیدا نہیں ہوتا؟ دوسرے سیشن کی صدارت محترمہ عصمت چغتائی نے کی۔ اور نظامت کے فرائض مشتاق مومن نے انجام دیے۔ سب سے پہلے مائیک م۔ ناگ کے سامنے پیش کیا گیا۔ انھوں نے کہانی "گھرونده" سنائی۔ کہانی میں نئی نسل اور پرانی نسل کے ٹکراو سے جو سچویشن پیدا ہوتی ہے اسے بیان کیا گیا تھا علی امام نقوی نے کہانی "خمیر" پیش کی جو ہندوستان اور پاکستان کی سرزمین سے جنم لینے والے رشتوں ناطوں اور آدمی کے احساس اور Conflict کو پیش کرتی تھی۔ انور خاں نے افسانہ "حسرت حاصل" پیش کیا جس میں انھوں نے بمبئی کے گریجویٹ جو تا چوروں کے لیل و نہار اور ان کی ناکام حسرتوں اور ارادوں کو پیش کیا۔ افسانے میں بمبئی واضح طور پر نظر آتا تھا۔ سلام بن رزاق نے "ایک خیالی کہانی" عنوان کے تحت اپنے من پسند موضوع سیاسی جبر کو پیش کیا اور ان دُنیاؤں اور ان مناظر کی سیر کرائی جن سے ہم اکثر مُنہ موڑ لیتے ہیں۔

ڈاکٹر یونس اگاسکر نے ان چاروں کہانیوں پر اپنا تبصرہ پیش کیا۔ خیال تھا کہ مندرجہ بالا افسانوں پر بحث بھی ہوگی اور سریندر پرکاش، عبداللہ کمال، سلطانہ جعفری اور اسلم خاں نے بحث شروع بھی کر دی تھی مگر تنگیِ وقت کے باعث اس سلسلے کو روکنا پڑا اور مائیک عصمت چغتائی کے سامنے رکھ دیا گیا عصمت چغتائی نے کہا کہ تقریباً ہر کہانی میں عورت کے استحصال کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ سسٹم ہمیں چوری اور بے ایمانی پر اکساتا ہے، ضرورت ہے کہ اسے بدلا جائے۔

آخر میں یوسف ناظم، سیکریٹری اُردو اکادمی کے شکریے کے ساتھ یہ جلسہ برخاست ہوا۔

(مظہر سلیم)



قلمزاد کی ادبی نشست

۶/اپریل ۸۹ء کو قلمزاد کی ادبی نشست پروفیسر قمر رئیس کی صدارت میں اُردو اکادمی دہلی کے کانفرنس روم میں منعقد ہوئی۔ نظامت ڈاکٹر ابنِ کنول نے کی۔ پروگرام کے آغاز میں جنابِ خسرو متین نے اپنی پانچ تازہ غزلیں پیش کیں۔ جن پر حاضرین نے اظہارِ خیال کیا۔ ڈاکٹر حسین ماجد نے کہا کہ خسرو متین کی غزلوں میں آدھے اشعار پُرانے رنگ کے ہیں۔ جدید علامتوں کے ساتھ قدیم علامتوں کو جس طرح استعمال کیا ہے اس سے ان کا انفرادی رنگ ضائع ہوتا ہے۔ یہاں جو علامتیں اور استعارے استعمال ہوتے ہیں وہ بہت آسان اور عام فہم ہیں ــــ پروفیسر قمر رئیس صاحب نے ڈاکٹر حسین ماجد کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ غزل کا شاعر روایت سے الگ ہو کر اچھی شاعری نہیں کر سکتا۔ خسرو متین کی شاعری میں بہت سے امکانات محسوس ہوتے ہیں انھوں نے آج کی سچائیوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے اپنا مقالہ "اُردو افسانے میں بیانیے کا احیا" پیش کیا۔ جس میں انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ اُردو افسانے میں جدیدیت اور وجودیت کا نظریہ چند برسوں میں تمام ہو گیا انھوں نے یہ بھی کہا کہ جدید افسانے کو شمس الرحمان فاروقی اور پروفیسر گوپی چند نارنگ نے سمجھنے کے بجائے سمجھانے کی زیادہ کوششیں کیں۔ بیانیہ افسانہ نگاروں میں انور خاں، سلام بن رزاق، علی امام نقوی، ابنِ کنول، انجم عثمانی، مشرف عالم ذوقی اور قاسم خورشید وغیرہ کا ذکر کیا۔ بحث کا آغاز کرتے ہوئے ڈاکٹر ابنِ کنول نے کہا کہ علامتی کہانی کو اور علامت کو بالکل رد کرنا غلط ہے البتہ ایسی علامت کا استعمال نامناسب ہے جو مبہم ہو۔ ڈاکٹر توقیر احمد خاں نے کہا کہ جو چیز مبہم ہے وہ علامت کہلانے کی مستحق نہیں۔ خسرو متین نے کہا کہ علامتی افسانوں میں تسلسل اور ربط کی کمی ہے۔

مخمور سعیدی صاحب نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ پچھلے چند برسوں میں بیانیہ کو جس طرح مطعون کیا گیا، اس کا کوئی علمی جواز تلاش کرنا مشکل ہے افسانہ بیانیہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا شاعری میں بھی بیانیہ کی قوت مثنویوں میں اور مرثیوں میں جس طرح ظاہر ہوئی ہے اس سے کیونکر انکار ہو سکتا ہے۔ بیانیہ کو یکسر رد کر دینے والے ناقدوں نے دراصل تخلیق کاروں کو گمراہ کیا ہے۔ پروفیسر قمر رئیس صاحب نے کہا کہ علامتی افسانے کو بیانیے سے یکسر جدا کرنے کی کوشش کی گئی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ افسانے کا اس کی روایت سے رشتہ ٹوٹ گیا انور سجاد، رشید امجد اور رم۔ ق۔ خاں وغیرہ سبھی افسانہ نگار بہک گئے تھے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ اردو افسانے کا سماجی، لسانی اور تہذیبی تجزیہ ہونا چاہیے۔ کچھ نقاد ایسے تھے جنھوں نے ہمارے ماضی کے ادبی سرمایے کو رد کرنا چاہا۔ یہ بہت بڑی بھول تھی انھوں نے ابلاغ کے ذرائع کو بنیاد بنا کر روایت کے تئیں نفرت اور حقارت کا جذبہ پیدا کیا اور محض اپنی شخصیت کو منوانے کے لیے بعض مغربی نظریوں کو تھوپا گیا۔ مخمور سعیدی صاحب نے مزید کہا کہ اس ماحول میں لکھنے والوں کا قصور کم تھا نقادوں کا قصور زیادہ تھا۔ آخر میں پروفیسر قمر رئیس نے جلسے میں ہوئی کامیاب بحث پر قمر کا کو مبارکباد دی۔ بعد ازاں قلمزاد کے کنوینر کے شکریے کے ساتھ یہ جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

(ڈاکٹر جلال انجم)

عربی زبان کی اہمیت

"نواب شیر خاں انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانس اسٹڈیز ان اُردو" کی جانب سے "عربی زبان کی اہمیت اور اس کی امتیازی خصوصیات" کے موضوع پر مالیر کوٹلہ میں ایک توسیعی لیکچر کا اہتمام کیا گیا۔ صدارت کے فرائض ڈاکٹر بھگت سنگھ وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی پٹیالہ نے انجام دیے۔

اظہارِ خیال کے لیے ڈاکٹر ارشد حسین کو دعوت دی گئی تھی۔ ڈاکٹر ارشد حسین شعبۂ مطالعۂ تقابلی مذاہب پنجابی یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔ انھوں نے اپنا توسیعی خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ کسی زبان کی اہمیت اور مقبولیت کا پیمانہ صرف یہ نہیں ہے کہ اس کا دائرۂ عمل زمین کے کتنے لمبے چوڑے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ یا اُسے دُنیا کی آبادی میں سے کتنی بڑی اکثریت بولتی یا سمجھتی ہے۔ بلکہ اُس کے ساتھ اُس کی کسوٹی یہ بھی ہے کہ اُس کا دامن کتنا وسیع ہے اِس میں کتنی گہرائی اور کتنی گیرائی ہے۔ اس کے نحوی قاعدوں اور گرامر کے اصولوں

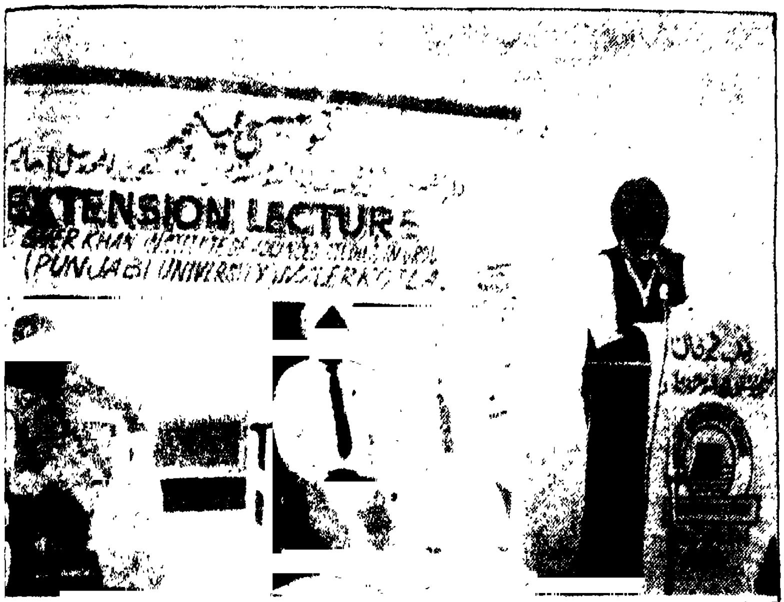
میں کتنا استحکام، پختگی اور اسی کے ساتھ کتنی وضاحت ہے۔ عربی زبان کی گوناگوں خصوصیات نے نہ صرف اسے بول چال کی ایک کثیر الاستعمال زبان کی حیثیت سے قایم رکھا ہے، بلکہ ایک ترقی پذیر، وسیع اور دلکش ادبی وفنی زبان کے قالب میں بھی زندہ رکھا ہے۔ عربی زبان کا دامن مترادفات کے معاملے میں بڑا وسیع ہے۔ چناں چہ علماے لغت نے صرف سال کے لیے ۲۴ نام، روشنی کے لیے ۲۱، تاریکی کے لیے ۵۲، کنویں کے لیے ۸۸، پانی کے لیے ۱۲۰ اور اُونٹ کے لیے ۳۵۰ نام لکھے ہیں۔ عربی زبان اپنی اعلا خصوصیات کی بنا پر ہی بین الاقوامی زبانوں میں شامل ہے۔

ڈاکٹر بھگت سنگھ نے اپنے صدارتی خطبے میں کلاسیکل زبانوں کی طرف سے عدم توجہی پر افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ ان میں اخلاقیات و درسیات کا اتھاہ خزانہ موجود ہے۔ جس سے فیض یاب ہونے کی ضرورت ہے۔ اگر نئی نسل عربی و فارسی کی طرف متوجہ ہوتی تو وہ ذہنی بے راہ روی کا شکار نہ ہوتی۔ آخر میں انھوں نے انسٹی ٹیوٹ کی ہر ممکنہ مدد کا یقین دلایا۔

یاد رہے کہ ڈاکٹر بھگت سنگھ انسٹی ٹیوٹ کے بانیوں میں سے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی اُردو دوستی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ ان کی ذاتی کوششوں سے ہی انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں آیا ہے۔

فی الحال اس ادارے میں ایم۔اے۔ فارسی اور عربی کے سرٹیفکیٹ کورس کی کلاسز شروع کی گئی ہیں۔ اور مستقبل قریب میں اُردو اور فارسی کی تحقیق کے لیے تدریسی سہولیات کے فراہم ہونے کے قوی امکانات ہیں۔ اس تقریب کی نظامت کے فرائض شعبۂ اُردو کے اُستاد پروفیسر محمد اقبال نے انجام دیے۔ اور انسٹی ٹیوٹ کے پرنسپل بھگت سنگھ نے سامعین کو خوش آمدید کہا۔

(منظور عالم)



پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کے وائس چانسلر ڈاکٹر بھگت سنگھ صدارتی خطبہ دیتے ہوئے
(دائیں سے) پروفیسر محمد اقبال، سردار امر سنگھ اور ڈاکٹر ارشد حسین۔

ادبی خدمات کا اعتراف

گذشتہ دنوں لدھیانہ میں اُردو، ہندی اور پنجابی کے مشہور ادیب ڈاکٹر کیول دھیر کی پچاس سالہ ادبی خدمات کے اعتراف میں "جشنِ دھیر" کمیٹی کے



ممبر پارلیمنٹ جناب ست پال متل ڈاکٹر دھیر کو شال، طلائی سند اور کیسہ زر پیش کرتے ہوئے

زیرِ اہتمام ایک پُر وقار تقریب منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر کیول دھیر کو طلائی سند، شال اور مبلغ ایک لاکھ روپے کی تھیلی پیش کی گئی۔ اسی موقعے پر اُن کی ۵۱ ویں کتاب "خوشبو کا سفر" (سفر نامۂ پاکستان) اور ہندی کہانیوں کے نئے مجموعے "لہو کے رنگ" کی رونمائی بھی ہوئی۔

علی گڑھ کی ایک ادبی شام



تصویر میں (بائیں سے) پروفیسر قاضی عبدالستار، شہپر رسول، پروفیسر آلِ احمد سرور "صدف" اور "سمندر" کی رونمائی کرتے ہوئے اور منظور ہاشمی۔

چراغِ دہلی

میرزا حیرت دہلوی اپنے زمانے کے مشہور و ممتاز ادیبوں میں تھے۔ دہلی پر اُن کی کتاب "چراغِ دہلی" بہت اہم تصنیف ہے جو کرزن پریس دہلی سے ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" اور سرسید کی "آثار الصنادید" کے انداز پر اُردو زبان اور ادب کی تاریخ لکھی گئی ہے اور "آثار الصنادید" کو نمونہ بنا کر دہلی کی تاریخی عمارتوں کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ شروع میں اُردو کی ابتدا سے بحث کی ہے۔ پھر ہندی زبان کی مختصر تاریخ بیان کرکے کبیر، گرو نانک، سور داس، کیشو داس، بہاری لال اور تلسی داس کے حالات مختصر طور پر بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد دکن کے شجاع الدین نوری سے ذوق اور غالب تک چند اہم شاعروں کے کلام پر تنقیدی رائے دی گئی ہے۔

دہلی کی سماجی، سیاسی، لسانی، ادبی، تہذیبی زندگی کے بارے میں یہ کتاب بہت اہم معلومات فراہم کرتی ہے۔ اشاعتِ اوّل کے پچاسی سال بعد اُردو اکادمی دہلی نے اسے دوبارہ شائع کردیا ہے۔ اشاعتِ ثانی، اشاعتِ اوّل کا ہوبہو عکس ہے تاکہ قارئین اُس زمانے کے اندازِ کتابت سے بھی واقف ہوسکیں۔ دہلوی تہذیب و تمدن کے دلدادگان کے لیے یہ کتاب ایک سدا بہار تحفے کی حیثیت رکھتی ہے۔

مصنف : میرزا حیرت دہلوی

صفحات : ۵۳۶

قیمت : ۳۹ روپے

مرزا محمود بیگ کے مضامین کا انتخاب

مرزا محمود بیگ مرحوم ایسے صاحبِ طرز انشا پرداز تھے لیکن انھیں وہ شہرت نہیں ملی جس کے وہ مستحق تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ان کی توجہ کا مرکز دلی کالج اور اس کے طلبہ رہے۔ لکھنے پڑھنے کا وقت انھیں بہت کم ملتا تھا پھر بھی انھوں نے آل انڈیا ریڈیو کے اصرار آمیز تقاضوں پر بہت سے مضامین اور انشائیے لکھے۔ ان کے انشائیوں کے دو مجموعے بھی "بڑی حویلی" اور "دِلّی ۱۸۵۰ء کی" کے نام سے شائع ہوئے۔

زیرِ نظر کتاب مرزا محمود بیگ کے انشائیوں کا بہترین انتخاب ہے جو اُردو اکادمی دہلی کے ایما پر ڈاکٹر کامل قریشی نے تیار کیا ہے۔ ابتدا میں انھوں نے مرزا صاحب کے خاندانی حالات اور ان کی سیرت و شخصیت پر مفصل روشنی ڈالی ہے اور ان کے اندازِ تحریر کی خصوصیات بھی واضح کی ہیں۔

گفتگو کی زبان کا لطف تحریر سے اُٹھانا ہو تو اس کتاب کا مطالعہ کیجیے۔

مرتب : ڈاکٹر کامل قریشی

صفحات : ۲۹۶

قیمت : ۳۱ روپے

اُردو اکادمی، دہلی سے طلب کریں

آپ کی رائے

○ اس مرتبہ "ایوانِ اُردو" کے پہلے صفحے پر آپ نے 'قومی آواز' میں شائع شدہ خبر کے سلسلے میں جو کوائف لکھے ہیں ان کو پڑھ کر بے حد افسوس ہوا۔ اب ادب بھی سیاست کی سطح پر برتا جانے لگا ہے؛ جس میں جھوٹ، فریب، دغابازی، جعل سازی سب کی گنجائش ہے اگر نہیں ہے تو دیانتداری کی نہیں ہے:

محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

—— نامی انصاری، کانپور

○ 'ابوالکلام آزاد نمبر' زیرِ مطالعہ رہا۔ واقعی آپ نے تو کمال کر دیا۔ بے حد معلوماتی اور مستند مضامین پڑھنے کو ملے۔

اُردو کُشی کے اس دور میں اُردو کی بقاو ترقی کے لیے آپ کی جو کوششیں ہیں وہ قابلِ صد مبارکباد اور ناقابلِ فراموش ہیں۔

—— محمد عارف شجر، ہزاری باغ

○ "ایوانِ اُردو" برابر اور وقت پر مل رہا ہے۔ پرچے کو نظر لگ رہی ہے۔ 'مولانا آزاد نمبر' تو تاریخی حیثیت کا حامل تھا۔

—— سری نواس لاہوٹی، حیدرآباد

○ ماہنامہ "ایوانِ اُردو" کی مقبولیت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ مدھیہ پردیش کے اس دور دراز قبائلی علاقے میں بھی اس کے قارئین موجود ہیں۔ 'مولانا ابوالکلام آزاد نمبر' کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

—— (ڈاکٹر) شکیل احمد (علیگ)، جگدل پور بستر

○ "ایوانِ اُردو" کا 'مولانا ابوالکلام آزاد نمبر' ہر لحاظ سے مکمل، جامع اور تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔ مولانا آزاد پر اب تک جتنے بھی نمبر نکلے ہیں اُن میں یہ ممتاز و منفرد ہے۔

مارچ ۸۹ء کے شمارے میں راج نرائن راز کا پرکاش پنڈت پر مضمون بہت اچھا لگا ساتھ ہی دُکھ بھی ہوا کہ پرکاش پنڈت کی اُردو خدمات کا صحیح معنی میں ابھی تک اعتراف نہیں کیا گیا ہے۔

—— رضی احمد تنہا، پورنیہ

○ آنجہانی پرکاش پنڈت پر راج نرائن راز کے مضمون نے بہت سی یادوں کو تازہ کر دیا۔ ان کی تصویر نظروں کے سامنے گھوم گئی۔ اُن کے ساتھ گذارا ہوا وقت یاد آ گیا۔ پرکاش پنڈت مرحوم نے مجھے ساحر لدھیانوی مرحوم کے بارے میں بڑی دلچسپ اور حیرت انگیز باتیں بتائیں تھیں لیکن یہ وعدہ لیا تھا کہ اُن باتوں کو کبھی قلمبند نہیں کیا جائے گا

ایک چھوٹا سا مشورہ ہے۔ ہم اُردو والے اپنے قلمکاروں کو بہت جلد بھول جاتے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ سال میں ایک شمارہ مرحوم قلمکاروں کے نام وقف کر دیا کریں اور ان کے حالاتِ زندگی اور ایک منتخب تخلیق شائع کر کے آنے والی نسلوں کے لیے ایک ادبی دستاویز تیار کر دیں۔

—— عظیم اختر، دہلی

○ "ایوانِ اُردو" مارچ ۸۹ء میں ابراہیم یوسف صاحب کا مضمون "غالب اور ڈراما" میں نے اشتیاق سے پڑھا اس موضوع پر تحریروں کا انھوں نے خوب احاطہ کیا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دو کتابیں جو اس مطالعے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں موصوف کی نظر سے نہیں گزریں۔ ایک احمد جمال پاشا کی مرتبہ "غالب سے معذرت کے ساتھ" اور دوسری میری مرتبہ "چھیڑ غالب سے" ان دونوں کتابوں کے بغیر متعدد اہم ڈرامے اور فیچر ابراہیم یوسف صاحب زیرِ بحث نہ لا سکے۔ اچھا ہو کہ وہ ان کتابوں کو پیشِ نظر رکھ کر اس عنوان کا تتمہ تحریر فرمائیں تاکہ موضوع کے ساتھ انصاف ہو سکے۔

—— عرشی زادہ، رامپور

○ مارچ ۸۹ء کے شمارے میں سریندر پرکاش کی کہانی "آدمی" بے حد لاجواب کہانی تھی سریندر نے ثابت کر دیا کہ ابھی اس کے قلم میں وہی کاٹ باقی ہے۔ نئی نسل میں وہ لوگ جو یہ دعویٰ کرتے تھے کہ انھوں نے کہانی کو پھر سے اُس کا چہرہ لوٹایا ہے اب خود اپنے آپ کو دوہرانے لگے ہیں۔ اپریل کے شمارے میں مشتاق مومن کی کہانی "قصہ جدید حاتم طائی کا" قطعی متاثر نہ کر سکی۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں مشتاق مومن اپنے پہلے مجموعے "رت جگوں کا زوال" کے بعد اب تک ایک بھی عمدہ کہانی نہیں لکھ سکے۔ جیسے ان کی ہی کہانی "کریم لگا بسکٹ اور چونٹیاں" یا "موز" یا "آسیب" کے مقابل رکھ سکیں۔

رسالے کے آخر میں آپ کسی ایک شاعر کی تصویر کے ساتھ اُس کی غزل بھی شائع کرتے ہیں اس طرح ایک عمدہ البم تیار ہو رہا ہے۔ یہ سلسلہ جاری رکھیے۔

—— کاظم علی، اورنگ آباد

"ایوانِ اُردو" کے گذشتہ شمارے میں
ں والے حنیف نقوی صاحب کا خط چھپا
اور میں اُن کے ایک ایک لفظ کی تائید و
یق کرتا ہوں (اگرچہ اس کا نشانہ بھی میں
نا ہوں)۔

واقعی وہ حنیف نقوی صاحب (بنارس
سٹی) کا تقویمی حساب تھا جس کے مطابق
کی ولادت کی تاریخ کا اعلان کرکے یہاں
علا درجے کی محفل رکھی تھی۔ (حنیف فوق
راجی نہیں، حنیف نقوی آف بنارس)۔
اسی محفل میں، جہاں بمبئی کے چنے ہوئے
سوا پانچ سو حضرات شریک تھے، دوسرے
ں محقق، کالی داس گپتا رضا صاحب نے
تاریخیں رد کرکے وہی پرانا حساب
دسمبر والا برقرار رکھا۔ اور انھوں نے
اریخ کو بے جا اور خلافِ تحقیق قرار دیا۔
پتا چلا کہ ہمارے تحقیقیوں کی نظر میں
"تحقیق" (ریسرچ یا علمی نکتہ سنجی یا
ذکر و فکر کی تلاش) یہیں تک ہے کہ
ں شاعر یا ادیب کس دن پیدا ہوا، اس
چاند گرہن تھا یا نہیں تھا، پڑوس میں
طوطہ ملا ہے جس سے ولادت کی تائید
ں نکلتی ہے وہ کہاں تک قابلِ اعتنا ہے
طوطہ دراصل ملا کس کو ہے رام کو یا شیام
اب تحقیقیوں کی موجودہ نسل (خدا
عمر دراز عطا کرے!) از مالک رام تا
ف نقوی (درمیان میں صمد رضوی آف
، عابد پیشاوری و کالی داس گپتا رضا)
بحث و تمحیص کے بعد غالب کا یوم ولادت
طور پر طے فرما دیں تاکہ ہم جیسے بے تحقیق
ں کے پاس سندر ہے اور بعد والوں کے
کام آئے۔

ضمناً عرض ہے کہ تحقیق یا محض ادبی
تحقیق کی دُنیا بھی ایک سمندر ہے اور اس
سمندر میں دُور و نزدیک باد بانی کشتی سے
گھومنے پھرنے والے اگر کسی ساحلی بستی والوں
کی نظر میں "بے تحقیق" ٹھیریں تو وہ اس بستی
کو بے حیثیت نہیں ٹھیراتے بلکہ اس کے
طول و عرض اور سلامتی پر نظر کرکے گزر
جاتے ہیں۔

—— ظ۔ انصاری، بمبئی

○ اپریل کے شمارے میں اطہر فاروقی کا
مضمون "سکندرآباد کی ادبی روایتوں کے
گُم شدہ سلسلوں کی بازیافت" ایک اہم
تحقیقی مضمون ہے، مگر تمام مباحث
ادھورے ہیں۔ اگر سنجیدگی سے تمام قدیم
ادبی مراکز کے لوگ اپنی تاریخیں مرتب کرلیں
تو اُردو کی مستند اور مکمل تاریخ کی ترتیب،
جو ابھی صرف ایک خواب ہے، ممکن ہوسکے گی۔

'اجے چند نامہ' سے متعلق اطہر
فاروقی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ حیرت
انگیز اور بالکل نئی تحقیق ہے۔ مگر جتنے
صفحات کا یہ مضمون ہے اتنے صفحات تو
صرف اُردو کی اس پہلی کتاب کے مباحث کو
ضبطِ تحریر میں لانے کے لیے بھی ناکافی ہیں۔
مگر سوال یہ ہے کہ کیا کاغذ اور سیاہی سے
اس کتاب کا عہدِ مذکور کا ہونا محقق ہے؟
اگر اس کے کچھ صفحات کا عکس بھی شائع
ہو جاتا تو کیا ہی اچھا ہوتا کہ "ایوانِ اُردو"
اُردو کی سب سے قدیم کتاب کا عکس شائع کرتا۔
آپ کو اس اہم لغت پر ایک تفصیلی مضمون
جلد از جلد شائع کرنا [illegible]

بال مکند بے صبر کی مثنوی کا ذکر بھی
مضمون نگار نے صرف ایک پیراگراف میں کیا
ہے، جب کہ اگر یہ اتنی ہی نایاب مثنوی ہے
تو اس پر پورا مضمون لکھا جانا چاہیے تھا۔ پھر
اس میں ترقیمے کی عبارت بھی غائب ہے جب کہ
اصولِ تحقیق کے مطابق ترقیمے کی اصل عبارت
نقل کرنا ضروری تھا۔ اور اگر مضمون نگار کے
پاس اصل مثنوی ہے تو اس کے سرورق کا
عکس بھی شائع کرا دیتے تو محققین کی کئی مشکلیں
آسان ہو جاتیں۔

مضمون نگار کے قول کے مطابق
بیسویں صدی کے نصف آخر کی مثنوی سے
متعلق تمام اہم کتب اس اہم مثنوی کے
ذکر سے خالی ہیں مگر پروفیسر گیان چند جین
کی کتاب "اُردو مثنوی کا ارتقا: شمالی ہند
میں" جو ان کا ڈی لٹ کا مقالہ ہے، میں اس
مثنوی کا ذکر موجود ہے۔ وہ شاید مضمون
نگار کی نظر سے نہیں گزری۔

—— احسن اعظمی، حیدرآباد

○ جناب اطہر فاروقی کا مضمون "سکندرآباد
کی ادبی روایتوں کے گُم شدہ سلسلوں کی بازیافت"
"ایوانِ اُردو دہلی" کے اپریل ۱۹۸۹ء کے شمارے
میں نظر نواز ہوا۔ سکندرآباد کی ادبی روایتوں
کے گُم شدہ سلسلوں کی بازیافت کی یہ مستحسن
مگر تشنہ کوشش ہے۔

یہ صحیح ہے کہ یہ مضمون اطہر فاروقی صاحب
کی سخت کوشش اور تگ و دو کا ثمرہ ہے، مگر ان
کے مزاج کی انتہا پسندی، اور ایک احساسِ
برتری شروع سے آخر تک جاری و ساری ہے۔
مجھ ناچیز کے بارے میں تمام تر ذاتی تعلقات کے
[illegible]

شاکر انصاری اور شاہد ایّوبی صاحبان سے حق دوستی نباہتے ہوئے انھیں بھی شعرائے سکندرآباد کے سوسالہ تذکرے "شہرِ تفتہ" کے مرتّبین میں شامل کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں کا اس کتاب کی ترتیب سے کچھ تعلّق نہیں۔ انھوں نے چوں کہ اشاعت کے مراحل میں میری مدد فرمائی تھی، یوں میں نے ان دو حضرات کا نام معاونین میں لکھ دیا تھا کتاب کے سرورق پر مرتّب کی حیثیت سے میرا ہی نام درج ہے۔

"شہرِ تفتہ" اچھا یا بُرا، مستند یا غیر مستند اور مضمون نگار کے قول کے مطابق آدابِ ترتیب و تدوین سے عدم واقفیت کے باوجود سکندرآباد کی ادبی تاریخ پر پہلا کام ہے۔ مالک رام صاحب نے تلامذۂ غالب میں تفتہ کی جو تصویر شائع کی ہے وہ "شہرِ تفتہ" سے لی گئی ہے مگر مالک رام صاحب نے اس کا حقّہ کاٹ دیا ہے۔

اطہر فاروقی صاحب نے ضیاالدّین احمد انصاری کی کتاب "تفتہ اور غالب" کا حاشیے میں حوالہ دے کر پروفیسر مسعود حسین خاں کے حوالے سے تفتہ کا جو مقطع درج کیا ہے وہ مقطع وہ حوالہ "تفتہ اور غالب" میں اس صفحے پر تو کیا پوری کتاب میں کہیں نہیں ہے :

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے

میں نے "شہرِ تفتہ" کی ترتیب کے زمانے میں تفتہ کا اُردو دیوان ایم۔ ایس۔ انٹر کالج کی لائبریری میں چند گھنٹے مطالعہ کیا تھا۔ اس میں یہ دونوں غزلیں تو موجود ہیں جن کے مقطعے اطہر فاروقی صاحب نے لکھے ہیں مگر غالب کی موت والا قطعہ اس میں نہیں ہے فاروقی صاحب

تفتہ کے اُردو دیوان میں بڑی تعداد میں فارسی غزلیں، قطعاتِ تاریخ وفات بھی درج ہیں۔ اس دیوان کی اُردو غزلوں کے تمام مقطعے میرے پاس موجود ہیں اور میں نے ہی غالباً فاروقی صاحب کو سنائے ہوں گے۔ بے صبر کا ذکر بھی تشنہ ہے اور اُنیسویں اور بیسویں صدی کے تمام شعرا کے حالات بھی مذکور نہیں۔

——— یعقوب بدر، سکندرآباد

○ اطہر فاروقی صاحب کے مضمون کی اشاعت کے لیے تمام اہلِ سکندرآباد کی جانب سے مبارک باد قبول فرمائیے۔ سکندرآباد کے ادب کو مبسوط طریقے پر ضابطۂ تحریر میں لانے کی یہ ایک کامیاب کوشش ہے۔ مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ انھوں نے اس مواد کو کس تگ و دو سے یکجا کیا ہے اور اپنے وطنِ مالوف سے یہ ان کی جذباتی وابستگی کا ثبوت ہے کہ وہ اسے کسی بھی تحقیقی کام کرنے والے کو دینے کو تیّار ہیں۔

مضمون میں ایم۔ ایس۔ انٹر کالج کی لائبریری (جو یو۔ پی کی قدیم ترین لائبریری ہے) کا ذکر بہت مروّت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ وہاں لائبریری کی صورتِ حال اس سے کہیں زیادہ خراب ہے جو مضمون میں مذکور ہے۔ اس لائبریری میں ۱۸۸۶ء تک کی ہزاروں اہم اُردو کتب اور اُردو مخطوطے موجود تھے جو پرانی کتب کے پارکھیوں کو اونے پونے داموں میں بیچ دیے گئے۔ ایسی بیش تر کتب علی گڑھ کے بعض حضرات نے خریدی ہیں جن کے نام میرے علم میں ہیں۔ ابھی ایسے دس بیس لوگ بھی سکندرآباد میں زندہ ہیں [illegible]

نکلوا کر پڑھا ہے۔ تباہ شدہ حالت میں بھی نایاب کتب کی بڑی تعداد اس لائبریری میں اب بھی موجود ہے، مگر اُردو کے تمام ریک ایک کونے میں پڑے دھول چاٹ رہے ہیں۔

گذشتہ ۱۱ ویں ستمبر کو انجمن ترقی اُردو ہند کی سکندرآباد شاخ کی طرف سے منعقدہ "اُردو ذریعۂ تعلیم کے مسائل" پر سیمینار میں میں نے اس معاملے کو اٹھایا تھا اور ایک قرارداد بھی پاس کرائی تھی۔ ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر مسعود حسین خاں، حیات اللہ انصاری، ڈاکٹر اسلم پرویز، بیگم سلطانہ حیات، جگن ناتھ آزاد صاحبان یہ وعدہ فرما کر گئے تھے کہ وہ اس لائبریری کے لیے کچھ کریں گے، اس ذخیرے کو برباد نہیں ہونے دیں گے۔ یہ وعدہ ہنوز تشنۂ ایفا ہے میں "ایوانِ اُردو" کے ذریعے حکومت سے پُرزور اپیل کرتا ہوں، خصوصاً یو۔ پی کے گورنر سے، جو خود بھی شاعر ہیں کہ خدارا اس اہم ذخیرۂ کتب کو بچا لیجیے ورنہ آئندہ نسلیں ہمیں کبھی معاف نہیں کریں گی۔

——— امان اللہ خالد، سکندرآباد

○ اس بار انجم عثمانی اور مشتاق مومن کی کہانیاں بڑی دل چسپ تھیں۔ یہ کہانیاں اس لیے بھی اچھی لگیں کہ اچھے خاصے جانے پہچانے افسانہ نگار بھی اب تمثیلی کہانیوں کے بہانے Pseudo کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ جب کہانی کار کے پاس موضوع نہیں رہ جاتا تو ایسی کہانی لکھنے لگتا ہے تاکہ مہارت کے سہارے قاری کو لبھا سکے۔ لیکن کب تک؟

——— انور خاں، بمبئی

○ یہاں مکتبہ جامعہ کا تو یہ حال ہے کہ "ایوانِ اُردو" ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے [illegible]

...والوں کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ :
First Come First Serv...

...نئے کالم اور گوشے آپ نے بڑھائے ہیں
...صرف ادبی ہی نہیں علمی اور عملی بھی ہیں۔
ایک بات اور جو بہت اہم ہے وہ یہ کہ
...نیا اُردو املا Follow کر رہے ہیں یہ
...اچھا ہے۔ بچّے ضرور ضرور مانوس ہوں گے
...ے پر ہمزہ نہیں اور گاؤں صحیح طور سے
...و لکھا دیکھا تو جی عش عش کر اُٹھا۔

——— مشتاق مومن، بمبئی

...) "ایوانِ اُردو" ماہ اپریل ۱۹۸۹ء میں
...ب کی رائے" کے تحت شامل ارشد عبدالحمید
...ب نے اپنے خط میں ٹھیک نتائج نہیں نکالے۔
...اس بنا پر کہ کرشن موہن، عرشی زادہ
...شجاع خاور کی غزلیں ایک صفحے پر یکجا ہیں
...شاعروں کو ایک ہی صف میں نہیں
...جاسکتا۔ شجاع خاور کی شاعری بالکل
...رے قبیل کی شاعری ہے۔ ان کے ہاں فنی
...ی اور معانی کی گہرائی کے امتزاج کو خاطر انصاری
...سخت گیر اور غزل مخالف نقّاد نے بھی تسلیم
...ہے۔ کرشن موہن کے اشعار پر ارشد صاحب
...اعتراضات کافی حد تک قابلِ اتفاق ہیں۔ البتّہ
...میں لفظ "بھی" کا کردار قطعاً مشکوک نہیں
...ا سکتا۔ عرشی زادہ کی غزل کے بیشتر اشعار
...ت و آہنگ کی غرابت کا شکار ہیں۔ اب
...شجاع خاور کی غزل اور اس پر اٹھائے
...مراسلہ نگار کے اعتراضات پر وہ لکھتے ہیں
...ہر ہے کہ 'مثلاً' کی ث ساکن نہیں 'متحرک'
...چاہیے" "ظاہر ہے" والی بات غلط ہے
...کہ یہ کوئی مسلّم کلیہ نہیں۔ یقیناً 'مثلاً' لفظ
...سے مشتق ... [illegible]

لیکن ایسے سینکڑوں الفاظ ہیں جن میں اشتقاق کے فطری عمل کے سبب بنیادی لفظ کے اعراب میں گفتگو یا تحریر کی سطح پر کچھ تبدیلی ہو جاتی ہے۔ مثلاً دیکھیے لفظ گلستاں۔ اس میں بنیادی لفظ ہے گُل جس میں ل ساکن ہے مگر اسم ظرف ستاں لگانے پر جب گلستاں بنا اور فعولن کے وزن پر (وتد مجموع+ سبب خفیف) باندھا گیا جیسا کہ اُردو فارسی کے ہزاروں اشعار میں ہے تو ل جو گُل میں ساکن تھی یہاں متحرک ہو گئی۔ پھر شجاع خاور کی شاعری کا ایک میلان یہ بھی ہے کہ وہ گفتگو اور عام بول چال کی زبان میں بھی شعر کہتے ہیں۔ کسی شعر میں الفاظ کا استعمال قاری کے ہجّے اور املا دُرست کرنے کے لیے نہیں ہوتا۔ بس شاعری صرف ایسے قارئین کے لیے بے ضرر ہوتی ہے جن کے مکتبی اکتساب کو شاعر کی گاہ بہ گاہ بے راہ روی سے ٹھیس نہ لگے۔

شجاع کی 'ع' گرنے پر اعتراض آج کل کچھ لوگوں کا شغل بن گیا ہے۔ اس کج بحثی پر تورانچی کے سرور ساجد کا تبصرہ ہی مناسب ہے۔ "اگر شجاع کی 'ع' گر گئی ہے تو آپ اُٹھا لیجیے۔" کج بحثی میں اسے اس لیے کہتا ہوں کہ شجاع خاور نے اپنے تازہ مجموعے "مصرعِ ثانی" کے صفحہ ۸۳ پر اپنے اس شعر پر :

کون آپ کی باتوں میں آئے گا شجاع صاحب
اشعار سے کیا دنیا بدلے گی اماں چھوڑو

یہ حاشیہ لگایا ہے :

"کیوں کہ لفظ شجاع کی صوتی ادائیگی 'ع' پر اتنا اصرار نہیں کرتی جتنا اِس لفظ کی تحریر ... [illegible]

ہے اِس لیے میں شعری سہولت کے تحت کبھی کبھی اِس لفظ کو بطور وتد مجموع باندھ لینا قبیح نہیں سمجھتا۔"

...سی مجموعے میں صفحہ ۱۰۵ پر یہ شعر ہے :

غزل کے نام پر خوب عورتوں سے گفتگو کیجیے
مزے کیا کیا ادب کی اصطلاحوں میں بھی ہوتے ہیں

اِس حاشیے کے ساتھ :

"یہاں لفظ عورتوں میں 'ع' کا صوتی کردار الف جیسا ہے اس لیے میرے تئیں کوئی حرف ساقط نہیں ہوتا۔"

شجاع خاور کے مذکورہ مجموعے میں درجنوں مقطعے ایسے ہیں جن میں شجاع کی 'ع' تقطیع میں شامل ہوتی ہے اور درجنوں دوسرے مقطعے ہیں جن میں ایسا نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا انھوں نے نہ صرف دانستہ طور پر کیا ہے بلکہ اس کا اعلان بھی کر دیا ہے اور اپنے تئیں اس کی وجہ بھی فراہم کر دی ہے۔ سخت حیرت کا مقام ہے کہ فاضل مراسلہ نگار شجاع کو 'ع' کے بغیر لکھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شجاع بشمول 'ع' ہی ایک بامعنی لفظ ہے۔ اور محض 'شجا' مہمل ہوا۔ اگر اس مشورے کو مان لیا جائے کہ جو حرف تقطیع میں نہ آئے اُسے لکھا ہی نہ جائے تو اساتذہ کے اُن لاکھوں اشعار کی کیا درگت بنے گی جن میں کہیں کوئی حرف خارج از تقطیع ہے کہیں کوئی۔ حالاں کہ یہ سب اصول و ضوابط کے تحت ہے اور قطعی دُرست اور جائز ہے لیکن تحریر میں تو ہر حرف کو لانا ہوتا ہے۔ حیرت اس پر بھی ہے کہ مراسلہ نگار نے یہی مشورہ ...

بہ لحاظ تقطیع کرشن کی 'ر' کی گنجائش نہیں:

سنا ہے لے لیا بیراگ کرشن موہن نے

آہ اور درد والے اعتراض میں کچھ جان ہے گو وہاں بھی اس بات کی گنجائش ہے کہ شعر میں نظم ہونے پر کوئی بھی لفظ مطلق طور پر اپنے لغوی اور روایتی معانی کی حدود میں نہیں رہتا۔ پھر یہ انفرادی فکر کا معاملہ بھی ہے کیوں کہ زندگی میں سے حد درجہ غور و فکر اور سنجیدگی نکال دینے پر بھی آہ اور درد کے امکانات یکسر زائل نہیں ہو جاتے صرف زاویۂ نظر اور آہ اور درد کی نہج میں فرق آسکتا ہے۔ تاہم شجاع خاور کا مقطع ان کے باقی اشعار سے میل نہیں کھاتا اور وہ شاید روا روی میں ایسی بات کہہ گئے ہیں۔ مگر یہاں شاعر کی بات غیر منطقی بھی مان لی جائے تو یہ Sadism کہاں سے آئی، وہ تو کوئی اور ہی شے ہے۔

ارشد صاحب کے ان اعتراضات پر رائے زنی کے بعد بھی کچھ باتیں ضروری ہیں جن کے بغیر یہ خط نامکمل رہے گا۔ میں ارشد صاحب سے متفق ہوں اور یہ بھی درست کہ بڑا نام اور بڑی شاعری ہم معنی نہیں مگر یہ بھی تو صحیح ہے کہ کچھ لوگ بڑا نام پڑھتے ہی اس میں چھوٹی شاعری کی تلاش شروع کر دیتے ہیں۔ شجاع خاور کی زیرِ بحث غزل کے معاملے میں ارشد صاحب نے یہی کیا ہے ـــــ ارشد صاحب معترف ہیں کہ شجاع خاور کی غزل کے بعض اشعار 'اچھے' ہیں۔ مگر یہ بے انصافی کیوں کہ انھوں نے اچھائیوں کا سرسری بیان بھی نہیں کیا۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ارشد صاحب کی [illegible]

شاعروں کو محض اس وجہ سے ایک ہی سطح پر رکھ دیا ہے کہ ان کی غزلیں مذکورہ شمارے کے ایک ہی صفحے پر شائع ہوئی ہیں۔ یقیناً بڑے نام سے متاثر ہونے کا ان کا اعتراض عرشی زادہ کے سلسلے میں قطعاً اور کرشن موہن کے سلسلے میں ایک حد تک دُرست ہو سکتا ہے مگر کسی بھی معمّر شاعر کی عمر شجاع خاور کی مسلّم Originality کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ شجاع خاور کی زیر بحث غزل کے ہر شعر میں بالکل نئی بات اور نیا ذائقہ ہے۔ مطلع تو لاجواب ہے ہی۔ تیسرے شعر میں زبان و بیان کے کمال اور معنوی تہ داری کا نادر امتزاج ہے۔ چوتھا شعر ہر لحاظ سے انوکھا ہے اور پانچواں شعر نہ صرف حاصلِ غزل ہے بلکہ بقول پروفیسر محمد حسن شجاع خاور کی انفرادیت کی مہر اس پر ثبت ہے۔ صرف آخری دو شعر نسبتاً ہلکے ہیں۔ پھر زمین کی تازگی اور وزن کی ندرت بھی پیشِ نظر رہنے چاہئیں۔

ارشد صاحب نے بحیثیت ایک قاری کے ان تینوں "بڑے" شاعروں کی غزلوں کا تفصیلی معائنہ کیا ہے اور پھر شمارے کے دیگر شعرا کی غزلوں کو زیادہ پختہ اور بزرگ پایا ہے، جبکہ ان دیگر غزلوں میں محض ایک آدھ شعر اچھا ہے اور متاثر کرتا ہے مگر بیشتر اشعار غرابت اور ناپختگی کا شکار ہیں۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک دوسرے قاری غلام نبی مومن نے پورے شمارے میں کرشن موہن اور شجاع خاور ہی کی غزلوں کو (بہ کاشش تیواڑی کے ساتھ ساتھ) قابلِ ذکر پایا ہے۔ اور اُن (مومن صاحب) کو کسی اور غزل نے [illegible]

غزلوں کے) متاثر نہیں کیا۔ لہٰذا سب ذاتی تاثر اور انفرادی آرا کا معاملہ ہے۔ نہ غلام نبی مومن کی بات حتمی ہوئی نہ ارشد عبدالحمید کی اور نہ میری۔ پس ہم میں سے کسی بھی قاری کو یہ زیب نہیں دیتا کہ محض اپنی ذاتی رائے پر یہ سوال قائم کرے کہ ادارے نے فلاں نام کے شاعر کی غزل کو شمارے میں کیوں شامل کیا ہے۔ اور فلاں کو کیوں نہیں کیا۔ بین السطور کہی گئی یہ بات بھی غلط ہے کہ مخمور سعیدی جیسا شاعر/ مدیر شاعر کے کلام کے علاوہ اُس کے نام اور دوسری غیر متعلقہ باتوں پر بھی توجہ مرکوز رکھتا ہے!

آخر میں یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ فنی معاملوں پر کیے گئے اعتراضات کی وضاحت، ان سے اتفاق یا اختلاف اور ان پر رائے زنی ادارے کی طرف سے مراسلہ نگار کے خط کے ساتھ شائع ہونا چاہیے*۔ اس کے بعد ہی قارئین اظہارِ رائے کریں۔ ادارے میں مخمور سعیدی جیسے شاعر کی موجودگی کے سبب میری یہ رائے غور طلب ہے۔ اس سے قارئین کے فنی ذوق کی تہذیب و تربیت ہوگی اور "ایوانِ اُردو" کی علمی حیثیت میں اضافہ ہوگا۔

ـــــ عبدالرحمٰن، د[illegible]

* ابتداءً یہی طرزِ عمل اختیار کیا گیا تھا مگر اس سے قارئین کو بدگمانی ہوئی کہ ادارہ ان پر اپنی رائے تھوپ دینا چاہتا ہے۔ اس لیے یہ سلسلہ موقوف کر دیا گیا ـــــ ادارہ

○ "ایوانِ اُردو" کو جس انداز میں آپ [illegible] کر رہے ہیں اس کے لیے مبارکباد۔ کم قیمت [illegible] اتنا عمدہ رسالہ نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں [illegible]

تشنہ اعجاز، مغربی چمپارن [illegible]

اُردو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

فون نمبر ۲۷۶۲۱۱، ۲۶۳۳۴۸

ایوانِ اُردو دہلی

ادارۂ تحریر

سیّد شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی

جلد: ۳، شمارہ: ۳ — فی کاپی ۲/۵۰ روپے، سالانہ قیمت ۲۵ روپے — جولائی ۱۹۸۹ء

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ

ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی

اُردو اکادمی، دہلی — گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خوشنویس: تنویر احمد

سیّد شریف الحسن نقوی، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے سیما آفسٹ پریس، دہلی ۱۱۰۰۰۶ سے چھپوا کر اُردو اکادمی، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

حرفِ آغاز

پچھلے مہینے ہم نے شعرا سے گزارش کی تھی کہ وہ صرف غزل کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو کر نہ رہ جائیں، شاعری کی دوسری اصناف کی طرف بھی متوجہ ہوں اور ان میں بھی اپنی طبیعت کے جوہر دکھائیں۔ اس کے بغیر ہمعصر اردو شاعری کا منظر نامہ اس دلکشی اور رنگارنگی سے محروم رہ جائے گا جس کا آنے والی نسلیں اس سے مطالبہ کر سکتی ہیں۔

یہی بات ہم اپنے نثر نگاروں سے بھی کہنا چاہتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں (ہندوستان کی حد تک) جو نثر لکھی جا رہی ہے وہ بالعموم ادبی مسائل و مباحث سے آگے نہیں بڑھتی۔ تخلیقی ادب کے علاوہ ادب کی تنقید و تحقیق، یہی وہ دائرہ ہے جس میں ہمارے نثر نگار اپنی ذہنی اور علمی صلاحیتوں کو بروئے کار لا رہے ہیں۔ لیکن اگر اردو کو ایک باوقار زندہ زبان کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے اور حیات و کائنات کی بھرپور ترجمانی کرنی ہے تو تمام مروجہ علوم و فنون سے اس کی وابستگی اور قربت ضروری ہے، بالخصوص سائنسی علوم جن سے ضروری واقفیت کے بغیر آج کوئی شخص ایک ذمّے دار شہری کے فرائض ادا نہیں کر سکتا۔ اگر اردو ان علوم تک رسائی کا ذریعہ نہ بن سکی تو ان علوم کی کشش اور اہمیت تو کم ہونے سے رہی۔ اردو اپنی اہمیت اور افادیت ضرور کھو بیٹھے گی۔ جن زبانوں میں ان علوم کا ذخیرہ موجود ہے اور بتدریج اضافہ پذیر، لوگ اردو کو چھوڑ کر ان زبانوں سے اپنا رشتہ جوڑنے لگیں گے۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہوگی جو اردو صرف اس لیے پڑھیں کہ اس میں اچھا ادب لکھا جا رہا ہے۔ بات ذرا اور آگے بڑھائی جائے تو یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ عصری علوم سے بے خبر رہ کر ایسا ادب بھی تخلیق کیا جا سکتا ہے یا نہیں جو صرف سستی تفریح کا ذریعہ نہ ہو کر ہماری جذباتی اور ذہنی تہذیب و تطہیر کا وسیلہ بن سکے اور ہماری زندگی میں شائستگی اور معنویت کے نئے رنگ بھر سکے۔

ہماری خواہش ہے اس مسئلے کی نزاکت اور اہمیت کو ہمارے اہلِ قلم محسوس کریں اور اپنے گوناگوں کرشماتِ قلم سے اپنی زبان کو زیادہ سے زیادہ مالامال بنانے کی کوشش کریں۔

ہماری ہزار کوششوں کے باوجود "مولانا ابوالکلام آزاد نمبر" کی اشاعتِ ثانی اب تک ممکن نہ ہو سکی کیوں کہ اس کے لیے جس مقدار میں کاغذ درکار ہے وہ دستیاب نہیں ہو پا رہا۔ اب امید بندھی ہے کہ اگلے ہفتے تک شاید کاغذ فراہم ہو جائے ——— ہم چاہتے ہیں کہ جن حضرات نے اس نمبر کے آرڈر ہمیں بھیج رکھے ہیں، وہ ان کی توثیق کر دیں۔ ان آرڈروں کی کمی بیشی کو سامنے رکھ کر ہی ہم تعداد اشاعت کا فیصلہ کر سکیں گے۔

——— سیّد شریف الحسن نقوی



بلراج کومل

دیدۂ تر

تم مرے کوئی نہیں
اور یہ ننھی سی جاں
کون ہے؟ کوئی نہیں
میں بھی تم دونوں کو شاید
اجنبی لگتا ہوں، شاید کچھ نہیں
عین ممکن ہے کہ روزِ حشر کے امکان سے ہی قبل ہم
اپنے اپنے راستوں پر
روز و شب چلتے ہوئے
ریگِ نامعلوم کے طوفان میں
ایسے بچھڑیں
پھر کبھی نہ مل سکیں

یہ جو لمحہ بخت میں لکھا ہے ہم سب کے خدا نے
قرب کا، رنگِ تمازت کا، لہو کے جشن کا
کاش اس لمحے میں ہم
بند کرلیں اپنی آنکھوں میں حسیں چہرے شگوفے
قہقہے، روشن ستارے
لہلہاتے جسم
موجِ برق، شعلوں کا تموّج
موت کے، تخلیق کے اسرار سب
خانۂ موجود ان سب کے لیے
اب ہمارے دیدۂ تر کے سوا کچھ بھی نہیں
رسمِ رخصت بھی کبھی ہوگی مگر
لمحۂ بے نام کی تحویل میں
(گھر یہ سچ ہے مختصر ہے)
اس فنا انجام جلتے مختصر گھر کے سوا کچھ بھی نہیں

ای-۱۳۹، کالکاجی، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹

سیّد ضمیر حسن دہلوی

اُردو زبان کے محاورے اور کہاوتیں

کوئی بولی جب زبان کی شکل اختیار کرتی ہے تو اس کے بہت سے روپ ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ علمی اور ادبی گفتگو صرف اُن لفظوں میں نہیں کی جا سکتی جو روزمرّہ کی بات چیت میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ لفظوں کے اس مجموعے کو جو کوئی معنی بیان کرتا ہو ہم جُملے کے نام سے پکارتے ہیں۔ گرامر کے اصول لفظوں کی ترتیب اور بامعنی جُملے بنانے کے قوانین کا نام ہے۔ گرامر کے اصول یا اُس قانون کی ضرورت جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے، عام طور پر کافی دیر میں پیش آتی ہے۔ اوّل اوّل وہ طریقہ جو زبان کے کام لینے کے لیے "اہلِ زبان یعنی زبان کے اصل بولنے والے استعمال کرتے ہیں، سب سے بڑا قانون یا سند مانا جاتا ہے۔ بول چال کی عام زبان جس میں کسی زبان کو مادری زبان کی حیثیت سے بولنے والے گفتگو کرتے ہیں، اس کو "روزمرّہ" کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ اپنے معنی کے اعتبار سے انگریزی کے COLLOQUIAL کے قریب ترین مفہوم کو پیش کرتا ہے۔

جس طرح مادری زبان کی حیثیت سے کسی زبان کے بولنے والوں کو اہلِ زبان کہا جاتا ہے اسی طرح وہ لوگ جو اس زبان کو باقاعدہ سیکھ کر اس میں مہارت حاصل کرتے ہیں، خواہ ان کی اپنی زبان کچھ اور ہو، وہ زباں داں کہلاتے ہیں۔ زباں دانی ایک قابلِ تعریف ہنر ہے اور یقیناً اس ہنر کو جاننے کے لیے آدمی کو کڑی محنت کرنی پڑتی ہے، لیکن یہ بات بھی خاص طور سے جاننے کی ضرورت ہے کہ زباں داں اپنی پوری کوشش کے باوجود زبان کے بعض نکتے یا وہ اصول جو سینہ بسینہ نسل در نسل چلے آ رہے ہوں، مشکل ہی سے سیکھ پاتا ہے۔ انگریزوں کو انگریزی، عربوں کو عربی، ایرانیوں کو فارسی پر جو ناز ہے وہ چھپا نہیں ہے۔ زباں داں لغت اور گرامر کے ذریعے زبان کے بارے میں بہت کچھ جان لیتے ہیں لیکن محاورے یا روزمرّہ پر قدرت حاصل کرنے کے لیے عمرِ عزیز کا وقفہ بہت تھوڑا ہے۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ آپ حضرات کو سنانا چاہتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیے:

ڈاکٹر فیلن جس کی انگریزی اردو ڈکشنری بہت مشہور ہے، اس گھمنڈ میں تھے کہ انھیں اہلِ زبان سے کہیں زیادہ اُردو آ گئی ہے۔ سیّد احمد دہلوی نے جو زبان کے بڑے رسیا تھے، صاحب کو بتایا کہ دلّی کے شرفا کا تو ذکر ہی کیا ہے آپ یہاں کے کمینوں جتنی اُردو بھی نہیں جانتے۔ ڈاکٹر فیلن ان کی بات سن کر سُرخ ہو گئے۔ بولے آپ میرا امتحان لیجیے۔ اتنے میں ایک مہترانی اپنا ٹوکرا اٹھائے سامنے سے گزری۔ سیّد صاحب نے کہا ذرا اس سے بات کیجیے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے؟ صاحب نے کہا بلاؤ اسے۔ سیّد صاحب نے مہترانی کو آواز دی: "اے بُوا ذرا یہاں آنا صاحب تم سے بات کرنی چاہتے ہیں۔" مہترانی نے آ کر کہا "فرمائیے کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔" صاحب نے کہا تم ہم سے کچھ پوچھو۔ وہ سٹ پٹائی کہ یہ گورا آخر چاہتا کیا ہے۔ کہیں سٹھیا تو نہیں گیا مُوا۔ سیّد صاحب نے کہا تم ان سے کسی محاورے کے معنی پوچھو۔ مہترانی نے کہا "اچھا تو میں اس ٹوکرے کو لپک کر ڈلاؤ پر ڈال آؤں تب پوچھوں گی، صاحب بغلیں جھانکتے رہ جائیں گے۔ ڈاکٹر فیلن کے کان کھڑے ہوئے کہ مہترانی ایک ہی فقرے میں دو باتیں ایسی کہہ گئی جو مجھے معلوم نہیں ہیں۔ مولوی صاحب سے پوچھا۔ کیوں مولوی صاحب ڈلاؤ کسے کہتے ہیں اور بغلیں جھانکنا کیا ہوتا ہے۔ سیّد صاحب نے کہا "تیل دیکھیے تیل کی دھار دیکھیے۔ ابھی تو ٹھہریے، دیکھیں وہ واپس آ کر کیا پوچھتی ہے؟ صاحبو! دلّی کا ذکر یہاں دو وجوہات کی بنا پر آیا ہے ایک تو یوں کہ میں خاصا بدنام دلّی والا ہوں اور دوسرے یوں کہ میں جس زمانے کی بات کر رہا ہوں اس زمانے میں دلّی ہی زبان کا سب سے بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ لکھنؤ، حیدر آباد، بھوپال یا لاہور جیسے اُردو کے بڑے مرکز بعد کے دنوں میں اپنے اپنے مرتبے کو پہنچے ہیں۔ چناں چہ اب ان جگہوں کے لوگ بھی میر کی طرح "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" کہنے کا حق رکھتے ہیں۔ البتہ یہ بحث جاری رہے گی کہ کہاں کی زبان کہاں سے بہتر ہے اور کون سا محاورہ اُردو کا اصل محاورہ ہے۔ داغ کا یہ دعویٰ آج بھی چند دلّی والوں کی زبان پر آ ہی جاتا ہے:

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

زبان کے معاملے میں دلّی کی تاریخ کا یہ پہلو بہت روشن ہے کہ یہاں والوں نے روزمرّہ اور عوام

اے ۔ ۸۶۸، سیکٹر ۲۶، نوئیڈا (یو پی)

کی گفتگو کو سند کا درجہ دیا۔ بول چال میں روانی اور گھلاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ دلی کے نثرنگاروں کی طرح دلی کے شاعروں نے بھی سادگی، صفائی اور محاورے پر بہت زور دیا ہے۔ انھوں نے اپنے زمانے میں بولے جانے والے ہندی الفاظ کو جوں کا توں استعمال کیا ہے۔ بول چال کے بے شمار الفاظ جو ادب میں حقیر اور گرے پڑے سمجھے جاتے تھے، دلی والوں کی شاعری میں بڑی شان سے جلوہ افروز ہوئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ادب اور شاعری کو عوام سے قریب لانے کے لیے زبان کو سادہ اور آسان بنانا ضروری ہے۔ ایسی صورت میں خیال اور مطلب کی ادائیگی میں پیچیدگی سے بچنے کے لیے بول چال کی زبان، روزمرۃ اور محاورے کا استعمال کرنے کے علاوہ کوئی اور طریقہ مناسب نہیں ہے۔

محاورات وہ ننھی ننھی تصویریں ہوتی ہیں جو کسی سماج کے تجربات، تصورات اور احساسات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ عوام کے لیے ان میں وہی مبالغہ، مصوری اور اشاریت ہوتی ہے جو تربیت یافتہ ذہنوں کے لیے حسین و جمیل تشبیہوں اور معنی خیز ترکیبوں میں نظر آتی ہیں۔ زبان کی خوبی اس کی سلاست، عام فہمی، نرمی، موزونی، چھوٹے چھوٹے الفاظ اور بڑے بڑے مطالب پر موقوف ہوتی ہے۔ عام لوگوں کی زبان کو کم تر اور حقیر سمجھنا زبان کے زوال اور غیر مقبولیت کا سبب بنتا ہے۔ ہر اچھے شاعر کے یہاں مجموعی اعتبار سے وہ زبان اور لب و لہجہ ملتا ہے جو بنیادی طور پر اردو بولنے والوں کی قدرتی زبان اور لب و لہجہ ہونا چاہیے۔ چناں چہ اردو کے قدیم شعرا کے بعض اشعار یہاں مثال کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں:

عشق کرتے ہیں ان حسینوں سے
میر صاحب بھی کیا دوانے ہیں
—— میر

پگڑی اپنی سنبھالیے گا میر
اور بستی نہیں یہ دلی ہے
—— میر

دیکھنا غالب سے گر الجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا
—— غالب

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
—— مومن

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی
—— شیفتہ

لائی حیات، آئے، قضا لے چلی، چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے
—— ذوق

اس زلف پہ پھبتی شبِ دیجور کی سوجھی
اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی
—— جرأت

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے
—— عزیز لکھنوی

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جب اس نے مرے ہاتھ پاؤں داب تو دے
—— غالب

ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں
ہم سے زمانہ خود ہے زمانے سے ہم نہیں
—— جگر

سب کو مارا جگر کے شعروں نے
اور جگر کو شراب نے مارا
—— جگر

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے
—— میر

اردو میں داغ کی شاعری اس حیثیت سے بہت مشہور ہے کہ ان کے ہاں زبان کا وہ لب و لہجہ ملتا ہے جو اردو بولنے والوں کا قدرتی لب و لہجہ ہے۔ داغ کے بے شمار اشعار اور مصرعے ایسے ہیں جن میں بول چال کی زبان بالکل اسی ترتیب الفاظ کے ساتھ ملتی ہے جیسا کہ ہم اور آپ بولتے ہیں یا اس زمانے کی دہلی میں لوگ بولتے تھے اسی لیے ان کے بہت سے شعر اور مصرعے ضرب المثل بن گئے ہیں یعنی کہاوت کے طور پر بولے جاتے ہیں۔ آئیے ان میں سے چند شعر پڑھیں اور لطف اٹھائیں۔

جب جوانی کا مزا جاتا رہا
زندگانی کا مزا جاتا رہا

کوئی نام و نشاں پوچھے تو اے قاصد بتا دینا
تخلص داغ ہے اور عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں

بات کرنی بھی نہ آتی تھی تمھیں
یہ ہمارے سامنے کی بات ہے

آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا بھی نہیں
آپ کے ملنے کا ہوگا جسے ارماں ہوگا

جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

محاوروں کی طرح کہاوتیں انسانی سماج کے صدیوں پُرانے تجربوں اور مشاہدوں کی تصویریں ہوتی ہیں۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، آنکھ کے اندھے نام نین سُکھ، گھی بنا دے سالن بڑی بہو کا نام، ساجھے کی ہنڈیا چوراہے پر پھوٹے گی، دلی کی بیٹی متھرا کی گائے، کرم پھوٹیں تو باہر جائے، کرم ہین کھیتی کرے بیل مریں یا سوکھا پڑے، اندھیر نگری چوپٹ راجا ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجا، ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے، سو سنار کی تو ایک لوہار کی، باپ نہ مارے پدڑی بیٹا تیرانداز، روپ کی روئے بھاگ کی کھائے، بولے سو پائے ورنہ رہیے چُپ، جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔ نیم حکیم خطرۂ جان نیم مُلا خطرۂ ایمان، سر سے سر راہ جب بیل پھوٹ تو رائی رائی ہوگئی۔ جسے نہ دے مولیٰ اسے دے آصف الدولہ، دلی میں رہے اور بھاڑ جھونکا، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، پڑھے لکھے کو فارسی کیا، بغل میں چھری اور منہ میں رام رام، جس نے کی شرم اُس کے پھوٹے کرم، دیس چوری پردیس بھیک۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایسی سینکڑوں کہاوتیں ہیں جو زبان کا ایسا حصہ ہیں جنھیں الگ نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نے یہ بھی ملاحظہ کیا ہوگا کہ ان کی زبان اپنے اپنے دور کے اعتبار سے اس عہد کی نمائندہ زبان ہے۔ اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت، جاکو پربھو دکھ دیں وا کی مت پہلے ہر لیں۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگہا۔ جس کی کبھی نہ پھوٹی بوائی وہ کیا جانے پیڑ پرائی، یقیناً اُس زمانے کی کہاوتیں ہیں جب اُردو زبان اپنے گرد و پیش کی بولیوں کا اثر قبول کر رہی تھی اور فارسی یا عربی سے اس کا واسطہ برائے نام تھا لیکن حصہ بقدر جثہ، اصفہان نصف جہان، خدا رکھے بیگم کا پائنچہ بھاری ہے، دلی کی دل والی منہ چکنا پیٹ خالی۔ سلطنت شاہ عالم از دلی تا پالم، اکبر شاہ ثانی، چولہے آگ نہ گھڑے پانی، یا مسلماں اللہ اللہ یا برہمن رام رام وغیرہ جیسی کہاوتیں ہماری تہذیب کے اس دور کی یاد دلاتی ہیں جب بقول ڈاکٹر تارا چند ہندوستان کا دار الخلافہ دہلی سرزمینِ ایران کا ایک خطہ دکھائی دیتا تھا۔

اکثر کہاوتوں کے پیچھے دلچسپ کہانیاں ہیں جن کو سن کر ان کہاوتوں کے پیدا ہونے کا سبب اور دہرائے جانے کی وجہ سمجھ میں آتی ہے لیکن یہاں کہانیاں سنانے کا موقع اور وقت نہیں ہے اس لیے اپنی گفتگو یہیں ختم کرتا ہوں۔ پھر کبھی ملاقات ہوگی تو کہاوتوں کی کہانیاں بھی سنا دی جائیں گی۔ عقل مند کو اشارہ کافی ہے۔

ل ٹھکر

انگارے کی قسمت

انسان کو پیدا ہونے کے لیے عورت
کی کوکھ کی ضرورت پڑتی ہے، جبکہ شیطان کو
پیدا ہونے کے لیے عورت کی کوکھ کی نہیں انسان
کے ذہن کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ ایسے ذہن
کی تلاش میں مارا مارا پھرتا تھا ——
موجودہ حال میں اسے اس تلاش میں بھٹکنا
نہیں پڑتا۔ جس طرح کال پڑنے پر گیدڑ کو
خوراک کی تلاش میں بھٹکنا نہیں پڑتا۔ آبادی
کے اطراف مُردہ مویشیوں کے ڈھانچے بکھرے
پڑے مل جاتے ہیں۔

اس نے سوچا ——
کیا سچ مچ قحط پڑا ہے؟
انسانیت کا!!
اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا ——
اس کی آنکھیں سامنے بیٹھے ہوئے
مسافر کے سوٹ کیس پر لٹکتے ہوئے لیبل
پر اٹک گئیں۔
ایک خیال آیا اُسے ——
اور وہ خیال —— جنم دے
گیا ——
ایک شیطان کو۔
اس نے نظریں اُٹھا کر اس مسافر
کو دیکھا۔ وہ اپنی عمر سے کافی چھوٹا نظر آرہا
تھا۔ اس نے سوٹ کیس کے لیبل پر پھر
سے نظریں جمادیں۔
انسان پیدا ہوتے ہی روتا ہے۔

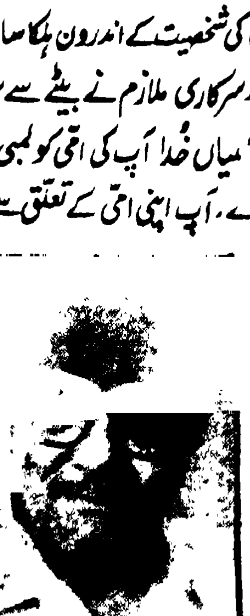
شیطان پیدا ہوتے ہی چپ اختیار کرلیتا
ہے، کینسر کی طرح۔ اور جب وہ اپنے وجود
کا اعلان کرتا ہے، تب کافی دیر ہوچکی ہوتی
ہے۔

سوٹ کیس کے لیبل کو دیکھتے ہوئے
اُس نے سوچنا شروع کیا "—— اس
شخص کو موت کے گھاٹ کیسے اُتارا جائے۔
گلا گھونٹ کر —— نہیں۔ یہ ڈھنگ ——
نہیں، نہیں۔ یہ تو عام بات ہوگی۔ کوئی
سنسنی خیز —— کوئی نیا ظالمانہ انداز۔ سُننے
والے کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں۔ اور میرے
جسم کے مسامات سے خوشیوں کی کونپلیں
پھوٹ نکلیں۔"

مہالکشمی ایکسپریس اپنی پوری رفتار
کے ساتھ چلی جارہی تھی۔ ہُبلی چھوڑے
ہوئے ٹرین کو تقریباً ایک گھنٹہ ہوچکا تھا۔
دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد مسافروں پر
غنودگی چھارہی تھی۔ سوٹ کیس والا مسافر
اخبار پڑھ رہا تھا اور وہ خیالوں کے
تانے بانے بُن رہا تھا —— "مجھے تیار
رہنا چاہیے۔ یہ کسی بھی وقت TOILET
کی طرف جائے گا —— جیسے ہی وہ
TOILET کے باہر آنے کے لیے دروازہ
کھولے، چاقو اس کے پیٹ میں اُتر جانا
چاہیے —— اور پھر چلتی ٹرین سے
لاش کو ——"

سوٹ کیس والے مسافر نے اخبار ایک
طرف رکھا۔ جماہی لی، چہرے سے عینک
اُتاری، اسے صاف کیا اور عینک پہنتے ہوئے
TOILET کی طرف جانے لگا۔ وہ جھٹ سے
کھڑا ہوگیا۔ پھُرتی سے اس کے ہاتھ جیب
کی طرف بڑھے —— اس نے مایوس ہوکر
زور سے سانس چھوڑی اور بیٹھ گیا ——
"انسان کو ہر وقت چاقو اپنے پاس رکھنا
چاہیے۔ نہ جانے کب ضرورت پڑ جائے۔ خیر
چاقو نہیں ہے تو کیا ہوا۔ چاقو کے بغیر بھی تو
کسی کی جان لی جاسکتی ہے۔"

یوں تو وہ صبح کی گول گنبد ایکسپریس
سے سفر کرنے والا تھا۔ کل شام دفتر سے
لوٹنے کے بعد اس نے چائے کا کپ ابھی
ہونٹوں کو لگایا نہیں تھا کہ ماں کے سیریس
ہونے کا تار ملا۔ خبر پڑھتے ہی شہر کے کتنے
ہی مشہور و معروف ڈاکٹروں کے سُنے سُنائے
نام ذہن کی سطح پر تیرنے لگے۔ اُسی وقت
اس کی شخصیت کے اندرون ہلکا سا ارتعاش
ہوا۔ سرکاری ملازم نے بیٹے سے سرگوشی
کی "میاں خُدا آپ کی امّی کو لمبی عمر عطا
کرے۔ آپ اپنی امّی کے تعلق سے جو سوچ



۳۸، آدرش نگر، ہبلی ۵۸۰۰۳۲

رہے ہیں وہ درست ہے۔ مگر ___ حضرت یہ مہینے کا آخری ہفتہ ہے۔ آج صبح ہی آپ اپنے بچوں کی امّی سے غصّے میں آکر کہا ہے۔ ڈالڈا نہیں ہے تو تیل سے کام چلالو۔ پہلی کے بعد دیکھیں گے۔" سرکاری ملازم کی حقیقت بیانی سے بیٹا پریشان تو ہوا۔ مگر اس نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ حالات کا سامنا کرنے کو کمر کس لی اور اپنے دفتر کے چپراسی خیرات علی کے گھر جا پہنچا۔ خیرات علی دفتر میں سرکاری کام سے زیادہ اپنے کاروبار کا کام کرتا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ پنجرے کی طرف رُخ نہ کرنے والا چوہا آج خود پنجرے کی طرف بڑھا چلا آرہا ہے تو اس کی باچھیں کھِل گئیں۔ اس نے گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ بچّے کو چائے لانے کے لیے کہا اور بڑی مٹھاس سے بولا "وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے ___ کہیے، جناب۔ آج اس غریب کو کیسے یاد کرلیا!!"

اس نے جیب سے تار نکال کر خیرات علی کے سامنے رکھ دیا۔ خیرات علی نے تار کو چھوا تک نہیں، صرف ایک نظر دیکھا۔" کوئی بیمار ہے؟"

"ہاں ___ ماں سیریس ہے۔"

"کتنے چاہئیں؟"

"پندرہ سو۔"

اِتنے میں چائے آگئی۔ اس نے چائے پی، تب تک خیرات علی نے اسٹامپ پیپر نکال کر اس پر کچھ لکھا۔ اس کے دستخط لیے اور تیرہ سو پچاس روپے اس کے ہاتھ میں رکھتے ہوئے بولا "ایک سو پچاس [illegible] تیرہ سو پچاس۔ گن لو۔"

اس نے مُنہ بنایا جیسے ذائقہ بگڑ گیا ہو۔ کیوں کر سوٹ کیس والا مسافر TOILET سے لوٹ کر اپنے برتھ پر لیٹ گیا تھا۔" یہ کیا!! بکرے نے خود گردن چھری پر رکھ دی! مرنے سے پہلے بکرا ممیائے نہیں تو پھر اسے ذبح کرنے کا لُطف ہی کیا۔" وہ جھنجھلا کر اُٹھا۔ TOILET کے پاس جاکر اس نے سوچا۔ "نہیں۔ جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔" اس نے TOILET کا دروازہ کھول کر اندر دیکھا۔ دروازے کے سامنے ہی واش بیسن تھا۔ اس کے اُوپر آئینہ لگا ہوا تھا۔ دائیں طرف اُوپر سے آیا ہوا پائپ نیچے TOILET کی اسٹین لیس اسٹیل کی سیٹ سے جُڑا ہوا تھا ___ "ہاں۔ یہ جگہ اچھی ہے۔ سیٹ کا سُوراخ ___ نہیں، اس کا سر اس سُوراخ سے بڑا ہے۔" اس نے جھٹ سے TOILET کا دروازہ بند کیا اور اِدھر اُدھر نظریں گھما کر ڈبّے کے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔ دروازہ کھولا، تیز ہوا نے اس اس کے بال بکھیر دیے۔ اس نے دروازے کے باہر کی دونوں سلاخوں کو پکڑا اور دھیرے سے دروازے میں بیٹھ گیا۔

کھڑے کھڑے ہی اس نے چائے پی کر خالی کپ بیوی کو لوٹایا۔ سود پر لاتے روپے جیب میں رکھے، سوٹ کیس اٹھایا اور گھر سے باہر نکل کر سونی گلی میں داخل ہوا جیسے کوئی فوجی فرض کے ہتھیاروں سے لیس وطن کے لیے لڑنے جارہا ہو۔

تنگ گلی میں اسے کہرے کا احساس نہیں ہوا مگر جب بڑی سڑک پر آیا تو اس نے دیکھا شبنم میں نہائی سڑک زمین سے چپکی اپنے جسم کے اُبھار کے ساتھ ذرا ذرا سی چمک رہی تھی۔ وہ رُکا۔ کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ اس نے اپنے دائیں بائیں دیکھا، کوئی آٹو رکشا نظر آیا۔ تو اس نے پھیلی ہوئی دھند میں پیدل ہی اسٹیشن جانے کا تہیّہ کرلیا اور تیز قدموں سے آگے بڑھا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد اوس سے بھیگی پلکوں سے اس نے دیکھا کہ ایک کتّا اور اس کا مالک کُہر آلود جھالر سے چھن کر اس کی سمت چلے آرہے ہیں۔ کُتّا یہاں وہاں زمین کو سونگھتا ہوا آگے آگے چل رہا تھا۔ اور اس کا مالک ہاتھ میں چھڑی لیے اطمینان سے چلا آرہا تھا۔ کُتّا ایک بہ یک ٹیلیفون کے کھمبے کے پاس رکا، کچھ سونگھتے ہوئے پیچھے کی ٹانگ اُٹھائی تب تک کُتّے کا مالک اس کے اِتنا قریب آگیا کہ وہ اسے ٹھیک سے دیکھ سکے۔ اس نے دیکھا کہ وہ تو شہر کا مشہور ڈاکٹر پربھو تھا۔ اس نے سُنا تھا کہ پربھو کے پاس مریض کو لے جانا ہے تو پندرہ روز پہلے وقت لینا پڑتا ہے۔ اس کے دل میں آیا کہ ابھی وہ اکیلا ہے کیوں نہ اِسی وقت اسے اپنی ماں کے سیریس ہونے کی خبر سُنائی جائے۔ اس نے جیب سے تار نکالا ___ "وہ پوچھے گا، تمھاری ماں کو کیا ہوا ہے۔ تو میں کیا جواب دوں گا!!" اس نے سوچا ___ اتنے میں کُتّا بڑی تیزی سے اس کے قریب سے گزر گیا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ ڈاکٹر پربھو آگے نکل چکا تھا

س نے تار جیب میں رکھا اور اسٹیشن کی جانب دم بڑھاتے۔ راستے میں اسے خالی آٹو رکشا ل گیا۔ اس نے اسے کرائے پر لے لیا۔ وہ بہت ی اُداس تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ اچانک کیا ہوا ہوگا امّی کو ؟ عُمر تو ہو چکی ہے مگر پھر بھی ہمت کافی اچھی ہے۔ آج تک عینک کی ضرورت نہیں اٹھیں۔ دانت بھی سلامت ہیں۔ اپنا سب کام خود کر لیتی ہیں۔ پھر یہ ـــ کہیں یسا تو نہیں نا ـــ عام طور پر کسی کی چانک موت ہونے پر اس کی اولاد کو سیریس ہونے کی خبر دے کر بُلوایا جاتا ہے ـــ و کیا امّی ؟ ؟ ـــ اس خیال ہی سے وہ کانپ سا گیا۔ اس نے ایسے خیالوں سے چھٹکارا پانے کے لیے جیب سے سگریٹ نکال کر جلایا۔ اسٹیشن کے قریب پہنچ کر اس نے دیکھا کہ ایسی سردی میں بھی کچھ چائے سگریٹ کی دوکانیں کھُل گئی تھیں۔ اس نے آٹو والے کو رُکنے کے لیے کہا "میں سگریٹ لے کر آتا ہوں" کہتے ہوئے وہ دُکان کی جانب بڑھا۔ پورے دن کے سفر کو سامنے رکھتے ہوئے تین ڈبیاں سگریٹ اور ماچس خریدنے کے لیے جیب سے پیسے نکالتے ہوئے اس نے دیکھا کہ اس کا آٹو رکشا تیزی سے چلا جارہا تھا۔ وہ چلاتے ہوئے اس کے پیچھے بھاگا مگر کچھ ہی فاصلے تک دوڑ کر اسے یقین ہوگیا کہ وہ اور پیچھا نہیں کر سکتا۔ وہ رُک کر آٹو رکشا آنکھوں سے اوجھل ہونے سے پہلے اس کا نمبر اپنی ہتھیلی پر لکھنے لگا۔ اتنے میں سامنے سے ایک اور آٹو رکشا آیا۔ اس نے اسے روکا اور اس میں سوار ہوتے ہوئے بھاگتے ہوئے آٹو کا پیچھا کرنے کے لیے کہا۔

ایک گھنٹے کی تلاش اور بھاگ دوڑ کے بعد بھی جب نتیجہ کچھ نہیں نکلا تو اسے یاد آیا کہ جس آٹو رکشا میں وہ گھوم رہا ہے اس کے پہیوں کے ساتھ ساتھ اس کا میٹر بھی گھوم رہا ہے۔ تو اس نے رکشا والے کو گھر کی طرف چلنے کو کہا

گاؤں کے باہر دھوبی گھاٹ والے راستے سے آٹو رکشا گھر کی طرف جارہا تھا کہ اس کی نظر سڑک کے کنارے ٹھہرے ہوئے رکشا پر پڑی اور وہ چلّایا "یہی ہے ـــ وہ یہی رکشا ہے" وہ جلدی سے اُس رکشا کے پاس گیا کہ وہ رکشا والے کی گردن دبوچ لے گا مگر اس رکشا میں نہ تو رکشا چلانے والا تھا اور نہ ہی اس کا سوٹ کیس۔ خالی رکشا دیکھ کر وہ مایوس ہوا۔ اتنے میں جس رکشا میں وہ آیا تھا اس کا ڈرائیور بولا "آپ پریشان نہ ہوں۔ وہ یہیں کہیں اپنے گھر سوٹ کیس رکھنے گیا ہوگا۔ وہ ابھی آئے گا" اس نے سوچا یہاں انتظار کرنے سے تو آٹو رکشا گھر لے جانا ہی بہتر ہے۔ جو بھی اس کا مالک ہوگا آئے گا ڈھونڈتا ہوا۔ اس نے دوسرے رکشا کا کرایہ ادا کرکے اسے بھیج دیا اور خود جا بیٹھا ڈرائیور کی سیٹ پر رکشا چلانے۔

آٹو رکشا چلاتے ہوئے جب اسے اپنی ماں کا خیال آیا تو وہ اُلجھن میں پڑ گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ آٹو رکشا گھر لے جائے یا یہیں چھوڑ دے۔ پھر اس نے سوچا اب ٹرین تو ویسے بھی چلی گئی ہوگی۔ پھر دوپہر تک دوسری ٹرین ہے نہیں۔ دوپہر تک دیکھ لیتے ہیں۔ سوٹ کیس واپس مل گیا تو اچھا ہے ورنہ ـــ وہ ایک دم گڑبڑا گیا۔ اس نے زور سے بریک دبائی اسٹیئرنگ ایک طرف موڑ کر بڑی مشکل سے راستے کے کنارے گڑھے پر آ کر آٹو رکشا کو روکا۔ اس نے غصّے سے اس موٹر سائیکل والے کی طرف دیکھا جس نے تیزی سے لاکر اپنی موٹر سائیکل اس کے سامنے کھڑی کر دی تھی۔ مگر اس کی غصّے سے سُرخ آنکھیں ڈر سے سفید پڑ گئیں جب اس نے دیکھا ایک حوالدار کے ساتھ موٹر سائیکل پر سوار پولیس انسپکٹر اسے اشارے سے اپنے پاس آنے کو کہہ رہا ہے۔

ٹرین کے دروازے میں بیٹھے بیٹھے اس نے اپنے پانو کے پاس نیچے پتھروں کو جس تیزی سے پیچھے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا اتنی ہی تیزی سے اس کے چہرے پر وحشیانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ آنکھوں میں برق سی لہرا گئی۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا ـــ "ہاں یہی ٹھیک رہے گا۔ ہر ایسے شخص کی موت ایسی ہی ہونی چاہیے۔ معاشرے کو اخلاقِ عالیہ کی تربیت خوف پیدا کرکے ہی دی جا سکتی ہے۔ اور آج کے دَور میں یہ طریقہ میں شروع کروں گا ـــ" دل ہی دل میں تہیہ کرکے وہ اپنے ارادے کو ترتیب وار سوچنے لگا ـــ ایسے ہی۔ یہیں بیٹھ کر ـــ اس کا جسم اپنی رانوں پر رکھ کر اس کا سر والا حصّہ دھیرے دھیرے نیچے کی طرف سرکاتا جاؤں گا۔ جب اس کا سر نیچے پیچھے کی طرف بھاگتے پتھروں کو چھوئے گا تو اس کی کھوپڑی تڑخنے گی ـــ

اس کا جسم اُوپر کی طرف اُچھلے گا وہ زوروں سے چیخے گا۔ میں پھر آہستہ آہستہ اس کا سر پتھروں کے قریب لے جاؤں گا' وہ روئے گا' گڑگڑائے گا' چیخے گا ــــ مگر نہیں میں رحم نہیں کروں گا۔ میں اس کے سر کو پتھروں سے ٹکرانے دوں گا۔ اب کی بار اس کی کھوپڑی کا آدھا حصہ ناریل کی طرح پھٹ کر الگ ہو جائے گا۔ بھیجا باہر نکل آئے گا۔ خون کا فوارہ اُڑے گا ـــ یہ سب سوچتے ہوئے اس نے ہونٹوں کو چاٹا جیسے اس کا چہرہ خون سے رنگا ہوا ہو۔

انسپکٹر نے ایک گھونسا اس کے منہ پر رسید کیا۔ وہ چیخ اُٹھا" میں نے رکشا نہیں چرایا" انسپکٹر نے اسے لات مارتے ہوئے کہا" حرام زادے' میں بھی دیکھتا ہوں' کب تک سچ نہیں بولتا۔" وہ ایک اور لات مارنے کو تھا کہ حولدار نے آکر اسے سلام کیا اور آگے بڑھ کر انسپکٹر کے کان میں کچھ کہا۔

" اسے اندر بند کردو" یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں آیا۔ آٹو کا مالک نہایت ادب سے سامنے کھڑا تھا۔ رات ڈھائی بجے گشت کے بعد انسپکٹر وہسکی پی کر عالمِ سُرور میں سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ آٹو کا مالک آگیا تھا اپنے آٹو کی چوری کی شکایت درج کروانے۔" ہم نے تمہارا رکشا ڈھونڈ نکالا ہے" انسپکٹر نے رکشا کے مالک کو دیکھتے ہی کہا۔

" بڑی مہربانی کی ہے آپ نے۔"

اندر ہے وہ' دیکھ لو۔ یہ وہی ہے جو کل رات تمہیں کالونی کی طرف لے جاکر' رکشا لے کر فرار ہو گیا تھا؟"

کچھ ہی دیر میں آٹو کا مالک اندر کے کمرے سے پلٹ آیا' اور بولا" نہیں یہ وہ آدمی نہیں ہے سرکار"۔ انسپکٹر نے لمحہ بھر سوچا' پھر بولا" ٹھیک ہے۔ تم باہر بیٹھو"۔

اس نے ابھی گھونسوں اور لاتوں کے درد سے نجات حاصل بھی نہیں کی تھی کہ حولدار نے آکر اسے سمجھانا شروع کر دیا کہ وہ اپنا گناہ قبول کرلے۔ کیوں کہ یہ انسپکٹر بڑا ظالم ہے۔ وہ مار مار کر اس کا حلیہ بگاڑ دے گا۔ بار ہا سمجھانے کے بعد بھی جب وہ ایک ہی جواب دیتا رہا کہ اس نے رکشا نہیں چرایا تو حولدار نے درد بھرے لہجے میں کہا" اگر ایسا ہے تو تمہیں بچانے کا کچھ راستا تو نکالنا ہی ہوگا۔"

حولدار کی بات سن کر اسے محسوس ہوا جیسے کوئی فرشتہ حولدار کے روپ میں اس کے لیے آسمان سے اُترا ہے۔ اب وہ یقیناً دوپہر کی ٹرین سے اپنی امّی کے پاس جا سکتا ہے۔ اس نے اپنی ساری پریشانیوں کا چٹھا حولدار کے سامنے رکھ دیا۔ حولدار بڑے ہمدردانہ لہجے میں اس کے درد کو سہلاتا رہا۔

" تم کرتے کیا ہو؟" حولدار نے پوچھا۔

" سرکاری ملازم ہوں بھائی۔"

" تو تو بیڑا غرق ہی سمجھو۔"

" کیوں؟" اس نے ڈر کر سوال کیا۔

حولدار نے سمجھاتے ہوئے کہا" چوری کے الزام میں اس پر مقدمہ ہوگا۔ پولس نے رنگے ہاتھوں' چوری کے مال کے ساتھ اسے پکڑا ہے۔ اس لیے اسے سزا ہوگی۔ اور سرکاری ملازم کو چوری کے الزام میں سزا ایک دن کی ہو یا ایک سال کی' اس کی نوکری گئی سمجھو۔"

یہ سُن کر وہ پریشان ہو گیا۔ اس کا دل بیٹھ گیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اس نے اپنے فرشتے سے گڑگڑا کر کہا کہ وہ اسے کسی طرح بھی اس مصیبت سے بچالے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ماں سخت بیمار ہے۔۔۔۔۔۔

حولدار نے دھیمی آواز میں اس کے کان میں نجات حاصل کرنے کا نسخہ بتایا۔ نسخ
سنتے ہی وہ جھٹ سے پوچھ بیٹھا۔" کتنا؟"
" یہی کوئی ــــ ڈھائی تین ہزار" حولد
نے یوں کہا جیسے ڈھائی' تین روپے کی بات
کر رہا ہو۔ اس کے کافی دیر تک رونے دھو
اور گڑگڑانے کے بعد فرشتے نے ایک ہزا
روپے یہ کہتے ہوئے جیب میں رکھ لیے کہ و
کوشش کرکے دیکھتا ہے ــــ کچھ ہی دیر ب
فرشتے کی کوشش کامیاب ہوئی۔ وہ باعز
بَری ہو کر اسی آٹو میں اسٹیشن کو روا
کر دیا گیا' جس کی بدولت اسے حراس
میں لیا گیا تھا۔ آٹو میں بیٹھے بیٹھے اس۔
بچے ہوئے روپیوں کو حسرت سے دیکھتے ہ
دل کو دلاسا دیا ــــ نوکری بچی لاکھ
پائے۔ جو ہونا تھا ہوا۔ قرض دینے
لیے خیرات علی تو ہے ہی اور قرض اُتار
کو اللہ میاں کی دی ہوئی زندگی۔ وہ ا
اپنے دل کو ٹھیک سے بہلا بھی نہیں پایا
کہ آٹو والے کے کھولتے خون نے بڑبڑا
کر دیا ــــ" رکشا میرا چوری ہوا۔ ر
بھر میں بدحواس مارا مارا پھرتا رہا
مجھے ہی میرا رکشا واپس لینے کے لی
سو روپے رشوت دینی پڑی۔ کیا زمانہ آ

[redacted]

اس نے روز سے تھوکا، جیسے زمانے کے منہ پر تھوک دیا ہو۔!

"مگر تم نے رشوت دی کیوں؟ تم تو چور نہیں تھے۔!"

"نہ دیتا تو کیا کرتا۔ نہ دیتا تو وہ چھوٹا موٹا ہی سہی، آپ پر نہ سہی کسی اور پر الزام دھر کر دعویٰ تو ٹھوک ہی دیتے اور کیس چلنے تک رکشا تھانے کے کمپاؤنڈ میں سڑتا۔ کیس کا فیصلہ ہونے تک تیس ہزار کا مال تین سو کا بھی نہ رہتا۔ حرام زادے، اندر کا سب سامان، انجن، یہ، وہ سب نکال نکال کر بیچ کھاتے۔"

اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ سوٹ کیس والے مسافر کے قتل کی کارروائی کو وہ ترتیب دار طے کر چکا تھا۔ مطلوبہ کارروائی پر عمل کرنے کے لیے وہ اُٹھا تو اس نے محسوس کیا کہ ٹرین کی رفتار دھیمی ہو رہی ہے۔ اس نے دیکھا کوئی اسٹیشن آ رہا تھا۔ اسٹیشن کے گزرنے تک اس نے اسے اپنی سیٹ پر بیٹھنا مناسب سمجھا۔ وہ اپنی سیٹ کے پاس گیا تو حیران رہ گیا۔ مسافر اپنا سوٹ کیس اُٹھا کر آنے والے اسٹیشن پر اُترنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ سوٹ کیس پر وہی لیبل اب بھی لٹک رہا تھا۔ اس نے اسے پڑھا، جیسے مرنے سے پہلے کوئی کلمہ پڑھ رہا ہو۔ اس پر لکھا تھا — ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر رام نرائن شرما۔

ٹرین رُکی — مسافر سوٹ کیس لے کر اسٹیشن پر اُتر گیا۔

غزلیں

نشتر خانقاہی

خون کی شب زندہ داری، فیصلہ کہلائے گی
اب نمازِ صبح گاہی بھی قضا کہلائے گی

ہاتھ میں پتھر کے ہے، اس پھول سی مورت کا ہاتھ
کم سے کم گھر میں تو وہ شادی شدہ کہلائے گی

شق کبھی پردہ جو ہوگا، جان لیوا حبس کا
دوپہر میں لُو چلے گی تو صبا کہلائے گی

جب صدا دے گی نہ مجھ کو وسعتِ گرد و نواح
خود نگہداری مری، زنجیرِ پا کہلائے گی

پی چکی خونِ شہیداں، راکھ اب سرسبز ہو
حشر تک لیکن یہ دھرتی کربلا کہلائے گی

منحصر ہے ارثِ موقوفہ پہ شیخِ بے ہنر
کل یہ نسلِ خود نگر بے دست و پا کہلائے گی

گر بدل پایا نہ اب بھی عہدِ عیّاری مجھے
یہ مری سادہ مزاجی بھی خطا کہلائے گی

آخری گاڑی گزرنے کی صدا بھی آگئی
سو رہو، بے خواب آنکھو! رات آدھی آگئی

زندگی سے سیکھ لیں ہم نے بھی دُنیا داریاں
رفتہ رفتہ اس میں بھی موقع پرستی آگئی

سادہ لوحی دین جو قصبے کی تھی، رخصت ہوئی
شہر آنا تھا کہ اس میں ہوشیاری آگئی

ہم ملے تھے جانے کیا آفت زدہ روحیں لیے
گفتگو اوروں کی تھی، آپس میں تلخی آگئی

اپنے ہی گانو کی سرحد پر پہنچ کر آج ہم
پوچھتے ہیں ہم سفر! یہ کون بستی آگئی

اب نہ ذوقِ رہ نوردی ہے نہ لطفِ ماندگی
ایسا لگتا ہے کہ منزل پر سواری آگئی

ترک کیوں کرتے نہیں ہو کاروبارِ آرزو
خانقاہی اب تو بالوں میں سفیدی آگئی

حسین الحق

سپنوں کے دیس میں آدم کی تلاش

اختر اورینوی کے فن کی ایک گمشدہ جہت

اُردو افسانہ بنیادی طور پر فنِ قصّہ کی ایک شاخ ہے اور اگر یہ کہا جائے تو شاید زیادہ صحیح ہوگا کہ اُردو قصوں کی ایک مخصوص شکل ہی کا نام اُردو افسانہ ہے اور تمام قصص و حکایات، داستانوں اور افسانوں میں قصّے کا بنیادی عنصر مماثلت اور اشتراک کی گنجائش پیدا کرتا ہے اور اسی بنیادی عنصر کے حوالے سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اُردو قصّے کی وہ مخصوص شکل جو ایک مخصوص تکنیک اور ہیئت کے ساتھ پریم چند کے یہاں ملتی ہے اور جس کی پیروی میں کرشن چندر وغیرہ نے اپنا سفر آگے جاری رکھا اسے تو ہم دیارِ مغرب کی دین کہہ سکتے ہیں۔ لیکن پریم چند کے دیگر معاصرین مثلاً سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری وغیرہ جو قصّے لکھ رہے تھے وہ اپنی ہیئت اور مزاج کے لحاظ سے دیارِ مغرب کی دین نہ ہو کر اُردو کی قدیم داستانوں اور تلمیحی و تمثیلی قصص و حکایات کے واسطے سے اپنی شناخت کراتے نظر آتے ہیں، یہی سلسلہ آگے بڑھ کر نہ صرف یہ کہ جدید افسانہ نگاروں بلکہ خود ترقی پسند عہد کے ممتاز افسانہ نگار کرشن چندر (چھتری، غالیچہ، مردہ سمندر، آدھے گھنٹے کا خدا) اور کرشن چندر سے سال دو سال پہلے لکھنا شروع کرنے والے افسانہ نگار اختر اورینوی تک پہنچتا نظر آتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ابتدا ہی سے اُردو قصّے کی دوہری رو متوازی چل رہی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ جس طرح کوئی ندی کہیں کہیں زیرِ زمین بہتی ہے اور پھر کچھ دور جا کر سطحِ زمین پہ نمایاں ہوتی ہے اسی طرح بہت دنوں تک اُردو افسانے کی یہ دوہری رو، جو دیارِ مغرب کے بجائے اپنے قدیم داستانوی اور حکایاتی سرمائے سے قوت و اثر لے رہی تھی، ترقی پسندی کے عہدِ شباب میں "حلقۂ اربابِ ذوق" تک محدود رہی اور اس کے عہدِ پیری (یا عہدِ زوال) میں اپنی پوری قوت اور تازگی کے ساتھ سامنے آئی، نتیجتاً اس عہد میں بزرگ افسانہ نگار اختر اورینوی کو بھی "ایک درخت کا قتل" جیسے افسانے کی صورت میں اپنے تمثیلی اور استعاراتی رویّے کا اظہار کرنا پڑا۔

یہ دوسری رو تلاشِ ذات، مشاہدہ و مطالعۂ داخل اور اسمِ ذات کے اسمِ اعظم ہونے کے احساس کی رو تھی۔

لہٰذا اس مخصوص اندازِ فکر کے افسانہ نگاروں نے نہ صرف اپنے ادب بلکہ مغرب کے ادبیات سے بھی جب لاشعوری طور پر خوشہ چینی کی کوشش کی تو وہاں بھی وہ ہر اُس موڑ پر ٹھہرے اور ٹھٹھکے جہاں سارتر، کرکے گارڈ، مارشل پروست، فرائڈ، یونگ، کامیو، رلکے، فلابیر اور ویسٹ لینڈ والا ٹی ایس ایلیٹ کھڑا تھا۔ اس سلسلے میں مثال کے طور پر احمد علی کے افسانے "ہماری گلی" "استاد شمسو خاں" "مارچ کی ایک رات" "قلعہ" "قید خانہ" "تیسرا کمرہ" اور "موت سے پہلے" عزیز احمد کے افسانے "الف خاں اور ب خاں" ممتاز مفتی کے افسانے "آپا" "ماتھے کا تل" اور سارتر کے اثرات کے ذیل میں بعد کے افسانہ نگاروں میں انتظار حسین کا افسانہ "چاند گہن" اور ورجینا وولف کے اثرات کے ذیل میں قرۃ العین حیدر کے کئی افسانے ناقابلِ فراموش ہیں۔

دوسری طرف اُردو افسانے کی وہ رو جس نے پریم چند، سدرشن، علی عباس حسینی، سہیل عظیم آبادی اور پھر کرشن چندر، امرت رائے اور عصمت چغتائی وغیرہ کو جنم دیا، یہ دراصل اردو کی اصلاحی اور تلمیحی حکایات کا لاشعوری نتیجہ، سائنٹفک سوسائٹی اور سائنٹفک رویّے کا منطقی نتیجہ، سرسید گروپ کے ذریعے اصلاحِ قوم و ادب کی کوششوں کا شعوری نتیجہ اور حالی کے "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" والے رویّے کا اکتسابی نتیجہ تھا۔ اس کا بنیادی مقصد انسان کے اخلاقِ حمیدہ کا فروغ، اخلاقِ رذیلہ کی سرکوبی اور گرتی ہوئی معاشی، مادی اور دنیوی حالت کا سدھار تھا مگر ہُوا کچھ یوں کہ مذہب جب تک تمام معاملات کو سنبھالتا رہا تب تک تو وہ اخلاقِ حمیدہ اور دنیوی حالت کے فروغ و فلاح، اور حُسنِ باطن کی بلندی سرفرازی اور طہارت کا سبب رہا مگر جب مذہب صرف خدا تک پہنچنے یا بہ الفاظِ دگر صرف مابعد الطبیعاتی سہارے کی تلاش کا ذریعہ بنا اور تمدن و معاشرت کی اصلاح کے دوسرے پہلو مثلاً سیاست، معاش، اور سماجی روابط وغیرہ مذہب سے اپنا دامن جھٹک کر الگ ہو گئے تو دنیوی حالت

ریڈر شعبۂ اُردو، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا

کا سُدھار تعیّش کا استعارہ بنا اور اخلاقِ حمیدہ کا مطلب صرف انسان اور انسان کے درمیان کے ظاہری تعلقات اور روابط کی خوش نمائی سے لیا جانے لگا۔ ایسے میں اخلاقِ حمیدہ، وضع داری، تکلف، اظہارِ شرافت، نرمی، قوتِ برداشت، شیریں بیانی اور ان سب کے پس پردہ منافقت کا استعارہ بنا۔ سجاد حیدر یلدرم وغیرہ جس رو کے افسانہ نگار تھے وہ رو اس منافقت کا ساتھ دیتی نظر نہیں آتی۔

کہنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ پریم چند جس رو سے وابستہ تھے وہ منافقت کی رو تھی بلکہ عرض صرف یہ کرنا ہے کہ سرسید اور حالی وغیرہ سے اردگرد کی زندگی کے مطالعے کی جو عادت پڑی، اس عادت نے حقیقت کا پوزیٹو بلکہ انلارجمنٹ تو دکھا دیا مگر نگیٹو جو "اصلِ عکس" ہے وہ آہستہ آہستہ نظروں سے دور ہونے لگا اور پریم چند وغیرہ کے قبیل کے فنکاروں کے یہاں فنکار کی تلاش، تلاشِ ذات کا استعارہ نہ بن سکی، فنکار صرف اردگرد دیکھتا اور گھومتا نظر آتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اردگرد کا مطالعہ بھی کارِ عظیم و دشوار ہے اور یہ کارِ عظیم و دشوار دوسری رو (یعنی ترقی پسند رو) کے افسانہ نگاروں نے عہد بہ عہد بحسن و خوبی انجام دیا۔ تاہم تصویر کا یہ رُخ حقیقت کی صرف ایک جہت ہے اختر اورینوی نے حقیقت کے (نگیٹو اور پوزیٹو) دونوں رُخ پیش کیے ہیں۔

اختر اورینوی کے فن پر غور کرتے ہوئے یہ بات بطورِ خاص یاد رکھنے کی ہے کہ منٹو کی طرح اختر اورینوی نے بھی کبھی اپنے کو ترقی پسند زمرے میں شامل کرنے کی کوشش نہیں کی اور دوسری اہم بات یہ بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اختر صاحب کے زیادہ تر افسانے ("سپنوں کے دیس میں" "کیچلیاں" اور "بالِ جبریل" اور "ایک درخت کا قتل" وغیرہ کو چھوڑ کر) ہیئت کے لحاظ سے اُس دوسری رو کے افسانوں میں رکھے جاسکتے ہیں جنھیں دیارِ مغرب سے متاثر بتایا جاتا ہے مگر اسی کے ساتھ ساتھ ایک دلچسپ امر یہ بھی ہے کہ موضوعاتی طور پر اُن کے نوّے فیصد افسانوں میں انسانی وجود سے جو محبت جھلکتی ہے اور وجود کی عظمت پر جو ایقان نظر آتا ہے وہ انھیں من حیثِ کُل اس صف کے افسانہ نگاروں سے الگ کر دیتا ہے جس صف والے "دیارِ مغرب کی دین" (افسانوی طرزِ فکر) مستعار لے رہے تھے اور جو انسانوں کو "مہالکشمی کا پُل" کے اس طرف یا اُس طرف دیکھنا چاہتے تھے، برسبیلِ تذکرہ اگر اس کا اعتراف نہ کیا جائے تو شاید یہ ادبی بے ایمانی ہو کہ کرشن چندر کا افسانہ "مہالکشمی کا پُل" تکنیک کے لحاظ سے تو خیر "مسدس حالی" کا قریبی رشتے دار معلوم ہوتا ہے کہ "مثنوی مدوجزرِ اسلام" (یا مسدس حالی) کی طرح اس افسانے میں بھی ساریوں کی ترتیب بدل دینے سے بھی افسانے کی ہیئت یا اثر اندازی کا کوئی نقصان نہیں پہنچتا مگر موضوعی طور پر بھی یہ افسانہ دلچسپ ہے کہ اس میں ویسی ہی ادعائیت اور قطعیت پسندی کروٹیں لیتی نظر آتی ہے جیسی ادعائیت اور کٹر پنتھی رویّے کے لیے ترقی پسند لبل اور سوشلسٹ مذہب اور مذہب سے زیادہ مذہب کے علمبرداروں سے اختلاف کرتے رہے، یہی بات یہ ہے کہ انسانوں کو خواہ مومن اور کافر کے خانوں میں بانٹا جائے یا مہالکشمی کے پُل کے کسی ایک طرف رکھا جائے، یہ رویہ اصلاحی، مذہبی اور تحریکی بنیادوں پر صحیح ہو تو ہو، ادبی پس منظر میں اس رویّے کو ایماندارانہ کیا شاید انسانی بھی نہ کہا جاسکے۔ اختر اورینوی کے یہاں آدمی خانوں میں تقسیم ہوتا نظر نہیں آتا، اس کا مطالعہ صرف آدمی کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔

"دُنیا تو صد چہرہ ہے، خوب صورت چہرے بدصورت چہرے اور وطن کا پیار؟ کبھی گل و لالہ کبھی آہ و نالہ، ہمسائے؟ کبھی نسیم گلشن، کبھی برقِ نشیمن، نہ جانے خدا نے انسان کو آزاد کیوں پیدا کیا اور کیا آدمی بالکل آزاد ہے؟ کاش جبر مستقبل ہوتا اختیار کامل اور ابنِ آدم خیر و شر کے بھنور میں گرفتا نہ ہوتا، خیر ہی خیر ہوتا، حسن ہی حسن ہوتا" [۱]

محشر

یہ صحیح ہے کہ اختر اورینوی بھی دوسرے فنکاروں کی طرح جب آدم زاد اور آدم زاد کی اِس کائنات کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ انسان کی درندگی وحشت، سفلہ پن، سطحیت، توہم پرستی اور جہالت کی وجہ سے کبھی کبھی آدمی کے تئیں اپنی انتہائی مایوسی کا اظہار کرتے ہیں۔

"[۲] تم نے سپنوں کا دیس پیدا کیا اور خدا پر تُل گئے، تم کائنات کا راز جاننا چاہتے تھے اور تمھیں حسرت کے سوا کچھ نہ ملا.... بھٹکنے والے اوہام! تم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ ایمیبا ہو جیلی فش مینڈک ہو یا میمون یا گوریلا، تم اپنی زہریلی روح کی محض ایک کینچلی ہو، تم بالِ جبریل بننے کی لاحاصل کوشش کر رہے ہو، تم شیت کی بگڑی ہوئی تصویر ہو۔"

تاہم وہ انسان سے بالکل مایوس نظر نہیں آتے۔ ابنِ آدم کی عظمت کا احساس بھی ان کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے

"[۳] تمھارا وجود عبث نہیں، ابدیت تمھارا

---

۱. حشر
۲. سپنوں کے دیس میں
۳. حدیث

انعام ہے اور فانی انسانوں کو حساس، ذکی، ہمدرد اور ذہین بنانا تمہارا کام، ان کے اندر انقلاب فکر و نظر برپا کرنا تمہاری تخلیق کا مقصد . . . تم اپنے خالق کی نعمتوں کا کب تک انتظار کروگے۔"

ابن آدم کی شناخت کا یہی وہ بنیادی نقطہ ہے جو اُنھیں ان کے تحریکی معاصرین سے ممیز کرتا ہے۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے اور ان کے افسانوں کے مجموعی مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے تحریکی دوستوں کے یہاں، دوستوں کے ساتھ ساتھ دشمنوں کی صف بھی موجود ہے مگر اختر صاحب کے یہاں دشمن کا نشان نہیں ملتا وہ آدمی کے دوست ہیں اور آدمی ان کا دوست، اور دوست دوست کا مطالعہ تخلیقی سطح پر کرتا ہے اور اس سطح کو کسی دوسری سطح سے ملوث یا متاثر نہیں ہونے دیتا کیوں کہ ادب بذاتِ خود انسان کے زمان و مکان کا تخلیقی انعکاس ہے اور اس انعکاس میں زمان و مکان کا داخل اور خارج، ظاہر اور باطن سب ایک اکائی بن کر فن کی بھٹی میں جب پگھلتے ہیں تو تخلیق کا سونا خس و خاشاک کنارے کرکے کندن بنتا اور چمکتا ہے۔

یہ سارا کا سارا زمان و مکان اختر اور رینوی کے افسانوں میں طرح طرح سے اپنا اظہار کرتا ہے۔ فی الحال ہم تلاشِ آدم کی تخلیقی جہتوں کی تلاش میں مصروف ہیں لہٰذا اسلوبیاتی پہلو پر گفتگو ہمارے نفسِ مضمون سے خارج ہے، مختصراً اتنا عرض ہے کہ اظہار خواہ کسی نوع کا ہو ننگا اظہار اختر اور رینوی کے یہاں نہیں ملے گا لفظ کے ملبوس، استعارے اور تلمیحیں لفظ کی ستر پوشی کرنے کو ہر پل تیار نظر آتے ہیں اور اس طرح اختر صاحب خارج کے اظہار میں خارج کے داخل کو داخل کے اظہار میں داخل کے خارج کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ ایک صورتِ حال ملاحظہ ہو:

"شام ہوچکی تھی تیاری شروع کردی گئی اور رات ہوتے ہوتے پسپائی کا آغاز ہوا، جوانوں کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں، کندھے ڈھیلے پڑے ہوئے تھے اور سینوں کا تناؤ باقی نہیں رہا تھا، دستہ اس طرح غمگین انداز میں مارچ کررہا تھا جیسے لوگ جنازہ اٹھائے دفنانے کو جارہے ہوں، اندرونِ ہمالہ کی برفیلی رتوں کا ملگجا اندھیرا پھیلتا جارہا تھا اور اندھا دھند کہرے کی دھند بلند و پست کا فرق مٹا چکی تھی، ایسا محسوس ہورہا تھا کہ دنیا و مافیہا دھواں بن کر فضا میں تحلیل ہوگئی ہے، زندگی ایک عذرِ لنگ معلوم ہوتی تھی، یقین و اعتبار اُٹھ چکا تھا سارے ماحول میں پھیلے سکوت کی سرحدیں عدم سے جا ملی تھیں، زمان و مکان باطل ہوچکے تھے۔"

مندرجہ بالا اقتباس اور مذکورہ باتوں کا جواز پیش کرتا ہے کہ اختر اور رینوی ایک ہاری ہوئی فوج کی پسپائی اور واپسی کا منظر بیان کررہے ہیں۔ مگر اس بیان میں پسپا فوج کے ہر ایک سپاہی کا داخل اور شکست کھائی فوجوں کو مایوس واپسی کا خارج دونوں اس طرح ٹوٹ ٹوٹ کر ایک دوسرے میں ملتے نظر آتے ہیں کہ آپ اگر چاہیں بھی تو منظر اور کیفیت کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرسکتے۔ اور واضح طور پر خارج اور داخل کی شناخت اور تقسیم امرِ محال بن جاتی ہے۔ زمان و مکان کی اس مخصوص "اختری ہیئت" سے "قطع نظر" "شناختِ آدم" کا اگلا زینہ ملاحظہ فرمایئے:

"میری کا باپ ایشائی تھا اور ماں انگریز، باپ کے مرنے کے بعد میری اپنی ماں کے ساتھ اس جزیرے میں آبسی تھی، نازک بدن میری، اس کا رنگ زیتونی تھا، بال سیاہ اور لانبے تھے، اس کی آنکھیں نیلی، بڑی بڑی گہری گویا اور معنی خیز تھیں، اس کا پیارا ترشا ہوا چہرہ زندگی کا اعتماد پیدا کردیا کرتا تھا۔ اس کی دلکش آواز نہ جانے بحرِ حیات کے کس کنارے سے پکارتی تھی کہ میری روح میں نئے امکانات بیدار ہوجاتے تھے، اس کا وجود خوابناک تھا۔ وہ اپنے خوابوں میں مجھے شریک کرلیتی تھی۔ ہم نے مل کر بہت سے خواب دیکھے تھے۔ آدم اور حوا کے ازلی اور ابدی خواب: گھر کا خواب، محبت کے نیرنگ ساماں خواب۔ آدم و حوا کی نسل فنا ہورہی تھی۔ خواب بے تعبیر ہورہے تھے۔ میری مرچکی تھی۔ میں مرجاؤں گا۔ دنیا مررہی ہے۔ شاید . . . شاید کوئی میری بچ جائے۔ کوئی ولیم بچ جائے اور پھر ایک گھر بنے پھول کھلیں، بچے ہنسیں، کھیلیں، اور پھر دنیا بسے . . . کاش!"

مندرجہ بالا اقتباس سے اختر صاحب کا رویہ بالکل واضح ہوجاتا ہے، وہ دوست اور دشمن اقوام کی سیاسی خانہ سازی کے عمل کو مکمل طور پر رد کرتے نظر آتے ہیں، پتا نہیں اختر اورینوی برٹرنڈ رسل سے حیاتِ انسانی کے مختلف مسائل کے سلسلے میں کس حد تک متفق تھے اور کیا کیا اختلاف رکھتے تھے۔ مگر مندرجہ بالا اقتباس پڑھ کر تو بے ساختہ برٹرنڈ رسل کی وہ خواہش یاد آجاتی ہے جس کے مطابق وہ ایک ایسی دنیا کا آرزو مند ہے" جہاں افراد آزادانہ طور پر پلتے بڑھتے ہیں اور جہاں نفرت لالچ اور حسد اپنی موت آپ مر جاتے ہیں کیوں کہ انھیں غذا نہیں ملتی۔"

یہ صحیح ہے کہ برٹرنڈ رسل منکرِ خدا تھا اور اختر اورینوی خدا پرست مگر شناختِ آدم کے سلسلے میں دونوں دو الگ الگ راستوں سے چل کر ایک ہی مقام پر پہنچنے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔

۱۔ کیچلیاں اور بالِ جبریل۔
۲۔ کرۂ ارض کا ایک سانحہ

ے آدم کے مستقبل سے زیادہ مایوس ہیں جب کہ ز اور ینوی انسان کی بربری جبلت کو محسوس نے کے باوجود نسبتاً ایک پُر اُمید نقطۂ نظر اختیار تے ہیں، ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

" سخت تصادم رونما ہوا، بھیانک ماکے ہوئے، کائنات لرزہ براندام ہوگئی، ب کے پُتلے فنا ہوگئے، سپنوں کا سنسار بل ہونے لگا۔ شاید بندو برہما کی کہانی ختم ہورہی ے، یہ دماغ عظیم دماغ کا ایک لمحہ تھا یا ابدیت ایک کڑی۔ کون جانے عظیم دماغ خلفشارِ عالم ے بیدار ہو رہا تھا۔ برہما کی نیند دھماکوں سے اُچٹ ی تھی، سپنوں کا سنسار چھایا، خواب کی دنیا پایا۔ یا برہما پھر سپنوں کا سنسار رچے گا؟"

یہ وہ بنیادی نکتہ ہے جو رسل اور اختر ر ینوی کو ایک دوسرے سے واضح طور پر الگ کرتا ہے کہ شناختِ آدم کے سلسلے میں رسل کسی مابعد الطبیعاتی سطے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اور اختر نہ صرف یہ ہ برہما کے سپنوں کے سنسار کے منتظر ہیں بلکہ آدم کے ان و مکان کی بازیافت اور شناخت کے لیے رسل کے ساتھ ساتھ اپنے تحریکی دوستوں کے بھی برعکس تاریخی ور مابعد الطبیعاتی دونوں واسطوں اور حوالوں کو پیشِ ظر رکھتے ہیں۔"

" اور برہما نے دیکھا، ابدیت حنوط شدہ اشوں میں نہیں، سقراط کے زہر پینے میں ہے . . . . خواب کے پُتلے فانی ہیں حقیقت اور ابدیت ماورائے خواب ہے۔ یہ تو عشق کی جرأت رندانہ ہے جو سارے پردے اُٹھا کر برہما کے خواب میں رخنے ڈال کر ماورائے خواب ابدیت کو جھانک کر دیکھ لیتی ہے، ابراہیم، موسیٰ، سقراط، کرشن، رام اور بودھ نے برہما کے خواب کے گورکھ دھندے سے آگے بڑھ کے پردے کو دیکھ لیا اور وہیں ابدیت تھی۔"

اور جس طرح قرۃ العین حیدر "آگ کا دریا" میں ہزاروں سال پیچھے سے اپنا سفر شروع کرتی ہیں، اسی طرح قرۃ العین حیدر سے برسوں پہلے سیاح فنکار اختر اورینوی بھی تلاش و دریافت اور شناخت و بازیافت کے شوق میں ہزاروں صدیوں قبل کے اُس زمان میں پہنچ جاتے ہیں جب:

" ہمالہ نے برف آلود کہرے سے جھانک کر دیکھا، سندھو لہرا رہا تھا۔ برہم پتر بل پہ بل کھا رہا تھا، گنگا، جمنا، نرمدا، تاپتی، کرشنا اور کاویری تھرک رہی تھیں ناچ رہی تھیں، وندھیا اور ستپورہ مہک رہے تھے، سندر بن گا رہا تھا، نلگری سنجیرا بجا رہا تھا، اور نیلے سمندروں میں نہائے ہوئے بادل مستی میں اپنی لٹ کھولے ڈھول بجا رہے تھے۔ اس سنگیت سبھا کو ہمالے نے اپنے سن سفید سر اور پُرشکن پیشانی کو جھکا کر دیکھا، اس نے دیکھا: پورب دکھن کے ٹاپوؤں سے چوڑی ناک، چوڑے جبڑے اور چوڑے چہرے والے پُتلے ایرادوی اور برہمپتر کے ساتھ ناچتے گاتے ہوئے اُس کی شرن میں آگئے، ان کا رنگ تانبے جیسا تھا، پھر پچھم دیس سے کالے کالے پُتلے، اُبھرے ناک نقشے والے پُتلے، رقص کرتے دھوم مچاتے آئے اور اس کے دامن سے لے کر نلگری اور نیلے سمندر تک چھا گئے۔"

اس سارے پس منظر میں جو اُوپر بیان کیا گیا، اصل قابلِ غور بات اور ایک اہم سوال یہ ہے کہ اگر سجاد حیدر یلدرم کو اُس دوسری رو کے افسانوں کا پیش رو قرار دیا جاسکتا ہے جو اپنی اصل قوت اور طاقت پریم چند اور اُن کے ہم نواؤں کے پیش کردہ اُن افسانوں سے اخذ نہیں کر رہے تھے جنھیں مزاج اور ہیئت کے اعتبار سے "دیارِ مغرب کی دین" کہا جاتا رہا ہے بلکہ اس کے برعکس اس دوسری رو کے افسانوں کی جڑیں ان تلمیحوں، تمثیلوں اور داستانوں میں تلاش کی جاسکتی ہیں جن سے احتشام حسین مرحوم، وقار عظیم اور ممتاز حسین صاحبان وغیرہ بہت ناخوش رہے اور کلیم الدین احمد صاحب بھی کچھ زیادہ خوش نہیں رہے تو پھر آخر سجاد حیدر یلدرم کے بعد یہ دستارِ فضیلت سید سے سید قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے سر پر کیوں رکھ دی گئی؟

عجیب بات ہے کہ وحدتِ آدم کو اپنے سفر کا نقطۂ ارتکاز قرار دینے والی قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین تو میرِ کارواں بن جائیں اور شناختِ آدم کی جستجو میں ہزار ہا سال پیچھے سے اپنا سفر شروع کرنے والے اختر اورینوی بھلا دیے جائیں حالاں کہ اختر اورینوی بھی اپنے افسانوں میں عینی صاحبہ اور انتظار صاحب کی طرح یہی کہتے ہیں کہ ـــــ"

" میں چاہتا ہوں کہ ایک دفعہ میں اپنے سب جنونوں کے دماغ سے اکٹھا کام لوں، اپنے سارے قالبوں کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھوں۔ آریائی دماغ اور سامی دماغ، عبرانی مزاج اور یونانی مزاج، منگول اور حبشی طبیعتوں کا ایک شاندار مرکب بناؤں اور اپنے نطفے اور بطن سے ایک نئے آدم کو جنم دوں، میں اپنے ابنام اپنے جگر گوشوں میں مفاہمت کرانا چاہتا ہوں، عملی مفاہمت، کپل، گوتم، منو، میکاولی، مارکس، فرائڈ، ہیگل، برگساں، برٹنڈرسل، گاندھی، ابن رشد، سینا، فارابی، رومی، ابن عربی، غزالی اور ولی اللہ دہلوی کے درمیان میں ایک دار السلام کی تعمیر کے لیے بے چین ہوں۔"

اور ایک بار پھر وہی سوال دہرانا چاہتا

---

۱. سپنوں کے دیس میں
۲. " " " "
۳. " " " "
۴. کیچلیاں اور بالِ جبریل

ہوں کر جون بدلنے' اور تضادات کے درمیان عملی مفاہمت" کرانے کی خواہش رکھنے والا' تاریکی اور مابعد الطبیعاتی واسطوں سے اس کائنات کو سمجھنے کی کوشش کرنے والا' اور وحدتِ آدم پر یقین رکھنے والا فنکار سجاد حیدر یلدرم اور قرۃ العین حیدر و انتظار حسین کے درمیان کی کڑی کیوں نہیں بن سکا؟ ضرورت ہے کہ "عصری اثرات" سے بے نیاز ہو کر اختر اورینوی کی صحیح تخلیقی اور فنی حیثیت اور مقام کی شناخت اور بازیافت کی جائے۔ اگر ایسا کبھی ہو سکا تو میرا یقین ہے کہ سجاد حیدر یلدرم اور قرۃ العین حیدر کے درمیان اختر اورینوی ایک سنگِ میل کی حیثیت سے نمایاں نظر آئیں گے ——!!

نثر واصف

آگ

پروفیسر اکرام کو دس بجے یونیورسٹی پہنچنا تھا ابھی نو ہی بجے تھے۔

وہ کافی پہلے سے تیار ہو گئے تھے اس لیے قت گزارنے کے لیے اپنے گھر کے برآمدے میں ہی ھ گئے اور اخبار دیکھنے لگے۔

سامنے والی سڑک سے سواریوں کے آنے انے کا شعور اُبھر رہا تھا۔ دکانیں بھی کھل گئی ھیں اور نکڑ والے چائے خانے سے فلمی گانوں ی آواز آرہی تھی۔

"کتنا بدل گیا ہے سب کچھ" انھوں نے وچا "پندرہ برس..... صرف پندرہ رس ہی تو گزرے ہیں"۔

آج سے پندرہ سال پہلے پروفیسر اکرام قامی کالج میں لکچرر تھے لیکن اپنی سروس سے و سال بعد ہی انھیں ہارورڈ یونیورسٹی سے یلو شپ مل گئی اور وہ تین سال کے لیے امریکا چلے ئے فیلو شپ کی تکمیل کے بعد وہ امریکہ میں ہی زید دو سال تک درس و تدریس کے فرائض انجام یتے رہے اس کے بعد انھیں کناڈا یونیورسٹی سے فر ملی اور وہ چار سال کے لیے کناڈا چلے گئے۔ وہاں ے بعد وہ آسٹریلیا پہنچے اور پانچ سال تک ھنے پڑھانے میں مشغول رہے۔ اس بیچ وہ ہر ین چار سال کے وقفے سے چند ہفتوں کے لیے ندوستان آئے اور واپس لوٹ گئے، لیکن اب ی بار انھوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب انھیں ہیں نہیں جانا ہے، یہیں ہندوستان میں رہنا ہے..... اور آج انھیں یونیورسٹی جوائن کرنا تھا، پورے پندرہ سال بعد۔

واقعی بہت کچھ بدل گیا تھا ان پندرہ برسوں میں۔ پندرہ سال پہلے یہ محلّہ کھلا کھلا سا ہوا کرتا تھا۔ گھر ایک دوسرے سے فاصلے پر تھے لیکن ان پندرہ برسوں میں وہ تمام خالی جگہیں پُر ہو گئی تھیں مکانات زمین کے اندر سے خودرو درختوں کی صورت اُگ آئے تھے اور پورا محلّہ مکانوں کے جنگل میں تبدیل ہو کر رہ گیا تھا۔ دُکانوں کی تعداد میں بھی خاصہ اضافہ ہوا تھا۔

سامنے والی سڑک اس زمانے میں سُونی سُونی سی رہا کرتی تھی۔ صرف صبح میں نو سے دس بجے تک اور شام چار سے پانچ بجے تک دفتر آنے جانے والوں کی وجہ سے اس پر ٹریفک بڑھ جاتا تھا باقی وقتوں میں سڑک پر چُپّی چھائی رہتی کبھی کوئی کار زن سے نکل جاتی تو کبھی کوئی بس شور مچاتی بھاگتی چلی جاتی۔ لیکن اب تو جیسے سواریوں کا تانتا بندھ گیا تھا۔ ٹیمپو، رکشے، بسیں، اسکوٹر، موٹر سائیکلیں دن بھر دندناتی گزرتی رہتیں۔

پروفیسر اکرام سوچ رہے تھے، یہاں بھی دُنیا کتنی تیز رفتار ہو گئی۔ جسے دیکھو بھاگا جا رہا ہے۔ چاروں طرف ایک بھیڑ ہے اور اس بھیڑ سے جُڑا ہر شخص تیزی سے راستے طے کر رہا ہے اپنی منزل کی طرف گامزن ہے۔ یہ محلہ، یہ شہر کتنا بدل گیا ہے۔ پندرہ سال پہلے یہ شہر جہاں پر ختم ہوتا تھا وہاں سے لہلہاتے کھیتوں کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا لیکن اس مدت میں ان کھیتوں کو میلوں پیچھے کی طرف ڈھکیل دیا گیا ہے اور ان کی جگہ سینکڑوں چھوٹی بڑی فیکٹریاں اُٹھ کھڑی ہوئی ہیں جن کی چمنیاں دن رات دُھواں اُگل رہی ہیں۔ لمبی چوڑی کالونیاں بس گئی ہیں اور پورے شہر میں سڑکوں کا جیسے جال بچھ گیا ہے۔

وہ ندی جو پندرہ سال پہلے بڑے سکون سے شہر کے کنارے سے بہتی ہوئی نکل جاتی تھی اب اس کے سینے پر تین پُل بن گئے ہیں جن پر ہمہ وقت ٹرین کی گڑگڑاہٹ اور بھاری ٹرکوں کے انجن کی آواز گونجتی رہتی ہے۔

پروفیسر اکرام نے بے خیالی میں اخبار کا صفحہ پلٹا اور سُرخیوں پر نظر دوڑانے لگے لیکن ان کی نگاہیں اخبار میں چھپی تحریر سے گزر کر کہیں دُور، بہت پیچھے کی طرف دیکھ رہی تھیں ان کی آنکھوں کے سامنے آج سے پندرہ سال پہلے والا شہر، یہ محلّہ اور یہاں رہنے والے لوگ باگ ان کے عزیز و اقارب، دوست احباب اور نہ جانے کتنی جانی انجانی صورتیں اُبھر رہی تھیں جو ان پندرہ برسوں میں دُھندلا گئی تھیں۔ ان کے ذہن کے تاریک گوشوں میں جا سوئی تھیں آج دوبارہ ان کے سامنے ساکار ہو رہی تھیں۔

دفعتاً ان کی آنکھوں کے سامنے دُھواں اُگلتی چمنیوں، دوڑتی بھاگتی لاریوں اور سڑکوں کے جال کے بیچ سے ایک چہرہ اُبھرا —— ممدین کا چہرہ۔

ممدین آج سے پندرہ سال قبل رکشا چلاتا تھا۔ اس وقت اس کی عمر چالیس سال سے کم نہ تھی لیکن اپنے گٹھے ہوئے بدن اور قابل رشک

ای۔ایس۔آئی کارپوریشن، بیلی روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۱

صحت کی وجہ سے وہ تیس بتیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ پروفیسر اکرام نے اسے ہمیشہ چیک کی لنگی اور خاکی کُرتا پہنے دیکھا تھا۔ اس کا نام ممدین نہیں بلکہ محمد دین تھا جسے لوگوں نے کاٹ چھانٹ کر ممدین بنا لیا تھا۔

ممدین کو اپنے نام کی اس تراش خراش کے علاوہ دُنیا کی ہر چیز پر اعتراض تھا عجیب جھگڑالو طبیعت کا آدمی تھا وہ۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑا کھڑا کر دینا، مار پیٹ پر اُتر آنا اس کے معمولات میں تھا۔ گالیاں تو جیسے اس کی زبان پر دھری رہتی تھیں۔ بس اُس نے مُنہ کھولا اور گالیاں ٹپک پڑیں۔ محلّے میں شاید ہی کوئی ایسا رہا ہوگا جس سے ممدین کا جھگڑا نہ ہوا ہو۔ دوسروں سے جھگڑنے کے لیے اسے کسی بہت بڑے مدّے کی ضرورت نہ تھی۔ کسی سواری نے چار آنے پیسے کم دینے چاہے اور ہوگیا جھگڑا۔ کسی گاڑی والے نے بغیر ہارن دیے ممدین کے رکشے سے گاڑی آگے نکال لی اور اس نے پھٹاک سے ایک گالی دے ماری۔ کوئی سائیکل والا اس کے آگے سے کاوہ کاٹ کر نکلا اور ممدین نے للکار دیا۔ بلکہ اکثر وہ دوسروں کے پھٹے میں ٹانگ اڑایا کرتا۔ کوئی رکشے والا سواری لے کر آیا اور بھاڑے کو لے کر تُوتُو مَیں مَیں شروع ہوئی تو کُود پڑے بیچ میں ممدین میاں۔ اب اصلی رکشے والا الگ اور جھگڑا ہو رہا ہے ممدین سے۔

لیکن اسی غصیلے اور جھگڑالو ممدین کا ایک پہلو اور بھی تھا جسے پروفیسر اکرام جانتے تھے پندرہ سال قبل جب وہ مقامی کالج میں لکچرر تھے، اسی کے رکشے سے کالج آیا جایا کرتے تھے۔ معلوم نہیں کیوں وہ ان کی بہت عزّت کرتا تھا۔ روز سویرے ساڑھے نو بجے وہ ان کے گھر کے سامنے رکشا کھڑا کر دیتا اور جب تک وہ باہر نہ آتے ان کا انتظار کرتا رہتا۔ معلوم نہیں کیسے ان کے کالج سے چھوٹنے کے وقت کا بھی علم ہوگیا تھا۔ کس روز دو بجے آنا ہے، کس روز ساڑھے تین بجے اور کس روز پانچ بجے اسے اچھی طرح معلوم تھا۔ پروفیسر اکرام کو بھی اس سے عجیب سی اُنسیت ہوگئی تھی۔ کسی دن اسے دیر ہو جاتی تو وہ اس کا انتظار کرتے رہتے۔

تعجب کی بات تو یہ تھی کہ ممدین نے پروفیسر اکرام سے کبھی جھک جھک نہیں کی تھی۔ جو کچھ انھوں نے دیا اس نے چُپ چاپ لے کر رکھ لیا۔ ایک بار انھوں نے مذاق میں پوچھا بھی تھا:

"ممدین، تم سب سے لڑتے ہو لیکن مجھے کبھی کچھ نہیں کہتے؟"

"آپ کو کا بولیں صاحب" ممدین نے کہا تھا "آپ اِتنے سریپھ، اِتنے پڑھے لکھے... آپ کو کیسے بولیں گے صاحب۔"

اس روز پروفیسر اکرام کا دل ایک عجیب سے احساسِ تفاخر سے بھر اُٹھا تھا اور اس دن کے بعد سے وہ اسے اکثر سمجھانے بجھانے لگے تھے۔

ممدین، اتنا تیز رکشا مت چلایا کرو۔

ممدین، تمھارا بیٹا پڑھ رہا ہے نا، اسے ضرور پڑھاؤ، پڑھ لکھ جائے گا تو زندگی بن جائے گی۔

ممدین، کیوں لڑتے رہتے ہو سب سے، مت لڑا کرو۔

ممدین ان کی سب باتیں چُپ چاپ سُن لیتا لیکن جھگڑا نہ کرنے والے مشورے پر وہ بول اُٹھتا ــــ "اب کا کریں مالک" اپنا مجاج ہی ایسا ہے۔ کوئی کچھ بولے تو برداس نہیں ہوتا کوئی کم پیسہ دے تو کیسے چُپ چاپ لے لیں صاحب، محنت تھوڑی کرتے ہیں۔ ای کا ای مطلب تو نا ہے کی جو چاہے دبا دے۔ اُوپر سے دو گو بات بول دے، کیسے۔ برداس ہوگا صاحب۔"

پروفیسر اکرام ممدین کی اس بات پر خاموش ہو جایا کرتے تھے لیکن ایک دن جب وہ اس کے رکشے سے گھر لوٹ رہے تھے تو ایک واقعہ ہوا تھا۔ انھیں یاد ہے، ممدین حسبِ معمول تیز تیز رکشا چلا رہا تھا کہ اچانک بغل والی گلی سے ایک سائیکل سوار نکل پڑا۔ ممدین نے پورا بریک لیا تھا لیکن سائیکل والا خود کو قابو میں نہیں رکھ سکا اور رکشے کے اگلے پہیے سے ٹکرا کر وہیں گر پڑا۔ اُوپر سے ممدین نے دو چار گالیاں بھی جھاڑ دیں۔ پھر کیا تھا۔ سائیکل والا تاؤ میں اُٹھ کھڑا ہوا اور چپّل نکال کر پل پڑا ممدین پر۔ لیکن ممدین بھی کب پیچھے رہنے والا تھا۔ دونوں گتھم گتھا ہوگئے۔ اتفاق سے اس وقت پروفیسر اکرام کے کچھ طالب علم وہاں آپہنچے اور انھوں نے ان کی مدد سے دونوں کو بڑی مشکل سے الگ کیا۔ ممدین کی طرف سے خود انھوں نے سائیکل والے سے معافی مانگی تب کہیں جا کر معاملہ رفع دفع ہوا حالاں کہ ممدین اخیر تک چیختا رہا۔ "مالک، آپ کاہے کو سالے سے ما بھی مانگ رہے ہیں . . . . کوتو ہمری گلتی رہی کا؟ آپ ہٹ جائیے، ہم بوجھ لیں گے سالے سے۔"

پروفیسر اکرام نے بڑی مُشکل سے اسے

ٹھنڈا کیا اور اس معاملے کو نبٹانے کے بعد جب وہ اس کے رکشے پر بیٹھے گھر کی طرف جا رہے تھے تو انھیں اس پر زور کا غصّہ آ گیا تھا۔

"ممدین . . . . تم کبھی نہیں سُدھرو گے . . . . یوں ہی خود کو ضائع کرتے رہو گے۔ بہت غصّہ ہے تمھارے اندر، بہت آگ بھری ہے لیکن سب ضائع ہو جائے گی، بس ایسے ہی چھوٹے موٹے جھگڑوں میں . . . . اسے بچا کر رکھتے تو ایک دن یہ کام آتی، تمھارے ہی کام آتی . . . . کسی بہت بڑے مقصد میں اس کا استعمال ہوتا . . . . لیکن تم، نہیں سُدھرو گے . . . . بس خود کو ضائع کرتے رہو گے۔"

ممدین خاموشی سے ان کی باتیں سُنتا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب ان کا غصّہ فرو ہوا تو وہ اسے سمجھانے لگے ــ "جانتے ہو ممدین . . . . میں اپنی کہانی سُناتا ہوں تمھیں . . . . جب میں آٹھ سال کا تھا تبھی میرے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ کوئی امیر آدمی نہیں تھے۔ جائداد کے نام پر بس ایک دو کمروں کا مکان چھوڑا تھا انھوں نے اور بینک میں چند سو روپے۔ ان کی موت کے بعد ہم بہت پریشانی میں گھر گئے تھے۔ بہت خراب حالت تھی ہماری۔ لیکن میری ماں بڑی ہمّت والی تھیں۔ انھوں نے سب دُکھ سہہ لیے لیکن میری تعلیم رُکنے نہ دی۔ وہ رات رات بھر سلائی کا کام کرتیں، کپڑوں پہ پھول کاڑھتیں، لگی رہتیں اپنے کام میں . . . . ممدین . . . . ان دنوں ہمارے رشتے دار ہمیں دیکھ کر اپنا مُنہ پھیر لیا کرتے تھے۔ ہمیں دیکھتے تو کترا کر نکل جاتے کہ ہم کہیں ان سے کچھ مانگ نہ بیٹھیں۔ وہ ہمیں اپنا رشتہ دار کہنے میں بھی گھبراتے تھے۔ ان دنوں مجھے لگتا تھا ممدین کہ ان رشتے داروں کے مُنہ نوچ لوں . . . . ان کے بدن پر تیزاب پھینک دوں۔ ساری دُنیا مجھے اپنی دُشمن نظر آتی تھی اور میں ایک عجیب سی آگ میں جلتا رہتا تھا لیکن میں نے اپنے آپ کو دبا لیا۔ وہ آگ میرے اندر برابر بھڑکتی رہی، لیکن میں اسے چھپائے رہا۔ میں تو بس اپنی ماں کا چہرہ دیکھتا تھا جس نے اپنے لہو کا ایک ایک قطرہ میرے نام وقف کر دیا تھا . . . . اور میں پڑھتا رہا . . صرف پڑھتا رہا . . . . اور آج وہی رشتے دار دوسروں سے فخر یہ کہتے ہیں کہ میں ان کا بھانجا ہوں، بھتیجا ہوں۔ میری خوشامدیں کرتے ہیں، میرے ارد گرد منڈلاتے ہیں گو میں ان باتوں سے آگے نکل چکا ہوں لیکن ممدین یہ دُنیا بڑی خود غرض ہے، بچاؤ خود کو . . . . ضائع ہونے سے روکو۔"

اور بھی بہت کچھ کہا تھا انھوں نے۔ ممدین سر جھکائے چپ چاپ رکشا کھینچتا رہا تھا۔ پتا نہیں اس نے ان کی باتیں سُنی بھی تھیں یا نہیں اور سُنی تھیں تو کتنا سمجھ پایا تھا۔

پروفیسر اکرام نے چونک کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے نو بج چکے تھے۔ انھوں نے جلدی اخبار سمیٹا اور اُٹھ کھڑے ہوئے پھر انھوں نے گیٹ کی طرف دیکھا۔ پندرہ سال قبل ممدین اس وقت اپنا رکشا لیے وہاں کھڑا رہتا تھا۔ لیکن آج وہاں کوئی نہیں تھا۔ مایوسی کی ایک چھوٹی سی لہر انھیں چھوتی ہوئی گزر گئی ــ بھلا ممدین کو کیا معلوم کہ میں واپس آ گیا ہوں اور کیا ضروری ہے کہ وہ رکشا ہی چلاتا ہو۔ پورے کا پورا شہر بدل گیا، اتنی تبدیلیاں آ گئیں، کیا وہ اب تک رکشا ہی چلا رہا ہو گا؟

وہ چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے رکشا پڑاؤ کے پاس آ پہنچے۔ وہاں کئی رکشے والے کھڑے تھے جو انھیں دیکھتے ہی آئیے صاحب، آئیے صاحب کی ہانک لگانے لگے لیکن پروفیسر اکرام کی نگاہیں کسی اور کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔ تبھی ایک بوڑھا سا آدمی ان کی طرف لپکا ــ "ارے صاحب، آپ؟"

پروفیسر اکرام نے غور سے اس کی طرف دیکھا ــ

"نہیں پہچانے مالک . . . ہم ممدین!"

وہ اسے پہچان گئے تھے لیکن اس کے چہرے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے خاکی کُرتے اور لُنگی کی وجہ سے۔

ایک دم بدل گیا تھا وہ۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کے بدن کا سارا لہو نچوڑ لیا ہو۔ گال پچک گئے تھے آنکھیں دُھندلا گئی تھیں۔ اور کمر بھی تھوڑی سی جُھک گئی تھی۔ اس کے ہٹّے کٹّے بدن میں صرف ہڈّیوں کا ڈھانچہ باقی رہ گیا تھا۔

"تم اب تک رکشا ہی چلا رہے ہو ممدین؟"

پروفیسر اکرام دھیرے سے بُدبُدائے لیکن اس نے سُن لیا۔

"اَور کا کریں گے صاحب . . . . اَور کا ہے ای دُنیا میں ہمرا لیے . . . . بہت جمانا بعد آئے صاحب، کالج چلیے گا؟"

انھوں نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا اور ممدین ایک قطار میں کھڑے رکشوں کے بیچ سے اپنا رکشا نکال لایا پھر اپنے گمچھے سے سیٹ کو پونچھتا ہوا بولا ــ آئیے مالک . . . بیٹھیے۔

پروفیسر اکرام ہچکچاتے ہوئے اس کے رکشے پر بیٹھ گئے جیسے وہ رکشے پر نہیں اس کے

جسم پر اپنا بوجھ رکھ رہے ہوں اور ممدین نے رکشا آگے بڑھایا۔ لیکن تھوڑی ہی دُور آنے کے بعد انھیں محسوس ہوا کر رکشا بہت دھیرے دھیرے چل رہا ہے۔ پندرہ سال پہلے یہی ممدین تھا کسی دوسرے رکشے والے کی مجال نہیں تھی کہ اس سے آگے نکل جاتا وہ تو سائیکل والوں سے بھی ریس کر لیتا تھا لیکن آج اتنی ہی دُور میں نہ جانے کتنے رکشے اور سائیکلیں بغل سے نکل چلی گئی تھیں لیکن وہ سر جُھکائے ایک دم دھیرے دھیرے رکشا چلا رہا تھا۔ دفعتاً انھیں ممدین کے بیٹے کی یاد آئی اور انھوں نے پوچھا۔

"ممدین..... تمھارا ایک بیٹا تھا نہ، کیا کرتا ہے وہ؟"

"کا بتاویں صاحب..... اوکر لو نام مت لیجیے..... بس، ہمرا بھاگ کھراب ہے..... نا تو جوان بیٹا کے رہتے ہم ای بُڑھاپا میں رکشا کاہے کو کھینچتے؟"

"کیوں ممدین..... کیا ہوا؟" پروفیسر اکرام نے پوچھا۔

"صاحب، آپ کہے رہے نا کی پڑھا لکھا دو جندگی بن جاوے گی..... ہم اوکو بڑھائے صاحب اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کے بڑھائے۔ موٹا جُھوٹا پہن کے رہ لیے، بس اِہی کرتا اور لُنگی۔ جندگی میں کوئو سُوکھ نا کیے صاحب..... او پڑھ تو گیا مالک..... مگر....."

"کیا ہوا ممدین اس کو.....؟" پروفیسر اکرام نے بے تابی سے پوچھا۔

"اب کا بتاویں مالک..... ہمرا تو بس بھاگے کھراب ہے..... آپ کہے رہیں

[illegible]

سہی بولے رہیں..... او بی۔ اے، ایم۔ اے کر گیا لیکن اوکے اکل نا ہوا..... جانے کَون لوگ کے سنگت میں پڑ گیا..... پہلے تو رات رات بھر گائب، پھر ہپھتہ ہپھتہ دن آوَر اب تو مہینہ دو مہینہ پر مُسکل سے سکل دیکھے ہے....."

"ایسا.....!" پروفیسر اکرام نے تعجب سے کہا۔

"ہاں مالک..... اب کا کہیں..... بہت کہا سُنا اوکے، بہت سمجھایا مگر اُو کا تو دماگے پھر گیا ہے۔ اُلٹے ہمی کو سمجھاوے ہے کی انکلاب لانا ہے..... مگر ای کَون انکلاب ہے مالک... جَون بیٹا اگو بوڑھ باپ کے دو جون روٹی نا جُٹا سکے او کَیسن انکلاب لامئی ہیں مالک؟..... پولس الگ تنگ کرے ہے... روج دروا جا کھٹکھٹائے ہے..... بول تیرا بیٹا کہاں ہے۔ سُنا ہے مالک اُو کہون اور ڈاکا جنی کا الجام ہے..... ہم تو آج اُگھنے صاحب... بھاگے پھُوٹ گیا ہمرا... کا سوچے رہے اُور کا ہو گیا؟"

ممدین اپنی دُھن میں بولے جا رہا تھا لیکن پروفیسر اکرام ایک دوسری ہی بات سوچ رہے تھے کہ ممدین نے تو اپنے اندر کی آگ اپنے بیٹے کے سینے میں منتقل کر دی لیکن اب اس کے بیٹے کے سینے میں جو جہنم سُلگ رہا ہے کیا وہ ضائع ہو جائے گا؟ ○

دوہے

ہوگی اِک دِن گھر مرے، پھولوں کی برسات
میں پگلا اس آس میں، ہنستا ہوں دن رات

کہاں مجھے لے آئی ہے، لمبے قد کی ہوڑ
اپنی بانہیں کاٹ کر، لیں ٹانگوں میں جوڑ

پیچیدہ ہیں راستے، گلیاں ہیں گنجان
گھر اپنا بھی ڈھونڈ، یہاں نہیں آسان

بھانڈا سب کے سامنے، دیا بھاگ نے پھوڑ
اولے اپنے گھر پڑے، برکھا چاروں اور

ڈھگ ڈھلان رستہ وکٹ، ساودھان انجان
گاڑی تیری کانچ کی، لوہے کا سامان

آخر مجھ پر کھل گیا، میرے دل کا راز
آئی ہے ہنستے سمے، رونے کی آواز

پلک جھپکنے ہی نہ دے، وقت کا ساگر گھاؤ
اب اعجاز یہ زندگی، مچھوارے کی ناؤ

بھگوانداس اعجاز

ڈی ۴۵۱، بلجیت نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۸

دو ہائیکو نظمیں

(۱)

اُف یہ سناٹا
کرمک تک کی سانسوں کو
ٹیلوں نے چاٹا

(۲)

ننھی سی مچھلی
دھارے کے مخالف کیوں کر
تیزی سے تیری

ناز قادری

مہدی حسن روڈ، مظفر پور ۸۴۲۰۰۳

توصیف علوی عاصی کیرانوی

مرزا احمد اختر

بہادر شاہ ظفر کے آسمان کے ان بہت سے ستاروں میں، جن پر تاریخ کے ایک عظیم انقلاب اور گردشِ دوراں کی بدلیاں مدتوں چھائی رہیں اور جو ایک عرصے تک گمنامی کے پردے میں چھپے رہے ان میں مرزا احمد اختر کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ ۱۸۵۷ء کی قیامتِ صغریٰ میں شاہی خاندان کے بہت سے افراد اور شہزادے تہہ تیغ کر دیے گئے، بچے کچھے اِدھر اُدھر روپوش ہونے پر مجبور ہو گئے۔ ان ہی میں سے ایک شہزادے مرزا احمد اختر تھے جو مدتوں ہندوستان میں نہ جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھانے کے بعد دہلی کے مضافات میں ایک تاریخی قصبے کیرانہ میں اپنی والدہ کے پاس آ گئے تھے۔ انھوں نے عمر کا بڑا حصہ یہیں گزارا اور یہیں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

شاہی خاندان کے ایسے بہت سے افراد کی اس قسم کی داستانوں کے سلسلے میں تاریخ خاموش ہے۔ سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ان کے حالات پر مدتوں پردہ پڑا رہا۔ فضا بدلنے اور انگریز کے دمن چکر کے سرد پڑنے پر ان میں سے کچھ لوگ سامنے آئے بھی تاہم سارے نہیں۔ ان لوگوں کے حالات مقامی اور علاقائی وسائل اور ذرائع پر منحصر ہو کر رہ گئے ہیں اس صورتِ حال نے ان لوگوں کے حالات کو روشنی میں لانے اور تاریخ کا حصہ بنانے کی بات بہت کچھ مقامی اہلِ علم اور صاحبانِ قلم کے ذوق و تجسس پر چھوڑ دی ہے۔

مرزا احمد اختر کے حالات کچھ تو ان کے موجودہ خاندانی افراد کی زبانی روایات، ان کے بزرگوں کی قلمی تحریروں اور ان کے سب سے بڑے صاحبزادے مرزا محمد اختر کے مرتب کیے ہوئے مطبوعہ "طغریٰ" اور کچھ مرزا احمد اختر کی تصنیف "کلیدِ حکمت" میں ملتے ہیں۔ "خمخانۂ جاوید" میں بھی لالہ سری رام نے اختر کیرانوی کے نام سے بہ طور شاعر ان کے کچھ مختصر حالات اور کلام دیا ہے۔

مرزا احمد اختر شہزادہ فخر الملک دارا بخت میران شاہ کے صاحبزادے تھے، جو آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے ولی عہدِ اوّل تھے مگر ان کا انتقال شاہ ظفر کی زندگی میں ۱۸۴۹ء میں ہو گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی معرکہ آرائی اور خوں ریزی میں جب حالات یہاں تک پہنچے کہ بہادر شاہ اور زینت محل قید کر لیے گئے، شہزادے شہید کر دیے گئے، اور شاہی خاندان کے باقی افراد کے لیے بھی دہلی میں پناہ کی کوئی صورت نہ رہی۔ تو جس کے جہاں سینگ سمائے وہ ادھر نکل گیا۔ مرزا دارا بخت کی بیگم ملکہ مہر النساء یعنی مرزا احمد اختر کی والدہ نے مولانا محمد حسین کیرانوی کے ہمراہ جو ان کے بچوں کے اتالیق تھے کیرانہ کا رُخ کیا اور یہ لوگ چھپتے چھپاتے لونی، باغپت، بڑوت اور جھیر ولی وغیرہ مختلف مقامات پر پناہ لیتے ہوئے کیرانے پہنچے اور وہاں محلہ خیل کلاں میں قیام پذیر ہوئے۔ کیرانہ یو پی کا ایک دور افتادہ قصبہ ہے اور نہایت پُر امن اور پُر سکون جگہ ہے۔

مرزا احمد اختر ہمایوں کے مقبرے سے جہاں شاہی خاندان پناہ گزین ہوا تھا، اپنی والدہ کے ہمراہ فرار نہیں ہوئے اور کسی مصلحت کے تحت دوسری طرف کا رُخ کیا وہ بیت بھوپال گئے کچھ عرصہ وہاں قیام کیا پھر دہلی سے کچھ اور دور ہو جانے کا ارادہ کیا اور کہا جاتا ہے کہ وہاں سے مہاراشٹر کی طرف نکل گئے اور ہندوانی وضع قطع اختیار کر کے ایک مشہور عالم پنڈت بھاسکر راو کی شاگردی اختیار کی۔ برسوں اس کے حلقۂ تلامذہ میں رہے مختلف علوم سنسکرت، جوتش، طب یونانی، رمل اور جفر حاصل کیے اور وہاں سے اس وقت کے ایک اچھے عالم ہو کر نکلے۔ غدر کے بعد سے مرزا کی اس دربدری کا زمانہ ان کے خاندانی افراد کی روایات اور اس سلسلے کے کچھ دوسرے شواہد کی روشنی میں کوئی ۱۶۔۱۷ سال کے قریب ہے اور یہی زیادہ قرین قیاس ہے۔ تاہم "خمخانۂ جاوید" کے مولف کے مطابق مرزا احمد اختر غدر کے بعد پچیس تیس برس تک خوفِ دار و گیر سے گمنامی میں بسر کرتے رہے۔

بعد ازاں مرزا موصوف کو والدہ کی جستجو کا خیال آیا۔ انھیں یاد تھا کہ ان کی والدہ ان کے اتالیق مولانا محمد حسین کے ہمراہ گئی تھیں اس لیے یقیناً کیرانہ پہنچی ہوں گی چناں چہ مرزا احمد اختر سادھو کے بھیس میں کیرانے پہنچے محلہ بساطیان میں اس وقت کے مشہور حکیم محبوب الٰہی صاحب سے ماں سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

علوی منزل، رائے رانا، ضلع مظفر نگر (یو پی)

حکیم صاحب نے ان سے مزید معلومات کیں اور جب انھیں یقین ہو گیا کہ وہ گردشِ دوراں کے شکار مرزا احمد اختر ہیں تو انھوں نے انھیں ان کی والدہ کا پتا بتا دیا اور اس طرح مرزا مدتوں ٹھوکریں کھانے کے بعد اپنی والدہ سے مل گئے۔ بعد ازاں یہیں مستقلاً قیام پذیر ہو گئے۔

مرزا احمد اختر کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی شادی غالباً دہلی میں اور شاہی خاندان میں ہوئی۔ پہلی بیوی کے بطن سے ایک صاحبزادے مرزا محمد اختر عرف محبت شاہ ہوئے پہلی بیوی کے انتقال کے بعد اس صاحبزادے کو ان کی نانی عالم آرا بیگم نے متبنّٰی بنا لیا اس لیے مرزا محمد اختر کی دہلی میں ان کی نانی کے زیرِ سایہ پرورش اور تعلیم و تربیت ہوئی مرزا احمد اختر کی دوسری شادی کیرانے میں ہوئی اور اس سے ان کے دو لڑکے مرزا محمد شاہ اور مسعود شاہ اور تین لڑکیاں احمدی بیگم، صغریٰ بیگم اور فاطمہ بیگم ہوئیں۔ ان کی اولاد کا سلسلہ موجود ہے جن میں سے کچھ کیرانے اور آس پاس آباد ہیں۔ اور کچھ پاکستان ہجرت کر گئے۔ اس سلسلے کے شواہد میں وہ طغرے خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں جو کچھ ان کے صاحبزادے مرزا محمد اختر نے تیار کیے تھے اور کچھ مرزا محمد اختر کی نانی عالم آرا بیگم کو شاہی تبرکات کے طور پر ملے تھے۔ یہ سب مطبوعہ ہیں۔ ان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ احمد اختر اور محمد اختر دونوں تاریخی نام ہیں اس حساب سے مرزا احمد اختر کی تاریخِ پیدائش ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۳۸ء ہے اور مرزا محمد اختر کا سنِ ولادت ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۵ء ہے جس کے معنی ہیں کہ مرزا محمد اختر غدر سے ۱۸ سال بعد پیدا ہوئے۔ مرزا احمد اختر کا انتقال ۱۰ فروری ۱۹۱۰ء کو کیرانے ہی میں ہوا اور یہیں "پیر ہالا" عرف "نوگزہ" نامی قبرستان میں مدفون ہوئے۔ تقریباً ۷۲ سال کی عمر پائی۔

مرزا احمد اختر نے مشرقی علوم کی تعلیم تو شہزادگی کے زمانے میں قلعۂ معلّٰی میں حاصل کی اور خانہ بدوشی کے دوران مہاراشٹر کے علاقے میں پنڈت بھاسکر راؤ سے ہندوستانی علوم ویدک، جوتش، سنسکرت وغیرہ سیکھے اسی لیے وہ علم و فضل میں دو آتشہ ہو گئے تھے طباعت اور معالجات میں تو انھیں بہت ہی مہارت اور کمال حاصل تھا۔ کیرانے میں آکر انھوں نے طباعت کا پیشہ ہی اختیار کیا۔ اس فن پر انھوں نے ایک کتاب بھی کلیدِ حکمت کے نام سے لکھی جس کا ایک آدھ نسخہ اب بھی دستیاب ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ مرزا احمد اختر بہت بڑے نبّاض تھے۔ نبض کے سلسلے میں انھوں نے اس کتاب میں تقریباً ۲۳ فصلوں میں بحث کی ہے مرزا احمد اختر حکمت اور ویدک کے علاوہ جوتش، رمل، جفر، عملیات اور تعویذات سے بھی علاج کرتے تھے۔ عملیات کے سلسلے میں انھوں نے اپنی اس کتاب میں باقاعدہ ایک علاحدہ باب دیا ہے جس میں ہر مرض کے لیے ہندوانی عقائد کے اعتبار سے مختلف جاپ اور خیرات کے لیے مختلف اناج تجویز کیے ہیں اور مسلمانی عقائد کی روشنی میں قرآن پاک کی مختلف سورتوں کے ختم، طرح طرح کے وظائف، مختلف نیازیں اور فقیروں میں تقسیم کرنے کے لیے مختلف کھانے تجویز کیے ہیں۔ غرض یہ کہ معالجات کی دنیا میں ان کا یہ طریقِ کار بالکل ایک نادر مثال ہے۔

مرزا احمد اختر علم و ادب، فکر و فن اور شعر و سخن کے میدان میں بھی ایک ممتاز مقام کے حامل تھے۔ تصنیف و تالیف سے خاص شغف تھا انھوں نے مختلف موضوعات پر تقریباً بیس بائیس کتابیں تصنیف کی تھیں اپنا ایک کتب خانہ "مطبع العلوم تیموری" قائم کر رکھا تھا جو کتابوں کا ایک اچھا ذخیرہ تھا۔ یہیں سے ان کی تصنیفات اور تالیفات شائع ہوتی تھیں ان میں سے کچھ ذخیرہ کتابوں کا اب تک بھی صندوقوں میں موجود بتایا جاتا ہے مگر وہ ان کے خاندان کے بعض ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو اسے نہ خود دیکھ سکتے ہیں نہ دکھا سکتے ہیں۔ مرزا اختر کو تصوف سے بھی بہت رغبت تھی۔ چشتیہ سلسلے کے ایک بزرگ شاہ غلام فرید چشتی پیر چاچڑاں (پنجاب) سے بیعت تھے۔ بڑے باوضع، خلیق،...... شریف النفس اور فقیر منش انسان تھے" خمخانۂ جاوید" کے مؤلف رقم طراز ہیں:

" سرکار سے کبھی معمولی وظیفے کے بھی روادار نہ ہوئے۔ چند احباب خیر سگال کی کوشش اور ان کی مصنفہ و مؤلفہ کتب طب اور تصنیف کی بنیاد پر صاحب بہادر کمشنر دہلی نے دس روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی تھی آپ کی ذاتِ مجمع الصفات، شرافت، اخلاق و ہمدردی خلائق کا مجموعہ ہے۔ طبیعت فقر کی طرف زیادہ مائل ہے اور اسباب آسائش سے متنفر۔ شہزادگی کے اظہار سے گھبراتے ہیں۔ تصوف کی بعض نادر الوجود کتابیں آپ نے فراہم کر کے چھپوائی ہیں۔ سوانح دہلی کے کئی رسالے آپ کی تالیف سے شائع ہو چکے ہیں"۔

جہاں تک مرزا کی شاعری اور ذوقِ سخن کا تعلق ہے وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے ان کے کتابی ذخیرے سے ان کا پورا کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔ فارسی

کلام میں ان کی ایک نظم ان کی کتاب "کلید حکمت" سے لی ہے جس میں انھوں نے فنِ نباضی پر نہایت سیر حاصل روشنی ڈالی ہے اور نبض کی مختلف علامتوں کی وضاحت کی ہے۔ یہ نظم اکتیس ۳۱ شعروں پر مشتمل ہے بطور اقتباس ان چند شعروں سے اس نظم کے مزاج کا پتا چلتا ہے:

بقول حکیمانِ ہندی نژاد
بگویم ترا نبض اے خوش نہاد
اگر رگ برفتارِ زاغاں رود
یقین است از محض تلخ بود
وگر چوں فرس یا چو گردوں دود
بر تعجیل یا مثل غوکاں جہد
بطی نبض باشد و ساکن جہد
یقین دان ز بلغم خبر مید ہد
دراز خون تلخہ بہ پُرسی نشاں
علامات پنہاں بگویم بداں
اگر رگ برفتار افعی بود
زباد و ز بلغم ز تلخہ بود
سلیم است گر احمد اختر ذہن
کفایت کنند ایں مقالات فن

ان کے بڑے صاحبزادے مرزا محمد اختر کے مطبوعہ طغروں میں ان کا فارسی کا ایک نعتیہ قطعہ اس طرح ہے:

الصلوٰۃ اے حامد و محمود رب العالمین
والسلام اے احمد مرسل شہ دنیا و دین
بچوں نظر گاہِ تو یکساں نست در نزدیک و دور
غم ندارم گرچہ دورم از سر یثرب زمین

اردو میں مرزا غزل گوئی کا زیادہ شوق رکھتے تھے۔ زبان و بیان میں اپنے دادا شاہ ظفر کا انداز ہے ابتدائی کلام میں اگرچہ روایتی انداز اور تغزل کی جھلک زیادہ تھی تاہم بعد ازاں اس میں حالات کی تلخیوں کی آمیزش ایک فطری عمل تھا۔ اس سلسلے کی شاعری کے "خمخانۂ جاوید" میں دو اقتباس ملتے ہیں جن سے ان کے اندازِ بیان اور فکر و تخیل کی عکاسی ہوتی ہے۔

○ ایک غزل کے دو شعر:

تم ذرا چشم فسوں گر سے اشارہ کر دو
ابھی ہو جاتی ہے بیمار کی حالت اچھی
کر کے اک آہ وہیں رہ گئے احمد اختر
چلتی پھرتی جو نظر آئی صورت اچھی

○ ایک اور غزل جس میں رنگ تغزل کے ساتھ زندگی کی تلخیاں اور کرب بھی جھلک رہا ہے:

بسا جاتا ہے نظروں میں کھبا جاتا ہے آنکھوں میں
نظر لگ جائے گی دیکھو سنبھالو اپنے جوبن کو
ہر ایک ہے داستاں اپنا کسے تھامیں کسے روکیں
تمہارے ابھرے جوبن کو تمہاری کالی چتون کو
ہمیں ہیں اے فلک جن کا سلامی ایک عالم تھا
ہمیں ہیں کفش برداری تھی جن کی فخر ہمن کو
یہی ہم ہیں کہ شکل خار افتادہ ہیں صحرا میں
یہی ہم ہیں کہ شکل گل تھی زینت ہم سے گلشن کو
ہمارا ایک دل اختر کسے بیچیں کسے سونپیں
کسی کی چشمِ قتال کو کسی کی بانکی چتون کو

مرزا احمد اختر کی اردو شاعری کے کچھ نمونے ان کے صاحبزادے مرزا محمد اختر کے ان مطبوعہ طغروں میں بھی ملتے ہیں جن کا ذکر اس سے پہلے کیا جا چکا ہے۔ ایک شعر میں مرزا نے اپنے تیموری نسب کی جانب اشارہ کیا ہے۔

احمد اختر نام ہے میرا یہ ہے میرا نسب
پوتا ہوں انیسواں میں حضرت تیمور کا

انھیں طغروں میں مرزا کی ایک غزل کے چند شعر بھی ہیں جن میں انھوں نے اپنی زندگی کی افتاد اور تلخیوں کو نہایت ہی پُر سوز انداز سے ظاہر کیا ہے۔ یہ اشعار ان کے جذبات اور احساسات کا پوری طرح آئینہ ہیں:

کوئی پوچھے سکندر سے کہاں وہ قصرِ عالی ہے
بتا تربت پہ اب حاضر کوئی حالی موالی ہے
حیا آتی ہے یہ کہتے ہوئے ہم شاہزادے ہیں
فلک نے اس طرح کی کچھ مصیبت ہم پہ ڈالی ہے
غلام اوروں کے بن کر بھی رہے ہم صاحب عالم
ہماری شانِ بربادی بھی دنیا سے نرالی ہے
ہمارے اوج کی شہرت تھی دنیا میں مگر اب تو
زمانے کے لیے عبرت ہماری پائمالی ہے
الٰہی عفو ہو جائیں خطائیں ہم غریبوں کی
بہت کچھ ٹھوکریں کھا لیں سزا بھی خوب پالی ہے

آخری دور میں ان کی طبیعت پر صوفیانہ رنگ زیادہ غالب آگیا تھا شعر کہنا کم کر دیا تھا "خمخانۂ جاوید" کے تذکرہ نویس لکھتے ہیں۔ یہ مرزا کے اسی دور کا ذکر ہے:

"شعر گوئی کا ذوق پہلے کے برابر نہیں رہا۔ اگر کچھ لکھتے ہیں تو وہ اکثر بزرگانِ دین کی تعریف میں ہوتا ہے۔ دیوان بھی ترتیب نہیں دیا۔"

یہی وجہ ہے کہ اس دور کا کلام نایاب ہے بہ ہزار کوشش کوئی نمونہ دستیاب نہیں ہو سکا۔

مرزا احمد اختر کے سوانح اور علم و فن کے سلسلے میں یہ ایک مختصر سا خاکہ ہے۔ بہت سے گوشے تشنہ رہ گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ہماری تاریخ، غدر کے بعد اس باب میں خاموش ہے۔ انگریزی دور میں اس کی وجہ ظاہر تھی لیکن اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہمارے تاریخ داں اور اہلِ قلم اس طرف پوری طرح توجہ مبذول کریں اور اس سلسلے کی تمام بکھری ہوئی اور گم شدہ کڑیوں کو ڈھونڈ نکالیں۔

خسرو متین

روشنی کا کرب

دوڑتے دوڑتے اس کے ہاتھ پیر شل ہو گئے۔ جسم کا جوڑ جوڑ دکھنے لگا مگر وہ اپنے گرد و پیش کے ماحول سے بے خبر بے تحاشا دوڑ رہا تھا۔ ارجن کی طرح اسے صرف چڑیا کی آنکھ نظر آرہی تھی اور وہ آنکھ تھی ——— ایک روشنی کا ہالہ ——— ! جو اب بھی اس کی دسترس سے باہر تھا اور مختلف رنگ بدل بدل اس کے جذبۂ شوق کو اُبھار رہا تھا۔

اس نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو ایک عجیب سی دھند میں گھرا ہوا پایا۔ جیسے کسی نے اُجالے کے چہرے پر اندھیرا مل دیا ہو۔ اس اندھیرے میں ایک گھٹن تھی۔ جس میں ہر شئے گھٹ کر رہ گئی تھی۔ اُسے اپنی سانس بھی گھٹی گھٹی محسوس ہوتی۔ وہ اپنے ساتھیوں کے چہروں پر نظریں دوڑاتا مگر وہاں بھی اُسے سوائے اندھیرے کے کچھ نظر نہ آتا۔ اس اندھیرے میں ان کے چہروں کے نقوش کو دُھندلا دیا تھا۔ وہ اپنے اس کرب اور بے چینی کا اظہار کرنا چاہتا مگر جذبوں کو الفاظ نہ ملتے۔

ایک روز کسی اجنبی آواز نے اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔

"اس اندھیرے کے باہر ایک تیز روشنی ہے۔ تم اگر چاہو تو اس روشنی کو حاصل کر سکتے ہو۔ مگر ——— نہیں، تم تو اس اندھیرے کے باسی ہو۔ تمہارا روشنی سے کیا تعلق۔؟ تم اس اندھیرے میں گھٹ کر مر جاؤ گے۔ یوں ہی مر جاؤ گے۔"

"نہیں ——— نہیں میں اس اندھیرے میں مرنا نہیں چاہتا۔ اس اندھیرے میں میرا دم گھٹتا ہے۔ میں روشنی حاصل کروں گا۔"

اجنبی آواز نے اس کے احتجاج پر قہقہہ لگایا اور گم ہو گئی۔

اُسے یاد آیا۔ بچپن میں اس کے باپ نے بھی یہی بات کہی تھی۔

"بیٹا! اس اندھیرے کے باہر ایک تیز روشنی ہے جو اندھیرے کا چاروں طرف سے احاطہ کیے ہوتے ہے مگر یہ اندھیرا اس قدر گاڑھا اور کثیف ہے کہ ہم تک ——— روشنی کی صرف موہوم کرنیں ہی پہنچ پاتی ہیں۔"

اور ——— ایک دن اس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ اندھیرے کے ان دبیز پردوں کو چاک کر دے گا اور باہر کی تمام روشنی سمیٹ کر اپنی دُنیا میں لے آئے گا۔ وہ بھی دوسروں کی طرح کھلی اور صاف فضا میں سانس لے سکے گا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے بھی روشن مناظر ہوں گے۔ وہ بھی اپنے ساتھیوں کے چہروں پر لکھی ہوئی تحریریں پڑھ سکے گا۔ مگر، باوجود کوشش کے وہ اپنی اس خواہش کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ روشنی اور اندھیرے کے بیچ حائل ان دبیز دیواروں کو توڑنا اس کی قوت سے باہر تھا۔

اچانک، ایک دن، اس اندھیرے میں روشنی کا ایک جھماکا ہوا۔ ایک لمحے کے لیے ہر شئے روشن اور منور ہو گئی۔ اُسے خود اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ شاید کہیں سے اندھیرے کی دیوار گر گئی تھی۔ وہ حیران حیران سا یہ منظر دیکھتا رہا۔ یکایک اس کے کانوں میں اُسی اجنبی آواز نے سرگوشی کی۔

"جاؤ! روشنی تمہارے سامنے ہے۔ اگر تم میں ہمت ہے تو اس کو پکڑ لو۔ اور اپنی تمام آرزوؤں اور خواہشات کو عملی جامہ پہنا لو۔"

وہ بے تحاشہ روشنی کی طرف دوڑنے لگا۔ گندہ اور کثیف اندھیرا چھٹنے لگا۔ ہلکی ہلکی روشنی میں اس کا سارا وجود نہا گیا۔ سامنے روشنی کا ایک خوبصورت دریا بہہ رہا تھا۔ اس نے چاہا کر دوڑ کر اس دریا میں چھلانگ لگا دے اور ہمیشہ کے لیے اپنے آپ کو روشن اور تابناک بنا لے مگر بہت سے چھوٹے بڑے پتھروں نے اس کی راہ روک لی۔ وہ لاکھ کوشش کے باوجود اپنے آپ کو ان پتھروں سے نہ بچا سکا اور ٹھوکر کھا کر زمین پر آ رہا۔ چند لمحوں کے لیے وہ حواس

۲۴۹، کلیان واس، دہلی ۱۱۰۰۹۱

باختہ ہوگیا۔ زمین و آسمان تیزی سے گھومتے نظر آئے اور جب اس نے اپنے آپ کو سنبھالا تو روشنی کا دریا اس سے بہت آگے نکل چکا تھا۔ کانوں میں وہی اجنبی آواز قہقہوں کا زہر گھول رہی تھی۔ اب نہ وہاں روشنی کا دریا تھا اور نہ وہ چھوٹے بڑے پتھر —— چاروں طرف وہی اندھیرا تھا، وہی گھٹن تھی۔

اس نے ایک بار پھر اپنی قوت اور حواس کو یکجا کیا اور پھر اسی سمت دوڑنا شروع کر دیا۔ دھیرے دھیرے اندھیرا کم ہونے لگا اور روشنی بڑھنے لگی۔ سانسوں میں تازگی اور توانائی کا احساس جاگا۔ کچھ فاصلے پر مختلف رنگ کی روشنیاں تھرک رہی تھیں۔ بڑا ہی حسین اور پُر کیف منظر تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے مبہوت سا ہوگیا۔ دھیرے دھیرے روشنی کے سحر نے اس کے دل و دماغ پر قبضہ کرلیا۔ وہ راہ کے پتھر کی طرح جامد و ساکت کھڑا ہوگیا۔ اجنبی آواز نے اس کو جھنجھوڑا۔

"کم ہمت انسان!!"

نہ جانے ان الفاظ میں کیسا جادو تھا۔ اس کا پتھر سا وجود موم کی مانند پگھل گیا۔ اس نے آگے کی طرف قدم بڑھانا چاہا مگر اگلے ہی پل وہ روشنیاں غائب ہوگئیں اور وہی ازلی اندھیرا چھا گیا۔

اس اندھیرے میں اب اُسے پہلے سے بھی زیادہ گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ روشنی پانے کے لیے اور بھی زیادہ بیتاب ہوگیا۔ اب وہ ہر قیمت پر روشنی کو پالینا چاہتا تھا۔ اب روشنی کے بغیر اس کی زندگی موت سے بھی بدتر تھی۔ موت جو کہ ہر انسان کا مقدر ہے: مگر وہ ایسی موت مرنا نہیں چاہتا تھا، جو ہر سانس کے ساتھ اس کے وجود کو ریزہ ریزہ بکھیر دے۔

اور —— ایک بار پھر اس نے اسی سمت بے تحاشا دوڑنا شروع کر دیا جہاں کچھ دیر قبل روشنی کی حسین شہزادیاں رقص کر رہی تھیں۔ وہ اندھیرے میں راستے کی رکاوٹوں کی پروا کیے بغیر بے تحاشہ دوڑتا رہا۔ دوڑتا رہا۔ آخر اسے روشنی کی کرن نظر آ ہی گئی۔ دھیرے دھیرے یہ روشنی کی کرن تیز روشن ہالے میں تبدیل ہوگئی۔ دونوں کا درمیانی فاصلہ تیزی سے گھٹنے لگا اور صرف ایک قدم رہ گیا، صرف ایک قدم۔ سامنے اس کی تمناؤں کی دُنیا روشنی کی شکل میں کھڑی ہوئی تھی۔ وہ صرف ایک لمحے میں اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کو اپنی مٹھیوں میں بھر سکتا تھا۔

یکایک اس کے اور روشنی کے درمیان پھولوں کا ایک حسین اور دلفریب تختہ اُبھر آیا۔ خوش رنگ اور ننھے ننھے پھول اس کی طرف مُسکرا کر دیکھ رہے تھے۔ اجنبی آواز نے سرگوشی کی۔

"جاؤ! تمھارے خوابوں کی منزل تمھارے سامنے ہے۔ صرف ایک قدم کا فاصلہ ہے۔ ان خوش نما اور ننھے ننھے پھولوں کو اپنے قدموں تلے روند ڈالو اور روشنی کو اپنی بانہوں میں بھر لو۔ بڑھاؤ اپنے قدم ہمت سے کام لو صرف ایک قدم کا فاصلہ ہے، صرف ایک قدم!!"

اس نے اپنا پاؤں آگے بڑھانا چاہا مگر کسی جذبے کے تحت واپس کھینچ لیا۔ ان ننھے ننھے پھولوں کو روند کر آگے بڑھنا اس کی قوت سے باہر تھا۔

روشنی کا ہالہ اب دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا اور پھر اس نے اپنی سمت تبدیل کرلی۔ اب اس کے اور روشنی کے درمیان پھولوں کا تختہ نہ تھا۔ اب وہ دوڑ کر روشنی کو پکڑ سکتا تھا۔ اس نے پھر دوڑنا شروع کر دیا مگر یہ کیا ——؟ وہ جتنا آگے بڑھتا، روشنی کا ہالہ اس سے اتنا ہی آگے بڑھ جاتا۔ وہ اپنی چال دھیمی کرتا تو روشنی کے ہالے کی رفتار بھی سُست پڑ جاتی۔ اس آنکھ مچولی میں کتنا وقت گزر گیا، اسے کچھ پتا ہی نہ چلا۔ دھیرے دھیرے وہ اس کھیل سے اُکتا سا گیا۔ ہمت بھی جواب دینے لگی مگر روشنی پانے کی آرزو نے اسے رُکنے نہ دیا اور جب اس میں ایک قدم چلنے کی بھی قوت نہ رہی تو وہ چند لمحے تازہ دم ہونے کے لیے رُکا۔ روشنی کا ہالہ بھی اس سے تھوڑے فاصلے پر رُک گیا اور مختلف رنگ بدل بدل کر اس کے جذبۂ شوق کو اُبھارنے لگا۔

اُس نے ایک بار پھر اپنی تمام قوت کو یکجا کرکے روشنی کو پکڑنا چاہا مگر چند قدم بعد ہی ہمت نے جواب دے دیا اور وہ وہیں سے بیٹھا بیٹھا روشنی کو حسرت سے تکنے لگا۔ دھیرے دھیرے وہ تیز روشنی معدوم ہوتی چلی گئی اور پھر وہی اندھیرا چھا گیا۔

زندگی کے اس دوراہے پر کھڑا وہ سوچ رہا تھا۔ یہ اندھیرا میرا مقدر نہیں ہو سکتا، مگر یہ روشنی بھی مجھے نہیں مل سکتی۔

ایک عجیب کشمکش!

ایک مسئلۂ لاینحل!!

ایک لامحدود کرب!!!

وہ سوچتا رہا، سوچتا رہا۔ اور اسی سوچ میں گم ہوگیا۔

○

غزلیں

جرّار چھولسی

وہ روشنیٔ چہرۂ زیبا کہاں سے لاؤں
اب شامِ زندگی ہے اُجالا کہاں سے لاؤں

احساسِ غم، شعورِ تباہی نہ ہو جسے
اے حادثو! وہ دل وہ کلیجا کہاں سے لاؤں

وہ منتظرِ گزارشِ پیہم کرے کوئی
میں مضطرب، زبانِ تقاضا کہاں سے لاؤں

بیٹھا ہوا ہوں انجمنِ ناشناس میں
اے فن! میں آج تیرے شناسا کہاں سے لاؤں

ہر چند بزمِ عالمِ امکاں ہے دیدنی
میں فرصتِ نگاہِ تماشا کہاں سے لاؤں

"بزمِ ساز و ادب" بی۔ ۲۸، طبیہ کالج، قرول باغ، نئی دہلی ۵

ہجومِ سنگ میں ہیں، دل کا آئینہ دے کر
صنم خرید لیے ہیں تجھے خدا دے کر

ہماری راہ میں کانٹے وہی بچھاتے ہیں
ہٹے تھے راہ سے ہم جن کو راستہ دے کر

جو ماں سمجھ نہیں سکتی ہے جنگ کا مفہوم
وہ اپنے بیٹے کو رُخصت کرے دُعا دے کر

نہیں ہے عکس کوئی اک تری طلب کے سوا
کیا ہے شیشۂ دل آئینہ جلا دے کر

مرے سفینے کو ساحل ملے کہ غرقابی
میں اب پکاروں گا کس کو تجھے صدا دے کر

حیاتؔ اہلِ وفا مانگ ہی نہیں سکتے
کرم کی بھیک، محبت کا واسطہ دے کر

سیّد حیات وارثی

باغ مولوی انوار، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۳ (یو۔پی)

آزاد گورداسپوری

کس درجہ المناک ہے آواز کا عالم
پوچھے نہ کوئی ٹوٹے ہوئے ساز کا عالم

کیا کہیے کسی پیکرِ صد ناز کا عالم
سرتا بہ قدم ایک حسیں راز کا عالم

منجدھار میں جیسے کسی کشتی کا لرزنا
صحرا میں وہ دیوانے کی آواز کا عالم

جیسے سرِ اورنگ کوئی شاہِ جہاں دار
ہے دار پہ وہ ایک سرافراز کا عالم

ہر سانس ہے جیسے کوئی چلتا ہوا خنجر
آزادؔ یہ ہے درد کے آغاز کا عالم

کوارٹر نمبر ۴، بلاک نمبر ۵۲/۱۴، روڈ نمبر ۱۷، آدتیاپور، جمشید پور

رضا نقوی واہی

طرحی مشاعرے

آنہ پائی کے حساب کے زمانے میں شاہنامۂ فردوسی کے اشعار بھی گنے گئے اور دیوانِ میر کے نقطے بھی۔ پتا لگانے والوں نے زبانِ اردو کے شاعرِ اول کا بھی سراغ پالیا؛ لیکن یہ امر باعثِ حیرت ہے کہ اب تک یہ نہ معلوم ہو سکا کہ طرحی مشاعروں کا موجد کون تھا اور اس عجیب و غریب ایجاد کی داغ بیل کس سن، کس تاریخ اور کس ساعت میں پڑی۔ آج جب کہ کمپیوٹر کی سہولت میسر ہے، بہت ممکن ہے کہ کوئی محقق اپنے سمندِ جستجو کی باگ اس اچھوتے میدان کی طرف بھی موڑ دے۔ تحقیقی مقالے لکھنے والوں سے زیادہ لکھوانے والوں کی بے تحاشہ دوڑ کے زمانے میں یہ امر بعید از قیاس بھی نہیں۔ اگر ایسا کیا گیا تو صنفِ تحقیق کسی حد تک اس الزام سے بری ہو جائے گی جو ماضی قریب میں اردو تنقید پر لگایا گیا تھا کہ اس کا وجود "معشوق کی موہوم کمر" ہے یا "اقلیدس کا فرضی نقطہ"۔ اس تحقیق سے ایک ماہرِ نفسیات کو طرحی مشاعروں کے موجد کی دماغی ساخت پر روشنی ڈالنے میں بھی مدد ملے گی۔

بہرکیف ان طرحی مشاعروں سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ لغت مرتب کرنے والوں کی آمدنی میں اضافے کی صورت نکل آئی۔ غزل کی قبائے تنگ کے لیے ہر قسم کے قافیے اور کہاں ملتے ؟ دوسرے یہ کہ شعرا میں جذبۂ تقابل و تسابق کی وجہ سے مشاعروں میں گہما گہمی، سامعین کی دلچسپی کا سبب بنی۔ شعرا کے ساتھ ساتھ سامعین بھی مختلف ٹولیوں میں بٹ گئے۔ کبھی ایطائے جلی اور ایطائے خفی کی بحثیں ہیں تو کبھی شترگربہ پر گرفت۔ کبھی کسی لفظ کے گرنے پر اعتراض تو کبھی تقطیع کی گردان۔ یہ سب مناظر جنھیں عرفِ عام میں شاعرانہ چشمک کہتے ہیں اور کہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات یہ چشمکیں میدانِ کارزار کا نمونہ پیش کرتیں۔ کبھی مصرعے لڑ جاتے، کبھی اشعار لڑ جاتے اور کبھی یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ غزلیں بھی لڑ جاتیں۔ کبھی یہ بھی ہوا کہ آپس میں شعرا لڑ جاتے۔

جب ایوانِ قانون ساز میں معمولی سی لغزش بھی ہنگامے کا سبب بنتی ہے تو پھر طرحی مشاعروں کو مطعون کرنے کا کیا جواز؟ ایک صحت مند جمہوری نظام میں تو حزبِ مخالف کا ہونا لازمی قرار دیا گیا ہے۔

شاعروں اور غزلوں کے لڑ جانے کے ذکر میں دو مشاعروں کا حال بھی سن لیجیے۔ ان دونوں مشاعروں کا تعلق ہمارے شہرِ عظیم آباد سے ہے۔ ایک طرحی مشاعرہ تھا۔ ایک صاحب نے غزل شروع کرنے سے پہلے یہ دعویٰ کیا "اگر کوئی صاحب ایسا مطلع کہنے کی جرأت کریں تو انھیں سیر دل خون تھوکنا پڑے۔" دوسرے صاحب نے سوال کیا "آپ کو کتنا خون تھوکنا پڑا ؟" یہ دونوں حضرات دو آتشہ کے نشے سے سرشار تھے۔ یعنی اول تو شاعری کا نشہ تھا، دوسرے اُس شئے کا خمار جو نشہ آور ہوتی ہے۔ فرق اتنا تھا کہ اول الذکر ٹھرے کے عادی تھے اور موخر الذکر تاڑی کے رسیا۔ اس نوک جھونک نے سمندِ غیرت پر تازیانے کا کام کیا۔ گالی گلوچ کے بعد لپاڈگی کی نوبت آگئی۔ منہ کی بات یہ کہ دونوں شعرا اور سامعین کے بیچ بچاؤ کرنے کے بعد دونوں گلے مل کر رونے لگے۔

اب دوسرے مشاعرے کا حال سنیے

ایک مشاعرے میں حضرت جگر مرادآبادی کی غزل سے ایک نوجوان شاعر کی پوری غزل لڑ گئی۔ جب حضرتِ محفل جگر صاحب نے ٹوکا کہ یہ تو میری غزل پڑھی جا رہی ہے، جو دلی ریڈیو سے ایک ماہ قبل نشر کی جا چکی ہے، تو نوجوان شاعر نے ابرو پر بل ڈال کے کہا کہ خاموش رہیے آپ مجھے درمیان میں ٹوک کر میری توہین کر رہے ہیں۔ اس کے بعد پوری غزل ترنم سے سنائی اور یہ کہتا ہوا مشاعرہ گاہ سے واک آؤٹ کر گیا کہ آج کل کے بڑے شعرا نئے شاعروں کے منہ آتے ہیں اور یہ نہیں چاہتے کہ ان کے چراغ کے مقابل دوسروں کا چراغ بھی جلے۔ اصل واقعہ یہ تھا کہ نوجوان شاعر کے ایک دوست نے ریڈیو پر جگر کی غزل سنی تھی جس کے تقریباً کل اشعار انھیں یاد تھے۔ اس غزل کو لکھ کر نوجوان شاعر کو یہ کہتے ہوئے دے دیا تھا کہ تازہ غزل ہے، ذرا جم کر مشاعرے میں پڑھنا۔ جب دوسرے دن بیچارے شاعر کو اصل حقیقت معلوم ہوئی تو پھر کیا تھا، اپنے دوست کے گھر جا کر زبانی تکرار کے بعد دھینگا مشتی پر اُتر آیا۔

اب مشاعروں کے آپس میں لڑ جانے کی مثال پیش ہے۔ میرے دوست اور نبیرۂ شاد عظیم آبادی، بہزاد فاطمی نے اپنی کتاب "یہ فسانہ زلفِ دراز کا" میں لکھا ہے کہ شعرا کی

واہی روڈ، 14/5 گردنی باغ، پٹنہ

رقابت کی وجہ سے بہ یک وقت ایک ہی زمین اور ردیف قافیے میں مصرعِ طرح بدل کر مشاعرے ہونے لگے۔ ایک مشاعرے کی طرح تھی "ان کو معلوم نہیں رسم محبت کیا ہے" اور اُسی روز اُسی وقت جو دوسری جگہ مشاعرہ ہوا اُس کی طرح تھی "بزمِ اغیار میں جانے کی ضرورت کیا ہے"۔ ادھیڑ عمر کے ایک شاعر تھے کلو میاں مختصرؔ۔ انھوں نے دونوں مصرعوں کو ملا کر اپنی غزل کا مطلع تیار کر لیا اور بڑے ٹھکنے سے مشاعرے میں پڑھ کر داد وصول کرلی۔ مطلع اس طرح ہو گیا:

ان کو معلوم نہیں رسم محبت کیا ہے
بزمِ اغیار میں جانے کی ضرورت کیا ہے

جہاں تک ان طرحی مشاعروں کی گہما گہمی کا تعلق ہے تو ایک تصویر ازقلم پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ ملاحظہ فرمائیے:

یہ طرحی مشاعرہ ـــــ "روزِ آدینہ وقت شام نواب بلیغ الدولہ بہادر کی گلابی بارہ دری میں" قرار پایا تھا جو عروس البلاد شہر لکھنؤ میں واقع ہے۔ مصرعِ طرح یہ تھا:

ہم سے اُس شوخ نے عیاری کی

"شعرا اور سامعین کھچا کھچ بھرے ہیں۔ کہیں تل رکھنے کی جگہ نہیں۔ تھالی اچھالیے تو سر ہی سر جائے۔ بغرض کہ جب رات بھیگی اور چاندنی خوب نکھری، مشاعرہ شروع ہوا ـــــ شاعر نے پورا شعر بھی نہیں پڑھا کہ یار لوگ لے اُڑے ـــــ ایک پست قامت، زیبا اندام، تیز طبیعت، بلیغ الکلام شاعر نے طرح کے مصرعے پر ایک غزل پڑھی، جس کا ایک شعر درجِ ذیل ہے:

ہم کو دیکھیں تو وہ ہنس دیتے ہیں
آنکھ چھپتی ہی نہیں یاری کی

سامعین ـــــ گاڑی کی، بارک اللہ کیا نایاب شعر فرمایا ہے۔ گاڑی کی، اور جسے دیکھیے غل مچا رہا ہے۔ گاڑی کی، گاڑی کی۔ شاعر بیچارہ چیختا ہے کہ حضرات ـــــ گاڑی کی نہیں، یاری کی، مگر غل غپاڑے میں سُنتا کون ہے۔"

اور شمس العلماء محمد حسین آزاد فرماتے ہیں "ایک روز راجا صاحب کے دربار میں غزل پڑھی جس کا قافیہ تھا۔ لالیاں، اور بالیاں۔ سب سخن فہموں نے تعریف کی۔ راجا صاحب کی صحبت میں 'جگنو میاں' ایک مسخرے تھے۔ ان کی زبان سے نکلا کہ نواب صاحب، سب قافیے آپ نے باندھے مگر "تالیاں" کا قافیہ رہ گیا۔ انھوں نے ٹال دیا اور کچھ جواب نہیں دیا۔ راجا صاحب نے خود فرمایا کہ نواب صاحب، سُنتے ہو جگنو میاں کیا کہتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ مہاراج اس قافیے کو مبتذل سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ حضور فرمائیں تو اب بھی ہو سکتا ہے۔ مہاراج نے کہا، ہاں کچھ تو کہنا چاہیے۔ انھوں نے اُسی وقت پڑھا:

جگنو میاں کی دُم جو چمکتی ہے رات کو
سب دیکھ دیکھ اس کو بجاتے ہیں تالیاں

تمام دربار چہک اُٹھا اور میاں جگنو مدھم ہو کر رہ گئے۔"

یہ واقعہ عظیم آباد میں مہاراجہ شتاب رائے کے دربار کا ہے، اور اس شعری نشست میں نواب اشرف علی فغاںؔ نے مذکورہ غزل سنائی تھی۔

اب آپ ہی بتائیں کہ اگر یہ شعری نشستیں نہ ہوئی ہوتیں تو ان کے دلچسپ حالات فسانۂ آزاد اور آبِ حیات کی زبردست انشا پردازی کے ساتھ اربابِ ذوق تک کیوں کر پہنچتے۔ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ یہ ان طرحی مشاعروں کی مطبوعہ غزلوں ہی کا فیض تھا جس کی بدولت مولانا حالی جیسے بزرگ اہلِ قلم سے مقدمۂ شعر و شاعری جیسی نادر تصنیف وجود میں آئی اور موجودہ دور میں پروفیسر کلیم الدین احمد (مرحوم) نے اپنی چونکا دینے والی کتاب "اُردو شاعری پر ایک نظر" لکھ کر دنیائے ادب میں ہل چل مچا دی۔ لیکن اس کو کیا کیجیے کہ جب موصوف بہار اُردو اکادمی کے سربراہ کی حیثیت سے کام کرنے لگے تو ان کے سامنے ہر سال سینکڑوں مسودے غزلوں کے، مالی امداد کے لیے پیش ہوتے اور وہ دل پر جبر کر کے اس "نیم وحشی" صنفِ سخن کی اشاعت کے لیے رقمیں منظور کرتے۔ یہ اور بات ہے کہ گھر والیوں کی ناقدر شناسی ان کتابوں کے مطبوعہ اوراق سے چولہا جلانے کے لیے ایندھن کا کام لیتی اور اُردو زبان سے ناواقف سپوت سفینۂ سخن کو دفترِ بے معنی سمجھ کر کاغذ کی ناؤ بنا کر نالیوں میں بہا دیتے۔ سفینۂ سخن کی کثرت اور ان کے عبرت ناک انجام کے پیشِ نظر پروفیسر کلیم الدین احمد نے اپنی رحلت سے دو تین سال قبل خدا بخش لائبریری کے ایک سیمینار کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ غزل نویسوں کو کم از کم دس برسوں تک غزل نویسی سے تائب ہو کر قافیہ پیمائی کے کاروبار کو بند کر دینا چاہیے۔ اس فتوے نے میری شاعری کے لیے خام مواد کا کام کیا جس کے نتیجے میں میں ایک نظم بعنوان 'غزل اور کثرتِ اولاد' لکھی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ایک ناقد نے دیا ہے شاعروں کو مشورہ
کم سے کم دس سال تک توڑو غزل سے رابطہ
تاکہ اُردو شاعری کی جان چھوٹے ضیق سے
ہے مسلط قوم کے اعصاب پر یہ کافرہ

بوجھ آبادی کا بڑھتا جا رہا ہے جس طرح
یوں ہی گردش میں مسلسل ہیں ردیف و قافیہ
حد تو یہ ہے ایک املا بھی نہیں جس کا درست
رات دن غزلوں پہ غزلیں لکھ رہا ہے مسخرہ
کر چکا ہے اپنا مجموعہ مرتب آج وہ
ختم جس نے کل کیا اُردو کا پہلا قاعدہ
ایسے مجموعوں کا بالآخر یہی ہوتا ہے حشر
گھر میں بنیوں کے بنا کرتا ہے ان کا مقبرہ
اس لیے اے شاعرانِ تیز گام و بے لگام
اپنے ہاتھوں خود کرو غزلوں کی نسبندی کا کام

لیکن پروفیسر کلیم الدین احمد کے مشورے پر ہمارے شاعروں نے توجہ نہیں دی، بلکہ اب تو ان کے انتقال کے بعد ایسا صائب مشورہ دینے والا بھی کوئی موجود نہیں۔ اس لیے میدان صاف ملا تو طرحی مشاعروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ایک مشاعرے میں مجھے بھی دھر پکڑ کر لے جایا گیا۔ میں نے طرحی غزل تو نہیں لکھی لیکن طرح کی زمین میں کچھ اشعار سنائے۔ چند پیش ہیں:

دوستو، آج اولمپک کا مزا پاؤ گے
شعر کی ریس میں شاعر کو کھڑا پاؤ گے
ہیں گدایانِ سخن داد کے طالب یارو
بزم میں بُت بنے بیٹھو گے تو کیا پاؤ گے
داد و توصیف تو ہے بھیک سخنور کے لیے
اس کرم کے لیے محشر میں جزا پاؤ گے

ہو اجازت تو میں اربابِ سخن سے پوچھوں
کھوٹے سکّے کو کھرا کیسے بنا پاؤ گے
بحر و اوزان کے گرداب میں پھنس کر یارو
خاک تم روحِ تغزل کا پتا پاؤ گے
تم نے سوچا ہے کبھی طرحی نشستوں کے وکیل
بے تُکی قافیہ پیمائی سے کیا پاؤ گے

میرے اشعار بھی صدا بہ صحرا ثابت ہوئے۔ اور اگلے ہفتے ایک دوسرا مشاعرہ "شاد عظیم آبادی" کی زمین میں منعقد ہوا، جس میں مدعو کرنے کے لیے خود مہتمم مشاعرہ تشریف لائے اور مجھے بادل ناخواستہ جانا پڑا۔ اس مشاعرے میں جو کلام میں نے پڑھا، اس کے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جو دل نے حضرتِ کوثر کو اشتعال دیا
انھوں نے طرح کا مصرعہ کوئی اُچھال دیا
خوشی سے کھل گئیں باچھیں غزل نویسوں کی
کسی نے جیسے انھیں مژدۂ وصال دیا
سخن نوردی کا موقع جو دستیاب ہوا
تو لاوا ذہن میں جتنا تھا سب نکال دیا
لغت کو چھان پھٹک کر قوافی جمع کیے
کسی نے میر کے دیوان کو کھنگال دیا
یہ مال ہاتھ لگا جس کو جس قدر اُس نے
ہر ایک قافیے پر ایک شعر ڈھال دیا
بُلا کے طرحی نشستوں میں دوستوں نے مجھے
ہر ایک بار بڑی الجھنوں میں ڈال دیا
رفوگری کا یہ دھندا مجھے راس نہ آیا
کبھی قبول کی، دعوت کو گاہ ٹال دیا
مگر خلوصِ محبّاں نے اس نشست میں آج
مرے دماغ میں کانٹا جو تھا نکال دیا
"خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم"
سرِ دوشِ فکر نے یہ تحفۂ خیال دیا
"انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو"
اسی خیال نے میرا قدم سنبھال دیا
لگا کے خون شہیدوں میں ہو گیا شامل
کنویں میں طرح کے میں نے بھی ڈول ڈال دیا
گلہ کرے گی نہ اب ارضِ شاد واہی سے
"غریب جان کے تو نے مجھی کو ٹال دیا"

ان اشعار نے بھڑ کے چھتّے کو چھیڑ دیا۔ پھر کیا تھا ہمارے شہر کی ہر انجمن طرحی مشاعرے منعقد کرنے لگی۔ یہاں تک کہ وہ ادارے جو صرف نعتیہ مشاعرے کرکے شعرا کی عاقبت سنوارا کرتے تھے اب وہاں بھی طرحی مشاعرے شروع کر دیے گئے۔

ایک مشاعرے میں جس میں قدیم و جدید شعرا جن کی مجموعی تعداد تقریباً ستر ہوگی، شریک ہوئے۔ دس بجے دن سے شام کے سات بجے تک شعرا طرحی کلام سناتے رہے۔ اس مشاعرے میں میں نے جو اشعار سنائے وہ بالکل بے معنی تھے۔ آپ بھی ان اشعار سے لطف اندوز ہوں:

خطِ تجرید میں آشفتہ سری کا لکھا
یوں ہے جیسے بشر کا لُجری کا لکھا
وہ ادب ہو کہ سیاست کا بیابانِ وجود
رنگ آمیز بنا بے بصری کا لکھا
جوہری دور میں ابلاغ سے ترسیل کا بُعد
نقش بر آبِ سخن بے ہنری کا لکھا
مرکزِ نقل سے تا نقطۂ پرکارِ جنوں
رُخِ مشہود پہ شاہد نظری کا لکھا
رہزنی دُردِ تہہ جام سے اُبھرے جس دم
عصرِ نو پر ہو عیاں راہبری کا لکھا
ایک آتش کدۂ فکر ہے سردابِ خیال
اک معمّا ہے زوالِ بشری کا لکھا
خرد آشوبِ تمنا ہے نمودِ ہستی
نقشِ تقدیر بنا بے اثری کا لکھا
میرے اشعار میں سرچشمۂ تفہیم جدید
آپ سمجھیں نہ اسے بے خبری کا لکھا

ان اشعار پر داد و تحسین کے نعرے بلند ہوتے رہے، اور میرا یہ حال تھا کہ:

ناطقہ سر بہ گریباں اسے کیا کہیے

بعض لوگ کہتے ہیں کہ طرحی مصرعوں پر غزلیں کہنا بانس پر چڑھنے اُترنے کی کرتب بازی ہے' یا زیادہ سے زیادہ پیمائشِ طولِ قد و گیسو کا شغل میں پوچھتا ہوں کہ جب کوہ پیمائی اور اولمپک میں مختلف کرتب کی نمائش کے لیے انعامات دیے جاتے ہیں تو وہ شعرا جو طرحی مشاعروں میں قافیہ پیمائی کرتے ہیں' انھیں کیوں اس اعزاز سے محروم کیا جائے۔ کم از کم داد تو ملنی ہی چاہیے۔ یہ اور بات ہے کہ خود مجھے یہ دھندا راس نہ آیا۔ مگر اس کو کیا کہیے کہ اب بھی طرحی مشاعرے ہوتے ہیں' جن میں مجھے مدعو کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ شہر کی سب سے فعال اَدبی انجمن کا سرپرست بھی بالاتفاق مقرر کیا جا چکا ہوں۔ پتا نہیں یہ اربابِ انجمن کی مخلصانہ ستم ظریفی ہے یا کسی ناکردہ گناہ کی سزا ہے ـــــ کہ اب اس انجمن کے طرحی مشاعرے خود میری قیام گاہ پر منعقد کرائے جاتے ہیں۔

حواشیِ ابوالکلام آزاد

جو لوگ مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے واقف ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ مولانا کو اوائلِ عمر ہی سے پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ عمر کا جو حصہ بچے کھیل کود میں گزارتے ہیں' مولانا نے کتابوں کے مطالعے میں صرف کیا اور ان کا یہ ذوق آخر عمر تک ان کے ساتھ رہا۔ مولانا نے کسی مدرسے میں تعلیم نہیں پائی۔ گھر پر ہی پڑھا اور پھر انھیں ایسے مواقع ملے کہ اُردو' فارسی اور عربی کے علاوہ انھوں نے انگریزی اور فرانسیسی سے بھی واقفیت حاصل کی اور ان زبانوں میں قدیم و جدید علوم کا جو سرمایہ تھا اسے اپنی شخصیت میں سمو لیا۔

یہ کتاب ان حواشی کا مجموعہ ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد نے دورانِ مطالعہ مختلف کتابوں پر لکھے ہیں۔ یہ کتابیں مختلف زبانوں کی ہیں اور مختلف علوم سے تعلق رکھتی ہیں۔ مولانا نے' جب وہ حکومتِ ہند کے وزیرِ تعلیمات تھے' انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا اور اپنا ذاتی کتب خانہ جو کئی ہزار کتابوں پر مشتمل تھا' اس ادارے کو دے کر ایک لائبریری قائم کر دی تھی۔ سید مسیح الحسن صاحب نے' جو برسوں تک اس لائبریری میں کام کرتے رہے ہیں' ان تمام کتابوں کو غائر نظر سے دیکھا ہے اور ان پر مولانا کے قلم سے جو حواشی درج ہیں وہ اس کتاب میں یکجا کر دیے ہیں۔ ایک اور اہم کام انھوں نے یہ کیا ہے کہ جن کتابوں پر یہ حواشی درج تھے' ان کے بارے میں بھی تمام ضروری معلومات فراہم کر دی ہیں۔

مصنف : مولانا ابوالکلام آزاد
مرتب : سید مسیح الحسن
صفحات : ۵۷۹
قیمت : ۶۲ روپے

دہلی اور اس کے اطراف

"دہلی اور اس کے اطراف" جس کا پہلا نام "ارمغانِ احباب" تھا' **مولانا حکیم سید عبدالحئی کے سفر کا** روزنامچہ ہے۔ یہ سفر انھوں نے ۱۸۹۴ء میں دہلی اور اس کے نواحی **علاقوں میں کیا تھا**۔ حکیم سید عبدالحئی صاحب موجودہ دنیائے اسلام کی نامور شخصیت **مولانا سید ابوالحسن علی ندوی** کے والدِ بزرگوار تھے۔

اس سفرنامے کو لکھے ہوئے تقریباً سو سال ہو رہے ہیں لیکن گزشتہ تہذیب سے دلچسپی رکھنے والا قاری اسے آج بھی لطف و بصیرت سے خالی نہ پائے گا اس لیے کہ جو کہانی اس میں بیان ہوئی ہے وہ بہت دور کی نہیں ہے۔ تاریخ میں ایک صدی کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔ اس سفرنامے میں لطف و بصیرت کا پہلو اس لیے بھی ہے کہ سفر کرنے والا جویائے حق ہے۔ اسے علم کی سچی لگن ہے' اپنی تہذیب سے گہرا لگاؤ ہے' بزرگوں کے کارناموں کے لیے دل میں احترام اور ہمعصروں کی قدر شناسی کا جذبہ ہے۔ اسلامی تاریخ اور ہندوستان میں مسلم حکمرانوں' عالموں اور صوفیوں کی فیض رسانیوں سے مکمل آگاہی نے اس کے تاثرات کو وسیع سے وسیع تر کر دیا ہے اور اس سفرنامے کو ایک تاریخی' تہذیبی اور علمی دستاویز کی حیثیت دے دی ہے۔

مصنف کا اندازِ بیان ہر قسم کے مبالغے سے بری ہے اور بے تکلف گفتگو کا رنگ لیے ہوئے ہے۔

مصنف : مولانا حکیم سید عبدالحئی
مرتبہ : ڈاکٹر صادقہ ذکی
صفحات : ۱۳۴
قیمت : ۲۵ روپے

اُردو اکادمی' دہلی سے طلب کریں

غزلیں

امان اللہ خالد

گھر اپنا وادیِ برق و شرر میں رکھا جائے
تعلقات کا سودا نہ سر میں رکھا جائے

سُنا ہے دخترِ تہذیب گھر سے بھاگ گئی
چھپا کے بچوں کو ہرگز نہ گھر میں رکھا جائے

اگر طلب ہو کبھی چند گھونٹ پانی کی
سمندروں کا تصوّر نظر میں رکھا جائے

بتاؤ کیسے ملے گی ہمیں کوئی تعبیر
جب اپنا خواب ہی چشمِ دگر میں رکھا جائے

کتابِ زیست میں بابِ الم بھی ہو محفوظ
سیاہ رات کا منظر سحر میں رکھا جائے

قفس کو لے کے جو اُڑ جائے گلستاں کی طرف
وہ عزم طائرِ بے بال و پر میں رکھا جائے

انصاریان، سکندرآباد ضلع بلند شہر ۲۰۳۲۰۵ (یو۔پی)

غموں کو بانٹ دوں اپنے، مرا اصول نہیں
کسی کا درد بڑھانا مجھے قبول نہیں

کرو نہ مجھ سے توقع کسی ہدایت کی
میں ایک شاعرِ حسّاس ہوں، رسول نہیں

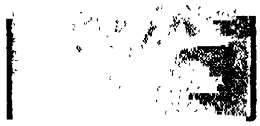
نصیب چھاؤں ہے اُس کو کسی کی زلفوں کی
غموں کی دھوپ میں رہ کر بھی جو ملول نہیں

نہ مل سکیں گی اُسے منزلیں مسرّت کی
سفر میں جس کی جبیں پر غموں کی دھول نہیں

تضاد ہی میں تو مضمر ہے کائنات کا راز
گلوں کے ساتھ یہ کانٹے اسدؔ فضول نہیں

اسد رضا

۲۷/۱۴ — ای، حوض رانی، مالویہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷



احمد ریاض

کوئی شناسا دُور نہ پاس
میں تنہا اور شام اُداس

آج ہوا پھر شدّت سے
تیری جُدائی کا احساس

شہر میں رہ کر بھی جیسے
جھیل رہا ہوں میں بن باس

اس ست رنگی دُنیا میں
کون کرے کس پر وشواس

پیار کے سوتے سوکھ گئے
کیسے بجھے اب روح کی پیاس

احمدؔ تیری باتوں کو
لوگ سمجھتے ہیں بکواس

شکور مارکیٹ، رفیع گنج، اورنگ آباد ۸۲۴۱۲۵ (بہار)

سیّد تنویر احمد

بیدری

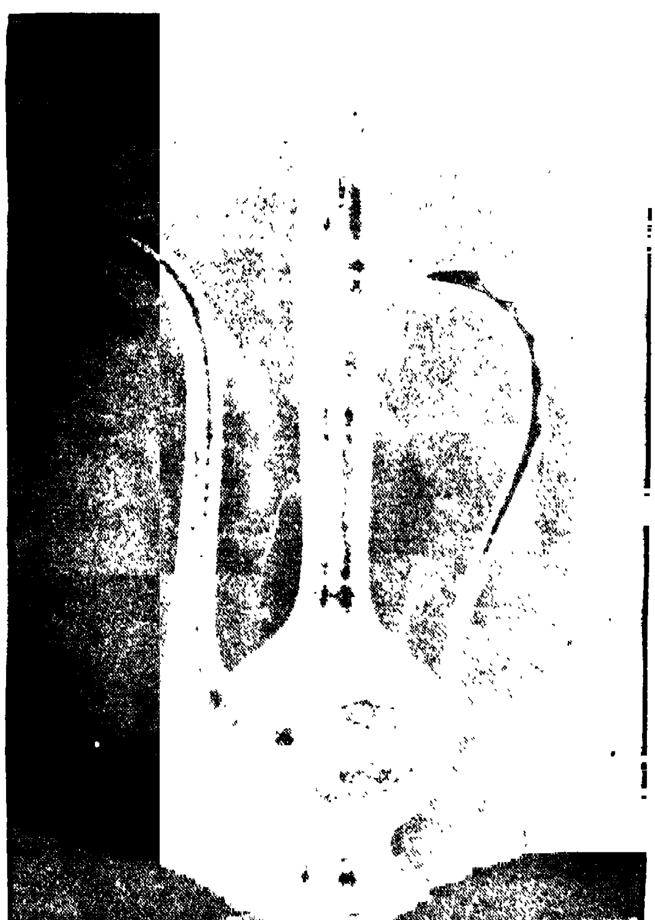
تشہیر کی محتاج دست کاری

ہندوستان دُنیا میں دست کاری کا اہم مرکز مانا جاتا ہے۔ یہاں کی مختلف دستی صنعتوں کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ بنارسی ساڑیاں، مُرادآبادی ظروف اور کھادی کے کپڑے وغیرہ۔ ہندوستان کی ان مشہور دستی صنعتوں میں ایک اہم "بیدری صنعت" بھی ہے۔ "بیدری" دوسری دستکاریوں کی بہ نسبت غیر معروف صنعت بن کر سکڑتی جا رہی ہے۔ کیا یہ تاریخ کا حصّہ بن کر رہ جائے گی؟ شاید ایسا ہی ہوگا مگر شاید ایسا نہیں ہوگا۔

یہ قدیم اور شاہی دست کاری جو آج سے قریب ۵۰۰ سال قبل بہمنی سلطنت کے دور میں پیدا ہوئی، فارس کے فن سے بہت زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔ لوہے اور تانبے پر کھدائی اور اُس پر چاندی سونے کی نقش نگاری فارس کی اہم دست کاری تھی۔ بہمنی دور میں بہت سے تاجر ایران سے بھارت آئے چنانچہ ان تاجروں کے ساتھ فارس کے دست کاروں کا ایک قافلہ بھی بہمنی سلطنت کے پایۂ تخت بیدر کو منتقل ہوا۔ یہاں انھوں نے لوہے اور تانبے پر سونے یا چاندی کی نقش نگاری کے بجائے جست ZINCALLOY پر چاندی کی نقش نگاری ایجاد کی۔ چونکہ اس صنعت کا آغاز بیدر میں ہوا، اس کی نسبت سے اس کا نام "بیدری" رکھا گیا۔ بیدر جو کرناٹک کا ایک ضلع اور ضلعی صدر مقام ہے حیدرآباد سے ۱۲۵ کلومیٹر دُور واقعہ ہے۔

بیدری دست کاری کے تین مراحل ہیں۔ پہلے مرحلے میں جست کا بھرت تیار کیا جاتا ہے اور اس بھرت کو پسندیدہ نمونوں اور شکلوں میں ڈھال کر مختلف اشیا تیار کی جاتی ہیں۔

دوسرے مرحلے میں ان ڈھالی ہوئی اشیا پر کُھدائی اور اس کُھدائی میں چاندی بھرنے کا کام انجام دیا جاتا ہے۔ یہی مرحلہ سب سے اہم ہے اس مرحلے میں فن کا اظہار ہوتا ہے۔ نوکیلے آلات اور ہتھوڑے کے استعمال سے اشیا پر جاذب نظر خوبصورت نقش نگاری کی جاتی ہے اور چاندی کے باریک تاروں کو بھرا جاتا ہے۔ "لالہ کا بوٹا" "مہتابی کام" اور "بوٹا نقش" کی اہم اقسام ہیں۔ اس کے علاوہ اشیا پر منبت کاری کا کام (EMBOSING WORK)



"بیدری" دست کاری کا خوبصورت نمونہ جس کی آج بھی مانگ ہے

انڈیا بلڈنگ، ۹/۱۰ ایس۔ پی۔ روڈ، بنگلور ۲

، ہوتا ہے۔ یہ زیادہ دلکش ہوتا ہے لیکن
کے لیے اعلیٰ فنی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔
ت کاری کے فنکار آج اِس صنعت میں برائے
پائے جاتے ہیں۔ یہ فن WALL PLATES
لیے زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ نقش نگاری کا
خاندان در خاندان منتقل ہوتا آرہا ہے۔
ش نگاری کرنے والے فنکاروں کی کل تعداد
رمستقر پر لگ بھگ ۳۰۰ کے قریب ہے۔

تیسرے مرحلے میں تیار کردہ ظروف اور
رٗ اشیا کا رنگ کالا کیا جاتا ہے۔ کالے رنگ میں
ندی کی سفیدی بیدری دست کاری کی خوبصورتی
نکھارتی ہے۔ بیدر کے قلعے میں پائی جانے والی
، اور امونیم کلورائیڈ کے مرکب کی پرت نقش
ری کی ہوئی اشیا پر چڑھائی جاتی ہے۔ اشیا
نیم گرم کرنے کے بعد اُس پرت کو صاف کرلیا
تا ہے۔ صفائی کے بعد سفید جست کی اشیا مکمل
ل ہوجاتی ہیں اور چاندی کی نقش نگاری اپنے
ملی رنگ میں باقی رہتی ہے۔ ایک زمانے تک
ں عمل کو بیدر کی مٹی کا جادو تصور کیا جاتا
ھا اور آج بھی سائنس سے ناواقف کاروں
یہ کہنا ہے کہ بیدر کی مٹی ہی میں کچھ ایسی
صوصیت ہے۔ لیکن حال ہی میں جب قلعے کی
س خاص مٹی کی کیمیائی ترکیب کو معلوم کیا گیا
پتہ چلایا کہ اس مٹی میں نمک کی کثرت ہے
س کی وجہ سے یہ جست کے بھرت کو کالا کر
یتی ہے۔ تجزیہ کاروں کا یہ خیال ہے کہ کسی
قام کی بھی مٹی جس میں نمک کا عنصر زیادہ
و اُس کو استعمال کرنے سے اس طرح کا کالا
نگ لایا جاسکتا ہے۔ لیکن آج تک اِس
بہت میں کوئی خاص پیش قدمی بیدر کے صنعت
[illegible]

خاں نے یہ بھی کوشش کی تھی کہ اِس مٹی کے
بجائے کوئی کیمیائی مرکب استعمال کیا جائے انھوں
نے مرکب کی تیاری میں کامیابی حاصل کی تاہم
اُن کے خیال میں کیمیائی شئے مٹی سے زیادہ
قیمتی ہوجائے گی جس کا راست اثر بیدری اشیا
کی فروخت پر پڑ سکتا ہے۔

قدیم زمانے میں "بیدری" کے ظروف
شاہی محلوں میں استعمال ہوتے تھے۔ "بیدری"
کے ظروف میں رکھا ہوا پانی صحت کے لیے
مفید تصور کیا جاتا تھا۔ اس کی وجہ اہل علم
نے یہ بتائی کہ جست اور پانی کے درمیان کیمیائی
تعمل واقع ہوتا ہے اور پانی میں کچھ ایسے عناصر



[illegible] ۱۹۰۰ء مرحوم غلام عبدالستار [illegible] کے بعد بیدری صنعت کو منبت کاری کے فن

پیدا ہو جاتے ہیں جو صحت کے لیے مفید ثابت ہوتے ہیں۔ پانی کے ظروف کے علاوہ چارپائی، تخت اور کرسی کے پیر قدیم بیدری دست کاری کے شاہکار ہیں، لیکن آج یہ دست کاری شاہی محلوں تک ہی محدود نہیں رہی تاہم غریب طبقہ ابھی اِس کے استعمال سے دور ہے۔ اب "بیدری" صنعت میں مختلف اشیا تیار کی جا رہی ہیں۔ عورتوں کے لیے — چوڑیاں، کنگن، بالیاں، کاجل کی ڈبیاں اور کنگھی کے گچھے وغیرہ۔ لیکن آج بھی قدیم طرز کے گلدستوں کی کافی مانگ نظر آتی ہے۔

"بیدری" دست کاری کے فروغ میں جو رکاوٹیں ہیں اُن میں ایک عدم تشہیر اور بیرونی لوگوں کی اس سے لاعلمی ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ بیدر میں بسنے والے لوگوں کی بھی ایک بڑی تعداد اپنے شہر کے فن سے ناواقف ہے۔ دوسری چیز چاندی کی قیمتوں میں روز افزوں اضافہ ہے جس کی وجہ سے دست کاری مہنگی ہوتی جا رہی ہے۔ تیسری رکاوٹ اشیا کی پائیداری ہے جو سالہا سال خراب نہیں ہوتیں۔ آخری اور اہم رکاوٹ دست کاروں اور صنعت کاروں میں تجارتی صلاحیتوں کی کمی ہے۔ اِن رکاوٹوں کے اِزالہ کے لیے حکومت نے کوششیں کی ہیں اور خاص اسکیمیں بھی بیدری دست کاری کے لیے وضع کی گئی ہیں تاہم مزید تشہیر اور دیگر سہولیات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ○

بان نقوی امروہوی

پھلوں کا بادشاہ — آم

ہندوستان کو اگر محبت کی مثال یادگار تاج محل پر فخر ہے تو دُنیا سب سے زیادہ لذیذ اور فرحت بخش پھل پر بھی ناز ہے جو ہندوستان سے بہتر یا میں کہیں بھی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ اندرون تو ایک محبوب پھل ہے ہی مگر مغربی ملکوں خلیجی ریاستوں میں بھی لوگ اس پھل عاشق ہیں۔ ہر سال کروڑوں روپے آم ان ملکوں کو اکسپورٹ ہوتا ہے جس ملک کو قیمتی زرِ مبادلہ حاصل ہوتا ہے۔

آم کی اس غیر معمولی مقبولیت کا سبب ہے کہ یہ لذّت، لطافت اور افادیت کے بار سے تمام پھلوں میں ممتاز ہے انگور، انار، سب سبھی کی اپنی اپنی خصوصیات ہیں لیکن تمام پھلوں کی مجموعی خوبیاں صرف آم میں۔ یہ صحت بخش وٹامن کا خزانہ بھی ہے ایک مقوی غذا بھی بدن کو طاقت اور بھی حاصل ہوتی ہے برسات کا موسم پھل انبہ کے شباب کا زمانہ ہوتا ہے بازار خوبصورت اور رنگا رنگ پھلوں سے بھر جاتے ہیں۔ غریب و امیر سبھی بقدرِ استطاعت قدرت کی اس نعمت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

آم پیدا تو ہزاروں سال سے ہندوستان میں ہوتا ہے مگر جب سے پیوند کاری کا سلسلہ شروع ہوا ہے بے شمار ایسی قسمیں وجود میں آگئی ہیں جو لاجواب ہیں اور نئی اقسام پیدا کرنے کا یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے صرف آم ہی ایک ایسا پھل ہے جس کو ملک میں ایک خاص سماجی اور مذہبی حیثیت بھی حاصل ہے مقدس ویدوں میں آم کا ذکر کیا گیا ہے مندروں میں دیوی دیوتاؤں کو آم بھینٹ کیے جاتے رہے ہیں ہر گاؤں میں آم کا ایک باغ یا کم از کم ایک درخت اس لیے ضروری تھا کہ اس کے پتوں اور پھولوں سے بعض امراض کا علاج کیا جا سکے شادی بیاہ کے موقعوں پر اس کے پتوں کی بندروال باندھی جا سکے جو ایک مبارک شگون ہے اس طرح آم کو ملک کی سماجی زندگی میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ شعرا بھی اس پھل کی تعریف میں رطب اللسان رہے ہیں۔

بیرونی ممالک میں آم کی مانگ کے پیش نظر مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے بھی فصلوں کے تحفظ اور فروغ کے لیے کئی اقدامات کیے ہیں محکمہ ہارٹی کلچر اور پنت نگر زرعی یونیورسٹی آم پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ نمائشوں کے ذریعے مالکانِ باغات کی حوصلہ افزائی سرکاری سطح پر کی جارہی ہے انھیں قرض اور کیڑے مارنے والی دوائیں دی جارہی ہیں اور جدید تحقیقات سے آگاہ کیا جارہا ہے تاکہ ان بھرپور غذائیت والے پھلوں سے امیر و غریب سبھی کو طبی فوائد حاصل ہو سکیں۔

پختہ آموں کی افادیت

آم ایک لذیذ فرحت بخش اور زود ہضم پھل ہے دل و دماغ کو تقویت دیتا، ذہن کو معطر کرتا اور خون کو صاف کرتا ہے معدے، آنتوں اور معدے اور حلق کے درمیان کی نالی کو قوت بخشتا ہے گردے اور مثانے کی خشکی کو دور کرتا اور شہوانی قوت میں اضافے کا باعث ہے خفقان دور کرتا اور رنگ کو نکھارتا ہے۔ کھانسی، دمے، سرد ہوا کے دردِ سر، قبض، بواسیر اور آنتوں کے درد میں شفا بخش ہے۔ کمزوری، تھکن اور سستی کو دور کرتا اور کھل کر پیشاب لاتا ہے۔ طبیعت کو نرم کرتا ہے تپ کہنہ میں بھی مفید بتایا گیا ہے یہ پھل جتنا زیادہ خوشبودار ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ دماغ کو تقویت دیتا ہے اس کا سونگھنا بھی دماغ کو فرحت دیتا ہے قاش کے آموں کی بہ نسبت شیریں اور رسیلے آم زیادہ زود ہضم اور مفید ہوتے ہیں آم کھا کر دودھ پی لیا جائے تو آم کی گرمی کم ہو جاتی ہے اور قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے آم کو دیر تک ٹھنڈا کر کے یا برف کے پانی میں بھگو کر کھانے سے نہ صرف لذت

۵۲- سی منٹو روڈ کمپلیکس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پیدا ہو جاتے ہیں جو صحت کے لیے مفید ثابت ہوتے ہیں۔ پانی کے ظروف کے علاوہ چارپائی، تخت اور کرسی کے پیر قدیم بیدری دست کاری کے شاہکار ہیں۔ لیکن آج یہ دست کاری شاہی محلوں تک ہی محدود نہیں رہی تاہم غریب طبقہ ابھی اس کے استعمال سے دور ہے۔ اب "بیدری" صنعت میں مختلف اشیا تیار کی جا رہی ہیں۔ عورتوں کے لیے — چوڑیاں، کنگن، بالیاں، کاجل کی ڈبیاں اور کنگھی کے گچھے وغیرہ۔ لیکن آج بھی قدیم طرز کے گلدستوں کی کافی مانگ نظر آتی ہے۔

"بیدری" دست کاری کے فروغ میں جو رکاوٹیں ہیں اُن میں ایک عدم تشہیر اور بیرونی لوگوں کی اس سے لاعلمی ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ بیدر میں بسنے والے لوگوں کی بھی ایک بڑی تعداد اپنے شہر کے فن سے ناواقف ہے۔ دوسری چیز چاندی کی قیمتوں میں روز افزوں اضافہ ہے جس کی وجہ سے دست کاری مہنگی ہوتی جا رہی ہے۔ تیسری رکاوٹ اشیائی پائیداری ہے جو سالہا سال خراب نہیں ہوتیں۔ آخری اور اہم رکاوٹ دست کاروں اور صنعت کاروں میں تجارتی صلاحیتوں کی کمی ہے۔ ان رکاوٹوں کے ازالہ کے لیے حکومت نے کوششیں کی ہیں اور خاص اسکیمیں بھی بیدری دست کاری کے لیے وضع کی گئی ہیں تاہم مزید تشہیر اور دیگر سہولیات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ●

تاباں نقوی امروہوی

پھلوں کا بادشاہ — آم

ہندوستان کو اگر محبّت کی بے مثال یادگار تاج محل پر فخر ہے تو دُنیا کے سب سے زیادہ لذیذ اور فرحت بخش پھل آم پر بھی ناز ہے جو ہندوستان سے بہتر دُنیا میں کہیں بھی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ اندرونِ ملک تو ایک محبوب پھل ہے ہی مگر مغربی ملکوں اور خلیجی ریاستوں میں بھی لوگ اس پھل کے عاشق ہیں۔ ہر سال کروڑوں روپے کا آم ان ملکوں کو اکسپورٹ ہوتا ہے جس سے ملک کو قیمتی زرِ مبادلہ حاصل ہوتا ہے۔

آم کی اس غیر معمولی مقبولیت کا سبب یہ ہے کہ یہ لذّت، لطافت اور افادیت کے اعتبار سے تمام پھلوں میں ممتاز ہے انگور، انار، سیب سبھی کی اپنی اپنی خصوصیات ہیں لیکن تمام پھلوں کی مجموعی خوبیاں صرف آم میں ہیں۔ یہ صحت بخش وٹامن کا خزانہ بھی ہے اور ایک مقوی غذا بھی بدن کو طاقت اور فربہی حاصل ہوتی ہے برسات کا موسم پھلِ انبہ کے شباب کا زمانہ ہوتا ہے بازار خوبصورت اور رنگا رنگ پھلوں سے بھر جاتے ہیں۔ غریب و امیر سبھی بقدرِ استطاعت قدرت کی اس نعمت سے لُطف اندوز ہوتے ہیں۔

آم پیدا تو ہزاروں سال سے ہندوستان میں ہوتا ہے مگر جب سے پیوند کاری کا سلسلہ شروع ہوا ہے بے شمار ایسی قسمیں وجود میں آگئی ہیں جو لاجواب ہیں اور نئی اقسام پیدا کرنے کا یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے صرف آم ہی ایک ایسا پھل ہے جس کو ملک میں ایک خاص سماجی اور مذہبی حیثیت بھی حاصل ہے مقدس ویدوں میں آم کا ذکر کیا گیا ہے مندروں میں دیوی دیوتاؤں کو آم بھینٹ کیے جاتے رہے ہیں ہر گاؤں میں آم کا ایک باغ یا کم از کم ایک درخت اس لیے ضروری تھا کہ اس کے پتّوں اور پھولوں سے بعض امراض کا علاج کیا جا سکے شادی بیاہ کے موقعوں پر اس کے پتّوں کی بندر وال باندھی جا سکے جو ایک مبارک شگون ہے اس طرح آم کو ملک کی سماجی زندگی میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ شعرا بھی اس پھل کی تعریف میں رطب اللساں رہے ہیں۔

بیرونی ممالک میں آم کی مانگ کے پیشِ نظر مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے بھی فصلوں کے تحفّظ اور فروغ کے لیے کئی اقدامات کیے ہیں محکمہ ہارٹی کلچر اور پنت نگر زرعی یونیورسٹی آم پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ نمائشوں کے ذریعے مالکانِ باغات کی حوصلہ افزائی سرکاری سطح پر کی جا رہی ہے انھیں قرضے اور کیڑے مارنے والی دوائیں دی جا رہی ہیں اور جدید تحقیقات سے آگاہ کیا جا رہا ہے تاکہ اِن بھرپور غذائیت والے پھلوں سے امیر و غریب سبھی کو طبی فوائد حاصل ہو سکیں۔

پختہ آموں کی افادیت

آم ایک لذیذ فرحت بخش اور زود ہضم پھل ہے دل و دماغ کو تقویت دیتا، ذہن کو معطر کرتا اور خون کو صاف کرتا ہے معدے، آنتوں اور معدے اور حلق کے درمیان کی نالی کو قوت بخشتا ہے گردے اور مثانے کی خشکی کو دور کرتا اور شہوانی قوت میں اضافے کا باعث ہے خفقاں دُور کرتا اور رنگ کو نکھارتا ہے۔ کھانسی، دمے سرد ہوا کے دردِ سر، قبض، بواسیر اور آنتوں کے درد میں شفا بخش ہے۔ کمزوری، تھکن اور سستی کو دُور کرتا اور کھل کر پیشاب لاتا ہے۔ طبیعت کو نرم کرتا ہے تپِ کہنہ میں بھی مفید بتایا گیا ہے یہ پھل جتنا زیادہ خوشبودار ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ دماغ کو تقویت دیتا ہے اس کا سونگھنا بھی دماغ کو فرحت دیتا ہے قاش کے آموں کی بہ نسبت شیریں اور رسیلے آم زیادہ زود ہضم اور مفید ہوتے ہیں آم کھا کر دودھ پی لیا جائے تو آم کی گرمی کم ہو جاتی ہے اور قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے آم کو دیر تک ٹھنڈا کر کے یا برف کے پانی میں بھگو کر کھانے سے نہ صرف لذّت

۵۲-سی منٹو روڈ کمپلیکس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پیدا ہو جاتے ہیں جو صحت کے لیے مفید ثابت ہوتے ہیں۔ پانی کے ظروف کے علاوہ چارپائی، تخت اور کرسی کے پیر قدیم بیدری دست کاری کے شاہکار ہیں۔ لیکن آج یہ دست کاری شاہی محلوں تک ہی محدود نہیں رہی تاہم غریب طبقہ ابھی اس کے استعمال سے دور ہے۔ اب "بیدری" صنعت میں مختلف اشیا تیار کی جا رہی ہیں۔ عورتوں کے لیے — چوڑیاں، کنگن، بالیاں، کاجل کی ڈبیاں اور کنجی کے گچھے وغیرہ۔ لیکن آج بھی قدیم طرز کے گلدستوں کی کافی مانگ نظر آتی ہے۔

"بیدری" دست کاری کے فروغ میں جو رکاوٹیں ہیں اُن میں ایک عدم تشہیر اور بیرونی لوگوں کی اس سے لاعلمی ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ بیدر میں بسنے والے لوگوں کی بھی ایک بڑی تعداد اپنے شہر کے فن سے ناواقف ہے۔ دوسری چیز چاندی کی قیمتوں میں روز افزوں اضافہ ہے جس کی و[جہ سے] دست کاری مہنگی ہوتی جا رہی ہے۔ تیسری رکاوٹ [اس کی] پائیداری ہے جو سالہا سال خراب نہیں ہوتیں۔ [ایک] اہم رکاوٹ دست کاروں اور صنعت کاروں میں صلاحیتوں کی کمی ہے۔ ان رکاوٹوں کے ازالہ [کے لیے] حکومت نے کوششیں کی ہیں اور خاص اسکیمیں [بھی] دست کاری کے لیے وضع کی گئی ہیں تاہم مزید تشہ[یر اور] دیگر سہولیات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے

تاباں نقوی امروہوی

پھلوں کا بادشاہ — آم

ہندوستان کو اگر محبت کی بے مثال یادگار تاج محل پر فخر ہے تو دُنیا کے سب سے زیادہ لذیذ اور فرحت بخش پھل آم پر بھی ناز ہے جو ہندوستان سے بہتر دُنیا میں کہیں بھی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ اندرونِ ملک تو ایک محبوب پھل ہے ہی مگر مغربی ملکوں اور خلیجی ریاستوں میں بھی لوگ اس پھل کے عاشق ہیں۔ ہر سال کروڑوں روپے کا آم ان ملکوں کو اکسپورٹ ہوتا ہے جس سے ملک کو قیمتی زرِ مبادلہ حاصل ہوتا ہے۔

آم کی اس غیر معمولی مقبولیت کا سبب یہ ہے کہ یہ لذت، لطافت اور افادیت کے اعتبار سے تمام پھلوں میں ممتاز ہے انگور، انار، سیب سبھی کی اپنی اپنی خصوصیات ہیں لیکن تمام پھلوں کی مجموعی خوبیاں صرف آم میں ہیں۔ یہ صحت بخش وٹامن کا خزانہ بھی ہے اور ایک مقوی غذا بھی بدن کو طاقت اور فرحت بھی حاصل ہوتی ہے برسات کا موسم فصلِ انبہ کے شباب کا زمانہ ہوتا ہے بازار خوبصورت اور رنگا رنگ پھلوں سے بھر جاتے ہیں۔ غریب و امیر سبھی بقدرِ استطاعت قدرت کی اس نعمت سے لُطف اندوز ہوتے ہیں۔

آم پیدا تو ہزاروں سال سے ہندوستان میں ہوتا ہے مگر جب سے پیوند کاری کا سلسلہ شروع ہوا ہے بے شمار ایسی قسمیں وجود میں آگئی ہیں جو لاجواب ہیں اور نئی اقسام پیدا کرنے کا یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے صرف آم ہی ایک ایسا پھل ہے جس کو ملک میں ایک خاص سماجی اور مذہبی حیثیت بھی حاصل ہے مقدس ویدوں میں آم کا ذکر کیا گیا ہے مندروں میں دیوی دیوتاؤں کو آم بھینٹ کیے جاتے رہے ہیں ہر گاؤں میں آم کا ایک باغ یا کم از کم ایک درخت اس لیے ضروری تھا کہ اس کے پتوں اور پھولوں سے بعض امراض کا علاج کیا جا سکے شادی بیاہ کے موقعوں پر اس کے پتوں کی بندروال باندھی جا سکے جو ایک مبارک شگون ہے اس طرح آم کو ملک کی سماجی زندگی میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ شعرا بھی اس پھل کی تعریف میں رطب اللسان رہے ہیں۔

بیرونی ممالک میں آم کی مانگ کے پیش نظر مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے بھی فصلوں کے تحفظ اور فروغ کے لیے کئی اقدامات کیے ہیں محکمہ ہارٹی کلچر اور پنت نگر زرعی یونیورسٹی آم پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ نمائشوں کے ذریعے مالکان باغات کی حوصلہ افزائی سرکاری سطح پر کی جا رہی ہے انھیں قرضے اور کیڑے مارنے والی دوائیں دی جا رہی ہیں اور جدید تحقیقات سے آگاہ کیا جا رہا ہے تاکہ ان بھرپور غذائیت والے پھلوں سے امیر و غریب سبھی کو طبی فوائد حاصل ہو سکیں۔

پختہ آموں کی افادیت

آم ایک لذیذ فرحت بخش اور زود ہضم پھل ہے دل و دماغ کو تقویت دیتا ذہن کو معطر کرتا اور خون کو صاف کرتا ہے معدے آنتوں اور معدے اور حلق کے درمیان کی نالی کو قوت بخشتا ہے گردے اور مثانے کی خشکی کو دور کرتا اور شہوانی قوت میں اضافے کا باعث ہے خفقان دُور کرتا اور رنگ کو نکھارتا ہے۔ کھانسی، دمے، سرد ہوا کے درد سر، قبض، بواسیر اور آنتوں کے درد میں شفا بخش ہے۔ کمزوری، تھکن اور سستی کو دُور کرتا اور کھل کر پیشاب لاتا ہے۔ طبیعت کو نرم کرتا ہے تپ کہنہ میں بھی مفید بتایا گیا ہے یہ پھل جتنا زیادہ خوشبودار ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ دماغ کو تقویت دیتا ہے اس کا سونگھنا بھی دماغ کو فرحت دیتا ہے قاش کے آموں کی بہ نسبت شیریں اور رسیلے آم زیادہ زود ہضم اور مفید ہوتے ہیں آم کھا کر دودھ پی لیا جائے تو آم کی گرمی کم ہو جاتی ہے اور قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے آم کو دیر تک ٹھنڈا کرکے یا برف کے پانی میں بھگو کر کھانے سے نہ صرف لذت

۵۲۔ سی منٹو روڈ کمپلیکس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

بڑھ جاتی ہے بلکہ اس کی گرمی بھی کم ہو جاتی ہے۔

آم ڈال اور پال دونوں ہی کے خوش ذائقہ ہوتے ہیں لیکن ڈال کے کچھ آم ایسے ہوتے ہیں جن میں ہلکی سی ترشی باقی رہ جاتی ہے جب کہ پال کے آم خوب شیریں ہوتے ہیں لیکن یہ صحیح لطف اسی صورت میں دیتے ہیں جب انھیں درخت سے اس وقت توڑا گیا ہو جب کم از کم ایک چوتھائی آم درخت سے ٹپک چکے ہوں اور باقی پختگی کے قریب ہوں بازار میں جو پختہ اور خوش رنگ آم ہوتے ہیں وہ بالعموم کاربائڈ سے پکائے جاتے ہیں جن سے نہ صرف ذائقہ ہی متاثر ہوتا ہے بلکہ کاربائڈ کی ہلکی سی سمیت بھی اس میں شامل ہو جاتی ہے ایسے آموں سے پرہیز بہتر ہے۔ آموں کو قاشوں کی صورت میں کھانا اگرچہ شائستگی کی علامت سمجھا جاتا ہے مگر طبی اعتبار سے آم کو چوس کر کھانا زیادہ مفید ہے۔

مضرات

آم جگر کے لیے مُضر ہے اور ورم جگر میں اور بھی زیادہ مُضر رساں ہے اس سے استسقاء (جلندھر) بھی پیدا ہو سکتا ہے مویز یعنی منقیٰ سے اس کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ بعض لوگ سونٹھ کو بھی آم کا مصلح بتاتے ہیں۔ شربتِ بیدانہ، شربتِ جامن اور سکنجبین بھی اس کی مصلح ہے جن مزاجوں میں آم گرمی پیدا کرتا ہے اُن کے لیے آبِ سرد ٹھنڈے مشروبات اور چھاچ کا استعمال مفید ہے۔

آم کے شفا بخش نسخے

○ آم کے پتے اور نرم شاخ کا لیپ بالوں کو بڑھاتا تقویت دیتا اور ان کی سیاہی کو تیز تر کرتا ہے۔

○ آم کے ہرے پتے کو حقے میں تمباکو کی جگہ رکھ کر پیا جائے تو بواسیر میں نفع بخش ہے۔

○ دو تولہ آم کے نرم پتوں کا عرق دو تولہ شکر کے ساتھ استعمال کرنا ماہواری کے خون اور بواسیر کے لیے فائدہ رساں ہے۔

○ آم کے خشک پتوں کا دھواں گردے کے ریاح اور حلق کے زخم کے لیے فائدے مند ہے۔

○ درخت سے از خود گرا ہوا پتہ تمباکو کی صورت میں چلم کے ذریعے پینا اس زخم کے مفید ہے جس میں ناک اور سر کی راہ ایک ہو چکی ہو۔ چالیس دن کے عمل سے زخم مندمل ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

○ آم کے نو عدد تازہ پتوں کے ڈنٹھل نو عدد سیاہ مرچوں کے ساتھ پانی میں گھس کر گولیاں بنائی جائیں یہ گولیاں اسہال قے اور ہیضہ میں مفید ہیں۔

○ آم کے ڈنٹھل اور جڑ کا مزاج سرد اور قابض ہے اسے کوٹ کر شہد ملا کر کھایا جائے اور غذا میں صرف دودھ لیا جائے تو دست بند ہو جاتے ہیں۔

○ آم کی لکڑی کی خاک جاری خون کو روک دیتی ہے اور اس کے پتوں کا سفوف چھڑکنے سے بھی خون رُک جاتا ہے۔

○ دو تولہ آم کے درخت کی چھال اُوپر سے چھیل کر اور کچل کر ایک پاؤ پانی میں شب بھر بھگو کر چھان کر صبح و شام ایک ہفتے تک استعمال کرنا سوزاک کو ختم کرتا ہے۔

○ آم کی لکڑی کا مسواک دہن کی بدبو کو دُور کرتا ہے۔

○ آم کا پھول جسے بور یا مول کہتے ہیں خوشبودار اور قابض ہوتا ہے۔ جریان کو نافع ہے رُکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ خون بلغم اور صفرا کے فساد اور پھنسیوں کے لیے اکسیر ہے۔

○ آم کے پھولوں کا سونگھنا نکسیر اور مُنہ میں پانی بھر آنے میں نفع بخش ہے۔

○ جس پانی میں آم کے پتے، چھال اور پھول بھیگے گئے ہوں وہ پانی دانتوں مسوڑھوں اور مُنہ آنے میں مفید ہے اور اس پانی میں تر کیے ہوئے کپڑے کی بتی سیلان الرحم اور نسوانی شرمگاہ کی بدبو دُور کرنے میں کارآمد ہے۔

کچے آم کے فوائد و مضرات

کچا آم درجۂ اوّل میں سرد و خشک ہے بعض اسے دوسرے درجے میں سرد و خشک مانتے ہیں۔ پہلے درجے میں سرد و خشک آم ذائقے میں ترش ہوتا ہے یہ گرمی اور پت کو دور کرتا اور قے کو روکتا اور پیاس کو کم کرتا ہے تلی اور خرابیِ خون میں مفید ہے بھوک بڑھاتا اور گردے اور مثانے کی پتھری کو توڑتا ہے۔ بلغمی مزاج والوں کو بلغم اور سودا پیدا کرنے کی وجہ سے مُضر ہے۔ گردے پھیپھڑے اور قوتِ باہ کے لیے بھی نقصان رساں ہے۔ جنین یعنی حمل کو ضائع کرتا ہے شکر سے اس کی اصلاح ہوتی ہے۔ کچے آم کا چھلکا اُتار کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے دو ایک گھنٹے پانی میں بھگونا اور صاف کر کے قند یا مصری سے میٹھا کر کے استعمال کرنا زہریلی ہوا کے اثرات میں بہت مفید ہے اور دل اور معدے کو قوت دیتا ہے اگر لُو کا اثر ہو جائے تو کچا آم بھوبھل میں جھلبلا کر بلپلا کر کے نچوڑ کے میٹھا کر کے استعمال کرنے سے مہلک اور زہریلی ہوا کے اثرات دُور ہو جاتے ہیں۔ کچے آ

کو پیس کر دکھتی آنکھ پر باندھ دیا جائے تو وہ بہت جلد اچھی ہو جاتی ہے اگر مکھی پھل گئی ہو اور دانے نکل آئے ہوں تو ان پر ملنے سے بھی کافی فائدہ ہوتا ہے۔ انگور کو تھوڑے نمک کے ساتھ پیس کر گہرے زخموں پر لگایا جائے تو وہ جلد اچھے ہو جاتے ہیں داد پر ملنا بھی فائدے مند ہے توے پر آہستہ آہستہ دست پناہ کے ذریعے گھس کر لگایا جائے تو آشوبِ چشم میں فائدہ بخش ہے۔

آم کھانے کا طریقہ

بہتر آم پانی سے دھو کر پلپلا کر لکڑی کا ڈنٹھل سے جُدا کر کے اور دو تین قطرے رس ٹپکا کر کھایا جائے تاکہ اندر کا چیپ دُور ہو جائے اس کا ریشہ یا سوت نہیں کھانا چاہیے اس سے بھاری پن اور قبض کی شکایت ہو سکتی ہے چیپ اگر لب یا زبان کو لگ جائے تو جلن یا زخم کا سبب بن سکتا ہے چاقو سے کاٹ کر آم کھانے میں ریشہ یا سوت سے احتیاط نہیں ہوتی اس سے پیچش اور گلے میں خراش پیدا ہونے کا امکان ہے آم کے رس کو باریک کپڑے میں چھان کر گلاب اور مصری ملا کر ٹھنڈا کر کے کھایا جائے تو بہت لذیذ ہوتا ہے بعض لوگ اسے میٹھے دہی اور بالائی مصری اور گلاب وغیرہ ملا کر شیرمال کے ساتھ کھاتے ہیں بعض طبائع کو یہ اس لیے ناپسند ہے کہ اس طرح آم آم نہیں رہتا آم کھا کر دودھ پینا خاص طور پر مفید ہے۔

نئی مطبوعات

دیوانِ غالب (کامل) تاریخی ترتیب سے
مرتبہ: کالی داس گپتا رضا
صفحات: ۴۰۰
قیمت: ۱۶۰ روپے
ناشر: ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹیڈ، ۱۰۷، جولی بھون، بمبئی ۴۰۰۰۲۰۔

کالی داس گپتا رضا کی غالبی خدمات میں ایک کارنامے کا اور اضافہ ہوگیا — دیوانِ غالب کامل یعنی غالب کے اجزاے پریشاں کا شیرازہ — جی تو چاہتا ہے غالب ہی کی تراکیبِ لفظی میں اس 'جامِ زر' کی کیفیت بیان کروں لیکن اپنے عجز حوصلہ سے ڈرتا ہوں کہ میری ہیچمدانی نہ کھل جائے اس لیے سیدھے سادے لفظوں ہی میں اپنا مدعا بیان کرنا مناسب ہوگا لیکن پہلے ایک شکایت سن لیجیے۔ یہ شکایت بھی ہے اور 'انتباہ' بھی۔ رضا صاحب پہلی ہی ملاقات میں اپنے مخاطب کی 'تصحیح' کر دیتے ہیں (تصحیح کو مرمت بھی کہا جاسکتا ہے لیکن شاعرانہ اصطلاح "اصلاح" ہے) اُن کا مخاطب عام دستور کے مطابق جب ان سے کہتا ہے رضا صاحب آپ سے مل کر خوشی ہوئی، تو اس سے پہلے کہ مصافحے کی رسمِ اجرا بپایۂ تکمیل کو پہنچے اُن کا ارشاد ہوگا۔ جی میں رِضا نہیں رِضا ہوں — میرے ساتھ بھی شاید یہی ہوا تھا اور میں نے دل ہی دل میں رضا نقوی واہی کو بُرا بھلا کہا تھا کہ پٹنہ میں بدورانِ ملاقات اگر موصوف میری 'خطابت' کی تصحیح کر دیتے تو مجھے یہ دن نہ دیکھنا پڑتا — کالی داس گپتا رضا جو اس ضخیم اور وقیع کتاب کے مرتب ہیں، پہلے گپتا ہیں اور بعد میں رضا۔ اس لیے صرف میری رائے نہیں بلکہ رائے عامّہ یہ ہے کہ جب بھی انھیں مخاطب کرنا ہو رائے مکسورہ یا رائے مفتوح (مفتوحہ کا لفظ صحیح تو ہونا چاہیے) کے مسئلے میں خود کو الجھائے بغیر انھیں گپتا ہی کے نام سے مخاطب کیا جائے۔ اس لفظ میں اعراب کی کوئی گڑبڑ نہیں ہے اور کالی داس کے زمانے سے بلکہ اور پہلے سے اس لفظ کا املا اور تلفظ ایک ہے — اپنے اس جملۂ معترضہ کے ذریعے میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ اعراب کے معاملے میں اتنا محتاط فرض شناس اور چوکنا شخص جب تحقیق کے میدان میں قدم رکھے گا (اور اُسی میدان کا ہو کر رہ جائے گا) تو ظاہر ہے کارنامہ ہی انجام دے گا — ویسے مجھے احساس ہے کہ یہ لفظ 'کارنامہ' ہم لوگوں کے اصرارِ نابےجا کی وجہ سے اپنے اصل معنی کھو چکا ہے۔

غالب پر تحقیقی کام کے ہزاروں پہلو ہیں۔ ایک مرتبہ تو اس خاکسار نے بھی کلامِ غالب کو دو حصّوں میں تقسیم کرنے کی (نامناسب) کوشش کی تھی اور اسد کے تخلص کی غزلیں الگ کرکے ایک نیا دیوان اپنے ذہن میں مرتب کرلیا تھا لیکن کالی داس گپتا رضا نے کلامِ غالب کو ۱۱ ادوار میں تقسیم کرکے ان اشعار کی تعداد بھی متعین کردی ہے جو غالب کے متداول دیوان اور دیوانِ کامل میں شامل ہیں۔ چونکہ یہی ترتیب اس دیوانِ کامل کی بنیاد ہے، اس کا نقل کیا جانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مرتب نے 'تعارف' میں لکھا ہے کہ اس کتاب کی ترتیب میں ۱۹ ماخذوں سے استفادہ کیا گیا ہے اور غالب کے کلامِ اُردو کے (۱۱) ادوار قائم کیے گئے ہیں۔ مرتب نے اپنے جدول میں مختلف ادوار میں کہے ہوئے اشعار اور متداول دیوان کے اشعار کی تعداد بھی متعین کردی ہے۔

جدول مندرجہ ذیل ہے:

ادوار	کُل اشعار	دیوان کے لیے منتخب اشعار
۱۸۰۷ء تا ۱۸۱۲ء	۵۹	۴
۱۸۱۳ء تا ۱۸۱۶ء	۱۷۳۴	۳۰۲
۱۸۱۷ء تا ۱۸۲۱ء	۶۹۵	۳۳۹
۱۸۲۲ء تا ۱۸۲۶ء	۲۹۸	۲۶۸
۱۸۲۷ء تا ۱۸۲۸ء	۹۱	۸۶
۱۸۲۸ء تا ۱۸۳۳ء	۸۹	۷۴
۱۸۳۴ء تا ۱۸۴۷ء	۸۹	۸۵
۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۲ء	۴۴۴	۳۸۴
۱۸۵۳ء تا (فروری) ۱۸۵۷ء	۴۴۰	۲۵۴
مئی ۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۲ء	۹۵	۶
۱۸۶۳ء تا ۱۸۶۷ء	۱۹۵	—
میزان	۴۲۰۹	۱۸۰۲

میں نے سوچا تھا کہ مندرجۂ بالا جدول کا حسابی نقطۂ نظر سے جائزہ لوں اور پھر اس کا تجزیہ کروں کہ غالب نے کس دور میں سب سے زیادہ کہا اور کس دور میں غضب سے مضامین اُن کے خیال میں نہیں آئے اور اگر آئے تو کم؛ لیکن پھر میں نے سوچا کہ اس میں تجزیے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ یہ جدول تو خود آئینہ خانہ ہے اور زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے۔ ایک ہی نظر میں معلوم ہو جاتا ہے کہ غالب نے ۱۸۱۳ء سے ۱۸۲۱ء تک بہت کہا لیکن نصف سے زیادہ کلام رد کر دیا۔

غالب کے جو ۲۴۰۷ اشعار اس دیوان میں شامل ہیں ان کے الحاقی یا مشکوک ہونے سے متعلق بھی مرتب نے 'تعارف' میں اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کمال احمد صدیقی کی کتاب 'بیاضِ غالب تحقیقی جائزہ' کو مرتب نے زیرِ بحث لانا مناسب نہیں سمجھا۔ مرتب نے 'تعارف' میں بہت اہم مباحث چھیڑے ہیں اور بالخصوص عرشی مرحوم اور مالک رام کے حوالے سے غالب کے مختلف دواوین اور تعدادِ اشعار کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ مرتب کی باریک بینی اور ذوقِ جستجو پر دال ہے۔

غالب کا اولین اُردو منظوم کلام بہت دلچسپ باب ہے۔ تحقیق ہے ہی رد و قبول کا معاملہ۔ اسی باب میں مولانا روم سے منسوب ایک شعر بھی زیرِ بحث آگیا ہے۔ بہر حال یہ باب توجہ سے پڑھنے کے لائق ہے۔ اس کتاب کا ایک اور باب "توقیتِ غالب" بہت اہم ہے اور سمجھنے کے لیے بھی آسان ہے اس لیے مجھے سب سے زیادہ یہی باب پسند آیا (ورنہ یوں تو شمار سبحہ مرغوب بتِ مشکل اور تماشائے بیک کف بردن صد دل بھی پسند آنے کی چیزیں ہیں)۔ 'توقیتِ غالب' سے متعلق یہ چند صفحات تو تاریخی واقعات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔

شروع کے ۸، ۹ صفحات میں مرتب نے "کلامِ غالب کی تاریخی ترتیب کیوں" کے عنوان پر ایک دلچسپ وضاحتی مضمون قلمبند کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے "مندرجۂ بالا چند مثالوں سے بخوبی ظاہر ہے کہ جب تک غالب کے تمام کلام کا تاریخی ترتیب سے مطالعہ نہ کیا جائے گا ہم نتائج اخذ کرنے میں اکثر ٹھوکریں کھاتے رہیں گے۔"

گو کہ غالب کے مروجہ دیوان کے مقابلے میں زیرِ نظر دیوان میں دو ہزار سے زیادہ اشعار شامل ہیں۔ اس کے باوجود یہ احساس باقی رہتا ہے کہ غالب نے فارسی سے زیادہ محبت کی۔ غالب نے تو اُردو میں ان شاعروں سے بھی کم کہا جو ان کے کندھے کے برابر تھے۔

دیوانِ غالب کامل میں مجھے ایک شعر اپنے مطلب کا بھی ملا۔ مشتاق احمد یوسفی نے اپنے ایک مضمون میں غالب کے شعر "تم سلامت رہو ہزار برس ۔ ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار" پر کہ وہ اہلِ حساب ہیں (یعنی بینکر ہیں) حسابی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے اچھا ہوا کہ انھوں نے غالب کے یہ ۳ مصرعے نہیں پڑھے:

"امیر کلب علی خاں جئیں ہزار برس
فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں
کئی ہزار برس بلکہ بے شمار برس"

(ص ۳۵۹ ۔ ۳۱ کا حساب کون کرے گا)

میرا اس کتاب کے بارے میں کچھ کہنا کتاب کی افادیت کو نقصان پہنچانے کے مرادف ہوگا۔ کتاب کے فلیپ پہ مالک رام، گیان چند، جمیل جالبی اور مشفق خواجہ جیسے ماہرینِ تحقیق کی جو آرا درج ہیں وہ تحسین کی شق میں نہیں آتیں 'حق' کی تعریف میں آتی ہیں۔ مالک رام نے اسے تاریخ ساز کام بتایا ہے، گیان چند نے اسے بے نظیر تحقیقی کارنامہ ٹھہرایا ہے جمیل جالبی نے اسے غالبیات میں اضافہ بتایا ہے اور مشفق خواجہ نے کہا ہے کہ رضا صاحب نے دولتِ خفتہ کو دولتِ بیدار بنا دیا۔

اس کتاب کے مطالعے کے آغاز پر "کھل جا سم سم" کے الفاظ ضرور کہنے چاہئیں۔

—— یوسف ناظم

اشاریہ آج کل (جلد اوّل)
مرتب: جمیل اختر
صفحات: ۶۸۳
قیمت: ۷۷ روپے
ناشر: اُردو اکادمی، دہلی۔ گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

اُردو میں اشاریہ سازی حال فی الحال شروع ہوئی ہے، پاکستان میں کام زیادہ ہوا ہے اور ہندوستان میں کم۔ علماء محققین کے لیے حوالے کی کتابیں اشد ضروری ہیں، طلبہ کو بھی اپنے خاص مقاصد کے لیے ان کتابوں کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اُردو میں وضاحتی کتابیات کا ارتقا ابتدائی مرحلے میں ہے یہی وجہ ہے کہ [illegible]

اشاریے کم ہی دست یاب ہوتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ علمی کام کرنے والوں کو بڑے ضخیم دفتروں کی تفتیش کرنے کی زحمت اٹھانی پڑتی ہے اور انھیں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس حقیقت کو دیکھتے ہوئے جمیل اختر صاحب کا مرتب کیا ہوا "اشاریہ آج کل" ایک نعمتِ غیر مترقبہ معلوم ہوتا ہے، جس کے لیے وہ اُردو اکادمی دہلی اور اُردو دوستوں کے شکریے کے مستحق ہیں کہ ان کی توجہ اور اہتمام سے اُردو کے مشہور ادبی و علمی ماہنامے "آج کل" دہلی کا ایک نہایت حکیمانہ اشاریہ مرتب ہو کر اہلِ نظر کو دعوتِ مطالعہ دے رہا ہے۔ ابھی اس کی جلد اوّل ہی شائع ہوئی ہے، مگر جس علمی انداز اور خوش سلیقگی سے اکادمی کی یہ کوشش سامنے آئی ہے اس سے توقع ہوتی ہے کہ آئندہ جلد ہی ایسی مزید کاوشیں شیدایانِ تحقیق کے ذوق کی تسکین کا سامان کریں گی۔ جمیل اختر صاحب نے یہ مشکل مہم سر کر کے اپنی ریاضت اور اہلیت دونوں کا ثبوت دیا

زیرِ نظر تالیف میں نہ صرف یہ کہ رسالے میں مطبوعہ مضامین کے اشاریے اور حوالے فراہم کیے گئے ہیں بلکہ عنوانات قائم کر کے ایسی جامع فہرست سازی کی گئی ہے کہ صرف اس تالیف پر ایک نظر ڈال کر قارئین جان سکتے ہیں کہ "آج کل" نے متنوع موضوعات پر علم و ادب کا کتنا وقیع سرمایہ مہیا کر دیا ہے۔ اس طرح کتاب کے مندرجات سے استفادہ بہت آسان ہو جاتا ہے اور مطبوعہ مواد کی

کتاب کے شروع ہی میں رسالے کی اشاعت کے پس منظر، ابتدا، تاریخ اشاعت، صفحات، ٹائیٹل، قیمت، تعدادِ اشاعت اور مقاصد کے متعلق بھی معلومات درج کر دی گئی ہیں، پھر مُدیروں اور خاص اشاعتوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ حصّۂ نثر، حصّۂ شعر، عالمی ادب، افسانے اور بچّوں کا ادب الگ الگ سرخیوں کے تحت دیے گئے ہیں۔ ہر کام محنت اور نفاست سے انجام دیا گیا ہے۔ اس اسلوبِ ترتیب سے مرتب کے حسنِ مطالعہ اور سلیقۂ تحریر کا پتا چلتا ہے۔ یہ حکیمانہ اشاریہ سازی علمی تحقیق کی شان رکھتی ہے اور اس سے اُردو کی وضاحتی کتابیات میں ایک وقیع اضافہ ہوا ہے۔

—— عبد المغنی

بانکپن احساس کا (غزلیات)

مُصنّف: کرشن موہن
صفحات: ۱۲۸
قیمت: ۴۰ روپے
ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

طرح طرح کی غزلوں پر مشتمل کرشن موہن کی یہ بائیسویں پیش کش، تازہ ترین ہونے کے ساتھ ایک ایسے شعری سفر کی آئینہ دار ہے جسے تخلیقی سرگرمی کے ایک بے انت سلسلے کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ماہ و سال کی دھوپ چھاؤں سے بے نیاز کرشن موہن جیسے تخلیق کار کے وجدانِ شعر نے اس

سے انصاف کیا ہے۔ یہ عصریت ماضی اور حال دونوں کا احاطہ کرتی ہے۔ گویا یہ ایک غزل نامہ ہے، جو غزل کی محدود فنی پہنائی میں بھی بتدریج اور بڑے اہتمام کے ساتھ غزل کی رومانی روایات، فکری وحسّی محرکات، تجرباتی اجتہاد اور جدید ترین لوازم پر حاوی ہے اور غزل کے نیم وحشی کردار کو پایۂ ثبوت تو کیا بلکہ بہت آگے لے جا... کا اقدام کرتا ہے۔ مصنف کے تحت الشعور میں یہ حقیقت بڑے زور و شور سے موجزن ہے کہ غزل کا نیم وحشی کردار ہی اس کی بوقلمونی اور شگفتگی کا امین ہونے کی بدولت اس کی ہر دل عزیزی اور مقبولیت کا ضامن ... غزل کے رومانی اور روایتی رنگ آہنگ کی جلوہ کاری کا اندازہ ذیل کے چند اشعار سے لگائیے جن سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ کرشن موہن کے یہاں غزل کی روایت کا شعور و احساس، محض اُردو غزل تک ہی محدود نہیں، بلکہ انھیں فارسی شعرا کے عشقیہ انداز و آداب سے بھی بھرپور آگہی ہے:

میں قتیلِ سنانِ ابرو ہوں
شاعرِ عشق بازِ اُردو ہوں

عہدِ شباب کی وہ کشش رات میں نہیں
پہلا سا التفات ملاقات میں نہیں

تلاشِ یارِ طرحدار، کُو بہ کُو کرتے
ترس گیا ہوں تمنائے رنگ و بُو کرتے

روایت کی مستحکم اور مستند اساس سے قطع نظر کرشن موہن کے یہاں "بانکپن احـ...

ایک بامعنی صورتِ حال کے مصداق 'بڑے طمطراق کے ساتھ نئی غزل اور نئی غزل کی تخلیق میں اُن تمام شوخ و شنگ لوازمات سے کام لیتا ہے جو بیشتر 'نئی لفظیات' ہندی اُردو کی آمیزش' لب ولہجے کے کھردرے پن' بدلتے اوقات کی وارداتی واقعیت' جنسیاتی رُجحانات' نفسیاتی ترجمانی' عصری حسیات اور سائنسی عہد کی عطیات کے حوالوں پر مشتمل ہیں اور جن کی بدولت غزل میں تنوع اور تازگی کی فضا ہر قدم پر نئی سے نئی ہوتی چلی جاتی ہے۔ فکری رنگا رنگی جمالیاتی شعور اور احساس کی جدیدیت کے اعتبار سے یہ چند اشعار خاصے دلچسپ ہیں:

چمک چھت چور چنچل آنچلوں کی
ہمارے ذہن میں رچ بس گئی ہے

کھٹکتا ہے یہاں تو ذکر بھی علم و ثقافت کا
یہ محفل تو سیاسی ہے' ہمارا دل نہیں لگتا

تب کُھلا بھید اُس کی عظمت کا
ہو گیا جب غریب کا دیہانت

ہے یہ کیسا تضاد' نثری نظم
جیسے زبل کا نام ہو بلونت

جب سے بیٹا عشق فرمانے لگا
ٹیلیفون کا بل ڈبل آنے لگا

وہ کسی کے کام تو آیا نہیں
ہاں فقط ممنون ہو کر رہ گیا

کرشن موہن نے نثری نظم سے تو گریز کیا ہے لیکن آزاد غزل سے وہ دامن نہیں بچاسکے گویا غزل کے رسیا ہونے کے ناطے انھیں آزاد غزل کی وسعتوں میں شدتِ اظہار کے تحت کھل کھیلنے کی آزادی اِدھر لے آئی۔ ذیل کے چند اشعار قابلِ توجہ ہیں:

ہو جو مطلب تو پرستش بھی کرے
نوچتا ہے ورنہ یہ انسان ہی انسان کو

خامشی کا پیرہن پہنے ہوئے
گھومتی ہے' جھومتی ہے شہر میں کبرومنی

درحقیقت عقل ہی کا ڈھونگ ہے
یار لوگوں کی جنوں پیراہنی

امنگ کا کیف ورنگ کا ماحصل ہے کتبہ
تنبیہِ نام و ننگ پتھر

ناشر نے اس کتاب کو اسی بانکپن کے ساتھ طبع کیا ہے جو اس کے مشمولات میں موجود ہے۔ کتاب کا خیر مقدم ایک امرِ ناگزیر کے مصداق کسی رسمی التزام کا مرہون نہیں۔

——— رام پرکاش راہی

دستِ نگاریں

شاعر: رشید شاہجہاں پوری
قیمت: ۶۰ روپے
ناشر: ڈاکٹر راشد حسین' شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی' علی گڑھ (یو.پی)

"دستِ نگاریں" رشید شاہجہاں پوری کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ رشید کی تاریخ پیدائش ۱۰ اپریل ۱۹۱۳ء اور تاریخِ وفات ۴ مارچ ۱۹۸۰ء ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ رشید کی زندگی اور فن بیسویں صدی کے پروردہ ہیں۔ کتاب کی تقریظ میں وارث کرمانی نے صحیح لکھا ہے کہ:

"رشید شاہجہاں پوری ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اس اُتھل پتھل میں اپنی شاعری کو محفوظ رکھا' اور کلاسیکی قواعد و ضوابط کی پابندی کے ساتھ فکر و خیال کے خوش رنگ پھول کھلائے ہیں۔"

رشید کے کلام کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے زبان اور اسلوب کی سطح پر کلاسیکی نظم وضبط اور روایات کا احترام کرتے ہوئے انھیں اپنی شاعری میں باقی رکھا ہے۔ ان کی شاعری میں زبان و بیان کی صحت اور عروض وفن کا التزام ہے۔ رشید شاہجہاں پوری نے حبیب شاہجہاں پوری اور مختار شاہجہاں پوری سے شرفِ تلمذ حاصل کیا اور زبان وفن کے نکات کو ذہن نشین کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اُردو فارسی شعرا کے اثرات بھی قبول کیے ہیں۔ جس کا اظہار ان کی شاعری سے ہوتا ہے۔ رشید کی شاعری میں یوں تو مہذب افکار اور خیالات ملتے ہیں لیکن اس میں ایک رنگ رومانیت کا بھی ہے۔ کبھی وہ من کی موج کو حدیثِ دیگراں بناتے ہیں اور کبھی جہانِ دیگر کو آپ بیتی بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں ایک مہذب اور روایتی رنگ میں نظر آتے ہیں۔ نظمیں عام طور پر [illegible]

میں ایک سنبھلی ہوئی کیفیت نظر آتی ہے۔
چند شعر ملاحظہ کیجیے :

غور سے جب نگاہ کی دہر کے بندوبست میں
جبر ہی اختیار تھا نظمِ بلند و پست میں

کم نظر سمجھتے ہیں، بے قرار کرتے ہیں
حادثات انساں کو پختہ کار کرتے ہیں

کم سے کم تذکرۂ عشق کا عنواں ہو جائے
دِل ہوا ہے جو پریشاں تو پریشاں ہو جائے

بیٹھا ہوں دل میں یار کو مہماں کیے ہوئے
ذرّے کو رشکِ مہرِ درخشاں کیے ہوئے

ابھی سے نقشِ حیرت بن گئے کیا دیکھنے والے
تجلّی چاہنے والے، تماشا دیکھنے والے

طباعت اور کتابت دل کش ہے، کاغذ اور جلد دونوں اعلیٰ درجے کے ہیں۔ کلاسیکی رنگ کی غزل کو پسند کرنے والوں کے لیے "دستِ نگاریں" ایک تحفہ ہے۔

—— نعیم الدّین رضوی

نئے شگوفے
مُصنّف : کنھیّا لال کپور
صفحات : ۱۹۲
قیمت : ۳۵ روپے
پبلشر اور ملنے کا پتا : سلوچنہ پبلیکیشنز، ڈی ۱۴۱، گل مُہر پارک، نئی دہلی ۴۹ ۱۱۰۰۔

کنہیا لال کپور (۲۷ جون ۱۹۱۰ء — ۵ مئی ۱۹۸۰ء) اُردو طنز و مزاح کے قد آور ادیب ہیں۔ یہی سبب ہے کہ فکر تونسوی انھیں عمر بھر اپنا گُورو مانتے رہے۔ ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے نو مجموعے شائع ہوئے: سنگ و خشت، شیشہ و تیشہ، چنگ و رباب، نوک و نشتر، بال و پر، نرم گرم، گردِ کارواں، گستاخیاں اور نازک خیالیاں۔ پہلا مجموعہ ۱۹۴۲ء میں اور آخری ۱۹۷۴ء میں منظرِ عام پر آیا۔

"نئے شگوفے" کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا انتخاب خود کپور صاحب نے کیا اور اس کا نام سنسکار بھی یہ اُن کی آخری کتاب ہے۔ اس مجموعے کا مقدمہ اُردو اور انگریزی کے معروف ادیب اندر جیت لال نے بعنوان "کچھ طنز نگار کے بارے میں" سپردِ قلم کیا ہے۔ ہمارے نقّاد اس بات پر متفق ہیں کہ کپور صاحب بنیادی طور پر طنز نگار ہیں، مزاح ان کے ہاں ذیلی و ضمنی حیثیت رکھتا ہے۔ طنز و مزاح کے بارے میں کپور رقمطراز ہیں :

" طنز : تنقید ہے، صدائے احتجاج ہے، دُشنام یار ہے، تبصرہ ہے، تازیانہ ہے، اس کا مقصد اصلاح ہے، دوسرے کی پگڑی اُچھالنا ہے، اپنے احساسِ برتری کا مظاہرہ کرنا ہے، بے ہودہ اشیا اور اشخاص کا مضحکہ اُڑانا ہے۔

مزاح : مبالغہ ہے، مشغلہ ہے، مہتابی ہے، انار ہے، پھلجھڑی ہے، اپنے آپ پر ہنسنے کا نام ہے، چٹکی لینا ہے، ہمدردانہ نقطۂ نظر سے انسانی کمزوریوں کو بے نقاب کرنے کا فن ہے۔" (طنز و مزاح میری نظر میں)

کنھیّا لال کپور کا طرزِ نگارش اور اندازِ طنز و مزاح ملاحظہ کیجیے مشتے نمونہ از خروارے:

"آدمی —— وہ جانور جسے چڑیا گھر میں اس لیے نہیں بھجوایا گیا، مبادا باقی جانور اس کی صحبت میں رہ کر بگڑ نہ جائیں۔

بیوی —— دھوبن، باورچن، نرس اور باندی کا قابلِ رحم مرکب۔

بھابی —— سالی کے علاوہ واحد ہندوستانی عورت ہے جس کے ساتھ تھوڑی سی بے تکلفی کے ساتھ پیش آیا جاسکتا ہے۔

تقریر —— کچھ کہے بغیر متواتر بولتے چلے جانے کا فن۔

زبان —— گوشت کا لوتھڑا جس کی لمبائی گز بھر ہو سکتی ہے اگر وہ عورت کے مُنہ میں ہو۔

فاختہ —— ایک پرندہ جسے کبھی خلیل خاں اُڑایا کرتے تھے لیکن جوان کی وفات کے بعد خود اُڑ رہی ہے۔" (لغاتِ جدید)

آنکھیں —— وہ جو اگر آ جائیں تو زحمت، چلی جائیں تو مصیبت، لڑ جائیں تو آفت اور لڑائی جائیں تو قیامت ہوتی ہے۔

پارسا —— ایک قسم کا لائسنس یافتہ ریاکار۔

فلسفہ —— کوئی ایسی بات جو نہ اس کی سمجھ میں آئی ہے جو سمجھا رہا ہے اور نہ اس کی سمجھ میں آئی ہے جو اسے سمجھ رہا ہے مگر اس کو کبھی پتے کی بات کہا جاتا ہے۔" (لغاتِ جدید تر)

اندر جیت لال نے ٹھیک لکھا ہے "اس (کپور صاحب) کا ہر دوسرا فقرہ چست اور ہر تیسری ترکیب چاق و چوبند ہوتی ہے۔ اس کا ہر لفظ ایک طمانچہ اور ہر شوشہ ایک چپت ہے" کپور صاحب مرحوم کی یہ تازہ ترین کتاب بلکہ آخری کتاب۔ اُن کی نمائندہ تحریر کہی جا سکتی ہے اور طنزیہ ادب کی ایک قابلِ قدر کتاب بھی۔ جو ہر اعتبار سے دلکش ہے۔ کپور صاحب کے مداحوں کے لیے یہ ایک یادگاری تحفے کا درجہ رکھتی ہے۔

—— جاوید وششٹ

ہم طرح اشعار

جون ۱۹۸۹ء کے شمارے میں دیے جانے والے مصرعے پر ہمیں تقریباً سو شعر موصول ہوئے لیکن حیرت ہے کہ ان میں صرف آٹھ شعر صحیح بحر اور درست ردیف قافیے میں تھے، باقی اشعار کی یا تو بحر مختلف ہے یا ردیف قافیہ۔ ایک عام قاری کو بحر میں مغالطہ ہو سکتا ہے لیکن ردیف قافیے کی بھی اسے پہچان نہ ہو اور وہ شاعری سے لگاؤ کا دعویدار ہو، ایسا کم دیکھنے میں آیا ہے ـــــــ یہ آٹھوں شعر ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں۔ "گلدستہ" ان اشعار کے ارسال کنندگان کو بھیجا جائے گا جو جو کھٹے میں دیے جا رہے ہیں۔

نہاں شانِ تغافل میں ہے رمزِ امتیاز اس کا
باندازِ جفا ہے التفاتِ دل نواز اس کا
(حسرت موہانی)

مرسلہ: محمد یٰسین احمد جمالی، بھاگلپور

چھپا یا دم زدن میں دل کو فکرِ شادی و غم سے
قیامت پُر اثر تھا جلوۂ حیرت نواز اُس کا
(حسرت موہانی)

مرسلہ: قاسم علی، بھاگلپور

غلط ہے شکوہ سبھی میرے عشقِ ناشکیبا کی
بجا کرتا ہے جو کرتا ہے حسنِ بے نیاز اس کا
(حسرت موہانی)

مرسلہ: اصغر امام، معرفت علی امام، مجاہد پور، ویسٹ بھاگل پور ۸۱۲۰۰۲ (بہار)۔

نگاہِ آرزو، تابِ نگاہِ یار کیا لاتی
اگر حائل نہ ہوجاتا حجابِ کارساز اس کا
(حسرت موہانی)

مرسلہ: قیصر امام، معرفت عبدالکریم، مجاہد پور، پچھم ٹولہ، بھاگلپور ۸۱۲۰۰۲۔

دیارِ شوق میں ماتم بپا ہے مرگِ حسرت کا
وہ وضعِ پارسا اس کی وہ عشقِ پاک باز اس کا
(حسرت موہانی)

مرسلہ: مظہر مجاہدی، بھاگلپور

اشاروں سے کیا ظاہر نہ آنکھوں سے کیا ظاہر
امانت کی طرح سینے میں رکھا ہم نے راز اُس کا
(کمال اختر کمال بدایونی)

مرسلہ: کمال اختر کمال، ناہرخاں سرائے بدایوں

مزہ اب زندگی کا درحقیقت پا رہا ہوں میں
مری سانسوں میں یاد اس کی مرے سینے میں راز اس کا
(مناظر حسن شاہین)

مرسلہ: مظفر نصیب صدیقی، گیا

سکھایا ہے بسے میں نے بڑی طاقت سے ٹکرانا
کبوتر سے مرے بچ کر کہاں جائے گا باز اُس کا
(غلشن بڑودوی)

مرسلہ: احمد میاں حکیم، بڑودہ

آئندہ مہینے کے لیے اس مصرعے پر اپنی پسند کے شعر اس طرح ارسال کریں کہ ہمیں ۱۲ر جولائی ۸۹ء تک مل جائیں:

ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے
قافیہ　ردیف

یہ مصرع حسرت موہانی کا ہے۔ اس غزل کا کوئی شعر شاملِ مقابلہ نہ ہوگا۔

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے

موصولہ عنوانات

جون ۱۹۸۹ء کے "ایوانِ اُردو دہلی" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی، اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانوں میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوان ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں :

شعری عنوانات

کیوں تعجب ہے مری صحرا نوردی پر تجھے؟
یہ تگا پوئے دما دم زندگی کی ہے دلیل
(اقبال)

مرسلہ : محمد سرور عالم بنٹی، کٹھل باڑی
بلادر گنج، پورنیہ ۸۵۵۱۰۱ (بہار)

ریت کے صحرا میں تاباںؔ اور تو رکھا ہے کیا
پیاس سے ٹوٹے سرابوں کا نظارہ کیجیے
(غلام ربانی تاباں)

مرسلہ: شبینہ پروین، بھاگلپور

میں ہوں آوارہ مسافر راہ بے منزل مری
دل لیے پھرتا ہے مجھ کو دربدر کہنا اسے
(ناصر کاظمی)

مرسلہ: معین الدین شمسی، کانڈے

اُس شخص نے جو دیر سے برکھا میں کھڑا تھا
جب پاؤں اٹھایا کئی صحرا نظر آئے
(بمل کرشن اشک)

مرسلہ: کماری نیلم چودھری، صاحب گنج

جب تلک جان کے پیچھے ہے یہ آشوبِ وجود
چین گھر میں بھی کہاں، دربدری میں بھی کہاں
(فضا ابن فیضی)

مرسلہ: سلمیٰ نکہت، صاحب گنج

میں اپنا ریگ زارِ تمنا سمیٹ لوں
تو مجھ سے اپنی سونپی ہوئی پیاس چھین لے
(شاذ تمکنت)

مرسلہ: قیصر امام، بھاگلپور

زندگانی ہے کہ سنسان ہے صحرا کوئی
دُور تک کوئی شجر اور نہ سایا کوئی
(عثمان عارف)

مرسلہ : محمد قمر الہدیٰ قمر، پورنیہ

سائباں دھوپ کا کافی ہے ہمیں اے ساقی
ریگ زاروں کے مسافر ہیں ہمیں سایا کیا؟

مرسلہ: جاوید اقبال صدیقی، گیا

لب خشک و زباں خشک و گلوئے من خشک
پانی ارے پانی ارے پانی ساقی
(ساحر شاہجہانپوری)

مرسلہ : مقصود حسن خاں گمنام، پہرپوی، رائے بریلی۔

نثری عنوانات

"انسان اور بزمِ قدرت" (اقبال کی نظم)

مرسلہ : محمد پرویز اختر ولی، پورنیہ

"زادِ راہ" (منشی پریم چند کا افسانوں کا مجموعہ)

مرسلہ : نذیر احمد قریشی کارنجوی، کھنگرولی، بیر

"سودیشی ریل" (شوکت تھانوی کا مزاحیہ مضمون)

مرسلہ : محمد خالد سیف اللہ، پوسٹ باکس نمبر ۱۶۰، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲۔

"پت جھڑ کے مسافر" (مسرور سبزواری کا ناول)

مرسلہ: انجم آرا چندہ، ہزاری باغ

"یاترا سے پہلے" (شاہد انور کا افسانہ)

مرسلہ : محمد الیاس داغ، مجاہد پور، پچھم ٹولہ نزدیک چھوٹی مسجد، بھاگلپور

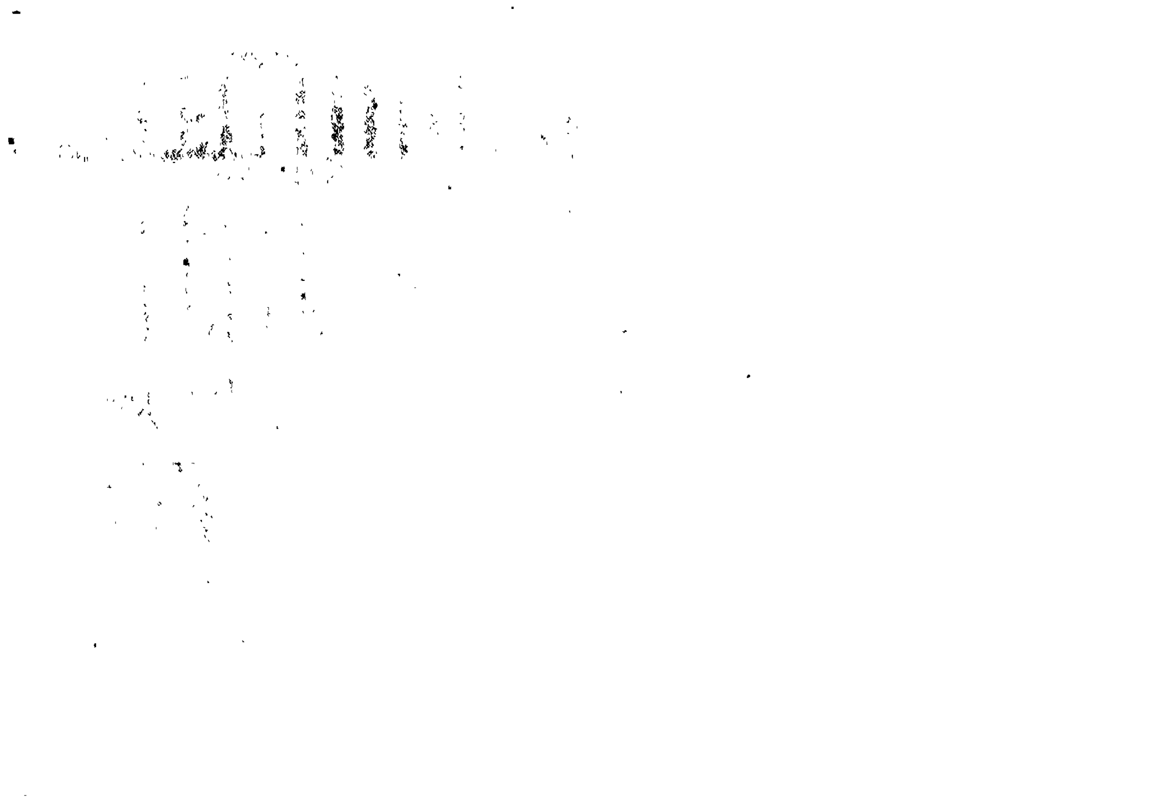
"دھوپ کا سفر" (اظہار صہباتی کا افسانہ)

مرسلہ : ہاشم احمد، بھاگلپور

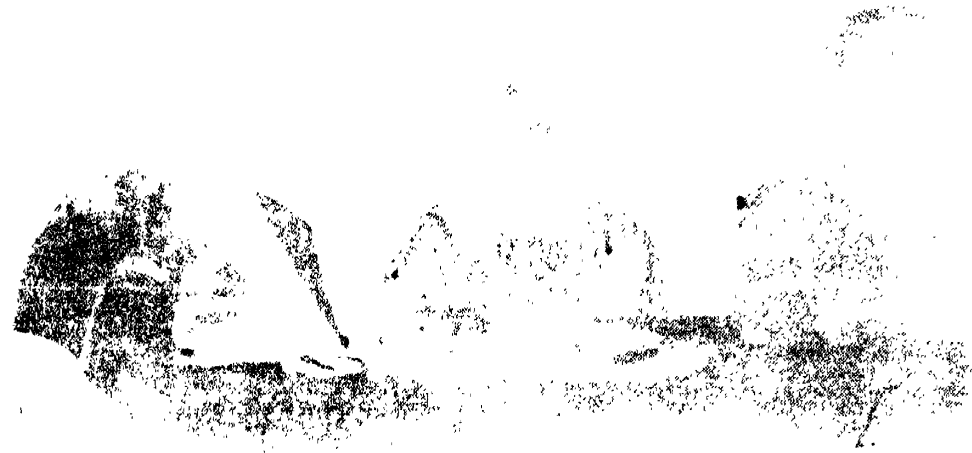
"گلدستہ" پہلے نمبر پر درج شعری عنوان اور تیسرے اور پانچویں نمبر پر درج نثری عنوان بھیجنے والوں کو ارسال کیا جارہا ہے۔

اُردو خبرنامہ

اُردو اکادمی کی سرگرمیاں



۹ مئی کو دہلی کے چیف ایگزیکٹو کونسلر جناب جگ پرویش چندر نے اپنی کوٹھی واقع ۲۔ کوشک روڈ پر عید ملن کی تقریب منعقد کی اور اس کے اہتمام کا خوشگوار فریضہ اُردو اکادمی کو تفویض کیا۔ اس تقریب میں مرکزی وزرا اور دہلی انتظامیہ کے ذمہ داروں کے علاوہ دہلی کے سینکڑوں سرکردہ شہریوں نے شرکت کی۔ تصویر میں جناب جگ پرویش چندر، دہلی کے لیفٹننٹ گورنر جناب رومیش بھنڈاری کو خوش آمدید کہتے ہوئے۔



۱۹ مئی کو اُردو اکادمی نے پاکستانی شاعرہ محترمہ حسنیٰ عالمگیر کے اعزاز میں ایک شعری نشست منعقد کی جو غالب اکیڈمی کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی جس کی صدارت جنابِ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے کی۔ تصویر میں، دائیں طرف سے: جنابِ کنور مہندر سنگھ، محترمہ حسنیٰ عالمگیر، جناب عالمگیر اور جنابِ عنوان چشتی۔

۳۰ مئی کو پاکستان سے آئے ہوئے مشہور صحافی، نقّاد اور کراچی یونیورسٹی میں پاکستانی ادب اور ثقافت کے شعبے کے صدر پروفیسر محمد علی صدیقی کے ساتھ اُردو اکادمی نے ایک شام کا اہتمام کیا۔ یہ شام غالب اکیڈمی کے ہال میں اقلیتی کمیشن کے چیئرمین جنابِ سید مظفر حسین برنی کی صدارت میں منائی گئی۔ پروفیسر محمد علی صدیقی نے پاکستان کی ادبی صورتِ حال پر روشنی ڈالی اور پاکستان کی قومی زبان کے روپ میں وہاں اُردو کے پھولنے پھلنے کے کیا امکانات ہیں، اس کا بھی ذکر کیا۔ انھوں نے ان اندیشوں کو بے جا قرا

دیا کہ علاقائی زبانوں کے پنپنے سے اُردو کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان میں اُردو کی وہی حیثیت ہے جو ہندوستان میں ہندی کی ہے۔ ان دونوں کی ترقی اور توسیع میں دوسری زبانیں بھی رکاوٹ بن سکتی ہیں جب ان کی بالادستی قائم کرنے کے لیے دوسری زبانوں کو دبایا جائے۔ ان سے متعدد سوالات بھی کیے گئے جن کے انھوں نے جواب دیے۔ جلسے میں پروفیسر قمر رئیس اور دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی نے خیر مقدمی تقریریں کیں۔ صدر محترم جناب سید مظفر حسین برنی کی تقریر کے بعد سکریٹری اکادمی کے شکریے پر یہ ادبی شام اختتام پذیر ہوئی ــــ تصویر میں دائیں سے: پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر محمد علی صدیقی، جناب سید مظفر حسین برنی، جناب دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی۔ (تصاویر: سید فدا علی)

مضمون نویسی کے مقابلوں کے نتائج

اُردو اکادمی دہلی نے پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد پر کالجوں اور یونیورسٹیوں کے انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ طلبا اور طالبات اور ریسرچ اسکالرز کے لیے کل ہند مقابلۂ مضمون نویسی کا اعلان کیا تھا۔ نیز بیرسٹر آصف علی صاحب کی یاد میں دہلی کے اسکولی طلبا اور طالبات اور اساتذہ کو مضمون نویسی کے مقابلے میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہماری دعوت پر دہلی اور بیرون دہلی کے طلبا، طالبات، ریسرچ اسکالرز اور اساتذہ کی ایک بڑی تعداد نے ملک کے ان تین محسنوں کی یاد میں مضامین لکھے۔ موصول شدہ مضامین میں سے انعامی کمیٹی نے انعامات کے لیے جو مضامین منتخب کیے، ان کے لکھنے والوں کے نام ذیل میں دیے جا رہے ہیں۔ پہلے، دوسرے اور تیسرے انعامات کے علاوہ کچھ مضامین پر ہمت افزائی کے نقطۂ نظر سے بھی انعامات دیے گئے ہیں۔

کل ہند مضمون نویسی مقابلہ
بیاد پنڈت جواہر لال نہرو

زمرہ انڈر گریجویٹ طلبا و طالبات:

ایم۔ معارف (گلاب میموریل کالج، بیتیا، ویسٹ چمپارن، بہار)۔ سوم

زمرہ پوسٹ گریجویٹ طلبا و طالبات:

محمد قسیم الزماں (ڈپارٹمنٹ آف پولیٹیکل سائنس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، یو۔پی)۔ دوم

زمرہ ریسرچ اسکالرز:

شجاع الدین (شعبۂ اُردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، یو۔پی)۔ کنسولیشن

کل ہند مضمون نویسی مقابلہ
بیاد مولانا ابوالکلام آزاد

زمرہ انڈر گریجویٹ طلبا و طالبات:

۱۔ محمد محمود ہاشم (کرائسٹ چرچ کالج، کانپور)۔ اوّل

۲۔ ناظرہ جبیں (گورنمنٹ گرلز پی۔جی۔ کالج، رامپور)۔ دوم

۳۔ عمرانہ بیگم (ڈاکٹر ذاکر حسین کالج، اجمیری گیٹ، دہلی)۔ سوم

۴۔ مس انصاری تمکین (آرٹس اینڈ کامرس کالج، مالیگاؤں)۔ کنسولیشن

۵۔ صبا انجم (ویمنس کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)۔ کنسولیشن

زمرہ پوسٹ گریجویٹ طالبات و طلبا:

۱۔ رئیس احمد (شعبۂ اُردو، راجستھان یونیورسٹی، جے پور)۔ اوّل

۲۔ شہزاد انجم (شعبۂ اُردو، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا، بہار)۔ دوم

۳۔ وصی احمد راہی (شعبۂ اُردو، بہار یونیورسٹی، مظفر پور)۔ سوم

زمرہ ریسرچ اسکالرز:

۱۔ شجاع الدین (شعبۂ اُردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)۔ اوّل

۲۔ محمد حامد علی خاں (شعبۂ اُردو، بہار یونیورسٹی، مظفر پور)۔ دوم

۳۔ سہیل صدیقی (سیفیہ پوسٹ گریجویٹ کالج آف آرٹس، کامرس اینڈ لا، بھوپال)۔ سوم

۴۔ طاہر الحسن (شعبۂ اُردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)۔ کنسولیشن

۵۔ مس وسیم بانو (ڈپارٹمنٹ آف سائیکو عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد)۔ کنسولیشن

مضمون نویسی مقابلہ بیاد بیرسٹر آصف علی
(دہلی کے اسکولی طلبا، طالبات اور اساتذہ کے لیے)

سیکنڈری و سینیئر سیکنڈری زمرہ:

۱۔ فردوس ولد حکیم الدین (گورنمنٹ گرا سیکنڈری اسکول، حویلی اعظم خاں، آصف علی روڈ، نئی دہلی)۔ اوّل

۲۔ ندیم خاں (اینگلو عربک سینیئر سیکنڈری اسکول اجمیری گیٹ، دہلی)۔ دوم
۳۔ شاہینہ (گورنمنٹ گرلز سیکنڈری اسکول لال کنواں، نمبرا، دہلی)۔ سوم
۴۔ حنا رحمان (اندر پرستھ گرلز سینیئر سیکنڈری اسکول جامع مسجد، دہلی)۔ کنسولیشن
۵۔ فردوس بیگم (گورنمنٹ گرلز سیکنڈری اسکول، حویلی اعظم خاں، آصف علی روڈ، نئی دہلی)۔ کنسولیشن

مڈل زمرہ:

۱۔ اسداللہ صدیقی (جامعہ مڈل اسکول جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)۔ اوّل
۲۔ شمع پروین (گورنمنٹ گرلز مڈل اسکول، بلبلی خانہ، بازار سیتا رام، دہلی)۔ دوم
۳۔ سلمیٰ خاتون (گورنمنٹ گرلز سیکنڈری اسکول لال کنواں، نمبرا، دہلی)۔ سوم
۴۔ شارق الرحمان (منظر الاسلام سیکنڈری اسکول، فراشخانہ، دہلی)۔ کنسولیشن
۵۔ شائستہ پروین (گورنمنٹ گرلز مڈل اسکول، بلبلی خانہ، بازار سیتا رام، دہلی)۔ کنسولیشن

زمرۂ اساتذہ:

۱۔ محترمہ جمیلہ عزیز دہلوی (ہیڈ مسٹریس، ایم سی۔ پرائمری اسکول سیکنڈ شفٹ، گلی بوخاں، دہلی)۔ اوّل
۲۔ محترمہ طلعت فاطمہ (گورنمنٹ گرلز سیکنڈری اسکول، حویلی اعظم خاں، آصف علی روڈ، نئی دہلی)۔ دوم
۳۔ محترمہ سکندر جہاں (ایم سی۔ پرائمری اسکول لال کنواں سیکنڈ، دہلی)۔ سوم

اُردو قومی اتحاد کی علامت

راجستھان اُردو اکادمی کے زیرِ اہتمام ۱۲ مئی ۱۹۸۹ء کو مولانا آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو صدی تقریبات کے سلسلے میں ایک کل ہند قومی ایکتا مشاعرہ بیکانیر میں منعقد کیا گیا۔ مرکزی وزیر جناب پی شیو شنکر صاحب نے اس مشاعرے میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت فرمائی اور راجستھان کے وزیرِ تعلیم جناب بی ڈی۔ کلّا صاحب نے مشاعرے کی صدارت فرمائی۔

مشاعرے کے آغاز میں اکادمی کے چیرمین ڈاکٹر ثاقب رضوی نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا اور مہمان گرامی اور شعرا کی گلپوشی کی، اس موقع پر راجستھان کے وزیرِ تعلیم شری بی۔ ڈی۔ کلّا صاحب نے اپنے شہر کے گیارہ شعرا کو شال پہنا کر اعزاز سے نوازا۔

مہمان خصوصی جناب پی شیو شنکر صاحب نے اپنی تقریر میں اُردو کی نفاست، نزاکت لطافت اور شیرینی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ ہمارے ملک کی زبان ہے اور یہیں پروان چڑھی ہے یہ کسی خاص مذہب یا فرقے کی زبان نہیں ہے بلکہ ہماری اپنی زبان ہے انھوں نے کہا کہ میری مادری زبان تلگو ہے لیکن میں خود اُردو کا ایک طالبِ علم ہوں یہ زبان قومی اتحاد کی ایک علامت ہے

اس مشاعرے کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر ملک زادہ منظور نے انجام دیے۔ مشہور شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔ تقریباً دس ہزار سامعین رات کو ۳½ بجے تک شعرا کے کلام کا لطف اٹھاتے رہے۔

کٹک میں آل اُڑیسہ اُردو کانفرنس اور مشاعرہ

مسلم یوتھ کلچرل ایسوسی ایشن (۱۹۷۸ء) کے زیرِ اہتمام گذشتہ ۲۰ اور ۲۱ مئی کو مایکا ہاؤس دیوان بازار کٹک میں اُردو کانفرنس اور کل ہند مشاعرے کی دو روزہ تقریبات منعقد کی گئیں۔ پہلے روز شام کا اجلاس مجلس استقبالیہ کے چیرمین محمد افسر صاحب کی صدارت میں ہوا۔ فرزان سیفی صاحب نے معزز مہمانوں کا تعارف کراتے ہوئے ان کی ادبی و سماجی خدمات پر روشنی ڈالی۔

اپنی استقبالیہ تقریر میں جناب محمد یوسف ایڈوکیٹ نے اُردو کی اہمیت اور اس کے ہمہ گیر اثرات کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا۔ ایسوسی ایشن کے سیکریٹری یوسف اقبال صاحب نے اپنی رپورٹ میں کانفرنس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ ان کے علاوہ مہمانِ خصوصی جناب شریف الحسن نقوی، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں (بنگلور)، شریمتی منورما مہاپاترا، جناب محمد افسر اور ڈاکٹر مشتاق علی نے خدمتِ قوم و ملّت کے طریقِ کار اور اُردو کو درپیش مسائل کو موضوعِ تقریر بنایا۔ جلسے کے اختتام پر اڑیسہ کی ان ادبی ہستیوں کو ایوارڈ پیش کیے گئے جنھوں نے اُردو کی ترقی و ترویج میں گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ ایوارڈ پانے والوں کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ جناب سلیمان خاکی
۲۔ جناب ضمیر خاں ضمیر
۳۔ جناب ساجد اثر
۴۔ جناب

جنابِ خالد رحیم
جنابِ سعید رحمانی
جنابِ ظہیر اللہ نورؔ
جنابِ اسمٰعیل آذر
جنابِ الیاس آباد
شری انتریامی ساہو

تقسیم ایوارڈ کے بعد اُردو کے مشہور
ِرا آنجہانی لکشمی نرائن مشرا کی یاد میں
ِقی کا ایک دلنواز پروگرام مس سنگیتا
پاترا اور ان کی سہیلیوں نے پیش کیا۔

دوسرے دن کا اجلاس سویرے ۹ ؍
ِمد یوسف صاحب کی صدارت میں ہوا
ِ میں درج ذیل موضوعات زیرِ بحث آئے۔
ِف) اُردو زبان وادب کا ملک کی تعمیرِ نو
میں حصّہ
ِب) قومی یکجہتی اور ملکی سالمیت میں
اُردو کا کردار
ِج) اڑیسہ میں اُردو زبان کا ماضی، حال
اور مستقبل

مباحثوں کے بعد چند اہم قراردادیں
ِتہ طور پر منظور ہوئیں۔ اس کے بعد آل
ِسہ اُردو کانفرنس کو مستقل حیثیت دے کر
ِ کا کنوینر یوسف اقبال صاحب کو منتخب کیا
اسی روز شب کے ۹ ؍ بجے کُل ہند مشاعرہ
حضرت نجمی منعقد ہوا۔
(سیّد یوسف اقبال)

ِدہ دلانِ بمبئی کا جلسۂ تہنیت

جمعہ ۱۲ ؍ مئی ۸۹ء کو انجمن زندہ دلانِ
ِی کی جانب سے المالطیفی ہال صابو صدیق
ِکنیک ۔۔۔ [illegible]

اہتمام کیا گیا۔ اسٹوڈینٹس ایسوسی ایشن آف ٹریڈ اینڈ سرٹی فیکٹس کورسس صابو صدیق پالی ٹیکنیک کے اشتراک سے منعقدہ اس تقریب کا آغاز طلبہ کے پیش کردہ تفریحی پروگرام سے ہوا۔ پھر زندہ دلانِ بمبئی کے سیکریٹری فیاض فیضی نے نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے جناب یوسف ناظم سے استقبالیہ تقریر کی درخواست کی۔ جنابِ یوسف ناظم نے صدرِ جلسہ ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا وزیرِ شہری ترقیات حکومتِ مہاراشٹر اور غالب ایوارڈ یافتہ ممدوحین جنابِ علی سردار جعفری، جنابِ اختر الایمان اور جنابِ کالی داس گپتا رضا کا استقبال کرتے ہوئے غالب ایوارڈز کی تاریخ بیان کی۔ انھوں نے بتایا کہ غالب صدی کے دوران فخر الدین علی احمد مرحوم سابق صدر جمہوریہ ہند کی صدارت میں غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کی تشکیل ہوئی اور غالب ایوارڈز قائم کیے گئے جو ہر سال مختلف اصنافِ ادب میں نمایاں خدمات انجام دینے والوں کو وزیرِ اعظم یا صدر جمہوریہ ہند کے ہاتھوں پیش کیے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے جنابِ علی سردار جعفری، جنابِ اختر الایمان اور جنابِ کالی داس گپتا رضا کے فن اور خدمات پر روشنی ڈالی اور انھیں غالب ایوارڈز پانے پر مبارک باد دی۔ زندہ دلانِ بمبئی کی جانب سے ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا نے مہمانوں کی پرجوش تالیوں کے درمیان اپنے ہاتھوں سے علی سردار جعفری، اختر الایمان اور کالی داس گپتا رضا صاحبان کو شال پیش کی اور ایک خوبصورت فوٹو فریم ۔۔۔ [illegible]

حضرات اور مرزا غالب کی تصویر ساتھ ساتھ نقش تھی۔

ممدوحین کی تہنیت اور گُل پوشی کے بعد انھیں اظہارِ خیال کی زحمت دی گئی۔ جنابِ کالی داس گپتا رضا نے صدرِ جلسہ ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا سے پُرزور اپیل کی کہ وہ اُردو گھر کی تعمیر کے پروگرام کو جلد از جلد عملی جامہ پہنائیں جہاں اُردو پروگرام کے لیے آڈی ٹوریم، مہمان ادیبوں اور شاعروں کے ٹھہرنے کے لیے قیام گاہ اور شائقینِ ادب کے لیے اُردو لائبریری کا انتظام ہو۔ سامعین نے زوردار تالیاں بجا کر اس اپیل کی تائید کی۔ جنابِ اختر الایمان نے خلافِ توقع ایک مختصر مزاحیہ نظم سُنا کر سامعین کو حیرت میں ڈال دیا۔ جنابِ علی سردار جعفری نے غالب کی زمین میں ایک غزل سُنائی۔

اس کے بعد جنابِ حسین دلوائی، ممبر پارلیمنٹ اور چیئرمین حج کمیٹی جو اچانک اس تقریب میں تشریف لے آئے تھے، ان کی گلپوشی کی گئی۔ انھوں نے اپنی مختصر تقریر میں فرمایا کہ زندہ دلانِ بمبئی کے اس پروگرام کا یہ لطیفہ ہے کہ وہ اس تقریب میں شرکت کے لیے نہیں آئے تھے بلکہ انھیں وزیرِ شہری ترقیات ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا صاحب کے ساتھ ایک دوسری تقریب میں شرکت کرنا تھی اس لیے وزیرِ موصوف کے ہمراہ جانے کے لیے یہاں آ گئے تھے۔ مہمانوں کے قہقہوں کے درمیان انھوں نے فرمایا کہ انھیں یہ بھی پتہ نہیں کہ آج کی تقریب کی صدارت کون کر رہا ہے اپنی جانب سے انھوں نے زندہ دلانِ بمبئی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تمام مہمانوں کو ۔۔۔ [illegible]

اپنی صدارتی تقریر میں ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا نے فرمایا کہ شعر و ادب کی قدر آور شخصیتوں کی موجودگی میں ایک سیاسی فرد کے لیے لب کشائی کرنا بہت دشوار کام ہے۔ انھوں نے اپنی مختصر مگر جامع تقریر میں عید کی مبارک باد دیتے ہوئے مسلمانوں کو مذہبی رواداری اور صبر و تحمل کی پالیسی پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی۔

(فیاض احمد فیضی)

گورنر اور وزیر اعلیٰ اُتّر پردیش سے اپیل

انجمن ترقی اُردو ہند کے جنرل سیکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے اُتّر پردیش کے گورنر اور وزیر اعلیٰ کو الگ الگ خط لکھ کر ایم۔ ایس۔ انٹر کالج سکندر آباد کی قدیم ترین لائبریری میں موجود اُنیسویں اور بیسویں صدی کے اہم مخطوطات اور نایاب کتب کی حفاظت کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ اور درخواست کی ہے کہ اس لائبریری کو مولانا آزاد یونیورسٹی علی گڑھ یا رضا لائبریری رامپور میں منتقل کر دیا جائے۔

خلیق انجم صاحب نے جنابِ عثمان عارف نقش بندی اور جنابِ نرائن دت تیواڑی کو لکھا ہے کہ گذشتہ دنوں جب انھیں اس لائبریری میں جانے کا اتفاق ہوا تو یہ دیکھ کر ان کے استعجاب و افسوس کا ٹھکانہ نہ رہا کہ وہاں اُردو مخطوطات اور کتب کی تمام الماریاں ایک کونے میں پڑی

انھیں اونے پونے فروخت کیا جا رہا ہے۔ یہ قدیم لائبریری ۱۸۳۶ء میں قائم ہوئی تھی اور اس میں نایاب کتب اور مخطوطات کی بڑی تعداد ہے۔ اُمید ہے کہ ڈاکٹر خلیق انجم کے خطوط پر حکومت فوراً کچھ کارروائی کرے گی۔

(امان اللہ خالد)

مزاحیہ کلام درکار ہے

ادبی و سماجی تنظیم "دی ملّت" کی طرف سے زیرِ ترتیب مزاحیہ مجموعے کے لیے مزاحیہ کلام کی ضرورت ہے۔ جو مزاحیہ شعرا اس مجموعے میں شرکت کرنا چاہیں وہ اپنا مختصر تعارف، منتخب کلام اور ایک تازہ فوٹو درج ذیل پتے پر روانہ کر دیں۔

پتا: کوشل مرزا، معرفت 'دی ملّت' ۲۲/۳، ہری کالونی، جوہی، کانپور ۲۰۸۰۱۴۔

نثری اور شعری تخلیقات کی ضرورت

اڑیسہ اُردو اکادمی کی جانب سے ایک سہ ماہی رسالے "فروغِ ادب" کا پہلا شمارہ جلد ہی شائع ہونے جا رہا ہے۔

اہلِ قلم حضرات سے گذارش ہے کہ وہ اپنی نثری و شعری تخلیقات درج ذیل پتے پر ارسال فرمائیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ ادبا و شعرا اُردو زبان و ادب کے فروغ میں حصہ لے کر ہماری حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

پتا:

سکریٹری اڑیسہ اُردو اکادمی۔

رفتید ولے نہ از دلِ ما

پچھلے دنوں اُردو دنیا کئی صدموں سے دوچار ہوئی۔ ۲۴ اپریل کو مشہور شاعر، ادیب اور اُستاد سیّد نجم الدّین نقوی کا مختصر علالت کے بعد لکھنؤ کے بلرام پور اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم رضا پوسٹ گریجویٹ کالج رام پور میں شعبۂ اُردو کے صدر رہے تھے۔ ۱۹۷۸ء میں ملازمت سے سبکدوشی کے بعد لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہ اُتّر پردیش اُردو اکادمی کی مجلس عام کے رکن بھی رہ چکے تھے۔ وہ ایک خوش گو شاعر تھے۔ ان کے تین شعری مجموعے شائع ہوئے۔

●

مشہور شاعر حقیر اُستانی ۲۳ مئی کو بمبئی میں وفات پا گئے۔ وہ معاشیات کے ماہر تھے ہندوستان اور امریکہ سے معاشیات کی اعلا ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد شکاگو میں یونیورسٹی کے طالب علموں کو اپنے علم سے فیض یاب کرتے رہے اس کے بعد ایشین ڈویلپمنٹ بینک سے منسلک ہوگئے۔ ڈاکٹر کیشو چندر سین (حقیر اُستانی) اصل میں ادب و فن کے آدمی تھے اس لیے دنیاوی علوم اور مشاغل سے زیادہ ان کا جھکاؤ ادب اور شاعری کی طرف تھا۔ "افکارِ گریزاں" اور "ضبط و خبط" کے نام سے ان کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور آخر الذکر مجموعے کو مہاراشٹر اُردو اکادمی کی طرف

۲۶ مئی ۸۹ء بروز جمعہ، سہ پہر کو دہلی کے گنگارام ہاسپٹل میں ڈاکٹر عابدہ بیگم نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ جہاں وہ معالجے کے لیے داخل کی گئی تھیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

مرحومہ عابدہ بیگم دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے سینیر اُستاد اور اُردو اکادمی دہلی کے معزز رکن ڈاکٹر فضل الحق صاحب کی رفیقۂ حیات تھیں۔ خود انھوں نے بھی دہلی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی اور پھر شعبۂ اُردو میں بہ طور اُستانی ان کا تقرر ہوگیا۔ مرحومہ نے پی۔ایچ۔ڈی کے لیے جو مقالہ قلمبند کیا تھا، وہ "اُردو نثر کا ارتقا (۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک)" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوگیا ہے۔ اس مقالے میں انھوں نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے اور موضوعِ زیرِ بحث کا کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا ہے جس سے سیر حاصل بحث نہ کی ہو۔ ان کی ایک اور کتاب "پیکرِ احساس" ہے جو خاکوں پر مشتمل ہے۔ یہ خاکے افسانوی رنگ لیے ہوئے ہیں لیکن جو کردار ان میں پیش کیے گئے ہیں وہ جیتے جاگتے انسانوں کی طرح ہمیں اپنے اردگرد چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ طرزِ تحریر کی شگفتگی اور زبان کی سلاست و صفائی قاری کو خصوصیت سے متاثر کرتی ہے۔

۳۰ مئی کی صبح کو ساون کرپال روحانی مشن کے سربراہ سنت درشن سنگھ کا دہلی میں انتقال ہوگیا۔ سنت درشن سنگھ کا مشن مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا، باہمی اجنبیت کو دُور کرنا اور عقاید و نظریات کے اختلافات سے اُوپر اُٹھ کر پوری بنی نوع انسان کی خدمت انجام دینا تھا۔ اس مشن کو کامیاب بنانے کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کردی تھی۔ اپنے گرو باوا ساون سنگھ اور اپنے والد سنت کرپال سنگھ کے نام پر انھوں نے ۱۹۷۵ء میں ساون کرپال روحانی مشن کی بنیاد رکھی تھی۔ جس کی ساڑھے تین سو شاخیں ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان میں سرگرم ہیں۔

سنت درشن سنگھ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کی شاعری بھی ان کے اسی روحانی پیغام کی حامل ہے جس کی تبلیغ ان کی زندگی کا واحد مقصد بن چکی تھی۔ ان کے کلام کے چار مجموعے اُردو میں اور تین انگریزی میں شائع ہوئے۔ اُردو میں ان کا آخری مجموعۂ کلام "متاعِ نور" کے نام سے شائع ہوا تھا اور اس پر اُردو اکادمی دہلی نے ان کی خدمت میں شاعری کا ایوارڈ بھی پیش کیا تھا۔

اُردو کے مشہور صحافی، مترجم اور ناول نگار جناب سلامت علی مہدی نے ۱۰ جون کی رات کو لکھنؤ میں داعیِ اجل کو لبیک کہا اور عیش باغ کے ملکہ جہاں قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔ وہ کئی برس سے صاحبِ فراش تھے۔

سلامت علی مہدی صاحب نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز ۱۹۴۴ء میں لکھنؤ کے روزنامہ "قومی آواز" سے کیا تھا۔ پھر وہ کئی اخباروں، رسالوں اور ڈائجسٹوں سے وابستہ رہے۔ انھوں نے خود بھی کئی اخبارات و رسائل نکالے جن میں "محراب" "بنیاد" اور "عورت کا آنچل" نے ملک گیر مقبولیت حاصل کی۔ انھوں نے کئی کتابیں بھی دوسری زبانوں سے اُردو میں منتقل کیں۔ اور کئی ناول بھی لکھے۔ وہ قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ اور ان کے قلم میں ایسا زور اور تحریر میں ایسی دلکشی تھی جو پڑھنے والوں کے دل موہ لیتی تھی۔ مرحوم بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی گفتگو بھی تاثر انگیز ہوتی تھی۔ اور وہ کسی بھی موضوع پر فی البدیہہ بول سکتے تھے۔ ان کی موت پر بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ:

خاموش ہوگیا ہے چمن بولتا ہوا

ان شخصیتوں کا ہمارے درمیان سے اٹھ جانا ایک ایسا نقصانِ عظیم ہے جس کی تلافی مشکل ہی سے ہوسکے گی ہم ان سانحوں پر اپنے دلی رنج کا اظہار کرتے ہیں اور ان کے غمزدہ خاندانوں کے غم میں شریک ہیں۔

قلمکار حضرات سے گزارش

دفتر میں مضامینِ نثر و نظم کثیر تعداد میں جمع ہوگئے ہیں اس لیے اعلانِ ثانی تک اپنی نگارشات بلاطلب بھجوانے کی زحمت نہ فرمائیں۔
اُمید ہے اس گزارش کو گستاخی پر نہیں ہماری مجبوری پر محمول کیا جائے گا۔

——— ادارہ

آپ کی رائے

○ "ایوانِ اُردو" کے تازہ شمارے (مئی ۱۹۸۹ء) میں میری نظم "ہندوستاں ہمارا" شائع ہوئی ہے۔ اس کے حاشیہ نمبر ۴ میں مجھ سے ایک غلطی ہوگئی ہے۔ میں نے علامہ اقبال کا جو شعر نقل کیا ہے اُس کی تلمیح حضرت خواجہ سیّد نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کی طرف نہیں ہے بلکہ علّامہ اقبال مرحوم کے اُستاد شمس العلماء مولوی سیّد میر حسن کی طرف ہے۔ مجھے یہاں حاشیے میں یہ شعر لکھنا چاہیے تھا:

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری، فیض عام ہے تیرا

سامنے کا شعر تھا، نہ جانے میں کیوں اس سے خالی الذہن ہوگیا۔

میری اس غلطی کی جانب مجھے برادرِ محترم مالک رام صاحب نے توجہ دلائی ہے۔ میں اُن کا ممنون ہوں۔ در اصل یہ محض غلطی ہی نہیں ہے بلکہ بے احتیاطی کی انتہا ہے۔ نہ جانے یہ کیسے سرزد ہوگئی۔ مجھے اس پر ندامت محسوس ہو رہی ہے۔

ازراہِ کرم میری یہ چند سطور اپنے موقر جریدے میں شائع کرکے ممنون فرمائیں تاکہ قارئین کرام اپنے اپنے شماروں میں تصحیح کرلیں۔

—— جگن ناتھ آزاد، جموں

○ "ایوانِ اُردو" کے تازہ شمارے (مئی

جناب شیخ سلیم احمد کا مضمون "ایک گھر جو تقسیم ہوگیا" پڑھا جو بہت پسند آیا۔ مضمون پڑھ کر پوری کتاب کا خاکہ ذہن نشین ہوگیا۔ اور موصوف نے پوری کتاب کو پڑھنے کی خواہش کو بھی جگا دیا۔

—— ارشد مجید، نئی دہلی

○ مئی کے شمارے میں شامل شیخ سلیم احمد کا مضمون "ایک گھر جو تقسیم ہوگیا" قابلِ توجہ ہے۔ موصوف مضمون ختم کرنے سے ذرا پہلے ایک جگہ رقم طراز ہیں "... اُردو والوں کو تو اس کتاب کے وجود تک کا علم نہیں۔" لگتا ہے یہ جملہ منطقی کھینچ کر لکھا گیا ہے۔ ورنہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

افسانہ "سادھو" کے علاوہ عبدالحق پٹھان کا "تبصرہ نگاری کا فن" اور حامدی کاشمیری، ساجد اثر اور جمیل قریشی کی غزلیں سیرابیِ ذوق ونظر کا سبب بنیں۔

—— خالد عبادی، دربھنگہ

○ شیخ سلیم احمد صاحب کا مضمون نظر سے گزرا۔ موصوف نے امرت رائے کی کتاب A House Divided کا ترجمہ "ایک گھر جو تقسیم ہوگیا" کیا ہے۔ ترجمہ لفظی ہے اور کھلتا ہے۔ میرے خیال میں اس کا ترجمہ "گھر، جو بٹ گیا" زیادہ موزوں اور اُردو کے مزاج سے قریب ہوگا۔ شیخ سلیم احمد صاحب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ

امرت رائے کی کتاب پر دو بہت اچھے مضمون پچھلے برس "ہماری زبان" (دہلی) میں چھپ چکے ہیں۔ ایک ڈاکٹر ابو محمد سحر، دوسرا کمال احمد صدیقی کا تحریر کردہ۔ شیخ سلیم الله صاحب نے پچھلے برس بھی اسی قسم کا ایک سرسری مضمون امرت رائے کی کتاب پر حیدرآباد کے روزنامہ "سیاست" میں چھپوایا تھا۔

—— نجم الثاقب شحنہ، یادگیر (کرناٹک)

○ مئی ۱۹۸۹ء کا "ایوانِ اُردو" ملا۔ جناب شیخ سلیم احمد کا مضمون "ایک گھر جو تقسیم ہوگیا" شوق سے پڑھا۔ شیخ صاحب نے امرت رائے کی کتاب A House Divided کا خلاصہ دے کر اس کتاب کے چند اہم نکات سے متعارف کرایا جس سے عام قاری کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ شیخ صاحب نے مضمون کے آخر میں اپنی لاعلمی کے باعث اہلِ اُردو کو کم علمی کا سرٹیفکیٹ بھی عنایت فرما دیا۔ شیخ صاحب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس زہریلی کتاب کا مدلل جواب ڈاکٹر ابو محمد سحر نے "ہندی/ہندوی پر ایک نظر" میں دیا ہے جو جامعہ دہلی کے دو شماروں اپریل، مئی ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون کی اہمیت کے پیشِ نظر "ہماری زبان" دہلی نے ۱۵، و ۲۲ مئی اور یکم جون و ۸، جون ۱۹۸۷ء کے شماروں میں قسط وار شائع کیا اور پھر یکم اپریل ۸۸ء کو "اُردو مسائل نمبر" میں دوبارہ مکمل شائع کیا۔ ڈاکٹر عبدالمغنی

تاریخ "تشکیل تقدیر" مطبوعہ کتاب نما دہلی بابت ماہ دسمبر ۱۹۸۸ء میں پروفیسر مسعود حسین صاحب کے ایک خطبے کا حوالہ دیتے ہوئے جو علی گڑھ یونیورسٹی میں دیا گیا تھا لکھا "اس خطبے کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس میں پریم چند کے سپوت امرت رائے کی مغالطہ آمیز، متعصبانہ اور شر پسندانہ کتاب A House Divided (ایک منقسم خاندان) کا موثر جواب دیا گیا"۔ مغنی صاحب ہی نے ایک اور مضمون "سہ لسانی فارمولا" مطبوعہ 'ہماری زبان' دہلی ۸، مارچ ۱۹۸۹ء میں لکھا کہ "... دیوناگری نام کا ایک رسم خط اختیار کر کے ہندی کی وہ شکل وضع کی جسے بالکل غلط طور پر شری امرت رائے انگریزی میں "ایک منقسم خاندان" (A House Divided) جیسی گمراہ کن کتاب لکھ کر پورے ملک کی اصل قومی زبان قرار دے رہے ہیں"۔ شمس الرحمٰن فاروقی اپنے مضمون "دکنی نہیں قدیم اُردو" مطبوعہ شب خون الہ آباد بابت ماہ جون تا اگست ۱۹۸۸ء میں اسی کتاب کے باعث جناب امرت رائے کو نیم حکیم قرار دے چکے ہیں۔ ان کے علاوہ مرزا خلیل بیگ اور دیگر حضرات بھی اس کتاب پر لے دے کر چکے ہیں۔ تعجب ہے کہ جناب شیخ سلیم احمد صاحب کی نظر سے یہ مضامین نہیں گزرے جبکہ شیخ صاحب دہلی کے رہنے والے ہیں اور ان میں کے اکثر مضامین دہلی ہی کے اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اگر وہ انھیں ملاحظہ فرما لیتے تو اہلِ اردو کو کم علمی اور انگریزی سے ناواقفیت کا طعنہ نہ دیتے۔

—— ابراہیم یوسف، بھوپال

○ "حرفِ آغاز" کے بعد شمس الرحمٰن فاروقی کی غزل پر نظر پڑی، اشعار اچھے ہیں لیکن یہ مصرعہ:

خط میں بھیجوں اسے یہ بہت سراج

خارج از بحر ہو گیا ہے واضح رہے کہ لفظ 'بہت' بروزن فعو ہے(۱)؟

ڈاکٹر گیان چند جین نے بے شک اپنے مضمون "اقبال کے چند منسوخ اشعار کا وزن" میں بڑے خلوص اور فراخدلی سے جواب دیا ہے۔ اب موصوف کی تحریر سے جناب کمال احمد صدیقی کی غلط فہمی دور ہو جانی چاہیے ڈاکٹر گیان چند خود انھیں ماہر عروض تسلیم کرتے ہیں اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مضمون "ایک گھر جو تقسیم ہو گیا" یقیناً قابل اعتنا ہے اور جناب شیخ سلیم احمد کی رائے معقول ہے۔ لیکن کتاب کا انگریزی زبان میں ہونا کوئی مجبوری نہیں کیوں کہ کتنے اُردو داں آج بھی انگریزی کے اسکالر ہیں جو مذکورہ کتاب کا جواب بحسن وخوبی دے سکتے ہیں۔ اس کے لیے اصل میں جراتِ رندانہ کی ضرورت ہے۔ بس اسی کا فقدان ہے۔ "ملیریا کی تحقیق کے سو سال" معلوماتی نظریے سے اہم مضمون ہے۔ اسی طرح کے معلوماتی مضامین برابر شائع کیا کریں۔

—— افتخار فہیم، کٹیہار

○ "ایوانِ اُردو (مئی ۱۹۸۹ء) موصول ہوا۔ سب سے پہلے شمس الرحمٰن فاروقی کی غزل پڑھی اور تیسرے شعر کا پہلا مصرعہ پڑھتے ہی بے ساختہ چونک پڑا۔ حالاں کہ میرا غزل کی نیم وحشی صنف سے تعلّق ہرگز نہیں مگر پھر بھی تھوڑی بہت دلچسپی ضرور رکھتا ہوں۔ تیسرے شعر کا پہلا مصرعہ:

خط میں بھیجوں اسے یہ بہت سراج

بے بحر ہے۔ پوری غزل فعلن فعلن مفعلن پر ہے، اس لحاظ سے مصرعہ میں 'یہ' نہیں آسکتا۔ اگر یہ مصرعہ اس طرح ہو:

خط میں بھیجوں اسے بہت ہے سراج

اس صورت میں درست قرار دیا جا سکتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی اُردو ادب میں ایک معتبر نام ہے، عروض پر ان کی قدرت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ وہ بے بحر شعر کہہ دیں گے، ایسا لگتا ہے کہ کاتب صاحب کی ستم ظریفی نے اصل شعر کا چہرہ مسخ کر دیا ہے(۲)۔

—— خورشید ملک، شاہجہاں پور

(۱)،(۲) 'بہت' کو 'بِت' پڑھیں آپ کی الجھن دور ہو جائے گی ویسے آپ نے غزل کا جو وزن لکھا ہے وہ درست نہیں — ادارہ

○ جون ۱۹۸۹ء کے "ایوانِ اُردو دہلی" کے شمارے میں یعقوب بدر صاحب، اطہر فاروقی صاحب کے مضمون پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنے مراسلے میں لکھتے ہیں کہ "شہر تفتہ" کے مرتبین میں شاہد ایوبی اور شاکر انصاری شامل نہیں ہیں بلکہ میں تنہا اس کا مرتب ہوں اور مذکورہ کتاب کے سرورق پر مرتب کی حیثیت سے میرا ہی نام ہے ان دونوں بزرگوں کے نام تو معاونین کی حیثیت سے شائع کر دیے گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب مذکورہ کتاب چھپ کر سامنے آئی تب ہم کو علم ہوا کہ یعقوب بدر صاحب نے ہم لوگوں کے نام مرتبین میں شامل نہیں کیے بلکہ معاونین کے طور پر دیے ہیں جبکہ مذکورہ کتاب کے

لیے تمام تر جدّو جہد ہم لوگوں نے کی اور اس کا نام بھی شہرِ تفتہ ہم نے ہی تجویز کیا۔ جملہ معلومات نہایت جانفشانی کے بعد حاصل کیں مرزا تفتہ صاحب کا فوٹو بھی ہم نے ہی فراہم کیا۔ کتاب کے مضامین حتی الامکان غور و فکر کے ساتھ ہم نے لکھے تھے لیکن یعقوب بدر صاحب نے ہم پر ظاہر کیے بغیر تمام مضامین میں ترمیم کر دی جس کی وجہ سے کتاب میں بہت سی خامیاں راہ پا گئیں۔

—— شاہد ایوبی' شاکر انصاری' سکندر آباد

○ ویسے تو میں کئی رسالوں کا مطالعہ کرتی ہوں۔ لیکن آج کے دور میں اتنی کم قیمت میں اتنا عمدہ رسالہ ملنا مشکل ہے۔ مولانا آزاد نمبر ہر لحاظ سے مکمل و جامع تھا۔ مولانا آزاد پر نکلنے والے تمام نمبروں میں اس کا ایک منفرد مقام ہے۔

—— اصیف النساء' بالاسؤ' سیوانی

○

اُردو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

فون نمبر ۲۷۶۲۱۱، ۲۶۳۳۲۸

ایوانِ اردو دہلی

ادارۂ تحریر

سید شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی

جلد: ۳، شمارہ: ۴ — فی کاپی ۵۰ر۲ روپے، سالانہ قیمت ۲۵ روپے — اگست ۱۹۸۹ء

ماہنامہ "ایوانِ اُردو دہلی" میں شائع ہونے والے افسانوں میں نام، مقام اور واقعات سب فرضی ہیں، کسی اتفاقیہ مطابقت کے لیے ادارہ ذمہ دار نہیں۔

مضمون نگاروں کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ

ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی

اُردو اکادمی، دہلی — گھٹا مسجد روڈ،

دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خوشنویس: تنویر احمد

سید شریف الحسن نقوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے میرا آفسیٹ پریس دہلی ۱۱۰۰۰۶ سے چھپوا کر اُردو اکادمی نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا

حرفِ آغاز

اگست کا مہینہ ہم ہندوستانیوں کے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اسی مہینے کی پندرہویں تاریخ تھی جب ہمیں غیر ملکی تسلط سے چھٹکارا ملا اور ایک طویل اور صبر آزما جدوجہد کے بعد ہم نے آزادی کی کھلی فضا میں سانس لی ـــــ اس جدوجہد کا آغاز ۱۸۵۷ء میں میرٹھ سے ہوا تھا جہاں خود انگریزی فوج کے جانباز ہندوستانی سپاہیوں نے اپنے غیر ملکی آقاؤں کے جبر و تعدی کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا تھا۔ جدوجہد آزادی کی یہ ابتدائی شکل متشددانہ تھی اور بھاری خونریزی کے بعد شکست انجام ہوئی۔ اس بغاوت کی شکست انتہائی قابلِ فہم سہی لیکن پوری قوم کو مایوس اور بے حوصلہ کر دینے والی تھی۔ تبھی کچھ نئے مسیحائے قوم سامنے آئے جو بدلی ہوئی صورتِ حال کے تقاضوں سے باخبر اور وطنیت اور قومیت کے نئے شعور سے آشنا تھے۔ ان کا پہلا کام قومی حوصلے کو بحال کرنا اور خود اپنی صفوں میں پائے جانے والی خرابیوں کو دور کرنا تھا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آگے چل کر یہی نیا قومی شعور کانگریس کی تنظیم پر منتج ہوا۔ انڈین نیشنل کانگریس کے قیام نے ہندوستانی قوم کو ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کر دیا جہاں سے وہ اپنے اجتماعی مطالبات براہِ راست غیر ملکی حکمرانوں تک پہنچا سکتے تھے اور اس انداز میں کہ ان کی باتوں کا وزن و وقار محسوس ہو سکے۔ کانگریس نے قومی مقاصد کی تکمیل کے لیے محاذ آرائی اور مورچہ بندی کی بجائے افہام و تفہیم کا راستہ اپنایا اور وقت نے ثابت کر دیا کہ یہ صحیح ترین راستہ تھا۔ مہاتما گاندھی، مولانا آزاد، پنڈت نہرو اور دوسرے ممتاز رہنماؤں کے فکر و عمل کی روشنی ہمیں ہمیشہ یاد دلاتی رہے گی کہ آزادی اور جمہوریت کی لڑائی عدم تشدد کے اصولوں پر کاربند رہ کر کس قدر کامیابی سے لڑی جا سکتی ہے۔

آزادی اپنے ساتھ نئی امنگیں اور نئے ولولے بھی لاتی ہے۔ یہ امنگیں اور ولولے قومی ہونے کے ساتھ ساتھ بعض حالتوں میں گروہی بھی ہو سکتے ہیں۔ ایک جمہوری نظام میں قومی امنگوں کی طرح گروہی امنگوں کی تکمیل بھی ضروری ہے بشرطیکہ ان کی زد قومی اور ملکی مفادات پر نہ پڑتی ہو۔ ایک اور بات بھی قابلِ لحاظ ہے۔ ہمارے بزرگوں نے ایک غیر ملکی استحصالی طاقت کے مقابلے میں بھی معقولیت پسندی اور افہام و تفہیم کی راہ اختیار کی۔ اب کہ ہم خود ہی اپنے حکمراں ہیں اور خود ہی اپنے محکوم، ہمارا غم و غصہ کس کے خلاف ہے؟ خود اپنے لیے؟ بصورت موجودہ اگر ہم تعمیر کوشی پر تخریب کاری کو ترجیح دیتے ہیں تو کسی اور کا نہیں، اپنا ہی کچھ بگاڑیں گے۔

آزادی کی برکتوں سے بہرہ اندوز ہوتے ہوئے ہمیں ان ذمہ داریوں کو ضرور یاد رکھنا ہے جو ایک آزاد ہندوستانی شہری کی حیثیت سے ہم پر عائد ہوتی ہیں اور جن کی وضاحت ہمارے آئین میں، جو خود ہمارے معتمد ترین نمائندوں کا تیار کردہ ہے، بہت واضح لفظوں میں کر دی گئی ہے۔

ـــــ سید شریف الحسن نقوی



کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

○

مجھ کو سو بار جہنم میں جلایا ہوتا
میرے سینے میں مگر دل نہ بنایا ہوتا

کوئی صدمہ نہ کوئی رنج اُٹھایا ہوتا
بھولنے والے اگر تجھ کو بھلایا ہوتا

تب پریشاں تھا کہ اُس بزم میں جاؤں کیونکر
اب پشیماں ہوں کہ اے کاش نہ آیا ہوتا

اپنی نظروں میں سرافراز ہوا جاتا ہوں
مجھ کو اتنا نہ نگاہوں سے گرایا ہوتا

حرم و دیر و کلیسا سے بھی کچھ پالیتے
تیرے قدموں پہ اگر سر کو جھکایا ہوتا

حالِ دل ان کو سُنانے کی تمنّا تھی بہت
اب یہ کہتا ہوں کہ اُن کو نہ سُنایا ہوتا

خود نہ آتے وہ مگر اُن کے تغافل کی قسم
کوئی نامہ کوئی پیغام تو آیا ہوتا

داد پانے کی تمنّا تھی اگر دل میں سحر
کچھ ترنم سے سرِ بزم سُنایا ہوتا

ظفر گورکھپوری



○

اشکوں کا سیلابی منظر، آنکھ میں سپنا چھوٹا سا
دُور تلک پھیلے ساگر میں ایک جزیرہ چھوٹا سا

اپنے تن کی مٹی کھودیں، پاٹ دیں سارے دریا ہم
آب گزیدہ لاکھوں ٹھہرے، پیاس کا صحرا چھوٹا سا

اُس پر کیا کچھ گزری ہوگی چٹانوں کے گرنے سے
بیچ پہاڑوں کے رہتا تھا ایک قبیلہ چھوٹا سا

میلے والو اُس کو کھو کر، میں نے خود کو کھویا ہے
میرے ساتھ، مرے ہی جیسا تھا اِک بچّہ چھوٹا سا

اُس سے گفت و شنید کے کتنے آدھے ادھورے موضوعات
آتی جاتی سانسوں کا بس ایک وسیلہ چھوٹا سا

دُنیا کیا، خود اپنا وجود بھی کتنا بھاری لگتا ہے
دیکھ لبوں پہ رکھ کے کبھی اِک حرفِ تمنّا چھوٹا سا

میرے باہر باڑھ کا پانی، اندر ننھی سی بستی
گڈّو راجہ، گڑیا رانی اور گھروندا چھوٹا سا

مجھ کو اکثر راہ دِکھائے کالی گہری ندی بیچ
پانی کی کھڑکی سے جھانکے کوئی ستارہ چھوٹا سا

○

نہیں معلوم اب کی فصل میں پھولوں پہ کیا گزری
مرے کوچے سے آنسو پونچھتی بادِ صبا گزری

ہُوا ہم تک پہنچ کر ختم شوقِ دشت پیمائی
ہمارے بعد جنگل سے نہ پھر کوئی نوا گزری

زمیں پر ابر اپنے ساتھ لشکر لے کے آئے تھے
نہ جانے اک اکیلے دُھوپ کے ٹکڑے پہ کیا گزری

تمھارے دم قدم سے شہرِ دل آباد تھا میرا
پھر اُس کے بعد گُل مہکے نہ کُوچے سے صبا گزری

نہ جانے پھول جیسے، کھیلتے بچّوں سے کیا کیا تھی
گلی میں دُور تک چنگاریاں رکھتی ہوا گزری

کبھی چہرے پہ رنگِ درد یوں نکھرا نہیں دیکھا
گزرنے کو تو جوئے خوں، جگر سے بارہا گزری

سماعت کے گلی کوچوں میں گھنگھرو بج اُٹھے جیسے
کچھ اِس انداز سے کل شب تری آواز پا گزری

یہ گلہائے سرشکِ خوں، مبارک ہوں ظفر اب کے
تمھارے بام و در چھو کر ہوائے کربلا گزری

ین الدین جینابڑے

پریم چند اور ہندوستانی فلمیں ــــ ایک مطالعہ

(پریم چند کے یومِ وفات ۳۱ جولائی کے موقعے پر خاص مضمون)

پریم چند کی ہندوستانی فلموں سے وابستگی، ئی میں ان کا قیام اور یہاں ان کی مصروفیات، فلم ے مورخین ہی کی دلچسپی کے موضوعات نہیں رہے ہیں ر ادب کے محققین و ناقدین نے بھی اس طرف جہ کی ہے۔ پریم چند کی زندگی میں سفرِ بمبئی اور یہاں ن کے قیام کا مختصر سا عرصہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

پریم چند نے ۴۵ برس کی عمر میں بمبئی کا سفر یا۔ اُس وقت تک وہ اُردو اور ہندی کی ادبی نیا میں اپنا ایک مقام بنا چکے تھے۔ ان کا ناول گئودان" زیرِ تکمیل تھا اور ابھی انھیں اپنا فسانوی شاہکار "کفن" لکھنا تھا۔ اسی دوران بقول فراق گورکھپوری، مولانا شبلی نعمانی پریم چند کی نثر نگاری سے متعلق یہ ارشاد فرما چکے تھے کہ سات کروڑ مسلمانوں میں کوئی شخص پریم چند کی سی لطیف اور سنواری ہوئی نثر نہیں لکھ سکتا۔[۱]

اسی اثنا میں انھوں نے "مریادا" اور "مادھوری" نامی دو ہندی ماہناموں کی ادارت بھی کی اور بعد میں سرسوتی پریس کے نام سے خود اپنا چھاپہ خانہ قائم کیا اور دو رسالے "ہنس" اور "جاگرن" جاری کیے۔ ان دو رسالوں اور سرسوتی پریس کو وہ اپنے اصولوں اور نظریۂ حیات کی تبلیغ اور قارئین کی ذہنی تربیت کے لیے استعمال کرتے تھے۔

پریم چند کی یہ مصروفیتیں اُن کے لیے زندگی سے عبارت ہو گئی تھیں۔ ان سے ہٹ کر وہ زندگی کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔ ان مشاغل میں انھیں یک گونہ روحانی مسرت و تسکین حاصل ہوتی تھی۔ وہ اسی روحانی نشے سے سرمست اپنے شب و روز گذار رہے تھے۔ مالی منفعت کے خیال اور کاروباری تقاضوں کو انھوں نے کبھی اپنے حواس پر غلبہ نہیں پانے دیا۔

انھوں نے اپنی زندگی عسرت میں گزاری۔ وہ اس سے نباہ کرنا سیکھ گئے تھے۔ لیکن جب اُن کی عسرت کے سائے سرسوتی پریس اور دونوں رسالوں پر پڑنے لگے تو پریم چند کانپ اُٹھے۔ "ہنس" اور "جاگرن" یہ دونوں رسالے خود کفیل نہیں بن سکے، اُدھر پریس کے معاملے میں بھی برابر خسارہ ہو رہا تھا۔ فروری ۱۹۳۴ء میں ایک مرتبہ پریس کے مزدوروں نے ہڑتال بھی کر دی۔[۲] مجبوراً پریم چند نے بمبئی کا رُخ کیا۔ اپنے ایک خط میں وہ جینندر کو لکھتے ہیں:[۳]

"بمبئی کی ایک فلم کمپنی مجھے بُلا رہی ہے۔ تنخواہ کی بات نہیں۔ کنٹریکٹ کی بات ہے۔ آٹھ ہزار روپے سال ہیں۔ میں اس حالت کو پہنچ گیا ہوں، جب میرے لیے ہاں کے سوا اور کوئی سبیل نہیں رہ گئی ہے . . . . . میں سوچتا ہوں کیوں نہ ایک سال کے لیے چلا جاؤں۔ وہاں سال بھر کے بعد کچھ ایسا کنٹریکٹ کر لوں گا کہ میں یہیں بیٹھے بیٹھے تین چار کہانیاں لکھ دیا کروں۔ اس سے جاگرن اور ہنس دونوں مزے میں چلیں گے اور پیسے کی تکلیف جاتی رہے گی۔"

بمبئی کی اس فلم کمپنی کا نام "اجنتا سینے ٹون" تھا۔ پریل میں اس کمپنی کا اپنا اسٹوڈیو تھا۔ اس کے مالک موہن بھونانی تھے۔ موہن بھونانی خاموش فلموں کے زمانے سے فلمی صنعت سے وابستہ تھے۔ ۲۸-۱۹۲۷ء میں انھوں نے ممتاز فلم ساز اردشیر ایرانی کی امپیریل فلم کمپنی کے لیے "خوابِ ہستی" تیار کی تھی۔ یہ فلم باکس آفس پر خوب کامیاب رہی۔ "خوابِ ہستی" امپیریل فلم کمپنی کی دوسری فلم تھی۔ اس کمپنی کی پہلی فلم "میواڑ کا سنگھ" کی ناکامی کے بعد "خوابِ ہستی" کی کامیابی دراصل موہن بھونانی کی کامیابی تھی۔ موہن بھونانی نے اس فلم کی تیاری کے دوران ہندوستانی فلمی صنعت کی تاریخ میں پہلی مرتبہ رات کے وقت شوٹنگ کرنے کا کامیاب تجربہ بھی کیا تھا۔[۴]

۱۹۳۱ء میں امپیریل فلم کمپنی نے ہندوستان کی پہلی ٹاکی فلم "عالم آرا" پیش کی۔ "عالم آرا" کے ڈائرکٹر اردشیر ایرانی تھے۔ کمپنی کی دوسری ٹاکی فلم "نورجہاں" موہن بھونانی کی ڈائرکشن میں تیار ہوئی۔ اس فلم میں سلوچنا ہیروئن تھیں۔ اور ڈی بیلیموریا ہیرو۔ اس فلم کو اُردو کے علاوہ انگریزی اور فارسی میں بھی پیش کیا گیا۔[۵]

موہن بھونانی کا شمار اپنے وقت کے ممتاز اہم ڈائرکٹروں میں ہونے لگا تو انھوں نے امپیریل فلم کمپنی سے الگ ہو کر "اجنتا سینے ٹون" کے نام سے اپنی الگ فلم کمپنی قائم کی۔ اجنتا فلم کمپنی نے کُل نو فلمیں بنائیں اور نویں فلم کے بعد کمپنی بند ہو گئی۔ ان نو فلموں کے نام اس طرح ہیں:[۶]

۱۔ رنگیلا راجپوت

لیکچرار شعبۂ اُردو، بمبئی یونیورسٹی، بمبئی ۴۰۰۰۹۸

۲۔ مایاجال
۳۔ واسودت
۴۔ بھارتی بالا
۵۔ شانِ خدا
۶۔ شیردل عورت
۷۔ دردِ دل
۸۔ نوجوان
۹۔ غریب پرور

منشی پریم چند اسی اجنتا سینےٹون کی دعوت پر بمبئی آئے تھے۔ اس کمپنی کے لیے اُنھوں نے جو فلم لکھی وہ "مل مزدور" یا "غریب مزدور" کے نام سے مشہور ہے جبکہ کمپنی کی فلموں کی اس فہرست میں ہمیں یہ نام نہیں ملتا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہم جس فلم کو مل مزدور" یا "غریب مزدور" کے نام سے یاد کرتے ہیں وہ دراصل اجنتا فلم سینےٹون کی آخری فلم "غریب پرور" ہے اس سلسلے میں فلم کے ہیرو اداکار جے راج نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا:

"پہلے اِس تصویر کا نام صرف مِل تھا۔ انگریزی میں اسے THE MILL لکھا جاتا تھا۔ تصویر کے مکمل ہونے تک اِسے مِل مزدور کر دیا گیا۔ اسی نام سے یہ فلم سنسر کے سامنے پیش ہوئی۔ یہ تصویر زمانے کے حساب سے بڑی ہی BOLD اور REALISTIC تھی۔ اس میں مِل مالک اور مزدوروں کا تصادم دکھایا گیا تھا۔ کہانی کا APPROACH تمام تر SOCI-ALISTIC تھا وہ انگریزوں کی حکومت کا زمانہ تھا سنسر نے اوّل تو نمائش کی اجازت نہیں دی ــــــ بعد میں کچھ کاٹ چھانٹ اور نام کی تبدیلی کے ساتھ فلم کی نمائش کی اجازت دے دی گئی۔ اب یہ فلم "غریب پرور" عرف "دَیا کی دیوی" کے نام سے ریلیز ہوئی۔ سنسر کی ہدایت پر یہی کچھ کیا گیا۔ دوبارہ شوٹنگ نہیں ہوئی۔ میں فلم کا ہیرو تھا اور تبو ہیروئن تھیں۔ اس تصویر کی کہانی اور مکالمے منشی پریم چند نے لکھے تھے۔ یہی ایک فلم تھی جو انھوں نے کسی فلم کمپنی کے لیے لکھی۔"

سوال: آپ نے اس کمپنی کی کسی اور تصویر میں کام کیا؟

جواب: میں نے اس کمپنی کی نو میں سے پانچ فلموں میں کام کیا۔ شیردل عورت، دردِ دل اور غریب پرور میں میں ہیرو تھا۔ مایاجال اور واسودت میں بھی ایک ایک کردار نبھایا ہے۔

سوال: آپ نے فلم غریب پرور عرف دیا کی دیوی کو ایک REALISTIC تصویر کہا اس سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟

جواب: اس فلم کی کہانی میں افسانہ طرازی نہیں تھی حقیقت ہی حقیقت تھی۔ مِل مالک اور مزدوروں کا آپسی رشتہ اس کہانی کا مرکزی تھیم تھا پوری فلم اسی مرکزی خیال کے گرد گھومتی ہے۔ فلمی ضرورت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے LOVE STORY کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ اس طرف کچھ ہلکے سے اشارے کر دیے گئے تھے۔ آخر میں ہیرو ہیروئن کی شادی البتہ ہو جاتی ہے۔

فلم کے ڈائریکٹر بھونانی صاحب کا CINEMATIC TREATMENT ــــــ بھی بڑا ہی REALISTIC تھا وہ ہم سب سے بغیر میک اپ کے کام کراتے تھے۔ مزدوروں کو میک اپ کی کیا ضرورت! فلم کا ایک اور REALISTIC پہلو یہ بھی تھا کہ مِل کے تمام سین پریل میں واقع مرارجی گوکل داس مل میں شوٹ کیے گئے تھے اس سے پہلے اس طرح LOCATION پر کبھی شوٹنگ نہیں ہوئی تھی۔ ہم صبح صبح مرارجی گوکل داس مِل کے مزدوروں کے ساتھ ان کا سا لباس پہن کر ان میں مِل جاتے تھے اور اپنی سمجھ کے مطابق ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ یہاں کام کرتے رہتے جہاں شوٹنگ ہوتی۔ جہاں ضرورت ہوئی تو بلا لیے گئے اور ہم چلے گئے ــــــ واقعی یہ ہماری انڈسٹری کی پہلی SOCIALISTIC تصویر تھی ــــــ (خواجہ احمد عباس، وغیرہ تو بعد میں آئے۔ پہلی BOLD اور REALISTIC تصویر یہی تھی۔

سوال: آپ فلم کے ہیرو تھے اور منشی پریم چند فلم کے رائٹر۔ پریم چند کے تعلق سے آپ کیا جانتے ہیں؟ آپ نے اُنھیں کیسا پایا؟ ان سے اپنی پہلی ملاقات بیان کیجیے؟

جواب: میری مادری زبان تیلگو ہے۔ لیکن حیدرآباد کا ہونے کی وجہ سے تہذیبی زبان اور ذریعہ تعلیم اردو رہی ہے۔ میں جب پریم چند سے ملا اس وقت ایمان کی بات تو یہ ہے کہ میں نے ان کی کوئی کہانی نہیں پڑھی تھی۔ کالج میں ہمارے محبوب فکشن رائٹر راشد الخیری تھے۔ ہماری کمپنی کے ایک ساتھی مشرا جی تھے وہ پریم چند کی ادبی اہمیت سے واقف تھے۔ مجھے پریم چند سے پہلی مرتبہ انھوں نے ہی ملایا تھا۔

سوال: آپ اُنھیں کیا کہہ کر مخاطب کرتے تھے؟

جواب: ہم انھیں پنڈت جی کہتے تھے۔ میں مشرا جی اور ہمارے ایک اور ساتھی اداکار خلیل آفتاب ــــــ بس ہم تین نوجوان ہی تھے جو پنڈت جی سے قربت کو عزیز سمجھتے تھے اور وہ بھی شاید یہ سوچ کر کہ پڑھے لکھے لڑکے ہیں ہمیں منہ لگاتے تھے۔ پنڈت جی SET پر کبھی نہیں آتے تھے۔ باہر ہی بیٹھے

بیٹھے تھے۔ سیٹ پر پہلا کام ختم ہو جاتا اور باہر پنڈت جی بیٹھے ہوتے تو ہم اگلے شاٹ کے انتظار کے وقفے میں باہر جا کر پنڈت جی سے گپ شپ کر لیتے تھے۔ وہ روز نہیں آتے تھے۔

سوال: آپ نے پنڈت جی کو کس مزاج کا آدمی پایا؟

جواب: میں نے انھیں ہنسنے اور ہنسانے والا آدمی پایا۔ ہمیشہ ہنستے ہنساتے رہتے تھے۔ مذاق کرتے تھے ـــــ ایک بات ہے۔ ان کے مذاق میں طنز ہوا کرتا تھا۔

سوال: ان کے مذاق ـــــ طنزیہ مذاق کی کوئی مثال . . . ؟

جواب: اتنے سال بیت گئے ـــــ کوئی خاص واقعہ یاد کرنے پر بھی یاد نہیں آتا۔ میں جو بیان کر رہا ہوں وہ پنڈت جی کی شخصیت کا وہ تاثر ہے جو میرے ذہن پر نقش ہو گیا ہے۔ طنزیہ مذاق اور ویسے بھی مذاق وہ کرتے رہتے تھے۔ ایک بات ہو تو کوئی یاد بھی رکھے ـــــ کمپنی کے مالک اور ڈائریکٹر بھونانی صاحب دراز قامت تھے اور گورے چٹے تھے۔ پنڈت جی ہم سے اکثر پوچھا کرتے تھے "صاحب کہاں ہیں بھائی؟ صاحب کیا کر رہے ہیں؟" ان کے اس جملے کی لطافت اسی میں ہے کہ ان دنوں انگریزوں کو صاحب کہہ کر یاد کیا جاتا تھا۔

پنڈت جی ہنستے ہنساتے ضرور تھے لیکن ان کی شخصیت میں سنجیدگی کا عنصر بھی نمایاں تھا۔ ان کے ہنسی مذاق کا بھی اپنا ایک وقار تھا۔ آج جب میں پنڈت جی کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرے ذہن میں ایک درویش کی تصویر ابھرتی ہے ـــــ ایک عارف کی تصویر ابھرتی ہے۔ ایک ایسا شخص جو زندگی کے سرد و گرم جھیل چکا ہو، اسے پوری طرح برت اور پرکھ چکا ہے اور اس کی اصلیت سے مکمل واقفیت حاصل کرنے کے بعد بے نیازی کے ساتھ شب و روز گذار رہا ہے۔

سوال: کچھ اور بتائیے پنڈت جی کے بارے میں فلمی ماحول میں پنڈت جی کیسا محسوس کرتے تھے؟

جواب: اکثر کہتے تھے کہ بھائی تمہاری یہ دنیا سمجھ میں نہیں آتی! بس ہو گیا یار ـــــ تم لوگوں کی یہ فلم انڈسٹری، جو بھی ہے ـــــ یہ بھی دیکھ لی۔ اس قسم کی باتیں اکثر کرتے تھے فلم کی دنیا کو وہ عجیب دنیا کہتے تھے۔

سوال: پریم چند دادر میں کہاں رہتے تھے؟

جواب: نہیں معلوم۔

سوال: یونٹ میں انھیں کسی سے خاص انسیت تھی؟

جواب: نہیں ـــــ بس ہم تین تھے جو اُن سے خود ہی بڑھ کر بات کر لیتے تھے ـــــ اور پنڈت جی کے چمچے کہلاتے تھے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے! میرے دو ساتھیوں میں سے ایک جسے ہم شرما جی کہتے تھے۔ اس کا نام ایس۔ این پراشر تھا ـــــ ہم لوگ کبھی کبھار پنڈت جی سے مذاق بھی کر لیا کرتے تھے۔ ایک موقع ایسا آیا کہ فلم میں بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ کے ایک سین میں ان کو ڈائیلاگ کہنے کا موقع ملا۔ جب پنڈت جی تیار ہو کر سیٹ پر جانے لگے تو ہم میں سے ایک نے کہا کہ پنڈت جی پیڑے کھلائیے۔ آپ ہماری برادری میں آ رہے ہیں تو دوسرا بول اُٹھا۔ پنڈت جی کیوں ہم غریبوں کے پیٹ پر لات مارنے پر تلے ہو! اس قسم کے ہلکے پھلکے مذاق کرنے کی ہم جرأت کر لیا کرتے تھے اور وہ اس سے خوش ہوتے تھے ـــــ بات یہ ہے کہ پنڈت جی طبیعت کے بڑے غریب آدمی تھے۔

سوال: اُن دنوں فلمیں فلم کمپنی کے نام پر چلتی تھیں لیکن ڈائریکٹر اس وقت بھی CAPTAIN OF THE SHIP ہوا کرتا تھا۔ فلم کی کہانی کو لے کر بھونانی اور پریم چند کے درمیان کیا بحث ہوا کرتی تھی۔ دونوں کے پیشہ ورانہ تعلقات کیسے تھے؟

جواب: شاید ان کی ایک شرط یہ تھی کہ ان کی کہانی کو توڑ مروڑ کر پیش نہیں کیا جائے گا۔ بھونانی سے کہانی پر ان کی اکثر بحث ہوا کرتی تھی۔ لیکن یہ سب الگ ہوا کرتا تھا سیٹ پر نہیں۔ سیٹ سے الگ کیا ہو رہا ہے اس سے ہمیں واسطہ نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت ایک کے کام میں دوسرا مداخلت نہیں کرتا تھا ـــــ ویسے فلمی صنعت سے وہ کچھ خوش نہیں تھے ـــــ وہ فلموں میں گانوں اور دوسرے فلمی مسالے کے قائل نہیں تھے۔

سوال: اجنتا سینے ٹون کے مالک بھونانی کے ذہن میں یہ خیال کیسے آیا کہ پریم چند کو بمبئی بلایا جائے۔ پریم چند کا نام کس نے سجھایا؟

جواب: جہاں تک میرا خیال ہے یہ تجویز ایس۔ این۔ پراشر جنھیں ہم شرما جی کہتے تھے، کی رہی ہو گی وہ ہندی کے آدمی تھے اور پریم چند کے قدر دان تھے۔ بھونانی بہت ہی سلجھے ہوئے فلم ساز تھے۔ فلم سازی کی تربیت انھوں نے جرمنی کے UFA STUDIOS میں حاصل کی تھی۔ وہ سماج کو بامقصد اور سنجیدہ فلمیں دینا چاہتے تھے ان دنوں داستانی اور افسانوی قسم کی فلموں کا چلن تھا یا ہمارے فلم ساز انگریزی فلموں کی نقل کرتے تھے۔ بھونانی کا شمار اُن گنتی کے فلم سازوں میں ہوتا تھا جو غیر سنجیدہ فلموں سے حتی الامکان

احتراز کرتے تھے۔ غریب پرور، عُرف کرپا کی دیوی کی کہانی کو اس کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

سوال: پریم چند آٹھ ہزار روپیہ سالانہ کے کنٹریکٹ پر بمبئی آئے تھے۔ کیا اس کمپنی کے تمام فن کار کنٹریکٹ ہی پر کام کرتے تھے؟

جواب: اس زمانے میں کنٹریکٹ نہیں ہوتا تھا۔ کنٹریکٹ کا لفظ دوسری جنگِ عظیم کے بعد سننے میں آیا۔ جب فری لانسنگ شروع ہوئی۔ اجنتا سِنے ٹون میں اس وقت ایگریمینٹ ہوا کرتا تھا اور ہم سب کمپنی کے نوکر ہوتے تھے۔ ہم نوکری کرتے تھے۔ ہماری ماہانہ تنخواہ طے ہوا کرتی تھی جو ایگریمینٹ کی مدّت ختم ہونے تک ہر ماہ ملا کرتی تھی۔

سوال: اُس وقت سب سے زیادہ معاوضے کی رقم کس کے حصے میں آتی تھی۔ اداکار، ٹیکنیشنز، رائٹر یا کوئی اور؟

جواب: دیکھیے میں اُس فلم کا ہیرو تھا اور میری ماہانہ تنخواہ تین سو روپے تھی۔ رائٹر اگر نامور ہوتا تھا تو اس کی عزت ہوتی تھی اور اسے معاوضہ بھی بہتر ملتا تھا ——— ورنہ تو رائٹر کی کوئی اہمیت نہیں تھی ——— وہ بس منشی کہلاتا تھا۔

سوال: آپ نے پریم چند کے مکالمے اسکرین پر ادا کیے ہیں۔ آپ ان کی مکالمہ نگاری کے بارے میں کیا کہیں گے؟

جواب: یہ سوال آپ نے اچھا پوچھا۔ پریم چند کے ڈائیلاگ میں NATURALNESS ہوا کرتی تھی۔ ہمیں کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ ڈائیلاگ لکھا گیا ہے اور ہم یاد کرکے اسے بول رہے ہیں۔ ان کے مکالمے کردار کی فطرت، نفسیات اور اس کے سماجی مرتبے کی روشنی میں اس حد تک NATURAL ہوتے تھے کہ ہم نیچرل ایکٹنگ کر سکتے تھے۔ ان کی رائٹنگ میں REALISM ہی REALISM تھا۔ ان کے لکھے ہوئے ڈائیلاگ، ڈائیلاگ نہیں معلوم ہوتے تھے۔ ان کے قلم کی اس خوبی کی وجہ سے ہم کردار سے اپنے آپ کو بڑی آسانی اور کامیابی کے ساتھ IDENTIFY کر سکتے تھے ——— پھر اس کے بعد جے راج نہیں بولتا تھا۔ کیریکٹر بولتا تھا۔

سوال: ایک سوال ہمارے موضوع سے ہٹ کر پوچھنا چاہوں گا؟

جواب: فرمائیے۔

سوال: آپ فلم کے لیے تصویر کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ آپ کی نسل کی تمام شخصیتوں کی زبان پر تصویر ہی کا لفظ ہے۔ آپ بتا سکتے ہیں کہ اس لفظ کا رواج کب ختم ہوا؟

جواب: اچھا سوال ہے۔ دیکھیے شروع شروع میں اشرف خاں وغیرہ اسٹیج سے فلم میں آئے ——— ہم بھی تھے ——— یہ اسٹیج اُردو اسٹیج تھا۔ ہم سب تصویر ہی کہتے تھے اور اب بھی کہتے ہیں۔ رہی یہ تو سن، ۵ کے بعد چل چتر اور چترپٹ استعمال ہونے لگے۔

سوال: پریم چند سے متعلق یہ بتائیے کہ وہ اسکرپٹ اُردو میں لکھتے تھے یا ہندی میں، آپ کے پاس ڈائیلاگ پریم چند کی تحریر میں آتے تھے یا ان کی نقل آتی تھی؟

جواب: مجھے ہندی نہیں آتی تھی۔ اب بھی نہیں آتی۔ مجھے میرے ڈائیلاگ اُردو میں ملا کرتے تھے لیکن وہ پنڈت جی کے ہاتھ کی تحریر نہیں ہوتی تھی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس رسم خط میں لکھتے تھے۔ آپ کا سوال دلچسپ ہے۔ اس طرف کبھی توجہ ہم نے نہیں کی۔

سوال: اس وقت کے فلم کے کامیاب رائٹر کون تھے؟

جواب: پنڈت بیتاب ——— ! ایک ہی نام یاد آرہا ہے ——— ! پنڈت خالی بھی ایک رائٹر تھے اور ایک رائٹر یوپی کے تھے . . . . جے۔ ایس۔ کیشپ!!

سوال: کیا پریم چند پنڈت بیتاب یا دوسرے فلمی رائٹروں سے تعلقات رکھتے تھے؟

جواب: اُن کی روشنی الگ تھی۔ ان کا دیا الگ تھا۔

سوال: آپ کے خیال میں کیا فلم کا آرٹ اُن کی گرفت میں آگیا تھا؟

جواب: فلم کے میڈیم کو سمجھنا بہت مشکل کام ہے۔ فلم کی زبان الگ ہے اور ادب کی زبان الگ ہے۔ پریم چند بنیادی طور پر افسانہ نگار اور ناول نگار تھے۔ وہ اس فن کے ماہر تھے۔ اسکرین کو SHORTEST FORM OF FICTION کہا گیا ہے۔ اچھے اچھے ادیبوں نے اس کو سمجھنے میں غلطی کی یا اسے سمجھ نہیں سکے۔

سوال: مثال کے طور پر . . . .

جواب: مثال کے طور پر بھگوتی چرن ورما کو لیجیے اشک ——— اُپندر ناتھ اشک کو ——— ضروری نہیں کہ ہر ادیب اچھا فلم رائٹر بن جائے۔ کامیاب فلم رائٹر بننے کے لیے ادیب ہونا کوئی شرط نہیں۔ پنڈت جی کے تعلق سے کہہ چکا ہوں کہ ان کے ڈائیلاگ اداکار کو فطری اداکاری کرنے پر اکساتے تھے۔ یہ اُن کے قلم کی خوبی تھی۔

اجنتا سنے ٹون بند ہونے کے بعد دوسری فلم کمپنیوں نے کوشش کی کہ وہ ان سے منسلک ہو جائیں۔ لیکن انھوں نے انکار کیا اور چلے گئے۔

بابے ٹاکیز والے گُنّو داں کے لیے ۱۵ سے ۲۰ ہزار تک کی بات کر رہے تھے اُن دِنوں۔

سوال: کیا آپ اجنتا سِنے ٹون کے کسی ایسے ملازم کا نام اور پتا بتا سکتے ہیں جو اس فلم اور پریم چند کے تعلق سے کچھ بتا سکے؟

جواب: کس کا نام اور بتاؤں؟ سب اللہ کو پیارے ہوگئے سوائے میرے اور نیام پٹی کے۔ نیام پٹی کھار ہی میں رہتے ہیں ____ یہاں سے قریب ہیں۔ ہمارے مقابلے میں وہ بھونانی سے زیادہ قریب تھے۔

●

پہلی مرتبہ جب فلم سنسر کے سامنے پیش ہوئی تو بورڈ کے ایک رُکن شری جیجی بھائی نے اس کی پرزور مخالفت کی تھی۔ شری جیجی بھائی بہت بڑے صنعت کار تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ برِ عظیم کے صنعتی مرکز میں اس فلم کی نمائش شہر کی صنعتی فضا کو مسموم کرسکتی ہے۔ سنسر بورڈ نے فلم کو منظوری نہیں دی تو فلم کے ڈائرکٹر اور کمپنی کے مالک موہن بھونانی نے بورڈ کے چیرمین سے اپیل کی۔ بمبئی کے پولیس کمشنر مسٹر ولسن بورڈ آف سنسرز کے چیرمین تھے۔ ان کی ہدایت کے مطابق فلم میں کاٹ چھانٹ کی گئی اور فلم کو دوبارہ سنسر کے سامنے پیش کیا گیا۔ مجوزہ کاٹ چھانٹ کے باوجود SOCIALISTIC APPROACH بورڈ کے صنعت کار اراکین کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ انھوں نے ایک مرتبہ پھر فلم کو منظوری دینے سے انکار کردیا۔ نتیجتاً فلم بمبئی میں ریلیز نہیں ہوسکی۔

یہ فلم پہلی بار پنجاب بورڈ آف فلم سنسرز کی منظوری کے بعد لاہور کے امپیریل سینما ہال میں دکھائی گئی تو بقول بھونانی سینما ہال کے گیٹ پر کچھ ہزار مزدوروں کا مجمع اکٹھا ہوگیا تھا اور ہجوم کو قابو میں رکھنے کے لیے پولیس کے علاوہ فوج طلب کی گئی تھی۔ حکومت پنجاب کو سنسر بورڈ کی اس سادہ لوحی کے ازالے کی ایک ہی صورت نظر آئی ____ پنجاب حکومت نے فلم کی نمائش پر پابندی عائد کردی۔

پھر ایسی ہی صورت دہلی میں پیش آئی اور وہاں بھی فلم کی نمائش پر پابندی عائد کی گئی۔ دہلی کے بعد یو۔پی اور سی۔پی کے بعض مقامات پر یہ فلم دکھائی گئی لیکن جلد ہی حکومتِ ہند نے اس کی نمائش پر پابندی عائد کردی اور قصّہ ختم ہوگیا۔

ذیل میں اس فلم کے قصّے کا خلاصہ درج ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فلم "غریب پرور" عرف "دیا کی دیوی" جسے ہم "مل مزدور" یا "غریب مزدور" کے نام سے یاد کرتے آئے ہیں واقعی ایک BOLD اور REALISTIC تصویر تھی نیز اس کے SOCIALISTIC APPROACH کے تئیں سنسر اور حکومت کے رویّے کی وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے۔ قصّے کا یہ خلاصہ اجنتا فلم سِنے ٹون کے شائع کردہ PUBLICITY BOOKLET سے من وعن نقل کیا گیا ہے۔ اس تشہیری کتابچے میں قصّے کا خلاصہ اردو کے علاوہ گجراتی اور انگریزی میں بھی درج ہے۔ اس کتابچے میں یہ تو نہیں لکھا کہ قصّے کا خلاصہ کس نے قلمبند کیا ہے اور نہ ہی ایسی اطلاع اس قسم کے تشہیری ادب میں فراہم کی جاتی ہے تاہم نثر کے اسلوب اور بیانیہ کی شگفتگی کے پیشِ نظر گمان ہوتا ہے کہ کہانی کا یہ خلاصہ پریم چند نے قلمبند کیا ہے۔

عبارت ____ کے پہلے جملے کا سقم البتہ کھٹکتا ہے۔

●

غریب پرور ____ قصّے کا خلاصہ

اگر سیٹھ ہنس راج جیسے غریب دوست ملوں کے مالک عنقا نہ ہوتے تو دنیا میں محنت اور سرمایے کی کشمکش اتنی خوفناک نہ ہوتی۔ سیٹھ جی بہت معمولی حیثیت کے آدمی تھے لیکن اپنی لیاقت، محنت اور خوش معاملگی کی بدولت انھوں نے ہنس راج مل قائم کیا اور بڑی کامیابی سے چلایا۔ مزدوروں سے ان کا برتاؤ اتنا شریفانہ اور فیاضانہ تھا کہ سب ان پر جان دیتے تھے۔

لیکن بدقسمتی سے سیٹھ جی کا نوجوان لڑکا ونود عیاش، بدمزاج اور ظالم تھا۔ سیٹھ جی اس کے اطوار سے بہت رنجیدہ رہتے تھے اور برابر اس کی تنبیہہ کرتے رہتے تھے مگر ونود پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ کب سیٹھ جی مریں اور وہ کھُل کھیلے۔

آخر سیٹھ جی بیمار پڑتے ہیں اور اُن کی حالت نازک ہوجاتی ہے۔ اس وقت بھی ونود کے مُنہ سے شراب کی بدبو آرہی ہے۔ سیٹھ جی نفرت سے مُنہ پھیر لیتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اُسے راہِ راست پر لے آئے۔

اُن کی موت کے بعد جب ان کی وصیت پڑھی جاتی ہے تو ونود کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگتی ہیں۔ سیٹھ جی کی نفرت نے اسے جائداد کا تنہا وارث نہ بنا کر اس کی بہن پدما کو برابر کا حصّے دار بنا دیا ہے۔ پدما رحم دل اور انصاف کی دیوی ہے اور سیٹھ جی کو اس پر کامل اعتماد ہے۔ ونود نے خود مختاری کے جو خواب دیکھے تھے وہ اس طرح پریشان ہوجاتے ہیں۔

سیٹھ جی کی وفات کے تھوڑے ہی دنوں بعد ونود مزدوروں پر سختیاں شروع کرتا ہے

جاپانی مقابلے کے باعث ان دنوں بازار سرد ہے اور نفع بھی کم ہو گیا ہے۔ اُدھر ونود کی عیاشی، قمار بازی اور شراب خوری روز افزوں ہوتی جاتی ہے۔ مزدوروں کو جو رعایتیں مرحوم سیٹھ جی کے زمانے سے حاصل تھیں، وہ سب بند کر دی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر کو جواب دے دیا جاتا ہے۔ مدرسہ بند کر دیا جاتا ہے۔ تعطیلیں گھٹا دی جاتی ہیں۔ کام کے گھنٹے بڑھا دیے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ تنخواہیں کاٹ لی جاتی ہیں اور پرانے مستقل ملازموں کو برطرف کر دیا جاتا ہے۔ مزدور تحمل اور برداشت سے کام لیتے ہیں لیکن جب کوئی چارہ نہیں سوجھتا تو ہڑتال کر دیتے ہیں۔

ہڑتال کے زمانے میں اُنھیں جو تکلیفیں جھیلنا پڑتی ہیں ناگفتہ بہ ہیں۔ وہ نظارے دیکھ کر آپ کی آنکھوں میں آنسو آجائیں گے۔ اس حالت میں پدما اپنے زیورات بیچ کر مزدوروں کی مدد کرتی ہے۔

اُدھر ونود کی سرمستیاں برابر جاری ہیں۔ شراب کے دَور ہیں۔ مجلسیں ہیں۔ مزدوروں پر اسے مطلق رحم نہیں آتا وہ نئے مزدور بھرتی کر کے مل کو چلانا چاہتا ہے لیکن پدما ان آدمیوں کو سمجھا بجھا کر رخصت کر دیتی ہے۔

ایک روز پدما مل سے نکل رہی ہے کہ ایک نوجوان اُس کی موٹر کی زد میں آکر بے ہوش ہو جاتا ہے، پدما اُسے اٹھوا کر شفا خانے لے جاتی ہے اور اسے ہوش میں لاتی ہے۔ اس نوجوان کا نام کیلاش ہے۔ وہ کئی دن سے بے کاری کے باعث فاقے کر رہا ہے۔ پدما اسے مل میں ایک جگہ دیتی ہے۔ ہڑتال کے دنوں میں کیلاش کی قربانیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

آخر ایک پنچایتی بورڈ مقرر ہوتی ہے اور فریقین کے بیانات سن کر آپس میں سمجھوتہ کرا دیتی ہے لیکن ونود کا نشہ ابھی تک نہیں اترا ہے۔ وہ ایک ایسی شرمناک حرکت کرتا ہے کہ مل کے مزدور بگڑ جاتے ہیں اور مل کے مینیجر سے فریاد کرتے ہیں۔

مینیجر ان کے آنسو پونچھنے کے بدلے مار پیٹ کرتا ہے۔ مزدوروں کی آتشِ غضب بھڑک اٹھتی ہے۔ سب کے سب مزدور اسے گھیرنا چاہتے ہیں۔

مزدوروں کا مطالبہ صرف اتنا ہے کہ ونود اُس عورت سے معافی مانگ لیں اور مینیجر کو نکال دیں۔ لیکن ونود کیلاش اور دو مزدوروں کو زخمی کرتا ہے۔ وہی پولیس جو مزدوروں کو گرفتار کرنے کے لیے بلائی گئی ہے ونود کو گرفتار کر لیتی ہے۔

ونود پر عدالت میں استغاثہ دائر ہوتا ہے اور اسے پانچ سال کی سزا ہوتی ہے۔ کیلاش کو پدما اپنے مکان پر لاتی ہے اور دل و جان سے اُس کی تیمارداری کرتی ہے۔ کیلاش صحت یاب ہوتا ہے۔

پدما دوبارہ مل جاری کرتی ہے۔ لیکن اتنے دنوں بند رہنے کے باعث ابتری کی حالت میں ہے۔ بینک میں جو نقد تھا وہ پہلے ہی ونود کی عیش پرستیوں کی نذر ہو چکا ہے۔ اس لیے پدما عارضی طور پر مزدوروں کی تنخواہ نصف کر دیتی ہے۔

مزدوروں کو بدگمانی ہوتی ہے کہ پدما بھی ان کے ساتھ وہی ظالمانہ برتاؤ کرے گی؟

سب کے سب غصے میں آکر پدما سے شکایت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہماری وفاداری کا یہ انعام؟ لیکن جب پدما انھیں حقیقت حال سمجھا دیتی ہے تو سب کے سب معافی مانگ لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم محض روٹیاں کھا کر آپ کا کام کرنے کو تیار ہیں۔

مگر اسی دوران میں مل کو ایک بہت بڑا آرڈر مل جاتا ہے اور پیشگی روپے آجاتے ہیں۔ پدما آدمیوں کی تنخواہیں بحال کر دیتی ہے مزدور خوش ہو کر اس کے قدموں کو بوسہ دیتے ہیں۔

کیلاش کی شرافت اور جواں مردی نے پدما کو گرویدہ کر رکھا ہے دونوں دل میں ایک دوسرے کی پرستش کرتے ہیں اور اس موقعے پر اس کی مسرت افشائے راز کر دیتی ہے۔ مل مزدور انھیں مبارک باد دیتے ہیں۔

اُدھر ونود جیل خانے میں پڑا ہوا اپنے کیے پر پچھتا رہا ہے اُس کی چشمِ عبرت کھل گئی ہے۔

●

فلم کی تھیم ڈائریکٹر موہن بھونانی کی تھی۔ اس کے گرد کہانی پریم چند نے بنی۔ منظر نامہ بھونانی نے تیار کیا اور مکالمے پریم چند نے لکھے۔ فلم کی تھیم ——— مزدور اور مل مالک کا تصادم ——— پریم چند کے مزاج کا موضوع تھا۔ اُن دنوں ایسے موضوع پر فلم بنانے کا فیصلہ، ڈائریکٹر کے ذہن و شعور کی پختگی اور سماجی فرض داری کے اس کے احساس پر دلالت کرتا ہے۔ مزید برآں یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ، یہ شخص اس کام کے لیے برِ عظیم کے موزوں ترین صاحبِ قلم کی خدمات حاصل کرتا ہے۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ بھونانی اور پریم چند کا یکجا ہونا دو ہم خیال شخصیتوں کے مابین تعلقات کی استواری کے مترادف تھا۔ دونوں "فن برائے زندگی" کے نظریے کے نہ صرف قائل اور مبلغ تھے بلکہ اُس پر عمل کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے۔ فلم کے تشہیری

کتابچے میں اجنتا فلم ٹون نے پریم چند کی فلم سے وابستگی کا ذکر نمایاں طور پر کیا ہے۔ سرورق کے بعد پہلے صفحے کی عبارت اس جملے سے شروع ہوتی ہے:

The Collaboration of the famous Hindi novelist Munshi Premchund in the scenario for "Ghrib Parvar" with the famous film Director Mr. Bhavnani, has resulted in a production which may be well described as a big picture.

موہن بھونانی کے ذہن میں جس فلم کا خاکہ منڈلا رہا تھا اُسے پردے پر تصویر کے رُوپ میں اتارنے کے لیے پریم چند کی سی صلاحیتوں والے قلم کار کا تعاون ناگزیر تھا۔ یہ فلم دراصل ہندوستانی سنیما کے میڈیم کی تاریخ میں افسانہ طرازی اور خالص رومانیت سے دامن بچا کر حقیقتوں سے الجھنے اور انھیں سلجھانے کی کوشش کرنے کا ایک دیانت دارانہ تجربہ تھی۔ تشہیری کتابچے میں اس طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے:

Realism is a distinctive note of this production in which the very mill blasts - the reek, the smoke, the sweat of factories and the cruelty and sufferings inflicted by a system are condensed into the atmosphere that hangs about an Indian Textile mill ______ and protrayed with a fidelity rarely attempted before in an Indian production.

اس عبارت میں لفظ "سسٹم" کا استعمال یہ آشکار کرتا ہے کہ فلم بنانے والوں کی اپنے موضوع سے واقفیت سطحی نہیں تھی۔ انھوں نے جس سماجی مسئلے کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا تھا اور فلم کی تھیم کے طور پر منتخب کیا تھا وہ اس کے تاریخی و معاشرتی تناظر سے بھی واقف تھے۔ مُلکی سرمایہ داروں اور سوشلسٹ دشمن غیر مُلکی حکومت کا اس فلم کے تئیں رویّہ ظاہر کرتا ہے کہ فلم ساز اپنے مقصد میں کافی حد تک کامیاب رہے تھے۔ فلم کی کہانی کا خلاصہ پڑھنے کے بعد یہ بات اور بھی وثوق کے ساتھ دہرائی جا سکتی ہے۔

لیکن پریم چند، فروری ۱۹۳۵ء کے خط میں جینندر کو لکھتے ہیں:

"مزدور تمھیں پسند نہیں آیا۔ یہ میں جانتا تھا کہ میں اسے اپنا کہہ بھی سکتا ہوں، نہیں بھی کہہ سکتا۔ . . . مزدور میں میں اپنا تھوڑا سا آیا ہوں کہ نہیں کے برابر۔ فلم کے ڈائرکٹر سب کچھ ہیں۔ لیکھک قلم کا بادشاہ کیوں نہ ہو یہاں ڈائرکٹر کی عملداری ہے وہ زور سے کہتا ہے: میں جانتا ہوں جنتا کیا چاہتی ہے اور ہم جنتا کی اصلاح کرنے نہیں آئے ہیں۔ ہم نے ویوسائے (کاروبار) کھولا ہے دھن کمانا ہماری غرض ہے۔ جو چیز جنتا مانگے گی ہم دیں گے۔"

یہ ہم نہیں جانتے کہ جینندر نے مزدور کو کن وجوہ کی بنا پر پسند نہیں کیا نیز اس عبارت سے یہ بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ آخر کے جملے بھونانی نے پریم چند سے کہے ہوں۔ یہاں پریم چند نے تعمیم سے کام لیا ہے۔

ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ فلم لکھنے کا پریم چند کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ بھونانی کی دی ہوئی تھیم پر انھوں نے کہانی تیار کی۔ بھونانی جیسا کہ ہم جانتے ہیں، ایک کامیاب اور تجربے کار فلم ساز تھے۔ انھوں نے خود اس کہانی کا منظر نامہ تیار کیا اور ایسا کرتے وقت کہانی میں کچھ تبدیلیاں بھی کیں۔ ملت کمار جنھیں پریم چند کی سفارش پر کمپنی کے اداکاروں میں شامل کر لیا گیا تھا اپنے مضمون "مل مزدور فلم کیسے بنی؟" میں لکھتے ہیں:

"سینیریو کی آسانی اور بھونانی صاحب کے (کمپنی کے مالک) کی رائے کے مطابق کہانی میں تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ کچھ نئی باتیں جوڑی گئیں اور کچھ ہٹائی گئیں۔ قصّے کو نئی شکل دی گئی۔ اس سے پلاٹ میں صرف تبدیلی ہی نہیں ہوئی بلکہ کئی جگہ اصل مطلب اور زبان کا لطف فوت ہو گیا۔ اس کے بعد شوٹنگ شروع ہوئی اور کئی جگہ پھر تبدیلیاں ہوئیں۔"

ملت کمار نے بھونانی کی جانب سے کہانی میں کی گئی تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے ان کی نشاندہی نہیں کی۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ پریم چند ملت کمار کے محسن تھے۔ قصّے کا خلاصہ پڑھنے کے بعد ہمیں اداکار جے راج کی اس رائے سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ فلم کی کہانی BOLD تھی۔ اس میں REALISM تھا اور اس کا APPROACH سوشلسٹ تھا۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو پریم چند کے نزدیک ادب اور

ن کی صحت مند قدروں کا درجہ رکھتی ہیں۔ واضح ہے کہ کہانی کی یہ شکل بھونانی کی تبدیلیوں کے بعد کی ہے۔

دراصل سوال یہ نہیں کہ بھونانی نے کہانی میں تبدیلی کیوں کی۔ اصل سوال یہ ہے کہ پریم چند جیسے زبان کے نباض فکشن رائٹر کی خدمات حاصل کرنے کے باوجود فلم کا منظر نامہ بھونانی نے خود کیوں تیار کیا؟

منظر نامہ یا SCENARIO خالص فلمی شعبہ ہے۔ اس کے تحت منتخب کہانی کو فلم کے میڈیم کی ضروریات کے مطابق ڈھال کر پردے پر پیش کرنے کا خاکہ تیار کیا جاتا ہے اور ایسا کرتے وقت اصل کہانی سے تھوڑا بہت انحراف ناگزیر ہوتا ہے۔ یہ کام کسی نوآموز کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے کسی ایسے تجربے کار فن کار پر ہی اعتماد کیا جا سکتا ہے جو فلم کے میڈیم کی ضروریات سے پوری طرح واقف ہو اور اس پر اچھی گرفت رکھتا ہو۔

منظر نامے کی تیاری میں اصل کہانی کے مجموعی تاثر کو، حتی الامکان کہانی کی حدود میں رہ کر، پردے کے وسیلے سے ناظرین تک پہنچانے کا اہتمام کیا جاتا ہے، اصل کہانی کو جوں کا توں پردے پر اتارنے کا نہیں کیوں کہ ایسا کرنا فلم سازی کے اصولوں کی روشنی میں دانشمندی نہیں ہے۔

اس نکتے کو پریم چند ہی کی ایک کہانی "شطرنج کے مہرے" کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے۔ پریم چند کی اس کہانی کو ممتاز فلم ساز ستیہ جیت رے نے "شطرنج کے کھلاڑی" کے عنوان سے فلمایا ہے۔ اس فلم کے لیے ستیہ جیت رے کا تیار کیا ہوا منظر نامہ پریم چند کی اصل کہانی کے تاثر کو کامیابی کے ساتھ فلم کے ناظرین تک پہنچاتا ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ ایسا کرتے ہوئے ستیہ جیت رے نے کہانی میں کچھ اضافے ضرور کیے ہیں۔

پریم چند چوں کہ پہلی مرتبہ کسی فلم یونٹ سے وابستہ ہوئے تھے۔ اس لیے ان سے منظر نامہ نہیں لکھایا جا سکتا تھا۔ لہٰذا موہن بھونانی نے خود اس ذمے داری کو قبول کیا اور پریم چند کی کہانی کے تاثر کو کامیابی کے ساتھ پردے پر اُتارنے کا اہتمام کیا۔ عرض یہ کرنا ہے کہ منظر نامہ لکھتے وقت بھونانی نے اصل کہانی میں جو مبینہ تبدیلیاں کی ہیں ان کے تعلق سے یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ ان سے کہانی مسخ ہو گئی۔ للت کمار جی کی ذیل کی عبارت میں یہ اعتراف پوشیدہ ہے کہ سنسر کی قینچی کے چلنے سے قبل فلم ایک بھرپور تاثر رکھتی تھی۔[12]

"اس فلم سے کمپنی کو بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ اس میں ایک ایسے عام مسئلے پر روشنی ڈالی گئی تھی جس میں دولت مندوں یعنی مل کے مالکوں اور مزدوروں کی کشمکش نمایاں تھی۔ مالکوں کا ظالمانہ رویہ اور ان کی سختی، مالکوں کا من مانا برتاؤ، مزدوروں کی خراب حالت، اُن کی بہو بیٹیوں کی غیر محفوظ حالت اور اس کا نتیجہ یہ سب باتیں بڑی صفائی اور قابلیت سے دکھائی گئی تھیں۔ . . . لیکن افسوس کہ سنسر کی قینچی نے ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس بے رحمی سے کاٹ چھانٹ کی گئی کہ فلم کی دھجیاں اُڑ گئیں۔"

"اگر ستیہ جیت رے، ۱۹۴۰ء سے قبل شطرنج کے کھلاڑی بناتے تو اس کی بھی دھجیاں اُڑ گئی ہوتیں اور پریم چند ہی کہتے کہ اس میں 'میں اتنا تھوڑا سا آیا ہوں کہ نہیں کے برابر۔'

پریم چند کے سفر بمبئی کی دوہری غایت تھی۔ ایک تو یہ کہ "جاگرن اور ہنس دونوں مزے سے چلیں گے۔" اور دوسرے یہ کہ وہ اپنے خیالات و نظریات کو ان پڑھ عوام نیز اردو اور ہندی کے رسم خط سے ناواقف پڑھے لکھے طبقے تک پہنچا سکیں گے۔ لیکن شیو رانی دیوی ان کے بمبئی جانے کے ارادے سے خوش نہیں تھیں ان سے مشورہ کرنے پر انھوں نے پریم چند کو منع بھی کیا تھا۔ پریم چند نے شیو رانی دیوی کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔[13]

"۔ . . . اور ایک بات بتاتا ہوں جو وہاں جانے کا خاص فائدہ ہوگا وہ یہ کہ ناول اور کہانیاں لکھنے میں جو فائدہ نہیں ہو رہا اس سے کہیں زیادہ فلم دکھا کر ہو سکتا ہے۔ کہانیاں اور ناول جو لوگ پڑھیں گے وہ تو ان سے فائدہ اُٹھا سکیں گے۔ فلم سے ہر جگہ کے لوگ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔"

بمبئی میں اپنے قیام کے دوران پریم چند نے محسوس کیا کہ ان کا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ ملکی سرمایہ داروں اور غیر ملکی سوشلسٹ دشمن حکومت کے متحدہ محاذ نے ان کی پہلی فلم کو جس طرح پسپا کیا اُس سے پریم چند نے اندازہ لگا لیا کہ بمبئی میں مزید قیام کی قیمت انھیں بازاری قسم کی فلمیں لکھ کر چکانی ہوگی۔ پریم چند اس خود فریبی پر راضی نہیں ہوئے اور انھوں نے بمبئی سے کوچ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بامبے ٹاکیز کے ہمانسو رائے نے جب یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ ان کی کمپنی سے وابستہ ہو جائیں تو انھوں نے بمبئی کی خراب آب و ہوا کا عذر کیا۔

مختصراً یہ کہ انگریز حکومت نے پریم چند کی پہلی کتاب اور پہلی فلم کے ساتھ یکساں سلوک

لیا۔ فلمی دُنیا سے پریم چند کی بددلی کا فقرے وار فلمی صنعت یا فلم کے ڈائریکٹر کو قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ ان کے خطوط سے ایسے اقتباسات اکثر دہرائے گئے ہیں جن میں پریم چند نے ڈائریکٹر کی عملداری کا ذکر کچھ تلخ الفاظ میں کیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ خود پریم چند فلمی صنعت میں ڈائریکٹر کی اہمیت کے معترف تھے۔ ۸ رجون ۱۹۳۴ء کو ایڈیٹر "زمانہ" منشی دیا نرائن نگم کے نام اپنے خط میں انھوں نے صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ فلم کے لیے کیا چیز موزوں ہوگی اس کا بہترین فیصلہ ڈائریکٹر ہی کر سکتا ہے۔[۱۸]

"میں یکم جون کو بمبئی چلا آیا۔ اس کمپنی سے ایک معاہدہ کر لیا ہے۔ سال بھر میں چھ قصے اسے دینے ہوں گے ... چھ قصے لکھنا مشکل نہیں ہاں ڈائریکٹر کے مشورے سے لکھنا ضروری ہے۔ کیا چیز فلم کے لیے موزوں ہوگی اس کا بہترین فیصلہ وہی کر سکتے ہیں۔"

جہاں تک بحیثیت منظرنامہ نگار اور ڈائریکٹر موہن بھونانی کی کارکردگی کا سوال ہے، اُن کے نام کی شہرت اور ان کی تجربہ کاری سے قطع نظر زیر بحث فلم تک ہی ہماری دلچسپی کو محدود رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے پریم چند کی کہانی کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا تھا ورنہ بلت کمار یہ نہ لکھتے۔[۱۹]

"پوری تیاری کے بعد جب اس کا پرائیوٹ مظاہرہ ہوا تو ہم لوگوں کو امید ہوگئی کہ یہ تماشہ ملک میں نہایت مقبول ہوگا۔ کانگریس کے اجلاس پر اس کی افتتاحی رسم کسی لیڈر سے ادا کرانے کا خیال تھا لیکن افسوس سنسر کی قاتل قینچی نے ساری اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ ایک تو اتنی دیر ہوگئی کہ موقع ہی نکل گیا، دوسرے اس بے رحمی سے کاٹ چھانٹ کی گئی کہ فلم کی دھجیاں اُڑ گئیں کتنے ہی موثر نظارے کاٹ دیے گئے۔ کتنے ہی اتنے مختصر کر دیے گئے کہ ان کا مقصد ہی فوت ہوگیا۔ غرض فلم کا چہرہ ہی خراب ہوگیا۔"

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ اپنے وقت کے بہترین ہدایت کار و منظرنامہ نگار، فلم کار اور اداکاروں نے اپنی یونٹ کے TECHNIC-IANS کے تعاون سے ایک ایسی انقلابی تصویر بنائی تھی جو فن کی افادی اور جمالیاتی دونوں قدروں پر پوری اُترتی تھی۔ لیکن ملکی سرمایہ داروں اور غیر ملکی حکومت کے ہاتھوں نے اس کی صورت بگاڑ دی اور اس کے بنانے والے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

●

فلم غریب پرور عرف وفا کی دیوی میں کل نو نغمے تھے۔ تشہیری کتابچے میں جس ترتیب سے یہ نغمے لکھے گئے ہیں اسی ترتیب سے ذیل میں ہر گیت کی ابتدائی دو دو سطریں نقل کی جارہی ہیں۔

(۱)

مسکری دھانی چندریا عطر گگے
موری بالی عمریا نیہہ کر ترسے

(۲)

پربھو مورے اوگن چت نہ دھرو
سلم دوشی ہے نام تہارو

(۳)

جھوم رہی ہیں شوخیاں دیدۂ نیم باز میں
جاگ رہے ہیں پاسباں یار ہے خوابِ ناز میں

(۴)

آؤ گلے مل جاؤ میں واری سیّاں
نس دن میکا کل نہ پڑت ہے

(۵)

ہماری پھول بگیا میں آؤ مہاراج
موری پھول بگیا میں بیلا چمبیلی

(۶)

آئے نہیں مورے شیام
اب کیا کروں رام!

(۷)

جنھیں ہے عشق سچا وہ کہیں فریاد کرتے ہیں
لبوں پر مہر خاموشی دلوں میں یاد کرتے ہیں

(۸)

پریم نگر کی راہ کٹھن ہے سنبھل سنبھل کر چلا کرو
رام نام کو من میں جپو تم بھجن گرو کا کیا کرو

(۹)

پیت راکھو نہ راکھو تمھاری مرضی
بدنامی تو ہوگئی عمر بھر کی!

فلم میں کرداروں کی ادائیگی کی تفصیل اس طرح ہے:

مس پدما ___ مس بتو
ونود ___ ایس۔ ایم۔ نیام پلی
کیلاش ___ پی۔ جے۔ راج
کیلاش کی ماں ___ مس تارا بائی
مل مینجر ___ خلیل آفتاب
مزدور عورت ___ مس آمنہ
اس کا شوہر ___ ایس۔ این۔ پراشر
مل کا فورمین ___ ایس۔ ایل۔ پوری
مل مزدور ___ بدھو اڈوانی۔ نوین یاگنک
ایف۔ ایس۔ شاہ۔ ابوبکر
وغیرہ۔

دیگر تفصیلات اس طرح ہیں:

سینیریو اور ڈائریکشن ___ ایم بھونانی
کہانی اور مکالمے ___ منشی پریم چند
ساؤنڈ انجینئر ___ الیشر سنگھ

اسسٹنٹ ــــ جے۔ ایس۔ اکالی
کیمرہ مین ــــ بی۔ سی۔ مترا
میوزک ڈائرکٹر ــــ بی۔ ایس۔ ہوگن
آرٹ ڈائرکٹر ــــ ایس۔ اے۔ پاٹنکر
فلم پروسسر ــــ وی۔ ایس۔ مراٹھے
SOUND EFFECT AND SPECIAL ORCHESTRATION BY WALTER KAUFFMAN AND HIS ORCHESTRA.

●

ایس۔ بیام پتی کا پورا نام سُندر بھولانی شنکر بیام پتی ہے۔ بیام پتی خاموش فلموں کے زمانے سے ہندوستانی فلموں میں اداکار رہے ہیں۔ پریم چند کی لکھی ہوئی تصویر "غریب پرور" عرف "دیا کی دیوی" میں انھوں نے ونود کا کردار ادا کیا تھا۔ فلم کے ڈائرکٹر موہن بھونانی سے ان کی قربت کے پیشِ نظر پریم چند کی فلمی زندگی سے متعلق میں نے ان سے چند سوالات کیے جن کے جوابات درج ذیل ہیں:

سوال: پریم چند فلم اسکرپٹ اردو میں لکھتے تھے یا ہندی میں؟

جواب: وہ ہندی میں لکھتے تھے۔ بھونانی صاحب کو اُردو نہیں آتی تھی اس لیے انھیں ہندی میں لکھنا پڑتا تھا۔

سوال: کیا آپ نے اُنھیں کبھی اسکرپٹ لکھتے ہوئے دیکھا ہے؟

جواب: کئی مرتبہ۔ لکھنے کا کام وہ بھونانی صاحب کے آفس میں کیا کرتے تھے۔

سوال: دونوں کے پیشہ ورانہ تعلقات کیسے تھے؟

جواب: دونوں کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ پریم چند بڑے ہی خوددار آدمی تھے۔ بھونانی ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔

سوال: کیا آپ کبھی ان کے مکان پر گئے تھے؟

جواب: جی نہیں! ہماری ملاقاتیں اسٹوڈیو ہی میں ہوا کرتی تھیں۔ میں نے انھیں کئی مرتبہ صبح اسٹوڈیو آتے اور شام کو گھر لوٹتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ وکٹوریا میں آتے تھے اور وکٹوریا سے ہی جاتے تھے۔ کبھی کبھار پریم چند جی صبح کچھ جلدی اسٹوڈیو آجاتے اور اسٹوڈیو میں ملازم کمپنی کے نائی سے اپنی داڑھی بنواتے تھے۔ ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔

سوال: آپ ان کی کسی عادت یا کسی شوق کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں؟

جواب: پریم چند جی بیڑی پینے کے بڑے شوقین تھے اُنھیں اس کی عادت تھی۔ بالکل دیہاتی کی طرح مُٹھی بند کرکے کش لگاتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ ایک اخبار لے کر آتے تھے۔ کوئی کام نہ ہوتا تو خالی وقت میں اُسے دیکھا کرتے تھے۔ چائے بھی پیتے تھے۔ بعض مرتبہ تو ہمارے ساتھ پانچ پانچ چھ چھ مرتبہ چائے پیتے تھے۔

سوال: وہ کون سا اخبار ہوتا تھا؟

جواب: ہندی کا اخبار ہوتا تھا۔ نام مجھے یاد نہیں۔

سوال: آپ نے ابھی کہا کہ وہ ہمارے ساتھ پانچ پانچ چھ چھ مرتبہ چائے پیتے تھے۔ اور کون ہوا کرتا تھا آپ کے ساتھ؟

جواب: میری مراد یونٹ کے اداکار ساتھیوں سے ہے۔ جے راج جی اور دوسرے اداکار نوین یاگنک وغیرہ۔

سوال: کیا آپ لوگ کھانا بھی ساتھ کھاتے تھے؟

جواب: شوٹنگ کے دوران پورا یونٹ ساتھ ہی کھاتا تھا اور ہماری ملاقاتیں شوٹنگ کے دوران ہی ہوا کرتی تھیں۔ پریم چند بہت کم خوراک آدمی تھے۔ لنچ میں بھی وہ ناشتے جیسی ہلکی پھلکی چیزیں کھاتے تھے۔ بسکٹ یا پوری بھاجی جیسی چیزیں۔

سوال: پریم چند ملنے ملانے میں کیسے تھے؟

جواب: اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ اجنتا سِنے ٹون میں ہر LEADING ARTIST کو ایک CABIN دیا گیا تھا جس میں ٹیبل، کرسی کے علاوہ ایک آرام کرسی پنکھا اور ایک زائد کرسی ہوا کرتی تھی۔ لیکن پریم چند کو میں نے ایک مرتبہ بھی اس کیبن میں بیٹھے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ کیبن سے باہر دالان میں کرسی لگاکر بیٹھتے تھے۔ بڑے ہنس مکھ آدمی تھے۔ ہمیشہ ہنستے رہتے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ بھی انھیں گمبھیر یا پریشان نہیں دیکھا۔ ہنستے ہوئے دیکھا یا مسکراتے ہوئے اپنے آس پاس کے لوگوں میں اور چیزوں میں بالکل بچے کی سی دلچسپی لیتے تھے۔

اُنھیں اس کا ذرہ برابر احساس یا گھمنڈ نہیں تھا کہ وہ ایک بڑے لیکھک یا مہان آدمی ہیں۔ شاید ہر بڑی شخصیت ایسی ہی ہوتی ہے۔ بڑے سیدھے سادے آدمی تھے۔

سوال: کچھ اور بتائیے پریم چند کے بارے میں؟

جواب: اُن کو اردو اور ہندی دونوں بہت اچھی آتی تھیں۔ فلموں میں یہ عام بات ہے کہ شوٹنگ کے دوران ڈائیلاگ میں کچھ تبدیلی کرنی پڑتی ہے۔ ایسے موقعوں پر، پریم چند، جن آرٹسٹوں کے ڈائیلاگ اُردو میں ہوتے تھے۔ جیسے جے راج جی، ان کے کاغذ پر اُردو میں تبدیلی کر دیتے اور مجھ جیسے آرٹسٹ کو ہندی میں۔

سوال: موہن بھونانی کو یہ کس نے سمجھایا کہ پریم چند کو بمبئی بلایا جائے؟

جواب: یہ بتانا مشکل ہے۔ یہ ہے کہ بھونانی

ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ اجنتا سنے ٹون بند ہونے کے بعد بھونانی نے "بھونانی پروڈکشن" شروع کیا اور سات آٹھ فلمیں بنائیں۔ "بھونانی پروڈکشن" بند ہونے کے بعد انھوں نے آزاد پروڈیوسر کی حیثیت سے پریم چند کے ایک ناول پر فلم بنائی۔ شائد وہ گئودان تھا۔

سوال: اجنتا سنے ٹون کب بند ہوا؟"

جواب: "غریب پرور عرف دیا کی دیوی" کے بعد ایک فلم "نوجیون" بنی اور اس کے بعد کمپنی بند ہوگئی۔ بھونانی کو فنانس ملنا بند ہوگیا۔

سوال: "غریب پرور" کے PUBLICTY-BOOKLET میں نوجیون کا نام کیسے شامل ہوا؟

جواب: یعنی؟

سوال: اس پبلسٹی بک لیٹ میں کمپنی کی فلموں کی جو فہرست ہے اس میں آخری نام نوجیون کا ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس فلم سے پہلے نوجیون بنی تھی اور غریب پرور کمپنی کی آخری فلم تھی؟

جواب: جی نہیں! ایسی کتابوں کے آخر میں دونوں طرح کی فلموں کے نام ہوتے تھے۔ جو پہلے بنائی گئی ہیں ان کے اور جو بعد میں بننے والی ہیں ان کے۔ یہ جو BOOKLET آپ جے راج جی کے پاس سے لائے ہیں مجھے یاد ہے یہ غریب پرور COM-PLETE ہونے کے بعد کا ہے۔ ایک BOOKLET فلم COMPLETE ہونے سے پہلے بھی چھاپا گیا تھا ــــــ غریب پرور کے بعد نوجیون بنی وہ کمپنی کی آخری فلم تھی۔

حوالے:

۱۔ منشی پریم چند نمبر: زمانہ، کانپور۔ مدیر: دیا نرائن نگم بی۔اے۔ ص۔۴۳ مضمون: پریم چند ایک انسان و مصنف کی حیثیت سے۔

۲۔ پریم چند: از ہنس راج رہبر ۱۹۵۸ء مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔ ص، ۱۹۸

۳۔ پریم چند: از ہنس راج رہبر ۱۹۵۸ء مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔ ص۔۲۰۳۔

۴۔ ہندوستانی فلموں کا آغاز و ارتقا۔ از نند کشور وکرم، مشمولہ آج کل۔ نئی دہلی۔ فلم نمبر شمارہ اگست ستمبر ۱۹۷۱ء، ص۔۱۲۔

۵۔ ہندوستانی فلموں کا آغاز و ارتقا۔ از نند کشور وکرم، مشمولہ آج کل۔ نئی دہلی۔ فلم نمبر شمارہ اگست ستمبر ۱۹۷۱ء ص۔۱۶-۱۹

۶۔ تشہیری کتابچہ فلم غریب پرور عرف دیا کی دیوی۔ سرورق، ۴۰ مملوکہ اداکار جے راج۔

۷۔ PREMCHAND—A LIFE: HARISH TRIVEDI. PP 316.

۸۔ PREMCHAND—A LIFE: HARISH TRIVEDI. PP 317.

۹۔ PREMCHAND—A LIFE: HARISH TRIVEDI. PP 317.

۱۰۔ PREM CHAND—A LIFE: HARISH TRIVEDI PP 317.

۱۱۔ بحوالہ آج کل نئی دہلی۔ فلم نمبر ۱۹۷۱ء ص۔۲۹۔

۱۲۔ منشی پریم چند نمبر: زمانہ، کانپور ص۱۴۸

۱۳۔ منشی پریم چند نمبر: زمانہ کانپور ص۔ ۱۴۹

۱۴۔ پریم چند: ہنس راج رہبر ۱۹۵۸ء، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی۔ ص۔ ۲۰۲۔

۱۵۔ پریم چند: ہنس راج رہبر ۱۹۵۸ء، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی۔ ص۔ ۲۰۲۔

۱۶۔ منشی پریم چند نمبر: زمانہ، کان پور ص۔ ۱۴۹۔

کمار پاشی

شعلۂ جنوں لے کر اِک دِیا بناتے ہیں
آکر ان اندھیروں میں راستا بناتے ہیں

یہ روایتوں والے اس لیے مخالف ہیں
ہم پُرانی چیزوں کو کچھ نیا بناتے ہیں

آکہ ساری دنیا کو کر دیں آج حیراں ہم
ایک خواب کو لے کر واقعا بناتے ہیں

اب کچھ ایسا کرتے ہیں اس میں رنگ بھرتے ہیں
اور اپنی دنیا کو خوشنما بناتے ہیں

آج کل بدلتے ہیں لوگ نت نئے چہرے
اور ان کی خاطر ہم آئینا بناتے ہیں

غیر کا تو کہنا کیا، وہ جو خاص اپنے ہیں
میرا ذکر آتے ہی حاشیا بناتے ہیں

آج بھی زمانے میں کچھ یزید زندہ ہیں
جو ہر ایک بستی کو کربلا بناتے ہیں

پھول، چشم، لب پاشیؔ محفلِ طرب پاشیؔ
دیکھ ہم بھی لفظوں سے کیا سے کیا بناتے ہیں

ہوئے ہیں بند دِشاؤں کے سارے رستے آ
اندھیرا چھانے لگا لوٹ کر پرندے آ

میں تیری ساری تمازت کو جذب کر لوں گا
اے آفتاب! کبھی میرے دل میں بجھنے آ

کبھی دکھا دے وہ منظر جو میں نے دیکھے نہیں
کبھی تو نیند میں اے خواب کے فرشتے آ

یہاں تو کب سے اندھیروں میں غرق ہے دنیا
اِدھر جو آ تو ستاروں کی شال اوڑھے آ

نہ چپکے چپکے سلگ، جی کو اپنے ہلکا کر
تجھے یہ کون سا دُکھ ہے، کبھی بتانے آ

بڑا سکون ملے گا تجھے یہاں آکر
جو ہو سکے تو کبھی میرے دل میں رہنے آ

میں شعلہ شعلہ دہکتا سا دشت ہوں پاشیؔ
اگر گھٹا ہے تو ساون کی تو برسنے آ

کہاں کا جلوۂ شام و سحر زینتیں کیسی
جو تو نہیں تو زمانے میں رونقیں کیسی

دھواں دھواں سے مناظر، نہ کوئی شخص نہ عکس
اب آئینے بھی دکھاتے ہیں حیرتیں کیسی

نہ تیرے خواب ہی دیکھوں نہ تجھ کو یاد کروں
ذرا تو سوچ کہ میری ہیں مشکلیں کیسی

بلا رہا ہے بھلا کون دُوریوں سے مجھے
یہ آ رہی ہیں صدائیں سی رات میں کیسی

اِک ایک حرف میں ہے اس کے لمس کی خوشبو
وہ لکھ گیا مرے دل پر عبارتیں کیسی

کوئی تو ہے جو مرے آس پاس چلتا ہے
یہ گونجتی ہیں مرے گھر میں آہٹیں کیسی

بجھا ہو دل ہی جو پاشیؔ تو راستے کیسے
نہیں ارادہ سفر کا تو منزلیں کیسی

۱/۳۳، دِلّی گیٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خون کا ذائقہ

اسلام علیکم کی اجنبی آواز پر میں نے
سے نظریں اُٹھائیں!
بڑے گھیر کی شلوار لمبا کُرتا اور پیروں
اوری چپل، شانے سے جھولتا ہوا ایئر بیگ
ہنے ہاتھ میں بریف کیس، سولہ سترہ برس
، لمبی لمبی گھنی پلکیں، گہری نیلی آنکھیں
ہوئی بھنوئیں اور گول چہرہ، گویا چٹا رنگ
ہاں دیکھا ہے؟ یہ چہرہ جانا پہچانا سا
لگ رہا ہے۔ میں نے ذہن پر زور دیا۔
"ماموں جان ــــ آپ نے مجھے پہچانا؟
ران ہوں۔"
مشابہت نے واضح شکل اختیار کر لی۔
ہ میری بڑی بہن کا چہرہ ہے جسے دیکھے
بیس برس گزر گئے، جب کبھی اُسے یاد
کی کوشش کرتا ہوں تو صبح کے وقت
ے پر ایک روتا ہوا بچہ نظر آتا ہے اور
ڈولی میں رخصت ہو رہی ہوتی ہے، یہ
ایک محلے سے دوسرے محلے ایک شہر سے
ے شہر کی نہیں ایک ملک سے دوسرے ملک کی
درمیان میں کانٹوں کی باڑھ اور باڑھ
پار پرائی نگری، پرائے لوگ بستے ہیں،
ن برسوں میں دونوں جگہ کیا کیا قیامتیں
ہوئیں، کیسی کیسی آندھیاں آئیں، بارشیں
کہ زمین لال ہو گئی اور کانٹوں کے اُس
وسم تو اور خراب تھا۔ آگ برسی گھر جلے۔
نے بھائی کے خون سے ہولی کھیلی اور اپنے

ہی گھر میں شرنارتھی بن کر رہنا پڑا، جن کے پیروں میں طاقت تھی بھاگ سکتے تھے بھاگ گئے، جو ٹھہر گئے وہ ایسے شرنارتھی ہیں جنھیں کوئی قبول کرنے کو تیار نہیں زمین تنگ ہے اور آسمان دُور . . .

ماموں جان ــــ عمران کی آواز پر میں خیالوں سے چونک کر بے اختیار کھڑا ہو گیا۔ میرا بچہ . . . میرا خون . . . میں نے اسے سینے سے بھینچ لیا۔ میرے اندر عجیب سی اُتھل پتھل ہو رہی تھی، یہ لمس کتنا اپنا ہے، یہ آواز کتنی شناسا ہے یہ چہرہ کتنا پیارا ہے ــــ "تو اتنا بڑا ہو گیا میں نے تو تجھے دیکھا بھی نہیں تھا . . ." میں نے محسوس کیا میری آواز بھرا رہی ہے گالوں پر گرم گرم چیونٹیاں سی رینگ رہی ہیں۔

جذبات کا سیلاب کم ہوا تو میں نے اسے اپنے سامنے بیٹھا لیا "آپا کیسی ہیں؟ میرا خط مل گیا تھا؟"

"جی ہاں! آپ کا خط ملتے ہی میں نے ویزے کے لیے دوڑ دھوپ شروع کر دی تھی افسوس کہ آپ نے پہلے خبر نہ کی، میں پہلے ہی آجاتا۔"

"میں نے بھی کب سمجھا تھا کہ اماں دو چار دنوں کی بیماری میں ہمیشہ کے لیے بچھڑ جائیں گی، کتنی تمنا تھی انھیں تم لوگوں کو دیکھنے کی۔ کتنی خوش ہوتیں تمھیں دیکھ کر" زخم پر چھنے والی

ہلکی سی کھرنڈ نچ گئی تھی اور اُداسی کی گھٹا چاروں طرف پھیلنے لگی تھی کہ بیوی آگئی۔

"کون ہے؟ کس سے باتیں کر رہے ہیں؟"

"یہ . . . یہ عمران ہے . . . سلمیٰ آپا کا بیٹا اور بیٹے یہ تمھاری ممانی جان . . ."

"اور آپ نے اسے اپنے پاس بیٹھا رکھا ہے، کئی دنوں کے سفر کا تھکا ہوا ہے، ہاتھ منہ دھولے، کچھ کھائے پیے پھر اطمینان سے باتیں کیجیے گا۔ چلو بیٹے اندر چلو۔"

گھر کی سوئی ہوئی سی زندگی دفعتاً جاگ اُٹھی تھی "آپ ہمارے بھائی جان ہیں"۔ مونا اور شارق نے اسے گھیر لیا "آپ کہاں رہتے ہیں پہلے ہمارے گھر کیوں نہیں آئے، میری کتاب دیکھیے گا اور میرے کھلونے . . ."

وہ مختلف گروہوں کا کھلونا بن گیا تھا کبھی خالائیں اُسے گھیر کر اپنی آپا کی باتیں پوچھتیں کبھی ممانیاں . . . اور کبھی اس کے ہم عمر عاصم اور قاسم بتاؤ وہاں کون کون سی نئی فلمیں آئی ہیں؟

نئی فلمیں ــــ وہ کچھ پریشان سا ہو گیا، اٹک اٹک کر ایک دو نام لیے پھر بے بسی سے کہنے لگا "وہاں کی زندگی بڑی تیز رفتار ہے ہم کبھی کبھی ٹی وی پر فلمیں دیکھ



کبیر گنج، سہسرام ۸۲۱۱۱۵ (بہار)

لیتے ہیں در اصل اتنا وقت ہی نہیں ملتا کہ..."

"ہم تمھیں دکھائیں گے فلمیں اور دیکھو گے کیسی ہوتی ہیں فلمیں، تمھارے ملک میں فلموں کی جگہ ڈرامے بنتے ہیں یا ہمارے یہاں کی بھونڈی نقلیں، اسی لیے تو جب تمھارے ملک کے لوگ آتے ہیں تو سنیما گھروں پر ٹوٹ پڑتے ہیں، میرے پاس جاپانی ٹیپ ہے اور سینکڑوں کیسٹ نمبر وَن گانوں کے، سنتے رہو دل نہیں بھرے گا۔"

جب ذرا سکون ہوا تو میں نے پوچھا۔

"تم نے مجھے کیسے پہچان لیا تھا؟"

"آپ کی شادی کی تصویریں ہمارے البم میں ہیں، ابو آتے تھے تو لیتے گئے تھے۔"

ابو کے ذکر پر میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ "ہاں عمران یہ تو بتانا صغیر بھائی کیا بیمار ہوئے تھے؟"

"بیمار کہاں ہوئے تھے وہ — دوپہر میں بازار گئے، واپس آکر سو گئے۔ ہم نے سمجھا تھک گئے ہوں گے جب کھانے کے لیے اُٹھایا جانے لگا تو..." میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا، کسی غم اور افسردگی کا سایا تک نہ تھا۔ "ہمیں کوئی پریشانی اس لیے نہیں ہوئی کہ بھائی جان دبئی میں تھے انھوں نے پچیس ہزار روپیہ بھیج دیا اور ہم نے ہوائی جہاز کا ٹکٹ خرید لیا، ایئرپورٹ والے پوچھ رہے تھے اب تو واپس نہیں آؤ گے۔ میں نے کہا۔ ہم ضرور واپس آئیں گے مگر دل میں کہہ رہا تھا موشے تم نے ہمیں اپنے گھر میں شرنارتھی بنا دیا ہے اور اچھی طرح جانتے ہو کہ کوئی آنے کے لیے یہاں سے نہیں جاتا پھر بھی ہر ایک سے پوچھتے ہو کہ..."

"وہاں جا کر کہاں ٹھہرے تھے؟"

"پہلے تو ایک واقف کار کے یہاں ٹھہرے پھر ایک کرایے کا مکان لے لیا، سنتے تھے وہاں بارش نہیں ہوتی مگر جب ہم گئے تو اتنی بارش ہوئی کہ سر چھپانا مشکل ہو گیا، ہم ساری رات جاگتے رہتے، سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ رکھتے رہتے پھر بھائی جان نے روپیہ بھیج دیا اور ہم نے ایک بہت اچھی جگہ پر دو منزلہ مکان خرید لیا۔"

اس گفتگو کے دوران اس کے لہجے میں نا اُمیدی افسردگی یا اضمحلال کی جھلک نہیں تھی پُر اعتماد اور پُرسکون لہجہ، کچھ اکھڑا اکھڑا سا جس میں جگہ جگہ غرور کے پیوند لگے ہوئے تھے۔

"ماموں جان آپ نے فریج کیوں نہیں لیا۔ ہمارے یہاں تقریباً ہر گھر میں فریج ضرور ملے گا۔"

"تم دیکھ ہی رہے ہو یہاں بجلی کی کتنی قلت ہے، رات اور دن میں کتنی دیر بجلی رہتی ہے فریج ضرورت سے زیادہ نمائش کے لیے ہوگی اور مجھے بہت سے ضروری کام کرنے ہیں ارے ہاں... اکثر ریڈیو سے نسلی فسادات کی خبریں آتی ہیں تمھارے علاقے میں امن ہے یا وہاں بھی —؟"

"سارے جھگڑے ہمارے ہی علاقے میں ہوتے ہیں،" اس کا لہجہ جوشیلا ہو گیا۔ "شروع میں شیطانوں نے ہمارا بہت جانی مالی نقصان کیا مگر اب ہم نے ان کی وہ پٹائی کی ہے کہ چھٹی کا دودھ یاد آگیا، انھیں سڑکوں پر گھسیٹ گھسیٹ کر مارتے ہیں پتھر سے سر کچل کر گٹر میں ڈال دیتے ہیں۔ اب ہمارے علاقے میں ان میں سے ایک بھی نہیں..." میں اس کی آنکھیں دیکھ رہا تھا نیلی نیلی آنکھیں ایسے چمک رہی تھیں جیسے کسی بچے کو اس کا پسندیدہ کھلونا مل گیا ہو۔

"پھر... اب وہ اِدھر نہیں آتے؟"

"آتے ہیں کسی کسی رات کو دس بیس کا گروہ گولیاں چلاتا ہوا آتا ہے جہاں ہم نے جوابی فائرنگ کی وہ بزدلوں کی طرح بھاگ جاتے ہیں کبھی کبھی جا جا کر پلٹ آتے ہیں تب ساری رات گولیاں چلتی رہتی ہیں جب بڑا گروہ حملہ کرتا ہے تو ہم موومنٹ والوں کو فون کر دیتے ہیں وہاں سے نقاب پوش آکر مورچہ سنبھال لیتے ہیں۔"

عمران کی باتیں جاسوسی ناول میں ہونے والے واقعات جیسی تھیں، مجھے رشک ہوا اس نے اتنی چھوٹی سی عمر میں کتنی دنیا دیکھی کتنے تجربات حاصل کیے، ایک عاصم قاسم ہیں جو صرف یہ جانتے ہیں کہ کس فلم میں کون ہیرو ہیروئن ہے اور کس فلم کا گانا ہٹ ہوگا۔

"ماموں جان، میں نے بھی کلاشنکوف خرید لیا ہے۔"

"کلاشنکوف؟ یہ کیا ہے؟"

"آپ کلاشنکوف نہیں جانتے، بڑی خطرناک چیز ہے چھوٹی مشین گن سمجھیے، میں نے جب آزمانے کے لیے برسٹ مارا تو گھر کا نچلا زینہ چُور چُور ہو گیا میں نے تو کلاشنکوف کو ٹی وی کے اوپر رکھ دیا ہے جب ضرورت پڑی حاضر اور ہمارا لیڈر جب جلسوں میں تقریریں کرنے جاتا ہے تو کلاشنکوف لیے باڈی گارڈ اسٹیج پر پہرہ دیتے ہیں اور لوگ تالیوں کے بجائے گولیاں چلا کر اس کی حمایت کا اعلان کرتے ہیں۔"

میں حیرت زدہ رہ گیا۔ یہ کس مہذب ملک کی باتیں ہیں جہاں اسلحے اتنے عام ہیں کہ بچہ بچہ نہ صرف ان کا نام بلکہ استعمال بھی جانتا ہے، جہاں تالیوں کی گونج گولیوں سے پیدا کی جاتی ہے۔

"چلیے کھانا کھا لیجیے بہت دیر ہو گئی ہے۔"

بیوی آگئی اور ہماری بات ادھوری رہ گئی۔

جب ایک چپاتی کھا کر عمران نے ہاتھ کھینچ لیا تو میں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔" اور کھاؤ میاں تکلف کیوں کرتے ہو، یہ تمھارا اپنا گھر ہے۔"

"بس ماموں جان، میں نے کھا لیا اتنا ہی کھاتا ہوں۔"

"صرف ایک چپاتی ـــــ ؟"

"ہاں، ہمارے یہاں عموماً دو ہی وقت کھانا کھایا جاتا ہے صبح اور رات، جب مرد گھر پر ہوتے ہیں اگر ہم کھانے پر ہی سب خرچ کر دیں تو رنگین ٹی۔وی، فریج، صوفے اور گاڑیاں کیسے آئیں گی، ہر کوئی زیادہ سے زیادہ پس انداز کرتا ہے کہ..."

"یعنی پیٹ بھرنے کے لیے نہیں، زندہ رہنے کے لیے کھایا جاتا ہے؟"

"جی ہاں! جتنی چپاتیاں ہم دو کے لیے اس دسترخوان پر آئی ہیں ان میں پورا گھر کھا لیتا ہے۔"

"ہاں تمھارا وہ لیڈر، کیا نام بتایا تھا تم نے آخر اسے اس موومنٹ کی تشکیل کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی، کیا ان لوگوں سے جھگڑے کی وجہ سے..."

جی... جی نہیں... یہ موومنٹ تو پہلے سے قائم ہے اور یہ جھگڑا تو سیاستدانوں نے درمیان میں کھڑا کر دیا، ہمارا لیڈر ہمارے حقوق کا تحفظ چاہتا ہے اور... اور..."

میں نے محسوس کیا کہ عمران کو جواب دینے میں دشواری محسوس ہو رہی ہے وہ صرف موٹی موٹی باتیں جانتا ہے لیڈر اسے اس لیے پسند ہے کہ اُس کے محافظ کلاشنکوف لیے رہتے ہیں اس کے جلسوں میں گولیاں چلا کر خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے اور فون کرنے پر نقاب پوش مدد کے لیے آتے ہیں اور وہ ان کے حقوق کی باتیں کرتا ہے۔ ان بزدلوں کے حقوق کی باتیں جنھوں نے اپنی جان بچانے کے لیے اپنا گھر اپنا ملک چھوڑ دیا اور جہاں گئے وہاں کے بھی نہ ہو سکے۔ ذلیل و خوار ہو کر نکالے گئے تو اب تیسری جگہ حقوق کے نام پر فتنہ و فساد کا سبب بن رہے ہیں حقوق کا تحفظ چاہتے ہیں مگر شاخ سے جدا ہو جانے والے پتے ہمیشہ ہوا کے رحم و کرم پر ہی رہتے ہیں۔

"ماموں جان، میں نے یہاں کسی کو جیکٹ پہنے نہیں دیکھا۔" عمران نے چائے پیتے ہوئے پوچھا تو میں خیالوں سے چونک پڑا۔

جیکٹ بھلا جیکٹ کیوں؟

"ہم جیکٹ کے اندر جیب بنوا لیتے ہیں اس میں ریوالور آسانی سے آجاتا ہے، وہاں تو کالج کی لڑکیاں تک اپنے پاس اسلحہ رکھتی ہیں۔"

"بھائی جان مجھے بھی ایک قلم بنا دیجیے جیسا پنکی کے لیے بنایا ہے۔" شارق اگر عمران سے ضد کرنے لگا تو میں نے اُسے ڈانٹا۔

"ابھی پرسوں ہی میں تمھارے لیے قلم لایا تھا پھر گم کر دیا تم نے؟"

"نہیں پاپا وہ پین گم نہیں ہوا ہے۔ بھائی جان نے پنکی کے لیے گلہری کی دُم قلم بنایا ہے میں بھی ویسا ہی بنواؤں گا۔"

گلہری کی دُم ـــــ میں نے سوالیہ نظروں سے عمران کی طرف دیکھا تو وہ ہنس کر بولا "یہاں گلہریاں بہت ہیں۔ ہم تو گلہریوں کی دُم کاٹ کر فونٹین پین پر لگا دیتے ہیں لکھتے وقت خوب صورتی سے ہلتی ہے۔"

"زندہ گلہریوں کی دُم" ـــــ میں نے دُکھ سے اُسے دیکھا۔" ترس نہیں آتا تمھیں معصوم جانوروں پر" جواب میں وہ لاپروائی سے ہنسنے لگا۔

میں اُسے سختی سے منع کرنا چاہتا تھا اب وہ گلہریوں کی دُم نہیں کاٹے گا مگر یہ سوچ کر چُپ رہا کہ میری سرزنش کا بُرا مان جائے عجیب دماغ کا لڑکا ہے۔ اتنے عرصے میں اُس نے ایک بار بھی اپنی نانی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا، ان کی باتیں لاپروائی سے سُنیں، ان کی تصویر سرسری نظروں سے دیکھی اور عاصم قاسم کے ساتھ ٹیپ بجانے لگا مگر نانی کی اس کے لیے کیا اہمیت ہے؟ میں نے خود کو سمجھایا۔ جن کو اُس نے کبھی دیکھا نہیں ان کی شفقتوں سے آشنا نہیں ہوا، جن کی پکار اس نے نہیں سُنی اس کے لیے وہ ایک اجنبی ہی تو تھیں پھر بچہ ہے۔ اُسے کیا احساس کہ بزرگ کیا ہوتے ہیں اور ان کی کمی کا احساس کیسے کیسے بے چین کرتا ہے۔

جمعہ کی نماز پڑھ کر آیا تو کہنے لگا "ماموں جان یہاں مسجد میں کتنے تھوڑے لوگ ہوتے ہیں اور خطبے میں حالات حاضرہ پر کوئی تقریر نہیں ہوتی۔" حالاتِ حاضرہ ـــــ میں نے طویل سانس لے کر سوچا، ہمارے حالاتِ حاضرہ

اب تک وہی ہیں جو آزادی سے قبل تھے کوڑو اور کھاؤ اور جدید حالاتِ حاضرہ براؤن شوگر استعمال کرکے ٹیپ ریکارڈ سے گانے سُن کر اس کے حافظ بننے کے عمل میں مصروف ہیں، مگر یہ براؤن شوگر کہاں سے آرہی ہے، جدید حالاتِ حاضرہ کو ہیجڑا بنانے کی سازش کون کر رہا ہے۔ سُہراب گوٹھ کہاں ہے؟

"ماموں جان ـــ میں کچھ پوچھتا ہوں تو آپ نہ جانے کیا سوچنے لگتے ہیں۔"

نہیں تو، میں سوچ کہاں رہا ہوں کہ میرے سوچنے سے بھی کیا ہوگا۔ براؤن شوگر آتی رہے گی، ٹیپ ریکارڈ گانے اُگلتا رہے گا ہیجڑا بننے کا عمل جاری رہے گا مگر اس دماغ کا کیا کروں؟ سچ بتاؤں کبھی کبھی جی چاہتا ہے دماغ نکال کر رکھنے کی چیز ہوتی تو نکال کر ہفتوں کے لیے بھول جاتا کہ مسلسل سوچتے رہنے کی اذیت سے نجات ملتی۔

شاید اس بار بھی میں نے اس سے کچھ نہیں کہا تھا اور سوچتا ہی رہ گیا تھا" ہاں مسجد کے بارے میں تم کچھ کہہ رہے تھے نا؟"

"امّی بتاتی ہیں کہ آپ کو بچپن سے سوچنے کی عادت ہے مگر ایسی بھی کیا عادت کہ باتیں کرتے کرتے غائب۔"

آنگن سے "لے گئی" کا شور ہوا تو ہم دونوں چونک کر آنگن کی طرف دیکھنے لگے۔

"کیا ہوا ـــ کیا چیز لے گئی؟" میں نے چیخ کر پوچھا۔

"بلی، کبوتر لے گئی ـــ" آنگن سے بیوی نے جواب دیا "بہت پرک گئی ہے روز ایک دو کو پکڑ لے جاتی ہے۔"

بلی ... عمران کی آنکھوں میں چمک جاگی اور وہ جلدی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ "آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا تھا ماموں جان، ہمارے یہاں بھی ایک بلی آنے لگی تھی میں نے ایسی ترکیب کی کہ ..."

اُس رات وہ دیر تک چھت اور زینے پر مصروف رہا نہ جانے کیا کیا کرتا رہا۔ شاید رات کا پچھلا پہر تھا یا آدھی رات گزری تھی جب ایک کربناک چیخ سُن کر ہم سب ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے، عمران بستر سے کود کر زینے کے پاس پہنچ گیا تھا۔

"پھنس گئی ـــ" اس کی پُرمسرت چیخ سُن کر میں نے آگے بڑھنا چاہا تو اس نے ہاتھ اُٹھا کر مجھے روکا۔

"نہیں ماموں جان ابھی مت آیئے گا پہلے کرنٹ بند کر دوں۔"

"تم نے کرنٹ لگا کر اسے مار دیا" ـــ میں زیرِ لب بڑبڑایا اور پژمردہ قدموں سے اپنے بستر کی طرف بڑھ گیا۔ پھر اس کے بعد نیند نہیں آئی کرنٹ لگنے سے بلی مرگئی تھی مگر اس کی آخری چیخ نے مجھے اندر تک جھنجھوڑ دیا تھا۔ خدا نے سب کے رزق کا انتظام کیا ہے اور وہ اپنی کوشش سے اسے حاصل کرتا ہے ہم بھی تو اپنا پیٹ بھرنے کے لیے جانوروں اور پرندوں کا خون بہاتے ہیں اگر بلی نے ایک دو کبوتر کھا ہی لیے تھے تو اس کی سزا موت نہیں ہونی چاہیے تھی۔ نہ جانے میں کب تک جاگتا رہا۔ دکھ کی لہریں اُٹھ اُٹھ کر مجھے بے چین کرتی رہیں۔ صبح اُٹھا تو آنکھیں جل رہی تھیں اور بدن درد سے ٹوٹ رہا تھا، کالج جانے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر کچھ کام تھے اس لیے جانا ضروری تھا، واپس ہوا تو گھر میں قدم رکھتے ہی گانے کی تیز آواز نے موڈ بگاڑ دیا۔

یہ فلمی گانے ان لونڈوں کی زندگی بن گئے ہیں۔

ابھی میں کمرے میں پہنچ کر کپڑے ہی تبدیل کر رہا تھا کہ مونا روتی ہوئی میرے پاس آگئی۔

"پاپا، بھائی جان نے چڑیا کے پر نوچ دیے ہیں، اب کیسے اڑے گی بچاری؟"

میں نے باہر نکل کر دیکھا گوریا کے نُچے ہوئے پر زمین پر بکھرے ہوئے تھے اور گوشت کا لوتھڑا بنی گوریا زمین پر پھدک رہی تھی عمران اس پر جھکا ہوا اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہو رہا تھا اس کی باچھیں پھٹی ہوئی تھیں اور گہری نیلی آنکھیں وحشیانہ انداز میں چمک رہی تھیں۔

شارق اور مونا رو رہے تھے، ٹیپ سے گانے کی تیز آواز فضا کو مرتعش کر رہی تھی، گوریا پھدک رہی تھی۔

اور عمران کی آنکھوں کی وحشیانہ چمک بڑھتی جا رہی تھی۔

میں تھکے قدموں اور بھاری دل کے ساتھ کمرے میں لوٹتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

میرے بچے، قصور تمہارا نہیں، تمہارے حالات کا ہے کہ نیم کے درخت کے نیچے نیم کا ہی پودا نکلتا ہے۔

○

سیّد آصف حسین عابدی

انسانی زندگی میں ماحول کی اہمیت

آئینے تو بدلے جا سکتے ہیں مگر انسان
اعکس نہیں بدلا جا سکتا اِس لیے کہ
ہروں کا عکس کسی ایک خاص ماحول کا
یَینہ دار ہوا کرتا ہے۔ ماحول کا تعفن زندگی
شراب میں زہر گھول دیتا ہے اور ماحول
تر و تازگی زندگی کے صحراؤں کو جاوداں
شبوؤں سے مہکا دیتی ہے۔

ماحول سیاست کی نگاہوں کا مرکز رہا
ہے۔ ماحول تاریخ کی نگاہوں میں گذشتہ
قلابات کے بکھرے ہوئے اوراق سے مُرتب
مدہ ایک کتاب ہے۔ ماحول جغرافیائی نظریے
ے افراد قوم اور ملک کی نشوونما کی بنیاد
ہے۔ ماحول اور اقتصادیات میں رُوح اور
سم کا رشتہ ہے۔ سائنس بھی ہر نئی تلاشِ
نزل کی داستاں کے لیے ماحول کی شفق
ے سُرخیاں چُراتی ہے۔ تمدّن آئینہ ہے اور
حول آئینہ گر ہے۔ ماحول ہر رُخ سے
سانی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرتا رہا
ہے اور کرتا رہے گا۔

آج انسان بیشتر کارخانوں کی دُنیا
ں سانس لے رہا ہے اور وہ یکایک
سوچنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ اُس کی زندگی
ک مختصر سا وقفہ ہے جو آج کے وقت کی
ز روی سے مُستعار ہے۔

وہ بنیادی وسائل حیات جو ہمیں
مین، سمندر یا پہاڑ سے دستیاب ہوتے
ہیں انھیں انسان جس تیز روی اور بے دردی سے صدیوں سے استعمال کرتا آ رہا ہے بہت ممکن ہے کہ زیادہ وقت تک ساتھ نہ دے سکیں۔ زمین سے ملنے والے وسائل حیات کی موجودہ مقدار بہت تیزی سے گھٹ رہی ہے اور اُس کے مقابلے میں کرۂ ارض پہ انسانی آبادی بے پناہ تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے تاریخِ انسانی کے آغاز سے آج تک ایک اندازے کے مطابق سارے وسائلِ حیات کی مقدار کا ۵۰ فیصدی تصرّف امریکہ نے کر لیا ہے اور بقیہ ۵۰ فیصدی میں دُنیا کے دوسرے ممالک شامل ہیں۔ صرف سَو سال کے اندر سارے وسائل حیات — جیسے تیل، ٹن، تانبہ وغیرہ تقریباً استعمال ہو چکے ہوں گے۔ بقیہ معدنی وسائل حیات یا تو دال میں نمک کی حیثیت رکھیں گے یا بے پناہ گراں ہو جائیں گے۔

وسائل حیات کا شدّت سے اجتماعی تصرّف نہ صرف فرد کے لیے بلکہ تمام سوسائٹی کے لیے بھی نہایت ضرر رساں ہے خود امریکہ جیسے مُلک میں اگر اقتصادیات کی ترقی میں سَو فیصدی اضافہ ہوا ہے تو اُسی تناسب سے ۱۰ گنا زیادہ انسانی آبادی میں اضافہ ہوا ہے دریاؤں میں آئے دن طغیانیاں ہیں اور موجودہ دُنیا کی آب و ہوا بڑی حد تک — زہر آلود ہو چکی ہے۔ شہر اور قصبے گندگی اور تعفّن کا گہوارہ بن چکے ہیں پھر بھی یہ بات قابلِ افسوس ہے کہ ان مسائل پر بطورِ خاص ترقی یافتہ ممالک کوئی خاص دھیان نہیں دے رہے ہیں۔ افراط آبادی نے ماحول کو بہت سے پیچیدہ مسائل سے دوچار کر دیا ہے چارے کا حد سے زیادہ تصرّف چراگاہ کو ویران کرتا ہے۔ پانی کا حد سے زیادہ تصرّف اور کمی بھی آج کل خود ہمارے ملک میں ایک اہم مسئلہ ہے۔ زمین سے حد سے زیادہ فصلیں پیدا کرنا زمین کو دھیرے دھیرے بنجر بنا دیتا ہے۔ غلط طریقے سے آب پاشی کے نتیجے میں ضائع ہو کر اکھٹا ہو جانے والے پانی میں متعدد اقسام کی پیدا ہونے والی بیماریاں ماحولِ انسانی میں اپنے قدم جمالیتی ہیں۔ اور پھر حالات سے اُکتا کر دیہاتی علاقوں سے تلاشِ روزگار میں آدمیوں کے جھنڈ شہروں اور قصبوں میں آکر جھگّی اور جھونپڑیوں کی ایک نہایت گندی بستی آباد کرتے ہیں۔ اکثر مسلسل بھوک مری انسان کو چور، ڈکیت، لُچّا، لفنگا بنا دیتی ہے کچھ اس گندے ماحول کے شکار ہو جاتے ہیں ملاوٹ کے کھانے پینے کے سودوں سے لے کر دواؤں کی ملاوٹ کا دھندا کرنے لگتے اور اِس طرح یہ درندے چند سکّوں سے اپنا گھر اور پیٹ بھر کر سینکڑوں بچّوں کو یتیم اور عورتوں کو بیوہ کر دیتے اور ماؤں کی گودیاں اُجاڑنے لگتے ہیں۔

بھوپال گیس ٹریجڈی اور چرنابل نیوکلیر حادثہ دُنیا کی تاریخ میں آنے

ڈپارٹمنٹ آف OCEAN ڈیولپمنٹ، مہا ساگر بھون، بلاک ۱۲، CGO کمپلیکس، لودھی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۳

ی نسلوں کے لیے بڑے اہم حادثات ہیں۔
خود ہمارے ملک میں کلکتہ، بمبئی،
اس، دہلی میں ماحول کی گندگی سے پیدا
نے والی طرح طرح کی بیماریاں جیسے کالرا،
ٹروانٹائیٹس، جانڈس ہر سال سینکڑوں
موت کے گھاٹ اُتار دیتی ہیں۔

کچھ سال پہلے ایک باوقار ادارہ کلب
ف روم (Club of Rome) نے
اہدات کی بنا پر ایک رپورٹ میں بتایا کہ
س رفتار سے اقتصادیات کی ترقی میں
معمولی اضافہ ہوتا رہے گا اُسی تیز رفتاری
ماحول میں تعفن اور زہریلا پن پھیلتا
ہے گا ساتھ ہی ساتھ کچے مال کے وسائل
یتے رہیں گے۔ جیسے جیسے وسائل گھٹتے جائیں
ویسے ویسے اِن وسائل کے حصول کے
سلے میں ہونے والے اخراجات آسمان سے
یں کریں گے اور ماحول کو زہر آلود کرنے
لے سائنسی اثرات شدت اختیار کرلیں گے
ممکن ہے ۲۰۲۰ عیسوی تک انسانی آبادی
ختم ہو جانے کے آثار نمایاں ہونے لگیں
ر ساتھ ہی ساتھ زراعت جس کا دارومدار
ملا پر ہے زوال کی حدوں میں داخل ہو جائے۔
یچے میں رہ جائے گا صرف ایک مکمل بربادی
خاک اور سوسائٹی کا بکھرا ہوا شیرازہ۔

اس سلسلے میں صرف یہی ممکن معلوم
تا ہے کہ بڑھتی ہوئی انسانی آبادی کو روکنے
مہم میں ہر فرد کا یوگ دان اور پانی سے
کر زمین سے حاصل ہونے والے معدنیات
ر خوراک کی پیداوار کا صحیح طریقے سے
تعمال کیا جائے اور بربادی کو روکا جائے
س سے ہمارا ماحول جس میں ہم سانس
لیتے ہیں ساز گار رہ سکے۔

کوئی بھی حکومت یا ملک اس مہم
میں کامیابی حاصل نہ کرے گا اگر اس کا
ہر شہری ہر باشندہ خود ذاتی طور پر اس
میں حصہ نہ لے۔ صبح سے لے کر شام تک
اُسے سوچ کر چلنا ہے کہ اس کے ہر فعل
سے کھانے پینے، چلنے پھرنے سے ماحول
میں کوئی بھی ایسی گندگی نہ پیدا ہو جو دوسر
کے لیے یا خود اس کے لیے بعد میں یا فوراً
ایک گھٹن پیدا کر دے۔ چاہے وہ دھواں
پھینکتی ہوئی گاڑی کا چلانا ہو چاہے تیز
ہارن کا بجانا جو ماحول میں ایک تھرتھراہٹ
پیدا کر کے لوگوں کے کان کے پردے ہلا دے۔
ہر مذہب نے ہر دور میں صفائی پر خاص زور
دیا ہے اسی لیے ہر پیدا ہونے والے انسان
کو جب وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے
تو اُسے غسل دے کر یہ بتایا جاتا ہے کہ
تمھیں ایک صاف ستھری زندگی بسر کرنی
ہے اور ماحول کو صاف ستھرا رکھنا ہے
تاکہ تم خود بڑے ہو کر اپنی پیدا کی
ہوئی گندگیوں کی گھٹن میں دم نہ توڑ دو۔

سید آصف حسین عابدی

انسانی زندگی میں ماحول کی اہمیت

آئینے تو بدلے جاسکتے ہیں مگر انسان کا عکس نہیں بدلا جاسکتا اِس لیے کہ چہروں کا عکس کسی ایک خاص ماحول کا آئینہ دار ہوا کرتا ہے۔ ماحول کا تعفّن زندگی کی شراب میں زہر گھول دیتا ہے اور ماحول کی تروتازگی زندگی کے صحراؤں کو جاوداں خوشبوؤں سے مہکا دیتی ہے۔

ماحول سیاست کی نگاہوں کا مرکز رہا ہے۔ ماحول تاریخ کی نگاہوں میں گذشتہ انقلابات کے بکھرے ہوئے اوراق سے مرتب شدہ ایک کتاب ہے۔ ماحول جغرافیائی نظریے سے افراد قوم اور ملک کی نشوونما کی بنیاد ہے۔ ماحول اور اقتصادیات میں رُوح اور جسم کا رشتہ ہے۔ سائنس بھی ہر نئی تلاشِ منزل کی داستاں کے لیے ماحول کی شفق سے سُرخیاں چُراتی ہے۔ تمدّن آئینہ ہے اور ماحول آئینہ گر ہے۔ ماحول ہر رُخ سے انسانی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرتا رہا ہے اور کرتا رہے گا۔

آج انسان بیشتر کارخانوں کی دُنیا میں سانس لے رہا ہے اور وہ یکایک یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا ہے کہ اُس کی زندگی ایک مختصر سا وقفہ ہے جو آج کے وقت کی تیز روی سے مُستعار ہے۔

وہ بنیادی وسائلِ حیات جو ہمیں زمین، سمندر یا پہاڑ سے دستیاب ہوتے ہیں انھیں انسان جس تیز روی اور بے دردی سے صدیوں سے استعمال کرتا آرہا ہے بہت ممکن ہے کہ زیادہ وقت تک ساتھ نہ دے سکیں۔ زمین سے ملنے والے وسائلِ حیات کی موجودہ مقدار بہت تیزی سے گھٹ رہی ہے اور اُس کے مقابلے میں کرۂ ارض پر انسانی آبادی بے پناہ تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے تاریخ انسانی کے آغاز سے آج تک ایک اندازے کے مطابق سارے وسائلِ حیات کی مقدار کا ۵۰ فیصدی تصرّف امریکہ نے کرلیا ہے اور بقیہ ۵۰ فیصدی میں دُنیا کے دوسرے ممالک شامل ہیں۔ صرف سَو سال کے اندر سارے وسائلِ حیات جیسے تیل، ٹن، تانبہ وغیرہ تقریباً استعمال ہوچکے ہوں گے۔ بقیہ معدنی وسائلِ حیات یا تو دال میں نمک کی حیثیت رکھیں گے یا بے پناہ گراں ہوجائیں گے۔

وسائلِ حیات کا شدّت سے اجتماعی تصرّف نہ صرف فرد کے لیے بلکہ تمام سوسائٹی کے لیے بھی نہایت ضرر رساں ہے خود امریکہ جیسے مُلک میں اگر اقتصادیات کی ترقی میں سَو فیصدی اضافہ ہوا ہے تو اُسی تناسب سے ۱۰ گنا زیادہ انسانی آبادی میں اضافہ ہوا ہے دریاؤں میں آئے دن طغیانیاں ہیں اور موجودہ دُنیا کی آب و ہوا بڑی حد تک زہر آلود ہوچکی ہے۔ شہر اور قصبے گندگی اور تعفّن کا گہوارہ بن چکے ہیں پھر بھی یہ بات قابلِ افسوس ہے کہ ان مسائل پر بطورِ خاص ترقی یافتہ ممالک کوئی خاص دھیان نہیں دے رہے ہیں۔ افراطِ آبادی نے ماحول کو بہت سے پیچیدہ مسائل سے دوچار کردیا ہے چارے کا حد سے زیادہ تصرّف چراگاہ کو ویران کرتا ہے۔ پانی کا حد سے زیادہ تصرّف اور کمی بھی آج کل خود ہمارے ملک میں ایک اہم مسئلہ ہے۔ زمین سے حد سے زیادہ فصلیں پیدا کرنا زمین کو دھیرے دھیرے بنجر بنا دیتا ہے۔ غلط طریقے سے آب پاشی کے نتیجے میں ضائع ہوکر اکھٹا ہوجانے والے پانی میں متعدد اقسام کی پیدا ہونے والی بیماریاں ماحولِ انسانی میں اپنے قدم جمالیتی ہیں۔ اور پھر حالات سے اُکتا کر دیہاتی علاقوں سے تلاشِ روزگار میں آدمیوں کے جھنڈ شہروں اور قصبوں میں آکر جھگّی اور جھونپڑیوں کی ایک نہایت گندی بستی آباد کرتے ہیں۔ اکثر مسلسل بھوک مری انسان کو چور، ڈکیت، لُچّا، لفنگا بنا دیتی ہے کچھ اس گندے ماحول کے شکار ہوجاتے ہیں ملاوٹ کے کھانے پینے کے سودوں سے لے کر دواؤں کی ملاوٹ کا دھندا کرنے لگتے اور اُس طرح یہ درندے چند سکّوں سے اپنا گھر اور پیٹ بھر کر سینکڑوں بچّوں کو یتیم اور عورتوں کو بیوہ کر دیتے اور ماؤں کی گودیاں اجاڑنے لگتے ہیں۔

بھوپال گیس ٹریجڈی اور چرنابل نیوکلیر حادثہ دُنیا کی تاریخ میں آنے

ڈپارٹمنٹ آف OCEAN ڈیولپمنٹ، مہاساگر بھون، بلاک 12، C60 کمپلیکس، لودھی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۳

سلوں کے لیے بڑے اہم حادثات ہیں۔
خود ہمارے ملک میں کلکتہ، بمبئی،
ں، دہلی میں ماحول کی گندگی سے پیدا
نے والی طرح طرح کی بیماریاں جیسے کالرا،
رو انٹائیٹس، جانڈس ہر سال سینکڑوں
وت کے گھاٹ اُتار دیتی ہیں۔
کچھ سال پہلے ایک باوقار ادارہ کلب
، روم (Club of Rome) نے
ہدات کی بنا پر ایک رپورٹ میں بتایا کہ
س رفتار سے اقتصادیات کی ترقی میں
معمولی اضافہ ہوتا رہے گا اُسی تیز رفتاری
ماحول میں تعفن اور زہریلا پن پھیلتا
ہے گا ساتھ ہی ساتھ کچے مال کے وسائل
ٹتے رہیں گے۔ جیسے جیسے وسائل گھٹتے جائیں
، ویسے ویسے ان وسائل کے حصول کے
سلے میں ہونے والے اخراجات آسمان سے
یں کریں گے اور ماحول کو زہر آلود کرنے
لے سائنسی اثرات شدت اختیار کرلیں گے
ر ممکن ہے ۲۰۲۰ عیسوی تک انسانی آبادی
ے ختم ہو جانے کے آثار نمایاں ہونے لگیں
ور ساتھ ہی ساتھ زراعت جس کا دارومدار
ماد پر ہے زوال کی حدوں میں داخل ہو جائے
تیجے میں رہ جائے گا صرف ایک مکمل بربادی
کا خاکہ اور سوسائٹی کا بکھرا ہوا شیرازہ۔
اس سلسلے میں صرف یہی ممکن معلوم
ہوتا ہے کہ بڑھتی ہوئی انسانی آبادی کو روکنے
کی مہم میں ہر فرد کا یوگ دان اور پانی سے
لے کر زمین سے حاصل ہونے والے معدنیات
اور خوراک کی پیداوار کا صحیح طریقے سے
استعمال کیا جائے اور بربادی کو روکا جائے
جس سے ہمارا ماحول جس میں ہم سانس

لیتے ہیں ساز گار رہ سکے۔
کوئی بھی حکومت یا ملک اس مہم
میں کامیابی حاصل نہ کرے گا اگر اُس کا
ہر شہری ہر باشندہ خود ذاتی طور پر اس
میں حصّہ نہ لے۔ صبح سے لے کر شام تک
اُسے سوچ کر چلنا ہے کہ اس کے ہر فعل
سے کھانے پینے، چلنے پھرنے سے ماحول
میں کوئی بھی ایسی گندگی نہ پیدا ہو جو دوسرں
کے لیے یا خود اس کے لیے بعد میں یا فوراً
ایک گھٹن پیدا کر دے۔ چاہے وہ دھواں
پھینکتی ہوئی گاڑی کا چلانا ہو چاہے تیز

ہارن کا بجانا جو ماحول میں ایک تھرتھراہٹ
پیدا کر کے لوگوں کے کان کے پردے ہلادے۔
ہر مذہب نے ہر دور میں صفائی پر خاص زور
دیا ہے اسی لیے ہر پیدا ہونے والے انسان
کو جب وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے
تو اُسے غسل دے کر یہ بتایا جاتا ہے کہ
تمھیں ایک صاف ستھری زندگی بسر کرنی
ہے اور ماحول کو صاف ستھرا رکھنا ہے
تاکہ تم خود بڑے ہو کر اپنی پیدا کی
ہوئی گندگیوں کی گھٹن میں دم نہ توڑ دو۔

سیّد آصف حسین عابدی

انسانی زندگی میں ماحول کی اہمیت

آئینے تو بدلے جاسکتے ہیں مگر انسان کا عکس نہیں بدلا جاسکتا اِس لیے کہ چہروں کا عکس کسی ایک خاص ماحول کا آئینہ دار ہوا کرتا ہے۔ ماحول کا تعفّن زندگی کی شراب میں زہر گھول دیتا ہے اور ماحول کی تروتازگی زندگی کے صحراؤں کو جاوداں خوشبوؤں سے مہکا دیتی ہے۔

ماحول سیاست کی نگاہوں کا مرکز رہا ہے۔ ماحول تاریخ کی نگاہوں میں گذشتہ انقلابات کے بکھرے ہوئے اوراق سے مرتب شدہ ایک کتاب ہے۔ ماحول جغرافیائی نظریے سے افراد قوم اور ملک کی نشوونما کی بنیاد ہے۔ ماحول اور اقتصادیات میں رُوح اور جسم کا رشتہ ہے۔ سائنس بھی ہر نئی تلاشِ منزل کی داستاں کے لیے ماحول کی شفق سے سُرخیاں چُراتی ہے۔ تمدّن آئینہ ہے اور ماحول آئینہ گر ہے۔ ماحول ہر رُخ سے اِنسانی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرتا رہا ہے اور کرتا رہے گا۔

آج اِنسان بیشتر کارخانوں کی دُنیا میں سانس لے رہا ہے اور وہ یکایک یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا ہے کہ اُس کی زندگی ایک مختصر سا وقفہ ہے جو آج کے وقت کی تیز روی سے مُستعار ہے۔

وہ بنیادی وسائلِ حیات جو ہمیں زمین، سمندر یا پہاڑ سے دستیاب ہوتے ہیں انھیں اِنسان جس تیز روی اور بےدردی سے صدیوں سے استعمال کرتا آرہا ہے بہت ممکن ہے کہ زیادہ وقت تک ساتھ نہ دے سکیں۔ زمین سے ملنے والے وسائلِ حیات کی موجودہ مقدار بہت تیزی سے گھٹ رہی ہے اور اُس کے مقابلے میں کرۂ ارض پر انسانی آبادی بےپناہ تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے تاریخِ انسانی کے آغاز سے آج تک ایک اندازے کے مطابق سارے وسائلِ حیات کی مقدار کا ۵۰ فیصدی تصرّف امریکہ نے کر لیا ہے اور بقیہ ۵۰ فیصدی میں دُنیا کے دوسرے ممالک شامل ہیں۔ صرف سَو سال کے اندر سارے وسائلِ حیات جیسے تیل، ٹن، تانبہ وغیرہ تقریباً استعمال ہوچکے ہوں گے۔ بقیہ معدنی وسائلِ حیات یا تو دال میں نمک کی حیثیت رکھیں گے یا بےپناہ گراں ہوجائیں گے۔

وسائلِ حیات کا شدّت سے اجتماعی تصرّف نہ صرف فرد کے لیے بلکہ تمام سوسائٹی کے لیے بھی نہایت ضرر رساں ہے خود امریکہ جیسے مُلک میں اگر اقتصادیات کی ترقی میں سَو فیصدی اضافہ ہوا ہے تو اُسی تناسب سے ۱۰ گنا زیادہ اِنسانی آبادی میں اضافہ ہوا ہے دریاؤں میں آئے دن طغیانیاں ہیں اور موجودہ دُنیا کی آب و ہوا بڑی حد تک زہر آلود ہوچکی ہے۔ شہر اور قصبے گندگی اور تعفّن کا گہوارہ بن چکے ہیں پھر بھی یہ بات قابلِ افسوس ہے کہ ان مسائل پر بطو
ترقی یافتہ ممالک کوئی خاص دھیان
دے رہے ہیں۔ افراط آبادی نے ما
بہت سے پیچیدہ مسائل سے دوچار
ہے چاہے کا حد سے زیادہ تصرّف چ
کو ویران کرتا ہے۔ پانی کا حد سے
تصرّف اور کمی بھی آج کل خود ہمارے
میں ایک اہم مسئلہ ہے۔ زمین سے حد
زیادہ فصلیں پیدا کرنا زمین کو دھیرے د
بنجر بنا دیتا ہے۔ غلط طریقے سے آب
کے نتیجے میں ضائع ہوکر اکھٹا ہوجانے
پانی میں متعدّد اقسام کی پیدا ہونے
بیماریاں ماحولِ انسانی میں اپنے قدم
ہیں۔ اور پھر حالات سے اُکتا کر دیہ
علاقوں سے تلاشِ روزگار میں آدمیو
جُھنڈ شہروں اور قصبوں میں آکر جُھگّی
جھونپڑیوں کی ایک نہایت گندی بستی
کرتے ہیں۔ اکثر مسلسل بھوک مری اِنسا
چور، ڈکیت، لُچّا، لفنگا بنا دیتی ہے بچ
گندے ماحول کے شکار ہوجاتے ہیں
کے کھانے پینے کے سودوں سے لے کر
کی ملاوٹ کا دھندا کرنے لگتے اور ا
طرح یہ درندے چند سکّوں سے اپنا گھ
پیٹ بھر کر سینکڑوں بچّوں کو یتیم اور ع
کو بیوہ کر دیتے اور ماؤں کی گودیاں
لگتے ہیں۔

بھوپال گیس ٹریجڈی اور چر
نیوکلیر حادثہ دُنیا کی تاریخ میں ا

ڈپارٹمنٹ آف OCEAN ڈیولپمنٹ، مہاساگر
بلاک C60، 12 کمپلیکس، لودھی روڈ، نئی دہلی ۳

والی نسلوں کے لیے بڑے اہم حادثات ہیں۔

خود ہمارے ملک میں کلکتہ، بمبئی، مدراس، دہلی میں ماحول کی گندگی سے پیدا ہونے والی طرح طرح کی بیماریاں جیسے کالرا، گیسٹرو انٹائیٹس، جانڈس ہر سال سینکڑوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیتی ہیں۔

کچھ سال پہلے ایک باوقار ادارہ کلب آف روم (Club of Rome) نے مشاہدات کی بنا پر ایک رپورٹ میں بتایا کہ جس رفتار سے اقتصادیات کی ترقی میں غیر معمولی اضافہ ہوتا رہے گا اُسی تیز رفتاری سے ماحول میں تعفّن اور زہریلا پن پھیلتا رہے گا ساتھ ہی ساتھ کچے مال کے وسائل گھٹتے رہیں گے۔ جیسے جیسے وسائل گھٹتے جائیں گے ویسے ویسے ان وسائل کے حصول کے سلسلے میں ہونے والے اخراجات آسمان سے باتیں کریں گے اور ماحول کو زہرآلود کرنے والے سائنسی اثرات شدت اختیار کرلیں گے اور ممکن ہے ۲۰۲۰ عیسوی تک انسانی آبادی کے ختم ہوجانے کے آثار نمایاں ہونے لگیں اور ساتھ ہی ساتھ زراعت جس کا دارومدار کھاد پر ہے زوال کی حدوں میں داخل ہوجائے۔ نتیجے میں رہ جائے گا صرف ایک مکمل بربادی کا خاکہ اور سوسائٹی کا بکھرا ہوا شیرازہ۔

اس سلسلے میں صرف یہی ممکن معلوم ہوتا ہے کہ بڑھتی ہوئی انسانی آبادی کو روکنے کی مہم میں ہر فرد کا یوگ دان اور پانی سے لے کر زمین سے حاصل ہونے والے معدنیات اور خوراک کی پیداوار کا صحیح طریقے سے استعمال کیا جائے اور بربادی کو روکا جائے جس سے ہمارا ماحول جس میں ہم سانس لیتے ہیں ساز گار رہ سکے۔

کوئی بھی حکومت یا مُلک اس مہم میں کامیابی حاصل نہ کرے گا اگر اُس کا ہر شہری ہر باشندہ خود ذاتی طور پر اس میں حصّہ نہ لے۔ صبح سے لے کر شام تک اُسے سوچ کر چلنا ہے کہ اس کے ہر فعل سے کھانے پینے، چلنے پھرنے سے ماحول میں کوئی بھی ایسی گندگی نہ پیدا ہو جو دوسر کے لیے یا خود اس کے لیے بعد میں یا فوراً ایک گھٹن پیدا کر دے۔ چاہے وہ دھواں پھینکتی ہوئی گاڑی کا چلانا ہو چاہے تیز ہارن کا بجانا جو ماحول میں ایک تھرتھراہٹ پیدا کرکے لوگوں کے کان کے پردے ہلادے۔

ہر مذہب نے ہر دَور میں صفائی پر خاص زور دیا ہے اسی لیے ہر پیدا ہونے والے انسان کو جب وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے تو اُسے غسل دے کر یہ بتایا جاتا ہے کہ تمھیں ایک صاف ستھری زندگی بسر کرنی ہے اور ماحول کو صاف ستھرا رکھنا ہے تاکہ تم خود بڑے ہوکر اپنی پیدا کی ہوئی گندگیوں کی گھٹن میں دم نہ توڑ دو۔

سیّد فضل المتین

(نذرِ خیال)

ولولہ راہ کی جُستجو کا گیا
ہمسفر منزلِ آرزو کا گیا

اب کہاں پہلی سی بزم آرائیاں
سب مزہ باہمی گفتگو کا گیا

رونقِ میکدہ ختم سی ہوگئی
ایک دیوانہ جام وسبو کا گیا

شہر سے کیا گیا وہ قتیلِ غزل
حسن اشعار کی آبرو کا گیا

کیا گیا وہ متین ایک جانِ چمن
تذکرہ موسمِ رنگ وبُو کا گیا

بیت الغنی، شرقی دروازہ درگاہ شریف، اجمیر

عشرت دھولپوری

یادوں کی چھاؤں درد کا بستر ہی آئے گا
دن ڈھل گیا تو شام کا منظر ہی آئے گا

شیشے کے گھر بھی میرے ہیں پتھر بھی ہیں مرے
الزام جو بھی ہوگا مرے سر ہی آئے گا

پھل دار پیڑ گھر میں اُگایا ہے کس لیے!
اب تو ہر ایک سمت سے پتھر ہی آئے گا

ہم ایسے موڑ پر ہیں وفا کی تلاش میں
جس سمت جائیں شہرِ ستمگر ہی آئے گا

بھائی کا سر اتار کے لشکر یہ شام کا
بہنوں کے سر سے لینے کو چادر ہی آئے گا

عشرت یہ شاعری نہیں پھولوں کی سیج کی
اس راستے میں خاک کا بستر ہی آئے گا

خوشی کی عمر ہی کم ہے غموں سے کیا کہیے
گلاب سوکھ گئے، شبنموں سے کیا کہیے

ہمارے ہاتھ ہی کام آگئے لڑائی میں
زمیں پہ گرتے ہوئے پرچموں سے کیا کہیے

وہ شخص ڈوب گیا آج کل جو پیاسا تھا
اب اِن بدلتے ہوئے موسموں سے کیا کہیے

گیا ہی کیوں تھا گھنے جنگلوں میں وہ تنہا
ہوا شکار تو اب ضیغموں سے کیا کہیے

خدا کے بیٹوں نے نیلام کر دیا ان کو
ہمارے دور کی ان مریموں سے کیا کہیے

غزل کے پردوں میں اس کو چھپائیے عشرت
یہ بات راز کی نامحرموں سے کیا کہیے

سول لائن، ٹونک (راجستھان)

...س۔ اعجاز

(...گریزی سے اُردو میں ترجمہ)

...وسری قسط

خوابوں کے اسرار سمجھیے

تجزیہ، چند خوابوں کا

اگر آپ سو افراد سے پوچھیں کہ ان کے خوابوں کی کیفیات کیا تھیں تو گمان ہے کہ چالیس آدمی اندیشے کی کیفیت بتائیں گے، اٹھارہ غصے اور چھے مغمومیت کی۔ صرف اٹھارہ افراد یہ کہیں گے کہ مسرت ان کے خوابوں کی جذباتی اُپج ثابت ہوئی بقیہ اٹھارہ سنسنی، تحیر، برانگیختگی، اشتعال یا دلچسپی کا ذکر کریں گے۔

یہ اعداد ۱۸۵۱ء تا ۱۸۵۵ء کے ایک جائزے سے حاصل ہوئے تھے یعنی سگمنڈ فرائڈ (SIGMUND FREUD) کی کتاب "خوابوں کی تشریح" (THE INTERPRETATION OF DREAMS) کی پہلی اشاعت کے ٹھیک پانچ برس کے بعد۔ اس عرصے میں فرائڈ کی تحقیقات کو تسلیم بھی کیا گیا اور ان میں ترمیم بھی کی گئی۔ اس زمانے میں ہمارے لیے خوابوں میں دکھائی دینے والی چیزوں کو بہت واضح دیکھنا آسان ہو گیا ہے۔ عام نیند میں مندرجۂ ذیل قسم کے خواب نظر آتے ہیں۔

پہلا خواب

جنس، ریگستانی جزیرے میں

خواب فہمی میں فرائڈ کی بڑی خدمت اس کا یہ نظریہ ہے کہ خواب لاشعوری فکری اعمال بالخصوص جنسی رویّوں پر مبنی اعمال کے غماز ہوتے ہیں جنس ٹھیک اسی طرح براہِ راست پیش کی جا سکتی ہے جس طور پر خواب میں نظر آتی ہے اور جس میں محبت ملوّث ہوتی ہے اکثر اوقات کسی نہ کسی صورت میں ایک جنسی پیغام چھپا ہوا ہوتا ہے۔

یہ تجربہ خاص کر اس وقت ہوتا ہے جب خواب دیکھنے والا ایک احساسِ جرم یا اپنی خواہش اور ضمیر کے مابین تضاد میں مبتلا ہو۔ ایک مثالی خواب لیجیے:

"میں نے خواب میں دیکھا، میں ایک خوبصورت بیابانی جزیرے پر کھڑی تھی۔ سبز طوطے میرے سر پر اُڑ رہے تھے۔ اچانک مارلن برانڈو نمودار ہوا۔ میں نے ملّایا طرز کا ایک ڈھیلا ڈھالا چمکدار اور خوبصورت ڈیزائن کا پیٹی کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے کہا تم پھول جیسی لگ رہی ہو.... دوسرا منظر جنگل کاٹ کر بنائی ہوئی بغیچی کا تھا جس میں ہم دونوں سایہ دار جھاڑیوں میں بیٹھے ہوئے تھے اور پھلوں اور لذیذ پکوانوں کے ڈھیر ہماری خوش وقتی اور پکنک کے لیے موجود تھے۔ باقی خواب.... ہماری... کیا کہا جائے محبت کے بارے میں تھا۔"

ماحول / پس منظر

یہ کئی طرح کے جنسی خوابوں میں سے ایک عام نمونہ تھا۔ "ایک خوبصورت ریگستانی جزیرہ" دور دراز کا ماحول ہے۔ جنس عموماً ایسی ہی گھنی طراوت دار یا پُرتکلف فضاؤں میں بہتر طور پر اُبھرتی ہے۔ کسی بھی خواب کے پس منظر کی ترتیب وغیرہ کو ضرور درج کرنا چاہیے۔ گھر طویل اور مانوس جگہیں عموماً نظر آتی ہیں۔ لطف و تفریح یا کھیل کے مقامات مثلاً فٹ بال کا میدان یا سوئمنگ پول عام طور سے خوابوں میں دیکھے جاتے ہیں۔ جب کہ کام کی جگہیں، باوجود یہ کہ آدمی اپنی بیدار زندگی کا زیادہ تر وقت وہیں گذارتا ہے، نسبتاً کم دکھائی دیتی ہیں۔

پس منظر کی ترتیب خواب میں رونما ہونے والے واقعات کے حوالے سے کافی اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔ یہاں واضح طور پر ریگستانی جزیرہ خواب کے غیر معمولی کردار اور ساخت کی علامت ہے اور "تکمیلِ خواہش" کا رمز ہے۔

ہیرو

مارلن برانڈو جیسا ایک گلیمرس اداکار رومانس اور جنسی اشتعال کی کیفیت کا ایک حصہ ہو سکتا ہے۔ نامور ہستیوں، اپنے کام کے ساتھیوں یا سماجی ملنے جلنے والوں مثلاً دوسری عورتوں کے شوہروں یا دوسرے شوہروں کی بیویوں کے ساتھ اپنے آپ کو خواب میں دیکھنا کوئی عجیب بات نہیں۔ اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں ہوتا کہ آپ اس شخص سے حقیقتاً محبت کرنے کے آرزومند ہیں۔ اس کا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دراصل آپ اس مخصوص قسم کے فرد سے اپنی جنسی آسودگی چاہتے ہیں۔ ایک فلم اداکار یا دوست جسے آپ خواب میں دیکھیں اس کے بارے میں غور فرمائیں تو آپ کو پتا چلے گا کہ دراصل آپ

٭ مدیر ماہنامہ "انشاء" ۶-۱اے گنگا تی سیل سٹریٹ، کلکتہ ۷۳...

اپنے رفیقِ زندگی میں اس کی خوبیاں اور اوصاف دیکھنا پسند کرتے ہیں اور کچھ نہیں۔ ایک شادی شدہ شخص کے لیے اپنے اصلی محبوب یا شریک زندگی کی بہ نسبت دور دراز کے لوگوں کا خواب دیکھنا بالکل فطری سی بات ہے۔ اگر آپ کا حقیقی رشتہ واقعی اطمینان بخش ہے تو آپ ایسی صورتیں خواب میں شاید ہی دیکھیں گے کیوں کہ خواب کا تجربہ عموماً ناآسودہ خواہشات اور نزاعی صورتِ حال کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔

ایسے ایک خواب میں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ آپ لگتے کیسے ہیں۔ کیا خواب کا "میں" آپ کے جیسا ہے؟ کیا چمک دار رنگ کے کپڑوں میں خود کو دیکھنے یا اپنی تعریف و ستائش سننے پر آپ کو ہنسی آجاتی ہے۔ شاید آپ سوچتے ہوں کہ آپ بہت جاذبِ نظر نہیں معلوم ہوتے یا پھر آپ کو اپنی شخصیت میں اصل رنگ کی کمی کھٹکتی ہے۔ جو غذا آپ خواب میں خود کو کھاتے ہوئے دیکھتے ہیں اس کے بارے میں آپ کیا رائے قائم کرتے ہیں؟ کیا آپ پوری بھوک اور خواہش کے ساتھ اسے کھاتے ہیں یا جبراً آپ کو ٹھونسنا چبانا پڑتا ہے۔ یہ ہرگز نہ بھولیں کہ غذا کبھی کبھی جنس کی علامت بھی ہوتی ہے جس سے جنس کی طلب اور بھوک نیز بہتر اہلیت کا پتہ چلتا ہے۔ کسی خواب کے جنسی پیغام کو سمجھنے کے لیے اس طرف بھی دھیان دینے کی ضرورت ہے۔

دوسرا خواب

قید خانے سے فرار

الفریڈ اڈلر ایک دیگر ماہر نفسیات کے مطابق جنس کی نسبت میں عام محرک 'طاقت' کے لیے ہوتا ہے۔ خواب اکثر و بیشتر کسی شخصیت کی مخفی خواہشات کو ظاہر کرتے ہیں۔ یا ایسے شوق اور لگن کے غماز ہوتے ہیں جو حقیقی زندگی میں ناآسودہ اور لب تشنہ رہ گئے ہوں۔

• میں نے ایک خواب دیکھا جس میں کئی مردوں کا گروہ تھا۔ ہم سب قلعے میں قیدی کی حیثیت سے تھے۔ ہر طرف سپاہیوں کا پہرہ تھا۔ میں نے تمام لوگوں کو ایک فراری گروہ کی صورت میں منظم کیا۔ میں کئی زبانوں میں بات چیت کرنے کا اہل معلوم ہوتا تھا۔ لہٰذا لیڈر میں ہی تھا۔ اس طرح ہم بھاگ نکلنے کے لیے ایک سرنگ کھود لی۔ پھر ہم ایک بہت اونچی دیوار پر چڑھ رہے تھے۔ . . . مانو کئی یگ بیت گئے ہیں دیوار پر چڑھتے چڑھتے۔ انجام کار مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں باہر ایک کھلی ریل گاڑی کے ڈبے میں کھڑا تھا اور دیہات کے بیچ سے گزر رہا تھا۔ اپنے فرار ہو جانے پر ہم بہت پرجوش تھے لیکن اپنے تعاقب کے خیال سے کافی خائف بھی تھے۔"

آپ نے غور فرمایا ہوگا کہ یہ ایک مرد کا خواب تھا ـــــ حالاں کہ ایسا نہیں ہے کہ عورتیں کارگزاری اور طاقت کے خواب نہ دیکھتی ہوں۔ لیکن عورتوں سے زیادہ مرد ایسے موضوعات کے خواب دیکھتے ہیں یہ ایک جھلک جسمانی خصوصیات کے فرق کو واضح کر دیتی ہے اور سماج میں دونوں جنسوں کو جس قسم کے کردار حاصل ہیں اس کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

مذکورہ خواب میں خواب دیکھنے والے کا رول

یہاں پھر خواب کا "میں" بھاری بھرکم اور نمایاں ہے۔ کیا خواب دیکھنے والا عملی زندگی میں بہت بزدل ہے اور کسی ایسے کام پر مامور ہے جہاں اسے میدان میں اپنی کارگزاری دکھانا نصیب نہیں ہوتا؟ اگر یہ درست ہے تو یہ خواب "تلافی کار" ہے اور اس کمی کو پورا کر رہا ہے جو اس شخص کو ایسی صورتِ حال میں نظر آتی ہے۔ دوسری طرف یہ خواب آدمی کے حاوی اور غالب ہونے، بہادر اور سخت پسند ہونے کا مظہر بھی ہو سکتا ہے۔ الفریڈ ابتدا میں فرائڈ کا مرید تھا لیکن بعد کو اس نے اپنے ہی نظریات کی پرورش کرلی۔ اس نے لوگوں میں اس جارحانہ رویے پر کافی زور ڈالا۔ اس کا نظریہ تھا کہ یہ جارحانہ رویہ جنسی جارحیت جتنا ہی اہم ہے اس سے کم نہیں۔

ذاتی شکوک اور اندیشے

خوابوں کا ایک بڑا تناسب شک، ابتلا یا ناکافی پن کے محسوسات پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کا سراغ ہمیں اس خواب میں بھی ملتا ہے کیوں کہ فرار ہو جانے والا شخص متفکر ہے کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ بہ الفاظ دیگر اگرچہ اس نے اپنے تئیں بہادر اور باوسائل ثابت کر دکھایا ہے پھر بھی اسے اطمینان حاصل نہیں ہوا ہے اور وہ بہ عجلت ریل گاڑی پر سوار ہو گیا ہے تاکہ اگلے چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہے۔ یہ خواب دیکھنے والا غالباً خود کو بہت دھکیل کر آگے بڑھاتا ہے اور اسے اپنے حدود کو قبول کر لینا چاہیے۔ حقیقی زندگی میں وہ خواب کے ہیرو جیسا ہو یہ قطعی ضروری نہیں۔

تیسرا خواب

تہ خانے میں بلیاں

• میں ایک بلند و بالا مکان میں گئی۔ ایک اندھیری سیڑھی سے نیچے اتری۔ میں نہیں جانتی کہ میں وہاں کیوں گئی تھی۔ لیکن لگتا تھا کہ مجھے ان

راستوں کا پتا تھا جن سے مجھے جانا چاہیے تھا۔ میں ایک تاریک کمرے میں پہنچی جو خالی تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ میں بلیوں میں گھری ہوئی ہوں۔ کالی کالی بلیاں۔ اتنے میں مجھے معلوم ہوا کہ میری پشت سے پٹوں سے بندھا ہوا ایک بلی کا بچہ لٹک رہا ہے۔ میں گھومی اور کمرے سے بھاگی۔ ایک بلی میری کمر پر جھپٹ پڑی اور بچے سے لٹک گئی۔ میں گھر سے باہر نکلنے کے لیے جدوجہد کرتی رہی اور کوشش کرتی رہی کہ بلی میری کمر سے چھوٹ جائے۔"

جانور اور جبلتیں

ایسا خواب ناگزیر طور پر خوابوں میں رمزو اشاریت کے تجزیے کی راہ ہموار کرتا ہے یہ تشبیہیں جو نظر آتی ہیں خواب دیکھنے والے کو کس بات کا اشارہ کرتی ہیں؟ یہاں وضاحت کی دو خاص سطحیں پائی جاتی ہیں۔ پہلے بلیوں کو لیجیے۔ جانور ایک فرد کی فطرت کے جبلی، جذباتی اور وجدانی (INT-UITIVE) حصوں کے نمائندہ ہوتے ہیں۔ لیکن یہ جاننا انتہائی ضروری ہوتا ہے کہ خواب دیکھنے والا یا اس مثال میں خواب دیکھنے والی خاتون کسی جانور (یا یہاں کالی بلیوں) کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہے۔ بالفرض اس شخص کی ایک پالتو بلی تھی جو مر گئی ہے تو بلی کے تئیں اس کے دل و دماغ میں ایک پیار، ایک انسیت اور نقصان کے صدمے کا احساس جاگے گا۔ لیکن اس کے برعکس یہ خواب دیکھنے والی لڑکی بلیوں کو ناپسند کرتی رہی ہے اور بلیوں کی حرکتیں نیز ان کا رینگنا اُچھلنا پھاندنا اسے قطعی پسند نہیں ہے۔ اور اسے ان کا تیز پنجوں سے اچانک حملہ کر دینا سخت ناپسند ہے۔ بلیوں کے بارے میں اپنے ذہن میں اس لڑکی نے یہ "رمزی قدر" پیدا کر رکھی ہے جو جانور کے تئیں عورتوں میں وجدانی، جبلی اور خاص کر نسائی جذبات کے لیے مخصوص ہے۔ غور فرمائیے کہ کس طرح خواب میں اس کا تسلسل اپنی کمر پر لادے ہوئے بلی کے بچے سے جا ملتا ہے۔ اس سے اس کے اپنے محسوسات کے خوف کی ترجمانی ہوتی ہے۔

پس منظر

یہ بتایا جا چکا ہے کہ خواب کا پس منظر معنی خیز ضرور ہوتا ہے۔ گھر اور مکانات خوابوں میں نظر آتے ہیں۔ رہائشی کمرے، خواب گاہیں، باورچی خانے اسی ترتیب سے سامنے آتے ہیں۔ تہ خانے اور زمین دوز شراب خانے وغیرہ "جنس" کا ہول اور بد فعلیوں کے خاص اڈے ہوتے ہیں جہاں گہرے اور اندرونی احساسات کو باہر نکلنے کا موقع فراہم ہو جاتا ہے۔ یہ خواب نہ صرف گہرے اور مخفی جذبات کی دریافت کا اشاریہ بلکہ اس فکرمندی یا زخم خوردگی کے اندیشے کا بھی غماز ہے جو ان کے بر آمد ہونے سے پیدا ہو سکتا ہے۔

ایک کُل کے مختلف اجزا

ایک خواب کا اس طرح تجزیہ کرنا گویا اس کے اندر کی ہر شئے حتیٰ کہ اس میں دکھائی دینے والے لوگ بھی خواب دیکھنے والے کا ایک حصہ ہوں کافی مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

یہ مکان بجائے خود لڑکی کے لیے آیا ہے۔ اس میں تہ خانہ اس کے اپنے گہرے فطری یا جبلی احساسات کے طور پر ہے۔ بچے سے مراد کسی دوسری جاندار شے کا لیا جانا ضروری نہیں ہے یا بچوں کے لیے لڑکی کی خواہش کا ہی سمجھا جانا ناگزیر نہیں ہے بلکہ یہ بھی لڑکی کے وجود کا ایک حصہ ہے جسے وہ ظاہر کرتے ہوئے ڈرتی ہے۔ اس کے افشا سے اسے اذیت کا سامنا کرنے کا اندیشہ ہے۔ ظاہر ہے کہ لڑکی ہی ٹھیک ٹھیک بتا سکتی ہے کہ یہ تمام تشبیہیں کیا معنی رکھتی ہیں اور کن سے منسوب ہیں۔ یہ خواب سوالات کا جواب تو کیا دے گا الٹے سوالات ہی کھڑے کرتا ہے۔ کہیں نہ کہیں اس کے لاشعور میں وہ محسوسات دفن پڑے ہیں جو افشائے حال کے لیے تڑپ رہے ہیں۔

چوتھا خواب

فیروزی رنگ کا تالاب

ہم میں سے بہتوں نے ایسا خواب دیکھا ہوگا جس میں کوئی نکتہ بار بار دہرایا جاتا ہے۔ کبھی کبھار کئی برسوں تک ایسا ہوتا رہتا ہے۔ ان خوابوں کو ہم "خواب اعادہ" یعنی "RECURR-ING DREAMS" کہیں گے۔ اکثر حالتوں میں یہ بچپن کے کسی سانحے سے متعلق ہوتے ہیں۔ یہ خواب عموماً خوف کی علامت ہوتے ہیں اور یہ وصف کھلے ہیں کہ ڈر کے اسباب کی نصف تفہیم ہی ان کے ذریعے ممکن ہوتی ہے۔

• میں نے ایک خواب دیکھا۔ میں ایک خوشنما فیروزی رنگ کے تالاب میں گر پڑی جس کے نیلگوں پانی میں اسفنج (جھاگ) اور فرن (فرن بغیر پھول کے پودے کی ایک قسم ہے) چٹانوں کے کنارے پر پیدا تھے۔ پہلے تو مجھے یہ سب بڑا اچھا لگا اور میں تیرنے لگی۔ پھر مجھے پتا چلا کہ پانی کافی تاریک اور گہرا ہے اور میں اس میں نیچے اترتی جا رہی ہوں۔ . . . میں سانس بھی نہیں لے سکتی تھی۔ میں نے اوپر آنے کی بھرپور

فردوس حیدر

جب موج ہوا زنجیر بنی

معزّزینِ شہر نے میت کو کاندھا دینے اور نمازِ جنازہ میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ محلّے کے نائی، دھوبی، قصائی، ماچھی، حلوائی اور ریڑھی والوں نے مل کر تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ نمازِ جنازہ میں شرکت کرنے والوں، قبر میں اُتارنے والوں اور مٹی دینے والوں میں وہ لوگ شامل تھے جنھیں معززینِ شہر سے کوئی سند حاصل کرنے میں دلچسپی نہ تھی۔ دن بھر خودکشی کرنے والی کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ گلی کے موڑ پر مسجد کے سامنے فیکے حلوائی کے تھڑے پر لوگوں نے خودکشی کے اسباب پر غور کیا اور آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ سبب خواہ کوئی بھی ہو خودکشی حرام فعل ہے اور معززینِ شہر کا فیصلہ دُرست ہے۔

میں نے برسوں پیش کار کی حیثیت سے ملازمت کی ہے اور اچھی طرح جانتا ہوں کہ عدالت کے سامنے مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کے جھوٹی قسمیں کھانے والے بے گناہوں کو سزائیں دلانے والے اور مقدس رشتوں کو پامال کرنے والے اکثر معززینِ شہر ہوتے ہیں لہٰذا میرے لیے ان کا کوئی فیصلہ بھی قابلِ قبول نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وقت اور حالات کے تحت انسان کے اندر جو تبدیلیاں آتی ہیں وہ دنیا والوں سے پوشیدہ نہیں رہتیں اس لیے کہ ہر عمل کا ردِّ عمل ہوتا ہے جس کی بنا پر انسان اپنے لیے اُصول وضع کرتا ہے اور جینے کا ڈھب سیکھتا ہے۔ کوئی ایک اچانک بدلتا ہوا لمحہ انسان کو ایسا جھٹکا دیتا ہے کہ ہر سہارا بے معنی ہو جاتا ہے اور انسان اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے۔ غالباً مونا بھی کسی ایسے جھٹکے کا شکار ہوئی ہوگی۔ مجھے کیا۔ ہوئی ہوگی۔ زندگی اسی کا نام ہے۔ لوگ آتے جاتے رہتے ہیں اور جانے والے کی جگہ کبھی خالی نہیں رہتی۔

وہ کہاں سے آئی تھی کسی کو علم نہ تھا۔ اس کا تعلق کس دیس سے تھا یہ جاننے کی ضرورت بھی پیش نہ آئی تھی۔ وہ ہمارے محلّے میں آتے ہی سب میں گھل مل گئی تھی اور اجنبیت کا احساس ختم ہو گیا تھا۔ پھر وہ بچّوں کو ٹیوشن دینے لگی اور یوں رفتہ رفتہ بچّوں کے والدین کو محبّت و اخلاص کا درس بھی دینے لگی۔ میاں بیوی کے جھگڑے ہوں یا لوگوں کے ذاتی مسائل وہ ماہرِ نفسیات کی مانند سب کا حل جانتی تھی۔ دوسروں کے دُکھ کو اپنا دکھ، دوسروں کے راز کو اپنا راز سمجھتی تھی اسی لیے سخی بی بی کے نام سے جانی اور پہچانی جاتی تھی۔ میرے نزدیک یہ پہچان ہی اس کے کردار کی سب سے بڑی خامی تھی۔ لوگ اپنے مصائب کے من گھڑت قصّے سُنا کر اسے رام کر لیتے اور وہ دامے، درمے، سخنے ان کی مدد کے لیے تیار ہو جاتی۔

شام کی اذان ہوتے ہی بازار کے واحد کھمبے کا بلب روشن ہوا تو نمازی ایک ایک کر کے مسجد کی جانب روانہ ہوئے۔ ملکھے نے بوسیدہ تھیلے سے ریوڑیاں نکال کے ریڑھی پر ڈھیر کیں اور گیس کا لیمپ جلایا۔ زندگی بظاہر معمول پر آگئی اور رات کی تاریکی میں منتقل ہونے والی ساعتیں اپنے اپنے آشیانوں اور پناہ گاہوں کی یاد دلانے لگیں۔ فیکے حلوائی کی دکان پر اب بھی دودھ اور لسّی پینے والوں کی بہ نسبت ان لوگوں کی تعداد زیادہ تھی جو مونا کی اچانک موت پر افسردہ تھے اور اس کا سبب جاننا چاہتے تھے۔ وہ سوالیہ نشان بنے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اگر اس گتھی کا کوئی سرا کسی ایک کے ہاتھ آجائے تو وہ مطمئن اپنے اپنے گھروں کو لوٹ سکیں گے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے مونا کو دفن کرنے کے لیے شہر کے قبرستان کی نسبت فضلو کے کلّر زدہ کھیت کو ترجیح دی تھی اور یوں اپنی دانست میں معززینِ شہر کی توہین کی تھی۔

جس کھیت میں وہ دفن کی گئی تھی کمہار کا کھیت نہ تھا پھر بھی پردیسیوں کے دفن کے لیے ۳۲ روپوں میں خریدا گیا تھا کھیت خواہ کمہار کا ہو یا چمار کا، اس میں پردیسی دفن ہو یا کوئی پردیسن یہ بات واضح ہے کہ



معرفت محسن خان، کنول ہار، ملیح آباد، لکھنؤ

اس کی خرید و فروخت میں ملوث حضرات ہمیشہ بے خبر ہوتے ہیں کہ وہ تاریخ میں کسی نئے باب کا آغاز کرنے جا رہے ہیں۔ جس طرح زمانۂ ماضی کے لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ کمہار کا کھیت "خون کا کھیت" کہلائے گا اسی طرح زمانۂ حال کے لوگ لاعلم ہیں کہ آنے والا کل فضلو کے کلّر زدہ کھیت کو کس نام سے یاد کرے گا۔ البتّہ فضلو نے اپنے کھیت کی وصول شدہ رقم سے سخی بی بی کے نام کا کتبہ بنوایا اور قبر کے چاروں اطراف ہری جھنڈیاں لگا کے اعلان کر دیا کہ سخی بی بی زندہ رہے گی۔ اسے یقین تھا کہ وہ موت کے تیسرے دن قبر سے باہر نکل آئے گی یا کم از کم اسے نظر آجائے گی۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ وہ ہمیشہ کی طرح لوگوں کے مسائل حل کرے گی اور دکھی دلوں کی ڈھارس بندھاتی رہے گی۔

مونا سے میری پہلی ملاقات ماکھے کی معرفت ہوئی تھی۔ مالک مکان نے اس پر مقدمہ کر دیا تھا اور وہ مکان خالی کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں نہ سبز، بھوری تھیں نہ سلیٹی بلکہ تمام رنگوں کا امتزاج مقناطیسی کشش لیے مجھے اپنی جانب کھینچ رہا تھا۔ اسی لمحے میں نے طے کر لیا کہ اب یہ آنکھیں صرف اور صرف میری راہ دیکھیں گی۔

"یہ محلّہ میری پناہ گاہ ہے" مونا نے نہایت بے بسی کے عالم میں کہا "اگر مکان مجھ سے خالی کرا لیا گیا تو میں رُل جاؤں گی" اس کے لہجے میں مایوسی اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ صورتِ حال میری منشا کے مطابق تھی۔ کوئی کام خواہ کتنا ہی سہل ہو میں اسے مشکل ترین بنا کے پیش کرتا ہوں تاکہ احسان جتانے اور معاوضہ طلب کرنے میں سہولت رہے۔ مونا کے سلسلے میں بھی یہ ترکیب کام آئی۔ میں وقتاً فوقتاً مونا کے گھر جاتا رہا اور اُسے باور کراتا رہا کہ مقدمہ جیتنے میں دشواری پیش آرہی ہے۔ وہ جس قدر پریشان ہوتی میں اسی قدر مسرور ہوتا۔ اور اس کی قربت کے نت نئے بہانے تلاشتا۔ اسے موسیقی سے گہرا لگاؤ تھا میں نے تمام راگوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اسے ادب سے دلچسپی تھی میں نے اس کے پسندیدہ ادیبوں اور شاعروں کی کتابیں پڑھ ڈالیں یہاں تک کہ ذہنی ہم آہنگی پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب میں کچہری کے شور اور تھکا دینے والے ہنگاموں سے جان چھڑا کے سیدھا مونا کے یہاں پہنچتا تو اس کی جھیل آنکھیں میری منتظر ہوتیں۔ وہ میرے لیے چائے بنا کر میرے سامنے بیٹھ جاتی۔ ہم گھنٹوں ادیبوں، شاعروں اور راگوں پر گفتگو کرتے۔ میری دن بھر کی تھکن دور ہو جاتی اور میں تازہ دم ہو کے گھر لوٹتا۔

مونا کا شمار ان معدودے چند خواتین میں تھا جو مرد کے وجود کی تصدیق کرتی ہیں۔ ان کی تھکن دُور کرتی ہیں اور معاوضے میں کچھ بھی طلب نہیں کرتیں۔ میں ایسی عورتوں کو احمق سمجھتا ہوں جو بے لوث محبّت کے نام پر خود اپنا استحصال کرتی رہتی ہیں۔ بنا مانگے کسی کو کچھ نہیں ملتا۔ کچھ بھی نہیں۔ میری گناہ گار آنکھوں نے کبھی کسی ظالم کو ملزم کے کٹہرے میں کھڑے نہیں دیکھا اس لیے میرے نزدیک حق تلفی کا کوئی مفہوم نہیں۔ مونا مجھے اچھی لگتی تھی اس پر تسلّط جمانا میرا حق تھا۔ میں اس کے حصول کے لیے کوئی بھی شکل کوئی بھی طریقہ اختیار کر سکتا تھا۔ کاش میں ہواؤں کا رُخ بدل سکتا جو میری رضا کے بغیر اسے سانس لینے میں مدد دیتی تھیں۔ کاش میں اس کے مداحوں اور خیر خواہوں کو ایک ہی وار میں قتل کر دیتا مگر وہ اپنی طرح زندہ رہی اور اپنی مرضی سے اپنے اسٹائل میں مر گئی۔

میں نے اکثر اسے واضح الفاظ میں سمجھایا تھا کہ میری آنکھ نے ہر رشتے کو شک سے دیکھنے کی تربیت حاصل کی ہے۔ میرے ہاں مقدس نام کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس کے باوجود بھی اس نے مجھ سے توقعات وابستہ کیں مجھے سمجھنے کی کوشش کی اور قدم قدم میرے ساتھ چلنا چاہا۔ توقعات وابستہ کرنے کی حد تک تو ٹھیک ہے مجھے اپنا قد چنار پیڑ کی مانند پھیلتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور میری انا کو تسکین ملتی ہے۔ میں صاحبِ اختیار حضرات سے اسی لیے اچھے مراسم رکھتا ہوں کہ ضرورت مندوں کے کام نکلوا کے اپنی طلب کا اظہار کر سکوں۔ میں اپنے اس اظہار پر کبھی نادم نہیں ہوا کہ دُنیا میں بلا سبب، بلا جواز، بلا معاوضہ کچھ نہیں ہوتا۔ میرا ایمان ہے کہ طالب و مطلوب صرف دو رشتے سچے اور کھرے ہیں۔ بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ان کی شکلیں بدل سکتی ہیں لیکن خاصیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ مونا اس قدر احمق تھی کہ مجھے یا میرے موقف کو سمجھنے سے قاصر رہی اور دوستی میں مساوی حقوق کا مطالبہ کرنے کے باوجود بھی میرے جال میں پھنس گئی۔ میں جو چاہتا اسے باور کراتا اور جیسے چاہتا ٹریٹ کرتا۔ وہ آمنّا و صدقنا کہتی رہی اور رفتہ رفتہ میں اس پر زندگی کا دائرہ تنگ کرتا رہا۔ اسے یہ

بھی احساس نہ ہوا کہ وہ جو آزاد پنچھی کی مانند پرواز کرتی تھی اس کے پر کاٹ دیے گئے ہیں۔ اب وہ صرف میری آنکھ سے دیکھتی، میرے کانوں سے سنتی اور میری زبان بولتی تھی۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ ہر آسودہ حال بیوی اپنے پیچھے نگاہ ڈالے تو اسے کسی نہ کسی تھکن دُور کرنے والی کی آرزوؤں کا خون بکھرا ہوا نظر آئے گا۔ میری بیوی جو میرے نام کی چھتر چھایا میں پھل پھول رہی ہے اچھی طرح جانتی ہے کہ میرے مزاج میں تحمل اور بردباری مونا کی توجہ اور خلوص سے ہے۔ میں نے اپنی بیوی کو صاحبِ جائیداد بنایا۔ اسے دنیا کی آسائشوں سے نوازا پھر بھی اس کے اندر کوئی خوشگوار تبدیلی نہیں آئی۔ وہ اسی طرح دن بھر کڑک مرغی کی مانند ٹرّاتی پھرتی ہے اور رات کو دیر سے گھر لوٹنے پہ میری جانب اس طرح دیکھتی ہے جیسے میری حیثیت کشکول میں پڑے کھوٹے سکّے کی سی ہے۔ دونوں عورتیں ہیں مگر دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں جیسے خسارے میں رہنا چاہیے وہی خسارے میں رہی ہم مردوں کا شیوہ ہے کہ صرف اپنی شناخت چاہتے ہیں۔ بیوی خواہ کتنی ہی بدسرشت و بدخو ہو ہمارے حوالے سے جانی پہچانی جاتی ہے اس لیے اسے ہر حال میں برداشت کرنا پڑتا ہے۔ مونا میری دوست تھی اور دوستیاں اچھا وقت گزارنے کے لیے کی جاتی ہیں۔ ایسی عورتوں کو ہم اپنے حوالے یا اپنی شناخت سے جینے کا حق نہیں دے سکتے۔ خسارے میں رہنے والیاں سب کچھ جانتے بوجھتے گھاٹے کا سودا کرنے پہ تیار ہو جاتی ہیں۔ وہ ہر بار ڈسی جاتی ہیں اور ہر بار اپنی غلطیوں کوتاہیوں کا اعادہ کرتی ہیں۔ میرے خیال میں وہ خود اذیتی کے مرض میں مبتلا ہوتی ہیں۔

میں فیکے حلوائی کی دُکان پہ بیٹھا لوگوں کے افسردہ چہرے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جس دن مونا نے مجھ پہ اعتماد کیا اسی دن اس کی زندگی کے تاریک باب کا آغاز ہوا تھا۔ میں نے مونا سے جو کچھ بھی حاصل کیا بدلے میں اس کے کئی کام سنوارے تھے۔ صرف لین دین کا معاملہ تھا۔ مجھے اس کے بچھڑنے کا کوئی ملال نہیں لہٰذا میں نے اس کی میّت کو کاندھا دینے یا نماز جنازہ میں شرکت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی میرے لیے مونا یا مونا جیسی سب غیر اہم ہیں۔ مجھے تو نہیں اور سہی کے منشور پہ عمل کرنا اچھا لگتا ہے۔ کسی اور مکان میں کوئی اور ناتواں، تنہا، غرض مند، میری منتظر ہوگی۔ بلکہ یہ انتظام تو میں نے اس کی زندگی میں ہی کر لیا تھا۔ اگر سمندر میری دسترس میں ہو اور مجھے یقین دلایا جائے کہ عمر بھر اس کا پانی میرے تصرّف میں رہے گا پھر بھی میں متبادل انتظام رکھوں گا۔ یہ میرے مزاج کا خاصّہ ہے۔ صائمہ بھی مونا کی طرح اپنے مسائل کے سلسلے میں میرے پاس آئی تھی اور میں اسے اپنی محبت کے جال میں پھنسانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ تھکن دُور کرنے والیاں، محبّت و ایثار کرنے والیاں سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ ہمدردی کے چند بے ربط جملوں اور جھوٹی قسموں سے ورغلائی جا سکتی ہیں۔ میں نے دُکان سے اُٹھ کے صائمہ کے گھر جانے کا قصد کیا ہی تھا کہ ماکھے نے مجھے دیکھ لیا اس نے مجھے بازو سے پکڑ کے فیکے حلوائی کی دُکان کے سامنے کھڑا کر دیا اور بلند آواز سے لوگوں کو پکارا "بوسنی بی بی تمھاری کیا لگتی تھی"، فیکے فضلو کے علاوہ کئی دیگر آوازیں سارے میں پھیل گئیں۔

"سنی بی بی میری ماں تھی"،

"سنی بی بی میری ماں تھی"،

"سنی بی بی میری ماں تھی"،

بازار میں عجیب شور تھا۔ نمازی فرض نماز ادا کرتے ہی مسجد سے باہر نکل آئے۔ سب کا رُخ فیکے حلوائی کی دُکان کی طرف تھا۔ یوں لگتا تھا کسی اہم مقدمے کا فیصلہ سننے جا رہے ہیں۔ ماکھے نے میری جانب ایک ٹیپ بڑھائی۔ میں نے ٹیپ ہاتھ میں لے کے اُلٹ پلٹ کے دیکھی۔ ٹیپ پر سفید کاغذ چسپاں تھا اور جلی حروف میں سورۃ القلم لکھی تھی۔ میں نے مونا کی تحریر پہچان لی تھی۔ "پڑھو" ماکھے کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ "کیا لکھا ہے" لوگوں کے استفسار پر میں بے اختیار بہ آواز بلند پڑھنے لگا" ایسے کی باتیں نہ سننا جو بڑا قسمیں کھانے والا، طعنے دینے والا، اِدھر اُدھر لگاتا پھرنے والا، درشت خو ہے۔ اس پہ طرّہ یہ کہ اس کی اصل میں خطا ہے"، پورے بازار میں سنّاٹا چھا گیا۔ ماکھے نے میرے ہاتھ سے ٹیپ لے کر فیکے حلوائی کی دُکان پہ رکھے ٹیپ ریکارڈر پہ لگا دی۔ میری آواز سارے میں پھیل گئی مجھے شدید جھٹکا لگا۔ صائمہ کو جیتنے کے لیے اس کی توجہ کا مرکز بننے کے لیے میں نے مونا کے کردار پہ کیچڑ اُچھالا تھا۔ ماکھے فیکے فضلو اور نہ جانے کس کس کے ساتھ اس کے ناجائز تعلقات ثابت کرنے کی کوشش کی تھی مگر یہ سب

باتیں تو میں نے انتہائی راز داری سے صائمہ کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کے کی تھیں اور میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ صائمہ میری گفتگو ٹیپ کر کے مونا کو بھیج دے گی۔

"تُف ہے تنگ کرنے والے پر" ماکھے نے زمین پہ تھوکا۔

"تُف ہے۔ تُف ہے۔ تُف ہے" کئی لوگوں کے تھوکنے کی آوازیں آئیں۔ لوگوں پہ مونا کی خودکشی کا سبب واضح ہو گیا۔ وہ مجھے حقارت سے دیکھنے لگے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ بھرے بازار میں ننگا کر دیا گیا ہوں اور سب لوگ مجھ پر تھوکنے کے لیے میری جانب بڑھ رہے ہیں۔ نہیں بلکہ میں دیکھ رہا ہوں اُن کے ہاتھوں میں ٹوکے، کلہاڑے اور چھرے بھی ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ میری تکا بوٹی کرنے میں کامیاب ہو جائیں مجھے بھاگ جانا چاہیے . . .

میں بھاگ رہا ہوں۔ پکڑو پکڑو کی صدائیں میرا تعاقب کر رہی ہیں۔ میں کہاں جاؤں؟ کہاں جا سکتا ہوں؟ شاید کہیں بھی نہیں جا سکتا۔ کہیں بھی نہیں۔ میں عمل اور ردِ عمل کے دائرے میں پھنس گیا ہوں۔ باہر نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔ کوئی راستہ نہیں۔

○

اگلے دن معززینِ شہر نے اخبار میں پڑھا کہ فلاں عدالت کا پیش کار جان محمد سخی بی بی کے مزار کے قریب مردہ پایا گیا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق اس نے رات کے کسی پہر خواب آور گولیاں کھائی تھیں۔ محلے کے نائی، دھوبی، قصائی اور اسی قبیل کے دیگر افراد نے متفقہ فیصلہ کیا کہ وہ نمازِ جنازہ میں شریک نہ ہوں گے۔

○

بقیہ:

خوابوں کے اسرار سمجھیے

جدوجہد کی اور پھر میں جاگی تو دیکھا کہ میں ہوا کے لیے الٹی سانسیں کھینچ رہی ہوں۔"

کسی تجربے کا بچپن یا جنم سے جھیلتے آنا کچھ تو بچے کے ذہن میں اس سانحے کے کافی قوی اور فعال ہونے کی وجہ سے ممکن ہے اور کچھ بعد کی زندگی کا فی مضبوط اور با اثر ہونے کے سبب ہوتا ہے۔ یہ ایک "ڈوبنے کا خواب" ہے جس کی تشریح فرائڈ نے پیدائش کے تجربے یا اذیت کی طویل مدتی یادداشت رحمِ مادر سے باہر آنے کے سفر سے کی ہے۔ ٹھیک اسی طرح "اڑنے والے" خوابوں کو اس نے جنسی جنون کے اظہار سے تعبیر کیا تھا۔ اگر بعد کی زندگی عدم تحفظ کے احساس کو جنم دیتی ہے یا جنم کے اوّلین تجربے کے خوف میں اضافے کا موجب بنتی ہے تو اسی مرکز اور تھیم پر خوف بھرا خواب بار بار نظر آ سکتا ہے۔

کبھی کبھار کابوس (NIGHT MARE) کا تعلق پیدائش کے تجربے کے بجائے بچپن کے کسی ایسے واقعے سے ہوتا ہے جس کا تجزیہ فوری طور سے نہیں کیا گیا یا جس سے بروقت نہیں نمٹا گیا۔ حتیٰ کہ تیراکی سیکھنے یا دورانِ غسل پھسل کر گر جانے کی کوئی یاد بھی اتنی گہری بن جاتی ہے کہ بار بار ایک کابوس کی شکل میں آتی رہتی ہے۔ اس طور پر خواب مددگار بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ وہ بار بار ایک واقعے کو دہرانے کے درمیان اس مخصوص تجربے میں ترمیم بھی کرتے رہتے ہیں تا آنکہ مشکل حل ہو جائے۔

مذکورہ صورت میں ایک بچی تالاب کے کنارے کھیل رہی تھی کہ اس نے اس کی گہرائی کے بارے میں کوئی فقرہ سُن لیا، جو اس کے دماغ میں بس گیا۔ اس کا خواب اس امکان کی آگہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ اگر وہ پھسل کر تالاب میں گر جاتی تو کیا ہوتا۔ یہ ایک شدید قسم کی تنبیہہ تھی۔

(باقی آئندہ)

○



دلیپ بادل

ہم جن پر قربان رہے ہیں
ہم کو دشمن جان رہے ہیں
گھر کا مقدّر جاگ اُٹھا ہے
جس دن وہ مہمان رہے ہیں
آپ کے برہم ہو جانے کا
کیا ہے مقصد، جان رہے ہیں
نا واقف ہیں ہم خوشیوں سے
غم کو مگر پہچان رہے ہیں
اُف ری سادگیِ دل اپنی
کس کا کہنا مان رہے ہیں
کس کی تمنّا میں ہم بادل
خاک جہاں کی چھان رہے ہیں

واسطہ بس کہ واجبی رکھنا
دوستوں جیسی دوستی رکھنا

دل لگانا، نہ جی میں گھر کرنا
خود کو دُنیا سے اجنبی رکھنا

صورتِ اشک، خوں رلائے گا
اِک تعلّق کبھی کبھی رکھنا

قصّے اپنے یہاں وہاں سُننا
بات اپنی گلی گلی رکھنا

شوق اپنا کہ ساتھ ہو ہر دم
طور اُس کا کہ بے رُخی رکھنا

حامد جعفری





سلمیٰ صادق

حاصلِ کائنات ہو جائے
زندگی نذرِ ذات ہو جائے
آج جو کچھ بھی میرے دل میں ہے
کاش وہ تیری بات ہو جائے
بازیِ عشق بھی انوکھی ہے
جیت جاؤں تو مات ہو جائے
رات بھر دن کا انتظار رہے
صبح کہتی ہوں، رات ہو جائے
غم تو حاصل ہے زندگانی کا
غم سے کیسے نجات ہو جائے
گفتگو پھر کسی سے ہو سلمیٰ
پہلے خود سے تو بات ہو جائے

اطہر فاروقی

سکندرآباد کی گم شدہ ادبی روایتوں کے سلسلوں کی بازیافت

چند وضاحتیں

ایوانِ اُردو اپریل ۱۹۸۹ء کے شمارے میں شائع شدہ میرے مضمون "سکندرآباد کی گم شدہ ادبی روایتوں کے سلسلوں کی بازیافت" کے سلسلے میں جناب احسن اعظمی اور جناب یعقوب بدر نے اپنے خطوط (ایوانِ اُردو مئی جون ۱۹۸۹ء) میں بعض اعتراضات کیے ہیں۔ بعض حضرات نے براہِ راست مجھے بھی مکتوب لکھے اور اپنی دانست میں بعض اغلاط کی نشان دہی کی، یا وضاحتیں چاہیں۔

احسن اعظمی صاحب کا کہنا ہے کہ مضمون اہم اور تحقیقی ہے، مگر مباحث ادھورے ہیں۔ انھوں نے بعض اعتراضات بھی کیے ہیں اور مشورے بھی دیے ہیں۔ میں نے "آجے چندنامے" کے متعلق واضح طور پر لکھا ہے کہ اس کا ایک نسخہ انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی کے کتب خانے میں موجود ہے اور دوسرا بھوپال کے CENTRAL AR-CHAIVES میں، میرے پاس اس کا وہ شائع شدہ متن ہے جسے انجمن کے ایک کارکن افسر امروہوی نے انجمن کے ترجمان "اردو" کے ۱۹۸۲ء کے دو شماروں میں شائع کیا ہے۔ مگر متن کی تصحیح نہیں کی گئی یوں بے شمار غلطیاں باقی رہ گئیں۔ ان کی تصحیح کوئی معمولی کام ہے بھی نہیں اور جب تک ایک ایک لفظ کی تحقیق کے ساتھ پورے متن کی تصحیح نہ ہو (جو برسوں کا کام ہے) تب تک نہ تو کوئی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے نہ اس پر اتنی آسانی سے مفصل مضمون لکھا جا سکتا ہے۔

ہو سکتا ہے اس کتاب کے اور نسخے بھی ہوں گے جن کا مجھے علم نہیں اور روشنائی و کاغذ سے اس کے عہدِ مذکور کے محقق ہونے کی ذمے داری بھی انجمن پر ہے جس کے ایک کارکن نے اس کا متن شائع کیا۔ کیا ہی اچھا ہو کہ احسن اعظمی صاحب یہ کام کر ڈالیں اور اردو کے قدیم ترین متن کو صحت مند متنی جامہ میسر آسکے۔ خاکسار نے گذشتہ سال جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ہندوستانی زبانوں کے مرکز میں ایم فل کے طالب علم کی حیثیت سے درخواست دی تھی کہ مجھے ایم فل کے DISSERTATION کے لیے "آجے چندنامے" کو یا پھر مثنوی بے صبر "لختِ جگر" کی ترتیب و تدوین کی اجازت دی جائے۔ مگر مجھے یہ اجازت مل نہ سکی۔ ورنہ اب تک ان میں سے کوئی ایک متن اشاعت کے مرحلے میں ہوتا۔ احسن اعظمی صاحب کا لہجہ کچھ ایسا ہے کہ بے صبر کی مثنوی "لختِ جگر" اس اہمیت کی حامل نہیں جس کا میں اظہار کر رہا ہوں ورنہ اس کا ذکر صرف ایک پیراگراف میں نہ کرتا اور ترجمے کی عبارت بھی نقل کرتا اور سرورق کا عکس بھی شائع کرا دیتا جس سے محققین کی کئی مشکلیں آسان ہو جاتیں۔ اس مثنوی پر میرا قدرے تفصیلی تعارفی مضمون "غالب نامے" کے جنوری ۱۹۸۹ء کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے جو غالباً اعظمی صاحب کی نظر سے نہیں گزرا جس پر اپنے اداریے میں اظہارِ خیال فرماتے ہوئے پروفیسر نذیر احمد رقم طراز ہیں:

"اطہر فاروقی صاحب کے مقالے میں ایک کم یاب مثنوی کا تعارف ہے۔ مرزا غالب کے ایک شاگرد تھے منشی بالمکند بے صبر، جو کہ سکندرآباد کے رہنے والے تھے۔ "لختِ جگر" ان کی مثنوی کا نام ہے، جس میں ایک عشقیہ قصہ نظم کیا گیا ہے۔ "لختِ جگر" تاریخی نام ہے جس سے سنِ تصنیف ۱۲۵۳ھ نکلتا ہے۔ مصنف نے خود اس کی صراحت کر دی ہے۔ ۱۲۵۷ھ میں انھوں نے اس پر نظرِ ثانی کی اور نظرِ ثانی کے بعد اسے اپنے اُستاد مرزا غالب کے سامنے اصلاح کی غرض سے پیش کیا۔ انھوں نے لکھا ہے:

غالب کی نگاہ سے گزر کر
بے عیب یہ ہو گئی سراسر

یہ مثنوی بس ایک ہی بار ۱۲۸۸ھ میں مطبع خورشید جہاں تاب سہارنپور میں چھپی تھی۔ مگر بڑے تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ اہم مثنوی اب تک اہلِ تحقیق کی نگاہوں سے پنہاں رہی۔ منظوم داستانوں اور مثنویوں پر اُردو میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں، اور وہ سب اس مثنوی کے ذکر سے خالی ہیں۔

ہاں، اس مثنوی کے آغاز میں حمد اور نعت کے بعد بے صبر نے اہم شعر اپنے اُستاد مرزا غالب کی مدح میں لکھے ہیں۔ یہ اشعار بھی اب تک عام طور پر نگاہوں سے پنہاں رہے ہیں۔

جناب اطہر فاروقی خود بھی سکندرآباد کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے اس اہم اور کمیاب مثنوی کا تعارف کرایا ہے اور اس طرح جہانِ غالب کے سلسلے کا کام کرنے والوں کے لیے قابلِ قدر معلومات فراہم کر دی ہیں۔ مضمون نگار نے

۱/۷، رسالداران، سکندرآباد ۲۰۳۲۰۵ (یوپی)

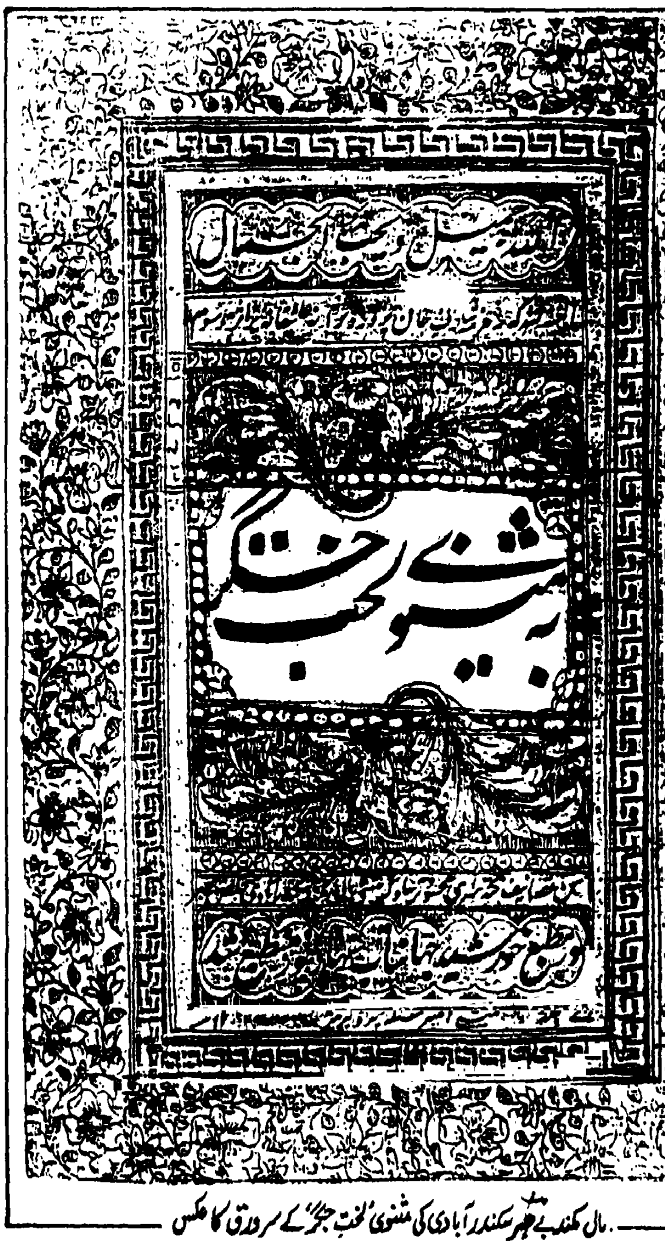
مدحِ غالب کے مکمل اشعار نقل کر دیے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کیا ہے کہ زبان، بیان اور املا کے لحاظ سے اس مثنوی میں جو قابلِ ذکر باتیں ہیں ان کا بھی تذکرہ کر دیا ہے اور یہ درحقیقت بہت مفید کام کیا ہے۔ مطالعۂ غالب کے سلسلے میں یہ تحریر اپنی اہمیت کی بنا پر مستحقِ ستائش ہے۔"

مثنوی کے سرِ ورق کا عکس محققین کی کون سی دشواریاں آسان کر سکتا ہے کہنا مشکل ہے، پھر بھی سرورق حاضر ہے اور کتاب کے آخر میں جو قطعات تاریخِ طبع درج ہیں ان کا بھی عکس حاضر ہے۔ یہ بات تو پروفیسر نذیر احمد کے اداریے سے واضح ہو گئی کہ مثنوی اتنی ہی نایاب اور اہم ہے جتنا راقم نے کہا ہے مگر اعظمی صاحب کو ایک اور غلط فہمی ہو گئی کہ گیان چند جین صاحب نے مثنوی کا ذکر اپنے ڈی لٹ کے تحقیقی مقالے میں کیا ہے۔ انھوں نے جین صاحب کا یہ تحقیقی مقالہ غالباً دیکھا بھی نہیں ہے۔ صرف کہیں ذکر سن لیا ہے اسی لیے وہ نام تک صحیح نہیں لکھ سکے کتاب کا صحیح نام "اُردو مثنوی شمالی ہند میں" ہے نہ کہ "اردو مثنوی کا ارتقا شمالی ہند میں" جو موصوف نے لکھا ہے۔

جن لوگوں نے غالب نامے والا مضمون نہیں پڑھا انھیں ایک اور غلط فہمی ہو گئی اور انھوں نے اس کی وضاحت چاہی کہ بے صبر کے اس شعر:

تصنیف کا سال تھا جگر لخت
ترمیم کا سنہ ہے میرا بخت

میں دوسرا مصرع میرا آنے کے اعلان سے ساقط الوزن ہو جاتا ہے اور یہاں مرا آنا چاہیے۔ غالب نامے کے مضمون میں اس پر حاشیہ موجود ہے کہ وزن میں تو مرا ہی آتا ہے مگر شاعر نے اعراب بالحروف کی روشِ قدیم کے مطابق یے کے دس عدد شامل کر دیے ہیں اور یوں نظرِ ثانی کا سال ۱۲۷۵ھ برآمد ہوا ہے۔ اس مثنوی کی سب سے قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مرزا غالب کی اصلاح شدہ یہ مثنوی اب نایاب کی حد تک کم یاب ہے بے صبر پُرگو شاعر تھے اور ان کے تفصیلی سوانح حالات تلامذۂ غالب میں موجود ہیں جن میں غالب کی وفات پر کہے گئے قطعاتِ تاریخ بھی ہیں عرشی ملسیانی مرحوم نے اپنی کتاب فیضانِ غالب میں بے صبر کے جو حالات دیے ہیں ان میں بھی یہی درج ہے کہ یہ مثنوی لختِ جگر اب نایاب ہے۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اعظمی صاحب کا یہ دعوا قطعاً خوش عقیدگی پر مبنی ہے کہ گیان چند جین صاحب نے مثنوی دیکھی ہے۔ "اردو مثنوی شمالی ہند میں" کا دوسرا ایڈیشن (۱۹۸۷ء) جو انجمن سے شائع ہوا ہے میرے پیش نظر ہے اس کے ضمیمے میں صفحہ ۲۴۴ پر بے صبر کی مثنوی کا ذکر ہے۔ مگر صرف نام، شاعر کا نام اور سنہ اشاعت درج ہے اور کیفیت کا خانہ خالی ہے۔ جین صاحب کے بقول اگر ان کی یہ بات مان لیں کہ درجہ سوم کی مثنویوں کو



مال کمند بے صبر سکندرآبادی کی مثنوی 'لختِ جگر' کے سرورق کا عکس

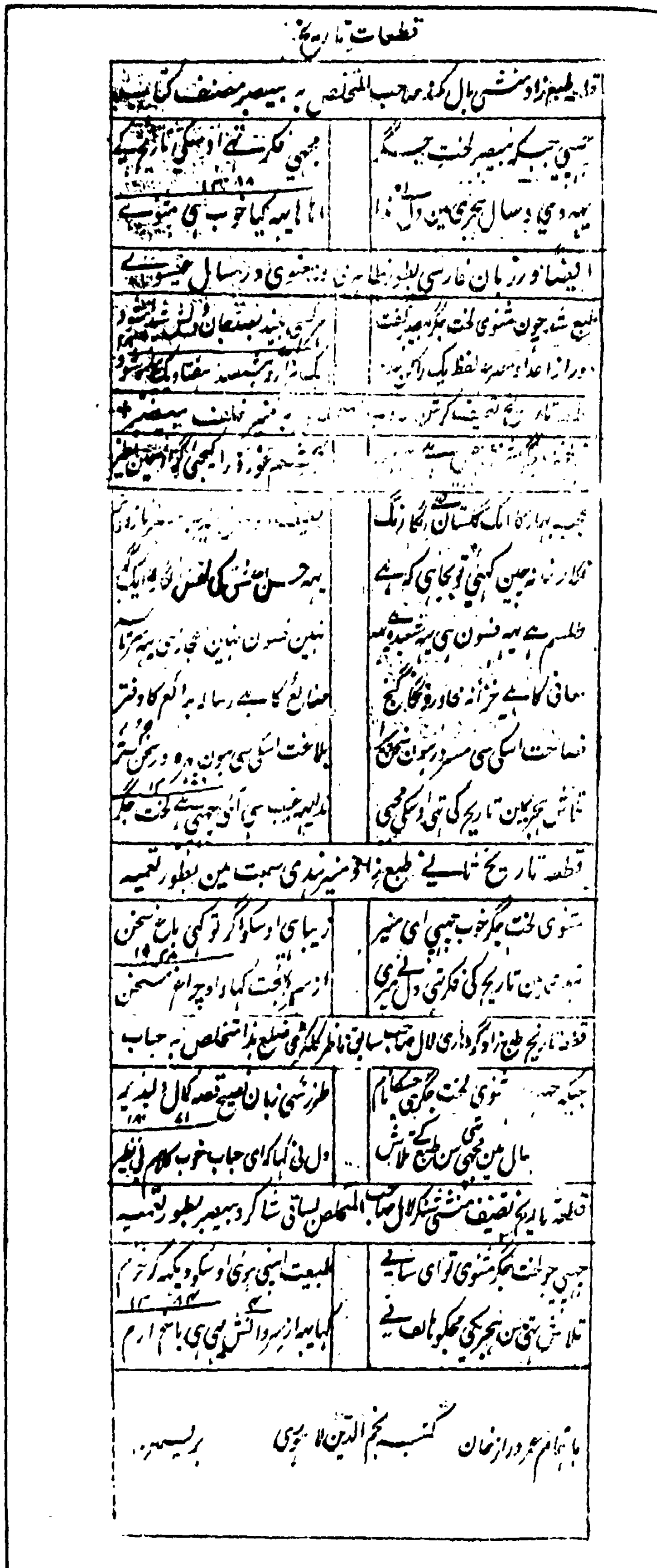
انھوں نے اس جائزے میں شامل نہیں کیا ہے اور غالب کی اصلاح شدہ یہ مثنوی تیسرے درجے کی ہی ہی۔ مگر کیا یہ ممکن تھا کہ وہ مثنوی دیکھتے اور اس کی کیفیت تک نہ لکھتے پھر مثنوی سے متعلق یہ معلومات تو حزین صاحب کے مذکورہ مقالے میں درج ہیں۔ "تلامذۂ غالب" میں بھی موجود ہیں۔ طبع اول ص ۵۵ اور طبع دوم ص ۰۰ ... پر اس مثنوی کا ذکر موجود ہے مگر قیاس اغلب یہی ہے کہ یہ مثنوی مالک رام صاحب کی نظر سے بھی نہیں گزری کیوں کہ انھوں نے بھی یہ نہیں لکھا کہ یہ مثنوی غالب کی اصلاح شدہ ہے۔ مثنوی اگر نظر سے گزری ہوتی تو یہ بات نہ کہنے کا سوال نہیں تھا اس مثنوی کی ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ اس میں غالب کے طریق نگارش کا ہی اتباع کیا گیا ہے۔ مثلاً ہر اک کی جگہ ہر یک کا استعمال اور گانو پانو چھانو کا طریق املا روا رکھا گیا ہے اور غالب کی پیروی میں ہی وہاں اور یہاں کو مخفف کی صورت میں وہاں اور یہاں لکھا ہے۔ اور ہُوس کو اسی طرح لیکن ملا کر ہر جگہ لکھا گیا ہے چند مثالیں دیکھیے:

شاہین و عقاب و بحری و باز
ہر یک پے صید گرم پرواز
(ص ۱۸)

باہم گل و سرو میں لڑائی
ہر یک بہ غرور و خود ستائی
(ص ۲۰)

آزادی کی اپنی کر نہ تقریر
ہے پانو میں موجِ آب زنجیر
(ص ۲۱)

اشجار کی جب وہ چھانو ہی چھانو
پہنچی لبِ حوض تک دبے پانو
(ص ۴۷)



مثنوی کی تاریخِ طباعت سے متعلق قطعات کا عکس

ـــــ گانو کے متصل قضارا
ـــس نے کیا ایک شب گزارا
(ص ۱۰۶)

ـنشنہ لبی سے، بس کر بے تاب
ـال کرنے لگا تجسّسِ آب
(ص ۱۹)

ـہ یہاں نہ مقامِ دم زدن ہے
ـوسعتِ عالمِ سخن ہے
(ص ۱۴)

ـبتر ترے کفر و دیں ہیں دونوں
ـال ایک، تو یہیں ہیں دونوں
(ص ۳)

ـق مجھے یہاں پھنسا دیا آہ!
ـوئی مری آہ تو نے کی راہ!
(ص ۴۷)

مت بلہوسی کا کیجیو کام
بدنام نہ کیجیو عشق کا نام
عاشق کم، بلہوس بہت ہیں
پروانے ہیں کم، مگس بہت ہیں
رکھ دل میں لحاظ پیش و پس کا
سُن قصہ یہ ایک بلہوس کا
(ص ۱۰۳)

اک دن اک بُلہوس نے یہ طور
دیکھا، اور ہو کے خوش کیا غور
(ص ۱۰۴)

ـاں صفحے پر یہ لفظ عنوان میں بھی آیا ہے:
"قصۂ تقریبِ عاشق و بُلہوس"
ـس لفظ کو ہر جگہ اسی طرح ملا کر (بلہوس) لکھا گیا
ـہے اور ب پر ہر جگہ پیش موجود ہے۔
اس مثنوی کا سب سے قابلِ ذکر حصہ وہ
ـاشعار ہیں جو غالب کی مدح میں لکھے گئے ہیں۔ بے تجبر
کی قصیدہ نگاری سے متعلق "قصیدہ نگارانِ اترپردیش"
مصنف سیّد علی جواد زیدی ناشر یو۔پی اردو اکیڈمی
(۱۹۷۸ء) کا مطالعہ بھی خالی از دلچسپی نہیں۔ اور ظاہر
ہے کہ پوری مثنوی کی طرح وہ بھی غالب کی نظر سے
گزرے ہیں۔ یہاں یہ اشعار نقل کیے جاتے ہیں جو
حمد و نعت کے بعد "در شانِ مجمعِ کمالاتِ صوری و
معنوی حضرت استادی جناب مولانا اسد اللہ خاں
صاحب" کا عنوان قائم کر کے درج کیے گئے ہیں:

بے صبر! وہ صاحبِ بصیرت
انساں صورت، فرشتہ سیرت
وہ پاک سرشت، پاک جوہر
وہ پاک نژاد، پاک گوہر
روشن دل و سینہ مشرقستاں
جاں، جملہ حق و تمام تن، جاں
خورشیدِ سپہرِ عزّ و تکریم
ماہِ فلکِ رضا و تسلیم
عقل اس کی، تنِ عقول کی جاں
نفس اُس کا، نفوس کا نگہباں
طے کردۂ وادیِ طریقت
پے بُردۂ منزلِ حقیقت
دانا ہے اصولِ علمِ معقول
آگاہِ رموزِ فنِّ منقول
ہر علم میں باکمال ہے وہ
ہر فن میں بے مثال ہے وہ
استادِ جہاں، فصاحت آموز
سحبانِ زماں، بلاغت اندوز
شاہنشہِ کشورِ معانی
فرماں دہِ ملکِ نکتہ دانی
استاد بہ ہر زباں سخن گو
منشی بہ زبانِ فرس و اردو
نام اس کے سے کرتا ہوں میں آگاہ
اوّل ہے اسد اور آخر اللہ
مشہور تخلّص اُس کا غالب
مطلوبِ دلِ ہزار طالب
مرزا نوشہ لقب ہے اُس کا
ثانی، کوئی اور کب ہے اُس کا
ہے سعدیِ آخر الزماں وہ
لے نے، سعدی کہاں، کہاں وہ
ہوتا وقت اب جو انوری کا
بھرتا نہ وہ دم سخن وری کا
خاقانی اگر مُوا نہ ہوتا
کیا اُس کا گدا ہوا نہ ہوتا
کرتا نہ اگر جہاں سے دوری
پاتا نہ ظہور اب کے ظہوری
مرتا اگر اب تلک نہ صائب
ہوتا وہ سخن وری سے تائب
عرفی جو گیا ہے نوجواں مر
غالب سے گیا وہ غالباً ڈر
گر شیخ علی حزیں نہ مرتا
ترکِ سخن اختیار کرتا
کیا بھرتی نہ پیش ہندیانی
شمشیرِ کمالِ اصفہانی
دلّی سے گئی جو صیتِ غالب
بھاگی اَمل سے روحِ طالب
جب پارسیوں کا حال یہ ہے
یہ قال ہے اور مقال یہ ہے
سودا اور مصحفی و جرأت
ناسخ اور دردؔ میر و حسرت
شاعر ہیں یہ سب جو ریختہ گو
غالب کی نہ ان سے ہمسری ہو
گر ہر سرِ مو مرا زباں ہو
وصف اس کا نہ حشر تک بیاں ہو

خوش خلق ہے، خوش مزاج، خوش خو
خوش رو ہے وہ، خوش نصیب، خوش گو
ہے مثلِ طمع، طمع سے خالی
ہمت اُسے دی خدا نے عالی
دل اُس کے پہ ہے نیازی کو ناز
مستغنی و سیر چشم و بے آز
لے کر کوئی احتیاج گر آئے
مایوس نہ اُس کے در سے وہ جائے
عالم میں ہے فیضِ عام اُس کا
فیاضی ہے خاص کام اُس کا
جو اُس کے تلامذہ میں آیا
دخل اُس پہ نہ معترض نے پایا
میں بھی کہ ہوں فنِ شعر کے گرد
شاگرد دل کا اُس کے ہوں میں شاگرد
میں ذرّہ ہوں اور ہے وہ خورشید
خورشید سے ذرّے کو ہے تائید
میں قطرہ ہوں اور وہ بحرِ عماں
عماں سے وجودِ قطرہ ہے ہاں
اب اُس نے ہی، ہوں میں جس کا مداح
دیوان کو میرے دی ہے اصلاح
مجھ کو دیا افتخار اُس نے
بخشا مجھے اعتبار اُس نے
ہے زیبِ سر اُس کے در کی جو خاک
پہنچا مرا سر بہ اوجِ افلاک
حق اُس کو رکھے سدا سلامت
شاگرد نواز تا قیامت
تفتہ کے سبب بہ خواہشِ دل
رُتبہ یہ ہوا ہے مجھ کو حاصل
وہ چرخِ زمینِ شعر تفتہ
ہے جس کا سخن مہرِ دو ہفتہ
ہندی رہِ فرس کا ہے رہ رو
عہد کا اپنے کا ہے امیر خسرو
ناطق ہے وہ فارسی زباں میں
ہے غلغلہ جس کا اصفہاں میں
ہے تفتہ آتشِ محبت
ہے جس کا کلام پُر حرارت
غالب کا ہی وہ بھی خوشہ چیں ہے
میں ہوں کہیں، اور وہ کہیں ہے
اے ساقیِ خوش کلام! لا جام
مجھ کو مے فیض کا پلا جام

(ص ۶ سے ۹ تک)

دوسرا خط میرے ہم وطن جناب یعقوب بدر کا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا تحقیق میں صرف حقائقِ موجود پر مکمل بھروسہ کرکے نتائج نکالے جاسکتے ہیں؟ اگر اس کا جواب ہاں میں ہے تو پھر شہر تفتہ کے مرتب یعقوب بدر صاحب ہی ہیں شاہد ایوبی اور شاکر انصاری صاحب ان کے معاون ہیں۔ لیکن اگر حقیقتیں معدوم نہ ہوئی ہوں، اشخاص بھی زندہ ہوں، شہادتیں بھی موجود ہوں تو پھر کسی تحریر کی حیثیت حرفِ آخر نہیں۔ خاکسار کا تعلق بھی سکندرآباد سے ہے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ شہر تفتہ کا خیال تو بدر صاحب کا تھا مگر مواد کی فراہمی ان دو حضرات کے تعاون کے بغیر ممکن نہ تھی۔ بدر صاحب ۱۹۸۲ء میں سکندرآباد تشریف لائے۔ بھلا ایک نو وارد کو کوئی کیوں معلومات فراہم کردے! میرے خیال میں تو تحریر سے کہیں زیادہ حیثیت حقائقِ معلوم کی ہے اور ان کے مطابق شہر تفتہ کے تین مرتبین ہیں۔ میں نے اپنے تبصرے (ہماری زبان ۸ مارچ ۱۹۸۶ء) میں بھی تینوں اصحاب کو ہی مرتبین لکھا تھا اور کتاب کے بارے میں اسی رائے کا اظہار کیا تھا جس کا اس مضمون میں کیا ہے۔ مگر اس تبصرے کے بعد مرتبین کے متعلق بدر صاحب نے کوئی وضاحت نہیں کی اور خاموش رہے یعنی میری تمام باتوں سے متفق تھے۔ اپنے وضاحتی مکتوب ایوانِ اُردو جولائی ۱۹۸۹ء میں شاہد ایوبی اور شاکر انصاری صاحبان نے کتاب کے پست معیار کے بارے میں میری رائے سے اتفاق کیا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس کتاب پر سو سالہ تذکرے کا اطلاق ہوسکتا ہے؟ جن لوگوں نے شہر تفتہ دیکھی ہے وہ بے تکلف کہیں گے کہ قطعی نہیں۔ پھر ایک اور سوال بھی ہے۔ سکندرآبادی شعرا کے علاوہ اگر ان شعرا کو جو اب سکندرآباد میں مقیم ہیں اس تذکرے میں شامل کرلیا جاتا تو بھی غنیمت تھا، مگر اس میں سکندرآباد سے باہر کے وہ زندہ شعرا بھی شامل ہیں، سکندرآباد نہ جن کے اجداد کا وطن ہے نہ ہی وہ کبھی یہاں آکر رہے۔

شہر تفتہ کے مرتبین نے قدیم شعرا کے معاملے میں صرف سکندرآباد میں فراہم معلومات پر ہی اکتفا کی ہے اور کسی تذکرے، کسی تصنیف مع "تلامذۂ غالب" کے وجود سے وہ ناواقف تھے جس سے ان کے علم و مطالعے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کتاب میں تفتہ کا چند سطری تعارف ہے اور تاریخِ ولادت غائب؟ اگر تلامذۂ غالب ہی دیکھی ہوتی تو اس کوتاہی کا ارتکاب ممکن نہ تھا۔ بدر صاحب نے لکھا ہے کہ انھوں نے تفتہ کے اُردو دیوان کا مطالعہ کیا ہے۔ اگر یہ بات درست ہے تو پھر ان کا اُردو کلام کیوں شاملِ اشاعت نہیں؟ بدر صاحب نے مجھ

خاکسار پر یہ الزام لگایا ہے کہ تفتہ کے اُردو اشعار مجھے انھوں نے ہی سنائے ہوں گے اور میں نے اس کا اعتراف نہیں کیا۔ ایسا قطعی نہیں:

تپ سوزِ محبت کے لیے چارہ نہیں قمری
یہ گنڈہ نیل گوں گردن میں کیوں لائے تفتہ جاں باندھا

ڈاکٹر فطرت انصاری نے سنایا تھا اور دوسرا:

ناراض نہ ہو صحبتِ احباب سے تفتہ
جینے کا مزہ دہر میں تنہا کا نہیں ملتا

پروفیسر مسعود حسین خاں نے لکھ بھیجا تھا اور میں نے ان ہی کے شکریے کے ساتھ درج کیا ہے البتہ حاشیے کی ترتیب میں پروف ریڈر سے سہو ہوا حاشیہ نمبر ۴ یوں تھا: مکتوب پروفیسر مسعود حسین خاں بنام راقم الحروف۔ یہاں ایک اور وضاحت بھی ضروری ہے۔ غالب کی موت پر تفتہ سے منسوب قطعے کا آخری مصرع میں نے یوں لکھا ہے:

چھے لفظ اس کے مرتے ہی بے یاد و سر ہوئے

میرا ماخذ خمخانۂ جاوید جلد دوم ص ۱۱۶ تھا یہ مصرع مع مالک رام صاحب سب نے یوں لکھا ہے:

چھے لفظ اس کے مرنے سے بے یاد و سر ہوئے

تلامذۂ غالب طبع اوّل ص ۶۵ اور طبع دوم مئی ۱۹۸۴ء ص ۱۱۹؛ اغلب یہی ہے کہ یہ غلطی تلامذۂ غالب کے اولین ایڈیشن میں راہ پا گئی اور ضیاالدین انصاری تفتہ اور غالب ص ۱۴۴ نے اولین ماخذ کی طرف رجوع کیے بغیر تلامذۂ غالب سے اسے نقل کیا۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں نے خمخانۂ جاوید بعد میں دیکھی اور حاشیے میں حوالہ "تفتہ اور غالب" کا نقل کیا اس کتاب میں اس مصرعے پر کوئی حاشیہ یا اختلافِ نسخ کی وضاحت نہیں۔ یعقوب بدر مجھے معتوب کر رہے ہیں کہ میں نے انیسویں اور بیسویں صدی کے شعرا کے حالات نہیں لکھے میں مضمون لکھ رہا تھا اور ان سے کئی گنا زیادہ معلومات یکجا کر گیا اور وہ تذکرہ مرتب کر رہے تھے اور یہ توفیق انھیں نہیں ہوئی۔

انیسویں اور بیسویں صدی کے تمام شعرا کے حالات کی دستیابی کا دعوا تو نہیں کر سکتا مگر پھر بھی جو کچھ تفصیلات میرے پاس ہیں رقم کرتا ہوں تاکہ شہر تفتہ کے نظرِ ثانی شدہ ایڈیشن کے وقت یعقوب بدر صاحب کے کام آئیں۔

تذکرہ شعرائے ہنود میں سکندر آباد کے درجِ ذیل شعرا کا ذکر اور کچھ کے مفصل کچھ کے مختصر حالات مذکور ہیں۔ اس سے رجوع کرنا مناسب ہوگا یہ تمام وہ شعرا ہیں جن کا ذکر "شہر تفتہ" میں نہیں ہے۔

بابو کلیان سنگھ جوشش۔ ص۔ ۴۳
منشی شنکر لال ساقی۔ ص۔ ۱۷
(تلمیذ بے صبر)
لالہ شنکر لال بے تاب۔ ص۔ ۳۲ اور ص۔ ۳۔ ۲۔
منشی جگت نرائن بے خود ص۔ ۳۲ اسی صفحے پر بے صبر کے تفصیلی حالات ہیں اور انتخابِ کلام بھی جو ص ۳۷ تک پھیلا ہوا ہے۔
بنسی دھر تخلص درج نہیں ص ۲۱ اجمیر میں مقیم رہے۔

(ممکن ہے کچھ نام چھوٹ گئے ہوں کیوں کہ میرا نسخہ ناقص الطرفین ہے)

شعرائے سکندر آباد کا ذکر بہت سے اہم تذکروں میں ہے ان سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

سکندرآباد کے ایک بزرگ جواب علی گڑھ میں مقیم ہیں؛ عمر بھر نایاب مخطوطات اور کتب جمع کرتے رہے اور اب خاصا ذخیرہ ان کے پاس ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے مجھے دیوان بے جگر کا سرورق دکھایا۔ ان کا بیان تھا کہ اس کا مخطوطہ لندن میں ہے اور مطبوعہ دیوان پاکستان میں۔ سرورق پر یہ قطعہ درج تھا:

سودا بھی بھلا بے سروسامانی بھی اچھی
ہاتھ آئیں وہ زلفیں تو پریشانی بھی اچھی
تادیر رہے سامنے آنکھوں کے وہ قاتل
اے بے جگر ایسی تو گراں جانی بھی اچھی

دیوان کا نام "ریاضِ سخن" تاریخی تھا جس سے ۱۸۲۱ء برآمد ہوتا ہے۔ ایک تذکرۂ شاعرات بھی، ۱۹۴۷ء سے پہلے سکندر آباد میں مرتب ہوا تھا۔ مگر اب وہ بھی دستیاب نہیں صرف نام سنتے ہیں۔

نامور سائنس داں سرشانتی سروپ بھٹناگر کے دیوان لاجونتی کا ذکر بھی مضمون میں آیا ہے۔ ان کا کلام بھی شہر تفتہ میں نہیں نہ ہی تفصیلی حالات صرف ذکر ہے۔ آج کل کے ۱۵ نومبر ۱۹۴۴ء کے شمارے میں خواجہ محمد شفیع کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں ان کی شخصیت اور شاعری پر خاصی گفتگو کی گئی ہے اس عالمی شہرت یافتہ سائنسداں کی اُردو شاعری ایک گراں مایہ سرمایہ ہے طوالت کے خوف سے مذکورہ مضمون سے صرف چند اشعار نقل کرتا ہوں:

تمھارا علمِ کیمیا تو زر کی اک تلاش ہے
یہ علم، علم ہے کہاں؟ وسیلۂ معاش ہے

فکرِ حصولِ سیم رہے میرا مشغلہ
اتنی سفید رنگ کی چاہت نہیں مجھے

سن کے رُک سی گئی اوراق گردانی مری
بن کے اشکِ منفعل ٹپکی پشیمانی مری

لالۂ رنگیں گلِ خنداں ہے پژمردہ نہ ہو
مطلع امید ہے میری تو افسردہ نہ ہو

تیرے دم سے نغمہ پیرا ہے مسرت کا رباب
تیری ہستی سے معنون ہے محبت کی کتاب

ان کا ایک اور شعر رشید بدایونی صاحب نے سنایا تھا جو اب تک حافظے میں موجود ہے:

مزہ تو جب ہے کہ ہندو کہے مسلماں سے
بغیر آپ کے ہندوستان کیا معنی؟

آج کل کے یکم اگست ۱۹۴۷ء کے شمارے میں لاجونتی پر مختصر تبصرہ بھی چھپا ہے۔ جس کے مطابق کتاب کی تفصیلات یوں ہیں ۱۴۴ صفحات، قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتا: جناب آنند سروپ بھٹناگر ۲/۵، تغلق روڈ نئی دہلی

مالک رام صاحب نے تلامذۂ غالب میں شانتی سروپ بھٹناگر کی تاریخ وفات یکم جنوری ۱۹۵۵ء لکھی ہے۔ ص ۱۱۸ اور اس امر پر اصرار کیا ہے کہ بھٹناگر صاحب تفتہ کے نواسے نہ تھے جیسا کہ عام خیال ہے۔

تفتہ پر دو صفحے کا مختصر مضمون آج کل کے یکم جولائی ۱۹۴۲ء کے شمارے میں آغا سرخوش قزلباش کا شائع ہوا ہے جس میں اس امر پر انتہائی افسوس کا اظہار کیا ہے کہ تمام تذکرے تفتہ کے ذکر سے خالی ہیں۔ قزلباش نے اس پر بھی اصرار کیا ہے کہ لفظ تفتہ نہیں تفتہ ہے اور ان کا وہی غالب کی موت والا قطعہ لکھا ہے اور آخری مصرع اسی طرح ہے جیسے خمخانۂ جاوید میں ہے اور خاکسار نے نقل کیا ہے:

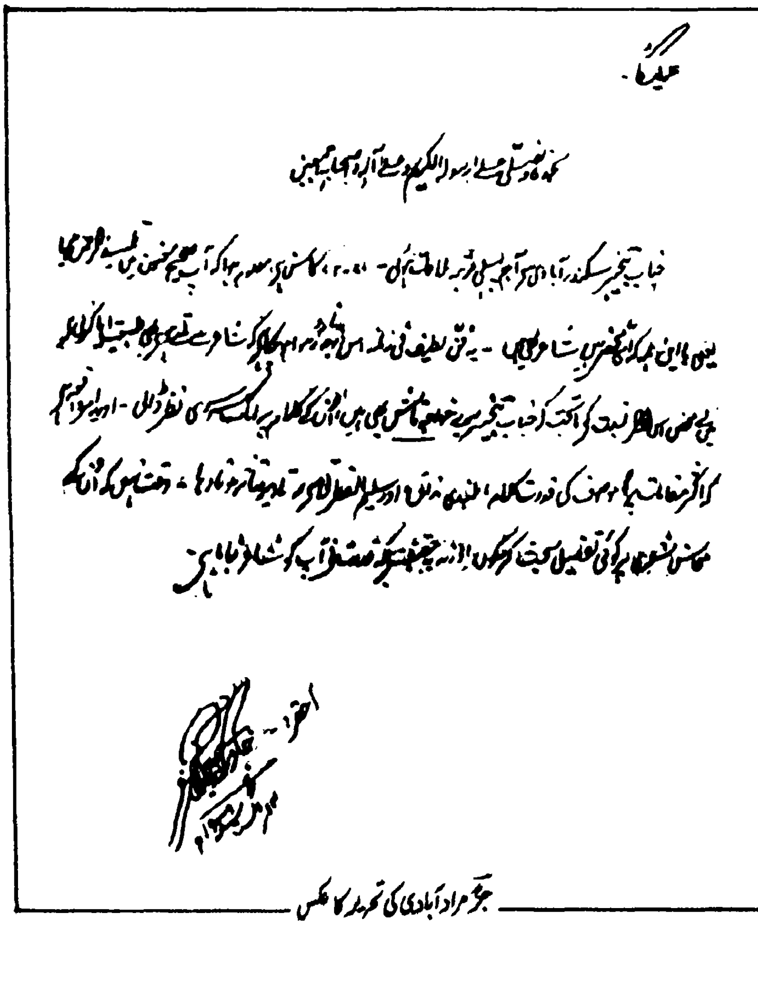
چھپے لفظ اس کے مرتے ہی بے پا و سر ہوئے

یعقوب بدر صاحب نے لکھا ہے تفتہ کی تصویر مالک رام صاحب نے شہر تفتہ سے لی ہے لیکن یہ تصویر تلامذۂ غالب کے اولین ایڈیشن میں بھی موجود ہے جو شہر تفتہ سے پچیس برس پہلے شائع ہوا۔ اُردو شاعری اور دیوان سے متعلق بھی وہ جب تک کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہ کریں ان کے بیان کی تحقیقی اعتبار سے چنداں اہمیت نہیں۔ الحاقی کلام کی متعدد مثالیں اساتذہ کے دواوین میں موجود ہیں۔ اور ابھی تک تفتہ کے اُردو میں شاعری کرنے کا کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں۔

سخن ہائے گفتنی تو بہت ہیں مگر میں چند باتیں عرض کر کے مضمون ختم کرتا ہوں۔ ایوانِ اُردو میں شائع شدہ میرے مضمون (اپریل ۱۹۸۹ء) میں ماہر عروض کنور بدر کرشن فروغ کی کتب کے ذیل میں "گوہرِ عرفانِ فروغ" کا بھی ذکر ہے۔

اس کا قطعۂ تاریخ روشن لال صاحب عاقب دہلوی "یادگارِ حضرت غالب دہلوی" نے لکھا ہے۔ مگر تلامذۂ غالب میں ان کا کہیں ذکر نہیں صلائے عام ہے محققینِ غالب کے لیے۔

ایک اور شاعر شیخ عبدالمجید بے خبر کا دیوان 'دیوانِ بے خبر' چندر گپت پریس دہلی سے شائع ہوا سنہ اشاعت تو درج نہیں مگر یہ ۱۹۴۰ء کے آس پاس کا ہے اس میں جگر مرادآبادی کی ایک تحریر کا عکس بھی شامل ہے جس میں انھوں نے انھیں اپنا خواجہ تاش یعنی رسا سکندرآبادی (جنھیں رام پوری بھی لکھا گیا) کا شاگرد کہا ہے یہ عکس بھی نذرِ قارئین ہے۔ اگلے صفحات میں رسا کے سکندرآبادی ہونے کی مکمل وضاحت کیف مرادآبادی کی تحریر سے ہو جاتی ہے اور کوئی الجھن


نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم و علیٰ آلہٖ و اصحابہٖ اجمعین

جگر مرادآبادی کی تحریر کا عکس

باقی نہیں رہتی۔ کیف مرادآبادی رقم طراز ہیں :
" قصبہ سکندرآباد ضلع بلند شہر کو یہ ناز ہو سکتا ہے کہ اس نے رسا جیسے ذی علم شاعر پیدا کیے وہیں اسے یہ بھی فخر ہو سکتا ہے کہ اس کی سرزمین میں بےخبر جیسے بے علم مگر باکمال شاعر بھی پیدا ہوتے بےخبر خود بھی رسا کی یادگار ہیں اس لیے رسا کی رسائی بھی قابلِ غور ہے۔"

سکندرآباد کے ایک اور لایق فرزند جناب ایس کے بھٹناگر نے ایم۔ اے۔ او کالج (موجودہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کی بے حد عالمانہ تاریخ HISTORY OF M.A.O COLLEGE ALIGARH کے نام سے لکھی۔ اقلیتی کمیشن نے اپنی پہلی رپورٹ میں مسلم یونیورسٹی سے متعلق اس کتاب کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ بھٹناگر صاحب کا انتقال ۱۹۸۸ء میں ہوا اور ۱۱ دین ستمبر ۱۹۸۸ء کو سکندرآباد میں منعقد ہونے والے "اُردو ذریعہ تعلیم کے مسائل" کے سیمینار میں اہلِ سکندرآباد نے اپنے اس لایق فرزند کو سلامِ عقیدت پیش کیا اور ایک تعزیتی قرارداد پاس کی۔

نظمیں

(۱)

علامتوں کے
زوال والی
علامتیں بھی
زوال آثار
ہوگئی ہیں

(۲)

لذّتوں کے سفر
عمر بھر
ساتھ ہوں گے
مگر ذائقہ
زہر آلود ہوگا!!



(۳)

مہاجر
مُدّتوں کے بعد بھی
اپنی زمینوں کو
نہیں بھولے کہ
ان کی
آنولیں
ان ہی زمینوں میں
گڑی ہیں

(۴)

کشتیاں
زیرِ آب ہیں ساری
پھر یہ کیوں
بادبان اوپر ہیں!!

(۵)

ایسا لگتا ہے
اب سمندر بھی
پانیوں کے لیے
ترستے ہیں
اور بادل
کہیں برستے ہیں

صابر فخرالدّین

میرا اندیشہ

میرے دل میں قید وہ
مغموم اور گُم صم ترنّم
جب کبھی
چپکے چپکے رونے لگتی ہے تبھی
اپنے چہرے کو چمکتی
مُسکراہٹ کے دوپٹے میں
چُھپا لیتی ہوں میں
اور پھر
کاٹنے لگتا ہے اندیشہ کوئی
ایسا نہ ہو جب
ایک دن گُم صم ترنّم
لفظ کا جامہ پہن لے گی
تو اس دن کیا کروں گی

مریم غزالہ

نزد یک بلڈنگ، نیو پولیس کوارٹرز، سین روڈ، یادگیر (کرناٹک)
سیفی محلہ، رادھا نگر [illegible]

رحمان شاہی

راستے بند ہیں

شور پھر بلند ہوا —— گاڑی آگئی
بھاگو...

وہ دفتر سے باہر آگیا۔ ساتھ اور لوگ بھی تھے۔ سب تماشا دیکھنے لگے کھڑے کھڑے ... وہ بھی تماشائی بن گیا ——

سب بھاگ رہے تھے، بدحواس ہوکر... گرتے پڑتے... سروں پر خوانچے اُٹھائے، کاندھوں پر بہنگی لٹکائے، ٹھیلا والے ٹھیلا ڈھکیلتے...

یہ چوہے بلّی کا سا کھیل تھا جو بہت دِنوں سے کھیلا جا رہا تھا ——

اکثر گیارہ بجتے ہی انکروچمنٹ والے آجاتے، کوڑا گاڑی اور ڈنڈے والی پولیس لیے۔ ساتھ پانچ سات رائفل دھاری بھی ہوا کرتے اور وہ سب دفتر کے اطراف میں پھیلے خوانچے، بہنگی اور ٹھیلے والوں کو کھدیڑ دیتے... سب بھاگ جاتے اور پل بھر میں سنّاٹا چھا جاتا۔ لیکن ان کے جاتے ہی دکانیں پھر لگ جاتیں اور دُور دُور تک وہی خوانچے، بہنگی اور ٹھیلے نظر آنے لگتے۔ دو چار گھنٹے تک ایسے دُکانداری ہوتی، جیسے پہلے کچھ بھی نہ ہوا ہو... لیکن صرف دو چار گھنٹے تک ہی۔ کبھی کبھی اس سے بھی کم اور انکروچمنٹ والے پھر آجاتے، اور پھر...؟ پھر وہی تماشا... وہی منظر... جان بچا کر بھاگتے ڈھیر سارے چوہے اور انھیں رگیدتی بہت ساری خونخوار بلّیاں...

یہ سب اس کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ مَن دُکھی ہو جاتا اور اپنے دُکھی من سے وہ سوچنے لگتا —— یہ لوگ تو محنت کش ہیں۔ دھندا کرتے ہیں۔ جو کچھ کماتے ہیں، اس سے اپنا اور پریوار کا پالن پوسن کرتے ہیں۔ پھر ان کے ساتھ یہ گھناؤنا سلوک کیوں؟ عزّت سے روٹی کھانے کا حق تو سب کو ہے۔ انھیں کیوں نہیں؟؟ اور پھر ناتھن...؟ ناتھن جیسے لوگوں کو تو جینے کا ادھیکار ملنا ہی چاہیے۔

کتنی بے رونق تھی یہ جگہ۔ دُور دُور تک کٹیلی جھاڑیاں پھیلی ہوئی... اور بیچ میں کولتار کی سونی سڑکیں... کالی کالی ڈراؤنی سڑکیں... دفاتر تو تھے، لیکن دو ہی اور وہ بھی ایسے جیسے ان میں کوئی بابو نہ ہو۔ آس پاس سرکاری کواٹر بھی تھے لیکن مردہ گھروں جیسے... کوئی شور نہ ہنگامہ... سواریاں بھی نہیں چلتی تھیں۔ اور اگر کبھی چلتیں بھی تو دس سے پانچ بجے تک ہی۔ وہ بھی اکّا دُکّا۔ شام ہوتے ہی پھر سنّاٹا... دہشت بھرا سنّاٹا... کوئی پیدل بھی آتا جاتا دکھائی نہیں دیتا تھا اور جب کبھی کوئی بھولا بھٹکا آنکلتا یا گاڑی گزرتی تو اسے بندوق کی نوک پر لوٹ لیا جاتا تھا۔ بابو لوگ تو ایکدم ڈرے رہتے تھے دفاتر میں... کواٹر والے بھی خوف زدہ رہتے تھے۔

کئی قتل بھی ہوئے تھے یہاں۔ دو خون تو اس کے سامنے ہوئے تھے۔ اب تک یاد ہے اسے کتنا بھیانک تھا وہ منظر... آدمی آدمی کو مار رہا تھا ——

جب وہ پیشاب کر رہا تھا تو دیکھا تھا کہ کچھ ڈراؤنی صورت والے بدمعاش دو آدمیوں سے چھینا جھپٹی کر رہے ہیں۔ دونوں نے مقابلہ کیا اُن بدمعاشوں کا... تب بدمعاشوں نے انھیں زمین پر گرا دیا تھا اور لمبے چھُرے سے کئی وار کیے تھے۔ وار... اور خون کا فوارہ ... دردناک چیخیں...

وہ پیشاب کرتے کرتے بھاگا تھا اور پھر کئی دِنوں تک نہیں آیا تھا۔ چھٹی لیے بغیر ہی دفتر سے غائب رہا تھا۔

ایسی تھی یہ جگہ ——

اور ایک دن نہ معلوم کہاں سے ناتھن آگیا تھا یہاں، اپنی دھرم پتنی کملا کے ساتھ، دونوں نے مل کر کئی دنوں تک کٹیلی جھاڑیوں کو صاف کیا تھا۔ مٹّی کا ایک بڑا سا چولہا بنایا تھا۔ پھر دو بنچ رکھے تھے اور چائے کی دُکان لگالی تھی۔ پھر دن بھر وہ دونوں... ناتھن اور کملا، بنچ پر بیٹھے بیٹھے اور کبھی کھڑے کھڑے گاہکوں کا انتظار کرتے تھے۔ لیکن کوئی نہیں آتا تھا ان کی دکان پر۔ کواٹر والے اور دفاتر کے بابو لوگ بھی نہیں۔

اور جب شام ہوتی تو دونوں سامنے والے کواٹر میں چلے جاتے تھے۔ رات وہیں گزارتے تھے وہ۔ پھر صبح ہوتی اور وہی

عالم گنج (گمہرا) پٹنہ، ۸۰۰۰۰۷ (بہار)

دکان اور گاہکوں کو تکتی آشا بھری آنکھیں... اور ان آنکھوں کو دیکھ کر وہ سوچتا تھا —— کب تھکیں گی یہ آنکھیں؟ شاید دس پندرہ دنوں بعد یا پھر پورا ایک ماہ لگ جائے۔ لیکن دو تین ماہ گزر جانے کے بعد بھی وہ آنکھیں ... آشائیں بھری آنکھیں نہیں تھکی تھیں تو ایک دن وہ دکان پر پہنچ گیا تھا۔ ناتھن خوش ہو گیا تھا۔ کملا بھی خوش ہو گئی تھی۔

اس نے جلدی سے میلے کچیلے کپڑے سے بنچ صاف کیا تھا۔ ناتھن نے چائے بنا کر دی تھی۔ آدھے دودھ اور آدھے پانی والی چائے اور وہ چائے پیتے ہوئے بولا تھا —— "تم لوگ کوئی اور جگہ کیوں نہیں دیکھتے؟ کون آئے گا اس ویرانے میں؟؟"

"آئے گا ساب آئے گا..." ناتھن کے لہجے میں بے پناہ اعتماد تھا —— "جیسے آپ آیا ویسے سب آئے گا، پھر ای جگہ ایسی نہیں رہے گی..."

ناتھن نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ سال دو سال کے اندر سب کچھ بدل گیا۔ اب کہیں کٹیلی جھاڑیاں نہیں اور نہ وہ گندگی جو روز صبح کواٹر کے لوگ پھیلاتے تھے۔

سواریاں بھی خوب چلنے لگی تھیں۔ دن اور رات میں بھی... بنا کسی ڈر کے پیدل چلنے والوں کی تعداد بھی کم نہیں تھی۔ کوئی لوٹ، چوری اور نہ قتل... دن تو دن رات میں بھی وہی چہل پہل، وہی ہنگامے، خوشیوں بھرے شور... کھنکتی ہنسی اور بے باک قہقہے... اور دور دور تک پھیلی دکانیں...

یہ سب ناتھن کی وجہ سے ہی ہوا تھا۔ پھر بھی وہ بھاگ رہا تھا ——

کل چائے پیتے وقت اس نے ناتھن سے پوچھا تھا —— "تم لوگ بھاگتے کیوں ہو؟" ناتھن کو کوئی جواب نہیں سوجھا تھا۔ چپ رہا تھا وہ۔ لیکن کملا بولی تھی —— "ہم گریب لوگ تو گلام ہیں ساب۔ بھاگیں نہیں تو اور کا کریں..."

"لیکن بھاگنا تو بزدلی ہے..." اس نے دھیرے سے کہا تھا۔ تب ناتھن چٹپٹا کر بولا تھا —— "ہم بجدل نہیں ہیں ساب، جینا چاہت ہیں، اور اسی باسطے بھاگتے ہیں..."

"جینے کے لیے بھاگنا ضروری ہے کیا...؟" اس نے پھر پوچھا ناتھن سے۔ لیکن اس بار اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ جھوٹی پیالیوں کو دھونے لگا تھا۔ کملا بھی خاموش کھڑی رہی تھی اور وہ چائے کے پیسے دے کر چپ چاپ دفتر لوٹ گیا تھا۔

اماں کسی بات پر بولی تھیں —— "ہمارا سماج بھی جنگل کی طرح ہے جس میں بھانت بھانت کے درندے بھرے پڑے ہیں۔ ہم محفوظ نہیں... کوئی بھی حادثہ، کسی وقت بھی ہو سکتا ہے۔ ہمیں تیار رہنا چاہیے ان سے نپٹنے کے لیے..."

تب اس نے ناتھن کی بات اماں سے کہہ دی تھی۔ اماں اس پر برس پڑی تھیں —— "بھاگنے والوں کی کوئی زمین نہیں ہوتی اور جن کی اپنی کوئی زمین نہیں، انھیں جینے کا ادھیکار نہیں..."

کتنا فرق ہے اماں اور ناتھن کی سوچ میں۔ لیکن ایک سوچ اور بھی تو ہے ... کملا کی سوچ۔ لیکن نہیں، کملا کی باتیں اس کی سوچ نہیں، وہ تو اس کا احساس ہے۔ ایک محنت کش کا احساس...

اپنے ہی وطن میں اپنے غلام ہونے کا احساس اچھی علامت نہیں، دیش کی آزادی کے لیے خطرہ ہے۔ لیکن اس خطرے کی چنتا کسی کو نہیں۔ سب کو اپنے پیٹ کی فکر ہے۔ اور پیٹ کے لیے بھاگنا تو سب کا ادھیکار ہے —— ادھیکار کے بدلتے ہوئے روپ اور جب یہ روپ اپنے اپنے راستوں سے چلتے ہوئے انت تک پہنچتے ہیں یا پہنچا دیے جاتے ہیں تو ایک نئے روپ کا جنم ہوتا ہے۔ نیا روپ... اور شاید یہی زندگی ہوتی ہے۔

زندگی بھوک ہے اور بھوک کے لیے بھاگنا... یہاں لوگ بھاگ رہے تھے۔ اپنے سروں پر خوانچے اٹھائے، کاندھوں پر بہنگی لادے، ٹھیلا ڈھکیلتے..... اور انکروچمنٹ والے انھیں کھدیڑ رہے تھے۔ کچھ پاس کی گلی میں گھس گئے، کچھ سامنے کواٹر میں۔ بہت سارے پکڑے بھی گئے ان میں ناتھن بھی تھا۔

انکروچمنٹ والوں نے اس کا مٹی کا چولھا توڑ دیا۔ چائے دانی اور بنچ گوڑا گاڑی پر اچھال دیے اور کھانے کا بہت سا سامان بھی۔

"رحم کر مائی باپ، کل سے اپن ادھر کو نہیں آئے گا..." ناتھن گڑگڑا رہا تھا۔ جینے کے لیے شاید گڑگڑانا بھی پڑتا ہے۔

"چپ سالا..." ایک ڈنڈے والے پولیس مین نے اس کی کمر پر لات ماری —— "روز ایک ہی بات بولتا ہے، اپن ادھر کو نہیں آئے گا، بدمعاش..."

ناتھن کمر پکڑے نیم کے گھنے درخت سے جا لگا۔ سپاہی اس کے شیشے کے گلاسوں کو آپس میں ٹکرا رہے تھے، اور ہنس رہے تھے۔ ہنستے ہوئے گالیاں بھی بک رہے تھے۔

دفعتاً ایک سپاہی کی چیخ اُبھری۔ اس کے ہاتھ میں ٹوٹے گلاس کی کرچیاں گھُس گئی تھیں۔ خون بہہ رہا تھا۔ اس نے غصّے میں ناتھن کو دیکھا۔ پھر چلّا کر اپنے ساتھیوں سے بولا ــــ "پکڑو سالے کو . . ."

چار سپاہی ڈنڈا لیے ناتھن پر جھپٹے۔ ناتھن بے تحاشا بھاگا . . . رائفل دھاریوں نے اس کا پیچھا کیا۔ لیکن وہ گلی میں گھُس کر غائب ہو گیا۔ غصّے میں رائفل دھاری پلٹے تو بوڑھا پان والا سامنے آگیا، اور انھوں نے رائفل کے کندوں سے اس کی پٹائی شروع کر دی۔ بے چارہ کمزور تھا۔ کمر سے جُھکا ہوا۔ پہلے ہی کندے کی مار سے گر کر بے ہوش ہو گیا۔ تب دو رائفل دھاریوں نے اسے پیروں سے پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے جیپ تک لے گئے۔ پھر اُچھال دیا . . . پتہ نہیں وہ زندہ تھا یا مُردہ ــــ اس کے بعد چاروں طرف قیامت ٹوٹ پڑی۔ جو ہاتھ لگتا اس پر رائفل کے کندے برس پڑتے۔ تماشا دیکھنے والے ڈر کر کھسک گئے۔ وہ بھی ہٹ گیا۔ ہٹتے وقت وہ سوچ رہا تھا ــــ "یہ پولیس ہیں یا لائسنسی غنڈے . . ."

اس کا من پھر دُکھی ہو گیا تھا اندر اندر سلگ بھی رہا تھا وہ۔ غصّہ تھا بھاگنے والوں اور پٹنے والوں پر۔ اسے امّاں کی بات یاد آئی ــــ "بھاگنے والوں کی کوئی زمین نہیں ہوتی اور جن کی کوئی زمین نہیں، انھیں جینے کا ادھیکار نہیں . . ." "انھیں رُکنا ہوگا، جینے کے لیے رُکنا ہوگا . . ." اس کے اندر کوئی چلّایا ــــ "بھاگنا زندگی نہیں، نپٹنا زندگی ہے . . . انھیں نپٹنا ہوگا، چاہے کچھ ہو جائے . . ."

شام میں وہ گھر لوٹا تو بہت تھکا ہوا تھا۔ کھائے پیے بغیر ہی بستر پر لڑھک گیا۔ فرحت نے کھانے کے لیے پوچھا بھی نہیں۔ بابو کو لیے وہ بھی لیٹ گئی۔ بہت غصّے میں تھی وہ۔

جب بھی وہ دفتر سے لوٹتا اور کھائے پیے بغیر ہی لیٹ جاتا تو فرحت کو غصّہ آجاتا تھا اور وہ سوچنے لگتا تھا ــــ "اس میں غصّہ ہونے کی کیا بات ہے؟ گم صم رہنے، کچھ بھی تنگ نہ کرنے پر غصّہ کیوں؟؟ عجیب لڑکی ہے۔ اس جیسا سیدھا سادہ شوہر ملا، پھر بھی غصّہ ہو جاتی ہے۔ ناتھن اور اس جیسوں کو غصّہ کیوں نہیں آتا؟ ان پر تو ظلم ہو رہا ہے . . . اکروچمنٹ کے نام پر نسل کشی . . . پھر بھی انھیں غصّہ کیوں نہیں آتا؟ کب آئے گا انھیں غصّہ؟؟ جینے کے لیے غصّہ بھی تو ضروری ہے۔

وہ لیٹے لیٹے کھانا مانگتا ہے۔ فرحت اُٹھ کر سامنے کھانا رکھ دیتی ہے۔ کھانا کھانے کے بعد وہ پھر بستر پر لڑھک جاتا ہے۔

الماری پر، پتیلی میں رکھا بابو کا دُودھ بلّی پی رہی ہے۔ فرحت چِلّاتی ہے ــــ "کمبخت نے پھر جھوٹا کر دیا . . ."

وہ اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ فرحت بگڑ رہی ہے ــــ "روز روز دُودھ پی جاتی ہے۔ آپ کو تو کچھ فکر نہیں . . ."

بلّی پلنگ کے نیچے گھُس جاتی ہے۔ فرحت پتیلی اُٹھا کر باہر پھینک دیتی ہے ــــ "آج تو کچھ ہے بھی نہیں، مانگے گا تو کیا دیں گے . . ."

فرحت رونے لگتی ہے اور آج پہلی بار اُسے احساس ہوتا ہے کہ بلّی سچ مچ تنگ کیے ہوئے ہے۔ بار بار بھگانے پر بھی باز نہیں آتی ہے دُودھ پینے اور جھوٹا کرنے سے۔ چوری چھپے حرکت کر ہی جاتی ہے۔ اب تو اس کا انت ہونا ہی چاہیے۔

وہ اُٹھتا ہے۔ باہر سے موٹا ڈنڈا لاتا ہے۔ پھر دروازہ بھیڑ کر بلّی سے اُلجھ پڑتا ہے۔ بلّی کھڑکی کی طرف بھاگتی ہے۔ کھڑکی میں جال لگا ہوا ہے۔ وہ وِنٹیلیٹر پر چھلانگ لگاتی ہے۔ وہاں سے بھی بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں۔ وہ پھر پلنگ کے نیچے گھُس جاتی ہے ــــ اور وہ . . . وہ ہانپ رہا ہے۔ جسم پسینے سے بھیگ چکا ہے۔ اس کے باوجود بلّی کی پٹائی نہیں ہو سکی۔ ہر بار وار خالی گیا۔

وہ ایک بار پھر کوشش کرتا ہے اپنی منتشر قوتوں کو سمیٹ کر ــــ

بلّی وِنٹیلیٹر پر بیٹھی، اب اس پر غرّا رہی ہے . . .

سارے راستے بند ہیں۔ نکل بھاگنا ممکن نہیں . . .

وہ زور سے ڈنڈا گھماتا ہے۔ مگر وار اس بار بھی خالی جاتا ہے، اور بلّی . . . بلّی اس مرتبہ اس پر چھلانگ لگا دیتی ہے، اپنی پوری طاقت سے غرّاتے ہوئے اور اس کے حلق سے گھُٹی گھُٹی چیخ نکل پڑتی ہے۔ اور وہ دھڑام سے گر کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔

دوسرے دن وہ دفتر میں بیٹھا ناتھن اور اس جیسوں کے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا ــــ ابھی سارے راستے بند نہیں ہوتے ہیں۔ بند ہوتے ہی وہ بھاگنا بھول کر نپٹنے لگیں گے، اور تب انھیں اپنا ادھیکار مل جائے گا۔ جینے کا ادھیکار!

ندر جیت لال

سویرے کی سیر

صبح کی سیر کے کئی فوائد و ثمرات ہوں گے۔ حکیم، وید، ڈاکٹر، اُستاد اور بزرگ اس کی برکتیں ساری عمر ہمیں بتاتے رہے ہیں لیکن ہم کبھی اس طرح کی سویرے کی سیر کے قائل نہیں ہوئے۔ آخری پہر کی گہری میٹھی اور سہانی نیند (جو ہم جیسوں کو جنھیں نیند کم آتی ہو زیادہ پیاری لگتی ہے) اس کی قیمت پر باہر کھلی ہوا میں کسرت کرنا، دوڑنا بھاگنا یا ہوا خوری کرنا ہمیں معقول نہیں لگتا۔ کئی برسوں تک یہ عالم رہا کہ صبح سویرے جب ہم نے سیر کرنے کے لیے اُٹھنے کی کوشش کی تو یوں لگا جیسے بستر نے ہمیں اوڑھ رکھا ہے اب بستر تو چھوڑتا ہی نہیں، لہٰذا سیر کو کیوں کر جائیں!

ہوتا یوں ہے کہ جوں ہی افق پر صبح کے نور کا سفید دھاگہ رات کی چادر کو چھوتا ہے تو نیند (جو رات بھر تو غائب رہی) ایک معصوم بچّے کی طرح ہماری آنکھوں میں آ بیٹھتی ہے یہی وہ چند لمحے یا گھڑیاں ہوتی ہیں کہ ہمیں نیند پر بے حد پیار آتا ہے اور ہم اُسے آنکھوں سے جانے نہیں دیتے۔ آخر نیند تازہ دم ہونے اور فعال زندگی کے لیے بہت ضروری بھی تو ہے۔

اِن دنوں جب عمر ساٹھ پینسٹھ پر پہنچ گئی ہے قویٰ مضمحل رہنے لگے ہیں اور آئے دن کی چھوٹی موٹی بیماریوں نے گھیر لیا ہے تو بادلِ ناخواستہ ڈاکٹروں کا مشورہ قبول کرتے ہوئے ایک دن صبح کی سیر کو معمول میں شامل کرنے کا ارادہ کر ہی لیا، اس اُمید کے ساتھ کہ صبح کی سیر سے شاید صحت پر خوشگوار اثر پڑے۔ لیکن اس کے لیے کچھ پلاننگ بھی ضروری تھی۔ یاد رہے اس جدید دور میں پلاننگ کے بغیر تو ایک پتا بھی نہیں ہل پاتا۔ اور سیر تو آخر سیر ہے۔ آخر یہ طے کیا کہ دو چار روز سیر کے لیے جائیں گے اور جو جو ملاقاتی راہ میں ملتے جائیں گے ہم ان سے ان کے خیالات و تاثرات حاصل کرتے جائیں گے اس طرح سب سمجھ میں آجائے گا کہ یہ صبح کے "سیرانی" اپنی سیر سے کہاں تک مطمئن ہیں، پھر جو پنچوں کی رائے وہی اپنی رائے۔ خیر ہم پہلے دن کر و فر سے صبح کی سیر کے لیے نکلے۔ اپنے بلاک سے گزرتے ہوئے ہم یہ چاہتے تھے کہ کوئی نہ کوئی آداب عرض کرے پھر کچھ پوچھے کہاں جا رہے ہیں دودھ لینے کے لیے یا؟ لیکن کسی نے کوئی خیر مقدم یا آداب عرض نہیں کیا۔ کچھ اندھیرا ابھی تو تھا۔ دائیں بائیں جو لوگ نکل کر آگے بڑھ رہے تھے یا سامنے سے آ رہے تھے اُن کی پہچان بھی تو نہیں ہو رہی تھی۔ خیر ہم دودھ کے ڈپو پر پہنچ گئے وہاں سے لوگ دودھ کی بھری بوتلیں لے کر تھیلوں میں بھر کر اپنے اپنے گھر لے جا رہے تھے۔ چند منٹ ہم یہ تماشہ دیکھتے رہے۔ لوگ اِدھر اُدھر پھیلتے گئے۔ ان لوگوں میں سے ایک نے اچانک آواز دی اور اس کے ساتھ ہی وہ ہماری طرف بڑھ آئے یہ کہتے ہوئے "کہو کیسے ہو کہاں مٹر گشت ہو رہی ہے" اور وہ ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ہم پندرہ بیس قدم ان کے ساتھ اُن کے گھر تک چلے گئے انھوں نے اشارۃً روکا اور دو تین منٹ میں دودھ کی بھری بوتلیں اندر پہنچا کر ہمارے ساتھ سیر کو چل پڑے۔

ہمارے یہ دوست پانڈے جی کئی برسوں سے ہم سے تعارف رکھتے ہیں۔ دن کو ملتے ہیں تو کچھ علیک سلیک ہو جاتی ہے خیر پانڈے جی نے ہماری صبح کی سیر پر بڑی خوشی کا اظہار کیا اور یہ پیش کش کی کہ ہم انھیں روزانہ صبح دودھ کے ڈپو پر بلاناغہ ملا کریں۔ پانڈے جی دمے کے مریض ہیں چنانچہ ہر دوسرے قدم پر انھیں کھانسی کا دورہ پڑتا۔ ہم انھیں سہارا دیتے۔ کچھ خود سنبھلتے اور انھیں سنبھالتے اور جب تک ان کا سانس بدستور تسلی بخش سطح پر نہ آجاتا، ہم رُکے رہتے۔ ایک دن ہم نے اُن سے پوچھا "آپ سیر کرنے کے حق میں کیوں ہیں کم از کم ہمیں سیر کے فوائد تو بتائیے۔"

پانڈے جی نے جواب میں کہا "بھئی میں تو وقت کاٹتا ہوں۔ دودھ لانے کی ڈیوٹی گھر والوں نے مجھے سونپ رکھی ہے۔ اب دودھ تو لاکر رکھ دیتا ہوں رسوئی میں جب تک بہو جاگے نہیں چائے پانی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا میں سیر کو نکل پڑتا ہوں کہ جب تک لوٹوں گا بہو جاگ

دی - ۱۴ مغل مہر پارک نئی دہلی ۱۱۰۰۴۹

جائے گی۔"

وقت گزاری کی بات ہمیں چبھی، دوسرے اپنی آزادی قائم رکھنے کے لیے ہم نے پانڈے جی کے ساتھ صبح کی سیر کا ساجھا چھوڑ دیا۔ اور چل پڑے تن تنہا۔ امیر لوگ کاروں سے اُتر کر اپنے کتّے اور بیوی کے ساتھ کچھ فاصلہ پیدل چلتے۔ کبھی تیز کبھی خراماں خراماں ہماری سوشل حس کسی نہ کسی ساتھی کی طلبگار رہتی۔ لیکن کتّے والے امیر زادوں سے ہمارا کیا رشتہ؟ ہمیں رہ رہ کر ایک دوست کا سنایا ہوا لطیفہ یاد آجاتا۔ جو برسوں پہلے انھوں نے سنایا تھا۔ یہ لطیفہ یوں ہے:

ایک شخص جو اچھا بھلا اکیلا سیر کو جاتا تھا۔ دیکھا دیکھی ایک دن ایک کتّے کو اپنے ساتھ گھسیٹ لایا۔ اُس کے ایک دوست نے بڑی معصوم حیرانی کے ساتھ پوچھا "گدھے کو سیر کرانے لائے ہو؟"

اُس شخص نے بڑے فخر سے کتّے کی طرف دیکھا اور پھر جواب دیا "یہ گدھا نہیں کتّا ہے کتّا۔"

دوست نے کہا "میں تم سے نہیں اُس کتّے سے پوچھ رہا ہوں۔"

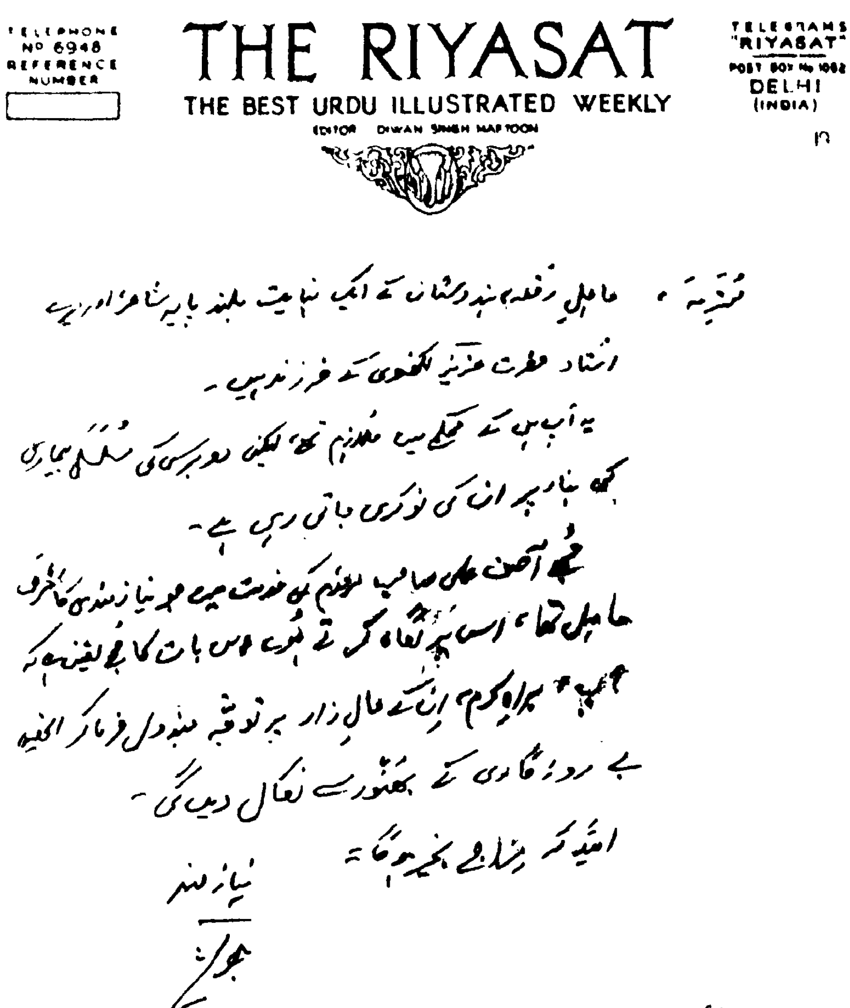
خیر ان دنوں صبح کی سیر ہم تن تنہا کرتے۔ سرکاری پارک میں اِدھر اُدھر کئی طرح کے لوگوں کے گروپ دیکھنے میں آتے باغ کے ایک ٹکڑے پر کچھ ادھیڑ عمر کے لوگ یوگا کرتے۔ ایک بڑے میدان میں نوجوان بھاگتے دوڑتے۔ ایک کونے میں کچھ بوڑھے اخباری خبروں پر تبصرہ فرماتے ہوتے۔ ہم چُپ چاپ اُن کے سر پر جا کھڑے ہوتے۔ ہر شخص اپنی بات منوانے پر مصر ہوتا۔ کسی کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ جو اخبار میں پڑھ لیا اُسی پر ایمان۔ گفتگو میں اسی کی تلخیص۔ ایسا لگتا تھا جیسے اِن ریٹائرڈ لوگوں کو اپنے اپنے اخبار کی خبریں سُنانے کا مرض ہو جو وہ ادھر آ کر کسی نہ کسی طرح سُنا ہی دیتے ہیں۔ ایک بزرگ نے دوسرے کو بے خبر کہہ دیا۔ اس پر وہ جل بُھن کر خاک ہو گیا اور کہا "تم کیا جانتے ہو تم تو اپنے اخبار کا خلاصہ سُنا رہے ہو۔"

"اور تم کیا الہام کی بات کر رہے ہو؟" اس نے جواباً کہا۔ بس کیا تھا معاملہ گرم ہو گیا تُو تُو مَیں مَیں ہونے لگی محفل درہم برہم ہو گئی۔ ہم نے سوچا کہ صبح کی سیر کی ایک افادیت یہ بھی ہے کہ جس کسی کو اپنے گھر میں کوئی نہ سُنے وہ پارک میں صبح کی سیر کرنے والوں کو اپنے دل کی بات کہہ کر تسلّی حاصل کر سکتا ہے۔

دھیرے دھیرے ہماری سویرے کی سیر میں کچھ دھیما پن آ گیا، اور ہم لگے ناغے کرنے۔ اوّلاً ہفتے میں چار بار پھر تین بار۔ پھر دو بار پر اُتر آئے۔ ایک دن اچانک بچپن کے ہم مکتب سیٹھی سے ملاقات ہو گئی۔ ہوا یوں کہ ہم نے شمال کی سڑک کی بجائے مغرب کی راہ اختیار کر لی۔ وہاں سیٹھی صاحب مل گئے۔ پچیس سال کے بعد کوئی لنگوٹیا یار مل جائے تو کیا فرحت حاصل ہوتی ہے۔ بس آپ قیاس کر لیجیے۔ سیٹھی صاحب اعلیٰ افسر ہیں۔ چار کمروں کا سرکاری مکان رکھتے ہیں، اچھے کھاتے پیتے آدمی ہیں۔ انھوں نے ہمیں بحالیِ صحت کے لیے کئی نسخے اور ورزشیں بتائیں۔ یوگا کے دو چار داؤ پیچ بھی کر کے دکھائے۔ پورا ایک گھنٹہ گھاس پر بٹھا کر ہماری سابقہ اور موجودہ زندگی کی پچاسوں باتیں پوچھیں اور بیسوں بتائیں بھی۔ اس فلمی طرز کی ملاقات سے ہمیں بھی بہت خوشی ہوئی۔ اور ہم نے وعدہ کیا کہ ہم عنقریب اُن کے دولت خانے پر حاضر ہوں گے بھابی اور بچّوں سے ملاقات ہوگی اور تبادلۂ خیالات بھی رہے گا۔

مگر سیٹھی صاحب ماننے والے تھے۔ نہ مانے۔ بس یوں سمجھیے گھسیٹ کر اپنے گھر لے ہی گئے۔ غسل کروایا۔ بازار سے کئی طرح کے پھل پکوان خرید کر لائے۔ اور ناشتہ تو کیا پورا کھانا تیّار کرایا اور سب فیملی نے ہمارے ساتھ تناول فرمایا، دوپہر کو ہم جب گھر پر پہنچے تو اہلیہ نے غصّے سے پوچھا "یہ ایک مہینے کی سیر ایک ہی دن میں کر ڈالی؟" ہم صرف مسکرائے اور کہا "کل سے صبح کی سیر بند۔ اب شام کو جایا کریں گے سیر کرنے۔" ہاں آج ایک بات ہم سوچتے ہیں۔ نسیم سحری، کھلی فضا، شبنم آلودہ قدرتی مناظر، کھلے آسمان، تازہ ہوا، خوشنوا

جوش ملیح آبادی کا ایک سفارشی خط


THE RIYASAT

THE BEST URDU ILLUSTRATED WEEKLY

EDITOR DIWAN SINGH MAFTOON

TELEPHONE Nº 6948 REFERENCE NUMBER

TELEGRAMS "RIYASAT" POST BOX No 1062 DELHI (INDIA)

محترمہ ۔ حاملِ رقعہ ہندوستان کے ایک نہایت بلند پایہ شاعر اور میرے استاد حضرت عزیز لکھنوی کے فرزند ہیں۔

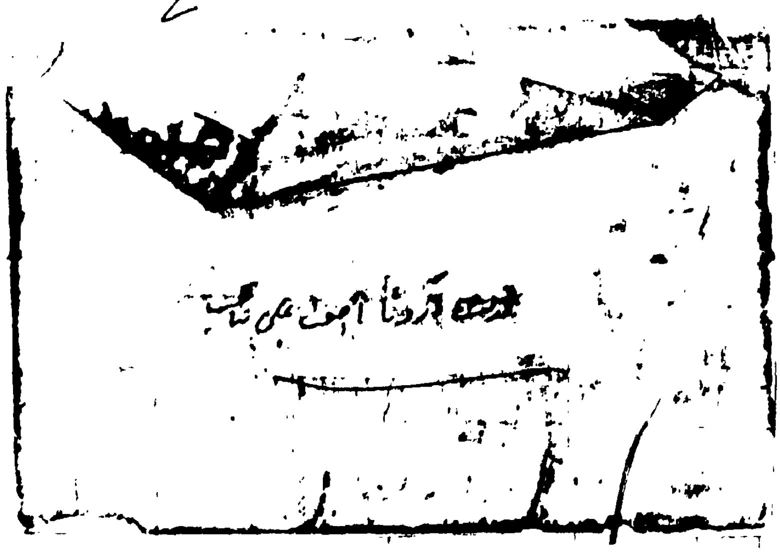
یہ آپ ہی کے محکمے میں ملازم تھے لیکن دو برس کی مسلسل بیماری کی بنا پر ان کی نوکری جاتی رہی ہے۔

مجھے آصف علی صاحب مرحوم کی خدمت میں جو نیاز مندی کا شرف حاصل تھا، اس پر نگاہ کر کے مجھے اس بات کا یقین ہے کہ آپ براہِ کرم ان کے حالِ زار پر توجہ مبذول فرما کر انھیں بے روزگاری کے بھنور سے نکال دیں گی۔

امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

نیاز مند

جوش



جوش ملیح آبادی ۱۹۵۴ء میں ترکِ وطن کر کے پاکستان چلے گئے تھے لیکن اس کے بعد بھی کبھی پرانی یادیں تازہ کرنے کے خیال سے اور کبھی ملیح آباد کے آموں کے باغوں کی آمدنی وصول کرنے وہ ہندوستان آتے رہے۔ وہ جب بھی ہندوستان آتے، ان کے قیام کی زیادہ مدت دلی میں گزرتی۔ ان کا یہ سفارشی خط جو یہاں شائع کیا جا رہا ہے، اس پر ۲۸، اپریل ۱۹۵۹ء کی تاریخ درج ہے اور یہ انھوں نے اپنے پرانے دوست اور اپنے زمانے کے مشہور ہفتہ وار اخبار 'ریاست' کے ایڈیٹر سردار دیوان سنگھ مفتوں کے دفتر میں بیٹھ کر لکھا ہے۔ خط محترمہ ارونا آصف علی کے نام ہے جو ان دنوں دلی کی میئر تھیں۔ خط میں جن صاحب کی سفارش کی گئی ہے اور جن کا ذکر جوش صاحب نے 'حاملِ رقعہ' کہہ کر کیا ہے، یہ عزیز لکھنوی کے بڑے صاحبزادے جنابِ محمد صادق تہذیب ہیں، جو لکھنؤ چھوڑ کر دلی آ بسے ہیں۔ ارونا صاحبہ نے جوش صاحب کی سفارش پر ان کی ملازمت بحال کر دی تھی اور وہ اب بھی دلی میونسپل کارپوریشن میں برسرِ کار ہیں۔

—— مخمور سعیدی

ہم طرح اشعار

جولائی ۸۹ء کے شمارے میں دیے جانے والے مصرعے پر ہمیں ہمیشہ کی طرح کافی تعداد میں شعر موصول ہوئے ان میں جو شعر صحیح بحر اور درست ردیف قافیے میں ہیں ان کا انتخاب درج ذیل ہے۔ گلدستہ ان حضرات کو ارسال کیا جائے گا جن کے بھیجے ہوئے اشعار چوکھٹے میں دیے جا رہے ہیں۔ بہتر ہو کہ اشعار پوسٹ کارڈ پر لکھ کر بھیجے جائیں۔ ایک پوسٹ کارڈ پر صرف ایک ہی شعر لکھیں۔

ہلاکِ تیغِ جفا یا شہیدِ ناز کرے
ترا کرم ہے جسے جیسے سرفراز کرے (بیدمؔ وارثی)

مرسلہ: مس فہیم النساء مسکینی، محلہ رسالداران، سکندر آباد، ضلع بلند شہر (یو۔پی)

اکڑ کے دوش پہ کیوں کر نہ زلف ناز کرے
کسی کے ہاتھ ہے وہ جس کو سرفراز کرے (شادؔ عظیم آبادی)

مرسلہ: محمد شہنشاہ عالم شہنشاہ، صاحب گنج

کہیں تو جام دھرا ہے کسی طرف ساغر
کدھر جھکائے سر انسان کدھر نماز کرے (شادؔ عظیم آبادی)

مرسلہ: جمیل اختر، بھاگلپور۔ ابن غوری، نلگنڈا۔ محمد نقیب انصاری نقیب، بھاگلپور۔

نگاہِ ناز سے مطلب نہیں مرا کچھ اور
کسی طرح سے خدا اس کو دل نواز کرے (شادؔ عظیم آبادی)

مرسلہ: قیصر امام، بھاگلپور۔ محمد جان عالم، صاحب گنج۔

شراب جام میں دی تو نے ساقیا یا زہر
کسے دماغ ہے اتنا جو امتیاز کرے (شادؔ عظیم آبادی)

مرسلہ: محمد منظر امام، مجاہد پور، ویسٹ بھاگلپور ۸۱۲۰۰۲۔
رتن لعل گپتا، محلہ دھیا ٹولہ، پوسٹ اور ضلع صاحب گنج ۸۱۶۱۰۹ (بہار)۔

مرے حسابوں تو عاشق نہیں حریص ہے وہ
فراق و وصل میں کچھ بھی جو امتیاز کرے (شادؔ عظیم آبادی)

مرسلہ: حسن حنا عرف رانی، صاحب گنج

بہ یک اشارہ نہیں تھا نہ غیر محفل میں
اُن ابروؤں کی خدا زندگی دراز کرے (شادؔ عظیم آبادی)

مرسلہ: بیگم امیرون ضیاء، صاحب گنج

گلہ سر آنکھوں پہ اُس کا ہے لیکن اے قاصد
ہم ایسے ہیں تو ہمیں کیوں امینِ راز کرے (شادؔ عظیم آبادی)

مرسلہ: حکیم محمد واعظ الحق، صاحب گنج

فقط بھروسے پہ تیرے ہے زندگی اپنی
خدا حیات تری اے اجل دراز کرے (شادؔ عظیم آبادی)

مرسلہ: محمد ضیاء الحق ضیاء، صاحب گنج

بہت دنوں سے ہے خالی فقیر کا کشکول
بس اب نگاہِ کرم وہ گدا نواز کرے (شادؔ عظیم آبادی)

مرسلہ: اشیش کمار گپتا، صاحب گنج

کبھی تو غور کریں حسن کی حقیقت پر
ہمیں بھی عشق جو اس بات کا مجاز کرے (شادؔ عظیم آبادی)

مرسلہ: ثاقب انصاری ثاقب، بھاگلپور
الیاس احمد داغ، بھاگلپور۔

ہم اپنے آپ نہیں جب تو ہوں گے غیر کیا
زمانہ شادؔ ہم ایسوں سے احتراز کرے (شادؔ عظیم آبادی)

مرسلہ: محمد شاہ باش عالم، صاحب گنج۔ محمد ہاشم احمد، بھاگلپور۔

کشادہ دستِ کرم جب وہ بے نیاز کرے
نیاز مند نہ کیوں عاجزی پہ ناز کرے (اقبالؔ)

مرسلہ: حلیمہ خاتون، جمشید پور۔ محمد سلیم بستر ہلال اختر، بدایوں۔ عقیل احمد، سلطان پور۔

مری نگاہ میں وہ رند ہی نہیں ساقی
جو ہوشیاری و مستی میں امتیاز کرے (اقبالؔ)

مرسلہ: آصف النساء، ہردوئی۔ اسلم خاں بشیر خاں، بمبئی۔ قمر النسا، جگدل پور۔ فضل امام فاروقی، علی گڑھ۔ شازیہ سلطانہ، بدایوں۔

غرورِ زہد نے سکھلا دیا ہے واعظ کو
کہ بندگانِ خدا پر زباں دراز کرے (اقبالؔ)

مرسلہ: اکرام حسین خان، دھنباد۔ نغمہ زمزم، آکولہ۔ عبدالماجد خاں، کھیری۔

بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تو نے اے واعظ
خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے (اقبالؔ)

مرسلہ: امین احمد انصاری، جمشید پور۔ شوکت علی انصاری، کھیری۔ نہال اختر، بدایوں۔

کوئی یہ پوچھے کہ واعظ کا کیا بگڑتا ہے
جو بے عمل پہ بھی رحمت وہ بے نیاز کرے (اقبالؔ)

مرسلہ: محمد امتیاز، کارنجہ۔ عبدالشاہد، علی گڑھ۔ غفران احمد، کھیری۔

مدام گوش بہ دل رہ یہ ساز ہے ایسا
جو ہو شکستہ تو پیدا نوائے راز کرے (اقبالؔ)

مرسلہ: رئیسہ بیگم، بستر۔ رضیہ سلطانہ، بدایوں۔

سخن میں سوزِ الٰہی کہاں سے آتا ہے
یہ چیز وہ ہے کہ پتھر کو بھی گداز کرے (اقبالؔ)

مرسلہ: محمد عمر انصاری، کھیری۔ فاطمہ بی، بستر۔

ہوا ہو ایسی کہ ہندوستاں سے اے اقبالؔ
اڑا کے مجھ کو غبارِ رہِ حجاز کرے (اقبالؔ)

مرسلہ: غوثیہ تبسم، سہسرام۔ شوکت علی، ہردوئی۔

غمِ جہاں سے جسے ہو فراغ کی خواہش
وہ ان کے دردِ محبت سے ساز باز کرے (نامعلوم)

مرسلہ: نذیر احمد قریشی کارنجوی، آکولہ۔ صبیحہ رئیس، بدایوں۔

بہار آئی، کھلا میکدے کا دروازہ
بتاؤ ایسے میں کیا کوئی پاکباز کرے (ظفر صدیقی)

مرسلہ: سید غفران رامپوری، رامپور

بگڑ چکا ہے بہت رنگِ انجمن اے رازؔ
کوئی کرشمہ، وہ چشمِ کرشمہ ساز کرے

(پریم نارائن سکسینہ رازؔ)

مرسلہ: برج نارائن سکسینہ، جے پور

میں اُس کی ذات سے مایوس بھی نہیں ہوں قمرؔ
وہ جس کو چاہے اُسے پل میں سرفراز کرے (قمر انصاری)

مرسلہ: قمر احمد زبیری، بدایوں

سکوں نصیب ہوا ہے بس ان کے ذکر کے ساتھ
علاجِ دردِ جگر اب نہ چارہ ساز کرے (ممتاز اثری)

مرسلہ: ممتاز اثری، فیروزآباد

مری نگاہ میں شاہینؔ وہ مجاہد ہے
ادا جو تیغ کے سائے میں بھی نماز کرے

(مناظر حسن شاہینؔ)

مرسلہ: جاوید اقبال صدیقی، گیا

ترا کرم ہے، نوازش ہے تیری جالبؔ پر
"وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے"

(محمد مقصود جالبؔ)

مرسلہ: مقبول احمد، سکندرآباد

آئندہ مہینے کے لیے اس مصرعے پر اپنی پسند کے شعر اس طرح ارسال کریں کہ ہمیں ۱۲؍ اگست ۸۹ء تک مل جائیں:

تلخ شکوے لبِ شیریں سے مزا دیتے ہیں
(قافیہ: مزا — ردیف: دیتے ہیں)

یہ مصرع سید ظہیر الدین ظہیرؔ دہلوی کا ہے۔ اس غزل کا کوئی شعر شاملِ مقابلہ نہ ہو گا۔

بقیہ:

سویرے کی سیر

پرندوں کی میٹھی آوازیں صبح کی سیر میں ہی میسّر ہو سکتی ہیں اور اُن سے ہی ہم کچھ تازگی اور فرحت لے سکتے تھے مگر ہمارے نصیب میں ایسا لکھا نہ تھا۔ غور فرمایئے شام کو ڈوبتے سورج کے وقت جب انسان تو کیا چرند پرند بھی اپنے اپنے بسیروں کو آرام کے لیے لوٹتے ہیں ایسے لمحوں میں کائنات بھر کی جب زندگی سمٹنے لگتی ہے ہمیں کیا فرحت و تازگی ملے گی۔ شام کی سیر کا صبح کی سیر سے کیا مقابلہ۔

قلمکار حضرات سے گزارش

دفتر میں مضامین نثر و نظم کثیر تعداد میں جمع ہو گئے ہیں اس لیے اعلانِ ثانی تک اپنی نگارشات بلاطلب بھجوانے کی زحمت نہ فرمائیں۔ اُمید ہے اس گزارش کو گستاخی پر نہیں ہماری مجبوری پر محمول کیا جائے گا۔

——— ادارہ

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے موصولہ عنوانات

جولائی ۱۹۸۹ء کے "ایوانِ اُردو دہلی" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی، اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانوں میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوان ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں :

شعری عنوانات

سفینہ جبکہ کنارے سے آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے
(غالب)

مرسلہ: مقصود حسن خاں گمنام پہر یموی، رائے بریلی۔

آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو
(اقبال)

مرسلہ: محمد سرور عالم بنٹی، پورنیہ

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کے اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو
(اقبال)

مرسلہ: محمد اشرف عالم شاداب، پورنیہ

اس بحرِ محبت میں اے دل بس ڈوبنے والے بچتے ہیں
پانی کو گزرنے دے سر سے پھر دیکھ کہ بیڑا پار بھی ہے
(فراق گورکھپوری)

مرسلہ: اے۔ علی، بھارت ہارڈ ویئر اسٹور، ھنڈی بازار، برہان پور ۴۵۰۳۳۱ (ایم پی)

ننگِ ساحل تو نہیں اب صدفِ بے مایہ
سرِ قلزم کرمِ ابرِ گہر بار تو دیکھ
(اکبر حیدر آبادی)

مرسلہ: اسلم خاں بشیر خاں، بمبئی

کشتی اس کا رین بسیرا، پانی میں اس کا ڈیرا
کرشنا موہن ایک مچھیرا، ساگر کا دلدادہ ہے
(کرشن موہن)

مرسلہ: معین الدین شمسی، گانڈے

محبت کو سمجھنا ہے تو ناصح خود محبت کر
کنارے سے کبھی اندازۂ طوفاں نہیں ہوتا
(شکیل بدایونی)

مرسلہ: قریش حسین، برہان پور

بہتے پانی پر لکھی تحریر تھے وعدے سبھی
ہاتھ آئے گا نہ اب کچھ لاکھ ڈھونڈا کیجیے
(بشر نواز)

مرسلہ: وسیم الحق اصغر، بہار شریف

عزم محکم ہو تو، ہوتی ہیں بلائیں پسپا
کتنے طوفان پلٹ دیتا ہے ساحل تنہا
(بیکل اتساہی)

مرسلہ: محمد عاصم، منگرول پیر

ساحل پہ وہ کھڑے ہوئے ہنستے رہے قمر
طوفاں میں اپنی کشتیِ دل ڈوبتی رہی
(قمر انصاری)

مرسلہ: رفیع احمد اعظمی، بدایوں۔ نسیم احمد، دہلی۔

دلیرانہ بڑھا کشتی نہ گھبرا موجِ طوفاں سے
کبھی کم ہمتی سے بھی سفینہ ڈوب جاتا ہے
(فہمی)

مرسلہ: منصور حسین، برہان پور

ساحل کے تماشائی ہر ڈوبنے والے پر
افسوس تو کرتے ہیں امداد نہیں کرتے
(نامعلوم)

مرسلہ: محمد علی، برہان پور

نثری عنوانات

"ابرِ کہسار" (اقبال کی نظم)
مرسلہ: محمد اشرف عالم، بھاگلپور

"ساحل اور سمندر" (سید احتشام حسین کا سفرنامہ)
مرسلہ: عتیق الرحمان، منگرول پیر

"دھرتی سدا سہاگن" (کشمیری لال ذاکر کا ناول)
مرسلہ: سید عقیل احمد، بیگو سرائے

"سمندر کا بلاوا" (مصور سبزواری کا ڈراما)
مرسلہ: مظفر نصیب صدیقی، موضع ڈبو، ڈاکخانہ بارا، وایا چاکند، ضلع گیا ۸۰۴۴۰۴۔

"ندی کے پار کا منظر" (حیات لکھنوی کا مجموعۂ کلام)
مرسلہ: محمد ضیار الحق ضیار، صاحب گنج۔

"نقش بر آب" (ظہیر غازی پوری کی نظم)
مرسلہ: تاجدار تابش زیب، معرفت محمد مجیب الرحمان، ہری گنج چوک کٹیہار ۸۵۴۱۰۵۔

"ساحلی علاقہ" (شاہد انور کا افسانہ)
مرسلہ: اقبال احمد، دہلی

"چھلنی چھلنی سائبان" (تنہا تماپوری کا شعری مجموعہ)
مرسلہ: سعید احمد قائد، دہلی

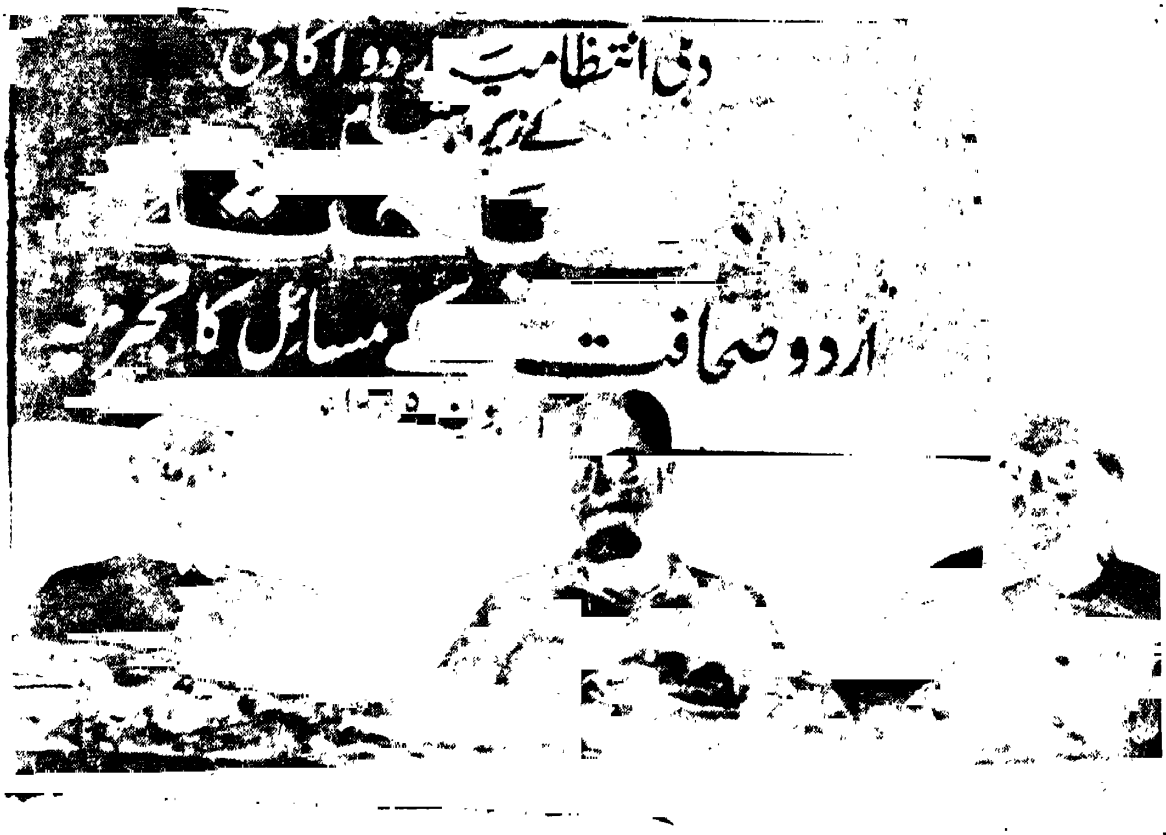
"گلدستہ" چوتھے نمبر پر درج شعری عنوان اور چوتھے اور چھٹے نمبر پر درج نثری عنوان بھیجنے والوں کو ارسال کیا جا رہا ہے۔

○

اُردو خبرنامہ

اُردو صحافت پر مباحثہ

۲۱ رجون کو دہلی اردو اکادمی کے زیرِ اہتمام ایک مباحثے میں اُردو صحافت کو درپیش مسائل پر تبادلۂ خیال کیا گیا۔ ممتاز اُردو صحافی جناب حیات اللہ انصاری نے اپنے کلیدی خطبے میں کہا کہ اُردو اخبارات معلومات واطلاعات کی کثرت کے دور میں بھی اپنے قارئین کو پوری اطلاعات فراہم نہیں کر رہے ہیں۔ انھوں نے اردو اخبارات کے فرقہ وارانہ طریقِ کار کی بھی شکایت کی۔ تقریب کے صدر اور سابق وزیرِ اطلاعات ونشریات مسٹر آئی کے گجرال نے کہا کہ پندرہ سال قبل جب گجرال کمیٹی نے اردو کے مسائل سے متعلق اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کی تھی اس وقت سے لے کر اب تک اُردو اخبارات کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے مسٹر گجرال نے شکایت کی کہ اردو کے میقاتی جرائد غزلوں اور مختصر افسانوں کے مرحلے سے آگے نہیں بڑھے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ بستی حضرت نظام الدین سے شائع ہونے والا کوئی اُردو اخبار علاقے کے حالات کے بارے میں کبھی کچھ نہیں لکھتا۔ ممتاز صحافی جے ڈی چندن نے دہلی اُردو اکادمی پر زور دیا کہ وہ یونائٹڈ نیوز آف انڈیا پر اپنی اُردو سروس جلد شروع کرنے کے لیے زور ڈالے کیونکہ اُردو اخبارات کے لیے روزانہ انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرنا ایک سخت کام ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو نیوز سروس شروع ہوجانے سے اردو کے صحافیوں کے لیے روزگار کے مواقع فراہم ہوں گے۔ مسٹر چندن نے اُردو کے صحافیوں کو اُردو زبان میں صحافتی تربیت دینے کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ اُردو اکادمی کے سکریٹری سید شریف الحسن نقوی نے اعلان کیا کہ اکادمی جلد ہی اُردو صحافت کے لیے ایک خط وکتابت



دائیں سے : دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی، جناب اندر کمار گجرال اور جناب حیات اللہ انصاری

(تصویر: سید فاضل علی)

کورس شروع کرے گی انھوں نے کہا کہ اکادمی ایک اردو فیچر سروس بھی شروع کرے گی جس میں ایسے موضوعات پر مواد ہوگا جن پر عام طور پر اردو اخبارات نہیں لکھتے انھوں نے اعلان کیا کہ اردو اکادمی نے اردو کمپیوٹر کے لیے بیس لاکھ روپیہ مختص کیا ہے انھوں نے کہا کہ ترقی اردو بورڈ نے ایک اردو کمپیوٹر کا آرڈر دیا ہے جس پر ۷ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔ اردو اکادمی اپنے لیے کمپیوٹر کے حصول سے قبل اس کی کارکردگی دیکھنے کی منتظر ہے

جلسے کی صدارت جناب آئی۔ کے۔ گجرال نے کی اور کلیدی خطبے پر بحث میں جناب جی۔ ڈی چندن کے علاوہ دہلی کے اور کئی ممتاز صحافیوں نے حصہ لیا۔

ترقی اُردو بیورو کی سرگرمیاں

ترقی اُردو بیورو نے پچھلے مالی سال (۸۸-۱۹۸۹) کے دوران اشاعت کا نیا ریکارڈ قائم کرتے ہوئے مختلف علوم وفنون سے متعلق ۸۴ نئی کتابیں اور ۲۰ کتابوں کے دوسرے ایڈیشن شائع کیے ہیں جو موضوعات کے تنوع کے علاوہ طباعت واشاعت کے لحاظ سے بھی عمدہ اور معیاری ہیں۔

ترقی اُردو بیورو نے اب تک ۶۰۰ سے زائد کتابیں شائع کی ہیں۔ ان میں بعض کتابوں کے دوسرے اور تیسرے ایڈیشن بھی شامل ہیں ساتھ ہی کچھ کتابیں ایسی بھی ہیں جو اپنے موضوع کے اعتبار سے اپنی نوعیت کی پہلی کتابیں ہیں۔ ان میں بعض کتابوں کو مختلف اردو اکیڈمیوں سے ایوارڈ بھی ملے ہیں۔

ترقی اُردو بیورو مختلف علوم وفنون سے متعلق نصابی، امدادی اور حوالہ جاتی کتب کی تیاری اور اشاعت میں مصروف ہے۔ بچوں کے اَدب سے متعلق بھی دلچسپ اور معلوماتی کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔ ساتھ ہی بیورو کتابوں کی فروخت اور نکاسی کے کام میں بھی مصروف ہے۔ وقتاً فوقتاً کتابوں کی نمائشیں بھی لگائی جاتی ہیں تاکہ کتابیں عام اُردو پڑھنے والوں تک پہنچ سکیں۔ پچھلے مالی سال کے دوران ترقی اُردو بیورو نے ملک کے مختلف حصوں میں کتابوں کی ایسی چھ نمائشیں منعقد کیں۔ اور ۶ لاکھ سے زائد مالیت کی کتابیں فروخت کر کے سالانہ سیل کا نیا ریکارڈ قائم کیا۔

علمی اور سائنسی کتابوں کی تصنیف و تالیف کے دوران، مناسب اور موزوں فنی اصطلاحات کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ اس کام کی اہمیت اور افادیت کے پیشِ نظر ترقی اُردو بیورو نے اپنے قیام کے بعد سے ہی ملک کے ممتاز ماہرین، اساتذہ اور دانشوروں کی مدد سے مختلف شعبہ جات علوم کی علمی اور تکنیکی اصطلاحات سازی کا کام شروع کیا تاکہ انھیں مرتب کر کے شائع کیا جا سکے اور اس طرح طلباً، اساتذہ اور تصنیف وتالیف اور ترجمے کا کام کرنے والوں کے لیے بھی سہولت ہو سکے۔ اب تک حسبِ ذیل مضامین کی اصطلاحات کی فرہنگیں شائع ہو چکی ہیں۔

فرہنگ اصطلاحات لسانیات
فرہنگ اصطلاحات انسانیات
فرہنگ اصطلاحات حیوانیات
فرہنگ اصطلاحات کیمیا
فرہنگ اصطلاحات معاشیات
فرہنگ اصطلاحات نباتیات
فرہنگ اصطلاحات تعلیم ونفسیات
فرہنگ اصطلاحات ریاضی
فرہنگ اصطلاحات سیاسیات
فرہنگ ادبی اصطلاحات۔

اس طرح بیورو نے اب تک ۱۰ مضامین کی اصطلاحوں کی فرہنگیں شائع کر دی ہیں۔ دیگر مضامین کی اصطلاح سازی کا کام جاری ہے۔

(ابوالفیض سحر)

اُردو اور ہندی ایک دوسرے کے لیے ناگزیر

انجمن اساتذہ اُردو جامعات ہند کی کُل ہند بارہویں سالانہ کانفرنس میں جو اندور میں منعقد کی گئی، مندوبین کا خیر مقدم کرتے ہوئے پروفیسر عزیز اندوری نے کہا کہ ایک طویل مدت کے بعد مدھیہ پردیش میں بتدریج اردو کی حیثیت بحال ہونے لگی ہے اور والدین مادری زبان کے سلسلے میں اپنی ذمے داریوں کو محسوس کرنے لگے ہیں۔ افتتاحی تقریر میں جسٹس عبدالغفور قریشی نے اُردو ہندی کے لسانی رشتے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اردو بھائی چارہ، دوستی اور قومی یک جہتی کی زبان ہے اس کو تقویت پہنچا کر ملکی اتحاد اور جمہوریت کو مضبوط کیا جا سکتا ہے۔ دیوی اہلیا یونیورسٹی کے وائس چانسلر ایم۔ ایم ٹیلوریا صاحب نے کہا کہ میں نے پرائمری اسکول میں اُردو ہندی ساتھ پڑھی تھی۔ پھر یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ انھوں نے کہا کہ اُردو اور ہندی ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں۔ یہ ایک دوسرے کی دشمن نہیں بلکہ دوست ہیں ان دونوں زبانوں کے اتحاد سے ہمارا سماج مضبوط ہوگا۔ انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ

اس وقت ساٹھ یونیورسٹیوں اور تین سو کالجوں میں اُردو پڑھائی جاتی ہے جن میں اردو اساتذہ کی تعداد آٹھ سو کے قریب ہے انھوں نے کہا کہ جنوبی ہند میں جہاں کی زبانوں سے اُردو کا کوئی براہِ راست رشتہ نہیں ہے' اردو خوب پھل پھول رہی ہے لیکن شمالی ہند جو اردو کا گہوارا ہے وہاں اُردو کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اتر پردیش میں اُردو بولنے والی آبادی بڑا ۱۳ فیصد ہے لیکن یہاں ابھی تک اُردو کو اس کا جائز حق نہیں ملا ہے۔ پروفیسر محمد حسن نے اپنے صدارتی خطبے میں یونیورسٹیوں میں تحقیق کی صورت حال' ادبی تاریخ نویسی کے مسائل' سارک ممالک میں اردو تعلیم کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ اُردو ملک کا ضمیر ہے اور اس کا مستقبل ہندوستان میں جمہوریت کے مستقبل سے وابستہ ہے۔ اس وقت اردو تدریس کو نئی للکار درپیش ہے اور اس کے پیشِ نظر اُردو اساتذہ کو اپنی منزل اور راستے کا تعین کرنا چاہیے۔

کانفرنس کے دوسرے اجلاس کا موضوع تھا سارک ممالک ہندوستان' پاکستان' بنگلہ دیش نیپال اور سری لنکا و بھوٹان میں اردو کی صورتِ حال اس موضوع پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی نے کہا کہ اگرچہ ان ممالک میں متعدد زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن ان میں صرف اُردو کو یہ شرف حاصل ہے کہ ان ملکوں کے اسی فیصدی لوگ اردو بولتے سمجھتے اور لکھتے پڑھتے ہیں اس لیے اگر سارک ممالک کو اپنے مقاصد حاصل کرنے ہیں تو انھیں انگریزی کے ساتھ اُردو کو بھی رابطے کا ذریعہ بنانا چاہیے اور تہذیبی' ثقافتی اور تجارتی رشتوں کو مضبوط کرنے کے لیے اُردو اخبارات و رسائل اور کتابوں کے ساتھ تعلیم کی سطح پر اُردو طلبا و اساتذہ کا بھی تبادلہ کرنا چاہیے۔ اس بحث میں دیگر حضرات نے بھی حصّہ لیا اور یہ طے پایا کہ اس موضوع پر علاحدہ سے سمینار منعقد کرنا چاہیے اس اجلاس کی مجلس صدارت میں پروفیسر آفاق احمد' ڈاکٹر قیوم صادق' ڈاکٹر مجیب الاسلام شامل تھے اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد شفیع نے انجام دیے۔

کانفرنس کے تیسرے اجلاس کا موضوع تھا ادبی تاریخ نویسی' طریقہ کار اور مسائل۔ اس اجلاس میں پروفیسر محمد حسن کے طویل مقالے کے علاوہ محترمہ ثریا رضوی' ڈاکٹر صادقہ ذکی' ڈاکٹر صابر حسین نے بھی اپنے مقالے پیش کیے۔ پروفیسر حسن نے اگر اُردو تاریخ کے نئے گوشوں کو پیش کیا تو دیگر حضرات نے اُردو تاریخ کی خامیوں کی طرف توجہ دلائی۔ اور تاریخ نویسی کے لیے مسلسل تحقیق و تلاش' تجزیے اور تنقید کی اہمیت کو واضح کیا۔ اس بحث میں متعدد حضرات نے حصّہ لیا اور مجلس صدارت کے رکن پروفیسر نعیم احمد' ڈاکٹر مظفر حنفی' سید منظور احمد نے بھی اپنے خیالات سے نوازا۔ اجلاس کی نظامت ڈاکٹر مختار شمیم نے انجام دی۔

کانفرنس کا چوتھا اجلاس یونیورسٹیوں میں تحقیق کی موجودہ صورت حال سے متعلق تھا۔ جو خاصا متنازعہ تھا۔ اس اجلاس کے مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر عارف حسن' ڈاکٹر صابر حسین' ڈاکٹر قیوم صادق ڈاکٹر ابو الحسنات اور محترمہ ہما مسعود شامل تھے یہ سب حضرات اس بات پر متفق تھے کہ ہماری یونیورسٹیوں میں اگرچہ تحقیقی کاموں میں اضافہ ہوا ہے لیکن اس کا معیار تسلی بخش نہیں رہا ہے۔ اور نئے اہم موضوعات پر کم توجہ دی جا رہی ہے۔ اس لیے کسی ایسے لائحہ عمل کی ضرورت ہے جو منصوبہ بند طریقے سے تحقیق کے کاموں میں معاون ثابت ہو سکے اور جس سے تاریخ ادب اُردو کی تدوین میں بھی مدد مل سکے۔ اس اجلاس کی مجلس صدارت میں پروفیسر عنوان چشتی' ڈاکٹر ہارون ایوب محترمہ ثریا رضوی اور ڈاکٹر اختر الحسن شامل تھے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر خلیل احمد صدیقی نے انجام دیے۔

پانچویں اجلاس کا اہم موضوع اردو پروفیشنل یا پیشہ وارانہ کورسز تھا۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر ظہور الدین نے کلیدی مقالہ پیش کیا اور پروفیسر حسن نے اُردو اور روزگار کے رشتے پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر ظہور نے کہا انسان روزی کمانے کے لیے کوئی بھی پیشہ اور زبان اختیار کر سکتا ہے۔ لیکن تخلیقی اظہار' صلاحیتوں کی بیداری' اپنی تہذیبی وراثت اور اردو گرد کی زندگی سے رابطہ قائم کرنے کے لیے مادری زبان سب سے اہم وسیلہ ہے۔ جس کا جاننا ہر شخص کے لیے ضروری ہے۔ مادری زبان اور روزگار کے رشتے کی نوعیت اکثر بدلتی رہتی ہے۔ اس لیے اگر کسی دور میں اُردو اور روزگار کے مابین روایتی رشتہ کمزور ہو جائے تو اس سے اُردو والوں کو بددل نہیں ہونا چاہیے بلکہ نئے رشتے اور مواقع تلاش کرنے چاہییں۔ موجودہ دور میں ریڈیو' فلم' ٹی۔وی۔ لائبریری' آرکائز' عدالت' صحافت' پریس' کتابوں کی اشاعت' تجارتی اشتہار سازی وغیرہ ایسے پہلو ہیں جن میں مہارت حاصل کر کے اُردو سے روزگار کے رشتے کو مضبوط کیا جا سکتا ہے۔ بحث میں متعدد حضرات نے حصّہ لیا اور مجلس صدارت کے اراکین پروفیسر کامل قریشی' پروفیسر ناز قادری' ڈاکٹر طیب انصاری' ڈاکٹر ابو الحسنات نے بھی اپنے خیالات پیش کیے نظامت کے فرائض پروفیسر وسیم احمد نے انجام دیے۔

چھٹا اجلاس کاروباری نوعیت کا تھا۔ اس کی مجلس صدارت میں پروفیسر محمد حسن، پروفیسر رضی الدین، پروفیسر کامل قریشی اور ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی شامل تھے۔ اس اجلاس میں پروفیسر محمد حسن نے انجمن اساتذۂ اردو کی سترہ سالہ خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کاموں کا ذکر کیا جو انجمن نے اردو تعلیم و تدریس کے فروغ کے سلسلے میں انجام دیے ہیں۔ اس کے بعد اہم تجاویز منظور کی گئیں جن میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے، متعدد یونیورسٹیوں میں اردو پروفیسر شپ قائم کرنے، اور اردو تعلیم کا بندوبست کرنے سے متعلق تجاویز شامل تھیں۔ کانفرنس کے بیشتر شرکا چاہتے تھے کہ ایک بار پھر پروفیسر حسن صدارت کی ذمے داری قبول کریں لیکن انھوں نے اپنی مصروفیات کے باعث اسے قبول نہیں کیا۔ پروفیسر محمد حسن گزشتہ سترہ سال سے بلا مقابلہ انجمن کے صدر منتخب کیے جاتے رہے ہیں اس لیے سب لوگوں کی خواہش تھی کہ وہ سرپرست اعلیٰ کی حیثیت سے انجمن کی رہنمائی کرتے رہیں جسے انھوں نے قبول کر لیا۔ انجمن کے نئے صدر پروفیسر آفاق احمد منتخب کیے گئے اور جنرل سکریٹری کے لیے ایک بار پھر ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی کا انتخاب کیا گیا۔ کانفرنس کے اختتام پر رات کو محفل مشاعرہ منعقد کی گئی جس میں متعدد شعراء نے اپنا کلام سنایا۔

(ڈاکٹر حبیب الاسلام)

راجستھان اردو اکادمی
قلمکاروں کی قدر افزائی

جناب شوچرن ماتھر چیف منسٹر راجستھان نے اجمیر میں راجستھان اردو اکادمی کی جانب سے منعقدہ مولانا آزاد صدی تقریبات کے افتتاحی جلسے میں یہ اعلان کیا کہ راجستھان اردو اکادمی کی عمارت کے لیے جے پور میں جگہ فراہم کی جائے گی اور سکھاڈیہ یونیورسٹی اودے پور میں مولانا آزاد چیئر قائم کی جائے گی۔ اس جلسے کی صدارت جناب بی۔ ڈی۔ کلا صوبائی وزیر تعلیم نے فرمائی۔ اور محترمہ ڈاکٹر گرجا ویاس، مہمان گرامی کی حیثیت سے جلسے میں شریک ہوئیں۔

جلسے کے آغاز میں اکادمی کے چیرمین ڈاکٹر ثاقب رضوی صاحب نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس موقع پر راجستھان کے پانچ ادیبوں اور شاعروں کا اکادمی کی جانب سے اعزاز بھی کیا گیا اور جناب مولانا اعجاز اجمیری (اجمیر) مولانا منظور الحسن برکاتی صاحب (ٹونک) جناب پارسا کوثری صاحب (جے پور) جناب مختار الرحمان راہی صاحب (جے پور) اور جناب موہن لال صاحب کول (جودھپور) کی خدمت میں ایک ایک توصیف نامہ، شال اور چیک پیش کیے گئے۔

دوپہر تین بجے مولانا آزاد کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر ایک سمینار منعقد کیا گیا جس میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر عنوان چشتی، ڈاکٹر فضل امام، ڈاکٹر شارب ردولوی، جناب شریف الحسن نقوی، جناب صاحبزادہ شوکت علیخاں، مشیر الدین قریشی صاحب اور فضل المتین صاحب نے اپنے مقالات پڑھے۔

شب میں ۸½ بجے ایک کل ہند مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں حضرات مجروح سلطانپوری، مخمور سعیدی، زبیر رضوی، بیگم ممتاز مرزا، جمیلہ بانو، نور جہاں ثروت، نہال تاباں کے علاوہ راجستھان کے مختلف مقامات کے بہت سے شعراء نے شرکت کی۔

(ابوالفیض عثمانی)

ایک شہر، دو اعزاز

غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی نے ۸۸-۱۹۸۷ء کے لیے "اٹلس غالب ایوارڈ" برائے ادبی خدمات ڈاکٹر عبدالمغنی اور "بیدی سحر ایوارڈ" برائے صحافت جناب رضوان احمد کو دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

"بزم فروغ ادب پٹنہ" نے اس سلسلے میں ۲۴ جون ۸۹ء کو مقامی اردو بھون میں انعام یافتگان کے اعزاز میں ایک استقبالیہ جلسے کا انعقاد کیا جس کی صدارت ڈاکٹر سید محمد محسن نے کی۔ نظامت کے فرائض جناب فخر الدین عارفی نے انجام دیے۔ جناب بہزاد فاطمی اس جلسے میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ طنز و مزاح کے ممتاز شاعر جناب رضا نقوی واہی (جنھیں گزشتہ سال غالب ایوارڈ سے نوازا گیا تھا) نے اس موقع پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"ہم اہل عظیم آباد غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے شکر گزار ہیں کہ اس نے ۸۸-۱۹۸۷ سال کا غالب ایوارڈ اردو ادب اور اردو صحافت کے دو اہم نمائندوں کو دینے کا اعلان کیا ہے جو بہار کے ادبی افق سے طلوع ہو کر اس وقت برصغیر ہند و پاک کو اپنے علم و دانش کی روشنی سے منور کر رہے ہیں۔ میری مراد ڈاکٹر عبدالمغنی اور جناب رضوان احمد مدیر عظیم آباد ایکسپریس" سے ہے۔"

اس موقع پر جناب بہزاد فاطمی، پروفیسر سمیع الدین حیدر، پروفیسر عبدالمعیز منظر، ڈاکٹر احسان اشرف، ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، جناب ریاض عظیم آبادی، جناب حبیب مرشد خاں، جناب انیس رفیع، جناب شین مظفر پوری، ڈاکٹر اطہر مشیر اور جناب سید رضی حیدر نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔ صدر جلسہ ڈاکٹر سید محمد محسن صاحب

نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ "ڈاکٹر عبد المغنی صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں اور ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر جگہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ وہ بیباک ناقد کے ساتھ ساتھ ایک اچھے صحافی اور بہار میں اردو تحریک کے روحِ رواں ہیں"۔ جناب رضوان احمد کی ادبی و صحافتی خدمات کا بھی ڈاکٹر سید محمد محسن صاحب نے ذکر کیا۔

جلسے کے اختتام سے قبل ایک چھوٹی سی شعری نشست بھی منعقد کی گئی۔

(محمد نسیم احمد قریشی)

اُردو محبّت کی زبان

۲۷ر جون ۸۹ء کو آل انڈیا اُردو اسٹینوگرافرز ایسوسی ایشن اور تنظیم مساوات کے زیرِ اہتمام انجمن ترقی اُردو (ہند) کے مرکزی دفتر اُردو گھر نئی دلی میں جناب ثاقب صدیقی اور انیس احمد صاحب کی مرتب کردہ کتاب "خواجہ میر درد۔ تنقیدی و تحقیقی مطالعہ" کی رسم اجرا کے جلسے کو خطاب کرتے ہوئے جناب رامیشور ٹھاکر (ایم۔پی) نے آزادی کے بعد ملک کی تعمیر و ترقی میں اُردو زبان کی نمایاں خدمات کو سراہا اور کہا کہ یہ قومی یکجہتی اور بھائی چارے کی زبان ہے۔

صدرِ جلسہ ڈاکٹر خلیق انجم نے تاریخی حوالوں سے سیکولرازم اور قومی یکجہتی کے فروغ میں اُردو شعر و ادب کی نمایاں خدمات کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ عہد میں صوفیائے کرام کی تعلیمات کو عام کرنے کی اشد ضرورت ہے اور ان کی بہت سی تعلیمات اس زبان میں ہیں جسے ہم ہندوستانی یا بول چال کی اُردو کہہ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر اسلم پرویز، جناب رشید حسن خاں

اور پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے بھی جلسے میں تقریریں کیں۔ نظامت جناب ذہین نقوی نے کی۔

(منصور احمد)

اُردو پرائمری ٹیچرس ایسوسی ایشن، بارکپور

شمالی کلکتہ کے صنعتی علاقے بارکپور سب ڈویژن میں اردو ٹیچرس پرائمری ایسوسی ایشن کا نام غیر متعارف نہیں ہے۔ یہ تنظیم غیر منظور شدہ اسکولوں کو منظوری دلانے کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہتی ہے۔ اس ایسوسی ایشن سے تا حال اٹھارہ اسکول منسلک ہیں۔

ایسوسی ایشن کی جانب سے طلبہ و طالبات کی ذہنی و جسمانی نشو و نما کے لیے مختلف قسم کے سالانہ پروگرام کیے جاتے ہیں مثلاً خوش نویسی کے مقابلے، سِٹ اینڈ ڈرا (SIT & DRAW) نظم خوانی کے انعامی مقابلے اور اسپورٹس وغیرہ۔

امسال بھی ایسوسی ایشن کا سالانہ پروگرام وقت معینہ پر منعقد ہوا۔ جس میں پہلی مرتبہ دوست محمد میموریل پرائمری اسکول کے بچے بھی شریک ہوئے اور کامیابی حاصل کی۔ شری شمبھو ناتھ گھوش صدر، ویسٹ بنگال پرائمری ٹیچرس ایسوسی ایشن نے انعام تقسیم کیے: بچوں کے نام اور پوزیشن پیش خدمت ہے۔

لڑکوں کی لونگ جمپ، گروپ "A"

محمد سرفراز انور (دوئم انعام)۔

لڑکیوں کی لونگ جمپ، گروپ "A"

اسما خاتون (سوئم انعام)۔

لڑکیوں کی ہائی جمپ، گروپ "A"

اسما خاتون (سوئم انعام)۔

لڑکیوں کی ..., گروپ "B"

شاہد حسین (دوئم انعام)

ا…نچ ریس، گروپ "C"

افسانہ پروین (اوّل انعام)

(آس محمد)

مقالے کے لیے معاونت کی درخواست

راقم الحروف جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ہندستانی زبانوں کے مرکز میں ایم فل کے لیے اپنا مقالہ A STUDY OF URDU LAN-GUAGE IN DEHLI STATE SINCE 1947. کے عنوان سے قلم بند کر رہا ہے۔ مقالے میں آزادی کے بعد دہلی میں اُردو تعلیم کی صورتِ حال اور یہاں کے تہذیبی و ثقافتی اداروں کی سرگرمیوں کا احاطہ کیا جائے گا۔ جو حضرات اس سلسلے میں میری رہنمائی اور مدد کر سکیں میں ان سے معاونت کا ملتجی ہوں میری درخواست ان حضرات سے بہ طور خاص ہے جو اس سلسلے میں اخبارات و رسائل میں خطوط یا مضامین لکھتے رہے ہیں۔ اگر وہ ازراہِ کرم ان خطوط یا مضامین کی نقول عنایت فرمادیں تو میں استفادے کے بعد واپس کر دوں گا۔ انجمنوں اور اداروں کے سربراہوں سے بھی بہ طور خاص ملتمس ہوں کہ وہ اپنی انجمنوں اور اداروں کی تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیوں کی تفصیلات بھجوانے کا کرم کریں فراہم شدہ تمام معلومات اور تفصیلات متعلقہ حضرات کے شکریے اور حوالے کے ساتھ مقالے میں درج ہوں گی۔

پتا: اطہر فاروقی

945, PERIYAR HOSTEL.

جواہر لال نہرو یونیورسٹی۔ نئی دلی، ۱۱۰۰۶۷

آپ کی رائے

○ میں "ایوانِ اُردو" کے ذریعے تمام محبانِ اُردو کو ایک اطلاع دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال نے جامعۂ اُردو علی گڑھ کے فارغ طلبہ کو اپنے یہاں ایم۔ اے میں داخلہ دینا بند کر دیا ہے جبکہ دوسری یونیورسٹیاں یہ سہولت فراہم کر رہی ہیں۔ اس زیادتی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ہندوستان کے تمام محبانِ اُردو کم از کم مدھیہ پردیش کے وزیرِ اعلا اور گورنر کے نام ایک ایک کارڈ لکھ کر روانہ کریں۔

—— خواجہ بدر واسطی، بھوپال

○ مئی ۸۹ء کے شمارے میں "ملیریا کی تحقیق کے سو سال" ایک دلچسپ اور معلوماتی مضمون ہے۔ اس طرح کے سائنسی مضامین سے ماہنامے کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ البتہ میری اپنی رائے میں مذکورہ مضمون ملیریا کی تحقیق کے سو سالوں کا احاطہ نہیں کر سکا ہے۔ خاص طور سے موجودہ صدی میں ہوئی زبردست تحقیقی پیش رفت کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ راس کی "سوانح" کو مختصر کر کے اس پیش رفت کا ذکر کیا جا سکتا تھا اور اس صورت میں مضمون کی افادیت بہت بڑھ جاتی۔ مضمون میں چند خامیوں کی نشاندہی ضروری سمجھتا ہوں تاکہ استفادہ کرنے والوں کو کوئی دشواری نہ ہو۔

مچھروں کی نسبت سے 'انافولیس' اصطلاح کا استعمال سب سے پہلے ایک جرمن سائنس داں میگن (Meigen) نے ۱۸۱۸ء میں کیا تھا لہٰذا اس کا سہرا راس کے سر باندھنا درست نہیں۔ سر من سن کے حوالے سے یہ کہنا کہ "جراثیم غلیظ پانی کے پینے سے انسان کے پیٹ میں پہنچتے ہیں" اور یہ کہ اس نظریے کے پیچھے پڑ کر راس نے اپنے کئی قیمتی سال ضائع کیے، سر من سن کے بارے میں غلط رائے قائم کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔ اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ من سن کو ملیریا میں مچھروں کے ملوث ہونے کا قطعی علم نہیں تھا۔ جبکہ واقعہ یہ ہے کہ سر من سن چین میں اپنے قیام کے دوران پہلے ہی یہ ثابت کر چکے تھے کہ فائلیریا (فیل پاؤں) کو پھیلانے میں مچھروں کا کلیدی رول ہے اور اپنی اس دریافت کی روشنی میں ہی انھوں نے راس سے کہا تھا کہ "شاید مچھر ہی ملیریا کے جراثیم کا ایجنٹ ہے"۔ سر من سن کا یہ خیال راس کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ راس نے تحقیق کے ذریعے یہ ثابت کر دکھایا کہ ملیریا 'جراثیم زدہ مچھروں' کے کاٹنے سے پھیلتا ہے جب کہ من سن نے یہ قیاس آرائی کی تھی کہ یہ جراثیم زدہ مچھر جب مرتے ہیں تو ملیریا کے جراثیم پانی میں چھوڑ جاتے ہیں اور جب کوئی انسان یہ جراثیم آلود پانی پیتا ہے تو اسے ملیریا ہو جاتا ہے۔

مضمون میں کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں بھی ہیں ورنہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ لیوران کی پیدائش (۱۸۴۵ء) سے پہلے (۱۷۷۸ء) میں

فرج میں تعینات ہو گئے تھے اور راس کو پیدائش (۱۸۵۷ء) سے پہلے (۱۸۵۶ء) واپس انگلستان بھیج دیا گیا تھا۔

—— (ڈاکٹر) شکیل احمد، بستر

○ جولائی ۸۹ء کے شمارے میں نشتر خانقاہی کی غزلیں نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ سامنے آئی ہیں۔ غزل کا پیراہن تار تار کرنے والے شعرا کے لیے یہ غزلیں کسی چیلنج سے کم نہیں۔ دوسری جانب حیات وارثی کی غزل بھی بڑی جان دار ہے جس کا مطلع نہ صرف معنیٰ خیز ہے بلکہ سنسنی خیز بھی:

ہجومِ سنگ میں ہیں دل کا آئینہ دے کر
صنم خرید لیے ہیں تجھے خدا دے کر

مضامین میں سید ضمیر حسن دہلوی کا مضمون "اُردو زبان کے محاورے اور کہاوتیں" خاصا معلوماتی ہے مگر موصوف نے ایک بڑی غلطی یہ کی ہے کہ درجِ ذیل شعر کو عزیز لکھنوی سے منسوب کر دیا ہے، جب کہ یہ زبان زد شعر ثاقب لکھنوی کا ہے:

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

ضمیر صاحب کی اطلاع کے لیے یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ وہی ثاقب لکھنوی ہیں جن کا ایک اور زبان زد شعر اس طرح ہے:

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

—— خالد ندیم، علی گڑھ

○ کم و بیش ہر اُردو اکادمی کا ایک رسالہ نکلتا ہے مگر "ایوانِ اُردو" کے بارے میں بےساختہ زبان پر یہ مصرع آ جاتا ہے:

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

جون کے شمارے میں حرفِ آغاز کے

تحت آپ کا اداریہ اُردو کے ایک بے حد اہم مسئلے کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے۔ غزل کی دلآویزی و اثر انگیزی نیز بے پناہ مقبولیت کے قائل غزل شکن اور غزل پرست دونوں ہیں۔ لیکن جیسا کہ آپ نے کہا ہے: "غزل کی اس مقبولیت اور محبوبیت کا ایک منفی پہلو بھی ہے جو پچھلے دس بارہ سالوں میں بطورِ خاص نمایاں ہوا ہے۔ غزل کی عام پسندیدگی کے پیشِ نظر ہمارے شعرانے دوسری اصنافِ سخن کی طرف سے اپنی توجہ کلیتاً ہٹالی ہے۔" آپ کے خیالات سے اختلاف کرنے کی گنجائش نہیں۔ یہ بالکل درست ہے کہ اُردو غزل وبا کی طرح پھوٹ پڑی ہے اور غزل گو شعرا کی تعداد تو حشرات الارض کی طرح ناقابلِ شمار ہے۔ دیگر اصنافِ سخن کے فروغ میں "ایوانِ اُردو" کا رول مُربیانہ ہونا چاہیے گو کہ یہ کسی حد تک ہو بھی رہا ہے مگر ابھی مزید تحریک دینے کی ضرورت ہے۔

تازہ شمارے میں راج نرائن راز کا مقالہ غرض سے بالاتر تحریر اور ایک کم نام و کم معروف شاعر کو بہتر ڈھنگ سے متعارف کرانے کی قابلِ تحسین کوشش ہے۔ ف۔ س۔ اعجاز کی معرفت وادیِ خواب کی سیر بھی خوب ہے۔ سینیئر کہانی کار انور خاں اور انور قمر کی کہانیاں بہت خوب تو نہیں البتہ خوب ضرور ہیں۔ عذرا اصغر کی کہانی "بدچلن" مجھے بطورِ خاص پسند آئی۔ محمد علوی کی غزلیں اور نظمیں بہت اچھی لگیں۔ باقی حصے ابھی پڑھ نہیں پایا ہوں۔

—— رضی احمد تنہا، پورنیہ

○ "حرفِ آغاز" کے تحت آپ نے اُردو غزل کی بڑھتی ہوئی اہمیت و افادیت اور اس کے روشن مستقبل کا ذکر کرتے ہوئے اُردو شاعری کی دوسرے اصناف یعنی نظم، رباعی اور قطعہ وغیرہ کی عوام میں مقبولیت کی کمی کے اسباب و وجوہات کی نشاندہی کی ہے جو قابلِ غور و فکر ہے۔

—— محمد نور الدین چاند، محبوب نگر

○ "ایوانِ اُردو" برابر مطالعے میں رہتا ہے۔ جون کے شمارے میں شفا گوالیاری پر راج نرائن راز کا مضمون پڑھا۔ خدا کا شکر ہے کہ شفا صاحب پر کسی نے قلم اٹھایا تو ورنہ بعض شاعر تو ایسے ہیں جن کے بعد لوگ انھیں بالکل فراموش کر بیٹھے ہیں جیسے نازش پرتاب گڑھی۔ ان کے انتقال کے بعد کسی مستند ادیب کا کوئی مضمون اب تک نظر سے نہ گزرا۔ "ایوانِ اُردو" میں پابند نظمیں خال خال ہی نظر آتی ہیں اس بار بھی صرف ایک نظم محمد علوی صاحب کی شائع ہوئی ہے جو کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑتی۔ غزلوں میں کرشن ادیب، رام پرکاش راہی، شکیل دسنوی اور رحمت امروہوی نے متاثر کیا۔ کتابوں پر تبصرے بھی اچھے ہیں۔

—— مہدی پرتاپگڑی، پرتاپگڑھ

○ راج نرائن راز کا مضمون "شفا گوالیاری مرحوم" پسند آیا۔ خصوصی طور پر پہلا پیراگراف ایک تلخ حقیقت پر مبنی ہے۔ راز صاحب کا یہ کہنا کہ "آج ادب میں کھینچ تان، پیروی، خویش و اقربا پروری، منصب خواہی، مطلب برآری اور مفاد پرستی کا دور دورہ ہے۔" اس قدر سچ ہے کہ اسے جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ پھر ان کا یہ بیان کہ "تنقید کا تعلق اچھی بُری اوسط تخلیق سے کم اور اس کے اوسط معمولی مگر ذی مرتبہ و با اثر خالق سے زیادہ ہوتا ہے" وقت اور حالات کی صحیح عکاسی کر رہا ہے۔

آپ سے بھی مجھے یہی کہنا ہے کہ عظیم اقبال افسانوی دنیا میں بے شک ایک معتبر نام ہے لیکن انشائیہ نگاری ایک مخصوص مزاج کا تقاضہ کرتی ہے "داڑھی" میں اس کا پتا نہیں ملتا۔ اسی طرح ف۔ س۔ اعجاز جو نئی نسل کے شاعروں میں ایک جانے پہچانے شاعر ہیں لیکن نثر میں بھی ان کی زبان معتبر ہو یہ ضروری نہیں۔

اعجاز صاحب نے "خوابوں کے اسرار سمجھیے" میں "خواب" کو جمع کی صورت میں استعمال کیا ہے جو مناسب ہے لیکن پھر ان کا یہ جملہ —— "اہم ترین کام یہ سمجھنا ہے کہ خواب غیر منظم اور احمقانہ تو نہیں ہے۔" پھر آگے دیکھیے —— (شروع سے ترتیب وار جملے چُنے گئے ہیں)۔

۱۔ وہم زدہ (ترکیب کے اعتبار سے کہاں تک درست ہے؟)۔

۲۔ مشہور معالجین امراضِ نفسیات (دو اضافت کا ایک ساتھ استعمال فارسی میں تو رائج ہے لیکن اُردو میں نہیں)

۳۔ انتہائی درجے ذہنی خلل۔

۴۔ خوش ترین اور بھرپور زندگی (درجہ کے اعتبار سے خوش ترین اور بھرپور میں بڑا تضاد ہے)۔

۵۔ مثال کے طور سے ("پر" کی جگہ "سے" کا استعمال کس طرح مناسب ہے؟)۔

۶۔ یہ کئی بھیسوں میں نمایاں ہوا (غیر شستہ ترکیب ہے)۔

۷۔ اس کا دل خوش کن پہلو یہ ہے (جب صرف "خوش کن" سے بات واضح ہوجاتی ہے تو "دل" کی ضرورت ہے؟)

۸۔ کسی خواب نے نہ کبھی خسارے کا بینک بیلنس درست کیا اور نہ کبھی بدصورت لڑکے بچے کو راج ہنس بنا سکا (خواب نے' کا 'بنا سکا' سے کیسا جوڑ؟)۔

۹۔ باتوں کو تلاش کیجیے اور صرف ایسے خوابوں کو رقم کرنے پر ہی زور نہ دیا کریں۔

۱۰۔ 'ہر ممکن' اور 'بھرپور' مواد فراہم رہے (یہ مضمون کا آخری جملہ ہے یہاں معنی کے اعتبار سے کس قدر تضاد ہے)۔

—— شبیر حسن، مونگیر

○ آج جہاں سطحی اور غیر معیاری ادب سے متعلق رسائل کی بہتات ہے۔ معدودے چند ادبی و علمی رسالوں میں "ایوانِ اُردو" کا ہر ماہ پابندی سے شائع ہونا ایک معجزے سے کم نہیں ہے۔ پھر اسے معیار اور مواد کے اعتبار سے بھی دوسرے رسائل پر فوقیت حاصل ہے۔ بے شک "ایوانِ اُردو" نے اُردو زبان و ادب کی اشاعت میں جو اہم اور نمایاں کردار ادا کیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔

جون کے شمارے میں خاص طور پر سیّد شکیل دسنوی صاحب کی غزل پسند آئی۔ راج نرائن رازؔ صاحب کا شفا گوالیاری پر مضمون بھی اچھا لگا۔

—— (ڈاکٹر) زارا احمد، جمشید پور

○ جون ۸۹ء کے شمارے میں "آپ کی رائے" کے تحت جناب انور خاں صاحب، بمبئی کا خط پڑھ کر افسوس ہوا کہ انھیں اس افسانے (قصہ جدید حاتم طائی) میں Pseudo اور تمثیلیت نظر آ رہی ہے۔ نیز ان کا یہ فتویٰ کہ "جب کہانی کار کے پاس موضوع نہیں رہ جاتا تو ایسی کہانی لکھنے لگتا ہے تاکہ مہارت کے سہارے قاری کو لُبھا سکے"، جب کہ اس شمارے میں خود ان کا افسانہ "دلبر او دلبر" چھپا ہے جس کی رومانوی فضا بچّوں کا دل بہلانے کے سوا کچھ نہیں!

—— وجیب الرحمان، مظفر پور

○ جون کے شمارے میں انور قمر کا افسانہ "پرندے کا سایہ" بہت پسند آیا۔ ف۔ س۔ اعجاز کا مضمون "خوابوں کے اسرار سمجھیے" پڑھنے کے بعد اس افسانے کے نفسیاتی پہلو کا بخوبی انکشاف ہوتا ہے، کیوں کہ یہ مضمون اس کا ترجمان ہے۔ عذرا اصغر کا "بدچلن" بھی کامیاب کاوش ہے۔ اس بار غزلوں کا انتخاب بھی بہت خوب ہے۔ "اُردو خبر نامہ" سے ایسی خبریں مل جاتی ہیں جنھیں ہم عام طور پر اکٹھا نہیں کر پاتے، اسے جاری رکھیں۔

پرچے کا حسن پہلے سے مزید بڑھا ہے۔

—— صغیر رحمانی، آرہ

○ "ایوانِ اُردو" بلاشبہ ایک معیاری ادبی جریدہ ہے۔ ہر شمارے میں شامل مضامین، نظمیں، غزلیں اور افسانے نہایت ہی معیاری ہوا کرتے ہیں۔

جون ۱۹۸۹ء کے شمارے میں انور خاں کی کہانی "دلبر او دلبر" یوں تو ٹھیک ہے مگر اس قسم کی کہانیوں کا مقصد کیا ہے۔ آخر ہمارے کہانی کار کیا پیغام دینا چاہتے ہیں۔ تعمیری، مقصدی، معلوماتی، اصلاحی کون سا پہلو اُجاگر کرنا چاہتے ہیں؟ سماج کو اس قسم کی کہانیوں سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے قلم کے زور پر لفظوں کو گھسیٹتے چلے جانا اس طرح ایک کہانی تو بن جائے گی مگر بے مقصد۔

"ایوانِ اُردو" شمارہ جنوری ۱۹۸۹ء کے صفحہ ۲۱ پر رام دھاری سنگھ دواکر کی کہانی کا ترجمہ جاوید اقبال نے پیش کیا تھا۔ آخر ہمارے اُردو کے افسانہ نگار اس قسم کی کہانیاں کیوں نہیں لکھتے؟ یا پھر لکھ ہی نہیں سکتے؟

—— ممتاز صنم، کلکتہ

○ جدید افسانہ ایک بھول بھلیاں بن کر رہ گیا ہے۔ انور قمر صاحب کا افسانہ "پرندے کا سایہ" ایک معمّہ بن کر رہ جاتا ہے گرچہ اس طرح کے افسانے سے مرحوم اختر اورینوی صاحب روشناس کرا چکے ہیں۔

—— جاوید اختر آزاد، مونگیر

○ "ایوانِ اُردو" ابتدا ہی سے بڑی دلچسپی سے پڑھتا آ رہا ہوں۔ پرانے قلمکاروں کا کیا کہنا۔ وہ تو اساتذہ ہی کی صف میں ہیں۔ ساتھ ہی جدید قلم میں بھی کافی جان ہے۔

'دلّی کے آثارِ قدیمہ' کی طرح پھر کوئی قسط وار سلسلہ شروع کیجیے(۱)۔ پچھلے کچھ شماروں میں 'ناقابلِ فراموش' کے نام سے آپ نے بہت اچھا گوشہ شروع کیا تھا۔ اسے کیوں بند کر دیا گیا۔ کیا اس گوشے پر مضامین کم ملتے تھے(۲)؟

—— محمد طارق صدری، سمستی پور

(۱) ایف۔ س۔ اعجاز صاحب کا سلسلہ وار مضمون شائع کیا جا رہا ہے۔
(۲) نہ ملنے کے برابر۔

○ جون ۱۹۸۹ء کا شمارہ دیکھا۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی آپ نے اپنے رسالے کا معیار برقرار رکھا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ نے "ایوانِ اُردو" کو ہمیشہ نوجوان بنائے رکھنے کی قسم کھا رکھی ہو!

—— کلیم احمد، کلکتہ

اُردو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

ایوانِ اُردو دہلی

فون نمبر ۳۲۷۲۱۱، ۳۲۶۴۴۳۲۲

زیرِ ادارت

سید شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی

جلد: ۳، شمارہ: ۶ — فی کاپی ۲٫۵۰ روپے، سالانہ قیمت ۲۵ روپے — اکتوبر ۱۹۸۹ء

ماہنامہ "ایوانِ اُردو دہلی" میں شائع ہونے والے افسانوں میں نام، مقام اور واقعات سب فرضی ہیں، کسی اتفاقیہ مطابقت کے لیے ادارہ ذمہ دار نہیں۔
مضمون نگاروں کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ

ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی

اُردو اکادمی، دہلی — گھٹا مسجد روڈ،

دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خوشنویس: تنویر احمد

سید شریف الحسن نقوی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے سیما آفسیٹ پریس، دہلی ۱۱۰۰۰۶ سے چھپوا کر اُردو اکادمی، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا

حرفِ آغاز

چھپتے چھپتے

ایوانِ اُردو کی کاپیاں پریس جا چکی تھیں۔ اسی دوران وزیرِ اعلیٰ یو۔پی جناب نرائن دت تیواری نے بھی یہ اعلان فرما دیا ہے کہ آئندہ اسمبلی سیشن میں موصوف حکومتِ بہار کے طرز پر یو۔پی میں اُردو کو آئینی ثانوی حیثیت دینے کے لیے باضابطہ بل پیش کر دیں گے۔ یقیناً یہ ہم سب کے لیے ایک خوشگوار لمحہ ہے۔ اُردو والوں کی مدتوں کی آرزو پوری ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس قدم کو بنظرِ احسن دیکھا جائے گا۔

حکومت کا وعدہ پورا ہوا، اب خود اُردو والوں پر جو ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں ضرورت ہے کہ انھیں پورا کیا جائے۔

پریس سے پہلی کاپی واپس منگا کر یہ نوٹ دیا جا رہا ہے، انشاءاللہ آئندہ اداریے میں اس پر تفصیل سے بات کی جائے گی۔

بہار میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جانا آزاد ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ وزیرِ اعلیٰ بہار جناب ایس۔ این سنہا نے جب اس فیصلے کا اعلان کیا تو پوری اُردو دنیا میں مسرت کی لہر دوڑ گئی اور سبھی اُردو دوست حلقوں کی طرف سے حکومتِ بہار کے لیے تشکر کا اظہار کیا گیا۔ یہ امر خصوصیت سے موجبِ اطمینان ہے کہ اس فیصلے کی مخالفت میں ریاست کے اندر یا باہر سے کوئی آواز بلند نہیں ہوئی۔

اس عمل کا آغاز بہار کے سابق وزیرِ اعلیٰ اور ریاستی کانگریس (ا) کے موجودہ صدر جناب جگن ناتھ مشرا نے ریاست کے ۱۴ اضلاع میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے کر کیا تھا اور اس وقت بھی اس فیصلے کا ملک بھر کے انصاف پسند حلقوں نے خیر مقدم کیا تھا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر اُردو کو ان دوسری ریاستوں میں بھی، جہاں اُردو والے بجا طور پر یہ مطالبہ کر رہے ہیں، بالخصوص اُتر پردیش میں، جو صدیوں سے اردو کا گہوارہ رہا ہے، اسے دوسری سرکاری زبان بنا دیا جائے تو اس کا خیر مقدم ہی ہوگا، اس کے خلاف احتجاج نہیں۔ اور اگر یہ احتجاج ہوا بھی تو بے اثر ہوگا، اسی طرح جس طرح بہار میں، پہلے مرحلے پر اس فیصلے کے خلاف کچھ آوازیں اُٹھی تھیں اور خود ہی دب گئی تھیں۔ کیونکہ انھیں عوامی تائید حاصل نہ ہو سکی تھی۔

بہار میں اُردو کے ساتھ جو انصاف ہوا ہے، اس کے لیے ریاستی حکومت اور مرکزی حکومت دونوں ہی مبارکباد کی مستحق ہیں لیکن اس کے لیے خود بہار کی اُردو آبادی بھی کم مبارکباد کی حقدار نہیں جو ناساعد حالات میں بھی اپنی زبان کی بقا اور تحفظ کے لیے کمربستہ رہی اور جس نے صرف حکومت سے توقعات قائم کرنے کی بجائے اپنے طور پر بھی وہ سب کچھ کیا جو اس مقصد کے لیے ضروری تھا۔ وہاں اُردو تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا، چلن بھی ختم نہیں ہوا، ایسے اخبار رسالے اور کتابیں بھی شائع ہوتی رہیں جنھیں اپنے قارئین کی تلاش صوبے سے باہر نہیں کرنی پڑی اور اس کے ساتھ ساتھ اُردو کے آئینی اور جمہوری حقوق کی بحالی کے لیے وہاں جو کوششیں کی گئیں، وہ بھی مخلصانہ اور دانش مندانہ تھیں ——— اگر دوسرے صوبوں کی اُردو آبادی بھی یہی طرزِ عمل اختیار کر سکے تو وہاں بھی اُردو کو اپنے جائز حقوق حاصل کر لینے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

حسبِ اعلان نومبر میں "ایوانِ اُردو" اور "اُمنگ" دونوں کے نہرو نمبر شائع ہو رہے ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ یہ نمبر پنڈت جواہر لال نہرو کی عظیم شخصیت کے شایانِ شان ہوں اور اکادمی نے اپنے خاص نمبروں کی جو روایت قائم کی ہے، اسے آگے بڑھا لے جائیں ——— ایجنٹ حضرات سے گزارش ہے کہ وہ اپنے آرڈر سے جلد از جلد مطلع کریں۔ "ایوانِ اُردو" کے نہرو نمبر کی قیمت ۱۲/= روپے اور "اُمنگ" کے نہرو نمبر کی قیمت ۴/= روپے رکھی گئی ہے جو واجبی سے بھی کم ہے۔ مقصد یہ ہے کہ دونوں نمبر زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچ سکیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نمبر کی دوبارہ اشاعت کا ہم نے ایک سے زائد بار اعلان کیا مگر کاغذ کی عدم دستیابی کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا۔ لیکن ہمیں اپنے وعدے کا پاس تھا، تمام دشواریوں پر قابو پا کر بالآخر یہ نمبر دوبارہ شائع کر دیا گیا ہے اور آرڈروں کی تعمیل کی جا رہی ہے۔

——— سید شریف الحسن نقوی

غزلیں

بشیر بدر

(۱)

دُلہن بنی ہے رات بڑے اہتمام سے
آنسو سجا رہی ہے ستاروں کے نام سے

سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے
نیند آگئی ہے آج چراغوں کو شام سے

اُن سے ضرور ملنا، سلیقے کے لوگ ہیں
سر بھی قلم کریں گے بڑے احترام سے

کتنا بدل گیا ہوں میں دُنیا کے واسطے
آواز دے رہی ہے مجھے تیرے نام سے

(۲)

کئی پیڑ دھوپ کے پیڑ تھے تری رحمتوں سے ہرے رہے
مرے نام آگ کے پھول تھے مری جھولیوں میں بھرے رہے

کہیں مال و زر کے وزیر تھے کہیں علم و فن کے امیر تھے
ولے ہم بھی ایسے فقیر تھے جو ہمیشہ ان سے پرے رہے

مرے دل میں درد کے پیڑ ہیں یہاں کوئی خوف خزاں نہیں
یہ درخت کتنے عجیب ہیں سبھی موسموں میں ہرے رہے

وہ کلام جن سے چھتیں اُڑیں وہیں شامیانوں میں دفن ہے
ترے شعر دل میں اُتر گئے جو کھرے تھے سکے کھرے رہے

بشیر بدر



وحید منزل، ۴۴، مالی پورہ روڈ، پیر گیٹ، بھوپال



حامدی کاشمیری

ہوا، زمین، فلک، شمس سب ہیں میرے سے
تو کیا یہ وہم ہی دامِ ہوس میں میرے ہے

قفس کو چھوڑ کے جاؤں میں کس علاقے کو
تمام وسعتِ عالم، قفس میں میرے ہے

کہو یہ برق سے، میرے چمن سے دُور رہے
کہ سور جوں کی تپش خار و خس میں میرے ہے

جہاں فروز ہیں اسرارِ جسم شب کے تمام
یہ کیسی روشنی دستِ ہوس میں میرے ہے

زمانہ گزرا چھوا تھا کسی کے ہونٹوں کو
گلاب زار کی خوشبو نفس میں میرے ہے

شعبۂ اُردو، کشمیر یونیورسٹی، حضرت بل، سری نگر ۱۹۰۰۰۶

عنوان چشتی

مولانا ابوالکلام آزاد اور حُریّتِ فکر

مولانا ابوالکلام آزاد کو ان کے مذہبی اور دینی کارناموں کی روشنی میں بنیاد پرست ادّعائیت پسند یا قدامت پسند بنا کر پیش کرنا فیشن سا ہو گیا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے تصورات میں کافی لچک، وسعت اور ہمہ جہتی نظر آتی ہے۔ مولانا آزاد نے جس روحانی فضا میں آنکھ کھولی تھی، اس کا اثر ان کی پوری شخصیت اور دینی کارناموں پر نظر آتا ہے۔ جس کا رشتہ متصوفانہ فکر سے ملتا ہے۔ متصوفانہ فکر، جو آزادی کی طرف مائل ہے، مولانا آزاد کی تحریروں میں ایک واضح رُجحان کی شکل میں دکھائی دیتی ہے۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے فرمایا تھا کہ تصوف کی ابتدا علم، اس کا اوسط عمل اور اس کی انتہا عشق اور عطائے الٰہی ہے۔ علم کی بنیاد خبر پر ہوتی ہے اور یہ استدلال کے سہارے آگے بڑھتا ہے۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے علم، خبر اور استدلال کو تصوف کی پہلی منزل قرار دیا ہے۔ اور "عشق" کو آخری۔ مولانا آزاد نے علم و خبر اور تعقل و استدلال کی اہمیت کا احساس اپنی ہر تحریر میں کرایا ہے۔ لیکن وہ "عشق" کو علم و خرد سے بالاتر اور عظیم تصور کرتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے:

"عقائد، اعمال، عادات، خصائل، فکر و نظر، طرز و روش، کوئی بات بھی تو ایسی نہیں، جس کو اپنے قدرتی حالات کے مطابق پاتا ہوں۔ پس اپنی شکستگی و خستگی نہ تو کسی ہاتھ کی ممنون ہے نہ کسی زبان کی۔ نہ خاندان کی، نہ تعلیم و تربیتِ ظاہری کی۔ جو کچھ پایا ہے بارگاہِ "عشق" سے پایا ہے۔"

مولانا آزاد نے اپنی شخصیت کی تشکیل اور تکمیل میں عشق کو بنیادی محرک ہی نہیں بلکہ ایک فعال اور تخلیقی قوت قرار دیا ہے۔ اسی ضمن میں لکھتے ہیں:

"علم کا دروازہ اسی نے کھولا۔ عمل کی حقیقت اسی نے بتائی۔ وقت کے صحیفے اسی کی زبان پر اترے۔ حقیقت کے خزانے اسی کے دستِ کرم میں تھے۔ شریعت کے حقائق کا وہی معلّم تھا۔ طریقت کے نشیب و فراز میں وہی رہبر تھا۔ قرآن کے بھید اُسی نے بتلائے۔ سنّت کے اسرار اُسی نے کھولے۔ نظر اُسی نے دی۔ دل اُسی نے بخشا۔" (تذکرہ، ص ۳۳۰)

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ مولانا آزاد کی میزانِ اقدار میں "عشق" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ "عشق" کو شریعت کا معلّم اور طریقت کا رہبر قرار دینا، اس کو قرآن کے بھید اور سنّت کے اسرار کھولنے والا قرار دینا اور عشق کو نگاہ و دل کا پروردگار سمجھنا محض خطابت یا شاعری نہیں بلکہ اس اندازِ فکر کے پردے میں مولانا آزاد کا ذہن بولتا ہے اور اُن کا دل دھڑکتا ہے۔ مولانا آزاد کے اس اندازِ فکر پر متصوفانہ فکر کا گہرا اثر ہے۔

مولانا آزاد کا تصورِ عشق وسیع ہے۔ جو مجازی اور حقیقی دونوں دائروں پر محیط ہے۔ اُن کا "تصوّرِ عشق" اگرچہ ان کی تحریروں میں جگہ جگہ جلوہ گر ہے لیکن "حیاتِ سرمد" میں بالکل بے نقاب ہو گیا ہے۔ "حیاتِ سرمد" کے سرورق پر مولانا آزاد کا یہ اقتباس تحریر ہے:

"عشق کی شورش انگیزیاں ہر جگہ ہیں۔ ہر عاشق قیس نہ ہو، مگر مجنوں ضرور ہوتا ہے۔ اور جب عشق آتا ہے تو عقل و حواس سے کہتا ہے کہ میرے لیے جگہ خالی کر دو۔ سرمد پر بھی یہی حالت طاری ہوئی اور جذب و جنوں اس طرح چھایا کہ ہوش و حواس کے ساتھ تمام مال و متاعِ تجارت کو بھی غارت کر دیا۔ دُنیاوی تعلقات میں جسم پوشی باقی رہ گئی تھی۔ بالآخر اس بوجھ سے پا تو ہلکا ہو گیا کہ پابندیاں تو مدعیانِ ہوشیاری کے لیے ہیں۔" (حیاتِ سرمد: سرورق)

آخری جملے "پابندیاں تو مدعیانِ ہوشیاری کے لیے ہیں" میں جو بلا کا طنز



بی—۱۱۷، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

نے اور اوّلین جملوں میں "عشق" کی جن عظمتوں کا رجز ہے، وہ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔

"سرمدؔ" ہماری روحانی اور تہذیبی تاریخ کا ایک المیہ کردار ہے۔ مولانا آزاد نے "حیاتِ سرمدؔ" کے عنوان سے ایک ایسی پُرمغز اور بامعنی تحریر سپردِ قلم کی ہے، جس کی گاگر میں حقائق کا ساگر موجیں مارتا ہے۔ اور مولانا آزاد کا متصوفانہ رجحان نکھر کر سامنے آتا ہے۔ مولانا آزاد نے سرمد کی شہادت کو سیاسی قتل قرار دیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ سرمد کو قتل کرانے کے لیے اورنگ زیب اور درباری علمار نے جو الزامات عاید کیے تھے، اُن کو اِس طرح پیش کیا جاسکتا ہے:

۱. سرمد ننگا رہتا ہے
۲. وہ نصف کلمہ پڑھتا ہے
۳. وہ معراجِ جسمانی کا منکر ہے اور
۴. ایک ہندو لڑکے سے عشق کرتا ہے

"عشق" کا ذکر آتا ہے تو مولانا آزاد کا قلم رنگ رس اور آنند کی بارش کرنے لگتا ہے۔ وہ مولانا کی فکر میں جذبے کا شوخ رنگ بھرنے لگتا ہے۔ مولانا آزاد "عشقِ سرمدؔ" کی ابتدا کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں:

"کہتے ہیں کہ ایک ہندو لڑکا تھا، جس کی چشم کافر نے یہ افسوں طرازی کی اور ایسا ہونا کچھ مستبعد نہیں۔ کیوں کہ عشق خیز دلوں کو دو نیم کرنے میں بخیہ گر کی سوئی اور جلاد کی تیغ دونوں برابر ہیں۔" (حیاتِ سرمدؔ ص ۱۱)

مولانا آزاد کا متصوفانہ نظریہ اُن تحریروں میں زیادہ روشن اور طاقتور انداز میں ملتا ہے، جہاں انھوں نے صوفی و زاہد کا تقابل کیا ہے۔ یہ تقابل ارادی نہیں بلکہ اضطراری اور بے ارادی معلوم ہوتا ہے۔ اور ان کے ذہن و ضمیر کی آواز بن جاتا ہے۔ مولانا آزاد نے عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی کا زینہ تصور کیا ہے۔ انھوں نے ایسے موقعوں پر علمائے ظاہر اور زاہدانِ تہی اخلاص پر بطور خاص طنز کیا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے:

"جس کے دل و جگر میں تپش اور آنکھوں میں تری نہیں، اُس کو معنیِ انسانیت سے کیا واسطہ؟ تم نے اکثر دیکھا ہوگا کہ زاہدِ معتکف بھی باایں ہمہ تعبس تقشف، جب اپنے زاویۂ عبادت میں سر بہ زانو ہوتا ہے تو حور و غلمان کی مُسکراہٹ سے لطف لیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یعنی جو خشک دماغ مسجد کے گوشوں اور حجروں میں دوست کو ڈھونڈتے ہیں، انھیں بھی اس تصور کے بغیر چارہ نہیں۔" (حیاتِ سرمدؔ ص ۷)

اس تحریر سے چند باتیں صاف طور پر معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مولانا آزاد کی نگاہ میں عشقِ حقیقی میں بھی عشقِ مجازی کی جلوہ گری ہے۔ یا یوں کہیے کہ حقیقت بھی آیینۂ مجاز میں جلوہ گر ہے۔ دوسری بات یہ واضح ہوتی ہے کہ مولانا آزاد نے مسجد کے گوشوں اور حجروں میں اعتکاف کرنے والے زاہدوں پر "خشک دماغ" کی پھبتی کسی ہے۔ یہ محض اندازِ بیان نہیں، بلکہ مولانا آزاد کی حریتِ فکر کا قدامت پسندی اور بنیاد پرستی پر گہرا وار ہے۔

تاریخ کے صفحات پر اورنگ زیب اور داراشکوہ کی داستانِ خوں آشام ثبت ہے۔ اس ضمن میں سرمد کا ذکر بھی نمایاں ہے۔ یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا چلوں کہ اس ضمن میں غالب کے طرف داروں اور سخن سنجوں نے اپنے اپنے پیرو کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے الفاظ کے ذخیرے اور دلیلوں کے انبار لگادیے ہیں۔ اگر مولانا آزاد دعویٰ پسند، قدامت پرست یا بنیاد پرست ہوتے تو یقیناً غالب کے طرف دار ہوتے لیکن انھوں نے حیاتِ سرمد میں سرمد اور اورنگ زیب کو باطل اور سرمد کو حق پر قرار دیا ہے اور اورنگ زیب کے مقابلے میں داراشکوہ اور اس کے موقف کو سراہا ہے۔ انھوں نے سرمد کی شہادت کے محرکات و پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"یہ وہ زمانہ تھا کہ عنقریب بساطِ ہند پر عالم گیر ایک نئی چال چلنے والا تھا اور یہ شاہ جہانی حکومت کا عہد آخری تھا اور شاہزادہ داراشکوہ ولی عہد سلطنت تھا۔ سلسلۂ مغلیہ میں داراشکوہ ایک عجیب طبیعت و دماغ کا شخص گزرا ہے۔ اور ہمیشہ افسوس کرنا چاہیے کہ تاریخ ہند کے قلم پر اس کے دشمن کا قبضہ رہا۔ اس لیے (داراشکوہ) کی اصلی تصویر پولیٹیکل چالوں کے گرد و غبار میں چھپ گئی۔ وہ ہمیشہ سے درویش دوست اور صوفیانہ دل و دماغ کا شخص تھا۔ اور ہمیشہ فقرا اور اربابِ تصوف کی صحبت میں رہتا تھا۔ اس کی بعض تحریرات جو دستبردِ زمانہ سے بچ گئی ہیں، بتلاتی ہیں کہ اُن کا لکھنے والا بھی ذوق و کیفیت سے خالی نہیں۔ اس کے صاحبِ ذوق ہونے کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے تلاشِ مقصد میں دیر و حرم کی تمیز اٹھا دی تھی

وہ جس نیازکیشی کے ساتھ مسلمان فقراء کے آگے سر جھکاتا تھا ویسی ہی عقیدت ہندو درویشوں سے بھی رکھتا تھا۔ اس اصول سے کون صاحبِ حال اختلاف کرسکتا ہے۔"

(حیاتِ سرمد، ص ۱۷)

مولانا آزاد نے اس تحریر میں اورنگ زیب پر جو بنیاد پرستوں اور ادّعائیت پسندوں کا ہیرو ہے، یہ لکھ کر حرف گیری کی ہے کہ "ہمیشہ افسوس کرنا چاہیے کہ تاریخ ہند کے قلم پر اُس کے دشمن کا قبضہ رہا۔" جب تاریخ ہند کے قلم پر داراشکوہ کے دشمن کا قبضہ رہا تو داراشکوہ اور سرمد کے ساتھ معاصر تاریخ انصاف کرہی نہیں سکتی۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس بات پر خاصے تاسف کا اظہار کیا ہے کہ سرمد کے حالات سے اور ان کے شہادت کے پس منظر کو بیان کرنے سے اکثر معاصر تاریخیں قاصر ہیں۔ مولانا آزاد نے اورنگ زیب کی سیاست کو اس کا ذمّہ دار ٹھہرایا ہے۔ اس نقطۂ نظر کو مولانا آزاد کے اس بیان سے بھی تقویت ملتی ہے کہ "داراشکوہ کی اصلی تصویر پولیٹیکل چالوں کے گرد وغبار میں چھپ گئی۔"

مولانا آزاد نے نہ صرف داراشکوہ کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے بلکہ اس کے نظریۂ اتحاد اور بقائے باہم کو بھی دل کھول کر سراہا ہے۔ ہندوستان میں قومی اتحاد کا مسئلہ کسی نہ کسی شکل میں دورِ قدیم سے رہا ہے۔ بقول مولانا آزاد داراشکوہ نے اسلامی افکار و عقائد کے ساتھ ہندو تہذیب اور خیالات کا احترام کرکے قومی اتحاد کو تقویت پہنچائی تھی۔ مولانا نے صاف الفاظ میں تحریر کیا ہے کہ "وہ یعنی داراشکوہ جس نیازکیشی کے ساتھ مسلمان فقراء کے آگے سر جھکاتا تھا۔ ویسی ہی عقیدت ہندو درویشوں سے بھی رکھتا تھا۔" پھر لکھتے ہیں کہ "اس اصول سے کون صاحبِ حال اختلاف کرسکتا ہے۔"

مولانا آزاد اس نکتہ سے بخوبی آگاہ تھے کہ ہندوستان کی سالمیت، آزادی اور خودمختاری کو قومی اتحاد کے بغیر باقی نہیں رکھا جاسکتا۔ انھوں نے اپنی ایک تحریر میں اس بات کا واضح طور پر اعلان کیا ہے کہ اگر ایک فرشتہ آسمان سے اتر کر اور قطب مینار پر کھڑے ہوکر اعلان کرے کہ ہندوستان کی آزادی لے لو اور ہندو مسلم اتحاد یعنی قومی اتحاد سے دست بردار ہوجاؤ تو میں قومی اتحاد کو قبول کروں گا اور آزادی کے مطالبے سے دست بردار ہوجاؤں گا۔" انھوں نے دلیل یہ دی کہ اگر ملک آزاد نہ ہوا تو یہ صرف ملک کا نقصان ہوگا۔ اگر قومی اتحاد کی ردا تار تار ہوگئی تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہوگا۔ اس بات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مولانا آزاد اس تصورِ اتحاد کے مفسر، داعی اور نقیب تھے، جس کو اورنگ زیب کی ادّعائیت اور بنیاد پرستی کے مقابلے میں داراشکوہ نے پیش کیا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ داراشکوہ سے لے کر مولانا ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب تک ایسے تمام مفکر، دانشور اور رہنما حق بجانب ہیں جو لسانی، تہذیبی، مذہبی اقلیتوں کے تشخص کا احترام کرتے ہوئے وسیع تر ہندوستانی قوم کی تشکیل پر زور دیتے ہیں۔ مولانا آزاد نے جگہ جگہ داراشکوہ کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور اورنگ زیب کی کٹر پالیسی سے شدید اختلاف کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"بہرکیف عالم گیر کی ہوشیاری سے تو ہمیں داراشکوہ کی دیوانگی اور جنون دوستی پسند آتی ہے کہ وہاں تو تیغ ہوشیاری کشتگانِ مسرت کے خون سے رنگین ہے، اور یہاں خود اپنے جسم کے رگ ہائے گردن سے خون کی نالیاں بہ رہی ہیں۔"

(حیاتِ سرمد، ص ۱

اس شہادت کے بعد مزید کسی ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اکثر ادّعائیت پسندوں اور بنیاد پرستوں کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ انھوں نے انھی وجوہ سے اورنگ زیب پر حرف گیری کی ہے۔ سرمد کی شہادت پر اظہار خیال کرتے ہوئے اورنگ زیب کے اقدام قتل سرمد کو سراسر سیاسی قرار دیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

"اصل بات یہ ہے کہ عالم گیر کی نظروں میں تو سرمد کا سب سے بڑا جرم داراشکوہ کی معیّت تھی۔ اور وہ کسی نہ کسی بہانے قتل کرنا چاہتا تھا۔ ایشیا میں ہمیشہ سے پالیٹکس مذہب کی آڑ میں رہا ہے۔ اور ہزاروں خوں ریزیاں جو پولیٹیکل اسباب سے ہوئی ہیں انھیں مذہب کی چادر اوڑھا کر چھپایا گیا ہے۔"

(حیاتِ سرمد، ص ۲

ایک اور مقام پر اسلامی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے "بنیاد پرستوں" کے مظالم پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اسلام کے تیرہ سو برس کے عرصے میں فقہا کا قلم ہمیشہ تیغِ بے نیام رہا ہے اور ہزاروں حق پرستوں کا خون اُن کے فتووں کا دامن گیر ہے۔ اسلام کی تاریخ

کہیں سے پڑھو، سیکڑوں مثالیں کہتی ہیں کہ جب بادشاہ خوں ریزی پر آتا تھا تو دارِ افتا کا قلم اور سپہ سالار کی تیغ دونوں یکساں طور پر کام دیتے تھے۔"

(حیاتِ سرمد، ص ۲۱)

ان شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا آزاد نے ہر جگہ اس سیاسی ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے، جو سیاسی مفادات کے حصول کی غرض سے مذہب کے نام پر کیا جاتا ہے، اور ان تمام علمائے سو، اور بنیاد پرستوں سے اظہارِ بیزاری کیا ہے، جو علمائے حق، صوفیائے کامل اور دانشورانِ قوم کے خلاف برسرِ اقتدار شخصی حکومت اور سیاست کا آلۂ کار بنتے رہے ہیں۔

چاہے تذکرہ ہو یا خطباتِ آزاد، حیاتِ سرمد ہو یا اور کوئی تحریر، جہاں علمائے سو اور درباری عالموں کا ذکر آتا ہے، مولانا کا قلم آگ اگلنے لگتا ہے۔ جہاں بنیاد پرستوں اور ادعائیت پسندوں کی بات آتی ہے، مولانا آزاد کی تحریر خون آشام ہو جاتی ہے۔ وہ ان کے اندازِ فکر پر جم کر وار کرتے ہیں اور ان کی شخصیت پر بڑے دل پذیر انداز میں طنز بھی کرتے ہیں۔ لیکن جہاں صوفیا اور علمائے حق کا ذکر آتا ہے اور ان کے لچک دار نیز وسیع تصورات کی بات ہوتی ہے، وہاں مولانا آزاد کا قلم رقص کرنے لگتا ہے۔ ان کی تحریر پھول برسانے لگتی ہے۔ اور وہ اُن کے تصورات کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ یہ اندازِ فکر مولانا ابوالکلام آزاد کے متصوفانہ رجحانِ فکر کی غمّازی کرتا ہے۔ اور حرّیتِ فکر کا شاہد ہے۔ آخر میں مولانا آزاد کی اس تحریر پر اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں:

اُورنگ زیب کے فقیہانہ تقشّف سے اگرچہ فنونِ لطیفہ کی گرم بازاری سرد پڑ گئی، مگر جو کچھ ہوا صرف دربارِ شاہی تک محدود تھا۔ پچھلی آب پاشیوں نے ملک کے ہر گوشے میں جو نہریں رواں کر دی تھیں، وہ اتنی تنک مایہ نہ تھیں کہ شاہی سرپرستی کا رخ پھرتے ہی خشک ہونا شروع ہو جاتیں۔"

(غبارِ خاطر ۱۹۱۱ء، جون ۴۶)

مُنہ ابوالحسن

منظر

چھن سے چینی کا نقشین کٹورا فرش پر گر کر کھیل کھیل ہوا تو الماس سہم کر کونے میں دبک گئی کین کی کشن لگی آرام دہ کرسی پر متمکن بیگم حسین بڑے والے سوٹ کیس میں کافور کی گولیاں بکھروا کر ڈرائی کلین کیے ہوئے گرم کپڑے محفوظ کروا رہی تھیں کر چھناکا سن کر باورچی خانے کی طرف لپکیں "کیا ٹوٹا الماس ـــــ؟" اور اپنے پرائیویٹ سکریٹری کو دن بھر کی مصروفیات کی ہدایات دیتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ کر حسین صاحب بھی چھناکے کی آواز پر کچن کی طرف بڑھے "کیا ہوا بھئی ـــــ؟"

"بی بی صاحب کے ہاتھ سے جاپانی کٹورا گر کر ٹوٹ گیا ہے میم صاحب جی" سہمی ہوئی الماس نے خوفزدہ انداز میں اطلاع دی۔

"نا نا نا" حسین صاحب اپنی بیگم کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولے "صرف ایک کٹورے کے لیے ہماری بیٹی کو ڈانٹ ڈپٹ کرنا ٹھیک نہیں بیگم۔ کٹوروں کی بازار میں کوئی کمی نہیں بہت آجائیں گے ذرا یہ تو دیکھ لیجیے بیٹی کو کوئی زخم وغیرہ تو نہیں آیا۔"

"نہیں صاحب جی ـــ بی بی صاحب کو کچھ نہیں ہوا" الماس نے اطمینان بھری سانس لیتے ہوئے کہا۔ حسین صاحب نے چند قدم آگے بڑھ کر حجاب کی پیشانی چومی "تم باورچی خانے میں آئی ہی کیوں ہو حجاب۔ اتنے تو نوکر ہیں ان سے کام کیوں نہیں لیتیں۔"

حجاب نے روہانسی صورت بنا کر ماں کی جانب دیکھا "ممی کا حکم تھا پاپا"

"ہاں میں نے بھیجا تھا حجاب کو کچن میں تاکہ تعطیلات میں الماس کے ساتھ رہ کر پکوان سیکھ لے۔"

"کمال کرتی ہیں آپ بھی۔ بھلا حجاب کو یہ سب کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اپنے گھر میں تو آرام سے ہے گی ہی اور آئندہ بھی جس گھر میں بیاہ کر جائے گی انشاءاللہ اپنے ساتھ ملازموں کی فوج لے جائے گی پھر بیگم ـــــ؟"

یہ سن کر بیگم حسین نے تنبیہہ کرنے کے لیے کھولا ہوا اپنا منہ بند کر لیا۔ اور گہرے تاسف کے ساتھ دوبارہ بڑے ہال کمرے میں پہنچ کر چھوڑا ہوا کام کروانے لگیں۔

جاڑے رخصت ہو رہے تھے اور فضا میں خوشگواری کے شائبے شامل ہونے لگے تھے۔ ایسے میں بیگم حسین کو وہ پرانی شام بے اختیار یاد آگئی جب ایسے ہی موسم میں ایک روز حسین صاحب اپنے بزنس کے سلسلے میں مشورہ لینے کے لیے ان کے ڈیڈی کے گھر آئے تھے۔ ڈیڈی اس وقت گھر پر نہیں تھے اور وہ خود برآمدے میں کھڑی مالیوں کو مختلف ہدایات دے رہی تھیں جب ایک ملازم نے حسین صاحب کی پیشوائی کر کے انھیں ان تک پہنچایا تھا۔ احکامات صادر کرتے کرتے ایک ثانیے کے لیے رک کر انھوں نے نہایت اخلاق سے پوچھا تھا "فرمائیے"

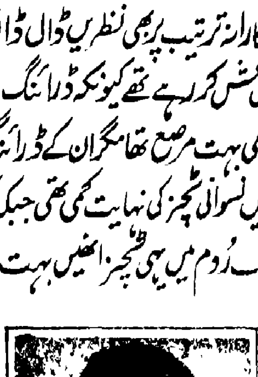
"محترم فراز صاحب تشریف رکھتے ہیں کیا ـــ؟"

"جی نہیں۔ ڈیڈی اس وقت گھر پر نہیں۔ آپ چاہیں تو انتظار کر سکتے ہیں۔ ورنہ آنے کے بعد آپ کا پیغام یقینی طور پر ان تک پہنچ جائے گا۔"

"کام اہم ہے اس لیے میں تھوڑا انتظار کیے لیتا ہوں۔"

"ضرور" تب انھوں نے ملازم کو حکم دیا تھا کہ حسین صاحب کو ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا جائے اور ان کی خاطر مدارت کا انتظام بھی ہو جائے۔

تب ڈرائنگ روم میں بیٹھے بیٹھے قطرہ قطرہ شہد بھری آواز کو اپنے کانوں میں ٹپکتا ہوا محسوس کرتے ہوئے نوجوان حسین صاحب رہ رہ کے یہی سوچ رہے تھے کہ کیا لڑکیاں بھی اس قدر منتظمانہ صلاحیت کی مالک ہو سکتی ہیں ـ؟ اور اس سوچ کے ساتھ ساتھ وہ ڈرائنگ روم کی فنکارانہ ترتیب پر بھی نظریں ڈال ڈال کر عش عش کر رہے تھے کیونکہ ڈرائنگ روم تو ان کا بھی بہت مرصع تھا مگر ان کے ڈرائنگ روم میں نسوانی ٹچز کی نہایت کمی تھی جبکہ اس ڈرائنگ روم میں یہی ٹچز انھیں بہت پسند



۲۷، پٹودی ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

آئے تھے اس وقت حسین صاحب جوان تھے اور تازہ تازہ لندن سے لوٹے تھے لہٰذا اب ہندوستان میں اپنے والد کی فرم میں نت نئی تبدیلیوں اور جدتوں کے خواہش مند تھے جن سے سرفراز صاحب ہی انھیں بہ خوبی روشناس کروا سکتے تھے کیونکہ سرفراز صاحب کا گھرانا امارت اور کاروبار میں ان کے گھرانے سے کہیں زیادہ ممتاز اور مقبول تھا کافی انتظار کے بعد بھی جب سرفراز صاحب نہیں آئے تو بادلِ ناخواستہ وہ چلنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے دیکھا مس سرفراز اسی وقت ہدایات سے فارغ ہو کر اندر لوٹ رہی تھیں۔ ان کا سامنا ہوتے ہی حسین صاحب نے اپنی پیشانی سے پسینے کے قطرے پونچھے اور تپاک سے بولے۔

"میں پھر کبھی حاضر ہو جاؤں گا۔ خدا حافظ"

باہری لان میں پودوں کی کانٹ چھانٹ اپنی نگرانی میں کروا کے حرم بھی کچھ تھک سی گئی تھیں لہٰذا حسین صاحب کو رخصت کر کے وہ بھی اپنے کمرے میں چلی گئیں جس کے بعد دوبارہ حسین صاحب تو ان کی کوٹھی پر نہیں آئے مگر حرم کے لیے ان کا رشتہ بڑی شدومد سے آیا جسے سرفراز صاحب نے بلا تامل قبول بھی کر لیا اور وہ دونوں زندگی کے مضبوط ترین بندھن میں بندھ گئے اور اپنے کاروباری مشاغل میں انتہائی دلچسپی کے باوجود حسین صاحب ایک مدت تک حرم کے جمالیاتی ذوق اور منتظمانہ صلاحیتوں کے مداح و معترف رہے اور اپنے بیاہ کی پہلی ہی رات کو انھوں نے حرم کو بتا دیا کہ وہ حرم سے کس قدر متاثر ہوئے تھے خوبصورت لڑکیوں کی تو کبھی کمی نہیں رہی مگر خوبصورتی کے ساتھ ساتھ اعلیٰ ذوقی اور سلیقہ ایسے اوصاف تھے جو یکجا ہونا مشکل تھے اور یہ اعلیٰ ذوقی اور سلیقہ ہی تھا جو حرم کو دوسروں سے ممتاز و ممیز کرتا تھا تو پھر اب ــــــ؟

اب حسین صاحب یہ کیوں نہیں چاہتے کہ ان کی لڑکی میں بھی وہی صفات لازمی طور پر پیدا ہو جائیں جن کے وہ دیوانے رہے...

بیگم حسین کی سوچ لڑکھڑانے لگی انھیں اپنی گزری زندگی کا ایک ایک قیمتی دن بہ خوبی یاد تھا۔ ازدواجی زندگی کی آسودگی کے بعد وہ تکمیلی دور جب دانش ان کی اور حسین صاحب کی زندگی میں آیا۔

اس وقت تک حرم بالکلیہ حسین صاحب کے لیے وقف تھیں مگر دانش کے آجانے کے بعد ان کی توجہ بٹ گئی اور حسین صاحب نے بھی اس بٹوارے کی کوئی شکایت نہیں کی کیونکہ ان کی زندگی میں آنے والے نومولود نے ان کی چاہتوں کے رنگ اور گہرے اور انمٹ کر دیے تھے۔ اب وہ حرم کے ساتھ ساتھ اپنے نوزائیدہ بیٹے دانش پر بھی لٹو تھے اور آفس سے بار بار فون کر کے دونوں کی خیر خیریت دریافت کرتے رہتے تھے۔

دانش کی پیدائش پر بڑا شاندار جشن منایا گیا تھا اور اپنے ددھیال اور ننھیال میں دانش یکساں طور پر مقبول و ہر دل عزیز تھا۔ دونوں گھرانوں میں دانش کے آگے کسی چیز کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ لہٰذا انتہائی آسائش میں وہ اطمینان سے منازلِ حیات طے کر رہا تھا کہ اس کی پیدائش کے ٹھیک دو سال بعد حجاب حرم کی گود میں آگئی۔ اور دانش کی طرح حجاب بھی والدین اور اپنے تمام متعلقین کی شفقتوں کے گہوارے میں پلتی ہوئی پروان چڑھنے لگی۔ اب حسین صاحب اور حرم کی تمام خواہشیں اپنے دونوں بچوں میں سمٹ گئی تھیں اور کوئی خواہش ایسی نہیں رہی تھی جو ان سے ہٹ کر ہوتی ــــــ ان سے وابستہ نہ ہوتی۔

دانش کو بچپن سے ہی کتابوں سے دلچسپی تھی اور فرماں برداری دانش کی سرشت تھی جبکہ حجاب بالکل دانش کے الٹ تھی۔ بچپن میں بھی حجاب کو بہت بہلا پھسلا کر اسکول بھجوانا پڑتا تھا اور اب نوجوانی میں بھی اُسے کتابیں سخت ناپسند تھیں۔ من مانی کرنے میں حجاب بے مثال تھی۔ وہ کبھی اپنی ماں اور بھائی کی کسی بات پر کوئی دھیان نہیں دیتی تھی اور صرف وہی کرتی جو خود کرنا چاہتی۔ حرم کو اُس کے مشغلوں پر کوئی اعتراض نہیں تھا بے شک وہ سہیلیوں سے ملے۔ ڈسکو اور بریک ڈانس کرے موویز دیکھے مگر اس کے ساتھ ساتھ ضروری امور۔ تہذیب اور اخلاق پر بھی اس کی توجہ رہے یہی بیگم حسین چاہتی تھیں لیکن اپنی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ بجائے بااخلاق ہونے کے حجاب بے قابو ہی ہوتی جا رہی تھی اور تہذیب و آداب۔ ملائمت و سلیقے سے حجاب کو ذرہ برابر لگاؤ نہیں تھا۔

بیگم حسین نے حسین صاحب کو کئی بار اُس بات کی طرف متوجہ کروایا تھا مگر اپنی چہیتی بیٹی کے سلسلے میں حسین صاحب کی سوچ نرالی ہی تھی وہ حجاب کی بجائے اپنی بیوی کو ہی سمجھایا کرتے کہ "ہر شوق ایک حد پر پہنچ کر خود بخود ختم ہو جاتا ہے جانِ من۔ برداشت کرو۔

حجاب خاندانی لڑکی ہے۔ اخلاق کے تمام تقاضے ضرور پورے کرے گی۔ وقت پر نہیں تو دیر سویر سے سہی"۔ اور حسین صاحب کی یہ سوچ بیگم حسین کو ہمیشہ کچلا دیتی۔ انھیں لگتا حجاب کی بے پروائیوں کی وجہ سے اُن کی اپنی خوبیاں ختم ہوتی جارہی ہیں اور وہ بتدریج مٹی کے اس بیکار ڈھیر میں تبدیل ہو رہی ہیں جو پھول پودوں کی پرورش کے مصرف کی بھی نہیں ہوتی انھیں رہ رہ کر حسین صاحب پر غصہ آتا جو سلیقے کے شیدائی تھے مگر اب محض اپنی بیٹی کے پھوہڑپن کی وجہ سے خود بھی سلیقے سے دُور ہوتے جارہے تھے۔ حسین صاحب جو اپنی مطمئن جوانی گزارنے کے بعد اب اندھادھند طور پر کاروبار کی نذر ہو گئے تھے اور شوہر کا پارٹ بہ خوبی ادا کرنے والے حسین صاحب نہ جانے کیوں باپ کا اہم رول انجام نہیں دے پا رہے تھے۔ حسین صاحب کی بے اندازہ محبتوں کے سائے میں بیگم حسین اب بھی خود کو تنہا تو نہیں محسوس کرتی تھیں مگر حجاب کو دیکھ دیکھ کر وہ ضرور ہولا یا کرتیں۔ خود سری کی وجہ سے حجاب کا خوبصورت چہرہ بیگم حسین کو بتدریج بدصورتی کی طرف مائل نظر آتا۔ یہ خوف کہ ان کی خوبصورت بیٹی خواہ مخواہ ہی بدصورت ہوتی جارہی ہے، ناپسندیدہ زخمی کرنے والا ہتھیار بنی جارہی ہے ان کا چین و قرار لوٹ لیتا۔

وہ کیا کریں کہ حجاب بدصورت نہ لگے؟ یہ ایسی فکر تھی جس کا کوئی علاج ان کے پاس نہیں تھا اور اب قیمتی کٹورا توڑنے کے بعد سے حجاب بجائے پشیمان ہونے کے اپنے کمرے میں گھسی مسلسل آنسو بہا رہی تھی۔ حسین صاحب اُسے سمجھا بجھا کے آفس روانہ ہو چکے تھے اور بیگم حسین بار بار اس کے کمرے میں جھانک جھانک کر دیکھ رہی تھیں حجاب کے آنسو ان کا دل دُکھا رہے تھے مگر حجاب کی بے رُخی ان کی محبت کے اظہار میں حائل تھی۔ وہ اپنی ماں کو دشمن کیوں سمجھتی ہے یہ خیال پھانس کی طرح ان کے احساس میں گم ہو کر رہ گیا تھا اور پہلی مرتبہ انھیں آرزو ہوئی تھی کہ کاش وہ امیر کبیر ہونے کی بجائے غریب ہوتیں تو شاید ان کی لڑکی آسائشوں کی نذر ہو کر اُن سے اس قدر دُور نہ ہوئی ہوتی۔

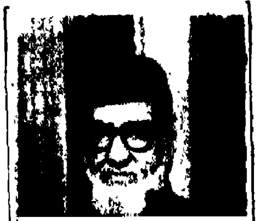
غریب امیروں جیسے چکاچوندھ نہ سہی دولتِ احساس سے کتنے مالا مال ہوتے ہیں۔ جنھیں زندگی بھر زخموں کے سوا کچھ نہیں مِلتا پھر بھی جو مسکرانا نہیں بھولتے انھوں نے الماس کو اب تک نہیں جانا تھا۔ حالتِ مسرت میں انھیں الماس کبھی ملازمہ سے زیادہ کچھ اور نظر نہیں آئی تھی مگر اب فکر و کرب کے لمحوں میں وہ ایک بہترین ساتھی ثابت ہو رہی تھی جو رہ رہ کے ان کے اضطراب کو ڈھارس بندھایا کرتی "سب ٹھیک ہو جائے گا میم صاحب جی —— بی بی صاحب ضرور سنبھل جائیں گی . . . . آپ اتنی فکر کیوں کرتی ہیں . . . ." الماس کے یہ دردمندانہ دوستانہ جملے بیگم حسین کے تپتے جُھلستے احساس پر مہین بوچھار کی طرح بکھر کر انھیں بے انتہا ٹھنڈک پہنچا رہے تھے۔ اُن کی گہری مایوسی میں اُمید کا اجلا راستہ بنا رہے تھے۔ بیگم حسین نے جیسے اپنے احساس میں ہی الماس کو گلے لگا کر شاباشی دی۔ ان کی کتنی شدید خواہش تھی کہ اُن کی بیٹی حجاب تاریخ کی طالبہ بنے کیوں کہ تاریخ زمانوں اور عہد ساز شخصیات کا عنوان ہوتی ہے اور مسمار کھنڈروں کو بھی معتبر نام اور مقام عطا کرتی ہے۔ تاریخ ایسی شخصیات پر بے حد نازاں ہوتی ہے جو اس کے ابواب میں اضافے کا باعث بنیں مگر حجاب تو ایک متوازن انسان بھی نہیں بن پا رہی تھی۔

نفرتوں کی کوکھ کے پھل کتنے بھی کسیلے سہی محبت کی کوکھ کا یہ پھل کس طرح اتنا کڑوا ہو گیا یہی وہ دردناک سوچ تھی جسے بہلانے کے لیے بیگم حسین نے اپنی عظیم الشان کوٹھی کی ایک ایک شاندار چیز کا سہارا لیا تھا مگر کوئی بھی چیز اُن کے زخم پر مرہم نہیں بن سکی تھی۔ سکون کھو کر اپنی عظیم الشان کوٹھی بیگم حسین کو اُس ویرانے کی طرح معلوم ہونے لگی تھی جو کسی طرح آبادی کا مسکن نہیں ہوتا اور آبادیاں تنظیم حیات کے لیے کس قدر ضروری . . . .

خاموشی۔ فکرمندی اور اپنے رنجیدہ خیالات کے بوجھ تلے دبی جب وہ شاندار چیز سے بیزار بددل ہو کر اپنے کمرے سے برآمدے میں پہنچیں تو وہاں انھیں دانش نظر آیا۔ چڑھتی ہوئی نرم سنہری دھوپ میں نہاتا ہوا۔ تازگی اور توانائی کا مظہر۔ اپنی کتابوں کی رفاقت میں دل و جان مصروف و منہمک . . . اس بے کراں منظر کی طرح جو قدرت کی فیاضیوں سے مالا مال زندگی کا صرف ایک حصہ نہیں بلکہ تمام تر زندگی معلوم ہوتا ہو . . . .

ایک دم سے ٹوٹے ہوئے کٹورا

غزلیں



محمد منشاء الرحمٰن خاں منشا

ہوش گم ہوں تو سجھائی نہیں دیتا کچھ بھی
آنکھ ہو کر بھی دکھائی نہیں دیتا کچھ بھی

نالۂ غم ہو کہ آوازِ شکستِ دل ہو
شورِ ہستی میں سنائی نہیں دیتا کچھ بھی

راہِ منزل نہیں معلوم تو آوارہ سفر
بجز اک آبلہ پائی نہیں دیتا کچھ بھی

لاکھ بہتان لگیں، پاکیِ دامن والا
اپنی جانب سے صفائی نہیں دیتا کچھ بھی

خوں اگلتے ہوئے زخموں کی جراحت کے سوا
خوابِ انگشتِ حنائی نہیں دیتا کچھ بھی

منشا پردہ پڑے آنکھوں پہ تو خیر و شر میں
فرق زنہار دکھائی نہیں دیتا کچھ بھی

۱۱، اسٹار کی ٹاؤن، ناگپور

گفتگو تہذیب نو پر بس یہ آخر چلی ہے
سرورق دانش، کتاب اندر سے پوری کھوکھلی ہے

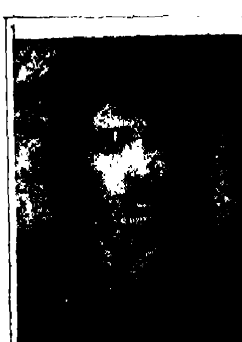
راکھ پل پل ہو رہی ہے منہ میں انگارہ دبائے
زندگی کچھ بھی نہیں سگرٹ سلگتی ادھ جلی ہے

جی رہی ہے اپنے جھوٹے پیٹ میں بارود بھر کر
نسل نو جو یاس و نومیدی کے آنگن میں پلی ہے

تم اگر اس دور کی تاریخ لکھنا چاہتے ہو
ہر ورق پر بس یہی لکھ دو سیاست دوغلی ہے

انگلیاں جھلسی ہوئی ہیں احترام اسلام اس کی
اس نے نادانی میں انگارے کو سمجھا تھا کلی ہے

احترام اسلام



۵۴۷، اتر سوئیا، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

شاہد کبیر

یہی نہیں کہ وہ سب سے جدا سا لگتا ہے
عجیب شخص ہے ہر دم نیا سا لگتا ہے

تمام شہر میں رونق بپا کی ہے جس نے
ہر ایک شخص کا چہرہ بجھا سا لگتا ہے

اندھیری شب میں کہاں سے یہ روشنی آئی
کسی کا کوئی دریچہ کھلا سا لگتا ہے

وہ شخص دور سے کتنا قریب لگتا تھا
گلے لگا ہے تو اک فاصلہ سا لگتا ہے

فضا بدلنے کی رفتار کا یہ عالم ہے
ذرا جو دیر ہوئی، گھر نیا سا لگتا ہے

اماں ملے گی کہاں آپ کو یہاں شاہد
جسے بھی دیکھیے، بے حوصلہ سا لگتا ہے

ڈائریکٹوریٹ آف مارکیٹنگ اینڈ انسپکشن، نیو سیکریٹریٹ، ناگپور ۴۴۰۰۰۱

کمال احمد صدیقی

عروض معروض — ۲

مئی ۱۹۸۹ء کے "ایوانِ اُردو" میں ڈاکٹر گیان چند کا مضمون "اقبال کے چند منسوخ اشعار کا وزن" پڑھا۔ سب سے پہلے مجھے اپنے مشفق دوست ڈاکٹر گیان چند اور "ایوانِ اُردو" کے قارئین سے معذرت کرنا ہے کہ فروری کے شمارے میں میرے مضمون "عروض معروض" میں میرا لہجہ کچھ تلخ ہوگیا تھا۔ سنجیدہ علمی مباحث میں ایسا نہیں ہونا چاہیے، خاص طور سے ڈاکٹر گیان چند کی تحریر کے ردِّ عمل کے طور پر، کیوں کہ موصوف خلیق اور حلیم الطبع ہونے کے ساتھ ساتھ میرے دیرینہ کرم فرما بھی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ازراہِ قدر شناسی' رمزیہ انداز میں مجھے مخاطب فرمایا تھا۔ اُن کے بیان کی صداقت میں کلام نہیں۔ جو غلط فہمی ان کی تحریر اس لہجے میں پڑھ کر مجھے ہوئی اور جو اُنھیں مقصود نہیں تھا، اس کے لیے میں پشیمان ہوں:

مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

مذہب کی طرح علمی نظریے کے سلسلے میں بھی کوئی جبر نہیں۔ اور پھر عروض میں تو نظریہ کو 'مذہب' ہی کہا جاتا ہے۔ زحاف 'رفع' کے مقام کے سلسلے میں، میں اپنا نظریہ قارئین پر لادنے کے لیے نہیں، بحث میں اُن کو شریک کرنے کے لیے، واضح کرنا چاہتا ہوں۔ دل کے کسی گوشے میں شاید یہ خواہش بھی ہے کہ محبی ڈاکٹر گیان چند اس کو پڑھیں۔ انھوں نے اس مضمون میں لکھا ہے:

"فارسیوں نے جب عربی عروض کو لیا تو اپنی ضروریات کے مطابق، اس میں کثرت سے حذف و اضافہ کیا۔"

یہ بیان بالکل دُرست ہے۔ عروض پر جو قارئین دسترس نہیں رکھتے، اُن کے لیے یہ تحریر بامعنی ہو، کچھ باتیں عرض کر دی جائیں۔

پہلا مصرع جس رُکن پر ختم ہوتا ہے، اُسے (بھی) 'عروض' اور دوسرا مصرع جس رُکن پر ختم ہوتا ہے اسے 'ضرب' کہتے ہیں۔ ایک آہنگ میں عروض اور ضرب کی تعداد مساوی ہونا چاہیے۔ عربی میں ایسا نہیں ہے محقق طوسی کی کتاب "معیار الاشعار" سے واضح ہوتا ہے کہ شروع میں فارسی شاعروں نے یہ روش اپنائی تھی۔

عربی شاعری میں اس کی بھی اجازت تھی کہ ہزج (مفاعیلن) کے آہنگ میں ایک مصرع کا پہلا رکن سالم ہو دوسرے کا اخرم (مفعولن)۔ مصرعِ اوّلی کا پہلا رکن 'صدر' اور دوسرے مصرعے کا 'مطلع' کہلاتا ہے۔ مثال یہ ہے:

گر ہو تلخ تو سب لمبے لمبے گھونٹ لیتے ہیں
مزے کی ہو تو پیتے ہیں شراب آہستہ آہستہ

صدر مفعولن اور مطلع مفاعیلن ہے۔ عربی عروض میں یہ درست ہے۔ لیکن فارسی اور اُردو میں یہ روش نہیں اپنائی گئی۔ 'گر' کی جگہ 'اگر' کر دینے سے صدر مفاعیلن ہو جاتا ہے۔ اور ہم اسی آہنگ سے مانوس ہیں۔

اہلِ عرب نے پانچ زحاف: خرم، ثلم، خرب، شتر اور ثرم صدر و مطلع کے لیے خاص رکھے تھے۔ اہلِ فارس نے انھیں عام زحاف کر دیا۔

فارسی میں یہ لسانی رویّہ تھا کہ جہاں تین متوالی حرکات ہوں، درمیان کی حرکت کو زائل کر دیتے تھے۔ اس لسانی رویّہ کو عروض میں محقق طوسی نے ارکان میں بھی جاری کر دیا۔ یہ تسکین اور تحقیق کے زحاف ہیں۔

فارسی کا مزاج، عربی کے مزاج سے مختلف ہے، اس لیے آہنگ بھی مختلف ہیں۔ ان کے پیشِ نظر اہلِ فارس نے تیرہ[۱۳] زحاف نئے وضع کیے:

۱۔ رفع۔ ۲۔ جبّ۔ ۳۔ ہتم۔ ۴۔ زلل۔
۵۔ بتر۔ ۶۔ جدع۔ ۷۔ نحر۔ ۸۔ جحف۔
۹۔ ربع۔ ۱۰۔ درس۔ ۱۱۔ خنج۔ ۱۲۔ طمس
اور ۱۳۔ سلخ۔

یہاں پانچویں زحاف بتر (بَ تَ رُ) کے بارے میں عرض کر دیا جائے کہ عروض و ضرب کے لیے عربی میں بھی ایک مرکب زحاف اس

بلاک نمبر ۱۰۶/۱/۱، اولڈ کیمپس جواہر لال یونیورسٹی، نئی دہلی ۶۷

نام کا ہے۔ اس کا عمل اہلِ فارس کے مرکب زحاف 'بتر' سے ذرا مختلف ہے۔ اس بات کی اطلاع ابھی تک کچھ لوگوں کو نہیں ہے، اور وہ دوسروں پر غلط الزام لگاتے ہیں (ملاحظہ فرمائیں "اردو ادب" ۱۹۸۹ء میں "عروض معروض")۔

'رفع' کو چھوڑ کر باقی سب، یعنی بارہ زحاف عروض و ضرب کے لیے مخصوص ہیں۔ 'رفع' عروض و ضرب کو چھوڑ کر ہر مقام پر، یعنی صدر و مطلع اور حشو میں آتا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند نے یاس یگانہ چنگیزی کی کتاب "چراغِ سخن" اور مرزا اوج کی کتاب "مقیاس الاشعار" کے حوالے سے مرفوع مزاحف عروض و ضرب میں بھی لائے جانے کو درست قرار دیا ہے۔ ان کی تحریر سے یہ نتیجہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ "قواعد العروض" میں قدر بلگرامی نے بھی مرفوع مزاحف کو مصرع کے آخری رکن کے طور پر جائز رکھا ہے۔ یہ تینوں کتابیں اس وقت میری دسترس سے باہر ہیں اس لیے ان کے موقف اور استدلال سے بحث نہیں کرسکتا۔ البتہ مجھے اس بات پر اصرار ہے کہ رسالہ منتہی العروض (ص ۲۶) میں سید محمود نے مرفوع مزاحف کے عروض و ضرب میں لانے کے لیے جو حکم امتناعی لگایا ہے، وہ درست ہے۔ صاحبِ منتہی العروض نے کوئی استدلال پیش نہیں کیا ہے۔ عروض کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں نے اس کے بارے میں غور کیا۔ کچھ تفصیل سے میں نے اس کے بارے میں اپنی کتاب "آہنگ اور عروض" میں لکھا ہے، جو پریس میں ہے، اور خیال ہے کہ ان معروضات کی اشاعت سے پہلے بازار میں آجائے گی۔ یہاں صرف یہ گزارش کروں گا کہ

بات علمی اساس کے بغیر ہو تو قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ مرزا اوج، یا یگانہ چنگیزی یا قدر بلگرامی یا کسی اور کا قول نہ ثبوت ہے اور نہ استدلال۔

یہ معروضات توجہ چاہتی ہیں:

(۱) جس رکنِ سالم کے شروع میں دو اسباب خفیف ہوں، 'رفع' اس کے پہلے سببِ خفیف کو ساقط کرتا ہے، اگر اس کا ساکن 'خبن' سے ساقط نہ کیا گیا ہو۔ یہ شرط اس لیے لازمی ہے کہ 'خبن' کی کارفرمائی کے ساتھ ساتھ 'رفع' کا عمل امرِ ممتنع ہے۔ (یہ امرِ ممتنع کچھ معلم عروض کرتے رہتے ہیں)

(۲) دو ارکان جن کے شروع میں دو اسباب خفیف ہیں، مستفعلن (متصل) اور مفعولات ہیں۔

(۳) مستفعلن مرفوع ہو کر تفعلن یعنی فاعلن رہ جاتا ہے۔

(۴) ہمارا بحور کا نظام اس طرح مرتب ہوا ہے کہ کسی سالم بحر کا استخراج کسی اور بحر کے مزاحف کی تکرار سے نہیں ہوگا۔ رجز (مستفعلن) میں اگر مرفوع فاعلن عروض و ضرب میں بھی لانے کی اجازت ہو تو متدارک سالم کا انفکاک رجز مرفوع کے طور پر بھی ممکن ہو جائے گا، جو عروض کے نظام کے سراسر خلاف ہے۔ مختلف افاعیل کے مزاحف سے مرتب ہونے والی مزاحف بحریں، ایک آہنگ کی ہو سکتی ہیں، لیکن کوئی سالم آہنگ کسی اور سالم رکن کا مزاحف آہنگ نہیں ہو سکتا۔

'ہزج' میں مفاعیلن کا اشتر فاعلن۔ اہلِ فارس نے عام مزاحف تو کر دیا، لیکن کسی آہنگ کی ترتیب میں اسے عروض و ضرب میں اس لیے استعمال نہیں کیا گیا کہ ہزج اشتر

وافر (مفاعلتن) میں 'عصب' عام زحاف ہے، اور عروض و ضرب کے لیے مخصوص زحاف قطف کے علاوہ صرف یہی آسکتا ہے۔ 'عصب' سے 'ل' ساکن ہوتا ہے اور مفاعلتن یعنی مفاعیلن ہو جاتا ہے۔ اب مفاعیلن کی تکرار سے آہنگ کو ہزج کے بجائے وافر معصوب کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟ اس لیے سالم ارکان مفاعیلن وافر میں نہیں رکھے جاسکتے۔ عربی میں ہزج چوں کہ مسدس ہی رائج نہیں ہے، اس لیے وہاں وافر معصوب مسدس مقطوف (مفاعیلن مفاعیلن فعولن — ۲ بار)۔ مثال عربی شعر کی "زرِ کامل عیار" میں ص ۱۲۶ پر ہے اور اس وزن کے بارے میں صراحت بھی ہے۔ اردو میں چوں کہ ہزج مثمن بھی رائج ہے، اس لیے یہاں یہ صورت رائج تقلید نہیں۔

'کامل' میں اضمار عام زحاف ہے۔ مُتفاعلن، اضمار کے بعد مُتْفاعلن یعنی مستفعلن ہو جاتا ہے۔ اضمار عام زحاف ہونے کے باوجود، مضمر مستفعلن عروض و ضرب میں لانے کے لیے حکم امتناعی ہے۔ اس حکم امتناعی کی کوئی اور توجیہہ سوائے اس کے ممکن نہیں کہ کامل مضمر کا آہنگ رجز سالم کا آہنگ نہ ہو جائے۔

عروض کا ہر طالب علم یہ بات جانتا ہے کہ عام زحافوں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو صدر/مطلع، حشو اور عروض/ضرب میں، ہر مقام کے لیے ہیں۔ یہ حقیقی عام زحاف ہیں۔ دوسرے وہ عام زحافات ہیں جو عروض/ضرب میں نہیں لائے جاسکتے، جیسے کف، شکل

(منتہی العروض، ص ۱۸)۔ زحافِ حقیقی اور عام مجازی کا فرق بہت اہم ہے۔ اگر 'رفع' کو عام زحاف کے زمرے میں رکھا جائے گا، تو وہ 'عام حقیقی' نہیں، بلکہ 'عام مجازی' ہوگا۔ جن عروضیوں نے اسے عروض ضرب کے لیے جائز بتایا ہے، اُن سے تسامح ہوا ہے۔

(۵) مستفعلن فاعلن، مفتعلن فاعلن اور مفاعلن فاعلن کی تکرار کے آہنگ، مرکب بحر، بسیط کے تحت آتے ہیں۔ عروض کی کسی مستند کتاب میں پہلے دو آہنگ رجز کے تحت، اور تیسرا آہنگ ہزج کے تحت نہیں ملے گا۔ اگر کسی کتاب یا رسالے میں ایسا ہے، تو وہ میری نظر سے نہیں گزرا۔

ایک عجیب اور دلچسپ بات ہے۔ رجز میں 'فاعلان' مرفوع مذیل ہے، اس لیے مستفعلن فاعلان یا مفتعلن فاعلان کی تکرار کا آہنگ رجز کے تحت آسکتا ہے۔ اسی طرح مفعول فاعلان اور مفاعلن فاعلان کی تکرار کے آہنگ بھی ہزج کے تحت آسکتے ہیں کیوں کہ فاعلان ہزج میں اشتر مسبغ ہے۔

بات علمی سطح پر ہو، تو حوالوں کی اتنی اہمیت نہیں رہتی۔ 'منقول' کی اہمیت ہوتی ضرور ہے، لیکن اگر 'منقول' اور 'معقول' میں تضاد ہو، اور دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہو تو؟ ــــ فیصلہ میں ڈاکٹر گیان چند پر چھوڑتا ہوں، کیوں کہ جب وہ خود اپنی بے جا وکالت نہیں کرتے تو زائد المیعاد یا نادرست اقوال کو کسوٹی پر پرکھنے کو "خطائے بزرگاں گرفتن" نہیں سمجھیں گے۔

ڈاکٹر گیان چند نے جو صراحتیں اور

کچھ عرض نہیں کرنا ہے۔ البتہ ایک بات، جس کی اُن سے توقع نہیں تھی، پڑھ کر ذہن کو شدید جھٹکا لگا:

"محقق نے انھیں قصیدے کے اشعار کہا ہے۔ یہ مطالبہ زیادتی ہے کہ محقق جیسے مصنف کی شعری مثالوں کو شاعروں کے دیوان سے ملا کر دیکھا جائے۔ میں کوئی خاقانی پر تحقیق نہیں کر رہا تھا۔ کمال صاحب خاقانی کے عالم ہیں[1]۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے کبھی دیوانِ خاقانی نہیں دیکھا۔ فارسی ادب کبھی میرا موضوعِ مطالعہ نہیں رہا۔"

ڈاکٹر گیان چند نے غیر معمولی جرأت سے یہ اعلان کیا ہے۔ اپنے بارے میں ایسا اعلان صرف ایک محقق اور ایک عالم ہی کرسکتا ہے۔ جو کچھ موصوف نے لکھا ہے، شک تو وہی مجھے بھی تھا۔ شک کی بنیاد غیر مستحکم بھی ہوسکتی ہے۔ اس لیے اسے میں نے معروضی حقیقت نہیں، اپنا داخلی تاثر سمجھ کر نظر انداز کر دیا، اور نوکِ قلم پر اسے نہیں آنے دیا، کیوں کہ موصوف محترم نے مثال میں جو فارسی کے مصرعے پیش کیے تھے، ان کی قرأت نادرست تھی۔ میں چوں کہ اُن کو اس عہد کے سربرآوردہ محققوں میں سے سمجھتا ہوں، اس لیے اپنی اطلاع کے لیے اور قارئین کی اطلاع کے لیے یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ یہ مطالبہ زیادتی کیوں ہے کہ محقق جیسے مصنف کی شعری مثالوں کو دیوان سے ملا کر دیکھا جائے؟ موصوف محترم مجھ سے زیادہ یہ بات جانتے ہیں کہ تذکروں میں اندراجات غلط ہیں، الحاقی عبارتیں جگہ پاگئی ہیں، کتابت کی غلطیاں ہیں۔ ترجموں میں شعروں کا غلط اندراج ہے، وغیرہ وغیرہ۔ "زرِ کامل عیار" میں مظفر علی اسیر نے "معیار الاشعار" کا متن اور اس کے ساتھ سعد اللہ کا حاشیہ بھی دیا ہے اور نہ صرف ترجمہ کیا ہے بلکہ جہاں ضروری سمجھا، تشریح بھی کی ہے۔ خواجہ نصیر الدین محقق طوسی کی کتاب اغلاط سے پاک نہیں تھی، مقدمے میں اسیر کا یہ جملہ توجہ چاہتا ہے، "معلوم ہوا کہ بعض مقامات کتاب صحت سے بھی رہ گئے ہیں۔" اگر اسیر یہ نہ بھی لکھتے تو متن کو اغلاط اور غلط انتساب یا الحاقی عبارتوں سے پاک نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔ بعض مقامات کے سلسلے میں جو شکوک مجھے ہیں، ان کے بارے میں لکھا بھی ہے، اور تحقیق بھی کر رہا ہوں۔ آخر اگر 'منقول' میں کوئی کھوٹ ہے، تو وہ اسے چومنے اور آنکھوں سے لگانے سے تو دور ہوگی نہیں۔ صدیوں سے یہ مثال 'محقق' کی کتاب سے نقل ہوتی چلی آرہی ہے، اور خاقانی پر اتہام تھوپا جا رہا ہے۔ یہ ناقل، ڈاکٹر گیان چند کی طرح محقق کا عقیدت مند تھا۔ عقیدت مند میں بھی ہوں، لیکن تحقیق کے سلسلے میں جو سبق میں نے اپنے والد (ڈاکٹر محمد احمد صدیقی مرحوم و مغفور) اور اساتذہ

---

[1] اسی مضمون میں ڈاکٹر گیان چند نے لکھا ہے:
"حیرت ہے کہ میں نے از راہِ قدر شناسی اُن کی طرف روئے سخن کیا۔ وہ اسے تعریض و تضحیک سمجھے۔ چوں کہ تحریر میں قائل کے لہجے کی صحیح نمائندگی نہیں ہوتی، اس لیے غلط فہمی کا امکان رہتا ہے۔ اگر یہ جملہ نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ میں اسے طنز پر نہیں، اپنے تئیں اُن کے حسنِ ظن پر محمول کرتا ہوں۔ اور یہ اعتراف سنجیدگی اور خلوص سے کرتا ہوں کہ میں صرف طالبِ علم

ڑ نورالحسن ہاشمی سے پڑھا اور اپنے بزرگ
ستوں عبدالقادر سروری مرحوم اور سید
لدین قادری زورؔ مرحوم اور سید بشیرالدّین
وم کو جس بات پر اصرار کرتے دیکھا وہ یہ ہے
انوی مآخذ پر بحالتِ مجبوری قناعت کی جائے۔
ی مآخذ کیسا ہی اور کتنا ہی معتبر کیوں نہ ہو،
ل مآخذ سے ضرور رجوع کرنا چاہیے۔ یہاں
ث خاقانی کے شعروں سے تھی۔ چنانچہ خاقانی
سب سے معتبر نسخہ دیکھا گیا (تفصیل فروری ۸۹ء
ے شمارے میں ہے)۔ "معیارالاشعار" میں جن
و شعروں کو قصیدے کا جزو بتایا گیا ہے، وہ
صیدے میں نہیں ہیں، اگرچہ اس زمین میں
صیدہ ہے۔ اسی زمین میں غزل بھی ہے، اور
رہ قصیدے کا حصہ نہیں ہے، اپنا آزادانہ
جود رکھتی ہے۔ جس قرأت کی بنیاد پر عروضی
حث چھڑی، وہ محرّف ہے۔ میرا خیال تھا کہ
ڈاکٹر گیان چند ناراض ہونے کے بجائے
اس بات کا خیر مقدم کریں گے کہ اُردو والوں
کے لیے صدیوں سے خاقانی کے کلام کی جو غلط
قرات، عروضی نظریات کا حصہ بن گئی تھی
اس کی نشاندہی اس حقیر نے کی۔ محقق طوسی
سے جو تسامح ہوا، یا "معیارالاشعار" میں جو نادرست
قرأت در آئی، وہ ٹھیک کیسے ہوتی اگر ...
"محقق جیسے مصنّف کی شعری مثالوں کو دیوان
سے ملاکر" نہ دیکھا جاتا۔ میرے عزیز اور کرم فرما
ڈاکٹر گیان چند مجھے معاف فرمائیں گے کہ محقق
طوسی یا کسی پر بھی، کسی اور کے شعر کی قرأت
کے لیے بھروسہ کرنا عقیدت مندی نہیں، سہل
انگاری ہے، اور "سہل انگاری" وہ رویّہ ہے
جو اُن کے مرتبے کے محقق اور نقّاد کا نہیں
ہوسکتا۔ "سہل انگاری اور تحقیق" دو ایسے متوازی
خط ہیں، جو اُفق پر جاکے بھی نہیں ملتے۔

فیضی کا ایک شعر غبارِ خاطر میں ابوالکلام
آزادؔ نے یوں لکھا ہے (مکتوبِ سفر[۴]):

کس نمی گویدم از منزلِ آخر خبرے
صد بیاباں بگذشت و دگرے در پیش ست

"شعرالعجم" میں شبلی نے اس قرأت کے ساتھ
یہ شعر لکھا ہے:

کس نمی گویدم از منزلِ اوّل خبرے
صد بیاباں بگذشت و دگرے در پیش ست

اگر یہ نہ معلوم ہو کہ شبلی نے پہلے مصرع میں "منزلِ
اوّل" لکھا ہے، تو کیا فیضی پر لکھتے وقت ابوالکلام
آزادؔ کا مصرع جوں کا توں نقل کر دینا ذمّہ داری
کا کام ہوگا؟ اب اگر ابوالکلام آزاد اور شبلی
نعمانی، دونوں کی قرأتیں سامنے ہیں تو کیا
فیصلہ اس سے ہوگا کہ ہمیں ابوالکلام سے زیادہ
عقیدت ہے، یا شبلی سے؟ فیضی کے شعر کا حوالہ
دینا ہے، تو فیضی کا دیوان دیکھنا محقق یا نقّاد
کا اخلاقی فرض ہے۔ اگر ایسا نہ کیا تو یہ ادبی
دیانت کے منافی ہوگا۔

غبارِ خاطر میں اور شعر بھی ایسے مل
جائیں گے۔ بیدل کے ایک مطلع اور ایک
شعر میں تو ردیف ہی بدل گئی ہے (اور یہ
دو شعر بھی اسی خط میں ہیں):

بیداریِ میانِ دو خواب ست زندگی
گردِ تخیّلِ دو سراب ست زندگی

از لطمۂ دو موج حبابے دمیدہ است
یعنی طلسمِ نقش بر آب ست زندگی

ابوالکلام کا حافظہ یقیناً اچھا تھا۔ بیدل کے
اشعار کا مفہوم، بیدل ہی کے الفاظ میں اُن
کے ذہن میں رہا، لیکن یادداشت نے ایک
چہل کی۔ کیا ہم حق بجانب ہوں گے کہ ابوالکلام
آزادؔ جیسے مصنّف کے شعری حوالوں کو دیوان
سے ملائے بغیر" علمی مباحث میں پیش کریں۔
میں لاکھ اعتراف کروں کہ میں نے کلیاتِ بیدل
نہیں دیکھا[۵] یا یہ کہ فارسی ادب کبھی میرا موضوع
مطالعہ نہیں رہا، میں نے کبھی فارسی کے کسی
ادیب پر کوئی مضمون نہیں لکھا، لیکن اگر مجھے
عروض کے سلسلے میں بیدل کے یہ دو شعر پیش
کرنا ہیں، تو کلیاتِ بیدل دیکھنا میرا فرض
ہو جائے گا۔ کلیاتِ بیدل میں یہ مطلع اور
شعر یوں ہیں:

بیداریِ میانِ دو خواب ست، ہستیم
گردِ تخیّلِ دو سراب ست، ہستیم

از لطمۂ دو موج حبابے دمیدہ است
یعنی طلسمِ نقش بر آب ست ہستیم

مثالوں کی کمی نہیں، "غبارِ خاطر" ہی میں اتنی ہیں کہ
ایک رسالہ لکھا جا سکتا ہے۔ محرّف قرأت کے
علاوہ، شعروں کا نادرست انتساب بھی ہے۔ عرض
کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قدر بلگرامی کی قواعدالعروض
کی مثال کو جو محقق کی کتاب سے نقل بمطابق اصل

---

[۵] یہ صرف بحث کے لیے عرض کیا جا رہا ہے۔ میرے پاس کلیاتِ بیدل کا وہ نسخہ تھا، جس پر میاں داد خاں سیّاح کا لکھا ہوا دیباچہ تھا، اور جو مجتبائی پریس بمبئی نے پچھلی صدی میں چھاپا تھا۔ "بیاضِ غالب" میں "عالم ہمہ افسانۂ ما باشد و ما ہیچ" تھا سوداؔ نے "دارد" لکھا تھا۔ یہ ۱۹۶۹ء کی بات ہے میں نے سری نگر (کشمیر) سے مالک رام کو ساہتیہ اکادمی فون کیا، انھوں نے تصدیق کی کہ افغانستان میں چھپے ہوئے نسخے میں "دارد" ہے۔ (کمال)

(منتہی العروض، ص ۱۸)۔ 'عام حقیقی' اور 'عام مجازی' کا فرق بہت اہم ہے۔ اگر 'رفع' کو عام زحاف کے زمرے میں رکھا جائے گا، تو وہ 'عام حقیقی' نہیں، بلکہ 'عام مجازی' ہوگا۔ جن عروضیوں نے اسے عروض ضرب کے لیے جائز بتایا ہے، اُن سے تسامح ہوا ہے۔

⑤ مستفعلُن فاعلن، مفتعلُن فاعلن اور مفاعلن فاعلن کی تکرار کے آہنگ، مرکب بحر، بسیط کے تحت آتے ہیں۔ عروض کی کسی مستند کتاب میں پہلے دو آہنگ رجز کے تحت، اور تیسرا آہنگ ہزج کے تحت نہیں ملے گا۔ اگر کسی کتاب یا رسالے میں ایسا ہے، تو وہ میری نظر سے نہیں گزرا۔

ایک عجیب اور دلچسپ بات ہے۔ رجز میں 'فاعلان' مرفوع مذیل ہے، اس لیے مستفعلُن فاعلان یا مفتعلن فاعلان کی تکرار کا آہنگ رجز کے تحت آسکتا ہے۔ اسی طرح مفعول فاعلان اور مفاعلن فاعلان کی تکرار کے آہنگ بھی ہزج کے تحت آسکتے ہیں کیوں کہ فاعلان ہزج میں اشتر مسبغ ہے۔

بات علمی سطح پر ہو، تو حوالوں کی اتنی اہمیت نہیں رہتی۔ 'منقول' کی اہمیت ہوتی ضرور ہے، لیکن اگر 'منقول' اور 'معقول' میں تضاد ہو، اور دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہو تو؟ —— فیصلہ میں ڈاکٹر گیان چند پر چھوڑتا ہوں، کیوں کہ جب وہ خود اپنی بے جا وکالت نہیں کرتے تو زائدالمیعاد یا نادرست اقوال کو کسوٹی پر پرکھنے کو "خطائے بزرگاں گرفتن" نہیں سمجھیں گے۔

ڈاکٹر گیان چند نے جو صراحتیں اور [illegible]

کچھ عرض نہیں کرنا ہے۔ البتہ ایک بات، جس کی اُن سے توقع نہیں تھی، پڑھ کر ذہن کو شدید جھٹکا لگا:

"محقق نے اُنھیں قصیدے کے اشعار کہا ہے۔ یہ مطالبہ زیادتی ہے کہ محقق جیسے مصنف کی شعری مثالوں کو شاعروں کے دیوان سے ملاکر دیکھا جائے۔ میں کوئی خاقانی پر تحقیق نہیں کر رہا تھا۔ کمال صاحب خاقانی کے عالم ہیں[1]۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے کبھی دیوانِ خاقانی نہیں دیکھا۔ فارسی ادب کبھی میرا موضوع مطالعہ نہیں رہا۔"

ڈاکٹر گیان چند نے غیر معمولی جرأت سے یہ اعلان کیا ہے۔ اپنے بارے میں ایسا اعلان صرف ایک محقق اور ایک عالم ہی کرسکتا ہے۔ جو کچھ موصوف نے لکھا ہے، شک تو وہی مجھے بھی تھا۔ شک کی بنیاد غیر مستحکم بھی ہوسکتی ہے۔ اس لیے اسے میں نے معروضی حقیقت نہیں، اپنا داخلی تاثر سمجھ کر نظر انداز کردیا، اور نوکِ قلم پر اسے نہیں آنے دیا، کیوں کہ موصوف محترم نے مثال میں جو فارسی کے مصرعے پیش کیے تھے، ان کی قرأت نادرست تھی۔ میں چوں کہ اُن کو اس عہد کے سربرآوردہ محققوں میں سے سمجھتا ہوں، اس لیے اپنی اطلاع کے لیے اور قارئین کی اطلاع کے لیے یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ یہ مطالبہ زیادتی کیوں ہے کہ محقق جیسے مصنف کی شعری مثالوں کو دیوان سے ملاکر دیکھا جائے؟ موصوف محترم مجھ سے زیادہ یہ بات جانتے ہیں کہ تذکروں میں اندراجات غلط ہیں، الحاقی عبارتیں جگہ پا گئی ہیں، کتابت کی غلطیاں ہیں۔ ترجموں میں شعروں کا غلط اندراج ہے، وغیرہ وغیرہ۔" زرِ کامل عیار" میں مظفر علی اسیر نے "معیار الاشعار" کا متن اور اس کے ساتھ سعداللہ کا حاشیہ بھی دیا ہے اور نہ صرف ترجمہ کیا ہے بلکہ جہاں ضروری سمجھا، تشریح بھی کی ہے۔ خواجہ نصیرالدین محقق طوسی کی کتاب اغلاط سے پاک نہیں تھی۔ مقدمے میں اسیر کا یہ جملہ توجہ چاہتا ہے۔ "معلوم ہوا کہ بعض مقامات کتاب [illegible] صحت سے بھی رہ گئے ہیں۔" اگر اسیر یہ نہ بھی لکھتے تو متن کو اغلاط اور غلط انتساب یا الحاقی عبارتوں سے پاک نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔ بعض مقامات کے سلسلے میں جو شکوک مجھے ہیں، ان کے بارے میں لکھا بھی ہے اور تحقیق بھی کر رہا ہوں۔ آخر اگر 'منقول' میں کوئی کھوٹ ہے، تو وہ اسے چومنے اور آنکھوں سے لگانے سے تو دُور ہوگی نہیں۔ صدیوں سے یہ مثال 'محقق' کی کتاب سے نقل ہوتی چلی آرہی ہے، اور خاقانی پر اتّہام تھوپا جارہا ہے۔ ہر ناقل، ڈاکٹر گیان چند کی طرح محقق کا عقیدت مند تھا۔ عقیدت مند میں بھی ہوں، لیکن تحقیق کے سلسلے میں جو سبق میں نے اپنے والد (ڈاکٹر محمد احمد صدیقی مرحوم و مغفور) اور استاذہ سراج لکھنوی، سید احتشام حسین مرحوم اور

---

[1] اسی مضمون میں ڈاکٹر گیان چند نے لکھا ہے:
"حیرت ہے کہ میں نے ازراہِ قدر شناسی اُن کی طرف روئے سخن کیا۔ وہ اسے تعریض و تضحیک سمجھے۔ چوں کہ تحریر میں قائل کے لہجے کی صحیح نمائندگی نہیں ہوتی۔ اس لیے غلط فہمی کا امکان رہتا ہے۔" اگر یہ جملہ نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ میں اسے طنز پر نہیں، اپنے تئیں اُن کے حسنِ ظن پر محمول کرتا ہوں۔ اور یہ اعتراف سنجیدگی اور خلوص سے کرتا ہوں کہ میں صرف طالب علم ہوں۔ (کمال)

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی سے پڑھا اور اپنے بزرگ دوستوں عبدالقادر سروری مرحوم اور سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم اور سید بشیر الدین مرحوم کو جس بات پر اصرار کرتے دیکھا وہ یہ ہے کہ ثانوی مآخذ پر بحالتِ مجبوری قناعت کی جائے۔ ثانوی مآخذ کیسا ہی اور کتنا ہی معتبر کیوں نہ ہو، اصل مآخذ سے ضرور رجوع کرنا چاہیے۔ یہاں بحث خاقانی کے شعروں سے تھی۔ چنانچہ خاقانی کا سب سے معتبر نسخہ دیکھا گیا (تفصیل فروری ۸۹ء کے شمارے میں ہے) "معیارالاشعار" میں جن دو شعروں کو قصیدے کا جزو بتایا گیا ہے۔ وہ قصیدے میں نہیں ہیں، اگرچہ اس زمین میں قصیدہ ہے۔ اسی زمین میں غزل بھی ہے، اور وہ قصیدے کا حصہ نہیں ہے، اپنا آزادانہ وجود رکھتی ہے۔ جس قرأت کی بنیاد پر عروضی بحث چھیڑی، وہ محرّف ہے۔ میرا خیال تھا کہ ڈاکٹر گیان چند ناراض ہونے کے بجائے اس بات کا خیر مقدم کریں گے کہ اُردو والوں کے لیے صدیوں سے خاقانی کے کلام کی جو غلط قرأت، عروضی نظریات کا حصہ بن گئی تھی اس کی نشاندہی اس حقیر نے کی۔ محقق طوسی سے جو تسامح ہوا، یا "معیارالاشعار" میں جو نادرست قرأت در آئی، وہ ٹھیک کیسے ہوتی اگر ... "محقق جیسے مصنّف کی شعری مثالوں کو دیوان سے ملا کر" نہ دیکھا جاتا۔ میرے عزیز اور کرم فرما ڈاکٹر گیان چند مجھے معاف فرمائیں گے کہ محقق طوسی یا کسی پر بھی، کسی اور کے شعر کی قرأت کے لیے بھروسہ کرنا عقیدت مندی نہیں، سہل انگاری ہے، اور سہل انگاری، وہ رویّہ ہے جو اُن کے مرتبے کے محقق اور نقاد کا نہیں ہو سکتا۔ سہل انگاری اور تحقیق، دو ایسے متوازی خط ہیں، جو اُفق پر جا کے بھی نہیں ملتے۔

فیضی کا ایک شعر غبارِ خاطر میں ابوالکلام آزاد نے یوں لکھا ہے (مکتوب سفر۲۲):

کس نمی گوید م از منزلِ آخر خبرے
صد بیاباں بگذشت و دگرے درپیش ست

"شعرالعجم" میں شبلی نے اس قرأت کے ساتھ یہ شعر لکھا ہے:

کس نمی گوید م از منزلِ اوّل خبرے
صد بیاباں بگذشت ودگرے درپیش ست

اگر یہ نہ معلوم ہو کہ شبلی نے پہلے مصرع میں "منزلِ اوّل" لکھا ہے، تو کیا فیضی پر لکھتے وقت ابوالکلام آزاد کا مصرع جوں کا توں نقل کر دینا ذمہ داری کا کام ہوگا؟ اب اگر ابوالکلام آزاد اور شبلی نعمانی، دونوں کی قرأتیں سامنے ہیں تو کیا فیصلہ اس سے ہوگا کہ ہمیں ابوالکلام سے زیادہ عقیدت ہے، یا شبلی سے؟ فیضی کے شعر کا حوالہ دینا ہے۔ تو فیضی کا دیوان دیکھنا محقق یا نقاد کا اخلاقی فرض ہے۔ اگر ایسا نہ کیا تو یہ ادبی دیانت کے منافی ہوگا۔

غبارِ خاطر میں اور شعر بھی ایسے مل جائیں گے۔ بیدل کے ایک مطلع اور ایک شعر میں تو ردیف ہی بدل گئی ہے (اور یہ دو شعر بھی اسی خط میں ہیں):

بیداری میانِ دو خواب ست زندگی
گردِ تخیّلِ دو سراب ست زندگی

از لطمۂ دو موج حبابے دمیدہ است
یعنی طلسم نقش بر آب ست زندگی

ابوالکلام کا حافظہ یقیناً اچھا تھا۔ بیدل کے اشعار کا مفہوم، بیدل ہی کے الفاظ میں اُن کے ذہن میں رہا، لیکن یادداشت نے ایک جہل کی۔ کیا ہم حق بجانب ہوں گے کہ ابوالکلام آزاد جیسے مصنّف کے شعری حوالوں کو دیوان سے ملائے بغیر[1] علمی مباحث میں پیش کریں۔ میں لاکھ اعتراف کروں کہ میں نے کلیاتِ بیدل نہیں دیکھا،[1] یا یہ کہ فارسی ادب کبھی میرا موضوعِ مطالعہ نہیں رہا۔ میں نے کبھی فارسی کے کسی ادیب پر کوئی مضمون نہیں لکھا، لیکن اگر مجھے عروض کے سلسلے میں بیدل کے یہ دو شعر پیش کرنا ہیں، تو کلیاتِ بیدل دیکھنا میرا فرض ہو جائے گا۔ کلیاتِ بیدل میں یہ مطلع اور شعر یوں ہیں:

بیداری میانِ دو خواب ست ہستیم
گردِ تخیّلِ دو سراب ست ہستیم

از لطمۂ دو موج حبابے دمیدہ است
یعنی طلسم نقش بر آب ست ہستیم

مثالوں کی کمی نہیں، "غبارِ خاطر" ہی میں اتنی ہیں کہ ایک رسالہ لکھا جا سکتا ہے۔ محرّف قرأت کے علاوہ، شعروں کا نادرست انتساب بھی ہے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قدر بلگرامی کی قواعدالعروض کی مثال کو جو محقق کی کتاب سے نقل بمطابق اصل

---

[1] یہ صرف بحث کے لیے عرض کیا جا رہا ہے۔ میرے پاس کلیاتِ بیدل کا وہ نسخہ تھا۔ جس پر میاں داد خاں سیاح کا لکھا ہوا دیباچہ تھا، اور جو مجتبائی پریس بمبئی نے پچھلی صدی میں چھاپا تھا۔ "بیاضِ غالب" میں "عالم ہمہ افسانۂ ما باشد و ما ہیچ" تھا مسودانے 'دارد' لکھا تھا۔ یہ ۱۹۶۹ء کی بات ہے۔ میں نے سری نگر (کشمیر) سے مالک رام کو ساہتیہ اکادمی فون کیا، انھوں نے تصدیق کی کہ افغانستان میں چھپے ہوئے نسخے میں 'دارد' ہے۔ (کمال)

کے عمل سے ہوتی ہوئی آئی ہے کلیاتِ خاقانی سے زیادہ اہم ماخذ خاقانی کے شعر کے لیے تصور نہ کیا جائے۔

اب ایک نہایت اہم عروضی نکتہ۔ اقبال کے وہ دو شعر جنھوں نے ڈاکٹر گیان چند کے مضمون بلکہ مضامین کو عنوان فراہم کیا' اُن کے پہلے مضمون میں جس طرح چھپے تھے، اُن پر میں نے 'جہان' میں نون کے اعلان کا نہ ہونا اور 'لذتِ فراغ' میں کسرۂ اضافت کا ہونا نادرست بتایا تھا۔ صاحبِ مضمون نے ان دونوں کو کاتب کی تحریفیں بنایا ہے۔ میں اُن کے بیان کی صداقت تکلفاً نہیں کھلے دل سے تسلیم کرتا ہوں۔

پہلے وہ دو شعر:

کیوں کر نہ وہ جہان کو پیغامِ بزمِ راز دے
غافل مجھے خبر نہیں لذت فراغ میں ہے کیا

اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
غربت کے درمند کا طرزِ کلام اور ہے

میں نے ہر مصرع کے نیچے وزن "مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن" نقل کیا تھا' اور عرض کیا تھا کہ تیسرے مصرع میں دوسرا رکن مخبون مذال مفاعلان ہے۔ ڈاکٹر گیان چند نے میری غلطی کی نشاندہی کی ہے اور تیسرے مصرع کے دوسرے رکن کے مفاعلان کے بجائے مفاعلن لکھنا "غائب دماغی" کا نتیجہ بتایا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

"کمال صاحب نے لکھا ہے کہ جب نقل کردہ چاروں مصرعوں میں سے ہر ایک کا وزن مستفعلن مفاعلن مستفعلن مفاعلن ہی تھا' تو ہر مصرع کے نیچے ارکان لکھنے کے تکلف کی وجہ ؟ لیکن 'ہماری زبان' میں چاروں مصرعوں کے نیچے یہی ایک وزن کہاں لکھا ہے۔ دوسرے شعر کے پہلے مصرعے کا پہلا رکن اور دوسرے مصرعے کا تیسرا رکن مفتعلن چھپا ہے۔"

'ہماری زبان' دیکھا تو واقعی ایسا ہے۔ میں ڈاکٹر گیان چند کے بیان کی تصدیق کرتا ہوں۔ میری غلطی کی دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ اس زمانے میں پڑھنے کی عینک بٹوہ سمجھ کے کسی گرہ کٹ نے بس میں نکال لی تھی، اور میں کم نمبر کی پرانی عینک سے کام چلا رہا تھا۔ یہ قابلِ قبول جواز نہیں ہے اور اہم بھی نہیں۔ میں نے دراصل چاروں مصرعے مطوی مفتعلن کے بجائے سالم مستفعلن کے آہنگ میں مخبون مفاعلن (مخبون مذال مفاعلان) کے ساتھ پڑھے تھے۔ اور اب بھی مجھے اس بات پر اصرار ہے کہ چاروں مصرعوں میں پہلا اور تیسرا رکن مستفعلن ہے تقطیع یہ ہے (ڈاکٹر گیان چند نے 'اوروں' کو دوسرے واو کو بڑے مصوتے سے چھوٹا مصوتہ بنایا' یعنی ساقط کیا' 'میرا' کا الف بھی ساقط کیا' کیوں ؟)۔

کیوں کر نَ وہ (مستفعلن) جہان میں (مفاعلن) پیغامِ بز (مستفعلن) مِ راز دے (مفاعلن)۔

غافل مجھے (مستفعلن) خبر نہیں (مفاعلن) لذت فرا (مستفعلن) غ میں ہَ کیا (مفاعلن)۔

اوروں کَ ہے (مستفعلن) پیام اور (مفاعلان) مے را پیا (مستفعلن) م اور ہے (مفاعلن)۔

غربت کِ در (مستفعلن) دمند کا (مفاعلن) طرزے کلا (مستفعلن) م اور ہے (مفاعلن)۔

'ہماری زبان' میں اقبال کے دو فارسی شعروں کی (جس میں سے ایک مطلع ہے) قرا[ت] نادرست تھی۔ ڈاکٹر گیان چند نے اس [کی] میں درستی کر دی ہے۔ شعر یہ ہیں:

پیرہنِ وجودِ من چہ آتشِ جنوں گرفت
سینہ بہ برق درکنم' دیدہ بہ نیشتر ز[نم]

اے گُل چو خارِ آرزو' آزاد چوں رسی[م]
تو ہم زخاکِ ایں چمن' مانندِ ما دم[ی]

ڈاکٹر گیان چند نے ان اشعار [کے بارے] میں لکھا تھا: "ان غزلوں میں بھی وہی غیر [مترنم] زحافات استعمال کیے ہیں"۔ پہلا شعر رجز مثمن مخبون/مخبون مذال میں ہے' اور یہ نہایت [مترنم] بحر ہے۔ اس میں کوئی غیر مترنم زحاف ا[ستعمال] نہیں ہوا ہے مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفا[علن] مفتعلن مفاعلن مفتعلن مفاعلن۔ یہ وہی [بحر] ہے جس میں غالب کا یہ شعر ہے:

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے ت[ہی]
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا ک[ہ یوں]

حیرت ہوئی کہ ڈاکٹر گیان چند' جو شعر [کو] پڑھنے پر قدرت رکھتے ہیں' فارسی کا یہ شع[ر] کسی "غیر مترنم" آہنگ میں پڑھتے رہے [اس] کی تقطیع یہ ہے:

پیرہنے (مفتعلن) وجو دِ من (مفا[علن])
چاآتش اے (مفعولن) جنوں گرفت[...]
چہ آ تشے (مستفعلن)

سی نَ بَ بر (مفتعلن) قِ درکنم
دی دَ بَ نے (مفتعلن) شتر زنم (مفاعلن)

پہلے مصرعے میں پہلا رکن مفتعلن ہے' لیکن [دوسرا] رُکن تسکینِ اوسط سے مفعولن ہے مستف[علن] بھی تقطیع ہوتی ہے۔

دوسرا شعر رجز مثمن سالم مخبو[ن]

اے گل بجُ خا (مستفعلن) رآرزو (مفاعلن)
آزاد چوں (مستفعلن) رسیدٌ ای (مفاعلن)۔
تو ہم زِ خا (مستفعلن) کِ ایں چمن (مفاعلن)
بند ما (مستفعلن) دمیدٌ ای (مفاعلن)۔

ڈاکٹر گیان چند نے تحریر فرمایا ہے:

"میرا بنیادی استفسار یہ تھا کہ کیا کسی کتاب میں اس وزنِ مخصوص میں مفتعلن کی جگہ مستفعلن لانے کی اجازت ملتی ہے؟ اور کیا اس کی مثال میں کوئی شعر ملتا ہے؟ مجھے دونوں میں سے کسی کا جواب نہ تھا۔ کمال صاحب نے عروض کی کسی کتاب سے اس کا جواز تو نہیں دیا، لیکن خاقانی کے یہاں سے میری مفید مطلب ایک بات درج کر دی ہے۔"

شاعری پہلے ہے، اور عروض بعد میں ہے۔ جس طرح زبان پہلے ہے، اور قواعد بعد میں۔ زبان بدلتی رہتی ہے، اور قواعد کے اصول وہی پرانے رہتے ہیں۔ پرانے قواعد کی زبان مر جاتی ہے۔ اور یہ بات ڈاکٹر گیان چند شاید مجھ سے زیادہ جانتے ہیں، اس لیے میں کلاسیکل زبانوں کی مثالیں نہیں دوں گا۔ عروض میں بھی شعرا کے طریق کے مطابق تبدیلیاں ہونی چاہئیں۔ جو اصول زائد المیعاد نہیں ہوتے، وہ اچھی اور مفید روایت کی طرح باقی رہتے ہیں۔ محقق طوسی نے ہزج میں مسبغ رکن مفاعیلان کو سالم بحر کی مثمن اور مربع ہیئتوں میں لانے کی ممانعت کی کہ اس سے شعر دائرے کے باہر ہو جاتا ہے۔ اگر یہ بات 'ہزج' کے لیے درست تھی، تو 'رمل' اور 'رجز' کے لیے بھی درست ہونا چاہیے تھی کیوں کہ تینوں کے افاعیل کی تالیف ایک وتد مجموع اور دو اسباب خفیف سے ہوتی ہے۔ لیکن انھوں نے 'رمل' اور 'رجز' میں منع نہیں کیا، اور ہزج میں، مثمن کینڈے میں مفاعیلان آخری رکن حافظ کے یہاں ہے۔ ایک غزل تو ایسی بھی ہے کہ اس کی ردیف کی وجہ سے ہر ضرب میں مفاعیلان واقع ہوتا ہے۔ حافظ کا یہ مشہور شعر تو اُن کے ذہنوں میں ضرور ہوگا جنھیں فارسی شاعری سے ذرا بھی مس ہے:

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنارِ آبِ رکن آباد و گلگشتِ مصلیٰ را

پہلے مصرعے کا آخری رکن 'یافت' کے 'ت' کی وجہ سے مفاعیلن نہیں، مفاعیلان ہے۔

ایک صاحب نے، جو خیر سے عروض کے اُستاد بھی ہیں، اپنی کتاب میں رکن سالم میں زحاف تسبیغ اور اذالہ نادرست قرار دیے، اور یہ لکھا کہ ان زحافوں کا عمل صرف مزاحف ارکان پر ہوتا ہے، سالم ارکان پر نہیں۔ محقق طوسی کی کتاب کا ترجمہ ہو چکا ہے، لیکن موصوف نے اسے بھی نہیں پڑھا۔ محقق نے صرف ہزج مثمن اور مربع سالم میں مفاعیلان لانے کو منع کیا تھا۔ موصوف نے کسی سے سُنا اور سمجھے بغیر ایسا لکھ مارا۔ اس کے بارے میں میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں، اس لیے یہاں صرف تو جہ دلا رہا ہوں کہ شعرا کے طریق سے عروض کے اصول وضع ہوتے ہیں۔ میں ڈاکٹر گیان چند کے اس خیال سے اتفاق کرتا ہوں، جس پر انھوں نے مضمون ختم کیا ہے:

"اُردو شعرا نے فارسی شعرا کے متعدد مختارات کو قبول نہیں کیا۔ انھوں نے فارسی کے بہت سے اوزان کو نہیں لیا، اور ہندی کے کئی اوزان کو استعمال کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ اہم نہیں کہ عربی اور فارسی کتب عروض میں کن کن زحافوں کی اجازت دی گئی ہے۔ اہم یہ ہے کہ ہم یہ پرکھیں کہ وہ زحافات اُردو کے احساس آہنگ سے مطابقت رکھتے ہیں یا نہیں۔"

اس بیان میں ڈاکٹر گیان چند نے ان ہندی اوزان کی نشاندہی نہیں کی، جو قبول کیے گئے اُردو شعرا نے اپنائے۔ اس کے بارے میں وہ کہیں گے تو ان کے خیالات سے استفادہ کرنے کا موقع ملے گا۔ ہاں انھوں نے ایک سوال کا جواب میرے ذمے ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ خاقانی کے یہاں سے مختلف مزاحف کے خلط کی مثال تو میں نے دی، لیکن عروض کی کتاب سے اس کا جواز نہیں دیا۔ پہلی بات تو میں یہ عرض کر دوں کہ میں عروض کی کتب سے حافظ، خاقانی، سعدی، فردوسی، جامی، خسرو، نظامی، عرفی، نظیری، طالب کلیم، سودا، میر اور غالب کے طریق کو زیادہ اہم سمجھتا ہوں۔ اس لیے جو نظیر پیش کی گئی ہے، وہ اسناد میں کسی بھی قواعد العروض اور ترجیح سخن پر بھاری ہے۔ یہ عرض کر دینے کے بعد اب کچھ علم سینہ کے ابتدائی سباق دہرا دوں، جو نصف صدی پہلے مجھے پڑھائے گئے تھے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ عربی عروض میں رکن سالم اپنی قلمرو میں حکمران ہوتا ہے، صدر ہوتا ہے۔ صدر و مطلع، حشو اور عروض و ضرب میں ہر مزاحف کو مثال کر اس کی جگہ خود لے سکتا ہے۔ مخبون اور مطوی کا خلط ہو سکتا ہے۔ مسبغ/مذال کا خلط ان مزاحف کے ساتھ ہو سکتا ہے، جن میں مرکب زحاف کی حیثیت سے یہ شامل ہیں۔ مقصور اور محذوف اور اسی طرح موقوف اور مکسوف کا خلط ہوتا ہے۔ عربی میں اس کی بھی اجازت ہے کہ ہزج میں ایک مصرع اخرم (مفعولن) سے شروع ہو اور دوسرا سالم (مفاعیلن) سے۔ اُردو نے یہ آہنگ قبول نہیں کیا۔ محقق طوسی نے "معیار الاشعار" میں عروض کی تعداد ضربوں سے

مختلف بتائی ہے۔ اُردو کے نظام نے یہ بھی قبول نہیں کیا۔ صرف رملِ مخبون صدر/مطلع میں سالم رکن سے بدلا جاتا ہے۔ یعنی فعلاتن کے ساتھ فاعلاتن کا خلط صرف صدر و مطلع میں رائج ہے، وہ بھی مخبون میں۔ رملِ سالم میں، مخبون رکن کا خلط نہیں ہو سکتا۔ تسکینِ اوسط عام زحاف ہے۔ لیکن اس کی کارفرمائی 'رملِ مخبون کے عروض و ضرب' میں اور ہزج میں رباعی کے علاوہ کچھ اور تالیفوں (مفعول مفاعلن فعولن/فعولان) میں خوش آہنگ لگتی ہے۔ فعلاتن اور مفتعلن تسکینِ اوسط سے مفعولن کے ہم وزن ہو جاتے ہیں۔ صرف مثالوں کے لیے ناسخ اور یگانہ وغیرہ نے اور صرف اپنی عروضی بصیرت واضح کرنے کے لیے اکا دکا شعر ایسے کہے:

ناسخ قول ہے بجا حضرتِ میر درد کا
(ناسخ)

اور:

شادیِ مرگ ہو گئے عید کے دن نماز میں
(یگانہ)

"ڈاکٹر گیان چند سے معذرت" اور پُرخلوص معذرت کے ساتھ میں ان کے ۸ جنوری ۹۸۸ کے "ہماری زبان" میں چھپے مضمون کی طرف واپس آ رہا ہوں۔ اُن کے مضمون کا یہ حصہ توجہ چاہتا ہے، جس میں انھوں نے یاس یگانہ چنگیزی کا اقتباس "چراغِ سخن" سے دیا ہے:

"بحرِ رجز میں خبن، طے، رفع، تسکین سے ہر جگہ پر کام لیا جا سکتا ہے۔ رکنِ مرفوع کے جواز کے ثبوت میں مرزا اوج صاحب مرحوم و مغفور نے "مقیاس الاشعار" میں یہ شعر پیش کیا ہے:

پیام کردہ است برمن بوالہوسے طنطنے
مفاعلن مفتعلن مفتعلن فاعلن

گر تو بمدرح ملکاں نہ از قیاس منے
مفاعلن مفتعلن مفاعلن فاعلن

پہلا مصرع "ہماری زبان" میں سہوِ کتابت سے "پیام کردرست برمن بوالہوسے طنطنے" ہو گیا تھا۔ اس قرأت کی وجہ سے فہم سے بالاتر تھا۔ صاحبِ شعر کا نام درج نہیں ہے، اس لیے "چراغِ سخن" اور یاس یگانہ کے حوالے کے باوجود میں اس وقت تک اس کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے خود کو معذور مانتا ہوں، جب تک صاحبِ شعر کی مستند کتاب میں اسے خود نہ دیکھ لوں۔ ڈاکٹر گیان چند قدر بلگرامی کی "قواعد العروض" مرزا اوج کی "مقیاس الاشعار" اور یاس یگانہ چنگیزی کی "چراغِ سخن" کو عروض کی مستند ترین کتابیں تصور فرماتے ہیں۔ میں بدقسمتی سے موصوف کے اس تاثر میں شریک نہیں ہوں۔ "قواعد العروض" میں خاقانی سے جو اشعار منسوب کیے گئے ہیں (اور جو محقق کی "معیار الاشعار" سے نقل کیے گئے ہیں) اُن کے بارے میں حقیقت عرض کی جا چکی ہے۔ صرف اسی کی وجہ سے "قواعد العروض" پایۂ اعتبار سے گر جاتی ہے۔ کم از کم "مستند ترین" کے درجے میں نہیں رہتی۔ اب جوہر مراد آبادی تلمیذِ امیر مینائی کی کتاب "جواہر العروض" کے مستند مآخذ ہونے کے بارے میں بھی کچھ عرض کر دوں، کہ ڈاکٹر گیان چند نے ۸ جنوری ۹۸۸ کے مضمون میں اس سے بھی سند پیش کی ہے۔ اقتباس:

"اقبال متعدد مقامات پر مفتعلن کی جگہ رکنِ سالم مستفعلن لائے ہیں۔ کیا اس کا جواز ہے؟ مجھے رجز مثمن مطوی مخبون کے سلسلے میں ایسی کوئی تائید نہ مل سکی۔ ہاں اس سے بہت مماثل بحرِ منسرح کے وزن میں ملتی ہے۔ منسرح سالم کا وزن ہے:

مستفعلن مفعولاتُ مستفعلن مفعولاتُ

اس کا مطوی مکسوف وزن مفتعلن فاعلن مفتع فاعلن ہے۔ مطوی موقوف[1] وزن میں فاعلن کی جگہ فاعلات[2] آئے گا۔ جوہر مراد آبادی، تلم امیر مینائی نے اپنی کتاب "جواہر العروض" لکھا ہے کہ اس میں مفتعلن کی جگہ، حسب مفعولن، مفاعلن نیز مستفعلن بھی آ سکت

خاقانی کی مثال:

کیست کہ پیغامِ من بہ شہرِ شرواں برد
مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن

یک سخن از من بداں مردِ سخنداں برد
مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن

گویا خاقیا[3] با این ہمہ آشوب چیست
مفعولن فاعلن مفتعلن فاعلات[2]

نہ ہر کہ گوید دو بیت نسبت بہ خاقاں برد
مفاعلن فاعلات[2] مستفعلن فاعلن

پچھلے مضمون میں جب اس طرف توجہ دلائی تھی کہ خاقانی کے شعر کی قرأت غلط ہے، او شعر خاقانی کے نام سے غلط منسوب ہوا۔ اور یہ کہ ڈاکٹر گیان چند کا تحقیق میں جو با ارفع منصب ہے، اس کے پیشِ نظر اُن۔ توقع کی جاتی تھی کہ کلامِ خاقانی کی تصدیق خاقانی سے کر لیتے۔ اس پر وہ برہم ہو گئے لکھا کہ یہ مطالبہ "زیادتی ہے"۔ اب انھیں طرف توجہ دلانے کی جرأت نہیں کروں گا۔ صر عرض کروں گا کہ یہ شعر بھی خاقانی کے نہیں ا علما کا کام اپنے مطلب کے حوالے دینا۔

---

[1] مفعولاتُ کا (کمال)
[2] فاعلات پہ تسکینِ ت، یعنی فاعلان (ک
[3] کذا

اور ہم جیسے طالب علموں کا کام ہے کہ یہ دیکھیں کہ جو خاقانی ہم نے پڑھا ہے، یہ اس کے شعر ہیں کہ نہیں۔

عبدالقادر رامپوری نے غالب سے ایک بار پوچھا کہ "حضرت آپ کا ایک مطلع ہماری سمجھ میں نہیں آیا"۔ غالب نے پوچھا "کون سا مطلع؟" تو عبدالقادر نے پڑھا:

پہلے تو روغنِ گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

اب اگر کوئی غالب شناس عروضی، کلامِ غالب کے طور پر اس کا تجزیہ کرے تو کیسا رہے؟ ایسا ہی کچھ خاقانی کے ساتھ "جواہر العروض" میں جوہر مرادآبادی تلمیذِ خاص حضرت امیر مینائی نے کیا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند نے اسے بھی کلامِ خاقانی مان لیا اور جو زیادتی جوہر مرادآبادی نے کی تھی، اس پر استناد کی سند لگادی۔ آخر گیان چند اس عہد کے سربرآوردہ عالم اور محقق ہیں۔ مجھے اُن کی خدمت میں چوتھائی صدی سے نیاز حاصل ہے۔ لیکن پچھلے مضمون میں شعر کی تصدیق کرنے کی بات پر برہم ہو چکے ہیں، اس لیے اُن سے شکایت بھی نہیں کروں گا کہ آخر آپ مجہول ماخذوں سے ہی کیوں حوالے دیتے ہیں؟

جواہر العروض میں انتساب کی طرح اشعار کی قرآت بھی غلط ہے۔ ایسی اغلاط والے اشعار عروض کی بحث کے لائق نہیں اپنے مشفق دوست ڈاکٹر گیان چند کی اس تادیب کے باوجود کہ "مستند" کتب میں درج قرآت کو شعرا کے دیوان سے ملانے کا مطالبہ یا روش زیادتی ہے، میں اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہوں، اور اگر یہ گستاخی ہے تو یہ مجھ سے سرزد ہوتی رہے گی۔ مجھے خوشی ہوتی کہ "معیار الاشعار" "قواعد العروض" "جواہر العروض" کی یہ اغلاط مجھ سے پہلے کسی نے بتائی ہوتیں، تاکہ جو وقت ان کے سمجھنے میں صرف ہوا کسی زیادہ مفید کام پر صرف ہوتا۔ خاقانی شروانی کا مستند نسخہ ڈاکٹر ضیاء الدین سجادی کا مرتب کیا ہوا ہے۔ اس میں یہ اشعار نہیں ہیں۔ پہلے مصرعے کا وزن جواہر العروض سے ڈاکٹر گیان چند نے یہ نقل کیا ہے:

مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن

یہ درست وزن نہیں ہے۔ تیسرا رکن سالم مستفعلن ہے۔

ڈاکٹر گیان چند اب بھی مطمئن نہیں ہیں، جو استدلال پہلے پیش کیا جا چکا ہے، اس سے ہٹ کر "جواہر العروض" سے اُن کی پیش کی ہوئی مثال کی طرف اُن کا دھیان لے جانا چاہتا ہوں۔ وہ غور فرمائیں کہ مفتعلن، مفاعلن اور فاعلن فاعلان، مفعولن، سارے مزاحف جب رجز میں فراہم تھے، تو جوہر مرادآبادی ان شعروں کو (غلط انتساب اور غلط قرآت کے باوجود) بحرِ منسرح میں کیوں لے گئے؟ صرف اس لیے کہ فاعلن عروض و ضرب میں نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند اگر محقق طوسی کو یاس یگانہ اور قدر بلگرامی سے کچھ بہتر عروضی سمجھتے ہیں تو "معیار الاشعار" میں رجز سالم اور مزاحف آہنگوں کے عروض و ضرب دیکھیں۔ "زرِ کامل عیار" (اترپردیش اردو اکادمی ایڈیشن) میں ص ۱۵۴ کی پہلی سطر سے ص ۱۶۳ کی آخری سطر تک رجز کا بیان ہے۔ عروض اور ضربوں کے بارے میں ان کا قول، قولِ فیصل اور اُن کا حکم ناطق ہے، اس ترمیم کے ساتھ کہ ہمارے یہاں عروض کے ارکان کی تعداد وہی ہے جو ضربوں کے ارکان کی "مقیاس الاشعار" میں اگر میرا اور ان کا وہی نظریہ ہے جو تجزیۂ سخن کے اقتباس میں پیش کیا گیا ہے۔ تو وہ اور میں کے ساتھ یاس یگانہ چنگیزی کا موقف مرفوع مزاحف کے عروض و ضرب کے سلسلے میں مسترد ہو چکا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ ایک طالب علم کو اس طرح قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہنا چاہیے لیکن یہ ایسا مسئلہ ہے کہ دوسری رائے ممکن نہیں۔

متبادل ارکان کے سلسلے میں ڈاکٹر گیان چند نے سوال اٹھایا تھا کہ رجز مطوی کے سلسلے میں انھیں کوئی تائید نہیں مل سکی۔ ہاں منسرح میں ایسی صورت ملی۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے جو سبق مجھے پڑھایا گیا تھا، وہ کچھ تو دہرا چکا ہوں، کچھ اور دہراؤں گا۔ مرکب بحریں، دو مختلف افاعیل کی ترتیب سے وجود میں آتی ہیں۔ جو اجازتیں مفرد بحروں میں ہیں، وہ اُن کے ارکانِ مزاحفہ کے لیے مرکب بحروں میں بھی ہیں، معاقبہ، مراقبہ اور مکانفہ کی شرائط اور پابندیوں کے ساتھ۔

مشفقی و محبی ڈاکٹر گیان چند کے پہلے مضمون کے لہجے کو میں نے غلط سمجھا تھا۔ اس کے لیے میں ایک بار پھر معذرت خواہ ہوں۔ لیکن اس کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ اہم عروضی نکات سامنے آئے، اور مجھے اپنے ناقص خیالات پیش کرنے کا موقع ملا۔ اگر ڈاکٹر گیان چند یا کسی اور عروض شناس کو میرے نظریات سے اختلاف ہے تو وہ اس کے خلاف مضمون لکھیں اگر مجھ سے اتفاق ہے تو مجھے ذاتی خط لکھیں۔

لوہ سوں/مترجم: ارشد مسعود ہاشمی

دوا

چین کے ژیجیانگ صوبے کے شاؤ ژنگ قصبے میں ۲۵ ستمبر ۱۸۸۱ء کو ژوژوانگ شو کی ولادت ہوئی جس کا نام بعد میں پوسائی تجویز کیا گیا۔ خود اس نے باشعور ہونے کے بعد اپنا نام 'شورن' منتخب کیا۔ مگر ۱۹۱۸ء میں اپنی پہلی کہانی اس نے 'لوہ سوں' کے نام سے شائع کروائی اور پھر وہ اسی نام سے مشہور ہوا۔

لوہ سوں جدید چینی ادب کا باوا آدم گردانا جاتا ہے۔ چین کی شعری اور ادبی تاریخ میں وہ ایک عظیم مصنف، مفکر اور انقلابی دانشور کی حیثیت سے معروف ہے۔ آدمی کی نجات اور آزادی اس کی منزل مقصود تھی۔ اس نے عین عالم جوانی میں ادب کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا اور وہ ظالمانہ رویّوں کے خلاف غیر مصالحانہ طور پر لڑتا رہا۔ ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو لوہ سوں چینی عوام کی بقا کی جد وجہد کرتے ہوئے فوت ہوگیا۔ زیرِ نظر کہانی جو براہِ راست چینی زبان سے اُردو میں منتقل کی گئی ہے، لوہ سوں کی نمائندہ کہانیوں میں ہے۔ اور سالہا سال پرانی ہوکر بھی عصری معنویت کی حامل ہے۔

یہ خزاں کی طلوع ہوتی ہوئی صبح تھی۔ چاند ڈوب چکا تھا لیکن سورج نہیں نکلا تھا۔ آسمان پر گہری نیلی چادر چھائی تھی۔ رات کو بھٹکنے والے کے سوا سبھی سوئے تھے۔ اچانک بوڑھا چوان بستر پر اٹھ بیٹھا۔ ماچس کی ایک تیلی رگڑ کر اس نے روغنی شمع روشن کی، جس سے چائے خانے کے دو کمروں میں زردی مائل سبز روشنی پھیل گئی۔

"کیا تم اب جا رہے ہو؟" ایک بوڑھی عورت کی نحیف آواز آئی اور ساتھ ہی اندر کے چھوٹے کمرے سے کھانسنے کی آواز آنے لگی۔

"ہونہہ" کپڑے تبدیل کرتے ہوئے بوڑھے چوان نے اس آواز کو سنا اور پھر اپنا ہاتھ عورت کی طرف بڑھاتا ہوا بولا ——

"مجھے دے دو۔"

تکیے کے نیچے سے تلاش کر عورت نے چاندی کے سکوں کی ایک تھیلی نکال کر اسے دی۔ بوڑھے چوان نے اسے جھپٹ کر اپنی جیب میں رکھا اور پھر اسے دو مرتبہ تھپتھپایا۔ کاغذی لالٹین جلا کر اس نے روغنی شمع کو بجھا دیا اور پھر وہ اندر کے کمرے میں گیا۔ ہانپنے کی آواز آئی اور پھر کھانسی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ خاموشی چھانے پر بوڑھا چوان میٹھی آواز میں بولا —— "بیٹے ..... اتم اٹھنا مت! دکان تمھاری ماں سنبھال لے گی۔"

اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ یہ سوچ کر کہ اس کا بیٹا سوچکا ہے وہ وہاں سے نکل کر گلی میں چلا آیا۔ تاریکی میں خاکستر سڑک کے علاوہ کچھ بھی واضح نہ تھا۔ اسے اِدھر اُدھر اونگھتے ہوئے کتّے ملے مگر اس کی آہٹ پاکر کوئی بھی نہیں بھونکا۔ کمرے کے مقابلے میں یہاں خنکی تھی۔ تاہم بوڑھے چوان کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کی خوابیدہ روح بیدار ہو اٹھی ہے۔ وہ خود کو دفعتاً جوان محسوس کرنے لگا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کے باطن میں کوئی حیرت ناک زندگی بخشنے والی قوت بھر گئی ہے۔ اس کے قدم تیز ہوگئے۔ رفتہ رفتہ سڑک صاف ہوتی گئی اور آسمان چمکیلا ہوتا گیا۔

چلنے میں منہمک بوڑھا چوان اپنے سامنے چوراہا دیکھ کر چونکا۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹ کر ایک دُکان کے بند دروازے کے سامنے اولتی کے نیچے کھڑا ہوگیا۔ کچھ لمحے کھڑے رہنے کے بعد اسے سردی محسوس ہونے لگی۔

"اونہہ —— بُڈھا بھلا مانس!"

"زیادہ ہی خوش باش لگتا ہے . . ."

اس نے سڑک پر بہت سے لوگوں کو آتے جاتے دیکھا۔ ان میں سے ایک رُک کر اسے غور سے دیکھنے لگا جب کہ وہ اسے واضح طور پر نہیں دیکھ پایا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں کسی فاقہ زدہ انسان کی مانند شہوت پرستی کی چمک تھی۔ روشنی کے لیے چوان نے لالٹین کو اُوپر اُٹھایا تب اسے علم ہوا کہ سردی سے ٹھٹھر کر وہ بجھ چکی ہے۔ اس نے اپنی جیب تھپتھپائی۔ سخت تھیلی اب بھی وہاں تھی۔

چوان نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اس کی نگاہوں نے بہت سے انجان اور انوکھے لوگوں کو دو اور تین کی مقدار میں یکجا ہوکر کھوئی ہوئی روح کی مانند بھٹکتے دیکھا۔ حالاں کہ جب اس نے غور کیا تو ان میں کوئی بھی انوکھی چیز اسے نہ ملی۔

کمرہ، مظفر پور ۸۴۲۰۰۱ (بہار)

ابھی اس نے سپاہیوں کو چہل قدمی کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان کے لباس پر آگے اور پیچھے موجود سفید گھیرے دُور ہی سے صاف نظر آرہے تھے، ان کے قریب آتے جانے پر اسے گہرا سُرخ کنارا بھی دکھائی پڑا۔ اب سڑک پر لوگوں کا ہجوم رواں دواں تھا۔ سپاہیوں کا گروہ چند قدم آگے جاکر چوراہے پر رُک گیا، پھر وہ سب نصف دائرہ بناکر کھڑے ہوگئے۔

بوڑھے جوان کو صرف ان کی پشت نظر آرہی تھی۔ اپنی گردنوں کو اکڑائے ہوئے وہ سب بطخوں کی مانند لگ رہے تھے، جنھیں کوئی غیر مرئی ہاتھ سنبھال رہا تھا۔ چند لمحوں تک سکوت طاری رہا۔ دفعتاً ایک چیخ سنائی دی اور تماشائیوں میں ہلچل پیدا ہوگئی۔ ایک گڑگڑاہٹ ہوئی اور ہجوم بوڑھے جوان کو پیچھے ڈھکیل کر اسے تقریباً گراتے ہوئے بھاگنے لگا۔

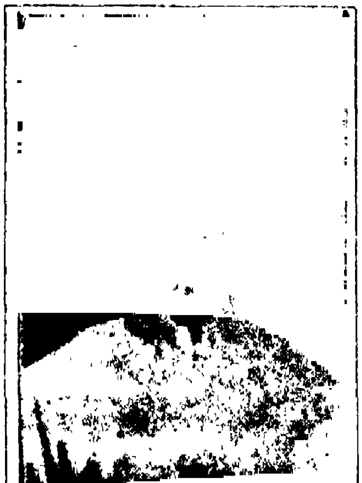
"ہے —— ! رقم مجھے دے دو! میں تمھیں چیزیں فراہم کروں گا —— !" سیاہ پوشاک میں ملبوس ایک شخص اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں نشتر کی مانند تھیں۔ جنھیں دیکھ کر بوڑھا جوان اپنی جگہ سکڑ گیا۔ سیاہ پوش نے اپنا ایک چوڑا پنجہ اس کے سامنے پھیلایا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک روٹی دبی تھی، جس سے بھاپ نکل رہی تھی اور قرمزی رنگت کے قطرے ٹپک ٹپک کر زمین میں جذب ہورہے تھے۔

بوڑھا جوان سکّوں کو ٹٹولتا ہے اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے تھیلی باہر نکالنا چاہتا ہے، مگر ہمت نہیں کر پاتا۔ وہ شخص بے صبر ہوکر چلایا: "کس بات کا خوف ہے؟ لیتے کیوں نہیں؟" بوڑھا جوان پھر بھی ہچکچاتا رہا۔

سیاہ پوش نے اس کی لالٹین چھین کر اس کے کاغذ کو پھاڑ ڈالا، پھر روٹی کو اس کاغذ میں لپیٹ کر اسے بوڑھے جوان کے کانپتے ہاتھ میں جبراً پکڑا دیا، اور اس کے سکّوں کو جھپٹ کر جھنجھناتے ہوئے چلا گیا

"بڈھا بے وقوف . . ."

یہ کس کی بیماری کے لیے ہے؟ بوڑھے جوان کو محسوس ہوا کہ کسی نے اس سے پوچھا ہے مگر وہ خاموش رہا۔ اس کا ذہن پوری طرح اس لفافے پر مرکوز تھا، جیسے وہ اس طرح



لوہ سوں

پکڑے تھا، مانو وہ کسی قدیم ریاست کا تنہا وارث ہو۔ اب کچھ نہیں ہوگا۔ وہ اس نئی زندگی کو اپنے گھر میں منتقل کرنے والا تھا، تاکہ کچھ خوشیاں میسّر ہوسکیں۔

سورج اپنی آب و تاب کے ساتھ اس عظیم پختہ سڑک کو چمکا رہا تھا، جو سیدھے اس کے گھر کو جاتی تھی۔ چوراہے پر اس کے پیچھے "قدیم شہ نشیں" کی تختی آویزاں تھی۔

○

جب بوڑھا جوان گھر پہنچا، دُکان کی صفائی ہوچکی تھی اور میبل کرسی سلیقے سے رکھے تھے، لیکن کوئی خریدار نہ تھا۔ صرف اس کا بیٹا دیوار کے قریب بیٹھا کھا رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں جھلملا رہی تھیں۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی کا ابھار دُور سے ہی نظر آرہا تھا اور اس کے مونڈھوں کی ہڈیاں بے حد ابھری ہوئی اور ایک دوسرے سے سٹی ہوئی تھیں۔ یہ سب دیکھ کر اس کی بھنویں سکڑ گئیں۔ اس کی بیوی متوقع نگاہوں کے ساتھ باورچی خانے سے دوڑتی آئی۔ تھرتھراتے ہونٹوں سے اس نے کہا:

"لے آئے؟"

"ہاں!"

وہ دونوں ساتھ ہی باورچی خانے میں گئے اور کچھ دیر صلاح مشورہ کرتے رہے۔ اس کی بیوی باہر آکر کنول کی ایک سوکھی پتّی لے کر اندر چلی گئی۔ اس نے اسے میز پر پھیلا دیا۔ چھوٹا جوان اپنا کھانا ختم کرچکا تھا۔ اس کی ماں نے سرعت سے کہا:

"ابھی بیٹھو چھوٹے جوان! ادھر مت آنا!"

انگیٹھی میں آگ جلاکر بوڑھے جوان نے سبز پلندہ اور سرخ و سپید لالٹین کے کاغذ کو اس میں ڈال دیا۔ ایک سرخی مائل سیاہ شعلہ لپکا اور ایک انوکھی خوشبو ساری دُکان میں پھیل گئی۔

"بڑی اچھی مہک ہے! کیا کھا رہے ہو تم؟" کوزپشت نے پوچھا۔ وہ ان میں سے ایک تھا جو اپنا سارا وقت چائے خانوں میں گزارتے ہیں، سویرے سب سے پہلے آنے والا اور سب سے اخیر میں واپس جانے والا

ب وہ گلی کے رخ پر رکھی میز پر بیٹھ چکا تھا۔ کسی نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔

"بھنے ہوئے چاول کا دلیا تو نہیں ہے؟"

اب بھی خاموشی طاری تھی۔ بوڑھا جوان ں کے لیے چاے لے گیا۔

"یہاں آؤ، چھوٹے جوان!" اس کی ان نے اسے اندر کے کمرے سے آواز دی کمرے ے وسط میں ایک نیائی رکھ کر چھوٹے جوان کو س پر بٹھادیا گیا۔ پھر اس کی ماں تھالی میں یک گول سیاہ شے لے کر اس کے پاس آئی ور پیار سے بولی

"اسے کھالو بیٹے —— پھر تم اچھے ہوجاؤ گے۔"

چھوٹا جوان اسے اٹھا کر غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے اندر مختلف النوع جذبات ابھرنے لگے جیسے وہ اپنے ہاتھوں میں اپنی ہی زندگی کو پکڑے ہوئے ہو۔ اب وہ ہشیاری سے اس کی تہیں کھولتا ہے۔ جھلسی ہوئی پپڑی سے سفید بھاپ خارج ہوکر پھیل جاتی ہے۔ جلد ہی وہ اس کی مہک کو بھول کر، اسے اپنے معدے میں منتقل کرلیتا ہے۔ خالی تھالی رہ جاتی ہے۔ اس کے ماں اور باپ بظاہر اپنی آنکھوں سے اسے کچھ دیتے ہوئے اور اس سے کچھ حاصل کرتے ہوئے اس کے دائیں بائیں کھڑے ہیں۔ اس کا چھوٹا سا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے سینے کو دبا کر پھر کھانسنا شروع کردیتا ہے۔

"چل کر ایک نیند سولو —— پھر تم بالکل اچھے ہوجاؤ گے۔" اس کی ماں نے کہا۔

چھوٹا جوان کھانستے ہوئے سونے کی کوشش کرتا ہے۔ عورت نے اس کی کھانسی تھمنے کے بعد اسے پیوند لگی رضائی سے ڈھانپ دیا۔

○

دکان میں کافی بھیڑ تھی۔ بوڑھا جوان بڑی سی تانبے کی کیتلی میں ایک کے بعد دوسرے گاہک کے لیے چاے بنانے میں مشغول تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سیاہ دائرے رقص کررہے تھے۔

"بوڑھے جوان! کیا تمھاری صحت اچھی نہیں ...؟ کیا ہوا تمھیں؟" سفید داڑھی والے ایک شخص نے پوچھا:

"کچھ نہیں ——"

"کچھ نہیں؟ —— نہیں، تمھاری مسکراہٹ کہتی ہے کہ کچھ نہیں ہے۔ ہاں ٹھیک ہے!" بوڑھے شخص نے اپنی ہی تردید کی۔

"یہ سب فقط اس لیے کہ وہ مشغول ہے۔" کوزپشت نے کہا۔ "اگر اس کا بیٹا..."

لیکن اس کی بات پوری ہونے سے قبل ہی ایک بھاری جبڑوں والا شخص چاے خانے میں داخل ہوا۔ اس نے کھلے بٹن کی گہرے بھورے رنگ کی قمیص پہن رکھی تھی جو کمر پر بندھی چوڑی گہرے بھورے رنگ کی پیٹی میں اڑسی ہوئی تھی۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ چیخ کر بوڑھے جوان سے بولا:

"اس نے کھالیا اسے؟ کوئی فائدہ —— قسمت تمھارے ساتھ ہے، بوڑھے جوان۔ کیا قسمت پائی ہے تم نے! اگر میں باتیں اتنی جلدی نہ جان لیتا ... !"

بوڑھا جوان، جو ایک ہاتھ میں کیتلی پکڑے تھا اور دوسرا ہاتھ اس کی عزت افزائی کے لیے سیدھا کیے تھا، سن کر مسکرایا۔ درحقیقت وہاں موجود سبھی اسے عقیدت سے دیکھ رہے تھے۔

بوڑھی عورت، جس کی آنکھوں کے سامنے بھی سیاہ دائرے محو رقص تھے، ایک پیالہ جس میں زیتون کی آمیزش والی چاے کی پتی تھی، لے کر مسکراتی ہوئی باہر آئی۔ بوڑھے جوان نے نئے آنے والے کے لیے پیالے میں ابلتا ہوا پانی انڈیل دیا۔

"یہ ایک مجرب علاج ہے۔ مجرب علاج! دوسری چیزوں کی طرح نہیں!" بھاری جبڑوں والے نے کہا —— "سوچو تو، جب خریدا تو گرم تھا اور گرم ہی کھاتے وقت بھی!"

"ہاں، یقینا! چچا کانگ کی عنایت کے بغیر یہ ناممکن تھا۔" بوڑھی عورت نے گرم جوشی سے اس کا شکریہ ادا کیا۔

"ایک مجرب علاج! یقینی علاج ——! اسی طرح گرم انسانی خون میں ڈوبی ہوئی یہ دوا۔ دق کا قطعی علاج!"

بوڑھی عورت لفظ 'دق' سن کر پریشان سی ہوگئی اور اس کے چہرے پر زردی چھانے لگی۔ وہ مسکراتی ہوئی کوئی عذر بنا کر وہاں سے ہٹ گئی۔ بھورے لبادے میں ملبوس شخص زور زور سے بولتا رہا، یہاں تک کہ چھوٹے جوان کی آنکھ کھل گئی اور اس نے کھانسنا شروع کردیا۔

"حسن اتفاق سے تمھارے ننھے جوان کی تقدیر اتنی اچھی ہے۔ مجھے یقین ہے، اس کی بیماری پوری طرح دور ہوجائے گی۔ کوئی تعجب کی بات نہیں اگر بوڑھا جوان مسکراتا ہے۔"

جب وہ بول رہا تھا، سفید داڑھی والا اس کے نزدیک آکر کھڑا ہوگیا، پھر دھیمی آواز سے اس نے کہا:

"محترم کانگ! میں نے سنا ہے کہ وہ مجرم جسے آج پھانسی دی گئی ہسیا خاندان کا

زندہ ہے۔ کون تھا وہ؟ اور حقیقتاً اسے پھانسی کیوں دی گئی ہے؟"

"کون! ہسیا کی چوتھی بیوہ بہو کا بیٹا! کون ــ جوان شرارتی!"

یہ دیکھ کر کہ اس کی باتوں کو سبھی دھیان اور احترام سے سُن رہے ہیں، کانگ کا جوش بڑھ گیا۔ اپنے جبڑوں کو پھیلا کر وہ زور زور سے بولنے لگا۔

"شیطان کا نطفہ! زندہ نہیں رہنا چاہیے تھا۔ بالکل نہیں! میرے لیے اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ حتیٰ کہ اس کے جسم سے اتارے گئے کپڑے بھی سُرخ آنکھوں والے جیلر نے لے لیے۔ ہمارا بوڑھا جوان سب سے زیادہ خوش قسمت اور اس کے بعد چچا ہسیا سوم! سارا انعام اس نے اپنی جیب میں رکھ لیا ــ چاندی کے پچیس چمکیلے سکے ــ اور ایک دمڑی بھی اس نے خرچ نہیں کی۔"

چھوٹا جوان دھیمی رفتار سے چلتا ہوا کمرے سے باہر آیا۔ وہ سینے کو ہاتھوں سے دبائے کھانستا جا رہا تھا۔ وہ باورچی خانے میں گیا۔ پیالے میں ٹھنڈا اُبلا ہوا چاول رکھ کر اس میں گرم پانی ملانے کے بعد بیٹھ کر اسے کھانے لگا۔ اس پر منڈلاتی رہنے والی اس کی ماں نے پوچھا:

"کیا تم بہتر محسوس کر رہے ہو بیٹے؟ ابھی پہلے جیسی ہی بھوک ہے؟"

"ایک قطعی علاج!" کانگ نے بچے کو دیکھا پھر مڑ کر لوگوں سے مخاطب ہو گیا۔ "چچا ہسیا سوم درحقیقت ہشیار ہے۔ اگر اسے خبر نہ ہوتی، اس کے سارے خاندان کو پھانسی دے دی جاتی اور ان کی دولت ضبط کر لی جاتی۔ لیکن سچ مچ یہ چاندی! وہ جوان شیطان کا بچہ! بد ذات! وہ جیلر کو بغاوت پر اکسا رہا تھا۔"

"ہاں ــ نہیں! اس کا طرزِ عمل!" پچھلی قطار میں بیٹھا ہوا بیس برس کا لڑکا برہم ہو کر بولا۔

"تمہیں معلوم ہے! سُرخ آنکھوں والا اسے پھانسی کے لیے لے جا رہا تھا، لیکن اس نے اس کے ساتھ گفتگو شروع کر دی۔ اس نے کہا کہ عظیم چینگ شاہی سلطنت سب ہم لوگوں سے ملتا ہے۔ ذرا سوچو، کیا یہی عقلمندی کا تقاضہ ہے! سُرخ آنکھوں والا جانتا تھا کہ اس کے گھر پر صرف بوڑھی ماں ہے، لیکن اس نے خود کو کبھی غریب نہیں سمجھا تھا۔ اسے جھنجھلاہٹ ہونے لگی اور وہ طیش میں آگیا۔ اس بیوقوف نے شیر کا سر کھجانے جیسا کام کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے دو طمانچے بھی کھانے پڑے۔"

"لال آنکھوں والا ایک اچھا مکے باز ہے۔ وہ طمانچے یقیناً شدید ہوں گے!" کونے میں دیوار کے نزدیک بیٹھا ہوا کوزہ پشت جھک کر بولا۔ "اسے مار کھانے کا خوف نہیں تھا!"

"اس قسم کے کمینے انسان کو مارنے میں افسوس کی کوئی بات نہیں۔" سفید داڑھی والے نے کہا۔

کانگ نے اس کی طرف نخوت سے دیکھا اور حقارت سے گویا ہوا۔

"تم غلط سمجھے! اس کے کہنے کے انداز سے صاف ظاہر ہے کہ اسے سُرخ آنکھوں والے پر افسوس ہے۔"

اس کے سامعین نے اس پر ایک پتھرائی ہوئی نظر ڈالی۔ سب خاموش ہو رہے۔ چھوٹا جوان چاول ختم کر چکا تھا۔ اس کا سارا جسم پسینے سے تر تھا۔

"سُرخ آنکھوں والے پر افسوس ــ ــ سودائی! وہ یقیناً پاگل ہی ہوگا!" سفید داڑھی والے نے یوں کہا جیسے اسے اچانک روشنی دکھائی دی ہو۔

"ہاں وہ یقیناً پاگل ہی ہوگا۔" بیس برس والے نے تائید کی۔

ایک بار پھر گاہکوں نے دلچسپی لی اور گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شور و غل کے درمیان کھانسی نے بچے پر دوبارہ غلبہ پا لیا۔ کانگ اس کے پاس گیا اور اس کے کاندھوں کو پکڑ کر بولا:

"ایک قطعی علاج! اس طرح مت کھانسو ننھے جوان۔ ایک قطعی علاج!"

"پاگل، سودائی!" کوزہ پشت نے اپنا سر ہلاتے ہوئے اقرار کیا۔

○

دراصل مغربی دروازے کے باہر فصیل شہر سے ملحق زمین عوامی تھی۔ مختصر مسافت کی غرض سے لوگ اس سے ہو کر گزرتے، جس کی وجہ سے اس میں ٹیڑھے میڑھے راستے بن گئے جو اب قدرتی لگتے ہیں۔ یہ عوامی قبرستان ہے۔ اس راستے کی بائیں طرف پھانسی دیے گئے مجرم یا قید کی سختی سے مر جانے والے دفن کیے جاتے ہیں۔ راستے کی دائیں طرف مفلسوں اور محتاجوں کی قبریں ہیں۔ راستے کے دونوں جانب قبر کے ٹیلوں کی سلسلہ وار ترتیب کسی امیر کی پیدائش کے دن کی خوشی میں بنے ہوئے شیر مالوں جیسی تھی۔

اس برس چنگ منگ تیوہار جس میں لوگ ان قبروں پر حاضری دیتے ہیں، غیر معمولی طور پر سرد رہا۔ بید مجنوں سے چاول کے دانے سے بھی چھوٹے کونپل پھوٹے تھے۔

تڑکا ہوتے ہی بوڑھے چوان کی بیوی چار ڈونگے اور ایک پیالہ چاول لے کر آئی۔ پھر داہنی جانب کی ایک نئی قبر پر اسے رکھ کر وہیں بیٹھ کر گریہ وزاری کرنے لگی۔ کاغذی نوٹوں کو جلا دینے کے بعد وہ مدہوش سی ہوکر قبر سے لپٹ گئی، جیسے اسے کسی چیز کا انتظار ہو، مگر کس کا، یہ خود اسے بھی نہیں معلوم تھا۔ ہوا کی خنک لہروں سے اس کے بال، جو یقیناً پچھلے برس سے زیادہ سفید تھے، الجھنے لگے۔

خاکستری بال اور چیتھڑوں میں ملبوس ایک دوسری عورت راستے پر آتی دکھائی دی۔ وہ ایک پرانی اور گول سُرخ لاکھ کی ٹوکری اور کاغذی نوٹوں کی لڑی کے ساتھ رُک رُک کر چل رہی تھی۔ جب اس نے بوڑھے چوان کی بیوی کو قبر کے نزدیک بیٹھ کر اپنی طرف دیکھتے پایا تو وہ تذبذب میں پڑ گئی اور اس کے زرد چہرے پر شرم پھیل گئی، تاہم وہ سر جھکا کر بائیں طرف کی ایک قبر تک گئی، جہاں اس نے اپنی ٹوکری رکھ دی۔

یہ قبر چھوٹے چوان کی قبر کے بالکل سامنے تھی۔ صرف ایک راستہ ان دونوں کے درمیان حائل تھا۔ بوڑھے چوان کی بیوی نے دوسری عورت کو چار ڈونگے اور چاول کا ایک پیالہ قبر پر رکھنے کے بعد روتے ہوئے دیکھا۔ جب وہ کاغذی نوٹوں کو جلانے لگی، اس نے سوچا: "یقیناً، اس قبر میں اس کا بھی بیٹا ہی ہوگا۔" بوڑھی عورت بے مقصد ہراساں سی اِدھر اُدھر چکراتی رہی۔ پھر اچانک وہ کانپی اور لڑکھڑا کر پیچھے جھکنے لگی، جیسے اسے چکّر سے آرہے ہوں۔

بے انتہا دُکھ اور رنج سے اس کا ذہن بے قابو ہو چکا تھا، بوڑھے چوان کی بیوی کھڑی ہوگئی اور چند قدم چل کر راستہ پار کرنے کے بعد چپکے سے بولی: "رنجیدہ مت ہو! چلو ہم لوگ گھر چلیں۔"

اس عورت نے سر ہلایا، مگر وہ اب بھی کانپ رہی تھی۔ وہ منمنائی: "دیکھو، وہ کیا ہے؟"

اس کی اشارہ کرتی ہوئی اُنگلی کے سامنے بوڑھے چوان کی بیوی کی نظر ایک قبر پر پڑی، جس پر اب تک گھاس نہیں اُگی تھی۔ مٹی کے مہیب ڈھیلے اب بھی دکھائی دے رہے تھے۔ غور سے دیکھنے پر اس نے پایا کہ اس ٹیلے پر سُرخ و سپید پھولوں کے گچھے رکھے تھے۔

ان دونوں کی بینائی کمزور تھی۔ پھر بھی وہ ان سُرخ و سفید پھولوں کو واضح طور پر دیکھ رہی تھیں۔ یہ بہت زیادہ نہیں تھے، لیکن ایک دائرے میں رکھے تھے۔ حالاں کہ یہ تازہ بھی نہیں تھے، مگر خوبصورتی سے سجائے گئے تھے۔ چھوٹے چوان کی ماں نے چاروں طرف نظر پھیری، پھر اس کی نگاہیں اپنے بیٹے کی قبر تک گئیں۔ بقیہ سبھی قبروں کی مانند اس پر بھی زرد اور بدرنگ چھوٹے چھوٹے پھول اور پتیاں بکھری تھیں۔ پھر اسے یہ سب یکلخت فضول لگنے لگے اور اس نے پھولوں کے گچھوں کے متعلق متجسس ہونا چھوڑ دیا۔

اسی درمیان بوڑھی عورت قبر کے نزدیک چلی گئی تھی۔ "ان میں جڑیں نہیں ہیں" اس نے خود کلامی کی۔ "یہ یہاں نہیں اُگے ہوں گے۔ کون ہو سکتا ہے یہاں! بچّے تو یہاں کھیلنے آتے نہیں!" اس کا ذہن یہ سب نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ اچانک اس کے آنسو بہنے لگے اور وہ روتی ہوئی چیخ کر بولی:

"بیٹا! ان سب نے تم پر ظلم کیا اور تم بھولے نہیں۔ کیا تم اب بھی اتنے غمگین ہو کر مجھے یہ سب بتانے کے لیے اتنے ... کام کر رہے ہو!"

اس نے چاروں طرف دیکھا لیکن بغ... پتیوں والی شاخ پر بیٹھے ایک کوّے کے سو... اسے کچھ بھی نظر نہ آیا۔ "میں جانتی ہوں،" وہ بولی: "ان سب نے تمہارا قتل کیا۔ لیکن حساب کا ایک دن آئے گا۔ عالم بالا وا... سب دیکھتا ہے۔ تم سکون سے اپنی آنکھیں بند رکھو۔ اگر تم واقعی ابھی یہیں ہو، اور مجھے سُن سکتے ہو، تو اپنے آرام و سکون کے لیے اس کوّے کو اپنی قبر کے اُوپر سے اُڑنے کی ترغیب دو ——— یوم حساب آئے گا۔"

ہوا بند ہو چکی تھی اور سوکھی گھاس تانبے کے تار کی مانند سیدھی کھڑی تھی۔ ... لہروں پر ایک مدہوش سی گھبراتی ہوئی آ... تھرتھرائی، پھر دھیرے دھیرے ختم ہو گ... چاروں طرف موت جیسا سکون تھا۔ وہ دو... سوکھی گھاس پر کھڑی کوّے کو دیکھ رہی تھ... اور کوّا درخت کی بے لوچ ٹہنی پر سر کو جھکا... پتھر کی مانند منجمد ہو چکا تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ بہت سارے لوگ

بوڑھے اور جوان، قبروں پر حاضری دینے گئے۔

بوڑھے جوان کی بیوی نے محسوس کیا کہ اس کے سر پر سے کوئی وزنی بوجھ ہٹ چکا ہے۔ اس نے دوسری عورت سے کہا:

"چلو ہم چلیں۔"

بوڑھی عورت نے آہیں بھرتے ہوئے پیالہ اور ڈونگے اُٹھالیے۔ پھر چند وقفوں کے بعد دونوں دھیرے دھیرے راستے کی جانب بڑھنے لگیں۔ بوڑھی عورت منمناتی آواز میں بولی:

"یہ سب کیسے ہوا؟ کیا مطلب ہے اس کا؟"

وہ تبس قدم ہی چلی ہوں گی کہ انھیں اپنے عقب میں ایک تیز چیخ سنائی دی۔ چونکتے ہوئے انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کوا اپنے پنکھوں کو پھیلائے قبر کے اوپر سے اُڑتا ہوا تیر کی مانند دور افق کی طرف چلا جا رہا تھا۔

عربی جنگجو شاعر
علی احمد سعید ادونیس

ترجمہ: صفدر امام قادری
کمار بھون، بھنور پوکھر، پٹنہ ۴ (بہار)

تعارف اور نظمیں

۱۹۵۰ء کے بعد عرب کے جن چند شاعروں، ادیبوں نے عالمی منظر نامے پر دستک دی ہے، اور جنھیں اس زبان کے نمائندہ تخلیق کار کی حیثیت سے ممتاز مقام ملا ہے، ان میں علی احمد سعید ادونیس ایک اہم نام ہے۔ ادونیس کے مزاج کو اگر ہم اُردو میں سمجھنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ ترقی پسندوں کا ایک بہترین امتزاج ہے۔ اس نے اگر لفظ و بیان کی سطح پر فرد کے احساس کو زیادہ تیز کیا ہے تو اسی کے ساتھ معاشرتی نظام کے مسائل اور دنیا کے اجتماعی رنگ ڈھنگ پر اس کی گہری توجہ رہی ہے۔ اسی لیے ادونیس کی شاعری میں ترقی پسندوں کی نعرے بازی نہیں ہے اور نہ ہی جدیدیوں کی ابہام پسندی۔

ادونیس کا ماننا ہے کہ عظیم شاعری فرد اور سماج کو گہرے طور سے متاثر کرتی ہے اور اسی لیے وہ شاعری کو ایک لافانی اور غیر مختتم عمل قرار دیتا ہے۔ اس نے اپنی تنقیدی کتاب 'شاعر کا عہد' میں صاف صاف لکھا ہے کہ چونکہ اس کی شاعری جنگ کے میدان میں جنمی ہے، اس لیے اس کے پارکھ ابھی کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ اس لیے آنے والے دنوں میں ادونیس کی شاعری کے مقبول ہونے کا اور زیادہ یقین ہے۔

—— صفدر امام قادری

(۱)

اور اب
جب وہ اجنبی آئے
مسجد میں روتے
اذان کے مینار کی جگہ
ایک چمنی بنا لینا

(۲)

اس طرح تم
دھرتی کے چہرے کو
مسخ کرکے ہی دم لوگے
لیکن، دوسرا بھی بناؤ گے کیا؟
تب تمہارے پاس کون سا راستہ ہوگا؟
چنگاری، آگ کے شعلے، موت کا پیغام
اور تمہارے اِنکار کا جہنم

اس طرح یہ دھرتی
ہو جائے گی ایک اندھی قبرگاہ
اور صرف بچ جائے گا تمہارا تنہا رب!

(۳)

مری صدا کو
محض گونج کیوں سمجھتے ہو؟

تم

تم تو ایک بیکار
پڑی ہوئی لاش ہو
اور حیوان تہذیب کی آغوش میں
جواں ہوا ہیں
اپنے ہاتھوں میں
موت کا پیغام لیے
گھومتا...... ناچتا.....

میری صدا کو
محض گونج کیوں سمجھتے ہو؟

(۴)

میرا گھر
نراشا کے دونوں سروں پر بستا ہے
ٹھیک جیسے پیلے مکھن کی دیواریں ہوتی ہیں
اور خالی خالی، ٹوٹے بکھرے بادل

میرا گھر ——
یہاں طوفان کیا آئے گا؟
جہاں ماحول کو صاف بنانے کی خاطر
سوراخ والی بیمار کھڑکیوں سے
کھلے آکاش کی ہوائیں آتے..... آتے
تھک چکی ہوتی ہیں

میرا گھر
سامنے دکھائی دیتے سورج سے غیر متاثر
پڑوسی چھوٹی چڑیوں سے بھی بے تعلق

میرا گھر ——
اپنے ہی تصورات سے خود مسمار
لاتعداد وقت کے بالکل پار تک دیکھنے کی خواہش
یعنی محض ایک خیال

اور ——
اسی اپنے گھر میں
میں گہری نیند سوتا ہوں
چاروں طرف سے
گونگی بنادی گئیں بے بس آوازیں
اور مقہور سانسیں ہوتی ہیں

(۵)

ان چہروں کو سلام
جن کی نا امیدی تہیں اور گہری ہوتی جاتی ہیں
سلام ان پگڈنڈیوں کو
جنھیں میری بھیگی فریادیں یاد نہیں
اس مرحوم باپ کو سلام
جس کی شفقتیں آکاش کی طرح پھیلی تھیں
اُس فروخت شدہ بچے کے حضور میں بھی میرا سلام
جسے جنگی جوتے بھی صاف کرنے ہیں اور نمازیں بھی ادا کرنی ہیں
(کہ ہمارے ملک میں سبھی عبادت کرتے ہیں
اور سبھی جوتے بھی تیار کرتے ہیں)
اس پہاڑ کو میرا سلام
جس میں بھوک کے پتھر اُگتے ہیں
ان آنکھوں کو سلام
جو بارش کی طرح برستی ہیں اور عافیت محسوس کرتی ہیں
اس گھر کے در و دیوار کو سلام
جس کی گرد لیے میں کہاں کہاں نہ گیا!

∞

جاوید وششٹ

تنکا

یہ برگِ کاہ یعنی تنکا آوارہ مزاج، بادشاہِ بے تاج، ہر شے سے بے نیاز مگر آندھی طوفان سے ساز باز۔ عجوبۂ روزگار، ہوا کے دوش پر سوار، کبھی اکیسویں صدی میں تو کبھی بیسویں صدی میں، کبھی چندر لوک میں تو کبھی دُھرولوک میں۔ زمین سے آسمان تک ہر جگہ اس کا گزر، نارد مُنی کی طرح اتال پاتال کی اس کو خبر۔ بظاہر دیکھنے میں غیر اہم حقیر و بے بضاعت بے بساط و بے وقعت۔ تاہم ڈوبتے کا سہارا، جان بچانے والا۔ خدائی خدمت گار، عالمِ انسانیت کا یار۔ حرکت میں آئے تو گردشِ جام کو مات کرے، ہوا سے بات کرے۔ ٹھہر جائے تو کسی بدبخت کے مقدر کی طرح ساکن، سیاہ رات سا تیرہ و تار دن۔

ہمارا مشہور پرند بیا تنکے کا جوہر شناس و قدر داں ہے، جو پرندوں میں ست یُگ کے معمارِ اعظم وشوکرما کا درجہ رکھتا ہے۔ ایسا گھونسلا بناتا ہے کہ بڑے بڑے سُنکر دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ اس کی تعمیر میں تنکوں کا انتخاب بھی لاجواب ہوتا ہے۔ وہ اپنے کاشانے میں بیڈ روم اور ڈرائنگ روم الگ الگ بناتا ہے۔ روشنی کے لیے کیچوے کی مٹی سے راڈ لائٹ کا اہتمام بھی کرتا ہے۔ درخت کی لچکدار شاخ پر گھونسلے کی ایسی بنیاد رکھتا ہے کہ آندھی طوفان سے اس کو کوئی گزند نہیں پہنچتا بلکہ جھولے کا مزہ ملتا ہے۔ بیا کی چونچ میں تنکا تحریکِ تعمیر کی علامت ہے اور پھر تنکا تنکا مل شود گھونسلا۔ مگر کبھی کبھی آندھی اور بارش میں بندر پر طنز و نصیحت کے بے جا استعمال سے بیا اپنے گھونسلے کو تنکا تنکا کرا لیتا ہے۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ:

سیکھ اسی کو دیجیے جس کو سیکھ سُہائے
سیکھ نہ دیجے باندرا، گھر بیا کا جائے

تنکا جاسوسی میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتا۔ پورا ڈیٹکٹو ہوتا ہے۔ پولیس کے کتے تو سونگھ سانگھ کر چور کے دروازے تک پہنچاتے ہیں مگر تنکا تو چور کی داڑھی ہی پکڑ لیتا ہے اور اسے گرفتار کرا دیتا ہے۔ چور کی داڑھی اور تنکے میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مگر یہ کیا تنکے نے چور کی داڑھی چھوڑ کر قاضی کی داڑھی کو بھی پکڑ لیا۔ آیئے تنکے سے ہی یہ راز معلوم کیا جائے۔

"میاں تنکے! چور کی داڑھی پکڑنے کی بات تو سمجھ میں آئی مگر تم نے قاضی کی بھی داڑھی کیوں جا پکڑی؟"

"قاضی بھی چور ہے۔ چور سے "وزدانہ" لے کر اسے بری کر دیتا ہے۔ یہ تو دلالی سے بھی بدتر ہے۔ اس لیے میں نے قاضی کی داڑھی پر بھی ہاتھ ڈال دیا۔"

"یہ وزدانہ کیا بلا ہے؟"

"چوری کا نصف سے کچھ کم حصہ جو قاضی کی نذر کیا جاتا ہے، وزدانہ کہلاتا ہے۔ اس سے چور بھی خوش، قاضی بھی مسرور، دونوں دھندا خوب چلتا ہے۔ ایک بار قاضی کی کچہری میں ایک تیلی اور جاٹ کا قضیہ تھا۔ تیلی قاضی کے گھر تیل پہنچا دیا۔ جاٹ کو قاضی تیور سے ہی پتا چل گیا کہ تیلی سے کچھ کھا لیا۔ بقول شخصے، نٹ بدیا پا جائے پر جٹ بدیا پائے۔ جاٹ نے کچہری میں ہی قدم بوسی بہانے قاضی کے پانو تلے چُپ چاپ نوٹ سرکا دیے۔ اب تو قاضی تیلی پر برسا۔ تیلی بار بار یاد دلائے کہ تیل دیکھ! تیل کی دھ دیکھ! قاضی نے بھی برجستہ کہا کہ تیل کی دھ کیا دیکھوں، یہاں پیروں تلے کی نکلی جا رہی فیصلہ تیلی کے خلاف ہو گیا۔"

"مگر یہ کیا؟ میاں تنکے! تم نے شاہ وقت کی داڑھی کو بھی نہیں بخشا؟"

"شاہِ وقت بھی چور ہے۔ وہ قاضی "قضیانہ" لیتا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ، راجہ چوری کرے، نیاؤ کون گھر جائے؟ اس میں نے شاہِ وقت کی داڑھی کو بھی پکڑا کہ چور ہوگا تو چور کی داڑھی میں تنکا بھی ضرور ہوگا۔ شاہِ وقت شاہی خزانے پر ڈاکہ ڈالتا ہے کسی نہ کسی بہانے۔"

ہمارے سماج میں جہاں ریاکار وال



نقلی پیروں کی بھرمار ہے، تنکا کمال صفائی سے ایسے لوگوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ نقلی داڑھیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ یہ تنکے کی باریک بینی اور فطرت شناسی کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے۔

ہمارے معاشرے کا ایک خاص کردار ہے جسے اپنی آنکھ کا شہتیر نہیں دکھائی دیتا مگر دوسرے کی آنکھ کے تنکے کو دیکھ لیتا ہے۔ یہ خاص کردار اپنے گریبان میں جھانکنے کی کبھی زحمت نہیں کرتا۔ مگر تنکا بھی بڑا استاد ہے کہ اسے گریبان تو کیا کنواں جھنکا دیتا ہے۔

تنکا بڑا صوفی صافی ہے، راضی بہ رضا، سرِ تسلیم خم کیے ہمیشہ مراقبے میں۔ آتم سمرپن میں اپنے کا جواب نہیں۔ خود سپردگی میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔ ہمہ وقت یادِ الٰہی میں مستغرق۔ نہ دین کی خبر، نہ دنیا کا پتا، ہر شے سے بے نیاز۔ اس کے احکام کی تعمیل میں کمربستہ، نہ چوں نہ چرا۔ مشیتِ ایزدی کے اشارے پر ہر قربانی کے لیے مستعد، ہر بلیدان کے لیے تیار۔ فنا فی اللہ کے رموز سے آشنا، بقا باللہ کے اسرار کا محرم۔ اسی باعث تنکے میں نہ اہنکار ہے نہ تکبر بلکہ وہ تکبر شکن ہے۔

ہندی کہاوت ہے کہ ابھیمان اور بھگوان میں بیر ہے۔ وہ کسی قسم کا ابھیمان یا غرور برداشت نہیں کرتا۔ کیوں کہ تکبر صرف اللہ میاں کو ہی زیب دیتا ہے۔ اس نے فرمایا بھی ہے کہ تکبر میرا پردہ ہے۔ ایک بار دیوتاؤں کو اپنی غیر معمولی قوت پر بڑا گھمنڈ ہو گیا، تو مزے کی بات یہ ہے کہ بھگوان نے ایک تنکے سے ہی ان کا گھمنڈ چور چور کر دیا۔ وشنو بھگوان نے ایک بوڑھے برہمن کا بھیس دھارن کیا اور دیوتاؤں سے ملنے کی یوجنا بنائی۔ پہلے اگنی دیوتا سے ملاقات ہوئی۔ اگنی دیوتا نے اپنا پریچے دیتے ہوئے بڑی ڈینگ کی لی اور یہ بھی کہہ دیا کہ میں چاہوں تو اپنے تیج سے برہمانڈ کو ذرا سی دیر میں بھسم کر دوں۔ برہمن نے ایک تنکا لے کر اگنی دیوتا سے کہا کہ اچھا پہلے اس تنکے کو ہی جلا کر دکھائیے، برہمانڈ کو پھر بھسم کرنا۔ اگنی دیوتا نے بڑی حقارت سے تنکے کی طرف دیکھا اور ایک لپکتا شعلہ اس پر دے مارا۔ مگر یہ دیکھ کر بڑے حیران ہوئے کہ تنکے پر کوئی آنچ نہیں آئی۔ اب تو وہ بپھر گئے اور اپنی شعلگی کے سارے وار تنکے پر کر ڈالے۔ تنکا جوں کا توں یہ تماشا دیکھتا رہا۔ آخر اگنی دیوتا بڑے خفیف ہوئے اور چپکے سے وہاں سے کھسک گئے۔ جب وایو دیوتا تشریف لائے تو برہمن نے پوچھا 'آپ کی تعریف؟' انھوں نے بڑی اکڑ کے ساتھ اپنا تعارف کچھ اس طرح کرایا کہ میں وایو دیوتا ہوں۔ اگر میں چاہوں تو پوری کائنات کو ایک پھونک میں اڑا دوں۔ برہمن ہنسا اور کہا کہ اچھا یہ تنکا ہی اڑا کر دکھائیے۔ وایو دیوتا نے تمسخر سے تنکے کو دیکھ کر کہا کہ اس کی کیا اوقات ہے۔ اور ایک ہلکا سا جھونکا اس پر چھوڑا مگر تنکا ہلا تک نہیں تو انھوں نے بھی اپنا پورا زور لگایا مگر ناکام رہے اور خاموشی کے ساتھ، سر جھکائے وہاں سے چلے گئے۔ اندر دیوتا کو سارا قصہ سنایا تو انھوں نے کہا کہ وہ بوڑھا برہمن اور کوئی نہیں وشنو بھگوان ہیں۔ آؤ! چل کر ان سے معافی مانگیں۔ وہ ہمارا غرور خاک میں ملانے کو ہی یہ لیلا کر رہے ہیں۔ جب دیوتا وہاں پہنچے تو برہمن غائب مگر تنکا حاضر تھا۔ انھیں دیکھ کر تنکے نے زور کا قہقہہ لگایا۔ دیوتا بڑے جھینپے اور چپ چاپ اندر لوک کو چلے گئے۔

تنکا سادہ مگر بڑا پرکار ہے۔ اس کی سادگی میں پرکاری کا نظارہ کرنا ہو تو نواب مرزا شوق کی مثنوی "بہارِ عشق" کے ایک نسائی کردار میں ملاحظہ کیجیے:

گل سے رخسار گول گول بدن
گات جس طرح قمقمے روشن

رخ پہ وہ بکھرے بکھرے زلف کے بال
رنگ گل سے وہ ہونٹ پان سے لال

لب نازک کہ جان دے دیجے
دہن ایسا کہ چٹکیاں لیجے

ناک میں نیم کا فقط تنکا
شوخی، چالاکی، مقتضا سن کا

عکسِ رخ موتیوں کے دانوں میں
بجلیاں چھوٹی چھوٹی کانوں میں

اس سراپے میں نیم کے تنکے نے چار چاند لگا دیے ہیں۔ گویا نیم کے تنکے میں ہی رازِ شباب مضمر ہے، تنکے کی اوٹ اوجھل پہاڑ۔ نیم کے تنکے کی طبی اہمیت بھی ہے یعنی ناک یا کان کو رندھنے نہیں دیتا۔

عجیب تماشا ہے کہ تنکا دو لخت ہوتے ہی 'ان کا' ہو جاتا ہے۔ نہیں سمجھے؟ تنکا دو لخت ہوا تو 'تن کا' ہوا۔ قدیم اردو میں 'تن کا' کا مطلب ہے ان کا۔ کبیر کے یہاں بھی تنکا اس مفہوم میں ملتا ہے۔ سند کے طور پر کبیر کا یہ دوہا محفوظ رکھیے:

جن کھوجا تن پائیا گہرے پانی بیٹھ
میں بَوری ڈُوبن ڈری، رہی کنارے بیٹھ

اُردو زبان ادب پہ تنکے کا بڑا احسان ہے۔ اس نے اپنی کہاوتوں اور محاوروں سے اُردو ادب کو مالا مال کر دیا ہے ان کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

ویدک کال کی ایک روایت ہے کہ رِشی مُنی اپنے شِشیوں (مریدوں) کو اہنکار تیاگ (ترکِ انا) کی شکشا (درس) دینے کے لیے ایک چھوٹی سی کتھا سُنایا کرتے تھے دو تنکوں کی۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک ندی میں باڑھ آئی ہے، دو تنکے بہے جا رہے ہیں۔ ایک تنکا اَڑا ہو کر بہہ رہا ہے اور بزعمِ خویش ندی کے بہاؤ کو روکنا چاہتا ہے۔ یہ تنکا اہنکار (انا) کی علامت ہے۔ دوسرا تنکا بہاؤ کے ساتھ بہہ رہا ہے۔ رقص کرتا ہوا، ناچتا ہوا۔ وہ بڑے آنند میں ہے۔ اسے کوئی دعویٰ نہیں، اہنکار نہیں۔ اس لیے مزے میں ہے۔ جب کہ اَڑا تنکا مسلسل پریشانیوں میں ہے اہنکار کی وجہ سے۔

کبیرؔ کے ایک دوہے میں تنکے کا درشن کر کے عرفان حاصل کیجیے:

تنکا کبھو نہ نندیے، جو پاین تری ہوئے
کبھوک اُڑ آنکھن پرے، پیر گھنیری ہوئے

انتخابِ کلامِ داغ

علامہ اقبال نے داغ کے مرثیے میں کہا ہے:

تھی زبانِ داغ پر، جو آرزو ہر دل میں ہے
لیلیٰ معنی وہاں بے پردہ، یاں محمل میں ہے

داغ کی شاعری پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ان کے معتقدوں اور مداحوں نے بھی لکھا ہے اور نکتہ چینیوں نے بھی اور ان لوگوں نے بھی جو خالص تنقیدی نقطۂ نظر سے کلامِ شاعر کو پرکھنے کے قائل ہیں: ان سب لوگوں کی تحریروں کا مرکزی خیال ایک ہی ہے کہ داغ زبان کے شاعر تھے اور روزمرہ کا حسن ان کے کلام کی اصل خوبی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ داغ کی حق تلفی اس سے زیادہ ہو ہی نہیں سکتی کہ انھیں صرف زبان اور اندازِ بیان کا شاعر کہہ جائے۔ اقبال نے داغ کی شاعری کے اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے جس کی حیثیت بنیادی نقطے اور محور کی ہے اور کہا ہے کہ وہ ایک جذبۂ مشترک جو ہر انسانی دل میں تمنا بن کر رہتا ہے مگر ہر شخص اس کے اظہار پر قادر نہیں۔ داغ کے اشعار اسی جذبے کی ترجمانی کرتے ہیں۔

بات میں اگر گہرائی کچھ نہ ہو، بس بات کہنے کا ڈھنگ اچھا ہو تو ایسی باتیں چنگاریوں کی چمک کی طرح جلد ہی دھندلا جاتی ہیں جبکہ داغ کی شاعری آج بھی قدر و قیمت کی حامل ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان کے ہاں سارا کرشمہ محض اندازِ بیان کا نہیں، یہ کرشمہ ہے اس انسانی جذبے کی ترجمانی کا جو آرزو بن کر ہر دل میں موجزن رہتا ہے۔

مصنف : نواب مرزا خاں داغ دہلوی
مرتبہ : بیگم ممتاز میرزا
صفحات : ۲۴۶
قیمت : ۳۴ روپے

نیا اُردو افسانہ

تجزیہ اور مباحث

اُردو دنیا کا کوئی کارنامہ چاہے اُس کا تعلق اُردو کے لسانی مباحث سے ہو شاعری یا فکشن کی تنقید و تفہیم سے ہو، پروفیسر گوپی چند نارنگ نے جس موضوع کو بھی چھوا ہے اپنی شخصیت کے گہرے نقوش مرتسم کر دیے ہیں۔

اُردو کے افسانوی ادب کی قدر شناسی پروفیسر گوپی چند نارنگ کے نمایاں علمی اوصاف میں ایک خاص وصف ہے۔

اِس کتاب میں نارنگ صاحب نے اُردو اکادمی، دہلی کے زیرِ اہتمام منعقدہ افسانوی سمینار میں پڑھے جانے والے افسانے، ان افسانوں کے فنی تجزیے اور ان پر ہونے والے مباحث یکجا کر دیے ہیں۔

افسانہ نگاروں میں ۱۹۷۰ء کے بعد سامنے آنے والے اہم افسانہ نگار اور تجزیہ نگاروں میں افسانوی ادب کے ممتاز نقاد شامل ہیں۔ شرکائے بحث میں بھی اہم شخصیتیں ہیں۔

کتاب کے آغاز میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کے خیال انگیز بسوط مقدمے کے علاوہ، جو اس سمینار کے ڈائرکٹر تھے، بیگم صالحہ عابد حسین اور شمس الرحمن فاروقی کے مضامین ہیں۔

سیمینار کی مکمل روداد بھی جو باقل عباسی نے لکھی ہے، شاملِ کتاب ہے۔

سیمینار پر دنیا بھر کے اخبارات و رسائل نے جو تبصرے کیے تھے آخر میں ان کے اقتباسات بھی دیے گئے ہیں۔ ہم عصر افسانوی ادب و تنقید کی ایک اہم دستاویز۔

مرتب : پروفیسر گوپی چند نارنگ
صفحات : ۴۳۱
قیمت : ۹۰ روپے

اُردو اکادمی، دہلی سے طلب کریں

ف۔ س۔ اعجاز

(انگریزی سے اُردو میں ترجمہ)

(چوتھی قسط)

خوابوں کے اسرار سمجھیے

خوابوں کی زبان

خواب اپنا پیغام براہِ راست اور غیر زبانی طور پر دیتے ہیں۔ یہ آپ کو آپ کے خوابیدہ دماغ میں بننے والے خیالات کا منظر دکھاتے ہیں۔ بعض خیالات تو اتنے صاف اور واضح تصویری روپ میں نظر آتے ہیں کہ آپ انہیں صبح بہ آسانی دہرا سکتے ہیں ٹھیک اس طرح جیسے سچ مچ کوئی واردات گزری ہو یا آپ نے کسی کتاب کا کوئی باب پڑھا ہو لیکن بعض اوقات تصاویر اتنی ٹکڑا ٹکڑا بے ترتیب اور خلط ملط ہوتی ہیں کہ آپ کو کسی خاص فعل یا عمل کے سوا کچھ یاد نہیں رہ پاتا۔

ماہرینِ نفسیات اس طریقے کو بڑی اہمیت دیتے ہیں جس سے چیزیں خواب میں نظر آتی ہیں۔ پیغام سمجھنے کے لیے اپنے مقصدِ تلاش کو جاننا ازحد ضروری ہے۔ مثلاً اگر آپ جس سے بات کر رہے ہیں وہ جمائی لیتے ہوئے آپ سے کہتا ہے "کتنا دلچسپ ہے"۔ جبکہ وہ آپ کے بائیں شانے کی طرف دیکھ رہا ہوتا ہے۔ تو دراصل وہ آپ سے یہ کہنا چاہتا ہے کہ تمام موضوع اُسے بور اور خشک لگ رہا ہے۔ خواب اکثر ان عادات و اطوار کا استعمال کرتے ہیں جو ہم باہمی گفتگو میں اختیار کرتے ہیں۔ اور اندازِ گفتگو کے ذریعے ہی ہمیں اس پیغام کا علم ہو پاتا ہے جس کے لیے ہمیں خواب نظر آتا ہے

رموز کا مطلب

پہلی بات تو یہ کہ آپ خواب کے 'رموز' اور 'تشبیہات' کے مابین فرق کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کی کوشش کریں۔ یہ دونوں ہی خواب کی تصاویر ہیں لیکن دونوں کے ممکنہ معنی میں بہت اختلاف اور فرق کی گنجائش پائی جاتی ہے۔ رموز یا اشارات ہر شخص سے کچھ بات کہتے ہیں۔ جسے کہیں کے بھی لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً:

جادوگر یا شعبدہ باز

ایک روایتی 'علامت' ہے جس کے کئی نمونے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ میرلن شعبدہ باز 'وزارڈ آف اوز' 'WIZARD OF OZ' افریقہ کے وِچ ڈاکٹر یا امریکی ہندوستانی قبائل اطبا ایک جیسی طاقت اور اثر رکھتے ہیں۔

باغِ بہشت

ایک دوسری عام علامت ہے۔ یہ ایک ایسی جگہ کا مظہر ہے جہاں ہر چیز درست ہے اور کچھ غلط نہیں ہے۔ ہر عہد کے لوگوں نے اسے رمز کے طور پر بیان کرنے کی راہ ڈھونڈ نکالی ہے۔ انجیل میں باغِ عدن، یونانی دیومالاؤں میں 'ایلیسزائی میدان' اور اسلامی عقیدے کی خوبصورت جنت کا حوالہ قابلِ غور ہے جس میں حوریں مُشک کی خوشبو اور ایفائے محبت کی شراب کے ساتھ اللہ کے نیک اور مقرب بندوں کی منتظر ہیں۔ آجکل اسی خیال کو سفری کتابچوں میں کچھ ایسے الفاظ میں اُجاگر کیا جاتا ہے: "یہاں سورج ہمیشہ چمکتا رہتا ہے اور سمندر صاف اور نیلا نظر آتا ہے اور ساحل پر بھیڑ کم ہوتی ہے۔ اور یہاں اشتہا انگیز کھانوں، مشروبات اور لوگوں کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ چلتا رہتا ہے"۔

خالی ندی میں بہتا ہوا جہاز

یہ زندگی میں آدمی کی ترقی کا اشارہ سمجھا جاتا ہے۔ کسی بھی بوجھی صورتحال پر ایک سے زائد رموز کے یکجا ہو کر روشنی ڈالنے کی یہ ایک اچھی مثال ہے۔ جہاز آدمی کی سوسائٹی کا نمائندہ ہے، دیگر لوگوں کے ساتھ آدمی کے منظم ہونے کے انداز کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ نیز ممکنہ دنیاوی ابتری و انتشار کے خلاف اس کے طرزِ عمل کا غماز بھی ہے۔ سمندر کائنات کی غیر دریافت شدہ قوتوں یا سطحِ ذہن کے نیچے دبے ہوئے اس تخلیقی ہجوم کا علامیہ ہے جو غیر تشکیل شدہ ہے۔ زندگی کو متصور کرنے کا یہ سلیقہ ہمیں اوڈیسیوس (ODYSSEUS) کے بحری سفر کے قصوں میں ملتا ہے جن میں وہ گھر کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ عہدِ وسطیٰ میں "جہازِ احمقاں" (SHIP OF FOOLS) ایک پسندیدہ موضوع تھا جس کے ذریعے زندگی کے سفر میں ملنے والے تمام قسم کے لوگوں کی کردار نگاری کی جاتی تھی۔

خواب کی تشبیہات

تشبیہ علامت سے مختلف کام کرتی ہے۔ یہ کسی تصویر کے زیادہ صحیح حوالے کے طور پر اُجاگر ہوتی ہے۔ جب آپ تشبیہات کے سلسلے کو خواب

مدیر ماہنامہ انشا، ۲۶ ۔ اے، انانی سیل اسٹریٹ، کلکتہ ۴۰۰۰۰۱۴

میں دیکھنا شروع کریں تو اس کی ظاہری کہانی پر غور کرتے جائیں۔ اس سے اس کا مطالعہ آپ کے لیے آسان ہو جائے گا۔ ہر تصویر کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھیں اور خواب کے مجموعی تاثر کا جائزہ ضرور لیں۔ جب آپ شبیہیں پہچان لیں گے اور ان میں سے چند ایک کی رمزیت کو سمجھ لیں گے تو آپ خواب کی زبان کی چال بازیاں (TRICKS) یا عادات کے بارے میں کوئی رائے قائم کر سکیں گے۔ ان نکات کو سب سے پہلے سگمنڈ فرائیڈ نے تسلیم کیا تھا جس کی کتاب "خوابوں کی تشریح" (THE INTERPR-ETATION OF DREAMS) آج بھی اس میدان میں مطالعے کے لیے ایک زبردست اور بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہے۔

خلاصہ قائم کرنا

شاید اب یہ بات آپ پر واضح ہو گئی ہو گی کہ ایک شبیہہ خواب میں ایک سے زائد معنی رکھتی ہے۔ اگر ایک ساتھ ڈھیر سارے خیالات آپ کے ذہن میں بیدار ہو جائیں تو ہرگز اس سے پریشان اور اُداس نہ ہوں۔ فرائیڈ نے ایسی صورت حال کے لیے ایک اچھی مثال پیش کی تھی۔ ایک عورت نے ایک چھوٹے ڈبے میں بند کئی بھنوروں کا خواب دیکھا۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ یہ شبیہہ اس شے کی تشکیل کردہ ہے جو اس نے ایک دن پیشتر دیکھی تھی۔ یعنی پانی بھرے گلاس میں ایک مچھر۔ یہ قطعی ممکن ہے کہ اس شبیہہ کو اسی بات نے تخلیق کیا ہو لیکن اس سے اس بات کا جواب نہیں ملتا کہ دن بھر کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات اور معاملات میں سے ایک یہی بات کیوں شبیہہ بن کر خواب میں آئے گی۔ پھر عورت کو اس کی بیٹی کی یہ عادت یاد دلائی گئی کہ وہ تتلیاں پکڑتی تھی اس پر یہ ہوا کہ وہ عورت خود اپنی کمسنی کی یادوں میں کھو گئی۔ آخر کار فرائیڈ نے اس عورت کو اس خواب کے مخفی یا دور از کار مفہوم کو سمجھنے میں مدد پہنچائی وہ جنس میں اپنے شوہر کی عدم دلچسپی سے فکر مند تھی اور اسے معلوم تھا کہ CANTHARID-ES نامی ایک مشہور افزودائی مخلوق کچلے ہوئے بھنوروں سے جنم لیتی ہے۔

لیکن اگر آپ کسی شبیہہ کو کوئی معنی نہ پہنا سکیں تو کیا ہو گا؟ کیونکہ بھنوروں کے رس یا مادّہ سے افزودائی کی تخلیق کے بارے میں ہم میں سے کوئی علم نہیں رکھتا۔ عورت نے اپنے خواب کی بھنورے والی شبیہہ کے اپنے طور سے نجی معنی پیدا کر لیے۔ اور یہ محض روابط یا خلاصوں کے ذریعے ممکن ہوا۔ اپنی بیٹی کے شوق کے بارے میں اس نے سوچا تو اسے اپنی جوانی اور دلکشی نیز پرانے رومانس کی یاد آ گئی۔ یہ پھر ذہن نشین کر لیں کہ اکثر خواب انھی چیزوں کے بارے میں نظر آتے ہیں جو ہمیں زیادہ متفکر رکھتی ہیں۔

کسی مظہر کا "جگہ سے بے جگہ" ہونا

جب مدّعا یہ ہو کہ خواب کی اصل غایت کو ایک چھوٹی سی شبیہہ میں دریافت کیا جائے تو کسی شے (OBJECT) کو "جگہ سے بے جگہ" کرنے کا عمل بھی خلاصہ آرائی کے عمل سے کم اہم نہیں ہوتا۔ شبیہیں اصل معاملے کے گرد طواف کرتی رہتی ہیں۔ اگر خواب حد درجہ صاف اور واضح ہو جائے تو اکثر یہ ایک کابوس یعنی ڈر میں تبدیل ہو جاتا ہے جس سے خواب دیکھنے والا بیدار ہو جاتا ہے۔ فرائیڈ کا یہ بھی خیال تھا کہ خواب اس طور پر بہروپ اس لیے بدل کر آتے ہیں کہ دماغ کے "حصّہ ضمیر" کو غیر منظم، منتشر یا پریشان ہونے سے بچائے رکھیں۔ "حصّہ ضمیر" دراصل وہ حصّہ ہے جو بنیادی افکار کی نگرانی اور حفاظت کرتا ہے نیز انھیں باہر آنے سے روکے رکھتا ہے۔ لیکن فی زمانہ فرائیڈ کے دیگر کئی خیالات کی طرح یہ خیال بھی متنازعہ فیہہ بنا ہوا ہے۔

الٹا رُخ اختیار کرنا (REVERSAL)

اگر کوئی خواب آپ پر کوئی معنویت آشکار کرنے سے قاصر ہو تو ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ اس کا رُخ بالکل الٹا کر دیں۔ خوابوں کی زبان میں "الٹا گھمانا" ایک عام بات ہے۔ اگر آپ دیکھتے ہیں کہ آپ ایک قالین پر کیچڑ بھرے جوتوں کے ساتھ چل رہے ہیں تو آپ ایسا سوچ کر دیکھیے: "کیا میں ایک قالین ہوں جس پر دوسرے لوگ چل رہے ہیں؟" اور غالباً اس قسم کے خواب سے آپ اپنے تئیں بے چین اور پریشان محسوس کریں گے جس سے یقیناً آپ پر اصل معنی آشکار ہو جائیں گے۔

والدین کے لیے ایک بچّے کے قتل یا چوٹ کا خواب عام پریشانی کا باعث سمجھا جاتا ہے۔ یہ لوگ امید کرتے ہیں کہ خاندان کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ لیکن فرائیڈ کے مطابق یہ ایک تکمیل خواہش کا خواب ہو سکتا ہے جو ماں یا باپ کے اس انتہائی غصیلے لمحے کا غماز ہو جب اسے محسوس ہونے لگے کہ وہ غصّے یا طیش میں اپنے بچّے کو قتل کر ڈالے گا۔ ایسے احساس کو ذہن میں پالنے سے بہتر ہے کہ یہ بھاپ یونہی باہر نکل جائے۔

لیکن اپنے ہی باپ یا ماں کے قتل کے لیے الٹا کرنے کا اصول نہیں چلتا کیونکہ اس

سے جو بات فیصل ہوگی وہ یہ کہ آپ کی کوششیں مادرانہ یا پدرانہ حیثیت کی تنسیخ میں صرف ہو رہی ہیں۔ آپ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا اور آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن آپ کے والد کی حیثیت ایک دوسری بااثر حیثیت مثلاً بادشاہ یا حکمراں یا آپ کے باس کی حیثیت کے پیچھے چھپ جائے گی۔ اس سلسلے میں ینگ یہ سوال اٹھاتا ہے کہ کہیں آپ اپنے ہی کسی غالب یا سرکش تقے کی بغاوت پر تو آمادہ نہیں ہیں جو آپ کو ایک مقتدر انسان کے روپ میں دکھائی دینے لگا ہے۔

تلافی

(JUNG) ینگ نے بھی الٹ دینے یا اوندھا کر دینے کے خیال کی وضاحت اس نظریے کے ساتھ کی ہے کہ خواب ایک اہم ترین فرض یہ ہے کہ وہ آپ کی حقیقی زندگی کی کسی کمی کی تلافی کرے۔ اگر آپ ایک ستائی ہوئی گھریلو عورت ہیں تو آپ کے لیے ایک پرکشش نزک بھڑک اور سرد مزاج خاتون ہونے کا خواب دیکھنا قرین قیاس ہے۔ ایک بے رحم سنگدل کاروباری اپنے آپ کو زندگی کی مصروفیتوں سے دور ایک محفوظ مقام پر تتلیاں پکڑنے والے یا رومانی ذہنی کردار کے روپ میں دیکھنا پسند کرے گا۔ ایک شرمیلی لڑکی کا خواب یہ ہوگا کہ وہ تعریف کا پل باندھنے والے لڑکوں کے جھرمٹ میں گھری ہوئی ہو۔ یہ تمام خواب روزمرہ ناکامیوں یا غیر آسودہ احتیاجات کی تلافی کا سامان ہیں۔

اگر ایک بہت خوبصورت اور نازک عورت مرد کے خواب میں جھلک دکھائے تو ایسا خواب دراصل مرد کے صنفِ نازک کے بارے میں اپنے رجحانات کا غماز کہا جاسکتا ہے جسے ینگ نے ANIMA سے تعبیر کیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ایک باعزم اور ہمدرد مرد کی شبیہہ عورت کے لیے اس کی اپنی بہادرانہ فطرت کا علامیہ ہوسکتی ہے جسے ANIMUS کہا گیا ہے۔

خواب عادتاً خیالی یا تجریدی چیزوں کو انسانوں یا حیوانوں کی مادی شکل میں دکھاتے ہیں۔ بہادری جس کا ابھی ذکر کیا گیا ایک بہادر مرد بن جاتی ہے تو نزاکت ایک پیار کرنے والی عورت۔ فرائیڈ اس ترکیب کو ANIMISM کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

ایک سپاہی کا کردار ہمارے خواب میں اکثر ضمیر کی آواز بن کر نمودار ہوتا ہے۔

ایک شیطانی شبیہہ ان احساسات یا ترغیبات کی نمائندگی کرتی ہے جنھیں آپ غلط تو سمجھتے ہیں لیکن جن پر قابو نہیں پا سکتے۔

ایک فرشتہ اس طرح صدائے خیر بن کر ابھرتا ہے جیسے آپ کی فطرت کے نیک پہلو کی نشاندہی کر رہا ہو یا کسی اچھی شے سے متعلق آپ کے عقیدے کا ترجمان ہو۔

ایک خانہ بدوش (جپسی) کسی ایسی وحشی جارحانہ نیز خلاف معمول خواہش کی علامت کے بطور آتا ہے جسے آپ اپنے اندر گردش کرتا ہوا پا رہے ہیں۔

بلی کی شبیہہ عموماً نسائی صفات اور وجدانیت کا روپ سمجھی جاتی ہے۔

کتوں کا دکھائی دینا روایتاً مردانہ رجحانات کی عکاسی کرتا ہے جن میں تحیر خیزی، جارحیت یا وفاداری و اعتماد بھی شامل ہیں۔ لیکن یہ شبیہہ ایسی ہے جس میں مختلف مجرد حوالے نمو پاسکتے ہیں۔ لہٰذا یہ سوچنا آپ کا کام ہے کہ کتوں کے بارے میں آپ کا اپنا خاص نظریہ کیا ہے۔

دیگر جانور جو عموماً خوابوں میں شبیہیں بن کر ابھرتے ہیں وہ ہیں بھیڑیے (خوف، جنسی جارحیت، بھوک کے لیے) چوہے (فرومایہ خسیس، کمینے لوگوں یا محسوسات کے لیے) خرگوش (زرخیزیت یا نرم اور بہ آسانی چوٹ کھا جانے والے کردار) برہ یعنی بھیڑ کا بچہ (قربانی، معصومیت یا پاکی) اور بھیڑ (بہ آسانی بہکا دیے جانے والے ڈرپوک لوگ) بسا اوقات کسی جانور کی اپنی مخصوص فطرت ہی خواب فہمی میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہے۔

مثلاً گھوڑے خواب دیکھنے والی عورتوں کے جنسی جذبے کو اُجاگر کرتے ہیں۔ ایک جنگلی اسپ نر اپنے لہراتے ایال کے ساتھ جنسی جذبے کی زبردست طاقت اور کشش کا خوبصورت علامیہ ہے۔ اب اسی پر غور کریں کہ گھوڑے کی جگہ آٹوموبائل اپنی رفتار کے باوجود گھوڑے جیسی زبردست جنسی علامت نہیں بن سکتی۔

کار ایک چست، طاقتور اور چمکدار ماہیت والی شے ہے لیکن یہ خود کار میکانکی سسٹم بھی رکھتی ہے۔ اگر آپ خواب دیکھیں کہ کوئی آپ کو کار میں بٹھا کر خود ڈرائیو کر رہا ہے یا مسافر کی نشست پر بیٹھا ہوا ہے تو یہ ایک انفعالی PASSIVE صورتحال کی غمازی ہوئی۔ آپ کو خوابوں کے اندر یہ دیکھنا چاہیے کہ کوئی مثبت رجحان آپ کے لیے پیدا ہو رہا ہے یا نہیں؟

کسی عمودی پہاڑ کی چڑھائی مشقت طلب ہوتی ہے اور یہ معنی رکھتی ہے کہ زندگی میں پیش رفت کرنا بہت مشکل کام ہے۔ ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک خواب آپ کے خوف یا شک کی ترجمانی کر رہا ہو جو آپ کے معینہ مقصد سے وابستہ ہے۔ آپ ذرا توقف کریں گے اور

سوچیں گے کہ کیا اس مقصد کا حصول اتنا ہی ضروری ہے جتنی اہم آپ کے لیے اس کی کوشش ہے۔

ٹرین یا بس کے ذریعے بہت لمبا سفر بھی اسی خیال کا ترجمان ہے۔ ٹرین کی شبیہہ میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ اسے پکڑنا یا اس کا چھوٹ جانا زندگی کے بارے میں آپ کے نظریات سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ کیا آپ اچھے مواقعے ضائع کر رہے ہیں؟ کیا آپ کامیابی کے لیے متفکر ہیں؟ بار بار ایک ٹرین کو پکڑنے کا خواب اسی تفکر یا کشمکش کا اشارہ ہے جو دنیا کا اہم قدم بننے میں درپیش آتا ہے۔ شاید آپ کو خواب یہ تنبیہہ کر رہا ہے کہ آپ تھوڑا آرام کریں، معاملات کو اتنی سنجیدگی سے نہ لیں۔ یاد رہے کہ سفر کا میکینکل ذریعہ آپ کی زندگی میں ایک خودکار ـــــ AUTOMATIC نیز کھینچ کر لے جانے والی طاقت کی علامت ہے۔ کسی کے حالات بگڑ جائیں تو ہم کہتے ہیں فلاں شخص کی گاڑی پٹڑی سے اُتر گئی ہے۔ ایک نہ ختم ہونے والا ریل کا سفر خاص طور سے جب آپ خموشی سے اور مجہول انداز میں ڈبے میں بیٹھے ہوئے ہوں اور ہر شے کو چپ چاپ گزرتے دیکھ رہے ہوں اسی مبہم اور پیچیدہ وجود کا غماز ہے جس میں آپ نے خود کو سواری کے طور پر کھینچ کر لے جانے کے لائق بنا ڈالا ہے اور آپ کے سفر کے لیے کوئی اور ذمے دار ہے۔ تاہم آپ کا خواب بتاتا ہے کہ آپ کے شعور کی تہ میں یہ احساس زندہ ہے کہ آپ ایسا کچھ پسند نہیں کرتے ہیں۔

عاقلانہ خواب

کبھی کبھار آپ ایسا خواب دیکھیں گے جس میں آپ مفعول نہ ہوں گے مگر آپ کی مختلف

انداز سے۔ آپ رونما ہونے والے واقعات کے پس منظر میں کھڑے ہیں اور اپنے آپ سے کہہ رہے ہیں "میں جانتا ہوں کہ یہ ایک خواب ہے لیکن میں اسے گزرنے دوں گا۔" دیگر لوگ بھی یہی فیصلہ کرتے ہیں لیکن وہ خواب میں داخل ہو کر اس میں رونما ہونے والے واقعات کو تبدیل کر دیتے ہیں۔ یہ گویا ایسا ہے کہ کوئی کہے "میں خواب کے اس حصے کو ناپسند کرتا ہوں۔ آؤ ہم اسے بدل ڈالیں۔" انھیں ہم عاقلانہ خواب کہہ سکتے ہیں۔ ان کی دو تشریحات ممکن ہیں۔ اگر آپ کو خبر ہے کہ یہ ایک خواب ہے لیکن آپ پیچھے کھڑے رہتے ہیں اور کچھ نہیں کرتے تو یہ صورتِ حال کو ایک ہاتھ کے فاصلے پر رکھنے والی مثال ہے۔ آپ مسئلے کے تجربے میں دورانِ خواب بھی شریک نہیں ہوتے۔ یہ ایک طریقہ ہو سکتا ہے یہ بیان کرنے کا کہ آپ حقیقت میں یہی روّیہ برتنے کے عادی ہیں ـــــ سامنے آنے والے مسائل سے ٹکراتے نہیں ہیں یا انھیں حل کرنا پسند نہیں کرتے۔

اس کے برعکس اگر آپ خواب کے عمل پر اس طرح حاوی ہیں کہ خواب کا پلاٹ اپنی ہدایت سے بدل دیتے ہیں اور من مانے حالات پیدا کر دیتے ہیں تو خواب یقیناً آپ کے لیے معاون ثابت ہو رہا ہے۔ آپ مختلف نتائج کی کھوج میں ہیں اور زندگی کی سبھی مشکلات و مسائل کو حل کرنے کے درپے ہیں۔ یہ اس بات کی خوبصورت رمز ہے کہ آپ کے اندر کافی غیر استعمال شدہ طاقتیں اور جوہر پنہاں ہیں جو باہر آنا چاہ رہے ہیں۔ ایسے خوابوں سے آپ کی حوصلہ افزائی ہونا چاہیے اور ان پر زیادہ سے زیادہ عمل کرنا آپ کے لیے اچھا ہے

ثانوی ترمیم

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ خواب اتنا صاف اور واضح ہوتا ہے کہ اس کے معنی سیدھے اور فوراً سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اس کا امکان اس وقت زیادہ ہوتا ہے جب خواب کسی خواہش یا پسندیدہ مقصد سے مماثلت رکھتا ہو۔ فرض کیجیے آپ نے خواب دیکھا کہ آپ ایک بہت خوبصورت آراستہ اور پُرتکلف گھر میں موجود ہیں جہاں آرائش کا ہر وہ سامان موجود ہے جو آپ چاہتے ہیں۔ اس خواب میں کچھ بھی رونما ہو امید یہی ہے کہ آپ جاگ اٹھیں گے اور کہیں گے "ارے بالکل ایسا تو صاف ہے۔ یہ میری تکمیلِ خواہش کا خواب تھا۔" اور اس کے بعد آپ اسے بھول جائیں گے۔ یقیناً آپ ایسا ہی ایک گھر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بہت سے لوگ یہی چاہتے ہیں۔ آپ غالباً خواب کے دیگر حصوں کو نظر انداز کر دینا پسند کریں گے تاکہ یہ تمام تجربہ آپ کے تصور کے مطابق فٹ ہو جائے۔ فرائیڈ اس ترکیب کو ثانوی ترمیم کہتا تھا اور سمجھتا تھا کہ یہ لوگوں کو ان کے خوابوں کے مواد سے متعلق فوری اور سطحی فیصلوں کا عادی بناتی ہے۔ ایک بار اس گھر کو اور باریکی سے دیکھیں۔ کیا اس میں دیگر تفصیلات موجود تھیں۔ مثلاً آپ کا تہ خانہ میں اُترنا یا سیڑھیوں سے چھت پر چڑھنا تاکہ تمام منظر کو آپ دیکھ سکیں؟ مثلاً الماری میں رکھے کپڑے یا کسی گوشے میں قرینے سے پھینکا گیا کوڑا وغیرہ؟

یہ ضروری نہیں ہے کہ ہمیشہ اس ترکیب پر عمل کرنا ممکن ہو کیونکہ خواب بہت

مرجھا جاتے ہیں۔ بالخصوص جب آپ ایک
دری فیصلہ تو کر لیں لیکن آپ کی فکر ایک
نارے دھری رہ جائے۔ لیکن اگر آپ خواب
بار سہر نو دہرانے میں کامیاب ہو جائیں اور
س کی نازک تفصیلات پر غور کر سکیں تو آپ
پنے دماغ میں نئی تعبیریں اور تشریحیں پروان
ڑھتے دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔

اپنے خوابوں میں جھانکنا

اگر آپ کو یہ خیال ستا رہا ہے کہ آپ خواب کی مختلف باتیں یاد نہیں رکھ پائیں گے تو پریشان ہرگز نہ ہوں۔ کیونکہ اگر ایک دو باتیں بھی آپ کو یاد رہ سکیں تو باقی باتیں آپ کو یاد آنے لگیں گی۔ اگر آپ ایک سرخ پنسل لے کر
لمبی فہرست تیار کرنے بیٹھ جائیں اور سوچیں کہ کوئی عملی کام انجام دے لیں گے تو آپ کو محض ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ خواب فطری چیز ہوتے ہیں اور انھیں ذہنی قیاسات کی بازی گری میں زبردستی داخل کرنا بُرا ہے۔

(باقی آئندہ)

حواشیِ ابوالکلام آزاد

جو لوگ مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے واقف ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ مولانا کو اوائل عمر ہی سے پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا عمر کا جو حصہ بچے کھیل کود میں گزارتے ہیں مولانا نے کتابوں کے مطالعے میں صرف کیا اور ان کا یہ ذوق آخر عمر تک ان کے ساتھ رہا۔ مولانا نے کسی مدرسے میں تعلیم نہیں پائی۔ گھر پر ہی پڑھا اور پھر انھیں ایسے مواقع ملے کہ اُردو، فارسی اور عربی کے علاوہ انھوں نے انگریزی اور فرانسیسی سے بھی واقفیت حاصل کی اور ان زبانوں میں قدیم و جدید علوم کا جو سرمایہ تھا اسے اپنی شخصیت میں سمو لیا۔

یہ کتاب ان حواشی کا مجموعہ ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد نے دوران مطالعہ مختلف کتابوں پر لکھے ہیں۔ یہ کتابیں مختلف زبانوں کی ہیں اور مختلف علوم سے تعلق رکھتی ہیں۔ مولانا نے جب وہ حکومتِ ہند کے وزیرِ تعلیمات تھے، انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا اور اپنا ذاتی کتب خانہ جو کئی ہزار کتابوں پر مشتمل تھا، اس ادارے کو دے کر ایک لائبریری قائم کر دی تھی۔ سید مسیح الحسن صاحب نے، جو برسوں تک اس لائبریری میں کام کرتے رہے ہیں، ان تمام کتابوں کو غائر نظر سے دیکھا ہے اور ان پر مولانا کے قلم سے جو حواشی درج ہیں وہ اس کتاب میں یکجا کر دیے ہیں۔ ایک اور اہم کام انھوں نے یہ کیا ہے کہ جن کتابوں پر یہ حواشی درج تھے، ان کے بارے میں بھی تمام ضروری معلومات فراہم کر دی ہیں۔

مصنف : مولانا ابوالکلام آزاد
مرتب : سید مسیح الحسن
صفحات : ۵۷۹
قیمت : ۶۲ روپے

دہلی اور اس کے اطراف

"دہلی اور اس کے اطراف" جس کا پہلا نام "ارمغان احباب" تھا، مولانا حکیم سید عبدالحی کے سفر کا روزنامچہ ہے۔ یہ سفر انھوں نے ۱۸۹۴ء میں دہلی اور اس کے نواحی علاقوں میں کیا تھا۔ حکیم سید عبدالحی صاحب موجودہ دنیائے اسلام کی نامور شخصیت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے والد بزرگوار تھے۔

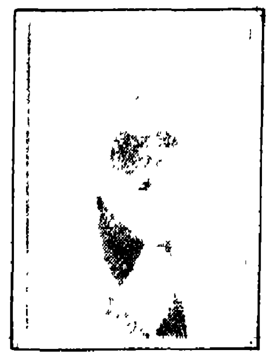
اس سفرنامے کو لکھے ہوئے تقریباً سو سال ہو چکے ہیں لیکن گزشتہ تہذیب سے دلچسپی رکھنے والا قاری اسے آج بھی لطف و بصیرت سے خالی نہ پائے گا اس لیے کہ جو کہانی اس میں بیان ہوئی ہے وہ بہت دور کی نہیں ہے۔ تاریخ میں ایک صدی کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔ اس سفرنامے میں لطف و بصیرت کا پہلو اس لیے بھی ہے کہ سفر کرنے والا جویائے حق ہے۔ اسے علم کی سچی لگن ہے، اپنی تہذیب سے گہرا لگاؤ ہے، بزرگوں کے کارناموں کے لیے دل میں احترام اور ہمعصروں کی قدر شناسی کا جذبہ ہے۔ اسلامی تاریخ اور ہندوستان میں مسلم حکمرانوں، عالموں اور صوفیوں کی فیض رسانیوں سے مکمل آگاہی نے اس کے تاثرات کو وسیع سے وسیع تر کر دیا ہے اور اس سفرنامے کو ایک تاریخی، تہذیبی اور علمی دستاویز کی حیثیت دے دی ہے۔

مصنف کا اندازِ بیان ہر قسم کے مبالغے سے بری ہے اور بے تکلف گفتگو کا رنگ لیے ہوئے ہے۔

مصنف : مولانا حکیم سید عبدالحی
مرتبہ : ڈاکٹر صادقہ ذکی
صفحات : ۱۳۴
قیمت : ۲۵ روپے

اُردو اکادمی، دہلی سے طلب کریں

غزلیں



خداداد مونس

کانٹوں کا تو نام ہے دل پر ڈال رہے ہیں چھالے پھول
اب کے برس بگیا میں کھلے ہیں کیسے کالے کالے پھول

میرا کیا ہے بھول خوشی سے ہاں ہاں پھولنے والے پھول
غم کی آندھی یاد رہے کر دیتی ہے مٹیالے پھول

اصلی رنگ گلابی ٹھہرا اور اسی کے لالے ہیں
سوکھے میں بھی یوں تو کھلے ہیں نیلے پیلے کالے پھول

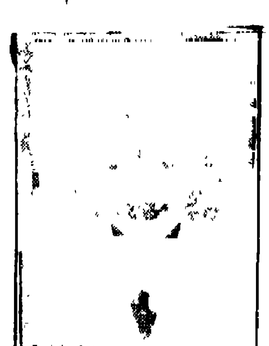
جیتے جی کچھ قدر نہ جانی مرنے پر ہنگامے ہیں
صد سالہ تقریب منائی قبر پہ آکر ڈالے پھول

مُنہ سے جھڑیں تو بات بھی مونسؔ آنکھوں سے کیوں جھڑتے ہیں
کبھی کبھی تو بن جاتے ہیں آفت کے پرکالے پھول

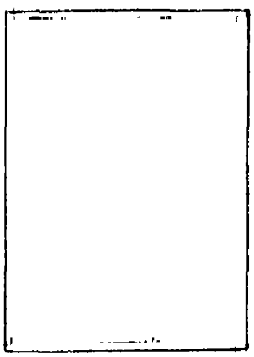
ای — ۱۰، میر شاہ علی کالونی، اجمیر

اِس آس پر گزار دے سخت مرحلے
آجائیں دن ہمارے بھی شاید کبھی بھلے
کیوں دیں کسی کو عرصۂ پرواز کا حساب
یہ بال و پر بتائیں گے خود ہی کہاں چلے
یادوں کا شہر خیر سے محفوظ رہ گیا
آنے کو آئے یوں تو کئی سخت زلزلے
سیلابِ غم جو اور بڑھا ڈوب جائیں گے
پانی اب آچکا ہے ہمارے گلے گلے
ساحل پہ لاکے ہم نے سفینہ ڈبو دیا
دیکھیں گے دُور بیٹھ کے موجوں کے مشغلے
آجائے مڑ کے عمرِ گریزاں بھی اس طرف
حائل نہ ہوں جو راہ میں لمحوں کے قافلے
چن لیں شمیمؔ آپ بھی اچھا سا کوئی دل
ہونے لگے خراب دلوں کے تبادلے

مبارک شمیم



محلہ احمد پورہ، شاہجہاں پور (یو۔پی)



فاروق شفق

ہم اس امید پر بھیگی ہوئی چھت پر نکل آ۔
گھنے ان بادلوں سے دھوپ مٹھی بھر نکل آ۔

یہ سب بستی کی زہریلی ہواؤں کا نتیجہ ۔
ذرا سے شور پر گھبرا کے ہم باہر نکل آ۔

یہاں تک ہم کو یہ بے منظری اس واسطے لا
عجب کیا اس خرابے میں کوئی منظر نکل آ۔

یہ شہرِ سنگ ناپرساں ہے پھر بھی آس رکھتے ہ
ہمارے نام کا شاید کوئی پتھر نکل آ۔

گلابی سردیوں میں دھوپ کی پتّی کی یاد
پرانے بکس میں شاید کوئی چادر نکل آ۔

جی — ۱۸۵، دھنکھیتی، گارڈن ریچ، کلکتہ ۲۴ ۰۰۰

رفیع حیدر انجم

سفر ایک شہر کا

میں ابھی ابھی اس شہر میں وارد ہوا ہوں اور شام سے قبل لوٹ جاؤں گا۔ یہ ایک خوبصورت شہر ہے لیکن اس عروس البلاد کی پُرشکوہ عمارتوں، پُرہجوم سڑکوں اور بارونق بازاروں کے درمیان مجھے اپنا وجود بے کراں سمندر میں گم ہوتی ہوئی کشتی کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ کیا یہ وہی شہرِ آرزو ہے جو کبھی میرے دل کی بستی میں خوشگوار یادوں کی طرح خیمہ زن تھا؟ لیکن وہ خیمہ تو طوفانِ حوادث میں اُجڑ چکا ہے اور اب یہاں جلی ہوئی رسّی اور خالی صراحی کے نشان تک باقی نہیں رہے۔ دل کی بستی ویران ہوئی تو تمام نشانیاں سوکھے ہوئے پتوں کی طرح بکھر کر رہ گئیں۔ اس شہر کی نئی تبدیلیاں اپنی پُرتجسس نگاہوں سے میرے ذہن و دل کے گوشوں کو کُرید رہی ہیں اور مجھ سے پوچھ رہی ہیں کہ تُو کون ہے اور یہاں کس جستجو میں آیا ہے؟ میں اپنا خالی کاسہ دکھا کر آگے بڑھ جاتا ہوں لیکن فصیلِ شہر کی اجنبی آنکھیں میرا تعاقب کرتی ہوئی مجھ تک پہنچ جاتی ہیں اور مجھ سے میرا شناختی کارڈ طلب کرتی ہیں۔

میں نے اپنی تمام جیبوں کی تلاشی لے لی ہے لیکن چند سکّوں کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ ان سکّوں سے کیا ہو سکتا ہے؟ —— ٹی وی، فریج، اسکوٹر، لڑکیاں..... سڑکیں، گلیاں، پوسٹر، جلوس، نعرہ اور چوراہے..... ان سکّوں کی کیا اوقات ہے؟

ہاں! ایک کپ چائے، دو عدد بسکٹ، مٹھی بھر چنے یا پھر مونگ پھلی کا ایک ٹھونگا..... یکایک میں خود کو بے حد تھکا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ مجھے اب لوٹ جانا چاہیے۔ یوں بھی شناختی کارڈ کے بغیر اس شہر میں زیادہ دیر رہنا اخلاقی جُرم کے مترادف ہے۔

تھوڑی دیر کے لیے ایک چوراہے پر ٹھہر کر سوچتا ہوں کہ شہر کی تبدیلیوں نے لوگوں کو کتنا اجنبی اور لاتعلق بنا دیا ہے! ہر شخص مشینی انداز میں کسی انجانی منزل کی سمت نگاہیں جمائے تیز رفتاری سے فاصلہ طے کر رہا ہے لیکن وہ منزل کون سی ہے؟ یہ فاصلہ کب ختم ہوگا؟ میں خود بھی تو نہیں جانتا کہ اب تک کتنا فاصلہ طے کر چکا ہوں۔

بھائی..... آپ کہاں جائیں گے؟.....

ایک دراز قد اور خوش لباس شخص سے پوچھنا چاہتا ہوں جو میری ہی طرح بس کی کیو میں کھڑا ہے لیکن پوچھنے کی ہمت نہیں پڑتی کہ وہ شخص متواتر اخبار کی سرخیوں کو چاٹ رہا ہے۔ کیا خبریں اتنی دلچسپ ہیں کہ اس تپش بھری دوپہر کو مسافروں کی بھیڑ، شور و غل اور حبس زدہ ماحول میں بھی پڑھی جا سکتی ہیں؟ میری پُراشتیاق نظریں اخبار کے جلی حروف کا احاطہ کرتی ہیں:

پولیس اور تخریب کاروں کے مابین جھڑپ۔
انتہا پسندوں کے ذریعے قتل کی واردات۔
کم سن بچّی کی آبروریزی۔
گراسن تیل، ڈیزل اور پانی کا بحران۔

میں گھبرا کر اپنی نگاہیں ہٹا لیتا ہوں۔ یہ خبرنامہ ہے یا حشر نامہ؟ کیا اس شہر میں یہی کچھ ہو رہا ہے؟ وہ سونے کی چڑیا کہاں گئی؟ چین کی بانسری کون چرا لے گیا؟ سفید کبوتروں کی ٹولیاں کیا ہوئیں؟ امن کی منڈیریں سونی کیوں ہیں؟ لوگوں کے چہروں کی تازگی کہاں گم ہوگئی ہے؟ —— میں دوبارہ اس شخص کو دیکھتا ہوں جو بڑے انہماک سے اخبار کی خبروں میں کھویا ہوا ہے۔ عدم تحفظ کے اس ماحول میں اس کی آسودگی پر مجھے رشک آتا ہے۔

تیز دھوپ میں کھڑا ہوا میں پسینے سے شرابور ہو رہا ہوں۔ ہر شخص حبس سے پریشان ہے۔ اور سب کے چہروں پر ایک ہی سوال لکھا ہوا ہے..... بس کب آئے گی؟..... شاید ابھی وقت نہیں ہوا ہے اور وقت گزاری کے لیے لوگ اخبار پڑھ رہے ہیں۔ خوبصورت، جوان اور فیشن ایبل جسموں کو گھور رہے ہیں۔ آئس کریم کھا رہے ہیں۔ پوسٹروں سے اُلجھ رہے ہیں اور سیاسی اٹکلیں لگا رہے ہیں۔

میں کیا کروں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

اخبار سے دِل اُچاٹ ہو گیا ہے۔ شہر کی لڑکیاں مصنوعات کی وجہ سے اپنا فطری حُسن کھو چکی ہیں لہٰذا تھوڑی ہی دیر میں اکتاہٹ ہونے لگتی ہے۔ آئس کریم کھا کر اپنا گلا خراب کرنا نہیں چاہتا۔ پوسٹروں کی نیم عُریاں تصویروں میں فنّی رچاؤ نظر نہیں آتا اور سیاسی گفتگو فضول ہے.....

آزاد نگر، ارریا، پورنیہ ۸۵۴۳۱۱

میں کیا کروں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

عجیب سی الجھن ہوتی ہے۔ جی چاہتا ہے' ایک ایک آدمی سے پوچھوں کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے؟ اس کی منزل کیا ہے اور یہ کہ اس شہر سے اس کا کیا تعلق ہے؟ لیکن اپنے ہی خیال پر ندامت محسوس ہوتی ہے کہ اگر میں واقعی ایسا کرنے لگوں تو لوگ مجھے نیم پاگل سمجھیں گے۔

اچانک لوگوں میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ ایک لمبی چوڑی اور چمکدار بس آکر کھڑی ہوگئی ہے اور ہر آدمی اس کے اندر سما جانے کی جدوجہد کرنے لگا ہے۔ مسافروں کی لمبی کیو ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور افراتفری کے عالم میں یوں لگتا ہے جیسے یہ بس کسی دہشت گرد کی طرح لوگوں کے درمیان آکھڑی ہوئی ہے۔ میں بھی اس بھیڑ میں شامل ہوں اور اپنی زور آزمائی کی بدولت بس کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ بس کی سیٹ پر بیٹھ کر اطمینان کی سانس لیتا ہوں جیسے کوئی بڑا معرکہ سر کرلیا ہو۔ اس خیال کے آتے ہی ایک لمحہ کے لیے میں حیران ہوا کہ مجھ جیسے کمزور آدمی میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی کہ بھیڑ کو کچلتا ہوا آگے بڑھ گیا؟ اس طاقت کے پس پشت میری مجبوری تھی یا خودغرضی؟ تو کیا میں ایک خودغرض آدمی ہوں؟ کیا اب تک میں نیک چلن' شریف اور ایماندار ہونے کا ڈھونگ کرتا رہا ہوں؟ دوسروں کو دھکے دے کر آگے بڑھ جانا کیا میرا اخلاقی جُرم نہیں تھا؟

بس آگے بڑھ چکی ہے اور شہر پیچھے چھوٹتا جا رہا ہے لیکن میرے سوالات مجھے ہی اپنے حصار میں جکڑے ہوئے ہیں۔ مجھے اپنی نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ میرے بغل میں بیٹھا ہوا آدمی اطمینان سے سگریٹ پھونک رہا ہے۔ مجھے اس کی بو بُری لگتی ہے لیکن یہ جانتے ہوئے بھی کہ بس پر سگریٹ نوشی ممنوع ہے' میں خاموش رہتا ہوں دوسروں کو دھکے دینا بھی تو اخلاق کے منافی ہے۔ نہیں' مجھے اس شخص کو سگریٹ نوشی سے روکنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ یہ سوچ کر میں اُداس ہو جاتا ہوں اور کھڑکی سے باہر قصبے میں اُترتی ہوئی شام کے مناظر میں اپنا انتشار چُھپانے کی کوشش کرتا ہوں۔

تیز رفتاری سے بڑھتی ہوئی بس' آہستہ آہستہ پھیلتے ہوئے شام کے دھندلے سائے اور سڑک کے کنارے درختوں کی طرف لوٹتے ہوئے دن بھر کے تھکے ہوئے پرندوں کے جُھنڈ دیکھ کر بوجھل پن سا محسوس ہوتا ہے۔ بس کے اندر کی لاتعلقی اور باہر کے بے کیف منظر سے اُداسی اور گہری ہوچلی تھی کہ دفعتاً مجھے اپنے بائیں کاندھے پر ایک بوجھ سا محسوس ہوا۔ میں نے گھوم کر دیکھا' میرے بغل والا آدمی جو کچھ دیر قبل سگریٹ نوشی کر رہا تھا اب اونگھنے لگا تھا اور لاشعوری طور پر اس کا سر میرے کاندھے سے آٹکرایا تھا۔ مجھے عجیب سی بدمزگی اور جھنجھلاہٹ محسوس ہوئی۔ اس شخص کا اونگھنا مجھے بے حد ناگوار لگا۔ اس شہر کے لوگ اتنے غیر مہذب ہوگئے ہیں کہ انھیں سفر کے آداب بھی نہیں معلوم ..... میں نے ارادہ کرلیا کہ اسے مزید اونگھنے سے روک دوں گا کہ وہ بار بار میرے کاندھے سے ٹکرا رہا تھا اور میری خفگی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ آخر ایک مسافر کو دوسروں کے آرام کا خیال تو رکھنا ہی چاہیے۔ بس پر بیٹھنے کی جگہ ہے' سونے کی تو نہیں۔ یہ دُرست ہے کہ میں بھی زیادہ ... آدمی نہیں ہوں اور مجھ سے بھی اخلاقی جُرم سرزد ہوا ہے لیکن جب بس کے تمام مسافر جاگے ہوئے ہیں تو پھر یہ شخص سونے کی کوشش کیوں کر رہا ہے؟

میرا ذہنی ردِ عمل شدید احتجاج کی صورت اختیار کرتا جا رہا تھا اور عین ممکن تھا کہ میں اس کا سر اپنے کاندھے سے جھٹک دیتا' مجھے یاد آیا کہ ایک بار اسی طرح میرے ایک ہم سفر دوست کو نیند آنے لگی تھی اور وہ اپنا سر میرے کاندھے پر لٹکا کر اطمینان سے سوگیا تھا۔ مجھے اچھا لگا تھا کہ میں نے اپنے عزیز دوست کو آرام پہنچانے میں مدد دی تھی۔ ایک لمحہ کے لیے پُرانی تازہ ہوا کے خوشگوار جھونکے کی طرح یاد کی کھڑکی سے در آئی اور مجھے چھوتی ہوئی گزر گئی۔ میں نے اپنے بغل والے مسافر کو غور سے دیکھا اور یہ محسوس کرکے حیران رہ گیا کہ اس نوجوان کا چہرہ غیر معمولی طور پر میرے اسی دوست سے مشابہ ہے۔ جب تصویر میں یاد نے چند ثانیہ قبل کی ساری کدورت مٹا دی تھی۔ اس شخص کے چہرے پر بھی ویسی ہی معصومیت ہے۔ ویسی ہی سیاہ مونچھیں' پتلے پتلے ہونٹ اور پلکوں کے غلاف سے ڈھکی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں.. نیند میں کھوئے ہوئے اس نوجوان اور میرے

دوست میں کیا فرق ہے ؟ کچھ بھی تو نہیں...... تو پھر مجھے اس کے اونگھنے پر غصہ کیوں آنے لگا تھا ؟ یہ خوبصورت اور صحت مند نوجوان بھی شاید روزی روٹی کی تلاش میں اس شہر کی خاک چھان کر اپنے گھر کو لوٹ رہا ہوگا ۔ وہاں اس کی بیوی منتظر ہوگی ۔ بچّے ہوں گے ۔ ماں، باپ اور بھائی بہن اس کی راہ تک رہے ہوں گے ۔ ان سب کے لیے اس نوجوان نے خوابوں کا گھروندا بنایا ہوگا اور اس وقت بھی شاید...... نہیں، مجھے اس نوجوان کا خواب چھین لینے کا کوئی حق نہیں ہے ۔ بس خواب ہی تو رہ گیا ہے اس کے پاس، ہمارے پاس...... میں ایک بار پھر اس نوجوان کی طرف محبّت آمیز نظروں سے دیکھتا ہوں جو میرے کاندھے پر اپنا سر رکھے بے فکری کی نیند لے رہا ہے ۔ مجھے اس کا پُر سکون چہرہ دیکھ کر عجیب سی خوشی ہوتی ہے جیسے اسے نہیں، مجھے نیند آگئی ہے ۔ میں سو رہا ہوں اور وہ خواب میری آنکھوں میں بھی اُتر آیا ہے ۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے ۔ باہر شام بہت گہری ہو چکی ہے لیکن میرے چہرے سے اُداسی کی تمام لکیریں مٹ گئی ہیں ۔

فیاض رفعت

نثری نظمیں

ٹھنڈے فریزر میں رکھی زندگی

نئے شہر کے پُرانے کافی ہاؤس میں
پامال شدہ باسی خبروں پر تبصرہ جاری ہے
کاغذ کی گیلی سیاہی غریبی کے نعروں کے
خشک ہونے کے انتظار میں،
سر جھکائے کسی بشارت کی منتظر ہے
میں تنہا تاریک گوشے میں بیٹھا
کسمساتی فراغت کے نا آسودہ احساس
کے ساتھ نیم جان کافی کے کڑوے کسیلے
گھونٹ گلے سے اُتارتے ہوئے نئی دیو مالا
کو جنم دے رہا ہوں کہ اب سمندر
کے منتھن کی روایت سوختہ جان ہو چلی ہے
اور ہم نئی وِشں کنیاؤں کے انتظار میں
وقت کے گھوڑے پر مجسّمے کی صورت
ایستادہ اپنے زوال کا ماتم کر رہے ہیں

اور ایسے میں پھر وقت کی سوئیاں اچانک
ٹھہر جاتی ہیں میں خالی احساس کی خالی کشکول
آنکھوں سے باہر کے منظر کو ڈھونڈتا ہوں
جو ماضی کے گمشدہ ورق کی طرح مجھ سے بچھڑ گیا ہے
گو کہ بظاہر معمول کا ٹھہرا پہیّا وقت اور ناوقت
کی صلیب کے درمیان نا تمام سفر کی
منزلیں طے کر رہا ہے۔ انجان مردہ لفظوں
کی آوازیں خلائے بسیط خلاء کی جزو بدن ہوتی
جا رہی ہیں۔ معدوم ہوتا ہوا سورج شفق رنگی
رتھ پر سوار آسمانوں میں پا بہ رکاب ہے
نئے منظروں کی بشارت کے ساتھ ایک بار پھر طلوع ہونے کے لیے
گویا اس طور نئی کلبیت زدہ کلفتوں اور جھوٹی فراغتوں کے ساتھ
معمول کے دن تمام ہوتے رہیں
کاش یہ معمول کا حصار ٹوٹے
تو شاید زندگی کے بدلاؤ کا احساس
جسم و روح کو گرما دے
مگر ٹھنڈے فریزر میں رکھی زندگی
حرارتوں کا سمندر کب سمیٹ پاتی ہے

منجمد خون

قوتِ گویائی تو کبھی کی سلب ہو چکی
کچھ کہتے ہوئے جی ڈرتا ہے
خود سے خائف رہنے کی عادت
خوابوں میں وحشت ناک منظروں کو
جگاتی ہے
سُر تال صراحی سے سانپ لپٹے رہتے ہیں
جیسے صندل کی تمامتر شاخیں
ہمیشہ کے لیے اُجاڑ اور ویران ہو چکی ہوں
جاگتے ہیں خواب دیکھنے کی آدھی ادھوری عادت تو
پہلے ہی سے عذابِ جان تھی
اب مزید تاریک منظروں میں گھرے
زندگی کے سیارے پناہ مانگ رہے ہیں

پُرانے چناروں کی ٹھنڈک مجھے خوابیدہ
کیفیتوں کی وحشتوں سے کبھی جگاتی ہے کبھی سُلاتی ہے
تمھارے گھر کے راستے میں پھیلی ہوئی
سبزہ زار قالین مجھے ہُمک ہُمک کر
آواز دیتی ہے
مگر خالی مکان کے طلسماتی سنّاٹے
میرے پاؤں کی زنجیر بن جاتے ہیں
میں بغیر دستک دیے وحشی خوابوں
کی دُنیا میں لوٹ جاتا ہوں
کہ ازل تا ابد سنّاٹے
میری نثر پاروں میں
منجمد خون کی طرح ٹھہر گئے ہیں

اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر، آل انڈیا ریڈیو، بھوپال

نئی مطبوعات

پریم چند کچھ نئے مباحث

مصنف : مانک ٹالا
قیمت : ۱۰۰ روپے
صفحات : ۲۸۰
ملنے کا پتا : موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اردو کے مشہور افسانہ و ناول نگار پریم چند کی شخصیت اور ان کی تخلیقات سے کون واقف نہیں۔ ان پر جو تحقیقی اور تنقیدی کام ہوئے ہیں ان سے بھی اردو دنیا آشنا ہے۔ ”پریم چند کچھ نئے مباحث“ مانک ٹالا کی پریم چند پر دوسری کتاب ہے۔ اس سے قبل ۱۹۸۵ء میں ”پریم چند اور تصانیف پریم چند“ کے عنوان سے ان کی کتاب شائع ہو چکی ہے۔ ان کتابوں کے مصنف خود بھی افسانہ نگار ہیں اور اس حیثیت سے انھیں پریم چند پر لکھنے کا خصوصی حق ہے۔ میری رائے میں ایک مصنف، تبصرہ نگار، محقق و نقاد کو اپنے طرزِ عمل سے کسی کی دل آزاری نہیں کرنی چاہیے۔ پھر یہ بھی ہے کہ جس شخصیت پر آپ نئے مباحث پیش کر رہے ہیں۔ اس پر کیے جانے والے پچھلے کاموں کو یکسر رد کر دینا ضروری نہیں۔ اختلاف رائے فکر کی نئی راہیں کھول سکتا ہے لیکن جب اختلاف کی اساس پر جو تحریر وجود میں آئے اس میں عصبیت کا شامل ہو جانا فطرتی بات ہے یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ پریم چند گاندھی ازم اور کسی حد تک اشتراکیت سے بھی متاثر تھے اور یہ دونوں نظریات ان کی تخلیقات میں عیاں ہیں۔ جس سے ان کے فکری رویے پر روشنی پڑتی ہے۔ ان ہی نظریات اور خصوصیات نے دھنپت رائے کو پریم چند بنایا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر اصغر علی انجینئر، ڈاکٹر زیدی اور ڈاکٹر گوئنکا کے خیالات آج بھی پریم چند کے مطالعے کے لیے بنیاد کا کام انجام دیتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں شامل مضامین: ملکانہ راجپوت، مسلمانوں کی شدھی، اکسیر سخن، ہاتھی دانت اور ہندوستانی ریلوں کی ساٹھ سالہ تاریخ، کے حوالے ڈاکٹر گوئنکا نے کافی پہلے دیے تھے البتہ ان کی تلاش آسان کام نہیں تھی۔ ان کے حاصل کرنے میں مصنف کو جو تگ و دو کرنی پڑی ہوگی اس کی انھیں داد دی جانی چاہیے۔ ان کا تقابلی مطالعہ ان کی روشن خیالی اور معقولیت پسندی کو واضح کرتا ہے اور قاری کی آگہی میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ ان کا استدلال بھی جاندار ہے اور وہ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

خلیل الرحمٰن اعظمی: ترقی پسندی سے جدیدیت تک

مصنف : ڈاکٹر اسلام عشرت
قیمت : ۵۰ روپے
ملنے کا پتا : دانش پبلیکیشنز، بی۔ ۹۵، پی سی کالونی، کنکر باغ، پٹنہ ۲۰

ڈاکٹر اسلام عشرت نے خلیل الرحمان اعظمی کی شاعری پر ایک پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ تحریر کیا ہے جس پر ۱۹۹۴ء میں انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی۔ یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ خلیل الرحمان اعظمی مرحوم کی ادبی شخصیت پر ایک ایم۔ فل کا مقالہ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں پیش کیا گیا تھا۔ وہ بھی اسی سال منظرِ عام پر آیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں خلیل صاحب کی شاعری کے کئی پہلو اجاگر ہوئے ہیں۔

کسی شاعر یا ادیب کے حالاتِ زندگی یکجا کرنا کچھ اہم بات نہیں اس کام میں اسکالر کو اپنا خون پانی کرنا اور پتے کو مارنا پڑتا ہے تب کہیں پیدائش سے لے کر آخری سفر تک کے حالات جمع ہوتے ہیں۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا ہے کہ اس کتاب کے سوانحی باب میں بہت سی نئی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اعظمی صاحب مرحوم ایک معلم، شاعر، ادیب، محقق اور نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک انسان دوست شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی زندگی ہی میں لوگ ان کے مرتبے کو پہچاننے لگے تھے، جب کسی محفل میں بولنے پر آتے تو کوئی دوسرا ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ راقم نے ان کو علی گڑھ میں پروفیسر خورشید الاسلام کی شاعری کے مجموعے شاخِ نہالِ غم کی رسم اجرا کے موقعے پر بولتے دیکھا تھا اس جلسے کی صدارت پروفیسر خسرو کر رہے تھے جو ان دنوں مسلم یونیورسٹی میں وائس چانسلر کے عہدے پر فائز تھے۔

اس کتاب کے مطالعے سے اور بہت سی باتوں کا علم ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر اعظمی صاحب کے انتقال کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی نے انھیں پروفیسر شپ دی۔ غالباً اعظمی صاحب اردو دنیا کے پہلے شخص تھے جنھیں یہ اعزاز بعد از مرگ دیا گیا تھا۔ ہر اچھے اور بڑے شاعر کی طرح وہ بھی بچپن ہی سے ادبی ذوق رکھتے تھے۔ مضامین لکھنے کا سلسلہ انھوں نے اپنے ہائی اسکول کے زمانے میں ہی شروع کر دیا تھا لیکن ان کی فکر اور ذوق کو تقویت علی گڑھ جیسے زبان و ادب کے گہوارے میں ملی، ان کی ادبی تربیت۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی۔ اختر انصاری، معین احسن جذبی اور ڈاکٹر نسیم قریشی جیسی ادبی شخصیتوں کے زیر سایہ ہوئی۔

اس کتاب کو پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۴۷ء کے ناگفتہ بہ حالات میں اعظمی صاحب دہلی سے علی گڑھ تشریف لے جا رہے تھے کہ فسادیوں نے انھیں اپنے طور پر مار کر ٹرین سے نیچے گرا دیا پھر انھیں جامع مسجد کے ریلیف کیمپ میں لے جایا گیا جہاں وہ تین ماہ زیر علاج رہنے کے بعد علی گڑھ پہنچے۔ مصنف کا خیال ہے کہ اعظمی کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ان کے تنقیدی مضامین کا مطالعہ ازحد ضروری ہے کیوں کہ انھوں نے اپنے مضامین کے ذریعے شخصیت اور شاعری کے تمام اصول و قواعد۔ حقیقی اور غیر حقیقی شاعری میں فرق، موضوع کا انتخاب اور اس سے شعر و ادب کا تعلق اس قسم کے مسئلوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہ کتاب دعوتِ مطالعہ دیتی ہے۔

—— مجیب الاسلام

نقطۂ نظر (تنقید و تحقیق)

مصنف: حنیف سیف ہاشمی

قیمت: ۲۰ روپے

ملنے کے پتے: انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر، راوز ایونیو، نئی دہلی۔ علی گڑھ۔
ادبی ٹرسٹ بک ڈپو، کیسر اہینگ، عابد روڈ، حیدرآباد۔

حنیف سیف ہاشمی کے مطالعے اور تحقیق کا خاص میدان لسانیات ہے۔ یہی ان کا پیشہ بھی ہے اور شاید زندگی کا نصب العین بھی۔ گلبرگہ یونیورسٹی (کرناٹک) میں کنٹر زبان کو اہمیت حاصل ہے ایسے ماحول میں اردو کی محبت سے لبریز دلوں کی موجودگی مسرت کا باعث ہے —— لیکن . . .

زیر مطالعہ کتاب کے پیش لفظ میں ڈاکٹر محمد عبدالرزاق فاروقی پروفیسر و صدر شعبۂ اردو گلبرگہ یونیورسٹی کا یہ جملہ کہ —— "نقطۂ نظر" میں شامل مضامین میں خیالات کا تنوع نہیں ہے اور نہ فکر و نظر کی کوئی نئی شمع روشن نظر آتی ہے" بڑی حد تک درست ہے۔ نو مختلف موضوعاتی مضامین کے اس مجموعے میں تحقیق کے نام پر صرف ایک مضمون "ہند آریائی اور اردو" شامل کیا گیا ہے جس میں زبان کی تاریخی حیثیت پر تحقیق کے بجائے اس کی شائستگی ثابت کرنے کی ایسی سعی کی گئی ہے جو اردو ادب کے نونہالوں کے لیے سود مند ثابت ہو سکتی ہے لیکن اردو ادب یا اردو لسانیات کے سنجیدہ طالب علموں کے لیے مضمون نامکمل ہے۔

دوسرے مضامین میں ایک مضم نعتیہ شاعروں کے ذکر پر مبنی ہے جس ابوالاعلام مصطفےٰ اعشقی بیدری کو مبین نعت کا درجہ دیا گیا۔ ماہر غالبیات مالک کو ایک خاکہ نگار کا لقب دے کر جو مضمو صاحب نے قلمبند کیا ہے اس میں ان ک عبارت آرائی کے علاوہ شمیم حنفی، عبدال صدیقی، اسلوب احمد انصاری، پروفیسر وغیرہم کے حوالہ جات ہیں۔ غالباً ہاشمی نے مالک رام کا مطالعہ سنجیدگی سے نہیں ورنہ وہ یہ نہ لکھتے کہ غالب کے بارے مالک رام کو پڑھتے ہوئے FOSTER کی کتاب CELESTIAL-OM-NI BUS کی یاد آتی ہے۔ یہاں یہ ضروری ہے FORSTER نے کیٹ شبلی کی مرقع نگاری میں ERMAN کی تلاش کی ہے جسے اردو زبان میں اقبال کے یہاں مرد مومن کی شکل میں ڈ کی ایک روایت بن گئی ہے۔ لیکن ایسے نظریے نہیں گزرا کسی نے غالب SUPERMAN کو تلاشنے کی کوش کی ہے۔

ہاشمی صاحب نے شخصی تحقیق سیڑھیاں بھی طے کی ہیں اور رشید بیدری، کرشن چندر، شیخ سعد ح اور صلاح الدین منیر سے ملاقات اد بنا پر ایک ایک مضمون لکھ کر شامل کر لیا ہے ان میں تعریفی جملے اس کثر کہ لفظ تنقید اپنے معنی تلاش کرتا ر

کتاب اُردو ادب کے ابتدائی طالب علموں کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

مکاتیب عروج و فنا

مُصنّف و ناشر: معراج بدایونی
قیمت: ۲۰ روپے
ملنے کا پتا: قادری بُک اسٹور، سبزی منڈی گیٹ، بدایوں (یو۔پی)

زیرِ مطالعہ کتاب دو نامور شعرا مرزا نثار بیگ فنا نظامی کانپوری اور سید فیاض علی عروج زیدی بدایونی کے خطوط و نمونۂ کلام پر مشتمل ایک ایسی کتاب ہے جسے ان دونوں شاعروں کے فن اور شخصیت پر مقالوں اور دیگر تذکراتی مضامین سے ضخیم بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ نثری یا شعری مسودے کو ایک مکمل کتاب کی شکل دینے کے لیے ازحد ضروری ہے کہ قاری کے منتشر ذہن کو یکجا کر کے موضوع کے ابتدائی سرے سے باندھنے کی شرط بہ عنوان ترتیب و تزئین پوری چابکدستی سے عمل میں لائی جائے۔ جو یہ کتاب پوری نہیں کرتی۔ مطالعے کے لیے اس کتاب میں عروج و فنا کے چند خطوط کے علاوہ شاداب ذکی شاکر نقوی کا خطوط نگاری سے متعلق بہت مختصر لیکن جامع مقالہ ہے جو فن میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے سودمند ثابت ہو سکتا ہے۔ شاداں بدایونی مدیر ہماری آواز" بدایوں کا مقدمہ بہ عنوان "مکاتیب عروج و فنا" ناشر و مصنف معراج بدایونی کی حوصلہ افزائی کا ضامن ہے۔

خطوط نگاری کو فن کی حیثیت اس لیے حاصل ہے کہ خط میں مکتوب نگار کے مزاج، ذوق، افتادِ طبع، علم، تہذیب، اخلاق و تمدن اور کردار کی آئینہ داری ہوتی ہے اور ایسے خطوط سے "زمانہ" کے اقدار و افکار کی پہچان میں مدد ملتی ہے۔ زمانے کے مزاج و کردار اور ماحول کی فضا جس خط میں عکس ریز نہ ہو بے شک اُس خط کو فن کے احاطے میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ مکتوباتِ غالب کی اہمیت یہی ہے لیکن فنا اور عروج کے مکتوبات کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ آج کا انسان اپنی تمام تر فنی صلاحیتوں کے باوجود اپنی ذات کے حصار میں مقید ہے۔ اُس کی سوچ اور فکر کا دائرہ سماجی، سیاسی، ثقافتی دائرے سے منقطع ہو کر ذاتی ترجیحات تک محدود ہو گیا ہے جہاں اس کا وجود زمانی حصار میں نہ عملی کردار کے تئیں وسیع النظر ہے نہ فکری کردار کے تئیں خود کو ذمے داری کے احساس کا مرکز بنا پاتا ہے۔ لیکن جو شخص حصارِ ذات سے منقطع ہو جائے وہ یقیناً عالمِ انسانی میں ایک بلند مرتبہ زمانی شخص بن کر اُبھرتا ہے اور اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے زمان و مکان کے فکری شاہدے جس سے قاری کی زندگی روشن ہو جاتی ہے۔

آخیر میں عروج زیدی کی یہ سطور ملاحظہ فرمایئے:

"زندگی کا دوسرا نام حرکت ہے اور حرکت میں برکت ہے۔ میرے اندازۂ فکر سے اہلِ خانہ متفق نہیں۔ خطوط کا جواب لکھ رہا ہوں۔ مگر تیمارداروں کی نظریں بچا کر۔"

اور فنا کی سطریں:

"مگر ایک محترمہ نے مجھے بہت اذیت پہنچائی۔ وہ بلند مرتبے کی ہیں، سب کو آرام پہنچاتی ہیں۔ انھیں کے دم سے آپ کے گھر میں رونق ہے۔ مگر مجھے دیکھ کر مل گئیں اور ان کا دل بجھ گیا۔ میں ان کا نام نہ بتاتا لیکن آپ پریشان ہوں گے اس لیے لکھ رہا ہوں کہ وہ محترمہ ہیں نکلی صاحبہ۔ اگر آپ انھیں گالی سے نوازیں تو پیشگی شکریہ۔"

مذکورہ بالا دونوں شاہدے زمانی کرداروں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ لیکن ان میں فنکار کی داخلی کیفیات نظر آتی ہیں تو خارجی نہیں۔ دونوں اچھے شاعر تھے اس سے انکار نہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ اچھے نثر نگار بھی ہوں۔ غالب کی مکتوب نگاری سے آگے کا سفر طے ہوگا اس میں شبہ ہے اور شاید آئندہ صدی تک رہے گا۔

——— شاہد رحیم

تنویرات

مُصنّف: قیوم خضر
صفحات: ۲۰۰
قیمت: ۳۰ روپے
ناشر: قیوم خضر
مطبع: جن کلیان پریس، پٹنہ ۴

تنویرات قیوم خضر صاحب کی چھٹی تصنیف ہے۔ مصنف اس سے قبل "اُردو درپن"، "اُردو اور قومی ایکتا"، "مسلمان اور حالاتِ حاضرہ"، "صادق پور ——— قربان گاہِ آزادی" اور "خضرِ راہ" منظرِ عام پر لا چکے ہیں۔ اپنی تحریروں میں خضر صاحب TRUE TOONES DUTY پر کاربند نظر آتے ہیں۔ یعنی جس میدان میں اُترتے ہیں اس کی زرخیزی، اس کی افادیت اور اس

(بقیہ ص ۲۸ پر)

ہم طرح اشعار

ستمبر ۸۹ء کے شمارے میں دیے جانے والے مصرعے پر ہمیں ہمیشہ کی طرح کافی تعداد میں شعر موصول ہوئے ان میں جو شعر صحیح بحر اور درست ردیف قافیے میں ہیں ان کا انتخاب درج ذیل ہے۔ گلدستہ ان حضرات کو ارسال کیا جائے گا جن کے بھیجے ہوئے اشعار چوکھٹے میں دیے جا رہے ہیں۔ بہتر ہو کہ اشعار پوسٹ کارڈ پر لکھ کر بھیجے جائیں۔ ایک پوسٹ کارڈ پر صرف ایک ہی شعر لکھیں۔

چمن کی شاخوں کو ہم نشینو جو خون اپنا عطا کرے گا
اُجاڑ موسم کے درمیاں بھی وہ پھول بن کر کھلا کرے گا
(انجم اعلیٰ پوری)
مرسلہ: صفدر علی خاں، پوسٹ ماسٹر
اعلیٰ پور، بدایوں (یو۔پی)

یہ شہر آسیبِ فرقہ بندی سے مبتلائے عذاب ہے گر
تو نقشِ حُبِّ بشر بِلاؤ امید ہے فائدہ کرے گا
(شاہد رضا ساجد)
مرسلہ: نکہت نعیمہ، ۱۵۔ ایف سڑک نمبر ۱۶۱
سیکٹر نمبر ۲، بھلائی نگر، ضلع درگ (ایم۔پی)

لہو پلا کر چمن کو اپنے جو زندگانی عطا کرے گا
ہر ایک پتہ چمن کا نجمی وظیفہ اُس کا پڑھا کرے گا
شاعر اور مرسل: نجمی اعلیٰ پوری، بدایوں

کوئی کسی سے کرے گا اُلفت، کوئی کسی سے دغا کرے گا
رہے گا جب تک جہان باقی، یہی تماشہ ہوا کرے گا
(رضا مدھوپوری)
مرسلہ: عبدالستار انصاری، مدھوپور

جواب جس کا نہ مل سکے گا سوال ایسا اٹھا کرے گا
نئے زمانے میں گھر کے اندر چراغ دن میں جلا کرے گا
(ایم۔ ابرار تابندہ)
مرسلہ: ایم۔ ارشد حبیب، مدھوپور

ہوا ہے ہم سے نہ کچھ بھی اب تک نہ آگے کچھ بھی ہوا کرے گا
کیا ہے جو کچھ کیا خدا نے کرے گا جو کچھ خدا کرے گا
شاعر اور مرسل: خالق بلہروی، بدایوں

ہر ایک سازش دبا کرے گی، ہر ایک فتنہ مٹا کرے گا
جہاں میں جب تک ہے حق پرستی، چراغ حق کا جلا کرے گا
شاعر اور مرسل: رضا مدھوپوری، مدھوپور

غریب دل کی وقار جو بھی دعائیں ہر دم لیا کرے گا
ہر ایک دولت خدا بھی اُس کو یہاں وہاں کی عطا کرے گا
شاعر اور مرسل: وقار بدایونی، بدایوں

قیام کب تک رہے گا تیرا مسافرِ رنج و غم یہاں پر
ہمارے دل کی سرائے خالی خوشی سے کس دن بنا کرے گا
(ریحانہ بیگم ریحانہ)
مرسلہ: رئیسہ بیگم، جگدل پور

وطن پرستوں نے خونِ دل سے لکھی ہے جو داستانِ جرأت
ہر ایک اہلِ وطن ہمیشہ کہا کرے گا سنا کرے گا
(ساجد رضا زاہد)
مرسلہ: دانش ہاشمی، بھلائی نگر

تمہاری فطرت جفائیں کرنا نہ کوئی شکوہ نہ کچھ شکایت
ہمارا دل تو مدام پھر بھی تمھارے حق میں دعا کرے گا
(کمال بدایونی)
مرسلہ: جمال اختر، سرائے بدایوں

ہزار ناکامیوں کے قصے سنے ہیں انور جہاں نے پھر بھی
مرا فسانہ پڑھا کرے گا مری کہانی سُنا کرے گا
(انور حسین انور)
مرسلہ: ایس۔ آر۔ فریدی، اوجھا

غموں کو پینا ستم کو سہنا یہ اس کی عادت سی ہو گئی ہے
جو درد دینا ہو اور دے دو ریاض یونہی ہنسا کرے گا
شاعر اور مرسل: ریاض بوندوی، بوندی راجستھان

تمہاری خوش اعتمادی سرور بنے گی بربادیوں کا باعث
وفا سے جو آشنا نہیں ہے وہ تم سے کیسے وفا کرے گا
(سرور الہدیٰ)
مرسلہ: ندیم الہدیٰ، کلکتہ

ہمارے غم کا علاج بسمل طبیب کیوں کر بھلا کرے گا
دیا ہے یہ دردِ دل کو جس نے وہی اب اس کی دوا کرے گا
شاعر اور مرسل: رام کشور بسمل، بدایوں

یہ پائے لغزش، طریقِ غفلت بلاسبب تو نہیں ہے ہم میں
دلاسہ دل کو ہے جب عفو کا گناہ سرزد ہوا کرے گا
(صدف جعفری)
مرسلہ: نظر حسین بابا، کلکتہ

بتوں کا کلمہ پڑھے ہے کوئی خدا کی یا کوئی پکارے
سبھوں کی پوری مگر ضرورت خدا کرے ہے خدا کرے گا
(حفیظ شعبانی)
مرسلہ: امتیاز احمد انصاری، آسنسول

رہے گی تا زندگی ہمارے عمل میں 'لاتقنطو' کی آیت
خدا ہمیں قیدِ رنج و غم سے ضرور اک دن رہا کرے گا
(ریحانہ بیگم ریحانہ)
مرسلہ: فاطمہ بی، جگدل پور

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے

موصولہ عنوانات

ستمبر ۱۹۸۹ء کے "ایوانِ اُردو دہلی" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی، اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانوں میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوان ذیل میں درج کیے جارہے ہیں :

شعری عنوانات

زندگی شغلِ آہ وزاری ہے
زندگی ایک ضربِ کاری ہے
پھر بھی کیا دِلکشی ہے ظالم ہیں
پھر بھی کم بخت کتنی پیاری ہے
(زریش کمار شاد)

مرسلہ : ایم۔ ندیم زیدی شہنشاہ صاحب گنج (ہوپاپانہ بھجیں)

ایک عمر اور دے کہ تجھے یاد کرسکوں
یہ زندگی تو وقفِ غمِ حادثات ہے
(نامعلوم)

مرسلہ : ایم مختار احمد، جمالیہ دواخانہ
۴/۷، گیس اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۰۹۔

کیا دیکھتا ہے ہاتھ مرا چھوڑ دے طبیب
یاں جان ہی بدن میں نہیں نبض کیا چلے
(ذوقؔ)

مرسلہ : عابد حسین، برہنڈہ

مرا رنگ روپ بگڑ گیا مرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں سے اُجڑ گیا میں اسی چمن کی بہار ہوں
(بہادر شاہ ظفرؔ[1])

مرسلہ : قیام الدین بوندی راجستھان

[1] یہ شعر ظفر کا نہیں مضطر خیرآبادی کا ہے ـــــ ادارہ

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر
(حالیؔ)

مرسلہ : زبیر اشرف، اکبرپور

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی
(نامعلوم)

مرسلہ : سید فاروق احمد قادری، برہان پور
غلام جیلانی، مظفرپور۔

ہو چکی صبح، فسانہ ہے قریبِ تکمیل
گھل چکی شمع بس اب ہے اسے ٹھنڈا ہونا
(جمیل مظہری)

مرسلہ : عبدالمنان ہمدم، برہنڈہ

ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں
(فیض احمد فیضؔ)

مرسلہ : محمد ضیاء الحق ضیاء، صاحب گنج

ہم سے زندہ تھی زندگی کل تک
آج ہم زندگی کے مارے ہیں
(شکیلؔ بدایونی)

مرسلہ : نقی، لکھمینیا

حالات کی دیمک نے انھیں چاٹ لیا ہے
اس دور کے انساں ہیں بوسیدہ رسالے
(ندا فاضلی)

مرسلہ : راشد مرزا، حیدرآباد

یہ مانا ہم نے کہ دشوار ہے بہت مرنا
تو جینا بھی نہیں آسان آدمی کے لیے
(ریاضؔ بوندوی)

مرسلہ : شمیم الزماں، راجستھان

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں
(نامعلوم)

مرسلہ : ایم علی، برہانپور

زلزلہ جس کے گھروندے کو مٹا دیتا ہے
اُس کو بھی صبر کی توفیق خدا دیتا ہے
(نامعلوم)

مرسلہ : فرزانہ اعظمی، جہانگیرپور

تڑپتی دیکھتا ہوں جب کوئی شے
اٹھا لیتا ہوں اپنا دل سمجھ کر
(نامعلوم)

مرسلہ : قریش حسین، برہانپور

کیا ہے جو راہ دل کی طے کرتے مر گئے ہم
جوں نقشِ پا ہمارا تا دیر اثر رہے گا
(میر تقی میرؔ)

مرسلہ : مسحور قیصر، مونگیر

پہلے فساد میں مرا سندور چھن گیا
اب کے فساد میں مرا بیٹا نہیں رہا
(ظفر صدیقی)

مرسلہ : محمد سہیل، کٹک

حادثوں کا کیا ہے یہ تو زندگی کے ساتھ ہیں
ایک سے بچ کر چلوگے دوسرا مل جائے گا
(عزیز بگھروی)

مرسلہ : حکیم محمد واعظ الحق، صاحب گنج

گم کہیں ہو جائے گی قدموں کی آہٹ چھوڑ کر
دیکھنا اک روز یہ پچھلے پہر کی زندگی
(ظہیر غازی پوری)

مرسلہ : ارشد نجمی، گیا

مصیبت جھیلنے والے نئی دنیا بنا لیں گے
تماشہ دیکھنے والے ترا انجام کیا ہوگا
(نامعلوم)

مرسلہ : محمد عمر انصاری، ٹانڈہ

ہم طرح اشعار

ستمبر ۸۹ء کے شمارے میں دیے جانے والے مصرعے پر ہمیں ہمیشہ کی طرح کافی تعداد میں شعر موصول ہوئے ان میں جو شعر صحیح بحر اور درست ردیف قافیے میں ہیں ان کا انتخاب درج ذیل ہے۔ گلدستہ ان حضرات کو ارسال کیا جائے گا جن کے بھیجے ہوئے اشعار چوکھٹے میں دیے جا رہے ہیں۔ بہتر ہو کہ اشعار پوسٹ کارڈ پر لکھ کر بھیجے جائیں۔ ایک پوسٹ کارڈ پر صرف ایک ہی شعر لکھیں۔

چمن کی شاخوں کو ہم نشینو جو خون اپنا عطا کرے گا
اُجاڑ موسم کے درمیاں بھی وہ پھول بن کر کھلا کرے گا
(انجم اعلیٰ پوری)
مرسلہ: صفدر علی خاں، پوسٹ ماسٹر
اعلیٰ پور، بدایوں (یو۔پی)

یہ شہر آسیب فرقہ بندی سے مبتلائے عذاب ہے گر
تو نقشِ حُبِّ بشر پلاؤ امید ہے فائدہ کرے گا
(شاہد رضا ساجد)
مرسلہ: نکہت نعیمہ، ۱۵۔ ایف سڑک نمبر ۱۱، سیکٹر نمبر ۲، بھلائی نگر، ضلع درگ (ایم پی)

لہو پلا کر چمن کو اپنے جو زندگانی عطا کرے گا
ہر ایک پتہ چمن کا نجمی وظیفہ اُس کا پڑھا کرے گا
شاعر اور مرسل: نجمی اعلیٰ پوری بدایوں

کوئی کسی سے کرے گا اُلفت، کوئی کسی سے دغا کرے گا
رہے گا جب تک جہان باقی، یہی تماشہ ہوا کرے گا
(رضا مدھوپوری)
مرسلہ: عبدالستار انصاری، مدھوپور

جواب جس کا نہ مل سکے گا سوال ایسا اٹھا کرے گا
نئے زمانے میں گھر کے اندر چراغ دن میں جلا کرے گا
(ایم۔ ابرار تابندہ)
مرسلہ: ایم۔ ارشد حبیب، مدھوپور

ہوا ہے ہم سے نہ کچھ بھی اب تک نہ آگے کچھ بھی ہوا کرے گا
کیا ہے جو کچھ کیا خدا نے کرے گا جو کچھ خدا کرے گا
شاعر اور مرسل: خالق بلہروی، بدایوں

ہر ایک سازش دبا کرے گی، ہر ایک فتنہ مٹا کرے گا
جہاں میں جب تک ہے حق پرستی، چراغ حق کا جلا کرے گا
شاعر اور مرسل: رضا مدھوپوری، مدھوپور

غریب دل کی وقار جو بھی دعائیں ہر دم لیا کرے گا
ہر ایک دولت خدا بھی اُس کو یہاں وہاں کی عطا کرے گا
شاعر اور مرسل: وقار بدایونی، بدایوں

قیام کب تک رہے گا تیرا مسافر رنج و غم یہاں پر
ہمارے دل کی سرائے خالی خوشی سے کس دن بنا کرے گا
(ریحانہ بیگم ریحانہ)
مرسلہ: رئیسہ بیگم، جگدل پور

وطن پرستوں نے خونِ دل سے لکھی ہے جو داستانِ جرأت
ہر ایک اہلِ وطن ہمیشہ کہا کرے گا سنا کرے گا
(ساجد رضا زاہد)
مرسلہ: دانش ہاشمی، بھلائی نگر

تمھاری فطرت جفائیں کرنا نہ کوئی شکوہ نہ کچھ شکایت
ہمارا دل تو مدام پھر بھی تمھارے حق میں دعا کرے گا
(کمالی بدایونی)
مرسلہ: جمال اختر، سرائے بدایوں

ہزار ناکامیوں کے قصے سنے ہیں انور جہاں نے پھر بھی
مرا فسانہ پڑھا کرے گا مری کہانی سنا کرے گا
(انور حسین انور)
مرسلہ: ایس۔ آر۔ فریدی، اوجین

غموں کو پینا ستم کو سہنا یہ اس کی عادت سی ہو گئی ہے
جو درد دیتا ہوا اور دے دو ریاض یونہی ہنسا کرے گا
شاعر اور مرسل: ریاض بونڈوی، بونڈی، راجستھان

تمھاری خوش اعتمادی ترور بنے گی بربادیوں کا باعث
وفا سے جو آشنا نہیں ہے وہ تم سے کیسے وفا کرے گا
(سرور الہدیٰ)
مرسلہ: ندیم الہدیٰ، کلکتہ

ہمارے غم کا علاج بسمل طبیب کیوں کر بھلا کرے گا
دیا ہے یہ درد دل کو جس نے وہی اب اس کی دوا کرے گا
شاعر اور مرسل: رام کشور بسمل، بدایوں

یہ پائے لغزش، طریقِ غفلت بلا سبب تو نہیں ہے ہم میں
دلاسہ دل کو ہے جب عفو کا گناہ سرزد ہوا کرے گا
(صدف جعفری)
مرسلہ: نظر حسین بابا، کلکتہ

بتوں کا کلمہ پڑھے ہے کوئی خدا کی یا کوئی پکارے
سبھوں کی پوری مگر ضرورت خدا کرے ہے خدا کرے گا
(حفیظ شعبانی)
مرسلہ: امتیاز احمد انصاری، آسنسول

رہے گی تا زندگی ہمارے عمل میں 'لاتقنطو' کی آیت
خدا ہمیں قیدِ رنج و غم سے ضرور اک دن رہا کرے گا
(ریحانہ بیگم ریحانہ)
مرسلہ: فاطمہ بی، جگدل پور

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے

موصولہ عنوانات

ستمبر ۱۹۸۹ء کے "ایوانِ اُردو دہلی" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی، اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانوں میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوان ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں :

شعری عنوانات

زندگی شغلِ آہ وزاری ہے
زندگی ایک ضربِ کاری ہے
پھر بھی کیا دلکشی ہے ظالم میں
پھر بھی کم بخت کتنی پیاری ہے
(نریش کمار شاد)

مرسلہ : ایم. ندیم زیدی شہنشاد، صاحب گنج (پوپلا پتا بھیجیں)

ایک عمر اور دے کہ تجھے یاد کر سکوں
یہ زندگی تو وقفِ غمِ حادثات ہے
(نامعلوم)

مرسلہ : ایم مختار احمد، جمالیہ دواخانہ
۳/۷ گیس اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۰۹۔

کیا دیکھتا ہے ہاتھ مرا چھوڑ دے طبیب
یاں جان ہی بدن میں نہیں نبض کیا چلے
(ذوق)

مرسلہ : عابد حسین، برہنڈہ

مرا رنگ روپ بگڑ گیا مرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں سے اُجڑ گیا میں اسی چمن کی بہار ہوں
(بہادر شاہ ظفر)[1]

مرسلہ : قیام الدین، بوندی راجستھان

[1] یہ شعر ظفر کا نہیں مضطر خیرآبادی کا ہے ——— ادارہ

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر
(حالی)

مرسلہ : زبیر ارشد، اکبر پور

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی
(نامعلوم)

مرسلہ : سید فاروق احمد قادری، برہان پور۔
غلام جیلانی، مظفر پور۔

ہو چکی صبح، فسانہ ہے قریبِ تکمیل
گھل چکی شمع بس اب ہے اسے ٹھنڈا ہونا
(جمیل مظہری)

مرسلہ : عبدالمنان ہمدم، برہنڈہ

ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں
(فیض احمد فیض)

مرسلہ : محمد ضیاء الحق ضیاء، صاحب گنج

ہم سے زندہ تھی زندگی کل تک
آج ہم زندگی کے مارے ہیں
(شکیل بدایونی)

مرسلہ : تقی، لکھمینیا

حالات کی دیمک نے انھیں چاٹ لیا ہے
اس دور کے انسان ہیں بوسیدہ رسالے
(ندا فاضلی)

مرسلہ : راشد مرزا، حیدر آباد

یہ مانا ہم نے کہ دشوار ہے بہت مرنا
تو جینا بھی نہیں آسان آدمی کے لیے
(ریاض بوندوی)

مرسلہ : شمیم بانو، بوندی راجستھان

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں
(نامعلوم)

مرسلہ : ایم علی، برہانپور

زلزلہ جس کے گھروندے کو مٹا دیتا ہے
اُس کو بھی صبر کی توفیق خدا دیتا ہے
(نامعلوم)

مرسلہ : فرزانہ اعظمی، ھ گیور

تڑپتی دیکھتا ہوں جب کوئی شے
اٹھا لیتا ہوں اپنا دل سمجھ کر
(نامعلوم)

مرسلہ : قریش حسین، برہانپور

کیا ہے جو راہ دل کی طے کرتے مر گئے ہم
جوں نقشِ پا ہمارا تا دیر اثر رہے گا
(میر تقی میر)

مرسلہ : مسحور قیصر، مونگیر

پہلے فساد میں مرا سندور چھن گیا
اب کے فساد میں مرا بیٹا نہیں رہا
(ظفر صدیقی)

مرسلہ : محمد سہیل، کٹک

حادثوں کا کیا ہے یہ تو زندگی کے ساتھ ہیں
ایک سے بچ کر چلوگے دوسرا مل جائے گا
(عزیز بگھروی)

مرسلہ : حکیم محمد واعظ الحق، صاحب گنج

گم کہیں ہو جائے گی قدموں کی آہٹ چھوڑ کر
دیکھنا اک روز یہ پچھلے پہر کی زندگی
(ظہیر غازی پوری)

مرسلہ : ارشد نجمی، گیا

مصیبت جھیلنے والے نئی دنیا بنا لیں گے
تماشہ دیکھنے والے ترا انجام کیا ہوگا (نامعلوم)

مرسلہ : محمد عصمت انصاری، ٹانڈہ

نثری عنوانات

"خدا کی بستی" (شوکت صدیقی کا ناول)
مرسلہ: مس شبنم خاں، ڈی-۵۲۶، نیتا جی نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۳۔

"آخرِ شب کے ہم سفر" (قرۃ العین حیدر کا ناول)
مرسلہ: محمد صدیق، معرفت شبّیر احمد، صدیق منزل، انوپ شہر روڈ، اے ایم یو، جمال پور، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲ (یو-پی)۔

"تصویرِ درد" (ڈاکٹر محمد اقبال کی نظم)
مرسلہ: نوشابہ پروین، بھاگلپور

"اندھیری رات کے مسافر" (نسیم حجازی کا ناول)
مرسلہ: محمد ارمان صدری، تاج پور

"ہمدردی" (اقبالؔ کی نظم)
مرسلہ: سیّد فاروق احمد قادری، برہان پور

"غم کے سائے" (بیگم محمودہ بشیر کا ناول)
مرسلہ: انجم آرا چندہ، ہزاری باغ

"خدا مصروف ہے اب تک" (امیر قزلباش کی نظم)
مرسلہ: بدرؔ واسطی، بھوپال

"وہ نہیں آئے گا" (عُمیر عثمانی کا افسانہ)
مرسلہ: رتن لعل گپتا، صاحب گنج

"ایک زخم اور" (حامد علی شہباز کا افسانہ)
مرسلہ: نصرت متین سعدیہ، حیدرآباد

"بکھری ہوئی زندگی" (ڈاکٹر کیول دھیر کا افسانہ)
مرسلہ: بیگم المیرون ضیاء، صاحب گنج

"سسکتے ساز" (گلشن نندہ کا ناول)
مرسلہ: محمد صدیق، جمال پور

"گلدستہ" پہلے اور دوسرے نمبر پر درج شعری عنوان اور پہلے اور دوسرے نمبر پر درج نثری عنوان بھیجنے والوں کو ارسال کیا جارہا ہے۔

بقیہ

نئی مطبوعات

کے مزاج کا بہ خوبی اندازہ کرنے کے بعد فصل لگاتے ہیں۔ ان کی گزشتہ ساری کتابیں ان کی برسوں کی ادبی ریاضت اور وسیع مطالعے کی نشان دہی کرتی ہیں۔

تنویرات تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب تنبیہات سے موسوم ہے۔ اس میں دس مضامین ہیں اور اکثر "گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را" کے مصداق ہیں۔ ان مضامین میں "کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور" صاف نظر آتا ہے۔ سوانحی خاکے بھی دل کش اندازِ بیان کے نمونے ہیں۔

دوسرا باب تنویرات ہے اور مختلف عنوانات کے تحت خضر صاحب کے زورِ قلم کی سند پیش کرتا ہے۔ اس باب کے مضامین میں مافی الضمیر کو کم سے کم الفاظ میں ادا کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ تقریباً یہ سارے مضامین وقتاً فوقتاً آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے نشر ہوتے رہے ہیں۔

تیسرا باب تنذیہات سے معنون ہے۔ اُردو دنیا کا عام قاری ہندو دیومالائی قصص کی تفصیلات سے پوری طرح واقف نہیں ہے۔ خضر صاحب نے ہندوؤں کی مقدس کتابیں، رامائن اور مہابھارت کا مطالعہ بھی کیا ہے اور ان سے متعلق ہندی کے اسکالروں سے معلومات حاصل کرنے کے بعد "کرشن جی کا ایک سرسری مطالعہ" اور "مہابھارت میں یقین کامل بہ ذات مطلق کا تصور" جیسے مضامین لکھے ہیں۔ اس باب میں فراق گورکھپوری سے متعلق ایک طویل مضمون ہے "قومی یکجہتی کا علامتی شاعر فراقؔ" اس میں ضرورت سے زیادہ اشعار نقل کر کے مضمون کو طول دے دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مضمون کے عنوان کا حق بھی ادا نہیں ہو سکا ہے۔ مجموعی اعتبار سے تنویرات ہمارے نثری سرمایے میں قابلِ لحاظ اضافہ ہے۔

——— فیاض الرحمٰن

بقیہ

منظر

کا چھنا کا بیگم حسین کے احساس سے معدوم ہوگیا اور وہ تمام کرچیاں جو ان کے محسوسات میں پھنسی انھیں مضطرب کر رہی تھیں اپنے آپ نکل گئیں ان کی جگہ بلا تامل اس بے پایاں منظر نے لی جو انھیں یہ یقین دلانے میں کامیاب ہوگیا کہ وہ کمزور، رنجور، تہی دست نہیں ہیں بلکہ اب بھی خود میں پہلے جیسی ہی طاقت ور اور منظم ہیں۔ کیوں کہ یہ نظر نواز جاں فزا منظر اُن کا اپنا ہے۔ بالکلیہ ان کا اپنا . . .

اُردو خبرنامہ

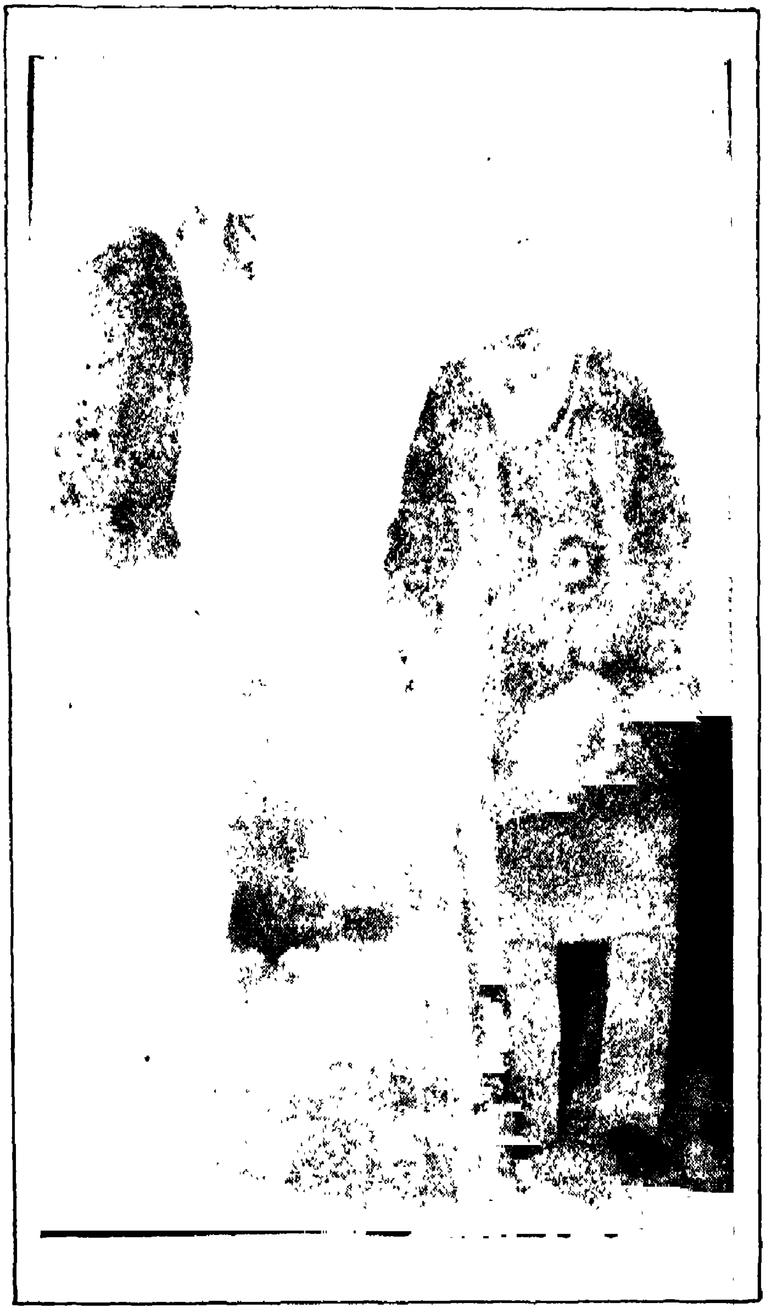
ایک کامیاب تجربہ

ج کل ہر ذی علم اس بات کو محسوس کر
غزلوں کی بہتات اور اس کی روز افزوں
ں کی وجہ سے نظموں پر توجہ میں کچھ کمی آتی
ہے اور بعض اوقات تو نظموں کے دور
آغاز کا بھی اندیشہ ہونے لگتا ہے اس امر
ردو اکادمی نے بھی محسوس کیا اور اسی
نظر اردو اکادمی کی جانب سے قائدین
نڈت نہرو اور مولانا آزاد صدی تقریبات
ے پریکی آڈیٹوریم میں جو مشاعرہ جشن
منعقد کیا گیا اس میں شعرا حضرات سے
طور پر گزارش کی گئی کہ وہ اس مشاعرے
نظمیں ہی پیش فرمائیں۔ اُردو اکادمی کا یہ
یاب رہا اور علمی حلقوں میں اس اقدام
ستائش کی گئی۔ آڈیٹوریم جشن آزادی
مشاعروں کی طرح اس بار بھی مکمل طور
اتھا لیکن ایک تبدیلی جو نظر آرہی تھی وہ
ہاں ترنم کے دلدادہ اور ہلکے پھلکے شعروں
سکنے والے یا سیٹیاں بجانے والے
کی جگہ مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں
با اور اساتذہ نے لے لی تھی جو شعر کو
زاج کے مطابق سمجھتے ہیں اور جو شعر کی
بیوں اور خامیوں سے بخوبی واقف

سنجیدہ ماحول، خوبصورت اسٹیج، باوقار

شعرا اور فہیم سامعین کے امتزاج سے ایک ایسے

مشاعرے کا آغاز ہوا جس میں روایتوں سے
انحراف کیا گیا تھا اور اس مشاعرے میں شہوت
سے آخر تک نظموں کی ہی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔
مشاعرہ بیگم انیس احمد کی صدارت اور
ندا فاضلی کی نظامت میں ہوا۔ ف۔ س۔ اعجاز
پہلے شاعر کی حیثیت سے مائک پر آئے اور



بیگم انسا ہی شمع روشن کر کے مشاعرے کا افتتاح کر رہے ہیں

انھوں نے "مجھے وہ خواب مت بھیجو" سُنائی ساغر خیامی نے چند قطعات کے بعد "استاد مر گئے" اور "آموں کا سہرا" سنایا۔ افتخار اعظمی نے "ادھوری نظم" مظفر پور کے ناز قادری نے "نغمۂ سحر" ہلال سیوہاروی نے "نہرو پرلوک میں" عنبر بہرائچی نے "قابیل کے شہر سے" اور کرشن موہن نے "سقراط بڑا خوش قسمت تھا" نظمیں سنائیں۔ کنور مہندر سنگھ بیدی نے ملک کے نوجوانوں خصوصی طور پر طلبا کو حصولِ علم کی ضرورت اور اس کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ "عمر درکار ہے اک مُلک سنورنے کے لیے" راہی شہابی نے ایک طویل نظم "شکوہ" پڑھی۔ جس میں انھوں نے کہا کہ آج کے اس پُر آشوب دور میں بھی:

احباب کو شکوہ ہے غزل کیوں نہیں کہتے
مستی بھری آنکھوں کو کنول کیوں نہیں کہتے

خداداد مونس نے "آتنک" کے پس منظر میں ایک نظم پڑھی جس میں اس المیہ کی طرف اشارہ کیا:

بے گناہوں کے لہو کی بہہ رہی ہیں ندیاں
خون مل سکتا نہیں لیکن مریضوں کے لیے

چنڈی گڑھ سے آئے ہوئے ڈاکٹر نریش نے اپنی نظم "ونسٹر کاسل میں" میں اپنے ان مجروح احساسات کا ذکر کیا جو لندن میں واقع ونسٹر کاسل کے مقام پر اس نمائش کو دیکھنے کے بعد ان میں بیدار ہوئے تھے جس میں ہندوستان سے لوٹے گئے تخت و تاج اور نوادرات کی نمائش کی گئی تھی۔ شہریار نے اپنی مختصر نظموں سے سامعین کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ زبیر رضوی، بلراج کومل، متین امروہوی اور ثریا رحمٰن نے بھی اپنی نظمیں پیش کیں۔ ندا فاضلی نے دو موں کے بعد "اک لٹی ہوئی بستی کی کہانی" اور "باپ کی موت پر ایک نظم" سنائی موخرالذکر نظم کے آخری لفظ:

تمھاری قبر میں، میں دفن ہوں
تم مجھ میں زندہ ہو۔
کبھی فرصت ملے تو
فاتحہ پڑھنے چلے آنا۔

مشاعرہ آخری مرحلے میں پہنچ چکا تھا اور اب باری تھی علی سردار جعفری کی جنھوں نے "نیند" اور "آبلہ پائی" سنائی۔ "نیند" کو سامعین نے بے حد پسند کیا۔ یہ نظم انھوں نے بہت پہلے اپنے بیٹے کی پہلی سالگرہ کے موقعے پر جیل میں لکھی تھی۔

کیفی اعظمی کاغذ پر لکھ کر "احتجاج" لائے تھے ان کا دعوا تھا کہ دلی میں پہلی بار وہ اپنا کلام لکھ کر لائے ہیں۔ اس کی وجہ انھوں نے مزاحیہ انداز میں یہ بتائی کہ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں دہلی



دائیں سے: ناظمِ مشاعرہ ندا فاضلی، بلراج کومل، افتخار اعظمی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، صدرِ مشاعرہ بیکل اتساہی، علی سردار جعفری اور کرشن موہن

والے مجھے اتنا جاہل نہ سمجھنے لگیں کہ میں اپنی لکھی ہوئی نظم پڑھ بھی نہیں سکتا۔ احتجاج میں انھوں نے یہ دکھایا ہے کہ ووٹنگ کے دوران کس طرح گھپلے بازی ہوتی ہے۔ ایک شعر ملاحظہ فرمائیے جس سے پوری نظم کے تھیم کا پتہ چلتا ہے:

وہ جس کو ڈوبنا تھا تر چکا ہے
میں اس کا ووٹ ہوں جو مر چکا ہے

آخر میں صدر مشاعرہ بیکل اتساہی نے: "سنا ہے ہم ترقی کر رہے ہیں" اور "میں شرمندہ ہوں تیرا نام اکثر بھول جاتا ہوں" سنا کر داد وصول کی۔

مشاعرے میں پیش کی جانے والی سبھی نظمیں فسادات اور آج کل کے حالات پر تھیں جس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آج کا شاعر افراتفری کے ماحول سے کس قدر متاثر ہے۔ تقریباً ساڑھے نو بجے مشاعرہ ختم ہو گیا اور اکثر لوگ یہ کہتے ہوئے سُنے گئے کہ اگر مشاعرے اسی وقت پر ختم ہونے لگیں تو ہم سب کو ان مشاعروں سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملے۔ لوگ یہ کہتے ہوئے بھی سُنے گئے کہ جس طرح غزلوں کی روایت سے انحراف کرکے دہلی اُردو اکادمی نے نظموں کے مشاعرے کا انعقاد کیا اگر اسی طرح آدھی رات کو مشاعرہ ختم کرنے کی روایت سے بھی انحراف کر لیا جائے تو دور دراز سے آنے والے ان قدآور شعرا کو بھی سُن سکیں گے جو عموماً آخر وقت میں اپنا کلام پڑھتے ہیں۔

نظموں کے مشاعرے کا تجربہ ایک کامیاب تجربہ ثابت ہوا۔ اگر نظموں کے مشاعروں کی روایت چل پڑی تو اس کا سہرا دہلی اُردو اکادمی کے ہی سر جائے گا۔

(محمد ظفرالدین، قومی آواز، نئی دہلی)

آغا شاعر قزلباش پر یک روزہ سیمینار

دہلی اُردو اکادمی نے ۲۶ اگست کو اُردو کے مشہور شاعر افسر الشعرا آغا شاعر قزلباش دہلوی پر یک روزہ سیمینار منعقد کیا۔ سیمینار غالب اکیڈمی نئی دہلی کے آڈیٹوریم میں صبح ۱۰ بجے شروع ہوا اور شام چار بجے تک جاری رہا۔

افسر الشعرا آغا شاعر قزلباش دہلی کے نامور شعرا میں امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔ وہ جہاں استاد حضرت داغ دہلوی کے ان شاگردوں میں تھے جنھوں نے نہ صرف استاد کی روایات کو آگے بڑھایا بلکہ اپنی انفرادیت کا بھی ثبوت دیا۔ غزل کے علاوہ انھوں نے نظم گوئی اور مرثیہ نگاری میں بھی کمال حاصل کیا۔ انھوں نے رباعیات عمر خیام کو اُردو رباعی کا

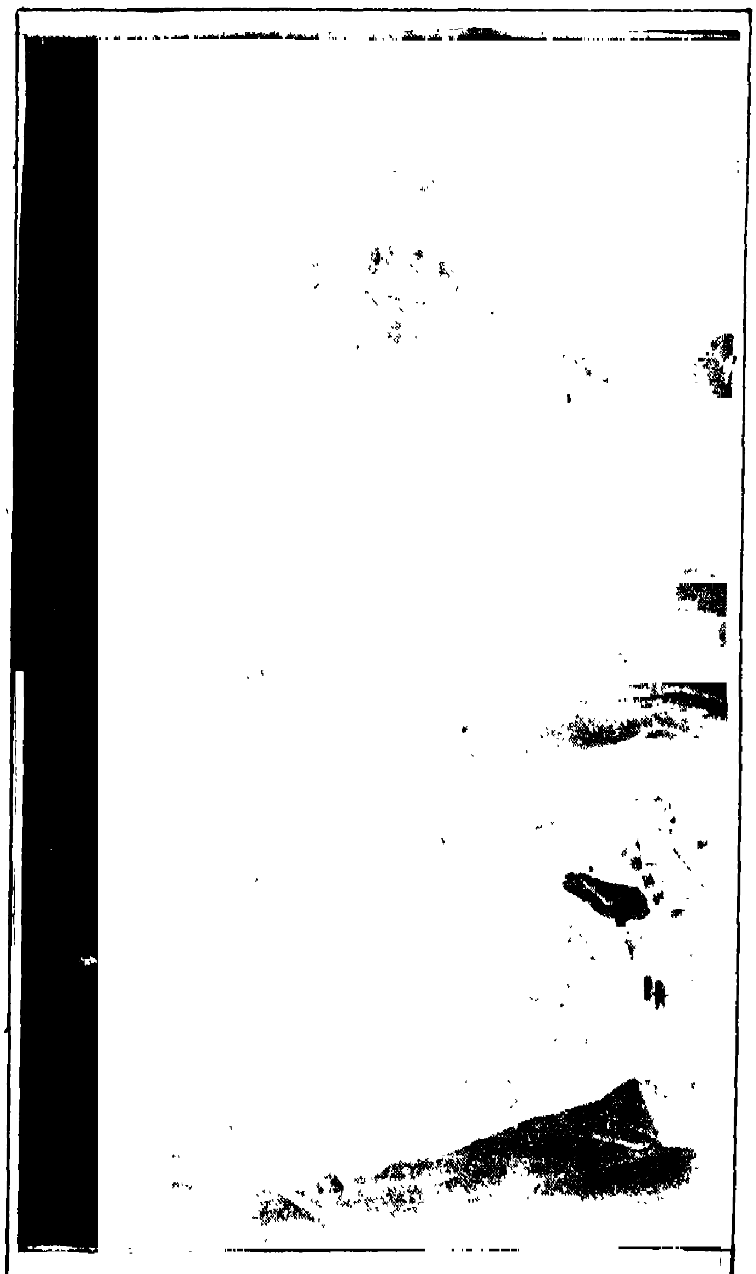


دائیں سے: جناب مالک رام، جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، جناب آغا آفتاب قزلباش اور مقالہ پڑھتے ہوئے جناب امیر حسن عابدی

جامہ پہنایا اور خود بھی رباعیاں کہی ہیں۔ اُنھوں نے قرآن مجید کا منظوم ترجمہ بھی شروع کیا تھا۔ لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور یہ کام چند پاروں سے آگے نہ بڑھا۔ آغا شاعر قزلباش ایک اچھے نثر نگار اور صحافی بھی تھے۔ اُنھوں نے بمبئی کی پارسی کمپنیوں کے لیے بہت سے کامیاب ڈرامے بھی لکھے۔ اس فن میں وہ آغا حشر کاشمیری کے پیش رو ہی نہیں، رہنما بھی تھے۔

دہلی اُردو اکادمی، دہلی کے قدیم ادیبوں اور شاعروں کے نام اور کام کو نئی نسلوں تک پہنچانے کی جو متواتر کوششیں کر رہی ہے۔ یہ سیمینار اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔

اس سیمینار کا افتتاح آغا شاعر قزلباش مرحوم کے فرزند آغا آفتاب قزلباش نے کیا، جو سیمینار میں شرکت کے لیے بطور خاص کراچی سے آئے تھے۔ سیمینار کی صدارت کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے کی۔ اور مہمانِ خصوصی تھے کرنل بشیر حسین زیدی۔ مقالہ نگاروں میں جناب مالک رام، امیر حسن عابدی، جناب گلزار دہلوی اور جناب ضمیر حسن دہلوی شامل تھے۔ سیمینار کے اختتام پر نامور گلوکارہ سمن دیوگن نے آغا شاعر کی غزلیں ساز اور سنگیت کے ساتھ پیش کیں۔


سمن دیوگن صاحبہ آغا شاعر قزلباش کا کلام پیش کر رہی ہیں

ترقیِ اُردو بیورو میں جدید اُردو کمپیوٹر

ترقیِ اُردو بیورو ملک میں اردو کی ہمہ گیر اور ہمہ جہت ترقی کے لیے کام کر رہا ہے۔ ایک عرصے سے اردو کتابوں کی طباعت و اشاعت کو جدید ٹکنالوجی سے لیس کرنے کی کوششیں جاری تھیں۔ آج خطِ نستعلیق میں کمپیوٹر کے ذریعے طباعت و اشاعت ممکن ہے۔ چنانچہ ترقیِ اُردو بیورو نے لندن سے ایک ایسا کمپیوٹر درآمد کر لیا ہے جس سے خطِ نستعلیق میں اردو کتابوں کی اشاعت ہو سکتی ہے۔

ترقیِ اُردو بیورو نے فی الحال اس کمپیوٹر سے اُردو انسائیکلوپیڈیا، اُردو لُغت، انگریزی اُردو لغت اور علمی اصطلاحات کی فرہنگوں کی اشاعت کا پروگرام بنایا ہے تاکہ یہ ضخیم کتابیں جلد سے جلد اور بہتر طریقے پر شائع ہو کر منظرِ عام پر آ سکیں۔

(پریس ریلیز)



یومِ عزیز لکھنوی

پچھلے دنوں غالب اکیڈمی نئی دہلی میں عزیز لکھنوی یادگار کمیٹی کی جانب سے "یوم عزیز لکھنوی" کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر ایک کل ہند مشاعرہ بھی ہوا۔ تصویر میں (بائیں سے دائیں) صدر مشاعرہ سید ظہور قاسم (وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ) جناب شور ٹھاکر، پروفیسر قمر رئیس، جناب حسین علی جعفری اور عزیز لکھنوی کے بیٹے جناب حیات لکھنوی نظر آرہے ہیں۔

(تصاویر سید فدا علی)

لائبریریاں اُردو کے فروغ کا ذریعہ

اُردو لائبریریوں کا قیام اور ان کا فروغ بلاشبہ یہ اُردو کے فروغ کا باعث ہوگا۔ یہ بات علامہ اقبال لائبریری بلگام کی پنج سالہ تقریبات کے موقع پر ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے جناب ایم۔ ایل۔ دکھنی نے کہی۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی ترقی و ترویج کی مختلف شکلیں ہیں۔ ان میں لائبریری بھی ایک ذریعہ ہے۔ لہٰذا جس شاندار پیمانے پر اُردو کی لائبریریاں چلیں گی قدرتی طور پر اُردو کو ایک نئی طاقت و قوت ملے گی۔ انھوں نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ شہر بلگام میں اُردو داں حضرات کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہے اور لائبریری کی رپورٹ کے مطابق صرف ۱۰۰ افراد اس سے استفادہ حاصل کر رہے ہے۔ اُردو داں حضرات کی یہی سرد مہری اور مجرمانہ غفلت ایک دن اُردو کے چراغ کو گُل کرکے رکھ دے گی۔ انھوں نے عوام پر زور دیا کہ وہ اپنی زبان کے اخبارات و رسائل اور کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالیں اور اُردو لائبریریوں کے قیام اور استحکام میں اپنا حصہ ادا کریں۔

(ا... ست)

جناب محمد عثمان عارف کی نئی کتاب

ریاست اتر پردیش کے گورنر جناب محمد عثمان عارف کی ۱۱ قومی نظموں کا ایک مجموعہ ادارۂ بزم خضرِ راہ نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ اس کی رسم اجرا گورنر صاحب کی قیام گاہ راج بھون (لکھنؤ) میں ادا کی گئی اور مقررین نے ان نظموں کے محاسن اور ان کی افادیت پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر سکریٹری اُردو اکادمی، دہلی کا ایک پیغام بھی پڑھ کر سنایا گیا۔ جس میں کہا گیا ہے کہ "جناب محمد عثمان عارف ایک سچے محب الوطن شاعر ہیں۔ انھیں ہندوستانی دھرتی کے ذرے ذرے سے گہری وابستگی ہے۔ اور وہ ان ذرّوں کو مہتاب و آفتاب بنا دینے کی

شا اپنے دل میں لیے ہوئے ہیں۔" ایک اطلاع کے مطابق اس کتاب کو کانپور یونیورسٹی نے بی۔ اے سالِ اوّل کے نصاب میں شامل کر لیا ہے۔

(نامہ نگار)

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری

یونیورسٹی آف کشمیر، سری نگر نے پروفیسر جگن ناتھ آزاد (جموں یونیورسٹی) کو ان کی علمی و ادبی خدمات اور بالخصوص اقبالیات پر کام کے لیے ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ ڈگری پروفیسر آزاد کو یونیورسٹی کے سالانہ کنووکیشن میں ۹ ستمبر ۸۹ء کو پیش کی گئی۔

(ڈاک سے)

قدر افزائی

جناب کیف بھوپالی کی شعری خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے بھوپال کی ایک ادبی تنظیم نے ان کا استقبال کیا۔ اس موقع پر تنظیم کی جانب سے سپاسنامہ، ایک شال اور ایک ہزار روپے پیش کیے گئے۔ اسی کے ساتھ مدھیہ پردیش اُردو اکادمی کی جانب سے بھی کیف صاحب کو ڈھائی ہزار روپے پیش کیے گئے۔

جناب کیف پر ڈاکٹر بشیر بدر، پروفیسر آفاق احمد اور شری دیوی سرن نے مقالات پڑھے۔ پروگرام کی صدارت جناب اختر سعید صدیقی صاحب نے کی۔ انھوں نے نوجوانوں کے اس قدم کی تعریف کرتے ہوئے کیف کی شاعری پر روشنی ڈالی اور کہا کہ یہ اچھی بات ہے کہ ہم مردہ پرستی کی روایات سے انحراف کرتے ہوئے ایک ایسے شاعر کا استقبال کر رہے ہیں جو ہمارے درمیان موجود ہے۔ آخر میں فیصلہ کیا گیا کہ بھوپال کے کچھ اور شعرا کا استقبال کر کے ان کی زندگی میں ہی ان کی شعری اور ادبی خدمات کا اعتراف کیا جائے گا۔

(خواجہ بدر واسطی)

تقسیم انعامات

سال ۱۹۸۹ء ایک خاص اہمیت کا حامل ہو گیا ہے۔ کیوں کہ ملک اس سال قائدینِ آزادی" پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد اور بیرسٹر آصف علی کی صد سالہ تقریباتِ ولادت منا رہا ہے۔ اردو اکادمی دہلی نے نوجوان نسل میں ذہنی بیداری پیدا کرنے کی غرض سے ان عظیم شخصیتوں پر مقابلۂ مضامین کا اہتمام کیا تھا۔ پنڈت نہرو اور مولانا آزاد پر مضامین کا مقابلہ کل ہند نوعیت کا تھا جس میں بی۔ اے کے طلبا سے ریسرچ اسکالرز تک شریک ہو سکتے تھے۔ جب کہ بیرسٹر آصف علی پر یہ مقابلہ دہلی کے اُردو میڈیم اسکولوں کے اساتذہ اور مڈل سے سینیر سیکنڈری زمرے تک کے طلبا کے لیے تھا۔ ان مقابلوں میں اکادمی کی طرف سے 23050/- روپے کے نقد انعامات دیے گئے۔ ہر مقابلے میں پانچ انعامات تھے۔ اوّل۔ دوم۔ سوم اور دو کنسولیشن انعامات۔ اُردو اساتذہ کے لیے 3 انعامات اوّل۔ دوم و سوم بالترتیب =/2000، =/1800 اور =/1500 روپے کے تھے۔ ان نقد انعامات کے ساتھ ساتھ ان حضرات کو اکادمی کا نشان اور سند بھی دی گئی۔

اکادمی نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ ان مضامین پر مشتمل کتاب بھی مرتب کی جائے گی جو اسکولوں اور کالجوں کی لائبریریوں میں مفت تقسیم کی جائے گی۔

یہ تقریب انعامات غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی میں ۷ ستمبر ۱۹۸۹ء شام ساڑھے پانچ بجے منعقد کی گئی۔

انعامات کی تقسیم جناب کلانند بھارتیہ اور محترمہ اروناآصف علی نے فرمائی۔

قلم کار حضرات سے گزارش

دفتر میں مضامین نثر و نظم کثیر تعداد میں جمع ہو گئے ہیں اس لیے اعلانِ ثانی تک اپنی نگارشات بلا طلب بھجوانے کی زحمت نہ فرمائیں۔
اُمید ہے اس گزارش کو گستاخی پر نہیں ہماری مجبوری پر محمول کیا جائے گا۔

—— ادارہ

آپ کی رائے

● "ایوانِ اُردو" کے آخری صفحے پر "سرودِ رفتہ" کا سلسلہ خوب ہے۔ یہ شعر:

یوں تو ہوتے ہیں محبت میں جُنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

بہت سُنا جاتا ہے لیکن "ایوانِ اُردو" کے ذریعے معلوم ہُوا کہ یہ شعر توظہیر دہلوی کا ہے۔

"سرودِ رفتہ" کے لیے مضطر خیرآبادی کی ایک غزل اور نایاب تصویر ارسال کر رہا ہوں۔ یہ غزل بہادر شاہ ظفر کے نام سے غلط منسوب ہوگئی ہے۔ نول کشور نے ۱۸۸۷ء میں "کلیاتِ ظفر" کا پہلا ایڈیشن شائع کیا اس میں یہ غزل موجود نہیں ہے۔ ۱۹۱۸ء میں پانچویں ایڈیشن کی اشاعت میں بھی یہ غزل شریک نہیں ہے۔ جب کہ مضطر خیرآبادی کے قلمی دیوان میں مقطع کے ساتھ موجود ہے۔

—— خلیل تنویر، اودے پور

● "ایوانِ اُردو" کے اگست ۸۹ء کے شمارے میں معین الدین جینا بڑے صاحب کا مقالہ "پریم چند اور ہندوستانی فلمیں: ایک مطالعہ" کا مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ مضمون بہت ہی معلومات افزا ہے۔ پریم چند کی فلمی زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات فراہم تھیں۔ اس مضمون نے یہ کمی پوری کر دی ہے۔

اس مقالے کے نیچے ایک ذیلی عنوان بھی ہے:

(پریم چند کے یومِ وفات ۳۱ جولائی کے موقع پر خاص مضمون)۔

۳۱ جولائی ۱۸۸۰ء پریم چند کا یومِ پیدائش تھا۔ پریم چند ۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو فوت ہوئے تھے۔

—— مانک ٹالا، بمبئی

● اگست ۱۹۸۹ء کے پورے شمارے میں سب سے اچھا اور تحقیقی مضمون "پریم چند اور ہندوستانی فلمیں: ایک مطالعہ" ہے اس میں مضمون نگار نے پریم چند سے متعلق بہت سے تاریک پہلوؤں کو روشن کیا ہے۔ جو ریسرچ اسکالروں کے لیے فائدہ مند ثابت ہوسکتا ہے۔

افسانوں میں "جب موج ہوا زنجیر بنی" اور "راستے بند ہیں" بہت اچھے اور معیاری افسانے ہیں۔

غزل کی فہرست میں سب سے زیادہ متاثر کنور مہندر سنگھ بیدی کی غزل نے کیا۔

—— سیّد طیب کوکب، لکھنؤ

● اگست کا شمارہ ہاتھوں میں ہے "انسانی زندگی میں ماحول کی اہمیت" اور "پریم چند اور ہندوستانی فلمیں: ایک مطالعہ" جیسے دلچسپ مضامین کو بار بار پڑھنے کو جی چاہ رہا ہے۔ جوشؔ صاحب کا سفارشی خط قابلِ تقلید ہے۔ حامد جعفری، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، ظفر گورکھپوری صاحب کی غزلیں کافی اچھی لگیں۔ فردوس حیدر کا افسانہ ان کے اچھوتے طرزِ نگارش کے لیے داد طلب ہے۔ اندر جیت لال صاحب کا "اپنیا سوتر" کی سیر دلچسپ مگر مختصر ہے۔

—— عارف الرحمٰن خان، کوٹہ

● "ایوانِ اُردو" کا اگست کا شمارہ دستیاب ہوا۔ سرورق کی سرسبزی و شادابی شمارے میں شامل مضامین نظم و نثر سے بین مطابقت رکھتی ہے۔ کمار پاشی اور ظفر گورکھپوری اس شمارے کی جان ہیں۔ حقیقت نشر میں معین الدین جینابڑے کا مضمون پریم چند کی زندگی کا وہ رُخ دکھلاتا ہے جو عام قاریوں سے پوشیدہ ہے۔ شفق کا افسانہ "خون کا ذائقہ" جاں نثار اختر کے اس شعر کی تفسیر لگتا ہے:

اب جیسے بھی چاہیں اسے حالات بنادیں
یوں ہے کہ کوئی شخص بُرا ہے نہ بھلا ہے

رحمان شاہی کا افسانہ "راستے بند ہیں" کامیو کے باغی کی یاد دلاتا ہے۔

—— ساجد حمید، ساگر

● ف۔س۔ اعجاز کا قسط وار ترجمہ "خوابوں کے اسرار سمجھیے" نہایت ہی کارآمد ہے۔ "پریم چند اور ہندوستانی فلمیں: ایک مطالعہ" سے جہاں آزادی سے پہلے کی فلموں کے معیار کا پتہ لگتا ہے وہیں پریم چند کی شخصیت کا ایک پہلو ابھر کر سامنے آتا ہے۔ جہاں تک مجھے خیال ہے فلم "مل مزدور" میں پریم چند نے مزدور کے لیڈر کا رول بھی ادا کیا تھا۔

—— جاوید اختر آزاد، مونگیر

● اگست کے شمارے میں شفق کی کہانی تعصب کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ دانستہ یا نادانستہ

طور پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ افسانہ بھی نہیں اور حقیقت بھی نہیں۔ افسانوں میں Topicality کے علاوہ افسانویت بھی دیکھیے۔ ابھی اچھے اور بہت اچھے افسانے لکھے جا رہے ہیں۔ نام نہ دیکھیے، کام دیکھیے۔

مئی کے شمارے میں شائع اپنی تحریر "داڑھی" کے متعلق ایک مراسلہ نظر نواز ہوا۔ مجھے مراسلہ نگار سے اس حد تک اتفاق ضرور ہے کہ اس میں انشائیہ والی کوئی بات نہیں۔ دراصل یہ مضمون تھا اسے آپ نے انشائیہ کے زمرے میں ڈال دیا۔

—— عظیم اقبال، بتیا

● "ایوانِ اُردو" ماہ اگست میں شائع شدہ شفق کی کہانی "خون کا ذائقہ" ایک تہذیبی تقابل کا حقیقی بیانیہ ہے۔ گرچہ ملک کا نام واضح نہیں کیا گیا ہے لیکن باشعور قاری کے لیے یہ اشارہ کافی ہے کہ کہانی تقسیم ہندوستان کے جدید پس منظر کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ مجھے ایک میٹرو پولیٹن شہر میں اپنے رشتے داروں کے یہاں آئے ہوئے کچھ سرحد پار کے لڑکوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ اس کہانی کو پڑھتے ہوئے مجھے عمران کے کردار پر ان لڑکوں کے چہروں کے خدوخال اُبھرتے ہوئے محسوس ہوئے۔ باہر کا کلچر ہمارے معاشرے میں جس تیز رفتاری سے جڑ پکڑتا جا رہا ہے اس سے اندیشہ ہوتا ہے کہ ہمارے گھروں میں بھی عمران نظر آنے لگے گا۔ ہمارے بزرگوں نے گھروں کے اطراف آم کے درخت لگائے تھے لیکن آج ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جدید تر نسل اپنے آنگن میں ببول کے پودوں کی آبیاری کرنے لگی ہے۔

فردوس حیدر کی کہانی "جب موجِ ہوا زنجیر بنی" میں مونا کا کردار غیر حقیقی معلوم ہوتا ہے۔ کہانی کا انجام بھی ڈرامائی ہے جسے ذہن قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کہانی میں تخلیقی دانشوری کی کمی کھٹکتی ہے۔ البتہ جملوں کی نشست و برخاست میں فنی شعور ضرور ہے جس کی وجہ سے قاری کی شمولیت آخر تک برقرار رہتی ہے۔

کہانی "راستے بند ہیں" میں رحمان شاہی نے ایک اچھے موضوع پر قلم اٹھایا ہے لیکن ان کی جذباتیت فن پر غالب آگئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ کہانی ایک طرفہ بیان معلوم ہوتی ہے۔ تخلیق کار کے ذاتی محسوسات میں اتنی گنجائش ضرور ہونی چاہیے کہ اس میں قاری بھی اپنی شمولیت محسوس کر سکے۔ اس کہانی میں اخباری خُو بُو زیادہ ہے۔ فنی نقطۂ نگاہ سے کہانی کا آخری پیراگراف فاضل ہے۔ غالباً رحمان شاہی بلّی کو استعارے کے طور پر پیش کرنے کے بعد بھی مطمئن نہیں ہوئے۔ حالاں کہ کہانی کے 'وہ' اور بلّی کے درمیان تصادم سے پیدا شدہ حالات ہی کہانی کار کے موقف کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں۔

—— رفیع حیدر انجم، اَرریا

● "ایوانِ اُردو" کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ سرورق پر فریم چڑھا کر سجانے کو جی چاہتا ہے۔ شفق کا افسانہ اچھا ہے۔ لیکن اِدھر افسانوی حصّہ کچھ ہلکا ہو گیا ہے۔ پچھلے شماروں میں حیات اللہ انصاری صاحب کے افسانے پڑھ کر بڑی مسرت کا احساس ہوا۔ انھیں شامل کر کے آپ نے رسالے کو وقار بخشا۔ اس پایہ کے دوسرے افسانہ نگاروں کو بھی لکھنے کی دعوت دیجیے۔ ان درختوں میں ابھی بہت ثمر ہوں گے۔

—— محسن خاں، لکھنؤ

● اگست کے شمارے میں جناب معین الدین جینا بڑے کا خصوصی مضمون "پریم چند اور ہندوستانی فلمیں: ایک مطالعہ" ایک دلچسپ اور معلوماتی مضمون ہے۔ اس طرح کے مضامین سے اُردو کے نامور ادیبوں اور شاعروں کی زندگی کے غیر معروف گوشے اُجاگر ہوتے ہیں اور قارئین کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔

"انسانی زندگی میں ماحول کی اہمیت" (سیّد عاصف حسین عابدی) بھی اچھا اور معلوماتی مضمون ہے۔ "خوابوں کے اسرار سمجھیے" (ف۔ س اعجاز) اگرچہ خشک مضمون ہے لیکن کارآمد اور معلوماتی ہے۔ اس طرح کے مضامین سے اُردو رسائل کا دامن خالی ہوا کرتا ہے۔ یہ خوبی صرف اور صرف ماہنامہ "ایوانِ اُردو" کو حاصل ہے کہ وہ اپنے قارئین کو علمی، معلوماتی، سائنسی اور نفسیاتی ہر طرح کے مضامین پڑھنے کو مہیّا کرتا رہتا ہے۔ جس سے قارئین کو بہت فائدہ پہنچتا ہے۔

—— سیّد محمد افضال، بیگوسرائے

● اگست کا شمارہ ملا۔ سرورق تو خوبصورت ہے ہی مندرجات بھی اہم ہیں۔ انور قمر کا افسانہ اور معین الدین جینا بڑے کا مضمون پسند آیا۔ ان سے اور مضامین لکھوائیے۔

دونوں شماروں کے خطوط کے مطالعے سے یہ بات سامنے آئی کہ بعض لوگ خطوں میں گھما کر، اشاروں، کنایوں اور علامتوں میں باتیں کرتے ہیں جس سے ہوتا یہ ہے کہ جاننے والے تو جان جاتے ہیں کہ روئے سخن کس کی جانب ہے، کسے مُنہ چڑایا گیا ہے مگر قارئین

گمراہ ہو سکتے ہیں (میں ان قارئین کا تہہ دل سے مشکور ہوں جنھوں نے اس خصوص میں مجھے خط لکھے)۔

—— مشتاق مومن، بمبئی

● ... ابھی میرے ہاتھوں میں اگست کا شمارہ ہے۔ کالم 'آپ کی رائے' کے کچھ خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ جون کے شمارے میں آپ نے غزل کی تحسین یا تنقیص میں کچھ جملے کہے ہوں گے۔ جیسے جناب رضی احمد تنہا نے کچھ زیادہ ہی متانت دلی سے لیا ہے اور مجھے تو ایک حد تک اُردو شاعری سے متنفر لگ رہے ہیں، موصوف کا یہ کہنا ہے کہ "اُردو غزل وبا کی طرح پھوٹ پڑی ہے اور غزل گو شعرا کی تعداد تو حشرات الارض کی طرح ناقابلِ شمار ہے" قابلِ اعتراض ہے۔ کیونکہ اس جملے میں دو لفظوں (وبا اور حشرات الارض) سے نفرت کی بو آتی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ موصوف کو شاعری کے فن، تاثیر اور ندرت سے واقفیت نہیں۔ میرے خیال میں شاعری کا ملکہ بیکار نہیں ہے یہ عقل اللہ کی عطا کردہ نعمتوں میں ایک گراں بہا نعمت ہے مگر بہت سے لوگ اسے مکر و فریب اور شر و فساد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ شجاعت بھی ایک عطیۂ الٰہی ہے مگر بعض اوقات وہ قتل و غارت و رہزنی میں صرف کی جاتی ہے۔ کیا اس سے عقل کی شرافت اور شجاعت کی فضیلت میں کچھ فرق آسکتا ہے۔ اسی طرح ملکۂ غزل گوئی بُرے استعمال سے بُرا نہیں ٹھہر سکتا۔

—— ارشاد احمد، سیوان

● ماہ اگست ۸۹ء کا "ایوانِ اُردو دہلی" نظر نواز ہوا۔ سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے جو مناسب اشعار منتخب کیے گئے ہیں ان میں ایک شعر یہ بھی ہے جسے برہان پور سے محمد علی صاحب نے بھیجا ہے:

ساحل کے تماشائی ہر ڈوبنے والے پر
افسوس تو کرتے ہیں امداد نہیں کرتے

بھیجنے والے کو شاعر کا نام نہیں معلوم ہے اس لیے شعر کے اختتام پر "نامعلوم" درج کر دیا گیا ہے۔ میں عرض کر دوں کہ یہ شعر حضرت فنا نظامی کانپوری کا ہے جن کا ابھی کچھ دنوں پہلے ہی انتقال ہوا ہے۔

زیرِ مطالعہ شمارے میں فردوس حیدر کا افسانہ "جب موج ہوا زنجیر بنی" بہت پسند آیا۔ ان کا اندازِ تحریر انوکھا اور دل کو چھو لینے والا ہے —— غزلیات میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، ظفر گورکھپوری، کمار پاشی، عشرت دھولپوری اور سلمیٰ صادق کی غزلیں اچھی لگیں۔

کلکتہ کی ممتاز صنم نے انور خاں کی کہانی "دلبر او دلبر" پر جو اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے اس سے میں بھی متفق ہوں۔

—— خلیل انجم، بھنڈارہ

● ماہنامہ "ایوانِ اُردو" کے، میں اور میرے گھر والے سبھی بہت پرانے قاری ہیں۔ "ایوانِ اردو" بلاشبہ ایک معیاری ادبی جریدہ ہے۔ اگست ۸۹ء کے شمارے میں "راستے بند ہیں" اور "خون کا ذائقہ" بے حد پسند آئے۔

—— مصباح الدین ذوق سہسرامی، بوکارو تھرمل

● "ایوانِ اُردو دہلی" کا مطالعہ تو میں عرصے سے کر رہا ہوں۔ لیکن رائے آج پہلی بار بھیج رہا ہوں۔ ہندوستان میں یوں تو سینکڑوں ماہنامے شائع ہوتے ہیں مگر "ایوانِ اُردو" جیسا دیدہ زیب رسالہ نظر سے نہیں گزرا۔ اس رسالے کی ایک خوبی از حد پسند آئی کہ یہ ہر ماہ وقت سے ہندوستان کے کونے کونے میں محبانِ اُردو کے ہاتھوں میں پہنچ جاتا ہے۔ آپ کے دو جامع خاص نمبر "خواجہ احمد عباس نمبر" اور "مولانا ابوالکلام آزاد نمبر" سے قاری کو بہت قیمتی معلومات فراہم ہوئیں۔ اُمید ہے آگے بھی اس قسم کے اچھے نمبر منظرِ عام پر لانے کی کوشش کریں گے (۱)

—— سید اختر حسن ماجد، گورکھپور

(۱) اب ہم نومبر میں پنڈت جواہر لال نہرو نمبر شائع کر رہے ہیں اور اسے بہتر سے بہتر بنا کر پیش کرنے کے لیے کوشاں ہیں —— ادارہ

● "ایوانِ اُردو" کا ستمبر کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ جناب نصر ملک کی کہانی "دُعا" ایک خوبصورت تخلیق ہے جس میں تارکینِ وطن کے المیے کی ایک اچھوتے پہلو سے عکاسی کی گئی ہے۔ سونیا چڈھا کی کہانی "ایک اور بھگوان" ایک پُر اثر کہانی ہے اندازِ بیان کی بیساختگی اور تحریر میں ہندی افسانوی مزاج نے اس میں اور بھی حسن پیدا کر دیا ہے۔ شیریں نیازی کے افسانے کی شروعات یوں تو دلی میں گذشتہ دنوں وقوع پذیر ہونے والے ایک حادثے سے ہوتی ہے مگر بعد میں یہ کہانی کئی اور موضوعات کی لپیٹ میں آ کر اُلجھ گئی ہے۔

ف۔س۔ اعجاز کا ترجمہ کردہ مضمون "خوابوں کے اسرار سمجھیے" ایک اچھا معلوماتی مضمون ہے۔ اس میں خوابوں کی نفسیاتی اور سائنسی تشریح ٹیکنیکل انداز سے پیش کی گئی ہے۔ جناب شبیر حسن نے اگست ۸۹ء کے شمارے میں اس مضمون میں زبان کی غلطیوں کی نشاندہی کر کے داد طلب تو ہونا چاہا ہے مگر وہ اپنے خط میں مضمون کے افادی پہلو کو نظر انداز

کر گئے ہیں۔ یوسف ناظم نے "مظاہرہ کمالات کا" خوبصورت انداز میں لکھا ہے مگر اس میں اُن کا وہ مزاح کا مخصوص رنگ جو بار بار لبوں پر مسکراہٹ لے آتا ہے قدرے دبا دبا سا لگا۔

موہنی انجم نے "جناب نیاز فتحپوری کے ہاں عورت کا تصور" میں کچھ باتیں بڑے پتے کی کہی ہیں۔ عورت بلاشبہ استحصال کا شکار ہوئی ہے، مگر اس مضمون میں موہنی انجم صاحبہ نے عورتوں کی کچھ زیادہ ہی طرفداری کی ہے۔ آج کل کی عملی زندگی میں اکثر ایسا نظر آ رہا ہے کہ دفتروں کی خواتین میں کاہلی، تساہل پسندی اور کام چوری کی عادات سر اٹھا رہی ہیں۔ اُن کی موجودگی سے کام کرنے والے مردوں کی اہلیت نفسی میں بھی فرق آیا ہے۔ اگر اقتصادی بحران اس طرح بڑھتا رہا تو وہ دن دُور نہیں جب عورتیں بھی رشوت لینا شروع کر دیں گی۔ اسمیک کی اسمگلنگ تو اُن کی ذات سے منسوب ہو ہی رہی ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ہمارے اقتصادی نظام میں عورتوں کے ورکنگ گروپ میں آنے سے جو عدم توازن پیدا ہوا ہے وہ ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ ہماری سوسائٹی میں مرد ہی کُنبے کا کفیل سمجھا جاتا ہے اور اُسی کے دم سے بیوی بچے پلتے ہیں اب ہوا یہ ہے کہ ایک مرد کی جگہ ایک عورت نے سنبھال لی ہے جس سے ایک گھر میں دو تنخواہیں آنے لگ گئی ہیں اور ادھر ایک دوسرے گھر کا مرد اس لیے ملازمت حاصل نہیں کر سکا کہ اس کی اسامی ایک عورت سے پُر کر لی گئی ہے اور اب وہ اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرنے سے محروم ہو گیا ہے۔

—— ہیرانند سوز، فرید آباد

● "ایوانِ اُردو" کا مطالعہ میں ہر ماہ کرتا ہوں اور اس میں شائع ہونے والے مضامین سے مستفید بھی ہوتا ہوں۔ ستمبر ۱۹۸۹ء کے پرچے میں 'خسرو نامہ' پر تبصرہ کرتے ہوئے ازلفی کریم صاحب نے لکھا ہے:

"امیر خسرو کی اختراع پسند طبیعت نے ایک نیا طلسم خانہ انشا پردازی کا کھولا یعنی برج بھاشا کی زمین میں فارسی کا بیج بویا اور اس سے وہ ہونہار بچّہ عالم ظہور میں آیا جس نے پیدا ہو کر ہندی اور ہوش سنبھال کر ریختہ اور جوانی کے عالم پر پہنچ کر اُردو نام اختیار کیا۔"

اسی ماہ کے "ایوانِ اُردو" میں "حرفِ آغاز" کے تحت آپ نے لکھا ہے:

"اُردو اور ہندی ایک ہی ماں کی بیٹیاں ہیں۔ یہ دونوں کھڑی بولی سے نکلی ہیں لیکن جداگانہ تہذیبی اور ادبی پس منظر میں پروان چڑھنے کی وجہ سے دو مختلف زبانیں بن گئی ہے۔" ان دونوں باتوں میں سے کون سی بات صحیح اور درست ہے۔ اس کے علاوہ ماہرین لسانیات نے جس زبان کو کھڑی بولی کہا ہے اور جو ان کے قول کے مطابق اُردو زبان کے وجود میں آنے سے قبل دہلی اور اس کے اطراف میں بولی جاتی تھی اس کا نمونہ کیا ہے۔ اگر آپ مجھ سے کھڑی بولی کے متعلق دریافت فرمائیں تو میں عرض کروں گا کہ کھڑی بولی آج بھی سہارنپور، مظفر نگر، میرٹھ اور بجنور کے اضلاع میں عوام کی زبان ہے اور اس کا نمونہ یہ ہے۔

کلیر شریف کے تانگہ اسٹینڈ پر تانگے والا ایک شخص کو مخاطب کر کے جو اس کے تانگے سے ذرا فاصلے پر کھڑا ہے بلند آواز سے کہتا ہے۔

"اُو بے اُو کیسا کھڑا ہے۔ کہاں جائے گا۔ رڑکی جاوے گا۔ رڑکی جاوے تو تانگے میں بیٹھ جا۔"

بجنور کے بزار میں ایک شخص ہاتھ میں لیے ایک ہوٹل پر آتا ہے دینے کے بعد جب رخصت ہونے لگتا ہوٹل کا مالک اس سے کہتا ہے۔

"اُو بے کہاں جاوے ہے۔ روٹی جا۔ بھوکے نہیں جاویں ہیں۔"

میں یہاں مولانا محمد حسین صاحب کی اس رائے کا بھی حوالہ دینا مناسب سمجھتا جو ان کی مشہور و معروف تصنیف آبِ حیات میں درج ہے:

"اتنی بات تو سب ہی جانتے اُردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔" کیا آزاد صاحب کی یہ تحریر صداقت پر مبنی

—— ضیا علی خاں اشرفی،

۱ اب یہ بات محقق ہو چکی ہے کہ اُردو سے نکلی ہے، تفصیل کے لیے آپ اس موضوع مسعود حسین صاحب کی تحریریں ملاحظہ کریں۔

● "ایوانِ اُردو" پابندی سے پڑھتا ہوں۔ رسالے میں ندرت اور تنوع سے قاری کی معلومات اور دلچسپی میں ہوتا ہے۔ مثلاً "ہم طرح اشعار" "نامہ"۔ "سرورق کے اندرونی صفحے کے عنوانات" وغیرہ جیسے مشمولات۔

—— فاخر جلالپوری،

اُردو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

ایوانِ اردو دہلی

ادارۂ تحریر
سیّد شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی

پنڈت جواہر لال نہرو نمبر



جلد ۳، شمارہ ۸
دسمبر ۱۹۸۹ء
قیمت: ۱۲ روپے
سرورق عکس:
[illegible]

پیغامات:

نقش ونگار:

احوال و آثار: شخصیت پر مضامین

گفتار و کردار: منظوم خراجِ عقیدت

اذکار و افکار : نظریات و خیالات پر ایک نظر

احساس و اظہار : پنڈت نہرو کی منتخب تحریریں

سید شریف الحسن نقوی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے سیما آفسیٹ پریس، دہلی ۱۱۰۰۰۶ سے چھپوا کر ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا

حرفِ آغاز

جدید ہندوستان کے معماروں میں پنڈت جواہر لال نہرو کا نام سرِفہرست ہے۔ ۱۹۱۲ء میں جب وہ انگلینڈ سے بار ایٹ لا کی ڈگری لے کر ہندوستان واپس آئے تو ذاتی ترقی کے راستے ان کے لیے ہر طرف کشادہ تھے۔ لیکن انھوں نے اپنے لیے خدمتِ وطن کی راہ چُنی اور اپنی عملی زندگی کا آغاز ہندوستان کی جنگِ آزادی کے ایک پُرجوش سپاہی کی حیثیت سے کیا۔ آزادی کی لڑائی میں انھوں نے جس دانش مندی، استقلال اور استقامت کا ثبوت دیا اور جو بے مثال قربانیاں پیش کیں، ان کا ذکر سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا۔

آزادی کے فوراً بعد رونما ہونے والے پُرآشوب حالات اور افراتفری پر قابو پانے میں انھوں نے جو ہمت اور حوصلہ دکھایا، بھٹکے ہوئے ذہنوں کو راہِ راست پر لانے کی جو مؤثر کوششیں کیں اور ایک عظیم سیکولر سوشلسٹ اور جمہوری اسٹیٹ کی جو مضبوط بنیاد رکھی، وہ ہماری تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش باب ہے۔ دستور ساز اسمبلی میں، جس نے جمہوریۂ ہند کا آئین تیار کیا، سب سے مؤثر آواز پنڈت نہرو ہی کی تھی جو مذہب و ملّت، رنگ و نسل یا لسانی، ثقافتی اور علاقائی امتیازات کی بنا پر ہندوستانی شہریوں میں کسی قسم کی تفریق روا رکھنے کی مخالفت اور جمہوریۂ ہند کے ہر شہری کے یکساں حقوق کی حمایت میں بلند ہوئی۔

آزاد ہندوستان کی تعمیر و ترقّی کے اوّلین خاکے بھی پنڈت نہرو ہی نے تیار کیے۔ وہ ہندوستان کی ہمہ جہت ترقی کے خواہاں تھے چنانچہ انھوں نے زراعت وصنعت، سائنس اور ٹیکنالوجی، تہذیب و ثقافت، تعلیم، فنونِ لطیفہ، کھیل کود غرض قومی زندگی کے سبھی اہم شعبوں کی اصلاح و ترقّی میں گہری دلچسپی لی۔ یہ انھی کی دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ سبھی شعبوں میں ملک نے حیرت انگیز ترقّی کی اور دُنیا کے آزاد ملکوں میں بہت جلد ایک باعزّت مقام حاصل کر لیا۔

پنڈت نہرو بین الاقوامی سیاست کی بھی ایک اہم شخصیت تھے۔ انھوں نے یوگوسلاویہ کے مارشل ٹیٹو اور مصر کے کرنل ناصر کے ساتھ مل کر ناوابستہ تحریک کی بنیاد رکھی۔ ابتداءً یہ تحریک دُنیا کے دونوں بڑے بلاکوں کی ناخوشی کا سبب بنی کیوں کہ اس کی براہِ راست زد ان کی سیاسی نیز اقتصادی بالادستی پر پڑتی تھی لیکن اس تحریک نے ایشیا اور افریقہ کے نوآزاد ملکوں کو ایک نیا حوصلہ دیا، ان میں خود اعتمادی پیدا کی اور بڑی طاقتوں کے استحصال سے محفوظ رہنے کے راستے دکھائے۔

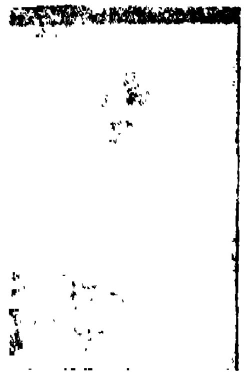
سیاسی آویزشوں کے ماحول میں بقائے باہم کے اصول کو متعارف اور مستحکم کرنے میں بھی پنڈت نہرو کا رول ناقابلِ فراموش ہے۔ آج اس اصول کی اہمیت کو دُنیا کی دو سب سے بڑی باہم متحارب طاقتیں ـــــ روس اور امریکہ ـــــ بھی تسلیم کر چکے ہیں۔ یہ پنڈت جی کی سیاسی بصیرت اور انسانیت کے مستقبل کے بارے میں ان کی دانشورانہ دور اندیشی کا بیّن ثبوت ہے۔

لیکن پنڈت نہرو صرف سیاسی رہنما ہی نہیں تھے۔ ایک روشن خیال مفکر، ایک بالغ نظر مورّخ، ایک صاحب طرز ادیب اور سب سے بڑھ کر ایک مہذّب اور درد مند انسان کی حیثیت سے بھی ان کی عظمت کا اعتراف ناگزیر ہے۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ اس نمبر میں جو پنڈت جی کی صدسالہ تقریبات کے موقعے پر ان کی یاد میں شائع کیا جا رہا ہے، ان کی عظیم شخصیت کے سبھی پہلوؤں اور ان کے گراں بہا خیالات و نظریات کے سبھی مفاہیم و مضمرات کی ایک جھلک پیش کی جاسکے۔ اس کوشش میں ہم کس حد تک کامیاب ہوسکے ہیں، اس کا فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔

ہم نائب صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما کے شکر گزار ہیں جنھوں نے اس نمبر کے لیے پیغام ہی نہیں ایک مختصر مگر جامع مضمون بھی عنایت فرمایا۔ ہم دہلی کے لیفٹننٹ گورنر جناب رومیش بھنڈاری، چیف ایگزیکٹو کونسلر جناب جگ پرویش چندر اور ایگزیکٹو کونسلر (تعلیمات) جناب کُلانند بھارتیہ کے بھی ممنون ہیں جن کے پیغامات اس نمبر کی زینت ہیں۔ اپنے تمام قلمی معاونین کا شکریہ بھی ہم پر واجب ہے جن کے تعاون کے بغیر یہ نمبر مرتّب نہ ہوسکتا تھا۔

ـــــ سیّد شریف الحسن نقوی



उप-राष्ट्रपति, भारत
नई दिल्ली

VICE-PRESIDENT
INDIA
NEW DELHI 110011

۱۱ستمبر ۱۹۸۹ء

پیغام

مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی ہے کہ اردو اکادمی دہلی پنڈت جواہر لال نہرو کے جنم دن پر اپنے ماہوار رسالہ 'ایوان اُردو' دہلی کا ایک خاص ایڈیشن شائع کر رہی ہے۔ پنڈت جواہر لال جی کی جنم شتابدی کے موقع پر خراج عقیدت پیش کرنے کا یہ ایک خوبصورت طریقہ ہوگا۔

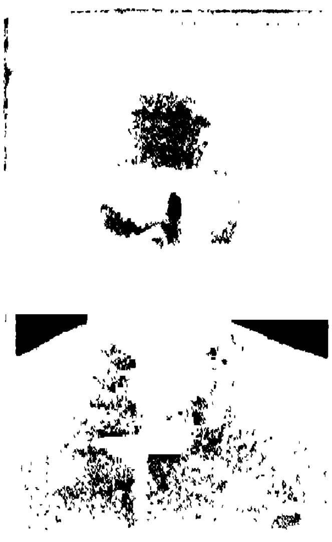
پنڈت جی کی شخصیت ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ ہر زبان، تہذیب اور روایت کو فوراً اپنا لیتی تھی۔ وہ جہاں بھی جاتے اُسی فضا میں اس طرح گھل مل جاتے جیسے ہوا میں خوشبو۔ پھر کبھی جو ہندوستانیت ان کے چہرے سے جھلکتی تھی وہ اپنے آپ میں بے مثال تھی۔

یوں تو پنڈت جواہر لال جی نے ہند کی ہر زبان کو اہمیت دی لیکن اردو ادب اور اور اُسکی شاعری سے وہ بہت متاثر تھے۔ جس طرح پنڈت جی کی شخصیت نے ہند کے مختلف پہلوؤں کو اپنے اندر سمیٹ کر ملک کو ایکتا دی تھی، اُسی طرح کی یکجہتی اور یکسانیت کی آج پھر ضرورت ہے۔

شنکر دیال شرما
شنکر دیال شرما

उपराज्यपाल
दिल्ली
LIEUTENANT GOVERNOR
DELHI

राज निवास
दिल्ली-११००५४
RAJ NIWAS
DELHI-110054



پیغام

پنڈت جواہر لال نہرو ہندوستان کی ہمہ جہت تعمیر وترقی کے علم بردار تھے۔ انہوں نے جہاں ایک طرف جہالت، افلاس سماجی عدم مساوات، اقتصادی استحصال اور فرقہ وارانہ ذہنیت کے خلاف موثر اقدامات کیے وہیں دوسری اور فنون لطیفہ کے فروغ کے لیے بھی بنیادی اہمیت کے کام کیے جو ایک قوم کی ذہنی اور جذباتی نشوونما کے ضامن ہوتے ہیں۔ ادب، آرٹ، مصوری، موسیقی، رقص غرض ہر فن لطیف کے لیے ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

بین الاقوامی سطح پر پنڈت جی نے غیر جانبداری کی تحریک کی نہ صرف بنیاد رکھی بلکہ اسے استحکام اور فروغ بھی بخشا۔ اس تحریک نے بڑی طاقتوں کے درمیان کشیدگی کم کرنے، ترقی یافتہ ممالک کی طرف سے نوآزاد ترقی پذیر ملکوں کی حق تلفیوں کا ازالہ کرنے اور پر امن ماحول میں مسائل کا حل تلاش کرنے کے جس رجحان کو فروغ دیا اس کی افادیت اور اہمیت کی آج پوری دنیا معترف اور مداح ہے۔

اس عالی القدر شخصیت کی یاد اور اس کے آدرشوں کو تازہ رکھنا انسانیت کے مستقبل کے لیے ایک نیک فال ہے۔ مجھے یہ جان کر دلی مسرت ہوئی کہ اردو اکادمی اپنے ماہانہ رسالے ایوان اردو دہلی کا خاص نمبر پنڈت جی کی یاد میں شائع کر رہی ہے۔ میں دل کی گہرائیوں سے اس نمبر کی کامیابی کا متمنی ہوں۔

رومیش بھنڈاری

(رومیش بھنڈاری)
لیفٹننٹ گورنر دہلی

JAG PARVESH CHANDRA

No. 1516/CEC/89/Admn.
मुख्य कार्यकारी पार्षद
CHIEF EXECUTIVE COUNCILLOR
दिल्ली प्रशासन, दिल्ली
DELHI ADMINISTRATION, DELHI

दिनांक -8 SEP 1989
Dated

M E S S A G E

I am glad to know that Urdu Academy of Delhi Administration is bringing out a Special Number of its prestigious Urdu monthly journal "Aiwan-e-Urdu Delhi" on the occasion of the birth day of Pandit Jawahar Lal Nehru in connection with his birth centenary celebrations. I congratulate the Academy for this noble idea.

Pandit Jawahar Lal Nehru was an institution in himself, who played a vital role during the struggle for freedom of India, as well as for the reconstruction of Independent India, as the first Prime Minister for seventeen years, from 1947 to 1964. It was Nehru who led us to a modern industrial society-scientific in temper, socialist in content; democratic in spirit and secular in character. He had been instrumental in our national Renaissance and the attainment of independence.

Panditji was a very knowledgeable person. He was an eminent scholar and himself an illustrious author of world repute. As an author, he had a dream of world community, which could have materialise by breaking all barriers and boundaries.

He was lover of literature and poetry. To quote Indira Gandhi: "Books fascinated Jawahar Lal Nehru. He sought out ideas. He was extraordinarily sensitive to literary beauty. He was a luminous man and his writings reflected the radiance of his spirit."

I am sending my best wishes for the beautiful publication of the Special Number of Aiwan-e-Urdu Delhi on Pandit Jawahar Lal Nehru.

Jag Parvesh Chandra
(JAG PARVESH CHANDRA)

Mr. S.H.Naqvi,
Secretary(Urdu Academy),
Delhi Administration,
Ghata Masjid Road,
Daryaganj,
New Delhi-110002

کلا نند بھارتیہ

कार्यकारी पार्षद (शिक्षा)
EXECUTIVE COUNCILLOR (EDU)
दिल्ली प्रशासन, दिल्ली
DELHI ADMINISTRATION, DELHI
दिनांक 15.9.89
Dated

پیغام



مجھے یہ جان کر دلی مسرت ہوئی ہے کہ اردو اکادمی دہلی مرحوم پنڈت جواہر لال نہرو کے یوم پیدائش کے موقع پر اپنے ماہنامہ اردو رسالہ "ایوانِ اردو دلی" کا خصوصی نمبر شائع کر رہی ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ وہ امن کے پیامبر تھے۔ انہوں نے ہندوستان کی آزادی اور ملک کو مہذب زندگی میں ترقی کے راستے پر گامزن کیا انہوں نے اپنی تمام زندگی سماج اور ملک کی خدمت میں گزاری۔ اور غریب لوگوں کی زندگی کو بہتر بنایا۔ ان کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر ہی ہم ملک کی حفاظت کر سکتے ہیں اور ملک کے اتحاد کو مضبوط بنا سکتے ہیں۔ اور دوسرے ملکوں کے مقابلے میں اپنے ملک کو آگے بڑھا سکتے ہیں

اردو اکادمی مرکزی علاقہ دہلی میں اردو کو فروغ دینے کی کوششوں میں سرگرم ہے۔ اردو کو بڑھاوا دینے سے متعلق اسکیموں پر تیزی سے عمل ہو رہا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اکادمی اپنے فرائض پوری طرح سر انجام دے رہی ہے۔ امید ہے مستقبل میں بھی اکادمی اپنے فرائض کی انجام دہی میں گامزن رہے گی۔

میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔ میں ایوان اردو دلی کے خاص نمبر کی کامیاب اشاعت کے لئے دعا گو ہوں۔

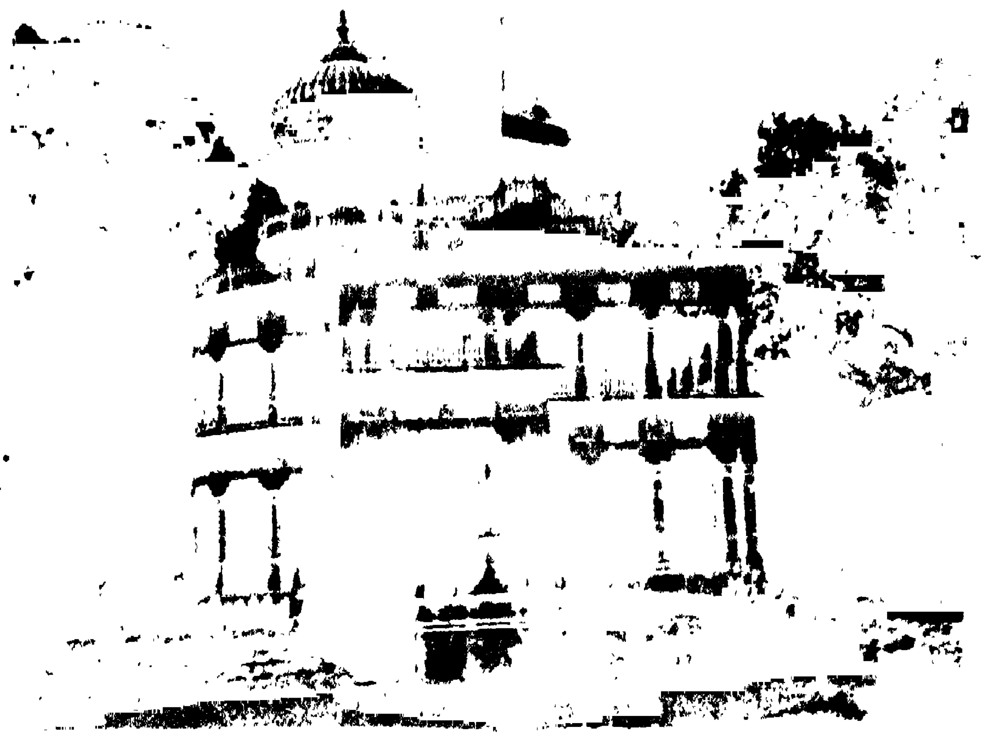
15.9.89
(کلا نند بھارتیہ)

جناب سکریٹری صاحب
دلی اردو اکادمی
دلی انتظامیہ
گھٹا مسجد روڈ۔ نئی دہلی ۲

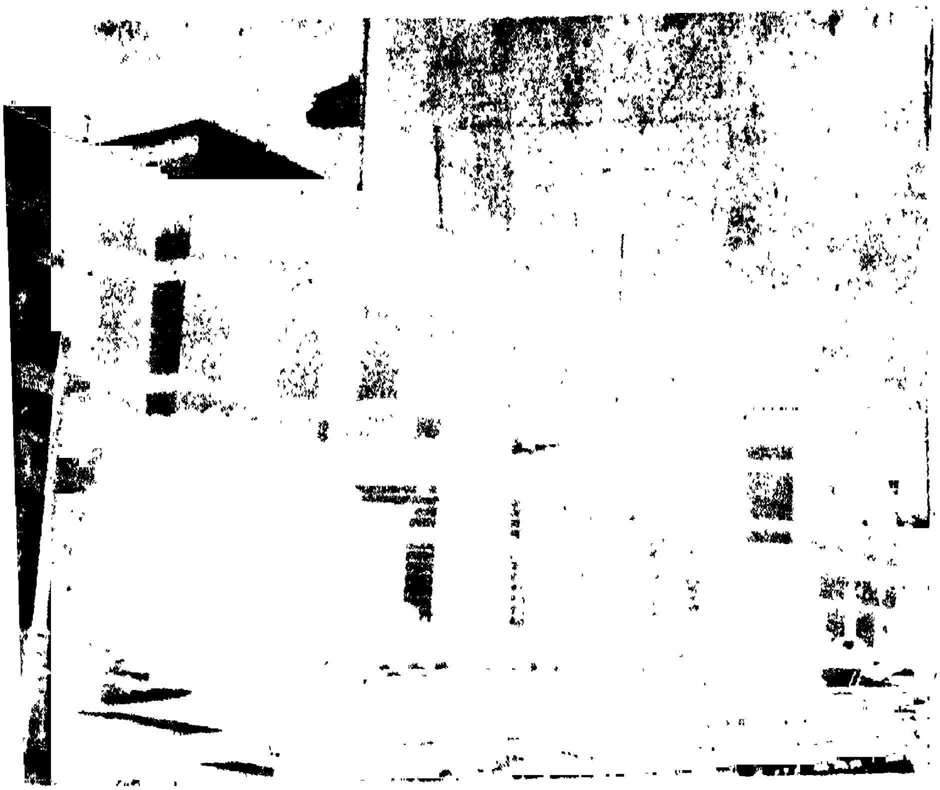
نقش و نگار

پتھروں کی یادگار تہذیبیں

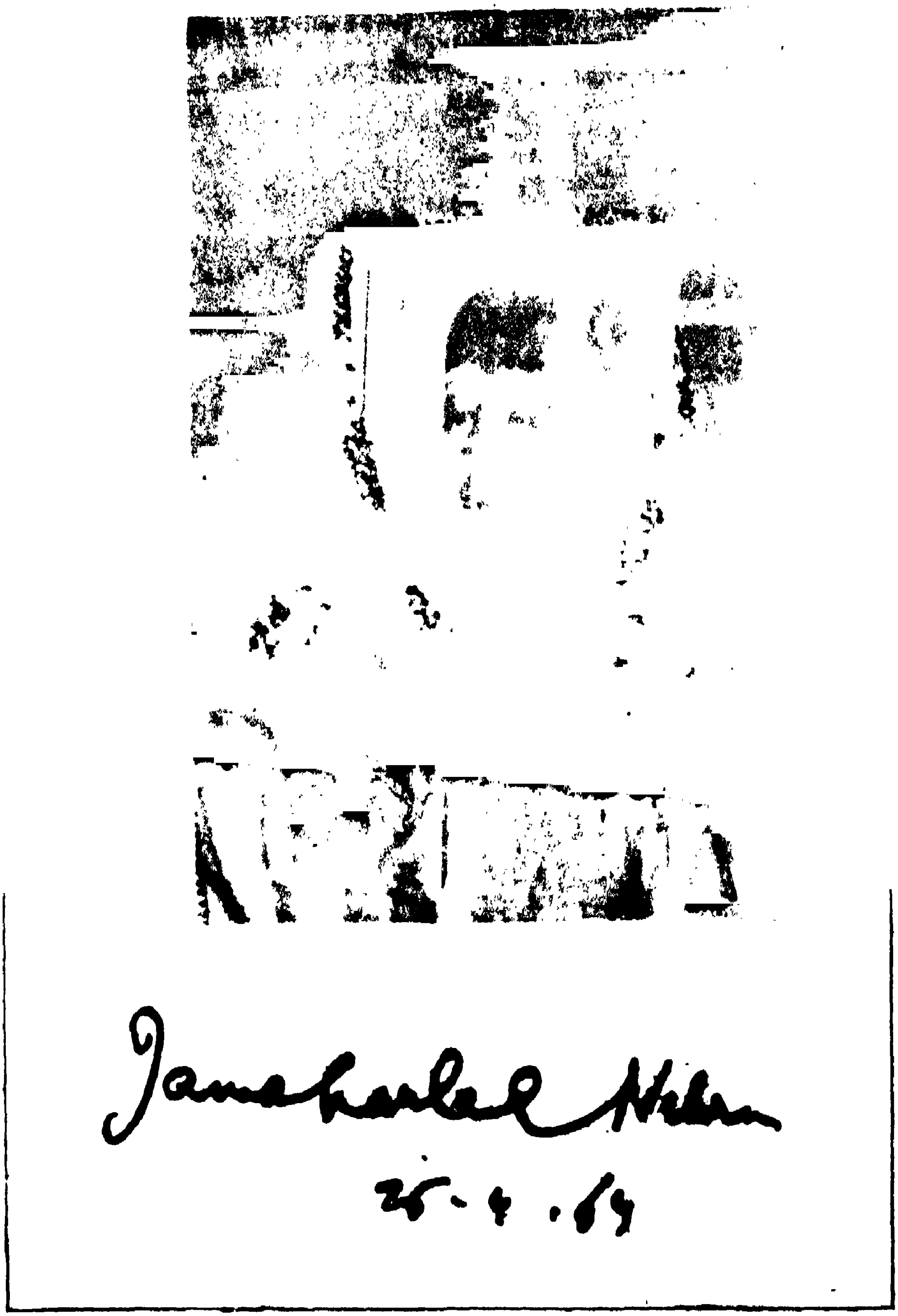
۱۱



آنند بھون، الہ آباد

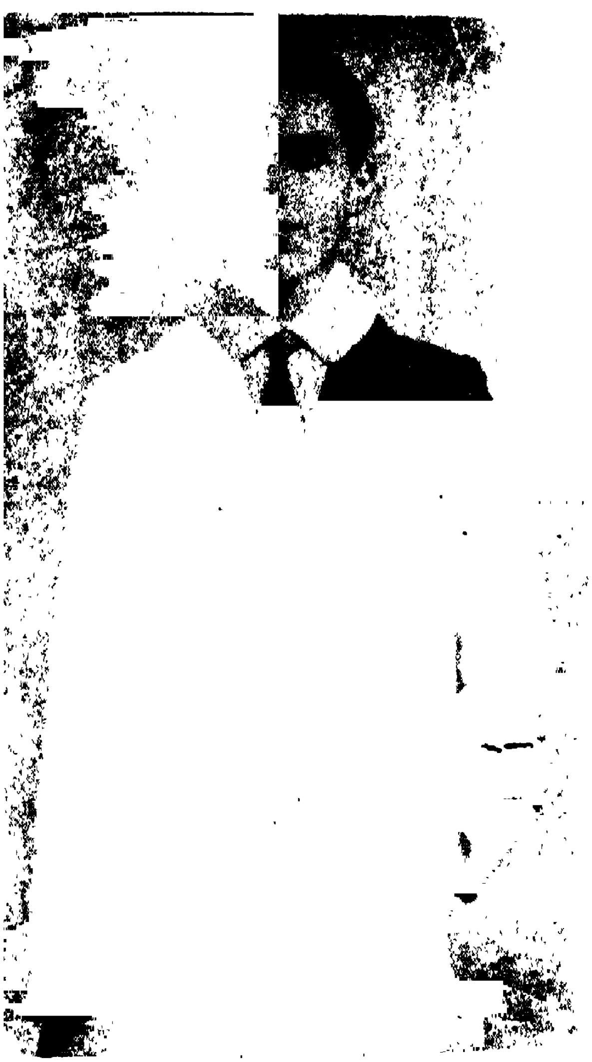


تین مورتی ہاؤس، نئی دہلی


Jawaharlal Nehru
25-4.64



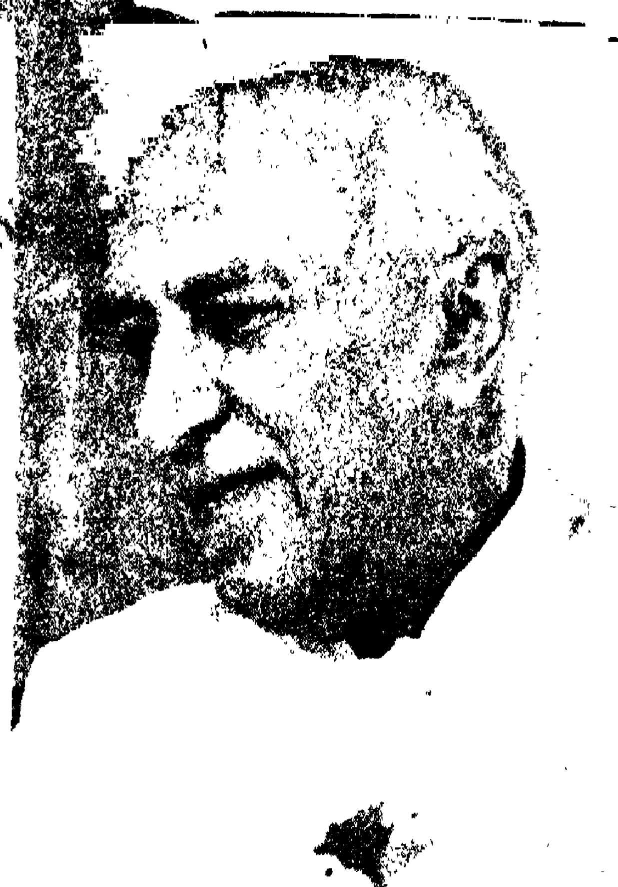
برس پندرہ کا یا کہ سولہ کا سن



جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

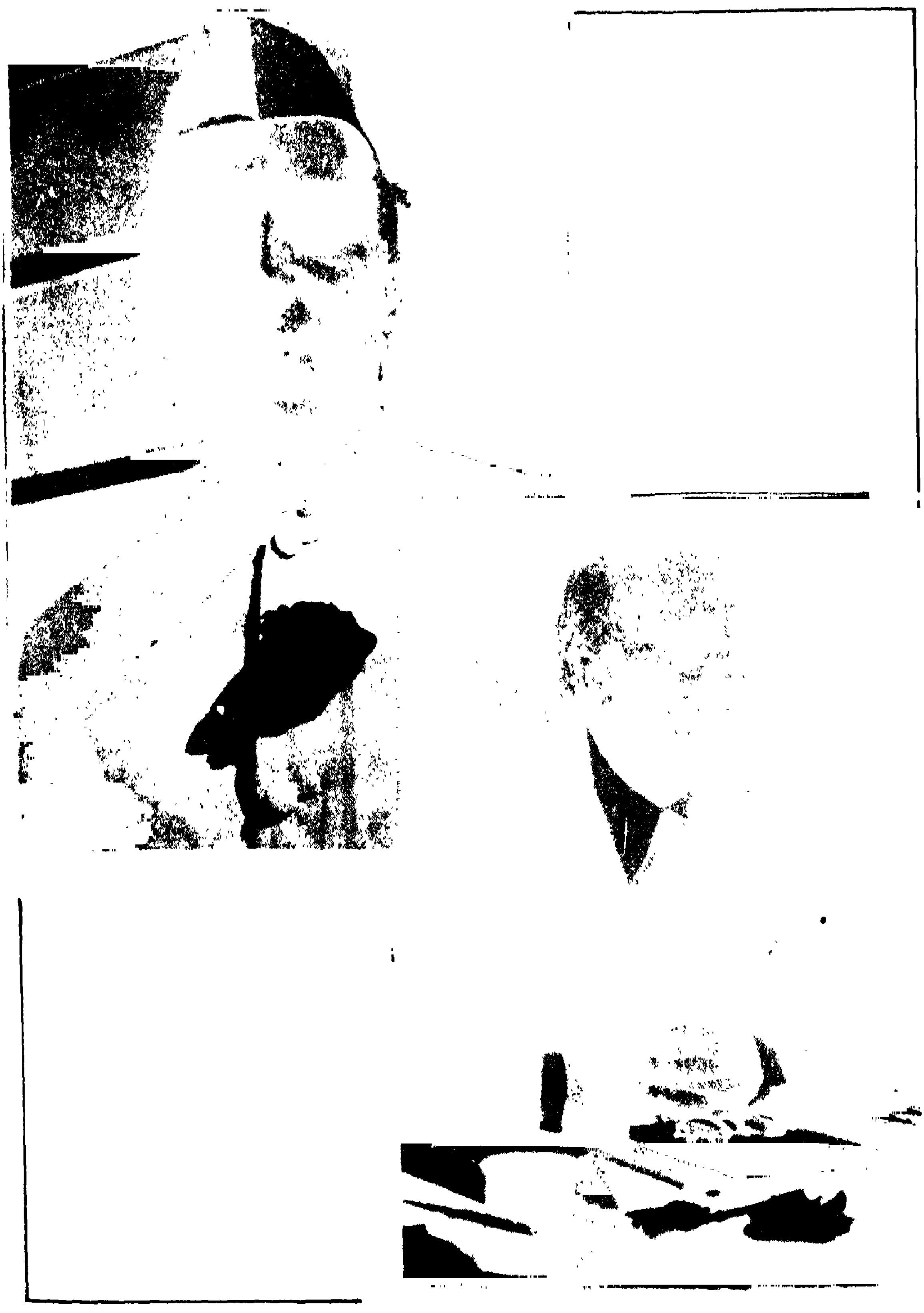


مختلف کیفیاتِ مزاج

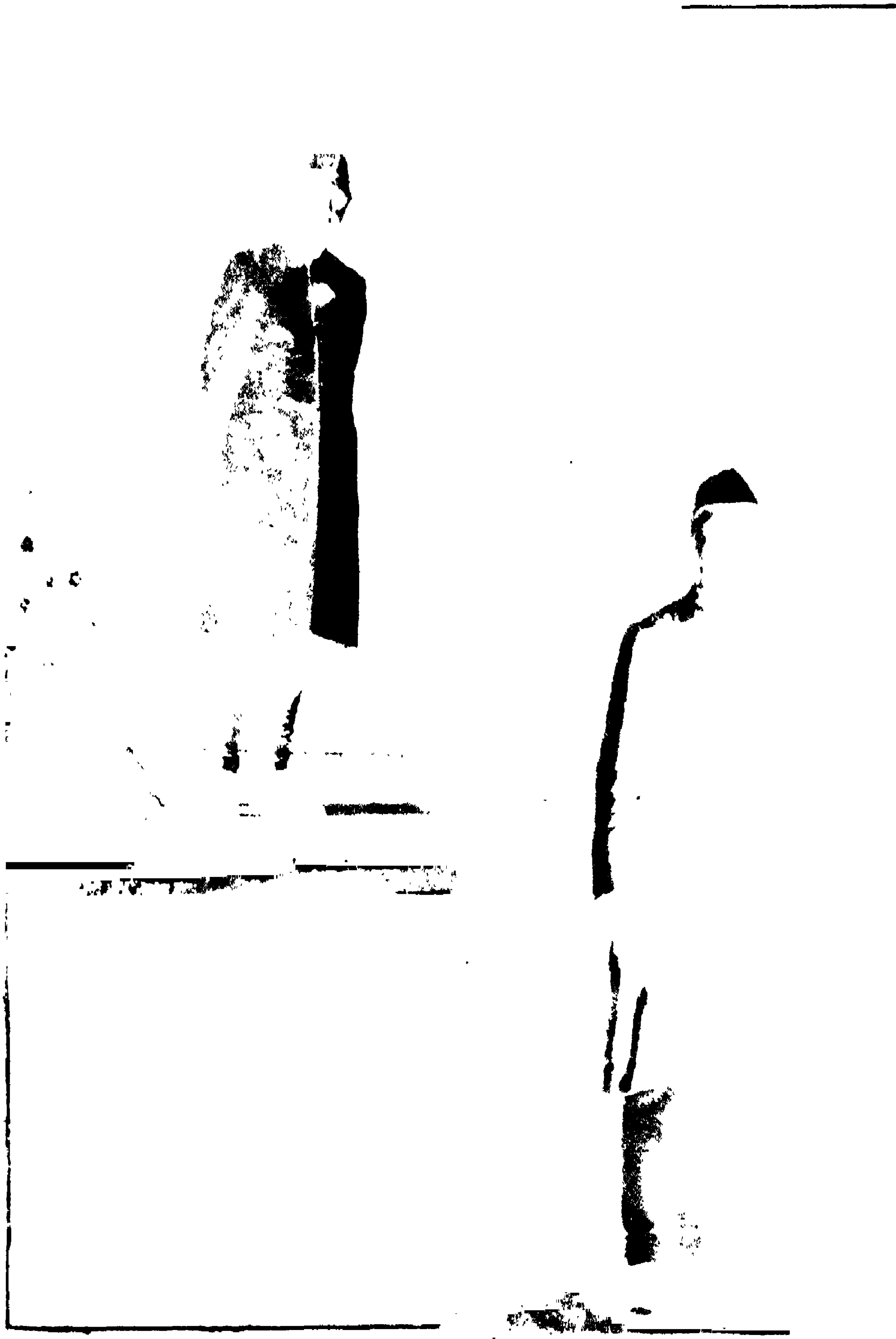














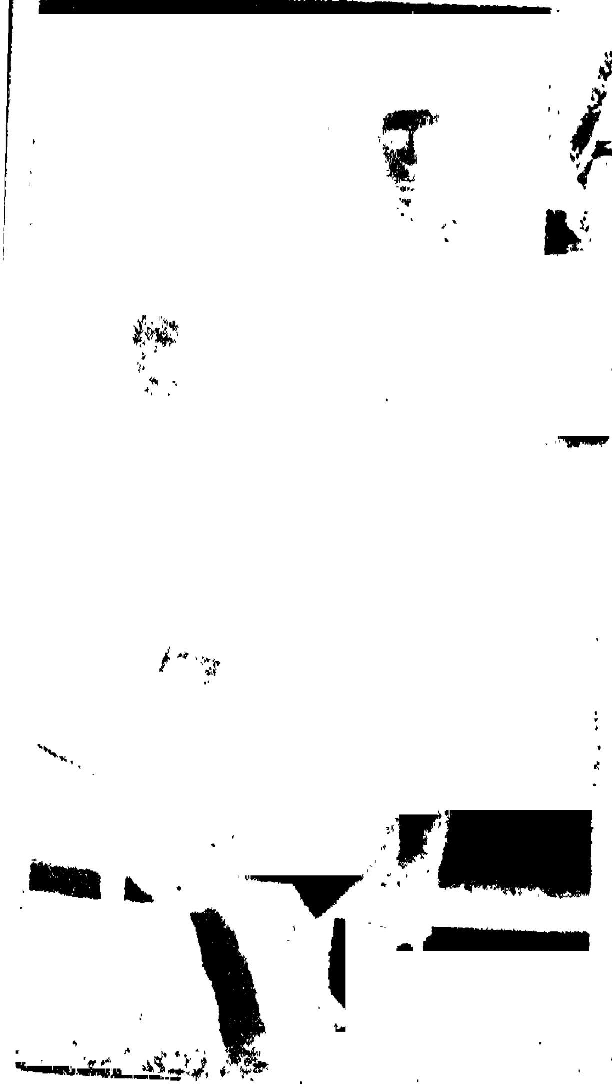
منصبی مصروفیات



افرادِ خاندان کے ساتھ



پنڈت موتی لال نہرو
محترمہ سروپ رانی
اور پنڈت جی



والدِ محترم اور پنڈت جی



بیٹی، بیوی



اور بہن کے ساتھ





بیٹی



اور بہن کے ہمراہ



اندرا جی کی شادی کے موقع پر



نواسوں راجیو، سنجے اور اندرا جی کے ساتھ

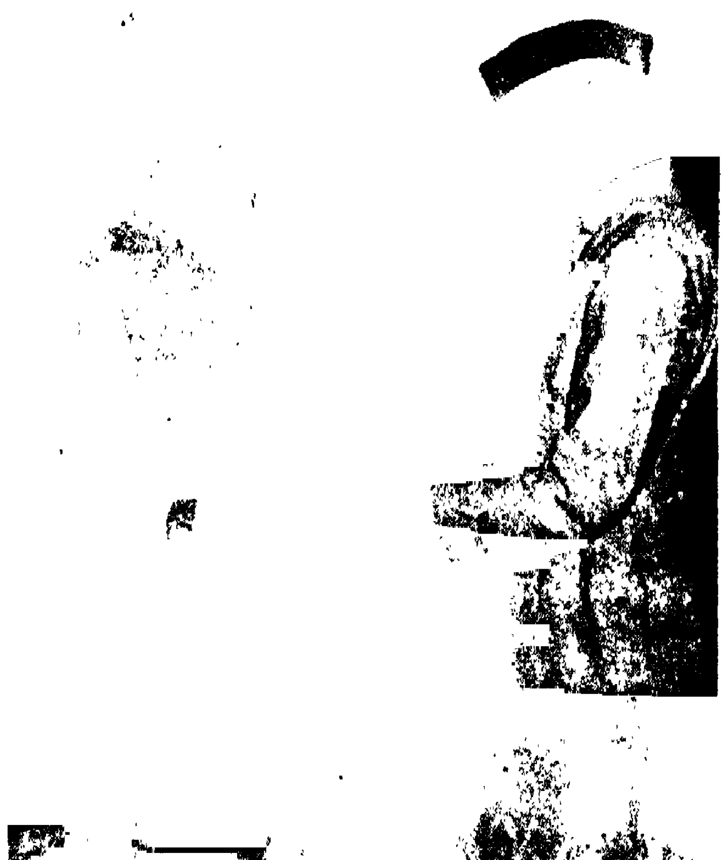


راجیو گاندھی، سنجے گاندھی اور پنڈت جی

رفقائے کار کے ساتھ



اوپر:
گاندھی جی
اور پنڈت جی



نیچے:
مولانا آزاد
اور پنڈت جی



ڈاکٹر راجندر پرشاد کے ساتھ ہولی کے موقع پر



پنڈت جی، ڈاکٹر رادھا کرشنن اور اندرا جی



سردار پٹیل کے ساتھ



پنڈت گووند ولبھ پنت کے ساتھ



شری لال بہادر شاستری اور پنڈت جی

پنڈت جی، سردار پٹیل اور سی۔ راجگوپال آچاریہ

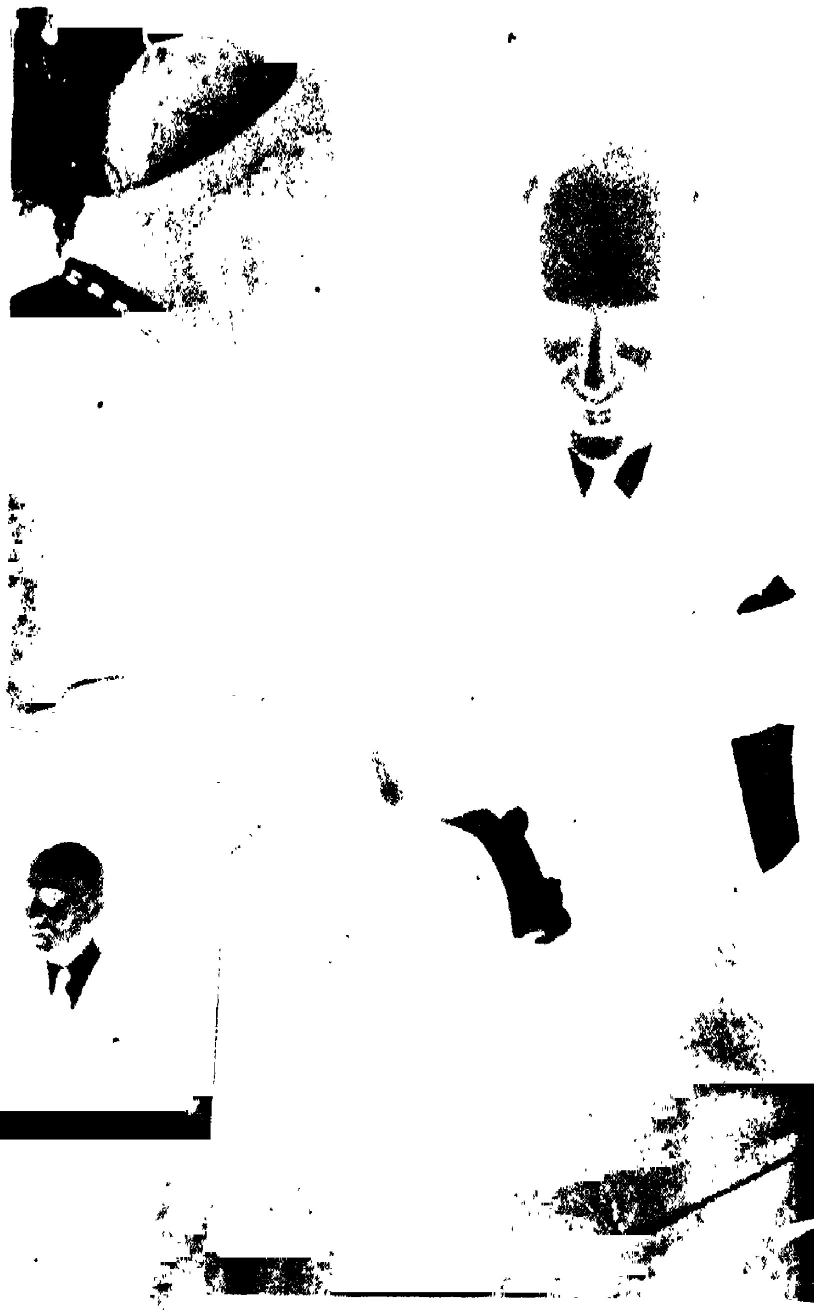


سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں کے ساتھ



پنڈت جی، مسز کرشنا ہتھی سنگھ
اور سروجنی نائیڈو

بین الاقوامی شخصیتوں سے ملاقاتیں





پوپ پال کے ساتھ

جارج برنارڈ شا کے ساتھ



صدر آئزن ہاور اور پنڈت جی



صدر کینیڈی اور پنڈت جی



ملکہ الزبتھ اور پنڈت جی



خروشیف، بریزنیف اور پنڈت جی



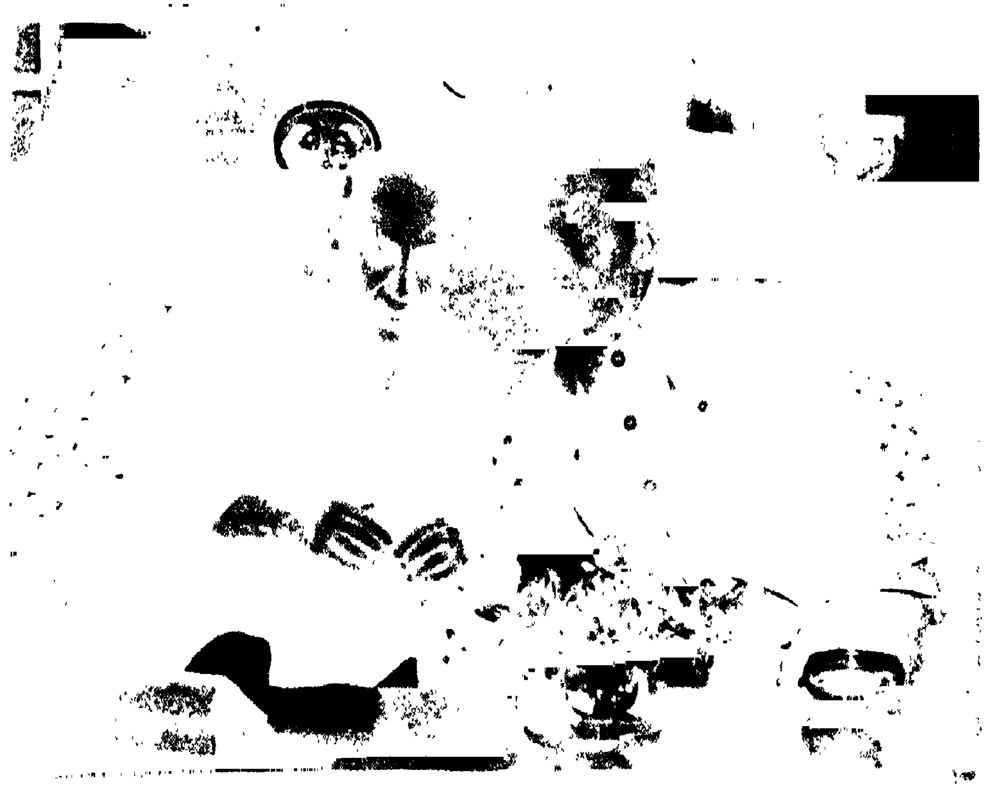
صدر ایوب کے ساتھ



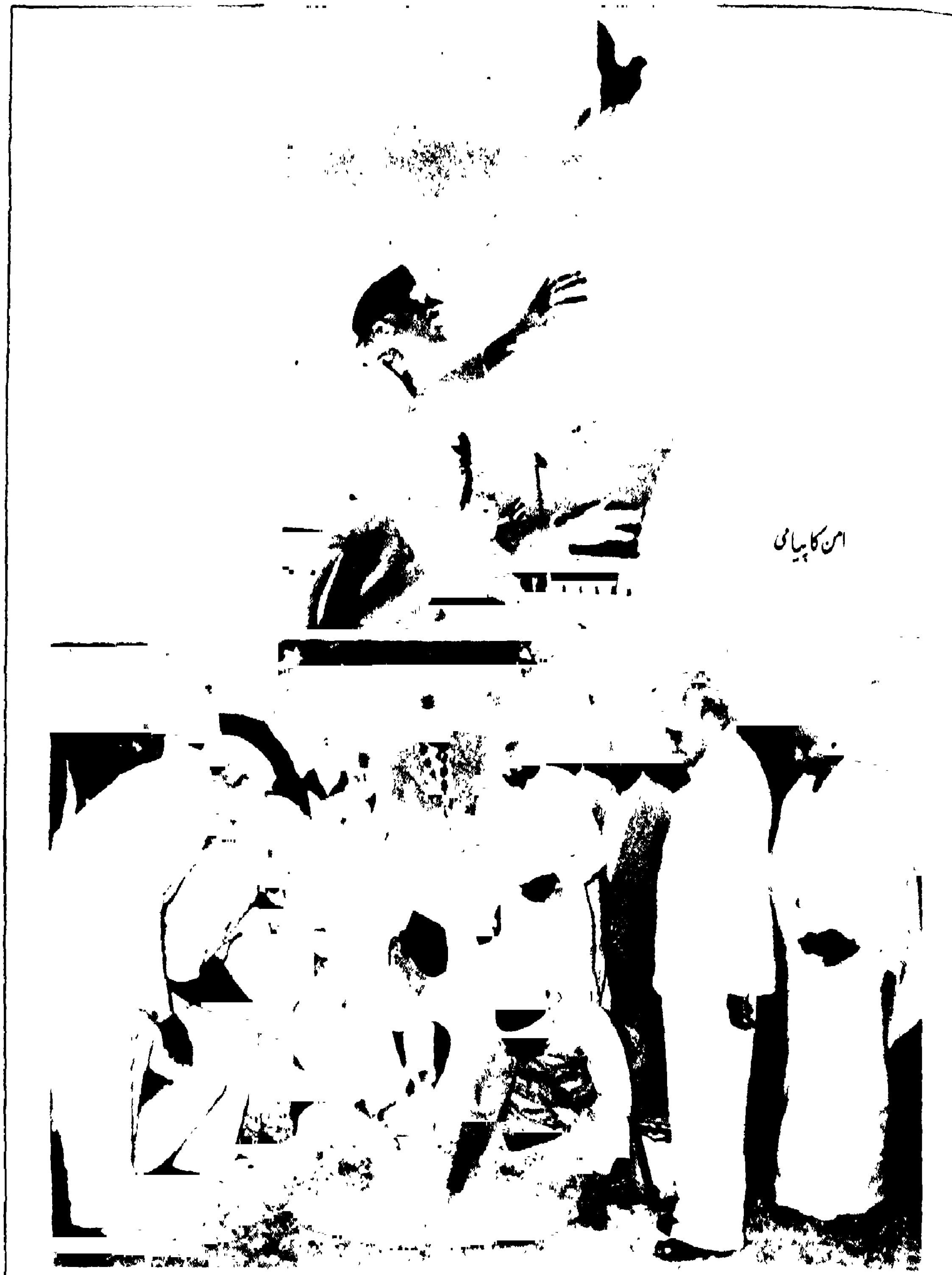
شاہ سعود کے ساتھ



سری لنکا کی سابق وزیر اعظم مسز بندرا نائکے کے ساتھ



بیوی مسعود اور پنڈت جی



امن کا پیامی

شبیر کاری





بمبر رنگ گرخوائی جاری ہے ایک شخص
کی ہمدرد قدرت رائی شناسم



جرم کا نتیجہ ہوئے

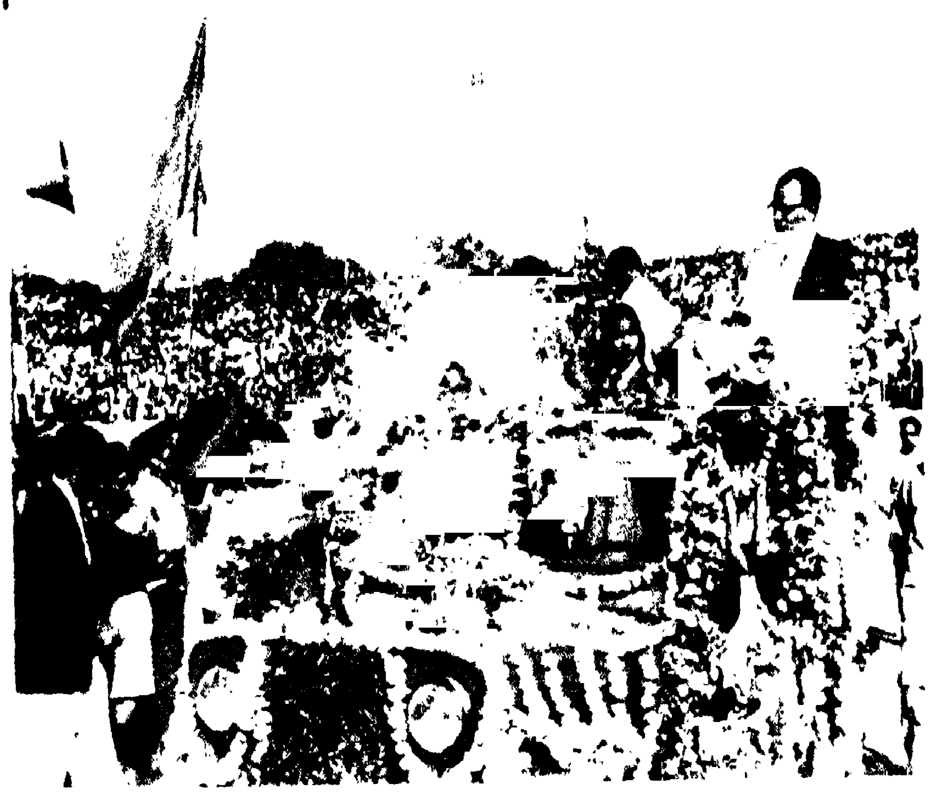


پرائم منسٹر الیون کے کپتان

فلمی اداکار سنیل دت اور نرگس دت کے ساتھ



شہیدا تیوں کے



مجمع میں



آخری دیدار



سنجے گاندھی اور راجیو گاندھی سنجے کی نعش اٹھاتے ہوئے

احوال و آثار

شخصیت بر مضامین

۳۷

رشید الدین
کرشنا ہتھی سنگھ
بشمبھر ناتھ پانڈے
حامدہ حبیب اللہ
(پروفیسر) جگن ناتھ آزاد
کالی داس گپتا رضا
عبداللطیف اعظمی
عظیم فیروز آبادی
(پروفیسر) نثار احمد فاروقی
ظفر پیامی
سردار احمد علیگ
کشمیری لال ذاکر
فیضان نادر
جمیل مہدی (مرحوم)

نہرو خاندان کا ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں کیا رول رہا ہے اور جدید ہندوستان کی تعمیر میں اس خاندان نے کتنا اہم حصہ لیا ہے یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ یہ تسلسل ابھی بھی نہیں ٹوٹا ہے۔ اسی خاندان کا ایک فرد آج بھی اس عظیم جمہوری ہندوستان کا وزیر اعظم ہے۔ اس خاندان کی ایک اہم بزرگ اس وقت بھی ہمارے درمیان موجود ہیں لیکن اس طرح کہ لوگ انھیں تقریباً بھول چکے ہیں۔ مراد مسز وجے لکشمی پنڈت سے ہے، جو پنڈت موتی لال کی دختر، پنڈت جواہر لال نہرو کی بہن، مسز اندرا گاندھی کی پھوپھی اور مسٹر راجیو گاندھی کی نانی ہیں۔ آج وہ اپنی دو بیٹیوں، نین تارا اور چندر لیکھا کے ساتھ دہرہ دون میں خاموش زندگی گزار رہی ہیں، ان کی تیسری لڑکی ریتا دہلی میں رہتی ہے، مسز پنڈت کو معاشی طور پر بھی آسودہ حال نہیں کہا جاسکتا۔

یہ وہی مسز وجے لکشمی پنڈت ہیں (اپنے شوہر آنجہانی رنجیت پنڈت کی وجہ سے وہ اسی نام سے مشہور ہیں) جو برطانیہ میں ہندوستان کی ہائی کمشنر رہ چکی ہیں۔ انھیں ہندوستان کی پہلی خاتون سفیر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ وہ جنرل اسمبلی کی صدر رہ چکی ہیں، یہ اعزاز بھی انھیں بطور پہلی ہندوستانی خاتون ملا ہے۔ وہ مہاراشٹر کی گورنر رہی ہیں اور رکن پارلیمنٹ بھی رہ چکی ہیں۔

رشید الدین

نہرو خاندان کے افراد

(مسز وجے لکشمی پنڈت کا اظہار خیال)

انھوں نے اپنی مرضی سے لوک سبھا کی رکنیت سے استعفیٰ دیا کیوں کہ وہ اپنی پارٹی کی صرف پارلیمنٹ میں ہی نمائندگی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ یہ استعفیٰ انھوں نے اس وقت دیا تھا جب ان کی بھتیجی اندرا گاندھی (جنھیں وہ پیار سے اندو کہتی ہیں) ہندوستان کی وزیر اعظم تھیں۔ بہرحال حالات اور قسمت نے مسز وجے لکشمی پنڈت کا ساتھ نہیں دیا لیکن وہ کچھ چھپاتی بھی نہیں۔ سب کچھ صاف صاف کہتی ہیں۔ کچھ ماہ قبل سیلش کوٹھاری نے دہرہ دون میں ان کا بزبان انگریزی تفصیلی انٹرویو لیا تھا۔ یہ ایک طویل انٹرویو ہے لیکن میں اس میں سے صرف وہ حصہ لے رہا ہوں جس میں انھوں نے اپنے افراد خاندان کے بارے میں اظہار رائے کیا ہے۔ واضح رہے کہ نہرو خاندان ایک کشمیری برہمن خاندان ہے جو کشمیر چھوڑ کر اتر پردیش میں الٰہ آباد میں آبسا تھا۔

پنڈت موتی لال نہرو

میرے والد پنڈت موتی لال نہرو ایک شاندار شخصیت کے حامل تھے۔ ہندوستانیوں میں وہ غیر معمولی تھے اور انھوں نے کانگریس میں شرکت سے پہلے بڑی رئیسانہ زندگی گزاری۔ سوٹ پہنا، میز پر بیٹھ کر چھری کانٹے سے کھانا کھایا، موٹروں میں گھومے اور ہمارے لیے انگریز گورنس رکھی، لیکن گاندھی جی سے ملاقات کے بعد وہ ایسے بدلے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کھدر کو اپنا لیا۔ ان کے زمانے میں الٰہ آباد کے شاندار مکان آنند بھون میں ہم ۴۳ افراد رہتے تھے اور نہایت شان و شوکت کے ساتھ بغیر کسی لڑائی جھگڑے کے سکون کی زندگی گزار رہے تھے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ عیش کرتے تھے۔ وہ ایک بہت بڑے وکیل تھے۔ انھوں نے کبھی ہار نہیں مانی، کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور جسے چھوڑ دیا اس کا پچھتاوا نہیں کیا، بلاشبہ وہ عظیم تھے۔

پنڈت جواہر لال نہرو

میرے بھائی جواہر لال نہرو میں بہت سی اچھی باتیں تھیں۔ وہ اوپر سے جتنے خوبصورت تھے اندر سے بھی ویسے ہی تھے۔ وہ بہت رحم دل (بلکہ فراخ دل کہنا زیادہ صحیح ہوگا) تھے، بے حد وسیع النظر اور سیکولر تھے، بہت جلد کسی پر بھروسہ کرلیتے اور اپنے جیسا دوسروں کو سمجھتے تھے کرشنا مینن نے انھیں بہت گمراہ کیا۔ وہ بے حد جذباتی تھے اور جلد خفا ہوجاتے۔ لیکن ان کا غصہ زیادہ دیر نہیں رہتا تھا۔ انھوں نے ہندوستانی عوام کو بہت چاہا اور جواباً ہندوستانی عوام بھی ان پر جان چھڑکتے تھے ان کی بہت سی خصوصیات گوتم بدھ کی تھیں لیکن



سیاست اور یہ خصوصیات ایک ساتھ تو نہیں چل سکتیں، یہ کمزوری اُن کی بیٹی اندرا میں نہیں تھی۔ وہ صرف ایک سیاست داں تھی۔ اندرا نے مجھے کبھی میرے بھائی کے قریب ہونے نہیں دیا۔

کملا نہرو

کملا نہرو میری بھاوج تھی۔ لیکن ہم کبھی ایک دوسرے کے قریب نہیں آئے۔ وہ ایک قدامت پسند خاندان سے ہمارے خاندان میں آئی تھی جو بہت جدید تھا وہ لوگوں کو سمجھنے اور ان کے قریب آنے میں بہت سخت تھی وہ اپنی پسند اور ناپسند میں بہت کٹر تھی۔ بعد میں وہ بھی قومی تحریک میں شامل ہو گئی اور گاندھی جی کے بہت قریب آگئی۔ عمر نے اس کے ساتھ زیادہ وفا نہ کی میرے بھائی بھی اپنی سیاسی مصروفیات کی وجہ سے زیادہ وقت نہ دے سکے۔

مسز اندرا گاندھی

اندرا میرے اکلوتے بھائی بھاوج کی اکلوتی اولاد تھی، بھائی اسے بہت چاہتے تھے۔ وہ بچپن سے ہی بڑی ضدی، خود سر اور مغرور تھی نہ بچپن میں وہ بے حد دُبلی پتلی اور کمزور تھی اس نے شادی بھی اپنی پسند سے ایک پارسی نوجوان سے کی جو بعد میں فیروز گاندھی کہلائے۔ اپنی خود سر طبیعت کی بنا پر بعد میں اس کی اپنے محبوب خاوند سے بھی نہیں بنی جو ایک بے حد اچھا آدمی تھا۔ میرے بھائی کے انتقال کے بعد اندرا نے بہت نام کمایا اور صحیح معنوں میں ان کی قائم مقامی کی۔ اپنے باپ کے برخلاف اندرا بہت کم کسی پر اعتماد کرتی تھی، وہ مجھ پر بھی اعتماد نہیں کرتی تھی اور یہ بات اس نے مجھ سے میرے مُنہ پر کہی تھی۔ اس نے ہمیشہ مجھے اپنے باپ اور ملک سے دور رکھا اور اندرا ہی کی وجہ سے میں نے پارلیمنٹ کی رکنیت سے استعفیٰ دیا۔ ایمرجنسی کے زمانے میں اُس کی پالیسیوں کو میں نے کبھی پسند نہیں کیا، خصوصاً جبری نسبندی جو اس نے سنجے گاندھی کے زیرِ اثر جاری کی۔ یہ صرف وہ اثر نہیں تھا جو ایک بیٹا اپنی ماں پر رکھتا ہے، بلکہ اس سے بہت زیادہ تھا۔ اندو پوری طرح اس کے شکنجے میں تھی۔ اس کو اپنی ماں کے مزاج میں بہت زیادہ دخیل ہونے سے مجھے بھی نقصان پہنچا۔

راجیو گاندھی

راجیو گاندھی میرا نواسہ ہی نہیں بلکہ میرا بیٹا ہے۔ وہ بچپن ہی سے بہت اچھی طبیعت کا ہے وہ نہ صرف شکل و صورت بلکہ عادات و اطوار میں بھی باپ پر گیا ہے۔ اپنے سیدھے پن سے بطور وزیر اعظم اس سے کچھ غلطیاں بھی ہوئیں جنھیں میں نے بچہ سمجھ کر ہمیشہ نظر انداز کیا لیکن اس کی بعض غلطیوں کی وجہ سے میں تشویش میں بھی مبتلا ہوئی دراصل اس کے حاشیہ بردار اچھے نہیں۔ ورنہ وہ بہت کُھلے ذہن و دل کا مالک ہے۔ وہ اپنے نانا کی طرح عوام کا چہیتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ مستعفی بھی ہو جائے (جیسا کہ پچھلے دنوں مطالبہ کیا جا رہا تھا) تو وہ پھر منتخب ہو جائے گا۔

سونیا گاندھی

سونیا گاندھی بے حد سنجیدہ، سمجھ دار اور ہوشیار عورت ہے وہ ایک باشعور خاتون ہے۔ اس کے بارے میں یہ افواہیں ہیں کہ وہ اٹلی کی جانب اپنا جھکاؤ رکھتی ہے لیکن میں نہیں سمجھتی کہ ایسا ہے۔ وہ اپنے خاندان سے بہت زیادہ لگاؤ رکھتی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا، رکھتی ہے اگر یقین نہ آئے تو اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھ لیجیے وہ صحیح معنوں میں راجیو کی جیون ساتھی ہے۔ عام طور پر لوگ اس لیے بھی اس سے کدورت رکھتے ہیں کہ اس نے ایک ہندوستانی عورت کی جگہ چھین لی۔ لیکن پسند اور ناپسند تو کسی کا اختیار نہیں۔

ارون نہرو

ارون نہرو ایک ہوشیار آدمی اور صحیح معنوں میں سیاست داں ہے، راجیو گاندھی کو سیاست میں لانے کا وہی ذمے دار ہے اور ابتدا میں اس نے راجیو کی بہت سی سیاسی غلطیوں کی پردہ پوشی بھی کی لیکن بعد میں وہ راجیو کے اعتماد سے محروم ہو گیا اور کابینہ سے نکال دیا گیا۔ اس کے ماں باپ دونوں مجھ سے بہت قریب تھے۔ اس کی دادی اوما نہرو ہمارے خاندان کی پہلی خاتون رکن پارلیمنٹ تھی۔

فیروز گاندھی

میں فیروز گاندھی کو بہت پسند کرتی تھی، اور مجھے یقین ہے کہ وہ بھی مجھے پسند کرتا ہوگا۔ وہ بڑا جری اور بے باک نوجوان تھا۔ مصلحت پسندی اسے چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔ جو بات اس کے دل میں ہوتی وہی زبان پر ہوتی۔ وہ خود دار بھی بہت تھا۔ وہ زہر ہلاہل کو کبھی قند نہ کہہ سکا۔ جب وہ پارلیمنٹ میں تھا تو اپنے خسر کے

لیے اپنی ان ہی خصوصیات کی وجہ سے دردِ سر بنا ہوا تھا۔ اُس نے پارلیمنٹ میں بڑے بڑے لوگوں کو بے نقاب کیا۔ جس میں ممتاز صنعت کار مندھرا بھی شامل تھا اور اس معاملے کی وجہ سے اُس زمانے کے وزیرِ خزانہ ٹی ٹی کرشناچاری کو مستعفی ہونا پڑا۔

ہندوستانیوں کی بدقسمتی ہے کہ ہم ان کی ذات سے خاطر خواہ استفادہ نہیں کر سکے ——————
انھوں نے خدمات ضرور انجام دیں لیکن زیادہ تر ملک کے باہر۔ آزادی کے بعد اندرونِ ملک کام کرنے کا انھیں بہت کم موقع ملا اور

اس کی وجہ انھوں نے اوپر بیان کر دی ہے۔ آج کل وہ دہرہ دون میں خاموش زندگی گزار رہی ہیں اور جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے ان کے معاشی حالات بھی اطمینان بخش نہیں ہیں۔

رنجیت پنڈت

میں رنجیت کو اس لیے نہیں چاہتی کہ وہ میرا شوہر تھا وہ آدمی ہی تعریف کے لائق تھا۔ شادی کی گھڑی سے لے کر اس کی آخری سانس تک میں نے اسے چاہا اور ٹوٹ کر چاہا وہ بے حد قابل تھا اور اس سے بھی زیادہ شریف۔ اس نے میری کردار سازی میں بہت حصہ لیا، آج میں جو کچھ بھی ہوں اسی کی وجہ سے ہوں۔ سیاسی زندگی میں بھی اس نے میری بہت رہنمائی کی، بعد میں گاندھی جی کے زیرِ اثر وہ بھی سیاست میں آگیا تھا۔ اور جیل یاترا بھی کی لیکن وہ علم و ادب کا آدمی تھا، سیاست اس کی لائن نہیں تھی۔ رنجیت بے حد وجیہہ تھا۔ وہ ایک بے حد قدامت پسند خاندان کا تھا۔ اور میری بے باکی (خصوصاً مردوں سے بے تکلف ہو جانے کو) پسند نہیں کرتا تھا لیکن ہمارے درمیان کبھی ناچاقی نہیں ہوئی۔

مسز وجے لکشمی پنڈت اسّی کی طرف رواں دواں ہیں، لیکن ان کی عام صحت آج بھی اچھی ہے وہ بے حد قابل، وسیع النظر اور تجربہ کار خاتون ہیں۔ انھیں کیمبرج یونیورسٹی میں پہلی خاتون گریجویٹ ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ یہ ہم

جواہر لال اپنے باپ موتی لال کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اس بات کا موتی لال کو بہت احساس تھا۔ ایک بار دونوں ایک ساتھ جیل میں تھے۔ ان دنوں موتی لال نے لکھا:

"جواہر میرا بہت خیال رکھتا ہے۔ صبح کی چائے سے لے کر رات کو سونے تک مجھے ہر چیز وقت پر مل جاتی ہے۔ میرا ہر کام ڈھنگ سے ہو جاتا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی بہت خیال رکھتا ہے جن کاموں کے لیے مجھے آنند بھون میں اتنا چیخنا پڑتا تھا وہ سارے کام اب کہے بغیر ہو جاتے ہیں کبھی کبھی محمود بھی مدد کرتے ہیں، لیکن کاموں کا اصل بوجھ جواہر پر ہی پڑتا ہے۔ یہ سوچ کر مجھے اپنے آپ سے نفرت سی ہو جاتی ہے کہ میں اتنا کاہل ہوں اور جواہر کا اتنا بہت سا وقت برباد کر دیتا ہوں۔ اس کا یہ وقت اس سے کہیں بہتر طریقے سے استعمال ہو سکتا تھا۔

جواہر سمجھ لیتا ہے کہ مجھے کب کس چیز کی ضرورت ہوگی اور اسے اس طرح کر دیتا ہے کہ مجھے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کاش اس دنیا میں ایسے بہت سے باپ ہوتے جو ایسے بیٹوں پر ناز کر سکتے!"



نہرو — میرے بھائی، میرے دوست

کرشنا ہٹھی سنگھ

یہ تو مجھے معلوم تھا کہ میرے ایک بھائی ہیں جو بہت دُور انگلستان میں ہیں لیکن شعوری طور سے میں نے اُنھیں اس وقت جانا جب ۱۹۱۲ء میں وہ کیمبرج سے بیرسٹری پاس کر کے واپس آئے۔ یوں تو وہ ۱۹۰۸ء میں آئے تھے لیکن میں اس وقت مشکل سے ایک سال کی رہی ہوں گی۔

ان کی آمد سے کافی دن پہلے سے سارے گھر میں بڑی ہما ہمی تھی اور انھیں خوش آمدید کہنے کی زور دار تیاری ہو رہی تھی۔ اس مصروفیت کی وجہ سے لوگوں کی توجہ میری طرف سے بالکل ہٹ گئی اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ میری گورنس کو بھی میرے پڑھانے، مشق کرانے اور کھیل کھلانے کے معمولات کی فکر نہیں تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اتنے ہنگامے کی کیا ضرورت ہے لیکن دھیرے دھیرے میں بھی جوش و خروش کی عام رو میں بہہ گئی اور سوچنے لگی کہ میرے بڑے بھائی جو اب تک میرے لیے اجنبی تھے کیسے ہوں گے۔

پہلی بار میں ان سے مسوری میں ملی۔ والدہ کو چھوڑ کر باقی سارا خاندان والد صاحب کے ساتھ راجپور اُنھیں لینے گیا۔ مسوری اگرچہ مقبول جگہ تھی لیکن اس وقت وہاں تک پہنچنے کا کوئی آسان راستہ نہیں تھا۔ موٹر کے لائق سڑک نہیں تھی۔ اور وہاں جانے کے لیے ٹٹو پر سفر کرنا پڑتا تھا یا ایک طرح کی پالکی پر جس کو ڈانڈی کہتے ہیں ہمارے خاندان کا یہ قافلہ ٹٹو پر سوار ہو کر راجپور گیا تھا۔ میں بہت چھوٹی تھی اس لیے مجھے نہیں لے جایا گیا۔ میں اپنے سفید ٹٹو پر سوار ہو کر صرف لائبریری تک گئی اور وہیں سب کی واپسی کا انتظار کرتی رہی۔ والدہ چونکہ بیمار تھیں اس لیے وہ گھر ہی پر بے چینی سے منتظر تھیں۔

شروع کے کچھ دن جواہر میرے لیے ایک عجیب معمہ تھے۔ کبھی تو وہ بڑی نرمی سے پیش آتے اور چہلیں کرتے، کبھی چھیڑتے، پریشان کرتے اور ڈراتے دھمکاتے اور کبھی اپنے خیال میں مجھے مضبوط بنانے کے لیے سختی اور کھردرے پن سے پیش آتے۔ اگر میں رو دیتی تو اور بھی پریشان کرتے اور اگر جھیل جاتی تو خوش ہوتے اور فوراً اُن چیزوں میں سے کوئی چیز انعام دیتے جو وہ اپنے ساتھ انگلستان سے لائے تھے اور ایسے موقعوں کے لیے رکھ چھوڑی تھیں۔ غرض کہ میری حالت عجیب تھی۔ ایک طرف ان سے ڈر بھی لگتا تھا کہ معلوم نہیں کب کون سا مذاق کر بیٹھیں اور دوسری طرف جی چاہتا تھا کہ وہ میرے پاس رہیں، مجھے ٹٹو پر بیٹھنا سکھائیں اور نئے نئے کھیل دکھلائیں۔ رفتہ رفتہ اس بھائی کی طرف سے جس کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا کہ کب کیا کر بیٹھے، میرا ڈر کم ہوتا گیا اور محبت بڑھتی گئی۔

میری اور ان کی عمر میں اتنا کافی فرق تھا کہ عام بھائی جیسے تعلقات ممکن نہیں تھے۔ چنانچہ جواہر ہمیشہ اس طرح پیش آتے جیسے میں ان کی بیٹی ہوں۔ یہی حال ان کی بیوی کا بھی تھا۔ میں انھیں عزت اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ رشتہ مضبوط تر ہوتا گیا۔ جب تک سول نافرمانی کی تحریک نہیں شروع ہوئی اور والد صاحب اور جواہر اس میں نہیں شریک ہوئے ہماری زندگی کا دھارا بہت سکون کے ساتھ بہتا رہا۔ میرے معمولات کی پابندی سختی سے کی جاتی اور ان میں کوئی رخنہ نہ پڑنے پاتا۔ بزرگوں سے میری ملاقات کے اوقات مقرر تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے صبح اور شام کو اور اتوار کے روز دوپہر کے کھانے پر۔ ہمارے گھر میں سیاست کا دخل ہونے کے ساتھ ہماری انگریز گورنس نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ والد نے اُنھیں چرچ لے جا کر وداع کر دیا اور اس موقع پر ایک عصرانہ بھی کیا۔ اُن کا نام ہُوپر تھا اور 'ٹوپی' کہلاتی تھیں۔ چھوٹی ہونے کی وجہ سے میرے مُنہ سے ہُوپر کے بجائے ٹوپر نکلتا تھا جو بگڑ کر صرف 'ٹوپی' رہ گیا اور یہی ان کا نام پڑ گیا۔ یہ ہمارے گھر تقریباً سولہ برس سے تھیں اور اُنھیں خاندان کا ایک فرد سمجھا جاتا تھا۔ ہم سب

کو ان کے جانے کا غم تھا لیکن خوش قسمتی سے ان کے شوہر الٰہ آباد ہی میں کام کرتے تھے اس لیے ہم جب چاہتے ان کے یہاں آجا سکتے تھے۔ لو پی کے جانے کے بعد میں ایک دم آزاد ہو گئی۔ گھر کے سب لوگ سیاست میں اتنے منہمک تھے کہ کسی کو میری فکر نہیں تھی۔ میرے پڑھانے کے لیے استاد اب بھی تھے لیکن نسبتاً اب میں آزاد تھی۔ اس عرصے میں بڑی تبدیلیاں آئی تھیں۔

والد صاحب اپنی محنت سے ایک کامیاب وکیل بنے تھے۔ انھوں نے خوب کمایا اور خوب ٹھاٹھ سے رہتے اور خرچ کرتے تھے۔ دولت جمع کرنے کی فکر انھیں کبھی نہیں ہوئی۔ اب جب گاندھی جی نے قومی تحریک میں شرکت کی دعوت دی تو انھیں پریکٹس چھوڑنی پڑی ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہو گیا کہ اخراجات کم کیے جائیں۔ چنانچہ ہمیں سادہ اور کم خرچ زندگی کی عادت ڈالنی پڑی۔ والد صاحب کے لیے اس عمر میں یہ بڑا کٹھن کام تھا لیکن انھوں نے ماتھے پر بل لائے بغیر اسے جھیلا۔

جواہر کی شروع کی تعلیم گھر پر ہوئی تھی اور باقی تعلیم ہیرو اور کیمبرج میں۔ چنانچہ وہ انگلستان سے ایک صاحب بہادر بن کر پلٹے جسے بد دماغ کہا جا سکتا ہے۔ اس کا انھیں خود بھی اعتراف تھا۔ پڑھے لکھے طبقے کے زیادہ تر لوگوں کی طرح بھائی بڑے عیش و آرام میں پلے بڑھے اور اس غربت اور تکلیف کو جانتے بھی نہیں تھے جو ملک کی عام زندگی تھی۔ انھوں نے اگر روپیہ اڑایا نہیں تو کبھی جمع کرنے کی بھی فکر نہیں کی۔ واپس آکر پریکٹس شروع کی لیکن والد جیسی دلچسپی اُنھیں کبھی نہیں پیدا ہوئی۔

گاندھی جی نے ان کے سیاسی اور سماجی خیالات بالکل بدل دیے۔ والد صاحب نہیں چاہتے تھے کہ بھائی ایک دم سیاست کے اکھاڑے میں کود پڑیں چنانچہ اس مسئلے پر گھر میں کافی گرما گرمی رہی۔ آخر بھائی گاندھی جی کے ساتھ ہو گئے۔ تھوڑے ہی دن بعد والد صاحب بھی اسی ڈھرے پر آ گئے۔ بھائی اپنے بہترین سلے ہوئے سوٹوں کی جگہ پر کھدر کے کپڑے پہننے لگے۔ کہاں تو وہ ایک صاحب قسم کے نوجوان تھے جسے تھیوسوفی اور ہوم رول لیگ کی ہلکی پھلکی سیاست سے تھوڑی دلچسپی تھی اور کہاں اب دیکھتے ہی دیکھتے ملک کی آزادی کے جانباز سپاہی بن گئے۔ چونکہ اب میری پڑھائی اور روزمرہ کی زندگی میں پہلی جیسی پابندی نہیں تھی اس لیے اکثر میں ان کے اور بھابی کے ساتھ دیہاتوں کو جایا کرتی جہاں وہ تقریریں کرتے اور لوگوں کو اہنسا کا پیغام سناتے۔ میں اگرچہ چھوٹی تھی لیکن یہ محسوس کر سکتی تھی کہ میرے بھائی سب کچھ چھوڑ کر کس طرح سیاست کے پیچھے لگ گئے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ دیش کی جنتا کو سمجھنے لگے اور بڑے بڑے مجمعوں پر اپنی تقریروں کا اثر دیکھ کر بہت خوشی محسوس کرتے۔ شروع میں جب انھوں نے کسانوں کے دکھوں کو دیکھا اور سنا تو اُنھیں یقین نہیں آیا کیونکہ اب تک اُنھوں نے جس طرح کی زندگی گزاری تھی اس میں ایسے دُکھ کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ دھیرے دھیرے ان کی سمجھ میں آنے لگا کہ عوام کے مسائل کتنے بڑے ہیں اور وہ دن بدن اپنے اس ارادے میں پکے ہوتے گئے کہ انھیں عوام کے دکھوں اور مسئلوں کو اپنا بنانا ہے۔

سیاست میں پڑنے کے بعد عام گھریلو زندگی نہ ان کے لیے ممکن رہی اور نہ باقی ہم سب کے لیے۔ عوام میں ان کی مقبولیت روز بروز بڑھتی گئی۔ گاندھی جی کے چہیتے چیلے ہونے کی وجہ سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ دوسروں کی طرح انھیں سیاسی زندگی نیچے سے نہیں شروع کرنی پڑی اور وہ سیاست کے زینے پر دھیرے دھیرے نہیں چڑھے بلکہ ایک دم اوپر پہنچ گئے۔ اس کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ ہندوستان کے لوگ پرانے رسم و رواج کے اب بھی پابند ہیں اور صدیوں سے صبر اور تحمل کے عادی رہے ہیں۔ اسی لیے وہ امیروں کی طاقت اور دولت سے بیر نہیں رکھتے۔ زندگی اگرچہ بڑی تیزی سے بدل رہی ہے ہمارے ملک میں زیادہ تر لوگ اب بھی پرانے ڈھرے پر ہیں۔ لیکن اگر والی کی طرح کوئی امیر آدمی اپنی دولت تیاگ دے اور اس کا اکلوتا لڑکا معمولی زندگی بسر کرنے لگے تو عوام پر اس تیاگ کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے اور وہ ان پر اپنا پریم نچھاور کرنے لگتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ سیاست کے میدان میں اترتے ہی بھائی نیتا بن گئے۔ لیکن اس روز افزوں مقبولیت نے ان کا دماغ خراب نہیں کیا اب بھی وہ پہلے ہی جیسے نیک اور خاکسار آدمی رہے اور ایسا لگتا تھا کہ ابھی انھیں اپنے اوپر پورا بھروسہ نہیں ہے۔

۲۶ء میں وہ اپنی بیوی کے علاج کے لیے سوئزرلینڈ گئے۔ چند مہینوں کے بعد میں بھی پہنچ گئی۔ میں اس لیے گئی تھی کہ بھابی کی دیکھ بھال اور تیمارداری میں بھائی کا ہاتھ بٹا سکوں اور وہاں کے چھوٹے سے گھر کا انتظام سنبھالوں۔ والد صاحب یہ بھی چاہتے تھے کہ اس بہانے میں باہر گھوم آؤں

اور اگر ہو سکے تو پڑھ بھی لوں۔ جنیوا میں میں نے وہاں تعلیم بھی حاصل کی۔ جنیوا میں بھائی، کملا اور اندرا کے ساتھ رہنے کا جو موقعہ ملا وہ گھر پر کبھی نہیں ملا تھا۔ اندرا اس وقت آٹھ سال کی تھی۔

کچھ مہینوں بعد جب کملا کی حالت کافی سنبھل گئی اور وہ اکیلی چھوڑنے کے قابل ہو گئیں تو میں نے بھائی کے ساتھ یورپ کے مختلف حصّوں کا دورہ کیا۔ میری حیثیت بھائی کے سکریٹری کی تھی۔ ہم نے کانفرنسوں میں بھی شرکت کی مثلاً شہنشاہیت دشمن لیگ کی کانفرنس جو برسلز میں ہوئی اور جو سیاست میں میری جیسی نوسکھ کے لیے بڑی سبق آموز تھی۔ دنیا کے بڑے بڑے اور مشہور لوگوں سے ملنے اور اپنے ہم عمر نوجوانوں کے ساتھ ہنسی مذاق اور وقت گزارنے کا خوب موقع ملا۔ پہاڑوں پر چڑھائی کی اور سردیوں کے کھیلوں میں شرکت کی۔ بھائی محنت کرانے اور کام لینے میں بڑے سخت تھے اور مجھے بخشتے نہیں تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ محنت سے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچتا۔ ان کا سکریٹری بننا کوئی کھیل نہیں تھا۔ لیکن میں نے خوب لطف اٹھایا اور اب جب پچھلے دنوں کو یاد کرتی ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ وہی میری زندگی کے سب سے زیادہ خوشی اور بے فکری کے دن تھے۔

ہندوستان لوٹتے ہی وہ پھر سیاست میں ڈوب گئے۔ یورپ میں میں نے مانٹسوری کی ٹریننگ لی تھی۔ الہ آباد میں جب پہلا مانٹسوری اسکول کھلا تو میں اس میں استانی بن گئی۔ لیکن ڈیڑھ سال کے اندر ہی میں نے محسوس کیا کہ قومی تحریک سے الگ رہنا ناممکن تھا چنانچہ جلد ہی میں بھی تھوڑی مدت کے لیے جیل کی سیر کرنے چلی گئی۔ مدتوں ایک دوسرے سے الگ رہنے کا دور پھر شروع ہو گیا لیکن اس سے خاندان والوں کے آپسی رشتے کمزور نہیں ہوئے بلکہ دن بدن اور مضبوط ہوتے گئے۔

جون ۳۰ء میں بیمار ہونے کے باوجود والد صاحب کو دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ اب تک ساری عمر ان کی تندرستی بہت اچھی رہی تھی اور مجھے یاد نہیں کہ کبھی وہ ایک دن کے لیے بیمار ہوئے ہوں۔ لیکن عمر کے آخر حصّے میں بار بار جیل جانے کی وجہ سے ان کے جیسے مضبوط آدمی کی صحت بھی جواب دے گئی۔ اگرچہ انھیں جیل کے اوّل درجے میں رکھا گیا تھا لیکن دوسروں کی طرح عام قاعدوں کی پابندی انھیں بھی کرنی پڑتی تھی۔ مثلاً چودہ روز میں ایک بار سے زیادہ خط لکھنے یا ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ کوئی مخصوص رعایت انھیں نہیں حاصل تھی۔ ستمبر آتے آتے ان کی صحت بہت بگڑ گئی اور گرفتاری کے دس ہفتے بعد ۸ ستمبر ۳۰ء کو انھیں رہا کر دیا گیا۔ بھائی ایک دوسرے جیل خانے میں تھے۔ کملا سیاست میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اور ان کی صحت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ میری بہن کی شادی ہو گئی تھی اور وہ اپنے گھر تھیں۔ والد صاحب کی تیمارداری کے لیے صرف میں اور میری ماں تھیں۔ چونکہ ان کی حالت بہت خراب تھی اور میں زیادہ سے زیادہ وقت ان کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی اس لیے سیاست میں زیادہ حصّہ نہ لیتی تھی۔ لیکن اپنی پوری کوشش کے باوجود میں گرفتار ہونے سے بچ نہ سکی۔ خوش قسمتی سے بارہ گھنٹے کے بعد ہی رہا کر دی گئی۔

۲۶ جنوری ۳۱ء کو والد صاحب کی حالت خراب ہونے کی وجہ سے بھائی اور میرے بہنوئی رنجیت کو نینی جیل سے رہا کر دیا گیا۔ چند ہی روز کے اندر ورکنگ کمیٹی کے سارے ممبر رہا ہو گئے اور سب والد کے گرد جمع ہو گئے۔ ۶ فروری کو ان کا انتقال ہو گیا۔

چونکہ سیاست میں ایک طرح کا جمود پیدا ہو گیا تھا۔ اس لیے گاندھی جی سے کہا گیا کہ وہ وائسرائے لارڈ ارون سے ملیں۔ اس کے چند ہی روز بعد گاندھی جی نے بھائی کو بلوایا۔ ابھی والد کے انتقال کو تھوڑے ہی دن گزرے تھے اور بھائی والدہ کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے تھے لیکن جانے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ دلّی سے بھائی نے مجھے ایک خط لکھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ انھیں والد کے انتقال کا کتنا صدمہ تھا اور ایسے وقت گھر والوں سے دور ہونے کی کتنی تکلیف تھی۔

والد صاحب کے انتقال کے بعد میں سیاست میں بے دھڑک کود پڑی۔ ایسا لگتا تھا کہ زندگی کی کوئی بنیادی چیز جاتی رہی اور اب کچھ بھی ہو جائے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں خود کو تنہا اور بے مددگار محسوس کرتی تھی اور جھنجھلاتی تھی کہ والد صاحب کیوں مر گئے۔ دسمبر ۳۱ء میں غیر قانونی جلسے میں شرکت کے جرم میں مجھے یوتھ لیگ کی سکریٹری کی حیثیت سے گرفتار کر لیا گیا۔ میرے ساتھ میری بہن اور ستر خواتین بھی گرفتار ہوئیں۔ دو ہفتے زیر مقدمہ قیدی کی حیثیت سے بھانت بھانت کی عورتوں کے ساتھ جیل میں رکھنے کے بعد ہمیں مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ مجسٹریٹ ہم سے بھی زیادہ ڈرا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے

ہیں چھ مہینے سے لے کر دو سال تک کی قید کی مختلف سزائیں دیں۔ مجھے اور بہن کو ایک سال کی قید بامشقت ملی اور چند ہی روز بعد ہمیں لکھنؤ سینٹرل جیل منتقل کر دیا گیا۔ یہاں کم سن مجرم رکھے جاتے تھے۔ چونکہ کسی دوسرے جیل میں سیاسی قیدیوں کے رکھنے کا انتظام نہیں تھا اس لیے ہمیں یہاں رکھا گیا تھا۔ چودھویں روز بھائی کے خط کملا کے نام آتے کبھی کبھی ان میں میرے نام بھی پرچہ ہوتا۔ کبھی میری صحت کی طرف سے اظہارِ تشویش ہوتا اور کبھی پچھلے دنوں کی یادیں اور ان کے تذکرے ہوتے۔ ہر خط محبت، خوش امیدی اور میری ہمت افزائی سے لبریز ہوتا۔ جیل خانے کی طویل مدت اور افسردہ دنوں میں جب اپنوں کو دیکھنے کے لیے آنکھیں ترستی تھیں اور بات چیت کے موقعے کبھی کبھار آتے تھے بھائی کے خطوں سے بڑی تسکین ہوتی۔

جیل سے چھوٹ کر ہم الٰہ آباد آگئے اور بعد میں مسوری چلے گئے جہاں بہن نے اپنے بچوں کے لیے ایک مکان کرایے پر لے رکھا تھا۔ ہم لوگوں کے ساتھ ماں کو بھی جانا پڑا اگرچہ ان کا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ پہاڑی پر جائیں جبکہ بھائی جیل میں تھے اور کملا میدان کی گرمی میں مر رہی تھیں۔ لیکن وہ بہت ضعیف ہو گئی تھیں اور ہم لوگوں نے انھیں ساتھ لے جانے پر اصرار کیا۔ مسوری ہندوستان کا سب سے رنگین اور خوبصورت پہاڑی مقام سمجھا جاتا تھا۔ وہاں ہم نے طرح طرح کے آدمی دیکھے جن کے بارے میں بھائی کو میں نے لکھا ہوگا۔ راجہ مہاراجہ بڑی بڑی پارٹیاں کرتے تھے۔ نائٹ کلب خوب چلتے تھے اور شاید ہی کبھی کوئی سوچتا ہو کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے اور کس طرح لوگ جیلوں میں سڑ رہے ہیں۔ ہم لوگ چونکہ حال ہی میں رہا ہوئے تھے اور ہمیں برطانیہ کا باغی سمجھا جاتا تھا اس لیے راجہ مہاراجہ اور دوسرے لوگ جنھیں ہم ذاتی طور سے جانتے تھے اور جو والد صاحب کے موکل اور دوست تھے ہم سے دور دور رہتے تھے۔ اس لیے ہماری حیثیت صرف تماشائی کی تھی۔ میرے خط کے جواب میں بھائی کا ایک خط آیا جس میں انھوں نے اپنی دہرہ دون جیل کی زندگی اور مسوری کی رنگین بے مقصد زندگی کا موازنہ کیا تھا۔

۳۳ء کے وسط میں میں نے بھائی کو بتایا کہ میں راجہ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ ان سے میں بمبئی میں ملی تھی۔ لیکن انھیں نہ بھائی جانتے تھے اور نہ بہن کے علاوہ خاندان کا کوئی فرد۔ میری اُن سے اس وقت ملاقات ہوئی جب میں جیل سے چھوٹ کر بہن کے ساتھ بمبئی آئی تھی جہاں ان کے بچے بورڈنگ میں رہتے تھے۔ عام ہندوستانی بھائی باپ کی طرح وہ مجھ پر خفا نہیں ہوئے اور نہ اپنی رضامندی دینے سے انکار کیا۔ لیکن جب میں نے انھیں یہ بتایا کہ مجھے راجہ اور ان کے خاندان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا اور نہ یہ جانتی تھی کہ راجہ کیا کرتے ہیں اور ان کی کیا آمدنی ہے تو بھائی برافروختہ ہو گئے۔ انھوں نے کہا یہ حماقت کی حد تھی کہ میں ایک ایسے شخص سے شادی کرنے کی اجازت چاہتی ہوں جس کے بارے میں ذرا بھی واقف نہیں ہوں۔ وہ خود راجہ سے ملنا چاہتے تھے اور یہ بھی کہ راجہ میری ماں اور گھر والوں سے ملیں۔ چنانچہ راجہ لکھنؤ آئے جہاں میری ماں، بہنیں، بچیاں وہاں تھیں۔ دیکھتے ہی سمجھ گئیں اور مجھے بتا دیا۔ جب انھوں نے ان کی نیکی اور سچائی کا احساس کر لیا تو بھائی بھی ان کے قائل ہو گئے۔ بھائی، ماں اور رشتے کے سب جاننے والے راجہ کو پسند کرنے لگے۔ ماں اور کملا کو تو وہ بہت ہی اچھے لگے۔ جس بات نے میں جو بات تھی اس کو دیکھتے ہوئے بھائی نے میری شادی میں جو جلدی کی وہ شاید ابا جان اگر تب زندہ ہوتے تو نہ کرتے۔ ماں چونکہ کئی مہینوں سے بیمار تھیں اور راجہ انھیں بہت پسند تھے اس لیے ان کی خواہش تھی کہ جلد سے جلد ان کی زندگی میں شادی ہو جائے۔ چنانچہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو اسی گھر میں جہاں میں پلی بڑھی تھی میری شادی ہو گئی۔ عام ہندوستانی تقریبوں کو دیکھتے ہوئے یہ تقریب بڑی خاموشی سے ادا ہوئی۔

شادی کے بعد بھائی اور کملا دونوں نے اس بات کا خیال رکھا کہ مجھے اکثر خط لکھتے رہیں وہ جانتے تھے کہ میں نئے ماحول میں تنہائی محسوس کرتی ہوں گی اور مجھے ہمت افزائی کی ضرورت ہوگی۔ بھائی کے خط اگرچہ بڑے محتاط ہوتے تھے لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بوقت ضرورت میری مدد کے لیے وہ میرے قریب ہیں۔ کملا کو میرے اور راجہ کے ساتھ جو لگاؤ تھا اس سے بڑی ڈھارس ملتی تھی۔ کملا راجہ کو جو خط لکھتی تھیں اس میں مذاقاً انھیں دھمکی دیتی تھیں کہ اگر مجھے ذرا بھی تکلیف ہوئی تو ان کے لیے اچھا نہ ہوگا۔

۳۷ء میں بھائی کے کہنے پر راجہ نے پریکٹس چھوڑ دی اور سیاست میں آگئے۔ بھائی



کا کہنا تھا کہ ملک جدوجہدِ آزادی کے جس دور سے گزر رہا تھا اس میں کسی غیرت مند ہندوستانی کو یہ نہیں زیب دیتا کہ وہ روپیہ کمانے میں لگا رہے۔ مجھے اختلاف تھا۔ میں کافی جیل جا چکی تھی اور ۲۰ء سے اب تک کی غیر یقینی زندگی سے تھک گئی تھی۔ لیکن راجہ نے میری بات نہیں مانی اور پریکٹس چھوڑ کر تن من سے سیاست میں لگ گئے۔ تاریخ خود کو دہرا رہی تھی۔ جب میں بہت پریشان ہوتی تو بھائی مجھے لکھتے اور سمجھاتے کہ راجہ نے اپنی آرام کی زندگی چھوڑ کر حالات کا چیلنج قبول کرنے کا جو فیصلہ کیا وہ درست تھا۔ بھائی کو پُرسکون زندگی سے نفرت تھی۔ چنانچہ انھوں نے راجہ کو بھی اُسی راستے پر لگا لیا جو غیر یقینی تھا اور جس میں مشقت ہی مشقت تھی۔

۹ اگست ۴۲ء کو بھائی اور راجہ کو میرے فلیٹ سے گرفتار کر کے کسی غیر معلوم مقام لے جایا گیا۔ کئی مہینوں بعد مجھے پتہ چلا کہ راجہ بمبئی سے ۱۲۰ میل دور پونا میں تھے اور بھائی دوسرے لیڈروں کے ساتھ احمد نگر جیل میں رکھے گئے تھے۔ یہاں یہ لوگ تین سال رہے۔

دوسروں کے مقابلے میں بھائی کی زندگی زیادہ مہم جوئی اور سرفروشی کی تھی۔ جیل کی لمبی مدت سب کے لیے اتنی خوشگوار نہیں تھی جتنی اُن کے لیے۔ بھائی کے ساتھ خاص بات یہ تھی کہ انھوں نے زندگی کے ہر دَور میں تن من سے پوری دلچسپی لی۔ وہ سمجھتے تھے کہ علم کی کوئی تھاہ نہیں ہے اور ہر وقت آدمی کے لیے اور زیادہ سیکھنے کا موقعہ ہے۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ وہ محسوس کرتے تھے کہ مسلسل ان کی نشو و نما ہو رہی ہے اور وہ ذہنی طور سے برابر بڑھ رہے ہیں۔ ان کے اسی احساس اور نوجوانوں جیسے جوشیلے پن نے انھیں زندہ رہنے کا شوق بخشا۔

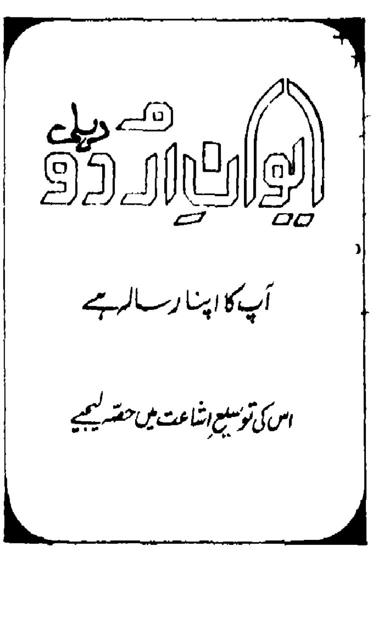
۴۹ء میں جب میں بھائی کے ساتھ سیلون گئی تھی تو وہاں ایک انگریز اخبار نویس پیٹر بے ٹن نے ان کے بارے میں لکھا:

"زرد چہرہ، گہرے سیاہ حلقوں میں گھری ہوئی آنکھیں جن سے علم و فکر کی ریاضت نمایاں، نہرو کا چہرہ ایک ایسے تھکے ہوئے آدمی کا چہرہ معلوم ہوتا تھا جس کو ایک ایسی اندرونی طاقت آگے بڑھنے پر اکسا رہی ہو جس کی بے پناہ شدت انھیں ختم کر سکتی ہے اگر انھوں نے احتیاط نہ کی۔۔۔۔ وہ یکے بعد دیگرے سگریٹ سلگاتے اور دیاسلائی کی لو کو سمندری ہوا کے جھونکوں سے بچانے کے لیے اپنے چھوٹے ہاتھ سے آڑ کر لیتے۔ ان کے ہاتھ بہت ہی چھوٹے تھے، بالکل آرٹسٹ جیسے چھوٹے ہاتھ۔ میری توجہ کی سب سے زیادہ مرکز اُن کی چبھتی ہوئی تیز آنکھیں تھیں۔ لیکن روشنی میرے سامنے تھی۔ اس لیے میں آنکھوں کا رنگ نہیں بتلا سکتا۔ خود پنڈت نہرو نے بتایا 'میرے پاسپورٹ کے مطابق گہری بھوری' جب میں نے کہا کہ میں انھیں بادامی کہوں گا تو وہ مسکرا دیے اور بولے 'پاسپورٹ میں اپنی تفصیلات میں نے خود بھری تھیں اور گہرا بھورا رنگ مجھے سب سے زیادہ پسند ہے'۔ نہرو کے ساتھ ان کی چھوٹی بہن کرشنا بھی تھی۔ جب میں نہرو کے ساتھ زینے سے اُتر رہا تھا تو وہ نیچے کھڑی تھی۔ انھوں نے اس کے گلے میں باہیں ڈال کر لپٹا لیا۔ جب نہرو نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ دونوں میں کتنا تعلق تھا۔۔۔۔ وہ وقت آ سکتا ہے جب نہرو کو انقلاب کی رہنمائی کرنی پڑے لیکن میری پیشین گوئی ہے کہ اس خمیر سے ہیرو نہیں شہید بنتے ہیں، بے ادبی نہ ہوگی اگر میں یہ کہوں کہ وہ اپنے عوام کے لیے سولی پر چڑھنا قبول کریں گے لیکن ان ہاتھوں سے نفرت نہیں کریں گے جنھوں نے انھیں شہید کیا۔"

جواہر لال خود اپنے لیے کیا چاہتے تھے اس کا لب لباب لوحِ مزار کے وہ الفاظ ہیں جو انھوں نے اپنے لیے تجویز کیے:

"اگر میرے ملک کے عوام پسند کریں تو میں یہ کہلانا چاہوں گا کہ: یہ وہ آدمی تھا جس نے ہندوستان اور اس کے عوام سے محبت کی اور انھوں نے اس کے عوض اپنی بے پناہ محبت اس پر نچھاور کی۔"

ترجمہ: محمد خلیق صدیقی



ایک مشفق رہنما

بشمبھر ناتھ پانڈے
(سابق گورنر اڑیسہ)

تقریباً پچاس سال تک پنڈت نہرو کے ساتھ ان کی سرکردگی میں اور ان کے مشورے سے کام کرنے کا موقعہ ملا۔ جب ان کا تصور کرتا ہوں تو یادوں کے خزانے کھل جاتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سا واقعہ لکھوں، کون سا چھوڑ دوں۔ ۱۹۳۰ء کے نمک ستیاگرہ میں ہزاروں نوجوان کانگریس سیوادل میں بھرتی ہوئے۔ فروری ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں سیوادل کے سپاہیوں کے ٹریننگ کیمپ کا انتظام کیا گیا۔ جواہر لال نہرو اگرچہ کانگریس کے سربراہ تھے پھر بھی وہ ہر روز سویرے خود سپاہیوں کی وردی پہنے سیوادل کے ڈرل اور پریڈ میں ہمارے ساتھ شامل ہوتے اور کپتان کے حکم کی تعمیل کرتے۔ ایک دن شام کو کیمپ فائر میں سیوادل کے کپتان نے جواہر لال نہرو سے ایک گیت گانے کی درخواست کی۔ پنڈت نہرو کو گانے سے نہ دلچسپی تھی اور نہ لگاؤ تھا۔ پھر بھی انھوں نے پہلے ہندی اور بعد میں ایک انگریزی نظم سنائی۔ کیمپ کے کنووکیشن کی تقریروں میں پنڈت جی نے ہم سیوا دل کے سپاہیوں سے کہا:

"جب تک نیتا اپنے کو خود خادم سمجھتا ہے تب تک وہ خدمت کے ذریعے عوام کو ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار کرتا ہے۔ جس دن اس کے دل سے خدمت کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے پھر نہ تو وہ کام کرنے کے لائق رہ جاتا ہے اور نہ نیتا۔ عوام کا بھی اس پر سے بھروسہ اُٹھ جاتا ہے۔ اس لیے ہمیشہ اپنے دل میں خادم کو خدمت کا جذبہ رکھنا چاہیے"۔

بہتوں نے پنڈت جی کے ان تاریخی جملوں کو اپنی زندگی میں سمو کر رکھا ہے۔ پنڈت جی اپنے محبت بھرے سلوک سے ہمیشہ ہمارے اوپر یہی اثر ڈالتے کہ وہ ہم میں سے ایک ہیں اور ہمارے ساتھی ہیں۔ وہ ہمارے دُکھ سُکھ کی بات پوچھتے اور اگر کوئی بیمار پڑتا تو معمولی سے معمولی کانگریس کارکن کے گھر جا کر اُسے دیکھتے اور علاج کا انتظام کرواتے۔

۲

۱۹۲۸ء میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے اپنے یہاں قومی تحریک کے لیے ایک تحصیل کو تیار کیا۔ اتر پردیش کانگریس کمیٹی نے پنڈت جی کی مرضی پر الہ آباد ضلع کی ہنڈیا تحصیل کو چُنا۔ جواہر لال جی نے یہ طے کیا کہ وہ ہنڈیا تحصیل میں ایک ہفتہ پیدل سفر کریں گے۔

جب وہ ٹرین سے ہنڈیا آئے تو ہزاروں کسانوں نے ان کا استقبال کیا۔ وہ فوراً سی پور گانو کے لیے روانہ ہو گئے ہزار ڈیڑھ ہزار آدمی ان کے ساتھ ہو لیے جن میں زیادہ تر اسکول کے طلبہ تھے۔ جگہ جگہ پنڈت جی رکتے اور کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کسانوں سے باتیں کرتے۔ وہ کاشتکاری کے استعمال میں آنے والے ہل اور دوسرے اوزاروں پر غور کرتے، کس فصل میں کتنی مقدار میں کھاد دیتے ہیں اس کے بارے میں پوچھتے، فی ایکڑ خریف کی اور ربیع کی فصل میں کتنی پیداوار ہوتی ہے۔ یہ دریافت کرتے، ان کے قرضوں کے بارے میں بھی ان سے سوال کرتے۔ پنڈت جی جب کسانوں سے اس طرح کے سوال پوچھتے تو کسانوں کی آنکھوں کی کوریں گیلی ہو کر ڈبڈبا جاتیں۔ اتنی ہمدردی تو پہلے کبھی کسی نے نہیں دکھائی تھی۔ بہت سی جگہ تو لوگ زیادہ تر کسان گھرانوں کی عورتیں اپنی مصیبت کی کہانی کہتے کہتے رونے لگتیں۔ پنڈت جی ان کی ڈھارس بندھاتے۔ انھیں ہمت دیتے اور یقین دلاتے کہ مستقبل قریب ہی میں ان کی تکلیفیں دور ہوں گی۔

تیسرے پہر کو بڑے بڑے عوامی جلسے ہوتے جن میں پنڈت جی کسانوں کو باخبر کرتے کہ طے شدہ لگان بندی ستیاگرہ میں اُنھیں کیسی زبردست رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ ان سے چھوت اور نشیلی چیزوں کے استعمال سے بچنے کو کہتے اور آپس میں اتحاد بنائے رکھنے کو کہتے۔

ہم لوگوں نے پنڈت جی کے رات کے آرام کے لیے ایک چھوٹے تنبو کا انتظام کیا تھا۔ وہیں وہ سوتے۔ سویرے کی چائے اور ناشتہ لیتے اور جیسے ہی آگے کے لیے چلنے کو تیار ہوتے تو ہم لوگ تنبو پیک کر اپنے رات کے پڑاو کی جگہ اُسے کھڑا کرنے کا انتظام کرتے۔ پہلے پنڈت جی نے سوچا تھا کہ گانو میں اسی طرح رہیں گے جیسے گانو کے لوگ رہتے ہیں۔ مطلب رفع حاجت

کے لیے میدان میں لوٹا لے کر نکل جانا۔ مگر اُن کے اُٹھنے سے پہلے ہی سینکڑوں آدمیوں کی بھیڑ اکٹھی ہو جاتی۔ وہ رفع حاجت کے لیے چلتے تو بھیڑ بھی ان کے ساتھ چلنے لگتی۔ عوام کی محبت نے انھیں پریشان کر دیا۔ تب ہم لوگوں نے سوچا کہ تمبوؤں میں ہی پاخانے کا انتظام کر دیا جائے۔

جب وہ کوئیں پر نہانے کے لیے جاتے تو گانو کے جوانوں میں بے چینی جاگ جاتی کہ کم سے کم ایک لوٹا پانی وہ ان کے بدن پر ضرور ڈالیں گے۔ لوگ اصرار کرتے کہ وہ ان کے یہاں کھانا تناول کریں اور پنڈت جی ایک شرط پر منظور کر لیتے کہ وہ اُبلے ہوئے آلو اور شکر قند سوکھی چپاتی اور گاجر کے سوا کچھ نہ لیں گے۔ پیدل سفر میں ہنڈیا، پھول پور اور سوراؤں تحصیل کے کچھ حصے شامل کیے گئے تھے۔ پنڈت جی کے پیدل سفر نے کسانوں کے اوپر بے حد اثر ڈالا۔

۱۹۳۲ء میں جب لگان بندی ستیاگرہ شروع ہوا تو کسانوں نے لگان دینے سے انکار کر دیا۔ جاٹ رجمنٹ کو توپ اور بندوق کے ساتھ سوراؤں، پھول پور اور ہنڈیا کے گانوؤں میں گھمایا گیا۔ آگے آگے چلنے والے برٹش افسر کسانوں کو بندوق دکھا کر دھمکاتے کہ اگر لگان نہ دو گے تو گولی سے اُڑا دیے جاؤ گے۔ لیکن پیچھے چلنے والے جاٹ رجمنٹ کے جوان کسانوں کو بھروسہ دلاتے کہ انگریز افسر کی بندر گھڑکی میں نہ آنا، اپنی آن پر ڈٹے رہنا۔ جاٹ فوجی تو خود کسان گھرانے سے آئے تھے اس لیے ان کی پوری ہمدردی کسانوں کے ساتھ تھی۔

دسمبر ۱۹۳۳ء تک قید کی سزائیں بھگت کر ہم میں سے بہت سے ستیاگرہی باہر آ گئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو بھی جیل سے باہر آئے لیکن انھیں لگان بندی ستیاگرہ میں کسانوں کو جن سخت تکلیفوں سے اور قربانیوں کے بیچ سے گزرنا پڑا اُس کی فکر تھی۔ انھوں نے الہ آباد کے کانگریسی ذمے داروں کو آنند بھون بلایا اور ان سے کہا کہ کانگریس کی طرف سے ہمیں کسانوں کے درمیان جا کر اُن کی عظیم قربانی کے لیے بدھائی دینی چاہیے اور ان کے ساتھ ہمدردی کرنی چاہیے۔

انھوں نے ہم لوگوں سے اپیل کی کہ ہم میں سے کچھ ایسے لوگ اپنا نام دیں جو پندرہ دن کے پیدل سفر پر ایک ایک تحصیل کے گشت میں جائیں گے اور کسانوں کو کانگریس کی طرف سے ہمدردی پیش کریں گے۔ لگان نہ دینے کے سبب اپنے کھیتوں سے سینکڑوں کسان بے دخل کر دیے گئے تھے۔ پولیس نے ان کی عورتوں کے زیور اور گھر کے برتن و بستر سب قُرق کر لیے تھے۔

دو برس کے بعد ابھی ابھی جیل سے چھوٹ کر آئے ہوئے کارکنوں میں سے صرف تین نے اپنے نام دیے یہ تین تھے لال بہادر شاستری، فیروز گاندھی اور میں۔ لال بہادر شاستری کو ہنڈیا تحصیل، فیروز گاندھی کو کرچھنا تحصیل اور مجھے پھول پور تحصیل کے پیدل سفر کی ذمے داری سونپی گئی۔ شرط یہ تھی کہ ہم تحصیل کے صدر مقام تک ریل سے جائیں گے اور پھر پیدل سفر کریں گے۔ اپنے ساتھ صرف ایک جوڑا کپڑوں کا اور ایک کمبل لے جائیں گے۔ جھولے میں صابن منجن ہوں گے لیکن ایک پیسہ بھی ساتھ نہ لیں گے۔ کسی کسان گھرانے نے کھلا پلا دیا تو کھا پی لیں گے ورنہ بھوکے رہیں گے۔ کسی نے رات کو سونے کے لیے جگہ دی تو گھر میں سو جائیں گے۔ نہیں تو رات درخت کے نیچے کاٹیں گے۔ دسمبر کا مہینہ تھا اور الہ آباد میں کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ ہمارا پندرہ دن والا پیدل گشت شروع ہوا۔ ہزاروں کسانوں سے ہم ملے۔ کانگریس کی طرف سے جواہر لال جی کا پیغام انھیں دیا۔ ان کے دُکھ سکھ کی کہانی سنی۔ کانگریس کی طرف سے ان کو ہمدردی پیش کی اور ان کی ہمت کی تعریف کی۔ ربیع کی فصل کی سینچائی چل رہی تھی۔ اس لیے دن میں ہمیں کسانوں سے کوئیں پر ہی ملنا پڑتا۔ ان سے بات کر کے آگے بڑھتے۔ شام کو ایک بڑا جلسہ ہوتا۔ اس میں ملک کی حالت پر روشنی ڈالی جاتی۔

اس پورے سفر میں ایک بھی دن ایسا نہیں آیا جب ہمیں فاقہ کرنا پڑا ہو یا پیڑ کے نیچے سونا پڑا ہو کسان ہمارے لیے پوال بچھا دیتے جس کی گرمی میں دن بھر کے تھکے ہوئے ہم سکھ کی نیند سوتے۔ روز پندرہ پندرہ میل چلنا ہمارا کام تھا۔ پندرہ دنوں میں ہم نے یہ گشت پورا کیا۔ ایک نئی اُمنگ گانو کے لوگوں میں پیدا ہوئی۔ ہم سمجھتے تھے کہ دو تین دن کے اندر ہی ہم تینوں آدمی گرفتار ہو جائیں گے۔ لیکن پندرہ دن کا اپنا سفر ہم نے اطمینان بخش طور پر پورا کیا لوٹ کر پنڈت جی کو رپورٹ دی کہ گانو میں کتنے لوگ اپنی کھیتی سے بے دخل ہوئے۔ کتنوں کی قرقی ہوئی۔ اب وہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ گھنٹوں بیٹھ کر سارے حالات انھوں نے ہم لوگوں سے سُنے۔ گانو کے ایک ایک کانگریس کارکن کے بارے میں انھوں نے پوچھا اور پھر ہم تینوں کی پیٹھ تھپتھپا کر ہمارے کام کے لیے ہماری تعریف کی۔

وہ دن یاد آتے ہیں جب نیتا نوجوان کارکنوں کا کتنا خیال رکھتے تھے اور کیسا سخت امتحان لیتے تھے۔

۳

۱۹۳۸ء میں پنڈت جی یورپ کے سفر سے واپس الہ آباد لوٹے۔ ہم لوگ ان سے ملنے آنند بھون گئے۔ ابھی انھوں نے ہمیں اپنے سفر کے حالات سُنانے

ئے گئے تھے کہ اتنے میں رفیع احمد قدوائی اور
بہادر شاستری بھی پہنچ گئے۔ انھیں دیکھتے ہی
ت جی نے کہا " آیئے ڈاکٹر ڈالفس۔" رفیع صاحب
چا پنڈت جی ان کو کوئی نیا خطاب دے رہے
وہ تھوڑا جھینپ سے گئے انھیں تب تک پتہ
کہ ڈاکٹر ڈالفس کون ہیں۔ پنڈت جی ان کی حیرت
کے اور بولے " رفیع تمھیں یہ خطاب نہیں دیا
ہے میں تو لال بہادر شاستری کو مخاطب کر
تھا " پھر انھوں نے بتایا کہ ڈاکٹر ڈالفس لال بہادر
کے ناٹے آدمی ہیں اور اس وقت وہ چیکوسلواکیا
وزیر اعظم اور وزیر خارجہ ہیں۔ رفیع صاحب بولے
پ نے لال بہادر کے لیے آزاد ہندوستان کی
رتیں وزیر خارجہ کی جگہ پکی کر دی "

جواہر لال جی نے جواب دیا " رفیع تم مایوس
ہو۔ اگر پنت جی تمھیں یو۔ پی کی کابینہ سے چھٹی دے
تو تمھیں بھی مرکزی وزارت میں جگہ مل جائے گی "

تب کسے پتہ تھا کہ پنڈت جی کی دونوں باتیں
اور نہ بن جائیں گی۔ رفیع صاحب اور لال بہادر
ستری دونوں مرکزی وزیر بنے اور لال بہادر
شاستری ڈاکٹر ڈالفس کی طرح وزیر اعظم کی مسند پر
بیٹھے۔

۴

۱۹۳۸ء میں مئی جون کی گرمی کے دن تھے۔ الہ آباد کی
۱۱۵ سے ۱۱۸ ڈگری تک جل رہی تھی۔ ایک دن پنڈت
نے کہا " ہندی کی بہت سی ڈاک جواب دینے
لیے جمع ہو گئی ہے۔ تم اگر ہندی کے خطوں کا جواب
تو میرے پوچھنے پر پنڈت جی نے کہا " لنچ کے بعد
بجے دوپہر کو آجاؤ " دوسرے دن میں ٹھیک
پر پہنچ گیا۔ وہ اوپر لائبریری میں بیٹھ کر کام کر
رہے تھے۔ پنکھے کے نیچے دروازے سب بند تھے تو
کمرے کے اندر گرمی تھی۔ پنڈت جی ہاف پینٹ
پہنے تھے۔ اوپر کا بدن ننگا تھا۔ کچھ پندرہ بیس
خطوط ان میں نے ڈکٹیشن لی اور اس کے بعد دوسرے
کمرے میں خطوط کے جواب لکھنے چلا گیا۔ جب لکھ چکا تو
ان کے سامنے دستخط کے لیے رکھے۔ خطوط کو لفافوں میں
بند کیا۔ لفافوں پر پتے لکھے۔ انھیں رجسٹر پر چڑھایا اور
ہری کو بازار پوسٹ کرنے دے دیے۔ یہ کام تقریباً
دس دن تک چلا۔ ایک دن میں نے ہمت کر کے
پوچھ ہی لیا " پنڈت جی آپ پورے دن کھڑکی دروازے
کے سامنے بیٹھ کر گرم لو کے تھپیڑے برداشت
کرتے ہیں۔ آپ کا ننگا بدن جھلس نہیں جاتا " پنڈت
جی ہنستے ہوئے بولے " قدرت نے
ہمیں جو جسم دیا ہے اس کی ہم قدر نہیں کرتے۔ ہم
اسے گرمی سردی برداشت کرنے کی عادت ہی
نہیں ڈالتے۔ جسم میں بڑی صلاحیت ہے۔ [illegible]
روز [illegible]
[illegible] نہیں دیتے ہیں ہم
[illegible]
قدرت سے [illegible] قدرت
کی ہماری صلاحیت بڑھ جاتی ہے "
شاید اسی لیے [illegible]
[illegible] آج [illegible] تھے۔

نہرو کبھی جھوٹے پن کا ثبوت نہ دیتے تھے۔ وہ شرافت اور
انسانیت کا نمونہ تھے۔ اپنے نجی برتاؤ میں وہ بڑی شرافت، رواداری
اور انسانیت سے کام لیتے تھے۔ اپنے عمل سے وہ دوسروں کو
دریا دلی اور وسعتِ قلب کا سبق دیتے تھے۔ وہ کبھی اُن
لوگوں کی حوصلہ افزائی نہ کرتے تھے جو دوسروں کی بُرائی
کرنے کے عادی ہوتے تھے۔ ایک بار آنند بھون میں کسی
کانگریسی لیڈر نے آدھے گھنٹے تک اپنے کسی سیاسی مخالف
کی برائی کی۔ نہرو خاموشی سے اس کی باتیں سنتے رہے
اور جب اس نے اپنی بات پوری کر لی تو وہ یہ کہہ کر اُٹھ گئے
" ممکن ہے اس شخص میں وہ سارے عیب موجود ہوں جو
آپ نے بیان کئے ہیں لیکن جو لوگ اس طرح کسی کے عیب
گنا تے ہیں وہ بھی اعلیٰ درجے کے انسان نہیں ہو سکتے "
شکایت کرنے والا خاموش ہو گیا۔

یگانۂ دہر

جواہر لال نہرو ایک یگانۂ روزگار ہستی تھے۔ انھوں نے تاریخ عالم کے صفحات پر اپنا ایک نقش مرتسم کر دیا ہے۔ وہ تمام دوسرے انسانوں کی طرح ایک انسان تھے لیکن اُن میں اتنی خوبیاں پائی جاتی تھیں اور وہ اتنی صفاتِ حسنہ سے متصف تھے کہ اگر اُن میں کوئی انسانی کمزوری رہی بھی ہو تو وہ نظر نہیں آتی۔ اُن کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ حصولِ آزادی کے بعد انھوں نے ہندوستان ایسے وسیع و عریض ملک کو ایک شیرازے میں منسلک کر دیا اور اُس کی وحدت برقرار رکھی۔ جواہر لال سارے ہندوستان کے تھے اور سارا ہندوستان اُن کا۔ وہ جنوب میں بھی اُسی قدر ہر دل عزیز تھے جس قدر شمال میں، اور مغربی ہندوستان بھی اُن سے اتنی ہی محبت کرتا تھا جتنا کہ مشرقی ہندوستان۔ اُتر پردیش کے لیے یقیناً یہ فخر کی بات ہے کہ وہ اِس ریاست میں پیدا ہوئے۔ خود جواہر لال بھی اِس پر فخر کرتے تھے۔

جواہر لال اپنے پُرانے دوستوں کو کبھی بھولے نہیں۔ وہ اُنھیں ہمیشہ عزیز رہے۔ ساتھ ہی نئے روابط اور تعلّقات کو بھی انھوں نے سراہا۔ عوام سے اُن کا رابطہ گہرا تھا اور وہ اِس رابطے کی قدر بھی کرتے رہے۔ ایک مرتبہ جب وہ میرے شوہر میجر جنرل عنایت حبیب اللہ کے ساتھ جیپ پر ایک مجمع کے درمیان سے جو اُن کا

حامدہ حبیب اللہ
سابق صدر، اُتر پردیش اُردو اکادمی، لکھنؤ

استقبال کرنے کے لیے اکٹھا ہو گیا تھا گزر رہے تھے تو لوگوں کی آنکھوں میں اپنے ساتھ محبّت اور عقیدت کی چمک دیکھ کر میرے شوہر سے انگریزی میں بولے: "انسانوں کی اِس بے پناہ محبّت کو دیکھ کر انتہائی مسرّت کا احساس ہوتا ہے۔" پھر بولے: "بے شک یہ بڑی خوشی کی بات ہے لیکن اِسی کے ساتھ مجھے اپنی اِس ذمّے داری کے بوجھ کا بھی احساس ہوتا ہے کہ مجھ پر جس اعتماد کا اظہار کیا جا رہا ہے کاش میں اُن میں سے کم سے کم کچھ توقعات تو پوری کر سکوں۔"

آخری مرتبہ میں اُن سے رانچی میں ملی۔ اُس روز اُن کی سالگرہ تھی۔ وہ وہاں ہیوی انجینیرنگ کے کارخانے کا افتتاح کرنے آئے تھے اور وہاں کے کارکنوں اور مزدوروں سے خطاب کرتے ہوئے اُن سے کہا تھا کہ اُن کی کوششوں ہی سے اِس منصوبے میں کامیابی ہوگی۔ وہ اِس سے پہلے شدید طور سے بیمار پڑ چکے تھے اور اُن کے چہرے پر کچھ آماس بھی تھا۔ لیکن اِس حالت میں بھی سرکاری نگرانی میں چلنے والے اِس کارخانے اور اُس میں کام کرنے والوں سے اُنھیں اتنی دل چسپی تھی کہ دہلی سے رانچی تک انھوں نے سفر کیا اور اصرار کیا کہ وہ کارخانے کے چاروں طرف گھوم کر کام دیکھیں گے اور چھوٹا ناگپور کے باشندوں سے ملیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی ایک گز زمین بھی ایسی نہ تھی جسے وہ اپنی نہ سمجھتے ہوں اور اپنے کو اُس کا نہ تصوّر کرتے ہوں۔ جتنے مختلف قسم کے لوگوں سے وہ ملتے تھے اُتنی ہی زیادہ اُنھیں خوشی ہوتی تھی۔ اور اپنے آپ کو وہ اُنھیں میں سے ایک سمجھتے تھے۔

مجھے ۱۹۵۷ء کا ایک واقعہ ابھی تک پوری طرح یاد ہے جب میں پہلی مرتبہ روس گئی تھی۔ وہاں گورکی پارک میں ایک بہت ضعیف خاتون سے میں بات کرنے لگی۔ اُس خاتون نے میرا ہاتھ پکڑا اور اُس کی آنکھوں [سے] آنسو بہنے لگے۔ روتے روتے اُس نے کہا "ہم تم سے پیار کرتے ہیں۔ تم نہرو کے مُلک سے آ رہی ہو جو امن کا علم بردار ہے۔"

تو یہ تھے جواہر لال نہرو، جن کی عظمت کی ساری دُنیا قائل تھی۔ وہ ہندوستان کی جنگِ آزادی ہی کے ایک بڑے رہ نما نہ تھے بلکہ حصولِ آزادی کے بعد انھوں نے اُس آزادی کو مستحکم بنانے، ہندوستان کو خود کفیل بنانے، منصوبہ بندی کرانے اور ہندوستا[ن]

میں جذبۂ اخوت پیدا کرنے میں بیش از بیش حصّہ لیا تھا۔ انھوں نے اقوامِ عالم کی صف میں ہندوستان کو ایک ممتاز درجہ دلایا اور اُن کا شمار ہندوستان ہی نہیں بلکہ ممتاز عالمی رہنماؤں میں ہونے لگا۔ وہ جدید ہندوستان کے معمارِ اعظم اور نا وابستہ ممالک کی تنظیم و تحریک کے اوّلین رہنماؤں میں تھے۔ انھوں نے ہندوستان میں جمہوری نظام ہی نہیں قائم کیا بلکہ اُس کے باشندوں میں جمہوریت کی روح پیدا کر دی۔

کیا ہم اس عظیم المرتبت ہستی کے نقشِ قدم پر چلیں گے؟ کیا ہم اس جلیل القدر انسان کی تقلید کر سکیں گے جس میں ہندوستان کی صدیوں پرانی عظمت جلوہ گر تھی؟ میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ اپنے عہد کی اس عہد ساز اور نادرِ روزگار شخصیت سے مجھے نیاز حاصل تھا۔

●

عالم میں انتخاب — دِلّی

اس کتاب کے پیش لفظ میں پروفیسر سیّد نور الحسن لکھتے ہیں :

"مہیشور دیال صاحب نے "عالم میں انتخاب - دلّی" لکھ کر نہ صرف ان لوگوں کو ممنونِ احسان کیا ہے جنھیں دلّی سے پیار ہے بلکہ ان تمام لوگوں کو بھی زیر بار احسان کیا ہے جنھیں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب پر ناز ہے اور جو قومی یک جہتی کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ مہیشور دیال صاحب کے اس قول سے چاہے پوری طرح کوئی متفق نہ ہو کہ یہ چیزیں دلّی کی دین ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان خصوصیتوں کو بڑھاوا دینے میں جو ہاتھ دلّی کا ہے وہ شاید کسی اور شہر کا نہیں۔"

تیرھویں صدی کی ابتدا میں دہلی ترکوں کی سلطنت کا پایۂ تخت بنا اور ایک کے بعد دوسری جگہ آبادی کے بسنے کے باوجود دہلی کی رونق قائم رہی۔ مہیشور دیال صاحب نے لال کوٹ، کلوکھڑی، تغلق آباد، جہاں پناہ، فیروز آباد، دین پناہ اور پرانا قلعہ، شیر گڑھ اور شاہ جہاں آباد کا ذکر کیا ہے۔ سب سے زیادہ تفصیلی ذکر شاہ جہاں آباد کا ہے۔

لوگ کیسے مکانوں میں رہتے تھے، کیا اُن کے شغل اور مشغلے تھے، پھیری والے کیا آوازیں لگاتے تھے، بچوں کے کھیل کود کیا تھے، کھانا پینا، دسترخوان، پان اور حقہ اور ان سے متعلق کہاوتیں، دلّی کے لوگ گیت، تہذیب اور وضع داری، داستان گوئی، تعلیمی ادارے، فنِ خطاطی، تشبیہیں اور استعارے، میلے اور تہوار غرض کہ ہر وہ چیز جو طرزِ زندگی کی تصویر کھینچتی ہے، مہیشور دیال صاحب نے پیش کی ہے۔

مصنف : مہیشور دیال
صفحات : ۵۱۲
قیمت : ۵۳ روپے

سوانحِ دہلی

بہادر شاہ ظفر کے بیٹے ولی عہد [illegible] کے صاحب زادے مرزا [illegible] تھے [illegible] تخت نشینی کے سات آٹھ سال بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ [illegible] کے سب سے بڑے صاحب زادے مرزا احمد اختر تھے جو اس کتاب کے مصنف ہیں۔ کتاب کی تصنیف کے وقت وہ [illegible] کے [illegible] گھرانے میں مقیم تھے۔ اور آج تک اس خاندان کے لوگ وہاں موجود ہیں۔

سوانحِ دہلی میں اختصار کے ساتھ دہلی کے [illegible] حالات بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب سے پہلے اس موضوع پر دو اہم کتابیں شائع ہو چکی تھیں: سیر المنازل اور سید احمد خاں کی آثار الصنادید [illegible] لیکن اس کتاب کی اہمیت یہ ہے کہ [illegible] کے [illegible] نے یہ کتاب لکھی ہے۔ اس میں کچھ ایسے واقعات اور حقائق بیان کیے گئے ہیں جو کہیں اور اب تک نظر سے نہیں گزرے۔ بعض ایسی معلومات بھی فراہم کی گئی ہیں جن تک آج تک ہماری رسائی نہیں تھی۔

مرزا الٰہی بخش نے بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کرانے میں انگریزوں کی مدد کی تھی۔ ان کے بارے میں مرزا احمد اختر نے معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھا ہے :

"بعد غدر شاہزادہ ہدایت افزائے مرزا الٰہی بخش کے [illegible] روپے ماہوار نسلاً بعد نسل مقرر فرمائے اُن کی جاگیر و املاک برقرار رکھی اعزازِ قدیم مرعی رکھا۔ اُن کے نقصان کے بدلے میں لاکھوں دیے۔ اُن کی اولاد کی بدستور پرورش اور مراعات چلی آتی ہے :"

مصنف : شاہزادہ مرزا احمد اختر گورگانی
مرتب : مرغوب عابدی
صفحات : ۶۴
قیمت : ۱۸ روپے

اُردو اکادمی، دہلی سے طلب کریں

حرفے زلبش شنیدہ ام من

تقسیمِ ہند سے کوئی دس گیارہ برس پہلے کی بات ہے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء نافذ ہو چکا تھا اور اب اس ایکٹ کے تحت ہندوستانی صوبائی اسمبلیوں کے لیے انتخابات ہونا تھے۔ کانگرس اور مسلم لیگ دونوں انتخاب کے میدان میں کود چکی تھیں۔ یہ انتخابات اگرچہ فرقہ وارانہ بنیادوں پر ہو رہے تھے اور مسلم لیگ نے صرف مسلم امیدواروں ہی کو اسمبلیوں کے لیے ٹکٹ دیے تھے لیکن کانگرس نے ہندو مسلم سوال سے بلند ہو کر اپنے امیدوار چنے تھے جن میں ہندو بھی تھے، مسلمان بھی، سکھ اور عیسائی بھی، پارسی بھی اور دوسرے مذاہب کے لوگ بھی۔

اس وقت ہندوستان، جسے ایک دن دنیا کے سب سے بڑے جمہوری ملک کی صورت میں نقشۂ عالم پر نمودار ہونا تھا، پہلی بار جنرل الیکشن کے نام سے آشنا ہو رہا تھا۔ سارا ملک الیکشن کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ ایک دن اخبارات میں خبر آئی ـــ جواہر لال نہرو کانگرس کے امیدواروں کی حمایت میں ہوائی جہاز کے ذریعے سے سارے ملک کا دورہ کریں گے ـــ جواہر لال نہرو کے سارے ملک میں دورہ کرنے کے معنی یہ تھے کہ وہ ہمارے شہر راولپنڈی میں بھی آئیں گے۔ اگرچہ ۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نے ہندوستان کو "صوبائی خود مختاری" نام کا کھلونا دے دیا تھا لیکن دراصل ابھی تک جنگِ آزادی ختم نہیں ہوئی تھی۔ ملک میں انگریز کے خلاف جو جذبہ ۱۹۳۵ء سے قبل تھا وہی ۱۹۳۵ء کے بعد بھی موجود تھا اس لیے اس وقت تک آزادی کی جنگ لڑنے والے تمام رہنماؤں کے لیے اہلِ ہند کے دلوں میں محبت اور عقیدت کا عالم لفظ و بیان سے باہر تھا۔ سیاسی رہنماؤں کے "درشن" اس ذوق و شوق سے ہوتے تھے جیسے یہ کوئی دیوتا ہوں جو آسمان سے اتر کر آئے ہیں اور ان دیوی دیوتاؤں میں مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، ماتا کستوربا گاندھی، ابوالکلام آزاد، سروجنی نائیڈو، سبھاش چندر بوس، شیخ محمد عبد اللہ، ارونا آصف علی، سردار پٹیل، جے پرکاش نرائن اور خان عبد الغفار خاں ایسی شخصیتیں تھیں جن پر اہلِ ملک جان چھڑکتے تھے۔

(پروفیسر) جگن ناتھ آزاد
اے ـ ۲۵، گورنمنٹ کوارٹرس، گاندھی نگر، جموں توی
(جموں و کشمیر) ۱۸۰۰۰۴

میں اس زمانے میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان دے چکا تھا اور بی اے میں داخل ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ سولہ برس کی میری عمر تھی۔ اس عمر میں ہیرو ورشپ کا جذبہ بھی زوروں پر ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر روز میں فقط یہ جاننے کے لیے اخبار بڑی توجہ سے پڑھتا تھا کہ جواہر لال نہرو کب راولپنڈی آرہے ہیں۔ آخر ایک دن ان کی راولپنڈی میں آمد کی اطلاع اخبارات میں آگئی۔ راولپنڈی کی کانگرس کمیٹی نے زور شور سے ان کے استقبال کی تیاری شروع کر دی۔ ہر روز لاؤڈ اسپیکر پر یہ اعلان ہوتا تھا کہ پنڈت جی کا طیارہ فلاں تاریخ کو چک لالہ کے ہوائی اڈے پر اترے گا۔ سب لوگ جوق در جوق چک لالہ پہنچ کر اپنے محبوب رہنما کا استقبال کریں۔

پنڈت جی کا ہوائی جہاز غالباً دوپہر کو چک لالہ کے ہوائی اڈے پر اُترا لیکن راولپنڈی اور مضافات کے گوشے گوشے سے لوگ صبح ساڑھے آٹھ بجے ہی چک لالہ کے ہوائی اڈے پر پہنچنا شروع ہو گئے۔ جس طرف نگاہ جاتی تھی لوگوں کا سیلاب ایک ہی منزل کو رواں تھا ـــ چک لالہ کا ہوائی اڈہ۔

دراصل اُس زمانے میں کسی قومی لیڈر کا ہوائی جہاز سے آنا اپنی جگہ ایک تاریخی واقعہ تھا۔ کیونکہ ملک میں چند ہوائی جہاز تھے جو آسمان میں اڑتے ہوئے کبھی کبھار ہم لوگوں کو نظر آجاتے تھے۔ گویا ہوائی جہاز ایک انتہائی



نادر شے تھی اور ہم ... پنڈت نہرو ہوائی جہاز میں راولپنڈی آرہے تھے۔ اس سے ہم لڑکوں کی حیرت میں اضافہ ہو رہا تھا اور دلچسپی میں بھی ——— اور ساتھ ہی ساتھ ہم تمام طلبا کی نظر میں ہوائی جہاز کا تصور جواہرلال نہرو کی عظمت میں بھی اضافہ کر رہا تھا۔

اور حقیقتاً اُس وقت ہوائی جہاز بھی کیا ہوں گے، ابو کی ڈکوٹا کی طرح کا طیارہ ہوگا یا اس سے بھی کہنہ تر ماڈل جس میں کبھی وائسرائے یا گورنر یا کمانڈر انچیف آ نکلتے ہوں گے۔ اُس وقت ہوائی جہاز کا اور کوئی مصرف ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ ایرفورس نام کی تو ملک میں کوئی شے تھی نہیں۔ اور طیارہ گاہ؟ جیسے طیارے ویسی ہی طیارہ گاہ، جیسی روح ویسے فرشتے۔ اندیشہ یہ تھا کہ نہ جانے وہ جسے ایرپورٹ کہتے ہیں اُس پر یا اُس کے آس پاس اُن ہزاروں افراد کے کھڑے ہونے کی جگہ بھی ہوگی جو راولپنڈی اور اس کے گردونواح سے ہزاروں کی تعداد میں طیارہ گاہ کو رواں دواں ہیں۔ گھر والوں نے روکا کہ اس بھیڑ میں کچلے جانے کا ڈر بھی ہے اس لیے ہم چند لڑکوں نے ایرپورٹ کا رُخ تو نہ کیا لیکن قبل از وقت میونسپل باغ کو روانہ ہوگئے جہاں انتخابی جلسے میں جواہرلال نہرو کو تقریر کرنا تھی۔ (آج اس باغ کو لیاقت باغ کہتے ہیں) وہاں پہنچے تو دیکھا کہ سارا باغ سامعین سے بھر چکا ہے۔ چنانچہ باغ کے باہر بلکہ سڑک سے بھی دور ایک جگہ ہم سب کھڑے ہو گئے تاکہ دور ہی سے سہی اس عظیم شخصیت کی ایک جھلک دیکھ سکیں۔

وہ ڈائس جس پر کھڑے ہو کر پنڈت جی کو تقریر کرنا تھی بہت اُونچا تھا۔ اور ہمیں یقین تھا کہ جب پنڈت جی اس ڈائس پر کھڑے ہو کر تقریر کریں گے تو ہم انھیں بآسانی دیکھ سکیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پنڈت جی ہجوم میں گھرے ہوئے انقلاب زندہ باد، ٹوڈی بچہ ہائے ہائے، مہاتما گاندھی زندہ باد، جواہرلال نہرو زندہ باد کے نعروں میں جلسہ گاہ میں پہنچے اور بجلی کی سرعت سے ڈائس پر چڑھ گئے۔ بہت ہی تیز چلنا ان کی شخصیت کا ایک خاص پہلو تھا۔ یہی بات بعد میں ہم لوگوں نے اندرا جی میں بھی دیکھی۔ ان کے ساتھ پنجاب کے اور لیڈر بھی تھے۔ اِدھر اُدھر لوگ ڈائس کی طرف اشارے کر کے کہہ رہے تھے وہ ڈاکٹر ستیہ پال ہیں، وہ سیف الدین کچلو ہیں، وہ ڈاکٹر گوپی چند بھارگو ہیں، وہ ماسٹر تارا سنگھ ہیں، وہ عطاء اللہ شاہ بخاری ہیں، وہ میاں افتخار الدین ہیں، وہ ملک لعل خاں ہیں۔ یہ سب حضرات پنڈت جی کے ساتھ ڈائس پر بیٹھ گئے اور پنڈت جی نے تقریر شروع کی۔

تقریر کیا تھی ایک شعلۂ جوالہ تھا کہ بھڑک رہا تھا، ایک دریا تھا کہ ٹھاٹھیں مارتا جا رہا تھا۔ اس وقت یہ تقریر چھپی ہوئی، اخبارات اور بعض کتابوں میں مل جائے گی۔ مجھے اس وقت تقریر کا متن یاد بھی کہاں ہے۔ ہاں ایک بات یاد ہے جس کی اہمیت کا اُس وقت مجھے اندازہ نہیں ہوا، بہت بعد میں اس کی قدر و قیمت سے میں آشنا ہوا۔

ڈائس پر دو جھنڈے لہرا رہے تھے ایک کانگریس کا اور ایک کانگریس سوشلسٹ پارٹی کا جو اُس وقت کانگریس ہی کا ایک حصہ تھی۔ کانگریس کا ترنگا جھنڈا اُونچائی میں کم اور سوشلسٹ پارٹی کا سُرخ جھنڈا اُونچائی میں زیادہ تھا۔ پنڈت جی کی تقریر کے آخری الفاظ کچھ اس طرح کے تھے کہ ترنگا جھنڈا ملک کا جھنڈا ہے، راشٹر یہ کا جھنڈا ہے، ساری قوم کا جھنڈا ہے اور سُرخ جھنڈا ایک پارٹی کا جھنڈا ہے اور اگرچہ یہ جھنڈا دنیا بھر کے مزدوروں اور محنت کشوں کی نمائندگی کرتا ہے لیکن ہے پارٹی ہی کا جھنڈا اور اس کا رتبہ ملک اور راشٹر یہ کے جھنڈے سے اُونچا نہیں ہو سکتا۔

یہ پنڈت جی کی پہلی جھلک تھی جو میں نے دور سے دیکھی اور یہی تقریر تھی جو میں نے سنی۔

(۲)

اس کے بعد ۱۹۴۷ء تک پنڈت جی کو دیکھنے یا سننے کا اتفاق نہ ہوا۔ ہاں جب آزادی ملنے والی تھی تو انتقالِ اختیارات سے چند روز قبل ریڈیو سے ان کی تقریر سنی۔ اُس وقت تین تقریریں ہوئیں، ایک پنڈت جی کی دوسری جناح صاحب کی اور تیسری سردار بلدیو سنگھ کی ——— لیکن ۱۹۴۷ء میں جب ہم لوگ لُٹ لٹا کر دہلی آ گئے تو ایک دن اعلان ہوا کہ آج شام کو فلاں وقت رام لیلا گراؤنڈ میں کانگریس کا جلسہ ہوگا جس میں پنڈت جواہرلال نہرو،



مولانا آزاد، سردار پٹیل اور دوسرے قومی لیڈر تقریریں کریں گے۔ میں مزاجاً اس طرح کے سیاسی جلسوں سے دور ہی رہتا ہوں لیکن میں ان دنوں عرش ملسیانی کے گھر میں مقیم تھا۔ جلسے سے تھوڑی دیر قبل پنڈت ہری چند اختر آئے اور ہم دونوں کو اپنے ساتھ جلسہ گاہ میں لے گئے۔

دہلی میں فسادات تو ختم ہو چکے تھے لیکن مُسلم مہاجرین کا ہمایوں کے مقبرے اور دوسرے کیمپوں میں جاکر پناہ لینے کا سلسلہ جاری تھا۔ پنڈت جی نے تو خود فساد زدہ علاقوں میں جاکر اور اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر مسلمانوں کو قتل ہونے سے بچایا تھا اس لیے ان کی تقریر کا ہر لفظ ان کے دل سے نکل رہا تھا۔ وہ اپنی تقریر میں مغربی استعمار پرستوں پر حملے بھی کر رہے تھے، مسلمانوں کی ڈھارس بھی بندھا رہے تھے اور انھیں ہندوستان کو چھوڑ کر نہ جانے کا مشورہ دے رہے تھے۔ شرارت پسند عناصر پر آتشیں تقریر سے کوڑے بھی برسا رہے تھے۔ سب لوگ ہمہ تن گوش ہو کر ان کی تقریر سن رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سننے والوں پر ایک جادو کا عمل ہو گیا ہے۔ کیا مجال جو مجمعے میں کہیں سے بھی کوئی آواز آ رہی ہو۔ اسی عالم میں پنڈت جی نے اپنی تقریر ختم کی اور فوراً ہی کسی دوسری مصروفیت کے پیشِ نظر وہاں سے چلے گئے۔ مولانا آزاد اس جلسے میں تشریف نہیں لائے تھے۔ پنڈت جی کے بعد سردار پٹیل نے تقریر کی۔ تقریر تو ان کی بھی عمدہ تھی، وہ بھی ایک باعمل لیڈر تھے، صرف گفتار کے نہیں کردار کے بھی غازی تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں جموں و کشمیر کا بھی ذکر کیا اور پنڈت جی کی پالیسی سے اختلاف کا اظہار بھی کیا۔ لیکن ایک جملہ انھوں نے ایسا بھی کہا جو خاصا بے محل تھا اور وہ جملہ کچھ اس طرح کا تھا — میں مسلمانوں سے بھی کہوں گا کہ وہ بھی اس ملک کے شہری بن کر رہیں اور ان حرکتوں سے باز آجائیں جن کے وہ اس وقت مرتکب ہو رہے ہیں — گویا انھوں نے 'ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں' کے مصداق ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو ایک ہی صف میں لاکر کھڑا کر دیا۔ پنڈت ہری چند اختر، عرش ملسیانی اور میں ایک طرف کھڑے ہوئے یہ تقریر سُن رہے تھے۔ اختر صاحب نے فوراً ہی ہم دونوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ ہندوستان کے ہوم منسٹر کو اس طرح کی بات کہنا زیب نہیں دیتا۔ انھوں نے یہ بات کہہ کر غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے اور اپنی حدود سے تجاوز کیا ہے۔

تقریر کے اس حصے پر دوسرے دن اخبارات بالخصوص مسلمانوں کے اخبارات میں اختلافی انداز کے تبصرے ہوئے مگر وہ ایسا نفسی نفسی کا دور تھا کہ تبصروں وغیرہ سے کیا ہوتا تھا۔ بڑی بات یہ تھی کہ ہندوستان میں جمہوریت روزِ اوّل سے اپنے قدم جما رہی تھی اور ملک کے ہوم منسٹر کے خلاف یا کسی بھی منسٹر کے خلاف اخبارات کے تبصرے ہماری معمول کی زندگی کا جزو بن رہے تھے اور جمہوریت کے ساتھ ہی ساتھ یہ طرزِ زیست بھی جواہر لال نہرو کی دین تھا۔

(۳)

کچھ مدت کے بعد پبلیکیشنز ڈویژن شعبۂ اردو میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کے طور میرا تقرر ہو گیا۔ جوش ملیح آبادی اس ۔ کے ایڈیٹر یا مدیر تھے اور ہم تین بلکہ ان کے نائب مدیر تھے۔ عرش ملسیانی، ہ چند اختر، بلونت سنگھ اور راقم التحریر۔

اس دور میں یعنی ۴۷ء کے شرو سے ۱۹۵۵ء کے آخر تک جوش صاحب بدولت پنڈت جواہر لال نہرو سے خا ملاقاتیں رہیں۔ اگرچہ ان ملاقاتوں میں میر حیثیت محض ایک سامع کی ہوتی تھی لیک یہ بھی کیا کم ہے کہ دنیا کے اتنے بڑے دانشو کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا رہا

(۴)

اب میں آئندہ سطور میں شاید واقع کی ترتیب برقرار نہ رکھ سکوں اور اس روداد میں ترتیب واقعات کی زیادہ اہمی بھی نہیں۔ زیادہ اہمیت اس بات کی ہے ممکن ہے اس مقالے کے ذریعے سے پنڈت جی کی شخصیت کے بعض ایسے پہلو سامنے آجائیں جو ابھی تک اکثر لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہوں گے۔

جوش صاحب جب بھی جاتے تے انھیں پنڈت جی کے ساتھ ملاقات کے

بہت مل جاتا تھا۔ اور دو ایک بار تو میں نے یہ بھی دیکھا کہ پنڈت جی جوش صاحب کے انتظار میں نیچے پورچ میں موجود ہیں۔

ہاں تو میں پبلیکیشنز ڈویژن کے شعبۂ اردو کا ذکر کر رہا تھا۔ انگریز کے دور میں اس ادارے کا نام یونائٹیڈ پبلیکیشنز تھا اور آزادی کے بعد جب ادارے کو دوبارہ ایک فعال حیثیت دی گئی تو صرف اس کا نام ہی نہیں بدلا گیا بلکہ ایک طرح سے اس کا پُنر جنم ہوا۔ اس ادارے کے تحت اردو کے تین ماہنامے جاری ہوئے۔ ایک تو وہی پرانا 'آج کل' تھا جو شروع سے چلا آرہا تھا۔ دوسرے دو تھے 'بساط عالم' اور 'نونہال'۔ بساط عالم کا نائب مدیر میں تھا اور 'نونہال' کے نائب مدیر تھے بلونت سنگھ۔ جب 'بساطِ عالم' کے پہلے شمارے کی تیاری ہونے لگی تو میں نے جوش صاحب سے کہا کہ یہ ایک نیا جریدہ ہے۔ مناسب ہوگا اگر اس کے لیے پنڈت جواہر لال نہرو کا پیغام ہمیں مل جائے۔ جوش صاحب نے اس تجویز کو پسند کیا اور فوراً ہی انھوں نے پنڈت جی کو خط لکھ دیا۔ اب اس وقت جوش صاحب کا خط یا اس کی نقل تو میرے سامنے نہیں ہے لیکن اس میں ایک جملہ کچھ اس طرح کا تھا کہ اگر آپ نے 'بساطِ عالم' کے لیے پیغام نہ بھیجا تو آپ کے ساتھ میری ایسی جنگ ہوگی جسے دنیا کی کوئی یو۔ این۔ او ختم نہیں کر سکے گی۔ اس خط کے تیسرے دن پنڈت جی کی طرف سے جوش صاحب کو ایک بند لفافہ ملا جس میں مندرجۂ ذیل پیغام ملفوف تھا۔

"کچھ عرصے سے میں نے ارادہ کیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اخباروں اور رسالوں کو پیغام نہ بھیجا کروں۔ ایسے پیغاموں کی جتنی مانگ آتی ہے ان کا جواب دینے میں سارا کام رک سکتا ہے۔ علاوہ اس کے اخباروں اور رسالوں کو رائے دینے سے پہلے ان کا امتحان ہونا چاہیے۔ پہلے سے رائے دینا کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

لیکن میرے پرانے دوست جوش ملیح آبادی نے اتنا اصرار کیا ہے؛ یہاں تک کہ ایک الٹی میٹم دیا ہے لہٰذا میرے لیے بالکل انکار کرنا مشکل ہوگا۔

ظاہر ہے کہ جو رسالہ جوش صاحب نکال رہے ہیں وہ دلچسپ ہوگا اور شاعرانہ ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بہت لوگوں کو نئی دنیا کے خیالات پہنچائے گا۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس کام میں جوش صاحب کو کامیابی ہوگی۔

جواہر لال نہرو

نئی دہلی

۲۸ جون ۱۹۴۸ء"

یہ پیغام 'بساط عالم' کے پہلے شمارے میں جو جولائی ۱۹۴۸ء میں منظر عام پر آیا پنڈت جی کی تصویر کے ساتھ شائع ہوا۔

یہ پیغام ہم لوگوں کو ملا تو سارے پبلیکیشنز ڈویژن میں اس بات کی دھوم مچ گئی کہ پنڈت جی نے جوش صاحب کی فرمائش پر 'بساطِ عالم' کے لیے پیغام بھیجا ہے۔ اور یہ اس لیے بھی بڑی بات تھی کہ پبلیکیشنز ڈویژن کی طرف سے ماہنامے اور دوماہی جریدے تو اور بھی شائع ہو رہے تھے، انگریزی میں بھی اور ہندی میں بھی۔ مثلاً MARCH OF INDIA اور FOREIGN REVIEW (انگریزی) 'آج کل' (ہندی) اور 'بال بھارتی' (ہندی) لیکن یہ شرف تو صرف اردو ہی کے ایک ماہنامے کو حاصل ہوا تھا۔ چونکہ 'بساط عالم' کو مرتب کرنے کی ذمہ داری میری تھی اس لیے یہ پیغام جوش صاحب نے میرے حوالے کر دیا۔ میں نے اسے کاتب کے حوالے کیا کہ اسے خوش خط لکھ دے۔

غالباً اس دوران میں عرشؔ نے جوش صاحب کو یہ مشورہ دیا کہ اس خط کا انگریزی ترجمہ کرکے ڈائرکٹر کو بھیجا جائے اور مجھے اسی روز جوش صاحب کی طرف سے ایک پرچہ موصول ہوا جس پر لکھا تھا:

ترجمہ کر کے حرفِ مہر و وُد کا
بھیج دیجے پیام نہرو کا

چنانچہ میں نے اس کا انگریزی ترجمہ کرکے جوش صاحب کو بھیج دیا۔ جوش صاحب نے یہ ترجمہ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن کو بھیجا ڈائرکٹر نے منسٹری میں بھیجا اور وہاں سے ڈپٹی سکریٹری، جوائنٹ سکریٹری، سکریٹری سے ہوتا ہوا اُس وقت کے وزیر اطلاعات و نشریات تک پہنچا اور منسٹری میں جوش صاحب کا ڈنکا جو پہلے ہی روز سے بج رہا تھا اور زور شور سے بجنے لگا۔

(۵)

اب جوش صاحب ہی کے تعلق سے جواہرلال نہرو کی زندگی کے کچھ واقعات بہ تسلسل یاد آرہے ہیں سوچتا ہوں پہلے انھی کا ذکر کر دوں کیونکہ اب کچھ صورتِ حال ایسی ہے کہ کوئی بات ایک بار حافظے سے نکل جائے تو بعض دفعہ دوبارہ وہ یاد ہی نہیں آتی۔

اسی زمانے میں شیخ محمد عبداللہ مرحوم اور بخشی غلام محمد مرحوم نے ذاتی دلچسپی لے کر سری نگر میں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا۔ اور اس مشاعرے کی صدارت پنڈت جواہرلال نہرو نے کی۔ صدارت سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ وہ محض زینتِ مسند بن کر مشاعرے میں موجود رہے بلکہ نظامت بھی خود انھوں نے کی۔ فہرست ان کے سامنے موجود تھی اور وہ یکے بعد دیگرے ایک ایک شاعر کو زحمتِ کلام دیتے رہے۔ اس مشاعرے میں جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، ساغر نظامی، روش صدیقی، معین احسن جذبی اور راقم التحریر نے شرکت کی۔ ہندی کے مشہور شاعر ہری ونش رائے بچن بھی ان دنوں کشمیر کی سیر کو آئے ہوئے تھے وہ بھی شریکِ مشاعرہ ہوئے۔

مجھے ٹھیک سے یاد نہیں آرہا کہ اس میں کشمیر کے مقامی شعرا مدعو تھے یا نہیں لیکن کچھ خیال ایسا آرہا ہے کہ غلام رسول نازکی اس مشاعرے میں شریک تھے۔

اس مشاعرے میں فراق صاحب پنڈت جی سے قدرے دور بیٹھے تھے اور جب کوئی شاعر کلام پڑھ رہا ہوتا تھا تو فراق صاحب اپنے پاس بیٹھے ہوئے شعرا کے ساتھ یا دوسرے مہمانوں کے ساتھ باتیں شروع کر دیتے تھے۔ پنڈت جی تھوڑی دیر تو یہ منظر برداشت کرتے رہے لیکن دیکھ رہے تھے کہ فراق صاحب کی اس روش سے مشاعرہ خراب ہو رہا ہے۔ کہاں تک گوارا کرتے۔ جب ایک شاعر کلام پڑھ چکا تو پنڈت جی فراق صاحب سے مخاطب ہو کر بولے 'فراق صاحب' آپ کیوں مجھ سے اتنی دور بیٹھے ہیں۔ آئیے یہاں میرے قریب آجائیے۔" فراق صاحب اٹھے اور پنڈت جی کے قریب آکے بیٹھ گئے اور ان کی زبان کو چپ لگ گئی۔

اسی طرح انھوں نے چیمسفورڈ کلب نئی دہلی میں ایک انڈو پاک مشاعرے کی صدارت کی۔ کیا زمانہ تھا اور مشاعروں کے انتظام کا کتنا اونچا معیار ہوتا تھا۔ بالخصوص چیمسفورڈ کلب کے مشاعرے کا انتظام تو ایک طرح سے شنکر پرشاد آئی سی ایس، دیاشنکر آئی سی ایس، جوش ملیح آبادی اور کنور مہندر سنگھ بیدی آئی سی ایس جیسی مہتم بالشان ہستیوں کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ خیر جمہوریت کے شجر کا پہلا پھل تو سیاسی آزادی ہے۔ جس مشاعرے کا میں ذکر کر رہا ہوں اس کے منتظم خاص دہلی جن سنگھ کے لیڈر لالہ یودھراج تھے۔ انھوں نے مشاعرے کے لیے ایک خطیر رقم بھی مشاعرہ کمیٹی کو دی تھی۔ ادھر جن سنگھ کے ورکروں نے فیصلہ کیا کہ پنڈت جواہرلال نہرو نے آج تک کسی ہندی کوی سمیلن کی صدارت تو کی نہیں، اردو مشاعرے کی صدارت کیسے کر سکتے ہیں۔ اور مشاعرہ بھی وہ جس میں پاکستان سے شعرا آئے ہوئے ہیں ہم یہ نہیں ہونے دیں گے اور ہم مظاہرہ کریں گے۔

چنانچہ ادھر مشاعرہ شروع ہوا ادھر کلب کے باہر جن سنگھ کے ورکروں نے مشاعرے کے خلاف نعرے لگانا شروع کیے۔ ادھر سے چند منتظمین اٹھے کہ پولیس سے کہہ کے انھیں رفع دفع کرا دیں لیکن پنڈت جی نے یہ کہہ کے روک دیا کہ نعرے لگانا تو ہر کسی کا حق ہے۔ ایجی ٹیشن کرنے والوں سے یہ جا کے کہہ دیجیے کہ جب شاعر کلام پڑھ رہا ہو تو نعرے نہ لگائیں۔ اور دو شاعروں کے درمیان جو وقفہ ہو اس میں نعرے لگا لیا کریں۔ یہ مشورہ ڈائس پر بیٹھے ہوئے شعرا اور معززین کے لیے خاصی ہنسی کا سامان بن گیا۔

(۶)

مذکورہ بالا مشاعرۂ سری نگر کے سلسلے کی ایک بات میں بھول گیا۔ اس کا ذکر چیمسفورڈ کلب کے مشاعرے سے پہلے ہونا چاہیے تھا۔ خیر سری نگر کا مشاعرہ تو رات کو ہوا۔ اس سے قبل شام کو شیخ صاحب مرحوم نے نیڈوز ہوٹل میں پنڈت جی کے اعزاز میں ایک دعوتِ چائے کا اہتمام کیا۔ اس میں ہم تمام شعرا بھی مدعو تھے۔ ہم جب وہاں پہنچے تو ابھی پنڈت جی نہیں آئے تھے۔ ہم سب



بڑے گرد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ مجھے یقین تھا کہ جب پنڈت جی تشریف لائیں گے تو جوش صاحب سے ملنے اس میز کی طرف ضرور آئیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پنڈت جی جوش صاحب ہی کی خاطر ہماری میز کی طرف آئے۔ شیخ صاحب بھی ان کے ساتھ تھے۔ ہم سب احتراماً اٹھ کے کھڑے ہوئے۔ پنڈت جی نے شیخ محمد عبداللہ سے کہا شیخ صاحب! آپ نے جوش صاحب کے لیے سب انتظام کر دیا ہے یا نہیں۔ شیخ صاحب نے جواب دیا جی ہاں سب انتظام کر دیا گیا ہے۔ اس پر پنڈت جی نے کہا کہ وہ انتظام بھی کر دیا ہے یا میں دہلی سے کرادوں۔ اس پر شیخ صاحب نے قہقہہ لگایا جس کا مفہوم یہ تھا کہ انتظام کر دیا گیا ہے۔

اس ملاقات میں پنڈت جی جوش صاحب ہی سے باتیں کرتے رہے۔ اس صورتِ حال سے ساغر نظامی کو خاصی اُلجھن ہو رہی تھی۔ جوش صاحب نے یہ محسوس کر لیا اور پنڈت جی سے کہا کہ یہ ساغر صاحب ہیں۔ آپ نے شاید انھیں نہیں پہچانا۔ پنڈت جی نے کہا کہ "خوب پہچانا ہے"۔ اس لفظ "خوب" کا بعض شعرا نے خاصا لطف لیا اور جب تک ہم لوگ سری نگر میں رہے نجی محفلوں میں اس جملے کی کہ "خوب پہچانا ہے" گردان ہوتی رہی۔

(۷)

ابھی تھوڑی دیر قبل میں نے فراق صاحب کا ذکر کیا ہے۔ اب فراق صاحب کی پنڈت جی سے ایک ملاقات کی داستان بھی سن لیجیے۔

یوں تو یہ کہانی اپنے پس منظر سمیت کافی طویل ہے اور اس کا ذکر میں تفصیل سے اس مضمون میں کر رہا ہوں جو میں فراق صاحب کے متعلق "مہمانِ عزیز" کے زیرِ عنوان لکھ رہا ہوں لیکن چونکہ تمہید کا تعلق پنڈت جی کی ذات سے نہیں ہے اس لیے میں یہ واقعہ تمہید کے بغیر ہی عرض کرتا ہوں۔

دہلی میں فراق صاحب بالعموم ہمارے ہی غریب خانے پر قیام کیا کرتے تھے اور بعد میں جب میں سری نگر آ گیا تو بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ دو ایک بار ایسا بھی ہوا کہ گھر میں پہلے ہی سے مہمان زیادہ تھے اور میں نے فراق صاحب کے قیام کا انتظام ٹورسٹ ریسپشن سنٹر میں کرا دیا۔ بہرطور جو واقعہ میں سنا رہا ہوں اس کا تعلق دہلی سے ہے۔ فراق صاحب نے الٰہ آباد سے میرے یہاں پہنچتے ہی فرمایا کہ پنڈت جی سے ملاقات کا وقت طے کرا دو۔ کچھ ضروری باتیں اُن سے کرنا ہیں۔

وقتِ ملاقات طے ہو گیا اور جب فراق صاحب اور راقم التحریر تین مورتی ہاؤس پہنچے تو پنڈت جی فراق صاحب کے انتظار میں نیچے برآمدے میں موجود تھے۔ فراق صاحب کے ساتھ وہ بڑے تپاک سے ملے اور انھیں لے کے اوپر کی منزل کی طرف چلے جہاں وہ رہتے تھے اور ملنے والوں سے ملاقات کیا کرتے تھے۔

باتیں شروع ہوئیں۔ میری حیثیت تو محض سامع کی تھی اور میں تو فراق صاحب کے ساتھ تشریف لے گئے تھے۔ پنڈت جی نے خیریت وغیرہ پوچھنے کے بعد فراق صاحب سے پوچھا آپ ابھی یونیورسٹی میں ہیں نا؟

فراق: پنڈت جی اگر یونیورسٹی میں ہوتا تو آپ سے ملنے آتا؟

پنڈت جی: (دلکش مسکراہٹ کے ساتھ) فرمائیے اس سلسلے میں میں کیا خدمت کر سکتا ہوں بلکہ آپ ہی بتائیے آپ کیا کام کرنا پسند کریں گے

فراق: دیکھیے پنڈت جی' کام دام تو میں بہت کر چکا۔ اگر کام ہی کرنا ہوتا تو آپ کے پاس کیوں آتا۔ ہاں کوئی SINE CURE JOB ہو تو مجھے دے دیجیے۔ پنڈت جی اس پر کچھ سوچ میں پڑ گئے اور کہنے لگے اچھا میں مولانا صاحب سے بات کرتا ہوں۔ دہلی یونیورسٹی میں وہ شاید آپ کے لیے چیئر وغیرہ کا انتظام کر سکیں۔

اس پر میں نے کہا کہ اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں۔ پنڈت جی نے فرمایا "کہیے"

میں نے جواب دیا کہ ابھی مولانا صاحب نے جوش صاحب کے لیے دہلی یونیورسٹی میں چیئر قائم کی ہے۔ شاید دو شعرا کے لیے ایک ہی یونیورسٹی میں چیئر قائم کرنا ان کے لیے آسان نہ ہو بالخصوص جب دونوں چیئرز ایک ہی شعبے میں ہوں گی۔

پنڈت جی نے تھوڑی دیر کے لیے اس پر غور کیا اور پھر فرمایا کہ ٹھیک ہے میں اس سلسلے میں سردار پٹیل سے بات



کروں گا (اور راقم التحریر کا یہ خیال ہے کہ فراق صاحب کو چند ہفتوں کے بعد ریڈیو کا پروڈیوسر ایمیرٹس بنایا گیا تو وہ غالباً فراق صاحب کی پنڈت جی سے اسی بات چیت کا نتیجہ تھا)

یہ بات ختم ہوئی تو فراق صاحب کہنے لگے۔

پنڈت جی ایک کام اور بھی ہے۔

انھوں نے کہا "فرمائیے"۔ بولے "میری ڈاک خانے کی پاس بک گم ہو گئی ہے اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ اس میں روپیہ کتنا ہے"۔ مجھے ان کا یہ سوال سن کے حیرت ہوئی کہ اپنی ملازمت کی حد تک تو بات ٹھیک تھی یہ ہندوستان کے وزیراعظم کے ساتھ پاس بک کا کیا بکھیڑا لے بیٹھے ہیں۔

پنڈت جی نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ میں نے جسارت سے کام لیتے ہوئے پنڈت جی سے کہا کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس کام کے لیے میں دوّیا شنکر صاحب سے کہہ سکتا ہوں۔ آپ کیوں زحمت کریں۔ پنڈت جی نے فرمایا کہ ٹھیک ہے آپ ہی کہہ دیں میں بھی انھی سے کہتا۔

اس دوران میں چائے ہم پی چکے تھے وقت بھی پندرہ بیس منٹ سے زیادہ ہی ہو گیا تھا۔ میں نے فراق صاحب کو اجازت لینے کا اشارہ کیا۔ وہ ابھی کچھ دیر اور بیٹھنا چاہتے تھے لیکن وزیراعظم کے سکریٹری اور میرے دوست لال صاحب پہلے ہی مجھ سے کہہ چکے تھے کہ پندرہ منٹ سے زیادہ وقت نہ لینا۔ وہ پنڈت جی کو میرے بارے میں بتا چکے تھے کہ فلاں کے فرزند ہیں، شاعر ہیں، فراق صاحب کے نیازمند ہیں۔ فراق انھی کے وہاں ٹھہرے ہیں۔ پریس انفارمیشن بیورو میں انفارمیشن آفیسر ہیں، وہ بھی فراق صاحب کے ساتھ آئیں گے۔ شاید اس FORMALITY کے بغیر میرا فراق صاحب کے ساتھ تین مورتی ہاؤس میں جانا ممکن ہی نہ ہوتا۔

(۸)

اپنے پریس انفارمیشن بیورو کے زمانے میں مجھے انفارمیشن آفیسر یا ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن آفیسر کے طور پر پنڈت جی کے ساتھ یا دوسرے لفظوں میں وزیراعظم کے ساتھ کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس مدت کا زیادہ حصہ میں انفارمیشن آفیسر اردو کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ کچھ مدت ورکس اینڈ ہاؤسنگ منسٹری میں اور اس سے کچھ زیادہ مدت ہوم منسٹری میں۔ اور ہوم منسٹری کے بعد جب میں ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن آفیسر کے طور پر واپس پریس انفارمیشن بیورو میں آیا تو ٹیکنیکل سروسز کا کام میرے سپرد ہوا یعنی فوٹو ڈویژن اور اسی نوعیت کے دوسرے کام۔ اور یا پھر میں باہر سے آئے ہوئے مہمانانِ گرامی قدر کے دورانِ سفرِ ہند میں ان کے ساتھ رہا۔ مثلاً شاہ افغانستان اور شاہ ایران کے ساتھ دو بار ہندوستان کے طول و عرض میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا اور شاہ اردن کے ساتھ ایک بار۔ اس لیے پریس انفارمیشن بیورو میں مجھے پنڈت جی کو وزیراعظم کے طور پر کام کرتے دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا لیکن میرے جن رفقا کو یہ موقع ملا ان میں اکثر ان کے متعلق جب کوئی بات سناتے تھے تو میں وہ غور سے سنتا تھا۔ مثلاً اندر پرتاپ تیواری جب پنڈت جی کے ساتھ اندرون ملک کے ایک سفر کے بعد واپس آئے تو میں نے ان سے پوچھا کہ پنڈت جی کی عادات و اطوار کے بارے میں کچھ بتائیے تو انھوں نے کہا کہ رات کو جب کھانے کا وقت ہوتا تھا تو وہ جونیر افسروں کے بارے میں بلاناغہ پوچھا کرتے تھے کہ فلاں فلاں نے کھانا کھالیا یا نہیں اور جب انھیں اطمینان ہو جاتا تھا کہ ڈرائیور سمیت سب نے کھانا کھالیا ہے تو وہ اپنے ڈنر کے لیے بیٹھتے تھے۔

ایک دفعہ میرے یہ پوچھنے پر کہ پنڈت جی کی اتنی عمدہ صحت کا راز کیا ہے مجھے اپنے رفیق کار بلراج باؤری نے یہ بتایا کہ پنڈت جی ابلی ہوئی سبزیاں اور ابلا ہوا گوشت استعمال کرتے ہیں اور شکر کا استعمال نہیں کرتے۔ میں نے یقین کر لیا اور میں نے بھی ابلی ہوئی سبزیاں اور گوشت استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اور شکر کا استعمال ترک کر دیا۔ لیکن میں چند روز میں بیمار ہو گیا اور جب علاج کے لیے ڈاکٹر کے پاس گیا تو اس نے دوبارہ شکر کا نارمل استعمال شروع کر دینے کی ہدایت دی۔ چند روز بعد میں ٹھیک ہو گیا۔ بات آئی گئی ہو گئی

لیکن اس کے کچھ دن بعد ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس سے مجھے یہ پتا چلا کہ باورچی نے گپ ہانکی تھی اور اس بات کا کہ پنڈت جی مرغن کھانے یا شکر کا استعمال نہیں کرتے حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا.

ڈاکٹر سید محمود مرحوم مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ ان کی دخترِ نیک اختر کی شادی تھی. مجھے بھی انھوں نے اس تقریب میں مدعو کیا اور ہوا یوں کہ کھانے کے وقت مجھے اسی میز پر جگہ ملی جس پر پنڈت جی تشریف فرما تھے بلکہ میں ان کے بالکل سامنے ہی بیٹھا تھا. انھوں نے بلا تکلف مرغِ مسلّم کا ایک چھوٹا سا حصّہ بھی لیا۔ کباب اور ذرا سا قورمہ وغیرہ بھی اور اس کے بعد میٹھا بھی. تو گویا باورچی نے بالکل گپ اڑائی تھی کہ وہ پرہیزی کھانا کھاتے ہیں۔

یہ کھانا DEVICOES کے مالک ـــــ نواب صاحب کی نگرانی میں جو اس فن کے ماہر تھے تیار ہوا تھا. نواب صاحب سے میرے دوستانہ مراسم تھے لیکن اب ان کا اسم گرامی میں بھول گیا ہوں۔ یہ DEVICOES ہوٹل بعد میں STANDARD کے نام سے چلتا رہا۔ اب بھی شاید STANDARD ہی کے نام سے چل رہا ہو۔ ریگل سینما سے ملحقہ۔

اس دعوت میں پنڈت جی کے بائیں طرف کوئی قومی نیتا تشریف فرما تھے. میں ان سے واقف نہیں تھا۔ انھوں نے جھٹ ایک مرغِ مسلّم اٹھایا۔ اسے اپنی پلیٹ میں رکھا اور چھری لے کر اس پر حملہ آور ہوئے. پنڈت جی نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا "اتنی تیزی نہ دکھاؤ' یہ اُڑ نہیں جائے گا" معلوم نہیں وہ صاحب یہ تادیبی جملہ سن کے جھینپے یا نہیں لیکن ساتھ بیٹھے ہوئے دوسرے سب لوگوں نے پنڈت جی کے اس جملے کا خوب لطف اٹھایا۔

اس دعوت میں صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد بھی تشریف لائے تھے. وہ ویجٹیرین تھے۔ ان کے کھانے کا انتظام کسی اور میز پر تھا۔ شروع میں پروٹوکول کے مطابق پہلے راشٹرپتی تشریف لائے ان کے تھوڑی دیر بعد وزیر اعظم۔ ان دونوں کو یکے بعد دیگرے ایک شامیانے میں لے جایا گیا جہاں شادی کی رسومات ادا ہو رہی تھیں۔ میں اس شامیانے سے دور تھا اس لیے شادی کی رسوم تو نہ دیکھ سکا لیکن بعد میں ہم لوگوں کو پتا چلا کہ نکاح نامے پر ڈاکٹر راجندر پرشاد اور پنڈت جواہر لال نہرو دونوں نے دستخط کیے ہیں۔ معلوم نہیں یہ بات صحیح تھی یا ویسے ہی کسی نے وہاں اڑا دی تھی۔

(۹)

یہ مقالہ بربنائے مصروفیت مختلف قسطوں میں لکھا جا رہا ہے اس لیے تین مورتی کے واقعات کو میں ایک جگہ جمع نہیں کر سکا ہوں۔ مخمور سعیدی صاحب کا حکم ہے کہ مقالہ انھیں جلد درکار ہے۔ اس لیے اب عبارت کو آگے پیچھے کرنے میں اندیشہ یہ ہے کہ سارا کام جہاں ہے وہیں نہ رہ جائے.

تین مورتی کی دو ایک ملاقاتوں کا ذکر میں اُوپر کر چکا ہوں. ایک دفعہ کا ذکر ہے ساہتیہ اکیڈمی کا سالانہ جلسہ تھا. اس کے بعد ساہتیہ اکیڈمی نے سپرو ہاؤس میں ادیبوں اور شاعروں کا ایک جلسہ منعقد کیا اس میں جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری ایسے جلیل القدر شعرا اور دوسرے اہلِ قلم حضرات صفِ سامعین میں موجود تھے. سامنے ڈائس پر پنڈت جواہر لال نہرو اور ابوالکلام آزاد تشریف فرما تھے. غالباً صدارت ابوالکلام آزاد کر رہے تھے. تقریر صرف جواہر لال نہرو کی تھی. پنڈت جی نے پہلے اردو میں تقریر کی اس کے بعد انگریزی میں. دونوں کا موضوع معمولی سے فرق کے ساتھ قریب قریب ایک ہی تھا لیکن بعض باتیں اُردو تقریر میں نہیں تھیں اور بعض انگریزی تقریر میں نہیں تھیں. مثلاً ایک بات جو انھوں نے اردو والی تقریر میں بڑے مسرت بھرے انداز میں کہی' یہ تھی کہ ایک وقت تھا میں بھی آپ ہی کی برادری کا ایک فرد تھا۔ میں لکھتا تھا اور ذوق و شوق سے لکھتا تھا. لیکن اس بات کو اب زمانہ ہو گیا ہے۔ اب تو مجھے لکھنے پڑھنے کی فرصت ہی نہیں ملتی[1]. سیاست سے

---

[1] یہ ترجیحات کی بات ہے. ظاہر ہے کہ کسی بھی ملک کا وزیراعظم سو فیصد ایک ادیب کی زندگی تو بسر نہیں کر سکتا. لیکن ان کے قریبی احباب اور تین مورتی ہاؤس کے افسروں کی زبانی ہمیں یہ اکثر معلوم ہوتا رہتا تھا کہ پنڈت جی رات کو سونے سے قبل دو' تین یا چار گھنٹے مطالعے میں صرف کرتے ہیں۔ (ج۔ ن۔ ا)

اور سرکاری نوعیت کے کام۔ مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ میری زندگی کا ڈھانچہ بدل گیا ہے[۲]

جوش صاحب صفِ سامعین میں موجود تھے۔ انھوں نے کھڑے ہوئے پنڈت جی کو اس فقرے پر ٹوکا اور کہا آپ نے اور مولانا آزاد نے خود ہی اپنے لیے غلط راستے کا انتخاب کیا۔ آپ کو خدا نے علم و ادب میں اضافہ کرنے کے لیے پیدا کیا تھا۔ آپ نے خود ہی وزارتوں کا بوجھ اپنے اوپر لے لیا ہے۔ خود کردہ را علاجے نیست۔ صرف یہی نہیں کہ آپ ہماری برادری کے افراد تھے بلکہ آپ اپنی جن وردیوں کو اتار کر پھینک چکے ہیں وہ ابھی تک ہمارے پاس رکھی ہیں اور علم و ادب کے ساتھ آپ کی وفاداریوں کی داستان سنا رہی ہیں۔[۳]

جوش صاحب کی اس "مداخلت" نے سارے ہال میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی اور ہال قہقہوں اور تالیوں سے گونج اٹھا اور مزے کی بات یہ ہے کہ ان قہقہوں میں پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد دونوں شریک تھے۔

دوسری شام کو پنڈت جی نے اپنے گھر یعنی تین مورتی ہاؤس میں ہم شاعروں اور ادیبوں کو چائے کی دعوت دی۔ اس روز فیض صاحب بھی دہلی میں تھے۔ وہ بھی اس چائے میں مدعو تھے۔ INFORMAL قسم کی چائے تھی۔ تین مورتی ہاؤس کے پیچھے کے لان میں سب چل پھر کے چائے پی رہے تھے۔ اُس زمانے میں ڈاکٹر رادھا کرشنن صدر جمہوریۂ ہند تھے۔ لان میں تین چار کرسیاں رکھی تھیں۔ پنڈت جی نے خود فیض صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کی۔ فیض نے جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وہ نظم سنائی تھی جس میں ایک مصرع شاید اس طرح کا آتا ہے:

اب تخت گرائے جائیں گے اب تاج اچھالے جائیں گے

اب ماحول ہی ایسا تھا کہ صدرِ جمہوریہ، وزیر اعظم اور بعض دوسرے وزرا کی موجودگی نے غیر رسمی چائے کو بھی رسمی بنائے رکھا۔ فیض صاحب کی نظم ختم بھی ہو گئی، نہ کہیں سے آہ اٹھی نہ واہ، نہ داد نہ فریاد جیسے قبرستان میں اذان دے رہے ہوں۔

لیکن پنڈت جی اپنے گھر کی نشستوں میں اپنے بعض پسندیدہ اشعار پر کسی نہ کسی طرح سے پسندیدگی کا اظہار کر ہی دیا کرتے تھے۔ واہ واہ بھی کر دیتے تھے لیکن وہاں نہ جانے کیا بات تھی وہ بھی خاموش رہے اور دوسرے سارے سامعین بھی۔ اس وقت مجھے ان کے گھر کی ایک اور نشست یاد آ رہی ہے نشست تو یہ بھی گھر ہی کی تھی لیکن اس میں اور اس میں فرق یہ تھا کہ یہ ایک بہت بڑے لان میں دعوتِ چائے تھی۔ کوئی دو سو کے قریب مہمان ہوں گے جس نشست کا میں اب ذکر کر رہا ہوں وہ اوپر کی اس منزل میں منعقد ہوئی جس میں وہ فراق صاحب کو لے گئے تھے یعنی جہاں وہ خود رہتے تھے۔ یہ فرشی نشست تھی۔ قالین کے اوپر سفید چادر بچھی تھی۔ تکیے لگے تھے اور وہ صحیح معنوں میں اُردو شعر و سخن کی ایک نشست معلوم ہو رہی تھی۔ اب مجھے پوری طرح یاد نہیں کہ کون کون سے شعرا اس نشست میں موجود تھے۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ ہندوستان کے شعرا میں جوش تھے، فراق تھے، مجروح تھے، ساغر تھے، راقم التحریر تھا۔ پاکستانی شعرا میں حفیظ جالندھری تھے، عبدالمجید سالک تھے اور سید محمد جعفری تھے۔ مہمانوں میں دہلی کے چیف کمشنر شنکر پرشاد صاحب تھے۔ افرادِ خانہ میں اندرا جی تھیں اور نہرو فیملی کی چند خواتین تھیں۔ باقی حضرات یاد نہیں آ رہے۔ شاید اور شعرا بھی ہوں، پوری طرح سے یاد نہیں آ رہا ہے۔ پہلے ہندوستانی شعرا نے اپنا کلام سنایا۔ اس کے بعد پاکستانی شعرا نے۔ پاکستانی شعرا میں سب سے پہلے سید محمد جعفری مرحوم نے اپنی نظم پڑھی ـــ اور پس منظر اس نظم کا یہ تھا کہ کچھ مدت پہلے پاکستان میں جنرل محمد ایوب خاں برسرِ اقتدار آئے تھے۔ گویا جمہوریت کے بعد آمریت کا دور آیا تھا۔ جنرل ایوب خاں نے آتے ہی ملک کی اصلاحات کی طرف توجہ کی۔ رشوت ستانی اور اسمگلنگ کے خلاف حکومت کی ساری مشینری حرکت میں آ گئی تھی اور شروع شروع میں ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ حکومت جمہوری حکومت سے کہیں بہتر ہے۔ اسمگلروں نے سمندر کی تہہ کے نیچے سونا چھپا رکھا تھا، نئی حکومت نے

۲، ۳۔ پنڈت جی اور جوش صاحب کے صحیح الفاظ تو اب میرے حافظے میں نہیں ہیں لیکن مفہوم ان کا یہی تھا (ج۔ ن۔ ا)

وہ سونا ڈھونڈ نکالا اور اسے ضبط کرلیا۔ سید محمد جعفری کی نظم میں ایک مصرع کچھ اس طرح کا بھی تھا۔

بھری کی تہ میں جو سونا تھا نکلوا یا گیا

یا شاید اس مفہوم کا اس سے بہتر مصرع تھا۔ ساری نظم بحیثیت مجموعی بہت عمدہ تھی لیکن پنڈت جی ایک مصرعے پر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا دوسرے شعرا یا سامعین حضرات نے بھی اس نظم پر داد نہ دی حالانکہ اس سے پہلے شعرا کو داد مل رہی تھی سامعین کی طرف سے بھی اور پنڈت جی کی طرف سے بھی۔ بعد میں حفیظ صاحب نے اپنی غزل پڑھی تو اس میں اس شعر پر خاصی تعداد ملی:

برہمن نالۂ ناقوس مسجد تک بھی پہنچا دے
عجب کیا ہے مؤذن خواب سے بیدار ہو جائے

قبلہ سالک صاحب کے کلام پر محفل ختم ہوئی، چائے آئی۔ اندرا جی ایک ایک مہمان کی دیکھ بھال کررہی تھیں لیکن اس کے باوجود پنڈت جی خود بھی تواضع کر رہے تھے۔ اگرچہ شعرا کے دل میں یہ خلش ایک سوال بن کر موجود تھی کہ سید محمد جعفری کی نظم پر سناٹا کیوں چھا گیا لیکن اس موضوع پر وہاں کوئی بات نہ ہوئی اور ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ دو ڈھائی گھنٹے کی محفل کے بعد ہم سب لوگ اجازت طلب ہوئے اور تین مورتی ہاؤس کی گاڑیوں میں اپنے اپنے گھروں کو واپس پہنچے۔

دوسرے دن حسب معمول جوش صاحب کے کمرے میں جب محفل جمی تو پنڈت جی کے گھر کی نشست بات چیت کا موضوع بنی۔ عرش نے سوال کیا کہ جوش صاحب جعفری کی نظم پر پنڈت جی کیوں خاموش رہے حالانکہ ہر اعتبار سے وہاں نشست کا ماحول تھا۔ جوش صاحب نے کہا بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ اس پر جوش صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے اور کہنے لگے آپ کا کیا خیال ہے۔ میں نے کہا کہ اس کا ایک سبب میرے ذہن میں آرہا ہے اور وہ یہ کہ جنرل محمد ایوب خاں جمہوری حکومت کو ختم کرکے فوجی آمریت کی حکومت کو برسراقتدار لائے ہیں۔ اور یہ نظم اس آمریت کی برسراقتدار حکومت کی تعریف میں تھی گویا دوسرے لفظوں میں جمہوریت کے خلاف تھی۔ جوش میرے اس خیال سے متفق تھے لیکن عرش نے کہا کہ نہیں یہ سبب نہیں ہو سکتا کیونکہ نظم میں جنرل محمد ایوب خاں کے ان اقدامات کی تعریف کی گئی تھی جو انھوں نے چور بازاری، اسمگلنگ اور رشوت ستانی کے خلاف کیے تھے۔ گویا نظم میں اچھے اقدامات کی تعریف تھی۔

(۱۰)

اب جوش صاحب کی ایک نظم "ماتم آزادی" کا قصہ سنیے۔ دراصل یہ قصہ بلکہ یہ واقعہ اگر آپ کنور مہندر سنگھ بیدی کی زبانی سنیں تو صورت حال اور زیادہ وضاحت کے ساتھ سامنے آجائے گی کیونکہ میں نے بھی یہ واقعہ کنور صاحب ہی کی زبانی سنا ہے۔ گویا میرے لیے یہ واقعہ شنیدہ کی حیثیت رکھتا ہے، دیدہ کی نہیں۔ لیکن کنور صاحب کے لیے یہ محض دیدہ ہی کی نہیں آزمودہ کی بھی حیثیت رکھتا ہے۔

جشن جمہوریت کا مشاعرہ تھا۔ لال قلعہ میں، پنڈت جواہر لال نہرو صدارت فرمارہے تھے، کنور صاحب نظامت کررہے تھے۔ جوش نے اس میں اپنی نظم 'ماتم آزادی' پڑھ ڈالی جس میں اس طرح کے اشعار نظر آتے ہیں۔

کھدر پہن پہن کے بد اطوار آگئے
در بر سفید پوش سیہ کار آگئے

چلنے لگی لغت پہ چھری انتقام کی
چھانٹی گئیں تمام جو لفظیں تھیں کام کی
رحمٰن ہی کی بات چلی اور نہ رام کی
گدی سے کھینچ لی گئی جو زباں تھی عوام کی
حیوان بوکھلا گئے، منہ کھولنے لگے
انسان بولیاں وہ نئی بولنے لگے

وہ جو تمام راہزنوں کا امام ہے
وہ شخص آج خضر علیہ السلام ہے

کل جن کی ڈپٹیوں کا نشانہ تھے رہنما
ان ڈپٹیوں کو ہم نے کلکٹر بنا دیا

حکام مجرموں کے ہیں دامن سیے ہوئے
سی آئی ڈی ہے بادۂ غفلت پیے ہوئے
داروغہ جی ہیں قول بدوں کو دیے ہوئے
چوروں سے کوتوال ہے سازش کیے ہوئے

برٹش کے خادموں کو اچھالے ہوئے ہیں ہم
سانپوں کو آستین میں پالے ہوئے ہیں ہم

برطانیہ کے خاص غلامانِ خانہ زاد
دیتے تھے لاٹھیوں سے جو حُبِّ وطن کی داد
جن کی ہر ایک ضرب ہے اب تک سروں کو یاد
وہ آئی سی ایس اب بھی ہیں خوش وقت و بامراد
شیطان ایک رات میں انسان بن گئے
جتنے نمک حرام تھے کپتان بن گئے

وحشت روا، عناد روا، دشمنی روا
ہلچل روا، غرور روا، سنسنی روا
رشوت روا، فساد روا، رہزنی روا
انسان کا لہو تو پیو اذنِ عام ہے
انگور کی شراب کا پینا حرام ہے

اور آخری بند اس طویل مسدّس کا یہ تھا:

وہ تازہ انقلاب ہوا آگ پر سوار
وہ سنسنائی آنچ وہ اڑنے لگے شرار
وہ گم ہوئے پہاڑ، وہ غلطاں ہوا غبار
اے بے خبرو آگ لگی آگ، ہوشیار
بڑھتا ہوا، فضا پہ قدم مارتا ہوا
بھونچال آ رہا ہے وہ پھنکارتا ہوا

یہ تصویر اب یوں بنتی ہے کہ جشنِ جمہوریت کا مشاعرہ ہو رہا ہے، وہ بھی لال قلعے میں، ہندوستان کا وزیر اعظم اس کی صدارت کر رہا ہے۔ دہلی کا سٹی مجسٹریٹ اس مشاعرے کی نظامت پر مامور ہے اور جوش صاحب کہہ رہے ہیں۔

کھدّر پہن پہن کے بد اطوار آ گئے
در پر سفید پوش سیہ کار آ گئے

اب جوش صاحب جب ٹھاٹھیں ملاتے ہوئے دریا کی طرح نظم پڑھنے میں معروف ہیں مجمع بے اختیار ہو کر ایک ایک شعر بلکہ ایک ایک مصرعے پر بے تحاشا داد دے رہا ہے۔ خود جواہر لال نہرو بڑے اشتیاق سے یہ نظم سن رہے ہیں تو کنور صاحب انھیں روکیں بھی تو کیسے۔ لیکن انھیں یہ تو محسوس ہو رہا ہو گا کہ نظم غلط مقام پر پڑھی جا رہی ہے — ہر سخن نکتہ و ہر نکتہ مقامے دارد لیکن جوش صاحب ان باتوں کی کہاں پروا کرتے تھے۔ قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس وقت ایک ذمہ دار سٹی مجسٹریٹ کے دل کی کیا حالت ہو رہی ہو گی۔ بہر طور نظم ختم ہوئی اور جوش صاحب چونکہ اس مشاعرے کے آخری شاعر تھے، مشاعرہ ختم ہوا۔

دوسری صبح کنور صاحب نے جوش صاحب سے دوستانہ شکوہ کیا اور از راہِ مزاح یہ کہا کہ جوش صاحب آپ کو تو کوئی کچھ نہیں کہے گا لیکن اب میری چھٹی ہو جائے گی۔ بہر طور دونوں میں ہنسی مذاق کی باتیں چلتی رہیں کہ اسی دن یا دوسرے دن پنڈت جی کی طرف سے جوش صاحب اور کنور صاحب کے نام فرمائش آئی کہ آپ دونوں حضرات میرے یہاں تشریف لائیے۔ جوش صاحب کے نام پیغام میں یہ بات بھی تھی کہ آپ نے لال قلعے کے مشاعرے میں جو نظم پڑھی تھی وہ بھی ساتھ لائیں۔

کنور صاحب کہتے ہیں کہ اب تو بڑی حد تک یقین ہو گیا کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے لیکن جب دونوں تین مورتی ہاؤس میں پہنچے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ محفل سجی ہے۔ پنڈت جی کے علاوہ اندرا جی اور نہرو خاندان کے بعض اور اراکین اور پنڈت جی کے بعض قریبی احباب وہاں جمع ہیں اور جوش صاحب کا انتظار ہو رہا ہے۔

پنڈت جی نے دونوں کو عزت سے بٹھایا اور جوش صاحب سے فرمائش کی کہ نظم "ماتمِ آزادی" ارشاد فرمائیں کیونکہ یہ تمام حضرات جو کل رات کے مشاعرے میں نہیں تھے نظم سننے کے آرزو مند ہیں۔ چنانچہ جوش صاحب نے داد و تحسین کے شور میں وہ نظم پھر وہاں سنائی۔

کنور صاحب بیان کرتے ہیں کہ یہ نقشہ دیکھ کے میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اندیشہ تو یہ تھا کہ شاید باز پرس ہو گی کہ جشنِ جمہوریۂ ہند کے مشاعرے میں یہ نظم پڑھنے کا کیا تک تھا لیکن وہاں تو نقشہ ہی اور تھا۔

یہ تھے ہندوستان کے وزیر اعظم جو شعر و ادب کی قدر کرنا بھی جانتے تھے، تہذیب و تمدن کے مفہوم و اسرار سے بھی آگاہ تھے اور شاعری کے مزاج سے بھی آشنا تھے اور اس راز سے بھی کہ بلند پایہ اصلاحی شاعری اگر طنز و مزاح کا پہلو لیے ہوئے ہو تو وہ کتنی موثر ہو جاتی ہے۔

(۱۱)

اس تحریر میں جوش صاحب اور فراق



صاحب کی ملاقاتوں نے بہت جگہ گھیر لی ___ لذیذ بود حکایت دراز ترگفتم ___ اور دو ایک ایسی اہم باتیں رہ گئیں جو جواہر لال نہرو کے نظریۂ زبان اور نظریۂ تعلیم پر روشنی ڈالتی ہیں۔

تعلیم اور بالخصوص بچّوں کی تعلیم کے متعلق ان کا زاویۂ نگاہ ان کی ایک ___ ذرا سی بات سے میرے سامنے آیا۔ جب والد محترم کی بچّوں کے لیے دو کتابیں "بہار طفلی" اور "بچّوں کی نظمیں" شائع ہوئیں تو میں نے ان سے کہا کہ یہ دونوں کتابیں آپ پنڈت جی کو پیش کیجیے۔ چنانچہ پنڈت جی سے وقتِ ملاقات اور مقامِ ملاقات دونوں طے ہو گئے۔ مقامِ ملاقات ان کا دفتر تھا۔ سیکریٹریٹ میں نارتھ بلاک۔ والد محترم اور میں، ہم دونوں وقت ملاقات پر پہنچے۔ ذرا سی بات چیت کے بعد والد محترم نے کتابیں پیش کیں۔ پنڈت جی بلا مبالغہ کوئی دس منٹ تک دونوں کتابوں کی ورق گردانی کرتے رہے۔ متن کے بعد دیباچوں کے صفحات پر نظر ڈالی اور کہنے لگے محروم صاحب، کتابیں بچّوں کے لیے ہیں لیکن شروع کے صفحات کی کتابت بہت باریک قلم سے کی گئی ہے۔ والد صاحب نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس کی کتابت طباعت کا سارا کام آزاد کی نگرانی میں ہوا ہے۔ خود میں نے اس بات کا خیال نہیں کیا۔ میں نے جواب میں یہ عرض کیا کہ نظموں کی کتابت تو جلی قلم سے ہے کہ یہ بچّوں کے لیے ہیں۔ ہاں دیباچوں کی کتابت خفی قلم سے ہے کیونکہ دونوں کتابوں کے دیباچے بچّوں کے لیے نہیں ہیں بلکہ اساتذہ کے لیے ہیں۔ فرمانے لگے یہ بات صحیح ہے لیکن ہو سکتا ہے کوئی دانشمند لڑکا ایک نظر دیباچے پر بھی ڈالنا چاہے لیکن وہ دیباچے کو اس قدر باریک قلم سے لکھا ہوا دیکھ کر ان صفحات سے بیزار ہو جائے گا۔ ہونا چاہیے کہ بچوں کی کتاب اوّل سے آخر تک ظاہری دلکشی سے بھی معمور ہو۔ ان کتابوں کا حصّۂ نظم خوبصورت اور دلکش انداز سے چھپا ہے لیکن دیباچے والے حصے میں وہ بات نہیں۔

میں بچوں کی کتابوں کے متعلق ان کے یہ الفاظ سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔

جب ہم چلنے لگے تو حسبِ معمول پنڈت جی اٹھے اور والد صاحب کے ساتھ دروازے تک چلنے لگے تو والد نے بہت روکا اور کہا کہ آپ تشریف رکھیے لیکن انھوں نے کہا "تا حدِ باب" اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنے چیمبر کے دروازے تک انھیں پہنچانے آئے۔ اُن کی زبان سے "تا حدِ باب" سن کر مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ "اردو" کو وہ محض ایک زبان نہیں بلکہ تہذیب اور کلچر سمجھتے ہیں۔

۱۹۶۲ء کی بات ہے پریس انفارمیشن بیورو کی جانب سے نئی دہلی کے وگیان بھون میں ایک "اردو نمائش" منعقد ہوئی۔ اس اردو نمائش کی تفصیل بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ جن حضرات نے یہ نمائش وگیان بھون میں دیکھی ہے وہ اس کی قدر و قیمت سے آگاہ ہوں گے۔ اس کا افتتاح پنڈت جواہر لال نہرو ہی نے کیا تھا

انھوں نے اپنی افتتاحی تقریر میں اہل قلم حضرات کو یہ تلقین کی کہ ادیبوں اور شاعروں کی زبان عوام کی زبان کے قریب ہونا چاہیے اور اس سلسلے میں انھوں نے رابندرناتھ ٹیگور کی مثال دی۔ افتتاحی تقریر جب ختم ہوئی تو میں طے شدہ پروگرام کے مطابق انھیں نمائش گاہ کا ایک ایک پینل دکھانے لے گیا۔ جب وہ "الہلال" اور "البلاغ" کے پینل کے سامنے پہنچے تو کافی دیر تک ان کے BLOWUPS کو دیکھتے رہے۔ اس دوران میں ان سے میں نے کہا کہ آپ نے فرمایا ہے ادیبوں اور شاعروں کی زبان عوام کی زبان کے قریب ہونا چاہیے لیکن مولانا کی زبان تو ایسی نہیں تھی اور علمی اور ادبی دنیا میں انھیں ایک قابلِ رشک مقام حاصل ہے۔ فرمانے لگے میں نے اُس ادب کی بات نہیں کی جو اس وقت تک ___ اردو میں پیدا ہو چکا ہے۔ میں نے آپ لوگوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ آپ آج کے حالات کی نبض پر انگلی رکھیں اور ایسی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کریں جسے ہندوستان کے عوام اپنی زبان سمجھیں۔

(۱۲)

دہلی میں ۱۹۵۵ء کے بعد ایک مدت تک میرا قیام موتی باغ میں رہا۔ اور روزانہ گھر سے دفتر یعنی آکاش وانی بھون یا شاستری بھون جاتے ہوئے تین مورتی ہاؤس کے آگے سے گزرنا ہوتا تھا۔



۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کا دن تھا ہم چار دوست اور رفقائے کار یعنی اندر پرتاپ تیواری (جن کا ذکر اس مقالے میں پہلے آ چکا ہے) امیش تیواری اور مدن گوپال (پریم چند قلم کا مزدور کے مصنف) امیش تیواری کی گاڑی میں گھر سے دفتر جا رہے تھے۔ ہم چاروں دوست موتی باغ میں رہتے تھے اور پریس انفارمیشن بیورو میں کام کرتے تھے۔ ابھی ہم نے تین مورتی سے ہو کے راشٹرپتی بھون والی سڑک کا رخ کیا ہی تھا کہ سامنے سے دو ایمبولینس کاریں جن میں چند نرسیں اور ڈاکٹر سوار تھے ہمارے پاس سے گزریں اور تین مورتی ہاؤس میں داخل ہو گئیں۔ ہم میں سے کسی نے کہا کہ یہاں تین مورتی ہاؤس مین کوئی بیمار ہو گیا ہو گا۔ یہ ڈاکٹر اور نرسیں اسی لیے جا رہی ہیں۔ دوسرے نے کہا ہاں حکومت کا کوئی اہم مہمان یہاں ٹھہرا ہوا ہو گا۔ ہم میں سے کسی کو یہ خیال نہیں آیا کہ ہو سکتا ہے پنڈت جی ہی بیمار ہو گئے ہوں۔ کوئی دو تین منٹ میں ہم اپنے دفتر میں پہنچ گئے۔ وہاں کسی کو اس بات کی خبر نہیں تھی کہ تین مورتی ہاؤس میں کوئی بیمار ہو گیا ہے اور دو ایمبولینس کاریں ڈاکٹروں اور نرسوں کو لے کر وہاں پہنچ چکی ہیں ـــ تھوڑی دیر میں بیورو میں اطلاع ملی کہ پنڈت جی کی طبیعت خراب ہے اور کوئی ایک آدھ گھنٹے میں یہ خبر آ گئی کہ وہ ہمیشہ کے لیے اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے ہیں۔

اللہ تیری ذات بڑی بے نیاز ہے!

ہم لوگوں پر تو گویا بجلی سی گری لیکن پریس انفارمیشن بیورو کو ایسے موقعوں پر اور زیادہ فعّال ہو جانا پڑتا ہے۔ فوراً پرنسپل انفارمیشن آفیسر نے ہمیں اپنے کمرے میں بلایا اور ہدایت دی کہ وزیرِ اعظم کے ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن کے سوا کوئی افسر تین مورتی ہاؤس کی طرف نہ جائے۔ ہاں اپنی اپنی وزارتوں کے ساتھ رابطہ قائم رکھیں۔ جن کے پاس کسی وزارت کی پبلسٹی کا کام نہیں ہے وہ اپنے اپنے کمرے میں موجود رہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں ان سب کو ان کی ڈیوٹی سے آگاہ کر دیا جائے گا۔

کوئی ایک گھنٹے میں ڈیوٹی لسٹ آ گئی۔ میری ڈیوٹی یہ مقرّر ہوئی تھی کہ کل میں فارن پریس کو لے کر راج گھاٹ پہنچوں گا جہاں پنڈت جی کا انتم سنسکار ہو گا۔

اس دوران میں ان کے جسدِ خاکی کو عام درشنوں کے لیے تین مورتی ہاؤس ہی میں پھولوں کی سیج پر لٹا دیا گیا۔ شام کو ہم لوگوں نے جا کے اُن کے آخری درشن کیے اور دوسری صبح میں غیر ملکی پریس کے نمائندوں کو ایک ڈی لکس بس میں لے کر راج گھاٹ کو روانہ ہوا۔

ارتھی کے پیچھے پیچھے بلکہ آگے اور دائیں بائیں بھی ہجوم کا اندازہ کرنا دشوار تھا۔ پولیس کے انتظام کے باوجود صورتِ حال یہ تھی کہ اکثر معزز مہمانوں کو اپنی کاریں سڑک ہی کے کنارے یا درمیان میں ہجوم کے رحم و کرم پر چھوڑ کر سفر کا خاصا حصہ پیدل طے کرنا پڑا۔ راج گھاٹ سے ڈیڑھ فرلانگ ادھر میں نے دیکھا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور بخشی غلام محمد بھیڑ میں دھکے کھاتے ہوئے راج گھاٹ کو جا رہے ہیں۔ برطانیہ کے وزیرِ اعظم کا ہیلی کاپٹر جمنا کے دوسرے کنارے پر اترا اور وہاں سے وہ کشتی کے ذریعے راج گھاٹ تک پہنچے۔

میں جس بس میں فارن پریس کو لے کے جا رہا تھا اس کا عین چتا کے قریب پہنچنا ضروری تھا کہ اس میں غیر ملکی اخبارات کے نمائندے تھے اور یہ ساری رسومات بہت قریب سے دیکھنا چاہتے تھے اور قریب سے اس کے فوٹو لینا چاہتے تھے۔ یہ بس بھیڑ کی وجہ سے کبھی رکتی اور کبھی چلتی تھی اور وہ بھی چیونٹی کی رفتار سے۔ آخر کار ہم لوگ تمام رکاوٹوں کے باوجود اس جگہ کے قریب پہنچ ہی گئے جہاں چتا بنی تھی۔ ارتھی وہاں رکھی جا چکی تھی اور ارتھی کے پاس ہی میں نے شیخ محمد عبداللہ، وجے لکشمی پنڈت، کرشنا ہتھی سنگھ، اندرا جی، راجیو اور سنجے کو دیکھا۔ اندرا جی نے جب پنڈت جی کی لاش کے ماتھے کو چوما اور کہا good bye papa تو قریب کھڑے لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ بڑا دردناک منظر تھا۔ سچ پوچھیے تو یہ سارا منظر دیکھنے کی تاب مجھ میں نہ تھی۔ اگر فرائضِ منصبی کی مجبوری نہ ہوتی تو میں وہاں رک نہیں سکتا تھا۔ پولیس کے انتظام کی وجہ سے چتا کے بالکل قریب بہت کم لوگ ہی پہنچ سکے تھے۔ ادھر ہجوم میں اکثر لوگ تو دھاڑیں



مار مار کے رو رہے تھے۔ بعض ایک دوسرے کو سہارا دے رہے تھے۔ ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے سارا ملک ایک خاندان ہے اور بزرگِ خاندان رخصت ہوگیا ہے۔

تمام رسومات جب مکمل ہوگئیں تو میں اسی طرح غیر ملکی پریس کو وہاں سے بین الاقوامی تار گھر میں لایا جہاں انھوں نے اپنے اپنے اخبارات کو CABLES بھیجنا شروع کیے۔ میں ان سے اجازت طلب ہوا اور میری زبان پر اس وقت یہ اشعار تھے:

اس وقت جب کہ موں تری جلتی چتا کے پاس
میں اپنے ہوش میں ہوں نہیں گم مرے حواس
کوئی سناب ہے یاس کا عالم نہ کوئی آس
اک تشنگی ہے روح تو آنکھیں ہیں ایک پیاس

تیری خبر ہے اور نہ اپنی خبر مجھے
آنکھیں ہیں اور کچھ نہیں آتا نظر مجھے

جب ایک پل میں راکھ ہوا تیرا جسم پاک
لاکھوں تھے اشکبار کروڑوں تھے سینہ چاک
گردوں سے بھی بلند تر اے ایک مشتِ خاک
اے عزم تند شعلہ وائے فکر تابناک

ایسے مری نظر میں ترا شوقِ دید تھا
گویا نظر نہیں تھی دلِ نا اُمید تھا

جب راکھ ہو کے تیرا بدن خاک میں ملا
محسوس یوں ہوا کہ چمن خاک میں ملا
رفعت سے گر کے تاجِ وطن خاک میں ملا
سارا جمالِ گنگ و جمن خاک میں ملا

اے خاکِ ہند آج بس اتنا خیال کر
محسن کی راکھ ہے اسے رکھنا سنبھال کر

پہلی ستمبر ۱۹۴۷ کو پنڈت نہرو اور لیاقت علی خاں آگرہ ہوائی اڈے پہنچے۔ کئی بڑے علاقوں میں جانے کے لیے ہوائی جہاز کا بندوبست کیا گیا تھا۔ یہ ڈکوٹا جہازوں میں سوار ہوئے۔ نہرو جی کو اس پر اعتراض تھا۔ انھوں نے کہا کہ فوجیں ہیں جو اس وقت رنگیلی پر تھیں کیا وہ فوجیوں کے ساتھ سفر نہیں کر سکتے اس پر انھیں بتایا گیا کہ یہ حکومت کا حکم ہے۔ پنڈت جی نے کہا "میرے خیال سے تو یہ کوئی بہت اچھا حکم نہیں ہے" اس پر اصرار کیا گیا کہ کم سے کم فوجیوں کی تعداد آدھی تو کر دی جائے۔

قریب ہی کنگ ... میں ہندوستانی مہاجرین کا کیمپ تھا۔ دونوں وزیر اعظم وہاں پہنچے۔ مسلمان مہاجرین نے جیسے ہی پنڈت نہرو کو دیکھا وہ چیخنے لگے "آدمیوں کو مار ڈالا، لوٹ لیا" ہجوم کے مخالفانہ رویے کو دیکھ کر فوجیوں کا دستہ پریشان ہوگیا۔ انھیں اندیشہ تھا کہ کوئی بڑی مصیبت پیش آسکتی ہے انھوں نے یہ کوشش کی کہ پنڈت جی کے گرد حصار سا بنالیں اور اس طرح انھیں اپنے بیچ میں لے کر محفوظ کرلیں۔ مگر۔ پنڈت جی تھے کہاں؟ وہ تو کہیں بھی نظر نہ آرہے تھے۔ فوجیوں نے پریشان ہوکر ایک دوسرے کو دیکھا۔ آخر پنڈت جی ایک بوڑھی عورت کے پاس بیٹھے نظر آئے۔ وہ اس کی دکھ بھری داستان سن کر اسے تسلی دے رہے تھے۔ اب وہی مجمع جو ذرا دیر پہلے ان کے خلاف نعرے لگا رہا تھا اور انھیں قاتل بتا رہا تھا، اب انھیں پہلے کی طرح محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

دونوں وزیر اعظم ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف شکایتیں سن رہے تھے۔

ایک مسلمان کانسٹبل کھڑا ہوکر لیاقت علی سے بولا "گاندھی اور نہرو ہی ہمارے ماں باپ ہیں۔ آپ نے کیا کیا؟ آپ نے تو ہوٹل میں بیٹھ کر پاکستان لیا۔ آپ نے کیا قربانی دی؟"

جب ہندوستان کے وزیر اعظم مسلمان پناہ گزینوں کے کیمپ سے رخصت ہوئے تو "ظالم آگیا" کی آوازیں نہ اٹھیں بلکہ "ہندوستان کا وزیر اعظم۔ زندہ باد!" کے نعرے لگے۔



نہرو جی — چند یادیں

میری رُباعیوں کا مجموعہ 'شعاعِ جاوید' کے نام سے ۱۹۸۰ء میں چھپا تھا۔ اس کی پہلی ہی رُباعی کا عنوان بطورِ انتساب یہ ہے۔ 'نہرو کے ہیومن ازم کے نام' اور پھر رُباعی درج ہے:

دِل سیلِ تعصب میں بہا جاتا ہے
اور ذہنِ رسا پیچھے رہا جاتا ہے
کہیے اِنھیں ہندو، اُنھیں مسلم کہیے
انسان تو نہرو کو کہا جاتا ہے

جو لوگ اہلِ پنجاب سے ہیں اور میرے ہم عمر ہیں یا جنھیں تاریخِ آزادی سے دلچسپی ہے، وہ جانتے ہیں کہ مولانا سید داؤد غزنوی پنجاب کے مشہور کانگریسی لیڈر تھے۔ ۱۹۴۲ء کی انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک "ہندوستان چھوڑدو" میں شریک ہوکر برطانوی سامراجیوں کے ہاتھوں گرفتار بھی ہوئے تھے۔[۱]

شاید جنوری ۱۹۴۶ء کے کسی اخبار میں خبر شائع ہوئی تھی کہ پنڈت جواہر لال نہرو پنجاب کے ایک دن کے دورے پر آنے والے ہیں۔ دوسرے دن کے اخبار میں پروگرام شائع ہوا کہ فلاں تاریخ کو شہر لدھیانہ کے "روشنی کے میدان" میں صبح گیارہ بجے تقریر فرمائیں گے۔ لوگوں میں اس قدر جوش و خروش ہوا کہ خدا کی پناہ میرا گاؤں جالندھر کے ضلعے میں ہے اور جالندھر ہم سے ۳۲ میل دُور ہے۔ مگر لدھیانہ سیدھی سڑک سے، جو ستلج کے پُل کو پار کرتی ہوئی نکل گئی ہے، صرف ۴۲ میل کے فاصلے پر ہے۔ میری عمر ۲۰-۲۱ برس کی تھی۔ ہم کئی لڑکے سائیکلوں پر منہ اندھیرے نکل کھڑے ہوئے اور پو پھٹتے ہی لدھیانہ پہنچ گئے۔ باوجود کڑاکے کی سردی کے دس بجے تک مجمع، کہا جاتا ہے، دس لاکھ کو پہنچ گیا تھا۔ میں نے اس سے پہلے ایسا جمِ غفیر نہ دیکھا تھا۔ سروں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ پھر ۱۱ بج گئے مگر پنڈت جی کا پتا نہیں۔ لاؤڈ اسپیکر کبھی تقریریں، کبھی دیش بھگتی سے لبریز گانے اُگلے جا رہا تھا۔ دم بدم ایسا اعلان بھی سننے میں آجاتا تھا کہ اب پنڈت جی کرنال پہنچ گئے ہیں اور اب کھنہ، اب دوراہہ۔ حتیٰ کہ چار بجنے کو آئے، سورج ڈھلنے لگا۔ پھر یکا یک اناؤنس کیا گیا: "پنڈت جی لدھیانہ میں تشریف لا چکے ہیں مگر چوں کہ تھکے ہوئے ہیں اس لیے پانچ بجے تقریر فرمائیں گے۔" اندازہ لگائیے۔ دس لاکھ سے متجاوز مجمع صبح سے میدان میں جما بیٹھا ہے اور اب بھی انتظار کی گھڑیاں باقی ہیں۔ ہم سب نوجوان ایک ہی جگہ تھے۔ مجھے یاد ہے کہ سب کا متفقہ فیصلہ یہی تھا کہ پنڈت جی دہلی سے پیدل تو تشریف نہیں لائے۔ کار میں آئے ہیں۔ کار اور تھکن کیا؟ (یاد رکھیے یہ وہ زمانہ ہے جب کار کہیں اِکا دُکا ہی دیکھنے کو ملتی تھی، آج کی طرح نہیں)۔

مولانا داؤد غزنوی[۱] اُن دِنوں انڈین نیشنل کانگریس پنجاب کے صدر تھے اور کانگریس ہی کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ خدا خدا کرکے پنڈت جی تشریف لائے۔ مولانا داؤد غزنوی ان کے ہمراہ تھے۔ سیدھے اسٹیج کی طرف بڑھنے لگے۔ مجمع ایک حد تک بے قابو سا ہوگیا۔ پنڈت جی خود اِس بدنظمی کو دور کرنے پر تُل گئے۔ اُن کا لوگوں کو دھکا یا جھڑکی

کالی داس گپتا رِضا
۴۳ — اے، جل درشن، چوتھا فلور، نیپین سی روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۳۶

---

[۱] مولانا سید داؤد غزنوی، مولانا سید عبدالجبار بن سید عبداللہ، ۱۸۹۵ء میں امرتسر میں پیدا ہوئے تھے۔ مکتبی، علمی اور دینی تعلیم (بیشتر مدرسہ غزنویہ امرتسر اور مدرسہ مسجد فتحپوری دہلی سے) مکمل کرنے کے بعد تحریکِ آزادی میں حصہ لینے لگے تھے۔ سیاسی اسٹیج تحریکِ خلافت نے مہیا کیا۔ جمیعت علمائے ہند کے مدتوں رکن اور پھر نائب صدر رہے۔ ۱۹۲۱ء میں تین سال کی قید بھی کاٹی۔ رہا ہوئے تو ۱۹۲۵ء میں پھر گرفتار کر لیے گئے۔ سائمن کمیشن کے بائیکاٹ میں بھی خوب خوب حصہ لیا اور تیسری بار گرفتار ہوئے۔ مجلسِ احرارالاسلام کے بانی ارکان میں سے تھے اور پہلے سکریٹری بھی۔ ۱۹۴۲ء میں کانگریس میں شامل ہوئے اور اسی سال چوتھی بار قید کیے گئے۔ ۱۶؍دسمبر ۱۹۶۳ء کو لاہور میں فوت ہوئے۔ کم از کم تین کتابیں ان کی تالیفات سے ہیں مگر سب کی نوعیت مذہبی ہے۔



دینا تو گویا ایک اعزاز تھا۔ وہ تو پنڈت جی کو پوجتے تھے۔ وہ ہمارے بھی پاس سے گزرے اور ہم نے اُنھیں پہلی بار جی بھر کر دیکھا۔

اسٹیج پر معمولی کارروائی کے بعد مولانا داؤد غزنوی نے تقریر کی۔ تقریر کیا تھی خطابت کا نمونہ تھی۔ ہندو مسلم اتحاد اور کانگریس کے حق میں اس سے بہتر تقریر میں نے آج تک نہیں سُنی تھی۔ پھر پنڈت جی اپنے خاص انداز میں رس گھولنے لگے۔ کوئی پون گھنٹہ بولے ہوں گے۔ مجمع انقلاب زندہ باد کے نعروں سے گونج اُٹھا۔ اب کچھ کچھ اندھیرا ہونے لگا تھا۔ پنڈت جی رخصت ہو گئے مگر مجمع ایسا مسحور ہو گیا تھا کہ چھٹنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ گویا کہہ رہا ہو:

جھٹپٹے میں کہیں نکلتے ہیں
بیٹھو بھی، دونوں وقت ملتے ہیں

مہینوں بعد ۳ اگست ۱۹۴۶ء کے اخبار کی ہیڈ لائن کچھ ایسی تھی، "مولانا داؤد غزنوی کل کانگریس سے مستعفی ہو کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔" اللہ اللہ خیر سلا۔ اس واقعے نے پھر سے پنڈت جی کا سراپا اور تقریر یاد دلا دیے جو آج بھی اسی طرح یادوں میں تر و تازہ ہیں۔

لارڈ ویول (WAVELL) جب ۴ جون ۱۹۴۵ء کو لندن سے دہلی پلٹے تو اُنھوں نے کچھ تجاویز ایسی رکھیں جن کا مقصد ان کے اس وقت کی سیاسی گتھی کو سلجھانا اور ہندوستان کو مکمل خود مختار بنانا تھا۔ اسی بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ویول نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کو جو جیل میں تھے رہا کر دیا۔ اور ۲۵ جون ۱۹۴۵ء کو ۲۱ لیڈروں پر مشتمل ایک آل پارٹیز کانفرنس شملہ میں بلوانے کی تجویز رکھی۔ چنانچہ سب نامی سیاسی پارٹیوں کے ۲۱ لیڈر شملہ پہنچ گئے۔ جن میں پنڈت نہرو، مولانا آزاد، خان عبدالغفار خاں، نواب زادہ لیاقت علی خاں، قائدِ اعظم محمد علی جناح، سردار پٹیل وغیرہ شامل تھے۔ گاندھی جی بھی شملہ ہی میں تھے۔ مگر انھوں نے کانفرنس میں حصہ نہیں لیا تھا۔ کانفرنس نہایت آہستہ خرام ثابت ہوئی۔ حتیٰ کہ ۱۴ جولائی کی آخری میٹنگ کے بعد اعلان کر دیا گیا کہ کانفرنس ناکام ہو گئی۔

میں ان دنوں انبالہ شہر میں تھا۔ شملہ سے دہلی کے لیے ٹرین کالکا میں تبدیل ہو کر انبالہ چھاؤنی (جو انبالہ شہر سے کہیں بڑا اسٹیشن ہے) سے گزرا کرتی تھی اور وہیں سے ایک ٹرین مین لائن سے الگ ہو کر لکھنؤ کو جاتی تھی۔ ہم کمرے میں چار ساتھی اکٹھے تھے اور ہمارا ایک زائد مگر مشترکہ دوست وہ تھا جو انبالہ کے اسٹیشن ماسٹر کا بیٹا تھا۔ اُس نے ایک دن ہم سے نہایت رازدارانہ کہا کہ آج رات کو ایک اسپیشل ٹرین شملہ سے آنے والی ہے جس میں سب لیڈر سفر کر رہے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو انھیں دیکھ سکتے ہیں۔ مگر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ ٹرین رات کو انبالہ اسٹیشن پہنچی اور ایک سنسان پلیٹ فارم پر کھڑی کر دی گئی۔ صرف ایک ہی کمپارٹمنٹ میں روشنی تھی اور وہ تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ تھا۔ ہم پانچوں نے اُس ڈبے کے پاس جا کر اندر جھانکا تو ہمارے بالکل پاس والے لکڑی کے برتھ پر سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں لیٹے ہوئے تھے اور ان کے متصل غالباً پیارے بھی سیتا رمیا اور سامنے خود گاندھی جی تھے جو بیٹھے تھے۔ وہ ہمیں دیکھ کر اور ہمارا پرنام قبول کرتے ہوئے بچوں کی سی ہنسی ہنسے دو ایک منٹ ہم سے باتیں کیں، پھر گھڑی دیکھی اور دیکھتے ہی کہنے لگے سونے کا وقت ہو گیا اور فوراً لکڑی کے برتھ پر لیٹ کر خراٹے بھرنے لگے۔ ہمارے لیے یہ سب جیسے کسی اور ہی دنیا کی بات تھی۔ لیٹے ہوئے خان عبدالغفار خاں امن کا ستون معلوم ہوتے تھے جسے زمین پر لٹا دیا گیا ہے اور کسی روز مناسب وقت دیکھ کر 'فتح میدان' میں ایستادہ کرنا ہے۔ پوری گاڑی جادو کی ٹرین معلوم ہوتی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ ہمیں ساتھ والے فرسٹ کلاس ڈبوں کی طرف اشارہ کر کے بتایا گیا کہ ان میں تمام غیر کانگریسی لیڈر، جن میں نواب زادہ لیاقت علی خاں، اور جناح صاحب بھی تھے، محوِ استراحت ہیں۔ اتنے میں ایک دوسرے ڈبے سے کسی کے اُترنے کی آہٹ آئی۔ اندھیرا تھا ہم اس طرف کو لپکے تو دیکھا کہ پنڈت جی ہیں اور ان کے ساتھ ان کی بھانجی (شاید چندر لیکھا نام تھا) ہیں۔ پنڈت جی صاف شفاف کھدر کا لباس پہنے ہوئے تھے اور سر سے ننگے تھے، مگر ان کی بھانجی اگرچہ ساڑھی میں تھیں (شاید ساڑھی کھدر کی تھی) مگر بناؤ سنگھار وغیرہ قطعی انگریزی تھا۔ پلیٹ فارم چوں کہ اصل اسٹیشن سے فاصلے پر تھا اس لیے اُس پر چھت نہ تھی۔ خیال کیجیے کہ سنسان ریلوے پلیٹ فارم اور کھلے آسمان کے نیچے ایک بنچ پر معمولی سامان رکھے ہوئے پنڈت جی تن تنہا لمحہ بھر کے لیے

چندر لیکھا کو بھول جائیے) اور لاکھوں شیدائیوں کی بھیڑ کی جگہ (جو کہیں بھی پنڈت جی کو گھیرے رہتی تھی) ہم پانچ ـــــ محض پانچ ـــــ خوش نصیب نوجوان شیدائی ـــــ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے غالب تہہ کے دے دے کر ہم سے کھلوار ہا ہو :

رکھیو یارب ایہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا

ہم گھنٹہ بھر گم صم پنڈت جی کے سامنے کھڑے رہے۔ ایسی عظیم شخصیت کے رُوبرو زبان کھولنا کارے دارد۔ پنڈت جی خاصے بے چین دکھائی دے رہے تھے۔ اُٹھتے تھے اور بنچ پر بیٹھ بیٹھ جاتے تھے۔ کبھی کبھار ہم سے گفتگو کی راہ بھی کھول دیتے تھے۔ دفعتاً انھوں نے کہا کہ لکھنؤ کی گاڑی میں ابھی خاصا وقت ہے دیکھو ریٹائرنگ روم خالی ہے کہ نہیں۔ اب رات بھیگ چکی تھی۔ ہمیں جب کچھ خدمت کا موقع ملا تو آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ لپک کر ان کا سامان ہاتھوں ہاتھ لیا اور خراماں خراماں پنڈت جی اور اُن کی بھابھی کو فرسٹ کلاس ریٹائرنگ روم کی طرف لے چلے۔ روم میں جاکر ہم نے دیکھا کہ وہاں ایک آدمی سو رہا تھا۔ اسٹیشن ماسٹر کا لڑکا ہمارے ساتھ تھا۔ اُس نے کہا پنڈت جی آپ فکر نہ کریں میں ابھی اُسے اُٹھا کر رُوم خالی کرا دیتا ہوں۔ یہ کہنا تھا کہ پنڈت جی آگ بگولا ہو گئے " وہ انسان نہیں؟ کیا ہم اس سے بہتر انسان ہیں؟ کیا انگریز ہمارے حقوق کو کم پائمال کر رہے ہیں؟ جو ہم اپنے ہی بھائیوں کے حقوق کو پائمال کریں۔ آپ کو شرم آنی چاہیے۔" اب جو ہمارے دلوں پر بیتی اس کی نہ پوچھیے۔ بہت جی چاہا کہ معافی مانگ لیں مگر حوصلہ نہ ارد۔ ہم ڈر کے مارے جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہ گئے۔ اتنے میں ایک محبت بھری آواز آئی " بھائیو! جاؤ اب رات بہت ہو چکی ہے۔" یہ آواز پیارے پنڈت جی کی تھی اور ان چند پیار بھرے لفظوں نے ہماری رات کو دن بنا دیا۔

۲۷ر مئی ۱۹۶۴ء کو بعد دوپہر خبر آئی کہ پنڈت جی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ میں اپنے ہیڈ آفس (نیروبی کینیا۔ مشرقی افریقہ) میں کام کر رہا تھا۔ ایک تیر سا لگا۔ میں نے اور میرے کو ڈائرکٹر (CO-DIRECTOR) مسٹر جان رانلڈ اسٹیفن سن (JOHN ROWLAND STEPHEN SON) نے مشورہ کرکے فوراً اپنے تمام دفاتر اس ماتم میں بند کر دیے اس سے زیادہ ہم کر بھی کیا سکتے تھے؛

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

نہرو کی دلچسپیاں بڑی گوناگوں اور ان کی ہمدردیاں بہت گہری تھیں ۔ ان گنت لوگ ان کی پُرکشش شخصیت کی طرف مائل ہوئے ۔ ان کا دلکش چہرہ ایک لافانی شرافت اور حُسن رکھتا تھا ۔ انھیں طرح طرح کے لوگوں کی طرف سے تعریف بھرے خطوط ملتے رہتے تھے ۔ امرتا شیرگل بڑی ہونہار مصورہ تھیں ۔ وہ جوانی ہی میں اس دنیا سے چل بسیں ۔ انھوں نے نہرو کو ایک خط لکھا تھا ۔ یہاں ہم اس کے کچھ حصے نقل کرتے ہیں ۔

" ابھی کچھ دیر پہلے مجھے کسی نے بتایا کہ جواہر لال نہرو بیمار ہیں ۔ مجھے پہلے سے اس کی خبر نہیں تھی، میں اخبار نہیں پڑھتی ۔ میں تمہارے بارے میں بہت سوچتی رہی ہوں لیکن کس وجہ سے ۔ شاید اسی وجہ سے کہ میں تمہارے بارے میں اتنا زیادہ سوچتی رہی ہوں ۔ میں تمہیں خط نہ لکھ پائی ۔ میرا خیال ہے مجھے تم کو اور نزدیک سے جاننا چاہیے تھا۔ مجھے وہ لوگ پسند ہیں جن کی شخصیت بحرانی ہوتی ہے اور جنھیں ماضی کا افسوس بھی ستاتا نہیں ہوتا ۔ میرا خیال ہے میری تصویروں میں تمہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔ تم نے انھیں اس طرح دیکھا جیسے دیکھا ہی نہیں ۔

تم سخت دل نہیں ہو ۔ تمہارے چہرے پر خاصی نرمی ہے ۔ مجھے تمہاری صُورت پسند ہے ۔"

دو یادگار واقعات

وسط جون ۱۹۴۵ء میں تمام قومی رہنماؤں کو نظر بندی سے رہائی ملی۔ اس مہینے کے آخری ہفتے یا جولائی کے پہلے ہفتے کی کوئی تاریخ تھی، پنڈت جواہر لال نہرو نئی دہلی میں مقیم تھے۔ اس زمانے میں خاکسار راقم الحروف مکتبہ جامعہ (قرول باغ) میں کام کرتا تھا۔ شعبۂ تصنیف و تالیف اور طباعت کا انچارج تھا۔ مکتبہ جامعہ کے مینیجر حامد علی خاں صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ "پنڈت جی کی رائلٹی کا چیک تیار ہے، تم جا کر دے آؤ۔" پنڈت جی کو جامعہ سے بڑا لگاؤ تھا اور اسی طرح بچوں سے بھی، لہٰذا اکثر جامعہ آتے تھے، در طالب علموں کے ساتھ گھل مل کر کچھ وقت گزارتے۔ اس لیے ان کو بہت قریب سے دیکھنے کا بارہا موقع ملا تھا۔ جامعہ کے اسی تعلق اور لگاؤ کی وجہ سے وہ اپنی اہم کتابیں ترجمے اور اشاعت کے لیے جامعہ کو دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جامعہ میں ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم جیسے بہترین مترجم موجود تھے، جن کے ترجموں کو پڑھ کر تصنیف کا لطف آتا تھا۔ نیز مکتبہ جامعہ کی کتابیں اپنے گیٹ اپ اور خوبصورتی کے لیے ملک گیر شہرت رکھتی تھیں۔ چنانچہ اس وقت تک پنڈت جی کی خود نوشت سوانح حیات کا ترجمہ "میری کہانی" دو جلدوں میں اور "ورلڈ ہسٹری" کا ترجمہ "جگ بیتی" حصہ اول چھپ چکی تھیں۔ پہلی کتاب کا ترجمہ عابد صاحب نے کیا تھا اور دوسری کا محمود علی خاں صاحب جامعی نے لیا

عبداللطیف اعظمی
۳۴۹، ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

جب میں پنڈت جی کی قیام گاہ پر پہنچا تو وہاں ملنے والوں کی بہت بڑی تعداد موجود تھی اور پنڈت جی کوٹھی کے لان پر انتہائی بے تکلفی کے ساتھ سب سے مل رہے تھے۔ ان ملنے والوں میں میری طرح، پنڈت جی کے ناشرین بھی شامل تھے۔ جب پنڈت جی کو میری اطلاع ملی تو اٹھ کر میرے پاس آئے اور بڑی محبت اور شفقت سے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے ایک گوشے میں الگ لے گئے اور یہ شکایت کی کہ اب تک "جگ بیتی" کا دوسرا حصہ شائع نہیں ہوا۔ چند سال پہلے ہی میں تعلیم سے فارغ ہوا تھا۔ اور اس کے چند ہی ماہ کے اندر مکتبے میں کام شروع کیا تھا۔ مکتبے کے معاملات سے مجھے بہت زیادہ واقفیت نہیں تھی، اس کے بارے میں تو بالکل ہی نہیں جانتا تھا کہ "جگ بیتی" کے دوسرے حصے کی اشاعت میں رکاوٹ کیا ہے۔ مگر بہر حال مکتبے کے نمائندے کی حیثیت سے ان سے ملا تھا اس لیے جواب تو کچھ دینا ہی تھا۔ میں نے کاغذ کی دقت کا بہانہ کیا اور عرض کیا کہ جنگ کی وجہ سے حسب منشا کاغذ بالکل نہیں مل رہا ہے، اس لیے یہ تاخیر ہوئی ورنہ ہم آپ کی کتاب کو ہمیشہ اولیت دیتے ہیں۔ اب معاملات کچھ بہتر ہو رہے ہیں، انشاء اللہ جلد شائع کرنے کی کوشش کریں گے۔ انھوں نے فرمایا کہ آپ کو کاغذ کی بے شک دقت ہوگی مگر مجھے ایسے ناشروں کی کمی نہیں جو مجھ سے جلد شائع کرنے کے لیے تیار ہیں، مگر بوجوہ میں جامعہ کو ترجیح دینا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد پنڈت جی نے فرمایا کہ میں نے جیل میں "ڈسکوری آف انڈیا" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ میں چاہتا ہوں اس کا ترجمہ جامعہ سے شائع ہو۔ میں نے اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے فوراً وعدہ کر لیا اور یہ فرمائش بھی کر دی کہ اگر آپ مسودہ عنایت فرما دیں تو ہم کوشش کریں گے کہ انگریزی کتاب کے ساتھ ساتھ اس کا اردو ترجمہ بھی بازار میں آجائے۔ پنڈت جی نے فرمایا۔ "یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ مسودے کی ٹائپ کاپی صرف دو ہیں، ایک پریس میں ہے اور دوسری تصحیح کے لیے اندرا کے پاس ہے، البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ پروف کی کاپیاں آپ کو بھیج دی جائیں۔" میں نے عرض کیا کہ "بہتر ہے یہی سہی۔"

میں اپنے اس کارنامے پر خوش خوش واپس آیا۔ اور حامد صاحب کو یہ خوشخبری بڑے فخر سے سنائی، مگر ان کا جواب سن کر میں سناٹے میں آگیا۔ انھوں نے فرمایا کہ افسوس ہے کہ ہمارے پاس روپیہ نہیں ہے اور ہم یہ ترجمہ شائع نہ کر سکیں گے۔ مجھے اس جواب سے بڑا شاک پہنچا، نہ صرف اس لیے کہ میرا وعدہ غلط ہو رہا تھا بلکہ اس لیے کہ میری دلی خواہش تھی کہ پنڈت جی کی اس تازہ کتاب کا ترجمہ

مکتبے سے شائع ہونا چاہیے۔ اس لیے میں نے عرض کیا کہ آپ کو کتنے روپے کی ضرورت ہے، میں مہیا کر دوں گا مگر یہ کتاب چھپے گی یہیں سے۔ حامد صاحب نے اتنی رعایت کی کہ ترجمے کا معاوضہ مکتبہ ادا کرے گا اور باقی طباعت، کتابت اور کاغذ کے اخراجات تمھارے ذمے، نفع میں دونوں کا حصہ نصف نصف۔

اس کتاب کے گیارہ ابواب ہیں: عجلت کے خیال سے گیارہ مترجموں کو ایک ایک باب ترجمے کے لیے دے دیا گیا، ایک صاحب کے ترجمے کا نمونہ عابد صاحب کو پسند نہیں آیا، اس لیے ان میں سے ایک صاحب نے دو باب کا ترجمہ کیا، ڈاکٹر عابد صاحب نے پورے ترجمے کی نظر ثانی کی۔ یہ مترجمین جامعہ کے اساتذہ میں سے تھے اور ان کو دونوں زبانوں پر اتنا عبور تھا کہ نظر ثانی میں بہت کم قلم لگانے کی ضرورت پیش آئی۔ اس طرح یہ ترجمہ "تلاشِ ہند" کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوا۔ اور جیسا کہ میں نے پنڈت جی سے وعدہ کیا تھا، تقریباً انگریزی کتاب کے ساتھ ساتھ اردو ترجمہ بازار میں آ گیا۔ کتاب پنڈت جی جیسے عالمی شہرت کے مصنف کی تھی اور مکتبہ جامعہ نے شائع کی تھی، اس لیے چند مہینوں کے اندر مطبوعہ تعداد کا نصف حصہ ختم ہو گیا۔ مگر مادر چہ خیالیم و فلک در چہ خیال است۔ اسی درمیان دہلی میں فساد پھوٹ پڑا اور فوراً تین روز کا کرفیو لگا دیا گیا۔ مکتبے کی عمارت قرول باغ میں گردوارہ روڈ پر تھی اور راقم الحروف بھی اسی عمارت کے ایک کمرے میں رہتا تھا۔ تیسرے روز جب کرفیو میں ڈھیل دی گئی تو میں وہاں سے چند فرلانگ کے فاصلے پر مسلم محلے میں ایک دوست کے یہاں منتقل ہو گیا۔ میرے نکلنے کے کچھ ہی دیر کے بعد مکتبہ جامعہ کی عمارت میں آگ لگا دی گئی اور تھوڑی ہی دیر میں مکتبے کی مطبوعات کا پورا اسٹاک جل کر خاک ہو گیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب پنڈت جی کی یہ اہم کتاب "تلاشِ ہند" نایاب ہے، بڑی تلاش و جستجو کے بعد اس کا ایک حصہ کسی کباڑی کے یہاں سے ملا اور اس کو سینے سے لگائے بیٹھا ہوں۔

اوپر جو کچھ بیان کیا ہے، اس کا تعلق ایک ملاقات سے تھا، جس کا نتیجہ بہت دُور رس اور معنی خیز نکلا۔ اب ایک ایسا چشم دید واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں جو دلچسپ بھی ہے اور اس سے پنڈت جی کے مزاج اور ان کی سیرت و شخصیت کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب پنڈت جی تین مورتی میں منتقل ہو گئے تھے وہاں کوئی اہم تقریب تھی، جس میں حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار، غیر ملکی سفیر اور معززینِ شہر شریک تھے۔ اتفاق سے یہ عزت مجھے بھی حاصل ہوئی۔ میں جب کبھی اس قسم کے جلسوں یا تقریبوں میں شریک ہوتا ہوں تو بزرگوں کا مطالعہ اور مشاہدہ کرنے کی پوری کوشش کرتا ہوں۔ جامعہ کی طالب علمی کے زمانے میں کانگریس کے مختلف اجلاسوں میں والنٹیر کی حیثیت سے بار ہا شریک ہونے کے مواقع ملے تھے اور ان مواقع پر میری معلومات اور مشاہدے میں بڑا قیمتی اضافہ ہوا تھا۔ تین مورتی کی اس تقریب میں بھی یہی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔

پنڈت جی کے علاوہ ملک کے گورنر جنرل راجہ گوپال اچاری اور وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد میری خصوصی توجہ کا مرکز تھے۔ راجہ جی کی سادگی اور اُن کی شکل و صورت ہمیشہ میرے لیے جاذبِ توجہ رہی ہے۔ اس زمانے کے مشہور کارٹونسٹ شنکر ان کا کارٹون کچھ ایسا بناتے تھے کہ سارس یا بگلے کی صورت آنکھوں میں پھر جاتی۔ اس تقریب میں ان کو دیکھ کر بالکل اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ ملک کے اعلیٰ ترین عہدے پر فائز ہیں۔ لوگ کھانے پینے یا خوش گپیوں میں مصروف تھے، راجہ جی ایک مرکزی جگہ پر کھڑے تھے اور ہاتھ جوڑ کر مہمانوں کا خیر مقدم کر رہے تھے یا لوگوں کے سلام کا جواب دے رہے تھے۔ پنڈت جی پوری سرگرمی کے ساتھ اپنی روایتی خوش دلی اور مسکراہٹ کے ساتھ بیرونی مہمانوں کی خاطر مدارات میں لگے ہوئے تھے۔ مولانا آزاد چند مسلم ممالک کے سفیروں کے ساتھ، کبھی عربی میں اور کبھی فارسی میں انتہائی بے تکلفی سے ہنس ہنس کر باتوں میں مشغول تھے۔ اردو کے ایک مشہور شاعر اور مولانا کے عقیدت مند کا ان کے بارے میں ایک شعر ہے:

خامشی، تمکنتِ کوہِ گراں کی صورت
گفتگو، زمزمۂ جوئے رواں کی صورت

اس سے پہلے مولانا کو بار بار دیکھنے کا موقع ملا تھا، مگر ہمیشہ اس شعر کے پہلے مصرعے کی مکمل تفسیر نظر آئے تھے، مگر دوسرے مصرعے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا منظر آج پہلی مرتبہ دیکھنے کو ملا۔ واقعی یقین نہیں آتا تھا کہ یہی مولانا ہیں جن سے سنجیدگی اور چہرے کی خشکی جدا نہیں ہوتی۔ تقریب ابھی پورے شباب پر تھی کہ مولانا نے اپنی گھڑی پر ایک نظر ڈالی اور وہاں سے رخصت ہو گئے۔ اس پر مجھے کچھ تعجب ہوا مگر اس کی مصلحت اس وقت سمجھ میں آئی جب تقریب ختم ہوئی اور مہمانوں کا ایک طویل کیو لگ گیا۔ ظاہر ہے مولانا کی انفرادیت اور ان کی فطرت اس کو برداشت نہیں کر سکتی تھی، اس لیے اس سے پہلے ہی رخصت ہو گئے۔

اس تقریب میں ایک اور شخصیت تھی جس کی کس مپرسی دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ وہ تھے نواب چھتاری یعنی نواب حافظ احمد سعید علی گڑھ کی شاندار روایات کی مجسم یادگار اور شاندار مونچھوں کے حامل۔ ۱۹۲۸ء میں یو۔ پی کے انگریز گورنر کے قائم مقام تھے تو رمضان المبارک کے زمانے میں گورنر ہاؤس میں تراویح میں قرآن سناتے تھے۔ اسی زمانے میں دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں انھیں سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ اس وقت میں ندوہ کا ایک طالب علم تھا اور درجۂ عالمیت کی آخری کلاسوں میں پڑھتا تھا۔ موصوف جب ندوہ کے ہال میں داخل ہوئے تو ان کے پیچھے دو انگریز باڈی گارڈ ننگی تلواریں لیے ہوئے بڑے ادب کے ساتھ چل رہے تھے۔ جب کلام حکیم کی تلاوت شروع ہوئی تو علی گڑھ کی روایت کے مطابق معزز مہمان کھڑے ہو گئے۔ عجب شاندار منظر تھا۔ انگریزوں کے دورِ حکومت میں ایک ہندوستانی کی یہ عزت، یہ توقیر، تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ منظر ایسا پُر اثر اور پُر جلال تھا کہ مولانا سید سلیمان ندوی جیسے جید عالم اور عظیم مصنف پر ایسا رعب طاری ہوا کہ سپاسنامہ پڑھتے وقت ان کے ہاتھوں میں لرزش تھی اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے حلق سے آواز ہی نہیں نکل رہی ہے۔ بعد میں ریاست حیدرآباد کے چیف منسٹر بھی رہے، ان کا یہ عہد بھی ریاست کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ لیکن سیاست کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اتنی عظیم شخصیت کا مالک اس تقریب میں اس طرح یکہ و تنہا اور الگ تھلگ تھا جیسے اس عظیم مجمع میں ان کا کوئی شناسا اور کوئی ہمدم و دمساز نہیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے سب سے آخر میں وہی رخصت ہوئے۔ کیونکہ وہ قطار سے الگ خاموش کھڑے تھے۔ جب سب لوگ جا چکے تو ان کی کار آئی اور پنڈت جی سے ہاتھ ملا کر رخصت ہوئے۔

میں نے پنڈت جی کے ایک یادگار واقعے کو بیان کرنے کے لیے قلم اٹھایا تھا مگر ضمناً راجہ جی، مولانا آزاد اور نواب چھتاری مرحومین کا ذکر آ گیا، چونکہ یہ حکایات دلچسپ اور پُر لطف تھی، اس لیے دراز ہو گئی۔ کہنا یہ تھا کہ جب یہ شاندار تقریب ختم ہو گئی اور ایک طرف مہمانوں کا کیو لگ گیا اور دوسری طرف کاروں کا تو پنڈت جی فوراً اپنی کوٹھی کے پورٹیکو میں پہنچ گئے اور بحیثیت میزبان کے ہر مہمان سے مصافحہ کرتے، کار کا دروازہ کھول کر اسے بٹھاتے اور رخصت کرتے۔ پنڈت جی کی سیرت اور شخصیت کے اس پہلو کو دیکھ کر میں حیرت میں آ گیا۔ کسی اور ملک کو چھوڑیے کیا خود ہندوستان کے کسی وزیر اعظم کی زندگی میں ایسی مثال ملے گی؟ لیکن پنڈت جی کی زندگی میں جہاں ایسے انکسار، تواضع اور کسر نفسی کی مثال ملے گی تو جلال کی مثالیں بھی ملیں گی۔ کانگریس کے بعض اجلاسوں کے مواقع پر ایسی مثالیں بھی مجھے دیکھنے کو ملیں مگر ان کے جلال اور غصے کی ایک مثال مولانا آزاد کی زبانی سن لیجیے، اسی پر یہ مضمون ختم کرتا ہوں۔

اگست ۱۹۴۲ء میں جب قومی رہنماؤں کا قافلہ بمبئی سے قلعۂ احمد نگر کو روانہ ہوا: تو برطانوی حکومت کی تمام کوششوں کے باوجود کہیں کہیں لوگوں کو سن گن مل گئی۔ مولانا "انڈیا ونس فریڈم" میں ایک جگہ لکھتے ہیں: "معلوم ہوتا ہے کہ ہماری گرفتاری کی خبر کسی طرح پونا پہنچ گئی تھی۔ پلیٹ فارم پر ہر طرف پولیس ہی پولیس تھی۔ اور پبلک میں سے کسی کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ البتہ پل کے اوپر بڑا اژدہام تھا۔ جوں ہی گاڑی اسٹیشن پر پہنچی، لوگوں نے "مہاتما گاندھی کی جے" پکارنا شروع کر دیا۔ جوں ہی لوگوں نے نعرے لگائے کمشنر نے پولیس کو لاٹھی چارج کرنے کا حکم دے دیا۔ اسے حکم ملا تھا کہ کسی قسم کے مظاہرے یا نعرے کی اجازت نہ دی جائے۔ جواہر لال کھڑکی کے قریب بیٹھے تھے۔ جوں ہی انھوں نے دیکھا کہ پولیس لاٹھی چارج کر رہی ہے تو ڈبے سے باہر کود پڑے اور چیختے ہوئے آگے بڑھے کہ تمھیں لاٹھی چارج کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ پولیس کمشنر ان کے پیچھے لپکا اور انھیں ان کے ڈبے میں واپس لانے کی کوشش کی۔ جواہر لال نے اس کا کہنا نہیں سنا اور غصے میں باتیں کرنے لگے۔ اسی اثنا میں ورکنگ کمیٹی کے ایک اور ممبر شنکر راؤ دیو بھی پلیٹ فارم پر اتر پڑے۔ چار سپاہیوں نے ان کو گھیر لیا اور گاڑی میں واپس جانے کو کہا۔ جب انھوں نے جانے سے انکار کیا تو پولیس والے ان کو زبردستی اٹھا کر ڈبے میں لائے۔"[۳]

حواشی

۱۔ "نذرِ عابد" مرتبہ: مالک رام، میں جمیل الدین قریشی صاحب نے عابد صاحب کی جو ببلیوگرافی مرتب کی ہے اس میں عابد صاحب کے ترجموں میں "جگ بیتی" کا بھی ذکر کیا ہے (صفحہ ۱۰۲) جو صحیح نہیں ہے کتاب پر مترجم کی حیثیت سے محمود علی خاں مرحوم کا نام چھپا ہوا ہے۔

۲۔ "نذرِ عابد" کی ببلیوگرافی میں اس کتاب کا ترجمہ بھی ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم کی طرف منسوب کیا گیا (صفحہ ۱۰۲) جو غلط ہے کتاب پر ان کا نام چھپا بھی نہیں ہے۔

۳۔ مولانا آزاد: ہماری آزادی (ترجمہ: محمد مجیب) پہلا ایڈیشن صفحات ۱۷۹۔۱۸۰ ●



پنڈت نہرو اور مولانا آزاد

(قلعۂ احمدنگر میں)

عظیم فیروزآبادی
نادر بخش اینڈ کو گلاس ورکس، فیروزآباد ۲۸۳۲۰۳

مولانا آزاد اور پنڈت نہرو بیسویں صدی کی ایسی جلیل القدر ہستیاں تھیں جو اپنے علم و فضل، سیاسی تدبّر اور تحریکِ آزادیٔ ہند میں اپنی استقامت اور قربانیوں کی بنا پر ہندوستان کے کسی لیڈر سے کم نہیں۔ انھوں نے ۱۹۲۱ء سے ۱۹۵۸ء تک آزادی کی جدوجہد اور ملک کو ترقی کی راہ پر لگانے میں مل جل کر کام کیا اور تقریباً تین سال تک (۹ اگست ۱۹۴۲ء تا جون ۱۹۴۵ء) قلعۂ احمدنگر کے زنداں میں ایک جان دو قالب بن کر رہے۔ اس دوران میں مولانا آزاد نے "غبارِ خاطر" اور پنڈت نہرو نے "تلاشِ ہند" کے علاوہ اپنی ڈائری مشمولہ "جواہرلال نہرو کی منتخب تحریریں" جلد ۱۳ (THE SELECTED WORKS OF JAWAHAR LAL NEHRU. VOL.XIII.) میں روزمرّہ کی زندگی اور اپنے سیاسی اور فلسفیانہ نظریات وافکار کی ایک دلچسپ داستان مرتب کردی ہے۔

غبارِ خاطر ایک عظیم انسان کی ذہنی زندگی کا ایک دلفریب مرقع ہے۔ مولانا بڑے ذہین تھے اور بڑے وسیع المطالعہ۔ حافظہ اتنا قوی کہ ایک بار جو کتاب یا مضمون نظر سے گزر جاتا ان کے دل پر نقش ہو جاتا۔ اس نے ان میں احساسِ برتری یا انانیت پیدا کردی تھی۔ باہر کی دنیا سے زیادہ ان کی نظر اپنے دل کی دنیا پر مرتکز رہتی تھی، جس کی تعمیر میں قدیم و جدید فلسفے اور خصوصاً فارسی، عربی اور اردو شاعری کے جمالیاتی تصورات نے اہم حصہ لیا تھا۔ اس کے برعکس پنڈت نہرو ایک دیدہ ور مورخ اور ادیب تھے۔ روزمرّہ کی زندگی کے واقعات، چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے سیاسی اور معاشرتی مسائل اور ان کی تفہیم و تشریح اپنی تصانیف میں ایسے دلکش اور شگفتہ انداز میں کرتے ہیں کہ ان کی نثر میں نظم کا حسن اور سحر آفرینی پیدا ہو جاتی ہے۔

پنڈت نہرو کی یہ ڈائری، غبارِ خاطر کا تکملہ ہے۔ دونوں کو ساتھ پڑھنے سے ہماری دلچسپی اور معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ احمدنگر جیل میں مولانا نے اپنے عزیز و اقارب کو بھی خط لکھے تھے، کس کس کو اور کتنے، ہمیں معلوم نہیں۔ غبارِ خاطر کے مشمولہ تمام خطوط میں، مولانا کے مخاطب حبیب الرحمان خاں شروانی ہیں اور شروانی صاحب بھی محض ایک بہانہ ہیں، اصل مخاطب یا مکتوب الیہ تو مولانا خود ہیں۔ مولانا کے یہ مکاتیب دراصل انشائیے ہیں جن میں موقع محل یا کیفیت (موڈ) کے بموجب مولانا نے اپنے احساسات و تخیلات کی محفل سجائی ہے اور اس کی نقش آرائی ایسے شگفتہ اور دلآویز پیرایے میں کی ہے کہ مولانا کے کمالِ فن کی داد دینی پڑتی ہے۔ اس بزم آرائی یا خود کلامی میں شروانی صاحب کو اتنا دخل ضرور ہے کہ ان کا سیاسی مسلک جداگانہ ہونے کی رعایت سے مولانا نے اس شرابِ دو آتشہ کو سیاسی تلچھٹ سے پاک کر دیا ہے۔ اور اس سلسلے میں یہاں تک احتیاط برتی ہے کہ ۹ اگست ۱۹۴۲ء کی گرفتاری کے اسباب سے بھی اعراض کیا ہے۔ صرف اتنا بتایا ہے کہ کئی دن پہلے سے یہ افواہ گرم تھی کہ کانگریسی کارکنوں کو گرفتار کر لیا جائے گا، کب اور کہاں، یہ ابھی پردۂ راز میں تھا۔ میٹنگ کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد، جب مولانا گیارہ بجے رات اپنی قیام گاہ پر پہنچے تو صاحبِ خانہ نے وثوق سے کہا کہ آج آپ کی گرفتاری یقینی ہے۔ مولانا دن بھر کے تھکے ہارے تھے، سر میں بھی گرانی تھی۔ کسی فکرمندی کا اظہار کیے بغیر سو گئے۔ حسبِ معمول صبح چار بجے آنکھ کھلی، کچھ بیداری کچھ نیند کا غلبہ تھا کہ بلڈنگ کے احاطے میں کاروں کی آمد کا احساس ہوا۔ تھوڑی ہی دیر میں دھیرو (صاحبِ خانہ کا لڑکا) نے جگایا کہ پولیس آگئی ہے۔ مولانا نے بغیر کسی تشویش کے فرمایا "ان سے کہیے تیاری میں کچھ وقت لگے گا۔ پھر غسل کیا، کپڑے بدلے، کچھ خط لکھے۔ اس تیاری میں پانچ بج کر پینتالیس منٹ ہو گئے۔ وقار اور متانت کے ساتھ مولانا نے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا۔" کار باہر نکلی تو صبح مسکرا رہی تھی

سامنے دیکھا تو سمندر بھی اُچھل اُچھل کر ناچ رہا تھا۔"

کار وکٹوریہ ٹرمینس (Victoria Terminus) پہنچی، تو مولانا کو ٹرین میں بٹھا دیا گیا۔ یہاں پتہ چلا کر ان کے دوسرے ساتھیوں کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ "بہت سے آچکے ہیں، جو نہیں آئے وہ بھی آتے جاتے ہیں:

بہت آگے گئے۔ باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔"

ان گرفتار شدگان میں کون کون تھے، مولانا ان کے بارے میں ایک لفظ نہیں بتاتے۔ ساڑھے سات بجے ٹرین اسٹارٹ ہوئی۔ گرفتاری سے پہلے جو افواہیں گرم تھیں، ان کے بموجب گرفتار شدگان کو پونا یا احمد نگر کے قلعے میں رکھا جانا تھا۔ ٹرین کے پونا پہنچنے سے پہلے ایک غیر آباد اسٹیشن پر کچھ ساتھیوں کو اتار لیا گیا۔ مولانا یہاں بھی ساتھیوں کے نام نہیں بتاتے۔ پونا کے بعد اب ان کا احمد نگر پہنچنا یقینی تھا۔ دو بجے کے قریب احمد نگر بھی آگیا اور مولانا کے حافظے کی مشین حرکت میں آگئی۔ اب احمد نگر کی گزشتہ تاریخ کا منظر سامنے تھا۔ یہاں وہ کسی قدر تفصیل سے چاند بی بی کے عزم و شجاعت اور عبدالرحیم خانخاناں کی جواں مردی کے واقعات سناتے ہیں۔ قلعے میں قدم رکھتے ہی انھیں اپنے کمرے میں چارپائی نظر آئی۔ نو مہینے کی نیند اور تھکن کے ساتھ مولانا اس چارپائی پر دراز ہوگئے۔ دوسرے دن صبح تین بجے آنکھ کھلی تو تازہ دم اور چُست تھے۔ انفلوئنزا اور سر کی گرانی رخصت ہو چکی تھی۔ انگیٹھی جلائی، چائے دم دی اور جام و صراحی کے ساتھ اپنے محبوب دوست حبیب الرحمان کے تصور میں ڈوب گئے:

گرچہ دوریم بیادِ تو قدح می نوشیم

اب اسی داستان کو پنڈت نہرو کی زبانی سنیے۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۴۲ء کو اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں:

"ایک مہینہ ایک دن ہوا کہ ہمیں احمد نگر کے قلعے میں لایا گیا۔ ہم بارہ آدمی تھے، مولانا، ولبھ بھائی پٹیل، گوبند بلبھ پنت، محمود، کرپلانی، شنکر دیو، پرفل گھوش، پٹابھی سیتارمیہ، آصف علی، نریندر دیو، ہرے کرشن مہتاب اور میں۔ ہم میں سے دس تو ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے اور دو کو خصوصی طور پر مدعو کر لیا گیا تھا۔ ۷ اور ۸ اگست کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی میٹنگ بمبئی میں ہوئی۔ جو تجویز منظور ہوئی میں اس سے پوری طرح مطمئن تھا۔ اس کے بموجب گاندھی جی کو سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنی تھی۔ شام کو راجہ کے فلیٹ پر کھانا کھایا اور کہیں آدھی رات کے قریب جاکر سوئے۔ ۹ اگست کو صبح پانچ بج کر پانچ منٹ پر اندرا نے جگایا کہ پولیس آگئی ہے۔ نیند جتنی گہری تھی، اتنی ہی تیزی سے اُچاٹ ہوگئی۔ طبیعت میں جھنجھلاہٹ پیدا ہوئی کہ ہم ہمیشہ کی طرح خود کو پولیس کے حوالے نہیں کریں گے۔ لیکن مزاحمت سے کیا فائدہ، پولیس زبردستی کرے گی۔ پھر بھی اطمینان سے شیو کیا، نہائے دھوئے، جیسے کوئی خاص جلدی نہ ہو۔ بینک کے منیجر کو خط لکھ کر، اندرا کو کھاتہ آپریٹ کرنے کے لیے مجاز کیا۔ چائے پی، اتنی دیر میں اندرا نے سوٹ کیس میں کپڑے اور دوسرا ضروری سامان رکھا۔ ڈرائنگ روم میں آنے پر پولیس کمشنر نے وارنٹ دکھایا۔ راجہ کی بھی گرفتاری کا وارنٹ تھا۔ لیکن اس میں ترمیم کر دی گئی تھی کہ راجہ یرودا جیل میں رکھا جائے گا۔ پنت آسانی سے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ انھوں نے انکار کر دیا کہ وہ نیند پوری کرنے سے پہلے نہیں اٹھیں گے۔ بعد انھیں اور ہرے کرشن مہتاب کو پولیس اپنے ساتھ نہیں لے گئی۔ ہم نے اندرا، بے تی بہن، فیروز، چتی، ہرشش اور راجیت کو الوداع کہا۔ مجھے اور راجہ کو علاحدہ علاحدہ کاروں میں بٹھایا گیا۔ صبح کی وجہ سے ہوا میں خنکی تھی اور بمبئی بیدار ہو چلا تھا۔

ہم وکٹوریہ ٹرمینس پہنچے۔ پلیٹ فارم پر رام منوہر لوہیا نظر پڑے۔ علیک سلیک ہوئی۔ اسٹیشن پر ایک خاص گاڑی ہم لوگوں کے لیے تیار کی گئی تھی۔ یہاں سینکڑوں پولیس والے اور انگریز افسر موجود تھے۔ جلدی ہی ہمیں معلوم ہوگیا کہ مہاتما گاندھی، میرا اور مہادیو بھی آگئے ہیں۔ دوسرے ڈبے میں مولانا، آصف علی، محمود، سروجنی نائیڈو، ولبھ بھائی، ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ممبران، نیز بمبئی کانگریس کمیٹی کے دیگر ارکان بی۔ جی۔ کھیر، مرار جی، یوسف مہر علی تھے۔ منی بین بھی تھیں لیکن باہر نہیں تھیں۔ نوری کو بھی پھانس لیا گیا تھا۔ پلیٹ فارم سے باہر ارونا آصف علی اور اجمل خاں کھڑے تھے۔ انھیں گرفتار نہیں کیا گیا تھا بلکہ اسٹیشن پر بھی آنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ پنت کے بغیر گاڑی سات بجے روانہ ہوئی۔ ہم نے ریسٹوراں میں کھانا کھایا۔ یہاں ہمیں پتہ چلا کہ گاندھی جی اور ان کے ساتھیوں کو پونا سے ایک اسٹیشن پہلے اُتار لیا جائے گا۔ ورکنگ کمیٹی کے دوسرے

ہران کی منزل آگئی تھی۔ مولانا، ولبھ بھائی کھیر
ریں گاندھی جی کے پاس گئے اور ان سے
مستقبل کے پروگرام کے بارے میں مشورہ کیا۔
نا اسٹیشن پر کوئی بیس تیس مظاہرین پل پر
گئے تھے انھوں نے جب ہمارے ڈبوں کے
س آنا چاہا تو پولیس نے ان پر ڈنڈے برسائے
صے دیکھا نہ گیا۔ جب میں نے دروازے
سے نکل کر ان تک پہنچنے کی کوشش کی تو پولیس نے
روک لیا۔ میں نے کھڑکی سے کود کر ان مظاہرین
بچانے کی کوشش کی تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو
گیا۔ پولیس والے جیسے تیسے مجھے ڈبے میں لانے
ں کامیاب ہوئے۔ میری دیکھا دیکھی شنکر راؤ
بھی ہنگامے میں شامل ہو گئے تھے۔ انھیں بھی
بردستی ڈبے میں لایا گیا۔

آخرکار احمد نگر پہنچے۔ کچھ بارکوں میں
ہماری رہائش کے لیے انتظام کر دیا گیا تھا مولانا
ا اور میرا کمرہ ملے ہوئے تھے۔ صرف سات
فیٹ اونچی دیوار حائل تھی جو باہمی بات چیت
میں مزاحم نہ ہوتی تھی۔"

مولانا کا ۱۱ راگست ۱۹۴۲ء کا مکتوب
اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ یہ مولانا کی نفسیات،
ان کے فلسفۂ حیات، ان کی غیر معمولی استقامت
اور ناقابلِ شکست قوتِ برداشت کے منبع یا
محرک پر روشنی ڈالتا ہے۔ مولانا طبعاً ایک فلسفی
اور شاعر تھے۔ ان کی نایاب قوتِ حافظہ اور
بے نظیر ذہانت اور فطانت نے انھیں باور کرا دیا
تھا کہ وہ ایک غیر معمولی انسان ہیں اور ان کا یہ
غیر معمولی ہونے کا پندار زندگی بھر ان کے کردار
اور فکر کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہا۔ ان کا کم آمیز
یا خلوت پسند ہونا، دوسروں سے ہٹ کر اپنے لیے
ایک علاحدہ اور ممتاز راہ اختیار کر لینا، مصائب
اور مشکلات کے وقت ثابت قدمی اور قوتِ
برداشت کا مظاہرہ کرنا، یہ سب ان کی عبقریت
کی جلوہ نمائیاں ہیں۔ دیکھا جائے تو ان کا منفرد
اور جمالیاتی اسلوب بھی اسی احساسِ برتری کا
پروردہ ہے۔ ان کے شاعرانہ مزاج نے جہاں
ان میں لطافتِ بیان کا ذوق پیدا کیا وہاں ان
کے فلسفیانہ دماغ نے انھیں ہر شے کی حقیقت
کا مشاہدہ کرنے اور ہر معاملے کی تہہ تک پہنچنے کا
شعور بخشا۔ فلسفے کے مطالعے نے ان میں روحانیت
پیدا کی اور وہ رنج و الم کے حادثات کو ایک
بلند سطح سے دیکھنے لگے۔ لیکن انھیں احساس
ہوا کہ رواقیت کی فراہم کردہ تسکین ایجابی
نہیں، سلبی ہوتی ہے اور ہمیں اطمینانِ قلب
مہیا کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ اس کے برعکس
آلام و مصائب میں مذہب، عقیدہ ہمیں سہارا
دیتا ہے۔ یہ ہمیں سکھاتا ہے کہ زندگی ایک فریضہ
ہے، ایک فرض داری ہے جس سے عہدہ برآ
ہونا ضروری ہے۔ زندگی کا راستہ کانٹوں سے
بھرا ہوا ہے اور کانٹوں کی چبھن میں ہمیں لذت
ملنے لگتی ہے، اگر کوئی مقصد اپنے حصول کے
لیے ہمیں ابھارتا ہے۔

اس فلسفۂ حیات سے اکثر سیاستداں
واقف ہوتے ہیں۔ اصل مدعا تو اسے عملی جامہ
پہنانا یا ان اعلا اصولوں کی کسوٹی پر پورا اترنا ہے۔
یہ سوچنا کہ مولانا کے پیشِ نظر اپنے وطن کی آزادی
تھی اور جس دن انھوں نے سیاست میں قدم
رکھا تھا، اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ انھیں ہر طرح
کی آزمائشوں اور کلفتوں سے گزرنا ہوگا۔ یہ مقصد
تو ہندوستان کے دوسرے رہنماؤں کے بھی
پیشِ نظر تھا۔ پھر ان میں مولانا کی سی مثالی
استقامت اور قوتِ برداشت کیوں نہیں ملتی؟
اس کے جواب میں اس کے سوا اور کیا کہا جائے
کہ یہ توفیقِ خداوندی ہے جس کے حصے میں
آجائے۔

۹ راپریل ۱۹۴۳ء کو مولانا کی اہلیہ کا
انتقال ہو گیا۔ مولانا کے کوئی اولاد نہ تھی ان کی وابستگی
اور محبت کا مرکز صرف زلیخا کی ذات تھی جو ان پر
جان چھڑکتی تھی اور جس کی اصل بیماری مولانا کی
جدائی تھی۔ مولانا گھر پر ہوتے اور ان کی تیمارداری
اور دیکھ بھال کرتے تو شاید یہ حادثہ پیش نہ آتا
یا کچھ اور مدت کے لیے ٹل جاتا۔ مولانا کو ان کی
خطرناک حالت کا علم تھا۔ مولانا کو حق نہیں ان
کے رفقا حتیٰ کہ جیلر بھی ان کے درد میں شریک
تھا۔ مولانا کی رہائی اور زلیخا کا آخری دیدار کرنے
کے لیے ضابطے کے مطابق بیگم کی تشویشناک
حالت کو گورنمنٹ کے نوٹس میں لانا ضروری تھا
لیکن مولانا کی خودداری اور ضبطِ نفس نے گوارا
نہ کیا کہ وہ سرکار سے اپنی رہائی کے لیے درخواست
کریں۔ مولانا کی عدم موجودگی میں زلیخا نے دم
توڑ دیا۔ اس حادثے نے مولانا کے وجود کو
ہلا کر رکھ دیا لیکن مولانا کے ضبطِ نفس اور
وضع داری کو دیکھ کر دل دہل جاتا ہے کہ اس
گمبھیر حالت میں بھی انھوں نے اپنے معمولات
اور ظاہرداری کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ مولانا
نے اعتراف کیا ہے:

"اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو

حال رہا۔ میں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میری کوشش تھی کہ اس صورت حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کروں۔ اِس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن شاید باطن نہ ہو سکا۔"

مولانا کے رفقا کے لیے بھی اس غم کی تاب لانا مشکل تھا۔ اپنے ۹ر اپریل ۱۹۴۳ء کے خط میں جواہر لال نے اندرا کو لکھا ہے:

"خط لکھنے کے دوران مولانا کی بیوی کی وفات کی خبر ملی۔ یوں تو ہم پہلے ہی اس بُری خبر کے سننے کے لیے تیار تھے۔ لیکن یہ حادثہ اتنی جلدی رونما ہوگا اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ ان کی طبیعت عرصے سے اچھی نہیں تھی۔ اور دو مہینے پہلے وہ صحت یابی کے خیال سے پہاڑ پر جانے کے لیے سوچ رہی تھیں شاید ان کی حالت میں یکایک تغیر ہوا۔ ان کی وفات سے ہم سب کو صدمہ ہوا اور مولانا کی حالت کا تم خود اندازہ کر سکتی ہو۔ ادھر کئی مہینوں سے مجھے انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ میں جانتا ہوں وہ کتنے بڑے عالم ہیں۔ ان کے مشورے میرے لیے کتنے دانشمندانہ ہوتے ہیں۔ وہ ایک بڑے دلیر اور با اخلاق انسان ہیں اور ایک ایسی اعلا تہذیب اور شرافت کا پیکر ہیں جو آج کے دور میں عنقا ہے۔ مجھے اس سانحے سے سخت تکلیف پہنچی ہے۔ کاش میں ان کی کچھ مدد کر سکتا لیکن میں کیا کر سکتا ہوں۔ میری تو ہمت بھی نہیں پڑتی ان کے پاس جانے کی۔"

۱۳ر اپریل کی ڈائری میں لکھا ہے:

"اس ہفتے میں مولانا کا پانچ پونڈ وزن کم ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے چھے ہوا ہو۔ اس طرح آج تک ان کا تیس پونڈ وزن کم ہوا ہے۔ ظاہر میں تو وہ پُرسکون، خاموش اور باوقار نظر آتے ہیں لیکن جھریوں سے اُن کے چہرے کا دُبلا پن ٹپکنے لگا ہے۔"

اتنا کچھ لکھنے کے بعد بھی ان کے دل کا بار ہلکا نہیں ہوا۔ ۹ر اپریل ۱۹۴۳ء کو اپنی بہن کو لکھتے ہیں:

"مولانا کی بیگم کی رحلت کا ہم سب کو بہت صدمہ ہوا۔ کافی دن تک در و دیوار سے مایوسی ٹپکتی رہی۔ حسبِ معمول مولانا کا رویہ قابلِ تعریف رہا۔ لیکن ان کی ظاہر داریاں ان کے قلب کے اضطراب کو نہیں چھپا سکیں۔ وہ بہت دُبلے ہو گئے ہیں۔ اور ان کے چہرے پر جھرّیاں پڑ گئی ہیں۔ مجھے ان کی بہت فکر ہے ایسے لوگ جو حسّاس ہوتے ہیں اور اپنے غم اور تاثرات کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں وہ اپنی ذات کو سخت نقصان پہنچاتے ہیں۔ کاش میں ان کی کچھ مدد کر سکتا اور ان کے کام آسکتا لیکن یہاں اس کا موقع نہیں۔"

مولانا فطرتاً کم آمیز اور خلوت پسند تھے۔ ان کے دوستوں میں دو نام بہت نمایاں ہیں۔ حبیب الرحمان شروانی اور پنڈت نہرو۔ اگر غبارِ خاطر کے تمام خطوط شروانی صاحب کے نام نہ لکھے گئے ہوتے تو شاید ہمیں ان کی دوستی کا علم بھی نہ ہوتا۔ پنڈت نہرو سے البتہ ان کی تیس چالیس سال کی رفاقت رہی۔ کانگریس کمیٹی کی برسہا برس کی مجالست کے علاوہ ۱۹۴۲ء سے لے کر ۱۹۵۸ء تک تو کہنا چاہیے کہ وہ شب و روز ایک دوسرے سے قدم ملا کر چلے۔ 'ہماری آزادی' یا 'انڈیا ونس فریڈم' کا پنڈت نہرو کے نام انتساب ملی ہے کہ تا ہے کہ پنڈت جی ان کی نظروں میں کتنے عزیز اور محترم تھے۔ کانگریس کی تجویزوں میں وہ اکثر ہمارے نظر آتے ہیں۔ اس کے باوجود غبارِ خاطر میں ان کا نام صرف پانچ جگہ نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس پنڈت نہرو کی منتخب تحریروں میں مولانا آزاد کا ذکر چودہ اس جگہ آیا ہے۔ ان میں سے تین مقامات پر تو پنڈت جی کی خوش مذاقی، مستعدی، ہمدردی اور دل سوزی ٹپکتی ہے اور بقیہ دو جگہ وہ ذہنی طور پر عوام کی صف میں بیٹھے نظر آتے ہیں۔ اپنی سحر خیزی کے ضمن میں مولانا فرماتے ہیں:

"اگر اس وقت سناٹے میں کوئی آواز مخل ہو رہی ہے تو وہ جواہر لال کے ہلکے خراٹوں کی آواز ہے۔ وہ ہمسائے میں سو رہے ہیں صرف لکڑی کا ایک پردہ حائل ہے۔ خراٹے جب تھمتے ہیں تو حسبِ معمول نیند میں بڑبڑانے لگتے ہیں۔ بڑبڑانا ہمیشہ انگریزی میں ہوتا ہے۔ یہ نیند میں بڑبڑانے کی حالت بھی عجیب ہے یہ عموماً ایسی طبیعتوں پر طاری ہوتی ہے جن میں دماغ سے زیادہ جذبات کام کرتے ہیں جواہر لال کی طبیعت سرتاسر جذباتی واقع ہوئی ہے۔"

نیند میں خراٹے لینا اور بڑبڑانا جواہر لال کی عادت میں داخل تھا کبھی کبھار ان کے پڑوس میں سونے والے ان کی اس حالت سے بہت پریشان ہوتے تھے۔ خود جواہر لال کو بھی اس کا احساس تھا لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سوتے میں ان کی یہ حالت کیوں ہو جاتی ہے۔ اور اس سے کس طرح نجات حاصل کی

ے. اس سلسلے میں ۱۷ر جون ۱۹۴۲ء کی
ما میں ایک دلچسپ اندراج ملتا ہے:
" پچھلی راتوں میں بہت زور سے چیخا
اور کراہا۔ اس سے میرے پڑوسیوں کو بڑی
ت ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ میں بڑا خطرناک
مہ برپا کر دیتا ہوں۔ سوتے میں بہت
ؤنے اور خطرناک خواب مجھے ستاتے ہیں لیکن
ے ہی وہ کافور ہو جاتے ہیں۔ سوتے میں کبھی کبھی
نجانے تخیلی اور خوفناک ملک میں پہنچ جاتا
یں نہیں جانتا مجھے کیا چیز ستاتی ہے اور
ے لاشعور پر کون حاوی ہو جاتا ہے۔ کیا یہ
اقعات کا تسلسل ہے جن سے مجھے پچھلی چوتھائی
ی میں واسطہ رہا ہے۔ یا یہ میرے بچپن کی کوئی
اگرہ ہے جس کی کشادگی اب میرے لیے
ں نہیں۔ میرے بچپن میں کوئی چیز جس نے
رے دماغ پر اس طرح دسترس حاصل کر لی ہو مجھے
ق یاد نہیں آتی۔ ہاں مجھے بہت سی چیزیں
نے بچپن کی انجانے میں یاد آتی ہیں جن کے بارے
سوچتا ہوں اگر وہ یوں نہ ہوتیں تو اچھا ہوتا
ن ان سب کو میرے ڈراؤنے خوابوں اور
نے چلانے سے کیا واسطہ۔

سوتے میں چیخنا چلانا میری پرانی عادت
ے۔ کملا اکثر مجھے اس کے بارے میں بتایا کرتی
ں۔ جیل میں بھی کبھی کبھی ایسا ہی ہوا ہے کہ پ
گفتگو کے دوران میں بہت زور سے چیخا چلایا
ا تو راجن بابو دوڑتے ہوئے یہ دیکھنے آئے
ے کہ کس بیماری نے میری یہ درگت بنا دی ہے۔
بچپن کا ایک خواب مجھے اکثر یاد آتا ہے
راسے میں مختلف شکلوں میں دیکھتا رہا ہوں۔
کوئی خطرناک جانور میرا پیچھا کر رہا ہے۔ کوئی ایسا جانور جس کی میں ٹھیک سے نشان دہی نہیں کر سکتا۔ میں خوب تیزی سے بھاگ رہا ہوں۔ میری تیزی کے باوجود وہ قریب تر آتا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ میں ایک عمارت میں داخل ہو کر ایک مینار پر چڑھ جاتا ہوں۔ اور اس میں اندر سے تالا لگا لیتا ہوں۔ لیکن ایک کھڑکی یا روشن دان میں سے ایک ہاتھ مجھے پکڑنے کے لیے نکلتا ہے۔ ہاتھ میں ایک خنجر بھی ہے۔ اب اس کمرے سے باہر نکلنے کا میرے لیے کوئی راستہ نہیں۔ یہ ہاتھ مجھے پکڑنے کے لیے نزدیک تر آتا جا رہا ہے۔ میری آنکھ کھل جاتی ہے، تمام جسم پسینے میں شرابور ہوتا ہے۔ ڈر کے مارے بس دم نکلنا ہی باقی رہ جاتا ہے۔

یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے۔ کیا اس کے پیچھے کوئی ذہنی دباؤ ہے۔ کیا اس کی نوعیت جنسیاتی ہے۔ جزوی طور پر ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ لیکن یہ اصل سبب نہیں ہے۔ کیا یہ سیاسی حالات کا پیدا کردہ بے بسی کا احساس ہے۔ شاید ایسا ہو۔"

مولانا چائے کے بڑے رسیا تھے اور چائے بھی چین کی وائٹ جیسمن (WHITE JAS-MINE) ۔ جسے چینی اور دودھ سے آلودہ کرنا گوارا نہیں تھا۔ اور اس کے مقابلے میں جواہر لال نہرو کی دودھ اور شکر میں پروردہ لیپچو دیپچو کو نظرِ تمسخر دیکھتے تھے۔ آخر یہ گوری چنبیلی کہاں تک نباہ کرتی اور وہ بھی جیل میں۔ ایک دن ساتھ چھوڑ گئی۔ مولانا کی بے کیفی کا دور شروع ہوا اور ہر شے میں کسی شے کی کمی محسوس کرنے لگے۔ چیتہ خاں نے احمد نگر اور پونا کے بازاروں میں تلاش کرائی مگر بازاری جنس کہیں سے ہاتھ نہ آئی۔ ایک مہینے کی محرومی اور انتظار کے بعد بمبئی کے آرمی اینڈ نیوی اسٹور نے چیتہ خاں کے توسط سے ایک پونڈ کا پارسل بذریعہ وی۔ پی بھیج دیا۔ چیتہ خاں نے اس کی گرانی کی شکایت کی۔ شوق سود و زیاں کو کب خاطر میں لاتا ہے۔ مولانا حیران تھے اتنی سستی کیسے ہاتھ آگئی۔ طلبِ صادق نے بمبئی کے کچھ دوستوں سے بھی چند ڈبے فراہم کرا دیے۔ یہاں بھی مولانا نے دوستوں کے نام نہیں بتائے ہیں۔ بعد میں جواہر لال کے کہنے پر ان کی بہن نے بمبئی سے ایک پیکٹ اور بھجوا دیا۔ اب کیا تھا صبح آنکھ کھلتے ہی مولانا تھے اور دورِ نا و نوش۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس سرخوشی کے عالم میں، مولانا ایسا کلچرڈ اور شائستہ انسان جواہر لال کی بہن اور ان کا شکریہ ادا کرنا بھول گیا۔

مولانا کی دوسری تصنیفات کے علاوہ غبارِ خاطر بھی ان کے وسیع مطالعے اور محیر العقل حافظے کی شہادت فراہم کرتی ہے۔ چائے کا ذکر آتا ہے تو یہ پہلے کہاں پیدا ہوئی۔ کن کن ملکوں میں اور کب کب اس کا استعمال اور رواج شروع ہوا اور مختلف وقتوں اور مزاج کے لوگوں نے اس کے استعمال میں کیا کیا تبدیلیاں کیں۔ پھولوں پر نظر جاتی ہے تو ایک پورا دبستان کھل جاتا ہے۔ احمد نگر کے داخلے کے ساتھ، احمد نگر کی گزشتہ تاریخ ان کے سامنے اپنا سینہ کھول دیتی ہے۔ موسیقی کے دربار میں پہنچتے ہی گمان ہوتا ہے رامش و رنگ اور اس کی معلمی کے آداب تک سے وہ واقف ہیں۔ ان کے غیر معمولی حافظے کو دیکھ کر یہ خیال

ہوتا ہے کہ اب ایسے لوگ پیدا نہیں ہوں گے۔ اور قدرت نے وہ سانچا ہی توڑ دیا جس میں ان کا وجود ڈھالا تھا۔ اپنے متعلق قدرت کی ان بے پایاں فیاضیوں کا انھیں خود بھی احساس تھا اور ان کی نمود و نمائش میں مسرت اور فخر محسوس کرتے تھے اور یوں سوچتے اور ظاہر کرتے تھے جیسے لوگ منتظر رہتے ہوں کہ کوئی کلمہ ان کی زبان سے نکلے اور وہ اُسے زبان زدِ خاص و عام بنا لیں۔ چینیہ خاں کے بارے میں کہتے ہیں:

"پھر جس دن انسپکٹر جنرل آیا اس دن ایک اور شخص بھی اس کے ہمراہ آیا۔ معلوم ہوا آئی۔ ایم۔ ایس سے تعلق رکھتا ہے۔ میجر ایم سینڈک (MAJOR M.SENDUK) نام ہے میں نے جی میں کہا یہ سینڈک بینڈک کون کہے کوئی اور نام ہونا چاہیے جو ذرا مانوس اور رواں ہو۔ معاً حافظے نے یاد دلایا کہیں نظر سے گزرا تھا کہ چاند بی بی کے زمانے میں ایک قلعے کا قلعے دار چینیہ خاں نامی ایک حبشی تھا۔ میں نے ان حضرت کا نام چینیہ خاں ہی رکھ دیا۔ ابھی چار دن بھی نہ گزرے تھے کہ یہاں ہر شخص کی زبان پر یہی نام تھا۔ قیدی اور وارڈرز بھی اسی نام سے پکارنے لگے۔"

لیکن پنڈت نہرو کی ڈائری میں ایم سینڈک کا نام چوبیس جگہ آیا ہے۔ کہیں بھی ان کے قلم سے اس کا نام چینیہ خاں نہیں نکلا۔

چینی چائے کی تلاش میں چینیہ خاں نے چینی ریستوراں میں خالی ڈبّے بھیج کر دریافت کرایا کیا یہ چائے ان کے یہاں مل سکتی ہے۔ انھوں نے ڈبّہ دیکھتے ہی کہا کہ یہ چائے کہاں مل سکتی ہے لیکن یہ ڈبّہ کہاں سے ملا اور اس چائے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ کیا چین کا کوئی بڑا آدمی آ رہا ہے۔ جو وارڈر گیا تھا اس نے بہ حیثیت باتیں بنائیں مگر ان کی تشفی نہیں ہوئی۔ دوسرے دن سارے شہر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ میڈم چیانگ کائی شیک (MADAM CHIANG KIA-SHEK) قلعے کے قیدیوں سے ملنے آ رہی ہیں۔ اور اس لیے چینی چائے کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ میڈم چیانگ کائی شیک ان دنوں علاج کے لیے انگلینڈ آئی ہوئی تھیں اور جواہر لال نے انھیں ۱۲ دسمبر ۱۹۴۲ء کو ایک خط لکھا تھا جسے گورنمنٹ نے روک لیا اور میڈم تک نہیں جانے دیا۔ مولانا کی چائے کا ذخیرہ تقریباً ۸ دسمبر ۱۹۴۲ء کو ختم ہو گیا تھا۔ اور ۵ جنوری ۱۹۴۳ء کو انھیں بمبئی سے چائے کا پیکٹ موصول ہوا۔ مولانا فرماتے ہیں: دوسرے دن ہی سارے شہر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ میڈم چیانگ کائی شیک قلعے کے قیدیوں سے ملنے آ رہی ہیں جبکہ اس افواہ کی بھنک سے بھی جواہر لال کے کان آشنا نہیں ہوئے۔

مولانا کی ایک خوبی اور ہے۔ وہ اپنے متعلق بہت کچھ بتانے کے باوجود بہت کچھ چھپا جاتے ہیں۔ داغ کے الفاظ میں ایسے اہتمام سے وہ چلمن کے قریب بیٹھے ہیں کہ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔ فرماتے ہیں: "گرفتاری چونکہ سفر کی حالت میں ہوئی تھی اس لیے مطالعے کا کوئی سامان ساتھ نہ تھا۔ صرف دو کتابیں میرے ساتھ تھیں جو سفر میں دیکھنے کے لیے رکھ لی تھیں۔ اسی طرح دو دو کتابیں بعض ساتھیوں کے ساتھ آئیں۔ یہ ذخیرہ بہت جلد ختم ہو گیا اور مزید کتابیں منگوانے کی کوئی راہ نہیں نکلی۔ لیکن پڑھنے کے سامان کا فقدان ہوا تو لکھنے کے سامان کی کوئی کمی نہیں ہوئی۔ کاغذ کا ڈھیر میرے ساتھ ہے اور روشنائی کی احمد نگر کے بازاروں میں کمی نہیں۔ تمام دن خامہ فرسائی میں خرچ ہوتا ہے۔ . . . . میرا دوسرا وقت دوپہر کا ہوتا ہے۔ زیادہ وضاحت کے ساتھ کہوں کہ زوال کا ہوتا ہے۔ لکھتے لکھتے تھک جاتا ہوں تو تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جاتا ہوں پھر اٹھتا ہوں۔ غسل کرتا ہوں۔ چائے کا دور تازہ کرتا ہوں اور تازہ دم ہو کر اپنی مشغولیتوں میں گم ہو جاتا ہوں:"

ترجمان القرآن کی پہلی جلد شائع کردہ ساہتیہ اکادمی نئی دہلی کے دیباچۂ ثانی جو ۸ فروری ۱۹۴۵ء کو لکھا گیا، سے پتہ چلتا ہے کہ "مولانا نے اس جلد کے پورے حصے پر نظر ثانی کی ہے اور ہر دوسری یا تیسری سطر میں کوئی نہ کوئی تبدیلی کی ہے" لیکن مولانا کی اس دن بھر تسوید و تحریر اور چوتیس مہینے کے مسلسل انہماک کو دیکھتے ہوئے ان کا یہ سرمایہ ناکافی معلوم ہوتا ہے اور قیاس چاہتا ہے کہ مولانا نے اور بھی بہت کچھ لکھا ہوگا جو ان کے بھتیجے نورالدین کے یہاں چلا گیا یا کہیں اور محفوظ ہے اور نذر تغافل ہو رہا ہے۔ اسی طرح مولانا نے اپنے عزیز و اقارب کو جو خط لکھے تھے وہ بھی ہمارے علم کی دسترس سے باہر ہیں۔ مالک رام صاحب نے "ایوانِ اردو" میں مولانا کے متعلق مزید کام کرنے کے جو مشورے دیے ہیں ان میں ہمارا کام ان تحریروں کو بالاستیعاب تلاش کر کے اور انھیں اگر مکمل طور پر شائع کرنا ممکن نہ ہو تو ان میں سے مفید اور مستقل پائیدار

ریرات کا انتخاب ضرور شائع کرنا چاہیے[1]۔ ہم
ھتے ہیں پنڈت نہرو نے اس اسیری کے دوران
نچ سو نوے صفحے کی "تلاشِ ہند"
(DISCOVERY OF INDIA) لکھی
ان کے پانچ مہینے کا کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ
کی مختلف تحریرات کا مجموعہ دس طویل نوٹ
س پر مشتمل ہے جس کے انتخاب سے چھ سو چالیس
ات کی یہ ڈائری مرتب کی گئی ہے۔ پنڈت نہرو
تلف دلچسپیوں اور سرگرمیوں کے انسان تھے۔
ن کا بڑا وقت مطالعے، باغبانی اور اپنے رفقا
نگرانی اور تیمارداری پر صرف ہوتا تھا۔ اس
باوجود ان کی تحریرات کا یہ ضخیم ذخیرہ ہمارے
امنے موجود ہے۔ مولانا اس کے برعکس طبعاً
وت پسند تھے علمی اور ادبی انہماک ان کی زندگی
محبوب مشغلہ تھا۔ کس جوش اور ولولے سے فرماتے

ہیں: "میں آپ کو بتلاؤں۔ میرے تخیل میں عیش
زندگی کا سب سے بہتر تصور کیا ہو سکتا ہے۔
جاڑے کا موسم ہو اور جاڑا بھی قریب قریب
درجۂ انجماد کا۔ رات کا وقت ہو، آتش دان میں
اونچے اونچے شعلے بھڑک رہے ہوں اور کمرے
کی ساری مسندیں چھوڑ کر اس کے قریب بیٹھا ہوں
اور پڑھنے لکھنے میں مشغول ہوں۔"

یہ پُرمسرت دور احمد نگر کے قلعے میں انھیں
تین سال تک حاصل رہا۔ اس عرصے میں سیاست
کے کانٹے کی خلش سے ان کے دل و دماغ محفوظ
رہے۔ ظاہر ہے اس صورت میں ان کی تخلیقات
کا خرمن پنڈت نہرو کے ڈھیر سے زیادہ وزنی ہونا
چاہیے۔ کیفیت اور کمیت دونوں لحاظ سے۔
کاش ساہتیہ اکادمی یا اُردو کی کوئی دوسری اکادمی
اس عظیم ذخیرے کی بازیافت اور اس کو منظرِ عام
پر لانے کی مہم کو اپنے مشن میں شامل کرلے۔

ہاں ذکر تھا مولانا کی چھُپ کر خود نمائی
کرنے کی ادا کا۔ بقول حسرت موہانی:

اس نے چھپ کر جو خود نمائی کی
انتہا تھی یہ دل رُبائی کی

مولانا اپنے حافظے کے کرشموں سے ہمیں
حیران کرنے کے لیے بعض حقائق پر دانستہ پردہ
ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً مذکورہ بالا
اقتباس میں "احمد نگر کے قلعے میں ان کے ساتھ
صرف دو کتابیں گئی تھیں، دو ایک کتابیں باقی
رفقا کے ساتھ تھیں جنھیں انھوں نے چند دن میں
ختم کرلیا اور مزید کتابیں منگوانے کی کوئی راہ نہ
نکلی"، مولانا ہمیں یہ نہیں بتاتے کہ پنڈت نہرو
درجنوں کتابیں ایک وقت میں منگواتے تھے۔ انھیں

خود تو وہ شوق سے پڑھتے ہی تھے، دوسرے رفقا
بھی ان سے محظوظ یا مستفید ہوتے تھے۔ چنانچہ ہم
دیکھتے ہیں ۱۲ مارچ ۱۹۴۳ء کو اکتالیس کتابیں
انھوں نے یک مشت اندرا کو پڑھنے کے لیے بھیجی تھیں۔
اسی طرح ۹ جنوری ۱۹۴۳ء کے خط میں انھوں نے
اپنی بہن کو ایوری مینس لائبریری کی متعدد کتابیں
بھیجنے کے لیے لکھا تھا۔ ۵ دسمبر ۱۹۴۳ء کے خط میں
مولانا نے فرانسیسی مجاہد زو۔ این۔ ویل کے
متعلق جو کچھ خامہ فرسائی کی ہے اس کا آغاز
اس طرح کیا ہے گویا یہ کتاب برسوں پہلے ان کے
مطالعے میں آئی تھی اور محض حافظے کی بنا پر اس
کے نقوش تازہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ دبی زبان
سے وہ اس کا اعتراف کرتے ہیں ـــــ
"ایک عرصے کے بعد مجھے اس کتاب کے دیکھنے کا
یہاں پھر اتفاق ہوا ایک رفیقِ زنداں نے ایوری
مینس لائبریری کی کچھ کتابیں منگوائی تھیں۔ ان
میں یہ بھی آگئی"۔ یہاں وہ پنڈت نہرو کے نام کو
ظاہر نہیں کرتے اور اس طرح اس کتاب کے
مضمون پر خامہ فرسائی کرتے ہیں گویا ان کا حافظ
پچھلے بھولے بسرے مناظر کو ہمارے سامنے پیش کر رہا ہو۔ جد
یہ ہے کہ غبارِ خاطر میں کہیں یہ ذکر نہیں ملتا کہ ترجمان القرآن
کی پہلی یا دوسری جلدیں انھوں نے کلکتے سے منگوائی تھیں اور
نہ ان کے مکتوبات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شب و روز
منہمک رہ کر جو انھوں نے خامہ فرسائی اور جاں فشانی کی
تھی، اس کا موضوع کیا تھا اور کتنا عظیم ذخیرہ وہ ہماری
رہنمائی اور استفادے کے لیے چھوڑ گئے ہیں۔

مولانا کی علمی فضیلت، ان کی قاموسی
معلومات، ان کے سیاسی فہم و تدبر، ان کے بے
مثال ضبطِ نفس اور غضب کی قوتِ حافظہ کو

---

[1] مولانا غلام رسول مہر نے جامعہ فروری ۱۹۸۸ء
نمبر ۱۳ میں لکھا ہے: "مولانا کے عزیزوں میں سے بمبئی والے
احب (طاہر خاں صاحب) زیادہ ذی وسائل اور صاحب
بیر تھے خیال یہ ہے کہ ان کے قبضے میں کوئی چیز آجاتی تو وہ
وہ دیر تک دبائے نہ بیٹھے رہتے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ شروع
مسودات کے متعلق عدالت کا فیصلہ ہونے تک وہ مصلحتاً
وش رہے ہوں۔ وراثت کا فیصلہ نور الدین کے حق میں
جانے کے بعد اس وجہ سے خائف ہوں کہ کوئی قدم اشاعت
لیے اٹھانے میں حکومت کی طرف سے ان کے خلاف
روائی شروع ہو جائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ یہی صورت
س آئی۔ اگر مولانا مہر کا یہ قیاس صحیح ہے تو ہمیں طاہر صاحب
رجوع کرنا چاہیے۔ ان دستاویزات کا حصول اور ان کی
اعت فکریات میں ایک اہم اضافہ ہوگا۔

غبارِ خاطر کے مقابلے میں، پنڈت نہرو کی ڈائری زیادہ اجاگر کرتی ہے۔ اس سے خود پنڈت نہرو کی متحرک اور فعال شخصیت بھی بے نقاب ہو کر اس طرح ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ تکلفات کے سارے پردے چاک ہو جاتے ہیں اور شاید پہلی بار ہمیں علم ہوتا ہے کہ اردو شعر و ادب اور اس زبان کی تحصیل کے لیے کیسا زندہ شوق اور ولولہ ان کے قلب میں موجزن تھا۔ آئیے اس آئینے میں دلوں کو تسخیر کرنے والے اس جادوگر کی تصویر دیکھیں جس کا مثیل مولانا آزاد کی طرح آئندہ چند صدیوں میں پیدا ہوتا نظر نہیں آتا۔ اپنے روزانہ کے پروگرام کے متعلق ہمیں بتاتے ہیں:

" صبح پانچ بجے اٹھتا ہوں۔ چند منٹ کے لیے ہلکی ورزش، آسن وغیرہ کرتا ہوں۔ اس کے بعد کوئی ایک گھنٹے تک پودوں کو پانی دیتا ہوں۔ میں یہ تحریر کرنا تو بھول ہی گیا کہ اپنے صحن میں کوئی چوتھائی میل تک دوڑ بھی لگاتا ہوں۔ اس سے میرے اعضا میں بغیر تکان کے چستی آجاتی ہے۔ اس کے بعد شیو کر کے نہاتا ہوں اور ساڑھے سات بجے ناشتے کے لیے تیار ہو جاتا ہوں۔ آٹھ سے لے کر گیارہ بجے تک کسی ضخیم کتاب کے مطالعے میں غرق ہو جاتا ہوں۔ کھانے سے فارغ ہو کر بارہ سے ایک بجے تک محمود سے اُردو پڑھتا ہوں۔ ایک سے لے کر تین بجے تک اخبارات یا تفریحی قسم کا لٹریچر پڑھتا ہوں۔ کبھی کبھی اس دوران میں سو بھی جاتا ہوں۔ تین سے چار بجے تک نرنیدر دیو سے کاویری کا ترجمہ سنتا ہوں۔ ساتھ میں چائے کا دور چلتا رہتا ہے۔ ساڑھے چار بجے سے لے کر ۵ بجے تک محمود کو ہندی پڑھاتا ہوں۔ اس کے بعد اپنے باغیچے میں گھومتا ہوں۔ سید منٹ ٹہلتا ہوں۔ گپ شپ ہوتی ہے۔ چونکہ کرکٹ میں شامل ہو جاتا ہوں۔ وہاں سے فارغ ہو کر دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مولانا سے بات چیت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ بعد میں پڑھنا شروع کرتا ہوں اور رات کو ساڑھے دس بجے بستر پر دراز ہو جاتا ہوں۔ اس طرح خود فراموشی یا خوابوں کی دنیا میں پہنچ جاتا ہوں۔ کبھی کبھی نیند میں دورہ بھی پڑتا ہے —— میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ کھانے کے علاوہ ہم سب کے پروگرام مختلف ہیں۔ مولانا اکثر ساڑھے تین بجے اٹھتے ہیں اور کبھی کبھی اس سے بھی پہلے۔"

اسی خط میں اندرا کو لکھتے ہیں کہ تم نے ہر خط میں مجھے اُردو کا شعر لکھنے کے لیے کہا تھا لیکن میں نے اس پر اس لیے عمل نہیں کیا کہ اُردو یا ہندی کے خطوط سنسر والے روک لیتے ہیں۔ وہ ان میں کچھ خفیہ معنی پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ غالب کے اشعار قدرے مشکل ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں اردو کی ہلکی پھلکی شاعری زیادہ مفید رہے گی۔ ذیل میں دو اشعار لکھ رہا ہوں۔ ایک غالب کا ہے دوسرا نظم طباطبائی کا:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اس طرح طے کی ہیں ہم نے منزلیں
گر گئے، گر کر اُٹھے، اُٹھ کر چلے"

اشعار لکھنے کے بعد عموماً انگریزی میں ان کا ترجمہ بھی کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ کوئی ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔ اس طرح میر، درد، غالب، ذوق، حالی، اقبال کے بارے میں بڑی حد تک متعدد شعراء کے ۱۹ اشعار وغیرہ کی شرح سے ڈائری بھری پڑی ہے۔

ڈائری سے معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی نے مولانا سے جدید فارسی پڑھنے کی بھی کوشش کی تھی۔ اس سے متعلق متعدد فارسی لغات کے معنی اور ساتھ کئی ایک فارسی شعروں کے ترجمے بھی ملتے ہیں۔

مولانا نے چڑیوں کی بولی بھی سیکھی تھی۔ اپنے حسنِ طبیعت اور قلم کی جولانیوں کا یہ مظاہرہ قید میں کر دیا ہے۔ مولانا بے حد شفقت اور خلوص سے پیش آتے۔ وہ چڑیاں تین ماہ تک مانوس ہو گئی تھیں اور ان کو دانہ کے شانوں اور کندھوں پر بیٹھنے میں کوئی خوف نہیں محسوس ہوتا تھا اور وہ بلا تکلف ان کے گرد منڈلایا کرتی تھیں۔ دانے چگتے ہوئے جب ان کی نگاہیں مولانا کی نگاہوں سے ملتیں تو گویا راز و نیاز کی باتیں شروع ہو جاتیں۔ ان نورانی واقعات کا تذکرہ خود مولانا کی زبانی سنیے، فرماتے ہیں:

" موٹی ایک چڑیا کا نام رکھ دیا تھا کیونکہ ہم دام قفس تمہارے سے موسوم کر سکتے ہیں —— چھریرا بدن، نکلتی ہوئی گردن، کٹی ہوئی دم اور گول گول آنکھوں میں ایک عجیب بھولا پن۔ جب وہ دانہ چگنے کے لیے آئے گی تو ہر دانے پر میری طرف دیکھتی جائے گی۔ ہم دونوں کی زبانیں خاموش رہتی ہیں، مگر نگاہیں گویا ہو گئی ہیں۔ وہ میری نگاہوں کی بولی سمجھنے لگی ہے۔ میں نے اس کی نگاہوں کو پڑھنا سیکھ لیا ہے . . . . بہر حال اس موقعے پر بھی اس کی بے ساختہ نگاہوں نے مجھ سے کچھ کہا اور بغیر کسی جھجک کے جست لگا کر انگوٹھے کی جڑ پر آ کھڑی ہوئی اور دانوں پر چونچ مارنا شروع کر دیا۔



یہ چونچ نہیں تھی نشتر کی نوک تھی جو اگر چاہتی تو ہتھیلی کے آر پار ہو جاتی مگر صرف چیر کے لگا کر رُک جاتی تھی۔"

میں نے شروع میں کہا تھا "منتخبات نہرو" غبارِ خاطر کا تکملہ ہے۔ اب بقیہ داستان نہرو کی زبانی سنیئے "ایک ہفتے پہلے یہاں ایک بلّی آگئی۔ دیکھنے میں بڑی خوبصورت ہے۔ کسی اچھے گھر کی پلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں نام کو جنگلی پن نہیں اور شروع سے ہی اس کا رویہ یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو تھپتھپائے جانے اور پیار کیے جانے کا مستحق سمجھتی ہے۔ ہم اہلِ زنداں اس کی وجہ سے دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ ایک جو اس سے گھن کرتا ہے اور دوسرا جو اس سے پیار کرتا ہے۔ مولانا، میں، آصف علی اور خلافِ امید پنت جی بھی بلّی کے نازبرداروں میں ہیں۔ مخالفین بلّی کو کہیں دور چھوڑ آئے اور سمجھنے لگے چلو اس سے چھٹکارا ملا۔ لیکن چند ہی گھنٹے بعد وہ لوٹ آگئی دوسری دفعہ چھوڑ آئے تو دوسری بار بھی آگئی۔ اب انھیں ہار ماننی پڑی اور بلّی کو اپنے قدردانوں کی پوری توجہ اور شفقت حاصل ہو گئی۔ ہم نے اس کا نام چندو بلی رکھ دیا۔ اس سے بظاہر ایک ہی الجھن ہوتی تھی۔ وہ گربھ سے تھی اور اس کے بچے ہمارے صوفوں اور کرسیوں کو گندہ کر سکتے تھے۔ لیکن وہ اعلانسل کی نکلی اور اس نے صرف ایک بچے کو جنم دیا۔

تھوڑے دنوں کے بعد اس چندو نے ایک اخلاقی مسئلہ کھڑا کر دیا۔ ہمارے یہاں آنے کے تھوڑے دن بعد یہاں کی گوریّوں سے ہماری آشنائی ہو گئی تھی۔ ہم ان کے دانے دنکے کی اس طرح خبر گیری کرتے جیسے وہ ہماری پالتو ہو گئی ہوں بھوک کی حالت میں وہ بے خوفی سے ہمارے پاس آجاتیں اور ظاہر کرتیں کہ ان کے کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔

چندو کی نگاہ ان چڑیوں کی طرف دوسری ہی طرح اٹھتی۔ بظاہر وہ بڑی مسکین نظر آتی اور عاجزی سے میاؤں میاؤں کرتی رہتی جیسے وہ محض ایک بےضرر مخلوق ہے اور زمانے کی ستائی ہوئی ہے۔ وہ خاموشی سے دھوپ میں لیٹی رہتی۔ اِدھر اُدھر دیکھتی جیسے وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہو کسی اہم موضوع پر اور پھر تیزی سے جھپٹتی، بجلی کے کوندے کی طرح اور ایک چڑیا ختم ہو جاتی۔ ہم سے مانوس ہونے کی وجہ سے چڑیوں کے دل سے خوف نکل گیا تھا۔ اس لیے وہ آسانی سے اس کا شکار بن جاتی تھیں۔ اس طرح بلی روزانہ ایک چڑیا کو چٹ کر کے، دھوپ میں جاکر مراقبے میں گم ہو جاتی جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ اس بلی نے کائنات اور قدرت کے حقائق اور اخلاقی قدروں کے تضاد کو نمایاں کر دیا ہے جن پر ہماری نظروں میں پردہ پڑا ہوا تھا۔"

اس داستان کا اس سے زیادہ دلچسپ ایک ٹکڑا ہے، جو سننے سے تعلق رکھتا ہے۔ "دو دن پہلے ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ صبح آنے والے انڈوں کو ہم علاحدہ ایک ڈبے میں بند کر دیتے ہیں۔ دوپہر کو جب ڈھکن کھولا تو ایک انڈے میں سے ایک چھوٹا بچہ نکل آیا۔ یہ ابھی تک زندہ ہے اور پل رہا ہے اور چندو بلی اور اس کے بچے کی عارفانہ نگاہ سے ابھی تک محفوظ ہے۔ چندو کو کبھی کبھی بڑی الجھن کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب اس سے مختلف زبانوں میں بات کی جاتی ہے۔ مولانا اس سے فارسی میں ہم کلام ہوتے ہیں۔ اور چونکہ یہاں کی زبان مرہٹی ہے، معلوم ہوتا ہے وہ مرہٹی سمجھتی ہے۔" صوبائی لسانی تنگ نظری پر کیسا چبھتا ہوا طنز ہے اور کتنا لطیف۔

مولانا آزاد اور پنڈت نہرو میں بعض خصوصیات مشترک ہیں۔ دونوں اعلا ادبی مذاق اور دلنشین اسلوب بیان کے مالک ہیں۔ مطالعہ دونوں کا وسیع ہے۔ دونوں کا مزاج دانشورانہ اور مفکرانہ ہے۔ دونوں آزادی ہند کے متوالے ہیں اور اس ضمن میں بڑی سے بڑی قربانی دینے سے گریز نہیں کرتے۔ گاندھی جی کے مقابلے میں دونوں کے سیاسی نظریات میں زیادہ ہم آہنگی ہے۔ دونوں گاندھی جی کو اپنا رہنما مانتے ہیں۔ ان کی سچائی، ان کے خلوص، ان کے تیاگ کے دونوں قائل ہیں۔ مولانا کے مقابلے میں گاندھی جی کے لیے جواہر لال کی عقیدت کچھ زیادہ ہی بڑھی ہوئی ہے اور جس طرح بیٹا یا چیلا اپنے باپ یا گرو سے محبت اور سعادت مندی کی بنا پر اپنی بات منوانے کی جرات کر سکتا ہے، جواہر لال کو بھی اپنے اوپر اس طرح کا ناز ہے۔ مولانا کا بھی وہ بزرگوں کی طرح احترام کرتے ہیں۔ وزیر اعظم ہونے کے باوجود، مشورے کے لیے مولانا کے پاس جاتے اور ان کی بات پر عمل کرتے تھے۔ اس مماثلت کے باوجود دونوں الگ الگ شخصیت اور انفرادیت کے مالک تھے۔ مولانا کو قدرت نے غیر معمولی حافظے اور فطانت سے نوازا تھا۔ اور جو کوئی ان سے ملتا، پہلی ہی ملاقات میں ان کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر اُٹھتا۔ جواہر لال کو بھی ان کی نابغیت کا اعتراف تھا۔ مولانا کا ادبی ذوق اور نفاست، اسلوب عربی خصوصاً فارسی



ادبیات کا رہین منت تھا۔ جبکہ جواہر لال کے ذہن و فکر کی آبیاری انگریزی لٹریچر اور تمدن نے کی تھی۔ مولانا کا اندازِ بیان اپنی نفاست اور تابانی کے لیے زیادہ صنعت کاری اور جگر کاوی چاہتا ہے۔ بار بار کانٹ چھانٹ کے بغیر اس میں مطلوبہ جمالیاتی رفعت پیدا نہیں کی جا سکتی۔ پنڈت نہرو کے اسلوب بیان میں زیادہ روانی، زیادہ سادگی اور خیالات و احساسات کو زیادہ صحت اور معقولیت سے ظاہر کرنے کی صلاحیت ہے۔

اس میں درخشندگی اور حلاوت بیان پیدا کرنے کے لیے مولانا کی سی جاں فشانی اور رصع کاری نہیں کرنی پڑتی۔ شاید یہی ایک وجہ ہے کہ اتنے زیادہ مصروف رہے اور پڑھنے لکھنے میں اتنا زیادہ وقت صرف کرنے کے باوجود مولانا کا ادبی سرمایہ پنڈت نہرو سے کم ہے۔

جیل یا جیل سے باہر کے ساتھیوں میں کسی نے بھی مولانا کے ذہن کی درّاکی، ان کی تاموس معلومات، ان کی اصول پرستی، ان کی پابندیِ وقت کی اتنی تاثر آمیز تعریف نہیں کی جتنی جواہر لال نہرو نے کی ہے۔ جواہر لال جتنے زیادہ ان کے نزدیک تھے، اتنے ہی زیادہ ان کے مداح تھے۔ عجیب بات یہ ہے کہ جہاں جواہر لال مولانا کی تعریف کرتے ہوئے نہیں تھکتے، وہاں گاندھی کا یوں سرسری ذکر کرتے ہیں جیسے کوئی نہ ورثتا رقیب کی گلی سے گزر رہا ہو۔

اندھیرا ہو چکا تھا۔ ستمبر 1955 کی گیارہ تاریخ تھی۔ نہرو پنّا (وندھیا پردیش) میں تقریر کر چکے تھے اور واپس جانے کیلیے کار میں بیٹھے تھے۔ سڑک پر کیچڑ تھی۔ بھیڑ بہت زیادہ تھی کار آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور نہرو ہجوم کو دیکھ رہے تھے۔ اچانک کچھ گاؤں والے کار کے آگے لیٹ گئے۔ کچھ لوگوں نے کہا یہ گاڑی کو روکنے کی کوشش ہے۔ یہ لوگ آپ کو روک کر اپنی کچھ شکایتیں بیان کرنا چاہتے ہیں کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ شستنگ ڈنڈوت ہے۔ اس طرح یہ لوگ بندگی بھی کرنا چاہتے ہیں اور اس موقع پر اپنی دُکھ بھری کہانی بھی سنانا چاہتے ہیں۔

تھوڑی دیر نہرو ان لوگوں کو دیکھتے رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ انھیں غصہ نہ آئے اور بات آئی گئی ہو جائے۔ لیکن اچانک ہی وہ پھٹ پڑے:۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟ تمھیں ایسا کرنا کس نے سکھایا ہے"۔ وہ کار سے کود کے کیچ پانی میں اتر گئے۔ اُن کی بیٹی نے انھیں روکنا چاہا مگر پنڈت جی نے ان سے کہہ دیا کہ وہ بیچ میں نہ بولیں۔ پنڈت جی کے محافظوں نے ان سے درخواست کی کہ وہ اندھیرے میں بھیڑ میں نہ جائیں مگر پنڈت جی نے انھیں ڈانٹ دیا کہ "کیا بکواس کرتے ہو۔"

ہر طرف افراتفری سی مچ گئی۔ جو گاؤں والے کار کے آگے لیٹ گئے تھے وہ ڈر گئے اور بھاگنے کی کوشش کرنے لگے۔ پولیس بھی انھیں جلدی سے جلدی بھگا دینا چاہتی تھی۔ لیکن نہرو نے گرج کر کہا:

"یہ کیا کر رہے ہو ان سے ایسا سلوک نہ کرو۔
مجھے ان سے ملنا ہے، مجھے ان سے بات کرنی ہے،
مجھے ان سے پوچھنا ہے کہ یہ کیا کہنا چاہتے ہیں"

پنڈت جی کو غصہ دلانے والے یہ لوگ فوراً ہی اُن کے سامنے لائے گئے۔ انھوں نے غصہ سے پوچھا:

"تمھیں ایسا کرنا کس نے سکھایا ہے؟ کار کے آگے تم کیوں لیٹے تھے؟"

ذرا دیر وہ ان لوگوں پر غصہ کرتے رہے۔ پھر ان سے کہا کہ وہ لوگ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کہیں۔ پنڈت جی نے ان کی شکایتیں بڑے دھیان سے سنیں اور حکم دیا کہ ان شکایتوں کی فوراً جانچ کی جائے



مشرقی تہذیب کا پیکر — پنڈت نہرو

(پروفیسر) نثار احمد فاروقی
پوسٹ بکس نمبر ۲۳ ،۹۷ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

پنڈت جواہرلال نہرو ایک دلکش
شخصیت کے مالک تھے انھوں نے بہترین
مغربی تعلیم پائی تھی اور انگلستان کے مشہور ہیرو
سکول میں پڑھا تھا مگر ان کے اخلاق اور کردار
میں مشرق کی تہذیب وشائستگی بھی رچی ہوئی
تھی اس طرح وہ مغرب کی آزادیٔ فکر اور
مشرق کی وسعتِ قلب کا ایک انوکھا سنگم
بن گئے تھے۔

میں نے پنڈت نہرو کو اپنی طالبِ علمی
کے زمانے میں غالباً ۱۹۴۶ء کے اوائل میں پہلی
بار دیکھا تھا جب وہ اپنے طوفانی دورے میں
مرادآباد سے گزرے تھے اور ہندو انٹر کالج میں
ان کی تقریر ہوئی تھی۔ پبلک گھنٹوں سے ان کی
منتظر تھی اور ان کا دیدار کرنے کے لیے لوگ
آس پاس کے درختوں پر بھی چڑھے بیٹھے تھے۔
پنڈت جی کو آنے میں خاصی دیر ہوئی مگر سارا
مجمع نہایت اشتیاق سے ان کا انتظار کرتا رہا۔
جب وہ آئے تو سارا ماحول "انقلاب
زندہ باد" اور "پنڈت نہرو زندہ باد" کے
فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھا تھا۔ وہ بھی
کیا زمانہ تھا کوئی سیکورٹی کا انتظام نہ تھا
پبلک چاروں طرف سے اسٹیج کو بھی گھیرے
ہوئے تھی، اور تمام راستے میں بھی دونوں طرف
قطار باندھے کھڑی تھی، چھتوں پر بھی ہزاروں مرد
اور عورتیں جمع تھیں۔ پنڈت جی کھدر کا کرتا پاجامہ
اور جواہر کٹ پہنے ہوئے تھے سر پر گاندھی ٹوپی
تھی، چہرہ تابناک اور عزم وہمت سے بھرپور
نظر آتا تھا، اس وقت ان کا بدن چھریرا تھا اور
وہ بے تکلف عوام کی بھیڑ بھاڑ میں گھس کر سب
سے باتیں کرتے ہوئے اور سلام کا جواب دیتے
ہوئے جارہے تھے۔ ان کی تقریر تو شاید ۱۵ منٹ
سے زیادہ کی نہ تھی مگر ان کی شخصیت نے جو
تاثر چھوڑا تھا اس کا اثر آج تک ذہن پر باقی ہے۔

اس کے بعد جون ۱۹۴۶ء میں تقسیم ہند
کا پلان منظور ہونے کے بعد ان کی تقریر آل
انڈیا ریڈیو سے سنی۔ اس وقت میں حیدرآباد
میں تھا۔ ان کے ساتھ ہی محمد علی جناح اور
لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بھی ریڈیو پر خطاب کیا
تھا۔ وہ میری نوعمری کا زمانہ تھا مگر آج تک
پنڈت نہرو کے دبے ہوئے جذبات کی شدت
اور ان کے تاثرات کی گرفت یاد آتی ہے۔

۱۹۵۷ء میں میری پہلی کتاب "میر کی
آپ بیتی" دہلی سے شائع ہوئی تھی یہ اُردو کے
مشہور شاعر میر تقی میر کی خود نوشت سوانح عمری
'ذکرِ میر' کا فارسی زبان سے اُردو میں ترجمہ تھا
میں اس وقت دہلی یونیورسٹی لائبریری میں کام کرتا
تھا۔ ۱۹۶۱ء میں ایک دن مجھے اچانک یہ خیال
آیا کہ پنڈت نہرو سے ملاقات کی جائے۔ میں نے
ان کے سکریٹریٹ میں ٹیلیفون کیا، ان کے اے۔
ڈی۔ سی نے ۲۵ اگست ۱۹۶۱ء کو صبح ۹ بجے
ملاقات کا وقت مقرر کردیا۔ یہ سب اتنی
سہولت سے ہوا کہ آج سوچ کر حیرت ہوتی
ہے۔ اس زمانے میں تو کسی انڈر سکریٹری سے
بھی ملاقات کا وقت ایسی آسانی سے نہیں ملتا۔
میں مقررہ وقت پر تین مورتی ہاؤس پہنچ گیا۔ نہ
کوئی تفتیش ہوئی، نہ جامہ تلاشی ہوئی، نہ کسی
ڈیٹیکٹر سے گزرنا پڑا۔ سیدھا ان کے پی۔ اے
کے کمرے میں پہنچا دیا گیا، انھوں نے مجھے ایک
ہال میں لاکر بٹھا دیا۔ جہاں تین چار حضرات اور
بیٹھے تھے۔ ہال کے سامنے ایک بڑی مہتابی
تھی، اور اس سے نیچے اتر کر پائیں باغ تھا۔ مہتابی
پر کچھ پنجابی مرد اور عورتیں بیٹھی تھیں، یہ لوگ
شرنارتھی معلوم ہوتے تھے۔ میں نے تقریباً دس
منٹ اس ہال میں بیٹھ کر پنڈت جی کے آنے کا
انتظار کیا اور وہاں کچھ کتابیں اور رسالے
رکھے ہوئے تھے ان کی ورق گردانی کرتا رہا۔
اسی ہال کے اندر ایک زینہ تھا اچانک دیکھا تو
پنڈت جی سیڑھیوں سے اُتر رہے تھے۔ سب
ان کے احترام میں کھڑے ہوگئے۔ میں اپنی
کتاب "میر کی آپ بیتی" کا ایک نسخہ ساتھ لے
گیا تھا، وہ میں نے پنڈت جی کو نذر کیا، اُسے لے



کرخوش ہوتے اور ادھر اُدھر سے الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ میں نے مختصراً بتایا کہ کتاب کیا ہے اور اس کی اہمیت کیا ہے تو انھوں نے توجہ سے سُنا اور کہا کہ یہ آپ نے ایک اچھا کام کیا ہے۔ پھر وہ کتاب اپنے اے۔ ڈی۔ سی کو یہ کہہ کر دے دی کہ میری لائبریری میں پہنچا دو۔ میں پنڈت نہرو کی خود نوشت سوانح عمری کا ایک نسخہ بازار سے خرید کر لیتا گیا تھا۔ اس پر میں نے اُن سے آٹوگراف لیے۔ ایک صاحب مع اپنی بیگم کے وہاں موجود تھے انھوں نے مجھے آٹوگراف لیتے دیکھا تو وہیں ہال میں رکھی ہوئی ایک چھوٹی سی پیپر بیک کتاب اُٹھا کر انھوں نے بھی آٹوگراف لینے کے لیے پیش کردی۔ پنڈت جی نے انھیں کتاب اٹھاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ مگر جب دستخط کرنے لگے تو پلٹ کر کتاب کا ٹائیٹل دیکھا اور مسکرا کر کہنے لگے: "یہ تو چوری کا مال معلوم ہوتا ہے۔" وہ صاحب جھینپ گئے اور کہنے لگے جی ہاں یہ کتاب میں نے یہیں سے اٹھائی ہے۔ پنڈت جی نے دستخط کرکے وہ انھیں دے دی۔ اب انھوں نے اپنی بیگم کا تعارف یہ کہتے ہوئے کرایا کہ یہ میری مسز ہیں' (SHE IS MY MRS.) پنڈت جی نے فوراً کہا: "آپ کا مطلب ہے آپ کی بیوی ہیں۔" (YOU MEAN YOUR WIFE) اس فقرے پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے' اور مجھے احساس ہوا کہ زبان کے معاملے میں پنڈت جی کا مذاق کتنا لطیف ہے۔ اُن دنوں سکھ لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے مرن برت رکھا ہوا تھا' اور اس پر کئی ہفتے گزر چکے تھے' سیاسی دنیا میں اس کی وجہ سے خاصا تناؤ بنا ہوا تھا مگر پنڈت نہرو کے برتاؤ میں اس تناؤ کا کوئی اثر نہ تھا' اتنا یاد آتا ہے کہ کسی بات پر انھوں نے اس کا حوالہ دیا تھا اور کہا تھا کہ آج کل ماسٹر جی برت رکھے ہوئے ہیں دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ میری اس ملاقات کی خبر روزنامہ الجمعیتہ دہلی (۲۸ اگست ۱۹۶۱ء) میں اس طرح شائع ہوئی:

"میر کی آپ بیتی پنڈت نہرو کی خدمت میں پیش کی گئی یہ ایک اچھا کام ہوا ہے پنڈت نہرو کی حوصلہ افزائی۔

نئی دہلی' ۲۵ اگست کو صبح نو بجے جناب نثار احمد فاروقی نے اپنی کتاب "میر کی آپ بیتی" کا ایک نسخہ پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم کی خدمت میں پیش کیا۔ وزیر اعظم نے یہ ہدیہ قبول کرتے ہوئے اپنی مسرت کا اظہار فرمایا اور کتاب کو جستہ جستہ ملاحظہ فرما کر موضوعِ کتاب کے بارے میں فاروقی صاحب سے متعدد سوالات کیے۔ آخر میں انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ آپ ایسے مفید سلسلے کو جاری رکھیں۔ یاد رہے میر کی آپ بیتی اُردو کے مشہور شاعر میر تقی میر کی فارسی خود نوشت "ذکرِ میر" کا اردو ترجمہ ہے' جسے جناب نثار احمد فاروقی نے حواشی اور توضیحات کے ساتھ مرتّب کیا ہے اور ۱۹۵۷ء میں اسے مکتبہ بُرہان دہلی نے شائع کیا تھا۔ ۱۹۵۹ء میں اس کتاب پر حکومت اتر پردیش نے مؤلف کو انعام بھی دیا تھا۔ علمی و ادبی حلقوں سے بھی یہ کتاب خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے۔ میر تقی میر کی زندگی اور تاریخی ماحول کے بارے میں یہ سب سے مستند ریکارڈ سمجھا جاتا ہے۔" (نامہ نگار)

یہ غالباً اُردو کی پہلی کتاب تھی جو پنڈت نہرو کو اس طرح پیش کی گئی۔ اس کے بعد تو اردو کتابوں کے پیش کرنے کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ اس کی خبر پاکستان کے روزنامہ "جنگ" نے بھی اس زمانے میں نمایاں طور پر شائع کی تھی:

"اردو کی کتاب میر کی آپ بیتی

نئی دہلی ۴ ستمبر۔ ۱۸ویں صدی کے اُردو شاعر میر تقی میر کی سوانح حیات "میر کی آپ بیتی" جو فارسی سے ترجمہ کی گئی ہے اور جس کو دہلی یونیورسٹی کے جناب نثار احمد فاروقی نے مرتب کیا ہے۔ وہ وزیر اعظم پنڈت نہرو کو پیش کی گئی یہ کتاب اس سال حکومت یوپی سے انعام حاصل کر چکی ہے۔"

پنڈت نہرو کے سامنے جو مُہمات مسائل تھے ظاہر ہے کہ ان کے مقابلے میں نہ میری کوئی اہمیت تھی نہ اس کتاب سے انھیں کوئی دور کا بھی سروکار تھا' مگر یہ ان کی شائستگی تھی کہ اُردو کے ایک نوعمر ادیب کو بھی انھوں نے مایوس نہیں کیا' اور اپنے نہایت قیمتی اوقات میں سے اُسے بھی ملاقات کا وقت دے دیا۔

ہم لوگوں سے باتیں کرکے پنڈت نہرو ہال سے باہر نکلے اور مہتابی پر پنجابی حضرات کا جو مجمع تھا اس کی طرف بڑھ گئے ہم ان کے پیچھے چلے۔ وہ لوگ شاید کرنال یا پانی پت سے آئے تھے اور اپنی کچھ پریشانیاں بیان کر رہے تھے' ٹوٹی پھوٹی اُردو بولتے بولتے پنجابی بولنے لگتے تھے۔

ن میں ایک بوڑھی عورت تھی جس کی عمر ستر سال سے بھی زیادہ ہوگی وہ بہت بول رہی تھی اور دوسروں کی بات بھی کاٹ دیتی تھی، اس نے پنڈت جی سے اس طرح کی باتیں کہیں کہ "ہم تو سمجھتے تھے آزادی ملے گی تو ہمارے دلدّر دُور ہوں گے، اور چین سُکھ ملے گا مگر ہم تو لُٹ گئے برباد ہو گئے، ہمارا گھر بار بھی چھن گیا، یہ تکلیف ہے وہ تکلیف ہے، آخر ہمیں آزادی ملنے سے کیا فائدہ ہوا؟" پنڈت جی اس بوڑھی عورت کی باتیں بڑے استقلال سے سُنتے رہے اور آخر میں اس سے کہا: "ماتا جی کیا یہ تھوڑی بات ہے کہ آپ یہ باتیں ہندوستان کے پرائم منسٹر سے کہہ رہی ہو" واقعی اس عورت کا لب و لہجہ خاصا بے باکانہ تھا اور اس طرح اگر کسی میونسپلٹی کے افسر سے بھی بات کی جاتی تو وہ چراغ پا ہو جاتا، مگر پنڈت نہرو نے بے حد تحمل کے ساتھ سُنا اور اسے یہ احساس دلایا کہ آج ہم آزادی کی بدولت ملک کے سب سے بااختیار شخص سے بھی ایسی بے تکلفی سے بات کر سکتے ہیں۔

پنڈت نہرو کی شخصیت میں عجیب مقناطیس تھا اس کا ایک اور تجربہ ہوا۔ اُنھیں دہلی یونیورسٹی کے کسی جلسے میں بُلایا گیا تھا، وہ جلسہ نئے کانووکیشن ہال (آرٹس فیکلٹی) میں ہونا تھا، پنڈت جی ٹھیک وقت پر آ گئے، اور یہاں سارا ہال خالی پڑا تھا اِدھر اُدھر بھی لوگ نظر نہیں آ رہے تھے، یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے ان کی موٹر یونیورسٹی لائبریری کی طرف مڑوا دی اور کچھ دیر انھیں لائبریری کی سیر کرائی، وہاں سے نکل کر وہ لائبریری کے گیٹ کے سامنے سڑک پر آ کھڑے ہوئے، اور پانچ سات منٹ وہیں کھڑے باتیں کرتے رہے، اب انھیں کانووکیشن ہال کی طرف لے کر چلے تو سب مِلا کر پچاس آدمی ہوں گے، اس بھیڑ میں میں بھی شامل تھا اور یہ سوچ رہا تھا آج کیا بات ہے کہ پنڈت جی کے جلسے میں حاضری اتنی کم ہے، ہال خالی پڑا رہے گا۔ لائبریری سے ڈائس تک جانے میں شاید تین یا چار منٹ لگے ہوں گے، جلسہ شروع ہوا تو میں نے مڑ کر دیکھا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، اور بہت سے لوگ ہال کے باہر بھی جمع ہو چکے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی غیبی طاقت نے اچانک یہ مجمع اکٹھا کر دیا ہے۔

پنڈت نہرو کی انسان دوستی مروت اور شرافت کے دو واقعے اور میرے علم میں ہیں: امروہہ میں ایک خاندانی رئیس سید غیاث الدین رضوی تھے، ان کے انتقال کے بعد جائداد کے مسئلے پر اہلِ خاندان ہی میں مقدمے بازی کا سلسلہ چلا جو الہ آباد ہائی کورٹ تک پہنچا، الہ آباد میں غیاث الدین صاحب کی بیوہ انیسہ خاتون صاحبہ کے وکیل پنڈت موتی لال نہرو تھے۔ یہ خاتون اپنے مقدمے کے سلسلے میں اکثر آنند بھون جایا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں پنڈت نہرو کم سن تھے اور انھیں آنند بھون میں کھیلتے ہوئے مِلتے تھے۔ مقدمہ وغیرہ نمٹ نمٹا گیا، موتی لال جی کا بھی انتقال ہو گیا، اور انیسہ صاحبہ کو پھر اس خاندان سے ملنے کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ غالباً ۱۹۶۰ء کے آس پاس انیسہ خاتون صاحبہ دہلی آئیں وہ اب خاصی بوڑھی اور ضعیف ہو چکی تھیں اپنے کسی عزیز کے مکان پر پھاٹک حبش خاں میں قیام کیا۔ انھیں نجانے کیا خیال آیا کہ انھوں نے پنڈت نہرو کو ایک خط لکھ دیا اور اس میں حوالہ دیا کہ میں اپنے مقدمے کے سلسلے میں آنند بھون آیا کرتی تھی اس وقت تم بچے تھے۔ اب مجھے کیا پہچانو گے مگر میرا جی چاہتا ہے اب تمھیں دیکھوں۔ پنڈت جی نے فوراً انھیں ملاقات کا وقت دیا، جب وہ گئیں تو باہر پورٹیکو تک آ کر ان کا استقبال کیا، اور جس کمرے میں وی۔ آئی۔ پیز سے ملاقات کرتے تھے وہاں ان کو لا کر بٹھایا۔ اس زمانے میں بھی ملکی سیاست میں کوئی بڑا شورانگیز مسئلہ چل رہا تھا اور پارلیمنٹ کے اجلاس بھی جاری تھے۔ اے۔ ڈی۔ سی یہ کرتے تھے کہ جس شخص کا ملاقات کا جتنا وقت ہوتا تھا اتنی دیر بعد کا الارم ایک گھڑی میں لگا دیتے تھے جو ملاقات کے کمرے میں رکھی رہتی تھی اور اچانک اس کا الارم بول کر ملنے والے کو یہ احساس دلاتا تھا کہ اب اُسے رخصت ہو جانا چاہیے۔ یہ ایک قصبے کی رہنے والی اور گھریلو خاتون تھیں، زیادہ پڑھی لکھی بھی نہ تھیں نہ ان آداب و اطوار سے واقف تھیں، وہ تو بس یوں ہی اپنے ماضی کی یادوں کے سہارے چلی آئی تھیں کہ جس بچے کو آنند بھون میں کھیلتے کودتے دیکھا تھا، اب وہ وزیراعظم ہو کر کیسا لگتا ہے! ان کے پاس باتیں کرنے کو بھی کوئی موضوع نہ تھا، بس اس طرح کی باتیں کرتی رہیں کہ تم اتنے چھوٹے سے تھے، یوں بھاگتے تھے، یوں شرارتیں کیا کرتے تھے، آنند بھون کا پرانا نقشہ یاد کر رہی تھیں موتی لال جی کیا کرتے تھے، کیسے تھے وغیرہ اور پنڈت نہرو

ہایت سعادت مندی کے ساتھ سر جھکائے اُن کے سامنے بیٹھے تھے، اور کہتے تھے کہ جی ہاں اب وہ زمانہ تو خواب و خیال ہو گیا۔ بڑے مسائل ہیں، بڑی پریشانیاں ہیں وغیرہ۔ اور کہتے بھی لیا؟ اس دوران میں تین بار گھڑی کا الارم بولا، ور ہر بار پنڈت جی نے خود اُٹھ کر اُسے بند کر دیا۔ ایک بار تو پی۔ اے نے آکر چپکے سے انھیں یاد دلایا کہ پارلیمنٹ کا وقت ہو گیا ہے، مگر پنڈت جی نے اپنے مخصوص انداز میں "ہونہہ" کہہ کر اُسے جھڑک دیا۔ ان خاتون کے لیے انھوں نے اپنے نہایت قیمتی اور مصروف وقت میں سے تقریباً بیس منٹ صرف کیے، اور انھیں پورٹیکو تک رخصت کرنے آئے۔ کئی بار اپنے سکریٹری سے کہا کہ ان سے پوچھو اگر کوئی کام ہو تو وہ فوراً کر دو۔ خود انیسہ صاحبہ سے بھی ایک سے زائد بار کہا کہ میں نے اپنے سکریٹری سے کہہ دیا ہے، آپ کا کوئی کام ہو تو ان کو بتا دیں وہ کریں گے۔ یہ بھی اسی مشرقی تہذیب و شائستگی کا اثر تھا کہ اُنھوں نے ایک پرانی مؤکلہ کے احساسات کا اتنا احترام کیا۔

دوسرا واقعہ اس سے بھی زیادہ پنڈت نہرو کی انسان دوستی اور بلند ظرفی کی شہادت دیتا ہے۔ رفیع احمد قدوائی مرحوم کا ایک ذاتی ملازم تھا، مشرقی یو پی کا رہنے والا اَن پڑھ لکھا بالکل نہ تھا۔ قدوائی مرحوم اس پر اعتماد رکھتے تھے اور وہ ضروری خفیہ کاغذات لے کر پنڈت نہرو، مولانا آزاد، لال بہادر شاستری اور دوسرے لوگوں تک جایا کرتا تھا اس لیے ان میں سے بیشتر لوگ اسے پہچانتے تھے۔ سمیع اللہ اس کا نام تھا۔ قدوائی صاحب کے انتقال کے بعد اُن کے بھائی اس ملازم کو اپنے ساتھ مسولی لے گئے، مگر وہاں اس کا دل نہیں لگا اور اس نے چاہا کہ دہلی ہی میں کہیں سروس کرے۔ لکھنو میں ہمارے ایک دوست تھے انھوں نے اسے پرچہ لکھ کر دے دیا اور وہ دہلی آکر مجھ سے ملا۔ جس گھر میں ہم کئی آدمی رہتے تھے وہیں وہ بھی رہنے لگا۔ میں نے اردو کے ایک استاد سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ اُسے میرے پاس بھیج دو یہاں آرام سے رہے گا، مگر اُن کے سلوک سے وہ چند ہی روز میں تنگ آگیا اور مجھ سے شکایت کی تو میں نے کہا تم آجاؤ اور دوسری جگہ تلاش کرو۔ ایک دن وہ کہنے لگا کہ پنڈت نہرو کی کوٹھی میں کچھ نوکر میرے جاننے والے ہیں ان سے ملنے جا رہا ہوں۔ شام کو ہنستا ہوا آیا کہ آج تو پنڈت جی سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے کہا تجھے وہ کہاں مل گئے؟ اس نے بتایا کہ جب وہ تین مورتی ہاؤس کے قریب پہنچا تو پنڈت جی اپنی موٹر میں بیٹھے ہوئے جا رہے تھے یہ داہنی طرف فٹ پاتھ پر پیدل چل رہا تھا۔ پنڈت جی کی گاڑی تقریباً ایک فرلانگ آگے نکل گئی پھر وہ واپس پلٹ کر آئے اور سمیع اللہ کے قریب آکر سڑک پر گاڑی روک لی۔ اس سے پوچھا: ارے سمیع اللہ اب تو کہاں ہے؟ اس نے کہا: میں بیکار ہوں نوکری تلاش کر رہا ہوں پنڈت جی نے کہا اچھا تم کل صبح کو پانچ بجے میرے پاس آنا۔ یہ کہہ کر پنڈت جی چلے گئے۔

اگلے دن سمیع اللہ رات کو تین بجے سے اُٹھ کر تیار ہوا اور ان کی کوٹھی کی طرف لال کنوئیں سے پیدل روانہ ہوا۔ ٹھیک پانچ بجے سے پہلے پہنچ گیا۔ پنڈت جی اس وقت لان میں ورزش کر رہے تھے اس کو وہیں بلا لیا اور اسے خوب دوڑایا، بھگایا، یہاں تک کہ اس کا سانس پھول گیا۔ ورزش کرنے کے بعد اس سے کہا جاؤ اب تم ناشتہ کر لو۔ ان کے اسٹاف نے کہیں بٹھا کر اُسے ناشتہ کرا دیا۔ اب اُسے پنڈت جی نے پھر بلایا اور پوچھا کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ میں نے اُسے یہ سکھا کر بھیجا تھا کہ پنڈت جی سے کہنا مجھے اپنی کوٹھی ہی میں نوکر رکھ لیجیے، وہی اس نے پنڈت جی سے کہا۔ انھوں نے کہا کہ ہم ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے بغیر کسی کو نوکر نہیں رکھ سکتے، پہلے تم وہاں جا کر اپنا نام لکھوا دو جب وہاں سے نام آئے گا تو ہم دیکھیں گے۔ اس میں وقت لگے گا، اس مدت کے لیے تمھیں جتنے خرچ کی ضرورت ہو وہ ہمارے دفتر سے لے لو۔" پنڈت جی کے سکریٹری اُسے اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے گئے اور اس سے پوچھا کہ تمھیں کتنے روپے دے دوں؟ یہ اگر ہزار روپے بھی مانگتا تو مل جاتے، مگر اتنا سیدھا اور نیک لڑکا تھا کہ ان سے بولا مجھے پانچ روپے دے دیجیے۔ سکریٹری بھی اس کی بے وقوفی پر مسکرائے اور اُسے پانچ کا نوٹ دے دیا۔ وہاں سے پانچ روپے لے کر دانت نکالتا ہوا میرے پاس آیا تو میں نے الگ جھاڑا کہ اس سے تو کچھ نہ لیا ہوتا۔ پانچ روپے تو اس گھر میں بھی تجھے مل جاتے۔ مگر وہ کہنے لگا میں نے سوچا زیادہ مانگوں گا تو یہ کیا خیال کریں گے۔ بہر حال اسی



طرح ایک دن اُسے لال بہادر شاستری کہیں مل گئے وہ اس زمانے میں ریلوے منسٹر تھے انھوں نے بھی اس کا حال معلوم کیا اور پھر اُسے بمبئی کے کسی مِل مالک کے نام خط لکھ کر دیا اور بمبئی روانہ کر دیا تھا۔ اب خدا جانے وہ کہاں ہوگا اور کس حال میں ہوگا۔

لیکن اس واقعے سے پنڈت نہرو کی اخلاقی عظمت، کردار کی بلندی، اور غریبوں کے لیے دل سوزی کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

پنڈت نہرو مذہبی تعصب سے کوسوں دُور تھے بلکہ انھیں مذہبی آدمی سمجھنا ہی غلط ہوگا وہ مادہ پرست تھے اور سائنسی نقطۂ نظر کو ترجیح دیتے تھے مگر ہندوستانی عوام کی اکثریت مذہبی توہمات میں گرفتار ہے اس لیے وہ مذہب کا پورا احترام کرتے تھے۔ ایک بار کچھ لوگوں نے عالمی مذاہب کی کانفرنس رام لیلا گراؤنڈ میں منعقد کرنے کا پروگرام بنایا اور یہ طے کیا کہ اس کا افتتاح پنڈت نہرو سے کرایا جائے۔ یہ درخواست لے کر ایک وفد پنڈت جی سے ملنے گیا جس میں ہر مذہب کا ایک ایک نمائندہ شامل تھا، اسی وفد میں ایک صاحب تھے جو مذہبی عقائد میں خاصے جنونی (FANATIC) واقع ہوئے تھے۔ خوب بھاری ڈیل ڈول تھا اور ایک موٹا سا ڈنڈا ہاتھ میں رکھتے تھے جب اس وفد نے پنڈت جی کو کانفرنس کا افتتاح کرنے کی دعوت دی تو پنڈت جی نے کہا: "کیوں آپ لوگ مذہب کے نام پر اتنا وقت اور روپیہ خرچ کرتے ہیں؟ ہم تو چاہتے ہیں کہ مذہب ختم ہوجائے اور سیکولر بھارت کو سب مل کر آگے بڑھائیں"۔ وہ جنونی صاحب یہ سن کر اپنا موٹا سا ڈنڈا ہاتھ میں سنبھال کر کھڑے ہوگئے اور ڈنڈے کو زمین پر پٹک کر کہنے لگے "اگر تم مذہب کو ختم کروگے تو ہم تمھیں ختم کردیں گے"۔ پنڈت جی نے ان کی طرف ایک نظر دیکھا، اگر وہ سکورٹی اسٹاف کو اشارہ کرتے تو اسی وقت ان کی ڈنڈا ڈولی ہوجاتی مگر پنڈت جی نے اُن کے دوسرے ساتھی سے صرف اتنا کہا کہ "ان سجن سے میں بات نہیں کرسکتا"۔ پھر اس وفد کو رخصت کرنے کے لیے دروازے تک آئے۔

یہ کچھ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں مگر اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ اس آئینے میں ہم نہرو کی شخصیت کے دل کو لبھانے والے خط و خال دیکھ سکتے ہیں۔ ان کے پاس علم کے سوا مجلسی اخلاق، تہذیب اور رواداری کا وہ سرمایہ بھی تھا جس سے نئی نسلیں محروم ہوتی جاتی ہیں اور اسی لیے اب سیاست میں کردار سازی نہیں کردار کشی ہو رہی ہے۔

●

ساری دنیا میں نہرو کے بے شمار دوست تھے لیکن وہ خود کو بہت تنہا محسوس کرتے تھے۔ بیوی کی موت کے بعد سے یہ تنہائی برابر قائم رہی۔ وہ کتنے ہی بڑے مجمع میں کیوں نہ ہوں خود کو تنہا پاتے تھے۔

کملا کی زندگی میں نہرو کو قومی کاموں میں اتنا وقت دینا پڑتا تھا کہ وہ ان کے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزار سکتے تھے کملا کی موت کے بعد انھیں اندازہ ہوا کہ کملا نے ان کی زندگی پر کتنا اثر ڈالا تھا۔ جو کملا کو جانتے تھے ان کا خیال ہے کہ وہ اگر زندہ رہی ہوتیں تو نہرو کی زندگی مختلف رہی ہوتی۔ کملا کے بعد نہرو نے دوسری شادی نہیں کی۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے ملک کے لوگ جو انھیں سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ بڑے پرانے خیال کے لوگ ہیں۔ یہ لوگ ان کی دوسری شادی کو پسند نہیں کریں گے۔

مسز ہٹی سنگھ نے ایک اور بات لکھی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ نہرو کی عمر کم تھی پھر بھی انھوں نے شادی نہیں کی وہ اس لیے کہ ایسا کرنا شاید اندرا کے ساتھ زیادتی ہوتی۔

اُردو کو اترپردیش کابینہ کی جانب سے دوسری سرکاری زبان بنانے کے فیصلے کا ملک بھر میں خیر مقدم کیا گیا ہے۔ اگر اس فیصلے کو اعلان کے مطابق عملی شکل دے دی گئی تو یقیناً نہ صرف ایک بہت بڑی زبان کے ساتھ بہت بڑی بے انصافی کا ازالہ ہو جائے گا بلکہ وہ وعدے بھی ایفا ہو جائیں گے جو قومی رہنما پچھلے چالیس سال سے دُہراتے رہے ہیں۔ یہ فیصلہ اس لیے بھی قابل قدر ہے کہ نہرو صدی کی تقریبات کے سال کے دوران کیا گیا ہے۔ اُردو کو جائز مقام دینے کا یہ فیصلہ پنڈت نہرو کو بہترین خراجِ عقیدت کہا جا سکتا ہے۔

پنڈت نہرو کو اُردو سے جو ذہنی اور تہذیبی رشتہ تھا وہ ان کے معاصرین ذاتی طور پر تو جانتے ہیں لیکن اس کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ اترپردیش میں اُردو کو جائز مقام دلوانے کے لیے پنڈت نہرو ہمیشہ کوشاں رہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس دور کے مخصوص سیاسی حالات اور جذباتی پس منظر میں ان کی کوششیں کامیاب نہیں ہو سکیں۔

مثلاً مجھے یاد ہے کہ اپریل ۱۹۶۱ء میں انھوں نے ایک پریس کانفرنس کے دوران میں میرے ہی ایک سوال کے جواب میں بڑی وضاحت سے یہ بتایا تھا کہ اُردو کی ترویج و ترقی

پنڈت نہرو اور اُردو — چند یادیں

ظفر پیامی
۱۹ اے/۱ کیلاش پارک۔ نئی دہلی

سے ملک کو بحیثیت مجموعی کیا فائدہ ہوگا۔

اس زمانے میں اترپردیش اور شمالی ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے اسکولوں میں سہ لسانی فارمولا لاگو کیے جانے پر خاصی بحث چل رہی تھی۔ ایک مسئلہ یہ تھا جو آج تک زیر بحث ہے یعنی سہ لسانی فارمولے میں کن زبانوں کو جگہ دی جائے اور اس میں سنسکرت کی گنجائش ہے یا نہیں؟ میں نے پوچھا تھا کہ "سہ لسانی فارمولے میں ہندی اور انگریزی کے علاوہ سنسکرت کو تیسری زبان کے طور پر پڑھایا جا رہا ہے۔ کیا آپ کے خیال میں سنسکرت کی جگہ اردو کا حق نہیں ہے جو اس ملک اور خصوصاً اترپردیش کے کروڑوں لوگوں کی زبان ہے؟"

پنڈت جی نے اس کا جو جواب دیا وہ کچھ اس طرح تھا: "سہ لسانی فارمولے کا مقصد ہے کہ بچوں کو مادری زبان میں تعلیم کے علاوہ اہم ترین عالمی زبان انگریزی کی بھی کچھ شد بد ہو اور وہ کم از کم ایک جدید ہندوستانی زبان سے بھی واقف ہو سکیں تاکہ قومی ایکتا کو فروغ حاصل ہو۔ سنسکرت ایک قابلِ فخر کلاسیکی زبان ہے لیکن اس فارمولے میں وہ شامل نہیں کی جا سکتی کیونکہ وہ جدید ہندوستانی زبانوں تک مخصوص ہے۔"

اُردو کا خصوصی ذکر کرتے ہوئے اپنے نہایت طویل جواب میں پنڈت جی نے کہا، "ہم سمجھتے ہیں کہ اُردو کا علم نئی نسل کے لیے کئی اعتبار سے مفید ثابت ہوگا۔ ایک تو یہ کہ اُردو اس ملک کی ایک اہم اور مقبول زبان ہے اور کروڑوں لوگوں کی مادری زبان بھی ہے۔ دوسرے یہ کہ اُردو ایک خوبصورت زبان ہے جس کا ادبی سرمایہ ہندی سے بہت حد تک مشترک ہے اور اس کا علم باقی ہندوستانی زبانوں خصوصاً ہندی کو مالا مال کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔ تیسرے یہ کہ اردو اس ملک کے ایک عظیم مذہب اسلام کے مذہبی اور تہذیبی ورثے کو سمجھنے اور اجاگر کرنے میں ہمیں مدد دے سکتی ہے۔ چوتھے یہ کہ اُردو ہمسایہ ملک پاکستان کی سرکاری زبان ہے اور اس کی بدولت ہمارے دونوں ملکوں میں اچھے تعلقات کو بڑھاوا مل سکتا ہے۔ پانچویں یہ کہ اُردو رسم الخط کے ذریعے ہم ایران، افغانستان، عرب دنیا اور کئی ایسے مسلم ملکوں سے رشتہ جوڑ سکتے ہیں جہاں عربی یا فارسی رسم الخط رائج ہے۔ ان ملکوں سے زبان کی دوری دور کرنے



باپ کے خط بیٹے کے نام

موتی لال نہرو نے اپنے اکلوتے اور بیٹے جواہر لال نہرو کو شمع محفل کی طرح سے جُدا، سب کا رفیق بنانے میں جس انہماک، جگر سوزی اور جگر کاوی کا دیا ہے وہ تمام والدین کے لیے ایک اور ایک نمونہ ہے۔ موتی لال نہرو نے بے حد مصروف زندگی اور اپنے انتہائی دل شب و روز میں ایک لمحے کے لیے بھی بیٹے جواہر لال نہرو کی سیرت و شخصیت کی و تشکیل کے سلسلے میں غفلت نہیں برتی اور میں جواہر لال نہرو مادرِ ہند کے عظیم سپوت بھارت رتن ثابت ہوئے۔

موتی لال نہرو کے دل و دماغ میں اپنے کے مستقبل کے لیے کیا کیا خیالات اور کون سے جذبات موجزن تھے، وہ اپنے کی کتنی چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھی نظر رکھتے تھے، کی کہانی وہ خطوط بیان کرتے ہیں جو لال نہرو انگریزی زبان میں اپنے بیٹے کو ینڈ کے پتے پر بذریعہ ڈاک بھیجتے رہے۔ طوط ایک مشفق باپ کی دُور بینی و بیدار ی اور ایک ہونہار بیٹے کے بچپن کی معصومیت تعلیمی سفر کی رُوداد سناتے ہیں۔ اُردو میں خطوط کا ترجمہ ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ ل میں چند خطوط کا اُردو ترجمہ پیش کیا رہا ہے۔ موتی لال نہرو نے انگریزی زبان میں جس سادگی و پُرکاری اور شگفتگی و بے تکلفی کے ساتھ ان خطوط کو اپنے فکر و خیال کا آئینہ خانہ بنا دیا ہے اس کا اندازہ تو اصل خطوط پڑھ کر ہی کیا جا سکتا ہے پھر بھی میں نے کوشش کی ہے کہ نقل میں اصل کی روح آ جائے:

سردار احمد (علیگ)
ڑھی والا گھر، کٹرہ شہاب خاں، اٹاوہ ۲۰۶۰۰۱ (یو۔پی)

خط نمبر ۱

BAD EMS

SEPTEMBER 2, 1905

میرے پیارے جواہر

... ننھی کو تم سے بہت سخت شکایت ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ میرے بھائی نے میری سالگرہ پر بطور تحفہ ایک پیسے کا پوسٹ کارڈ بھی نہیں بھیجا۔ میرے خیال میں اس کی شکایت دُرست ہے۔ وہ تمھیں قریب قریب روز ہی ایک خط لکھتی ہے۔ اس کی تحریر میں ٹیڑھی میڑھی لائنیں ہوتی ہیں اور جب میں کہتا ہوں کہ میں انھیں پڑھ نہیں پاتا تو اس کا جواب ہوتا ہے "آپ جرمن زبان جانتے نہیں ہیں اور یہ جرمن ہے۔" ایک انگریز کرنل کی تیرہ برس کی بیٹی ہے۔ (اس انگریزی بیوی اس کا بڑا خیال رکھتی ہے۔ ننھی نے اسے اپنا دوست بنا لیا ہے اور وہ ساتھ ساتھ دن بھر کھیلا کرتی ہیں۔

تمھارا چاہنے والا باپ

موتی لال نہرو

۲

[درج ذیل خط لندن سے اس وقت لکھا گیا جب HARROW میں جواہر لال نہرو کی تعلیم و تربیت کا جائزہ لینے کے بعد موتی لال نہرو اپنے وطن ہندوستان واپس آ رہے تھے]

BAILEY'S HOTEL LONDON

SEPTEMBER 30TH 1905

میرے پیارے جواہر

ہیرو (HARROW) میں تم سے ملاقات کے بعد میں اوّلین موقع نکال کر یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تم سردی سے جتنی حفاظت کر رہے ہو، اس سے کہیں زیادہ موثر طریقے سے اپنے کو ٹھنڈک سے محفوظ رکھو۔ تم (اپنے لباس کے معاملے میں) ایک ہی حالت میں ہمیشہ کی طرح نہ رہو جب تم کمرے کے اندر ہو تو تمھیں زیادہ کپڑوں کی ضرورت نہیں ہے لیکن کھلی ہوا میں، چاہے ایک سیکنڈ کے لیے نکلو تم کو

اتنے کپڑے پہن لینے چاہئیں جتنا وزن تم سنبھال سکو۔

اپنے قریبی پڑوسیوں سے دوستانہ تعلقات رکھو۔ موقعے موقعے سے تعطیلات میں اُن کی تواضع کر دیا کرو اور گفتگو کے ذریعے عام پسندیدگی حاصل کرو۔

اس بیچ اپنی فلینل (FLANNEL) شرٹ کے کالروں کو کاٹ لینا اور انھیں اسٹف (STIFF) شرٹ اور انڈر ویسٹ کے درمیان استعمال کرنا۔

تم سے محبت رکھنے والا

باپ

(۳)

(تاریخ اور مقام درج نہیں)

میرے پیارے بیٹے

اُمید ہے تم بحفاظت ہیرو (HARROW) پہنچ گئے ہوگے اور گھر میں بغیر کسی مشکل کے داخلہ مل گیا ہوگا۔ حقیقت میں ایک دوسرے سے جُدا ہونا بڑی تکلیف دہ بات ہے تمھاری ماں اور میرے لیے یہ اتنی ہی تکلیف دہ جدائی ہے جتنی کہ تمھارے لیے۔ تم اس قدر جلد رخصت ہوتے کہ نہ میں بغل گیر ہو سکا اور نہ تمھارا بوسہ لے سکا کیوں کہ ٹرین کے حرکت میں آجانے سے صرف مصافحہ کرنے کا ہی وقت رہ گیا تھا۔ خیر یہ محض جذبات ہیں اور مجھے پورا یقین ہے کہ ان کے اثرات جلد ختم ہو جائیں گے۔

میں (انگلینڈ سے) ہندوستان اس یقینِ محکم کے ساتھ واپس جا رہا ہوں کہ میں نے مستقبل میں تمھاری عظمت کا بیج بو دیا ہے اور مجھے اس میں شک کا شائبہ تک نہیں ہے کہ تم اپنے سامنے ایک شاندار مستقبل رکھتے ہو۔ ہم تمھیں ہیرو (HARROW) میں دیکھ کر اطمینان کر چکے ہیں کہ تم وہاں خوش رہو گے۔ تمھاری والدہ تمھاری جدائی کے صدمے پر قابو پا رہی ہیں اور تمھاری بھلائی کے خیال سے انھیں تسکین ہے لیکن تم خط لکھنے سے غفلت نہ کرنا۔ جیسا کہ پچھلی رات کو طے ہوا تھا، اسی کے مطابق تم ہم کو پیرس، مارسیلز (MARSEILLES) اور پورٹ سعید کے پتے پر خط لکھنا... اچھا تو اب میرے پیارے بیٹے ــــ الوداع ــــ اپنے تئیں ہر ممکن احتیاط رکھنا۔

تم کو چاہنے والا

باپ

(۴)

HOTEL CONTINENTAL

3, RUE DE CASTIGLIONE PA

OCTOBER 16TH, 1905

10.45 P.M.

میرے پیارے بیٹے

... میں اب فرانس میں ہوں اور اُمید ہے کہ تمھاری خیریت روزانہ مل سکے گی۔ تم اسکول میں اپنے پہلے دن کا پورا حال لکھنا۔ مجھے تشویش رہتی ہے کہ ہیرو (HARROW) میں اس باپ کے چہیتے اور پیارے بیٹے کو کون کون سے ایسے کام کرنا پڑتے ہیں جن کے لیے اس کے باپ کے پاس ہندوستان میں پچاس سے زائد نوکر موجود ہیں۔

براہِ کرم جلد از جلد اپنی تصویر اپنے نئے کپڑوں میں کھنچوا کر ہمارے پاس کم سے کم نصف درجن کی تعداد میں بھیج دینا۔ سرجنٹ کے پاس اپنے یونیفارم کے آرڈر میں تاخیر نہ کرنا اور جب یہ تیار ہو جائے تب اس یونیفارم میں بھی فوٹو کھنچوانا اور اس کی نصف درجن کاپیاں بھیج دینا۔

تمھارا چاہنے والا باپ

(۵)

MARSEILLES

20-10-1905

میرے پیارے جواہر

تمھیں یہ بات ضرور یاد رکھنا ہے کہ اس دُنیا میں اور آنے والی دُنیا میں جو کچھ بھی ہماری عزیز ترین متاع ہے وہ تمھاری صورت میں چھوڑ رہا ہوں۔ ہم تمھاری جدائی کی بے قراری صرف تمھاری بہتری اور اچھائی کی خاطر برداشت کر رہے ہیں۔ سوال تمھارے اخراجات پورے ہونے کا نہیں ہے کیوں کہ یہ تو میں صرف اپنی ایک سال کی آمدنی سے پورے کر سکتا ہوں۔ بلکہ سوال ہے تم کو ایک حقیقی اور مکمل انسان بنانے کا جو تمھیں بننا ہے۔ یہ انتہائی خود غرضی کی بات ہوگی بلکہ میں تو کہوں گا کہ گناہ کی بات ہوگی کہ تم کو ہم اپنے ساتھ رکھیں اور معمولی تعلیم یا بغیر تعلیم کے تمھارے سپرد دھن دولت



ں تقدیر کر جائیں ۔ میں بغیر کسی شیخی اور غرور ہتا ہوں کہ میں نہرو خاندان کا بانی ہوں۔

میں تمھاری طرف میرے بیٹے! ایک ے انسان کے رُوپ میں دیکھتا ہوں جو میری رکی ہوئی بنیادوں پر عمارت کی تعمیر کا ں انجام دے گا اور اپنی عزت و ناموری کو ںدی کے آسمان تک پہنچا دے گا۔ ہم تمھارے شت پوست کے جسم سے ضرور جدا ہیں لیکن روح کے تعلق سے ایک ساتھ ہیں۔ تم اپنے دِس مقاصد کے حصول کی فکر کرو اور اپنے یز اور محبوب والدین کی جدائی کا احساس رز نہ کرو۔

تقریباً دو سال میں تم اس لائق : جاؤ گے کہ تم اپنے قدیم اور مانوس مقام ہ آباد میں چند ماہ گزار سکو، لیکن اس وقت منا نشاط افروز فرق محسوس ہوگا جب تم اپنی سائی کے مطابق ـــــ ہیرو (HARROW) ے انعام و اکرام سے لیس ہو کر ایک پُرجوش واں مرد بن رہے ہو گے۔ کیا اس وقت تمھیں یکھ کر ہمارے دل مارے خوشی کے اُچھل ز جائیں گے۔

میں تم کو کتنا زیادہ چاہتا ہوں، اس ا احساس جدائی کے وقت ہوتا ہے۔ خواہ بدائی لمحوں کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔ شاید یہ یرے کمزور دل کی وجہ سے ہے لیکن فرائض ی ادائیگی کا احساس ہمیشہ کی طرح قوی تر ہے۔ رہ گیا میرے کمزور دل کا معاملہ سو یہ نمھارے ہی فکر و خیال میں رہتا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ میری زندگی کی واحد خواہش تمھیں کامیاب دیکھنا ہے۔ مجھے شمّہ برابر بھی شک نہیں ہے کہ تم میری اُمیدوں اور خواہشوں سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر ترقی کرو گے۔ تم کو مشغول رکھنے کے لیے تمھارے پاس کافی کام ہے۔ ایک مرد کی طرح اپنے کو ان کاموں میں لگا دو اور اپنا مشن پورا کرو۔

کام میں تندرستی کی حفاظت بھی شامل ہے۔ تم جسم اور دماغ دونوں اعتبار سے کامل بنو اور یہی صلہ ہے جس کا میں تمھاری جدائی کے عوض متلاشی ہوں۔ میں صفحات کے صفحات اس پر لکھ سکتا ہوں لیکن اب ایک بجے (خط لکھنا) بند کرتا ہوں۔ اور تم کو میرے کسی وعظ کی ضرورت نہیں ہے۔ اچھا اب میں اپنے چہیتے بیٹے کو الوداع کہتا ہوں۔ اپنی پوری دیکھ بھال کرنا اور احتیاط رکھنا ایسا کرنے میں تم سمجھنا کہ تم اپنے والدین کی دیکھ بھال کر رہے ہو۔

تمھارا پیارا
باپ

نہرو مریضوں کی اچھّی دیکھ بھال کرتے تھے ۔ اگر کوئی ان کے ساتھ ہو اور بیمار پڑ جائے تو وہ یہ بھروسہ کر سکتا تھا کہ نہرو محبّت کے ساتھ اور اچھّی طرح اس کی تیمارداری کریں گے ۔ میں نے سُنا ہے کہ جب وہ قلعۂ احمد نگر میں قید تھے تو راتوں کو جاگ جاگ کر اپنے بیمار ساتھیوں کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے ۔ ان کے ایک ساتھی نے کہا تھا ” ان کے موجود ہونے سے مریض مطمئن رہتا تھا۔ اور اس کی تکلیف بہت کم ہو جاتی تھی “۔

نہرو اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ممبر 1942 میں احمد نگر میں قید کر دیے گئے ۔ پنڈت جی نے دل و جان سے اپنے بیمار ساتھیوں کی خدمت کی ۔ ان کی ہر طرح مدد کی ، باغبانی اور کھیلوں میں ان کا ہاتھ بٹایا یہ نہرو کی محنت کا ہی نتیجہ تھا کہ اس اُجاڑ جگہ جو چھوٹا سا باغ لگایا گیا تھا اس کی رونق دنوں دن بڑھتی گئی ۔ وہ برابر گُھدائی ، نرائی میں لگے رہتے ۔ پابندی سے پانی دیتے ، گھاس پوس صاف کرتے ۔

ہم سب گواہ ہیں

(پنڈت جی کے آخری سفر کی کہانی)

دہلی کے تین مورتی مارگ پر بنگلے میں کھڑی تین مورتیاں ایک دم خاموش ہیں۔ خاموش بے جان اور ساکت ان کے سامنے لوہے کا بڑا سا گیٹ بند ہے۔ گیٹ کے باہر بے شمار لوگ آہنی سلاخوں کو پکڑے کھڑے ہیں ان کی آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر سسکیاں ہیں۔ گیٹ کے اندر کے وشال بھون میں ایک دردناک فضا ہے۔ اس عمارت کی دیواروں کو ناز اور شان بخشنے والا انسان ان سے وداع ہو گیا ہے۔ کروڑوں انسانوں کی دھڑکنوں میں سمایا ہوا شخص انھیں ایک دم چھوڑ گیا ہے جس نے ایک بار ان لوگوں کے لیے کہا تھا کہ :

"IF ANY PEOPLE CHOSE TO THINK OF MF THEN I SHOULD LIKE THEM TO SAY: THIS WAS THE MAN WHO WITH ALL HIS MIND AND HEART, LOVED INDIA AND INDIAN PEOPLE. AND THEY IN TURN, WERE INDULGENT TO HIM AND GAVE HIM OF THEIR LOVE MOST ABUNDANTLY AND EXTRAVAGANTLY".

وہی اس گھڑی ان سب سے بے نیاز گہری نیند سو یا پڑا ہے اور اس کے پاس اس کی اکلوتی لڑکی جسے وہ پیار سے اندو کہا کرتا تھا اور جس کے خط درست کر کے واپس بھیجا کرتا تھا تھم وائم کی تصویر بنی بیٹھی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں۔ روح میں اچانک بھڑکی آگ نے آنسوؤں کے سوتے خشک کر دیے ہیں۔

شام ہو رہی ہے لوگوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی ہے۔

سب کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔

سب کے ہونٹوں پر سسکیاں ہیں۔

اور سب کے من میں چاہت ہے کہ وہ ایک بار اور آخری بار اس چہرے کے درشن کر لیں جسے دیکھنے کو پھر آنکھیں ترس جائیں گی۔

اور پھر لوہے کا بڑا سا گیٹ دھیرے دھیرے کھلتا ہے انسانوں کا ایک دریا بڑھتا ہے عمارت کے اندر باندھ توڑ کر اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف جل تھل ہو جاتا ہے انسانوں کی شردھا کی نہریں سب چیزوں کو اپنے میں سمو لیتی ہیں۔ چاروں طرف ایک اتھاہ سمندر پھیل جاتا ہے اور اس سمندر میں خشکی کا ایک سفید سا ٹکڑا نظر آ رہا ہے جیسے ایک غیر آباد جزیرہ ہو اور اس جزیرے میں صرف خاموشی اور سکوت ہے کہیں زندگی کی رمق نہیں صرف ایک گھلتی ہوئی سی شمع جل رہی ہے ہلکی ہلکی روشنی بکھیرتی ہوئی۔ اور یہ روشنی اس شمع نے پھول کی پنکھڑیوں میں سے پھوٹ کر نکل رہی ہے جو اس شخص کی اچکن میں لگا ہے۔ رات کا اندھیرا بڑھ رہا ہے لیکن اس چراغ کی روشنی بڑی خاموشی اور عظمت سے سب کے درمیان پھیل رہی ہے اور اس اجالے میں آنکھوں کے آنسو، ہونٹوں کی سسکیاں، سینوں کی دھڑکن اور روح کی جلن نظر آ رہی ہے۔

اور یہ سب کچھ نظر آ رہا ہے صرف دو ہستیوں کو۔ ایک سفید سا رکھی ٹوپی پر رکھی اندرا کو ——

اور ایک لان کے کونے میں اگے گلاب کے پودے پر ادھ کھلے پھول کو۔ اور وہ پھول میں ہوں اور اس گھڑی اپنی ہی روشنی سے سب کو دیکھ رہا ہوں۔ سب کے درد کو محسوس کر رہا ہوں سب کی محرومی کے احساس کو ماپ رہا ہوں اور اپنی پنکھڑیوں کی آنکھوں سے آنسو بہا رہا ہوں۔ میں رو رہا ہوں بغیر آواز کے اور اپنی بے زبان آواز میں مخاطب ہو رہا ہوں ان سب سے جو یہاں جمع ہیں۔ یہ ایک ایسی آواز ہے جس کی کوئی گونج نہیں جس کے کوئی الفاظ نہیں کوئی ارتھ نہیں پھر بھی اس کے معنی ہیں ایک مقصد ہے ایک منزل ہے۔

گلاب کا یہ پودا بہت دنوں سے یہاں کھڑا ہے اس نے درجنوں پھول کھلائے ہیں۔ اور آج

کشمیری لال ذاکر
ہریانہ اردو اکادمی، ۹۷۸۔ سیکٹر ۹، پنچکولہ ۱۳۴۱۰۸

یدمیں آخری پھول ہوں جو اس ٹہنی پر کھلا ہوں۔
اس ٹہنی پر کوئی پھول نہ کھلے گا، کوئی کلی نہ
ے گی، کوئی خوشبو نہ اڑے گی، کوئی رنگ نہ
مرے گا۔

میرے ساتھ تین پھول اور بھی ہیں، ہم سب
ج شام کے وقفے سے کھلے ہیں۔ ہماری شکل و
ورت، سج دھج، روپ رنگ بالکل ایک جیسا
ہے۔ ہمیں مالی نے بڑے پیار اور دلار سے پالا ہے
ہنیوں کی تراش خراش کی ہے پانی دیا ہے سوکھے
توں کو الگ کیا ہے۔ نئی نئی کونپلوں کو اپنی محبت
ی حرارت دی ہے۔

ابھی کچھ دیر پہلے ہم میں سے ایک پھول
لک ہو گیا ہے۔ مالی جب توڑنے آیا تو ہم سب
نے اپنی اپنی گردنیں ہلا کر خود کو پیش کیا لیکن اُس
نے صرف ایک پھول کو توڑا جو سب سے آخر میں
کھلا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا مالی اس پھول کو مالک
کی اچکن میں ٹانک رہا تھا کیوں کہ آج ابھی تک
ان کی اچکن میں پھول نہیں لگا تھا کہیں ایک کمی رہ
گئی تھی جسے کسی نے اب تک محسوس نہ کیا تھا اور
اب وہ کمی پوری ہو گئی تھی اور یہ وہی پھول تھا۔
جس کی روشنی ارد گرد چھائے اندھیرے میں تحلیل
ہو رہی تھی۔

اور پھر اندھیرا چھٹ گیا لیکن انسانوں
کی شردھا کا ٹھاٹیں مارتا سمندر اور بھی گہرا ہوتا
گیا اور اس وسیع سمندر میں نظر آتا خشکی کا ٹکڑا
اور بھی اونچا ہو گیا۔ طوفان بھی اُٹھا تھا، بادل بھی
گرجے تھے مینہ بھی برسا تھا لیکن غم کی شدت
ایک مقام پر رُک گئی تھی۔ ماحول ساکن ہو گیا
تھا مشرق کے جھروکے سے سورج نکلا تھا اس کی
کرنوں نے عمارت کے در و دیوار کے ساتھ لگ
کر سسکیاں بھری تھیں اور اس ہستی کو گھر کے
ایک ایک کونے میں تلاش کیا تھا جو ان کرنوں
کو اُٹھا کر ایک مشعل بنا رہا تھا جس کی روشنی میں وہ
دنیا کے ہر فرد و بشر کو امن، محبت اور بھائی چارے
کا راستہ دکھا رہا تھا۔

گیتا، قرآن، جپ جی صاحب کا پاٹھ
ہو رہا تھا۔ رندھے ہوئے گلے سے رام دھن کا
اچارن ہو رہا تھا اور اپنے مالک کو گھر سے سدا
کے لیے وداع کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں میں
سبز سبز پتوں کی اوٹ سے گردن اٹھا اٹھا کر سب
کچھ دیکھ رہا تھا اور ان کلیوں کو بتا رہا تھا جو کانٹوں
کے ساتھ لگی سسک رہی تھیں اور لہو لہان ہو
رہی تھیں۔

اور پھر آسمان کو دہلا دینے والی ایک
ہوک اُٹھی اور گھر کا مالک گھر سے جُدا ہو گیا۔
ایسا مالک جس کا گھر صرف اس تین مورتی مارگ
کی عمارت کی دیواروں پر مشتمل نہیں تھا اس کا گھر
تو ہمالیہ کی چوٹیاں تھیں، سندھیا ساگر کی ترنگیں
تھیں اجنتا اور ایلورا کے غار تھے۔ گنگا اور جمنا
کی لہریں تھیں لال قلعہ اور جامع مسجد کی سُرخی تھی،
غالب اور ہمایوں کے خواب تھے ظفر اور شیواجی
کے خاکے تھے، گوتم بدھ کے اصول تھے چاروں
طرف لہلہاتے ہوئے کھیت تھے، گیہوں کی بالیاں
اور دھان کے خوشے تھے۔ تربخنوں کے گیت اور
لوک ناچوں کی آن تھی۔ اور آج جب اتنے بڑے
گھر کا مالک گھر سے جُدا ہو رہا تھا تو سبھی رو رہے
تھے۔ ہمالیہ کی چوٹیاں، ہند مہا ساگر کی لہریں رو
رہی تھیں گوتم اور نانک کے اقوال سسک رہے
تھے، اجنتا اور ایلورا کے بُت آنسو بہا رہے تھے
کھیتوں میں گیہوں کی بالیاں کانپ رہی تھیں اور
تربخنوں کے گیت اور لوک ناچوں کی آن تڑپ
رہی تھی۔

میں یہ سب دیکھ رہا تھا، محسوس کر رہا تھا
لیکن خاموش تھا۔ میری طرح میری بہن بھی خاموش
تھی جس کو لوگ اندرا پریہ درشنی کہہ کر پکارتے
تھے اور آج جس کے چہرے پر زمانے بھر کی
مایوسی پھیل گئی تھی۔

اور اس کے الفاظ "باپو الوداع"
فضا میں گونج رہے تھے اور سُرخ سُرخ
شعلے لپک رہے تھے اور چاروں طرف آنسوؤں کا
سمندر پھیلا تھا اور کچھ ہی سو گز کے فاصلے پر بدھ اور
عیسیٰ کا نام لیوا جسے کچھ ہی برس پہلے کروس فائی کر دیا
گیا تھا اپنی خاموش آواز میں کہہ رہا تھا۔

"میرا ہندوستان نہرو کے ہاتھ میں محفوظ
رہے گا۔"

میں نے یہ سب کچھ سُنا ہے میں اس کا
ساکھشی ہوں اور میرے ساتھ ہزاروں میرے
ساتھیوں نے بھی اسے سنا ہے میرے وہ ساتھی
جو جانے کہاں کہاں کھِلے تھے اور اب پنڈت نہرو
کے قدم چومنے کے لیے سینکڑوں میلوں کا فاصلہ
طے کر کے یہاں پہنچے تھے۔ وہ سب اس دعوے
کے ساکھشی ہیں۔

جب اندرا واپس لوٹی تو وہ وشال بھون
ایک کھنڈر بن چکا تھا جس میں یادوں کے چراغ
جل رہے تھے اور خوابوں کے پھول مُرجھا رہے تھے۔

ایک دن اور بیت گیا۔
ایک یُگ ختم ہو گیا۔

ایک زمانہ سو گیا۔

اور پھر پو پھٹی اور لال قلعے پر جھکا ہوا جھنڈا سر نہوڑائے اپنی یادداشت میں پچھلے سینکڑوں سال کی تاریخ کو دہرا رہا تھا۔

وسیع عمارت کی اداسی اور غم کی چادر اوڑھے اس گھر کا پرانا ملازم ہیرالال آرہا تھا میری طرف۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اس کی اداس آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں اس کے قدم میری طرف بڑھتے آرہے تھے وہ بالکل میرے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ اُس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ وہ رو پڑا۔ شبنم کے چند قطرے میری پنکھڑیوں سے ٹکرا کر پتوں پر جم گئے۔ یہ پنکھڑیاں ہی تو میری پلکیں ہیں۔ رات جب روتی ہے تو اس کے آنسو ان پلکوں پر ہی تو جمتے ہیں میں نے کئی بار رات کو روتے دیکھا ہے۔ رات تب ہی روتی ہے جب کسی سہاگن کا سیندور لٹتا ہے۔ وہ اس لمحے بھی روتی ہے جب کوئی بچہ یتیم ہو جاتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت بھی آنسو آتے ہیں جب فٹ پاتھ پر سویا ہوا کوئی بھکاری سردی سے اکڑ کر مر جاتا ہے۔ وہ اُس پل بھی سسک اُٹھتی ہے جب کوئی بے گناہ پھانسی کے تختے پر جھول جاتا ہے۔ رات آج بھی جی بھر کر روئی تھی۔ اس لیے کہ آج سبھی کچھ ہوا تھا۔ سہاگنوں کا سیندور بھی لٹا تھا، یتیمی کا وار بھی ہوا تھا، فٹ پاتھوں پر جاڑے سے بھی موتیں ہوئی تھیں۔ بے گناہ بھی پھانسی پر لٹکے تھے۔ رات کی پلکوں پر آنسوؤں کی نمی تھی اور اُس کے ہونٹوں پر سسکیوں کی جلن تڑپ رہی تھی میری ہمت نہ ہوئی کہ میں ہیرالال کی سوجی ہوئی آنکھوں کو جی بھر کر دیکھ سکوں میں نے نظریں جھکا لیں۔

اور جب ہیرالال نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے میرے ساتھ کھلے ہوئے دوسرے پھول کو توڑ کر اپنے غم کی چادر میں چھپا لیا تو میری روح میں سینکڑوں کانٹوں کی نوکیں ٹوٹ کر رہ گئیں۔

اور میں نے سنا اس دلدوز آواز کو جو شانتی گھاٹ کی گرم راکھ سے اُبھری تھی جب اس پر دودھ اور پانی چھڑکا گیا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے کانوں میں کوئی اُبلتا ہوا سیسہ ڈال رہا تھا۔ میں نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ گھر کا مالک راکھ کا ایک ڈھیر بن چکا تھا کل شام لپکتے ہوئے شعلے گرم راکھ میں بدل گئے تھے۔ میں اب سن تو نہیں رہا تھا میرے کانوں میں چیخوں کی آواز نہیں آرہی تھی۔ ہونٹوں پر لرزتی ہوئی سسکیاں مجھ تک نہ پہنچ رہی تھیں لیکن میری آنکھوں میں جوتیں جل اُٹھی تھیں۔ روشنی اور تیز ہو گئی تھی جیسے کل کے لپکتے ہوئے شعلے میری آنکھوں میں سما گئے تھے۔ میں نے دیکھا ایک دم حیرت زدہ اور بنا پلک جھپکائے۔ میں نے دیکھا ہیرالال سر جھکائے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے ٹھنڈی ہو چکی راکھ کے ڈھیر کے پاس آیا۔ پل بھر کو رُکا اس کے ہونٹوں سے ایک چیخ نکلی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی ٹوٹی اور اُس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے غم کی چادر میں چھپایا وہ گلاب کا پھول جو صبح اس نے توڑا تھا نکال کر راکھ کے ڈھیر پر رکھ دیا۔

"میرے مالک یہ اپنا من چاہا پھول سویکار کیجیے۔" پاس کھڑے لوگوں کی چھاتی پھٹ گئی۔ وہ ڈھیر سے ڈھیر پر لوٹ گیا۔

شرث پھول ٹہنی پر کھلا ہوا دوسرا گلاب راکھ کے ڈھیر پر پڑا رو رہا تھا لیکن سسکیاں منتروں کے اچارن میں ڈوب گئی تھیں۔

اور پھر راکھ بھرا کلش تین مورتی مارگ کے وشال بھون کی آخری امانت بن کر شردھا اور عقیدت کا خراج وصول کرتا رہا جیسے مرد اور عورتیں ہزاروں کی تعداد میں آنسوؤں کی شکل میں پیش کرتی رہیں۔

میں یہ سب دیکھتا رہا اور کانٹوں سے لہولہان ہوتی کلیاں سرگوشیوں میں مجھ سے درد کی داستان کہتی رہیں۔ ایک یگ اور بیت گیا کروڑوں لمحوں کا ایک عظیم تر قافلہ ہاتھی چال سے وقت کی راہوں پر سے گزر گیا۔ منزل کی تلاش تھی اندھیرے میں۔ اندھیرے میں بھلا منزلیں کہاں ملتی ہیں؟

اس گہرے اندھیرے میں کئی قافلے چلتے چلتے ایک دم رُک گئے تھے۔ کئی راستے ایک دوسرے میں مدغم ہو کر اپنا وجود کھو بیٹھے۔ کئی منزلیں اپنا نشان گنوا رہی تھیں۔ اسی اندھیرے میں اپنے ساتھ کلیوں کو چھپائے میں سوچ رہا تھا ہم سب اب کہاں جائیں گے۔ ہماری منزلیں اپنائیں گی کہ نہیں۔ عمارت کے وسیع احاطے اگا ہر پیڑ، ہر بوٹا، ہر بیل، ہر پھول، ہر کلی سوچ رہی تھی۔ اب ہم کہاں جائیں گے؟ اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟ اب ہمارے سامنے کون راستہ ہے؟

ہماری سوچوں سے رات کا اندھیرا بوجھل ہو کر اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔ سناٹا اور بھی شدید ہو گیا تھا۔



اندھیرے کی اس خاموشی میں ایک ؟
دھڑکن جاگی۔ ایک آواز گونجی۔ میں اس آواز کو
پہچانتا تھا۔ یہ آواز میں پہلے بھی کئی بار سن چکا تھا۔
سی فضا میں، اسی ماحول میں، اسی عمارت کے اندر۔
یہ پنڈت نہرو کی بہن کی آواز تھی۔ وجے لکشمی پنڈت
کی، اس عورت کی جس کے چہرے کو میں ایک
ٹک دیکھتا رہتا تھا۔ کتنی جاذبیت اور جلال تھا
اس چہرے پر اور وہی چہرہ کیسے بجھ گیا تھا۔ جیسے
بلتی ہوئی مشعل پر کسی نے ایک دم پردہ ڈال
دیا ہو۔

میرے اور ہم سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ وجے لکشمی پنڈت کی آواز دھیرے دھیرے ابھر رہی تھی۔ وہ اپنے عزیز بھائی کی وصیت سے کچھ اقتباسات پڑھ کر سنا رہی تھیں۔ ان کی آواز میں درد تھا اور گلا رندھ رہا تھا۔

"گنگا ندی کا تصور میرے ذہن میں ہمیشہ یہ رہا ہے کہ یہ بھارت کے ماضی کی علامت ہے جو زمانۂ حال میں سے گزرتی ہوئی مستقبل کے مہاساگر کی طرف بہہ رہی ہے۔ اگرچہ میں نے ماضی کی بہت سی روایات اور رسوم کو ترک کر دیا اور میری زبردست خواہش ہے کہ بھارت کو تمام بندھنوں سے نجات حاصل ہو جو اس کے بہت سے لوگوں پر بوجھ بنے ہوئے ہیں، ان کے پھلنے پھولنے میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں اور ان میں نفاق پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔ تاہم میں ماضی سے اپنا رشتہ بالکل ہی نہیں توڑنا چاہتا۔ مجھے اپنے عظیم ورثے پر فخر ہے اور مجھے اس امر کا احساس ہے کہ میں بھی بھارت کے دوسرے لوگوں کی طرح اس زنجیر کی ایک کڑی ہوں جس کا ایک سرا بھارت کی قدیم ترین تاریخ تک پہنچتا ہے۔ بھارت کے ثقافتی ورثے کے تئیں آخری عقیدت کے طور پر میں یہ درخواست کر رہا ہوں کہ میری مٹھی بھر استھیاں الٰہ آباد کے مقام پر گنگا ندی میں بہادی جائیں تاکہ وہ اس مہاساگر میں مل جائیں جو بھارت کے ساحل کو چھو رہا ہے۔ میری استھیوں کا بیشتر حصہ ہوائی جہاز کے ذریعے ان کھیتوں میں بکھیر دیا جائے جہاں بھارت کے کسان محنت و مشقت کرتے ہیں تاکہ وہ بھارت کی مٹی میں مل کر بھارت ہی کا رچا ہوا حصہ بن جائیں۔"

ہائے دھرتی سے کتنا پیار تھا اس کو ہم دھرتی پر رہنے والوں کو ایک دم تنہا اور بے سہارا چھوڑ کر آسمان کی وسعتوں کی طرف پرواز کر گیا تھا۔ اسے پہاڑ اور دریا پسند تھے۔ اسے گنگا سے اس لیے محبت تھی کہ وہ اسے روشن ماضی کی روایات کی امانت دار نظر آتی تھی، اس میں حال کے حسین خاکوں کے لیے رنگ اور مستقبل کے سنہری خوابوں کی روپ ریکھا تھی۔ اس کی لہروں میں ماضی، حال، مستقبل کا یہ تسلسل کتنا عزیز تھا پنڈت جی کو۔ اس لیے انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ ان کی راکھ کی ایک مٹھی گنگا میں بہادی جائے تاکہ وہ ایک عظیم مستقبل میں تحلیل ہو کر رہ جائے۔

اور پھر ایک صبح کشتی میں راکھ کا کلس لہروں پر سے گزرتا ہوا اس مقام کی طرف جا رہا تھا جہاں گنگا جمنا ملتی ہیں اور جہاں سرسوتی ان میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ سرسوتی جو نظر نہیں آتی، جو گپت ہے۔ جو ان دو ندیوں کے نیچے بہتی ہوئی ان کے ساتھ شامل ہو جاتی ہے۔ جسے کوئی دیکھ نہیں سکتا لیکن جس کی مہانتا کو ہر کوئی تسلیم کرتا ہے۔ اور آج سنگم پر ایک اور دریا چل رہا تھا، ایک بہت بڑی شخصیت کا دریا، جس کی ہلکی سی لہر میں تینوں ندیوں کی لہروں کو اپنے بازوؤں میں لے کر انھیں امر کر رہی تھیں۔ ایک ایسا دریا جو دیکھنے میں صرف راکھ کی ایک لکیر، اور بے شمار پنکھڑیوں کی ایک قطار نظر آتی تھی پانی کی سطح پر تیرتی ہوئی لیکن جس میں کروڑوں ہندوستانیوں کی بھاؤنائیں مل گئی تھیں۔ لاکھوں سوچنے والوں کے دماغوں کی روشنی سینکڑوں ہاتھوں کا مشعل بردار اُجالا تھا اور اس میں وہ مہن شیلتا تھی جسے ہماری پرمپراؤں نے جنم دیا تھا اس میں وہ ٹھہراؤ تھا جو ہماری تہذیب کا امانت دار تھا۔ اس میں وہ زور تھا جو ہمارے ارادوں کی دین تھا اور یہ چوتھا دریا اپنے آغوش میں تینوں ندیوں کو لیے بڑھے جا رہا تھا ہند مہاساگر کی طرف، انھیں بھی سمندر میں بدل ڈالنے کے لیے۔

اور چاروں دریاؤں کی ایک لہر پر ڈولتا ہوا میری ٹہنی پر میرے ساتھ کھلا ہوا تیسرا پھول تھا جسے سنجے اور راجیو توڑ کر لے گئے اپنے معصوم ہاتھوں سے آخری بھینٹ پیش کرنے۔ اور وہ پھول اپنی بھیگی ہوئی پنکھڑیاں لیے سورج کی کرنوں میں چمکتا ہوا بہا جا رہا تھا اور اسے میری یاد آ رہی تھی۔ میری یاد جسے وہ اکیلا چھوڑ گیا تھا اس اداس اور غمگین فضا میں سسکنے کے لیے۔

اور پھر اس سارے المیے کی آخری کڑی تشکیل پا رہی تھی۔

اتنے بڑے گرنتھ کا انتم ادھیائے لکھا جانے والا تھا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کا آخری روشن کنارہ افق کی وسعتوں میں ڈوبنے جا رہا تھا۔ وصیت

میں تھی آخری خواہش کی تکمیل ہونے والی تھی۔

پنڈت نہرو کی راکھ ان کھیتوں میں بکھیری جانے والی تھی جہاں ہندوستان کے کسان اپنا خون پسینہ ایک کرتے ہیں اس لیے کہ راکھ کے وہ ذرّے بھارت کی دھرتی میں سما کر ایک ہو جائیں۔

ہوائی جہاز راکھ لیے اُڑ رہے تھے۔ پہاڑوں اور میدانوں پر گلشیروں اور سوکھی چٹانوں پر، جنگلوں اور سمندروں کو چھوتے ساحلوں پر قلعۂ احمد نگر کے گرد پھیلے کھیتوں پر بکھیر رہے تھے راکھ کے ذرّے۔ اسی کی دیواروں میں پنڈت جی نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر اپنی دھرتی کو آزاد کرانے اور اس کی تقدیر سنوارنے کے خواب دیکھے تھے۔ یہ راکھ جیسے اس تصویر کو آخری ٹچ دے رہی تھی۔ انڈیمان اور لکادیو جزیرے، پنجم اور راج کوٹ، کنیا کماری اور تری وینڈرم، بھونیشور اور امپھل، ملک کے چاروں کھونٹ ان کی راکھ کے ذرّے بکھیر دیے گئے کہ ان کے خواب دھرتی میں مل کر اس کا ایک جزو بن جائیں۔

میرے کانوں میں ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ گونج رہی تھی اور میں اکیلا اپنی ٹہنی کے ساتھ لگا سوچ رہا تھا کہ اب میرا کیا ہوگا؟ یوں بے سہارا پڑے رہنے سے کیا فائدہ۔ میرے باقی تین ساتھی خوش قسمت تھے کہ میرا ساتھ چھوڑ کر کتنی پرا پت کر گئے۔ انھیں نروان مل گیا۔ اور میں یہاں تین مورتی مارگ کے سامنے بڑی سی عمارت کے ایک کونے میں پڑا سسک رہا تھا میرے پاس دبکی کلیاں کانٹوں سے لہولہان ہو کر مجھ سے بات کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن میں خاموش تھا۔ وہ مجھ سے سُننا چاہتی تھیں ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرنوں کی کہانی۔ لیکن میری زبان جیسے کٹ گئی تھی۔ میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ میں تو قوتِ گویائی سے محروم ہو گیا تھا۔

کلیوں نے بات کرنا چاہی۔
پتیوں نے سرگوشی کی۔
کانٹوں نے سوال کیے۔
لیکن میرے پاس کسی بات کا جواب نہیں تھا۔

میں تو خود ایک سوال بن کر ٹہنی کے ساتھ سا کن لٹکا تھا۔ کاش اس سوال کا کوئی جواب مل سکے۔ اور پھر اچانک ہوا کا ایک تند ریلا آیا اور میرے چاروں طرف جیسے بگولے سے ناچنے لگے۔ میں جیسے بے ہوش سا ہو گیا ——— مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ کیا ہو رہا تھا۔ احساس ہو رہا تھا جیسے میں اُڑ رہا ہوں، ٹہنی سے ایک دم الگ ہو گیا ہوں، ہوا کے کندھے پر سوار ہو کر کہیں جا رہا ہوں، آسمان کی طرف بلندیوں کی سمت اور جب مجھے ہوش آیا۔ جب میں نے اپنے آپ کو سنبھالا تو میں نے دیکھا میں پہاڑوں کے اوپر سے اڑتا ہوا ایک وادی کی طرف آ رہا تھا بلندی سے کم بلندی کی طرف۔ نیچے سرسبز گھاس پھیلی تھی۔ ایک ندی کا نیلا پانی بہہ رہا تھا اور اس میں گول گول پتھر پڑے لہروں کا راستہ روک رہے تھے۔ میں نے آنکھیں جھپکیں، دوبارہ جھپکیں میں شاید خواب دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو جھنجھوڑا۔ نہیں خواب نہیں تھا حقیقت تھی۔ میرے قریب تو اندرا جی بیٹھی تھیں۔ سفید ساڑھی لپیٹے اداس نگاہوں سے نیچے پھیلی وادی اور اس میں بہتی ہوئی ندی کو دیکھتی۔ یہ پہلگام کی وادی تھی۔ جہاں وہ اپنے پتا کے ساتھ کتنی بار آئی تھیں اور بس سے انھیں ذہنی لگاؤ تھا۔

اور پھر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور اس ستھی سے اس کہانی کی آخری سطر لکھ دی گئی۔ رحمہ کی آخری منٹی۔ ندی کی لہروں پر بکھیر کر پیچھے برس سے بکھے جاتے ہوئے رشتے کی تکمیل کر دی تھی۔

میں نے سفید کنول کو آخری بار چھوا۔
گھر کی پتی کو آخری بار پرنام کیا
کر ستے کے آخری سفے پر ٹکر کر مسکرا دیا
مجھے بھی نروان مل گیا اور میرے ساتھ ان ہزاروں پھولوں کو جنھوں نے اس پوجا میں حصّہ لیا تھا اور اب میں اور میرے تینوں ساتھی گلاب کے پھول جو میرے ساتھ گلاب کی ایک ہی شاخ پر کھلے تھے اور پھر دھیرے دھیرے جدا ہو گئے تھے ہم سب ساکشی ہیں اس بات کے کہ راکھ کے ان ذرّوں سے جو ملک کے کونے کونے میں بکھرے ہیں ہندوستان کا مستقبل بنے گا روشن اور مضبوط مستقبل۔

اور میرے ساتھ ساکشی ہیں لاکھوں میلوں میں پھیلے ہوئے کھیت اور کنوارے میدان۔ اور برف سے ڈھکی چوٹیاں اور سمندر سے ملتے ساحل اور ان سب دریاؤں کے تٹ جہاں تہذیب نے پہلی بار سورج کی روشنی دیکھی تھی۔ اور وہ سارے کسان جو اس تہذیب کے رکھوالے ہیں۔ اور کلائیوں میں کھنکتی چوڑیاں اور پنگھٹوں پر گونجتے لوک گیت، اجنتا اور ایلورا میں نکھرے خاکے۔ یہ سب اور ان سب کے ساتھ دلوں میں گونجتی دھڑکنیں اور ہاتھوں پر رقصاں مضبوط ارادے گواہ ہیں کہ ہمیں انسان کی عظمت اور اس کی شرافت کا یقین ہے۔ ●



پنڈت جواہر لال نہرو
ماہ و سال کے آئینے میں

۱۸۸۹ء

۱۴ر نومبر کو الٰہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام موتی لال نہرو اور والدہ کا نام سروپ رانی تھا۔

۱۹۰۵ء

مئی۔ تعلیم کے لیے انگلینڈ گئے۔

۱۹۱۲ء

بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ الٰہ آباد میں وکالت شروع کی۔ بانکی پور کانگریس سیشن میں ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے شرکت کی۔

۱۹۱۳ء

اُتر پردیش کانگریس میں شامل ہوئے۔

۱۹۱۵ء

الٰہ آباد میں اخباروں پر پابندی قانون کے خلاف پہلی تقریر کی۔

۱۹۱۶ء

شریمتی کملا کول سے شادی ہوئی۔ لکھنؤ کانگریس سیشن میں گاندھی جی سے ملاقات کی۔

۱۹۱۷ء

ہوم رول تحریک میں شرکت کی۔

۱۹۱۷ء

۱۹ر نومبر، اندرا جی (پریہ درشنی اندو متی) کی پیدائش۔

فیضان نادر
۳۸۴، نزد دور بھا انڈسٹریز کلب،
ضلع ایوت محل ۴۴۵۴۰۱ (مہاراشٹر)

۱۹۱۸ء

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر بنے۔

۱۹۲۰ء

۶ر دسمبر، پرنس آف ویلز کی آمد کے موقعے پر ہڑتال کروائی اور گرفتار ہوئے۔

۱۹۲۲ء

۳ر مارچ۔ جیل سے رہا ہوئے۔

۱۹۲۲ء

۱۱ر مئی، غیر ملکی کپڑے کے بائیکاٹ پر دوبارہ گرفتار ہوئے۔

۱۹۲۳ء

۳۱ر جون، رہائی ہوئی
۲۲ر ستمبر، نابھ میں گرفتاری
۴ر اکتوبر کو رہائی ہوئی

۱۹۲۴ء

۱۹۲۵ء، ۱۹۲۷ء ۱۹۲۹ء میں کانگریس کے جنرل سکریٹری رہے

۱۹۲۶ء

کملا جی کو علاج کے لیے سوئٹزرلینڈ لے گئے یورپ اور روس کا سفر کیا۔

۱۹۲۷ء

بروسیلز (بیلجیم) میں غلام قوموں کی کانگریس میں بھارت کی طرف سے شرکت کی۔

۲۹ر نومبر، لکھنؤ میں سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے لیے پولیس کی لاٹھیوں سے زخمی ہوئے۔

۱۹۲۹ء

لاہور کانگریس سیشن کے صدر بنے۔ مکمل آزادی کا نصب العین پیش کیا۔ اسی زمانے میں "باپ کے خط بیٹی کے نام" کتاب لکھی۔

۱۹۳۰ء

۱۴ر اپریل، نمک ستیہ گرہ، چھ ماہ کے لیے قید۔

۲۹ر ستمبر، کسان کانفرنس میں حصہ لینے پر دو ماہ کی قید۔

۱۹۳۱ء

۲۶ر جنوری۔ رہائی

۶ر فروری۔ والد پنڈت موتی لال نہرو کا انتقال۔

۲۶ر دسمبر، الٰہ آباد سے باہر نہ جانے کے حکم کی خلاف ورزی کرنے پر دو سال کی سزا۔
۳۰ر اگست ۱۹۳۱ء کو رہائی۔

۱۹۳۴ء

۱۶ر فروری۔ کلکتہ میں تقریروں کی وجہ سے دو سال کی قید۔

۱۱ر اگست۔ کملا نہرو کی بیماری کی وجہ سے رہا

ہوئے۔
۱۲ راگست کو حکومت کے خلاف تقریروں کے لیے پھر گرفتار کر لیے گئے۔
اسی زمانے میں تصنیف "تاریخ کی جھلکیاں" کی اشاعت
الموڑہ جیل میں خود نوشت "سوانح حیات" کی تکمیل۔

۱۹۳۵ء

۴ ستمبر، کملاجی کی بیماری کی وجہ سے رہائی۔
ان کو یورپ لے گئے۔

۱۹۳۶ء

کملاجی کا انتقال
۲۳ اپریل۔ لکھنؤ کانگریس سیشن کے صدر بنے۔

۱۹۳۸ء

والدہ شریمتی سروپ رانی کا انتقال۔
نیشنل پلاننگ کمیٹی کے صدر بنے۔
اسپینی خانہ جنگی کے دنوں میں اسپین کا سفر کیا۔

۱۹۳۹ء

چین کا سفر کیا۔

۱۹۴۰ء

پونا کانفرنس انفرادی ستیہ گرہ میں شرکت۔
۳۱ اکتوبر، چار سال کی قید کا اعلان۔

۱۹۴۱ء

رہائی ہوئی۔

۱۹۴۲ء

چیانگ کائی شیک سے بات چیت۔ کرپس مشن سے بات چیت۔
"بھارت چھوڑو" قرارداد پیش کی۔ اسی وقت گرفتاری۔

۱۹۴۵ء

شملہ کانفرنس میں شرکت۔
آزاد ہند فوج کے افسروں اور فوجیوں کی پیروی کا انتظام کیا۔

۱۹۴۶ء

کتاب "ڈسکوری آف انڈیا" کی اشاعت۔
مارچ۔ جنوب مشرقی ایشیا کا دورہ۔
۹ مئی۔ چوتھی بار کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔
۱۷ اگست، عبوری حکومت بنانے کے لیے وائسرائے کی دعوت قبول کی۔
دسمبر، کیبنٹ مشن پلان کی بعض باتوں کی وضاحت کے لیے حکومت برطانیہ سے بات کرنے لندن گئے۔

۱۹۴۷ء

۲۳ مارچ، دہلی میں ایشیائی کانفرنس کا افتتاح کیا۔

۱۹۴۷ء

۱۵ اگست
آزاد بھارت کے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالا۔
۳۱ اگست۔ فساد زدہ پنجاب کا دورہ کیا

۱۹۴۸ء

۱۷ فروری۔ آئین ساز اسمبلی میں ناوابستگی کی پالیسی پیش کی۔
۱۳ اپریل۔ ہیراکنڈ بند کا سنگِ بنیاد رکھا۔
۶ اکتوبر۔ دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس میں شرکت کی۔ دولت مشترکہ میں ممبر کی حیثیت سے بھارت کا داخلہ۔
۳ نومبر۔ پیرس میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں تقریر۔

۱۹۴۹ء

انڈونیشیا میں ڈچ حملے کے خلاف ایشیائی
ملکوں کی کانفرنس کا افتتاح۔

۱۹۵۰ء

سپریم کورٹ کا افتتاح کیا۔
مارچ۔ منصوبہ بندی کمیشن کی تشکیل کی ا
اس کے صدر بنے۔
نہرو۔ لیاقت سمجھوتا ہوا۔

۱۹۵۱ء

قاہرہ، جنیوا، لندن اور پیرس کا سفر۔
۱۱ جون، نیپال کا سرکاری دورہ۔
۱۸ اکتوبر، دہلی میں، ۵۷ ویں کانگریس
اجلاس کی صدارت کی۔

۱۹۵۲ء

بھارت، شام معاہدے پر دستخط۔

۱۹۵۳ء

۱۵ جنوری، حیدرآباد میں کانگریس اجلا
کی صدارت کی۔
۲۸ مئی، ملکہ الزبیتھ دوم کی تاج پوشی
شرکت کے لیے لندن گئے۔
۲۵ جولائی۔ حکومت پاکستان کی دعوت
کراچی گئے۔

۱۹۵۴ء

۱۵ جنوری سیلون کے وزیر اعظم سر جا
کوٹیلا ملنے آئے۔
۲۷ اپریل سیلون کا ایک ہفتے کا دورہ کی
۲۵ جون، چین کے وزیر اعظم ملنے آئے۔
شیل سے متعلق مشترکہ اپیل پر دستخط ہوئے
اکتوبر۔ چین کا دورہ کیا۔



۱۹۵۵ء

دولتِ مشترکہ کانفرنس میں گئے۔
جنوری۔ ملکہ الزبتھ سے ملاقات کی۔
۱۴ر اپریل۔ مصر کے وزیرِ اعظم جمال ناصر سے ملے
۱۵ر اپریل۔ بنڈونگ میں افریشیائی کانفرنس میں شرکت کی۔
۱۴ر مئی۔ پاکستان کے وزیرِ اعظم محمد علی اور صدر سکندر مرزا سے بات کی۔
۵ر جون۔ مصر کے صدر جمال ناصر سے ملے۔
۱۵ر جولائی، بھارت رتن اعزاز ملا۔
۱۲ر ستمبر۔ لاؤس کے شہزادے اور وزیرِ اعظم کے ساتھ لاؤس جنیوا سمجھوتے کے بارے میں مشترکہ بیان پر دستخط۔
۱۸ر نومبر۔ روس کے وزیرِ اعظم مارشل بلگانن اور مسٹر خروشچیف کا بھارت میں خیر مقدم کیا۔

۱۹۵۶ء

برطانیہ، امریکہ، فرانس کے وزرائے خارجہ اور روس کے فرسٹ ڈپٹی وزیرِ اعظم سے ملے۔
۲۸ر اپریل۔ بمبئی میں ری ایکٹر قائم کرنے کے لیے کینیڈا سے سمجھوتے پر دستخط
۲۷ر جون۔ دولتِ مشترکہ کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے۔
۱۲ر نومبر۔ نئی دہلی میں مصر کی صورتِ حال پر غور کرنے کے لیے کولمبو پلان ملکوں کے وزرائے اعظم کی کانفرنس میں حصّہ لیا۔
۲۸ر نومبر۔ نئی دہلی میں چو این لائی سے سرحدی تنازعے پر بات چیت کی۔
دسمبر۔ امریکہ، کینیڈا اور یورپ کا سفر کیا۔ اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں تقریر کی۔ دہلی میں چو این لائی سے بات چیت کی۔

۱۹۵۷ء

ٹرامبے (بمبئی) میں ایشیا کے پہلے ایٹمی ری ایکٹر کا افتتاح کیا۔
۲۷ر اپریل۔ نہرو کی قیادت میں نئی مرکزی کابینہ نے حلف اٹھایا۔
۲۶ر جون۔ دولتِ مشترکہ کے وزرا کی کانفرنس میں حصّہ لیا۔

۱۹۵۸ء

۳ر جنوری، چیکوسلواکیہ کے وزیرِ اعظم سے بات چیت۔
۸ر جنوری۔ صدر سوئیکارنو سے بات چیت۔
برطانیہ کے وزیرِ اعظم سے اسی روز بات چیت۔
۳ر فروری۔ وزیرِ اعظم کے عہدے سے ہٹنے کی خواہش ظاہر کی، لیکن پارٹی کے ممبروں کی درخواست پر یہ خیال ترک کر دیا۔

۱۹۵۹ء

بھارت اور پاکستان کے تعلقات کے بارے میں پاکستان کے صدر ایوب خاں کے ساتھ تبادلۂ خیال کیا۔
برما کے وزیرِ اعظم کے ساتھ بات چیت۔
ستمبر، افغانستان کا دورہ کیا۔

۱۹۶۰ء

مئی۔ نئی دہلی میں چو این لائی سے ملاقات۔
مئی۔ دولتِ مشترکہ کانفرنس میں شرکت کی اور پیرس، مصر، ترکی، لبنان کا دورہ کیا۔
۱۹ر ستمبر۔ پاکستان کے ساتھ دریائے سندھ کے پانی کے متعلق معاہدے پر دستخط۔
ستمبر۔ بھارتی وفد کے قائد کی حیثیت سے اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کی چوٹی کے اجلاس میں شرکت کی۔ پیرس کا دورہ کیا۔
ستمبر۔ مصر، ترکی، لبنان، سیریا اور مغربی پاکستان کا دورہ کیا۔ صدر ایوب سے بات چیت کی۔

۱۹۶۱ء

۱۶ر جنوری: بمبئی میں کینیڈا کے اشتراک سے بھارت کے نیوکلیری ایکٹر کا سرکاری طور پر افتتاح کیا۔
مارچ۔ دولتِ مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس میں شرکت کی۔
ستمبر۔ بلگریڈ میں ناوابستہ ملکوں کی چوٹی کی میٹنگ میں شرکت۔
دسمبر۔ پنجاب میں بھاکڑا ننگل کے بجلی گھر کا افتتاح
دسمبر۔ ملایا کے حکمران سے ملاقات۔
صدرِ روس سے ملاقات۔

۱۹۶۲ء

۳ر جنوری۔ بھارتی سائنس کانگریس کے ۴۹ ویں اجلاس کا افتتاح۔
۱۱ر جنوری۔ برما کے وزیرِ اعظم او نو سے ملاقات۔
۱۱ر جنوری۔ کامن ویلتھ ایجوکیشن کانفرنس کا افتتاح۔
۲۴ر جنوری۔ بھارت میں بنائی ہوئی پہلی نسان پیٹرول گاڑی کا افتتاح۔ ڈنمارک کے صدر سے ملاقات۔ متحدہ عرب جمہوریہ کے نائب صدر عامر سے ملاقات۔

۱۰ اپریل۔ تیسرے انتخابات کے بعد نئی کابینہ نے حلف اُٹھالیا۔
۲ جون۔ قومی یکجہتی کی کونسل کی میٹنگ کی صدارت کی۔
ستمبر۔ دولتِ مشترکہ کانفرنس کے بعد پیرس اور قاہرہ کا دورہ کیا۔
۲۳ اکتوبر۔ چینی جارحیت کا متحدہ طور پر مقابلہ کرنے کے لیے قوم سے اپیل۔
۲۶ اکتوبر۔ چینی جارحیت کے بارے میں سربراہوں کو پیغامات۔
۲۷ اکتوبر۔ چینی وزیرِ اعظم کو لکھا کہ چین ۸ ستمبر ۶۲ء سے پہلے کی حالت کو برقرار رکھے۔
۲۷ اکتوبر۔ ملایا کے وزیرِ اعظم تنکو عبدالرحمٰن کا خیر مقدم۔
۳۱ اکتوبر۔ قبرص کے صدر کا خیر مقدم۔
یکم نومبر۔ عارضی طور پر محکمۂ دفاع کا چارج سنبھالا۔
۳۰ نومبر۔ صدر ایوب کے ساتھ مشترکہ بیان جاری کیا۔

۱۹۶۳ء

وزیرِ اعظم سیلون شریمتی بندارا نائکے، متحدہ عرب جمہوریہ کے علی صبری اور گھانا کے مسٹر عطا کے ساتھ بھارت اور چین کے جھگڑے کے بارے میں کولمبو تجاویز پر بات چیت۔
۱۵ جنوری۔ لبنان کے وزیرِ اعظم خورشید کرامی کا خیر مقدم۔
۲۳ جنوری ...

منظوری کے لیے قرارداد پیش۔
۲۶ جنوری۔ قومی والنٹیر فورس کا افتتاح۔
۲۸ جنوری۔ کمبوڈیا کے شہزادے سہانوک کا خیر مقدم۔
اکتوبر۔ اقوامِ متحدہ نے ۱۹۶۵ء کو تعاون کا سال منانے سے متعلق نہرو کی تجویز منظور کی۔
نومبر۔ دہلی میں لاؤس کے وزیرِ اعظم سے ملاقات۔
نومبر۔ افریقی ملکوں کے سفیروں کی کانفرنس کا افتتاح۔
دسمبر۔ اردن کے شاہ حسین نے نہرو سے ملاقات کی۔

۱۹۶۴ء

جنوری۔ اڑیسہ کے نیکرپاڑہ ڈیم پراجیکٹ کا سنگِ بنیاد رکھا۔
جنوری۔ کانگریس کے بھوبنیشور اجلاس کے دوران بیمار ہوئے۔

فروری۔ برما کی انقلابی کونسل کے صدر نے نہرو سے ملاقات کی۔
فروری۔ سنگاپور کے وزیرِ اعظم لی کوان یاؤ سے نہرو کی ملاقات۔
مئی۔ کوسی اور گنڈک پراجکٹوں کے سنگِ بنیاد رکھنے کی رسم کے موقعے پر نیپال کے مہاراجا مہندر سے ملاقات۔
مئی۔ سوڈان کے صدر فاروق ابراہیم عبود سے ملاقات۔
۲۳ مئی۔ آرام کے لیے دہرہ دون گئے۔
۲۷ مئی (بدھ) دہلی میں انتقال۔
۳۱ مئی (اتوار) چتا کو آگ لگائی گئی اور آخری رسمیں ادا کی گئیں۔ راکھ سارے بھارت میں منتشر کی گئی۔

(۱۹۶۴ء کے مختلف اخباروں رسالوں سے)

●

پنڈت نہرو چیزوں کو جلدی سمجھتے تھے اور ہر معاملے میں جلدی ہی اپنی رائے قائم کر لیتے تھے۔ اپنی بات کو ایک چھوٹے سے جملے میں ظاہر کر دینے کا کمال بھی حاصل تھا۔ انھوں نے کھادی کو "آزادی کی وردی" کا نام دیا۔ اس سے گاندھی جی بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے فوراً نہرو کو لکھا:
"تم نے کھادی کو 'آزادی کی وردی' کا جو نام دیا ہے، اس کے لیے لوگ تمھیں ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ تم نے یہ نام کیا رکھا ہے شاعری کی ہے۔ ویسے میرے لیے اس میں شاعری سے زیادہ سچائی ہے۔ ایک ایسی سچائی جس کو ابھی پوری طرح سمجھنا مشکل ہے۔

جواہر لال نہرو کی یاد

اندھیروں میں مشعل

جب بھی کوئی اہم سوال اُبھرتا ہے، جب بھی کوئی سیاسی یا قانونی بحران پیدا ہوتا ہے، جب بھی کوئی دستوری تنازعہ اُبھرتا ہے تو جواہر لال نہرو کی یاد ذہن میں تازہ ہو جاتی ہے۔ ان کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن قدرت کے اٹل قانون کے مطابق نہ تو یادیں کسی انسان کو دوبارہ زندگی دے سکتی ہیں نہ کوئی ضرورت اسے دوبارہ معرکۂ عمل وکار میں واپس لا سکتی ہے۔

آزاد ہندوستان کا دستوری ڈھانچہ، اس کے جمہوری مزاج، اس کی قانونی فضا اور اس کے لیے بہتر روایات کی فراہمی نہرو نے اپنے ہی ذمے لی تھی، اور اس سلسلے میں انھوں نے اپنی پہلی وزارت میں جماعت اور غیر جماعت کا امتیاز بھی اٹھا کر رکھ دیا تھا۔ انھوں نے کانگریس کے کٹر مخالف اور نکتہ چیں لوگوں کو وزارت میں شامل کیا تو صرف اس لیے کہ وہ جماعت سے زیادہ ملک کے وقار کو پیشِ نظر رکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے ہندو مہا سبھا کے لیڈر شیاما پرساد مکرجی کو بھی وزارت میں شامل کیا، اور کانگریس کے حریف بلکہ رقیب ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کو بھی وزیرِ قانون بنایا تو صرف اس لیے کہ وہ ان کی صلاحیتوں سے واقف تھے اور ان صلاحیتوں کو ملک کے مفاد میں استعمال کرنا چاہتے تھے۔

دونوں عظیم لیڈر ـــــ شیاما پرساد مکرجی اور ڈاکٹر امبیڈکر بہرحال مرکزی کیبنٹ میں نہیں

جمیل مہدی (مرحوم)

رہ سکے اور بالآخر استعفے دے کر باہر آ گئے۔

ان میں سے ایک ـــــ شیاما پرساد مکرجی نے ایک نئی سیاسی پارٹی کی تشکیل کی اور ڈاکٹر امبیڈکر نے ہریجنوں میں بدھ مذہب کی اشاعت کی مہم کا آغاز کیا۔ تاہم، جو کام ـــــ جواہر لال نہرو ان سے لینا چاہتے تھے، وہ انھوں نے کر دیا اور ہندوستانی دستور کے نام پر ایک ایسی دستاویز انھوں نے مرتب کر دی جو ان کے نام اور کام کو آنے والی بے شمار نسلوں تک زندہ رکھے گی۔

جواہر لال نہرو کی قیادت، ان کی شخصیت اور ان کے نظریات کی قدر و قیمت کے متعدد پہلو قابلِ غور ہیں۔ وہ ہندوستانی جمہوریت کے بانی، سیکولرازم کے مبلّغ اور جمہوری اصولوں کے معلّم تھے اور اس سلسلے میں ان کی محنت، جدّ و جہد اور ذوق و شوق کی ایک تاریخی قدر و قیمت ہے، اور ان چیزوں سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔

غلط طور سے انھیں مغرب پسند کہا گیا ہے۔ ایک زمانے میں انھیں ہندوستانیت کا مخالف بھی کہا جاتا رہا ہے۔ لیکن ان سے زیادہ ہندوستانیت کا قدر دان کوئی دوسرا اس ملک میں ایسا پیدا نہیں ہوا جس نے اپنی راکھ کو اس ملک کی دھرتی

کا ایک حصہ بنا دیا ہو۔ "ملاپ" کے ایڈیٹر رنبیر، یورپ اور امریکہ کے دورے کے بعد ان سے ملنے گئے تو انھوں نے وہاں کے لوگوں کے مہذّب طور طریقوں، اعلیٰ اخلاق اور ایمان داری کی تعریف کی اور ہندوستان کے لوگوں کے مقابلے میں انھیں ارفع و اعلیٰ قرار دیا تو انھوں نے دیکھا کہ نہرو کا چہرہ غصّے سے تمتما گیا ہے، وہ کچھ جھجکے تو نہرو نے ان سے کہا۔

"تو آپ یہ کیوں نہیں کرتے کہ ہندوستان کے لوگوں کو کھینچ کر سمندر میں پھینک دیں اور انھیں غرق کر دیں اور ان کے بجائے اِنھی ایمان دار اور مہذّب لوگوں کو لا کر یہاں بسا دیں جن کی آپ تعریف کر رہے ہیں۔"

رنبیر کے چہرے پر خجالت کے آثار ظاہر ہوئے تو نہرو نے انھیں سمجھایا۔

"اچھے یا بُرے، ہندوستان کے یہی لوگ ہیں، جن سے ہندوستان کا ملک بنتا ہے، یہاں کا سماج بنتا ہے، یہاں کی تاریخ بنتی ہے، اس لیے ہمیں اِنھی کو عزّت دینی ہے۔ اِنھی کو ٹھیک کرنا ہے تاکہ وہ دنیا کی قوموں میں اپنا با عزّت مقام بنانے کے قابل ہوں۔"

کئی بار نہرو نے کہا کہ ہندوستان کی تاریخ، رنگارنگی میں یک رنگی کے اصول کے مطابق

ہی عظیم تاریخ بنی ہے کئی بار انھوں نے کہا کہ ہندو مسلمانوں کی مشترک تہذیب اور مشترکہ جدو جہد نے ہی اس ملک کو ترقی کی معراج تک پہنچایا تھا" اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم تاریخ سے سبق لے کر اس مشترکہ تہذیب اور مشترکہ جدو جہد کو نہ صرف باقی رکھیں بلکہ اسے فعال بنانے کی کوشش کریں، جو انگریزوں کی غلامی کے دور میں، معطل ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ ہندوستان میں تصادم اور باہمی جنگ وجدل کے خوفناک نتائج کا حد درجہ احساس رکھنے والے ایک لیڈر تھے، جو کسی بھی ٹکراؤ کسی بھی فساد کو مستقبل کے لیے ایک چیلنج سمجھتے تھے انھوں نے بے شمار مرتبہ کہا کہ:

"فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے تو میری گردن شرم سے جھک جاتی ہے اور میری کیا، ہر اس حساس آدمی کی گردن شرم سے جھک جانی چاہیے جو تاریخ کا ذرہ برابر بھی شعور رکھتا ہے، کیونکہ یہ ملک ہمیشہ متحد رہ کر ہی آگے بڑھا ہے اور لڑائی جھگڑوں اور خانہ جنگی میں پھنس کر ہمیشہ قعرِ مذلت میں جا گرا ہے۔"

وہ ایک ایسے لیڈر تھے جنھوں نے تنگ نظری کے بجائے روشن خیالی، تعصب کے بجائے رواداری اور استحصال کے بجائے فیاضی اور شرافت کی تبلیغ ہی نہیں کی بلکہ اپنی پوری زندگی، ان چیزوں کے ترجمان اور ان چیزوں کی علامت بنے رہے۔ انھوں نے جمہوریت کے نظام کو سیکولرازم اور بعد میں سوشلزم کو شامل کرکے، سیکولر اور سوشل اصولوں پر قائم کیا اور اس کے لیے بہتر سے بہتر روایات بھی اپنے عمل اور اپنے پرچار کے ذریعے فراہم کیں اور پورے سترہ سال ہندوستان کے لوگوں میں جمہوری ذوق اور جمہوری شعور کی آبیاری کرتے رہے اور انھوں نے اپنی زندگی میں اس نظام کو اتنا مضبوط بنا دیا کہ وہ ان کے بعد کی چوتھائی صدی میں بھی ابھی تک ہر آزمائش اور ہر چیلنج سے کامیاب ہو کر نکلنے کی شاندار قوت کا مظاہرہ کر رہا ہے اور اس کو نہرو کا ایک ایسا کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے جس کی ہمسری اس عہد کا کوئی دوسرا لیڈر نہیں کر سکتا۔ ●

کرنل لوئی جانسن کچھ دنوں ہندوستان میں صدر روزویلٹ کے ذاتی سفیر کی حیثیت سے رہے۔ وہ نہرو سے ملے تو نہرو کی شخصیت کا جادو ان پر اثر کر گیا۔ ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت انھوں نے اخبارات کو بیان دیا تو اس میں یہ بھی کہا کہ وہ نہرو کو بہت پسند کرتے ہیں۔ پھر ملک کی آزادی کی بات چیت کرنے کرپس دہلی آئے تو کرنل جانسن کا آنا بھی ہوا۔ وہ برابر پنڈت نہرو سے ملتے رہتے تھے۔ وہ نہرو کو چوڑی دار پاجامے میں دیکھ کر حیران ہوتے تھے۔ انھیں حیرت یہ تھی کہ ایسا تنگ لباس پہنا کس طرح جاتا ہے۔ آخر ایک دن انھوں نے معذرت کے ساتھ سوال کر ہی لیا۔ "معاف کیجیے مسٹر نہرو، مجھے یہ پوچھنے کی اجازت دیجیے کہ یہ لباس جسم پر چڑھتا کیسے ہے؟ انھوں نے جواب دیا" میں تو اسے آسانی سے پہن لیتا ہوں"۔ اس پر سب ہنسنے لگے آخر پنڈت جی نے سمجھایا کہ یہ کس طرح پہنا جاتا ہے۔

اسی طرح کا ایک اور قصہ سنیے۔ کہتے ہیں لندن میں ایک بار پنڈت نہرو کو تقریر کرنے کی دعوت دی گئی۔ وہ چوڑی دار پاجامہ اور شیروانی پہن کر جلسے میں گئے۔ جب وہ تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو جلسہ گاہ میں جگہ جگہ کھسر پھسر ہونے لگی۔ کچھ لوگ ان کے پاجامے کو زیر جامہ سمجھ رہے تھے اور ان کا خیال تھا کہ وہ پتلون پہننی بھول گئے ہیں!

گفتار و کردار

منظوم خراجِ عقیدت

گفتار و کردار

منظوم خراج عقیدت

یفی اعظمی

ضا نقوی واہی

بف بھوپالی

بلراج کومل

مال احمد صدیقی

محمد عثمان عارف نقشبندی

فضا ابن فیضی

راج نرائن راز

یوسف ناظم

رونق نعیم

عشرت ظفر

ملک تابش

مخمور سعیدی



نہرو

میں نے تنہا کبھی اس کو دیکھا نہیں
پھر بھی جب اس کو دیکھا وہ تنہا ملا
جیسے صحرا میں چشمہ کوئی
یا سمندر میں مینارِ نور
یا کوئی فکر اوہام میں
فکر صدیوں اکیلی اکیلی ملی
ذہن صدیوں اکیلا اکیلا ملا
اور اکیلا اکیلا بھٹکتا رہا
ہر نئے ہر پرانے زمانے میں وہ
بے زباں تیرگی میں کبھی
اور کبھی چیختی دھوپ میں
چاندنی میں کبھی خواب کی
اس کی تقدیر تھی اک مسلسل تلاش
خود کو ڈھونڈا کیا ہر فسانے میں وہ

جن تقاضوں نے اس کو دیا تھا جنم
ان کی آغوش میں پھر سمایا نہ وہ
خون میں وید گونجے ہوئے
اور جبیں پر فروزاں اذاں
اور سینے پہ رقصاں صلیب
بے جھجک سب کے قابو میں آتا گیا
اور کسی کے بھی قابو میں آیا نہ وہ

بوجھ سے اپنے اس کی کمر جھک گئی
قد مگر اور کچھ اور بڑھتا رہا
خیر و شر کی کوئی جنگ ہو
زندگی کا ہو کوئی جہاد
یا کوئی معرکہ عشق کا
وہ ہمیشہ ہوا سب سے پہلے شہید
سب سے پہلے وہ سولی پہ چڑھتا رہا

ہاتھ میں اس کے کیا تھا جو دیتا ہمیں
صرف اک کیل، اسی کیل کا اک نشاں
نشۂ مے کوئی چیز ہے
اک گھڑی دو گھڑی ایک رات
اور حاصل وہی دردِ سر
اس نے زنداں میں لیکن پیا تھا جو زہر
اٹھ کے سینے سے بیٹھا نہ اس کا دھواں
میں نے تنہا کبھی اس کو دیکھا نہیں
پھر بھی جب اس کو دیکھا وہ تنہا ملا

کیفی اعظمی
موضع اور ڈاکخانہ مجواں، ضلع اعظم گڑھ (یو۔پی)



جواہر لال

یہ نظم اس وقت لکھی گئی تھی جب ملک نیا نیا آزاد ہوا تھا اور پنڈت جی پہلے وزیرِ اعظم منتخب ہوئے تھے۔ آزادی کے فوراً بعد فرقہ وارانہ فسادات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا تھا، لیکن پنڈت جی کے عزم و عمل نے جلد ہی اس پر قابو پا لیا۔ اُسی زمانے میں یہ نظم پٹنہ ریڈیو سے نشر ہوئی تھی۔ (واہی)

غضب تھی سامراجی سازشوں کی گرم بازاری
صباحِ عیدِ آزادی تھی اور ماتم کی تیاری
پتنگوں نے ابھی اُمید کے پَر بھی نہ جھاڑے تھے
کہ شمعِ حُریّت پر نزع کی حالت ہوئی طاری
فضا پر نیند کی مستی چھڑک دی تھی ہواؤں نے
ستارے اونگھتے تھے پھیلتی جاتی تھی اندھیاری
جہانِ علم و دانش میں یہ منظر جاہلیت کے؟
دیارِ ماہ و انجم میں یہ ظلمت کی عملداری؟
وہ ظلمت جس میں ٹھوکر کھا رہی تھی قسمتِ انساں
وہ ظلمت جس میں بھٹکی جا رہی تھی روحِ بیداری
وہ ظلمت جس میں فتنے دے رہے تھے عقل کو لوری
وہ ظلمت جس کے سناٹے میں خوابیدہ تھی ہشیاری
وہ ظلمت جس کے سایے میں ہوس کی تربیت گاہیں
وہ ظلمت جس کے دامن میں پلے ذوقِ سیہ کاری
وہ ظلمت جس کے سینے میں بنیں قبریں ستاروں کی
وہ ظلمت جس کی سورج کر رہا تھا ناز برداری
اُسی ظلمت کا سینہ توڑ کر ایسی کرن نکلی
جسے کہیے جواہر لال کے سینے کی چنگاری
جواہر کی نگاہیں آئینہ حُسنِ تدبّر کا
جواہر کی خموشی کوہِ استقلال خودداری
جواہر کا تکلّم ہے دلِ تہذیب کی دھڑکن
جواہر کا تبسّم ہے طلوعِ صبحِ بیداری
مورّخ کا قلم اس شوخیِ رفتار پر صدقے
کہ ہر نقشِ قدم ہے ایک تاریخِ رواداری
جواہر کے لبِ معجز نما کا یہ کرشمہ ہے
کہ باطل ہے فسوں کا راز مغرب کی فسوں کاری
جواہر تیری عظمت کا رضاؔ پر قرض ہے لیکن
بجز الفاظ کے کیا اس کو دے شاعر کی ناداری

رضا نقوی واہی

واہی روڈ، ۵/۱۷، گردنی باغ، پٹنہ

بال و پر

لوگ بچّوں سے باتیں کرتے ہیں
آنے والے دِنوں کی، خوابوں کی
ایک ایسے جہان کی جس میں
وادیوں اور سبزہ زاروں کا
ایک رنگین سلسلہ ہوگا
جھومتے گنگناتے پیڑوں کے
درمیاں اک حسین کھلونا سا
گاؤں ہوگا جہاں پہ سب پریاں
چاندنی کے جمیل آنچل میں
رقص کرنے کو آئیں گی ہر شب

آنے والے دِنوں کے خوابوں میں
ماہ پاروں کے شوخ جھرمٹ میں
اِک پری میرے ننھے منّے کی
ننھی دلہن کا رُوپ ہوتی ہے
ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر دونوں
وادیوں اور سبزہ زاروں سے
مثلِ بادِ صبا گزرتے ہیں

شوقِ پرواز، جوشِ نصرت سے
اِک افق کو پھلانگ جاتے ہیں
آرزو دوسرے کی کرتے ہیں
لوگ بچّوں سے باتیں کرتے ہیں
خوابِ فردا کی، خوابِ رنگیں کی

خوابِ آغاز، منزلیں انجام
درمیاں سختیاں مسافت کی
درمیاں صبر آزما ایّام
درمیاں دھوپ ابر تاریکی

ہم جو بیمارِ خواب ٹھہرے ہیں
خود سلاسل ہیں، وضع کرتے ہیں
سب کی پابستگی کی خاطر ہم

جبر و وحشت کی بھاری زنج
خوف و دہشت کی ساری
کاش ہم لوگ بال و پ
ذوقِ پرواز کی سعادت
خواب جب دیکھتے منظر
جگمگاتے حسین چہرے ور
گلکدوں اور آبشار ور
لہلہاتے جوان کھیتور
باوقار و بلند شہرور
سب کو آنچل کی جو مواد
اِک نئی جاوداں مسرت
فاصلوں پر محیط ہو ج
سب نشیبوں سے، سب فراز و
مثلِ بادِ صبا گزر ج
ایسا ہوتا تو لمحۂ نو
طفلِ معصوم کی طرح
ہر افق سے نظر ملا
ہر افق کو پھلانگ جا

بلراج کومل

ای-۱۳۹، کالکاجی، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹

روحِ نہرو سے

جگہ ہے یہ دِلّی میں "شانتی ون" بھی
نہ بستیوں میں ہے شامل نہ جنگلوں میں ہے
ا ڈرل، کہیں ورزش، کہیں چہل قدمی
ہر اِک گروپ مگن اپنے مشغلوں میں ہے
کیاں ہیں وہ لڑکے صفیں بناتے ہوئے
ضعیف لوگوں کی ٹولی بھی منچلوں میں ہے

ے خیال میں نہرو کی آگئی تصویر
بہ اشتیاق میں اس طرح ہمکلام ہوا
یم ہند کے معمار! تجھ کو ہو معلوم
سماج واد ترے ملک کا نظام ہوا
ر پدر نہ تواند پسر تمام کند"
یہ قول سب کی زبانوں پہ آج عام ہوا
خبر ہو کہ تن من سے ہم نے محنت کی
کہ شب میں چین سے سونا ہمیں حرام ہوا

ا ہے ہم نے کہاوت 'سپوت و پوت و کپوت
سو ہم کپوت نہیں ہیں، سپوت و پوت ہیں ہم

وطن کو اپنے پسینے سے ہم نے سینچا ہے
خدا گواہ کہ خود اپنے میگھ دوت ہیں ہم

کپوت بن کے مٹایا نہیں ترا ورثہ
سپوت بن کے وراثت میں کچھ بڑھایا ہے
تری قسم کہ تری ساری کلپناؤں کو
حقیقتوں سے دُلہن کی طرح سجایا ہے

ہمارے دوست نما دشمنوں کو کیا کہیے
بُرائیوں کی ہمیشہ دہائی دیتے ہیں
انھیں کہیں بھی ترقّی نظر نہیں آتی
ہر ایک چیز میں کیڑے دکھائی دیتے ہیں

کہو ان آنکھوں کے اندھوں سے، بے وقوفوں سے
ہرا بھرا جو یہ بھارت نہیں تو پھر کیا ہے
نظر اٹھاکے دُکانوں کی رونقیں دیکھو
ترقیوں پہ تجارت نہیں تو پھر کیا ہے

خدا کا شکر کہ ہر طرح خود کفیل ہیں ہم
گیا تھا چھوڑ کے کنگال، سامراج ہمیں
ذرا سی سوئی سے لے کر بڑی مشینوں تک
وہ چیز کیا ہے جو حاصل نہیں ہے آج ہمیں

ہر ایک شہر کا ماحول نور میں ڈوبا
ہر ایک گاؤں کا موسم یہ رنگ برساتا
یہ کارخانے، یہ میلیں، یہ پل، یہ ڈیمز، یہ روڈ
یہ بلڈنگیں کہ ہے سر آسماں سے ٹکراتا

ہمارے بجلی گھروں کا یہ کارنامہ ہے
کہ گاؤں رشکِ مہتاب ہو گئے یارو
جہاں سے ابرِ بہاراں خفا خفا گزرا
علاقے آج وہ شاداب ہو گئے یارو
ہمارے میلوں کے کپڑوں کی مانگ ہے ایسی
کہ ہیچ اطلس و کمخواب ہو گئے یارو
وہ مشغلے جو رئیسوں کے چونچلے تھے کبھی
ہمارے عہد میں نایاب ہو گئے یارو

کہا تھا تو نے کہ بابر گلاب دیتا تھا
مزید توپ بھی بابر کے ساتھ ہی آئی
سمجھ کے دونوں ہی چیزوں کو تو نے اے ساحل
خود اپنے ملک ہی کی بے سود پذیرائی

ہے آج ملک شگفتہ گلاب کی مانند
حیات تیز قدم ہے مشین کی صورت
"رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل"
کہ خون گھوم رہا ہے زمین کی صورت

نظامِ زر متوازن کیا ہے یوں ہم نے
ہیں سر بہ جیب حکیمِ معاشیت بہت
یہ کیا توازنِ زر کی ہے کامیابی کم
در آمدات صفر ہیں برآمدات بہت

عظیم ہند کے معمار، بانیِ اوّل!
تو ہند کا نہیں سنسار کا بھی ہے رہبر
یہ تیرا امن کا نغمہ، یہ پیار کا پیغام
خدا گواہ کہ گونجے گا ایک دن گھر گھر

کیف بھوپالی

شاہجہاں آباد، بھوپال، (مدھیہ پردیش)

نہرو کے خیالات

نگل ہے حسین اور گھنیرا ـــــ یہ اندھیرا
عدہ جو کیا ہے، وہ نبھانا ہی پڑے گا
وسوں ابھی منزل ہے ـــ کروں کیسے بسیرا
بلنا ہی پڑے گا، مجھے جانا ہی پڑے گا
ـــــ رابرٹ فراسٹ

(۱)

مجھے پسند نہیں ہے جمودِ فکر و خیال
کہ میرا ذہن ہے آزاد بوئے گُل کی طرح
چٹک رہی ہیں خیالوں کی نازنیں کلیاں
تصوّرات ہیں گویا نموئے گُل کی طرح

نہیں ہوں میں کسی کٹّر خیال میں زنجیر
ہے ایک بات مگر جس پہ ہے مرا ایمان
یہ کائنات کی تخلیق اک معمّہ سہی
ہے کائنات کی تخلیق کا سبب انسان

ہزار حیف، کہ انسان آج بھی ہے اسیر
وہ قید ہے، جو بظاہر نظر نہیں آتی
جہاں میں آج بھی محنت چرائی جاتی ہے
یہ رات صدیوں سے ہے اور سحر نہیں آتی

میں چاہتا ہوں کہ انسان اپنا حق پائے
ہر ایک فرد ہو آزاد بوئے گُل کی طرح
سماج وہ ہو کہ جس میں سبھی برابر ہوں
ہر ایک چہرہ دمکتا ہو روئے گُل کی طرح

(۲)

لوگ کہتے ہیں کہ ماضی ہے ہمیشہ باقی
لوگ کہتے ہیں کہ ماضی ہے ہمیشہ زندہ
آج جو چیز ہے ماضی کی عنایات سے ہے
چہرہ امروز کا ماضی ہی سے ہے تابندہ

لوگ جو چاہیں کہیں، مجھ کو ہوا ہے محسوس
یہ جو ماضی ہے، مرے سینے پہ اک پتھر ہے
کیا ملے میرے تخیل کو سکوں ماضی میں
سیج پھولوں کی نہیں کانٹوں کا اک بستر ہے

کمال احمد صدیقی
بلاک نمبر ۱۰/۱۴، اولڈ کیمپس، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

مجھ کو تسلیم کہ میراث مقدّس شے ہے
لیکن اک قوم! جو میراث کو سرحد سمجھے
کیا ترقی وہ کرے گی کہ یہ ہے اس کی مثال
اپنے ہی سائے کو جیسے کوئی معبد سمجھے

صرف میراث پرستی سے نہیں کچھ حاصل
یہ تو کچھ بھی نہیں، اجداد کی نقالی ہے!
تو کہ ماضی کا پرستار ہے، تو پیاسا ہے
ایک قطرہ بھی نہیں، تیرا سبو خالی ہے

اپنی میراث کی عظمت کا ہوں قائل میں بھی
میری میراث: یہ تخلیق کی سرگرمی ہے
میری میراث عمل ہے، مری میراث حیات
میری میراث میں ماضی بھی ہے فردا بھی ہے

میری میراث فقط گزرا ہوا کل ہی نہیں
میری میراث سے فردا کو جلا ملتی ہے
قلبِ امروز میں دھڑکن مری میراث سے ہے
میری میراث سے ہر دل کی کلی کھلتی ہے!

نذرِ نہرو

مجموعۂ صفات تھی نہرو کی زندگی
ہے لاجواب قوم کی خدمت جو اس نے کی
دشمن کہ دوست مانتے آئے ہیں یہ سبھی
قوم و وطن کو راہ دکھائی نئی نئی
ہر اک مہم میں ملک کا سالار وہ رہا
آزادیِ وطن کا علمدار وہ رہا

انسانیت میں ڈوبی ہوئی بات بات تھی
اک پیکرِ خلوص و وفا اس کی ذات تھی
باطن میں پاک صاف تھا دل میں نہ گھات تھی
دن کہہ سکا نہ اس کو جو تاریک رات تھی
ناراض ہو کے اس کو جو دشمن بھی کہہ گیا
سچی اگر تھی بات تو سختی بھی سہہ گیا

کردار کا بلند تھا انساں عظیم تھا
بادِ بہار کی طرح فیضِ عمیم تھا
جس سے چمن میں پھول کھلے وہ نسیم تھا
فطرت سے جو کلام کرے وہ کلیم تھا
کیا قدر اس کے دل میں تھی حُسن و جمال کی
دُنیا بڑی حسین تھی اس کے خیال کی

ہمدرد تھا غریب کا خدمت گزار تھا
مزدور اور کسان کا وہ غم گسار تھا
انسانیت کا کیا کہیں کیا وضع دار تھا
بوڑھے، جوان، آج کے بچے سے پیار تھا
دولت اگر تھی پاس تو دولت تھی پیار
حُسنِ عمل سے مُلک کی صورت نکھار

ظلمت کدوں کو دے گیا ماحول نور کے
عالم دکھا گیا وہ خوشی کے سرور کے
روشن کیے چراغ وہ فکر و شعور کے
منصوبے ہم کو دے گیا وہ دُور دُور کے
تصویر میں وطن کی نئے رنگ بھر
ہندوستانِ نو کی وہ تشکیل کر

راوڑ کیلا، بھلائی، بکارو کہ بھاکھڑا
نقشہ ہے اس کے ذہنِ رسا کا شعور کا
کل کارخانے صنعتیں کیسی وہ دے گیا
بھارت کو آج ہر طرح آگے بڑھا گیا
تکنیک اور سائنس کی تعلیم عام
ہر انتی پہ چھاپ ہے نہرو کے نام

احترام تھا ماضی کا حال کا
اساتھ بڑھتے زمانے کی چال کا
اکس قدر تھا ہنر کا کمال کا
چھنا بلندیِ فکر و خیال کا
قائم وہ کرتا ہند کی عظمت فضاؤں میں
راکیٹ بھی بھیج دیتا کبھی وہ خلاؤں میں

پیغامِ امن و صلح کو وہ عام کر گیا
دشمن کو اپنے پیار سے ہی رام کر گیا
گاندھی کا جانشیں تھا بڑا کام کر گیا
تاریخ میں وہ اپنا امر نام کر گیا
نقشہ تھا اس کے ذہن میں یہ کائنات کا
سارا جہان ایک ہے انساں کی ذات کا

، ملک کا تو وہ حامی بنا رہا
ٹوں سے سارے ہمیشہ جدا رہا
نے جہاں بھی ظلم کیا ٹوکتا رہا
ل میں وہ احتجاج پہ اپنے ڈٹا رہا
کیسے اصول وضع کیے پنچ شیل کے
دنیا جسے قبول کرے بے دلیل کے

راجہ نہ بادشاہ نہ کوئی تاجدار ہے
آقا نہ اب غلام نہ خدمت گزار ہے
ہر شخص اپنے آپ میں با اختیار ہے
دستور کی نظر میں ہر اک باوقار ہے
سنسد کا یہ نظام اسی کی تو دین ہے
مختاریِ عوام اسی کی تو دین ہے

کا تھا دوست سب سے محبت رہی اسے
ب کی عزیز آبرو عزت رہی اسے
ب کے تفرقوں سے عداوت رہی اسے
ل ذات پات سے نفرت رہی اسے
ہندو رہا نہ گبرو مسلمان ہی رہا
انسان کے لباس میں انسان ہی رہا

حکمت سے اپنی ہر جگہ عزت بنا گیا
خدمت سے اپنی اہلِ وطن پر وہ چھا گیا
عزم و عمل کی راہ پہ سب کو لگا گیا
سارے جہاں پہ ہند کا سکہ بٹھا گیا
نہرو کی زندگی کی اگر داستاں کہیں
معمارِ ملک و عظمتِ ہندوستاں کہیں

محمد عثمان عارف نقشبندی
گورنر اتر پردیش، راج بھون لکھنؤ

ماتمِ یک شہرِ آرزو

(جواہر لال نہرو کی یاد میں)

ستم رسیدہ تھی، انسانیت کی روح جہاں — وہاں سے گزرا تو، پیغامِ سرخوشی لے کر
وطن پرستوں نے طے کی تھی، راہِ آزادی — ترے جنوں، ترے جذبوں کی پختگی لے کر
تری صراحیِ ذوقِ عمل سے ٹپکا تھا — وہ قطرہ، تھا جو طوفانِ زندگی لے کر
ترے بغیر، چراغوں کی لَو ہے افسردہ — مرے قریب تو آ اپنی روشنی لے کر
بھٹک رہا ہے ترا کارواں، اندھیرے میں
کہاں تو چھپ گیا، خوابوں کی چاندنی لے کر

وہ "شیروانی" میں الجھا ہوا "گلاب کا پھول" — ترے مذاقِ شگفتہ کی، اک علامت تھا
وہی خلوص، وہی سادگی، وہی نرمی — ہر اک سے پیار کا اعلان، تیری فطرت تھا
جو، زندگی و محبت کا ایک سنگم ہے — تو، اس ثقافت و تہذیب کی امانت تھا
تری سماجی بصیرت تھی، سوشل ازم کی دین — عوامی قدروں کا سرمایہ، تیری دولت تھا
ترے بغیر، ادھورا رہے گا "قومی مشن"
تو، اپنے دور کی، سب سے بڑی ضرورت تھا

بہت دنوں سے، سیاست مریض تھی، لیکن — تری نظر نے، مسیحائیوں سے کام لیا
چبھو دیے، دلِ ظلمت میں روشنی کے خدنگ — شبوں سے تو نے کچھ اس طرح انتقام لیا
نہ جانے، لغزشِ حالات، کیا ستم کرتی — تری نگاہ نے، گرتے ہوؤں کو، تھام لیا
کسے، دلوں کی پرستش کا تھا خیال اتنا — ترے چراغ نے، پروانوں کا سلام لیا
چمک اٹھے، مری پلکوں پر، آنسوؤں کے نجوم
ترا، یہ کس نے بھری انجمن میں نام لیا

کبھی، جو قوم کے تلووں میں چبھ گیا کانٹا — تو اپنی روح میں محسوس کی چبھن تو نے
دیا، تصورِ جمہوریت کے خوابوں کو — جوان و شوخ حقیقت کا بانکپن تو نے

مخالفانہ عناصر سے کر کے سمجھوتہ — مٹا دی، ابرو ماحول کی شکن تو نے
جو آفتیں پڑیں، ہنس ہنس کے اُن کو جھیل لیا — بنائے کانٹوں سے، پھولوں کے پیرہن تو نے
وہ تیرے ذہن کی جودت، وہ عالمی افکار
بلند کر دیا، کردارِ انجمن تو نے

بڑھے، تو پیچھے نہ پھر ہٹ سکے قدم تیرے — ثبات و عزم، ترے آئنے کا جوہر تھا
افق پہ وقت کے، کرنیں بکھیر دیں جس نے — وہ آفتاب، تری صبح کا مقدر تھا
تری نسیم جنوں کی، وہ عنبر افشانی — کہ خوشبوؤں سے تری، کل چمن معطر تھا
نگاہیں خیرہ رہیں، دوسرے ممالک کی — تو ایشیا کے صدف کا چمکتا گوہر تھا
تو، سر سے تا قدم، اے شاہزادۂ جمہور!
نشاطِ حسن و خمارِ غزل کا پیکر تھا

تری نگاہ نے، صہبائے نور چھلکائی — سحر کے ہاتھ میں، مینائے آفتاب تھا تو
ترا وہ حسن، ترا برہمن نژاد جمال — صنم کدوں کا، مہکتا ہوا شباب تھا تو
ادا شناس تھا تو، عالمی سیاست کا — ہو کوئی مرحلۂ وقت، کامیاب تھا تو
جو، میرے ہاتھوں سے، جوشِ سرور و مستی میں — چھلک گیا ہے، وہی ساغرِ شراب تھا تو
کہاں سے لاؤں، وہ تصویرِ حسن و محبوبی
کہ چھن گیا، مری آنکھوں سے جو، وہ خواب تھا تو

اس انجمن میں نہیں تو، مگر قلم میرا — ترے خیال سے، مصروفِ گفتگو ہے ابھی
دلوں میں آج ترا درد جاگ اٹھا ہے — کہ تو خلوص و محبت کی آبرو ہے ابھی
ابھی اٹھائی تھی تجھ کو نہ یہ بساطِ شراب — کہ رند پیاسے ہیں، محفل تہی سبو ہے ابھی
کسے، سنائیں گے اب شیخ، قصۂ غمِ دل — کہ نا تمام وہ افسونِ رنگ و بو ہے ابھی
تری جدائی ہے وہ غم، کہ ہر نفس میرا
ہلاکِ "ماتمِ یک شہرِ آرزو" ہے ابھی

فضا ابنِ فیضی

مئو ناتھ بھنجن ۲۷۵۱۰۱ (یو۔پی)



روحِ وطن سے

(ایک نظم پنڈت نہرو کے نام)

روشنی کس نے مانگی تھی ظلمات سے
جاگ اُٹھی تڑپ کر نگارِ سحر
جگمگایا طلائی دیارِ سحر

گو مخالف ہواؤں کی یلغار تھی
نامساعد فضاؤں میں پھولا پھلا
خونِ دل جب بہا کام آہی گیا

رفتہ رفتہ ہوئی کیسی کایا پلٹ
جانے دل کیوں اچانک حزیں ہوگیا
ہوک سی اک تھی، ایک صدمہ ہوا

کون لے کر سحر کا پیام آگیا
ظلمتیں چھٹ گئیں روشنی ہوگئی
گویا تقدیر اغیار کی سوگئی

پھول آئے تو سارا چمن جی اُٹھا
پات نکھرے تو نکھری فضائے چمن
رشکِ قوسِ قزح بن گئی انجمن

سعی گر باغبانوں کی مشکور ہے
کیوں نہ جانے ہوئے پات کم کم ہرے
رُوپ آیا مگر پھول کم کم کھلے

کس نے اُکسایا دھرتی کے پندار کو
طنزِ ذوقِ نمو پر یہ کیا خوب تھا
دیش کی کہر ماری زمیں، مرحبا

ایک بے حد حسیں انقلاب آگیا
کتنے مسرور تھے ساکنانِ وطن
دیش اپنا تھا، اپنا تھا سارا چمن

چند بیلوں کے ہاتھوں ہوئی مضمحل
تازگی گل کی، پتّوں کی ساری پھبن
ہر طرح یہ سجائی سجی انجمن

ناگہاں دیکھ کر خلق حیران تھی
ایک بوٹا اُگا، ایک پودا اُٹھا
اضطراب و سکوں کا بھی عالم تھا کیا

آپ سے باغباں کے تجسس میں ہیں
پھول پتّے نویلی پھبن کے لیے
ہے تڑپ اک نئے بانکپن کے لیے

راج نرائن راز
۳۰/۲۹، ایسٹ پٹیل نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۸



خاکستر

(پنڈت نہرو کی وصیت)

مجھے اِس دیس کے لوگوں نے اتنا پیار بخشا ہے
کہ میرے جسم میں اس کی حرارت رقص کرتی ہے
مجھے ہر گام پہ لوگوں نے عزت دی، محبت دی
مرے الفاظ جس کی ماہیت سمجھا نہیں سکتے
یہ مانا، مجھ سے پہلے بھی کئی لوگوں نے پایا ہے
محبت کا یہ تحفہ اور عقیدت کا یہ سرمایہ
مگر مجھ تک تو ہم قوموں کا اتنا پیار پہنچا ہے
کہ میں جذبات کی شدت سے کچھ بھی کہہ نہیں سکتا
بدل اس پریم کا کیا ہو، صلہ اِس پیار کا کیا ہو!

مری خواہش ہے اپنے دیس پر میں خونِ دل چھڑکوں
مری خواہش ہے میرا دیس ہو آزاد بندھن سے
وہ بندھن جن میں تفریق و عداوت کارفرما ہوں
وہ زنجیریں جو جسم و روح کی بالیدگی روکیں
وہ بندھن جو بہاروں کی فسوں زا تازگی روکیں
تمنا ہے یہ زنجیریں یہ بندھن کٹ کے گر جائیں
قیودِ بغض و نفرت سے وطن آزاد ہو جائے

مگر — ارمان یہ بھی ہے کہ ہم بھولیں نہ ماضی کو
کہ یہ میراث ہے اپنی — بڑی ہی بیش قیمت ہے
یہ ورثہ ہے محبت اور تہذیب و تمدن کا
مرے دل کی صدا یہ ہے، نہ ٹوٹے رشتۂ اُلفت
رہے یہ روشنی دائم، رہے یہ سلسلہ قائم
مری یہ آرزو ہے جب میں مر جاؤں تو — اے لوگو!
چتا کے آتشیں شعلوں میں تم مجھ کو جلا دینا
مرا یہ جسم فانی، راکھ کا جب ڈھیر ہو جائے
تو خاکستر اُڑا دینا وطن کی اِن فضاؤں میں
چھڑک دینا اسے کھیتوں میں تا کہ جُز یہ بن جائے
وطن کی پاک مٹی کا — جُدا ہونے نہ پھر پائے

مری کچھ راکھ — سنگم کے بھی پانی میں بہا دینا
کہ اِس پانی سے میں بچپن سے اُلفت کرتا آیا ہوں
مری وابستگی اِس سے ابھی تک یونہی قائم ہے
مجھے گنگا پیاری ہے کہ اِس کے بہتے پانی میں
مجھے اِس دیس کی تہذیب کی تصویر ملتی ہے

یوسف ناظم
۱۹- الہلال ۱۲، باندرہ ریکلیمیشن، بمبئی ۴۰۰۰۵۰

سُرخ گلاب

موج در موج سمندر کی طرح اتنے خیالات کی رَو
کیوں مرے ذہن سے ٹکراتی ہے
اور چپ چاپ مرے دل میں اُتر جاتی ہے
کس سے پوچھوں یہ زمیں چپ ہے، فلک ہے خاموش
میرے حصّے کی زمیں دُور تلک ہے خاموش
موجِ گل خون میں لت پت ہو تو کیا ذوقِ نمو
اب کہیں زیبِ نظر، وجہِ سکوں، رنگ نہ بُو
اپنی پرواز پہ نادم ہیں پرندے ہر سو
سسکیاں لے کے جو چلتی ہے صبا کیسی ہے
گھات میں کون ہے، دھڑکا کیا ہے
زہر آلود یہ طوفان اُٹھا ہے کیسا
زرد پتّوں کی طرح خواب بکھر جاتے ہیں

آسمانوں سے پرے کون یہ کرتا ہے سوال
شاخِ امروز کی زینت نہیں کیوں سُرخ گلاب
وہ تو اک پھول تھا جس کی خوشبو
دُور اس کونے سے آکاش کے اُس کونے گئی
اور پھیلی تو مہکنے لگیں دھرتی کی مدھر آشائیں
وہ تو اک دیپ تھا جس کی جوتی
گھر کی سیما سے بڑھی
اور جگ جگ کے اندھیرے سے اُلجھتی ہی رہی
کیسی آواز ہے، آواز کدھر سے آئی

پھول باقی نہیں خوشبو تو مگر باقی ہے
دیپ کی جوت کا جادو تو مگر باقی ہے

رونق نعیم
جواہر لال نہرو روڈ، رانی گنج ۷۱۳۳۴۷ (مغربی بنگال)

امن کا پیامی

امینِ شمعِ وفا، شعلۂ زماں نہرو
چراغِ فہم و فراست کا پاسباں نہرو

اسی کے دم سے منوّر تھا ایشیا کا افق
وہ سیلِ رنگ، وہ خورشیدِ ضو فشاں نہرو

کفِ فلک پہ مزاج آشنائے ماہ و نجوم
بساطِ ارض پہ ذرّوں کا ہمزباں نہرو

فضائے امن میں اک آفتابِ شبنم خُو
حدودِ جنگ میں اک برقِ بے اماں نہرو

سوال یہ کہ اسے پیار کیوں گلاب سے تھا
جواب یہ کہ تھا معمارِ گلستاں نہرو

فصیلِ جبر و ستم بن گئی خس و خاشاک
اٹھا جو صورتِ سیلابِ بے کراں نہرو

مدبّر اور مفکّر، عقیل اور فہیم
بقیدِ موسمِ پیری بھی تھا جواں نہرو

نہ کیوں کہ اس کو عقیدت کے پھول نذر کریں
کہ تھا ہم اہلِ وطن کو سکونِ جاں نہرو

رسولِ امن تھا انسانیت کا پیکر تھا
فضائے آشتی و صلح کا پیمبر تھا

عشرت ظفر
۱۰۵/۶۵۴، فہیم آباد، کان پور ۲۰۸۰۰۱ (یو۔پی)

روشنی جاتی رہی

(پنڈت جواہر لال نہرو کی موت پر کہی گئی)

جس سے گرمی تھی دلوں میں وہ شرارہ بجھ گیا
گل ہوئی شمعِ منوّر، روشنی جاتی رہی
دردِ انسانی کا واقف، مونسِ غم اُٹھ گیا
رمزِ آگاہی کا حامل جہل کا دشمن گیا

ہند کی تقدیر کا روشن ستارہ بجھ گیا
کشورِ ہندوستاں سے زندگی جاتی رہی
مفلس و نادار کا غم خوار و ہمدم اُٹھ گیا
علم و دانش کا مربّی، یارِ فکر و فن گیا

○

اے رسولِ صلحِ کُل! اے داعیِ امن و اماں
اِک صفِ ماتم بچھی تیرے لیے لندن میں ہے
سوگ تیرا ارضِ بابل، مصر کے اہرام میں
الپس کی چوٹی پہ، روما کے کلیساؤں میں سوگ
راز اِس اندوہ و غم کا تیری انساں دوستی

سوگ میں ڈوبا ہوا ہے آج تیرے اِک جہاں
غم جدائی کا تری جنوا و واشنگٹن میں ہے
ٹوکیو کی صبح، پیرس کی سہانی شام میں
روس کے شہروں میں، افریقہ کے صحراؤں میں سوگ
وقف تھی جس کے لیے ہر آن تیری زندگی

○

تیری ہستی عزم و ہمّت کا ہمالہ دہر میں
عشق تجھ کو تھا تمدّن کی حسیں اقدار سے
سالہا کروٹ بدلتے رہتے ہیں لیل و نہار

تو محبت اور مروّت کا شوالہ دہر میں
فکر کی نیرنگیوں سے، عظمتِ کردار سے
تب کہیں ہوتا ہے پیدا تجھ سا فخرِ روزگار

○

تجھ سے وابستہ رہیں خوشیاں ہماری عمر بھر
اب ذرا روتے ہوئے ہندوستاں پر اِک نظر



تیرے اُٹھ جانے سے گویا ہوگئے ہیں ہم یتیم
سر بسر اُجڑی ہوئی ہے آج یہ ارضِ قدیم
ہے ادھوری ملک کی ہر داستاں تیرے بغیر
ذرّہ ذرّہ دیش کا ہے خوں چکاں تیرے بغیر
ہے ہمالہ دم بخود، خاموش ہیں گنگ و جمن
بن گیا ہے غم کدہ ہر خوشنما صحنِ چمن
رنگِ حسرت ہے اجنتا کی حسیں تصویر میں
غم کی جھلکی آگئی ہے تاج کی تنویر میں
رو رہا ہے خوں ایلورا کا بتِ طنّاز آج
پڑ گیا ہے سرد غم سے ہر سُریلا ساز آج
آج گوتم کی جبیں پر ہیں تردّد کے نشاں
آج گاندھی و مہاویر و منو ہیں نوحہ خواں
آج اشوکا اور اکبر کی ہیں روحیں بے قرار
آج خسرو اور غالب کے ہیں شق، غم سے مزار
تلسی و ٹیگور کی وہ زمزمہ خوانی نہیں
والمیکی کے لبوں پر وہ مدھر بانی نہیں
بجھ گئی ہے آج کالیداس کے سینے کی آگ
آج پھر میرا نے چھیڑے دُکھ بھرے برہا کے راگ
تیرے اُٹھ جانے سے سارے دیش میں کہرام ہے
کس قدر ارزاں ہیں آنسو، رنج کتنا عام ہے

○

رہنمائے ملک و ملّت! اے ادیبِ بے مثال!
تیری ہستی غیر فانی، تیری شہرت لازوال
تو جیے گا حشر تک تاریخ کے اوراق میں
تا ابد باقی رہے گا وسعتِ آفاق میں
تو جیے گا امنِ عالم کے پرستاروں کے ساتھ
بھاکڑہ ننگل کے اٹھلاتے ہوئے دھاروں کے ساتھ
گنگنائے گا محبّت کے حسیں سازوں میں تو
پُر فشاں ہوگا جواں ہمّت ہوا بازوں میں تو
درس گاہوں، کارخانوں اور کھلیانوں میں تو
آنے والے دَور کے مسرور انسانوں میں تو
یادگارِ دِل نشیں تیری، نیا ہندوستاں
روضۂ بے مثل تیرا، نغمۂ امن و اماں
زندہ باد اے آرزوئے قلبِ انساں! زندہ باد
فخرِ عالم، نازشِ ہندوستاں! پائندہ باد

ملک ناسے
۵/۲، ۱۴ وسوانی روڈ، پونہ ۴۱۱۰۰۱ (مہاراشٹر)

پنڈت جواہر لال نہرو

مرے چمن کی وہ ایک خوشبو ——
چمن چمن جو بکھر گئی تھی
وہ میرے آنگن کی روشنی جو ——
افق افق پر نکھر گئی تھی
وہ میرے خوابوں کی شخصیت جو ——
حدودِ امکاں میں نو بہ نو رنگ بھر گئی تھی
حصارِ ناممکنات کو پار کر گئی تھی
زماں مکاں سے گزر گئی تھی

مہک رہی ہے ہواؤں میں دیر سے وہ خوشبو
وہ روشنی دور تک فضاؤں میں پر فشاں ہے
وہ شخصیت کل بھی بے کراں تھی
وہ شخصیت اب بھی بے کراں ہے
کل اس کا سایہ جہت جہت تھا
اب اس کا پرتو جہاں جہاں ہے
مری زمیں تیرا آسماں ہے

مخمور سعیدی
سی۔۱۰، ڈی ڈی اے فلیٹس، ماتا سندری روڈ،
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اذکار و افکار

نظریات و خیالات برای یک نظر

اکٹر شنکر دیال شرما

روفیسر خواجہ احمد فاروقی

روفیسر مسعود حسین خاں

روفیسر خلیق احمد نظامی

روفیسر محمد شفیع اگرانی

مد عثمان عارف نقشبندی

روفیسر محمد حسن

غر علی انجینئر

اکٹر محمد محسن

روفیسر عبد المغنی

اکٹر تارا چرن رستوگی

عابد سہیل

سانتی رنجن بھٹا چاریہ

وتی لال ساقی

روفیسر آزاد گلاٹی

اکٹر سید حامد حسین

روفیسر احمد شمیم

اکٹر خورشید نعمانی

اکٹر اعجاز علی ارشد

سد رضا

اکٹر محمد اسلم پرویز

ریم پال اشک

مد شفیق

پروفیسر لطف الرحمٰن



اُردو کے بہی خواہ ــــ پنڈت نہرو

(ڈاکٹر) شنکر دیال شرما
(نائب صدر جمہوریۂ ہند)

پنڈت جواہر لال نہرو کی زبان کے متعلق جانکاری اور نظریہ نہایت وسیع اور فراخدلانہ تھا۔ آزادی کی جدّوجہد کے دوران اور بعد میں دیش کے پردھان منتری کی شکل میں انھوں نے زبان کے متعلق فراخدلی کا ثبوت وقت وقت پر دیا۔

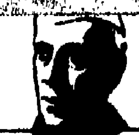
پنڈت نہرو ملک میں کسی بھی طرح کے زبان سے تعلّق رکھنے والے تنازعے کو بے معنی سمجھتے تھے۔ کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ ہر زبان کی اپنی کلچرل اور تاریخی بیک گراؤنڈ ہوا کرتی ہے جس میں وہاں کے لوگوں کے جذبات ظاہر ہوتے ہیں۔ اس لیے کسی بھی زبان کے بڑی ہونے یا چھوٹی ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا۔ وہ بھارت کی سبھی زبانوں کو مہان زبانیں مانتے تھے۔ اور اُن سبھی کی ترقی کو ضروری سمجھتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ ہمارے ملک میں ایک عوامی زبان کی ترقّی سبھی زبانوں کے آپسی سہیوگ سے ہوگی نہ کہ آپسی تنازعے سے۔ بھارت کی سبھی زبانیں ایک دوسرے کے کافی قریب ہیں۔ اور انھیں ایک دوسرے سے آپسی تبادلۂ خیالات کی معرفت ایک دوسرے کو اور خود کو بھی مضبوط کرنا چاہیے۔

پنڈت جواہر لال نہرو ہندی اور اُردو زبان کے آپسی سہیوگ کو نہایت اہم ضروری اور لازمی سمجھتے تھے۔ دراصل وہ اُردو کو ہندی یا ہندی کو اُردو سے الگ کوئی دیگر زبان مانتے ہی نہیں تھے۔ وہ اُردو زبان کو محض ایک زبان ہی نہیں بلکہ بھارتیہ کلچر کا ایک اٹوٹ حصّہ مانتے تھے۔ ان کے لیے اُردو بھارتیہ کلچر کی ایکتا کی ایک سندر مثال تھی۔ ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو نئی دلّی میں اُردو اخبارات اور کتابوں پر منعقد ایک نمائش کا اُدگھاٹن کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا: "اُردو ہمارے ملک کی صرف زبان ہی نہیں بلکہ سوچ، لٹریچر اور کلچر کی ایکتا کی بھی مثال ہے۔ یہ سو فیصدی ایک بھارتیہ زبان ہے۔"

زبان کے متعلّق نظریے میں پنڈت نہرو گاندھی جی کے کافی قریب تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ گاندھی جی اپنے آندولن میں اس لیے کامیاب ہوئے کیوں کہ انھوں نے خود اور لوگوں کے درمیان کی ساری رکاوٹوں کو ہٹا دیا تھا، زبان بھی ان میں سے ایک تھی۔ اگر ہمیں لوگوں کے دلوں تک پہنچنا ہے تو وہ ان کی زبان کی ہی معرفت پہنچا جا سکتا ہے۔ اس لیے گاندھی جی آسان زبان کے حامی تھے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کی سمجھ میں آسانی سے آ سکے۔ اور اس کے لیے انھوں نے ہندی اور اُردو کی مشترکہ شکل "ہندوستانی" کو سویکار کیا تھا۔ نہرو جی گاندھی جی کے اس خیال سے متفق تھے۔ لوک سبھا میں "سرکاری بھاشا بل" پر اپنی تقریر میں انھوں نے ۲۴ اپریل ۱۹۶۳ء کو کہا تھا "میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہندی کو تیزی سے ترقی کرنی ہے تو اُردو کو ساتھ لے کر چلنا چاہیے۔ ساتھ لے کر چلنے سے میری مراد ہے الفاظ کے نظریے سے۔ اسے اُردو سے جیون شکتی حاصل ہوگی۔ ..... اُردو ایک زندہ زبان ہے۔ اُردو میں دیگر زبانوں سے الفاظ حاصل کرنے کی خاص صلاحیت ہے۔" اس طرح پنڈت نہرو ہندی اور اُردو کے آپسی سہیوگ کے حامی تھے۔ اور اُن کا ماننا تھا جب دو زبانیں تعاون میں آتی ہیں تو وہ ایک دوسرے کو مضبوط کرتی ہیں۔ ان کا تو یہاں تک ماننا تھا کہ ہمیں غیر ملکی زبانوں سے بھی الفاظ لینے میں نہیں ہچکچانا چاہیے۔

پنڈت نہرو ہندی اور اُردو زبان میں بنیادی فرق ڈکشنری کا نہیں بلکہ لپی کا مانتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ اُردو میں تقریباً تین چوتھائی الفاظ ہندی کے ہی ہیں۔ باقی ایک چوتھائی میں فارسی، عربی اور ترکی کے الفاظ ہیں۔ اس طرح کسی بھی ہندی جاننے والے کے لیے اُردو جاننا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

اس طرح پنڈت جواہر لال نہرو نے ہمیشہ ہندی اور اُردو کے آپسی سہیوگ پر زور دیا اور چاہا کہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کو خوشحال کرتی ہوئی آگے بڑھیں۔ ●



نہرو کی عظمت

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

آزادی کے قافلہ سالاروں میں جواہر

ل نہرو کا نام اتنا ہی معتبر اور اہم ہے جتنا اتما گاندھی کا ـــــــ حقیقت یہ ہے ہماری آزادی کی تحریک اور آزاد ہندوستان تعمیر کی داستان، اس وقت تک مرتب نہیں ہوسکتی جب تک ہم پنڈت نہرو کے کار و سوانح سے پورا استفادہ نہ کریں۔ نوں لازم و ملزوم ہیں۔ میں تو یہاں تک وں گا کہ جواہر لال نہرو دنیا کے ان ظیم المرتبت رہنماؤں میں سے ہیں جن کا نام یدۂ روزگار پر ثبت ہے اور جنھوں نے ل ہی کو نہیں سنوارا بلکہ مستقبل کی رگاہوں کو بھی روشن کر دیا۔ وہ ۱۹ ویں صدی کے اواخر میں پیدا ہوئے تھے اور سویں صدی کے آغاز میں سنِ تمیز کو پہنچے ہاں سے تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ ان کی تعلیم کا آغاز ہیرو کے پبلک سکول سے ہوا جو کیمبرج یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام تھا۔ اسی یونیورسٹی میں انھوں نے اپنی تعلیم مکمل کی ـــــــ اس عرصے میں ان کے ذہن و ضمیر پر جن تحریکوں اور انقلابوں نے سب سے زیادہ اثر ڈالا، ان میں یورپ کی سائنسی ترقی، انگلستان کا صنعتی انقلاب، فرانس کا انقلاب جس میں آزادی، مساوات اور اخوت پر سب سے زیادہ زور تھا، امریکہ کا انقلاب جس نے سامراجیت پر ضرب لگائی اور نوآبادیاتی لوٹ کھسوٹ کو ختم کرنے کی کوشش کی اور آخر میں ۱۹۱۷ء کا روسی انقلاب، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے جرمنی کی نازسی تحریک، اسپین کی فسطائیت اور برطانیہ کی نوآبادیاتی لوٹ کی شدت سے مخالفت کی یہی اجزا اور عوامل اُن کے تصورِ آزادی میں شامل ہو گئے ہیں۔

پنڈت جی نے اپنی شخصی زندگی میں گنگا اور جمنا کے سنگم پر پنڈتوں کی ریاضتیں، ان دریاؤں کا خوبصورت بہاؤ، مغرب کی مادیت اور مشینی ترقی سب ہی کچھ دیکھا تھا اور اس بات سے قدرے سکون محسوس کیا تھا کہ ویدوں کے نظریے اور آئن سٹائن کے زمان و مکان کے تصورات میں زیادہ فرق نہیں ہے۔

اُس وقت برطانیہ کا متوسط اور تعلیم یافتہ طبقہ اُبھر رہا تھا۔ یہ لوگ روس کا سا خونی انقلاب برپا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ سوسائٹی میں ایسی سیاسی اور اقتصادی

خیال تھا کہ یہ تبدیلیاں صرف پارلیمانی جمہوریت ہی کے ذریعے ممکن ہیں۔ جواہر لال نہرو نے اس زمانے کے لبرل اور سوشلسٹ مفکرین کی کتابیں بہت غور سے پڑھیں مثلاً جارج برنارڈ شاہ، سڈنی وب WEBB، ایچ۔ جی ویلز۔ انھوں نے مباحثوں میں بھی شرکت کرنا چاہی لیکن اس وقت کیمبرج اور آکسفورڈ کی یونین سوسائٹیوں میں ہندوستانیوں کی شرکت ممنوع تھی۔ اس لیے انھوں نے اپنی علیحدہ سوسائٹیاں قائم کیں اور رنگ و نسل کے خلاف آئینی جہاد کیا۔ ان تمام باتوں نے جواہر لال کی غیرت و حمیت کو سخت دھکا پہنچایا اور وہ فیوڈلزم اور جاگیرداری کے تمام تصورات کو چھوڑ کر سیاسی آزادی اور متوازن اقتصادی ترقی کے حامی بن گئے۔ ان کے دل میں آزادی کا جذبہ بھڑک اٹھا جو آگے چل کر شعلۂ جوالہ کی شکل میں رونما ہوا۔ سائنس اور تاریخ کے مطالعے نے ان کو یہ بتلایا کہ قوموں کے عروج و زوال کا اصل سبب کیا ہے اور نفیِ خودی اور دل کی نامحکمی اور نابرابری کس طرح قوموں کو



سے خام مال حاصل کرنا اور اپنی مشینی مصنوعات کو ان کے بازاروں میں بیچنا چاہتی تھیں۔ اسی لیے ان میں بلا کی رنجشیں اور عداوتیں تھیں اور انھوں نے تمام انسانی حقوق کو محکوم ملکوں میں پامال کر رکھا تھا۔

جواہر لال جی نے یہ بات بڑی شدت سے محسوس کی کہ بغیر سیاسی آزادی کے، سماجی، معاشی اور تہذیبی ترقی ناممکن ہے۔ یہی بات جنوبی افریقہ سے آکر گاندھی جی نے بھی کہی۔ گاندھی جی کی یہ آواز پنڈت جی کو اپنی آواز معلوم ہوئی اور انھوں نے یہ طے کر لیا کہ وہ ہندوستان کے لاکھوں کروڑوں بے زبانوں کے انسانی حقوق کے لیے جدوجہد کریں گے اور ان کو انگریزی سامراج کے ظلم سے بچائیں گے ان کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ انھوں نے آزادی کی تحریک کو ایک ذہنی سمت عطا کی۔

اس وقت نہ تعلیم آزاد تھی، نہ ادب آزاد تھا۔ نہ صحافت آزاد تھی۔ نہ تخلیقی فنون آزاد تھے۔ نہ خام پیداوار کے ذرائع اور کارخانے آزاد تھے۔ ہمارے حصے میں بس دور کا جلوہ تھا اور بے عزتی اور بے غیرتی الگ۔ جواہر لال جی نے آزادی کا علم اٹھایا۔ اور دل و نگاہ و نفس سب ہندوستان کی ترقی اور آزادی میں صرف کر دیے۔ یہ اسلوبِ بیان نہیں۔ ان کے دل کی آواز تھی۔

پنڈت جی کے پاس پیش بینی اور ایک معمار قوم کی فراست اور دانش مندی تھی۔

کا خواب نہیں دیکھا بلکہ دوسرے محکوم ملکوں کی آزادی کے لیے بھی پوری جدوجہد کی۔ انھوں نے اپنے فکر و عمل سے مغربی ملکوں میں بھی عزت اور توقیر کی جگہ حاصل کر لی اس لیے کہ انھوں نے بقائے باہم، امنِ عالم اور ناوابستگی پر زور دیا۔ ہماری خارجی حکمت عملی کا قافلہ آج بھی ان ہی خطوط پر چل رہا ہے۔

پنڈت جی کے تصورِ آزادی میں انصاف اور مساوات کو بڑا درجہ حاصل ہے۔ انھوں نے سماجی تفریق کو ختم کرنے کی دل و جان سے کوشش کی اور جمہوریت، سوشلزم، ہیومن ازم اور سیکولرازم کو میزان قدر میں سب سے بڑی اور اونچی جگہ دی۔ وہ پہلے سیاست داں اور مدبر ہیں جس نے وجود باہمی پر اصرار کیا اور اسٹالن پرستی کے خلاف آواز بلند کی۔ ان کے ساتھیوں اور ان کی ان تھک کوششوں کی بدولت ہندوستان کو آزادی ملی جس نے اس قدیم ملک کو جدید ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔

جواہر لال نہرو کے آزادی کے تصور میں معاشی انصاف کا جذبہ غالب تھا۔ اس میں مساوات، انسان دوستی اور پس ماندہ طبقوں کی بہتری شامل تھی۔ ان کے آزادی کے تصور میں ماضی کی صحت مند اقدار کا احترام اور مستقبل میں عوام الناس کی فلاح و بہبود اور خوشحالی شامل تھی۔

یہ کام جواہر لال جی منصوبہ بندی اور صنعت کاری اور تہذیبی داد و ستد کے

لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہندوستان کی تعمیر علوم سائنس، تعق اور سیکولر انداز فکر سے کرنا چاہتے تھے مورخ اور ادیب بھی تھے۔ ان کی ہر میں بے پایاں دل سوزی اور مظلومو لیے بے کراں ہمدردی ملتی ہے۔ وہ اچھ جانتے تھے کہ امن، ہم آہنگی، فرد کی عز اور بغیر اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو ہوئے صحت مند اور آزاد معاشرہ صو پذیر نہیں ہو سکتا۔

جواہر لال جی کی فراخ دلی، امن پسندی، صلح جوئی، ان کے سا مزاج کا ہماری نئی تہذیب کے فر میں بڑا اہم مرتبہ ہے۔ ان کی عظمت کا یہ بھی ہے کہ انھوں نے ایسا ماحول کیا جس میں آزادی اور جمہوریت جذبہ جاگ اٹھا۔ جس میں ہم خوشی خ دار و رسن پر چڑھ گئے اور جیل کی سختیا ہمیں بازیچۂ اطفال معلوم ہونے لگیں۔

جواہر لال جی مشرق و مغرب دونوں دریاؤں سے فیض یاب ہو تھے۔ ان کے لہو کی گردش میں ہزار شامل تھے۔ ان کی انسان دوستی، کی جمہوریت پسندی اور سیکولرز میں بڑی خیر و برکت اور عدل و انصا شامل ہے ان کے امن کے تصور کے یہ تصور پوشیدہ تھا کہ انسانی تہذیب ایک واحد ہے اور قطعی ناقابلِ تقس

نہیں کر سکتا کہ وہ صرف ایک پھول کے رس سے بنا ہے اسی طرح ان کے تصورِ آزادی میں ماضی کی صحت مند اقدار، حال کے ہوش مندانہ تقاضے اور مستقبل کے خوش آئند خواب شامل ہیں۔ ان کے آزادی کے تصور میں کہن سال تمدن کی بہت سی روایتیں اور تہذیب مسلسل کی بے شمار علامتیں شامل ہوگئی ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ حال کے دامن میں ماضی کی امانت تھے۔ ان کے یہاں آزادی کا تصور اتنا وسیع ہے کہ اس میں ذات پروری، لسانی فرقہ پرستی، تنگ نظری اور مذہبی تعصب کی گنجائش ہی نہیں یہی وجہ ہے کہ وہ ہندوستان ہی کے بڑے رہنما نہیں تھے بلکہ دنیا کے تمام محکوم، پس ماندہ اور ترقی پذیر ملکوں کے رہنما اور عزیز تھے جہاں تھے ان میں بلاشبہ ماضی حال اور مستقبل کی صحت مند اقدار ہم آغوش ہوگئی تھیں۔

پنڈت جی کی فلسفیانہ بصیرت، باطنی زندگی، عالمانہ معروضیت اور ہمہ گیر انسانیت کو سمجھنے کے لیے ان کی تلاش ہند کا مطالعہ ضروری ہے جو زندانی ادب کی فہرست میں خاص امتیاز رکھتی ہے اور ایک علیحدہ مقالے کا تقاضا کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ جس دن وہ شائع ہوئی وہ لازوال اور جدید کلاسیکی لٹریچر میں شامل ہوگئی۔ یہ شرف دنیا کی بہت کم کتابوں کو حاصل ہے۔

پنڈت نہرو اور جدید ہندوستانی زبانیں

سیاسی سطح پر پنڈت نہرو کی لسانی پالیسی پر بحث کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اپنی اور ان کے خاندان کی زبان یا زبانوں کا پس منظر بیان کر دیا جائے۔ ان کا خاندان کشمیری پنڈتوں کا خاندان تھا جس کی مادری زبان کشمیری اور سرکاری و علمی زبان فارسی تھی۔ اس خاندان کے دہلی اور آگرے کے قیام میں جب کہ فارسی کا چراغ روشن رہا، ان کی مادری زبان کشمیری سے اُردو میں تبدیل ہو گئی۔ چنانچہ پنڈت نہرو کے والد موتی لال نہرو اُردو فارسی سے بہت اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ ننہال کی طرف سے بھی انھیں دہلی کی شُستہ و رفتہ زبان ملی تھی۔ دستورِ ہند کی تشکیل کے وقت جب آٹھویں شیڈول میں زبانوں کی فہرست ترتیب دی جانے لگی اور اس میں اُردو کو شامل کیا گیا تو ایک رکن نے اچانک سوال کیا کہ یہ اُردو کہاں کی اور کس کی زبان ہے۔ اس پر پنڈت نہرو نے اپنے مخصوص جذباتی لہجے میں کہا کہ یہ میری ماں اور میری نانی کی مادری زبان تھی۔

لیکن اس خاندانی ماحول میں نہرو نے صرف بول چال کی زبان پر قدرت حاصل کی۔ ان کی تربیت، ان کے والد کی طرح اُردو فارسی میں نہیں ہو سکی اس لیے کہ ابتدا سے وہ انگریزی تعلیم کے چکر میں ڈال دیے گئے تھے۔ چوں کہ ان کی اسکول کی تعلیم کی مدت ہندوستان میں بہت کم رہی اور

-(پروفیسر) مسعود حسین خاں

پروفیسر ایمے رِٹس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

بہت جلد وہ HARROW، انگلستان، بھیج دیے گئے، اس لیے جس زبان میں ان کے ذہن کے دریچے کھلے وہ کوئی ہندوستانی زبان نہیں بلکہ انگریزی تھی جس کی کیمبرج کے دوران قیام نے اور پختہ کر دی۔ اس طرح جب وہ ۱۹۱۲ء میں بار ایٹ لا ہو کر ہندوستان واپس آئے تو وہ ہر اعتبار سے 'جنٹلمین' بن چکے تھے۔

ان کی بہن کرشنا ہٹھی سنگھ کے بقول

"وہ انگلستان سے ایک صاحب بہادر بن کر پلٹے جسے بد دماغ کہا جا سکتا ہے۔"

ہندوستان پہنچ کر بہت جلد وہ وکالت سے زیادہ سیاست کی گردش میں آ گئے۔ یہاں ان کا سابقہ اُس جادو گر، سے پڑا جس کو مولانا محمد علی مہاتما بنا چکے تھے اور جو انگلستان اور لنکن اِن کا پروردہ ہونے کے باوجود اور سات سمندر پار جا کر بھی اپنی جڑوں سے وابستہ رہا، میری مراد موہن داس کرم چند گاندھی سے ہے۔ گاندھی جی کا عقیدہ تھا کہ کوئی بدیسی زبان مادری زبان کی جگہ نہیں لے سکتی۔ اس لیے ہندوستانی تعلیم کا ذریعہ انہی زبانوں کو ہونا چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں وہ انگلستان جا کر بھی لسانی اعتبار سے سودیشی رہے۔ ۱۹۲۰ء میں انھوں نے جب قومی تعلیم کو آواز دی کہ خود کو انگریزی کی گرفت سے آزاد کرے تو اس آواز پر جامعہ ملیہ اسلامیہ، کاشی ودیا پیٹھ، اور گجرات ودیا پیٹھ عالم وجود میں آئیں۔ میں گاندھی جی کی لسانی پالیسی کا تذکرہ اس لیے قدرے تفصیل سے کر رہا ہوں کہ بعد کو یہی کانگریس کی لسانی پالیسی کا بنیادی تصور بنا جس کی تائید انگریزی زبان سے محبت ہونے کے باوجود، نہرو کو بھی کرنی پڑی۔

گاندھی جی کے علی الرغم نہرو جذباتی طور پر انگریزی کے آدمی تھے۔ چوں کہ انھیں ہندوستان کی کسی زبان کی تحریر اور اظہار پر قدرت حاصل نہیں تھی اس لیے انھوں نے اوّل تا آخر انگریزی ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔ وہ اُردو، ہندی تھکنے کی بس شُد بُد رکھتے تھے لیکن ان زبانوں میں ان کی کوئی مسلسل تحریر یا لائق اعتنا کارنامہ نہیں ملتا۔ حالاں کہ احمد نگر کے قلعے کی اسیری کے دوران انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد جیسے معلم اور انشا پرداز سے اُردو کا درس لیا تھا۔

یہ نہرو کی عقلیت پسندی اور قومیت پرستی تھی کہ انگریزی کے خلاف جوں جوں کانگریس کے حلقوں میں آواز بلند ہوتی گئی وہ اس میں اپنی آواز ملاتے گئے۔ حالاں کہ اس کی زد خود



ان کے لسانی وجود پر پڑتی تھی جس کے تاروپود انگریزی کے بنے ہوئے تھے اور جس پر وہ بڑی شاعرانہ اور ماہرانہ قدرت رکھتے تھے۔

کان پور کے اجلاس میں ۱۹۲۵ء میں جب کانگریس نے قومی زبان کے سلسلے میں "دونوں لکھاوٹوں میں ہندوستانی" کی تجویز پاس کی تو نہرو بھی اس کے حمایتی تھے۔ ۱۹۳۷ء میں نہرو نے اپنے ایک کتابچے میں قومی زبان کے مسئلے کو اس قدر وضاحت کے ساتھ پیش کیا کہ گاندھی جی نے متاثر ہو کر ۲۱۔ اگست کے ہریجن میں اسے جگہ دی۔ نہرو کے اس زمانے کے لسانی خیالات کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) ہمارے سرکاری کام اور سرکاری تعلیم کے لیے مختلف لسانی علاقوں میں وہیں کی زبان استعمال ہونی چاہیے، جو وہاں کی سب سے زائد رائج زبان ہو۔ اس کام کے لیے ان زبانوں کو سرکاری طور پر منظور کیا جائے —— ہندوستانی (جس میں ہندی اور اردو دونوں شامل ہیں) بنگالی، گجراتی، مراٹھی، تامل، تلگو، کنٹر، اڑیا، سندھی اور کسی حد تک پشتو اور پنجابی بھی۔

(۲) ہندوستانی بولنے والے علاقوں میں ہندی اور اُردو دونوں ہی کو اپنی اپنی لکھاوٹ کے ساتھ سرکار کی طرف سے تسلیم کیا جائے۔

(۳) ہندوستانی کے علاقے میں تعلیم کا سرکاری ذریعہ ہندوستانی ہوگی اس لیے دونوں لکھاوٹوں کو تسلیم اور استعمال کیا جائے۔

(۴) ہندوستانی کو، دونوں لکھاوٹوں کے ساتھ، کل ہند زبان کی حیثیت سے بھی تسلیم کیا جائے۔

(۵) دیوناگری، بنگالی، گجراتی اور مراٹھی لکھاوٹوں میں یکسانیت لانے اور ان کے میل سے ایک ایسی ملی جلی لکھاوٹ بنانے کی کوشش کی جائے جو چھاپے خانوں، ٹائپ رائٹروں اور دوسری طرح کی مشینوں کے لیے موزوں ہو۔ (یہ بہت انقلابی تجویز تھی)۔

(۶) سندھی لکھاوٹ کو اُردو لکھاوٹ میں ملا دیا جائے اور اسے جہاں تک ممکن ہو سکے آسان اور چھپائی اور ٹائپنگ وغیرہ کے لیے موزوں بنایا جائے۔

(۷) دکھنی بھارت کی زبانوں کی لکھاوٹوں کو دیوناگری لکھاوٹ جیسا بنانے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ اگر یہ کام ممکن نہ ہو تو دکھن بھارت کی مختلف زبانوں (تامل، تلگو، کنٹر اور ملیالم) کے لیے ایک لکھاوٹ بنانے کی کوشش کی جائے (یہ دوسری انقلابی تجویز تھی جو صرف اہلِ سیاست سے سرزد ہو سکتی تھی)

(۸) لاطینی لکھاوٹ میں کئی طرح کے فائدے ہوتے ہوئے بھی کم سے کم فی الحال ہماری دیسی زبانوں کے لیے اس کا تصور ممکن نہیں ہے۔ اس لیے ہمیں دو لکھاوٹیں اختیار کرنی ہوں گی ایک لکھاوٹ دیوناگری، بنگالی، گجراتی اور مراٹھی کے جوڑ سے بنی ہوئی اور دوسری اُردو - سندھی لکھاوٹ۔ اور اگر دکھن بھارت کی زبانوں کی مختلف لکھاوٹوں کو دیوناگری کے نزدیک نہ لایا جائے تو سب دکھنی زبانوں کے لیے ایک اور لکھاوٹ ہو۔

اسی مضمون میں پنڈت نہرو نے 'بیسک ہندوستانی' کی تشکیل اور یونیورسٹی کی سطح تک تعلیم کا ذریعہ لسانی علاقے کی زبان تجویز کیا ہے۔

ہندوستانی کی اس صورتِ حال کے پیشِ نظر جو ۱۹۳۷ء کے آس پاس پائی جاتی تھی، یہ تجاویز ایک غیر ماہرانہ ذہن کی پیداوار ہونے کے باوجود ایک اہم لسانی دستاویز ہیں۔ جن سے نہرو کی فراخ دلی، ذہنی وسعت اور خلوصِ نیت کا پتہ چلتا ہے۔ گاندھی جی نے ۱۹۴۶ء میں جو بات نہرو کی شخصیت کے بارے میں کہی تھی وہ ان کے کردار کے ہر دور میں پائی جاتی ہے۔ گاندھی جی لکھتے ہیں:

"اس کا دل ایک بچے کا سا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ عقل و دانش علم و فضل اور بے پناہ صلاحیت سے بھی مالامال ہے۔"

لیکن اس عقل و دانش کے پتلے نے متحدہ ہندوستان کے لسانی مسئلے کا جو حل نکالا وہ تاریخ کو منظور نہیں تھا۔ ہندوستان تقسیم ہوا تو ساری حقیقتیں بدل گئیں، سارے خواب پریشان ہو گئے۔ تقسیمِ ملک کے دس سال کے اندر ملک کی نئی تنظیم نہرو کی آنکھوں کے سامنے لسانی ریاستوں کی شکل میں نمودار ہوئی اور یہ سب تجاویز بے معنی ہو گئیں۔ اب مسئلہ درپیش تھا، انگریزی بنام ہندوستانی زبانیں اور انگریزی بنام ہندی کا۔

یہاں بھی نہرو نے معقولیت پسندی کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ بغیر کسی طرفداری کے انھوں نے انگریزی اور ہندوستانی زبانوں میں ایک توازن قائم رکھنے کی کوشش کی۔ انگریزی کے



بارے میں کہا:

"انگریزی ہمارے لیے ایک ناگزیر ضرورت کے طور پر رہے گی، کچھ تو اس سے اپنی گذشتہ وابستگی کی وجہ سے اور کچھ موجودہ دنیا میں جو اس کی ضرورت ہے اس وجہ سے۔"

اس ضرورت کے احساس کے باوجود نہرو ہندوستانی عوام کے سمندر کے اس جوار بھاٹا کو بھی دیکھ رہے تھے جس نے اس عہد کی سیاست کو متلاطم کر دیا تھا۔ وہ اپنے سوشلسٹ قول و قرار کی وجہ سے اس پر نظر جمائے ہوئے تھے۔ انھی کی خاطر انھوں نے اپنی انگریزی چال ڈھال اور لباس کو ترک کیا تھا۔ وہ ان کی زبان سے کس طرح اغماض کر سکتے تھے۔ چنانچہ گاندھی جی کی طرح انھیں بھی اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا:

"ہم کروڑوں انسانوں کو ایک بدیسی زبان میں خواندہ نہیں بنا سکتے۔"

اور پھر یہ کہ:

"میں تصور بھی نہیں کر سکتا کہ انگریزی ہندوستان میں تعلیم کا ذریعہ بنی رہے گی۔ یہ ذریعۂ تعلیم یا تو ہندی ہوگی یا کوئی اور علاقائی زبان۔"

سب سے بڑے سوشلسٹ ملک روس کی جانب جب نظر اٹھی تو اس سے بھی یہی سبق ملا:

"ذریعۂ تعلیم مادری زبان کو ہونا چاہیے۔ سوویت روس میں ہندوستان کے مقابلے میں زیادہ قومیتوں اور زبانوں سے سابقہ ہے، مشکلات بھی دوچند ہیں، ان کے باوجود اس اصول پر پابندی سے عمل کیا جا رہا ہے۔"

چنانچہ انھی تصورات کے تحت جب ۱۹۴۹ء میں دستور ساز اسمبلی نے ہندوستان کی لسانی صورت حال پر غور کیا تو نہرو کی قیادت میں حسب ذیل اصول وضع کیے۔

۱۔ ابتدائی تعلیم کا ذریعہ مادری زبان ہوگی۔

۲۔ اقلیتوں کی مادری زبان کا مکمل طور پر تحفظ کیا جائے گا اور انھیں اپنے ادارے قائم کرنے کا اختیار ہوگا۔

۳۔ ہندی دیوناگری رسم خط میں مرکزی سرکار کی زبان ہوگی، لیکن انگریزی کا چلن پندرہ سال تک قائم رہے گا۔

۴۔ ہر پانچ سال کے بعد صدر جمہوریہ ہند کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ ایک اعلیٰ اختیاری کمیشن کے ذریعے ہندی کے سرکاری زبان بننے کی رفتار کا جائزہ لے اور اس کی ترقی کے لیے تجاویز پیش کرے۔

ان اصولوں اور ہدایات کے وضع کرنے میں نہرو کا بہت اہم رول رہا ہے۔ مولانا آزاد تو جب برسر اقتدار کانگریس پارٹی نے دُگنی اکثریت سے ہندوستانی دو لکھاوٹوں کے بجائے 'ہندی' دیوناگری رسم خط میں کا ریزولیوشن پاس کر دیا تو لسانی محاذ سے کنارہ کش ہوتے گئے، لیکن نہرو نے اس محاذ سے منہ موڑنے کے بجائے نئی صورت حال کو قبول کرتے ہوئے ہندوستانی زبانوں کے بارے میں نئے انداز میں سوچنا شروع کر دیا۔

تقسیم و آزادیِ ملک سے قبل کانگریس بڑی شد و مد کے ساتھ لسانی اساس پر ریاستوں کی تشکیل کی حمایت کر چکی تھی۔ آزادی ملنے کے بعد لسانی تعصب کی شدت کے پیش نظر نہرو مذبذب تھے۔ لیکن وہ اس تحریک کو روک نہ سکے اس لیے ۱۹۵۶ء میں اس مقصد کے لیے ایک کمیشن کی تشکیل کی گئی۔ نہرو نے اپنے اس وقت کے ایک بیان میں یہ اشارہ کیا ہے کہ ضروری نہیں کہ لسانی اور انتظامی سرحدیں یکساں ہوں یعنی ایک زبان ایک سے زائد ریاستوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ ان کے پیش نظر یہ بات بھی کہ دو لسانی ریاستیں بھی ہو سکتی ہیں۔ لیکن ان کی اس تجویز کو خود کانگریس پارٹی نے نامنظور کر دیا۔ اور ایک بہت بڑے اور دور رس فیصلے کے بعد ریاستوں کی لسانی اساس پر تنظیم کر دی گئی۔ جنوبی ہند کے لوگ چاہتے تھے کہ اتر پردیش کو انتظامی نقطۂ نظر کے تحت کم از کم دو ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ نہرو کے لیے یہ تجویز بہت زیادہ نامعقول نہیں تھی۔ لیکن جب پنڈت گووند ولبھ پنت نے یہ کہا کہ "اتر پردیش میرے 'شو' پر دوبھاجت ہوگا" تو وہ بھی چپ ہو گئے۔ اس طرح ہندی کی چھ ریاستیں قائم ہوئیں: اُتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان اور پھر پنجابی صوبہ بن جانے کے بعد ہریانہ اور ہماچل پردیش۔

لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تشکیل کے عمل کے ساتھ ہی لسانی اقلیتوں کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا، جس میں اردو لسانی اقلیت کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم تھا، اس لیے کہ اردو باعتبار تعداد ہندوستان کی چھٹی بڑی زبان ہے لیکن اپنے انتشار کی وجہ سے کسی ریاست کی کسی



ضلعے میں بھی اس کے بولنے والے اکثریت میں نہیں۔ نہرو کو، جیسا کہ اس سے قبل اشارہ کیا جا چکا ہے، اُردو زبان کے مسئلے سے بہت ہمدردی رہی تھی لیکن نئے سیاسی دباؤ اور ہندی والوں کی شاونیت کی وجہ سے وہ اس کے کے لیے بہت زیادہ نہیں کر سکے بعض دیگر معاملات کی طرح اس اعتبار سے نہرو جیسا جید قائد مقید نظر آتا ہے۔ ۱۹۵۸ء میں مولانا آزاد کے انتقال کے بعد وہ خود کو اس بارے میں اور زیادہ کمزور محسوس کرنے لگے۔ وہ اُردو کی شستگی اور شائستگی کی قسم کھاتے رہے لیکن ہندی کی بڑھتی ہوئی یلغار کے سامنے خود اپنی ریاست اتر پردیش میں وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکے اور اُردو ریاست کے نظم و نسق اور سرکاری اسکولوں سے خارج کر دی گئی۔ آئین کے عطا کردہ اس حق کا کہ بچے کی ابتدائی تعلیم اس کی مادری زبان میں ہوگی، کھلے بندوں استحصال ہوا کیا اور وہ کچھ نہ کر سکے۔ ۵۲ء میں ۲۰ ۱/۲ لاکھ دستخطوں کے ساتھ اُردو والوں نے ایک محضر داوری کے لیے صدر جمہوریہ ہند کو پیش کیا وہ بھی حکومت کے برف خانے میں ڈال دیا گیا۔ ۱۹۶۱ء میں ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ کی کانفرنس نے منظور کردہ مشہور سہ لسانی فارمولے سے بھی اُردو کے دردِ دل کا علاج نہ ہو سکا اس لیے کہ اتر پردیش جیسی ہندی ریاستوں میں تیسری زبان کی حیثیت میں سنسکرت داخلِ فہرست کر دی گئی۔ یہ سب دھاندلیاں نہرو کی نظروں کے سامنے ہوا کیں۔

اُردو کے معاملے میں نہرو جیسے قائد اور زبردست سیاست داں کی بے بسی کا نظارہ جب یاد آتا ہے تو بے ساختہ وہ لاعلم شعر زبان پر آجاتا ہے جس کا مصرع ثانی نواب محسن الملک نے ایک ایسے ہی موقع پر اُردو کے لیے پڑھا تھا۔

چل ساتھ کہ حسرت دلِ مرحوم سے نکلے
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

نہرو نے چلتے چلتے ہندوستان کی لسانی بساط پر ملک کی سالمیت کو قائم رکھنے کے لیے البتہ ایک دور اس نتائج کی حامل کی شہ چال ضرور چلی تھی اور وہ تھی اس بات کی یقین دہانی کہ جنوبی ہند، بالخصوص تمل ناڈو کی ہندی مخالفت کے پیش نظر انگریزی کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے اس وقت تک برقرار رکھا جائے گا جب تک اس کو ہٹانے کے لیے وہاں سے آواز نہ اُٹھے۔ اپریل ۶۳ء میں اس غرض سے تفصیلی بل پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا تاکہ انگریزی کے چلن کو جنوری ۱۹۶۵ء کے بعد بھی جاری رکھنے کا جواز قائم رہے۔

لیکن نہرو کا انتقال مئی ۶۴ء میں ہو گیا۔ وہ نہ صرف اُردو کے مسئلے کو بلکہ انگریزی کے معاملے کو بھی تشنہ چھوڑ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اگر ان دونوں معاملوں پر اپنی بھاری بھر کم شخصیت کا پورا وزن ڈال دیتے تو شاید یہ اس قدر اُلجھے ہوئے نہ رہ جاتے۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ نہرو کی گرتی ہوئی صحت اور چینیوں کی چپقلش میں ہندوستان کی ہزیمت نے ان کی جسمانی اور نفسیاتی قوت کو بالکل چور کر دیا تھا۔ ان کے ساتھ ایک اور دقت بھی تھی۔ انھوں نے ہندوستان کے لسانی مسئلے کو ماہرانہ انداز میں حل کرنے کے بجائے سیاسی ڈھنگ سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی۔ آزادی کے بعد کی قومی سیاست بڑی تیز رفتاری سے بدل رہی تھی۔ نئی امنگیں اور نئے تقاضے سر اٹھا رہے تھے۔ کوئی قائد کتنا ہی با اثر کیوں نہ ہو، تاریخ کے دھارے کے خلاف نہیں چل سکتا۔ گاندھی جی ہوں یا مولانا آزاد یا پنڈت نہرو ان سب کا المیہ یہی تھا کہ یہ سب بہت سے معاملات میں تاریخ کا شکار ہو گئے۔ آزادی کے فوراً بعد جو ہندی کا سیل بے پناہ اُمڈا اس میں اُردو تو دریا بُرد ہو گئی لیکن جب یہ خطرناک عزائم کے ساتھ بنگال اور دکن کی جانب بڑھا اور وہاں کی لسانی فصیلوں سے ٹکرایا تو ہندو اور ہندوستان کی وحدت کا نعرہ بھی کام نہ دے سکا۔ یہی صورت حال اردو اور بنگالی کے ساتھ پاکستان میں ہوئی جہاں سید سلیمان ندوی اور مولوی عبدالحق کی بنگالی زبان کے لیے حروف القرآن کی تحریک کامیاب نہ ہو سکی۔ اس سے زیادہ شدید صورت جنوری ۱۹۶۵ء کے بعد نہرو کے جانشینوں کو پیش آئی جب تمل ناڈو میں آگ سی لگ گئی۔ یہاں تک کہ پانڈے چری کے سری اربندو آشرم تک پر شرمناک حملے کیے گئے۔ دستور ہند کی کاپیاں جلائی گئیں اور بالآخر جب تک نہرو کی یقین دہانی کو ایک حقیقت نہیں بنا دیا گیا نہ دم لیا اور نہ لینے دیا۔

میں اس سلسلے میں کسی کی طرفداری نہیں

کر رہا ہوں البتہ ایک لسانی اقلیت کے فرد کی حیثیت سے یہ ضرور محسوس کرتا ہوں کہ دین کے معاملے ہی میں نہیں زبان کے معاملے میں بھی جبر و اکراہ سے مسئلے حل نہیں ہوتے بلکہ زہر پھیلتا ہے۔ کہتے ہیں کہ بعض سانپ سر کچل دیے جانے کے بعد اپنا زہر لاٹھی میں چھوڑ جاتے ہیں۔ زبانوں کے بننے کے لیے بھی ایک مدت درکار ہوتی ہے اور مرنے کے لیے بھی۔ اس لیے ہمیں بہت کچھ تیز رو سیاست کے بجائے سُبک گامِ تاریخ پر بھی چھوڑ دینا چاہیے۔

انتخابِ کلامِ داغ

علامہ اقبال نے داغ کے مرثیے میں کہا ہے :

تھی زبانِ داغ پر، جو آرزو ہر دل میں ہے
یعنی یہ لیلیٰ وہاں بے پردہ، یاں محمل میں ہے

داغ کی شاعری پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ان کے معتقدوں اور مداحوں نے بھی لکھا ہے اور نکتہ چینوں نے بھی اور ان لوگوں نے بھی جو خالص تنقیدی نقطۂ نظر سے کلامِ شاعر کو پرکھنے کے قائل ہیں؛ ان سب لوگوں کی تحریروں کا مرکزی خیال ایک ہی ہے کہ داغ زبان کے شاعر تھے اور روزمرہ کا حسن ان کے کلام کی اصل خوبی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ داغ کی حق تلفی اس سے زیادہ ہو ہی نہیں سکتی کہ انھیں صرف زبان اور اندازِ بیان کا شاعر کہا جائے۔ اقبال نے داغ کی شاعری کے اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے جس کی حیثیت بنیادی نقطے اور محور کی ہے اور کہا ہے کہ وہ ایک جذبۂ مشترک جو ہر انسانی دل میں تمنا بن کر رہتا ہے مگر ہر شخص اس کے اظہار پر قادر نہیں، داغ کے اشعار اسی جذبے کی ترجمانی کرتے ہیں۔

بات میں اگر گہرائی کچھ نہ ہو، بس بات کہنے کا ڈھنگ اچھا ہو تو ایسی باتیں چنگاریوں کی چمک کی طرح جلد ہی دھندلا جاتی ہیں جبکہ داغ کی شاعری آج بھی قدر و قیمت کی حامل ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان کے ہاں سارا کرشمہ محض اندازِ بیان کا نہیں، یہ کرشمہ ہے اس انسانی جذبے کی ترجمانی کا جو آرزو بن کر ہر دل میں موجزن رہتا ہے۔

مصنف : نواب مرزا خاں داغ دہلوی
مرتبہ : بیگم ممتاز میرزا
صفحات : ۲۴۹
قیمت : ۳۴ روپئے

نیا اُردو افسانہ

تجزیہ اور مباحث

اردو دنیا کا کوئی کارنامہ چاہے اس کا تعلق اردو کے لسانی مباحث سے ہو، تحقیق یا تنقید و تفہیم سے ہو، پروفیسر گوپی چند نارنگ نے جس موضوع کو بھی چھوا ہے اپنی شخصیت کے گہرے نقوش مرتسم کر دیے ہیں۔

اردو کے افسانوی ادب کی قدر شناسی پروفیسر گوپی چند نارنگ کے نمایاں علمی اوصاف میں سے ایک خاص وصف ہے۔

اس کتاب میں نارنگ صاحب نے اردو اکادمی، دہلی کے زیرِ اہتمام منعقدہ افسانہ سیمینار میں پڑھے جانے والے افسانے، ان افسانوں کے فنی تجزیے اور ان پر ہونے والے مباحث یکجا کر دیے ہیں۔

افسانہ نگاروں میں ۱۹۶۰ء کے بعد سامنے آنے والے اہم افسانہ نگار اور تجزیہ نگاروں میں افسانوی ادب کے ممتاز نقاد شامل ہیں۔ شرکائے بحث میں بھی اہم شخصیتیں ہیں۔

کتاب کے آغاز میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کے خیال انگیز، بسوط مقدمے کے علاوہ جو اس سیمینار کے ڈائرکٹر تھے، بیگم صالحہ عابد حسین اور شمس الرحمن فاروقی کے مضامین ہیں۔

سیمینار کی مکمل روداد بھی جو بازل عباسی نے لکھی ہے، شاملِ کتاب ہے۔

سیمینار پر دنیا بھر کے اخبارات و رسائل نے جو تبصرے کیے ہیں آخر میں ان کے اقتباسات بھی دے دیے گئے ہیں۔ ہم عصر افسانوی ادب و تنقید کی ایک اہم دستاویز۔

مرتب : پروفیسر گوپی چند نارنگ
صفحات : ۶۳۱
قیمت : ۶۰ روپیے

اُردو اکادمی، دہلی سے طلب کریں



پنڈت جواہرلال نہرو کا ذوقِ اُردو شاعری

(پروفیسر) خلیق احمد نظامی
نظامی وِلا، سرسید روڈ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ (یو۔ پی)

پنڈت جواہرلال نہرو کی ذات ہندوستان کی تہذیبی اقدار، سماجی رجحانات، فکری میلانات اور لسانی محسوسات کے چند بہترین مظاہر میں تھی۔ ان کو اپنے ملک کے دریاؤں، پہاڑوں، موسموں، زبانوں، رسم و رواج ہر چیز سے محبت تھی، اور یہ محبت اُن کی رگ وپے میں اس طرح سرایت کر گئی تھی کر وہ "از ہر تو میرم زبراے تو زیم" کی تصویر نظر آنے لگے تھے۔ اُردو زبان سے ان کا تعلق اسی جذبے کی پیداوار تھا۔[1] وہ اس زبان کو ایک ایسا تہذیبی ورثہ سمجھتے تھے جس میں ہندوستان کی سماجی زندگی کے خدوخال صاف نظر آتے ہیں۔ کہتے تھے کہ ادبی اُردو نے اس وقت جنم لیا تھا جب مغلیہ سلطنت سکرات کے عالم میں تھی (۱۳: ۲۲۴) اس لیے اردو لٹریچر میں ایک پورے عہد کی تاریخ سمٹ آئی ہے۔

(۱۳: ۲۴۰)

پنڈت نہرو جب جیل خانے کی چہار دیواری میں قدم رکھتے، تو اُن کی سیاسی زندگی پیچھے رہ جاتی، اور علمی اور ادبی زندگی کا آغاز ہو جاتا۔ جیل کی حیثیت ان کے لیے دارالمطالعہ کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاسی زندگی کے ہوش رُبا تقاضے جس فرصت سے محروم رکھتے تھے، وہ ان کو جیل خانے میں میسّر آجاتی تھی، جہاں وہ بے شمار کتابیں اور رسائل پڑھتے، غور کرتے، خود اپنے افکار میں تلاطم کا تماشہ دیکھتے، خیالات کے تصادم سے لطف اندوز ہوتے اور جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی اور فرصت ملتی تو خطوں میں اپنے دل کی بے چین دھڑکنیں منتقل کر دیتے۔ جیل خانہ ان کی فکر اور جذبات دونوں میں جِلا پیدا کرتا تھا۔ حافظ نے سچ کہا ہے:

شہپرِ زاغ و زغن درقید و بند صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

وہ اپنی معلومات کے جن گوشوں میں خلا محسوس کرتے تھے، ان کو جیل خانے میں پُر کرتے تھے۔ انھوں نے احمد نگر جیل میں مولانا آزاد سے فارسی پڑھی (۱۳: ۵۱۰) اردو شاعری کا مطالعہ بھی یہیں شروع کیا۔ روزانہ مولانا سے کچھ اُردو اشعار لکھوا لیتے تھے (۱۳: ۱۵) اور یقیناً ان کو بار بار دہراتے ہوں گے۔ مولانا محمد حسین آزاد کی "دربارِ اکبری" انھوں نے پوری جیل خانے میں پڑھی (۱۳: ۱۲۲)، میر امن کی "باغ و بہار" بھی یہاں مطالعے میں رہی۔

(۱۳: ۱۸۰)

سیاسی زندگی کی ہوش رُبا مصروفیتوں اور ہنگاموں کے باوجود، پنڈت نہرو کو شاعری میں دلچسپی تھی۔ اس سے اُن کے جذبات کی دنیا میں گرمی رہتی تھی۔ جیل خانے میں ذہن اور جذبات دونوں، ماضی، حال اور مستقبل کی کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کبھی ماضی کی یاد دل میں احتسابی کیفیت بیدار کر دیتی ہے، کبھی حال کی واماندگیاں طبیعت پر بوجھ بن جاتی ہیں، کبھی غیر یقینی مستقبل، مایوسی کے سائے دور تک پھیلا دیتا ہے۔ ایسے موقعوں پر اشعار قلبی اور فکری بے چینی کے ترجمان بن کر زبان پر آجاتے تھے۔ ایک بار پنڈت نہرو نے بے اختیار دردؔ کا یہ شعر مسز اندرا گاندھی کو لکھا تھا، ایسی بے ساختگی کے ساتھ کہ ان کی ذہنی کیفیات کی مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے متحرک نظر آنے لگی:

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

---

[1] یہ مضمون پنڈت نہرو کی جیل خانے کی ڈائری اور مسز اندرا گاندھی اور بعض اعزّا کے نام خطوط کی بنیاد پر تیار کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

SELECTED WORKS OF JAWAHARLAL NEHRU, ORIENT LONGMAN.

یہ شعر اُن کی زبانِ قلم پر کس طرح آیا، اس کی تفصیل خود ان سے سُنیے :

"مجھے عمر کے ساتھ ساتھ جسمانی اور ذہنی جمود میں مبتلا ہو جانے کا خوف دامن گیر رہتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ خاموشی سے گزر اوقات کرنے کی کیفیت پیدا ہو جائے، اور زندگی کا دریا سلامت روی کے ساتھ ہلکے ہلکے بہنے لگے ـــــــ میں تو ذہنی جمود اور (جسمانی) تعطل کے خلاف پیہم جنگ کرتا رہتا ہوں :

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

(۱۳ : ۳۸۴)

جیل خانے کی زندگی میں بعض اوقات حسرت اور بے چینی کے ساتھ مستقبل کی روشن تصویریں بھی اُبھر اُبھر کر آتی ہیں۔ اور یہ تمنّائیں بے اختیار دعائیں بن جاتی ہیں۔ ایک ایسے ہی موقعے پر مرزا مظہر جانِ جاناں کا یہ شعر بڑی حسرت سے اُن کی زبان پر آیا ہے :

یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا، گُل اپنا، باغباں اپنا

(۱۳ : ۲۲۴)

آزاد ہندوستان کے معمار کی یہ حسرت ایک دن حقیقت میں بدل گئی۔

بعض اوقات ماضی ایک فلم کی طرح اُن کے پردۂ ذہن پر نمودار ہو جاتا تھا، وہ ایک ایک تصویر کو دیکھتے تھے، اور اس سے لُطف اندوز ہوتے (۱۳ : ۲۳۷)، لیکن ایسے لمحات بھی آتے تھے جب بے اختیار پکار اُٹھتے تھے :

یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ
نادان پھر وہ دل سے بھلایا نہ جائے گا

(۱۳ : ۲۴۰)

احمد نگر جیل کے زمانے میں مسز اندرا گاندھی نے ان سے فرمایش کی تھی کہ وہ اپنے خطوط میں اُردو اشعار لکھا کریں۔ پنڈت جی نے جواب دیا کہ خود انھیں بھی کئی بار اس کا خیال آیا، لیکن پھر یہ سوچ کر اشعار لکھنے سے گریز کیا کہ ایسی صورت میں خطوط سنسر کے یہاں سے دیر میں نکل پائیں گے (۱۳ : ۱۱۹) لیکن پھر خطوط میں اردو اشعار لکھنے شروع کر دیے۔ کچھ عرصے بعد، ۱۸ ستمبر ۱۹۴۳ء کے خط میں لکھا :

"کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں اپنے خطوں میں تم کو اُردو اشعار بھیجتا رہوں۔ میرے لیے اس میں کوئی دقت نہیں، لیکن جب تک تم کو خود ان میں دلچسپی نہ ہو، میں تمھارے اوپر اُن کا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔ وہ کوئی بہت اعلا شاعری کے نمونے تو نہیں ہیں۔ لیکن اُن سے ہم کو ہندوستان کی تاریخ کے، اور یہاں کے بسنے والوں کے ایک عہد سے متعلق حالات معلوم ہوتے ہیں اور زبان کے متعلق ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔" (۱۳ : ۲۴۰)

۲۴ دسمبر ۱۹۴۳ء کے خط میں پوچھتے ہیں کہ اُردو اشعار کا تمھارا ذخیرہ کتنا ہو گیا۔

(۱۳ : ۲۴۱)

پنڈت نہرو نے جن شعرا کے اشعار نقل کیے ہیں وہ یہ ہیں :

مرزا مظہر جانِ جاناں، میرؔ، مومنؔ، غالبؔ، دردؔ، امیرؔ، انشاؔ، مصحفیؔ، جراتؔ، ذوقؔ، انیسؔ، آتشؔ، وزیرؔ لکھنوی، حالیؔ، اکبرؔ الٰہ آبادی، اقبالؔ، نظم طباطبائی، آسیؔ۔

اشعار کا انتخاب نہ صرف ان کے اعلا ادبی ذوق اور شاعری سے گہری دلچسپی کو ظاہر کرتا ہے، بلکہ بعض اوقات ان کی ذہنی اور قلبی کیفیات کا عکس بھی ان میں نظر آتا ہے۔ اگر اُن کے نقل کیے ہوئے اشعار کو اُس دن کی ذہنی کیفیات کے چوکٹے میں سجایا جائے تو یہ مطالعہ بہت دلچسپ اور معنی خیز ہو جائے۔ بعض اوقات وہ شعر کا مفہوم سمجھانے لگتے ہیں تو ان کا شعری ذوق غیر معمولی نفاست اور گہرائی اختیار کر لیتا ہے : انگریزی میں ترجمہ کرتے ہیں تو اس کی روح کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔ وہ غزل کے اشعار کی اس نوعیت کا بہت صاف احساس رکھتے تھے کہ اس میں ہر شعر فکر کی اکائی ہوتا ہے (۱۳ : ۱۶۰)، دوسری اصنافِ سخن میں خیالات کا تسلسل ہو سکتا ہے، لیکن غزل میں یہ ممکن نہیں۔

(۱۳ : ۱۶۰)

بعض اوقات پنڈت نہرو کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ اُردو میں بہت سے استعارات اور تشبیہات فارسی زبان اور ایرانی ماحول سے لیے گئے ہیں۔ اور ہندوستان کے حالات پر پوری طرح چسپاں نہیں ہوتے۔ احمد نگر جیل میں موسمِ بہار آگیا، تو غالبؔ کا یہ شعر لکھ کر :

خزاں کیا فصلِ گُل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

اپنی زندانی زندگی کی تصویر کھینچ دیتے ہیں، پھر لکھتے ہیں:

"ایران میں خزاں کا موسم بہت خوشگوار ہوتا ہے۔ برخلاف ہندوستان کے (شمالی اور پہاڑی علاقوں کو چھوڑ کر) اردو نے فارسی سے بہت سے خیالات اور استعارے لیے ہیں، اس میں چڑیوں، دریاؤں، پہاڑوں، درختوں، پھولوں، ایرانی موسموں کا ذکر ہے، وہ ہندوستان میں ہوں یا نہ ہوں۔ اس کی وجہ سے اردو میں ایک مصنوعی پن سا آگیا ہے۔" (۱۳: ۱۶۰)

پھر دوسرے مصرعے کا مطلب سمجھاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس میں بال سے مراد سر کے بال نہیں ہیں۔ اس سے پرندے کے بازو مراد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایک پرندہ جو پنجرے میں بند ہے، اپنے آزاد دوست کو جو بہار کی آمد آمد کا اعلان کر رہا ہے، اپنی کیفیت بتاتا ہے۔ پھر لکھتے ہیں:

"آج یہ شعر بہت سے محبوس پرندے پڑھ سکتے ہیں" (۱۳: ۱۶۰)

ماورائے ہستی کا خیال، جنت دوزخ کا تصور، گناہوں کا احساس کسی نہ کسی طرح کسی نہ کسی وقت ذہن کے دریچوں میں جھانکے بغیر نہیں رہتا۔ پنڈت نہرو کی زبان پر ایسے موقعوں پر جو اشعار آئے ہیں وہ پختہ شعری مذاق کے آئینہ دار ہیں۔ ۲۳ر اکتوبر ۱۹۴۳ء کے خط میں اکبر الہ آبادی کے اس شعر کی تعریف کرتے ہیں:

تُو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
معلوم ہوا بس تری پہچان یہی ہے
(۱۳: ۲۶۴)

غالب کے اس شعر کو نقل کرتے ہیں:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

پھر ایک موقعے پر غالب کا یہ شعر لکھتے ہیں:

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
(۱۳: ۱۲۹)

اور اس کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ اگر گناہوں کی سزا ہم کو ملنی ہی ہے تو پھر ہمیں ان ناکردہ گناہوں پر انعام بھی ملنا چاہیے جن کی خواہش پیدا تو ہوئی لیکن ہم نے نہیں کیے۔ (۱۳: ۱۲۹)

ایک موقعے پر وزیر لکھنوی کے یہ اشعار نوکِ قلم پر آجاتے ہیں:

نہ کر عوض مرے جرم و گناہِ بے حد کا
الٰہی تجھ کو غفور الرحیم کہتے ہیں
کہیں کہیں نہ عدو دیکھ کر مجھے محتاج
یہ اس کے بندے ہیں جس کو کریم کہتے ہیں
(۱۳: ۱۷۷)

قید و محن کی زندگی میں مختلف ذہنی اور قلبی کیفیات سے گزرنا، ناگزیر ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار کے انتخاب کے پیچھے جو جذبات کارفرما ہیں، ان کو پوری طرح محسوس کیا جاسکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

زندگی اپنی جب اس طرح سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

دیا:

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا
میر (۱۳: ۹)

ایک موقعے پر غالب کا یہ شعر نقل کرتے ہیں

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

پھر بے اختیار زبان سے نکل جاتا ہے۔

"یہ شعر یہاں کی زندگی سے مطابقت رکھتا ہے" (۱۳: ۴۰)

ایک جگہ انیس کی یہ رباعی نقل کر کے بعد:

دنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی
ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا
جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

کہتے ہیں کہ یہ دنیا کی بے ثباتی کی تصویر ہے اس میں کوئی خاص بات نہیں، لیکن اردو شاعری کے مزاج کی نمائندگی اس میں ہے۔ (۱۳: ۱۶۳)

جیل خانے میں بعض اوقات انسانی فطرت کو اپنے مستقبل کی تصویریں بھی نظر آتی ہیں۔ ایک موقعے پر امیر کا یہ شعر نقل کرتے ہیں اور ذہنی کیفیت بے اختیار بول اٹھتی ہے:

ہے آج جو سرگزشت اپنی
کل اس کی کہانیاں بنیں گی
(۱۳: ۱۹۰)

پنڈت نہرو نے اشعار ہی نقل نہیں کیے بلکہ شاعر کی ذہنی کیفیتوں کا جائزہ لینے کی بھی کوشش کی ہے۔ غالب کے یہ

شعار نقل کرتے ہیں۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

اور فوراً ذہن ان اسباب و عوامل اور نفسیاتی پس منظر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس نے غالب میں یہ کیفیت پیدا کر دی تھی۔ ۱۸۵۷ء اپنے پورے دردناک مناظر کے ساتھ سامنے آجاتا ہے اور لکھتے ہیں کہ اُس وقت:

"غالب کی دنیا دم توڑ چکی تھی۔ دلی کا برائے نام دربار بھی اب باقی نہ رہا تھا۔ اُن کے دوست احباب یا تو ختم ہو گئے تھے یا شدید تکالیف میں مبتلا تھے۔ جس تمدن کی وہ نمائندگی کرتے تھے اس کا کوئی مرکز نہ رہا تھا۔ یہ احساس غم بہت شدید تھا۔ (جو ان اشعار میں پکار اٹھا ہے)" (۱۳: ۱۹۳)

پھر غالب کے یہ اشعار نقل کرتے ہیں اور ذہن پھر ۱۸۵۷ء کی تباہی کے دردناک مناظر میں کھو جاتا ہے:

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے
(۱۳: ۲۱۰)

لکھتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء میں ایک پورا نظام گرا۔ اس نظام کو ختم ہونا تو تھا ہی۔ اس لیے کہ وہ بے جان ہو چکا تھا۔ لیکن جس طرح وہ گرا وہ بڑا ہی دردناک تھا: (۱۳: ۲۱۰)

ایک بار غالب کا یہ شعر نقل کیا:

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

اور لکھا کہ اس میں غالب اپنے ماضی قریب کی یاد میں مبتلا نظر آتا ہے۔

NOSTALGIC OF THE IMMEDIATE PAST)
(۱۳: ۲۲۳)

بعض اوقات اشعار نقل کرنے سے پہلے، اُن کی شانِ نزول تفصیل سے بیان کرتے ہیں تاکہ صحیح پس منظر میں ان کو سمجھا جا سکے۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۳ء کے ایک خط میں مسز اندرا گاندھی کو لکھتے ہیں:

"میرے ہفتہ وار اُردو اشعار آج ایک کہانی کا روپ اختیار کریں گے۔ اشعار تو کچھ خاص نہیں ہیں، لیکن جس واقعے کی پیداوار ہیں وہ اہم ہے۔ میر تقی دہلی کے رہنے والے تھے جو نئی زبان اُردو کا مرکز تھا۔ اور جہاں شاعر شاعروں میں جمع ہوتے تھے۔ میر کا خیال تھا کہ کسی کو اردو زبان پر قدرت حاصل نہیں ہو سکتی جب تک دہلی یا نواحِ دہلی میں وہ نہ رہا ہو۔ لیکن دہلی اب گہن میں آچکی تھی اور مائل بزوال بھی۔ لکھنؤ کو نواب وزیر کے زمانے میں مختصر مقامی رونق حاصل ہو گئی تھی۔ مفلس اور فاقہ کش شاعر اور نظمیں لکھنے والے دہلی سے لکھنؤ جانے لگے تھے۔ اور وہاں اکثر ان کو سرپرستی اور یہاں جہاں ادھر مصحفی ہو یا تقی چھپاں چھپے۔ میر تقی جو بہت نازک مزاج اور مدقق انسان تھے اور ان کے ساتھ بد دماغی و بے جا مشکل تھی۔ انھوں نے دلی چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور لکھنؤ کے سفر پر روانہ ہوئے۔ جب وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ اسی شام وہاں ایک مشاعرہ ہونے والا ہے۔ وہ نہایت ہی پرانی وضع کے کپڑے پہنے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ کوئی ان کو پہچانتا نہ تھا۔ چنانچہ (جب مشاعرے میں آئے) تو چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ کسی نے پوچھا کہ یہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟ انھوں نے ان اشعار میں جواب دیا جو فی البدیہہ وہاں کہے تھے:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اُسی اجڑے دیار کے
(۱۳: ۲۳۸-۲۳۷)

موسمِ بہار کی آمد آمد ہے، زبان پر بے اختیار غالب کے یہ شعر آجاتے ہیں:

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی



ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادِ پیمائی

(۱۳: ۲۵۴)

احمد نگر کا قلعہ، موسمِ بہار، غالب کے یہ اشعار تصور ساتھ دے تو پنڈت نہرو کو گنگناتے ہوئے سنا جا سکتا ہے۔

برسات کے موسم میں خیال امیر خسرو کی طرف پہنچ جاتا ہے۔ ان کی ہمہ گیر صلاحیتوں اور دل نواز شخصیت کی تعریف کرتے ہیں۔ پھر اُن کے راگ اور راگنیوں کا ذکر چھیڑتے ہیں اور ذہن خاص طور پر اُن کے عوامی گیتوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لکھتے ہیں اُن کے گیت شمالی ہندوستان کے گاؤں گاؤں میں گائے جاتے تھے۔ آج بھی ہزاروں دیہاتی لڑکیاں اُن کو گاتی ہیں۔ آگے لکھتے ہیں:

"ساون میں ذہن ان کے چھ سو سال پہلے کے گیتوں کی طرف منتقل ہو جانا فطری بات ہے"۔

پھر خالق باری کا ذکر کرتے ہیں۔ پھر نہ سپہر میں خسرو نے ہندوستان کے جو امتیازی اوصاف بیان کیے ہیں ذہن ان کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ (۱۳: ۴۰۷-۴۰۶)

پنڈت نہرو کے ذہن میں اُردو کے بعض ایسے اشعار محفوظ تھے جن کے ساتھ دلچسپ داستانیں وابستہ ہیں۔ ایک بار انشا کے یہ اشعار لکھے:

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

(۱۳: ۴۲۷)

ایک اُردو شعر پنڈت نہرو اکثر اپنی تقریروں میں پڑھتے تھے۔ اس میں حقیقتاً اُن کو اپنی سیاسی جد و جہد کی تصویر نظر آتی تھی۔ جیل خانے سے بھی طبا طبائی کا یہ شعر مسز اندرا گاندھی کو لکھا ہے:

اس طرح طے ہم نے کی ہیں منزلیں
گر گئے، گر کر اُٹھے، اُٹھ کر چلے

قلندر بخش جرأت کا یہ مصرعہ بھی پنڈت نہرو کو بہت پسند تھا:

مٹک دیکھ لیا دل شاد کیا خوش کام ہوئے اور چل نکلے

کہتے ہیں کہ اس مصرعے میں آوارہ مزاجی کی بڑی اچھی ادا پوشیدہ ہے جو چینی فلسفی LAO-TSE کی یاد دلاتی ہے۔ یہ مصرعہ زندگی پر مجموعی طور پر بھی منطبق ہوتا ہے اور کسی خاص واقعے پر بھی چسپاں ہو سکتا ہے۔ گو صوفیانہ نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے لیکن یہ اس سے کہیں زیادہ معنی اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ صوفی زندگی سے فرار اختیار کرتے ہیں۔ اور اس کو ایک فریب بتاتے ہیں۔ لیکن یہ شعر اس صوفیانہ مفہوم کا نہیں ہے۔ یہ زندگی سے شادکام ہو کر، اپنے اوپر کچھ بوجھ لیے بغیر آگے بڑھ جانے کی آواز ہے۔

(۱۳: ۱۵۷-۱۵۶)

غالب کے بعض فلسفیانہ افکار کو پنڈت نہرو نے نہایت خوبی سے سمجھا ہے، اور اس سے زیادہ خوبی سے سمجھایا ہے غالب کے اس شعر:

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت ہی کیوں نہ ہو

کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آدمی محض ایک فرد نہیں ہے۔ اس کے اندر افکار و احساسات کی ایک دنیا آباد ہے۔ تنہائی کے اوقات میں بھی اس کے اندر بحث و تکرار کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ (۱۳: ۱۲۹)

عقل اور دل کی رسہ کشی ہر انسان کے پیکر میں ہوتی ہے۔ پنڈت نہرو بھی اس سے دوچار ہوئے اور بالآخر اقبال کے اس شعر میں ان کو اس کشمکش کا حل نظر آیا:

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اپنی بیٹی کو یہ شعر سمجھاتے ہیں تو کوئی مشکل لفظ نظر نہیں آتا، سوائے "پاسبان" کے۔ اس کی کس معصومانہ انداز سے وضاحت کرتے ہیں کہ اقبال نے اپنے ترانے "ہندوستاں ہمارا" میں ہمالیہ کو ہندوستان کا پاسبان کہا ہے۔ (۱۳: ۱۵۶)

آتش کے یہ اشعار لکھتے ہیں:

نہ کچھ شوخی چلی بادِ صبا کی
بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی
ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

پھر مطلب سمجھاتے ہیں کہ صبح کی ہوا معشوق کی زلفوں سے کھیل رہی ہے۔ لیکن جتنے بال بکھرتے ہیں اتنے ہی حسن کے ساتھ زلف بنتی ہے۔ شاعر نے کس انداز سے یہ بتایا ہے

جس راہ سے معشوق گزرا ہے اس کا پتہ اس
نقشِ پا سے چل گیا۔ (۱۳:۱۶۹)

غالب کا یہ شعر نقل کرتے ہیں:

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

اس کا ترجمہ کتنی خوبصورت انگریزی
میں کرتے ہیں:

"NOW THAT EVERY PARVENU
CONCEITED FOOL HAS CONSTIT
HIMSELF AS A CONNOISSEUR AND J
OF THE BEAUTIFUL, THERE IS
HONOUR OR PLACE LEFT FOR THOSE
HAVE THE EYES TO SEE AND APPREC
(13:250)

امیر کے ایک شعر کا انگریزی ترجمہ
لائقِ ستائش ہے:

اے برق تو ذرا یوں ہی تڑپی، ٹھہر گئی
یاں عمر کٹ گئی ہے اسی اضطراب میں

...ہیں:

"THE IDEA (IS) THAT THE LIGH'
FLASHES (POSSIBLY IN PAIN) AND
RESTS FOR A WHILE; BUT FOR ME '
IS NO REST FROM THIS - MALA:
(13:267)

میر کے مندرجہ ذیل اشعار پنڈت نہرو کو پسند
تھے:

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا
(۱۳:۱۶۹)

جی میں تھا اس سے ملیے تو کیا کیا نہ کہیے میر
پر جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھ کر
(۱۳:۲۴۰)

مت رنجہ کر کسی کو کہ اپنے تو اعتقاد
دل ڈھائے کر جو کعبہ بنایا تو کیا ہوا
(۱۳:۲۴۶)

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر
(۱۳:۲۴۹)

غالب کے اور اشعار جو ان کو یاد تھے اور اکثر
زبان پر آتے تھے یہ تھے:

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
(۱۳:۱۶۴)

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
(۱۳:۱۸۴)

تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز
(۱۳:۱۹۰)

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
(۱۳:۲۴۶)

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟
"ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا"
اور درویش کی صدا کیا ہے؟
(۱۳:۲۹۹)

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
(۱۳:۳۲۱)

مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی
(۱۳:۳۲۱)

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں؟
دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
(۱۳:۳۳۰)

غالب کے اشعار کا یہ انتخاب پختہ شعری ذوق
کا آئینہ دار ہے۔

حالی کی بعض رُباعیاں اور اشعار بھی پنڈت نہرو کو بہت پسند تھے۔ حالی نے اصلاح و تربیت کا کام کرنے والوں کو ایک رباعی میں اعتدال کی ہدایت کی ہے' اور گو روے سخن غالباً سرسید کی طرف تھا' لیکن اندازِ بیان کی سادگی اور تاثیر نے اس رُباعی کو مقبولِ عام بنا دیا تھا۔ پنڈت نہرو کو بھی یہ رُباعی پسند تھی :

دھونے کی ہے اے ریفارمر جا باقی
کپڑے پہ ہے جب تلک کہ دھبا باقی
دھو شوق سے کپڑے کو پر اتنا نہ رگڑ
دھبا رہے کپڑے پہ نہ کپڑا باقی

(۱۳ : ۱۷۳)

اس میں حقیقت بینی کی جو تعلیم دی گئی ہے' اور احتیاط کا جو انداز ہے وہ شاید پنڈت نہرو کی انقلابی فطرت سے ہم آہنگ نہ ہو' لیکن وہ اس رُباعی کو پسند کرتے تھے۔ حالی کے دو اور شعر جو انھوں نے نقل کیے ہیں' یہ ہیں :

اُن کے آتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت
اُن کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

(۱۳ : ۲۲۲)

حالی نے ایک جگہ جس طرح وطن میں اختلافات کا ذکر کیا ہے' اس پر بھی پنڈت نہرو نے پسندیدگی ظاہر کی ہے :

سرو و قمری میں یہ جھگڑا ہے وطن کس کا ہے
کل خزاں آکے بتا دے گی چمن کس کا ہے
فیصلہ گردشِ دوراں نے یہ سو بار کیا
مروِ کس کا ہے' بدخشان و ختن کس کا ہے

لیکن اختلاف کے جمہوری پہلو کو وہ نظر انداز نہیں کرتے تھے' اور ذوق کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے :

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

حالی نے جس طرح اعلا مقاصد کے لیے جہد و سعی کرنے والوں کو کامیابی کی بشارت دے کر ہمتوں کو بڑھایا ہے' وہ بھی پنڈت نہرو کو بہت دلآویز معلوم ہوتی تھی :

رہروِ تشنہ لب نہ گھبرانا
اب لیا چشمۂ بقا تو نے

(۱۳ : ۳۴۸)

بعض اور اُردو اشعار جو پنڈت نہرو کو پسند تھے اور بے اختیار زبان قلم پر آگئے ہیں اُن کے شعری ذوق کے مطالعے میں نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ مثلاً :

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ذوق (۱۳ : ۳۱۷)

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

مومن (۱۳ : ۳۲۷)

اذاں دی کعبے میں' ناقوس دیر میں پھونکا
کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

آسی (۱۳ : ۳۲۷)

قسمت تو دیکھیے کہ کہاں ٹوٹی ہے کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

قائم (۱۳ : ۲۹۷)

لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

آتش (۱۳ : ۳۱۷)

تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس
یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں الٹا سیدھا

آتش

یہ عجب میں رسم دیکھی کہ بروزِ عیدِ قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

مصحفی

تہمت چند اپنے ذمے دھر چلے
کس لیے آئے تھے ہم کیا کر چلے
شمع کی مانند ہم اس بزم میں
چشم تر آئے تھے دامن تر چلے
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جس قدر بس چل سکے ساغر چلے

درد

پنڈت جواہر لال نہرو کے انقلابی پیکر میں بعض رومانی رنگوں کی دھنک اُردو اشعار کے ذریعے بڑی خوب صورتی سے جلوہ ریز نظر آتی ہے۔ جو شخص ان اشعار پر داد دے سکتا ہو' اس کے رومانی جذبات سے انکار نہیں کیا جا سکتا :

شبِ وصال بہت کم ہے' آسماں سے کہو
کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شبِ جدائی کا

امیر

وہ زمانہ کیا ہوا جب مری آہ میں اثر تھا
یہی چشمِ خوں فشاں تھی' یہی دل' یہی جگر تھا

نامعلوم (۱۳ : ۳۵۹)



ُس نے بھولے سے کیا نظر ڈالی
عمر ساری خراب کر ڈالی
(نامعلوم)

انگریز رومانی شاعروں سے بھی پنڈت دِ کو گہرا لگاؤ تھا۔ شیلے کو بائرن سے زیادہ سند کرتے تھے، لیکن اس سے تعلق خاطر کا ب دوسرا تھا۔ بائرن کی خود بینی ہر چند ن کو پسند نہ تھی لیکن اس نے اسی اسکول (HARROW) اور اسی کالج (TRINITY COLLEGE CAMBRIDGE) میں تعلیم پائی تھی جہاں پنڈت نہرو کی تعلیم ہوئی تھی۔ (۱۳۱:۵۲) جیل خانے میں انھوں نے ٹیگور کی نظمیں، EZRA POUND کا کلام اور TAMBIMUTTU کی جمع کی ہوئی POETRY IN WAR TIME بڑے شوق سے پڑھی تھیں۔

پنڈت نہرو کے اُردو اشعار کا یہ خریطۂ جواہر اُن کی شخصیت کی دل کشی میں اضافہ کرتا ہے، اور اُردو شاعری کے مزاج اس کی لفظی خوبیوں اور معنوی اعجاز سے اُن کی واقفیت پر روشنی پڑتی ہے۔



نہرو اور عرب ممالک

نہرو کا دنیا کے متعلق نظریہ اُن کی تابندہ ذہانت، انسان دوستی اور مقصدِ حریت سے والہانہ وابستگی کا حقیقی آئینہ ہے۔ تاریخ کے متعلق ان کی بصیرت تعصبات کی دیواروں کو توڑتے ہوئے انسانی شناخت، مناسبت اور تکمیل کی جستجو کے مثبت پہلوؤں کا انکشاف کرتی ہے۔ جیسا کہ نہرو کے ایک سوانح نگار نے لکھا ہے کہ وہ کائنات کے لیے ایک جذباتی اور تعقلی شعور رکھتے تھے، وہ ہر جگہ اپنا پن محسوس کرتے تھے اور اُسے دوسروں تک پہنچانے کے لیے کوشاں نظر آتے تھے۔ نہرو کی ذات میں بین الاقوامیت کا عنصر ہندوستان کی تحریکِ آزادی کو سامراج واد کے خلاف ایک عالمی جدوجہد سے منسلک کرتا تھا۔ مولانا آزاد کے الفاظ میں نہرو اپنے ذہن سے کبھی یہ محو نہیں کر سکے کہ ہندوستان کے باہر دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ آزادی کے بعد تو وہ ہندوستان کی داخلی اور خارجہ پالیسیوں کے کسی بھی پہلو کو اس بات سے علیحدہ کر کے نہیں سوچ سکتے تھے۔

نہرو کی ذات کے پہلوؤں کا یہ عملِ باہمی آزادی سے پہلے اور بعد میں اُن کی عرب پالیسی میں وافر طور پر منعکس ہوتا ہے۔ عربوں کا عالمی تہذیب میں تعمیری حصہ اور مدت دراز سے چلے آرہے عرب اور ہندوستان کے ثقافتی اور دانش ورانہ مسلسل روابط کا، نہرو کے اندر کا مورخ گرویدہ

(پروفیسر) محمد شفیع اگوانی
وائس چانسلر جواہرلال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

رہا ہے۔ مجاہد آزادی کی حیثیت سے انھیں عرب دنیا کے تمام حصوں میں ہونے والی قومی ہلچلوں سے جذباتی ہم آہنگی عزیز تھی۔ نہرو اور ان کے دور کے کئی عرب مشاہیر اس معاملے میں ہم خیال تھے کہ سامراج واد کے خلاف تحریک واحد اور ناقابلِ تقسیم ہے۔ ۱۹۲۷ء میں نہرو نے کہا تھا "سامراج واد کا یہ پارچہ جو بہت گٹھی بُنائی والا اور شاندار دکھائی دیتا ہے ایک کھونچ لگتے ہی خود بخود بالکل تباہ ہو جائے گا۔" سامراج واد کے پارچے میں پہلی بڑی کھونچ ۱۹۴۷ء میں لگی جبکہ ہندوستان آزاد ہوا اور جیسا کہ پیشین گوئی کی جا چکی تھی اس واقعے سے نوآبادیاتی تسلط سے عرب ممالک کی آزادی کی رفتار تیز ہو گئی۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ نہرو کی عرب پالیسی کی جڑیں تین اہم مرکزی اصول میں پیوست تھیں۔ یعنی نوآبادیاتی نظام کی مخالفت، امن کے علاقے کو مستحکم کرنا اور وسعت دینا اور عرب دنیا کے ساتھ ہندوستان کے ثقافتی، اقتصادی اور تجارتی رابطے بحال کرنا۔ کچھ عرب ممالک میں نوآبادیاتی مسئلہ اوروں سے زیادہ پیچیدہ تھا۔ مصر اور عراق کے معاملے میں برطانیہ نے آزادی کے مشابہ نظام تو دیا مگر اس میں اصلی جوہر مفقود تھا۔ دوسری طرف فرانس والے اس آئینی مفروضے سے چمٹے رہے کہ الجیریا میٹرو پالیٹن فرانس کا جزوِ لاینفک ہے۔ فلسطینی مسئلے کی پیچیدگیاں بھی زیادہ خوفناک اور مشکل ہیں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ آزادی سے برسوں پہلے ہی نہرو فلسطین میں رونما ہونے والے واقعات پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اور اس جنگ زدہ خطے کے بنیادی مسائل پر انھوں نے عبور حاصل کر لیا تھا۔ جولائی ۱۹۳۸ء میں ایک تقریر میں نہرو نے کہا تھا

"یہ (مسئلۂ فلسطین) ایک عجیب مسئلہ ہے ہم بہت کچھ حد تک یہ سوچنے پر مائل ہیں کہ یہ عربوں اور یہودیوں کا تصادم ہے۔ لیکن کیا میں آپ کو ابتدا میں ہی یاد دلاؤں کہ گزشتہ دو ہزار برسوں سے عربوں اور یہودیوں میں کوئی حقیقی تصادم کبھی نہیں ہوا۔ یہ مسئلہ ابھی جنگ کے بعد اُبھرا ہے اور بنیادی طور پر یہ برطانوی سامراج کا تخلیق کردہ مسئلہ ہے اور جب تک آپ یہ ذہن نشین نہ کر لیں آپ اسے حل نہیں کر سکتے۔"

جنگِ عظیم دوم کے آغاز سے کچھ ہی قبل نہرو نے کہا تھا کہ برطانوی سلطنت نے مرکزی یورپ، اسپین اور فلسطین میں سفاکانہ خوں ریزی کر کے اپنے گناہوں میں اضافہ کیا ہے۔ بلاشک نہرو کا یہ عقیدہ تھا کہ فلسطین کی اور ہماری تحریکِ آزادی میں بہت کچھ مشترک ہے۔

آزاد ہندوستان کی خارجہ پالیسی کے معمار کی حیثیت سے نہرو فلسطین کے لیے ہمیشہ تشویش کا اظہار کرتے رہے۔ اقوام متحدہ کی خصوصی کمیٹی برائے فلسطین کے رکن کی حیثیت سے ہندوستان اس اصول کے لیے برابر جدوجہد کرتا رہا کہ فلسطینی عوام کی آزادی ہی اُس ملک کے مستقبل کے متعلق کسی بھی منصوبے یا تجویز کا اوّلیں مقصد ہونا چاہیے۔ ہندوستانی نمائندے نے جو خصوصی نوٹ پیش کیا تھا اس میں 'بلفور اعلان' کے قانونی جواز اور صیہونیت کی معقولیت پر سوال اٹھایا گیا تھا۔ اس میں دلیل دی گئی تھی کہ کسی خطۂ زمین سے لوگوں کی قدیم وابستگی موجودہ زمانے میں ان کے لیے قانونی یا سیاسی حقوق نہیں تشکیل دے سکتی۔ نہ ہی اس دلیل کو معقول مانا جاسکتا ہے کہ کسی شخص کو کسی خاص عقیدے کو ماننے کی وجہ سے کسی ملک میں خصوصی حقوق مل جاتے ہیں۔

بڑی طاقتوں کی مصمم کوششوں کے نتیجے کے طور پر بالآخر فلسطین تقسیم ہوا۔ اسرائیل ایک توسیع پسند سلطنت کے روپ میں اُبھرا جس نے اقوام متحدہ کی قرارداد کی رو سے ملے ہوئے علاقے سے کہیں زیادہ بڑے خطۂ ارض پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ دس لاکھ فلسطینی خانماں برباد ہوگئے۔ اس نے عرب اور اسرائیلیوں کے مابین ایک بڑے تنازعے کے بیج بو دیے۔ نتیجے کے طور پر اس کے بعد جو ایک طویل جدوجہد شروع ہوئی اس میں نہرو نے فلسطینیوں کے حقوق واپس دیے جانے کی پُرزور حمایت ثابت قدمی کے ساتھ کی۔

نہرو نے عرب دنیا میں اور جگہوں مراقش، تیونس، الجزائر، جنوبی عربستان میں چلنے والی تحریکاتِ آزادی کی حمایت کی لیکن سوئز نہر کے بحران کے زمانے میں نہرو نے عرب دماغ پر ایک فیصلہ کن اثر ڈالا۔ یہ ضروری نہیں کہ یہاں سوئز تنازعے کے مختلف پہلوؤں کی موافقت یا مخالفت میں غور کیا جائے۔ اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ برطانیہ نے ہندوستان میں اپنا راج کھونے کے بعد تیل کی دولت سے مالامال خلیجی ممالک میں ایک نئی سلطنت ڈھونڈھ نکالی جس نے اُسے منفعت بخش تجارت کے مواقع فراہم کیے اور دنیا کے تیل بازاروں پر اس کا تسلط قائم کر دیا۔ اس سلسلے میں جولائی ۱۹۵۶ء میں ناصر کے سوئز نہر کمپنی کو قومیانے کے فیصلے کو برطانوی قدامت پسندوں نے ایک ایسی خطرناک چال بتایا جس کی نقل اس خطے کے اور لوگ بھی کر سکتے تھے۔ نہرو نے اوّلین موقع ملتے ہی یہ واضح کر دیا کہ سوئز نہر میں جہازرانی کی آزادی ایک غیر ملکی ملکیت والی کمپنی کے ہاتھ میں انتظام رہنے پر ہی موقوف نہیں ہے۔ بے شک نہرو سوئز مسئلے کا پُرامن تصفیہ پسند کرتے تھے اور ان کو یہ یقین تھا کہ نہر استعمال کرنے والوں کے جائز حقوق اور سوئز نہر کا مصر کا جزو لاینفک ہونے میں آپس میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے لیکن جب برطانوی اور فرانسیسی افواج کو سوئز نہر کے خطے میں اتار کر پُرامن تصفیے کی تمام کوششیں ناکام کر دی گئیں تو نہرو کا ردِعمل تیکھا تھا۔ اُنھوں نے برطانیہ اور فرانس کی اس بدبختانہ مہم" کو "کھلی جارحیت" کہہ کر اس کی مذمت کی جو ماضی کے سامراجی طریقوں کی یاد دلاتی تھی۔

سوئز بحران کے دوران ہی کرشنا مینن کی سفارتی ذہانت کو خطابتی اظہار کا موقع ملا۔ ان کی لندن کانفرنس اور اقوامِ متحدہ میں دلیرانہ مدافعت نے تمام عرب دنیا سے انھیں ستائش و احترام دلایا۔

سرد جنگ کی بڑھتی ہواؤں کے جھکڑوں کی گھڑی اس دنیا میں نہرو کی خطۂ امن کو توسیع دینے کی مسلسل کوششوں نے عرب دنیا اور ہندوستان کے مابین دوستانہ تعلقات اور مفاہمت کی ایک اور کڑی جوڑ دی۔ جنگ عظیم کے بعد کے ابتدائی برسوں میں عرب سیاست ہیجانی کیفیت میں تھی۔ ایک طرف تو وہاں آزادی کے لیے ناقابلِ تسخیر اُمنگ تھی اور دوسری طرف قدامت پسندوں کا اثر کم ہو رہا تھا جنھیں یہ دکھائی دیتا تھا کہ عربوں کی قسمت مغربی طاقتوں کی خوش قسمتی کے ساتھ منسلک ہے۔ اس مناقشے کے تکمیلی جزو ہمہ گیر عربیت اور ہمہ گیر اسلامیت کے دو حریفانہ تصورات میں تھے۔ برطانیہ کے حامی قدامت پسند جیسے عراق کے نوری السعید، اُردن کے امیر عبداللہ پرانے نظام کو برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے سہارے کے لیے ہمہ گیر اسلامی جذبے کی اپیل کر رہے تھے۔ لیکن ان کو عرب قائدین کی نوجوان نسل کی سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا جن کا یہ یقین تھا کہ دنیا میں عرب اپنا صحیح مقام عرب قومی جذبے کو مضبوط کر کے ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ قومیت کے حامی اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ مذہبی نعروں سے حوصلہ پانے والی سیاست متنازع فیہ مسائل میں اور ابتری پیدا کر دے گی نیز عرب ممالک میں غیر مسلم

اقلیتوں کو برگشتہ کردے گی۔ ان دونوں حریفانہ گروہوں میں نہرو کسے فوقیت دے سکتے تھے اس کے متعلق کوئی شک ہو ہی نہیں سکتا۔ ہمہ گیر اسلامیت کے نام نہاد حمائیتوں کے ساتھ پاکستان کی دلیوانہ وار دکھاوے کی محبت اور ان کے ذریعے عرب ممالک کو عالمی سرد جنگ کے دلدل میں کھینچ لانے کی سازش کی وجہ سے اس مناقشے اور تنازعے نے ہندوستان کے لیے خاص اہمیت حاصل کر لی تھی۔

اسی پس منظر میں نہرو کے غیر جانبداری کے تصور کا عرب ممالک میں فوری ردِ عمل ہوا اور بد قسمت بغداد پیکٹ کے خاتمے کے بعد سے تو یہ خیال ہر سمت چھا گیا۔ ۱۹۵۷ء میں ملک شام کے (BATHIST) وزیر خارجہ صلاح الدین بطار نے غیر جانبداری کے عقیدے کے ساتھ عرب وابستگی کا موزوں طریقے سے خلاصہ یوں کیا ہے۔

"کوئی حکومت شام میں برسرِ اقتدار نہیں آسکتی جب تک کہ وہ پُرزور طریقے سے ناوابستگی کا اعلان نہ کردے سابقہ حکومتیں یہ کہا کرتی تھیں کہ ایسا کوئی معاہدہ نہیں کیا جائے گا جس سے ہمارے اقتدارِ اعلا پر حرف آئے۔ ان دو باتوں میں بہت فرق ہے کیونکہ موخر الذکر کا مطلب جانبداری کے سوا اور کچھ نہیں۔"

عراق میں سرد جنگ کے معاہدوں کے خلاف قوم پرستوں کی مزاحمت کی انتہا ۱۹۵۸ء کا انقلاب تھا جس نے معاہدۂ بغداد سے ملک کا رشتہ منقطع کر دیا۔

عرب جدوجہدِ حریت اور عظمت و منزلت کے ممتاز ترین قائد ناصر تھے اور نہرو انھیں خاص طور سے پسند کرتے تھے۔ یہ دونوں حضرات پہلی مرتبہ فروری ۱۹۵۵ء میں قاہرہ میں ملے اور دونوں میں بے ساختہ دوستی کا رابطہ قائم ہوا جس کے ایک لمبے عرصے تک پڑنے والے اثر کو حسنین ہیکل نے مخصوص بے لاگ طریقے سے بیان کیا ہے:

"ناصر نے نہرو میں سب چیزوں سے بڑھ کر یہ دیکھا کہ یہ وہ شخص ہے جو سوچ سکتا ہے، ایک ایسا شخص ہے جو کسی بھی مسئلے کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈال سکتا ہے اور اس کے آغاز، نتائج اور حل پر غور و فکر کر سکتا ہے اُن کی استدلالانہ ذہانت نے ناصر کو متاثر کیا اور اس طرف نہرو ناصر کے متعلق وہی احساس رکھتے تھے جو جذبہ وہ اپنے بیٹے کے لیے رکھتے۔ اور زیادہ تر والدوں کی طرح وہ بھی اپنے بیٹے کی کئی باتوں کو سراہتے تھے اور کئی سے خائف بھی رہتے تھے۔ وہ ناصر کی بے باکی کی تعریف بھی کرتے تھے اور اُس سے خائف بھی تھے وہ ناصر کی قوت و صلاحیتِ عمل کے معترف بھی تھے، اس پر فخر و رشک بھی کرتے تھے مگر اس سے خوفزدہ بھی تھے بالکل اُسی دانشور باپ کی طرح جس کا بیٹا کوہ پیمائی کے لیے گیا ہو۔"

عالمی سیاست کے بہت سے اہم مسئلوں پر ناصر اور نہرو کے نظریوں میں مکمل ہم آہنگی تھی۔ ٹیٹو کے ساتھ مل کر وہ ناوابستگی کی تحریک کے خاص معماروں میں تھے۔ اس صدی کے چھٹے دہے میں جبکہ دنیا سرد جنگ کی تند موجوں کے تھپیڑے کھا رہی تھی یہ ایک عہد ساز واقعہ تھا۔

نہرو اور ناصر کا یہ قریبی تعلق اور ہم خیالی صرف خارجہ پالیسی کے میدان تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ یہ قومی ترقی کے مسائل تک پھیلا ہوا تھا۔ گاندھی جی سے جب پوچھا گیا کہ اور امیدوار کے ہوتے ہوئے بھی آپ نے نہرو کو اپنا وارث منتخب کیا تو انھوں نے جواب دیا "نہرو وا... ہے جو ہندوستان کو بیسویں صدی کے ساتھ جوڑ ... ہے" ناصر کا عرب دنیا کے ساتھ بھی یہی ر... تھا۔ اس نے عربوں کو عہدِ حاضر کے ترقیہ دھاروں کے ساتھ جوڑ دیا۔ یہاں پر بھی نہرو کے اندازِ فکر کا اثر نمایاں ہے۔ ناصر کا نہرو ... لیے ذاتی انس کو ظاہر کرنے والا ایک واقعہ اسوان ڈیم سے متعلق ہے۔ جنوری ۱۹۶۰ء میں دریائے نیل کے رُخ کو موڑنے کے منصوبے کا پہلا حصہ ایک قابلِ دید دھماکے کے ساتھ عمل میں لایا گیا۔ نہرو کے لیے اُس موقعے پر شریک ہونا ممکن نہ ہو سکا جس کے لیے انھیں بازحد تاسف تھا لیکن جب وہ مئی میں قاہرہ گئے تو معلوم ہوا کہ ناصر نے ایک دھماکہ ان کے سامنے کرنے کے لیے محفوظ کر رکھا تھا نہرو اُس ڈیم کی جگہ مدعو کیے گئے تاکہ وہ بٹن دبا کر دھماکے کی رسم انجام دیں جس سے دریائے نیل کا موجزن پانی نئی نہر میں جا سکے۔ نہرو اس واقعے سے بہت متاثر ہوئے

نہرو کا عہد واقعتاً ہند و عرب کے تعلقات میں جامع ترقی کا دور رہا۔ عرب دنیا کے ساتھ ثقافتی روابط بحال ہوئے۔ دونوں خطوں میں تجارتی تعلقات بڑی تیزی کے ساتھ بڑھے اور مشترکہ صنعتی کارخانے شروع کیے گئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نہرو کے عہد میں ایک مضبوط اور زندہ و پائندہ رہنے والی عرب پالیسی کی بنیاد پڑی جس پر ان کی شخصیت کا گہرا پرتو تھا۔

(انگریزی سے ترجمہ: ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ)



یک جہتی کے علمبردار
پنڈت جواہر لال نہرو

محمد عثمان عارف نقشبندی
گورنر اتر پردیش، لکھنؤ

ہندوستان زمانۂ قدیم سے ہی مختلف قوموں، فرقوں اور طبقوں کا مسکن اور مختلف تہذیبوں، روایتوں اور زبانوں کا گہوارہ رہا ہے۔ ہندوستان میں وقتاً فوقتاً مختلف اقوام کی آمد ہوتی رہی جو ایک نئی تہذیب، نئے رسم و رواج اور نئی قدریں اپنے دامن میں سمیٹ کر لائیں اور رفتہ رفتہ ہندوستانی تہذیب میں مدغم ہو گئیں۔ لیکن امتدادِ زمانہ کے ساتھ ہی ہندوستان میں ایک ایسی قوم بھی آئی جو چالبازیوں اور فتنہ انگیزیوں سے نہ صرف دیسی ریاستوں پر قابض ہو کر ملک کی حکمراں بن گئی بلکہ کثرت میں وحدت اور صدرنگی میں یک رنگی کے لیے مشہور ہندوستانی تہذیب کو بدرنگ بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ صرف یہی نہیں انگریز حکمرانوں نے محبانِ وطن پر ظلم و زیادتی اور ناانصافیوں کا بازار گرم کر دیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے قومی اتحاد و اتفاق اور یگانگت اور بھائی چارے کے رشتے کو تار تار کرنے کی سازشوں کا آغاز بھی کیا نیز مذہبی، لسانی اور علاقائی بنیاد پر اختلافات کو ابھار کر عصبیت و تنگ نظری اور نفاق و حقارت کے ایسے بیج بوئے کہ اہلِ وطن آپس میں ہی برسرِ پیکار ہو گئے۔ تاہم "لڑاؤ اور حکومت کرو" کا سحر زیادہ دنوں نہ چل سکا۔ قوم کے عظیم رہنماؤں کی کوششوں سے محبانِ وطن میں ملک کو آزاد کرانے کی انقلابی بیداری پیدا ہوئی اور انھوں نے سب سے پہلے ۱۸۵۷ء میں زبردست انقلاب برپا کیا۔ دراصل یہ انقلاب ایک ایسی چنگاری تھی جو رفتہ رفتہ شعلۂ جوالہ بنتی گئی اور پھر وہ دن بھی آیا جب قوم کے باپو مہاتما گاندھی کی قیادت میں پورا ملک "انقلاب زندہ باد" کے نعروں سے گونج اٹھا۔ محبانِ وطن انگریزوں کے خلاف بلاتفریق مذہب و ملت متحد ہو گئے اور ملک کو آزاد کرا کر ہی دم لیا۔ تحریکِ آزادی کے دوران انگریزوں نے کئی بار ہندو مسلم فسادات کرائے۔ لیکن ہمارے رہنماؤں بالخصوص مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسی متعدد عظیم المرتبت شخصیتوں نے محبانِ وطن میں قومی یکجہتی اور بھائی چارے کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے سرگرم کوششیں کیں۔ ایک بار تو ہندو مسلم ایکتا کے لیے گاندھی جی کو "برت" تک رکھنا پڑا۔

دراصل دنیا کے مختلف ممالک میں رائج تمام مذاہب میں کوئی بھی ایک ایسا مذہب نہیں ہے جو نفرت و حقارت اور بغض و عناد کی تعلیم دیتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی شخص خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، سکھ ہو یا عیسائی ۔۔۔ اگر اپنے مذہب پر سختی سے عمل پیرا ہے تو اس کا عمل سماج دشمن اور انسانیت مخالف ہو ہی نہیں سکتا۔ ہم دنیا کے کسی بھی مذہب کو لیں اور اس کی تعلیمات پر نظر ڈالیں تو یہی بات سامنے آئے گی کہ زندگی پیار اور محبت سے گزارو، ہمیشہ اتحاد و آزادی سے رہنے کی ترغیب دی اور بے سہارا لوگوں کی مدد کرنے کی ہدایت دی۔ اللہ کالے گورے، امیر و غریب کی تفریق نہیں کرتا۔ یہی وہ مذہب ہے جس کے باعث قوم کے باپو مہاتما گاندھی نے سے نازک حالات میں بھی یہی نصیحت کی کہ مذہب میں مفاد پرست عناصر ہندو اور قوم دشمن عناصر کی قوتوں سے ہوشیار رہنا۔ انھوں نے ہمیشہ محبانِ وطن کو یہی تلقین کی کہ تعصب یا مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا۔ اس سلسلے میں کھوئے ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں ایک بار انھوں نے اس اعتقاد کا بھی اظہار کیا تھا کہ میں واقعی اتحاد حاصل کرنے سے مایوس ہو جاتا اگر مقدس قرآن میں کوئی ایسی بات ہوتی جس میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہوتی کہ وہ ہندوؤں کو اپنا قدرتی دشمن سمجھیں یا اگر ہندو دھرم میں ایسی کوئی چیز ہوتی جس سے دونوں کے درمیان ایک دوامی دشمنی کی سند حاصل ہو جاتی۔" اس کے علاوہ انھوں نے ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یکجہتی قائم کرنے کے لیے یہ وضاحت بھی کی تھی کہ "نہ تو قرآن میں اور نہ ہی ہندوؤں کی کسی کتاب میں تشدد کی اجازت دی گئی اور نہ ہی اسے پسند کیا گیا ہے۔" دراصل مہاتما گاندھی تاحیات ہندوستانیوں کو حق و صداقت، عدمِ تشدد اور "جیو اور جینے دو" کی پالیسی پر عمل پیرا ہونے کی تاکید کرتے رہے۔



اسی طرح ہندوستان کے پہلے وزیراعظم آنجہانی پنڈت جواہرلال نہرو بھی تحریکِ آزادی کے دوران اور حصولِ آزادی کے بعد مسلسل ملک سے فرقہ پرستی اور تعصب کو مٹانے کے لیے کوشاں رہے۔ انھوں نے انتہائی مدبرانہ انداز میں قوم کو صرف نصیحت ہی نہیں کی، بلکہ انھیں برابر یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم نے یہ آزادی اتحاد و اتفاق کی طاقت سے ہی حاصل کی ہے۔ اگر ہمارا اتحاد ختم ہوگیا تو ہم آزادی کے حقیقی لطف سے محروم ہو جائیں گے۔ اور ایک آدرش بھارت کی تعمیر کا ہمارا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔ انھوں نے قومی یکجہتی، اتحاد و اتفاق اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم رکھنے کے لیے ایک بار محبانِ وطن سے یہ اپیل کی تھی کہ "میں چاہتا ہوں کہ مذہب، ذات پات، زبان یا صوبوں کے حقیر اختلافات ختم ہوں اور ایک ایسے سماج کی تعمیر ہو، جس میں طبقوں اور ذات پات کی کوئی تفریق نہ ہو، جس میں ہر شخص کو اپنی صلاحیت اور قابلیت کے مطابق ترقی کرنے کا موقع ملے۔"

درحقیقت پنڈت جواہرلال نہرو قومی یکجہتی اور اخوت و اتحاد کے جذبے سے سرشار تھے اور جمہوریت ان کی رگ رگ میں پیوست ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی زندہ مثال یہ ہے کہ نہرو جی نے آزادی کے فوراً بعد جب ملک بھر میں آندھی اور طوفان کے مانند فرقہ وارانہ فسادات پھیل گئے تھے اور لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے تو انھوں نے بڑی دلیری اور جواں مردی سے اس سنگین صورتِ حال کا مقابلہ کیا اور سینہ سپر ہو کر متاثرہ علاقوں میں فی الفور جا پہنچے۔ مظلوموں اور بے سہارا لوگوں کی [illegible]

علاوہ انھوں نے شرناتھیوں کو بھی ڈھارس بندھائی اور ان کی آبادکاری اور بحالی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ الغرض نازک سے نازک حالات میں ملک کی سالمیت کو برقرار رکھنے کی جو کوشش کی، اس کی مثال مفقود ہے۔ انھوں نے غیر ملکی جارحیت کے موقع پر بھی اپنے آہنی عزم و حوصلے کو مطلق متزلزل نہ ہونے دیا اور قوم کو خطاب کرتے ہوئے اتحاد کی ضرورت پر ہی زور دیا کہ "ہم بیرونی حملوں کا مقابلہ صرف اسی صورت میں کر سکتے ہیں، جب ہم میں اتحاد ہو۔"

پنڈت جواہرلال نہرو نے آزادی کے فوراً بعد ہندوستان کی پارلیمانی اور سیاسی ذمے داری سنبھالتے ہی ملک میں جمہوری نظام رائج کرنے کی غرض سے اتفاقِ رائے سے ایک منفرد اور اعلیٰ دستور مرتب کرایا، جس میں روس، امریکہ، فرانس اور برطانیہ جیسے ممالک کے دساتیر کے اعلیٰ عناصر کی شمولیت کے ساتھ ہی اس میں ہندوستان کی "کثرت میں وحدت" کی انفرادیت کو بھی برقرار رکھا اور اسے مغربیت کا عکاس بنانے کے بجائے مشرقیت کا علمبردار بنایا۔ اس میں ہندوستان کے تمام فرقوں، طبقوں اور ذاتوں کے احساسات کا پورا پورا خیال رکھا گیا۔ گویا دستور کیا تھا مختلف النوع پھولوں کا ایک انتہائی دلکش گلدستہ تھا۔

پنڈت جی انفرادیت کے مقابلے میں ہمیشہ اجتماعیت کو ترجیح دیتے تھے لیکن افادیت اور اہمیت کے اعتبار سے فرد کی رائے کو بھی اس وقت بلا تامل قبول کر لیتے تھے، اگر اس میں انھیں ملک و قوم کا مفاد نظر آتا تھا۔ حالانکہ وہ پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلے کو حل کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے اس کے باوجود ... قطعی فیصلہ کرنے [illegible]

سے اکثر مشورہ بھی کر لیتے تھے۔ پنڈت جی مسائل کو باہمی گفت و شنید کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مزید برآں تصفیے کے دوران یہ ضرور ملحوظ رکھتے تھے کہ ان کے فیصلے سے کسی فرد، جماعت اور ادارے کے کاز کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے۔ ان کا فیصلہ حق و انصاف پر مبنی ہوتا تھا۔ وہ بیجا طرفداری اور فرقہ پروری کو یکسر گناہ سمجھتے تھے۔

پنڈت جواہرلال نہرو نے سیکولرزم، جمہوریت اور سوشلزم کے اصولوں کو زندگی بھر عزیز رکھا اور فسطائی و فرقہ پرست طاقتوں کا قلع قمع کرنے کے لیے ہمیشہ کمربستہ رہے۔ ان کا یہ ایمان تھا کہ "فرقہ واریت انسان کو نیچے گرا دیتی ہے اور بدتہذیب بنا دیتی ہے۔" اسی لیے وہ محبانِ وطن کو ہمیشہ یہی سمجھانے کی مسلسل کوشش کرتے رہے کہ "فرقہ واریت کے ساتھ نہ تو کسی قسم کا سمجھوتہ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے برداشت کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ یہ بات بے حد ضروری ہے کہ ہم سب ہندوستان میں شعوری اور غیر شعوری دونوں قسم کی فرقہ واریت کو دبانے اور ختم کرنے کی کوشش کریں۔" نہرو جی زندگی بھر جمہوری قدروں کو تقویت پہنچانے، باہمی میل جول کو مستحکم کرنے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور آپسی یگانگت کو برقرار رکھنے کے لیے کوشاں رہے۔

پنڈت جی قوم پرستی کے رمز سے بخوبی واقف تھے۔ کیونکہ انھوں نے ذاتی طور پر اپنے اس خیال کا بھی اظہار کیا تھا کہ "ہندوستان میں ہندو، مسلمان، سکھ اور دوسرے فرقوں کے ملاپ سے ہی قوم پرستی جنم لے سکتی ہے۔" اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ "اس کا مطلب یہ نہیں ہے اور نہ ہونا چاہیے کہ کسی بھی فرقے کی حقیقی تہذیب ... غائب ہو جائے۔



لیکن اس کا مطلب مشترکہ قومی نظریے کی تشکیل ہوتا ہے"۔

اس کے ساتھ ہی انھوں نے قوم کو یہ بھی باور کرا دیا تھا کہ "ہندوستان میں رہنے والی کوئی بھی جماعت یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ ہندوستان کے قلب و دماغ اور اندازِ فکر پر اسی کی اجارہ داری ہے۔ ہندوستان کی تعمیر میں ہر طبقے اور فرقے نے حصہ لیا ہے۔ اگر ہم اس بنیادی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے، تو ہندوستان کو نہیں سمجھ سکتے"۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے طرزِ بیان، طرزِ عمل اور طرزِ گفتار سے کبھی یہ تاثر نہ ہونے دیا کہ وہ کسی ایک فرقے، ذات یا برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ہندوستانی تھے ——— صرف ہندوستانی۔ ان کی نظر میں سبھی ہندوستانی ایک قوم تھے، خواہ وہ کسی بھی مذہب و مسلک سے تعلق رکھتے ہوں۔ پنڈت جی کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ جب مسلمانوں میں پہنچتے، تو وہ مسلمانوں کو بالکل اپنے ہی محسوس ہوتے۔ اور جب ہندوؤں، سکھوں، عیسائیوں اور جینیوں میں پہنچتے تو انھیں بھی وہ بالکل اپنے ہی لگتے۔ کیا بچہ، کیا جوان اور کیا بوڑھا ——— وہ سبھی کے چہیتے تھے۔ بچوں میں بیٹھتے تو بچوں جیسی باتیں کر کے خوب ہنستے اور بچوں کو بھی خوب ہنساتے۔ الغرض ان کی ہمہ گیر شخصیت ذات پات اور اونچ نیچ کی تفریق سے بالاتر تھی۔

پنڈت جواہر لال نہرو تا حیات فرقہ پرستی، تنگ نظری، تعصب و جہالت اور فرسودہ سماجی قدروں کے خلاف برسرِ پیکار رہے۔ ان کے سامنے صرف ایک ہی نصب العین تھا اور وہ تھا، ایک متحد و مستحکم ہندوستان کی تعمیر۔ حالانکہ اس سلسلے میں وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ اسی وقت ممکن ہو سکے گا، جب ہندوستان کا ایک ایک فرد اپنے ذاتی، مذہبی، سیاسی اور لسانی اختلافات کو یکسر فراموش کر دے اور بلا تفریقِ مذہب و ملت شانے سے شانہ ملا کر ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے خود کو وقف کر دے۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ "ہمیں آج بھی اسی جوش و جذبے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی ضرورت ہے جس کی بدولت ہم نے ظالم و جابر انگریز حکمرانوں کو مادرِ وطن کو آزاد کرنے پر مجبور کر دیا تھا"۔ دراصل پنڈت جی نے محبانِ وطن میں جذبۂ اخوت کو پروان چڑھانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

ان کی یہ سب سے بڑی خواہش تھی کہ ہندوستان تیز رفتاری سے ترقی کرے اور نہ صرف خود کفیل ہو جائے، بلکہ وہ ترقی پذیر ملکوں کی صف سے نکل کر ایک ترقی یافتہ ملک بن جائے۔ پنڈت جواہر لال نہرو ایک ترقی پسند انسان تھے اور ان کے افکار و نظریات کی اساس سائنس اور منطق پر قائم تھی۔ وہ ہندوستان کو ایک مضبوط اور خوشحال ملک بنانے کے لیے مسلسل کوشاں رہے۔ پنڈت جی کی ہر شعبۂ حیات پر پوری گرفت تھی۔ وہ جانتے تھے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کے بغیر ملک میں خود کفالتی قدرے مشکل ہے۔ اسی لیے خواہ وہ زرعی محاذ ہو یا صنعتی محاذ ——— سائنس کی ترقی کا معاملہ ہو یا تکنیکی توسیع کا مرحلہ ——— پنڈت جی ہر محاذ پر مسلسل برسرِ پیکار رہے اور "آرام حرام ہے" کا نعرہ دے کر قوم میں بھی ایک نئی تحریک اور مستعدی پیدا کر دی۔ المختصر وہ ہر میدان میں چاق و چوبند نظر آتے تھے۔ کیونکہ ان کا عزم مستحکم تھا اور ارادہ انتہائی مضبوط۔ لیکن ان کے ذہن و دماغ میں اگر کوئی خلش تھی تو وہ تھی فرقہ پرستی کی لعنت، جو ملک کی ترقی کی راہ میں اکثر رکاوٹ پیدا کرتی رہتی تھی۔ اس بات کا اظہار ایک بار پنڈت جی نے ان الفاظ میں کیا تھا ——— "فرقہ پرستی ہماری پسماندہ ذہنیت کی علامت ہے۔ آج سائنس کی بدولت دنیا سکڑ رہی ہے۔ تنگ نظری کا موجود رہنا قابلِ فہم نہیں۔ تنگ نظری اور تعصب ہمارے راستے کے ایسے روڑے ہیں جو رکاوٹ بنے ہیں جب ہم نئے سماجی اور معاشی نظام کی بنیاد ڈالنا چاہتے ہیں"۔

پنڈت جی نے ملک میں قومی یکجہتی اور خیرسگالی کا ماحول قائم کرنے کے لیے ایک بار یہ بھی کہا تھا کہ "قومی یکجہتی کا مقصد صرف یہ کہ لسانی، صوبائی اور مذہبی تعصب اور تفریق کو ختم کرنا ہے، بلکہ اس کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ایسی تعلیم و تربیت کا بندوبست کیا جائے کہ ہر فرد کی ذہنی نشوونما بچپن ہی سے صحت مند بنیادوں پر ہو۔" اس مقصد کے حصول کے لیے اگر ایک طرف انھوں نے ہندی کو قومی زبان کا درجہ دیا اور اس کی توسیع و اشاعت کی سرگرم کوششیں بھی کیں تو دوسری طرف دیگر علاقائی زبانوں کی نشوونما پر بھی خاطر خواہ توجہ دی۔ انھوں نے انگریزی کو بھی بین الاقوامی رابطے کی زبان کی حیثیت سے ملک میں رائج رکھنے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس کے برعکس ان کی نظر میں مادری زبان کی بڑی اہمیت تھی۔ وہ اکثر اپنے اس نظریے کا برابر اعادہ کرتے رہتے تھے کہ "اگر ہم اپنے ملک کی بات اپنی زبان میں نہیں کہہ سکتے تو ہرگز ترقی نہیں کر سکتے"۔ اسی لیے وہ طلبہ کو اکثر یہی تلقین کرتے رہتے تھے کہ وہ "اپنی مادری زبان سیکھیں اور اپنی بات اسی زبان میں کہیں"۔ اس طرح یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے

ہے کہ پنڈت جی کا رجحان ایک ایسی لسانی پالیسی وضع کرنے کی جانب تھا جس کی بنیاد پر تمام ہندوستانیوں میں باہم یگانگت اور اتحاد قائم رہ سکے اور زبان کے نام پر ان میں کبھی کسی قسم کی تفریق اور علیحدگی پسندی کا جذبہ پروان نہ چڑھنے پائے۔

ان تمام امور کی بنیاد پر ہم پورے وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ پنڈت جواہر لال نہرو قومی یکجہتی کے علمبردار تھے۔ امن عالم اور بقائے باہم کی کوششوں کے ساتھ ہی ساتھ ملک میں اتحاد و یکجہتی اور اخوت و خیرسگالی کا ماحول قائم کرنے کے لیے وہ تاحیات سرگرمِ عمل رہے۔ ●

حواشیِ ابوالکلام آزاد

جو لوگ مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے واقف ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ مولانا کو اوائل عمر ہی سے پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ عمر کا جو حصہ بچے کھیل کود میں گزارتے ہیں مولانا نے کتابوں کے مطالعے میں صرف کیا اور ان کا یہ ذوق آخر عمر تک ان کے ساتھ رہا۔ مولانا نے کسی مدرسے میں تعلیم نہیں پائی، گھر پر ہی پڑھا اور پھر انھیں ایسے مواقع ملے کہ اردو، فارسی اور عربی کے علاوہ انھوں نے انگریزی اور فرانسیسی سے بھی واقفیت حاصل کی اور ان زبانوں میں قدیم و جدید علوم کا جو سرمایہ تھا اسے اپنی شخصیت میں سمو لیا۔

یہ کتاب ان حواشی کا مجموعہ ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد نے دورانِ مطالعہ مختلف کتابوں پر لکھے ہیں۔ یہ کتابیں مختلف زبانوں کی ہیں اور مختلف علوم سے تعلق رکھتی ہیں۔ مولانا نے، جب وہ حکومتِ ہند کے وزیرِ تعلیمات تھے، انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا اور اپنا ذاتی کتب خانہ جو کئی ہزار کتابوں پر مشتمل تھا، اس ادارے کو دے کر ایک لائبریری قائم کر دی تھی۔ سید مسیح الحسن صاحب نے، جو برسوں تک اس لائبریری میں کام کرتے رہے ہیں، ان تمام کتابوں کو غائر نظر سے دیکھا ہے اور ان پر مولانا کے قلم سے جو حواشی درج ہیں وہ اس کتاب میں یکجا کر دیے ہیں۔ ایک اور اہم کام انھوں نے یہ کیا ہے کہ جن کتابوں پر یہ حواشی درج تھے، ان کے بارے میں بھی تمام ضروری معلومات فراہم کر دی ہیں۔

مصنف : مولانا ابوالکلام آزاد
مرتب : سید مسیح الحسن
صفحات : ۵۷۹
قیمت : ۶۲ روپے

دہلی اور اس کے اطراف

"دہلی اور اس کے اطراف" جس کا پہلا نام "ارمغانِ احباب" تھا، مولانا حکیم سید عبدالحی کے سفر کا روزنامچہ ہے۔ یہ سفر انھوں نے ۱۸۹۴ء میں دہلی اور اس کے نواحی علاقوں میں کیا تھا۔ حکیم سید عبدالحی صاحب موجودہ دنیائے اسلام کی نامور شخصیت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے والدِ بزرگوار تھے۔

اس سفرنامے کو لکھے ہوئے تقریباً سو سال ہو رہے ہیں لیکن گزشتہ تہذیب سے دلچسپی رکھنے والا قاری اسے آج بھی لطف و بصیرت سے خالی نہ پائے گا اس لیے کہ جو کہانی اس میں بیان ہوئی ہے وہ بہت دور کی نہیں ہے۔ تاریخ میں ایک صدی کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔ اس سفرنامے میں لطف و بصیرت کا پہلو اس لیے بھی ہے کہ سفر کرنے والا جویائے حق ہے۔ اسے علم کی سچی لگن ہے، اپنی تہذیب سے گہرا لگاؤ ہے، بزرگوں کے کارناموں کے لیے دل میں احترام اور ہمعصروں کی قدرشناسی کا جذبہ ہے۔ اسلامی تاریخ اور ہندوستان میں مسلم حکمرانوں، عالموں اور صوفیوں کی فیض رسانیوں سے مکمل آگاہی نے اس کے تاثرات کو وسیع سے وسیع تر کر دیا ہے اور اس سفرنامے کو ایک تاریخی، تہذیبی اور علمی دستاویز کی حیثیت دے دی ہے۔

مصنف کا اندازِ بیان ہر قسم کے مبالغے سے بری ہے اور بے تکلف گفتگو کا رنگ لیے ہوئے ہے۔

مصنف : مولانا حکیم سید عبدالحی
مرتبہ : ڈاکٹر صادقہ ذکی
صفحات : ۱۳۴
قیمت : ۲۵ روپے

اردو اکادمی، دہلی سے طلب کریں



نہرو اور میں

بعض شخصیتیں میرے لیے عمر بھر معمہ بنی رہی ہیں۔ ان کا معاملہ میرے ساتھ کچھ اس انداز کا رہا ہے جیسے کسی فارسی شاعر نے اس مصرعے میں ادا کیا تھا:

دم بدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من

ان میں ایک شخصیت جواہر لال نہرو کی بھی ہے جب سے ہوش سنبھالا گاندھی اور نہرو کے نام سُنے۔ گاندھی جی تو خیر ہمیشہ سے بھاری پتھر رہے جسے چوم کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس کی پیروی یا اُسے اُٹھانا ممکن نہیں ہوتا، ہاں، جواہر لال کی شخصیت میں نوجوانوں کے لیے ہمیشہ ایک غیر معمولی کشش تھی۔

اُردو کے مشہور اور مستند محقق قاضی عبدالودود مدتوں پلوریسی کے مریض رہے اس زمانے میں اس کا علاج نہ تھا اور صاحبِ ثروت لوگ محض بہتر آب وہوا اور مکمل آرام کے ذریعے ہی اس کا مداوا کیا کرتے تھے قاضی صاحب بھی سوئٹزرلینڈ کے ایک نرسنگ ہوم میں داخل ہوگئے۔ ان کے برابر کے کمرے میں جواہر لال نہرو کی اہلیہ کملا نہرو بھی اس بیماری کے علاج کے لیے مقیم تھیں اور نہرو خاندان کے کئی افراد کا آنا جانا رہتا تھا۔ کملا نہرو اردو ہی جانتی تھیں اور برآمدے میں آرام کرسی پر دراز اُردو کی کتابیں پڑھا کرتی تھیں۔ اسی برآمدے میں دوسری آرام کرسی پر قاضی عبدالودود لیٹے رہتے تھے۔

جواہر لال جی کی دونوں بہنیں جو بعد کو مسز وجے لکشمی پنڈت اور کرشنا ہتھی سنگھ کے نام سے مشہور ہوئیں برابر آتی جاتی رہتی تھیں اور کبھی کبھی تیمار داری کے سلسلے میں مقیم بھی رہتی تھیں جواہر لال جی بھی یہاں کچھ عرصے آکر رہے۔

جواہر لال جی کو گھنے جنگلوں اور پہاڑوں سے عشق تھا وہ گھوڑے پر سوار عقب کے پہاڑوں اور جنگلوں میں گھوما کرتے تھے۔ ایک مرتبہ قاضی صاحب سے سوئٹزرلینڈ کے کسی مقامی مصنف کی ملاقات ہوئی اور جواہر لال جی کا ذکر آگیا اس نے کہا کہ "تمہارا ہم وطن بڑا بہادر اور جری ہے۔ ذرا خوف نہیں کھاتا اور بڑی جرات سے ان جنگلوں اور پہاڑوں میں گھومتا ہے۔" اتفاق سے چند روز بعد قاضی صاحب کی ملاقات جواہر لال جی سے ہوئی اور انھوں نے اس مصنف کا بیان نقل کیا۔ جواہر لال جی نے کہا کہ "بہادر وہ ہوتا ہے جو خوف کے جذبے کو فتح کرتا ہے۔ میں زندگی بھر خوف سے واقف ہی نہیں ہوا تو اس کے فتح کرنے اور بہادر کہلانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" یہ نڈر کردار جواہر لال کا اصل روپ تھا۔

اس کا بھرپور مظاہرہ ہوا ۱۹۴۷ء کے بعد کے دہلی کے ہندو مسلم فسادات میں جب قتل اور خوں ریزی پر آمادہ بھیڑ میں گھس کر نہتے جواہر لال نے مظلوموں کو بچایا۔ اس ہمت اور حوصلے کی وجہ بھی جواہر لال نے ایک جگہ نہیں کئی جگہ بیان کی ہے وہ کہتے تھے کہ اعلا مقصد کی لگن چھوٹے آدمیوں کو بھی بڑا بنا دیتی ہے۔

اور یہ دونوں خوبیاں ایسی تھیں جنھوں نے جواہر لال کو نوجوانوں کے لیے ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ نڈر ہونا اور مقصد کی لگن۔

بہت سے نوجوان ان کی طرف کھنچے میں بھی ان کا معترف ہوا۔ اس قسم کی روایتیں بھی ہمارے زمانے میں بہت مشہور تھیں کہ ان کے کپڑے پیرس سے دھل کر آتے تھے تمام نوجوانوں کو اس کا بھی بڑا احساس تھا کہ وہ ایک بہت بڑے اور مالدار گھرانے کے اکلوتے بیٹے تھے اور آنند بھون کا سارا عیش و آرام چھوڑ کر گاؤں گاؤں بھٹک رہے تھے کسانوں کو منظم کر رہے تھے۔ کھدر پہن رہے تھے جو اس زمانے میں ایسا موٹا جھوٹا ہوتا تھا کہ بدن پر خراش ڈال دیتا تھا۔ برطانوی ڈنڈے کھاتے تھے اور سنگینوں کا مقابلہ کرتے تھے انگریزی اور بے عیب انگریزی میں مضامین لکھتے تھے جیل خانے کی لمبی سزائیں بھگتتے تھے اور جب باہر آتے

(پروفیسر) محمد حسن
جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۷

تو پھر اسی دَم خم سے انگریز حاکموں کی مخالفت میں سینہ سپر ہو جاتے۔ یہ سب ادائیں ہندوستان کے نوجوانوں کو بھاتی تھیں، ان کی چھوٹے چھوٹے جملوں والی تقریریں لوگوں کے دلوں کو گرماتی تھیں کہ ان سے خلوص ٹپکا پڑتا تھا۔ جواہر لال اس طرح ہندوستان کے گھر گھر کے لاڈلے ہو گئے تھے ہر خاندان کے سپوت بن گئے تھے۔

مجھے ان کی ایک اور ادا بھاتی تھی کانگریس کے سبھی رہنماؤں میں وہ اپنے طرزِ خیال اور طرزِ زندگی کے اعتبار سے سب سے زیادہ جدید تھے ان کا نقطۂ نظر مغرب کے سائنسی مزاج کو اپناتا تھا۔ گاندھی جی کی طرح اس کی نفی کر کے محض ہندوستانی روحانیت کی طرف نہیں لے جاتا تھا اور غالباً اسی وجہ سے وہ بیرونی ممالک سے اس قدر آگاہ اور وہاں کی آزادی کی تحریکوں سے اس قدر ہم آہنگ تھے وہ انگریزوں کی حکومت کے خلاف تھے ان کے تہذیبی اور فکری سرمایے کے منکر نہ تھے۔

پھر جب روس میں انقلاب ہوا تو وہاں جانے والے چند پہلے ہندوستانیوں میں وہ بھی تھے وہاں سے آکر اشتراکی طرزِ فکر کے حامی ہو گئے۔ مارکسزم سے اتنے قریب ہو گئے کہ ان دنوں جو سوشلسٹ اور کمیونسٹ انقلابی کانگریس میں شامل تھے، انھوں نے ان کو رہنما مان لیا۔

پھر ایک بات اور تھی۔ وہ ادیبوں اور شاعروں سے قریب تھے خاص طور پر اُردو کے شاعروں اور ادیبوں کی عزت کرتے تھے جوشؔ ملیح آبادی تو جیسے ان کے یارِ غار تھے جوشؔ صاحب کی بات کو کبھی نہ ٹالتے تھے ان سے چوٹیں بھی چلتی تھیں اور کہیں اور کسی حالت میں بھی ہوں ہمیشہ جوشؔ صاحب کی دسترس میں تھے یہی معاملہ فراقؔ گورکھپوری سے تھا جو ایک زمانے میں ان کے سکریٹری بھی رہ چکے تھے۔

اس زمانے میں فراقؔ شاعر کی حیثیت سے زیادہ مشہور نہیں ہوئے تھے فراقؔ کم تھے رگھوپتی سہائے زیادہ تھے اور الٰہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد تھے۔ جواہر لال جی کی جیل یاترا کا سلسلہ جاری تھا جیل سے چھوٹ کر آئے تو ملنے والوں میں ایک صاحب کا کارڈ سامنے آیا۔ لکھا تھا:

آر۔ سہائے فراقؔ

ذہن پر زور ڈالا کچھ یاد نہ آیا۔ اتنے میں فراقؔ صاحب داخل ہوئے جواہر لال نے پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ "ارے رگھوپتی، تم ہو! یہ فراقؔ کب سے ہو گئے؟"

فراقؔ صاحب نے مختصر لفظوں میں جواہر لال کی جیل یاترا کے دوران شاعری کرنے کا حال سُنایا بولے: "اس بار جیل گیا تھا تو تم رگھوپتی سہائے سے آر۔ سہائے فراقؔ ہو گئے اگلی بار جیل گیا تو تم فقط ہائے فراقؔ رہ جاؤ گے۔"

اور جوشؔ ملیح آبادی تو اکثر ان کو آزمائشوں میں ڈالتے رہتے تھے۔ وزیرِ اعظم بن جانے کے بعد کی بات ہے کہ مہاراشٹر میں شراب بندی کا قانون نافذ ہوا اور پورے ہندوستان میں اس کی گونج سنائی دینے لگی۔ جوشؔ صاحب شراب کے برملا علمبردار۔ لال قلعے کے یومِ آزادی والے مشاعرے میں خود جواہر لال جی کی صدارت میں اور اُنھیں مخاطب کر کے جوشؔ نے شراب بندی کے خلاف رباعی پڑھی جس کا آخری مصرعہ تھا:

بونے چلے ہیں لنکا ڈھانے

جواہر لال جی مسکرا کر چُپ ہو رہے۔

لیکن اس بے پناہ کشش کے باوجود میں ان نوجوانوں میں تھا جو جواہر لال جی کی گاندھی پرستی کو کبھی نہ سمجھ پائے۔ دونوں کے مزاج نظریے اور رویے میں زمین آسمان کا فرق تھا جس پر بڑی تفصیل سے ڈاکٹر عابد حسین نے اپنی کتاب "گاندھی اور نہرو کی راہ" میں روشنی ڈالی ہے۔ جواہر لال خدا کے وجود کے قایل نہ تھے کسی مذہب کو ماننے کا سوال ہی نہ تھا گاندھی جی سرتاسر مذہبی تھے اور مذہب کے بغیر ایک قدم آگے نہ بڑھتے تھے۔ جواہر لال جی ماڈرن ذہن کے مغرب آشنا، صنعتی ترقی کے قایل بڑے بڑے مشینی کارخانوں کے ذریعے ہندوستان کی معیشت کو تبدیل کرنے کے خواہاں، اور گاندھی جی مشرقیت میں ڈوبے ہوئے اور صنعتی کارخانوں کے بجائے گاؤں کی چھوٹی چھوٹی صنعتوں میں ترقی کا راز تلاش کرنے والے حتیٰ کہ علاج معالجے تک ہی پرانے طریقوں اور ریت رواج کے پابند —— اور پھر بھی جواہر لال جی نے اپنی باگ ڈور مکمل طور پر گاندھی جی کے سُپرد کر دی۔

یہی نہیں جب کبھی سیاست میں زبردست موڑ آئے جواہر لال جی نے گاندھی جی ہی کا ساتھ دیا ایسا ہی ایک موڑ تھا سبھاش چندر بوس کا صدرِ کانگریس کی حیثیت سے انتخاب۔

سُبھاش بوس کتنے ہی مختلف کیوں نہ سہی جواہر لال نہرو ہی کی طرح "ماڈرن" تھے اور گاندھی جی کے مقابلے میں ان سے کہیں زیادہ قریب تھے۔ وہ سیاست کو گاندھی جی کی طرح اخلاقی اصولوں کو پرکھنے کی تجربہ گاہ نہیں سمجھتے تھے اور اسی لیے عدم تشدد حکمت عملی تو ہو سکتا تھا ایمان نہ تھا۔ یہی حال مذہبیت کا تھا جسے سبھاش سیاست سے الگ رکھنا چاہتے تھے مگر اس موقعے پر بھی جب ملک بھر کے کانگریس مندوبین نے گاندھی جی کی اپیل کے برخلاف ان کے نمائندے کے مقابلے میں سبھاش بوس کو صدر کانگریس منتخب کیا جواہر لال جی نے گاندھی جی ہی کا ساتھ دیا۔

پھر ۱۹۳۷ء آیا۔ سوال یہ تھا کہ کانگریس برطانوی حکومت کی دی ہوئی انتخابی رعایتوں سے فائدہ اٹھا کر ریاستی اسمبلیوں کے الیکشن لڑے گی یا نہیں لڑے گی۔ شروع شروع میں جواہر لال جی کے سبھی بیانات الیکشن میں شامل ہونے کی مخالفت میں تھے مگر اچانک گاندھی جی نے اس تجویز کی حمایت کی اور جواہر لال جی نے بھی اس کی حمایت کا اعلان کر دیا۔

وجودِ خداوندی کا انکار جواہر لال جی برابر کرتے رہے مگر وہ روحانیت کے قائل تھے انھوں نے موت کے بعد اپنی راکھ کو گنگا اور دوسری ندیوں میں بہا دینے کی وصیت کی مگر اسے مذہبی رنگ نہیں دیا بلکہ اسے مادرِ وطن سے محبت کے سبب بتایا گو یہ محض ایک مذہبی رسم ہی تھی اور یہ کچھ ایسی ہی بات ہے جسے میں معمے سے تعبیر کرتا ہوں۔

پھر ان کے سیاسی فیصلے بھی اس قسم کے تضاد سے خالی نہیں تھے۔ سب سے بڑا معاملہ تو وہ ہے جسے مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب میں تقسیم ملک کا سبب قرار دیا ہے یعنی ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ سے سمجھوتہ کر کے متحدہ طور پر انتخابات لڑنا اور پھر انتخابات میں کامیابی کے بعد مسلم لیگ کو حکومت میں شامل کرنے سے انکار اور یہ دونوں باتیں جواہر لال جی کے دورِ صدارت میں ہوئیں۔ یہیں سے وہ اختلاف شروع ہوا جو بعد میں مطالبۂ پاکستان کی شکل میں سامنے آیا۔

خود تقسیم ہندوستان کے فیصلے کو قبول کر لینا جواہر لال جی کی پوری شخصیت کی نفی کرتا ہے۔ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ سے معاہدے کو منسوخ کرنے کے بعد کانگریس نے مسلم ماس کانٹیکٹ MUSLIM MASS CONTACT کا پروگرام بنایا تھا مگر اس پر عمل درآمد نہیں کیا گیا اور مسلم عوام کو کانگریس میں شامل کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی اور جب دس سال بعد انگریز حکمرانوں نے پاکستان کے مطالبے کو کچھ ترمیم کے ساتھ منظور کر لیا تو جواہر لال جی نے اسے مان لیا اور ملک کے پہلے وزیر اعظم بن گئے۔

اور اسی مُلک نے اُن کی سربراہی میں دو نہایت انقلاب آفریں اور مبارک فیصلے کیے اور ایک نہایت حیران کُن فیصلہ بھی کیا۔ مبارک فیصلے تھے اتنا سب کچھ ہو جانے پر بھی ہندوستان کو ایک غیر مذہبی سیکولر جمہوریت بنائے رکھنے کا فیصلہ اور دوسرا پنج سالہ منصوبوں کے ذریعے ترقی دینے کا فیصلہ اور حیران کن فیصلہ تھا اردو کے بجائے ہندی کو جو صرف ناگری حروف میں لکھی جاتی ہے ہندوستانی کو ملک میں رابطے کی زبان بنانے کا فیصلہ حالانکہ کانگریس کمیٹی اور گاندھی جی دونوں ناگری اور اردو رسم الخط میں لکھی جانے والی ہندوستانی کو ہندوستان کی قومی زبان تسلیم کر چکے تھے۔ زندگی بھر جواہر لال جی اعلان کرتے رہے کہ ان کی مادری زبان اُردو ہے مگر وہ اُردو کو اس کا حق نہ دلا سکے۔

جواہر لال جی کی شخصیت کی اس دو رنگی کا راز کیا ہے اور اس کا سرچشمہ کہاں ہے؟ یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے البتہ جواہر لال جی نے خود اپنی شخصیت پر ایک مضمون مدتوں پہلے نیشنل ہیرلڈ لکھنؤ میں کسی دوسرے کے نام سے لکھا تھا اس میں اپنی شخصیت کا بڑا بے لاگ تجزیہ کرتے ہوئے یہ بھی لکھا تھا کہ ان کے مزاج میں انانیت اور خود رائی بلکہ آمریت کے عناصر بھی ہیں جنھیں ان کا جمہوری مزاج برابر روکے تھامے رہتا ہے۔ اس مضمون کے آخر میں انھوں نے اس روک تھام کی ضرورت پر خاص طور پر زور دیا تھا شاید یہی روک تھام تھی جس نے انھیں جہاں بہت سے اچھے معاملات پر اپنے فیصلوں پر اصرار کرنے سے روکا وہاں بعض نہایت نازک معاملات پر بھی سمجھوتہ کرنے پر آمادہ کر لیا۔

جواہر لال جی کے تین کارناموں سے چشم پوشی ممکن نہیں جواہر لال نہ ہوتے تو مُلک



سیکولر نہ ہوتا ملک صنعتی ترقی کی طرف قدم نہ بڑھا پاتا اور ملک کی وہ متوازن اور روشن خیال خارجہ پالیسی نہ ہوتی جو آج غیر جانبداری اور پنچ شیل کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔

جب جواہر لال جی اس راہ پر گامزن تھے پوری دنیا دو دھڑوں میں بٹی ہوئی تھی اور دونوں دھڑوں میں سر دھڑ کی بازی لگی ہوئی تھی سرد جنگ شباب پر تھی اور نئے نئے آزاد ہونے والے ملکوں سے کسی ایک دھڑے میں شامل ہونے کا تقاضا شدید تھا ایسا لگتا تھا کہ اگر وہ ان میں سے کسی دھڑے میں شریک نہ ہوئے تو بغیر سائبان یوں ہی جھلستی دھوپ میں جل کر مرجھا جائیں گے مگر جن چند سیاست دانوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ خود اپنے سیاسی اور اقتصادی مفادات کی بنیاد پر اپنی غیرت برقرار رکھتے ہوئے غیر جانبدار ملکوں کا بھی ایک حلقہ بنایا جا سکتا ہے جو باہمی تعاون اور باہمی احترام پر قایم ہو، ان میں جواہر لال جی کا نام سرِ فہرست ہے۔

"جیو اور جینے دو" کے اصول پر مبنی غیر جانبدارانہ خارجہ پالیسی دراصل سیکولرزم کی داخلی پالیسی ہی کی توسیع تھی اور یہ شرف جواہر لال جی کو جاتا ہے کہ تاریخ کے ایک اہم موڑ پر انھوں نے ملک ہی کو نہیں دنیا کو گہرے گڑھے میں گرنے سے بچایا اور خود اپنے ملک کو مذہبی راج کی تنگ نظری سے محفوظ رکھا۔ سیکولرزم کو اپنایا اور بڑے صنعتی کارخانوں کے ذریعے ترقی کا راستہ دکھایا۔ یہ سب راستے ہی ہیں اور ابھی منزل بہت دور ہے اور ان راہوں پر ابھی پوری طرح ملک اور قوم چلنے میں کامیاب بھی نہیں ہوئی ہے مگر جواہر لال جی کی زندگی کے یہی کارنامے بہت ہیں اب ان کی تکمیل کی ذمہ داری تو ان کے آنے والوں کی ہے۔ بقول شاعر دِبراونی تصرف

کچھ خواب نئے دور کے دکھلا تو گئے ہم
اے گردشِ دوراں ترے کام آ تو گئے ہم

۴

نہرو کو اپنے ملازموں کی اور ان غریبوں کی جو ان کے نزدیک تھے اتنی فکر رہتی تھی کہ اس کے خیال سے دل پر بہت اثر ہوتا ہے۔ وہ جیل میں بھی انھیں نہیں بھولتے تھے۔ آنند بھون کی مہترانی جب تک زندہ رہی نہرو الہ آباد آتے تو اس سے ضرور ملتے۔ اس کی خیریت وہ برابر پوچھتے رہتے تھے ——— ۱۹۴۳ میں انھوں نے قلعۂ احمد نگر سے اپنی بہن کو ایک خط لکھا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ برسات نزدیک ہے۔ اس بوڑھی مہترانی کے گھر کی مرمت کرا دی جائے۔ ایک اور خط میں لکھا تھا کہ "آنند بھون کے ملازموں کی تنخواہ بڑھا دی جائے۔ کیونکہ ہم لوگوں کے آنند بھون میں نہ ہونے سے ان کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں"۔

ایسے میں جب ملازموں کے کرنے کے لیے کوئی کام نہ ہو، ان کی تنخواہ بڑھانے کی بات پنڈت نہرو ہی سوچ سکتے تھے۔

ایک بار جیل ہی سے انھوں نے اپنی بہن کو یہ یاد دلایا تھا کہ ۲۶ جنوری کو ہمیشہ کی طرح ملازموں کو وردیاں دی جائیں۔ یہ دن اب یوم جمہوریت کہلاتا ہے اس وقت یہ یوم آزادی کے نام سے منایا جاتا تھا۔ اس خط میں نہرو نے یہ بھی لکھا تھا کہ گنگا جو پہلے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دفتر میں ملازم تھا اور کبھی کبھی ان کی ڈاک لیکر ڈاک خانے جایا کرتا تھا، وردی پانے والوں میں اس کا نام بھی ہونا چاہیے۔

نہرو سیکولرزم اور فرقہ وارانہ مسئلہ

اصغر علی انجینیئر
اورین کانج، ۲۲ فلور، ۱۳ روڈ، سانتا کروز (ایسٹ) ممبئی ۵۵... ۴۰۰

جواہر لال نہرو ایک سیاسی رہنما ہی نہیں بلکہ ایک اہم دانشور اور مفکر بھی تھے۔ جواہر لال کو اپنی سیاسی جدوجہد کے دوران میں جن مسائل سے سابقہ پڑا، ان کا انھوں نے ایک فعال کارکن کے ناتے ہی حل تلاش نہیں کیا بلکہ ایک مفکر کی حیثیت سے بھی ان مسائل پر سوچا اور ہندوستان کے لیے ایک وژن بھی پیش کیا۔ جواہر لال نے تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور تاریخ کی گہری سمجھ رکھتے تھے۔ ہندوستان کے ماضی سے بھی انھیں شغف تھا۔ جس نے انھیں نہ صرف ہندوستان کے مزاج کو سمجھنے میں مدد دی بلکہ موجودہ مسائل کو صحیح تناظر میں حل کرنے کی اہلیت بھی پیدا کی۔ نہرو نے ہندوستان سے متعلق سبھی مسائل پر سوچا وہ سیاسیات کے میدان میں ہو یا معاشیات کے تاریخ کے یا ادب کے میدان میں۔ ہم یہاں نہرو کے سیکولرزم اور فرقہ واریت سے متعلق نظریات سے بحث کریں گے۔

جنگِ آزادی کے دوران فرقہ واریت کا مسئلہ (COMMUNAL PROBLEM) بنیادی اہمیت رکھتا تھا۔ اس کی کئی وجوہ تھیں۔ انگریزوں کی سامراجی حکومت نے ہندوستان کے سماجی اور معاشی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ سائنسی نظام معاشی، سماجی اور سیاسی اعتبار سے سامراجی (COLONIAL) نظام میں تبدیل ہو گیا تھا سامراجی نظام میں معاشی اور سیاسی طاقت سامراجی حکمرانوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور اس سامراجی ڈھانچے میں نہ معاشی ترقی کی زیادہ گنجائش ہوتی ہے اور نہ سیاسی اقتدار پر قدرت حاصل کرنے کی۔ ایسی حالت میں سامراجی حکمراں آبادی کے کبھی ایک طبقے کو زیادہ مراعات دیتے ہیں تو کبھی دوسرے طبقے کو اور چونکہ ہندوستان میں ہندومت اور اسلام کے پیرو کار بڑی تعداد میں موجود تھے، انگریزوں نے یہ سیاسی کھیل خوب کھل کر کھیلا۔ کبھی ہندوؤں کو زیادہ مراعات دیں اور کبھی مسلمانوں کو، دوسرے یہ کہ ہندوستان کی تاریخ کو فرقہ وارانہ رنگ میں رنگ دیا۔ آج کے آپسی تنازعے کو ماضی کا مستقل تنازعہ بنا دیا۔

اس کی ایک اور اہم وجہ تھی جس کے لیے انگریز کم اور ہمارے سماجی حالات زیادہ ذمے دار تھے۔ ہندوستان میں جدید قومیت کا تصور نہیں پایا جاتا تھا۔ انگریزوں نے جب مغل بادشاہت کو ختم کر کے سامراجی نظام قائم کیا تو ہمیں ایک جدید سیاسی ڈھانچے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ یہ سیاسی ڈھانچہ جدید قومی ڈھانچہ بھی ہو سکتا تھا۔ مغربی تعلیم یافتہ دانشور طبقے کو تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آگئی لیکن عوام میں قومیت کے تصور کی مقبولیت آسان بات نہیں تھی۔ عوام جدید سیکولر سیاسی تصورات کے عادی نہیں تھے اس لیے بعض سیاسی رہنماؤں کو جن میں گنگا دھر تلک اور مہاتما گاندھی شامل تھے مذہبی محاورے سے کام لینا پڑا۔ اس سے مسلم اقلیت میں ایک طرح سے بیگانگی کا احساس پیدا ہوا۔ اس لیے موقع آنے پر مہاتما گاندھی کو انگریزوں کے خلاف خلافت تحریک کو بھی استعمال کرنا پڑا چوں کہ اس تحریک سے کروڑوں مسلمانوں کے مذہبی جذبات وابستہ تھے اور اس تحریک کی بدولت لاکھوں مسلمان جنگِ آزادی کی تحریک میں شامل بھی ہوئے۔ اس طرح دونوں طرف سے مذہبی سیاست کو تقویت پہنچی۔

جواہر لال دوسری طرف مغربی تعلیم یافتہ دانشور تھے اور وہ ہندوستان کو ایک جدید قومیت پر مبنی آزاد ملک دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے وہ جدید سیاست کے لیے سیکولرزم کو سنگِ بنیاد کی حیثیت دیتے تھے۔ کیوں کہ ان کے نزدیک جدید قومیت سیاست اور مذہب کو الگ کیے بغیر ممکن ہی نہیں تھی۔ ویسے پنڈت نہرو سے

قبل انڈین نیشنل کانگریس نے جس کی بنیاد ۱۸۷۵ء میں پڑی تھی سیکولرزم کو ہی سیاسی پالیسی کے طور پر اپنایا تھا اور اس دور کے کانگریس لیڈر اس سیاسی جماعت میں مسلمانوں کی شرکت کو خصوصی اہمیت دیتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ اسی ابتدائی دور میں بدرالدین طیب جی کو کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا۔ لیکن پنڈت جواہر لال نہرو نے سیکولرزم کو محض وقتی پالیسی کے طور پر ہی نہیں اپنایا بلکہ جدید سیاست میں اس کو ایک ٹھوس نظریاتی اہمیت بھی بخشی۔

نہرو سیاست میں مذہبی محاورے (RELIGIOUS IDIOM) کو استعمال کرنے کے بھی خلاف تھے۔ لیکن نہرو اپنے دور کی سماجی پیچیدہ صورت حال سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مغرب میں سیکولرزم کا جو تصور ہے وہ ہندوستان کے حالات میں میکانکی طور پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔ نہرو خود مذہب پر دوسروں کی طرح عقیدہ نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ اپنے آپ کو لاادری (agnostic) کہتے تھے۔ ان کی مذہب کی جانب اگر کوئی کشش تھی تو وہ ایک تہذیبی سرمائے اور ماضی کی تاریخ کے طور پر تھی، نجی عقیدے کے طور پر نہیں وہ سماج کی اخلاقی بنیادوں کے قائل تھے اور اس معاملے میں چینیوں کے نظریے سے زیادہ قریب تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ "چینی نظریہ بنیادی طور پر اخلاقی ہے لیکن اس کے باوجود غیر مذہبی ہے۔ بلکہ مذہب کی طرف اس کا رویہ تشکیکی ہے۔ اس نظریے میں میرے لیے کافی کشش ہے حالاں کہ اپنی زندگی پر منطبق کرنے کا میں حامی نہیں ہوں۔"

(جواہر لال نہرو سوانح عمری' الائڈ پبلیشرز ۱۹۶۲ء صفحہ ۳۱۶)

مذہبی نظریے سے متعلق وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں: "عام طور پر مذہبی نظریہ اس دنیا سے لاتعلق ہوتا ہے اور مجھے یہ (مذہبی عقیدہ) واضح خیالات کا دشمن نظر آتا ہے۔ کیوں کہ یہ نہ صرف اس بات پر مبنی ہے کہ چند عقائد کو بے چون و چرا تسلیم کر لیا جائے۔ بلکہ اس کی بنیاد ہی جذبات اور جذباتیت پر ہوتی ہے میرے خیال سے یہ روحانیت اور روحانی امور سے بہت دور جا پڑتا ہے اور یہ جان بوجھ کر حقائق سے منہ موڑ لیتا ہے کیوں کہ اس کے مفروضے حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔"

(جواہر لال نہرو سوانح عمری' الائڈ پبلیشرز ۱۹۶۲ء ص ۳۷۶، ۳۷۷)

نہرو خاص طور سے منظم مذہب کے سخت خلاف تھے اور سیاست میں منظم مذہب کی دخل اندازی کو بہت برا تصور کرتے تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ سیاست میں مذہب کا دخل نہ صرف جدید سیکولر سماج کے لیے برا ہے بلکہ ہر طرح کے سیاسی و سماجی نظام کے لیے برا ہے چاہے اس کا تعلق ماضی سے ہو یا حال سے۔ جو لوگ مذہب کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں وہ لوگ ہی سیاست میں مذہب کی دخل اندازی پسند کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں نہرو یہ بات اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ سیاست میں مذہب کا دخل اخلاقیات یا روحانیت کا عنصر پیدا کرنے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ اپنے نجی یا طبقہ واری مفادات کو، جو سیاسی بھی ہو سکتے ہیں اور معاشی بھی، پورا کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ اس لیے نہرو سے زیادہ سیاست میں مذہب کی دخل اندازی کے کون خلاف ہو سکتا تھا؟

لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ نہرو کا رویہ میکانکی اور سطحی نہیں تھا۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ ہندوستانی عوام پر مذہب کا کتنا گہرا اثر ہے۔ اسی لیے وہ مہاتما گاندھی کے نہ صرف مخلص پیروکار تھے بلکہ وہ ان کے مذہبی نظریوں کو ہمدردی سے سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ مہاتما گاندھی بذاتِ خود گہری مذہبی عقیدت رکھتے تھے اور سیاست میں بھی مذہبی محاورہ استعمال کرتے تھے۔ نہرو نے مہاتما گاندھی کے اس رویے کو سمجھنے کی کوشش کی اور ان کے خیالات کا گہرا مطالعہ کیا۔ نہرو اپنی سوانح عمری میں گاندھی جی کے مذہبی خیالات کے اقتباس پیش کرتے ہیں۔ گاندھی جی کہتے ہیں کہ کوئی مذہب کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا چند لوگ عقل پرستی کے زعم میں یہ کہتے ہیں کہ ہمارا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی یہ کہے کہ میں سانس لیتا ہوں لیکن ناک نہیں رکھتا۔ مہاتما گاندھی یہ بھی کہتے ہیں کہ میری حق پرستی مجھے سیاست کی طرف لائی ہے اور میں یہ بات بغیر کسی تذبذب اور عجز و انکسار کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مذہب اور سیاست کا کوئی تعلق نہیں ہے وہ نہیں جانتے کہ مذہب کیا ہے۔

نہرو گاندھی جی کی اس بات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر مہاتما گاندھی اس بات کو اس طرح کہتے کہ جو لوگ مذہب کو سیاست سے جدا کرنا چاہتے ہیں یا زندگی سے خارج کرنے کے حق میں ہیں وہ نہیں جانتے کہ میرے (یعنی مہاتما

گاندھی کے) نزدیک مذہب کے معنی وہ نہیں ہیں جو لوگ سمجھتے ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ گاندھی جی مذہب کو عقیدے سے زیادہ اخلاقیات اور روحانیات کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح گاندھی جی کے نزدیک مذہب وہ نہیں ہے جو مذہب کی تنقید کرنے والے سمجھتے ہیں (ایضاً ص، ۳۰)

یہ دلچسپ بات ہے کہ جہاں نہرو گاندھی جی کو پوری ہمدردی کے ساتھ سمجھنا چاہتے ہیں وہاں وہ اپنے آپ کو فرانسیسی دانشور اور مفکر روماں رولاں کے خیالات سے زیادہ قریب پاتے ہیں۔ نہرو اور روماں رولاں کی "مذہبی فکر" عوام کے مقابلے میں خواص (ELITES) سے زیادہ قریب ہے۔ روماں رولاں کا خیال تھا کہ جو لوگ اپنے آپ کو مذہب سے آزاد سمجھتے ہیں۔ دراصل وہ ایک مافوق العقل شعور میں ڈوبے رہتے ہیں جسے ہم سوشلزم، کمیونزم، انسان پرستی، قوم پرستی یا عقل پرستی کہہ سکتے ہیں۔ دراصل جو خیال پورے خلوص اور عزم و حوصلے کے ساتھ اور قربانی کے جذبے سے سرشار حق کی جستجو میں محو ہو، وہ صحیح معنی میں مذہبی خیال ہے کیوں کہ یہ اسی وقت ممکن ہے جب صاحبِ خیال ایسے مقصد پر ایمان رکھتا ہو جو موجود سماج کی زندگی سے ماورا ہو بلکہ پوری انسانیت کی زندگی سے فوق ہو تشکیک بھی اگر حق پرستی کے جذبے سے سرشار ہو اور کمزوری کے بجائے قوت کی علامت ہو تو وہ بھی مذہبی نفوس کے آگے بڑھتے ہوئے جلوس میں شامل ہے۔ نہرو کہتے ہیں کہ شاید میں وہ شرائط نہ پوری کر سکوں جو روماں رولاں عائد کرتے ہیں لیکن میں ان نفوس کی فوج میں پورے عجز و انکسار کے ساتھ شامل ہونے کے لیے تیار ہوں۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ نہرو مافوق عقل شعور کے منکر نہیں تھے اور سچائی کی تلاش کا جذبہ رکھتے تھے اور اس معنی میں اپنے آپ کو ان نفوس میں شمار کرنے کے لیے تیار تھے جنھیں روماں رولاں "مذہبی نفوس کی شاندار فوج" کہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ نہرو لاادری ہوتے ہوئے بھی گاندھی جی کے مذہبی محاورے اور مذہبی نقطۂ نظر کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور اسے پوری ہمدردی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے نہرو کو ہمیں میکانکی طور پر مذہب کا منکر قرار نہیں دینا چاہیے اور ان کے سیکولر نقطۂ نگاہ کو اس کی پوری لطافت اور گہرائی سے سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ حق پرستی کے جذبے سے سرشار ہونا اور پوری جرأت اور بے باکی کے ساتھ اس کا اظہار کرنا اگر مذہبیت ہے تو نہرو یقیناً لامذہب نہیں تھے اور سیکولرزم اگر منظم مذہب کی سیاست میں نجی یا طبقاتی مداخلت کی نفی کا نام ہے تو نہرو اس معنی میں پورے سیکولر تھے۔

ہم یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ عام طور پر سیاست میں مذہب کا دخل اخلاقیات یا روحانیات کی سطح پر نہیں بلکہ مفادات کی سطح پر ہی ہوتا ہے۔ اس لیے نہرو اس مداخلت کے ہمیشہ خلاف رہے اور فرقہ پرستی کی ہمیشہ سخت مذمت کی۔ نہرو اس بات کے قائل نہیں تھے کہ کسی مذہبی گروہ کے اپنے الگ سیاسی اور معاشی مفاد ہو سکتے ہیں اور ایک فرقے کے مفادات پر مبنی سیاسی پارٹی ہی اس فرقے کے حقیقی مفادات کی ترجمانی کر سکتی ہے۔ نہرو اس بات کے قائل تھے کہ جہاں تک عوام کا تعلق ہے ان کے سیاسی اور معاشی مفادات مشترک ہیں چاہے ان کا تعلق کسی بھی مذہبی گروہ سے کیوں نہ ہو۔ اسی لیے وہ یہ ماننے کے لیے ہرگز تیار نہ تھے کہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کے مفاد کی نمائندگی کر سکتی ہے یا ہندو مہاسبھا ہی ہندوؤں کے مفادات کی حفاظت کر سکتی ہے۔ اس معنی میں پنڈت نہرو نے مسلم لیگ کو کبھی بھی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم نہیں کیا۔ وہ یہ سمجھتے تھے اور اس میں بڑی حد تک وہ حق بجانب بھی تھے کہ انڈین نیشنل کانگریس ہندوستانی عوام کی نمائندہ جماعت ہے اور حتی الامکان وہ یہ کوشش بھی کرتے تھے کہ کانگریس میں مسلمانوں کی مناسب نمائندگی ہو۔

نہرو فرقہ پرستی کو جدید صنعتی نظام کے خلاف اور جاگیردارانہ مراعات کی پیداوار سمجھتے تھے۔ چنانچہ نہرو ایک خط میں جو ۲۰ فروری ۱۹۴۲ء میں سید محمود کو لکھا تھا، تحریر کرتے ہیں:

"میں خصوصاً یہ سمجھتا ہوں کہ جناح اور مسلم لیگ کا رجحان، بنیادی تبدیلیوں کے، یا جمہوری نظام ہندوستان میں رائج کرنے کے خلاف اس لیے نہیں ہے کہ یہاں ہندو اکثریت ہے بلکہ اس لیے کہ اس سے نیم جاگیردارانہ مراعات ختم ہو جائیں گی۔ قانون ساز اسمبلی کے ذریعے ہم عوامی عناصر اور امنگوں کو اس طرح ابھارنا چاہتے ہیں کہ وہ فرقہ واریت کے مسئلے کو درمیانی طبقے کے نقطۂ نگاہ سے نہ دیکھے جس نے ہمیں

اس ناقابلِ حل حالت میں پھنسا دیا ہے۔ مجھے اس مسئلے کا حل تب تک نظر نہیں آتا جب تک تیسرا عنصر یعنی برطانوی حکومت ختم نہیں ہو جاتی۔" (NEHRU - A BUNCH OF OLD LETTERS صفحہ ۴۶۳-۴۶۴)

دراصل نہرو یہاں ایک بہت پیچیدہ مسئلے کو آسان کر کے پیش کر رہے ہیں اور شاید ایک خط میں اس سے زیادہ گنجائش بھی نہ ہو۔ ویسے جناح اور مسلم لیگ کا رجحان محض نیم جاگیردارانہ مراعات کو قائم رکھنا ہی نہیں تھا۔ ۱۹۳۷ء کے واقعات کے بعد جس پر مولانا آزاد نے اپنے تیس صفحات میں تبصرہ کیا ہے، معاملہ اس سے کہیں آگے بڑھ چکا تھا۔ مسلم لیگ کے دو وزیر یو۔پی کی کابینہ میں شامل نہ کر کے کانگریس نے بھی سیاسی داؤ پیچ کھیلنے میں مات کھائی تھی اور ۱۹۴۲ء تک جب جواہر لال جی نے یہ خط سید محمود کو لکھا ہے، معاملہ بہت اُلجھ چکا تھا۔ اب اور کئی طاقتیں تھیں جن میں طبقاتی مفاد کے ساتھ ساتھ جناح کا ذاتی ایغو اور مسلمانوں کے ایک حصے کا ناانصافی کا احساس بھی کام کر رہا تھا۔ خیر ہم یہاں اس پیچیدہ مسئلے کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔

لیکن ایک سطح پر ہمیں یہ بات ماننا ہوگی کہ فرقہ وارانہ سیاست جاگیردارانہ مراعات کی بقا کو عوامی مفاد پر زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ مذہب کا استعمال ایسے طبقے اپنے مفادات کا جواز پیدا کرنے کے لیے کرتے ہیں اور اپنے طبقاتی مفادات سے مذہب کا رشتہ جوڑ کر اپنے ہم مذہب عوام کے مفادات سے ہم آہنگ کرنے کا فریب پیدا کرتے ہیں اور نہرو بھی ایک حد تک اپنے اس خط میں یہی بات کہنا چاہتے ہیں۔ یہی بات وہ اپنی ایک کتاب UNITY OF INDIA جو لندن سے ۱۹۴۸ء میں شائع ہوئی ہے، کے صفحہ ۳۸۶ پر کہتے ہیں:

" ہمارے سامنے یہ بات واضح ہونا چاہیے کہ یہ فرقہ واریت کا مسئلہ صحیح معنی میں مفاد پرستوں کے مفادات کے تحفظ کا مسئلہ ہے اور مذہب ہمیشہ اس مقصد کے لیے ایک مفید طاقت ثابت ہوتا ہے۔ جن کے اپنے جاگیردارانہ مراعات و مفادات ہیں وہ تبدیلی سے ڈرتے ہیں اور برطانوی سامراج وادیوں کے خیمے میں شامل ہو جاتے ہیں۔"

یہاں نہرو بات کو پھر بہت آسان بنا کر پیش کر رہے ہیں لیکن اس سے زیادہ اہم بات ہمارے لیے یہ ہے اور وہ آج بھی اتنی ہی صحیح ہے کہ مذہب مفاد پرستوں کے لیے بڑی آسانی سے آلۂ کار بن جاتا ہے۔ کیوں کہ اس کی زبردست جذباتی اپیل ہوتی ہے۔ اور ایک انتہا کو پہنچ کر اس معنی میں فرقہ واریت سماج کے لیے زبردست خطرہ بن جاتی ہے۔ اور نہرو بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ عوام پر فرقہ پرست طاقتوں کا کتنا اثر ہو سکتا ہے۔ جن کا اپنا کوئی مفاد نہیں ہوتا۔ وہ اس سلسلے میں ہٹلر کی مثال دیتے ہیں کہ اس نے جرمن عوام پر مقناطیسی اثر ڈال دیا تھا۔ وہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر یہ بھی کہتے ہیں کہ ہندوستان کے فرقہ پرست وہی حربے استعمال کر رہے ہیں جو جرمنی میں نازی کرتے ہیں۔

نہرو یہ بھی سمجھتے تھے کہ فرقہ واریت متوسط طبقے کے مفادات کی پیداوار ہے۔ انھوں نے لکھنؤ میں ۱۹۳۶ء کے کانگریس کے اجلاس کے صدارتی خطبے میں کہا تھا کہ جب تک سیاست پر متوسط طبقے کا قبضہ رہے گا ہم فرقہ واریت کو پوری طرح ختم نہیں کر سکتے۔ اسی خطبے میں آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ مختلف فرقوں کے متوسط طبقے ایک دوسرے کے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کر سکیں۔ آج کی جدید جمہوری سیاست میں یہ مقابلہ آرائی ایک حد تک ناگزیر ہے لیکن اسے حتی الامکان کم کیا جا سکتا ہے۔ نہرو کے مطابق اگر اکثریتی فرقہ فیاضی اور کشادہ دلی سے کام لے اور اقلیتی فرقے کے شکوک و شبہات، جو ہمیشہ معقول نہیں ہوتے، دور کرنے میں معاون ہو تو فرقہ واریت کا اثر کم ہو سکتا ہے۔

نہرو یہ بھی جانتے تھے کہ فرقہ واریت کا مسئلہ محض معاشی مسئلہ نہیں ہے۔ فروری ۱۹۳۶ء میں لندن میں کچھ سوالوں کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ فرقہ واریت بنیادی طور پر معاشی وجوہ پر مبنی نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ معاشی پس منظر اس پر اثر انداز ہوتا ہے لیکن اس کی بنیادی وجہ معاشی سے زیادہ سیاسی ہے۔ ان کے سامنے یہ بات بھی صاف تھی کہ مذہبی ٹکراؤ یا تصادم کا تعلق فرقہ واریت سے زیادہ نہیں ہے۔ اس حد تک تو ضرور ہے کہ مذہبی تصادم خاص طور سے ماضی میں ایک حد تک معاندانہ یا مخالفانہ رویہ پیدا کرتا ہے لیکن یہ بات صاف ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ مذہبی مسئلہ نہیں ہے حالانکہ یہ مذہبی جذبات کا ضرور فائدہ



اُٹھاتا ہے۔

یہاں یہ بات صاف ہے کہ نہرو فرقہ واریت کے مسئلے کی نزاکت کو بھی بہت اچھی طرح سمجھتے تھے اور اس کی پیچیدگی کو بھی۔ نہ تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا کوئی تعلق مذہب سے نہیں ہے نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ محض مذہبی مسئلہ ہے۔ بعض عناصر ہم سے یہ منوانا چاہیں گے کہ یہ محض سیاسی مسئلہ ہے اور مذہب سے اس کا کوئی تعلق نہیں جبکہ فرقہ پرست یہ یقین دہانی کرانا چاہیں گے کہ یہ محض مذہبی مسئلہ ہے اور اسے اسی زاویے سے دیکھنا چاہیے۔ نہرو ان دونوں انتہا پسند نظریوں سے اپنا دامن بچاتے ہیں اور حقیقت پسند رویہ اختیار کرتے ہیں۔ نہ یہ محض مذہبی مسئلہ ہے نہ محض سیاسی۔ اس میں مفاد پرستوں کے مفادات بھی شامل ہیں اور عوام کے مذہبی جذبات بھی۔ کوئی بھی میکانکی رویہ مسئلے کی پیچیدگی کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

اس بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے اور بعض سوالوں کا جواب دیتے ہوئے نہرو کہتے ہیں کہ یہ اس حد تک معاشی ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں زیادہ پچھڑے ہوئے ہیں۔ ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ قرض دینے والے ہندو ہیں اور قرض لینے والے مسلمان، زمیندار ہندو ہیں اور کسان مسلمان۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ اصل ٹکراؤ ساہوکار اور قرض دار میں ہوتا ہے یا زمیندار اور کسان میں ہوتا ہے لیکن اس کی شکل ہندو مسلم تصادم کی ہو جاتی ہے۔ اور ہمارے اخبار بھی اسی طرح کی خبریں شائع کرتے ہیں لیکن اس مسئلے کی اصل نوعیت ہندو اور مسلم اوپری طبقوں میں آسامیوں اور سیاسی اقتدار کے لیے آپسی لڑائیوں کی ہوتی ہے۔

نہرو نے آزادی کے بعد بھی فرقہ واریت کو ملک کا سب سے بڑا دشمن تصور کیا۔ وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ فرقہ واریت بیرونی جارحیت سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ بیرونی جارحیت کا متحد ہو کر مقابلہ کیا جا سکتا ہے لیکن فرقہ واریت کے روپ میں داخلی تصادم اس سے زیادہ خطرناک ہے کیوں کہ یہ زہر ہماری رگوں میں سرایت کر جاتا ہے اور ہماری سمجھ کو ہی ماؤف کر دیتا ہے۔ آج ہمارے دور میں بھی نہرو کی یہ بات کتنی صحیح معلوم ہوتی ہے۔ آج آزادی کے چالیس برسوں کے بعد بھی فرقہ واریت کا زہر ہماری رگ رگ میں سرایت کرتا جا رہا ہے اور ہمارے اتحاد کو بیرونی جارحیت سے بھی کئی گنا زیادہ نقصان پہنچا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اسی فرقہ واریت نے ۱۹۴۷ء میں ہمارے ملک کے ۲ ٹکڑے کرائے اب خدانخواستہ شاید ۲۰ ٹکڑے کرا کر دم لے۔ کیا بیرونی جارحیت ہمارے اتحاد کو اس طرح پاش پاش کر سکتی ہے؟ نہرو کا خیال کتنا صحیح تھا کہ فرقہ واریت بیرونی جارحیت سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔

ایک بار بچپن میں جب نہرو کی عمر پانچ چھ سال کی تھی تو ان کے والد نے ان کو بہت بُری طرح پیٹا تھا۔ موتی لال کی میز پر دو خوبصورت قلم رکھے تھے، ان کے بیٹے کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ایک وہ لے لیں۔ انھوں نے اپنے والد سے اجازت لیے بغیر میز پر سے ایک قلم اٹھا لیا انھوں نے دل میں سوچا "پتاجی ایک ساتھ تو دونوں قلم استعمال کر نہیں سکتے پھر میں ایک کیوں نہ لے لوں"۔ جب یہ پتہ چلا کہ ایک قلم غائب ہے تو گھر میں ایک طوفان سا اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہر طرف اس کی تلاش ہونے لگی۔ کم عمر جواہر لال ڈر گئے مگر انھوں نے یہ قبول کر کے نہ دیا کہ میز سے قلم انھوں نے اٹھایا تھا۔ بعد میں جب پتہ چلا کہ قلم انھوں نے ہی لیا تھا تو موتی لال نے ان کی بڑی پٹائی کی۔ اپنے بچپن کے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے نہرو نے لکھا ہے۔ "شرم اور تکلیف سے بے حال ہو کر میں ماں کے پاس پہنچا۔ میرے ننھے سے زخمی بدن پر کئی دن دوائیں لگائی گئیں اور مرہم تھوپے گئے"۔



قیادت کی نفسیات اور پنڈت نہرو کا طرزِ قیادت

قیادت کی اصطلاح جماعت کے کسی فرد کی دوسرے افراد پر اثر انداز ہونے کی اہمیت کا مفہوم ادا کرتی ہے جو شخص دوسروں سے اپنی بات منوانے اور انھیں اپنی دکھائی ہوئی راہ پر چلانے کی طاقت رکھتا ہے اُسے ہی قائد کے لقب سے نوازا جاتا ہے۔ ویسے بھی کسی منظم جماعت کے افراد ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس اعتبار سے جماعت کے اندر ہر فرد کی حیثیت اضافی ہوتی ہے۔ لیکن جو شخص دوسروں سے متاثر ہونے سے زیادہ دوسروں کو مثبت طریقوں سے متاثر کرتا رہتا ہے اسی کی حیثیت قائد کی ہوتی ہے۔ جو گھسے پٹے رستے پر چلنے کے بجائے نئی اور ان دیکھی راہ پر چلنے کی جماعت کے افراد کو ترغیب دیتا ہے اور اس کی وجہ سے خطرات مول لینے میں دریغ نہ کرکے انھیں متاثر کرتا ہے، نئی قیادت کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں آجاتی ہے اور اس طرح وہ جماعت کے اندر ایک انفرادی پوزیشن کا حامل ہوجاتا ہے۔

قیادت کی کامیابی کا انحصار قائد کے ذاتی اوصاف پر ہوتا ہے اس کے طور طریقوں پر انفرادیت کی چھاپ ہوتی ہے۔ صحت مند اور کارگر قیادت میں قائد کی غیر معمولی ذہانت، ہوش گوش، ذکاوت اور بصیرت، بسا اوقات اس کے علم و دانش کا بھی، اہم مقام ہوتا ہے۔

(ڈاکٹر) محمد محسن

سابق صدر شعبۂ نفسیات پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ

دوسروں کے ساتھ بحسن و خوبی نمٹنا، ناسازگار حالات میں اپنا دماغی توازن قائم رکھنا، جذبات کی شدت سے بے قابو نہ ہوجانا۔ یہ ساری خوبیاں نتیجہ خیز اور بارآور قیادت کی آئینہ دار ہیں۔ ان کے علاوہ غیر معمولی طور پر فعال اور چاق و چوبند شخصیت کا مالک قیادت کی ذمّے داریاں سنبھالنے اور ان سے ہنرمندی کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کا اہل ہوتا ہے۔

ایک کامیاب اور دُور بین قائد سماج کی قید و بند، رسم و رواج، اور رائج الوقت چلتے پھرتے اصولوں اور قاعدوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ اپنی قیادت کی نئی راہ نکالنے کی فکر میں رہتا ہے۔ اپنے اوپر سماج کا کسی طرح کا دباؤ اس کی برداشت سے باہر ہوتا ہے۔ لیکن بسا اوقات وہ اپنے باغیانہ خیالات اور آزادانہ روش کے برملا اظہار اور ان پر کھل کر عمل پیرا ہونے میں احتیاط سے کام لیتا ہے اس خیال سے کہ جماعت کے افراد کے اندر افتراق اور انتشار راہ نہ پاجائے اور ہم آہنگی اور اتحاد کی استواری میں خلل نہ پڑے اُسے اپنی آزاد خیالی سے مصالحت کرنے میں تامل نہیں ہوتا۔ اس کی فرض شناسی، خلوص اور خوش نیتی اپنی جماعت کے افراد کی جدوجہد میں ہاتھ بٹانے پر اسے آمادہ کرتی رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے اُن سے اُس کا نہایت قریبی تعلق اور جذباتی لگاؤ پیدا ہوجاتا ہے۔ جو اس کی قیادت کی کارفرمائی میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔ اس کے لیے وہ اپنے معیارِ زندگی اور رہن سہن میں انقلاب پیدا کرنے کے لیے آمادہ رہتا ہے۔ اس کی طرزِ زندگی کا تغیّر عوام پر اس کی شخصیت کے اثرات کو توانائی اور استواری عطا کرتا ہے۔

دوسروں کو اپنے ساتھ لے کر چلنے کے علاوہ قائد کی کچھ اور ذمّے داریاں بھی ہوتی ہیں جنھیں پورا کرنے کی اس سے توقع کی جاتی ہے۔ جیسے دوسری جماعتوں کے ساتھ گفت و شنید اور رابطہ قائم رکھنا، جماعت کے افراد کو وہ معلومات بہم پہنچانا جن کا جماعت کی بہبود سے تعلق ہو۔ عام انسانوں کو فطری طور پر زندگی کی دشواریوں پر قابو پانے کے لیے کسی ایسے شخص کی ضرورت ہوتی ہے جس پر وہ پوری طرح اعتماد کرسکیں۔ ایک موثر اور کامیاب قائد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی اور طریقہ کار کو اپنے پیرووں کے لیے ایسا نمونہ بنا کر پیش کرے کہ وہ بغیر زیادہ غور و فکر اور سوچ بچار کے اس کے نقشِ قدم

پر چلنا اپنی کامرانی کا ذریعہ تصور کریں۔ ایک قائد سے یہ توقع بھی کی جاتی ہے کہ وہ اپنے منصب اور فرائض کی ادائیگی اس طور سے کرے کہ اس سے نسبتاً کم سن افراد جن کے اندر قیادت کی پوشیدہ صلاحیتیں موجود ہوں اُن کی نشوونما کے لیے سازگار فضا تیار ہو سکے اس سے جماعت کی نتیجہ خیز کارکردگی میں اضافے کے علاوہ جماعت کے ایسے افراد کی لگن اور جماعت کے ترقیاتی پروگرام میں ان کی شمولیت دوچند ہو جائے گی۔ دوسری طرف وہ آئندہ قیادت کا بار اُٹھانے کے قابل بن سکیں گے۔

زیادہ تر قائد مثالیت پرست (IDEALISTIC) ہوا کرتے ہیں۔ وہ اپنی جماعت کی قیادت کی ذمے داری یہ سوچ کر اور اس کا تعین کر کے اپنے سر لیتے ہیں کہ جماعت کی منزلِ مقصود کیا ہونی چاہیے۔ اور کس لائحۂ عمل کو بروئے کار لا کر اس کے حصول میں کامیابی حاصل ہو سکے گی۔ اس کے بعد ہی اس پر یقین کے ساتھ اپنا قدم بڑھاتے ہیں۔ جماعت کے افراد بھی اسی کے پیشِ نظر ان کی قیادت قبول کرتے ہیں۔ اور ان کے بتائے ہوئے رستے پر گامزن ہو جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف کچھ قائدوں کی مقبولیت کا انحصار اُن کی مقناطیسی جاذبیت (CHARISMA) پر ہوتا ہے۔ ان کی قیادت کا راز اُن کے پیروؤں کی ان کے لیے جذباتی کشش میں مضمر ہوتا ہے۔ جماعت کے افراد اُن کی پیروی کے نتیجوں کو ملحوظ رکھے بغیر محض ان سے عقیدت کے جوش میں آنکھ بند کر کے ان کے پیچھے چلنے لگتے ہیں۔ جیسے ان کی قیادت پر ان کے پیروؤں کا ایمان ہو۔ وہ اپنی ذاتی صلاحیتوں پر اعتماد سے ہاتھ دھو کر قائد کو اپنی کشتی کا ناخدا باور کرنے لگتے ہیں۔ اکثر حالات میں ایسی قیادت بجائے سودمند ہونے کے بربادی اور ہلاکت کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ ایک نادر الوجود قائد مثالیت پرستی اور اپنی شخصیت کی تاثر انگیزی اور جاذبیت کے امتزاج کا نمونہ ہوتا ہے۔ ایسے قائد کی حیثیت علامتی بن جاتی ہے۔ وہ عام قائدوں کی طرح اپنی جماعت کے افراد کی صرف نمائندگی نہیں کرتا یا ان کی جانب سے ہی دوسری جماعتوں کے سربراہوں سے گفت و شنید کا فریضہ ادا نہیں کرتا۔ اس کی حیثیت جماعت کے ایسے نشان کی ہو جاتی ہے جیسے اس کی جماعت اُس کی ذات میں ضم ہو گئی ہو۔ جیسے دوسروں کے نزدیک اس کی ہر بات جماعت کی آواز ہو۔ جماعت کے تصورات اور جذبات کی گونج۔

قائد کی شخصیت والدین کی شخصیت کے مماثل ہوتی ہے قائد بھی والدین کی طرح اپنے پیروؤں کی رہنمائی کرتا ہے۔ ان کے ہاتھ سے اُسے سزا و جزا ملتی ہے۔ وہ ان کی توصیف و تحسین اور ان پر اعتراض اور ان کی نکتہ چینی بھی کرتا ہے۔ چناں چہ اکثر والدین اپنی اولاد کے ساتھ جن متضاد رویّوں کا مظاہرہ کرتے ہیں ان کے اعتبار سے قیادت کے طور کو دو صنفوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو باپ اور دوسری وہ جو ماں کے روایتی برتاؤ سے مماثلت رکھتی ہے اور جس کی بنا پر قائد باپ یا ماں کی علامت بن جاتا ہے۔ اوّل الذکر آمرانہ و استبدادی ہوتی ہے قائد اپنے پیروؤں پر حاوی رہتا ہے۔ وہ ان کی ہر بات پر روک ٹوک کرتا اور انھیں تشنیع و تادیب کا نشانہ بنائے رہتا ہے۔ وہ اکثر ان سے ایسی توقعات وابستہ رکھتا ہے جن کی تکمیل ان کے بس سے باہر ہوتی ہے۔ وہ اپنا حکم ان پر نافذ کرتا رہتا ہے اور ان کی طرف سے کسی طرح کی چون و چرا برداشت نہیں کرتا ثانی الذکر قیادت جمہوری اور مشفقانہ ہوتی ہے۔ قائد اپنے پیروؤں کی دیکھ بھال، ان کی پشت پناہی، ہمت افزائی۔ ان کے ساتھ رواداری اور مفاہمت کو اپنی ذمے داری سمجھتا ہے۔ اوّل الذکر قیادت فرائض مرکوز (TASK - ORIENTED) اور دوسری شخص مرکوز (PERSON ORIENTED) ہوتی ہے۔ فرائض مرکوز قائد کی نظر اپنے پیروؤں کی کارکردگی پر جمی رہتی ہے۔ جو کام انھیں سونپا جاتا ہے اس کی انجام دہی قائد کی توجہ کا مرکز ہوتی ہے۔ ان کی ذات سے قائد کو کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ ان کے دُکھ درد، ان کے آرام و عافیت، ان کی دل جمعی یا بے اطمینانی سے قائد کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ ان باتوں کی توقع صرف شخص مرکوز، مادرانہ قیادت سے ہی کی جا سکتی ہے۔

ہم جب پنڈت نہرو کے طرزِ قیادت کا جائزہ لیتے ہیں تو کامیاب اور کارگر قیادت کا جن باتوں پر انحصار ہوتا ہے، پنڈت نہرو کی زندگی، ان کے نظریات، طریقۂ کار اور کارناموں میں ہمیں ان کا نمایاں عکس نظر آتا



ہے۔ اگر ملک کی جنتا میں مقبولیت کو بے مثل قیادت کی کسوٹی سمجھا جائے تو مہاتما گاندھی کے بعد اس زمانے میں جتنی مقبولیت پنڈت نہرو کو حاصل ہوئی دنیا کے کسی دوسرے قائد کے حصے میں نہیں آئی۔ ان کی شخصیت ملک کے لیے ایک ایسی علامتی حیثیت کی حامل ہو گئی تھی کہ ان کے دورِ حکومت میں کوئی بھی بڑے سے بڑا شخص ہندوستان کو پنڈت نہرو کی ذات سے الگ کر کے سوچ نہیں سکتا تھا۔ ان کی آواز ملک کی جنتا کی آواز سمجھی جاتی تھی۔ ہندوستان سے متعلق ان کی ہر رائے ملک کے اعلا اور ادنٰی افراد کی متحدہ رائے قرار دی جاتی تھی۔

پنڈت نہرو کی تربیت و تعلیم ان کے والد موتی لال نہرو نے جس اعلا معیار سے کی تھی اور پنڈت نہرو کی عدیم المثال ذہانت ذکاوت، بصیرت اور دانشوری کو اس کی وجہ سے جو فروغ اور توانائی حاصل ہوئی تھی، ایشیا میں ہی نہیں، بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس اعتبار سے دنیا کی کوئی عظیم ترین سیاسی شخصیت ان کے ہم پلّہ قرار نہیں دی جاسکتی۔ انگریزوں کی جابرانہ اور جارحانہ حکومت اور لوٹ کھسوٹ نے ملک کو جس پسماندگی اور فلاکت کا شکار بنا دیا تھا، پنڈت نہرو کی ہمت مردانہ، عمل پیہم اور یقین محکم نے اسے ترقی کے اس مقام پر پہنچا دیا جہاں پہنچنے میں مغربی ممالک کو صدیاں لگ گئی تھیں۔ آج کی دنیا میں ترقی کا راز سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی میں مضمر ہے۔ پنڈت نہرو نے اس بات کو محسوس کیا کہ دنیا کی ترقی یافتہ قوموں نے سائنسی اور ٹکنالوجیکل نظریات اور لائحہ عمل اپنا کر ہی موجودہ دور میں بلند و بالا مقام حاصل کیا ہے۔ ہمارا ملک بھی صرف ماضیِ قدیم کی تسکین آفریں روایتوں پر اکتفا کرنے کے بجائے ان ترقی یافتہ ملکوں سے قدم ملا کر چلنے کی اہلیت حاصل کرنے میں لگ جائے۔ انھوں نے ملک کے ہر حصے میں ایسے ایسے ادارے قائم کر دیے جن کی بدولت ہم نے نہایت قلیل عرصے میں سائنس اور ٹکنالوجی میں ترقی کی وہ منزلیں طے کر لی ہیں جنھیں کوئی انصاف پسند مبصر نظر انداز نہیں کر سکتا۔

پنڈت نہرو جب ۱۹۱۲ء میں ولایت سے اعلا تعلیم حاصل کر کے وطن واپس آئے تو بقول ان کے وہ "اپنی پسند و ناپسند میں ہندوستانی سے زیادہ انگریز تھے اور ہندوستان کے سارے معاملات کو انگریز کی نگاہ سے دیکھتے تھے"۔ لیکن واپسی کے صرف چھ سال بعد، پنڈت مالویہ کی قائم کردہ کسان سبھا کے نائب صدر کی حیثیت سے انھوں نے اپنی زندگی میں انقلاب پیدا کر لیا۔ انگریزی کپڑے اُتار پھینکے اور چوڑی دار پائجامہ اور اچکن زیب تن کر لی۔ انگریزی کھانا جس کے وہ انگلستان جانے سے پہلے ہی تقریباً عادی ہو چکے تھے اور جو سات سال تک ہیرو (HARROW) کے پبلک اسکول۔ ٹرینیٹی (TIRINITY) کالج کیمبرج اور انر ٹیمپل (INNER TE-MPLE) میں کھاتے رہے تھے یکبارگی ترک کر دیا۔ ہندوستان کے کونے کونے میں گشت لگانے لگے۔ کسانوں کے گھر میں قیام کرتے اور وہ جو کچھ کھاتے ان کے ساتھ مل کر کھانے لگے۔

ابتدا میں پنڈت نہرو کے اندر ہندوستان کی روایتی زندگی اور معاشرت سے بغاوت کی آگ سلگتی رہی تھی۔ ۱۹۲۶ء میں وہ یورپ کے سفر پر گئے اور جب ماسکو پہنچے تو وہاں کی ترقیاں دیکھ کر وہ اشتراکیت کے دلدادہ ہو گئے، جس کے نظریات اور پروگرام ان کی افتادِ طبعیت اور مطمحِ نظر سے میل کھاتے تھے۔ اُسی دور میں ہٹلر اور مسولینی کی فسطائیت نے بھی اپنا سکہ جمانا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت پنڈت نہرو نے اشتراکیت سے اپنے جذباتی تاثر کی ترجمانی ان لفظوں میں کی تھی: "مجھے یقین ہے کہ بنیادی طور پر دنیا کے سامنے اشتراکیت اور فسطائیت میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے کا سوال ہے۔ میں کما حقہٗ اوّل الذکر کے ساتھ ہوں"۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ باوجود اس کے کہ اشتراکیت کا عملی کارنامہ سرعت کے ساتھ مادی ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا، سوویت روس کے صرف عوام ہی نہیں بلکہ خواص اور اکثر عظیم شخصیتیں بھی اپنی انفرادی آزادی کے پیدائشی حق سے محروم کر دی گئی تھیں تو اشتراکیت سے اپنے جذباتی تعلق پر انھوں نے پوری طرح قابو پالیا۔ ملک کی ترقی کے لیے انھوں نے بھی پنج سالہ منصوبے اور دوسرے فلاحی ادارے قائم کیے لیکن ان سب کے ساتھ ان کا برتاؤ آمرانہ کے بجائے جمہوری تھا۔ وہ اپنی عدیم المثال عقلیت اور سوجھ بوجھ کے بل پر ان منصوبوں کے بنیادی مواد اور ان کی ضروری تفصیلات پلاننگ کمیشن اور ایسی ہی دوسری کمیٹیوں کے



سامنے رکھتے۔ ان پر مختلف زاویۂ نگاہ سے کھل کر بحث و مباحثہ ہوتا جس پر وہ پوری توجہ دیتے اور ترمیم یا تنسیخ کے متعلق جو اتفاق رائے ہوتا اُسے تسلیم کرتے۔

ہندوستان کی جنتا کے اندر اُن کے لیے جو بے پناہ کشش تھی اس کے پیشِ نظر آزادی کے بعد جو انتخابات ہوئے ان میں صرف نہرو کے نام پر جنتا کو ووٹ دینے کی ترغیب دی جاتی تھی اور حقیقت میں اس وقت جنتا کا اس سلسلے میں رویہ بھی یہی ہوا کرتا تھا۔ جب وہ ہندوستان کے کونے کونے کا دورہ کر کے ایک ایک دن مختلف مقامات پر جنتا کو مخاطب کرتے تو امڈتے ہوئے سیلاب کی طرح لوگ ان کو دیکھنے اور سُننے کو جمع ہو جاتے۔ وہ ہر موقعے پر پنج سالہ منصوبہ، اس کی غرض و غایت، کمیونٹی ترقیاتی پروگرام، سوشلسٹک سماج کے مقاصد، دنیا میں ہندوستان کی روز افزوں ساکھ اور قدر شناسی ان ساری باتوں سے جنتا کو باخبر کرتے تاکہ اس کے سیاسی شعور کی نشو و نما ہو۔ اس طرح وہ جمہوری قیادت کا حق پوری طرح ادا کرتے۔ اور اس جمہوری نقطۂ نظر اور نصب العین کی آبیاری کرتے جس پر انھوں نے سیکولرزم اور سوشلسٹک سماج کے نظریات کی بنیاد رکھی تھی۔ وہ سیاسی جمہوریت اور اقتصادی جمہوریت کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے سوچنے کے عادی نہ تھے۔

پنڈت نہرو کی قیادت کے طرز میں پدرانہ اور مادرانہ دونوں انداز کی قیادت کا امتزاج تھا۔ بسا اوقات وہ کھل کر اور ان کے روبرو اپنے شرکائے کار کی تنقید کرنے سے باز نہ رہتے۔ کبھی کبھی غصے میں آپے سے باہر بھی ہو جاتے۔ جس کے نتیجے میں ان سے محبت اور ان کے احترام کے ساتھ لوگوں پر ان کا رعب بھی طاری ہو جاتا۔ لیکن وہ جلد ہی اپنے جذبات پر قابو پا لیتے۔ جذبات کی موضوعیت اور عقلیت کی معروضیت کے درمیان یہ عدیم المثال ربط ان کی شخصیت کا ایک اہم عنصر تھا۔ ان کی مشفقانہ قیادت اور ہندوستان کی جنتا سے ان کے شدید جذباتی لگاؤ نے انھیں صرف بچوں ہی کا چاچا نہرو نہیں بنا دیا تھا۔ اپنے عملوں اور کارکنوں کے ساتھ ان کا حسنِ سلوک اور مصیبت زدہ افراد کے لیے ان کے دل میں درد کا اندازہ ان کے ایک خصوصی پرائیوٹ سکریٹری ایچ۔ وی۔ آر۔ آئینگر کی ایک تحریر سے لگایا جاسکتا ہے۔ ایک دفعہ سری نگر جاتے ہوئے ہوائی جہاز میں کچھ ایسی خرابی پیدا ہوگئی کہ وہ جموں سے آگے نہ جاسکا اور پنڈت نہرو کو سری نگر کا سفر موٹر سے کرنا پڑا جہاں وہ رات کے گیارہ بجے پہنچے۔ اس افراتفری میں ان کے اسٹینوگرافر کا سوٹ کیس اِدھر اُدھر ہوگیا اور وہ سوتی قمیص پہنے جاڑے سے کانپتا ہوا سری نگر پہنچا۔ پنڈت نہرو نے کسی سے ایک سوئٹر اور کوٹ منگوا کر اپنے سامنے اسٹینوگرافر کو پہنوایا۔ ایک دفعہ وہ کامن ویلتھ کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن جارہے تھے۔ مشرقی پنجاب سے آئے ہوئے مہاجرین جن بیرکوں میں مقیم تھے وہ مرمت چاہتی تھیں اور وہاں پانی کی بھی سخت قلت تھی۔ ان کو خبر ہوئی تو انھوں نے ان بیرکوں کو جلد سے جلد درست کرنے کا حکم دیا اور لندن چلے گئے۔ واپس آئے تو آتے ہی ان کی بابت سوال کیا اور یہ جان کر بھی کہ ان کی مرمت ہوگئی تھی انھیں اطمینان نہیں ہوا اور خود جا کر بیرکوں کا معائنہ کیا۔

پنڈت نہرو کی نعمان اور انھیں کے وضع کردہ ضرب المثل "آرام حرام ہے" پر ان کے عمل کی مثال کسی دوسرے سیاسی قائد کی زندگی میں نہیں ملتی۔ وہ چوبیس گھنٹوں میں سولہ سترہ گھنٹے کام میں منہمک رہتے۔ اس معاملے میں ان کے اسٹاف کے لوگ جو ان سے عمر میں کم تھے وہ بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے مطابق کانگریس نے انتخاب میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس سلسلے میں پنڈت نہرو نے پانچ ماہ کے اندر تقریباً پچاس ہزار میل کا سفر کہیں ہوائی جہاز، کہیں ریل، کہیں موٹر، کہیں بیل گاڑی، کہیں گھوڑے پر اور کہیں پیدل چل کر طے کیا۔ لوگ لاکھوں کی تعداد میں ان کا درشن کرنے اور انھیں سننے کو جمع ہوتے اور ان کے نام کے نعروں سے فضا گونجنے لگتی۔ اسی وقت سے گاندھی جی کے بعد عام جنتا کے دلوں پر پنڈت نہرو کی حکومت ہوگئی تھی۔

گاندھی جی کے علاوہ خود علیحدگی SELF-DETACHMENT اور اپنی ذاتی اغراض سے بیگانگی کی جو نادر مثال پنڈت نہرو کی ذات میں ملتی ہے وہ اس وقت بھی خال خال ہی نظر آتی تھی، اور آج تو بالکل عنقا ہوگئی ہے۔ آزادی کے بعد سات سال تک

عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں رکھ کر پنڈت نہرو نے ۱۹۵۹ء میں اپنے عہدے سے سبکدوشی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور اس کی پیش کش بھی کی۔ لیکن کابینہ کے اراکین اور کانگریس کی دوسری بااثر شخصیتوں نے انھیں اس کی اجازت نہ دی اور وہ تادمِ حیات اپنے عہدے پر فائز رہے۔ ان کی شخصیت کے غالب اوصاف میں ان کی بے باکی اور حق پرستی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ حق بات کہنے میں وہ کسی سے خوف نہیں رکھتے تھے اور اس معاملے میں ملک میں اپنی عظیم ترین پوزیشن اور اقتدار کو برقرار رکھنے کی انھیں کبھی فکر نہ ہوتی۔ اپنی سوانح حیات میں لکھتے ہیں "میں تعلیم کے اعتبار سے انگریز ہوں، تہذیب و تمدن کے اعتبار سے مسلمان، اور پیدائش کے محض اتفاقی امر ACCIDENT OF BIRTH کی بنا پر ہندو۔" ہندوستان جیسے قدامت پرست ملک میں جہاں کی اسّی فی صد آبادی ہندو ہے اور جہاں جمہوری حکومت کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی وہاں کی قیادت کے سربراہ کا یہ بیان جرأتِ رندانہ کی ایک بے نظیر مثال ہے۔

پنڈت نہرو کے اندر خود احتسابی کی صلاحیت ان کی جذباتیت اور عقلیت میں توازن کی ذمّے دار تھی۔ انھوں نے فرضی نام سے ایک بار خود اپنے بارے میں لکھا تھا: "وہ شخص اپنے اندر ایک ڈکٹیٹر کی ساری خصوصیتیں رکھتا ہے۔ بے پناہ مقبولیت، زبردست قوتِ ارادی، پندار، انتظامی صلاحیت، اہلیت، درشتی، اجتماعِ کثیر کی کشش، دوسروں کے تئیں عدمِ برداشت، اور نااہلوں کے لیے قدرے حقارت، اسی کے ساتھ وہ سب کچھ فی الفور کرا دینا چاہتا ہے اور ہر اس چیز پر جھاڑو پھیر دینا چاہتا ہے جسے وہ ناپسند کرتا ہے۔ اور اس کی ازسرِ نو تعمیر میں لگ جاتا ہے۔" ظاہر ہے کہ جو شخص اس گہرائی کے ساتھ اپنا تجزیہ کر سکتا ہے کبھی ڈکٹیٹر نہیں بن سکتا۔ چنانچہ پنڈت نہرو ہمیشہ اس کے خلاف اپنی مدافعت کرتے رہے اور ان کا قدم کبھی جادۂ اعتدال سے باہر نہ گیا۔ کسی معاملے میں اُنھوں نے مصالحت کی پالیسی سے انحراف نہیں کیا۔ ملک کی معیشت میں انھوں نے پبلک اور پرائیوٹ دونوں ہی سیکٹروں کی آبیاری کی گنجائش رکھی۔ چنانچہ ٹاٹا، برلا، بجاج جیسے کروڑ پتی کارخانے داروں کے کاروبار کو قومیانے کا انھوں نے کبھی منصوبہ نہیں بنایا۔ جس کی وجہ سے وہ بائیں بازو کی جماعتوں کی تنقید کا نشانہ بنے رہے۔ دنیا کی دونوں بڑی طاقتوں سوویت روس اور یونائیٹڈ اسٹیٹ آف امریکہ سے دوستانہ تعلقات کی پیش کش کی لیکن ہندوستان کو ان دونوں میں سے کسی کے زیرِ اثر ہونے سے بچائے رکھا۔ برطانیہ سے باوجود ماقبل مخاصمت کے ملک کی آزادی کے بعد انھوں نے دشمنی مول نہیں لی اور ہندوستان کا کامن ویلتھ سے تعلق باقی رہنے دیا۔ انھوں نے کسی ملک یا قوم کے خلاف نفرت کو اپنے دل میں جگہ نہ دی اور اقبال کے بقول "محبت فاتحِ عالم" پر کاربند رہے۔

پنڈت نہرو کی سیاست کا دائرہ اپنے ملک یا قوم تک محدود نہیں تھا۔ ان کی بین الاقوامی قائد ہونے کی حیثیت کسی طرح ان کے قومی قائد ہونے سے کم نہ تھی۔ بین الاقوامی سیاست کی گتھیاں ان کی دقیق رس نگاہوں کے سامنے روزِ روشن کی طرح عیاں تھیں۔ بلکہ ان کو سلجھانے کی تدبیروں پر بھی ان کی نظر تھی۔ افریقہ اور ایشیا کے پس ماندہ ملکوں اور قوموں پر ترقی یافتہ ممالک کی استحصالی استعماریت کے خلاف انھوں نے ویسی ہی بلند آواز اٹھائی تھی جیسی اپنے ملک کو انگریزوں کی حکومت سے آزاد کرانے کی۔ یہ انھیں کی دانشورانہ سیاست کا فیض تھا کہ ترقی یافتہ اور پسماندہ قوموں کے علاوہ ایک تیسری ترقی پذیر قوم کا وجود بھی تسلیم کیا جانے لگا۔

نہرو نے بہت بار اپنی سالگرہ قید خانے میں منائی۔ ہر سال گرہ انھیں اور قوم کو یہ یاد دلاتی تھی کہ زندگی کا ایک اور قیمتی سال بیت گیا۔ ایک جگہ اپنی سال گرہوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

"کبھی میری سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ میری سال گرہ اتنے دنوں بعد آتی ہے۔ کئی بار جی چاہا کہ اس بات کا مطالبہ کروں کہ میری سال گرہ جلدی جلدی ہونی چاہیے۔ اس وقت مجھے یہ خیال نہ تھا کہ ایک ایسا زمانہ بھی آئے گا جب سال گرہ بڑھتی ہوئی عمر کی یاد دلا کر اُداس کر دیا کرے گی۔"



پنڈت نہرو اور مولانا آزاد کی رفاقت

ایک جائزہ

نہرو اور آزاد کا موازنہ اگر صحیح طریقے سے اور مناسب تناظر میں کیا جائے تو تحریک آزادی کے بہترین عوامل اور آزاد ہندوستان کی نئی تعمیر کے اہم ترین عناصر کا سراغ مل سکتا ہے۔ فی الواقع نہرو اور آزاد کی باہمی رفاقت، اشتراک اور تعاون سے ہی موجودہ ہندوستان کی بنیادی پالیسیوں کا وہ نقشہ مرتب ہوا جو آج تک قومی فروغ اور ملک کے بین الاقوامی وقار کا باعث ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو جب چالیس سال کی عمر میں کانگریس کے اجلاس لاہور کے صدر ۱۹۲۹ء میں بنائے گئے تو اپنی خود نوشت میں انھوں نے اظہارِ خیال کیا:

"بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ میں کانگریس کا سب سے کم عمر صدر ہوں مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ میرے خیال میں گوکھلے جب کانگریس کے صدر ہوئے تو ان کی بھی قریب قریب یہی عمر تھی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے (اگرچہ وہ مجھ سے کچھ بڑے ہیں) اس سے بھی کم عمر میں صدارت کی۔ مگر گوکھلے ۳۷۔ ۳۸ برس کی عمر میں پختہ کار مدبروں میں شمار ہوتے تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد نے خاص اہتمام سے قابلِ احترام بوڑھوں کی سی شکل بنالی تھی جو ان کے علم وفضل کے شایانِ شان تھی مگر مجھے نہ تو لوگ مدبر سمجھتے تھے اور نہ کبھی مجھ پر علم وفضل کا الزام لگایا گیا۔"

(میری کہانی۔ ص۔ ۳۲۰)

(پروفیسر) عبدالمغنی
وارثی کنج، عالم گنج، پٹنہ ۸۰۰۰۰۷

مولانا آزاد پنڈت نہرو سے چھ سال قبل ۱۹۲۳ء میں کانگریس کے صدر بنائے گئے تھے جب ان کی عمر ۳۵ سال تھی۔ پنڈت نہرو کی پیدائش ۱۸۸۹ء میں ہوئی تھی اور مولانا آزاد کی صرف ایک سال قبل ۱۸۸۸ء میں۔ دونوں کے بچپن میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ ان کے والدوں کی شخصیت پورے ماحول پر چھائی ہوئی تھی اور وہ بڑے بارعب اور سخت گیر تھے۔ گرچہ ان کا مقصد بچوں کی بہتر سے بہتر تعلیم و تربیت اور ان کے کردار میں زیادہ سے زیادہ نظم وضبط پیدا کرنا تھا۔ آزاد اور نہرو کے ایامِ طفولیت میں ایک فرق ضرور رہا ہے، وہ یہ کہ آزاد کی ماں ان کے بچپن ہی میں رحلت کر گئی تھیں اور باپ کی سخت گیریوں کے مقابلے میں کوئی ان کی فریاد رسی کرنے والا نہ تھا جب کہ نہرو کو ماں کی شفقت حاصل تھی اور وہ ان کے دامنِ شفقت میں پناہ لیتے تھے۔ ممکن ہے نہرو کی تیز مزاجی کو بڑھانے میں اس واقعے کا بھی حصہ ہو، جب کہ آزاد کو اس طرح تند مزاجی کے اظہار کا موقع نہ ملا، اور انھیں ضبط وتحمل سے کام لینے کی مشق بچپن ہی سے ہوگئی۔ پتہ نہیں نہرو کو اپنے اور آزاد کے بچپن میں یہ فرق معلوم تھا یا نہیں۔ بہر حال ان کا یہ خیال صحیح نہیں کہ "مولانا ابوالکلام آزاد نے خاص اہتمام سے قابلِ احترام بوڑھوں کی سی شکل بنالی تھی"۔ اس کے بجائے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ بوڑھوں کی سی شکل مولانا کے "علم وفضل کے شایانِ شان تھی":

۱۹۰۰ء میں جب ان کی عمر صرف بارہ سال تھی، مولانا آزاد نے "المصباح" ہفتہ وار کی ادارت کی۔ نہرو ابھی ہندوستان میں ثانوی درجے کی تعلیم اتالیق یا اتالیقوں سے حاصل کر رہے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں جب نہرو پندرہ برس کی عمر میں لندن کے اسکول ہیرو میں داخلے کے لیے انگلستان پہنچے، مولانا آزاد لکھنؤ میں "الندوہ" کی اڈیٹری کر رہے تھے (ص: ۳۱۴، آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، بہ روایت عبدالرزاق ملیح آبادی)۔ ۱۹۰۷ء میں نہرو کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوئے جب کہ مولانا آزاد اپنے سوانح نگار مہادیو ڈیسائی کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ۱۹۰۸ء میں درحقیقت وہ عالم اسلام کی سیاحت کے سلسلے میں قاہرہ گئے تھے اور انھوں نے وہاں جامعہ ازہر کے حالِ زار کا مشاہدہ کیا تھا۔ پھر عراق اور ترکی چلے گئے تھے جہاں



مصر کی طرح "عرب اور ترک انقلابیوں سے تعلقات" قائم کرنے اور ان کی جدوجہد کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا (ص۔ ۲۰' ہماری آزادی مترجمہ محمد مجیب)۔۔ ۱۹۱۰ء میں کیمبرج سے فارغ ہوکر بیرسٹری کے امتحان کی تیاری کے زمانے میں پنڈت نہرو بھی آئرلینڈ گئے اور وہاں کے انقلابیوں کا "اثر دل پر لے کر" لوٹے (ص ۵۳' میری کہانی)

۱۹۱۲ء کی گرمیوں میں پنڈت نہرو بیرسٹری کی سند لے کر انگلستان سے واپس ہوئے اور ٹھیک اسی وقت جون ۱۹۱۲ء میں مولانا آزاد نے اپنا تاریخ ساز اور انقلاب انگیز اخبار "الہلال" جاری کیا۔ اس وقت آزاد کی عمر ۲۴ سال تھی اور نہرو کی ۲۳ سال۔

۱۹۱۶ء میں جب پنڈت نہرو لکھنؤ کانگریس میں گاندھی جی سے پہلے پہل ملاقات کر رہے تھے' مولانا آزاد کو ایک باغی کی حیثیت سے رانچی میں نظر بند کیا جا رہا تھا۔ جہاں چمپارن کی احتجاجی تحریک کے سلسلے میں اپنے دورۂ بہار کے موقع پر گاندھی جی کو ان کی خواہش کے باوجود حکومت نے مولانا آزاد سے ملنے کی اجازت نہیں دی۔ یہاں تک کہ نظر بندی کے چار سال بعد ۱۹۲۰ء میں خلافت کے مسئلے پر تبادلۂ خیال اور وائسرائے کو پیش کی جانے والی ایک یادداشت پر مشورے کے لیے دلی میں جو جلسہ ہوا' وہاں مولانا آزاد کی پہلی ملاقات گاندھی جی سے ہوئی جب کہ اس سے قبل ۱۹۱۹ء میں رولٹ بل پر ہنگامہ ہو چکا تھا۔ گاندھی جی ستیاگرہ سبھا کی بنیاد ڈال چکے تھے اور بقول پنڈت جواہر لال نہرو امرتسر میں "پہلی گاندھی کانگریس" پنڈت موتی لال نہرو کے زیر صدارت منعقد ہو چکی تھی۔ یہی وہ تاریخی موقع تھا جب کانگریس کی قیادت ہمیشہ کے لیے اعتدال پسندوں کے ہاتھوں سے نکل گئی اور احتجاجی سیاست کا وہ عوامی دور شروع ہوا جو تحریک آزادی میں عام طور پر گاندھی جی کا دور کہا جاتا ہے' حالاں کہ ترک موالات کی وہ لہر جو بعد میں عدم تعاون کے نام سے مشہور ہوئی سب سے پہلے تحریک خلافت کے محاذ سے اس طرح چلائی گئی کہ گاندھی اور آزاد یکساں طور پر اس کے بانی نظر آتے ہیں۔ ۱۹۲۰ء کے اجتماع دلی میں وائسرائے کو پیش کرنے کے لیے مرتب ہونے والی یادداشت پر مولانا آزاد نے دستخط تو دیگر رہنماؤں کے ساتھ کر دیے مگر یادداشت لے کر جانے والے وفد میں شریک نہیں ہوئے۔ ان کی رائے تھی کہ "اب معاملہ عرض داشتوں اور وفدوں کی منزل سے بہت آگے بڑھ گیا ہے۔" (ص ۲۴' ہماری آزادی)۔

وائسرائے سے مل کر ناامیدی کے بعد اگلا قدم اٹھانے کے لیے جب گاندھی جی نے اپنا احتجاجی نقشۂ عمل پیش کیا تو سب سے آگے بڑھ کر مولانا آزاد ہی نے اس کی تائید کی۔ اس کے چند ہفتے بعد میرٹھ کی خلافت کانفرنس میں پہلی بار ایک پبلک پلیٹ فارم سے گاندھی جی نے عدم تعاون کے پروگرام پر عمل کرنے کی تلقین کی اور مولانا آزاد نے اپنی تقریر میں ان کی غیر مشروط تائید کی۔ سال کے اواخر میں ستمبر میں کانگریس کے خصوصی اجلاس کلکتہ اور دسمبر میں کانگریس کے سالانہ اجلاس ناگ پور نے اس پروگرام کی توثیق کر دی۔

ہندوستان کی تحریک آزادی کا یہی وہ لمحہ ہے جب مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو دونوں بہت زور و شور سے عملی جدوجہد میں شریک ہوئے اور آزادی سے قبل ان کی مسلسل قید و بند کی زندگی کا دور شروع ہوا۔ ۱۹۲۱ء تا ۱۹۳۰ء کی دہائی میں گاندھی جی کے ساتھ ساتھ' ان کے دائیں اور بائیں جدید ہندوستان کے پردے پر جو دو نمایاں ترین سیاسی شخصیتیں کانگریس کی سطح سے ابھریں وہ یہی آزاد اور نہرو ہیں۔ آزاد کو اس دہائی کے آغاز پر ۱۹۲۳ء ہی میں کانگریس کی صدارت پہلی بار ملی اور نہرو کو دہائی کے آخر ۱۹۲۹ء میں یہ اعزاز عطا کیا گیا۔ اس کے بعد بیسویں صدی کی چوتھی دہائی سول نافرمانی اور پانچویں دہائی آزادی کے لیے برطانیہ سے ہندوستانیوں کی طرف انتقال اختیارات کے اقدامات و مذاکرات میں گزری۔ ان بیس برسوں میں جو تحریک آزادی کے نازک ترین ایام تھے۔ مولانا آزاد اور پنڈت نہرو ایک دوسرے کے شانہ بہ شانہ اور قدم بہ قدم نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ احمد نگر کے قید خانے میں ہم انھیں ایک طویل عرصے تک یکجا دیکھتے ہیں اور یہیں ان کے مشترک معمولات و مشاغل کا کچھ اندازہ مولانا آزاد کے معروف و مشہور مجموعہ مکاتیب "غبار خاطر" سے ہوتا ہے۔ یہی وہ دور ہے جس میں ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۶ء تک مولانا آزاد سات سال مسلسل کانگریس کے صدر رہے۔ یہ کانگریس کی تاریخ میں کسی ایک شخص کی پیہم صدارت کا طویل ترین عہد ہے۔



اس عہد کے طول سے بھی زیادہ اہمیت حصول آزادی کے لیے اس کے فیصلہ کُن ہونے کی ہے۔ اس عہد میں جو گویا آزادی کی تحریک میں مولانا آزاد کا عہد ہے، پنڈت نہرو ان کے قریب ترین رفیق نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ملک کے مختلف عصری مسائل پر کانگریس کے اعلیٰ کمان میں سب سے زیادہ اتفاقِ رائے اور اشتراکِ عمل انہی دونوں کے درمیان معلوم ہوتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنے اور بہت زیادہ پسند کرنے لگے تھے۔ ان کا ذاتی ارتباط جگری دوستی تک بڑھ گیا تھا۔

مولانا آزاد عمر میں پنڈت نہرو سے صرف ایک سال بڑے تھے، لیکن آزادی کی جدوجہد میں ان کی شمولیت بہت قبل ہو چکی تھی بنگال کے دہشت پسندوں کے ساتھ ان کا تعلق بیسویں صدی کے اوائل ہی میں قائم ہو چکا تھا۔ پھر الہلال اور البلاغ کے ذریعے وہ پورے ملک میں حریت کا صور پھونک چکے تھے۔ صدی کی دوسری دہائی میں ہی ان کی شہرت کا ڈنکا پورے ملک میں بجنے لگا تھا۔ اور وہ برطانوی ہند کے صفِ اوّل کے رہنماؤں میں شمار کیے جانے لگے تھے۔ چنانچہ حکومتِ وقت انھیں اربندو گھوش اور بال گنگا دھر تلک کی طرح ایک انتہائی خطرناک انتہاپسند سمجھنے لگی تھی یہی وجہ ہے کہ ایک باغی کی حیثیت سے انھیں ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۰ء تک چار سال رانچی میں نظربند رکھا گیا۔ اس کے بعد جب مولانا آزاد تحریک آزادی کے محاذ پر نظر آئے تو صفِ اوّل کے ایک قومی رہنما کی حیثیت سے اور ۱۹۲۳ء میں انھیں کانگریس کا صدر بنا کر ان کی حیثیت پر پورے ملک نے مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔

پنڈت نہرو ۱۹۱۲ء میں اپنی تعلیم مکمل کر کے انگلستان سے ہندوستان آئے اور ۱۹۲۱ء تک آزادی کی جدوجہد کے بیچ دھارے میں شامل نہیں ہوئے۔ اس کے بعد عدم تعاون کی تحریک نے ان کی زندگی کا رُخ بدل دیا اور وہ بہت تیزی سے تحریکِ آزادی کے صفِ اوّل کے قائدین میں نمایاں ہونے لگے۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۹ء میں انھیں کانگریس کا صدر بنا دیا گیا۔ واقعات کی اس ترتیب اور تجزیے سے واضح ہوتا ہے کہ آزادی کی جدوجہد میں نہرو، آزاد کے کم از کم دس سال بعد شریک ہوئے۔ اس طرح ہم عمر ہونے کے باوجود قومی زندگی میں آزاد نہرو سے بزرگ تر تھے۔ آزاد اس جہت سے گاندھی جی کے برابر تھے۔ گاندھی اور آزاد دونوں اپنی اپنی شہرتیں لے کر کانگریس میں آئے۔ ایک افریقہ سے، دوسرا بنگال سے۔ سرکار کے باغی دونوں تھے اور اسی وجہ سے عوام میں مقبول و مشہور ہو چکے تھے۔ ٹھیک جس وقت گاندھی جی شمالی بہار کے علاقے چمپارن میں قانون شکنی کر کے پورے ملک کی توجہ کا مرکز بن رہے تھے اس وقت آزاد باغیانہ سرگرمیوں کے سبب جنوبی بہار کے شہر رانچی میں نظربند ہو کر ہندوستان کی آنکھوں کا تارا بن چکے تھے۔ اس طرح آزاد، نہرو کی رفاقت تقریباً ویسی ہی ہے جیسی گاندھی اور نہرو کی۔ چنانچہ گاندھی جی اور آزاد دونوں کا رویّہ نہرو کے ساتھ یکساں نظر آتا ہے۔ دونوں نہرو کو بے حد عزیز رکھتے تھے اور مستقبل کی اُمید سمجھتے تھے۔ گاندھی جی کے بارے میں تو مشہور ہی ہے کہ انھوں نے نہرو کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا، لیکن ملک کی آزادی کے پیش خیمے کے طور پر عبوری حکومت کی تشکیل سے ذرا قبل ۱۹۴۶ء میں مولانا آزاد نے سات سال تک نازک ترین لمحات میں کانگریس کی کشتی کی ناخدائی کرنے کے بعد مستقبل کی حکمراں جماعت کی صدارت سے الگ ہو کر پنڈت نہرو کے لیے کیوں جگہ خالی کر دی؟ یہ معلوم ہے کہ انتقالِ اختیارات کے لیے برطانوی کیبنٹ مشن کے پلان کو منظور بھی انھوں نے ہی کرایا مگر ٹھیک اسی وقت وہ کانگریس کی صدارت سے علاحدہ ہوئے اور پنڈت نہرو کو صدر ہونے کا موقع ملا، حالاں کہ مولانا آزاد کی صدارت و قیادت پر کانگریس کے رہنماؤں اور سیاسی حلقوں کو عام طور پر اعتماد تھا۔ لوگوں نے چاہا بھی کہ مولانا آزاد حسبِ دستور صدر رہیں۔ حتیٰ کہ جب مولانا صدارت کے عہدے سے رخصت ہونے لگے تو عام حالات میں ان کے مخالف سردار ولبھ بھائی پٹیل نے ان کی عظیم الشان خدمات کو باضابطہ ایک تجویز کے ذریعے خراجِ عقیدت پیش کیا۔ مولانا آزاد اگر اس وقت کانگریس کی صدارت سے استعفیٰ نہ دیتے تو ظاہر ہے کہ عبوری کابینہ کے سربراہ وہی ہوتے اور انھیں ہندوستان کا وہ نقشہ بنانے کا موقع ملتا جو ان کے ذہن میں تھا۔ یہ نقشہ ایک غیر منقسم ہندوستان کا تھا۔ جس کیبنٹ مشن پلان پر ہندوستان کی وزارت بن رہی تھی وہ خود مختار صوبوں کا ایک وفاق تجویز کرتا تھا۔ پھر مولانا آزاد جیسے دُوراندیش مدبر نے ۱۹۴۶ء میں



کانگریس کی صدارت سے علاحدگی کیوں اختیار کی؟ میں سمجھتا ہوں کہ تحریک آزادی کے اہم ترین سوالوں میں یہ ایک نہایت پُراسرار سوال ہے، جس کا کوئی جواب آج تک نہیں دیا گیا۔ خود مولانا نے جو جواب دینے کی کوشش کی ہے وہ یہ ہے:

" اس مسئلے کے ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد میں بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ چوں کہ میں ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۶ء تک سات سال صدر رہ چکا ہوں اس لیے مجھے ریٹائر ہو جانا چاہیے۔ اس بنا پر میں نے فیصلہ کیا کہ اپنا نام تجویز کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ دوسری بات یہ طے کرنا تھی کہ میرا جانشین کون ہو۔ مجھے اس کی فکر تھی کہ میرے بعد جو صدر ہو، وہ میرے نقطۂ نظر سے متفق ہو اور اسی پالیسی پر عمل کرے جسے میں نے اختیار کیا تھا۔ اس کی موافقت اور مخالفت میں تمام دلیلوں کو جانچنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ جواہر لال کو صدر ہونا چاہیے۔"

(ص، ۱۰-۹-۳۰۔ ہماری آزادی)

یہ اصل سوال کا جواب نہیں ہے۔ اس سیاق و سباق میں مولانا نے جو کچھ کہا ہے، اس سے صرف یہ اشارہ کسی جواب کے سلسلے میں ملتا ہے کہ کچھ لوگ مولانا کا جانشین سردار پٹیل کو بنانا چاہتے تھے۔ حتیٰ کہ گاندھی جی کا میلان بھی اس وقت سردار پٹیل ہی کی طرف تھا۔ لہٰذا مولانا آزاد نے سبقت کر کے اپنی علاحدگی اور اپنی جانشینی کے لیے پنڈت نہرو کو پسند کرنے کا اعلان کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گاندھی جی خاموش ہو گئے اور پنڈت نہرو کے نام پر اجماع ہو گیا کانگریس کے دوسرے لیڈروں کی بہ نسبت نہرو کی طرف آزاد کا میلان بہت پہلے سے تھا اس کا ایک بیان ۱۹۲۳ء میں بہ حیثیت صدر مولانا کی کانگریس کی مجلسِ عاملہ کی تشکیل کے سلسلے میں اس طرح درج ہوا ہے:

" ایک نمایاں شخص جنھیں ڈاکٹر راجندر پرشاد کی کمیٹی میں شامل نہیں کیا گیا تھا جواہر لال نہرو تھے۔ وہ اس وقت سے الگ رہے تھے جب کہ سبھاش چندر بوس نے گاندھی جی سے اختلاف ہونے کی بنا پر کانگریس کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ میں جواہر لال کو کمیٹی میں واپس بلا لایا۔"

(ص، ۷۱۔ ہماری آزادی)

ان بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ گاندھی جی کی طرح مولانا آزاد نے بھی پنڈت نہرو کو اپنا جانشین تجویز کر کے مستقبل کے ہندوستان یا ہندوستان کے مستقبل کے لیے ان سے اُمیدیں وابستہ کیں۔ اگرچہ اس تجویز اور وابستگی کے محرکات میں گاندھی اور آزاد کے درمیان اختلاف ہو سکتا ہے۔ گاندھی جی کا معاملہ عمر کا بھی ہے اور اقتدار سے الگ رہنے کی پالیسی کا بھی۔ جب کہ مولانا آزاد کے سامنے ان دونوں میں سے کوئی بات نہیں تھی، وہ نہرو کے ہم عمر بھی تھے اور ان کے ساتھ اقتدار میں شریک بھی ہوئے۔ لہٰذا ان کا محرک کسی اور چیز میں تلاش کرنا ہوگا۔ سردار پٹیل کو پسند نہ کرنے کی بات بالکل شخصی اور منفی ہے۔ جب کہ مولانا آزاد کے فیصلے غیر شخصی اور مثبت بنیادوں پر ہوا کرتے تھے۔ نہرو سے انھیں یقیناً کچھ مثبت توقعات تھیں، لیکن یہی توقعات وہ اپنے آپ سے بھی کر سکتے تھے۔ پھر کیا وجہ ہوئی کہ آزادی کی منزل تک پہنچنے کے لیے جس منصوبے کو انھوں نے اختیار کیا اور اپنے رفقائے کار سے منظور کرایا اس پر عمل درآمد کے لیے خود آگے نہیں بڑھے بلکہ عین وقت پر پیچھے ہٹ گئے؟ اس گہرے نازک اور پیچیدہ سوال کا جواب آزاد کی تحریروں میں کہیں نہیں ملتا۔ ایسی حالت میں کسی دوسرے شخص کے لیے جواب کی تلاش بہت مشکل اور اس میں کامیابی سخت دشوار ہے۔ بہرحال، آزاد نے نہرو کی شخصیت کا جو مطالعہ کیا اس کے بین السطور میں چند اشارات کی جستجو کی جا سکتی ہے: "غبارِ خاطر" کا ایک اندراج ہے:

" نیند میں بڑبڑانے کی حالت بھی عجیب ہے۔ یہ عموماً ان طبیعتوں پر طاری ہوتی ہے جن میں دماغ سے زیادہ جذبات کام کیا کرتے ہیں۔ جواہر لال کی طبیعت بھی سرتاسر جذباتی واقع ہوئی ہے اس لیے خواب اور بیداری دونوں حالتوں میں جذبات کام کرتے رہتے ہیں۔"

(ص ۵۲-۵۱۔ مرتبہ، مالک رام، طبع ثانی، ۱۹۸۳)

ہماری آزادی (انڈیا ونس فریڈم) کا حسب ذیل اندراج آزاد کے بعد نہرو کے عہدۂ صدارت پر جانشین ہونے کا ایک جائزہ ہے:

" جواہر لال میرے عزیز ترین دوست ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کی قومی زندگی کو ترقی دینے میں کسی سے کم حصّہ نہیں لیا ہے، انھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے محنت کی ہے اور تکلیفیں اُٹھائی ہیں اور آزادی کے بعد وہ



ہمارے قومی اتحاد اور ترقی کی علامت بن گئے ہیں، پھر بھی مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ کبھی کبھی اپنے جذبات کی رو میں بہہ جاتے ہیں، یہی نہیں بسا اوقات وہ معاملوں کے خالص نظری پہلو سے اس درجہ متاثر ہوتے ہیں کہ واقعی صورت حال کا صحیح اندازہ نہیں کر پاتے۔"

(ص ۔ ۳۲۴)

ان بیانات سے نہرو کے متعلق آزاد کے حسب ذیل خیالات معلوم ہوتے ہیں:

اول: نہرو کے مزاج میں جذباتیت ہے جس کا اظہار ان کے تمام کاموں میں ہوتا ہے۔

دوم: نہرو بہت زیادہ مثالیت پسند ہیں اور بسا اوقات حقیقت پسندی سے کام نہیں لیتے۔

سوم: ملک کی آزادی کے لیے ان کی قربانیاں کسی سے کم نہیں۔

چہارم: وہ آزاد کے عزیز ترین دوست ہیں۔

پنجم: وہ آزاد ہندوستان کے اتحاد و ترقی کی علامت ہیں۔

ان میں اول، دوم، اور چہارم بالکل شخصی تبصرے ہیں اور اول و دوم آزاد و نہرو کے مزاجوں کے اختلاف پر مبنی کہے جا سکتے ہیں لیکن سوم اور پنجم کی اہمیت اجتماعی و قومی ہے، خاص کر پنجم ہی وہ نکتہ ہے جو آزاد کی نگاہ میں کانگریس کے دوسرے رہنماؤں پر نہرو کی ترجیح کا سبب بتایا جا سکتا ہے۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ اسی سبب کے نتیجے میں نہرو کو آزاد نے اپنا عزیز ترین دوست سمجھا۔ اس طرح نہرو کی شخصیت میں دوسرے تمام انسانوں کے مانند بعض کمزوریاں کے باوجود آزاد نے جدید ہندوستان کے لیے ان کی اہمیت کا ایک تصور ایک معروضی مطالعے کی بنیاد پر قائم کیا، جو فی الواقع آزاد کے طرزِ فکر کا طرۂ امتیاز ہے۔ ہم بآسانی یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ آزاد کے ذہن کی معروضیت نے نہرو کے دماغ کی موضوعیت کو اس طرح پسند کیا کہ برقِ آزادی کے مثبت اور منفی تار ایک دوسرے سے مل گئے اور ان کے اس تال میل سے وہ روشنی پیدا ہوئی جس نے آزاد ہندوستان کے نقشے کو منور کیا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہمارے اس سوال کا جواب ہو سکتا ہے کہ آزادی کی طویل جدوجہد کے بعد حصول اقتدار کے وقت آزاد نے نہرو کے لیے جگہ کیوں خالی کی؟ لیکن اس جواب میں ایک ایسی بات بھی شامل کی جانی چاہیے جس کا پورے فسانے میں کہیں ذکر نہیں، حالانکہ وہ نوشتۂ دیوار کی طرح تحریک آزادی کے آخری ایام میں بالکل نمایاں ہو چکی تھی اور آزاد جیسا حقیقت پسند اُسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ کانگریس کے ایک قوم پرست تنظیم ہونے اور آزادی کی پوری جدوجہد میں قوم پرستی پر اصرار کرنے کے باوجود ملک کی تقسیم دو قومی نظریے کی بنیاد پر ہوئی جسے عملاً لیگ کے ساتھ کانگریس نے بھی بالآخر تسلیم کر لیا۔ جب کہ مولانا آزاد آخری لمحے تک اس کی مخالفت کرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ اس واقعے کے جو آثار نظر آئے انھیں مولانا نے یقیناً بھانپ لیا ہوگا اور شدت سے محسوس کیا ہوگا کہ وہ اب کانگریس کی صفوں میں اقلیت کے ایک فرد سمجھے جائیں گے۔ لہٰذا انھوں نے خود وزیر اعظم بننے کے بجائے اکثریت کے ایک فرد کو وزیر اعظم بننے کا موقع دینا پسند کیا، جو ان کے خیال میں کانگریس کے دوسرے سب رہنماؤں سے زیادہ روشن خیال تھا اور جس کے بارے میں انھیں اعتماد تھا کہ ملک کی پالیسی اور پروگرام کی تشکیل میں ان کے مشوروں کو زیادہ سے زیادہ وزن دے گا۔

آزاد کا یہ اعتماد مجروح نہیں ہوا اور نہرو سے ان کی توقع پوری ہوئی۔ نئے ہندوستان کی داخلہ و خارجہ پالیسیوں پر آزاد کی سیاسی بصیرت کی چھاپ بہت گہری ہے۔ دستورِ ہند کے بنیادی حقوق میں بلا امتیاز مذہب و ملت ہر طبقے کو اس کے عقیدے اور طریقے کے جو تحفظات دیے گئے ہیں ان کی تہہ میں آزاد کا ہاتھ بھی کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ معلوم ہے کہ نہرو کی وزارتِ عظمیٰ میں آزاد ایک اہم ترین وزیر کابینہ کی حیثیت سے حکمراں جماعت کے اندرونی معاملات کی نگرانی زندگی کے آخری لمحے تک کرتے رہے۔ حکومت کی سطح پر بھی آزادی کے ہنگامہ خیز ابتدائی ایام میں بہت ہی پیچیدہ و نازک قومی مسائل کے حل پر آزاد کا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ فرقہ پرستی کا جو زہر پھیل چکا تھا اس کا فوری تریاق نہ آزاد کے پاس تھا نہ نہرو کے پاس۔ لیکن پہلے وزیر اعظم کی حیثیت سے نہرو نے اعلیٰ قومی و سیاسی سطح پر جو روایت بنائی اس سے ہر فرقے کی آبرو مندانہ زندگی کے لیے ایک فضا بنی اور انتظامیہ کی بے شمار کوتاہیوں اور زیادتیوں کے باوجود ہر طبقے کو اپنی تہذیب کے تحفظ کے لیے جدوجہد کرنے کا موقع ملا۔ اس موقعے کی فراہمی میں کم و



بیش دس سال تک آزاد ہندوستان میں آزاد کا شریکِ اقتدار اور نہرو کا قریب ترین رفیقِ کار رہنا ایک مفہوم رکھتا ہے۔

سیاسی سطح پر آزاد اور نہرو کی رفاقت نے ملک کی آزادی اور تعمیرِ نو کی مہم سر کی۔ گاندھی جی کا عدم تشدد جابر غیر ملکی حکومت کو پریشان کرنے کا ایک حربہ تھا۔ جب کہ ملک کی آزادی اور تعمیرِ نو کے لیے ایک مثبت اور جامع نصب العین درکار تھا جو ظاہر ہے کہ خون کو گرمانے والے چند نعروں سے نہیں حاصل ہو سکتا تھا۔ اس کے لیے ایک مضبوط اور محیط ذہن کی ضرورت تھی تاکہ تاریخی شعور اور تہذیبی تصور کے ساتھ مرتب ہونے والا ایک قابلِ عمل نظامِ فکر عصرِ حاضر کے ہندوستان کو میسر آئے اور اس کے محور پر ساری کوششوں کو مرکوز کیا جائے۔ خوش قسمتی سے تحریکِ آزادی کو ذہن کی یہ قوت آزاد اور نہرو کی شخصیتوں کے اس مرکب سے ملی جس کے دونوں اجزاے ترکیبی ایک دوسرے کا تکملہ تھے۔ نہرو اور آزاد دو مختلف پس منظروں سے تاریخ کے پردے پر نمودار ہوئے۔ نہرو کا ماحول سراسر مغربی تھا۔ اور آزاد کا یکسر مشرقی۔ دونوں کی تعلیم و تربیت میں بھی جدید اور قدیم کا فرق ہے۔ اس سے بھی بڑا فرق یہ ہے کہ آزاد کا مطمحِ نظر دینی تھا اور نہرو کا لادینی۔ نہرو قوم پرستی کے ساتھ ساتھ اشتراکیت کی طرف مائل تھے جب کہ آزاد نے اسلام کے حوالے سے وطن دوستی کی راہ اختیار کی تھی۔ ان باہمی اختلافات کے باوجود آزاد اور نہرو کی فکری ہم آہنگی ایک وسیع انسان دوستی پر مبنی تھی۔ یہی وہ نقطۂ مشترک ہے جس پر آزاد اور نہرو دونوں متحد ہو کر گاندھی جی کے ساتھ وابستہ ہو جاتے اور تحریکِ آزادی کی نظریاتی قیادت کا ایک مثلث بناتے ہیں۔

بہر حال، یہ بات اپنی جگہ رہتی ہے کہ اس مثلث میں اگرچہ اقدام و عمل کا سررشتہ بالعموم گاندھی جی کے ہاتھ میں رہا۔ مگر فکر و نظر کا عنصر آزاد و نہرو کی ذہانت نے فراہم کیا۔ اس ذہانت کے دونوں عوامل کے باہمی اختلافات جو بھی ہوں انھوں نے مل کر ایک ترقی پذیر قومیت کا نقشہ مرتب کیا جو ۱۹۲۰ء سے ۱۹۵۸ء تک تقریباً چالیس سال قومی تحریک کا اساسی نصب العین بنا رہا اور بعد کے برسوں میں بھی آزاد ہندوستان کی زندگی کا کارواں اسی نصب العین کی متعین کی ہوئی منزل کی طرف گامزن رہا۔ اس نقشے اور نصب العین کے چند بنیادی اجزا حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ سیکولرزم کا ایک خالص ہندوستانی مفہوم متعین کیا گیا جو اس اصطلاح کے اصل مفہوم پر ایک اضافہ ہے۔ مغرب کی مسیحی دنیا میں کلیسا اور ریاست کی جنگ میں کلیسا کو شکست ہوئی تو پوری اجتماعی زندگی سے مذہب کو بے دخل کر دیا گیا اور ریاست کے ساتھ ساتھ سماج بھی لادین ہو گیا۔ لیکن جمہوریۂ ہند میں صرف ریاست مذہب کے معاملے میں غیر جانب دار ہو گئی اور اس نے تمام مذاہب کے یکساں احترام کی پالیسی اختیار کی، جس کے نتیجے میں سماج پر مذہب کا اثر باقی رہا۔

۲۔ ہندوستانی معیشت پنج سالہ منصوبوں اور بعض صنعتوں اور اداروں کے قومیا لیے جانے کے باوجود ایک آزاد اور مخلوط معیشت رہی اور ریاست کی مکمل اشتراکی اجارہ داری اس پر مسلط نہیں ہوئی۔

۳۔ مغربی ایشیا کے مسلم ممالک کے مسائل میں ہندوستان نے یورپ اور امریکہ کے برخلاف مسلم ممالک کی مطلق حمایت کی، جس کے سبب ہندوستان خارجہ سیاست میں بین الاقوامی سطح پر ایک قوت بن کر ابھرا اور اسے غیر جانب دار ممالک کی ایک تیسری طاقت کا محاذ کھڑا کرنے کا موقع ملا۔ جس نے امریکہ اور روس کے درمیان ناوابستگی کو فروغ دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہند ایرانی تہذیب نے پچھلے ہزار سال کے تاریخی عمل میں جو طرزِ حیات برصغیر ہندوستان میں پیدا کیا، اس کے بہترین نمائندے عصرِ حاضر اور کانگریس کی صفوں میں مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو ہی تھے۔ یہ حقیقت ان دونوں کے اپنے اپنے طرزِ ادب میں بھی نمایاں ہے۔ آزاد اور نہرو اپنی اپنی جگہ صاحبِ طرز ادیب تھے۔ آزاد کا شمار اُردو کے منفرد اور ممتاز ترین نثر نگاروں میں ہے۔ "غبارِ خاطر" اور "ترجمان القرآن" میں انھوں نے نمونے کی نثر لکھی ہے۔ نہرو انگریزی کے معروف و مقبول مصنف ہیں اور ان کے اسلوبِ نگارش کا موازنہ دورِ حاضر کے سب سے بڑے انگریزی ادیب جارج برنارڈ شا کے اسلوبِ نگارش سے کیا جا سکتا ہے۔ دونوں کے درمیان کافی مشابہت ہے۔ "ڈسکوری آف انڈیا" اور "گلیمپسز آف ورلڈ ہسٹری" میں نہرو کی

نثر اپنے عروج پر ہے۔ زبان کے اختلاف کے باوجود اگر آزاد اور نہرو کے اسالیب کا موازنہ کیا جائے تو دونوں کے درمیان شوکت و نفاست کی قدریں مشترک نظر آئیں گی۔

یہ قدریں درحقیقت آزاد اور نہرو کی شخصیتوں کا اشاریہ ہیں۔ ان شاندار شخصیتوں کا جمال و جلال ان کے چہروں کے نقوش اور لباس کے سلیقے نیز رفتار و گفتار کے وقار سے عیاں ہے۔ اپنے اعلیٰ اجتماعی مقصد کے حصول کے لیے آزاد اور نہرو نے جس طرح اپنی پوری زندگی وقف کر دی، وہ خاص کر نئی نسلوں کے لیے سبق آموز ہے۔ نوجوانوں کے لیے تخیل اور شخصیت دونوں کا نمونہ آزاد اور نہرو کے پیغام اور کردار میں ہے۔

مولانا آزاد کی کتاب "انڈیا ونس فریڈم" کی باقی ماندہ تیس صفحات کے ساتھ اشاعت کے بعد حالیہ ایام میں پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کے تقابلی مطالعات بڑی بد مذاقی کے ساتھ کیے گئے اور بعض مضمون نگاروں نے بالخصوص انگریزی اخبارات و رسائل میں نہایت غلط باتیں پھیلائیں۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ آج بھی واضح ہے کہ نہرو اور آزاد کے درمیان اتنا اعتماد اور خلوص تھا کہ اپنے اوپر مولانا کی چند سخت اصولی تنقیدوں کے باوجود پنڈت جی نے مولانا کی وفات کے بعد خود ہی انڈیا ونس فریڈم کی پہلی بار اشاعت کی اجازت دے دی۔ اس واقعے سے ثابت ہوتا ہے کہ پنڈت جی نے ہرگز مولانا کی تنقیدوں کو اس رنگ میں نہیں دیکھا جس میں پنڈت جی کے بعض نئے وکیلوں نے دکھانے کی کوشش کی۔ مولانا آزاد پنڈت نہرو کو نہ صرف ذاتی طور سے بے حد عزیز رکھتے تھے بلکہ گاندھی جی کی طرح مولانا نے بھی جدید ہندوستان کے تشکیلی دور میں اقتدار کی امانت پنڈت جی ہی کے سپرد کی۔ لہٰذا تحریکِ آزادی کے آخری دور میں پنڈت جی کے بعض اقدامات پر مولانا کی تنقید کا مطلب صرف تاریخ کا ریکارڈ درست کرنا تھا، نہ کہ پنڈت جی کے کردار کو مجروح کرنا۔

واقعہ یہ ہے کہ تحریکِ آزادی سے جدید ہندوستان کی تعمیر تک مولانا آزاد اور پنڈت نہرو کی رفاقت ملک کے دو بڑے فرقوں کے درمیان مکمل قومی یکجہتی کی سب سے بڑی علامت ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے دو مختلف نظریات و عقاید رکھنے والی شخصیتیں وسیع النظری اور حقیقت پسندی سے کام لے کر مشترکہ اجتماعی مقاصد کے حصول کی کوششوں میں ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ اتفاق و اتحاد اور اشتراک و تعاون کر سکتی ہیں۔ آزاد اور نہرو کے موازنے کا سب سے بڑا سبق یہی ہے، جو آج کے ہندوستان کو سیکھنا چاہیے۔

●

نہرو شاندار صحت کے مالک تھے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے۔ وہ باقاعدگی سے کسرت کرتے تھے اور اپنے بدن کو ٹھیک ٹھاک رکھتے تھے۔ اپنی صحت کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے ایک بار کہا تھا۔ "میں صحت کے معاملے میں خوش نصیب ہوں۔ کانگریس کے کاموں کی وجہ سے مجھ پر بوجھ بھی بہت پڑا اور میرے کاموں کے اوقات میں باقاعدگی نہ رہ سکی۔ پھر بھی عام طور پر میری صحت ٹھیک ہی رہی۔ اس کا ایک سبب تو شاید یہ ہے کہ مجھے ورثے میں اچھا بدن ملا۔ دوسرے یہ کہ میں نے اس کی دیکھ بھال کی۔ بیماری، بُری صحت اور مٹاپے کو میں نے سدا ناپسند کیا ہے۔ کسرت، تازہ ہوا اور سادہ غذا کی وجہ سے میں ہمیشہ ان برائیوں سے بچا رہا ہوں۔"

جواہر لال نہرو اور سر شیخ محمد اقبال

...غیر منقسم ہندوستان کی یہ دو عظیم
...یاں ہم عصر تھیں اور دونوں اپنے نام اور کام
...ساطت سے ہمارے فکری و ثقافتی سرمایے
داخل ہو چکے ہیں۔ باوجود اختلافِ فکر و روش
دل ایک دوسرے کے بارے میں کیا خیال
تے تھے، اس پہلو پر ہنوز بھرپور روشنی نہیں
الی گئی ہے۔ پیشِ نظر مضمون میں یہی کوشش
گئی ہے۔

جواہر لال نہرو کانگریس کے لیڈر تھے
ر شیخ محمد اقبال کو ان کے دوست احباب
ے مسلم لیگ سے وابستہ کرا دیا تھا۔ بایں ہمہ ان
دلوں میں بعد المشرقین نہیں تھا۔ موقف نیز
ختلاف رائے کے باوصف اقبال کے دل
ں نہرو کے لیے نرم گوشہ تھا۔ ۶ر دسمبر ۱۹۳۳ء
و دیے گئے ایک پریس بیان میں گول میز
مذاکروں کا ذکر کرتے ہوئے اقبال نے بشمول
دیگر امور نہرو کا ذکر بھی کیا تھا ملاحظہ ہو:

I HAVE NEVER HAD THE PLEASURE C
MEETING PANDIT JAWAHAR LAL NEHR
THOUGH I HAVE ALWAYS ADMIRED HI
SINCERITY AND OUTSPOKENNESS - -
(S.A.VAHID,(ED):THOUGHTS
REFLECTIONS OF IQBAL .....KARACHI
1964 --pp-363)

(ڈاکٹر) تارا چرن رستوگی
بیرو باڑی، گوہاٹی ۷۸۱۰۱۶

یعنی پنڈت جواہر لال نہرو سے ملنے کی مسرت مجھے حاصل نہیں ہوئی ہے درآں حالیکہ میں ان کے خلوص اور صاف گوئی کا ہمیشہ معترف رہا ہوں۔ . . ."

اسی تالیف میں جواہر لال نہرو کے نام ایک مکتوب مورخہ ۲۱ر جون ۱۹۳۶ء دستیاب ہے، کچھ حصہ درج ذیل ہے:

MY DEAR PANDIT JAWAHAR LAL,

THANK YOU SO MUCH FOR YOUR LETTER WHICH I RECEIVED YESTERDAY. AT THE TIME I WROTE IN REPLY TO YOUR ARTICLES I BELEIVED THAT YOU HAD NO IDEA OF THE POLITICAL ATTITUDE OF THE AHMADIAS -- HOWEVER I AM GLAD TO KNOW THAT MY IMPRESSION WAS ERRONEOUS I MYSELF HAVE LITTLE INTEREST IN THEOLOGY BUT HAD TO DABBLE IN IT A BIT IN ORDER TO MEET THE AHMADIS ON THEIR OWN GROUND I ASSURE YOU THAT MY PAPER WAS WRITTEN WITH THE BEST OF INTENTIONS FOR ISLAM AND INDIA -- I AM EXTREMELY SORRY TO MISS THE OPPORTUNITY OF MEETING YOU IN LAHORE. I WAS VERY ILL IN THOSE DAYS AND COULD NOT LEAVE MY ROOM FOR THE LAST TWO YEARS I HAVE BEEN LIVING A LIFE PRACTICALLY OF RETIREMENT ON ACCOUNT OF COTINUED ILLNESS DO LET ME KNOW WHEN YOU COME TO THE PUNJAB NEXT ---

YOURS SINCERELY,
M.IQBAL

(ibid : pp 306-307)

یعنی:

"ڈیر پنڈت جواہر لال!
کل موصول ہوئے آپ کے مکتوب گرامی کے لیے شکر گزار ہوں۔ آپ کے مضامین کے جواب میں لکھتے وقت مجھے یقین (؟) تھا کہ آپ احمدیوں کے سیاسی ہتھکنڈوں سے بالکل ناواقف ہیں . . . بہر کیف، مسرت ہوئی کہ میرا تاثر غلط تھا۔ مجھے بھی دینیات سے کوئی خاص رغبت نہیں ہے مگر احمدیوں کا سامنا

کرنے کے لیے مجھے ان کے مقام و منزل سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔ باور فرمائیں میری تحریر کا مقصد اسلام اور ہندوستان کے بارے میں اچھے خیالات پیش کرنا ہی تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ میں لاہور میں شرفِ ملاقات حاصل نہ کرسکا۔ بیماری کے باعث ان دنوں میں کمرے سے باہر بھی نہیں آسکتا تھا۔ گزشتہ دو برسوں سے طویل علالت نے مجھے سب سے الگ تھلگ کرکے رکھ دیا ہے۔ اب جب کبھی لاہور تشریف لانے کا پروگرام ہو مجھے ضرور مطلع کیجیے۔

مخلص

محمد اقبال"

محولا فوق بیان نیز مکتوب دونوں یہ واضح ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ اقبال کل ہند کانگریس کمیٹی سے متعلق جو بھی خیالات رکھتے ہوں جواہر لال نہرو کی وہ تہہ دل سے عزت کرتے تھے اور وہ ان سے ملاقات بھی کرنا چاہتے تھے۔ غالباً اسی لیے اپنی وفات سے چند ماہ قبل اقبال نے تار دے کر اپنی رہائش گاہ پر بلایا، جس کا ذکر جواہر لال نہرو نے اپنی معروف تصنیف " DISCOVERY OF INDIA " (تلاشِ ہند) میں کیا ہے۔ سیاق و سباق کے اعتبار سے چند صفحات کی تلخیص درج ذیل ہے۔

"میں HAVALL کی اس رائے سے اتفاق کرتا ہوں کہ ہندوستان میں مذہب کو ضعیف الاعتقادی نہ سمجھنا غلط ہے۔ ہندوستانی مذہب کا اطلاق محض ایسی طرز و روش سے ہوتا ہے جو روحانی نیز معاشرتی زندگی کے مقامات و منازل سے ہم آہنگ ہوتی چلی جاتی ہے . . . .

سیاسی واقعات کچھ ایسے انداز سے رونما ہو رہے تھے کہ ہندوستان کے مسلم عوام اور مسلمانوں کا متوسط طبقہ دونوں حیران و پریشان ہونے لگے تھے۔ سر محمد اقبال نے اہم کردار ادا کرنا شروع کیا جس کا مسلم متوسط طبقے کے نوجوانوں پر خاصا اثر مرتب ہونے لگا مگر مسلم عوام نے اس کا کوئی بھرپور نوٹس نہیں لیا۔ اقبال نے نہایت پُرجوش اور وطنیت سے بھرپور نظمیں لکھیں، جو بہت مشہور ہوئیں اور ان کی خوب پذیرائی ہوئی۔ بلقان جب لڑائیوں کی لپیٹ میں آگیا تو اقبال کے موضوعات میں اسلامی موضوعات بالخصوص شامل ہوتے گئے۔ مرورِ ایام کے ساتھ اقبال کے جذبات و تصورات شدت آگیں اور سنگین ترین ہوتے گئے مگر بایں ہمہ وہ عوامی لیڈر کی حیثیت میں اُبھرنے سے ہمیشہ خاصے فاصلے پر رہے۔ اقبال شاعر تھے، دانش ور تھے۔ اور فلسفی بھی تھے مگر ان کے رجحانات و تمایلات جاگیردارانہ نظام کی گرفت میں رہے . . . اُنھوں نے قابلِ قدر شاعری پیش کی مگر اس شاعری کے پس منظر نے مسلم علم و دانش کو علاحدگی پسندانہ رخ و سمت بھی دینا شروع کیا . . . . پہلے پہل اقبال کا شمار تصورِ پاکستان کے حامیوں میں ہوتا تھا تاہم بعد کو وہ اس تصور کے خطرناک مضمرات اور نامعقولیت کے پیشِ نظر اس تصور سے دور ہونے لگے۔ ایڈورڈ تھامپسن (EDWARD THOMPSON) سے ایک گفتگو کے دوران اقبال نے بتایا کہ انھوں نے بحیثیت صدرِ مسلم لیگ اجلاس میں پاکستان کے تصور کی حمایت ضرور کی تھی مگر انھیں اس کا احساس تھا کہ اس تصور سے ہندوستان کو بالخصوص مسلمانوں کو بہت نقصان ہوگا . . . تاہم بعد کو انھوں نے اس تصور پر غور کیا ہو مگر میرے تئیں ان کا طرزِ حیات کسی مقام پر تصورِ پاکستان سے ہم آہنگ نظر نہیں آتا۔ ان کی شاعری نے بھی ایک نیا موڑ لیا۔ اپنی وفات کے چند ماہ پیشتر جب وہ بہت بیمار تھے، انھوں نے مجھے بلایا اور میں حکم بجا لایا۔ متعدد مسائل پر گفتگو سے مجھے یہی عندیہ ملا کہ باوصف اختلافات ہمارے بیشتر خیالات مشترک تھے۔ انھیں رہ رہ کر پرانی باتیں یاد آرہی تھیں اور نتیجتاً وہ ایک موضوع سے دوسرے موضوع اور تیسرے موضوع کی جانب چلے جاتے۔ میں خاموشی سے سب کچھ بغور سنتا رہا۔ میں اقبال اور ان کی شاعری دونوں کا مداح تھا۔ مجھے اس بات سے بہت مسرت ہوئی کہ وہ بھی مجھے پسند کرتے تھے اور رخصت کے وقت انھوں نے کہا تھا کہ "جناح اور تمھارے مابین کیا مشترک ہے؟ وہ سیاست کار (POLITICIAN) ہے اور تم محبِ وطن (PATRIOT)... اقبال کی رائے غالباً درست تھی۔ درآں حالیکہ میں سیاست کی گرفت میں آچکا ہوں مگر میں زیادہ سیاست کار نہیں ہوں۔"

DISCOVERY OF INDIA, CENTENARY EPRINT : pp 250,350-52)

ابھی تک درجِ ذیل تحریریں پیش کی گئی ہیں:

اقبال کا پریس بیان، مورخہ ۶ دسمبر ۱۹۳۳ء
اقبال نے کہا کہ میں جواہر لال کی صاف
ی، خلوص، دل و دماغ کی خوبیوں کا معترف
ہوں. حالانکہ ابھی تک ہماری ملاقات
ب ہوئی ہے۔

مکتوب اقبال بہ نام جواہر لال نہرو۔
مورخہ ۲۱ جون ۱۹۳۶ء

یہ مکتوب اس نقطۂ نظر سے اہم ہے کہ اقبال نے
شگاف طور پر یہ اعتراف کیا ہے کہ میں بھی دینیات
ں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا. مزید برآں اقبال
لکھا ہے کہ میرا یہ خیال ہے کہ نہرو قادیانیت
مسائل سے ناواقف ہیں، غلط ثابت ہوا مزید
ں، انھوں نے نہرو سے ملنے کے متعلق اپنی
ی خواہش کا بھی اظہار کیا ہے۔

. جواہر لال نہرو کی تصنیف DISCOVERY OF IND. میں ذکرِ اقبال کی تلخیص

ان تینوں تحریروں سے یہ ثابت ہو جاتا ہے
سیاسی موقفوں میں اختلاف کے باوجود اقبال
ے دل میں جواہر لال نہرو کے لیے نرم گوشہ
ما اور جواہر لال بھی اقبال اور اقبال کی شاعری
و پسند کرتے تھے۔

اقبال کا یہ کہنا کہ میری دلچسپی کا محور
ینیات نہیں ہے خاصی معنویت کا حامل
ہے اور یہ اعتراف اس امر کا ثبوت بھی فراہم کرتا
ہے کہ علامہ اقبال نے نہرو کے مکتوب میں
یش کردہ دلائل کو پسند کیا ہوگا۔ ورنہ وہ
ہبیات سے اپنی بے التفاتی کا ذکر کیوں کرتے۔

ہرو سے ملنے کا اشتیاق ۱۹۳۸ء کے
ائل میں زیادہ ہو گیا اور انھوں نے بذریعۂ
تار نہرو کو اپنی علالت سے مطلع کرتے ہوئے
لاہور آکر مل جانے کو لکھا۔ نہرو کے دل میں بھی
اقبال کے لیے وقعت تھی اور وہ بہ غرض
عیادت لاہور پہنچ گئے جس کا ذکر نہرو نے
اپنی معروف تصنیف ۔DISCOVERY OF
INDIA میں کیا ہے اور جس کے اقبال سے
متعلقات کو اس مضمون میں پیش بھی کیا گیا ہے۔

بغرض یاد دہانی، اقبال سے متعلق نہرو کے
خیالات بہت واضح اور تجزیاتی ہیں، جو یہ ہیں:

۱۔ اقبال تصورِ پاکستان کے مخالف تھے۔
صدر مسلم لیگ پنجاب کی حیثیت ہی میں انھوں
نے اس تحریک کی تائید کی تھی۔

۲۔ اقبال سوشلزم کی جانب متوجہ ہونے
لگے تھے۔

۳۔ اقبال کی وطنی شاعری بغایت پُرجوش
تھی، جس نے وطنیت کی تحریک کی نشو و نما
میں خاصا کردار ادا کیا۔

۴۔ بلقان میں پھوٹ پڑنے والی لڑائیوں
کا اقبال کے دل پر بہت اثر پڑا تھا اور
نتیجتاً وہ اسلامی موضوعات کی جانب متوجہ
ہوئے۔

۵۔ مسلم جاگیر دارانہ نظام سے وابستہ عناصر
نیز مسلم متوسط طبقے نے اقبال کی شاعری کو علاحدگی
پسندانہ معنی پہنائے، جس سے ملک کی فضا
مکدر ہوتی گئی۔ ان نتائج سے ڈبلو. سی. سمتھ
نے بھی اتفاق کیا ہے، ملاحظہ ہو اس کی
معروف تصنیف .ISLAM IN MODER
N HISTORY-(ص ۹۹، ۸۹، ۱۹۸)
ٹائٹس نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے،
جس کی کتاب ISLAM IN INDIA &
PAKISTAN W.A. TITUS: میں سر
شیخ محمد اقبال کے خیالات و کردار کے متعلقات
پر ۳۔۴ صفحات میں ذکر ملتا ہے۔

اقبال کا نہرو سے یہ کہنا کہ جناح سیاست
کار ہے اور تم محبِ وطن ہو لہٰذا جناح اور
تمھارے مابین کوئی قدر مشترک ہے ہی نہیں.
نہرو نے اقبال کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے
لکھا ہے کہ غالباً اقبال نے درست ہی کہا تھا کہ
سیاست کی گرفت میں پڑ جانے کے باوجود میں
کوئی سیاست کار نہیں ہوں. نہرو نے لفظ
POLITICIAN استعمال کیا ہے، جس کا
ترجمہ سیاست داں بھی کیا جاتا ہے جو مجھے صحیح
معلوم نہیں ہوتا۔ نہرو سیاست داں (ST-
-ATESMAN) تھے اور ملکی نیز بین الاقوامی
معاملات میں ان کا انہماک و مطالعہ قابلِ قدر
تھا۔ البتہ وہ سیاست کار نہ تھے یعنی ایسے شخص
جو سیاست سے ذاتی و طبقاتی فوائد حاصل
کرنے میں مہارت رکھتا ہو۔ اقبال محبِ وطن
ہونا ضروری سمجھتے تھے۔ "حبِ وطن" اقبال
کا ہمیشہ نصب العین رہا۔ اگر کسی نے ان کی شاعری
کا استحصال کرتے ہوئے تقسیم وطن کے لیے
راہ ہموار کی تو اقبال کو موردِ الزام قرار نہیں
دیا جاسکتا۔ آج بھی ہندوستان میں ترانۂ
ہندی کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہے:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

اقبال اور نہرو دونوں گول میز کانفرنس
میں شرکت کے لیے جانے والے وفود میں (مسلم
وفد اور کانگریسی وفد) شریک ہوا کرتے

تھے۔ ان کانفرنسوں میں پیش کیے گئے نوٹس NOT-ES- اور رپورٹوں (REPORTS) کا ژرف بینی سے مطالعہ کرنے پر اقبال اور نہرو کے خیالات کے بارے میں کوئی واضح نیز قابلِ توجہ خاکہ نہیں ابھرتا۔ بہرکیف اس مضمون میں ۱۹۳۳ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک کے دوران اقبال اور نہرو کے مابین مراسلت و تعلقات پر مبنی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اقبال اور نہرو کے مابین ہمیشہ خوشگوار تعلقات رہے۔ نہرو اقبال کی عظمت سے واقف تھے اور اقبال نہرو کے کردار سے۔ دونوں ہندوستان کے مایۂ ناز سپوت ہیں۔ گفتار در رفتار قلم نیز حسنِ کردار سے پیش نظر دونوں کو اپنے زمانے کا کامل کہا جا سکتا ہے:

بود در اضطراب از بہر عام ہر کامل سد
طپیدن در میان جملہ اعضا قسمت دل شد

رسومِ دہلی

مولوی سید احمد دہلوی جو فرہنگِ آصفیہ کے مرتب کی حیثیت سے آج تک یاد کیے جاتے ہیں انہی مولوی سید احمد دہلوی کی ایک اور اہم تصنیف رسومِ دہلی ہے جس میں لال قلعے کی زندگی اور ۱۹ویں صدی کی دوسری دہائی تک دلی میں رائج تمام رسوم کی تفصیل بیان ہے۔ اس موضوع پر یہ واحد کتاب ہے۔ مصنف نے دہلی کے رسم و رواج کا سائنٹفک انداز میں مطالعہ کیا ہے۔ لہٰذا ہماری آج کی سماجی زندگی میں بھی اس کتاب کی بھرپور معنویت ہے۔

کسی بھی سماج کے تہذیبی، نفسیاتی، مذہبی اور سماجی مطالعے کے لیے رسم و رواج کا مطالعہ ضروری ہے۔ ہماری بیشتر رسوم وہ ہیں جو اس وقت سے رائج ہیں جب سے انسان نے سماجی زندگی کا آغاز کیا ہے۔ ہماری ایک بھی رسم ایسی نہیں ہے جو بے وجہ ہو۔ ہر رسم کی بنیاد کسی نہ کسی مقصد پر ہے۔

ہندوستان کی موجودہ تہذیب اور رسم و رواج کی داستان ہزاروں سال پر مشتمل ہے۔ دنیا کی مختلف نسلوں، علاقوں، مذہبوں سے تعلق رکھنے والے لوگ مختلف زمانوں میں ہندوستان آتے رہے ہیں۔ ان میں سے بیشتر لوگوں نے تو اس طرح مستقل سکونت اختیار کرلی کہ ان کی نسلی اور تہذیبی انفرادیت ہی ختم ہوگئی اور بعض لوگ طویل عرصے تک یہاں رہ کر اپنے وطن واپس چلے گئے۔ ہندوستانی تہذیب کی تشکیل اور اسے پروان چڑھانے میں ان سب لوگوں نے اہم رول ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اس کتاب کو نئے انداز سے ترتیب دیا ہے۔ کتاب کے شروع میں مرتب کا طویل مقدمہ شامل ہے جس میں سید احمد دہلوی کے سوانح حیات بیان کیے گئے ہیں اور سماجیاتی نقطۂ نظر سے رسم کی اہمیت پر بحث کی گئی ہے۔

مصنف : مولوی سید احمد دہلوی
مرتب : ڈاکٹر خلیق انجم
صفحات : ۳۰۸
قیمت : ۲۰ روپے

دیوانِ حالی

مولانا حالی کے دیوان کی یہ اشاعت ان لوگوں کے لیے ایک نئی بشارت کا حکم رکھتی ہے جو کسی سے تعلق رکھتے ہیں مگر کلاسکی ... آج بھی ... اس آشوب زمانے میں بھی غزلیت شاعری کو حصول مسرت کا ... بے مثال ... سمجھتے ہیں۔

مولانا حالی کا یہ دیوان ایک اور اعتبار سے بھی ہماری توجہ کا طالب ہے۔ اس مجموعے میں ... کی ترجمان جو غزلیں ہیں ان کی سطحیت اور بے رنگی ... یہ روایت ... کہ غزلیت شاعری کو جب سماجی اور قومی اصلاح کے مضامین سے گراں بار کیا جائے گا اور اسے وعظ و پند کا ترجمان بنایا جائے گا تو یہ فائدہ خواہ حاصل ہوں یا نہ ہوں، غزل اس لطافت اور نفاست سے محروم ہو جائے گی جو اس کی امتیازی صفت رہی ہے۔ اس میں نہ تہ داری ہوگی نہ تاثیر۔

مولانا حالی کے اس دیوان میں غزلوں کے ساتھ ساتھ کچھ اور اصنافِ سخن بھی ہیں مگر ان کی حیثیت ضمنی ہے، اصل حیثیت غزلوں کی ہے اور یوں صحیح معنوں میں اس کو غزلوں کا مجموعہ کہنا چاہیے۔

اس دیوان میں مرثیۂ غالب بھی شامل ہے اور یہ واقعہ ہے کہ شخصی مرثیوں میں یہ بے مثال اور منفرد مرثیہ ہے۔ حالی نے گویا کاغذ پر کلیجا نکال کر رکھ دیا ہے۔ ان کی طبیعت کا گداز اس کے ہر شعر میں سما گیا ہے۔

دیوانِ حالی کا مقدمہ رشید حسن خاں نے لکھا ہے جو حالی کی شاعری کے مختلف پہلوؤں اور ان کے فنی نظریات پر سیر حاصل روشنی ڈالتا ہے۔

مصنف : مولانا الطاف حسین حالی
مقدمہ : رشید حسن خاں
صفحات : ۲۲۲
قیمت : ۲۲ روپے

اردو اکادمی، دہلی سے طلب کریں



ڈاکٹر عبدالعلیم کے کاغذات میں چھ صفحات پر مشتمل انگریزی میں ٹائپ شدہ ایک خط مجھے ملا جو ۲۴ ستمبر ۱۹۳۶ء کو الہ آباد سے لکھا گیا تھا۔ تاریخ کے اوپر آنند بھون درج ہے۔ یہ خط ڈاکٹر سیّد محمود کے نام ہے اور ان کے خط کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ اختتام پر پنڈت نہرو کے دستخط نہیں ہیں بلکہ

Youn's Affectionately

Sd. Jawahar lal Nehru لکھا ہوا ہے اور بائیں جانب کونے میں ڈاکٹر سیّد محمود دریا گنج۔ دہلی درج ہے۔ خط کا کاغذ نہایت خستہ حالت میں ہے۔ پنڈت نہرو کے دستخط نہ ہونے کی وجہ سے ممکن ہے کسی دل میں یہ شبہ پیدا ہو کہ یہ تحریر ان کی نہیں ہے لیکن اس کی انگریزی، اس میں ظاہر کیے جانے والے خیالات، زبان اور عالمی سیاست کے تعلق سے اس وقت کے مباحث کے حوالے اور پنڈت نہرو سے ڈاکٹر سیّد محمود اور ڈاکٹر عبدالعلیم کے تعلقات کو اگر ذہن میں رکھا جائے تو کسی قسم کا شبہ نہیں رہ جاتا کہ یہ خط پنڈت نہرو ہی کا ہے۔ لیکن اس سارے پس منظر کو زیادہ واضح کرنے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر سیّد محمود اور پنڈت نہرو ہم عمر تھے، دونوں کا سن پیدائش ۱۸۸۹ء ہے۔ دونوں کی ایک دوسرے سے ملاقات انگلینڈ میں ۱۹۰۹ء میں ہوئی تھی۔ دونوں ہی وکالت کی تعلیم حاصل

دشتِ جنوں میں ہوشمندی

عابد سہیل

معرفت نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین آباد، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸ (یو۔پی)

کررہے تھے۔ ڈاکٹر محمود سید پور بھتری، ضلع غازی پور کے ایک بڑے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ لندن جانے سے قبل ۱۹۰۸ء میں انھیں ترقی پسند خیالات اور طلبہ کی ہڑتال کی پاداش میں اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ سے خارج کردیا گیا۔ اتر پردیش کے پس ماندہ ترین علاقے سے تعلق، لندن میں اعلیٰ تعلیم اور مولانا مظہر الحق سے قربت نے وہ آمیزہ تیار کیا جس کے اجزائے ترکیبی میں مظلوموں سے محبت، وسیع فکری افق اور وطن پرستی کو دوسرے عناصر پر فوقیت حاصل تھی۔ پنڈت نہرو سے ان کی قربت کا سبب یہی تھا اور ان کی حیثیت نہرو گھرانے کے ایک فرد کی سی تھی۔ اس قربت کا ثبوت جنیوا اور برائٹن سے ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۷ء میں ان کے نام محترمہ کملا نہرو کے اردو میں لکھے ہوئے خطوط ہیں جن میں سے ایک خط میں انھوں نے ہندوستان واپس آکر ڈاکٹر محمود کی اہلیہ کے تعاون سے خواتین میں تعلیم کے فروغ اور ہندو مسلم اختلافات کو ختم کرنے کے لیے جد و جہد کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے[1]۔

۱۹۱۳ء میں انگلینڈ سے واپس آنے کے بعد ڈاکٹر محمود نے پٹنہ میں وکالت شروع کی لیکن چند ہی برسوں کے بعد مکمل طور پر سیاست کے ہو رہے۔ ۱۹۲۳ء میں وہ پنڈت نہرو کے ساتھ کانگریس کے جوائنٹ سکریٹری منتخب ہوئے اور ۱۹۲۹ء میں پارٹی کے جنرل سکریٹری بنائے گئے۔

ڈاکٹر علیم انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانیوں میں تھے۔ سولہ یا سترہ برس کی عمر میں غازی پور ضلع خلافت کمیٹی کے سکریٹری چنے گئے۔ انھوں نے ہائی اسکول کا پرائیوٹ امتحان دے کر صوبے میں دوسری پوزیشن حاصل کی تھی لیکن سرکاری وظیفہ اور ڈاکٹر ضیاالدّین کی مزید وظیفہ کی پیش کش کو مسترد کرکے جامعہ میں داخلہ لے لیا تھا جہاں سے تعلیم مکمل کرکے وہ عربی میں ڈاکٹریٹ کے لیے جرمنی چلے گئے تھے۔ برلن میں قیام کے دوران میں وہ ہندوستان ایسوسی ایشن آف سنٹرل یورپ کے صدر اور ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اس کے سکریٹری تھے۔ ۱۹۳۴ء میں انھوں نے جے پرکاش نرائن، فرید الحق انصاری، رام منوہر لوہیا اور یوسف مہر علی کے ساتھ پونا میں کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی بنیاد ڈالی تھی۔

زبان کے مسئلہ سے علیم صاحب کو گہری

---

[1] جواہر لال نہرو: بائیوگرافی۔ جلد اوّل صفحہ ۱۹۵۔ مصنف سروپلّی گوپال۔



دلچسپی تھی اور انھوں نے اس مسئلہ پر دو مضامین "ہماری قومی زبان" اور "اردو، ہندی اور ہندوستانی" لکھے تھے۔ وہ New Indian Literature کی مجلس ادارت کے بھی رکن تھے۔ مجلس ادارت کے دوسرے اراکین ڈاکٹر ملک راج آنند اور احمد علی تھے۔ یہ رسالہ علیم صاحب کے بیرو روڈ کے مکان ہی سے شائع ہوتا تھا۔

علیم صاحب کے انتقال کے اگلے دن تجہیز و تکفین کے بعد علی گڑھ سے میری روانگی کے وقت مرحوم کے داماد پروفیسر عبدالماجد صدیقی نے ایک بستہ یہ کہہ کر میرے سپرد کیا "تم ہی اس سے انصاف کر سکتے ہو۔"

یہ خط اسی بستے میں تھا۔ اس کے علاوہ علیم صاحب کے متعدد غیر مطبوعہ مضامین جو انگریزی اور اردو میں ہیں، جامعہ کے ابتدائی دور اور مسائل کے متعلق ڈاکٹر ذاکر حسین، شفیق الرحمٰن قدوائی اور سعد اللہ انصاری کے چند خطوط جو انھیں برلن بھیجے گئے تھے۔ برلن میں علیم صاحب کے بنک کے کاغذات، ان کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ، انجمن ترقی پسند مصنفین سے متعلق متعدد سائکلواسٹائل کاغذات، چند کتابیں، وہ مقالہ جو انھوں نے ۱۹۳۶ء میں انجمن کی افتتاحی کانفرنس میں پڑھا تھا اور غالباً اب تک غیر مطبوعہ ہے اور ان کے چند بالکل نجی کاغذات اور خطوط تھے۔

ڈاکٹر علیم پنڈت نہرو سے تقریباً پندرہ سال چھوٹے تھے لیکن افکار و خیالات کی ایک ہی دنیا میں سفر کرنے کے سبب بقول عشرت علی صدیقی صاحب دونوں میں "دوستانہ اور برابری" کے تعلقات تھے جو پنڈت نہرو کی زندگی کی آخری سانسوں تک قائم رہے اور جن کا احترام محترمہ اندرا گاندھی نے ساری زندگی کیا۔

پنڈت نہرو اور علیم صاحب کی قربت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ جب ۱۹۲۷ء میں ہفت روزہ 'ہندوستان' شائع ہوا تو علیم صاحب اس کے منیجنگ ڈائرکٹر مقرر کیے گئے۔ اچاریہ نریندر دیو اور رفیع احمد قدوائی اس کے ڈائرکٹر تھے۔ علیم صاحب کا نیں روڈ کا مکان ہی 'ہندوستان' کا دفتر تھا اور حیات اللہ انصاری صاحب اخبار کے ایڈیٹر۔ Tabloid سائز کے ۸ صفحات کا یہ اخبار ۱۹۴۲ء تک جاری رہا۔ اس ہفت روزہ کو "قومی آواز" کے پیش رو کی حیثیت حاصل ہے۔ دسمبر ۱۹۴۵ء میں جب قومی آواز جاری ہوا تو 'ہندوستان' کا سارا ادارتی عملہ اس میں کام کرنے لگا۔

۱۹۳۶ء جو ہندوستان کی تاریخ میں ترقی پسند خیالات اور رجحانات کے عروج کا سال ہے، رجعت پرستی اور "لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو" کے ہم نواؤں کے لیے بھی نئے زمین و افق کی جستجو کا نقطۂ آغاز ہے۔

پنڈت نہرو کا عالمی نقطۂ نظر اور سوشلسٹ رجحانات ہندوستان کی سیاست میں گہرائی تک پیوست ہوتے جا رہے تھے۔ کانگریس سوشلسٹ پارٹی اور حد یہ ہے کہ کمیونسٹ پارٹی تک اس وقت کانگریس کے اندر رہ کر ہی سرگرم عمل تھیں۔ زبان کا مسئلہ جو کانگریس اپنے طور پر طے کر چکی تھی بار بار سر اٹھا رہا تھا اور غلط فہمیوں کے سیاہ بادلوں نے ان دونوں زبانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

گمان غالب یہ ہے کہ ڈاکٹر سید محمود سے جن سے علیم صاحب کی رشتہ داری نہیں تو قرابت ضرور تھی، پنڈت نہرو سے ان کی قربت، زبان کے مسئلہ سے ان کی دلچسپی، انجمن ترقی پسند مصنفین میں ان کی حیثیت کے پیش نظر پنڈت نہرو نے خط کی یہ نقل ان کو بھیجی ہوگی۔ اس خط کی اصلیت کے بارے میں علیم صاحب کو ذرا بھی شک و شبہ ہوتا تو وہ اسے اس قدر سنبھال کر نہ رکھتے۔

پنڈت نہرو کو جس قدر میں نے جانا، سنا اور پڑھا ہے اس کے پیش نظر مجھے اس خط کی اصلیت کے بارے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ اس کا ایک ایک لفظ، فقرے کی ایک ایک لہر پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ ان کی تحریر ہے۔

اب کچھ اس ترجمے کے بارے میں:

اس خط کا ترجمہ خاصا مشکل کام ثابت ہوا۔ کئی الجھنیں پیش آئیں۔ پہلی مشکل لفظ You کے ترجمے سے متعلق تھی۔ تم لکھا جائے یا آپ۔ پنڈت نہرو کی شرافتِ نفس اور شائستگی متقاضی تھی کہ "آپ" مناسب ہوگا، لیکن ڈاکٹر محمود سے ہم عمری اور دونوں کے تعلقات کی نوعیت کا مطالبہ "تم" کے حق میں تھا۔ آخر اس مشکل کا حل سرنامے سے نکل آیا جس میں "مائی ڈیر محمود" لکھا گیا ہے "مائی ڈیر محمود صاحب" نہیں۔ انگریزی کم بیانی (Under Statement) کی زبان ہے جس میں اشاروں کنایوں میں بہت کچھ کہہ دیا جاتا ہے اور سخت سے سخت بات بھی



کہنے کے لیے نہ زبان بگاڑنے کی ضرورت پڑتی ہے نہ ذہن۔ سیاسی اور لسانی مناقشوں کی بحث نے اس مشکل میں اضافہ کر دیا۔

کوشش یہ تھی کہ ہر جملے کی روح بھی برقرار رہے اور ترجمہ اُردو اظہار کے لیے اجنبی بھی نہ ہو۔ جہاں بھی یہ خیال ہوا کہ مافی الضمیر پوری طرح ادا نہیں ہو پایا ہے جملے کے اثر کو مطابقِ اصل بنانے اور انھیں جوڑنے کے لیے بریکٹ میں مناسب عبارت لکھ دی گئی ہے۔ انگریزی میں اسمِ معرفہ کے ابتدائی حروف بڑے لکھے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی نکتے پر زور دینے کے لیے بھی ایسا کیا جاتا ہے۔ اردو رسم خط کو یہ سہولت حاصل نہیں۔ چنانچہ Nationalist India کا ترجمہ قوم پرست ہندوستان کرتے وقت ان الفاظ کے نیچے لکیر کھینچ دی۔ بعض مقامات پر احساس ہوا کہ انگریزی محاورہ یا طریقِ اظہار پوری طرح منتقل نہیں ہو پایا ہے، یا یہ کہ موقف کا اظہار انگریزی میں جس اصرار یا شائستگی سے کیا گیا ہے اس کے سارے رنگ ترجمے میں نہیں آپائے ہیں تو انگریزی عبارت بھی نقل کر دی گئی ہے۔ مثلاً I am afraid اور All the King horses and all the King's man چند مختصر حواشی جو ناگزیر محسوس ہوئے، ترجمہ میں شامل کر دیے گئے ہیں۔ یہ اصل خط کا حصہ نہیں ہیں۔

مجھے احساس ہے کہ ترجمہ اس "جرأتِ انکار" اور "حرفِ حق" سے عاری ہے جو انگریزی خط میں جاری و ساری ہے لیکن اسے مزید چمکانا اور مطابقِ اصل بنانا اس وقت میرے لیے ممکن نہیں۔ چند حوالے جو ۱۹۳۶ء میں کسی وضاحت کے محتاج نہیں تھے آج تشریح طلب ہیں لیکن طوالت میں اضافے کے خوف سے اس سے احتراز کیا گیا ہے اور یہ بھی امید ہے کہ اس خاص نمبر کے دوسرے مضامین سیاق و سباق فراہم کرکے اس خط کے ہر جملے اور ہر تصور کی معنوی تہوں کو آشکارا کر دیں گے۔

اب خط ملاحظہ کریں:

آنند بھون

الہ آباد، ستمبر ۲۴، ۱۹۳۶ء

مائی ڈیر محمود

مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھے اردو۔ ہندی قضیئے پر جو بحث اور کشمکش کچھ دنوں سے جاری ہے اس کی جانب متوجہ کیا ہے۔ میں نے اس قضیئے کے بارے میں سنا تھا لیکن متعدد دوسری مصروفیات کی وجہ سے اس کی طرف توجہ نہ دے سکا تھا (اور) اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا I am afraid کہ اب بھی یہ مسئلہ مجھے مشتعل نہیں کر پا رہا ہے۔ مجھے تو ایک ایسی دنیا میں جو زبردست اذیت[1] میں مبتلا ہے اور جسے ایسے بڑے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جو ہمارے ملک کے مستقبل بلکہ اس میں بسنے والے کروڑوں لوگوں اور خود تہذیب و تمدن کو خطرے میں ڈالے ہوئے ہیں، یہ ایک غیر حقیقی مسئلہ معلوم ہوتا ہے۔ میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان لوگوں کو جو ہندی۔ اردو مسئلے پر طیش میں آجاتے ہیں، ان بڑے اور زیادہ اہم مسائل کا کوئی تصور ہی نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پورے جنگل کو نظر انداز کرکے وہ اپنی توجہ صرف چند فضول سے درختوں پر صرف کر رہے ہیں۔

مسائل کو دیکھنے اور سمجھنے کا میرا طریقہ بالکل مختلف ہے۔ (اس وقت) دنیا میں سب سے اہم مسئلہ وہ خوں ریز جدو جہد ہے جو ترقی اور رجعت پرستی کے درمیان جاری ہے۔ یہ جدو جہد دنیا کے ہر حصے میں مختلف صورتوں اور طرح طرح کے بھیسوں میں ملتی ہے ___ اسپین میں، فلسطین میں، ہندوستان میں۔ آج اسپین میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے نتائج کا دنیا پر اور حد یہ ہے کہ ہندوستان تک پر، شاید کسی اور چیز سے زیادہ ہی اثر پڑے گا۔ میں (اسپین کے واقعات سے) اسی طرح پریشان ہوں جس طرح فلسطین کے عربوں کو کچل ڈالنے کی برطانوی سامراج کی کوششوں سے۔ یہ سب کچھ، جس میں ہندوستان کی جدو جہدِ آزادی بھی شامل ہے، میرے لیے تصویر کے ایک ہی رخ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور جب میں اس دیوپیکر منظر نامے پر جو ہر وقت متبدل ہے نظر ڈالتا ہوں تو وہ بہت سی چھوٹی چھوٹی چیزیں جو مجھے پریشان کرتی رہتی ہیں، اپنی اہمیت کھو بیٹھتی ہیں۔

اب ہندوستان کو لو۔ اہم مسئلہ غربت

---

[1] ۱۱ر ستمبر کو ایک اخباری بیان میں پنڈت نہرو نے کہا تھا "اسپین میں حالات جو رخ اختیار کر رہے ہیں اس نے مجھے سخت ذہنی اذیت اور کوفت میں مبتلا کر رکھا ہے۔"

اور بے روزگاری کا ہے، باقی سب کچھ ذیلی اہمیت کا ہے' اور (اول الذکر) مسائل کے حوالے ہی سے ان پر غور کیا جا سکتا ہے۔ مسائل کو دیکھنے کا میرا طریقہ یہ ہے اور میرے خیال میں یہی درست بھی ہے۔ لیکن بیشتر دوسرے لوگوں میں مسائل کو اس طرح دیکھنے کی صلاحیت حیرت انگیز طور پر مفقود ہے۔ ان میں وہ لوگ خاص طور پر شامل ہیں جو ہندی اور اردو کے بارے میں باتیں کرتے اور اپنا زورِ قلم صرف کرتے ہیں۔ زبانیں اور ادب اس وقت پھلتے پھولتے ہیں جب عوام پھلتے پھولتے ہیں اور جب انھیں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی آزادی ہوتی ہے۔ بھک مری کے شکار، مفلسی کے مارے ہوئے اور غلام لوگوں کے لیے وہ سطحی کلچر کیا معنی رکھتا ہے جو ان تک پہنچتا بھی نہیں؟

میں یہ چاہتا ہوں کہ ہمارے دوست مسئلے کو اس نقطۂ نظر سے دیکھیں۔

میری ایک پریشانی اور ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ اس مسئلے پر غیر جذباتی اور عالمانہ انداز سے غور نہیں کر رہے ہیں اور ان کے دل و دماغ میں سے شکوک و شبہات اور جانبداری نے گھر کر لیا ہے۔ ان کا مشغلہ غلطیاں تلاش کرنا، ہر فعل کو بدنیتی پر محمول کرنا، تہمتیں لگانا اور سازشیں سونگھنا ہے۔ اس سلسلے میں خود میری نیت پر شبہ کا اظہار کیا گیا ہے۔ سچ پوچھیے تو اس سلسلے میں اظہارِ خیال کرنے سے میری ہچکچاہٹ کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اگر میری نیت ہی مشکوک ٹھہری تو میری بات کی اہمیت کیا ہوگی۔ لیکن اس بارے میں لوگ میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں مقابلتاً بہت کم اہمیت کا حامل ہے اور جب میں یہ سوچتا ہوں کہ گاندھی جی کی نیت تک پر زبردست حملے کیے گئے ہیں اور ان پر اردو کو کچل ڈالنے کی گہری سازش کرنے کا الزام بھی لگایا جا رہا ہے تو مجھے اپنے بارے میں لوگوں کے شکوک و شبہات بالکل ہی غیر اہم معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بات میرے لیے حیران کن ہے کیونکہ میں گاندھی جی کی نیک نیتی اور ان کی راست بازی پر ہر چیز سے زیادہ یقین رکھتا ہوں۔ تم کو معلوم ہے کہ متعدد معاملوں میں مجھے ان سے اختلاف ہے اور میں نے زاویۂ نگاہ کے اس فرق کا متعدد بار اظہار بھی کیا ہے، لیکن اس کا ان کے زبردست خلوص اور ہمارے مقصد کے لیے ان کی بے پناہ خدمات پر میرے خیال سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ میرے نزدیک انھوں نے ملک میں ایک مشترکہ زبان کے لیے ذہنوں کو تیار کرنے کے واسطے کسی بھی فرد کے مقابلے میں زیادہ ہی کام کیا ہے۔ کانگریس اور اس کے باہر ہندوستانی کو مشترکہ لسانی رابطے کی زبان کے طور پر تسلیم کیا جانا بڑی حد تک ان کی ہی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس کے باوجود گھٹیا لوگ اس شخص پر اس بات کا الزام لگا رہے ہیں جسے روکنے کی اس نے جان توڑ کوشش کی ہے۔

لیکن اب میں افراد کو زیرِ بحث نہیں لاؤں گا۔ ہم لوگوں کو جس مسئلے پر غور کرنا ہے اس کا تعلق افراد سے قطعاً نہیں ہے، علاوہ اس کے کہ اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے اس کے پس منظر پر غور کرنا مقصود ہو۔ سب سے پہلے تو ہمارے ذہن میں یہ بات صاف ہونی چاہیے کہ کانگریس یعنی قوم پرست ہندوستان کا موقف کیا ہے۔ ہمارے دستور میں صاف صاف لکھا ہے کہ ملک اور کانگریس کی زبان ہندوستانی ہے۔ اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ دونوں رسم الخط دیوناگری اور اردو سرکاری طور پر تسلیم کیے جائیں گے۔ اور کراچی کی بنیادی حقوق کی قرارداد میں کہا گیا ہے کہ "اقلیتوں اور مختلف لسانی علاقوں کی ثقافت، زبان اور رسم الخط کا تحفظ کیا جائے گا۔"

اب یہ بات بالکل صاف ہو گئی۔ چنانچہ صورت حال یہ ہے۔ ہمارے خیال میں ہندوستان کی اہم (Principal) زبانوں کو جن میں سے ہر ایک قدیم ہے اور جن میں ادب کا قابلِ ذکر ذخیرہ موجود ہے، اپنے لسانی علاقوں میں ترقی دی جانی چاہیے۔ انھیں اپنے علاقوں کی پہلی (Principal) زبان ہونا چاہیے۔ یہ زبانیں ہندوستانی اور اس کی مختلف شکلوں کے علاوہ بنگالی، مراٹھی، گجراتی، تمل، تلگو، کنڑ، ملیالم، اڑیہ اور آسامی اور سندھی وغیرہ ہیں۔ ان میں سے کسی زبان کو ہندوستانی سے نقصان پہنچانے کا کوئی سوال نہیں۔ لیکن شمال کے ایک بڑے علاقے میں ہندوستانی اپنی مختلف شکلوں کے ساتھ حکمراں ہے۔ ہمیں (اس) شمالی حصے کے لیے جہاں تک ممکن ہو سکے اس

۱؎ یورپ کے کسی باشندے تک کے لیے ان پنڈت نہرو کی ہندوستانی سمجھنا ممکن ہے کیونکہ وہ آسان الفاظ اور فقرے استعمال کرتے ہیں (ایک برطانوی افسر کی کتھا) ہیری سن کو رپورٹ۔ ۲ ستمبر ۱۹۲۶ء

ہندو مسلم زبان بنانے کی ضرورت پڑ جاتی تاکہ باقی ہندوستان کے لیے اسے دوسری لازمی زبان بنانا ہے تاکہ اس سے وہ لسانی رابطہ قائم کیا جاسکے جو پورے ہندوستان کو باندھ کر رکھتا ہے۔ ایسی کوئی دوسری زبان نہیں جو اس رابطہ کا کام کرسکے اور میرے خیال میں اس جانب ہندوستانی کی نشوونما ناگزیر ہے۔ میں انگریزی یا غیر ملکی زبانوں کا مخالف نہیں ہوں (بلکہ) میرے خیال میں دنیا اور جدید فکر سے روشناس ہونے کے لیے غیر ملکی زبانوں سے واقفیت لازمی ہے۔ لیکن ملک کے بہت زیادہ لوگ (غیر ملکی زبانوں سے) واقفیت نہیں حاصل کر سکتے۔

چنانچہ ہندوستانی ہی ملک کی قومی زبان ہوگی۔ اس وقت اس کی متعدد شکلیں ہیں۔ ہم عام طور سے اردو اور ہندی کا ذکر کرتے ہیں اور ایسا کرتے وقت ہمارے ذہن میں بالخصوص رسم الخط اور جزوی طور سے فارسی اور سنسکرت کا پس منظر ہوتا ہے۔ لیکن زیادہ اہم شہری اور دیہی علاقوں کی زبان کا فرق ہے۔ اس سلسلے میں ہم دیہی علاقوں کے بارے میں شاید ہی کبھی سوچتے ہوں کیونکہ ہماری ساری عوامی زندگی شہر کے رہنے والوں سے فیضان حاصل کرتی ہے۔ ایک حد تک ایسا ہوتا رہے گا اور یہ ٹھیک بھی ہے کہ شہر کا بہتر ثقافتی معیار ایک اہم رول ادا کرے لیکن دیہی علاقوں میں تعلیم جوں جوں عام ہوگی شہر کی یہ فوقیت کمزور پڑتی جائے گی اور ہماری زبان میں بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ ممکن ہے زبان اتنی چمکیلی اور شائستہ نہ رہ جائے لیکن اس کی قوت اظہار میں اضافہ ہوگا اور وہ زیادہ جاندار ہو جائے گی۔

زبان کی اصل معیار بندی تو اس وقت شروع ہوگی جب حکومت کی طرف سے تعلیم کے فروغ کا کام بڑے پیمانے پر شروع ہوگا۔ اس ضمن میں ہماری آج کی کوششیں زیادہ کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ بس یہ ہو سکتا ہے کہ ایک مناسب ماحول تیار ہو جائے۔ ایک بات اور ذہن میں رکھنی ضروری ہے۔ لوگ اکثر اس بات پر معترض ہوتے ہیں کہ (ہندوستانی کی) ہندی اور اردو شکلیں ایک دوسرے سے دور ہوتی جارہی ہیں۔ میرے خیال میں یہ رجحان بڑھ رہا ہے اور بعض لوگ اس میں مدد بھی کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے اصل سبب کا تعلق افراد کی تحریک سے نہیں۔ اس کا سبب زیادہ بنیادی ہے۔

فارسی اور سنسکرت آمیز زبان کے بجائے جب ہم ایک مشترکہ اور آسان زبان کو ترقی دینے کی بات کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد کیا ہوتی ہے؟ یہ تو ہر مبتدی بھی جانتا ہے کہ دہلی، بہار اور ناگپور کی زبانوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایسی صورت میں عوام کی سادہ زبان کیا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک فطری طور سے اپنی یا اپنے گروپ کی زبان کو معیاری تصور کرتا ہے اور جب اس زبان کی کوئی مختلف شکل استعمال کی جاتی ہے تو اسے الجھن ہوتی ہے۔ اپنی جہالت اور محدود علم پر خجل ہونے کے بجائے ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنی کم علمی پر فخر محسوس کر رہا ہے۔

لیکن میں جس مسئلے کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں وہ زیادہ گہرا ہے۔ عوام کی سادہ زبان ہمیشہ محدود زبان ہوتی ہے۔ کم و بیش دو ہزار الفاظ پر مشتمل یہ زبان عام زندگی کے روزمرہ کے کاموں کے لیے کافی ہوتی ہے لیکن جوں ہی ہم زندگی کے کسی اہم مسئلے پر — وہ سیاسی ہو، ثقافتی ہو، معاشی ہو یا سماجی — غور و خوض شروع کرتے ہیں تو یہ سادہ اور آسان زبان ہمارا ساتھ نہیں دے پاتی اور ہمیں غیر معمولی تصورات کے اظہار کے لیے اس کے حلقہ سے باہر جاکر مطلوبہ الفاظ اور محاوروں کی جستجو کرنا پڑتی ہے۔ (ایسے مواقع پر) فطری طور سے مصنف یا مقرر کو فارسی آمیز یا سنسکرت آمیز الفاظ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس طرح اس زبان کے دونوں طریق اظہار ایک دوسرے سے دور ہوتے جاتے ہیں۔ دراصل یہ زبان کی قوت کی علامت ہے اور ہمیں اس سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ارتقا کی اس پہلی جداگانہ لہر کے بعد یہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آئیں گے کیونکہ ایسا ہونا ان کے لیے ناگزیر ہے۔ حالات اور سامعین کی بڑی تعداد انھیں سادگی اور ہم رنگی اختیار کرنے پر مجبور کر دے گی۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ جہاں بھی ممکن ہو ہم اس میں مدد کریں۔ میرا خیال ہے کہ ہم اس سلسلے میں اس وقت کچھ کر سکتے ہیں۔ زبان کی اس ترقی میں چاہے علیحدگی پسندی کے رجحانات ہی کیوں نظر نہ آئیں۔ ہمیں اس پر اعتراضات کرنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں ایک مالا مال اور رنگا رنگ زبان کی ضرورت ہے جس نے اپنے وجود اور قوت (Vitality) کے لیے کلاسیکی زبانوں کے ساتھ ساتھ دنیا کی جدید زبانوں سے بھی مدد لی ہو۔ زبان کے جدید تصور کے مطابق ہماری زبانیں کسی قدر غیر ترقی یافتہ ہیں اور انھیں جدید

خیالات اور تصورات کے باریک اختلافی رنگوں Fine Shades of Modern Thoughts کے اظہار کے قابل ہونے کے لیے خاصی ترقی کرنے کی ضرورت ہے، چنانچہ وہ جتنی مالا مال ہوں گی اتنا ہی بہتر ہوگا۔ ہمیں اپنے حسد و ظلم کی وجہ سے اس زبان کے ارتقا کو روکنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ ہندی اور اردو میں اصل قابل اعتراض رجحان تو ایک طرح کا خوش اسلوب اور مکلف طریق اظہار ہے جو اپنی ساری لفاظی کے باوجود ذرا بھی جاندار نہیں اور جس کی عام لوگوں تک رسائی ممکن نہیں۔ ہم اگر عوام کو پیش نظر رکھ کر سوچیں، لکھیں اور بات کریں گے تو ناگزیر طور پر ہماری تحریر اور گفتگو سادہ اور زور دار ہو جائے گی۔ اردو اور ہندی کی غیر ضروری خود فریبی اور علیحدگی پسندی کے رجحانات کو روکنے کا یہی طریقہ ہے۔

میں رسم الخط کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں کہہ رہا ہوں کیونکہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے یہ مسئلہ طے ہو چکا ہے۔ ہندوستانی زبان کے لیے ناگری اور اردو رسم الخط کو ہر جگہ ضرور تسلیم کیا جانا چاہیے اور ان کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔ یہ کوئی سیاسی سمجھوتہ نہیں ہے جیسا کہ شاید کچھ لوگوں کا خیال ہو بلکہ یہ قومی ترقی کے لیے ایک بنیادی اصول ہے۔ ذاتی طور سے میں ہر زبان اور ہر رسم الخط کی جو ہندوستان میں مروج ہے حوصلہ افزائی کرنا چاہوں گا کیونکہ مجھے یقین ہے کہ عمر کی منزلیں طے کرتے ہوئے بچے کو اصل تعلیم صرف اس زبان اور رسم الخط میں دی جا سکتی ہے جو اس کے گھر میں استعمال ہوتا ہے۔ جب میں یہ سنتا ہوں کہ کچھ لوگ کسی مخصوص علاقے میں کسی زبان یا رسم الخط کو کچلنا چاہتے ہیں تو یہ بات مجھے بڑی احمقانہ معلوم ہوتی ہے۔ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو نہ یہ معلوم ہے کہ قوم کیسے ترقی کرتی ہے اور نہ وہ اس بات سے واقف ہیں کہ اس ترقی میں زبان کا کیا حصہ ہوتا ہے۔ روسیوں نے اپنے وسیع و عریض اور مختلف النوع (Varied) ملک میں اس مسئلے کو جس طرح حل کیا ہے وہ تم کو یاد دلانا چاہتا ہوں۔ روسیوں نے ہر زبان کی حوصلہ افزائی کی ہے اور حد تو یہ ہے کہ بعض خانہ بدوش قبیلوں کی زبانوں کے لیے جو اس وقت تک رسم الخط سے محروم تھیں، رسم الخط بھی تیار کیے ہیں۔ نتیجے کے طور پر روس کے ہر علاقے میں تعلیم کو حیرت خیز ترقی ملی ہے۔ میں تو یہ تک چاہوں گا کہ اگر شمالی ہند کے کسی شہر کے سرکاری اسکولوں میں، جہاں تمل پڑھنے کے خواہش مند لڑکوں اور لڑکیوں کی ایک قابل لحاظ تعداد ہو، اس زبان میں، یا کسی دوسری زبان میں جسے لوگ پسند کریں، تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ یہی سلوک دوسری زبانوں اور رسم الخط کے ساتھ بھی روا رکھا جانا چاہیے۔ ہماری پالیسی یہ ہونی چاہیے کہ کسی زبان یا رسم الخط کو کچلنے کے بجائے جس حد تک بھی ہو سکے اس کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اس اصول کو ہندوستان پر منطبق کرنے کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمیں اس سارے علاقے میں جہاں ہندوستانی بولی جاتی ہے ناگری اور اردو رسم الخط کو ترقی دینی چاہیے۔ ان میں سے کسی کو بھی دبانے یا نقصان پہنچانے کی کوشش غلط اور نقصان دہ ہوگی۔ مزید برآں غیر ہندوستانی علاقوں میں ریاستی حکومتوں کو ان تمام مقامات پر جہاں قابل لحاظ تعداد میں لوگ چاہیں ہندی یا اردو رسم الخط کی تعلیم کا انتظام کرنا چاہیے۔

اپنے اس ذہنی پس منظر میں مجھے یہ معلوم کر کے کہ شمال مغربی سرحدی صوبہ سرحد میں ہندی رسم الخط کی تعلیم کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی جا رہی ہیں حیرت بھی ہوتی ہے اور افسوس بھی۔ تعلیم سے صوبے بہار کے بارے میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ اردو رسم الخط کے لیے دی جانے والی سہولتوں پر کچھ لوگ ناک بھوں چڑھا رہے ہیں۔ میرے نزدیک یہ نہایت غلط رویہ ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ان دونوں کے لیے دروازے ہر جگہ کھول دیں اور لوگوں کو اس کی آزادی ہو کہ وہ ان میں سے کوئی ایک یا دونوں رسم الخط استعمال کریں۔

ہمارے ملک میں کتنی بہت سی چیزیں فرقہ پرستی کا رنگ اختیار کر لیتی ہیں اس پر حیرت ہوتی ہے۔ زبان تک کے سوال نے پر اسرار طور پر فرقہ وارانہ صورت اختیار کر لی ہے۔ اردو کے بارے میں فرض کر لیا جاتا ہے کہ اس پر مسلمانوں کی مہر لگی ہے۔ بڑے ادب کے ساتھ میں کہنا چاہوں گا کہ میں اسے تسلیم نہیں کرتا۔ اردو کو جو میں بچپن سے بولتا رہا ہوں اپنی زبان سمجھتا ہوں۔ بدقسمتی سے میری تعلیم کچھ اس طرح ہوئی کہ میں ٹھیک سے نہ اردو جانتا ہوں نہ ہندی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اردو میری زبان نہیں رہ جاتی۔ چنانچہ میں اس مسئلے کو مکمل طور سے لسانی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں، فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے نہیں اور میں چاہتا ہوں کہ

دوسرے بھی ایسا ہی کریں۔ اس سلسلے میں ہندو کلچر اور مسلم کلچر کی بات کرنا غیر متعلق ہے۔

ہندوستان کے لیے مشترکہ زبان کے سوال پر غور کرتے وقت ہمیں یہ اہم حقیقت ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ زبان ملک کی ساری زبانوں کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ ہم ایسی مصنوعی زبان بنا کر اسے سارے ہندوستان پر تھوپ نہیں سکتے۔ اگر ایسا کیا گیا تو یہ اسی طرح ناکام ہوگی جیسے ایسپرینٹو[1] (Esperanto) اور وال پک[2] (Volapuk) زبانیں ناکام ہوئیں۔ ہندوستانی کیا ہے اس کا فیصلہ ہندوستانی نہ بولنے والے علاقوں، مثلاً جنوبی ہند کے حوالے سے نہیں کیا جاسکتا۔ ہندوستانی کا تعین ہم صرف شمالی ہندوستان اور ہندی اور اردو کی مختلف بولیوں سے ایک مشترکہ بولی تشکیل دے کر ہی کر سکتے ہیں۔ اس زبان کے ارتقا میں ہندوستان کی دوسری زبانوں کو شامل کرنے کی اگر کوئی کوشش کی گئی تو اس کی ناکامی یقینی ہے۔

اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم لوگ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ شمالی ہند کی معیاری ہندوستانی اور ملک کی دوسری خاص زبانوں کے مشترک الفاظ اور رشتوں کو تلاش کرنے کی کوشش کریں اس طریق کار سے ملک کے باقی حصوں میں ہندوستانی کی تعلیم میں مدد ملے گی۔ میں نے اس اپروچ (Approach) کے ان دو طریقوں کے درمیان بنیادی فرق کی نشاندہی کرنے کی ناگپور کے بھارتی ساہتیہ پریشد کے اجلاس میں کوشش کی تھی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میں اپنے نقطۂ نظر کی پوری طرح وضاحت نہ کر سکا۔ اس اجلاس میں بہت سے لوگوں کے دلوں میں ایسے مسائل بھرے ہوئے تھے جو مجھے سطحی معلوم ہوئے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے ناگپور کے اجلاس میں ان چند جملوں کے سوا میں نے کچھ نہیں کہا تھا کیونکہ اس اجتماع میں خود کو اجنبی اجنبی سا اور شرکائے جلسہ کے مختلف عناصر سے غیر ہم آہنگ محسوس کر رہا تھا۔ اس اجلاس میں میری اصل دلچسپی یہ تھی کہ اس کے ذریعہ ملک کی مختلف زبانوں کے ادب کے درمیان رابطہ قائم ہو سکے تاکہ ان میں مشترک تصورات جنم لے سکیں اور ان کا رخ ملک کے عوام کی جانب زیادہ سے زیادہ ہو سکے۔ میں چاہتا تھا کہ ہماری زبانوں کے ادیب ان متعدد مسائل پر غور کریں جن کا سامنا یورپ کے ادیبوں کو کرنا پڑ رہا ہے اور مجھے امید تھی کہ ساہتیہ پریشد ایک ایسی انجمن بن جائے گی جس میں ان مسائل پر غور ہوگا۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ ہندی اور ہندوستانی اور بے خیالی میں بولے گئے چند الفاظ (Odd Words Here and There) جیسے غیر اہم مسائل موضوعِ بحث بنے رہے۔ ذاتی طور سے میں لفظ ہندوستانی کو استعمال کرنے کا حامی تھا اور اس کا میں نے اظہار بھی کیا لیکن میں یہ دیکھ کر بے چینی محسوس کرتا رہا کہ یہ مسئلہ دوسرے سارے مسائل پر چھا گیا۔ اس کانفرنس میں جنوبی ہند کے لوگ جو اپنے علاقے کی زبان کی نمائندگی کر رہے تھے بڑی تعداد میں شریک ہوئے تھے۔ ہندوستانی زبان کے حامیوں کی کوششوں کو وہ شک و شبہ کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ اس کے باوجود وہ پریشد میں شرکت کرنے آئے تھے۔ ناگزیر طور سے وہ ہندوستانی کو سنسکرت کے توسط سے جو ایک مشترک رابطہ ہے، سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لفظ ہندی تو موٹے طور پر ان کی سمجھ میں آتا تھا لیکن 'ہندوستانی' ان کے تصورات کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ میرے خیال میں گاندھی جی نے اس مشکل کا احساس کیا اور انھوں نے یہ بات وضاحت سے کہہ دی کہ ان کی خواہش یہی ہے کہ جنوبی ہند کے ادیب "ہندوستانی" لفظ کو قبول کریں۔ لیکن وہ لوگ "ہندوستانی" کو بخوشی قبول کرنے سے پہلے ہم لوگوں سے کچھ اور بات چیت کرنا چاہتے تھے۔ اس پس منظر میں گاندھی جی نے کہا کہ اس بے ڈول لفظ کے بجائے "ہندی یعنی ہندوستانی" استعمال کیا جائے۔ گاندھی جی کا مقصد یہ تھا کہ جنوبی ہند اور ملک کے مغربی علاقے کے ادیبوں کے شکوک دور کر کے انھیں "ہندوستانی" کو ملک کی مشترکہ زبان کے طور پر تسلیم کرنے کے لیے آمادہ کر لیا جائے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ان کے سامنے جو راستے تھے ان میں سے انھوں نے سب سے زیادہ قابلِ عمل طریق کار اختیار کیا۔ لیکن ایسا کرنے میں انھوں نے یہ بات بالکل صاف کر دی تھی کہ وہ اس اصول کے کسی نکتے کو ترک کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کیونکہ ان کے نزدیک خود لفظ ہندی کے معنی میں دونوں رسم الخط،

---

[1] عالم گیر استعمال کے لیے ایک مصنوعی زبان جو ڈاکٹر آئی۔ ایل۔ زمنہوف نے تشکیل دی تھی۔

[2] اسی مقصد کے لیے بنائی جانے والی ایک دوسری زبان جو ایم۔ شلیئر کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ دونوں ناکام رہیں۔

استعمال اور زبان کے دونوں طریق اظہار شامل ہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ بعد میں انھوں نے ساہتیہ سمیلن کے جلسہ میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کردی تھی۔

ناگپور پریشد کے بارے میں ایک بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ وہ ہندوستانی بولنے والے علاقے کے ہندی اور اردو کے ادیبوں کا جلسہ نہیں تھا بلکہ اس میں جنوب اور مغرب کے لوگ اکثریت میں تھے اور ان کے زاویۂ نظر پر غور بھی کرنا تھا اور اسے عزت بھی دینی تھی۔

یہ خط بہت طول طویل ہوگیا ہے اور شاید بے جوڑ اور اُکھڑا اُکھڑا بھی۔ اسے میں نے کسی قدر عجلت میں املا کرایا ہے اور ممکن ہے میں اپنا مافی الضمیر پوری طرح واضح نہ کرسکا ہوں لیکن تم کو اس سے کم از کم اتنا تو معلوم ہو ہی جائے گا کہ میں اس مسئلے کے سلسلے میں کیا محسوس کرتا ہوں۔ تم چاہو تو میں مسئلے کے کسی ایسے پہلو کی (جو چھوٹ گیا ہو) مزید وضاحت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ایک بات اور۔ اس مسئلے کے سلسلے میں ہندو کلچر اور مسلم کلچر کی بات مجھے حیرانی میں ڈال دیتی ہے۔ اس سے جدید حالات اور نئی طاقتوں سے حیرت انگیز عدم واقفیت ظاہر ہوتی ہے۔ اس موضوع پر میں نے اپنی خودنوشت میں جو کچھ لکھا ہے وہ شاید تم نے پڑھا ہو۔ اس سے قبل میں نے کلچر کے سوال پر سر محمد اقبال سے کچھ باتیں دریافت کی تھیں۔ میرے ان سوالات کا کوئی جواب نہیں ملا اور اگر تم یا کوئی اور مجھے ان کے جوابات فراہم کردے تو مجھے خوشی ہوگی۔ میرے خیال میں ان مسائل پر مبہم خیالات بے حد عام ہیں۔ ان کی حوصلہ افزائی نہیں کرنی چاہیے۔

(میرے خیال میں) متعدد قومی کلچروں کا وجود تو ضرور ہے اور ان پر مذاہب کا اثر بھی پڑا ہے لیکن بنیادی طور پر وہ قومی کلچر ہی رہے ہیں۔ جوں جوں وقت گزرا ہے قومی کلچر نے پاس پڑوس کے کلچروں کو متاثر کیا ہے چنانچہ بیشتر ممالک میں اب ملے جلے کلچر پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان ایک نہایت مضبوط قومی کلچر کا مالک ہے لیکن اس پر دوسرے کلچروں کا اتنا ہی قوی اثر بھی پڑا ہے۔ ان الگ الگ رجحانات کو میں ہندو اور مسلمان ماننے کے لیے تیار نہیں۔ وہ بنیادی طور سے ہماری مشترکہ وراثت کا حصہ ہیں اور اب ان پر مغرب کی سائنسی تہذیب کے ثقافتی اور دوسرے رجحانات کا اثر پڑ رہا ہے۔ دنیا کی کوئی قوت (All The King's Horses, All The Kings Men) ہندوستان کے سیاسی، معاشی اور ثقافتی اتحاد کی طاقتوں کے عروج کو نہیں روک سکتی۔ سچ پوچھو تو یہ ایک عالمی رجحان ہے۔ جنگوں اور تصادموں کے باوجود ہم ایک عالمی کلچر کو فروغ دے رہے ہیں جو قومی کلچروں کو مسمار کرنے اور انھیں یکساں بنانے کے بجائے انھیں ایک دوسرے سے مشترکہ رشتوں سے ملانے کے ساتھ ساتھ ان کی لامحدود انفرادیت بھی برقرار رکھے گا۔ ہندوستان میں ہمارا مقصد سیاسی اور دوسرے اجزا پر مشتمل ایک ایسی متحدہ قوم کی تشکیل ہونا چاہیے جس کے ثقافتی رشتے مضبوط ہوں اور ساتھ ہی ساتھ مختلف ثقافتی رنگ و آہنگ کو مکمل طور سے روا رکھا جائے۔ بلکہ ثقافت کے رنگ و آہنگ کی ان مختلف شکلوں کی حوصلہ افزائی اور مدد کی جانی چاہیے۔ ہم ہندوستان میں ایک بھدی ہم رنگی نہیں چاہتے بلکہ ایک ایسی وسیع و عریض اور مختلف النوع زندگی کے متمنی ہیں جس سے گراں بہا قوتِ حیات پھوٹ پڑ رہی ہو۔ ہم کو مدد ملتی ہیں مشترکہ عالمی کلچر اور عالمی نظام کے لیے جو ساری دنیا میں بڑھتی ہوئی بدنظمی اور ابتری سے بچنے کا واحد راستہ ہے جدوجہد کرنی چاہیے۔

ایک معاملہ ایسا ہے جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جب بھی یہ نام نہاد ثقافتی اور اس طرح کے دوسرے سوال سامنے لائے جاتے ہیں تو سیاسی طور سے رجعت پرست لوگ ان میں اگوا بن جاتے ہیں۔ کیا یہ بات اس قدر نمایاں نہیں ہے کہ ہمیں گہرائی سے غور و خوض پر آمادہ کرسکے۔ سیاسی رجعت پرستی سے ثقافتی عروج کبھی برآمد نہیں ہوسکتا جو شخص بھی ہندوستان کی ثقافتی ترقی میں واقعتا دلچسپی رکھتا ہے اسے ہندوستان کی آزادی کا بھی اتنا ہی متمنی اور اپنے مقدور بھر اس کے لیے سرگرم عمل ہونا چاہیے۔

(دستخط) جواہر لال نہرو

ڈاکٹر سید محمود
۱۔ دریا گنج۔ دہلی



گرو دیو ٹیگور اور پنڈت نہرو

شانتی رنجن بھٹّاچاریہ
آنند پلّی۔ پُور باہتیاری، کلکتہ۔ ۷۰۰۰۹۳

رابندر ناتھ ٹیگور (درست لفظ "ٹھاکر" ہے لیکن انگریزی کے مطابق اُردو میں "ٹیگور" ہی لکھا جاتا ہے) محض کسی ایسے شاعر کا نام نہیں ہے جو شعر و شاعری کی دنیا ہی میں مگن رہا ہو، بلکہ یہ اُس عظیم شخصیت کا نام ہے جو کم و بیش نصف صدی تک ہماری سماجی، سیاسی اور تمدّنی زندگی پر چھایا رہا اور جس سے ایک پورا عہد متاثر ہوا ہے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ انیسویں صدی کی چوتھی دہائی تک کا زمانہ وہ ہے جب ٹیگور نے اس ملک کے صاحبِ فکر و نظر حضرات کو اپنی طرف متوجّہ کیا اور اُن سب کے فکر و عمل پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے۔

اسی طرح جواہر لال نہرو کی اہمیت محض یہ نہیں ہے کہ وہ آزاد ہندوستان کے پہلے وزیرِ اعظم ہوئے بلکہ وہ ہندوستان کے ترقی پسند نوجوانوں کے میرِ کارواں، اُن کے محبوب رہنما اور ساتھ ہی ہندوستان میں سوشلسٹ خیالات کو پروان چڑھانے والے دانشور اور سیاست داں رہے ہیں۔ اُردو کے ترقی پسند اہلِ قلم اور دانشوروں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جن کو پنڈت نہرو نے متاثر کیا اور اُن میں سیاسی بیداری کی روح پھونکی۔ مشہور ترقی پسند شاعر علی سردار جعفری نے اپنے لڑکپن کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"غالباً عید غدیر کا دن تھا، یا یوں ہی ہمارے گھر میں کوئی محفل تھی۔ میں اس محفل میں قصیدہ پڑھنے کے بجائے اُس عام جلسے میں چلا گیا جہاں پنڈت نہرو نے جاگیرداری ظلم و استبداد کے خلاف تقریر کی۔ جلسے کے بعد میں واپس آیا تو گھر کے لوگ مجھ سے خفا تھے، اور میں ساری کائنات سے بیزار ظلم اور افلاس کے سماجی اسباب کے پہلے شعور نے میرے دل میں چراغ جلا دیے تھے ـــــ" [1]

جواہر لال نہرو نے نہ صرف آزاد اور خوشحال ہندوستان کا ایک خاکہ تیار کیا تھا بلکہ اُس خاکے میں زندگی کے آخری لمحوں تک رنگ بھرنے کا کام بھی انجام دیا اور اس طرح بجا طور پر اُن کو نئے ہندوستان کا معمار قرار دیا جاتا ہے۔

ٹیگور کی ایک چھوٹی سی نظم ہے جس میں سر پر ہوا سے لہراتی ہوئی برہمن کی چوٹی، ہاتھ اور پاؤں سے مخاطب ہو کر کہتی ہے کہ ہاتھ پاؤں بہت غلطیاں کرتے ہیں۔ ہاتھ اور پاؤں نہایت خاموشی سے چوٹی کی سخت اور ناگوار باتوں کو سُنتے ہیں اور آخر میں صرف اتنا کہتے ہیں ـــــ "ہم نے غلطیاں کی ہیں، اس لیے کہ ہم نے بہت سے کام بھی کیے ہیں۔ تم تو کوئی کام نہیں کرتی ہو، پھر بھلا تم سے کوئی غلطی کیسے ہو سکتی ہے۔ کام کرنے والوں سے کبھی کبھی کوئی غلطی بھی ہو جاتی ہے ـــــ" ٹیگور ہوں یا نہرو، دونوں تا حیات میدانِ عمل میں سرگرم رہے ہیں۔ اُن کی زندگی ہی میں کئی لوگوں نے اُن پر تنقیدیں کی ہیں۔ اُن کے کئی اقدامات کی سخت مخالفت کی گئی، اور اُن کو بُرا بھلا بہت کچھ کہا گیا۔ لیکن ان تمام تنقیدوں کے باوجود اُن کی عظمت اور خدمات سے انکار ممکن نہیں ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور جہاں دیدہ اور جوہر شناس تھے۔ انسان میں پوشیدہ خوبیوں کو وہ بہت جلد جان لیتے تھے اور جس کسی میں وہ کوئی جوہر پاتے، اُسے اپنے قریب کر لیتے تھے۔ پھر نہرو کو وہ اپنے سے دُور کیسے رکھتے ـــــ؟ ٹیگور نے بہت جلد نہرو کی خوبیوں کو جان لیا تھا، اُنھوں نے ۱۹۳۶ء کے جشنِ بسنت اور ہولی کے موقعے پر نہرو کے سلسلے میں شاعرانہ انداز میں اپنے دلی جذبات کا کھُل کر اظہار کیا اور ایک طویل بیان میں موسمِ بسنت کے ساتھ نہرو کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھا:

"آج ہولی ہے، بسنت کا تہوار ہے۔ یہ پت جھڑ کا موسم ہے اور یہی نظامِ قدرت ہے

[1] لکھنؤ کی پانچ راتیں، سردار جعفری۔ دوسرا ایڈیشن۔ ۱۹۸۸ء صفحہ ۲۸۔ نصرت پبلشرز، لکھنؤ

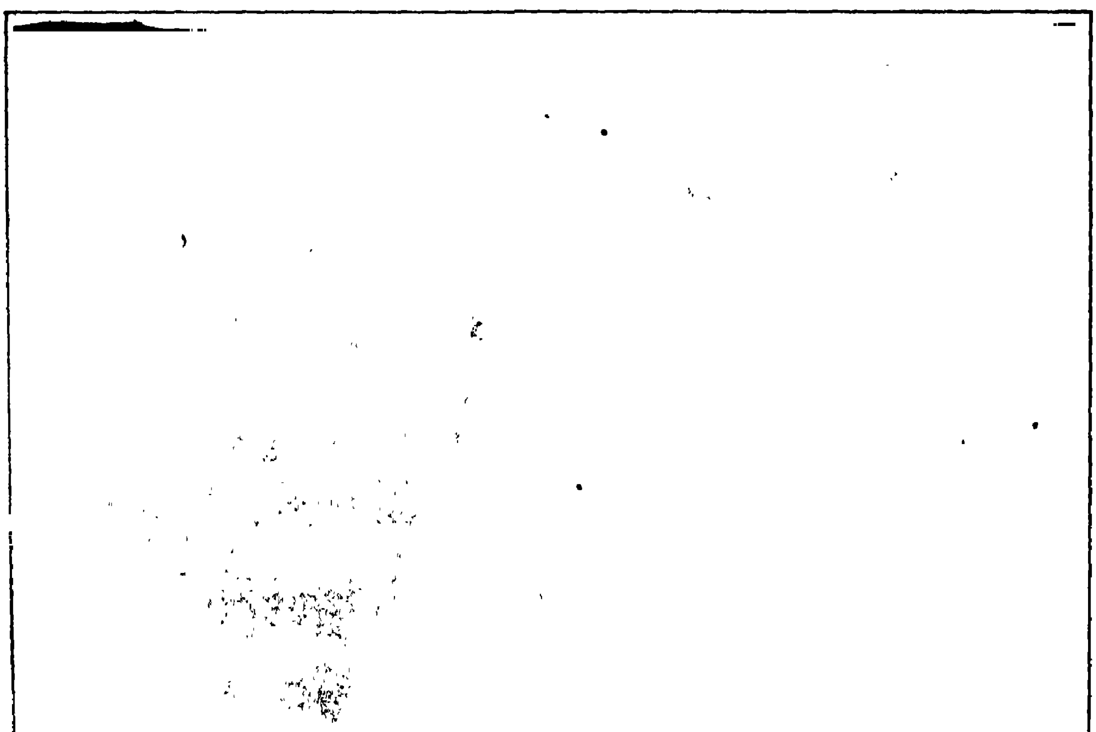
کہ قدیم کو زوال آئے اور نئی زندگی پھوٹ نکلے۔ ہر شاخ پر پھوٹنے والے نئے پتے، اُسی نئے کی آمد کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں، سواگت کر رہے ہیں ——— نظامِ قدرت کے اس نئے پن میں، نئی زندگی میں، مجھے ملک کی نئی روح نظر آرہی ہے۔ اس جشن کا، اس نئی جوانی اور عہدِ نو کا پرچم ہے جواہر لال نہرو ——— جواں ہندوستان پر، ہندوستانی نوجوانوں کے دلوں پر جواہر لال کی حکمرانی ہے۔"

ٹیگور سے نہرو کی پہلی ملاقات غالباً ۱۹۲۰ء میں ہوئی تھی۔ تب نہرو ۳۱ سال کے نوجوان تھے اور کلکتہ میں کانگریس کے خاص اجلاس میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ اس تاریخی اجلاس میں لالہ لاجپت رائے، بپن پال، گاندھی جی، جناح اور موتی لال نہرو جیسے لوگ بھی شامل تھے لیکن کلکتے سے زیادہ نہرو کا دل شانتی نکیتن کی طرف کھنچتا رہا کیوں کہ وہاں ٹیگور تھے اور اسی سال وہ پہلی بار شانتی نکیتن گئے۔ پھر جنوری ۱۹۳۴ء میں جنگِ آزادی کے سپوتوں اور بنگال کے عوام سے ملنے نہرو کلکتہ آئے اور کلکتہ سے شانتی نکیتن گئے۔ اس بار اُن کے ساتھ کملا نہرو بھی تھیں۔ اُن دنوں اندرا ممبئی کے PUPIL'S OWN SCHOOL کی طالبہ تھیں اور میٹرک کی تیاری کر رہی تھیں۔ نہرو ان کی تعلیم کے سلسلے میں فکرمند تھے اور گرودیو ٹیگور سے اس سلسلے میں مشورہ کرنے ہی وہ شانتی نکیتن گئے تھے۔ ۱۹ جنوری کو نہرو اور کملا نہرو کے شانتی نکیتن پہنچنے پر ٹیگور نے ان کا پُرجوش سواگت کیا۔ ٹیگور اور شانتی نکیتن کے دیگر اساتذہ کے خلوص و محبت سے نہرو اور کملا نہایت خوش ہوئے اور شانتی نکیتن سے جاتے ہوئے انھوں نے VISITOR'S BOOK میں لکھا:

"IN MEMORY OF A DELIGHTFUL DAY IN LIFE'S JOURNEY"

JAWAHAR LAL NEHRU

KAMALA NEHRU 20. JANUARY 1934



ٹیگور اور نہرو شانتی نکیتن میں



پھر نہرو نے فیصلہ کیا کہ اگر ہندوستان کو درست طور پر سمجھنا ہو اور ہندوستانی عوام سے دلی لگاؤ پیدا کرنا ہو، تو ایسی تعلیم کی ضرورت ہے جو شانتی نکیتن میں دی جاتی ہے۔ ایک ایسی تعلیم گاہ جہاں امیر و غریب طالب علموں میں کوئی بھید بھاؤ نہیں برتا جاتا، جہاں استاد اور طالب علم میں دلی لگاؤ ہے، محبت ہے۔ شانتی نکیتن سے لوٹنے پر اُن کی گرفتاری عمل میں آئی اور ۱۲ فروری ۱۹۳۴ء سے ۷ مئی تک یعنی ۸۰ دنوں تک وہ علی پور سنٹرل جیل (کلکتہ) میں رہے۔ ایک نہایت تنگ کمرے میں جو صرف ۹ × ۱۰ فٹ کا تھا اور جو کمرہ آج علی پور جیل میں ان کی ایک یادگار ہے۔ لیکن جیل میں رہ کر بھی وہ شانتی نکیتن کو نہیں بھولے۔ انھوں نے علی پور جیل سے ٹیگور کو لکھا:

"میں اندرا کو کسی سرکاری یونیورسٹی میں تعلیم کے لیے داخل کرنا نہیں چاہتا ـــــ میری خواہش ہے کہ اندرا شانتی نکیتن میں تعلیم پائے۔ اُس سے ملاقات ہونے پر میں اس سلسلے میں گفتگو کروں گا۔ آخری فیصلہ اُسے ہی کرنا ہے چوں کہ جدید دور کی لڑکیوں پر میں اپنے کسی فیصلے کو لاد دینے کے خلاف ہوں۔"

پنڈت نہرو، اندرا کو کیسی تعلیم دینا چاہتے تھے اس سلسلے میں انھوں نے اے۔ کے۔ چندرا کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

"میں ایسی تعلیم پسند نہیں کرتا جس سے لڑکی محض ڈرائنگ روم میں اُٹھنے بیٹھنے کے قابل ہی بنے اور دوسرا کوئی کام نہ کر سکے۔ اگر میرا بس چلتا تو میں اپنی بیٹی کو سال بھر تک کسی فیکٹری میں عام مزدور کے طور پر کام کرنے بھیج دیتا اور اُسے بھی اُس کی تعلیم کا ایک حصہ تصور کرتا۔"

اور پھر جون ۱۹۳۴ء میں اندرا کو شانتی نکیتن میں داخل کرتے ہوئے جواہر لال نہرو نے داخلہ فارم بھرتے ہوئے لکھا:

"اندرا کے والدین کی خواہش ہے کہ وہ آئندہ کسی ایسے مضمون یا مضامین میں مہارت حاصل کرے جس کی مدد سے وہ اپنی زندگی میں کوئی ایسا کام خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکے جو سماجی طور پر مفید ہو۔ یہی نہیں بلکہ جب تک موجودہ سماجی ڈھانچہ برقرار رہتا ہے وہ اقتصادی طور پر خود کفیل بھی ہو سکے ـــــ اندرا کے والدین یہ نہیں چاہتے کہ وہ محض ادبی قسم کی یا ایسی کوئی تربیت حاصل کرے جو اُسے بالکل نکما بنا دے اور وہ اپنے پیروں آپ کھڑی نہ ہو سکے۔"

لیکن حالات نے نہرو کو یہ موقع نہیں دیا کہ وہ اندرا کو طویل عرصے تک شانتی نکیتن میں زیرِ تعلیم رکھتے۔ اپریل ۱۹۳۵ء میں نہرو نے ایک خط میں ٹیگور کو لکھا کہ وہ اندرا کو شانتی نکیتن سے لے جانے پر مجبور ہیں۔ ان کا خط یوں ہے:

DEAR GURUDEV,

IT HAS BEEN DECIDED THAT MY WIFE MUST PROCEED TO EUROPE FOR FURTHER TREATMENT WHICH MIGHT INVOLVE OPERATION. SHE WILL PROBABLY SAIL IN THE THIRD OR FOURTH WEEK OF MAY. AS I AM INCAPACITATED FROM ACCOMPANYING HER, IT HAS BECOME ALL THE MORE NECESSARY THAT INDIRA SHOULD GO WITH HER. I HAVE INFORMED INDIRA OF THIS.

THIS NEW DEVELOPMENT DISTRESSES ME IN MANY WAYS, BUT I SEE NO WAY TO AVOID IT. I DO NOT KNOW HOW MATTERS WILL SHAPE IN THE FUTURE AND WHAT INDIRA WILL DO. MEANWHILE SHE HAS TO CUT SHORT HER CAREER AT SANTINIKETAN AND I AM EXCEEDINGLY SORRY THAT SHE SHOULD HAVE TO DO SO. I HAVE SEEN VERY LITTLE OF HER DURING HER YEAR AT SANTINIKETAN. THE LAST TIME I HAD A BRIEF GLIMPSE, AS WELL AS THE REPORTS I HAVE HAD FROM FRIENDS, HAVE CONVINCED ME HOW WELL SHE WAS GETTING ON THERE. HER OWN TESTIMONY, AND THAT IS IMPORTANT ENOUGH, IS CLEAR AND SHE HAS BEEN VERY HAPPY AT SANTINIKETAN AND HAS NO DESIRE WHATEVER TO LEAVE IT. I WAS LOOKING FORWARD TO HER REMAINING THERE FOR A LONGER PERIOD AND GROWING IN MIND AND BODY UNDER YOUR SHELTERING CARE AND GUIDANCE.



IT WAS A GREAT CONSOLATION TO ME IN PRISON THAT MY DAUGHTER WAS SURROUNDED BY LOVING AND CAPABLE FRIENDS WHO WERE GENTLY HELPING IN HER DEVELOPMENTS IN THE RIGHT DIRECTION AND I FELT INFINITELY GRATEFUL TO ALL OF THEM FOR THE LOVE AND KINDNESS THEY SHOWERED ON HER AND REJOICED THAT I HAD BEEN FORTUNATE ENOUGH TO CHOOSE SANTINIKETAN FOR HER EDUCATION AT THIS STAGE OF LIFE.

MY PLANS AND EXPECTATIONS IN THIS MATTER, AS WELL AS IN MY OTHERS, HAVE BEEN CUT SHORT AND TWISTED BY UNTOWARD CIRCUMSTANCES AND I MUST PERFORCE NOW TO THEM. BUT YOU WILL PERMIT ME, I HOPE, TO EXPRESS MY DEEP GRATITUDE TO YOU AND TO OTHER FRIENDS AT SANTINIKETAN, AND TO WISH YOUR GREAT INSTITUTION ALL THE SUCCESS, IT SO RICHLY DESERVES. I WRITE THESE FEW LINES FROM THE SANATORIUM AT BHOWALI WHERE I HAVE BEEN BROUGHT FOR A DAY TO VISIT MY WIFE. FROM HERE I GO BACK TO MY PRESENT HABITATION, THE ALMORA JAIL.

WITH AFFECTIONATE REGARDS,

YOURS

JAWAHAR LAL NEHRU

APRIL 1935

اس طرح شانتی نکیتن میں اندرا کی تعلیم کا دور ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔ اس سے نہ جواہر لال خوش ہوئے تھے اور نہ ٹیگور۔ ٹیگور نے اپنے دلی دُکھ کا اظہار اُس خط میں کھُل کر کیا ہے جو انھوں نے ۲۰ اپریل ۱۹۳۵ء کو جواہر لال نہرو کے خط کے جواب میں لکھا۔ خط حسبِ ذیل ہے:

MY DEAR JAWAHAR LAL,

IT IS WITH A HEAVY HEART WE BADE FAREWLL TO INDIRA, FOR SHE WAS SUCH AN ASSET IN OUR PLACE. I HAVE WATCHED HER VERY CLOSELY AND HAVE FELT ADMIRATION FOR THE WAY YOU HAVE BROUGHT HER UP. HER TEACHERS, ALL IN ONE VOICE, PRAISE HER AND I KNOW, SHE IS EXTREMELY POPULAR WITH THE STUDENTS. I ONLY HOPE THINGS WILL TURN FOR THE BETTER AND SHE WILL SOON RETURN HERE AND GET BACK TO HER STUDIES.

I COULD HARDLY TELL YOU HOW SAD I FEEL WHEN I THINK OF YOUR WIFE'S SUFFERINGS - BUT I AM SURE, THE SEA VOYAGE AND TREATMENT IN EUROPE WILL DO HER IMMENSE GOOD AND SHE WOULD BE HER OLD SELF AGAIN BEFORE LONG

WITH MY AFFECTIONATE BLESSINGS,

YOURS

RABINDRA NATH TAGORE

APRIL, 20, 1935

اس طرح شانتی نکیتن میں داخلہ لینے کے کوئی دس ماہ بعد اپنی ماں کی تیمارداری کے لیے اندرا کو شانتی نکیتن چھوڑ کر جانا پڑا۔ ۱۳ اپریل ۱۹۳۵ء کو کملا دیوی کو یورپ لے جایا گیا۔ اندرا ماں کے ساتھ تھیں لیکن ۲۸ فروری ۱۹۳۶ء کو سوئٹزرلینڈ کے ایک سنی ٹوریم میں کملا نہرو انتقال کر گئیں۔ ۸ مارچ کو شانتی نکیتن میں اُن کے سوگ میں ٹیگور نے جو تقریر کی (جو بعد میں ایک مضمون کے طور پر "کملا جواہر" کے عنوان سے شائع ہوئی) وہ اُن کے رنج و غم کی آئینہ دار ہے۔ اندرا پھر تعلیم پانے شانتی نکیتن لوٹ کر نہیں آئیں بلکہ وہ آکسفورڈ میں پڑھنے لگیں لیکن وہ شانتی نکیتن اور گرودیو ٹیگور کو بھی بھلا نہیں سکیں۔ اپنے والد کے نام انھوں نے بعض خطوط میں شانتی نکیتن اور ٹیگور کا ذکر کیا ہے۔ نہرو نے ۱۴ دسمبر ۱۹۳۶ء کو ٹیگور کو ایک خط لکھتے ہوئے بیٹی اندرا کے خط سے چند جملے نقل کیے تھے جو یوں ہیں ——"



I WAS GLAD OF MY STAY
SANTINIKETAN CHIEFLY BECAUSI
GURUDEV. IN THE VERY ATMOSI
THERE HIS SPIRIT SEEMED TO ROAI
HOVER OVER ONE AND FOLLOW ONE
A LOVING THOUGHT DEEP WATCHFULN
AND HIS SPIRIT, I FEEL, HAS GRE
INFLUENCED MY LIFE AND THOUGHT"

خود پنڈت نہرو بھی ٹیگور کو گرودیو مانتے
اور اہم اور پیچیدہ مسائل پر اُن سے تبادلۂ
ل کرتے تھے۔ ایسے مسائل کے سلسلے میں نہرو
ٹیگور سے کئی بار ملاقاتیں کی ہیں۔ ۱۹۳۹ء
چین کے سفر پر جانے سے پہلے نہرو کلکتہ
ے اور چونکہ ٹیگور بہت قبل ہی چین کا سفر کر
تھے اور چین سے ہندوستان کے قریبی دوستانہ
لقات کو پروان چڑھا چکے تھے۔ اس لیے
و نے یہ ضروری سمجھا کہ وہ ٹیگور سے ملتے ہوئے
ئیں تاکہ چین کے حالات کے سلسلے میں اُن
ے علم میں اضافہ ہو، اور انھوں نے ایسا ہی کیا
گور کے دل میں نہرو کو جو بلند مقام حاصل تھا
س کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ
۱۹۴ء میں "چائنا بھون (CHINA BH-
AVA - کا افتتاح کرنے کے لیے ٹیگور نے
ہرو کو دعوت دی تھی۔ حالاں کہ اُس بار نہرو
انتی نکیتن نہیں آ سکے اور انھوں نے اپنی
فتتاحیہ تقریر بیٹی اندرا کے ہاتھوں روانہ کر دی
ی۔ لیکن ۳۱ جنوری ۱۹۳۹ء کو "ہندی
بھون" کا افتتاح کرنے خود نہرو شانتی
نکیتن آئے تھے۔ اس موقعے پر نہرو تین دن
ٹیگور کے ساتھ شانتی نکیتن میں رہے اور مُلک
کی سیاسی صورتِ حال پر دونوں نے تبادلۂ
خیال کیا۔ اُن دنوں نیتاجی سبھاش چندر بوس
صدر کانگریس تھے اور چند مسائل ایسے تھے
جن پر نیتاجی اور نہرو ہم خیال نہیں تھے، جس
کی وجہ سے ٹیگور نے چاہا کہ نیتاجی بھی شانتی نکیتن
آئیں اور کھل کر بات چیت ہو۔ ٹیگور کی خواہش
کے مطابق نیتاجی سبھاش ایک دن کے لیے
شانتی نکیتن گئے تھے اور ٹیگور کی موجودگی میں
نہرو اور نیتاجی نے تبادلۂ خیال کیا، اور بہت
بڑی حد تک اختلافات دُور ہو گئے تھے۔

جب تک ٹیگور زندہ رہے (انتقال
۷ اگست ۱۹۴۱ء) ٹیگور اور نہرو کے تعلقات
نہایت خوش گوار رہے اور جب تک نہرو زندہ
رہے وہ ٹیگور کی یادوں کو کسی طور بھلا نہ
پائے اور شانتی نکیتن آتے رہے۔ ٹیگور کے
انتقال پر نہرو نے اپنے غم کا اظہار کرتے
ہوئے کہا:

"گرودیو کے انتقال نے ہم سب کو،
جنھوں نے ان کی عالیشان ذہانت اور زبردست
شخصیت کے سائے میں پرورش پائی ہے اور
ان کی تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوتے رہے ہیں،
تنہائی اور تاریکی میں چھوڑ دیا ہے ——
ہندوستان کا سب سے بڑا ستارہ جو صرف ہمارے
ہی ملک کو نہیں بلکہ سارے عالم کو ماضی اور
حال کے بیش بہا علوم کے نور سے روشن و منور
کر رہا تھا، غروب ہو گیا۔ اور ہمارے دل خالی
ہو گئے۔ پھر بھی ان کی آواز ہمارے کانوں میں
گونج رہی ہے اور ان کے فرمودات کی روشنی
ہماری رہنمائی کرے گی۔"

ٹیگور کے انتقال کے برسوں بعد ۱۴ر
نومبر ۱۹۵۹ء کو نہرو کو ایک اور ایسا موقعہ
ہاتھ آیا جب وہ ٹیگور کے سلسلے میں اپنے خیالات
کا بھرپور اظہار کر سکے۔ ڈاکٹر سکمار سین کی
تصنیف "تاریخِ بنگلہ ادب" کا پیش لفظ لکھتے ہوئے
جواہر لال نہرو نے لکھا:

"رام موہن رائے، ایشور چندر ودیا ساگر،
مائیکل مدھوسودھن دت، بنکم چندر چٹرجی،
رمیش چندر دت، سرت چندر چٹرجی اور اس
سے کچھ پرے ہٹ کر قاضی نذر الاسلام، یہ
سب بلند چوٹیوں کی طرح زبان و ادب کی
ترقی کی داستان میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ لیکن
سر بہ فلک ہے وہ ممتاز ٹیگور گھرانہ جو ادب،
مصوری، موسیقی اور دیگر فنون میں یکتا رہا
ہے۔ بنگال سے باہر ہم میں سے اکثر کے لیے
رابندر ناتھ ٹیگور کا نام اور بنگلہ ادب کی
عظمت مترادف ہے۔ میرے عہد کے لوگ
اُس باا ثر عظیم ہستی کے سائے تلے پروان چڑھے
اور شعوری یا غیر شعوری طور پر اُن سے متاثر
ہوئے ہیں۔ اُن کی شخصیت ایک رشی کی سی تھی
جو ہمارے قدیم علوم پر ملکہ رکھنے کے ساتھ
ساتھ موجودہ زمانے کے مسائل پر عبور رکھتے
تھے اور مستقبل سے غافل نہیں تھے۔ انھوں نے
بنگلہ زبان میں تخلیق کا کام انجام دیا۔ لیکن اُن
کی فراخ دلی کو ہندوستان کے کسی ایک حصّے میں
قید نہیں کیا جا سکتا۔ وہ لازمی طور پر نہ صرف
کُل ہند ہی کے بلکہ پوری انسانیت کے پرستار
رہے ہیں۔ وہ قومی بھی تھے اور بین الاقوامی بھی

اُن سے ملاقات یا ان کی تخلیقات کا مطالعہ کرنے سے، فرد میں ایک نادر احساس اُبھرتا ہے، جیسے تجربات اور تمام تر علوم کے کسی بلند پربت کی چوٹی سے ملن ہو جائے۔ باوجود تمام تر بزرگی کے، رابندر ناتھ ہوائی قلعے میں رہنے والے آدمی نہیں تھے۔ انھوں نے زندگی کو قبول کیا وہ مکمل طور پر زندگی کو بسر کرنا چاہتے تھے۔ اُن کی تمام جد و جہد کا لگاؤ زندگی سے رہا ہے۔"



پنڈت نہرو اور کشمیر

موتی لال ساقی
جموّں اینڈ کشمیر کلچرل اکادمی، لال منڈی، سری نگر

کشمیر کے ساتھ پنڈت جی کا والہانہ پیار کسی سیاسی مصلحت یا ذاتی غرض کا نتیجہ نہیں تھا۔ ان کا دل کشمیر کا متوالا تھا اور کشمیر ان کے جسم و جاں میں بسا ہوا تھا۔ ان کی حسن پرست اور حسن شناس نظروں نے اس گہرائی کی تھاہ لی تھی جس گہرائی سے کشمیر کے ماورائی حسن کے سوتے پھوٹتے تھے۔ نہرو کے لیے کشمیر ایک مہکتا ہوا خواب تھا۔ ایک ایسا خواب جس پر بے شمار حقیقتوں کو قربان کیا جا سکتا ہے۔

شہنشاہ جہانگیر نے کہا ہے کہ کشمیر کو ملک نہیں باغ کہو۔ شہنشاہ نے کشمیر کے صرف ایک رنگ کو جانچا اور پرکھا تھا مگر نہرو کشمیر کے ہر رنگ اور ہر پہلو کے شیدائی تھے۔ نہرو جیسا کشمیر کا دوسرا عاشق تلاش کرنے پر بھی کہیں نظر نہیں آتا حالاں کہ کشمیر کے عاشقوں اور دیوانوں کی کبھی کوئی کمی نہیں رہی ہے۔ پنڈت جی کی حسن شناس نگاہوں نے کشمیر کو الگ الگ زاویوں سے دیکھا اور پرکھا اور اس کی ہر تیکھی ادا کے بانکپن اور رنگینی کو سمیٹنے اور اپنے اندر جذب کرنے کی مقدور بھر کوشش کی۔ پنڈت جی ایک حساس دل لے کر پیدا ہوئے تھے۔ وہ فطرت کی فیاضیوں کے نہ صرف دلدادہ تھے بلکہ قدرداں بھی۔ ان کی نظر میں کشمیر فطرت کا ایک لازوال شاہکار تھا۔ وہ جب بھی کشمیر آتے، اس جنت ارضی کو ایک نئے اندازِ نظر سے دیکھتے اور اس کی جلوہ سامانیوں سے لطف اندوز ہو کر اپنے لیے روحانی بالیدگی کا سامان فراہم کرتے۔

کشمیر کے ساتھ پنڈت جی کا لگاؤ تو شاید ان کی گھٹی میں پڑا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ لگاؤ عشق کے الاؤ میں تبدیل ہو کر رہ گیا تھا۔ تحریکِ آزادی کے دوران میں بھی وہ فرصت نکال کر کشمیر آجایا کرتے تھے اور سرشار ہو کر واپس چلے جاتے تھے۔

۱۹۴۰ء کے موسم گرما میں پنڈت جی بارہ دن تک کشمیر میں قیام پذیر رہے، اگرچہ وہ اس دوران بھی سیاسی دنیا سے اپنا تعلق منقطع نہیں کر سکے پھر بھی انھوں نے کشمیر کے حسن کے اندر چھپے ہوئے جادو کو ٹٹولا اور اسے نئے معنی عطا کیے۔

"ایک بہت ہی حسین عورت کی طرح جس کا حُسن ماورائی اور انسانی خواہش سے بالا ہو، کشمیر کا حُسن کچھ ایسا ہی ہے، دریا، وادی، جھیل اور پُرشکوہ درخت اس حسن کا حصہ ہیں۔ اس سحر انگیز حسن کا دوسرا پہلو، جو سخت پہاڑوں، برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں، یخ کے ذخیروں اور نیچے کی طرف بھاگتے ہوئے نالوں کی صورت میں آنکھوں کے سامنے آتا ہے، کشمیر کے مردانہ جلال کا آئینہ دار ہے۔ اس کے سینکڑوں چہرے اور بے شمار رُوپ ہیں جو بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی یہ روپ ہنستے مسکراتے نظر آتے ہیں اور کبھی روتے بسورتے۔ ڈل کی سطح سے اُٹھتی ہوئی دھند ایک ایسے پردے کا احساس دلاتی ہے جس کو نظریں چاک کر سکتی ہوں۔ اس دھند میں سے وہ سب کچھ نظر آتا ہے جو اس کے پیچھے چھپا ہے۔ بادل باہیں پھیلا کر پہاڑ کی چوٹی کو گلے لگاتے ہیں یا آہستہ خرامی کے ساتھ اتنے نیچے آتے ہیں کہ لگتا ہے بچے کھیلنے میں مصروف ہیں۔ میں نے لمحہ بہ لمحہ بدلتے اس منظر کو دیکھا۔ کبھی کبھی اس کی دلپذیری میں کھو کر بے خودی طاری ہو جاتی تھی۔ جب بھی میں نے اس منظر کو دیکھا مجھے خواب کا سا احساس ہوا اور ایسا لگا کہ یہ حقیقت نہیں بلکہ محض تصور ہے۔ ہماری امیدوں اور خواہشوں کی طرح جن کے سہارے ہم اپنے آپ کو تسلی دیتے ہیں مگر کبھی کبھار ہی یہ خواہشیں اور اُمیدیں بر آتی ہیں۔ یہ خواب میں دیکھے ہوئے محبوب کا روئے زیبا ہے جو نیند ٹوٹنے کے ساتھ ہی ہوا ہو جاتا ہے۔"

(نیشنل ہیرالڈ، جولائی ۱۹۴۰ء)

آبائی وطن ہونے کے ناطے دوسرے کئی مشاہیر کے لیے بھی یہ مسحور کن خواب زار کشش اور جاذبیت کا مرکز رہا ہے۔ اقبال ہوں یا چکبست

سر تیج بہادر سپرو ہوں یا کیلاش ناتھ کاٹجو۔ یہ سب لوگ دیوانگی کی حد تک کشمیر سے پیار کرتے تھے اور جی جان سے اسے چاہتے تھے۔ ان لوگوں کے دل بھی کشمیر کا نام زبان پر آتے ہی مچل اٹھتے تھے مگر پنڈت جواہر لال نہرو کی بات ہی کچھ اور تھی۔ ان کا دل ہمیشہ کشمیر کی یاد سے معمور رہتا تھا۔ یہاں تک کہ جیل خانے کی فضا میں بھی وہ کشمیر کے خواب دیکھتے اور اپنے آپ کو تسلی دیتے تھے۔ ۵ جنوری ۱۹۴۳ء کو وہ ایک خط میں گاندھی جی کو لکھتے ہیں:

" ملاقاتوں پر بندش نے مجھے اپنے اندر جھانکنے کی تھوڑی بہت فرصت عطا کی ہے۔ مگر میرا شفیق اور رفیق ہمسایہ ہمالیہ ہے۔ آسمان کی اوٹ میں اس کا خاکہ اور اب اس کی تازہ برف سے ڈھکی چوٹیاں میرے لیے کافی معنویت رکھتی ہیں۔ لگتا ہے یہ پہاڑ میری بہت پہلے کی یادوں کو جگاتے ہیں جب میرے آباو اجداد کشمیر کے پہاڑوں پر گھوم پھر رہے تھے اور برف اور یخ کے تودوں سے کھیلتے تھے۔ میرے یہاں بھی ساتھی ہیں مگر مجموعی طور پر مجھے اپنے سہارے چھوڑا گیا ہے۔"

کشمیر پنڈت جی کے لیے دلچسپی دلنوازی اور دل بستگی کے ہزاروں سامان لیے ہوئے تھا۔ انھیں کشمیر کے مخلوط تمدن، کشمیر کی علمی روایات اور کشمیری عوام سے بے حد پیار تھا۔ حسن فطرت کا گہوارہ کشمیر نہرو کی نظروں میں انسانی قدروں، رواداری اور بھائی چارے کی ایک دلربا پناہ گاہ تھا۔ کشمیر کے اس پہلو پر بات کرتے ہوئے پنڈت جی نے لکھا ہے:

" در حقیقت کشمیریوں کی خاص خصوصیت برداشت کرنے کا مادہ تھا۔ اس طرح کشمیر باقی ہندوستان کے مقابلے میں ایک ایسی تجربہ گاہ ہے جہاں مختلف تمدنوں کے میل ملاپ کا سلسلہ جاری ہے۔ لسانی اعتبار سے کشمیر عرصہ دراز تک سنسکرت علوم کا مرکز رہا اور بعد میں فارسی زبان کی پناہ گاہ بھی رہا۔ اسی میل ملاپ نے موجودہ کشمیری زبان کے خدوخال کو سنوارا۔ کشمیر میں خواتین نے تاریخ میں قابل قدر حصہ ادا کیا ہے۔ واشگاف انداز میں بات کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ وہاں ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں خواتین کو زیادہ حقوق حاصل تھے۔

فطرت کی خوبصورتی دوسرے مقامات کا بھی خاصہ ہے جس کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ کشمیر میں عام لوگوں نے اس خوبصورتی کا لطف اُٹھایا اور یہ چیز حکمرانوں اور اس قبیل کے دوسرے لوگوں تک ہی محدود نہیں رہی۔ کشمیر کے مردوں اور عورتوں نے خوبصورت دستکاریوں کی دنیا کو آراستہ کیا۔ ان دو خصوصیات اور مخلوط تمدن کے جنم لینے اور پنپنے نے عوام کو عام طور پر فرقہ وارانہ ٹکراؤ سے دور رکھا اور اُن کے اندر قوتِ برداشت کو بڑھاوا دیا۔"

(دیباچہ۔ تاریخ کشمیر)

پنڈت جی جب بھی شہروں کے شور وغل اور بھیڑ بھاڑ سے اکتا جاتے تھے تو فرصت کے چند دن نکال کر کشمیر کی فضاؤں میں پناہ لیتے تھے۔ بھارت جیسے عظیم اور وسیع دیش کا وزیر اعظم بننے کے بعد بھی وہ وقت نکال کر کشمیر آجایا کرتے تھے اور یہاں چشمہ شاہی، اچھی کام اور پہلگام کی دلکش فضاؤں میں چند دن گزار کر تازہ دم ہو جایا کرتے تھے۔ جب میدانی علاقوں کی ہلاکت خیز گرمی اور سورج کی تمازت انھیں بے قرار کر دیتی تھی تو وہ خیالوں خیالوں میں کشمیر پہنچ جاتے تھے اور ایک داخلی ٹھنڈک محسوس کرتے تھے، جو ٹھنڈک چنار کی چھاؤں اور سدا بہتے ندی نالے وادی گلپوش میں بکھیرتے رہتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ پنڈت جی کا خاندان کئی نسلوں سے شمالی ہندوستان میں آباد تھا مگر کشمیر کے ساتھ ان کا روحانی اور جذباتی رشتہ اس قدر گہرا تھا کہ وہ اپنے آپ کو کشمیر کا ایک حصہ، ایک انگ سمجھتے تھے۔ کشمیر کے ساتھ اس گہرے رشتے کا اظہار کرنے کے لیے جب بھی اُن کا قلم حرکت میں آجاتا تھا، ہر طرف پھولوں کے انبار لگ جاتے تھے اور ڈھیروں موتی جمع ہو جاتے تھے۔ یوں تو وہ اپنے جذبات نثر میں بیان کرتے تھے مگر یہ نثر اتنی شاعرانہ ہے کہ نظم کے شاہکاروں کو بھی اس نثر پر قربان کیا جا سکتا ہے۔ ایسے ہی خوابوں ــــ ایسے ہی سپنوں کو پنڈت جی نے اس وقت زبان عطا کی جب اُنھوں نے رنجیت سیتا رامیہ پنڈتا کی راج ترنگنی کے انگریزی ترجمے کا پیش لفظ سپردِ قلم کیا۔ یہ پیش لفظ جہاں ایک طرف پنڈت جی کی تاریخ شناسی کا اعلا نمونہ ہے وہاں دوسری طرف یہ پیش لفظ ان کے پُرزور تخیل اور کشمیر کے ساتھ ان کے عشق کا بھی اظہار ہے۔ لکھتے ہیں:

" میں کشمیر اور اس کے مدہوش کن حسن کا عاشق ہوں کیوں کہ شاید میرے دل کی گہرائیوں

بن جس کی یاد بھی اب مجھے نہیں رہی ہے، ایسا مجھ ہے جو اپنے پرانے وطن کا بلاوا پانے پر اُبل پڑتا ہے۔ وہ وطن جہاں سے ہم بہت پہلے نکل آئے ہیں۔ چوں کہ اس بلاوے، اس پیغام کا میری چاہت کے بقدر کوئی جواب نہیں، اس لیے مجھے خوابوں اور تصورات کا سہارا لینا پڑتا ہے اور میں برفانی پہاڑوں سے گھری ہوئی وادی کی دوبارہ سیر کتابوں اور دوسری بے جان تحریروں کے سہارے کرتا ہوں۔ اس وقت جب میں یہ الفاظ کاغذ پر اُتار رہا ہوں میری نظریں بلند دیواروں سے ٹکرا جاتی ہیں جو مجھے گھیرے ہوئے ہیں اور مجھ پر تنگ ہوتی جا رہی ہیں۔ میدانوں کی گرمی میں میرا دم گھٹا جا رہا ہے مگر کلہن[1] نے مجھے ان دیواروں کو پھاند جانے کا حوصلہ دیا ہے تاکہ گرمی کی یورش بھول جاؤں اور سورج دیوتا کی سرزمین کی سیر کروں۔ اس سرزمین کو اُس کے والد نے جنم دیا ہے اس بات کو محسوس کر کے کہ یہ سرزمین سخت گرمی برداشت نہیں کر سکتی، تند کرنیں بکھیرنے والا سورج احترام کے طور پر یہاں موسم گرما میں نرمی اور حلیمی کے ساتھ چمکتا ہے، جہاں دائمی برف پر اوشا سونے کی بارش کر دیتی ہے اور شام کے وقت روشنی بلند پہاڑوں کی چوٹیوں کو خراجِ عقیدت نذر کرتی ہے۔ اور نیچے وادی میں خمار آلود وتستا ہنستے ہوئے کھیتوں اور میوے سے لدے ہوئے باغوں کے درمیان سے سُبک خرامی کے ساتھ کبھی چناروں کی چھاؤں کے تلے اور کبھی کنولوں سے ڈھکی پُرسکون جھیلوں میں سے بل کھاتی ہوئی بہتی ہے۔"

آگے چل کر پنڈت جی نے لکھا ہے:

"میدانی علاقوں میں رہنے والا بھلا کس طرح پہاڑوں میں بکھری ہوئی شادمانی کو بھانپ سکتا ہے، خاص کر ایشیا کے اس ہیرے کی شادمانی کو جو اس براعظم کے بیچوں بیچ واقع ہے"

قادرالکلام شاعر بھی کشمیر کی روپ ریکھا کو اُس نزاکت، نفاست اور باریک بینی کے ساتھ الفاظ کے شیشے میں نہیں اُتار سکتا جس نزاکت، نفاست اور باریک بینی سے پنڈت جی نے اپنے لفظوں میں اسے سمیٹا ہے۔ کشمیر پر دُنیا کی مختلف زبانوں میں ہزاروں کی تعداد میں نظمیں لکھی گئی ہیں مگر جس فنکارانہ انداز اور رنگینی کے ساتھ پنڈت جی نے کشمیر کی روح کو الفاظ کے دھاگے میں پرو دیا ہے اور بازیاب کیا ہے اُس کی شان ہی کچھ اور ہے حق تو یہ ہے کہ پنڈت جی ایک شاعر ایک قلم کار کا دل و دماغ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ سیاسیات کے پُرخار دشت میں زندگی گزارنے کے باوجود اُن کے اندر کا شاعر اور فنکار زندہ رہا اور جب بھی اس شاعر اور فنکار نے کروٹ لی تو مہکتے ہوئے گلستاں کھل اُٹھے۔

بیسویں صدی کے اس عظیم مدبّر، مفکّر سیاست داں اور قلم کار کے لیے کشمیر ایک آدرش ـــــ ایک جاندار روایت اور ایک دلنواز تہذیبی ہم آہنگی کی علامت بن گیا تھا۔ ملک کی آزادی کے بعد اس آدرش اور علامت کی معنویت اور اہمیت زیادہ وسعتوں کی حامل ہو گئی تھی۔ پنڈت جی جس فلاحی ریاست کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے، جس سیکولر سماج کی طرح ڈالنا چاہتے تھے اُس کی زندۂ جاوید مثال کے روپ میں کشمیر اُن کے سامنے تھا۔ کیوں کہ ۱۹۴۷ء کے خون آشام دور میں بھی کشمیر میں بھائی چارے اور مذہبی رواداری کی مشعل روشن تھی جس کا اعتراف راشٹر پتا مہاتما گاندھی نے یہ کہہ کر کیا تھا کہ اس اندھیرے میں مجھے کشمیر میں روشنی کی کرن نظر آتی ہے۔

پنڈت جی اس کرن کی ضو فشانی سے سارے ملک کو منور کرنے کے متمنی تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس کا اظہار واضح الفاظ میں کیا۔ ۲ اگست ۱۹۵۶ء کو ایک اخباری کانفرنس میں مائیکل بریچر کے اس سوال کا کہ وہ کون سی شے ہے جو کشمیر کو ہندوستان کے لیے اس قدر اہم بناتی ہے؟ کیا اس کا کچھ تعلق ہندوستان کو ایک غیر مذہبی ریاست بنانے اور ملک میں قومی یکجہتی کو بنائے رکھنے کے ساتھ ہے؟' جواب دیتے ہوئے پنڈت جی نے کہا:

"ہاں شاید یہی اس کا سب سے اہم پہلو ہے۔ ایک جذباتی پہلو بھی ہے مگر وہ اس قدر اہم نہیں۔ ہندوستان کا کشمیر کے ساتھ تہذیبی اور دوسری طرح کا قریبی رشتہ دو یا تین ہزار سال سے ہے۔ یہ ہندوستانی تہذیب کا ایک عظیم مرکز رہا ہے۔ یہ بودھ تہذیب کا بھی زبردست گہوارہ رہا ہے اور اسلامی تہذیب کا ایک

---

[1] بارہویں صدی کا عالمگیر شہرت کا مالک سنسکرت اتہاسس کار۔



جلیل القدر مرکز بھی۔ ہندوستان کی دوسری جگہوں کے مقابلے میں وہاں فرقہ واریت کا کم احساس رہا ہے۔ ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسرے لوگوں نے کبھی کبھار ہی آپس میں جھگڑا کیا ہے اور اگر کبھی جھگڑا ہوا بھی ہے تو اس کے اثرات نفی کے برابر رہے ہیں۔ ان کی زندگی کم و بیش ایک جیسی ہے۔ اُن کا تمدن، ان کی زبان، ان کے کھانے پینے کے عادات اور وہ سب کچھ جس سے تمدن عبارت ہے وہ لوگ خوشی خوشی ایک ساتھ رہے ہیں اگرچہ ہندوستان میں افراتفری رہی۔"

کشمیریوں کے آپسی میل ملاپ کا یہ روشن پہلو پنڈت جی کے لیے اتنا ہی پُرکشش اور پُرمعنی تھا جتنا کہ کشمیر کا لاہوتی حُسن۔ وہ کشمیر کے خارجی حُسن کے بھی متوالے تھے اور داخلی حُسن کے بھی۔ دراصل کشمیر ان کے دُوروں میں بسا ہوا تھا اور دوروں کی آواز بیروں کی آواز سے زیادہ دل آویز اور پُراثر ہوتی ہے۔ کشمیر کے ساتھ اسی دلی تعلق نے پنڈت جی کو کشمیر کی سرحد پر مہاراجہ ہری سنگھ کے ہاتھوں ۱۹۴۶ء میں گرفتار کروایا جب وہ شیخ محمد عبداللہ کے کیس کی وکالت کرنے کے لیے کوہالہ تک پہنچے۔ اس موقعے پر اُنھوں نے مہاراجہ کے مجسٹریٹ کو یہ نوٹ دیا:

"گزشتہ پچیس سال کے دوران میں نے نہ تو انگریزی حکومت اور نہ ہی کسی مہاراجہ کے حُکم کو مانا جو میرے راستے میں آیا۔ ایک بار لیے گئے فیصلے سے جواہر لال کبھی مُکرتا نہیں وہ آگے ہی جاتا ہے۔ اگر آپ اس کے برخلاف سوچتے ہیں تو آپ جواہر لال کو نہیں جانتے۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے ہندوستان کے کسی بھی حصے میں جانے سے نہیں روک سکتی سوائے اس کے کہ مجھے گرفتار کیا جائے یا زبردستی ہٹا لیا جائے۔"

وہ ۱۹۴۶ء کے سیاسی طوفان میں پھر سے کشمیر آنے کی سوچ رہے تھے مگر گاندھی جی کی مداخلت نے انھیں آنے سے روک دیا۔

کشمیر کی فضاؤں میں کھو جانے کی تمنا عمر بھر پنڈت جی کے ساتھ رہی چنانچہ اپنی وصیت میں بھی انھوں نے یہ بات درج کر دی تھی کہ استھیوں کا کچھ حصہ ہمالیہ میں بھی بکھیرا جائے۔ کشمیر میں ہمالیہ کے ساتھ پنڈت جی کو خاص لگاؤ تھا۔ ●

۱۹۴۲ کے شروع کی بات ہے کہ کوئی پرانا کانگریس کارکن صبح ہی صبح آنند بھون آیا۔ وہ نہرو کو پیش کرنے کے لیے ہاتھ کا کتا ہوا بہت عمدہ کھادی کا سوت لایا تھا۔ نہرو کو یہ سوت بہت زیادہ پسند آیا۔ وہ اُسے گاندھی جی کو پیش کرنے کے لیے وردھا لے جانا چاہتے تھے۔ میں آنند بھون کے برآمدے میں کھڑا ہوا تھا۔ انھوں نے مجھے ایک طرف بلا کر پوچھا "اس آدمی کو کیا دینا چاہیے۔؟"

میرے لیے یہ بڑا مشکل سوال تھا۔ میں جانتا تھا کہ روپیہ ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ میں نے سوچا کہ اگر کم پیسے بتاتا ہوں تو وہ کہیں گے کہ یہ چھوٹی طبیعت کا آدمی ہے۔ اگر اس چھوٹی سی چیز کے لیے کوئی بڑی رقم بتاتا ہوں تو وہ مجھے بے وقوف کہیں گے۔ میری قسمت اچھی تھی کہ اتنے میں ان کی بیٹی آگئیں۔ نہرو نے یہ معاملہ ان پر چھوڑ دیا۔ انھوں نے اس آدمی کو اچھی رقم دے دی۔ اور نہرو کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ وہ شخص اس امید کے ساتھ آنند بھون نہیں گیا تھا کہ اسے سوت کی کوئی قیمت ملے گی لیکن وہ بہت خوش تھا کہ اس معمولی سے تحفہ کی نہرو نے اتنی قدر کی اور اس کا اتنا بڑا انعام دیا۔



نہرو کا ادبی رُتبہ

(پروفیسر) آزاد گلاٹی
گورنمنٹ کالج، نابھہ ۱۴۷۲۰۱ (پنجاب)

پنڈت نہرو نے "تاریخ عالم کی جھلکیاں" میں خود سے استفسار کرتے ہوئے کہا ہے: "میں ادیب بھی نہیں ہوں اور مورخ بھی نہیں ہوں، تو پھر یچ مچ ہوں کیا؟" حقیقت یہ ہے کہ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ وہ کیا نہیں تھے لیکن اس میں شک وشبہہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ وہ ایک ادیب بھی تھے اور مورخ بھی۔ وہ ایک حد تک، اپنے عہد کے خالق بھی تھے اور ناظر بھی۔ جب کبھی جیل میں انھیں فراغت کے لمحے ملے، انھوں نے حال اور ماضی پر ایک گہری نظر ڈالی اور اس کی روشنی میں مستقبل کے خواب ڈھالے اور جب ان کا اظہار کیا تو ان کی تحریروں میں ایک ایسے باشعور ادیب کی شخصیت جھلکنے لگی جس کے زاویۂ نگاہ، حساس دل، بے پناہ ذہانت اور فطانت اور انگریزی زبان پر قابلِ رشک دسترس نے اُسے دنیائے ادب میں ایک لافانی مقام عطا کیا۔ یہ بجا ہے کہ انھوں نے ادب کی مروجہ اصناف میں طبع آزمائی نہیں کی لیکن جس انداز سے انھوں نے اپنی ذات، انسانی برادری اور کائنات کے باہمی رشتوں اور رابطوں کا احاطہ کیا اور جس طرح ان کی تہوں میں اُتر کر اپنے ملک کی عظمت کی بازیافت کے ساتھ ساتھ خود اپنی ذات کی بازیافت کی سعی بھی کی، وہ ان کے بنیادی طور پر ایک ادیب ہونے کا بیّن ثبوت ہے۔

ہر ادیب اپنی تخلیقات میں اپنی شخصیت کے ادراک اور اظہار کی سعی کرتا ہے اور یہ دونوں عمل ساتھ ساتھ جاری رہتے ہیں۔ جب ادیب نہرو جیسی جامع شخصیت کا حامل ہو تو اس کے ادراک و اظہار سے جو ادب معرضِ وجود میں آئے گا اُس کے معیار و وقار کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ بقول رادھا کرشنن "نہرو لطیف ذہنی حسیات اور احساسات کی کمیاب نفاستوں کا مرکب تھے۔" ان کی ذہنی یافت اور اس کی توانائی اور ان کے کردار کی سنجیدگی اور سچائی نے ان کی تحریروں کو غیر معمولی تاثیر عطا کی۔ ان کے خیالات خود ساختہ نہیں تھے، اس لیے ان کے خیالات کی جدّت سے کہیں زیادہ اہم ان کی مہذّب شخصیت کی وہ آواز تھی جو ایک اعلا مقصد کے حصول کے لیے اُبھرتی رہی اور یہی اُن کی تحریروں میں زندگی کا آہنگ پیدا کرتی رہی۔ اس آواز میں ہمدردی بھی تھی اور طنز بھی، استحکام اور پختگی بھی اور حرارت و حلاوت بھی۔ اگر کوئی یہ پوچھے کہ جواہر لال نہرو کے اعلا ادیب ہونے کا راز کیا ہے تو اس کا سیدھا سا جواب ہوگا۔ جواہر لال خود! اس شخصیت کی تہذیب و تربیت میں جہاں اُن کی خاندانی روایات کا دخل تھا وہاں ان کی اعلا تعلیم، علمی تجربہ اور ناسازگار ماحول سے مسلسل جدّوجہد کے جذبے سے پیدا شدہ کیفیات کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔ نہرو کی تصانیف میں اگر صرف حوالوں ہی کو دیکھا جائے تو ان کے وسیع مطالعے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ قدیم و جدید علوم و فنون، سیاست، تاریخ، معاشیات، ثقافت، سائنس اور مذہب کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا ہوگا جو ان کی گرفت سے باہر ہو۔ مطالعے کا اُنھیں اس قدر شوق تھا کہ سفر میں بھی کتابیں ساتھ رہتی تھیں۔ کسی نے بجا کہا ہے کہ نہرو نے پڑھا ریل میں اور لکھا جیل میں! ان کی تحریروں میں ایک ایسے مہذب شخص کے نکھرے ستھرے کردار کا اظہار ملتا ہے جسے انسانیت سے محبت تھی اور جو محض اس لیے کرب و ایذا سے گزرتا ہے کہ اُس کی نظروں میں مہذب معاشرے میں استحصال اور نا انصافی جیسی حماقتیں بے معنی اور غیر ضروری تھیں۔ نہرو جیسے تخلیقی مفکر کے تجربات و خواہشات اور ان کی کامرانیوں اور محرومیوں کا اظہار نہ صرف عصری ذہنوں کو متاثر کرتا ہے بلکہ انسانی تاریخ کا ایک لازوال حصّہ بھی بن جاتا ہے۔ نہرو کی ادبی حیثیت اور منزلت کی یہ ایک اہم دلیل ہے۔

نہرو کی تصانیف مجموعی طور پر انسانی تہذیب کے ارتقا اور قومی اور بین الاقوامی مسائل پر اُن

کے نقطۂ نظر کی وضاحت کے ساتھ ساتھ خود اُن کی اپنی ذات، شخصیت اور نظریۂ حیات کی شناخت میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ عام طور پر ان کی تین تصانیف "تاریخ عالم کی جھلکیاں" (اشاعت ۱۹۳۹ء) "سوانح حیات" (اشاعت ۱۹۳۶ء) اور "تلاش ہند" (اشاعت ۱۹۴۶ء) کے توسط ہی سے ان کے ادبی مقام اور مرتبے کا تعین کیا جاتا ہے کیوں کہ ان کتابوں میں ان کی تخلیقی صلاحیتیں اور اسلوب اپنے عروج پر ہیں۔ "تاریخ عالم کی جھلکیاں" دراصل ان خطوط کی اضافی شکل ہے جو انھوں نے اپنی بیٹی اندرا کو اپنی قید کے دوران لکھے تھے۔ یہ کتاب تاریخ سے متعلق نہرو کے نظریے کا ایک اجمالی منظر نامہ ہے اور جو خطوط ابتدا میں انسان کے ارتقائی مراحل اور حیاتیات سے متعلق تھے وہ رفتہ رفتہ دنیا کی تاریخ کی بھرپور جھلکیاں پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔ "تلاش ہند" جہاں ہندوستان کی قدیم ثقافتی وراثت کی بازیافت ہے وہاں یہ خود نہرو کی ذات کی دریافت کی بھی ایک کامیاب سعی ہے۔ نہرو نے جب اپنی سوانح لکھی تو وہ ۴۵ برس کے تھے اس لیے یہ ایک بھرپور، توانا اور پُر وقار شخصیت کا ادبی اظہار ہے یہ کتاب لکھتے وقت ان کے سامنے دو واضح مقاصد تھے۔ وہ نہ صرف قید کے دنوں کا کوئی مثبت استعمال کرنا چاہتے تھے بلکہ "خود ان ہی کے لفظوں میں" ان کی خواہش تھی کہ وہ "خود اپنے ذہنی ارتقا کو بیان کریں۔" انھوں نے اس کے دیباچے میں لکھا ہے: "میں اپنے ماضی کے محسوسات و تجربات کو اس اُمید پر قلمبند کر رہا ہوں کہ اس سے مجھے کچھ سکون اور نفسیاتی تشفی ملے۔" اس کتاب میں وہ "دانستہ طور پر ہندوستان کے موجودہ مسائل پر مباحثے سے بھی دور" رہے ہیں اور اس طرح یہ سوانح "ماضی کا ایک اجمالی اور ذاتی بیانیہ ہے جو حال کی سرحد کے قریب تو آتا ہے لیکن اسے چھونے سے بہت ہوشیاری سے گریز کرجاتا ہے۔" یہ تصنیف ان کے رومانی تحرک، رزمیہ شکوہ اور غنائی سوز و گداز کا فنکارانہ امتزاج ہے۔ یہاں ان کی ذات کی داستان پوری قوم کی آزادی کی جدوجہد کی داستان میں مدغم ہوجاتی ہے۔

بنیادی طور پر نہرو ایک شاعرانہ ذہن و دل کے مالک تھے۔ ان کی تصانیف ہوں یا تقاریر، خطوط ہوں یا گفتگو، ان کے اندر کے شاعر کی آواز اپنی پوری تخلیقی جولانیوں کے ساتھ سنائی دیتی ہے۔ اگر شاعری سے مراد وہ فن ہے جو روح کی گہرائیوں میں تحرک پیدا کردے اور تجربہ اور مشاہدہ کا حسیاتی احاطہ کرکے اسے جذباتی طرزِ اظہار عطا کرے، تو نہرو بلا شبہ ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کی تحریروں میں "نثری نظموں" کے کتنے ہی نمونے ملتے ہیں۔ ماضی کا ذکر کرتے وقت ان کی آواز میں شاعرانہ تخیل اور غنائیت دبے پاؤں در آتے ہیں۔ وہ اپنے نظریۂ انسانیت کا اظہار کر رہے ہوں یا انسانی تہذیب کے ارتقا کا بصیرت افروز تجزیہ یا پھر حقیقت اور وجودیت کا تذکرہ، وہ شاعرانہ استعاروں اور علامتوں کو بڑی خوبی سے بروئے کار لاتے ہیں اور سادگی میں پرکاری اور پرکاری میں سادگی کے پہلو نکال لیتے ہیں۔ وہ جب بھی تنہائی کے کرب کا شکار ہوتے ہیں ان کے اندر کا شاعر بیدار ہوجاتا ہے۔ اپنی روحانی تنہائی کا اظہار وہ اپنی سوانح میں یوں کرتے ہیں:

"مغرب میں، میں اجنبی ہوں کیوں کہ مغرب کا ہو کر نہیں رہ سکتا۔ لیکن اپنے ملک میں بھی کبھی کبھی مجھے جلا وطنی کا احساس ہوتا ہے۔"

دراصل نہرو کا بنیادی تاثر تو خود اُن کے اندر تھا جس کا نفسیاتی تدارک کرنے کے لیے وہ اپنے جذبات و احساسات کو الفاظ کا پیکر عطا کرتے تھے۔ بقول ہری موہن پرشاد "ٹالسٹائی اونیل اور لارنس کی طرح تحریر کا عمل ان کے اندر کو بھی صاف ستھرا کردیتا تھا اور ان کے اندرونی تنازعوں کو سلجھاتا رہتا تھا۔" غالباً یہ تنہائی کا احساس ہی تھا جس کی وجہ سے انھیں قدرت کی تنہا اور ویران وسعتوں میں بھی ایک عجیب قسم کی تشفی کا احساس ہوتا تھا اور وہ ان سے قوت اور بہجت کشید کرلیتے تھے۔

نہرو کی ادبی حیثیت کا ایک نمایاں پہلو ان کی تیز جمالیاتی حس ہے وہ خوبصورتی کے پرستار تھے اور انسان کے ساتھ کی جانے والی ناانصافیوں کو زندگی کی خوبصورتی کے انہدام کے مترادف تصور کرتے تھے۔ قدرت کی خوبصورتی کے احساس و اظہار میں وہ WORDS WORTH کے بہت قریب ہیں۔ پہاڑوں کے لیے ان کے دل میں خاص کشش تھی اور پہاڑوں کی ٹیڑھی میڑھی قوسیں "انھیں "عورت کی چھاتیوں کی طرح نرم اور گول" محسوس ہوتی ہیں۔ طلوع و غروبِ آفتاب کے مناظر اُن کے ذہنی افق کو تابندہ

کیے رکھتے ہیں: "پہاڑوں کی چوٹیوں کو اپنے آنچل میں سمیٹتے ہوئے بادل" انھیں "خواب میں دیکھے ہوئے محبوب کے چہرے کی طرح نظر آتے ہیں جو آنکھ کھلتے ہی غائب ہوجاتا ہے۔" وہ جیل میں گھاس کے چھوٹے موٹے گچھوں اور پتھر کے ٹکڑوں سے اپنے "پرانے دوستوں" کی طرح ملتے تھے اور ان کے دل میں "کھلی جگہوں، وسیع سمندروں اور پہاڑوں کی طلب" ہمیشہ زندہ رہتی تھی۔ بدلتے موسموں اور کھلتے پھولوں کے وہ رسیا تھے، اور دھوپ اور ہواؤں کے لمس سے نشاط اور بشاشت حاصل کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں: "علی الصبح میں ننگے بدن کھلی جگہ پر لیٹ جاتا اور پہاڑوں کی نرم دھوپ مجھے اپنی باہوں کی حدت میں لے لیتی۔ برفانی ہواؤں سے بدن میں جھرجھری تو پیدا ہوتی لیکن دھوپ میرے تحفظ کے لیے آجاتی اور مجھے حدت اور بشاشت سے سرشار کردیتی۔" ان کے سوانح سے درج ذیل اقتباس مناظرِ قدرت کا ایک ایسا بیانیہ ہے جس کی مثال ملنا مشکل ہے:

" جیل میں سورج کے طلوع و غروب کے مناظر ناپید تھے۔ افق ہماری نظروں سے اوجھل رہتا تھا اور صبح کو تھوڑی دیر بعد گرم شعاعوں والا سورج ہماری نگراں دیواروں کے اوپر سے اچانک طلوع ہوجاتا تھا۔ رنگ کہیں تھے ہی نہیں اور ہماری آنکھیں مٹیالی دیواروں اور جیل کے کمروں کے بے جان مناظر دیکھتے دیکھتے خود بے جان ہوچکی تھیں۔ انھیں دھوپ چھاؤں اور رنگ کی پیاس تھی۔ جب ساون کے بادل عجیب و غریب شکلیں اختیار کرتے، مستی و سرشاری سے اٹھلاتے اور رنگوں کی یلغار سے کھیلتے گزرتے تو میں حیران کن مسرت سے انھیں ایسے دیکھتا رہ جاتا جیسے میں کسی وجد آور کیفیت میں ہوں۔ کبھی کبھی کوئی بادل درمیان سے ٹوٹ جاتا تو اس کے اندر اس سوراخ سے آسمان ایک حیران کن منظر لیے سامنے آجاتا۔ ایک حیران کر دینے والی گہرائی کا کالا نیلا رنگ جو آفاقیت کا حصہ معلوم ہوتا تھا۔"

ایسے کتنے ہی تجربات و مشاہدات ان کی تحریروں میں بکھرے ہوئے ہیں جن میں حزنیہ کیفیات کی ایک زیریں لہر رواں دواں ہے۔ یہ حزنیہ رو ہی ہے جو ان کی تحریروں کو کربِ نشاط اور نشاطِ کرب کا ایک منفرد کھٹا میٹھا ذائقہ دیتی ہے۔

نہرو کی تیز قوتِ مشاہدہ اُن کی فطانت کی تابندگی اور تجزیاتی صلاحیتوں نے انھیں ایک بے حد کامیاب خاکہ نگار بھی بنادیا۔ ان کا خاکہ نگاری کا فن انسانی فطرت و نفسیات پر ان کی دسترس کا مظہر ہے۔ وہ کردار کے بنیادی عناصر تک بہت آسانی سے رسائی حاصل کر لیتے ہیں اور پھر جامع استعاروں، ٹھوس حوالوں اور دلچسپ واقعات سے اس کے خدوخال نکھارتے، سنوارتے چلے جاتے ہیں۔ انھوں نے لینن، شنکر اچاریہ، نپولین، لیونارڈا ونچی وغیرہ کے قلمی خاکے بھی پیش کیے ہیں اور میڈم کاما، مہندر پرتاپ، شیام جی کرشنا ورما وغیرہ کے بھی، لیکن خاکہ نگاری کی بہترین مثالیں ان کے ہاں گاندھی جی اور موتی لال نہرو کے خاکوں میں ملتی ہیں۔ مہاتما گاندھی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

" اس نحیف جسم والے چھوٹے سے آدمی میں کچھ فولادی عناصر بھی تھے۔ وہ ایک ایسی چٹان کی طرح تھے جو جسمانی طاقتوں کے آگے نہیں جھکتی۔ اپنے متاثر نہ کرنے والے خدوخال، لنگوٹی اور ننگے بدن کے باوجود اُن کے اندر ایک ایسا شاہانہ جلال تھا جس کی وجہ سے دوسرے خود بخود اس کے سامنے جھک جاتے۔ دانستہ اور شعوری طور پر کمزور اور حلیم ہونے کے باوجود ان میں ایسی طاقت اور تحکم تھا جس سے وہ خود بھی آگاہ تھے اور کبھی کبھی شاہانہ انداز میں وہ ایسے احکام بھی جاری کر دیتے تھے جن کی تعمیل ہم پر لازم ہوجاتی تھی۔" نہرو موازنے اور تقابل کو بھی خاکہ نگاری کے لیے بروئے کار لاتے تھے۔ موتی لال نہرو کا موازنہ مہاتما گاندھی سے کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

" میرے والد ان سے قدرے مختلف تھے لیکن ان کی شخصیت میں بھی ایک قوت تھی اور اپنے ہی انداز کا شاہانہ وقار بھی۔ وہ شعوری طور پر حکم صادر کرتے تھے اور دوسروں میں گہری وفاداری کے ساتھ ساتھ شدید مخالفت بھی پیدا کرسکتے تھے۔ چوڑے ماتھے، بھنچے ہوئے ہونٹوں اور مستحکم ٹھوڑی کی وجہ سے اٹلی کے عجائب گھروں میں رکھے رُوم کے بادشاہوں کے مجسموں سے ان کی گہری مماثلت تھی۔"

کبھی کبھی وہ ہمدردی اور طنز کا سہارا بھی لیتے تھے۔ مہندر پرتاپ کے بارے میں لکھتے ہیں: " وہ عجیب مرکب قسم کا لباس پہنتے تھے جو تبت کی چٹیل پہاڑیوں اور سائبیریا کے میدانوں میں یکساں کام آسکتا تھا۔ اس میں لاتعداد بڑی بڑی جیبیں ہوتی تھیں جو کاغذوں اور تصویروں سے ٹھسا ٹھس بھری رہتی تھیں۔



وہ قرونِ وسطیٰ کے رومانی ناولوں کا کوئی کردار لگتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے DON - QUIXOTE - بھٹک کر بیسویں صدی میں آگیا ہو۔ لیکن تھے وہ بے حد راست باز اور ایماندار شخص۔"

نہرو کے ادبی وقار کا انحصار بہت حد تک ان کے اسلوب کی جادوگری پر بھی ہے۔ انھیں اس بات کا احساس تھا کہ "انگریزی ایک غیر ملکی زبان ہے اور اس میں سادگی کے ساتھ موثر پیرایے میں کچھ لکھنا آسان نہیں ہے۔" لیکن اُن کی تحریروں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انھوں نے اِس مشکل کو آسان کر دکھایا ہے۔ MARJOURI BOULTON نے اپنی کتاب THE ANATOMY OF PROSE میں لکھا ہے: "ان انگریزوں کو جو اپنی زبان میں لکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے، پنڈت جواہر لال نہرو جیسے ہندوستانیوں کی انگریزی پڑھ کر شرمسار ہونا چاہیے۔" اور JOHN GU-NTHER - کے الفاظ میں "بمشکل ایک درجن زندہ ہستیاں ایسی ہوں گی جو نہرو جیسی انگریزی لکھ سکیں۔" نہرو بلاشبہ ایک صاحبِ طرز انشا پرداز تھے۔ وہ مختلف مراحل پر مختلف اسالیب استعمال کرنے کے فن میں طاق تھے۔ وہ حسبِ ضرورت تحلیلی اندازِ بیاں بھی اختیار کر سکتے تھے اور بیانیہ بھی، طنزیہ بھی اور شاعرانہ بھی لیکن ان کے شاعرانہ تخیل میں حقیقت کی صالح اور موثر آمیزش ہوتی ہے۔ ان کا اسلوب دراصل ایک ایسی شخصیت کا وسیلۂ اظہار ہے جو مخلص بھی ہے اور پُر وقار بھی، عینیت پرست بھی اور حقیقت آشنا بھی، شاعرانہ سوز و گداز کی حامل بھی اور سائنسی نقطۂ نظر کی پرستار بھی، جو ہندوستان کے ماضی کی عظمتوں کی قدرداں بھی ہے اور عصری تقاضوں سے بھی آشنا ہے، جس میں سنجیدگی بھی ہے اور لطیف حسِ مزاح بھی۔ ظاہر ہے کہ ایسی شخصیت کے اظہار کے لیے اسلوب میں تہ داری، تنوع، روانی، سادگی، سنجیدگی اور حقیقت آمیز تخیل کا ہونا لازمی ہے۔ جب وہ اپنی دس سالہ بیٹی کو خطوط لکھتے ہیں تو بیانیہ انداز اور سیدھی سادی زبان کا استعمال کرتے ہیں اور بہت آسانی سے انسانی ارتقا کے مشکل مراحل کا تذکرہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ دنیا کی تاریخ کی جھلکیاں پیش کرتے ہیں تو تاریخ کی خشک ہڈیوں میں اپنے تخیل اور زورِ بیان سے زندگی کا تحرک پیدا کر دیتے ہیں۔ ماضی کو حال اور مستقبل سے منسلک کرنے کے مراحل پر وہ FLASH BACK کا طریقہ اپناتے ہیں اور استعاروں کے ذریعے خوبصورت اور موثر رابطے قائم کر دیتے ہیں۔ یہاں ان کے اندر کا شاعر ان کے تاریخ داں سے اس قدر ہم آہنگ ہو جاتا ہے کہ ماضی، حال اور مستقبل کی ایک خوش آئند سمفنی سنائی دینے لگتی ہے۔ سوانح لکھتے وقت ان کا شاعرانہ جمال، سنجیدگی اور پختگی کے جلال سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور اس میں مزید گیرائی اور گہرائی آجاتی ہے۔ وہ مناسب الفاظ کے موزوں ترین استعمال کے فن میں طاق ہیں۔ کئی بار وہ بیان کے اختصار سے جامعیت کا حسن پیدا کر لیتے ہیں۔ مثلاً LIBERALS کو وہ "ہندوستانی سیاست کے ہیملٹ" کہتے ہیں، وہ فارسی کو "مشرق کا فرانس"۔ کبھی کبھی وہ بڑھتی ہوئی سنجیدگی کو طنز و مزاح کی مسکراہٹ میں تحلیل کر دیتے ہیں۔ وہ شیرشاسن کیا کرتے تھے۔ اس کے بارے میں لکھتے ہیں: "اس قدرے مضحکہ خیز حالت نے میرے اندر مزاح کی حس کو بڑھاوا دیا ہے اور زندگی کی ستم ظریفیوں کو برداشت کرنے کی صلاحیت دی ہے۔" نینی تال جیل کی بیرک کو "کتا گھر" کہا جاتا تھا۔ جب انھیں وہاں رہنا پڑا تو کہا: "یہ اس کا پرانا نام تھا اور میرے وہاں قیام سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔"

نہرو کی ادبی صلاحیتوں نے انھیں دنیائے ادب میں ایک منفرد اور امتیازی مقام عطا کیا ہے۔ ان کی سبھی تصانیف میں مسلسل نکھرتی ہوئی جمالیاتی حس اور انسانی معاملات و مسائل میں ان کی بتدریج بڑھتی ہوئی دلچسپی کے حسین امتزاج کا فنکارانہ اظہار ملتا ہے۔ ان کا اسلوب جس طرح ان کی کثیر الجہات شخصیت کی عکاسی کرتا ہے، اس کی مثال شاذ شاذ ہی ملتی ہے۔ انسان پر اُن کے اعتماد اور استحصال اور جبر کے خلاف جد و جہد نے ان کے کردار کو جو بے باکی، خلوص اور تہ داری بخشی تھی، وہ ان کی نوکِ قلم سے ہمیشہ مترشح رہی۔ ان کی سیاسی مصروفیات نے

ہمارے ملک کو ایک بے مثال سیاسی مدبّر تو عطا کیا لیکن ہندوستان نے ایک ایسا ادیب بھی گنوا دیا جو سیاسی رہنما سے کہیں زیادہ قد آور ثابت ہونے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ یہ بات اس لیے بھی وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ان کی ادبی شخصیت ان کی سیاسی مصروفیات کے باوجود نکھر کر سامنے آتی رہی۔ بقول میڈم چیانگ کائی شیک:

"سیاسی جدوجہد کے شور و غل کے ختم ہو جانے کے کافی عرصے بعد جب یہ سب یادِ ماضی بن کر رہ جائے گا نہرو کی ادبی شخصیت کو بقائے دوام نصیب ہوگی اور یہ پیش گوئی کرنا خیال آرائی نہیں ہے کہ نہرو انگریزی ادب کے آسمان پر ایک منور ستارے کی طرح اس وقت تک جگمگاتا رہے گا جب تک انگریزی زبان زندہ رہے گی" ۲

دہلی کی آخری شمع

"دلّی کا یادگار مشاعرہ عرف دہلی کی آخری شمع" مرزا فرحت اللہ بیگ (مرحوم) کے ادبی کارناموں میں سے ایک ہے۔ مرزا صاحب کا شمار ان لوگوں میں ہے جنھوں نے ۱۸۵۷ء کے انقلاب دہلی کے بعد انقلاب سے پہلے کی آخری جھلک سب کو کچھ اس انداز سے دکھائی کہ ایک جیتی جاگتی محفل آراستہ ہوگئی۔

"دہلی کی آخری شمع" کے پیش لفظ میں مرزا فرحت اللہ بیگ لکھتے ہیں کہ "مجھے بچپن سے شعرائے اُردو کے حالات پڑھنے اور سُننے کا شوق رہا مگر کبھی کوئی ایسی تحریک نہیں ہوئی جو ان کے حالات کو ایک جگہ جمع کرنے کا خیال پیدا کرتی ..... اتفاق دیکھیے کہ پرانے قدیم کاغذات میں مجھے حکیم مومن خاں دہلوی کی ایک قلمی تصویر ملی۔ قلمی تصویر کا ملنا تھا کہ یہ خیال پیدا ہوا تو بھی محمد حسین آزاد مرحوم کے نیرنگِ خیال کی محفلِ شعرا کی طرح ایک مشاعرہ قائم کر، مگر ان لوگوں کے کلام پر تنقید کرنے کے بجائے صرف ان کی چلتی پھرتی تصویریں دکھا۔ خیال میں رفتہ رفتہ پختگی ہوئی اور اس پختگی خیال نے ایک مشاعرے کا خاکہ پیشِ نظر کر دیا۔" آزاد نے "نیرنگِ خیال" میں تاریخ کے اکثر مشاہیر کو لا بٹھایا ہے۔ چنانچہ اس دربار کی رونق نے مرزا فرحت اللہ بیگ کو اکسایا۔ دوسری طرف مولوی کریم الدین کے مشہور تذکرے طبقات الشعرائے ہند نے ایک مشاعرے کا پتہ دیا۔ چنانچہ ان دونوں تحریروں کی روشنی میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے اس فرضی مشاعرے کی بنیاد رکھی۔ مولوی کریم الدین کا تذکرہ طبقات الشعرائے ہند ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا تھا اور دہلی کی آخری شمع پہلی مرتبہ ۱۹۲۸ء میں کتابی شکل میں شائع ہوئی۔

دلّی کے اس یادگار مشاعرے کا نیا اڈیشن ڈاکٹر صلاح الدین نے اپنے جامع مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ بعض ضروری حواشی اور فرہنگ کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔

مصنف : مرزا فرحت اللہ بیگ

مرتب : ڈاکٹر صلاح الدین

صفحات : ۱۴۷

قیمت : ۲۳ روپے

دہلی کا آخری دیدار

سید وزیر حسن دہلوی نے دلّی کی ٹکسالی زبان میں دلّی کے لال قلعے اور اس کے مکینوں کے شب و روز کی جھلکیاں پیش کی ہیں۔ یہ کتاب آخری مغل دَور کی معاشرتی فضا کا منہ بولتا مرقع ہے۔ مہذب انسانوں کی طرح ہر تہذیبی شہر کا بھی ایک مزاج زندگی بن جاتا ہے جو صدیوں کے تمدنی شعور اور ذہنی روایتوں کی دین ہوتا ہے۔ شاہ جہاں آباد جس قطعۂ زمین پر بسایا گیا وہ اس سرزمین کا ایک حصہ تھا جس پر ہندوستان کے وسطی عہد کی تاریخ میں جنم لینے والے تہذیبی انقلاب نے اپنی نمو پذیری کے بہت سے مراحل طے کیے تھے۔ عہدِ وسطیٰ کی دہلی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے معاشرے کے مختلف طبقات کو یکجا کر کے اخوت، وسیع النظری، باہمی میل ملاپ اور فطری ارتقا کی راہیں ہموار کیں۔

قاعدہ ہے کہ جب چراغ بجھنے کو ہوتا ہے تو لَو بھڑکتی ہے۔ اسی طرح سلطنتِ تیموریہ کا چراغ جب گل ہونے کو ہوا اس نے وہ روشنی دکھائی اور ایسا سنبھالا لیا جس کی مثال مشکل سے تاریخ میں ملے گی۔ سلطنت دم توڑ رہی تھی لیکن تہذیبی شعور ابھی مردہ نہ ہوا تھا۔ یہاں خانقاہیں بھی تھیں اور شراب خانے بھی، مدرسے بھی تھے اور قمار بازی کے اڈے بھی، لوگ بڑی عقیدت کے ساتھ خانقاہوں اور مزارات پر حاضر ہوتے تھے۔ پھر اسی جوش اور ولولے کے ساتھ طوائفوں کی محفلوں میں شرکت کرتے تھے۔ ان کی رندی اور مذہبیت ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ نہ رندی مذہبیت پر غالب آتی تھی اور نہ مذہبیت رندی پر۔

جس دلّی کا یہ کتاب قصہ سناتی ہے وہ صرف ایک شہر ہی نہ تھی، ایک تہذیب کا نشان، ایک تمدن کا گہوارہ، علم و ادب کا مرکز اور ایک ایسی گزرگاہ فکر تھی جہاں علم و فن، تعلیم و تربیت، اخلاق و مذہب، حکومت و سیاست کے سانچے صدیوں تک ڈھلے تھے۔ سید ضمیر حسن دہلوی نے اپنے طویل مقدمے کے ساتھ اس کتاب کو مرتب کیا ہے۔

مصنف : سید وزیر حسن دہلوی

مرتب : سید ضمیر حسن دہلوی

صفحات : ۷۴

قیمت : ۱۷ روپے

اُردو اکادمی دہلی سے طلب کریں

نہرو — بہ حیثیت ادبی فنکار

(ڈاکٹر) سیّد حامد حسین

۱۵-۲/۱۸۴، پروفیسر کالونی، بھوپال ۴۶۲۰۰۲ (ایم پی)

دورِ حاضر کے ممتاز مورخ آرنلڈ ٹائن بی نے پنڈت جواہر لال نہرو کو ایسی نادرِ روزگار شخصیتوں میں شامل کیا ہے جن میں بلند تخیل کے ساتھ حیرت انگیز عملی صلاحیتوں کا امتزاج ہوتا ہے۔ ہر فرد اپنے ماحول کا اسیر ہے اور اعلا ترین ذہانت کے مالک افراد کا بھی یہی المیہ ہے کہ انھیں بھی اپنے گرد و پیش کی صورتِ حال کے جبر کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے سیاسی رول کی بنا پر تاریخ میں جگہ پائی ہے۔ لیکن یہ رول نہ تو ان کی شخصی انفرادیت کا واحد مظہر ہے اور نہ ہی اس کے ذریعے ان کی اعلیٰ فکری اور محسوساتی صلاحیتوں کی عکاسی کی گنجائش ہے۔ لیکن دوسری جانب تحریکِ آزادی کی پرشورش جدوجہد کے ساتھ ان کی شخصیت اس طرح منسلک ہوئی ہے کہ اس کے بغیر ان کی انفرادیت کا تصور اکثر دشوار ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاسی جدوجہد میں نہرو نے جو مقام حاصل کیا اور سیاسی رول سے قطع نظر انھوں نے جس طرح شخصی امتیاز پیدا کیا، اس کا منبع ایک ہی ہے یعنی اُن کا خلاقانہ تصور۔ تحریک آزادی کے رہنما اور آزاد ہندوستان کے قائد کی حیثیتوں میں انھوں نے ایک صاحبِ نظر مدبر، ایک دردمند اور دانش نواز اور ایک خلاق منصوبہ ساز کا کردار ادا کیا ہے۔ نہرو نے ہندوستان کی تاریخ میں جو جگہ بنائی ہے وہ اُن کے تاریخی تصور، مستقبل کے بارے میں ان کے وژن اور ان کی حساس شخصیت کی ہی دین ہے۔

جواہر لال نہرو کی شخصیت کے یہ جوہر اور ان کے تخیل کی بھرپور روشنی ان کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ آگے چل کر جو لوگ نہرو سے صرف اُن کی تحریروں کی مدد سے تعارف حاصل کریں گے، اُن کا پہلا تاثر غالباً ایک ادبی فنکار کی حیثیت سے نہرو کے امتیاز کا اعتراف ہوگا۔ وہ چاہے نہرو کی وہ تقریر ہو جس میں دریائے راوی کے کنارے کھڑے ہو کر انھوں نے آزادیِ ہند کا پہلا اعلان کیا تھا یا گورکھ پور مقدمے میں ان کا بیان ہو۔ وہ چاہے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی نصف شب مجلسِ دستور ساز میں آزادیِ ہند کا استقبال ہو یا گاندھی جی کے انتقال پر قوم کے نام ان کا ریڈیو پر خطاب ہو۔ وہ چاہے ۱۹۵۱ء میں کانگریس کے اجلاس میں غریبی کے خلاف مہم کے آغاز کے سلسلے میں بیان ہو یا اُن کے انتقال کے بعد قوم کے سامنے آنے والی ان کی وصیت ہو، اُن میں سے ہر ایک محض صورتِ احوال واقعی کا اظہار نہیں بلکہ الفاظ و آہنگ، فکر و نظر اور تخیل و محسوسات کا موثر و پرکار شاہکار ہے۔

نہرو نے خود کبھی ادیب ہونے کا دعویٰ نہیں کیا لیکن جس شائستہ ماحول میں انھوں نے تربیت پائی، جس طرح ان کی تہذیب فکر و نظر ہوئی جس طرح دنیا کے عظیم ترین ادب فنکاروں کی تخلیقات سے تعارف حاصل کرنے کا موقع انھیں حاصل ہوا اس نے لفظوں کا خلاقانہ استعمال ان کی عادتِ ثانیہ بنا دیا۔ جھول دار، غیر متوازن، بے ربط خیالات سے بوجھل عبارت سے مطمئن ہونا انھوں نے نہیں سیکھا۔ شعوری طور پر انھوں نے بیان کی بازی گری سے پرہیز کیا۔ لیکن غیر شعوری طور پر اُن کی تحریریں ایک اندرونی آہنگ کی تابع رہیں۔

موتی لال نہرو اپنے عہد کی اعلا تہذیبی روایات کے زندہ نمونہ تھے۔ اُن کی نفاستِ طبع اور شستگیِ مذاق اور شائستگیِ آداب اور سلیقۂ گفتار کے اوصاف مشہورِ زمانہ تھے۔ جواہر لال نہرو نے ان آداب و اقدار کی پاسداری ورثے میں پائی تھی اور ان کے اعلا تعلیمی ماحول سے اُس کو مزید تقویت حاصل ہوئی تھی۔ انگلستان میں جس وقت وہ تعلیم کے لیے پہنچے تو یہ ایک ایسا دور تھا جو وکٹورین عہد کے زیرِ اثر رسمی آداب کا بے حد پابند تھا لیکن معقولیت، وسیع النظری اور دانش پسندی کو بھی فروغ دینے پر آمادہ تھا۔ جواہر لال نہرو نے ان



اثرات کو بھی اپنی شخصیت میں جذب کیا اور بے تعصب معقولیت، تنگ نظری سے پرہیز اور بلند ترین مقاصد کے حصول کی آرزو نے اُنھیں ساری زندگی تحریک بہم پہنچائی۔

انگلستان میں تعلیم کے دوران ہی میں اُن میں تاریخ کے معروضی مطالعے کا رجحان پیدا ہوا لیکن اپنے ملک کے تہذیبی سرمایے سے پُرخلوص وابستگی نے اُنھیں مشرقی تہذیب و تاریخ کے قابلِ قدر پہلوؤں کو نمایاں کر کے پیش کرنے اور ان کی عالمگیر معنویت کو واضح کرنے کی تحریک بخشی۔ جواہرلال نہرو نے یونیورسٹی میں سائنس کی تعلیم حاصل کی اور اس مطالعے نے اُنھیں اسباب و نتائج کو مدِنظر رکھ کر کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے ذہنی تربیت فراہم کی۔ مغرب کے روشن خیالی کے ماحول نے نہرو کو وسیع النظری کی قدر سکھائی، چنانچہ انھوں نے تعصب کی حد تک تنگ نظری سے پرہیز کیا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات نہرو کے تاریخی تصور میں ایک عدم یقینی کا رجحان اُبھرتا دکھائی دیتا ہے اور وہ اندھے عقیدے سے اپنا دامن بچانے کی فکر میں بعض اوقات خود کو یقین کی دولت سے بھی محروم کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تینوں اہم تصانیف "تاریخ عالم کی جھلکیاں"، "آپ بیتی" اور "تلاشِ ہند" میں یقین اور بے یقینی کی ایک دھوپ چھاؤں دکھائی دیتی ہے۔

ان تینوں تصانیف کا تخلیقی امتیاز شخصی اور غیر شخصی عناصر کے ایک انوکھے امتزاج سے مرتب ہوتا ہے۔ "تاریخ عالم کی جھلکیاں"، اور "تلاشِ ہند" بظاہر تاریخی جائزوں پر مشتمل ہیں، لیکن یہ تصانیف تاریخ کی رسمی اور موضوعاتی کتابوں کی طرح ترتیب نہیں دی گئی ہیں۔ ان دونوں کتابوں میں تاریخ کا دھارا دونوں کناروں پر مصنف کی شخصیت کو چھوتا ہوا گزرتا ہے۔ مصنف کا تخیل بار بار اُسے تاریخی تسلسل کے جبر سے آزادی دلانے کا عمل جاری رکھتا ہے۔ اُس کا وژن اکثر ماضی کی پرچھائیوں کے بطن سے حال کے ڈرامے اور مستقبل کے خوابوں کو جنم دینے میں مدد دیتا ہے۔ سرد و جامد تاریخ، مصنف کے زندہ اور پرواز آشنا تصور کے لمس سے حرارت و حرکت کا تحفہ پاتی ہے۔ جب کہ "آپ بیتی" میں شخصیت باہیں پھیلا کر عصرِ موجود کی تاریخ کو اپنے آغوش میں سمیٹنے کی بار بار کوشش کرتی ہے۔ "آپ بیتی" مصنف کی اپنی زندگی کی بھی کہانی ہے اور اس کے عہد کی داستان بھی۔ "آپ بیتی" ایک عجیب و غریب کھڑکی ہے جو ایک طرف مصنف کے نہاں خانے میں کھلتی ہے تو دوسری طرف اپنے عہد کی وسیع و عریض اور پُرہجوم دنیا کی طرف، پنڈت نہرو کی تینوں بڑی تصانیف فرد اور زمانے کی ایک انوکھی آنکھ مچولی ہیں۔ کبھی مصنف پس پردہ چلا جاتا ہے اور اسٹیج زمانے کی ریل پیل سے بھر جاتا ہے۔ اور پھر کبھی مصنف اپنی دلفریب شخصیت کے ساتھ نمودار ہوتا ہے اور زمانے کی پرچھائیاں سمٹ کر دیوار دل سے چمٹ جاتی ہیں۔

پنڈت نہرو کی اہم تصانیف ایک قسم کی خود کلامی کی پیداوار ہیں۔ اُن میں سے کئی قید خانے کی تنہائی میں لکھی گئی ہیں۔ ان کتابوں میں کہیں مصنف بظاہر اپنی بیٹی سے مخاطب ہے، کہیں وہ زمانے سے مخاطب ہے لیکن بیشتر وہ خود سے مخاطب ہے۔ اس خطاب کے پس پردہ کہیں ایک خاموش آویزش، ایک باطنی جدوجہد، ایک غیر مرئی تصادم کا احساس ہوتا ہے جس میں کہیں ایک عہد دوسرے عہد سے، کہیں فرد زمانے سے، کہیں فرد اپنے باطن سے اور کہیں باطنی کیفیات فرد کے خوابوں سے متصادم نظر آتی ہیں اور اسی کشمکش کے مدھم زیروبم سے ان بظاہر تاریخی موضوعات پر مشتمل تحریروں میں بھی ایک غیر شعوری ڈرامائی تاثر پیدا ہوتا محسوس ہوتا ہے۔

پنڈت نہرو کی تصانیف میں اکثر ایک تنہا انسان کی تخیل نوردی کا تاثر ملتا ہے شاید نہرو کی زندگی میں ان کی طویل ترین اور مخلص ترین رفیق اُن کی تنہائی تھی۔ بچپن میں باپ کی واحد اولادِ نرینہ ہونے اور تہذیبی آداب کی پابند تربیت کے باعث نہرو میں دُروں بینی کے رجحانات کا فروغ پانا خلاف توقع نہیں کہا جا سکتا۔ لڑکپن میں تعلیم کی خاطر گھر سے دُور انگلستان میں رہنا پڑا جہاں سماجی اور شخصی روابط کے محدود امکانات نے فکر و تخیل کے میلانات کو بڑھاوا دیا۔ ہندوستان لوٹنے پر سیاسی مصروفیات اور قید و بند کی زندگی نے نہرو کو اپنی شخصیت کے دائرے میں بند رہنے کا تقریباً عادی بنا دیا۔ بیوی اور باپ کی موت نے اُن کو اپنے ذہنی حصار

میں بار بار لوٹ جانے پر آمادہ کیا لیکن نہرو کی بامقصد عملی زندگی نے انھیں مریضانہ قسم کی فراریت کی نفسیات کا شکار ہونے سے بچائے رکھا۔ بہرحال غور و فکر کا رجحان جیسے اس نفسیاتی کیفیت نے جنم دیا۔ اس نے جہاں ان کی تخلیقی صلاحیتوں کی آبیاری کی وہیں ان کو ایک عہد ساز سیاسی تفکر کا مالک بنایا۔ تنہائی کے احساس سے پیدا ہونے والی نفسیاتی کیفیت اکثر دنیائے تخیل میں نئے گوشوں اور نئی وسعتوں کے مواقع پیدا کرتی ہے اور قوت تخیل سے صورت گری، کردار شناسی اور رموز آگہی کے ایسے امکانات پیدا ہوتے ہیں جو تخلیقی فنکاروں کو ایک امتیازی توانائی بخشتے ہیں۔ جواہر لال نہرو کی تصانیف میں بھی جا بجا ایسے نقوش ملتے ہیں جو ان کی خلاقانہ صلاحیتوں کی شہادت بہم پہنچاتے ہیں۔

" تاریخ عالم کی جھلکیاں " مختلف تاریخی شخصیتوں کے مختصر لیکن زندگی سے بھرپور اسکیچوں سے بھری پڑی ہے۔ نپولین کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" جب دستور پر بحث ہو رہی تھی تو کسی نے تجویز پیش کی کہ صدر کو کسی قسم کے حقیقی اختیارات کا مالک نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا کام صرف دستاویزوں پر دستخط کرنا اور رسمی موقعوں پر پبلک کی نمائندگی ہونا چاہیے۔ لیکن نپولین اختیارات چاہتا تھا نہ کہ بادشاہ کی زرق برق پوشاک۔ اُسے ایسے شان و شوکت کے مالک لیکن بلا اختیار صدر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اور وہ بگڑ کر بولا "بھاڑ میں ڈالو اس موٹے بھینسے کو...."

" اکبر کی طرح نپولین حیرت انگیز یادداشت کا مالک تھا اور اس کا دماغ زبردست ترتیب کے ساتھ کام کرتا تھا۔ خود اس کا کہنا ہے: جب میں کوئی بات اپنے ذہن سے خارج کرنا چاہتا ہوں تو وہ دراز بند کر دیتا ہوں اور دوسری کھول لیتا ہوں۔ ان درازوں میں جو باتیں بھری ہیں وہ کبھی ایک دوسرے میں نہیں ملتیں۔ اس لئے تو مجھے کوئی پریشانی ہوتی ہے اور نہ گراں باری۔ سونا چاہتا ہوں تو ساری درازیں بند کر دیتا ہوں اور نیند آجاتی ہے۔ اور لوگ بتاتے ہیں کہ نپولین واقعی جہاز کے بیچوں بیچ لیٹ جاتا اور سو جاتا اور آدھے گھنٹے سونے کے بعد پھر سے اٹھ آتا اور زیادہ لمبے عرصے کے لیے کام میں جُٹ جاتا۔"

شخصیتوں کی یہ غیر رسمی مگر ڈرامائی انداز سے پیش کش نہرو کی خلاقانہ بصیرت کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی سی تفصیلات اور ہلکے ہلکے اشاروں کی مدد سے ایک جیتا جاگتا پیکر تراشنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ یہ ایسے اوصاف ہیں جو ایک ناول نگار کے فن میں بڑے معاون ہوتے ہیں لیکن نہرو نے اس فن سے تاریخی کردار نگاری کا کام لیا ہے۔

نہرو کو مناظر فطرت سے بیحد لگاؤ تھا۔ اور ہمالیہ کی برف پوش چوٹیاں اور گنگا کی بسیط و عریض خاموش سطح نہرو کے لیے نفسیاتی سکون کا ہی نہیں بلکہ ایک قسم کی روحانی تسکین کا باعث رہی ہیں۔ ان کا بیان کرتے ہوئے ان کی عبارت ایک شعری حسن اختیار کرلیتی ہے۔ اپنی وصیت تک میں وہ ان کا ذکر کرنا نہیں بھولتے۔ گنگا کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

" گنگا تو خاص طور پر ہندوستان کی اپنی ندی ہے۔ ہندوستانی لوگوں کی چہیتی۔ اس سے ہندوستان کی ساری نسلی یادیں، ساری امیدیں اور اندیشے، ہندوستان کی فتح کے گیت اور اس کی شکستیں لپٹی ہوئی ہیں۔ یہ ہر وقت بدلنے والی، برابر بہنے والی پھر بھی ایک جیسی رہنے والی گنگا ہندوستان کے یگوں پرانے تہذیب و تمدن کی علامت رہی ہے اور ہندوستان کی تہذیبی وراثت کو خراج عقیدت کے طور پر، میری یہ درخواست ہے کہ میری مٹھی بھر راکھ الہ آباد میں گنگا میں ڈالی جائے تاکہ وہ بہہ کر اس عظیم سمندر میں جا ملے جو ہندوستان کے ساحل کو دھوتا رہتا ہے۔"

نہرو کی تحریروں میں جا بجا ان کی انسان دوستی، نرم دلی اور دردمندی کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ " آپ بیتی " میں وہ لڑکپن میں اپنے شکار کے تجربے کے بارے میں لکھتے ہیں:

" ایک بار کشمیر میں مجھے اتفاق سے ایک ریچھ مارنے میں کامیابی ملی۔ لیکن ایک چھوٹے بارہ سنگھے کے شکار سے مجھ پر جو گزری اس نے مجھ میں شکار کے لیے جو تھوڑا بہت جوش تھا اُسے بھی ٹھنڈا کر دیا۔ یہ چھوٹا سا بے ضرر جانور زخمی ہو کر میرے قدموں میں پڑا اپنی بڑی بڑی آنسو بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اور تب سے یہ آنکھیں بار بار میرے ذہن میں اُبھر کر مجھے اس واقعے کی یاد دلاتی



ہی ہیں۔"

"آپ بیتی" میں ایک پورا باب اُن جانوروں کے متعلق ہے جن سے نہرو کی جیلوں میں مڈبھیڑ ہوئی تھی اور اس بیان میں بھی جابجا دلکش منظر نگاری اور دردمندانہ بیانِ واقعہ کی مثالیں ہیں لیکن "آپ بیتی" کا سب سے زیادہ قابلِ توجہ حصہ وہ مقامات ہیں جہاں نہرو نے اپنے محسوسات اور ذہنی کیفیات اور اپنے ذاتی تجربات کو بیان کیا ہے۔ اس کے باوجود کہ بعض مواقع پر نہرو کا احساسِ تنہائی انھیں جذباتیت کے کنارے تک کھینچ کر لے جاتا ہے، نہرو اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے پر قدرت رکھتے ہیں اور وہ اپنی فکر کی باگ ڈور پوری طرح جذبات کے ہاتھ میں جانے نہیں دیتے۔ اسی طرح نہرو نے نہ صرف اس کا پورا خیال رکھا ہے کہ وہ خود کو ہیرو بنا کر پیش نہ کریں، بلکہ بعض اوقات انھوں نے خود اپنا ناقد و نکتہ چیں بننے کا رول بھی ادا کیا ہے۔ اسے آپ کسر نفسی کہہ سکتے ہیں لیکن نہرو شاید اسے حقیقت پسندی کا ایک تقاضا سمجھتے ہیں۔ اس سے بعض اوقات بیانِ واقعہ کی بڑی دلچسپ صورت حال پیدا ہوتی ہے اور نہرو کی اپنے بارے میں اس قسم کی صاف گوئی ان کی تحریروں میں اعتبار کے وصف کو اور زیادہ یقینی بنا دیتی ہے۔ لاٹھی چارج کے پہلے تجربے کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"گھوڑوں کو اپنی جانب دوڑتے دیکھ کر قدرتی طور پر دل میں آیا کہ بھاگ کر ان سے بچ لوں کیوں کہ یہ بڑا حوصلہ پست کر دینے والا منظر تھا۔ پھر میں سمجھتا ہوں کسی چیز نے اندر سے میرے پیر پکڑ لیے۔ لیکن پہلے حملے سے میں بچ گیا کیونکہ میرے پیچھے کھڑے رضاکاروں نے اس حملے کا سامنا کیا۔ تھوڑی دیر میں بیچوں بیچ سڑک پر میں اکیلا کھڑا تھا۔ مجھ سے چند گز کے فاصلے پر ہر طرف پولیس والے رضاکاروں کی پٹائی میں لگے ہوئے تھے۔ میں نمایاں نظر نہ آؤں اس لیے میں خود بخود سڑک کی ایک جانب سرکنے لگا۔ لیکن میں نے پھر قدم روکے اور اپنے آپ سے دل ہی دل میں بحث کرنے لگا اور یہ طے کیا کہ میرا یہاں سے ہٹنا میرے لیے مناسب نہیں۔"

اس قسم کے بیانات نہرو کی اس خود اعتمادی کو ظاہر کرتے ہیں جس نے نہرو کو اپنی کمزوریوں کے بارے میں بھی حق گوئی کی جرأت دی ہے۔

نہرو کی ساری قابلِ ذکر تحریریں انگریزی زبان میں ہیں اور سادہ اور شگفتہ انگریزی نثر کی اچھی مثال ہیں۔ نہرو نے اپنے لیے ایک غیر پیچیدہ، منطقی اسلوب منتخب کیا ہے جو رسمی انداز کا بے لچک، بوجھل تاثر پیدا نہیں کرتا۔ نہرو قطعیت کی بجائے وضاحتِ خیال کو ترجیح دیتے ہیں اور اپنی نثر کو اصطلاحات سے بوجھل بنانے کی بجائے اُسے تخیل کی مدد سے زیادہ آسانی سے قابلِ قبول بناتے ہیں۔ نہرو اکثر نظریات سے بحث کرتے ہیں لیکن یہ نظریات اُن کے ذہن میں پوری طرح واضح ہیں اس لیے اُن کا اسلوب بھی گنجلک بیانی سے پاک ہے۔ وہ معاملات و مسائل پر ایک ناقدانہ نظر رکھتے ہیں اور اس کے نتیجے میں اُن کے اسلوب میں بعض اوقات ایک قسم ظریفانہ کیفیت (IRONY) بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ "تاریخ عالم کی جھلکیاں" میں وہ سومناتھ پر محمود غزنوی کے حملے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" جب محمود نے اس جانب قدم بڑھائے تو ہزاروں لوگوں نے اس اُمید میں مندر میں پناہ لی کہ کوئی معجزہ ہوگا اور جس دیوتا کی وہ پوجا کرتے تھے وہ ان کی حفاظت کرے گا۔ لیکن معجزے شاذ و نادر ہی ظہور میں آتے ہیں۔ وہ بھی یقین رکھنے والوں کے خیال میں۔ محمود نے مندر کو توڑ کر لوٹ لیا اور پچاس ہزار لوگوں کی جانیں اس انتظار میں گئیں کہ کوئی معجزہ ہوگا لیکن وہ نہیں ہوا۔"

نہرو انگریزی کے نثری آہنگ کا شعور رکھتے ہیں اور اس سے اپنی عبارت کو آراستہ کرنے کی قدرت بھی اُن میں ہے۔ وہ اکثر جملے کو چھوٹے چھوٹے متوازن فقروں سے ترتیب دیتے ہیں۔ یہ فقرے معنوی اعتبار سے تضاد، تکرار، تائید یا توضیح کا کام کرتے ہیں اور صوتی اعتبار سے نثری آہنگ کے زیر و بم میں معاون ہوتے ہیں۔ تمثیلیں اور تشبیہات نہرو کی کمزوری نہیں لیکن جہاں وہ اُن کی تحریر کی معنوی فضا میں جگہ پیدا کر سکتی ہیں وہاں وہ ان کے استعمال سے پرہیز بھی نہیں کرتے۔ کشمیر کے حُسن کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

LIKE SOME SUPREMELY BEAUTIFUL WOMAN, WHOSE BEAUTY IS ALMOST

IMPERSONAL AND ABOVE HUMAN DESIRE, SUCH WAS KASHMIR IN ALL ITS FEMININE BEAUTY OF RIVER AND VALLEY AND LAKE AND GRACEFUL TREES. AND THEN ANOTHER ASPECT OF THIS MAGAIC BEAUTY WOULD COME TO VIEW, A MASCULINE ONE, OF HARD MOUNTAINS AND PRECIPICES, AND SNOW CAPPED PEAKS AND GLACIERS, AND CRUEL AND FIERCE TORRENTS RUSHING DOWN TO THE VALLEY BELOW. IT HAD A HUNDRED FACES AND INNUMERABLE ASPECTS, OVER-CHANGING, SOMETIMES SMILING, SOMETIMES SAD AND FULL OF SORROW. THE MIST WOULD CREEP UP FROM THE DAL LAKE AND, LIKE A TRANSPARENT VEIL, GIVE GLIMPSES OF WHAT WAS BEHIND. THE CLOUDS WOULD THROW OUT THEIR ARMS TO EMBRACE A MOUNTAIN TOP, OR CREEP DOWN STEALTHILY LIKE CHILDREN AT PLAY.

پوری عبارت نثر میں شاعری کا تاثر رکھتی ہے صرف تحریر میں ہی نہیں بلکہ اُسے سن کر بھی لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔ پہلے جملے میں "اور" سے جوڑے گئے فقرے ایک دلچسپ تکرار کا لطف پیدا کرتے ہیں۔ آخری جملے میں ایک خوبصورت تمثیل لائی گئی ہے جس میں بادل اپنی باہیں پھیلا کر پہاڑ کی چوٹی کو آغوش میں لے لیتے ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو ایک پہلو دار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک بلند پایہ مفکر، صاحب نظر سیاست داں، قابل قدر سیاسی رہنما، وسیع النظر نظریہ ساز، دردمند انسان دوست، حساس فطرت پرست تو تھے ہی اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک منفرد ادیب، صاحب طرز نثر نگار اور لفظوں کے رمز شناس فنکار بھی تھے۔ انھوں نے ہندوستان میں انگریزی زبان میں تخلیق کیے جانے والے ادب میں جو اضافہ کیا اس سے اس قسم کے ادب کا اعتبار بڑھا ہے۔ ان کے نظریات و تجربات تک تو ترجمے کی مدد سے رسائی ہو سکتی ہے لیکن اُن کے ادبی اسلوب کا لطف صرف ان کی انگریزی زبان میں اصل تحریروں سے ہی لیا جا سکتا ہے۔ ان کی بے لاگ معقولیت، وسیع النظری، معروضیت، سائنٹفک نقطہ نظر، بے تعصبی اور غیر جانبداری بہر حال کسی بھی زبان کو پڑھنے اور سمجھنے والوں کے لیے مشعلِ راہ بن سکتی ہے۔

●

نہرو — اپنی تحریروں کے آئینے میں

جنگِ آزادی کے سورماؤں میں مولانا ابوالکلام آزاد اور جواہر لال نہرو دو ایسی شخصیتیں ہیں جن میں بعض مغائرتوں کے باوجود مشابہتوں کے بہت پہلو ہیں شاید اسی لیے آزاد جو خود اپنی ذات کے حصار میں سرشار ایک بڑے انا پرست تھے نہرو کو اپنا بہترین دوست سمجھتے تھے اور اس کی وجہ دو تخلیقی ذہنوں کی یگانگت ہے۔ مولانا آزاد اور پنڈت نہرو اگر سیاست میں نہ بھی آئے ہوتے تو انھیں اپنے قلم کے بل پر دائمی شہرت و عزت نصیب ہوتی بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ سیاست سے الگ رہنے کی صورت میں ان کی عزت و توقیر کچھ زیادہ ہی معتبر و محترم ہوتی کہ قدرت نے انھیں ایسے خلاقانہ ذہن سے نوازا تھا جس کی مثال کم ملتی ہے۔

مولانا آزاد ۱۸۸۸ء میں ارضِ مقدس مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے۔ پنڈت نہرو نے ۱۸۸۹ء میں آنند بھون میں آنکھیں کھولیں ایک کی تعلیم و تربیت خالص مشرقی انداز میں ہوئی اور دوسرے نے "ہندوستانی صاحبوں" کا ماحول پایا۔ آنند بھون میں ایک نیا ہندوستان پیدا ہو رہا تھا جبکہ آزاد کے والد بزرگوار مولانا خیرالدین اپنی بزرگی اور علمی بصیرت کے باوجود ایک ڈھلتی ہوئی تہذیب کے محافظ بنے ہوئے تھے۔ لیکن اسی گھر میں محی الدین ابوالکلام آزاد بننے میں مصروف تھے اور اس روایت سے بغاوت کی تیاریاں کر رہے تھے جس کی محافظت میں ان کے والد نے اپنی عمر کھپا دی۔

(پروفیسر) سیّد احمد شمیم
کریم سٹی کالج، جمشید پور (بہار)

ابوالکلام آزاد قومی جدوجہد میں نہرو سے کوئی دس سال پہلے داخل ہو چکے تھے۔ جس وقت نہرو مہاتما گاندھی سے پہلی بار ۱۹۱۶ء میں مل رہے تھے ابوالکلام آزاد ایک نڈر صحافی اور صاحب فکر کی حیثیت سے معتبر ہو چکے تھے۔

ادبی تاریخ کا یہ ایک اہم واقعہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے قلعۂ احمد نگر کی نظربندی کے دوران "غبارِ خاطر" لکھی جو اُردو میں اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے اور جس میں ابوالکلام آزاد کی انشا کا جادو انتہائی بلندی پر نظر آتا ہے حالانکہ اس سے پہلے ہی وہ ایک بے مثال مصنف، مفسر اور صحافی کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے تھے۔ دوسری طرف جواہر لال نہرو نے بھی اسی قلعۂ احمد نگر میں اپنی معرکۃ الآرا کتاب "ڈسکوری آف انڈیا" لکھی اور وہ بھی اسے پہلے

1. RECENT ESSAYS AND WRITINGS.
2. LETTERS FROM OR FATHER TO HIS DAUGHTER
3. WHITHER INDIA.
4. A WINDOW IN PRISON AND PRISON LAND.
5. INDIA AND THE WORLD.
6. AUTOBIOGRAPHY
7. THE UNITY OF INDIA.

لکھ کر ایک منفرد ادیب کی حیثیت سے انگریزی زبان میں اعتبار کا درجہ حاصل کر چکے تھے۔

ابوالکلام آزاد نے "غبارِ خاطر" میں کئی جگہ جواہر لال نہرو کا ذکر کیا ہے اور ترشے ترشائے مختصر فقروں میں نہرو کی شخصیت کی چلتی پھرتی تصویریں کھینچ کر رکھ دی ہیں۔ نہرو کی لطیفہ گوئی، ان کا "گڑ کھانا" ان کی جذباتیت، خوابوں میں بڑبڑانا اور وہ بھی انگریزی میں۔ "غبارِ خاطر" میں ایک جگہ لکھا ہے:

"نیند میں بڑبڑانے کی حالت بھی عجیب ہے یہ عموماً ان طبیعتوں پر طاری ہوتی ہے جن میں دماغ سے زیادہ جذبات کام کرتے ہیں۔ جواہر لال کی طبیعت بھی سرتاسر جذباتی واقع ہوئی ہے۔ اسی لیے خواب اور بیداری دونوں حالتوں میں جذبات کام کرتے ہیں۔"

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نہرو دماغ سے کام لینا نہیں جانتے تھے البتہ وہ آزاد کی طرح اپنے آپ کو ہزار پردوں میں چھپائے رکھنے کے قائل نہیں تھے ان کا اندر اور باہر کھلی کتاب کی طرح عیاں تھا۔ نہرو نے خود بھی اپنے جذباتی

ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ پدماجا کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"DO NOT WORRY ABOUT THE FOOLISH TEARS THAT CAME TO MY EYES. TEARS ARE NOT SO RARE FOR ME"

[میرے ان احمقانہ آنسوؤں کا غم نہ کرو۔ جو میری آنکھوں سے ٹپک پڑے تھے کہ آنسو میرے لیے اتنے نایاب نہیں ہیں]

اسی خط میں دو بہت چاہنے والوں کے درمیان جو ایک بے نام سی کشمکش ہوتی ہے اسے بہت ہی دلکش انداز میں پیش کیا ہے:

"YOU HAVE BUILT UP AN IDEALISED PICTURE OF ME AND YOU ARE SURPRISED WHEN IT DOES NOT FIT IN WITH REALITY AND THEN YOU RUSH TO THE OTHER EXTREME AND SUFFER PAIN AND ARE DISTRESSED. I AM NOT THAT IDEALISED PICTURE AND I AM NOT SO BAD AS YOU MIGHT SOMETIMES HAVE THOUGHT ME. I HAVE ENOUGH OF THE DEVIL IN ME AND IT IS THAT PERHAPS THAT DRIVES ME ON, BUT THE ANGLES IS THERE ALSO TO CURB IT AND SUBDUE IT".

[تم نے میری ایک مثالی تصویر بنا رکھی ہے اور جب مجھے اس کے ہو بہو نہیں دیکھتیں تو تمھیں حیرت ہوتی ہے اور احساس کی دوسری انتہا پر پہنچ کر ملول ہوتی ہو اور درد محسوس کرتی ہو ــــــ میں کوئی مثالی پیکر نہیں ہوں اور اتنا برا بھی نہیں ہوں جیسا کہ تم اکثر سوچ لیا کرتی ہو یقیناً مجھ میں شیطانی عناصر ہیں جو مجھے متحرک رکھتے ہیں لیکن میرے اندر ایک فرشتہ بھی ہے جو میرے شیطان کو دباتا اور روکتا رہتا ہے]

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ جو اپنی رگ جاں سے بھی قریب ہوتا ہے بہت اجنبی بہت دور بھی محسوس ہوتا ہے۔ نہرو نے اسی خط میں اپنے اس احساس کو یوں بیان کیا ہے:

"AND YOU, STRAGNER, WHO ARE YOU? I DO NOT KNOW BUT I KNOW THAT I LIKE TO SEE YOU AND BE NEAR YOU AND HEAR YOUR VOICE AND TOUCH YOU AND TO LOOK AT YOUR RADIANT SMILE. IS THAT NOT ENOUGH FOR ME? WHETHER I WILL OR NOT, UNKNOWN DEPTHS, REVEAL THEMSELVES AND SOMETIMES THEY PLEASE AND SOME TIMES THEY TROUBLE".

[اور تم ــــ اے اجنبی ــــ کون ہو تم؟ میں نہیں جانتا ــــ لیکن میں جانتا ہوں کہ تمھیں دیکھنا مجھے بھاتا ہے ــــــ میں تمھاری قربت چاہتا ہوں۔ تمھیں سننا چاہتا ہوں، چھونا چاہتا ہوں اور دیکھنا چاہتا ہوں تمھاری شگفتہ مسکراہٹوں کو ــــ اور کیا یہ سب میرے لیے بہت نہیں ہیں؟ میں رہوں گا یا نہیں رہوں گا ــــ لیکن انجانی گہرائیاں خود کو ظاہر کرتی رہتی ہیں کبھی مسرور کرتی ہیں کبھی افسردہ ــــ!]

میں نے ذکر کیا تھا "ڈسکوری آف انڈیا" کا کہ یہ کیا عجیب کتاب ہے جو کسی خانے ادبی سانچے میں نہیں سماتی۔ اس میں بیک وقت تاریخ، اس کا فلسفہ، تہذیب و ثقافت اور شخصی سوانح ــ کے رنگ ملتے ہیں۔ دراصل نہرو نے اس میں صرف ہندوستان کی ہی نہیں تلاش کرنے کی سعی کی ہے بلکہ اپنی ذات کے حوالے سے اپنے عہد کا قومی و عالمی منظر نامہ بھی پیش کیا ہے۔

کئی بڑے مغربی و مشرقی مفکروں، مدبروں اور حکمرانوں، مذہبی و سماجی رہنماؤں کے ذکر کے ساتھ ساتھ اپنے ہم عصروں، دوستوں اور عزیزوں کے نام بھی جگہ جگہ لیے ہیں۔ اس طرح یہ تاریخ بھی ہے اور سوانح عمری بھی حالانکہ نہرو نے اپنی مستقل سوانح عمری بھی لکھی ہے جو اپنے آپ میں خود بھی زبان و بیان کا عمدہ نمونہ ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ ابوالکلام آزاد نے "غبارِ خاطر" میں کئی جگہ نہرو کا نام لیا ہے۔ نہرو نے بھی "ڈسکوری آف انڈیا" میں آزاد کا ذکر بڑے احترام سے کیا ہے:

"THOUGH I AM GRATEFUL TO ALL MY COMPANIONS, I SHOULD LIKE TO MENTION SPECIALLY MAULANA ABUL KALAM AZAD, WHOSE VAST ERUDITION INVARIABLY DELIGHTED ME BUT SOMETIMES ALSO RATHER OVER WHELMED ME".

[یوں تو میں اپنے تمام ساتھیوں کا شکر



گزار ہوں لیکن خاص طور پر مولانا ابوالکلام آزاد کا نام لینا چاہتا ہوں جن کے بے پناہ تبحر علمی نے مجھے اکثر مسرور ہی نہیں کبھی کبھی مرعوب بھی کیا ہے۔]

نہرو کے اپنے جینے کا ڈھب اور سوچنے کا انداز تھا جس کا مشاہدہ "ڈسکوری آف انڈیا" میں قدم قدم پر ہوتا ہے۔ مثلاً وقت کے سلسلے میں لکھا ہے:

"THE PAST BECOMES SOMETHING THAT LEADS UP TO THE PRESENT, THE MOMENTS OF ACTION, THE FUTURE SOMETHING THAT FLOWS FROM IT AND ALL THREE ARE INEXTRICABLY INTERTWINED AND INTER RELATED".

[ماضی ہمیشہ حال میں ہمارے عمل کی رہنمائی کرتا ہے اور مستقبل یوں ہے کہ ہمیشہ اس سے رواں ہوتا ہے اور یہ تینوں ناگزیر طور پر باہم پیوست اور مربوط ہیں۔]

نہرو کی خاص دلچسپیاں سائنس، سماجیات، ادب اور تاریخ سے تھیں اور تاریخ کو بھی انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں برتا ہے ان کے یہاں محض واقعات کی کھتونی نہیں ملتی بلکہ انھوں نے گزرے ہوئے واقعات کو اپنی ذات کے حوالے سے ایک نیا چہرہ بھی دیا ہے جس کی بہترین مثال "گلمپسیز آف ورلڈ ہسٹری" ہے جو خط کے پیرائے میں لکھی گئی ہے اور یہ خطوط ان کی بیٹی پریہ درشنی اندرا گاندھی کے نام ہیں۔ اس پر گفتگو بعد میں ہوگی لیکن تاریخ سے اپنے تعلق کے سلسلے میں نہرو نے کچھ یوں بیان کیا ہے:

"I CAME LATE TO HISTORY AND, EVEN THEN, NOT THROUGH THE USUAL DIRECT ROAD OF LEARNING A MASS OF FACT AND DATES AND DRAWING CONCLUSIONS AND INFERENCES FROM THEM, UNRELATED TO MY LIFE'S COURSE SO LONG AS I DID THIS HISTORY HAD A LITTLE SIGNIFICANCE FOR ME".

[تاریخ تک میری رسائی بہت بعد میں ہوئی وہ بھی براہ راست جانے مانے تدریسی راستے سے نہیں جس میں واقعات اور پسند کے حوالے سے نتائج اور مفاہیم برآمد کیے جاتے ہیں جن کا زندگی کے معمول سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ایسی تاریخ میرے لیے معمولی اہمیت کی حامل ہے اور اس نے مجھے بہت کم متاثر کیا ہے۔]

نہرو نے اپنی بے پناہ سیاسی مصروفیتوں کے باوجود زندگی سے بھرپور محبت کی تھی۔ دیکھا جائے تو سامراج کے خلاف ان کی لڑائی صرف آزادیِ ہند کے لیے نہیں تھی بلکہ زندگی کے استحصال کے خلاف تھی۔ مولانا آزاد نے بھی آفاقی نظر پائی تھی مگر ان کی سب سے بڑی متاع مذہبی بصیرت تھی۔ دین سے جدا ان کی کوئی سوچ نہیں تھی۔ لیکن ان کے عزیز ترین دوست اور مہاتما گاندھی کے معتبر ترین جانشین جواہر لال نہرو برہمن خاندان میں پیدا ہونے کے باوجود مذہب، خدا اور دوسری دنیا پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

"ESSENTIALLY, I AM INTERESTED IN THIS WORLD, IN THIS LIFE NOT IN SOME OTHER WORLD OR FUTURE LIFE. WHETHER THERE IS SUCH A THING AS A SOUL, OR WHETHER THERE IS SURVIVAL AFTER DEATH OR NOT. I DO NOT KNOW; AND, IMPORTANT AS THESE QUESTIONS ARE, THEY DO NOT TROUBLE ME IN THE LEAST".

[بنیادی طور پر مجھے اسی دنیا اور اسی زندگی سے دلچسپی ہے۔ کسی دوسری دنیا یا زندگی سے نہیں۔ خواہ ایسی چیزیں موجود ہوں یا نہ ہوں ــــ جیسے کہ روح اور حیات بعد الموت یہ سب ہیں یا نہیں ــــ؟ میں نہیں جانتا۔ یہ سوالات کتنے ہی اہم کیوں نہ ہوں ــــ مجھے ذرا بھی پریشان نہیں کرتے!]

جواہر لال نہرو مہاتما گاندھی کی بے انتہا عزت کرتے تھے۔ انھیں اپنا رہنما بھی مانتے تھے لیکن نظری اور فکری معاملات میں ان سے اختلاف بھی رکھتے تھے۔ مہاتما گاندھی کی سیاست روحانیت سے جڑی ہوئی تھی جبکہ نہرو مارکس اور لینن کی مادیت سے متاثر تھے۔

"A STUDY OF MARX AND LENIN PRODUCED A POWERFUL EFFECT ON MY MIND AND HELPED ME TO SEE HISTORY AND CURRENT AFFAIRS IN A NEW LIGHT".

[مارکس اور لینن کے مطالعے نے میرے ذہن پر گہرا اثر مرتب کیا اور گزشتہ تاریخ اور



عصری حالات کو نئی بصیرت کے حوالے سے دیکھنے میں میری مدد کی۔]

ابوالکلام آزاد نے "غبارِ خاطر" کے دو خطوط میں اپنی بیگم زلیخا کا ذکر ان کی علالت اور موت کا بیان نہایت ہی درد ناک انداز میں کیا ہے اور یہیں انھوں نے اپنے چہرے سے انا کی نقاب ہٹالی ہے۔ اور ایک دُکھی دردمند اور بے پناہ پیار کرنے والے شوہر کی حیثیت سے اُبھر کر ان کی شخصیت سامنے آئی ہے۔ نہرو نے بھی "ڈسکوری آف انڈیا" کے دوسرے باب میں کملا سے اپنی شادی، اپنی ازدواجی زندگی، کملا کی بیماری اور موت کے ذکر میں اپنا کلیجہ نکال کر قارئین کے سامنے رکھ دیا ہے۔ ایک ایک لفظ سے محبت کی گرمی، جذبات کی شدت اور پیار کی بے لوثی ٹپکتی ہے:

"THERE WAS THE SAME OLD AND BRAVE SMILE ON KAMLA'S FACE, WHEN I SAW HER, BUT SHE WAS TOO WEAK AND TOO MUCH IN THE GRIP OF PAIN TO SAY MUCH. PERHAPS MY ARRIVAL MADE A DIFFERENCE, FOR SHE WAS A LITTLE BETTER THE NEXT DAY AND FOR SOME DAYS AFTER BUT THE CRISIS CONTINUED AND SLOWLY DRAINED THE LIFE OUT OF HER".

[کملا کو دیکھا تو اس کے چہرے پر وہی پہلی سی زندہ اور بے خوف مسکراہٹ تھی مگر وہ خود بہت کمزور ہو چکی تھی اور بڑی تکلیف میں تھی مگر میری آمد نے تھوڑا فرق پیدا کر دیا تھا اور وہ دوسرے دن اور کچھ دن اس کے بعد بھی بہتر نظر آنے لگی تھی مگر آہستہ آہستہ تکلیفیں بڑھتی گئیں جو زندگی کو اس سے دور کرتی گئیں۔]

اور کملا اور اپنے تعلق سے بہت ہی خوبصورت انداز میں لکھا ہے:

"I OFTEN WONDERED IF I REALLY KNEW HER OR UNDERSTOOD HER, THERE WAS SOMETHING ELUSIVE ABOUT HER SOMETHING FAY-LIKE, REAL BUT UNSUBSTANTIAL, DIFFICULT TO GRASP. SOMETIMES LOOKING IN TO HER EYES, I WOULD FIND A STRANGER PEEPING OUT AT ME".

[مجھے اکثر تعجب ہوا ہے کہ میں کیا سچ مچ اسے جان اور پہچان سکا ہوں؟ اس میں کچھ چیز پریوں جیسی ماورائی تھیں ـــــ حقیقی مگر تجریدی ـــــ گرفت میں نہ آنے والی کبھی کبھی اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مجھے محسوس ہوا ہے کہ جیسے کوئی اجنبی مجھے دیکھ رہا ہو!]

اور کملا کا مسکراتا ہوا گلاب جیسا چہرہ جب سپردِ خاک ہوا تو نہرو پر کیا گزری اس کا اندازہ "ڈسکوری آف انڈیا" کی ان چند خوبصورت سطروں سے لگایا جا سکتا ہے:

"WITHIN A FEW MINUTES THAT FAIR BODY AND THAT LOVELY FACE, WHICH USED TO SMILE SO OFTEN AND SO WELL, WERE REDUCED TO ASHES. A SMALL URN CONTAINED THE MORTAL REMAINS OF ONE WHO HAD BEEN VITAL, SO BRIGHT AND SO FULL OF LIFE"

[چند لمحوں میں اس کا صندلیں جسم اور پیارا چہرہ جس پر اکثر بڑی زندہ اور شگفتہ مسکان ہوا کرتی تھی، خاکستر ہو گیا۔ اور اس جانِ جاں کی راکھ ایک چھوٹے سے برتن میں سمیٹ لی گئی کہ جو زندہ تھی تو زندگی حسن اور توانائی سے بھرپور تھی۔]

یہ ایک عبرتناک حقیقت ہے کہ نہرو کی زندگی اور ان کے سیاسی کارناموں پر کتب خانہ بھر کتابیں رقم ہونے کے باوجود اب تک ان کی ادبی حیثیت، ان کے قلم کی جادوگری اور ان کے اندر چھپی ہوئی خلاق شخصیت کا کسی نے اس طرح جائزہ نہیں لیا کہ جسے جائزہ لیا جانا کہا جا سکتا ہو۔ نہرو کا بحیثیت ادیب کیا مرتبہ ہے ـــــ؟ انھوں نے اپنے خونِ جگر سے اپنی تحریر کو کس طرح تازہ کیا ہے؟ اپنے اندر کے جمال سے کس طرح سنوارا اور نکھارا ہے اسے چند پڑھے لکھے لوگوں کے سوا کوئی نہیں جانتا ـــــ اور یہ پڑھے لکھے لوگ بھی وہ ہیں جنھیں انگریزی زبان و ادب کے مطالعے کا ذوق حاصل ہے۔ ورنہ عام طور پر صرف اتنا ہی جانا جاتا ہے کہ نہرو ایک ادیب بھی تھے۔ مگر یہ کون جانتا ہے کہ انھوں نے کس طرح اپنی تحریر کو ہندوستانی ثقافت، فلسفہ، اساطیر اور روایات سے



جلا بخشی ؟ کس طرح مکتوب نگاری کو انشا کا اور انشا کو تاریخ کا چہرہ دیا ؟ "ڈسکوری آف انڈیا"، "گلمپسیز آف ورلڈ ہسٹری" کے علاوہ "آٹو بائیوگرافی" اور "اے بنچ آف اولڈ لیٹرس" کو بھی ذوق و شوق سے پڑھا گیا۔ لیکن شہرت اور مقبولیت سب سے زیادہ "ڈسکوری آف انڈیا" اور "گلمپسیز آف ورلڈ ہسٹری" کے حصے میں آئی۔ نہرو کا اسٹائل کہیں کہیں شاعرانہ ہے اور کہیں تیکھا اور شگفتہ بھی ہے جسے پڑھ کر برنارڈ شا کے اسٹائل کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ یوں بھی شا اور نہرو ایک دوسرے کے قدر داں تھے۔ کہتے ہیں جواہر لال نہرو جب لندن میں جارج برنارڈ شا سے ملے تو اخباری نمائندوں نے نہرو سے پوچھا آپ دونوں میں کیا باتیں ہوئیں۔ نہرو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "میں نے ان کی بحواس سُنی اور انھوں نے میری۔" حسّ مزاح کی نہرو میں کمی نہیں تھی۔ وہ اکثر اس سے کام لیتے تھے۔ پدماجا کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"DO NOT PLAY TRICKS IN YOUR BATH OR ELSEWHERE. HAVE SOME CONSIDERATION ATLEAST FOR THE YOUNG DOCTOR AND HAVE TO ATTEND ON YOU. AND REMEMBER THAT YOU HAVE TO PRODUCE A BUDHA".

[اپنے حمام میں یا کہیں اور چہل نہ کرنا — کچھ نرم گوشہ رکھتی ہو اس نوجوان ڈاکٹر کے لیے تم جس کے زیرِ علاج ہو ؟ اور مت بھولنا کہ تمھیں ایک بودھ جنم دینا ہے۔]

"گلمپسیز آف ورلڈ ہسٹری" ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۰ء سے اگست ۱۹۳۳ء تک کے مکاتیب پر مشتمل ہے۔ جو پریہ درشنی اندرا گاندھی کے نام لکھے گئے ہیں۔ اس زمانے میں نہرو نینی تال جیل میں قید و بند کی سزا بھگت رہے تھے۔ انھیں اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ پریہ درشنی اندرا کی تعلیم و تربیت کا وہ حق ادا نہیں کر سکے ہیں جو ایک باپ کے ذمے ہوتا ہے۔ لہٰذا انھوں نے خطوط کے حوالے سے اپنی بیٹی کے سامنے تاریخ عالم کی جھلکیاں پیش کی ہیں۔ جنھیں ۱۹۳۴ء میں وجے لکشمی پنڈت نے کتابی صورت عطا کی۔ پھر ۱۹۳۹ء، ۱۹۴۵ء اور ۱۹۴۹ء کی اشاعتوں میں ان پر کہیں کہیں نظر ثانی کی گئی۔ نہرو نے ان خطوط کے وسیلے سے تاریخ نگاری کو ایک نیا اسلوب دیا ہے۔ کہیں کہیں ذاتی تاثرات اور جذبات بھی ابھر آئے ہیں۔ ان میں ایک مورخ کی معروضیت کم اور فنکار کی داخلیت زیادہ ہے نہرو نے خود بھی اس کا اعتراف کیا ہے:

"IN THE COURSE OF THESE LETTERS I HAVE OFTEN EXPRESSED MY OPINIONS RATHER AGGRESSIVELY. I HOLD TO THOSE OPINIONS, BUT EVEN AS I WAS WRITING THE LETTERS MY OUT LOOK ON HISTORY CHANGED GRADUALLY. TODAY IF I HAD TO RE-WRITE THEM I WOULD WRITE DIFFERENTLY OR WITH A DIFFERENT EMPHASIS. BUT I CAN NOT TEAR UP WHAT I HAVE WRITTEN AND START AFRESH .

[ان خطوط کو لکھتے ہوئے اکثر میرا اسلوب اظہار جارحانہ ہو گیا ہے کہ جب میں انھیں لکھ رہا تھا تو میرے خیالات ایسے ہی تھے پھر اسی دوران تاریخ کے متعلق میرا نقطۂ نظر بدل گیا اب اگر انھیں دوبارہ لکھنا پڑے تو شاید مختلف ڈھنگ سے لکھوں ـــــ لیکن جو کچھ لکھا گیا ہے اسے رد نہیں کر سکتا اور نہ از سرِ نو لکھ سکتا ہوں۔]

واقعہ یہ ہے کہ نہرو نے تاریخ کو کٹھن بیان ہونے سے بچا لیا اور واقعات کو تخلیقی رنگ دے کر زندہ مرقعوں میں بدل دیا ہے۔ نہرو کی زبان میں سادگی مگر پُرکاری ہے۔ شگفتگی اور رعنائی کا احساس قدم قدم پر ہوتا ہے۔ فی الحال تو یہ ممکن نہیں ہے کہ نہرو کے اسٹائل کا بھرپور جائزہ لیا جائے مگر یہ کہ غالب نے اپنے مراسلے کو مکالمے بنا دینے پر فخر کیا تھا۔ نہرو نے "گلمپسیز آف ورلڈ ہسٹری" میں اپنے مکاتیب کو تاریخ جیسے موضوع پر مشتمل ہونے کے باوجود مکالمے کا رنگ دیا ہے:

"I CAN NOT SAY IF YOU WILL LIKE THESE LETTERS WHEN YOU SEE THEM - BUT I HAVE DECIDED TO WRITE THEM FOR MY OWN PLEASURE. THEY BRING YOU VERY NEAR TO ME, AND I WILL FEEL ALMOST THAT I HAVE HAD A TALK WITH YOU".

[میں نہیں کہہ سکتا کہ جب تم میرے خطوط دیکھوگی تو پسند کروگی یا نہیں؟ مگر انھیں لکھنا میں نے طے کرلیا ہے خود اپنی مسرت کے لیے کہ ان کے ذریعے تمھیں اپنے بہت قریب محسوس کرسکوں گا ـــــ مجھے احساس ہوگا کہ گویا تم سے گفتگو کرلی ہے۔]
کہیں کہیں احساس کی تازگی اور شاعرانہ حسیت بھی مزا دے جاتی ہے:

"BUT WHAT PRESENT CAN I SEND YOU FROM NAINI PRISON MY PRESENT CAN NOT BE MATERIAL OR SOLID. THEY CAN ONLY BE OF THE AIR AND OF MIND AND SPIRIT, SUCH AS A GOOD FAIRY MIGHT BESTOWED ON YOU - THINGS THAT EVEN THE HIGH WALLS OF PRISON CAN NOT STOP".

[لیکن ـــــ نینی جیل سے تمھارے لیے کیا تحفہ بھیج سکتا ہوں؟ میرا تحفہ مادی اور ٹھوس نہیں ہوسکتا۔ ہاں میرے ذہن و خیال اور روح کا سُبک خرام تحفہ ہوسکتا ہے جسے پری تم تک پہنچا دے گی کہ اسے جیل کی بلند دیواریں بھی نہیں روک سکتیں۔]
قید و بند کی زندگی پرانی یادوں کو جگاتی ہے اور احساس کا رشتہ بچھڑے ہوؤں کو کچھ اور قریب کر دیتا ہے۔ نہرو کے ان خطوط میں جذبات کی ہلکی ہلکی آنچ ہر جگہ ملتی ہے۔ ایک خط میں اپنی بیٹی پریہ درشنی کی معنویت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بہت ہی شاعرانہ اسلوب اختیار کیا ہے:

"PRIYADARSHANI - DEAR TO THE SIGHT, BUT DEARER STILL WHEN SIGHT IS DENIED' AS I SAT HERE TODAY TO WRITE TO YOU, FAINT CRIES, LIKE DISTANT THUNDER, REACHED ME. I COULD NOT MAKE OUT AT FIRST WHAT THEY WERE, BUT THEY HAD A FAMILIAR RING, AND THEY SEEMED TO FIND AN ANSWERING ECHO IN MY HEART. GRADUALLY THEY SEEMED TO APPROACH AND GROW IN VOLUME, AND SOON THERE WAS NO DOUBT AS TO WHAT THEY WERE 'INQUILAB ZINDABAD! INQUILAB ZINDABAD!! THE PRISON RESOUNDED WITH THE SPIRITED CHALLENGE, AND OUR HEARTS WERE GLAD TO HEAR IT".

[پریہ درشنی ـــــ محبوب نظر اور نگاہوں سے اوجھل محبوب تر ـــــ! جب میں خط لکھنے یہاں بیٹھا تو دور سے آتی ہوئی ایک گونج سنائی دی جیسے دور بجلی کی کڑک ـــــ سمجھ نہ سکا وہ کیا تھی؟ پھر پہچانی ہوئی سی لگی۔ دل کے اندر گونجتی ہوئی سی۔ اور آہستہ آہستہ بلند ہوتی گئی اور قریب آتی گئی۔ وہ للکار تھی انقلاب زندہ باد، انقلاب زندہ باد کی ـــــ جس سے سارا زنداں گونج اٹھا اور ہمارے دل سرشار ہوگئے۔]
اور آگے چل کر انقلاب کی فلسفیانہ تعبیر یوں کی ہے:

"NOTHING IN THE WORLD THAT IS ALIVE REMAINS UNCHANGING. ALL NATURE CHANGES FROM DAY TO DAY AND MINUTE TO MINUTE. ONLY THE DEAD STOP GROWING AND ARE QUIESCENT. FRESH WATER, RUNS ON AND IF YOU STOP IT, IT BECOMES STAGNANT. SO ALSO IS IT WITH THE LIFE OF MAN AND THE LIFE OF A NATION".

[دنیا میں کوئی زندہ شے نہیں ہے جو غیر متغیر ہو۔ ساری فطرت لمحہ بہ لمحہ دن بہ دن بدلتی رہتی ہے۔ صرف بے جان اشیا ذوق نمو سے محروم اور بے حس ہوتی ہیں تازہ پانی بہتا رہتا ہے۔ روک لو تو تھم جائے گا ـــــ بالکل یہی حال حیات انسانی کا بھی ہے ـــــ قوموں کی زندگی کا بھی!!]
نہرو صدی کے اس موقعے پر جہاں جواہر لال نہرو کی مدبرانہ حیثیت اور دانشورانہ صلاحیت کی تہنیت کی جائے گی وہیں ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ ان کی ادبی صلاحیتوں اور قلمی کاوشوں سے بھی لوگوں کو روشناس کرایا جائے کہ نہرو بہرحال ایک بڑے ادیب اور صاحب قلم تھے اور تمام اہل قلم پر ان کا یہ قرض واجب الادا ہے ـــــ!!



پنڈت نہرو بحیثیت مورخ

میں نے اکثر سوچا ہے کہ مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو اور مولانا آزاد اگر خارزار سیاست میں نہ اُلجھتے اور اپنی تخلیقی صلاحیتیں علم و ادب، تہذیب و ثقافت، فلسفہ و تاریخ وغیرہ میں بروئے کار لاتے تو اپنی دانش و بینش سے نہ جانے کتنی شمعیں فروزاں کرتے جن سے عالم انسانیت کے دل منوّر اور سینے روشن ہوتے لیکن کیوں کہ وہ دردمند دل اور حساس طبیعت رکھتے تھے انھوں نے وطن کی آزادی کی جدوجہد کو مقدم سمجھا اور سماجی عدم انصاف اور سیاسی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لیے کمربستہ ہوگئے۔ ان نامساعد حالات کے باوجود وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے بے خبر نہیں رہے، جیل سے باہر میدانِ سیاست میں سرگرم عمل رہے اور جب سلاخوں کے پیچھے رہے تو اپنی تحریروں سے آندھیوں میں چراغ جلاتے رہے اور اپنے عوام میں صور بیداری پھونکتے رہے۔ ان کی تصانیف ہمارا قابلِ قدر ورثہ ہیں۔

مجھے اس مضمون میں پنڈت نہرو کے تاریخی شعور سے بحث کرنی ہے لیکن اس سے قبل ان کی مختلف تصانیف کا ذکر مناسب ہوگا:

۱۔ سوویت روس
۲۔ باپ کے خطوط بیٹی کے نام (نہرو کے خط اندرا جی کے نام)
۳۔ خود نوشت سوانح حیات (میری کہانی)
۴۔ تاریخ عالم کی جھلکیاں (جگ بیتی)
۵۔ تلاش ہند

ان کتابوں کے علاوہ نہرو کی دوسری کتابیں مثلاً "ہندوستان میں اٹھارہ مہینے" "نئے مضامین اور تحریریں" "ہم کہاں ہیں" اور "چین، ہسپانیہ اور جنگ" خطبات اور مقالات ہزاروں کی تعداد میں ان کے علاوہ ہیں۔

جواہر لال نہرو ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، وہ ایک حیرت انگیز انسان، دانشور، معلم، مدبر، مفکر اور مجاہد تھے، وہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے علمبردار، اعلیٰ پایے کے مصنف، پیشہ ور مورخ نہ ہوتے ہوئے بھی تاریخی شعور کو عام کرنے والے اور اس کے سرمایے سے محبت کرنے والے تھے، یوں تو ہر مورخ اپنے عہد کی تاریخ کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اس کا زمانے کے تصورات سے متاثر ہونا ناگزیر ہوتا ہے لیکن اس زمرے میں جواہر لال کی اپنی انفرادیت ہے جو انھیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے بقول شاعر:

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

نہرو، ہر چند کہ ایک پیشہ ور مورخ نہ تھے لیکن تاریخ کا ایک جامع اور واضح تصور رکھتے تھے ان کا خیال تھا کہ مورخ کو حال کو سمجھنے کے لیے ہر حالت میں ماضی کے جھروکوں میں جھانکنا چاہیے اور مستقبل کی تعمیر میں اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ وہ تاریخ کے اس روایتی تصور کے خلاف تھے جس میں بادشاہوں کے نام، جنگوں کی تفصیل اور سنین کا یاد رکھنا ضروری سمجھا جاتا تھا، تاریخ کا یہ تصور اب داستانِ پارینہ بن چکا ہے۔ ان کے خیال میں تاریخ ابتدا میں سیاسی نقطۂ نظر سے لکھی جاتی تھی۔ اس میں مذہبی اور کسی قدر سماجی عنصر بھی شامل ہوتا تھا اور پھر معاشی پہلو پر بھی زور دیا جانے لگا تھا۔ لیکن موجودہ دور میں تاریخ کے سماجی پہلو پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ ان کا خیال تھا تاریخ عالمی یک جہتی اور ہم آہنگی کا رول بہتر طور سے انجام دے سکتی ہے، تاریخ ابتدا میں ایک فرد کی داستان ہوا کرتی تھی لیکن آج تاریخ قوموں سے پرے بین الاقوامی سرحدیں پار کر چکی ہے۔ ان کے خیال میں موجودہ مورخ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ فروعات کو نظر انداز کرے اور وسیع تر تناظر کو سامنے رکھتے ہوئے غیر جانبداری کے ساتھ سچی تصویر پیش کرے، موجودہ دنیا میں تعمیری و تخریبی دونوں سرگرمیاں جاری ہیں، مورخ کا فرض ہے کہ وہ تعمیری سرگرمیوں کو اُجاگر کرے اور تخریبی سرگرمیوں کو نظر انداز کرے۔ ان کے

(ڈاکٹر) خورشید نعمانی
۱۸۰-اے، پائپ روڈ، کرلا (ویسٹ)، بمبئی ۴۰۰۰۷۰

نزدیک تاریخ کا اصل مقصد عالم انسانیت کو ایک دوسرے سے قریب تر لانا ہے۔ اگر آج کے مورخین نے یہ کام خوبی سے کر لیا تو سمجھے کر وہ اپنے فرائض منصبی سے بہتر طور سے عہدہ برآ ہوئے۔ ان کے خیال میں مورخ کو وسیع القلب، فراخ دل اور غیر جانبدار ہونا چاہیے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ تاریخ نیکی و بدی کی ایک داستان ہے لیکن آخر میں بدی کی شکست اور نیکی کی فتح ہوتی ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں :

"I SEE MAN'S REPEETED MOR-
_TYRDOM AND CRUCIFIX ION
BUT I SEE THE SPIRIT OF
MAN RISING AGAIN AND AG.
.AIN AND TRUCNIPHING
OVER THE EVIL."

نہرو کے تصورِ تاریخ پر بحث کرتے ہوئے مجھے علامہ شبلی کا یہ مقولہ یاد آیا کہ :

"تاریخ کا کام دلوں کو جوڑنا ہونا چاہیے نہ کہ دلوں کو توڑنا۔"

علامہ شبلی کے اس قول کا مقصد بھی وہی ہے جو کہ پنڈت نہرو کا ہے۔ ماضی میں اگر کچھ ناخوشگوار واقعات رونما ہوتے ہوں انھیں فراموش کر دینا ہی مناسب ہے اور خوشگوار واقعات ہی لوگوں کو یاد دلائے جائیں جس سے مثبت اثرات پیدا ہوں اور عوام الناس ایک دوسرے سے قریب آسکیں۔

پنڈت نہرو نے تاریخ کے مطالعے سے جو نتائج اخذ کیے تھے انھوں نے ان کی آنکھوں کے سامنے ایک صاف اور سیدھا راستہ کھول دیا تھا۔ تاریخ سے انھوں نے جو وجدانی طاقت حاصل کی اس کو انھوں نے وطن اور دنیا کی خدمت میں عملی طور پر برتنے کی کوشش کی اور ایک متوازن رہنما کی حیثیت سے پہچانے گئے۔

پنڈت نہرو کی ہر تصنیف کم و بیش تاریخ کا درجہ رکھتی ہے یوں تو ان کی پہلی تصنیف سوویت رکس ہے جو کہ ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی لیکن وہ زیادہ قابلِ اعتنا نہیں ہے۔ ان کی دوسری تصنیف "باپ کے خط بیٹی کے نام" وہ خط ہیں جو انھوں نے اپنی بیٹی اندرا جی کے نام لکھے تھے جب وہ دس سال کی تھیں۔ یہ ۳۰ خطوط ۱۹۲۸ء میں لکھے گئے تھے اور ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئے تھے۔ نہرو جی اندرا جی کو اپنے زمانے کے ہندوستان کے نوجوانوں کا ایک سمبل سمجھتے تھے اور ان سے ان کی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ ان خطوط میں وہ دنیا کی تعمیر اور اس کی نشوونما کی داستان بیان کرتے ہیں، ان کی اس تصنیف کو سائنس کا محض ایک کتابچہ سمجھنا غلط ہوگا اس میں طبقات الارض اور حیاتیات کے خشک مسائل کی بھول بھلیاں ہی نہیں بلکہ مصنف کے ذاتی تاثرات کی بڑی دلکش جھلکیاں نظر آتی ہیں، دلوپیکر ستاروں کی گردش میں انھیں اپنی امیدیں اور خوف رقصاں نظر آتے ہیں اور زندگی کی مسرت و کج روی ارضی زندگی کے عظیم سمندر میں مل کر ایک ایسی ابدیت اختیار کر لیتی ہے جو وقت کی دستبرد سے محفوظ ہے۔

'میری کہانی' سوانح حیات ہے جو ۱۹۳۴ء میں مینی سینٹرل جیل کی اسیری کے زمانے میں لکھی گئی۔ یہ کتاب تاریخ کی بازیافت کی اہم کڑی ہے ان کی اپنی زندگی کی کہانی، قوم کی کہانی اور آزادی کے لیے کی گئی جد و جہد سے ہم آہنگ ہے۔ اس لیے یہ صرف ان کی داستان حیات ہی نہیں ہے بلکہ اس ہندوستان کی داستان ہے جو ماضی کے بوجھ کو جھٹک کر ایک بار پھر اٹھ کھڑا ہوا تھا جو ماضی کی قید سے آزاد ہونے کی جد و جہد کرتے ہوئے بھی ماضی کی قوتوں ہی سے اپنی جد و جہد کے لیے توانائی حاصل کر رہا تھا۔

تاریخ عالم کی جھلکیاں ۔GLIMPS (.ES OF WORLD HISTORY) بظاہر ان ۲۰۰ خطوط کا مجموعہ ہے جو اندرا جی کے نام جیل سے لکھے گئے اور ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئے تاریخ کا ان کے یہاں ایک واضح تصور ہے ان کو دنیا کے ماضی سے اس لیے دلچسپی ہے کہ اس سے انھیں اپنے ملک کا حال دریافت کرنا تھا۔ وہ لکھتے ہیں :

"تاریخ ایک مسلسل زنجیر کی طرح ہے جس میں ایک ملک کی کڑی دوسرے ملک سے ملی ہوئی ہے۔ مختلف ملکوں کے باشندوں میں اتنا فرق نہیں ہوتا جتنا کہ ہم تصور کرتے ہیں۔" (جگ بیتی حصہ اول، ص ۹) نہرو کی یہ کتاب ان کی اس کوشش کا نتیجہ ہے کہ انسان کی تاریخ کو ملکوں کی تاریخ میں بانٹ کر پڑھنے کے بجائے تاریخ کی شکل میں دیکھا جائے بظاہر یہ بھی ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنی بیٹی کے نام لکھے تھے لیکن دراصل اس طرح سے وہ اپنے مطالعے کو ازسرِنو ترتیب دینا چاہتے تھے۔ اس کتاب کے ابتدائی صفحات پر یہ عہد آفریں جملہ ملتا ہے۔



"تاریخ پڑھنا اچھا تو ہے لیکن میرے نزدیک تاریخ بنانے میں حصہ لینا اس سے کہیں زیادہ اچھا ہے۔"

نہرو کی تحریر غیر شعوری طور پر ایک پیشن گوئی تھی کیونکہ ہندوستان کی آزادی کے بعد مکتوب نگار (نہرو) اور مکتوب الیہ (اندرا جی) دونوں ہمارے ملک کے سربراہ بنے اور ملک کی مایۂ ناز تاریخ ساز شخصیتیں بھی۔

اس کتاب میں انسانی تہذیب کی نشو و نما کا ذکر جامع الفاظ میں کیا گیا ہے اس میں انھوں نے یونانیوں کی جرأت فکر اور رومیوں کے بے پناہ عزم حیات کا ذکر کیا ہے عیسیٰ کے ساتھ دار پر چڑھے ہیں اور سقراط کے ساتھ زہر کا پیالہ پیا ہے۔ اسلام سے اخوت و مساوات کا پیام لے کر آگے بڑھے ہیں، یورپ کی نشاطِ ثانیہ کی زندگی بخش تحریکوں سے متاثر ہوئے ہیں۔ انقلاب فرانس کے موضوع پر ان کا قلم ایک نفس آتشیں کا روپ اختیار کرلیتا ہے، میونخ پیکٹ کے بیان میں ایک ایسے مفکر کا روپ ہے جس کے دل میں ساری دنیا کا درد سمٹ گیا ہے، بالشویک انقلاب میں روسی عوام کی ہی نہیں بلکہ اپنے خوابوں کی تعبیر سچی ہوتی ہوئی دیکھی ہے، ہندوستان تو ان کا ملک ہی تھا جس کے وہ وارث تھے جس کے حال کی تعمیر اور جس کے مستقبل کی تشکیل میں انھوں نے اپنے زمانے کے ہر فرد سے زیادہ اہم حصہ لیا۔ اس کتاب کا کینوس بہت وسیع ہے لیکن مصنف کی شخصیت پوری کتاب میں ہمہ وقت موجود نظر آتی ہے اور ہم یہ بات کبھی فراموش نہیں کرسکتے کہ دنیا کا مرقع دراصل خود مصنف کا مرقع ہے۔

یہ کتاب تاریخی سماجیات کی بھی ایک اہم کڑی ہے، یہ محض واقعات اور حالات کی ایک دستاویز ہی نہیں ہے اشتراکیوں کی طرح سے نہرو تاریخ میں سیاسی اور سماجی واقعات کا تجزیہ فی الوقت وقوع پذیر واقعات سے نہیں کرتے ہیں مثال کے طور پر وہ نپولین کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"نپولین اگر کسی دوسرے وقت اور پرامن دور میں پیدا ہوتا تو وہ ایک ممتاز جنرل کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا اور غالباً کوئی اس کے متعلق جانتا بھی نہیں لیکن انقلاب اور تبدیلی نے اسے آگے بڑھنے کا موقع عطا کیا اور موقعے سے اس نے فوراً فائدہ بھی اٹھالیا۔" (جگ بیتی، ص ۳۲۳)

پنڈت نہرو کی آخری تصنیف تلاشِ ہند (DISCOVERY OF INDIA) ہے، "تلاشِ ہند" کو ان کی خود نوشت سوانح عمری کے بعد دوسرا اہم کارنامہ کہا جاسکتا ہے، دراصل نہرو کی "تلاشِ ہند" کی ابتدا برسوں پہلے سے جاری تھی انھوں نے نوجوانی کے زمانے سے ہندوستان کی تاریخ اور ادب کا مطالعہ شروع کردیا تھا اور اپنے سفروں کے دوران میں ان مناظر قدرت اور آثارِ قدیمہ کو دیکھا تھا جو اس کی تاریخ ادب اور دیومالا کی زندہ یادگار ہیں، قلعۂ احمد نگر کی اسیری کے زمانے میں ہندوستان کے ماضی و حال پر زیادہ گہری اور شخصی نظر ڈالنے کا موقع ملا اور اپنے خیالات میں وضاحت پیدا کرنے کے لیے انھوں نے ۴۵-۱۹۴۲ء میں یہ کتاب لکھی۔ انھوں نے اس کتاب میں ہندوستان میں تہذیبوں کی کثرت میں ایک بنیادی وحدت اور کشمکش اور تصادم کی لمبی کہانی میں جذب و انجذاب کی ایک لہر دیکھی اور دکھائی۔ آل احمد سرور اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اس کتاب میں ہندوستان سے ایک رومانی عشق نہیں ملے گا۔ اس کی روح اور اس کی روح کے سفر کا عرفان ملے گا اس میں اس ہندوستان کی ایک جھلک ہے جو بدلتا رہا ہے۔ ہر اثر کو جذب کرتا رہا ہے۔ جس نے علم و عمل کی کتنی ہی منزلیں طے کی ہیں مگر جو عقلیت اور سائنس کی طرف سے تغافل برتنے کی وجہ سے بعض فرسودہ اداروں کو گلے سے لگائے رہنے کی وجہ سے سست اور بے جان ہوگیا تھا۔" تلاشِ ہند کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں فرد اور دنیا کا یکساں خیال ہے اور ان میں غم ذات کو غم کائنات سے ہم آہنگ کردینے کی صلاحیت ہے۔ "تلاشِ ہند" کے صفحات پر ہندوستان کی تاریخ بے روح لفظوں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ وہ تاریخ ہے جو لکھنے والے دماغ میں زندگی کی سانس لے رہی تھی، دراصل یہ وہ ہندوستان ہے جو نہرو کے خلاقانہ ذہن میں تشکیل پا رہا تھا، اس ہندوستان کی تلاش میں وہ ہر اس مقام تک پہنچے جہاں تک تحقیق کی روشنی انھیں لے جا سکتی تھی۔

میری کہانی، تاریخ عالم کی جھلکیاں اور تلاشِ ہند، نہرو کے ایسے زندۂ جاوید کارنامے ہیں جنھوں نے "بنی آدم اعضائے یک دیگر اند" کا ازلی اور ابدی نظریہ نئی دنیا کو پیش کیا ہے، ان کتابوں کو پڑھنے والا یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ یہ تاریخ کی عام کتابیں نہیں بلکہ جدید ذہن

کی دریافت کی تین منزلیں ہیں۔ تاریخ کی تحقیق نے انھیں وہ سیاسی بصیرت عطا کی جس کے بغیر ان کی نظر میں ایسی وسعت پیدا نہ ہو سکتی تھی کہ وہ قدیم و جدید، قومی اور بین الاقوامی عناصر کی آمیزش سے ایسا مسلک انسانیت پیش کر سکیں جو خود ان کے الفاظ میں سائنٹفک ہیومنزم (SCIENTIFIC HUM-ANISM) کہلایا جا سکتا ہے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد ان کی ان تصانیف کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"ان کی تحریریں خواہ کتابیں ہوں خواہ مقالات و خطبات، فولادی قلعے ہیں جنھیں وقت کی دستبرد سے کوئی اندیشہ نہیں، گھنے اشجار ہیں جن کے سایے میں راہ چلتے مسافر آرام کر سکتے ہیں اور تازہ دم ہو کر نئے سفر پر روانہ ہو سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر "میری کہانی" اور "تاریخ عالم کی جھلکیاں" ہی کو لیجیے، ان دونوں کتابوں کا کینوس بہت وسیع ہے "میری کہانی" جیسا کہ نام سے گمان ہوتا ہے محض واقعات ہی کا بیان نہیں بلکہ یہ ایک دھڑکتے ہوئے دل کی داستان ہے اوّل سے آخر تک یہ داستان آپ کو رلاتی ہے۔ آپ کے آنسو بھی پونچھتی ہے اور آپ کے دل میں ایسا ولولہ بھی پیدا کرتی ہے کہ آپ سامراج سے ٹکر لینے پر آمادہ ہو جائیں اسی طرح "تاریخ عالم کی جھلکیاں" ویسی ہی تاریخ کی کتاب نہیں ہے جو ہم اسکولوں اور کالجوں میں پڑھتے چلے آئے ہیں۔ مصنف نے اس کتاب میں ماضی اور مستقبل میں ایک گہرا تعلق قائم کیا ہے، دیروز کے کھنڈروں میں مصنف نے فردا کی تعمیریں دیکھی ہیں۔ تاریخ کی یہ کتاب ماضی کے مرثیوں سے خالی ہے۔ یہ کتاب اس معمار کے ذہن کی تخلیق ہے جو ہر قدم پر شوقِ تعمیر اپنے دل میں لیے آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ تاریخ کی یہ کتاب جو:

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ قدیم و جدید

کی تفسیر ہے۔ یہ ایک ایسے مصنف کی تصنیف ہے جو صرف تاریخ داں ہی نہیں، تاریخ ساز بھی ہے۔"

(نشانِ منزل از جگن ناتھ آزاد، ص ۵۳ مضمون جواہر لال نہرو کا ادبی مرتبہ)

نہرو تاریخ نگاری میں صرف افراد کی سوانحی حیثیت سے بحث نہیں کرتے بلکہ بنیادی طور پر خارجی عناصر پر زیادہ زور دیتے ہیں، نہرو چارٹن، MO-NTISQUIEIS) اور بکل کی طرح تاریخ انسانی پر ماحول اور آب و ہوا کے اثرات پر زور دیتے ہیں۔

ہر چند کہ نہرو تاریخ میں خارجی عناصر پر زیادہ زور دیتے ہیں لیکن وہ محض ایک مادہ پرست نہیں، وہ تاریخ میں ہیروز کے اہم رول کا ذکر بھی کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے، روسی انقلاب کے بارے میں ہر چند کہ وہ سماجی اور معاشی اسباب کو ان کا محرک مانتے تھے جو ان کی بنیاد ہے لیکن اس کے ساتھ وہ ایک فرد کی تخلیقی قوت کے بھی معترف تھے جو کروڑوں انسانوں کی زندگی میں تبدیلی لے آتی ہے۔ وہ لینن کو انقلاب روس کا نقیب سمجھتے تھے، ہندوستان کی ہم عصر سیاست میں وہ گاندھی جی کی مقناطیسی شخصیت کا ہندوستان کے سماجی و سیاسی انقلاب کے رونما ہونے میں ہر جگہ ذکر کرتے ہیں۔

تاریخ سے انھوں نے روشنی حاصل کی۔ تاریخ نے انھیں ایک مثالی آدرش دیا، تاریخ نے انھیں ایک عالمگیر انسانیت کا ظہور نظر آیا جس کا ہیرو انسان ہے، تاریخ ہی نے انھیں بتلایا کہ نظام عالم میں ایک تسلسل، ایک یکسانیت، ایک ترتیب اور ایک قانون ہے جو انسان کے ذہن میں عقل کے روپ میں دکھائی دیتا ہے۔

مورخین کا ایک مکتب فکر ہے جس کا یقین ہے کہ تاریخ محض واقعات کی طولانی کہانی ہے، دوسرا مکتب فکر اس کا مخالف ہے مارکس کے مطابق تاریخ دو طبقوں کی کشاکش کا نام ہے جس میں مزدور طبقہ سرمایہ دار طبقے پر فتح حاصل کر لیتا ہے۔ ٹائن بی کا عقیدہ ہے کہ تہذیب کی عمارت کی بنیاد مذہب پر ہے اور انسان تمام مرحلوں کو طے کرنے کے بعد نصرانیت کے سایے میں دم لے گا۔ جواہر لال نے ان سب سے ہٹ کر اپنی راہ نکالی جو انھیں دنیا کے کارخانے میں دوسری جنگِ عظیم سے نظر آئی۔ ایک وہ جس کا تعلق ساری اندرونی زندگی سے ہے جہاں ضمیر اور جذبہ ایک دوسرے کے حریف ہیں، دوسری وہ جہاں آدمی اپنے ماحول سے دست و گریباں ہے۔ اس ماحول میں انسان دوستی اور انسان دشمنی دونوں کے عناصر موجود ہیں، تاریخ انھیں دونوں جنگوں کی ہار جیت کا نام ہے۔ یہ آخر کس جگہ جا کر ختم ہوگی، اس کے بارے میں جواہر لال کا عقیدہ ہے کہ اخلاق کی فتح ہی انسان کی بقا کی ضمانت ہے۔ ●



نئے ہندوستان کی تعمیر اور نہرو

(پروفیسر) لطف الرحمٰن
شعبۂ اردو، بھاگل پور یونیورسٹی، بھاگل پور (بہار)

نئے ہندوستان کے رہنماؤں میں پنڈت جواہر لال نہرو کا مقام ومرتبہ سب میں بلند اور اہم ثابت ہو چکا ہے۔ اس لیے کہ نہرو نے نئے ہندوستان کی تعمیر میں اپنی شخصیت اور سیاسی ومعاشی نظریات کے گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔ ابتدا میں نہرو حصول علم کے لیے انگلینڈ گئے جہاں انھوں نے سائنس اور قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں اپنی اہلیہ کملا نہرو کے علاج کی خاطر نہرو بار بار یورپ کا سفر کرتے رہے۔ اپنے ان اسفار کے درمیان نہرو نے مختلف ممالک کے ادیبوں، فن کاروں، رہنماؤں اور دانشوروں سے ملاقاتیں بھی کیں۔ آئنسٹائن، برنارڈ شا اور اسٹالن وغیرہ کا نام اس سلسلے میں خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ ان تمام اسباب وعوامل نے نہرو کی شخصیت اور افکار وخیالات کو بسیط پیمانے پر متاثر کیا۔ وہ نہ صرف یہ کہ عالمی سطح پر تیزی سے رونما ہونے والے مختلف انقلابات وتغیرات سے واقف ہوئے بلکہ انھوں نے ہندوستان کو آزاد اور خود کفیل بنانے کے خواب دیکھنا شروع کیے۔ اور ایک نئے عہد کے آغاز کا فیصلہ بھی کیا۔ گاندھی جی نے ان کو کانگریس کی رہنمائی کے جو مواقع فراہم کیے ان کی وجہ سے کانگریس کی تجویزوں اور پالیسیوں پر ان کے افکار وخیالات کی گہری چھاپ پڑی۔

چنانچہ ہندوستان کی آزادی کے بعد جب اقتدار کانگریس کے ہاتھوں میں آیا تو نہرو کی قیادت میں نئے ہندوستان کی تعمیر کی بنیاد انھی اصولوں اور نظریوں پر رکھی گئی جن کو نہرو نے جنگ آزادی کے زمانے میں متشکّل کیا تھا۔ نہرو کا خواب ہندوستان کو آزاد کرنے کے ساتھ ساتھ دنیا میں اسے ایک اہم مقام بھی دینا تھا۔ جس میں انھیں یقیناً کامیابی ملی۔ اس دعوے کی دلیل نہرو کے مندرجۂ ذیل خیالات اور پالیسیوں کے جائزے سے سامنے آتی ہے۔

تحریک آزادی کے وقت ہی سے نہرو نے عالمی پس منظر اور موجودہ دور کے تقاضوں کے تحت نئے ہندوستان کی تعمیر کا خواب دیکھنا شروع کیا۔ انھوں نے ہندوستان کی جنگ آزادی کو عالمی نوآبادیاتی تحریک کا ایک حصّہ بنایا اور ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ساتھ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک کے لیے بھی جدوجہد شروع کی۔ نہرو کا یہ رجحان ۱۹۲۷ء کے بعد سامنے آیا جب انھوں نے بلجیم کے شہر برسلز میں نوآبادیات کے خلاف ایک عالمی کانگریس میں شرکت کی اس کے بعد سے لگاتار انھوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی کو ایک عالمی جنگ کی حیثیت دی ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۶ء میں کانگریس کی صدارتی تقریروں میں انھوں نے بار بار اسی پر زور دیا کہ ہندوستان عالمی نوآبادیات کے خلاف جنگ سے الگ نہیں رہ سکتا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے مختلف ممالک کی جنگ آزادی کے رہنما ہندوستان کی آزادی کو اپنی آزادی کی ابتدا تصور کرنے لگے۔ نہرو نے اندرا گاندھی کے نام اپنے خطوط میں (جو بعد میں Glimpses of world history کے نام سے شائع ہوئے) بار بار اپنے ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کانگریس کی خارجہ پالیسی کی ساری تجویزیں نہرو ہی تیار کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کانگریس کی تمام عالمی پالیسیوں پر نہرو کی پوری چھاپ ہوتی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں احمد نگر جیل میں انھوں نے Discovery of India لکھی جس میں نہرو نے ایشیا اور افریقہ کے دوسرے ممالک کی تحریکات آزادی کو ہندوستان کی تحریک آزادی کے لیے بے حد اہم بتایا۔ انھوں نے ایشیا کے اتحاد پر بطور خاص زور دیا۔ اور ایشیائی ملکوں کی ایک الگ تنظیم

بنانے کی تجویز رکھی۔ ان کے اس خواب کی تعبیر مارچ ۱۹۴۷ء میں سامنے آئی جب دہلی میں ایشیائی ممالک کے نمائندوں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مختلف ایشیائی ملکوں کے علاوہ یورپ اور امریکہ کے نمائندوں نے بھی شرکت کی۔ آزادی کی چالیسویں سالگرہ کے موقع پر اکتوبر ۱۹۸۷ء میں پھر اس کانفرنس کے ان نمائندوں کی نشست دہلی میں ہوئی جنھوں نے پہلی ایشیائی کانفرنس مارچ ۱۹۴۷ء میں حصہ لیا تھا۔ اس طرح ایشیا میں آزادی کی جنگ کو نہرو نے ہندوستان کی جنگ آزادی کا حصہ بنا دیا۔ انجام کار نہرو نے ہندوستان کی آزادی کے بعد نوآبادیات کے خلاف نئے پیمانے پر جنگ شروع کی اور ہندوستان کو دو بڑی طاقتوں سے الگ رکھ کر یوگوسلاویہ کے مارشل ٹیٹو اور مصر کے کرنل ناصر کے ساتھ مل کر ایک غیر جانبدارانہ پالیسی کی تشکیل کی۔ اسی پالیسی پر اندرا گاندھی نے عمل کیا۔ دہلی میں ناوابستہ ممالک کی کانفرنس اس کا ثبوت ہے۔ راجیو گاندھی بھی اسی پالیسی پر عمل کر رہے ہیں۔

ہندوستان میں جمہوری نظام کی بنیاد بھی نہرو ہی نے رکھی۔ ہندوستان کا جو آئین ۱۹۵۰ء میں آئین ساز اسمبلی کے ذریعے تشکیل پذیر ہوا اس پر نہرو کی شخصیت اور اندازِ فکر و احساس کی گہری چھاپ ملتی ہے۔ نہرو ابتدا ہی سے شخصی آزادی اور جمہوری نظام کے حامی تھے۔ کراچی کانگریس میں ۱۹۳۱ء میں شخصی آزادی کے لیے نہرو نے جو تجویز پاس کرائی تھی اس کو بنیادی اختیارات کی شکل میں ہندوستان کے نئے آئین میں خاص مقام دیا گیا۔ نہرو ہی کی وجہ سے ہندوستان میں پارلیمانی نظام قائم ہوا جس کے نتیجے میں بالغ رائے دہندگی اور مساوات کے اصول کو نئے آئین میں شامل کیا گیا اور مرکز کو مضبوط بنا کر ملک کے اتحاد اور ایکتا کو قائم رکھنے کی کوشش کی گئی۔ نہرو پریس کی آزادی کے بھی کٹر حامی تھے۔ ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ کو اپنے خطوط میں انھوں نے اقلیتوں کی ترقی پر توجہ دینے کے لیے بار بار ہدایتیں کیں۔ جواہر لال نہرو نے نئے ہندوستان کی تعمیر میں جس معاشی نظام کو ترجیح دی وہ اشتراکی اصولوں سے متاثر تھا۔ ۱۹۲۷ء میں نہرو نے پہلی بار روس کا سفر کیا وہاں ان کا قیام بے حد مختصر رہا لیکن وہ اشتراکی نظام سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنے سیاسی نظریات میں اس کو اہم جگہ دی۔ وہ بار بار سوشلزم پر زور دیتے تھے۔ اور سرمایہ دارانہ نظام پر تنقید کرتے تھے جس کی وجہ سے کانگریس کے وہ رہنما جو سرمایہ داروں سے متاثر تھے ان کو شک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ۱۹۳۷ء کے بعد نہرو نے نئے ہندوستان کی تعمیر کے لیے معاشی منصوبہ بندی کے اصولوں کو اپنے اقتصادی نظریات کا حصہ بنا لیا چنانچہ ہندوستان کی آزادی کے بعد اپنے ملک کو مغرب کے دوش بدوش لانے کے لیے انھوں نے منصوبہ بندی کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے پلاننگ کمیشن کی تشکیل کی۔ جس کی سفارش پر نئے نئے اور بڑے بڑے کارخانے قائم کیے گئے۔ ریل سڑک جہاز رانی اور مواصلاتی نظام کی تیزی کے ساتھ ترقی پر زور دیا گیا۔ نہرو اور گاندھی جی میں معاشی نظام کے مسئلے پر کئی بار اختلافات ہوئے جن کا ذکر گاندھی جی کے آخری خطوط میں ملتا ہے جو ۸ نومبر ۱۹۸۷ء کے "سنڈے" اور "ٹائمز آف انڈیا" میں "To my Successor" کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں۔ دراصل گاندھی جی گاؤں کی ترقی پر زیادہ زور دیتے تھے اور چرخے کے علاوہ گھریلو صنعتوں کو اہمیت دیتے تھے۔ نہرو نے ان کی بات کی مکمل تردید نہ کرتے ہوئے گاؤں کی ترقی کو بھی اپنے معاشی اصولوں کا حصہ بنایا لیکن بڑی صنعتوں کے قیام کو خاص اہمیت دی اس طرح ہندوستان جواہر لال نہرو کے معاشی اصولوں پر عمل کر کے آج تیسری دنیا میں ایک اہم مقام حاصل کر چکا ہے۔

نئے ہندوستان کی تعمیر کے لیے جواہر لال نہرو نے تعلیم ادب اور تمدن کی ترقی کو بھی اہمیت دی۔ انھوں نے ابتدا ہی سے تعلیم کی ترویج کی کوشش کی آزادی کے بعد اعلیٰ تعلیم کی ترویج و اشاعت کے لیے انھوں نے مولانا آزاد کی معیت میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی بنیاد رکھی جس کو اعلیٰ تعلیم کے لیے پالیسی وضع کرنے اور اس کو عملی جامہ پہنانے کا اختیار دیا گیا۔ اس کے علاوہ نئے نئے اسکولوں کی تعمیر پر توجہ دی گئی۔ عورتوں کی تعلیم پر انھوں نے خصوصی توجہ دی اس مقصد کے لیے انھوں نے خواتین کی تعلیم کے لیے ایک قومی ادارے کی بھی تشکیل کی۔ جس کی سفارش پر عورتوں کی تعلیم کو فروغ دیا گیا۔ یہی نہیں ایک مرکزی



سماجی بہبودی ادارہ بھی انھوں نے قایم کیا تاکہ عورتوں کی سماجی بہبود کی اسکیم کو کامیابی کے ساتھ بروئے کار لایا جا سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں ۱۹۵۰ء میں ۳۳ فی صد لڑکیاں ہائی اسکولوں میں تعلیم پاتی تھیں وہاں ۱۹۵۹ء میں ان کی تعداد چالیس فی صد ہو گئی۔ پرائمری سطح پر ۱۹۵۰ء میں ۳۹ فی صد لڑکیاں زیر تعلیم تھیں ۱۹۶۵ء میں ان کی تعداد ۵۵ فیصد ہو گئی۔ اسی نسبت سے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں لڑکیوں کی تعداد میں اضافے ہوئے۔ نہرو کی پالیسی کے مطابق لڑکیوں کو عام تعلیم کے علاوہ ٹیچرز ٹریننگ نرسنگ اور ہوم سائنس کی تعلیم بھی دی جانے لگی۔ نہرو نے تکنیکی تعلیم کو بھی اپنے تعمیری نظام میں بنیادی اہمیت دی۔ چنانچہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں زراعتی اور تکنیکی ادارے قایم کیے گئے۔ دوسرے ملکوں کے ساتھ سمجھوتا کر کے نہرو نے ہندوستانی طلبا کو اعلیٰ تعلیم کے لیے مغربی ممالک میں جانے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کیے جس کی وجہ سے نئے ہندوستان کی تعمیر میں اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے نے خصوصی حصّہ لیا۔ نہرو نے صرف تعلیم ہی پر زور نہیں دیا بلکہ ہندوستان کی فنی، جمالیاتی، تہذیبی اور تمدنی ترقی کو بھی ہندوستانی قومیت کا اسی طرح حصہ بنایا جس طرح امریکہ، روس اور فرانس نے بنایا تھا۔ فنی، جمالیاتی اور تہذیبی ترقی کے لیے انھوں نے مختلف اکادمیاں قایم کیں جو آج بھی ہندوستانی قومیت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ ان منصوبوں کی تشکیل و تکمیل میں انھیں مولانا آزاد کی سرگرم حمایت بھی حاصل رہی۔ اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی نے بھی اس پالیسی پر عمل کر کے ادب و فن، رقص، مصوری اور سنگیت وغیرہ کے تعلق سے مرکزی اور ریاستی سطح پر متعدد اکادمیاں قایم کیں۔ یہ کوششیں بھی نہرو کی پالیسی کی توسیع و ترقی سے عبارت ہیں۔

نہرو نے سماجی تبدیلی کو بھی نئے ہندوستان کی تعمیر کے لیے لازمی سمجھا۔ گاندھی جی کی طرح انھوں نے بھی ملکی آبادی کے پسماندہ حصّوں، قبائلیوں اور اقلیتوں کی ترقی پر خاص توجہ دی۔ اپنی وزارت میں جگ جیون رام کو ایک اہم عہدے پر فائز کر کے انھوں نے عملاً یہ ثابت کر دیا کہ پس ماندہ طبقے کے ایک عام آدمی کو بھی ان کے نزدیک وہی اہمیت حاصل ہے جو دوسرے ترقی یافتہ طبقوں اور افراد کو۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو اپنے سیاسی نظام اور کابینہ میں انھوں نے جو خصوصی اہمیت دی اور ذمہ داری سونپی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اپنی کابینہ میں راجکماری امرت کور کو شریک کر کے نہرو نے خواتین کو بھی سیاسی معاملات میں حصّہ لینے کا موقع دیا۔ سروجنی نائیڈو کو انھوں نے آزاد ہندوستان میں پہلا صوبائی گورنر مقرر کیا۔ اور اپنی بہن وجے لکشمی پنڈت کو U.N.O. میں ہندوستان کا نمائندۂ خاص بنا کر بھیجا جنھوں نے آگے چل کر U.N.O. کی جنرل اسمبلی کی صدارت حاصل کی۔ اس طرح نہرو نے خواتین کو نہ صرف سماج کا ایک اہم حصّہ سمجھا بلکہ نئے ہندوستان کی تعمیر میں ان کو ہاتھ بٹانے کے پورے مواقع فراہم کیے۔ نہرو کے اس رجحان کی جھلک ان کی اس تقریر میں بھی ملتی ہے جو انھوں نے ۱۹۴۹ء میں اپنے امریکہ کے دورے کے موقع پر کی تھی۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے نئے آئین میں عورتوں کو ووٹ دینے، انتخاب میں حصّہ لینے اور وزارت کا عہدہ حاصل کرنے کے مواقع بھی فراہم کیے۔ ۵۵-۱۹۵۴ء میں ہندوستانی پارلیامنٹ سے ہندو کوڈ بل پاس کرا کے انھوں نے عورتوں کے ایک معتبر سماجی منصب کی ضمانت دی۔

جہیز کے خلاف انھیں کے دورِ حکومت یعنی ۱۹۶۱ء میں قانون پاس ہوا۔ اور اس لعنت کو دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ اسی نقشِ قدم پر چل کر حال میں وزیر اعظم راجیو گاندھی نے اس قانون کو اور بھی بہتر کرنے کے لیے پارلیامنٹ سے ترمیم پاس کرائی۔ غرض یہ کہ عالمی نقطۂ نگاہ سے ہندوستان کی تعمیر و ترقی کو نہرو نے ایک نئی روشنی سے دیکھا اور دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی طرح عورتوں کے حالات میں سدھار لانے کی ہر ممکن کوشش کی۔

نہرو چونکہ اشتراکی اصولوں سے بہت حد تک متاثر تھے اس لیے انھوں نے مزدوروں کے حالات کو بہتر بنانے کے لیے پارلیامنٹ سے کئی قانون پاس کرائے۔ ۱۹۴۸ء میں کارخانوں کے مزدوروں کے لیے ایک نیا قانون بنایا گیا۔ اسی سال مزدوروں کی کم سے کم مزدوری طے کرنے کے لیے ایک دوسرا قانون عمل میں آیا۔ ۱۹۵۰ء میں چائے، کافی اور مختلف باغات میں کام کرنے والے مزدوروں کی حالت میں سدھار کے لیے ایک نیا قانون بنا

جو آج بھی ترمیمات کے ساتھ رو بہ عمل ہے۔

۱۹۴۸ء میں مزدور عورتوں کو زچگی کی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے ایک انقلابی قانون پاس ہوا۔ آگے چل کر یہ پالیسی ایک قومی پالیسی بن گئی۔ مزدوروں کے اختیارات کو فروغ دینے کے لیے اپنے پنج سالہ منصوبوں میں نہرو نے کئی ایسے اقدام کیے جن سے ہندوستانی مزدوروں کو وہ سہولتیں بڑی حد تک فراہم ہوئیں جو دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کے مزدوروں کو حاصل ہیں۔

نہرو نے نئے ہندوستان کی تعمیر میں دیہاتوں کی ترقی پر زور دیا۔ اپنی سیاسی زندگی کے آغاز میں ہی انھیں اپنے صوبے یو۔پی کے کسانوں کی بدحالی کا تجربہ ہو چکا تھا۔ انھوں نے اپنے نظم و دیا بنی صدارتی تقریروں میں کسانوں کی بھلائی اور دیہاتوں کی ترقی پر بار بار زور دیا۔ آزاد ہندوستان میں جاگیرداری اور زمیں داری نظام کو ختم کر کے انھوں نے کسانوں کو ظلم و جبر سے نجات دلائی اور دیسی ریاستوں کو ختم کر کے ان میں مزدوروں کو زمیں داروں کے استحصال سے آزاد کرایا۔ آزادی کے بعد دیہاتوں کی ترقی کے لیے انھوں نے کمیونٹی ڈویلپمنٹ پروجیکٹ شروع کیا۔ جس کے تحت عام لوگوں کو مختلف سہولتیں فراہم کرنے کے لیے قریہ قریہ، بستی بستی نئے نئے مراکز کھولے گئے۔ گاؤں گاؤں میں بجلی پہنچانے کے لیے مختلف اسکیمیں بنائی گئیں۔ دریاؤں پر بڑے بڑے بندھ بنا کر نہ صرف سینچائی کا انتظام کیا گیا بلکہ بجلی کی پیداوار میں بھی اضافے کیے گئے۔ دامودر ندی پر D.V.C. اور بھاکڑا ندی پر بھاکڑا ننگل پراجکٹ آج بھی نہرو کے خواب کی تعبیر کی شکل میں موجود ہیں جن کو نہرو نے ہندوستان کے نئے مندروں سے تعبیر کیا تھا۔

جواہر لال نہرو نے جن اصولوں پر نئے ہندوستان کی تعمیر کا سنگِ بنیاد رکھا تھا انھیں اصولوں پر عمل کر کے ان کے بعد مسز اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی نے ہندوستان کو اکیسویں صدی میں لے جانے کا خواب دیکھنا شروع کیا۔ ہر وہ قدم جو آج کی حکومت اٹھا رہی ہے اس کی بنیاد نہرو ہی کے زمانے میں رکھی گئی تھی۔ آج وزیرِ اعظم راجیو گاندھی ہندوستان کی ترقی اور اس کو ایک عالمی قوت بنانے کا جو خواب دیکھ رہے ہیں وہ انھی اصولوں اور نظریوں پر مبنی ہے جن کی تشکیل نہرو نے کی تھی۔

جمہوری سوشلزم، سیکولرزم اور عالمی سطح پر غیر جانبدارانہ پالیسی جواہر لال نہرو کے تین ایسے عطیات ہیں جو ہمیشہ امر رہیں گے۔ امریکی رہنما مسٹر جیفرسن کی طرح نہرو نے جمہوریت کے ساتھ ساتھ سیکولرزم اور شخصی آزادی کو سیاسی ردِ عمل کا جزو بنا دیا۔ یہ ان کی بڑی دین ہے یہ اصول آج بھی ملک کے رہنماؤں کو متاثر کر رہے ہیں یہاں تک کہ جنتا پارٹی کے مختصر دورِ حکومت میں بھی ان اصولوں کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ یہ نہرو کے عملی اصولوں اور سیاسی نظریوں کی اصابت اور صلابت کا ٹھوس ثبوت ہے۔

●

نہرو اپنے بڑوں کا ادب کرتے تھے اور اپنے دوستوں اور جاننے والوں کا خیال رکھتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بھی ان کی اس عادت کا پتہ لگ جاتا تھا۔ مسٹر بے۔ پی۔ دوبے نہرو کے پرانے جاننے والے تھے۔ انھوں نے نہرو کو ایک خط لکھ کر انھیں نہرو کی ایک تصویر چاہیے یہ تصویر وہ الٰہ آباد ہائی کورٹ کی لائبریری میں لگانا چاہتے تھے۔ مارچ 1955 میں نہرو الٰہ آباد گئے تو دوبے جی ان سے ملنے آنند بھون گئے۔ انھیں یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ نہرو ان کے لیے دہلی سے ایک تصویر اپنے ساتھ لائے ہیں۔ خوشی سے ان کا چہرہ دمک اٹھا۔ نہرو انھیں دیکھتے ہی بولے "میں تمھارے لیے ایک اچھی سی تصویر لایا ہوں۔ میرا خیال ہے تم اسے پسند کرو گے"



نہرو اور قومی یک جہتی

(ڈاکٹر) اعجاز علی ارشد
صدر شعبۂ اُردو، بی. این. کالج، پٹنہ ۴ ۸۰۰۰۰ (بہار)

اس حقیقت سے شاید ہی کوئی انکار کرے گا کہ پنڈت جواہر لال نہرو نظریاتی اور عملی طور پر ایک سیکولر انسان تھے اور انھوں نے اپنی سیاسی زندگی کے آخری ایام تک فرقہ پرستوں سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ حالاں کہ سیاست میں ایسے کئی سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں جو دل سے قابلِ قبول نہیں ہوتے۔ لیکن نہرو کا حال یہ تھا کہ عام طور سے جو ان کے دل میں ہوتا تھا وہی زبان پہ آتا تھا۔ اور جو زبان سے ادا ہوتا تھا اس کا جلوہ عمل میں دکھائی دیتا تھا۔ ایسا نہیں کہ نہرو کو اپنے قول و فعل میں یکسانیت قائم رکھنے کے لیے دشواریوں کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو۔ خود کانگریس میں ایسے لوگ موجود تھے جن کا ذہن کم از کم مصلحت پرستی کے زہر سے محفوظ نہیں تھا۔ آزادی سے قبل اور اس کے بعد ان کی مصلحت پرستی نے بڑے گُل کھلائے۔ جن کی تفصیل میں جانے کا یہاں موقع نہیں مگر ایسے لوگوں کے بارے میں خود پنڈت نہرو کا یہ اعتراف قابلِ توجہ ہے۔

"خود کانگریس تو ان فرقہ پرست تنظیموں سے دُور رہی مگر کانگریس والوں پر ان کا زہر چڑھ گیا۔ سچے قوم پرست لوگوں نے اس فرقہ پرستی کے جنون کو روکنے کی کوشش کی مگر انھیں کامیابی نہیں ملی اور بڑے بڑے فسادات ہو گئے۔"

ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں سے پنڈت نہرو کو ہمیشہ سابقہ پڑا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انھیں جتنی محنت دوسری جماعتوں کے مخالف لوگوں کا مقابلہ کرنے میں صرف کرنی پڑی اس سے زیادہ محنت خود اپنے ہی لوگوں کو مطمئن کرنے میں درکار ہوئی کیوں کہ یہ ایسے لوگ تھے جو کبھی برسرِ عام اور کبھی در پردہ نہرو کے نظریات کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ یہ نہرو کی شخصیت تھی جس نے دونوں سطحوں پر فرقہ پرستی کا مقابلہ کیا اور کبھی ان کے پائے استقامت میں لرزش نہ آئی۔ قومی یکجہتی کے نام پر پہلے بھی بہت کچھ سطحی قسم کی باتیں کی جاتی رہی ہیں اور اب بھی بھانت بھانت کی دُکانیں اس نام پر چل رہی ہیں۔ مگر زیادہ تر دکان داروں کا حال یہ ہے کہ قومی ایکتا ان کے لیے بس ایک نعرہ ہے یا پھر اسمال اسکیل انڈسٹری جس سے موقع بہ موقع فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ نہرو کے لیے قومی ایکتا اور سیکولرزم صرف ایک نعرہ نہیں، نظریہ بھی نہیں بلکہ ایمان تھا جسے وہ عمر بھر سینے سے لگائے رہے۔

یہاں یہ اعتراف کر لینے میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیے کہ نہرو کے بعد بھی قومی یکجہتی کے سلسلے میں خاصا کام ہوا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے لیکن حال کچھ یہ ہے کہ: مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی ـــــ

اس کی وجہ کیا ہے، وہ بھی نہرو کی ہی زبان سے سنیے۔ وہ فرقہ پرستی کے مرض کی صحیح تشخیص کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قومی یکجہتی کا مسئلہ نشستند و گفتند و برخاستند یا سمیناروں اور کانفرنسوں سے حل نہیں ہو سکتا۔ ان کے الفاظ میں:

"ہندو مسلم ایکتا کے لیے آئے دن جو اپیلیں ہوتی رہتی ہیں وہ بے شک فائدہ مند ہوتے ہوئے بھی، مجھے بالکل ہی فضول معلوم ہوتی ہیں، جب تک اختلاف کے اسباب کو سمجھنے کی کوشش نہ کی جائے۔ مگر کچھ لوگوں کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ اس منتر کو بار بار رٹنے سے آخر میں ایکتا جادو کی طرح آ ٹپکے گی۔"

ایک دوسری جگہ ذرا تفصیل سے اس نکتے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میرا اپنا خیال ہے کہ قومیت کا طلوع ہندو، مسلم، سکھ اور دوسرے سبھی طبقوں کی ذہنی ہم آہنگی (وچارک ایکتا) سے ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کسی بھی تہذیب کو دبا دیا جائے اس کے لیے تو ایک عام نقطۂ نظر کی ضرورت ہے جس کے آگے باقی ساری باتیں غیر اہم ہیں۔ میں نہیں مانتا کہ صرف منتر جاپ کی طرح ہندو مسلم ایکتا آ جائے گی۔ وہ آ کر رہے گی اس میں مجھے کوئی شک نہیں لیکن آئے گی وہ نیچے سے، اُوپر سے نہیں۔"

قومی یک جہتی کے قیام اور استحکام کے سلسلے میں یہ ایک بنیادی نکتہ ہے جس کی طرف نہرو نے بہت پہلے توجہ دلائی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ نہرو کے یہ خیالات فرقہ پرستی کے اسباب و عوامل کے گہرے مطالعے پر مبنی ہیں۔ ان دنوں ہر طرف سے اتحاد کے نعرے بلند ہو رہے ہیں مگر دلوں میں نفرت کا زہر دن بہ دن پھیلتا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم مسائل کی

جڑیں نہیں تلاش کر پاتے۔ بہرحال، یہ ایک تفصیل طلب مسئلہ ہے۔ یہاں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ خود نہرو نے فرقہ پرستی کے اسباب متعین کرنے کی کوشش کی یا نہیں۔ اگر ہم اس باب میں نہرو کی کوششوں کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت ہماری نگاہوں کے سامنے روشن ہو جاتی ہے کہ فرقہ پرستی کی مختلف سطحوں اور رُتبوں پر نہرو کی نظر تھی اور وہ ہر سطح پر اس کا مقابلہ بھی کرتے رہے۔

آزادی سے قبل ایک طرف ہندو مہا سبھا اور دوسری طرف مسلم لیگ جیسی تنظیمیں، نہ صرف یہ کہ دو قومی نظریے کی وکالت کر رہی تھیں بلکہ مذہب کے نام پر اپنی اپنی سیاست چمکانے میں مصروف تھیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے جو جذباتی مانگیں ان تنظیموں کی طرف سے پیش کی جا رہی تھیں ان کا تعلق عوام الناس کی معاشی اور سماجی ضرورتوں سے کم اور لیڈروں کے سیاسی مفادات سے زیادہ تھا۔ مذہبی نعروں کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ بیدار ہوتے ہوئے عوام کو ایک غلط سمت میں موڑ دیا جائے اور ان کے سہارے کسی نہ کسی طرح اقتدار پر قبضہ کر کے اپنے مفادات کی نگہبانی کی جائے۔ گویا امیروں کا بہت بڑا طبقہ جو ابھی تک اقتدار سے وابستہ رہا تھا اب اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لیے نئے جال بچھا رہا تھا۔ نہرو نے سیاست کے پس پردہ چھپی ہوئی اس ہوسِ اقتدار کو دیکھ لیا تھا۔ انھوں نے واضح طور پر کہا:

"آج کی بنیادی فرقہ پرستی سیاسی ردِ عمل ہے اور اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ فرقہ پرست لیڈر معاشی اور سیاسی معاملوں میں ضرور REACTIONARY بن جاتے ہیں۔"

نہرو نے اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعے فرقہ پرست تنظیموں کی اصلیت پر سے نقاب اُٹھاتے ہوئے بار بار واضح کیا کہ وہ اگرچہ مذہب کے نام کی مالا جپتے ہیں مگر مذہبی نہیں ہیں، قدیم تہذیب کا حوالہ دیتے ہیں مگر وہ مہذب بھی نہیں ہیں، وہ عمل یا نظریے میں اعلیٰ قدروں کو فروغ دینے والے بھی نہیں ہیں، وہ سماجی اصلاحات بھی نہیں چاہتے بلکہ صرف سیاسی دائرے میں کام کرتے ہیں اور خود کو معصوم قرار دیتے ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندو فرقہ پرستی کے ساتھ ساتھ مسلم فرقہ پرستی بھی اپنے شباب پر تھی۔ دراصل سیاسی مفادات کے حصول یا تحفظ میں اکثریت اور اقلیت دونوں کے نمائندے ایک ہی طرح کی چالیں چل رہے تھے۔ نہرو نے یہ بھی دیکھا کہ ہندوؤں کی تنظیمیں ساری ذمے داری مسلم تنظیموں پر ڈال رہی ہیں۔ انھوں نے محسوس کیا کہ کسی بھی ملک میں اقلیت کی فرقہ پرستی کا جواب اکثریت کی فرقہ پرستی نہیں ہو سکتی بلکہ یہ کہ اکثریت کی فرقہ پرستی ملک کے لیے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ ان تمام نکات کو ذہن میں رکھتے ہوئے انھوں نے کہا:

"مسلم فرقہ پرستوں کو بھی الزام دینے سے کام نہیں چلے گا۔ ویسے یہ کام ہے آسان کیونکہ بھارتی مسلمان بہت پچھڑے ہوئے ہیں اور دنیا کے دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کے ساتھ ان کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ بھارت میں ہندوؤں کی ایک خاص ذمہ داری ہے اس لیے بھی کہ یہاں ان کی اکثریت ہے اور اس لیے بھی کہ معاشی اور تعلیمی نقطۂ نظر سے وہ بہت آگے ہیں۔ لیکن ہندو مہا سبھا نے یہ ذمے داری نباہنے کے بجائے وہ طریقہ اختیار کیا ہے جس سے بلاشبہ مسلم فرقہ واریت کو بڑھاوا ملا ... ایک فرقہ پرستی دوسری فرقہ پرستی کو ختم تھوڑے ہی کر سکتی ہے۔ اس سے تو دونوں ہی ایک دوسرے کے سہارے اور پنپتے ہیں۔"

صاف ظاہر ہے کہ نہرو فرقہ پرستی کو کوئی اُبھرا عمل نہیں، نئے بلکہ سیاسی و سماجی نیز معاشی سطح پر رونما ہونے والی تہہ در تہہ تبدیلیوں کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ ہندوؤں پر فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کی ذمے داری مسلمانوں سے زیادہ ہے کیونکہ انھیں یہ بھی اندازہ تھا کہ سماج کا ایک مخصوص طبقہ جس میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی لیکن دراصل وہ نہ ہندو ہیں نہ مسلمان بلکہ صرف اپنے مفادات کے محافظ اور اقتدار کے عاشق ہیں، سماج میں ہمیشہ فرقہ پرست طاقتوں کو ہوا دیتا رہتا ہے۔ ایسے طبقے کو یا اس طرح کی فرقہ پرست تنظیموں کو زیادہ حمایت بھی حاصل نہیں ہوتی لیکن چونکہ یہ امیروں کی نمائندہ تنظیمیں ہیں اس لیے حکمراں کی سرپرستی بار بار مزدوروں و غریبوں کو خواب غفلت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ مزدور مذہب کی سادگی میں مات کھا جاتا ہے اور سرمایہ داروں کے مفادات پورے ہو جاتے ہیں۔

آزادی کے بعد دو باتیں فرقہ پرستوں کی طرف سے بار بار دہرائی گئیں۔ ایک تو یہ کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کا وطن ہے اور مسلمانوں کو اب پاکستان چلا جانا چاہیے۔ دوسرے یہ کہ مسلمان ہندوستان میں رہنا چاہیں تو انھیں اپنی تہذیب، اپنا تمدن، کلچر، یہاں تک کہ مذہب بھی بدل دینا چاہیے۔ تقسیم کے ساتھ ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات اگرچہ وقتی اور جذباتی ردِ عمل کا نتیجہ تھے مگر گاندھی جی کا قتل کر کے فرقہ پرستوں نے یہ تاثر دینا چاہا کہ آزاد ہندوستان میں اقلیتوں کے مفاد کی بات کرنے والا کوئی بھی حق پسند لیڈر برداشت نہیں کیا جائے گا۔ یہ صورتحال بے حد خطرناک تھی۔ نہرو نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

"ہم کو یاد رکھنا چاہیے کہ بھارت ان سبھی لوگوں



کاوطن ہے جو یہاں رہتے ہیں، چاہے وہ کسی بھی دھرم کے ہوں۔ وہ ہماری عظیم روایت میں برابر کے حصے دار ہیں۔ اور ان کے حقوق و فرائض بھی برابر ہیں۔ . . . سیکولر حکومت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ لوگ اپنا دھرم چھوڑ دیں۔ سیکولر حکومت اسے کہتے ہیں جو سبھی دھرموں کی حفاظت تو کرتی ہے کسی ایک دھرم کی قیمت پر دوسرے دھرم کی حمایت نہیں کرتی۔ نہ کسی مذہب کو حکومت کا مذہب تصور کرتی ہے۔"

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، فرقہ پرستوں کا نقطۂ نظر عوام میں نفرت کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ ۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ء کو جب جمہوری ہندوستان کا آئین بنا تو وہ ایک سیکولر آئین تھا جس میں سبھی مذہبی و لسانی اقلیتوں کو تحفظ فراہم کیا گیا تھا۔ خود اپنے ہی دوستوں کی مخالفت کے باوجود اُردو کو آٹھویں شیڈول میں جگہ دلانے میں نہرو کامیاب رہے۔ مولانا آزاد کو ہندوستان کا پہلا وزیرِ تعلیم بنانے میں بھی انھیں کامیابی ملی۔ حالاں کہ فرقہ پرستوں کی مخالفت کا یہ حال تھا کہ آزادی کے تقریباً پندرہ سال بعد بھی دہلی کا ایک روزنامہ مولانا آزاد کے خلاف زہر افشانی کرتا رہا اور اس نے مولانا کی وفات پر یہاں تک لکھ دیا کہ آج مغل حکومت کا آخری تاجدار مر گیا۔

انھی دنوں ایک اور مطالبے نے زور پکڑا۔ بعض لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ تقسیم ہند کا فیصلہ غلط تھا اور اسے بدل دینا چاہیے۔ نہرو نے اس مطالبے کے مضمرات کا اندازہ لگاتے ہوئے فوراً ہی اس کی مخالفت کی۔ اس معاملے میں وہ مہاتما گاندھی اور مولانا آزاد کے نظریے سے بڑی حد تک اتفاق کرتے تھے کہ جب پاکستان بن گیا تو اسے آزاد اور خوشحال رہنا چاہیے۔ انھوں نے کہا:

"ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو آج بھی اکھنڈ بھارت کی بات کرتے ہیں۔ . . تقسیم آج ایک اٹل حقیقت ہے اور جو لوگ اکھنڈ بھارت کی بات کرتے ہیں وہ اپنے مفاد کے لیے دونوں ملکوں کے بیچ جنگ کرانا چاہتے ہیں۔ یہ سب غیر فرقے وارانہ طریقے ہیں جن سے صرف عوام کو ٹھگا جا سکتا ہے اور چناؤ میں ووٹ حاصل کیے جا سکتے ہیں۔"

ان ساری باتوں کی روشنی میں آسانی سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نہرو نے کس طرح پہلے فرقہ پرستی کے اسباب تلاش کیے اور پھر مختلف سطحوں پر قومی ایکتا کے قیام کی کوشش کی۔ آزادی کے بعد اگرچہ وہ قومی تعمیر کے کاموں اور وزارت عظمیٰ کی ذمے داریوں میں بے حد مشغول رہے، اس کے باوجود انھوں نے فرقہ پرستی اور قومی یکجہتی جیسے اہم معاملات کی طرف توجہ دی۔ ان کی نگاہِ دور اندیش نے آنے والے خطرات اور حالات کو دیکھتے ہوئے ملک کی جو پالیسی متعین کی تھی، اس پر عمل کرکے آج بھی بہت سے مسائل کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔



نہرو ـــــ ایک عظیم سائنسی مفکّر

اسد رضا
۴۷/۱۱ ـــ اے، حوض رانی، مالویہ نگر، نئی دہلی ۱۷

پنڈت جواہرلال نہرو کا مزاج سائنسی تھا اور اس مزاج کی تشکیل کا عمل ۱۹۰۱ء سے شروع ہوا جب ان کے والد پنڈت موتی لال نہرو نے مشہور تھیوسوفسٹ فرڈینینڈ ٹی۔ بروکس کو نہرو کا استاد مقرر کیا تھا۔ اس وقت نہرو کی عمر ۱۱ سال تھی۔ نہرو کے خاندان اور گھریلو ماحول نے بھی ان کے سائنسی اور سیکولر نقطۂ نظر کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا۔ موتی لال نہرو ایک روشن خیال انسان تھے اور قدامت پرستی کے سخت مخالف تھے

نہرو نے اسکول اور کیمبرج میں سائنس کا مطالعہ کیا۔ انھوں نے کیمسٹری، طبعیات، ارضیات اور علم نباتات کا گہرائی سے مطالعہ و مشاہدہ کیا تھا اور بی، ایس سی کی ڈگری حاصل کی تھی۔

نہرو نے اپنی بیٹی اندرا گاندھی میں بھی سائنسی نقطۂ نظر پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ۳ فروری ۱۹۳۲ء کو انھوں نے جیل سے اندرا جی کو ایک خط لکھا تھا جس میں سائنس اور سائنسدانوں کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا کہ "آج سائنسدانوں کو زیادہ وقار و احترام حاصل ہے۔ سائنس کا چیزوں کو دیکھنے کا ایک بالکل مختلف طریقہ ہے۔ اس میں کوئی تعصب یا کٹرپن نہیں ہوتا۔ سائنسداں کھلے دماغ کے ساتھ سچائی تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے لیے وہ بار بار تجربات کرتا ہے۔"

سائنسی مزاج کی تعریف کرتے ہوئے نہرو نے کہا تھا کہ "سائنسی نقطۂ نظر یا سائنسی مزاج ایک طرزِ زندگی ہے، سوچنے کا عمل ہے اور کام کرنے نیز اپنے ساتھیوں کے ساتھ برتاؤ کرنے کا طریقہ ہے۔ سائنسی مزاج اس راہ کی نشاندہی کرتا ہے جس پر ہمیں چلنا چاہیے۔ یہ ایک آزاد اور روشن خیال انسان کا مزاج ہے۔"

۵ مارچ ۱۹۳۸ء کو الٰہ آباد میں قومی سائنس اکادمی کے ساتویں سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے نہرو نے کہا تھا کہ سائنس کی بدولت زبردست تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں لیکن وہ سب نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لیے ہی نہیں ہیں۔ تاہم سائنس کی پیدا کردہ تبدیلیوں میں انتہائی اہم اور امید افزا تبدیلی انسان میں سائنسی نقطۂ نظر کا فروغ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آج بھی لوگوں کی بہت بڑی تعداد قبل سائنسی عہد میں رہتی ہے۔ لیکن صرف سائنسی طریقہ ہی نوعِ انسانی میں یہ امید پیدا کرتا ہے کہ دنیا کی روحانی تکلیف ختم ہو جائے گی۔"

نہرو کا خیال تھا کہ دنیا کے بیشتر مسائل سائنسی نقطۂ نظر اپنا کر ہی حل کیے جا سکتے ہیں۔ افلاس، ناخواندگی، معاشی پسماندگی، فرقہ پرستی، ذات پات سے متعلق بھید بھاؤ، تنگ نظری اور تعصب کے خاتمے کے لیے وہ سائنسی فکر اور سائنسی طریقے پر مبنی منصوبہ بندی اور روشن خیالی کو ضروری سمجھتے تھے۔ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلے میں وہ سوشلسٹ سماج کو ترجیح دیتے تھے اور سوشلزم کو سائنسی نظریۂ حیات خیال کرتے تھے۔ ۳ جنوری ۱۹۳۹ء کو اسکاٹش چرچ کالج کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے جواہرلال نہرو نے کہا تھا کہ "اگر ہم تمام عالمی مسائل حل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کے لیے سائنسی نقطۂ نظر کو اپنانا ہوگا اور اپنے لیے مناسب نشانے اور مقاصد مقرر کرنے ہوں گے۔ میں ایک سوشلسٹ ہوں کیونکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ سوشلزم عالمی مسائل کے بارے میں ایک سائنسی نظریہ ہے۔ یہ مجھے تاریخ کے مسائل اور خود تاریخ کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔"

نہرو کی آرزو تھی کہ ہم اپنے معاشی، سماجی، سیاسی، ثقافتی اور تاریخی مسائل پر



سائنسی نقطۂ نظر سے غور کریں اور خود کو ہر طرح کی تنگ نظری، تعصب اور جانب داری سے آزاد کریں۔ کالج کے طلبا کے سامنے تقریر کرتے ہوئے انھوں نے زور دیتے ہوئے کہا تھا کہ "میری خواہش ہے کہ آپ ثقافتی اور سماجی مسائل پر سائنسی نقطۂ نظر سے غور و خوض کریں اور اسے اپنی ذاتی زندگی میں اپنائیں"۔

پنڈت نہرو نے سائنس کے اچھے اور برے دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ وہ سائنس کی حدود سے واقف تھے۔ جہاں سے سائنس کی حدود ختم ہوتی ہیں مذہب اور فلسفے کی حدود وہیں سے شروع ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں نہرو نے لکھا ہے کہ "سائنس حتمی مقاصد کا تعین نہیں کرتا ہے۔ اس کی اپنی حدود ہیں جن سے یہ تجاوز نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن ہمیں سائنسی طریقے کی حدود کو تسلیم کرتے ہوئے بھی اسے اختیار کرنا ہوگا۔ کیونکہ اس سائنسی بنیاد اور پس منظر کے بغیر ہم کسی سچائی اور حقیقت پر گرفت حاصل نہیں کر سکیں گے۔ سائنس آج تمام ممالک اور اقوام کے لیے ناگزیر ہے اور اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ سائنسی نقطۂ نظر، سائنس کا تنقیدی اور تحقیقی مزاج، سچائی کی تلاش، کسی بات کو سوچے سمجھے اور آزمائے بغیر تسلیم کرنے سے انکار اور نئے شواہد کی موجودگی میں گذشتہ نتائج کو تبدیل کرنے کی صلاحیت، مشاہدہ کرنے کے بعد کسی حقیقت پر انحصار صرف سائنس کے اطلاق کے لیے ہی ضروری نہیں ہیں بلکہ خود زندگی اور اس کے متعدد مسائل کے حل کے لیے بھی لازمی ہیں"۔

نہرو کے مطابق سائنس کا تعلق مثبت علم کے میدان سے ہے لیکن سائنسی مزاج جو یہ پیدا کرتا ہے اس میدان سے باہر ہے۔ تحصیل علم کی صلاحیت حاصل کرنا، سچائی کو محسوس کرنا، حسن اور نیکی کی ستائش کرنا وغیرہ وغیرہ انسان کے حتمی مقاصد ہو سکتے ہیں معروضی جانچ کے سائنسی طریقے کا ان پر اطلاق نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے فلسفے کی ضرورت ہے۔

سائنس اور مذہب کے درمیان تعلق کے بارے میں بھی نہرو نے نہایت فکر انگیز خیالات کا اظہار کیا تھا۔ نہرو روایتی اصطلاح میں مذہبی نہیں تھے لیکن انھوں نے حقیقی مذہب کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا۔ انھوں نے مذہب کو بھی سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھا۔ اگر بیواؤں کی دوسری شادی پر پابندی لگانا، شودروں (ہریجنوں) کو ذلیل سمجھنا، فرقہ وارانہ منافرت اور تعصب کو ہوا دینا اور دوسروں کا استحصال کرنا ہی مذہب ہے تو نہرو یقیناً لامذہب تھے۔ لیکن اگر انسانیت، محبت، آزادی، اخوت، مساوات اور روشن خیالی کی حمایت، سیاسی سماجی اور معاشی استحصال کی مخالفت مذہب کا حصہ ہیں تو بلاشبہ نہرو مذہب پرست تھے۔ تاہم انھوں نے مذہب کو سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی۔

نہرو نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ "انسانی فطرت کی چند بنیادی ضرورتوں کی تکمیل میں مذہب کا اہم رول رہا ہے مگر اس طرح کے مذہب کی پکڑ اب ڈھیلی ہو چلی ہے اور وہ آج کل کے دلائل اور سائنس کے سامنے ٹھہر نہیں پا رہا ہے۔ مذہب کی ضرورت ہو یا نہ ہو لیکن انسان کے لیے ایسے آدرش میں اٹوٹ اعتقاد رکھنا ضروری ہے جس سے زندگی کا لطف حاصل ہوتا رہے اور جو ہمیں آپس میں جوڑے رکھے۔ انسان کو زندگی کی روزمرہ کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اس سے بھی بڑے کسی مقصد کو سامنے رکھنے کی اشد ضرورت ہے"۔

نہرو نے سائنس اور مذہب کے درمیان ٹکراؤ کے بارے میں بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ اپنی بیٹی اندرا کے نام جیل سے لکھے گئے ایک خط میں نہرو نے مشہور سائنسداں گیورڈانو برونو کا تذکرہ کیا ہے جنھیں روم میں چرچ کے عہدیداروں نے زندہ جلا دیا تھا۔ ایک اور سائنسداں گیلیلیو کو بھی مذہبی جنونیوں کے عتاب کا نشانہ بننا پڑا تھا کیونکہ اس سائنسداں کا کہنا تھا کہ زمین سورج کے اردگرد گھومتی ہے۔ یہ خیال مقدس بائبل کے اس قول کے خلاف تھا کہ سورج زمین کے اردگرد گھومتا ہے۔ اس طرح سائنسی نقطۂ نظر اور مذہبی نقطۂ نظر میں ٹکراؤ شروع ہوا تھا۔

اس سلسلے میں نہرو نے الٰہ آباد میں سائنس اکادمی کے سالانہ جلسے میں کہا تھا کہ "آج سب سے بڑا ٹکراؤ سائنسی طریقے اور

غیر سائنسی طریقے کے درمیان ہے۔ سائنس کے ابتدائی دنوں میں مذہب اور سائنس کے درمیان ٹکراؤ کا بہت ذکر کیا جاتا تھا۔ لیکن اب جب کہ سائنس نے کائنات کی تحقیق شروع کر دی ہے اور یہ ٹھوس مادے کو ہوا میں تبدیل کرنے لگا ہے یہ ٹکراؤ حقیقی نہیں لگتا ہے۔ تاہم یہ ٹکراؤ حقیقی تھا کیونکہ یہ مذہب کے تھوپے ہوئے ذہنی استبداد اور سائنسی طریقے کے پروردہ انسان کی آزاد روح کے درمیان تھا۔ سائنس دماغ کی کھڑکیوں کو بند کرنے کے عمل کو قبول نہیں کر سکتا ہے۔ ایک حقیقی سائنسداں تو ایک سچے عارف کی طرح ہے جو اپنے عمل کے نتیجے سے بے پرواہو کر سچائی کی کھوج کرتا ہے۔ اگر مذہب اور سائنس میں ٹکراؤ ہے تو مذہب کو اپنے مسائل سائنسی اسپرٹ کے ساتھ حل کرنے ہوں گے۔"

مذہبی طریقۂ کار کا تجزیہ کرتے ہوئے نہرو کہتے ہیں کہ "مذہب کا طریقہ سائنسی طریقے سے بالکل مختلف ہے۔ بنیادی طور پر اس کا تعلق ان میدانوں سے ہے جو معروضی تحقیق کی حدود سے باہر ہیں۔ مذہب جذبات اور وجدان پر انحصار کرتا ہے۔ اور اس کے بعد یہ اس طریقے کو زندگی کی ہر چیز میں یہاں تک کہ ان چیزوں میں بھی استعمال کرتا ہے جو ذہنی تحقیق اور مشاہدے کے دائرے میں آتی ہیں۔ منظم مذہب کا اکثر روحانی باتوں کے مقابلے میں خود غرضانہ مفادات سے زیادہ تعلق ہوتا ہے اور یہ ایک ایسے مزاج کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جو سائنسی مزاج کی ضد ہوتا ہے۔ اس سے تنگ نظری، عدم رواداری، اندھے اعتقادات اور جذبات پیدا ہوتے ہیں۔"

اس سلسلے میں نہرو نے مزید لکھا ہے کہ "جیسے جیسے علم میں اضافہ ہوتا ہے مذہب کا اس لفظ کے محدود معنی میں میدان سکڑتا جاتا ہے۔ ہم زندگی اور فطرت کو جتنا زیادہ سمجھتے ہیں اُتنے ہی کم ماورائے فطرت اسباب کو تلاش کرتے ہیں۔ زراعت ہمارا کھانا، ہمارے پہننے کے کپڑے ہمارے سماجی تعلقات یہ سب چیزیں کبھی مذہب کے دائرے میں آتی تھیں لیکن اب ان پر مذہب کی گرفت کمزور ہوتی جا رہی ہے اور یہ سائنسی مطالعات کا موضوع بنتی جا رہی ہیں۔"

اس عظیم سائنسی مفکر نے تاریخ اور ملک کے شاندار ماضی کو بھی سائنسی نقطۂ نظر سے دیکھا۔ اپنی کتاب "تلاش ہند" میں نہرو نے تاریخی حالات وواقعات کا معروضی طور پر تجزیہ کیا۔ انھیں ماضی پر فخر ہے لیکن وہ ماضی پرست نہیں ہیں۔ اس سیاق وسباق میں ان کا یہ قول انتہائی اہم ہے کہ "ہندستان کو اپنے ماضی سے اس قدر ناتا ضرور توڑنا چاہیے کہ ماضی حال پر حاوی نہ ہو پائے۔"

نہرو کے سائنسی مزاج نے ان کے خیالات میں اعتدال اور توازن پیدا کیا۔ اس عظیم مدبر اور مفکر کے خیال میں ہندستان کو درپیش مسائل تنہا سائنسداں یا تنہا سیاستداں حل نہیں کر سکتے کیونکہ سائنسدانوں کے پاس اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اقتدار و اختیار نہیں ہے اور سیاستدانو کے پاس ماہرانہ علم اور بصارت نہیں ہے لہٰذا ان مسائل کو دونوں کے تعاون سے حل کیا جا سکتا ہے۔

جدید ہندوستان کے معمار اس سائنسی مفکر نے ملک کی سماجی، معاشی سیاسی ترقی کے لیے سائنسی بنیاد رکھی تھی نہرو نے سائنس کی تعلیم اور سائنسی تحقیق کے میں اہم رول ادا کیا۔ انھوں نے ہندوستان کی اور تعمیری روایات کو برقرار رکھنے کی حمایت کرتے ہوئے مذہبی، لسانی، علاقائی اور نسلی تعصب اور قدامت پرست طاقتوں کی جو ملک ترقی اور جدید کاری میں رکاوٹ ڈال رہی تھی سختی سے مخالفت کی۔ ہندوستان آج سائنسی اور صنعتی لحاظ سے نہ صرف ایشیا بلکہ دنیا کی طاقتوں میں سے ایک ہے اور اس کا یقیناً نہرو کے سائنسی مزاج، منصوبہ بندی اور سائنسی نقطۂ نظر کے سر ہے۔

سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں ہونے والی ترقیات نے ہندوستان کو ترقی پذیر ممالک میں ایک ممتاز مقام پر پہنچا دیا ہے۔ سائنس کے کئی اہم میدانوں میں ہماری پیش رفت ہم کو ترقی یافتہ ممالک کے شانہ بشانہ لے آئی ہے۔ نیوکلیائی توانائی کا میدان ہو یا خلائی پروازیں، قطب کا سر کرنا ہو یا سمندری تحقیقات، بایو ٹکنالوجی کا استعمال ہو یا الیکٹرانکس کا، اہم ہر سائنسی محاذ پر قابلِ قدر فتوحات سے ہمکنار ہوئے ہیں۔ ہماری یہ سائنسی ترقی کسی اتفاقی حادثے کا نتیجہ نہیں ہے۔ آج جس پھل دار درخت سے ہم فیضیاب ہو رہے ہیں اس کا بیج آج سے پچاس سال قبل بویا گیا تھا اور ان تمام برسوں میں اس کی دل و جان سے آبیاری کی گئی ہے۔

۱۹۳۹ء میں انڈین نیشنل کانگریس نے ایک نیشنل پلاننگ کمیٹی تشکیل دی تھی جس کے چیئرمین پنڈت جواہر لال نہرو تھے۔ انھوں نے اس وقت کے اہم ہندوستانی سائنسدانوں کو مدعو کیا کہ وہ پلاننگ میں مدد کریں۔ اس کمیٹی نے ایک اہم مشورہ یہ دیا کہ صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ سائنسی تحقیق کا کام بھی پوری توجہ سے جاری رکھنا چاہیے۔ یہی وہ اندازِ فکر تھا جس نے آزادی کے بعد پالیسی کی شکل اختیار

(ڈاکٹر) محمد اسلم پرویز
ذاکر حسین کالج، اجمیری گیٹ، دہلی

نہرو اور سائنسی ترقّی

کر لی اور جب ۱۹۵۸ء میں پارلیمنٹ میں سائنس ریزولیوشن پیش ہوا تو اس میں بھی یہ بات واضح طور پر کہی گئی تھی۔

کسی بھی ملک کی ترقّی دو باتوں پر منحصر ہوتی ہے۔ اوّل یہ کہ اس کی پلاننگ اچھے ڈھنگ سے اور دور اندیشی کے ساتھ کی گئی ہو اور دوسرے یہ کہ تیّار کردہ پلانوں پر محنت اور لگن سے کام ہو سکے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ان دونوں باتوں پر بھرپور توجہ دی۔ وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالنے کے بعد انھوں نے سائنس اور ٹکنالوجی پر خصوصی توجہ دی۔ ہر قسم کے مشوروں میں سائنسدانوں کو ساتھ رکھا ان کی رائے کو مقدم مانا۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ سائنسداں صرف تجربہ گاہ تک محدود نہ رہیں بلکہ ملک کی ہمہ گیر ترقی میں پوری طرح شامل رہیں۔

انھوں نے ہر تجربہ گاہ اور تحقیقی ادارے کے سائنسدانوں سے اپنا بالواسطہ اور بڑی حد تک ذاتی تعلق بھی رکھا۔ سائنسدانوں کے سالانہ اجلاس "سائنس کانگریس" میں وہ ہمیشہ شریک ہوتے تھے اور انھیں کے زمانے سے یہ دستور چلا آرہا ہے کہ ملک کا وزیر اعظم سائنس کانگریس میں شریک ہوتا ہے اور سائنس دانوں سے خطا[ب] کرتا ہے۔ اگر بنیاد گہری اور مضبوط [ہو] تو عمارت بھی اعلیٰ اور پائیدار ہوتی [ہے۔] ایک اچھی سائنسی پالیسی اور اس [پر] ہونے والے عمل پیہم نے ہم کو سائنس کے سبھی شعبوں میں سرخرو کیا ہے۔ ذیل [میں] کچھ ان شعبہ جات کا ذکر ہے جن میں پنڈت جواہر لال نہرو نے ذاتی دلچسپی لی اور [جن] میں ہونے والی ترقّی کے بغیر ہم آزاد ہو[نے] کے باوجود بڑی طاقتوں کے غلام رہتے

زراعت

آج سے کچھ عرصہ قبل تک زراعت محض ایک پیشہ مانا جاتا تھا لیکن آج زرا[عت] ایک سائنس ایک تکنیک ہے۔ پنڈت [نہرو] نے بہت پہلے محسوس کر لیا تھا کہ ہمار[ے] ملک کا ایک بڑا علاقہ زراعت کے استعمال ہوتا ہے اور تقریباً ہمار[ے] ۷۰ فیصد عوام کا ذریعۂ معاش کھیتی باڑ[ی] ہے۔ اگر اس اہم شعبے میں قابلِ قدر پیش [رفت] نہ ہوئی تو تین چوتھائی ہندوستان پس ما[ندہ] رہ جائے گا جس کی وجہ سے طبقاتی کشمک[ش]

کو فروغ ملے گا اور ملک کی سالمیت خطرے میں پڑ جائے گی۔ ان باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے پہلے پنج سالہ پلان سے ہی زراعت پر توجہ دی گئی۔ پنڈت نہرو نے وزارت خوراک و زراعت کو خصوصی ہدایات دیں کہ تمام ملک میں اور ہر قسم کے زرعی علاقے میں تحقیقاتی مراکز قایم کیے جائیں جہاں فصلوں پر، پالتو جانوروں پر، مچھلیوں پر اور زراعت کے دیگر شعبوں پر تحقیقات ہوں۔ آزادی سے قبل ہمارے ملک میں صرف نو زرعی تحقیقاتی ادارے تھے لیکن آج ان کی تعداد ۴۵ ہے۔ ان میں سے نو اداروں میں فصلوں سے متعلق تحقیقات ہوتی ہے، پانچ میں پھلوں اور سبزیوں پر، چار میں زراعتی انجینئرنگ اور ٹکنالوجی پر، سات میں پالتو جانوروں پر، چھ میں مچھلیوں پر، دو میں زراعتی معیشت اور ایک ادارے میں زرعی انتظامات پر تحقیقات ہوتی ہیں۔ ان میں سے بیشتر ادارے یونیورسٹیوں سے بھی زیادہ بڑے ہیں اور کئی کئی ذیلی اداروں پر مشتمل ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے ملک میں چار قومی بیورو، سات ریسرچ مراکز اور ۸۱ زراعتی پروجیکٹ ڈائرکٹریٹ ہیں جو مرکزی ادارے انڈین کاؤنسل آف ایگریکلچرل ریسرچ کے تحت کام کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں حکومت نے ۱۹۶۱ء سے ۱۹۸۷ء کے دوران ۲۶ ریاستی زرعی یونیورسٹیاں قایم کیں جن کی پلاننگ اور شروعات پنڈت نہرو کے زمانے میں ہی ہوئی تھی۔ ۱۹۶۰ء میں پنڈت نہرو نے ڈاکٹر کیو منگ کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی تھی جس کا کام ریاستی حکومتوں کو زراعتی یونیورسٹیاں قایم کرنے میں صلاح دینا تھا۔ متعلقہ قانون سازی کا کام بھی اس کمیٹی کے سپرد تھا۔ ان کاوشوں کی وجہ سے تیسرے پنج سالہ پلان (۶۵-۱۹۶۰ء) کے دوران مختلف ریاستوں میں سات زراعتی یونیورسٹیاں قایم کی گئیں۔ تحقیقی اداروں اور یونیورسٹیوں کے پھیلے ہوئے اس جال کی بدولت ہی آج ہم اسی کروڑ سے زیادہ عوام کو مکمل اور بھرپور خوراک مہیا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

خلا میں پیش رفت

۴ اکتوبر ۱۹۵۷ء کو روس نے اسپٹنک اول کو خلا میں بھیج کر ایک نئے دور کا آغاز کیا تھا۔ خلائی پروازوں کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے پنڈت نہرو نے ہندوستان خلائی پروگرام کی داغ بیل ڈالی۔ خلائی پالیسی کی تیاری میں ڈاکٹر وکرم سارابھائی پنڈت نہرو کے دست راست تھے۔ ان کی نگہداشت میں ترملوندرم کے نزدیک تھمبا نامی قصبے میں پہلا خلائی مرکز قایم کیا گیا اور خلائی دور کی شروعات کے محض چھ سال بعد ہی ۲۱ نومبر ۱۹۶۳ء کو تھمبا کے مقام سے ایک راکٹ فضا میں داغا گیا۔ یہ ہندستانی خلائی پروگرام کی شروعات تھی۔ بعد ازاں ۱۹۶۵ء میں ایسی جگہ خلائی سائنس و ٹکنالوجی مرکز قایم کیا گیا جہاں سے خلائی تحقیقات کی شروعات ہوئی۔ ۱۹۶۷ء میں مواصلاتی سیاروں سے متعلق ایک تحقیق اور ترقی مرکز احمد آباد میں قائم کیا گیا۔ ۱۹۷۰ء میں ڈاکٹر وکرم سارابھائی کے انتقال کے بعد تھمبا خلائی مرکز کا نام ان کے اعزاز میں وکرم سارابھائی خلائی مرکز رکھ دیا گیا۔

اگرچہ خلائی پروازیں مختلف ممالک میں مختلف وجوہات کی جاتی ہیں لیکن ہماری خلائی پالیسی کی بنیاد ملک کی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے مواصلاتی نظام اور موسمی پیش گوئی کو مستحکم کرنے کے لیے رکھی گئی تھی۔ اس کام کے لیے نہ صرف یہ کہ مصنوعی سیاروں کو تیار کرنا ہوتا ہے بلکہ ان کو خلا میں لے جانے کے لیے راکٹ سازی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں ان دونوں محاذوں پر تحقیقات شروع ہوئیں جن کے نتیجے میں آج ہم نہ صرف یہ کہ مصنوعی سیارے بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں بلکہ ان کو خلا میں لے جانے والے راکٹ بھی بنا سکتے ہیں۔ آریہ بھٹ ہمارا پہلا سیارہ تھا جو ۱۹ مارچ ۱۹۷۵ء کو کامیابی سے خلا میں پہنچایا گیا۔ اس کے بعد بھاسکر اول، روہنی، بھاسکر دوئم، میں روس اور انسیٹ سلسلے کے سیارے خلا میں بھیجے گئے۔ ان سیاروں کی مدد سے ملکی اور بین الاقوامی مواصلات کو بہت وسعت ملی ہے۔ اب ہم دور دراز کے ممالک تک آسانی سے فون پر بات کر سکتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگرام ملک کے کونے کونے تک پہنچاتے ہیں، موسم کے متعلق تفصیلی

جانکاری حاصل کرتے ہیں اور اپنے قدرتی وسائل پر بھی باریک نظر رکھتے ہیں۔

سمندری تحقیقات

بنیادی طور پر سائنسی تحقیقات دو قسم کی ہوتی ہیں۔ بنیادی قسم کی تحقیقات ہم کو سائنس کے اصولوں اور قوانین کو سمجھنے میں مدد کرتی ہیں جب کہ دوسری قسم کی تحقیقات وہ ہوتی ہیں جو بالواسطہ ہماری ضروریات سے جڑی ہوتی ہیں اور جن کی مدد سے ہم اپنی ضرورت کی مختلف چیزیں تیار کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر شعاعوں سے متعلق تحقیقات کے نتیجے میں اتفاقیہ طور پر ایکسرے (ایک قسم کی شعاع) دریافت ہوئی۔ یہ تحقیق پہلے زمرے میں آتی ہے۔ بعد ازاں ایکس ریز کو مختلف کاموں میں استعمال کرنے کے لیے طرح طرح کی مشینیں بنائی گئیں جن کی مدد سے ایکس ریز کو اسپتالوں سے لے کر کسٹم محکمے تک استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ تحقیقات دوسرے زمرے میں آتی ہیں۔ پنڈت نہرو نے ملک میں دونوں قسم کی تحقیقات کی حوصلہ افزائی کی ہر قسم کی سائنسی تحقیقات کی سرپرستی کرنے اور ان کے درمیان رابطہ قایم رکھنے کی غرض سے انھوں نے کاونسل آف سائینٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (سی ایس آئی آر) قایم کی۔ اس ادارے کی سرپرستی میں تمام ملک میں تحقیقی تجربہ گاہیں قایم کی گئیں۔ ۱۹۵۰ء میں دہلی میں نیشنل فزیکل لیباریٹری پونا میں نیشنل کیمکل لیباریٹری اور میسور میں سنٹرل فوڈ ٹکنالوجیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں آیا۔ آج اس ادارے کی سرپرستی میں ۳۰ بڑی تجربہ گاہیں کام کر رہی ہیں اور اسی وجہ سے سی ایس آئی آر کا شمار دنیا کے ان چند عظیم اداروں میں ہوتا ہے جہاں اتنے بڑے پیمانے پر تحقیقی کام چل رہا ہو۔

سی ایس آئی آر کو فروغ دینے میں پنڈت نہرو نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ وہ بذاتِ خود اس ادارے کے صدر تھے۔ ۲۳ مارچ ۱۹۶۴ء کو انھوں نے بطور صدر سمندری تحقیقات سے متعلق ایک تجربہ گاہ کی تجویز کو منظوری دی اور اسی کی رو سے یکم جنوری ۱۹۶۶ء کو نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوشنوگرافی کا قیام عمل میں آیا۔ اس تحقیقی ادارے میں سمندری سائنس کے سبھی اہم پہلوؤں پر ریسرچ ہوتی ہے۔ اس وقت تمام عالم میں ہونے والی سمندری تحقیقات کا رُخ سمندری کان کنی کی طرف ہے۔ سمندر کی تہہ میں پائے جانے والے معدنیات کے ذخائر پر سب کی نظر ہے۔ تاہم سمندر کی تہہ سے ان قدرتی خزانوں کو نکالنا آسان بھی نہیں ہے۔ دنیا کے چند ممالک ایسے ہیں جو اس کان کنی کی ٹکنالوجی رکھتے ہیں اور ہمارا ملک بھی ان میں سے ایک ہے۔

پوشیدہ خزانوں کی دریافت

سمندر کی تہہ میں چھپے معدنیات کے ذخائر تو فی الحال کان کنی کے منتظر ہی ہیں لیکن زمین کے سینے میں دفن معدنیات کسی بھی ملک کی معیشت میں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ نئے نئے معدنیات
تلاش اور ان کو قابل استعمال شکل
لانے کے لیے کافی جدید ٹکنالوجی در
ہوتی ہے۔ جیولوجیکل سروے آف انڈ
سنٹرل مائننگ ریسرچ اسٹیشن اور دیگر
اداروں کی سرگرمیوں نے ہم کو کان کنی
میدان میں خود کفیل کر دیا ہے۔ ۱۹۴۷
جب ملک آزاد ہوا تو ہمارے ملک
صرف ۲۲ اقسام کی معدنیات نکالی جاتی تھی
جن کی قیمت لگ بھگ ۴۶ کروڑ۔ ۱۹۰ کرو
تھی لیکن ۱۹۶۰ء کے اواخر میں ہم ۵۲ اق
کی معدنیات کی کان کنی کر رہے تھے جن
مجموعی قیمت تقریباً ۵ ارب ۲۴ کروڑ رو
تھی۔ آج ہم ہر قسم کی کان کنی کرنے کی صلاح
رکھتے ہیں اور ہماری اس صلاحیت
بین الاقوامی سطح پر تسلیم کیا گیا ہے جس
واضح ترین ثبوت یہ ہے کہ ہمارے آلا
معلومات اور ماہرین کی باہر کے ممالک
مانگ بڑھ رہی ہے۔ کئی ممالک میں ہمار
ماہرین کان کنی کرا رہے ہیں جب کہ کچھ او
ممالک میں ہمارے تیار کردہ آلات استعما
ہو رہے ہیں۔

ایٹمی توانائی کا حصول

ایٹم کے قلب میں واقع نیوکلین
توڑ کر اس کے اندر پوشیدہ توانائی
حاصل کرنے کے لیے ہم کو کسی ترقی یافتہ ملک
کی قطعاً مدد درکار نہیں ہے۔ اس ایٹمی نیوکلیا
توانائی سے ہم بجلی بھی بناتے ہیں اس

زراعت کے میدان میں بھی استعمال کرتے ہیں، اس کی مدد سے مریضوں کا علاج بھی ہوتا ہے اور مزید تحقیقی کام بھی جاری ہیں۔ نیوکلیائی تکنالوجی کے حصول کا یہ پُرپیچ سفر ہم نے تنہا ہی طے کیا ہے۔ کسی بھی ترقی یافتہ ملک کو یہ پسند نہیں تھا کہ نیوکلیائی توانائی پر اس کی اجارہ داری ختم ہو۔ یہ ایسی ٹکنالوجی تھی جس کو دینے کے لیے کوئی تیار نہیں تھا بلکہ اس کام میں رکاوٹ ڈالنے میں سب پیش پیش تھے۔ ایسے ماحول میں اگر ہمارے پاس اپنی سوجھ بوجھ یا اپنے سائنسداں نہ ہوتے تو آج بہت سے ممالک کی طرح ہم بھی کاسۂ گدائگری لیے ترقی یافتہ ممالک کے دروازے پر کھڑے ایٹمی بھٹیاں مانگ رہے ہوتے۔ قابل ستائش ہیں پنڈت نہرو اور ان کی دور اندیشی کہ آج سے ۳۵ سال قبل انھوں نے یہ بھانپ لیا کہ اگر اس اہم میدان میں ابھی سے خاطر خواہ پیش رفت نہ ہوئی تو آنے والا کل ہم کو ایک نئے قسم کی غلامی سے متعارف کرائے گا۔

۱۹۵۴ء میں پنڈت جی نے ایٹمی توانائی کا شعبہ قایم کرکے اس کو وزارت کا درجہ دیا اور اس کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں رکھی۔ ایٹمی توانائی کے اس شعبے کی سکریٹری شپ کے لیے ان کی نگاہِ انتخاب ڈاکٹر ہومی بھابھا پر پڑی۔ کام کی رفتار کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارا پہلا تحقیقی ری ایکٹر (ایٹمی بھٹی) "اپسرا" ۱۹۵۶ء میں شروع ہو چکا تھا۔ اس ری ایکٹر کا ڈیزائن اور اس کی تیاری پوری طرح سے ہندوستانی سائنسدانوں کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ ۱۹۵۶ء میں جب "اپسرا" نے کام کرنا شروع کیا تھا اس وقت دنیا میں صرف پانچ ممالک ایسے تھے جو اپنے آپ ایٹمی ری ایکٹر بنانے کی صلاحیت رکھتے تھے اور ہمارا ملک ان میں سے ایک تھا۔ آج ہم یورینیم کی کان کنی سے لے کر ایندھن کی تیاری، ری ایکٹر سازی اور ایندھن کے دوبارہ استعمال کی تمام تکنیکوں میں مہارت حاصل کر چکے ہیں۔ تاراپور، راناپرتاپ ساگر، کلپکم اور نرورا کے ری ایکٹر ہماری اس مہارت کی منہ بولتی تصویر ہیں۔

پنڈت نہرو نے جب وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ سنبھالا تھا اس وقت یورپ میں سائنس کی صبح طلوع ہو چکی تھی۔ انھوں نے اس نئے انقلاب کی دھمک سن لی تھی اور اپنے ملک میں اس کی آمد کا بگل بجا دیا تھا۔ آج محسوس ہوتا ہے کہ اگر اس وقت مناسب سائنس پالیسی مرتب نہ کی جاتی اور سائنس اور تکنالوجی پر خاطر خواہ توجہ نہ دی جاتی تو آج ہم وہاں نہ ہوتے جہاں ہیں یعنی دنیا کے تیسرے سائنسی اور تکنیکی قوت رکھنے والے ملک کے بجائے ترقی یافتہ ممالک کے زیرِ منت ہوتے۔ اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کو خوراک مہیا کرنے کے لیے ہم کو باہر سے اناج منگانا پڑتا کبھی پی ایل ۴۸۰ کے تحت تو کبھی ادھار تو کبھی بیرونی زرِ مبادلہ دے کر۔ عوام کو روزگار مہیا کرانے کے لیے باہر سے صنعتیں لانا پڑتیں، دوائیں بھی باہر سے آتیں اور کارخانوں کی مشینیں بھی۔ اس طرح ہم اپنے آپ کو ایک نئے قسم کی غلامی میں جکڑا ہوا پاتے۔ یہ سہرا پنڈت نہرو کے سر ہے کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ بلاواسطہ بیرونی تسلط سے ہم کو نجات دلائی بلکہ بالواسطہ تسلط سے بھی ہم کو بچایا۔ اس طرح دیکھا جائے تو پنڈت جی نے ہمارے لیے ایک نہیں بلکہ آزادی کی دو لڑائیاں لڑی ہیں۔ آج اس دوسری آزادی کی حفاظت بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی پہلی کی اور اگر ہم اس آزادی کو برقرار رکھ سکے، جیسی کہ پوری امید ہے، تو یہ ہی مناسب ترین خراجِ عقیدت ہوگا جو ہم اس عظیم ہستی کو پیش کر سکتے ہیں۔

●



پنڈت جواہر لال نہرو اور سنیما

پنڈت جواہر لال نہرو ہندوستان کے کروڑوں دلوں کے بے تاج بادشاہ ہی نہیں بلکہ جدید ہندوستان کے عظیم ترین معماروں میں سے بھی ایک تھے۔ انھوں نے یہاں کے عوام کے سماجی شعور کو بیدار کرنے کی سر توڑ کوشش کی، اور سنیما کو انھوں نے شعور کی بیداری کا ایک لازمی جزو قرار دیا۔ اگرچہ وہ فلمیں بہت کم دیکھا کرتے تھے، لیکن جو بھی فلم دیکھتے اُسے نہایت توجہ اور انتہائی دلچسپی کے ساتھ دیکھتے تھے۔ دنیا کے اس مقبول ترین ذریعۂ اظہار کے تئیں انھوں نے کبھی اپنی آنکھیں بند نہیں رکھیں، بلکہ اس کی اہمیت اور افادیت ہر قدم پر محسوس کی۔

سنیما کے تئیں ان کا نقطۂ نظر واضح ہی نہیں بڑا وسیع اور فراخ بھی تھا۔

۱۹۵۲ء میں جب بمبئی میں پہلا بین الاقوامی فلمی میلہ منعقد ہوا تو انھوں نے اس موقعے پر یہ فرمایا:

" فلموں کا کام ہے دیواریں توڑنا انسان اور انسان کے درمیان کی دیوار، مذہب اور مذہب کے درمیان کی دیوار، کالے اور گورے کے بیچ کی دیوار، قوم اور قوم کے درمیان کی دیوار۔"

۱۹۵۵ء میں نئی دہلی میں سنگیت ناٹک اکاڈمی کے زیرِ اہتمام سنیما پر ایک سیمینار منعقد کیا گیا۔ اس سیمینار کی کارروائی ۳۰ کے دہے کی ممتاز فلمی شخصیت اور اپنے دور کی ممتاز فلم ساز اداکارہ دیویکا رانی کے ذریعے عمل میں آئی۔ اس سیمینار کی صدارت نیو تھیٹرز کے بانی فلم ساز بی۔ این۔ سرکار نے انجام دی تھی۔ اس سیمینار سے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی خطاب کیا تھا۔ انھوں نے اس موقعے پر فلم کو دورِ جدید کی سب سے بڑی چیزوں میں سے ایک قرار دیا تھا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ اس ملک کے عوام کے رجحانات کو ایک سانچے میں ڈھالنے اور ان کے شعور کو اجالنے اور نکھارنے کے لیے سنیما، اخبارات اور رسائل دونوں کی نسبت زیادہ مؤثر ثابت ہوا ہے۔

۱۹۶۱ء میں جب نئی دہلی میں دوسرا بین الاقوامی فلمی میلہ منعقد ہوا تو پنڈت نہرو نے ملکی اور غیر ملکی ڈیلی گیٹوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"ہر ایک نقطۂ نظر سے فلموں کی اہمیت مقدم ہے۔ اس لیے نہیں کہ فلم تفریح کا ایک ذریعہ ہے، جو فلموں کا بنیادی مقصد ہے۔ بلکہ اس لیے کہ تعلیم و تربیت کے لیے فلموں سے بڑھ کر طاقت ور ذریعۂ اظہار اور کوئی نہیں، تفریح کے ساتھ ساتھ عوام کے شعور کو بیدار کرنا فلموں کی سب سے بڑی ذمّے داری ہے، فلموں کے ذریعے حقائق سے پردے ہٹائیے۔ فلاح کا جذبہ نمایاں کیجیے اور عوام کی جمالیاتی حس کو بیدار کیجیے۔ یعنی ستیم۔ شیوم۔ سُندرم کے مقولے کو حقیقی طور پر نمایاں کرنے میں فلمیں ایک بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔"

پنڈت نہرو فلموں کے معیار کو بلند کرنے پر ہمیشہ زور دیتے رہے، اور اس میدان میں خدمات انجام دینے والے فنکاروں کی کوششوں کی وہ ہمیشہ قدر کرتے رہے۔ ۱۹۶۳ء میں بمبئی میں ہندوستانی سنیما کی گولڈن جوبلی منائی گئی تھی۔ پنڈت جی نے اس نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے جن خیالات کا اظہار کیا۔ اُن سے اُن کے جذبے کی صداقت بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے۔ کسی فلمی تقریب میں نہرو جی کی یہ آخری شرکت تھی جس میں انھوں نے ہندوستانی سنیما کے عظیم فنکاروں کو یوں یاد کیا:

" ہندوستانی سنیما کی ۵۰ ویں سالگرہ بہت معنی رکھتی ہے۔ جن مہان کلاکاروں نے اپنی انتھک محنت سے ہندوستانی فلموں کی شروعات کی ان سورگ باسی ہستیوں کو

پریم پال اشک
III/B، 44-A، دلشاد گارڈن، دہلی ۱۱۰۰۹۵

شردھا نجلی پیش کرنے کے لیے میں یہاں آیا ہوں۔ اس صاف ستھری تقریب میں شرکت میرے لیے فخر کی بات ہے۔"

پنڈت نہرو کی ایک خاص خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اپنے دل کی کوئی بات چھپاتے نہ تھے بلکہ اس کا اظہار کھلے بندوں بے خوف و خطر کر دیتے تھے۔ اس کے ساتھ یہاں یہ واضح کر دینا بھی مناسب ہوگا کہ ان کے نظریات صحیح معنوں میں تعمیری تھے۔

فلموں کے معیار کے متعلق انھوں نے اس تقریر میں فرمایا "ہمارے فلم سازوں میں بدیشی خیالات کو نقل کرنے کی بہت بُری عادت ہے یہ بڑی شرم کی بات ہے۔ کیا ہمارے یہاں کہانیوں کا قحط پڑا ہے؟ اس مقام کو ہی لے لیجیے جہاں سے میں بول رہا ہوں۔ یہاں آزادی کی کتنی ہی لڑائیاں لڑی گئی تھیں کیا اس کے پس منظر میں فلم بنانے کی ہمت اور صلاحیت ایک بھی فلم ساز میں نہیں ہے؟

ہمارے فلم سازوں کو ہندوستانی قصّوں کہانیوں پر مبنی فلمیں بنانی چاہئیں۔ ایسی فلمیں جو ہمارے ملک کی صحیح نمائندگی کر سکیں اور صحیح تصویر پیش کر سکیں۔ یہ تصویریں ہمارے ماضی کی یا آج کل کے ترقی کر رہے سماج کی ہوں۔ ایسی فلمیں جب بدیشوں میں جائیں تو وہ ہمارے لیے دوستی کا پیغام لائیں۔ ایسا کام کرنے سے نہ صرف انڈسٹری کا بھلا ہوگا بلکہ دیش کی بھلائی بھی اسی میں ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات اور! آپ لوگ جنتا میں خود اعتمادی پیدا کیجیے۔ نراشا اور نا اُمیدی کی جگہ اُمیدیں جگائیے۔"

پنڈت نہرو کے دل میں فنکاروں کی کتنی قدر تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ان کے فلاح و بہبود کی جانب اکثر توجہ دیتے رہتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انھیں فلم انڈسٹری سے وابستہ فنکاروں اور ٹیکنیشینوں کے معاوضے کے درمیان فرق کا بھی علم تھا۔ اس کلنک کو دھونے کے لیے انھوں نے اس موقع پر کی گئی تقریر میں مختصر لیکن انقلاب آفریں خیالات کا یوں اظہار کیا:

"ہمارے لیے کتنے شرم کی بات ہے کہ پچاس سال بعد بھی ہمارے فلم ٹیکنیشینوں کی آمدنی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جبکہ فلم اسٹاروں کی آمدنی لاکھوں تک پہنچ گئی۔ آپ کے فلمی ستاروں اور دوسرے ٹیکنیشینوں کے معاوضے میں زمین آسمان کا فرق ہے میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہ فرق آپ اس طرح کب تک رہنے دیں گے جو لوگ کیمرے کے پیچھے کام کرتے ہیں۔ یا جن کا نام بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ وہ فلمی ستاروں سے کم ضروری کام نہیں کرتے۔ پھر انھیں ان کے حقوق سے محروم کیوں رکھا جاتا ہے؟"

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے پنڈت جواہر لال نہرو وقت کی قلت کی وجہ سے فلمیں بہت کم دیکھا کرتے تھے۔ غالباً سال میں دو تین فلموں سے زیادہ دیکھنے کا موقع انھیں نہیں ملتا تھا۔ ان میں ہندوستانی فلمیں بھی ہوتی تھیں اور انگریزی بھی۔ ۱۹۳۶ء میں انھوں نے بامبے ٹاکیز کی مشہور زمانہ فلم "اچھوت کنیا" دیکھی تھی۔ اس میں دادا صاحب پھالکے اوارڈ یافتگان اشوک کمار اور دیویکا رانی نے کام کیا تھا۔ اشوک کمار نے اس فلم میں برہمن لڑکے اور دیویکا رانی نے اچھوت لڑکی کا کردار ادا کیا تھا۔ گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور اور پنڈت جواہر لال نہرو دونوں دیویکا رانی کی اداکاری سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ اور انھوں نے ان کی اداکاری کی بے حد تعریف کی تھی۔

اس کے علاوہ پنڈت جواہر لال نہرو نے چیتن آنند کی پہلی فلم "نیچا نگر" بھی دیکھی تھی۔ اس فلم کی کہانی اردو روزنامے "قومی آواز" کے سابق مدیر نامور صحافی اور ممتاز ادیب جناب حیات اللہ انصاری کے زورِ قلم کا نتیجہ تھی۔ اس فلم کو ۱۹۴۷ء میں کانز کے فلمی میلے میں اعزاز سے سرفراز کیا گیا تھا۔ کامنی کوشل اس فلم کی ہیروئن تھی۔ یہ کامنی کوشل کی پہلی فلم تھی۔ پنڈت نہرو کو یہ فلم بے حد پسند آئی تھی۔ اسی لیے یہ فلم ۱۹۴۹ء میں نئی دہلی میں منعقدہ پہلی ایشیائی کانفرنس کے ڈیلی گیٹوں کو پنڈت نہرو کے ایما پر دکھائی گئی تھی۔ اس فلم میں برطانوی حکومت کے دوران ہندوستانیوں کی زبوں حالی اور استحصال پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس فلم کی فنکارانہ حیثیت اتنی بلند تھی کہ یہ فلم برطانوی حکومت کے عتاب کا شکار نہ ہو سکی۔

پنڈت نہرو نے حکومت ہند کی طرف سے صدرِ جمہوریہ کے طلائی تمغے سے سرفراز کی جانے والی پہلی ہندی اُردو فلم "جیسے ہندی کا سنسر سرٹیفکیٹ دیا گیا تھا" کی اعزازی تقریب

میں شرکت کی اور اس فلم کی بھی انھوں نے بہت تعریف کی تھی۔

پنڈت نہرو اپنی زندگی میں فلمی دُنیا کی جن معزز شخصیتوں سے متاثر ہوئے۔ اُن میں شانتارام، محبوب خان، سہراب مودی، پرتھوی راج کپور، دیویکارانی، نرگس، دلیپ کمار راج کپور، خواجہ احمد عباس، چارلی چپلن سر لارنس اولیور، ڈیوڈ لین اور والٹ ڈزنی شامل تھے۔

پرتھوی راج کپور کو راجیہ سبھا میں لانے کا سہرا اُنھیں کے سر بندھتا ہے چارلی چپلن سے تو وہ خود ملنے گئے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے جب بھی امریکہ کا دورہ کیا ڈزنی لینڈ ضرور دیکھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو پرتھوی تھیٹرز کی جانب سے دہلی میں کھیلے گئے ڈرامے دیوار کو بھی دیکھنے آئے تھے محبوب خاں تو پنڈت نہرو کی مقناطیسی کشش کی حامل شخصیت کے گرویدہ تھے۔ وہ ان کے لائحہ عمل کے پرستار بھی تھے اور خوابوں کے عاشق بھی۔ ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء کو جب پنڈت نہرو کا انتقال ہوا تو یہ خبر سنتے ہی محبوب خاں پر بھی دل کا دورہ پڑا اور آنِ واحد میں وہ بھی اسی روز اللہ کو پیارے ہوگئے۔

پنڈت نہرو بچوں میں بے حد ہردلعزیز تھے اور بچے بھی انھیں پیار سے چاچا نہرو کہا کرتے تھے وہ بچوں کو قوم کا انمول اثاثہ تصور کرتے تھے اور انھیں قوم کے مستقبل کے معمار کہا کرتے تھے۔ بچوں میں حب الوطنی کا جذبہ نمایاں کرنے، ان میں سماجی شعور کا جذبہ بیدار کرنے اور فرض شناسی کا احساس دلانے کے لیے اُنھیں کے ایما سے ۱۹۵۵ء میں چلڈرن فلم سوسائٹی قائم کی گئی۔ اس ادارے نے اب تک ۱۰۰ سے زائد عمدہ اور معیاری فلمیں تیار کی ہیں۔ اس کی دوسری فلم "جل دیپ" نے وینس فلم فیسٹول میں پہلا انعام حاصل کیا تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ اس امر کی جانب بھی توجہ دلانی ضروری ہے کہ ۱۹۵۳ء میں بچوں کی بہترین فلم پر وزیر اعظم کا طلائی تمغہ عطا کیے جانے کا فیصلہ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی تحریک پر ہی کیا گیا تھا۔ اور سب سے پہلا اعزاز پی۔ ایل۔ سنتوشی کی فلم "ہم پنچھی ایک ڈال کے" کو حاصل کرنے کا فخر نصیب ہوا۔ کئی برس تک وہ قومی فلمی اعزازات کی تقریب میں شریک ہوتے رہے تاکہ فلم سازوں اور ہدایت کاروں کو بچوں کی عمدہ فلمیں تیار کرنے کی تحریک ملتی رہے۔

حکومت نے بچوں کی بہترین فلم پر وزیر اعظم کا طلائی تمغہ دینے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا۔ اُسے بعد میں بند کر دیا گیا۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ نہرو صدی کے موقعے پر بچوں کی بہترین فیچر فلم کو نہرو گولڈ میڈل دیے جانے کا سلسلہ شروع کیا جائے تاکہ مستقبل کے معماروں کے سماجی شعور کو جلا دینے کے لیے عمدہ اور معیاری فلمیں تیار کی جاسکیں۔ یہ پنڈت نہرو کو ایک مناسب خراجِ عقیدت ہوگا۔

اس تلخ حقیقت کو کیوں کر گوارا کیا جائے کہ پنڈت نہرو جیسی عہد آفریں شخصیت پر اب تک کوئی بھی فیچر فلم نہیں آئی۔ اور نہ ہی اب تک "گاندھی" جیسی عمدہ ترین فلم بنانے والا سر ایٹن برو جیسا دیوانہ فلم ساز پیدا ہوسکا البتہ مختلف فیچر فلموں میں پنڈت نہرو کی شخصیت اور ان کے پیغامات کے ہلکے ہلکے اشارے اور تاثرات ضرور ملتے ہیں۔ سب سے پہلے ۱۹۴۶ء میں شانتارام کی فلم "ڈاکٹر کوٹنس کی امر کہانی" کی یاد آرہی ہے اس میں شولاپور کے ڈاکٹر دوارکا ناتھ کوٹنس کی حقیقی داستانِ حیات اور شخصیت کو پردۂ سیمیں پر پیش کیا گیا تھا فلم میں ڈاکٹر کوٹنس کے کردار کو نہایت عمدہ انداز سے پیش کیا گیا تھا اور اس کا کردار شانتا رام نے خود ادا کیا تھا۔ اور اس کی بیوی شانتارام کی بیوی جے شری بنی تھیں۔ اس میں ڈاکٹر کوٹنس ڈاکٹری کا امتحان پاس کر کے گھر آتا ہے لیکن راستے میں اُسے بمبئی کے آزاد میدان میں پنڈت نہرو کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ حاضرینِ جلسہ سے خطاب کر رہے ہیں۔ وہ پنڈت جی کی تقریر سننے کے لیے رُک جاتا ہے پنڈت نہرو اپنی طویل جذبات انگیز تقریر میں عالمی جنگ کی ہولناک تباہی کے ساتھ ساتھ چین میں پھیلی پلیگ کی وبا کا بھی ذکر کرتے ہیں اور ملک کے نوجوانوں کو چین جاکر وہاں کے عوام کو ڈاکٹری امداد بہم پہنچانے کی اپیل کرتے ہیں۔ اسی تقریر سے متاثر ہوکر ڈاکٹر کوٹنس چار دیگر ڈاکٹروں کی ٹیم کے ساتھ چین جاکر خدمتِ خلق کرنے کا ارادہ کر لیتے ہیں۔ تقریر کا منظر ہدایت کار نے فلیش بیک کی شکل میں پیش کیا ہے۔ یعنی جب ڈاکٹر کوٹنس کا باپ اپنے

بیٹے سے چین جانے کی وجہ دریافت کرتا ہے تو وہ جواباً اس تقریر کا حوالہ دیتا ہے ملاحظہ ہو یہ ہے کہ ڈاکٹر کوٹنس اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے وہ چین جاکر پلیگ کے مرض کا شکار ہو جاتا ہے اور وہیں اُس کی وفات ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد مجھے ۱۹۴۸ء میں بننے والی پرانی سپرہٹ فلم "شہید" کی یاد آرہی ہے جس میں دلیپ کمار، کامنی کوشل، چندرموہن لیلا چٹنس اور رام سنگھ نے کلیدی کردار ادا کیے تھے۔ اس کے ہدایت کار اور مصنّف رمیش سہگل تھے۔ اس میں دلیپ کمار ایک مجاہدِ آزادی کا کردار ادا کرتا ہے اور اس کا باپ شہر کا ڈپٹی کمشنر ہے۔ دلیپ کمار کے دل میں بچپن ہی سے حب الوطنی کا جذبہ ٹھاٹیں مار رہا ہے۔ وہ بچپن میں اپنی ماں سے کہتا ہے "ماں، میں بڑا ہو کر جواہر لال بنوں گا" لیکن بالغ ہونے پر اپنی ماں سے کہتا ہے "ماں میں جواہر لال تو نہیں بن سکا۔ ہاں دیش کی آزادی کا ایک سپاہی ضرور بن گیا ہوں" اور دلیپ واقعی دیش کی آزادی کی خاطر ہنستے ہنستے پھانسی کے تختے پر جھول جاتا ہے۔

اس کے بعد مجھے ۱۹۵۷ء میں آر۔ کے فلمز کے جھنڈے تلے تیار کی گئی فلم "اب دِلّی دُور نہیں" یاد آرہی ہے۔ اس فلم کے ہدایت کار امر کمار تھے۔ اس میں موتی لال مرحوم نے کام کیا تھا۔ کلیدی کردار رومی نامی ایک بچے نے کیا تھا۔ بن ماں کے اس بچے کے باپ کو بلا قصور جیل میں بند کر دیا جاتا ہے۔ چند لوگ بچے کو دلی جاکر اور پنڈت جواہر لال نہرو سے مل کر اپنے باپ کو جیل سے چھڑانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ بچے کے نازک دل پر اس کا گہرا اثر پڑتا ہے اور وہ بمبئی سے دلی پیدل روانہ ہو جاتا ہے راستے میں اُسے کئی مشکلات اور پریشانیوں سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ آخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ دلی آکر بچہ اپنے چاچا نہرو سے ملتا ہے وہ ایک جلسے سے خطاب کر رہے ہوتے ہیں۔ بچہ بھیڑ کو چیر کر سیدھا نہرو جی کے پاس پہنچتا ہے اور اپنی فریاد سناتا ہے۔ نہرو جی فوراً اس کا کام کرنے کا حکم دیتے ہیں اور بچے کا باپ جیل سے چھوٹ جاتا ہے۔ اگرچہ یہ راج کپور کے ادارے کی کمزور ترین فلم تھی۔ لیکن کئی اعتبار سے بہت اہم تھی۔ اس فلم میں جہاں ایک بچے کی مہم جوئی کا جذبہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہاں پنڈت نہرو کی انصاف پروری اور بچوں کے تئیں ان کی محبت پر بھی بخوبی روشنی پڑ جاتی ہے۔

اس کے بعد ۱۹۶۷ء میں مرکزی پروڈکشن کے جھنڈے تلے بننے والی فلم نونہال کا ذکر بھی ضروری ہے اس میں بلراج ساہنی اور سنجیو کمار کے علاوہ ایک ننھے بچے ببلو نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ یوں تو اس کی کہانی "اب دلی دُور نہیں" سے کافی ملتی جلتی ہے اس فلم میں بھی سنجیو کمار کو جیل میں ڈال دیا جاتا ہے اور وہ چند غنڈوں کے چنگل میں پھنس جاتا ہے۔ بچہ اپنے باپ کو جیل سے چھڑانے کے لیے اپنے چاچا نہرو سے ملنے بمبئی سے دلی جاتا ہے۔ اور کئی مصیبتیں برداشت کرنے کے بعد دلی پہنچ کر چاچا نہرو سے ملنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر جس روز وہ دلی پہنچتا ہے اس دن پنڈت نہرو سورگ باش ہو جاتے ہیں۔ وہ ان کی ارتھی کے پیچھے پیچھے چلتا ہے اور نہرو جیسا بننے کا عزم کرتا ہے۔ اس فلم کی بھی اہمیت اور افادیت مسلم ہے۔ اس میں مہم جوئی اور بچے کے عزم محکم پر روشنی پڑتی ہے جس کی عکاسی اس فلم میں کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ پنڈت نہرو پر شیام بینیگل نے روس کے اشتراک سے پوری لمبائی کی دستاویزی فلم بنائی تھی۔ یہ فلم پنڈت نہرو کی حیات اور شخصیت کا پورا احاطہ کرنے میں کامیاب رہی۔

اس کے ساتھ ہی یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ دُور درشن نے بھی پنڈت نہرو اور ان کی تخلیقات پر مشتمل چند عمدہ سیریل دکھانے کا پروگرام شروع کر رکھا ہے۔ ۵۲ حصوں پر مشتمل ایک طویل سیریل تو آج کل چل بھی رہا ہے، جو پنڈت جی کی شاہکار تصنیف "ڈسکوری آف انڈیا" پر مبنی "بھارت ایک کھوج" کے زیرِ عنوان دکھایا جا رہا ہے۔ پنڈت جی نے جس حسین اور منفرد انداز سے ہندوستان کی تاریخ لکھی ہے وہی اس سیریل میں پیش کی گئی ہے اس کے ہدایت کار بھی شیام بینیگل ہیں "بھارت ایک کھوج" ہر اعتبار سے ایک کامیاب اور عمدہ سیریل قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کے ہر دور کو انھوں نے بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ شیام بینیگل اپنے تماشائیوں کو اس دور میں لے جاتے ہیں جس کا ذکر پنڈت

نہرو کرتے ہیں۔ اس میں کلیدی کردار اوم پوری نے ادا کیے ہیں جس کی اداکاری کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ ۱۳ حصوں پر مشتمل ایک کارٹون سیریل پنڈت نہرو کی شہرۂ آفاق تصنیف GLIMPSES OF WORLD HISTORY بھی "باپ کے خط بیٹی کے نام" کے زیرِ عنوان شروع کی گئی ہے۔

آخر میں ایک اور ٹی۔وی۔سیریل کی جانب توجہ دلانی نہایت ضروری ہے۔ وہ ہے ری ممبرنگ نہرو REMEMBERING NEHRU اس سیریل کی سب سے بڑی فنکارانہ خوبی یہ ہے کہ اس میں نہرو جی کی شخصیت کو براہِ راست پیش کرنے کے بجائے ان کے معاصرین کے علاوہ اُن کے اسٹاف کے اراکین اور پارلیمنٹ کے ممبروں کے انٹرویو اور بیانات کے ذریعے پنڈت نہرو کی شخصیت کو مؤثر ڈھنگ سے اُبھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس سے ان کے کردار کے تمام گوشے بخوبی نمایاں ہو جاتے ہیں۔

اب ایک اور پہلو پر روشنی ڈالی جانی ضروری ہے کہ پنڈت نہرو کے کردار کن کن اداکاروں نے کن فلموں میں اور کس انداز سے پیش کیے۔ ۱۹۶۶ء میں ہیمن گپتا کی ایک دلچسپ اور عمدہ فلم نیتا جی سبھاش چندر بوس آئی تھی۔ اس کے علاوہ گاندھی جی پر ایک دو دستاویزی فلمیں آئیں۔ اور وٹھل بھائی جھاوری نے پوری لمبائی کی دستاویزی فلم 'مہاتما' بنائی تھی۔ ان سب میں نہرو کا رول سدرشن سیٹھ ہی نے ادا کیا تھا۔ لیکن وہ اس کردار میں اتنے کامیاب نہیں رہے جتنی اُن سے توقع تھی۔ ان کی اداکاری میں تصنع کا پہلو بھی نمایاں تھا۔ سدرشن سیٹھ کے پردے سے ہٹ جانے کے بعد ایک اور شخص کا انتخاب نہرو کے کردار کے لیے عمل میں آیا۔ اس کا نام ہے روشن سیٹھ۔ اُنھیں تلاش کرکے پردۂ سیمیں پر پیش کرنے کا سہرا فلم "گاندھی" کے خالق سر رچرڈ ایٹن برو کے سر بندھتا ہے۔ شیام بینیگل نے انھیں اپنے طویل ٹی۔وی۔سیریل "بھارت ایک کھوج" میں نہرو جی کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان فلموں میں روشن سیٹھ نے کمال کی اداکاری کی ہے۔ ان کے ایک ایک ایکشن چال ڈھال اور گفتگو کے انداز سے نہرو جی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ روشن سیٹھ سے بہتر نہرو کا کردار اب تک اور کسی نے ادا نہیں کیا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ روشن سیٹھ نے اپنی ایک ایک اَدا سے نہرو جی کو زندہ کر دیا ہے۔ خاص طور پر لانگ شاٹ میں تو وہ بالکل نہرو نظر آتے ہیں۔

اب چلتے چلتے ایک اور پہلو پر بھی گفتگو ہو جائے نہرو کی شخصیت کو نمایاں کرنے والے گیت کن کن فلموں میں آئے ہیں اور وہ شعرا کون تھے۔ یوں تو ساحر، نیرج، مجروح، شکیل بھرت ویاس اور اختر جلال آبادی کے علاوہ گلشن باورا نے بھی کئی فلموں میں ضمنی طور پر یا بطور قافیہ نہرو یا جواہر لال الفاظ کو استعمال کیا ہے۔ ان میں "جوہر محمود ان گوا" "دیدی" "اُپکار" "پورب پچھم" جیسی فلمیں شامل ہیں۔ لیکن نہرو جی کی پوری شخصیت ان کے کردار اور لائحہ عمل کو نمایاں کرنے والے تین گیت خصوصیت سے اہم اور توجہ طلب ہیں۔ سب سے پہلے ہم فلم "آدھی روٹی" کا ایک گیت پیش کریں گے۔ جس کے بول ہیں:

جو کچھ بھی مانگیں، ہم کو ملے
پورے ہوں گے ہمارے سوال
ہمارا چاچا جواہر لال

اس گیت میں بھرت ویاس نے پنڈت نہرو کی بچوں سے محبت اور بچوں کے دلوں میں اپنے چاچا نہرو کے لیے پیار اور عقیدت کے جذبے کو نہایت صدق دلی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ گیت سُن کر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا چاچا نہرو اپنے پیارے بچوں کو دلّی آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اور بچے بھی بس دلّی جانے کو تیار ہی ہیں۔ اس کے موسیقار اوناش ویاس ہیں۔

اس کے بعد فلم "آج کل" کا یہ گیت بے حد مقبول ہوا۔ اس کے خالق ساحر اور موسیقار روی ہیں۔

بھارت کے نوجوانو
آزادی کے دیوانو
دیش کے کونے کونے میں
پہنچا دو یہ پیغام
آرام ہے حرام

۱۹۵۷ء میں نہرو جی نے قوم کو ایک نعرہ دیا تھا "آرام حرام ہے" نہرو جی کے اس پیغام کو عوام تک اور خاص طور پر بچوں تک پہنچانے میں اس گیت نے اہم کردار ادا کیا ہے جن بچوں کو آرام حرام ہے کے معنی تک نہیں آتے تھے وہ بھی اس گیت کے ذریعے محنت کی عظمت کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں۔

آخر میں ایک ایسی فلم کے گیت کا ذکر کیا

جائے گا کہ جس کے بغیر یہ تذکرہ نامکمل محسوس ہوگا۔ فلم ہے نونہال۔ اس گیت کے خالق شاعر کیفی اعظمی ہیں اور موسیقار مدن موہن ہیں۔

گیت ہے :

میری آواز سنو
پیار کا راز سنو میری آواز سنو
میں نے اِک پھول جو سینے پہ سجا رکھا ہے
اس کے پردے میں تمھیں دل میں چھپا رکھا ہے
تھا جدا سب سے مرے عشق کا انداز سنو
میری آواز سنو

اس گیت کے گلوکار محمد رفیع ہیں۔ گیت کیا ہے نہرو جی کی شخصیت کا ایک ایک پہلو اُبھر کر سامنے آجاتا ہے۔ اس کی دھن بھی بے پناہ اچھی ہے اور رفیع نے اسے گایا بھی نہایت موثر اور خوبصورت انداز میں ہے۔ کیفی اعظمی کے اس گیت کو سن کر ایسا محسوس ہوتا ہے پنڈت نہرو کی روح اس میں اتر آئی ہے اور وہی خود پوری دنیا سے مخاطب ہیں۔

اس تجزیے سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ پنڈت نہرو کو سینما سے کتنا لگاؤ تھا۔ اور اس عہد آفریں شخصیت کو سمجھنے اور سمجھانے کی ہمارے فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے سینما اور ٹی۔ وی کے ذریعے کس حد تک کوشش کی۔

●

نہرو بہت جذباتی تھے۔ انھیں اپنے دوستوں، ساتھیوں اور خاندان کے لوگوں سے بہت لگاؤ تھا۔ وہ ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ پولس نے ان کی ماں پر لاٹھی چارج کیا تو وہ جیل میں تھے۔ اس پر انھیں بے حد غصہ آیا۔ اپنی آپ بیتی میں انھوں نے لکھا ہے:۔

"میری ماں کو کرسی سے نیچے گرا دیا گیا۔ ان کے سر پر لگاتار بید مارے گئے۔ سر میں ایک گہرا زخم آیا اور اس سے خون بہنے لگا۔ وہ بیہوش ہوگئیں اور سڑک پر پڑی رہیں۔ اس وقت اگر میں وہاں ہوتا تو نہ جانے کیا کر گزرتا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت میرا عدم تشدد کس حد تک باقی رہتا۔ شاید وہ زیادہ دیر تک باقی نہ رہتا۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ سبق جو میں نے بارہ برس سے زیادہ عرصے تک یاد کرنے کی کوشش کی ہے اس منظر کو دیکھ کر یاد نہ رہتا۔ یہ سوچے بغیر کہ میرے لیے اور ملک کے لیے اسکا کیا نتیجہ ہوگا میں ضرور کچھ کر گزرتا۔"

نہرو ہمیشہ خان عبدالغفار خاں کا بہت ادب کرتے تھے۔

ایک بار وہ جیل میں تھے۔ بے چینی کی حالت میں انکی آنکھ لگ گئی۔ انھوں نے ایک عجیب خواب دیکھا۔ اس خواب سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خان عبدالغفار خاں سے کتنی محبت کرتے تھے۔

اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے نہرو نے لکھا ہے:۔

"سخت گرمی کی سہ پہر تھی۔ ذرا دیر کو میری آنکھ لگ گئی۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے عجیب خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ خان عبدالغفار خاں پر چاروں طرف سے حملے ہو رہے ہیں اور میں انھیں بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میری آنکھ کھلی تو بہت تھکا ہوا سا تھا اور بہت تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ میرا تکیہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا ہوا تھا۔ مجھے اس سے حیرت ہوئی وہ یوں کہ جاگتے میں ایسا واقعہ پیش آتا تو میری آنکھوں سے آنسو نہ بہتے۔"

وہ اکثر اپنے جذبات کو دبا لیتے تھے۔ مگر تھے وہ بہت جذباتی آدمی۔ ان کے گہرے جذبات ان کی تحریروں میں جھلکتے ہیں اور ان کے خوبصورت چہرے سے بھی ظاہر ہوتے تھے۔

کھیلوں کے شائق ــــ پنڈت نہرو

پنڈت جواہرلال نہرو صرف میدانِ سیاست کے ہی نامور کھلاڑی نہیں تھے بلکہ بہ نظرِ غائر اگر ان کے کردار و شخصیت کا مطالعہ کیا جائے تو وہ جذبۂ عمل اور ذہن سے ایک سچے کھلاڑی تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انھوں نے زندگی کے ہر شعبے میں ایک کھلاڑی کی صفات کو اپنایا اور ہمیشہ ہی کھیلوں اور کھلاڑیوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا۔ انھوں نے نہ صرف نوجوانوں کو اچھا کھلاڑی بننے کی ترغیب دی بلکہ کھیلوں کی دنیا میں بھارت کو بلند مقام دلانے کی بھی کوشش کی۔

پنڈت نہرو کھیلوں کو کتنی اہمیت دیتے تھے اس کا اندازہ اُن کی ایک تقریر کے اقتباس سے بخوبی کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے ۱۹۶۰ء میں دلی میں منعقدہ قومی کھیلوں کے موقعے پر کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا:

”بھارت میں کھیلوں کے تئیں بڑھتی ہوئی دلچسپی سے مجھے بے حد مسرت ہوتی ہے۔ میں اسے بے حد اہمیت دیتا ہوں، نہ صرف جسمانی تندرستی کے لیے بلکہ نفسیاتی فوائد کے لیے بھی، جو کہ کھیلوں سے نوجوان قبول کرتے ہیں۔“

اپنی گوناگوں مصروفیات سے اُنھیں جب بھی وقت ملتا وہ کھیل دیکھنے یا کھیلوں سے متعلق تقریبات میں شرکت کرنے ضرور جاتے۔ دلی کا فیروز شاہ کوٹلہ گراؤنڈ شاہد ہے کہ وہاں کھیلا گیا شاید ہی کوئی کرکٹ ٹیسٹ میچ ایسا ہو، جو پنڈت جی نے نہ دیکھا ہو۔ شائقین میں ان کی موجودگی سے کھلاڑیوں کے حوصلے بلند ہو جاتے تھے۔ فروری ۱۹۶۴ء میں خرابیِ صحت کے باوجود پنڈت نہرو بھارت اور انگلینڈ کے درمیان، اس گراؤنڈ پر کھیلا گیا آخری ٹیسٹ میچ دیکھنے گئے۔ میدان میں آنے کے بعد وہ اپنے آئندہ پروگرام بھول جاتے تھے اور زیادہ سے زیادہ وقت کھیل دیکھنے یا کھلاڑیوں کے ساتھ رہنے کی کوشش کرتے تھے۔

پنڈت نہرو کی خود نوشت سوانح حیات اور اُن کے رفقا کے بیانات سے کھیلوں کے تئیں اُن کی دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔ بقول جی۔ کے مینن ”ان کے والد چاہتے تھے کہ وہ کرکٹ یا ٹینس کے ممتاز کھلاڑی بنیں۔ ان میں کھیلوں کو زیادہ سے زیادہ جاننے کا جذبہ دیوانگی کی حد تک تھا۔“

پنڈت نہرو کے بچپن کا دور وہ دور تھا جب بھارت میں کھیلوں کو فضول چیز سمجھا جاتا تھا لیکن شاید یہ ان کی انگلینڈ کی ابتدائی تعلیم کا اثر تھا جس نے اُنھیں ایک سچا کھلاڑی بننا سکھایا اور اور یہ بات ان کی آئندہ زندگی میں بہت کام آئی۔ اپنے والد کی خواہش کے مطابق وہ ایک اچھے کھلاڑی تو نہ بن سکے لیکن کھیلوں سے دلچسپی ہمیشہ لیتے رہے۔ اپنی سوانح حیات میں لکھتے ہیں:

”میں نے کھیلوں میں پوری طرح دلچسپی لی، گو اُن میں کوئی قابلِ ذکر کارنامہ انجام نہیں دے سکا پھر بھی مجھے یقین ہے کہ اتنا تو تسلیم ہی کیا جائے گا کہ میں نے ان سے پہلو تہی نہیں کی۔“

ان کی سوانح حیات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ تیراکی سے انھیں کتنا لگاؤ تھا۔ انھوں نے ’آنند بھون‘ کے تالاب کا تذکرہ کرتے ہوئے سر تیج بہادر سپرو کا ذکر کیا ہے جنھوں نے تیراکی کے تالاب میں ۱۵ انچ گہرے پانی سے آگے قدم رکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ مگر جہاں وہ خود کس طرح لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح انھوں نے اپنے گھوڑ سواری کے شوق کا بھی ذکر کیا ہے۔ نئی دلی میں چھٹی قومی رائفل شوٹنگ چیمپین شپ کا افتتاح کرتے ہوئے پنڈت جی نے جو شاندار نشانہ لگایا تھا، اس نے سب کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ یہ اُنھی کی ترغیب کا نتیجہ تھا کہ ارکانِ پارلیمان نے اپنا ایک رائفل کلب بنایا اور

محمد شفیق

۱۴۴۸، گلابی باغ، دہلی ۱۱۰۰۰۷

پھر چیمپین شپ کا بھی اہتمام کیا۔

پنڈت نہرو کی دلچسپی کسی ایک کھیل تک محدود نہیں تھی۔ وہ کرکٹ، فٹبال، ہاکی، رائفل شوٹنگ، کلائمبنگ اور بلیرڈ میں خاص طور پر اور دیگر کھیلوں میں عام طور پر دلچسپی لیتے تھے۔ ان کی گہری دلچسپی کے باعث ہی رانجی ٹرافی اور دلیپ ٹرافی کی طرح کرکٹ کی قومی جونیئر چیمپین شپ شروع ہو سکی۔

ایشیائی کھیل اور نہرو جی

پنڈت نہرو بھارت نیز ایشیائی اور افریقی ممالک میں کھیلوں کی دگرگوں صورتِ حال سے بخوبی واقف تھے وہ چاہتے تھے کہ ان ممالک میں کھیلوں کا معیار بلند ہو اور یہاں کے نوجوانوں کو اس شعبے میں دُنیا کے دیگر نوجوانوں کے مساوی موقعے دستیاب ہوں۔ اس کا اندازہ ان کے ان خیالات سے بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے جن کا اظہار انھوں نے ۲۹ جنوری ۱۹۵۰ء کو نئی دلّی میں نیشنل اسٹیڈیم کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے کیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا:

"اس ملک اور دنیا کے دیگر بہت سے ممالک کا المیہ یہ ہے کہ وہاں کے عوام کو یکساں موقعے میتسر نہیں ہیں۔ انسان انسان میں زبردست فرق ہوتا ہے لیکن جس معاملے میں اُنھیں یکساں ہونا چاہیے وہ ہے موقعوں کی دستیابی جو انھیں ترقی کے لیے ملنے ہی چاہئیں۔"

اسی مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے ایشیائی کھیلوں کے اہتمام کی بھی تائید کی۔ دراصل ان کھیلوں کا نام "ایشیائی کھیل" (ایشین گیمز) بھی انھی کے کہنے پر رکھا گیا تھا ورنہ پہلے ان کا نام "ایشیاٹک گیمز" (ASIATIC GAMES) رکھنے کی تجویز تھی۔ اولین ایشیائی کھیلوں کا بھارت میں انعقاد بھی انھی کی بھرپور حمایت اور تعاون کا مرہونِ منت ہے۔

کھیلوں میں تفریق کی مخالفت

پنڈت جواہر لال نہرو کھیلوں میں کسی قسم کی تفریق بھید بھاؤ یا اسے کسی ایک ملک یا خطّے کے ساتھ وابستہ کرنے کو قطعی طور پر ناپسند کرتے تھے۔ ایک بار انھوں نے کہا تھا:

"میں نہیں سمجھتا کہ کوئی کھیل بھارتی ہے یا غیر مُلکی اور کسی ایک کھیل سے وابستگی کسی قسم کی حب الوطنی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح صرف غیر ملکی کھیل کھیلنے پر بھی زور نہیں دینا چاہیے۔"

وہ کھیلوں کو میل جول، دوستی اور عوام و ممالک کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ پہلے ایشیائی کھیلوں کے کرتا دھرتا انتھونی ڈی میلو اپنی کتاب "پورٹریٹ آف انڈین اسپورٹس" (PORTRAIT OF - INDIAN SPORTS) میں رقمطراز ہیں:

"نہرو جی کا کہنا تھا کہ کھیل کے میدان سے باہر کا کوئی بھی واقعہ ایشیائی اتحاد کے فروغ کا اتنا اچھا سبب نہیں بن سکتا جتنا کہ نئی دلّی میں منعقد ہونے والے یہ کھیل ....."

پنڈت نہرو خوش گوار مقابلوں کو پسند کرتے تھے لیکن فضول رقابتوں کو ناپسند کرتے تھے۔ میلبورن (آسٹریلیا) میں منعقدہ ۱۶ویں اولمپک کھیلوں کے موقعے پر اپنے ایک پیغام میں انھوں نے کہا تھا:

"اولمپک کھیلوں کو رقابتی جذبے سے بالاتر ہونا چاہیے ... اس دوران شریک ممالک کے نمائندوں کے درمیان سخت مقابلے ہوں گے، جو ہونے بھی چاہئیں تاکہ کامیابی اور کارنامے ان کے قدم چومیں، لیکن یہ مقابلے دوستانہ ہونے چاہئیں اور تمام کھیل اور مقابلے کھیل کے جذبے کے ساتھ منعقد ہونے چاہئیں۔

مجھے امید ہے کہ بھارتی کھلاڑیوں کا دستہ اس بات کو ذہن میں رکھے گا اور نہ صرف ہمارے ملک کے وقار کو برقرار رکھے گا بلکہ ایسے دوستانہ جذبات کا اظہار کرے گا جو دیگر ممالک کو ہم سے قریب لائے۔"

کھیل سب کے لیے

وہ کھیلوں کو صرف پیسے والوں کی جاگیر نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کے خیال میں کھیلوں کی عام لوگوں تک رسائی سے ہی کھیلوں کی ترقی بہتر طور پر ہو سکتی تھی۔ اُن کی تقریر کے اس اقتباس سے ان کے ان خیالات کا پتہ چلتا ہے۔

"بھارتی عوام کی صحت اور انسانی زندگی کی سطح کو بہتر بنانا بہت اہم ہے۔ لہٰذا

نیشنل اسٹیڈیم امیروں کے لیے کھیل کا میدان نہیں ہونا چاہیے۔ بھارت کے بڑے شہروں اور قصبوں میں ایسے بڑے بڑے اسٹیڈیم بنانے کا کوئی فائدہ نہیں اگر وہ چند لوگوں کی تضیعِ اوقات کے لیے ہی مخصوص ہو کر رہ جائیں۔"

پنڈت نہرو ایسے اسٹیڈیموں کی تعمیر کے خلاف تھے جو 'کلب ہاؤسوں' سے منسلک ہوں۔ ان کا خیال تھا کہ ایسے اسٹیڈیموں سے عوام استفادہ نہیں کر پاتے اور یہ اونچے اور امیر طبقے کے افراد تک ہی محدود رہتے ہیں۔ اپنی ایک تقریر میں انھوں نے کہا تھا:

"میں نے بارہا کہا ہے کہ ہمیں مزید کلب ہاؤسوں کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ یہ کھیلوں کے فروغ کے لیے کچھ زیادہ نہیں کر پاتے بلکہ یہ کھیلوں کی ترقی و فروغ کی راہ میں حائل ہیں۔ ہم کلب ہاؤسوں کے ساتھ منسلک اسٹیڈیم بھی نہیں چاہتے بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ اُن میں عام کھلاڑی دوڑ سکے۔ وہاں جدید طرز کے سائیکل ٹریک ہوں۔ ہم اعلا درجے کا کھیلوں کا ساز و سامان اور ہر قسم کی سہولیات چاہتے ہیں۔"

پنڈت نہرو صاف ستھرے اور ایماندارانہ کھیل پر یقین رکھتے تھے۔ اس کا اندازہ صرف اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب نیشنل اسٹیڈیم میں ایک امدادی کرکٹ میچ صدر ایلیون اور وزیر اعظم ایلیون کے درمیان کھیلا جا رہا تھا تو پنڈت نہرو صرف تین ہی رنز پر آؤٹ ہو گئے۔ ایمپائر نے میچ کی نوعیت، شائقین کے ذوق اور شاید نہرو جی کے مرتبے کو دیکھتے ہوئے انھیں آؤٹ نہیں دیا لیکن وہ ایک سچے کھلاڑی کی طرح بے جھجک میدان سے واپس آ گئے۔ ان میں قائدانہ صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں جن کا استعمال انھوں نے ایسے موقعوں پر بخوبی کیا۔

نہرو جی چاہتے تھے کہ ہمارے ملک کے نوجوان کھلاڑیوں کو جدید سے جدید تر اور بہتر سے بہتر سہولیات دستیاب ہوں۔ وہ انھیں ماہر کوچوں (COACHES) سے تربیت دلانے کے بھی خواہش مند تھے۔ ایک تقریر میں آخر ان کے دل کی بات زبان پر آ ہی گئی۔

"ہم اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کی تربیت کے لیے بہترین ماہر کوچ چاہتے ہیں تاکہ ہم اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو مناسب 'موزوں' مسلسل اور باقاعدہ تربیت دے سکیں۔ ہم اس ملک میں جو کچھ بھی کرتے ہیں اس میں ہمارا مقصد بلند ترین سطح کا حصول ہونا چاہیے لیکن زیادہ تر معاملات میں ہم اس سطح سے بہت نیچے ہیں۔"

جب پہلے ایشیائی کھیلوں کے انعقاد کے لیے نئی دلّی میں نیشنل اسٹیڈیم کی تعمیر کا منصوبہ بنایا گیا تو کھیلوں کے تئیں پنڈت نہرو کی دلچسپی اور لگن کو دیکھتے ہوئے کچھ لوگوں نے اس اسٹیڈیم کو نہرو جی کے نام سے موسوم کرنے کی تجویز پیش کی لیکن پنڈت جی نے اس کی سخت مخالفت کی اور اپنی ناپسندیدگی و ناراضگی کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

"مجھے زندہ لوگوں کے نام سے کسی جگہ کو موسوم کیے جانے پر سخت اعتراض ہے۔ یہ ایک بُری عادت ہے اور اگر ایک بار آپ نے اسے پھیلنے کی اجازت دی تو ہو سکتا ہے کہ آپ چند مستحق شخصیتوں کو اعزاز بخش دیں لیکن اس سے کہیں زیادہ غیر مستحق لوگ اپنی یادگار قائم کرنے کی غرض سے اس کا ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کوشش کریں گے۔"

پنڈت جواہر لال نہرو صحیح معنوں میں کھیلوں کی شخصیت اور کھیلوں کے دلدادہ تھے۔ وہ کھیل کے جذبے کو نہ صرف سمجھتے تھے بلکہ اُس پر عمل پیرا بھی ہوتے تھے۔ ۱۹۵۱ء میں نئی دلّی میں اوّلین ایشیائی کھیلوں کے موقعے پر انھوں نے کھلاڑیوں، کھیلوں کے منتظمین اور شائقین کو جو نعرہ دیا وہ آج تک کھیلوں کے ہر مقابلے اور تقریب کی زینت بنتا رہتا ہے۔ انھوں نے کیا خوب کہا تھا:

"PLAY THE GAME IN THE SPRIT OF GAME" یعنی "کھیل کو کھیل کے جذبے سے کھیلنا چاہیے۔"

قلمکار حضرات سے گزارش

دفتر میں مضامین نثر و نظم کثیر تعداد میں جمع ہو گئے ہیں اس لیے اعلان ثانی تک اپنی نگارشات بلا طلب بھجوانے کی زحمت نہ فرمائیں۔

اُمید ہے اس گزارش کو گستاخی پر نہیں ہماری مجبوری پر محمول کیا جائے گا۔

—— ادارہ

احساس و اظهار

پیشرفت نیروی منشعب از تجربیات



راشٹرپتی جواہر لال نہرو

پنڈت جواہر لال نہرو نے نومبر ۱۹۳۷ء میں "چانکیہ" کے نام سے، جو قدیم ہندوستان کا ایک مشہور سیاست داں گزرا ہے، اپنے متعلق ایک مضمون لکھا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جواہر لال دو سال مسلسل (۱۹۳۶ اور ۱۹۳۷ء میں) کانگریس کے صدر رہ چکے تھے۔ اور یہ خیال کیا جا رہا تھا کہ تیسرے سال پھر وہی صدر بنائے جائیں گے۔ اس زمانے میں کانگریس کے صدر کو راشٹرپتی کہا جاتا تھا۔ یہ مضمون کلکتے کے انگریزی رسالے **ماڈرن ریویو** میں شائع ہوا تھا۔ اس کا پتہ بہت دنوں کے بعد چلا کہ مضمون نگار خود پنڈت جواہر لال نہرو ہیں۔ یہاں اس مضمون کا ترجمہ شائع کیا جا رہا ہے۔

"راشٹرپتی جواہر لال کی جے"۔ راشٹرپتی نے نظر اٹھائی، بیتاب مجمعے کے بیچ سے تیزی سے گزرتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر سلام کیا اور اس کا پیلا سا کرخت چہرہ مسکراہٹ سے کھل پڑا۔ یہ ایک پُرتپاک بے تکلف مسکراہٹ تھی۔ لوگوں نے اسے دیکھا اور دیکھتے ہی سب کے سب نہال ہوگئے۔

مسکراہٹ گزر گئی اور وہ چہرہ پھر سنجیدگی اور غم میں ڈوب گیا جس کی تمنا کو جذبات سے اُمنڈتے ہوئے اس طوفان میں پانا ناممکن تھا۔ ایسا لگا جیسے اس ہنسی اور مسکراہٹ کے انداز کو حقیقت سے بہت کم لگاؤ تھا اور یہ صرف مجمعے کا دل بہلانے کی چالیں تھیں ـــــ وہ مجمع جس کا محبوب وہ بن چکا تھا۔ تھا نہ ایسا ہی؟

اداکاری

اُسے پھر دیکھیے۔ ایک زبردست جلوس ہے۔ ہزارہا انسان اس کی کار کو گھیرے ہوئے ہیں اور والہانہ عقیدت میں اس کے نعرے لگا رہے ہیں۔ وہ کار کی سیٹ پر کھڑا ہے، سنبھلا ہوا سیدھا، جیسے کوئی دیوتا۔ اس کے چہرے پر لاکھوں انسانوں کی عقیدت و محبت کا بھی کوئی اثر نہیں ہے۔ یکایک پھر وہی مسکراہٹ یا ہنسی اور چہرے کا وہ تناؤ ختم ہو جاتا ہے سارا مجمع اس کے ساتھ ہنسنے لگتا ہے بغیر یہ جانے ہوئے کہ وہ کیوں ہنس رہا ہے۔ اب وہ دیوتا جیسا نہیں ہے، انسان بن گیا ہے اور ان ہزارہا انسانوں سے، جو اسے گھیرے ہوئے ہیں، قرابت کے رشتے جوڑ رہا ہے۔ مجمع خوش ہوتا ہے اور اسے اپنے دل میں بٹھا لیتا ہے۔ وہ مسکراہٹ پھر غائب ہو جاتی ہے وہ پیلا اور سنجیدہ چہرہ پھر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

یہ فطری باتیں ہیں یا مصنوعی، پہلے سے سوچ سمجھ کر اختیار کی ہوئی؟ شاید فطری بھی اور مصنوعی بھی۔ پرانی عادتیں اب اس کی فطرتِ ثانیہ بن گئی ہیں۔ سب سے زیادہ دلپذیر انداز وہ ہوتا ہے جس میں اداکاری کی سب سے کم جھلک آتی ہے اور جواہر لال نے بے پینٹ اور پاؤڈر کی اداکاری اچھی طرح سیکھ رکھی ہے۔ جب وہ پبلک اسٹیج پر آتا ہے تو اس کی ظاہرا بے پروائی میں بڑی فن کارانہ احتیاطیں بھری ہوتی ہیں۔ یہ اُسے کدھر لے جائیں گی اور ملک کو کدھر لے جائیں گی؟ اس بظاہر بے غرضی میں اس کی کیا غرض ہے؟ اس نقاب میں جو اس نے ڈال رکھی ہے کیا خواہشیں، کیا آرزوئیں اور کیسے نہ سیر ہونے والے حوصلے چھپے ہوئے ہیں؟

یہ سوالات کسی حال میں بھی خالی از دلچسپی نہیں ہیں۔ اس لیے کہ جواہر لال ایک ایسی شخصیت ہے جو انسان کو متوجہ کرنے اور دلچسپی لینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ہمارے لیے یہ سوالات خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ حال کے ہندوستان اور غالباً مستقبل کے ہندوستان سے گندھا ہوا ہے۔ اور اس میں وہ طاقت ہے جو ہندوستان کے ساتھ بڑی اچھائی یا بڑی برائی کر سکتی ہے۔ اس لیے ہمیں ان سوالات کے جوابات ضرور تلاش کرنے چاہئیں۔

اب وہ تقریباً دو سال سے کانگریس کا صدر ہے۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ کانگریس ورکنگ کمیٹی میں صرف ایک فرمانبردار رکن ہے

جیسے دوسرے لوگ دبائے یا روکے رہتے ہیں۔ پھر بھی اس کا شخصی وقار اور شخصی اثر نہ صرف عوام بلکہ ہر حلقے کے لوگوں پر استقلال واستحکام کے ساتھ بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ کسان اور مزدور سے ملتا ہے، زمیندار اور سرمایہ دار سے ملتا ہے، سود والے اور راہ گیر سے ملتا ہے، برہمن اور اچھوت سے ملتا ہے۔ مسلم، سکھ، عیسائی اور یہودی سے ملتا ہے یعنی ان سب سے ملتا ہے جو ہندوستانی زندگی میں عظیم الشان صد رنگی پیدا کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک سے کچھ مختلف زبان میں بات کرتا ہے اس لیے کہ وہ ان کو اپنا بنانا چاہتا ہے۔ اس کی توانائی، عمر کو دیکھتے ہوئے حیرت انگیز ہے۔ اس نے اس زبردست ملک کو چھان ڈالا ہے اور ہر جگہ عوام نے اس کا بہت ہی غیر معمولی خیر مقدم کیا ہے۔ دور شمال سے لے کر راس کماری تک وہ جہاں بھی گیا ہے ایک فتحمند سیزر کی طرح گزرا ہے اور اپنے پیچھے عظمت کا ایک طلسمی سلسلہ چھوڑ آیا ہے۔ کیا یہ سب محض ایک لطفِ گریزاں ہے جس سے وہ خوش ہوتا ہے یا ایک گہری سازش ہے یا ایک جذبے کی کارفرمائی ہے جس سے وہ خود بھی واقف نہیں ہے۔ کیا یہ کسی طاقت کی آرزو ہے جس کے بارے میں اس نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں لکھا ہے کہ یہ اس کو ایک ہجوم سے دوسرے ہجوم انسانی میں لے جاتی ہے اور اس کے کان میں چپکے سے کہتی ہے:

"میں نے ان انسانوں کی موجوں کو اپنی مٹھی میں بند کر لیا اور لوحِ آسمان پر اپنی مرضی ستاروں سے ثبت کر دی۔"

فاشسٹ خیال

یہ خیال بدل گیا تو کیا ہوگا؟ جواہر لال کے جیسے انسان، خواہ ان میں بڑے اور اچھے کاموں کی کتنی ہی صلاحیت ہو، جمہوریت کے لیے خطرے سے خالی نہیں ہیں۔ وہ جمہوریت اور سوشلزم کا دعویدار ہے اور یہ سچ بھی ہے لیکن ماہرین نفسیات جانتے ہیں کہ دماغ آخر کار غلام ہے دل کا اور منطق کی تعبیر ہمیشہ ایسی کی جا سکتی ہے جو انسان کی بے محابا خواہشات کے مطابق ہو۔ ایک ذرا سا بل پڑا بس جواہر لال ڈکٹیٹر بن جائے گا اور سست خرام جمہوریت کا سارا تام جھام ٹھکانے لگ جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ جمہوریت اور سوشلزم کے نعروں اور زبان کو پھر بھی کام میں لاتا رہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ فاشزم نے ان سے اپنا دامن کتنا بھر لیا ہے اور پھر اسے جھاڑ کر کیسا خالی کر دیا ہے۔

جواہر لال نہ اپنے عقیدے سے فاشسٹ ہے اور نہ اپنے مزاج سے۔ وہ اس بلا کا نفاست پسند ہے کہ فاشزم کے بھدے پن اور بھونڈے پن کو برداشت ہی نہیں کر سکتا۔ اُس کا چہرہ اور اُس کی آواز حقیقی ہیں۔ بھیڑ اور مجمع میں اس کی آواز جانی پہچانی معلوم ہوتی ہے جو ہر ایک کو گھریلو اور دو ٹوک انداز میں خطاب کرتی ہے جب کوئی اسے سُنتا ہے یا اس کے چہرے کو دیکھتا ہے تو وہ حیران رہ جاتا ہے کہ اس کی اوٹ میں کیا چیزیں ہیں؟ کیا خیالات، کیا خواہشیں، کیا اُلجھنیں، کیا جذبات ہیں جو دب دبا کر توانائی میں بدل گئے ہیں؟ کیا آرزوئیں ہیں جنھیں وہ اپنے دل سے بھی کہنے کی ہمت نہیں کرتا۔ پبلک تقریر میں نئے حالات کا سلسلہ رو کے رہتا ہے لیکن دوسرے موقعوں پر اس کے تیور غمازی کر جاتے ہیں اس لیے اس کا دماغ عجیب و غریب میدانوں میں بھٹکنے لگتا ہے۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے بھول جاتا ہے کہ اس کے اردگرد کون ہے اور اپنی ذہنی مخلوقات سے خاموش زبان میں باتیں کرنے لگتا ہے۔ کیا وہ اس سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ اپنی سخت اور طوفانی زندگی کے اس دور میں وہ کن انسانی روابط سے محروم رہ گیا ہے اور کیا اُس کے دل میں ان کی تمنائیں موجزن ہیں؟ یا وہ اپنی خواہش کے مستقبل، تصادم اور بادلِ ناخواستہ فتح کا خواب دیکھنے لگتا ہے؟ وہ خوب جانتا ہے کہ اس راستے میں جو اس نے اختیار کیا ہے ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہے اور خود فتح کا مطلب بھی اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہی ہے۔ جیسا کہ لارنس نے عربوں سے کہا تھا:

"بغاوت کے راستے میں قیام گاہیں نہیں ہوتیں۔ یہاں خوشی کا منافع نہیں تقسیم کیا جاتا ہے۔"

ہو سکتا ہے کہ مسرت اس کے حصے میں نہ ہو لیکن مسرت سے بھی ایک بڑی چیز ——— مقصدِ حیات کی تکمیل ——— اس کی ہو سکتی ہے بشرطیکہ تقدیر نے اس کا ساتھ دیا۔

جواہر لال یا سیزر

جواہر لال فاشسٹ نہیں بن سکتا۔ لیکن اس میں وہ تمام چیزیں موجود ہیں جو ایک ڈکٹیٹر کو جنم دیتی ہیں۔ غیر معمولی مقبولیت، پختہ

ادو' واضح مقصد' طاقت' غرور' تنظیمی صلاحیت'
قت' سخت گیری اور عوام سے اپنی تمام محبت
کے باوجود دوسروں کو برداشت نہ کرنا اور
زور اور نا اہلوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنا۔
س کی بد مزاجی کے مظاہرے سبھی نے دیکھے ہیں
ر جب وہ اپنے غصّے پر قابو پا لیتا ہے تب بھی اس
ہونٹوں کو چبانا اس کی اصلیت کو ظاہر کرتا ہے
س کی یہ بے پناہ خواہش کہ جو وہ کہے وہ ہو
ئے' جس چیز کو وہ ناپسند کرے وہ ہٹا دی
ئے اور اک نئی چیز بنادی جائے سست
رام جمہوریت کے ساتھ زیادہ دن نہیں چل
سکتی۔ وہ خس و خاشاک کو ساتھ رکھ سکتا ہے
لیکن اُسے اپنی مرضی پر چلا کر رہے گا۔ عام حالات
ں وہ محض ایک مستعد اور کامیاب حاکم ہوتا۔
لیکن اس انقلابی عہد میں سیزریت اس کے
روازے پر دستک دیتی رہتی ہے اور کیا یہ
ممکن نہیں ہے کہ جواہر لال اپنے کو ایک سیزر سمجھنے
لگے؟

یہیں جواہر لال کے لیے بھی خطرہ ہے اور
ہندوستان کے لیے بھی۔ اس لیے کہ ہندوستان
سیزریت کے ذریعے آزادی نہیں حاصل کرسکتا'
گو وہ وقتی طور پر ایک مہربان اور مستعد آمریت
ں کچھ پنپ سکتا ہے لیکن وہ ٹھٹھر کر رہ جائے گا
ور عوام کی نجات کا دن دور چلا جائے گا۔

دو سال سے برابر جواہر لال کانگریس کا
پریسیڈنٹ ہو رہا ہے اور اس نے اپنے کو اتنا
ناگزیر بنادیا ہے کہ بہت سے لوگ چاہتے ہیں کہ
تیسری مرتبہ بھی اسی کا انتخاب ہو۔ لیکن اس سے
بڑی دشمنی جواہر لال اور ہندوستان کے ساتھ

نہیں ہو سکتی۔ ہم اس کو تیسری مرتبہ چنیں گے تو کانگریس کی بھینٹ دے کر ایک آدمی کو آگے بڑھائیں گے اور لوگوں کو مجبور کریں گے کہ وہ سیزریت کے ڈھرے پر پھر سوچنے لگیں۔ ہم جواہر لال کی غلط صلاحیتوں کو ہوا دیں گے اور اس کے تکبّر اور غرور کو بڑھائیں گے۔ وہ مغرور ہو جائے گا' سمجھے گا کہ صرف وہی اس بار کو اُٹھا سکتا ہے اور ہندوستان کے مسائل کو حل کر سکتا ہے۔

یاد رکھیے کہ عہدے سے ظاہرا بے نیازی کے باوجود وہ پچھلے سترہ سال سے کانگریس میں اہم عہدے سنبھالتا رہا ہے۔ وہ سوچتا ہوگا کہ وہ ناگزیر ہے اور یہ سمجھنے کی کسی کو بھی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ ہندوستان کے لیے یہ بہتر نہ ہوگا کہ متواتر تیسرے سال بھی وہی کانگریس کا پریسیڈنٹ ہو۔

اسے خراب نہ کیجیے

اس کی ایک وجہ شخصی بھی ہے بہادری کی باتوں کے باوجود جواہر لال' ظاہر ہے تھک گیا ہے اور پُرانا ہو گیا ہے۔ اگر وہ پریسیڈنٹ بنتا رہا تو بتدریج گرتا ہی جائے گا۔ وہ آرام نہیں کر سکتا اس لیے کہ شیر کا سوار اُتر نہیں سکتا۔ ہم کم سے کم یہ کر سکتے ہیں کہ اس کو بھٹکنے نہ دیں اور اس پر بہت زیادہ ذمّے داریاں ڈال کر اس کی دماغی صلاحیتوں کو گرنے نہ دیں۔ ہمیں حق ہے کہ ہم اس سے مستقبل میں بہتر کاموں کی توقع کریں۔ ہمیں بہت زیادہ تعریفیں کرکے اسے خراب نہیں کرنا چاہیے۔ اس کا غرور' اگر اس میں غرور ہے تو' پہلے ہی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ اس کی روک تھام کرنا چاہیے۔ ہمیں سیزر رول کی ضرورت نہیں ہے۔

مذکورہ بالا مضمون سے ایک سال پہلے ۲۰۔ نومبر ۳۶ء کو' پنڈت جی کا ایک مضمون شائع ہوا تھا' جس میں انھوں نے لکھا تھا۔

"جب سے میرا نام دوبارہ صدارت کے لیے پیش کیا گیا ہے اس وقت سے میں اس کی فکر میں مبتلا ہوں اور بار بار اس معاملے پر غور کر رہا ہوں۔ یہ بات کچھ میرے جی کو نہیں لگتی اس لیے کہ میں یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ ایک ہی شخص بار بار ایک عہدے پر کام کرے۔"

ترجمہ: فرحت اللہ انصاری

وہ یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ لوگ ان کیلیے پھل چھیلیں یا کاٹیں۔ وہ اسے گندی عادت سمجھتے تھے۔ وہ کم کھاتے تھے اور مقررہ وقت پر کھاتے تھے نہیں یہ اچھا نہیں لگتا تھا کہ کھانے کی اہمیت سی چیزیں ایک ساتھ پیش کی جائیں۔ وہ کم خوراک تھے اور متوازن غذا کے عادی تھے۔ لذیذ کھانے نہیں پسند تھے لیکن اس کا مطلب وہ یہ نہ سمجھتے تھے کہ کھانا اچھا ہو تو زیادہ بھی کھایا جانے۔

میری کہانی

خوش حال ماں باپ کا اکلوتا بچہ (خصوصاً ہندوستان کے گھرانوں میں) کتنا ناز پیار میں بگاڑ دیا جاتا ہے اور جب گیارہ برس کی عمر تک اس کے کوئی بھائی بہن نہ ہو تو وہ بگڑنے سے بچ ہی نہیں سکتا۔ میری دونوں بہنیں مجھ سے بہت چھوٹی ہیں اور ان میں کئی کئی سال کا فرق ہے اس لیے میرا بچپن تنہائی میں گذرا اور مجھے اپنی عمر کا کوئی ساتھی نہیں ملا۔ یہاں تک کہ اسکول کے بچوں کی صحبت سے بھی محروم رہا کیونکہ مجھے کنڈر گارٹن یا کسی اور مکتب میں داخل نہیں کیا گیا، بلکہ گھر پر استانیاں اور استاد آ کر تعلیم دلاتی تھیں۔

ہمارے گھر میں تنہائی نہیں بلکہ خوب چہل پہل تھی۔ میرے رشتے کے بھائی بہن اور قریبی عزیز ملا کر بہت بڑا کنبہ تھا اور یہ سب ہندو خاندان کے دستور کے مطابق ایک ہی جگہ رہتے تھے، مگر میرے بھائی مجھ سے عمر میں بہت بڑے تھے۔ ان میں کچھ اسکول میں اور کچھ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے اور مجھے بچہ سمجھ کر اپنے کام میں اور کھیل میں شریک نہیں کرتے تھے۔ غرض میں اتنے بڑے گھرانے میں اپنے آپ کو بالکل اکیلا پاتا تھا اور زیادہ تر اپنے خیالات میں ڈوبا رہتا تھا یا اکیلے بیٹھ کر کھیلا کرتا تھا۔

ہم لوگوں کا اصلی وطن کشمیر ہے۔ اب سے کوئی دو سو برس پہلے اٹھارہویں صدی کے شروع میں ہمارے پردادا کے باپ کشمیر کی پہاڑی وادی کو چھوڑ کر دولت اور شہرت کی تلاش میں نیچے کے زرخیز میدان میں آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ فرخ سیر ہندوستان کا بادشاہ تھا۔ ہمارے بزرگ جن کا نام راج کول تھا کشمیر میں سنسکرت اور فارسی کے عالم کی حیثیت سے امتیاز رکھتے تھے۔ جب فرخ سیر کشمیر گیا تو اس کی نظر عنایت راج کول پر پڑی اور غالباً اسی کے حکم سے وہ ۱۷۱۶ء کے لگ بھگ ترکِ وطن کر کے دلی آ گئے۔ بادشاہ نے انھیں جاگیر عطا کی جس میں ایک مکان بھی تھا۔ یہ مکان نہر کے کنارے واقع تھا، جس کی وجہ سے راج کول نہرو کہلانے لگے۔ اب خاندان کا نام "کول" کی جگہ "کول نہرو" قرار پایا۔ آگے چل کر کول تو اڑ گیا اور صرف نہرو باقی رہ گیا۔

اس کے بعد جو بدامنی کا زمانہ آیا اُس میں ہمارے خاندان کو تقدیر نے بہت سے نشیب و فراز دکھائے۔ ہماری جاگیر گھٹتے گھٹتے بالکل ختم ہو گئی۔ میرے پردادا لکشمی نرائن نہرو نے "سرکار کمپنی" کی ملازمت اختیار کی اور اس کی طرف سے دلی کے برائے نام دربار میں وکیل بنا کر بھیجے گئے۔ میرے دادا گنگا دھر نہرو ۱۸۵۷ء کی شورش سے پہلے کچھ دن دلی کے کوتوال رہے تھے۔ ۱۸۶۱ء میں ۳۴ برس کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ہم لوگوں سے دلی ہمیشہ کے لیے چھوٹ گئی اور ہمارے پرانے خاندانی کاغذات اور دستاویزیں بھی اسی گڑبڑ میں تلف ہو گئیں۔ ہمارا خاندان اپنی ساری املاک کھو کر اور بہت سے لوگوں کی طرح دلی کو چھوڑ کر بھاگ رہے تھے آگرے پہنچا۔ میرے والد اس وقت تک پیدا نہیں ہوئے تھے مگر میرے دونوں چچا نوجوان تھے۔ ان کو تھوڑی بہت انگریزی بھی آتی تھی جس کی بدولت چھوٹے بھائی نے اپنے آپ کو اور اپنے خاندان والوں کو ناگہانی اور ذلت کی موت سے بچا لیا۔ وہ چند عزیزوں کے ساتھ جن میں ان کی ننھی سی بہن بھی تھی دلی سے جا رہے تھے۔ یہ لڑکی بعض کشمیری بچوں کی طرح بہت صاف رنگ کی تھی۔ رستے میں گورے ملے جنھیں شبہ ہوا کہ یہ کسی انگریز کی لڑکی ہے جسے میرے چچا چرا کر لیے جا رہے ہیں۔ اس زمانے میں سرسری تحقیقات کرنا اور پھانسی دینا یہ سارے مرحلے چند منٹ میں طے ہو جاتے تھے اور کچھ عجب نہیں تھا کہ میرے چچا اور دوسرے عزیزوں کو سب سے قریب کے درخت پر پھانسی دے دی جاتی۔ مگر خوش قسمتی سے چچا جان کی انگریزی دانی کام آ گئی اور تھوڑی سی مہلت مل گئی۔ اتنے میں کوئی شخص جو ان لوگوں سے واقف تھا ادھر سے گذرا اور اس نے انھیں رہائی دلائی۔

چند سال ہمارا خاندان آگرے میں رہا اور اسی شہر میں ۶ مئی ۱۸۶۱ء کو میرے والد پیدا ہوئے۔[1] ان کی پیدائش سے تین مہینے پہلے دادا جان کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کی ایک قلمی تصویر ہمارے یہاں اب تک موجود ہے وہ مغل دربار کا لباس پہنے ہیں اور ان کے ہاتھ میں ایک خمدار تلوار ہے۔ ان کا چہرہ مہرہ بالکل کشمیری ہے پھر بھی یہ گمان ہوتا ہے کہ کسی مغل امیر کی تصویر ہے۔ اب خاندان کی پرورش کا بوجھ میرے دونوں چچاؤں پر پڑا جو عمر میں والد سے بہت بڑے تھے۔ بڑے چچا بنسی دھر نہرو حکومت برطانیہ کے محکمۂ عدالت میں نوکر ہو کر ایک جگہ سے دوسری جگہ تبدیل ہوتے رہے اور ان کا تعلق ایک حد تک خاندان

[1] یہ عجیب اتفاق ہے کہ رابندر ناتھ ٹیگور کی ولادت بھی ۶ مئی ۱۸۶۱ء کو ہوئی۔

سے قطع ہوگیا۔ چھوٹے چچا نندلال نہرو نے ایک ہندوستانی ریاست کی ملازمت اختیار کی اور دس برس تک راجپوتانے کی ریاست کیتری میں دیوان رہے۔ اس کے بعد انھوں نے قانون سیکھا اور آگرے میں وکالت کرنے لگے۔

میرے والد نے انھیں کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے اور ان کے تعلقات میں برادرانہ الفت نے باپ بیٹے کی سی محبت کے ساتھ مل کر ایک عجیب شان پیدا کر دی تھی۔ والد اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے اس لئے ظاہر ہے کہ وہی اپنی ماں کے لاڈلے تھے۔ دادی جان اپنے ارادے کی پکی تھیں اور مجال نہ تھی کہ کوئی اُن کی بات کو ٹال دے۔ ان کی وفات کو پچاس برس ہو گئے مگر ابھی تک بوڑھی کشمیری خواتین ان کا ذکر کرتی ہیں کہ وہ بڑے طنطنے کی بی بی تھیں اور اگر کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف ہوتا آفت مچا دیتی تھیں۔

میرے چچا ہائی کورٹ میں جو نیا نیا قائم ہوا تھا، وکالت کرنے لگے اور جب وہ آگرے سے الٰہ آباد منتقل ہوا تو ہمارا خاندان بھی وہیں چلا گیا۔ اس وقت سے الٰہ آباد ہمارا وطن ہو گیا اسی شہر میں ایک مدت کے بعد میں پیدا ہوا۔ میرے چچا کا کام رفتہ رفتہ بہت بڑھ گیا اور ان کا شمار ہائی کورٹ کے چوٹی کے وکیلوں میں ہونے لگا۔ اس عرصے میں میرے والد کانپور اور الٰہ آباد میں اسکول اور کالج کی تعلیم کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ ابتدا میں انھوں نے صرف عربی فارسی پڑھی اور انگریزی کہیں بارہ چودہ برس کی عمر میں جاکر شروع کی۔ اس کم سنی میں وہ فارسی کی بہت اچھی استعداد رکھتے تھے۔ مگر اسکول اور کالج کے زمانے میں ان کی شہرت زیادہ تر ان کی شرارتوں کی وجہ سے تھی۔ وہ کوئی قابلِ تقلید طالب علم نہ تھے۔ پڑھنے لکھنے سے زیادہ انھیں کھیل کود اور من چلے پن کی حرکتوں سے دلچسپی تھی۔ کالج میں وہ فسادی لڑکوں کے سرغنہ سمجھے جاتے تھے۔ انھیں مغربی لباس اور مغربی تہذیب کا بہت شوق تھا حالانکہ اس وقت تک کلکتہ بمبئی جیسے شہروں کے سوا اور جگہ ہندوستانیوں میں ان چیزوں کا رواج بہت ہی کم تھا۔ ان کی شوخیوں کے باوجود انگریز پروفیسر ان پر مہربان تھے اور اکثر ان مشکلوں میں ان کی مدد کرتے تھے جن میں وہ اپنی شرارت کی وجہ سے پھنس جاتے تھے۔ ان میں سے ایک میور سنٹرل کالج الٰہ آباد کے پرنسپل مسٹر ہیریسن بھی تھے۔ ان کا ذکر میرے والد آخر عمر میں ہم لوگوں کے سامنے بڑی محبت سے کیا کرتے تھے اور اپنی طالب علمی کے زمانے کا ایک خط جو ان بزرگ نے انھیں لکھا تھا، انھوں نے بڑی احتیاط سے رکھ چھوڑا تھا۔

یونیورسٹی کے ابتدائی امتحانوں میں انھوں نے کوئی خاص امتیاز تو حاصل نہیں کیا مگر پاس ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ بی۔ اے کے امتحان کی نوبت آئی اس کے لیے انھوں نے بہت کم محنت کی تھی اور پہلے پرچے کے جواب جو انھوں نے دیئے ان کے خیال میں بالکل ناقابلِ اطمینان تھے۔ یہ سمجھ کر کہ پہلا پرچہ بگڑ گیا ہے۔ وہ کامیابی سے مایوس ہو گئے اور امتحان چھوڑ چھاڑ تاج محل کی سیر کرنے لگے (اُن دنوں یونیورسٹی کے امتحان آگرے میں ہوتے تھے) بعد میں ان کے پروفیسر نے انھیں بلا کر بہت ڈانٹا اور کہا کہ تمہارا پہلا پرچہ اچھا خاصا ہو گیا تھا۔ تم نے سخت حماقت کی کہ دوسرے پرچوں میں شریک نہیں ہوئے۔ بہر حال میرے والد کی یونیورسٹی کی تعلیم یہیں ختم ہو گئی۔ بی اے انھوں نے پاس نہیں کیا۔

ان کے دل میں ترقی کی اُمنگ تھی اور وہ کوئی علمی پیشہ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کی نظر قانون کے پیشے پر پڑی کیونکہ ان دنوں ہندوستان میں یہی ایک پیشہ تھا جس میں قابل آدمی کھپ سکتے تھے اور جسے اس میں کامیابی حاصل ہو جائے اس کے پو بارہ تھے۔ پھر ان کے سامنے بھائی کی مثال بھی تھی۔ چنانچہ انھوں نے ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان دیا اور اس میں اوّل نمبر پر پاس ہو کر سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ اب انھیں اپنی پسند کا کام مل گیا یا یوں کہیے کہ جو کام ایک بار اختیار کر لیا اس میں کامیابی حاصل کرنے پر تل گئے۔

انھوں نے کانپور میں ضلع کی عدالتوں میں وکالت شروع کر دی ترقی کی دُھن میں انھوں نے خوب محنت کی اور تھوڑے ہی دنوں میں ان کا کام چل نکلا۔ مگر کھیل تماشوں کے شوق کا وہی حال تھا اور اب بھی ان کا تھوڑا بہت وقت اس میں صرف ہوتا تھا۔ سب سے زیادہ دلچسپی انھیں کشتی سے تھی۔ کانپور کے دنگل اس زمانے میں مشہور تھے۔

کانپور میں تین سال کام سیکھنے کے بعد وہ الٰہ آباد آ گئے اور ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد ان کے بھائی پنڈت نندلال نہرو کا یکایک انتقال ہو گیا۔ یہ صدمہ میرے والد کے لیے بہت سخت تھا ایک طرف تو یہ غم کہ وہ پیارا بھائی جس نے بیٹے کی طرح پالا تھا جدا ہو گیا دوسری طرف یہ فکر کہ خاندان کا سردار اور سب سے زیادہ کمانے والا فرد اُٹھ گیا۔ اس دن سے ایک بہت بڑے کنبے کی پرورش کا بہت سا بوجھ اس کم عمری میں میرے والد پر پڑ گیا۔

انھوں نے دل میں ٹھان لی کہ وکالت میں کامیابی حاصل کر کے رہیں گے اور کئی مہینے تک اور سب کچھ چھوڑ کر اسی میں محو رہے۔ چچا کے قریب قریب کل مقدمے انھیں کو ملے اور چونکہ انھوں نے اس کام کو بڑی عمدگی سے انجام دیا اس لیے ان کی وکالت خوب چمکی اور وہ بات جس کی انھیں دلی تمنا تھی حاصل ہو گئی یعنی انھیں کام بھی زیادہ ملنے لگا اور آمدنی بھی بڑھ گئی۔ نوجوانی میں کامیاب وکیل ہو جانے کا خمیازہ انھیں یہ بھگتنا پڑا کہ ان کے محبوب پیشے نے جسے اپنی محبت میں شرکت گوارا نہیں ان کی ساری زندگی پر قبضہ کر لیا۔ انھیں اور کسی ذاتی یا قومی کام کا وقت ہی نہیں ملتا تھا اور چھوٹی بڑی تعطیلوں کا زمانہ بھی وکالت ہی کی نذر ہو جاتا تھا۔ انھیں دنوں نیشنل کانگرس انگریزی جاننے والے اوسط طبقے کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ میرے والد بھی اس کے بعض جلسوں میں شریک



ہوئے اور اصولی طور پر اس کے حامی بن گئے۔ مگر اس زمانے میں انھیں اس کے کام سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ ایک تو انھیں اپنے پیشے سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ دوسرے وہ سیاسی مسئلوں اور قومی کاموں میں کچھ دخل بھی نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے ابھی تک ان چیزوں کی طرف توجہ نہیں کی تھی اور ان سے بالکل ناواقف تھے۔ وہ کسی ایسی تحریک یا انجمن میں شریک نہیں ہونا چاہتے تھے جس میں انھیں دوسرے کی پیروی کرنی پڑے۔ ان میں جو خودسری بچپن اور نوجوانی میں تھی، وہ بظاہر دب گئی تھی، مگر اصل میں اس نے ایک نئی یعنی طلب قوت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یہی چیز تھی جس نے انھیں ان کے پیشے میں کامیاب کیا اور ان کے دل میں خودداری اور اعتمادِ نفس کے جذبات پیدا کئے۔ انھیں لڑنے کا خصوصاً زبردست سے مقابلہ کرنے کا شوق تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس زمانے میں وہ سیاسی لڑائی کے قریب تک نہ آتے تھے۔ سچ پوچھئے تو اس وقت تک نیشنل کانگرس کی سیاست میں لڑائی کو دخل بھی نہ تھا۔ بہرحال وہ اس کوچے سے نابلد تھے اور ان کے دل میں ہر وقت اپنے کٹھن پیشے کا خیال بسا رہتا تھا۔ انھوں نے ترقی کے زینے پر مضبوطی سے قدم جما لیا تھا اور ایک ایک سیڑھی کر کے اوپر چڑھتے چلے جاتے تھے۔ انھیں اس پر فخر تھا کہ اس میں کسی کے احسان یا عنایت کو دخل نہیں بلکہ یہ خود ان کے دماغ اور ارادے کا کرشمہ ہے۔

گو وہ ایک معنی میں قوم پرست تھے مگر انگریزوں کو اور ان کے طور طریقے کو بہت پسند کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم ہندوستانیوں کا اخلاق اس قدر پست ہو چکا ہے کہ جو برتاؤ ہمارے ساتھ ہوتا ہے ہم ایک حد تک اس کے مستحق ہیں۔ وہ ان سیاسیوں کو کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے جو باتیں بہت بناتے ہیں اور کرتے کچھ نہیں حالانکہ وہ خود بھی نہیں جانتے تھے کہ آخر اور کیا کیا جائے۔ پھر ان کی ذاتی کامیابی نے ان کے دل میں یہ خیال بھی پیدا کر دیا تھا کہ سب تو نہیں مگر بہت سے لوگ جب اور پیشوں میں ناکام رہتے ہیں تو سیاست کو لے بیٹھتے ہیں۔

آمدنی میں روز بروز اضافہ ہونے سے ہمارا زندگی کا طریقہ بہت کچھ بدل گیا۔ ادھر آمدنی بڑھتی گئی ادھر خرچ بڑھتا گیا۔ روپیہ جمع کرنے کو میرے والد اپنی کمانے کی قوت کی توہین سمجھتے تھے۔ انھیں بھروسا تھا کہ میں جب چاہوں اور جتنا چاہوں پیدا کر سکتا ہوں۔ کھیل تماشے کے شوق اور عیش و عشرت کے ذوق میں جو کچھ ملتا سب اُڑا دیتے۔ رفتہ رفتہ ہمارے طرزِ زندگی پر مغربی رنگ گہرا ہوتا چلا گیا۔

یہ تھا ہمارے گھر کا نقشہ جو میں نے اپنے بچپن میں دیکھا۔[1]

میرا بچپن دُنیا کے بکھیڑوں سے محفوظ اور واقعات سے خالی تھا۔ میں اپنے رشتے کے بھائیوں کی بات چیت، جو میرے سن سے اونچی تھی سنا کرتا تھا۔ بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ یہ لوگ اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے کہ انگریز ہندوستانیوں سے حقارت کا برتاؤ کرتے ہیں اور ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ اس بات کو چپ چاپ نہ سہے بلکہ ڈٹ کر مقابلہ کرے۔ حاکم اور محکوم میں آئے دن اس طرح کے جھگڑے ہوا کرتے تھے اور ان کے قصے ہمارے گھر میں چھڑے رہتے تھے۔ یہ پتہ عام تھا کہ جب کبھی انگریز ہندوستانی کو مار ڈالتا ہے، اس کے ہم قوموں کی جیوری اُسے بری کر دیتی ہے۔ ریلوں پر ڈبے انگریزوں کے لیے محفوظ ہوتے تھے اور چاہے گاڑی میں کتنی ہی بھیڑ ہو ان دنوں بھیڑ ہوتی بھی بہت تھی کسی ہندوستانی کی مجال نہ تھی کہ ان ڈبوں میں گو وہ خالی ہی کیوں نہ ہوں سفر کر سکے۔ یہی نہیں بلکہ انگریز غیر محفوظ ڈبے پر بھی قبضہ کر لیتا تھا اور کسی ہندوستانی کو اس میں قدم رکھنے نہیں دیتا تھا۔ اسی طرح پارک وغیرہ میں بنچیں یورپین کے لئے محفوظ ہوتی تھیں۔ مجھے بدیسی حاکموں کی ان بیہودہ حرکتوں پر بڑا غصہ آتا تھا اور جب کوئی ہندوستانی پلٹ کر جواب دیتا تھا تو میں بہت خوش ہوتا تھا۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ خود میرے بھائیوں یا ان کے دوستوں میں سے کسی کی جھڑپ انگریز سے ہو جاتی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہم سب کو بڑا جوش آتا تھا۔ میرے ایک رشتے کے بھائی جو گھر بھر میں سب سے مضبوط تھے، اور جان بوجھ کر انگریزوں سے اور ان سے زیادہ انگریزی داں ہندوستانیوں سے لڑ بیٹھتے تھے۔ اس کے کرکرانے شاید یہ دکھانے کو کہ ہم بھی حاکم قوم میں سے ہیں انگریز عہدہ داروں اور تاجروں سے زیادہ بدتمیزی کرتے تھے۔ یہ جھگڑے زیادہ تر ریل کے سفر میں پیش آتے تھے۔

اگرچہ مجھے بدیسی حاکموں کا ہونا اور ان کا یہ برتاؤ بہت برا لگتا تھا لیکن جہاں تک یاد ہے افراد کی حیثیت سے مجھے انگریزوں سے کوئی کد نہیں تھی۔ میں میم استانیوں کی نگرانی میں رہ چکا تھا اور ابا جان کے انگریز دوستوں کو گھر میں آتے جاتے دیکھا کرتا تھا۔ سچ پوچھئے تو میں دل میں انگریزوں کو بڑا سمجھتا تھا۔

شام کو والد سے ملنے بہت سے دوست آیا کرتے تھے۔ وہ اس بوجھ کو جو دن بھر دل پر رہتا تھا اُتار پھینکتے تھے اور سارا گھر ان کے قہقہوں کی آواز سے گونج اٹھتا تھا۔ ان کی ہنسی سارے شہر میں مشہور تھی۔ بعض وقت میں پردے کے پیچھے سے تاک کر انھیں اور ان کے دوستوں کو دیکھتا تھا اور اس سوچ میں رہتا تھا کہ یہ بڑے بڑے لوگ آپس میں کیا باتیں کیا کرتے ہیں۔ اگر کسی نے مجھے دیکھ لیا تو میں پکڑا جاتا۔ والد مجھے کچھ دیر اپنے گھٹنے پر بٹھا لیتے تھے اور میں ذرا سہما ہوا بیٹھا رہتا تھا۔ ایک بار میں نے انھیں کلیرٹ یا کوئی اور لال رنگ کی شراب پیتے ہوئے دیکھا۔ وسکی کو تو میں پہچانتا تھا اس لیے کہ میں نے والد کو اور ان کے دوستوں کو اکثر اسے پیتے ہوئے دیکھا تھا مگر اس نئی سُرخ چیز کو دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور میں نے دوڑ کر اماں جان سے کہا کہ

---

[1] میری پیدائش الٰہ آباد میں ۱۸۸۹ء کو ہوئی۔



اباجان خون پی رہے ہیں۔

میرے دل میں والد کی بے حد عظمت تھی۔ میں انھیں قوت، ہمت اور عقل کا پُتلا جانتا تھا اور جتنے آدمی میں نے دیکھے تھے سب سے برتر سمجھتا تھا۔ مجھے آرزو تھی کہ میں بھی بڑا ہوکر ان جیسا ہو جاؤں۔ مگر عظمت اور محبت کے ساتھ میرے دل میں ان کا ڈر بھی بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے انھیں نوکروں وغیرہ پر خفا ہوتے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ مجھے بہت ڈراؤنے معلوم ہوتے تھے اور میں خوف سے اور کبھی کبھی طیش سے کانپنے لگتا تھا کہ نوکروں کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ ان کا غصہ واقعی بہت بُرا تھا اور میں نے اس وقت کیا اس کے بعد بھی اس کی ٹکر کا غصہ نہیں دیکھا مگر یہ اچھا تھا کہ ان میں ظرافت کا مادّہ تھا اور ارادے کے بہت مضبوط تھے اس لئے عام طور پر ضبط سے کام لیتے تھے۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ ضبط کی قوت بڑھتی گئی اور آخر عمر میں شاید ہی کبھی انھیں پہلا سا غصہ آیا ہو۔

مجھے بچپن کی جو سب سے پہلی باتیں یاد ہیں اُن میں والد کا غصہ بھی ہے اس لئے کہ یہ مجھی پر نازل ہوا تھا۔ میں ان دنوں کوئی پانچ چھ سال کا ہوں گا۔ والد کی کام کی میز پر دو "ثبوت قلم" (فاؤنٹن پین) رکھے ہوئے دیکھ کر میرا دل للچا گیا۔ میں نے کہا انھیں ایک ساتھ دو قلموں کی تو ضرورت ہونے سے رہی۔ اس لئے ایک میں نے لے لیا۔ بعد میں جب یہ دیکھا کہ اس قلم کی زور شور سے تلاش ہو رہی ہے تو میں بہت ڈرا مگر میں نے اقرار نہیں کیا۔ آخر پتہ چل گیا اور میرے جرم کا ڈھنڈورا پٹ گیا۔ والد بے حد خفا ہوئے اور میری خوب مرمت کی۔ میں درد کی تکلیف اور ذلت کے رنج سے بے تاب سید ماماں کے پاس پہنچا اور کئی روز تک میرے چھوٹے سے دُکھتے ہوئے جسم پر طرح طرح کے روغنوں کی مالش ہوتی رہی۔

مجھے یاد نہیں کہ اس سزا کی وجہ سے مجھے والد سے کوئی شکایت پیدا ہوئی ہو۔ غالباً میرا یہی خیال تھا سزا تھی تو بالکل بجا، مگر حد سے بڑھ گئی تھی لیکن باوجود اس کے کہ میرے دل میں ان کی عظمت اور محبت اُسی طرح قائم رہی' اب میں ان سے ڈرنے بھی لگا۔ البتہ والدہ سے میں بالکل نہیں ڈرتا تھا کیونکہ یہ معلوم تھا کہ چاہے میں کچھ بھی کروں وہ درگذر سے کام لیں گی۔ ان کی بے اندازہ محبت کی وجہ سے میں ان کے ساتھ کسی قدر تحکم کا برتاؤ کرنے لگا تھا۔ والد سے تو کبھی کبھی ملنا ہوتا تھا اور ان کا ہر وقت کا ساتھ تھا اس لئے ان سے میں زیادہ مانوس تھا اور اپنے دل کی بات جو والد سے کبھی نہ کہتا ان سے کہہ دیا کرتا تھا۔ وہ چھریرے جسم اور چھوٹے سے قد کی تھیں اور تھوڑے دن میں میرا قد ان کے لگ بھگ جا پہنچا اس لئے میرے دل میں عمر کے فرق کا احساس کم ہو گیا اور وہ مجھے اپنے برابر کی معلوم ہونے لگیں مجھے ان کی پیاری صورت اور ننھے منے ہاتھ پاؤں بہت بھلے لگتے تھے وہ ایک نووارد کشمیری گھرانے کی تھیں جسے اپنا وطن چھوڑے دو ہی پشتیں گذری تھیں۔

میرے دوسرے ہمراز والد کے ایک محرر منشی مبارک علی تھے۔ وہ بدایوں کے ایک آسودہ حال خاندان سے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی شورش میں ان کا گھر اجڑ گیا اور انگریزوں کی فوج نے ان کے خاندان کو قریب قریب ختم کر دیا۔ مصیبت نے ان کے قلب میں رقت اور درد پیدا کر دیا تھا اور وہ سب سے' خصوصاً بچوں سے بڑی نرمی سے پیش آتے تھے میرے لئے ان کا دامن جانا بوجھا امن کا ٹھکانا تھا۔ جب کبھی اُداس یا پریشان ہوتا انھیں کے پاس پہنچتا۔ ان کی شاندار سفید داڑھی کو دیکھ کر میں بچپن کی سادگی سے یہ سمجھتا تھا کہ یہ پرانے وقتوں کے آدمی ہیں جنھیں کئی جُگ کی باتیں یاد ہیں۔ ان کی گود میں بیٹھ کر حیرت سے آنکھیں پھیلائے میں ان کی بیشمار کہانیوں میں سے الف لیلہ اور دوسری کتابوں کے قصے یا ۵۷ء اور ۵۸ء کے حالات سُنا کرتا تھا۔ منشی جی کا انتقال بہت برسوں کے بعد میری جوانی کے زمانے میں ہوا۔ وہ مجھے اب تک یاد ہیں' اور ان کی یاد کو میں دل و جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔

میری والدہ اور چچی ہندوؤں کی دیو مالا کی کہانیاں اور رامائن اور مہابھارت کی داستانیں سُنایا کرتی تھیں۔ میری چچی یعنی پنڈت نندلال کی بیوہ کو ہندوستان کی پُرانی کتابوں پر عبور تھا اور انھیں اس طرح کے ہزاروں قصے یاد تھے۔ اس لئے میری معلومات ہندوستان کی دیو مالا اور کتھا مالا میں بہت بڑھ گئی۔

مذہب کا میرے دل میں محض ایک دھندلا سا تصور تھا۔ میں اسے عورتوں کا معاملہ سمجھتا تھا۔ والد اور میرے چچیرے بھائی مذہبی امور کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے اور ہنسی میں ٹال دیا کرتے تھے۔ گھر کی عورتیں طرح طرح کی رسمیں مناتی تھیں اور پوجا پاٹ کیا کرتی تھیں۔ مجھے یہ باتیں بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ اگرچہ میں اپنے بڑوں کی تقلید میں کسی حد تک بے پروائی کا اظہار کرتا تھا۔ کبھی کبھی میں والدہ کے ساتھ گنگا اشنان کو جایا کرتا تھا۔ بعض اوقات وہ مجھے الہ آباد بنارس اور دوسری جگہوں کے مندروں میں یا ان سنیاسیوں کی خدمت میں جو بڑے مہاتما سمجھے جاتے تھے' لے جاتی تھیں۔ مگر میرے دل پر ان چیزوں کا کوئی مستقل اثر نہیں پڑا۔

پھر بڑے بڑے تہوار تھے جیسے ہولی جس میں سارا شہر رنگ رلیاں مناتا تھا اور ہم ایک دوسرے پر خوب پانی پھینکتے تھے یا دیوالی جس میں ایک ایک مکان میں ہزاروں دیئے بالے جاتے تھے۔ جنم اشٹمی میں آدھی رات کو کرشن کے قید خانہ میں پیدا ہونے کی خوشی منائی جاتی تھی۔ ہم لوگوں کے لئے آدھی رات تک جاگنا بہت مشکل تھا' دسہرے اور رام لیلا میں رام چندر جی کے لنکا جیتنے کی پُرانی کہانی جلوس اور سوانگ کی شکل میں دُہرائی جاتی تھی اور تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے تھے۔ ہم سب بچے محرم کا جلوس دیکھنے بھی جایا کرتے تھے جس میں علموں کے ریشمی پھریرے لہراتے تھے اور حسنؓ حسینؓ کی



شہادت کا ماتم ہوتا تھا۔ دونوں عیدوں کو منشی جی اچھے اچھے کپڑے پہن کر عیدگاہ میں نماز پڑھنے جاتے تھے اور میں اُن کے گھر پر سوئیاں اور دوسرے لذیذ کھانے اڑاتا تھا۔ ان کے علاوہ ہندوؤں کے بہت سے چھوٹے چھوٹے تہوار تھے جیسے رکشا بندھن بھیا دوج وغیرہ۔

ہم کشمیریوں کے بعض خاص تہوار بھی تھے جو اور ہندوؤں میں نہیں منائے جاتے تھے ان میں سب سے بڑا نوروز یعنی ہمارے سمت کے شروع ہونے کا تہوار تھا۔ یہ ہم لوگوں کے لئے خاص خوشی کا دن ہوتا تھا۔ گھر بھر نئے کپڑے پہنتا تھا اور بچوں کو نقدی ملتی تھی۔

مگر ان سب تہواروں سے زیادہ مجھے اُس تقریب سے دلچسپی تھی جو ہر سال خاص میرے لئے ہوا کرتی تھی۔ یعنی میری سالگرہ۔ اس دن میرے جوش کو کچھ نہ پوچھیے۔ صبح تڑکے میں ایک بڑی ترازو میں گیہوں وغیرہ سے تلتا تھا اور یہ چیزیں غریبوں کو بانٹ دی جاتی تھیں پھر نئی پوشاک پہن کر میں لوگوں سے تحفے لیتا تھا، اور شام کو دعوت ہوتی تھی جس میں بہت سے لوگ جمع ہوتے تھے۔ اپنے آپ کو اس برات کا دولھا سمجھ کر میں فخر سے پھولا نہ سماتا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ شکایت یہ تھی کہ میری سالگرہ بہت دن کے بعد آتی ہے بلکہ میں نے بہت کچھ شور بھی مچایا کہ یہ تقریب سال میں کئی بار ہوا کرے۔ اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ ایک دن وہ آئے گا جب سالگرہ بڑھتی ہوئی عمر کی نشانی بن کر ناگوار ہو جائے گی۔

بعض اوقات ہمارا سارا خاندان دور کا سفر کر کے دوسرے شہر میں جاتا تھا کہ کسی عزیز یا دوست کی شادی میں شریک ہو۔ ہم بچوں کو [illegible] سفر سے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ اس لئے کہ شادی کے زمانے میں قاعدوں کی بندشیں ڈھیلی پڑتیں اور ہم گھر بھر میں آزادی سے پھرتے۔ شادی کے گھر میں کئی خاندان اکٹھے رہتے تھے اور بہت سے لڑکے لڑکیاں جمع ہو جاتی تھیں۔ ان موقعوں پر مجھے تنہائی کی شکایت نہیں ہو سکتی تھی۔ ہم دل بھر کر کھیل کود اور شرارت کا لطف اٹھاتے اور کبھی کبھی بڑوں کی ڈانٹ بھی کھاتے۔

ہندوستان کے غریبوں اور امیروں کی شادیوں کو بے جا نمائش اور فضول خرچی کی وجہ سے بہت کچھ بُرا بھلا کہا گیا ہے اور وہ اس کی مستحق بھی ہیں۔ فضول خرچی کے علاوہ اس عامیانہ آرائش کو دیکھ کر جس میں نفاست اور خوش مذاقی کا نام تک نہیں ہوتا، بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ بعض صورتیں اس سے مستثنیٰ بھی ہوتی ہیں۔ اس کا الزام اصل میں اوسط طبقے کے لوگوں پر ہے۔ غریب لوگ بھی فضول خرچ ہوتے ہیں اور اس کی وجہ سے اکثر قرض کے بوجھ میں دب جاتے ہیں۔ مگر یہ بات جو بعض حضرات کہا کرتے ہیں، بالکل مہمل ہے کہ ان کا افلاس ان رسموں کی وجہ سے ہے۔ لوگ اس کو نہیں دیکھتے کہ غریبوں کی زندگی بالکل پھیکی اور سپاٹ ہوتی ہے اور شادی کے موقع پر جو تھوڑا سا گانا بجانا، کھانا کھلانا ہوتا ہے وہ ان کی بے روح مشقت کی خشکی میں ذرا سا رس پیدا کر دیتا ہے اور دم بھر کے لئے انھیں گھر میں گھسے رہنے اور بے لطف کام میں جٹے رہنے سے نجات دے دیتا ہے۔ ایسا کون بے درد ہوگا کہ ان بیچاروں کو جو کبھی کبھی ہنسنے کا موقع مل جاتا ہے اس سے بھی انھیں محروم کر دے؟ آپ شوق سے فضول خرچی کو روکئے تکلفات کو کم کیجئے "ان بیچاروں کی غریب خوشیوں کے لئے اتنے بڑے بڑے لفظ استعمال کرنا [illegible] معلوم ہوتا ہے) مگر خدا کے لئے ان کی زندگی کو اور زیادہ بے رنگ اور اداس نہ بنائیے۔

اسی طرح اوسط طبقوں میں بھی فضول خرچی اور تکلف سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو یہ شادیاں وہ صحبتیں ہیں جن میں دور افتادہ عزیز اور دوست مدت کے بعد مل بیٹھتے ہیں۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ یہاں دوستوں سے ملنا آسان نہیں ہے، خصوصاً بہت سے دوستوں کا ایک جگہ اکٹھا ہونا بہت دشوار ہے اسی وجہ سے شادی کی تقریبیں اس قدر ہر دلعزیز ہیں۔ صرف سیاسی مجلسیں یعنی کانگریس یا اس قسم کی اور کانفرنسیں ان کا مقابلہ کر سکتی ہیں بلکہ سچ پوچھئے تو لطف صحبت کے لحاظ سے بھی ان سے بڑھ گئی ہیں۔

کشمیری ایک لحاظ سے اور ہندوستانیوں خصوصاً شمال کے رہنے والوں سے فائدے میں ہیں۔ ان کے یہاں پردے کی رسم کبھی نہیں تھی۔ جب وہ نیچے کے میدانوں میں آئے اور انھوں نے یہاں پردے کا رواج دیکھا تو انھوں نے بھی اسے اختیار کر لیا اس لئے کہ وہ عموماً شمالی ہند میں رہے اور یہاں یہ شرافت کی لازمی شرط سمجھی جاتی تھی۔ مگر پھر بھی ان میں [illegible] کڑا پردہ نہیں اور جو ہے وہ بھی صرف غیر کشمیریوں کے مقابلے میں ہے۔ آپس میں ان کے یہاں عورت مرد آزادی سے ملتے ہیں اور ہر کشمیری بے تکلف دوسرے کشمیریوں کے گھر میں داخل ہو سکتا ہے۔ ان کی تقریبوں اور دعوتوں میں عورتیں اور مرد ساتھ ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ اگرچہ عموماً عورتوں کی ٹولی الگ بیٹھتی ہے۔ لڑکے لڑکیاں کم و بیش برابری کے ساتھ ملتی جلتی ہیں۔ البتہ مغرب کی سی آزادی ان میں نہیں ہے۔

اس طرح سے میری زندگی کے ابتدائی سال گذرے۔ بعض اوقات جیسا کہ بڑے خاندانوں میں لازمی طور پر ہوتا ہے، آپس میں لڑائی بھی ہو جایا کرتی تھی۔ جب یہ بہت بڑھ جاتی تو میرے والد کو خبر ہوتی۔ وہ بہت خفا ہوتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ یہ سب عورتوں کی بیوقوفی کا نتیجہ ہے۔ یہ تو میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ قصہ کیا ہے مگر میں دیکھتا تھا کہ لوگ ایک دوسرے سے بُری طرح گفتگو کرتے ہیں یا کھنچے کھنچے رہتے ہیں۔ مجھے اس سے بہت رنج ہوتا تھا۔ اگر والد نے دخل دیا تو گھر بھر تھرا اٹھتا تھا۔

اس زمانے کا ایک چھوٹا سا واقعہ میرے حافظے میں اب تک نقش ہے۔ میری عمر کوئی سات آٹھ برس کی ہوگی۔ میں روز چھاؤنی کے ایک سوار کے ساتھ گھوڑے پر سیر کرنے جایا کرتا تھا۔ ایک دن شام کو میں گر پڑا اور میرا ٹٹو (یہ بڑا خوبصورت جانور تھا جس میں عرب خون بھی شامل تھا) میرے بغیر گھر واپس آگیا۔ والد کے یہاں اس وقت ٹینس پارٹی تھی۔ ایک ہلچل

ہان خون پی رہے ہیں۔

میرے دل میں والد کی بے حد عظمت تھی۔ میں انھیں قوت، ہمت اور عقل کا پُتلا تا تھا اور جتنے آدمی میں نے دیکھے تھے سب سے برتر سمجھتا تھا۔ مجھے آرزو تھی کہ میں بڑا ہوکر ان جیسا ہو جاؤں۔ مگر عظمت اور محبت کے ساتھ میرے دل میں ان کا ڈر بھی ا ہوا تھا۔ میں نے انھیں نوکروں وغیرہ پر خفا ہوتے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ مجھے ت ڈراؤنے معلوم ہوتے تھے اور میں خوف سے اور کبھی کبھی طیش سے کانپنے لگتا تھا کہ روں کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ ان کا غصہ واقعی بہت بُرا تھا اور میں نے اس ت کیا اس کے بعد بھی اس کی ٹکر کا غصہ نہیں دیکھا مگر یہ اچھا تھا کہ ان میں ظرافت کا تھا اور ارادے کے بہت مضبوط تھے اس لئے عام طور پر ضبط سے کام لیتے تھے۔ عمر ساتھ ساتھ یہ ضبط کی قوت بڑھتی گئی اور آخر عمر میں شاید ہی کبھی انھیں پہلا سا غصہ آیا ہو۔

مجھے بچپن کی جو سب سے پہلی باتیں یاد ہیں اُن میں والد کا غصہ بھی ہے اس لئے کہ ں پر نازل ہوا تھا۔ میں ان دنوں کوئی پانچ چھ سال کا ہوں گا۔ والد کی کام کی میز پر دو ت قلم" (فاؤنٹن پین) رکھے ہوئے دیکھ کر میرا دل للچا گیا۔ میں نے کہا انھیں ایک دو قلموں کی تو ضرورت ہونے سے رہی۔ اس لئے ایک میں نے لے لیا۔ بعد میں جب یھا کہ اس قلم کی زور شور سے تلاش ہو رہی ہے تو میں بہت ڈرا مگر میں نے اقرار ں کیا۔ آخر پتہ چل گیا اور میرے جرم کا ڈھنڈورا پٹ گیا۔ والد بے حد خفا ہوئے اور خوب مرمت کی۔ میں درد کی تکلیف اور ذلت کے رنج سے بے تاب سیدھا ماں کے پہنچا اور کئی روز تک میرے چھوٹے سے دُکھتے ہوئے جسم پر طرح طرح کے روغنوں کی ا ہوتی رہی۔

مجھے یاد نہیں کہ اس سزا کی وجہ سے مجھے والد سے کوئی شکایت پیدا ہوئی ہو۔ غالباً یہی خیال تھا سزا تھی تو بالکل بجا، مگر حد سے بڑھ گئی تھی لیکن باوجود اس کے کہ میرے میں ان کی عظمت اور محبت اُسی طرح قائم رہی، اب میں ان سے ڈرنے بھی لگا۔ البتہ رہ سے میں بالکل نہیں ڈرتا تھا کیونکہ یہ معلوم تھا کہ چاہے میں کچھ بھی کروں وہ درگذر سے لیں گی۔ ان کی بے اندازہ محبت کی وجہ سے میں ان کے ساتھ کسی قدر تحکم کا برتاؤ کرنے تھا۔ والد سے تو کبھی کبھی ملنا ہوتا تھا اور ان کا ہر وقت کا ساتھ تھا اس لئے ان سے میں ہ مانوس تھا اور اپنے دل کی بات جو والد سے کبھی نہ کہتا ان سے کہہ دیا کرتا تھا۔ وہ پچھ ا اور چھوٹے سے قد کی تھیں اور تھوڑے دن میں میرا قد ان کے لگ بھگ جا پہنچا اس لئے ے دل میں عمر کے فرق کا احساس کم ہوگیا اور وہ مجھے اپنے برابر کی معلوم ہونے لگیں ان کی پیاری صورت اور ننھے منے ہاتھ پاؤں بہت بھلے لگتے تھے وہ ایک نو وارد کشمیری نے کی تھیں جسے اپنا وطن چھوڑے دو ہی پشتیں گذری تھیں۔

میرے دوسرے ہمراز والد کے ایک محرر منشی مبارک علی تھے۔ وہ بدایوں کے ایک آسودہ حال خاندان سے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی شورش میں ان کا گھر اجڑ گیا اور انگریزوں کی فوج نے ان کے خاندان کو قریب قریب ختم کر دیا۔ مصیبت نے ان کے قلب میں رقت اور درد پیدا کر دیا تھا اور وہ سب سے، خصوصاً بچوں سے بڑی نرمی سے پیش آتے تھے میرے لئے ان کا دامن جانا بوجھا امن کا ٹھکانا تھا۔ جب کبھی اُداس یا پریشان ہوتا انھیں کے پاس پہنچتا۔ ان کی شاندار سفید داڑھی کو دیکھ کر میں بچپن کی سادگی سے یہ سمجھتا تھا کہ یہ پرانے وقتوں کے آدمی ہیں جنھیں کئی جُگ کی باتیں یاد ہیں۔ ان کی گود میں بیٹھ کر حیرت سے آنکھیں پھیلائے میں ان کی بیشمار کہانیوں میں سے الف لیلہ اور دوسری کتابوں کے قصے یا ۵۷ء اور ۵۸ء کے حالات سُنا کرتا تھا۔ منشی جی کا انتقال بہت برسوں کے بعد میری جوانی کے زمانے میں ہوا۔ وہ مجھے اب تک یاد ہیں اور ان کی یاد کو میں دل و جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔

میری والدہ اور چچی ہندوؤں کی دیومالا کی کہانیاں اور رامائن اور مہابھارت کی داستانیں سُنایا کرتی تھیں۔ میری چچی یعنی پنڈت نندلال کی بیوہ کو ہندوستان کی پُرانی کتابوں پر عبور تھا اور انھیں اس طرح کے ہزاروں قصے یاد تھے۔ اس لئے میری معلومات ہندوستان کی دیومالا اور کتھا مالا میں بہت بڑھ گئی۔

مذہب کا میرے دل میں محض ایک دھندلا سا تصور تھا۔ میں اسے عورتوں کا معاملہ سمجھتا تھا۔ والد اور میرے چچیرے بھائی مذہبی امور کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے اور ہنسی میں ٹال دیا کرتے تھے۔ گھر کی عورتیں طرح طرح کی رسمیں مناتی تھیں اور پوجا پاٹ کیا کرتی تھیں۔ مجھے یہ باتیں بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ اگرچہ میں اپنے بڑوں کی تقلید میں کسی حد تک بے پروائی کا اظہار کرتا تھا۔ کبھی کبھی میں والدہ کے ساتھ گنگا اشنان کو جایا کرتا تھا۔ بعض اوقات وہ مجھے الہ آباد، بنارس اور دوسری جگہوں کے مندروں میں یا ان سنیاسیوں کی خدمت میں جو بڑے مہاتما سمجھے جاتے تھے، لے جاتی تھیں۔ مگر میرے دل پر ان چیزوں کا کوئی مستقل اثر نہیں پڑا۔

پھر بڑے بڑے تہوار تھے جیسے ہولی جس میں سارا شہر رنگ رلیاں مناتا تھا اور ہم ایک دوسرے پر خوب پانی پھینکتے تھے یا دیوالی جس میں ایک ایک مکان میں ہزاروں دئے بارے جاتے تھے۔ جنم اشٹمی میں آدھی رات کو کرشن کے قید خانہ میں پیدا ہونے کی خوشی منائی جاتی تھی۔ ہم لوگوں کے لئے آدھی رات تک جاگنا بہت مشکل تھا، دسہرے اور رام لیلا میں رام چندر جی کے لنکا جیتنے کی پُرانی کہانی جلوس اور سوانگ کی شکل میں دُہرائی جاتی تھی اور تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے تھے۔ ہم سب بچے محرم کا جلوس دیکھنے بھی جایا کرتے تھے جس میں عَلموں کے ریشمی پھریرے لہراتے تھے اور حسنؑ حسینؑ کی



شہادت کا ماتم ہوتا تھا۔ دونوں عیدوں کو منشی جی اچھے اچھے کپڑے پہن کر عیدگاہ میں نماز پڑھنے جاتے تھے اور میں اُن کے گھر پر سویاں اور دوسرے لذیذ کھانے اڑاتا تھا۔ ان کے علاوہ ہندوؤں کے بہت سے چھوٹے چھوٹے تہوار تھے جیسے رکشا بندھن، بھیا دوج وغیرہ۔

ہم کشمیریوں کے بعض خاص تہوار بھی تھے جو اور ہندوؤں میں نہیں منائے جاتے تھے۔ ان میں سب سے بڑا نوروز یعنی ہمارے سمت کے شروع ہونے کا تہوار تھا۔ یہ ہم لوگوں کے لئے خاص خوشی کا دن ہوتا تھا۔ گھر بھر نئے کپڑے پہنتا تھا اور بچوں کو نقدی ملتی تھی۔

مگر ان سب تہواروں سے زیادہ مجھے اُس تقریب سے دلچسپی تھی جو ہر سال خاص میرے لئے ہوا کرتی تھی۔ یعنی میری سالگرہ۔ اس دن میرے جوش کو کچھ نہ پوچھیے۔ صبح تڑکے میں ایک بڑی ترازو میں گیہوں وغیرہ سے تلتا تھا اور یہ چیزیں غریبوں کو بانٹ دی جاتی تھیں۔ پھر نئی پوشاک پہن کر میں لوگوں سے تحفے لیتا تھا، اور شام کو دعوت ہوتی تھی جس میں بہت سے لوگ جمع ہوتے تھے۔ اپنے آپ کو اس برات کا دولہا سمجھ کر میں فخر سے پھولا نہ سماتا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ شکایت یہ تھی کہ میری سالگرہ بہت دن کے بعد آتی ہے بلکہ میں نے بہت کچھ شور بھی مچایا کہ یہ تقریب سال میں کئی بار ہوا کرے۔ اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ ایک دن وہ آئے گا جب سالگرہ بڑھتی ہوئی عمر کی نشانی بن کر ناگوار ہو جائے گی۔

بعض اوقات ہمارا سارا خاندان دور کا سفر کر کے دوسرے شہر میں جاتا تھا کہ کسی عزیز یا دوست کی شادی میں شریک ہو۔ ہم بچوں کو ان سفروں سے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ اس لئے کہ شادی کے زمانے میں قاعدوں کی بندشیں ڈھیلی پڑ جاتیں اور ہم گھر بھر میں آزادی سے پھرتے۔ شادی کے گھر میں کئی خاندان اکٹھے رہتے تھے اور بہت سے لڑکے لڑکیاں جمع ہو جاتی تھیں۔ ان موقعوں پر مجھے تنہائی کی شکایت نہیں ہو سکتی تھی۔ ہم دل بھر کر کھیل کود اور شرارت کا لطف اٹھاتے اور کبھی کبھی بڑوں کی ڈانٹ بھی کھاتے۔

ہندوستان کے غریبوں اور امیروں کی شادیوں کو بےجا نمائش اور فضول خرچی کی وجہ سے بہت کچھ بُرا بھلا کہا گیا ہے اور وہ اس کی مستحق بھی ہیں۔ فضول خرچی کے علاوہ اس عامیانہ آرائش کو دیکھ کر جس میں نفاست اور خوش مذاقی کا نام تک نہیں ہوتا، بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ بعض صورتیں اس سے مستثنیٰ بھی ہوتی ہیں۔ اس کا الزام اصل میں اوسط طبقے کے لوگوں پر ہے۔ غریب لوگ بھی فضول خرچ ہوتے ہیں اور اس کی وجہ سے اکثر قرض کے بوجھ میں دب جاتے ہیں۔ مگر یہ بات جو بعض حضرات کہا کرتے ہیں' بالکل مہمل ہے کہ ان کا افلاس ان رسموں کی وجہ سے ہے۔ لوگ اس کو نہیں دیکھتے کہ غریبوں کی زندگی بالکل پھیکی اور سپاٹ ہوتی ہے اور شادی کے موقع پر جو تھوڑا سا گانا بجانا، کھانا کھلانا ہوتا ہے وہ ان کی بے روح مشقت کی خشکی میں ذرا سا رس پیدا کر دیتا ہے اور دم بھر کے لئے انھیں گھر میں گھسے رہنے اور بے لطف کام میں جتے رہنے سے نجات دے دیتا ہے۔ ایسا کون بے درد ہوگا کہ ان بیچاروں کو جو کبھی کبھار ہنسنے کا موقع مل جاتا ہے اس سے بھی انھیں محروم کر دے؟ آپ شوق سے فضول خرچی کو روکئے تکلفات کو کم کیجئے۔ ان بیچاروں کی غریبانہ خوشیوں کے لئے اتنے بڑے بڑے لفظ استعمال کرنا سخت معیوب ہوتا ہے۔ مگر خدا کے لئے ان کی زندگی کو اور زیادہ بے رنگ اور اداس نہ بنائیے۔

اسی طرح اوسط طبقوں میں بھی فضول خرچی اور تکلف سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو یہ شادیاں وہ صحبتیں ہیں جن میں دور افتادہ عزیز اور دوست مدت کے بعد مل بیٹھتے ہیں۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ یہاں دوستوں سے ملنا سہل نہیں ہے، خصوصاً بہت سے دوستوں کا ایک جگہ اکٹھا ہونا بہت دشوار ہے اسی وجہ سے شادی کی تقریبیں اس قدر ہر دلعزیز ہیں۔ صرف سیاسی مجلسیں یعنی کانگرس یا اس قسم کی اور کانفرنسیں ان کا مقابلہ کر سکتی ہیں بلکہ سچ پوچھیے تو لطف صحبت کے لحاظ سے بھی ان سے بڑھ گئی ہیں۔

کشمیری ایک لحاظ سے اور ہندوستانیوں خصوصاً شمال کے رہنے والوں سے فائق ہیں۔ ان کے یہاں پردے کی رسم کبھی نہیں تھی جب وہ نیچے کے میدانوں میں آئے اور انھوں نے یہاں پردے کا رواج دیکھا تو انھوں نے بھی اسے اختیار کر لیا اس لئے کہ وہ عموماً شمالی ہند میں سے ہے اور یہاں یہ شرافت کی لازمی شرط سمجھی جاتی تھی۔ مگر پھر بھی ان میں یہ گہرا پردہ نہیں اور جو ہے وہ بھی صرف غیر کشمیریوں کے مقابلے میں ہے۔ آپس میں ان کے یہاں عورت مرد آزادی سے ملتے ہیں اور ہر کشمیری بے تکلف دوسرے کشمیریوں کے گھر میں داخل ہو سکتا ہے۔ ان کی تقریبوں اور دعوتوں میں عورتیں اور مرد ساتھ ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ اگرچہ عموماً عورتوں کی ٹولی الگ بیٹھتی ہے۔ لڑکے لڑکیاں کم و بیش برابری کے ساتھ ملتے جلتے ہیں۔ البتہ مغرب کی سی آزادی ان میں نہیں ہے۔

اس طرح سے میری زندگی کے ابتدائی سال گذرے۔ بعض اوقات جیسا کہ بڑے خاندانوں میں لازمی طور پر ہوتا ہے' آپس میں لڑائی بھی ہو جایا کرتی تھی۔ جب یہ بہت بڑھ جاتی تو میرے والد کو خبر ہوتی۔ وہ بہت خفا ہوتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ یہ سب عورتوں کی بیوقوفی کا نتیجہ ہے۔ یہ تو میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ قصہ کیا ہے مگر میں دیکھتا تھا کہ لوگ ایک دوسرے سے بُری طرح گفتگو کرتے ہیں یا کھنچے کھنچے رہتے ہیں۔ مجھے اس سے بہت رنج ہوتا تھا۔ اگر والد نے دخل دیا تو گھر بھر تھرا اٹھتا تھا۔

اس زمانے کا ایک چھوٹا سا واقعہ میرے حافظے میں اب تک نقش ہے۔ میری عمر کوئی سات آٹھ برس کی ہوگی۔ میں روز چھاؤنی کے ایک سوار کے ساتھ گھوڑے پر سیر کرنے جایا کرتا تھا۔ ایک دن شام کو میں گر پڑا اور میرا ٹٹو (یہ بڑا خوبصورت جانور تھا جس میں عرب خون بھی شامل تھا) میرے بغیر گھر واپس آ گیا۔ والد کے یہاں اس وقت ٹینس پارٹی تھی۔ ایک ہل چل

ہو گئی اور پارٹی کے سب کے سب لوگ میرے والد کے پیچھے سواریوں کا ایک جلوس بنا کر مجھے ڈھونڈنے نکلے۔ میں انھیں راستے میں مل گیا اور انھوں نے مجھے اس طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جیسے میں نے کوئی بڑا بہادری کا کام کیا ہو۔

مئی ۱۹۰۵ء میں جب میری عمر پندرہ برس کی تھی، میرے والد مجھے، میری والدہ اور میری چھوٹی بہن کو لے کر انگلستان روانہ ہوئے۔ آخر مئی کی کسی تاریخ کو لندن پہنچے۔ ڈوور سے ریل پر روانہ ہونے کے بعد رستے میں ہم نے یہ خبر پڑھی کہ جاپان کو تُوشیما کے مقام پر بڑی زبردست بحری فتح حاصل ہوئی۔ میں خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ دوسرے ہی دن ڈربی کی گھڑدوڑ تھی اور ہم سب اس کا تماشا دیکھنے گئے۔ وہاں سے لوٹ کر ہماری ملاقات ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے ہوئی جو اُس زمانے میں ایک ذہین اور مستعد نوجوان تھے اور اپنی تعلیم میں نہایت اعلیٰ درجے کی کامیابی حاصل کر چکے تھے۔ اُن دنوں وہ لندن کے ایک ہسپتال میں ہاؤس سرجن تھے۔

میری خوش قسمتی سمجھیے کہ مجھے ہیرو میں جگہ مل گئی، کیونکہ میری عمر پندرہ برس کی ہو چکی تھی اور یہ داخلے کی مقررہ عمر سے کچھ تھوڑی سی زیادہ تھی۔ میرے خاندان کے لوگ یورپ کے اور ملکوں کو چلے گئے اور وہاں سے ہندوستان واپس ہو گئے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اپنے آپ کو غیروں میں بالکل اکیلا پایا۔ مجھے تنہائی اور گھر کی یاد ستانے لگی، مگر یہ حالت زیادہ دن نہیں رہی، میرا قدم اسکول میں تھوڑا بہت جم گیا اور پڑھنے میں اور کھیل میں وقت گذرنے لگا۔ مگر میں وہاں پوری طرح کبھی نہیں کھپ سکا، ہمیشہ یہ احساس رہتا تھا کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں اور شاید وہ لوگ بھی مجھے غیر سمجھتے ہوں گے، پھر بھی میں کھیلوں میں پورا حصہ لیتا تھا، اگرچہ میں کسی قسم کا امتیاز حاصل نہ کر سکا۔ میرے خیال میں یہ بات مان لی گئی تھی کہ میں کسی کام سے جی چرانے والا نہیں۔

شروع میں میرا داخلہ چھوٹے درجے میں ہوا اس لئے کہ میں لاطینی بہت کم جانتا تھا مگر تھوڑے ہی دن میں مجھے ترقی مل گئی۔ بہت سے مضمونوں میں خصوصاً عام معلومات میں میں اپنی عمر کے لڑکوں سے آگے تھا۔ میرا ذوق زیادہ وسیع تھا اور میں اپنے اکثر ساتھیوں سے زیادہ کتابیں اور اخبار پڑھتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنے والد کو ایک خط میں لکھا تھا کہ انگریز لڑکے اکثر غبی ہوتے ہیں اور سوائے اپنے کھیلوں کے اور کسی چیز کے متعلق گفتگو نہیں کر سکتے۔ تاہم مجھے بعض تیز لڑکے بھی نظر آئے خصوصاً اونچی جماعتوں میں پہنچنے کے بعد۔

مجھے پارلیمنٹ کے عام انتخاب سے، جو غالباً ۱۹۰۵ء کے آخر میں ہوا، بہت دلچسپی تھی۔ اس میں لبرل جماعت نے بڑی زبردست فتح پائی۔ ۱۹۰۶ء کے شروع میں ہمارے اُستاد نے ہم سے نئی حکومت کے بارے میں سوال کیا اور انھیں بڑا تعجب ہوا کہ ساری جماعت میں صرف میں نے ہی ان کے سوال کا اچھی طرح جواب دیا بلکہ کیمبل بیزمین کی مجلس وزرا کی قریب قریب پوری فہرست زبانی سنادی۔ سیاست کے علاوہ ایک اور چیز سے بھی مجھے خاص شوق تھا اور وہ ہوائی جہاز رانی کی ابتدائی نشو و نما تھی۔ یہ رائٹ برادران اور سینٹوس ڈومونٹ کا زمانہ تھا (جس کے بعد ہی فارمین، لیتھم اور بلیریو کا دور آیا) اور میں نے اپنے جوش میں ہیرو سے والد کو لکھا تھا کہ بہت جلد میں سنیچر اتوار کی چھٹی میں ہوائی جہاز سے ہندوستان آیا کروں گا۔

میرے زمانے میں ہیرو میں چار پانچ ہندوستانی لڑکے تھے۔ ان میں سے جو اور ہوسٹلوں میں رہتے تھے ان سے مجھ سے بہت کم ملاقات ہوتی تھی۔ خود میرے ہوسٹل میں جس کے نگران ہیڈ ماسٹر تھے، مہاراج بڑودہ کے صاحبزادے تھے اور بعد میں مہاراج کپور تھلہ کے بڑے صاحبزادے پرم جیت سنگھ بھی آ گئے جو اب ٹکا صاحب ہو گئے ہیں۔ وہ اس مدرسے میں بالکل نہیں کھپتے تھے۔ ہمیشہ اداس رہا کرتے اور دوسرے لڑکوں سے ملنے جلنے سے گھبراتے۔ جب یہ لوگ ان کا مذاق اڑاتے تو وہ بہت خفا ہوتے اور کہتے کہ کبھی کپور تھلہ آئے تو سمجھ لوں گا۔ ظاہر ہے کہ اس سے معاملہ اور بگڑ جاتا تھا۔ وہ یہاں آنے سے پہلے کچھ دن فرانس میں رہ چکے تھے اور فرانسیسی زبان روانی سے بولتے تھے مگر یہ لطف دیکھیے کہ اس سے انھیں اپنے فرانسیسی کے سبق میں کوئی مدد نہیں ملتی تھی۔ یہ اس طریقۂ تعلیم کی برکت تھی جو انگلستان کے پبلک اسکولوں میں غیر زبانوں کی تعلیم دینے کے لئے اختیار کیا جاتا تھا۔

ایک بار عجیب واقعہ ہوا۔ آدھی رات کو یکایک ہوسٹل کے نگراں ہمارے کمروں میں پہنچے اور سب کی تلاشی لی گئی۔ معلوم ہوا کہ پرم جیت سنگھ کی سونے کی خوشنما چھڑی غائب ہو گئی ہے۔ تلاشی کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ دو تین دن میں لارڈ کے میدان میں ایٹن اور ہیرو کا میچ ہوا اور اس کے بعد ہی وہ چھڑی مالک کے کمرے میں پائی گئی۔ ظاہر ہے کہ کوئی صاحب اُسے لے کر میچ دیکھنے گئے تھے اور پھر واپس کر گئے۔

ہمارے ہوسٹل میں اور دوسرے ہوسٹلوں میں چند یہودی بھی تھے۔ ان لوگوں سے اچھی خاصی نبھتی تھی مگر دلوں میں سامی نسل سے کسی قدر نفرت ضرور موجود تھی۔ یہ "ملعون یہودی" کہلاتے تھے اور قریب قریب غیر شعوری طور پر میں بھی یہ سمجھنے لگا کہ ان سے نفرت کرنا فیشن میں داخل ہے۔ مگر اصل میں مجھے سامی نسل سے کوئی کد نہ تھی اور آگے چل کر کئی یہودیوں سے میری بڑی دوستی ہو گئی۔

میں ہیرو سے مانوس ہو گیا تھا اور اسے بہت پسند کرتا تھا مگر اب یہ احساس ہو چلا تھا کہ میں اس کی سطح سے اونچا ہوتا جاتا ہوں۔ میرا دل یونیورسٹی کی طرف کھنچ رہا تھا۔ ۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۷ء میں ہندوستان کی خبریں انگلستان کے اخباروں میں بہت مجمل طور پر آتی تھیں مگر ان سے بھی یہ پتہ چلتا تھا کہ بنگال، پنجاب اور مہاراشٹر میں بڑے بڑے واقعات ہو رہے ہیں۔ لالہ لاجپت رائے اور اجیت سنگھ جلا وطن کر دئے گئے تھے، بنگال میں



شورش برپا تھی، پونا سے تلک کی جدوجہد کے متعلق تار آرہے تھے، سودیشی اور بائیکاٹ کا زور تھا۔ ان سب باتوں نے میرے دل میں سخت ہیجان پیدا کر دیا تھا مگر ہیرو میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جس سے میں اس کا ذکر کر سکوں۔ البتہ چھٹیوں میں اپنے رشتے کے بھائیوں سے یا اور ہندوستانی دوستوں سے ملنا ہوتا تھا اور میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتا تھا۔

اسکول میں اچھا کام کرنے کے انعام میں مجھے ایک بار ج۔ م۔ ٹریویلین بالڈی کی کتابیں ملیں۔ انھیں میں نے بہت شوق سے پڑھا اور بہت جلد اس سلسلے کی باقی دو کتابیں بھی مہیا کر کے گاری بالڈی کے سارے حالات کا غور سے مطالعہ کیا۔ میری نظر میں یہ نقشے پھرنے لگے کہ ہندوستان میں ایسے ہی کارنمایاں انجام پا رہے ہیں اور آزادی کی خاطر بڑی بہادری سے جنگ ہو رہی ہے ان خیالات کی وسعت کے آگے ہیرو ایک تنگ اور محدود جگہ معلوم ہونے لگی اور میرا دل یونیورسٹی کی وسیع تر فضا کو ڈھونڈنے لگا۔ چنانچہ میں اپنے والد کی اجازت حاصل کر کے ہیرو سے رخصت ہو گیا۔ یہاں میرا قیام صرف دو برس رہا، جو مقررہ میعاد سے بہت کم تھا۔ میں ہیرو سے اپنی خوشی سے جا رہا تھا مگر مجھے یاد ہے کہ جب رخصت ہونے کا وقت آیا تو میرا دل بھر آیا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھے اس سے ایک گونہ انس ہو گیا تھا اور اس کے چھوڑنے سے میری زندگی کا ایک دور ختم ہو گیا۔ مگر یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے رنج تھا یا نہیں۔ شاید مجھے یہ احساس تھا کہ اس موقع پر اداس ہونا ضروری ہے۔ اس لئے کہ ہیرو کی روایات اور گیتوں کا تقاضا یہی ہے۔ میں ان روایات سے متاثر تھا اس لئے میں نے جان بوجھ کر ان روایات کے اثر سے بچنے کی کوشش نہیں کی تھی تاکہ جس جگہ رہتا ہوں اس سے ہم آہنگ ہو جاؤں۔

شروع اکتوبر ۱۹۰۷ء، سترہ اٹھارہ برس کی عمر، ٹرینٹی کالج، کیمبرج کا منظر۔ میرا دل فرط مسرت سے معمور تھا۔ اب میں یونیورسٹی کا طالب علم تھا اور اسکول کے مقابلے میں بہت آزاد تھا۔ لڑکپن کی بیڑیاں کٹ چکی تھیں اور وہ دن آ گیا تھا کہ میں اپنے آپ کو بالغ کہہ سکوں۔ میں کیمبرج کے چوڑے چوکوں اور تنگ گلیوں میں اکڑتا پھرتا تھا اور اگر کوئی جاننے والا مل جاتا تو مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی۔

تین سال میں کیمبرج میں رہا اور یہ تین سال بے خلل سکون اور خاموشی سے گذر گئے جیسے کیم ندی دھیرے دھیرے بہتی ہے۔ یہ بھی کیا خوش گوار زمانہ تھا۔ بہت سے دوست، تھوڑا سا کام، تھوڑا سا کھیل اور دائرۂ نظر کا آہستہ آہستہ بڑھنا۔ میں نے سائنس کی سند حاصل کی جس میں میرے مضمون کیمیا، ارضیات اور نباتات تھے مگر میری دلچسپی انھیں مضامین تک محدود نہ تھی۔ میں جن لوگوں سے کیمبرج میں یا تعطیل کے زمانے میں لندن میں ملتا تھا وہ عالمانہ انداز سے ادب، تاریخ، سیاسیات اور معاشیات پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ پہلے پہل تو ان علمیت بھری باتوں میں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں مگر جب میں نے تھوڑی سی کتابیں پڑھ ڈالیں تو مجھے اس کا ڈھب آ گیا اور کم سے کم اتنا ہو گیا کہ میں گفتگو کا سلسلہ جاری رکھ سکتا تھا اور عمومی موضوعوں سے اپنی ناواقفیت کا اظہار نہیں ہونے دیتا تھا۔ چنانچہ ہم نٹشے کے فلسفے، جس کا ان دنوں کیمبرج میں زور تھا، برنارڈ شا کے دیباچوں اور لوئیس ڈکنسن کی نئی کتابوں پر بحث کیا کرتے تھے۔ ہم اپنے آپ کو بہت پختہ کار سمجھتے تھے۔ عورت مرد کے تعلق اور اخلاقی مسئلوں کا ذکر اس طرح کرتے تھے گویا ہم عام معیار سے بہت اونچے ہیں اور ایوان بلاک، ہیولاک ایلیس، کرافٹ ایبنگ، آٹو وائیننگر کے حوالے اس بے پروائی سے دیتے تھے جیسے ان کی سب کتابیں چاٹے بیٹھے ہیں۔ اپنے نزدیک ہم اس موضوع سے اتنی واقفیت رکھتے تھے جتنی ایک غیر ماہر فن کو ہونی چاہیے۔

مگر سچ پوچھئے تو اس قدر بڑھ بڑھ کے باتیں بنانے کے باوجود ہم میں سے اکثر جنسی معاملات میں کچے اور جھینپو تھے۔ کم سے کم میرا یہی حال تھا اور بہت عرصے تک یعنی کیمبرج چھوڑنے کے بعد تک جنسی مسائل کے متعلق میری واقفیت محض نظری پہلو تک محدود رہی اس کی وجہ بتانا ذرا مشکل ہے۔ ہم میں سے اکثر میں جنسی رغبت بہت قوی تھی اور گناہ کا خیال شاید ہی کسی کو ہو۔ مجھے تو بالکل نہیں تھا۔ مذہب کی روک کو اس میں مطلق دخل نہ تھا۔ ہم لوگ ان چیزوں کو غیر اخلاقی کہا کرتے تھے یعنی نہ اچھی نہ بری۔ مگر باوجود ان سب باتوں کے کچھ تو میرے شرمیلے پن نے اور کچھ اس کراہت نے جو عشق بازی کے مروجہ طریقوں کو دیکھ کر ہوتی تھی، مجھے روکے رکھا۔ میں ان دنوں بہت شرمیلا تھا شاید اس سبب سے کہ میرا بچپن تنہائی میں گذرا تھا۔

میرا عام تصور زندگی اس زمانے میں ایک طرح کی دھندلی سی لذت پرستی تھی جس میں کچھ تو جوانی کی ترنگ شامل تھی اور کچھ آسکر وائلڈ اور والٹر پیٹر کا اثر۔ لطف و مسرت کی خواہش کا موٹا سا فلسفیانہ نام رکھ دینا سہل ہے مگر اصل میں میرا مقصد لذت پرستی سے اونچا تھا۔ اس لئے کہ عیش و آرام کی زندگی سے مجھے کوئی خاص رغبت نہیں تھی۔ بات یہ تھی کہ میری طبیعت میں مذہبی رنگ نہیں تھا اور میں مذہب کی سختیوں کو ناپسند کرتا تھا اس لئے ظاہر ہے کہ مجھے کوئی اور معیار زندگی تلاش کرنا تھا۔ مگر میری نظر بالکل سطحی تھی اور میں کسی چیز کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس لئے زندگی کے جمالی پہلو نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور یہ بات دل کو لگتی ہوئی معلوم ہوئی کہ انسان عامیانہ طریقے سے دنیا کی لذتوں پر نہ گرے بلکہ اپنا وقار قائم رکھے مگر اسی کے ساتھ ہر طرح کی نعمتوں کے مزے لیتا رہے اور بھری پُری وسیع اور ہمہ گیر زندگی بسر کرے۔ میں زندگی کا لطف اٹھاتا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس میں گناہ کی کیا بات ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ خطرے کی زندگی اور منچلے پن کے کام بھی میرے لئے ایک خاص کشش رکھتے تھے، مجھے اپنے والد کی طرح ہمیشہ جوا کھیلنے کا شوق رہا، پہلے

وپے کا داؤ لگاتا تھا پھر زندگی کے بڑے بڑے مقاصد کی بازی لگنے لگا۔ ۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۷ء میں ہندوستان کی سیاست سخت ہیجان کی حالت میں تھی اور میں اس میں بہادری سے حصہ لینے کی آرزو رکھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ راہ کوئی آرام کی راہ نہیں تھی۔ ان ملی جلی خواہشوں کی وجہ سے، جو کبھی کبھی آپس میں لڑ بھی جاتی تھیں، میرے خیالات کچھ عجیب طرح سے گڈ مڈ ہو گئے تھے۔ مگر باوجودیکہ میرے خیالات دھندلے اور الجھے ہوئے تھے۔ مجھے کوئی خاص پریشانی نہیں تھی اس لئے کہ فیصلے کا زمانہ ابھی دور تھا۔ اس وقت تو میں جسمانی حیثیت سے اور ذہنی حیثیت سے بھی بڑی خوش گوار زندگی بسر کر رہا تھا۔ زندگی کے نئے نئے منظر میری نظر سے گذر رہے تھے۔ بہت کچھ کرنا تھا بہت کچھ دیکھنا تھا، بہت سے کوچوں کی سیر کرنی تھی۔ ہم جاڑوں کی لمبی راتوں میں آگ کے گرد بیٹھے اطمینان سے بات چیت اور بحث مباحثہ کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آگ بجھنے لگتی تھی اور ہم کانپتے ہوئے بستروں میں جا گھستے تھے۔ کبھی کبھی بحث کے دوران میں ہماری ہموار آوازیں بلند ہو جاتی تھیں اور ہم جوش میں آکر جھگڑنے لگتے تھے مگر یہ سب جھوٹ موٹ کی باتیں تھیں۔ ہم انسانی زندگی کے مسئلوں سے معمولی سنجیدگی سے کھیلتے تھے اس لئے کہ یہ بھی ہمارے لئے حقیقی مسئلے نہیں تھے اور ہم دنیا کے جھمیلوں میں نہیں پڑے تھے۔ یہ بیسویں صدی کے شروع کی، یعنی جنگ عظیم سے پہلے کی دنیا تھی۔ اس دنیا کا خاتمہ قریب تھا اور ایک دوسری دنیا پیدا ہونے کو تھی۔ ہلاکت اور تباہی اور مصیبت سے معمور، نوجوانوں کے دل کو درد و الم سے بھر دینے والی۔ مگر یہ انقلاب ابھی تک مستقبل کے پردے میں چھپا ہوا تھا اور ہمیں اپنے آس پاس ترقی کا منظر دکھائی دیتا تھا جو بے فکروں کو خوش رکھنے کے لئے کافی تھا۔

میں نے لذت پرستی کا اور مختلف تصورات کا ذکر کیا ہے جن سے میں اُس زمانے میں متاثر تھا۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ میں ان چیزوں پر وضاحت سے غور کیا کرتا تھا سچ پوچھئے تو مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں معلوم ہوتی تھی کہ ان کا کوئی واضح اور معین تصور انسان کے ذہن میں ہو۔ یہ محض دھندلے سے خیالات تھے جو میرے دل میں آتے جاتے تھے اور اپنا تھوڑا بہت نقش چھوڑ جایا کرتے تھے۔ میں کبھی ان فکروں میں سر نہیں کھپاتا تھا۔ میرا سارا وقت پڑھائی کھیل اور تفریح میں گذرتا تھا اور میرے سکون میں خلل ڈالنے والی صرف ایک ہی چیز تھی یعنی ہندوستان کی سیاسی کشمکش۔ کیمبرج میں جن کتابوں کا اثر میرے سیاسی خیالات پر پڑا ان میں ٹاؤنسینڈ کی کتاب "ایشیا اور یورپ" بھی تھی۔

۱۹۰۷ء سے کئی سال تک ہندوستان میں ایک ہیجان کی سی کیفیت رہی۔ ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد پہلا موقع تھا کہ یہ ملک بدیسی حکومت کے آگے چپ چاپ سر جھکانے کے بجائے اس سے لڑنے پر آمادہ تھا۔ تلک کی جدوجہد اور ان کا قید ہونا، آروند گھوش کی کوشش اور بنگال کے لوگوں کا سودیشی اور بائیکاٹ کا حلف اٹھانا، ان واقعات کی خبریں انگلستان پہنچتی تھیں اور ہم ہندوستانیوں کے دلوں کو جوش سے بھر دیتی تھیں ہم سب کے سب تلک کے پیرو تھے جو ہندوستان میں انتہا پسند کہلاتے تھے۔

کیمبرج کے ہندوستانیوں کی ایک انجمن تھی جو "مجلس" کے نام سے مشہور تھی اس میں ہم اکثر سیاسی مسئلوں پر بحث کرتے تھے مگر نمائش کے طور پر۔ ساری کوشش پارلیمنٹ اور یونیورسٹی یونین کے طور طریقوں کی نقل میں صرف ہوتی تھی اور بحث کے مضمون کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی تھی۔ میں مجلس میں اکثر جایا کرتا تھا مگر تین برس کے زمانے میں شاید ہی کوئی تقریر کی ہو۔ میں اپنی جھجک اور جھینپ کو کسی طرح دور نہیں کر سکتا تھا۔ یہی مشکل مجھے اپنے کالج کی ڈیبیٹنگ سوسائٹی THE MAGPIE AND STUMP میں پیش آتی تھی۔ وہاں یہ قاعدہ تھا کہ جو ممبر پوری ٹرم تقریر نہ کرے اسے جرمانہ دینا پڑتا تھا چنانچہ میں نے اکثر جرمانہ دیا۔

مجھے یاد ہے کہ ایڈون مانٹیگو جو آگے چل کر وزیر ہند ہوئے اکثر کالج کی انجمن میں آیا کرتے تھے۔ وہ ٹرینٹی کالج کے قدیم طالب علم تھے اور کیمبرج کی طرف سے پارلیمنٹ میں ممبر تھے۔ انھیں کی زبان سے میں نے پہلی بار عقیدے کی جدید تعریف سُنی۔ یعنی اُس چیز کا ماننا جسے عقل نہ مانتی ہو اس لئے اگر عقل نے اسے تسلیم کر لیا تو پھر عقیدے کا سوال ہی نہیں رہتا۔ مجھ پر سائنس کے مطالعے کا بہت اثر تھا اور اسی اثر کی وجہ سے میں اپنی رائے کو قطعی سمجھتا۔ اس لئے کہ انیسویں صدی کے شروع کی سائنس، بہ خلاف آج کل کی سائنس کے اپنے آپ پر اور اپنی دنیا پر بڑا وثوق رکھتی تھی۔

"مجلس" میں بھی اور رنج کی گفتگو میں بھی ہندوستانی طالب علم اپنے ملک کی سیاست کا ذکر کرتے وقت اکثر سخت سے سخت الفاظ استعمال کرتے تھے یہاں تک کہ بنگال والے جو تشدد کے کام شروع کر رہے تھے ان کی تعریف سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ آگے چل کر میں نے دیکھا کہ یہی حضرات ہندوستان کی سول سروس کے ارکان ہائی کورٹ کے جج، بہت متین اور ثقہ وکیل وغیرہ بن گئے۔ ان قائلین کے شیروں میں بہت کم ایسے نکلے جنھوں نے آگے چل کر ہندوستانی سیاست میں کچھ موثر حصہ لیا ہو۔

اس زمانے کے بعض مشہور ہندوستانی سیاسی ہمارے یہاں کیمبرج میں آئے۔ ہم لوگ ان سے ادب سے پیش آئے مگر اس میں ایک جھلک برتری کے احساس کی بھی تھی۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہماری ذہنی تربیت کا دائرہ بڑا ہے اور ہم ہر چیز کو زیادہ وسیع نظر سے دیکھتے ہیں، جو حضرات ہمارے یہاں تشریف لائے اُن میں بپن چندر پال، لالہ لاجپت رائے اور گوکھلے بھی تھے۔ بپن پال سے ملنے کے لئے ہم میں سے کسی کے نشست کے کمرے میں سب ہندوستانی طالب علم جمع ہوئے۔ ہماری تعداد ایک درجن سے زیادہ نہ تھی مگر بپن بابو اس طرح گرج رہے تھے جیسے دس ہزار کے مجمع میں تقریر کر رہے ہوں۔ آواز کا گھن اس



قیامت کا تھا کہ میں ان کے الفاظ مشکل سے سمجھ سکتا تھا۔ لالہ جی کا انداز گفتگو زیادہ معقول تھا اور مجھ پر اس کا اثر ہوا۔ میں نے والد کو لکھا کہ مجھے لالہ جی کی تقریر بپن پال کی تقریر سے زیادہ پسند آئی۔ وہ اس سے خوش ہوئے کیوں کہ ان دنوں بنگال کے انتہا پسند کچھ [illegible] سمجھے جاتے تھے۔ گوکھلے نے کیمبرج میں عام جلسے میں تقریر کی اور مجھے اس جلسے کی جو بات خاص طور پر یاد ہے وہ عبدالمجید خواجہ کا ایک سوال تھا جو انھوں نے گوکھلے کی تقریر کے بعد پوچھا۔ خواجہ نے ہال کے بیچ میں کھڑے ہوکر ایک طول طویل سوال چھیڑ دیا جس کا سلسلہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ ہم میں سے اکثر یہ بھول گئے کہ بات کیا تھی [illegible] کیا پوچھی گئی تھی۔

ہندوستانیوں میں ہردیال کی بڑی شہرت تھی مگر وہ آکسفورڈ میں تھے اور وہ بھی میرے کیمبرج کے زمانے سے پہلے۔ جن دنوں میں ہیرو میں تھا ان سے ایک دو مرتبہ لندن میں ملاقات ہوئی۔

میرے کیمبرج کے ساتھیوں میں کئی آدمی تھے جنھوں نے آگے چل کر ہندوستان میں کانگریس کے کاموں میں نمایاں حصہ لیا۔ ج۔ م۔ سین گپتا میرے کیمبرج پہنچنے کے تھوڑے دن بعد وہاں سے رخصت ہوگئے۔ سیف الدین کچلو، سید محمود اور تصدق احمد خاں شیروانی، کم و بیش میرے ہم عصر تھے۔ شاہ محمد سلیمان بھی جو اب الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہیں میرے زمانے میں وہاں پڑھتے تھے۔ میرے اور ہم عصر سول سروس کے رکن یا وزیر بن کر چلے گئے۔

لندن میں ہم شیام جی کرشن ورما اور ان کے انڈیا ہاؤس کا ذکر سنا کرتے تھے مگر مجھ سے ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ کبھی کبھی ان کا رسالہ INDIAN SOCIOLOGIST ہماری نظر سے گذرتا تھا۔ ایک عرصے کے بعد یعنی ۱۹۲۶ء میں مجھے شیام جی سے جنیوا میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان کی جیب میں اب تک INDIAN SOCIOLOGIST کی پرانی کاپیاں بھری ہوئی تھیں اور وہ ہر شخص کو جو ان کے قریب آتا تھا برطانوی حکومت کا جاسوس جانتے تھے۔ لندن میں طالب علموں کا ایک مرکز بھی تھا جو انڈیا آفس نے قائم کیا تھا۔ اس کو ہم سب لوگ ہندوستانی طالب علموں کی مخبری کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے اور یہ خیال بڑی حد تک بجا تھا۔ مگر بہت سے ہندوستانیوں کو چار و ناچار اس سے واسطہ رکھنا پڑتا تھا اس لئے کہ اس کی سفارش کے بغیر یونیورسٹیوں میں داخلہ قریب قریب ناممکن ہوگیا تھا۔

ہندوستان کی سیاسی حالت نے میرے والد کو بھی عملی سیاست میں کھینچ لیا۔ میں اس سے خوش تھا اگرچہ مجھے ان کے سیاسی اصولوں سے اتفاق نہیں تھا۔ وہ قدرتی طور پر اعتدال پسندوں کے ساتھ شریک ہو گئے جن میں سے اکثر ان کے دوست اور وکالت میں ان کے رفیق کار تھے۔ انھوں نے اپنے صوبے کی ایک کانفرنس میں صدارت کی اور اپنی تقریر میں بنگال اور مہاراشٹر کے انتہا پسندوں کی بڑی سختی سے مخالفت کی۔ وہ صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی کے صدر بھی منتخب ہوگئے۔ ۱۹۰۷ء میں وہ سورت کے اجلاس میں موجود تھے جس میں کانگریس دو ٹکڑے ہوگئی اور اس کے بعد خاص اعتدال پسند جماعت بن گئی۔

سورت کے جلسے کے بعد ہی ۱۹۰۷ء میں [illegible] انھوں نے جو کتاب ہندوستان کے متعلق لکھی [illegible] "سکاوت کے سوا دو ہر معاملے میں اعتدال پسند [illegible] بالکل غلط تھا۔ والد کسی چیز میں اعتدال پسند نہ تھے بجز سیاست کے اور [illegible] ان کی طبیعت [illegible] یعنی رفتہ رفتہ یہ رہا سہا اعتدال بھی غائب ہوگیا۔ ان جیسے [illegible] جوشیلے [illegible] مغرور طبیعت اور مضبوط ارادے کا آدمی اعتدال پسندی سے کوسوں دور تھا۔ پھر بھی ۱۹۰۷ء [illegible] ۱۹۰۸ء میں اور اس کے کئی سال بعد تک وہ [illegible] اعتدال پسند [illegible] انتہا پسندوں کے سخت مخالف رہے اگرچہ میرے خیال میں تلک کے وہ قائل تھے۔

اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ان کے ذہن کی تربیت قانون اور دستور کی بنیادوں پر ہوئی تھی اس لئے وہ قدرتی طور پر ہر چیز کو قانونی اور آئینی نقطہ نظر سے دیکھتے تھے۔ اپنی [illegible] کی بدولت انھوں نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ سخت [illegible] جب تک کہ عمل بھی زبان کا ہم رنگ نہ ہو اور موثر عمل کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ [illegible] اور بائیکاٹ سے کچھ کام چلتا معلوم نہیں ہوتا تھا اور پھر ان تحریکوں کی تہ میں مذہبی [illegible] قومیت تھی جو ان کی طبیعت کے بالکل خلاف تھی۔ وہ ہندوستان کی قدیم تہذیب کو زندہ کرنے کے حامی نہیں تھے۔ نہ وہ اسے سمجھ سکتے تھے اور نہ وہ اس سے ہمدردی رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک ذات پات کی پابندی اور بہت سی اور قدیم رسمیں رجعت پسندی کی دلیل تھیں۔ وہ انھیں سخت ناپسند کرتے تھے۔ ان کی نظر میں مغرب [illegible] کی ترقی نے ان کے دل کو موہ لیا تھا اور ان کا یہ خیال تھا کہ مغرب کے تعلق کی بدولت ہم بھی ترقی کرسکیں گے۔

سماجی حیثیت سے دیکھئے تو ۱۹۰۷ء میں ہندوستانی قومیت کا نئے سرے سے ابھرنا کھلی ہوئی رجعت پسندانہ تحریک تھی جیسا کہ مشرق کے اور ملکوں میں ہوا تھا۔ ہندوستان میں بھی قومیت کی نئی تحریک لازمی طور پر مذہبی چیز بن گئی۔ اعتدال پسندوں کی جماعت سماجی معاملات میں زیادہ آزاد خیال تھی مگر اس میں صرف اونچے طبقے کے مٹھی بھر آدمی تھے جنھیں عام لوگوں سے کسی قسم کا تعلق نہیں تھا۔ یہ حضرات معاشی مسئلوں پر جو کچھ غور کرتے تھے وہ صرف اونچے اوسط طبقے کے لحاظ سے جس کے ایک حصے کے یہ نمائندے تھے اور جس کی ترقی پیش نظر مقصود تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی سماجی اصلاحوں کی کوشش کررہے تھے تاکہ ذات پات کی بندشیں ڈھیلی ہوں اور پرانی رسمیں جو ترقی کی راہ میں حائل ہیں موقوف ہوجائیں۔

اعتدال پسندوں کے ساتھ شریک ہوکر والد نے جارحانہ طرز عمل اختیار کیا۔ بنگال

اور پونا کے چند لیڈروں کو چھوڑ کر اکثر انتہا پسند نوجوان تھے اور والد کو نہایت ناگوار تھا کہ یہ کل کے چھوکرے الگ راہ پر چلنے کی جرأت کرتے ہیں۔ وہ مخالفت کو برداشت نہیں کرسکتے تھے اور جن لوگوں کو احمق سمجھتے تھے ان کے ساتھ نبھانا ان کے لئے غیر ممکن تھا۔ انھیں ان لوگوں سے لڑنے میں لطف آتا تھا اور جہاں موقع پایا حملہ کر دیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ کیمبرج سے رخصت ہونے کے بعد میں نے ان کا ایک مضمون پڑھا جس سے مجھے بہت تکلیف ہوئی۔ میں نے انھیں کسی قدر گستاخی کے لہجے میں خط لکھا جس میں چبھتا ہوا فقرہ تھا کہ برطانوی حکومت یقیناً آپ کے سیاسی کاموں سے بہت خوش ہوگی یہی باتیں تھیں جن پر انھیں بے حد طیش آجاتا تھا وہ مجھ سے خفا ہوگئے اور قریب تھا کہ مجھے فوراً انگلستان سے واپس آنے کا حکم دیں۔

کیمبرج کے قیام کے زمانے میں یہ سوال اٹھا کہ مجھے کونسا پیشہ اختیار کرنا چاہئے کچھ دن انڈین سول سروس کا خیال رہا کیونکہ اس وقت تک یہ بڑی چیز سمجھی جاتی تھی مگر یہ تجویز نہ والد کو پسند تھی اور نہ مجھ کو اس لئے ترک کردی گئی۔ میرے خیال میں اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ میری عمر سول سروس کے مقررہ معیار سے کم تھی اور اگر میں اس کا امتحان دینا چاہتا تو مجھے سند لینے کے بعد انگلستان میں تین چار برس اور قیام کرنا پڑتا۔ جب میں نے کیمبرج سے سند حاصل کی تو میری عمر بیس برس کی تھی اور سول سروس کے امتحان کے لئے اس زمانے میں ۲۲ سے ۲۴ سال تک کی قید تھی اور پھر کامیابی کے بعد ایک سال اور ٹھہرنا پڑتا تھا۔ میرے عزیز میرے انگلستان کے طویل قیام سے گھبرا گئے تھے اور چاہتے تھے کہ میں جلد لوٹ آؤں۔ ایک اور وجہ جو والد کے نزدیک اہمیت رکھتی تھی یہ تھی کہ اگر مجھے سول سروس میں جگہ ملتی تو گھر سے دور مختلف مقامات پر رہنا پڑتا لیکن والد اور والدہ دونوں اتنے عرصے کی جدائی کے بعد مجھے اپنے پاس ہی رکھنا چاہتے تھے۔ غرض فیصلہ یہ ہوا کہ میں اپنا آبائی پیشہ یعنی بیرسٹری اختیار کروں اور میں انر ٹمپل میں داخل ہوگیا۔

یہ عجیب بات ہے کہ سیاست میں تو میری انتہا پسندی روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ مگر سول سروس کی ملازمت یعنی ہندوستان میں برطانوی حکومت کی مشین کا ایک پرزہ بن جانے کی تجویز مجھے کچھ زیادہ ناپسند نہ تھی۔ چند سال کے بعد یہ خیال مجھے بہت مکروہ معلوم ہونے لگا۔

۱۹۱۰ء میں میں کیمبرج سے سند لے کر رخصت ہوگیا۔ میں نے سائنس کے سندی امتحان میں اوسط درجے کی کامیابی حاصل کی یعنی سیکنڈ کلاس آنرس پائے۔ اس کے بعد دو برس تک لندن میں سرگشت کرتا رہا۔ قانون کے مطالعے میں مجھے بہت کم وقت صرف کرنا پڑتا تھا۔ بیرسٹری کے امتحانات میں نے ایک ایک کرکے پاس کرلئے اور بہت اچھا نہیں تو بہت برا بھی نہیں رہا۔ اور باتوں کے لحاظ سے میری زندگی بغیر کسی مقصد کے گذر رہی تھی۔ اِدھر اُدھر کی کتابیں پڑھ کر وقت کاٹتا تھا فیبین جماعت اور اشتراکیوں کے خیالات کا کچھ دھندلا سا اثر مجھ پر پڑ رہا تھا اور اس زمانے کی سیاسی تحریکوں کی طرف توجہ رہا کرتی تھی آئرستان کے مسئلے اور عورتوں کے ووٹ کی تحریک سے مجھے خاص طور پر دلچسپی تھی۔ ۱۹۱۰ء میں گرمی کی تعطیل میں آئرستان جانے کا اتفاق ہوا اور سن فین جماعت کا، جو نئی نئی قائم ہوئی تھی، اثر دل پر لے کر آیا۔

لندن میں ہیرو کے چند پرانے دوست مل گئے اور ان کی صحبت میں فضول خرچی کی عادت پڑگئی۔ میرے والد مجھے بہت معقول جیب خرچ دیتے تھے مگر میں اکثر اس سے زیادہ خرچ کر ڈالتا تھا۔ میرے والد بہت گھبرائے کہ لڑکا تباہی کے گڑھے میں گر رہا ہے۔ مگر میں اصل میں یہ کارنمایاں انجام نہیں دے رہا تھا بلکہ صرف اُن کا منہ کے پورے آنکھ کے اندھے انگریزوں کی تقلید کی کوشش کر رہا تھا جو "لندن کے چھیلے" کہلاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ عیش وآرام کی اس بے معنی زندگی سے مجھے کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچا۔ میرا جوش بہت جلد ٹھنڈا ہوگیا۔ البتہ میری خود بینی اور بڑھ گئی۔

تعطیل کے زمانے میں کبھی کبھی میں یورپ کے اور ملکوں کا سفر بھی کیا کرتا تھا ۱۹۰۹ء کی گرمیوں میں جب کاؤنٹ زیپلن' فریڈرش ہافن سے اپنے نئے ہوائی جہاز میں اڑکر برلن آئے تو میں اور والد برلن میں موجود تھے۔ میرے خیال میں یہ زیپلن کی پہلی لمبی اڑان تھی اس لئے اس کے اعزاز میں بڑا زبردست مظاہرہ کیا گیا اور خود قیصر نے باضابطہ طور پر اس کا استقبال کیا۔ بہت بڑا مجمع جس کا اندازہ دس لاکھ اور بیس لاکھ کے درمیان کیا جاتا تھا برلن کے ٹمپل ہوف کے میدان میں اکٹھا تھا۔ زیپلن مقررہ وقت پر پہنچا اور خوبصورتی کے ساتھ ہمارے سروں پر منڈلاتا رہا۔ ہوٹل آدلان نے اس روز اپنے ہر مہمان کو کاؤنٹ زیپلن کی ایک نہایت عمدہ تصویر تحفے کے طور پر دی اور میرے پاس یہ تصویر اب تک موجود ہے۔ اس کے دو مہینے کے بعد ہم نے پیرس میں ایک طیارے کو پہلے پہل سارے شہر کا چکر لگاتے اور ایفل ٹاور کے گرد منڈلاتے دیکھا اس کے چلانے والے کا نام میرے خیال میں کونت دولا بیر تھا۔ اتفاق سے اٹھارہ برس بعد جب لنڈبرگ بحر اوقیانوس کو پار کرکے چمکتے ہوئے تیر کی طرح پیرس پہنچا تو میں پھر وہیں موجود تھا۔

ایک بار ناروے میں بال بال بچ گیا۔ ۱۹۱۰ء میں کیمبرج سے سند لینے کے بعد میں وہاں ایک جماعت کے ساتھ سیر کرنے گیا تھا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ہم لوگ ایک پہاڑی خطے میں پیدل سفر کر رہے تھے۔ دن بھر کے تھکے ماندے اور گرمی سے پریشان ہم اپنی منزل پر یعنی ایک چھوٹے سے ہوٹل میں پہنچے اور پہنچتے ہی یہ کہا کہ ہم نہانا چاہتے ہیں وہاں نہانے کا کسی نے نام بھی نہیں سنا تھا اور ہوٹل میں اس کا کوئی انتظام نہیں تھا البتہ یہ معلوم ہوا کہ وہاں سے قریب ایک چشمہ ہے اور ہم چاہیں تو اس میں غسل کرسکتے ہیں چنانچہ ایک انگریز اور میں دو آدمی میز کی چادریں یا شاید ہاتھ منہ پونچھنے کے تولئے جو



ہوٹل والوں نے اپنی فیاضی سے عنایت کیے تھے لے کر وہاں پہنچے۔ یہ ایک پتلا سا نالہ تھا جو ایک قریب کی برف کی چٹان سے نکلا تھا۔ میں نے اس میں قدم رکھا تو گہرا نہ تھا مگر پانی برف کی طرح ٹھنڈا تھا اور اس کی تہ میں غضب کی پھسلن تھی۔ میں پھسل گیا اور سردی سے بے ہوش ہو گیا یعنی نہ تو کچھ حس باقی رہی اور نہ ہاتھ پاؤں پر قابو رہا۔ میں نے قدم جمانا چاہا مگر نہیں جما اور پانی مجھے تیزی سے بہا لے چلا۔ میرا انگریز ساتھی [illegible] پانی سے نکلا اور چشمے کے کنارے کنارے دوڑتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے میری ٹانگ پکڑ پائی اور مجھے کھینچ کر باہر نکالا۔ ہمیں اپنے خطرے کا اندازہ بعد میں ہوا [illegible] دو تین سو گز کے فاصلے پر یہ پہاڑی چشمہ بہت بڑی بلندی سے نیچے گرتا تھا اور ایک [illegible] بن جاتا تھا جو اس مقام کے دلچسپ مناظر میں شمار ہوتا تھا۔

۱۹۱۲ء کی گرمی میں میں نے بیرسٹری کی سند حاصل کر لی [illegible] میں سات برس کے قیام کے بعد انگلستان سے ہندوستان روانہ ہوا [illegible] تعطیل میں گھر آ چکا تھا مگر اب کی بار مستقل طور پر واپس آ رہا تھا۔ جب میں نے بمبئی میں قدم رکھا تو سوا خود بینی کے کوئی صفت مجھ میں نظر نہیں آتی تھی۔

میری شادی دہلی میں ۱۹۱۶ء میں ہوئی۔ بسنت پنچمی کا دن تھا جو ہندوستان میں موسم بہار کی آمد آمد کی خبر دیتا ہے۔ اس سال کی گرمیوں میں چند ہفتے کے لئے ہم کشمیر گئے۔ اپنے کنبے کے لوگوں کو تو میں نے نیچے وادی میں چھوڑا اور خود اپنے ایک رشتے کے بھائی کے ساتھ کئی ہفتے پہاڑوں پر گھومتا رہا اور لداخ والی سڑک پر بہت دور تک گیا۔

میں نے ان تنگ اور سنسان وادیوں کو جو دنیا میں سب سے اونچی ہیں اور جن کا سلسلہ تبت کی سطح مرتفع تک چلا گیا ہے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ درۂ زوجیلا کی چوٹی پر سے ایک طرف ہرے بھرے پہاڑ نظر آتے تھے اور دوسری طرف بے برگ و گیاہ چٹانیں۔ ہم اوپر چڑھتے چلے جا رہے تھے۔ اس تنگ وادی کے دونوں طرف سربفلک پہاڑ تھے جن کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں اور برف کے چشمے ہمارے استقبال کے لئے بڑھ رہے تھے۔ ان کی سرد ہوا تیر کی طرح لگتی تھی۔ دن میں دھوپ بھی خاصی تیز ہوتی تھی اور فضا اتنی صاف شفاف تھی کہ ہمیں اکثر چیزوں کے فاصلے کے متعلق دھوکا ہو جاتا تھا یعنی دور کی چیزیں بھی بالکل نزدیک معلوم ہوتی تھیں۔ ویرانی بڑھتی جاتی تھی یہاں تک کہ آگے چل کر سبزے اور درختوں نے بھی ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔ صرف کھُرّی پہاڑیاں رہ گئیں یا برف۔ البتہ کہیں کہیں پھول نظر آتے تھے۔ جن کو دیکھ کر دل خوش ہو جاتا۔ مجھے فطرت کے ان ویران اور سنسان رقبوں میں عجیب لطف آتا تھا۔ میری رگوں میں زندگی کا خون دوڑ رہا تھا اور وجد کا عالم طاری تھا۔

اس سفر میں ایک عجیب ہیجان خیز واقعہ پیش آیا۔ جب ہم درۂ زوجیلا سے آگے بڑھے تو ایک مقام پر جسے شاید متایان کہتے ہیں یہ معلوم ہوا کہ امرناتھ کا غار یہاں سے صرف آٹھ میل ہے۔ اگرچہ بیچ میں ایک برف پوش پہاڑ حائل تھا اور اسے عبور کرنا تھا لیکن ہم نے سوچا کہ آٹھ میل کی بھلا کیا حقیقت ہے۔ اپنے جوش اور ناتجربہ کاری کی بنا پر ہم نے وہاں تک پہنچنے کی کوشش کرنا چاہی۔ ہم اپنے کیمپ سے جو [illegible] ہزار فٹ کی بلندی پر تھا روانہ ہو گئے اور ایک چھوٹی سی جماعت کے ساتھ پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ اسی جگہ کا ایک چرواہا ہمارا رہبر تھا۔

ہماری کمر میں رسی بندھی تھی اور اس کی مدد سے ہم برف کی چٹانوں پر چڑھتے چلے جا رہے تھے۔ [illegible] مشکلیں بڑھنی شروع ہوئیں اور سانس لینے میں دقت ہونے لگی۔ قلیوں پر اگرچہ بہت کم بوجھ تھا لیکن ان میں سے بعض خون تھوکنے لگے۔ اب برف پڑنی شروع ہوئی اور پہاڑوں پر بڑی ڈھلان پر پھسلنے لگے۔ ہم تھک کر پست ہو چکے تھے اور ایک ایک قدم اٹھانے کے لئے خاص کوشش کرنی پڑتی تھی۔ پھر بھی ہم اپنی احمقانہ حرکت سے باز نہ آئے۔

اپنے کیمپ سے صبح ۴ بجے روانہ ہوئے تھے [illegible] برف سے ڈھکا ہوا ایک وسیع میدان نظر پڑا [illegible] برف کی چوٹیاں اس کے چاروں طرف سر نکالے کھڑی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ [illegible] موتیوں کا تاج رکھا ہے یا دیوتاؤں کا گول گھر ہے [illegible] برف اور کہر کی وجہ سے بہت جلد یہ منظر ہماری نظروں سے پوشیدہ ہو گیا۔ [illegible] کہ جس مقام پر ہم تھے اس کی بلندی کیا تھی؟ [illegible] فٹ سے کم نہ ہوگی کیونکہ امرناتھ کے غار سے ہم بہت اونچائی پر تھے۔ اب ہمیں اس برف کے میدان کو جو آدھ میل کے قریب تھا عبور کرنے کے بعد دوسری طرف اترنا تھا۔ ہم نے خیال کیا کہ اب چڑھائی ختم ہو گئی اس لئے ہماری مصیبتوں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ چنانچہ گو ہم تھک کر چور ہو گئے تھے لیکن کامیابی کی خوشی میں ہم نے سفر کی یہ دوسری منزل بھی شروع کر دی۔ اب بڑی نازک صورت پیش تھی کیونکہ قدم قدم پر کھڈ تھے اور تازہ برف سے بہت سی خطرے کی جگہیں ڈھک گئی تھیں۔ ایک دفعہ تو اس برف نے میری جان ہی لے لی ہوتی کیونکہ جیسے ہی میں نے اس پر قدم رکھا وہ دھنس گئی اور میں ایک خوفناک کھڈ میں جا پڑا۔ یہ اتنا زبردست اور گہرا تھا کہ اگر کوئی چیز اس کی تہ تک پہنچ جائے تو ہزارہا سال تک وہیں محفوظ رہ سکتی تھی۔ لیکن میری کمر میں رسی بندھی تھی۔ دوسرے میں کھڈ کی دیوار سے چمٹ گیا تھا۔ غرض بڑی مشکل سے مجھے باہر کھینچا گیا۔ اگرچہ اس واقعے سے ہماری ہمتوں نے بہت کچھ جواب دے دیا تھا۔ پھر بھی ہم اپنے ارادے پر قائم رہے اور آگے قدم بڑھایا۔ لیکن اب یہ کھڈ تعداد میں جتنے زیادہ بڑھتے جاتے تھے اتنی ہی ان کی وسعت اور گہرائی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ ہمارے پاس انہیں عبور کرنے کا کوئی سامان نہ تھا۔ اس لئے مجبوراً ہم تھکے ہارے اور مایوس واپس آئے اور امرناتھ کے غار کو دیکھنے کی حسرت ہی رہ گئی۔

کشمیر کی ان اونچی وادیوں اور پہاڑیوں نے میرا دل کچھ ایسا موہ لیا کہ میں نے ایک بار پھر یہاں آنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے بعد میں نے بارہا کشمیر جانے کی تجویزیں کیں اور طرح طرح سے سفر کے منصوبے باندھے لیکن کوئی پورا نہ ہوا۔ ایک تب یہ سوچا کہ تبت کی حیرت انگیز جھیل مانسرور اور کیلاش پہاڑ کو جو اس کے نزدیک ہی ہے، دیکھنے چلیں گے۔ اس خیال ہی سے میں پھولا نہ سماتا تھا۔ لیکن آج اس کو کوئی سترہ برس ہو گئے ہیں اور اب بھی میں مانسرور اور کیلاش سے اتنا ہی دور ہوں جتنا پہلے تھا۔ بلکہ اس قدر اشتیاق کے باوجود کشمیر جانا بھی نصیب نہ ہوا کیونکہ سیاسی اور قومی کاموں کے ہجوم میں گھرتا ہی چلا گیا۔ پہاڑوں پر چڑھنے یا سمندروں کو پار کرنے کے بجائے میری جہاں گردی کی خواہش مجھے جیل خانے لے آئی۔ لیکن اب بھی میں وہاں کے خیال سے اپنا دل بہلایا کرتا ہوں کیونکہ اس سے بھی ایک مسرت حاصل ہوتی ہے اور پھر اس کے سوا جیل خانے میں کام ہی کیا ہے۔ میں اس دن کا تصور کیا کرتا ہوں جب میں ہمالیہ کی سیر کرتا پھروں گا اور اسے پار کر کے اپنی محبوب جھیل اور پہاڑ پر پہنچ جاؤں گا، مگر اس عرصے میں زندگی کی دھوپ کہیں سے کہیں پہنچی، جوانی ڈھل چکی ہے اور ابھی اس سے بدتر وقت آنے والا ہے۔ اس لئے کبھی کبھی تو دل میں یہ مایوس کن خیال آنے لگتا ہے کہ کیلاش اور مانسرور دیکھنا میری قسمت میں نہیں ہے۔ شاید بڑھاپا اس کی اجازت نہ دے گا لیکن چاہے منزلِ مقصود نظر آئے یا نہ آئے سفر میں بجائے خود ایک لذت ہے والٹر ڈے لامیر نے سچ کہا ہے۔

" یہ پہاڑ میرے دل میں سمائے ہوئے ہیں
ان کے خطروں میں شام کے شفق سی رنگینی ہے
اور اب تک میری روح میری آنکھوں میں گُھلی ہوئی
تمہاری پرسکون برف کی تمنا میں تڑپ رہی ہے "

میں نے اپنے والد کو دو ہفتے کے بعد دیکھا۔ اس سے پہلے وہ ۱۲ جنوری کو مجھ سے ملنے نینی گئے تھے اور اسی وقت میں ان کی صورت دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ اب ان کی حالت اور بھی خراب تھی، چہرہ پہلے سے بھی زیادہ سوج گیا تھا۔ ان سے بات نہیں کی جاتی تھی اور ان کے حواس بھی بعض وقت ٹھیک نہیں رہتے تھے مگر ان کے ارادے کی مضبوطی کا وہی حال تھا اور اسی کی وجہ سے ان کا جسم اور دماغ کام کرتا رہا۔

وہ مجھے اور رنجیت کو دیکھ کر خوش ہوئے۔ دو ایک روز کے بعد رنجیت (جو ورکنگ کمیٹی کے زمرے میں نہیں آئے تھے) پھر نینی جیل بھیج دئے گئے۔ اس کا والد کو بہت قلق ہوا اور وہ بار بار انھیں پوچھتے اور شکایت کرتے کہ لوگ دو، دو، سے انھیں دیکھنے آتے ہیں مگر ان کا داماد ان سے چھڑا لیا گیا ہے۔ ڈاکٹروں کو ان کی اس بے چینی سے تشویش تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ یہ ان کے لئے اچھا نہیں ہے۔ تین چار روز کے بعد غالباً ڈاکٹروں کی تحریک سے صوبہ متحدہ کی حکومت نے رنجیت کو رہا کر دیا۔

۲۶ جنوری کو جس دن میری رہائی ہوئی گاندھی جی بھی یروادا جیل سے رہا کر دئے گئے۔ میرا بہت ہی چاہتا تھا کہ انھیں الٰہ آباد بلاؤں اور جب میں نے ان کی رہائی کا ذکر والد سے کیا تو انھوں نے بھی ان سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ دوسرے ہی دن گاندھی جی خیر مقدم کے ایک زبردست جلسے کے بعد، جیسا بمبئی میں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، بمبئی سے روانہ ہو گئے۔ وہ رات گئے الٰہ آباد پہنچے مگر والد ان کے انتظار میں جاگ رہے تھے۔ ان کے آنے سے اور تسلی کے چند کلموں سے جو انھوں نے کہے والد کو بہت سکون ہوا اور میری والدہ کو بہت ہی تسکین ہوئی۔

اس زمانے میں ورکنگ کمیٹی کے اصلی اور قائم مقام ممبر جو قید سے رہا ہوئے تھے بے کار بیٹھے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ جلسے کی کوئی اطلاع آئے۔ ان میں سے بہت سے والد کی طرف سے فکر مند تھے اور فوراً الٰہ آباد آنا چاہتے تھے چنانچہ یہ طے کیا گیا کہ جلسہ فوراً کیا جائے اور ان سب کو الٰہ آباد بلا لیا جائے۔ دو روز کے بعد ان میں سے تیس چالیس پہنچ گئے اور ان کا جلسہ سوراج بھون میں ہوا، جو ہمارے گھر سے ملا ہوا ہے۔ میں کبھی کبھی ان جلسوں میں جایا کرتا تھا مگر اس قدر بدحواس تھا کہ ان میں اچھی طرح حصہ نہیں لے سکتا تھا اور مجھے بالکل یاد نہیں کہ ان میں کیا فیصلہ کیا گیا۔ غالباً یہی طے ہوا کہ سول نافرمانی جاری رکھی جائے۔

یہ سب پرانے دوست اور رفیق جو وہاں موجود تھے، جن میں سے اکثر سیدھے جیل سے چھوٹ کر آئے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ کوئی دن میں پھر قید کر دئے جائیں گے والد سے مل کر انکو خدا حافظ کہنا چاہتے تھے۔ غالب خیال یہی تھا کہ اس کے بعد ان کی صورت دیکھنا نصیب نہیں ہوگا وہ صبح اور شام کے وقت دو دو تین تین کر کے آتے تھے اور والد بڑے اصرار سے آرام کرسی پر بیٹھ کر اپنے پرانے رفیقوں سے ملتے تھے۔ یوں تو وہ بُت بنے بیٹھے رہتے تھے اس لئے کہ انکے چہرے کی جو حالت تھی اس کی وجہ سے کوئی کیفیت ظاہر نہیں ہوتی تھی، مگر جب ان کے دوست اور رفیق ایک ایک کر کے آتے تو ان کی آنکھوں کی چمک سے ظاہر ہوتا کہ وہ انھیں پہچانتے ہیں ان کا سر کسی قدر جھک جاتا اور ان کے ہاتھ پرنام کرنے کے لئے جُڑ جاتے۔ انھیں بات کرنی مشکل تھی۔ پھر بھی وہ کبھی کبھی دو ایک لفظ کہہ دیتے تھے اور ان کی پرانی ظرافت اب تک باقی تھی۔ وہ ایک زخمی شیر کی طرح بیٹھے رہتے تھے۔ ان کی طاقت جواب دے چکی تھی مگر انکے چہرے سے شاہانہ جلال ٹپکتا تھا۔ میں انھیں دیکھ کر سوچا کرتا تھا کہ نہ جانے ان کے دل میں کیا کیا خیالات آتے ہوں گے۔ خدا معلوم انھیں ہماری جدوجہد میں کوئی دلچسپی باقی ہے یا نہیں؟ انکے چہرے سے اکثر ایک اندرونی کشمکش کے آثار ظاہر ہوتے تھے جیسے خیالات کا سلسلہ انکے قابو سے نکلا جاتا ہو اور وہ اسے پکڑنا چاہتے ہوں۔ یہ کشمکش آخر وقت تک جاری رہی اور انھوں نے ہار نہیں مانی۔ کبھی کبھی وہ بالکل ہوش و حواس کی باتیں کرنے لگتے تھے۔ اس وقت



بھی جب ان کے گلے سے بالکل آواز نہیں نکلتی تھی وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے کاغذ کے پرزوں پر لکھ دیتے تھے۔

انھیں ورکنگ کمیٹی کے جلسوں سے جو ہمارے مکان میں ہو رہے تھے۔ تقریباً کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ دو ہفتے پہلے انھیں ان چیزوں سے بہت جوش آتا مگر اب انھیں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ان سے بہت دور پہنچ گئے ہیں۔ انھوں نے ایک بار گاندھی جی سے کہا: "مہاتما جی میرا اب چل چلاؤ ہے۔ میں سوراج دیکھنے کے لئے نہیں رہوں گا مگر مجھے معلوم ہے کہ آپ نے لڑائی جیت لی اور سوراج آنے ہی والا ہے۔"

اکثر لوگ جو دوسرے شہروں اور صوبوں سے انھیں دیکھنے آئے تھے رخصت ہو گئے۔ صرف گاندھی جی اور چند خاص خاص دوست اور عزیز رہ گئے۔ تینوں مشہور ڈاکٹر یعنی مختار احمد انصاری، بدھان چندر رائے اور جیوراج مہتا جو ان کے پرانے دوست تھے اور جن کے متعلق وہ کہا کرتے تھے کہ میں نے اپنی جان ان کے سپرد کر دی ہے [illegible] تھے۔ [illegible] کی صبح کو ان کی طبیعت بظاہر کچھ سنبھل گئی اور یہ طے کیا گیا کہ اس سے فائدہ اٹھا کر انھیں لکھنؤ لے جائیں جہاں ایکسرے کے علاج کے لئے الہ آباد سے زیادہ سہولتیں موجود تھیں۔ [illegible] انھیں موٹر سے لکھنؤ لے گئے اور گاندھی جی مع اور بہت سے لوگوں کے ہمارے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔ ہم بہت آہستہ آہستہ جا رہے تھے مگر پھر بھی وہ بہت مضمحل ہو گئے۔ دوسرے دن بظاہر ان کی تکان دور ہو گئی مگر اور آثار کچھ اچھے نہ تھے۔ اگلے دن یعنی چھ فروری کو صبح تڑکے میں ان کی پٹی کے پاس بیٹھا تھا رات بھر انھیں بڑی تکلیف اور بے چینی رہی تھی۔ دفعتاً مجھے ان کے چہرے پر سکون کے آثار نظر آئے اور بے چینی کی کیفیت دور ہو گئی۔ میں یہ سمجھ کر خوش ہوا کہ انھیں نیند آ گئی ہے مگر میری والدہ حقیقت کو سمجھ گئیں اور چیخ کر رونے لگیں۔ میں نے ان سے التجا کی کہ خاموش رہئے۔ ان کو نیند آ گئی ہے۔ مگر یہ نیند ان کی آخری نیند تھی جس سے انھیں کوئی نہیں جگا سکتا تھا۔

ہم اسی دن ان کی لاش موٹر سے الہ آباد لے گئے۔ میں اسی گاڑی میں بیٹھا تھا اور [illegible] چلا رہا تھا۔ والد کا معتمد خدمتگار ہری بھی ہمارے ساتھ تھا۔ دوسری گاڑی میں والدہ اور گاندھی جی تھے۔ اس کے پیچھے اور گاڑیوں کا سلسلہ تھا میری عقل خبط تھی اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ہو گیا۔ مسلسل واقعات اور لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے میں کچھ سوچ نہیں سکتا تھا لکھنؤ میں لوگوں کا زبردست مجمع جو یہ خبر سنتے ہی اکٹھا ہو گیا تھا، لاش کو قومی جھنڈے میں لپیٹ کر موٹر میں جس پر ایک بڑا سا جھنڈا لگا ہوا تھا، لکھنؤ سے الہ آباد لے جانا، الہ آباد پہنچنا، تعزیت کرنے والوں کا ہجوم جو میلوں تک پھیلا گیا تھا، یہ سب باتیں مجھے خواب سی یاد ہیں۔ گھر پر کچھ رسمیں ادا کی گئیں اور اس کے بعد آرتھی بے شمار مجمع کے ساتھ گنگا کی طرف روانہ ہوئی۔ جاڑے کی شام تھی اندھیرا چھا رہا تھا، گنگا کے کنارے بڑے بڑے شعلے اٹھ رہے تھے اور اس جسم کو جلا کر خاک کر رہے تھے جو ہم خاندان والوں کو اور ہندوستان کے [illegible] عزیز تھا۔ گاندھی جی نے مجمع کو مخاطب کر کے ایک چھوٹی سی تقریر کی اور [illegible] کے بعد ہم سب خاموشی سے اپنے اپنے گھر چلے آئے۔ آسمان پر ستارے جھلملا رہے تھے [illegible]

[illegible] اور ہم سب کو [illegible] صدمے کے برداشت کرنے میں [illegible] وہ گاندھی جی کی موجودگی تھی۔ [illegible] دلوں کو تسکین دینے اور شکستہ دلوں کو جوڑنے کی عجیب و غریب قوت ہے۔ مجھے کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ والد ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ تین مہینے کے بعد [illegible] کے ساتھ لنکا گیا ہوا تھا [illegible] اطمینان کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ دفعتاً مجھے خیال آیا کہ والد کو یہاں کی [illegible] بہت تھکے ہوئے ہیں کچھ دن آرام کر لیں گے۔ میں ان کے نام [illegible] لکھتے لکھتے رہ گیا۔

لنکا سے الہ آباد واپس آنے کے بعد ایک دن ڈاک میں ایک عجیب خط آیا۔ لفافہ پر میرا پتہ والد کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا اور خدا جانے کن کن ڈاکخانوں کی بہت سی مہریں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے بڑی حیرت سے اسے کھولا تو معلوم ہوا کہ واقعی والد کا خط ہے جو ۲۸ فروری ۱۹۲۶ء کا لکھا ہوا ہے۔ یہ مجھے ۱۹۳۱ء کے وسط میں یعنی ساڑھے پانچ سال کے بعد ملا۔ والد نے یہ خط ۱۹۲۶ء میں میرے اور کملا کے یورپ روانہ ہونے سے ایک روز پہلے احمد آباد سے لکھا تھا اور اطالوی لائڈ کمپنی کے اس جہاز کے پتے سے جس سے ہم روانہ ہونے والے تھے، بمبئی بھیجا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاز کی روانگی کے بعد پہنچا اور پھر خدا جانے کہاں کہاں پھرتا رہا۔ یہاں تک کہ کسی منچلے نے میرے پاس بھیج دیا۔ عجیب بات ہے کہ یہ الوداعی خط [illegible]

۴ ستمبر ۱۹۳۵ء کو میں دفعتاً الموڑہ کی جیل سے رہا کر دیا گیا۔ اس لئے کہ خبر آئی تھی کہ میری بیوی کی حالت بہت نازک ہے۔ وہ یہاں سے بہت دور جرمنی کے بلیک فارسٹ میں باڈن وائلر کی صحت گاہ میں مقیم تھیں۔ میں [illegible] سے سڑک کے راستے الہ آباد اور اسی روز سہ پہر کو ہوائی جہاز سے یورپ روانہ ہو گیا۔ ہوائی جہاز کراچی، بغداد، قاہرہ ہوتا ہوا اسکندریہ پہنچا۔ وہاں سے برنڈزی تک میں نے بحری جہاز میں اور برنڈزی سے سوئٹزرلینڈ کے شہر بال تک ریل میں سفر کیا۔ [illegible] اور الموڑہ جیل سے رہا ہونے کے چھٹے دن شب باڈن وائلر پہنچ گیا۔

کملا کے چہرے پر میں نے وہی اگلی سی مسکراہٹ پائی۔ مگر انھیں اتنی زیادہ کمزوری اور



پی وادیوں اور پہاڑیوں نے میرا دل کچھ ایسا موہ لیا کہ میں نے ایک بار پھر
اس کے بعد میں نے بارہا کشمیر جانے کی تجویزیں کیں اور طرح طرح سے مگر
پورا نہ ہوا۔ ایک تبر یہ سوچا کہ تبت کی حیرت انگیز جھیل مانسروور اور کیلاش پہاڑ کو جا کر
دیکھنے چلیں گے۔ اس خیال ہی سے میں پھولا نہ سماتا تھا۔ لیکن آج
ہو گئے ہیں اور اب بھی میں مانسرور اور کیلاش سے اتنا ہی دور
اس قدر اشتیاق کے باوجود کشمیر جانا بھی نصیب نہ ہوا کیونکہ سیاسی
میں گھرتا ہی چلا گیا پہاڑوں پر چڑھنے یا سمندروں کو پار کرنے
گردی کی خواہش مجھے جیل خانے لے آئی۔ لیکن اب بھی میں وہاں
بہلایا کرتا ہوں کیونکہ اس سے بھی ایک مسرت حاصل ہوتی ہے اور
نے میں کام ہی کیا ہے۔ میں اس دن کا تصور کیا کرتا ہوں جب
وں گا اور اسے پار کر کے اپنی محبوب جھیل اور پہاڑ پر پہنچ جاؤں گا،
ن کی دھوپ کہیں سے کہیں پہنچی، جوانی ڈھل چکی ہے اور ابھی اس
الا ہے۔ اس لئے کبھی کبھی تو دل میں یہ مایوس کن خیال آنے لگتا ہے
یقینا میری قسمت میں نہیں ہے۔ شاید بڑھاپا اس کی اجازت نہ دے گا
نظر آئے یا نہ آئے سفر میں بجائے خود ایک لذت ہے۔ وا لیئر
ہے۔

ز میرے دل میں سمائے ہوئے ہیں
کے خطروں میں شام کے شفق سی رنگینی ہے
ب تک میری روح میری آنکھوں میں کھلی ہوئی
پر سکون برف کی تمنا میں تڑپ رہی ہے"

رکو دو ہفتے کے بعد دیکھا، اس سے پہلے وہ ۱۲ جنوری کو مجھ سے ملنے
نت میں ان کی صورت دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ اب ان کی حالت
پہلے سے بھی زیادہ سوج گیا تھا۔ ان سے بات نہیں کی جاتی تھی اور
وقت ٹھیک نہیں رہتے تھے مگر ان کے ارادے کی مضبوطی کا دم
سے ان کا جسم اور دماغ کام کرتا رہا۔
کو دیکھ کر خوش ہوئے دو ایک روز کے بعد رنجیت (جو ورکنگ

کی حکومت نے رنجیت کو رہا کر دیا۔

۲۶ جنوری کو جس دن میری رہائی ہوئی گاندھی جی بھی یرواد اجیل سے رہا کر دیئے گئے۔ میرا بہت جی چاہتا تھا کہ انھیں الہ آباد بلاؤں اور جب میں نے ان کی رہائی کا ذکر والد سے کیا تو انھوں نے بھی ان سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ دوسرے ہی دن گاندھی جی خیر مقدم کے ایک زبردست جلسے کے بعد جیسا بمبئی میں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، بمبئی سے روانہ ہو گئے۔ وہ رات گئے الہ آباد پہنچے مگر والد ان کے انتظار میں جاگ رہے تھے۔ ان کے آنے سے اور تسلی کے چند کلموں سے جو انھوں نے کہے والد کو بہت سکون ہوا اور میری والدہ کو بہت ہی تسکین ہوئی۔

اس زمانے میں ورکنگ کمیٹی کے اصلی اور قائم مقام ممبر جو قید سے رہا ہوئے تھے، بے کار بیٹھے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ جلسے کی کوئی اطلاع آئے۔ ان میں سے بہت سے والد کی طرف سے فکرمند تھے اور فورا الہ آباد آنا چاہتے تھے۔ چنانچہ یہ طے کیا گیا کہ جلسہ فورا کیا جائے اور ان سب کو الہ آباد بلا لیا جائے۔ دو روز کے بعد ان میں سے تیس چالیس پہنچ گئے اور ان کا جلسہ سوراج بھون میں ہوا، جو ہمارے گھر سے ملا ہوا ہے۔ میں کبھی کبھی ان جلسوں میں جایا کرتا تھا مگر اس قدر بدحواس تھا کہ ان میں اچھی طرح حصہ نہیں لے سکتا تھا اور مجھے بالکل یاد نہیں کہ ان میں کیا فیصلہ کیا گیا۔ غالبا یہی طے ہوا کہ سول نافرمانی جاری رکھی جائے۔

یہ سب پرانے دوست اور رفیق جو وہاں موجود تھے، جن میں سے اکثر سیدھے جیل سے چھوٹ کر آئے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ کوئی دن میں پھر قید کر دیئے جائیں گے۔ والد سے مل کر انکو خدا حافظ کہنا چاہتے تھے۔ غالب خیال یہی تھا کہ اس کے بعد ان کی صورت دیکھنا نصیب نہیں ہوگا۔ وہ صبح اور شام کے وقت دو دو تین تین کر کے آتے تھے اور والد بڑے اصرار سے آرام کرسی پر بیٹھ کر اپنے پرانے رفیقوں سے ملتے تھے۔ یوں تو وہ بت بنے بیٹھے رہتے تھے اس لئے کہ انکے چہرے کی جو حالت تھی اس کی وجہ سے کوئی کیفیت ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ مگر جب ان کے دوست اور رفیق ایک ایک کر کے آتے تو ان کی آنکھوں کی چمک سے ظاہر ہوتا کہ وہ انھیں پہچانتے ہیں۔ ان کا سر کسی قدر جھک جاتا اور ان کے ہاتھ پرنام کرنے کے لئے جڑ جاتے۔ انھیں بات کرنی مشکل تھی۔ پھر بھی وہ کبھی کبھی دو ایک لفظ کہہ دیتے تھے اور ان کی پرانی ظرافت اب تک باقی تھی۔ وہ ایک زخمی شیر کی طرح بیٹھے رہتے تھے۔ ان کی طاقت جواب دے چکی تھی مگر انکے چہرے سے شاہانہ جلال ٹپکتا تھا۔ میں انھیں دیکھ کر سوچا کرتا تھا کہ نہ جانے ان کے دل میں کیسا کیسا



بھی جب ان کے گلے سے بالکل آواز نہیں نکلتی تھی وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے کاغذ کے پرچوں پر لکھ دیتے تھے۔

انھیں ورکنگ کمیٹی کے جلسوں سے جو برابر کے مکان میں ہو رہے تھے۔ تعجب یا کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ دو ہفتے پہلے انھیں ان چیزوں سے بہت جوش آتا مگر اب انھیں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ان سے بہت دور پہنچ گئے ہیں۔ انھوں نے ایک بار گاندھی جی سے کہا: "مہاتما جی میرا اب چل چلاؤ ہے۔ میں سوراج دیکھنے کے لئے نہیں رہوں گا مگر مجھے معلوم ہے کہ آپ نے لڑائی جیت لی اور سوراج آنے ہی والا ہے۔"

اکثر لوگ جو دوسرے شہروں اور صوبوں سے انھیں دیکھنے آئے تھے رخصت ہو گئے۔ صرف گاندھی جی اور چند خاص خاص دوست اور عزیز رہ گئے۔ تینوں مشہور ڈاکٹر یعنی مختار احمد انصاری، بدھان چندر رائے اور جیوراج مہتا جو ان کے پرانے دوست تھے اور جن کے متعلق وہ کہا کرتے تھے کہ میں نے اپنی جان ان کے سپرد کر دی ہے ... ساتھ۔ ۔۔ فروری کی صبح کو ان کی طبیعت بظاہر کچھ سنبھل گئی اور یہ طے کیا گیا کہ اس سے فائدہ اٹھا کر انھیں لکھنؤ پہنچائیں، جہاں ایکسرے کے علاج کے لئے الٰہ آباد سے زیادہ سہولتیں موجود تھیں۔ اسی دن ہم انھیں موٹر سے لکھنؤ لے گئے اور گاندھی جی مع اور بہت سے لوگوں کے ہمارے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔ ہم بہت آہستہ آہستہ جا رہے تھے مگر پھر بھی وہ بہت مضمحل ہو گئے۔ دوسرے دن بظاہر ان کی تکان دور ہو گئی مگر اور آثار کچھ اچھے نہ تھے۔ اگلے دن یعنی چھ فروری کو صبح تڑکے میں ان کی پٹی کے پاس بیٹھا تھا رات بھر انھیں بڑی تکلیف اور بے چینی رہی تھی۔ دفعتاً مجھے ان کے چہرے پر سکون کے آثار نظر آئے اور بے چینی کی کیفیت دور ہو گئی۔ میں یہ سمجھ کر خوش ہوا کہ انھیں نیند آ گئی ہے مگر میری والدہ حقیقت کو سمجھ گئیں اور چیخ کر رونے لگیں۔ میں نے ان سے التجا کی کہ خاموش رہیے۔ ان کو نیند آ گئی ہے۔ مگر یہ نیند ان کی آخری نیند تھی جس سے انھیں کوئی نہیں جگا سکتا تھا۔

ہم اسی دن ان کی لاش موٹر سے الٰہ آباد لے گئے۔ میں اسی گاڑی میں بیٹھا تھا اور رنجیت چلا رہا تھا۔ والد کا معتمد خدمتگار ہری بھی ہمارے ساتھ تھا۔ دوسری گاڑی میں والدہ اور گاندھی جی تھے۔ اس کے پیچھے اور گاڑیوں کا سلسلہ تھا میری عقل خبط تھی اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ہو گیا۔ مسلسل واقعات اور لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے میں کچھ سوچ نہیں سکتا تھا لکھنؤ میں لوگوں کا زبردست مجمع جو یہ خبر سنتے ہی اکٹھا ہو گیا تھا، لاش کو قومی جھنڈے میں لپیٹ کر موٹر میں جس پر ایک بڑا سا جھنڈا لگا ہوا تھا، لکھنؤ سے الٰہ آباد لے جانا، الٰہ آباد پہنچنا، تعزیت کرنے والوں کا ہجوم جو میلوں تک چلا گیا تھا، یہ سب باتیں مجھے خواب کی سی یاد ہیں۔ گھر پر کچھ رسمیں ادا کی گئیں اور اس کے بعد ارتھی بے شمار مجمع کے ساتھ گنگا کی طرف روانہ ہوئی۔ جاڑے کی شام تھی اندھیرا چھا رہا تھا، گنگا کے کنارے بڑے بڑے شعلے اٹھ رہے تھے اور اس جسم کو جلا کر خاک کر رہے تھے جو ہم خاندان والوں کو اور ہندوستان کے کروڑوں آدمیوں کو دل و جان سے عزیز تھا۔ گاندھی جی نے مجمع کو مخاطب کر کے ایک چھوٹی سی تقریر کی اور اس کے بعد ہم سب خاموشی سے اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے اور ہم تنہائی کا درد اور غم کا بوجھ دل پر سے ہوتے واپس آ رہے تھے۔

میری والدہ کے نام ہمدردی کے [illegible] پیغام آئے روزانہ [illegible] دن نے کی مناسب حالات میں ہمدردی کا اظہار کیا لوگوں کی بے پایاں دلسوزی اور ہمدردی سے ہمارے دلوں میں درد کی کسک کچھ کم ہوئی مگر سب سے زیادہ جس چیز نے میری والدہ کو اور ہم سب کو اس جانکاہ صدمے کے برداشت کرنے میں مدد دی وہ گاندھی جی کی موجودگی تھی۔ جن میں غمزدوں کو تسکین دینے اور شکستہ دلوں کو جوڑنے کی عجیب و غریب قوت ہے۔

مجھے کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ والد ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ تین مہینے بعد میں بیوی اور بیٹی کے ساتھ لنکا گیا ہوا تھا اور نوارا ایلیا میں چند روز کے لئے سکون و اطمینان کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ دفعتاً مجھے خیال آیا کہ والد کو یہاں کی آب و ہوا راس آئے گی لاؤ ان کو بلا بھیجیں۔ وہ بہت تھکے ہوئے ہیں کچھ دن آرام کر لیں گے۔ میں ان کے نام الٰہ آباد تار بھیجتے بھیجتے رہ گیا۔

لنکا سے الٰہ آباد واپس آنے کے بعد ایک دن ڈاک میں ایک عجیب خط آیا۔ لفافہ پر میرا پتہ والد کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا اور خدا جانے کن کن ڈاکخانوں کی بے شمار مہریں پڑی ہوئی تھیں میں نے بڑی حیرت سے اُسے کھولا تو معلوم ہوا کہ واقعی والد کا خط ہے مگر ۲۸ فروری ۱۹۲۶ء کا لکھا ہوا ہے۔ یہ مجھے ۱۹۳۱ء کے وسط میں یعنی ساڑھے پانچ سال کے بعد ملا۔ والد نے یہ خط ۱۹۲۶ء میں میرے اور کملا کے یورپ روانہ ہونے سے ایک روز پہلے احمد آباد سے لکھا تھا اور اطالوی لائڈ کمپنی کے اس جہاز کے پتے سے جس سے ہم روانہ ہونے والے تھے، بمبئی بھیجا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاز کی روانگی کے بعد پہنچا اور پھر خدا جانے کہاں کہاں پھرتا رہا۔ یہاں تک کہ کسی من چلے نے میرے پاس بھیج دیا۔ عجیب بات ہے کہ یہ الوداعی خط ...

۴ ستمبر ۱۹۳۵ء کو میں دفعتاً الموڑے کی جیل سے رہا کر دیا گیا اس لئے کہ خبر آئی تھی کہ میری بیوی کی حالت بہت نازک ہے۔ وہ یہاں سے بہت دور جرمنی کے بلیک فورسٹ میں باڈن وائلر کی صحت گاہ میں مقیم تھیں۔ میں موٹر کے ذریعہ سے سفر کر کے دوسرے دن الٰہ آباد اور اسی روز سہ پہر کو ہوائی جہاز سے یورپ روانہ ہو گیا۔ ہوائی جہاز کراچی، بغداد، قاہرہ ہوتا ہوا اسکندریہ پہنچا۔ وہاں سے برنڈزی تک میں نے بحری جہاز میں اور برنڈزی سے سوئٹزرلینڈ کے شہر بال تک ریل میں سفر کیا ... آباد سے روانہ ہونے کے پانچویں دن اور الموڑہ جیل سے رہا ہونے کے چھٹے دن میں باڈن وائلر پہنچ گیا۔

کملا کے چہرے پر میں نے وہی اگلی سی مسکراہٹ پائی۔ مگر انھیں اتنی زیادہ کمزوری اور

کشمیر کی ان اونچی اونچی وادیوں اور پہاڑوں نے میرا دل کچھ ایسا موہ لیا کہ میں نے ایک بار پھر یہاں آنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے بعد میں نے بارہا کشمیر جانے کی تجویزیں کیں اور طرح طرح کے منصوبے باندھے لیکن کوئی پورا نہ ہوا۔ ایک تجربہ سوچا کہ تبت کی حیرت انگیز جھیل مانسرور اور کیلاش پہاڑ کو جو اس کے نزدیک ہی ہے دیکھنے چلیں گے۔ اس خیال ہی سے میں پھولا نہ سماتا تھا۔ لیکن تب سے کوئی اٹھارہ برس ہو گئے ہیں اور اب بھی میں مانسرور اور کیلاش سے اتنا ہی دور ہوں جتنا پہلے تھا۔ باوجود اس قدر اشتیاق کے دوبارہ کشمیر جانا بھی نصیب نہ ہوا کیونکہ سیاسی اور قومی کاموں کے ہجوم میں گھرتا ہی چلا گیا۔ پہاڑوں پر چڑھنے یا سمندروں کو پار کرنے کے بجائے میری جہاں گردی کی خواہش مجھے جیل خانے لے آئی۔ لیکن اب بھی میں وہاں کے خیال سے اپنا دل بہلایا کرتا ہوں کیونکہ اس سے بھی ایک مسرت حاصل ہوتی ہے اور پھر اس کے سوا جیل خانے میں کام ہی کیا ہے۔ میں اس دن کا تصور کیا کرتا ہوں جب میں ہمالیہ کی سیر کرتا پھروں گا اور اسے پار کر کے اپنی محبوب جھیل اور پہاڑ پر پہنچ جاؤں گا۔ مگر اس عرصے میں زندگی کی دھوپ کہیں سے کہیں پہنچی، جوانی ڈھل چکی ہے اور ابھی اس سے بدتر وقت آنے والا ہے۔ اس لئے کبھی کبھی تو دل میں یہ مایوس کن خیال آنے لگتا ہے کہ کیلاش اور مانسرور دیکھنا میری قسمت میں نہیں ہے۔ شاید بڑھاپا اس کی اجازت نہ دے گا لیکن چاہے منزلِ مقصود نظر آئے یا نہ آئے سفر میں بجائے خود ایک لذت ہے۔ والٹر ڈی لا میر نے سچ کہا ہے۔

"یہ پہاڑ میرے دل میں سمائے ہوئے ہیں
ان کے خطروں میں شام کے شفق سی رنگینی ہے
اور اب تک میری روح میری آنکھوں میں کھلی ہوئی
تمہاری پرسکون برف کی تمنا میں تڑپ رہی ہے"

میں نے اپنے والد کو دو ہفتے کے بعد دیکھا۔ اس سے پہلے وہ ۱۲ جنوری کو مجھ سے ملنے نینی گئے تھے اور اسی وقت میں ان کی صورت دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ اب ان کی حالت اور بھی خراب تھی، چہرہ پہلے سے بھی زیادہ سوج گیا تھا۔ ان سے بات نہیں کی جاتی تھی اور ان کے حواس بھی بعض وقت ٹھیک نہیں رہتے تھے مگر ان کے ارادے کی مضبوطی کا وہی حال تھا اور اسی کی وجہ سے ان کا جسم اور دماغ کام کرتا رہا۔

وہ مجھے اور رنجیت کو دیکھ کر خوش ہوئے۔ دو ایک روز کے بعد رنجیت (جو ورکنگ کمیٹی کے زمرے میں نہیں آتے تھے) پھر نینی جیل بھیج دئے گئے۔ اس کا والد کو بہت قلق ہوا اور وہ بار بار انھیں پوچھتے اور شکایت کرتے کہ لوگ دوسرے انھیں دیکھنے آتے ہیں مگر ان کا داماد ان سے چھڑا لیا گیا ہے۔ ڈاکٹروں کو ان کی اس بے چینی سے تشویش تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ یہ ان کے لئے اچھا نہیں ہے۔ تین چار روز کے بعد غالباً ڈاکٹروں کی تحریک سے صوبہ متحدہ کی حکومت نے رنجیت کو رہا کر دیا۔

۲۶ جنوری کو جس دن میری رہائی ہوئی گاندھی جی بھی یروادا جیل سے رہا کر دئے گئے۔ میرا بہت جی چاہتا تھا کہ انھیں الہ آباد بلاؤں اور جب میں نے ان کی رہائی کا ذکر والد سے کیا تو انھوں نے بھی ان سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ دوسرے ہی روز گاندھی جی بمبئی میں ایک زبردست جلسے کے بعد جیسا بمبئی میں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، بمبئی سے روانہ ہو گئے۔ وہ رات گئے الہ آباد پہنچے مگر والد ان کے انتظار میں جاگ رہے تھے۔ ان کے آنے سے اور تسلی کے چند کلموں سے، جو انھوں نے کہے والد کو بہت سکون ہوا اور میری والدہ کو بہت ہی تسکین ہوئی۔

اس زمانے میں ورکنگ کمیٹی کے اصلی اور قائم مقام ممبر جو قید سے رہا ہوئے تھے بے کار بیٹھے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ جلسے کی کوئی اطلاع آئے۔ ان میں سے بہت سے والد کی طرف سے فکر مند تھے اور فوراً الہ آباد آنا چاہتے تھے۔ چنانچہ یہ طے کیا گیا کہ جلسہ فوراً کیا جائے اور ان سب کو الہ آباد بلا لیا جائے۔ دو روز کے بعد ان میں سے تیس چالیس پہنچ گئے اور ان کا جلسہ سوراج بھون میں ہوا، جو ہمارے گھر سے ملا ہوا ہے۔ میں کبھی کبھی ان جلسوں میں جایا کرتا تھا مگر اس قدر بدحواس تھا کہ ان میں اچھی طرح حصہ نہیں لے سکتا تھا اور مجھے بالکل یاد نہیں کہ ان میں کیا فیصلہ کیا گیا۔ غالباً یہی طے ہوا کہ سول نافرمانی جاری رکھی جائے۔

یہ سب پرانے دوست اور رفیق جو وہاں موجود تھے، جن میں سے اکثر سیدھے جیل سے چھوٹ کر آئے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ کوئی دن میں پھر قید کر دئے جائیں گے، والد سے مل کر انھیں خدا حافظ کہنا چاہتے تھے۔ غالب خیال یہی تھا کہ اس کے بعد ان کی صورت دیکھنا نصیب نہیں ہوگا۔ وہ صبح اور شام کے وقت دو دو تین تین کر کے آتے تھے اور والد بڑے اصرار سے آرام کرسی پر بیٹھ کر اپنے پرانے رفیقوں سے ملتے تھے۔ یوں تو وہ بت بنے بیٹھے رہتے تھے اس لئے کہ ان کے چہرے کی جو حالت تھی اس کی وجہ سے کوئی کیفیت ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ مگر جب ان کے دوست اور رفیق ایک ایک کر کے آتے تو ان کی آنکھوں کی چمک سے ظاہر ہوتا کہ وہ انھیں پہچانتے ہیں۔ ان کا سر کسی قدر جھک جاتا اور ان کے ہاتھ پرنام کرنے کے لئے جڑ جاتے۔ انھیں بات کرنی مشکل تھی۔ پھر بھی وہ کبھی کبھی دو ایک لفظ کہہ دیتے تھے اور ان کی پرانی ظرافت اب تک باقی تھی۔ وہ ایک زخمی شیر کی طرح بیٹھے رہتے تھے۔ ان کی طاقت جواب دے چکی تھی مگر ان کے چہرے سے شاہانہ جلال ٹپکتا تھا۔ میں انھیں دیکھ کر سوچا کرتا تھا کہ نہ جانے ان کے دل میں کیا کیا خیالات آتے ہوں گے۔ خدا معلوم انھیں ہماری جدوجہد میں کوئی دلچسپی باقی ہے یا نہیں؟ ان کے چہرے سے اکثر ایک اندرونی کشمکش کے آثار ظاہر ہوتے تھے جیسے خیالات کا سلسلہ ان کے قابو سے نکلا جاتا ہو اور وہ اسے پکڑنا چاہتے ہوں۔ یہ کشمکش آخر وقت تک جاری رہی اور انھوں نے ہار نہیں مانی۔ کبھی کبھی وہ بالکل ہوش و حواس کی باتیں کرنے لگتے تھے۔ اس وقت



بھی جب ان کے گلے سے بالکل آواز نہیں نکلتی تھی وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے کاغذ کے پرچوں پر لکھ دیتے تھے۔

انھیں ورکنگ کمیٹی کے جلسوں سے جو ہمارے مکان میں ہو رہے تھے۔ تقریباً کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ جلتے پہلے انھیں ان چیزوں سے بہت جوش آتا مگر اب انھیں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ان سے بہت دور پہنچ گئے ہیں۔ انھوں نے ایک بار گاندھی جی سے کہا: "مہاتما جی میرا اب چل چلاؤ ہے۔ میں سوراج دیکھنے کے لئے نہیں رہوں گا مگر مجھے معلوم ہے کہ آپ نے لڑائی جیت لی اور سوراج آنے ہی والا ہے"۔

اکثر لوگ جو دوسرے شہروں اور صوبوں سے انھیں دیکھنے آئے تھے رخصت ہو گئے۔ صرف گاندھی جی اور چند خاص خاص دوست اور عزیز رہ گئے۔ تینوں مشہور ڈاکٹر یعنی ڈاکٹر محمد انصاری، بدھان چندر رائے اور جیوراج مہتا جو ان کے پرانے دوست تھے اور جن کے متعلق وہ کہا کرتے تھے کہ میں نے اپنی جان ان کے سپرد کر دی ہے [illegible] ساتھ۔ بے چوتھی ضروری کی صبح کو ان کی طبیعت بظاہر کچھ سنبھل گئی اور یہ طے کیا گیا کہ اس سے فائدہ اٹھا کر انھیں لکھنؤ لے جائیں جہاں ایکسرے کے علاج کے لئے الٰہ آباد سے زیادہ سہولتیں موجود تھیں۔ اسی دن ہم انھیں موٹر سے لکھنؤ لے گئے اور گاندھی جی مع اور بہت سے لوگوں کے ہمارے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔ ہم بہت آہستہ آہستہ جا رہے تھے مگر پھر بھی وہ بہت مضمحل ہو گئے۔ دوسرے دن بظاہر ان کی تکان دور ہو گئی مگر اور آثار کچھ اچھے نہ تھے۔ اگلے دن یعنی چھ فروری کو صبح تڑکے میں ان کی پٹی کے پاس بیٹھا تھا رات بھر انھیں بڑی تکلیف اور بے چینی رہی تھی۔ دفعتاً مجھے ان کے چہرے پر سکون کے آثار نظر آئے اور بے چینی کی کیفیت دور ہو گئی۔ میں یہ سمجھا کہ خوش ہوا کہ انھیں نیند آ گئی ہے مگر میری والدہ حقیقت کو سمجھ گئیں اور چیخ کر رونے لگیں۔ میں نے ان سے التجا کی کہ خاموش رہیے۔ ان کو نیند آ گئی ہے۔ مگر یہ نیند ان کی آخری نیند تھی جس سے انھیں کوئی نہیں جگا سکتا تھا۔

ہم اسی دن ان کی لاش موٹر سے الٰہ آباد لے گئے۔ میں اسی گاڑی میں بیٹھا تھا اور اسے چلا رہا تھا۔ والد کا معتمد خدمتگار ہری بھی ہمارے ساتھ تھا۔ دوسری گاڑی میں والدہ اور گاندھی جی تھے۔ اس کے پیچھے اور گاڑیوں کا سلسلہ تھا میری عقل خبط تھی اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ہو گیا۔ مسلسل واقعات اور لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے میں کچھ سوچ نہیں سکتا تھا لکھنؤ میں لوگوں کا زبردست مجمع جو خبر سنتے ہی اکٹھا ہو گیا تھا۔ لاش کو قومی جھنڈے میں لپیٹ کر موٹر میں جس پر ایک بڑا سا جھنڈا لگا ہوا تھا، لکھنؤ سے الٰہ آباد لے جانا، الٰہ آباد پہنچنا، تعزیت کرنے والوں کا ہجوم جو میلوں تک چلا گیا تھا، یہ سب باتیں مجھے خواب سی یاد ہیں۔ گھر پر کچھ رسمیں ادا کی گئیں اور اس کے بعد ارتھی بے شمار مجمع کے ساتھ گنگا کی طرف روانہ ہوئی۔ جاڑے کی شام تھی اندھیرا چھا رہا تھا۔ گنگا کے کنارے بڑے بڑے شعلے اٹھ رہے تھے اور اس جسم کو جلا کر خاک کر رہے تھے جو ہم خاندان والوں کو اور ہندوستان کے کروڑوں آدمیوں کو دل و جان سے عزیز تھا۔ گاندھی جی نے مجمع کو مخاطب کر کے ایک چھوٹی سی تقریر کی اور اس کے بعد ہم سب خاموشی سے اپنے اپنے گھر چلے آئے۔ آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے اور ہم تنہائی کا درد اور غم [illegible] بوجھ [illegible] رہے تھے۔

[illegible] دن بعد [illegible] کے [illegible] سے [illegible] بے شمار [illegible] آئے [illegible] دن [illegible] کی [illegible] مناسب [illegible] ہمدردی کا اظہار کیا۔ لوگوں کی [illegible] سچی دلسوزی اور ہمدردی [illegible] ان [illegible] درد کی شدت کچھ کم ہوئی مگر سب سے [illegible] جس چیز نے میری والدہ کو اور ہم سب کو اس جانکاہ صدمے کے برداشت کرنے میں مدد دی وہ گاندھی جی کی موجودگی تھی۔ جن میں غمزدوں کو دستگیری دینے اور شکستہ دلوں کو جوڑنے کی عجیب و غریب قوت ہے۔

مجھے کسی طرح یقین نہیں آتا تھا کہ والد ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ تین مہینے کے بعد میں اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ لنکا گیا ہوا تھا اور نورا ایلیا میں چند روز کے لئے سکون و اطمینان کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ دفعتاً مجھے خیال آیا کہ والد کو یہاں کی آب و ہوا راس آئے گی لاؤ ان کو بلا بھیجیں۔ وہ بہت تھکے ہوئے ہیں کچھ دن آرام کر لیں گے۔ میں ان کے نام الٰہ آباد تار بھیجتے بھیجتے رہ گیا۔

لنکا سے الٰہ آباد واپس آنے کے بعد ایک دن ڈاک میں ایک عجیب خط آیا۔ لفافہ پر میرا پتہ والد کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا اور خدا جانے کن کن ڈاکخانوں کی بے شمار مہریں لگی ہوئی تھیں۔ میں نے بڑی حیرت سے اسے کھولا تو معلوم ہوا کہ واقعی والد کا خط ہے جو ۲۸ فروری ۱۹۲۶ء کا لکھا ہوا ہے۔ یہ مجھے ۱۹۳۱ء کے وسط میں یعنی ساڑھے پانچ سال کے بعد ملا۔ والد نے یہ خط ۱۹۲۶ء میں میرے اور کملا کے یورپ روانہ ہونے سے ایک روز پہلے احمد آباد سے لکھا تھا اور اطالوی لائڈ کمپنی کے اس جہاز کے پتے سے جس سے ہم روانہ ہونے والے تھے، بمبئی بھیجا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاز کی روانگی کے بعد پہنچا اور پھر خدا جانے کہاں کہاں پھرتا رہا۔ یہاں تک کہ کسی من چلے نے میرے پاس بھیج دیا۔ عجیب بات ہے کہ یہ الوداعی خط تھا۔

۴ ستمبر ۱۹۳۵ء کو میں دفعتاً الموڑہ کی جیل سے رہا کر دیا گیا اس لئے کہ خبر آئی تھی کہ میری بیوی کی حالت بہت نازک ہے۔ وہ یہاں سے بہت دور جرمنی کے بلیک فورسٹ میں باڈن وائلر کی صحت گاہ میں مقیم تھیں۔ میں موٹر اور ریل سے سفر کر کے دوسرے دن الٰہ آباد اور اسی روز سہ پہر کو ہوائی جہاز سے یورپ روانہ ہو گیا۔ ہوائی جہاز کراچی، بغداد، قاہرہ ہوتا ہوا اسکندریہ پہنچا۔ وہاں سے برنڈزی تک میں نے بحری جہاز میں اور برنڈزی سے سوئٹزرلینڈ کے شہر بال تک ریل میں سفر کیا۔ الٰہ آباد سے روانہ ہونے کے پانچویں دن اور الموڑہ جیل سے رہا ہونے کے چھٹے دن میں باڈن وائلر پہنچ گیا۔

کملا کے چہرے پر میں نے وہی اگلی سی مسکراہٹ پائی۔ مگر انھیں اتنی زیادہ کمزوری اور

شدید تکلیف تھی کہ زیادہ باتیں نہیں کر سکتی تھیں۔ شاید میرے آنے کا کچھ اچھا اثر پڑا، اس لئے کہ ان کی طبیعت اگلے دن اور اس کے بعد کئی روز تک کچھ بہتر رہی۔ لیکن حالت بدستور نازک تھی اور وہ روز بروز گھلتی چلی جا رہی تھیں۔ میں کسی طرح ان کی موت کا خیال اپنے ذہن میں نہیں آنے دیتا تھا اور اس دھوکے میں رہا کہ ان کی طبیعت سنبھل رہی ہے اور اگر وہ اس بحران سے نکل جائیں تو بالکل اچھی ہو جائیں گی۔ ڈاکٹر بھی جیسا کہ ان کا قاعدہ ہے، میری امید بندھاتے تھے۔ بظاہر فوری بحران گذر گیا اور وہ اُسے جھیل گئیں مگر وہ اس قابل کبھی نہیں ہوئیں کہ دیر تک گفتگو کر سکیں۔ ہم کچھ تھوڑی دیر باتیں کرتے اور میں جیسے ہی ان پر تکان کے آثار دیکھتا فوراً رک جاتا۔ کبھی کبھی میں ان کو کتابیں پڑھ کر سناتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ان میں سے ایک پرل بک کی پیاری زمین تھی۔ وہ شوق سے سنتی تھیں مگر مجھے بہت آہستہ آہستہ پڑھنا پڑتا تھا۔

روز صبح اور سہ پہر کو میں اپنے ہوٹل سے جو قصبے کے اندر تھا، سینے ٹوریم جاتا تھا اور چند گھنٹے ان کے ساتھ رہتا تھا۔ میرے دل میں نہ جانے کتنی باتیں تھیں جو میں ان سے کہنا چاہتا تھا لیکن مجھے ضبط سے کام لینا پڑتا تھا۔ کبھی ہم گذرے ہوئے زمانے کا، بیتی ہوئی صحبتوں کا اور اپنے مشترک دوستوں کا جو ہندوستان میں تھے ذکر کرتے اور کبھی آئندہ کے متعلق منصوبے باندھتے کہ یہ کریں گے اور وہ کریں گے۔ باوجود اپنی نازک حالت کے وہ مستقبل کا دامن مضبوطی سے تھامے ہوئے تھیں۔ ان کی آنکھیں روشن اور جان دار تھیں اور چہرہ عام طور پر بشاش رہتا تھا۔ اکا دکا کوئی دوست ان کی مزاج پرسی کو آتا تو یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا کہ ان کی ظاہری حالت اس کی توقع سے بہت بہتر ہے۔ وہ ان روشن آنکھوں اور مسکراتے ہوئے چہرے سے دھوکا کھا جاتے تھے۔

خزاں کی طویل شام میں ہمیشہ اپنی قیام گاہ پر اپنے کمرے میں گذارتا تھا۔ کبھی کبھی کھیتوں میں یا جنگل میں ٹہلنے کو چلا جاتا تھا۔ کملا کی سینکڑوں تصویریں ان کی بھرپور اور گہری شخصیت کے سینکڑوں پہلو ایک ایک کر کے میرے ذہن میں آتے تھے۔ ہمارے بیاہ کو تقریباً بیس برس گذر چکے تھے مگر اب بھی مجھے اکثر ان کی ذہنی اور روحانی خصوصیات میں کوئی نہ کوئی چیز نظر آ جاتی تھی۔ میں ان کی شخصیت کے ہر پہلو سے واقف تھا اور آخر کے چند سال میں میں نے ان کو سمجھنے کی انتہائی کوشش کی تھی۔ میں اس کوشش میں ناکام نہیں رہا، پھر بھی کبھی کبھی یہ شبہ پیدا ہو جاتا تھا کہ میں واقعی انہیں سمجھ سکا ہوں یا نہیں۔

بعض اوقات جب میں ان کی آنکھوں کی طرف دیکھتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے ان کے اندر سے کوئی اجنبی جھانک رہا ہے۔

انھوں نے تھوڑا بہت پڑھ لیا تھا مگر باقاعدہ تعلیم نہیں پائی تھی۔ ان کا ذہن اعلیٰ تعلیم کے سانچے میں نہیں ڈھلا تھا۔ جب وہ ہمارے ہاں ایک بھولی بھالی لڑکی کی حیثیت سے آئیں تو بظاہر ان کے اندر نفسیاتی الجھنوں میں سے جو آج کل عام ہیں کوئی چیز نہ تھی۔ ان کے چہرے پر لڑکپن کا انداز کچھ نہ کچھ ہمیشہ باقی رہا لیکن پختہ عمر کو پہنچنے کے بعد ان کی آنکھوں میں ایک ایسی گہرائی اور جوش پیدا ہو گیا کہ دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کہ ان ساکن چشموں کے اندر سے طوفان اُمڈ رہا ہو۔ وہ جدید طرز کی لڑکیوں میں سے نہ تھیں اور ان کی سی عادتیں اور بے چین طبیعت نہیں رکھتی تھیں پھر بھی انھوں نے جدید فیشن بڑی آسانی سے اختیار کر لئے۔ دراصل ان کے اندر ایک ہندوستانی بلکہ کشمیری لڑکی کی روح تھی جو خودداری اور زود حسی، بچپن اور سیانا پن، سادہ لوحی اور دانشمندی کا مجموعہ تھی۔ جن لوگوں کو وہ جانتی نہیں تھیں یا پسند نہیں کرتی تھیں اُن سے الگ الگ رہتی تھیں لیکن جن کو جانتی اور پسند کرتی تھیں ان کے سامنے بے تکلفی سے دل کھول کر ہنستی بولتی تھیں۔ وہ لوگوں کے متعلق بہت جلد رائے قائم کر لیتی تھیں اور یہ رائے بعض اوقات غلط فہمی اور بے انصافی پر مبنی ہوتی تھی مگر وہ محبت اور نفرت کے معاملے میں اپنے وجدان کی پیروی کرتی تھیں۔ ان میں زمانہ سازی نام کو نہ تھی۔ اگر وہ کسی شخص کو ناپسند کرتی تھیں تو بات صاف ظاہر ہو جاتی تھی۔ وہ اس کو چھپانے کی مطلق کوشش نہیں کرتی تھیں اور اگر کرتیں بھی تو غالباً کامیاب نہ ہوتیں۔ ان کا سا خلوص میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھا ہے ...

جنوری ۱۹۳۶ء کے آخر میں میں کملا کو لے کر باڈن وائلر سے لوزان (سوئٹزرلینڈ) کے ایک سینے ٹوریم لے گیا۔

سوئٹزرلینڈ کملا کو بھی پسند آیا اور مجھے بھی۔ وہ مقابلتاً بشاش نظر آتی تھیں اور میں سوئٹزرلینڈ کے اس حصے سے پہلے سے واقف تھا، اس لئے مجھے یہاں اجنبیت کا احساس نہ تھا۔ کملا کی حالت میں کوئی خاص تغیر نہیں ہوا۔ فی الحال کسی اور بحران کا اندیشہ نہ تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک مدت تک ان کی طبیعت ٹھہری رہے گی۔

ادھر ہندوستان مجھے اصرار سے بلا رہا تھا۔ میرے دوستوں کا تقاضا تھا کہ جلد واپس آؤں۔ میری بے چینی بڑھنے لگی اور میرا ذہن اپنے ملک کے مسائل پر غور کرنے میں مصروف ہو گیا۔ کئی سال سے جیل میں رہنے اور دوسری معذوریوں کی وجہ سے میں سیاسی معاملات میں عملی حصہ نہیں لے سکا تھا اور ان سے بے تعلق سا ہو گیا تھا، مگر اب مجھ سے صبر نہیں ہو سکتا تھا۔ لندن اور پیرس کے سفر اور ہندوستان کی خبریں مجھے خیالی دنیا سے کھینچ کر عملی دنیا میں لے آئیں اور اب میرے لئے وہاں لوٹ کر جانا ممکن نہ تھا۔

میں نے اس بارے میں کملا سے گفتگو کی اور ڈاکٹر سے مشورہ کیا۔ دونوں نے یہ رائے دی کہ مجھے ہندوستان واپس جانا چاہئے اور میں نے ڈچ کے ایل۔ ایم لائن کے ہوائی جہاز کا ٹکٹ خرید لیا۔ مجھے ۲۸ فروری کو لوزان روانہ ہونا تھا۔ جب یہ سب باتیں طے ہو گئیں تو میں نے دیکھا کہ کملا کو اس خیال سے تکلیف ہوئی ہے کہ میں انھیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، مگر انھیں

بھی منظور نہ تھا کہ مجھے میرے ارادے سے روکیں۔ میں نے ان کو تسلی دی کہ میں ہندوستان میں زیادہ نہیں ٹھہروں گا اور دو تین مہینے کے بعد واپس آجاؤں گا۔ بلکہ اگر وہ چاہیں تو اس سے پہلے بھی آسکتا ہوں، جس دن وہ مجھے بلانے کا تار دیں گی، اس کے ایک ہفتے کے اندر پہنچ جاؤں گا۔

میری روانگی میں چار پانچ روز باقی تھے۔ اندرا جو قریب کے ایک قصبے کے مدرسے میں داخل کر دی گئی تھی، یہ چار پانچ روز ہمارے ساتھ بتانے کے لئے آ گئی تھی۔ اس دن ڈاکٹر مجھ سے ملنے کو آیا اور اس نے میرا سے دو گزارش کی، روانگی آٹھ دس دن کے لئے ملتوی کر دوں۔ اس سے آگے اس نے کچھ نہیں کہا۔ میں نے فوراً اس کی بات مان لی اور دوسرے ہوائی جہاز سے روانگی کا انتظام کر لیا۔

ان آخری دنوں میں کملا کی حالت میں ایک عجیب تغیر ہوا۔ ان کی جسمانی صحت میں تو بظاہر کوئی خاص فرق نہ تھا، مگر وہ کچھ کھوئی کھوئی سی رہتی تھیں اور آس پاس کی طرف بہت کم توجہ کرتی تھیں۔ وہ مجھ سے کہتی تھیں کہ انھیں کوئی پکار رہا ہے یا کوئی شخص کمرے میں داخل ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے، حالانکہ مجھے کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

۲۸ فروری ۱۹۳۶ء کو صبح تڑکے ان کا انتقال ہو گیا[1]۔ اس وقت اندرا وہاں موجود تھی اور ہمارے سچے دوست ڈاکٹر اٹل بھی تھے، جنھوں نے پچھلے چند مہینے میں کسی وقت ہمارا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔

کچھ اور دوست آس پاس کے قصبوں سے آ گئے اور ہم کملا کی لاش کو لوزان کے کریمیٹوریم[2] میں لے گئے، چند منٹ میں وہ خوش نما جسم اور وہ حسین چہرہ جو ہر وقت مسکرایا کرتا تھا، جل کر راکھ ہو گیا۔ جو ہستی کبھی نشاطِ زندگی سے معمور تھی۔ اب اس کا جسمِ خاکی ایک چھوٹے سے ظرف میں سما گیا۔

اندرا پریہ درشنی کے نام۔ تیرھویں جنم دن کے موقع پر

سنٹرل جیل نینی۔ ۲۶[3] اکتوبر ۳۰ء

ہمیشہ جنم دن کے موقع پر تمیں اچھے اچھے تحفے اور مبارک باد ملا کرتی تھی۔ مبارک باد تو اب بھی بہت سی ملیں گی لیکن تحفہ بھلا میں اس نینی جیل سے کیا بھیج سکتا ہوں، میرے پاس مادی تحفے کہاں۔ ہاں روحانی اور دماغی تحفے ضرور ہیں۔ اگر کوئی پری تمھارے لئے تحفے لاتی تو وہ ایسے ہی ہوتے۔ انھیں جیل خانے کی اونچی اونچی دیواریں بھی روک نہیں سکتیں۔

پیاری بیٹی! تم خوب جانتی ہو کہ مجھے نصیحت کرنے اور وعظ کہنے سے کتنی نفرت ہے۔ جب کبھی نصیحت کرنے کو میرا جی چاہتا ہے تو ہمیشہ اس "مرد دانشمند" کی کہانی یاد آجاتی ہے جو میں نے کبھی پڑھی تھی۔ شاید تم بھی ایک دن وہ کتاب پڑھو جس میں یہ کہانی درج ہے۔ کوئی تیرہ سو برس گذرے کہ چین سے ایک سیاح علم و دانش کی تلاش میں ہندوستان آیا تھا اس کا نام ہیونگ سانگ تھا۔ وہ شمال کے پہاڑ اور ریگستان طے کرتا ہوا یہاں پہنچا۔ اسے علم کا اتنا شوق تھا کہ راستے میں اس نے سینکڑوں مصیبتیں اٹھائیں اور ہزاروں خطروں اور مشکلوں کا مقابلہ کیا۔ وہ ہندوستان میں بہت دن رہا۔ خود سیکھتا تھا اور دوسروں کو سکھاتا تھا۔ زیادہ تر وہ نالندہ کی یونیورسٹی میں رہا جو شہر پاٹلی پتر کے قریب واقع تھی۔ اب اس شہر کو پٹنہ کہتے ہیں ہیونگ سانگ پڑھ لکھ کر بہت قابل ہو گیا حتیٰ کہ اسے بودھ مت کے فاضل قانون کا خطاب دیا گیا۔ پھر اس نے سارے ہندوستان کا سفر کیا اور اس عظیم الشان ملک کے ان باشندوں کو جو اب سے صدیوں پہلے یہاں رہتے تھے دیکھا بھالا اور ان کے متعلق پوری معلومات حاصل کی۔ اس کے بعد اس نے اپنا سفرنامہ لکھا۔ اسی کتاب میں وہ کہانی درج ہے جو اس وقت مجھے یاد آئی۔ یہ ایک شخص کا قصہ ہے جو جنوبی ہند سے شہر کرن سوورن میں آیا تھا۔ یہ شہر صوبہ بہار میں بھاگل پور کے آس پاس کہیں واقع تھا۔ سفرنامے میں لکھا ہے کہ یہ شخص اپنے پیٹ کے چاروں طرف تانبے کی تختیاں باندھے رہتا تھا اور سر پر ایک جلتا ہوا مشعل رکھتا تھا۔ ہاتھ میں عصا لئے وہ اکڑ اکڑ کر چلتا تھا اور اس عجیب و غریب ہیئت میں بڑی شان سے ادھر ادھر گھومتا پھرتا تھا۔ جب کوئی اس سے پوچھتا کہ آخر آپ نے یہ کیا قطع بنائی ہے تو وہ جواب دیتا کہ میرے اندر اتنی حکمت بھری ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں میرا پیٹ نہ پھٹ جائے۔ اس لئے میں نے اپنے پیٹ پر تانبے کی تختیاں باندھ لی ہیں اور چونکہ تم سب لوگ جہالت کی تاریکی میں رہتے ہو اور مجھے تم پر بہت ترس آتا ہے اس لئے میں ہر وقت اپنے سر پر مشعل لئے پھرتا ہوں۔

لیکن مجھے عقل و حکمت کی زیادتی سے اپنا پیٹ پھٹ جانے کا اندیشہ نہیں ہے اس لئے تانبے کی تختیاں پہننے یا زرہ بکتر پہننے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتا۔ اور پھر مجھ میں جو کچھ تھوڑی بہت عقل ہے وہ میرے پیٹ میں نہیں۔ اس کا ٹھکانا جہاں کہیں بھی ہے وہاں بہت گنجائش باقی ہے اور جگہ کی کمی پڑنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ جب میری عقل اتنی محدود ہے تو میں دوسروں کے سامنے عقل مند کیسے بن سکتا ہوں اور سب کو خواہ مخواہ نصیحت کرنے کا مجھے کیا حق ہے۔ اس لئے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جب یہ معلوم کرنا ہو کہ صحیح بات کیا ہے اور غلط کیا ہے؟ کیا کرنا چاہئے اور کیا نہ کرنا چاہئے؟ تو اس کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ آدمی وعظ کہنے لگے بلکہ بہترین صورت یہ ہے کہ آپس میں گفتگو اور بحث کی

---

[1] کملا نہرو کی تاریخ پیدائش یکم اگست ۱۸۹۹ء بمقام دہلی

[2] وہ قبرستان جہاں لاش کو پہلے بجلی سے جلاتے ہیں اور پھر اس کی راکھ کو دفن کر دیتے ہیں (مصنف)

[3] اندرا کا جنم دن عیسوی سنہ کے مطابق ۱۹ نومبر کو پڑتا ہے لیکن بکرمی سمت کے حساب سے ۲۶ اکتوبر کو منایا گیا۔

جائے۔ اس سے کبھی کبھی حقیقت کی ایک جھلک نظر آجاتی ہے۔ میں تم سے جو گفتگو کیا کرتا تھا اس میں مجھے بڑا لطف آتا تھا۔ ہم نے بہت سی چیزوں پر بحث کی لیکن ہماری یہ دنیا بہت بڑی ہے اور اس دنیا کے علاوہ اور بہت سے عجیب و غریب اور پُراسرار عالم ہیں۔ ہمارے سامنے علم کا بہت بڑا میدان ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ہمیں بے شغلی کی شکایت ہو یا ہم اس بیوقوف اور مغرور آدمی کی طرح جس کا قصہ ہیونگ سانگ نے لکھا ہے یہ سمجھنے لگیں کہ ہمیں سب کچھ آگیا ہے اور اب ہم بہت ہی دانشمند ہو گئے ہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ ہی اچھا ہے کہ ہم بہت زیادہ دانشمند نہیں بن سکے' اس لئے کہ اگر دنیا میں ایسے دانشمند ہوں بھی تو وہ ضرور دل میں کڑھتے ہوں گے کہ افسوس اب کوئی نئی چیز باقی نہیں جسے ہم سیکھیں۔ وہ نئی نئی دریافت کرنے اور نیا علم حاصل کرنے کی مسرت سے محروم ہیں لیکن ہم میں سے جو چاہے وہ اس نعمت کو حاصل کر سکتا ہے۔

غرض کہ مجھے وعظ ہرگز نہیں کہنا چاہئے لیکن پھر کروں تو کیا کروں؟ خط میں بات چیت کا مزا تو آ نہیں سکتا کیونکہ اچھے سے اچھا خط بھی یک طرفہ ہوتا ہے اس لئے اگر میں کوئی ایسی بات کہوں جو نصیحت معلوم ہو تو یہ نہ سمجھ لینا کہ اس کڑوے گھونٹ کو کسی نہ کسی طرح پینا ہے بلکہ یہ سمجھنا کہ میں نے ایک بات کہی ہے تاکہ تم اس پر غور کرو گویا ہم سچ مچ آپس میں بات چیت کر رہے ہیں۔

تاریخ کی کتابوں میں تم نے پڑھا ہوگا کہ مختلف قوموں کی زندگی میں بڑے معرکے کے دور گذرے ہیں۔ ہم اکثر اولوالعزم مردوں اور عورتوں کا اور ان کے کارناموں کا حال پڑھا کرتے ہیں۔ پھر کبھی کبھی اپنے خواب یا تصور میں یہ دیکھتے ہیں جیسے ہم بھی اسی زمانے میں پہنچ گئے ہیں اور انھی سورماؤں کی طرح بڑے بڑے جواں مردی کے کام کر رہے ہیں۔ تمھیں یاد ہوگا جب تم نے پہلے پہل جون آف آرک کا قصہ پڑھا تھا تو تم پر کتنا اثر ہوا تھا اور تمھارا بھی جی چاہتا تھا کہ میں بھی اسی طرح کچھ کر دکھاتی۔ سب عورت مرد ایسے جاں باز نہیں ہوتے۔ ان بیچاروں کو اپنی دال روٹی کی' اپنے بال بچوں کی اور اپنے گھربار کی ہر وقت فکر لگی رہتی ہے' لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ساری کی ساری قوم کو کسی عظیم الشان مقصد کے حاصل کرنے کی لگن لگ جاتی ہے۔ اس وقت معمولی عورت مرد بھی سورما بن جاتے ہیں۔ پھر تو تاریخ میں انقلاب ہو جاتا ہے اور بڑے بڑے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ بڑے لیڈروں کی بات میں کچھ ایسا جادو کا اثر ہوتا ہے کہ وہ ساری قوم میں ایک نئی روح پھونک دیتے ہیں اور لوگ بڑے بڑے کام کر گذرتے ہیں۔

جس سال تم پیدا ہوئیں وہ تاریخ کا ایک یادگار سال تھا۔ اسی سال ایک عظیم الشان لیڈر نے جس کا دل غریبوں کی محبت اور مظلوموں کی ہمدردی سے لبریز تھا اپنے ملک کے لوگوں سے ایسا شاندار کام کرایا جو تاریخ کے اوراق سے کبھی مٹ نہیں سکتا۔ ٹھیک اسی مہینے میں جس میں تم پیدا ہوئیں لینن نے وہ زبردست انقلاب شروع کیا جس نے روس اور سائبیریا کا نقشہ بدل دیا۔ اسی طرح آج ہندوستان میں بھی ایک عظیم الشان لیڈر جس کا دل مظلوموں کی محبت سے معمور ہے ان کی مدد کے لئے تڑپتا ہے' ہماری قوم میں ایسی روح پھونک دی ہے کہ وہ بھی بڑے بڑے کارنامے کرنے اور شاندار قربانیاں دینے کو تیار ہے تاکہ ہمارا ملک پھر آزاد ہو جائے اور بھوکوں' غریبوں اور مظلوموں کے سر سے یہ مصیبت ٹل جائے۔ باپوجی[ٹ] اگرچہ جیل میں بند ہیں لیکن ان کا وہ پیغام جو جادو کا سا اثر رکھتا ہے ہندوستان کے کروڑوں آدمیوں کے دلوں میں گھر کر گیا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مرد' عورتیں حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی میدان میں نکل کھڑے ہوئے ہیں اور ہندوستان کی آزادی کے سپاہی بن گئے ہیں۔

آج ہندوستان میں ہماری قوم جو کچھ کر رہی ہے وہ تاریخ میں یادگار رہے گا۔ ہم تم بڑے خوش قسمت ہیں کہ اپنی آنکھوں سے یہ تماشا دیکھ رہے ہیں بلکہ خود بھی اس میں تھوڑا بہت حصہ لے رہے ہیں۔

ہم اس زبردست تحریک میں کیا کریں گے؟ ہمارا اس میں کیا حصہ ہوگا؟ سچ پوچھو تو یہ ہمیں نہیں معلوم لیکن اتنا ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ہم سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جس سے ہمارے پاک مقصد کو نقصان پہنچے یا ہماری قوم کی رسوائی ہو۔ اگر ہم ہندوستان کے سپاہی بننا چاہتے ہیں تو ہمیں سمجھنا چاہئے کہ ہندوستان کی عزت ہمارے ہاتھ میں ہے اور یہ عزت بڑی مقدس امانت ہے۔ اکثر ہم کو یہ الجھن ہوگی کہ ہم کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ صحیح اور غلط راستے میں امتیاز کرنا آسان نہیں ہے اس لئے میں تمھیں اس کے پرکھنے کی ایک ترکیب بتاتا ہوں۔ جب کبھی تمھیں کسی معاملے میں دُگدھا ہو تو اس سے کام لینا۔ امید ہے کہ اس سے تمھیں بڑی مدد ملے گی۔ کوئی کام چھپ کر یا کوئی ایسا کام جسے چھپانے کی ضرورت ہو کبھی نہ کرنا کیونکہ چھپانے کی خواہش کے معنی یہ ہیں کہ تم ڈرتی ہو اور ڈر بہت بری چیز ہے یہ تمھارے شایانِ شان نہیں۔ بس ہمت سے کام لو پھر سارے کام بن جائیں گے تمھارے دل میں ہمت ہے تو ڈر پاس نہ پھٹکے گا اور تم کوئی ایسی بات نہ کرو گی جس کے ظاہر ہونے سے تمھیں شرم آئے تم خوب جانتی ہو کہ باپوجی کی رہنمائی میں آزادی کی جو زبردست تحریک جاری ہے اس میں چھپ کر کوئی بات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ہمیں کسی بات کے چھپانے کی ضرورت ہی نہیں ہے ہم جو کچھ کہتے ہیں یا کرتے ہیں ڈر کر نہیں کرتے' ڈنکے کی چوٹ کرتے ہیں۔ اسی طرح ہمیں اپنی

ٹ ۱۹۱۷ء

ٹ مہاتما گاندھی



بھی زندگی میں بھی کھلے بندوں کام کرنا چاہیے۔ خفیہ کارروائیوں سے دور رہنا چاہیے۔ اپنے نجی معاملات کو اپنے ہی تک رکھنے کا ہمیں حق ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ لیکن یہ اور چیز ہے اور چوری چھپے کچھ کرنا اور چیز ہے۔ پس اگر تم اس پر عمل کروگی تو تم روشنی کی گود میں پرورش پاؤگی اور ہر حالت میں بے خوف اور مطمئن رہوگی۔

میں نے تمھیں بڑا طویل طویل خط لکھ ڈالا۔ پھر بھی بہت سی ایسی باتیں رہ گئیں جو میں تمھیں بتانا چاہتا تھا۔ بھلا ایک خط میں سب کچھ کیسے سما سکتا ہے۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ اس معاملے میں تم بڑی خوش قسمت ہو کہ اس جنگ آزادی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہو جو آج ہندوستان میں چھڑی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی تمھاری خوش قسمتی ہے کہ بڑی اچھی اور بہادر ماں ملی ہے۔ اگر تمھیں کبھی کوئی الجھن یا پریشانی ہو تو ان سے بہتر مدد کرنے والا تمھیں نہیں مل سکتا۔

اچھا رخصت، ننھی بیٹی! اب رخصت۔ خدا کرے تم بڑی ہو کر ہندوستان کی خدمت کے لئے ایک بہادر سپاہی بنو۔ بہت بہت دعائیں اور پیار۔

۱۹۱۲ء کی گرمی میں میں نے بیرسٹری کی سند حاصل کی اور اسی سال خزاں کے موسم میں سات برس کے قیام کے بعد انگلستان سے ہندوستان روانہ ہوا۔ اس عرصے میں دو مرتبہ تعطیل میں گھر آ چکا تھا مگر اب کی بار مستقل طور پر واپس آ رہا تھا۔ جب میں نے بمبئی میں قدم رکھا تو سوا خود بینی کے کوئی صفت مجھ میں نظر نہیں آتی تھی۔

۱۹۱۲ء کے آخر میں ہمارے ہندوستان پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تلک جیل میں تھے۔ انتہا پسند اچھی طرح کچلے جا چکے تھے اور ان کی حالت بے چرواہے کی بھیڑوں کی سی تھی۔ تقسیم بنگالہ کو منسوخ کرانے کی کوشش میں ناکامی ہونے کے بعد بنگال میں بھی ایک سناٹا چھا گیا تھا اور اعتدال پسند جماعت منٹو مارلے اسکیم کے نفاذ کے بعد کونسلوں کے جال میں پھنس چکی تھی البتہ ان ہندوستانیوں کا کچھ خیال لوگوں کو ضرور تھا جو بیچارے پردیس میں پڑے ہوئے تھے، خاص کر جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کا۔ کانگریس بھی اس زمانے میں معتدل خیال کی جماعت تھی، بس سال کے سال جلسہ ہو جاتا اور چند بے جان سی تجویزیں منظور ہو جاتیں، غرض اس میں کوئی کشش نہ تھی۔

۱۹۱۲ء میں بانکی پور کانگریس کے جلسے میں ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے میں بھی شریک ہوا تھا۔ اس وقت یہ انگریزی داں اعلیٰ طبقے کے لوگوں کا ایک جلسہ معلوم ہوتی تھی، جدھر دیکھو بس کوٹ پتلون کی نمائش تھی، اس پر کسی سیاسی جلسے کا شبہ تک نہ ہوتا تھا۔ نہ کوئی جوش و خروش تھا اور نہ کشاکش، معلوم ہوتا تھا کہ دوستوں کی بے تکلف صحبت ہے۔ گوکھلے جو اسی زمانے میں افریقہ سے واپس آئے تھے، اس جلسے میں موجود تھے اور سب سے نمایاں تھے۔ وہ بے چین طبیعت کے آدمی تھے، سرگرمی اور جوشِ عمل کے پتلے معلوم ہوتے تھے۔ اس سارے مجمع میں وہی ایک ایسے شخص تھے جو سیاست کی سچ مچ کوئی اہمیت سمجھتے تھے اور قومی کام کو کام کی طرح کرنا چاہتے تھے۔ بہرحال میں ان سے بہت متاثر ہوا۔

میں نے ہائی کورٹ میں وکالت شروع کر دی اور اس نئے کام میں میرا تھوڑا بہت جی بھی لگنے لگا۔ یورپ سے واپسی پر شروع شروع میں چند مہینے تو لطف سے کٹے کیونکہ مجھے وطن واپس آنے اور بچھڑے ہوؤں سے ملنے کی بڑی خوشی تھی لیکن رفتہ رفتہ یہ زندگی جو میں اپنے ہم جنسوں کے ساتھ گذار رہا تھا، بے کیف معلوم ہونے لگی اور یہ محسوس ہونے لگا کہ لایعنی اور بے مقصد زندگی کے جنجال میں پھنس گیا ہوں۔ شاید میری دوہری تعلیم اس بے اطمینانی اور پریشانی کا باعث ہو۔ میں انگلستان میں سات برس رہا تھا، اس لیے مجھ پر وہاں کی تہذیب و تمدن کا کافی اثر تھا، ممکن ہے اسی وجہ سے میرا یہاں دل نہ لگتا ہو۔ خوش قسمتی سے گھر کی فضا کچھ غنیمت تھی، اس لیے یہاں مجھے سکون ملتا تھا لیکن سارے دن گھر ہی میں تو رہنا نہ تھا۔ اکثر وقت بار لائبریری اور کلب میں گذرتا تھا۔ یہاں دونوں جگہ زیادہ تر وکیل ہی ہوتے تھے اور ان میں ہر وقت بس اپنے پیشے اور قانون کی باتیں چھڑی رہتی تھیں۔ غرض ذہنی نشو و نما کی کوئی صورت نہ تھی اور نہ تفریح یا دل بہلانے کا کوئی معقول انتظام تھا۔ اس لیے میری طبیعت پر ایک اداسی سی طاری رہنے لگی۔

ان ہی وجوہ سے انگلستان سے واپسی کے بعد چند سال تک تو بہت دل برداشتہ رہا۔ اپنے پیشے میں مجھے پورا انہماک پیدا نہیں ہوا تھا اور سیاسیات میں اس وقت مجھے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کا موقع نہ تھا کیونکہ میرے نزدیک سیاسیات کا مفہوم صرف یہ تھا کہ غیر ملکی حکومت کے خلاف جارحانہ کارروائی کی جائے۔ بایں ہمہ میں کانگریس میں داخل ہو گیا اور کبھی کبھی اس کے جلسوں میں شریک ہوتا رہا۔ جب کبھی کوئی خاص موقع پیش آتا تھا، مثلاً ہندوستانی مزدوروں کو اقرار نامے لکھوا کر فجی لے جانے کے خلاف جدوجہد کرنے کا سوال یا جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کا مسئلہ تو میں پوری سرگرمی سے اس میں کود پڑتا تھا اور دل و جان سے کوشش کرتا تھا لیکن یہ سب کچھ محض وقتی الوقتی تھا، کوئی مستقل شغل نہ تھا۔

جنگِ عظیم شروع ہوتے ہی ہماری توجہ کا رُخ ادھر پھر گیا چونکہ یہ لڑائی بہت دُور ہو رہی تھی، اس لیے شروع شروع میں ہم پر اس کا زیادہ اثر نہیں پڑا اور سچ پوچھئے تو ہندوستان کو اس کی تباہ کاریوں کا پورا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ بہرحال اس کی وجہ سے سیاسی تحریک رُک گئی اور اس کی اہمیت کم پڑ گئی۔ قانونِ تحفظ ہند نے سارے ملک کو اپنی آہنی گرفت میں جکڑ لیا۔ جنگ کے دوسرے سال سے ملک میں گولیاں چلنے کی اور طرح طرح کی سازشوں کی خبریں آنے لگیں اور یہ معلوم ہوا کہ پنجاب میں رنگروٹ بھرتی کرنے میں انتہائی جبر و تشدد سے کام لیا جا رہا ہے۔

جنگ کے ابتدائی زمانے تک میں سیاسی اور قومی کاموں میں کھل کر حصہ نہ لیتا تھا، خاص کر جلسوں میں تقریر کرنے سے بچتا تھا کیونکہ عام مجمع میں زبان کھولتے ہوئے ابھی مجھے خوف اور جھجک سی معلوم ہوتی تھی۔ ایک دوسری وجہ بھی تھی، میرا خیال تھا کہ عام جلسوں میں



انگریزی میں تقریریں نہ ہونا چاہئیں اور اپنے متعلق مجھے یہ اطمینان نہ تھا کہ میں ہندوستانی میں اچھی طرح بول سکوں گا۔ بہرحال الٰہ آباد میں پہلی مرتبہ میں نے تقریر کی۔ اس وقت کا ایک معمولی سا واقعہ اب تک مجھے یاد ہے۔ غالباً یہ ۱۹۱۵ء کا ذکر ہے لیکن مجھے صحیح تاریخوں کا خیال نہیں ہے اور واقعات کا سلسلہ بھی میرے ذہن میں کچھ خلط ملط سا ہے۔ اس وقت حکومت نے پریس کا گلا دبانے کے لیے ایک نیا قانون بنایا تھا، اس کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے ایک جلسہ کیا گیا، اسی جلسے میں میں نے مجبوراً انگریزی میں نہایت مختصر تقریر کی۔ جلسہ ختم ہوتے ہی ڈاکٹر تیج بہادر سپرو نے ڈائس ہی پر مجھے گلے لگا لیا اور بھرے مجمع میں پیار کرنا شروع کیا۔ میں گھبرا اُٹھا۔ ڈاکٹر سپرو کے جوش کی یہ وجہ نہ تھی کہ میں نے کوئی بڑی بات کہی تھی یا اچھے انداز سے کہی تھی بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں قومی کام تقریروں تک ہی محدود تھا، اس لیے وہ پھولے نہ سماتے تھے کہ میں نے مجمع کے سامنے زبان تو کھولی، گویا قومی کام کے لیے ایک نیا کارکن ہاتھ آ گیا۔

اس زمانے میں ہمارے گھر میں سیاسی مسائل پر خوب گرما گرم بحثیں ہوتی تھیں اور جہاں یہ ذکر چھڑا، فوراً جھڑپ ہو جاتی تھی۔ والد نہایت غور سے اس چیز کا مطالعہ کر رہے تھے کہ میرا رجحان انتہا پسندی کی طرف ہے اور میں سیاست میں باتیں بنانے کا سخت مخالف اور عملی کام کرنے کا حامی ہوں۔ میں کیا عملی کام چاہتا تھا، یہ اس وقت واضح نہ تھا لیکن کبھی کبھی والد کو یہ خیال ہوتا تھا کہ بنگال کے بعض نوجوانوں کی طرح میں بھی تشدد کی طرف جا رہا ہوں، اس سے انھیں بڑی تشویش ہوتی تھی حالانکہ میرا رجحان اس طرف قطعی نہ تھا، صرف یہ خیال ہر وقت پریشان کیا کرتا تھا کہ موجودہ صورت ہمیں بزدلی کے ساتھ گوارا نہ کرنی چاہیے، بلکہ اب کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے، لیکن کوئی ایسی نتیجہ خیز کارروائی جس سے قوم کا بیڑا پار ہو آسان نہ تھی۔ تاہم میرے نزدیک ہماری انفرادی اور قومی عزت کا تقاضا یہی تھا کہ ہم غیر ملکی حکومت کے خلاف جارحانہ کارروائی کریں۔ والد بھی اعتدال پسندوں کے نظریے سے دل برداشتہ تھے اور ان کے دماغ میں بھی خاموش کشمکش جاری تھی لیکن ان میں ایک خاص آن تھی، جب تک انہیں یقین نہ ہو جاتا کہ اب کوئی دوسرا راستہ نہیں رہا، وہ اپنی جگہ سے ہرگز نہ ہٹتے۔ ہر نیا قدم وہ خوب سوچ سمجھ کر اُٹھاتے اور جو قدم آگے بڑھ جاتا، اس کا پیچھے ہٹنا ناممکن تھا، ان کا ہر فعل وقتی جوش کا نہیں بلکہ انتہائی غور و خوض کا نتیجہ ہوتا تھا اور ایک مرتبہ طے کر لینے کے بعد ان کی غیرت پھر اس کی اجازت نہ دیتی تھی کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھیں۔

ان کے سیاسی عقائد میں ظاہری تبدیلی مسز بیسنٹ کی نظربندی کے بعد سے شروع ہوئی۔ اس وقت سے وہ درجہ بدرجہ برابر آگے بڑھتے گئے اور اپنے اعتدال پسند رفقا کو بہت پیچھے چھوڑ دیا حتیٰ کہ ۱۹۱۹ء میں حادثۂ پنجاب کے بعد انہوں نے اپنی قدیم معاشرت اور اپنا پیشہ سب کچھ تج دیا اور گاندھی جی کی شروع کی ہوئی نئی تحریک میں تن من سے شریک ہو گئے۔ ...

گاندھی جی سے میں پہلے پہل ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ کانگریس میں ملا تھا۔ جنوبی افریقہ میں انھوں نے حکومت کا جس دلیری سے مقابلہ کیا تھا، ہم سب اس کے معترف اور مداح تھے۔ لیکن ہم نوجوانوں کو وہ عجیب و غریب شخص اور کچھ غیر سیاسی آدمی معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے اس وقت کانگریس یا ملک کی سیاست میں حصّہ لینے سے انکار کر دیا اور صرف جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے معاملے تک اپنی سرگرمیوں کو محدود رکھا۔ اس کے کچھ عرصے بعد ہی انہوں نے چمپارن میں چائے کے کاشتکاروں کی حمایت میں جو معرکے فتح کیے، ان سے ہم میں ایک نیا جوش پیدا ہو گیا، ہمیں یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ وہ ہندوستان میں بھی اپنے طریق کار پر عمل کرنے کو تیار ہیں اور اس سے کامیابی کی اُمید بھی ہوتی ہے۔

لکھنؤ کانفرنس مسز سروجنی نائیڈو نے الٰہ آباد میں چند پُرجوش تقریریں کیں — یہ تقریریں حبّ الوطنی کے جذبے سے لبریز تھیں، مجھے یاد ہے کہ میں ان سے بہت متاثر ہوا کیونکہ میں بھی اس وقت خالص قوم پرست تھا اور کالج کے زمانے کے اشتراکی خیالات کب کے دب چکے تھے۔ لیکن مطالعہ جاری تھا، اس لیے میرے دماغ میں اشتراکی عقائد کی چنگاریاں کبھی کبھی روشن ہو جاتی تھیں۔ ابھی یہ باتیں بہت مبہم سی تھیں، ان کی کوئی علمی بنیاد نہ تھی بلکہ یہ محض قیاسی اور نوعِ انسانی کے مفاد سے متعلق تھیں۔ جنگ کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی میرا محبوب مصنف برٹرینڈ رسل تھا۔

ان عقائد کی وجہ سے میرے اندر ایک عجیب کشمکش بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ مجھے وکالت کے پیشے سے نفرت ہوتی جاتی تھی لیکن بالفعل میں نے اسے جاری رکھا، کیونکہ وکالت چھوڑ دینے کے بعد کوئی کام ہی نہ تھا۔ بہرحال یہ مجھے روز بروز یقین ہوتا جاتا تھا کہ قومی کام خاص کر جارحانہ قسم کے قومی کام کے ساتھ، جس کا میں حامی تھا، وکالت نبھ نہیں سکتی۔ ...

شروع میں میرے سیاسی خیالات بھی وہی تھے جو اوسط طبقے کے ہوتے ہیں کیونکہ میں اسی طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ سچ پوچھیے تو اس زمانے میں (بلکہ بڑی حد تک اب بھی) متوسط طبقہ ملکی سیاسیات پر حاوی تھا۔ اعتدال پسند اور انتہا پسند دونوں اسی طبقے کی نمایندگی اور مختلف صورتوں میں ان ہی کی بہتری کی کوشش کرتے تھے۔ اعتدال پسند تو خاص کر متوسط طبقے کے اونچے درجے کے ان مٹھی بھر لوگوں کے نمایندے تھے جو برطانوی دَور میں پھلے پھولے ہیں، اس لیے وہ ایسی فوری تبدیلی گوارا نہیں کر سکتے جس سے ان کی موجودہ حیثیت اور ذاتی مفاد خطرے میں پڑ جائے ..... رہے انتہا پسند تو وہ بھی متوسط طبقے کے نیچے درجے کے لوگوں کے نمایندے تھے .... ۱۹۲۰ء میں مجھے کھیتوں یا کارخانوں کے مزدوروں کی حالت کا بالکل علم نہ تھا کیونکہ میرے سیاسی خیالات بھی اوسط طبقے کے رنگ میں رنگے ہوتے تھے۔ لیکن میں ضرور جانتا تھا کہ ہمارا ملک افلاس کی مصیبت میں گرفتار ہے، اس لیے آزادی حاصل کرتے ہی سب سے پہلے اسی مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے لیکن یہ میں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ آزادی کے بعد متوسط طبقہ ملک کی سیاست پر حاوی ہو جائے گا۔ چمپارن (بہار) اور کیرا

(گجرات) میں گاندھی جی کی ذیلی تحریکوں کے بعد مجھے کسانوں کے مسئلے سے بھی کچھ دلچسپی ہو گئی تھی لیکن ۱۹۲۰ء کے سیاسی ہنگاموں اور ترک موالات کی تحریک سے جو شروع ہونے والی تھی، مجھے اتنی فرصت کہاں تھی کہ اس طرف کچھ توجہ کرتا۔

اسی زمانے میں مجھے ایک نئی چیز سے دلچسپی پیدا ہو گئی جو آگے چل کر میری زندگی میں خاص اہمیت اختیار کرنے والی تھی یعنی تقریباً بلا ارادہ مجھے کسانوں سے سابقہ پڑا اور اس کی عجیب صورت ہوئی۔

میری ماں اور میری بیوی کملا دونوں کچھ بیمار تھیں، اس لیے مئی ۱۹۲۰ء کے پہلے ہفتے میں میں انھیں مسوری لے گیا . . . . ہم مسوری کے سیوائے ہوٹل میں جا کر اترے امان اللہ کے تخت نشین ہونے کے بعد افغانستان اور برطانیہ میں ۱۹۱۹ء میں ایک مختصر سی جنگ ہو گئی تھی۔ اس زمانے میں ان دونوں حکومتوں کے نمائندے مسوری میں موجود تھے اور مصالحت کی گفتگو ہو رہی تھی۔ افغانی نمائندے سیوائے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے لیکن وہ سب سے الگ تھلگ رہتے تھے، الگ بیٹھ کر کھانا کھاتے اور ہوٹل کے عام کمرے میں کبھی قدم نہ رکھتے تھے۔ مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ایک مہینے کے قیام میں ان میں سے کسی شخص کو میں نے دیکھا تک نہ تھا، اگر دیکھا بھی ہو تو پہچانتا نہ تھا۔ یکایک ایک دن شام کے وقت سپرنٹنڈنٹ پولیس ہمارے یہاں پہنچے اور صوبہ متحدہ کی حکومت کا ایک خط مجھے دکھایا جس میں مجھ سے اس قسم کے اقرار نامے کا مطالبہ کیا گیا تھا کہ میں افغانی وفد سے کوئی راہ و رسم یا تعلق نہ رکھوں گا۔ یہ بات مجھے عجیب سی معلوم ہوئی کیونکہ پچھلے ایک مہینے کے قیام میں، میں ان میں سے کسی سے نہیں ملا تھا، نہ آئندہ اس کی کوئی امید تھی — سپرنٹنڈنٹ موصوف بھی یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کیونکہ وہ ان کی خاص نگرانی کر رہے تھے اور ان کے پیچھے خفیہ پولیس کے سینکڑوں آدمی لگے ہوئے تھے۔ بہرحال اس طرح کا اقرار نامہ لکھنا میری طبیعت کے خلاف تھا، اس لیے میں نے صاف انکار کر دیا۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ اگر آپ دہرہ دون کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے مل لیں تو اچھا ہو۔ میں نے ان کی اس تجویز کو منظور کر لیا اور ان سے ملا لیکن چونکہ اقرار نامہ لکھنے سے برابر انکار کرتا رہا، اس لیے مجھے حکم دیا گیا کہ میں چوبیس گھنٹے کے اندر دہرہ دون کے ضلع سے باہر نکل جاؤں۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ مسوری سے میں چند گھنٹے کے اندر روانہ ہو جاؤں۔ میرا دل تو نہ چاہتا تھا کہ اپنی بیمار ماں اور بیوی کو چھوڑ کر چلا جاؤں لیکن اس وقت سول نافرمانی شروع نہیں ہوئی تھی، اس لیے میں نے اس حکم کی خلاف ورزی کرنا مناسب نہ سمجھا اور مسوری سے روانہ ہو گیا . . .

مسوری سے شہر بدر کیے جانے کے بعد میں دو ہفتے تک الٰہ آباد میں رہا۔ اسی زمانے میں کسانوں کی تحریک سے مجھے کچھ لگاؤ پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد یہ لگاؤ بڑھتا گیا اور اس سے میرے ذہن پر بہت کچھ اثر پڑا۔ اکثر مجھے یہ خیال آتا ہے کہ اگر میں مسوری سے نکالا نہ گیا ہوتا اور اس زمانے میں الٰہ آباد میں بے کار نہ ہوتا تو اس وقت میرا کیا رنگ ہوتا۔ بہرحال کبھی نہ کبھی تو کسانوں کی تحریک سے مجھے ضرور سابقہ پڑتا لیکن شاید اس کی نوعیت مختلف ہوتی اور مجھ پر اس کا اثر بھی کچھ اور ہوتا . .

۱۹۲۱ء ہم لوگوں کے لیے غیر معمولی سال تھا۔ اس زمانے میں قوم پرستی، سیاسیات، مذہب، بالطنیت اور جنون کا ایک عجیب معجون مرکب بن گیا۔ ادھر کسانوں کی تحریک چل رہی تھی اور بڑے شہروں میں مزدوروں کی تحریک بھی زور پکڑ رہی تھی۔ قوم پرستی اور ایک مبہم طرح کی تصور پرستی نے جمہور کے ان عناصر کو جن میں سے بعض ایک دوسرے کے مخالف تھے، متحد کرنا چاہتی تھی اور اُسے اس میں حیرت انگیز کامیابی ہوئی۔ یہ قوم پرستی خود بھی ایک مرکب قوت تھی۔ اس میں تین اجزا الگ الگ نظر آ رہے تھے یعنی ہندو قوم پرستی، مسلم قوم پرستی جس کی دلچسپی ایک حد تک ہندوستان سے باہر اسلامی ممالک سے وابستہ تھی، اور ہندوستانی قوم پرستی جو مقتضائے وقت سے زیادہ مطابقت رکھتی تھی، عارضی طور پر یہ تینوں قوتیں مل جل گئی تھیں اور ساتھ ساتھ کام کر رہی تھیں۔ ہر جگہ ہندو مسلمان کی جے کے نعرے گونج رہے تھے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ گاندھی جی نے ان تمام فرقوں اور جماعتوں پر نہ جانے کیا جادو کر دیا کہ یہ رنگ برنگ کا مجمع اکٹھا ہو کر ایک ہی طرف جھک پڑا۔ وہ حقیقت میں لوگوں کی مخلوط خواہشوں کا مظہر بن گئے تھے (یہ فقرہ ایک دوسرے بیذر کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔)

اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ لوگوں کے اس جوش و خروش میں بدیشی حکمرانوں سے نفرت کا جذبہ نسبتاً بہت کم پایا جاتا تھا۔ قوم پرستی اصل میں ایک مخالفانہ جذبہ ہے۔ دوسری قوموں سے نفرت اور بیزاری اس کی غذا ہے۔ خصوصاً غلام ملک کی قوم پرستی تو سراسر بدیسی حکمرانوں سے نفرت کے جذبے پر منحصر ہے۔ ہندوستان میں بھی ۱۹۲۱ء میں برطانیہ سے نفرت اور بیزاری موجود تھی لیکن دوسرے غلام ملکوں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ سچ پوچھیے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ گاندھی جی نے عدم تشدد پر غیر معمولی زور دیا تھا۔ ایک دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ تحریک کے شروع ہوتے ہی لوگوں میں آزادی اور قوت کا احساس پیدا ہو گیا تھا اور انھیں یقین تھا کہ منزلِ مقصود ہم سے بہت قریب ہے اس لیے وہ سوچتے تھے کہ جب کام اتنی اچھی طرح چل رہا ہے اور کامیابی بالکل یقینی ہے تو نفرت اور غصے کی ضرورت ہی کیا ہے یا احساسِ قوت نے ہم میں فراخدلی پیدا کر دی تھی۔

مگر ہمارا دل اپنے ان معدودے چند ہم وطنوں سے صاف نہ تھا جو ہمارے حریفوں سے مل کر قومی تحریک کی مخالفت کر رہے تھے گو ہم نے اپنے طرزِ عمل میں بہت احتیاط سے کام لیا اور اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ ان کے معاملے میں نفرت یا غصے کا کوئی سوال نہیں تھا اس لیے کہ ان کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور ہم انھیں آسانی سے نظر انداز کر سکتے تھے، البتہ ان کی کمزوری، ابن الوقتی اور قوم فروشی کو دیکھ کر ہمارے دل میں حقارت کا جذبہ ضرور پیدا ہوتا تھا۔

بہرحال ہم بے سوچے سمجھے زور شور سے بڑھے چلے جا رہے تھے۔ سفر کا سرور ہمارے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا مگر منزلِ مقصود کا کوئی واضح تصور ہمارے سامنے نہیں تھا۔ اب



یہ خیال کرکے حیرت ہوتی ہے کہ ہم نے کس طرح تحریک کے نظری پہلو یعنی اس کے فلسفے اور مقصد کو قطعی طور پر نظر انداز کردیا تھا۔ ہم سب سوراج سوراج پکارتے تھے لیکن اس لفظ کا مفہوم ہر شخص اپنے خیال کے مطابق الگ الگ سمجھتا تھا۔ اکثر نوجوانوں کے نزدیک اس کا مفہوم کامل سیاسی آزادی اور جمہوری طرزِ حکومت تھا اور ہم اپنی تقریروں میں اس کا صاف صاف اظہار بھی کرتے تھے۔ ہم میں سے بہت سے یہ بھی سمجھتے تھے کہ اس سے لازمی طور پر اس بوجھ میں کمی ہو جائے گی جو کسانوں اور مزدوروں کے طبقے کو کچلے ڈالتا ہے لیکن یہ یقینی ہے کہ ہمارے اکثر لیڈر سوراج کا مفہوم مکمل آزادی سے بہت کم سمجھتے تھے۔ گاندھی جی خود اس معاملے میں بڑے مزے کی گول مول باتیں کیا کرتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس پر وضاحت سے غور کیا جائے مگر ان کی مبہم گفتگو سے بھی یہ صاف طور پر ظاہر تھا کہ وہ غریبوں کے حامی ہیں اور اس بات سے ہم میں سے اکثر کو بڑی تسکین ہوتی تھی۔ اگرچہ اسی کے ساتھ وہ امیروں کو بھی بہت اطمینان دلاتے تھے۔ گاندھی جی کسی مسئلے کو عقلی طور پر حل کرنے کے قائل نہیں تھے بلکہ سیرت اور پرہیزگاری پر زور دیتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھیں ہندوستانیوں میں محکم ارادہ اور مضبوط سیرت پیدا کرنے میں حیرت انگیز کامیابی ہوئی لیکن بہت ایسے بھی تھے جن میں نہ محکم ارادہ پیدا ہوا اور نہ مضبوط سیرت بلکہ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ ڈھیلا ڈھالا جسم اور بے رونق چہرہ پرہیزگاری کی علامت ہے۔

لوگوں میں جو غیر معمولی قوت اور چستی پیدا ہوگئی تھی اسے دیکھ کر ہمارا دل اعتمادِ نفس کے جذبے سے معمور تھا۔ یہ سست، پست اور منتشر جماعت یکایک سینہ تان کر اور گردن اٹھا کر چلنے لگی اور منضبط اور متحدہ تحریک میں جو ملک میں اس سرے سے اس سرے تک اٹھی تھی، شریک ہوگئی۔ ہمیں یقین تھا کہ یہ جوشِ عمل بجائے خود ان میں ایسی قوت پیدا کردے گا جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کرسکتی۔ اس لیے ہمیں اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی کہ عمل کی تہ میں کوئی خیال بھی ہونا چاہیے۔ ہم نے اس حقیقت کو فراموش کردیا تھا کہ صحیح تخیل اور منزلِ مقصود کے بغیر عوام کا یہ سارا جوش و خروش دھواں بن کر اُڑ جائے گا۔ ہماری تحریک میں ایک اصلاحی عنصر تھا، وہ ہمیں کسی حد تک آگے بڑھائے جا رہا تھا۔ ہمیں یہ زعم تھا کہ عدم تشدد جو سیاسی اور معاشی تحریکوں کے لیے اور مظالم کا تدارک کرنے کے لیے سب سے کارگر چیز ہے۔ ایک نیا پیام ہے جو ہم ساری دنیا کو دے رہے ہیں، سچ پوچھئے تو ہم اور سب قوموں کی طرح اس فریبِ نفس کا شکار ہوگئے کہ ہم ایک برگزیدہ قوم ہیں۔ عدم تشدد کو ہم جنگ و جدال کا اخلاقی بدل سمجھتے تھے اور اسی کے ساتھ وہ ایک موثر حربہ بھی تھا۔ غالباً ہم میں سے بہت کم لوگ ایسے تھے جو مشنری اور جدید تہذیب کے متعلق گاندھی جی کے پرانے نظریوں کو تسلیم کرتے ہوں۔

ہمارا خیال تھا کہ وہ خود بھی انہیں ناقابلِ عمل اور جدید حالات کے لیے ناموزوں سمجھتے ہیں۔ بہرحال ہم میں سے اکثر جدید تہذیب کے کارناموں کو ٹھکرانے کے لیے تیار نہ تھے یہ اور بات ہے کہ ہم ہندوستان کے حالات کے مطابق ان میں مناسب ترمیم کی ضرورت سمجھتے ہوں۔ مجھے تو بڑی مشینیں اور تیز رفتار سواریاں بہت پسند ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ گاندھی جی کے خیالات کا بہت سے لوگوں پر اثر پڑا اور وہ مشینری اور اس کے استعمال کے نتائج پر نکتہ چینی کرنے لگے۔ گویا صورت یہ تھی کہ بعض لوگوں کی نظر مستقبل پر تھی اور بعض کی ماضی پر مگر لطف یہ ہے کہ دونوں فریق اس متحدہ کوشش کو جو وہ کررہے تھے، مفید سمجھتے تھے اسی لیے وہ ایثار اور قربانی کے لیے آسانی سے تیار ہوگئے۔

میں اور میری طرح اور بہت سے لوگ اس تحریک میں محو ہو کر رہ گئے۔ میں نے اپنی تمام پرانی دلچسپیاں اور تعلقات، پرانے دوستوں کی صحبت، کتب بینی، غرض سب کچھ ترک کردیا۔ یہاں تک کہ اپنے کام کی خبروں کے سوا اخبار تک پڑھنا چھوڑ دیا۔ اس وقت تک مجھے تازہ ترین مطبوعات پڑھنے کا شوق تھا اور میں کوشش کرتا تھا کہ واقعاتِ عالم سے باخبر رہوں لیکن اب اس کے لیے وقت کہاں سے آتا؟ باوجود اس محبت کے جو مجھے اپنے خاندان سے تھی، میں نے اپنے سب عزیزوں یہاں تک کہ اپنی بیوی اور لڑکی کو بھی بھلا دیا تھا۔ یہ احساس مجھے ایک عرصے کے بعد ہوا کہ اس زمانے میں ان لوگوں کو مجھ سے کتنی تکلیف پہنچی ہوگی اور میری بیوی نے کس قدر صبر و تحمل سے کام لیا۔ میں دن رات دفتروں، کمیٹیوں اور جلسوں میں رہا کرتا تھا۔ ان دنوں دیہات جانے کا زور تھا اور ہم کھیتوں ہی کھیتوں میلوں پیدل چلا کرتے تھے اور دور دور پہنچ کر کسانوں کے جلسوں میں تقریریں کیا کرتے تھے۔ اب مجھے اس جوش کا احساس ہوا جو مجمع میں جاکر پیدا ہوتا ہے اور معلوم ہوا کہ مجھ میں لوگوں پر اثر ڈالنے کی قوت ہے۔ میں مجمع کی نفسیات کو تھوڑا بہت سمجھنے لگا اور اس فرق سے واقف ہوگیا جو شہر والوں اور دیہاتیوں کی ذہنیت میں ہوتا ہے۔ مجھے بڑے بڑے جلسوں کے گرد و غبار، ریل پیل، دھکم دھکا میں لطف آنے لگا۔ البتہ کبھی کبھی ان کی بدنظمی سے مجھے غصہ آجاتا تھا۔ اس کے بعد بعض اوقات مجھے مخالف اور برہم مجمع سے بھی سابقہ پڑا جو اس قدر برافروختہ ہوتا تھا کہ ذرا سی چنگاری آگ لگا دینے کو کافی تھی۔ ایسے موقعوں پر میں نے یہ اندازہ کیا کہ میرا ابتدائی تجربہ اور وہ اعتمادِ نفس جو اس کی وجہ سے مجھ میں پیدا ہوگیا تھا۔ بہت کام آیا۔ میں نے ہمیشہ لوگوں پر بھروسہ کیا اور مجمع کے بیچ میں درآتا چلا گیا۔ اب تک وہ مجھ سے ہمیشہ بڑے اخلاق اور عزت سے پیش آئے ہیں چاہے انہیں میری رائے سے اتفاق نہ بھی ہو لیکن مجمع کا کیا اعتبار۔ ممکن ہے آئندہ مجھے تلخ تجربے پیش آئیں۔ مجھے مجمع سے اور مجمع کو مجھ سے اُنس ہوگیا لیکن میں نے کبھی اپنی ہستی کو اس میں محو نہیں ہونے دیا۔ ہمیشہ اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھا۔ اپنے خاص زاویۂ نگاہ سے میں اس پر ناقدانہ نظر ڈالتا تھا اور ہمیشہ تعجب کیا کرتا تھا کہ اگرچہ میں ان ہزاروں افراد سے جو مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں، عادات و اطوار، جذبات و خواہشات، ذہنی اور روحانی نظریات غرض ہر چیز میں بالکل مختلف ہوں، پھر بھی وہ مجھ سے خوش ہیں اور کسی حد تک اعتماد بھی کرتے ہیں کیا اس کی یہ وجہ تھی کہ انہوں نے مجھے کچھ سے کچھ سمجھ لیا تھا؟ کیا مجھے میرے اصلی رنگ میں دیکھنے کے بعد بھی وہ درگزر سے کام لیں گے؟ میں نے صاف گوئی برتی اور ان کے



سامنے سچی بات کہنے سے کبھی گریز نہ کیا۔ اکثر میں نے انہیں کھری کھری سنائیں اور ان کے توہمات اور رسم و رواج پر لعن طعن کی۔ پھر بھی وہ مجھ سے بیزار نہیں ہوئے لیکن میرے دل میں یہ خیال ہمیشہ کھٹکتا رہا کہ وہ میری ذات سے جیسی وہ واقعی ہے محبت نہیں کرتے ہیں بلکہ اس خوشنما تصور سے محبت کرتے ہیں جو انہوں نے میرے متعلق اپنے ذہن میں قائم کر لیا ہے لیکن یہ جھوٹی مورت کب قائم رہ سکتی ہے اور کیوں قائم رہنے دی جائے؟ پھر جب یہ مورت پاش پاش ہو جائے گی اور حقیقت کھل جائے گی تو کیا ہوگا؟

مجھ میں خود پسندی کا عیب ہے لیکن ان بھولے بھالے لوگوں کے سامنے خود پسندی کا کوئی موقع نہیں تھا۔ ان میں اس بناوٹ اور اوچھے پن کا شائبہ بھی نہیں ہے جو اکثر ہمارے اوسط طبقے کے لوگوں میں جنہیں ان سے برتر ہونے کا دعویٰ ہے، پائی جاتی ہے اس میں شبہ نہیں کہ یہ بیچارے عام طور پر بے حس اور انفرادی طور پر نہایت غیر دلچسپ ہیں لیکن بہ حیثیت مجموعی ان پر بڑا ترس آتا ہے اور اس مصیبت کو دیکھ کر جو ان کے سروں پر منڈلاتی رہتی ہے، بہت دکھ ہوتا ہے۔

لیکن ہماری کانفرنسوں کا رنگ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ یہاں ہمارے چیدہ کارکن (جن میں میں بھی شامل تھا) پلیٹ فارم پر طرح طرح کے کرتب دکھاتے تھے۔ ہمارے انداز میں بناوٹ کی اور ہماری دھواں دھار تقریروں میں اوچھے پن کی کمی نہ تھی۔ یہ عیب ہم میں سے ہر ایک میں کسی نہ کسی حد تک موجود تھا لیکن چھوٹے چھوٹے خلافتی لیڈر شاید اس معاملے میں سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ کسی بڑے مجمع کے سامنے پلیٹ فارم پر فطری انداز قائم رکھنا آسان نہیں ہے اور ہم میں سے اکثر کو اتنی زیادہ شہرت حاصل کرنے کا یہ پہلا ہی اتفاق تھا۔ اس لیے ہم اپنی ہیئت بنا لیتے تھے جو ہمارے نزدیک لیڈروں کی ہونی چاہیے۔ یعنی ایک غور و فکر اور سنجیدگی کی شان جس میں ہنسی مذاق کا شائبہ بھی نہ تھا چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے یہاں تک کہ مسکراتے وقت بھی ہمیں یہ خیال رہتا تھا کہ ہزاروں آنکھیں ہم پر لگی ہوئی ہیں اور اس سے متاثر ہو کر ہم طرح طرح کی مضحک حرکتیں کیا کرتے تھے۔ ہماری تقریریں اکثر بہت زوردار اور جوشیلی لیکن اتنی ہی مہمل اور بے معنی بھی ہوتی تھیں۔ دوسروں کی نظر سے اپنے آپ کو دیکھنا بہت مشکل ہے اس لیے میں خود اپنی تنقید نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ دوسروں کے انداز و اطوار کا بہت غور سے مطالعہ کرتا تھا اور اس سے بہت لطف اٹھاتا تھا لیکن اسی کے ساتھ یہ خیال کر کے دل کانپ اٹھتا تھا کہ شاید دوسروں کو میں بھی اتنا ہی مضحک معلوم ہوتا ہوں۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں سال بھر کانگریس کے کارکن ایک ایک کر کے برابر گرفتار ہوتے رہے اور سزا پاتے رہے۔ مجموعی گرفتاریاں شروع نہیں ہوئی تھیں۔ علی برادران کو فوج میں بغاوت پھیلانے کے جرم میں طویل سزا مل چکی تھی جن الفاظ کے زبان سے نکالنے پر انہیں سزا ہوئی تھی، سینکڑوں پلیٹ فارموں سے ہزاروں آدمیوں نے انہیں کو دہرایا۔ گرمیوں کے زمانے میں میرے متعلق بھی یہ اندیشہ ظاہر کیا گیا کہ چند تقریروں کی وجہ پر مجھ پر بغاوت کا جرم عائد کیا جائے گا اور مقدمہ چلایا جائے گا لیکن ایسی کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ سال کے آخر میں معاملات حد کو پہنچ گئے۔ پرنس آف ویلز ہندوستان آنے والے تھے۔ اور کانگریس نے طے کیا تھا کہ ان کا بائیکاٹ کیا جائے۔ نومبر کے آخر میں بنگال میں کانگریس کے والنٹیئر خلاف قانون قرار دے دیے گئے۔ اس کے بعد اسی قسم کا اعلان صوبجات متحدہ میں بھی ہوا۔ دیش بندھو داس نے صوبہ بنگال کے نام ایک ولولہ انگیز پیغام شائع کیا اس میں لکھا تھا "مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئی ہیں اور میرا سارا جسم آہنی زنجیروں سے جکڑا ہوا ہے۔ یہ غلامی کا قہر ہے۔ سارا ملک ایک بہت بڑا جیل خانہ ہے۔ چاہے میں آزاد رہوں یا جیل خانے میں بند کر دیا جاؤں۔ چاہے میں زندہ رہوں یا مر جاؤں لیکن کانگریس کا کام بہر صورت جاری رہنا چاہیے۔" صوبہ متحدہ میں بھی ہم نے حکومت کے چیلنج کو قبول کر لیا اور نہ صرف یہ اعلان کیا کہ ہماری والنٹیئروں کی انجمن جاری رہے گی بلکہ روزانہ اخباروں میں اپنے والنٹیئروں کے نام بھی شائع کرانا شروع کر دیے۔ پہلی فہرست میں سب سے پہلا نام میرے والد کا تھا۔ وہ والنٹیئر نہ تھے لیکن محض گورنمنٹ کے حکم کی خلاف ورزی کے لیے انہوں نے بھی اپنا نام لکھا لیا۔ دسمبر کے آغاز میں ولیعہد کے آنے سے چند روز پہلے کثیر تعداد میں گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔

ہم جانتے تھے کہ اب پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ حکومت اور کانگریس کے درمیان جس جنگ کا اندیشہ تھا وہ اب چھڑنے ہی والی ہے۔ جیل خانہ ابھی تک ایک غیر معروف جگہ تھی اور جیل جانے کا خیال بالکل نیا تھا۔ میں ایک دن الہ آباد کے کانگریس کے دفتر میں معمولی وقت کے بعد بیٹھا پچھلا کام نبٹا رہا تھا کہ ایک کلرک گھبرایا ہوا آیا اور کہا کہ پولیس تلاشی کا حکم لے کر آ پہنچی ہے اور دفتر کی عمارت کو گھیرے ہوئے ہے۔ میں بھی کچھ گھبرا گیا کیونکہ اس قسم کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ مگر میں نے دل میں کہا کہ ذرا رعب جمانا چاہیے اور یہ ظاہر کرنا چاہیے کہ ہم بالکل مطمئن ہیں اور ہمیں پولیس کی آمد و رفت کی مطلق پروا نہیں، چنانچہ میں نے ایک کلرک کو حکم دیا کہ وہ پولیس افسر کے ساتھ ساتھ جا کر دفتر کے تمام کمرے دکھا دے اور باقی عملے کو سختی سے تاکید کی کہ وہ پولیس کی طرف کوئی توجہ نہ کریں اور بدستور اپنا کام کرتے رہیں۔ تھوڑی دیر بعد میرے ایک دوست اور رفیق کار، جو دفتر کے باہر ہی گرفتار ہوئے تھے ایک سپاہی کے ساتھ مجھ سے رخصت ہونے آئے۔ مجھے اس وقت یہ خبط سمایا ہوا تھا کہ جیسے یہ نئے واقعات میرے لیے آئے دن کی چیز ہیں اس لیے میں اپنے دوست سے بڑی سرد مہری سے پیش آیا یعنی میں نے ان سے اور سپاہی سے بڑی بے پروائی سے کہا کہ ذرا ٹھہریئے۔ میں یہ خط ختم کر لوں۔ اس کے بعد ہی شہر سے گرفتاریوں کی خبریں آنا شروع ہو گئیں۔ آخر کار میں نے سوچا کہ گھر چل کر دیکھنا چاہیے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ مکان پر پہنچا تو دیکھا کہ پولیس وہاں بھی موجود ہے اور ہماری وسیع کوٹھی کی تلاشی لے رہی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ والد کو اور مجھے گرفتار کرنے آئے ہیں۔

ہم پرنس آف ویلز کے بائیکاٹ میں چاہے جتنا اہتمام کرتے ہمیں اتنی کامیابی

ہرگز نہیں ہو سکتی تھی جتنی ان واقعات سے ہوئی۔ جہاں کہیں وہ تشریف لے گئے ہڑتالوں اور سونی سڑکوں نے ان کا خیر مقدم کیا۔ الٰہ آباد ان کی آمد کے موقع پر شہرِ خموشاں معلوم ہوتا تھا۔ چند دن بعد وہ کلکتے گئے تو اس عظیم الشان شہر میں بھی تمام چہل پہل یکایک بند ہو گئی۔ یہ پرنس آف ویلز کے ساتھ بڑا ظلم تھا کیونکہ نہ ان کا کوئی قصور تھا نہ ہمیں ان سے کوئی شکایت تھی۔ البتہ حکومتِ ہند ان کی شخصیت سے ناجائز فائدہ اُٹھانا چاہتی تھی اور ان کے ذریعے سے اپنی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالنا چاہتی تھی۔ اسی لیے ہم انکا بائیکاٹ کر رہے تھے۔

اب تو گرفتاریوں اور سزایابیوں کا تار بندھ گیا خصوصاً بنگال اور صوبجاتِ متحدہ میں ان صوبوں کے تمام مقتدر لیڈر اور کارکن گرفتار کر لیے گئے اور والنٹیر تو ہزاروں کی تعداد میں جیل بھیج دیئے گئے۔ شروع شروع میں زیادہ تر شہر والوں نے پیش قدمی کی اور یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ جیل جانے والے والنٹروں کا سلسلہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ صوبہ متحدہ کی کانگریس کمیٹی تو اپنے اجلاس کے وقت پوری پوری گرفتار کر لی گئی (اس وقت ۵۵ ممبر موجود تھے) بہت سے ایسے لوگ بھی جنہوں نے کانگریس میں یا سیاسی کاموں میں آج تک کوئی حصہ نہیں لیا تھا، جوش کے اس اُمڈتے ہوئے سیلاب میں بہہ گئے اور گرفتار ہونے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ ایسی مثالیں بھی سننے میں آئی ہیں کہ سرکاری دفتر کا کوئی کلرک شام کو اپنے کام پر سے واپس آرہا ہے۔ راستے میں وہ بھی اس رو میں بہہ گیا اور گھر جانے کے بجائے جیل پہنچ گیا۔ لڑکے اور نوجوان قیدیوں کی لاری میں گھس جاتے تھے اور اصرار کرتے تھے کہ ہمیں بھی جیل خانے لے چلو۔ روز شام کو ہم جیل کے اندر سے سُنا کرتے تھے کہ سیاسی قیدیوں کی لاریوں پر لاریاں چلی آرہی ہیں اور قومی نعرے لگائے جا رہے ہیں۔ جیل خانے کھچا کھچ بھر گئے تھے اور جیل کے افسر اس غیر معمولی صورتِ حالات سے سخت پریشان تھے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ پولیس کی لاری وارنٹ کے مطابق قیدیوں کی ایک خاص تعداد لے کر روانہ ہوئی (قاعدے کی وجہ سے یا مجبوری سے ان کے نام نہیں لکھے جاتے تھے) مگر جب جیل خانے کے دروازے پر پہنچی تو اس میں اس تعداد سے کہیں زیادہ قیدی نکلے۔ جیل کے افسر حیران رہ جاتے تھے کہ اس عجیب و غریب صورت میں کیا طرزِ عمل اختیار کریں کیونکہ جیل مینوئل میں اس کے متعلق کوئی دفعہ نہ تھی۔

آخر حکومت نے لوگوں کو بلا تفریق گرفتار کرنے کا رویہ ترک کر دیا۔ اب صرف مشہور مشہور کارکن چن لیے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ لوگوں کے جوش کا وہ پہلا زور کم ہو گیا اور چونکہ جیل میں سارے کے سارے معتمد کارکن نہ تھے اس لیے وہ ایک بے بسی اور تذبذب کی حالت میں پھنس گئے لیکن یہ تبدیلی محض ظاہری تھی۔ ابھی فضا میں گرمی اور کرنٹ موجود تھی۔ ملک میں بے چینی باقی تھی اور انقلابی رجحانات پائے جاتے تھے۔ دسمبر ۱۹۲۱ء و جنوری ۱۹۲۲ء میں ترکِ موالات کے سلسلے میں ۳۰ ہزار شخص جیل گئے لیکن اگرچہ سارے نمایاں لیڈر اور کارکن جیل میں تھے مگر تحریک کے بانی اور رہبرِ اعظم مہاتما گاندھی ابھی باہر تھے اور روزانہ پیغامات اور ہدایات جاری کرتے رہتے تھے جس سے لوگوں میں جوش بڑھتا تھا اور اکثر نامناسب حرکتیں رُک جاتی تھیں۔ حکومت نے اب تک انھیں نہیں چھیڑا تھا کیونکہ وہ اس کے نتائج سے ڈرتی تھی اور اسے اندیشہ تھا کہ کہیں ہندوستانی فوج اور پولیس نہ بھڑک اُٹھے۔

فروری ۱۹۲۲ء کے آغاز میں یکایک تمام منظر بدل گیا۔ جیل خانے میں یہ سُن کر ہمیں بڑی حیرت و پریشانی ہوئی کہ گاندھی جی نے تمام جارحانہ کاروائیاں ایک دم سے روک دیں اور عدم تعاون کی تحریک ملتوی کر دی۔ اخباروں میں ہم نے یہ بھی پڑھا کہ چورا چوری کے واقعات کی وجہ سے انھوں نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا، یہ موضع گورکھپور کے ضلع میں ہے یہاں دیہاتیوں کے ایک مجمع نے پولیس کے مظالم سے تنگ آکر تھانے کو آگ لگا دی اور چھ سات سپاہیوں کو زندہ جلا دیا۔

ہمیں جنگ کے التوا کی خبر سُن کر بڑا غصہ آیا کیونکہ اس وقت ہماری قوت بڑھی ہوئی تھی اور ہم ہر محاذ پر پیش قدمی کر رہے تھے لیکن جیل خانے کے اندر ہماری مایوسی اور غصے سے کیا نتیجہ نکل سکتا تھا، چنانچہ عدم تعاون ختم ہو گیا اور ترکِ موالات کی کلی کھلنے سے پہلے مرجھا گئی۔ مہینوں کی تگ و دو اور پریشانی کے بعد حکومت نے بھی اطمینان کا سانس لیا اور اب اسے پہلی بار موقع ملا کہ پیش قدمی کرے، چنانچہ چند ہفتے کے اندر اندر اس نے گاندھی جی کو گرفتار کر کے طویل مدت کے لیے جیل خانے میں بند کر دیا۔

میں شروع مارچ میں باہر آیا تھا اور چھ سات ہفتے بعد اپریل میں پھر جیل چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں کی دنیا ہی بدل گئی ہے۔ والد نینی تال کے جیل خانے میں بھیج دیئے گئے تھے اور ان کی روانگی کے بعد ہی نئے نئے قانون نافذ ہو گئے تھے۔ وہ سب قیدی جو پہلے میرے ساتھ پارچہ بافی کے کارخانے میں رہا کرتے تھے اب جیل کے اندرونی حصے میں منتقل کر دیئے گئے تھے اور ان بارکوں میں رہتے تھے جن میں علیحدہ علیحدہ کمرے نہ تھے بلکہ بڑے بڑے ہال تھے۔ ہر بارک گویا جیل خانے کے اندر ایک اور جیل خانہ تھا اور مختلف جیلوں میں آمد و رفت کی اجازت نہ تھی۔ اب مہینے میں صرف ایک بار عزیزوں سے ملاقات ہو سکتی تھی اور صرف ایک خط آ جا سکتا تھا۔ کھانا بھی اب نسبتاً ادنیٰ درجہ کا ملتا تھا لیکن ہمیں اس کی اجازت تھی کہ باہر سے اپنا کھانا منگا لیں۔

جس بارک میں میں تھا اس میں کوئی پچاس آدمی رہتے تھے جگہ کی تنگی کی وجہ سے وہاں بڑی بھیڑ ہو گئی تھی۔ ہمارے بستر ایک دوسرے سے تین چار فٹ کے فاصلے پر تھے۔ اتفاق سے جتنے آدمی اس بارک میں تھے میں ان سب کو جانتا تھا اور ان میں سے بعض میرے دوست بھی تھے لیکن دن رات میں کسی وقت تخلیہ میسر نہ آنا رفتہ رفتہ کھلنے لگا۔ ہمیشہ ایک مجمع ہر شخص کو گھورتا تھا اور بہت سی چھوٹی تکلیفیں اور ناگواریاں رہا کرتی تھیں۔ غرض کوئی ایسا پُرسکون گوشہ نہ تھا جہاں انسان چند منٹ چین سے بیٹھ سکے۔ ہم سب کے سامنے نہاتے تھے، سب کے سامنے اپنے کپڑے دھوتے تھے۔ ورزش کے لیے بارک کے چاروں طرف

دوڑا کرتے تھے۔ ہم اس قدر بکواس اور بحث کرتے تھے کہ معقول گفتگو کرنے کا دم باقی نہ رہتا تھا اور یہ ہماری خانگی زندگی کا، جس کا دائرہ سینکڑوں گنا وسیع ہوگیا تھا، ایک بے رنگ اور بے کیف نمونہ تھا جس میں خاندان کی خرابیاں تو سب موجود تھیں لیکن خوبی کوئی نہ تھی اور اس پر طرہ یہ کہ لوگوں کے مذاق اور خیالات میں بہت اختلاف تھا۔ ہم سب کو اس سے بڑی سخت کوفت ہوتی تھی اور میں اکثر تنہائی کے لیے تڑپا کرتا تھا۔ اس کے بعد تو ایک زمانے میں مجھے جیل خانے میں ایسی تنہائی اور اتنا تخلیہ ملا کہ مہینوں انسان کی صورت دیکھنے کو ترس گیا۔ ہاں کبھی کبھی جیل کا کوئی افسر ضرور آنکلتا تھا۔ اس حالت میں بھی میں بہت پریشان رہتا تھا اور اس وقت یہ تمنا تھی کہ کوئی اچھے ساتھی مل جائیں اس وقت مجھے ۱۹۲۲ء کی لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل کی چہل پہل یاد آتی تھی۔ پھر بھی میں یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ان دونوں میں میں پُرسکون زندگی کو ترجیح دیتا ہوں بشرطیکہ مجھے پڑھنے لکھنے کا موقع ملے۔

پھر بھی ہمارے سب ساتھی بہت مہذب اور دلچسپ لوگ تھے اور مجموعی طور پر ہماری آپس میں خوب نبھتی تھی لیکن میرا خیال ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کبھی کبھی دوسروں سے اُکتا جاتا تھا اور چاہتا تھا کہ کچھ دیر تو تنہائی میسّر آجائے۔ زیادہ سے زیادہ مجھے اتنا تخلیہ نصیب ہوتا تھا کہ بارک سے نکل کر صحن میں بیٹھ جاؤں۔ اب برسات شروع ہوگئی تھی اور بادل گھرا رہتا تھا اور اکثر اس کا موقع مل جاتا تھا۔ میں گرمی بھی برداشت کرتا تھا اور ہلکی ہلکی پھوار بھی۔ لیکن جہاں تک ممکن ہوتا تھا بارک کے باہر ہی پڑا رہتا تھا۔

کھلے میدان میں لیٹ کر میں آسمان اور بادلوں کو دیکھا کرتا تھا اس سے پہلے شاید کبھی مجھے اس حد تک یہ احساس نہیں ہوا کہ بادلوں کے بدلتے ہوئے رنگ کس قدر خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔

رنگ برنگ بادلوں کا وہ نقشہ جیسے زمین کے مختلف خطے آپس میں گتھے ہوتے ہوں۔
مزے ہیں اس کے جو لیٹا ہوا یہ نظارہ دیکھتا ہو اور عیشِ فرصت کو دعائیں دیتا ہو۔

ہمارے لیے یہ فرصت کوئی خوشگوار چیز نہ تھی بلکہ اُلٹی مصیبت ہوگئی تھی لیکن جتنا وقت میں ان چلتے پھرتے بادلوں کے نظارے میں گزارتا تھا وہ مجھے فرحت و انبساط سے لبریز کردیتا تھا۔ مجھے اس کی خوشی تھی کہ میں نے اس قید فرنگ سے عارضی چھٹکارا پانے کی ایک نئی ترکیب معلوم کرلی۔ معلوم نہیں اب کی بار برسات نے مجھ پر کیا جادو کر دیا تھا۔ یہ اثر نہ اس سے پہلے کبھی ہوا اور نہ اس کے بعد۔ میں نے پہاڑوں کی چوٹیوں پر اور سمندروں کے کنارے سے سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کے سماں اکثر دیکھے تھے۔ میں اس کے نور میں نہایا تھا اور وقتی طور پر اس کی عظمت و جلال سے متاثر بھی ہوا تھا لیکن عموماً ان چیزوں کو معمولی بات سمجھ کر کچھ زیادہ توجہ نہیں کرتا تھا۔ اب جیل میں سورج کے طلوع اور غروب کا منظر دیکھنے کو آنکھیں ترستی تھیں۔ افق ہماری نظروں سے پوشیدہ تھا۔ بہت دن چڑھے جب سورج کی تمازت بڑھ جاتی تھی تو اس کی شعاعیں ہمارے قید خانے کی دیواروں پر نمودار ہوتی تھیں۔ رنگ کہیں دیکھنے میں نہ آتے تھے۔ غرض ہماری آنکھیں روز روز ہی مٹیالے رنگ کی دیواریں دیکھتے دیکھتے پتھرا گئی تھیں۔ وہ دھوپ چھاؤں اور رنگوں کی بھوکی تھیں۔ اس لیے جب برسات کے بادل قسم قسم کے روپ بدلتے، طرح طرح کے رنگوں سے کھیلتے، جھومتے، اٹھلاتے اڑکر آسمان پر آتے تو میں حیرت اور مسرت سے انھیں دیکھتا اور مجھ پر وجد کا سا عالم طاری ہوجاتا تھا۔ کبھی یہ بادل کہیں کہیں سے پھٹ جاتے تو ان میں سے وہ حیرت انگیز کرشمہ دکھائی دیتا جو برسات سے مخصوص ہے۔ یعنی گہرے نیلے رنگ کے اتھاہ سمندر میں حسن لامحدود کی ایک جھلک۔

رفتہ رفتہ ہماری پابندیوں میں اضافہ ہونے لگا اور زیادہ سخت قانون نافذ کیے گئے۔ حکومت کو ہماری تحریک کی اہمیت کا اندازہ ہوگیا تھا اس لیے وہ چاہتی تھی کہ ہم پر دل کھول کر غصہ اتارے اور ہمیں اس گستاخی کا مزہ چکھائے کہ ہم نے اس کے مقابلے کی جرأت کی۔ ان نئے قوانین اور ان کے نفاذ کے طریقوں کا یہ لازمی نتیجہ ہوا کہ جیل کے افسروں اور سیاسی قیدیوں میں اَن بَن ہوگئی۔ کئی مہینے تک ہم سب نے جن کی تعداد لکھنؤ جیل میں کئی سو کے قریب ہوگی۔ احتجاج کے طور پر عزیز و اقارب سے ملاقات کرنا بند کردیا۔ افسروں کا یہ خیال تھا کہ ہم میں سے چند آدمی فساد کی جڑ ہیں اس لیے سات اشخاص اصل بارکوں سے دُور جیل کے ایک بالکل علیحدہ حصّے میں بھیج دیے گئے یعنی پرشوتم داس ٹنڈن، مہادیو ڈیسائی، جارج جوزف، بال کرشن شرما، دیوداس گاندھی، میں اور ایک اور شخص۔

ہم ایک چھوٹے سے احاطے میں رکھے گئے۔ یہاں کچھ تکلیف ضرور تھی لیکن مجموعی طور پر میں اس سے بہت خوش ہوا کیونکہ یہاں کم سے کم وہ بھیڑ بھاڑ نہیں تھی اور ہمیں کچھ زیادہ سکون اور تخلیہ میسر آسکتا تھا۔ اب پڑھنے لکھنے اور دوسرے ضروری کام کو بھی کافی وقت ملتا تھا۔ جیل کے دوسرے ساتھیوں سے ہمارا کوئی تعلق باقی نہ رہا تھا۔ نہ باہر کی دنیا کا کوئی حال معلوم ہوتا تھا کیونکہ اب تمام سیاسی قیدیوں کو اخبار ملنا بند ہوگئے تھے۔

اخبار تو ہمارے پاس نہیں آتے تھے لیکن جس طرح ہمیشہ جیل میں باہر کی خبریں پہنچا کرتی ہیں ہمیں بھی کچھ نہ کچھ خبریں مل ہی جاتی تھیں۔ ہر مہینے جو ملاقاتیں ہوتی تھیں یا جو خطوط آتے تھے ان سے بھی تھوڑا بہت حال معلوم ہوجاتا تھا۔ ہمارا اندازہ تھا کہ اب تحریک کا زور گھٹ رہا ہے۔ وقتی جوش کا طلسم ٹوٹ چکا تھا اور منزل مقصود دُور ہٹتی معلوم ہوتی تھی۔ کانگرس کے دو ٹکڑے ہوچکے تھے۔ ایک جماعت طریق کار میں تبدیلی چاہتی تھی اور دوسری اس تبدیلی کی مخالف تھی۔ تبدیلی کے حامیوں کی رہبری دیش بندھو داس اور میرے والد کر رہے تھے یہ جماعت چاہتی تھی کہ اسمبلی اور کونسلوں کے نئے انتخاب میں کانگریس بھی حصّہ لے اور اگر ممکن ہو تو ان پر قبضہ کرلے۔ دوسری جماعت کی رہنمائی سری راج گوپال اچاریہ فرما رہے تھے۔ یہ جماعت ترک موالات کے اصل پروگرام میں کوئی ترمیم گوارا کرنے کو تیار نہ تھی۔ گاندھی جی اس وقت جیل میں تھے۔ تحریک کے وہ زریں اصول جنہوں نے ہمیں سیلاب کی طرح آگے

بڑھایا تھا۔ اب چھوٹے چھوٹے قضیوں اور اقتدار حاصل کرنے کی سازشوں سے آلودہ رہتے تھے۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ جوش و خروش کی رو میں بڑے بڑے من چلے پن کے کام کر گزرنا کتنا آسان ہے اور جب یہ ندی اتر جائے تو مستقل طور پر کام کو جاری رکھنا کتنا مشکل ہے۔ باہر سے جو خبریں آتی تھیں ان سے ہم میں بے دلی پھیلی ہوئی تھی اور پھر اس چڑچڑے پن کی وجہ سے جو جیل میں رہنے کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ ہماری مشکلات اور بڑھ گئی تھیں پھر بھی ہمارے دل کو یہ اطمینان تھا کہ ہم نے خود داری اور وقار کو ہاتھ سے نہیں دیا اور چاہے کچھ بھی ہوا ہم راہِ راست سے نہیں بھٹکے۔ مستقبل دھندلا نظر آتا تھا اور چاہے وہ کوئی شکل اختیار کرے یہ بات یقینی تھی کہ ہم میں سے اکثروں کی قسمت میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ جیل میں گذارنا لکھا ہے۔ آپس میں ہم یہی باتیں کیا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ جارج جوزف سے اسی قسم کی گفتگو ہوئی تھی اور ہم اسی نتیجے پر پہنچے تھے۔ اب تو جوزف میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا ہے اور وہ ہماری تحریک کی دل کھول کر مخالفت کر رہے ہیں۔ معلوم نہیں کبھی انہیں وہ گفتگو بھی یاد آتی ہے جو لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل کے سول وارڈ میں ایک دفعہ مجھ میں اور ان میں ہوئی تھی؟

غرض ہم روزمرہ کے معمولی کاموں اور ورزشوں سے دل بہلاتے تھے۔ ورزش کی یہ صورت تھی کہ اپنے چھوٹے سے احاطے میں چاروں طرف دوڑ لگایا کرتے تھے یا اپنے صحن کے کنوئیں سے دو دو آدمی بیلوں کی طرح جُت کر چرس سے پانی کھینچتے تھے اور ترکاریوں کے کھیت کو جو ہمارے صحن میں تھا سینچتے تھے۔ ہم میں سے اکثر روزانہ تھوڑا بہت سوت بھی کاتتے تھے لیکن ان سردی کے دنوں اور لمبی لمبی راتوں میں میرا خاص شغل کتابیں پڑھنا تھا۔ جب کبھی سپرنٹنڈنٹ آتا ہمیشہ مجھے پڑھتے ہوئے پاتا۔ شاید وہ اس سے کچھ کھسیا گیا چنانچہ ایک مرتبہ اس نے مجھ پر فقرہ کسا اور کہا کہ میں تو اپنا تمام مطالعہ بارہ برس کی عمر ہی میں ختم کر چکا تھا۔ شاید پڑھنے سے یہ گریز ہی اس بہادر انگریز کرنل کے کام آیا اور اس نے اُسے پریشان کن حالات سے بچا لیا اور شاید اسی کی بدولت وہ صوبہ متحدہ میں جیل خانوں کے انسپکٹر جنرل کے عہدے تک پہنچا۔

جاڑے کی راتیں پہاڑ سی ہوتی ہیں اور اس زمانے میں ہندوستان میں مطلع بہت صاف ہوتا ہے چنانچہ ہمیں ستارے دیکھنے کا شوق ہو گیا۔ بعض نقشوں کی مدد سے ہم نے بہت سے ستاروں کو پہچان لیا۔ پھر تو ہر رات ہم ان کے نکلنے کا انتظار کیا کرتے تھے اور ان کا اس مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتے تھے جیسے کوئی اپنے بچھڑے ہوئے دوستوں سے ملتا ہے۔

اس طرح ہمارا وقت گذر رہا تھا۔ دنوں کے ہفتے اور ہفتوں کے مہینے ہوتے جاتے تھے۔ ہم روز کی مقررہ زندگی کے عادی ہو گئے تھے لیکن باہر سارا بوجھ ہماری عورتوں پر، ہماری ماؤں، بیویوں اور بہنوں پر پڑ گیا تھا۔ وہ ہمارا انتظار کرتے کرتے اُکتا گئی تھیں اور انھیں خود اپنی آزادی پر شرم معلوم ہوتی تھی جبکہ ان کے پیارے جیل خانے کی آہنی سلاخوں میں بند تھے۔

دسمبر ۱۹۲۱ء میں ہماری پہلی گرفتاری کے بعد ہی پولیس نے آنند بھون کے چکر لگانا شروع کر دیے۔ والد پر اور مجھ پر عدالت سے کچھ جرمانہ بھی ہوا تھا وہ اسی کو وصول کرنے آتی تھی لیکن کانگریس کا حکم یہ تھا کہ جرمانہ ادا نہ کیا جائے اس لیے پولیس آئے دن آ دھمکتی تھی اور فرنیچر میں سے جو کچھ ہاتھ لگتا وہ قرق کر کے لے جاتی تھی۔ میری لڑکی اندرا اس وقت چار سال کی تھی۔ اسے روز کی اس لوٹ مار پر بڑا غصہ آیا۔ چنانچہ اس نے پولیس والوں کے سامنے سخت احتجاج کیا اور ان پر بہت بگڑی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کے یہ ابتدائی تاثرات ہمیشہ کے لیے اسے ساری پولیس سے بدظن کر دیں گے۔

اس کی انتہائی کوشش کی جاتی تھی کہ ہم غیر سیاسی قیدیوں سے نہ ملنے پائیں اس لیے سیاسی قیدیوں کے لیے خاص جیل مخصوص تھے لیکن کبھی نہ کبھی یہ قیدی ہمیں مل جاتے تھے ہمیں براہِ راست بھی اور ان قیدیوں کے ذریعے سے بھی جیل کی زندگی کی حقیقت معلوم ہوئی یہ گویا تشدد، لوٹ مار اور بداخلاقیوں کی ایک دردناک داستان تھی کھانا بھی انہیں بہت خراب ملتا تھا۔ میں نے خود بارہا یہ کھانا منگا کر کھانے کی کوشش کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ کسی طرح انسانوں کے کھانے کے قابل نہ تھا۔ عملہ عموماً نااہل تھا اور اسے بہت تھوڑی تنخواہ ملتی تھی لیکن جب موقع ملتا تھا وہ قیدیوں اور ان کے رشتہ داروں سے کچھ نہ کچھ وصول کر کے اپنی آمدنی کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ جیل مینوئل میں جیلر نائب جیلر اور وارڈروں کی جو ذمہ داریاں اور فرائض درج تھے وہ تعداد میں اتنے زیادہ اور نوعیت میں اتنے مختلف تھے کہ کوئی انسان پوری طرح ان کی پابندی نہیں کر سکتا تھا اور شاید دوسرے صوبوں میں بھی جیل کی انتظامی پالیسی کو قیدیوں کی اصلاح سے یا ان کو نیکی کی تلقین کرنے اور کارآمد پیشے سکھانے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جیل میں محض قیدیوں کو ستانے کے خیال سے مشقت لی جاتی تھی[1]۔۔

---

(۱) یوپی جیل مینوئل کا دفعہ ۹۸۰ جسے اب نئے ایڈیشن سے حذف کر دیا ہے، یہ تھا کہ
"جیل کی مشقت کا مقصد قیدیوں کو محض کام میں لگائے رکھنا نہیں ہے بلکہ اس کا اصل مقصد سزا دینا ہے" اس لیے اس چیز کو کوئی اہمیت نہ دینا چاہیے کہ ان سے ایسے کام لیے جائیں جن سے آمدنی کافی ہو بلکہ خاص طور پر یہ لحاظ رکھنا چاہیے کہ جیل میں مشقت اتنی دشوار اور ناقابلِ برداشت ہو کہ مجرم اس سے ڈریں"
اس کے مقابلے میں ذرا روسی تعزیرات کے چند دفعات ملاحظہ کیجیے:۔
دفعہ ۹ سماجی مدافعت کے قوانین کا یہ مقصد نہیں ہے کہ لوگوں کو جسمانی تکلیف پہنچائی جائے یا انسانوں کو ذلیل کیا جائے یا انتقام لیا جائے اور سزا دی جائے"
دفعہ ۲۶ سزائیں سماجی مدافعت کا ایک ذریعہ ہیں اس لیے ان میں ظلم کا شائبہ بھی نہیں ہونا چاہیے اور مجرم کو غیر ضروری اور نامناسب تکلیف نہ پہنچانا چاہیے"

لالہ لاجپت رائے کے زخمی ہونے اور وفات پانے کے بعد سائمن کمیشن جہاں کہیں گیا، اس کے خلاف اور بھی زیادہ زور شور سے مظاہرے کیے گئے۔ اب وہ لکھنؤ آنے والا تھا اور وہاں کی کانگریس کمیٹی نے بہت بڑے پیمانے پر اس کے استقبال کا انتظام کیا تھا۔ کئی دن پہلے سے بڑے بڑے جلوس نکالے جا رہے تھے اور جلسے اور مظاہرے کیے جاتے تھے تاکہ پروپیگنڈا بھی ہو جائے اور اصل موقع پر کام کرنے کی مشق بھی ہو جائے۔ میں لکھنؤ گیا اور ان میں سے بعض چیزوں میں شریک ہوا۔ یہ ابتدائی مظاہرے بہت امن اور ضبط کے ساتھ کیے گئے اور ان کی کامیابی حکومت کے دل میں کھٹکنے لگی۔ اس نے ان کی راہ میں روڑے اٹکانے شروع کیے اور یہ احکام جاری کیے کہ فلاں فلاں مقام پر جلوس نہ نکالا جائے۔ اسی سلسلے میں مجھے ایک نیا تجربہ ہوا اور میرے جسم نے پولیس کے ڈنڈوں اور لاٹھیوں کا مزہ چکھا۔

جلوس نکالنے کی ممانعت کردی گئی تھی اور اس کی وجہ یہ ظاہر کی گئی تھی کہ سڑک کی آمدورفت میں حرج ہوتا ہے۔ ہم نے یہ طے کیا کہ جلوس اس طرح نکالیں جس میں کسی کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ہم نے سولہ سولہ آدمیوں کے جتھے بنا کر الگ الگ سونی سڑکوں سے بھیجے کہ جلسے کے مقام پر پہنچ کر مل جائیں۔ ظاہر ہے کہ قانون کے الفاظ کے لحاظ سے یہ حکم کی خلاف ورزی تھی، کیونکہ سولہ آدمیوں کا جھنڈا لے کر چلنا جلوس کی تعریف میں داخل ہے۔ ایک جتھے کے آگے آگے میں تھا اور میرے پیچھے کچھ فاصلے سے دوسرا جتھا آرہا تھا جس کے رہنما میرے رفیق کار گووند بلبھ پنتھ تھے۔ میرا جتھا سونی سڑک پر کوئی دو گز گیا ہوگا کہ پیچھے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ ہم نے مڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ دو تین درجن پولیس کے سوار ہم پر چڑھے آرہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں وہ آن پہنچے اور گھوڑوں کے دھکے سے ہمارا چھوٹا سا جتھا منتشر ہو گیا۔ پولیس کے سواروں نے ہمارے والنٹیروں کو بڑے بڑے ڈنڈوں سے مارنا شروع کیا اور انہیں بھاگ کر گلیوں اور چھوٹی چھوٹی دکانوں میں پناہ لینی پڑی۔ سواروں نے وہاں بھی ان کا پیچھا کیا۔ انہیں خوب پیٹا۔ میں نے بھی جب یہ دیکھا کہ گھوڑے چڑھے چلے آتے ہیں تو گھبرایا اور جی میں آیا کہ بھاگ کر جان بچاؤں مگر میرے دل نے یہ قبول نہ کیا اور میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ پہلے ریلے میں تو میں بچ گیا اس لیے کہ ان کی ٹکر ان والنٹیروں نے جو میرے پیچھے تھے، روک لی مگر تھوڑی دیر میں دیکھا کہ میں سڑک کے بیچ میں اکیلا کھڑا ہوں اور مجھ سے چند گز کے فاصلے پر پولیس والے ہر طرف ہمارے والنٹیروں کو پیٹ رہے ہیں۔ میرے قدم خود بخود سڑک کے کنارے کی طرف ہٹنے لگے تاکہ مجھ پر نظر نہ پڑے مگر میں پھر ٹھہر گیا اور اپنے دل کو سمجھایا کہ مجھے یہاں سے ہٹنا زیبا نہیں۔ یہ سب چند سیکنڈ میں ہو گیا مگر مجھے اب تک یاد ہے کہ میرے ذہن میں اس وقت کیسی کشمکش تھی اور میں نے کیا فیصلہ کیا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میرے غرور نے یہ گوارا نہ کیا کہ نامردی کی حرکت کروں مگر اس وقت مردی اور نامردی میں بس ایک ہی قدم کا فاصلہ تھا اور کوئی تعجب نہ تھا کہ میں قدم اٹھا لیتا۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک سوار اپنی لاٹھی ہلاتا ہوا میری طرف آیا۔ میں نے اس سے کہا کہ ہٹ جاؤ اور خود منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ یہ حرکت مجھ سے بے اختیار سرزد ہوئی تاکہ سر میں اور منہ پر چوٹ نہ آئے۔ اس نے میری پیٹھ پر کس کر دو لاٹھیاں جمائیں۔ مجھے چکر آگیا اور سارا بدن کانپنے لگا مگر یہ دیکھ کر مجھے تعجب اور خوشی ہوئی کہ میں نے اپنی جگہ سے قدم نہیں ہٹایا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد پولیس چلی گئی اور اس نے آگے جا کر ہمارا راستہ روک دیا۔ ہمارے والنٹیر پھر اکٹھے ہو گئے۔ ان میں سے بہتوں کا سر پھٹ گیا تھا اور خون بہہ رہا تھا۔ پنتھ اور ان کے ساتھی بھی آگئے۔ ان کی بھی یہی درگت ہوئی تھی۔ ہم سب کے سب پولیس کے مقابل سڑک پر بیٹھ گئے۔ اسی طرح ایک گھنٹہ گزر گیا اور شام ہو گئی۔ ایک طرف بڑے بڑے حکام جمع ہو گئے اور دوسری طرف لوگوں کا مجمع یہ خبر پا کر اکٹھا ہونے لگا۔ آخر حکام اس بات پر راضی ہو گئے کہ ہم جس راستے سے جانا چاہتے تھے اسی سے جائیں۔ ہم جب روانہ ہوئے تو وہی سوار جنہوں نے ہمیں زدوکوب کیا تھا محافظ دستے کے طور پر ہمارے ساتھ تھے۔

میں نے اس چھوٹے سے واقعے کو کسی قدر تفصیل سے اس لیے بیان کیا ہے کہ اس کا مجھ پر ایک خاص اثر ہوا تھا۔ مجھے جو چوٹ آئی تھی اسے میں اس خوشی میں بھول گیا کہ میں لاٹھی کھانے کی طاقت رکھتا ہوں۔ ایک اور بات جس سے مجھے تعجب ہوا یہ تھی کہ عین اس وقت جب مجھ پر لاٹھیاں پڑ رہی تھیں میرے خیالات بالکل واضح تھے اور میں اچھی طرح جان بوجھ کر اپنے جذبات کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس مشق سے مجھے فائدہ پہنچا اس لیے کہ دوسرے دن اس سے بھی زیادہ سخت آزمائش ہونے والی تھی۔ دوسرے دن صبح کو سائمن کمیشن کے آنے کا وقت تھا اور ہمارا بڑا مظاہرہ ہونے والا تھا۔

میرے والد اس وقت الٰہ آباد میں تھے اور مجھے خوف تھا کہ مجھ پر جو حملہ ہوا تھا اس کی خبر اخبار میں پڑھ کر وہ اور گھر میں سب لوگ پریشان ہوں گے۔ اس لیے میں نے شام کو انہیں ٹیلیفون کر دیا کہ میں خیریت سے ہوں آپ بالکل نہ گھبرائیں مگر وہ اس پر بھی گھبرائے۔ انہیں رات کو نیند نہیں آئی اور آدھی رات کے قریب انہوں نے فیصلہ کیا کہ خود لکھنؤ آئیں۔ آخری گاڑی چھوٹ چکی تھی۔ اس لیے وہ موٹر کار سے روانہ ہوئے۔ رستے میں کچھ گڑبڑ ہوئی اور وہ صبح پانچ بجے کے قریب ایک سو چھیالیس میل کا سفر طے کر کے تھکے ہارے لکھنؤ پہنچے۔

اسی وقت ہم لوگ اسٹیشن جانے کے لیے جلوس کی تیاری کر رہے تھے۔ گذشتہ شام کے واقعات کی وجہ سے لکھنؤ میں اتنا جوش پیدا ہو گیا تھا جو ہماری کوششوں سے کبھی نہ ہوتا اور ہزاروں آدمی اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔ شہر کے مختلف حصوں سے چھوٹے چھوٹے جلوس اُمڈے چلے آتے تھے۔ کانگریس کے دفتر سے بڑا جلوس روانہ ہوا جس میں کئی ہزار آدمی چار چار کی ٹولیوں میں چل رہے تھے۔ ہم لوگ اس بڑے جلوس میں تھے۔ جب اسٹیشن کے قریب پہنچے تو پولیس نے روکا۔ اسٹیشن کے سامنے آدھ میل مربع کا ایک کھلا میدان تھا جس



جہاں اب نیا اسٹیشن بنایا گیا ہے۔ ہم لوگوں کو اس سے آگے نہیں بڑھنے دیا گیا اور ہم اسی کے ایک طرف صفیں باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ ہمارا جلوس چپ چاپ کھڑا رہا اور اس نے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ ہر طرف پیدل اور سوار پولیس اور فوج کا ہجوم تھا۔ ہمدرد تماشائیوں کا مجمع بڑھتا گیا اور ان میں سے بعض دو دو تین تین کر کے میدان میں پھیل گئے۔ یکایک ہم نے دیکھا کہ دور سے ایک جماعت چلی آتی ہے۔ یہ فوج کے رسالے اور سوار پولیس کی دو تین لمبی صفیں تھیں، جو ہماری طرف بڑھ رہی تھیں اور ان لوگوں کو جو میدان میں کھڑے تھے، مارتی کچلتی چلی آتی تھیں۔ ان سواروں کا بڑھنا بجائے خود ایک شاندار منظر تھا مگر اس وقت تو یہ منظر بہت دردناک تھا اس لیے کہ بچارے بے قصور تماشائی حیران و پریشان گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے کچلے جا رہے تھے۔ سواروں کی بڑھتی ہوئی صفوں کے پیچھے یہ لوگ زمین پر پڑے تھے۔ ان میں سے بعض اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے تھے اور بعض درد سے تڑپ رہے تھے۔ میدانِ جنگ کا پورا نقشہ نظر کے سامنے تھا مگر ہمیں اس منظر کو دیکھنے یا اس پر غور کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ سوار تھوڑی دیر میں ہمارے قریب آن پہنچے اور ان کی پہلی صف پوری قوت سے ہمارے جلوس سے ٹکرائی۔ ہم اپنی جگہ جمے رہے۔ یہ دیکھ کر سواروں نے آخری لمحے میں گھوڑوں کی باگ کھینچ لی۔ گھوڑے پچھلے پیروں پر کھڑے ہو گئے اور ان کے اگلے پیر ہمارے سروں کے بالکل قریب تھرتھرا رہے تھے۔ اب سواروں اور پیادوں نے ہم پر لاٹھیاں اور ڈنڈے برسانے شروع کر دیے۔ یہ بڑا سخت حملہ تھا اور خیالات کی وہ وضاحت جو میں گذشتہ شام کو رکھتا تھا، اس وقت رخصت ہو گئی۔ مجھے صرف اتنا احساس باقی تھا کہ جہاں کھڑا ہوں وہاں سے سرکنا نہیں چاہیے۔ میں لاٹھیوں کی بوچھار سے اندھا سا ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی غصے سے بیتاب ہو جاتا تھا اور جی چاہتا تھا کہ میں بھی ہاتھ چلاؤں۔ میں دل میں سوچتا تھا کہ یہ کس قدر آسان ہے کہ میں اپنے سامنے والے پولیس افسر کو کھینچ کر گرا دوں اور اس کی جگہ خود سوار ہو جاؤں مگر ایک مدت کی تربیت اور انضباط کام آیا اور میں نے ہاتھ اُٹھایا تو مارنے کے لیے نہیں بلکہ صرف وار روکنے کے لیے۔ اس کے علاوہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر ہماری طرف سے ذرا سی بھی زیادتی ہوئی تو نہایت ہی ہولناک مصیبت پیش آئے گی اور ہم میں سے ہزاروں آدمی گولیوں سے ہلاک کر دیے جائیں گے۔

معلوم ہوتا تھا کہ بہت دیر میں مگر اصل میں چند منٹ کے بعد ہماری صف بغیر ٹوٹے ہوئے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی۔ اب میں اکیلا رہ گیا اور دونوں طرف سے حملے کا اندیشہ ہو گیا مجھ پر کچھ لاٹھیاں اور پڑیں اس کے بعد کسی نے یکایک مجھے پیچھے سے پکڑ کر اٹھا لیا جس پر میں بہت ہی جھنجھلایا۔ معلوم ہوا کہ میرے بعض نوجوان ساتھیوں نے یہ سمجھ کر کہ میری جان لینے کی فکر کی جا رہی ہے۔ مجھے بچانے کے لیے یہ زبردستی کا طریقہ استعمال کیا تھا۔

ہم سب جلوس والے کوئی سو فٹ سرک کر پھر جم گئے۔ پولیس بھی پیچھے ہٹ گئی۔ اور ہم سے پچاس فٹ کے فاصلے پر پرا باندھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس عرصے میں فساد کی جڑ یعنی سائمن کمیشن اسٹیشن سے جو ہم سے آدھ میل کے فاصلے پر تھا، چپکے سے روانہ ہو گیا مگر اس پر بھی وہ کالے جھنڈوں اور مظاہرہ کرنے والوں سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم اپنے جلوس کے ساتھ کانگریس کے دفتر واپس آئے اور وہاں پہنچ کر منتشر ہو گئے۔ میں سیدھا والد کے پاس گیا جو بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔

وقتی ہیجان کے گذر جانے کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا کہ میرے سارے بدن میں درد ہو رہا ہے اور میں تھک کر شل ہو گیا ہوں۔ رگ رگ میں درد ہو رہا تھا۔ سارے بدن پر زخم اور لاٹھیوں کے نشان تھے مگر خوش قسمتی سے کسی ایسے حصے میں چوٹ نہیں آئی تھی جس میں جان کا خطرہ ہو۔ میرے بعض ساتھی بہت بُری طرح زخمی ہوئے تھے۔ گووند ولبھ پنت اس ہنگامے میں میرے پاس ہی کھڑے تھے۔ ان کا قد چھ فٹ سے اوپر ہے اس وجہ سے وہ خاص طور پر لاٹھیوں کا نشانہ بنے۔ اس دن کی چوٹوں کی وجہ سے انہیں بڑی تکلیف دہ بیماری لاحق ہو گئی اور وہ ایک عرصے تک اپنی پیٹھ سیدھی کرنے اور چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوئے۔ مجھے اس دن سے اپنی جسمانی طاقت اور برداشت کی قوت پر اور زیادہ گھمنڈ ہو گیا مگر میری آنکھوں میں جو تصویر پھر رہی ہے وہ لاٹھی کے حملوں کی نہیں بلکہ ان پولیس والوں کے چہروں کی ہے جو ہم پر حملہ کر رہے تھے۔ زیادہ بے دردی سے یورپی سارجنٹوں نے مارا تھا۔ ہندوستانی سپاہیوں نے کسی قدر نرمی سے کام لیا تھا۔ کس قدر خوفناک تھے وہ چہرے جن میں نفرت اور خونخواری جنون کی حد تک پہنچ گئی تھی اور ہمدردی اور انسانیت کا نام تک نہ تھا! غالباً ہم لوگوں کے چہرے بھی ایسے ہی بھیانک ہوں گے۔ عدم تشدد نے نہ تو ہمارے دلوں میں حریفوں کی محبت کا جوش پیدا کیا تھا اور نہ ہمارے چہروں کے حسن میں اضافہ کیا تھا۔ اس پر بھی ہمیں ایک دوسرے سے کوئی شکایت نہ تھی۔ ہمارے دل ذاتی عداوت اور کینے سے پاک تھے۔ اس وقت ہمارے اندر عجیب و غریب زبردست قوتیں کارفرما تھیں اور ہمیں جدھر چاہتی تھیں موڑ دیتی تھیں۔ وہ ہمارے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھیں، ہمارے جذبات و خواہشات پر حاوی تھیں اور ہمیں کٹھ پتلی کی طرح اپنے اشاروں پر چلاتی تھیں۔ ہم اندھا دھند لڑ رہے تھے اور ہمیں یہ خبر نہ تھی کہ ہم کاہے کے لیے لڑ رہے ہیں اور کدھر جا رہے ہیں۔ عمل کا جوش اور ہیجان ہم پر طاری تھا مگر اس جوش کا ٹھنڈا ہونا تھا کہ ہمارے دلوں میں یہ سوال اُٹھا "آخر اس سارے ہنگامے کا مقصد کیا ہے ؟"

اب میں کوئی سات برس کے بعد قید ہوا تھا اور جیل کی زندگی کی یاد میرے دل سے کچھ مٹ سی گئی تھی۔ اس بار میں نینی سنٹرل جیل میں بھیجا گیا تھا جو اس صوبے کے بڑے جیل خانوں میں سے ہے اور سب قیدیوں سے الگ رکھا گیا، جو میرے لیے بالکل نیا تجربہ تھا۔ میرا احاطہ جیل کے بڑے احاطے سے، جس میں سب ملا کر بائیس تئیس سو آدمی رہتے تھے الگ تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا گول احاطہ تھا جس کا قطر تقریباً سو فٹ ہوگا اور دیوار کوئی پندرہ فٹ اونچی ہوگی اس کے بیچ میں ایک بھدی بدنما عمارت تھی اور اس میں چار کوٹھریاں تھیں۔ مجھے ان میں سے دو کوٹھریاں جن کے بیچ میں دروازہ تھا دی گئیں، ایک رہنے کے لیے اور دوسری غسل خانے اور پاخانے کے طور پر استعمال کرنے کے لیے، باقی دو کوٹھریاں کچھ عرصے تک خالی رہیں۔

اس مصروفیت اور ہلچل کی زندگی کے بعد جو میں نے پچھلے دنوں گذاری تھی، میں تنہائی اور اداسی محسوس کر رہا تھا۔ میں بہت تھکا ہوا تھا اور دو تین دن تک نیند بھر سوتا رہا۔ گرمی شروع ہو گئی تھی اس لیے مجھے رات کو صحن میں جو مکان کے اور احاطے کی دیوار کے بیچ میں تھا سونے کی اجازت تھی۔ میرا پلنگ زنجیروں سے جکڑ دیا گیا تھا کہ کہیں میں اس کو لے کر بھاگ نہ جاؤں یا شاید اس لیے کہ اس سے سیڑھی کا کام لے کر دیوار پر نہ چڑھ سکوں۔ رات کو عجیب عجیب آوازیں آیا کرتی تھیں۔ قیدی چوکیدار جو رات بھر بڑے احاطے کے گرد پہرہ دیتے تھے اکثر ایک دوسرے کو طرح طرح کے سُروں میں پکارتے تھے اور کبھی کبھی ایسی تان لیتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا دور سے آندھی چلنے کی آواز آرہی ہے۔ بارکوں کے پہرے والے زور زور سے قیدیوں کو گنتے رہتے تھے اور چیخ چیخ کر خیریت کی اطلاع دیتے تھے۔ رات میں کئی بار جیل کا کوئی افسر روند پھرتا ہوا ہمارے احاطے کے پاس سے گذرتا تھا اور پہرے والے کو پکارتا تھا۔ چونکہ میرا احاطہ اور احاطوں سے کسی قدر فاصلے پر تھا اس لیے اکثر آوازیں صاف طور پر نہیں سُنائی دیتی تھیں اور ابتدا میں میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیسا شور ہو رہا ہے۔ کبھی یہ خیال ہوتا تھا کہ کوئی جنگل قریب ہے اور کسان جنگلی جانوروں کو کھیتوں سے ہنکا رہے ہیں اور کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود جنگل کی صدا درندوں کی آواز میں مل جلی آرہی ہے

معلوم نہیں یہ صرف میرا وہم ہے یا واقعہ ہے کہ گول دیوار چوکور دیوار سے زیادہ قید کا احساس پیدا کرتی ہے۔ کونوں اور زاویوں کے نہ ہونے سے آدمی کا اور بھی دم گھٹتا ہے دن کو یہ دیوار آسمان تک چھپا لیتی تھی۔ بس اس کے ایک ذرا سے ٹکڑے کی جھلک نظر آتی تھی اور میں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا تھا۔

اس چھوٹے سے نیلے خیمے کو
جسے قیدی آسمان کہتے ہیں
اور بادل کے ہر تیرتے ہوئے ٹکڑے کو
جو روپہلے بادبان لگائے اڑا چلا جاتا ہے

رات کو یہ دیوار مجھے اور زیادہ سختی سے گھیر لیتی تھی اور مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ میں کنوئیں میں پڑا ہوا ہوں۔ تاروں بھرے آسمان کا وہ حصہ جو مجھے دکھائی دیتا تھا سچ مچ کا آسمان نہیں بلکہ اس کا ایک مصنوعی نقشہ معلوم ہوتا تھا۔

میری بارک سارے جیل میں "کتا گھر" کے نام سے مشہور تھی۔ یہ نام میری وجہ سے نہیں ہوا بلکہ پہلے سے تھا۔ ابتدا میں یہ ان خطرناک مجرموں کے لیے بنائی گئی تھی جنھیں قید تنہائی کی سزا ملتی تھی مگر آگے چل کر اس میں سیاسی قیدی اور نظر بند رکھے جانے لگے تاکہ وہ جیل کے اور حصوں سے الگ رہیں۔ اس احاطے کے سامنے کچھ دُور پر ایک عجب قسم کی چیز تھی۔ جب میں نے پہلی بار اپنی بارک سے اس کی جھلک دیکھی تو مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ معلوم ہوا کہ یہ پانی کا پمپ ہے جو انسانوں کی قوت سے چلایا جاتا ہے اور اس میں ایک وقت میں سولہ آدمی لگتے ہیں۔ انسانوں کو ہر چیز کی عادت ہو جاتی ہے۔ میں کچھ دن میں اس منظر کا عادی ہو گیا مگر میرا ہمیشہ یہ خیال رہا کہ یہ انسانی قوت کے استعمال کا نہایت احمقانہ اور وحشیانہ طریقہ ہے جب کبھی میں ادھر سے گذرتا ہوں مجھے چڑیا خانے کا دھیان آتا ہے۔

چند روز تک مجھے ورزش وغیرہ کے لیے بھی اپنے احاطے سے باہر نکلنے کی ممانعت رہی مگر بعد میں اجازت ہو گئی کہ صبح تڑکے جھٹپٹے وقت آدھ گھنٹے کے لیے باہر جا سکتے ہو اور بڑی دیوار کے نیچے نیچے ٹہل یا دوڑ سکتے ہو۔ اتنے سویرے کا وقت اس لیے مقرر کیا گیا کہ اور قیدی مجھ سے نہ مل سکیں بلکہ مجھے دیکھ بھی نہ سکیں۔ مجھے یہ سیر بہت پسند تھی اور اس سے بڑی تفریح ہوتی تھی۔ میں اس تھوڑے سے وقت کے اندر کھلی ہوا میں زیادہ سے زیادہ ورزش کرنا چاہتا تھا اس لیے میں نے دوڑنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ روزانہ دو میل سے اوپر دوڑنے لگا۔

میں صبح بہت تڑکے کوئی ساڑھے تین بجے اٹھتا تھا اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ میں سویرے سو جاتا تھا اس لیے کہ جو روشنی مجھے ملتی تھی وہ پڑھنے کے لیے کافی نہیں تھی۔ میں بڑے شوق سے تاروں کو دیکھا کرتا تھا اور ان کی جانی بوجھی صورتوں سے مجھے وقت کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ جہاں میں لیٹتا تھا وہاں سے قطب تارا دیوار سے ملا ہوا نظر آتا تھا اور اس کے ہر وقت سامنے رہنے سے مجھے بڑی تسکین ہوتی تھی۔ گھومتے ہوئے آسمان کے بیچ میں یہ ثبات و استقلال کا نمونہ کھڑا مسکراتا رہتا تھا۔

ایک مہینے تک میرا کوئی ساتھی نہیں تھا مگر میں بالکل اکیلا بھی نہ تھا اس لیے کہ میرے احاطے میں ایک وارڈر، ایک قیدی باورچی اور چند قیدی نگراں رہتے تھے۔ کبھی کبھی دوسرے قیدی بھی کسی کام سے آجاتے تھے۔ ان میں سے اکثر وہ قیدی تھے جو لمبی سزائیں بھگت رہے تھے۔ اور دوسروں کے نگراں بنا دیے گئے تھے۔ بہت سے عمر قیدی تھے جنھیں بیس سال سے زیادہ ہو چکے تھے۔ ان میں مجھے ایک عجیب مثال نظر آئی۔ قیدیوں کے کرتوں میں کندھے پر ایک تختی لگی رہتی ہے جس میں سزا کی کیفیت اور رہائی کی تاریخ درج ہوتی ہے۔ ایک قیدی کی تختی میں میں نے رہائی کی تاریخ ۱۹۹۶ء لکھی ہوئی دیکھی۔ ۱۹۳۰ء میں اس پر کئی سال ختم ہو چکے تھے اور وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ غالباً اُسے کئی سزائیں ملی تھیں اور ان سب کی میعاد جوڑ دی گئی تھی میرے خیال میں ان کا مجموعہ پچھتر برس تھا۔

ان عمر قیدیوں کو برسوں تک عورت یا بچے کی صورت بلکہ جانور کی شکل تک دیکھنی نصیب نہیں ہوتی۔ وہ باہری دنیا سے الگ اور نوع انسانی سے بے تعلق ہو جاتے ہیں۔ ہر وقت دل میں کڑھا کرتے ہیں اور خوف، انتقام اور نفرت کے خیالات میں ڈوبے رہتے ہیں۔ انھیں یاد نہیں رہتا کہ دنیا میں نیکی، سلوک اور خوشی بھی ہوتی ہے اور ان کی طبیعت میں بدی سما جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ نفرت کا جوش بھی کم ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ زندگی ایک بے روح مشین بن جاتی ہے — وہ بے جان پُتلوں کی طرح حرکت کرتے ہیں اور ان کے دن جو ہمیشہ ایک سے ہوتے ہیں بے حسی میں گذرتے چلے جاتے ہیں بس ایک ہی چیز کا احساس رہ جاتا ہے یعنی خوف کا۔ وقتاً فوقتاً قیدیوں کا جسم تولا جاتا ہے مگر ان کے نفس اور ان کی روح کو کیونکر تول سکتے ہیں جو اس جبر اور تشدد کی فضا میں سوکھتی اور مرجھاتی چلی جاتی ہے؟ لوگ موت کی سزا کی مخالفت میں بحث کرتے ہیں

اور ان کی دلیلیں میرے دل کو لگتی ہیں مگر جب میں قیدیوں کی عمر بھر کی مصیبت کو دیکھتا ہوں تو یہ خیال ہوتا ہے کہ اس طرح گھٹ گھٹ کر مرنے سے تو موت کی سزا ہی اچھی ہے۔ ایک بار ایک عمر قیدی نے مجھ سے پوچھا: "ہمارے جیسے قیدیوں کا کیا ہونا ہے؟ کیا سوراج ہمیں اس جہنم سے چھڑا دے گا؟..."

جیل کے باہر ملک کی حکومت میں یہی طریقہ ایک بڑے پیمانے پر نظر آتا ہے، اگرچہ اتنا کھلا ہوا نہیں ہے۔ وہاں قیدی پہریداروں اور قیدی جمعداروں کے نام دوسرے ہیں، ان کے القاب اور خطاب زیادہ شاندار اور وردیاں زیادہ بھڑک دار ہوتی ہیں اور ان کے پیچھے (اسی طرح جیسے جیل میں) اسلحہ کا ور سنگین لیے کھڑا رہتا ہے کہ وہ حکم سے سرتابی نہ کرنے پائیں۔

اس زمانے کی سلطنت میں جیل خانے کس قدر اہم چیز ہیں بلکم سے کم قیدی یہی سمجھتا ہے اور اس کی نظر میں حکومت کے اور سب شعبے جیل، پولیس اور فوج کے سامنے بالکل حقیر معلوم ہوتے ہیں۔ جیل ہی میں مارکس کا یہ نظریہ سمجھ میں آتا ہے کہ سلطنت یا ریاست وہ جبر و تشدد کا آلہ ہے جس کے ذریعے سب لوگ حکومت کرنے والے طبقے کی مرضی کے آگے سر جھکانے پر مجبور کیے جاتے ہیں۔

ایک مہینے تک میں اپنی بارک میں اکیلا رہا، اس کے بعد ایک ساتھی نربدا پرشاد سنگھ آگئے اور ان کے آنے سے بڑی تسکین ہوئی۔ ڈھائی مہینے بعد جون ۱۹۳۰ء کی آخری تاریخ کو ہمارے چھوٹے سے احاطے میں غیر معمولی ہلچل مچ گئی۔ صبح تڑکے کیا دیکھتے ہیں کہ میرے والد اور ڈاکٹر سید محمود چلے آرہے ہیں۔ یہ دونوں صبح کو آنند بھون میں سو رہے تھے کہ ایک دم سے گرفتار کر کے یہاں بھیج دیے گئے۔

میری کہانی ختم ہوگئی۔ سفرِ زندگی کے یہ حالات، جو بالکل شخصی نقطۂ نظر سے لکھے گئے ہیں، جیسے کچھ بھی ہیں، آج کی تاریخ یعنی ۱۴ر فروری ۱۹۳۵ء تک الموڑے کے ڈسٹرکٹ جیل میں مکمل ہوگئے۔ تین مہینے ہوئے میں نے اسی جیل میں اپنی پینتالیسویں سالگرہ منائی تھی اور غالباً ابھی میری زندگی کے بہت سے سال باقی ہیں۔ کبھی تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور تھک گیا ہوں اور کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کا تازہ خون میری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ میرا جسم خاصہ مضبوط ہے اور میرا دماغ صدمے جھیلنے کی قوت رکھتا ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی اتفاقی حادثہ پیش نہ آگیا تو میں ابھی بہت دن جیوں گا لیکن آنے والی زندگی جب تک بیت نہ جائے اس کا حال کیونکر لکھا جا سکتا ہے۔

شاید میری سرگذشت لوگوں کو ہیجان خیز نہ معلوم ہو جس کی عمر قید میں کٹی ہو اس کی زندگی میں ہیجان خیز واقعات کہاں سے آئیں؟ سچ پوچھیے تو میری کہانی میں کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ جو مجھ پر گذری وہی میرے ملک کے لاکھوں مردوں اور عورتوں پر بھی گذری، بدلتی ہوئی کیفیتوں، اُمیدوں اور مایوسیوں، شگفتگی اور افسردگی سخت جدوجہد اور جبری تنہائی کی یہ داستان ہم سب کی داستان ہے۔ ایک فرد قوم کی حیثیت سے میں قوم کے ساتھ ساتھ چلتا رہا، کبھی اس پر اثر ڈالا، کبھی اس سے متاثر ہوا۔ اس کے باوجود دوسرے افراد کی طرح میں ایک جداگانہ شخصی زندگی رکھتا تھا اور سب کے بیچ میں رہتے ہوئے سب سے الگ رہتا تھا۔ یوں تو ہم لوگ اکثر بنتے بھی تھے مگر ہمارے بہت سے کاموں میں حقیقت اور سچائی ہوتی تھی جس کی وجہ سے ہم اپنی ذات کے تنگ دائرے سے نکل کر وہ اہمیت حاصل کر لیتے تھے جو ہمیں ان کاموں کے بغیر کبھی حاصل نہ ہوتی۔ کبھی کبھی ہمیں خوش قسمتی سے اس مکمل زندگی کا تجربہ ہوتا تھا جو نصب العین اور عمل کی مطابقت کا نام ہے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اگر ہم نصب العین کو ترک کر کے غالب قوت کے آگے چپ چاپ سر جھکا دیتے تو ہماری زندگی برباد اور ہماری اوقات تلخ ہو جاتی۔

مجھے اس زمانے میں اور بہت سی چیزوں کے ساتھ ایک بڑی نعمت یہ حاصل ہوئی کہ میں زندگی کو ایک نہایت دلچسپ سفر سمجھنے لگا جس میں انسان بہت کچھ سیکھتا ہے، بہت کچھ کرتا ہے۔ مجھے ہمیشہ محسوس ہوتا رہا کہ میں عقل اور تجربے میں ترقی کر رہا ہوں۔ یہ احساس اب بھی ہے اور اس سے مجھے اپنے کاموں میں اور کتابوں کے مطالعہ میں خاص لطف آتا ہے اور زندگی اچھی طرح گذرتی ہے۔

اس سرگذشت کے لکھنے میں میں نے یہ کوشش کی ہے کہ ہر واقعے کے ساتھ ان خیالات اور جذبات کا بھی ذکر کروں جو اس وقت میرے دل میں تھے تاکہ جہاں تک ممکن ہو میری اندرونی حالت کا اندازہ ہو جائے۔ گذری ہوئی کیفیت کی تصویر اس طرح کھینچنا کہ اس میں بعد کے واقعات کی جھلک نہ آنے پائے سہل نہیں ہے۔ اس لیے لازمی طور پر اگلے حالات کے بیان میں پچھلے خیالات کا رنگ آگیا ہوگا مگر جو مقصد میرے پیش نظر تھا وہ یہی تھا کہ خود اپنی بصیرت کے لیے اپنی نشوونما کا نقشہ کھینچوں۔ شاید میں اس تحریر میں اپنے آپ کو ایسا نہیں دکھا سکا جیسا میں واقعی تھا بلکہ ایسا جیسا میں ہونا چاہتا تھا یا سمجھتا تھا کہ ہوں۔

چند مہینے ہوئے مسٹر پ۔ ملا سوامی آئر نے مجمع عام میں یہ کہا تھا کہ جواہر لال جمہور کے خیالات کا نمائندہ نہیں ہے مگر اپنی قربانی، تصور پرستی اور جوش عقیدت کی وجہ سے جو بقول ان کے محض "فریب نفس" ہے اور بھی زیادہ خطرناک ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص فریب نفس میں مبتلا ہو وہ اپنی حالت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔ میں اس ذاتی معاملے میں پ۔ ب سے بحث کرنے کی جرأت نہیں کروں گا۔ کئی سال سے مجھے ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا مگر اب سے بہت پہلے ایک زمانہ وہ بھی تھا جب وہ اور میں دونوں ہوم رول لیگ کے جوائنٹ سکریٹری تھے۔ اس عرصے میں دنیا بدل گئی۔ وہ ترقی کے مدارج طے کر کے آسمان پر پہنچ گئے اور میں خاک کا پتلا زمین پر پڑا رہا۔ اب مجھ میں اور ان میں اس کے سوا کوئی چیز مشترک نہیں کہ دونوں ایک ہی قوم کے افراد ہیں۔ وہ آج کل، خصوصاً پچھلے چند سال سے ہندوستان کی برطانوی گورنمنٹ کے قصیدہ خواں، ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں حکومتِ مطلق کے حامی اور خود بھی ایک دیسی ریاست کے وزیر اور استبداد کے چشم و چراغ ہیں۔ غالباً ان میں اور مجھ میں ہر معاملے میں اختلاف رائے ہے مگر ایک بزرگ

چیز میں ہم دونوں متفق ہیں۔ ان کا یہ ارشاد بالکل صحیح ہے کہ میں جمہور کے خیالات کا نمائندہ نہیں ہوں۔ مجھے ہرگز یہ مغالطہ نہیں ہے۔

سچ پوچھئے تو بعض وقت میں یہ سوچتا ہوں کہ کیا میں کسی کا بھی نمائندہ ہوں اور میرا دل کہتا ہے نہیں، کسی کا نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بہت سے لوگ مجھ سے انس اور محبت رکھتے ہیں۔ مشرق اور مغرب کا معجون مرکب بن کر میں ادھر کا رہا نہ اُدھر کا۔ غالباً میرے خیالات اور تصورِ حیات میں مغربی رنگ مشرقی رنگ پر غالب ہے مگر اور ہندوستانیوں کی طرح میں بھی اپنے دیس سے بے شمار رشتوں سے وابستہ ہوں اور میرے نفس کے نیم شعوری طبقے میں برہمنوں کی سیکڑوں پشتوں کی روایات دبی ہوئی ہیں۔ نہ تو میں قدیم اثرات سے آزاد ہوسکتا ہوں نہ جدید خیالات سے۔ یہ دونوں میری سیرت کا جز بن گئے ہیں اور اگرچہ وہ مشرق اور مغرب دونوں جگہ میرے کام آتے ہیں مگر اس کے ساتھ انھوں نے میرے دل میں روحانی ترقی کا احساس پیدا کردیا ہے جو نہ صرف سیاسی جدوجہد میں بلکہ ساری زندگی میں مجھ پر چھایا ہوا رہتا ہے۔ مغرب میں بالکل اجنبی معلوم ہوتا ہوں، وہاں کی زندگی میں کسی طرح نہیں کھپ سکتا مگر بعض اوقات اپنے دیس میں بھی مجھے بدیسی ہونے کا احساس ہوتا ہے۔

پہاڑ کو دور سے دیکھ کر اس پر چڑھنا سہل معلوم ہوتا ہے اور چوٹی اشارہ کرتی ہے کہ چلے آؤ مگر پاس پہنچ کر مشکل کا سامنا ہوتا ہے اور جتنا اوپر چڑھتے جایئے اتنا ہی راستہ کٹھن ہوتا جاتا ہے اور چوٹی دور ہٹتی جاتی ہے مگر پھر بھی چڑھنے کی کوشش بے کار نہیں، اس میں بجائے خود ایک لطف ہے۔ شاید زندگی کی قدروقیمت سعی پر منحصر ہے۔ انجام پر نہیں۔ اکثر راستے کا ڈھونڈھنا مشکل ہوتا ہے مگر غلط راستے کا پہچان لینا آسان ہے اور اگر انسان اس سے بچ کر چلے تب بھی غنیمت ہے۔ نہایت عجز وانکسار سے میں حکیم جلیل سقراط کا یہ قول نقل کرتا ہوں "مجھے نہیں معلوم موت کیا ہے۔ ممکن ہے وہ کوئی اچھی چیز ہو اس لیے میں اس سے نہیں ڈرتا۔ مگر یہ میں خوب جانتا ہوں کہ اپنے فرض سے منہ موڑنا برا ہے اور جس چیز سے بھلائی کا احتمال ہو اسے میں اس چیز پر ترجیح دیتا ہوں جس کی برائی کا یقین ہے"۔

نہ جانے کتنے سال میں نے جیل میں بسر کئے! کتنے موسم آئے اور چلے گئے، کتنے چاند بڑھے اور گھٹ گئے۔ ستارے بڑے ثبات اور وقار سے سیر کر چلتے رہے اور میں تنہائی اور محویت کے عالم میں تماشے دیکھتا رہا۔ میری جوانی کے بے شمار دن یہاں دفن ہیں۔ کبھی کبھی وہ بھوت بن کر میرے سامنے آتے ہیں۔ گذرے ہوئے زمانے کی تلخیاں یاد دلاتے ہیں اور چپکے سے میرے کان میں کہتے ہیں "اس سے کچھ حاصل بھی ہوا؟" میں اس کا جواب دینے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتا۔ اگر مجھے اپنے موجودہ علم اور تجربے کے ساتھ گذری ہوئی زندگی پھر بسر کرنے کا موقع ملے تو بے شک میں اپنی ذاتی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں کروں، اپنے پچھلے کاموں میں بہت کچھ ترمیم اور اصلاح کروں مگر خاص خاص قومی معاملات میں میرے فیصلے وہی ہوں گے جو پہلے تھے۔ سچ پوچھئے تو میں ان کو بدل ہی نہیں سکتا، میں خود ان کے آگے بے بس ہوں۔ یہ فیصلے میں نے نہیں کیے، بلکہ ایک ایسی قوت نے مجھ سے کرائے جو میرے اختیار میں نہیں۔

مجھے سزا پائے ٹھیک ایک سال ہوگیا۔ دو برس کی میعاد میں سے ایک برس گذرا ہے اور ابھی پورے بارہ مہینے باقی ہیں۔ اس بار تخفیف کی کوئی امید نہیں، قید محض میں تخفیف نہیں ہوا کرتی۔ وہ گیارہ دن جو میں نے پچھلے اگست میں جیل سے باہر گذارے تھے، محسوب نہیں ہوئے بلکہ دو سال کی میعاد میں گیارہ دن اور بڑھا دیے گئے مگر یہ سال بھی کسی نہ کسی طرح گذر جائے گا اور میں رہا ہوجاؤں گا۔ پھر کیا ہوگا؟ میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا، مگر مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میری عمر کا ایک باب ختم ہوگیا اور دوسرا باب شروع ہوگا، اس میں کیا مضمون ہوگا، اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں — کتابِ زندگی کے اگلے ورق سربمہر ہیں۔

(بہ شکریہ ہریانہ اُردو اکادمی)

پنڈت جواہر لال نہرو کی شادی کا دعوت نامہ

اپنے اخبار "ہریجن" (۲۹ راکتوبر ۱۹۲۸ء کے شمارے میں) مہاتما گاندھی نے لکھا تھا "ہندو ایسے ہزاروں ہیں جن کی مادری زبان اُردو ہے اور جو بجا طور پر اُردو کے عالم کہے جاسکتے ہیں، انھی میں سے ایک پنڈت موتی لال نہرو اور دوسرے ڈاکٹر تیج بہادر سپرو ہیں"۔

ذیل میں پنڈت جواہر لال نہرو کی شادی کے دعوت نامے کی نقل دی جارہی ہے۔ دعوت نامہ پنڈت موتی لال نہرو کی طرف سے ہے اور اُردو میں ہے۔ اس کی اصل الہ آباد میوزیم کے نہرو سیکشن میں محفوظ ہے:

> تمنا ہے کہ بتقریبِ شادی برخوردار جواہر لال نہرو، ساتھ دخترِ پنڈت جواہر مل کول، بمقام دہلی، بتاریخ ۷ رفروری ۱۹۱۶ء، تقاریبِ مابعد، تواریخ ۸۔ ۹ فروری ۱۹۱۶ء جناب مع عزیزان شرکت فرماکر مسرت و افتخار بخشیں۔

پنڈت موتی لال نہرو
آنند بھون۔ الہ آباد
منتظر جواب

اور ان کی دلیلیں میرے دل کو لگتی ہیں مگر جب میں قیدیوں کی عمر بھر کی مصیبت کو دیکھتا ہوں تو یہ خیال ہوتا ہے کہ اس طرح گھٹ گھٹ کر مرنے سے تو موت کی سزا ہی اچھی ہے۔ ایک بار ایک عمر قیدی نے مجھ سے پوچھا: "ہمارے جیسے قیدیوں کا کیا ہونا ہے؟ کیا سوراج ہمیں اس جہنم سے چھڑا دے گا؟ ..."

جیل کے باہر ملک کی حکومت میں یہی طریقہ ایک بڑے پیمانے پر نظر آتا ہے، اگرچہ اتنا کھلا ہوا نہیں ہے۔ وہاں قیدی پہریداروں اور قیدی جمعداروں کے نام دوسرے ہیں، ان کے القاب اور خطاب زیادہ شاندار اور وردیاں زیادہ بھڑک دار ہوتی ہیں اور ان کے پیچھے (اسی طرح جیسے جیل میں) مسلح گارڈ سنگین لیے کھڑا رہتا ہے کہ وہ حکم سے سرتابی نہ کرنے پائیں۔

اس زمانے کی سلطنت میں جیل خانے کس قدر اہم چیز ہیں! کم سے کم قیدی یہی سمجھتا ہے اور اس کی نظر میں حکومت کے اور سب شعبے جیل، پولیس اور فوج کے سامنے بالکل حقیر معلوم ہوتے ہیں۔ جیل ہی میں مارکس کا یہ نظریہ سمجھ میں آتا ہے کہ سلطنت یا ریاست وہ جبر و تشدد کا آلہ ہے جس کے ذریعے سب لوگ حکومت کرنے والے طبقے کی مرضی کے آگے سر جھکانے پر مجبور کیے جاتے ہیں۔

ایک مہینے تک میں اپنی بارک میں اکیلا رہا، اس کے بعد ایک ساتھی نربدا پرشاد سنگھ آگئے اور ان کے آنے سے بڑی تسکین ہوئی۔ ڈھائی مہینے بعد جون ۱۹۳۰ء کی آخری تاریخ کو ہمارے چھوٹے سے احاطے میں غیر معمولی ہلچل مچ گئی۔ صبح تڑکے کیا دیکھتے ہیں کہ میرے والد اور ڈاکٹر سید محمود چلے آرہے ہیں۔ یہ دونوں صبح کو آنند بھون میں سو رہے تھے کہ ایک دم سے گرفتار کر کے یہاں بھیج دیئے گئے۔

میری کہانی ختم ہوگئی۔ سفرِ زندگی کے یہ حالات، جو بالکل شخصی نقطۂ نظر سے لکھے گئے ہیں، جیسے کچھ بھی ہیں، آج کی تاریخ یعنی ۱۴ فروری ۱۹۳۵ء تک المونڑے کے ڈسٹرکٹ جیل میں مکمل ہوگئے۔ تین مہینے ہوئے میں نے اسی جیل میں اپنی پینتالیسویں سالگرہ منائی تھی اور غالباً ابھی میری زندگی کے بہت سے سال باقی ہیں۔ کبھی تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور تھک گیا ہوں اور کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کا تازہ خون میری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ میرا جسم خاصہ مضبوط ہے اور میرا دماغ صدمے جھیلنے کی قوت رکھتا ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی اتفاقی حادثہ پیش نہ آگیا تو میں ابھی بہت دن جیوں گا لیکن آنے والی زندگی جب تک بیت نہ جائے اس کا حال کیونکر لکھا جا سکتا ہے۔

شاید میری سرگذشت لوگوں کو ہیجان خیز نہ معلوم ہو جس کی عمر قید میں کٹی ہو اس کی زندگی میں ہیجان خیز واقعات کہاں سے آئیں؟ سچ پوچھیے تو میری کہانی میں کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ جو مجھ پر گذری وہی میرے ملک کے لاکھوں مردوں اور عورتوں پر بھی گذری۔ بدلتی ہوئی کیفیتوں، اُمیدوں اور مایوسیوں، شگفتگی اور افسردگی سخت جدوجہد اور جبری تنہائی کی یہ داستان ہم سب کی داستان ہے۔ ایک فردِ قوم کی حیثیت سے میں قوم کے ساتھ ساتھ چلتا رہا، کبھی اس پر اثر ڈالا، کبھی اس سے متاثر ہوا۔ اس کے باوجود دوسرے افراد کی طرح میں ایک جداگانہ شخصی زندگی رکھتا تھا اور سب کے بیچ میں رہتے ہوئے سب سے الگ رہتا تھا۔ یوں تو ہم لوگ اکثر بنتے بھی تھے مگر ہمارے بہت سے کاموں میں حقیقت اور سچائی ہوتی تھی جس کی وجہ سے ہم اپنی ذات کے تنگ دائرے سے نکل کر وہ اہمیت حاصل کر لیتے تھے جو ہمیں ان کاموں کے بغیر کبھی حاصل نہ ہوتی۔ کبھی کبھی ہمیں خوش قسمتی سے اس مکمل زندگی کا تجربہ ہوتا تھا جو نصب العین اور عمل کی مطابقت کا نام ہے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اگر ہم نصب العین کو ترک کر کے غالب قوت کے آگے چپ چاپ سر جھکا دیتے تو ہماری زندگی برباد اور ہماری اوقات تلخ ہو جاتی۔

مجھے اس زمانے میں اور بہت سی چیزوں کے ساتھ ایک بڑی نعمت یہ حاصل ہوئی کہ میں زندگی کو ایک نہایت دلچسپ سفر سمجھنے لگا جس میں انسان بہت کچھ سیکھتا ہے، بہت کچھ کرتا ہے۔ مجھے ہمیشہ محسوس ہوتا رہا کہ میں عقل اور تجربے میں ترقی کر رہا ہوں۔ یہ احساس اب بھی ہے اور اس سے مجھے اپنے کاموں میں اور کتابوں کے مطالعہ میں خاص لطف آتا ہے اور زندگی اچھی طرح گذرتی ہے۔

اس سرگذشت کے لکھنے میں میں نے یہ کوشش کی ہے کہ ہر واقعے کے ساتھ ان خیالات اور جذبات کا بھی ذکر کردوں جو اس وقت میرے دل میں تھے تاکہ جہاں تک ممکن ہو میری اندرونی حالت کا اندازہ ہو جائے۔ گذری ہوئی کیفیت کی تصویر اس طرح کھینچنا کہ اس میں بعد کے واقعات کی جھلک نہ آنے پائے سہل نہیں ہے۔ اس لیے لازمی طور پر اگلے حالات کے بیان میں پچھلے خیالات کا رنگ آگیا ہوگا مگر جو مقصد میرے پیشِ نظر تھا وہ یہی تھا کہ خود اپنی بصیرت کے لیے اپنی نشو و نما کا نقشہ کھینچوں۔ شاید میں اس تحریر میں اپنے آپ کو ایسا نہیں دکھا سکا جیسا میں واقعی تھا بلکہ ایسا جیسا میں ہونا چاہتا تھا یا سمجھتا تھا کہ ہوں۔

چند مہینے ہوئے سر چ۔پ۔ رماسوامی آئر نے مجمع عام میں یہ کہا تھا کہ جواہر لال جمہور کے خیالات کا نمائندہ نہیں ہے مگر اپنی قربانی، تصور پرستی اور جوشِ عقیدت کی وجہ سے جو بقول ان کے محض "فریبِ نفس" ہے اور بھی زیادہ خطرناک ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص فریبِ نفس میں مبتلا ہو وہ اپنی حالت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔ میں اس ذاتی معاملے میں چ۔پ سے بحث کرنے کی جرأت نہیں کروں گا۔ کئی سال سے مجھے ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا مگر اب سے بہت پہلے ایک زمانہ وہ بھی تھا جب وہ اور میں دونوں ہوم رول لیگ کے جوائنٹ سکریٹری تھے۔ اس عرصے میں دنیا بدل گئی۔ وہ ترقی کے مدارج طے کر کے آسمان پر پہنچ گئے اور میں خاک کا پتلا زمین پر پڑا رہا۔ اب مجھ میں اور ان میں اس کے سوا کوئی چیز مشترک نہیں کہ دونوں ایک ہی قوم کے افراد ہیں۔ وہ آج کل، خصوصاً پچھلے چند سال سے ہندوستان کی برطانوی گورنمنٹ کے قصیدہ خواں، ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں حکومتِ مطلق کے حامی اور خود بھی ایک دیسی ریاست کے وزیر اور استبداد کے چشم و چراغ ہیں۔ غالباً ان میں اور مجھ میں ہر معاملے میں اختلافِ رائے ہے مگر ایک جزوی

چیز میں ہم دونوں متفق ہیں۔ ان کا یہ ارشاد بالکل صحیح ہے کہ میں جمہور کے خیالات کا نمائندہ نہیں ہوں۔ مجھے ہرگز یہ مغالطہ نہیں ہے۔

سچ پوچھئے تو بعض وقت میں یہ سوچتا ہوں کہ کیا میں کسی کا بھی نمائندہ ہوں اور میرا دل کہتا ہے نہیں، کسی کا نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بہت سے لوگ مجھ سے انس اور محبت رکھتے ہیں۔ مشرق اور مغرب کا معجون مرکب بن کر نہ میں ادھر کا رہا نہ اُدھر کا۔ غالباً میرے خیالات اور تصورِ حیات میں مغربی رنگ مشرقی رنگ پر غالب ہے مگر اور ہندوستانیوں کی طرح میں بھی اپنے دیس سے بے شمار رشتوں سے وابستہ ہوں اور میرے نفس کے نیم شعوری طبقے میں برہمنوں کی سیکڑوں پشتوں کی روایات دبی ہوتی ہیں۔ نہ تو میں قدیم اثرات سے آزاد ہو سکتا ہوں نہ جدید خیالات سے۔ یہ دونوں میری سیرت کا جز بن گئے ہیں اور اگرچہ وہ مشرق اور مغرب دونوں جگہ میرے کام آتے ہیں مگر اسی کے ساتھ انھوں نے میرے دل میں روحانی ترقی کا احساس پیدا کر دیا ہے جو نہ صرف سیاسی جدوجہد میں بلکہ ساری زندگی میں مجھ پر چھایا ہوا رہتا ہے۔ مغرب میں بالکل اجنبی معلوم ہوتا ہوں، وہاں کی زندگی میں کسی طرح نہیں کھپ سکتا مگر بعض اوقات اپنے دیس میں بھی مجھے بدیسی ہونے کا احساس ہوتا ہے۔

پہاڑ کو دُور سے دیکھ کر اس پر چڑھنا سہل معلوم ہوتا ہے اور چوٹی اشارہ کرتی ہے کہ چلے آؤ مگر پاس پہنچ کر مشکل کا سامنا ہوتا ہے اور جتنا اوپر چڑھتے جائیے اتنا ہی راستہ کٹھن ہوتا جاتا ہے اور چوٹی دُور ہٹتی جاتی ہے مگر پھر بھی چڑھنے کی کوشش بے کار نہیں، اس میں بجائے خود ایک لطف ہے۔ شاید زندگی کی قدر و قیمت سعی پر منحصر ہے۔ انجام پر نہیں۔ اکثر راستے کا ڈھونڈھنا مشکل ہوتا ہے مگر غلط راستے کا پہچان لینا آسان ہے اور اگر انسان اس سے بچ کر چلے تب بھی غنیمت ہے۔ نہایت عجز و انکسار سے میں حکیم جلیل سقراط کا یہ قول نقل کرتا ہوں "مجھے نہیں معلوم موت کیا ہے۔ ممکن ہے وہ کوئی اچھی چیز ہو اس لیے میں اس سے نہیں ڈرتا۔ مگر یہ میں خوب جانتا ہوں کہ اپنے فرض سے منہ موڑنا بُرا ہے اور جس چیز سے بھلائی کا احتمال ہو اسے میں اس چیز پر ترجیح دیتا ہوں جس کی بُرائی کا یقین ہے"۔

نہ جانے کتنے سال میں نے جیل میں بسر کئے! کتنے موسم آئے اور چلے گئے، کتنے چاند بڑھے اور گھٹ گئے۔ ستارے بڑے ثبات اور وقار سے سیر پر چلتے رہے اور میں تنہائی اور محویت کے عالم میں تماشے دیکھتا رہا۔ میری جوانی کے بے شمار دن یہاں دفن ہیں، کبھی کبھی وہ بھوت بن کر میرے سامنے آتے ہیں۔ گذرے ہوئے زمانے کی تمنائیں یاد دلاتے ہیں اور چپکے سے میرے کان میں کہتے ہیں "اس سے کچھ حاصل بھی ہوا؟" میں اس کا جواب دینے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتا۔ اگر مجھے اپنے موجودہ علم اور تجربے کے ساتھ گذری ہوئی زندگی پھر سے بسر کرنے کا موقع ملے تو بے شک میں اپنی ذاتی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں کروں، اپنے پچھلے کاموں میں بہت کچھ ترمیم اور اصلاح کروں مگر خاص خاص قومی معاملات میں میرے فیصلے وہی ہوں گے جو پہلے تھے۔ سچ پوچھئے تو میں ان کو بدل ہی نہیں سکتا، میں خود ان کے آگے بے بس ہوں۔ یہ فیصلے میں نے نہیں کیے، بلکہ ایک ایسی قوت نے مجھ سے کرائے جو میرے اختیار میں نہیں۔

مجھے سزا پائے ٹھیک ایک سال ہوگیا۔ دو برس کی میعاد میں سے ایک برس گذرا ہے اور ابھی پورے بارہ مہینے باقی ہیں، اس بار تخفیف کی کوئی امید نہیں، قید محض میں تخفیف نہیں ہوا کرتی۔ وہ گیارہ دن جو میں نے پچھلے اگست میں جیل سے باہر گذارے تھے، محسوب نہیں ہوئے بلکہ دو سال کی میعاد میں گیارہ دن اور بڑھا دیئے گئے مگر یہ سال بھی کسی نہ کسی طرح گذر جائے گا اور میں رہا ہو جاؤں گا۔ پھر کیا ہوگا؟ میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا، مگر مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میری عمر کا ایک باب ختم ہوگیا اور دوسرا باب شروع ہوگا، اس میں کیا مضمون ہوگا، اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں ـــ کتابِ زندگی کے اگلے ورق سربمہر ہیں۔

(بہ شکریہ ہریانہ اُردو اکادمی)

پنڈت جواہر لال نہرو کی شادی کا دعوت نامہ

اپنے اخبار "ہریجن" (۲۹ اکتوبر ۱۹۳۸ء کے شمارے میں) مہاتما گاندھی نے لکھا تھا "ہندو ایسے ہزاروں ہیں جن کی مادری زبان اُردو ہے اور جو بجا طور پر اُردو کے عالم کہے جا سکتے ہیں! انھی میں سے ایک پنڈت موتی لال نہرو اور دوسرے ڈاکٹر تیج بہادر سپرو ہیں۔"

ذیل میں پنڈت جواہر لال نہرو کی شادی کے دعوت نامے کی نقل دی جا رہی ہے۔ دعوت نامہ پنڈت موتی لال نہرو کی طرف سے ہے اور اُردو میں ہے۔ اس کی اصل الٰہ آباد میوزیم کے نہرو سیکشن میں محفوظ ہے:

تمنا ہے کہ بتقریب شادی برخوردار جواہر لال نہرو، ساتھ دختر پنڈت جواہر مل کول، بمقام دہلی، بتاریخ ۷ فروری ۱۹۱۶ء، تقاریب مابعد، تواریخ ۸ - ۹ فروری ۱۹۱۶ء جناب مع عزیزان شرکت فرما کر مسرت و افتخار بخشیں۔

پنڈت موتی لال نہرو
آنند بھون۔ الٰہ آباد
منتظر جواب

اہم قومی مسائل پر اظہارِ خیال

پنچایت راج

" غالباً آج ہندوستان کا سب سے انقلابی قدم دیہی علاقوں میں پنچایت راج کا فروغ ہے، جس کے نتیجے میں اقتدار کا دائرہ بڑھا ہے اور دیہی تنظیموں کو زیادہ اختیارات حاصل ہوئے ہیں۔ اسی کے ساتھ امداد باہمی تحریک نے بھی زور پکڑا ہے۔ اس سے سب سے پہلے زراعت کو فیض پہنچے گا اور مختلف دیہی ترقیاتی اسکیموں کو بڑھاوا ملے گا۔ حتمی تجزیے کے طور پر، اس کا مقصد فرد کی اصلاح اور اسے زیادہ خود اعتماد بنانا ہے۔ اس طرح جمہوریت دیہات میں کروڑوں افراد تک پھیل رہی ہے اور دفتر شاہی کا قدیم عذاب کم ہوتا جا رہا ہے۔"

(زین فلورٹ کی کتاب "انڈیا؛ دی کنٹری اینڈ اٹس ٹریڈیشنز" کا پیش لفظ۔ ۱۹۶۲)

مزدور تحریک

" میں مزدوروں کو زیادہ بہتر مزدوری دینے کے حق میں ہوں۔ یہ ضرور ہے کہ ایسا کرنے سے پہلے سرکاری خزانے میں مزدوری اور تنخواہوں کی ادائیگی کے لیے معقول رقم موجود ہو۔ اس وقت ملک کو خود کفیل بنانے کی ضرورت ہے، جس کے لیے ہر ممکنہ عمل سے پیداوار بڑھانا لازمی ہے۔ جائز شکایتوں کے باوجود اس وقت جو شخص کام روکتا ہے وہ عوام کی پیٹھ میں خنجر گھونپتا ہے۔"

(ہفتۂ آزادی تقریبات کے موقعے پر عوام سے خطاب۔ نئی دتی ۹ر اگست ۱۹۴۷ء سلیکٹڈ ورکس آف جواہر لال نہرو۔ جلد سوم، دوسری سیریز ص ۱۳۵)

" ہم ایشیا کو صنعتی اور اقتصادی طور پر پسماندہ تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود نئی سماجی فکر پیدا ہوئی ہے اور مزدور جہاں بھی ہے، اس میں بیداری آئی ہے۔ یہ بیداری کہیں اڑیل پن کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے، کہیں تشدّد کی صورت میں۔

ہم تشدّد کے رجحان کی مذمت کرتے ہیں اور جہاں جہاں اس کا اظہار ہوا ہے، ہمیں اس کا افسوس بھی ہے، لیکن ہمیں یہ حقیقت نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ ماضی میں ان محنت کشوں کے ساتھ کبھی اچھا برتاؤ نہیں کیا گیا ہے اور اگر آج وہ اپنی مانگوں پر اڑے ہوتے ہیں تو کیا ہمیں ان کی مذمت کرنی چاہیے؟ ہم انھیں سمجھا بجھا سکتے ہیں، ان سے اپیل کر سکتے ہیں، انھیں حالات سے واقف کرا سکتے ہیں۔ اور اگر ہم واقعی ایسا کرتے ہیں تو مجھے پورا یقین ہے کہ وہ مان جائیں گے اور ہم سے تعاون کریں گے۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم سماجی انصاف پر مبنی اپنی اسکیموں اور مقاصد کے ذریعے انھیں مطمئن کر سکیں اس کے لیے محض منصوبے بنا لینا یا تجاویز پیش کر دینا کافی نہ ہوگا۔"

(آئی۔ ایل۔ او کے قومی علاقائی اجلاس کے نام پیغام۔ ۱۷ر جنوری ۱۹۵۰ء نوارا ایلیا (سری لنکا) بیفور اینڈ آفٹر انڈیپینڈنس (۵۰۔۱۹۲۲) جے۔ ایس برائٹ (پس) صفحہ ۶۰۶)

" آپ محنت کش کی مشکلات اور دیگر کئی مسائل کا ذکر کرتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ آپ کی شکایت اس صورت میں جائز ہو سکتی ہے جب تشدد کا سہارا لیا جا رہا ہو۔ لیکن حکومتی ذمّے داری اور ڈسپلن سے بالا ہو کر آپ اس کا کیا حل پیش کر سکیں گے۔ آپ اتنے افراد کی بھیڑ پر ردِّ عمل کا رویّہ اپنا کر ہرگز قابو نہیں پا سکتے۔ ان سے نمٹنے کے لیے آپ کو انسانی رویّہ اپنانا ہوگا۔ آپ انھیں یہ محسوس کرائیں کہ وہ ہم سے الگ نہیں ہیں، وہ صرف لکڑی کاٹنے والے یا گارا ڈھونے والے نہیں ہیں۔ بلکہ ہمارے ساتھ ایک عظیم ذمے داری کی ادائیگی میں ہمارے معاون ہیں۔"

(ایسوسی ایٹیڈ چیمبرز آف کامرس کلکتہ میں تقریر۔ ۱۴ر دسمبر ۱۹۵۳ء "جواہر لال نہرو ز اسپیچز ۱۹۵۷۔۱۹۵۳ء پرکاشن وبھاگ۔ بھارت سرکار، نئی دہلی صفحہ۔ ۶۴)

سائنس اور ٹیکنالوجی

" سائنس کے دو پہلو ہیں؛ ایک منفی یعنی تخریبی اور دوسرا مثبت یعنی تعمیری۔ یہ دونوں

پہلو ساتھ ساتھ چلتے رہے ہیں اور چلتے رہیں گے۔ کوئی نہیں جانتا کہ بالآخر فاتح کون سا رہے گا۔"

(انڈین سائنس کانگریس کے ۳۴ ویں اجتماع میں صدارتی تقریر۔ دہلی۔ ۳ جنوری ۱۹۴۷ء "جواہر لال نہرو آن سائنس" ایڈیٹر بلدیو سنگھ صفحہ ۷)

"سائنس دورِ جدید کی روح ہے، عصرِ حاضر کا ایک موثر ترین عنصر جس کی اہمیت حال کی بہ نسبت مستقبل میں زیادہ ہوگی، خاص طور سے ان افراد کے لیے جو سائنس سے دوستی نباہتے ہوئے انسانی ترقی میں اس سے مدد لینے کے خواہاں ہیں۔"

(انڈین سائنس کانگریس کے سلور جبلی اجتماع کے موقعے پر مرسلہ پیغام، یہ اجتماع ۳ جنوری ۱۹۳۸ء کو کلکتہ میں منعقد ہوا تھا۔ "جواہر لال نہرو آن سائنس" مرتب، بلدیو سنگھ۔ صفحہ ۱۔۲)

"دنیا میں تقریباً ہر جگہ تمام لوگ سائنس کو اہمیت دیتے ہیں۔ جس دنیا میں ہم لوگ رہتے ہیں وہ بہت حد تک سائنس ہی کی ڈھالی ہوئی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا سائنس کے تئیں جذبۂ احترام کے ساتھ اس کی حوصلہ افزائی کرنے کے بارے میں محض سوچنا بھی بلاشبہ ضروری ہے۔ تاہم یہ اتنا ضروری نہیں ہے کیونکہ آج یہ ایک تسلیم شدہ نظریہ ہے کہ سائنس کے مندر میں جاکر ہمیں اس کی پرستش کرنا ہی پڑے گی۔ یہ ایک صحیح بات ہے کیونکہ سائنس کی ترقی کے قدم جلدی جلدی آگے بڑھ رہے ہیں۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ ایک طرح سے ہم لوگ اب خلائی عہد کے کنارے کھڑے ہیں اور کچھ لوگ خلا میں بھی گئے ہیں۔ کچھ دور تک ہی گئے ہوں۔ تاہم یہ ایک بہت بڑی کامیابی ہے اور آئندہ دیگر سمتوں میں اور بھی زیادہ بڑی کامیابیاں ہمیں حاصل ہوں گی۔"

(انڈین سائنس کانگریس کے سلور جبلی اجتماع میں جو ۳ جنوری ۱۹۶۲ء کو کٹک میں منعقد ہوا تھا، افتتاحی تقریر۔ "جواہر لال نہرو آن سائنس" بلدیو سنگھ۔ ص ۷۵)

"میرے خیال میں سائنس کے بغیر کسی سماج کا کوئی مستقبل نہیں ہے لیکن اگر اس پر اخلاقی تصورات کا کنٹرول نہیں رکھا جائے گا تو بھی ہمارا کوئی مستقبل نہیں ہوگا۔"

(سری لنکا یونیورسٹی کولمبو میں سائنس کی ترقی سے متعلق ایسوسی ایشن میں ۱۵ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو جواہر لال نہرو کی تقریر۔ "جواہر لال نہرو آن سائنس" بلدیو سنگھ، صفحہ ۱۰۷)

نوجوانوں اور طلبہ کی تحریک

"آپ کے آدرش آپ پر واضح ہونے چاہئیں۔ آپ اپنے خوابوں کا ڈھانچہ اور کس طرح بنانے کی امید کرتے ہیں؟ کیا آپ جھونپڑی کی بنیاد پر عالیشان محل بنا سکتے ہیں؟ کیا آپ گھاس کے ذریعے ایک اچھا سا پل تعمیر کر سکتے ہیں؟ آپ کے نشانے سے متعلق آپ کے معینہ خیالات آپ کے مقصد کو واضح اور آپ کے کاموں کو اثرآفریں بنائیں گے پھر آپ جو بھی قدم اٹھائیں گے وہ آپ کو آپ کی دلی آرزو کے قریب لے جائے گا۔"

(۲۲ ستمبر ۱۹۲۸ء کو طلبہ کی کل بنگال کانفرنس سے صدارتی خطاب، "امپارٹینٹ اسپیچیز آف جواہر لال نہرو" صفحہ ۶۳۔ مرتبہ جے۔ ایس۔ برائٹ)

"میں پنجاب کے نوجوانوں سے جن میں اتنا زیادہ جوش و خروش ہے کہ وہ کبھی کبھی ڈسپلن چھوڑ بیٹھتے ہیں، کہنا اور انھیں آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ وقت آنے والا ہے جب محض جوش کی نہیں بلکہ ڈسپلن سے معمور خدمات کی قدر کی جائے گی۔ مجھے معلوم ہے کہ اگر وہ اس جانب مائل ہوں تو ان میں ایسا کرنے کی صلاحیت بھی ہے۔ ہندوستان میں بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہونے والی ہیں اور بڑی بڑی ذمے داریاں ایسے لوگوں کی منتظر ہیں جو انھیں اٹھانے کے اہل ہوں۔ لہٰذا ان ذمے داریوں کے لیے تیار رہیے اور آج کے چھوٹے چھوٹے مسائل اور نکتوں کو فراموش کر دیجیے۔ جو وقت آنے والا ہے اس میں پنجاب کا حصہ دلیرانہ ہوگا۔ بالآخر یہ کام نوجوانوں کو ہی انجام دینا ہے۔"

(لاہور میں ۹ نومبر ۱۹۴۵ء کی تقریر، "امپارٹینٹ اسپیچیز آف جواہر لال نہرو" ۱۹۲۲۔ ۱۹۴۶، مرتب جے۔ ایس۔ برائٹ صفحہ ۷۰)

"میں اپنے ملک کے نوجوانوں سے خاص طور پر یہ اپیل کرتا ہوں کہ وہ ہمارے مستقبل کے رہنما بنیں۔ ہندوستان کے وقار اور آزادی کو برقرار رکھنے کی ذمے داری انہی کے سر ہے۔ میری پیڑھی ختم ہو رہی ہے اور جلد ہی ہم ہندوستان کی روشن مشعل جو اس کی لازوال اور عظیم روح کی علامت ہے، طاقتور نوجوان ہاتھوں کو سونپ دیں گے۔ وہ اسے بلند رکھیں، دھیمی نہ ہونے دیں، اس کی چمک ماند نہ پڑنے دیں تاکہ اس کی روشنی ہر گھر میں پہنچے اور اس ملک کے عوام میں اعتماد اور حوصلہ



پیدا کرے۔"

(یومِ آزادی پر پیغام، نئی دہلی، ۱۵ راگست ۱۹۴۸ء "جواہر لال نہرو ز اسپیچیز" ۱۹۴۶ء ——— ۱۹۴۹ء پبلیکیشنز ڈویژن، گورنمنٹ آف انڈیا نئی دہلی، ص ۸۲)

کسان

"ہندوستان کے عوام کون لوگ ہیں؟ یہ لوگ ہیں گاؤں کے کسان، نہ کہ شہروں میں رہنے والے تھوڑے سے شہری یا وکیل ——— اگر کسانوں کی مصیبتیں دور نہ کی گئیں تو سوراج سے کیا فائدہ . . . . ؟ حقیقتاً سوراج کے معنی ہیں ہندوستانی عوام بالخصوص کسانوں کی مصیبتیں دور کرنا۔ کسانوں کی مصیبتوں کا خاص تعلق لگان، بے دخلی اور زمین کی ملکیت سے ہے۔ اگر ان کے مسائل حل نہیں کیے جاتے تو سوراج سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

(۲۰ رجون ۱۹۳۱ء کو الٰہ آباد ضلع کے کوکھراج میں کسانوں کے جلسے میں تقریر، "سلیکٹیڈ ورکس آف جواہر لال نہرو" جلد ۵، صفحہ ۸۱ ۔ ۸۲)

ہمارے مسائل میں سے کوئی بھی مسئلہ یقیناً زراعت کے مسئلے سے زیادہ اہم اور ضروری نہیں ہے۔ تمام ہندوستان کی سرزمین پر کسان کی گہری چھاپ ہے اور ہمارے مسائل میں سے ہر ایک مسئلے یعنی سیاسی اور اقتصادی مسئلے پر اس کا اثر ہے۔ اس بات کو محسوس کرتے ہوئے قومی کانگریس نے اس مسئلے کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اور ایک زرعی پروگرام تیار کیا ہے۔ لہٰذا یہ مناسب ہی ہے کہ ہمارے سیاسی اور اقتصادی مطالعات میں سب سے پہلا کام اس مسئلے کا مختصر سروے کرنا ہے۔"

(زیڈ۔ اے۔ احمد کی کتاب "دی ایگریرین پرابلم ان انڈیا" کی تمہید، ۸ رجولائی ۱۹۳۶ء "سلیکٹیڈ ورکس آف جواہر لال نہرو" جلد ۷، صفحہ ۶۴۶)

"تمام کسانوں کے، چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان مفادات ایک جیسے ہیں۔ تمام کسانوں کو چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان، لگان دینا پڑتا ہے ان لوگوں کو اُس زمین کی ملکیت حاصل ہونی ہے جسے وہ جوتتے ہیں۔ ان لوگوں کو اپنے حقوق حاصل کرنے، اپنی شکایات دور کرانے اور بوجھ کو ہلکا کرانے کے لیے شانہ بہ شانہ کام کرنا پڑتا ہے۔ کچھ لوگ کسانوں کی یکجہتی کو توڑنے کے لیے فرقہ وارانہ جذبات کو ہوا دیتے ہیں۔ کسانوں کو ایسے لوگوں سے بہت ہوشیار رہنا چاہیے۔"

(الٰہ آباد ضلعے میں کرچھنا میں ۱۶ راپریل ۱۹۳۹ء کو تقریر، "سلیکٹیڈ ورکس آف جواہر لال نہرو" جلد ۔ ۹ صفحہ ۔ ۳۲۴)

نجی شعبہ

ذاتی طور پر میں سوچتا ہوں کہ ہمارے سامنے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم نجی شعبے کو برقرار رکھیں اور اسے فروغ بھی دیں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ میں نجی شعبے کی عوامی شعبے کی قیمت پر حوصلہ افزائی کرنا چاہتا ہوں۔ عوامی شعبے کا ہمیشہ پہلا مقام رہے گا اور مجھے کوئی شبہ نہیں کہ یہ دوسرے شعبے کے مقابلے میں زیادہ تیز رفتاری سے بڑھے گا اور آہستہ آہستہ ہی ملک کے اقتصادی نظام کا فی الواقع تعین کرے گا۔ باقی سب کو اس نظام سے ہم آہنگ ہونا پڑے گا۔ ہم اب بھی اسے اپنے منصوبوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ذاتی طور پر میں سوچتا ہوں کہ عوامی شعبے کے ٹھیک طرح سے چلنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ ہمارے یہاں ایک مسابقتی نجی شعبہ ہو تاکہ وہ کسی حد تک عوامی شعبے کو ٹھیک رکھ سکے۔ یہ صحیح ہے کہ کبھی کبھی سرکاری کام اور حکومتی کام کی وجہ سے عوامی شعبہ بھی سرکاری محکمے کی طرح کام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ہم ایسا نہیں ہونے دینا چاہتے۔ ہم انھیں خود اختیار ادارے کی شکل دینا چاہتے ہیں۔ تاکہ وہ سرکاری محکمے جیسا کام نہ کریں جو حقیقتاً کام کرنے کا ساکن طریقہ ہے۔"

(کانگریس پارلیمانی پارٹی کی میٹنگ میں تقریر۔ جواہر لال نہرو۔ ٹوورڈس اے سوشلسٹک آرڈر۔ صفحہ ۴۳)

"نجی صنعت اچھی چیز ہے۔ لیکن انیسویں صدی میں جسے نجی صنعت کہا جاتا تھا وہ ختم ہو گئی ہے یا ختم ہو جانی چاہیے۔ یہ کسی شخص کی اچھائی یا برائی کا سوال نہیں ہے۔ ہمیں اپنے عہد کی اسپرٹ کو دھیان میں رکھنا چاہیے۔ جو رجحانات غریب ملک کو اور بھی زیادہ غریب بناتے ہیں ہمیں ان رجحانات کو ختم کر کے آگے بڑھنے کے خاص مسئلے کا سامنا کرنا ہے۔ اگر اسے سرمایہ دارانہ نظام کے تحت عام حالات کے حوالے کر دیا جائے تو بلاشبہ غریب اور غریب اور مٹھی بھر امیر اور امیر ہو جائیں گے ——— یہ سچ ہے کہ حکومت اس میں مداخلت کرے گی۔ امیروں کے سرمائے سے حکومت، غریبوں کی تعلیم، صحت، رہائش اور دیگر سہولیات کا

ظام کرے گی۔ تاہم اس طرح کی مداخلت
نظام کی بنیادی مشکل کو حل نہیں کرتی ہے جو
یان کی خلیج کو مزید چوڑا کرتی ہے۔"

(۳ر فروری ۱۹۵۸ء کو بمبئی میں انڈین مرچینٹس
ہبر کی گولڈن جوبلی میں کی گئی تقریر۔ جواہر لال نہرو ز اسپیچز
نبر ۱۹۵۷، اپریل ۱۹۶۳، پبلیکیشنز ڈویژن گورنمنٹ
ن انڈیا، صفحہ ۱۱۲)

جمہوریت

"ہم اس ملک میں جمہوریت کے حامی ہیں۔
ہم آزاد اور اقتدارِ اعلیٰ کے حامل ہندوستان
کے حامی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہمیں ایسی ہر چیز کی
مخالفت کرنی چاہیے جو جمہوری تصور ______
حقیقی اور لازمی جمہوری تصور کے خلاف ہو۔ جمہوری تصور
میں سیاسی ہی نہیں بلکہ اقتصادی جمہوریت بھی شامل ہے۔ اس
کے علاوہ کسی دوسرے تصور یا عمل کے تھوپے
جانے کی ہم مخالفت کریں گے۔"

(۸ر مارچ ۱۹۴۸ء کو نئی دہلی میں دستور ساز
اسمبلی میں تقریر۔ جواہر لال نہرو ز اسپیچز ستمبر ۱۹۴۶ء
مئی ۱۹۴۹، پبلیکیشنز ڈویژن گورنمنٹ آف انڈیا ___
صفحہ ۲۲۰)

"میں پوری طرح ایک ایسی حکومت میں
بھلے ہی وہ کیسی ہو، یقین رکھتا ہوں، جس کے
طاقتور ناقدین ہوں، جس کا مقابلہ کرنے کے
لیے مخالف پارٹی ہو۔ اگر تنقید نہ ہو تو لوگ اور
حکومت قناعت پسند ہو جاتے ہیں۔ حکومت
کا سارا پارلیمانی نظام اس طرح کی تنقید پر
مبنی ہے۔ آزاد صحافت بھی تنقید پر مبنی ہے۔
ہمارے لیے یہ ایک بُری بات ہوگی اگر پریس کو
تنقید کرنے کی آزادی نہ ہو اور اگر لوگوں کو بولنے
اور حکومت کی پوری طرح سے کھل کر تنقید کرنے
کی اجازت نہ ہو۔ ایسا ہوا تو وہ پارلیمانی حکومت
نہیں ہوگی۔ یہ مناسب جمہوریت نہیں ہوگی۔
میں پارلیمنٹ میں تنقید کا خیر مقدم کرتا ہوں۔
دراصل ہم تو خود اپنی پارٹی کے ممبران کے ذریعے
بھی تنقید کا سواگت کرتے ہیں۔ حکومت کی پالیسی
کی تنقید کرنے کی ہماری پارٹی میں کافی گنجائش
ہے۔"

(۳۱ر جنوری ۱۹۵۷ء کو آئی لینڈ گراؤنڈ مدراس
میں تقریر۔ جواہر لال نہرو ز اسپیچز مارچ ۱۹۵۳ء
اگست ۱۹۵۷ء، پبلیکیشنز ڈویژن گورنمنٹ آف انڈیا
صفحہ ۱۵۲)

سوشلزم

"اگر آپ کا نصب العین سماجی برابری اور
ایک عالمی فیڈریشن (وفاق) ہے تو یقیناً آپ
کو سوشلسٹ ریاست کے لیے کام کرنا ہوگا۔
ہمارے ملک میں بہت سے لوگ لفظ سوشلزم
سے خوفزدہ ہیں۔ لیکن یہ بات بے معنی ہے کیونکہ
خوف ایسے لوگوں کا مستقل ساتھی ہے۔ خیالات
کی اس دنیا میں یہ لوگ ہر اہم واقعے سے
بے خبر ہیں اور جب سے انھوں نے اسکولی تعلیم
چھوڑی ہے، وہ ہر اس چیز سے ڈرتے ہیں
جسے وہ نہیں سمجھتے اور سمجھیں گے بھی نہیں۔ اس
لیے یہ آپ کا، ملک کے نوجوانوں کا کام ہے کہ وہ
ان طاقتوں اور خیالات کی قدر کریں جو دنیا کو
جھنجوڑ رہے ہیں اور انھیں اپنے ملک میں بھی
نافذ کریں۔ آج کی اس پریشان دنیا کے لیے
سوشلزم ہی ایک اُمید ہے۔ یہ دلچسپ بات
ہے کہ پہلی عالمی جنگ کے دوران جب مغربی
ممالک کو خوفناک مصیبت میں پھنسنے کا خطرہ
پیدا ہو گیا تھا تو یورپ کے سرمایہ دار ممالک
بھی بہت کچھ سوشلسٹ طریقے اپنانے کے لیے
مجبور ہو گئے تھے۔ ایسا ہر ریاست میں صرف
داخلی طور پر ہی نہیں کیا گیا بلکہ بین الاقوامی بنیاد
پر بھی حالات و واقعات کا مقابلہ کرنے کے
کیا گیا۔ متعدد میدانوں میں تعاون کیا گیا اور ا
محسوس ہوتا تھا گویا قومی حدود دُھندلا گئی ہیں
نہایت قریبی اقتصادی تعاون دکھائی دیا ا
آخر میں متعدد ممالک کی افواج مل کر ایک
سپہ سالار کے تحت ہو گئیں۔"

(۲۲ر ستمبر ۱۹۲۸ء کو طلبا کی کل بنگال کانفر
میں تقریر۔ اسپارٹمینٹ اسپیچز آف جواہر لال نہر
۱۹۲۲-۱۹۴۶، مرتبہ جے۔ ایس۔ برائٹ، صفحہ

"مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دنیا اور ہندو
کے مسائل کے حل کی کنجی سوشلزم میں ہے
میں جب اس لفظ کو استعمال کرتا ہوں تو
اسے غیر واضح فلاحی ریاست کے معنی میں نہ
بلکہ سائنسی اور معاشی مفہوم میں استعمال کر
سوشلزم محض ایک معاشی نظریہ ہی نہیں
بلکہ یہ ایک فلسفۂ حیات ہے اور اسی لیے
معقول لگتا ہے۔ میں سوشلزم کے سوا غ
بے روزگاری، پستی اور ہندوستانیوں کی
کو ختم کرنے کا کوئی دوسرا طریقہ نہیں سمجھتا۔"

(۱۲ر اپریل ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ میں کانگریس
اجلاس میں تقریر۔ سلیکٹڈ ورکس آف جواہر لال ن
۷، صفحہ ۱۸۰-۱۸۱)

...یکولرزم

"ہم یہ اعلان کر چکے ہیں کہ ہم فرقہ پرست
...ں کا ہر طریقے سے مقابلہ کرتے رہیں گے اور
...چاہے مسلم ہوں یا ہندو یا سکھ یا اور کسی
...سے تعلق رکھتی ہوں ——— قوم پرستی
...پرستی کا وجود ایک ساتھ ممکن نہیں۔ قوم
...کے معنی ہندو قوم پرستی، مسلم قوم پرستی یا
...پرستی نہیں ہیں۔ جیسے ہی آپ ایک ہندو،
...سلمان کے طور پر بولنا شروع کرتے ہیں تو
...ت آپ ہندوستان کے لیے نہیں بول
...رتے ہیں۔ ہر شخص کو اپنے آپ سے یہ سوال
...ہیے کہ میں ہندوستان کو کیا بنانا چاہتا
...لیا بغیر طاقت اور قوت برداشت کا
...سا ملک جو ذرا سے دھکے سے ٹکڑوں میں
...ئے؟ ہر شخص کو اس کا جواب دینا ہے۔
...پسندی ہمیشہ سے ہندوستان کو کمزور
...ہی ہے۔ پھوٹ ڈالنے والے رجحانات
...وہ ہندوؤں کے رہے ہوں، مسلمانوں،
...، عیسائیوں یا دوسرے لوگوں کے،
...خطرناک اور غلط ہیں۔ وہ کھوکھلے اور
...دماغوں کی پیداوار ہیں۔ کوئی بھی شخص جو
...سناس ہے وہ فرقہ پرستی کی زبان میں
...ورچ سکتا ہے۔"

(۱۹ جولائی ۱۹۶۱ء کو سری نگر میں ہندی میں کی گئی
...واہر لال نہروز اسپیچیز" ۱۹۵۷ - ۱۹۶۳ء پبلیکیشنز
...گورنمنٹ آف انڈیا۔ صفحہ ۱۲)

...ہندوستان میں ہم سیکولر ریاست کی
...تے ہیں۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کے معنی
ہیں مذہب کی مخالفت لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے سیکولر ریاست کا مطلب ہے ایک ایسا ملک جہاں تمام مذاہب کو مساوی احترام حاصل ہے اور جہاں انھیں مساوی مواقع ملتے ہیں، حالانکہ ایک ریاست کے طور پر یہ اپنے آپ کو کسی ایک اعتقاد یا مذہب سے جوڑنے کی اجازت نہیں دیتا ہے جس سے وہ ریاست کا مذہب ہو جائے۔

ایک طرح سے یہ ایک جدید خیال ہے۔ ہندوستان کی تاریخ مذہبی رواداری کی ایک طویل تاریخ رہی ہے لیکن یہ سیکولر ریاست کا محض ایک پہلو ہے نہ کہ اس کا پورا حصہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں بہت سے مت اور مذاہب ہیں، کسی بھی حقیقی قوم پرستی کو سیکولرزم کی بنیاد کے بغیر فروغ نہیں دیا جا سکتا ہے۔"

(رگھوناتھ سنگھ کی "دھرم نرپیکش راجیہ" کا پیش لفظ ۱۹۶۱ء)

درج فہرست ذاتیں اور قبائل

"میں شہر میں متعدد ہریجن اداروں اور مکانوں کو دیکھتا رہا ہوں تاکہ مجھے مدراس کے اردگرد ہریجنوں کے حالات کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ میں اس مسئلے کو ہریجن مسئلے کے طور پر نہیں لیتا۔ بلکہ اسے ہندوستان میں مفلس، دبے کچلے، بے زمین مزدوروں کے مسئلے کے طور پر سمجھتا ہوں۔ ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس وقت سب سے بڑے ہندوستانی مسائل میں ہندوستان کی غریبی اور بے روزگاری کا مسئلہ ——— ہندوستانی عوام کی غربت اور بے روزگاری کا مسئلہ ہے بے روزگاری عوام میں ہی نہیں بلکہ متوسط طبقے میں بھی ہے۔ دراصل ہریجن مسئلہ انہی مسائل کا ایک حصہ ہے۔ لہٰذا اگر ہم مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تو ہم ہریجن مسئلے کو بھی حل کر سکتے ہیں۔"

(۶ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو مدراس میں تقریر "سلیکٹڈ ورکس آف جواہر لال نہرو" جلد ۷، صفحہ ۴۸۵)

"میں نے قبائلی لوگوں (آدی باسیوں) میں ایسی متعدد خصوصیات دیکھی ہیں جو میں نے میدانوں اور شہروں نیز ہندوستان کے دیگر حصوں کے لوگوں میں نہیں دیکھیں اور ان خصوصیات نے مجھے اپنی جانب متوجہ کیا . . . میں پورے یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ رہن سہن کا کون سا طریقہ بہتر ہے ہمارا یا اُن کا، تاہم مجھے پورا یقین ہے کہ کچھ معاملوں میں ان کا طریقہ بہتر ہے آدی باسیوں کے تئیں ہمارا نقطۂ نظر ایسا ہونا چاہیے کہ پہلے ہم ان سے سیکھیں اور سیکھنے کے بعد ان کی مدد کریں اور ان کے ساتھ تعاون کریں۔"

(۷ جون ۱۹۵۲ء کو نئی دہلی میں درج فہرست قبائل کی کانفرنس میں تقریر)

خواتین

ہندوستان میں سچی اور تیز رفتار ترقی تبھی ہوگی جب کہ ہماری خواتین خود کو دبا کر اور پسماندگی کی حالت میں رکھنے والی تمام شکلوں سے نجات حاصل کر کے حقیقی معنی میں متحرک ہوں گی۔ ایسی ہلچل کے واضح اور یقینی نشانات مجھے نظر آ رہے ہیں، اور چونکہ ہماری قومی تحریک نے ہی بہت حد تک عورتوں کو ان کے پرانے



بندھنوں سے آزادی دلاتی ہے، لہٰذا اس تحریک کی اچھائی اور طاقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔"

(راجکماری امرت کور کی کتاب "چیلنج ٹو ویمن" کی ۷ مارچ ۱۹۴۶ء کو لکھی گئی تمہید سے)

فطرت اور ماحولیات

"ہمیں فطرت سے محبت کرنے اور اُسے سمجھنے کا عمل ضرور سیکھنا چاہیے اور فطرت کے ساتھ جذبۂ یگانگت محسوس کرنا چاہیے۔

درختوں کی حفاظت اور نئے درختوں کا لگانا ملک کی ترقی کے لیے اہم ہے۔ درختوں کی حفاظت لازمی طور پر کی جانی چاہیے اور ہرے درختوں کے کاٹے جانے کے خلاف عوامی شعور پیدا کیا جانا چاہیے۔"

(یکم جولائی ۱۹۶۲ء کو ۱۳ ویں ون مہوتسو کے موقع پر افتتاحی تقریر سے)

یکجہتی

"گاندھی جی نے ہمیں جو اصول سکھائے ان میں سے ایک اصول ہے ہندوستانیوں کی یکجہتی چاہے یہ لوگ الگ الگ صوبوں میں رہتے ہوں یا وہ مختلف مذاہب کے ماننے والے ہوں یا وہ الگ زبانیں بولتے ہوں۔"

(ڈنڈیگل میں ۸ دسمبر ۱۹۵۷ء کو کی گئی تقریر سے)

"جب ہم ہندوستان کی آزادی کے لیے لڑے تو پورے ہندوستان کی آزادی کے لیے لڑے۔ ہم ہندوستان کے ایک حصّے کی آزادی کے لیے جیسے مدراس یا بنگال یا بمبئی یا اتر پردیش یا پنجاب کے لیے نہیں لڑے۔ جب ہمیں آزادی ملی تو پورے ہندوستان کو آزادی حاصل ہوئی ہم نے عظیم جمہوریۂ ہند قائم کی جس کے یہ سب حصّے ہیں اور ہم سب کو جمہوریۂ ہند کا شہری ہونے پر فخر ہے۔ اگر ہم ہندوستان کے اس آدرش کو فراموش کرتے ہیں اور صرف ایک صوبے یا ایک فرقے یا ایک ذات یا ایک زبان کے بارے میں سوچتے ہیں تو ہم کنٹرول کھو بیٹھتے ہیں اور غلط سمتوں میں بھٹکنے لگتے ہیں۔

ہماری قومی جدوجہد کے دوران ہم لوگوں میں ایسی یکجہتی تھی جس نے ہر صوبے، ہر مذہب، ہر ذات اور ہر لسانی گروپ کو ایکتا کے بندھن میں باندھ دیا تھا۔ اسی یکجہتی کی بدولت ہم نے آزادی حاصل کی۔"

(۷ دسمبر ۱۹۵۷ء کو مدراس میں کارکنوں کے اجتماع میں کی گئی تقریر سے)



سیکولرزم

"ہم یہ اعلان کر چکے ہیں کہ ہم فرقہ پرست تنظیموں کا ہر طریقے سے مقابلہ کرتے رہیں گے اور یہ تنظیمیں چاہے مسلم ہوں یا ہندو یا سکھ یا اور کسی مذہب سے تعلق رکھتی ہوں ـــــ قوم پرستی اور فرقہ پرستی کا وجود ایک ساتھ ممکن نہیں۔ قوم پرستی کے معنی ہندو قوم پرستی، مسلم قوم پرستی یا سکھ قوم پرستی نہیں ہیں۔ جیسے ہی آپ ایک ہندو، سکھ یا مسلمان کے طور پر بولنا شروع کرتے ہیں تو اس وقت آپ ہندوستان کے لیے نہیں بول رہے ہوتے ہیں۔ ہر شخص کو اپنے آپ سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ میں ہندوستان کو کیا بنانا چاہتا ہوں؟ کیا بغیر طاقت اور قوت برداشت کا ایک ایسا ملک جو ذرا سے دھکے سے ٹکڑوں میں بکھر جائے؟ ہر شخص کو اس کا جواب دینا ہے۔ علیحدگی پسندی ہمیشہ سے ہندوستان کو کمزور کرتی رہی ہے۔ پھوٹ ڈالنے والے رجحانات چاہے وہ ہندوؤں کے رہے ہوں، مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں یا دوسرے لوگوں کے، نہایت خطرناک اور غلط ہیں۔ وہ کھوکھلے اور پسماندہ دماغوں کی پیداوار ہیں۔ کوئی بھی شخص جو وقت شناس ہے وہ فرقہ پرستی کی زبان میں نہیں سوچ سکتا ہے۔"

(۱۹ر جولائی ۱۹۶۱ء کو سری نگر میں ہندی میں کی گئی تقریر، "جواہر لال نہروز اسپیچیز" ۱۹۵۷ - ۱۹۶۳ء، پبلیکیشنز ڈویژن، گورنمنٹ آف انڈیا۔ صفحہ ۱۲۰)

"ہندوستان میں ہم سیکولر ریاست کی بات کرتے ہیں۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کے معنی ہیں مذہب کی مخالفت لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ سیکولر ریاست کا مطلب ہے ایک ایسا ملک جہاں تمام مذاہب کو مساوی احترام حاصل ہے اور جہاں انھیں مساوی مواقع ملتے ہیں، حالانکہ ایک ریاست کے طور پر یہ اپنے آپ کو کسی ایک اعتقاد یا مذہب سے جوڑنے کی اجازت نہیں دیتا ہے جس سے وہ ریاست کا مذہب ہو جائے۔

ایک طرح سے یہ ایک جدید خیال ہے۔ ہندوستان کی تاریخ مذہبی رواداری کی ایک طویل تاریخ رہی ہے لیکن یہ سیکولر ریاست کا محض ایک پہلو ہے نہ کہ اس کا پورا حصہ۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں بہت سے مت اور مذاہب ہیں، کسی بھی حقیقی قوم پرستی کو سیکولرزم کی بنیاد کے بغیر فروغ نہیں دیا جا سکتا ہے۔"

(رگھوناتھ سنگھ کی "دھرم نرپیکش راجیہ" کا پیش لفظ ۱۹۶۱ء)

درج فہرست ذاتیں اور قبائل

"میں شہر میں متعدد ہریجن اداروں اور مکانوں کو دیکھتا آرہا ہوں تاکہ مجھے مدراس کے اردگرد ہریجنوں کے حالات کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ میں اس مسئلے کو ہریجن مسئلے کے طور پر نہیں لیتا۔ بلکہ اسے ہندوستان میں مفلس، دبے کچلے، بے زمین مزدوروں کے مسئلے کے طور پر سمجھتا ہوں۔ ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اس وقت سب سے بڑے ہندوستانی مسائل میں ہندوستان کی غریبی اور بے روزگاری کا مسئلہ ــــــ ہندوستانی عوام کی غربت اور بے روزگاری کا مسئلہ ہے۔ بے روزگاری عوام میں ہی نہیں بلکہ متوسط طبقے میں بھی ہے۔ دراصل ہریجن مسئلہ انھی مسائل کا ایک حصہ ہے۔ لہٰذا اگر ہم مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تو ہم ہریجن مسئلے کو بھی حل کر سکتے ہیں۔"

(۶ر اکتوبر ۱۹۳۶ء کو مدراس میں تقریر "سلیکٹڈ ورکس آف جواہر لال نہرو"، جلد ۷، صفحہ ۴۸۵)

"میں نے قبائلی لوگوں (آدی باسیوں) میں ایسی متعدد خصوصیات دیکھی ہیں جو میں نے میدانوں اور شہروں نیز ہندوستان کے دیگر حصوں کے لوگوں میں نہیں دیکھیں اور ان خصوصیات نے مجھے اپنی جانب متوجہ کیا . . . . میں پورے یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ رہن سہن کا کون سا طریقہ بہتر ہے ہمارا یا اُن کا۔ تاہم مجھے پورا یقین ہے کہ کچھ معاملوں میں ان کا طریقہ بہتر ہے۔ آدی باسیوں کے تئیں ہمارا نقطۂ نظر ایسا ہونا چاہیے کہ پہلے ہم ان سے سیکھیں اور سیکھنے کے بعد ان کی مدد کریں اور ان کے ساتھ تعاون کریں۔"

(۷ر جون ۱۹۵۲ء کو نئی دہلی میں درج فہرست قبائل کی کانفرنس میں تقریر)

خواتین

ہندوستان میں سچی اور تیز رفتار ترقی تبھی ہوگی جب کہ ہماری خواتین خود کو دباکر اور پسماندگی کی حالت میں رکھنے والی تمام شکلوں سے نجات حاصل کر کے حقیقی معنی میں متحرک ہوں گی۔ ایسی ہلچل کے واضح اور یقینی نشانات مجھے نظر آرہے ہیں، اور چونکہ ہماری قومی تحریک نے ہی بہت حد تک عورتوں کو ان کے پرانے



بندھنوں سے آزادی دلاتی ہے، لہٰذا اس تحریک کی اچھائی اور طاقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔"

(راجکماری امرت کور کی کتاب "چیلنج ٹو وومین" کی ۷، مارچ ۱۹۴۶ء کو لکھی گئی تمہید سے)

فطرت اور ماحولیات

"ہمیں فطرت سے محبت کرنے اور اُسے سمجھنے کا عمل ضرور سیکھنا چاہیے اور فطرت کے ساتھ جذبۂ یگانگت محسوس کرنا چاہیے۔

درختوں کی حفاظت اور نئے درختوں کا لگانا ملک کی ترقی کے لیے اہم ہے۔ درختوں کی حفاظت لازمی طور پر کی جانی چاہیے اور ہرے درختوں کے کاٹے جانے کے خلاف عوامی شعور پیدا کیا جانا چاہیے۔"

(یکم جولائی ۱۹۶۲ء کو ۱۳ ویں دن مہوتسو کے موقعے پر افتتاحی تقریر سے)

یکجہتی

"گاندھی جی نے ہمیں جو اصول سکھائے ان میں سے ایک اصول ہے ہندوستانیوں کی یکجہتی چاہے یہ لوگ الگ الگ صوبوں میں رہتے ہوں یا وہ مختلف مذاہب کے ماننے والے ہوں یا وہ الگ زبانیں بولتے ہوں۔"

(ڈیڈیگل میں ۸، دسمبر ۱۹۵۵ء کو کی گئی تقریر سے)

"جب ہم ہندوستان کی آزادی کے لیے لڑے تو پورے ہندوستان کی آزادی کے لیے لڑے۔ ہم ہندوستان کے ایک حصے کی آزادی کے لیے جیسے مدراس یا بنگال یا بمبئی یا اترپردیش یا پنجاب کے لیے نہیں لڑے۔ جب ہمیں آزادی ملی تو پورے ہندوستان کو آزادی حاصل ہوئی ہم نے عظیم جمہوریۂ ہند قائم کی جس کے یہ سب حصے ہیں اور ہم سب کو جمہوریۂ ہند کا شہری ہونے پر فخر ہے۔ اگر ہم ہندوستان کے اس آدرش کو فراموش کرتے ہیں اور صرف ایک صوبے یا ایک فرقے یا ایک ذات یا ایک زبان کے بارے میں سوچتے ہیں تو ہم کنٹرول کھو بیٹھتے ہیں اور غلط سمتوں میں بھٹکنے لگتے ہیں۔

ہماری قومی جدوجہد کے دوران ہم لوگوں میں ایسی یکجہتی تھی جس نے ہر صوبے، ہر مذہب، ہر ذات اور ہر لسانی گروپ کو ایکتا کے بندھن میں باندھ دیا تھا۔ اسی یکجہتی کی بدولت ہم نے آزادی حاصل کی۔"

(۷، دسمبر ۱۹۵۵ء کو مدراس میں کارکنوں کے اجتماع میں کی گئی تقریر سے)

اُردو ایک جاندار زبان ہے

۱۵، ۱۶، ۱۷ فروری ۱۹۵۸ء کو انجمن ترقیِ اُردو (ہند) کی طرف سے منعقدہ کل ہند اُردو کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں پنڈت نہرو اور مولانا آزاد دونوں شریک ہوئے تھے اور دونوں نے اس اجلاس کو خطاب کیا تھا۔ مولانا آزاد کی یہ آخری تقریر تھی جو ہم ایوانِ اُردو کے آزاد نمبر میں شائع کر چکے ہیں۔ ذیل میں پنڈت جی کی تقریر درج کی جا رہی ہے۔

جنابِ صدر اور حضرات!

زیدی صاحب* نے اپنی تقریر میں مجھے معلّم خطاب دیا ہے۔ اسی سلسلے میں مجھے یہ کہنا ہے میں خود کو اس خطاب کا حقدار نہیں سمجھتا ں۔ میں نے تو اردو باقاعدہ کسی اسکول میں بھی یں پڑھی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اردو میرے گھر زبان تھی جسے میں نے آنکھ کھول کر سُنا اور بولا۔ پلے دو سال میں زبان کے معاملے میں کافی شور و غل ا ہے۔ کہیں کہیں دنگا فساد بھی ہوا اور عجیب فضا پیدا ہو گئی۔ جنوبی ہند میں تو ہندی کے خلاف قاعدہ تحریک شروع ہو گئی ہے۔ حالانکہ آئین ں چودہ زبانوں کو قومی زبان تسلیم کیا گیا ہے اور ندی کو سرکاری زبان تسلیم کر لینے سے تامل یا سی اور زبان کو نقصان نہیں پہنچتا۔ جنوبی ہند ں تو یہ مطالبہ شروع کر دیا گیا ہے کہ انگریزی کو سرکاری زبان بنا دیا جائے۔ مجھے انگریزی زبان سے خاصمت نہیں بلکہ میں نے اس زبان میں تعلیم حاصل ی اور اس سے محبت کرتا ہوں۔ میں یہ بھی محسوس رتا ہوں کہ انگریزی یا کوئی اور بیرونی زبان دنیا کی رفتار سے باخبر رہنے کے لیے ہم کو معلوم رہنی چاہیے۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو بین الاقوامی ارتقا میں ہم پیچھے رہ جائیں گے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود میں انگریزی زبان کو ہمیشہ کے لیے سرکاری و قومی زبان نہیں مان سکتا۔ زبان کے معاملے میں کافی جوش و خروش پایا جاتا ہے اور غصّہ چڑھ آتا ہے لیکن زبانیں حکومت کے مدد نہ کرنے سے ختم نہیں ہو سکتیں اور نہ اس کی مدد سے اُونچی ہو سکتی ہیں۔ تاریخ میں مثالیں موجود ہیں کہ مضبوط زبانیں ہمیشہ قائم رہتی ہیں۔ زبان کو ایسی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے جیسی کہ مذہب کی حیثیت ہوتی ہے۔ کیا تشدد سے مذہب ختم کیا جا سکتا ہے؟ اسی طرح تشدّد سے زبانیں ختم نہیں ہوتیں اور نہ انھیں دبایا جا سکتا ہے بلکہ اس سے تو ان میں نئی جان پیدا ہو جاتی ہے۔ ماضی میں بیسیوں برس تک پولینڈ کی زبان کو دبانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اس کے باوجود پولینڈ کی زبان قائم رہی اور وہ آج یورپ کی بڑی زبانوں میں سے ایک ہے۔ زبان ہمیشہ اپنی کوششوں سے ہی بڑھتی ہے سرکاری کوششوں سے اس میں جان نہیں پڑتی ہاں اس سے اس کی ترقّی کا راستہ صاف ہو جاتا ہے۔ بس اردو میں اگر جان ہے اور میں سمجھتا ہوں اس میں جان ہے تو یہ یقیناً بڑھے گی اور ترقی کرے گی چاہے اس میں رکاوٹیں پیش آئیں۔

ابھی میں نے یہاں کی نمائش کو دیکھا جس میں وہ کتابیں رکھی گئی ہیں جو گزشتہ دس برسوں میں آزادی کے بعد لکھی گئی ہیں مجھے بتایا گیا ان کتابوں کی تعداد ساڑھے تین ہزار ہے۔ میں نہیں جانتا کہ دوسری زبانوں میں کتنی کتابیں چھپی ہیں۔ لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اکثر زبانوں میں اس سے کم ہی چھپی ہوں گی۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ایک زبان نے ترقّی کی تو دوسری کو اس سے نقصان پہنچ جائے گا۔ سوچنے کا یہ طریقہ غلط ہے اور اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جب انگریزی حکومت کے زیرِ سایہ اُردو ہندی کی بحث چلا کرتی تھی اور ایک دوسرے کے خلاف اس وقت کی حکومت کو درخواستیں دی جایا کرتی تھیں۔ ابھی تک ہمارے ذہنوں میں یہی جذبہ موجود ہے۔

اُردو کو آئین میں تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن اس پر اس طرح عمل نہیں ہوا جس طرح میں سمجھتا ہوں کہ ہونا چاہیے تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ اُردو کو خاص کر ان صوبوں میں جہاں اس کے بولنے والوں کی

*جنرل بشیر حسین زیدی جنھوں نے خیر مقدمی تقریر کی تھی۔



کثرت سے محبت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا ہے۔ زبانوں کی اس کشاکش میں ایک عجیب بات ہمارے ملک میں پیدا ہوگئی ہے۔ ایک صاحب اعتراض کرتے ہوئے کہیں گے "کیا سنسکرت کے الفاظ تقریر میں بھر دیے ہیں۔ ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔" دوسرے صاحب فرمائیں گے" اس قدر عربی فارسی کے الفاظ استعمال کیے ہیں کہ میری فہم سے بالاتر ہیں۔" گویا ناواقفیت بھی ایک فخر کی بات ہے۔ یورپ میں لوگ اس طرح چیخ چیخ کر اپنی جہالت کا اعلان نہیں کرتے۔ اگر کسی نے تقریر میں فرنچ یا لاطینی الفاظ استعمال کیے ہیں تو سننے والے یہ ظاہر کریں گے کہ انھوں نے سب سمجھ لیا ہے۔ خواہ نہ بھی سمجھے ہوں۔ اس مثال سے یہ نہ سمجھیے کہ میں زبان کو دشوار بنانے کا حامی ہوں۔ زبان جتنی بھی سادہ اور عام فہم ہو بہتر ہے لیکن ان اعتراضات میں ایک منفی ذہنیت کارفرما ہے۔

زیدی صاحب نے جن عملی مشکلات اور رکاوٹوں کی طرف اشارہ کیا وہ دور ہونی چاہئیں۔ ووٹر لسٹ، اطلاع نامے اسی لیے ہوتے ہیں کہ پبلک انھیں پڑھے۔ انھیں اردو میں بھی چھپنا چاہیے۔ اگر کسی جگہ دو زبانیں ہیں تو وہ دو زبانوں میں چھاپے جائیں۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ چودہ زبانوں میں یہ سب چھپیں لیکن ایسا ممکن نہیں۔ پھر بھی جن صوبوں میں ایک دو زبانیں چلتی ہیں ان میں وہ چھپنے چاہئیں۔ میرے اپنے سکریٹریٹ میں حتی الوسع یہ کوشش رہتی ہے کہ جس زبان میں خط آئے اسی زبان میں جواب بھی دیا جائے۔ عدالتوں اور دوسرے شعبوں میں مسلیں وغیرہ تو دو زبانوں میں لکھنا غلط ہوگا۔ لیکن درخواستیں وغیرہ اُردو میں ضرور لینی چاہئیں۔ اگر اس میں رکاوٹ پیدا کی جاتی ہے تو غلط ہے۔

جہاں تک بچوں کی تعلیم کا سوال ہے انھیں مادری زبان میں ہی تعلیم ملنی چاہیے۔ کیونکہ مادری زبان ہی میں بچوں کی بہترین نشوونما ہوتی ہے۔ بمبئی کلکتہ اور دوسرے شہروں کے کارپوریشنوں کو چاہیے کہ بچوں کو ان کے گھر کی زبان میں تعلیم دلانے کی کوشش کریں خواہ ان کی تعداد دس ہی کیوں نہ ہو۔ اردو ایسی چھوٹی موٹی زبان تو نہیں کہ اس میں اتنے بچے بھی نہ ہو سکیں۔ یو۔ پی۔ دہلی اور پنجاب کے متعلق تو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں وہاں اُردو والوں کی بہت بڑی تعداد ہے۔ اتر پردیش میں غالباً عملی طور پر اردو کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ لیکن ہمارا طرزِ مخالفت کا نہیں ہونا چاہیے بلکہ دوستی کا، اس سے ہر ایک کا فائدہ ہے۔

مجھے اردو کے بارے میں بالکل فکر نہیں، وہ ایک جاندار زبان ہے اسے دبانا یا ختم کرنا ناممکن ہے لیکن تنگ دلی کے مظاہرے پر مجھے اکثر افسوس ہوتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ اردو ترقی کرے پھلے پھولے۔ میں نے اردو کے سلسلے میں شکایات کے متعلق زیادہ نہیں کہا ہے وہ تو اپنی جگہ پر ہیں۔ میں نے اس موقعے پر یہ بتانے کی زیادہ کوشش کی ہے کہ زبانوں کے بارے میں ہمیں کس قسم کا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے۔ ●

اُردو صحافت

اُردو صحافت کو وجود میں آئے تقریباً ۱۶۵ سال ہوگئے ہیں۔ اس مدت میں اُردو صحافت نے ہندستانی سماج میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستان کی تمام زبانوں کے اخباروں نے آزادی کی جنگ میں نمایاں حصہ لیا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس میدان میں اُردو اخبارات سب سے آگے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ برطانوی حکومت نے جن اخباروں کی طباعت پر پابندی عائد کی، جن کی ضمانتیں ضبط کیں، یا جن کی کچھ مخصوص اشاعتوں کو ضبط کیا، ان میں سب سے زیادہ تعداد اُردو اخباروں کی تھی۔ اس طرح ہندوستانی اخباروں کے جن مدیروں کو باغیانہ تحریروں کے جرم میں قید و بند کے مرحلوں سے گزرنا پڑا، ان میں سب سے زیادہ تعداد اُردو اخباروں کے مدیروں کی تھی۔

اُردو اکادمی، دہلی نے اُردو صحافت پر سہ روزہ سیمینار منعقد کیا تھا جس کے ڈائرکٹر انور علی دہلوی صاحب تھے جو خود ایک تجربہ کار صحافی ہیں، انھوں نے اس سیمینار کے لیے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جن میں اُردو صحافت کی تاریخ، اس کی خصوصیات، سیاست اور ادب میں اس کا رول اور اس کے مسائل پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ کئی ایسے موضوع ہیں جن پر پہلی بار لکھا گیا ہے۔ اس طرح مقالوں کا یہ مجموعہ اُردو صحافت پر ایک اہم دستاویز بن گیا ہے۔

اُردو صحافت کی ابتدا، اس کے عہد بہ عہد ارتقا اور اس کی مزاجی خصوصیات کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

مرتب : انور علی دہلوی
صفحات : ۳۲۲
قیمت : ۳۲ روپے



لال قلعے کی آخری تقریر

(۱۵ر اگست ۱۹۶۳ء)

آزاد ہند کی سولہویں سالگرہ پر آج پھر ہم یہاں جمع ہوئے ہیں، مبارک دن ہے آپ سب لوگوں کو مبارک ہو۔ آپ میں سے بہتوں کو یاد ہوگا سولہ برس ہوئے ہم پہلی بار یہاں لال قلعہ کے نیچے جمع ہوئے تھے اور پہلی بار یہ ہمارا قومی جھنڈا یہاں لہرایا تھا۔ وہ دن ہم سبھی کو یاد رہے گا کیونکہ اس دن ہمیں ایک خوشی کا کچھ نشہ سا تھا۔ بہت کوششوں کے بعد بہت قربانیوں کے بعد بھارت آزاد ہوا۔ بہت دن بعد اندھیری رات ختم ہوئی اور اجالا ہونے لگا ہم نے یہ سمجھ کر بہت خوشی منائی تھی کہ اب ہمارے مصیبت کے دن ختم ہوگئے اور اب ہم اپنے ملک کو بنائیں گے۔ اس کے تھوڑے دن بعد ہمیں ایک زبردست دھکا لگا۔ ہندوستان کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ ہنگامے مچے پاکستان میں اور نئی سرحد کے اس پار اس ہندوستان میں ہولناک باتیں ہوئیں۔ ہمیں سخت دھکا لگا۔ سب کو رنج ہوا لیکن پھر بھی ہم نے اس کا سامنا کیا اور رفتہ رفتہ اس پر قابو پایا اسی زمانے میں تھوڑے دن بعد ایک ہندوستانی کے ہاتھ سے ہمارے لیڈر مہاتما گاندھی کی شہادت ہوئی۔ ہمیں اس سے بڑی سزا اور کوئی نہیں مل سکتی تھی، وہ ملی۔ لیکن پھر بھی ہم نے سوچا کہ اس وقت وہ ہمیں کیا صلاح دیتے۔ محض ہائے ہائے کرنے کی نہیں بلکہ ان غلط چیزوں، غلط باتوں اور غلط خیالوں کا مقابلہ کرنے کی، جو ملک کو تباہ کردیں۔ ہم نے (جب میں ہم کہتا ہوں تو اس میں آپ سب شامل ہیں) اس کا مقابلہ کیا اور ان خیالات کو دبایا تھا۔ ہندوستان میں پھر سے ایک نئی ہوا آئی اور ہم نے سوچا کہ اب ہم اس ہندوستان کو بچانے میں کہ نیا بھارت بنانے میں، خوش حال بھارت بنانے میں ساری طاقت لگائیں جس سے سب لوگ اٹھیں اور ہندوستان کی طاقت بڑھے اور ہم نے دھیان دیا اور بڑے بڑے پلان بنائے، ان پر کام کیا اور دس بارہ برس سے کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ بھی اس سے متفق ہوں گے کہ ان دس بارہ برسوں میں ہندوستان کی شکل بدلی ہے اور بدلتی جاتی ہے اس قدر نئے نئے شہر بنے ہزاروں نئے کارخانے بنے، نئی یوجنائیں بنیں اور اگر آپ اِدھر اُدھر پھر کر دیکھیں تو پہلے کے مقابلے میں کچھ خوش حالی نظر آتی ہے مگر ہم ابھی تک منزل سے بہت دور ہیں لیکن یہ بات ہوئی ہے۔

یہ بات تو ہوئی لیکن ہمارا دھیان کچھ بنیادی باتوں کی طرف سے ہٹ گیا۔ ہم نے سمجھا کہ ہم آزاد ہوگئے ہیں تو اب آزادی ہماری پکی ہے اور ہم غفلت کر سکتے ہیں اور کوئی ہمارے اوپر حملہ نہیں کر سکتا۔ ابھی تک ہم نے پورے طور سے سبق نہیں سیکھا کہ آزادی ایسی چیز نہیں جو اپنے آپ سے ٹپکتی رہتی ہے۔ ہمیں یہ خیال نہیں ہوا کہ آزادی کی خدمت ہمیشہ ہر سال دن اور رات کرنی ہوتی ہے اور غفلت ہونے سے آنکھیں ادھر سے ہٹ جاتی ہیں۔ اس وقت وہ پھسلنے لگتی ہے اور خطرے نظر آنے لگتے ہیں۔ ہم غفلت میں پڑ گئے۔ ہم نے اپنے کو امن کا شانتی کا ایک علمبردار بنایا۔ دنیا میں شہرت ہوئی کہ ہندوستان شانتی کے لیے ہے۔ یہ ٹھیک بات تھی ہم شانتی کے لیے تھے اور اب بھی ہیں لیکن شانتی یا امن کے ساتھ کمزوری نہیں چلتی، غفلت نہیں چلتی، شانتی کے ساتھ محنت اور طاقت چلتی ہے تبھی ہم اس کی حفاظت کر سکتے ہیں اور دنیا میں ہماری آواز کی کوئی طاقت ہو سکتی ہے۔

پار سال آپ اور ہم سب کو یکایک پھر دھکا لگا جب ہماری سرحد پر حملہ ہوا۔ ایک ملک جس کو ہم دوست سمجھتے تھے اس نے زوروں سے حملہ کیا اور سرحد پر علاقہ ہڑپا جس نے ہمیں اس غفلت سے نکالا اور سارے ملک میں



ایک نئی ہوا پھیلی اور لوگ تیار ہونے لگے۔ ہرطرف ایک جوش تھا اور قربانی دی جارہی تھی۔ ایثار کیا جارہا تھا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ کس طرح ہمارے عوام مہینوں تک اپنی ہر چیز جوان کے پاس تھی دینے کے لیے تیار ہوگئے۔ انھوں نے پیسے دیے ہمارے خزانے میں سونا چاندی سب کچھ دیا۔ سب سے زیادہ انھوں نے دیا جن کے پاس سب سے کم تھا اور یکایک ہندوستان بھر میں ہوا پھیلی جس میں لوگ اپنے آپس کے جھگڑے بھول گئے۔ (صورتِ حال نے) ان کو پیچھے کر دیا تھا، چھپا دیا تھا، دبا دیا تھا اور سب لوگ محسوس کرتے تھے کہ جب ہمارا ملک خطرے میں ہے تو اوّل کام اس کا سامنا کرنے کا ہے، اس کی مدد کرنے کا اور خطرے کا سامنا کرنے کا ہے، ایکتا کی ہوا پھیلی اور ہم نے دیکھا کہ اوپر کی نااتفاقیوں کے باوجود سارے ملک میں کیسی زبردست ایکتا ہے جو وقت آنے پر نکل آتی ہے ہماری ہمتیں بڑھیں اور ہم نے کوشش کی کہ ملک کو جلد سے جلد تیار کریں۔ اس کی طاقت بڑھائیں کیا معنی ہیں ملک کو تیار کرنے کے لیے صرف لوگوں کا جوش کافی نہیں۔ فوجی تیاری کے پیچھے ہزار تیاریاں ہوتی ہیں۔ سامان بنانے کے کارخانوں کی تیاریاں جو فوجی سامان دیتے ہیں۔ ہوائی جہازوں کے لیے ہزاروں کارخانے اور اس کے پیچھے ہندوستان کی بیشمار کھیتی ہے جہاں اناج پیدا ہوتا ہے۔ کھانے کا سامان وغیرہ یعنی اس تیاری کے معنی ہیں کہ ہر طرف سے کام ہو۔ ایک آدمی اپنا فرض ادا کرے اور زیادہ سے زیادہ پیسہ پیدا کرے جس سے ہماری اقتصادی حالت مضبوط ہو، ادھر دھیان دیا گیا اور ترقی ہوئی اور ہوتی جاتی ہے لیکن ہماری پُرانی غفلت کی حالت پھر کچھ نمایاں ہونے لگی کیونکہ لڑائی کچھ ٹھنڈی ہونے لگی، لوگ آپس کے اتحاد اور ایکتا کو بھولنے لگے وہ پھر اپنی پرانی بحثوں، پرانے جھگڑوں اور ملک کی کمزوری کی ہوا پیدا کرنے لگے۔ بدقسمتی سے یہ پرانی عادت ہے۔ جب خطرہ بالکل سامنے آیا تو ہم اسے بھول گئے تھے اب ہم پھر ادھر ادھر جانے لگے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ ہماری سرحد پر خطرہ ہر وقت ہے آپ کا اور ہمارا پہلا کام ہے کہ ہم اس ملک کو بچائیں اس کے بعد پھر باتیں ہوں گی جو ملک اپنی آزادی کو اپنی زمین کو بچا نہیں سکتا اس کی قدر دنیا میں کون کرے اور ترقی کرنے کی اس کی طاقت کیا ہے؟

اس وقت ہمارا سب میں بڑا کام ملک کی طاقت بڑھانا، ملک کی پیداوار بڑھانا ملک سے غریبی نکالنا اور ملک کو خوش حال بنانا ہے جس سے ہر ایک کو ترقی کا موقع ملے، کروڑوں آدمی جو ہندوستان میں رہتے ہیں ان کو اور ہمارے بال بچوں کو پورا موقع ملے کہ وہ اچھی طرح سے بڑھیں انھیں سب چیزیں ملیں وہ ملک کی اچھی خدمت کرسکیں لیکن یہ سب کام اسی وقت ہوسکتے ہیں جب ملک کی عزّت ملک کی آزادی قایم رہے اگر اس میں ڈھیل ہوگئی تو ملک کا وقار ٹوٹ جاتا ہے۔ کمر ٹوٹ جاتی ہے اور ملک نکمّا ہو جاتا ہے۔ تو وہ جو آزاد ہے اور آزاد رہنا چاہتا ہے، اپنی حفاظت کو اوّل رکھتا ہے اور سب باتیں پیچھے ہیں۔ ملک کی حفاظت کے لیے کوششیں ہونی چاہئیں۔ بحث کی تو خیر ضرورت ہے مگر دو آوازوں کی ضرورت نہیں، ہر ایک ہندوستانی کی رائے ایک ہی ہونی چاہئے۔ اگر ایک رائے ہے تو اسے یہ جاننا چاہیے کہ اس کو ہمیں مل کر کہنا ہے ہمارے ملک کی ایکتا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ ملک کی ایکتا کا یہ نقشہ ہم نے پارسال اور اس سال کے شروع میں دیکھا تھا لیکن کچھ دنوں تک سرحد پر لڑائی ٹھنڈی رہی تو لوگ پھر سے بھولنے سے لگے۔ پھر سے وہ چھوٹے موٹے جھگڑے پیدا ہونے لگے پھر سے الگ الگ آوازیں آنے لگیں۔ الگ الگ نکتہ چینی ہونے لگی۔ یہ افسوس کی بات ہے ہر ایک کو حق ہے کہ وہ نکتہ چینی کرے، ہر ایک کو حق ہے کہ وہ بحث کرے۔ ہمارا آزاد ملک ہے ہم کسی کو روکتے نہیں ہیں لیکن ہر ایک کو حق ہونے کے علاوہ اس کے فرض بھی ہوتے ہیں اور جو فرض پر دھیان نہ دے وہ اپنے حق پر کیسے دھیان دے سکتا ہے۔ ہر ایک کا فرض ہے ڈیوٹی ہے ملک کو بچانا ملک کی ایکتا بنائے رکھنا۔ یہ فرض ہر ایک ہندوستانی کے ہیں۔ چاہے اس کا کوئی مذہب ہو، ہندوستان کے کسی بھی حصّے کا رہنے والا ہو۔ اس کو ہم بھول جائیں تو ہمارے حق ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ ان کا مانگنا کچھ زوروں سے نہیں ہو سکتا۔ حق تو ہر ایک کے ہیں اور ہونے چاہئیں لوگوں کے بہت کچھ حق ایسے ہیں جو اس وقت پورے طور سے نہیں چل سکتے ہیں۔ ہندوستان میں ہر ایک کو حق ہے کہ وہ خوش حال زندگی بسر کرے اس کی غریبی نکل جائے اس پر غریبی کا بوجھ نہ ہو اور اس کے بچّوں کو ہر طرح سے ترقی کا موقع ملے۔



ہم کوشش کر رہے ہیں اور امّید کرتے ہیں کہ وقت آئے گا اور رفتہ رفتہ زیادہ سے زیادہ اچھا آئے گا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس وقت ہم منزل سے دور ہیں اور اس پر ہم تبھی پہنچیں گے جب ہم فرائض ادا کریں۔

آپ سے میں نے کہا کہ ملک خطرے میں ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ یہاں کوئی خاص بات ہونے والی ہے لیکن یہ جو نئی تصویر ہمارے سامنے آئی ہے اس نے ہماری سرحدوں پر ایسے نئے خطرے پیدا کیے ہیں جنھیں ہم بھول گئے تھے یہ ٹھیک ہے۔ ان خطروں کا سامنا کرنے کے لیے ہم وہاں فوجیں بھیجیں گے ہوائی جہاز بھیجیں گے لیکن صرف ہوائی جہاز ملکوں کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ آج کل ملکوں کی حفاظت تبھی ہوتی ہے جب پورے ملک کے سب لوگ مرد اور عورت حفاظت کے کام میں کچھ نہ کچھ کریں۔ سرحدی حفاظت کے پیچھے سارے ملک کی حفاظت ہونی چاہیے اور ملک کی طاقت میں سب سے پہلا کام ہے اتحاد یعنی مل کر کام کرنا کھیتی یا کارخانے میں یا جہاں کہیں آپ کام کرتے ہوں گے لوگ اس کے لیے تیار ہوں اور ملک کی طاقت اس طرح بڑھائیں اس کا نتیجہ ہوگا کہ آپ کی فوجی طاقت بڑھ جائے گی اور مضبوط ہو جائے گی۔ تو آپ یہ یاد رکھیں کہ ہمارے سامنے بڑے سوال ہیں۔ ہمارے پلانوں کے سوال بھی بڑے سوال تھے۔ یہ اب بہت بڑھ رہے ہیں۔ دنیا عجیب ہے دنیا بدلتی جاتی ہے دنیا میں ایک طرف بڑی لڑائیاں ہونے کے بڑے خطرے سہتے ہیں جس میں ایٹم بم ہائیڈروجن بم چلیں، دوسری طرف کچھ اچھی ہوائیں بھی چلتی ہیں۔

ابھی ابھی ایٹم کے سلسلے میں ماسکو میں ایک صلحنامے پر دستخط ہوئے جس میں امریکہ نے روس والوں نے اور انگریزوں نے دستخط کیے۔ بعد میں اور لوگوں نے بھی دستخط کیے ہمارے ملک نے بھی دستخط کیے وہ صلحنامہ لڑائی کا ڈر نہیں نکال دیتا۔ ہمارے خطروں کو کم نہیں کرتا۔ پھر بھی ایک راہ دکھاتا ہے جدھر چل کر شاید ہم ایسی جگہ پہنچ جائیں جہاں لڑائی وغیرہ قابو میں آ جائے اور دنیا امن سے رہے۔ آج سے سات آٹھ برس ہوئے ہم نے اقوام متحدہ میں ایسی بات کی تجویز کی تھی جس پر ماسکو میں دستخط ہوئے۔ اس بات کے لیے پہلی آواز ہندوستان کی اٹھی تھی تو ہمیں خاص طور پر خوشی ہے کہ اب اس پر عمل ہوا اور وہ بات کی گئی اور ہم امّید کرتے ہیں کہ جس راستے پر قدم بڑھایا گیا ہے وہ بڑھتا ہی جائے گا اور دنیا آخر اس خطرے سے بچ جائے گی۔ ہم ایک خطرناک دنیا میں رہتے ہیں جس میں خطرے ہیں جس میں امّیدیں ہیں۔ آج کل کے نوجوانوں کے سامنے جو زندگی ہے اس میں بھی دونوں باتیں ملی ہوئی ہیں۔ امّیدیں اور خطرے۔ اچھا ہے کہ ہم ایسے زمانے میں رہتے ہیں کیونکہ ایسے زمانے میں ایک قوم مضبوط ہوتی ہے، قوم میں ہمّت آتی ہے کسی قوم کے لیے بہت انا طلبی اچھی نہیں ہوتی وہ اس کو کمزور کر دیتی ہے ہمیں ہر وقت چوکنّا رہنا ہے۔ تو میں آپ کو اور خاص کر نوجوانوں اور بچّوں کو مبارک باد دیتا ہوں کہ وہ ایسے زمانے میں ہیں اور ہم سب کے سامنے ان کے بہت امتحان ہوں گے۔ یہ امتحان بہ نسبت ان کے بہت زیادہ بڑے ہیں جو اسکول اور کالج میں جا کر دیے جاتے ہیں۔ اس امتحان میں کوئی ایک کتاب پڑھ کر آپ پاس نہیں ہو جاتے بلکہ آپ کا کردار دل اور دماغ ایسا ہونا چاہیے کہ آپ کسی خطرے کا سامنا کر سکیں اور اس پر حاوی ہوں۔ گھبرائیں نہیں تو ہمیں اس طرح سے چلنا ہے اور جو آئندہ سال آتے ہیں اور ہمارے آزاد ہند کی عمر بڑھتی جاتی ہے تو اس کے ساتھ ہمیں بھی مضبوط ہوتے جانا ہے اور اپنے کو کبھی غفلت میں نہیں پڑنے دینا ہے۔ یہ یاد رکھنا ہے کہ چاہے ہماری رائیں کتنی ہوں دو تین سو ہزار کیوں نہ ہوں، ایک بات میں ہماری رائے ایک ہی ہے وہ ہے ہندوستان کی ایکتا اور ہندوستان کی حفاظت کرنا اور خوشحال بنانا۔ اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ ہاں کچھ رائیں الگ الگ ہو سکتی ہیں کہ کدھر کو جانا ہے کس طرح سے کرنا ہے لیکن ان باتوں کی بنیادی رائے تو ایک ہی ہونی چاہیے اور ہر وزن جو ہم اٹھائیں، ہر بات جو ہم کریں اس بات کے کرنے سے ہندوستان کی خدمت کریں۔ ہندوستان کا اتحاد بڑھائیں ہندوستان کی حفاظت کی باتوں میں مدد کریں نہ کہ اسے کمزور کریں۔ یہ ایک چھوٹا سا معیار ہے جو ہمیں ہر بات پر لگانا چاہیے کیونکہ اکثر ہم اپنے جوش میں مست ہو جاتے ہیں اور پارٹی بازی اور دل بندی میں پڑ کر ملک کے راستے کو کمزور کر دیتے ہیں اور ان باتوں کو یاد رکھیے آگے آنے



والے کوئی آسان دن نہیں ہیں مشکل دن ہیں آپ کسی طرف سے بھی دیکھیے مشکل دن ہیں کٹھن دن ہیں۔

جب ہمارے سامنے سرحد پر یہ بڑا حادثہ ہوا تھا خطرہ آیا تھا اس کے بعد ہمیں کئی باتیں کرنی پڑیں جو اچھی نہیں لگتی تھیں لیکن ہم کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ہمیں فوج پر بہت زیادہ خرچ کرنا پڑا۔ تقریباً دوگنا۔ شاید دوگنے سے بھی زیادہ ہمیں اس روپیے کو ٹیکس وغیرہ کے ذریعے جمع کرنا تھا۔ ٹیکس بڑھے، بڑھانا کسی کو اچھا نہیں لگتا نہ دینے والے کو اور نہ بڑھانے والے کو لیکن جب ملک خطرے میں ہو اور لوگ روپیہ پیسہ بچانے میں ملک کے خطرے کو بھول جاتے ہیں تو وہ ملک کی خدمت نہیں کرتے، ملک ایک چیز ہے جو رہے گا، پیسہ آتا ہے اور جاتا ہے، ہم خرچ کریں گے پیدا کریں گے۔ اس وقت اس کا ہر جگہ ہماری پارلیمنٹ میں اور ملک میں جو جواب ہوا وہ زوروں کا ہوا۔ شان کا ہوا حالانکہ تکلیف تھی اور پریشانی تھی۔ ہندوستان پر خطرہ آیا اور اسے خطرے سے بچانا ہے چاہے جو بھی کچھ دینا پڑے چاہے جو بھی تکلیف اٹھانا پڑے چاہے ہم مٹ جائیں لیکن ہندوستان رہے گا، سونا، چاندی آیا، پیسہ آیا، ٹیکس لگے تو اس بات کو آپ سوچیے ہمیں صرف یہ نہیں دیکھنا ہے کہ کوئی چیز بذات خود اچھی ہے یا نہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آج کل کی حالت میں اور آج کل کے خطرے میں چاہے وہ سرحد پر ہو چاہے اندرونی ہو کس طرح سے سامنا کرنا ہے۔ اگر اس کا سامنا کرنے میں ہمیں زیادہ بوجھ اٹھانا پڑے تو ضرور اٹھانا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جب بڑی لڑائی ہوتی ہے تو کتنے زبردست بوجھ عوام کو اٹھانے پڑتے ہیں۔ ملک تباہ ہو جاتے ہیں، ہمارے سامنے اس وقت ایسی لڑائی نہیں ہے، کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ آئندہ کیا ہو لیکن اس کو دور کرنے کے لیے اس وقت بھی ہمیں تیار ہونا ہے اور بار اٹھانا ہے۔

ہمارا نام دنیا میں ہوا تھا کہ ہم امن پسند ملک ہیں اور یہ بات صحیح ہے کہ اس وقت جو ہم اپنی فوجیں بڑھاتے ہیں اور نوجوانوں کو کچھ فوجی کام سکھاتے ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم نے اپنے صلح جوئی کے خیالات اور پالیسی کو چھوڑ دیا ہے، ہم اس پر چلیں گے، دنیا میں چلیں گے اور ہر جگہ چلیں گے اور کسی ملک سے ہمارا جو جھگڑا ہے اگر وہ پُرامن طریقے سے طے ہو جائے تو کوشش کریں گے۔ کیونکہ ہمیں اس قسم کی لڑائی پسند نہیں جو ملک میں تباہی لائے اور عوام بہت پریشان ہوں لیکن امن خودداری سے ہی ہو سکتا ہے، ایک غلط بات کے سامنے سر جھکا دینے اور ڈرنے سے نہیں، جو لوگ ڈرتے ہیں وہ ملک کو کمزور کر دیتے ہیں۔ بدنام کرتے ہیں اس لیے حالانکہ ہم ملک کی حفاظت کی پوری طرح تیاری کریں، ہمارا راستہ شانتی سے چلنے کا ہوگا۔ دنیا میں اور اپنے متعلق جب کبھی شانتی سے کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں تب اس کو پکڑیں گے لیکن ایسا ہو جس میں ہندوستان کی شان کو دھکا لگے یہ ضروری بات ہے اور اس لیے ہم اس کی پوری تیاری کریں گے اور اس تیاری کے معنی خالی توپ اور بندوق اور فوج نہیں اس تیاری کے معنی ہیں ملک بھر میں ہر شخص مرد، عورت، لڑکا اس کے لیے کچھ نہ کچھ دے، تیار ہو اپنے دل کو مضبوط کرے اپنے دماغ کو مضبوط کرے اور ساتھ مل کر چلے۔

ہمارے ملک کے بہت لوگ الگ الگ چلتے ہیں۔ ہمارے ملک میں قدم ملا کر ساتھ چلنا بہت کم لوگوں کو آتا ہے۔ قدم ملا کر چلنے میں کوئی خاص خوبی نہیں ہے لیکن وہ ایک ساتھ کام کرنے کی تصویر ہے۔ فوج کی طاقت کیوں ہے؟ وہ لوگ مل کر کام کرتے ہیں، قدم ملا کر چلتے ہیں۔ سب کام مل کر کرتے ہیں۔ ان میں ڈسپلن ہے، قاعدے سے کام کرتے ہیں تو ہمیں اپنے ملک کو کچھ سپاہیانہ انداز سکھانے ہیں۔ سارے ملک کو ڈسپلن سکھانا اچھا ہے کہ ہم اپنے مستقبل کے لیے اس طرح تیار ہوں اور اس خطرے سے جب نکلیں گے تو زیادہ طاقتور نکلیں گے تو زیادہ ہمت ہو گی ہمیں اپنے اوپر زیادہ بھروسہ ہوگا اور خوشحالی کے راستے پر ہم آسانی سے چل سکیں گے۔ آخر میں ملک وہی مضبوط ہوتے ہیں جو اپنے اوپر بھروسہ کر سکیں۔ دوسروں پر بھروسہ نہ کریں۔ اوروں سے دوستی ہوتی ہے بھروسہ اپنے اوپر ہوتا ہے اور تعاون ہوتا ہے۔ اچھے دل سے سوچنا ہوتا ہے۔ اپنے ہاتھوں پر کام کرنا ہوتا ہے جس وقت کوئی ملک بھول

جاتا ہے، گھبرا جاتا ہے، اپنے اوپر بھروسہ نہیں کرتا وہ گر جاتا ہے تباہ ہو جاتا ہے ذلیل ہو جاتا ہے۔ وہ نکما ملک ہے۔ یہ بات آپ کو یاد رکھنی ہے اور ہندوستان جیسے بڑے ملک میں اس سے زیادہ ذلّت کیا ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے دلوں میں ڈر جائیں، گھبرا جائیں اور اپنے اوپر بھروسہ نہ کر سکیں۔ ہمیں کرنا ہے اور دنیا میں ہمارے دوست ہیں، ان سے ہمیں دوستی کرنی ہے ان سے ہاتھ ملانا ہے ان سے مدد بھی لینی ہے۔ ہمیں بڑے بڑے ملکوں نے مدد دی ہے ان کے ہم شکرگذار ہیں محض مدد کے لیے نہیں بلکہ ان کی ہمدردی کے لیے اس سے ہمارا بوجھ کم ہو جاتا ہے جس منزل پر ہم چلے ہیں جو یاترا ہم کر رہے ہیں وہ کرنی ہے اور ہم منزل پر پہونچ جائیں گے۔ آپ کو یہ بات یاد رکھنی ہے ہم چاہتے ہیں کہ ہم اسی اصول سے ملک کو بڑھائیں، ملک کی ترقی کریں اپنے اوپر بھروسہ کر کے اوروں کی مدد لے کر ساری اقتصادی گتھیاں سلجھائیں اور اپنے ملک کو ایسا بنائیں کہ وہ اپنے پیروں پر پوری طرح کھڑا ہو سکے، بڑوں کی تو فکر ہے ہی لیکن ملک میں جو کروڑوں بچے ہیں میں چاہتا ہوں ان کو پڑھنے کا سیکھنے کا ملک کی خدمت کرنے کا، اپنی خدمت کرنے کا پورا موقع ملے۔ ہم ایسا ہندوستان بنائیں جس میں ان کو ایسے مواقع ملیں اور ملک میں کوئی اونچ نیچ نہ ہو ہم مستقبل کی ایسی تصویر دیکھتے ہیں۔ ہمارا پلاننگ کمیشن ہے اور لوگ بڑے بڑے دفتر بنا کر کام کرتے ہیں۔ لیکن آپ جانتے ہیں گورنمنٹ کی طرف سے اور پلاننگ کمیشن کی طرف سے تو صرف اشارے ہوتے ہیں کام تو آپ اور ہندوستان کے کروڑوں آدمیوں نے کرنا ہے اگر وہ کریں گے تو ٹھیک ہے اگر نہیں کریں گے تو نہ پلاننگ کمیشن کر سکے گا اور نہ گورنمنٹ کر سکے گی۔ اگر حفاظت کا کام ہے تو کروڑوں آدمی کریں گے اگر پلان چلانے کا ہے تو کروڑوں آدمی چلائیں گے۔ کچھ لوگ دفتر میں بیٹھ کر یہ نہیں کر سکتے۔ ہمارے کام کا تعلق ہندوستان کے ۴۵ کروڑ آدمیوں سے ہے، ہمیں ۴۵ کروڑ آدمیوں کو جگانا ہے، اٹھانا ہے اور زیادہ سے زیادہ راستے کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ چلنا تو ان کو ہے اور فائدہ بھی ان کو اٹھانا ہے ہمارے سامنے یہ تصویر ہے اور میرا خیال ہے کہ اس سال ہماری سرحد پر جو کچھ ہوا وہ ملک کے لیے اچھّا ہے برا نہیں ہے۔ وہ ملک کو تگڑا کرے گا مضبوط کرے گا، اگر ہم اس سے گھبرا اور ڈر نہ جائیں، ہماری قوم نے بزدلی کے راستے پر چلنا نہیں سیکھا ہے تو اس کے لیے ہمیں تیّار رہنا ہے۔

میں پھر سے آپ کو سولہویں سالگرہ کے لیے مبارکباد دیتا ہوں اور امّید کرتا ہوں کہ آپ اس دن کو یاد کریں گے ابھی تو آزاد ہند ایک بچّہ ہے ایک ملک کے لیے سولہ برس کی عمر کیا ہے یوں تو ہمارا ملک پرانا ملک ہے یہ جوں جوں بڑھے اس کی طاقت بڑھے اس کا کیریکٹر اچھا ہو، مضبوطی ہو، سر اونچا ہو اور دنیا میں سر اونچا کر کے آگے بڑھے۔ ان باتوں کو آپ یاد رکھیے اور خاص کر اس کو کہ ہمارے ملک میں جو لوگ رہتے ہیں چاہے جس حصّے میں وہ رہتے ہوں چاہے جو ان کا دھرم ہو سب ہمارے بھائی ہیں اور سبھی کو مل کر ساتھ چلنا ہے جو اس بات کو بھول جاتا ہے وہ ملک کی خدمت نہیں کرتا۔ جے ہند

(آزادی کے سترہ قدم صفحات ۱۴۱-۱۴۳)

وصیّت

(۱) منکہ جواہرلال نہرو، ساکن آنند بھون الٰہ آباد، خواہشمند ہوں کہ اپنی وصیت تیار کروں جس میں اس کی وضاحت ہوگی کہ میری وفات کے بعد میری جائداد اور ترکے کو کس طرح تقسیم کیا جائے۔ میری زندگی کے حالات اس قدر غیر یقینی تھے اور ہیں کہ مجھے معلوم نہیں کہ انتقال کے وقت کوئی چیز تقسیم کے لیے ہوگی بھی یا نہیں؟ والد ماجد سے مجھے وراثت میں جو کچھ ملا تھا، جسے انھوں نے اپنی شفقت اور دور اندیشی کی بنا پر میرے لیے محفوظ رکھا تھا، اس کا بڑا حصہ میں نے خرچ کر ڈالا ہے اور اس کے باوجود کہ میری کتابوں کی رائلٹی اور دوسری تحریروں سے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی ـــــ میرے پاس جو اصل سرمایہ تھا رفتہ رفتہ اس میں کمی آتی گئی۔ مجھ میں ملکیت کا جذبہ کچھ زیادہ نہیں رہا اور مجھے اکثر یہ احساس رہا کہ میری ملکیت کی چیزیں ایک طرح کا بوجھ ہیں جو مجھے اٹھانا پڑ رہا ہے جس طرح کی زندگی کے سفر کو میں نے اپنایا اس کا تقاضہ تھا کہ مجھ پر اس قسم کا بوجھ جتنا کم ہو اچھا ہے پھر چونکہ مجھے یہ احساس تھا کہ اگر میں اپنی آمدنی بڑھانا چاہوں گا تو مجھ میں اس کی صلاحیت ہے کہ ایسا کر سکوں۔ اس لیے مستقبل کے لیے انتظام کرنے کی بات میں نے کبھی نہیں سوچی۔ اس وجہ سے میں نے کبھی اپنی زندگی کا بیمہ بھی نہیں کرایا۔

(۲) اس اور دوسری وجوہ سے میرے لیے یہ بڑا مشکل ہے کہ مستقبل کے لیے کوئی تفصیلی انتظام کروں۔ مجھے یہ بھی خیال نہیں تھا کہ میرے لیے کسی قسم کا وصیت نامہ لکھنا بھی ضروری ہے کیونکہ مجھے شبہ تھا کہ میرے پاس دینے کے لیے کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے خیال تھا کہ میرے پاس جو کچھ بھی ہوگا وہ قدرتاً میری بیٹی اندرا پریہ درشنی کو ملے گا کیونکہ وہ میری قدرتی اور کھلی ہوئی وارث ہوگی۔

(۳) جب میں احمد نگر فورٹ میں قید میں تھا اور میرے پاس مستقبل کے متعلق سوچنے کے لیے بہت وقت تھا تو مجھے یہ خیال آیا کہ مجھے ایک وصیت نامہ ضرور چھوڑنا چاہیے۔ اپنے بہنوئی رنجیت سیتارام پنڈت کی اچانک موت سے مجھے دھکا سا لگا اور اس نے مجھے اپنی وصیت کے متعلق دوبارہ سوچنے کے لیے مجبور کیا۔ جیل سے میں کوئی قانونی کارروائی تو نہیں کر سکتا تھا لیکن دسمبر ۱۹۴۳ء میں جب میں ابھی احمد نگر میں ہی تھا، میں نے وصیت نامے کا ایک مسودہ تیار کیا۔

(۴) میں قید سے ۱۹۴۵ء کی گرمیوں میں رہا ہوا لیکن اس وقت سے مجھے ذاتی معاملات کے متعلق سوچنے کی فرصت نہیں مل پائی اور وصیت نامے کا مسودہ میرے پاس دس سال سے یونہی پڑا ہوا ہے۔ ان دس سالوں میں میری زندگی میں بہت سی تبدیلیاں آئیں اور پرانا مسودہ وقت کے ساتھ بیکار ہو گیا ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ میرے پاس جو کچھ دس سال پہلے تھا وہ اب ختم ہو چکا ہے، وزیر اعظم ہونے کے بعد سے میں اپنی تصنیفات کے ذریعے اپنی آمدنی میں کوئی اضافہ بھی نہیں کر سکا ہوں اور اس لیے مجھے اپنے سرمایے سے بار بار مدد لینی پڑی ہے کیونکہ وزیر اعظم کی تنخواہ میری محدود ضرورتوں کے لحاظ سے بھی ناکافی ثابت ہوتی ہے۔ اس سب کے باوجود میں اسے ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنا وصیت نامہ مکمل کر کے ایک مسئلے کو، جو کئی سال سے میرے دماغ میں خلش بنا رہا ہے ختم کر دوں۔

(۵) میں اپنی ساری جائیداد، سرمایہ اور اپنی کل ملکیت کا واحد وارث اپنی بیٹی اندرا پریہ درشنی منکوحہ فیروز گاندھی کو بناتا ہوں، سوائے ان انتظامات کے جن کی وضاحت مندرجہ ذیل سطروں میں کی گئی ہے۔



(۶) میری جائیداد اس وقت الٰہ آباد کے میرے مکان آنند بھون اور اس سے ملحق زمین اور عمارت پر مشتمل ہے، اس میں فرنیچر، کتابیں اور دوسرے لوازمات بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ وزیر اعظم کے گھر نئی دہلی میں بھی میری کتابیں، دستاویزیں اور کچھ ذاتی ملکیت کی چیزیں ہیں۔ میرے پاس کچھ بانڈ وغیرہ بھی ہیں اور کرنٹ اور فکسڈ ڈپیازٹ میں، بینکوں میں کچھ پیسے بھی ہیں، گو میری سرمایہ کاری اور سیکوریٹیز میں سے بیشتر میں نے اپنی بیٹی کے نام پہلے ہی منتقل کر دیا ہے یا کسی اور طرح انھیں خرچ کر چکا ہوں۔ اپنی لکھی ہوئی پرانی کتابوں سے بھی مجھے کچھ آمدنی حاصل ہوتی ہے جس کی مقدار غیر یقینی اور بدلتی رہتی ہے۔ میری یہ تمام ملکیت یعنی آنند بھون اور اس کے ملحقات، میری تمام سیکوریٹیز، سرمایہ کاری اور حصے، بینکوں میں نقدی، چاہے جہاں بھی ہوں اور کتابوں کی رائلٹی سے حاصل ہونے والی آمدنی اور کوئی جائیداد یا ملکیت جس کا یہاں ذکر نہیں۔ ان سب کی وارث میری بیٹی ہوگی اور میری موت کے بعد اس کی ملکیت ہوگی کہ وہ اسے جس طرح چاہے استعمال کرے۔

(۷) اگر میری بیٹی اندرا پریہ درشنی کی موت مجھ سے پہلے ہو جائے تو اس کے دونوں بیٹے، میرے نواسے، راجیو نہرو گاندھی اور سنجے نہرو گاندھی میرے وارث ہوں گے اور میری ساری جائیداد اور ملکیت میں وہ برابر کے حصے دار ہوں گے چاہے وہ اسے ایک ساتھ رکھیں یا الگ الگ۔

(۸) ایک ایسی زندگی جس میں مجھے آزمائشوں اور مشکلات کا ایک قابل لحاظ حصہ ملا ہے، میری دونوں بہنوں وجے لکشمی پنڈت اور کرشنا ہتھی سنگھ سے مجھے محبت اور تسکین ملی ہے وہ میرے لیے بڑے سکون کا باعث ہوئی ہے۔ میں اس کے بدلے میں انھیں اپنی محبت اور پیار کے سوا اور کچھ نہیں دے سکتا۔

(۹) میرے والد یا والدہ کی ذاتی چیزیں، جو اب بھی میری ملکیت میں ہوں، وہ میری بہنوں کو دے دی جائیں گی اس لیے کہ ان چیزوں پر دوسروں کے مقابلے میں ان کے حق کو اولیت ہوگی۔ وہ انھیں آپس میں جس طرح چاہیں بانٹ لیں گی۔

(۱۰) مندرجہ بالا دفعات کے ذریعے میں نے آنند بھون اور اپنی تمام ملکیت اپنی بیٹی اور اس کے بچوں کو، جو بھی صورت حال ہو، مطلقاً ان کی وراثت میں دے دیا ہے اور انھیں اس پر مطلق مالکانہ حقوق ہوں گے جس میں علیحدہ کرنے یا کسی اور طرح استعمال کرنے کا حق شامل ہے۔ آنند بھون ہمارے اور دوسروں کے لیے بہت سی ایسی چیزوں کی ایک نشانی سی بن گیا ہے جنھیں ہم اپنی زندگی میں اہم سمجھتے ہیں اس لیے یہ اینٹ اور سیمنٹ کے ایک ڈھانچے اور ذاتی ملکیت سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ اس کا ہماری جنگ آزادی سے گہرا تعلق ہے اور اس کی چار دیواری میں اہم واقعات ہوئے ہیں اور بڑے بڑے فیصلے کیے گئے ہیں یہ میری خواہش ہے اور مجھے یقین ہے کہ میری بیٹی کی بھی یہی خواہش ہے کہ جو کوئی بھی اس مکان میں رہے وہ ہمیشہ ان باتوں کو ذہن میں رکھے گا اور اس کی روایات کے خلاف کچھ نہیں کرے گا لیکن میری یہ خواہش یا دوسری خواہشات جن کا میں آنے والی دفعات میں ذکر کروں گا میری بیٹی کے مالکانہ حقوق پر کسی قسم کی پابندی نہ سمجھی جائیں۔

(۱۱) میں چاہوں گا کہ میری بیٹی اور اس کے شوہر فیروز گاندھی اور ان کے بچے آنند بھون کو اپنا گھر بنائیں اور اگر ایسا کسی وجہ سے نہ کر سکیں تو آنند بھون اکثر آتے رہیں۔

(۱۲) ہمارے گھر آنند بھون، الٰہ آباد کے دروازے میری بہنوں، ان کے بچوں اور میرے بہنوئی راجہ ہتھی سنگھ کے لیے ہمیشہ کھلے رہنے چاہئیں اور ان کو یہ احساس دلایا جانا چاہیے کہ یہ اب بھی ان کا گھر ہے جس میں انھیں ہمیشہ خوش آمدید کہا جائے گا وہ وہاں جب چاہیں اور جتنے دنوں کے لیے چاہیں ٹھہر سکتے ہیں۔ میں چاہوں گا کہ وہ وقتاً فوقتاً آنند بھون آئیں اور اس طرح وہ اپنے گھر سے اپنی یادوں کو تازہ اور مضبوط بنائے رکھیں۔

(۱۳) میرے والد کی زندگی میں اور اس کے بعد ملک کے مختلف حصوں سے لوگ ہمارے گھر آنند بھون کی طرف کھنچ کر آتے رہے ہیں۔ خاص طور پر غریب لوگ، کسان اور دوسرے لوگ جو آس پاس کے اضلاع اور دور دراز کے علاقوں سے وہاں مشورہ، مدد اور اپنی زندگی کی مصیبتوں میں ہمدردی کے لیے وہاں آتے

ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آنند بھون کے دروازے ہمارے ملک کے ان باشندوں کے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے اور ان کے ساتھ ہر طرح کا اخلاق برتا جائے گا یہ بات میرے لیے انتہائی افسوس کی ہے کہ وزیر اعظم کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کی بنا پر اپنے گھر شاذو نادر ہی جا پاتا ہوں۔

(۱۴) میں اجنبی لوگوں کو اپنا گھر کرایے پر دینا پسند نہیں کرتا۔ اگر میری بیٹی یا اس کے بچے ایک خاندانی رہائش گاہ کے طور پر آنند بھون کو برقرار رکھنے میں سہولت محسوس کرتے ہیں تو انھیں خود استعمال کرنا چاہیے یا پھر کسی عوامی مقصد کے لیے اسے وقف کر دینا چاہیے۔ یہ صورت کملا نہرو میموریل ہسپتال کے سلسلے میں ممکن ہے یا مجوزہ بچوں کے گھر کے طور پر ہو سکتی ہے جس کا اس کے قریب قائم ہونے کا امکان ہے یا کسی ایسے ہی دوسرے مقصد کے لیے۔

(۱۵) میں نے قومی اور تاریخی دلچسپی کے دستاویزات اور خطوط کی ایک قابلِ لحاظ تعداد جمع کی ہے، ان میں سے بہت سے کاغذات جو ہماری قومی جدو جہدِ آزادی کے مختلف مراحل سے وابستہ تھے، جب ہم جیل میں تھے، بدنصیبی سے برباد ہو گئے یا تتربتر ہو گئے، تاہم کچھ نہ کچھ باقی رہ گئے ہیں۔ کچھ دوسرے کاغذات اور دستاویزات نیز خطوط موجود ہیں جن کا تعلق بعد کے دور سے ہے جبکہ میں نے عہدہ سنبھالا یہ بھی قابلِ لحاظ تاریخی حیثیت کے حامل ہیں ایسے تمام اہم کاغذات اور دستاویزات اور خطوط، نیشنل لائبریری یا نیشنل آرکائیوز کو پیش کر دینا چاہیے۔

(۱۶) مجھے جو مختلف چیزیں پیش کی گئی تھیں، انھیں وقتاً فوقتاً مختلف قومی میوزیم کو دیتا رہا ہوں۔ میں ایسا آئندہ بھی کرتا رہوں گا اگر کچھ چیزیں باقی رہ جائیں جو لوگوں کو دکھانے کے لائق ہوں تو انھیں نیشنل میوزیم کو دے دیا جائے۔ ان میں سے کچھ وزیر اعظم کی رہائش گاہ میں رکھی جا سکتی ہیں۔ جو کہ خود ایک سرکاری عمارت ہے۔

(۱۷) مجھے ہندوستانی عوام سے اتنی محبت اور پیار ملا ہے کہ میں چاہے جو کچھ بھی کروں وہ اس کے چھوٹے سے چھوٹے حصے کا بھی بدل نہیں ہو سکتا اور بلاشبہ پیار جیسی بیش قیمت چیز کی کوئی قیمت بھی ادا نہیں کی جا سکتی۔ بہت سے ایسے لوگ گزرے ہیں جن کی بیحد قدر و منزلت کی گئی ہے، کچھ ایسے بھی ہیں جن کے ساتھ انتہائی عزت و احترام کا سلوک کیا گیا لیکن مجھے ہندوستان کے ہر حصے اور ہر طبقے کی ایسی بے پایاں محبت ملی کہ اس کے بوجھ سے میں دبا جا رہا ہوں۔ میں زیادہ سے زیادہ اس امید کا اظہار کر سکتا ہوں کہ اپنی زندگی کے باقی دنوں میں اپنی قوم کی توقعات اور محبت کا اہل ثابت ہوں۔

(۱۸) میں اپنے اَن گنت ساتھیوں اور دوستوں کا تہہ دل سے احسان مند ہوں ہم نے بہت سے معرکوں میں مشترکہ طور پر حصہ لیا ہے، جن میں کبھی کامیابی ہوئی ہے اور کبھی ناکامی مگر میرے ساتھیوں نے کبھی ساتھ نہیں چھوڑا۔

(۱۹) جن لوگوں نے انتہائی محبت اور پوری وفاداری کے ساتھ میرے والد اور میری خدمت کی ہے، ان میں کچھ لوگ گزر گئے ہیں اور کچھ حیات ہیں۔ وہ ہمارے خاندان کا ایک حصہ ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ جب تک وہ زندہ رہیں، انھیں ایسا ہی سمجھا جائے۔ میں ان سب کا یہاں ذکر کرنا نہیں چاہتا لیکن شیو دت اوپادھیائے ایم۔او۔ متھائی اور ہری لال کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

(۲۰) میں پوری سنجیدگی کے ساتھ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ میری وفات کے بعد میرے لیے کوئی مذہبی رسم ادا نہ کی جائے، اس قسم کی رسوم پر میرا عقیدہ نہیں ہے اور رسم کے طور پر بھی انھیں تسلیم کرنا، میں ریاکاری اور اپنے آپ کو اور دوسروں کو دھوکا دینے کے مترادف سمجھتا ہوں۔

(۲۱) میری خواہش ہے کہ مرنے کے بعد میری لاش کو جلا دیا جائے۔ اگر میری وفات کسی غیر ملک میں ہو، تو میری لاش کو وہیں جلا دیا جائے اور میری خاک الٰہ آباد بھیج دی جائے۔ اس میں سے مٹھی بھر گنگا میں بہا دی جائے اور اس کے بعد جو بڑا حصہ بچ رہتا ہے، اس کے بارے میں ذیل کی ہدایت پر عمل کیا جائے۔ اس کا بہر حال خیال رکھا جائے کہ میری استھیوں کا کوئی حصہ بچا کر ہرگز نہ رکھا جائے۔

(۲۲) جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، میری اس خواہش کے پیچھے کوئی مذہبی جذبہ کارفرما نہیں ہے کہ میری مٹھی بھر خاک

الٰہ آباد میں گنگا میں بہادی جائے۔ بچپن ہی سے مجھے الٰہ آباد میں گنگا اور جمنا سے گہرا لگاؤ رہا ہے اور جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا، یہ لگاؤ بھی بڑھتا گیا۔ جیسے جیسے موسم بدلتا ہے، میں نے ان ندیوں کے بدلتے ہوئے مزاج کو دیکھا ہے اور میں نے اکثر ان کی تاریخ، دیو مالا، روایت، گیت اور کہانی کے بارے میں سوچا ہے جو ان سے زمانۂ قدیم سے وابستہ چلی آرہی ہے اور ان کے بہتے ہوئے پانی کا حصہ بن گئی ہے گنگا خاص طور پر ہندوستان کی ایک ایسی ندی ہے، جس کے گرد اس ملک کی تہذیبی یادیں، اس کی امیدیں اور اندیشے، فتح مندیوں کے گیت اور اس کی ہار اور اس کی جیت کا تانا بانا بُنا ہوا ہے۔ وہ ہندوستان کی صدیوں پرانی تہذیب اور تمدن کی علامت ہے۔ سدا بدلتی اور ہمیشہ بہتی پھرتی، وہی گنگا کی گنگا رہتی ہے۔ اس کو دیکھ کر مجھے ہمالیہ کی برف پوش چوٹیوں اور گہری گھاٹیوں کا خیال آتا ہے جن سے مجھے بے حد محبت ہے۔ مجھے اس کے نیچے کے وہ وسیع اور زرخیز میدان یاد آجاتے ہیں جہاں میری زندگی اور عمل کی راہیں متعین ہوئی ہیں۔ صبح کی روشنی میں مسکراتی اور ناچتی اور شام کے پھیلے ہوئے سایے میں تاریک، اُداس اُداس اور پُر اسرار بنی ہوئی اور جاڑوں میں دامن سمیٹے، آہستہ خرامی اور دلبری کے ساتھ بہتی ہوئی اور برسات میں سینہ چوڑا کیے ہوئے گرجتی، دھاڑتی یعنی سمندر بنی ہوئی اور اسی کی طرح تباہ کر دینے والی طاقت کا مظاہرہ کرتی ہوئی یہی گنگا میرے لیے ہندوستان کے ماضی کی علامت اور اس کی یاد ہے۔ یہ ماضی سے بہتی ہوئی زمانۂ حال میں آئی ہے اور مستقبل کے عظیم سمندر کی طرف بہتی چلی جارہی ہے۔ اگرچہ میں نے بہت سی قدیم رسموں اور روایتوں کو ترک کر دیا ہے اور مجھے اس کی بڑی فکر ہے کہ ہندوستان ان تمام بندھنوں سے نجات پا جائے جو اسے جکڑے اور دبائے ہوئے ہیں اور اس کے عوام میں پھوٹ پیدا کیے ہوئے اور ان کی بڑی تعداد کو کچلے ہوئے ہیں اور ان کے جسم و روح کی ترقی میں حائل ہیں۔ گو کہ میں یہ سب کچھ چاہتا ہوں لیکن اس کے باوجود میں اپنے آپ کو اس ماضی سے بالکل منقطع کرنا نہیں چاہتا ہندوستان کا جو قدیم ورثہ رہا ہے اور جو اب بھی ہمارا ہے، میں اس پر فخر کرتا ہوں اور مجھے اس کا احساس ہے کہ میں بھی اپنے تمام دوسرے ہم وطنوں کی طرح اس سلسلۂ زنجیر کی ایک کڑی ہوں، جس کا سرا ہندوستان کی قدیم ترین تاریخ تک پہنچتا ہے۔ میں اس زنجیر کو توڑنا نہیں چاہتا، کیونکہ میں اس کی قدر کرتا ہوں اور اس سے جوش اور حوصلہ حاصل کرتا ہوں۔ اپنی اس خواہش اور ہندوستان کے تہذیبی ورثے کو اپنا آخری خراج عقیدت پیش کرنے کی غرض سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ مٹھی بھر میری خاک الٰہ آباد کے پاس گنگا میں ڈال دی جائے تاکہ وہ بہہ کر اس مہان ساگر میں جا گرے، جو ہندوستان کے کنارے سے ٹکرا رہا ہے۔

(۲۳) میری خاک کے بیشتر حصے کو اس طرح استعمال کیا جائے کہ ہوائی جہاز میں رکھ کر کافی اونچائی پر سے جا کر اسے ان کھیتوں میں بکھیر دیا جائے جہاں ہندوستان کے کسان اپنا پسینہ بہاتے ہیں، تاکہ میری راکھ ہندوستان کی مٹی اور خاک میں اس طرح مل جائے کہ الگ سے اس کا وجود باقی نہ رہے۔

میں نے اس وصیت کو نئی دہلی میں ۲۱ جون ۱۹۵۴ء کو لکھا ہے۔

(دستخط) **جواہر لال نہرو**

۲۱ جون ۱۹۵۴ء

(پنڈت جی نے اس دستاویز پر اسی تاریخ کو جناب کیلاش ناتھ کاٹجو اور جناب این۔ آر۔ پلائی کی موجودگی میں دستخط کیے تھے۔ وصیت ان کے انتقال کے بعد جاری کی گئی)

نہرو نما

تصنیفاتِ نہرو (اُردو تراجم)

آزادی کے سترہ قدم	جواہر لال نہرو	پبلیکیشنز ڈویژن دہلی	مارچ ۱۹۶۶ء	ص ۱۶۴
اٹھارہ مہینے ہندوستان میں	//	مترجم بشیر احمد انصاری، اردو مرکز دہلی	۱۹۴۵ء	ص ۲۴۰
باپ کے خط بیٹی کے نام	//	کتابستان الٰہ آباد	۱۹۳۵ء	ص ۱۸۳
تلاشِ ہند (حصہ اوّل)	//	مکتبہ جامعہ دہلی	۱۹۴۶ء	ص ۵۷۵
تلاشِ ہند (حصہ دوم)	//	مکتبہ جامعہ دہلی	دسمبر ۱۹۴۶ء	ص ۵۷۸
سوویت روس	//	نعمانی پریس دہلی	۱۹۵۲ء	ص ۱۴۳
سیاحتِ روس	//	لاہور	۱۹۴۰ء	ص ۱۵۸
کچھ پرانے خط (حصہ اول)	//	ترجمہ عبدالمجید الحریری، مکتبہ جامعہ دہلی	نومبر ۱۹۶۰ء	ص ۴۰۰
کچھ پرانے خط (حصہ دوم)	//	ترجمہ عبدالمجید الحریری، مکتبہ جامعہ دہلی	اکتوبر ۱۹۶۲ء	ص ۴۳۰
لڑکھڑاتی دُنیا	//	فاروقی پریس دہلی	۱۹۴۲ء	ص ۲۱۲
مضامین نہرو (جلد اوّل)	//	مترجم آنند نرائن ملا، انڈین پریس الٰہ آباد		ص ۲۵۴
مہلت کے آٹھ دن	//	جواہر پریس دہلی	۱۹۳۰ء	ص ۲۲
میری کہانی (حصہ اول)	//	مکتبہ جامعہ دہلی		ص ۴۶۷
میری کہانی (حصہ دوم)	//	مکتبہ جامعہ دہلی	۱۹۳۶ء	ص ۵۴۸
یادگار شخصیتیں	//	مترجم رفیق محمد شاستری، مکتبہ جامعہ دہلی	اپریل ۱۹۶۶ء	ص ۲۷۸

نہرو پر اُردو کتابیں

انمول رتن	اطہر پرویز	اُردو گھر، علی گڑھ		ص ۹۳
پنڈت جواہر لال نہرو	ضیا عظیم آبادی	لکھنؤ	اگست ۱۹۶۴ء	ص ۱۵۲
پنڈت نہرو سے بات چیت	ٹیبر منڈی	مترجم سعادت علی خاں، دہلی	۱۹۵۸ء	ص ۱۴۴
جواہر سے لال تک	نذیر بنارسی	منظوم، بنارس	۱۹۶۷ء	ص ۱۹۸

جواہرلال نہرو	نکولائی	دہلی	۱۹۵۷ء	ص ۱۲۰
جواہرلال نہرو	گوپال متل	لاہور	۱۹۴۵ء	ص ۶۴
جواہرلال نہرو	خراجِ عقیدت	پبلیکیشنز ڈویژن دہلی	اگست ۱۹۶۴ء	ص ۱۹۰
جواہرلال نہرو رادھاکرشنن کی نظر میں	رادھاکرشنن	پبلیکیشنز ڈویژن دہلی	۱۹۶۸ء	ص ۶۸
جواہرلال نہرو۔ کچھ کہی کچھ اَن کہی	ظ۔ انصاری	بمبئی	۱۴ر نومبر ۱۹۸۷ء	ص ۹۶
جواہرلال کی کہانی	محمد رحیم دہلوی	دہلی		ص ۴۹۶
جواہرلال کی کہانی	ایس۔ وی ساونت، ایس۔ ڈی۔ باولکر، پبلیکیشنز ڈویژن۔ دہلی		۱۹۷۲ء	
فرقہ پرستی نہرو کی نظر میں	نندلال گپتا	مترجم عنایت اللہ	اپریل ۱۹۶۸ء	ص ۲۷۹
نہرو، تصویروں کی زبانی	بھاردواج امرناتھ	دہلی		ص ۱۱۶
نہرو زنجیر سے تعمیر تک (منظوم)	چندرشیکھر آزاد	لدھیانہ	۱۹۶۴ء	ص ۱۳۲
نہرو دور کی یادیں	ایم۔ آر۔ متھائی، ترجمہ نذیر حق	لاہور	جولائی ۱۹۷۸ء	ص ۲۷۶
نہرونامہ (دورِ آفریدی)	منظوم	الجمعیۃ پریس دہلی	۱۹۷۶	ص ۸۰
نہرونامہ	ساغر نظامی	دہلی		ص

رسائل کے نہرو نمبر

جواہر نمبر (سہ ماہی اُردو ادب)	ایڈیٹر آل احمد سرور	علی گڑھ، شمارہ ۳، ۴	۱۹۶۴ء
نہرو نمبر (سہ ماہی صبح)	ادارت عبداللطیف اعظمی	انجمن ترقی اُردو ہند دہلی۔	اپریل ۱۹۶۸ء
نہرو نمبر	ماہنامہ نیا دور	لکھنؤ	جولائی ۱۹۶۴ء
نہرو نمبر	ماہنامہ آج کل	دہلی	نومبر ۱۹۶۴ء

نہرو پر مضامین اور منظومات

آہ نہرو	عطاء اللہ پالوی	آج کل دہلی	دسمبر ۱۹۶۴ء
احساس کی وحدت	(ایڈیٹر)	بہار کی خبریں	نومبر ۱۹۶۸ء
ادیبوں کا دوست جواہرلال	(اداریہ)	آج کل دہلی	نومبر ۱۹۶۴ء
اردو سے پنڈت نہرو کی محبت	خواجہ احمد فاروقی	بہار کی خبریں	اگست ۱۹۶۶ء
افسانۂ آں شب کہ بہ یار گذشت	خواجہ احمد فاروقی	آج کل	نومبر ۱۹۶۴ء
اور شمع بجھ گئی	ظفر احمد نظامی	آج کل	نومبر ۱۹۶۴ء
ایک روشن دماغ تھا نہ رہا	نگار گورکھپوری	اردو ادب، نہرو نمبر	۱۹۶۴ء
ایک شہنشاہ ایک غلام	پریم پال اشک	آج کل	نومبر ۱۹۶۴ء

بچوں کے نہرو	اڈیٹر	بہار کی خبریں	دسمبر ۱۹۶۷ء
بھارت کی مشترک ثقافت	اڈیٹر	بہار کی خبریں	دسمبر ۱۹۶۷ء
بھارتی پارلیمنٹ کے اراکین کی تصویریں	اڈیٹر	آج کل	جولائی ۱۹۵۵ء
پہلی کرن	اداریہ	صبح نہرو نمبر	۱۹۶۸ء
پنڈت جواہر لال نہرو	غلام رسول مہر	آج کل	نومبر ۱۹۶۴ء
پنڈت جواہر لال نہرو	نجم الدین نقوی	نیا دور	اپریل ۱۹۷۳ء
پنڈت جواہر لال نہرو	میر غلام رسول	آج کل	نومبر ۱۹۶۴ء
پنڈت جواہر لال نہرو	جوش ملیح آبادی	آج کل	نومبر ۱۹۶۱ء
پنڈت جواہر لال نہرو کا عقلی نظام	حسن عسکری بلکھنوی	اردو ادب، نہرو نمبر	۱۹۶۴ء
پنڈت جواہر لال نہرو کشمیر آرٹس ایمپوریم میں	اڈیٹر	آج کل	دسمبر ۱۹۴۹ء
پنڈت جی میری نظروں میں	بدرالدین طیب جی	آج کل	نومبر ۱۹۶۴ء
پنڈت نہرو	غلام الدین	بہار کی خبریں	دسمبر ۱۹۶۹ء
پنڈت نہرو انجینیرنگ یونیورسٹی روڑکی میں	اڈیٹر	آج کل	جنوری ۱۹۵۰ء
پنڈت نہرو انڈونیشیا میں	اڈیٹر	آج کل	اگست ۱۹۵۰ء
پنڈت نہرو اور سوشلزم	ابو سالم	اردو ادب نمبر، نہرو نمبر	۱۹۶۴ء
پنڈت نہرو، اہم تصنیفات، واقعات اور نہرو نمبروں کا اشاریہ	ایم حبیب خاں	صبح نہرو نمبر	۱۹۶۸ء
پنڈت نہرو کا دورۂ امریکہ	گوپال نجم کیشو	آج کل	دسمبر ۱۹۴۹ء
پنڈت نہرو کا فلسفۂ سیکولرزم	سعید احمد اکبر آبادی	اردو ادب نہرو نمبر	۱۹۶۴ء
پنڈت نہرو کی شخصیت اور کردار	جعفر حسن	اردو ادب نہرو نمبر	۱۹۶۴ء
پنڈت نہرو کے فکر کے چند پہلو	انیس نصرت	نیا دور لکھنؤ	نومبر ۱۹۷۳ء
پنڈت نہرو کے تعلیمی خیالات	عبداللہ ولی بخش قادری	صبح نہرو نمبر	۱۹۶۸ء
پنڈت نہرو لڑکپن سے نوجوانی تک	معین الرحمٰن	اردو ادب نہرو نمبر	۱۹۶۴ء
تصویر ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو	مدیر	آج کل	جولائی ۱۹۵۲ء
تصویر پنڈت نہرو اور اڑیسہ کی ناگا عورتیں	مدیر	آج کل	جولائی ۱۹۵۴ء
جدید ذہن کی دریافت	وحید اختر	اردو ادب، نہرو نمبر شمارہ ۴،۳	۱۹۶۴ء
جدید ہندوستان کا معمار اعظم نہرو	احمد ابراہیم علوی	نیا دور	نومبر ۱۹۷۳ء
جناح نہرو خط و کتابت اور مسلمانوں کے مسائل	مسلم سوشلسٹ	جامعہ	جولائی ۱۹۸۳ء
جنگ آزادی کا سپاہی جواہر لال نہرو	گوپی ناتھ امن	آج کل	نومبر ۱۹۶۴ء

جواہر لال نہرو	آل احمد سرور	آج کل	نومبر ۱۹۶۰ء
جواہر لال نہرو	چیلاپتی راؤ	بہار کی خبریں	جنوری ۱۹۶۶ء
جواہر لال نہرو	میری بک	نیا دور لکھنؤ	نومبر ۱۹۷۱ء
جواہر لال نہرو	الزماں	آج کل	ستمبر ۱۹۵۲ء
جواہر لال نہرو	قمر برنی	بہار کی خبریں	نومبر ۱۹۷۱ء
جواہر لال نہرو	چیلاپتی راؤ	بہار کی خبریں	اپریل ۱۹۶۶ء
جواہر لال نہرو	ایس. ایم. راؤ	نیا دور	نومبر ۱۹۷۳ء
جواہر لال نہرو امن عالم کے علمبردار	وی لانگر	قومی آواز	۱۳ر نومبر ۱۹۸۸ء
جواہر لال نہرو امن عالم کے علمبردار	وی لانگر	قومی آواز پٹنہ (خصوصی ضمیمہ)	۱۴ر نومبر ۱۹۸۸ء
جواہر لال نہرو اور ان کا نظریۂ زبان	احسن نشاط	اُردو ادب، نہرو نمبر	۱۹۶۴ء
جواہر لال نہرو اور بچے	عشرت علی صدیقی	نیا دور	نومبر ۱۹۶۴ء
جواہر لال جی اور گاندھی جی	پنڈت سندر لال	اُردو ادب، نہرو نمبر	۱۹۶۴ء
جواہر لال نہرو چند یادیں	محمد یونس	آج کل	نومبر ۱۹۷۱ء
جواہر لال نہرو کا ایک خط کرشنا نہرو ہتھی سنگھ کے نام	عتیق صدیقی	جامعہ	مئی ۱۹۶۵ء
جواہر لال نہرو کا سائنسی مزاج	فاروق اعظم	قومی آواز پٹنہ (خصوصی ضمیمہ)	۱۴ر نومبر ۱۹۸۸ء
جواہر لال نہرو کا سیاسی کارنامہ	ریاض الرحمٰن شروانی	اُردو ادب، نہرو نمبر	۱۹۶۴ء
جواہر لال نہرو کچھ یادیں (انسانیت، امن اور رواداری کا علمبردار)	سید محمود	آج کل	جولائی ۱۹۶۴ء
جواہر لال نہرو کچھ یادیں کچھ تاثرات	فراق گورکھپوری	آج کل	نومبر ۱۹۶۴ء
جواہر لال نہرو کی جیل کے زمانے کی تصنیفات	شاہد عفران زیدی	آج کل	نومبر ۱۹۶۸ء
جواہر لال نہرو کی وصیت سے اقتباسات	مدیر	آج کل	نومبر ۱۹۶۴ء
جواہر لال نہرو کی یاد میں	مدیر	آج کل	نومبر ۱۹۶۶ء
جواہر لال تحریک کی حیثیت سے	تاراچند	اُردو ادب، نہرو نمبر	۱۹۶۴ء
چاچا نہرو اور بچے	مدیر	نیا دور، لکھنؤ	نومبر ۱۹۶۳ء
چاچا نہرو کو کیوں پیار کرتے تھے	تنویر	بہار کی خبریں	نومبر ۱۹۶۸ء
خالدہ خانم کے تاثرات	عبداللطیف اعظمی	جامعہ	اپریل ۱۹۶۵ء
خراجِ عقیدت	مدیر	آج کل	نومبر ۱۹۶۴ء
راجدھانی میں جشن آزادی کی دھوم دھام		آج کل	اکتوبر ۱۹۵۲ء
روشنی بجھ گئی	امجد نجمی	آج کل	نومبر ۱۹۶۴ء
زوال علم و ہنر مرگ ناگہاں اس کی	جگن ناتھ آزاد	اُردو ادب، نہرو نمبر	۱۹۶۴ء

سرگزشت	جواہر لال نہرو	صبح، نہرو نمبر		۱۹۶۸ء
قطعات تاریخ وفات نہرو	سحر عشق آبادی	آج کل	نومبر	۱۹۶۴ء
کوائف جامعہ	مدیر	جامعہ	نومبر	۱۹۶۴ء
گاندھی اور نہرو	مدیر	بہار کی خبریں	دسمبر	۱۹۶۸ء
ماسکو کے پھول	نلسن	آج کل	اکتوبر	۱۹۵۵ء
محمد علی اور جواہر لال نہرو	سلیم قدوائی	جامعہ	جولائی	۱۹۸۰ء
مہاتما گاندھی اور نہرو	عابد حسین	صبح، نہرو نمبر		۱۹۶۸ء
میرے بھائی	مسز کرشنا نہرو	صبح، نہرو نمبر		۱۹۶۸ء
مرے قدح میں ہے صہبائے آتش مینا	صابرہ زیدی	اردو ادب، نہرو نمبر		۱۹۶۴ء
میں خود اپنا سوگوار	نازش پرتاپگڈھی			
نگہ بلند سخن دلنواز جاں پرسوز	آل احمد سرور	اردو ادب، شمارہ ۳-۴، نہرو نمبر		۱۹۶۴ء
نہرو	اجتبیٰ رضوی	بہار کی خبریں	۱۶ مئی	۱۹۶۶ء
نہرو	حیات اعظمی	نیا دور	جنوری	۱۹۶۳ء
نہرو انسانیت، امن اور رواداری کا علمبردار	عابد حسین	جامعہ	نومبر	۱۹۶۴ء
نہرو اور آزاد تعلقات کے آئینے میں	شعیب اعظمی	اردو ادب، نہرو نمبر		۱۹۶۴ء
نہرو اور آزاد قلعۂ احمد نگر میں	عتیق صدیقی	صبح، نہرو نمبر		۱۹۶۸ء
نہرو اور افریشیا	آبا دورائی	بہار کی خبریں	جون	۱۹۶۹ء
نہرو اور ان کی شخصیت	غفور عوف	جامعہ	نومبر	۱۹۶۹ء
نہرو اور بچے	آصف مجیب	صبح، نہرو نمبر		۱۹۶۸ء
نہرو اور بین الاقوامی تعلقات	سلیم قدوائی	نیا دور	نومبر	۱۹۷۴ء
نہرو اور سیکولرزم	مدیر	بہار کی خبریں	جون	۱۹۶۶ء
نہرو اور سیکولرزم	چھاگلہ	بہار کی خبریں	نومبر	۱۹۶۷ء
نہرو اور عرب ممالک	سید ایوب	آج کل	مئی	۱۹۶۵ء
نہرو اور متوازی اقتصادی ترقی	ایڈورڈ فلیرو	قومی آواز خصوصی ضمیمہ	۱۴ نومبر	۱۹۷۸ء
نہرو ایک ادیب	انور صدیقی	جامعہ	جنوری	۱۹۶۹ء
نہرو ایک ادیب کی حیثیت سے	ہمایوں کبیر	آج کل	نومبر	۱۹۶۴ء
نہرو ایک اصول پرست انسان	رادھا کرشنن	نیا دور	نومبر	۱۹۶۸ء
نہرو ایک انسان ایک ادیب	ہمایوں کبیر	اردو ادب، نہرو نمبر		۱۹۶۴ء
نہرو ایک خراجِ عقیدت	غفور عوف بی۔ جی	صبح، نہرو نمبر		۱۹۶۸ء

نہرو ایک دلچسپ ذاتی مطالعہ	مترجم عابد رضا بیدار	صبح، نہرو نمبر		۱۹۶۸ء
نہرو ایک عہد آفریں شخصیت	مشتاق احمد	بہار کی خبریں	مئی	۱۹۷۱ء
نہرو ایک معاصر کی نظر میں	مترجم عابد رضا بیدار	صبح، نہرو نمبر		۱۹۶۸ء
نہرو بحیثیت ادیب	سلیم قدوائی	نیا دور	مئی	۱۹۷۰ء
نہرو بحیثیت ایک صحافی	چیلاپتی راؤ	نیا دور	نومبر	۱۹۷۲ء
نہرو جن کے خوابوں کا یہ ہندوستان	نجم جاوید عثمانی	قومی آواز خصوصی ضمیمہ	۱۴ نومبر	۱۹۸۸ء
نہرو کا آدرش	راج آنند	بہار کی خبریں	نومبر	۱۹۶۴ء
نہرو کچھ یادیں	انور صدیقی ترجمہ	صبح، نہرو نمبر		۱۹۶۸ء
نہرو کے آدرش	سلیم قدوائی	نیا دور	مئی	۱۹۶۸ء
نہرو کے جانشین شاستری	عبدالمجیب	نیا دور	جنوری	۱۹۶۸ء
نہرو کی عظمت	مسعود حسین خاں	صبح، نہرو نمبر		۱۹۶۸ء
نہرو مفکر اور ادیب	احتشام حسین	صبح، نہرو نمبر		۱۹۶۸ء
نہرو مہاتما گاندھی کی نظر میں		صبح، نہرو نمبر		۱۹۶۸ء
نہرو میموریل میوزیم	گریس مورے	بہار کی خبریں	جون	۱۹۶۵ء
نہرو یگانۂ عصر	غلام رسول مہر	صبح، نہرو نمبر		۱۹۶۸ء
اس کی خوشبو گلاب کی سی ہے	حمیدہ سلطان احمد	صبح، نہرو نمبر		۱۹۶۸ء

(کتابوں، رسالوں اور مضامین کی یہ فہرست خدابخش لائبریری پٹنہ میں منعقدہ ایک نمائش پر مبنی ہے اور اس کا جامع ہونا یقینی نہیں)

اردو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

فون نمبر: ۳۲۶۳۴۴۸، ۳۲۷۶۲۱۱

ایوانِ اردو دہلی

ادارۂ تحریر

سید شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی

جلد: ۳، شمارہ: ۹ ● فی کاپی ۵۰ / ۲ روپے، سالانہ قیمت ۲۵ روپے ● جنوری ۱۹۹۰ء

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ

ماہنامہ ایوانِ اردو دہلی

اردو اکادمی، دہلی — گھٹا مسجد روڈ،

دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خوشنویس: تنویر احمد

سید شریف الحسن نقوی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے سیما آفسیٹ پریس دہلی ۱۱۰۰۰۶ سے چھپوا کر دفتر اردو اکادمی نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا

آغاز

اُردو زبان اپنے آغاز ہی سے مختلف الخیال اور مختلف العقائد افراد اور گروہوں کو باہم دگر قریب لانے کا خوش گوار فریضہ ادا کرتی رہی ہے بلکہ یہ کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا کہ یہ زبان اسی ضرورت کے تحت وجود میں آئی اور پھر اس نے اس اہم تاریخی اور تمدّنی ضرورت کو جس خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ پورا کیا' اس میں کوئی دوسری ہندوستانی زبان مشکل ہی سے اس کی برابری کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ آج بھی ملک گیر رابطے کی زبانیں دو ہی ہیں؛ ایک ہندی جسے ملک کی سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے اور دوسری اُردو جسے نہ تو مرکز اور نہ بیشتر ریاستوں میں کوئی سرکاری حیثیت ملی ہے لیکن جو کشمیر سے کنیا کماری تک ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جسے دوسری زبانوں والے بھی غیر زبان والوں کے سامنے اپنا مافی الضمیر ظاہر کرنے کے لیے کام میں لاتے ہیں۔

ماہرینِ لسانیات اس امر پر متفق ہیں کہ اردو اور ہندی ایک ہی ماں کی دو بیٹیاں ہیں۔ یہ دونوں کھڑی بولی سے نکلی ہیں لیکن جداگانہ تہذیبی اور ادبی پس منظر میں پروان چڑھنے کی وجہ سے دو مختلف زبانیں بن گئی ہیں۔ دونوں کے درمیان سب سے نمایاں فرق رسم الخط کا ہے لیکن اس اختلاف اور فرق کے باوجود یہ دونوں زبانیں جتنی ایک دوسرے سے قریب ہیں' ہندوستان کی دوسری کوئی دو زبانیں آپس میں اتنی قریب نہیں۔ اس صورت میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ آپس میں سگی بہنوں کی طرح مل جل کر رہیں اور ایک دوسرے کی ترقی میں مددگار و معاون ہوں لیکن بد قسمتی سے ایک تاریخی موڑ پر ملکی حالات نے کچھ ایسی شکل اختیار کی کہ ان کے باہمی رشتے کو رقابت کی شکل دے دی گئی۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں اُردو پر واقعی بڑا بُرا وقت پڑا تھا۔ اور اس ہر دل عزیز زبان کے خلاف شکوک اور شبہات کی ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی تھی جس نے اس کے قدرتی ارتقا کی راہ میں بہت سی رُکاوٹیں پیدا کر دی تھیں۔

یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ آزاد ہندوستان کا پہلا وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو جیسا وسیع النظر اور روشن خیال سیاست داں بنا۔ انھوں نے اُردو زبان و ادب اور ان گنگا جمنی تہذیبی اقدار کی' جن کی ترجمانی یہ زبان و ادب کرتے تھے' بدلے ہوئے حالات میں بھی پُر زور وکالت کی۔ یہ انھیں جیسے قومی رہنماؤں کی کوششوں کا ثمرہ تھا کہ دھیرے دھیرے شکوک و شبہات کے گہرے گھنے بادل چھٹنا شروع ہوئے اور محترمہ اندرا گاندھی کے دورِ حکومت میں سرکاری سطح پر کئی ایسے عملی اقدامات کیے گئے جو اُردو کی ترویج و ترقی میں معاون ہوئے۔ ان اقدامات کا ایک حصہ مرکز میں ترقی اُردو بورڈ اور متعدد ریاستوں میں اُردو اکادمیوں کا قیام تھا۔ عوامی حلقوں میں بھی اس زبان کے خلاف جو بے جا تعصب تھا وہ بڑی حد تک دُور ہو چکا ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اُردو کی سرگرم مخالفت کا زور باقی نہیں ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ یہ مخالفت بالکل ختم ہو چکی ہو۔ خصوصیت سے اُردو تعلیم کی راہ میں جو مشکلات پیدا ہو گئی تھیں انھیں نہ صرف باقی رکھا جا رہا ہے بلکہ نئی مشکلات بھی پیدا کی جا رہی ہیں۔

جہاں تک اُردو والوں کا تعلق ہے مقام شکر ہے کہ ان کے دلوں میں ہندی کے خلاف کوئی جذبہ نہیں ہے اور انھوں نے اس حقیقت کو بہ خوبی سمجھ لیا ہے کہ ہندی کی ترویج و ترقی سے اردو کو کسی طرح کا نقصان پہنچنے والا نہیں بلکہ بالواسطہ طور پر کچھ فائدہ ہی پہنچ سکتا ہے لیکن ہندی دوستوں کے بعض حلقوں میں یہ بدگمانی اب بھی پائی جاتی ہے کہ اردو کی ترویج و ترقی ہندی کے راستے کا روڑا بن سکتی ہے۔ زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس بدگمانی کا شکار وہ لوگ بھی ہیں جو خود کو دانشور کہلانا پسند کرتے ہیں مثال کے طور پر امرت رائے اور ڈاکٹر نامور سنگھ کے نام

یے جا سکتے ہیں جن کی اُردو دشمن تحریریں چھپ کر دونوں اُردو اخبارات و رسائل میں تعریض و تنقید کا ہدف بنی ہیں۔ اس قسم کی تحریروں سے اُردو کے خلاف ایک عام فضا بھی بنتی ہے اور انتظامیہ کے اس حصے کو جو بوجوہ اُردو کی مخالفت میں مستعد ہے، اخلاقی تقویت حاصل ہوتی ہے۔

ہندوستان میں بے شمار تنظیمیں اُردو کی ترویج و ترقی کے لیے کام کر رہی ہیں یا کم از کم اس کی دعوے دار ہیں۔ ان میں سے اکثر مقامی نوعیت کی ہیں۔ لیکن کچھ ریاستی سطح پر اور کچھ ملک گیر پیمانے پر بھی سرگرم ہیں۔ مقامی انجمنیں زیادہ تر ادبی نشستوں اور مشاعروں وغیرہ کے انعقاد تک اپنی سرگرمیاں محدود رکھتی ہیں۔ ادبی نشستیں اور مشاعرے بظاہر اردو کے حق میں کسی دور رس اور پائدار افادیت کے حامل نہیں لیکن یہ اُردو والوں کے ادبی اور شعری ذوق کو، جو ایک قابلِ قدر تہذیبی وصف ہے، زندہ رکھنے اور اسے تازگی بخشنے کا وسیلہ ضرور ہیں۔ ان میں شرکت کی بدولت بہت سے غیر اردو داں بھی اُردو کے قریب آجاتے ہیں اور اس طرح وہ لسانی تعصب جو محض ناواقفیت کی وجہ سے ان کے ذہنوں میں جگہ بنائے ہوتا ہے کم ہو جاتا ہے جو اُردو کے لیے یقیناً ایک نیک شگون ہے۔ اس افادیت کے باوجود ہمیں مشاعروں پر نسبتاً کم اور تعلیم پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ تعلیم کے میدان میں یہ مقامی انجمنیں یقیناً زیادہ اہم اور مؤثر رول ادا کر سکتی ہیں۔

ریاستی اور ملکی انجمنیں اردو کے تعلیمی مسائل سے بھی دلچسپی لیتی ہیں اور اکثر ریاستی و مرکزی سرکاروں تک اپنے مطالبے پہنچانے کے لیے عوامی تحریکیں بھی چلاتی ہیں۔ لیکن ایک افسوسناک حقیقت کا اعتراف ضروری ہے جو لوگ اُردو قائدین میں شمار ہوتے ہیں ان میں اتحادِ عمل کی بہت کمی ہے اور کچھ لوگ اپنا اخلاقی بھرم بھی کھو چکے ہیں۔ عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اُردو کو زینہ بنا کر ذاتی ترقی کے مدارج طے کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا سمجھنا کچھ زیادہ غلط بھی نہیں کیونکہ ایسی کئی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں جو اس خیال کی توثیق کے لیے کافی ہیں۔ لیکن ایسے بے غرض اور بے لوث اُردو قائدین بھی موجود ہیں جو محض زبان کی محبت میں کام کر رہے ہیں۔ ہم اُردو کے ایسے ہی خواہوں سے درخواست کرتے رہے ہیں اور کریں گے کہ وہ لوگ اپنے باہمی اختلافات کو جو زیادہ تر شخصی تحفظات و تعصبات پر مبنی ہیں دور کرنے کی کوشش کریں اور ذاتی مناقشات سے اوپر اُٹھ کر اجتماعی انداز میں کام کرنے کی عادت ڈالیں۔

جہاں تک اُردو عوام کا تعلق ہے انھیں یہ ذہن نشین کرانے کی ضرورت ہے کہ اردو سے دست برداری اپنے تہذیبی تشخص اور تاریخی شناخت دونوں سے دست برداری کے مترادف ہے اور یہ نقصان ایسا نہیں جسے کچھ مفروضہ وقتی مصلحتوں کی خاطر برداشت کر لیا جائے۔ روٹی روزی کا سوال یقیناً اہم ہے لیکن کچھ دوسرے معاملات و مسائل بھی ہیں جو کم اہم نہیں۔ پھر یہ محض ایک واہمہ ہے کہ اُردو پڑھنے والی نسلیں معاشی ترقی کی دوڑ میں دوسروں سے پیچھے رہ جائیں گی۔ اُردو پڑھانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ کے بچے دوسرے نصابی مضامین نہیں پڑھیں گے۔ اگر بچہ اُردو پڑھ رہا ہے تو اسے ہندی یا انگریزی یا کوئی اور زبان پڑھنے سے کون روک سکتا ہے اور جو دوسرے ضروری مضامین ہیں ان سے بھی اسے کیونکر نابلد رکھا جا سکتا ہے؟ اب ہر مضمون پر اُردو میں معیاری کتابیں موجود ہیں اس صورت میں کوئی وجہ نہیں کہ اُردو پڑھنے والا بچہ اپنے ہم سبقوں سے پیچھے رہ جائے۔ اس کے برعکس عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے اور ممتاز ماہرینِ تعلیم یہ کہتے بھی رہے ہیں کہ مادری زبان میں تعلیم پانے والا بچہ ان بچوں کے مقابلے میں زیادہ باصلاحیت ہوتا ہے جو غیر مادری زبان میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس کے باوجود اس پر اصرار بے جا ہوگا کہ آپ اپنے بچوں کو اُردو میڈیم سے ہی پڑھائیں۔ چاہیں تو انھیں ہندی میڈیم سے پڑھائیں، چاہیں تو انگریزی میڈیم سے لیکن ایک زبان کے طور پر انھیں اُردو بھی پڑھائیں۔ یہ آگے چل کر ان کے حق میں ضرر رساں نہیں، مفید ہی ثابت ہوگا۔ کئی سرکاری محکمے مثلاً پولیس کا محکمہ، ڈاک اور تار کا محکمہ، عدالتیں، سرکاری لائبریریاں، اسکول وغیرہ ایسی جگہیں ہیں جہاں ملازمت کے لیے اُردو جاننا ایک اضافی قابلیت ثابت ہو سکتا ہے۔

کبھی کبھی خیال گزرتا ہے کہ یہ غلط فہمی جس میں اُردو کے بعض دانشور بھی گرفتار ہیں اُردو کے مخالفوں کی پھیلائی ہوئی تو نہیں! معاش کا مسئلہ ہمیشہ اہم مسئلہ ہے اور موجودہ زمانے میں تو یہ اور بھی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ معاشی تحفظ کی ضمانت ہر شخص کی پہلی ترجیح بن گئی ہے اور بننا بھی چاہیے۔ اندریں حالات اگر کسی گروہ کو یہ باور کرا دیا جائے کہ کوئی خاص زبان پڑھنے سے اس کا اور اس کی آنے والی نسلوں کا معاشی مستقبل خطرے میں پڑ سکتا ہے تو باوجود اس کے کہ وہ زبان اس کے تہذیبی تشخص کا ذریعہ ہو اور وہ اس کے ساتھ جذباتی وابستگی بھی رکھتا ہو، اس سے کنارہ کشی اختیار کر سکتا ہے ——— اُردو کے بارے میں یہ بے بنیاد خیال اگر اس کے مخالفوں نے پھیلایا ہے تو ہمیں ان کی غیر معمولی ذہانت کا قائل ہو جانا چاہیے اور اگر ہم نے اسے بغیر کسی غور و فکر کے قبول کر لیا ہے تو اپنی

کم فہمی بلکہ نافہمی کا ماتم کرنا چاہیے۔

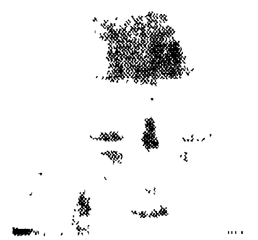
میں بار بار عرض کر چکا ہوں اور پھر زور دے کر کہتا ہوں کہ حکومت اور انتظامیہ سے ہمارے جو مطالبات ہیں انھیں منوانے کے لیے ہمیں تمام آئینی طریقے اختیار کرنے چاہئیں اور پوری کوشش کرنی چاہیے کہ اُردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافیاں ختم ہوں لیکن اس کے ساتھ ہمیں خود اپنی ذمے داریوں کو بھی سمجھنا اور پورا کرنا چاہیے ——— آخر اُردو کی تعلیم اور اس کے چلن کو فروغ دینے کے لیے ہم بھی تو کچھ کر سکتے ہیں۔ اپنے بچوں کو اُردو پڑھانے کے ساتھ ساتھ ہم اپنے ماہانہ بجٹ میں اُردو کے اخباروں، رسالوں اور کتابوں کی خرید کا بھی خیال کر سکتے ہیں۔ آخر اپنے مطالعے کی میز پر ہم صرف انگریزی مطبوعات رکھ کر کیوں خوش ہوتے ہیں جو اردو مطبوعات سے کئی گنا مہنگی ہوتی ہیں؟ اپنی نیم پلیٹوں، دکانوں اور دفتروں کے سائن بورڈوں پر اُردو کو جگہ دینے سے ہمیں کون روکتا ہے؟ اپنے کاروبار کا حساب اُردو میں رکھنے کا ہمیں حق حاصل ہے اور اگر ہم تقریبوں کے دعوت نامے اردو میں چھپوائیں تو ہم پر کون معترض ہو سکتا ہے؟ ہم اپنے خطوں پر پتے اُردو میں کیوں نہیں لکھتے؟ کیا اس اندیشے سے کہ پتے اُردو میں لکھے گئے تو خطوط منزلِ مقصود پر نہیں پہنچیں گے؟ یہ اندیشہ بے بنیاد ہے۔ ہزاروں لاکھوں خطوں کو محکمہ ڈاک ضائع نہیں کر سکتا۔ شروع شروع میں یہ ہوگا کہ ایسے خطوط کے پتے محکمہ ہندی یا انگریزی میں منتقل کرا کے انھیں مکتوب الیہ تک پہنچانے کا انتظام کرے گا۔ پھر یہ نوبت آسکتی ہے کہ ڈاک رسانوں کے لیے اُردو جاننا ایک اضافی قابلیت قرار دے دیا جائے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایسا ہوا تو اس سے اُردو کی تعلیم اور چلن دونوں کو فروغ ہوگا۔

اپنے ماہانہ بجٹ میں اُردو مطبوعات کی خریداری کے لیے ایک رقم مخصوص کر دینا بھی دور رس نتائج پیدا کرے گا۔ ہندوستان میں لاکھوں بلکہ کروڑوں اُردو جاننے والے ہیں۔ اگر وہ سب ایسا کرنے لگیں تو اردو کی کساد بازاری کی جو عام شکایت ہے وہ دور ہو سکتی ہے اور اُردو کے اشاعتی ادارے مضبوط مالی بنیادوں پر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ یہ عادت کہ اردو مطبوعات دوسروں سے مانگ کر پڑھ لی جائیں یا اعزازی طور پر حاصل کی جائیں اُردو کو بہت نقصان پہنچانے والی ہے۔ سرکاری یا سرکار سے امداد یافتہ اداروں کی طرف سے شائع ہونے والے رسائل و کتب کے بارے میں خاص طور پر یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اعزازی طور پر حاصل ہوں۔ یہ درست ہے کہ ان اداروں کا مالی خسارہ سرکار پورا کر دیتی ہے۔ لیکن ان رسائل و کتب کی خریداری یا عدم خریداری سے اس زبان کی مقبولیت اور اس کے اثر و رسوخ کا اندازہ بھی لگایا جاتا ہے جس میں یہ شائع ہوتے ہیں۔ خریداروں کی تعداد کم ہے تو حکومت اس زبان کو غیر مقبول یا مردہ سمجھ کر اس میں اپنی اشاعت کا سلسلہ بند بھی کر سکتی ہے۔ ماضی میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ اگر ہم نے اپنا طرزِ فکر نہ بدلا تو آئندہ بھی ایسی مثالیں سامنے آسکتی ہیں۔

اُردو اپنے ارتقا کے ابتدائی دور میں ہر طرح کی سرکاری سرپرستی سے محروم تھی لیکن پھر بھی وہ پھولتی پھلتی رہی کیونکہ اس کے بولنے والے اسے سینے سے لگائے رہے۔ اردو اب ترقی کی ان منزلوں تک آپہنچی ہے جہاں اس کے بولنے والے، اس کے چاہنے والے ہی اگر اس کا ساتھ نہ چھوڑ دیں تو دوسری کوئی طاقت اسے اپنے فطری ارتقا کی تازہ تر منزلیں سر کرنے سے نہیں روک سکتی۔

——— سیّد شریف الحسن نقوی

[redacted]



شمس الرحمٰن فاروقی

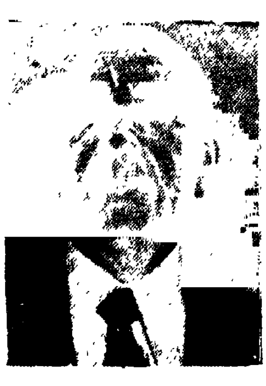
رایہ شعر بالآخر تجھے اپنی خبر دے گا
رے سب ہمدموں کو بھی نوائے معتبر دے گا
ھلا اس جستجوئے سائبان و در سے کیا حاصل
ھے معلوم ہے مجھ کو وہ دوزخ ہی میں گھر دے گا
یؔ لوگوں کو دیکھا ہے وہ دامن بھی نہیں رکھتے
ہ ننگے سینوں میں وہ چاندنی کے پھول بھر دے گا
ل امّید کے دامن پہ چشمِ تر نے لکھا ہے
یں کب تو سکوتِ آب سے آزاد کر دے گا
ں اتنا پوچھ لوں آنے میں اس کے دیر ہے کتنی
ھلا اتنی بھی فرصت تو مجھے اے رہ گزر دے گا
مندر میں لگائے گا کبھی یاقوت کی قلمیں
بھی مٹی کی مورت کو چراغِ بے بصر دے گا
ھے سب کچھ سکھا کر کاٹ ڈالے گا زباں میری
نائی میں وہ آنکھوں سے تکلم کا ہنر دے گا

۲۲۶، ڈاک تار بھون، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

جیتے جی ہلکان ہوئے ہم یعنی اپنا بھوت ہوئے　　اپنے گہرے غم کے کارن ویرانی کا دوت ہوئے
تن گھایل ہے، من افسردہ، اپنا پن مفقود ہوا　　پھر بھی ہم کیونکر زندہ ہیں سوچا تو مبہوت ہوئے
پروازِ فکر و تخئیل کے باعث عالم خاکی ہیں　　تھے کچھ ایسے انساں بھی جو شاہینِ لاہوت ہوئے
بے بس، بیکس، بیچمیرز و بیچمداں ہیں، بے حس ہیں　　ہم کیا جانیں لطفِ جوانی، ہم پیرِ فرتوت ہوئے
اے اکلوتے بیٹے، لیٹے لیٹے کیا حاصل ہو گا　　اہلِ عمل ارکانِ رکینِ انجمنِ ناسوت ہوئے
پیار، اخلاص ایثار، وفا کی قدروں کا فقدان ہوا　　دورِ نو کے اہلِ سیاست مرعوبِ طاغوت ہوئے
سچ پوچھو تو مرقد تک بھی ساتھ نبھانا مشکل تھا　　کیا یہ کم ہے یار ہمارے ہمراہِ تابوت ہوئے
ہم کیا چیز ہیں ہم تو دُنیاداری کے دلدادہ ہیں　　پیر فقیر اسیرِ زنجیرِ لعل و یاقوت ہوئے
عہدِ جوانی کا وہ کیف و رنگ کہاں، آہنگ کہاں　　اندوہِ پیرانہ سری سے ماتہ اہلِ جبروت ہوئے

جب سنسار سہانہ گیا دل سے بے چین رہا نہ گیا
کرشنا موہن ہار گئے، بیراگ لیا، اودھوت ہوئے

کرشن موہن



۱۵۸، پشپانجلی، آئی۔ پی۔ ایکسٹینشن II، دہلی

راج نرائن رازؔ

مولانا آزاد ــــ کچھ شاعری کے حوالے سے

مولانا آزاد کی تخلیقیت، طبعِ حاضر اور جولانیٔ طبع کے تعلق سے اُن کی شاعری پر نظر ڈالیں تو بعض بہت دلچسپ باتیں سامنے آتی ہیں۔ مولانا آزاد نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز وادیٔ شعر سے کیا۔ یہی وہ میدان ہے، جس میں مولانا نے، کم عمری کے باوجود، اپنی جولانیٔ طبع کے جوہر دکھائے۔ اس مختصر مقالے میں، مولانا کی شاعری کے حوالے سے اُن کی تخلیقیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یعنی مولانا آزاد کی شاعری براہِ راست موضوع نہیں ہے۔

صحیح تناظر کے لیے بعض باتوں کو مختصراً دہرانا نامناسب نہ ہوگا۔ مولانا آزاد مکّہ میں ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، مولانا آزاد کی مادری زبان عربی تھی۔ وہ عمر کے ابتدائی دس برس مکّہ میں رہے تھے۔ ظاہر ہے، ان دس برسوں میں مولانا آزاد کی تقریر اور تحریر کی زبان عربی رہی ہوگی۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ مولانا آزاد اپنے والدین کے ساتھ ۱۸۹۸ء میں مکّہ سے کلکتہ میں منتقل ہو گئے تھے۔

غلام رسول مہر، ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری اور دیگر آزاد شناسوں کے بیان کے مطابق، مولانا عمر کی گیارھویں منزل میں تھے، جب انھیں شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اُن کی پہلی غزل بمبئی سے نکلنے والے گلدستہ ارمغانِ فرخ بابت جنوری ۱۸۹۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ گویا مولانا گیارہ برس کی عمر میں پہلی مرتبہ مطبوعہ لفظ کے نشے سے سرشار ہوئے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"ارمغانِ فرخ میں یہ غزل چھپ کر آئی تھی اور زندگی میں پہلی بار میں نے اپنا نام ایک رسالے میں چھپا ہوا دیکھا تھا۔"

حقائق سامنے کے ہیں۔ ایک امر البتّہ توجہ چاہتا ہے۔ ایسا بچّہ جس کی مادری زبان عربی تھی، محض برس بھر کے عرصے میں ایک غیر زبان یعنی اُردو، جو بعد میں اس کی اپنی زبان ٹھہری، اتنی استعداد پیدا کر لیتا ہے کہ اس میں معقول حد تک پختہ اشعار کہنے لگتا ہے۔ اِن اشعار کی پختگی اور حسن کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ اُسی زمانے میں ملک کے مختلف حصّوں سے نکلنے والے رسائل اور گلدستوں میں شائع ہونے لگے تھے۔ مثلاً اُن کی پہلی ہی غزل: مقطع ملاحظہ ہو:

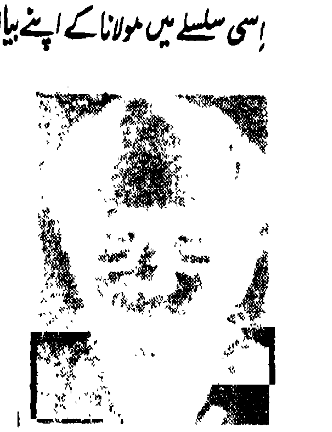
آزادؔ بے خودی کے نشیب و فراز میں
پوچھی زمیں کی، تو کہی آسمان کی

اِس غزل کے چار منتخب اشعار ارمغانِ فرخ میں شائع ہوئے تھے۔

مولانا جیسے نابغہ کی صلاحیتوں سے کچھ بعید نہیں۔ تاہم اس سلسلے کی بعض باتیں زیادہ تعجب خیز ہیں۔ یہ کم عمری کے باوجود، مولانا کی جودت، اور جولانیٔ طبع کی دلیل ہیں۔ مثلاً یہی نہیں کہ مولانا نے اتنی کم عمری میں شاعری شروع کی بلکہ یہ کہ اُن کی غزلوں میں اشعار کی تعداد زیادہ حیرت میں ڈالنے والی ہے۔ اُن کی پہلی ہی غزل میں اشعار کی تعداد توجہ چاہتی ہے۔ مولانا نے یہ غزل مصرعِ طرح پر کہی تھی اور مشاعرے میں سنانے کے لیے سترہ اشعار منتخب کیے تھے۔ مولانا نے مشاعرے میں غزل خود نہیں پڑھی۔ انھیں جھجک کم عمری کے باعث رہی۔ مشاعرے میں خود شعر نہ پڑھنے کے بعض دوسرے اسباب بھی ہیں میں یہاں اُن کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔

میں مولانا کی طبّاعی کے تعلق سے اشعار کی تعداد کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ آزمائش میں ڈالے جانے پر بھی وہ بہ سہولت ۴۱ شعر کہہ لیتے ہیں۔ مولوی محمد یوسف رنجورؔ کے علمی ذخیرے سے دستیاب مولانا کی ایک غزل تو ۵۹ اشعار پر مشتمل ہے۔ مولانا نے غزل کے علاوہ مثنوی، رباعی قطعہ جیسی دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی۔ مثنوی زیادہ تعدادِ اشعار کی متقاضی ہوتی ہے کہ نظم قصّے کی تکمیل یا اپنے کلائمکس تک مصرع مصرع بتدریج مکمّل ہوتی ہے۔ مولانا نے اس صنف میں بھی طبع آزمائی کی۔

اسی سلسلے میں مولانا کے اپنے بیان



۳۰/۲۹، ایسٹ پٹیل نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۸

کیے ہوئے دو واقعات خاص طور پر توجہ چاہتے ہیں۔ یہ دونوں واقعات اُن کی طبع حاضر اور فی البدیہہ گوئی کی دلیل ہیں۔ پہلا واقعہ نادر خاں شوخی رامپوری سے ملاقات کا ہے۔ شوخی رامپوری غالب کے آخری دور کے شاگرد تھے۔ شوخی رامپوری کسی بھی طور پر یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ جو شعر مولانا مشاعروں میں پڑھتے ہیں، وہ خود اُن کے اپنے ہوتے ہیں۔ رفع شک کے لیے شوخی رامپوری نے ایک ملاقات میں مولانا کو ایک مصرع دیا اور اصرار کیا کہ وہ ابھی غزل کہیں۔ مولانا نے کھڑے کھڑے غزل کے چھ شعر کہہ دیے۔ اس پر فرمائش ہوئی کہ تعداد طاق ہونی چاہیے۔ مولانا نے فوراً ایک شعر اور کہہ دیا۔ اس غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

وعدۂ وصل بھی کچھ طرفہ تماشے کی ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی اُن کو کبھی یاد نہ ہو

دوسرا واقعہ ظہیر احسن شوق نیموی سے ملاقات کا ہے۔ یہ ملاقات اپریل ۱۹۰۲ء میں ہوئی تھی۔ یہاں یہ ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اس سے پیشتر شوق نیموی کی شاگردی اختیار کر چکے تھے۔ وہ خط و کتابت کے ذریعے کلام پر اصلاح لیا کرتے تھے۔ ملاقات پر شوق نیموی کو یقین ہی نہیں آیا کہ تیرہ چودہ برس کا یہی لڑکا ابوالکلام ہے جو اصلاح کے لیے اپنا کلام بھیجا کرتا ہے۔ شوق نیموی نے آزمائش کے طور پر ایک مصرع دیا اور فی البدیہہ غزل کہنے کی فرمائش کی۔ مولانا نے ۱۴ اشعار کی غزل فی البدیہہ کہہ دی۔ گویا مولانا شعر کہتے چلے جاتے تھے اور ان کے ادبی ذوق کی سیری نہیں ہوتی تھی۔

پس منظر کے طور پر یہ عرض کر دوں کہ مولانا کو شاعری کا شوق سہسرام کے ایک شخص مولوی عبدالواحد کی صحبت میں پیدا ہوا تھا۔ مولوی عبدالواحد فاروق چڑیا کوٹی کے شاگرد تھے۔ وہ کلکتہ میں مولانا کے گھر پر اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ وہ خود بھی مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ مولانا سے ملاقات ہوتی تو انھیں مشاعروں کی سرگزشت، داد و تحسین کے ہنگامے، شاعروں کے لطیفے خاص خاص اشعار سے متعلق واقعات سنایا کرتے۔ مولانا کے شعری ذوق نے انھیں سے مہمیز پائی۔ وہ اور زیادہ ذوق و شوق سے شاعری کرنے لگے۔ مولانا نے اپنے شعری سفر میں بلاشبہ مولوی عبدالواحد سے خوب خوب کسب فیض کیا۔

مولانا کے اساتذہ کے باب میں یہ عرض کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ابتداً انھوں نے اپنے ہی وجدان و شعور کو اپنا رہنما بنایا۔ جب تک مطمئن نہ ہوتے، خود ہی اشعار میں ردو بدل، ترمیم و تنسیخ کرتے رہتے۔ بعد میں امیر مینائی (۱۸۹۹ء کے آخر آخر) سے مشورۂ سخن کیا۔ لیکن استاد کی دی ہوئی اصلاح سے تشفی نہ ہوئی اور وہ شوق نیموی کے حلقۂ تلمذ میں آ گئے۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری کا بیان ہے کہ کچھ دنوں تک مولانا نے امداد حسین ظہور میرٹھی سے بھی استفادہ کیا تھا۔

اپنے شوق کی تکمیل کے لیے مولانا نے خود ایک گلدستہ نیرنگ عالم کے نام سے شائع کرنا شروع کیا۔ یہ آٹھ ماہ سے زیادہ عرصے تک نہ چل سکا۔ یہ گلدستہ ۱۹۰۰ء کے اوائل میں جاری ہوا تھا۔ گویا مستقبل کے صاحب طرز صحافی مولانا آزاد نے ادبی صحافتی زندگی کا آغاز تیرہ برس کی عمر میں کیا۔ ۱۹۰۱ء میں، مولانا نے ایک اور گلدستہ المصباح کے نام سے جاری کیا۔ یہ بھی تین چار ماہ سے زیادہ نہ چل سکا۔ اپنے جاری کردہ گلدستوں کے علاوہ مولانا کا کلام ملک کے مختلف حصوں سے نکلنے والے گلدستوں، رسائل اور اخبارات مثلاً سفینۂ نجات بمبئی، الپنچ پٹنہ، مخزن لاہور، خدنگ نظر لکھنؤ وغیرہ میں شائع ہوا کرتا تھا۔ ان رسالوں، گلدستوں میں، مولانا کے کئی سو اشعار تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ یہ اشعار مولانا کی تحریروں میں بھی آ گئے ہیں۔

مولانا آزاد کا جو کلام مولوی محمد یوسف رنجور کے علمی ذخیرے سے دستیاب ہوا ہے، وہ زیادہ تر ۱۹۰۱ء اور ۱۹۰۲ء کا ہے۔ اس کے بعد کا شعری سرمایہ صرف چھ رباعیات اور چند متفرق اشعار (۱۹۱۷ء کی نظر بندی اور قلعۂ احمد نگر کی قید کے زمانے کے) ہیں۔ گویا مولانا کی شاعری بہ اعتبار زمانہ ۱۸۹۸ء کے اواخر سے ۱۹۰۳ء تک کے عرصے پر محیط ہے۔

اس زمانے میں مولانا نے جو شاعری کی وہ آج ہمیں روایت میں جکڑی اور بندھے ٹکے خیالات و موضوعات پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ ظاہر ہے اس نوع اور انداز کی شاعری مولانا جیسے طبّاع کو تا دیر مسحور نہیں رکھ سکتی تھی۔ قاتل، دشمن، جلّاد، کشتہ، تیر، ترچھی نظر، (بے نقاب) محبوب (جگر فگار) عاشق، وعدۂ وصل، تصویر، نظارہ، ظلم، غم وغیرہ اور اس جیسی لفظیات اس شاعری کی مبادیات تھیں۔

غلامی اور اسیری کے زمانے میں بھی یہ لفظ استعارہ، تمثیل اور علامت کیوں نہیں بن پاتے؟ غور کریں تو اسباب واضح ہونے لگتے ہیں۔ یہ مولانا آزاد کے لڑکپن کی شاعری ہے اور یہ کہ مولانا کا سیاسی شعور ابھی بیدار نہیں ہوا تھا۔ انھیں ابھی اُن راہوں کی بشارت نہیں ملی تھی، جن پر مستقبل میں انھیں چلنا تھا۔ اس پر بھی مولانا کے مزاج میں نئے پن کے لیے جو تڑپ پائی جاتی ہے، اس کے نقش اور عکس اس شاعری میں بھی بخوبی دیکھے جا سکتے ہیں۔

مولانا کی تخلیقیت اور جولانیِ طبع ہر آن نئی وسعتوں کی متقاضی، اظہار نئی راہوں کا متمنی۔ چنانچہ یہ دُنیائے شعر انھیں زیادہ عرصے تک محصور نہیں رکھ پائی۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں، کہ مولانا نے، غلط یا صحیح، اس شاعری کو کارِ طفلاں ہی تصوّر کیا۔ اور نثر میں نئی راہیں تلاش کیں۔

نثر لکھی، ایسی کہ نظمِ حسرت میں بھی مزا نہ رہا۔ نثر میں بھی وہ متعدّد اسالیب کے حامل ادیب ٹھہرے۔ وہ ظرفِ قدح خوار کے رمز آشنا تھے۔ اسلوب حسبِ موقع اختیار کرتے تھے۔ اُن کے متعدد اور ہمہ صفات اسالیب نثر اُن کا ایسا ہنر ہیں، جس کے تفہیم و تجزیے کی گنجائش ابھی باقی ہے۔

آہ! ظفر پیامی



۱۰ر دسمبر ۸۹ء کو صبح سوا دس بجے اُردو، ہندی اور انگریزی کے مشہور صحافی اور ادیب دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر صرف اٹھاون برس تھی۔ ان کے پس ماندگان میں ان کی بیوہ محترمہ منورما دیوان کے علاوہ جو خود بھی ایک نامور مُصنّفہ ہیں، دو لڑکیاں شامل ہیں۔

دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی صاحب نے ۵۸ سال کی مختصر عمر میں صحافت اور ادب کی جو خدمات انجام دیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ برِصغیر ہند پاک اور مشرقِ وسطیٰ کے معاملات و مسائل پر وہ گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ تقریباً پندرہ سال آل انڈیا ریڈیو کے سیاسی تبصرہ نگار رہے اور انھوں نے اُردو، ہندی اور انگریزی میں بے شمار مضامین لکھے جو اُن کی سیاسی بصیرت اور عصری آگہی کے آئینہ دار تھے۔ وہ کئی کتابوں کے مُصنّف تھے جن میں ان کا اُردو ناول "فراز" اور افسانوں کا مجموعہ "دہشت" شامل ہیں۔ موخر الذکر کتاب ان کے انتقال سے چند روز پہلے شائع ہوئی تھی۔

ظفر پیامی صاحب پچھلے پونے دو سال سے اُردو اکادمی کے ممبر اور اس کی سیمینار کمیٹی کے چیئرمین تھے۔ ان کے انتقال پر اکادمی کے چیئرمین محترم لیفٹننٹ گورنر دہلی نے ان کی ان خدمات کو بہ طورِ خاص خراجِ تحسین پیش کیا جو انھوں نے اپنی اس حیثیت میں اکادمی کے لیے انجام دیں۔

ہم ظفر پیامی صاحب کے سوگوار خاندان کے غم میں شریک ہیں۔ ان کی یاد میں جلد ہی "ایوانِ اُردو" میں ایک خصوصی گوشہ پیش کیا جائے گا۔

——— ادارہ

شوکت حیات

قرار داد

ہر طرف خاموشی تھی۔

سب لوگ سر جھکائے ہوئے تھے۔

ایک عجیب سا اُداس سنّاٹا چاروں طرف چھایا تھا۔

احمد صاحب کی دردناک موت نے سب کو مغموم کر دیا تھا۔ ابھی ابھی کچھ دیر پہلے احمد صاحب ہنس رہے تھے ــــــ جو چپراسی مینیجنگ ڈائرکٹر کے ہاں سے فائل لے کر ان کے پاس آیا تھا؛ اسے تو جیسے سکتہ لگ گیا تھا۔ احمد صاحب حسبِ دستور ایک ایک فائل کھولتے جاتے تھے۔ موومنٹ رجسٹر میں ان کا اندراج کرتے جا رہے تھے۔ فائل میں نمبر چڑھا کر انھیں دوسری طرف رکھتے جا رہے تھے۔

ایک فائل کو انھوں نے کھولا تو دفتری خانہ پری کے بعد اسے خلافِ معمول دوسری طرف نہیں رکھا۔ دیر تک وہ اسے پڑھتے رہے۔ پڑھتے پڑھتے ان کے چہرے پر ایک عجیب اُداسی پیدا ہوئی۔ جیسے اندر بہت اندر تک کچھ ڈوب رہا ہو۔ دیر تک وہ کبھی کبھی آنکھوں سے فائل کو گھورتے رہے۔ پھر انھوں نے ہنسنا شروع کیا۔ ہنستے ہنستے وہ چیخنے۔ پھر ان کے حلق سے پھنسی پھنسی آوازیں نکلنے لگیں۔ چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ مُنہ کے بل فائل پر گر پڑے۔ فائل ان کے چہرے کے نیچے کسی خونی خنجر کی طرح دبی ہوئی تھی۔

سب لوگ مبہوت تھے کہ اچانک احمد صاحب کو کیا ہو گیا۔ چشم زدن کے لیے سب کچھ ٹھہر سا گیا۔ چپراسی ان پر جھکا۔ لوگوں نے انھیں ہلا کر دیکھا۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر دل کی دھڑکن محسوس کرنے کی کوشش کی لیکن احمد صاحب تو اپنے آخری سفر کے لیے کوچ کر چکے تھے۔ دفتر میں سنّاٹا چھا گیا۔ بعض لوگوں نے سمجھا کہ ان پر فائلوں کے انبار والی الماری گر گئی اور احمد صاحب کچل کر مر گئے۔

"اسی لیے کہتے تھے کہ زیادہ وفاداری مت دکھاؤ! ہر وقت بس کام ہی کام! چاروں طرف فائلوں کے ڈھیر! بچپن کی عمر میں ساٹھ ستر کے لگنے لگے تھے!"

ان کے قریبی ساتھی نے بھاری گلے سے کہا۔

"سالا مینیجنگ ڈائرکٹر بہت حرامی ہے۔ خواہ مخواہ انھیں نگاہ پر چڑھائے ہوئے تھا۔ ان کا مزاج ایسا تھا کہ یونین کا کوئی لیڈر یا کوئی اور اسٹاف ان کے ٹیبل پر آکر فائل دیکھنے لگتا تو وہ کسی کو منع نہ کرتے۔ آخر سب اسی دفتر کے فرد تھے۔ کسی سے وہ کچھ نہ چھپاتے۔ اسی پر اسس میں ایک مرتبہ مینیجنگ ڈائرکٹر کے کچھ کانفی ڈینشیل فائل سے گھپلوں کی بات کھل گئی اور یونین نے ہنگامہ کر دیا تو ان کا کیا قصور۔ گھپلا کرنے والا بڑا افسر اور نیتا ہو تو کچھ نہیں اور چھوٹا اسٹاف بغیر کسی دوشش کے اپنی جان سے ہاتھ دھوئے!"

دوسرے اسٹاف نے کہا

"ایسے ایسے افسروں کی ......"

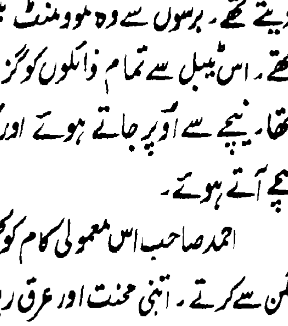
للّو بے حد غصّے میں تھا۔

بھیڑ میں سے کچھ لوگوں نے کہا۔

"احمد صاحب کو ایسے ہی رہنے دو۔ اس قاتل فائل کو بھی نیچے دبا رہنے دو۔ احمد صاحب کے خون کا بدلا ضرور لیں گے۔ مینیجنگ ڈائرکٹر کو چھوڑیں گے نہیں!"

حقیقت بھی یہی تھی کہ احمد صاحب دفتر کے کام کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ برسوں سے وہ موومنٹ ٹیبل پر تھے۔ اس ٹیبل سے تمام فائلوں کو گزرنا پڑتا تھا۔ نیچے سے اُوپر جاتے ہوئے اور اُوپر سے نیچے آتے ہوئے۔

احمد صاحب اس معمولی کام کو بھی بڑی لگن سے کرتے۔ اتنی محنت اور عرق ریزی کے باوجود انھیں ایک زمانے سے کوئی پروموشن نہیں ملی تھی۔ کبھی کبھی اوور ٹائم کے کچھ روپے مل جاتے۔ ان کے خیال کے مطابق وہ گھر کی خوشحالی کے لیے دفتر کو زیادہ سے زیادہ وقت دیتے تھے۔ لیکن دھیرے دھیرے



ڈاکٹر مہابیر بھون، مہندرو، پٹنہ ۸۰۰۰۰۶

وہ دفتر کے ہی ہو کر رہ گئے۔ اپنے لوگ ان سے دُور ہوتے گئے۔

اوورٹائم ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد ٹرین پکڑ کر اپنے گھر پہنچتے تو کافی رات ہو چکی ہوتی۔ بے روزگاری کا مارا بیٹا سو چکا ہوتا کنواری بیٹی جو شادی کی عمر پار کر چکی تھی اور مایوسی کے عالم میں رات میں کروٹیں بدلتی ہوئی بڑبڑاتی رہتی تھی، جاگ کر اپنے باپ کا انتظار کرتی رہتی۔ اس کی بروقت شادی کا انتظام نہ کر سکنے والے باپ کے لیے اس کے دل میں بے پناہ محبّت تھی۔ بیٹی اپنے باپ کی مجبوریاں اور زمانے کی سنگدلی سمجھتی تھی۔

دروازہ کھلنے پر احمد صاحب بیٹی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے اور کبھی کبھی آبدیدہ ہو جاتے۔ ان کے ہاتھ کانپنے لگتے۔

"بیٹی تو جاگ رہی ہے۔۔۔۔ میں کتنا بدنصیب ہوں کہ اب تک تیرے ہاتھ۔۔۔۔!"

بیٹی کیا بولتی۔ چپ رہتی۔ آنسوؤں کو اندر ہی اندر پیتے ہوئے باپ کے سامنے مسکرانے کی کوشش کرتی۔

"ابّو! آپ خواہ مخواہ تردّد کرتے ہیں۔ میں آپ کے لیے کیا بوجھ بن گئی ہوں!؟"

وہ تھکے تھکے قدموں سے گھر میں داخل ہوتے۔ بیمار بیوی بسترِ علالت پر درد سے کراہتی ہوئی ملتی۔ یہ سب دیکھ کر روزانہ ان کی بھوک مر جاتی۔ رات بے چینی میں بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے گزر جاتی۔ فجر کی اذان سن کر وہ بستر سے اٹھتے۔ نماز پڑھتے۔ تمام دکھوں کے باوجود انہیں خدا پر مکمل بھروسہ تھا۔ اسی وجہ سے انھوں نے دفتری ناانصافیوں کے لیے یونین سے رجوع کرنے کے بجائے ہمیشہ اپنا معاملہ خدا کے سپرد کیا۔ اس کے بعد افراتفری میں صبح کی ٹرین پکڑنے کی جانکاہ مہم کا آغاز ہو جاتا۔

جو ہونا تھا وہی ہوا۔ دفتر نے کسی طرح جینے بھر کی سہولت مہیا کی۔ بدلے میں ان کا خون نچوڑنا شروع کیا۔ ان کے نام وقت سے پہلے موت مقرر کر دی۔ احمد صاحب نے اپنے مسائل کا انفرادی حل تلاش کرنا چاہا اور خود ہی مسئلہ بن کر رہ گئے۔ تنگی اور مفلسی کے ریگستان میں وہ ننگے پاؤں چلتے رہے۔

میٹنگ ہال میں لوگ دھیرے دھیرے جمع ہو رہے تھے۔ سب کے سروں پر بوجھ تھا۔ حالانکہ عموماً یہ ہوتا تھا کہ دور کے کسی برانچ کے اسٹاف کی موت کی خبر ہیڈ آفس کے لوگوں کے لیے رنج والم کی بجائے خوشی کی خبر بن جاتی تھی۔ کسی کے مرنے کی اطلاع ملتے ہی بابو لوگ دوڑ دھوپ کر کے جلد از جلد کینڈولنس میٹنگ کا آرڈر کراتے۔ جتنی جلد تعزیت ہو جائے اتنی ہی جلدی چھٹی۔ رخصت ملتی تھی تجہیز و تکفین میں شامل ہونے کے لیے اور یار لوگ موقع غنیمت جان کر سینما ہال اور دوسری تفریح کا رُخ کرتے۔ کاروباری زندگی کی سفاکی اتنی بڑھ گئی تھی کہ بعض اعلیٰ انسانی اوصاف ان ملازمین سے چھن گئے تھے۔ سوچنے کا انداز غیر انسانی ہو چکا تھا اور اپنے ہی جیسے دکھ کے مارے کسی ملازم کی موت انھیں راحت پہنچاتی تھی۔

لیکن آج احمد صاحب کی موت نے سب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ پورے دفتر میں کھلبلی مچی تھی۔ معاملہ ہیڈ آفس کے اسٹاف کا تھا۔ آنکھوں کے سامنے ہنستا ہوا آدمی موت کی وادیوں میں اچانک گم ہو گیا تھا۔ سب لوگ لرز کر رہ گئے تھے۔

میٹنگ ہال میں بھیڑ بڑھنے لگی۔ مینیجنگ ڈائرکٹر کا انتظار تھا۔ وہی پورے دفتر کی طرف سے تعزیتی قرارداد پڑھتے تھے۔ بعض بیوقوف کسی چپراسی کی موت پر دفتر کے سب سے بڑے باس کے ذریعے تعزیتی تجویز پڑھنے کو اپنے طبقے کے لیے اعزاز اور توقیر کی بات سمجھتے تھے۔ جیسے ان کی موت پر یہ سوانگ رچا کر ان پر وہ احسان کرتا ہو۔

ایک عرصے کے بعد آج میٹنگ ہال آدمیوں سے کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ سب لوگ اس کارِ ثواب میں شامل ہو کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہ رہے تھے۔ کچھ لوگ جو عمارت کی دوسری منزل سے آئے تھے، سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے استفسار کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے احمد صاحب کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ لاش ان کے گھر بھیجی جا چکی تھی۔ انھیں یہی معلوم ہوا تھا کہ احمد صاحب کوئی فائل دیکھ رہے تھے۔ اسی وقت بھاری الماری کے نیچے کچل جانے سے ان کی موت ہو گئی۔ ان کے سیکشن کے لوگ غلط فہمی دور کر رہے تھے۔

"ان پر کوئی الماری نہیں گری تھی۔ یہ سب چھچھوں کی اڑائی ہوئی ہے۔ ہنستے ہنستے انھیں ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ سدھار گئے۔"

"جو کچھ ہوا وہ ایک مخصوص فائل پڑھنے کے بعد ہوا۔۔۔۔!" کسی نے اہم بات کہی۔

مینیجنگ ڈائرکٹر آ چکے تھے۔ چہ میگوئیاں بند ہو گئیں۔ سکریٹری نے کنڈولنس فائل میں سے ٹائپ کیا ہوا شوک پرستاو نکال کر مینیجنگ ڈائرکٹر کے حوالے کیا۔ ڈائرکٹر نے اپنی آواز میں درد پیدا کرتے ہوئے پڑھنا شروع کیا:

"شری احمد ایک کرمٹھ کرمچاری تھے۔ ہردے روگ سے ان کا دیہانت ہو گیا۔ سبھی کرمچاری ان کی آکسمک مرتیو پر ان کی آتما کی شانتی کے لیے دو منٹ مون رہ کر اپنا شوک پرکٹ کرتے ہیں!!!"

خاموشی کے دوران میں پورے استغراق کے ساتھ سر جھکائے ہوئے لوگوں نے آنکھیں بند کیں تو تمام مناظر ان کی نگاہوں کے سامنے ناچنے لگے۔ اصلی تصویر نظر آنے لگی۔ مرنے سے پہلے احمد صاحب کون سی فائل پڑھ رہے تھے۔ مرنے کے بعد کس فائل پر وہ گرے۔ اس فائل میں لکھا گیا تھا۔ بھیڑ میں مینجمنٹ کے کسی چمچے نے وہ فائل ان کے چہرے کے نیچے سے غائب کر دی۔

دو منٹ گزرے بھی نہیں تھے کہ تعزیتی خاموشی ایک چیخ کے ساتھ ٹوٹی۔ لوگوں نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اچانک انھیں یاد آیا کہ وہ ادھوری چیخ احمد صاحب کی تھی، جو انھوں نے ہنستے ہوئے دم توڑنے سے پہلے ماری تھی۔

لوگوں نے دیکھا مینیجنگ ڈائرکٹر کی پیٹھ پر احمد صاحب کی لاش لدی ہوئی ہے۔ جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے وہ کندھے جھاڑ رہا ہے۔ خطرے کی بُو سونگھتے ہی اس نے بھاگ کر اپنے چیمبر میں پناہ لینی چاہی۔ تمام لوگ اسے گھیرے میں لینے کے لیے چاروں طرف سے لپکے۔ لیکن ان میں سے بیش تر کی پیٹھ پر بھی ایک ہی احمد صاحب کی الگ الگ لاشیں لدی تھیں۔ جن کے مُنہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔

لیکن کچھ لوگوں کے کندھے ہلکے تھے۔ ان کی پیٹھ پر کسی کی لاش نہیں تھی۔ سرتاپا زندگی سے لبریز لوگ۔

یہ لوگ مسلسل آگے بڑھ رہے تھے۔ مینیجنگ ڈائرکٹر کے چاروں طرف بھیڑ کا دائرہ کستا جا رہا تھا۔ بابو اور چپراسی کورس میں بول رہے تھے:

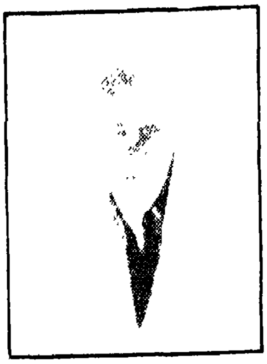
"ہم لوگ اس تعزیتی جلسے کو احتجاجی جلسے میں تبدیل کرتے ہیں۔"

"ہم لوگ اس شوک سبھا کو احتجاجی جلسے میں تبدیل کرتے ہیں۔"

"ہم لوگ . . . ."

کورس کی تیز آواز اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ 'مُردہ باد اور زندہ باد' کے نعروں سے فضا گونجنے لگی۔ مُکے ہوا میں لہرا رہے تھے افسروں میں بھگدڑ مچ گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ عمارت کی مضبوط چھت ابھی ابھی نیچے آ رہے گی۔

دراصل جو فائل احمد صاحب کی موت کا سبب بنی، وہ مینیجنگ ڈائرکٹر کے ہاں سے واپس آئی تھی۔ اس بار مینیجنگ ڈائرکٹر نے ان کی ترقی کی عرضداشت نہ صرف رد کر دی تھی بلکہ کمپلسری رٹائرمنٹ کے تحت زد میں آنے والے ملازمین کی فہرست بھی فوراً طلب کی تھی۔



رضا نقوی واہی

روڈ نمبر ۱۴/۵، گردنی باغ، پٹنہ ۱....

یہ لفافے

آج میں ایک رسالے کے جو دفتر میں گیا
محوِ ترتیبِ مضامیں تھے مدیرِ اعلیٰ

پوسٹ مین آگیا اتنے میں وہاں ڈاک لیے
پوسٹ کارڈ اور لفافوں کی کئی تھاک لیے

لگ گیا میز پہ اس طرح خطوں کا انبار
جس طرح شہر کی گلیوں میں ہو کوڑے کی قطار

لی ایڈیٹر نے انھیں دیکھ کے اک انگڑائی
کبھی رخسار پہ زردی، کبھی لالی آئی

کرکے پھر ڈاک کا تودہ تہ و بالا جھٹ سے
کارڈ جتنے تھے انھیں چن کے نکالا جھٹ سے

ان میں جو کام کا تھا، پڑھ کے الگ چھانٹ لیا
اور باقی جو بچے پھاڑ کے نیچے پھینکا

کارڈ کے بعد لفافوں کی جو باری آئی
اک عجب طرح کی چہرے پہ اداسی چھائی

دیکھتے دیکھتے رخسار کی رنگت ہوئی زرد
ایسا ظاہر ہوا جیسے کہ اٹھا پیٹ میں درد

میں نے گھبرا کے کیا حضرتِ والا سے سوال
بات کیا ہے، جو طبیعت ہوئی اس درجہ نڈھال؟

وہ یہ بولے کہ میں کیا حالِ دلِ زار کہوں
بسکہ حالات کے جنگل میں ہوں اک صیدِ زبوں

یہ لفافوں کا جو انبار نظر آتا ہے
اف، اسے دیکھتے ہی منہ کو جگر آتا ہے

یہ لفافے مرے اعصاب پہ چھا جاتے ہیں
میرے ایوانِ خیالات کو ڈھا جاتے ہیں

ان میں کچھ اور نہیں، صرف غزل ہوتی ہے
دیکھ کر جن کو طبیعت مری شل ہوتی ہے

دن میں دو بار اسی طرح سے ڈاک آتی ہے
اور ہر بار غزل تھاک کی تھاک آتی ہے

نہ تو خاکہ، نہ ڈرامہ، نہ کوئی افسانہ
بس جو آیا تو فقط "حالِ دلِ دیوانہ"

ان لفافوں میں نہ جب کوئی مقالہ نکلے
کیوں نہ اردوے معلیٰ کا دِوالہ نکلے

جس طرح سے کسی منڈی میں ہو جاپانی مال
یونہی بازارِ صحافت میں ہے غزلوں کا حال

چھاپنا چاہوں جو میں صرف غزل کے اشعار
آج بن جائے رسالہ مرا، "ڈیلی اخبار"

ہر گلی کوچے میں دس بیس سخنور ہیں ضرور
جن کے افلاس کا ہوتا ہے تغزل میں ظہور

جن کا آغاز غزل، جن کا ہے انجام غزل
دن غزل، رات غزل، صبح غزل، شام غزل

ذہن مفلس ہے، مگر مشقِ سخن جاری ہے
یہ غزل گوئی بھی اعصاب کی بیماری ہے

شعر جیسے بھی ہوں، بھیجیں گے اشاعت کے لیے
زیست دشوار ہے اب اہلِ صحافت کے لیے

"اب تو گھبرا کے یہ کہتا ہوں کہ مر جاؤں گا"
قبر میں بھی جو یہ پہنچے، تو کدھر جاؤں گا

رفعت سروش

انقلاب کا مطرب ـــــ مجاز

شاعری وجدانی کیفیت کے لفظی اظہار کا نام ہے۔ شاعری ایک نیم شعوری عمل ہے۔ شاعری کسی تحریک کی کوکھ سے جنم نہیں لیتی مگر ادبی تحریکات کو قوت بھی بخشتی ہے اور اُن سے اثر و قوّت قبول بھی کرتی ہے۔ شاعری کی ننھی کونپل علم و فضل کے ہمالیہ کی چوٹی پر نہیں پھوٹتی بلکہ انسان کے باطن میں پیدا ہوتی ہے اور انسان کا باطنی شعور متاثر ہوتا ہے۔ گرد و پیش کے ماحول سے' اپنے دوَر کے معاشرے اور سماجی حالات سے شاعری اور سماج کا رشتہ ہے تو ضرور۔ مگر ذرا پیچیدہ کیوں کہ اس میں جذبے اور جبّلت کو بھی دخل ہے۔ صرف سماجی شعور کی پختگی' شاعری کی ضامن نہیں۔ شاعری دلِ دردمند کی دھڑکنوں کی زبان بن کر بولتی ہے اور ذات کے حوالے سے سماج اور کائنات کی طرف پرواز کرتی ہے۔

مجازؔ ہمارے ان شاعروں میں ہیں جنھیں موزونیِ طبع اور فکرِ رسا کے ساتھ دلِ دردمند نصیب ہوا۔ اور جن کی وجدانی کیفیت ان کے رواں دواں اشعار سے نمایاں ہے۔ مجازؔ نے ایک ذہین فنکار کی طرح وقت کے تقاضوں کو اپنی فکر کا ایک حصّہ بنایا۔ اُن جدید خیالات و تصوّرات کو اپنے شعور میں جذب کیا جن سے جدید دُنیا روشناس ہو رہی تھی۔ سجّاد ظہیر نے "روشنائی" میں صاف الفاظ میں لکھا ہے:

"۱۹۳۰ء کے بعد چند سال میں سوشلزم کا نظریہ درمیانہ طبقے کے دانشوروں میں عام طور پر پھیل گیا تھا۔ ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کانگریس میں بائیں بازو کی سیاست واضح طور سے نمایاں ہونے لگی تھی نہرو نے اپنی سوانح حیات اور اپنے مضامین میں سوشلزم کی کھلے لفظوں میں تائید کرنا شروع کی تھی"۔

خوب پہچان لو اسرار ہوں میں
جنسِ الفت کا پرستار ہوں میں
عشق ہی عشق ہے فطرت میری
فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں
حور و غلماں کا یہاں ذکر نہیں
نوعِ انساں کا پرستار ہوں میں
محفلِ دہر پہ طاری ہے جمود
اور وارفتۂ رفتار ہوں میں

مجازؔ نے اپنا یہ تعارف ۳۵ء میں کرایا تھا۔ اس وقت جب ہندوستان میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کی داغ بیل تو نہیں پڑی تھی' ہاں لندن اور پیرس میں مشورے ہو رہے تھے۔ اس سے بھی دو سال پہلے ۳۳ء میں مجازؔ کی دو اہم نظمیں آچکی تھیں۔ "رات اور ریل" اور "انقلاب"۔ 'رات اور ریل' اپنے آہنگ کے اعتبار سے سحر انگیز نظم ہے:

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی
نیم شب کی خامشی میں زیرِ لب گاتی ہوئی
ڈگمگاتی جھومتی سیٹی بجاتی کھیلتی
وادی و کہسار کی ٹھنڈی ہوا کھاتی ہوئی

ریل کی رفتار کے ساتھ نظم کا آہنگ بُلند تر ہوتا جاتا ہے اور چالیس اشعار کی یہ نظم آخر تک پہنچتے پہنچتے انقلاب کا آہنگ پیدا کرتی محسوس ہوتی ہے:

ایک سرکش فوج کی صورت عَلم کھولے ہوئے
ایک طوفانی گرج کے ساتھ درّاتی ہوئی
ایک اِک حرکت سے اندازِ بغاوت آشکار
عظمتِ انسانیت کے زمزمے گاتی ہوئی
ہر قدم پر توپ کی سی گھن گرج کے ساتھ ساتھ
گولیوں کی سنسناہٹ کی صدا آتی ہوئی
وہ فضا میں سیکڑوں جنگی دہل بجتے ہوئے
وہ بگل کی جاں فزا آواز لہراتی ہوئی
الغرض اُڑتی چلی جاتی ہے بے خوف و خطر
شاعرِ آتش نفس کا خون کھولاتی ہوئی

مجازؔ کی یہ نظم جب ڈاکٹر مُلک راج آنند نے پہلی بار سُنی تو حیرت زدہ رہ گئے تھے انھوں نے لکھا ہے:

"اُس رات اُس نے اپنی طویل نظم "رات اور ریل" سُنائی جس میں اس نے ایک نئے موضوع کو اپنا کر' جس سے روایتی شاعری قطعاً نا آشنا تھی اور صنعتی زندگی کے محرکاتی

عکس اور استعارے استعمال کر کے ایک نئی مثال قائم کی تھی جو ان دنوں امریکہ اور یورپ کے صنعتی اعتبار سے ترقی یافتہ ممالک میں بھی پیش از وقت بات سمجھی جاتی تھی"

ان کے ابتدائی دور کی ہی ایک خوبصورت اور رواں دواں نظم ہے "اندھیری رات کا مسافر"، جس کا انقلابی آہنگ نئے قافلوں کی رفتار کا پتہ دیتا ہے:

فضا میں شعلہ افشاں دیو استبداد کا خنجر
سیاست کی سنانیں اہلِ زر کے خوں چکاں تیور
فریبِ بے خودی دیتے ہوئے بلّور کے ساغر
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں
تلاطم خیز دریا، موت کے میدان حائل ہیں
گرجتی آندھیاں بپھرے ہوئے طوفان حائل ہیں
تباہی کے فرشتے جبر کے شیطان حائل ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

ان دونوں نظموں کے بارے میں فراقؔ گورکھپوری کا تاثر اس وقت اردو شاعری میں مجازؔ کے مقام کی نشاندہی کرتا ہے:

" مصرعے دریا کی طرح جوش مار رہے تھے۔ رات کے اندھیرے اور سناٹے کو ریل کی گڑگڑاہٹ چیرتی پھاڑتی چلی جا رہی تھی۔ یہ نظم تھی مجازؔ کی جن کا نام میں نے اس وقت تک نہیں سنا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ایک نئی آواز نے اردو میں جنم لیا ہے۔ ابھی اس نظم کا اثر دھیما نہیں پڑا تھا کہ مجازؔ کی دوسری نظم "اندھیری رات کا مسافر" نظر آئی یہ نظم اور بھی زلزلہ خیز تھی۔ دونوں نظمیں جمود شکن تھیں۔ یہ نظمیں ترقی پسند شاعری کے اعلان (MANIFASTO) کی حیثیت رکھتی تھیں، یہ آواز اقبالؔ، جوشؔ، اختر شیرانی یا اردو شاعری کے دوسرے مشاہیر کی آوازوں کی صدائے بازگشت نہیں تھی۔ آسمانِ شاعری پر ایک نئے ستارے کے رقص کا سرگم اس نئی آواز میں سنائی دے رہا تھا۔ یہ آواز سن کر ہزارہا لوگوں کے جسموں میں دل کی دھڑکن اور خون کی گردش تیز ہو جاتی تھی۔ اجتماعی زندگی کا (TEMPO) بڑھ جاتا تھا یہ آواز قومی زندگی کی تقدیر کی آواز معلوم ہوتی تھی وہ تقدیر جو یکایک جاگ اٹھی تھی۔ دونوں نظمیں جشنِ نشاۃ ثانیہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ دونوں نظموں میں رات ایک نئی صبح کا پس منظر بن جاتی تھی۔ مصرعوں سے لوئیں پھوٹتی تھیں شعلے لپکتے تھے۔"

مجازؔ کی ایک اور ناقابلِ فراموش نظم ہے 'انقلاب'، اس کا سنہ تصنیف بھی ۳۳ء ہے اس نظم کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ مجاز اپنے تحت الشعور کی تیسری آنکھ سے دوسری جنگ کی عظیم تباہ کاریاں دیکھ رہے ہیں۔ ایٹمی دھماکوں کی دھمک محسوس کر رہے ہیں اور آزادی سے پہلے ہندوستان کی سرزمین پر کشت و خون کے مناظر ان کے آگے رقص کر رہے ہیں۔ نظم اس طرح شروع ہوتی ہے:

چھوڑ دے مطرب مراللہ پیچھا چھوڑ دے
کام کا یہ وقت ہے کچھ کام کرنے دے مجھے

اور پھر مطرب کے گرد و پیش کے ماحول کا نظارہ دکھاتے ہیں:

فرشِ گیتی سے سکوں اب مائلِ پرواز ہے
ابر کے پردوں میں سازِ جنگ کی آواز ہے
پھینک دے اے دوست اب بھی پھینک دے اپنا رباب
اٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں شورِ انقلاب
آ رہے ہیں جنگ کے بادل وہ منڈلاتے ہوئے
آگ دامن میں چھپائے، خون برساتے ہوئے

اور پھر شاعر شکوہ الفاظ کے ساتھ خونیں منظر پیش کرتا ہے۔ وہ منظر جسے کچھ سال بعد ۴۷ء میں دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا:

خون کی بو لے کے جنگل کی ہوائیں آئیں گی
خوں ہی خوں ہوگا نگاہیں جس طرف بھی جائیں گی
جھونپڑوں میں خوں، محل میں خوں، شبستانوں میں خوں
دشت میں خوں، وادیوں میں خوں، بیابانوں میں خوں
پُرسکوں صحرا میں خوں، بے تاب دریاؤں میں خوں
دیر میں خوں، مسجدوں میں خوں، کلیساؤں میں خوں
خون کے دریا نظر آئیں گے ہر میدان میں
ڈوب جائیں گی چٹانیں خون کے طوفان میں

اور عبرتناک خونی منظر نامہ پیش کرنے کے بعد آخر میں شاعر آزادیِ وطن کی بشارت دیتا ہے:

اس طرح لے گا زمانہ جنگ کا خونیں سبق
آسماں پر خاک ہوگی، فرش پر رنگِ شفق
اور اس رنگِ شفق میں باہزاراں آب و تاب
جگمگائے گا وطن کی حریت کا آفتاب

ایسی پُرشکوہ ایسی رواں دواں نظم، ایسی سچی نظم مجازؔ نے اس وقت کہی جب ان کی عمر صرف ۲۲ سال تھی اور وہ علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ حب الوطنی اور انقلابی شاعری کی جڑیں اردو میں بہت گہری ہیں اور مجازؔ کے شعرِ انقلاب کی کونپل انھیں جڑوں سے پھوٹی تھی۔

مجازؔ کی یہ نظمیں ہماری جنگِ آزادی کا وقیع حصہ ہیں۔ یہ نظمیں انجمن ترقی پسند مصنفین کو وراثت میں ملیں جب ۳۶ء میں ہندوستان میں اس کی بنیاد پڑی۔ اور خود مجازؔ کو کام کرنے کے لیے ایک پلیٹ فارم مل گیا۔ وہ زمانہ مجازؔ کی فعالیت کا زمانہ ہے۔ سبطِ حسن اور سردار جعفری کے ساتھ 'پرچم'، اور پھر

"نیا ادب" کا اجرا اور بے روزگار اور مفلس ہونے کے باوجود اپنے آپ کو انقلاب کے لیے وقف کر دینا انھیں دنوں کی بات ہے۔ سجاد ظہیر نے اپنی خود نوشت "روشنائی" میں لکھا ہے کہ ان کی شادی کو ایک ہفتہ ہوا تھا اور کچھ روپے ان کے پاس تھے۔ کلکتہ کانفرنس میں جانے کے لیے مجاز کا خرچ انھوں نے برداشت کیا اور مجاز اپنے ساتھیوں کے ساتھ ۳۸ء میں کلکتہ پہنچے جہاں اردو بولنے والوں کا ایک بڑا طبقہ مشاعرے میں آیا اور مجاز کا گرویدہ ہو گیا۔ لکھتے ہیں:

" مجاز بہت جلد اردو بولنے والے مزدوروں میں مقبول ہو گئے اور ان کا ترانہ:

شیر سے چلتے ہیں درّاتے ہوئے
بادلوں کی طرح منڈلاتے ہوئے
زندگی کی راگنی گاتے ہوئے
لال جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں

بہت جلد کلکتہ کے مزدوروں کا محبوب ترانہ بن گیا۔"

اس کانفرنس کا ذکر کرتے ہوئے ایک اور جگہ لکھا ہے:

" بنگال کے ادیب مجاز اور سردار جعفری کی نظمیں اتنی توجہ اور التفات سے سنتے تھے جیسے وہ کوئی نئی اور بیش قیمت چیز دریافت یا حاصل کر رہے ہوں۔"

اس وقت تک مجاز اپنی مشہور نظم "آوارہ" بھی کہہ چکے تھے جو ہندوستانی نوجوانوں کی ناآسودگی، زبوں حالی اور ان کے شوریدہ ارادوں کی منہ بولتی تصویر ہے۔ اور جس میں انگریزی سامراج سے بھرپور نفرت اور انتقام کا اظہار اور بغاوت کی للکار ہے:

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
اس کے ماتھے پہ چمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے، میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کر اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں، اس کا گلستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا، میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

ان کی ایک اور مشہور نظم "سرمایہ داری" بھی ۳۷ء میں کہی جا چکی تھی:

کلیجہ پھنک رہا ہے اور زباں کہنے سے عاری ہے
بتاؤں کیا تمھیں کیا چیز یہ سرمایہ داری ہے
غریبوں کا مقدس خون پی پی کر بہکتی ہے
محل میں ناچتی ہے، رقص گاہوں میں تھرکتی ہے

ان دنوں لکھنؤ نوجوان انقلابی ادیبوں اور شاعروں کا مرکز تھا اور مجاز سب سے مقبول شخصیت تھے اور ان سے انقلابی شاعری کا مستقبل وابستہ تھا۔ اور ان کی نئی نظموں کا انتظار رہتا تھا۔ سجاد ظہیر نے لکھا ہے:

" مجاز کی ہر ایک نظم کو ہم اس زمانے میں ترقی پسند ادب کے تخلیقی مراحل کا ایک اہم واقعہ سمجھتے تھے۔"

ان کی نظم "خوابِ سحر" ایک اور خوبصورت نظم ہے جو اشتراکی نظام کا استقبال کرتی ہے:

کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک ادھر دیکھا تو ہے

مجاز کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے قومی، وطنی اور انسانی معراج کی شاعری روشِ عام سے ہٹ کر کی۔ اس نے کھوکھلے نعروں سے گریز کیا، ہوائی باتیں نہیں کیں، بلکہ جو کچھ لکھا اس میں اس کا سوزِ دروں اور خونِ جگر شامل ہے۔ مجاز کی قومی شاعری محسوسات کی شاعری ہے۔ ہندوستان کے کروڑوں مزدوروں، کسانوں، طالب علموں اور نوجوانوں کے جذبات میں رچی ہوئی شاعری ہے۔ ان کا آہنگ نیا، اندازِ بیان نیا اور موضوعات متنوع ہیں۔ پروفیسر ممتاز حسین نے مجاز کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

" حالی کے زمانے سے دورِ حاضرہ تک ہماری قومی اور ملی شاعری کے معتدبہ حصے میں جو ایک قسم کی اکتا دینے والی خطابت پیدا ہو گئی تھی، مجاز اس رجحان کا ایک شاعرانہ ردِعمل بھی تھا۔ اس نے اپنی شاعری میں نہ غیرتِ قومی کے جذبے کو ابھارنے کی کوشش کی، اور نہ ترحم کے جذبے کو۔ بلکہ اس کے عکس اظہارِ نفس کو راہ دی۔ جگر کے زخموں کو ابھارا، اس نغمے کو زندہ کیا جو کہ شاعری کا جوہر ہوتا ہے۔ اس لطافت کو پیدا کیا جو کہ تزئین و آرائش سے آزاد ہو کر سلیقہ مندی کی حامل ہوتی ہے۔"

مجاز کے کلام کی یہ لطافت اس کے مزاج کا ایک حصہ تھی۔ وہ خشک سے خشک موضوع کو اپنے لطیف پیرایۂ بیان میں پیش کرنے پر قادر تھے۔ بہ قول فیض احمد فیض:

" مجاز کے شعر میں تھکن نہیں، مستی ہے، اداسی نہیں سرخوشی ہے۔ مجاز کی انقلابیت عام انقلابی شاعروں سے مختلف ہے۔ عام انقلابی شاعر انقلاب کے متعلق گرجتے ہیں، للکارتے ہیں، سینہ کوٹتے ہیں، انقلاب کے متعلق گا نہیں سکتے۔ مجاز انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں مطرب ہے۔ اس کے نغمے میں برسات کے دن کی سی سکون بخش خنکی ہے اور بہار کی رات

کی سی گرم جوشں تاثرآفرینی "

وطن کی محبت اوراس کے حسن کی کیفیات مجازؔ کی نظموں میں رچی ہوئی ہیں۔ انھوں نے مختلف شہروں کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ مگراپنی ذاتی مناسبت کے ساتھ ـــــ اوراس خوبصورت انداز سے کہ نظموں میں غزل سی داخلیت ہے اوران شہروں کا سماجی کردار بھی واضح ہو جاتا ہے "نذرِ علی گڑھ"، تو آج علی گڑھ یونیورسٹی کے ترانے کے انداز میں روزانہ ہزاروں طلبا گاتے ہیں۔ عجیب سرمستی ہے اس نظم میں:

سرشارِ نگاہِ نرگس ہوں وابستۂ گیسوئے سنبل ہوں
یہ میرا چمن ہے میرا چمن، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں

نظم کے آخری اشعار کیا خوب ہیں۔ ان کی لے سے علی گڑھ یونیورسٹی کی آفاقیت کا تصور ابھرتا ہے:

ابر یہاں سے اٹھّا ہے وہ سارے جہاں پر برسے گا
جوئے رواں پر برسے گا ہر کوہِ گراں پر برسے گا

دلّی کی عظمت کا ذکر ان اشعار میں ملتے ہیں:

لک شیرازِ سخن، ہندوستاں کی آبرو
سرزمینِ حسن و موسیقی، بہشتِ رنگ و بُو
عبدِ حسن و محبّت، بارگاہِ سوز و ساز
رے بُت خانے حسین، تیرے کلیسا دل گداز
تیں آباد ہیں تیرے در و دیوار میں
ر تو آباد خود شاعر کے قلبِ زار میں

لکھنؤ کا حسن ان کی نظموں میں سمایا ہوا ہے عجیب سرشاری کا احساس ہوتا ہے ازؔ کی زبان سے لکھنؤ کا ذکر سن کر:

رخصت اے ہم سفرو شہرِ نگار آ ہی گیا
خلد بھی جس پہ ہو قرباں وہ دیار آ ہی گیا

آنکھوں میں بس رہے ہیں حسینانِ لکھنؤ
رشکِ زنانِ مصر کنیزانِ لکھنؤ
اب اس کے بعد صبح ہے اور صبحِ نو مجازؔ
ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ

مجازؔ ۴۳ء میں لکھنؤ سے پھر دہلی آگئے تھے اور ہارڈنگ لائبریری (موجودہ ہردیال پبلک لائبریری) میں ملازم تھے۔ ان دنوں راقم الحروف بھی دہلی میں تھا اور مجازؔ سے بے پناہ قربت تھی۔ ۴۵ء کے موسمِ بہار میں وہ لکھنؤ اور الہ آباد گئے تو واپس آکر لکھنؤ اور الہ آباد والی نظمیں سنائیں ـــــ لکھنؤ کا ذکر تو میں نے ابھی کیا۔ اور الہ آباد:

الہ آباد میں ہر سو ہیں چرچے
کہ دلّی کا شرابی آگیا ہے
یہاں کے شہر یاروں کو بتا دو
کہ مردِ انقلابی آگیا ہے

ان کی مشہور نظم "بول اری او دھرتی بول" بھی انھی دنوں کی ہے۔ اس نظم کو مجازؔ ایک خاص کیفیت سے پڑھا کرتے تھے۔

بول اری او دھرتی بول
راج سنگھاسن ڈانواڈول

اپنی زبان لے اور معنویت کے اعتبار سے اردو ہندی کی وطنی نظموں میں اس نظم کا الگ مقام ہے:

کلجگ میں جگ کے رکھوالے
چاندی والے سونے والے
دیسی ہوں یا پردیسی ہوں
نیلے پیلے گورے کالے
مکھی بھُنگے بھن بھن کرتے
ڈھونڈیں ہیں مکڑی کے جالے

بول اری او دھرتی بول
راج سنگھاسن ڈانواڈول

ہندوستان کی جنگِ آزادی میں ایک موڑ ایسا بھی آیا تھا جب کمیونسٹ پارٹی نے پاکستان کے مطالبے کی حمایت کی تھی۔ یہ ۴۵ء کی بات ہے۔ مجازؔ کی کتاب میں "پاکستان ہمارا" نغمہ موجود ہے جو انھوں نے اردو بازار (دہلی) میں مسلم لیگ کے ایک جلوس کے آگے آگے چلتے ہوئے جھوم جھوم کر گایا تھا۔ اس ترانے میں دو بند ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کا پہلا بند مخدوم محی الدین کا ہے اور دوسرا مجازؔ کا۔ یہ بات مجھے خود مجازؔ نے بتلائی تھی۔ اور پھر مخدوم نے اس کی تصدیق کی تھی۔ اس سلسلے میں قرۃ العین حیدر نے بھی لکھا ہے:

" مجازؔ نے برسوں پارٹی کا ساتھ دیا۔ ۴۵ء میں جب پارٹی نے کہا کہ پاکستان کا مطالبہ عوامی مطالبہ ہے اور لینن اور اسٹالن کے نظریوں کے عین مطابق ہے تو مجازؔ مسلم لیگ میں جا شامل ہوئے اور یومِ پاکستان کے ترانے لکھنے لگے۔"

مجازؔ کی قومی شاعری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس نے اپنی نظموں سے ملک کے نوجوانوں اور خواتین کو درسِ عمل دیا۔ عورت کے بارے میں مجازؔ کا نظریہ نہایت ترقی پسندانہ تھا۔ ہمارے بعض انقلابی شاعروں نے عورت کے سماجی مرتبے کو مرد کے برابر ماننے میں نہایت بخل سے کام لیا ہے اور بعض نے اسے محض تعیش کا آلۂ کار مانا ہے۔ مثلاً ساغر نظامی نے بھکارن کے میلے میلے گالوں پر نظر پھسلاتے ہوئے للچائے لہجے میں کہا " تو میری اور باقی تیرا"۔ جوشں ملیح آبادی کا رویہ بھی کچھ ایسا

ما۔ اس کے برعکس مجازؔ نے عورت کا احترام
ترکی خاتون خالدہ ادیب خانم پر ان کی نظم
شاعری کا وقیع حصہ ہے۔

الدہ تو ہے بہشتِ ترکمانی کی بہار
بری پیشانی پہ نورِ حریت آئینہ کار
نے ترکوں کو دکھائی ہے صراطِ مستقیم
پھونک ڈالے ہیں تعصب کے حجاباتِ قدیم

ن کی نظم 'نوجوان خاتون سے خطاب' تو شاہکار
جہ رکھتی ہے:

ے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
ں آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

اور نوجوانوں کو جس ولولہ انگیز انداز میں آزادی کی
پر گامزن ہونے کا پیغام دیا ہے، وہ اپنی مثال
ہے:

جلالِ آتش و برق و سحاب پیدا کر
اجل بھی کانپ اٹھے وہ شباب پیدا کر
جو ہو سکے ہمیں پامال کر کے آگے بڑھ
نہ ہو سکے تو ہمارا جواب پیدا کر
تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

مجازؔ نے جس دن کے لیے اپنے رواں دواں
از میں نغمے گائے تھے، اور اپنی سانس کو چلتی
ی تلوار تصور کر کے دشمنانِ وطن پر وار پر
کیے تھے اور چنگیزِ وقت کے ماتھے کا جھومر
نے کا عزم کیا تھا وہ دن بھی آخر مجازؔ کی
دگی میں آ ہی گیا۔ اور ہندوستان آزادی
ہمکنار ہوا۔ اور مجازؔ نے آزادی کا نغمہ
ری قوت سے گایا:

مد غرور بہ صد فخر و نازِ آزادی
ے کھل گئی زلفِ درازِ آزادی
وہ بجوم اٹھا نغمہ طرازِ آزادی

وطن نے چھیڑا ہے اس طرح سازِ آزادی
زمانہ رقص میں ہے زندگی غزل خواں ہے

مجازؔ آزادی کا نغمہ خواں تھا انقلاب کا مطرب تھا۔
ایک تیز زندگی جیا اور صرف ۴۴ سال میں اردو
کو بہت سی لافانی نظمیں عطا کر گیا۔ وقت نے
اس دُرِ بے بہا کی قدر نہ کی اور اسے ناساز گار
حالات سے دوچار ہونا پڑا۔

۵۔ دسمبر ۵۵ء کی سرد رات میں
یہ شعلۂ جوالہ خاموش ہو گیا ——— دنیا
کے نزدیک اس کے خونِ دل کی کوئی قیمت
نہ ہو، مگر وہ اپنا خونِ دل نذرِ چمن بندی کر گیا:

آج بھی ہے لکھی ہوئی سرخ حروف میں مجازؔ
دفترِ شہریار میں میرے جنوں کی داستاں

●

کی سی گرم جوشش تاثر آفرینی ۔"

وطن کی محبت اور اس کے حسن کی کیفیات مجاز کی نظموں میں رچی ہوئی ہیں۔ انھوں نے مختلف شہروں کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ مگر اپنی ذاتی مناسبت کے ساتھ ——— اور اس خوبصورت انداز سے کہ نظموں میں غزل سی داخلیت ہے اور ان شہروں کا سماجی کردار بھی واضح ہو جاتا ہے۔ "نذرِ علی گڑھ" تو آج علی گڑھ یونیورسٹی کے ترانے کے انداز میں روزانہ ہزاروں طلبا گاتے ہیں۔ عجیب سرمستی ہے اس نظم میں:

سرشارِ نگاہِ نرگس ہوں وابستۂ گیسوئے سنبل ہوں
یہ میرا چمن ہے میرا چمن، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں

نظم کے آخری اشعار کیا خوب ہیں۔ ان کی لے سے علی گڑھ یونیورسٹی کی آفاقیت کا تصور ابھرتا ہے:

جو ابر یہاں سے اٹھے گا وہ سارے جہاں پر برسے گا
ہر جوئے رواں پر برسے گا، ہر کوہِ گراں پر برسے گا

دلی کی عظمت کا ذکر ان اشعار میں کرتے ہیں:

رشکِ شیرازِ کہن، ہندوستاں کی آبرو
سرزمینِ حسن و موسیقی، بہشتِ رنگ و بو
معبدِ حسن و محبت، بارگاہِ سوز و ساز
تیرے بت خانے حسین، تیرے کلیسا دل گداز
جنتیں آباد ہیں تیرے در و دیوار میں
اور تو آباد خود شاعر کے قلبِ زار میں

لکھنؤ کا حسن ان کی نظموں میں سمایا ہوا ہے ایک عجیب سرشاری کا احساس ہوتا ہے مجاز کی زبان سے لکھنؤ کا ذکر سن کر:

رخصت اے ہم سفرو شہرِ نگار آ ہی گیا
خلد بھی جس پہ ہو قرباں وہ دیار آ ہی گیا
آنکھوں میں بس رہے ہیں حسینانِ لکھنؤ
رشکِ زنانِ مصر کنیزانِ لکھنؤ
اب اس کے بعد صبح ہے اور صبحِ نو مجاز
ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ

مجاز ۴۳ء میں لکھنؤ سے پھر دہلی آ گئے تھے اور ہارڈنگ لائبریری (موجودہ ہردیال پبلک لائبریری) میں ملازم تھے۔ ان دنوں راقم الحروف بھی دہلی میں تھا اور مجاز سے بے پناہ قربت تھی۔ ۴۵ء کے موسم بہار میں وہ لکھنؤ اور الہ آباد گئے تو واپس آ کر لکھنؤ اور الہ آباد والی نظمیں سنائیں ——— لکھنؤ کا ذکر تو میں نے ابھی کیا۔ اور الہ آباد:

الہ آباد میں ہر سو ہیں چرچے
کہ دلی کا شرابی آ گیا ہے
یہاں کے شہر یاروں کو بتا دو
کہ مردِ انقلابی آ گیا ہے

ان کی مشہور نظم "بول اری او دھرتی بول" بھی انھی دنوں کی ہے۔ اس نظم کو مجاز ایک خاص کیفیت سے پڑھا کرتے تھے۔

بول اری او دھرتی بول
راج سنگھاسن ڈانواڈول

اپنی زبان لے اور معنویت کے اعتبار سے اردو ہندی کی وطنی نظموں میں اس نظم کا الگ مقام ہے:

کلجگ میں جگ کے رکھوالے
چاندی والے سونے والے
دیسی ہوں یا پردیسی ہوں
نیلے پیلے گورے کالے
مکھی بھنگے بھن بھن کرتے
ڈھونڈیں ہیں مکڑی کے جالے
بول اری او دھرتی بول
راج سنگھاسن ڈانواڈول

ہندوستان کی جنگِ آزادی میں ایک موڑ ایسا بھی آیا تھا جب کمیونسٹ پارٹی۔ پاکستان کے مطالبے کی حمایت کی تھی۔ یہ ۵ کی بات ہے۔ مجاز کی کتاب میں "پاکستان نغمہ موجود ہے جو انھوں نے اردو بازار (د میں مسلم لیگ کے ایک جلوس کے آگے آ چلتے ہوئے جھوم جھوم کر گایا تھا۔ اس ترانے دو بند ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کا بند مخدوم محی الدین کا ہے اور دوسرا مجاز کا۔ بات مجھے خود مجاز نے بتلائی تھی۔ اور پھر مخد نے اس کی تصدیق کی تھی۔ اس سلسلے میں قرۃ ا حیدر نے بھی لکھا ہے:

" مجاز نے برسوں پارٹی کا ساتھ د ۴۵ء میں جب پارٹی نے کہا کہ پاکستان مطالبہ عوامی مطالبہ ہے اور لینن اور اسٹا کے نظریوں کے عین مطابق ہے تو مجاز مسلم لیگ میں جا شامل ہوئے اور یومِ پاکستا کے ترانے لکھنے لگے۔"

مجاز کی قومی شاعری کا ایک پہلو یہ بھی کہ اس نے اپنی نظموں سے ملک کے نوجوان اور خواتین کو درسِ عمل دیا۔ عورت کے بار میں مجاز کا نظریہ نہایت ترقی پسندانہ تھا ہمارے بعض انقلابی شاعروں نے عورت کے سماجی مرتبے کو مرد کے برابر ماننے میں نہایت بخل سے کام لیا ہے اور بعض نے اس محض تعیش کا آلۂ کار مانا ہے۔ مثلاً ساغر نظامی نے بھکارن کے میلے میلے گالوں پر نظر پھسلا ہوئے للچائے لہجے میں کہا "تو میری اور باقی تیرا"۔ جوش ملیح آبادی کا رویہ بھی کچھ ایسا

ہی تھا۔ اس کے برعکس مجازؔ نے عورت کا احترام کیا۔ ترکی خاتون خالدہ ادیب خانم پر ان کی نظم اُردو شاعری کا وقیع حصہ ہے۔

خالدہ تو ہے بہشتِ ترکمانی کی بہار
تیری پیشانی پہ نورِ حرّیت آئینہ کار
تُو نے ترکوں کو دکھائی ہے صراطِ مستقیم
پھونک ڈالے ہیں تعصب کے حجاباتِ قدیم

اور ان کی نظم 'نوجوان خاتون سے خطاب' تو شاہکار کا درجہ رکھتی ہے:

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

اور نوجوانوں کو جس ولولہ انگیز انداز میں آزادی کی راہ پر گامزن ہونے کا پیغام دیا ہے' وہ اپنی مثال آپ ہے:

جلالِ آتش و برق و سحاب پیدا کر
اجل بھی کانپ اُٹھے وہ شباب پیدا کر
جو ہو سکے ہمیں پامال کر کے آگے بڑھ
نہ ہو سکے تو ہمارا جواب پیدا کر
تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

مجازؔ نے جس دن کے لیے اپنے رواں دواں انداز میں نغمے گائے تھے' اور اپنی سانس کو چلتی ہوئی تلوار تصور کر کے دشمنانِ وطن پر وار پر وار کیے تھے اور چنگیزِ وقت کے ماتھے کا پتھر توڑنے کا عزم کیا تھا وہ دن بھی آخر مجازؔ کی زندگی میں آ ہی گیا۔ اور ہندوستان آزادی سے ہمکنار ہوا۔ اور مجازؔ نے آزادی کا نغمہ پوری قوت سے گایا:

بہ صد غرور' بہ صد فخر و نازِ آزادی
مچل کے کھل گئی زلفِ درازِ آزادی
مہ و نجوم نے چھیڑا نغمۂ طرازِ آزادی
وطن نے چھیڑا ہے اس طرح سازِ آزادی
زمانہ رقص میں ہے زندگی غزل خواں ہے

مجازؔ آزادی کا نغمہ خواں تھا' انقلاب کا مطرب تھا۔

ایک تیز زندگی جیا اور صرف ۴۴ سال میں اُردو کو بہت سی لافانی نظمیں عطا کر گیا۔ وقت نے اس دُرِ بے بہا کی قدر نہ کی اور اسے ناسازگار حالات سے دوچار ہونا پڑا۔

۵ دسمبر ۵۵ء کی سرد رات میں یہ شعلۂ جوالہ خاموش ہو گیا ——— دنیا کے نزدیک اس کے خونِ دل کی کوئی قیمت نہ ہو' مگر وہ اپنا خونِ دل نذرِ چمن بندی کر گیا:

آج بھی ہے لکھی ہوئی سرخ حروف میں مجازؔ
دفترِ شہریار میں میرے جنوں کی داستاں

شین کاف نظام

دوہے

من رفتار سے بھاگتا، جاتا ہے کس اور
پلک جھپکتے شام ہے، پلک جھپکتے بھور

یاد آئی پردیس میں، اس کی اک اک بات
گھر کا دن ہی دن میاں، گھر کی رات ہی رات

بڑھیا چرخہ کاتتی، ہوگئی کیا ان ہوت
جھپکی سے جھٹکا لگا، گیا سانس کا سوت

سانجھ، سویرا، رات، دن، آندھی، بارش، دھوپ
اندر دھنش کے سات رنگ، اس کے سو سو روپ

ساجن شب چپکے گئے، انگ بھبھوت لگائے
برہن بیٹھی عمر بھر، سسکی سیج سجائے

گوبر سے گھر لیپ کر، گوری ہوئی اداس
دہرائے گا کون کل، آنگن کا اتہاس

ہم کبیرا اس کال کے، کھڑے ہیں خالی ہاتھ
سنگ کسی کے ہم نہیں، اور ہم سب کے ساتھ

گھر کے ہوگی ہم میاں، کریں بھور کو شام
ہم ان چاہے جنم کے، ہم آندھی کے آم

جمہائی لیتے ہوئے، کھڑے چیڑ کے پیڑ
سنّاٹا بھٹکا ہوا، کرے ندی سے چھیڑ

کورے کاغذ سا بدن، ہاتھ لگائے کون
من میں باتیں سینکڑوں، پر ہونٹوں پر مون

من میں دھرتی سی للک، آنکھوں میں آکاش
یاد کے آنگن میں رہا، چہرے کا پرکاش

کاجل سا آنکھوں میں ہے، تو، تیرا سنسار
آنکھیں موندے میں کروں، سپنوں سے شرنگار

ساجن سپنا ایک ہے، بھاگ کھڑے مسکائے
نیند ترستے نین میں، سپنا کیسے آئے

پت جھڑ کی رت آ گئی، چلو آپنے دیس
چہرہ پیلا پڑ گیا، دھولے ہو گئے کیس

یہ کیسا انعام ہے، یہ کیسی سوغات
دن دیکھے جگ ہوگئے، جب جاگوں تب رات

آنکھ کٹورا اور ہم، اور شہروں کی دھوپ
الکھ جگایا عمر بھر، ملا نہ روپ انوپ

سپنے میں ساجن ملیں، مل مل کریں گہار
آنگن تک آئے نہیں، ڈولی اور کہار

وہ سب کی پہچان ہے، سب اس کے انوروپ
شاعر، شعر اور شاعری، سبھی شبد کے روپ

جیون جیل میں عمر ہے، پل پل پہرے دار
پاؤں کی بیڑی ہتھکڑی، لوک لاج، گھر بار

اب نظام اس دیس میں، فن کی کیا پہچان
اکثر کو آنکھیں نہیں، نہیں بول کو کان

کلّوں کی گلی، جودھ پور (راجستھان)

پاندھی ننکانوی

میں خوش نہیں ہوا

میں رات کا کھانا کھاکر بیڈ پر دراز ہوا ہی تھا کہ باہری دروازے پر دستک سنائی دی۔ میں نے اُٹھ کر دروازہ کھولا، تو دیکھا کہ سنتوش دروازے پر کھڑی تھی۔ میں خاموشی سے ایک طرف ہوگیا۔ اور وہ سیدھی میرے کمرے سے گزر کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ جہاں کہ میری بیوی برتن صاف کرنے میں مصروف تھی۔ میں پھر بیڈ پر دراز ہوگیا اور میگزین اُٹھاکر ایک افسانہ پڑھنے لگ گیا۔ لیکن میرا دل افسانے میں نہیں لگ رہا تھا۔ میرے دماغ میں ایک خیال بار بار سر اٹھانے لگا کہ بیوی سے دریافت تو کروں کہ سنتوش ہمارے یہاں کیسے آئی ہے۔ کس کام سے آئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ میرے روبرو تو آج وہ پہلی بار ہی ہمارے گھر آئی تھی۔ حالانکہ ہمیں بھی اِس مکان میں آئے ہوئے قریب چار برس گزر گئے تھے۔ اور سنتوش بھی اپنے خاوند کے ہمراہ ہمارے پڑوس میں قریب دو سال سے بطور کرایہ دار رہائش پذیر تھی۔ میں یوں ہی میگزین کو اُتھل پُتھل کرتا رہا۔ مگر دماغ میرا برابر سنتوش کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ اتنے میں میری بیوی بھی سنتوش کے ہمراہ بیڈ روم میں آگئی۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"اجی، میں نے کہا آج بھائی صاحب نہیں لوٹے"۔ میری بیوی نے سنتوش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہوگئی؟ ویسے تو چھابڑہ صاحب چھ، سات بجے تک آ ہی جایا کرتے ہیں"۔

"مگر اب تو دس بجنے کو ہیں"۔ سنتوش نے دھیمی آواز میں کہا۔

"کوئی بات نہیں... کوئی بات نہیں، کہیں کافی ہاؤس میں دوستوں میں بیٹھے ہوئے گپیں ہانک رہے ہوں گے۔ فکر کی کیا بات ہے؟"

میں نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ سنتوش کے چہرے پر فکرمندی کی کالی گھٹا ویسے کی ویسے چھائی ہوئی تھی لگتا تھا جیسے وہ کسی اندرونی خوف سے کانپ رہی ہو۔ اُس نے کچھ کہنا بھی چاہا۔ مگر نہ معلوم کیوں خاموشی اختیار کرلی۔ میں نے بات چیت کا سلسلہ چھیڑنے کی غرض سے پھر کہا۔

"فون تو کیا ہی ہوگا آپ نے؟"

"وہ تو میں شام کو ہی کر بیٹھی ہوں"۔

"تو پھر؟ کوئی جواب ملا؟"

"جی ہاں آفس والے تو کہتے ہیں کہ آج تو وہ لنچ ٹائم پر ہی چھٹی لے گئے تھے"۔

"لنچ ٹائم پر؟" میں چونکا "کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ کہاں جاسکتا ہے وہ؟" میں بڑبڑایا۔

سنتوش رُندھے ہوئے گلے سے بولی۔

"بھائی جان۔ مجھے تو خدشہ ہے کہیں...؟"

اور وہ فقرہ بھی پورا نہ کرسکی۔

"ارے بھئی کُھل کر بات کیجیے۔ خدشہ کس بات کا ہے؟"

"جی۔ اُن کے آفس میں ایک لڑکی ہے... مس روزی"۔

"ہوں۔ اچھا!" میں چونکا۔

"وہ ان کے ساتھ... میرا مطلب اکثر گھومتی پھرتی رہتی ہے"۔

"اچھا! بھئی کمال ہے...؟" یہ کہہ کر میں خاموش ہوگیا اور خیالات کے سمندر میں غوطے لگانے لگا۔

سنتوش جیسی شریف۔ خوبصورت، شیریں مزاج عورت کو چھوڑ کر یہ چھابڑہ...؟ اور میرا دل غصّے سے ابلنے لگا۔ اور سنتوش کی قابلِ رحم حالت دیکھ کر ہمدردی سے پگھلنے لگا کیا معصوم۔ پاک ذہن لڑکی ہے۔ حسین قدرت کا کمال!

کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے پھر کہنا شروع کیا۔

"مس روزی۔ کبھی گھر بھی آئی ہے؟"

"جی ہاں، کئی بار آئی ہے ان کے ہمراہ"

"اچھا! کیا معلوم سنیما چلے گئے ہوں؟"

"مگر سنیما بھی جاتے تو اب تک گھر ضرور لوٹ آتے"۔

"تم نے کبھی منع نہیں کیا چھابڑہ صاحب کو!" میں نے رُک رُک کر پھر دریافت کیا۔

"میں تو کئی بار۔ باتوں باتوں میں ٹوک بھی چکی ہوں۔ مگر وہ ذرا پروا نہیں کرتے۔ آج صبح آفس جانے سے پہلے بھی میں نے ازراہِ مذاق ان کو ٹوکا تھا۔ مگر وہ اُلٹا مجھے ہی ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگ گئے۔ دیکھو نا بھائی جان۔ میں بھی اب کہاں جاؤں؟ میں نے بھی والدین کی

122/8-J، راجوری گارڈن، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۷

مرضی کے خلاف ان سے شادی رچائی تھی۔" اور یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔

"اوہو۔ ارے بھئی رونے دھونے کی کیا بات ہے۔ حوصلے سے کام لیجیے جہاں کہیں آپ کہیں میں چلے چلتا ہوں۔ کیوں جی؟" میں نے اپنی بیوی کی طرف جھانکا۔ اور اس نے رضامندی میں سر ہلا دیا۔

"آپ پولیس چوکی، پر میرے ساتھ چلیے۔" سنتوش کی زبان میں منت سماجت تھی۔

"ہاں۔ ہاں۔ ابھی چلے چلتے ہیں۔ ویسے ایشور خیریت ہی رکھے۔ یہاں دلی میں ایکسیڈنٹ بہت ہوتے ہیں۔ پھر بھی پولیس چوکی پر رپورٹ کرنے سے شاید کچھ . . . کیونکہ کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ آج کل کے ماحول میں . . ."

اور میں کپڑے بدلنے لگا۔

"بہن تم رنٹو کو ہمارے یہاں لے آؤ۔ گھر میں اکیلا ہے۔ کس کے پاس چھوڑ کر جاؤ گی؟" میری بیوی نے کہا۔ اور سنتوش سر ہلا کر باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد میری بیوی نے کہا۔

"اجی دیکھ لیا۔ لو میرج کا انجام؟ یہ سنتوش بھی پہلے چھابڑہ کے دفتر میں ہی کام کرتی تھی۔"

لو میرج کے مسئلے پر بلا کسی نکتہ چینی کے میں نے کہا۔

"ویسے مرد ذات کی یہ سب سے بری عادت ہے کہ وہ گھر کی حور کو چھوڑ کر بیگانی کھری میں منہ مارنے جائے گا۔ وہاں شاید زیادہ لطف اندوز ہوتا ہو گا؟"

"کیا تم بھی لطف اندوز ہونا چاہتے ہو چھابڑہ کی طرح؟" میری بیوی بھی ایک سوالیہ فقرہ بن گئی۔

"نہیں۔ نہیں۔ میں تو یوں ہی کہہ رہا تھا۔"

"اجی جاؤ۔ تم مردوں کا کیا بھروسہ؟ تم سب مرد ایک ہی مٹی کے بنے ہوئے ہو۔"

"اور عورت؟"

اسی لمحے سنتوش اپنے دو برس کے بیٹے رنٹو کو اٹھا کر لے آئی۔ میری بیوی نے اسے لحاف میں لٹا دیا۔ اور اس کے بعد میں سنتوش کے ہمراہ پولیس چوکی کی طرف چل دیا۔

جب واپس آئے تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ چھابڑہ صاحب ابھی تک گھر نہیں لوٹے تھے۔ ہماری پریشانی مزید بڑھ گئی سنتوش جب گھر جانے کو تیار ہونے لگی تو میری بیوی نے کہا۔

"بہن گھر میں اکیلی کیسے رہو گی؟ یہیں سو جاؤ نا اپنا ہی گھر سمجھو اسے۔" اور وہ رضامند ہو گئی۔

صبح پھر اسی بے چینی نے آگھیرا۔ میں نہا دھو کر تیار ہو ہی رہا تھا کہ سنتوش کہنے لگی۔

"بھائی جان! آپ آج میرے ساتھ ان کے آفس چلیں۔ اور دیگر جگہوں پر بھی جانا ہے کورٹ میں بھی کسی وکیل کے ساتھ صلاح مشورہ کرنا ہے۔"

مجھے آج آفس میں ضروری کام تھا۔ مگر میں سنتوش سے انکار نہ کرسکا۔ پھر ہم ناشتہ کر کے اسکوٹر پر بیٹھ کر چھابڑہ صاحب کے آفس کی طرف چل دیے۔ آفس سے معلوم ہوا کہ چھابڑہ صاحب اور مس روزی کل لنچ کے وقت سے غائب ہیں۔

شک و شبہ یقین میں بدل گیا کہ دونوں کہیں دلی سے باہر چلے گئے ہیں۔ یا دلی کی ہی کسی کالونی یا ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

تمام دن ہم کورٹ میں وکلا صاحبان سے صلاح مشورہ کرتے رہے۔ جس وکیل سے بھی بات کرتے۔ تمام وکیل مکھیوں کی طرح اکٹھے ہو جاتے۔ ویسے بھی کوئی نوجوان لڑکی کورٹ میں آجائے اور کسی وکیل سے قانونی صلاح مشورہ کرنے لگے تو عموماً اس پاس بیٹھے تمام وکیل اس میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ پھر سنتوش تو ایک خوبصورت اور دلکش لڑکی تھی۔ ان کی نظروں کا شکار کیسے نہ ہو؟ کئی وکلا سے میری پرانی جان پہچان بھی تھی۔ وہ مجھ سے بھی مذا کرنے لگے۔

"کیوں بھئی؟ کون ہے یہ حسینہ؟"

"ارے تم تو چھپے رستم نکلے۔ دیکھ لو کہا ہاتھ مارا ہے؟"

"بیٹا اس کو کہاں سے اڑا لائے ہو؟"

جیسے جیسے وکلا حضرات مجھ سے مذا کرتے ویسے ویسے مجھے ان کی عقل پر حیرانی رہی تھی۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ عورت کو ہر عورت سمجھ کر دیکھتا ہے بے شک وہ کیسی حا یا موڈ میں کیوں نہ ہو؟ کیا زمانہ آگیا ہے۔ و حضرات سے صلاح مشورے کے بعد ہم گھر لو آئے۔ چائے پیتے ہوئے سنتوش کہنے لگی۔

"میں تو سوچتی ہوں کہ کیوں نہ ان کے والدین کے گھر چلی جاؤں؟"

"نہیں . . . نہیں، اتنی جلدی بھی کیا ایک دو دن مزید انتظار کر لینا ہی بہتر ہو گا" میں نے اس کو دم دلاسا دیا۔ اور اس کے بعد ہم نہایت ہی خاموشی کے ساتھ چائے نوش کرنے لگے۔ چائے پیتے ہوئے میں کسی کسی و چور نگاہوں سے سنتوش کے دلکش چہرے کی طرف جھانک لیتا اور پھر دل ہی دل میں

کہ یہ چھابڑہ کیسا نکما آدمی ہے؟ اور مجھے چھابڑہ پر غصہ آنے لگتا۔ پھر میں سوچنے لگا کہ اگر میرے پاس اتنی خوبصورت بیوی ہوتی تو میں تو کبھی غصے سے ہی نہ بولتا۔ اتنی خوبصورت۔ نیک سیرت۔ دلکش اور جوان بیوی کو چھوڑ کر کمبخت کس کے پیچھے دوڑے جا رہا تھا؟ اور یہ سوچتے ہوئے ایک بار پھر میرا دل سنتوش کے غم میں ڈوبنے لگا۔

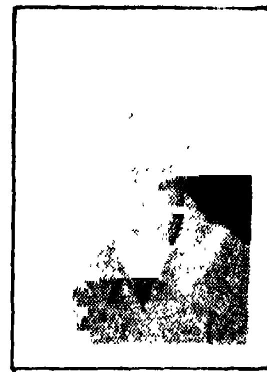
"میں یہ سوچ رہی ہوں کہ آخر کب تک میں آپ لوگوں پر بوجھ بنی بیٹھی رہوں گی؟"

"نہیں... نہیں، ایسی کیا بات ہے اور بڑدس ہوتا کس مرض کی دوا ہے؟" میرے جواب دینے سے پہلے ہی، میری بیوی بول اٹھی۔

اور آج دن بھر کی باتیں یاد کر کے مجھے کچھ سرور سا آنے لگا۔ ایک لمبی، خوبصورت، دلکش لڑکی کے ساتھ گھومنا پھرنا اچھا لگنے لگا۔ میں یوں ہی ایسی ویسی باتیں ہی سوچ رہا تھا کہ سنتوش کے گھر سے چھابڑہ نے آواز لگائی۔

"سنتوش"

اور اُسی لمحے وہ ہمارے گھر سے باہر نکل گئی۔ جیسے کہ اُس کی روح واپس آگئی ہو۔ میری بیوی بھی مارے خوشی کے کھل اُٹھی مگر مجھے نہ معلوم کیوں خوشی محسوس نہیں ہوئی؟ میں یونہی کرسی میں دھنسا ہوا بیٹھا رہا۔ اور بار بار اپنے دل سے پوچھے جا رہا تھا کہ آخر یہ ہمدردی کیسی تھی۔ مجھے بھی تو چھابڑہ صاحب کی آمد پر خوش ہونا چاہیے تھا۔ مگر میں تو اُداس ہو رہا تھا ——— آخر یہ اُداسی کیسی؟... مگر درحقیقت مجھے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ نہ معلوم میں کیوں خوش نہیں ہوا۔ نہ جانے کیوں میں خوش نہیں ہوا۔ نہ جانے کیوں؟



مسلم شہزاد

ہوا کا جال بھلا ٹوٹ کر بکھرتا کیا
مری صدا کا پرندہ اُڑان بھرتا کیا

نہ دست و پا ہی سلامت رہے نہ سر باقی
اب اس سے بڑھ کے کوئی سانحہ گزرتا کیا

بکھرتے ٹوٹتے رشتوں کا سخت جاں منظر
بچھڑتے وقت، میں آنکھوں میں قید کرتا کیا

لرز رہی تھیں اندھیرے کی سیڑھیاں ساری
دیارِ شب میں اُجالا کوئی اُترتا کیا

کنارِ آب کھڑا سوچتا رہا شہزاد
جو نقش ڈوب چکا تھا وہ پھر اُبھرتا کیا

بزمِ کہکشاں، نرکٹیا گنج، مغربی چمپارن (بہار)

ڈھلی ہوئی ہیں فضائیں ترے بدن کی طرح
کھلی ہوئی ہے دھنک رنگِ پیرہن کی طرح

یہ کیا غضب ہے کہ اس شہر میں ترے ہوتے
بھٹک رہی ہے نظر ایک بے وطن کی طرح

ہوئی وہ صبح وہ چمکی پہاڑ کی چوٹی
وہ آفتاب نکلتا ہے کوہ کن کی طرح

چراغِ دیر و حرم سے تو روشنی نہ ہوئی
ہمارے دل کی طرح تیری انجمن کی طرح

فلک پہ کاہکشاں کی لکیر ہے رفعت
جبینِ ناز پہ ٹھہری ہوئی شکن کی طرح

رفعت الحسینی

۱۲/۱، میونسپل کالونی، بیرسیا روڈ، بھوپال



انیس احمد خاں انیس

مرے خیال کا پیکر دکھائی دیتا ہے
میں سوچتا ہوں تو منظر دکھائی دیتا ہے

ہر آدمی ہے مرے خاندان میں شامل
ہر ایک ملک مرا گھر دکھائی دیتا ہے

میں دل کا آئینہ رکھ دوں گا سامنے لیکن
تمھارے ہاتھ میں پتھر دکھائی دیتا ہے

جو آنکھ کھولوں تو کچھ بھی نظر نہیں آتا
کروں جو بند تو منظر دکھائی دیتا ہے

انیس نکتے ہزاروں ہیں تل کے نقطے میں
جو دیکھتا ہوں تو دفتر دکھائی دیتا ہے

سپریم کورٹ ایڈووکیٹس لائبریری، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

...نت رائے شرما

عہدِ جہانگیری کے سکّے

پُرانے سکّے ہمارے ملک و قوم کا بیش بہا اثاثہ ہیں جن سے تواریخ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور پرانی تہذیب و تمدن کا پتہ چلتا ہے۔
تواریخ کے اوراقِ پارینہ اور مہاراجہ اشوک کے قدیم ستونوں پر منقش عبارات اور مختلف حوالہ جات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ دنیا میں سب سے پہلے ہندوستان میں ہی سکوں کا رواج شروع ہوا تھا۔ اس ملک میں اُس وقت سکّے جاری کیے گئے تھے۔ جب چین اور لدیا میں فن "سِکہ گری" یعنی علم سکہ جات و تمغہ جات کے بارے میں کسی کو کوئی علم نہ تھا یہ ایک حقیقت ہے اور اس کا سب سے دلچسپ ثبوت ہمارے پاس پانی (چھ سو سال قبلِ مسیح) کی اشٹ ادھیائی ہے جو آج بھی سنسکرت کی ایک نہایت جامع اور مستند کتاب ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اس زمانے میں ہمارے ملک میں دھات کے سکّے (مُدرا) رواج پا چکے تھے، چنانچہ مہابودھی استوپا گیا کے "بھارہت" استوپا (دو سو سال قبل مسیح) پر مختلف سکّوں کے نقوش کندہ ہیں۔
اُس زمانے میں سکّے ڈھالنے کا عام طریقہ یہ تھا کہ سکّے ڈھالنے سے پہلے دھات کو اکلی سے صاف کر کے مُتخّن اسے بڑی بڑی کٹھالیوں میں پگھلاتے تھے پھر اُس پگھلی ہوئی دھات کو بچھا کر اور ہتھوڑوں سے کوٹ کوٹ کر ہموار کر کے اس کی موٹی موٹی چادریں بناتے تھے جنھیں کاٹ کاٹ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تبدیل کر کے پھر ان ٹکڑوں پر مختلف نشانات کی مہروں سے سکّے ضرب کیے جاتے تھے۔ کبھی کبھی پگھلی ہوئی دھات کی چھوٹی چھوٹی گولیاں بنا کر ان پر مطلوبہ نشان یا مہر کا دباؤ ڈال کر سِکّے انھیں سِکّہ کرتے تھے یعنی تانبا چاندی اور سونے کو سکوں میں تبدیل کرتے تھے۔ کئی سکّوں پر ایک سے پانچ ضربوں تک کے نشانات ملتے ہیں انھیں "آہت" سکّے کہا جاتا تھا اور یہ "آہت" سکّے پورے ملک کے مختلف حصّوں میں رائج تھے جیسے: جَنید یعنی کوشل۔ ایودھیا۔ آدمبارا۔ یوُدھیا۔ کوُشامبی۔ مگدھ پانچال۔ اُجین۔ کُنِند۔ کاشی۔ رَسبی (کوئٹہ) وغیرہ وغیرہ۔ علاوہ ازیں جنوبی ہند کے ساتا واہن خاندان کے حکمرانوں نے بھی اپنے نام کے سکّے جاری کیے تھے۔
اس کے بعد ہندوستان پر یونانی کُشان اور شاکا حملوں سے تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ان حملہ آوروں نے بھی اپنے اپنے نام کے سکّے ہندوستان کے شمال اور شمال مغربی حصوں میں جاری کیے ــــــ چوتھی صدی عیسوی کے شروع میں جب گپتا حکومت کا دور شروع ہوا تو گپتا راجاؤں نے اپنے سنہری دور میں سب سے خوبصورت سونے کے سکّے بنوائے (سمدر گپت کے سکّے زرِ سامت یا زرِ دست افشار میں ڈھالے ہوئے ہیں)۔ اس کے بعد دسویں صدی عیسوی میں جنوبی ہند کے چولا، پلوا، پانڈیہ اور کادمبیہ خاندانوں کے حکمرانوں نے بھی اپنے اپنے نام کے سکّے جاری کیے۔
مسلمانوں کی فتحِ دہلی (۱۱۹۳ء) کے بعد پھر ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ سلاطینِ دہلی، بنگال، گجرات اور مالوہ کے حکمرانوں اور پھر مغل بادشاہوں نے اپنے اپنے نام کے سکّے جاری کیے۔
اس سے پہلے ڈھالے جانے والے سکّوں پر کوئی نہ کوئی تصویر ہوتی تھی۔ ہاتھی گھوڑے یا کسی جانور یا کسی انسان کی تصویر۔ (پورس کے سکّوں پر ایک ہاتھی اور اس کے پیچھے ایک گھوڑ سوار دکھایا گیا ہے) یہ سکّے عموماً سونے، چاندی یا تانبے سے تیار کیے جاتے تھے ــــــ لیکن شہنشاہ ہمایوں کی جان بچانے کے عوض جب نظام سقّے کو ایک دن کی بادشاہت ملی تو اس نے مشکیں کٹوا کٹوا کر ایک ہی دن میں چمڑے کے اَن گنت سکّے چلائے ــــــ مغل بادشاہوں کے سکّے دوسرے سکّوں سے قطعی مختلف تھے اور ان سکّوں کو ڈھالنے کا طریقہ بھی مختلف تھا پگھلی ہوئی دھات کی موٹی موٹی چادروں پر کوئی نہ کوئی "بیت" ضرب کر کے اُنھیں سکّوں کی شکل میں کاٹ لیا جاتا تھا۔ تصاویر یا حروف کے بجائے ان پر کوئی نہ کوئی عبارت



۱۰۷، گولڈ کراؤن، فرسٹ فلور، جے۔ پی۔ روڈ (نزد سات بنگلا) اندھیری (ویسٹ)، بمبئی ۴۰۰۰۶۱

کندہ ہوتی تھی۔ اکبر کے عہدِ حکومت کی ایک مہر جو بہت کمیاب ہے آگرہ کے دارالضرب سے مسلوک ہوئی تھی۔ اس کی تاریخ اسفندیار مز چہل و نہم سال الٰہی۔ اس پر فارسی کا یہ شعر درج ہے۔

چہرہ ——

مہر مہرِ شاہ اکبر آبروئے ایں زر است

پشت ——

تا زمین و آسماں و امہر انور زیور است

مغلیہ شہنشاہوں میں شہنشاہ جہانگیر کو سکّے رائج کرنے کا سب سے زیادہ شوق تھا۔ تخت نشینی کے موقع پر تو سکّے جاری ہوتے ہی تھے لیکن جوں ہی کوئی اہم واقعہ ظہور پذیر ہوتا تو فوراً نیا سکّہ جاری کر دیا جاتا۔ نور محل جب ملکہ نور جہاں کہلائی تو جہانگیر کے حکم سے ایک مہر مسلوک ہوئی جس پر یہ بیت نقش ہے:

چہرہ ——

بہ حکم شاہ جہاں گیر یافت صد زیور

پشت ——

بنام نور جہاں بادشاہ بیگم زر

ایک روپے کا سکّہ سب سے پہلے شیر شاہ سوری نے جاری کیا تھا (روپیہ کا لفظ آج بھی استعمال ہوتا ہے) اُس وقت روپے کا مطلب غالباً یہ تھا روپا (چاندی) پہیہ (چکر) یعنی روپہیہ جو بگڑ کر روپیہ کہلایا۔ شیر شاہ سوری کے بعد اکبر نے ایک روپے کا سکّہ چلایا اور پھر جہانگیر نے۔ قندھار کے جہانگیری روپے دو قسم کے ہیں ایک پر تو صرف الٰہی سال اور ایرانی مہینہ درج ہے دوسرے پر یہ بیت نقش ہے:

چہرہ ——

بسکّہ قندھار شُد دل خواہ

پُشت ——

از جہانگیر شاہ اکبر شاہ

دہلی ٹکسال سے ایک چھوٹی سی مُہر مسلوک ہوئی تھی جس پر یہ شعر درج ہے:

چہرہ ——

زر فتح و نصرت جہانگیر شاہ

پشت ——

بہ دہلی زد از فیضِ لطفِ اِلٰہ

احمد آباد ٹکسال سے جاری کیا گیا ایک خوش نما روپیہ، جس پر یہ شعر درج ہے:

چہرہ ——

بہفت کشور ایں زر ہمیشہ باد رواں

پُشت ——

زِ نقش نام جہانگیر بادشاہِ جہاں

اجمیر کی ٹکسال میں مضروب ہوئی ایک طلائی مہر کی ایک جانب یہ شعر درج ہے:

شبیہِ حضرت شاہِ جہانگیر
قضا بر سکّۂ زر کرد تصویر

اور دوسری طرف بیچ میں آفتاب کی تصویر ہے اور اس کے داہنی طرف یا معین اور بائیں طرف "ضرب اجمیر ۱۰۲۳ھ" کے الفاظ ہیں۔ اس کے اوپر اور نیچے ذیل کے دو مصرعے درج ہیں:

حروف جہانگیر و اللہ اکبر
ز روز ازل در عدد شُد برابر

اس شعر میں جہانگیر کو خدا کا ہم پلہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ سکّہ اجمیر کی ٹکسال میں اس وقت ضرب کیا گیا تھا جب برطانوی سفیر سر طامس رو وہیں مقیم تھا۔ ممکن ہے کسی خوشامدی شاعر کی روبہ گری نے یہ شعر موزوں کیا ہو۔

آگرہ کے دارالضرب کے دو روپیوں پر جن کا سن ۱۰۳۲ھ ہے، ذیل کا بیت ہے:

چہرہ ——

یافت در آگرہ رُوے زر زیور

پُشت ——

از جہانگیر شاہ شاہ اکبر

جہانگیری عہد کے کچھ بہت ہی خوبصورت سکّے لاہور کے ٹکسال سے مسلوک ہوئے تھے جن پر ذیل کی عبارت نقش ہے:

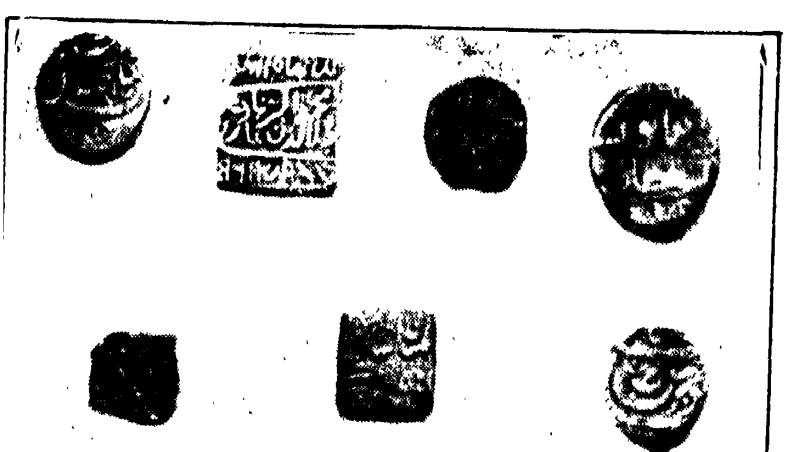
چہرہ ——

ہمیشہ باد ابر روئے سکّہ لاہور

پُشت ——

زنام شاہ جہانگیر شاہ اکبر نور

احمد آباد ٹکسال کے کچھ روپوں پر ذیل کا شعر درج ہے:



نیچے بائیں طرف کا سکّہ سب سے پُرانا سکّہ ہے

ہرہ ـــــــ

مالک الملک سکہ زد در زر

شت ـــــــ

شاہ سلطاں سلیم شاہ اکبر

ب روپیہ کا ایک اور سکہ جو کابل کے ٹکسال سے مسلوک ہوا اُس پر یہ بیت درج ہے:

ہرہ ـــــــ

سکہ زد در شہر کابل خسرو گیتی پناہ

شت ـــــــ

شاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

لاہور کے ٹکسال کا ایک خوش نما روپیہ ہے جس پر یہ شعر نقش ہے:

چہرہ ـــــــ

بہ دہر باد رواں تا فلک بود دَر دَور

پُشت ـــــــ

بنام شاہ جہانگیر سکۂ لاہور

لاہور ٹکسال کا ایک روپیہ جس پر یہ بیت نقش ہے:

(مہینہ اس کا فرور دین ہے)

چہرہ ـــــــ

بفرور دین زر لاہور شد رشک مہ انور

پُشت ـــــــ

زنورِ سکۂ شاہ جہانگیر ابن شاہ اکبر

احمد آباد ٹکسال کے کچھ روپے ایسے ہیں جن پر ذیل کا شعر درج ہے:

(یہ سکے عام طور پر دستیاب ہو سکتے ہیں)

چہرہ ـــــــ

سکہ زد در احمد آباد از عنایات اِلٰہ

پُشت ـــــــ

شاہ نورالدین جہانگیر ابنِ اکبر بادشاہ

اور الٰہ آباد کے ٹکسال سے جاری کیا گیا ایک روپے کا سکہ جس پر ذیل کا یہ شعر درج ہے:

چہرہ ـــــــ

ہمیشہ نورِ زر و سکۂ الٰہ آباد

پُشت ـــــــ

زنام شاہ جہانگیر شاہ اکبر باد

اجمیر کے ٹکسال کا ایک سکہ جس کا سال نہم جلوس ۱۰۲۳ھ ہے اور بیت یہ ہے:

چہرہ ـــــــ

جہاں فروز با جمیر گشت سکۂ زر

پُشت ـــــــ

زِ نورِ نام جہانگیر شاہ شاہ اکبر

جہانگیر کی تخت نشینی کے موقعے پر (ایک سال کے اندر) ایک طلائی مہر لاہور کے ٹکسال سے جاری کی گئی جس پر یہ شعر درج ہے:

چہرہ ـــــــ

زر لاہور شد در ماہ بہمن چوں مہ انور

پُشت ـــــــ

بہ دَور شاہ نورالدین جہانگیر ابن شاہ اکبر

ایک روپے کا ایک بہت ہی کمیاب سکہ جو اکبر کے عہد حکومت کے چوالیسویں سال الٰہ آباد کے دارالضرب میں مضروب ہوا۔ بڑا ہی خوبصورت سکہ ہے لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ سکہ دراصل جہانگیر نے اُس وقت مسلوک کرایا تھا جب اس نے اپنے باپ کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ اُس پر یہ شعر نقش ہے۔

چہرہ ـــــــ

ہمیشہ ہمچو زرِ مہر و ماہ رائج باد

پُشت ـــــــ

بغرب و شرقِ جہاں سکۂ اِلٰہ باد

جس طرح اکبر کو فتح پور سیکری۔ آگرہ سے پیار تھا۔ شاہ جہاں کو دہلی سے محبت تھی اسی طرح جہانگیر کو لاہور سے لگاؤ تھا وہ قلعہ لاہور میں رہنا پسند کرتا تھا۔ شالامار باغ جہانگیر کی اہم یادگار ہے۔ تخت نشینی کے موقعے پر اس نے لاہور سے سکہ جاری کیا تھا۔ یہ سکہ کشمیر اور قندھار کے ٹکسالوں سے بھی جاری کیا گیا اس پر یہ شعر نقش ہے:

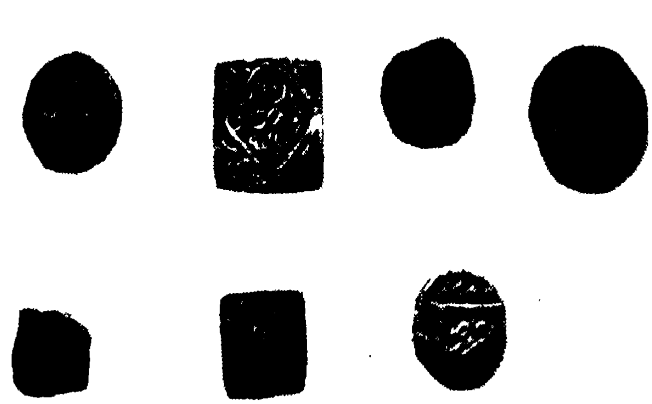
چہرہ ـــــــ

روئے زر را ساخت نورانی برنگِ مہر و ماہ

پشت ـــــــ

شاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

"تو زک جہانگیری" سے پتہ چلتا ہے کہ ایک شاہی فرمان آصف خاں کے نام جاری ہوا تھا



عہدِ مغلیہ و دیگر سلاطینِ دہلی کے کچھ نایاب سکے

جس میں درج تھا کہ بڑے بڑے طلائی سکوں پر مندرجہ ذیل شعر نقش کرائے جائیں:

بخطِ نور بر زد کلکِ تقدیر
رقم زد شاہ نورالدین جہانگیر

شد چوں خور زیں سکہ نورانی جہاں
آفتابِ مملکت تاریخ آں

یہ طلائی سکے وزن میں دس سے بیس اور پچاس سے سو تولہ تک کے تھے "آفتاب مملکت" کے الفاظ سے بحساب ابجد ۱۰۱۴ھ نکلتا ہے جو جہانگیر کی حکومت کا پہلا سال تھا۔ جن سکوں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ وہ ساخت کے لحاظ سے تمام اسلامی ممالک کے سکوں سے زیادہ خوش نما اور خوش وضع ہیں۔ محمد تغلق کے عہد کے سکے البتہ ان سکوں سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں۔ ان سکوں پر ایک طرف ایک اور دوسری طرف دوسرا مصرع درج ہے۔ ان تمام پرانے سکوں میں سب سے زیادہ اہم سکہ "اشرفی" ہے اشرفی ایک طلائی سکے کا نام تھا۔ یہ سکہ چونکہ اسلامی ممالک میں سب سے پہلے اشرف بادشاہ نے جاری کیا تھا۔ اس لیے اس سکے کا نام اشرفی پڑ گیا۔ اس سکے کو ڈھالنے کے لیے زرِ دہ دہی۔ زرِ سادا۔ زرِ صامت یعنی زرِ دست افشار استعمال کیا جاتا تھا۔ خالص سونے کو (جس سے اشرفی تیار ہوتی تھی) کبھی کبھی زرِ خلاص یا زرِ جعفری بھی کہا جاتا تھا۔ جعفر برمکی ایک وزیر تھا جس کے حکم سے اشرفیوں میں خالص سونے کا استعمال شروع ہوا تھا۔ اشرفی کا وزن عموماً دس ماشے کے قریب ہوتا تھا۔ اشرفی کو مُہر بھی کہا جاتا تھا عہدِ جہانگیری کی کچھ مُہروں کا وزن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے سو تولے کے قریب تھا اور قطر ایک طشتری کے برابر غالباً دنیا میں یہ سب سے بڑے سکے ہیں۔

پچھلے سال اکتوبر میں چکی کے پاٹ کے برابر سونے کا ایک سکہ جنیوا (سوئیٹزرلینڈ) میں نیلامی کے لیے لایا گیا۔ خالص سونے کے اس سکے کا وزن ۱۲ کلوگرام ہے۔ "ایک ہزار مُہر" مالیت والا یہ سکہ مغل بادشاہ جہانگیر کے دورِ حکومت میں دہلی میں ۱۶۱۳ء میں ڈھالا گیا تھا۔ یہ سکہ دُنیا کا سب سے بڑا اور سب سے وزنی ہونے کا بھی شرف رکھتا ہے۔ (نیلام گھر کے ترجمان مسٹر ڈیوڈ فیلڈ نے اس سکے کے اصل مالک کا نام صیغۂ راز میں رکھا۔)

جس طرح کچھ جعل ساز آج کل کے زمانے میں جعلی سکے اور جعلی نوٹ بناتے ہیں اسی طرح پُرانے زمانے میں بھی جعل ساز جعلی سکے بناتے تھے جنھیں "ستہ" یا "ستوقہ" کہا جاتا تھا "ستہ" (کھوٹا سکہ) اصل اس کی "سہ تہ" یعنی تین تہیں تھیں۔ اس لیے کہ کھوٹی اشرفی میں دو طرف یا دو پرت سونے کی ہوتی تھیں اور بیچ میں تانبے یا لوہے کی تہہ۔ ستہ کا معرب "ستوقہ" ہے۔ لیکن "کھوٹے سکے" پرانے زمانے میں شاذ و نادر ہی بنائے جاتے تھے کیونکہ اُن دِنوں لوگ عام طور پر ایمان دار۔ دیانت دار اور راست گو ہوتے تھے۔

رئیس احمد عثمانی

دھند میں لپٹے لوگ

سابو (شہاب الدین) کو اپنی عمر تو اچھی طرح یاد نہیں تھی لیکن اسے یہ اندازہ تھا کہ وہ گذشتہ بیس پچیس سال سے رکشہ کھینچ رہا تھا۔ اسے یہ بات بہت عجیب لگتی کہ پچھلے بیس سال میں شہر کی آبادی جس تیزی سے بڑھی تھی اس تیزی سے نہ تو رکشہ کرایہ میں اور نہ ہی اس کی آمدنی میں اضافہ ہوا تھا۔ بلکہ سابو کو تو لگتا جیسے اس کی آمدنی پہلے سے بھی کم ہوگئی ہے۔ اپنی روزمرّہ کی کمائی سے نہ وہ اپنے بیوی بچوں کا پیٹ بھرنے اور نہ ہی ان کے تن ڈھانکنے کا انتظام کر پاتا تھا۔ ایسی بات بھی نہ تھی کہ سابو محنت سے جی چُراتا تھا۔ وہ مُنہ اندھیرے گھر سے نکلتا اور نصف رات کے قریب اپنی کچّی جھونپڑی میں قدم رکھتا۔

سابو نے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھا اور سواری کی تلاش میں گزرتے لوگوں پر پُر اُمّید نظر ڈالی۔ آج صبح سے ہی اس کا دھندا اور دنوں کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہی مندہ چل رہا تھا۔ سابو آج تک بھاگتے دوڑتے لوگوں کی عجلت کو سمجھ نہ پایا تھا جس کی وجہ سے لوگ اس کی رکشہ میں بیٹھنا پسند نہ کرتے تھے۔ سابو اپنی رکشہ کے ساتھ اس دوڑ میں شامل ہونے کی کوشش میں نہ اپنی تھکن کی پروا کرتا نہ اپنے جسم سے بہتے پسینے کی، لیکن اس کی رفتار کو کبھی ٹریفک کی گہما گہمی بریک لگاتی، کبھی مخالف ہوا۔

"کہاں جانا ہے صاب؟" سابو نے ایک شخص کو بس کا منتظر دیکھ کر آواز لگائی۔ اس آدمی نے خاموشی سے لمحہ بھر کو سابو پر نظر ڈالی اور پھر دوبارہ بس کے آنے کی سمت دیکھنے لگا۔

"آجائیے صاب، بس کے آنے میں دیر ہے۔ میں آپ کو بس سے پہلے پہنچا دوں گا۔"

اس آدمی نے ایک بار پھر بس کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں اور مایوس ہوکر سابو کی طرف بڑھا۔

"ریلوے اسٹیشن چلنا ہے۔ مجھے ٹرین پکڑنی ہے اور وقت کم ہے۔"

"آپ بیٹھیے صاب! میں آپ کو وقت سے پہلے پہنچا دوں گا۔" سابو نے اس کو یقین دلایا اور وہ رکشہ پر سوار ہوگیا۔

سابو نے رکشہ کھینچنا شروع کیا۔ وہ رکشہ کو تیزی سے چلانے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ سواری کو وقت پر اسٹیشن پہنچا سکے۔ اسے قوی توقع تھی کہ اسٹیشن سے اسے لمبی دُوری کی سواری ضرور ملے گی۔ اُسے آج کسی بھی طرح اتنے روپے کما کر لے جانا تھے جن سے وہ اپنی کچّی جھونپڑی کو پھر سے کھڑا کر سکے، جسے کل ہی میونسپلٹی والے گرا گئے تھے۔

گذشتہ بیس سالوں میں رکشہ چلاتے ہوئے سابو دو ہی چیزیں اپنی کہی جاسکنے والی بنا پایا تھا۔ ایک یہ رکشہ جس سے وہ پچھلے پندرہ سال سے روزی روٹی کما رہا تھا اور دوسری وہ کچّی جھونپڑی جو سرکاری زمین پر ناجائز قبضہ کرکے بنائی گئی تھی۔ یہ جھونپڑی سابو نے ایک شخص سے دس سال قبل چار سو روپے میں لی تھی۔ ان دس سال میں میونسپلٹی نے بیسیوں مرتبہ اس جھونپڑی کو توڑا تھا، لیکن سابو کی ہمت نہ ٹوٹی تھی اور اس نے جھونپڑی کو پھر بنالیا تھا۔

"اے! رکشہ تیز چلاؤ ورنہ میری گاڑی نکل جائے گی۔" رکشہ میں بیٹھی سواری نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور سابو رکشہ تیز چلانے کی کوشش کرنے لگا۔

سابو کو یاد نہیں تھا کہ اس نے اس سے پہلے کبھی جھونپڑی کے ٹوٹنے کی پروا کی ہو۔ لیکن آج اُسے فکر تھی۔ جس کی ایک و تھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی اس پندرہ سالہ بیٹی شبانہ اور دوسری و تھی اپینڈکس کے درد سے تڑپتی اس بیوی۔

سابو کے پاس نہ اتنے پیسے تھے وہ اپنی بیٹی کی جوانی کو چھپانے کے لیے اس کے جسم کو پھٹے بدحال کپڑوں کی جگہ لباس دے سکتا اور نہ اتنے کہ آپریشن کرا کر اپنی بیوی کو روز کی اس تکلیف

۴۳۳۴، ہادی پورہ، جوکڑی رام چندر جی، جے!

نجات دلا پاتا۔ سابو کچھ اور زیادہ محنت کرلیتا لیکن ٹی بی نے اس کے جسم کو کھوکھلا کردیا تھا۔

سابو کو اپنی بیٹی کے جسم کو گھورتی بھوکی نگاہوں کا پھر خیال آیا اور وہ ٹریفک کی بھیڑ بھاڑ کی پروا نہ کرتے ہوئے رکشہ کو اور تیزی سے کھینچنے لگا۔

اپنے خیالوں میں گم سابو تیز رفتار سے پیچھے آتی بس کی آمد سے بے خبر تھا۔ اسے تب احساس ہوا جب ہوا کے تیز جھونکے کی طرح بس اس کے بہت قریب سے گزری۔ سابو کے کمزور ہاتھوں میں ذرا سی لرزش ہوئی اور وہ اپنی رکشہ کو بس کے پچھلے حصے سے ٹکرانے سے نہ بچا سکا۔

رکشہ بس سے ٹکرا کر سڑک پر الٹ گئی۔ رکشہ پر سوار آدمی اچھل کر کچھ دور گرا تھا۔ اس کے کوئی خاص چوٹ نہیں آئی تھی اس لیے وہ جلد اٹھا اور سابو کو گالیاں دیتے ہوئے اپنا بیگ سنبھالنے لگا۔ اس نے ایک نظر سڑک پر پڑے سابو کے متحرک جسم پر ڈالی اور بڑ بڑاتا ہوا وہ لوگوں کی بھیڑ چیر کر باہر نکل آیا۔ پھر وہ قریب ہی کھڑے ایک آٹو رکشہ میں سوار ہوکر روانہ ہوگیا۔

سابو کا سر سڑک سے بہت شدت سے ٹکرایا تھا اس وجہ سے وہ اب تک اپنے حواس پر قابو نہ پا سکا۔ سر سے بہتا ہوا خون اس کے چہرے اور گردن سے گزرتا ہوا اس کے کپڑوں کو رنگین کر رہا تھا۔

سابو کو ایک جم غفیر گھیرے ہوئے تھا۔ کوئی شخص اس سے ہمدردی جتا رہا تھا تو کوئی شخص بس ڈرائیور کو گالیاں دے رہا تھا لیکن کوئی ایسا نہ تھا جو آگے بڑھ کر سابو کو سہارا دیتا۔ سب کو تھانے پولیس کے چکرّ کا خدشہ تھا۔

سابو بار بار آنکھیں پھاڑ کر اپنے گرد جمع بھیڑ کو دیکھتا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں دھوئیں کا بادل گھس گیا ہے یا یہ لوگ دھند میں لپٹے ہوئے ہیں۔

نظمیں

خود کلامی

کون سنتا ہے
میں ہی سنتا ہوں
میری آواز
میرا سوزِ دروں
کوئی سنتا نہیں
مگر میں کیوں
چیختا ہوں کہ میرا ربِ کریم
سن ہی لے گا بڑی کریمی سے
اور مری چشمِ خوں چکیدہ پر
اپنی رحمت کا منہ لگا دے گا

یوں تو اب تک ہوا نہیں لیکن
ہو رہا ہے کچھ اس طرح جیسے
اپنی آواز ہی کے شعلوں میں
روز جلتا ہوں
روز بجھتا ہوں

نثار احمد نثار
معرفت نسرین لیدر انڈسٹریز (پرائیوٹ) لمیٹیڈ، ۳۳، ڈیوڈسن اسٹریٹ، مدراس ۶۰۰۰۰۱

سوچتا ہوں کبھی کبھی یوں ہی

چاند راتوں کو جاگتا کیوں ہے
نیند آنکھوں سے بھاگتی کیوں ہے
رات بستر پہ ڈولتی کیوں ہے
یاد تنہا اداس موسم میں
میرے اندر سے گونجتی کیوں ہے
کون پیتا ہے بوند بوند مجھے
دمبدم بڑھتی تشنگی کیوں ہے
جانتا ہوں کہ تو نہیں میرا
پھر بھی تجھ سے ہی دوستی کیوں ہے

سوچتا ہوں کبھی کبھی یوں ہی



خوش دیو مینی
اسسٹنٹ ڈائریکٹر، ڈسٹرکٹ انڈسٹریز سینٹر، پونچھ، جموں کشمیر

یاسر الرحمٰن صدیقی

تحریکِ آزادی اور اُردو ڈراما

تحریکِ آزادی کے فروغ اور قومی شعور
بیداری میں اُردو زبان وادب نے
عموماً اور اردو ڈرامے نے خصوصاً
نہایت اہم اور مؤثر کردار ادا کیا ہے۔
اگرچہ ڈرامے کی ترویج وترقی میں پارسیوں
کی کوششوں کا بڑا دخل رہا ہے اور ان کا مقصد
خالص تجارتی تھا۔ اسی لیے ابتدائی ڈراموں
میں ملکی وقومی مسائل سے بحث نظر نہیں
آتی۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد کے ڈراموں میں
ملکی اور قومی جذبہ واضح طور پر نظر آتا ہے۔
عشرت رحمانی "اُردو ڈرامے کی
تاریخ وتنقید" میں ۱۸۵۷ء کے بعد کی ڈرامہ
نگاری کا پس منظر بیان کرتے ہوئے رقمطراز
ہیں:

"۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے
بعد قومی اور سیاسی بیداری کے دور میں طویل
سیاسی جدوجہد کے دوران کئی ڈرامہ نگاروں
نے سیاسی موضوعات اور مسائل پر ڈرامے
تخلیق کیے۔ یہ ڈرامے عصری سیاسی تقاضوں
کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آئے۔ ان میں
سیاسی جذبات واحساس اور شعورِ عام نظر
آتا ہے۔ ان میں سے اکثر ڈرامے عوام میں بے حد
مقبول ہوئے اور اس زمانے کی تھیٹر
کمپنیوں نے جگہ جگہ انھیں اسٹیج کیا۔ ان میں
بعض ڈراموں کے سلسلے میں حکومت نے کئی
کمپنیوں کے خلاف کارروائی بھی کی بھاری
جرمانے کیے اور کمپنیاں ضبط کیں۔"

"تحریکِ آزادی میں اُردو کا حصہ"
میں حسین عقیل لکھتے ہیں:

"بعض ڈراموں میں محض سیاسی واقعات و
حالات پیش کیے گئے ہیں اور بعض میں کھل کر
برطانوی مظالم سیاسی جبر واستبداد اور انگریزوں
کی ریشہ دوانیوں کو دکھایا گیا ہے اور چند
ڈراموں میں آزادی کی اہمیت، حصولِ آزادی
کی ترغیب اور برطانوی حکومت سے نجات
جیسے موضوعات اور خیالات بیان کیے گئے ہیں۔"

سیاسی ڈراموں میں اردو کا پہلا ڈرامہ
"فرنگی اور ہندوستانی طرزِ حکومت" کو قرار
دیا جاسکتا ہے۔ مگر اس کے بارے میں زیادہ
معلومات دستیاب نہیں۔ عبدالعلیم نامی نے
صرف اتنی اطلاع دی ہے کہ "اُردو میں سیاسی
موضوعات پر پہلا ڈرامہ 'فرنگی اور ہندوستانی
طرزِ حکومت' ہے جو ۱۸۵۷ء میں بمبئی میں
اسٹیج کیا گیا۔"

اس کے کافی عرصے بعد ۱۸۹۳ء میں
امراؤ علی لکھنوی نے "البرٹ بل" کے نام سے
ایک ڈرامہ تخلیق کیا۔ اس ڈرامے میں ابتدا سے
آخر تک برطانوی حکومت کے جبر واستبداد کو دکھایا
گیا ہے اور انگریزوں کو متکبر، متعصب اور ظالم
قرار دیا گیا ہے۔ اس کے کرداروں میں مسٹر ہارس،
مسٹر پرتجوڈس، مسٹر اینگر، مسٹر براؤڈ کو اسم بامسمیٰ
دکھایا گیا ہے۔ ڈرامے کے آخری حصے میں ہندوستانیوں
کو فتحیاب دکھاتے ہوئے ترمیم شدہ البرٹ بل
کے وائسرائے کی کونسل میں منظور ہونے کے
واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

اس سلسلے کا ایک اہم ڈرامہ مولانا ظفر علی
خاں نے "جنگِ روس وجاپان" تصنیف کیا
تھا۔ اس ڈرامے کے بارے میں حسین عقیل نے
لکھا ہے:

"یورپ کی آخری انیسویں صدی کی جنگی
حکمتِ عملی کو "مرض جوع الارض" قرار دیا ہے۔
ظفر علی خاں نے جاپانیوں کی قوم پرستی کے ذکر
سے ہندوستانیوں کو سبق حاصل کرنے کی
ترغیب دی ہے۔ اس میں ایسے کردار پیش کیے
گئے ہیں جو ہندوستانیوں کے لیے مثالی ہوسکتے
ہیں۔ ضعیف بیوہ ماں کا محض اس خیال سے
خودکشی کرنا کہ اس کے بعد اس کا لڑکا ماں کی
خدمت کے بجائے ملک وقوم کی خدمت
کرسکے، اور اس نوجوان کا دھیان صرف ملک و
قوم کی خدمت کی طرف رہے۔ طفلِ مکتب کا
مدرسے کے اوقات کے بعد مٹھائی بیچ کر جنگی
فنڈ میں روپیہ دینا محکوم ہندوستانیوں کے لیے
مشعلِ راہ ہوسکتا تھا۔ اس ڈرامے کے ذریعے
یورپ کے مقابلے میں ایشیا کی برتری کے احساس
کو بیدار کرنا بھی تھا۔ جو فی الواقع جاپان کی

شعبۂ اُردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

کے مقابلے میں فتح (۱۹۰۵ء) کے بعد میں پیدا ہو رہا تھا۔[۴]

اس کے علاوہ متعدد ایسے ڈرامے ...تی کیے گئے جن میں حب الوطنی اور ملک کی خدمت کا جذبہ اور لگن پائی جاتی ہے۔ ...غم نظامی کے ڈرامے "قومی دلیر" میں ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا گیا ہے۔ عبداللطیف کا "ہمارا گھر" بھی اسی موضوع پر ہے۔ اس ڈرامے کا مرکزی کردار ہندو ہے جو مسلمانوں سے بے پایاں محبت کرتا ہے۔ وہ اپنا تمام سرمایہ سوراج اور خلافت فنڈ کو دے دیتا ہے۔ اسی طرح عباس علی نے "لیڈی جوتنی" اور "شاہی فرمان عرف دیش اپدیش" تخلیق کیے۔ آخرالذکر ڈرامے کا مرکزی کردار رام ناتھ اخبار "ہندو درپن" کا ایڈیٹر ہے۔ رام ناتھ انگریزوں کی بدعنوانیوں اور حکمتِ عملی کی خامیوں پر تنقید کرتا ہے۔ دل لکھنوی کا ڈرامہ "تاج محل" بھی ہندو مسلم یگانگت اور یکجہتی پر مبنی ہے۔ شمس لکھنوی کے ڈرامے "مادرِ وطن" اور "حب الوطن" خاص ہیں۔ انھوں نے ان ڈراموں میں حب الوطنی کے جذبات کو نمایاں کیا ہے اور بتایا ہے کہ وطن کی محبت ہر ہندوستانی کا فرض ہے اور غلامی سے نجات کے لیے ہندوستان کے ہر شہری کو جدوجہد کرنی چاہیے۔

محی الدین عزم کا ڈرامہ "دیش کی پکار" ایک اہم ڈرامہ ہے۔ اس ڈرامے کے ذریعے انھوں نے ہندوستانی عوام کے قومی شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ "کرشمۂ افلاس عرف خونِ حسرت" کے عنوان سے وحشت دہلوی نے ایک ڈرامہ تصنیف کیا تھا۔ اس میں انھوں نے انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت کی ہے اور سرمایہ داروں کے مظالم اور عوام کی زبوں حالی کو پیش کیا ہے۔ "بیداری" میں اظہر دہلوی نے آزادی کی تحریکوں کا پورا سیاسی تناظر پیش کیا ہے۔ تحریک عدم تعاون، تحریک خلافت، جلیانوالہ باغ کا سانحہ، مارشل لا، سودیشی تحریک کے مختلف واقعات اور ان کے عواقب بیان کیے گئے ہیں۔ اور ہندوستان کے عوام کو آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینے اور قربانیاں پیش کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر ایک اقتباس ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

امرت: جلیانوالہ باغ کی زمین لالہ زار بنادی گئی ہے۔ بے گناہ اور نہتے ہندوستانیوں کو مشین گنوں کا نشانہ بنادیا گیا۔ مسلمان بھائیوں کی خلافت پارہ پارہ کردی گئی اور ان کی فریاد مطلق نہیں سنی گئی۔

بخشی: بے شک عدم تعاون ہی ہمارے درد کا علاج ہے۔ عدم تعاون کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ قاتلانِ جلیانوالہ باغ کو عبرت انگیز سزا نہیں دی جائے گی۔ اور جب تک خلافت کا فیصلہ مسلمانوں کے خیال کے مطابق نہیں کیا جائے گا اور ہندوستانیوں کی آواز کو نہیں سنا جائے گا۔

امرت: مگر یہ باتیں سوراج کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتیں۔

بخشی: بے شک نہیں ہوسکتیں۔ اسی لیے کانگریس اور مسلم لیگ نے سوراج کو اپنا نصب العین قرار دیا ہے۔"[۵]

لالہ کشن چند زیبا کا ڈراما "شہیدِ وطن" موتی لال نہرو کی زندگی کا احاطہ کرتا ہے اس میں دکھایا گیا ہے کہ موتی لال نہرو اپنے پورے خاندان کے ساتھ گاندھی جی کا ساتھ دیتے ہیں اور اپنے پیشہ ورانہ تقاضوں کو پس پشت ڈال کر تحریک آزادی میں عملی حصہ لیتے ہیں۔ "شہیدِ وطن" کے دیباچے میں یہ اشعار درج ہیں:

پرورش کیا کیا کیے گوہر زمینِ ہند نے
کیسے کیسے لال اگلے سرزمینِ ہند نے
روشنی خورشید نے لی جن کی آب و تاب سے
ہے غلامی کو بھی سکتہ جن کے رعب و داب سے

نور الٰہی محمد عمر کا ڈرامہ "روحِ سیاست" پنڈت نہرو اور ابراہم لنکن کی سیاسی جدوجہد پر مشتمل ہے اس میں دونوں رہنماؤں کی ملکی اور قومی خدمات کو پیش کیا گیا ہے۔

اشتیاق حسین قریشی کا ڈرامہ "نقشِ آخر" جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے حالات و واقعات پر مبنی ہے۔ اس ڈرامے میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کا پورا منظر پیش کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی تباہی و بربادی اور مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کی پامالی۔ نیز مسلمانوں میں قومی سیاسی اور تعلیمی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پروفیسر محمد مجیب نے بعض اہم ڈرامے تخلیق کیے انھوں نے مقصدی اور اصلاحی ڈراموں کے علاوہ تاریخی ڈرامے بھی لکھے۔ ان کا ڈراما "آزمائش" اگرچہ آزادیِ ہند کے بعد یعنی جولائی ۱۹۵۷ء میں پہلی بار منظرِ عام پر آیا لیکن یہ ڈراما ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس ڈرامے کے بارے میں قمر اعظم "اردو ڈرامہ نگاری" میں لکھتے ہیں:

"اس میں انگریزوں کے خلاف عوام ا

فوجیوں کی بغاوت اور شہزادہ مرزا مغل کی رہبری نے وطن پرستانہ سرفروشی اور سرفروشانہ وطن پرستی کے سلسلے میں قومی زندگی کے بعض اہم پہلوؤں کی پوری وضاحت کردی ہے۔ یہاں عقائد و عزائم شدت و قوت کے ساتھ ایک دوسرے سے متصادم ہوتے ہیں۔ ان سے اثر انگیز مکالموں کے شعلے بلند ہوتے ہیں اور منزل و مقصد کے راستے روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان ڈرامائی واقعوں اور مکالموں میں ڈرامہ نگار کی صرف معلومات ہی نہیں محسوسات بھی ہیں۔[۵]

"آزمائش" کا ایک اقتباس ذیل میں پیش کیا جارہا ہے:

مرزا مغل: کیوں کیا ہوا؟

حکیم احسن اللہ خاں: کیا بتاؤں زبان میں طاقت نہیں کہ بیان کرسکے۔ فرنگیوں کی گستاخیاں کیا کم تھیں۔ آج اپنے ملک کی بیبا کی دیکھ لی۔ ... میرٹھ کی فوج نے غدر کردیا۔ وہاں مار دھاڑ کرکے باغی آج یہاں پہنچے حضورِ اقدس سے مطالبہ کررہے ہیں کہ ان کے بادشاہ بن جائیں۔[۶]

حوالے

۱۔ عشرت رحمانی ــــــ اُردو ڈرامے کی تاریخ و تنقید، ص۔ ۲۰۸۔

۲۔ معین عقیل ــــــ تحریکِ آزادی میں اُردو کا حصہ، ص ۵۸۹۔

۳۔ عبدالعلیم حامی ــــــ اُردو تھیٹر، جلد دوم، ۱۹۶۲ء، ص۔ ۳۰۰۔

۴۔ معین عقیل ــــــ تحریکِ آزادی میں اُردو کا حصہ، ص۔ ۵۹۰۔

۵۔ اظہر دہلوی ــــــ "بیداری" بحوالہ نوائے آزادی، مرتبہ عبدالرزاق قریشی، ۱۹۵۷ء، ص۔ ۱۹۵۔

۶۔ اشتیاق حسین قریشی ــــــ "نقش آخر"، ص۔ ۱۵

۷۔ پروفیسر محمد مجیب ــــــ آزمائش ۱۹۵۷، ص۔ ۷-۸۔

ملکہ خورشید

خالی پیکٹ

سگریٹ کا یہ خالی پیکٹ جو عرصے سے میری میز پر پڑا ہے میری ذات کا ایک حصّہ بن گیا ہے۔ میں اسے پھینک بھی نہیں سکتی کہ یہ جاں نواز بھی ہے۔ لوگوں کی سمجھ میں یہ معمّہ نہیں آتا کہ سگریٹ کا یہ ملگجا سا پیکٹ میری میز پر اتنی احتیاط سے کیوں رکھا رہتا ہے۔

میں سگریٹ نہیں پیتی، ایسا نہیں ہے کہ میں نے کبھی سگریٹ نہ پی ہو لیکن میں اس کی عادی نہیں ہوں، شوق البتہ رہا ہے، ابّو کے پیے ہوئے ادھ جلے سگریٹوں کے چوری چھپے لیے گئے کشوں کا ذائقہ اب بھی میرے ہونٹوں پر محفوظ ہے، لیکن یہ پیکٹ ان دنوں کی یاد ہرگز نہیں ہے۔

سگریٹ کا یہ خالی پیکٹ میرے لیے بھی اُلجھن کا سبب ہے اور دوسروں کے لیے بھی، کمرے کی صفائی میں خواہ کتنی بھی اتھل پتھل ہو، اس پیکٹ کی پوزیشن میں رتّی برابر بھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ شکر ہے لوگوں کے ذہن میں اس پیکٹ کا تم سے رشتہ جوڑنے کا خیال نہیں آیا ہے، ویسے یہ حقیقت ہے کہ یہ خالی پیکٹ تم یہاں چھوڑ گئے تھے۔ یہ خالی اور بیکار پیکٹ جسے تم لاپرواہی سے میز

نے کبھی نہیں سوچا تھا، اب اس کے بغیر نہ میں کچھ سوچ سکتی ہوں نہ لکھ سکتی ہوں احساس بھی کبھی کبھی کتنے سرکش ہو جاتے ہیں اور یہ سرکش احساسات اختیار میں کب ہوتے ہیں، ایک سرا ہاتھ میں رہے تو بھی کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ تم سے میرا کوئی تعلق کبھی نہیں رہا، نہ کبھی تھا، نہ ہے لیکن پھر وہی احساسات، جو کسی منطق کے پابند نہیں ہوتے، کسی اصول کو تسلیم نہیں کرتے کوئی دلیل نہیں سنتے۔ موج در موج آدمی کو غرق کر دیتے ہیں، ایسا کہ اس کی شخصیت مسخ ہو جاتی ہے، منہدم ہو جاتی ہے۔ کسی اسٹاپ، کسی رہ گزر پر ہونے والا تعارف روگ تو نہیں بن جاتا، روگ بھی ایسا ——

بھیّا نے مجھے تم سے گفتگو کرتے دیکھا۔

کلاس فیلوز نے پوچھا۔

"کون ہے؟" —— "کون ہے؟"

ہر رشتے کو عنوان کیوں چاہیے آخر؟

میں بہت ڈرپوک ہوں۔

کبھی اپنے گھر کا ایڈریس تم کو نہیں دیا پھر بھی دل کا ویرانہ چیختا رہا کاش تم آ جاؤ، آہٹوں پر دل بے ہنگم انداز میں دھڑکنے لگتا کہ شاید تم آئے ——

یہ محض اتفاق تھا کہ ایک دن تم ہمارے گھر چلے آئے۔ یونہی بے سان و گمان —— میں ہڑبڑا گئی تھی، ہراساں۔ یہ تک نہ پوچھا کہ تم کس طرح یہاں پہنچے؟ حواس تو جب واپس ہوئے جب تم جا چکے تھے اور میز پر سگریٹ کا خالی پیکٹ مجھے دلاسا دینے کو پڑا رہ گیا تھا جو آج تک محفوظ ہے۔ میں نے یوں سنبھال کر رکھا ہے جیسے متاعِ زیست ہو کوئی۔ برسوں بیت چکے ہیں، وقت کی دھول نے اسے بھی ملگجا بنا دیا ہے وقت اپنے ساتھ تمھیں بھی کہیں لے گیا۔ محفوظ ہے تو یہ پیکٹ۔ لوحِ تقدیر کی طرح —— جذبوں کی تشریح بھلا کہاں ممکن ہے۔ الفاظ، جذبوں کے ہجوم اور خیالات کی یورش میں اتنے بے بس کیوں ہو جاتے ہیں۔

●

سی-۲۴، جے پارک ۲، مہانگر ایکسٹینشن، لکھنؤ

قلمکار حضرات سے گزارش

دفتر میں مضامین نثر و نظم کثیر تعداد میں جمع ہو گئے ہیں اس لیے اعلانِ ثانی تک اپنی نگارشات بلا طلب بھجوانے کی زحمت نہ فرمائیں

پروانہ ردولوی

سلامت علی مہدی ـــــ ایک شعلہ جو بجھ گیا

لکھنؤ میں ۱۰ر جون ۸۹ء کی رات کو سلامت علی مہدی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کے انتقال سے اُردو دنیا ایک شعلہ رقم صحافی سے محروم ہو گئی۔ وہ صرف صحافی ہی نہ تھے بلکہ جوشیلے مقرر بھی تھے۔ اس صدی کی چھٹی دہائی میں ترلوکی سنگھ، شبن لال سکسینہ، گینڈا سنگھ اور ہیم وتی نندن بہوگنا کے انتخابی جلسوں میں جن لوگوں نے ان کو تقریر کرتے ہوئے دیکھا اور سنا ہے وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ وہ اپنی تقریروں سے جادو کا کام کرتے تھے۔

سلامت علی مہدی داستان گویوں کے انداز میں گفتگو کرتے تھے۔ دنیا کے ہر موضوع پر وہ گھنٹوں بول سکتے تھے اور سامعین ان کی گفتگو کے دلکش انداز پر حیرت زدہ ہو جایا کرتے تھے۔

انھوں نے بہت سے رومانی اور جاسوسی ناول اور افسانے بھی لکھے۔ کچھ کہانیوں کے ترجمے بھی کیے اور بہت سی تحریکوں کی قیادت بھی کی۔ مثال کے طور پر یگانہ چنگیزی کے خلاف ان کی تحریک جو ادبی دنیا کا ایک ناقابلِ فراموش واقعہ بن چکی ہے۔

سلامت علی مہدی کا تعلق لکھنؤ کے ایک اثنا عشری سوداگر خاندان سے تھا۔ اُن کے والد اپنے زمانے کے ایک کامیاب سوداگر تھے اور لکھنؤ کے محلّہ رستی بٹّان میں رہا کرتے تھے۔ ان کے ایک بھائی ابھی تک سوداگری کے پیشے سے وابستہ ہیں اور لکھنؤ کی نظیر آباد کی مارکیٹ میں ان کی ایک بہت بڑی دُکان ہے ان کے سب سے چھوٹے بھائی باقر مہدی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور وہیں لائبریری میں ملازم ہو گئے۔ درمیان میں وہ چند سال کے لیے ہندوستان سے باہر چلے گئے تھے مگر زیادہ عرصے تک اپنے وطن سے دور نہ رہ سکے اور دوبارہ ہندوستان واپس آنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ سلامت علی مہدی نے ایک سے زیادہ شادیاں کیں۔ ان کی پہلی بیوی لکھنؤ ہی کی تھیں اور عمر میں اُن سے بڑی تھیں سلامت صاحب اُنھیں ماسٹر جی کہا کرتے تھے۔ اس خطاب کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے سلامت صاحب کو پڑھایا بھی تھا۔ اُن سے سلامت صاحب کے دو لڑکیاں اور دو لڑکے ہوئے دونوں لڑکے کاروبار کرتے ہیں۔ اُن کی دوسری بیویوں کے سلسلے میں مجھے زیادہ معلومات نہیں۔ اتنا جانتا ہوں کہ آخری دنوں میں ایک گجراتی خاتون ان کی شریکِ زندگی تھیں۔ اُن سے بھی دو لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ یہ خاتون دونوں لڑکیوں کے ساتھ کرایے کے اس مکان میں سلامت صاحب کے ساتھ رہتی تھیں جو لکھنؤ میں کنگھی والی گلی میں سنڈیلہ ہاؤس کی پشت پر واقع ہے اور جہاں سلامت صاحب نے زندگی کے آخری دن گزارے۔ دونوں لڑکے جن کے نام عثمان اور علی ہیں گزشتہ دو سال سے سلامت صاحب سے الگ رہنے لگے تھے۔

سلامت صاحب سے میرا تعلق بہت گہرا اور پُرانا تھا۔ لگ بھگ چالیس سال سے میں اُنھیں جانتا تھا۔ پہلی بار اُن سے میری ملاقات کانپور میں حکیم سید آل حسن رضوی (مرحوم) کے مطب میں ہوئی تھی۔ حکیم صاحب میرے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ وہ کانپور کے مشہور سیاسی اور سماجی کارکن بھی تھے اور اُردو ادب و صحافت سے اُنھیں بڑی دلچسپی تھی۔ اسحٰق علمی کے جیل جانے کے بعد وہ "سیاست جدید" کے ایڈیٹر بھی ہوا کرتے تھے۔ ان کے مطب میں مولانا حسرت موہانی سے لے کر مولانا اسحٰق علمی تک اور مولانا احمد حسین پاروی سے لے کر شارق ایرایانی تک بڑے اور چھوٹے ہر طرح کے شاعر، ادیب اور صحافی ہر روز آیا کرتے تھے جب مولانا اسحٰق علمی لمبی مدت کے لیے نظر بند ہو گئے تو ان کے مینجر مولوی حفیظ ملیح آبادی نے سلامت علی مہدی کو ایڈیٹر بنا کر "سیاست" کی جگہ پر "سیاست جدید" نکالا۔ اسحٰق علمی صاحب سے سلامت علی مہدی کی زیادہ دن تک نہ بن سکی اور جلد ہی سلامت صاحب نے "سیاست جدید" سے قطع تعلق کر لیا۔ مگر اس اخبار کے ذریعے چند ماہ کے اندر ہی وہ یو۔پی، بہار، کلکتہ اور مدھیہ پردیش میں کافی مشہور ہو چکے تھے۔ اور چونکہ انھوں نے کلکتہ کے سید بدر الرحمٰن (مرحوم) اور علی گڑھ کے ایم ایم بشیر کے ساتھ مل کر علی گڑھ

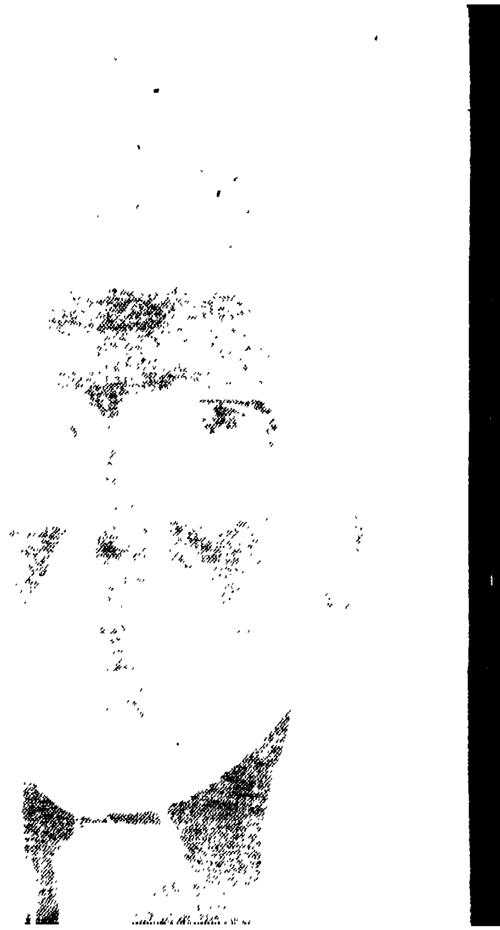
---

۱۶۵ حوض رانی، مالویہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

میں ایک مسلم کنونشن کامیابی سے منعقد کرنے کے بعد مسلم جماعت کے نام سے ایک سیاسی تنظیم قائم کر لی تھی اس لیے انھیں بھی "سیاست جدید" کی ضرورت نہ رہ گئی تھی۔ مسلم جماعت آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی پہلی جداگانہ سیاسی تنظیم تھی اور اس کا قیام حافظ ابراہیم، مولانا حفظ الرحمان، مولانا آزاد، جواہرلال نہرو تک کسی کو پسند نہ تھا۔ اس جماعت کے پلیٹ فارم سے سلامت علی مہدی نے بہت جوشیلی تقریریں کیں اور یو۔ پی، بہار بالخصوص مشرقی یو۔ پی میں نیم خواندہ مسلمانوں نے ان کو اپنا رہنما سمجھ کر انھیں سر آنکھوں پر بٹھانا شروع کر دیا۔ مگر جلد ہی یہ جماعت ختم ہو گئی اور ملکی سیاست میں کوئی تبدیلی نہ لا سکی۔

غالباً ۱۹۵۰ء کی بات ہے میں اپنی تعلیم نامکمل ہی چھوڑ کر روزگار کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔ ان ہی دنوں یو۔ پی روڈویز میں ایک جگہ کے لیے انٹرویو دینے الٰہ آباد گیا۔ الٰہ آباد کی دیواروں پر بڑے بڑے پوسٹر لگے ہوئے دیکھے جن سے معلوم ہوا کہ سلامت علی مہدی لکھنؤ سے اُردو کا ایک مکمل اور بے باک اخبار "ملت" نکالنے والے ہیں۔ ان پوسٹروں کو میں نے بار بار پڑھا اور مجھے ایسا لگا کہ "ملت" مسلمانوں کے تمام مسائل پلک جھپکتے ہی حل کر دے گا۔ دل نے کہا "سرکاری نوکری میں کیا رکھا ہے اخبار نویس بنو" اور میں الٰہ آباد سے سیدھا لکھنؤ آ گیا "ملت" کے دفتر میں سلامت صاحب سے ملا۔ ان سے بات چیت کر کے اس نتیجے پر پہنچا کہ انھیں مسلمانوں کی قسمت بدلنے کے لیے ایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے جو پیٹ پر پتھر باندھ کر کام کریں اور میں اس کے لیے تیار ہو گیا۔

اس اخبار کے اداریے احمد علی علوی کاکوروی لکھا کرتے تھے (بعد میں علوی صاحب نے دہلی میں برہم پرکاش کے اُردو اخبار "سنسار" میں کام کیا اور کچھ دن بعد پاکستان جا کر "جنگ کراچی" سے وابستہ ہو گئے۔) اس کا فکاہیہ کالم "خاصدان" "پروانہ ہاشمی" کے نام سے میں لکھا کرتا تھا۔ "ملت" میں میرا ایک قسط وار مضمون شائع ہوتا تھا جس کا عنوان تھا "شام اودھ پر چند آنسو" میرے ذمے خبروں کا ترجمہ کرنا، ریڈیو سے خبریں سن کر انھیں مناسب طور پر ایڈٹ کرنا اور کاپی جوڑنے کا کام بھی تھا۔ اقبال صدیقی صاحب بھی ملت کے عملے میں شامل تھے اور مقامی نامہ نگاری سے لے کر بنڈلوں کی بکنگ تک کا کام کیا کرتے تھے۔ ایک صاحب اور حسین قدوائی نام کے تھے وہ یو۔ پی اور بہار کے مختلف شہروں کا دورہ کر کے ملت کی ایجنسیاں قائم کیا کرتے تھے (حال ہی میں ان کا بھی انتقال ہو گیا) ملت کے لیے پہلا دفتر مولوی گنج میں خاکسار لیڈر رئیس فاطمی نے فراہم کیا تھا۔ یہ ٹوٹی پھوٹی عمارت ابھی تک موجود ہے۔ میں دن بھر کام کرنے کے بعد رات کو اسی دفتر میں زمین پر بوریاں بچھا کر سو جایا کرتا تھا۔ مسلمانوں کی قسمت بدلنے کے لیے



سلامت علی مہدی

پیٹ پر جو پتھر باندھا تھا وہ اکثر بہت اذیت ناک بن جایا کرتا تھا۔ مگر بظاہر ایم۔ ایم بشیر بھی بھوکے تھے، احمد علی علوی بھی، سلامت علی مہدی اور اقبال صدیقی بھی۔ پھر میرا پیٹ کیسے بھر سکتا تھا۔ ان حالات میں ملّت کا زیادہ دن چلنا ممکن نہ تھا پھر بھی سلامت علی مہدی کی ہمت کو داد دیجیے کہ انھوں نے ایک سال تک یہ اخبار چلایا جب فاطمی صاحب نے اپنا کمرہ خالی کرالیا تو "ملت" یونائٹیڈ پریس نظیر آباد سے نکلنے لگا۔ یہ پریس "نگار" کے ایڈیٹر نیاز فتحپوری کا تھا۔ انھوں نے اپنے مشین مین کو اس پریس کا ٹھیکہ دے دیا تھا۔ جب تک مشین مین سے سلامت صاحب کی بنتی رہی "ملت" اس پریس میں چھپتا رہا۔ جب مشین مین کو بھی پیٹ پر پتھر باندھنے پر مجبور ہونا پڑا تو اس نے اخبار چھاپنا بند کردیا انہی دنوں لکھنؤ کے علاقے فیض آباد میں شاہی خزانے کی تلاش ہو رہی تھی اور اخباروں میں اس خزانے کی تلاش کے سلسلے میں خبریں شائع ہو رہی تھیں۔ ایک دن سلامت صاحب نے مجھ سے کہا ——— "آج خزانہ نکال ہی دو" ——— اور میں نے خزانہ نکال دیا۔ سات کالمی سُرخیوں کے ساتھ "ملت" میں یہ خبر شائع ہوئی کہ خزانہ نکل آیا ہے۔ جواہرات اور زیورات کی پوری فہرست شائع کردی گئی۔ اشرفیوں کی تعداد بھی دی گئی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ایک پریس نوٹ جاری کرکے "ملت" کی خبر کو بے بنیاد قرار دیا مگر "ملت" نے اس تردید کو شائع نہیں کیا۔ ریڈیو پاکستان نے بھی ملت کی خبر نشر کردی۔ جن نواب صاحب کے ہاں خزانے کی تلاش کا کام ہو رہا تھا ان کے عزیز و اقارب کی جانب سے مبارکباد کے تار آ رہے تھے اور نواب صاحب اپنا سر پیٹ رہے تھے۔ اس واقعے کے چند روز بعد "ملت" بند ہوگیا۔ ایم۔ ایم۔ بشیر لکھنؤ سے علی گڑھ چلے گئے۔ اور وہاں سے پاکستان جا پہنچے۔ میں دہلی آگیا اور مولانا عبدالوحید صدیقی کے اُردو روزنامے "نئی دنیا" سے وابستہ ہوگیا۔

سلامت علی مہدی لکھنؤ میں رہ کر پرواز بک ڈپو کے نام سے ایک پبلشنگ ہاؤس چلانے لگے۔ جس میں ان کے شریک کار روزارت شکوہ کاشمیری تھے۔ اس بک ڈپو نے خان محبوب طرزی، ضیا عظیم آبادی، شوکت تھانوی اور خود سلامت علی مہدی کے بہت سے ناول شائع کیے۔ مگر سلامت صاحب سے یہ بک ڈپو بھی نہ چل سکا۔ پھر انھوں نے معمّوں کا سلسلہ شروع کیا اور کچھ دنوں کے بعد معمّے کا کاروبار بھی بند کردیا۔ سلامت علی مہدی کو سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ان کی لچھے دار بات چیت ہر شخص کا دل موہ لیتی تھی۔ لکھنؤ میں ان کے بے تکلف دوستوں کے حلقے میں ہر طرح کے لوگ شامل تھے۔ ممبرانِ اسمبلی، وزرا، اعلیٰ افسران، چھوٹے موٹے لیڈر، علما اور اخباری کارکن، ہاکر، مالش کرنے والے، شعرا۔ ان میں ایک صاحب شعور بریلوی تھے جو مولوی گنج میں خراد کی دُکان چلاتے تھے مگر عروض کے ماہر تھے۔ سلامت صاحب نے شعور صاحب کی مدد سے "ملت" میں کئی شاعروں کے بخیے اُدھیڑے۔

سلامت علی مہدی کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ہمت کبھی نہیں ہارتے تھے اور عزم و حوصلے سے کام لے کر بڑی سے بڑی مشکل پر قابو پا لیتے تھے۔ ان کے پاس پیسے ہوتے تو ضرورت مندوں کو آنکھ بند کرکے د تھے۔ اور نہ ہوتے تو دوستوں سے بالکل نہ ہچکچاتے۔

جن دنوں وہ "ملت" نکال ر ہی دنوں کشمیر کے اس وقت کے و بخشی غلام محمد لکھنؤ تشریف لائے۔ ہ کے بعض حلقے بخشی غلام محمد کی پالیسیوا تھے اور شیخ عبداللہ کو کشمیر کا حقیقی کرتے تھے۔ بخشی صاحب نے سلام مہدی سے معاملات طے کرنے کی کوش وہ اپنی ضد پر اڑے رہے اور بخشی غلا خلاف ان کے قلم کی روانی میں کوئی کمی، پھر بخشی صاحب کا معاملہ دہلی کے ایک سے طے پاگیا اور اس اخبار نے اپنا کا نکالا۔ کانپور ایڈیشن کا نیوز ایڈیٹر مجھ اور میں دہلی سے کانپور چلا گیا۔ کانپور ہر دوسرے یا تیسرے دن لکھنؤ جاتا تھ امین آباد میں عبداللہ کے ہوٹل میں یا کبھی میں اظہر صاحب کی دُکان کتاب دنیا میں شیعہ گزٹ کے ایڈیٹر ہاشم رضا عابدی کے والے مکان میں، اور کبھی حفیظ نعمانی کے تن پریس میں یا سالار بخش کی لکڑی کی ٹال پر صاحب سے ملاقات ہو ہی جاتی تھی۔ وا صاحب کے عروج کا زمانہ تھا۔ "ملت" "سیاست جدید" کے ذریعے وہ کافی شہر حاصل کرچکے تھے۔ سیاسی اور مذہبی جلسو دور دور سے ان کا بلاوا آتا تھا اور سیرت کے جلسوں میں ان کی شعلہ بار تقریروں نے بہت سے مستند واعظین کا بازار ٹھنڈا کر رکھ سلامت صاحب دونوں ہاتھوں سے کما تھے اور دونوں ہاتھ سے لٹاتے تھے عام مسلما

ان کی تحریروں اور تقریروں کا دیوانہ تھا مگر اُنھوں نے مسلمانوں کی اس دیوانگی اور جنون سے کوئی ناجائز فائدہ کبھی نہیں اُٹھایا۔

سلامت صاحب میں تعصب ذرہ برابر نہ تھا وہ اثنا عشری شیعہ تھے مگر سُنیّوں میں ان کی بڑی عزّت تھی۔ انھوں نے اپنے ایک بیٹے کا نام عثمان رکھا تھا۔ ان کی گجرات والی بیوی سُنّی تھیں ان سے جو بچّے ہیں وہ سب ماں کے ہم عقیدہ ہیں۔ سلامت صاحب نے اُن پر اپنے عقائد نہیں ٹھونسے۔ میں ان کو مجالسِ عزا میں بھی بہت کم دیکھتا۔ حالانکہ حضرت امام حسین ان کی بہن زینب اور اُن کے بھائی حضرت عباس پر وہ جان چھڑکتے تھے اور اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر دنیا کا کوئی مذہب کربلا کے ان تینوں کرداروں کا جواب پیش کر دے تو وہ اس مذہب کو اختیار کر لیں گے۔ گزشتہ چار سال سے وہ صاحبِ فراش تھے۔ سال میں ایک دو بار جب میں لکھنؤ جاتا تھا تو ان سے ملنے ضرور جایا کرتا تھا تین سال قبل لکھنؤ میں شیعہ سُنّی جھگڑے کی وجہ سے رات کا کرفیو نافذ تھا۔ میں اُن سے مِلنے چلا گیا ارادہ تھا کہ جلد اُٹھ آؤں گا اور کرفیو لگنے سے پہلے اپنی قیام گاہ پر پہنچ جاؤں گا۔ مگر ان کی باتوں میں کھو کر رہ گیا وقت کا پتہ ہی نہ چلا اور کرفیو لگ گیا ـــــ وہ اپنے مخصوص انداز میں مسلمانوں کی بدبختی پر تبصرہ کرتے رہے۔ انھوں نے بتایا کہ "فلمی ستارے" والے حاجی انیس، "گلفام" والے سلطان اختر اور "عظیم آباد ایکسپریس" والے رضوان احمد کبھی کبھی ان کی خبرگیری کر لیتے ہیں۔ وہ سخت بیمار تھے مگر ان کے حوصلے بلند تھے۔ انھوں نے کبھی کسی کے آگے دستِ طلب دراز نہیں کیا۔ ریاستی حکومت اور یو۔ پی۔ اُردو اکادمی سے امداد کی توقع ضرور کرتے تھے جو اُن کو ملی مگر برائے نام۔ یہ امداد بھی دہلی سے میری اور مخمور سعیدی کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ میں نے عمار رضوی کو اور میری تحریک پر مخمور سعیدی نے علی جواد زیدی کو خطوط لکھے تو ایک معمولی سی رقم اردو اکادمی نے منظور کی۔ ان کے علاج کا انتظام یو۔ پی کے وزیر صحت لوک پتی ترپاٹھی (کملاپتی ترپاٹھی کے صاحبزادے) نے بلرام پور ہسپتال میں کروا دیا تھا۔ جنتا لیڈر رجیندر سنگھ کو انھوں نے میرے ہاتھ ایک خط بھجوایا تھا۔ انھوں نے بھی سلامت صاحب کے لیے کچھ کر دیا تھا۔ اوپر میں نے کانپور میں بخشی غلام محمد کے حامی اخبار میں کام کرنے کا ذکر کیا ہے اس اخبار سے نکل کر جب میں نے کانپور سے اپنا اخبار "سیاست نو" نکالا تو سلامت صاحب کو بہت خوشی ہوئی ـــــ انھوں نے خط لکھ کر مجھے ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا اور "سیاست نو" کی اشاعت و مقبولیت بڑھانے میں عملی مدد دینے کے لیے پاکستان کے غیر مسلم قبایل کی دلچسپ زندگی پر ایک طویل مضمون کئی قسطوں میں لکھا۔ یہ مضمون بہت پسند کیا گیا۔ جب میں نے ان کی اس خدمت کا معاوضہ ادا کرنا چاہا تو انھوں نے صرف ساٹھ روپے لیے اور کہا "مجھے آج ساٹھ روپوں کی سخت ضرورت ہے اس لیے لے رہا ہوں۔" انھوں نے میرے سامنے ہی وہ ساٹھ روپے ایک برقعہ پوش خاتون کو دے دیے جو اُن کو دعائیں دیتی ہوئی چلی گئیں۔ سلامت صاحب کے تعلق سے اس قسم کے متعدد واقعات کا میں عینی شاہد ہوں۔ جب نامساعد حالات کی وجہ سے ایک سال بعد میں "سیاست نو" بند کر کے بمبئی چلا گیا اور وہاں سے پھر دہلی واپس ہو کر روزنامہ "نئی دنیا" سے دوبارہ وابستہ ہو گیا تو سلامت صاحب کو اس بات کا بڑا رنج ہوا کہ میں مالک سے دوبارہ نوکر بن گیا ہوں ـــــ عرصے تک سلامت صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔ کیونکہ دہلی سے لکھنؤ جانا آسان نہ تھا۔ "نئی دنیا" بند ہونے کے بعد میں جماعت اسلامی کے اخبار "دعوت" میں چلا گیا۔ "دعوت" چھوڑ کر لکھنؤ گیا اور مسلم مجلس کے اخبار "قائد" کا ریذیڈنٹ ایڈیٹر بن گیا۔ لیکن اُن دنوں سلامت صاحب لکھنؤ میں نہ تھے وہ دہلی آ گئے تھے اور مولانا عبدالوحید صدیقی کے "ہما اُردو ڈائجسٹ" میں کام کرنے لگے تھے۔ وہ کچھ سفارتخانوں بالخصوص سوویت یونین کے سفارتخانے میں ترجمے کا بھی کام کرتے تھے اور "گھوسٹ رائٹنگ" بھی کر رہے تھے کئی اُردو پبلشروں کے لیے دوسروں کے نام سے رومانی اور جاسوسی ناول لکھ رہے تھے۔ ہما اُردو ڈائجسٹ کی کامیابی سے تحریک حاصل کر کے "شمع" کے حافظ یوسف دہلوی نے "شبستاں" کے نام سے ایک اُردو ڈائجسٹ شروع کر دیا اور اس کی تمام تر ذمے داری سلامت علی مہدی پر ڈال دی۔ کچھ دنوں کے بعد سلامت صاحب نے "شبستاں" سے قطع تعلق کر لیا اور نظام الدین میں ایک فلیٹ لے لیا اور خود اپنا اردو ڈائجسٹ "آنچل" نکالا۔ یہ ڈائجسٹ کاروباری نقطۂ نظر سے نکالا گیا تھا اور کامیاب تھا۔ مگر سلامت صاحب کی شاہ خرچی کے نتیجے میں چند ماہ کے بعد بند ہو گیا۔ انھوں نے کچھ دوستوں کو ساتھ لے کر محراب اُردو ڈائجسٹ نکالا۔ اس کا دفتر جامع مسجد کے قریب ایک مچھلی مارکیٹ کی

بالائی منزل میں تھا۔ یہ بھی سلامت صاحب کی شاہ خرچیوں کی نذر ہو گیا تو انھوں نے رحمٰن نیّر کو ہفتہ وار "عوام" جاری کرنے پر آمادہ کیا۔ "عوام" خوب چلا مگر کسی بات پر رحمٰن نیّر اور سلامت علی مہدی میں ان بن ہو گئی (یہ بات مجھے معلوم ہے اور میں حیران ہوں کہ اس طرح کی بات کیسے ہوئی۔ شاید سلامت صاحب کے پائے استقلال میں لغزش پیدا ہو گئی تھی۔ معاملے کو نمٹانے کے لیے سلامت صاحب نے میری خدمات بھی لی تھیں۔ مگر معاملہ ہی کچھ ایسا تھا کہ یہ ان بن ختم نہ ہو سکی۔ اور "عوام" میں سلامت صاحب کے خلاف کئی اعلانات بھی شائع ہوئے) حالانکہ ان دنوں سلامت صاحب دہلی میں اُردو ٹائمز (بمبئی) کے نامہ نگار خصوصی بھی تھے اور حکومت ہند نے ان کو ریکریڈیشن بھی دے رکھا تھا۔ انھیں علاج اور رہائش کی وہ تمام مراعات حاصل ہو سکتی تھیں جو کسی کلاس ون افسر کو ملتی ہیں۔ مگر اچانک انھوں نے لکھنؤ جانے کا فیصلہ کر لیا اور وہ اپنی بیوی بچوں کو لے کر لکھنؤ چلے گئے۔ بیماری نقاہت اور آمدنی کے وسائل محدود ہونے کی وجہ سے سلامت صاحب پریشان رہنے لگے ان کے خانگی حالات بھی خراب ہو گئے۔ کئی بار تو وہ مجھ سے یارانِ وطن کی بے مہری کا ذکر کرتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو دیتے۔

ان کے دونوں پھیپھڑے بیکار ہو چکے تھے ان سے چار قدم چلنا بھی دشوار ہو گیا تھا۔ پھر بھی وہ دوسرے تیسرے ماہ لکھنؤ سے امین آباد جاتے تھے اور والی آسی کی دکان پر بیٹھ کر خوش گپیاں کیا کرتے تھے۔ ان پر آمدنی کے تمام دروازے بند تھے۔ اس کے باوجود وہ مایوس نہیں تھے۔ بستر مرگ پر بھی لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے تھے۔ انھوں نے "قومی آواز" سے اپنے ادبی اور صحافتی سفر کا آغاز کیا تھا۔ یہ سفر عیش باغ کے قبرستان ملکہ جہاں پر ختم ہو گیا ــــــ اس سفر کے دوران وہ کئی اخباروں سے وابستہ رہے جن میں بمبئی کا "انقلاب" بھی شامل ہے۔ انھوں نے کچھ عرصہ روسی اور امریکی سفارت خانوں میں ترجمے کا کام کیا۔ اپنے اخبارات اور رسالے نکالے۔ پبلشنگ ہاؤس قائم کیا۔ مطبع چلائے۔ جوتوں کی دُکان کھولی۔ دنیا کی سیر کی۔ صحافیوں کی ایک پوری نسل کی پرورش و پرداخت کی اور پارلیمنٹ کا الیکشن بھی لڑا۔ خود ہار گئے مگر دوسروں کو الیکشن میں کامیاب بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے۔ اُن کے بارے میں لکھنے کو تو بہت کچھ ہے۔ مگر سوچتا ہوں کہ اس سے سلامت علی مہدی کو کیا ملے گا۔ اب تو اُن کے اعمال ہی ان کے کام آئیں گے۔ خدا مرحوم پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے (آمین)

●

نئی مطبوعات

موضوعات (تنقیدی مضامین)
مصنف: ڈاکٹر ارتضیٰ کریم
صفحات: ۱۸۴
قیمت: ۷۰ روپے
تقسیم کار: زلالہ پبلی کیشنز، 113A/I، دلشاد گارڈن، دہلی ۱۱۰۰۹۵

ڈاکٹر ارتضیٰ کریم اُردو ادب و تنقید میں ایک نیا 'ابھرتا اور سنبھلتا ہوا نام ہے۔ جنھوں نے بہت کم وقت میں تحقیق و تنقید کی دنیا میں یکے بعد دیگرے کئی کتابوں کے ذریعے اپنا تعارف کرایا ہے۔ درمیان میں وہ ضرورت اور فرمائش کے تحت برابر مضامین لکھتے رہے اور پھر چند اچھے مضامین ترتیب دے کر "موضوعات" کے نام سے اپنے مضامین کا مجموعہ شائع کر دیا ابتدا میں ضرورت تنقید کے عنوان سے ان مضامین اور اس کتاب کی اشاعت کا جواز پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہمارے یہاں شاعری کی تنقید اتنی کمیاب نہیں کہ اس کے لیے معشوق کی موہوم کمر یا اقلیدس کے خیالی نقطے کی مثال پیش کی جائے لیکن یہ بات اُردو میں افسانوی اَدب کی تنقید پر بڑی حد تک صادق آتی ہے۔ سال رواں ۱۹۸۹ء میں اُردو ناول نگاری کی عمر کم و بیش ایک سو بیس برس کی ہو گی اسی طرح اُردو افسانہ نوے سال کی لپیٹ میں ہے لیکن کیا اردو ناول اور افسانے کی کوئی تنقیدی یا تہذیبی تاریخ لکھی گئی؟"

ایسا کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب انھوں نے اپنے مضمون "ترقی پسند تنقید اور اردو فکشن" میں دینے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ یہ موضوع خاصا بڑا اور الجھا ہوا ہے اور مضمون چھوٹا اس لیے اس میں تشنگی ہے پھر بھی مضمون نگار نے کچھ اچھے اشارے کیے ہیں لیکن اس سوال کا مکمل جواب ان کے مقدمے اور مضمون دونوں میں مل نہیں پاتا کہ اُردو میں تنقید کا تعلق شاعری سے زیادہ کیوں رہا ہے؟ یا پورے اُردو ادب پر شاعری حاوی کیوں رہی ہے؟

"موضوعات" میں شامل ان کے بارہ مضامین میں سے آٹھ مضامین کا تعلق فکشن سے ہے لیکن ان آٹھ مضامین میں سے دو مضامین ترقی پسند تنقید اور اُردو فکشن" اور "میرے بھی صنم خانے — ایک مطالعہ" خصوصیت سے توجہ طلب ہیں۔ دوسرا مضمون قرۃ العین حیدر کے ناول کا ایک اچھا اور تفصیلی تجزیہ پیش کرتا ہے۔ "طلسم ہوش رُبا اور داستان کی تنقید" ان کے اسی احساس کی تصویر ہے جس کا اظہار وہ اپنے مقدمے میں کر چکے ہیں۔ "عجائب القصص اور باغ و بہار" خالص تحقیقی مضمون ہے جو محققین کو متوجہ کر سکتا ہے۔ خواجہ احمد عباس اور احمد ندیم قاسمی پر لکھے گئے مضامین اوسط درجے کے ہیں اور جلدی میں لکھے گئے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ فکشن اور فکشن کی تنقید پر کام کرنے والا ادیب و محقق جب شاعری اور شاعر پر قلم اُٹھاتا ہے تو اس کے اصل جوہر اس میدان میں کھلتے نظر آتے ہیں۔ "فیض کا تنقیدی رویّہ"، "حسرت موہانی فکر و فن"، "نظیر اکبر آبادی اور اردو غزل"۔ اس مجموعے کے اچھے مضامین ہیں اور واقعی محنت اور سوجھ بوجھ کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ میزان میں شامل مضامین کی روشنی میں فیض کے تنقیدی رویے کو ارتضیٰ کریم نے بڑے پتے تُلے اور سنبھلے ہوئے انداز میں پیش کیا ہے۔ اسی طرح نظیر اکبر آبادی جو عام طور پر نظم کے شاعر سمجھے جاتے ہیں ان کی غزلوں کے مزاج و مذاق اور پھر غالب و ذوق پر ان کے اثرات کو خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ ارتضیٰ کریم صرف ادیب ہی نہیں بلکہ مُدرّس بھی ہیں اور دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے استاد ہیں اس لیے انھیں ماضی کے ادب کو نہ صرف پڑھنا چاہیے بلکہ جستہ جستہ نئے انداز سے اس کا تجزیہ بھی کرتے رہنا چاہیے کہ ہمارے بزرگوں نے ہمارے کام کے لیے بہت کچھ چھوڑ رکھا ہے۔

ان مضامین کا مطالعہ مضمون نگار کی محنت اور لگن کی طرف ضرور اشارہ کرتا ہے لیکن اس کے نقطۂ نظر کی طرف واضح اشارے کم کم ہی مل پاتے ہیں۔ ضرورتِ تنقید میں وہ شکوے ضرور کرتے ہیں لیکن ادبی تنقید کا ... اور ترقی پسند نظریہ کیا ہونا چاہیے اس پر ... نہیں ڈالتے۔ یہ صرف اشارہ ہے مطالبہ نہیں۔ ارتضیٰ کریم ہوں یا علی احمد فاطمی ہم سبھی ابھی اپنے تشکیلی و تعمیری دور سے گزر رہے ہیں۔

ادب ے [illegible] ہمارا سنجیدہ مطالعہ ابھی جانے کتنی رائیں قائم کرے گا اور پھر تبدیلی بھی کرے گا اور نظریے کی پختگی کے لیے بہر حال ایک عمر درکار ہوتی ہے بس لگاتار ریاضت کی ضرورت ہے۔ اور "موضوعات" کے یہ مضامین ایسی ہی ریاضت کی ابتدائی کڑی ہیں۔ نئے ادیبوں میں تنقیدی وژن خال خال ہے۔ ارتضیٰ کریم کا یہ مجموعہ ایسے مایوسی کے ماحول میں ایک کرن کی طرح پھوٹتا نظر آتا ہے اور ان سے کچھ اُمیدیں وابستہ کرنے کو جی چاہتا ہے لیکن ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ اب ایک مخصوص منزل پر پہنچنے کے بعد ان کی عجلت و جذباتیت ایک سنجیدہ روپ لے اور وہ پرانے ادب کو بالعموم اور نئے ادب کو بالخصوص تنقید کی نئی جہتوں اور ضرورتوں سے مالامال کریں "موضوعات" کی کتابت۔ طباعت۔ گٹ اپ سب کچھ بہت خوبصورت ہے۔ اسی لیے قیمت بھی زیادہ ہے۔ کتاب اردو اکادمی کے مالی تعاون سے چھپی ہے۔

——— علی احمد فاطمی

محمد علی طبیب : حیات اور تصانیف

مُصنف: ڈاکٹر عبدالحی

صفحات: ۲۹۵

قیمت: ۸۰ روپے

تقسیم کار: زلالہ پبلی کیشنز، I/113A، دلشاد گارڈن، دہلی ۱۱۰۰۹۵

ہم میں سے بہتوں کے لیے محمد علی طبیب تاریخ ادب کا ایک گمشدہ باب ہیں۔ خاکسار ادب کا ایک سنجیدہ طالب علم ہے اور اُردو ناول سے ایک نسبت خاص رکھتا ہے مگر مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ محمد علی طبیب کے مختلف ناولوں کے ناموں سے زیادہ میرا ان سے کبھی کوئی تعارف نہیں رہا۔ ڈاکٹر عبدالحی نے ماضی کے ایک ایسے ناول نگار کو اُردو قارئین کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کی ہے جسے تاریخ ادب نے کم و بیش فراموش کر دیا تھا۔

ڈاکٹر عبدالحی نے محمد علی طبیب کی حیات اور تصانیف کے سلسلے میں جتنی خاک چھانی ہے اس کا اندازہ ان کے درج ذیل بیان سے بہ خوبی کیا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"جب میں نے اپنے کام کا آغاز کیا تو گمان یہ تھا کہ طبیب کی تخلیقات ان کے رسائل اور ان کے حالاتِ زندگی کی تلاش اور دست یابی میں زیادہ دقت نہیں ہوگی لیکن جب عملاً ان کی تصانیف وغیرہ کی جستجو شروع کی تو صورتِ حال مختلف پائی۔ ایک مدت سے ان کی کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع نہیں ہو رہے ہیں۔ پرانے ایڈیشن نایاب ہیں کچھ پرانے کتب خانوں میں ایک دو نسخے ملے بھی لیکن نہایت بوسیدہ اور ناقص حالت میں۔ اس صورتِ حال نے اتنا مایوس کیا کہ کام کی رفتار بھی سُست پڑ گئی۔ لیکن پھر خیال آیا کہ یہ ایک چیلنج ہے۔ اگر ہم اس وقت ان کی کتابیں حاصل کرنے میں ناکام رہے تو آنے والے دور میں تو یہ کام اور بھی دشوار بلکہ محال ہو جائے گا اس لیے پھر کمرِ ہمت کسی نہ صرف دہلی اور اُتر پردیش بلکہ، بہار، مدھیہ پردیش اور ملک کے دوسرے علاقوں کے کتب خانوں میں بھی ان کی تصانیف اور رسائل کی تلاش شروع کی۔"

ڈاکٹر عبدالحی کے اس طویل اقتباس کو پیش کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ یہ جان سکیں کہ جب ایک سنجیدہ اسکالر ایسے کام کا بیڑہ اٹھاتا ہے جس پر کسی دو کی نگاہ نہ گئی ہو یا جس کے ساتھ تاریخ نے انصاف نہ کیا ہو تو اس کو اپنے کام کو خیر و خوبی انجام تک پہنچانے میں کتنی دشوار سے گذرنا پڑتا ہے۔

محمد علی طبیب ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ انھیں بنیادی طور پر تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ مگر چند ایسے ناول بھی ان کی فہرست میں شامل تھے جن کا تناظر معاشرتی ہے۔ طبیب نے ایک ادبی ماہنامہ "مرقع عالم" کے نام سے جاری کیا اور اس کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے اس کے علاوہ ابن ولید شحنہ (جو عرب کے ایک مشہور مورخ تھے) کی مشہور عربی تاریخ روضۃ المناظر کا اردو ترجمہ کیا۔ فنِ طب پر "مسیحائے عالم" کے نام سے ایک دستاویزی کتاب قلم بند کی۔

طبیب کے تاریخی اور معاشرتی ناولوں کی فہرست عبدالحی صاحب نے اس طرح پیش کی ہے۔

(الف) **تاریخی ناول** : عبرت، نیل کا سانپ، جعفر و عباسہ، خضر خاں دیول دیوی، رام پیاری۔

(ب) **معاشرتی ناول** : اختر و حسینہ، گورا، حسن و سرور۔

طبیب نے کل آٹھ ناول لکھے۔ پانچ تاریخی اور تین معاشرتی۔ ان میں سے بعض ناولوں

کے کئی کئی ایڈیشن بھی شائع ہوئے پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سی وجوہ تھیں کہ اپنے زمانے کا اتنا مشہور و معروف ناول نگار جس کے انتقال کو ابھی پون صدی بھی نہیں گزری، اسے یکسر فراموش کر دیا گیا۔ کہیں یہ تنقیدی بد دیانتی کا نتیجہ تو نہیں؟ بلا شبہ جب ہم اس نقطۂ نظر سے طبیبؔ کی حیات اور تصانیف کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ طبیبؔ کی گمنامی میں اکثر بد دیانت ناقدین کا ہاتھ رہا ہے۔ طبیبؔ کی بدنصیبی جانیے کہ انھوں نے جس عہد میں لکھنا شروع کیا وہ اُردو ناول کا تشکیلی دور تھا اور تاریخی ناولوں میں شررؔ کا طوطی بول رہا تھا۔ معاشرتی ناول کے باوا ڈپٹی نذیر احمد تھے۔ اور مولانا راشد الخیری بہن بیٹیوں کو رلانے کا کام اپنے ناولوں کے ذریعے بہ خوبی انجام دے رہے تھے۔ لہٰذا اُردو ناقدین کی نظر انھی ناولوں پر زیادہ تھی طبیبؔ پر اگر کسی نے کرم کیا بھی تو اس طرح کہ اس میں طبیبؔ کی حیثیت مسخ ہو کر رہ گئی۔ انھیں بیشتر ناقدین نے شررؔ کا مقلد یا مدِ مقابل ٹھہرایا۔ اب بھلا ادب میں مقلدین کی کیا حیثیت؟ رہی مدِ مقابل کی بات تو شررؔ جیسے بلند قامت کے سامنے طبیبؔ کا شمار کیا ہوتا۔ بہر حال تنقید کے ان دونوں رویوں نے طبیبؔ کی ادبی حیثیت متعین کرنے میں کوئی مدد نہیں کی۔

ڈاکٹر عبد الحئی نے ناقدین کی مبالغہ آمیز رایوں سے قطع نظر طبیبؔ کی فنی خدمات کا جائزہ از سر نو لیا ہے۔ طبیبؔ کے سلسلے میں ان کی یہ متوازن رائے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ:

"ان کے حالاتِ زندگی سے بھی اس مفروضے کی نفی ہوتی ہے کہ طبیبؔ شررؔ کے مقلد یا حریف تھے۔ ہاں ان دونوں نے اپنے عہد کے سماجی تقاضوں کے پیشِ نظر ایک خاص قسم کے ادب کی تخلیق کی اور اس طرح قوم کی اصلاح اور ہمت افزائی کے کام میں اپنا اپنا رول ادا کیا اور نہ صرف اُردو ناول کو تکمیل کی منزل پر لانے میں اہم خدمات انجام دیں ادبی صحافت کا اعلیٰ معیار بھی قائم کیا۔ تاریخ ادب میں ان دونوں ادیبوں کے کارنامے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔"

"محمد علی طبیب حیات اور کارنامے" نہ صرف طبیب کے فن کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے بلکہ ان کے ادبی قامت کے تعین میں بھی مددگار ثابت ہوگی۔ یہ کتاب جو دہلی اُردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے کتابت اور طباعت کے اعتبار سے بھی معیاری ہے۔

—— (ڈاکٹر) شکیب نیازی

لاشریک

مصنف: ف۔ س۔ اعجاز
صفحات: ۱۰۴
قیمت: ۵۰ روپے
پتا: انشا پبلیکیشنز، ۶۔ اے، کناٹی سیل اسٹریٹ، کلکتہ ۷۳

"لاشریک" ف۔ س۔ اعجاز صاحب کی منظومات کے تازہ مجموعے کا نام ہے جسے انشا پبلیکیشنز، کلکتہ نے شائع کیا ہے۔ کتاب بڑی عمدگی اور سلیقے سے طبع کی گئی ہے۔ اس میں ف۔ س۔ اعجاز صاحب کی پینتالیس منظومات شامل ہیں جن میں تین چار روسی نظموں کے ترجمے بھی ہیں۔

ف۔ س۔ اعجاز صاحب شاعر ہونے کے علاوہ صحافی اور نثر نگار بھی ہیں مگر انھوں نے اپنی پہچان ایک شاعر کے طور پر زیادہ قائم کر لی ہے۔ اُن کے اب تک کئی شعری مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ اگرچہ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں، مگر فطری طور پر ان کا جھکاؤ نظم کی طرف زیادہ ہے۔ انھوں نے اپنی زیرِ نظر منظومات میں دورِ حاضر کے آفاقی سطح پر اہم سیاسی اور سماجی مسائل کا بھی احاطہ کیا ہے جس سے اُن کی نظر کی وسعت اور شعور کی پختگی کا پتہ لگتا ہے۔ کوئی بھی فنکار اپنے دور کے مسائل سے چشم پوشی نہیں کر سکتا اور شاعر اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ ف۔ س۔ اعجاز صاحب اپنی کئی نظموں میں نہ صرف آج کی دو رنگی سیاست کا پردہ ہی فاش کرتے ہیں بلکہ فرقہ وارانہ ذہنیت پر بھی ایک کاری ضرب لگاتے ہیں۔ اس کتاب میں مشمولہ منظومات کو پڑھ کر ان کے بارے میں یہ خیال مضبوط ہوتا ہے کہ ان کی فکر میں ایک خاص گہرائی اور وسعت ہے اور وہ ایک آفاقی بھائی چارے، یگانگت اور اتحاد میں یقین رکھتے ہیں۔ ان موضوعات پر ان کی نظمیں 'سوال'، 'ایشیاڈ ایٹی ٹو'، 'جلا رہا ہے لیبیا کی مانگ کا سہاگ'، 'منفی ووٹ'، 'لاشریک'، 'ہمیں قتل کر دو' اور 'اگلے کرسمس میں' بڑی خوبصورت ہیں۔

ف۔ س۔ اعجاز صاحب صحیح معنوں میں ایک مثبت نظریہ رکھتے ہیں۔ دنیا میں ہر سو پھیلے جبر و تشدد، قتل و غارت اور نسلی اور مذہبی امتیاز کے باوجود وہ مایوس نہیں ہوتے۔ ان کی نظم 'جب وہ آدھی سو جاتی ہے' میں یہ بند قابلِ توجہ ہے:

برق گرے یا آندھی آئے
موسم جتنا برفانی ہو
میری کوکھ سے پھول کھلیں گے
گھاس اُگے گی، میں دھرتی ہوں

اور ان کی نظم "یہ ساری مخلوق" میں یہ احساسات

رات آئی ہے تھکی ہوئی ہے یہ ساری مخلوق
اپنا بستر ڈھونڈ رہی ہے یہ ساری مخلوق
شانہ ہلا کر لاکھ ہلاؤ کب دیتی ہے جواب
سوئی ہے کہ مری پڑی ہے یہ ساری مخلوق
اندر اندر جلتا ایندھن چھو لو تو جل جاؤ
باہر باہر برف بنی ہے یہ ساری مخلوق!

"لاشریک" بلاشبہ اردو شعری ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

—— م۔م۔ راجندر

دُکھ کی فصلیں (افسانے)
مُصنّف: شمیم یزدانی
صفحات: ۱۲۰
قیمت: ۲۵ روپے
ملنے کے پتے: (۱) نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین آباد، لکھنؤ۔
(۲) اسٹار میڈیکل اسٹور، میاں بازار، گورکھپور۔

"دُکھ کی فصلیں" شمیم یزدانی کے چودہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ یہ افسانے ہماری معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں۔ مثلاً دوسرے ملکوں میں ہجرت سے پیدا شدہ مسائل، انسانی رشتوں کی بے حرمتی، نفسیاتی خود فریبی، انسانی جراتِ عمل، نہ جوگ، جنسی شکست خوردگی اور عصری زندگی کے گوناگوں مسائل۔ ان افسانوں میں علامتیت اور تجریدیت کے بجائے راست انداز میں اپنی بات اور اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

شمیم یزدانی کے افسانوں میں مطالعے کے لیے دلچسپ مواد موجود ہے جس سے جمالیاتی حظ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ سوچنے اور غور کرنے کی تحریک بھی ملتی ہے۔ افسانہ نگار ریفارمر نہیں ہوتا مگر وہ قاری کے سامنے معاشرے کی اوپری اور اندرونی سطحوں پر ہونے والے ارتعاشات کو اور ذہنِ انسانی کی سوچ کے پیکروں کو لفظی تجسیم عطا کر کے روشنی کے نئے زاویے تو پیش کر ہی سکتا ہے اور پیکروں کی یہ دنیا جتنی متنوع رنگا رنگ اور دلآویز ہوگی۔ اتنی ہی کامیابی افسانہ نگار کے حصے میں آئے گی۔ زیرِ نظر کتاب کے بعض افسانے اس پیکر تراشی کی عمدہ مثال ہیں مثلاً "لذتِ احساس" جس کا موضوع مرد کا ہرجائی پن اور دوسری عورت میں جنسی تلذذ کی تلاش ہے مگر افسانے کے آخر میں کھلتا ہے کہ یہ محض مرد کی خود فریبی تھی جو اسے لذت کی تلاش میں دوسرا قلعہ سر کرنے کی ترغیب دے رہی تھی۔ اسی طرح "بن باس" میں روپیہ کمانے کے لیے عرب ممالک میں طویل عرصے تک رہنے سے خاندانی زندگی میں جو پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں ان کو دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

جدید مختصر افسانہ اب اتنی ترقی کر چکا ہے کہ افسانے میں خود افسانہ نگار کی دراندازی معیوب ہو گئی ہے۔ افسانہ نگار کا کام کہانی کو اس کے پیروں پر کھڑا کر دینا ہوتا ہے نہ کہ اس کو تھامے رہنا اور قدم قدم پر افسانے کی نشو و نما پر اثر انداز ہوتے رہنا۔ اس کتاب میں کم از کم دو افسانے "مہرے" اور "گرم گرم، سرخ سرخ" ایسے ہیں جن میں مصنف کا اپنا مقصدی نقطۂ نظر کہانی کے اوپر تیرتا نظر آتا ہے۔ ان چودہ افسانوں کو پڑھتے ہوئے مجھے افسانہ نگار کے خلوصِ نیت کا بار بار احساس ہوا ہے۔ مگر افسانے کی فنکارانہ بنت بھی ایک اہم پہلو ہے جو بعض افسانوں میں واضح طور سے کمزور نظر آتی ہے۔

"دُکھ کی فصلیں" آفسٹ پر چھپی ہے۔ اور خاص بات یہ ہے کہ افسانہ نگار نے نہ تو آغاز میں، نہ فلیپ پر مشاہیر کی آراء درج کی ہیں اور اس طرح براہِ راست مطالعے کے لیے انھوں نے راہ کھلی چھوڑ دی ہے۔ جو ان کی خود اعتمادی کی دلیل ہے۔

—— نامی انصاری

ہم طرح اشعار

پچھلا شمارہ چونکہ نہرو نمبر تھا اس لیے "ہم طرح اشعار" کے صفحات اس میں شامل نہیں ہو سکے تھے۔ اگلے مہینے سے یہ سلسلہ پھر شروع کیا جا رہا ہے۔ اس بار "سرودِ رفتہ" میں جناب ناطق گلاؤٹھوی کی غزل شائع کی جا رہی ہے۔ آپ اس زمین میں اپنی پسند کے شعر اس طرح بھجوائیے کہ ہمیں ۱۲ جنوری ۹۰ء تک مل جائیں۔

ہے کہاں پہچاننے والے مری آواز کے

قافیہ　ردیف

ایڈیٹر ایوانِ اُردو، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۲

اُردو خبر نامہ

اُردو اکادمی، دہلی کی سرگرمیاں:

○ دہلی اُردو اکادمی نے بالغوں کو تعلیم دینے کا جو کام شروع کیا ہے اس کے تحت پُرانی دہلی اور جمنا پار کے علاقوں میں ۱۲۳ مراکز کھولے جاچکے ہیں۔ ایک مرکز تہاڑ جیل میں بھی کھولا گیا ہے جہاں قیدیوں کو اُردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان مراکز میں پڑھنے والوں کی تعداد ۲۳ سو سے متجاوز ہے اور اب تک ۱۲ سو طلبہ اور طالبات نے تعلیم بالغاں کا بیسک کورس مکمل کرلیا ہے۔



تصویر میں شری پرشوتم لال گوئل ۱۷ اکتوبر ۱۹۸۹ء کو ایوانِ غالب، نئی دہلی میں منعقدہ تقریب میں ایک مرکز کی استانی کو ان کی بہتر کارکردگی کے لیے انعام دیتے ہوئے۔ اس موقعے پر ۱۲ ٹیچرز، ایک سُپروائزر اور تعلیم بالغاں کے پروجکٹ آفیسر جناب زاہد حسین خاں کو انعامات پیش کیے گئے۔

○ ۲۰، اکتوبر ۸۹ء سے ۲۲، اکتوبر ۸۹ء تک اکادمی نے "جدید ذرائع ابلاغ اور اُردو" کے موضوع پر ایک کُل ہند سہ روزہ سیمینار کا انعقاد کیا۔ اس سیمینار کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں نہ صرف مقالہ خواں حضرات کو بلکہ شرکائے بحث کو بھی ملک بھر سے مدعو کیا گیا تھا۔ یہ سب حضرات وہ تھے جو اس شعبے سے خصوصی تعلق رکھتے تھے اس لیے جو مقالے پڑھے گئے ان پر بہت بامقصد بحث بھی ہوئی۔



تصویر میں دائیں سے: پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر زاہدہ زیدی، جناب عابد سہیل اور جناب شہباز حسین۔

○ سمندری وسائل پر ہمارا بڑھتا ہوا انحصار ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہم سمندروں میں پوشیدہ خزانوں کے بارے میں مزید معلومات حاصل کریں اور ان خزانوں تک رسائی کے جدید ترین ذرائع بھی تلاش کریں۔ اُردو اکادمی دہلی نے حکومتِ ہند کے شعبۂ بحری ترقیات کے تعاون سے "سمندر —— ہمارا مستقبل" کے موضوع پر ایک سہ روزہ نمائش اور سلسلۂ مقالات کا اہتمام کیا۔ مقالہ خواں حضرات میں ڈاکٹر ونود کمار گوڑ، سیکریٹری شعبۂ بحری ترقیات، ڈاکٹر سیّد ظہور قاسم، جناب اے۔ رحمٰن اور جناب شمس الرحمان فاروقی کے نام شامل تھے۔



تصویر میں دائیں سے: جناب شمس الرحمان فاروقی، جناب صفدر نقوی اور ڈاکٹر ونود کمار گوڑ۔

اُردو اکادمی عرصے سے محسوس کر رہی ہے کہ اُردو ڈراما بتدریج زوال پذیر ہے اور اس کا سبب اس کے لیے سازگار ماحول کا فقدان ہے۔ اُردو ڈراما کے فروغ کے لیے سازگار فضا پیدا کرنے کی نیت سے اکادمی نے پچھلے سال سے اُردو ڈراما فیسٹیول کا آغاز کیا ہے اس کے لیے طریقِ کار یہ طے کیا گیا کہ اشتہارات کے ذریعے ڈراما گروپوں کو دعوت دی جائے اور اس طرح جو معیاری ڈرامے سامنے آئیں انھیں اسٹیج کرنے کے بنیادی اخراجات اکادمی ادا کرے۔ اس سال دہلی اور بیرونِ دہلی سے ۳۲ ڈراما گروپس نے اپنے اسکرپٹ اکادمی کو ارسال کیے جن میں پانچ اسکرپٹ منتخب کیے گئے اور انھیں اسٹیج کرنے کی متعلقہ گروپوں کو دعوت دی گئی۔ ان کی تفصیل درجِ ذیل ہے:

۱۔ کایا پلٹ
نرگس میموریل سوسائٹی، دہلی
۶ر نومبر ۱۹۸۹ء

۲۔ سرائے کی مالکن
ہستاکشر، دہلی
۷ر نومبر ۱۹۸۹ء

۳۔ مور پنکھی
منچ مادھیم، دہلی
۸ر نومبر ۱۹۸۹ء

۴۔ اندھیرے کا بیٹا
ہیرا آرٹ تھیٹر
۹ر نومبر ۱۹۸۹ء

۵۔ زہر کون پیے
بد وشک آرٹ اینڈ کلچر سوسائٹی، دہلی
۱۰ر نومبر ۱۹۸۹ء

ڈرامے اسٹیج کرنے کے ابتدائی اخراجات کی کفالت کے علاوہ اکادمی نے دو بہترین ڈراما نگار، دو بہترین سیٹ ڈیزائنر، دو بہترین ہدایت کار کے علاوہ تین بہترین اداکاراؤں اور تین بہترین اداکاروں کو انعامات دینا بھی طے کیا تھا۔ انعامات کا فیصلہ ایک کمیٹی نے کیا جس کے ارکان میں ڈرامے کی دُنیا کی جانی پہچانی شخصیتیں شامل تھیں۔

ایوارڈ فنکشن ۱۱ر نومبر ۱۹۸۹ء کی شام کو شری رام سنٹر نئی دہلی میں منعقد ہوا جس میں تھیٹر اور فلم کے مشہور ہدایت کار اور اداکار جناب ایم۔ کے۔ رینا کے ہاتھوں سے نقد انعامات اور نشاناتِ اکادمی انعام یافتگان کو پیش کیے گئے۔

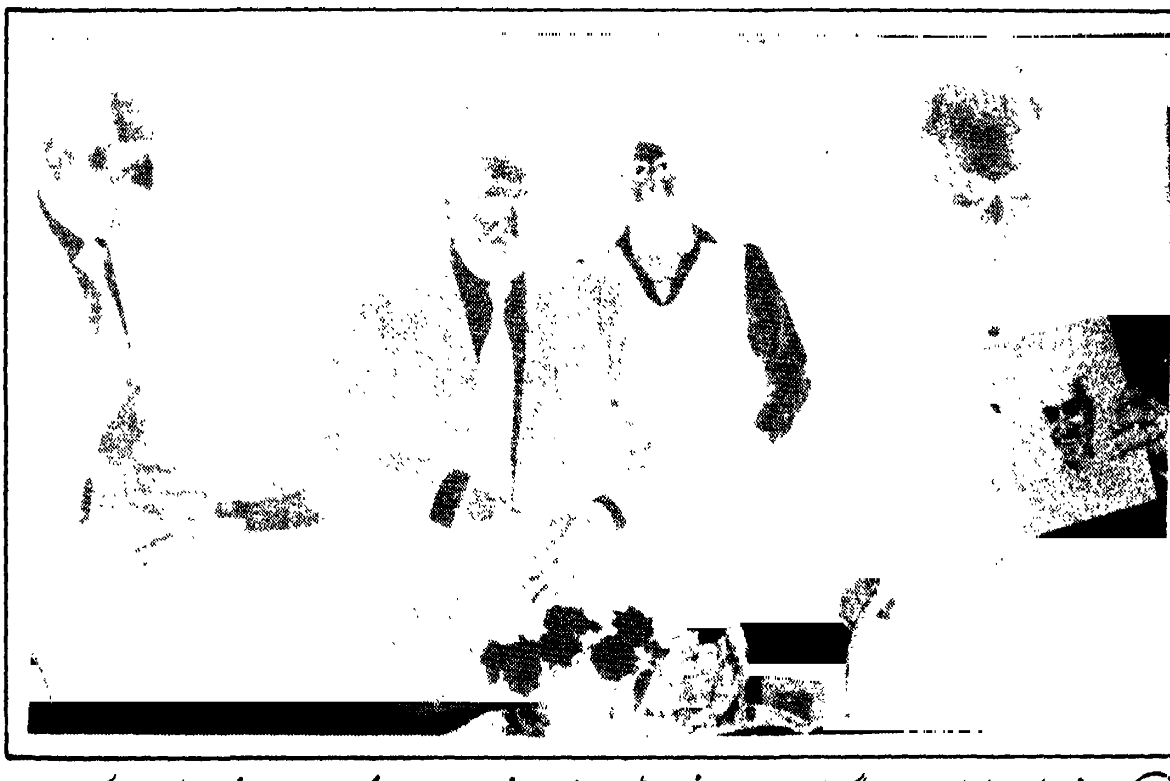
اس شام محترمہ شیلا بھاٹیہ نے اپنا مشہور ڈراما "درد آئے گا دبے پاؤں" بھی پیش کیا جو فیض احمد فیض کی شاعری پر مبنی ہے۔



تصویر میں جناب ریوتی سرن شرما بہترین ڈراما نگار کا انعام حاصل کرتے ہوئے



جنابِ کلانند بھارتیہ نے ۱۰ر نومبر کو "امنگ" کے چاچا نہرو نمبر کا اجرا کیا۔ تصویر میں دائیں سے : سیّد شریف الحسن نقوی، پروفیسر قمر رئیس، جنابِ کلانند بھارتیہ اور جنابِ بلراج کومل ۔



۱۵ر نومبر کو دہلی کے لیفٹننٹ گورنر جنابِ رومیش بھنڈاری نے راج نواس پر "ایوانِ اردو" کے نہرو نمبر کا اجرا کیا۔

○ ۲۰ نومبر ۱۹۸۹ء کی شام کو نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے اکادمی کی نئی کتاب "کلیاتِ مکاتیبِ اقبال" کا اجرا فرمایا۔ اس کلیات کے مرتب جنابِ مظفر حسین برنی ہیں۔ موصوف نے اقبال کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ خطوط کو جن میں کچھ انگریزی خطوط بھی شامل ہیں' تاریخی ترتیب سے جمع کیا ہے۔ اس تالیف کی پہلی جلد جس کا اجرا نائب صدر جمہوریہ نے فرمایا' ڈیمائی سائز کے ۱۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت ایک سو ستر روپے ہے۔



تصویر میں ڈاکٹر شنکر دیال شرما کتاب کی رونمائی کرتے ہوئے۔ درمیان میں جناب مظفر حسین برنی اور بائیں طرف پروفیسر قمر رئیس کھڑے ہیں۔

○ پچھلے دِنوں پاکستان کے مشہور محقق' ناقد اور مقتدرہ قومی زبان کے چیئرمین جنابِ جمیل جالبی دہلی تشریف لائے تو اکادمی نے ان کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ موصوف نے اس موقعے پر اپنا غیر مطبوعہ مقالہ "میرا جی —— ایک مطالعہ" ارشاد فرمایا۔ یہ مقالہ آپ جلد ہی 'ایوانِ اُردو' میں ملاحظہ کرسکیں گے۔



تصویر میں بائیں سے: جنابِ جمیل جالبی' جنابِ مالک رام اور جنابِ تنویر احمد علوی۔

اڑیسہ میں اُردو تعلیمی مرکز کا قیام

اڑیسہ اُردو اکادمی کی جانب سے آنکل سنگیت مہاودیالیہ بھوبنیشور میں اُردو تعلیمی مرکز (برائے بالغاں) کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اس سہ ماہی کورس کا افتتاح کرتے ہوئے ریاستی وزیر برائے ثقافت و سیاحت اور نائب صدر اکادمی جناب سرت راوت نے کہا کہ "اُردو دُنیا کی مشہور اور نہایت شیریں زبان ہے۔ اس کی آبیاری و ترقی کے لیے اڑیسہ میں حالات بہت سازگار ہیں۔"

جناب سرت راوت نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "اس میں داخلے کے لیے جو درخواستیں ہمیں موصول ہوتی ہیں وہ ہماری توقعات سے کہیں زیادہ ہیں۔ نیز ان میں ان لوگوں کی درخواستیں دو تہائی ہیں جن کی مادری زبان اُڑیا ہے اور وہ اُردو سیکھنا چاہتے ہیں۔" انھوں نے مزید کہا کہ "اس دلچسپی کو دیکھتے ہوئے اکادمی، ریاست کے دیگر بڑے شہروں میں بھی اس طرح کے مراکز کھولنے کا ارادہ رکھتی ہے۔"

(سیّد منظور احمد قاسمی، سیکریٹری اکادمی)

راجستھان اُردو اکادمی، جے پور کا مشاعرہ

مولانا آزاد صدی تقریبات کے سلسلے میں راجستھان اُردو اکادمی کے زیر اہتمام ۱۲، نومبر ۱۹۸۹ء کو جے پور میں ایک کُل راجستھان مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ جناب سیّد حامد صاحب صدر انجمن ترقی اُردو ہند نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے مولانا آزاد کی ہمہ جہت شخصیت پر مختصراً اظہارِ خیال فرمایا اور اکادمی کی کارکردگی پر اظہارِ خوشنودی فرمایا۔ مشاعرے کی صدارت ڈاکٹر نثار احمد فاروقی استاد شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی نے فرمائی۔ مشاعرے کے آغاز میں اکادمی کے سیکریٹری ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے مہمانِ خصوصی اور صدر جلسہ کا تعارف کرایا اور مولانا آزاد صدی سے متعلق اکادمی کی جانب سے منعقدہ تقریبات پر روشنی ڈالی۔ جناب مخمور سعیدی رکن راجستھان اُردو اکادمی نے مشاعرے کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔

اس مشاعرے میں راجستھان کے مختلف مقامات جودھپور، ٹونک، مکرانہ، بانسواڑہ، نیما ہیڑہ، چورو، بیکانیر اور جے پور کے شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

صحافت کی ترقی زبان کی ترقی سے وابستہ ہے

انجمن ترقی اُردو (ہند) کے زیر اہتمام اُردو گھر نئی دہلی میں روزنامہ "سیاست" حیدرآباد کے چالیس سال مکمل ہونے پر اس کے ایڈیٹر جناب عابد علی خاں کے اعزاز میں ایک تہنیتی جلسے کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت پاکستان کے معروف نقاد ممتاز حسین صاحب نے فرمائی۔

ڈاکٹر خلیق انجم کی تعارفی تقریر سے جلسے کا آغاز ہوا۔ جناب سیّد حامد نے روزنامہ "سیاست" نے صحافت کے م... بدلا ہے اور سنجیدہ اور تعمیری خبروں ک... کالم میں جگہ دی ہے۔ پنڈت آنند زا... صاحب نے فرمایا کہ چالیس سال قبل... اگست سے "سیاست" کی اشاعت ... ہوئی تھی۔ اشاعت کے لیے آزادی کے... انتخاب خود اس کے سیکولر کردار اور ... محبّت کا آئینہ دار ہے۔ جناب ظفر پیا... کہا کہ عابد علی خاں "سیاست" کو قومی ا... بنانے میں کامیاب رہے ہیں۔ پروفیسر قم... نے کہا کہ روزنامہ "سیاست" نے آزادی ... بعد اُردو داں طبقے میں اعتماد اور وطن... محبّت کا جذبہ پیدا کیا ہے۔ محترمہ فہمیدہ... نے کہا کہ "سیاست" نے آزادی کے بعد اُ... طبقے کو ذہنی سکون فراہم کرنے میں اہم کر... ادا کیا ہے۔ جناب مالک رام نے کہا... صحافت میں حیدر آباد اور پنجاب کو اہمی... حاصل ہے۔ انھوں نے کہا کہ حقیقی معنوں... ابھی تک صحافت کی تاریخ مرتب نہیں ہوئی... اسکالرس اس طرف توجّہ دیں۔ حیات اللہ انصا... صاحب نے کہا کہ "سیاست" خبروں کا نہیں... صحافت کا اخبار ہے۔ جناب کنور مہندر سن... بیدی سحر نے کہا کہ عابد صاحب کی میانہ رو... اور سماجی خدمات قابلِ مبارکباد ہیں۔

جناب عابد علی خاں صاحب نے تہنیتی جلسے کے انعقاد پر اظہارِ تشکّر کرتے ہوئے کہا کہ "سیاست" کو اس معیار تک لانے میں وہ تنہا نہیں بلکہ اس کا سہرا اخبار کے پورے اسٹاف کے سر ہے انھوں نے کہا کہ اُردو اخبا... کا معیار بدلا ہے اور اب اس کی خبروں کو

اعتبار کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ عابد صاحب نے اُردو زبان کو ترقی دینے کی ضرورت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ زبان کو ترقی دیے بغیر اخبار کا معیار کوئی معنی نہیں رکھتا۔ انھوں نے متحد ہوکر اُردو رسم الخط کی بقا اور اُردو تعلیم پر توجہ دینے کی اپیل کی۔ صدر جلسہ ممتاز حسین صاحب نے کہا کہ بول چال کی سطح پر اُردو ہندی میں فرق بہت کم ہے تاہم تحریر میں عربی اور سنسکرت الفاظ کے استعمال سے دونوں زبانوں میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ ممتاز صاحب نے مزید کہا کہ اس خلیج کو اس طرح پاٹا جاسکتا ہے کہ ہندی اور اُردو والے ماضی کے بجائے مستقبل پر نظر رکھیں۔

(شمیم جہاں)

انڈو پاک افسانوی مقابلہ

علّامہ اقبال لائبریری رامپور کی جانب سے انڈو پاک افسانوی مقابلے کا انعقاد کیا جا رہا ہے۔ جس میں ہند اور بیرون کی مستند اور نامور شخصیات کے نام سے ایوارڈ دیے جائیں گے۔ یہ مقابلہ خصوصاً نوجوان افسانہ نگاروں کی حوصلہ افزائی کے لیے کیا جا رہا ہے، مقابلے میں شمولیت کی شرائط یہ ہیں:

۱۔ افسانہ غیر مطبوعہ اور دس صفحات فل اسکیپ سے زیادہ نہ ہو۔
۲۔ جنس اور عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔
۳۔ ممکن ہو تو تصویر ارسال کریں۔

افسانہ علّامہ اقبال لائبریری، گھیر سیف الدّین خاں، رامپور (یو۔پی) کو مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۹۰ء تک مل جانا چاہیے۔

اُردو ڈرامے کو اوّل انعام

ساہتیہ کلا پریشد (شعبۂ ثقافت دہلی انتظامیہ) ہر سال اُردو، ہندی اور پنجابی زبانوں میں کُل ہند سطح پر فل لینتھ ڈراموں کے مقابلے منعقد کرتی ہے۔ اس سال اُردو، ہندی اور پنجابی کے ڈراموں میں سوائے اُردو کے بقیہ دو زبانوں کے ڈراموں کی کسی بھی اسکرپٹ کو اوّل انعام کے قابل نہیں پایا گیا بلکہ دوم اور سوم انعامات دیے گئے۔ صرف اُردو کی فل لینتھ سیاسی طنزیہ تمثیل "جلیانوالہ باغ ۸۹ء" کو بہترین اُردو ڈرامے کے اوّل انعام سے نوازا گیا۔ اِس ڈرامے کے مُصنّف بمبئی کے نوجوان افسانہ نگار اور صحافی جناب اقبال نیازی ہیں۔ اس مقابلے میں اُردو کے لیے ججوں کے فرائض ڈاکٹر محمد حسن، جناب ریوتی سرن شرما اور جناب ایس۔ایم۔مہدی نے انجام دیے تھے۔ اقبال نیازی اب تک تقریباً تیس یک بابی اُردو ڈرامے اور تین فل لینتھ اُردو ڈرامے تحریر کر چکے ہیں۔ اور عملاً بھی اسٹیج سے وابستہ ہیں۔

(اسلم پرویز، بمبئی)

حضرت رضا بریلوی بہ حیثیت شاعر

برِ صغیر کی مشہور شخصیت مولانا احمد رضا خاں رضؔا بریلوی پر ان کے علمی و تحقیقی مقام کے زاویے سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ مگر ان کی شاعرانہ حیثیت پر بہت کم لکھا گیا۔ ماہنامہ 'اشرفیہ' مبارک پور حضرت کی شخصیت پر ایک خصوصی نمبر نکال رہا ہے، اس سلسلے میں اُردو کے خادمین سے التماس ہے کہ حضرت رضا بریلوی پر شعر و سخن کے زاویے سے مقالات لکھیں تاکہ ان کو نمبر میں شامل کیا جا سکے۔ جو صاحبان اس سلسلے میں کچھ لکھنا چاہیں وہ ہمیں خط لکھ کر مراجع مصادر کی معلومات حاصل کر لیں بلکہ ہم بعض کتابیں فراہم کرنے کا بھی وعدہ کرتے ہیں۔

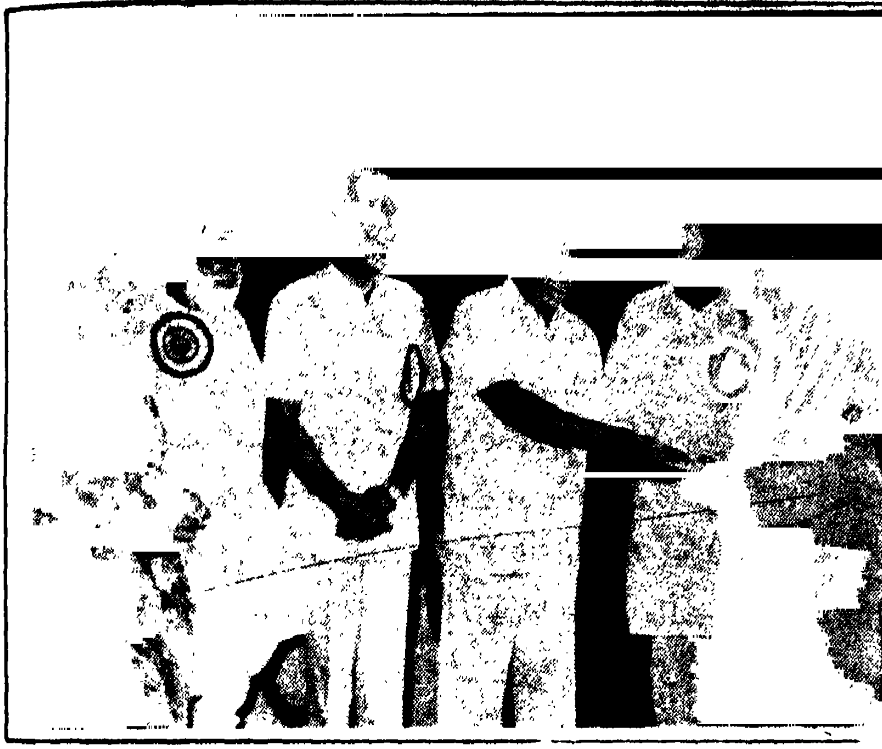
پتا: محمد عبدالمبین نعمانی ایڈیٹر ماہنامہ اشرفیہ، مبارکپور، اعظم گڑھ ۲۷۶۴۰۴ (یو۔پی)

انجمن ترقّی اُردو بہار کے نئے سکریٹری

دفتر انجمن ترقّی اُردو بہار "اُردو بھون" کے ایک پریس اعلانیہ کے مطابق انجمن ترقّی اُردو بہار کے نئے سکریٹری کی حیثیت سے اُردو کے جواں سال افسانہ نگار جناب فخر الدّین عارفی کو نامزد کیا گیا ہے۔ فخر الدّین عارفی پہلے بھی انجمن کے بعض اہم شعبوں میں کلیدی عہدے پر مامور رہے ہیں۔

ایوانِ اُردو

مِل بانٹ کر پڑھیے



جناب رحمت امروہوی کی ادبی اور شعری خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے احمد آباد کی پنجابی ایجوکیشنل اینڈ کلچرل سوسائٹی نے ان کا استقبال کیا۔ اور سپاسنامہ پیش کیا۔ اس موقعے پر انھیں ایک شال اور ۲۱ ہزار روپے کا چیک بھی پیش کیا گیا

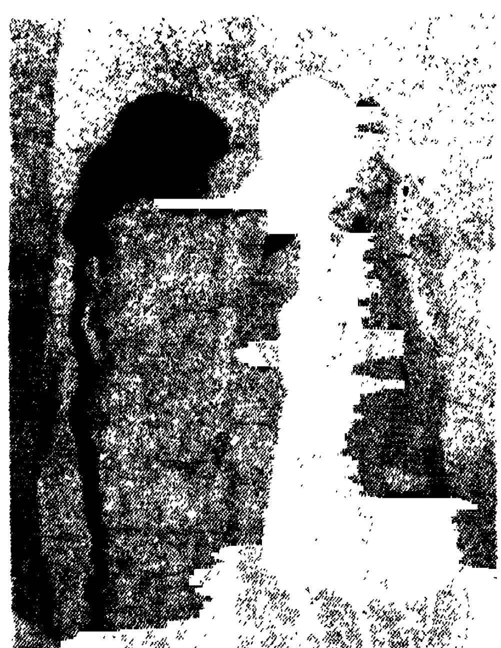


ڈاکٹر اختر بستوی (بائیں) راج بھون لکھنؤ میں اُتر پردیش کے گورنر جناب محمد عثمان عارف (دائیں) کے ہاتھوں اپنے تازہ شعری مجموعے "اپنے سایے کے سوا" کی رسم اجرا ادا ہونے کے موقعے پر کتاب کی ایک جلد گورنر موصوف کو پیش کرتے ہوئے۔

ہارن پور میں کل ہند اردو تعلیمی بورڈ کی جانب سے منعقدہ ایک تقریب میں اخبار "انڈین میسیج" (INDIAN MESSAGE) کے خاص



بر کا اجرا کرتے ہوئے مشہور نقاد اور مقتدرہ قومی زبان پاکستان کے چیئرمین ڈاکٹر جمیل جالبی اُن کے دائیں جانب جناب نعمان اللہ صدیقی جنرل سکریٹری بورڈ، جناب بشیر شاد جرنلسٹ (دائیں جانب) ابراہیم قمر اور ڈاکٹر شاہد زبیری جرنلسٹ



ایک تقریب میں پاکستانی شاعر سید حباب ترمذی کا خیر مقدم کرتے ہوئے انجمن معراج ادب شاہجہانپور کی صدر سیدہ شانِ معراج

شاد نوحی نہیں رہے

۲۸ر ستمبر ۸۹ء کو نوح (ضلع گڑگاؤں ہریانہ) کے معروف جدید شاعر جناب شاد نوحی ایک طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ اس وقت مرحوم کی عمر ۵۴ سال تھی۔ پہلا شعری مجموعہ زیرِ اشاعت تھا شاد نوحی گذشتہ دہائیوں میں ادبی جرائد میں برابر شائع ہوتے رہے تھے۔ وہ ایک ادبی انجمن 'گل و سمن' نوح کے بانی بھی تھے۔ ابھی جدید شاعری کو شاد نوحی سے کافی توقعات تھیں وہ جدید لب ولہجہ کے منفرد شاعر تھے۔

آپ کی رائے

○ "ایوانِ اُردو" ستمبر ۸۹ء کے حرفِ آغاز میں
آپ نے نہایت مناسب خیال کا اظہار کیا ہے کہ
'ہندی کے غلط اندیش بہی خواہوں کے ساتھ براہِ
راست رابطے اور گفتگو کے مواقع پیدا کیے جائیں۔'
گذارش یہ ہے کہ یہ صرف اظہارِ خیال بن کر نہ
رہ جائے بلکہ اسے عملی جامہ پہنانے کی بھرپور
کوشش ہونی چاہیے اور یہ کوشش دہلی ہی
میں رہ کر کی جا سکتی ہے دہاں اردو تحریک
سے متعلق بہت سے صاحبان مل بیٹھ کر سلسلہ
جنبانی کر سکتے ہیں۔ براہِ راست گفتگو سے بہت
سی باتیں اور بہت سی غلط فہمیاں اور شرارتیں
صاف نظر کے سامنے آجائیں گی ممکن ہے کہ اس
گفتگو سے کچھ بہتر نتائج سامنے آئیں اور اگر کوئی
نتیجہ برآمد نہ ہو تو کم از کم یہ تو ہوگا کہ غلط اندیش
بہی خواہ کے ذہن کو سمجھنے کا موقع ملے گا اور اس
کے پیشِ نظر اپنا طریقۂ عمل واضح ہوگا۔

——— سید علی رضا، بمبئی

○ "ایوانِ اُردو" ماہ اکتوبر ۸۹ء پیشِ نظر
ہے۔ آخری صفحے پر سرودِ رفتہ کے تحت ایک مشہور
معروف غزل:
نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جنابِ سید افتخار حسین مضطر خیرآبادی کے نام
سے شائع ہوئی ہے۔ جنابِ خلیل تنویر اودے پور
نے معہ فوٹو ارسال کی ہے اور صفحہ ۵۵ پر مصنف
کا مختصر ترین مراسلہ بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔
حیرت ہے کہ "ایوانِ اُردو" کے لائق و
فائق مدیر نے بنا تحقیق ایک گمنام یا غیر معروف
شخص کی غیر مفید رائے کو کیوں اور کیسے درست
مان لیا اور غزل مضطر خیرآبادی کے نام سے
شائع کر دی۔ میں نے جب سے ہوش کی دنیا میں
قدم رکھا، پڑھا، سنا کہ یہ غزل آخری مغل تاجدار
بہادر شاہ ظفرؔ کی ہے۔ ان کے دیوان میں بھی ہے
ہزاروں بار سنا، گانے سُنے فلم میں، ٹی۔وی پر
کئی ٹی۔وی سیریل میں۔ ملک اور غیر ممالک
کے غزل گائکوں نے گا کر یہی بتایا کہ یہ غزل ظفرؔ
کی ہے۔ ان گنت شواہد اسی امر کے ملے۔ آج
پہلی بار یہ پڑھا کہ یہ غزل مضطر خیرآبادی کی
ہے۔ اگر بقول مراسلہ نگار یہ غلطی سے بہادر
شاہ ظفر کے دیوان یا کلیات میں شامل ہو گئی
تو آج تک کسی جانب سے صدائے احتجاج یا
تردید کیوں نہ ہوئی۔

——— واحد حسین صدیقی

○ "ایوانِ اُردو" اکتوبر ۱۹۸۹ء کے شمارے
میں 'سرودِ رفتہ' کے تحت آپ نے جو غزل
مضطر خیرآبادی سے منسوب کی ہے۔ وہ خاندانِ
مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفرؔ کی انتہائی
مشہور و مقبول غزل ہے۔ مجھے بے حد تعجب
ہے کہ آپ لوگوں سے اتنی بڑی غلطی کیسے ہو گئی
کہ غزل کو مضطر خیرآبادی کے نام سے شائع
کر دیا۔

——— قیصر الرحمٰن پوری، سہسرام

○ "ایوانِ اُردو" اکتوبر کا شمارہ ہر ماہ کی
طرح اس بار بھی وقت پر دیکھنے کو ملا لیکن
ہی سرودِ رفتہ پر نظر پڑی تھوڑی دیر
چونکتا ہو گیا۔ اور سوچنے لگا کہ غلطی سے
تصویر کسی اور کی نہیں چھپ گئی ہے لہ
الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد جلد ہی ا
تک پہنچ گیا جس کی تلاش تھی۔ چونکہ
میں یہی جانتا تھا کہ یہ غزل بہادر شاہ
ہے۔ اور اس غزل میں جو کیفیت بیان
ہے اس سے تو لگتا ہی نہیں ہے کہ بہادر
کے علاوہ کسی اور کی ہے۔ اسے میں ا
میں ایک اضافہ سمجھتا ہوں۔

——— معبود احمد صدیقی، د

○ "ایوانِ اُردو" اکتوبر ۱۹۸۹ء
صفحے پر 'سرودِ رفتہ' کے عنوان سے س
حسین مضطر خیرآبادی کی تصویر، سنہ ولا
سال رحلت کے ساتھ ان کے نام سے
ایک غزل آپ نے بشکریہ جناب خلیل
شائع کی ہے مذکورہ غزل آخری مغل تا
بہادر شاہ ظفر کی بہت ہی مشہور غزل
صرف چند الفاظ الٹ پلٹ کر دیے گئے

——— سید حسین احم

○ "سرودِ رفتہ" کی غزل مضطر خیر
کے نام سے منسوب کی گئی ہے۔ کچھ عجیب
لگتا ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ
مضطر خیرآبادی کی ہے ظفر کی نہیں تو
افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے ناقدا
غفلت کے کس اندھیرے میں اب تک
تھے۔ خلیل تنویر صاحب کی بات حرف
نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے تحقیق کی ضرو
ہے۔

——— جاوید اختر،

○ یہ پڑھ کر تعجب ہوا کہ اکتوبر ۱۹۸۹ء کے
ٗرمیں جو غزل چھپی ہے وہ کسی افتخار حسین مضطر
ی ہے۔ میں تو اسے اب تک بہادر شاہ ظفر کی
سمجھتا رہا ہوں اس غزل کو فلم لال قلعہ میں
محمد رفیع نے گایا ہے اور ریڈیو اور T.V نے
ئی بار اسے یہ کہہ کر دہرایا ہے کہ یہ بہادر شاہ
ظفر کی ہے۔ ملک راج آنند نے اپنی کتاب
ہندوستان کی کہانی" میں اس غزل کے مطلع
و بہادر شاہ ظفر کے کلام کے نمونے کے طور پر
یا ہے۔ کہیں کوئی غلطی ضرور ہوئی ہے اس
پر کچھ روشنی ڈالیے۔ میں نے صفحہ ۵۵ پر خلیل
نویر صاحب کا خط پڑھ لیا ہے۔ میرے پاس
جو دیوانِ ظفر ہے یہ غزل اُس میں بھی نہیں ہے۔
چوں کہ یہ دیوان اگروال بکڈپو، کھاری باؤلی دہلی
کا شائع کردہ ہے اور شکل و صورت میں بھی
گھٹیا ہے۔ اس میں اس غزل کی غیر موجودگی
کو میں نے اس کی کوتاہی سمجھ لیا اور ریڈیو،
T.V اور ملک راج آنند کو صحیح مان لیا

—— بھولا ناتھ، نئی دہلی

○ یوں تو سرورق سے پشت تک
"ایوانِ اُردو" کے تمام سلسلے ایک سے بڑھ کر
ایک خاصے دلچسپ ہوتے ہیں جو پڑھنے سے
تعلق رکھتے ہیں لیکن میں سب سے پہلے "آپ
کی رائے" پڑھتا ہوں۔ اس لیے کہ اس سلسلے
کے تحت شائع ہونے والے تمام خطوط پرچے
کی تعریف و توصیف اور بے کار کی چاپلوسی اور
لفّاظی پر مبنی نہیں ہوتے بلکہ ادب کے مختلف
پہلوؤں پر بحث و مباحثے کی شکل میں ایک سچا
راستہ استوار کرتے ہیں۔ رہی ان شائع شدہ آرا
پر اتفاق کی بات تو ضروری نہیں کہ ہر شخص اُن
سے متفق ہی ہو لیکن اس حقیقت سے کس
شخص کو انکار ہو سکتا ہے کہ اس طرح کی تکرار
بہر حال صحت مند، معلومات افزا اور
روشن محسوسات سامنے لاتی ہے
میرا دوسرا پسندیدہ کالم "سرودِ رفتہ" ہے۔
اساتذہ کا کلام ہونے کے سبب میں یہ کالم بڑے
ہی ادب و احترام کی نگاہ سے پڑھتا ہوں لیکن
اس بار اکتوبر ۸۹ء کا شمارہ دیکھ کر حیران رہ گیا
"آپ کی رائے" میں خلیل تنویر صاحب نے چند
حوالوں کے ساتھ تحریر فرمایا ہے کہ یہ غزل
"نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں"
بہادر شاہ ظفر کی نہیں بلکہ مضطر خیر آبادی کی
ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو یہ مصرعہ:
"نہ ظفر کسی کا حبیب ہوں، نہ ظفر کسی کا رقیب ہوں"
کس نے نظم کیا اور پورا شعر بہادر شاہ ظفر سے
کیسے منسوب ہوا؟ ذرا وضاحت ہوتی تو اچھا
ہوتا۔

—— فراق جلال پوری، جلال پور

○ اکتوبر (۱۹۸۹ء) کا شمارہ ہاتھوں میں ہے
جناب جاوید وششٹ کا انشائیہ "تنکا"
تاثر قائم کرنے میں ناکام رہا۔ انشائیہ نگاری
نہ صرف ایک فن ہے، بلکہ اس کے لیے انشائیہ
نگار کا مخصوص مزاج بھی بڑا کام کرتا ہے۔ جناب
جاوید وششٹ اپنے میدان کو ترک نہ
کریں۔ جناب فیاض رفعت کی دوسری
نثری نظم مناسب ہے، پہلی نثری نظم "ٹھنڈے
فریزر میں رکھی زندگی" نظم نہیں، افسانوی نثر
کا ایک ایسا مربوط حصہ ہے جسے نظم کے طور پر
پیش کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ اس
کوشش کے مفید نتائج برآمد نہیں ہوں گے
اور نثری نظم کو اس سے نقصان پہنچے گا۔ "سرود
رفتہ" کے تحت سید افتخار حسین مضطر خیر آبادی
کی غزل نے بہت سوں کو چونکا دیا۔ میرا خیال ہے
کہ متنازعہ کلام کے حقیقی خالق کی نشاندہی "ایوانِ
اُردو" کی اہمیت میں اضافہ کرے گی۔ اس
سلسلے کو جاری رکھیں۔

—— حسینی جاوید، حیدر آباد

○ "ایوان اُردو" کے اکتوبر ۸۹ء کے شمارے
میں سرودِ رفتہ کے تحت اپنے پرنانا مرحوم حضرت
مضطر خیر آبادی کی غزل 'نہ کسی کی آنکھ کا نور...
نظر نواز ہوئی۔ اس سلسلے میں کہنا ہے کہ میرے
پاس موجود مضطر خیر آبادی صاحب کے کلام
میں اس غزل کا ایک اور شعر ہے، جس تک
جناب خلیل تنویر کی رسائی نہیں ہو سکی۔ شعر
پیش خدمت ہے اس کے علاوہ غزل کے دوسرے
شعر کے پہلے مصرعے میں وقت کے بجائے بخت
کا لفظ تحریر ہے:

میں کہاں رہوں میں کہاں بسوں نہ یہ مجھ سے خوش نہ وہ مجھ سے خوش
میں زمیں کی پیٹھ کا بوجھ ہوں میں فلک کے دل کا غبار ہوں

براہ کرم جناب خلیل تنویر کا پتا شائع کردیں[1]
تاکہ ان سے مزید معلومات حاصل کی جا سکے۔ کیونکہ
میں جناب مضطر خیر آبادی پر تحقیقی کام کرنے کا ارادہ
رکھتا ہوں۔

—— رفعت عزمی،
۳۵۸ قاضیانہ، پوسٹ رودولی ضلع بارہ بنکی۔ ۲۲۵۴۱۱

○ اکتوبر ۱۹۸۹ء کے شمارے میں جناب
جاوید وششٹ صاحب کا 'تنکا' انشائیہ
شائع ہوا ہے۔ جس میں محترم جاوید وششٹ
صاحب نے تنکے کے بے بہا فضائل اپنی پوری
انشائی صلاحیت کو بروئے کار لا کر بیان کیے
ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ محترم نے انشاپردازی کا اعلیٰ
نمونہ پیش کر دیا ہے۔ لیکن اردو کے اس ادیب
نے مضمون میں ہندی، سنسکرت کے اتنے ثقیل

(۱) انھیں اس پتے پر خط لکھا جا سکتا ہے: کیوریٹر، گورنمنٹ میوزیم، اودے پور (راجستھان)۔

الفاظ استعمال کیے ہیں جن کا اُردو میں کھپنا مشکل ہے۔ اگر محترم وششٹ صاحب چاہتے تو وہ ضرور اردو کے الفاظ استعمال کر سکتے تھے۔ محترم نے جگہ جگہ دکھرلوک، ست یگ، پریچے، برہمانڈ، ابھیمان، بیر، یوجنا، اہنکار جیسے لفظوں کو تحریر میں لاکر آکاش وانی والی خبروں کی یاد تازہ کردی۔ سوال یہ ہے کہ جب اُردو ادب کے استاد ہی اس طرح کے الفاظ کو کثرت سے استعمال کرنا شروع کردیں گے تو پھر کیا اُردو زبان وادب کی ایک خاص شکل کے باقی رہنے کے امکانات باقی رہ سکتے ہیں۔

——— س۔ب۔ رضائی دہلی

○ عزیز محمد خاں قیسی کا اخترالایمان پر مضمون نیا نیا سا لگا۔ شعری حصے میں رزاق ارشد، وقار واثقی اور رفضا ابن فیضی کی غزلیات دل کو چھو گئیں۔ کمال صاحب سے کہیے کہ نثر پارے اور نثری نظم کے فرق سے میں واقف ہوں۔

——— فیاض رفعت، بھوپال

○ "ایوانِ اُردو" اکتوبر ۸۹ء کے صفحہ ۴۲ پر فیاض رفعت کی نثری نظم "ٹھنڈے فریزر میں رکھی زندگی" مطالعے میں آئی۔ بار بار پڑھنے کے بعد بھی میری سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ یہ نظم ہے یا نثر۔ فیاض رفعت اور ادارہ 'ایوانِ اُردو' نے اسے نثری نظم تسلیم کیا ہے لیکن میں اسے صرف نثر کیوں نہ کہوں؟ مجھے تو اس میں نظم والی کوئی بات نظر نہیں آئی۔

دیکھیے اُردو شاعری میں سارے کھیل تماشے بڑوں ہی کی طرف سے بڑوں کی سرپرستی میں ہوتے ہیں ہم چھوٹے لوگ اگر اسی قسم کے کھیل تماشے دکھانے لگیں تو یہ بڑے لوگ ہم پر گدھ کی طرح جھپٹ پڑیں گے چلیے صاحب آپ سب 'ایوانِ اُردو' کے مالک ہیں جو جی میں آئے چھاپیے جس چیز کو جو نام دینا ہو دے دیجیے جن جن لوگوں کو اچھالنا چاہتے ہوں اچھالیے۔ ایسے لوگوں کے نام آپ کی فہرست میں محفوظ تو ہیں ہی! ہم سب کوتاہ قد، نام نہاد قدآوروں کی تقلید کے لیے تو ہیں ہی۔ فکر کس بات کی۔

میں جانتی ہوں میرا یہ خط آپ کو پسند نہ آئے گا اور نہ ہی اسے آپ شائع کریں گے کیونکہ اُردو صحافت میں ابھی اتنا دم نہیں ہے پھر بھی آپ میرے احساسات وجذبات سے واقف تو ہو ہی جائیں گے۔

——— ممتاز صنم، کلکتہ

○ "ایوانِ اُردو" کا ماہ اکتوبر کا شمارہ دیکھا۔ لوہ سوں کی کہانی "درد" کافی اچھی لگی۔ اس طرح کی کہانیاں ہماری اُردو میں نہیں ملتیں۔

——— شہنشاہ عالم، مونگیر

○ "ایوانِ اُردو" کے سرورق پر آپ نے تاریخی عمارات کی تصاویر شائع کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے شہر بھوپال پر بھی نظرِ عنایت کیجیے کہ یہاں بھی کئی تاریخی عمارتیں ابھی باقی ہیں۔ اور مساجد بھی خوب ہیں۔ اگر میں اس طرح کی کوئی تصویر پہنچاؤں تو کیا اس کا معاوضہ مل سکتا ہے۔ اور تصویر رنگین ہو یا بلیک اینڈ وہائٹ۔[1]

——— بدر واسطی، بھوپال

[1] تصویریں رنگین ہونی چاہئیں۔ شائع کی جانے والی تصاویر کا معاوضہ پیش کیا جائے گا۔

○ "ایوانِ اُردو" اکتوبر ۸۹ء کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ آپ کی کوششوں نے اسے دوسرے ادبی رسالوں سے منفرد کردیا ہے۔ مگر گستاخی معاف ہو تو میں آپ کی توجہ اس شمارے کے شعری حصے کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ شعری حصے کی ابتدا جناب بشیر بدر کے کلام سے ہوئی ہے۔ پہلی نظر میں حسنِ ترتیب دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی مگر کلام پڑھنے کے بعد نہایت ہی مایوسی ہوئی۔ کیا یہ وہی بشیر بدر ہیں جو بقول خود جدید اردو شاعری کا سب سے اونچا مینار ہیں اگر وہی ہیں تو واقعی ان کا کلام دیکھ کر رونا آیا اور آپ کا حسنِ ترتیب دیکھ کر حیرت بھی ہوئی۔ ایوانِ اردو کوئی فلمی یا نیم ادبی رسالہ یا کسی دیہی علاقے کے مشاعرے کا رپورتاژ نہیں کہ موصوف کا نام سرِ فہرست رکھا جائے۔ بڑا نام اور بڑی شاعری ہم معنی نہیں۔ جس رسالے کی ادارت کے ساتھ مخمور سعیدی جیسے شاعر کا نام وابستہ ہو اس میں نام پر نہیں بلکہ کلام پر توجہ دینی چاہیے ورنہ صرف ایوانِ اردو پر ہی نہیں مخمور سعیدی کے مزاجِ شعر و سخن پر بھی حرف آسکتا ہے۔ آئندہ احتیاط رکھی جائے تو بہتر ہو گا۔

خود کو میر و غالب کا حریف سمجھنے والا شاعر کاش اسی شمارے میں شائع شدہ منشاالرحمٰن منشا کی غزل پڑھ لیتا۔ حامدی کاشمیری کی غزل کے آخری دو اشعار ذہن میں محفوظ کرلیتا۔ احترام اسلام کی جھلستی ہوئی انگلیوں سے انگارے پر رکھی ہوئی کلیوں کی بے بسی دیکھ لیتا یا پھر گلابی سردیوں کے احساس پر دھوپ کی پتی سے لکھا ہوا فاروق شفق کا شعر سمجھ لیتا تو اُس کے تاریک پندار کے سارے پہلو اجاگر ہو جاتے۔[1]

——— اختر حسین، مغربی چمپارن

[1] بشیر بدر صرف مشاعرے کے شاعر نہیں۔ ان کی خود ستائیوں سے قطع نظر، انھیں جدید غزل کا ایک معتبر شاعر ماننے میں تامل نہ ہونا چاہیے۔

——— ادارہ

○ نومبر ۸۹ء کا "ایوانِ اردو" اپنی روایت کے مطابق خوش رنگ اور خوش ذائقے کا حامل ہے۔ لیکن اس معیاری جریدے میں مطبوعہ چیزوں کی اشاعت قاری کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ نومبر ۸۹ء کے شمارے میں صفحہ ۳۳ پر جناب ایم۔ آر۔ قاسمی کی مطبوعہ غزل باعثِ حیرانی بنی ہے، ایسا قصداً ہوتا ہے یا سہواً؟ اطلاعاً تحریر ہے کہ قاسمی صاحب کی یہ غزل ـــــ جنوری، فروری ۸۹ء کے "پروازِ ادب" میں صفحہ ۴۸ پر شائع ہو چکی ہے۔[1]

ـــــ صدف جعفری، کلکتہ

[1] ہم مصنفین کی اس اطلاع پر بھروسا کر لیتے ہیں کہ بھیجی جانے والی تحریر غیر مطبوعہ ہے۔ تمام رسائل کا بالاستیعاب مطالعہ ہمارے لیے ممکن نہیں۔ قارئین کو اس سے جو بے لطفی ہوتی ہے اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔

ـــــ ادارہ

○ نومبر ۸۹ء کے شمارے میں جناب کمال احمد صدیقی نے عنوان چشتی پر شیخ سلیم احمد کے مضمون سے استفادے/سرقے کا الزام لگایا ہے۔ سرقہ ہی کرنا ہوتا تو پروفیسر عنوان حال میں چھپے ہوئے مضمون ہی سے کیوں کرتے اور ایک ایسے صاحب کے مضمون سے جو بہر لحاظ ان سے کم تر ہیں؟ دراصل مولانا آزاد پر پچھلے پچاس برسوں میں اس قدر لکھا جا چکا ہے کہ ہر نیا مقالہ کسی پرانے مقالے کا کم یا زیادہ عکس دکھائی دیتا ہے۔

کمال صاحب نے پروفیسر عنوان کے مضمون میں اقتباسوں کی بھرمار بھی دیکھی ہے۔ مضمون اقتباس کا متقضی ہو تو اقتباس سے گریز بھی تو نہیں کیا جا سکتا۔

سرمد تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں کئی مورخوں نے ان پر لکھا ہے اور اپنے اپنے طرز و لب و لہجے میں لکھا ہے۔ تاریخ میں واقعہ ایک ہوتا ہے اور طرزِ بیان مختلف کتب تواریخ میں مختلف۔ ہر بات/واقعے سے لوگ نتیجہ بھی مختلف اخذ کرتے ہیں۔ میرے خیال میں پروفیسر عنوان چشتی اور شیخ سلیم احمد، دونوں کے ماخذ شیخ سلیم احمد (؟ ـــــ غالباً شیخ اکرام) کی "کوثریات" ہیں (آبِ کوثر، رودِ کوثر، موجِ کوثر)۔

اختر الایمان کی شاعری پر جناب عزیز قیسی کا مضمون مظہر ہے کہ عجلت میں اور شاید کسی تقریب کے لیے لکھا گیا ہے۔ قیسی نے اختر الایمان کی کھردری زبان کا ذکر تو کیا ہے لیکن زبان کی ان غلطیوں کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا جو موصوف زبان و بیان پر مکمل قدرت کے باوجود دانستہ کرتے ہیں۔

ـــــ نجم الثاقب شحنہ، پالگیر

○ نومبر ۸۹ء کے شمارے میں شامل تمام مضامین پسند آئے خصوصاً عزیز قیسی اور ظفر کمالی صاحبان کی چیزیں حاصلِ مطالعہ رہیں۔

ـــــ عبدالحق بیتاب، کٹک

○ اختر الایمان کے فکر و فن کے حوالے سے ان پر اب تک بہت سے مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ مگر عزیز قیسی کا مضمون اپنی فکر انگیزی اور خاص رنگ کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

ـــــ خالد عبادی، دربھنگہ

○ شمارہ نومبر ۸۹ء میں افسانوی حصہ ناقص ہے۔ جبکہ حصۂ مضامین خوب ہے۔ عزیز قیسی نے اختر الایمان کے محرکاتِ شاعری کو سمجھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ظفر کمالی اور سید حسین احمد کی کوششیں ستائش کے قابل ہیں۔ غزلیات میں ایم۔ آر۔ قاسمی، رزاق ارشد، اسلم بدر، اور رئیس منظر نے متاثر کیا۔ سازینہ کی نظم "حدیں" احساس کی شدت اور لفظوں کے مؤثر برتاؤ سے لبریز ہے۔

ـــــ ایم۔ ایم۔ وفا، بتیا

○ نومبر کے "ایوانِ اُردو" میں غزلوں میں رزاق ارشد، مسعودہ حیات اور گوہر عثمانی کی غزلیں پسند آئیں۔ ملک خورشید کی نظم "وراثت" بھی اچھی ہے۔ انیس نصرت کا افسانہ "ایک خطا اپنے نام" متاثر کرتا ہے۔ افسانہ "بیل" موجودہ زندگی کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ حالانکہ اس میں افسانہ نگار نے ایک نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے انسان کی زندگی ہی کو موضوع بنا کر افسانے کا اختتام کیا ہے۔ جب کہ میری نگاہ میں اس مشینی دور میں اونچے طبقے نے بھی ترقی کی اعلیٰ منازل طے کرنے کے لیے اپنی زندگی کو "بیل" کی طرح بنا دیا ہے۔

انشائیہ "دال" اس شمارے کی جان ہے۔ عبدالرحیم نشتر صاحب نے پورے معاشرے پر جو طنز کیا ہے وہ واقعی داد طلب ہے۔

ـــــ ظہیر اکرم۔ پلاول، ہزاری باغ

○ نومبر ۸۹ء کے شمارے کی تمام کہانیاں پسند آئیں خصوصاً انیس نصرت کا افسانہ "ایک خطا اپنے نام" بہت خوب ہے۔

ـــــ شاہد جمال، مظفرپور

○ "ایوانِ اُردو" کے کچھ شمارے میری نظر سے گزرے۔ جامع اور مؤثر نظر آئے۔ ان میں خوبیاں بھی نظر آئیں اور خامیاں بھی۔ خوبیاں تو بہت ہیں لیکن خامیاں کم۔ میں چند خامیوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ مثلاً مندرجۂ ذیل اشعار میں تقابلِ ردیفین کا عیب ہے:

چراغِ آخرِ شب کی عجیب قسمت ہے
سِسک رہا ہے اُمیدِ سحر بھی رکھتا ہے
(ساحر شیوی)

مہرباں ہیں گھٹائیں ساون کی
خوب قسمت ہے اس مہینے کی
(قتیل شفائی)

وغیرہ۔ انتخاب میں مزید سختی کی ضرورت ہے۔ ٭ 'حمد' اور 'نعت' پر آپ کے رسالے کا مباحثہ پسندیدہ نہیں۔ اختر الایمان کو زیادہ مت بڑھایئے باقی خیریت ہے۔

—— فیض اکبر آبادی، رانچی

٭ یہ اشعار تبصروں میں نقل کیے گئے ہیں۔

—— ادارہ

○ ہفتہ وار اُردو بلٹز (خواجہ احمد عباس کی حیات تک) کو اور اب "ایوانِ اُردو" کو یہ شرف حاصل ہے کہ یہ اُلٹے (آخری صفحے) سے پڑھے جاتے ہیں۔ اردو بلٹز "آزاد قلم" کے لیے اور "ایوانِ اردو" "سرودِ رفتہ" جیسے منفرد کالم کے لیے نادر و نایاب تصاویر اور غزلوں کا یہ کالم واقعی قابلِ تعریف ہے۔

اُردو خبر نامہ، سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے عنوان، 'نئی مطبوعات'، ہم طرح اشعار وغیرہ جیسے منفرد کالم ایوانِ اُردو کے حُسن کو دوبالا کرتے ہیں۔

—— عتیق فاروقی، بیڑ

○ کیا آپ اُردو کے سچے ہمدرد ہیں؟ کیا آپ اُردو کو ترقی کی منزل تک پہنچانا چاہتے ہیں؟ اگر ہاں تو اُردو کو ہر موزوں جگہ استعمال کریں خطوط پر پتہ اُردو میں لکھیں اور رسالہ روانہ کرنے کے لیے پتہ صرف اور صرف اُردو میں ہی لکھیں۔ قارئین پر بھی زور دیں کہ خطوط پر پتہ صرف اور صرف اُردو میں لکھیں۔

—— الیاس احمد، ہُبلی

○ "آپ کی رائے" کو مختصر کریں تو بہتر ہوگا۔ اس کی جگہ ہر ماہ انٹرویو شائع کریں۔

—— سرور احسن، سیوان

○ "ایوانِ اُردو" کا "نہرو نمبر" دیکھنے کو ملا۔ اس میں مختلف ادیبوں نے بہت اچھے مضامین قلم بند کیے ہیں۔ آپ کی یہ کوشش واقعی قابلِ تحسین ہے۔ یہ نمبر ضرور سبھی خاص و عام میں مقبول ہوگا۔ خصوصاً ریسرچ اسکالرس کے لیے یہ نمبر بہت ہی مفید اور کار آمد ثابت ہوگا۔

—— محمد رشید خاں، لکھنؤ

○ اتنے قلیل عرصے میں آپ نے مولانا ابوالکلام آزاد نمبر اور نہرو نمبر نکال کر ایک عظیم ادبی کارنامہ انجام دیا ہے۔ 'احوال و آثار' میں مسز وجے لکشمی پنڈت کا اظہارِ خیال حقیقت پر مبنی ہے۔ 'اذکار و افکار' میں پروفیسر عبد المغنی صاحب نے پنڈت نہرو اور مولانا آزاد کی رفاقت پر جو تبصرہ کیا ہے، دل کو چھو لیتا ہے

—— نظیر سہروردی، پربھنی

○ دسمبر ۸۹ء کا ایوانِ اُردو دہلی "نہرو نمبر" کی شکل میں دستیاب ہوا۔ ۲۰۲ صفحات پر مشتمل یہ خاص نمبر دلکشی و دیدہ زیبی کے ساتھ ساتھ معنوی لحاظ سے ایک عظیم نمبر ہے۔ اس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ نہرو صدی کے موقعے پر اُردو داں حضرات کے لیے اردو اکادمی دہلی کا یہ ایک بیش قیمت تحفہ ہے اس کے مطالعے سے نہرو جی کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے بخوبی واقفیت حاصل ہو سکتی ہے۔

"نہرو نمبر" کی اشاعت پر اراکین "ایوانِ اُردو" اور اُردو اکادمی دہلی دلی مبارکباد کی مستحق ہے۔

—— پیکر جعفری، لکھنؤ

اُردو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

فون نمبر: ۳۲۶۳۴۴۸، ۳۲۷۶۲۱۱

ایوانِ اُردو دہلی

ادارۂ تحریر

سیّد شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی

جلد: ۳، شمارہ: ۱۰ — فی کاپی ۴ روپے، سالانہ قیمت ۴۰ روپے — فروری ۱۹۹۰ء

ماہنامہ "ایوانِ اُردو دہلی" میں شائع ہونے والے افسانوں میں نام، مقام اور واقعات سب فرضی ہیں، کسی اتفاقیہ مطابقت کے لیے ادارہ ذمّہ دار نہیں۔

مضمون نگاروں کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ

ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی

اُردو اکادمی، دہلی — گھٹا مسجد روڈ،

دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خوشنویس: تنویر احمد

سرورق: راجستھان کی ایک گڑھی کا صدر دروازہ (بشکریہ جناب انصاری حفیظ الرحمان، مالیگاؤں)

سیّد شریف الحسن نقوی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے سیما آفسیٹ پریس دہلی ۱۱۰۰۰۶ سے چھپواکر دفتر اُردو اکادمی، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا

حرفِ آغاز

جب "ایوانِ اُردو" کا یہ شمارہ آپ تک پہنچے گا، ملک بھر میں جشنِ جمہوریت کے سلسلے کی تقریبات منائی جارہی ہوں گی۔

ہم یہ تقریبات ہر سال جوش و خروش سے مناتے ہیں۔ ۲۶ جنوری کا دن ہماری قومی اُمنگوں کا مظہر ہے۔ ہمیں غیر ملکی تسلّط سے رہائی ۱۵ اگست کو ملی لیکن ہماری آزادی کی تکمیل ۲۶ جنوری کو ہوئی جب نیا آئین ملک میں نافذ ہوا۔

ہمارے آئین سازوں نے بلاامتیازِ مذہب و ملّت ہندوستان کے ہر شہری کو یہ حق دیا ہے کہ وہ ملک کی اجتماعی زندگی میں حصّہ لے اور اس پر اثر انداز ہو، لیکن اس کی یہ شرکت اور اثر اندازی ان جمہوری ضابطوں کی پابند ہونی چاہیے جن کی وضاحت آئین میں موجود ہے۔ جمہوری ضابطوں کو نظرانداز کر کے اگر من مانی کارروائیاں کی جانے لگیں تو نہ صرف جمہوریت کی بنیادیں کمزور ہوں گی بلکہ ملک کی سالمیت اور سلامتی کے لیے بھی خطرہ پیدا ہو جائے گا۔

کسی جمہوری نظام میں اپنے مطالبات کو منوانے کا مناسب طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ آپ پُرامن طریقے سے اپنی بات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائیں اور دلائل سے انھیں اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کریں۔ ان میں ارکانِ حکومت بھی شامل ہیں، پریس بھی، دانشور طبقہ بھی اور عام شہری بھی۔ آپ کا تخاطب سبھی سے ہونا چاہیے۔ اگر آپ کے مطالبات میں وزن ہے تو لوگ آپ کی بات پر ضرور دھیان دیں گے اور ان کی تکمیل میں آپ کے معاون بھی ہوں گے۔

جمہوری نظام میں تشدّد کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ 'تشدّد' جوابی تشدّد کو جنم دیتا ہے اور معاملات طے ہونے کی بجائے اُلجھتے چلے جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے پچھلے چند برس سے ہمارے ملک میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ پنجاب اور آسام میں اور اب کشمیر میں جو اندوہناک حالات رونما ہوئے، اس کا سبب یہی ہے کہ جمہوری طریقِ کار کو خیرباد کہہ کر حصولِ مقصد کے لیے تشدّد کا سہارا لیا گیا اور سینکڑوں بلکہ ہزاروں بے گناہ لوگ موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے۔ جہاں تہاں یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور اس کے نتیجے میں مسائل پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتے جارہے ہیں۔ مسائل کو حل کرنے کے لیے جو لوگ خیرسگالی کے جذبے سے کام کرنا چاہتے ہیں، ضرورت ہے کہ تمام امن پسند اور جمہوریت میں یقین رکھنے والی جماعتیں اور افراد ان کی آواز پر لبیک کہیں اور بحالیِ امن کی کوششوں میں حصّہ لیں۔

کشمیر کے تشدّد پسند اپنی متشدّدانہ سرگرمیوں کے لیے مذہب کی آڑ لے رہے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ دُنیا کا کوئی مذہب تشدّد کی تعلیم نہیں دیتا نہ بے گناہوں کے خون کو روا ٹھہراتا ہے۔ جو لوگ مذہب کے نام پر یہ فتنہ و فساد برپا کر رہے ہیں، ان کی غفلت پر افسوس ہوتا ہے۔ خدا کے نام لیواؤں کو خلقِ خدا کو عافیت سے محروم کر کے کیا سکون مل سکتا ہے، یہ ہماری سمجھ سے باہر ہے۔

جشنِ جمہوریت کے مبارک موقعے پر ہم سب کو صمیمِ قلب سے یہ عہد کرنا چاہیے کہ ہم اپنے روز و شب کو جمہوریت کے سانچے میں ڈھالیں اور ایک عظیم جمہوریت کے امن پسند شہری بنیں۔

حسبِ اعلان اس شمارے سے "ایوانِ اُردو" کی قیمت میں معمولی اضافہ کیا جارہا ہے۔ اب ایک شمارے کی قیمت چار روپے اور زرِ سالانہ چالیس روپے ہوگا۔ اُمید ہے ہمارے قارئین اس معمولی سے اضافے کو بخوشی قبول کر کے ہمیں شکریے کا موقع دیں گے۔

——— سیّد شریف الحسن نقوی



دہلی کے نئے لیفٹننٹ گورنر اور اُردو اکادمی کے نئے چیئرمین

رٹائرڈ ایئر چیف مارشل

ارجن سنگھ

آپ کی ولادت لائل پور میں ہوئی جو اب پاکستان کا حصّہ ہے۔ آپ ہندوستانی فضائیہ سے جولائی ۱۹۶۹ میں چیف آف دی ایئر اسٹاف کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

آپ کا تعلیمی ریکارڈ شاندار رہا ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم لائل پور ہی میں حاصل کی، پھر اعلیٰ تعلیم کے ۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ کالج کی تعلیم کے زمانے میں آپ کھیل کود کے مقابلوں میں بھی حصّہ لیتے رہے اور تیر اور کھیل کے کچھ دوسرے شعبوں میں آپ نے متعدد تمغے حاصل کیے اور ریاستی سطح پر بہت سے ریکارڈ توڑے

اُن دنوں ملک میں فضائی تربیت کی ضروری سہولتیں موجود نہ ہونے کی وجہ سے آپ نے اس مقصد کے لیے انگل جانے کا فیصلہ کیا جہاں آپ نے رایل ایئر فورس کالج کران ویل میں فضائی تربیت حاصل کی۔ دورانِ تربیت آپ تیراکی اینتھیلیٹک ٹیموں کے وائس پریسیڈنٹ رہے۔ کران ویل کالج ہی سے آپ کو ہندوستانی فضائیہ میں داخلہ دے دیا گیا۔

ستمبر ۱۹۴۰ء میں دوسری جنگ عظیم چھڑ جانے پر آپ کو رایل انڈین ایئر فورس میں اعلیٰ عہدے پر فائز کیا گیا آپ ایک نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ وطن واپس تشریف لے آئے۔ دورانِ جنگ جاپانی محاذ پر آپ بڑی جاں سے لڑے۔ ۱۹۴۴ء تک آپ کو تین بار ترقی دی گئی اور اسکواڈرن لیڈر بنا دیا گیا۔ آپ کی خدمات کا اعتراف کر ہوئے حکومت نے آپ کو فلائنگ کراس (ڈی۔ ایف۔ سی۔) کے اعلیٰ امتیاز سے سرفراز کیا۔ آزادیِ ہند کے بعد ہندوس فضائیہ میں آپ نے بڑی تیزی سے ترقی کے مدارج طے کیے۔ ۱۹۶۴ء میں آپ کو چیف آف دی ایئر اسٹاف بنا د جانے کے ساتھ ساتھ ایئر مارشل کے خطاب سے بھی نوازا گیا۔ اس کے ایک ہی سال بعد پاکستان کے ساتھ جنگ چھڑ گ اس موقع پر ہندوستانی فضائی فوج نے نمایاں کارکردگی دکھائی اور جنگ کے بعد ایئر چیف کی حیثیت سے آپ دوسرے سب سے بڑے قومی اعزاز پدم وبھوشن سے مفتخر کیا گیا۔ ۱۹۶۶ء میں آپ کو ترقی دے کر ایئر چیف مارش بنا دیا گیا۔ آپ پہلے ہندوستانی ہیں جو اس عہدے پر فائز ہوئے۔

رٹائرمنٹ کے دو سال بعد ۱۹۷۱ء میں آپ کو سوئزرلینڈ میں سفیر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۷۴ء میں آپ نے کینیا ہائی کمشنر کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ ۱۹۷۷ء میں آپ کا تقرر اقلیتی کمیشن میں کر دیا گیا۔ چار سال بعد آپ اس عہدے سبک دوش ہوئے اور انسانی حقوق کے تحفظ اور دیگر سماجی کاموں میں مصروف ہو گئے۔

۱۴ دسمبر ۱۹۸۹ء کو آپ نے دہلی کے لیفٹننٹ گورنر کی حیثیت سے حلف لیا۔

(ڈاکٹر) جمیل جالبی

میراجی —— ایک مطالعہ

فیض احمد فیض اُردو زبان کے وہ شاعر تھے جن کے حوالے سے یہ زبان اور اس کی شاعری اُن انجان بستیوں میں بھی پہچانی گئی جہاں ہمارے دوسرے شاعر اور ادیبوں کے نام اور کام کا گزر تک نہ ہوا۔ فیض نے شاعری میں ایک ایسی منفرد آواز کو جنم دیا جو دُور سے پہچانی جاتی تھی اور اس آواز میں پھیلی ہوئی دنیا کے عوام کا کرب شامل کر کے اُسے سب کے دلوں کی دھڑکنوں میں جذب کر دیا۔ فیض احمد فیض، میراجی اور ن۔م۔ راشد کے ہم عصر بلکہ ہم عمر تھے۔ ن۔م۔ راشد ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ فیض ۱۹۱۱ء میں اور میراجی ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے نہ صرف اپنے دور کے اثرات کو قبول کیا بلکہ اُردو میں نئی شاعری کی طرح ڈالی۔ یہ تینوں شعرا، تین الگ الگ رنگوں کے علمبردار ہیں اور یہ تینوں رنگ مل کر اُردو شاعری کو ایک نیا تناظر فراہم کرتے ہیں۔ ایک بڑے معاصر فیض احمد فیض نے، اپنے دوسرے بڑے معاصر میراجی کے بارے میں لکھا تھا کہ:

"اُن کی نثر کی ماہیت اور فضا اُن کی نظم سے قطعی مختلف ہے۔ میراجی کے ذہن کا جو عکس ان کی نثر میں ملتا ہے بعض اعتبار سے ان کی شاعرانہ شخصیت کی قریب قریب مکمل نفی کرتا ہے ۔ ۔ ۔ ان کی تخلیق کا یہ حصہ تمام تر اسی پاسبانِ عقل کی رہنمائی میں لکھا گیا ہے جسے وہ بظاہر عملِ شعر کے قریب نہیں پھٹکنے دیتے۔"[1]

یہی میراجی، جن کی وفات کا انتالیسواں (۳۹) اور ولادت کا ستترواں (۷۷) سال ہے، آج کے "فیض میموریل لیکچر" کا موضوع ہیں۔

میراجی، جن کا اصل نام محمد ثناء اللہ ثانی ڈار تھا، منشی محمد مہتاب الدین کے ہاں ۲۵ مئی ۱۹۱۲ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ پہلے "ساحری" تخلص کرتے تھے لیکن ایک بنگالی لڑکی میرا سین کے یک طرفہ عشق میں گرفتار ہو کر، جیسا کہ شیخ سعدی نے گلستاں کے باب پنجم میں لکھا ہے کہ در عہدِ جوانی چناں کہ اُفتد دانی، میراجی تخلص اختیار کر لیا اور آج ہم انھیں اسی نام سے پہچانتے ہیں۔ میراجی کی ذات سے ایسے ایسے واقعات وابستہ ہیں کہ ان کی ذات عام آدمی کے لیے ایک افسانہ بن کر رہ گئی ہے۔ اُن کا حُلیہ اور اُن کی حرکات و سکنات ایسی تھیں کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے سلسلۂ ملامتیہ میں بیعت کر لی ہے۔ "لمبے لمبے بال، بڑی بڑی مونچھیں، گلے میں ایک سو ایک موٹے دانوں کی دو گز لمبی مالا، شیروانی جس کی کہنیاں ہمیشہ پھٹی ہوئی ہوتی تھیں، اُوپر نیچے بیک وقت تین پتلونیں، اوپر کی جب میلی ہو گئی تو نیچے کی اُوپر اور اُوپر کی نیچے بدل جاتی۔ شیروانی کی دونوں جیبوں میں بہت کچھ ہوتا تھا۔ کچھ دھلے ہوئے چیتھڑے، ایک پائپ، کاغذ میں پائپ کا دیسی تمباکو، پان کی ڈبیا، ہومیو پیتھک دوائیں ۔ ۔ ۔ کاغذوں اور بیاضوں کا پلندہ بغل میں دابے بڑی سڑک پر پھرتا تھا اور چلتے ہوئے ہمیشہ ناک کی سیدھ دیکھتا تھا۔ تاک جھانک کو وہ کفر خیال کرتا تھا۔ بازار میں کسی سے مذاق نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے گھر، اپنے محلے اور اپنی سوسائٹی کے ماحول کو دیکھ دیکھ کر کُڑھتا تھا ۔ ۔ ۔ اس نے عہد کر رکھا تھا کہ وہ اپنے لیے شعر کہے گا۔"[2]

سعادت حسن منٹو نے لکھا ہے کہ میراجی "تین گولے تھا جن کو لڑھکانے کے لیے اس کو کسی خارجی مدد کی ضرورت نہیں پڑتی تھی ۔ ۔ ۔ ان خارجی اشاروں نے ہی اس پر ایک ازلی اور ابدی حقیقت کو منکشف کیا تھا —— حسن، عشق اور موت۔ اس تثلیث کے تمام اُقلیدسی زاویے صرف ان تین گولوں کی بدولت اس کی سمجھ میں آئے تھے، لیکن حسن و عشق کے انجام کو چونکہ اس نے شکست خوردہ عینک سے دیکھا تھا جس کے شیشوں پر پردے پڑے تھے ۔ ۔ ۔ اس کے سارے وجود میں ایک ناقابلِ بیان ابہام کا زہر پھیل گیا تھا جو ایک نقطے سے شروع ہو کر ایک دائرے میں تبدیل ہو گیا تھا اس طور پر کہ ہر نقطہ اس کا نقطۂ آغاز ہے اور وہی نقطہ انجام۔ حسن، عشق اور موت —— یہ تکون یہ یک کہ میراجی کے وجود میں گول ہو گئی تھی۔"[3] ایک دفعہ میراجی کے ہاتھ میں تین گولے

صدر مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد (پاکستان)

کے بجائے دو گولے دیکھ کر منٹو نے پوچھا کہ تیسرا گولا کیا ہوا، تو میراجی نے جواب دیا "برخوردار کا انتقال ہو گیا ہے مگر اپنے وقت پر ایک اور ہو جائے گا۔"

الطاف گوہر نے پہلی ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ایک دن مختار صدیقی کے ہمراہ وہ میراجی کے گھر گئے۔ مختار صدیقی نے کھڑکی کے قریب جاکر آواز دی "میرا جی صاحب" اندر سے آواز آئی "آئیے" ہم اندر گئے۔ متوسط گھر کا کمرہ معلوم ہوتا تھا۔ ہوا کے جھونکے سے گلی کی بُو کمرے میں آگئی۔ میراجی نے کہا "بُو آرہی ہے۔ ابھی ٹھیک کیے دیتا ہوں۔" اور یہ کہہ کر انھوں نے یکے بعد دیگرے پانچ سات بیڑیاں سُلگائیں اور دو دو چار چار کش لگا کر کمرے میں اِدھر اُدھر پھینک دیں۔" ایک اور جگہ لکھا ہے کہ "پونا میں ایک مشاعرہ ہو رہا تھا۔ بڑے عظیم الشان پیمانے پر۔ جوش، جگر، فراق سبھی تھے۔ میراجی آئے اور حاضرین کی طرف پیٹھ کر کے پڑھنے لگے: "نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا۔"

یہ اور اسی قسم کے بے شمار واقعات آپ کو ان تحریروں میں ملیں گے جو ان کے دوست احباب نے میراجی کے بارے میں لکھی ہیں۔ یہ سب واقعات انتہائی دلچسپ ہیں۔ آپ بھی اس سے یقیناً لطف اندوز ہوئے ہوں گے۔ لیکن ان واقعات نے ایک طرف میراجی کو افسانہ بنا دیا اور دوسری طرف شاعری کی طرف سے توجہ ہٹا کر اس کا رُخ ان کی ذاتی طرف کر دیا۔ حالانکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ میراجی کی تخلیق سے میراجی کی طرف سفر کیا جاتا اور پھر اسی کے ساتھ فوراً سفرِ واپسی یعنی میراجی سے پھر تخلیق کی طرف۔ یہ یہاں عمل الٹا ہوا ہے۔ میراجی نے اپنی مشہور تصنیف "اس نظم میں" کے دیباچے میں خود لکھا ہے کہ "شاعر کے نام کی طرف نہیں بلکہ کام کی طرف دیکھا جائے۔" لیکن اب اُن کے حلیے، ان کے گولوں، ان کی بغیر جیب کی پتلون، اُن کی لٹوں، اُن کی مالا، ان کی شراب نوشی اور عجیب و غریب حرکات کو چھوڑ کر ان کے کام کی طرف دیکھتے ہیں۔ ان واقعات کو سُن کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ساری عمر یہی ڈھونگ رچائے رہے اور شاید انھوں نے تخلیقی سطح پر کوئی خاص کام نہیں کیا۔ اس تصویر سے ایک غیر ذمے دار اور مجنوں انسان کی تصویر ضرور اُبھرتی ہے، جو میراجی یقیناً نہیں تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے چراغ کی بتی کو دونوں سروں سے یقیناً جلایا اور صرف ½۳۷ سال کی عمر میں ۳ نومبر ۱۹۴۹ء کو مر گئے۔ اس مختصر سی عمر میں میراجی نے اتنا لکھا کہ آج صرف ان کی کلیاتِ شاعری ہی ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اور حال ہی میں اردو مرکز لندن سے شائع ہوئی ہے۔ ان کی تصانیف میں جہاں مشرق و مغرب کے نغمے (۱۹۵۸ء)، اس نظم میں (۱۹۴۴ء)، نگار خانہ (۱۹۵۰ء) خیمے کے آس پاس (۱۹۶۴ء) شامل ہیں، وہاں میراجی کے گیت (۱۹۴۳ء) میراجی کی نظمیں (۱۹۴۴ء) گیت ہی گیت (۱۹۴۴ء) پابند نظمیں (۱۹۶۸ء) اور تین رنگ (۱۹۶۸ء) شاعری کے وہ مجموعے ہیں جنھوں نے اردو شاعری کو نئے امکانات سے روشناس کرایا اور اسے اس راستے پر ڈال دیا جس پر وہ آج بھی گامزن ہے۔ ان کے علاوہ انھوں نے نثر میں بھی اتنا لکھا ہے کہ اگر اسے یکجا کر دیا جائے تو ایک ضخیم کتاب وجود میں آئے گی۔ شاعری کی طرح ان کی نثر کو بھی یکجا و مرتب کر کے شائع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ میراجی کی پوری تخلیقی شخصیت سامنے آجائے اور نئی نسل کو معلوم ہو سکے کہ میراجی نے جدید ادب کو کن نئے امکانات سے روشناس کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ اتنا نیا اور پُر از امکانات کام ہے کہ بعض لوگوں نے طویل عمر پاکر اور باقاعدہ زندگی گزار کر بھی انجام نہیں دیا ـــــ میراجی از سرتا پا تخلیق تھے۔

اس سوال نے مجھے اکثر پریشان کیا ہے کہ آخر اس ساری تخلیقی سنجیدگی اور گہرے تخلیقی انہماک کے باوجود انھوں نے یہ حُلیہ کیوں بنایا اور ساری عمر اپنی زندگی اس طرح سے کیوں گزاری۔ غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اُس دور میں جب وہ ادب کی دنیا میں کچھ کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے اور اپنے اور دوسری زبانوں کے شعرا کے کلام اور حالات کا گہرا مطالعہ کر رہے تھے، انھوں نے اپنے تخلیقی کرب و اضطراب کے پیشِ نظر یہ سوچا کہ اگر وہ بھی یہی کریں جو کہ دوسرے عظیم شعرا نے کیا ہے تو لوگ نہ صرف اُن کی طرف متوجہ ہوں گے۔ بلکہ ان کی شہرت تیزی سے چاروں طرف پھیل جائے گی۔ اس وقت میراجی کی عمر ۲۲۔۲۳ سال تھی اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں یہ عمر خواب دیکھنے کی عمر ہوتی ہے۔ اس زمانے میں چنڈی داس ان کا محبوب شاعر تھا۔ چنڈی داس نے رامی دھوبن سے عشق کیا۔ میراجی نے میراسین کے عشق کا افسانہ بنا دیا۔ بودلیئر دوستوں کو دشمن بنانے میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ میراجی بھی اس سے کم نہیں تھے۔ یہ مشرق و مغرب کے

ہے“ میں میراجی نے بودلیئر کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے کئی نظمیں اپنی ہی ذات کے لیے لکھی ہیں [۲۷] میراجی نے بھی ابتدائی دور کی شاعری اپنی ذات کے لیے کی۔ بودلیئر کے بارے میں میراجی نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ لاشعور کا شاعر تھا۔ وہ نئے احساسات، نئے لہجے، نئے اندازِ بیان اور نئی زبان کا شاعر تھا۔ یہی کام میراجی نے بھی کیا۔

بودلیئر نے سماج کے خلاف احتجاج کرنے کا یہ طریقہ نکالا کہ اپنا سر مُنڈا کر، اس پر ہرا رنگ بھروا دیا اور احتجاج کی عبارت سر پر لکھ کر اور ایک کیکڑے کو دھاگے میں باندھ کر پیرس کے ایک ریستوراں کے باہر کھڑا ہوگیا اور کیکڑے سے مخاطب ہوکر احتجاج کرتا رہا۔ میراجی نے بھی ایک بار اسی قسم کی وضع اختیار کی۔ اخلاق احمد دہلوی نے لکھا ہے کہ ”میراجی نے دلی میں جب ایک مرتبہ نیا سال آنے پر احباب کے اصرار پر نیا سوٹ پہنا اور اپنا وہ چارلی چیپلن والا جوتا بھی بدل ڈالا اور کلارک گیبل کی وضع کی مونچھیں بھی حذف کرا دیں تو ان سب کو بھی حیرت ہوئی جن کے اصرار پر وہ سوٹڈ بوٹڈ بنے تھے اور سب نے سمجھا کہ نیا سال میراجی کے نئے لباس سے شروع ہو رہا ہے۔ لیکن جب پوری طرح ٹیپ ٹاپ ہوکر انھوں نے سر پر اُسترا پھروا دیا اور چاند سے سر پر ہیپی نیو ایئر پینٹ کرایا اور وہ مالائیں جو قمیص کے اندر رہتی تھیں باہر کوٹ کے کالر پر پہن لیں تو ان کے مقربین کو کہنا پڑا کہ کوئی لباس میراجی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا“[۲۸]

بودلیئر نے اپنی ماں کو لکھا ”کبھی کبھی مجھے تین تین دن بستر پر لیٹے رہنا پڑتا ہے کیونکہ میرے پاس دُھلے ہوئے کپڑے پہننے کو نہیں ہوتے یا کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ سچ پوچھو تو شراب اور افیون کا ست دُکھ کا بدترین دارُو ہے۔ پچھلی دفعہ جب آپ نے مجھے مہربانی سے ۵ فرینک بھیجے تھے تو میں نے دو روز سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ دو روز یعنی ۴۸ گھنٹے“[۲۹]

میراجی اپنے دوست عبداللطیف کو ایک خط میں لکھتے ہیں ”رات کو روز دفتر میں سوتا تھا یعنی ریہرسل روم میں۔ آج اس کی چابی وقار صاحب کی جیب میں ان کے ساتھ چلی گئی جب سے آپ گئے ہیں صبح کا ناشتہ اور رات کا کھانا مختار اپنے حساب میں ہوٹل سے کھلوا دیتا ہے۔ دوپہر کا کھانا وشوا نندن اپنے گھر سے لا دیتا ہے۔ مانگ کر کھاتا ہوں اور قرض کی شراب پیتا ہوں“[۳۰] ایک اور خط میں لکھا ہے۔ ”تین دن بھوکا رہنے سے طبیعت صاف ہوگئی“[۳۱] بودلیئر ساری عمر قرض خواہوں سے جان نہ چھڑا سکا۔ میراجی بھی ساری عمر قرض لیتے رہے۔ ان میں پٹھان بھی شامل تھے جو انھیں ساری عمر ڈھونڈھتے رہے۔ ایڈگر ایلن پو کے بارے میں میراجی نے لکھا ہے کہ ”کوئی اسے شرابی کہتا ہے۔ کوئی اعصابی مریض۔ کوئی اذیت پرست اور کوئی جنسی لحاظ سے ناکارہ ثابت کرتا ہے اور ان رنگا رنگ خیال آرائیوں کی وجہ سے اصلیت پر ایسے پردے پڑ گئے ہیں کہ اٹھائے نہیں بنتا ہے“[۳۲] اس وقت جب میراجی نے یہ الفاظ لکھے تو میراجی ایک نارمل سے انسان تھے۔ لیکن جب ان تصورات کو انھوں نے اپنا کر زندگی کے روپ کو بہروپ بنایا تو آج ہم بھی ان کے بارے میں یہی کہہ رہے ہیں جو انھوں نے ۲۲۔۲۳ سال کی عمر میں ایڈگر ایلن پو کے بارے میں کہا تھا کہ ”ایڈگر ایلن پو مر چکا ہے . . . . شاعر مذکور اپنی ذات اور شہرت کے لحاظ سے تمام ملک میں پہچانا جاتا تھا لیکن کہیں بھی اس کا کوئی دوست نہ تھا“[۳۳] اب ملاحظہ فرمائیے کہ جب میراجی کا انتقال ہوا تو اخترالایمان نے بتایا کہ ان کے جنازے میں گنتی کے چار آدمی تھے۔ اخترالایمان، مہندر ناتھ، مدھوسودن اور ان کے ہم زلف سدن۔

پو کی بیوی کے بارے میں میراجی نے لکھا ہے کہ ”اس کی بیوی ایک ایسا سایہ بن جاتی تھی جسے حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہو“[۳۴] سایہ میراجی کی شاعری میں اسی نوع کی علامت بن کر بار بار آیا ہے۔ میراجی نے لکھا ہے کہ ”ایڈگر ایلن پو عورت کے بجائے عورت کے تصور کی پوجا کرتا تھا“[۳۵] میراجی کی شاعری کے بارے میں نقادوں نے لکھا ہے کہ ”میراجی کو تصور سے پیار ہے۔ تصور میراجی کا آدرش ہے۔ منظر بھی منظر بن کر نہیں تصور بن کر شاعری میں آتا ہے“[۳۶]

”ہاں تصور کو میں اپنے بنا کر دولہا
اسی پردے کے نہاں خانے میں لے جاؤں گا
بند ہوتا ہوا کھلتا ہوا دروازہ ہے
ہاں یہی منظرِ لبریزِ بلاغت اب تو
آئینہ خانے میں آنکھوں کے جھلکتا ہے مدام“[۳۷]

یہ سب حوالے میں نے اس لیے دیے تاکہ یہ بات آپ کے ذہن نشین کرا سکوں کہ میراجی کے تخلیقی ذہن کی تشکیل کے دور میں انھوں نے اپنے پسندیدہ اور بڑے شعرا کی وہ حرکات و سکنات، جو انھیں اچھی لگیں، اختیار کر لیں اور اپنی ذات میں جمع کیا اور اس جمع آوری سے اپنے خارجی وجود کو آباد کر لیا۔ بودلیئر ——

ایڈگرایلن پو، ہائنے، لارنس، میلارمے اور چنڈی داس وغیرہ سے ثناءاللہ ثانی ڈار نے میراجی کو تخلیق کیا اور پھر ساری عمر اپنے تخلیق کیے ہوئے میراجی کے روپ بہروپ میں وہ ایسی زندگی بسر کرتے رہے جیسی کہ انھوں نے کی۔ ان کی زندگی کے متضاد پہلوؤں کا ایک ایک ثبوت "مشرق و مغرب کے نغمے" سے ملتا ہے۔ اسی لیے میراجی کے مطالعے کے لیے ان کی یہ کتاب بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔

میراجی کی پیدائش (۱۹۱۲ء) اور وفات (۱۹۴۹ء) کے درمیان دنیا دو عالمگیر جنگوں کا شکار ہوئی جس کے نتیجے میں سارا معاشرتی، فکری و معاشی نظام درہم برہم ہو گیا اور سارا روایتی اخلاقی نظام، سماجی اقدار اور انسانی رشتے ٹوٹ پھوٹ کر بے ربط و بے معنی ہو گئے۔ مغلوب قومیں آزادی کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام آنکھوں میں کھٹکنے لگا۔ قدیم و جدید کی حدیں نمایاں ہونے لگیں۔ روایتی و قدیم اقدار سے بغاوت ایک عام رجحان بن گیا۔ مارکس، فرائڈ اور آئن سٹائن کے نظریات نے نئے معاشی، انسانی، ذہنی اور سائنسی علوم کے امکانات وا کر دیے۔ برصغیر بھی اس بدلے ہوئے تناظر سے متاثر ہوا۔ اور یہاں بھی صورتِ حال تیزی سے بدلنے لگی۔ افلاس، مایوسی، بے روزگاری اور بے یقینی نے نوجوان نسل کو گھیر لیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے مستقبل گم ہو گیا ہے۔ میراجی بھی اسی نوجوان نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ بے یقینی، بے روزگاری، اور بے معنی رسمی اخلاقیات سے برگشتگی ان کے لیے ایک زندہ حقیقت بھی تھی اور احساس کا حصہ بھی۔ میراجی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ دیکھا اور جو کچھ محسوس کیا اسے اپنے لفظوں اور روپ بہروپ سے دوسروں کو دکھا بھی دیا۔ میراجی نے لکھا:

"مستقبل سے میرا تعلق بے نام سا ہے۔ میں صرف دو زمانوں کا انسان ہوں۔ ماضی اور حال ـــــ یہی دو دائرے مجھے ہر وقت گھیرے رہتے ہیں اور میری علمی زندگی بھی انہی کی پابند ہے[۱۴]"

اگر اس زاویے سے میراجی کے فکر و عمل کو دیکھیے تو وہ بامعنی نظر آتے ہیں۔ بغیر مستقبل کے زندگی گزارنے والا نوجوان اس معاشرے میں اسی انداز سے اور اسی طرح زندگی گزار سکتا تھا۔ میراجی کا خارجی رُوپ ان کے داخلی وجود کا نتیجہ تھا اور اس طرح میراجی اس معاشرے کے عام نوجوان کی روح کا زندہ اور جیتا جاگتا پیکر تھے۔ انھوں نے نہ صرف لفظوں سے بلکہ اپنے خوابوں کے ساتھ اپنی زندگی کو جس سانچے میں ڈھالا وہ بے مستقبل نوجوان کی ترجمان تھی۔ کیا ہم اسے بغاوت نہیں کہیں گے؟ کیا کوئی نوجوان اپنی روح کے اظہار کے لیے رسمی اخلاقیات میں گھرے ہونے کے باوجود یہ صورت اختیار کرنے کی جرأت کر سکتا ہے جس کا اظہار میراجی نے کیا۔ ذرا میراجی کے حلیے کو، ان کے انوکھے روپ بہروپ کو اس نقطۂ نظر سے بھی دیکھیے تو آپ کو ان کے خارجی و داخلی وجود کے اظہار میں گہری معنویت نظر آئے گی۔ اسی لیے میراجی نے اپنے دوست عبداللطیف کو ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۶ء کے ایک خط میں لکھا:

"میں دلّی چھوڑ کر بمبئی کے گرد و نواح میں ہوں۔ پہلے دفتر کی میزوں پر سوتا تھا۔ اب فرش پر براجمان ہوں۔ ۔ ۔ ۔ خود کو کبھی معمولی اور کبھی پہنچا ہوا بڑا فقیر تصور کرتا ہوں اور دنیا شاید مجھے بھکاری سمجھتی ہے۔ سچ ہے سماج کے فرائض جس طرح دنیا انھیں سمجھتی ہے میں نے، جس طرح میں انھیں سمجھتا ہوں، پورے نہیں کیے۔ لیکن میں نے اپنی جسمانی زندگی سے زیادہ جس قدر ذہنی زندگی بسر کی ہے اس کا لحاظ کیسے ہو گا؟"[۱۵]

"ذہنی زندگی" کی بات کر کے اسی خط میں میراجی جو کچھ لکھتے ہیں اس سے سارے سماجی فکری نظام کے خلاف بغاوت کا پہلو واضح طور پر اُجاگر ہوتا ہے:

"افسوس یہ بھی ایک سوال ہے اور سوال بھکاری کی دوسری عادت کیا میں کبھی اس قابل نہ ہو سکوں گا کہ سوال کے بجائے اپنے آپ کو فیصلے کا اہل ثابت کر سکوں۔ ہر عزیز ترین چیز کے نام پر کہتا ہوں کہ یہ احساسِ کمتری نہیں، یہ وہی "جزئیات بینی" ہے جس نے میرے احساسات اور خیالات کو تو نفیس بنایا لیکن جو میرے واقعاتِ روزمرہ کو دنیا کی نظر میں نفیس نہ بنا سکے۔ ان دنوں، مہینوں بلکہ بعض دفعہ ایک ایک ڈیڑھ ڈیڑھ سال تک نہیں نہایا کرتا۔ دنیا کو یہ بات بُری معلوم ہوتی ہے اور میں اسے سمجھتا ہوں۔ میرے کپڑے اکثر میلے دکھائی دیتے ہیں۔ دُنیا بُرا مانتی ہے، میں جانتا ہوں۔ ۔ ۔ بعض دفعہ خالی پیٹ زیادہ شراب پینے سے صبح مجھے اپنا بستر خود گیلا محسوس ہوتا ہے تو میں اپنی زندگی کے اونچ نیچ کے ساتھ یہ بھی سوچ سکتا ہوں کہ اس حالت کے دیکھنے والے

چاہے میرے دوست یا خیر خواہ ہوں یا کوئی اور ان کی طبیعت منغض ہوگی . . . مگر یہ بات سوچنے کے باوجود اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اس تمام صورتِ حال، اس سماج، اس نظامِ حیات و کائنات کا مقصد کیا ہے؟ زلوہ تر لوگ مجھے خود غرض دکھائی دیتے ہیں۔"[21]

اس اقتباس سے دو پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ میراجی جو کچھ کر رہے تھے یا جو کچھ انھوں نے کیا وہ بے خبری میں نہیں بلکہ شعور کی سطح پر کیا ہے۔ بڑے سوال یعنی نظامِ حیات و کائنات کا مقصد کیا ہے؟ انھیں پریشان کر رہے تھے۔ اپنے معیارِ زندگی کو بلند کرنا ہرگز ان کا مسئلہ نہیں تھا وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ یہ نظام جس کے خلاف وہ احتجاج اور بغاوت کر رہے ہیں وہ نظام نہیں ہے کہ جہاں وہ سوال کے بجائے اپنے آپ فیصلہ کر سکتے ہیں۔ وہ زندگی کی بے معنویت کو ظاہر کر کے دنیا کو تبدیل کرنے کا احساس دلانا چاہتے تھے وہ اس شعور کو جو اُن کے اندر تھا معاشرے کا حصہ بنا دینا چاہتے تھے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن جسے روایت و معاشرے کے خلاف بغاوت کر کے میراجی نے جرأت کے ساتھ کر دکھایا ـــــــ فرزانوں کی اس دنیا میں دیوانوں کی بات سمجھنے کی بھی کوشش کرنی چاہیے۔ وہ اس دور میں نئی نسل کے جذبات و احساسات خیالات و حالات کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اس طور پر ترجمانی و نمائندگی کسی دوسرے ادیب، شاعر، دانشور نے نہیں کی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہ خود تو ساری عمر دُکھ بھوگتے رہے ذلیل و خوار ہوتے رہے۔ لوگوں کی نفرت کا نشانہ بنے رہے لیکن انھوں نے معاشرتی شعور پیدا کرنے میں وہ کام کیا کہ اس سطح پر شاید ہم کوئی دوسرا نام نہیں لے سکتے۔ نوجوان نسل ہی ان کی توجہ کا مرکز تھی۔

اس بات کی وضاحت کے لیے ایک چھوٹا سا اقتباس میراجی کے الفاظ میں اور سُن لیجیے:

"موجودہ صدی کی بین الاقوامی کشمکش (سیاسی، سماجی اور اقتصادی) نے جو انتشار نوجوانوں میں پیدا کر دیا ہے وہ بالخصوص میرا مرکزِ نظر رہا اور آگے چل کر جدید نفسیات نے اس تمام پریشان خیالی کو جنسی رنگ دے دیا . . . وشنو خیالات نے نہ صرف مذہبی لحاظ سے اپنا نقش چھوڑا بلکہ اس کی ادبی روایات بھی کچھ اس انداز سے بروئے کار آئیں کہ دل و دماغ ایک جیتا جاگتا برندا بن بن کر رہ گیا۔"[22]

اس اقتباس میں میراجی اپنے تخلیقی سفر کا راستہ بتا رہے ہیں۔ اس صدی کی بین الاقوامی کشمکش نے سیاسی، سماجی اور اقتصادی سطح پر نوجوانوں کو انتشار کا شکار کر دیا۔ یہ ان کا مرکزِ نظر ہے۔ جدید نفسیات نے اس پریشان خیالی کو جنس کا رنگ دے دیا اور اس رنگ سے میراجی نے جیتا جاگتا برندا بن آباد کر لیا۔ یہ ان کے نئے سفر کی پہلی منزل تھی جس پر چل کر وہ نئے طرزِ احساس، نئے انسان اور نئی شاعری کو جنم دینا چاہتے تھے:

رات اندھیری، بن ہے سونا کوئی نہیں ہے ساتھ
پَوَن جھکولے پیڑ ہلائیں، تھر تھر کانپیں پات
دل میں ڈر کا تیر چبھا ہے، سینے پر ہے ہاتھ
رہ رہ کر سوچوں یوں کیسے پوری ہوگی رات؟
بات کی گھڑیاں بیت نہ جائیں دور ہے اس کا دیس
دور دیس ہے پیتم کا اور میں بدلے ہوں بھیس[23]

بھیس بدل کر میراجی دور دیس کے سفر پر روانہ ہوئے تو انھوں نے غزل سمیت شاعری کی ان تمام اصناف کو ترک کر دیا جن سے معاشرہ مانوس تھا۔ بحور و اوزان کے سارے مروجہ نظام کو بھی توڑ دیا۔ (بحور و اوزان کے تعلق سے میراجی کی شاعری کے ایک الگ مطالعے کی ضرورت ہے۔) نئی ہیئیت اور شعری پیکر کا نظام انیسویں صدی کی جدید مغربی شاعری سے لیا اور آزادی کے اس احساس کے ساتھ حقیقت و احساس کو اپنی شاعری میں سمو دیا۔ گیت اور آزاد نظم، نئی نئی ہیئتوں کے ساتھ وہ نئی اصنافِ سخن تھیں جن سے میراجی نے اپنی نئی شاعری کا بندرابن آباد کیا۔ اس حقیقت و احساس میں جھوٹی اخلاقیات کو توڑنے کا جذبہ بھی شامل تھا اور جدید نفسیات سے زندگی میں جنسی پہلو کی بنیادی اہمیت کا شعور بھی شامل تھا۔ ہماری شاعری نے اس پہلو کو اب تک نظر انداز کر کے رسمی اخلاقیات کا ساتھ دیا تھا۔ میراجی نے اسے بھی توڑ دیا۔ اس نئے بندرابن سے لفظیات کی نئی دنیا آباد ہوئی۔ رموز و کنایات، تلمیحات و علامات بھی نئے آئے اور یہ سب چیزیں نئی ہیئت اور آزاد نظم کے چوکھٹے میں کھل اُٹھیں۔ اس سے طرز و اسلوب، زبان و بیان سب بدل گئے، نئی سچائیوں اور نئی حقیقتوں کے اظہار نے شعر کی گرفت کو مضبوط کر دیا۔ یہ یقیناً وہ شاعری نہیں تھی، اُردو شاعری کے قارئین جس کے عادی تھے۔ بودلیئر اور ملارمے سے ملاقات اور شعری پیکروں کے استعمال کا جو شعور میراجی نے حاصل کیا تھا اُسے نئی اُردو شاعری کے قالب میں ڈھال دیا۔

کیسے اپنے دل سے مٹاؤں برہ اگن کا روگ
کیسے سمجھاؤں پریم پہیلی کیسے کروں سنجوگ

اور انسان کی داخلی دنیا کی بے باک خواہشات اور ننگی، سچی، حقیقی تصویروں کو اپنی شاعری میں جرأتِ رندانہ کے ساتھ اُجاگر کر دیا۔ اسی کے ساتھ نئی نظم داخلی جذبات اور نفسیاتی حقیقتوں کا اظہار بن گئی۔ مغربی طرزِ احساس کا اپنے تہذیبی طرزِ احساس کے ساتھ تخلیقی سطح پر جو امتزاج میراجی نے کر دکھایا وہ اتنا مشکل اور بڑا کام تھا کہ یہ کام کسی اور سے نہیں ہوا۔ فیض نے یہ کام نہیں کیا۔ راشد نے بھی یہ کام نہیں کیا۔ ان کا تعلق غزل کی روایت سے کسی نہ کسی شکل میں باقی رہتا ہے اور "ماورا" کی شاعری میں تو اختر شیرانی اور اُردو غزل و شاعری کا عکس و اثر بہت نمایاں اور گہرا ہے۔ اسی امتزاج، نئی ہیئت، نئے شعورِ شاعری، نئے موضوعات، نئی علامات اور لفظیات نے میراجی کی شاعری میں ابہام کو جنم دیا۔ جب ہر چیز نئی ہو، جب دو طرزِ احساس تخلیقی سطح پر شیر و شکر ہو رہے ہوں، جب نئی ہیئت میں قدیم طرزِ احساس یا قدیم ہیئت میں نیا طرزِ احساس نمودار ہو رہا ہو تو ابہام ایک فطری عمل ہے۔ جب میراجی نے شاعری شروع کی تھی تو یہ ابہام بہت گہرا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے یہ عام شعور کا حصہ بنتا گیا ابہام کا رنگ بھی ہلکا پڑتا گیا اور آج جب ہم اس شاعری کو پڑھتے ہیں تو یہ زیادہ رواں صاف اور پُر اثر نظر آتی ہے۔ آج اس رنگ نے نئی نسلوں کی شاعری میں اُتر کر اپنی اجنبیت دُور کر دی ہے۔

اس ابہام کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ جنس ان کے اس پہلے سفر کی شاعری کا نمایاں پہلو ہے۔ میراجی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "میری نظموں کا نمایاں پہلو ان کی جنسی حیثیت ہے"[11]۔ جنس کے بارے میں یہ بات واضح رہے کہ جنس ابہام کے پردوں میں چھپ کر ہی جمالیاتی سطح کو چھو سکتی ہے۔ میراجی نے جب شاعری کا آغاز کیا تو اس وقت جنس کی بات کرنا مروجہ اخلاقیات کی سطح پر ایک ناپسندیدہ فعل تھا۔ اُردو شاعری میں محبوب اس لیے بھی مذکر تھا کہ پردہ نشین محبوب کے پردے کا پورا خیال رکھا جائے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اردو شاعری کا محبوب کہاروں کے کاندھوں پر ڈولی میں سفر کرتا تھا۔ اسی زمانے میں اختر شیرانی کی شاعری بھی شہرت کے بام پر چڑھ گئی لیکن غور سے دیکھیے تو اختر شیرانی کے ہاں بھی محبوب کا صرف نام ہی لیا گیا تھا۔ جنس اس کا موضوع ہی نہیں تھا۔ میراجی نے نہ صرف عورت کو بلکہ جنس کو اُردو شاعری میں داخل کیا اور ہمارے شعور کا حصہ بنا دیا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ:

"جنسی فعل اور اس کے متعلقات کو میں قدرت کی بڑی نعمت سمجھتا ہوں اور جنس کے گرد جو آلودگی تہذیب و تمدن نے جمع کر رکھی ہے وہ مجھے ناگوار گزرتی ہے اس لیے ردِعمل کے طور پر میں دنیا کی ہر بات کو جنس کے اس تصور کے آئینے میں دیکھتا ہوں جو فطرت کے عین مطابق ہے اور ______ جو میرا آدرش ہے"[12]

یہاں دو لفظ "ردِعمل" اور "آدرش" قابلِ توجہ ہیں۔ ردِعمل سماج اور اس کی اقدار کے خلاف اور پھر علمِ بغاوت بلند کر کے اس اظہار کو اپنا آدرش بنانا۔ اس سفر میں میراجی نے ہندی روایت کی طرف رجوع کیا جہاں اظہارِ عشق عورت کرتی ہے۔ جہاں ایک طرف کرشن مراری اور گوپیوں کی جمالیاتی و جنسی روایت موجود تھی اور ساتھ ساتھ بارہ ماسہ کی روایت بھی موجود تھی۔ جہاں موسموں کے تعلق سے فضا جنسی اضطراب اور تقاضوں کا اظہار کر کے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ سفر اور یہ موضوع زندگی وسیع داخلی رشتوں کے حوالے سے ایک سفر تھا۔ میراجی جب اس راستے پر چلے تو ایک طرف اختر شیرانی کی شاعری فضا میں تحلیل گئی۔ اور جنس میراجی کی انفرادیت بن کر ان شاعرانہ شہرت کا نشان بن گئی۔ اسی لیے م نے علامات، تلمیحات و کنایات ہندوی روا سے لے کر اسے اُردو شاعری کی روایت میں کر دیا اور جنس کو ابہام کے لطیف پردوں چھپا کر ایسی شاعری کی جیسی کہ وہ ہے۔ یہ و زمانہ ہے جب انگارے شائع ہوا جس م جنس کو موضوع بنایا گیا تھا اور معاشرے نثر میں یہ بے باکی و "گستاخی" دیکھ کر ا ضبط کر لیا تھا۔ ابہام کے پردوں میں چھپی ہو میراجی کی شاعری کو ضبط کرنا ممکن نہیں تھا۔ پس منظر میں دیکھیے تو میراجی کی شاعری کے مع سمجھ میں آسکتے ہیں۔ راشد و فیض کی شاعری باقاعدہ سفر بھی اسی زمانے میں شروع ہو ہے۔ لیکن اس موضوع، نئی ہیئت اور از نظم کے شعوری و تخلیقی سطح پر استعمال کے پیش میراجی اور صرف میراجی ہیں۔ راشد و فیض اظہار و بیان میں اُردو و فارسی روایت سے استفادہ کر کے اپنا رشتہ اس سے قائم رکھتے ہ لیکن میراجی اس روایت سے بغاوت کر کے ردِعمل کے طور پر ہندی شاعری کی روایت سے ناتا جوڑ لیتے ہیں۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس، بودلیئر ایڈگر ایلن پو، ملارمے اور فرائڈ کی جدید نفسیا کو اُردو ادب کے مزاج و رنگ میں شامل کر دیتے ہیں۔ منٹو بھی اپنے مخصوص انداز میں

اپنے افسانوں مثلاً کالی شلوار، دھواں وغیرہ ۔ میں اس رجحان کی ترجمانی کرتے ہیں۔ عصمت چغتائی کا افسانہ لحاف، حسن عسکری کا افسانہ پھسلن بھی اپنے طور پر یہی کام کرتا ہے۔ لیکن میراجی کا کام ان سب سے بڑا تھا۔ اس سلسلے میں خاص طور پر آپ ان کی نظمیں؛ دُکھ دل کا دارو، سرگوشیاں، سنجوگ، سرسراہٹ، دور و نزدیک، ایک تصویر، تن آسانی، لبِ جوئبارے، سنگِ آستاں، اُفتاد، وغیرہ پڑھ لیجیے۔ روزن، کھڑکی، دروازے جنس ہی کے اشارے ہیں۔ میراجی نے اس شاعری سے اُردو شاعری کو نئے امکانات سے روشناس کرکے نئے امکانات کے دروازے کھول دیے۔ اسی لیے وہ آج بھی اہم شاعر ہے۔ اس سارے عمل میں انھوں نے اُردو شاعری کی روایت سے پورے طور پر ناتا نہیں توڑا بلکہ اسے بدل کر ایک نیا روپ دے دیا۔ روایت کے بدلنے کے عمل میں جب صورت و احساس بدلتے ہیں تو روایت سے دور ہونے یا اس کے ٹوٹنے کا احساس ضرور ہوتا ہے لیکن جب نیا احساس یا نئی ہیئت مروّج ہو جاتے ہیں تو پھر روایت کی کرنیں اس میں سے پھوٹنے لگتی ہیں اور وہ روایت ہی کا نیا روپ نظر آنے لگتی ہے۔ میراجی کے ہاں یہی ہوا ہے۔ آپ میراجی کی نظموں کو پڑھتے ہوئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ اُردو شاعری نہیں پڑھ رہے ہیں بلکہ یہ ضرور کہیں گے کہ یہ روایتی اردو شاعری سے مختلف شاعری ہے۔ میراجی نے قافیے کی پابندی بھی کی ہے اور اسے توڑا بھی ہے۔ نظمِ معرّیٰ کو بھی استعمال کیا ہے اور نظمِ آزاد کو بھی ہیئت کے بھی تجربے کیے ہیں اور اظہارِ احساس کے بھی۔ یہ وہ کام ہے جو آگے پیچھے کی دو یا دو سے زیادہ نسلیں کرتی ہیں۔ میراجی نے ایک مختصر سی زندگی میں یہ سارا کام خود کر دکھایا اور ۱۹۴۹ء میں جب وہ مرے تو نئی شاعری قبولِ عام ہو کر نئی نسل کا حصہ بن چکی تھی۔ ۱۹۴۴ء کے قریب ان کا پہلا سفر مکمل ہو چکا تھا۔ ان کا پہلا مجموعہ "میراجی کی نظمیں" جو اس سفر کی روداد سناتا ہے ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا تھا۔

اس سفر میں خود میراجی نے ویرانی اور تنہائی کے علاوہ کچھ نہ پایا۔ اس سفر کو پورا کرکے اب وہ "دوسرے سفر" کی تیاری میں لگ گئے۔ پہلے سفر میں اس سے زیادہ آگے جانے کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ میرے پاس ایک نقشہ ہے جس کی ایک نقل بیدار بخت صاحب نے اختر الایمان سے لے کر مجھے بھجوائی ہے۔ اس نقشے میں میراجی اپنے نئے مجموعے مرتب کرنے پر غور کرتے نظر آتے ہیں۔ اور ان مجموعوں میں وہ کلام شامل کرنا چاہتے ہیں جو ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء تک انھوں نے کہا تھا۔ اس نقشے میں وہ اپنی پہلی نظموں یعنی "میراجی کی نظمیں" پانچ خانوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ خانہ نمبر ا۔ جنسی، خانہ نمبر ۲۔ مبہم، خانہ نمبر تین۔ رومانی، خانہ نمبر چار۔ ذاتی، اور خانہ نمبر پانچ نام نہاد ترقی پسند۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس تقسیم میں جنسی نظمیں کم و بیش صرف بیس فیصد ہیں۔ "میراجی کی نظمیں" سے بعد کے کلام میں "جنس" پوری زندگی کی اکائی کا جزو لاینفک بن کر نارمل جذبہ بن جاتی ہے اور میراجی کا راستہ نہیں روکتی۔ اب وہ زندگی کو ایک نئے زاویے سے دیکھتے ہیں اور "عمل" کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں۔ عمل تغیّر کا منادی ہے۔ عمل سماج کو انجماد سے حرکت کی طرف لے جاتا ہے۔ بیتے دن رات بن کر میراجی کے سامنے آتے ہیں:

میلے کپڑے کی طرح ٹنگی ہوئی تصویریں
بیتے دن رات مرے سامنے لے آتی ہیں

بات کیا ہے کہ وہ جیون جس کو
مشعلیں اپنے اُجالے ہی سے دکھلاتی تھیں
دھیان کی لہر کے اک نرم جھکولے ہی سے جاگ اُٹھا ہے
رات چھائی تھی مگر
رات بھی دن کی طرح نور کو لے آئی ہے۔[۲۶]

میراجی کی نظم "اجنتا کے غار" نئی قوتِ عمل کا اظہار ہے۔ اسی نظم کے نام سے وہ اپنا نیا مجموعۂ کلام مرتب کرنا چاہتے تھے۔ اس مجموعے کا دیباچہ بھی انھوں نے لکھنا شروع کیا تھا۔ اب ویرانی چھٹ جاتی ہے اور اُمید کی نئی کرن جگمگانے لگتی ہے۔ نظم "ایک منظر" کی یہ چند سطریں دیکھیے۔ میراجی ہم سے کیا کہہ رہے ہیں:

"ابھی اچانک ایک پل میں ایک نوحہ ایک
نغمہ بن کے ایسے گونج اُٹھے گا کہ دل کہے گا" میں
بھی ہوں"
ابھی اچانک ایک پل میں اس پہاڑ ہی
کے پار موت کی گھٹا سمٹ کے جا چھپے گی اور
حیات کی دھنک بھی جگمگائے گی[۲۷]

ان کی ایک اور نظم جس کا عنوان ہی "ایک نظم" ہے اسی بات کا اظہار ہے کہ وہ اب سماج سے مل کر ایک ہونے کی گہری تخلیقی خواہش رکھتے ہیں:

ایک نظم

اے پیارے لوگو!

تم دُور کیوں ہو؟
کچھ پاس آؤ
آؤ کہ پل میں
یہ سب ستارے
تاریکیوں کے
اس پار ہوں گے
اے پیارے لوگو!
میں تم سے مل کر
بہتر بنوں گا
ایسے اکیلے
یوں روتے روتے
آنسو بہیں گے
اور کچھ نہ ہوگا
تم پاس آؤ
پھر دیکھ لیں گے
دنیا ہے کیا کچھ
اور دین کیا ہے
پھر جان لیں گے
ہر سانس کیسے
آنکھیں جھپکتے
اَن مِٹ بنا تھا

لیکن محبت
یہ کہہ رہی ہے
ہم دُور ہی دُور
اور دُور ہی دُور
چلتے رہیں گے۔[28]

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بند میں تذبذب موجود ہے۔ نظم "بہاؤ" میں میراجی زندگی کے اُتار چڑھاؤ اور نشیب و فراز کو پیش کرکے زندگی کی گمبھیرتا کو واضح کرتے ہیں۔ یہاں بھی قوتِ عمل اپنا اظہار اور موت پر زندگی کے غالب آنے کی خواہش کا اظہار کر رہی ہے:

گزرتی رہی زندگی جس طرح
گھسٹتے ہوئے رینگتے رینگتے
جب آئے تو کاش آئے موت اس طرح
گھسٹتے ہوئے رینگتے رینگتے

میں اک پل میں اس کا گلا گھونٹ کر
گھسٹتے ہوئے رینگتے رینگتے
بڑھوں گا اُسے چھوڑ کر پُشت پر
گھسٹتے ہوئے رینگتے رینگتے[29]

دریا سے مل کر ساگر بننے کی خواہش بھی اسی نئے احساس کا اظہار ہے جس کا اظہار نظم "پردہ" میں ہوا ہے:

پھر ساگر میں مل جاتے ہم
اور مل کر دُھوم مچاتے ہم
یہ گیت ہمیشہ گاتے ہم
"سب گیانی ہی انجان رہے"
لیکن کیا ہو
جب ایسا ہو
ہم اور دیس تم اور دیس[30]

"تنہائی" ایک دلچسپ نظم ہے جس میں وہ سکون سے ہنگامے کی طرف جانا چاہتے ہیں۔ سکون انجماد ہے اور ہنگامہ عملِ حیات ہے:

سکوں دور ہو جائے، ہنگامہ پیدا ہو، ہنگامہ شورِ مجسم بنے سامنے آئے، پل میں سکوں دور ہو جائے لیکن، مرے دل کے گہرے سکوں میں ہوا سر سرانے لگی ہے[31]

نظم "یگانگت" میں میراجی کے ہاں یہ احساس جاگتا ہے کہ جو شے اکیلی ہے اس کی منزل فنا ہی فنا ہے:

زمانہ ہوں میں، میرے ہی دم سے
اَن مٹ تسلسل کا جھولا رواں ہے،
مگر مجھ میں کوئی بُرائی نہیں ہے
یہ کیسے کہوں میں
کہ مجھ میں فنا اور بقا دونوں آ کر ملے
ہیں[32]

یہ میراجی کا سفرِ واپسی تھا جو ۱۹۴۴ء میں شروع ہوا اور ۱۹۴۸ء تک جاری ر[ہا] اور انھوں نے اپنی وضع کردہ نئی روایتِ شعری کو اُردو شاعری کی روایت کے ساتھ ملا دیا، لیکن اس تخلیقی سفر میں وہ نڈھال ہو چکے تھے۔ دُکھ بھوگتے بھوگتے۔ گھسٹتے گھسٹتے رینگتے رینگتے۔" اسپتال میں انھوں نے ایک نرس کی کلائی چبا ڈالی۔ جب میراجی کو سمجھانے کی کوشش کی گئی تو انھوں نے کہا کہ وہ ایسے علاج پسند نہیں کرتے جس سے ان کے "کومپلیکسیز" (COMPLEXES) ختم ہو جائیں اور جو کچھ لکھنا چاہتے ہیں وہ نہ لکھ سکیں۔"[33] تخلیق... تخلیق... یہی میراجی کا آدرش تھا۔ ساری عمر وہ اسی کے حصول میں لگے رہے اور اُردو شاعری کو نئی ہئیت، نئے موضوعات، نئے جذبے، نئے احساسات سے مالا مال اور اسے جدید دور میں داخل کر کے بمبئی کے ایک اسپتال میں مر گئے۔ راشد نے میراجی کی وفات کے تقریباً بیس سال بعد اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ میراجی اس زمانے کے سب سے قابلِ ذکر سب سے زیادہ جدت پرست، سب سے زیادہ زرخیز ذہن کے مالک اور سب سے منفرد شاعر تھے۔[34] میں نے آج کی گفتگو

میں اسی میراجی کو آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔
(فیض میموریل لیکچر اُردو مرکز لندن میں پڑھا گیا)

حوالے

۱۔ مشرق و مغرب کے نغمے، میراجی، اکادمی پنجاب (ٹرسٹ) لاہور... ۱۹۵۸ء، ص ۸۔
۲۔ " میراجی " خلیل صفائی، فنون لاہور، اکتوبر ۱۹۶۵ء، ص ۱۹۵ ۲۰۰
۳۔ "تین گولے" سعادت حسن منٹو، "گنجے فرشتے" مکتبہ جدید لاہور۔
۴۔ "میراجی ایک تصویر" الطاف گوہر "تحریریں چند"، اسلام آباد ۱۹۸۸ء ص۔ ۱۰۵۔
۵۔ میراجی کی شخصیت، ایضاً، ص ۱۱۴
۶۔ میراجی کو سمجھنے کے لیے، ڈاکٹر جمیل جالبی، تنقید اور تجربہ، مشتاق بک ڈپو، کراچی ۱۹۶۷ اور نیا دور کراچی شمارہ، ۴۱۔ ۴۲،
۷۔ دیباچہ " اس نظم میں"، میراجی، ساقی بک ڈپو، دہلی ۱۹۴۴، ص ۱۱
۸۔ مشرق و مغرب کے نغمے، میراجی، ص۔ ۱۶۲۔
۹۔ میراجی، اخلاق احمد دہلوی، پھر وہی بیاں اپنا، مکتبہ عالیہ، لاہور ۱۹۷۹ء ص ۱۷۵۔
۱۰۔ مشرق و مغرب کے نغمے، ص ۱۷۳
۱۱۔ " شعر و حکمت"، مرتبہ ڈاکٹر مغنی تبسم حیدرآباد دکن، ۱۹۸۸ء ص ۹۴۔۹۵۔
۱۲۔ ایضاً، ص۔ ۱۰۶۔
۱۳۔ ایضاً، ص۔ ۲۳۰۔
۱۴۔ ایضاً، ص۔ ۲۳۲۔
۱۵۔ "شعر و حکمت"، مرتبہ ڈاکٹر مغنی تبسم حیدرآباد دکن، ۱۹۸۸ء ص۔ ۲۴۰۔
۱۶۔ ایضاً، ص۔ ۲۴۱۔
۱۷۔ میراجی کو سمجھنے کے لیے، ڈاکٹر جمیل جالبی تنقید اور تجربہ، ص ۲۴۰۔
۱۸۔ کلیات میراجی، مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی، اُردو مرکز لندن ۱۹۸۸ء، ص۔ ۱۰۸۔
۱۹۔ میراجی کی نظمیں، میراجی، ساقی بکڈپو دہلی ۱۹۴۴ء، ص ۱۲
۲۰۔ شعر و حکمت، ص۔ ۱۰۲۔
۲۱۔ شعر و حکمت، ص۔ ۱۰۳
۲۲۔ میری بہترین نظم مرتبہ محمد حسن عسکری، ساقی بکڈپو۔ دہلی۔ ۱۹۴۴۔
۲۳۔ کلیات میراجی، ڈاکٹر جمیل جالبی، اُردو مرکز لندن۔ ۱۹۸۸ء، ص ۴۳۔ ۴۴۔
۲۴۔ میری بہترین نظم مرتبہ محمد حسن عسکری
۲۵۔ میراجی کی نظمیں، میراجی، ساقی بکڈپو، ۱۹۴۴ء، ص ۱۴۔۱۵
۲۶۔ کلیاتِ میراجی" "اجنتا کے غار" ص ۱۷۸ ـــ ۱۸۹
۲۷۔ ایضاً، ص۔ ۱۹۵ ـــ ۱۹۶
۲۸۔ ایضاً، ص۔ ۱۹۷ ـــ ۱۹۸
۲۹۔ ایضاً، ص۔ ۲۰۱ ـــ ۲۰۲
۳۰۔ ایضاً، ص۔ ۲۰۵ ـــ ۲۰۶
۳۱۔ ایضاً، ص۔ ۲۰۹ ـــ ۲۱۰
۳۲۔ ایضاً، ص۔ ۲۳۷ ـــ ۲۳۸
۳۳۔ میراجی کے ساتھ ایک شام، انٹرویو اختر الایمان مرتبہ تصدق سہاروی، مطبوعہ شب خون الہ آباد، دسمبر ۱۹۷۱ء، شمارہ ۶۷، ص ۵۷۔
۳۴۔ ایضاً، ص۔ ۵۵۔

نظمیں

میزبان ساحل

پُر سکون ساحل کے
چمکیلے پانی میں
لمبی لمبی ٹانگوں پہ کھڑے
آبی پرندے
چُھری کانٹے سے لیس
پانی میں تیرتی
مچھلیوں پہ نظر جمائے
سوچ رہے ہیں
ناشتے میں کیا لیا جائے!!

مقبرہ

اُونچی اُونچی محرابیں
بھاری بھاری دروازے
گول مول سے گنبد میں
آوازے ہی آوازے

شہر کا جادو

میلوں تک
ایک ہی پٹری پر
نہایت بے دِلی سے
دوڑتی ہوئی ٹرین
جب شہر میں داخل ہوئی
تو مستی میں آکر
پٹریاں بدلنے لگی
لہرا کے چلنے لگی!!

ایک نظم

سینکڑوں دریا پاٹے ہیں
لاکھوں جنگل کاٹے ہیں
پھر بھی میرے چاروں اور
وہی بھیانک سناٹے ہیں

محمد علوی

۹، سمیر سوسائٹی، سرخیج، احمد آباد (گجرات)

رام پال

تب اور اب

وقت پل پل چھن چھن کی مدد سے زندگی کا تانا بانا بنتا ہے۔

اس تانے بانے سے حالات جنم لیتے ہیں جن کا آدمی غلام ہے۔

مجھے بھی حالات کے تحت آخری عمر میں نقلِ مکانی کر کے زندگی کے باقی ماندہ سال بسر کرنے کے لیے دہلی آنا پڑا۔ اور سر چھپانے کو جگہ ملی بھی تو قطب مینار کے سائے تلے۔ تاکہ کبھی میں سر اٹھانے کی کوشش بھی کروں تو بلندی سے مرعوب ہو کے سر جھکا لوں۔ دہلی آنے سے پہلے دوست احباب نے خوب ڈرایا دھمکایا۔

"میاں دہلی بہت ظالم شہر ہے۔"

"وہ دیہات تھوڑا ہے۔ جہاں دس دس کلومیٹر کے دائرے میں لوگ تمھارے نام سے واقف ہوں۔"

"وہاں تو اُوپر کے فلیٹ والا اپنے نچلے فلیٹ میں رہنے والوں سے برسوں متعارف نہیں ہوتا۔"

"دہلی میں کسی کو کسی کے لیے فرصت کہاں! اس شہر میں لاکھوں میں رہ کے بھی ہر فرد تنہا ہے۔ بھاگ دوڑ، افراتفری، ہنگامہ آدمی اس انسانی صحرا کا ایک ناچیز ذرّہ۔"

"اور پھر دُنیا کا آٹھواں عجوبہ، دہلی کی بس سروس۔ اگر اس میں گھسنا ہو تو بیمہ کمپنی کے کاغذات۔"

اور ایک صاحب نے مشورہ دیا "بس کے لیے تین قمیص ساتھ لیں ایک چڑھتے ہیں پھٹ جائے گی۔ دوسری اُترتے وقت۔ اور تیسری پہن کے آپ اپنی منزلِ مقصد پہ تن ڈھانپے جائیں گے۔"

یہ بہت حد تک ٹھیک تھا۔ ذاتی تجربے نے باور کرا دیا کہ جو کچھ سنا نہ افسانہ تھا نہ خواب۔ ایک حقیقت تھی۔ یہاں اچھی صورت پر بری نظر ڈالنا ایک معمول تھا۔ دھوکا دہی تجارت مگر چند باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں، جو سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں۔ اب ایک ایسی جگہ بودو باش رکھنا۔ جہاں حضرت بختیار کاکیؒ کی مہسر ہو جسے اب مہرولی کہتے ہیں۔ یا جہاں کنس جیسے نردئی کی موت کی بھوشیہ بانی سنانے والی یوگ مایا کا مندر ہو اراوَلی کی اُونچی نیچی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں بسا ہوا یہ مقام جس کے چپّے چپّے پر صدیوں نے فتح و شکست کی داستانیں کندہ کی ہوئی ہوں۔ عبرت انگیز، حسرت خیز، دو تہذیبوں کے انضمام کا منظر۔ جسے یہ لوگ پھول والوں کی سیر کے نام سے معنون کرتے ہیں۔ آج سے تقریباً ایک صدی قبل منشی سورج نرائن مہر نے اپنی مشہور کتاب "چہل درویش" میں ایک سادھو کی زبانی اس میلے کی کہانی یوں بیان کی تھی:

"پھول والوں کی سیر دلّی والوں کا سب سے بڑا میلہ ہے، مہرولی جہاں یہ میلہ ہوتا ہے، دہلی سے گیارہ میل کے فاصلے پہ جانب جنوب واقع ہے۔ جہاں پرانی رفیع الشان عمارتیں۔ چند سلامت، بعض منہدم گویا تاریخ ہندوستان کے اوراقِ کہنہ۔ گو مقام پرانا ہے لیکن پھول والوں کی سیر اتنا پرانا میلہ نہیں۔ اس کی ابتدا اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں ہوئی۔ اس کے بیٹے مرزا جہانگیر کو جو ولی عہد تھا۔ سرکار انگریزی نے ایک مرتبہ نظر بند کر کے الہ آباد بھیج دیا تھا۔ بادشاہ بیگم کو بیٹے سے بہت محبت تھی۔ اس نے منت مانگی کہ شہزادہ بخیر و عافیت دہلی میں واپس آئے تو میں قطب صاحب کی درگاہ پہ پھولوں کا چھپر کھٹ چڑھاؤں گی۔ ولی عہد جب رہا ہو کر دہلی آیا تو بیگم نے اپنی منت پوری کرنا چاہی۔ چنانچہ بادشاہ اور روسا و امرا سب مہرولی پہنچے۔ بادشاہ کی خوشی میں اہلِ شہر بھی خوشی منانے جوق جوق گئے۔ چھپر کھٹ میں پھولوں کا ایک پنکھا بھی آویزاں تھا۔ شام کو جب جلوس کے ساتھ چلے تو اچھے خاصے میلے کا مزا تھا۔ بادشاہ ایسے خوش ہوئے کہ اس کو پنکھا چڑھانے کا دوامی میلہ قرار دے دیا۔ اور تاریخ انعقاد ساون کی جمعرات مقرر کی گئی۔ چوں کہ یہاں جوگ مایا جی کا مندر بھی بڑی رونق کا مقام ہے۔ ہندوؤں نے بدھ کو وہاں پنکھا چڑھانا شروع کیا۔ اسی طرح ہندو و مسلمان دونوں کا ہر سال بڑا بھاری میلہ ہونے لگا۔

فلیٹ نمبر ۱۱۹۵، سیکٹر اے، پاکٹ بی، وسنت کنج کالونی، ڈاکخانہ مہرولی، نئی دہلی ۱۱۰۰۳۰

تب بہت کچھ تزک و احتشام کیا جاتا تھا۔ اب وہ تکلّف تو باقی نہیں رہا۔ نہ پنکھوں کے ساتھ ہاتھی گھوڑے ہوتے ہیں۔ نہ فوج کی پلٹنیں۔ لیکن میلہ اُسی دھوم دھام کے ساتھ ہوتا ہے۔ پنکھوں کے ساتھ خلقِ خدا کا وہی اژدہام ہوتا ہے۔ اور بازار نہایت رونق کے ساتھ آراستہ کیا جاتا ہے۔ اور یہی رونق دِلّی والوں کے دلوں میں گدگدی کیا کرتی ہے۔"

مگر افتادِ زمانہ چند نامساعد حالات کی وجہ سے ہندو مسلم اتّحاد کا یہ سوتہ سوکھ گیا۔ اور آزادی ملنے کے بعد پنڈت نہرو نے باہمی بھائی چارے کا یہ چشمہ پھر سے رواں دواں کیا۔

پھول والوں کی سیر کا میلہ قصبہ مہرولی میں اب بھی منایا جاتا ہے۔ لیکن اب یہ برسات کی رِم جھم میں نہیں، پت جھڑ کے دِنوں میں ہوتا ہے۔ جب گرمی سردی گلے ملتی ہیں۔ دلوں کی کدورتیں خشک زرد پتوں کی طرح جھڑ کے گِر جاتی ہیں۔ ہندو مسلم یکساں محبّت واخوّت کا نمونہ بنے، درگاہ پہ چادر چڑھاتے ہیں، پھولوں سے مزیّن۔ اور یوگ مایا کے مندر میں پھولوں سے سجا پنکھا۔ مگر مہرولی اب دہلی سے گیارہ میل کے فاصلے پہ نہیں۔ ایک صدی میں آبادی کا پھیلاؤ اُمڈ کے اس سے کہیں آگے جا پہنچا ہے۔ مغلیہ خاندان کے بادشاہ نہ سہی۔ جمہوریۂ ہند کے حکامِ اعلیٰ اب بھی میلے میں رونق افروز ہو کے پُرانی روایات کو نئی زندگی دیتے ہیں۔ اور لوگ ٹم ٹم، بگھیّوں، تانگوں، فٹنوں، گھوڑوں، رتھ گاڑیوں یا بیل والے گڈوں پہ بیٹھ کے نہ سہی کاروں، بسوں، سکوٹروں پہ خراماں خراماں نہیں فرّاٹے بھرتے آتے ہیں مگر ان رواداریوں کی دیواروں میں کہیں کہیں افواہیں دراڑ پیدا کرتی ہیں۔

"ارے بھائی۔ اگر زندہ رہنا ہے تو گھر سے باہر بنا کام کے مت جانا۔" اور جب میں، اِس شہر میں اجنبی، ہمہ تن گوش اُن کی بن مانگی نصیحت سنتا ہوں تو مجھ جیسے بدھو کو سرزنش کرتے ہوئے کہتے ہیں "اجی یہ میلہ ویلہ سب سرکاری ڈھونگ ہے۔ تماشائیوں سے زیادہ پولیس ہوتی ہے۔ پھول والوں کی سیر!" اور ٹھنڈی سانس بھر کے کہتے ہیں "یہ درگاہ کے مجاور اور یوگ مندر کے پجاری سب سرکار کے پِٹھو ہیں۔ سوانگ رچتے ہیں"۔ میں جب حیران ہو کے اُن کی طرف دیکھتا ہوں تو وہ اپنے ہونٹ میرے کانوں کے نزدیک لا کے سرگوشی کے لہجے میں کہتے ہیں "یہاں کہیں بھولے سے جامع مسجد کے علاقے میں نہ چلے جانا وہاں"۔ اور پھر "نہ تلک نگر میں قدم رکھنا اُس جگہ"۔ میں سہم جاتا ہوں وہ میری شکل دیکھ کے سمجھ جاتے ہیں تیر نشانے پہ بیٹھا اور سٹک جاتے ہیں۔ اب ہونی ہو کے رہتی ہے۔

ہوا یہ کہ میری چھوٹی بیٹی جمنا پار اپنے سُسرال رہتی ہے۔ اور میں مہرولی۔ وہ مشرقی گوشے میں اور میں جنوبی کونے میں مگر گھر گرہستی کے تقاضے تو نبھانے پڑتے ہیں۔ میں اس سے ملنے گیا تو میرا پانچ برس کا دوہتا ضد کرنے لگا کہ وہ بھی میرے ساتھ چلے گا۔ بال ہٹ کے سامنے تو بادشاہوں کا سر جھکتا ہے۔ میں تو ایک حقیر سا انسان ہوں۔ وہاں سے بس میں سوار ہوئے تو ہوئے کیسے۔ یہ بذاتِ خود ایک تفصیلی داستان ہے۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ دو تین بسیں تو اسی اُمید میں جانے دیں کہ شاید اگلی خالی، فقط ہمیں لے جانے کے لیے آجائے۔ لیکن یہ نہ تھی ہماری قسمت۔ میرا دوہتا جو نزدیک کے کسی اسکول میں پکّی پہلی جماعت، جسے شاید اب نرسری یا کے۔ جی کہتے ہیں، پڑھتا ہے، وہ یقیناً اپنے بزرگ سے زیادہ جہاں دیدہ نہ سہی آدمی دیدہ ضرور تھا۔ ایک بس آئی اس نے میرا ہاتھ پکڑا لپکا ٹانگوں میں سے نکل کے اُوپر چڑھا۔ اور میں بھی دھکّم دھکّا اندر۔ اب وہ کہاں تھا۔ میں کہاں۔ مجھے علم نہیں بس اتنا علم تھا کہ ہم نے لال قلعے سے اُتر کے اسٹیشن کے نزدیک سے دوسری بس پکڑنا ہے۔ اب جب میں لال قلعے کے نزدیک پہنچا تو عزیز کو آواز دی۔ اس نے جواب تو دیا میں سمجھا ہوشیار ہے۔ جیسے چڑھا تھا ویسے اُتر بھی آئے گا مگر بس والوں کی سمجھ میں یہ نازک رشتے نہیں آتے۔ میں باہر اور بچّہ اندر۔ اور دہلی کی بس دھواں چھوڑتی یہ جا وہ جا میں لاکھ رکو رکو پکارا لیکن اس طوطی میں نقار خانے کو گونجا دینے کی سکت کہاں تھی۔ اب کہاں جاؤں کیا کروں۔ بچّہ پانچ برس کا میں ساٹھ کا خود کو سنبھال نہ سکا۔ تو وہ اپنا خیال کیسے کرے گا۔ میں سر پکڑ کے بیٹھ گیا اور تب ایک لمبے چوڑے داڑھی والے نوجوان نے جو میرے ساتھ بس سے اُترا تھا اس نے آوازیں سُنی تھیں۔ معاملہ بھانپا، کہنے لگا

"وہ فلاں نمبر کی بس تھی۔ فلاں جگہ جارہی تھی۔ میں دوسری میں جاکے بچّے کو لاتا ہوں۔ آپ یہیں بیٹھیں،" اب میری کیا مجال صاحب جو میں اس فرشتۂ غیبی کی بات نہ مانوں۔ میں جہاں تھا وہیں کھڑا ہوگیا اور دہلی والے۔ پیدل، سوار۔ کار۔ بس۔ سکوٹر۔ تھری ویلر۔ سائیکل۔ تانگے غرضیکہ ان گنت میری زبوں حالی سے بے خبر۔ خود میں مست۔ ایسے بھاگے جارہے تھے۔ گویا یہ وقت نکل گیا تو قیامت آجائے گی۔ مجھے اس حالت میں شاید زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹہ گزرا ہوگا۔ مگر ذہنی خلجان اور قلبی بے چینی سے اب محسوس ہوتا تھا جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔ اور تب ایک مانوس سی آواز سنائی دی "ڈیڈی او ڈیڈی" میں نے وفور محبت سے مغلوب ہوکے اسے گلے سے لگالیا۔ اور یہ دیکھنے کی تکلیف گوارا نہ کی کہ یہ ننھا منّا اس بھیڑ بھاڑ میں گم ہوکے پھر صحیح سلامت ایک گنجان آبادی کی بھرپور رواں دواں سڑک پہ اکیلا کیسے آگیا۔ وہ ایک تھری ویلر سے اترا تھا۔ اس میں سے دو سواریاں اتریں، ایک بھاری بھرکم ادھیڑ عمر کی عورت اور دوسرا وہی داڑھی والا نوجوان۔ دونوں نے بزرگ اور بچّے کا سنگم دیکھا۔ چند ثانیے تھری ویلر والے کو پیسے دینے کی بات ہوئی لیکن اس نے مغایت انکساری سے لینے سے انکار کیا۔ اور تب وہ بیشتر اس کے کہ میں ان کا شکریہ ادا کرتا۔ ایک ایک بس میں چڑھ گیا۔ اور دوسری عورت بھیڑ میں گم ہوگئی۔ تب مجھے ہوش آیا کہ میرا بھی کوئی فرض بنتا ہے کہ اپنے کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کروں۔

مگر وہ تو اس بھیڑ میں گم ہوچکے تھے تھری ویلر والے نے بتلایا۔" جناب وہ عورت تلک نگر سے آئی تھی۔ اس نے سیس گنج میں ماتھا ٹیکنا تھا۔ جب وہ مجھ سے بات کر رہی تھی۔ تب یہ بچّہ روتا ہوا نکلا۔ اس عورت نے اس کا ہاتھ تھاما، پیار کیا اور پوچھا کہ کون ہے۔ کہاں سے آیا ہے کس کے ساتھ تھا۔ بچّہ ہوشیار تھا بتادیا اور تب وہ آدمی جو جامع مسجد کے نزدیک پتلی قبر کا رہنے والا ہے وہ ہماری طرف لپکا اس نے بچّے کو آپ کے ساتھ بس میں دیکھ لیا تھا۔ پہچان لیا اور کہنے لگا کہ اس کے بزرگ کو وہ لال قلعے کے نزدیک ایک جگہ کھڑا کر آیا ہے۔ پہلے تو ایک نے دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھا۔ مگر دونوں کے چہرے پہ معصومیت تھی۔ لہٰذا ہم روانہ ہوگئے اور یہاں آپ کھڑے تھے۔ آپ نہ ملتے تو ہم پولیس میں خبر کرکے وہاں چھوڑتے۔" اب وہ عورت جو تلک نگر کی تھی۔ جہاں مجھے خبردار کیا گیا تھا کہ بھولے سے مت جانا۔ وہاں تو ہر دوسرے روز سر پھٹول بلاوجہ ہوتی ہے۔ اور دوسرا جامع مسجد کے گرد و نواح کا جہاں کے لیے میرا خیال تھا کہ ہر شخص فقط دنگا فساد کرنے کے لیے رہتا ہے۔ اور میں سوچنے لگا کہ میں اجنبی دلّی سے ناواقف ہجوم میں تنہا اور میرا ننھا منّا دوہتا۔ دوسری قوم کا وہ نوجوان جس کے متعلق مجھے شبہ تھا کہ یہ لوگ بلاوجہ خون خرابہ کرتے ہیں۔ اور یہ دوسرے فرقے کی عورت جن کی رگ رگ میں نفرت سرایت کرچکی ہے۔ اور جن کی نیّت سے مجھے آگاہ کیا گیا تھا مگر جو ہوا۔ وہ قطعی مختلف تھا۔ عورت کے دل میں ممتا تھی اور نوجوان کے دل میں اخوّت۔ وہ جو بھی تھے انسان تھے، ہندوستانی تھے، اور وہ عورت گورو کی سچی بھگتن تھی۔ اور وہ مرد بقول اقبال مرد مومن تھا جسے علم تھا مذہب نہیں سکھاتا آپس میں ...: تب میں نے تھری ویلر کا دھیان کیا۔ وہ میری اس ذہنی ادھیڑ بن کے درمیان کہیں پیسے دینے والی سواری کی تلاش میں جاچکا تھا۔ میرے دوہتے نے کہا۔ "ڈیڈی جب وہ جانے لگا تو میں نے آپ کو ٹھونکا دیا مگر نہ معلوم آپ کہاں تھے۔ وہ یہ کہہ کے چلا گیا بابوجی سے کہہ دیں ہم بھی بال بچّے والے ہیں اور میں سوچنے لگا پھول والوں کی سیر کا میلہ ازل سے شروع ہوا ہے ابد تک رہے گا۔

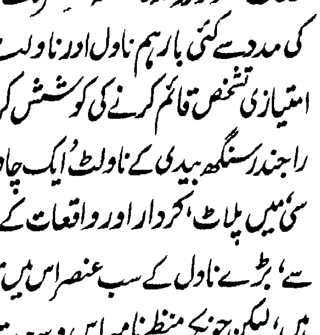
بلراج کومل

تین نئے اُردو ناول

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اُردو زبان میں تخلیقی اظہار غالب انداز میں بہ زبانِ شعر ہوا ہے۔ اگرچہ دیگر اصنافِ اظہار کی جانب بھی توجہ دی گئی ہے لیکن اس شدت، تواتر اور انہماک سے توجہ نہیں دی گئی جس شدت، تواتر اور انہماک سے شعری اصناف کی جانب دی گئی ہے۔ اُردو زبان کا بیشتر ادبی سرمایہ اسی لیے شعری تخلیقات پر مشتمل ہے۔ ڈرامہ اور ناول ان اصنافِ اظہار میں سے دو ایسی اصنافِ اظہار ہیں جن پر شعر کے مقابلے میں نسبتاً کم توجہ دی گئی ہے۔ اس صورتِ حال کی وجوہات کیا ہیں؟ یہ قابلِ غور مسئلہ ہے۔ لیکن ناول کی حد تک بھی، ناول کا وہ تصور جو ہمارے ذہن میں مغربی زبانوں کے ناولوں کی وساطت سے مرتب ہوا ہے اُردو زبان میں اس تصور کی سطح اور اس کے مرتبے کے ناول یا تو تعداد میں کم ہیں یا پھر فی الحال معرضِ وجود میں نہیں آئے۔ نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، مرزا رسوا، راشد الخیری ——— سے اردو ناول کا جو سفر شروع ہوا تھا وہ دورِ جدید تک پہنچتے پہنچتے متنوع تکنیکی اور تجرباتی مراحل سے گزرا ہے۔ پریم چند غالباً اُردو زبان کے پہلے بڑے ناول نگار ہیں۔ موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے بھی پریم چند کا دائرۂ عمل بڑا وسیع ہے۔ ہمارے دور کے اہم ناول نگاروں میں عزیز احمد، کرشن چندر، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، قرۃ العین حیدر، شوکت صدیقی انتظار حسین، عبداللہ حسین، خدیجہ مستور، جوگندر پال، انور سجاد ظفر پیامی ——— خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

فکشن کی تشکیلی تراکیب ———

پلاٹ، کردار، علامتیت، راوی کے نقطۂ نظر اور منظر نامے کے تعلق سے اردو زبان کے دورِ جدید کے ناول نگاروں کے ہاں مختلف آمیزشیں ملتی ہیں۔ کم و بیش تمام ناول نگاروں کے ہاں (قرۃ العین حیدر اور انور سجاد کے بعض ناولوں کو چھوڑ کر) پلاٹ اور واقعات کی ترتیب و تدریج کا احترام موجود ہے۔ کردار نگاری کے فن کا مظاہرہ بھی سبھی ناول نگار کرتے ہیں لیکن ناقابلِ فراموش کردار پریم چند کے ہاں تو موجود ہیں لیکن شاید ہمارے دور کے ناول نگاروں میں اس حد تک پہچان کی انفرادیت حاصل نہیں کر سکے۔ استعارہ اور علامت ادبی تخلیقی طریقِ کار کے ناگزیر عنصر ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے ہاں 'آگ کا دریا' میں وقت کی تجسیم بنیادی طریقِ کار کا جزوِ لاینفک ہے۔ انتظار حسین نے داستانی طریقِ کار کی مدد سے معانی کی نئی سطحیں دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جوگندر پال نے 'نادید' میں 'نابینا' کرداروں کی مدد سے ایک استعاراتی ماحول تشکیل کیا ہے۔ راوی کا نقطۂ نظر اکثر اوقات مصنف یا تخلیق کار کا نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ بعض ناول نگاروں کے ہاں راوی اور مصنف گڈمڈ ہو جاتے ہیں اس لیے ان کے ہاں راوی معروضی ناظر کے مرتبے سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور بطور ایک 'دخیل راوی' بار بار واقعات کی تدریج کے درمیان، کرداروں کی نظری حرکات و سکنات کے درمیان دخل انداز ہوتا ہے۔ پریم چند اور راجندر سنگھ بیدی کا راوی کبھی کبھی اور جوگندر پال کا راوی اکثر اوقات اپنا نقطۂ نظر بیان کرنے کے لیے بیانیہ کے سفر میں حائل ہوتا ہے۔ منظر نامے کے اعتبار سے ناول نگاروں کے ہاں بعض اوقات ایک سیر حاصل سلسلۂ تصاویر زندگی اور کائنات کے حسن، وسعت اور رنگا رنگی کا مرقع بن جاتا ہے اور بعض اوقات حشو و زوائد کا مسئلہ۔ منظر نامے کی حدود کی مدد سے کئی بار ہم ناول اور ناولٹ کا امتیازی تشخص قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کے ناولٹ 'ایک چادر میلی سی' میں پلاٹ، کردار اور واقعات کے اعتبار سے، بڑے ناول کے سب عنصر اس میں موجود ہیں، لیکن چونکہ منظر نامہ اس وسعت اور SWEEP سے عاری ہے جو دنیا کے بڑے ناولوں کا طرۂ امتیاز ہے لہٰذا راجندر سنگھ بیدی کا ناولٹ انتہائی پُر وقار ہونے کے باوجود ناول کے ذیل میں نہیں آتا۔ منظر نامے کی وسعت اور



ای — ۱۳۹، کالکاجی، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۹

SWEEP کی بہترین مثالیں ہمارے یہاں قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین کے ناولوں کی صورت میں موجود ہیں۔ شاعری کے برعکس فکشن کی ایک سماجی و دستاویزی جہت بھی ہوتی ہے جس کی مثالیں اُردو ناول نگاروں میں حیات اللہ انصاری اور شوکت صدیقی کے ہاں بطور خاص پائی جاتی ہیں۔

فکشن کی تشکیلی تراکیب کی مدد سے ناول نگار کچھ عناصر حاصل کرنا چاہتا ہے۔ حقائق، موضوع کی گرفت، پلاٹ کی ساختی بناوٹ، واقعیت، کردار، علامتیت راوی کا نقطۂ نظر، منظر نامہ، اعتبارِ حقیقت، ماحول کی تخلیق اور موضوع کی معنوی ترسیل ایک ہی تخلیقی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

اس بات کو پیشِ نظر کر اُردو زبان میں حاوی انداز میں تخلیقی اظہار بہ زبانِ شعر ہوتا ہے یہ بڑا اُمید افزا امکان ہے کہ حال کے کچھ برسوں میں دیگر اصناف اظہار کے علاوہ رفتہ رفتہ ناول کی جانب بھی سرگرم توجہ دی جانے لگی ہے۔ اور کچھ نئے نام منظرِ عام پر آئے ہیں۔ میرے سامنے اس وقت تین نئے ناول ہیں۔ عبدالصمد اردو کے جانے پہچانے افسانہ نگار ہیں۔ ان کا ناول ' دو گز زمین ' ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا تھا۔ غضنفر کا ناول ؟ (ناولٹ) ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا تھا۔ پیغام آفاقی بطور افسانہ نگار تو اپنی کامیاب پہچان کا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کا ناول ' مکان '، جو ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا تھا ان کی تخلیقی شخصیت کا تازہ ترین گوشۂ امکان ہے۔

اُردو کے ان تین نئے ناولوں میں جو قدرِ مشترک فوری طور پر متوجہ کرتی ہے وہ ان کے علامتی نوعیت کے نام ہیں: ' دو گز زمین '، ' پانی '، ' مکان '۔

عبدالصمد کا ناول ' دو گز زمین ' سماجی دستاویز بھی مرتب کرتا ہے اور کرداروں کی جہدِ بقا کے توسط سے ایک انسانی صورت حال کا منظر نامہ بھی۔ ہارڈی کے ناولوں کی طرح عبدالصمد کے ناول کا تعلق ایک مخصوص خطۂ ارض سے ہے۔ کہانی کے کردار بہار شریف (گاؤں کا مخصوص نام: بین) سے تعلق رکھتے ہیں۔ خاندان جاگیردار اور زمیں دار طبقے کے خاندان ہیں۔ زمانہ خلافت تحریک اور آزادی کی تحریک کا ہے۔ اور یہ وہ زمانہ ہے جب نصب العین اور زندگی کی اعلا اقدار کا دبدبہ اور وقار قائم تھا۔ شیخ الطاف حسین، ان کی بیگم، ان کے بچے (اصغر حسین اور سرور حسین) رشتے دار (اختر حسین۔ ان کا بھانجہ اور دیگر لوگ) خاندان کی جاگیردارانہ نوعیت اور ایک مخصوص مذہب یعنی اسلام کا عقیدہ رکھنے کے باوجود آزاد خیال اور کشادہ دل ہیں۔ ان کی ہمدردیوں کا دائرہ کسی مخصوص حد بندی کا اسیر نہیں ہے۔ یہ سب لوگ جہدِ حیات اور تحریکِ آزادی کے تشکیلی دور سے گزرتے وقت زندگی کی اعلا اور ہندوستانی معاشرے کی مشترکہ تہذیبی اور ثقافتی اقدار کا اپنی بساط سے بڑھ کر احترام کرتے ہیں۔ لیکن بالآخر رفتہ رفتہ اس تہذیبی زوال کا شکار ہونے لگتے ہیں جس کا سلسلہ اعلانِ آزادی کے پہلے برسوں میں شروع ہوا تھا۔ اعلانِ آزادی کے آس پاس کے برسوں میں معاشرہ شدید فرقہ وارانہ منافرتوں میں ڈھل گیا اور آزادی کے بعد کے چالیس برسوں میں ہندوستان کی مسلمان اقلیت کے لیے بقائی جدوجہد کا مسئلہ بن گیا۔ تقسیم ہندوستان کا سانحہ یا واقعہ کسی کے لیے عبرت ناک ثابت نہیں ہوا۔ نہ اکثریت کے لیے، نہ اقلیت کے لیے، نہ تقسیم کے نتیجے کے طور پر وجود میں آنے والے ممالک ہندوستان پاکستان اور مزید تقسیم کے مظہر بنگلہ دیش کے لیے حق تو یہ ہے کہ اقدار کے زوال اور حرص و ہوس کی یلغار میں وہ فعال عناصر بھی کمزور ہوئے یا برباد ہو گئے جو ہماری تہذیبی وراثت کا حصہ تھے۔ اس زوال کی تصویر کشی ہمیں قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، شوکت صدیقی اور ظفر پیامی کے ناولوں میں بھی ملتی ہے۔ لیکن دستاویزی نوعیت کے اس مشترکہ عنصر سے قطع نظر جو خوبی عبدالصمد کے ناول ' دو گز زمین ' کو امتیازی جہت عطا کرتی ہے، وہ برصغیر کے تقسیم شدہ ممالک کی جانب ہندوستانی مسلمانوں کی بنیادی جذباتی AMBIVALE-NCE- اور متعلقہ تضادات کا تجزیہ ہے۔ اقتصادی دباؤ کی شدت میں اضافہ ہونے کی وجہ سے اس رویے کے تضادات میں دن بدن نئی سے نئی پیچیدگیاں پیدا ہوتی جا رہی ہیں۔ ' ہاؤ، ہو ' کے درمیان کون کامیاب ہے ؟ کون ناکامیاب ؟ کون محفوظ ہے کون غیر محفوظ ؟ عبدالصمد کے کردار بھی قرۃ العین حیدر کے کرداروں کی طرح اکثر ہندوستان اور پاکستان اور بنگلہ دیش کی جغرافیائی حدود کو موقع پرستی اور مفاد پرستی کے ہتھیاروں سے ختم کرنے، ان کے آر پار آزادی سے سفر کرنے اور ان پر حاوی ہونے کے فن سے واقف ہیں۔ لیکن عام انسان کا مسئلہ بالآخر ' دو گز زمین ' کا ہے۔ بہادر شاہ

ظفر کے لیے یہ ’ دوگز زمین ‘ آخری جائے سکون تھی جو اسے اپنے ملک میں نصیب نہ ہو سکی عام انسان چاہے وہ ہندوستان میں ہو یا پاکستان میں یا بنگلہ دیش میں، یا تیسری دنیا کے کسی ملک میں چونکہ صاحبِ اقتدار طبقے کے ہتھیاروں سے محروم ہوتا ہے اس لیے وہ معاشرے کا فرد ہونے کے باوجود معنوی طور پر اقلیت بن کر رہ جاتا ہے۔ ’ دوگز زمین ‘ کے تعلق سے اس کا مسئلہ جائے پناہ کا مسئلہ ہے۔ اس ” اقلیتی فرد “ کو یہ جائے پناہ یہ جائے سکون آخر ملے گی تو کہاں ملے گی ؟ ہندوستان میں ؟ پاکستان میں بنگلہ دیش میں ؟ کسی اور غیر ملک میں لیکن کہاں ؟ ہمارے اردگرد کا معاشرہ، ہمارے اردگرد کے دور و نزدیک کے ملک سب تہذیبی زوال اور اقدار کے انہدام کی یلغار میں گھرے ہوئے ہیں۔ عبدالصمد کے ناول میں یہ سب اقلیتی افراد، مسلسل تضادات کی زد میں ہیں۔ ہم سب کے لیے بنیادی قدر پیسہ اور صرف پیسہ بن کر رہ گئی ہے۔ شیخ الطاف حسین، بی بی جی (شیخ الطاف حسین کی بیگم) اختر حسین مثبت تہذیبی استحکام کی علامت ہیں۔ باقی سب لوگ چوہا دوڑ میں ہیں۔ تلاشِ زر میں ہیں اور کفارۂ گناہ کے لیے حج کرنے کی خواہش یا حج کے عملی سفر کا سہارا لیتے ہیں۔ مزاحمت، احتجاج، حقائق سے آنکھ ملانے کا حوصلہ اور ان کو رُخ دینے کی خواہش۔ یہ سب تضاد میں گھرے ہوئے لوگوں کے آس پاس سے کبھی کبھی گزرتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے کوئی مثبت صورت اختیار نہیں کر پاتے۔

عبدالصمد نے ناول کے دستاویزی انداز کے ابتدائی حصوں سے گذرنے کے بعد واقعات، عمل اور ردِ عمل، مکالمہ اور منظر کشی کی مدد سے ہمارے سامنے ایک انسانی ڈرامہ تخلیق کیا ہے۔ جس کے کردار ہمارے جانے پہچانے کردار ہیں۔ بنیادی طور پر غیر محفوظ اور معصوم لیکن معصومیت کھونے کے ناگزیر عمل میں گرفتار۔ یہ کردار ایک مخصوص مذہبی اقلیت سے متعلق ہونے کے باوجود معنوی سطح پر بلالحاظِ مذہب و ملت انسان کی غیر محفوظیت کی انسان کی بنیادی AMBIVAL- ENCE- کی علامت بن جاتے ہیں۔

عبدالصمد کی ’ دوگز زمین ‘ جب جائے پناہ جائے سکون سے گزر کر مستحکم جائے محفوظ کی صورت اختیار کر لیتی ہے تو اس پر ایک ’ مکان ‘ تعمیر ہو جاتا ہے۔ عبدالصمد کے کردار جب کہ ’ دوگز زمین ‘ کی تلاش میں ہیں، پیغام آفاقی کے کردار یا تو جائے محفوظ کے تحفظ کو یقینی بنانے کے عمل میں ہیں یا ان عناصر کی مدافعت میں سرگرم عمل ہیں جو اس جائے محفوظ پر ہر جائز و ناجائز طریقے سے قابض ہونا چاہتے ہیں۔ ایک طرف نیرا، اس کی ماں، پردیپ، نیرا کی سہیلی، سرلا کا ماموں زاد بھائی۔ الوک، راکیش اور کچھ اور لوگ ہیں اور دوسری طرف کمار، اس کی بیوی، سب انسپکٹر نیر، کمار کا دوست اور اشوک، پراپرٹی ڈیلر مدن گوپال، جسم فروش لڑکی مدھو اور متفرق بے ایمان سیاست داں اور ان کے مہرے ہیں۔ درمیان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کا تعلق ہمارے ملک کی افسر شاہی سے ہے۔ یہ لوگ یا تو فیصلہ کرنے سے کتراتے ہیں، یا رشوت خور ہیں یا پھر سیاست دانوں کی جی حضوری کرتے ہیں یا پھر ہر قسم کی اہلیت قابلیت ہمدردی اور ایمان داری سے عاری ہو چکے ہیں۔ نیرا میڈیکل کالج کی طالب علم ہے اور اپنی بیوہ ماں کے ساتھ اپنے مکان میں رہتی ہے۔ اس مکان کے ایک حصے میں کمار نام کا ایک کرائے دار اور اس کے کنبے کے لوگ رہتے ہیں۔ کمار بظاہر شریف انسان دکھائی دیتا ہے۔ لیکن درحقیقت اس کی آنکھ اس مکان پر ہے جس میں وہ بطور کرایہ دار مقیم ہے۔ نیرا اور اس کی ماں مکان کو خالی کروانا چاہتی ہیں۔ جبکہ کمار کی کوشش یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح مکان پر قبضہ جما لے ایسے حالات پیدا کرے کہ نیرا اور اس کی ماں مکان اونے پونے اس کو بیچنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اس بدنیت کام میں اس کے ساتھی تمام وہ لوگ ہیں جو پیسے اور سیاسی تعلقات کے بل بوتے پر کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہیں۔ پراپرٹی ڈیلر مدن گوپال، سب انسپکٹر نیر اور اس نوع کے دیگر کردار حتی الوسع لگاتار اس کوشش میں ہیں کہ کسی طرح نیرا اور اس کی ماں کو مکان سے بے دخل کیا جائے۔ یہ سب کردار ہمارے معاشرے کے جانے پہچانے ٹائپ ہیں۔ نیرا کے دوستوں الوک اور راکیش میں خلوص اور نیک نیتی کا جذبہ تو ہے لیکن فیصلہ کن حرارتِ عمل شاید نہیں ہے۔ ان کی دوستی میں بھی ذاتی اغراض کسی حد تک شامل ہیں۔ نیرا، پیغام آفاقی کے ناول ’ مکان ‘ کا وہ واحد کردار ہے جو رزمیہ تناسب کا نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے عزم و استقلال، اور بے انصافی کے خلاف لڑنے کے مستحکم جذبے کی وجہ سے محض ٹائپ بن کر بھیڑ میں کھو جانے کے امکان سے بچ جاتا ہے۔ نیرا مصمم ارادے سے اپنے مکان کے تحفظ کی جنگ بھی جاری رکھتی ہے اور اپنی تعلیم کا سلسلہ بھی۔ وہ

پولس تھانوں، کچہریوں، سرکاری دفتروں، سیاسی اقتدار کے اڈوں، دوستوں دشمنوں کے درمیان تھکا دینے والا سفر جاری رکھتی ہے اور بالآخر یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے کہ حیات و کائنات وہی ہے جو انسان خود تشکیل کرتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنا مکان غاصبوں کے ہاتھوں سے محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو جاتی ہے بلکہ اپنی خود اعتمادی اور شخصیت کی دلکشی سے رکیش کے جنسی ارادوں، اشوک کی بدکارانہ خصلتوں اور کمار کی غاصبانہ نیتوں پر بھی حاوی ہو جاتی ہے۔ اثر اندازی کا یہ عمل شاید کسی حد تک میلو ڈرامیٹک محسوس ہوتا ہے۔ لیکن شاید (MELO DRAMA) میلو ڈراما بھی ہماری زندگی کا حصہ ہے۔

پیغام آفاقی کا دائرۂ عمل عبدالصمد کے مقابلے میں مختلف نوعیت کا ہے۔ عبدالصمد کے ناول کا کینوس وسیع ہے۔ پیغام آفاقی کے ناول کا کینوس اس کے مقابلے میں محدود ہے۔ عبدالصمد کے ناول میں ایک دستاویزی تمہیدی حصہ ہے جبکہ پیغام آفاقی کے ہاں کہانی پہلے جملے سے حرکت میں آجاتی ہے اور پھر واقعات اور کرداروں کے عمل، ردعمل اور ان کی گفتگو اور مکالموں کے درمیان سے گرم عمل ہو جاتی ہے۔ عبدالصمد کی کہانی غیر محفوظیت کی کہانی ہے۔ پیغام آفاقی کی کہانی سماجی زوال کے منظر نامے کی کہانی ہے جس میں مکان کا تحفظ نیرا کے لیے بدکار منافق معاشرے میں اپنی ذات اور اپنی شخصیت کے تحفظ کی علامت بن جاتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے غالباً دونوں ہی کہانیاں غیر محفوظیت کی کہانیاں ہیں۔

غضنفر اپنے ناولٹ 'پانی' میں انسانی غیر محفوظیت کی کہانی مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں۔ عبدالصمد اور پیغام آفاقی کا طریق کار حقیقت پسندانہ ہے۔ غضنفر کا طریق کار استعاراتی، علامتی، تمثیلی اور داستانی۔ 'پانی' انسان کی اور زندہ جانوروں کی بنیادی ضرورت ہے۔ غضنفر کے ہاں مسئلہ اس بنیادی ضرورت کی تلاش ہے۔ 'پانی' کا مرکزی کردار بے نظیر بچپن ہی میں ماں کی شفقت سے محروم ہو گیا تھا کیونکہ وہ اپنے لیے اور اپنے ننھے منے بیٹے کے لیے پانی کی تلاش میں تھی اور پانی کہیں بھی نہیں تھا۔ ماں کی موت کے بعد بے نظیر کسی نہ کسی طرح زندہ بچ رہنے میں تو کامیاب ہو گیا لیکن وہ بھی پانی سے محروم ہے۔ لہٰذا مسلسل پانی کی تلاش میں ہے۔ وہ تالاب جس کے کنارے وہ بڑی کوششوں کے بعد پہنچتا ہے پانی سے تو بھرپور ہے لیکن اس پر نہنگوں نے قبضہ کر رکھا ہے۔ ہجوم تشنگاں نے نہنگوں کو پتھر مار مار کر تالاب میں ختم تو کر دیا لیکن اس سے تالاب کا پانی زہر آلودہ ہو گیا۔ پانی کو صاف کرنے کے لیے ایک بوڑھے کے مشورے سے لوگ پہاڑ سے زہر مہرہ لائے اور تالاب کے پانی کو صاف کر دیا۔ اپنی پیاس بجھانے کے بعد لوگوں نے پانی کی حفاظت کے لیے کچھ محافظ مقرر کر دیے۔ پانی میں جب مچھلیاں پیدا ہو گئیں تو محافظوں کی نیت بدل گئی۔ پانی پینے کے بعد بے نظیر کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ لیکن اس کے خواب غفلت سے بیدار ہونے تک محافظوں نے تالاب کے اردگرد ایک اونچی دیوار کھنچوا دی تھی اور تالاب میں سے جانوروں انسان نما مگرمچھوں کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں

اب مسئلہ یہ تھا کہ تالاب کو غاصبوں کے قبضے سے کیسے آزاد کرایا جائے۔ بے نظیر نے مشورے اور رہنمائی کے لیے دارالتحقیقات کی جانب رجوع کیا۔ یہ ادارہ افسر شاہی اور نوکر شاہی کا نمونہ تھا۔ اس ادارے کا کام اصل مسئلے کا حل تلاش کرنے کے بجائے اسے مسلسل التوا میں رکھنا تھا۔ اور ضرورت مندوں کو اصل مسئلے سے دور رکھنے کے لیے اس کے لیے پرکشش بہلاووں کا انتظام کرنا تھا۔ پانی کی تلاش جاری تھی لیکن پانی کے بجائے بے نظیر کو کہیں فلسفیانہ توجیہات میں الجھا دیا گیا، کہیں اس کو سکون کا درس دیا گیا۔ وہ سرابوں سے گذرا۔ جب وہ امرت کنڈ کے پاس پہنچا تو پتہ چلا امرت دیوتاؤں کے لیے ہے انسانوں کے لیے نہیں۔ دیوتا امرت پی کر چل دیے اور پیاسے لوگ ٹوٹے ہوئے پیالوں کی کرچیاں چاٹنے میں مصروف ہو گئے۔ بے نظیر نے اپنا سفر جاری رکھا جب وہ چشمۂ حیواں کے کنارے پہنچا تو اسے پتہ چلا کہ وہاں بھی نہنگ قابض تھے اور آب حیات پی کر امر ہو چکے تھے۔ بے نظیر پھر پہلے تالاب کے کنارے پہنچا۔ لیکن اس کے اردگرد کی دیواریں اور بھی بلند ہو چکی تھیں اور پانی کے پیاسے دیواروں پر چڑھنے کے عمل میں زخموں سے چور چور ہو رہے تھے۔ گر گر کر دم توڑ رہے تھے اور آسمانوں سے گدھ ان پر جھپٹ رہے تھے۔ جن لوگوں میں دو چار سانس باقی تھے وہ ایک دوسرے کا خون پی کر زندہ رہنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ محافظ جنھوں نے تالاب پر قبضہ کر لیا تھا اور اس کے اردگرد دیواریں کھنچوا دی تھیں، دیواروں کے اندر انسانی لہجے سے عاری ہو چکے تھے۔

میں تینوں ناولوں کی ایک قدرِ مشترک یعنی ان کے علامتی ناموں کی جانب اشارہ کر چکا ہوں۔ اس قدرِ مشترک کے علاوہ کچھ اور بھی مشترک عناصر ہیں جو ہمیں تینوں ناولوں میں کسی نہ کسی روپ میں ملتے ہیں۔ تینوں ناولوں کے مرکزی کردار تلاشِ مسلسل کے کرب میں گرفتار ہیں۔ عبدالصمد کے یہاں 'دوگز زمین' کی تلاش ہے۔ 'مکان' میں اس ذریعے کی تلاش ہے جو نیرا کے لیے 'مکان' کا تحفظ یقینی بنا سکے۔ غضنفر کے ہاں بے بظیر کو پانی کی تلاش ہے جو ہر مقام پر یا تو کسی جارحانہ قوت کے قبضے میں ہے یا بالآخر اس کے قبضے میں چلا جاتا ہے۔ تینوں ناول نگار اقدار کے زوال کا ذکر کرتے ہیں۔ نوکر شاہی افسر شاہی تینوں ناولوں میں بے ایمان، بداخلاق، بد عنوان، بے کار اور مفلوج ہے۔ لوگوں کو راہِ راست سے ہٹانے کے لیے یا ورغلانے کے لیے جن ذرائع کی جانب اشارہ کیا گیا ہے ان میں جنسی کشش خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ 'دوگز زمین' میں کسی حد تک کم لیکن 'مکان' اور 'پانی' میں واضح انداز میں۔ تین میں سے دو ناولوں (دوگز زمین اور مکان) میں تقریباً سارے کے سارے کردار FLAT یعنی ٹائپ کردار ہیں۔ 'پانی' میں کرداروں کی نوعیت علامتی اور تمثیلی ہے۔ تینوں ناولوں میں دوستوسکی کے میتیا (MITYA) یا کزنتزاکی کے زوربا (ZORBA) کے مرتبے کا راؤنڈ ROUND کردار نہیں ہے جو حالات پر حاوی ہونے کی جسارت رکھتا ہو۔ صرف 'پانی' میں کسی حد تک 'رزمیہ عناصر' ہیں لیکن اس کا نصب العین محدود ہے۔

مندرجہ بالا مشترکہ خصوصیات کے علاوہ تینوں ناولوں کے کچھ پہلو ایسے بھی ہیں جو انھیں انفرادی کردار عطا کرتے ہیں۔ عبدالصمد کے ناول کی RANGE 'مکان' اور 'پانی' کے مقابلے میں دستاویزی اعتبار سے اور منظر نامے کے تناسب کے اعتبار سے وسیع تر ہے۔ 'مکان' میں ڈرامائی طریق کار کا استعمال بڑی فنکارانہ چابکدستی سے کیا گیا ہے۔ 'پانی' کی تمثیلی پرواز، استعارے، علامت اور داستانی طرزِ اظہار کے طفیل انتہائی پراثر اور بامعنی بن گئی ہے اور بعض پہلوؤں سے شاعرانہ نوعیت اختیار کر گئی ہے۔ انسان خود ہی انسانی صورتِ حال کا گناہ گار ہے اور خود ہی عمل کی وساطت سے اس کا مسیحا! ادیب، ناول نگار، افسانہ نگار، شاعر اپنی فنکارانہ حیثیت کے ذریعے اس صورتِ حال سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ اس کے نشیب و فراز میں سے گزرتا ہے۔ بعض اوقات اس صورتِ حال پر جمالیاتی سطح پر قادر ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ بعض اوقات شدید کرب میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات احتجاج اور مزاحمت کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ تخلیقی ردِ عمل کے یہ سبھی پہلو کسی نہ کسی شکل میں ــــ 'دوگز زمین' 'مکان' اور 'پانی' میں موجود ہیں۔

۱۔ "دوگز زمین" عبدالصمد، بجیرو لا، سلطان گنج، پٹنہ، ۱۹۸۸ء، صفحات ۲۸۶، قیمت ۶۰ روپے۔

۲۔ "مکان" پیغام آفاقی، فکشن اکیڈمی ۵۱۸-اے، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی، ۱۹۸۹ء، صفحات ۴۰۰، قیمت ۱۰۰ روپے۔

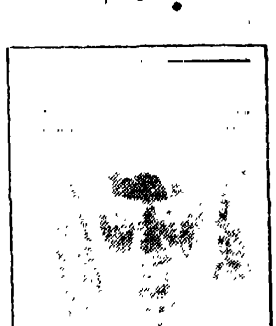
۳۔ "پانی"، غضنفر، اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر، سولن (ہماچل پردیش) ۱۹۸۹ء، صفحات ۱۰۳، قیمت ۷ روپے۔

صہبا وحید

کٹا جو رشتۂ ماضی تو حال سے بھی گئے
ہر ایک وسوسۂ ماہ و سال سے بھی گئے
عجب نجات دہندہ تھی خود فراموشی
زمیں کے موہ سے نکلے، ملال سے بھی گئے
وہ ایک دانۂ گندم کا تھا کرشمہ، غلط
تماشہ گاہ میں ہم اِس خیال سے بھی گئے
کہاں یہ عمرِ گریزاں، کہاں وہ سات سوال
ترے خیال سے اُلجھے، وصال سے بھی گئے
کہاں قیام ہو بے خانماں پرندوں کا
جنوب سے تو گئے تھے شمال سے بھی گئے
بچھڑ گئے تھے پہ ملنے کا احتمال تو تھا
شکستہ رشتوں میں اِس احتمال سے بھی گئے
لگائی چاند سے ایسی بھی لو کہ ہم صہبا
تمام عمر گھلے، خطّ و خال سے بھی گئے

یہ دن کا وقت اور خوابوں کی بھرمار
اٹھ اور سنگِ حقیقت کھینچ کر مار
ہنسا دیکھے نہ یوں اغیار پر مار
جدھر سے آئے ہیں پتھر، اُدھر مار
دیا تو دشت میں شیرِ ببر مار
پڑے گی شہر میں ہم کو مگر مار
مِلن کو جذبِ صادق کا صلہ کہہ
جدائی شومیِ قسمت کے سر مار
میاں بس قتل کر سکتی ہے شمشیر
مگر باتوں کی ہوتی ہے دگر مار
زمیں پر ایک مستقبل بنالے
یونہی سات آسمانوں سے نہ سر مار
انھیں بھی خیر سے ہو درسِ عبرت
عدو کو دوستوں میں گھیر کر مار
بیاباں جیب میں کیوں بھر رہے ہو
بڑے بوڑھوں نے ماری بھر اگر مار؟

شجاع خاور



عشرت دھولپوری

اُڑان بھرنے کے خواب و خیال سے بھی گئے
لہو لہان پرندے تو ڈال سے بھی گئے
ضمیر بیچنے والوں کو بھیک بھی نہ ملی
جو ہاتھ بن گئے کاسہ، سوال سے بھی گئے
یہ آئینہ تری پہچان تھا، جو ٹوٹ گیا
ہم اِس کے ساتھ ترے خدّ و خال سے بھی گئے
جو اہلِ ظرف نہ تھے جامِ جم ملا اُن کو
شریف لوگ تو جامِ سفال سے بھی گئے
قلم کی فصل کو چاندی سے کاٹنے والے
حوالوں میں بھی نہ آئے مثال سے بھی گئے
قریب رہ کے بھی اک فاصلہ رہا اُس سے
ملی نہ ہجر کی لذّت وصال سے بھی گئے
کیے جو تیری نمک پاشیوں نے زخم عطا
وہ زخم پھر نہ ترے اندمال سے بھی گئے

سیکٹر ۱۱۴۴/۱۲، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی | ۴۲ء فیسرز فلیٹس، مندر مارگ تھانہ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱ | سول لائنز، ٹونک ۳۰۴۰۰۱

معروف چودھری

ہے وسعتِ خیال سے بڑھ کر کنارِ شب
پھیلا ہے روح و جاں کی حدوں تک دیارِ شب

آتے ہیں یاد شام و سحر خواب کی طرح
سینے پہ جانے کب سے کھڑا ہے منارِ شب

پھرتا ہوں تیرگی کا پیمبر بنا ہوا
چہرے پہ میرے بیٹھ چکا ہے غبارِ شب

پالے ہوئے ہیں شب کے ہمیں پھر سے دیکھیے
چاہیں تو ہم ہیں ڈھونڈھ لیں نقش و نگارِ شب

شاید وہیں سے چیزیں نظر صاف آسکیں
اُترے گا جس مقام پہ جاکر خمارِ شب

معرفت انور صدیقی، شعبۂ انگریزی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

محمد شفیع عارف دہلوی

دیکھیں کیا بخششیں دامانِ کرم کوش میں ہیں
جرم ہی جرم مرے بارِ سرِ دوش میں ہیں

ایک لمحے کے لیے اُن سے ملی تھیں نظریں
آج صدیوں کی بہاریں مری آغوش میں ہیں

میرے ہنستے ہوئے چہرے پہ نہ جائے دنیا
لاکھ طوفان نہاں اِس دلِ خاموش میں ہیں

جو مری چشمِ تصوّر کا ہیں سرمایۂ خاص
ایسے نظارے کہاں وادیِ گُل پوش میں ہیں

یہ عجب حسنِ دو رنگی ہے تری محفل میں
کچھ تو بے ہوش نظر آتے ہیں کچھ ہوش میں ہیں

جو عطا بھی کرے سب کو، جو خطا بھی بخشے
یہ ادائیں تو فقط ایک خطا پوش میں ہیں

خاکِ دہلی کا ہوں اِک ذرّۂ بے قدر عارف
جھلکیاں اس کی مری طبعِ سخن کوش میں ہیں

۶/۸، شریف روڈ، لاہور (پاکستان)

نہال تاباں

رنگِ دُنیا، مری نگاہ میں ہے
کیا کہوں کیا، مری نگاہ میں ہے

جس کو سورج نے بھی نہیں دیکھا
وہ سویرا، مری نگاہ میں ہے

آئینہ مجھ کو کیا دکھائے گا
عکس میرا، مری نگاہ میں ہے

کیسے لوٹا گیا چمن میرا
سب تماشا، مری نگاہ میں ہے

اُس کے آنے کو کیا کہوں تاباں
اُس کا جانا، مری نگاہ میں ہے

E/31، نیو آنند نگر، ادھارتل، جبل پور (ایم۔ پی)

محمد شعائر اللہ خاں رامپوری

پنڈت نہرو —— ایک اشاریائی دستاویز

یہ اشاریہ جناب شعائر اللہ خاں نے ہماری گزارش پر ایوانِ اُردو کے نہرو نمبر کے لیے تیار کیا تھا مگر افسوس ہے کہ ہمیں تاخیر سے ملا اور نہرو نمبر میں شامل نہ کیا جا سکا۔ ہم شعائر اللہ خاں صاحب سے معذرت کے ساتھ اب اسے نذرِ قارئین کر رہے ہیں۔
ایسے چند مضامین ہم اگلی اشاعتوں میں بھی دیں گے —— ادارہ

پنڈت جواہر لال نہرو اور مہاتما گاندھی بیسویں صدی کے ہندوستان کی وہ عظیم الشان شخصیات ہیں جن کے بارے میں اُردو میں کافی مواد ملتا ہے۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی ایسا اخبار یا رسالہ ہو جس نے ان دو شخصیتوں کے سلسلے میں کچھ نہ لکھا ہو۔

اس سال نہرو صدی کے موقع سے جب 'ایوانِ اُردو' کے اربابِ حل و عقد نے نہرو نمبر نکالنے کا اعلان کیا اور نہرو جی کے بارے میں اُردو میں شایع ہونے والے مواد کا اشاریہ تیار کرنے کا کام راقم کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ کام شروع کیا گیا۔ نہرو جی کے سلسلے میں اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ یہ مسئلہ پیدا ہو گیا کہ کیا لیا جائے اور کیا چھوڑا جائے۔ طے یہ ہوا کہ ایسے مواد کا احاطہ کیا جائے جس تک ہر آدمی کی بآسانی پہنچ ہو سکے۔ چنانچہ معروف علمی و ادبی اخبارات و رسائل کا اشاریہ بنایا گیا جن کی تفصیل یہ ہے:

ماہنامہ نیا دور۔ لکھنؤ
" نقوش۔ لاہور
ماہنامہ صبا۔ حیدرآباد
" ادبی کائنات۔ دہلی
" آج کل۔ دہلی
" پرواز ادب۔ پٹیالہ
" شاہکار۔ الہ آباد
" تحریک۔ دہلی
" جامعہ۔ دہلی
" ترجمان القرآن۔ لاہور
" زمانہ۔ کانپور
" بہار کی خبریں۔ پٹنہ
" کتاب نما۔ دہلی
" کلیم۔ دہلی
پندرہ روزہ آواز۔ دہلی
دو ماہی شیرازہ۔ سری نگر
سہ ماہی اردو ادب۔ علی گڑھ و دہلی
سہ ماہی اُردو اورنگ آباد
سہ ماہی صبح دہلی
ہفتہ وار ضمیمہ قومی آواز۔ دہلی و لکھنؤ
ہفتہ وار ہماری زبان۔ علی گڑھ و دہلی

چونکہ تحقیق و جستجو میں کوئی کام حرفِ آخر نہیں ہوتا اس لیے ممکن ہے کہ کچھ چیزیں نظر میں نہ آ سکی ہوں۔ اربابِ نظر کی توجّہ فرمانی کا ممنون رہوں گا۔

اس اشاریے کو پنڈت نہرو کی ہمہ جہت شخصیت کے باعث مندرجۂ ذیل موضوعات میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ شخصیت: جس پر کسی نہ کسی انداز سے ہر آدمی نے نہرو کو جانچا اور پرکھا ہے۔
۲۔ منظومات: نہرو کی دلکش شخصیت پر شعرا کا نذرانہ۔
۳۔ سیاسیات: تحریکِ آزادی اور آزادی کے بعد کے ملکی امور میں مدبرانہ کاوشوں کا تذکرہ۔
۴۔ ترقیات: بحیثیت وزیرِ اعظم ہند کے ملکی ترقیات میں نہرو کا حصّہ۔
۵۔ لسانی مسئلہ: ہندوستان کے ایک اہم مسئلے کے سلسلے میں نہرو جی کا رویہ۔
۶۔ ادبیات: بحیثیت ادیب اور مورخ کے نہرو کی شخصیت کا جائزہ۔

موضوعاتی تقسیم کے بعد مضامین کا اندراج ابجدی ترتیب کے مطابق کیا گیا ہے:



ریسرچ فیلو، خدا بخش لائبریری، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴

شخصیت

آہ نہرو	عطاءاللہ پالوی	آج کل	دسمبر	۱۹۶۴ء
اس کی یادوں میں گلوں کی خوشبو	معصوم عزیز کاظمی	نیا دور	نومبر	۱۹۸۱ء
ایک بلند شخصیت ایک اعلا نظریہ	ڈی۔ این۔ واپنچو	آواز	۱۶ مئی	۱۹۸۲ء
ایک روشن دماغ تھا، نہ رہا	فراق گورکھپوری	اردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
بادِ نو بہار۔ جواہر لال نہرو	قاضی عیاض انصاری	صبا	جولائی	۱۹۶۴ء
پنڈت جواہر لال نہرو	مجنوں گورکھپوری	شاہکار	اگست	۱۹۶۴ء
پنڈت جواہر لال نہرو	آصف مجیب	جامعہ	دسمبر	۱۹۸۸ء
پنڈت جواہر لال نہرو	چندر بھوشن سنگھ	زمانہ	اپریل	۱۹۳۶ء
پنڈت جواہر لال نہرو	جوش ملیح آبادی	آج کل	نومبر	۱۹۷۱ء
پنڈت جواہر لال نہرو	خواجہ عبدالغفور	کتاب نما	اگست	۱۹۸۳ء
پنڈت جواہر لال نہرو	مجیب	صبا	جولائی	۱۹۶۴ء
پنڈت جواہر لال نہرو، ارتقائے حیات	گوپی ناتھ امن لکھنوی	آج کل	جولائی	۱۹۶۴ء
پنڈت جواہر لال نہرو، ایک ذاتی تاثر	مجنوں گورکھپوری	صبا	جولائی	۱۹۶۴ء
پنڈت جواہر لال نہرو کا عقلی نظام	حسن عسکری بلکھنوی	اُردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
پنڈت نہرو ــــ لڑکپن سے جوانی تک	معین الرحمٰن	اُردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
پنڈت نہرو کی سرگذشت (تلخیص)	عبداللطیف اعظمی	صبح	ــــ	۱۹۶۸ء
پنڈت نہرو کی شخصیت اور کردار کے چند منوّر پہلو	جعفر حسن	اُردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
پنڈت نہرو کے تعلیمی خیالات	عبداللہ ولی بخش قادری	صبح	ــــ	۱۹۶۸ء
پنڈت نہرو کے لمحاتِ فرصت	بی۔ ایس۔ این۔ مورتی	آج کل	۱۵ جون	۱۹۴۹ء
جدید ذہن کی دریافت ــــ نہرو	وحید اختر	اُردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
جواہر لال، اپنوں اور بیگانوں میں	ادارہ	شیرازہ	جولائی	۱۹۶۴ء
جواہر لال ــــ ایک تاریخ، ایک تاریخ ساز	ساجدہ عابد	صبا	جولائی	۱۹۶۴ء
جواہر لال جی اور گاندھی جی	پنڈت سندر لال	اُردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
جواہر لال نہرو	م۔ ع	جامعہ	مارچ	۱۹۳۶ء
جواہر لال نہرو	آصف علی اصغر فیضی	شیرازہ	جولائی	۱۹۶۴ء
جواہر لال نہرو	ظ۔ انصاری	شیرازہ	جولائی	۱۹۶۴ء
جواہر لال نہرو (۱۸۸۹ء۔ ۱۹۶۴ء)	عبدالماجد دریابادی	صبا	جولائی	۱۹۶۴ء
جواہر لال نہرو	قاضی عبدالغفار	صبا	جولائی	۱۹۶۴ء
جواہر لال نہرو	آل احمد سرور	آج کل	نومبر	۱۹۷۰ء

جواہر لال نہرو (آپ بیتی)	نہرو	نقوش (آپ بیتی نمبر)	حصہ دوم	۱۹۶۴ء
جواہر لال نہرو اور بچے	آصفہ مجیب	صبح	——	۱۹۶۸ء
جواہر لال نہرو اور بچے	صالحہ عابد حسین	صبح	——	۱۹۶۸ء
جواہر لال اور بچے	ڈاکٹر سر رادھاکرشنن	صبح	——	۱۹۶۸ء
جواہر لال نہرو اور کتب بینی	ڈاکٹر ایم سلیم قدوائی	نیا دور	نومبر	۱۹۸۱ء
جواہر لال نہرو —— ایک چراغ ایک نشان	ڈاکٹر کرن سنگھ	شیرازہ	جولائی	۱۹۶۴ء
جواہر لال نہرو —— ایک عہد ساز شخصیت	حسن ساجد	ادبی کائنات	نومبر۔دسمبر	۱۹۸۸ء
جواہر لال نہرو —— چند پہلو	جے لال کول	شیرازہ	جولائی	۱۹۶۴ء
جواہر لال نہرو —— چند یادیں	محمد یونس خاں	آج کل	نومبر	۱۹۷۱ء
جواہر لال نہرو کی عظمت کا راز	سردار احمد	آج کل	نومبر	۱۹۸۰ء
جواہر لال نہرو کی یاد میں	سید محمود	آج کل	جولائی	۱۹۶۴ء
چھوٹے صاحب	شاکر پرشارتھی	پرواز ادب	نومبر۔دسمبر	۱۹۸۸ء
خراج عقیدت	ڈاکٹر ذاکر حسین	صبا	جولائی	۱۹۶۴ء
خراج عقیدت	ڈاکٹر رادھاکرشنن	شیرازہ	جولائی	۱۹۶۴ء
راشٹرپتی جواہر لال نہرو —— چانکیہ	جواہر لال نہرو	صبح	——	۱۹۶۸ء
زعفران کی خوشبو (نہرو کی یاد میں)	رتن سنگھ	ضمیمہ قومی آواز	۱۶ نومبر	۱۹۸۷ء
زندگی ہی زندگی	جوگندر پال	صبا	جولائی	۱۹۶۴ء
سب تمہارے بیٹے	کرشن چندر	صبا	جولائی	۱۹۶۴ء
شری جواہر لال نہرو	خواجہ غلام محمد صادق	شیرازہ	جولائی	۱۹۶۴ء
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے	آل احمد سرور	صبا	جولائی	۱۹۶۴ء
مشاہیر ملک پنڈت جواہر لال نہرو	اقبال بہادر ورما سحر	زمانہ	دسمبر	۱۹۲۴ء
ملک کا معمار اعظم	آر۔ڈی۔ شرما تاثیر	پرواز ادب	نومبر۔دسمبر	۱۹۸۸ء
مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو	سید عابد حسین	صبح	——	۱۹۶۸ء
میرا بھائی (نہرو)	کرشنا ہتھی سنگھ	صبح	——	۱۹۶۸ء
مرے قدح میں ہے صہبائے آتش پنہاں (نہرو کی خود نوشت کا جائزہ)	صابرہ زیدی	اردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
نگہ بلند سخن دلنواز جاں پرسوز	آل احمد سرور	اردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
نہرو اور آزاد	ریاض الرحمٰن خاں شروانی	صبح	——	۱۹۶۸ء
نہرو —— ایک جائزہ	ڈاکٹر کہکشاں پروین	پرواز ادب	نومبر، دسمبر	۱۹۸۸ء
نہرو —— ایک خراج عقیدت	بی۔جی۔ غفور روف	صبح	——	۱۹۶۸ء
نہرو ایک عہد ساز شخصیت	عزیزہ امام	آواز	۱۶ مئی	۱۹۸۲ء

نہرو ــــ ایک معاصر (والٹر کروکر) کی نظر میں	ڈاکٹر عابد رضا بیدار	صبح	ــــ	۱۹۶۸ء
نہرو چاچا اور پائلٹ نشو	اقبال متین	صبا	جولائی	۱۹۶۴ء
نہرو	ڈاکٹر رادھا کرشنن	صبح	ــــ	۱۹۶۸ء
نہرو ــــ کچھ یادیں۔	چیسٹر باؤلز (مترجم: انور صدیقی)	صبح	ــــ	۱۹۶۸ء
نہرو کی عظمت	مسعود حسین خاں	صبح	ــــ	۱۹۶۸ء
نہرو ــــ مہاتما گاندھی کی نظر میں	ــــ	صبح	ــــ	۱۹۶۸ء
نہرو ــــ یگانۂ عصر	مولانا غلام رسول مہر	صبح	ــــ	۱۹۶۸ء
وہ اک چراغ رونق انجمن	عظیم اقبال	پرواز ادب	نومبر۔دسمبر	۱۹۸۸ء
یاد اس کی خوشبو گلاب کی سی ہے	حمیدہ سلطان احمد	صبح	ــــ	۱۹۶۸ء

منظومات

آؤ سورج کا ماتم کریں	راہی معصوم رضا	اُردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
آہ پنڈت نہرو	اسرار اکبرآبادی	اُردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
اے جواہر اے امیرِ کارواں	بگر جالندھری	پرواز ادب	نومبر۔دسمبر	۱۹۸۸ء
بازگشت	سلام مچھلی شہری	اُردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
بروفات رہبر مرحوم	منتر بکودری	پرواز ادب	نومبر۔دسمبر	۱۹۸۸ء
بھارت کا لال	صلاح الدین نیر	اردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
بھارت جسے اقبال کہیں	شباب للت	پرواز ادب	نومبر۔دسمبر	۱۹۸۸ء
بیادِ جواہر لال	عزیز وارثی	صبح	ــــ	۱۹۶۸ء
پنڈت نہرو	شرون کمار ورما	پرواز ادب	نومبر۔دسمبر	۱۹۸۸ء
پیغمبر امن نہرو	باوا کرشن گوپال مغموم	پرواز ادب	نومبر۔دسمبر	۱۹۸۸ء
تیری یہ موت عالمِ انساں کی موت ہے	جگن ناتھ آزاد	اردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
تیرے بعد!	آل احمد سرور	اردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
جواہر	بیتاب پیلی بھیتی	پرواز ادب	نومبر۔دسمبر	۱۹۸۸ء
جواہر لال	ہردیال شوق	پرواز ادب	نومبر۔دسمبر	۱۹۸۸ء
جواہر لال نہرو	[illegible] لال طالب	شیرازہ	جولائی	۱۹۶۴ء
جواہر لال نہرو	اسما سعیدی	صبح	ــــ	۱۹۶۸ء
جواہر لال نہرو	بہار برنی	صبح	ــــ	۱۹۶۸ء
جواہر لال نہرو	صابر ابوہری	پرواز ادب	نومبر۔دسمبر	۱۹۸۸ء
جواہر جیوتی	رفعت سروش	صبح	ــــ	۱۹۶۸ء
جواہر لال کی جے	شفیع الدین نیر	صبح	ــــ	۱۹۶۸ء

جواہر کی یاد	جمیل مظہری	اُردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
چاچا نہرو	مسعودہ حیات	پرواز ادب	نومبر۔دسمبر	۱۹۸۸ء
چراغِ محفل	کرشن موہن	پرواز ادب	نومبر۔دسمبر	۱۹۸۸ء
خراجِ عقیدت	سراج لکھنوی	صبح	—	۱۹۶۸ء
خراجِ عقیدت	روش صدیقی	صبح	—	۱۹۶۸ء
خضرِ رہگذر	حرمت الاکرام	اُردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
دکھ کیا گا رہی ہے سنو	نذیر بنارسی (مترجم)	شیرازہ	جولائی	۱۹۶۴ء
رباعیات	ناوک حمزہ پوری	پرواز ادب	نومبر۔دسمبر	۱۹۸۸ء
رباعیات	علقمہ شبلی	پرواز ادب	نومبر۔دسمبر	۱۹۸۸ء
روحِ گنگا	صلاح الدین نیر	اُردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
روشنی دیدۂ مشرق میں کہاں سے آئے	نشور واحدی	اُردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
رہبرِ اعظم	میکش اکبرآبادی	اُردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
زندہ و جاوید ہے روحِ ہندوستاں	علقمہ شبلی	اُردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
ساتھ تو ہے تو یہ اغیار کی چشمک کیا ہے!	آل احمد سرور	اُردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
مسلکِ جواہر	اقبال احمد سہیل	جامعہ	مارچ	۱۹۲۴ء
شانتی کا دوت	نجمہ عزیز مرادآبادی	پرواز ادب	نومبر۔دسمبر	۱۹۸۸ء
شمع گل ہو گئی	راز اٹاوی	پرواز ادب	نومبر۔دسمبر	۱۹۸۸ء
شہیدِ فرض	رام پرکاش راہی	پرواز ادب	نومبر۔دسمبر	۱۹۸۸ء
فخرِ ایشیا (سانیٹ)	وقار خلیل	شیرازہ	جولائی	۱۹۶۴ء
فرزندِ ہمالہ	وقار صدیقی	اُردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
قطعہ تاریخ وفات نہرو	محمد امین دارآب	شیرازہ	جولائی	۱۹۶۴ء
گلاب تھا جو بجھ گیا	دور آفریدی	اردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
مرا نام لینے والو	علی جواد زیدی	اُردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
مردِ عہد ساز	راز سنتوکھ سری	پرواز ادب	نومبر۔دسمبر	۱۹۸۸ء
مردِ معتبر	سورج تنویر	پرواز ادب	نومبر۔دسمبر	۱۹۸۸ء
مستی کردار	آل احمد سرور	اردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
ملک کا معمار	کرشن مراری	پرواز ادب	نومبر۔دسمبر	۱۹۸۸ء
مہک رہا ہے گلاب	مہدی پرتاپ گڑھی	پرواز ادب	نومبر۔دسمبر	۱۹۸۸ء
میرِ کارواں	اے۔سی۔بہار	اُردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
ندرِ جواہر	میر یٰسین علی خاں	اُردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
نذرِ عقیدت	فلک دہلوی	صبح	—	۱۹۶۸ء

نہرو جینتی	بسمل سعیدی	صبح	——	۱۹۶۸ء
نہرو کی وصیت	حبیب تنویر	شاہکار	اگست	۱۹۶۴ء
نہرو کی وصیت	اختر انصاری	اُردو ادب	(۳-۴)	۱۹۶۴ء
نہرو کی یاد میں (کرن سنگھ کا سانیٹ)	کمال احمد صدیقی (مترجم)	شیرازہ	جولائی	۱۹۶۴ء
وہ ایسا	سید فضل المتین	اردو ادب	(۳-۴)	۱۹۶۴ء

سیاسیات

آزاد اور نہرو، قلعۂ احمد نگر میں	——	شیرازہ	نومبر	۱۹۶۶ء
بین الاقوامی معاملات میں نہرو کا کردار	ٹی۔ این۔ کول	آواز	۱۶ر مئی	۱۹۸۲ء
پنڈت نہرو اور سوشلزم	ابو سالم	اُردو ادب	(۳-۴)	۱۹۶۴ء
پنڈت نہرو سے ایک سیاسی انٹرویو (ماخوذ از مدینہ)	——	ہماری زبان	۱۶ر جنوری	۱۹۴۰ء
پنڈت نہرو کا دورۂ امریکہ	کیشو پال نگم	آج کل	دسمبر	۱۹۴۹ء
پنڈت نہرو کا دورۂ روس	گوپال متل	تحریک	اگست	۱۹۵۵ء
پنڈت نہرو کا فلسفۂ سیکولرازم	سعید احمد اکبرآبادی	اُردو ادب	(۳-۴)	۱۹۶۴ء
جواہر لال نہرو، جدید ہندوستان کے معمار اور معلّم	جمیل مہدی	نیا دور	نومبر	۱۹۸۲ء
جواہر لال نہرو اور کامن ویلتھ	ڈاکٹر وی۔ پی۔ دت	ضمیمہ قومی آواز	۱۶ر نومبر	۱۹۸۶ء
جواہر لال نہرو کا سیاسی کارنامہ	ریاض الرحمٰن شروانی	اُردو ادب	(۳-۴)	۱۹۶۴ء
ڈاکٹر انصاری پنڈت نہرو کی نظر میں	عدیل احمد	آج کل	جنوری	۱۹۸۱ء
شری نہرو —— پانیکر کے آئینے میں	گوپال متل	تحریک	اگست	۱۹۵۵ء
عالمی اخوّت کی سمت	اے۔ بی۔ پٹیل	آواز	۱۶ر مئی	۱۹۸۲ء
قوم پرستوں کے نظریات (نہرو)	ابوالاعلیٰ مودودی	ترجمان القرآن	اکتوبر	۱۹۳۸ء
قومی منصوبہ اور مکمل آزادی	جواہر لال نہرو	جامعہ	جولائی	۱۹۳۹ء
گاندھی اور نہرو —— چند تصورات	محمد یوسف ٹینگ	شیرازہ	جولائی	۱۹۶۴ء
گاندھی اور نہرو کی راہ	گوپی چند نارنگ	صبح	(۲-۴)	۱۹۶۲ء
نہرو اور آزاد تعلقات کے آئینے میں	ڈاکٹر شعیب اعظمی	اردو ادب	(۳-۴)	۱۹۶۴ء
نہرو اور بین الاقوامی ناوابستگی	وی۔ پی۔ دت	آواز	۱۶ر مئی	۱۹۸۲ء
نہرو اور کمیونسٹ	گوپال متل	تحریک	جولائی۔ اگست	۱۹۵۸ء
نہرو ایک اصول پرست انسان	ڈاکٹر رادھا کرشنن	نیا دور	نومبر	۱۹۷۳ء
نہرو ایک عالمی شخصیت	ٹی۔ کے۔ ٹوپ	آواز	۱۶ر مئی	۱۹۸۲ء
نہرو پر گاندھی جی کے اثرات	ایم۔ چیلاپتی راؤ	ضمیمہ قومی آواز	۱۳ر نومبر	۱۹۷۷ء
نہرو تاریخ کے صفحات میں	بیگم انیس قدوائی	ضمیمہ قومی آواز	۱۶ر نومبر	۱۹۸۶ء

نہرو کی وصیت	جواہر لال نہرو	پرواز ادب	نومبر۔دسمبر	۱۹۸۸ء
نہرو کے بعد کون !	ڈاکٹر سید عابد حسین	شیرازہ	جولائی	۱۹۶۴ء
نہرو کے نزدیک سماج کا تصور	اندامشرا	آواز	۱۶ مئی	۱۹۸۲ء
نہرو معمارِ قوم	ایم۔ چیلاپتی راؤ	آواز	۱۶ مئی	۱۹۸۳ء

ترقیات

جواہر لال نہرو کی تعلیمی پالیسیاں	عزیز مرادآبادی	پرواز ادب	نومبر۔دسمبر	۱۹۸۸ء
نہرو اور جدید سائنس کی بنیاد	ایچ۔ جے۔ بھابھا	آواز	۱۶ مئی	۱۹۸۲ء
نہرو اور سائنس	یش۔ پال	آواز	۱۶ مئی	۱۹۸۲ء
نہرو اور سائنس	سلطانہ زیدعلی	ضمیمہ قومی آواز	۱۴ نومبر	۱۹۸۷ء
نہرو اور ہمارے قبائل	کے۔ ایل۔ مہتہ	آواز	۱۶ مئی	۱۹۸۲ء
نہرو ــــ امدادِ باہمی تحریک کے رہنما	مادھوراؤ	صبا	جولائی	۱۹۶۴ء
نہرو دور میں کلاسیکل سنگیت کی ترقی	جاوید لطیفی	صبا	جولائی	۱۹۶۴ء
نہرو کا تصورِ منصوبہ بندی	موہن لال مصری	شیرازہ	جولائی	۱۹۶۴ء

زبان کا مسئلہ

اُردو کے لیے پنڈت نہرو کی اپیل	ــــــ	ہماری زبان	۱۵ جون	۱۹۵۸ء
پنڈت نہرو اور مسئلہ زبان	ــــــ	اُردو	جولائی	۱۹۳۷ء
پنڈت نہرو اور ہندی	ــــــ	ہماری زبان	۱۶ اکتوبر	۱۹۳۹ء
پنڈت نہرو اور ان کا نظریۂ زبان	احسن نشاط	اُردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
پنڈت نہرو اور ہندی پرچار	ــــــ	اُردو	جنوری	۱۹۳۷ء
پنڈت نہرو کی پریس کانفرنس اور اُردو	ــــــ	ہماری زبان	۸ جولائی	۱۹۵۸ء
جواہر لال نہرو اور اردو	ڈاکٹر عبدالغفار شکیل	اُردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
رسم الخط کا مسئلہ	جواہر لال نہرو	صبح	ــــــ	۱۹۶۸ء
رسم الخط کا مسئلہ	جواہر لال	اُردو	جولائی	۱۹۳۶ء
زبان کا مسئلہ	جواہر لال نہرو	صبح	ــــــ	۱۹۶۸ء
نہرو اور اُردو	مدیر	ہماری زبان	۸ مارچ	۱۹۵۹ء
نہرو کی مادری زبان	مدیر	ہماری زبان	یکم دسمبر	۱۹۴۰ء

ادبیات

پنڈت نہرو بحیثیت ایک مصنف کے	عبدالقادر سروری	شیرازہ	جولائی	۱۹۶۴ء

پنڈت نہرو کا (اردو) خط بنام مسعود علی ندوی	(مکتوبہ ۱۰ر جنوری ۱۹۵۷ء)	ضمیمہ قومی آواز	۱۶ر نومبر	۱۹۸۷ء
پنڈت نہرو کی شادی کا دعوت نامہ اُردو میں	ـــــــــ	ضمیمہ قومی آواز	۱۶ر نومبر	۱۹۸۷ء
پنڈت نہرو کے چند خطوط	(مرتبہ) عبداللطیف اعظمی	صبح	ـــــــ	۱۹۶۸ء
جواہر لال نہرو بحیثیت ادیب	جگن ناتھ آزاد	پرواز ادب	نومبر، دسمبر	۱۹۸۹ء
جواہر لال نہرو بحیثیت تخلیق کار	آر۔ ڈی۔ شرما تاثیر	آواز	۱۶ر مئی	۱۹۸۵ء
جواہر لال نہرو کا ادبی مرتبہ	جگن ناتھ آزاد	بہار کی خبریں	جنوری	۱۹۸۴ء
جواہر لال نہرو کی جیل کے زمانے کی تصنیفات	شاہدہ غفران زیدی	آج کل	نومبر	۱۹۶۸ء
جواہر لال نہرو کی ادبی شخصیت	پروفیسر راجندر سنگھ ورما	پرواز ادب	نومبر، دسمبر	۱۹۸۸ء
جواہر لال نہرو مورخ کی حیثیت سے	ڈاکٹر تارا چند	اُردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
میری کہانی (از نہرو)	م۔ ع۔ ع	کلیم	دسمبر	۱۹۳۶ء
نہرو اپنی تحریروں کے آئینے میں	معین اعجاز	آواز	۱۶ر مئی	۱۹۸۳ء
نہرو ایک انسان ایک ادیب (از ہمایوں کبیر)	مترجم: عبدالحیٔ	اُردو ادب	(۳۔۴)	۱۹۶۴ء
نہرو بحیثیت ادیب	پروفیسر راجندر سنگھ ورما	ضمیمہ قومی آواز	۱۶ر نومبر	۱۹۸۷ء
نہرو مفکر اور ادیب	احتشام حسین	صبح	ـــــــ	۱۹۶۸ء

پیاس کو بوند دے صحرا کو گھٹا دے اللہ
دل کے ویرانے میں کچھ پھول کھلا دے اللہ

دھوپ ہی دھوپ ہے پھیلی ہوئی تا حدِ نظر
تپتے پیکر کو مرے ٹھنڈی ہوا دے اللہ

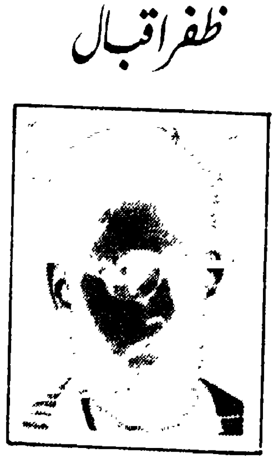
زندگی کانٹوں کے بستر پہ سدا گزری ہے
ڈوبتی سانسوں کو پھولوں کی ردا دے اللہ

دل ہے بے چین مرا پاک فضاؤں کے لیے
سبز گنبد مری آنکھوں کو دکھا دے اللہ

اس کے پھول ہیں دل میں نہ تمنّا کے شجر
شاخِ اُمّید کو پھولوں کی ردا دے اللہ

ہر طرف پھیلی ہوئی آگ ہے نفرت کی یہاں
آگ کے شعلوں کو گلزار بنا دے اللہ

ظفر اقبال



۷۰/۱، خیلدار، فتح پور ۲۱۲۶۰۱ (یو۔پی)

ساحل احمد

میں لبادہ اوڑھ کر جانے لگا
پتھروں کی چوٹ پھر کھانے لگا

میں چلا تھا پیڑ نے روکا مجھے
جب برستی دھوپ میں جانے لگا

دشت سارا سو رہا تھا اٹھ گیا
اُڑ کے طائر جب کہیں جانے لگا

پیڑ کی شاخیں وہیں رونے لگیں
ابر کا سایہ جہاں چھانے لگا

پتھروں نے گیت گایا جن دِنوں
اُن دِنوں سے آسماں گانے لگا

سلسلہ آگے بڑھے گا دھوپ کا
پنگھٹوں کو راستہ جانے لگا

شعبۂ اُردو، ای۔سی۔کالج، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

ماجد دیوبندی

ہم جس زمیں پہ رہتے ہیں وہ آسمان ہے
اُس آسماں کا نام ہی ہندوستان ہے

مجھ کو یہ تیز دھوپ بھلا کیا جلائے گی
میرے لیے تو ماں کی دُعا سائبان ہے

دُنیا ستم شعار سہی، بے وفا سہی
لیکن خدا کی ذات بڑی مہربان ہے

ہر شخص چاہتا ہے کہ پر اُس کے نوچ لے
جس خوشنما پرندے کی اونچی اُڑان ہے

میں نے بھی اس سے ترکِ تعلق کی سوچ لی
وہ بھی مری طرف سے بہت بدگمان ہے

ترکش میں کوئی تیر ہی باقی نہیں رہا
ماجد اب اُس کے ہاتھ میں خالی کمان ہے

شعبۂ اُردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

سلطان سبحانی

سایہ

کبھی کبھی ماضی اچانک سامنے آجاتا ہے۔
آج عرصے بعد اُسے دیکھا تو یہی محسوس ہوا۔

وہ کافی دیر سے ڈرائنگ رُوم میں میرے سامنے موجود ہے اور جب سے وہ میرے سامنے ہے میرا ذہن ماضی کی چھتنار شعاعوں سے منوّر منوّر ہے۔ بہت سارے مناظر حصار باندھ کر گشت کرنے لگے ہیں۔ بہت سی آوازیں آنے لگی ہیں۔ درد کے بہت سارے دریچے کُھل گئے ہیں۔ لگتا ہے کہ میں روح کی گہرائیوں میں جاگ اٹھا ہوں، اور لوگ کہتے ہیں کہ پیچھے مڑکر دیکھنے والا پتھر کا ہوجاتا ہے۔

میں اس سے کہتا ہوں۔ "دوست! آج تم اپنے ساتھ ماضی کی بارات لے کر آئے ہو۔ میں اپنے اندر بہت دھوم دھڑاکا محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں ہم تم کھیل کود پڑھائی لکھائی دھوم مستی غرض کہ ہر معاملے میں اپنی مثال آپ تھے۔"

وہ مسکراتا ہے ــــــ "لیکن آج تو ہماری مثالیں الگ الگ ہیں۔ میرے اور تمھارے درمیان زمین و آسمان کا فاصلہ در آیا ہے۔ تمھارے پاس زمین، کارخانے، عمارت، کاریں اور ملازم وغیرہ سبھی کچھ ہے اور میرے پاس خانہ بدوشی، حادثات، تکلیفیں، بیماریاں اور تنگ دستی۔"

میں نگاہیں اُٹھا کر سامنے کی دیوار پر آویزاں اپنے ماں باپ کی تصویروں کو دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ کاش وہ اس وقت میرے ساتھ ہوتے۔ میری خاطر انھوں نے کتنی تکلیفیں برداشت کیں۔ کتنی قربانیاں دیں۔ افسوس کہ وہ اچھے دن نہیں دیکھ سکے۔ انھوں نے صرف بُرے دن دیکھے اور رُخصت ہو گئے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ مگر یہ صرف میں جانتا ہوں کہ یہ کارخانے، عمارات اور زمین وغیرہ سب انھیں کی تربیت اور دُعاؤں سے مجھے حاصل ہوئی ہیں۔

میں اس سے کہتا ہوں۔ "مگر یہ تو بتلاؤ تم اتنے عرصے کہاں غائب رہے۔ کیا کرتے رہے؟ کیا تمھیں خبر ہے کہ ہم لگ بھگ تیس سال بعد ملے ہیں؟"

وہ ٹیبل پر اُنگلی سے لکیریں کھینچتا ہوا بہت دُکھ بھرے انداز میں کہتا ہے۔ "اپنے خاندان کے لیے میں نے خانہ بدوشی کی زندگی اختیار کی۔ مختلف شہروں میں بہت محنت مشقّت کی۔ دن رات جدّوجہد میں لگا رہا۔ ملازمت بھی کی، تجارت بھی کی لیکن اس کے بعد بھی ترقی نہیں کر سکا بلکہ اور بھی حواس باختہ ہو گیا۔ میں ایسا سمجھتا ہوں کہ یہ سب قسمت کا کھیل ہے . . . . "

مجھے ہنسی آجاتی ہے۔ "یہ سب قسمت کا کھیل نہیں، بلکہ قسمت تو وہ شے ہے جس سے ہم جس طرح چاہیں کھیلتے ہیں"

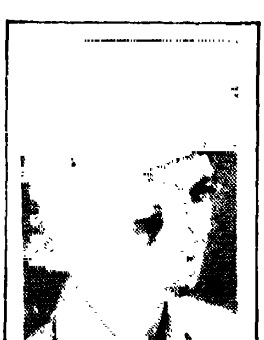
"لیکن میں نے جدّوجہد کی ہے۔"

"ہر چیز جدّوجہد سے حاصل نہیں ہوتی۔" میں مسکراتا ہوں۔ "اور بھی بہت سارے ذرائع ہیں۔ اگر کوئی سونے کی انگوٹھی تالاب میں گر گئی ہو تو ضروری نہیں کہ اس کے لیے پورا تالاب خالی کیا جائے۔ وہ دوسری طرح سے نہایت آسانی سے دستیاب ہو سکتی ہے۔"

"دوست، انگوٹھی اور قسمت میں فرق ہے۔" وہ مسکراتا ہے۔

"میں قسمت کو انگوٹھی سمجھتا ہوں۔" مجھے ہنسی آجاتی ہے اور پھر یاد آتا ہے کہ بچپن میں ایک بار میری تانبے کی انگوٹھی گم ہو گئی تھی تو اس حقیر انگوٹھی کے لیے میرے ماں باپ دونوں نے گھر کا کونا کونا چھان مارا تھا اور آخر دالان میں پڑے ہوئے کچھ پتھروں کے نیچے سے اُسے ڈھونڈ نکالا تھا۔ وہ انگوٹھی اگرچہ آج میری انگلیوں کے قابل نہیں ہے۔ لیکن میں نے اسے بہت سنبھال کر رکھا ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ میرا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ یہ ساری دولت اُس تانبے کی انگوٹھی کے سامنے ہیچ ہے۔

وہ کھڑکی پر لہراتے ہوئے پھول دار رنگین پردوں کی طرف کچھ لمحے دیکھتا رہتا ہے، پھر کہتا ہے۔ "ایک بات پوچھوں؟ بھئی تم نے اتنا سرمایہ کیسے اکٹھا کر لیا۔ مجھے تو یہ سب دیکھ کر بہت حیرت ہو رہی ہے۔ یاد ہے، کبھی ہم دونوں



۱۹۳، ایم۔ ایچ۔ بی۔ کالونی، مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳ (ناسک)

ے والد ایک ہی فرم میں ملازم تھے۔ پھر ہم دونوں ل کہانیوں میں اتنا فرق کیسے آگیا؟"

میں کہتا ہوں ۔۔۔۔ "کہانیاں بھی پیڑ پودوں کی طرح ہیں کہ ان میں بے شمار شاخیں ہوتی ہیں۔ جڑیں، تنے، پھول، پتے، کانٹے اور ثمر۔ ۔۔۔۔ جو پیڑ اپنی جڑیں زیرِ زمین بہت دور تک دراز کر دیتے ہیں وہ جلد بانجھ نہیں ہوتے اور کچھ پیڑوں کی جڑوں کے سامنے سنگلاخ زمین آجاتی ہے جس کی وجہ سے وہ زرخیزی کی جانب سفر نہیں کر پاتیں۔ ۔۔۔

خیر چھوڑو، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سرمایہ کوئی بھی اکٹھا کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس نے اپنی جبلت کے مطابق صحیح لائن اختیار کی ہو۔ شاید تمھیں تعجب ہوگا کہ میرے پاس اتنا سب کچھ ہے مگر میں خوش نہیں ہوں۔ مجھے کسی چیز کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ میں اپنے اندر کوئی بہت بڑا غم محسوس کر رہا ہوں . . . ."

"کون سا غم؟"

"کچھ غم ایسے ہوتے ہیں جو صرف سہے جا سکتے ہیں۔ بیان نہیں کیے جا سکتے"۔ میں کھڑکی سے باہر جھومتے ہوئے گلاب کے پھول کو دیکھتا ہوں تو ایک مہکتا ہوا گلابی منظر یاد آجاتا ہے۔

میں ایک ننھا منا سا بچہ ہوں اور اپنے والد کے کاندھے پر بیٹھا ہوا بھرے پُرے میلے سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ پُرشور، مسرور، رنگین اور جھومتا ہوا میلہ . . . . طرح طرح کے لوگ۔ کھیل کود۔ نٹ کے تماشے۔ باجے گاجے۔ مٹھائیاں۔ غبارے۔ پھرکیاں۔ کھلونوں کی دکانیں۔ میری ماں بھی ساتھ ہے۔ وہ مجھے باپ کے کاندھے پر بیٹھا دیکھ کر بہت خوش ہے۔ اس کی آنکھوں میں ستارے سے چمک رہے ہیں . . . . ایک ہنڈولے کے قریب رُک کر وہ مجھے اس میں بٹھانا چاہتے ہیں۔ مگر میں ڈر جاتا ہوں اور ضد کرتا ہوں "پاپا تم بھی بیٹھو نا"۔ مجبوراً میرے ساتھ ماں باپ بھی اس ہنڈولے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ ہنڈولہ اوپر اُٹھتا ہے . . . اور اوپر . . . اور پھر نیچے غوطے لگاتا ہے۔ ہم سب بہت خوش ہوتے ہیں اور پھر لگاتار چکر ہی چکر۔

والد صاحب دل کے مریض ہیں۔ بہت پرانے مریض۔ لیکن میری خوشی کی خاطر وہ ہنڈولے میں بیٹھ گئے ہیں۔ کچھ بھی ظاہر نہیں ہونے دے رہے ہیں۔ بار بار ہونٹ بھینچ لیتے ہیں۔ دل پر ہاتھ بھی رکھ لیتے ہیں لیکن میری طرح ہنس رہے ہیں۔

"ایسا لگ رہا ہے کہ تم کچھ سوچ رہے ہو"۔ وہ میری طرف غور سے دیکھتا ہے۔

میں چونک اُٹھتا ہوں "ہاں! ۔۔۔ میں بہت پیچھے چلا گیا تھا۔ اس مقام پر جہاں مجھ سے آگے کچھ نہیں ہے۔ سب کچھ پیچھے ہے"۔

وہ شاید میری بات سمجھ نہیں پاتا۔ مسکرا کر کہتا ہے "تم واقعی بہت آگے ہو چکے ہو۔ تمھارے پاس کسی شے کی کمی نہیں اور ایک میں ہوں کہ کرائے کے مکان میں رہتا ہوں۔ اپنے بچوں کی کتابوں کاپیوں کے لیے مجھے قرض لینا پڑتا ہے۔ تم واقعی بہت خوش قسمت انسان ہو"۔

"یعنی پھر وہی قسمت کی بات۔ ارے بھئی ابھی کچھ دیر پہلے میں نے قسمت کے بارے میں جو کچھ کہا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ . . . . خیر جانے دو۔ کوئی سنے گا تو سوچے گا کہ بہت ترقی پسند ہو گیا ہے۔ دراصل جدوجہد دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک مثبت اور دوسری منفی . . . ." مجھے بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے۔ "تم تو جانتے ہو کہ انسان کا دماغ کتنا عظیم ہے اور اس کے ہاتھ کتنے دراز۔ لیکن یہ بھی ضرور کہوں گا کہ جو ہاتھ ناجائز طور سے دراز ہوتے ہیں وہ انسان کے ہاتھ نہیں بلکہ کرگس کے ہاتھ ہیں"۔

"کرگس کے ہاتھ نہیں ہوتے"۔ وہ ہنس دیتا ہے۔

"اس کے ہاتھ ہمیں دکھائی نہیں دیتے"۔ میں مسکراتا ہوں "وہ صرف اپنی آنکھ، پیٹ اور چونچ کو ہمارے سامنے نمایاں کرتا ہے . . . . دوست آج تم ماضی کی بارات لے کر آئے ہو۔ ماضی جو یادوں کا جھومتا ہوا موسم ہے جو کبھی بچے کے ہاتھ کے سکے کی طرح کھو جاتا ہے مگر کہیں نہ کہیں چمک اٹھتا ہے۔ مجھے یاد ہے ایک دن جب شہر کی ندی میں سیلاب آیا تھا اور ہم تیراکی کے شوق میں کود پڑے تھے۔ اس وقت اگر تم نہ ہوتے تو شاید میں بھی ماضی کا حصہ بن جاتا۔ میری بھی کہانی ختم ہو جاتی . . . یاد ہے نا؟"

"ہاں مجھے یاد ہے لیکن اگر میری جگہ تم ہوتے تو تم بھی وہی کرتے"۔

"بے شک، دوست وہی ہوتا ہے جو دوست کے لیے اپنی جان پر کھیل جائے۔ لیکن پیارے تم نے اپنے بُرے دنوں میں مجھے یاد کیوں نہیں کیا۔ تمھاری باتیں سُن کر مجھے بڑا افسوس ہو رہا ہے۔ قسمت کے جال میں پھنس گئے تھے نا۔ اس چکر سے اب نکل جاؤ۔ میں اسے ایک ذہنی بیماری سمجھتا ہوں ایک ایسی بیماری . . . ."

اور اچانک میں دیکھتا ہوں کہ میں بے حد بیمار پلنگ پر پڑا ہوں۔ گھڑی میں رات کے تین بجے ہیں۔ والد صاحب قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گئے ہیں اور میری ماں

میرے سرہانے بیٹھی میرا سر دبا رہی ہے، مجھے تھپک رہی ہے۔ وہ بہت تھک چکی ہے۔ اس کی آنکھیں کئی راتوں سے جاگی ہوئی ہیں، اسے بار بار نیند کے جھکولے آ رہے ہیں مگر وہ سر کو جھٹک دیتی ہے۔

"دوست تم کہاں کھو گئے؟" وہ مجھے آواز دیتا ہے۔

"نہیں میں کھویا نہیں، بلکہ جو کھو گئے ہیں انھیں اور بھی قریب سے دیکھ رہا تھا۔ اچھا ایک بات بتلاؤ۔ تمھارے ماں باپ کیسے ہیں۔ کس حال میں ہیں؟"

"میرے ماں باپ؟" وہ اداس ہو جاتا ہے۔ "ماں گھر کے کام کاج میں تھوڑا بہت میری بیوی کا ہاتھ بٹا لیتی ہے لیکن اکثر بیمار رہتی ہے اور والد تو کئی سال سے دمے کے مرض میں مبتلا ہیں۔ جب سے وہ ریٹائر ہوئے ہیں مجھ پر اور پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ گھر کا سارا بوجھ میرے کاندھوں پر ہے۔ آمدنی کا کافی حصہ دواؤں کی نذر ہو جاتا ہے۔"

میں مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھتا ہوں۔

منظر یہ ہے کہ گھر میں کہرام مچا ہوا ہے۔ والد صاحب کا دل ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا ہے۔ میری ماں صدمے کی تاب نہ لاکر بے ہوش ہو گئی ہے۔ میری بیوی اور بچے بھی بے تحاشا رو رہے ہیں اور میں پاگل سا ہو گیا ہوں۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ ہنڈولہ زمین کے اندر جا رہا ہے۔ بہت اندر ۔۔۔

وہ کہتا ہے۔ "سن رہے ہو نا؟ —— میں جب بھی گھر میں داخل ہوتا ہوں۔ ماں باپ کے اداس، بیمار اور اُجڑے ہوئے چہرے دیکھ کر مجھے بے انتہا تکلیف ہوتی ہے۔ میں اتنا مجبور ہوں کہ ان کے بڑھاپے میں بھی انھیں سکھ نہیں دے پا رہا ہوں۔ اور پھر میں اپنے بچوں کے بارے میں بھی سوچتا ہوں کہ اگر یہی حال رہا تو ان کے مستقبل کا کیا حشر ہوگا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو ——" میں آہستہ سے سر ہلاتا ہوں۔ "مستقبل کی بنیاد تو آج کے کاندھوں پر ہوتی ہے۔ اگر آج شکستہ اور مخدوش ہو تو مستقبل کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں۔"

اس کی آواز بھرّا سی جاتی ہے۔ "میرا تو ماضی بھی ٹھیک نہیں۔"

"ماضی خواہ کیسا بھی ہو سمجھ دار انسان اس کے بھی کچھ حصوں کو جوڑ کر رکھتا ہے۔ میرے پاس جو تانبے کی انگوٹھی ہے۔ وہ آج بھی چمک رہی ہے۔"

"دوست تم بہت معنی خیز اور فلسفیانہ باتیں کر رہے ہو۔ یہ اشاروں کنایوں کی زبان میری سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ سب کہاں سے سیکھا تم نے۔"

"ماضی سے ——" میں مختصر سا جواب دیتا ہوں۔ "ماضی بہت گہرا ہے ۔۔۔"

میں خاموش ہو جاتا ہوں مگر اسی گہرائی میں دیکھتا ہوں کہ وہ ماں جو مجھے روزانہ اسکول پہنچانے جاتی تھی۔ پارک میں سیر کرانے اور کھلونوں کی دکان پر لے جاتی تھی۔ جو روزانہ میرے کپڑے تبدیل کرتی تھی۔ میرے لیے کھانا پروستی تھی۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد ایک دم ٹوٹ چکی ہے مگر اب دن رات میرے بچوں کو خوش رکھنے میں مصروف ہے۔ انھیں اسکول لے جاتی ہے۔ پارک لے جاتی ہے۔ ان کے کپڑے تبدیل کرتی ہے۔ رات میں انھیں میٹھی میٹھی کہانیاں سناتی ہے ۔۔۔

اور پھر اچانک منظر تبدیل ہو جاتا ہے

گھر میں پھر کہرام مچا ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے مجھ پر کبھی دھوپ نہیں آئی۔ جس کی وجہ سے میرے بچوں پر کبھی دھوپ نہیں آئی۔ جو چار چار راتیں میرے پاس بیٹھ کر تیمارداری کرتی تھی۔ جس کی لوری سن کر میں میٹھی نیند سو جاتا تھا۔ جس کی کہانیاں سن کر میرے بچے خواب میں کھو جاتے تھے۔ وہ خود شاید پہلی بار سوئی ہے۔

"دوست!"

"ہوں ——" اس کی آواز سن کر میں چونک اُٹھتا ہوں۔

"تمھاری آنکھوں میں آنسو؟"

"نہیں تو ——" میں مسکرانے کی کوشش کرتا ہوں۔ "دراصل مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں بہت عرصے سے سویا نہیں ہوں۔ اس لیے آنکھوں میں پانی آ گیا ہے ۔۔۔۔ ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے؟"

"ہاں میں کچھ کہہ رہا تھا۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ تمھارے اندر کوئی بہت بڑا غم ہے۔ تم بار بار کھو جاتے ہو۔ مجھے بتلاؤ آخر کیا بات ہے؟"

"بھئی کوئی بات نہیں۔ مجھے کس بات کا غم۔ میرے پاس اتنا سرمایہ ہے کہ ۔۔۔" میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ اسے کس طرح بتلاؤں کہ مجھے کیا غم ہے۔ اسے کس طرح سمجھاؤں کہ اتنا سرمایہ اکٹھا کرنے کے بعد بھی میں خود کو کتنا بدنصیب سمجھ رہا ہوں۔ اپنے گھر میں، اپنے دل میں، اپنے آس پاس اور اپنے سر کے اوپر کتنی بڑی کمی محسوس کر رہا ہوں۔ اسے کس طرح بتلاؤں کہ میں ہر وقت

یہی سوچتا ہوں کہ کاش صرف ایک لمحے کے لیے میرے ماں باپ سامنے آجائیں۔ انھیں میں ایک بار پھر دیکھ لوں۔ یا وہ مجھے دیکھ لیں ـــــــ صرف ایک نظر . . .

وہ کہتا ہے "معاف کرنا دوست۔ میں نے اپنا دکھڑا رو کر تمھارا بہت سارا قیمتی وقت ضائع کیا۔ میں دراصل اپنی زندگی کی ناکامیوں پر بہت شرمندہ ہوں۔"

"شرمندگی کا ہے کی۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنے حالات بتلائے۔ ہمت سے کام لو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کچھ ٹھیک نہیں ہوگا۔" وہ مایوس آواز میں کہتا ہے۔ "زندگی بھر کی جدّوجہد کا حاصل دیکھ لیا۔ ایسا لگتا ہے کہ آگے اور بھی گہرا اندھیرا ہے۔ جہاں بہت ساری تکلیفیں، غم اور اُداسیاں میری منتظر ہیں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اس زندگی سے موت بہتر کہ میں اپنے بچوں کی ادنا سی خواہشیں بھی پوری نہیں کر پاتا۔ ماں باپ کے لیے مناسب دوائیں بھی نہیں لا پاتا۔ انھیں اچھا کھانا بھی نہیں دے سکتا۔ انھیں دیکھتا ہوں تو میں اور بھی دکھی ہو جاتا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ وہ مر جاتے تو اچھا ہوتا۔"

میں چونک کر اس کی طرف دیکھتا ہوں۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"اور کیا کہوں ـــــــ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ مجھ سے زیادہ بدنصیب کوئی نہیں۔ بہت بدنصیب ہوں میں۔" وہ خاموش ہو جاتا ہے۔

میں میز کی دراز سے چیک بک کھینچ کر اس پر ایک بڑی سی رقم لکھ کر دستخط کر دیتا ہوں۔

"اگر نصیب کی کوئی حقیقت ہے تو تم بدنصیب نہیں ہو۔"

"بدنصیب نہیں ہوں؟" وہ میری طرف حیرت سے دیکھتا ہے۔ "یہ تم کس بنیاد پر کہہ رہے ہو؟"

میں اس کی طرف چیک بڑھا دیتا ہوں۔

"لو اسے قبول کرو ـــــــ میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ تم بدنصیب نہیں بلکہ میرے نزدیک انتہائی خوش نصیب ہو۔"

"میں اور خوش نصیب؟"

میری آنکھوں میں بے اختیار دو ننھے منّے قطرے چمک اُٹھتے ہیں۔

"ہاں ـــــــ بے انتہا خوش نصیب کیونکہ تمھارے ماں باپ ابھی زندہ ہیں۔"

○○

ظہیر بابیار

اوقات بدلتے ہیں
دن رات بدلتے ہیں

ہر بار قسم کھا کر
وہ بات بدلتے ہیں

ہوتے ہیں شجر تازہ
جب پات بدلتے ہیں

دل تو وہی رہتا ہے
جذبات بدلتے ہیں

کب جانے ظہیر اپنے
حالات بدلتے ہیں

۵-۵-۲/۲ نل صاحب اسٹریٹ، بیرونِ قلعہ رائچور ۵۸۴۱۰۱

تم اگر چُپ اُداس اور خاموش
گھر کا گھر چُپ اُداس اور خاموش
زندہ رہنے کی جنگ سارا دن
رات بھر چُپ اُداس اور خاموش
راستہ سائیں سائیں کرتا ہے
ہم سفر چُپ اُداس اور خاموش
قافلے والے شور کرتے ہیں
راہ بر چُپ اُداس اور خاموش
پنکھڑی ہنس رہی ہے پھولوں کی
دیدہ ور چُپ اُداس اور خاموش
اِن دنوں جب بھی دیکھا باقیؔ کو
بیشتر چُپ اُداس اور خاموش

باقی غازی پوری

کپور پور، غازی پور ۲۳۳۰۰۱ (یو.پی)

امروز

ہے نقشِ کارواں نہ کہیں گردِ کارواں
منزل کی جستجو میں چلے آئے ہم کہاں

کب تک لہو سے ہولیاں کھیلے گا آدمی
کب تک جلیں گی یوں ہی فسادوں میں بستیاں

کیا جانے وقت کون سا منظر دکھائے گا
چہرے بُجھے بُجھے سے ہیں آنکھیں دھواں دھواں

اِک رنگ اس کے چہرے پہ آکر گزر گیا
اِک بات دب کے رہ گئی ہونٹوں کے درمیاں

نکلے تو ہو تلاش میں لیکن نہ پاؤ گے
اِس شہرِ پُر فریب میں سچّائی کے نشاں

جھار کھنڈی، بازار سادھو داس، سکندرآباد (یو.پی)

شبیب احمد

بازی

الطاف بھائی میرے پیارے پیارے کزن ہیں۔ مجھے ان پر فخر ہے۔ ان کے رہن سہن ان کی خصلتوں پر ناز ہے۔ ان کی ایک عادت جو خاندان بھر میں مشہور تھی ان کی خودداری تھی۔ بچپن والد صاحب کی وساطت سے عیش سے گزرا۔ جوانی کے ایام بھی بے فکری میں گزرے۔ شادی ہوئی۔ بیوی سارے رشتے داروں کو ان سے کچھ زیادہ ہی پیاری لگی جہاں آتے الطاف بھائی دو آئیٹم بنانے کو کہتے وہ ایک آئیٹم زیادہ ہی بنائے ہوئے ہوتیں۔ اپنے شوہر کی طرح چاندی میں پلی تھیں سونے میں تُلی الطاف بھائی کے پاس آگئیں پر کیا مجال جو غریب یا اپنے سے کم تر لوگوں میں کبھی اپنی بڑھائی کا ذکر کر دیں۔

میں ایسے ہی لوگوں کی تلاش میں رہتا ہوں۔ سادہ سادہ جن کی طبیعت ہو تصنع سے یکسر عاری جن کے مزاج ہوں۔ رشتے داری گو دور کی تھی پر میں ان سے قریب تر ہو گیا۔

اپنی خودداری پر الطاف بھائی اور ان کی بیگم صاحبہ کبھی آنچ نہ آنے دیتے۔ بچوں کے لیے کبھی کبھار میں مٹھائی، چاکلیٹ یا پھل لے جاتا۔ پہلی بار دوسری بار۔ دونوں کے چہرے بدلے تھے۔ تیسری بار بھابھی صاحبہ نے صاف الفاظ میں کہہ دیا "شبیب بھائی آپ کی یہ بات ہمیں پسند نہیں ہے۔"

"کون سی بات؟" میں گڑبڑا گیا تھا۔

"یہاں آتے وقت آپ کچھ نہ کچھ لاتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے آئندہ اس سے پرہیز کیجیے۔"

"پر حرج ہی کیا ہے بچوں کے لیے لاتا ہوں" میں نے جرح کی۔

"ذرا فریج کھول کے دیکھیے۔ بھرا رہتا ہے اس کا سینہ۔ اگر خالی بھی رہے۔ . . ." وہ بولی تھیں۔

میں نے ان کی بات کاٹی "پر بھابھی! آپ کا فریج اگر ڈکاریں بھی لے رہا ہو تو یہ فرض ہے کہ . . . ."

اس بار انھوں نے میری بات اُچک لی۔

"شبیب صاحب! آپ کے اس عمل کو میں منفی پہلو سے ہرگز نہیں دیکھ رہی ہوں۔ تاریکی کو بھی ہم اُجالا سمجھتے ہیں۔ مجھے آپ سے شکایت نہیں ہے۔ آپ ایسا مت کیجیے آئندہ۔ یہ گزارش ہے اور آپ کے الطاف بھائی کی جانب سے بھی ہے۔"

○

میں نے وہاں جانا کم کر دیا۔ اس بات کو محسوس کیا دونوں نے ہی۔ اور ایک دن سڑک پر الطاف بھائی نے روک لیا۔

"کیا بات ہے محترم۔ آج کل نظر نہیں آرہے۔"

"مصروف رہنے لگا ہوں تھوڑا" میں نے بات چھپائی۔

"ذرا ہی تو مصروف ہیں۔ آجایئے۔ بلکہ چلیے ابھی . . ." انھوں نے کہا۔ میں نے اگلے دن کا وعدہ کیا۔ اب ایسا بھی تو نہیں تھا کہ پورا قطع تعلق کر لیتا ان لوگوں سے مجھے۔

پس دوسری شام پہنچا۔ الطاف بھائی موجود نہیں تھے۔ بھابھی صاحبہ نے آڑے ہاتھوں لیا۔ میں نے بھی کمر کس لی۔

"ارے ایک بات کہہ دی میں نے اور آپ تو بالکل ہی غائب ہو گئے۔ دیکھیے شبیب صاحب! ہمارے دلوں میں جو ہوتا ہے وہی ہم زبان پر لاتے ہیں۔ میں ہوں یا آپ کے الطاف بھائی۔ کوئی بات ہم دل میں رکھ ہی نہیں سکتے۔"

"آپ اچھا ہی کرتے ہیں بھابھی . . . میں نے اس ضمن میں کچھ کہا نہیں تھا۔ میں انجان بن گیا۔

"پھر یہ سولہ سالہ لڑکی کی طرح کیوں روٹھے ہوئے ہیں آپ۔ پندرہ منٹوں سے دیکھ رہی ہوں۔ بس گانے سن رہے ہیں۔ نہ کلام نہ طعام . . . یہ بھی کوئی تُک ہے؟"

"اور آپ کی کوئی تُک ہے" نہ چاہتے ہوئے بھی وہی بات میری نوک زبان پر آگئی۔ "جب بھی یہاں پر آتا ہوں آپ تواضع کرتی ہیں، دونوں مجھے باتوں میں لگا کر کھانے کا وقت کر دیتے ہیں۔ پھر جبراً کھانا بھی کھلایا جاتا ہے اور میں کبھی بچوں کے لیے کچھ لے آؤں تو طوفان اُٹھ جاتا ہے۔ پھر آپ لوگ میرے یہاں بھی نہیں آتے . . ."

"اچھا . . ." بھابھی نے اچھا کو گھسیٹتے ہوئے۔

---

۴۳ منتھیا اسٹریٹ، رویا پیٹا، مدراس ۱۴

کہا۔" تو حضور یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہم کسی لالچ کی خاطر آپ کی خاطر کرتے ہیں۔ دیکھیے شبیب صاحب! کوئی اور یہی کہہ دیتا تو بے نقط سُنتا مجھ سے۔ پر آپ نے کہی ہے یہ بات آپ نے۔ آپ کے الطاف بھائی سارے رشتے داروں میں آپ کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ مجھے جنابِ عالی۔ اور اب اس ضمن میں مذمت کھولیے۔" پھر انھوں نے کمر کے گرد ساری کس لی۔ اور مطبخ میں گھس گئیں۔ بیس منٹوں بعد باہر آئیں تو ناشتے کے لوازمات کے ساتھ۔

○

الطاف بھائی کا بڑا بیٹا دسویں جماعت میں تھا اور اسے تھیٹر جانے کی اجازت نہیں تھی اور وہ تھا سعادت مند۔ اپنے اسکول سے چند گز دوری پر واقع تین تھیٹروں کے کمپلکس پر روزانہ حسرت بھری نگاہیں ڈالتا اور چل دیتا تھا۔ شہر میں ان دنوں ایک پکچر کا بڑا چرچا تھا۔ وہ مجھ سے کہنا یہ کہہ گیا کہ یہ فلم وہ دیکھنے کا مشتاق ہے۔ میں نے دو ٹکٹیں لیں اور اُن کے گھر پہنچ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر کھل تو اٹھا تھا پر پانچ دس منٹ گزرنے پر بھی تیار نہیں ہوا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔

" چلنا نہیں ہے؟" میں نے سرگوشی کی۔

" ابا اجازت نہیں دے رہے شبیب چاچا؟" میں مخمصے میں پڑ گیا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ میں اجازت لوں۔ اس کی روہانسی صورت دیکھ کر میں الطاف بھائی کے پاس پہنچا، مدعا بیان کیا اور انھوں نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ آئندہ ہفتے اس کے ششماہی امتحانات شروع ہو رہے ہیں۔ دھیان بٹ جائے گا نہ لے جاؤں۔ میں نے کوئی جرح نہ کی۔ اور راحیل کی پیٹھ تھپک کر اسے صبر کی تلقین کرتا واپس ہوگیا۔

لیکن میرا پارہ اس وقت چڑھا جب سنا کہ دوسرے ہی دن الطاف بھائی نے راحیل اور شرجیل کے لیے اسی فلم کے دو ٹکٹ منگوائے تھے۔ میں سیدھا وہاں پہنچا اور بھابھی سے باقاعدہ جنگ شروع کر دی۔" مجھے معلوم نہیں تھا آپ لوگ برہمن ہیں اور مجھے ہریجن سمجھ رہے ہیں۔ کیا ہو جاتا جو راحیل کو میرے سنگ فلم دیکھنے بھیج دیتے؟"

اور بھابھی صاحبہ نے ٹھنڈے لہجے میں کہا تھا" شبیب صاحب! ابھی آپ کنوارے ہیں۔ گھر اولاد اور ان سے منسلکہ جذبوں کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لیے چُپ ہو جائیے۔ اور یہ بڑنگ نوٹس فرمائیے۔ اور ہاں اتوار کو ہم مہابلی پورم جا رہے ہیں کاروں میں۔ پوری توقع ہے آپ شریک ہو کر ہمیں ممنونیت کا نادر موقع عنایت فرمائیں گے۔" ان کا چہرہ سپاٹ تھا اور انداز کچھ ایسا تھا کہ میں نہیں میرا ایک مجسمہ کھڑا ہے ان کے رُوبرو۔ میں نے دماغ کو ٹھنڈا کیا۔ ایک ترکیب ذہن میں آئی انھیں نیچا دکھانے کی۔ بولا" بھابھی ایک شرط لگاتا ہوں۔ آپ کے شوہر صاحب کی خدمتِ عالیہ میں کوئی بھی چیز دو مہینوں کے اندر اندر اپنی طرف سے پیش کروں گا۔ انھیں احساس بھی نہ ہوگا کہ میرا کوئی احسان انھوں نے لیا ہے۔ یہ ہوگا اور ضرور ہوگا۔"

بھابھی نے چونک کر مجھے دیکھا پھر زیرِ لب مسکرائیں۔ پھر بولیں" اگر پتہ لگ جائے تو ....؟"

" تحفہ پہنچنے کے ساٹھ دنوں کے اندر اندر پتہ لگ گیا تو تحفہ واپس ورنہ نہیں۔ یاد رہے ساٹھ دنوں کے اندر۔"

" چلیے ... " انھوں نے پُر اعتماد آواز میں کہا۔" یہی شرط آپ پر بھی لاگو ... منظور؟"

" ہاں منظور ... " میں نے جواب دیا۔

○

وہاں سے واپسی کے دوران میں نے الطاف بھائی کی شخصیت پر غور کیا۔ نت نئے کپڑے۔ جوتے اور چپلیں اُن کی کمزوری رہی ہے۔ بارہ پندرہ جوڑیاں ہمیشہ ان کے مصرف میں ہوتی تھیں۔ اور پھر ایک خاکہ میرے ذہن میں آ ہی گیا ان کی خودداری کو ٹھیس پہنچانے کا۔

" دو دنوں بعد میں ان کے ہاں گیا۔ اور الطاف بھائی کا SHOE CASE کھول کر جوتوں اور چپلوں کا معائنہ کرنے لگا۔" کیا ہو رہا ہے محترم؟" پیچھے سے بھابھی صاحبہ کی آواز آئی۔ " پہلے سر تلاش کر لیجیے پھر جوتوں کا انتخاب ہو جائے گا۔"

میں نے سنجیدگی سے جواب دیا" بھابھی! نئی چپلیں خریدنی ہیں۔ سوچا کہ یہیں کوئی پسند آجائے تو اٹھالوں۔"

دراصل میں دیکھنا یہ چاہتا تھا کہ کس قسم کا ڈیزائن الطاف بھائی کے پاس موجود نہیں ہے۔ اس سروے کے بعد میں نے ایک اعلا قسم کی چپلیں خریدیں قیمت تھی ایک سو چھیاسٹھ روپے۔ پھر میں نے بڑی صفائی کے ساتھ ۱۶۶ میں سے ایک کا ہندسہ نکال دیا۔ اب چپلوں کی قیمت صرف چھیاسٹھ روپے رہ گئی۔

پھر میں یہ چپلیں پہن کر الطاف بھائی کے پاس پہنچا۔ وہ چونکے چپل اپنے ہاتھ میں لے لی۔ الٹا پلٹا قیمت دیکھی۔ حیرانی عیاں تھی اُن

کے چھپے پر "یہ کیوں بھئی قیمت کم لگ رہی ہے؟"

"ہاں الطاف بھائی دراصل ریڈکشن (REDUCTION) میں لیا ہے میں نے آدھی قیمت پر۔ آپ کا سائز بھی دستیاب ہے۔ اگر پسند ہو تو ایک جوڑی لادوں" میں نے جلدی سے کہہ دیا۔

"نہیں دکان بتادو خود خرید لیں گے۔" وہ بولے۔

"اب ایسا بھی کیا الطاف بھائی۔ روزانہ ہی ادھر سے گزرنا ہوتا ہے۔ کل لادوں گا۔" وہ راضی ہو گئے اور میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود بھی کہ چپلیں آنے کے بعد رقم لوں گا۔ انھوں نے چھیاسٹھ روپے مجھے تھمادیے

دوسرے دن وہ ایک سو چھیاسٹھ روپے کی چپلیں صرف چھیاسٹھ روپے میں حاصل کر کے بڑی شان سے گھوم رہے تھے مجھے ایک گونہ سکون ملا کہ آج انھوں نے مُنہ کی کھائی۔ اب دو مہینوں بعد مزاج پوچھنا تھا۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں میں افسانے لکھتا ہوں۔ ملک بھر کے بارہ چودہ مختلف چھوٹے بڑے رسالوں میں میری کہانیاں پابندی سے شائع ہوتی ہیں۔ بڑے رسالے تو معاوضہ دیتے ہی ہیں۔ چھوٹے رسالوں میں بھی دو ایک مجھے کچھ نہ کچھ روانہ کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔

الطاف بھائی اور ان کی بیگم دونوں کو ہی ادب سے شغف تھا۔ وہ مجھ سے نئی کہانیوں کی بابت استفسار کرتے، پرانی کہانیوں پر بحث کرتے۔ معاوضوں کی بات بھی ان سے پوشیدہ ہوئی نہیں تھی۔

ایک دن سہری نگر کے کسی نئے رسالے کے مدیر میری کہانی کے طلب گار ہوئے۔ مدیر محترم نے لکھا تھا کہ کہانی فوراً بھیجوں کہ وہ اپنی پہلی اشاعت میں میری کاوش شامل کرنا چاہتے تھے۔ میں نے کہانی کے ساتھ جواباً تحریر کیا تھا کہ حسب خواہش تازہ ترین کہانی ارسال خدمت ہے۔ پرچہ مجھے ضرور روانہ کریں۔

ہمارے ڈاک والوں کا بھی عجیب حال ہے۔ سنا ہے کہ محکمے میں چند اردو دوست حضرات ملازم ہیں جو عام ڈاک سے بھیجے گئے رسالوں کو چپ چاپ اپنے گھر لے جاتے ہیں۔ شاید سہری نگر والا رسالہ کسی ایسے ہی حضرت کی کرم فرمائی کا نشانہ بنا۔ پر ایک دن مجھے اس رسالے کی جانب سے دو سو روپوں کی رقم موصول ہوئی۔ میں نے شکریے کا خط محترم مدیر صاحب کو لکھا۔ اور یہ بھی کہ رسالہ مجھے ملا نہیں ہے دوسری کاپی ارسال کر دیں۔

الطاف بھائی اور بھابھی صاحبہ سے لگائی گئی شرط کی میعاد ختم ہو گئی۔ میں ان کے پاس گیا اور کہا کہ وہ لوگ ہار گئے ہیں کہ ایک سو روپے میں نے اپنی جیب سے خرچ کیے۔

اب بھابھی کو جو قہقہے شروع ہوئے ہیں تو ختم ہونے کو نہ آئے۔ میں ہونق بنا ان کی طرف دیکھتا رہا پھر وہ مجھے الطاف بھائی کے پاس لے گئیں اور کہنے لگیں۔

"ذرا سنیے۔ یہ کیا کہتے ہیں کہ بازی ہم نے ہاری ہے۔ ایک سو چھیاسٹھ کی چپلیں صرف چھیاسٹھ میں خرید کے . . . . "

الطاف بھائی مسکراتے رہے۔

میرا عجیب حال تھا۔ بھابھی کے قہقہے جاری تھے۔

"ٹھیک ہے بھابھی . . . " یہ مشکل میں بول پایا۔ "آپ اپنے قہقہے روک دیجیے۔ میعاد پوری ہو چکی ہے اس لیے وعدے کے مطابق آپ وہ سو روپے مجھے واپس نہیں کر سکتے۔ پر اپنے قہقہوں کی وجہ تو بتلائیے . . . "

"شبیب صاحب!" بھابھی جی نے کہا۔ "وہ جو سہری نگر کے رسالے نے دو سو روپے بھیجے تھے۔ ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

تبھی مجھے یاد آیا کہ سہری نگر میں بھابھی کے بھائی مقیم ہیں . . . رسالے کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

نئی مطبوعات

دنیا مرے آگے (شعری مجموعہ)
شاعر: کرشن موہن
صفحات: ۱۲۸
قیمت: ۵۰ روپے
ملنے کا پتا: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

کرشن موہن کی یہ تازہ تخلیق نہ صرف طباعت کی جملہ جمالیات کے اعتبار سے قابلِ توجہ ہے بلکہ یہ ان شعری متفرقات کا منظر نامہ بھی ہے جو چند نثری نظموں کے علاوہ متعدد آزاد نظموں، دوہوں اور دو پدوں جیسی اصنافِ سخن پر مشتمل ہیں۔ کرشن موہن جیسے جدت آشنا شاعر کے لیے 'دنیا مرے آگے' اسی عصریت کی آئینہ دار ہے جو بقول ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ ماضی، حال اور مستقبل تینوں کو اپنے احاطے میں لے لیتی ہے۔

انگریزی، فارسی اور اُردو ادبیات، زبان و بیان، فنِ شعریات پر گہری نظر کے علاوہ ہندی ادب کی کلاسیکی روایات سے کرشن موہن کی ذہنی اور فکری وابستگی سے سب واقف ہیں ان تمام اہم زبانوں کے پس منظر نے ہی موصوف کو وہ شعور عطا کیا ہے جس کی بدولت خارجی حقائق سے وابستہ انسانی عوامل یا معروضات کے تحت رُونما ہونے والے واقعات کو نئے فکر و احساس کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ ایلیٹ نے کہا ہے کہ نئے دور کے شاعر کو اپنی انفرادیت قائم کرنے کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے نئے نئے تجربات کو تازہ اظہار عطا کرے بلکہ پُرانے تجربات کو نئے انداز سے سمجھے اور انھیں اظہار دینے کے لیے نئے سے نئے مناسب الفاظ کی تلاش کرے۔ کرشن موہن کی بیشتر نظموں سے صاف ظاہر ہے کہ موصوف کا شعری رویّہ اسی نوعیت کا ہے۔ موضوعات سے پتہ چلتا ہے کہ نئے نئے تجربات کا انوکھا اظہار تو اپنی جگہ، موصوف کا طرزِ اظہار ماضی کے تجربات کو بھی ایسی ترسیلی جہات سے روشناس کراتا ہے جن سے ان تجربات کا تاثر بھی "تازہ کاری" سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

کرشن موہن کی قدرتِ کلام عجزِ بیاں سے مبرّا ہے۔ لہٰذا نثری نظم ان کے یہاں محض فنی بوقلمونی کے ایک عنصر کے طور پر آئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آزاد نظم ان کا جانا پہچانا میدانِ سخن ہے جس میں وہ لفظیات کے جلال و جمال سے زبان کی موسیقیت نفاست اور ترکیبی تنوّع کا جادو جگاتے ہیں۔

یہ اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

بھنور سے بچا کر جو لایا ہے ساحل پہ اُردو کی ناؤ کو
وہ ناخدا ہے
ہمیشہ پرے جس کے دل سے کدورت رہی ہے
ہر اک دور میں ایسے اکیلے رہبر کی، نارد منی کی،
ضرورت رہی ہے
ضرورت رہے گی
(نظم: اُردو کا نارد منی)

اُسے وہم ہے اس خضاب شباب آفریں سے
سدا بال کالے رہیں گے
اندھیرے جوانی کے ارماں اُجالے رہیں گے،
سنبھالے رہیں گے
(نظم: وہم)

کئی اور نظمیں اپنی انفرادیت اور انوکھے پن کے باعث خصوصاً قابلِ قدر ہیں مثلاً "زن زنی، سیب آسیب، ورکش پوجا، محویت، ہوس کے حربے، سقراط بڑا خوش قسمت تھا، تکیہ کلام، خدا گنجے کو ناخن دے، قافیوں کے پرندے، تیرہ نہاد، بیتے لمحوں کا شکار، کنول کی پتی پہ قطرۂ لرزاں، پاپا، تلفظ، قافیے کا مافیا، اور سخنہائے گفتنی۔

تلسی داس، کبیر، خسرو نے دوہے کی صنف کو اپنا کر اپنے محبوبِ حقیقی کے تئیں ارادت و عبادت کا حق ادا کیا ہے۔ کرشن موہن نے ایک دُنیادار کی حیثیت سے اپنے فرائض کی اُوبڑ کھابڑ ڈگر پر چلتے ہوئے اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں پر نقد و نظر کے لیے "دوہے" اور "دو پدے" کو اس خوبی سے استعمال کیا ہے کہ ایک تو "دوہے" اور "دو پدے" کی بنیادی تکنیک کا فرق واضح ہو جاتا ہے دوسرے ان دو اصنافِ سخن میں مضامین و موضوعات کی رنگارنگی قاری کا دامنِ دل کھینچ لیتی ہے۔ دوہے کی تکنیک اور ماہیت سے متعلق۔ دوہے قابلِ ذکر

ہیں :

سادہ ہے، مشکل نہیں، دوہے کی تکنیک
لیکن اتنا جانیے، دوہا ہو رمنیک

کرشنا موہن دوہے کا بھی ہے ایک اصول
فعلن فعلن فاعلن، فعلن فعلن فعول

کرشن موہن کے دوہوں اور دوپدوں میں خیالات کی رو، جنسی تعلقات، روحانی اقدار، پیار، انوراگ، موہ مایا، حسن و عشق کی دھوپ چھاؤں کے ساتھ تیاگ کی دین نجات کے سادھن اور زندگی کی بہت سی حقیقتوں سے اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی چلی جاتی ہے بموصوف کے دوہوں میں ہندی شاعری کے بیشتر 'رسوں' کی جھلک ملتی ہے۔ ذیل میں دیے گئے چند ایک دوہے اور دوپدے اس کیفیت کے آئینہ دار ہونے کے علاوہ عصری حسیت کے کئی گوشے بھی اپنی گرفت میں لیتے ہیں۔

دوھے :

گھر آنگن کی دھوپ ہیں، جسموں کا یہ میل
جس میں بیکل آتما، ہے اک پیاسی بیل

نسدن من بھرماتے ہے، مایا کا انوراگ
دنیا کو تجنا بھلا، شیتل ہو یہ آگ

جوبن امرت دھار ہے، جیون کا رس روپ
دو دن کا یہ پیار ہے، ایک سہانی دھوپ

دیش میں دُرگھٹناؤں کے، بڑھتے جائیں انک
جیسے اپنا دھرم ہو، ہنسا اور آتنک

دوپدے :

بادل بھی تو اک راہی ہے، رکھتا ہے منزل کی لگن
پانی کے سرچشمے کے من میں بھی لہراتی ہے اگن

بال بچے، من میں آئے گیا گیا گمبھیر وچار
توڑ دے اپنا آئینہ، اب جلد ہی سندر نار

یہ مجموعہ اُردو اکادمی، دہلی کے مالی اشتراک سے شائع ہوا ہے۔ اس لیے قیمت کم رکھی جاسکتی تھی۔

—— رام پرکاش راہی

خبر نگاری

مصنّف : شافع قدوائی
قیمت : ۳۵ روپے، لائبریری ایڈیشن : ۷۰ روپے
ناشر : نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین آباد، لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸ (یو۔پی)

خبر نگاری کے لیے کم از کم تین اجزا کی موجودگی ضروری ہے۔ خبر، خبر نگار اور خبر پڑھنے والا اور ان میں سے ہر ایک خبر کی نوعیت، اس کی پیش کش کے انداز اور پڑھنے والے کے ردّعمل کو متعین کرتا ہے۔

اُردو صحافت ڈیڑھ سو برس کا سفر طے کرنے کے بعد کہیں اس قابل ہوسکی ہے کہ خبر نگاری کی نوعی اساس اور عملی پیش کش پر ایک کتاب لکھی جاسکے۔ یہ بات اِن لوگوں کی توجہ کی مستحق ہے جنھوں نے ادب اور بالخصوص مشاعرہ اور اُردو کو ہم معنی سمجھ رکھا ہے۔ زبان کی سرحدوں کی وسعت، ادب کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتی بلکہ ممد و معاون ہوتی ہیں، اسے گیرائی اور گہرائی بخشتی ہے اور اس کے رشتے زندگی سے استوار کرتی ہے جس کے بغیر نہ ادب کا تصور ممکن ہے نہ زبان کا۔

سات ابواب پر مشتمل یہ کتاب خبر نگاری کے تقریباً سارے پہلوؤں کو محیط ہے جو خبری عنصر کے حامل واقعہ کے وقوع پذیر ہونے سے لے کر اس کی پیش کش کے ہر مروّج طریقہ کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے۔

واقعہ تو قاری کی مرضی، خواہش اور پسند و ناپسند کا پابند نہیں ہوتا لیکن اس کی پیش کش ضرور بڑی حد تک اخبار کے پڑھنے والوں کے ردّعمل پر منحصر ہوتی ہے۔ اس بنیادی حقیقت کی جانب اشارہ مصنّف نے اخبار میں خبر کے لیے جگہ کے تعین کے سلسلے میں کیا ہے۔ اخبار کا حلقۂ اشاعت غیر محسوس طریقے سے خبر کے انتخاب اور پیش کش کے انداز کو متاثر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اخبار کی پالیسی یا نقطۂ نظر، وہ مدیر کا ہو یا مالکان کا، نہ صرف خبر کی پیش کش بلکہ اس کی معروضیت کو اس حد تک متاثر کرتا ہے کہ بظاہر معروضیت کا دامن چھوڑے بغیر خبر موضوعی بن جاتی ہے۔ صحافت کے موجودہ طریقوں سے اہم خبر، غیر اہم بن سکتی ہے اور کم اہم خبر، بے حد اہم۔ خبر کا ابتدائیہ، سرخی، اخبار میں اس کے لیے جگہ کا تعین اور اوپر نیچے، دائیں بائیں شائع ہونے والی خبروں کی نوعیت بھی کسی خبر کی اہمیت کو کم یا زیادہ کرسکتی ہے۔

صحافت جو مشن سے پیشہ اور پیشہ سے وسیلۂ حصول شہرت و مالِ منفعت بن چکی ہے، نظم زندگی کے لیے رحمت کے علاوہ سبب زحمت بھی بن سکتی ہے۔

،کی تلاش اور دوسروں پر سبقت نے کی تمنّا اکثر خبر نگاری کو واقعہ روضی پیش کش سے زیادہ حقیقت کو ی جانب سے نہیں بلکہ اس کی پشت سے دکھانے لگتی ہے۔ ممکنہ حد تک خبر کی نیت پر اصرار کر کے مُصنّف نے صحافیوں یادہ ان کو جو صحافی بننا چاہتے ہیں ار کیا ہے، اور یہ ضروری بھی تھا۔

شافع قدوائی نے صحافت پہلے کی اور ی نظری اساس کا مطالعہ بعد میں کیا۔ وہ عملی پہلو کو اصول کی بنیاد پر نہیں ، بلکہ اصول تک عمل کی راہ سے پہنچتے صحافت نظریہ کم، نقطہء نظر زیادہ ہے، ں کم، عمل زیادہ ہے اور ہر خبر اور ہر ے واقعہ کی پیش کش کے مسئلے کو نئے قے سے نپٹانا ہوتا ہے جس کے لیے صحافت ظری اساس فیصلہ کن نہیں لیکن لازمی ضرور مُصنّف نے خبر نگاری کے کوچے میں ا رکھنے والوں کو نظری اساس بھی فراہم ی ہے اور اس کی تشکیل کی تقریباً ساری ہ صورتوں سے بھی واقف کرا دیا ہے۔

شافع قدوائی نے خبر کی ایک درجن زیادہ تعریفیں پیش کرنے کے بعد لکھا کہ خبر" لازماً کسی ایسے واقعے، حادثے یا ے پر مبنی ہوتی ہے جو عوام کے لیے لچسپی" کا باعث ہو۔ انگریزی لفظ In-teresting - کا یہ ترجمہ (دلچسپ) ثر دوسری صورتوں میں ممکن ہے درست لیکن خبر کی حد تک غالباً "کشش" اور سروکار" ایسے الفاظ زیادہ مناسب وں گے۔ اس ضمن میں پال ڈبلو وہائٹ کی تعریف کہ "خبر ایسے دلچسپ (پُرکشش۔ تبصرہ نگار) تازہ اور مصدقہ واقعات کا بیان ہے جو رونما ہو چکے ہوں، ہو رہے ہوں یا ہونے والے ہوں یا امید کے مطابق وقوع پذیر نہیں ہو رہے ہیں اور نہ ہونے کی امید ہے" شاید اس نکتہ کو واضح کر سکے۔ کسی ایک خاندان کے متعدد افراد کا قتل نہ خاندان کے باقی لوگوں کے لیے "دلچسپ" ہے نہ غیر متعلق لوگوں کے لیے لیکن یہ خبر ضرور ہے کیوں کہ ان کے احساسات کو چھُوتی ہے۔

اُردو صحافت نے اپنی زندگی کی ابتدائی منزلیں ادب کی گود میں بسر کیں لیکن اب خبروں کی حد تک جو عام طور سے اخبار کی ستر اسّی فی صد جگہ گھیر لیتی ہیں، براہِ راست اور سادہ طریقہء اظہار پسند کیا جاتا ہے۔ شافع قدوائی نے حشو و زوائد سے پُر اور عاری اور طویل اور مختصر جملوں کو پہلو بہ پہلو پیش کر کے کتاب کے بعض حصّوں کو عشق کی کاپی کی شکل دے دی ہے جس سے نئے خبر نگار بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

اس کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اسے صحافت کا طالب علم درسی کتاب کے طور پر پڑھ سکتا ہے اور عام قاری محض دلچسپی کے لیے کسی تکنیکی موضوع کو بہ سہولت بیان عطا کر دینا مواد سے مُصنّف کی مکمل واقفیت کی دلیل ہے۔

دیدہ زیب کتابت، آفسیٹ کی طباعت اور نیّر مسعود کے سرورق نے "خبر نگاری" کو جاذب نظر بھی بنا دیا ہے۔

—— عابد سہیل

آج کل (سندھی ادب نمبر)

مدیر اعلیٰ: راج نرائن راز
صفحات: ۱۱۲
قیمت: ۴ روپے
ناشر: پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ماہ نامہ "آج کل" ہمارا واحد جریدہ ہے جو تسلسل اشاعت اور پُر وقار و متنوع ادب کی پیش کش میں ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی ترتیب و تدوین کے لیے مرکزی حکومت نے تقریباً ہمیشہ ہی اُردو کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں کی خدمات حاصل کیں اور اسے متعدد وجوہ کی بنا پر ملک کے تمام ادبی حلقوں کا قلمی تعاون حاصل رہا ہے۔ ان ہی اسباب سے ماضی میں اس رسالے کے متعدد یادگار خصوصی شمارے شائع ہوئے جو تا حال معنویت کے حامل ہیں۔

شان دار ماضی کے بعد پُر وقار حال کی توقع عین فطری سہی لیکن فکری زوال پہ مائل معاشرے میں یہ توقع شاذ ہی پوری ہوتی ہے —— مگر رسالہ "آج کل" نے اس توقع کو حالیہ چند برسوں میں حیرت انگیز حد تک پورا کیا ہے۔ مُدیر اعلیٰ راج نرائن راز کے خلّاق ذہن نے ہم عصر اُردو ادب کی انتہائی اکتاہٹ انگیز یکسانیت کو دو طریقوں سے توڑنے کی کوشش کی: اوّل اس طرح کہ جریدے کے صفحات کو رواجی بڑے ناموں

کی املاک بنانے کے بجائے ایسی تخلیقات سے مزین کیا جو نام کی بیساکھی سے نہیں بلکہ اپنی ذاتی وقعت کے بل بوتے پر اشاعت کے قابل تھیں ـــــ اور دوم اِس طرح کہ قومی زبان اور کچھ اہم علاقائی زبانوں کی تازہ کار لہروں کی مدد سے ہم عصر اُردو ادب کی غیر مضطرب موجوں کو طوفاں سے آشنا کرنا چاہا۔ اِن کوششوں کی معنوی قوت اُردو قارئین اور صاحبانِ قلم پر، دیر سویر ہی سہی مگر یقیناً اثر انداز ہوگی؛ ہمیں لفظ کی قوت پر بھروسا ہے۔

پیشِ نظر شمارے میں سندھی ادب کے انتہائی ممتاز اور مسلّم فن کاروں کی تحریریں شامل ہیں جن کے ترجمے مخمور سعیدی، ایس۔ اے۔ رحمٰن، نریندر نسچل، لکشمن کومل، نند کشور وکرم اور مشرف عالم ذوقی وغیرہ نے ہندی، انگریزی اور سندھی سے کیے ہیں۔

۳ مقالوں، ۲۱ شعرا کی نظموں غزلوں، ۱۹ افسانوں اور ایک ڈرامے کے ذریعے: برصغیر میں آزادی کے بعد لکھے گئے سندھی ادب کی روش و رفتار کا بھرپور نقش قائم ہوتا ہے۔ یہ نقش بتاتا ہے کہ اِک دھرتی سے بچھڑے پودے کس کس طور نئی زمینیں پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں، اس کوشش کے دوران ماضی کے کھنڈر کیسی کیسی خراشیں کھاتے ہیں اور بھرتے گھاو پر لگی جانی انجانی چوٹیں انسانی نفسیات کے کیسے کیسے گوشے نمایاں کرتی ہیں۔ اِس نقش سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی زندگی میں محبت کے دم قدم سے اب بھی روشنی ہوتی ہے۔ یہ نقش باور کراتا ہے کہ معاشرہ و فرد کی مجہولیت کو ورثا نے کے لیے فن پارے کا مجہول ہونا لازمی نہیں ـــــ یہ نقشِ اُردو کے اُن افسانہ نگاروں کے لیے قبلہ نما ثابت ہو سکتا ہے جو اصطلاحی ترقی پسندی اور جدیدیت کے پھیر میں سادہ و پُرکار افسانہ سازی کی راہ کھو کر ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ کاش! ہمارے فن کار "آج کل" کی فراہم کردہ روشنی جذب کرنے پر کچھ وقت صرف کریں۔

کیسا اچھا ہو اگر راج نرائن راز رسالے کے پنجابی، ہندی اور سندھی ادب نمبروں اور دیگر شماروں میں شائع شدہ علاقائی زبانوں کے منتخبہ تراجم پر مشتمل ایک بھرپور کتاب، پبلی کیشنز ڈویژن سے شائع کرادیں۔

ـــــ شمس الحق عثمانی

صدف سمندر

شاعر: شہپر رسول
قیمت: ۴۰ روپے
تقسیم کار: (۱) مکتبہ جامعہ، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ، دہلی، بمبئی۔
(۲) ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ (یو۔پی)

"صدف سمندر" شہپر رسول کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو تقریباً سو غزلیات پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ اتر پردیش کے مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔

شہپر رسول نئی نسل کے اُن چند شاعروں میں سے ہیں جن پر "جدیدیت" کا لیبل نہیں لگایا جا سکتا۔ روایت اور جدیدیت کے مابین اُن کا شعری سفر اُس شاعری کو جنم دیتا ہے جو اس عہد میں قبولیت کی سند حاصل کرنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہے ـــــ شہپر کی شاعری کا ایک بڑا وصف یہ ہے کہ اُن کے یہاں مشاہدات، ذاتی تجربات اور داخلی حسیّت کے خمیر سے جو شعر وجود میں آتا ہے وہ بادی النظر میں سلیس سہی، لیکن در پردہ اُس میں بڑی معنوی تہیں چھپی ہوتی ہیں۔ بقول اُن کے:

میں اتنی گمبھیر صدا ہوں
برسوں مجھ کو لوگ سنیں گے

شہپر کی شاعری عصری تقاضوں کی عکّاس بھی ہے اور فنی اعتبار سے قابلِ توجہ بھی، اُن کی شاعری میں اظہارِ ذات اور داخلی کرب کا وہ شدید احساس بھی کروٹیں لیتا نظر آتا ہے جو جدید شاعری کی امتیازی خصوصیت ہے:

ذکر تھا اجداد کے اوصاف کا
ہو گیا پل بھر میں گھر کا گھر اداس
اور سُن پچھلی صدی کی رونقیں
اور کچھ بوڑھوں سے ہو مل کر اداس

مجھے بھی لمحۂ ہجرت نے کر دیا تقسیم
نگاہ گھر کی طرف ہے قدم سفر کی طرف

جدید تراکیب اور علامتیں، پیکر تراشی اور لفظی صنعت گری کے نمونے "صدف سمندر" میں جا بجا ملتے ہیں ـــــ ان سب کے اجتماع سے شہپر رسول کا لہجہ وجود میں آتا ہے جو ان کی پہچان کا ضامن ہے۔

لفاظ تو زباں سے نکلتے تھے خوش لباس
لیکن وہاں کسی کے بدن پر قبا نہ تھی

کون سا باب کہانی کا کھلا رکھنا ہے
کون سی سمت سے در آئے گا تو دیکھ تو لیں

پھر کسی یاد کے چھتنار گھنے جنگل میں
آؤ بے سمت ہواؤں کی طرح کھو جائیں

ٹوٹنا بھی اک عمل ہے لمحۂ تعمیر کا!
ٹوٹتے وقتوں سے ہم عبرت کُرا لائے بہت

"صدف سمندر" جدید غزلیہ شاعری
ں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ اُمید ہے
بی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوگی۔

—— خالد ندیم

سحر رنگ
شاعر: سید احمد سحر
صفحات: ۲۴۰
قیمت: ۵۰ روپے
ملنے کا پتا: محلہ خلیل غربی، شاہ جہاں پور (یو۔پی)

ہمارے زمانے میں جب تمام قدیم
دبی مراکز ویران ہو گئے ہیں، اساتذہ کے
واوین ردّی میں فروخت ہو رہے ہیں، اور
ستادی شاگردی کی وہ قدیم روایت جس
نے اُردو شاعری کے نشو و نما میں زبردست
کردار ادا کیا ہے، معدوم ہوتی جا رہی ہے،
شاہ جہاں پور میں نہ صرف زندہ ہے بلکہ
پوری آب و تاب سے وہاں کی ادبی محفلوں
میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔

سید احمد سحر شاہ جہاں پور کے ایک کہنہ مشق شاعر ہیں جو خود بھی چشموں کی طرزِ قدیم پر اپنے تلامذہ کی تربیت کر رہے ہیں، مگر ان کا یہ مجموعہ خیال و فکر کی سطح پر کلاسیکل اُردو شاعری کی روایتِ قدیم کی توسیع محض نہیں، البتہ فنی چابک دستی کی رو سے اسے اساتذہ کے دواوین کے روبرو رکھا جا سکتا ہے ان کے یہ اشعار دیکھیے جو میری بات کی تائید کریں گے:

دل کی دھڑکن تھی یا تھی بانگِ جرس
کارواں چل پڑا ستاروں کا

سن کے افسانہ مرا، جور پہ نادم ہیں مگر
مجھ سے اب شکوۂ اندازِ بیاں باقی ہے

آثار پھینک یہ افسردگی کی تنگ قبا
بہار نام ہے غنچے کے مسکرانے کا

ہوا کے رُخ سے ہمیں ہو گیا تھا اندازہ
بہارِ تازہ یہی برگ و بار لائے گی

لاکھ تیور بدل کے بات کہی
آ گیا پھر بھی التماس کا رنگ

لیتھو پر شائع شدہ کتاب کا سرورق دیدہ زیب اور کتابت کی خامیاں نا کے برابر ہیں۔

—— اطہر فاروقی

ایک وضاحت

جنوری کے شمارے میں سلامت علی مہدی صاحب پر جناب پروانہ ردولوی کا مضمون پڑھا۔ مضمون سلامت صاحب کی زندگی کے کچھ اہم گوشوں پر روشنی ڈالتا ہے اور ان کی شخصیت کے کئی پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے۔ مضمون میں جہاں اُتر پردیش اُردو اکادمی اور کچھ دوسرے ذرائع سے سلامت صاحب کی مالی مدد کا ذکر کیا گیا ہے وہاں اُردو اکادمی دہلی کا بھی نام آنا چاہیے تھا۔ اُردو اکادمی، دہلی نے انھیں وظیفہ بھی دیا تھا اور ان کے معالجے کے لیے الگ سے رقم بھی۔

—— مرغوب عابدی، دہلی

اُردو خبرنامہ

خیر مقدم



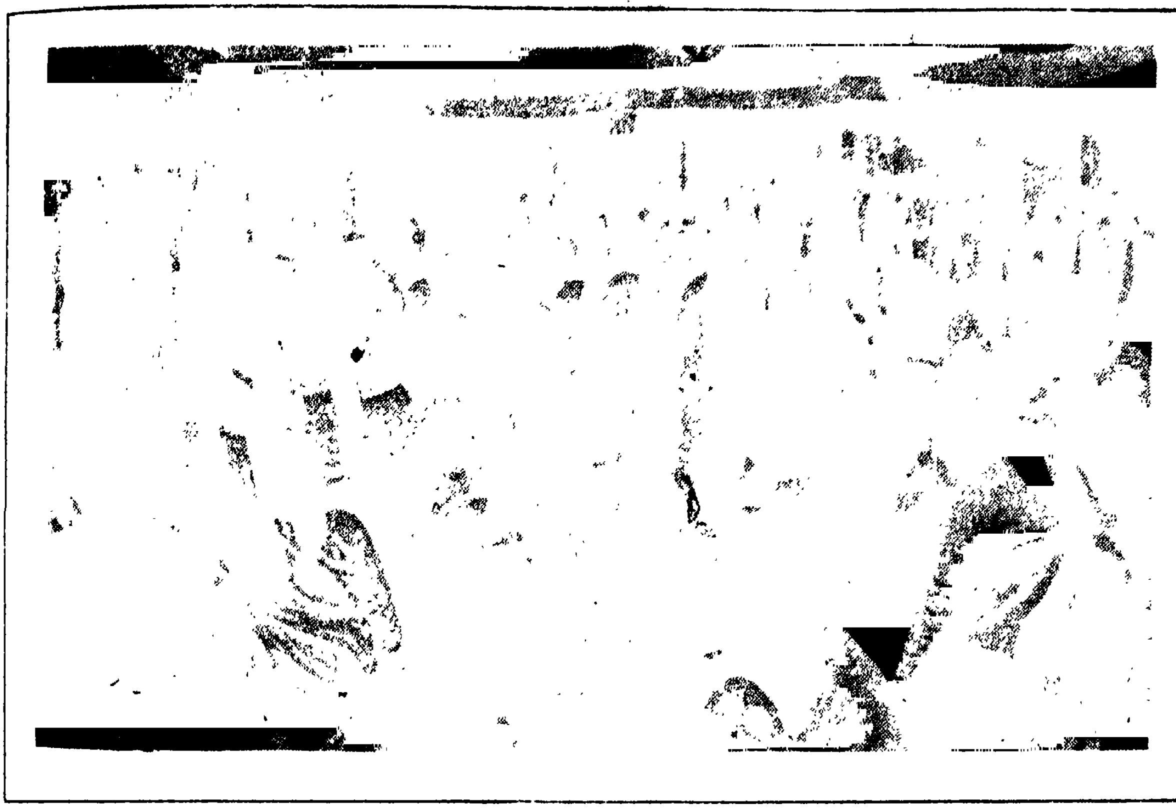
اُردو کے شاعر اور افسانہ نگار گورنام کھنہ گلشن جو مستقلاً لندن میں قیام پذیر ہیں، پچھلے دِنوں دلّی آئے تو اُردو اکادمی نے ان کے اعزاز میں ایک استقبالیہ محفل ترتیب دی۔ تصویر میں معزز مہمان مائک پر شرکاے محفل سے مخاطب ہیں۔ ان کے بائیں طرف ان کی بیگم اور داہنی طرف ڈاکٹر تنویر احمد علوی اور جناب انیس دہلوی تشریف فرما ہیں۔

تعلیمی میلہ

اُردو اکادمی دہلی انتظامیہ کی جانب سے ۴، ۵، اور ۶، جنوری کو تعلیمی میلہ منعقد کیا گیا میلے کے دوران اُردو کے طلبہ اور طالبات کو انعامات اور وظائف بھی تقسیم کیے گئے۔

میلے کے پہلے دن ۴، جنوری کو صبح ۱۱ بجے، تعلیمی مقابلے میں حصّہ لینے والے پرائمری زمرے کے طلبہ اور طالبات کو انعام دیے گئے اور ۲½ بجے سہ پہر درجۂ چہارم کے طلبہ اور طالبات کو وظائف۔

تعلیمی مقابلے میں کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ اور طالبات کو ۵، جنوری کو صبح ۱۱ بجے انعامات دیے گئے اور سیکنڈری اور سینئر سکنڈری زمرے کے طلبہ اور طالبات کو ۲½



میلے کا ایک منظر

بجے سہ پہر۔
تقسیمِ وظائف برائے درجہ ششم، ہشتم اور دہم ۶ر جنوری کو صبح ۱۱ بجے عمل میں آئی۔ جلسہ تقسیمِ انعامات برائے درجہ ہفتم، نہم اور یازدہم ۲/۱ ۲ بجے سہ پہر منعقد ہوا۔

میلے کا وقت روزانہ صبح ۱۱ بجے سے شام ۴ بجے تک۔ تھا۔ میلے میں مختلف اسکولوں کے طلبہ اور طالبات نے اپنے اپنے اسٹال لگائے اور اپنے اپنے اسکول کی طرف سے کلچرل پروگرام پیش کیے۔ میلے کے آخری دن تین بہترین اسٹالوں کو بھی انعامات دیے گئے۔ پہلا انعام اینگلو عربک سینئر سیکنڈری اسکول اجمیری گیٹ نے، دوسرا اینگلو سنسکرت سینئر سیکنڈری اسکول دریا گنج نے اور تیسرا انعام شفیق میموریل سینئر سیکنڈری اسکول باڑہ ہندو راؤ نے پایا۔ دو اسکولوں کو کنسولیشن انعام دیے گئے۔ یہ تھے: گورنمنٹ گرلز مڈل اسکول بلبلی خانہ اور گورنمنٹ گرلز سیکنڈری اسکول حویلی اعظم خاں۔



انعام یافتہ طلبہ اور طالبات اکادمی کی طرف سے دی جانے والی انعامی شیلڈوں کے ساتھ

خواتین کا مشاعرہ

۸ر جنوری ۹۰ء کو اردو اکادمی دہلی کی جانب سے پیارے لال بھون نئی دہلی میں خواتین کا مشاعرہ منعقد



(دائیں سے) مائک پر: محترمہ نور جہاں ثروت جنھوں نے نظامت کے فرائض انجام دیے، محترمہ انجنا سندھیر، محترمہ تسنیم صدیقی، محترمہ جمیلہ بانو، محترمہ تاج النسا تاج، محترمہ شاہ جہاں بانو یاد دہلوی، محترمہ ظفر شاہین اور محترمہ شمیم نکہت جنھوں نے مشاعرے کی صدارت کی۔



سامعین میں بعض مشہور شعرا بھی شامل تھے۔ پہلی صف میں دائیں جانب جناب بلراج کومل اور جناب شجاع خاور کو دیکھا جاسکتا ہے۔

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ

اُردو کے لیے اس سال کا ساہتیہ اکادمی ایوارڈ مشہور افسانہ نگار سریندر پرکاش کو ان کے افسانوں کے مجموعے "باز گوئی" پر دیا گیا ہے۔ یہ کتاب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے ۱۹۸۸ء میں شائع کی تھی اور اس میں سریندر پرکاش کے بارہ ۱۲ افسانے شامل ہیں۔

ساہتیہ اکادمی نے اس سال سے تراجم پر بھی ایوارڈ دینے کا سلسلہ شروع کیا ہے اور پہلا ایوارڈ اُردو کے مشہور شاعر حمید الماس کو ان کی کتاب "فرمودات" پر دیا گیا ہے۔ "فرمودات" کنڑا کے مشہور صوفی شاعر سری بسویشور کی ایک سو آٹھ نظموں کے منظوم تراجم پر مشتمل ہے اور اسے ۱۹۸۷ء میں موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی نے شائع کیا تھا۔

"ایوانِ اُردو" اس اعزاز پر جنابِ سریندر پرکاش اور جنابِ حمید الماس کو ہدیۂ تہنیت پیش کرتا ہے۔

کلکتے کی ایک ادبی تقریب

ماہنامہ 'انشار' کلکتہ کی جانب سے اتوار ۱۰ دسمبر ۸۹ء کی شام کو اُردو، ہندی اور پنجابی کے افسانہ نگار جناب ہرچرن چاولہ (ناروے) اور اقبال پروفیسر ڈاکٹر مظفر حنفی کے اعزاز میں شامِ افسانہ اور مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔

'شامِ افسانہ' کی صدارت ڈاکٹر ظفر اوگانوی نے کی۔ جناب رئیس الدین فریدی (مدیر روزنامہ ہند) بحیثیت مہمانِ خصوصی شریک ہوئے۔ جناب ف۔ س۔ اعجاز (مُدیر ماہنامہ انشار) نے جناب ہرچرن چاولہ اور ڈاکٹر مظفر حنفی کا خیرمقدم کرتے ہوئے ان دونوں حضرات کی ادبی خدمات کا ذکر کیا اور اس بات پر خوشی ظاہر کی کہ دنیائے اُردو ادب کی یہ دو اہم ہستیاں آج کی شام کلکتہ کے ادب نواز اور سخن فہم لوگوں کے درمیان موجود ہیں۔ جناب رئیس الدین فریدی نے کہا کہ آج کے ادیبوں اور شاعروں کا فرض ہے کہ وہ فرقہ پرستی کے خلاف اپنا قلم اٹھائیں، کیوں کہ ہم ایک بار پھر ۱۹۴۷ء جیسے حالات سے دوچار ہوگئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ تقسیم ہند کے بعد جب فرقہ پرستی نے سر اٹھایا تو اس وقت کرشن چندر، منٹو اور راجندر سنگھ بیدی جیسے متعدد ادیبوں نے فرقہ پرست طاقتوں کے خلاف جہاد کیا تھا اور اس جہاد کی آج بھی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر مظفر حنفی نے اپنی تقریر کے دوران اُردو افسانے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ افسانے سے افسانویت کا خاتمہ افسانہ نگار کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہرچرن چاولہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے افسانے لکھتے وقت اگر ایک طرف جدید تقاضوں کو برتا ہے تو دوسری طرف انھوں نے اپنے افسانوں میں افسانویت کو بھی برقرار رکھا ہے۔

جناب ہرچرن چاولہ نے حاضرینِ جلسہ کو ناروے میں اُردو کی سرگرمیوں سے باخبر کیا۔ انھوں نے ناروے کے ان ادیبوں اور شاعروں کا غائبانہ تعارف کرایا جو وہاں اُردو، ہندی اور پنجابی میں اپنی تخلیقات پیش کر رہے ہیں۔ یہ سن کر لوگوں کو خوشی ہوئی کہ ناروے میں اُردو، ہندی اور پنجابی کے کئی رسالے شائع ہو رہے ہیں۔ چاولہ صاحب نے بتایا کہ وہ ناروے اور ہندوستان کے درمیان 'ادبی پل' قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے حکومت ناروے کے تعاون سے اُردو میں ایک کتاب 'ناروے کی کہانیاں' شائع کی ہے اور اب جلد ہی ناروے کی زبان میں 'ہندوستان کی کہانیاں' شائع کرنے والے ہیں۔ اب تک اُردو، ہندی اور پنجابی کے متعدد ادیب اور شاعر ناروے مدعو کیے جا چکے ہیں اور حال ہی میں ناروے کے ایک ممتاز ادیب ہندوستان کے دورے پر آئے تھے۔ چاولہ صاحب نے بتایا کہ ناروے میں اب تک تین مشاعرے بھی ہو چکے ہیں۔

جناب ہرچرن چاولہ نے اپنا افسانہ "گھوڑے کا کرب" بھی پڑھ کر سُنایا جس پر انھیں ایک بین الاقوامی ایوارڈ مل چکا ہے۔

'شامِ افسانہ' کے بعد ڈاکٹر مظفر حنفی کی صدارت میں مشاعرہ ہوا۔

(ف۔ س۔ اعجاز)

جامعہ اُردو علی گڑھ کے طلبا کو انعامات

جامعہ اُردو علی گڑھ کے ادیب، ادیب ماہر اور ادیب کامل میں سب سے زیادہ نمبر لانے والے راجستھان کے مندرجہ ذیل طلبا/ طالبات کو راجستھان اُردو اکادمی کی جانب سے نقد انعامات دیے گئے۔

ادیب:

محمد عقیل نوری	۱۰۱ روپے
مس شکیلہ بانو	۱۰۱ روپے

ادیب ماہر:

محمد وقیع	۱۰۱ روپے
مس نجمہ پروین	۱۰۱ روپے

ادیب کامل:

شکیل احمد	۱۵۱ روپے
مس رخسانہ پروین	۱۵۱ روپے

اُردو طلبہ کی حوصلہ افزائی

اُردو کی ابتدائی تعلیم کے فروغ اور طلبا کی حوصلہ افزائی کے واسطے مقصود حسن خاں گمنام بہیڑیوی نے اپنی اہلیہ مرحومہ کے نام سے طیبہ خاتون میموریل اُردو ایوارڈ رائے بریلی کا اجرا امسال سے ضلعی سطح پر کیا ہے۔ تقسیم ایوارڈ کا جلسہ اور مشاعرہ کوآپریٹو بینک کے ہال میں ۶ر دسمبر ۸۹ء کو محترمہ عطیہ پروین کی صدارت میں منعقد ہوا۔ تقسیم ایوارڈ جناب کرشن بہاری نور لکھنوی کے ہاتھوں ہوئی۔ ایوارڈ کمیٹی کو موصول ہونے والے طلبا وطالبات کے ریکارڈ میں سرفہرست رہنے والے دو اُردو طلبا جونیئر ہائی اسکول سطح کے اور دو طالبات ہائی اسکول سطح کی جملہ چار کو فی کس مبلغ ایک سو ایک" روپے نقد، ایک کتاب اور توصیفی اسناد ایک لڑکی اور ایک لڑکے کو حوصلہ افزائی انعام میں دو کتب فی کس اور توصیفی اسناد نیز ان طلبا وطالبات کے اُردو اساتذہ کی خدمت میں صرف اعزازی اسناد پیش کی گئیں۔

دو اُردو ادیبوں کو اعزاز

انڈین کونسل برائے چائلڈ ایجوکیشن نے اُردو کے مشہور ادیبوں ڈاکٹر خوشحال زیدی اور سراج انور کو بچّوں کے ادب میں مجموعی خدمات کے لیے پچھلے دنوں اعزاز سے نوازا۔ اعزاز دینے کی تقریب ۳ر جنوری کی شام کو تالکٹورہ اسٹیڈیم نئی دہلی میں ہوئی۔ سراج انور کو بچّوں کے لیے ان کے تخلیقی ادب پر اور ڈاکٹر خوشحال زیدی کو ان کے تحقیقی مقالے 'اُردو میں بچّوں کا ادب' اور بچّوں کی تعلیم کے لیے ان کی خدمات پر یہ اعزاز دیے گئے۔ اس سے قبل بھی ۱۰ر نومبر ۸۹ء کو مراٹھی بال ساہتیہ سمیلن کے جلسے پر منعقدہ پونا (مہاراشٹر) میں بچّوں کے ادب میں مجموعی خدمات پر ڈاکٹر خوشحال زیدی کو اعزاز دیا جا چکا ہے۔

آل انڈیا افسانوی مقابلہ

بزم تعمیر ادب مرادآباد نے آل انڈیا سطح پر افسانوی مقابلہ کرانے کا فیصلہ کیا ہے تمام ہی نئے اور پرانے قلم کاروں کو شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ تفصیلات درج ذیل پتے سے طلب کی جا سکتی ہے:

پتا: بزم تعمیر ادب، کالا پیادہ، سنبھلی گیٹ، مرادآباد (یوپی) ۲۴۴۰۰۱

ظفر پیامی کے انتقال پر اکادمی کا تعزیتی جلسہ

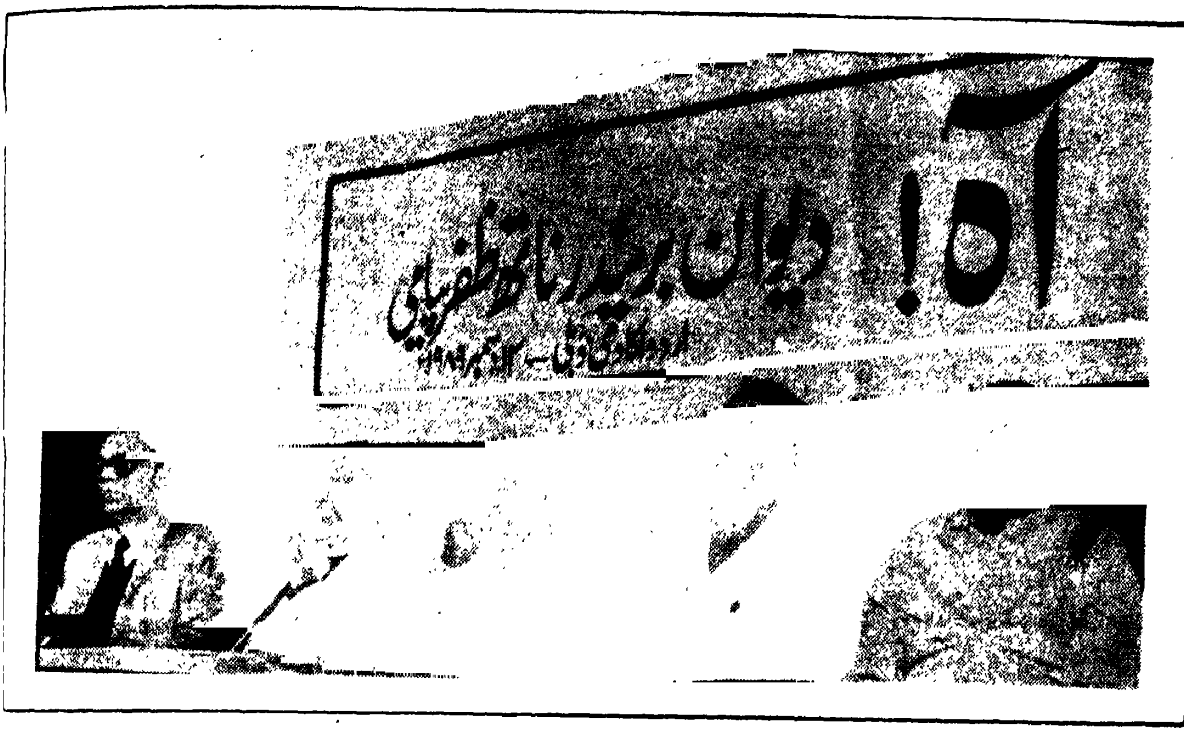
۱۳ر دسمبر ۸۹ء کو اُردو اکادمی، دہلی کی جانب سے اُردو کے نامور ادیب، صحافی اور اکادمی کی سیمینار کمیٹی کے چیئرمین دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی کے انتقال پر تعزیتی جلسہ غالب اکیڈمی نئی دہلی میں منعقد کیا گیا۔

اس موقع پر جو قرارداد تعزیت پیش کی گئی اس کا متن درج ذیل ہے:

"دہلی انتظامیہ اُردو اکادمی کا یہ جلسہ اپنے ممبر اور اُردو، ہندی اور انگریزی کے نامور صحافی اور ادیب جناب دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی کے انتقال پر اپنے دلی رنج وغم کا اظہار کرتا ہے۔ یہ جلسہ مرحوم کے پس ماندگان کے غم میں شریک ہے اور مرحوم کی روح کی شانتی کے لیے دعاگو۔"

انتقال کے وقت ظفر پیامی صاحب کی عمر صرف ۵۸ برس تھی لیکن اس مختصر عمر میں انھوں نے صحافت اور ادب کی جو خدمات انجام دیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ برصغیر ہند پاک اور مشرق وسطیٰ کے معاملات پر وہ گہری نظر رکھتے تھے وہ تقریباً پندرہ سال آل انڈیا ریڈیو کے سیاسی مبصر رہے اور انھوں نے اُردو، ہندی اور انگریزی میں ایسے بے شمار مضامین لکھے جو ان کی سیاسی بصیرت اور حالات حاضرہ سے ان کی مکمل باخبری کے آئینہ دار تھے۔ وہ لگ بھگ دس کتابوں کے مصنف بھی تھے جن میں ان کا اُردو ناول "فرار" اور افسانوں کا مجموعہ "دہشت" بھی شامل ہے جو ان کے انتقال کے چند ہی روز پہلے شائع ہوا تھا۔

ظفر پیامی صاحب پریس ایشیا انٹرنیشنل کے نام سے ایک نیوز ایجنسی بھی



(دائیں سے) جناب جوگندر پال، جناب اے۔آر۔ شیروانی، جناب مالک رام، پروفیسر علی محمد خسرو اور ڈاکٹر شارب ردولوی

چلاتے تھے جو تازہ ترین مسائل پر اخبارات کو معلوماتی مضامین فراہم کرتی تھی۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ان کی بیوہ محترمہ منورما دیوان جو خود بھی نامور صحافی ہیں ان کے اس مشن کو جاری رکھیں گی اور انھیں صحافتی دُنیا کا وہی تعاون حاصل رہے گا جو ان کے نامور شوہر کو حاصل تھا۔"

ظفر پیامی کی رحلت پر شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی کا تعزیتی جلسہ

۱۳ ر دسمبر ۸۹ء کو اُردو کے ممتاز ادیب اور صحافی ظفر پیامی کی رحلت پر شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی کا ایک تعزیتی جلسہ پروفیسر قمر رئیس کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں شعبہ کے اساتذہ اور طلبا نے شرکت کی۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر فضل الحق، ڈاکٹر شریف احمد، ڈاکٹر مغیث الدین فریدی، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، ڈاکٹر عتیق اللہ اور دوسرے اساتذہ نے ظفر پیامی کی شخصیت اور ادبی خدمات کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ آخر میں صدر جلسہ پروفیسر قمر رئیس نے مختصر تقریر کے بعد ایک قرارداد پیش کی جس میں کہا گیا ہے کہ ظفر پیامی کی ناگہانی رحلت نہ صرف اُردو زبان بلکہ پورے ملک کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ وہ ایک ممتاز ادیب اور اعلیٰ مرتبت صحافی تھے۔ ان کے افسانے اور ناول 'فرار' اُردو کے افسانوی ادب میں وقیع اضافہ ہیں۔ ایک روشن خیال صحافی اور دانشور کی حیثیت سے وہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ سارے ایشیا میں جانے جاتے تھے۔ انھوں نے اپنے قلم سے ایشیائی اقوام خصوصاً جنوب ایشیا کے عوام کو متحد کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ وہ اس خطّے میں امن اور آشتی کے پیغمبر تھے۔ ان کی شخصیت روادار اور شرافت نفس کا مرقع تھی۔ ظفر پیامی ملک کے ان چند ادیبوں میں تھے جو متحدہ قومی تہذیب اور سیکولرزم پر ایمان کامل رکھتے تھے۔ ہم شعبۂ اُردو کے اساتذہ اور طلبا یقین رکھتے ہیں کہ ان کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ پُر نہیں ہو سکتا۔ ہم ان کے پسماندگان سے دِ ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں اور ان کے لیے دعائے مغفرت۔

عظیم فیروز آبادی کو صدمہ

اُردو کے مشہور ادیب اور نقا جناب عظیم فیروز آبادی کی اہلیہ محتر

کا دل کا دورہ پڑنے سے اس وقت انتقال ہوگیا جب انھیں ۲۷ دسمبر کو بذریعۂ کار علاج کے لیے دہلی لے جایا جا رہا تھا۔ محترمہ نے راستے ہی میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ان کی عمر ۶۵ سال تھی۔ مرحومہ نہایت دیندار اور دوسروں کے دُکھ درد میں کام آنے والی نیک دل خاتون تھیں۔ ۲۸ دسمبر ۸۹ء دن کے تین بجے سینکڑوں سوگواروں کی موجودگی میں مرحومہ کو سپردِ خاک کیا گیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور مرحومہ کی مغفرت فرمائے۔

امیر اللہ خاں شاہین اور سیّد معظم علی شاہ کا انتقال

۲۸ نومبر ۸۹ء کو آگرہ کی علمی ادبی شخصیت اور مشہور بزرگ شاعر حضرتِ میکش اکبر آبادی کے فرزند سیّد معظم علی شاہ کا حرکتِ قلب بند ہونے سے انتقال ہوگیا۔ مرحوم سینٹ جانس کالج آگرہ میں ڈپارٹمنٹ آف سائیکلوجی کے صدر رہے تھے۔ اور آگرہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی کے نگراں اور سرپرست تھے۔

ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین نے جو میرٹھ کالج میں شعبۂ اُردو کے صدر اور اُتر پردیش اُردو اکادمی کے نائب صدر تھے، میرٹھ میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ انھیں تنفس کا عارضہ تھا۔ اُردو کے اُستاد ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھے مصنّف بھی تھے اور انھوں نے ایک سے زیادہ کتابیں یادگار چھوڑیں۔

ہم مرحومین کے لیے دعاے مغفرت کرتے ہیں اور ان کے پس ماندگان کے غم میں شریک ہیں۔

آپ کی رائے

نعت ایک مستقل صنفِ سخن

"ایوانِ اُردو" کا شمارہ ۷، جلد ۲ (بابت ماہ نومبر ۸۹ء) نظر نواز ہوا۔ جناب سیّد حسین احمد صاحب کا مضمون "کیا نعت ایک صنفِ سخن ہے"، پڑھا۔ چوں کہ مضمون کا عنوان ہی ایک سوال ہے، اس لیے جواب میں کچھ عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

اُردو میں اصنافِ سخن کی تقسیم نہ صرف موضوعات کی بنا پر ہے اور نہ ہیئت (فارم) کی بنا پر بلکہ مختلف اصناف کی شناخت کے لیے الگ الگ معیار متعیّن ہیں۔ چنانچہ موٹے طور پر تمام اصنافِ سخن کو چار گروہوں میں بانٹا جاسکتا ہے --- پہلا گروہ ان اصناف کا ہوگا جن میں ہیئت یا فارم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، جیسے غزل اور رُباعی وغیرہ، دوسرے گروہ میں اس کے بالکل برعکس موضوع ہی اہم ہے، جیسے مرثیہ یا شہر آشوب وغیرہ، تیسرے گروہ میں وہ اصناف رکھی جاسکتی ہیں، جن کی تشکیل میں موضوع اور ہیئت دونوں کا برابر کا حصّہ ہے، جیسے قصیدہ اور چوتھے گروہ میں ان اصناف کا شمار کیا جاسکتا ہے، جن کو نہ موضوع کی بنا پر ممتاز کرسکتے ہیں، نہ ہیئت کی بنا پر، بلکہ ان کی مخصوص روایت اور مزاج کی بنا پر ہی ان کی شناخت ہوتی ہے جیسے گیت۔

یہ دُرست ہے کہ ہماری قدیم یا کلاسیکی تقسیم نظم (یہ اصطلاح بھی غور طلب ہے) کے تحت شاعری کی جو اقسام بیان کی گئی ہیں وہ ہیئت کی بنا پر ہیں، لیکن یہ تقسیم ہرگز تشفی بخش نہیں ہے اور ان سے اصنافِ سخن کے متعلّق صحیح تصوّر ہرگز پیدا نہیں ہوتا ہے۔ اصناف کی یہ تقسیم جو عموماً ہمارے اسلاف کی تصنیف کردہ کتب میں نظر آتی ہے اس طرح ہے: غزل، قصیدہ، مثنوی، رُباعی، ترکیب بند، ترجیع بند، مسمط (اور اس کی قسمیں)، مستزاد اور فرد وغیرہ۔ ان کتب میں مرثیے جیسی صنفِ سخن کو بھی (جسے فاضل مضمون نگار نے ایک مستقل صنفِ سخن قرار دیا ہے) نظر انداز کیا گیا ہے۔

گویا یہ بات واضح ہے کہ ہم صرف اس بنا پر کہ کسی صنفِ سخن کا ذکر ہمارے اسلاف نے نہیں کیا، اسے صنفِ سخن کے درجے سے محروم نہیں کرسکتے۔ دوسری بات جو فاضل مضمون نگار نے نعت کے صنفِ سخن نہ ہونے کی دلیل میں پیش کی ہے، وہ یہ ہے کہ اس کی کوئی متعیّن ہیئت نہیں ہے۔ ساتھ ہی مرثیے کو اس کے مقابل صنفِ سخن کا درجہ دیا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ "عہد سودا سے قبل مرثیے کا کوئی فارم مقرر نہیں تھا اور نہ ہی اجزائے ترکیبی متعیّن تھے"۔ اس کی تفصیل میں جانے کا یہاں موقع نہیں، جن حضرات کو اس بحث سے دلچسپی ہو وہ ڈاکٹر مسیح الزماں کی کتاب "اُردو مرثیے کا ارتقا، ابتدا سے انیس تک" یا اس موضوع پر لکھی گئی دوسری کتابوں کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ ایسی صورت میں میرؔ، سوداؔ، درگاہ قلی اور دیگر قدیم شعرا کے ان مراثی کو جو مسدّس کی ہیئت میں نہیں ہیں کیا مراثی نہ سمجھا جائے، بلکہ ان کی ہیئتوں کے لحاظ سے انھیں نام دیا جائے؟ کیوں کہ مسدّس کی ہیئت کے علاوہ دیگر ہیئتوں میں لکھے گئے مرثیوں کے بارے میں فاضل مضمون نگار کا فرمان یہ ہے کہ وہ مرثیے نہیں ہیں۔ اسی ضمن میں انھوں نے غالب کے تحریر کردہ "مرثیۂ عارف" کا حوالہ بھی دیا ہے جو غالباً ان کے نزدیک غزل ہے (کیوں کہ اسے دیوان میں غزلوں کے درمیان رکھا گیا ہے) جیسا کہ میں شروع میں ہی عرض کرچکا ہوں، اصناف کی درجہ بندی میں صرف ہیئت ہی نہیں موضوع بھی اہمیت رکھتا ہے، نیز ہم اپنی شعری روایات کو بھی نظر انداز نہیں کرسکتے۔ یہ بات کچھ ایسی نہیں، جس کے بیان کی ضرورت ہو کہ ہمارے یہاں مراثی دو طرح کے ہیں --- ایک طرف وہ مراثی ہیں، جو حضرت امام حسینؓ اور ان کے رفقا کی شہادت یا دیگر مذہبی شخصیات سے متعلّق ہیں (اور زیادہ تر ایسے ہی مرثیے ہیں) دوسری طرف وہ مراثی ہیں، جو دُنیاوی حیثیت سے اہم افراد کے مرنے پر لکھے گئے ہیں۔ ان مراثی کو پہلی قسم کے مراثی سے ممتاز کرنے کے لیے عموماً شخصی مرثیہ کہا جاتا ہے۔ اوّل یہ کہ مضمون نگار نے دونوں کو

ایک دوسرے میں خلط ملط کر دیا ہے، دوم یہ کہ اگر غالب نے مرثیہ لکھا اور اس پر عنوان "مرثیہ" تحریر نہیں کیا، تو کیا وہ مرثیہ نہیں رہا؟ غالب نے کہیں یہ بھی تو نہیں کہا کہ یہ مرثیہ نہیں ہے، اگر کہا بھی ہوتا، تب بھی یہ مرثیہ ہی ہوتا۔ کیوں کہ اگر شاعر کے عنوان دینے سے ہی کسی صنفِ سخن کا تعین کیا جانے لگا تو روز نئے نئے مسائل پیدا ہوں گے۔ سب سے بڑا مسئلہ تو اقبال ہی کے ان قطعات سے متعلق پیدا ہو جائے گا جو "بالِ جبریل" میں رُباعیات کے عنوان کے تحت درج ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی رُباعی نہیں۔ کیوں کہ رباعی کے لیے جو اوزان مقرر ہیں، ان میں سے ایک تخلیق بھی اُن پر پوری نہیں اُترتی ہے، اور ساری کی ساری بحر ہزج کے وزن مفاعیلن مفاعیلن فعولن/ فعولان پر ہیں۔ پھر انھیں قطعہ کہا جائے یا شاعر کے عنوان دینے کی وجہ سے رُباعی مان لیں۔

اب چند باتیں اصل سوال کے جواب میں عرض ہیں ___ کسی صنفِ سخن کے تعین کے لیے خاکسار کے نزدیک جو چیز سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ شعری روایت ہے۔ اگر کسی مخصوص قسم کی شاعری کی کوئی مضبوط و توانا روایت موجود ہے، تو پھر اسے صنفِ سخن کی حیثیت سے تسلیم کرنے میں کیا حرج ہے؟ اگر ہم شہر آشوب اور واسوخت کو اصناف کا درجہ دے سکتے ہیں، (مجھے نہیں معلوم کہ فاضل مضمون نگار ان کا شمار بھی اصناف میں کرتے ہیں یا نہیں) جو مقدار کے لحاظ سے نعت کا عشر عشیر بھی نہیں ہیں، تو نعت کو صنفِ سخن تسلیم کرنے میں کون سی چیز مانع ہے؟

شہر آشوب کی بھی کوئی ہیئت مقرر نہیں ہے اور یہ قصیدہ، مثنوی، مخمس اور دیگر ہیئتوں میں ملتے ہیں۔ مثالوں کی غالباً ضرورت نہیں۔ واسوخت کے لیے عموماً مخمس کی ہیئت رائج ہے، لیکن اس کی پابندی نہیں۔ مومن کا مشہور واسوخت:

"اب اور سے لو لگائیں گے ہم
جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم"

غزل کی ہیئت میں ہے لیکن متفقہ طور پر واسوخت تسلیم کیا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر نعت کی کوئی ہیئت متعین نہیں ہے تو کس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسے صنفِ سخن کا درجہ حاصل نہیں ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا کسی صنف سخن کے تعین کے لیے جو چیز بنیادی ہے وہ ایک مضبوط و توانا شعری روایت کا ہونا ہے، نہ کہ کسی مخصوص ہیئت کی پابندی، اور نعت گوئی کی جیسی مضبوط و توانا شعری روایت ہمارے ادب میں موجود ہے وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ چنانچہ یہ سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ نعت ایک ادبی صنفِ سخن ہے یا نہیں؟ سوال یہ ہے کہ کیا اس صنفِ سخن کی کوئی مخصوص و متعین ہیئت ہونی چاہیے؟ اس کا جواب بالکل واضح ہے کہ یہ پابندی بہت سی دوسری اصنافِ سخن کی طرح نعت پر بھی نہیں لگائی جا سکتی۔ نعت ایک موضوعاتی صنف ہے، جس کے لیے کسی بھی ہیئت کی پابندی ضروری نہیں۔ اس کی شناخت اس کے موضوع کی بنا پر کی جا سکتی ہے۔

___ عارف حسن خاں، مراد آباد

نہ کسی کی آنکھ کا نُور ہوں...

جنوری ۹۰ء کا شمارہ دیکھا۔ "اُردو خبر نامہ" اور "آپ کی رائے" میں شامل خطوط کو دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔

مضطر خیر آبادی کی غزل "نہ کسی کی آنکھ کا نُور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں" کو آپ کے اکثر قارئین شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اسے بہادر شاہ ظفر کی تخلیق جانتے ہیں۔ یہ غزل بالتحقیق مضطر خیر آبادی کی ہے اور بہادر شاہ ظفر کے نام سے منسوب چلی آرہی ہے۔ خلیل تنویر صاحب سے بہت پہلے "نگار" میں اور حمیدیہ کالج میگزین بھوپال میں ڈاکٹر یونس حسنی (ٹونک) نے اس غزل کے بارے میں انکشاف کیا تھا کہ شاہ ظفر کے نام سے مذکورہ غزل دراصل مضطر خیر آبادی کی تخلیق ہے۔ ماہنامہ "آجکل" دہلی کے جنوری ۱۹۷۸ء کے شمارے میں پروفیسر عزیز انصاری کا ایک مضمون "بھوپال میں اُردو تحقیق" شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کا آخری حصہ یہاں نقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

"مضمون ختم کرنے سے پہلے بھوپال کی ان دو اہم پیش کشوں کا ذکر کرنا چاہوں گا جو بلاشبہ اس مردم خیز زمین کا اُردو تحقیق کو انمول تحفہ ہیں۔ ایک تو غالب صدی کے دوران غالب کے نسخۂ ثانی کی دریافت ہے۔

.... دوسری تحقیق جس کا بطور خاص ذکر کرنا چاہوں گا ڈاکٹر یونس حسنی نے پیش کی ہے جس میں انھوں نے مشہور غزل:

نہ کسی کی آنکھ کا نُور ہوں نہ کسی کے دِل کا قرار ہوں
کسی کام میں جو نہ آسکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

کے بارے میں یہ ثابت کیا ہے کہ وہ بہادر شاہ ظفر کی نہیں بلکہ مضطر خیرآبادی کی ہے۔ ڈاکٹر حسنی نے نواب فاروق حسین صاحب گوپاموی کے مرتّب کیے ہوئے مضطر کے ایک مختصر انتخاب کا مخطوطہ نواب صاحب کی صاحبزادی بیگم سعیدہ حسن مسعود کے یہاں بھوپال میں دریافت کیا جس میں یہ غزل بھی شامل تھی۔ نواب صاحب مضطر کے عزیز دوستوں میں سے تھے۔ نیاز فتحپوری نے 'نگار' میں اس تحقیقی مضمون کو نمایاں طور پر شائع کیا اور اس طرح بہادر شاہ ظفر سے غلط طور پر منسوب اس غزل کا صحیح مالک مضطر خیرآبادی کو قرار دیا گیا۔"

(آج کل، جنوری ۱۹۷۸ء، ص ۱۳)

ڈاکٹر یونس حسنی ٹونکی کی مشہور کتاب "اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب" ہے۔ وہ جامعہ کراچی میں اُردو کے اُستاد ہیں بیگم سعیدہ حسن مسعود کے شوہر حسن مسعود سیفیہ کالج بھوپال میں اقتصادیات کے پروفیسر ہیں۔ اور پروفیسر نورالحسن ہاشمی کے قرابت دار ہیں۔

—— مختار شمیم، اندور

نہرو نمبر

○ "ایوانِ اُردو" کا نہرو نمبر ملا، عام طور سے ہندوستان اور پاکستان میں شخصیات پر جو نمبر نکالے جاتے ہیں وہ فربہ تو بہت ہوتے ہیں لیکن ان میں پڑھنے کو کچھ نہیں ہوتا۔ "ایوانِ اُردو" کا یہ دوسرا نمبر ہے۔ پڑھنے سے پہلے میں نے اپنے جلد ساز کے پاس جلد بندی کے لیے بھیج دیا یہی میں نے آزاد نمبر کے ساتھ بھی کیا تھا، اس [illegible]

قحط ہے اس کو دیکھتے ہوئے "ایوانِ اُردو" جو آپ کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے اس کی حیثیت اس شاخِ زیتون کی ہے طوفانِ نوح میں جو ایک فاختہ کی چونچ میں نظر آئی تھی۔ فی الحال نہرو نمبر کی اشاعت پر میری طرف سے دِلی مبارکباد قبول کیجیے۔ ایک چھوٹی سی درخواست: اگر کوئی خاص دشواری نہ ہو تو "ایوانِ اُردو" کو کُل ہند کیریکٹر دے دیجیے اسے دِلّی تک محدود نہ رکھیے(۱)

—— کیفی اعظمی، مجواں ضلع اعظم گڑھ

(۱) 'ایوانِ اُردو' کو ہم نے یہی حیثیت دینے کی کوشش کی ہے۔ اکادمی کی دوسری سرگرمیوں کا دائرہ دہلی تک محدود ہے لیکن اس کے دونوں رسالوں 'ایوانِ اُردو' اور 'اُمنگ' کے صفحات ملک بھر کے قلمکاروں کے لیے کھلے ہیں اور ان کا حلقۂ اشاعت بھی ملک گیر ہے۔ —— ادارہ

○ "نہرو نمبر" ملا۔ رائے کیا دوں؟ سچ یہ ہے کہ بہت ہی خوب ہے اور آپ حضرات نے بہتر سے بہتر مضامین حاصل کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ مبارکباد قبول کیجیے۔

—— شانتی رنجن بھٹاچاریہ، کلکتہ

○ "نہرو نمبر" واقعی ان کی شخصیت کے شایانِ شان ہے، اس وقیع اور جامع نمبر کے لیے آپ واقعی انعام اور مبارک کے مستحق ہیں۔

—— مشتاق مومن، بمبئی

○ "نہرو نمبر" دنیائے اُردو میں ایک مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں پنڈت نہرو کی شخصیت کے ہر پہلو پر نظر رکھی گئی ہے۔ اس کے مطالعے سے [illegible] ان دیکھے پہلوؤں سے روشناس ہوا۔ یہ نمبر آپ کی بے شمار محنتوں کا ثمرہ ہے۔ جس کو "نمبروں" کی دُنیا میں ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

—— نور مکتومی، سہسولی، اورائی

○ "ایوانِ اُردو" میرا سب سے زیادہ پسندیدہ رسالہ ہے اور اس کے پہلے شمارے ہی سے ناچیز کو اس کے قاری ہونے کا شرف حاصل ہے آج بھی پابندی سے پڑھتا ہوں۔ آپ نے اس وقت نہرو نمبر نکال کر ایک کارِ نمایاں انجام دیا ہے جب گلستانِ نہرو کی رنگینیاں پھیکی پڑ رہی ہیں۔ ایسے میں پنڈت نہرو کے افکار و اعمال کو منظرِ عام پر لانا انتہائی ضروری بھی تھا۔ نہرو نمبر ابتدا تا انتہا نہایت دلچسپ ہے میری جانب سے تمام قلمکاروں کو دلی مبارکباد۔

—— ممتاز اثری، فیروز آباد

○ بے حد انتظار کے بعد "ایوانِ اُردو" کا نہرو نمبر ایک انوکھی خوشبو اور فرحت بخش تازگی لیے ہوئے سامنے آیا۔ آپ کی کوشش بڑی کامیاب اور قابلِ تحسین ہے تعریف اُس خدائے برتر کی ہے جس نے آپ کو ایک دریا کو کوزے میں بند کر دینے کی صلاحیت بخش دی۔ کس کس سجاوٹ کا ذکر کیا جائے سارے کا سارا نہرو نمبر جواہر پاروں سے جگمگا رہا ہے

—— عارف شجر، ہزاری باغ

○ تین سال قبل آگرہ کے لال قلعے سے تاج محل جاتے وقت ہم لوگوں کو تانگے والے نے "گلاب باڑی" دکھائی تھی۔ رنگ برنگے گلاب دیکھ کر دل و دماغ معطر ہو گئے تھے۔

اب "ایوانِ اُردو" کا نہرو نمبر ملا۔ مجھے
نے دیکھیے کہ آگرہ کی اس گلاب باڑی کے کھلے
دے پھول کبھی نہ کبھی ضرور مرجھائیں گے۔
رُ نہرو نمبر میں آپ نے جو پھول کھلائے ہیں
رہتی دُنیا تک کہیں نہ کہیں ضرور مہکتے رہیں گے۔

—— فیضان نادر، کلمب، ایوت محل

○ "ایوانِ اُردو" کا نہرو نمبر بے حد خوبصورت
بے حد جاذبِ نظر اور ہر اعتبار سے جامع نمبر
ہے۔ نمبر کو یادگار بنانے میں آپ کی محنت و
کاوش لائقِ داد ہے، سرورق پر نہرو جی کی
کوئی دوسری تصویر چھپنی چاہیے تھی۔

—— محمد کاشف رئیس بھوجپوری، نیا بھوجپور

○ "پنڈت جواہر لال نہرو نمبر" پنڈت جی
کی خدمت میں بہترین خراجِ عقیدت ہے۔
آپ سے گزارش ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو
کی تصنیف کردہ کتابیں، جن کے تراجم اُردو
میں نایاب ہیں۔ اُردو اکادمی سے شائع کر دیں۔

—— شوکت علی، گوپال گنج

○ "ایوانِ اُردو" کا ہر شمارہ اپنا ایک
مقام رکھتا ہے۔ مگر نہرو نمبر بے مثال ہے۔

—— انجم اعلیٰ پوری، بدایوں

○ "نہرو نمبر" بڑی افادیت اور اہمیت کا
حامل ہے۔

چھوٹا سا مشورہ مسز لکشمی پنڈت
اور مسز کرشنا ہتھی کے علاوہ جواہر لال کے
خاندان کے دوسرے افراد کے خیالات بھی ہوتے
تو بہتر تھا۔

عبدالمغنی صاحب کا مضمون موصوف
کی کتاب "آزاد ذہن و کردار" میں ایک باب
کے طور پر شامل ہے۔

—— علی عابد

○ "ایوانِ اُردو" کا نہرو نمبر دیکھا یہ
ضخیم، یادگار اور تاریخی خصوصی نمبر
منظرِ عام پر لانے کے لیے آپ کو مبارکباد۔
بے شک یہ ایک دستاویز ہے جسے
قاری اپنے پاس رکھنے میں فخر محسوس کرتا
ہے۔

—— معین الدین شمسی، گریڈیہہ

ولادت اور وفات کی تاریخیں درکار ہیں

مارچ ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے ہفت روزہ
"جامِ جہاں نما" جاری ہوا، جسے اُردو کا اوّلین
اخبار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے مالک
ہری ہردت اور ایڈیٹر منشی سدا سکھ لال
تھے۔ مجھے ان دونوں شخصیتوں کی ولادت
اور وفات کی تاریخوں کی تلاش ہے۔ میں
بے حد ممنون ہوں گا اگر کوئی صاحب یہ
معلومات مجھے مہیا فرمائیں۔ براہِ کرم مطلوبہ
اطلاع کے ساتھ اس کا ماخذ ضرور تحریر
کیا جائے۔

پتا: جی۔ ڈی۔ چندن، جی —— ۱۴۶
جنگ پورہ ایکس ٹینشن، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۴

تصحیح

میرے مضمون "سلامت علی مہدی: ایک شعلہ جو بُجھ گیا" مطبوعہ "ایوانِ اُردو" (جنوری ۹۰ء) میں کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں آئندہ اشاعت میں تصحیح فرما دیں۔

غلط: صفحہ ۳۶ کالم ۳، مولانا احمد حسین پاروی
صحیح: مولانا احمد حسین باروی
غلط: صفحہ ۳۶ کالم ۳، سیّد بدرالرحمٰن
صحیح: سیّد بدرالدجےٰ
غلط: صفحہ ۳۷ کالم ۲، شام اودھ پر چند آنسو
صحیح: شامِ اودھ کے چند آنسو
غلط: صفحہ ۳۸ کالم ۱، فیض آباد
صحیح: حُسین آباد
غلط: صفحہ ۴۰ کالم ۱، ریکر ڈیڈیشن
صحیح: ایکری ڈیٹیشن

—— پروانہ ردولوی، نئی دہلی

واحد رسالہ

"ایوانِ اُردو" اپنی نوعیت کا واحد رسالہ ہے۔ مختلف النوع مضامین اس کی خوبی ہیں۔ لیکن نئی کتابوں پر تبصرہ یا تنقیدی جائزہ کبھی کبھی کھوکھلا اور گھسا پٹا انداز ظاہر کرتا ہے۔

ایک اور بات جس کی طرف میں آپ کی توجہ بطورِ خاص مبذول کرانا چاہتا ہوں وہ یہ کہ آپ جریدے کے سرورق پر جن تاریخی مقامات کی تصویر دیتے ہیں۔ اندرونی صفحے پر اس کی نشاندہی کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ کیوں کہ تصویر دیکھنے کے بعد یہ تجسس جاگتا ہے کہ یہ تصویر کہاں کی ہے۔ سب لوگ تو سیاحت کی اہلیت نہیں رکھتے کم از کم گھر بیٹھے ہی ان تاریخی مقامات کے متعلق معلومات حاصل کرلیں تو کیا بُرا ہے۔[1]

—— کلیم اللہ انصاری، لہر یا سرائے

(۱) آپ نے بہت مناسب مشورہ دیا ہے اسی مہینے سے اس پر عمل شروع کیا جا رہا ہے۔

—— ادارہ

ہم طرح اشعار

جنوری ۹۰ ء کے شمارے میں دیے جانے
لے مصرعے پر ہمیں جو شعر موصول ہوتے
ا میں جو شعر صحیح بحر اور درست ردیف قافیے
ا ہیں ان کا انتخاب درجِ ذیل ہے۔ "گلدستہ"
ن حضرات کو ارسال کیا جائے گا جن کا بھیجا
ا شعر چوکھٹے میں دیا جارہا ہے۔

جب بھی چھا لے گئی بزمِ تصور میں ہمیں
کیوں نہ صدقے جائیں اپنی حسرتِ پرواز کے

مرسل و شاعر: محمد مقصود حجاب، سکندرآباد

کردیا بر وقت اک جھونکے نے طوفاں سے الگ
ورنہ پرزے اُڑ گئے ہوتے جنابِ رازؔ کے

مرسل و شاعر: پریم نارائن سکسینہ رازؔ، دہلی

پر کتر کے کردیا بے بال و پر صیاد نے
حوصلے کیسے ہوں شاداں پھر مجھے پرواز کے

مرسل و شاعر: انور جاوید شاداں، سہسرام

بند کمرے میں بھی سناٹوں سے گھبراتا نہیں
ساتھ میرے سلسلے ہیں آپ کی آواز کے (ناصر بدایونی)

مرسلہ: مشاہر حسین، بدایوں

آئندہ مہینے کے لیے اس مصرعے پر اپنی پسند کے شعر
اس طرح ارسال کریں کہ ہمیں ۱۲ فروری ۹۰ء تک مل جائیں:

دستِ تہہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے
قافیہ ردیف

اب سناؤں کس کو میں مہر و وفا کی داستاں
ہیں کہاں پہچاننے والے مری آواز کے
(وفاؔ ملک پوری)

مرسلہ: تاجدار عباس رضوی،
کاشانۂ وفا، پورنیہ سٹی (بہار)

ل کے زخموں تک رہے چرچے پر پرواز کے
وصلے ہم نے بھی دیکھے ہیں نگاہِ ناز کے (نور تقی نور)

مرسلہ: پرویز عالم چمن، میرٹھ

ند کرکے ایک چڑیا وہ قفس کے درمیاں
لطف گھر میں لے رہے ہیں کوکتی آواز کے (صدف جعفری)

مرسلہ: زیور جہاں، کلکتہ

ہم زمیں سے اُوب کر کچھ بے خودی میں اے صدفؔ
دیکھتے ہیں آسماں گو پر نہیں پرواز کے (صدف جعفری)

مرسلہ: افسر حسین گڈو، کلکتہ

کھول کر سارے دریچے اب حریمِ ناز کے
دیکھ لیں وہ بھی کرشمے چشمِ حیرت باز کے (شاہد رضا ساجد)

مرسلہ: معروف رضا، بھلائی نگر

بدنصیبی نے ہمیشہ کو جدا اس سے کیا
وہ بھی کیا دن تھے جو گزرے ساتھ اک ہمراز کے (انجم املی پوری)

مرسلہ: ریحان الدین، بدایوں

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے موصولہ عنوانات

جنوری ۱۹۹۰ء کے "ایوانِ اردو دہلی" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی، اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانوں میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوان ذیل میں درج کیے جارہے ہیں:

شعری عنوانات

میں سمجھتا ہوں تری چال ہر اک اے صیاد
تو سمجھتا ہے ستمگر مجھے نادانوں میں (خاور)

مرسلہ: محمد شہنشاہ عالم شہنشاہ، معرفت
حکیم محمد واعظ الحق، محلہ قلی پاڑہ، پوسٹ
اور ضلع صاحب گنج ۸۱۶۱۰۹ (بہار)

صبح نکلے ہیں تو ہو شام کو آنا بھی نصیب
آشیانوں میں پرندوں کی دعا ایک ہی ہے (قتیل شفائی)

مرسلہ: حامد مرزا، مکان نمبر ۲۴۱-۶-۲۰، بازار
روپ لال شاہ علی بندہ، حیدرآباد ۵۰۰۲۶۵

وہ پرندہ جسے پرواز سے فرصت ہی نہ تھی
آج تنہا ہے تو دیوار پہ آبیٹھا ہے (نامعلوم)

مرسلہ: محمد صدیق، علی گڑھ

بے کسوں کا حساب تم رکھو
ظالموں کا حساب ہم دیں گے (سحر جے پوری)

مرسلہ: مقبول نصیر آبادی، نصیرآباد

رہ رہ کے جیسے کان میں کہتا ہے یہ کوئی
ہوں گے قفس میں کل جو ہیں آج آشیانے میں (یگانہ یاس چنگیزی)

مرسلہ: اے علی، برہانپور

نثری عنوانات

"اچھی صورت بری نگاہ" (ریاض ارشد کا ناول)
مرسلہ: ایم. ایس. فراز، معرفت ایس.
فرقان علی، نزد مسلم یونیورسٹی پریس، جونس
کمپاؤنڈ، جیل روڈ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲ (یو.پی)

"آس" (رعنا حیدری کی نظم)
مرسلہ: بدر واسطی، ۹، مسجد ملنگ شاہ
چوکی امام باڑہ روڈ، بھوپال (ایم.پی)

"میرا قصور کیا ہے" (رابل کا ناول)
مرسلہ: محمد صدیق، علی گڑھ

"بکھری ہوئی زندگی"
مرسلہ: ممتاز علی، بھاگلپور

"اجنبی رشتے" (اصغر علی چک مگلوری کا افسانہ)
مرسلہ: آفرین صبا، ترکیرہ، کرناٹک

"شکاری" (احمد اقبال کا ناول)
مرسلہ: سعید احمد فائدؔ، دہلی

"گلدستہ" پہلے اور دوسرے نمبر پر درج شعری عنوان اور پہلے اور دوسرے نمبر پر درج نثری عنوان بھیجنے والوں کو ارسال کیا جارہا ہے۔

فون نمبر: ۳۲۷۶۲۱۱، ۳۲۶۳۴۴۸

اُردو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

ایوانِ اُردو دہلی

ادارۂ تحریر:
سیّد شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی

جلد: ۳ ● شمارہ: ۱۱ ● فی کاپی ۵۰ر۲ روپے، سالانہ قیمت ۲۵ روپے ● مارچ ۱۹۹۰ء ●

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا
ماہنامہ ایوانِ اُردو دہلی
اُردو اکادمی، دہلی ــــ گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

خوشنویس: تنویر احمد

سیّد شریف الحسن نقوی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے سیما آفسیٹ پریس، دہلی ۱۱۰۰۰۶ سے چھپوا کر اُردو اکادمی، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا

آغاز

ڈاکٹر خلیق انجم جنرل سیکریٹری انجمن ترقّیِ اُردو (ہند) نے کچھ دن ہوئے ایک ایسا واقعہ سنایا جو دلچسپ تو ہے ہی لیکن ہم اُردو والوں کے لیے لمحۂ فکر یہ بھی پیدا کرتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ انجمن کا ایک کُل ہند جلسہ "اُردو گھر" میں ہو رہا تھا کہ پنجاب کا ایک بوڑھا کسان جلسہ گاہ میں داخل ہوا اور کہا کہ اسے اُردو میں ایک ایسی کتاب کی ضرورت ہے جو اس کے پیشے زراعت سے متعلق ہو۔ یہ بوڑھا کسان اُردو بازار کے تمام کُتب خانوں پر ہو آیا تھا اور اسے اس کی مطلوبہ کتاب نہیں ملی تھی۔ وہیں اس سے کسی نے کہا کہ وہ انجمن کے دفتر جا کر معلوم کرے شاید وہاں ایسی کوئی کتاب مل جائے لیکن یہاں سے بھی اسے خالی ہاتھ ہی واپس لوٹنا پڑا۔

اُردو دھیرے دھیرے صرف ادب کی زبان بنتی جا رہی ہے اور دیگر علوم و فنون جو عملی قدر و قیمت کے حامل ہیں، ان سے اس کا رشتہ ٹوٹتا جا رہا ہے۔ ہم اپنے اس احساس میں انھی کالموں میں اپنے قارئین کو پہلے بھی شریک کر چکے ہیں اور اہلِ قلم سے متعدّد بار یہ گزارش بھی کر چکے ہیں کہ وہ ادبی موضوعات کے علاوہ دوسرے موضوعات کو بھی اپنی توجّہ کا مرکز بنائیں —— یہ نہ صرف وقت کی ضرورت ہے بلکہ اُردو کی بقا کا سوال بھی اس سے وابستہ ہے۔ اس شمارے میں "آپ کی رائے" کے کالم میں ایک خط شامل ہے جس میں بجا طور پر یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ ایک ایسا قاری جو ادب کے علاوہ بھی کچھ پڑھنا چاہتا ہے، بالخصوص ایسی تحریریں جو زندگی کے عملی تقاضوں کی تکمیل میں اس کی معاون ہو سکیں وہ اُردو کُتب و رسائل کیوں خریدے اور پڑھے۔ جیسا کہ ہم نے کہا یہ سوال بے جا نہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا سوال بھی اٹھتا ہے۔ اُردو میں ایسے قارئین کی تعداد کتنی ہے؟ لکھنے والے عام طور پر انھی موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں جن سے زیادہ قارئین دلچسپی رکھتے ہوں اور ناشرین بھی وہی تحریریں چھاپتے ہیں جن کی بازار میں مانگ ہو۔ آزادی سے پہلے اُردو میں ہر طرح کے موضوعات پر کثرت سے کتابیں شائع ہوتی تھیں اور رسائل کے مندرجات بھی گوناگوں ہوا کرتے تھے۔ اب اگر ایسا نہیں ہے تو اس کے لیے صرف قلمکاروں اور ناشروں کو ذمّہ دار ٹھہرانا زیادہ دُرست نہ ہوگا۔ اگر اُردو ہماری روز مرّہ کی زندگی میں آج بھی وہی جگہ حاصل کر لے جو اسے کبھی حاصل تھی تو اس کمی کی تلافی کی صورتیں خود بخود پیدا ہو جائیں گی۔

"ایوانِ اُردو" اور "اُمنگ" کی قیمتوں میں جو اضافہ کیا گیا تھا، واپس لے لیا گیا ہے جن وجوہ سے یہ اضافہ کیا گیا تھا، انھیں دُور کرنے میں انتظامیہ نے ہماری مدد کی جس کے لیے ہم شکر گزار ہیں۔ اب "ایوانِ اُردو" کے ایک شمارے کی قیمت ڈھائی روپے اور "اُمنگ" کے ایک شمارے کی قیمت دو (۲) روپے ہی ہوگی اور سالانہ قیمت بالترتیب پچیس (۲۵) روپے اور بیس (۲۰) روپے۔ جو حضرات اضافہ شدہ سالانہ قیمت ادا کر کے خریدار بنے ہیں، ان کی مدّتِ خریداری بڑھا دی جائے گی۔

—— سیّد شریف الحسن نقوی

(مولانا) امتیاز علی عرشی مرحوم

اُردو کی تذکیر و تانیث پر پشتو کا اثر

ابا کا ایک قدیم مضمون نکل آیا شاید ۱۹۴۵ء میں لکھا گیا تھا میرے علم کی حد تک کہیں شائع نہیں ہوا۔ اسے "ایوانِ اُردو" کے لیے بھیج رہا ہوں۔
——— اکبر علی خاں عرشی زادہ

اُردو زبان میں سنسکرت اور عربی کی طرح، الفاظ یا مذکر ہوتے ہیں یا مؤنث، اہلِ قواعد نے اس کے اصول استنباط کرکے اُردو سیکھنے والوں کے لیے بڑی آسانی پیدا کردی ہے۔ لیکن اہلِ علم آگاہ ہیں کہ یہ کوشش ابھی تک کما حقہٗ کامیاب نہیں ہوئی۔ سیکڑوں عربی، فارسی اور ترکی الفاظ ان کے برخلاف مذکر یا مؤنث بولے جاتے ہیں۔

فارسی زبان میں تذکیر و تانیث کا وجود ہی نہیں، اس لیے کسی لفظ پر فارسی اصولِ تذکیر و تانیث کے اثر انداز ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ عربی میں البتہ مذکر و مؤنث کی تقسیم موجود ہے۔ مگر اس کے قواعد میں استثنا کی گنجائش نہیں نکلتی چنانچہ ایک سو سماعی مؤنثات کے علاوہ جس اسم کے آخر میں تای تانیث، الفِ مقصورہ یا الف ممدودہ پایا جائے وہ مؤنث اور باقی سب مذکر مانے جاتے ہیں۔

اس صورت میں اگر کسی فارسی لفظ کو مؤنث یا مذکر بولا جائے گا، تو اس کی وجہ [illegible]

اصول کے برخلاف کوئی فارسی لفظ مذکر یا مؤنث قرار پا چکا ہوگا، تو اس استثنا کے اسباب کا سراغ لگانا اہلِ قواعد کا فرض ہوگا۔

اسی طرح عربی کے بھی جو لفظ اپنی اصل کے برخلاف مذکر یا مؤنث مستعمل ہوں گے، اگر یہ اختلاف اصولِ اُردو کے مطابق ہوگا، تو خیر، ورنہ اس بے قاعدگی کی وجہ بھی تلاش کی جائے گی۔

اُردو میں فارسی و عربی کے ایسے لفظ بھی پائے جاتے ہیں، جن کی جنسیت پر ہندی مترادف کی جنسیت اثر انداز ہوئی ہے، مثلاً کلید کو ہم اس لیے مؤنث بولتے ہیں کہ اس کا ہندی مترادف "کنجی" مؤنث بولا جاتا ہے۔

بلا شبہ اس اصول کے تحت بہت سے لفظوں کے تبادلِ جنسی کی علت کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس ہفتخواں کے طے کرنے میں ایک مشکل راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہندی قواعد نویس ایسی مثالیں بھی پیش کرتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خود ہندی [illegible]

تذکیر و تانیث کا تبادل کیا ہے، مثلاً بیار، وستو اور پستک اصلاً مذکر تھے۔ اُردو مترادفات ہوا، چیز اور کتاب کے اثر سے ہندی میں بھی مؤنث بولے جانے لگے ہیں۔ اسی طرح دیہہ کی تذکیر و تانیث کے اختلاف میں بھی اس کو دخل ہے کہ اس کا مترادف بدن مذکر بولا جاتا ہے۔

اگر یہ خیال دُرست ہے اور اس کے غلط ہونے کی کوئی وجہ بھی سمجھ میں نہیں آتی، تو پھر یہ کس طرح یقین کیا جا سکے گا کہ جس لفظ کو ہم بخیالِ خود ہندی مترادف کے اثر سے جنس تبدیل کرتا دیکھ رہے ہیں، اس کا واقعی سبب بھی بس یہی ہے۔ کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ اس کے برخلاف ہندی لفظ نے بدیسی اثر سے اپنی جنسیت بدل ڈالی ہو۔ اور اگر اس منزل کو بھی کسی نہ کسی طرح سر کر لیا جائے، تو کچھ لفظ ایسے باقی رہ جاتے ہیں جن کی کوئی تاویل نظر نہیں آتی۔ مثلاً غذا کا ہندی مترادف کھاجا مذکر ہے، مگر ہم اسے مؤنث بولتے ہیں۔ اسی طرح "ضو" کا ہندی مترادف "اُجالا" مذکر ہے، مگر ہم اسے بھی مؤنث ہی استعمال کرتے ہیں۔

میری رائے یہ ہے کہ جتنے پردیسی لفظ ہماری زبان میں پٹھانوں کی وساطت سے داخل ہوئے ہیں، اُن کی تذکیر و تانیث کی تعیین میں ہمارے بڑے بوڑھوں نے اپنے انھیں افغان اُستادوں کی پیروی کی ہے، اور اس لیے بہت سے لفظ ہمارے اصولِ زبان کے برخلاف مذکر یا مؤنث

[illegible]

مروّج ہوگئے ہیں۔ چنانچہ جتنا ماضی کی طرف پلٹتے جائیے، یہ اثر زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اور جتنا حال کی طرف آتے جائیے، پشتو اصول سے جگہ جگہ انحراف پیدا ہوتا دِکھائی دیتا ہے۔ مثلاً عربی کے وہ لفظ جو تفعیل وزن پر آتے ہیں سوائے ایک "تعویذ" کے اُردو میں سب مؤنث بولے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف پشتو میں اُن کی تذکیر کا رواج ہے۔ اب اگر آپ سلطان محمد قلی قطب شاہ اور ابن نشاطی وغیرہ دکنی شعرا کا کلام پڑھیں تو شاید بلا استثنا بالکل پشتو کے مطابق ان سب کو مذکّر پائیں گے۔

اسی طرح آج ہم "طاقت" وغیرہ اُن عربی لفظوں کو جن کے آخر میں تای مصدری ہے مؤنث بولتے اور لکھتے ہیں لیکن دکنی شعرا ان سب کو اور میر تقی کے زمانے تک شاعر بعض کو مذکّر لکھتے تھے، جو پشتو کے عین مطابق ہے۔

"آواز" کو سارے اُردو بولنے والے مؤنّث بولتے ہیں، لیکن رام پور اور جھالاواڑ میں ہر کرومہ "اس کا اچھا آواز" اُس کا بلند آواز" وغیرہ ترکیبوں میں مذکّر بولتا ہے۔ یہی تذکیر دکن میں بھی پائی جاتی ہے، اور ولی دکنی تک نے اسے مذکّر باندھا ہے۔ پشتو میں بھی یہ لفظ مذکّر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔

یہ اور اس قسم کی بہت سی اور مثالیں بھی اس طرف رہنمائی کرتی ہیں کہ پشتو کے اصولِ تذکیر و تانیث کا ہماری زبان کے لفظوں پر خاصا اثر ہے۔

پشتو کا قاعدہ تذکیر و تانیث

پشتو کا کلیہ قاعدہ ہے کہ جو لفظ "ا، و، ہ، ی" میں سے کسی ایک حرف پر ختم ہو، وہ مؤنّث اور باقی سب مذکّر ہوتے ہیں۔[1]

غور کرنے سے اندازہ ہوگا کہ یہ قاعدہ عربی اصول تذکیر و تانیث کے تو بڑی حد تک مطابق ہے، یعنی تائے تانیث، الفِ مقصورہ اور الف ممدودہ کی طرح جو عربی میں علاماتِ تانیث ہیں، پشتو میں الف اور ہای ہوز تانیث کی علامتیں شمار ہوتی ہیں۔ گویا پشتو کا الف، عربی کے دو الفوں کے قائم مقام اور "ہای ہوز" تای تانیث کی جگہ ہے، جو عربی زبان میں اس طرح (ۃ) لکھی جاتی اور حالت وقفی میں (ہ) بن جاتی ہے۔ اور اس امر میں یہ قاعدہ ہندی کے مطابق ہے کہ ی معروف، ہندی زبان کی طرح پشتو میں بھی علامتِ تانیث ہے۔

اب اس اصول کے تحت اُردو زبان کے اُن الفاظ پر غور فرمائیے جو مذکورۂ بالا حروف پر ختم ہوتے اور اُردو قواعد کے برخلاف مذکّر یا مؤنث بولے جاتے ہیں۔

(الف) اُردو کے الف پر ختم ہونے والے لفظ مذکّر مانے جاتے ہیں، سوائے ان لفظوں کے: آسیا، جا، پروا، شہنا، قرنا، کیمیا، نوا، مرحبا، بیجا، یغما، صل علا، صہبا، سیما، دنیا، عقبیٰ، حمیٰ، کربلا، وا ویلا، چوں و چرا، رعایا، برایا، املا، انشا، ایذا، ابتدا، انتہا، اشتہا، اغنا، اکتفا، التجا، امتلا، استدعا، استرضا، تمنّا، ادا، بقا، فنا، بلا، جلا، دغا، وِلا، وغا، صدا، قضا، جفا، رِضا، حیا، دوا، دعا، صبا، حنا، عبا، قبا، سزا، جزا، ریا، فضا۔

(ب) ایسے ہی اُردو کے "و" پر ختم ہونے والے لفظ مذکّر بولے جاتے ہیں، سوائے ان لفظوں کے: ہجو، نحو، ضو، آبجو، آبرو، بو، ترازو، جو، خو، دارو، جستجو، گفتگو، شست و شو، نازبو، شبو، کوکو، تگاپو، پرستو، زلو، رو، قلمرو، تگ و دو، روا رو، گاو۔

(ج) ہ پر ختم ہونے والے لفظ بھی اُردو میں مذکّر استعمال ہوتے ہیں، سوائے ان کے: آہ، باہ، راہ، کاہ، واہ، پناہ، پگاہ، گیاہ، رفاہ، نگاہ، سیاہ، کلاہ، خرگاہ، درگاہ، روباہ، رسم و راہ، دستگاہ، کارگاہ، بارگاہ، تن خواہ، خانقاہ، نانخواہ، مہرگیاہ، مردم گیاہ، واویلاہ، بسم اللہ، شکوہ، کوہ، چہ، شہ، براہ، گرہ، زہ، کنہ، تہیہ، ہیئیہ، شبیہ، توجہ، تنبیہ، تنزیہ، توجیہ، توبہ، دفعہ، فضہ، زہرہ، فاختہ۔

ان الفاظ کی بے قاعدگی کو پشتو کے زیرِ اثر کہنا بے جا نہیں۔ ان میں سے وہ سب لفظ کاٹ دیے جائیں جو ہندی مترادف کی وجہ سے خلافِ قاعدہ چل رہے ہیں، تب بھی بقیہ الفاظ پر پشتو کا اثر ناقابلِ انکار حقیقت ہے ورنہ اس کا مطلب یہ سمجھا جائے گا کہ محمود غزنوی کے وقت سے بارہویں صدی تک افغانستان سے کوئی شخص یہاں آکر نہیں بسا، اور بسا تو دنیا بھر کے اصولِ معاشرت کے برخلاف اُس نے یہاں کی زبان پر مطلق اثر نہیں ڈالا۔

عربی مکسر جمعوں کی جنسیت

اُردو میں بہت سے عربی [illegible]

---

[1] میں نے اس قاعدے کو کلیہ کہتے وقت کرنل راورٹی کی گرامر کی تفصیل کو قصداً نظر انداز کر دیا ہے، اس لیے کہ مانحن فیہ پر اس کا چنداں اثر نہیں پڑتا۔ اہلِ تحقیق کو تفصیل کی خاطر مذکورہ کتاب خود

لفظ واحد مذکر استعمال کیے جاتے ہیں، اور یہ وحدت اور تذکیر دونوں اُردو اصول کے تحت بھی نہیں ہیں، مثلاً اشراف، اوصاف، آداب، احوال، احکام، اخبار، اسباب، اولیا، شمائل، حقوق۔ بظاہر اس کی کوئی معقول توجیہ پیش نہیں کی جا سکتی، سوائے اس کے کہ پشتو میں یہ لفظ واحد مذکر بولے جاتے تھے، اس لیے ہم نے بھی افغانوں کی زبان سے واحد مذکر سن کر واحد مذکر ہی مان لیا۔

عربی مصادر مزید فیہ کی جنسیت

نیز عربی کے جو لفظ افعال، افتعال، استفعال، تفعل اور تفاعل وزن پر آتے ہیں، اُردو میں مذکر مانے گئے ہیں۔ لیکن حسب ذیل مصادر مؤنث بولے جاتے ہیں:

افعال = املا، انشا، ایذا، ایما، اصلاح، الحاح۔

افتعال = ابتدا، اشتہا، وغیرہ الف پر ختم ہونے والے اور اصطلاح، اطلاع۔

استفعال = استدعا وغیرہ الف پر ختم ہونے والے۔

تفعل = تمنا، تسلی، تجلی، ترقی، تجزی، توجہ، تفرع، توقع۔

تفاعل = تحاشی، تراضی، تواضع۔

ان میں سے حرف ی پر ختم ہونے والے لفظوں کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تانیث کا سبب یہ ہے کہ اُردو میں "ی" علامتِ تانیث ہے۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ یہ کوئی قاعدۂ کلیہ نہیں ہے۔ آخر ہاتھی، دہی، گھی، آدمی، بھنگی، بہشتی وغیرہ بھی تو "ی" پر ختم [illegible]

قدیم اُردو پر پشتو کا اثر

قدیم اُردو میں حسب ذیل الفاظ مذکر بولے جاتے تھے حالاں کہ اب یہ سب کے سب مؤنث مانے جاتے ہیں:

طلب، مضراب، محراب، شراب، تاب، رکاب، ضرب، جیب، آب، آب و تاب، نقاب، بحث، حدیث، احتیاج، طرح، فرح، شرح، فتح، مدح، روح، صلاح، سروح، دوزخ، داد، بنیاد، یاد، باد، مراد، امداد، مسند، مسجد، امید، عید، جرید، دید، کلید، پسند، گرد، سند، حمد، محشر، مجمر، کشور، فکر، بہار، خبر، خاطر، خیر، قدر، سیر، سپر، چادر، شکر، کمر، بصر، زنار، گفتار، زردار، عار، نیشکر، سطر، یادگار، دیوار۔

طرز، دہلیز، پرواز، آواز، جنس، ہوس، ناموس، مجلس، نرگس، آتش، سفارش، خورش، تابش، عرض، بساط، شرط۔

طبع، نزاع، صنع، شمع، متاع، تیغ، زلف، صف، سیف، لاف۔

خلق، برق، شفق، خاک، خاشاک، کلک، کمک، محک، مرگ۔

مثال، مجال، سلسبیل، عقل، دلیل، مشکل، آب و گل، بلبل، مشعل، جنگ و جدل، نقل، غزل، حمائل، قال و قیل، مثل۔

فہم، خاتم، زمام، رسم، قلم، رقم، چشم، بزم، شرم۔

سوزن، زین، معدن، انجمن، شان، زبان، جان، میزان، کمان، میان، داستان۔

جہاں تک میں نے غور کیا ہے، ان الفاظ کی سابقہ تذکیر اور موجودہ تانیث کی کوئی ایسی علامت [illegible] اس کے کہ اُسے پشتو کا اثر مانا جائے، اور اسے ہندی ترادف کا نتیجہ جانا جائے۔ یا بعض الفاظ کی حد تک معاملے کو ہنوز مبہم تصور کیا جائے۔

مختلف فیہ الفاظ

اسی طرح اُردو میں بہت سے لفظ ایسے بھی ہیں، جن کی تذکیر و تانیث میں دہلی و لکھنؤ کے استاد آج تک اختلاف رکھتے ہیں، اور اس لیے اُن کی دونوں جنسیں تسلیم کر لی گئی ہیں۔ اُن میں سے یہ لفظ ابھی تک دہلی میں مذکر بولے جاتے ہیں، یا غدر سے پہلے تک کے اساتذہ نے انھیں مذکر باندھا ہے:

خراش، ململ، سیر، حد، دشنام، ایجاد، بار، پرواز، پیداوار، پیش قبض، تاب و تواں، خلش، خلط، زہب، سیل، غور، فتراک، فکر، قامت، قلم، مخمل، شکن، پند، پیکان، بہشت، جراحت، زنار وغیرہ۔

آخر اس اختلاف کا باعث کیا ہے، اور کیوں اس قسم کے بیشتر لفظ دہلی میں مذکر استعمال کیے جاتے ہیں؟

چوں کہ ان لفظوں کو رام پور اور روہیلکھنڈ کے اُن شہروں میں جہاں پٹھانوں کی نسل زیادہ آباد ہے، لوگ زیادہ تر مذکر بولتے ہیں اور پشتو میں بھی یہ مذکر ہی ہیں، اس لیے میں یہ قیاس کرتا ہوں کہ ان کی تذکیر کی وجہ پشتو کا اثر ہے۔ چوں کہ مغربی ہندوستان پر افغانوں کا اثر نسبتاً زیادہ رہا ہے۔ اس لیے صرف روہیلکھنڈ ہی کی زبان نہیں مغربی یو۔پی اور دہلی کے اضلاع بھی تذکیر و تانیث میں پشتو سے زیادہ متاثر ہیں۔

ساجدہ زیدی

جستجو ذات کی

دلِ شوریدہ
حیرت خانۂ اسرارِ ہستی ہے
کہ رمزِ کائنات
آفاق کے سرِّ نہاں
اور ہست و بود و رفت کی محفل
زمینوں اور زمانوں کی حدیں
سیّارگانِ آسماں کے رقص و حرکت
روز و شب کی بزم آرائی
خدائے لم یزل کی کار فرمائی

مری شب زندہ داری میں سبھی شامل ہیں
میرے دل پر دستک دے کے
سرگوشی میں کہتے ہیں
کہ تیری حسرتیں
تیری نگاہِ تشنہ
تیری دھڑکنیں، آہیں
ترا ذوقِ نظر، سوزِ دروں
دشتِ جنوں میں آبلہ پائی
سبھی ہمراز ہیں اپنی

مگر اس دل میں گاہے گاہے اک کانٹا کھٹکتا ہے
نہ جانے کیا مرا آغاز ہے، انجام ہے،
منزل کہاں ہے،
کون سی سمتیں ہیں میرے ہست و امکاں کی؟
نہ جانے کیوں مری ہستی
لرزتا قطرۂ بے مایہ ہے
اس بحرِ موجودات کے بیتے خزانے ہیں؟
میں کیوں
اک ذرۂ ناچیز کی مانند
سرگرداں ہوں
دشتِ کالعدم میں میں
کیوں مرا مقسوم ہے مٹنا — فنا ہونا؟

میں شاید انفس و آفاق کے سرِّ نہاں میں
خود بھی شامل ہوں
اسی اسرار کا اک جزوِ لاینفک ہوں
اک ذرہ ہوں
لیکن وسعتِ صحرا کی حامل ہوں

گلبرگ، دودھ پور، سول لائن، علی گڑھ

فیاض رفعت

شرمیلا

بالائی منزل کے اپنے مخصوص کمرے میں کرسی پر نیم دراز میں سرت چندر چٹرجی کا "دیوداس" پڑھ رہا تھا۔ کہانی بڑی خوبصورتی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی اور میں نہایت منہمک انداز میں ناول پر جھکا ہوا تھا کہ یک بیک دادا جان کی رعبیلی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی — وہ مجھے نیچے سے پکار رہے تھے۔ ذہنی طور پر میں جھنجھلا گیا اور کتاب کو میز پر پٹکتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور نیچے اترنے کا ارادہ کیا۔ ابھی میں نیچے اتر ہی رہا تھا کہ دادا جان پھر زور سے چلّائے۔ "جیتندر۔ اے او جیتندر"... اور جیسے میری روح فنا ہو گئی۔ میں سمجھ چکا تھا دادا جان نے اس بار انتہائی غیظ و غضب کے ساتھ آواز دی تھی۔ — کسی حد تک اپنے حواس کو قابو میں لاتے ہوئے میں نے سیڑھیوں ہی سے جواب دیا — "آیا دادا جان —" اور پھر ایک ہی سانس میں نیچے اُتر گیا۔ دادا جان نے مجھے تنقیدی نگاہ سے گھورا اور ان کے جھریوں دار ہونٹ ملے — وہ فوجیوں کے لہجے میں بول رہے تھے....

"کیا کر رہے تھے جی — ہاں میں سمجھ گیا" انھوں نے کچھ سوچ کر قیاس سے کام لیا — "ناول پڑھ رہے ہوں گے لاٹ صاحب — کیوں؟ — ہنھ اور نہیں تو لکیریں کھینچ رہے ہوں گے۔ بڑے کلاکار بنے پھرتے ہیں — کہا کس نے تم سے تصویریں بنانے کو؟" شیر کی طرح بپھرتے ہوئے وہ میری طرف گھومے —

"جج — جی نہیں دادا جان"۔ میں نے بوکھلا کر سعادت مندی کا اظہار کرنا چاہا اور گردن جھکا لی —

"یہ کیسے کھڑے ہو جی؟ — حد ہو گئی آج کے نوجوان سے — ابھی سے کمر جھکی جا رہی ہے"

دادا جان اپنی ٹیک لگانے والی لکڑی کی طرح اکڑے۔ "مجھے دیکھو ساٹھ برس کا ہو گیا مگر خم نہیں آیا"

"جی —" میں نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

"اچھا ہاں سنو — آج شام کو ذرا تیار رہنا — ٹھیک پانچ بجے لکھیم پورہ کے زمیندار آ رہے ہیں تمھیں دیکھنے کے لیے"۔ انھوں نے میرے سراپا کا جائزہ لیا۔ "اور یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے — سو بار منع کیا بالوں کو لڑکیوں کی طرح نہ بڑھایا کرو۔ مگر آپ کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی — بھئی دماغ پر اثر پڑتا ہے سمجھے؟"

اس بار لہجہ شفقت آمیز تھا۔

میں خاموش رہا —

ایک ثانیہ سوچ کر وہ پھر اسی کس بل کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"بھول نہ جانا — ذرا لباس وغیرہ کا خیال رکھنا — کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھاری لاپروائی سے سارا بنا بنایا کام بگڑ جائے۔"

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوالیہ نگاہیں دادا جان کے چہرے پر مرکوز کر دیں —

"ارے بھئی وہ تمھیں دیکھنے آ رہے ہیں اپنی لڑکی کے لیے"۔ دادا جان کے الفاظ میرے کانوں میں لاوے کی طرح پگھلے — اور میں احتجاج کیے بنا نہ رہا۔ یہ میرے مستقبل کا سوال تھا۔

"مم مگر دادا جان ابھی تو میں نے بی۔ اے بھی نہیں کیا اور صرف میٹرک ہوں"۔ میں نے اپنی دانست میں دادا جان کو غیر مکمل تعلیم کا احساس دلایا۔

"بس بس چُپ رہو جی — مُنہ لگتے ہیں مُنھ"۔ دادا جان کی آنکھوں نے مجھے چشمہ کے دبیز شیشوں سے گھُورا —

معاملہ زندگی بھر کا تھا۔ میں خود کو روک — نہ سکا اور دبے لفظوں میں کہہ ہی گیا — "دادا جان کچھ تو سوچیے۔ میں نے میٹرک فرسٹ کلاس میں کیا ہے، مجھے ابھی پڑھنا چاہیے اور پھر میری عمر بھی تو ابھی نہیں گزری جا رہی ہے؟" —

"ہاں۔ ہاں آپ تو دودھ پیتے بچّے ہیں — سترہ اٹھارہ سال کے کڑیل نوجوان ہو، اور پھر جتنی جلدی شادی ہو جائے اچھّا ہے"۔ دادا جان نے اپنی قدامت پسندی کا ثبوت دیا اور مجھے یہ سوچ کر دل میں ہنسی آ گئی۔ "کڑیل نوجوان"۔ — میں نے تعظیماً پھر گردن جھکا لی تھی —

"جیتندر کی ماں — جیتندر کی ماں"۔ دادا جان نے ماتا جی کو بلند لہجے میں آواز دی۔ اور مجھے ایسا لگا کہ جیسے وہ کسی فوجی دستے کو آگے بڑھنے کا حکم دے رہے ہوں — دادا جان نے

اسٹیشن ڈائریکٹر آل انڈیا ریڈیو، بھوپال

عمر کا بیشتر حصّہ فوج میں گذارا تھا۔

"آئی پتاجی!" مجھے ماتاجی کی آواز سنائی دی اور پھر آنِ واحد میں وہ آموجود ہوئیں ـــــ انھوں نے ساری کے آنچل سے گھونگھٹ کا کام لیتے ہوئے آدرش ناری بننے کا ثبوت دیا۔

"بہو کچھ سُنا ـــ جیتندر بچّہ ہے وہ شادی نہیں کرے گا؟" انھوں نے مجھے طنز بھری نظروں سے دیکھا اور پھر وہ اُبل پڑے ـــ "جاؤ جی اوپر جاؤ اور شام کو تیّار رہنا" ـــ "دیکھنا" انھوں نے مجھے چلتے چلتے روکا ـــ "کوئی کمی نہ رہنے پائے، وہ نیلا سوٹ پہن لینا۔ زمین دار سکھ لال جی لاکھوں روپیے کے آسامی ہیں" ـــ اور میں منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہوا مضمحل قدموں سے سیڑھیاں چڑھنے لگا ـــ ماتاجی کی دبی دبی آواز نے میرے کانوں میں رس گھولا ـ "پتاجی ابھی ذرا پڑھ اور لیتا۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو بہو ـــ شادی کے بعد نہیں پڑھ سکتا؟" اور پھر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا ـ ماتاجی باورچی خانے کی طرف جارہی تھیں اور دادا جان شاید حقّہ گڑگڑانے۔ اُن کا فیصلہ اٹل تھا۔

میرے ذہن میں طوفان اٹھ رہے تھے، آندھیاں سی چل رہی تھیں میں کسی بھی حال میں شادی نہیں کرنا چاہتا تھا ـــ کمرے میں پہنچ کر میں نے پھر "دیوداس" میں دلچسپی لینا چاہی، مگر بے سود ـ دماغ کا سکون منتشر ہو چکا تھا اور میں کسی بے بس پنچھی کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ میرا موڈ قطعی آف ہو چکا تھا۔ مگر پھر میں نے سوچا۔ اس طرح گھبرانے سے کام نہیں چلے گا۔ مجھے کوئی تدبیر سوچنی چاہئے۔ اور پھر میں بڑی دیر تک ذہن سے الجھتا رہا۔

مگر نتیجہ وہی صفر رہا۔ دادا جان کا فیصلہ قطعی اور آخری تھا۔ اور پھر میں ہی کیا گھر کے سبھی افراد ان سے ڈرتے تھے۔ بلکہ ان سے نہیں اُن کے فوجی غصّہ سے ڈرتے تھے۔ مجھ میں اتنی ہمّت نہیں تھی کہ کھُلّم کھُلّا ان کے فیصلہ کو چیلنج کر سکتا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں کمرے میں مقیّد ہوں اور منوں بھاری زنجیریں میرے پاؤں سے بندھی ہیں ـــ اور زنجیروں کو میں نہیں توڑ سکتا تھا ـــ مضطرب کُن احساس کو زائل کرنے کے لیے بڑھ کر میں نے کمرے کی ساری کھڑکیاں کھول دیں اور کہنیوں کے بل کھڑکی پر جھک گیا دُور اُفق پر بدلیوں کے سائے منڈلا رہے تھے۔ ہواؤں کے جھونکے خُنک تھے۔ پہاڑوں کی حسین چوٹیاں کُہر کی دھند میں لپٹی ہوئی تھیں اور ان کے نشیب میں دور ایک چشمہ گیت گا رہا تھا۔ گُل پوش وادیوں میں پھول کھلے ہوئے تھے اور پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو ماحول میں رچ رہی تھی ـــ منظر بہت حسین تھا مگر میں اس سے زیادہ دیر تک محظوظ نہ ہو سکا ـــ ایک بار پھر شادی کا سوال ذہن میں خلش بن کر جاگ اٹھا تھا۔ میں نے زوروں سے کھڑکی کے پٹ بند کر دیے اور بالوں میں انگلیاں پھنسائے تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا ہوا صحن میں آگیا ـــ "کہاں جاؤں؟" ـــ ایک سوال، ایک خلش، میں فیصلہ کیے بغیر باہر نکل گیا مجھے اپنے کپڑوں تک کا احساس نہ رہا تھا۔ میں بھول گیا تھا کہ میں سادہ کرتے اور پاجامہ میں ملبوس ہوں ـــ اور میرے بدن پر صرف ایک سوئٹر ہے ـــ گھر سے نکل کر میں کھلی فضا میں آگیا اور مجھے سردی کا احساس ہوا۔ سوچا کوٹ پہن آؤں؟ مگر پھر اندر نہ جا سکا۔

اور پھر میں شہر کی کئی بھری پُری سڑکوں سے گزرا۔ نئی پگڈنڈیاں میرے قدموں تلے آئیں۔ میں سمت کا دھیان کیے بغیر آگے بڑھ رہا تھا ـــ یوں ہی میری نظریں گھڑی پر چلی گئیں اور میں چونکا۔ مجھے سڑکیں ناپتے ناپتے تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں نے ماحول کا جائزہ لیا اور گردن کو چاروں طرف گھمایا۔ یہ ایک نچلے طبقے کا محلّہ تھا۔ میں اور آگے بڑھا۔ اُدھر سڑک کے داہنی طرف کافی لوگ جمع تھے۔ شاید کوئی مجمع والا لوگوں کو اُلّو بنا رہا تھا ـــ اس سے ذرا فاصلہ پر فٹ پاتھ کے کنارے میں نے کئی نائیوں کو براجمان دیکھا ـــ مجھے دیکھ کر کئی چیخے ـــ "آئیے بابوجی"۔ اور میرے ذہن میں روشنی کی ایک کرن جگمگائی ـ میں بڑی پھُرتی سے ان کی طرف بڑھا اور پھر بے فکری سے ایک نائی کی چٹائی پر جا بیٹھا۔

"کہیے بابوجی حجامت کیسی بناؤں ـ ـــ دلیپ کٹ یا راج کپور کٹ؟" ـــ منچلے نوجوان نائی نے میرے سر پر ہاتھ پھراتے ہوئے بالوں کی شان میں قصیدہ کہا ـــ "آہا بابوجی کیا سجیلے بال ہیں۔ ایشور کسم فلمی ہیرو کے مافک (موافق) ہیں ـــ بمبئی کیوں نہیں چلے جاتے آپ؟" میں چپ نہ رہ سکا اور تیکھے لہجے میں اسے ڈانٹا ـــ "کیا بکواس لگائی ہے۔ چلو جلدی کرو۔"

"حضور آپ بتلائیے تو سہی کون سا کٹ بناؤں۔"

"ایک بال بھی چاند پر نہ رہنا چاہیے سمجھے"۔ میں نے اسے سنجیدگی سے دیکھا ـــــ

"ایں؟" ـ وہ چونکا ـــ وہ متحیّرانہ انداز میں پلکیں جھپکا رہا تھا ـ "یعنی کہ گھوٹ موٹ؟"

"ہاں" میرا لہجہ پُرسکون تھا
"مگر؟" اس نے کچھ کہنا چاہا۔
"اگر مگر کچھ نہیں"۔ میں نے اُسے غصّہ بھری نظروں سے دیکھا۔

اور پھر اس نے بلا کسی پس و پیش کے اپنا اُسترا میری چاند پر گھما دیا۔ میں نے اپنے سر کا جائزہ آئینہ میں لیا اور زیرِ لب مُسکراتے ہوئے بڑبڑایا ــــ "شادی ہوگی۔ ہنہ"ــــ

نائی کے ہاتھوں پر روپے رکھنے کے بعد میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ میرے ذہن میں خوشیوں کے پھول کھل رہے تھے۔ قدموں میں بجلی کی سی تیزی آگئی تھی مگر پھر کچھ سوچ کر میں رک گیا۔ "بیڑی پان"۔ پان والے کی مخصوص آواز نے مجھے چونکا دیا تھا، ویسے تو مجھے دھوئیں سے انتہائی نفرت ہے مگر جب میں اپنے خوبصورت بال ہی "شادی" کی نذر کر چکا تھا تو پھر بھلا بیڑی کے کش لگانے میں کیا ہرج تھا؟ سوچا۔ بیڑی کے کش لگاتا ہوا ٹھیک وقت پر گھر پہنچوں گا تاکہ میرے ہونے والے سسر میری شکل دیکھ کر ہی "لاحول ولا" کہہ اٹھیں۔

پان والے سے بیڑی خریدنے کے بعد میں نے ڈرتے ڈرتے بیڑی کا ایک لمبا کش لگایا۔ اور پھر کھانسی ــ طویل کھانسی۔ میرے حلق میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ میں نے بیڑی کو چٹکیوں سے مسل کر فٹ پاتھ پر پھینک دیا۔ اور بنڈل پھینکنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ کچھ سوچ کر رک گیا۔

گھر میں داخل ہوتے وقت میں نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بج کر دس منٹ ہوئے تھے ــــ "اوہ" ــــ میں تیزی سے چھوٹی راہداری طے کر کے ڈرائنگ روم میں جا گھسا

ڈرائنگ روم میں داداجان، ماتاجی اور ایک بزرگ موجود تھے۔ میرا قیاس صحیح تھا یقیناً وہ میرے ہونے والے سسر تھے۔ میرا حلیہ دیکھ کر ماتاجی چونکیں اور داداجان کے ماتھے کی شکنیں کچھ اور گہری ہوگئیں۔ مگر میں بدستور سنجیدہ رہا اور چُپ چاپ ایک صوفے پر بیٹھ گیا ــ ہونے والے سسر جی مجھے میٹھی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ایک لمحہ کچھ سوچ کر انھوں نے داداجان کو مخاطب کیا ــ "یہی ہے لڑکا" ــــ

"جی"۔ وہ غصّہ سے بل کھاتے ہوئے بولے۔ انھیں میرے ہونے والے سُسر جی کا خیال تھا۔ ورنہ شاید وہ مجھے کچا ہی چبا جاتے۔

"سندر۔ اتی سندر"۔ (خوبصورت بہت خوبصورت) سسر جی کے منہ سے اپنی تعریف میں یہ جملے سن کر میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میرے کانوں میں چلّی سی چل رہی تھی وہ کچھ اور ارشاد فرما رہے تھے ــــ "اجی آج کے لڑکے مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ اب بابو کو ہی لیجیے جسے دیکھو وہ ریچھ کی طرح بال بڑھا رہا ہے"۔ اور پھر میری طرف جھکتے ہوئے بولے ــــ "پچاسوں لڑکوں میں تم مجھے پسند آئے ہو"۔ اُن کے پیلے دانت نمایاں ہوگئے۔

"بات پکّی ہوگئی" مجھے ایسے ہی لڑکے کی تلاش تھی"۔ وہ داداجان سے کہہ رہے تھے۔

"او مائی گاڈ"۔ میں نے اپنا سر تھامنا چاہا مگر ہاتھ پھسل گیا۔ نائی نے شاید تیل زیادہ لگا دیا تھا۔

"خوب"۔ لڑکا انگریزی بھی جانتا ہے۔ ہونے والے سسر جی نے چشمہ سنبھالتے ہوئے اس طرح خوشی اور حیرت کا اظہار کیا جیسے کہ میں نے ان کے سامنے لاطینی زبان بول دی ہو ــــ مارے غصّہ کے میرا برا حال تھا میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ میری ساری امیدوں پر پانی پھر گیا تھا۔ پہلا حربہ ناکام ہوتے دیکھ کر میں نے دوسرا حربہ استعمال کیا۔ اور جیب سے بیڑی نکال کر سلگالی ــــ

داداجان نے کچھ کہنا چاہا۔ ماتاجی نے بھی پہلو بدلا ــ مگر ہونے والے سسر جی کے کیا کہنے۔ وہ گلاب کے پھول کی طرح کھل کر بولے "بھئی دیپ چند جی ایسے لڑکے کہاں ملتے ہیں۔ آج تو بڈھو چپراسی سے لے کر بلو دھوبی تک سگریٹ پیتے ہیں ــــ ارے نشہ کرنا بُرا نہیں مگر ذرا کچھ سوچنا تو چاہیے ــــ آخر سگریٹ میں کیا رکھا ہے؛ بیڑی کب زہر ہوتی ہے؛ ــــ دھرم سے کہتا ہوں بڈھا ہوگیا مگر مجال کیا جو کبھی ستیاناسی سگریٹ کو منہ سے بھی لگایا ہو بیڑی پیتا ہوں اور مرتے دم تک پیتا رہوں گا"۔ ہونے والے سُسر جی خوب چہک رہے تھے اور میں اپنی قسمت کا ماتم کر رہا تھا دل چاہ رہا تھا سر پیٹ لوں مگر اخلاقی بندھن حائل رہے

"قہ۔ قہ۔ قہ ــــ شرمیلا بہت ہے"۔ مٹھائی کی ڈلی حلق سے اتارتے ہوئے ہونے والے سُسر جی نے میری پیٹھ تھپتھپائی۔

اور میں سر جھکائے سوچ رہا تھا "کیا میں واقعی بہت شرمیلا ہوں"؟۔

کاظم علی خاں

مثنوی حُزنِ اختر ــــ منظر و پس منظر

ہندوستان میں برٹش سامراج کے استبداد کی طویل داستان اپنے دامن میں دار و گیر کے ایسے بہت سے الم ناک واقعات رکھتی ہے جن کو بیان کرنے کے لیے دفتر کے دفتر درکار ہوں گے۔ اُنیسویں صدی عیسوی کے دوران ہندوستان میں برٹش سرکار نے ظلم و جور کی جو پالیسی اختیار کی تھی وہ ایک ایسا المیہ قرار دی جا سکتی ہے جس میں بے شمار کردار انگریزوں کے جبر و استحصال کا شکار ہوئے تھے۔ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کی سرزمین پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے لیے ملک کے نقشے سے یکے بعد دیگرے جن دیسی ریاستوں کو اُن کے ہندوستانی سربراہوں سے محروم کیا اُن میں اودھ کی ریاست بھی شامل تھی۔ اودھ کے فرماں روا سلطانِ عالم واجد علی شاہ اختر لکھنوی جب اوائل فروری ۱۸۵۶ء میں برٹش سامراج کے ہاتھوں معزول ہوئے تو وہ اِس سیاسی بازی گری پر انصاف طلبی کے لیے مارچ ۱۸۵۶ء میں لکھنؤ سے براہ کلکتہ انگلستان کے سفر پر نکلے۔ واجد علی شاہ ۱۳ مئی ۱۸۵۶ء کو کلکتہ پہنچے۔ اِس تکلیف دہ سفر کے باعث بادشاہ علیل ہو گئے اور انھوں نے لندن میں ملکہ وکٹوریا کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کرنے کے لیے کلکتے سے ۱۸ جون ۱۸۵۶ء کو ایک وفد انگلستان روانہ کیا۔ اس وفد کی سربراہی بادشاہ کی والدہ ملکہ کشور کر رہی تھیں اور ان کے ہم راہ واجد علی شاہ کے سگے چھوٹے بھائی مع ولی عہد وغیرہ بھی تھے۔ واجد علی شاہ کلکتے میں ابھی اپنے مُقدمے کے فیصلے کے منتظر ہی تھے کہ مئی ۱۸۵۷ء میں بدیسی حکومت کے خلاف ہندوستانی عوام نے بغاوت کا پرچم بلند کر دیا۔ برٹش سرکار نے ۱۵ جون ۱۸۵۷ء کو اودھ کے معزول حکم راں واجد علی شاہ اختر کو ان کے مسکن مٹیابرج کلکتہ میں گرفتار کر کے فورٹ ولیم کلکتہ میں قید کر دیا۔ واجد علی شاہ اختر نے دو سال سے بھی زیادہ کی مُدّت تک قیدِ فرنگ میں رہ کر جولائی ۱۸۵۹ء میں رہائی پائی۔ مثنوی حُزنِ اختر میں واجد علی شاہ اختر لکھنوی نے اپنی اسی قیدِ فرنگ کی دردناک داستان بیان کی ہے۔ واجد علی شاہ کی یہ مثنوی اُس حبسیہ ادب میں شامل ہے جو تحریکِ آزادی کے سلسلے میں قید خانوں میں معرضِ وجود میں آیا تھا۔ جانِ عالم واجد علی شاہ اختر لکھنوی جس طرح فرنگیوں کی سیاسی بازی گری کا شکار ہوئے اس پر جوش ملیح آبادی نے اپنی خود نوشت "یادوں کی برات" (طبع دہلی جون ۱۹۸۲ء ص ۴۸ فُٹ نوٹ) میں یوں تبصرہ کیا ہے:

"... اے جانِ عالم، فرنگی نے آپ کو تباہ بھی کیا اور بدنام بھی۔ آپ جتنے اچھے تھے، اُتنے ہی بُرے بنا دیے گئے... اے میرے فرض شناس، جفاکوش، عدالت پناہ اور فقیر منش بادشاہ۔ اے میرے شرافت سنج، ہُنرور، نکتہ رس، علم نواز اور ادب پرست شاعر اور اے میرے صبح کے سپاہی و شہریار اور اے میرے شام کے موسیقار فنکار مالک، آپ کے سپہ سالار... فقیر محمد خاں گویا کا پرپوتا، جوش ملیح آبادی، آپ کے آستانِ عالی پر سر رکھ رہا ہے۔ اس بندۂ درگاہ کا ناچیز سلام قبول فرمائیے..."

مثنوی حُزنِ اختر بارہ سو اُنتالیس (۱۲۳۹) اشعار کی حامِل ہے۔ یہ مثنوی مطبعِ سُلطانی کلکتہ سے ۱۲۷۶ھ (۱۸۶۰ء) میں پہلی بار چھپی تھی اور اب تک یہ مُتعدّد بار شائع ہو چکی ہے۔ حُزنِ اختر (ص ۱۷۲) کی بعض داخلی شہادتیں بتاتی ہیں کہ یہ مثنوی ۲۶ ذیقعدہ ۱۲۷۴ھ مطابق جمعہ ۹ جولائی ۱۸۵۸ء تک اپنی تکمیل کی آخری منزلوں میں تھی یعنی اس کے ۱۲۳۹ اشعار میں سے ۱۱۳۶ اشعار کہے جا چکے تھے۔ مثنوی کے آخری حصّے مناجات میں قیدِ فرنگ سے نجات کی دعا مانگی گئی ہے۔ اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ مثنوی واجد علی شاہ نے قید و بند ہی کے عالم میں مکمل کی تھی۔ واجد علی شاہ نے ۸ ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ مطابق ہفتہ ۹ جولائی ۱۸۵۹ء کو قیدِ فرنگ سے رہائی پائی تھی اور چوں کہ حُزنِ اختر بادشاہ کی قید سے رہائی کے ذکر سے خالی ہے لہٰذا اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ مثنوی قیدِ فرنگ کے دوران ہی ۱۲۷۴ھ کے نصف آخر تک مکمل ہوئی ہوگی۔

مثنوی حزنِ اختر واجد علی شاہ نے قیدِ فرنگ کے دوران جس پریشانی کے عالم میں لکھی تھی جگہ جگہ وہی پریشاں خیالی اِس

۲۲ - اے، بلدا روڈ، نشاط گنج (پہلی لین) لکھنؤ ۲۲۶۰۰۷

مثنوی کی ترتیب میں بھی محسوس ہوتی ہے۔ مثنوی میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں اُن میں کہیں کہیں قدرے بے ترتیبی کا بھی احساس ہوتا ہے اور بعض واقعات کے سین لکھنے میں بھی بادشاہ سے تسامح ہوا ہے۔ حزنِ اختر (ص ۱۱۹) میں واجد علی شاہ کا یہ بیان درست نہیں کہ وہ ۱۲۷۲ھ میں مقید ہوئے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ واجد علی شاہ ۱۲۷۲ھ کے بجائے ۱۲ شوال ۱۲۷۳ھ (مطابق دوشنبہ ۱۵ جون ۱۸۵۷ء) کو گرفتار ہوئے تھے۔ حزنِ اختر (ص ۱۲۸) میں واجد علی شاہ نے ۹ شعبان ۱۲۷۴ھ کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے اپنی عمر ۳۳ سال لکھی ہے۔ یہ بیان بھی حافظے کا سہو ہے۔ واجد علی شاہ کی تاریخ ولادت ۱۰ ذی قعدہ ۱۲۳۲ھ کی بنیاد پر ۱۲۷۴ھ میں ان کی عمر ۳۳ برس کے بجائے تقریباً ۴۲ سال تھی۔

حزنِ اختر دراصل سوانحی اور تاریخی نوعیت کی مثنوی ہے۔ ادبی حیثیت سے یہ مثنوی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ سوانحی اور تاریخی لحاظ سے یہ مثنوی اپنے دامن میں ایسے متعدد واقعات رکھتی ہے جن کی تفصیلات سے تاریخ کے صفحات خالی نظر آتے ہیں۔ مثلاً مثنوی حزنِ اختر (ص ۱۱۸) سے پتہ چلتا ہے کہ واجد علی شاہ کی معزولی کے وقت ۱۸۵۶ء میں صوبۂ اودھ کی آبادی تین کروڑ تھی۔ یہ مثنوی بتاتی ہے کہ واجد علی شاہ کے ساتھ قیدِ فرنگ میں مرد اور عورت کل ملاکر ۳۲ لوگ تھے (حزنِ اختر ص ۱۲۹)۔ بادشاہ نے اِن لوگوں کے نام اور کام کی بھی تفصیل دی ہے۔ اِس مثنوی سے جہاں بادشاہ کے بعض مصاحبوں کی وفاداری اور جاں نثاری کا حال معلوم ہوتا ہے وہاں اُن میں سے کچھ کی بے وفائیوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ واجد علی شاہ نے سفرِ کلکتہ کے دوران بنارس پہنچنے پر بنارس کے راجا ایشوری پرساد نرائن سنگھ کی وفاداری کا ذکر یوں کیا ہے:

بنارس میں آکر رہے چودہ روز
وہ راجا کی کوٹھی میں ہم سینہ سوز
بہت پیش آیا اطاعت کے ساتھ
اُتارا مجھے کوٹھی میں ہاتھوں ہاتھ
وہ مصروفِ خاطر ہوا اِس قدر
فرشتہ بنا، کہنے کو تھا بشر

(حزنِ اختر ص ۱۲۰)

حزنِ اختر میں بادشاہ نے فنِ شاعری میں اپنے اُستاد فتح الدولہ مرزا محمد رضا برق لکھنوی کی بھی وفاداری اور جاں نثاری کا ذکر کیا ہے۔ برق بھی بادشاہ کے ساتھ قید میں رہے تھے اور انھوں نے اُسی عالم میں ۲۸ صفر ۱۲۷۴ھ کو وفات پائی تھی۔ فتح الدولہ برق کے لیے حزنِ اختر (ص ۱۳۰) کے یہ اشعار یادگار ہیں:

ضعیفی میں تھا فتح دولہ کا حال
چراغِ سحر کی طرح تھے نڈھال
کہا میں نے ہرچند، تم ہو ضعیف
نہ اُٹھے گا تم سے یہ بارِ عنیف
انھوں نے کہا میں تو ہوں جاں نثار
فدا تم پہ ہم ایسے ستّر ہزار
مرے تن میں جب تک ہے جاں بادشاہ
نہ چھوڑوں گا تم کو، خدا ہے گواہ
صفر کے مہینے میں وہ مر گئے
جو کہتے تھے مُنہ سے وہی کر گئے
وہ تھی بست و ہشتم صفر کی مُبیں
ہوئے فتح دولہ جو جنّت نشیں
کلیجہ مصیبت سے ہلنے لگا
جگر خارِ فرقت سے چھلنے لگا
ہوئی سنہ چوہتر میں یہ واردات
دہن سے نہ نکلی مرے ایک بات
کیا صبر میں نے کلیجے کو تھام
جو تپ نے کیا کام اُن کا تمام

حزنِ اختر (ص ۱۲۶ تا ۱۲۸) سے انکشاف ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ کو قیدِ فرنگ کے دوران ہی میں رجب و شعبان ۱۲۷۴ھ میں آنے والے خطوط سے اپنی والدہ، بھائی اور خورد سال بھتیجی کی وفات کی خبریں ملی تھیں۔ بادشاہ کے ان تینوں عزیزوں نے ملکِ فرانس میں وفات پائی اور وہ وہیں دفن بھی ہوئے تھے۔ مثنوی یہ بھی بتاتی ہے کہ واجد علی شاہ کی والدہ ملکۂ کشور جمادی الآخر ۱۲۷۴ھ میں فوت ہوئی تھیں اور بادشاہ کے سگے چھوٹے بھائی سکندر حشمت نے شبِ جمعہ ۱۰ رجب ۱۲۷۴ھ (مطابق ۲۵ فروری ۱۸۵۸ء) کو وفات پائی تھی۔ ملکۂ کشور اور سکندر حشمت کا سالِ وفات بعض اہلِ قلم نے غلطی سے ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء لکھا ہے۔ مثنوی حُزنِ اختر اِس غلطی کی تصحیح کرتی ہے۔

اب اِس گفتگو کے آخر میں مثنوی حُزنِ اختر کے جستہ جستہ چند اشعار گوش گذار کیے جاتے ہیں:

یہ واجد علی ابنِ امجد علی
سناتا ہے اب داستاں رنج کی
کہ جب دس برس سلطنت کو ہوئے
جو طالع تھے بیدار سونے لگے

ہُوا حکمِ جنرل گورنر یہ بار
کرو سلطنت کو خلا ایک بار
جفاکش کا شاہِ اودھ نام ہے
حکومت کا آخر یہ انجام ہے
ہوئے بند در قید خانے کے جب
لکھوں کیا جو گزرا ستم اور غضب
کلیجہ مرا منہ کو آ آ گیا
رُکا دم جو سینے میں گھبرا گیا
کوئی رنج زنداں میں ایسا نہیں
جو اس بے سروپا کو پہنچا نہیں
ہر اک سمت پہرا ہر اک سمت یاس
رفیق و ملازم میں خوف و ہراس
کبھی سر پہ رکھتا تھا میں کج کلاہ
اودھ کا کبھی میں بھی تھا بادشاہ
ملازم مرے تھے کبھی سو ہزار
مرے حکم میں تھے پیادہ سوار
فقط ستّرہ سو تھے اہلِ قلم
طبیبوں کو کر پانچ سو تو رقم
ہوئے قید اِس طرح ہم بے گناہ
اسیروں میں ہوں، نام ہے بادشاہ
ملا مجھ کو یا رب تو اولاد سے
چھڑا پھر مجھے قیدِ بیداد سے
ہر اک شاہزادی ہے در در تباہ
نہ ہے تن پہ کپڑا نہ کھانا ہے آہ
سُنو لو سُنو قصّۂ پُر ملال
جو گزرا ہے اس قید خانے میں حال
کسی کی محبّت کو پایا نہ ٹھیک
محبّت کو دیکھا ہے امرِ رکیک
عجب ہے یہ نیرنگِ دنیائے دوں
زبوں ہے زبوں ہے زبوں ہے زبوں

دلِ زار ہونٹوں پہ آ آ گیا
میں گھبرا گیا سخت گھبرا گیا
الٰہی مجھے قید سے دے نجات
نکلتی نہیں غم سے اب منہ سے بات
یہ اختر جو ہے خاکِ پائے جہاں
یہ شاہِ اودھ تھا کبھی اے جواں
مگر اب ہے محبوسِ اہلِ فرنگ
طبیعت سے جاتی رہی ہے امنگ
کہ برسوں مجھے قید میں ہو گئے
مرے بختِ بیدار سو سو گئے
ابھی تک رہائی کی صورت نہیں
وہ دولت نہیں ہے وہ ثروت نہیں

خُدایا مجھے قید سے دے نجات
رہے پائے مردی قدم میں ثبات
الٰہی رہیں شاد یارانِ ہند
پھر آباد ہو ویں جوانانِ ہند
ہوئی مثنوی اس سخن پر تمام
سلامٌ علیکم، علیک السلام

[اس مضمون میں مثنوی حُزنِ اختر مرتبہ امجد علی خاں لکھنؤ طبع ۱۹۸۱ء سے حوالے دیے گئے ہیں۔]

غزلیں

تسنیم فاروقی

دشمن کو بھی پیارا ہو جاتا ہے
اچھا شعر آوارا ہو جاتا ہے

اکثر خوشبو جیسے لہجے والا
جملہ بھی انگارا ہو جاتا ہے

رشتوں کی دیواریں گر جاتی ہیں
ہر گھر میں بٹوارا ہو جاتا ہے

شام کے دریا میں سورج گرتے ہی
مقتل کا نظارا ہو جاتا ہے

سورج کی کرنیں چمکا دیتی ہیں
اِک ذرہ بھی تارا ہو جاتا ہے

تلسی داس مارگ، نزد اسپتال، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۴ (یوپی)

شفیع اللہ خاں رازؔ اٹاوی

یہ کیسے کانچ کے پتلوں کے سر ہیں
زمانے بھر کے پتھر بے اثر ہیں

جدائی کی کوئی مدت نہیں ہے
ملاقاتوں کے لمحے مختصر ہیں

زمیں ہم صورتِ مقتل ہے یارب
لہو کی سرخیاں افلاک پر ہیں

یہاں نفرت کی گنجائش نہیں ہے
محبت کرنے والوں کے یہ گھر ہیں

وہ طوفانوں کو دعوت دے رہے ہیں
جو گیلی ریت کی دیوار پر ہیں

ہزاروں بندشیں اے رازؔ اب تک
ہمارے جذبۂ اظہار پر ہیں



ایس۔ این کالج، کٹرہ پردال خاں، اٹاوہ ۲۰۶۰۰۱ (یو۔پی)

سلیم انصاری

میرے زخموں کی قبا سے ٹوٹتا رشتہ مرا
کتنے شعروں سے چرا لے جائے گا لہجہ مرا

جسم کے شوکیس میں محفوظ رکھوں گا اسے
زندگی واپس تو کر ٹوٹا ہوا چہرہ مرا

جی میں آیا اپنی ساری انگلیاں ہی توڑ دوں
گاؤں کے میلے میں جب گم ہوگیا بچہ مرا

خودکشی کرنے کی خاطر گھر سے نکلا ہوں مگر
آکے تنہائی مری خود روک لے رستہ مرا

ہنس پڑے جب میرے اندر درد کے تازہ گلاب
قہقہوں کی بھیڑ میں مرجھا گیا چہرہ مرا

۵۳، سرسوتی وہار، دہرہ دون

شمس کنول

رئیس امروہوی — ایک انسان دوست شاعر

بالوں اور آنکھوں کی طرح خیالات اور رجحانات بھی انسان کو ورثے میں ملتے ہیں۔ مُصحفی کا امروہہ (مغربی اُتر پردیش کا مردم خیز خطّہ) اور وہاں کے سادات کا ایک خوش حال، با عزّت، مہذّب اور ذہین خاندان ——— جس میں سیّد محمّد تقی (سابق مدیر "جنگ" کراچی)، سید امیر حیدر کمال اور جون ایلیا جیسے دانش وروں نے جنم لیا۔ رئیس امروہوی اسی خاندان کے ایک صاحبِ علم و ہنر تھے۔ اُن کے اپنے اُنھیں پیار سے "اچھّن" کہتے تھے۔

رئیس صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۰ء میں مرادآباد میں ہوئی تھی۔ اس پہلی ہی ملاقات میں میں نے ان ہی کی زبان سے اُن کی نظم "سنا ہے کہ عذرا وطن آ رہی ہے" سُنی تھی۔ ان کی یہی وہ نظم تھی جو دہلی کے ماہنامے "شمع" کے پہلے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ رئیس صاحب اُن دنوں مرادآباد ہی کے ایک سہ روزہ اخبار 'جدّت'، کے ایڈیٹر تھے اور رکوکب مرادآبادی کے ساتھ مل کر رسالہ 'مسافر' کی بھی ادارت فرماتے تھے۔ رسالہ 'مسافر' مرادآباد کے اسلامیہ مسافر خانے کا آرگن تھا۔

محمود جیلانی[1]، ذوالفقار مصطفیٰ ماہ رومانی اور میں ——— ہم تینوں ہی ان دنوں مرادآباد گورنمنٹ انٹر کالج کے طالبِ علم تھے۔ رئیس صاحب ہمارے بزرگ دوست بھی تھے اور ہمارے علمی و ادبی ذوق کے سلسلے میں ہمارے استاد بھی۔ ہم اُن سے محبّت بھی کرتے تھے اور ان کا احترام بھی۔ مگر رئیس صاحب کو بزرگ بننے کا شوق قطعاً نہیں تھا۔ وہ تعلقات میں مجلسی تصنع کو رکاوٹ سمجھتے تھے اور نہ وہ لیے دیے ہی رہتے تھے۔ وہ تو مغز ہی مغز تھے۔ ان کا مزاج چھلکوں سے پاک تھا۔ دراصل بے تکلّفی ہی میں ان کو راحت ملتی تھی۔ اُن دِنوں وہ قطعی طور پر جوان تھے۔ سرخ و سفید رنگ، آریائی تیکھے خطوط اور چھریرا بدن۔ سراپا سے خاندانی شرافت اور وجاہت نمایاں تھی ——— سردیوں کے موسم میں وہ جب چھوٹی موری کے علی گڑھ کٹ پاجامے پر سیاہ سرج کی شیروانی زیب تن کرتے تو بلا کے حسین و خوب رو دکھائی دیتے۔ انھیں بھی اپنے خوش وضع اور وجیہہ ہونے کا احساس تھا۔ ہم اکثر ان سے مذاق میں یہ کہہ کر گستاخی کرتے کہ ——— "رئیس صاحب! آپ تو خود قیامت ہیں آپ کس کو محبوب مان کر شعر کہتے ہیں؟" مسکراتے اور برجستہ فرماتے "خود کو! میں خود بیک وقت بہت سے مردوں اور عورتوں کا محبوب ہوں!" ان دنوں دودھ جلیبی اُن کی مرغوب ڈش تھی۔

فی البدیہہ شعر کہنے میں مجھے دو شاعر ہمیشہ یاد رہیں گے۔ ایک علّامہ انور صابری اور دوسرے رئیس امروہوی ——— ہمارے کالج سے 'جدّت' اخبار کا دفتر صرف ڈیڑھ دو فرلانگ پر واقع تھا۔ دوسرے تیسرے دن جب پڑھائی کا کوئی گھنٹہ خالی ہوتا تو میں اور ماہ رومانی رئیس صاحب کے پاس پہنچ جاتے۔ وہ اخبار کے کام میں مصروف ہوتے۔ اگرچہ ہم ان کو ڈسٹرب کرتے مگر وہ کبیدہ خاطر نہ ہوتے۔ ایسی ہی حالت میں ہم ان سے باتیں کرتے اور وہ جواب دیتے جاتے۔ ردیف، قافیے، بحر یا اُردو قواعد سے متعلق یا نثر کے بارے میں ہم اُن سے کوئی بات دریافت کرتے تو وہ اپنے لکھنے ہی کے دوران میں اپنے سامنے سے کاغذ کا کوئی پرزہ اٹھاتے اور کوئی فی البدیہہ شعر کہتے ہوئے کاغذ کے اُس پُرزے پر لکھتے اور ہمیں تھما دیتے۔ وہ اپنا یا کسی دوسرے شاعر کا کوئی پرانا شعر مثال میں کبھی پیش نہ کرتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اچھّی اور صحیح اُردو لکھنے کے لیے فارسی زبان کا جاننا ضروری ہے۔ عالمی معلومات کے لیے وہ انگریزی زبان کی تعلیم حاصل کرنے پر زور دیتے تھے۔ رئیس صاحب انگریزی اخبارات سے اپنے اخبار 'جدّت' کے لیے خبروں کا ترجمہ خود ہی کیا کرتے۔ اُن کا کہنا تھا کہ میں نے باقاعدہ انگریزی کی تعلیم حاصل نہیں کی اور نہ کسی نے مجھے انگریزی پڑھائی مگر میں نے خود ہی کنگز ریڈر سے اے بی سی ڈی پڑھی ہے اور اب میں اپنے کام لائق انگریزی جانتا ہوں ——— اُن دنوں اُنھیں

---

[1] محمود جیلانی ان دنوں کراچی میں شعر و ادب سے دُور رہ کر تجارت کو اپنا پیشہ بناتے ہوئے ہیں اور ماہ رومانی کراچی کے ایک بڑے کالج میں انگریزی ادب کے پروفیسر ہیں۔ ش۔ ک

سلامہ، قاضی اسٹریٹ، بجنور-۲۴۶۷۰۱

یکھ کر، اُن سے مل کر اور اُن کی علمی صلاحیت کی روشنی میں اپنے آپ کو دیکھ کر ہمارے دل میں یہ خیال آتا تھا کہ قدرت ہمیں بھی ایسا ہی علم عطا کرے۔ اور ہمارا یہ خیال ان کی عظمت کی دلیل تھی۔

رئیس صاحب ایک خوش گلو انسان تھے۔ اُن کی آواز میں سریلا پن تھا۔ اُن دنوں وہ اپنا کلام ترنم ہی سے سُنایا کرتے تھے۔ اُنہی دنوں انھیں بامبے ٹاکیز کی فلم "بندش" (اشوک کمار۔ نیلا چٹنس) بہت پسند آئی تھی۔ اُن کا کہنا تھا کہ بہت کم فلمی کہانیوں میں اتنا اچھا ڈرامائی کلائی میکس پیش کیا گیا ہے۔ اُنھیں اس فلم میں ارون کمار کا گایا ہوا گانا "رُک نہ سکو تو جاؤ ـــــ تم جاؤ" بھی بہت پسند تھا۔ وہ خود بھی اس گانے کو بڑے شوق سے گاتے تھے اور اس گانے کی دُھن کی بھی وہ بڑی صحیح نقل کرتے تھے۔ رئیس صاحب کو گانا سُننے کا بھی شوق تھا۔ آج کی بات تو معلوم نہیں مگر اُن دنوں مرادآباد شہر کے وسط میں امروہہ گیٹ پر چند گانے والیوں کے کوٹھے بھی تھے۔ رئیس صاحب وہاں کبھی کبھی جایا کرتے تھے۔ ایسی باتوں کا علم ہمیں کسی اور سے نہیں خود رئیس صاحب ہی سے ہوا کرتا تھا۔ اُنھیں شاید تفریح کو عملی جامہ پہنانے سے زیادہ کی ہوئی تفریح کو کسی سے بیان کرنے میں مزا آتا تھا۔ وہ اپنے دفتر کے عملے خصوصی طور پر کاتبوں سے بھی خاصے بے تکلف رہتے تھے، پھکڑپن کی حد تک، ہنسی، دل لگی، مذاق، چھیڑ چھاڑ خوب کرتے تھے، ہنس ہنس کر مُغلظات بھی خُوب خُوب بکتے تھے۔ ایک دن میں نے ہنس کر کہا، "رئیس صاحب! آپ کے مُنہ سے تو، گالیاں بہت ہی اچھی لگتی ہیں!" انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا ـــــ "پیارے تم بھی دیا کرو۔ گالی سے دل و دماغ کی طہارت ہوتی ہے۔ اندر کی ساری کثافت باہر آجاتی ہے!" ـــــ دراصل وہ آقا و خادم، استاد، شاگرد کے درمیان فاصلے کے نہیں یارانے کے قائل تھے۔ وہ انتہائی صاف دل انسان تھے۔ اگرچہ وہ فیوڈل سماج میں پلے تھے لیکن فیوڈلسٹ نہیں تھے۔

'جدت' اخبار کے مالک مرزا عمر دراز بیگ تھے۔ وہ خاصے کاروباری انسان تھے۔ شمالی ہند کے دوسرے اُردو اخبار مالکوں کی طرح وہ بھی اپنے آپ کو مالک سے زیادہ ایڈیٹر کہلوانا پسند کرتے تھے۔ انھوں نے ایک بچوکور شیشے پر "مرزا عمر دراز بیگ، ایڈیٹر 'جدت'، مرادآباد" لکھوا کر اُسے فریم کروایا تھا اور اُسے اپنے دفتر میں آویزاں کر رکھا تھا۔ رئیس صاحب اس فریم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مذاقاً ان سے اکثر کہا کرتے تھے کہ "آپ کا مرتبہ تو بہت بڑا ہے، آپ تو اخبار کے مالک ہیں، آپ نے ایڈیٹر ہونا کیوں پسند کیا؟" مرزا جی بچکانہ معصومیت سے جواب دیتے تھے کہ "پروپرائٹر سے ایڈیٹر ہونا اچھا لگتا ہے۔" اُن دنوں 'جدت' اخبار کو نواب رام پور سے زیادہ یافت تھی۔ مالک کی ہدایت پر رئیس صاحب اخبار میں اکثر ایسی باتیں بھی اپنے قلم سے لکھنے پر مجبور ہوتے تھے جو نواب رامپور کے لیے خوش نودی کا باعث بنتی تھیں۔

'جدت' اخبار اس وقت کے عام اُردو اخباروں کی طرح مسلم لیگ اور مطالبۂ پاکستان کا حامی تھا۔ کانگریس کے عام رہنماؤں اور خصوصی طور پر گاندھی جی اور مولانا آزاد کا خوب خُوب مضحکہ اُڑایا جاتا تھا۔ رئیس صاحب کی اپنی رباعیوں میں بھی قوم پرست مسلم رہنماؤں پر پھبتیاں کسی جاتی تھیں لیکن ہم تینوں دوست یہ جاننے کی کبھی کوشش نہیں کرتے تھے کہ رئیس صاحب درحقیقت کس حد تک مسلم لیگی تھے ہم تو اُن کے نیازمند تھے اور اُن کی ذات ہمیں بہت پیاری لگتی تھی۔ ممکن ہے کہ روزی کی مجبوری نے رئیس صاحب جیسے دانشور کو ایک ایسا عام مسلم لیگی صحافی بنا رکھا ہو جو نواب رام پور کی شان میں قصیدہ کہنے پر تیار ہو جائے۔

رئیس صاحب کو شاگرد بنانے کا بہت شوق تھا۔ مرادآباد اور قرب و جوار کے اضلاع کے کتنے ہی لڑکے اور لڑکیاں اُن کے شاگرد تھے۔ لیکن اپنے اس شوق کے باوجود وہ اس سلسلے میں سنجیدہ کم رہتے تھے۔ وہ اپنے شاگردوں کے کلام پر سکھانے کے انداز میں اصلاح نہیں دیتے تھے۔ جس مصرع یا شعر کو غلط سمجھتے اُسے قطعی طور پر کاٹ دیتے اور اس کی جگہ خود کہہ کر مصرع یا شعر رکھ دیتے۔ بعض اوقات غزل کے سبھی مصرعۂ ثانی کاٹ کر اپنے کہے ہوئے مصرعوں سے غزل مکمل کر دیتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ رئیس صاحب کو شاگردوں کی تعداد بڑھانے کا تو شوق تھا مگر اصلاح دینے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی تو غلط نہ ہوگا۔ اسی سلسلے میں یہ بات بھی سُننے میں آئی تھی کہ پاکستان پہنچنے کے بعد رئیس صاحب اکثر دوسروں کے لیے معاوضے پر بھی اشعار کہا کرتے تھے۔

میں نے ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۶ء تک

رئیس صاحب کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ مجھے وہ دن آج بھی یاد ہے کہ جب جیلانی، ماہ، اطہر، برلاس اور میں نے محلہ مغل پورا (مرادآباد) میں گورنمنٹ کالج کے سامنے رئیس صاحب کے ہاتھوں ایک 'دارالمطالعہ' (اردو پبلک لائبریری) کا افتتاح کرایا تھا۔ گرمیوں کی وہ راتیں آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہیں جن میں مسافر خانے کی چھت پر اکثر چھوٹے چھوٹے مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے جن کے روحِ رواں رئیس صاحب ہوا کرتے تھے اور پڑھنے والوں میں مقامی نوجوان شعرا کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی ذرّانی اور نسیم امروہوی بھی شرکت فرماتے تھے۔ انہی دنوں رئیس صاحب نے فلم 'پکار' سے متاثر ہو کر ایک کہانی بھی لکھی تھی۔ نام تھا 'لال قلعہ'، کہانی کا پلاٹ بہادر شاہ ظفر کے سیاسی حالات سے متعلق تھا مگر وہ اپنی اس کہانی کو لے کر بمبئی کبھی نہ جا سکے بلکہ ۱۹۴۶ء میں رئیس صاحب مرادآباد کے اخبار 'جدّت' سے دہلی کے ماہنامے "مشہور" میں چلے گئے۔ ماہنامہ 'مشہور'، دہلی کی مسلمان پنجابی برادری کا آرگن تھا۔ انہی دنوں وہ ماہ نامہ "شمع" کے ادارے سے بھی پس پردہ وابستہ رہے۔

میں ۱۹۴۷ء میں اپنی تعلیم کے سلسلے میں مرادآباد کو خیرباد کہہ کر لکھنؤ پہنچ گیا اور ۱۹۴۷ء کے سیاسی ہنگامے نے رئیس صاحب کو دہلی سے کراچی منتقل کر دیا جہاں وہ اخبار 'جنگ' سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۵۴ء سے دسمبر ۱۹۸۷ء تک میری ان سے خط و کتابت رہی۔ ۱۹۵۹ء میں وہ جب بمبئی آئے اور باندرا پالی ہل پر اپنے بھائی کمال کے مہمان بنے تو میری بھی ان سے ملاقات ہوئی۔ اگرچہ بوڑھے ہو چکے تھے، ان کے چہرے کا سرخ و سفید گلاب زمانے کی تپش سے مرجھا چکا تھا مگر باتوں کی لہک اور مزاج کی شادابی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ علم و ادب کا ذوق تو اُن کے اپنے آباو اجداد نے اُن کو بخشا تھا مگر بہت سے دُکھ اٹھانے کے بعد اپنی زندگی کا سُکھ انھوں نے خود ہی کمایا تھا۔ بمبئی کے اُس دورے میں سیّد محمد تقی بھی ساتھ تھے۔ وہ کمال کی امارت اور فلمی سج دھج سے مرعوب تھے مگر رئیس صاحب بمبئی جیسے ساحلی شہر کے حُسن سے متاثر تھے ـــــ کہنے لگے:

"پیارے تمھارا بمبئی بہت حسین ہے!" میں نے کہا کہ "پیر و مرشد! آپ کا قیام پالی ہل پر ہے، یہ فلمی حسینوں کی نگری ہے، سامنے سمندر ہے اور ارد گرد سرسبز درخت۔ ذرا مدن پورے یا کماٹی پورے آیئے تو ہمیشہ کے لیے بمبئی کو سلام کہنے پر آپ مجبور ہو جائیں گے!" پہلے یہ سُن کر خوب ہنسے اور پھر میرے اشارے کو سمجھ کر سنجیدگی سے مجھے سمجھانے لگے کہ "پیارے سرمایہ دارانہ نظام میں کھولی والوں ہی کی محنت و دولت سے امیروں کے فلیٹ بنا کرتے ہیں"۔

پاکستانی شہری بننے کے بعد، پچھلے چالیس برس کے طویل عرصے میں رئیس صاحب نے اپنے ہندوستانی دوستوں کو جو خطوط لکھے اور ان کی جو تحریریں پاکستانی اخبارات میں شائع ہوئیں ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ پاکستان اُن کے خواب کی تعبیر نہیں بن سکا تھا۔ ملک کی تقسیم نے اُنھیں آسودہ حال تو ضرور بنا دیا تھا مگر اُن کی ہجرت انھیں دلی طور پر مطمئن نہیں کر پائی تھی۔ وہ اپنے ۲۲ جنوری ۱۹۶۵ء کے خط میں مجھے لکھتے ہیں:

۱۲۹۔ الف۔ مانک جی اسٹریٹ،
گارڈن ایسٹ، کراچی۔ ۳

عزیزم شمس کنول

جانِ من، جانِ سُخن! تمھارے محبت نامے مورخہ ۹ جنوری ۶۵ء کا جواب دے رہا ہوں۔ آج ۲۲ جنوری ہے نا۔ معافی چاہتا ہوں۔ پیارے عالم یہ ہے کہ:

گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل
کہاں کی رُباعی کہاں کی غزل

شمس کنول۔ کیا زندگی عذاب نہیں۔؟ بے شُبہ گائے اور بھینس کے لیے زندہ رہنا ایک نعمت ہے۔ ناند کے قریب کھونٹے سے بندھے ہوئے سانی کھا رہے ہیں اور جُگالی کر رہے ہیں۔ مکھیوں نے ستایا تو دُم ہلا دی اور گردن جھٹک دی۔ پھر بدستور جگالی۔ کاش میں بھینس ہوتا اور تم گائے اور ہم دونوں کسی گوالے یا دودھ والے کے کھونٹے سے بندھے ہوتے۔ لیکن نہیں میں اور تم آدمی ہیں، ملعون آدمی۔ خدا کا راندۂ درگاہ اور فرشتوں کا معتوبِ بارگاہ۔ کم بخت کو جنت سے نکالا گیا تو زمین پر آن مرا۔ آسمان اس کی صورت سے بیزار ہے اور زمین اس کے بوجھ سے کراہ رہی ہے۔ اب پھر یہ بے غیرت آسمان کی طرف جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یاد رکھنا۔ پہلے سے زیادہ جوتے کھا کر زمین پر گرا دیا جائے گا۔ یہ خط لکھ رہا ہوں ہنسی بھی آ رہی ہے۔ رو بھی رہا ہوں۔ جلا بھنا بیٹھا ہوں۔ خدا کی قسم خدا سے بھی مایوس ہوں اور خدا کے بندوں سے بھی۔ پھر آج زکام بھی ہے اور موڈ خراب ہے۔ اگر تم ہوتے تو دو گھنٹے اس موضوع پر تقریر کرتا، نہ جانے ہم کب ملیں

مگر کیوں ملیں؟ تم بھی تو زمین آسمان کے دو پاٹوں کے بیچ پس رہے ہو اور میں بھی اس چکی میں رگڑا جا رہا ہوں۔ کاش تم ہمیشہ صحت مند رہتے۔ یہ بیمار ہونا اور بار بار بیمار ہونا اس پر اور بھی جی جلتا ہے۔ میں خوش ہوتا تم خوش ہوتے۔ کوئی تو خوش ہوتا۔ نہ جانے ہم نے اللہ میاں کا کیا بگاڑا تھا کہ دنیا کے جہنم میں اس خوشخبری کے ساتھ پھینکے گئے ہیں کہ عقبیٰ میں بھی ہمارے لیے جہنم ہی جہنم ہے۔ چلیے پاپ کٹا۔ دونوں جہاں میں روسیاہ۔ دونوں جہاں میں معتوب و معذب:

مرے قریب نہ آ، اے بہشتِ بے خبری
خود آگہی کے جہنم میں جل رہا ہوں میں

اسی کیفیت میں ایک اور مطلع کہا ہے:

تڑپ رہا ہوں شعورِ خود آگہی کے لیے
مگر شعور جہنم ہے آدمی کے لیے

خیر یہ تو رونا عمر بھر کا ہے۔

جون ایلیا اور سب' اور سب' اور سب بخیر ہیں اگر بخیر ہونے کا کوئی مفہوم ہے۔ ماہ رومانی اور جیلانی قطعی زندہ ہیں۔

دُعاگو
رئیس امروہوی

اگرچہ پاکستان پہنچتے ہی رئیس صاحب اور ان کے خاندان کو حکومتِ پاکستان کی طرف سے ایک بڑی کوٹھی (زرجس) الاٹ ہو گئی تھی۔ وہ پاکستان کے سب سے بڑے اخبار (جنگ) سے وابستہ ہو چکے تھے۔ اُن کا اپنا ایک علمی و ادبی حلقہ بھی بن چکا تھا اور جوش ملیح آبادی بھی ہندوستان سے جانے کے فوراً بعد (اسلام آباد میں سکونت اختیار کرنے سے قبل) رئیس صاحب ہی کے حلقے میں شامل ہو گئے تھے۔ حکومتِ پاکستان اور اہلِ پاکستان نے ان کے سلسلے میں کافی قدر شناسی کا بھی ثبوت دیا تھا جیسا کہ ذیل کے خط میں رئیس صاحب نے اعتراف بھی کیا ہے:

رئیس اکاڈیمی
A-۱۲۹۔ مانک جی اسٹریٹ'
گارڈن ایسٹ، کراچی
۱۹۷۱، ۶ جون۔

پیارے شمس کنول! دعائیں! محبت نامہ (۱۷ مئی) ملا۔ کل پریس کلب میں ایک اجتماع تھا۔ وہاں ذوالفقار مصطفیٰ (ماہ رومانی) بھی مل گئے۔ تمہارا ذکر جمیل آیا اور دل نے بہت لطف اُٹھایا ———— یارا۔ اب نجانے کب ملاقات ہو اور ہو بھی یا نہ ہو' چلا چلی کا دور ہے۔ بہت آگے گئے' باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔ بہت جی چاہتا ہے کہ ایک مرتبہ پھر اُس جنت اور مٹی کی زیارت کر لوں۔ نہ جانے یہ آرزو اس زندگی میں پوری ہو سکے گی یا نہ ہو سکے گی۔ کاش بچھڑے ہوئے مل سکتے۔

ہاں! تمہارے رئیس کا جشن ۲۲ جون کو منعقد ہوا تھا۔ یارانِ کراچی نے واقعی اپنے حوصلے نکال لیے۔ رئیس اکاڈیمی کے قیام کا اعلان ہوا۔ ویسے سوا دس ہزار کے عطیات دیے گئے۔ ۱/۲ ۱۲ ایکڑ زمین نذر کی گئی (کہ دو لاکھ سے کم کی نہیں) یہ ساری باتیں بہت خوش کُن ہیں۔ میں وقتی طور پر بہت خوش ہوا۔ بہت اترایا مگر جب ناچتے ناچتے مور نے اپنے پاؤں پر نظر ڈالی تو شرما گیا ———— یہ تقریب اُن لوگوں کے بغیر ہوئی جو میرے پرانے ساتھی تھے۔ نہ جانے اس موقع پر کس کس کا خیال آیا' خیال آتا رہا' بہرحال جو نصیب میں لکھا ہے بھگتنا پڑے گا۔

میں جون ۱۹۴۷ء سے روزنامہ "جنگ" میں (روزانہ) ایک قطعہ لکھ رہا ہوں۔ اب قطعہ نویسی کو چوبیسواں سال شروع ہوا ہے۔ اندازہ کرو کہ ان چوبیس سال میں کتنے قطعے میرے قلم سے نکلے ہوں گے۔ ان قطعات کی مقبولیت بلکہ عالمگیر مقبولیت محتاجِ بیان نہیں۔ تا اینکہ یہ ادبِ اُردو صحافت کا مستقل فیچر بن گئے ہیں۔ "جنگ" کی اشاعت پونے دو لاکھ ہے تین ایڈیشن شائع ہوتے ہیں۔ کراچی۔ پنڈی اور لندن (جنگ انٹرنیشنل) تینوں ایڈیشنوں میں قطعات مستقل چھپتے ہیں۔ تقریباً دس لاکھ آدمی روزانہ قطعات کو پڑھتے ہیں۔ چند ماہ قبل جنگ پبلیکیشنز نے پانچ پانچ سو صفحات کی دو جلدیں چھاپی ہیں اور نہایت اہتمام کے ساتھ۔ پہلی جلد میں جون ۴۷ سے دسمبر ۵۳ء تک کے قطعات ہیں۔ دوسری جلد میں جنوری ۵۴ء سے دسمبر ۵۸ تک کے قطعات۔ یہ قطعات ہزار صفحات میں سمائے ہیں۔ اُن کی قیمت تیس روپے (دونوں جلدوں کی) مقرر کی گئی تھی۔ دو ہزار جلدیں چھاپی گئی تھیں جو چھ مہینے میں ختم ہو گئیں۔ کُل خرچہ چالیس ہزار آیا۔ میں تو چالیس ہزار سال لگاتار کوشش کرتا تو بھی یہ مجموعے نہ چھپ سکتے۔ یہ تو 'جنگ' کے وسائل ہی تھے کہ یہ مجموعے چھپ سکے۔ اب ۱۹۵۹ء سے ۱۹۷۱ء تک کے قطعات چھاپنے کے لیے ساٹھ ہزار روپے اور چاہئیں۔ خیر اللہ انتظام کرے گا۔

مخلص
رئیس

مگر یہ سب کچھ پانے کے باوجود رئیس صاحب کو مادرِ وطن کے کھو جانے کا زیادہ

[illegible] اپنی پرانی محفل کو ہمیں۔

وادیِ گنگ و جمن میں جو کبھی لوٹے تھے
وہ مزے اے دلِ مغموم کہاں سے لاؤں
رُت کراچی میں بھی برسات کی آتی ہے مگر
تجھ کو اے دلّیِ مرحوم کہاں سے لاؤں

رئیس صاحب نے اپنی ابتدائی زندگی (ہندوستان میں) ایک مسلم لیگی کی حیثیت سے گزاری تھی، مگر در حقیقت وہ کٹّر پنتھی کبھی نہیں تھے۔ جس سرزمین پر وہ پیدا ہوئے تھے اُس کی یاد انھیں ہمیشہ ستاتی تھی اور جس تہذیب میں وہ پلے تھے اس سے ناطہ توڑنے کے لیے وہ تیار نہیں تھے۔ فائیو اسٹار کلچر پر وہ اپنے ہندی کلچر ہی کو ترجیح دیتے تھے۔ انھوں نے ایک بار اپنے ایک طویل مضمون میں اپنی شناخت اس طرح کرائی تھی کہ ــــــ

"ہم لافانی انڈو اسلامی کلچر کے وارث ہیں۔ ہم گنگ و جمن کی سرزمین پر فخر کرتے ہیں جہاں ہماری انڈو اسلامی تہذیب کی عظیم الشان عمارت استوار ہوئی تھی۔"

اسی لیے انھیں مادرِ وطن ہندوستان کے چھوٹ جانے اور پاکستان کے راس نہ آنے پر بے حد پچھتاوا تھا۔ وہ اپنے ۱۰ر اگست ۱۹۷۱ء کے خط میں مجھے لکھتے ہیں ؛

۱۲۹ ۱۔ مانک جی اسٹریٹ
گارڈن الیسٹ، کراچی ۳

پیارے شمس کنول! جب سرحد پار سے کوئی خط موصول ہوتا ہے تو بخدا آبدیدہ ہو جاتا ہوں ؏

غربت ہم کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا!

یہاں جشنِ رئیس امروہوی نہایت اعلیٰ [illegible]ب جشنِ مرگِ رئیس اور [illegible] باں ہے :

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے!

کوئی شبہ نہیں کہ اقبال جماعتِ اسلامی کے شاعر ہیں اور غالبؔ انسانیت کا ترجمان۔ وہ جو ئے کم آب، یہ دریائے ذخّار؛ وہ محرابِ مسجد، یہ مینارۂ بشریت ــــــ

پیارے یہ تو بتاؤ! تم معاشی طور پر مطمئن ہو؟ مجھے سب سے زیادہ اسی کی فکر رہتی ہے کیونکہ صحافت و ادب کے بارے میں میرے پچھلے تجربات چنداں خوشگوار نہیں اور اب یہاں حالات بدلے ہیں تو بہت دیر سے :

عید ہوئی ذوقؔ و لے شام کو
ماہِ رومانی ملتے ہیں خوب آدمی ہے۔

شہناز کو بہت بہت دعائیں۔ واقعی شہناز سچّی رفیقِ حیات ہے۔

خیر اندیش
رئیس
۱۰ر اگست ۱۹۷۱ء

رئیس امروہوی زُود گو تھے۔ زود نویس تھے اور بسیار نویس بھی۔ یہی اُن کی خوبی تھی اور یہی اُن کی خامی

آگے کچھ کہنے سے پہلے یہ ذکر ضروری ہے کہ کمال امروہوی نے ایک ملاقات[1] میں مجھ سے کہا تھا کہ :

"اپنی ادبی زندگی کی ابتدا شاعری ہی سے ہوئی تھی۔ یہ بڑا دلچسپ اتفاق ہے کہ اچھن جو مجھ سے پانچ مہینے بڑے ہیں ابتدا میں افسانہ نگار تھے۔ بچپن میں وہ ہرات طلسم ہوش رُبا قسم کی ایک کہانی ہم سب کو برجستہ سُنایا کرتے تھے۔ اچھن[2] نے بڑے غضب کا ذہن پایا ہے ــــــ میں اُن دنوں شعر کہا کرتا تھا مگر میں کہانی کار بن گیا اور اچھن شاعر۔"

اگرچہ رئیس صاحب کی قلمی زندگی کی ابتدا افسانہ نگاری سے ہوئی تھی مگر آگے چل کر اُن کے قلم پر کوئی در بند نہ رہا۔ صحافت، شاعری، نفسیات، جنسیات، فلمیات وغیرہ حد یہ کہ جن، بھوت پریت، شیطانیت، ہپناٹزم کے موضوعات پر بھی انھوں نے لکھا۔ شعر و شاعری کے میدان میں وہ نظم بھی کہتے تھے اور غزل بھی۔ انھوں نے مثنوی بھی کہی اور رباعی بھی، سہرے بھی لکھے اور قصیدے بھی، مرنے والوں کی تاریخ بھی کہی اور پیدا ہونے والوں کو تاریخی نام بھی دیے۔ غرضے کہ انھوں نے تمام اصناف پر لکھا۔ دراصل یہ ان کے انتہائی ذہین، دانش ور، انٹلکچوئل اور جینئیس ہونے کی دلیل تھی لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ اگر کسی ایک ہی صنف کو اپنا لیتے تو اچھا تھا۔ JACK OF ALL TRADES (ہر فن مولا) ہونا اچھا نہیں ہوتا۔ بہر نوع انھوں نے شہرت اور دولت 'رئیس القطعات' ہی بن کر پائی۔ اگر ان کی قلم کاری کی عمر ۶۰ برس مان لی جائے تو وہ یقینی طور پر ۴۰ برس تک اُردو دنیا میں 'رئیس القطعات' ہی بن کر نمایاں رہے ہیں۔ یہ بات بنا شبہ کہی جا سکتی ہے کہ اُردو شاعری کی تاریخ میں ایک قطعہ نویس کی حیثیت سے جو نام وری رئیس صاحب کو حاصل ہوئی وہ

---

[1] ماہ نامہ 'گلگن'، بمبئی۔ اپریل ۱۹۶۹ء ... ش۔ ک

[2] جون ایلیا رئیس صاحب کے حقیقی بھائی ہیں اور کمال چچازاد۔ کمال کا گھر کا نام چندن ہے ... ش۔ ک

...ایذان ...

ے کسی بھی اردو شاعر کو نہیں ملی، اُن

...قطعات ملاحظہ ہوں

...نہ ہم نے دیکھا ہے ایک مہکی سیٹر کو

...رچہ ہے بھی کے جسم پر اخلاص کا جامہ

سیاست کے نگرِ حمام میں یاں ہر شخص ننگا ہے

یہ مولانا وہ مولانا' یہ علامہ وہ علامہ

میٹرک فیل طالبانِ علوم
کب ذلیل و حقیر ہوتے ہیں
میٹرک فیل ہی تو اپنے یہاں
مملکت کے وزیر ہوتے ہیں

چار عنصر ہیں زندگانی کے
آتش و آب و خاک و موجۂ باد
اور اپنے عناصرِ اربع
فرقہ بندی و ظلم و جہل و فساد

کراچی خوشامد پرستوں کا گھر ہے
مرے لب پہ آتا ہے یہ شعر اکثر
ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر
تو ہے خوف و ذلت کے حلوے سے بہتر

ایک طویل عرصہ گزرنے کے بعد بھی پاکستان ویسا نہیں بن سکا جیسا کہ ۱۹۴۷ء سے قبل رئیس صاحب کے تصور میں تھا۔" پاکستان کیا ہے اور اسے کیا ہونا چاہیے؟" کے ٹکراؤ نے اُن سے روز ایک قطعہ کہلوایا اور اُنھوں نے اپنی عمرِ عزیز کے آخری ۴۱ برس میں اپنے ملک کے معاشرے کی عدمِ مساوات، قومی دولت کی غیر مساوی تقسیم، بنیادی حقوق سے عوام کی محرومی، اشیائے ضروری کی مہنگائی، مزدور کی حق تلفی، مجبور کا استحصال، امیروں کی ہوسِ زر، مڈل کلاس کی مجبوری و لاچاری، کثرتِ اولاد، آبادی کی زیادتی، ہاؤس پرابلم، صنعتی تہذیب کی دی ہوئی مادہ پرستی، رشوت خوری، اسمگلنگ، کالا بازاری، ذخیرہ اندوزی، منافع خوری، دو نمبر کی دولت، امپورٹڈ اشیا کے استعمال کا شوق، تقاریب میں فضول خرچی، مذہبی تیوہاروں کے نام پر اسراف، قومی و بین الاقوامی سیاست میں انتشار، زبان کے نام پر تنگ نظری، شہری بس کا بُرا انتظام، اندھادھند ڈرائیونگ وغیرہ جیسے موضوعات پر بے شمار قطعات کہے اور قومی، سماجی، سیاسی و سماجی زندگی کا کوئی بھی پہلو اُن کی فکر کے دام میں آئے بغیر نہیں رہ سکا۔ دراصل رئیس صاحب نے خلوص کے ساتھ پاکستانی معاشرے کو سدھارنے کی کوشش کی اور آخیر میں انھوں نے انسانی زندگی کے اس فلسفے کا بھی اعتراف کیا کہ؛

فروری کیا، مارچ کیا، اپریل کیا
اک طلسمِ روز و شب ہے یہ نہ بھول
آدمی ہے وقت کا صیدِ زبوں
زندگی ہے مستقل اپریل فول

رئیس امروہوی کے قطعات دراصل پاکستان کی قومی و معاشرتی زندگی کی ایک جامع منظوم تاریخ ہیں۔ اُن کے قطعات اُن کی قادرالکلامی اور اُن کی سیاسی بصیرت کو بھی واضح کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ان کا خالق ایک صاحبِ فکر شاعر تھا۔

رئیس صاحب نے اپنے لیے بھی شعر کہے اور دوسروں کے لیے بھی۔ چنانچہ ایک اندازے کے مطابق ان کے اشعار کی تعداد چالیس پچاس لاکھ سے کم نہیں ہے اور شاید یہ دنیا کا ریکارڈ ہے۔ اگر یہ اندازہ غلط نہیں ہے تو رئیس صاحب کی فنکارانہ ذات کو PRODIGY (حیرت انگیز صلاحیت کا شخص) کہا جائے گا۔

مختلف موضوعات پر رئیس صاحب کی شائع شدہ تصنیفات کی تعداد تین درجن ہے۔

رئیس امروہوی آفاقی نظریے کے حامل تھے وہ محض کسی ایک گروہ کے طرف دار بن کے نہیں بلکہ سبھی انسانوں کے بہی خواہ تھے۔ اسی لیے وہ انڈو اسلامی کلچر کے طرف دار تھے اور جب انھیں پاکستان میں پنجابی، سندھی، بلوچی اور پٹھانی تعصب کا شکار ہونا پڑا اور وہ اپنے آپ کو ناخواندہ مہمان سمجھنے پر مجبور ہوئے تو انھوں نے مادرِ وطن کو اس طرح یاد کیا:

کیا ہم بھلا سکیں گے اجداد کے وطن کو
بھولی ہوئی فضا کو بسرے ہوئے چمن کو
گنگا کی دل کشی کو جمنا کے بانک پن کو
ماضی کی صحبتوں کو یاروں کی انجمن کو

او ہند کے مسافر سوزِ تمام لے جا
او ہند جانے والے میرا سلام لے جا

اور شاید اُن کی یہی انسان دوستی کسی تنگ نظر ظالم کو نہ بھائی اور اُس نے اپنی گولی سے انھیں جامِ شہادت پینے پر مجبور کردیا اور اس طرح رئیس صاحب ۲۲ ستمبر ۱۹۸۸ء کو ۷۱ برس کی عمر میں ہمیشہ کے لیے جُدا ہو گئے۔ اُن کے دل کی نرمی، ان کی شخصیت کا جادو اور اُن کے ذہن کی خوشبو ہمارا سرمایہ ہے۔

○○

نظمیں

ف.س. اعجاز

خبر

چھپا کے بات کنائے میں استعارے میں
یہ لوگ پوچھتے ہیں کس خبر کے بارے میں

حواس ان کے بجا ہوں تو کچھ سنائیں بھی ہم
یہ آنکھ والے اگر ہوں انھیں دکھائیں بھی ہم
یہ ان کا شیوہ ہے لفظوں میں ہیر پھیر کریں
یہ حرفِ حق جو سناتا ہو اُس کو زیر کریں
یہ بات بات میں بس اختلاف کرتے ہیں
یہ رسمِ حق سے فقط انحراف کرتے ہیں
ہر اِک خبر کا یہ چہرہ بگاڑ دیتے ہیں
ہر ایک لفظ کی قسمت اُجاڑ دیتے ہیں
یہ ڈھیٹ لوگ بظاہر جو نیک لگتے ہیں
ہمیں خبر ہے کہ کیسے خدا کے بندے ہیں
جو اطلاع ہمیں ہے اگر انھیں دے دیں
تو نیک بندوں کو کتنی یہ اُلجھنیں دے دیں
جو حق کی بات کو سُنتے ہیں افتراق پسند
زمیں پہ شور مچاتے ہیں یہ نفاق پسند
جو اختراع پہ رکھتے ہیں دسترس کامل
خبر سنانے کا ایسوں کو کچھ نہیں حاصل
یہی تقاضا ہے شاید خبر کی حرمت کا
کہ راز راز رہے منتظر حقیقت کا
یہ عنقریب خبر خود ہی جان جائیں گے
پہاڑ نشر کریں گے تو مان جائیں گے
وہ لڑکھڑاتی چلی آرہی ہے تند ہوا
یہ آسماں کو اُلٹنے کا اِک اِشارہ ملا
تو پھر بجا ہے کہ ہم چُپ لگائے بیٹھے رہیں
یہ حرفِ آگہی کے زخم کھائے بیٹھے رہیں

چھپا کے بات کنائے میں استعارے میں
یہ لوگ پوچھتے ہیں ہم سے کس کے بارے میں
ہمارے پاس کچھ ان کے لیے خبر بھی تو ہو

ماہنامہ 'انشاء' ۶-۱ے، کناٹی سیل اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۷۳

ہوش سرحدی

ہستیِ گم گشتہ

میں ابھی ہستیِ گم گشتہ ہوں خود اپنے لیے
کیوں کہ اِک فرضی انا سے مری ہم آہنگی
کوئی موقعہ ہی نہیں دیتی سمجھنے کا مجھے
اور خیالات کی وہ تیز روی
ایک پردے کی طرح اب بھی مری ذات پہ ہے

دو خیالات میں باریک سا جو وقفہ ہے
میں ٹھہر پایا کسی طرح نہ اُس میں اب تک
اپنے اس پردے کا شاہد میں اگر ہو جاؤں
تو خیالات کی وہ تیز روی رک جائے
اور پیدا ہو ترنگوں میں خلا کا امکاں
جس میں تنہا میں کسی لمحے کھڑا ہو جاؤں
اور یوں اپنی حقیقت کو میں پہچان ہی لوں

وہ حقیقت کہ جو اُس گرمی سے ہے وابستہ
نبضِ ہستی کو ہمیشہ جو رواں رکھتی ہے
اور پھر آ کے ہی رہتا ہے وہاں اِک وہ مقام
اجنبی غیر نہ بیگانہ نہ دشمن ہے جہاں
کوئی ڈر ہے نہ کوئی وہم نہ خدشہ کوئی
جاننے کو بھی کوئی چیز نہیں باقی وہاں
اِک حقیقت ہے کہ جو پیشِ نظر ہے ہر سمت
ہے یہی اچھّا کہ اُس کو میں کوئی نام نہ دوں
کیوں کہ الفاظ کے حلقے سے بہت دور ہے وہ
اور مری ہستیِ گم گشتہ کی پہچان بھی ہے

معرفت مسکین بک ڈپو، موتی ڈونگری روڈ، جے پور (راجستھان)

معین الدین جینابڑے

چاند سے زمین تک

رات کا وقت تھا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ سرد ہوا کے جھونکے کبھی دروازوں پر دستک دیتے تو کبھی رات کے پہرے داروں کو گدگداتے تھے۔ پہرے داروں نے الاؤ روشن کر لیے تھے۔ پورے چاند کی رات تھی اور پوری بستی چاندنی میں لپٹی ہوئی تھی۔ زمین پر ہوا، رات کے پہرے داروں کو چھیڑ رہی تھی اور آسمان پر بادل، چاند کی بڑھیا کا ناک میں دم کیے ہوئے تھے۔ بڑھیا بیٹھی سوت کات رہی تھی۔ اُس نے اپنے پاس ایک لاٹھی رکھ چھوڑی تھی۔ جب کبھی بادلوں کا جھنڈ مچلتا کودتا اُس کی طرف بڑھتا، وہ اُسے اپنی لاٹھی سے پرے دھکیل دیتی اور بادل آنِ واحد میں آنکھ سے اوجھل ہو جاتے۔ بادلوں کی شرارتوں سے بڑھیا کا انہماک کبھی متاثر نہیں ہوتا تھا۔ اُس کے سکون اور اطمینان میں البتہ خلل ضرور پڑتا تھا۔ بادلوں نے بھی نچلا بیٹھنا نہیں سیکھا تھا۔ بڑھیا اُنھیں پرے دھکیل دیتی تو وہ ہوا سے اُس کی شکایت کرتے۔ جیسے تیسے اُس کی خوشامد کر کے اُسے اِس پر راضی کر لیتے کہ وہ سنسناتی ہوئی، بڑی ہی تیز رفتاری کے ساتھ بڑھیا کے پاس سے گزر جائے۔ اِس سے ہوتا یہ تھا کہ بڑھیا کا آنچل سر سے ڈھل جاتا اور کچھ کپاس ہوا کے دامن سے لپٹ جاتی اور ہوا یہ کپاس بادلوں میں بانٹ کر ہنستی ہنساتی آگے بڑھ جاتی۔ اُدھر بڑھیا اپنا آنچل سنبھالنے لگتی تو بادل دُور ٹھہر کر تالیاں بجا بجا کر اُس کا مذاق اُڑاتے کہ دیکھو ذرا دیر کے لیے سہی بڑھیا کا انہماک جاتا رہا۔ بڑھیا جہاں دیدہ تھی ...... سچ تو یہ ہے کہ اُس نے کئی یُگ دیکھے تھے۔ وہ اِن سیلانیوں کی شوخیوں اور ساجھے کی شرارتوں کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ ہاں! کبھی کبھار تبسّم کی ایک ہلکی سی لکیر اُس کے جھریوں سے بھرے چہرے پر اُبھر آتی تھی ...... یہ لکیر بہت کچھ کہتی تھی لیکن مُنّے کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا ...... جواب میں وہ بھی مُسکرا دیتا تھا اور بڑھیا ایک ہاتھ سے اُس کا سر سہلاتے ہوئے کہتی :

"مُنّا جانتا ہے یہ سیلانی روز اِس طرح یہاں کیوں آتے ہیں ؟"

"نہیں دادی !"

"تو جس لیے آتا ہے اسی وجہ سے یہ بھی یہاں آتے ہیں۔"

"میں تو ڈر سے گھبرا کے یہاں آتا ہوں ...... مجھے گھر میں ڈر لگتا ہے۔"

"شاید یہ بھی کسی سے ڈرتے ہوں!"

"کس سے دادی ؟"

"اب میں تجھے یہ کیسے بتاؤں ؟ کل کو تو یہ بھی پوچھے گا کہ میں سوت کیوں کاتتی ہوں ؟"

دادی کی باتیں مُنّا کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ شاید اِسی لیے وہ اُسے بہت اچھی لگتی تھیں۔ ویسے دادی اُسے ہمیشہ سے اچھی لگتی تھی۔ یہاں چاند پر تو وہ ابھی کچھ دن ہوئے رہنے آئی ہے ورنہ پہلے تو وہ ممی پاپا اور مُنّا کے ساتھ نیچے بستی کے گھر میں رہتی تھی۔ وہاں دادی مُنّا کو خوش رکھنے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتی تھی۔ کہانیاں سُناتی تھی، لوریاں گاتی تھی، سیر کے لیے سامنے کے باغ میں لے جاتی تھی اور پہیلیاں بھی پوچھتی تھی۔ دادی کی پہیلیاں بوجھنا بڑا مشکل ہوتا تھا۔ مُنّا تو اکثر ہار ہی جاتا تھا۔ کافی منت سماجت کے بعد دادی کہتی دُودھ پی لے تو بتاؤں گی، کبھی کہتی کپڑے بدل لے تو بتاؤں گی۔ یہاں چاند پر آنے کے بعد یہ سب تو نہیں رہا لیکن یہاں آکر دادی پہیلیوں جیسی باتیں کرنے لگی تھی۔ اب یہ گھر تو تھا نہیں کہ مُنّا کسی طرح اُن کا مطلب بوجھ کر ہی دم لیتا! اُسے دادی نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تو ضِد کرے گا تو میں یہاں سے کہیں دُور چلی جاؤں گی پھر تو مجھے کبھی نہیں مل سکے گا۔ مُنّا کے لیے دادی کا یہ ذرا سی دیر کا ساتھ غنیمت تھا ...... دادی کی باتوں میں پیار تھا ...... اُن کی آواز میں پیار تھا ...... اُن کی آنکھوں میں پیار تھا ...... اُن کے ہاتھوں کے تھرتھراتے لمس میں پیار تھا ...... کبھی کبھی مُنّا کہتا :

"دادی ! تُو ساری کی ساری پیار ہے۔"

۲۳ ۷، شانتی نگر، چیمبور، بمبئی ۷۱ ۴۰۰۰

اور دادی کہتی :

"تو پورے کا پورا شیطان ہے۔"

اِس پر دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑتے اور دادی اُسے سینے سے لگا کر اُس کا مُنہ چوم لیتی۔

اِس خیال کے آتے ہی مُنّا کے ہونٹوں پر ہنسی پھوٹ پڑی۔ سوت کاتتے ہوئے دادی نے اُس کی طرف پیار بھری نظر سے دیکھا اور وہ بھی اُس کی ہنسی میں شامل ہو گئیں۔ دادی کی یہی تو خوبی تھی کہ وہ بغیر کہے سُنے مُنّا کے دِل کی بات جان جاتی تھی۔۔۔ اب پورا چاند دادی اور پوتے کی ہنسی کی کلکاریوں سے گونجنے لگا۔ آس پاس کے تاروں نے بھی آنکھیں جھپکا جھپکا کر اُن کی طرف دیکھا۔ اُن کی ہنسی کی بازگشت چاند کی وادی سے نکل کر ساری کائنات میں پھیلنے جا رہی تھی۔۔۔۔ کہ مُنّا کو اِس بازگشت کے ساتھ کچھ دھماکوں، گڑگڑاہٹوں، چیخوں اور چانٹوں کی بھی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔۔۔۔۔ اب وہ ہنس تو رہا تھا لیکن دھیرے دھیرے اُس کے چہرے کا رنگ فق ہونے لگا۔ اُس نے دادی کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔ وہ ہنس رہی تھی اور سوت کات رہی تھی۔۔۔۔۔ گویا اُسے یہ دوسری آوازیں سُنائی نہیں دے رہی تھیں۔ مُنّا کی حالت غیر تھی۔ اُس کے لیے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ دھماکے، گڑگڑاہٹیں چیخیں اور چانٹے بار بار اُس کے کان کے پردوں سے ٹکرا رہے تھے اور ہر بار اُن کی آواز تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ اُن آوازوں کے سامنے وہ بے بس تھا اور ہنسی تھی کہ رُوکے سے نہیں رُک رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔۔۔۔۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ ہنسی کے آنسو ہیں یا اُن آوازوں کے کان کے پردے سے ٹکرانے کے بعد آنکھ سے اِس طرح کا کوئی سیّال مادّہ خارج ہوتا ہے۔ بہر کیف صورتِ حال یہ تھی کہ اُس کے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے اور اُس کے کانوں میں پہاڑوں جتنے بڑے ڈھول بج رہے تھے کہ اچانک کسی نے اُس کی پیٹھ پر کَس کر چابُک کا ایک بھرپور وار کیا اور وہ بلبلا اُٹھا!

اُس کے حواس بجا ہوئے تو اُس نے دروازے پر ہوا کی دستک سُنی۔ ہوا کی آہٹ پا کر اُس نے آنکھیں کھولیں اور نائٹ بلب کی روشنی میں دیکھا کہ پاپا کے ہاتھ میں چمڑے کا پٹّا ہے جسے وہ گھما رہے ہیں۔ وہ پٹّا ہوا میں ایک ناگ کی طرح لہرا رہا ہے اور پاپا پھنکارتے ہوئے ممّی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ وہ ناگ کسی بھی لمحے ممّی کو ڈس سکتا ہے۔ وہ ڈسنے کے لیے چھٹپٹا رہا ہے۔ پاپا کی بھی یہی کوشش ہے کہ وہ ممّی کو ڈسے۔۔۔۔۔ لیکن ممّی نے مُنّے کو اپنے جسم سے چپٹا رکھا ہے۔

ممّی رو رہی تھیں اور مُنّا بلبلا رہا تھا۔ اب اُس کی سمجھ میں آیا کہ ماجرا کیا ہے؟ وہ چابک کا وار نہیں تھا۔۔۔۔۔ وہ تو پٹّا تھا جو پاپا نے چلایا تھا۔ اُس کی سمجھ میں یہ بات بھی آ گئی کہ کئی وار سہنے کے بعد جب ممّی برداشت نہیں کر سکیں تو اُنھوں نے سوئے ہوئے مُنّے کو اپنے بدن سے ڈھال کے طور پر چپٹا لیا، یہ سوچ کر کہ اب تو یہ جلّاد ہاتھ روک لے گا۔ جلّاد کا ہاتھ رُکا ضرور مگر تب تک ایک وار مُنّا کی پیٹھ پر پڑ چکا تھا۔ پاپا نے پھنکارتے ہوئے کہا:

"بچّے کو الگ کر۔ لٹا دے اُسے بستر پر۔"

"جو چاہے کر لے، اِسے الگ نہیں کروں گی۔ مارنا ہے تو مار لے۔"

ممّی نے مُنّا کو بھینچتے ہوئے اپنا جملہ پُورا کیا۔ پاپا نے ہوا میں زور کا پٹّا چلایا۔ زن کی آواز ہوئی۔ آواز کیا ہوئی ہوا سنّاٹے میں آ گئی۔ پورا کمرہ لرزنے لگا۔ ممّی سہم گئیں۔ مُنّا پر اُن کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔۔۔۔۔ مُنّا کسمسا کر خود ہی ممّی کے ساتھ چمٹ گیا۔۔۔۔۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی صورت میں اُسے ممّی اپنے سے الگ کریں!

کئی مرتبہ اُس کا جی چاہا تھا کہ وہ ممّی سے لپٹ جائے، اُسی طرح جس طرح وہ دادی سے لپٹ جاتا تھا۔۔۔۔۔ وہ چاہتا تھا کہ دادی کی طرح ممّی کو بھی وہ چھیڑے، ستائے۔۔۔۔۔ ممّی اُس سے کچھ کہیں۔۔۔۔۔ کچھ کہیں تاکہ وہ اِنکار کر سکے اور اُس کی "نا" پر ممّی ناراض ہو جائیں۔۔۔ پھر وہ کان پکڑ کر دس مرتبہ اُٹھک بیٹھک لگائے۔۔۔۔۔ وہ دادی کو بھی تو ایسے ہی منایا کرتا تھا۔۔۔۔۔ پھر ممّی مان جائیں۔۔۔۔۔ اور جب وہ مان جائیں تو وہ دوڑ کر اُن سے لپٹ جائے۔۔۔۔۔ یہ اور نہ جانے ایسی کتنی باتیں تھیں جو وہ ممّی کے ساتھ کرنا چاہتا تھا لیکن ممّی کے پاس اِن چونچلوں کے لیے وقت نہیں تھا۔ اُن کے شب و روز کچن، دفتر اور خوابگاہ میں بٹ گئے تھے۔ وہ بھی مجبور تھیں۔ دِن

ہیں صرف چوبیس ہی گھنٹے تو ہوتے ہیں۔ اگر ان کے پاس کچھ وقت زیادہ ہوتا تو شاید وہ اتنی دیر مُنّے کے ساتھ بِتا سکتیں..... لیکن !ــــ نہیں !! دِن صرف چوبیس گھنٹوں کا تھا...... اور اُس کی تقسیم پہلے سے طے تھی...... اٹل تھی...... اور وہ مجبور تھیں !!

اُنھیں اپنی اِس مجبوری کا احساس مُنّے کی آمد سے پہلے ہی سے تھا۔ وہ سوچتی تھیں، ایک تو زندگی پہلے ہی بٹ چکی ہے اور دوسرے ہر لمحہ آنکھوں کے سامنے لہراتا ہوا یہ ناگ! کیسے کچھ ممکن ہو سکے گا؟ اُس سانپ کی پھنکار کے ڈر سے وہ ہر پل ہراساں رہتی تھیں...... وقفے وقفے سے وہ سانپ اُن کو ڈستا بھی تھا...... اُس کا زہر اُن کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا...... بہت اندر تک، بہت دُور تک پہنچ چکا تھا وہ زہر۔ اُنھیں ڈر تھا کہ یہ زہر کہیں قطرہ قطرہ اُن کی کوکھ میں نہ جمع ہو جائے...... اُنھیں اندیشہ تھا کہ جب وہ اُس ننھی سی نئی جان کو اپنی چھاتی سے لگائیں تو اُس کے غوں غاں کرتے پوپلے مُنہ میں دُودھ کی جگہ زہر کی دھار نہ اُگل دی جائے!

مُنّا در دسے کراہ ضرور رہا تھا لیکن اُسے یہ سکون یہ تسلی بھی حاصل تھی کہ وہ ممی سے لپٹا ہوا ہے۔ وہ چاہ رہا تھا کہ چاہے جو ہو جائے چاہے جتنے ناگ پھن پھیلائیں وہ اسی طرح اپنی ممی کی گردن سے لٹکا رہے۔ وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے ممی کی پُشت کی جانب دیوار پر لگی ہوئی دادی کی تصویر کو دیکھنے لگا۔ کچھ دیر کے لیے اُس نے محسوس کیا کہ ممی بھی ساری کی ساری بیمار ہے۔

مُنّے کو شانے پر ڈال لینے کے بعد ممی کے کانپتے ہوئے پیر مضبوطی سے زمین پر جم گئے اور اُن کی تھرتھراتی ہوئی نظر کو بھی قرار مل گیا۔ اُنھوں نے اُدھر آئینے کی جانب نگاہ کی تو دیکھا کہ شانے سے لگا ہوا مُنّا ٹکٹکی باندھے اپنی دادی کی تصویر کو دیکھ رہا ہے اور اُس کی پلکیں بھیگی ہوئی ہیں۔ ممی بھی اُس آئینے کو دیکھنے لگیں اور دھیرے دھیرے ماضی کے دُھندلکے سے اُبھر کر ایک منظر اُس آئینے میں اُتر آیا۔ ممی نے دیکھا اُن کی ساس اُن سے کہہ رہی ہے:

"بیٹی! مہنگائی کس زمانے میں نہیں تھی۔ یہ تو ہر یُگ میں ہماری سنگی ہے۔ اِسے پہلے گربی کہتے تھے اب مہنگائی کہتے ہیں...... بس نام بدل دیا ہے! لیکن اُس یُگ سے اِس یُگ تک ونش تو برابر چل رہا ہے نا! ذرا سوچ ونش نہ چلے تو یُگ یُگ سے کیسے بدلے؟"

"ماں جی! من تو میرا بھی کرتا ہے، پر......"

"اری تو پر ور کو چھوڑ، میری سُن۔ جب یہ رگھو ہوا تھا تو میرے پاس ڈھنگ کی دھوتی بھی نا تھی...... پلّو سر پر لیتی تھی تو بھی سر کھلا ہی رہتا تھا...... تجھے اب کیا بتاؤں! اری میں تو چُرا چُرا کر کھایا کرتی تھی کہ دودھ برابر اُترتا رہے!"

"پر ماں جی! اب وقت بدل گیا ہے۔ وہ گاؤں تھا۔ یہ شہر ہے۔ آپ سمجھتی کیوں نہیں؟"

"تو مجھے تو مت سمجھا۔ میں سمجھا رہی ہوں اُسے سمجھ۔ ناری جاتی کا ایک دھرم ہوتا ہے اور اُسے نبھانا پڑتا ہے۔ تیرا من بھی تو کرتا ہے نا! ایک بات یاد رکھ۔ آدمی کو سدا اپنے من کی کرنا چاہیے۔ رہی بات رگھو کی! تو اُس کی چنتا چھوڑ۔ اُس کے باپ کو کہاں اکل تھی جو اس پاجی کے ہوتی۔ اُسے میں دیکھ لوں گی۔"

ممی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے منظر کو دھندلاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں کہ اچانک پاپا کے ہاتھ سے ایک گولہ سا نکلا اور چھناکے کے ساتھ آئینہ چکنا چور ہو گیا۔

ممی اور مُنّا دونوں ان کی طرف دیکھنے لگے۔ مُنّا نے دیکھا کہ پاپا کا چہرہ تمتما رہا ہے۔ آنکھیں لال ہو گئی ہیں۔ گلے کی رگیں تنی ہوئی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے مُنہ سے کف نکل رہا ہے۔ اُنھوں نے پھنکارتے ہوئے کہا:

"شانتی! بچّہ گرا دے۔"

"میں کہہ چکی ہوں، بچّہ نہیں گرے گا۔"

رگھو نے مُنّا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"یہ نائک تو نے اس حرام زادے کے وقت بھی کیا تھا۔ پہلے شرافت کے ساتھ راضی ہو جاتی ہے اور بعد میں تجھے ناری دھرم یاد آتا ہے...... چھنال سالی!"

صبح شانتی نے رگھو کو جگا کر خبر دی کہ مُنّا کا بدن بخار میں پھنک رہا ہے ایک سو چار ڈگری سے کم کیا ہو گا۔ شانتی شیرنی کی طرح اُسے گھور رہی تھی اور وہ ندامت کے مارے گردن جھکائے سراپا تقصیر بنا بیٹھا

تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ رگھو نے سوچا مزدور ہوں گے۔ بلڈنگ کی مرمت ہو رہی تھی۔ آج ان کی بالکنی میں ریلنگ لگانے کا دن تھا۔ رگھو نے موقعے کو غنیمت جانا شانتی کی نظروں کے خنجر اُسے چھلنی کیے دے رہے تھے۔ ایک جست میں وہ کمرے سے اور شانتی کی نظر کے دائرے سے باہر نکل گیا اور اِس سے پہلے کہ شانتی دروازے کی طرف بڑھتی اُس نے لپک کر دروازہ کھولا۔ دروازے پر مزدور ہی کھڑے تھے۔ رگھو نے انھیں سمجھایا کہ ہمارا بچہ بیمار ہے۔ ہم آج کام نہیں کرائیں گے۔

"لیکن صاحب! بالکنی کھُلی رہے گی۔ بالکل اوپن!!"

مزدور کسی طرح آج ہی اِس کام سے چھٹکارا پانا چاہتے تھے۔ رگھو نے بے زاری سے کہا:

"رہنے دو بھائی تم کیوں فکر کرتے ہو؟"

اُس صبح کوئی دفتر نہیں گیا۔ شانتی بیٹھی پانی کی پٹیاں بدلتی رہی اور بیچ بیچ میں منّے کی پیشانی کو چھُو کر بخار کا اندازہ لگاتی رہی۔ رگھو ڈاکٹر کو لینے چلا گیا۔

فیملی ڈاکٹر گھر کی اُونچ نیچ سے بخوبی واقف تھا۔ بچّے کے معائینے کے بعد اُس نے سمجھاتے ہوئے کہا:

"مرض تو کچھ نہیں ہے۔ بخار اُتر جائے گا۔ میں دوا دیتا ہوں۔ ویسے آپ دونوں خود سمجھدار ہیں، پڑھے لکھے ہیں۔ میں زیادہ کیا کہوں...... یہ بتائیے اس کی نیند میں چلنے کی عادت کیسی ہے؟"

"جی! وہ برقرار ہے۔ ویسی ہی پہلے جیسی!"

شانتی کے اِس جواب پر ڈاکٹر کی پیشانی پر شکن اُبھری۔ اُس نے خود کلامی کے انداز میں کہا:

"یعنی اب بھی سب کچھ ویسا ہی ہے!"

بابو رگھو ناتھ ڈاکٹر کے ساتھ باہر گئے اور شانتی دیوی بچّے کے سرھانے بیٹھ کر رونے لگیں۔

رات بھر گلیوں میں سرد ہوا کے جھونکوں کی گشت شروع ہوئی۔ رات کے پہرے داروں نے پھر الاؤ روشن کر لیے اور بستی کی کھڑکیوں کے دروازے کھڑکھڑانے لگے تو چاند کی ایک کرن نے ہولے سے منّے کے کمرے میں قدم رکھا، اُس کی اُنگلی پکڑی اور چل پڑی۔ منّا خوش تھا کہ وہ ایک مرتبہ پھر دادی سے ملے گا اور اُسے سب کچھ بتائے گا.... لیکن آج چاند پر دادی نہیں تھی اُس کا چرخہ بھی وہاں نہیں تھا۔ منّا کے لیے دادی کے بغیر چاند اور زمین دونوں برابر تھے۔ اُس نے دادی کو آواز دی:

"دادی امّاں!

دادی ماں!!

دادی!!!

دادی!!!!

دادی میں آگیا ہوں! میں تم سے ملنے آیا ہوں دادی! دادی تم آؤ تو میں تمھیں بتاؤں آج کیا ہوا۔ دادی تم نہیں آؤ گی تو میں کیسے بتاؤں گا؟"

منّا پکار پکار کر تھک گیا اور جب مایوس ہوا تو رونے لگا۔ پورا چاند اُس کی ریں ریں میں ڈوب گیا۔ پاس پڑوس کے تاروں نے بھی آنکھیں میچ کر اُس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ روتے روتے اس کی گھگھی بندھ گئی...... اب اُس کی سسکیاں چاند کی وادی سے نکل کر ساری کائنات میں پھیلنے جا رہی تھیں...... کہ اچانک کہیں سے دو ہاتھ آئے اور اُنھوں نے اُس کے آنسو پونچھے۔ منّا اُس لمس کو پہچان گیا وہ پلٹ کر دادی سے لپٹ گیا اور ہچکیاں لیتے ہوئے پوچھا:

"دادی تو کہاں چلی گئی تھی؟ میں کب سے آواز دے رہا ہوں۔ اور وہ تمھارا چرخہ کیا ہوا؟...... دادی میں بتاؤں آج گھر میں کیا ہوا؟"

دادی نے بڑے گمبھیر لہجے میں کہا:

"میں جانتی ہوں کیا ہوا ہے۔ تجھے بتانے کی ضرورت نہیں۔ آج یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہونے والا ہے...... وہ دیکھ بادلوں کی فوج آرہی ہے...... وہ فوج مجھے لینے آرہی ہے۔ پہلے وہ مجھے اپنے گھیرے میں لے گی پھر بہت اُوپر لے جا کر اُس گڑھے میں پھینک دے گی۔"

دادی نے اُس گڑھے کی طرف اِشارہ کیا جسے منّا آج تک صرف ایک کالا دھبّہ سمجھتا آیا تھا اور دادی کے کہنے پر اُس کے نزدیک بھی نہیں جاتا تھا۔ آج اُس نے دادی کی اُنگلی پکڑ کر گڑھے میں جھانک کر دیکھا۔ گڑھا بہت گہرا تھا۔ بہت اندھیرا تھا اُس میں۔ اُس نے گھبرا کر پوچھا:

"دادی! پھر میرا کیا ہو گا؟"

"بادل مجھے اِس گڑھے میں پھینک دیں گے۔ پھر ہوا اپنی بڑی بہن کے ساتھ

ری طرف بڑھے گی۔ اس کی بہن کا نام
می ہے۔ وہ دونوں بہنیں مل کر تمھیں چاند
نیچے دھکیل دیں گی اور تم زمین پر جا گروگے۔
کے بعد میں اس گڑھے سے نہیں نکل سکوں
ور تم دوبارہ چاند پر نہیں آسکوگے۔"

"لیکن دادی ہم دونوں مریں گے تو نہیں ؟"

"نہیں مُنّا...... ہم مریں گے نہیں ...... ہم دونوں کبھی نہیں مریں گے...... یں گرایا جاسکتا ہے...... گڑھے میں بند یا جاسکتا ہے...... لیکن مارا نہیں جاسکتا ...... بیٹا ہم امر ہیں!"

"دادی! پھر تم اِس گڑھے سے کب نکلوگی؟"

"ایک مرتبہ گڑھے میں پھینک دیے جانے کے بعد جلدی باہر نہیں نکلا جاسکتا۔ اس کے لیے مجھے تیرے مُنّے کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

"دادی مُنّا تو میں خود ہوں...... پھر میرا مُنّا؟"

دادی اور پوتے کی باتیں جاری تھیں کہ دیکھتے دیکھتے پورے چاند کو بادلوں نے گھیر لیا۔ سمٹتے سمٹتے اُن بادلوں نے دادی کو اپنے نرغے میں لے لیا۔ اُنھوں نے دادی کو بہت اُونچا اُوپر اُٹھایا اور پھر دھم سے گڑھے میں پھینک دیا۔ دادی نے آواز دی "مُنّا!"

مُنّا نے ابھی "دا" ہی کہا تھا کہ ہوا نے اُس کے پیر اُکھاڑ دیے اور آندھی نے وہ زور کا دھکّا دیا کہ وہ چاند سے نیچے گر گیا۔ بہت دیر تک وہ چاند اور زمین کے درمیان جھولتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اگر مجھے زمین پر گرنا ہی ہے تو وہ جلدی کیوں نہیں آتی۔ میں کب تک یوں لٹکا رہوں گا؟......

اور پھر وہ دھم سے زمین پر گر گیا!

ڈاکٹر بچے کی نبض دیکھ رہا تھا۔ بابو رگھوناتھ اور شانتی دیوی کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے اب کے قدرے سخت لہجے میں کہا:

"آپ ہی کی وجہ سے یہ SOMN-AMBULIST بنا ہے۔ رات کو نیند میں چلتا ہے...... اور کچھ نہیں کم از کم بخار کی حالت میں تو اس پر نظر رکھیے۔ جب کہ آپ کی بالکنی کی ریلنگ نہیں ہے۔ وہ تو کہیے کہ زیادہ خون نہیں بہا اور چوٹ بھی جان لیوا نہیں!"

کچھ دیر بعد مُنّے کو ہوش آگیا۔ شانتی دیوی اور بابو رگھوناتھ دونوں اُس پر جھک گئے۔ شانتی دیوی نے اُسے پُچکارتے ہوئے کہا:

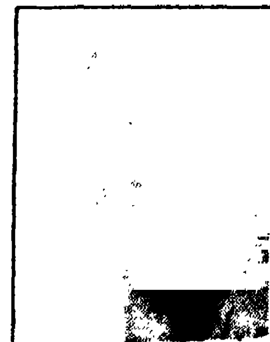
"بیٹے کیسے ہو؟ دیکھو ممی، پاپا، ہم دونوں تمھارے پاس ہیں۔"

مُنّے نے اُن کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس نے کہا:

"آپ دونوں مجھے گرانا چاہتے تھے نا! دیکھیں کتنے اُوپر سے گرا ہوں!!"

دونوں ایک دوسرے کا مُنہ دیکھتے رہ گئے۔ ان کی نظریں خود بہ خود جھک گئیں۔ اُن پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ وہ کہنا چاہتے تھے کہ بیٹے ہم نہیں گرے۔ گرے تو...... لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکے۔ شانتی دیوی کے اندر سے ایک ہوک اُٹھی، اُنھوں نے محسوس کیا کہ اندر ہی اندر کسی نے اُن کی کوکھ پر کس کر ایک مُکّا جمایا ہے...... اور بابو رگھوناتھ کے کانوں میں سیٹیاں بجنے لگیں۔ کمرے کا دایاں حصّہ بائیں جانب اور بایاں حصّہ دائیں جانب نظر آنے لگا۔ اُنھوں نے محسوس کیا کہ اُن کے پور پور سے پسینے کی نہریں نکل رہی ہیں اور وہ اُس میں گلے گلے ڈوبے ہوئے ہیں!

غزلیں



مہدی پرتاپ گڑھی

یقیں کی فصل جو دل میں اُگانے لگتے ہیں
مجھے تو بس وہی لمحے سہانے لگتے ہیں

ثمر جب آتے ہیں ان خوشنما درختوں میں
تو چاروں سمت سے پتھر بھی آنے لگتے ہیں

لٹی تھی جن میں متاعِ سکونِ جاں اپنی
ابھی کبھی وہی لمحے سہانے لگتے ہیں

انھیں بھلانے کی جب سعی کرنے لگتا ہوں
تو مجھ کو اور بھی وہ یاد آنے لگتے ہیں

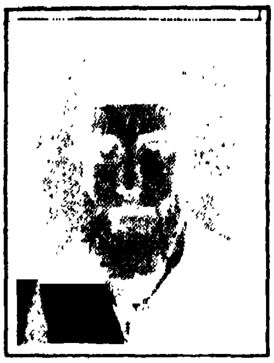
یہ میرے دوست بھی کیا سادہ لوح ہیں مہدی
مرے خلوص کی قیمت لگانے لگتے ہیں

معرفت ایگزیکٹو انجینیئر، اری گیشن ڈپارٹمنٹ، پرتاپ گڑھ (یو-پی)

یہ کوئی زندگی نہیں، نہ سہی
غم بھی کیا ہے، خوشی نہیں، نہ سہی
دل کی قندیل ہی جلا لیں گے
راہ میں روشنی نہیں، نہ سہی
جشنِ تشنہ لبی تو ہوگا ہی
صورتِ میکشی نہیں، نہ سہی
ایک انجانا سا تعلق ہے
آپ سے دوستی نہیں، نہ سہی
اُس کے بھیجے ہوئے یہ پھول تو ہیں
ان میں کچھ تازگی نہیں، نہ سہی
دل کو چھو لینے والی باتیں ہیں
یہ رضا شاعری نہیں، نہ سہی

رضا امروہوی

پی اینڈ ڈی، بلاک نمبر ۱۳، کوارٹرس نمبر ۱ — سی کالی باڑی مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱



قاضی حسن رضا

یہ احساسِ انا محفوظ رکھنا
مجھے میرے خدا محفوظ رکھنا

بنا ہوں پھول تیری بددعا سے
مرے حق میں دعا محفوظ رکھنا

پتہ بتلائیں گے منزل کا تم کو
ہمارے نقشِ پا محفوظ رکھنا

کسی دن کام آئے گا تمھارے
بزرگوں کا عصا محفوظ رکھنا

نہ جھکنا اہلِ زر کے سامنے تم
خودی اپنی رضا محفوظ رکھنا

قاضی پورہ، عندوہ ۴۲۵۰۰۱ (ایم پی)

خوشحال زیدی

بچّوں کے نہرو

اُردو میں ادبِ اطفال ان درسی کتب کی حیثیت سے وجود میں آیا جو بچّوں کی تعلیم و تربیت کی ضروریات کے پیشِ نظر لکھی گئی تھیں۔ یہ تعلیم انھیں گھر یا مدرسے میں دی جاتی تھی۔ مکتب اور مدرسے، انیسویں صدی کے وسط تک ہندوستان میں تعلیم اور تربیت کا وسیلہ بنے رہے۔ بچّوں کی درسی کتب میں مترجم فارسی حکایات اور فارسی قصّے ہوتے۔ یہ سلسلہ مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی درسی کتب تک پھیلا ہوا ہے۔ موضوعات، زبان اور اسلوب، بہر اعتبار بچّوں کا ادب خامیوں سے پُر تھا۔

پہلی جنگِ آزادی کی ناکامی کے مُضر اثرات کے باوجود، ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ اس حادثے نے ہندوستانی ادب کو جھنجوڑ دیا اور اس کے جمود کو توڑ دیا۔ ادب کو زندگی کا ترجمان بنانے پر زور دیا گیا۔ نیز محمد حسین آزاد، پیارے لال آشوب اور اسماعیل میرٹھی نے بچّوں کی تعلیم و تربیت کے لیے اُردو کی اچھی درسی کتب ترتیب دیں۔ ان کتب میں مشاہیرِ ادب کی تخلیقات سے، بچّوں کے لیے اقتباسات ماخوذ کیے گئے تھے۔ فارسی کی مشہور حکایات کو اُردو کے قالب میں ڈھالا گیا تھا۔ پہلی عالمی جنگِ عظیم (۱۹۱۶ء) اور دوسری عالمی جنگ (۱۹۳۹ء) کے درمیان ہمارا ملک مختلف قسم کے بحران اور سیاسی کشمکش کا شکار رہا۔ رہبرانِ قوم اور رہنمایانِ ملک، ملک کی آزادی کے حصول کی جدوجہد میں لگے رہے۔ ابوالکلام آزاد، مہاتما گاندھی، اور پنڈت جواہر لال نہرو کی کوششیں بارآور ہوئیں اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو مکمل طور پر ہمارے ملک کو غیر ملکیوں کے تسلط سے نجات ملی۔ لیکن تقسیمِ ہند کے حادثے نے اُردو ادبِ اطفال کو بے حد متاثر کیا۔ ادبِ اطفال دو حصّوں میں تقسیم ہو گیا۔ بچّوں کے کچھ اچھے شاعر اور ادیب، جنھوں نے بچّوں کے ادب کے فروغ اور نشوونما میں نمایاں حصّہ لیا تھا، پاکستان کے ہو گئے۔

بچّوں کے ادب اور ان کی تعلیم و تربیت کا درد رکھنے والے متعدّد دانشوروں اور اہلِ قلم نے مایوس کن حالات میں اردو ادبِ اطفال کو سہارا دیا۔ نئے ہندوستان کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے بچّوں کی درسی کتب اور ادبِ اطفال کو وسیلہ بنایا گیا۔ جس کے نتیجے میں بچّوں کے ادب میں مناسب اور خوشگوار تبدیلیاں آئیں۔ ہندوستان کے پہلے وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے بچّوں کی تعلیم و تربیت اور بہتر نگہداشت پر خصوصی توجہ دی۔ انھوں نے ملک کے نونہالوں کی آبیاری اور ذہنی تربیت کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے ماہرِ تعلیم کو اس اہم کام پر مامور کیا۔ پنڈت نہرو کی خصوصی دلچسپی کے نتیجے میں بچّوں کا میلہ، بچّوں کی کتابوں کا میلہ، بچّوں کے لیے اچھی اور صحت مند کتابیں تیار کرنے والے ادارے مثلاً نہرو بال پستکالیہ، چلڈرن بک ٹرسٹ، نیشنل بک ٹرسٹ، وغیرہ وجود میں آئے۔ مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے بچّوں کی ابتدائی تعلیم (بیسک ایجوکیشن) کی جو اسکیم آزادی سے قبل تیار کی تھی، پنڈت نہرو نے اسے بہتر طور پر عملی شکل دینے پر زور دیا۔ بچّوں کے لیے شعری ادب، افسانوی ادب اور غیر افسانوی ادب تخلیق کیا گیا۔

پنڈت نہرو کو بچّوں سے جو پیار تھا اس کے بارے میں سبھی جانتے ہیں۔ بچّوں کے لیے یہ پیار ان کے دل سے ہر وقت اُبلتا تھا۔ بچّوں کی دلچسپیوں اور ان کے تفریحی پروگراموں میں دل کھول کر دلچسپی لیتے۔ وہ یہ بھی بھول جاتے کہ وہ اس ملک کے وزیرِ اعظم ہیں۔ مسز ویلیتھی اینج فشر نے ایک دلچسپ واقعہ اس طرح بیان کیا ہے:

"سانچی کے دورے کے بعد واپسی میں گوالیار آئے۔ اس موقع پر لڑکوں کے ایک اسکول کی طرف سے قلعے کے اُوپر شام کو تفریحی پروگرام رکھا گیا۔ پنڈت نہرو کو اس میں تقریر کرنے کے لیے بلایا گیا۔ لڑکوں نے ایک عمدہ ڈرامہ پیش کیا۔ جب انھیں تقریر کرنے کے لیے بُلایا گیا تو وہ بچّوں کی طرح دوڑتے ہوئے مائکروفون کی طرف گئے۔ اس وقت ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بھی ان بچوں ہی میں سے ایک ہیں۔ انھوں نے کہا:

"آج شام جن لڑکوں نے اداکاری کی ہے وہ سب ڈرامے کا لباس پہنے ہوئے تھے۔ میرے پاس ایسا کوئی لباس نہیں، میں یہاں آکر کیا کروں؟ وہ ان

۸۰۔ انتظار لاج، غفار منزل ایکسٹینشن، جامعہ نگر،
نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

سے برابر باتیں کرتے رہے . . . قومی ترانہ گائے جانے کے بعد ہم سب اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے رہے تاکہ پنڈت جی اس کار میں بیٹھ جائیں جو ان کا انتظار کر رہی تھی اور پھر طیارے سے روانہ ہو جائیں۔ وہ اپنی کار کی طرف بڑھے لیکن کہیں سے انھوں نے پانچ چھ برس کے دو بچوں کو اپنے ساتھ لے لیا اور ان کے ساتھ ہنسی مذاق اور پیار کی باتیں کرتے ہوئے لوگوں کے درمیان سے گزر گئے۔"

بچوں کی کوششوں اور ان کے کارناموں کو پنڈت نہرو بے حد سراہتے تھے۔ بچوں کی تفریح کا ہر ممکن سامان فراہم کرنے کے لیے خود کوشاں رہتے۔ خواجہ احمد عباس نے بچوں کے لیے ایک دلچسپ فلم 'رُمنا' بنائی اس فلم میں نونہال اداکار ماسٹر رومی نے بہت اچھا کام کیا۔ رومی کو انعام ملا۔ رومی جب دہلی آیا نہرو جی سے ملا۔ نہرو جی نے بھی بے انتہا خوشی کا اظہار کیا اور اس کے کام کی تعریف کر کے اس کی ہمت افزائی کی۔ رومی کے ساتھ پنڈت نہرو نے فوٹو کھنچوایا۔ نہرو جی سے مل کر اور ان کے ساتھ تصویریں کھنچوا کر وہ اتنا خوش تھا کہ وہ شہرت اور تعریف جو اس فلم سے اسے حاصل ہوئی تھی، نہرو جی کی اس ملاقات کے آگے گرد تھی۔

نہرو جی میں آخر تک بچوں کی سی عادتیں، اُن کی سی اُمنگیں رہیں۔ انھیں خیالوں کی خوبصورت دنیا میں کھو جانا بہت پسند تھا۔ ہنسی مذاق میں دل کھول کر دلچسپی لیتے تھے۔ پی۔ ڈی۔ ٹنڈن، ایک دلچسپ واقعے کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

". . . . ۱۹۴۰ء کا واقعہ ہے۔ آنند بھون میں ہولی کھیلی جا رہی تھی نہرو جی بھی بڑے شوق سے اس تفریح میں شریک ہوئے۔ اس دن بہت لطف رہا۔ اس موقعے پر جب فوٹو کھینچا جانے لگا تو نہرو جی کچاریہ جے۔ بی۔ کرپلانی کے کندھے پر چڑھ گئے اور لوگوں کی مدد سے فوٹو کھنچنے تک وہیں ٹکے رہے۔ کرپلانی جی ہنستے رہے اور کہتے رہے۔ جواہر تم بچوں کی طرح ہلکے پھلکے تو نہیں ہو، اب مہربانی کر کے اُتر بھی جاؤ۔ نہرو ضد کرتے رہے کہ میں تو یہیں بیٹھ کر فوٹو کھنچواؤں گا۔"

آزادیِ ہند کے بعد ایک تعلیمی میلے میں بچوں نے پنڈت نہرو کو بلایا۔ انھوں نے آنے کا وعدہ کر لیا۔ اور وقت سے پہلے ہی میلے میں پہنچ گئے۔ میزبانی کے فرائض بچے ادا کر رہے تھے۔ صالحہ عابد حسین اس میلے کا بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"اس دن میری طرح جانے کتنے اور لوگ تھے جو رشک سے اپنے بچوں کو دیکھ رہے تھے کہ کاش ان کی جگہ آج ہم بچے ہوتے۔ میری آنکھوں میں وہ منظر اس وقت بھی گھوم رہا ہے کہ ایک بچی اور ایک بچے نے دونوں طرف سے ان کے دونوں ہاتھوں کو تھام رکھا ہے اور سینکڑوں بچے ان کے چاروں طرف ساتھ ساتھ جامعہ کی ہر عمارت ہر برآمدے، باغ، پارک میں اُنھیں گھما رہے ہیں۔ یہ نمائش ہے۔ یہ بچوں کی بنائی تصویریں، یہ بینک، یہ ہسٹری کلب، یہ زُو (چڑیا گھر)، یہ پنڈال، وہ ہر چیز کو شوق، توجہ اور مسرت کے ساتھ دیکھ رہے ہیں۔ سوال پوچھ رہے ہیں، فقرے کس رہے ہیں۔ ان کے حسین چہرے پر اس وقت وہی بچوں کی سی معصومیت اور مسرت ہے جو ان کے سب ننھے ننھے ساتھیوں کے چہرے پر ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ستاروں کے جھرمٹ میں بدرِ کامل اپنی آب و تاب بکھیر رہا ہو یا ننھی ننھی نیم شگفتہ کلیوں کے درمیان ایک پورا کھلا گلاب لہرا رہا ہو۔"

پنڈت جی بچوں کے دوست، ہمدرد، سرپرست اور خیر خواہ تھے۔ انھیں ان کے مستقبل کی فکر ہر وقت رہتی۔ ان کے لیے اچھی اچھی صحت مند کتابیں تخلیق کراتے۔ موصوف نے خود بھی بچوں کے لیے دلچسپ اور معلوماتی مضامین لکھے ______ ان کی ایسی نگارشات ______ موضوع، اسلوب اور زبان ہر اعتبار سے اُردو ادبِ اطفال میں شامل کیے جانے کا استحقاق رکھتی ہیں اور اس بات کا زندہ ثبوت ہیں کہ پنڈت جی ہر قوم اور ہر مذہب کے بچوں سے یکساں پیار کرتے تھے اور ان نونہالوں کی بہتر سے بہتر آبیاری کرنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہمارے ملک کے بچے جو دہری تہری محکومی کی بیڑیاں پہنے رہتے ہیں۔ جو والدین کی، بزرگوں کی اور اُستادوں کی سختی اور جبر کا شکار ہیں۔ ان جانے ہی میں جن کی بھلائی چاہنے والے ان کی جسمانی اور ذہنی نشو و نما میں رُکاوٹ بن جاتے ہیں، ان کے لیے جد و جہد کی جانی چاہیے کہ وہ آزاد فضا میں سانس لیں۔ بچوں کی جسمانی نگہداشت کے ساتھ ذہن و دماغ کی بھی مناسب تربیت کی جائے، اور ان کے دلوں کو تنگ نظری اور تعصب سے پاک رکھا جائے تاکہ وہ اس عظیم ملک کے ہونہار سپوت بن سکیں۔

پنڈت نہرو نے بچوں کے لیے جو مضامین لکھے اور جو اُردو میں شائع ہوئے، ان میں "دنیا کی سب سے پہلی جاندار اشیا" (پیامِ تعلیم دہلی، جنوری ۱۹۳۰ء) "دنیا کی تاریخ کیسے لکھی گئی" (پیامِ تعلیم، مارچ ۱۹۳۰ء) "بھولے بھالے بچے" (پیامِ تعلیم، اگست ۱۹۳۱ء) "ہمارا پیارا ملک" (پیامِ تعلیم، اکتوبر ۱۹۳۶ء) اور "ایک عقلمند آدمی" (نومبر

۱۹۵۵ء) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جو معلوماتی اور دلچسپ مضامین ہیں، جن کی زبان نہایت سادہ اور پُر اثر ہے۔ بچّوں کی اپنی زبان ہے۔ دلکشی کا یہ عالم ہے کہ موضوع کی خشکی کا پڑھنے والوں کو احساس بھی نہیں ہوتا۔

بلاشبہ آج ہندوستان میں بچّوں کا ادب جس انداز میں رخشاں اور درخشاں ہے، اس میں پنڈت نہرو کی ذاتی دلچسپی کا بڑا ہاتھ ہے۔ بچّوں کی خوبصورت کتابیں، رنگ برنگے رسائل، بچوں کی لائبریریاں، پارک، گڑیا گھر، نہرو میوزیم، ریل بھون، بال بھون اور اَپو گھر کا تعلق کسی نہ کسی طرح پنڈت نہرو کی ذات سے ہے۔

حواشی

۱۔ مسز ویلیقی ایچ. فشر، بحوالہ پی. ڈی. ٹنڈن، "نہرو کے ان دیکھے روپ" ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی۔ ۱۹۸۲ء۔ ص۔ ۹۰۔ ۸۹

۲۔ پی. ڈی. ٹنڈن۔ "نہرو کے ان دیکھے روپ" ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔ ۱۹۸۲ء، ص ۹۲

۳۔ صالحہ عابد حسین "بچوں کے چار بزرگ دوست" مکتبہ پیام تعلیم نئی دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۲۱، ۲۰

قلعۂ معلّٰی کی جھلکیاں

یہ کتاب آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے زمانے کے لال قلعے کی تہذیبی زندگی کا دل چسپ مرقع ہے۔ جس میں لال قلعے کے رسم و رواج، روز و شب کے معمولات اور مغل دَور کے آداب کا ذکر بڑے دل پذیر انداز میں کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مؤلف عرش تیموری ہیں۔ عرش صاحب تیموری خاندان کی یادگار ہیں۔ اگرچہ انھوں نے قلعۂ معلّیٰ کی وہ شان اور چہل پہل نہیں دیکھی جس کی یاد اُن کے دل کو گدگدا رہی تھی لیکن انھوں نے اپنے دادا اور دوسرے بزرگوں اور بڑے بوڑھوں سے جو کچھ سُنا تھا وہ اس کتاب میں محفوظ کر دیا ہے۔ اس میں بعض ایسی باتیں ملیں گی جو نہ تاریخوں میں ہیں نہ تذکروں میں۔ اس مختصر سی کتاب میں آپ کو بادشاہ، بیگمات اور شہزادے چلتے پھرتے نظر آئیں گے۔ ان کے اختیارات اور ان کی مجبوریوں کی جھلک دکھائی دے گی۔

دل چسپ اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ "قلعۂ معلّیٰ کی جھلکیاں" ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی۔ جب عرش تیموری کی عمر صرف سولہ سال تھی۔ سولہ سال کی عمر میں "قلعۂ معلّیٰ کی جھلکیاں" جیسی کتاب تصنیف کر دینا ناممکن نہ سہی غیر معمولی اور حیران کن ضرور ہے۔ بات صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتی، عرش تیموری نے اس کتاب سے پہلے اپنے شعری مجموعے "خورشید خاور" کے علاوہ چار کتابیں اور مکمل کر لی تھیں۔

اس دَور کے دوسرے مصنفین کی طرح عرش تیموری نے اپنے زمانے کے انگریز حکام کے بارے میں کوئی نازیبا بات نہیں کہی ہے لیکن ۱۸۵۷ء سے قبل لال قلعے میں انگریزوں نے اپنی سازشوں کا جو جال پھیلا رکھا تھا اور جس سے قلعے کا امن چین رفتہ رفتہ تہہ و بالا ہوتا جا رہا تھا اس کی نشان دہی انھوں نے صاف صاف لفظوں میں کی ہے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز نے اس کتاب کو اپنے مختصر لیکن جامع مقدمے کے ساتھ مرتب کیا ہے۔

مصنّف : عرش تیموری

مرتّب : ڈاکٹر اسلم پرویز

صفحات : ۷۲

قیمت : ۱۷ روپے

بزمِ آخر

بزمِ آخر آج سے تقریباً سَو سال قبل پہلی بار طبع ہوئی تھی۔ اس کے مصنف منشی فیض الدین ہیں جن کی زندگی کا بیشتر حصہ مرزا محمد ہدایت افزا عرف مرزا الٰہی بخش کے ملازم کی حیثیت سے لال قلعے میں گزرا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جب مغلوں کا چراغ گُل ہوا تو مغل بادشاہوں اور قلعۂ معلّٰے کے دم قدم سے دلّی جن روشن اور تاریخی روایات سے عبارت تھی وہ سب رفتہ رفتہ داستانیں بننے لگیں اور یہ احساس ہونے لگا کہ کہیں یہ داستانیں بھی فراموش نہ کر دی جائیں ایسے میں بعض ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ ہندوستان کی مشترکہ گنگا جمنی تہذیب و معاشرت، آداب و اخلاق اور دلّی کی زندگی اور ماحول کے تابناک نقوش کو صفحۂ قرطاس پر محفوظ کر لیا جائے۔ "بزمِ آخر" کی تصنیف کا پیش خیمہ یہی خیال بنا ہوگا۔ یہ کتاب آخری مغل دَور کے چشم دید حالات سُناتی ہے اور اس تہذیب کا آئینہ ہے جو ہندوستان کو مغلوں کی دین ہے۔

"بزمِ آخر" میں ابونصر معین الدین اکبر شاہ ثانی کے زمانے سے لے کر ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ آخری بادشاہ دہلی کے عہد تک کے روزمرّہ کے کل برتاؤ، عادتیں، رسمیں، خانگی معاملات، دربار اور سواری کے قاعدے، جشن اور نذروں کے قرینے، زنانہ اور مردانہ میلوں کے رنگ، تماشائیوں کے ڈھنگ، تخت نشینی اور مرنے کی کیفیت وغیرہ، نہایت شرح و بسط کے ساتھ درج ہیں جسے ڈاکٹر کامل قریشی نے اپنے جامع مقدمے کے ساتھ مرتب کیا ہے۔

مصنّف : منشی فیض الدّین

مرتّب : ڈاکٹر کامل قریشی

صفحات : ۱۲۴

قیمت : ۲۱ روپے

محمد مانکڈ / غلام مصطفےٰ

ہاشم کی بیوی

محمد مانکڈ گجراتی کے مشہور افسانہ نگار، ناول نگار اور کالم نگار ہیں۔ انھوں نے بچّوں کے ادب اور تراجم پر بھی کافی کام کیا ہے۔ اِس وقت ان کی عمر ساٹھ سال ہے۔ اور باقاعدگی سے لکھتے رہتے ہیں۔ انسانی زندگی کی اُلجھنوں اور اس کی فطری کمزوریوں کو مرکزی نقطہ بنا کر انھوں نے کئی کہانیاں لکھی ہیں ——

"ہاشم کی بیوی" جس کا گجراتی سے براہِ راست اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ ہم جناب غلام مصطفےٰ کے شکریے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ —— ادارہ

پینتیس۳۵ سال کی اپنی زندگی میں وہ کسی کو کبھی خوب صورت نظر نہیں آئی۔ شاید ہی کبھی کسی نے اسے زبیدہ کہہ کر بلایا ہوگا۔ 'جوبی...' 'جو بیلی...' 'جو بڈی...' ہی کہہ کر اسے پکارا جاتا تھا۔ انگیٹھی کے آر پار آڑی ترچھی شکل کی طرح اس کے نام کی بھی آڑی ترچھی بازگشت ہی اسے سننے کو ملتی۔

پینتیس سال بیت گئے۔ جوان —— الہڑ جوانی... یہ الہڑ جوانی بھی اسے خوب صورت نہیں بنا سکی تھی۔ اور پھر ہر آنے والا سال اسے زیادہ سے زیادہ بے ڈھب بنا رہا تھا۔ دُکھ اور کام کاج کی تپش نے اس کے جسم کو روکھا سوکھا بنا کر رکھ دیا تھا۔ آگ میں تپی ہوئی کالی مٹی کی طرح سخت، سوکھے اور ویران کورے بالوں میں دھول اور کیچڑ اَٹے رہتے۔ ناخنوں میں ڈھور ڈنگر کا گوبر بھرا رہتا۔ زبیدہ کی طرف شاید ہی کسی نے کبھی محبت سے دیکھا ہو۔ اُس کے شوہر ہاشم نے بھی نہیں ——!

ہاشم کے لیے اس کی بیوی باڑی کی کھاری زمین کی طرح بارش میں بھی اُجاڑ اور بےکار سی تھی۔

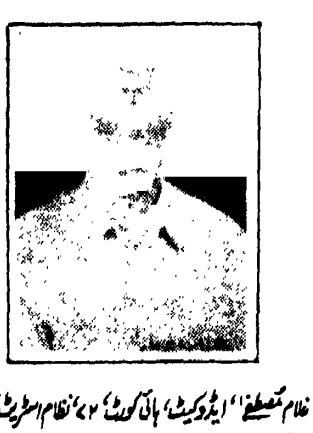
اور اب وہ مرچکی تھی ——!

زبیدہ مرگئی تھی ——!!

زندگی بھر وہ زمین اور کھیت کے ساتھ بھوتوں کی سی ہاتھا پائی کرتی رہی تھی۔ اب اسی زمین میں دفن ہوکر اسے ضرور سُکھ اور آرام ملے گا۔ دُکھ سے تو بہر حال نجات مل ہی گئی۔ لیکن ابھی اُس کی تجہیز و تکفین نہیں ہوئی تھی۔ ابھی کچھ اور وقت باقی تھا۔ پڑوس کے شہر سے جب تک مولوی صاحب نہ آجائیں اس بدنصیب کو زمین میں دفن نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ہاشم اکیلا تھا۔ برسوں سے اکیلا رہتا تھا۔ ساری زندگی اس نے گاؤں سے دُور اپنی باڑی میں بتائی تھی۔ باڑی ہی اس کی ملکیت تھی جو بنیے کے پاس گروی رکھی ہوئی تھی۔ اسی میں اس کی ایک کھولی تھی۔ زبیدہ نے آتے ہی گوبر کا ٹوکرا اٹھا لیا تھا۔ اور مرتے دم تک وہ گوبر کا کھاد بناتی رہی تھی۔ پھاوڑا، کدال، کلہاڑی، تخم، لوہے کی ٹوکریاں، بانس کی ٹوکریاں، مویشیوں کا فضلہ، پیشاب، سردی، گرمی، بارش... موت زبیدہ کے لیے ابدی سکون لے کر آئی تھی۔ زندگی کے دُکھوں اور پریشانیوں سے وہ چھوٹ چکی تھی۔ گیارہ لڑکے، دس بارہ مویشی، دھول، کھاد، اور تکلیف! ان سب سے اُسے چھُٹی مل گئی تھی ——!

پچیس سال کی عمر میں زبیدہ بیاہ کر ہاشم کے گھر آئی تھی۔ اس نے ہاشم کی پہلی بیوی کے پانچ پانچ لڑکوں کی پرورش کی تھی۔ ان کو بڑا کیا تھا۔ مصیبتوں کے دنوں میں خود اپنے بچّوں سے بھی زیادہ گھر کے چوپایوں اور مویشیوں کو اس نے کھلایا پلایا تھا۔ دس سال کے عرصے میں وہ کبھی شہر نہیں گئی تھی۔ صرف تین مرتبہ وہ گھر چھوڑ کر باہر گئی تھی۔ اور وہ بھی صرف پڑوس کے گاؤں تک ہی۔ شہر اس نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ موٹر اس نے نہیں دیکھی تھی۔ بجلی کی بتی اس نے نہیں جلائی تھی۔ لوگ جب بولتی مشین کی باتیں کرتے تو وہ خلاء



غلام مصطفےٰ، ایڈوکیٹ، ہائی کورٹ، ۲، نظام اسٹریٹ، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

پاک کو یاد کرتی اور شیطان کو بد دعائیں دیتی۔ آدمی نے بولتی مشین بنائی؟ مشین؟ بولتی؟ آدمی کی طرح؟ ... توتو توبہ ...

آنے والی دنیا کا اسے کوئی خیال نہیں تھا۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، روبو... نہیں تو وہ پاگل ہو جاتی۔ وہ تو گزرے ہوئے زمانے کی عورت تھی۔ اس کی باتیں سُن کر آنے والی نسل کو تعجب ہوگا کہ وہ کوئی عورت تھی یا جانور؟ کام، کام، کام۔ صبح چار بجے سے لے کر رات تک ڈھور ڈنگر مویشیوں کا فضلہ پیشاب صاف کرنا۔ ان کو چارہ اور پانی دینا۔ کھیت اور مزدوری۔ آرام سے نہانے دھونے کی تو بات ہی چھوڑیے۔ وقت مل گیا تو ایک لوٹا پانی سر پر سے پورے بدن پر ڈال لیا ... پل دو پل میں تو پھر وہی دھول، گرد و غبار! ہاتھوں میں چوپایوں کا گوبر اور بدن پر کھاد اور مٹی!

یہ سچ ہے کہ خدا نے انسان کو مٹی سے بنایا۔ زبیدہ یقیناً مٹی سے بنی ہوگی سوکھی، میلی، کچیلی، پھٹی ہوئی مٹی سے ــــ! اندھیرا ہو جاتا۔ سب سو جاتے گھر کے چوپائے بھی جگالی کرتے کرتے لڑھک کر آنکھیں بند کرکے پڑ جاتے اس کے بعد ہی زبیدہ ذرا سا لیٹتی اور وہ بھی رات میں کچھ دیر کے لیے۔ آنکھ لگی نہ لگی کہ بس ــــ

ہاشم بھی سارا دن کام کرتا رہتا۔ سخت محنت مزدوری۔ اس کے عوض وہی پھٹے کپڑے، بیمارِ سیمار ڈھور اور کچھ نہیں۔ جتنی زیادہ سخت مزدوری کرتا اتنا ہی وہ غریبی میں ڈوبتا جاتا۔ اکیلا تھا۔ سگے سمبندھی سب مر چکے تھے۔ لڑکوں کا جھمیلا اور زمین بنیے کے پاس گروی تھی۔ گویا قسمت کی پوتھی میں زندگی گروی رکھ کر ہی پیدا ہوا تھا۔ جب اناج کی فصل اُگاتا تو بارش ہی نہ ہوتی اور جب کپاس کی فصل کرتا تو موسلا دھار بارش ہوتی۔ آندھی، طوفان اور سیلاب آ جاتا! سال کے آخر میں ہاشم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتا۔ ایک آدھ ڈھور کم ہو جاتا یا پھر ایک آدھ بچّہ گھر میں بڑھ جاتا ... بس اسی طرح چلتا رہتا۔

ــــ اور اب زبیدہ مر چکی تھی۔ گاڑی کا بیل جیسے بیچ راستے میں ہی پھسل جائے، ہاشم کی زندگی کی گاڑی ٹوٹ کر ٹیڑھی ہو گئی تھی۔

پڑوس کے گاؤں سے پانچ سات مسلمان آ گئے تھے۔ جن میں دو تین عورتیں بھی تھیں۔ زبیدہ کی میت کو غسل دینے کی تیاری چل رہی تھی۔ بچّے ننگ دھڑنگ باڑی میں بھٹک رہے تھے۔ کچھ باپ کے ساتھ گُم صُم بیٹھے تھے۔ باپ کی طرح انھیں بھی کچھ سوجھ نہیں رہا تھا کہ کیا کریں۔ ہاشم کو مذہبی رسموں کی اور طور طریقوں کی خبر نہیں تھی۔ لوگ جو کرتے اسے صرف دیکھتا رہتا۔ گاؤں سے آئے ہوئے لوگ جان کاری رکھتے تھے۔ انھیں خدا کا کلمہ بھی آتا تھا! ہاشم تو بدھو تھا۔ بالکل جانور ... مالک کی مرضی ــــ!

شام ڈھل رہی تھی۔ مولوی صاحب کو لانے کے لیے گئے لوگ اب تک شہر سے لوٹے نہیں تھے۔ اگر زبیدہ زندہ ہوتی تو اس وقت باڑی کے مغرب یا شمال میں پانی نکالتے نکالتے ہانپ رہی ہوتی ــــ کبھی کبھی تو وہ کیاریوں میں جا رہے پانی کے بہاؤ کو روک کر ڈھور ڈنگر کے کام میں لگ جاتی۔ ہاشم کی زندگی بھی پانی کے بہاؤ کی طرح تھی ... لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے نہیں تھے۔ اس کا ایک گونگا بیل تھا۔ تین سال ہوئے قحط میں مر گیا تھا۔ اس وقت سے ہاشم اسی طرح گونگا گم صم ہو گیا تھا۔

زبیدہ کی میّت کو غسل دیا جا چکا تھا۔ ابھی تک مولوی صاحب نہیں آئے تھے۔ اندر عورتیں آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ کسی نے کہا ہاشم کو مُنھ دیکھنے اندر کمرے میں بھیجو۔ عورتوں کے اپنے طور طریقے تھے۔ ان کی کتاب اور ان کا مذہب اپنا تھا۔ گاؤں کی مسلمان عورتوں کا رسم و رواج اور زمان و مکاں کا اپنا انوکھا میزان ہوتا ہے اور وہ اسی طریقے پر چلتی ہیں ــــ بیاہ ہو یا موت ــــ!

ہاشم کو زبیدہ کا مُنھ دیکھنے اندر جانا تھا۔ اندر میّت پڑی تھی۔ دو چھوٹے بچّوں کو لے کر وہ اندر گیا۔

زبیدہ خاموش پڑی ہوئی تھی۔ مغربی سرے کی ٹوٹی دیوار پر سے غروب ہوتے ہوئے سورج کی روشنی ــــ دھندلی سنہری سی ــــ اندر آ رہی تھی ــــ زبیدہ ــــ نہائی دھوئی، دھلی ہوئی صاف ستھری، خاموش پُرسکون بھیگی ہوئی زمین کی طرح، اُجلی نہائی ہوئی، پہلی مرتبہ ندی کے پانی کی طرح شفاف چہرہ تھا بھیگے ہوئے بالوں کو گوندھ کر سینے پر رکھا گیا تھا۔ گردن کے گرد میل نہیں

تھا . . . انگلیوں میں تو کیا ناخنوں میں بھی گوبر نہیں تھا . . . کفن سے حنا کے عطر کی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی . . . "یہ زبیدہ! یہ زبیدہ؟ یہ زبیدہ ہے کہ کوئی اپسرا؟"

ہاشم نے آنکھیں موند لیں!

دہلیز کے پاس بیٹھی ہوئی ایک بوڑھی 'لا الٰہ' کہتی ہوئی اٹھی اور باہر چلی گئی۔ ہاشم کے پاس کھڑے ہوئے چھوٹے بچے اس خوب صورت عورت کو ایک نظر دیکھ رہے تھے۔ اس کے ناخن کیسے چمک رہے تھے۔ نہیں بھائی، کہیں اٹھ کر پاس آ بیٹھی تو؟ . . . اور پھر وہ وہاں سے بھاگ گئے۔

ہاشم دم بخود کھڑا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ شام کا سا سکون تھا۔ اس نے دھیرے سے جھک کر 'جوبی' کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ ناخن کی چمک کو چھو کر دیکھا اور اس کو چوم لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

اس کے بعد وہ اپنے لڑکوں سے ہمیشہ کہتا رہتا: "لڑکو! تمھاری ماں بہت خوب صورت تھی . . . کریم، غفار، جینو تم تو بہت چھوٹے تھے۔ تم نے اسے دیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ بہت تندرست تھی۔ بڑی سمجھدار . . .!"

OO

غزلیں

ایم۔ ایم۔ وفاؔ

سر پر عذاب جان یہ آفت اٹھائے گا
سچ بول کر وہ شخص مصیبت اٹھائے گا

ہم جنگ جیت کر بھی رہیں گے خراب حال
وہ ہار کر بھی مالِ غنیمت اٹھائے گا

تم تو حصارِ شب سے نکل آئے ہو مگر
یہ دن بھی دوپہر میں قیامت اٹھائے گا

ہے اپنا غم گسار بڑا مصلحت پسند
کوئی بھی غم بقدرِ ضرورت اٹھائے گا

اپنی نوا کی قید میں سب لوگ ہیں وفاؔ
محفل میں کون بارِ سماعت اٹھائے گا

ادبی سنگم، گنج نمبر ۲، پوسٹ آفس بتیا ۸۴۵۴۵۸ (یو۔پی)

حیات سالکی

راہِ حیات ان دنوں دشوار ہے بہت
انسان اپنی زیست سے بیزار ہے بہت

کوئی مسل کے پھینک دے کوئی بنائے ہار
ہنستے ہوئے گلوں کو بھی آزار ہے بہت

بھولے سے بھی کروں گا نہ جنت کی آرزو
مجھ کو تو تیرا سایۂ دیوار ہے بہت

جو ہوش میں ہے نیند کا مارا ہوا ہے وہ
جو ہوش میں نہیں ہے وہ بیدار ہے بہت

چپ رہنے سے بھی ہوتا ہے الفت کا راز فاش
خاموشیوں میں طاقتِ اظہار ہے بہت

کوئی خریدتا نہیں سر پیٹتے ہیں لوگ
مہنگا دیارِ عشق کا بازار ہے بہت

آواز دے رہی ہیں صلیبیں سنو حیاتؔ
جو بے گناہ ہے وہ گنہگار ہے بہت

معرفت بیگ کا ٹیج، کپّا احاطہ، لکھنؤ (یو۔پی)

عزیز بگھروی

یورشِ غم کے نہ شب خونِ ستم کے ہاتھوں
آپ برباد ہیں خود اپنے بھرم کے ہاتھوں

بے اثر ہو گیا شمشیر و سلاسل کا طلسم
انقلاب آئیں گے اب اہلِ قلم کے ہاتھوں

ایک بھی اشکِ ندامت نہیں باقی یارو
ایسے برباد ہوئے دیدۂ نم کے ہاتھوں

سب کی سب عہدِ مسرت میں گنوا دیں ہم نے
عظمتیں پائی تھیں جو کرب و الم کے ہاتھوں

مر گئے لوگ تو جینے کی تمنّا میں عزیزؔ
زندگی ہم کو ملی خوابِ عدم کے ہاتھوں

۲۵۰۳، بارہ دری شیر افگن، بلی ماران، دہلی ۱۱۰۰۰۶

ثریا ہاشمی

اُردو مرقع نگاری

خاکے کی طرح مرقع بھی اصلاً فنِ مصوّری کی اصطلاح ہے۔ مرقع کے لغوی معنی ہیں تصویروں کا مجموعہ۔ موجودہ دور میں مرقع نگاری اور خاکہ نگاری نے ایک ادبی اصطلاح اور صنفِ ادب کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ انگریزی میں، خاکے کا مترادف لفظ 'SKETCH' ہے۔ وہ بھی حقیقت میں فنِ مصوری کی اصطلاح رہی ہے جس کے معنی ہیں نقوش کی وہ ابتدائی صورت یا وہ بنیادی شبیہہ جس کے سہارے مصوّر مختلف رنگوں کے امتزاج اور استعمال سے اپنی تصویر کی تکمیل کرتا ہے۔

مصوّر کا ابتدائی خاکہ یا اسکیچ اُس کے اوّلین تاثر کا بے ساختہ اور بے تکلف اظہار ہوتا ہے۔ اس میں ایسی سنجیدگی، تہہ داری اور معنویت نہیں ہوتی جو مکمل یا معیاری تصویروں (PORTRAITS) میں نظر آتی ہے۔ اس میں مکمل یا معیاری تصویروں جیسی وضاحت، جامعیت اور تفصیل بھی نہیں ہوتی۔ اس میں جو شبیہہ منعکس ہوتی ہے، جو خد و خال نمایاں ہوتے ہیں ان میں زندگی اور ایک فطری دلکشی ہوتی ہے۔ ان میں ایسی ایمائی قوت ہوتی ہے جو ناظر کے ذہن اور تخیل میں اصل حقیقت کو اجاگر کرتی ہے۔ اس طرح اس کا غیر رسمی انداز، اُس کی بے تکلفی اور ناتمامی ہی اُس کا حسن بن جاتی ہے۔

ادبی خاکوں میں بھی مصوّرانہ خاکوں کے یہ اوصاف و عناصر بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ان ہی کی بنا پر خاکہ نگاری کو ایک منفرد اور ممتاز صنفِ ادب کا درجہ حاصل ہوا ہے۔

بظاہر یہ بات عجیب سی ہے کہ ادب کی ایک صنف میں مصوّری کا اسلوب و انداز پیدا ہو گیا ہے۔ جبکہ دونوں دو مختلف فن ہیں۔ دونوں کا وسیلۂ اظہار مختلف ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ادب اور مصوّری میں ہمیشہ سے کچھ عناصر مشترک رہے ہیں۔ مثلاً محاکات یعنی فطرت اور زندگی کی نقش گری کا عنصر دونوں میں مشترک ہے۔ دونوں انسانی جذبات اور احساسات کو متاثر کرتے ہیں۔ حسنِ تناسب، ایمائیت اور رمزیت دونوں کی جان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ناقدین نے فنِ مصوّری اور شاعری کا موازنہ کیا ہے۔ اٹھارویں صدی کے ایک جرمن ناقد G. E. LESSING نے اپنی مشہور کتاب "LAOKOON" اسی مطالعے کے لیے وقف کر دی تھی۔ اس نے لکھا ہے:

"PAINTING IS SILENT POETRY AND POETRY IS SPEAKING PAINTING."

یعنی مصوّری خاموش شاعری اور شاعری بولتی ہوئی مصوّری ہے۔ دراصل خاکہ نگار کا فن بھی اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے شاعری سے قریب ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس میں مصوّرانہ اوصاف بھی ملتے ہیں۔

خاکہ نگاری کے مقابلے میں سوانح نگاری نسبتاً زیادہ قدیم، زیادہ جامع اور ارتقا پذیر فن ہے۔ مشرق اور مغرب میں اس کی قابلِ قدر روایات ملتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ سترہویں صدی تک سوانح نگاری، تاریخ نگاری کا ایک جزو رہی اور موضوع یا ہیرو سے جذباتی عقیدت اور شعوری جانبداری اس کا نمایاں پہلو رہا۔ لیکن صنعتی اور سائنسی دور شروع ہوتے ہی سوانح نگاری میں مدلل مداحی کے بجائے حق پسندی، معروضیت اور غیر جانبداری کے عناصر شامل ہونے لگے۔ اور اس کے پسِ پشت انسان دوستی کا ایک نیا تصور ابھرنے لگا۔ اب صرف حکمراں، امرا یا با اقتدار افراد ہی سوانح نگاری کا موضوع نہیں رہے بلکہ ہر شعبۂ زندگی میں نمایاں خدمات انجام دینے والے انسان، اُن کی شخصیت اور سیرت ادیبوں کی توجہ کا مرکز بن گئی ـــــ اسی طرح اب سوانح عمری میں عمومی خصوصیات اور عظیم کارناموں کے بجائے انسانی اور بشری خصوصیات پر زور دیا جانے لگا۔ نفسی اور نفسیاتی پہلوؤں کا تجزیہ کیا جانے لگا۔ خاکہ نگاری کا آغاز اُس وقت ہوا جب ادب اور سوانح نگاری میں انسان دوستی اور دروں بینی کا یہ عنصر بہت نمایاں اور مقبول ہو گیا تھا۔

مواد اور موضوع کے امکانات اور اُن کی پیشکش کے اعتبار سے سوانح اور خاکے میں وہی فرق ہے جو ناول اور افسانے میں ہے۔ ناول پوری زندگی کی پیچیدگی، گہرائی اور وسعت کا احاطہ کرتا ہے۔ افسانے میں زندگی کا کوئی

پروگرام ایگزیکٹو، آل انڈیا ریڈیو، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

ایک تاثر، ایک واقعہ یا ایک پہلو پیش کیا جاتا ہے۔ سوانح عمری کسی فرد کی زندگی کی تاریخ ہوتی ہے جبکہ خاکہ اُس کی سیرت اور شخصیت کا ایک تاثر یا ایک نقش ہوتا ہے۔

سوانح نگاری اور خاکہ نگاری کا فرق واضح کرنے کے لیے ایک مثال پیش کی جاتی ہے ____ "کسی نے ایک سنگ تراش سے پوچھا کہ تم ایک پتھر سے اتنی خوبصورت مورتی کیسے تراش لیتے ہو۔ اس نے جواب دیا ____ مورتی تو خود اس پتھر میں موجود تھی میں نے تو صرف زائد حصہ الگ کر دیا۔"

شاعری میں مبالغہ آرائی کی جا سکتی ہے۔ نثر میں تخیل اور عبارت آرائی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ مگر جب ایک نثر نگار یا ادیب خاکہ لکھنے بیٹھتا ہے تو اس کی پہلی شرط حقیقت بیانی قرار پاتی ہے۔ تاکہ خاکہ پڑھنے کے بعد اس کی صورت، سیرت، کردار، زاویۂ نظر و فکر، اُس کی کمزوریاں اُس کی خوبیاں سب رونما ہو جائیں۔

بعض ناقدین کا خیال ہے کہ چند ناگفتنی باتوں کو بیان کر دینے سے اچھا خاکہ تیار ہو سکتا ہے۔ اور اسی اصول کے تحت انھوں نے پگڑیاں اُچھالنی شروع کر دیں۔ لیکن یہ ایک اچھے خاکے کے اوصاف سے قطعاً ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ خاکہ نگار کا کام حقیقت کو ملحوظِ خاطر رکھنا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ اس بات کو بھی مدِ نظر رکھتا ہے کہ کہیں تضحیک کا پہلو اُجاگر نہ ہو۔ تحریر میں طنز یا تیکھا پن نہ ہو۔ بلکہ ان کمزور گوشوں کی نقاب کشائی ''ہمدردی'' کے جذبے کے ساتھ کی جائے۔

بعض خاکہ نگاروں کا مقصد محض مدّاح سرائی رہا ہے۔ یا پھر اس طرح وہ اُس شخصیت سے اپنے تعلّقات کا اشتہار دینا چاہتے ہیں۔ لیکن ایک با اصول خاکہ نگار کا فرض بے لاگ تبصرہ کرنا ہے۔ "انسانی فطرت ایک ایسی پیچیدہ اور جامد چیز ہے جس کا احاطہ ممکن نہیں۔ خاکہ نگار تمام واقعات کا احاطہ کرنے کے بعد دریا کو کوزے میں نہیں بلکہ ایک ایسے جام بلّوریں میں پیش کرتا ہے جس کے اندر صاحبِ تذکرہ کی شخصیت صاف جھلکتی ہے۔"

اُردو میں خاکے کا ابتدائی نقش انشاءاللہ انشا کی تحریروں میں ملتا ہے۔ ان کے قلم میں خاکہ لکھنے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔ جس کی جھلک "دریائے لطافت" میں مل جاتی ہے۔ مثلاً یہاں انھوں نے منیر غضنفر علی اور "بی نورن" کا کردار اور مکالمے پیش کیے ہیں۔

بعض ناقدین کے خیال میں خاکے کی باضابطہ ابتدا دراصل محمد حسین آزاد سے ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنی تصنیف "آبِ حیات" میں شعرا کے قلمی پیکر تراشے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس سے پہلے "مکاتیبِ غالب" میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش دیکھے جا سکتے ہیں۔ غالب کا ذہن مصوّرانہ تھا اور انسانی سیرت سے انھیں غیر معمولی دلچسپی تھی۔ ایک طرف جہاں اُن کے مکاتیب میں اُن کی اپنی سیرت اور شخصیت کے بے شمار پہلو بے حجاب ہو گئے ہیں۔ وہاں دوسری طرف ان کے احباب، اعزّا اور اردگرد کے دوسرے افراد کے نقوش بھی بڑی دل کش صورت میں ملتے ہیں۔ پھر وہ ہلکی سی شگفتگی یا شوخیِ طبع جو کامیاب خاکے کی جان ہوتی ہے۔ فطرت نے غالب کو فراخدلی سے ودیعت کی تھی۔ اپنی ملازمہ بی وفادار کا خاکہ غالب اس طرح پیش کرتے ہیں:

" بی وفادار باہر نکلتی ہیں۔ سودا تو خیر کیا لائیں گی مگر خلیق اور ملنسار ہیں۔ رستے چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں۔ جب وہ محل سے نکلیں گی تو ممکن نہیں کہ اطرافِ نہر کی سیر نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو جا کر نہ دکھائیں اور نہ کہیں کہ یہ پھول تمہارے چچا کے بیٹے کی کاٹی کے ہیں۔ یعنی تمہارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں . . . . "

یہاں غالب نے نہایت اجمال اور اشاروں میں ایک زندہ کردار کا متحرک نقش پیش کر دیا ہے۔ اسی طرح کی دوسری ان گنت مثالیں بھی ان کے مکاتیب میں مل سکتی ہیں۔ تعجب ہے کہ کسی ناقد نے غالب کے مکاتیب کے اس پہلو کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ غالب کے بعد محمد حسین آزاد کی تصنیف "آبِ حیات" میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس میں آزاد نے شعرا کی چلتی پھرتی اور ان کی زندگی کی بولتی چالتی قلمی تصویریں اُتاری ہیں اور بقول خود انھیں "حیاتِ جاوداں" بخشی ہے۔

آزاد نے مرقع نگاری کا میدان ہموار کیا ہے۔ انھوں نے مرقع یا خاکے کو اپنے مخصوص اندازِ بیان میں صفحۂ قرطاس پر اُتار دیا ہے۔ بعض اوقات انھوں نے قیاس آرائی سے بھی کام لیا ہے۔ تاہم اس طرح کہ شاعر کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ آزاد جب حلیہ بیان کرتے ہیں تو لطیف مزاح کی چاشنی اُن کے اندازِ بیان میں گھل جاتی ہے۔ وہ الفاظ کے "طوطے مینا" اڑاتے ہیں۔ مثلاً شیخ ناسخ کے سیاہ رنگ کے بارے میں یوں گویا ہیں:

" زمانے کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ بے ادب گستاخ "دُم کٹے بھینسے" کی پھبتی کہا

[redacted]

کرتے تھے . . . "

آزاد کی دوسری تصنیف "دربارِ اکبری" میں بھی جا بجا خاکہ نگاری اور مرقع کشی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ مگر یہ سب تحریریں خاکہ نگاری کے ضمن میں کلیتاً نہیں آتیں۔ آزاد غیر جانبدار نہیں رہے۔ غالب اور مصحفی وغیرہ کی نسبت آزاد کی حمایت ذوق اور انشا کو حاصل رہی ہے۔ ان کے اس تاریخی تذکرے میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش اُبھرتے ضرور ہیں جو ابھی دھندلے بھی ہیں۔ لیکن ان ہی نقوش پر خاکہ نگاری کا پیکر تیار ہوا ہے۔

محمد حسین آزاد کی 'آبِ حیات' کے بعد جس خاکے کو ہم مکمل خاکہ کہہ سکتے ہیں۔ وہ مرزا فرحت اللہ بیگ کی تصنیف "نذیر احمد کی کہانی کچھ اُن کی کچھ میری زبانی" ہے۔ ان سے پہلے بھی ہم کو ایسے کردار مل جاتے ہیں جو حیاتِ جاوید حاصل کر چکے ہیں۔ مثلاً رتن ناتھ سرشار کی تصنیف "فسانۂ آزاد" میں "خوجی" کا کردار اور نذیر احمد کی تصنیف توبۃ النصوح میں "مرزا ظاہر دار بیگ" کا کردار ـــــــ مگر چوں کہ یہ تخیلی کردار ہیں اس لیے چاہے کتنے ہی اہمیت کے حامل کیوں نہ ہوں، خاکہ نگاری کے زمرے میں نہیں آتے۔ کیونکہ خاکہ زندہ شخصیت کے بیان کا نام ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کی تصنیف ـــــ "نذیر احمد کی کہانی کچھ اُن کی کچھ میری زبانی" مکمل خاکہ ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ پہلی تصنیف ہے جو خاکہ نگاری کے معیار پر پوری اترتی ہے تو بے جا نہ ہوگا

آزاد کی طرح فرحت اللہ بیگ بھی دلی کی بامحاورہ زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ اُن کے بیان میں نکتہ آفرینی اور لطیف طنز و مزاح کا عنصر پایا جاتا ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ مزاح ان کا مزاجِ ثانی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ انھوں نے الفاظ کے جادو جگائے ہیں اور مزاح کے پیکر تراشے ہیں۔ وہ کوئی ایسا گرا ہوا مذاق نہیں کرتے جو ذوقِ سلیم پر بار معلوم ہو۔ بلکہ اُن کی تحریریں مزاح کی چاشنی قاری کو زیرِ لب تبسم پر مجبور کر دیتی ہے۔ اپنی اس تصنیف میں جب وہ نذیر احمد کا سراپا بیان کرتے ہیں تو ایک بے ساختہ مسکراہٹ لبوں پر آجاتی ہے۔ ملاحظہ ہو :

" رنگ سانولا مگر روکھا۔ قد خاصا اونچا مگر چوڑان نے لمبان کو دبا دیا تھا۔ دوہرا بدن، گدرائی نہیں بلکہ موٹاپے کی طرف کسی قدر مائل ـــــــ فرماتے تھے کہ بچپن میں ورزش کا شوق تھا۔ ورزش چھوڑنے سے بدن جس طرح مُرمُروں کا تھیلا ہو جاتا ہے، بس یہی کیفیت تھی بھاری بدن سے چونکہ قد ٹھگنا معلوم ہونے لگا تھا۔ اس لیے اس کا تکملہ اُونچی ترکی ٹوپی سے کر دیا جاتا تھا کمر کا پھیر ضرورت سے زیادہ تھا۔ توند اس قدر بڑھ گئی تھی کہ گھر میں ازار بند باندھنا بے ضرورت ہی نہیں تکلیف وہ سمجھا جاتا تھا اور محض ایک گرہ کو کافی خیال کیا گیا ـــــــ سر بہت بڑا تھا مگر بڑی حد تک صفائی کا کام قدرت نے اپنے اختیار میں کر رکھا تھا . . . "

فرحت اللہ کا یہ خاکہ خواص کے دائرے سے نکل کر قبولِ عام کا شرف حاصل کر چکا ہے۔ اس کے مطالعے سے نذیر احمد کی جیتی جاگتی، چلتی پھرتی، ہنستی بولتی تصویر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ کفایت شعاری ان کا کمزور پہلو ہے۔ لیکن شخصیت کے اس رُخ کی بے حجابی فرحت اللہ نے بڑے فنکارانہ ڈھنگ سے کی ہے جس سے تضحیک کا پہلو نہیں اُبھرتا۔ لیکن کبھی کبھی بڑی بے دردی سے "نقاب" اتار دیتے ہیں۔ ان کا ایک اور خاکہ "وحید الدین سلیم" بھی ان ہی خصوصیات کا حامل ہے۔

فرحت اللہ کے خاکوں کی تعداد کافی ہے۔ ان کے موئے قلم کی موشگافیوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت نے ان کی قوتِ فکر کو خالص خاکہ نگاری کے فن کے لیے پیدا کیا۔

اُن کے بعد اُردو ادب میں بابائے اُردو مولوی عبدالحق، مولانا عبدالرزاق کانپوری، آغا حیدر دہلوی، چکبست، عبدالماجد دریاآبادی، رشید احمد صدیقی، اور عبدالمجید سالک ایک ہی عہد کے لکھنے والے ہیں لیکن کسی کا قد قدرے بڑا کسی کا چھوٹا۔

مولوی عبدالحق کے مجموعے "چند ہمعصر" نے شہرتِ عام اور بقائے دوام کا خلعت حاصل کیا ہے۔ انشا پردازی ان کا میدانِ خاص ہے۔ انھوں نے ہر عظیم شخصیت پر قلم اُٹھایا اور تحریر کا حق ادا کر دیا۔

عبدالحق انسانیت کے دلدادہ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ایک کامل شخصیت اگر انھیں "دیو مالی" یا "نور خاں" میں نظر آتی ہے تو وہ اس پر اپنا قلم اٹھاتے ہیں۔ نور خاں کے بیان پر انھوں نے لکھا ہے :

" انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان میں امیر غریب کا کوئی فرق نہیں ؏

"پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی شان ہے"

عبدالحق نے اپنے قلم کے جادو سے چھوٹی چھوٹی شخصیتوں کے بیان میں سحر پیدا کر دیا ہے۔ خصوصاً نام دیو مالی اور نور خاں کے

کردار کے مطالعے سے یقین ہو جاتا ہے کہ عبدالحق کی نظر میں انسانیت کے حسن اور اس کی عظمت و رفعت کی شناسا ہیں۔ چند ہم عصر میں چوبیس خاکوں میں اگرچہ چند ایسے بھی ہیں جو کہ خاکہ نگاری کے اعلا معیار پر پورے نہیں اُترتے۔ مثلاً امیر مینائی کا خاکہ جو ایک طرح سے ان کی سوانح کا بے رنگ خلاصہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود "میرن صاحب" "نام دیو مالی" اور "نور خاں" جیسے خاکے اس صنف میں اُن کے کمالِ فن کا مظہر ہیں۔

آغا حیدر حسن دہلوی کے خاکوں کا مجموعہ "پس پردہ" ہے اُن کا اندازِ بیان نہایت پُرلطف ہے۔ انھوں نے خالص بیگماتی لب و لہجہ اختیار کیا ہے۔ جس کا خاکہ کھینچا گویا اُس کا عکس صفحۂ قرطاس پر اُتار دیا۔ مسز سروجنی نائیڈو کا حُلیہ بیان کرتے ہیں۔

"ٹھمن کا ٹھمکا بوٹا سا قد، گول گول گدرایا ہوا ڈیل۔ کھلتی ہوئی چمپئی رنگت، کتابی چہرہ کھڑا کھڑا نقشہ ——— خوب گہری گہری کالی کالی جٹی بھنویں، جٹ کے اوپر چھوٹا سا خوب گہرا، سرخ کسوم کا ٹیکہ۔ بڑی بڑی نرگسی آنکھیں ——— بُوا! آنکھیں کیا بتاؤں غضب کی ہیں۔ موتی کوٹ کوٹ کر بھر دیے ہیں۔ . . . سیدھے رخسار میں ہلکا سا گڑھا پڑتا ہے جس کے متعلق دلّی والیوں کا خیال ہے کہ ساس پر بھاری ہوتا ہے . . ."

آغا حیدر حسن دہلوی نے الغرض جو مضامین لکھے ہیں ان میں بیگماتی زبان کے چٹخارے زیادہ ملتے ہیں۔ انھوں نے مسٹر حیات۔ مسٹر سید حسن وغیرہ کے خاکے بھی لکھے ہیں۔

اس عہد میں عبدالماجد دریا آبادی کے قلم سے کئی درجن مضامین شخصیات پر لکھے گئے ہیں۔ مہدی افادی، اکبر اللہ آبادی اور شبلی پر انھوں نے بڑے اعتماد سے لکھا ہے۔ مولانا نے ایک طویل تر خاکہ "محمد علی" پر لکھا ہے۔ اس سے تاثر بھرپور ہے۔ یہ خاکہ خالص عقیدت مندانہ لب و لہجے کا حامل ہے۔ انھوں نے جس اندازِ نگارش کو اپنا شعار بنایا وہ نہ صرف قابلِ تعریف ہے بلکہ اس میدان میں ان کا کوئی حریف نہیں۔

ان کے بعد رشید احمد صدیقی کے خاکوں کا مجموعہ "گنج ہائے گرانمایہ" آتا ہے۔ "ہم نفسانِ رفتہ" ان کے خاکوں کا ایک اور مجموعہ ہے۔ انھوں نے ایک طویل خاکہ "ذاکر صاحب" بھی لکھا ہے جو ایک کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ گنج ہائے گرانمایہ میں محمد ایوب عباسی، اصغر گونڈوی اور مولانا سلیمان اشرف وغیرہ خاکے تاثراتی طرزِ نگارش کے حامل ہیں۔ جن کی مثال دنیائے خاکہ نگاری میں ملنی شاید مشکل ہو۔

ان کے قلم کا جادو قاری کے جذبات بھی اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے۔ وہ روتے ہیں تو قاری کا دل بھی بھاری ہو جاتا ہے، وہ ہنستے ہیں تو قاری بھی مسکرا دیتا ہے۔ جب وہ سلیمان اشرف کی موت کا بیان کرتے ہیں تو قاری کی پلکیں بھی بھیگ جاتی ہیں . . . .

"یہیں سے وہ آج ہر شوق سے رخصت ہو رہے تھے۔ وہ شخص جو دوسروں کے لیے سہارا تھا آج ہر سہارے سے بے نیاز ہو رہا تھا۔ وہ آنکھیں جن میں زندگی کا خلوص اور سرداری کی چمک تھی بے نور ہونے لگی تھیں۔ . . میری وہ حالت تھی جب آدمی دُعا نہیں مانگتا۔ وہ سمجھتا ہے دُعا مانگنا عبث ہے وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ ہر چیز دگرگوں ہو جائے . . ."

یہ الفاظ قاری کے جذبات بھی متلاطم کر دیتے ہیں اور یہی رشید احمد صدیقی کی کامیابی کی دلیل ہے۔ محمد ایوب عباسی کا خاکہ بھی اُن کا شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ اور ان کی سحر بیانی کا نمونہ ہے۔

دوسرے قابلِ ذکر مرقع نگار دیوان سنگھ مفتوں، شوکت تھانوی، تمکین کاظمی، اعجاز حسین، شاہد احمد دہلوی، غلام احمد فرقت اور محمد طفیل ہیں۔ ان حضرات نے مختلف خاکے لکھے جن میں کافی مشہور بھی ہیں۔

شاہد احمد دہلوی نے وقتاً فوقتاً بعض بلند پایہ خاکے لکھے ہیں جو مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اور کتابی صورت میں چند ادبی شخصیتیں کے نام سے آچکے ہیں ان کے خاکے اپنی بعض منفرد خصوصیات کے اعتبار سے بلند پایہ تخلیقات میں شمارہ ہوں گے۔ وہ سیدھے سادے اسلوب اور عام فہم دہلوی زبان میں افراد کی بعض ایسی خصوصیات کو پیش کر دیتے ہیں جو اس کی سیرت کا حاصل ہوتی ہیں۔ اُن کے خاکوں میں ایک ایسی مرکزیت بھی ہوتی ہے جو آخر میں اچھے افسانے کی طرح وحدتِ تاثر کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ اپنے ذاتی تعلق کی بنا پر افراد کی زندگی کے جو واقعات اور حالات انھیں متاثر کرتے ہیں، زندگی کی دھوپ چھاؤں میں وہ انھیں جس طرح دیکھتے ہیں اپنے دل نشین بیان سے ان کی سیرت کا مرقع تیار کر دیتے ہیں اُردو کے بعض ممتاز ادیبوں اور شاعروں مثلاً بے خود دہلوی، حسن نظامی، میراجی، مجاز، جوش اور منٹو کے جیسے حقیقت پسندانہ خاکے انھوں نے پیش کیے ہیں وہ صرف اُن ہی کا حصّہ ہیں۔ ان کے علاوہ عام افراد کے خاکوں میں ڈپٹی صاحب، ان کا غیر فانی خاکہ ہے جس

میں انھوں نے تقسیم کے نتیجے میں پیدا ہونے والے انقلاب اور تہذیبی المیے کی طرف بھرپور اشارہ کیا ہے۔

فرقت کاکوروی نے بہترین خاکے لکھے ہیں۔ ان کے پاس خاکہ لکھنے کا بہت مواد ہے اس کے ساتھ قدرت نے اُن کی مزاح کی حس بھی دی ہے جس سے وہ صرف ہیئت اور تصور کی رنگ آمیزی سے مزاح کا ماحول پیدا کر دیتے ہیں۔ حسرت موہانی ان کا خوبصورت مزاحیہ خاکہ ہے۔ انھوں نے حسرت کے جس انداز سے مرقع کشی کی ہے اور جس طرح ان کا حلیہ بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ملاحظہ ہو:

"مٹیالی سفید بے داغ داڑھی، چہرے پر بٹی ہوئی جھریاں، بڑی بڑی آنکھوں پر ایک لمبے شیشوں والی عینک جس کا فریم پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ کوئی اللہ کا بندہ ہمارا بھی قصور معاف کرادے، کیونکہ کھال اترنے کے بعد فریم کی ادھڑی کی ہڈی نے اندر سے جھانکنا شروع کر دیا تھا۔"

اندازِ بیان کی یہ شگفتگی فرقت کاکوروی کے اور دوسرے خاکوں میں بھی ملتی ہے۔ جو ان کے ساتھ ساتھ قاری کو بھی زیرِ لب مسکراہٹ پر مجبور کر دیتی ہے۔

عہدِ جدید کے لکھنے والوں میں جو مغربی علم و فن سے آشنا ہیں وہ چراغ حسن حسرت شوکت تھانوی، عصمت چغتائی، محمد طفیل، منٹو، فکر تونسوی وغیرہ ہیں۔ ان میں سے بعض نے صرف دو ایک خاکے لکھے مگر بہترین اضافے کا باعث ہوئے۔

شوکت تھانوی کا اندازِ نگارش بھی مزاح کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ انھوں نے بعض ادبی ہستیوں کی خاکہ نگاری مزاحیہ انداز میں کی ہے۔ جس سے ان کی شخصیت کے کچھ خاص پہلو روشنی میں آئے ہیں۔ انھوں نے اپنی تصنیف "شیش محل" "ان حضرات کے نام جو اپنا تذکرہ پڑھ کر خفا نہ ہو جائیں" معنون کی ہے۔ شوکت تھانوی الفاظ سے کھیلنے کا گُر جانتے ہیں انھوں نے بہت مختصر خاکے لکھے، لیکن نہایت جامع اور دلچسپ ثابت ہوتے ہیں۔ ان کے اندازِ مزاح کا ایک رنگ حاضر ہے۔ امید امیٹھوی کے لیے لکھتے ہیں:

"کلام استادانہ ہے فن کے ماہر ہیں مگر گفتگو کریں تو سمجھ میں نہ آئے۔ شعر خواہ کسی بحر کا ہو، پڑھتے مثنوی کے انداز سے ہیں۔ لے سمجھ میں آجاتی ہے، الفاظ سمجھنے کی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ اگر کوئی گفتگو سمجھ لیتا ہے تو اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ کسی قدر شفقت میں ڈوبے ہوئے الفاظ فرما رہے ہیں۔ ورنہ عام طور پر گفتگو صرف یہ سمجھ میں آتی ہے کہ لوٹا بھق بھق کر کے کسی حوض میں ڈوب رہا ہے۔"

موجودہ لکھنے والوں میں عصمت چغتائی نے بھی خاکہ نگاری کے میدان میں اچھا اضافہ کیا ہے۔ ان کا ایک خاکہ خاصا قابلِ قدر رہا ہے۔ "دوزخی" خاکے میں انھوں نے اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی کی شخصیت کی نقاب کشائی کی ہے۔ اس کو پڑھ کر "تیرِ نیم کش کی سی خلش باقی رہ جاتی ہے اور دماغ کی طنابیں کھنچ جاتی ہیں۔" ان کی تحریر میں اتنا سوز ہے کہ قاری کا ذہن بھی بوجھل ہو جاتا ہے، ان کے طنز میں تلخی کا عنصر شامل رہتا ہے۔ فنی اعتبار سے یہ خاکہ خاصا تاثر پیدا کرتا ہے، لکھتی ہیں:

"وہ جھوٹے تھے، ان کی زندگی جھوٹی تھی سب سے بڑا جھوٹ تھی۔ ان کا رونا جھوٹا، ہنسنا جھوٹا، لوگ کہتے ہیں ماں باپ کو دُکھ دیا اور سارے جگ کو دکھ دیا۔ وہ ایک عفریت تھے جو عذاب بن کر دنیا پر نازل ہوئے تھے اور اب دوزخ کے سوا ان کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ اگر دوزخ میں ایسے لوگوں کا ٹھکانہ ہے تو ایک بار ضرور اُس دوزخ میں جانا پڑے گا ___ بس وہ تلخ بھری ہنسی دیکھنا چاہتی ہوں جسے دیکھ کر دوزخ کا داروغہ بھی جل اُٹھتا ہوگا۔۔۔"

"دوزخی" ایک اچھے خاکے کی فہرست میں آتا ہے۔ اس میں تاثر غضب کا ہے جو قاری کے دل و دماغ کو مغلوب کر لیتا ہے۔

سعادت حسن منٹو اردو کے ممتاز افسانہ نگار خیال کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے اردو مرقع نگاری کو بھی نئے تجربے سے آشنا کیا، اور ایک خوبصورت لب و لہجہ عطا کیا، ان کی حقیقت بین نگاہ شخصیت کے مخفی گوشوں تک پہنچ جاتی ہے، ان کے خاکوں کا مجموعہ "گنجے فرشتے" قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ ان میں حقیقت بیانی، مشاہدے کی گہرائی اور طنزیہ اندازِ بیان نمایاں نظر آتا ہے۔ انھوں نے ان خاکوں میں افسانوی اشاریت سے بھی کام لیا ہے۔ ان کا بیباک قلم شخصیت کی نقاب نوچ پھینکتا ہے۔ اس فصل میں اُن کی جھنجھلاہٹ خاص طور سے نمایاں رہی ہے ___ ان کے اصلاح خانے میں کوئی شیشہ، کوئی شیمپو اور کوئی گھونگھر پیدا کرنے والی مشین نہیں۔ "گنجے فرشتے" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"میرے اصلاح خانے میں کوئی شانہ نہیں، کوئی شیمپو نہیں، کوئی گھونگھر پیدا کرنے والی مشین نہیں ___ آغا حشر کی بھینگی آنکھ مجھ سے سیدھی نہیں ہو سکی ___ اور نہ میں اپنے دوست شیام کو مجبور کر سکا ہوں کہ

وہ بر خود غلط عورتوں کو سالیاں نہ کہے ـــــ اس کتاب میں جو بھی فرشتہ آیا ہے اس کا مونڈن ہوا ہے، اور یہ رسم میں نے بڑے سلیقے سے ادا کی ہے ـــــ"

اپنے خاکوں پر اتنا بھرپور تبصرہ شاید کسی نے نہ کیا ہوگا، انھوں نے بڑی بیباکی اور بیدردی سے چہروں سے نقاب اتاری ہے۔ اور شخصیت کے کمزور پہلوؤں کا اشتہار بڑی بے دردی سے دیا ہے۔ فلمی چہروں کی سیاہ شکلیں ان کے خاکوں کے آئینے میں صاف نظر آتی ہیں۔ فلم ایکٹریس "ستارہ" کا خاکہ انھوں نے نہایت طنزیہ انداز میں کھینچا ہے، جس سے اس کے کردار کے بعض ایسے گوشے بے نقاب ہوئے ہیں جنھوں نے اس کی شخصیت کو داغدار کر دیا ہے:

"وہ عورت نہیں کئی عورتیں ہیں۔ اس نے اپنے جنسی سلسلے کیے ہیں اس مختصر سے مضمون میں ان کا احاطہ نہیں کر سکتا ـــــ ستارہ کا میں جب بھی تصور کرتا ہوں تو وہ مجھے بمبئی کی پانچ منزلہ بلڈنگ معلوم ہوتی ہے جس میں کئی فلیٹ اور کئی کمرے ہیں، اور یہ واقعہ ہے کہ وہ بیک وقت کئی مرد اپنے دل میں بسائے رکھتی تھی ـــــ"

منٹو کے یہاں شخصیت کے کمزور پہلوؤں کی عکاسی زیادہ ملتی ہے۔ یہ ان کے خاکوں کی نمایاں خصوصیت ہے، واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو خاکہ نگاری کو نیا آہنگ دیا ہے۔

محمد طفیل کے خاکے "صاحب" اور "جناب" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں، "جن میں چہرہ نمائی ہی نہیں بلکہ گہرا نفسیاتی مطالعہ بھی ہے"۔ محمد طفیل فرقِ مراتب کے باوجود ایک معروضی اندازِ نظر اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اُن کی کمزوری یہ ہے کہ ان کے خاکوں میں دوسروں کی شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کی اپنی شخصیت بھی بے جا طور پر نمایاں ہو جاتی ہے۔ دوسرے ان کے تاثرات کہیں کہیں تعصبات کی صورت بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ بایں ہمہ جوش، منٹو اور احمد ندیم قاسمی کے بارے میں ان کے خاکے کامیاب اور اثر آفریں ہیں۔

غرض اُردو میں خاکہ نگاری کا فن نسبتاً نوخیز اور نوعمر ہے۔ اس لیے دوسری اصناف کے مقابلے میں اس کی ترقی کے امکانات بھی محدود رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں بھی خاکہ نگاری کم ترقی یافتہ صنف رہی ہے۔ ادبی تاریخوں میں سوانح، ڈرامہ یا ناول کی طرح اس کو الگ سے کوئی جگہ نہیں دی گئی۔ ہمارے یہاں دوسری اصناف کے مقابلے میں اس کی پستی، کم مائیگی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہمارے معاشرے میں ابھی تک ایسے حالات پیدا نہیں ہو سکے کہ جرأت اور بیباکی اور صفائی کے ساتھ لوگوں کی زندگی کے بارے میں کچھ لکھا جا سکے۔ بزرگوں اور مرحومین کی کوتاہیوں یا خطاؤں کا ذکر کرنا اخلاقی جرم سمجھا جاتا ہے، اور زندہ لوگوں کے بارے میں دیانت داری سے لکھنا اور بھی مشکل ہوتا ہے ـــــ لیکن ان دقتوں اور اس صنف سے ادیبوں کی عام بے اعتنائی کے باوجود ہمارے یہاں کامیاب اور قابلِ قدر ادبی خاکوں کا جو سرمایہ وجود میں آیا ہے، وہ کسی طرح بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ اور ہم اس پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں جیسے جیسے عقلی، سائنسی اور حقیقت پسندانہ اندازِ نظر پیدا ہوگا اور نئے دور کی صحت مند جمہوری قدریں جیسے جیسے اپنا سکہ جمائیں گی اسی طرح امید ہے کہ مرقع نگاری کے ترقی کے امکانات بھی روشن ہوں گے۔ مرقع نگاری کا اصل محرک انسانی زندگی اور اس کی شخصیت سے دلچسپی ہے۔ آنے والے دور میں یہ دلچسپی کم نہیں ہوگی بلکہ بڑھے گی۔ انسانی معاشرہ کے ساتھ جیسے جیسے انسان کی شخصیت پیچیدہ اور پُراسرار ہوتی جائے گی ویسے ویسے اس سے انسان کی دلچسپی بھی بڑھتی جائے گی اور اسی نسبت سے خاکہ نگاری کا فن بھی ترقی کے اعلیٰ مدارج طے کرے گا۔ ○○

نئی مطبوعات

اُردو ادب پر ذرائع ترسیلِ عامہ کے اثرات

مصنف: ڈاکٹر قیصر شمیم

قیمت: ۱۰۰ روپے

ملنے کا پتا: ۱۶۵، حوض رانی، مالویہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

یہ کتاب ڈاکٹر قیصر شمیم کا پی ایچ ڈی کا مقالہ اور ان کی پانچ سالہ جان توڑ محنت کا ثمرہ ہے جس میں ادب اور میڈیا کے اشتراک کا تجزیہ بھی ہے اور اس کی تاریخ بھی۔ پریس، فلم اور ریڈیو نے تخلیقی ادب کے لیے نئے راستے ہموار کیے ہیں اور تخلیقی فنکاروں کو نئی بصیرت بھی فراہم کی ہے۔ ترسیل کے تینوں ذرائع کس طرح وجود میں آئے اس کی کہانی نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ معلومات کا ایک ذخیرہ بھی پیش کرتی ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں طباعت کی ابتدا پرتگالیوں کے بعد سولھویں صدی عیسوی کے وسط میں ہوئی۔ عیسائی مبلغین عجلت پسند تھے اور کتابت کی سست رفتاری ان کو ناپسند تھی۔ اس لیے انھوں نے اپنی ضرورت کے مطابق طباعت کو معمولی فروغ دیا پھر کمپنی بہادر کی حکومت مستحکم ہوئی تو پریس کو بھی فروغ ملا۔ یہ واقعات محمد عتیق صدیقی کی کتاب "ہندوستانی اخبار نویسی" میں بھی ملتے ہیں لیکن قیصر شمیم نے اپنی کتاب میں سلسلہ وار مواد فراہم کیا ہے اور پریس کی بدولت اردو نثر اور نظم کو پھیلانے میں جو سہولتیں حاصل ہوئیں مخاطب بدلے ان کا تجزیہ بھی کیا ہے۔

فلم سے متعلق ہمارے پاس معلومات نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کی ابتدا اور ارتقا کے بارے میں مختلف روایتوں کو پیش کیا گیا ہے۔ نئی نسل تو بس فلم دیکھنے کی شوقین ہے اس کی تاریخ سے انھیں کچھ لینا دینا نہیں۔ مجھ سمیت بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ امریکہ میں اس کی ایجاد ہوئی۔ کتاب کے مطالعے سے یہ عقدہ کھلتا ہے کہ انیسویں صدی کی آخری دہائی میں سنیما کی ایجاد ہوئی اور پہلی فلم فرانس میں بنی۔ البتہ امریکہ پہلی جنگ عظیم کے بعد فلم سازی کا بڑا مرکز بنا۔ ہندوستان میں پہلی فیچر فلم "راجہ ہریش چندر" ۱۹۱۲ء میں بنی اس کے ہدایت کار دادا صاحب پھالکے تھے۔ فلم نے اردو زبان و ادب پر کیا اثرات ڈالے۔ ہمارے افسانہ نویسوں اور ناول نگاروں نے فلمی تقاضوں کے زیر اثر جو نئی نئی کہانیاں تخلیق کیں اس کی روداد بھی بے حد دلچسپ ہے۔

ریڈیو کا رول فلم کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے اس لیے کہ یہاں صرف آواز کے ذریعے پروگرام سنے جاتے ہیں۔ الفاظ کی اہمیت اور زبان کے استعمال پر پوری قوت صرف کی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ کب شروع ہوا اس کے ارتقا میں کن مسائل کا سامنا کرنا پڑا اور آج تک کتنے مراحل پیش آئے۔ آج ریڈیو سرکاری ادارہ ہے لیکن ایک زمانے میں کمپنیوں کو پرائیویٹ طور پر نشریات کی اجازت دی گئی تھی اس کی بھرپور معلومات کے ساتھ ریڈیو نے کیا اثرات مرتب کیے اور اردو زبان و ادب کی کن اصناف کو اس میڈیا کے ذریعے فروغ حاصل ہوا اس کی سیر حاصل روداد مقالہ نگار نے پیش کی ہے۔

آج کے دور میں صحافت، فلم اور ریڈیو ہماری زندگی کا ایک اہم جزو بن گئے ہیں۔ ان سے وابستہ افراد زبان و ادب کی کس طرح خدمات انجام دے رہے اس کی تفصیل کے لیے اس مقالے کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔

کتاب دہلی اردو اکادمی کے مالی تعاون سے چھپی ہے۔

ملک الشعرا گرامی جالندھری

مصنف: طارق کفایت

قیمت: ۴۰ روپے

ملنے کے پتے: مکتبہ جامعہ، اردو بازار، دہلی ۶، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، دہلی ۶

ملک الشعرا مولانا غلام قادر گرامی فارسی کے شاعر تھے۔ علامہ اقبال ان کے مداح مولوی محمد حسین آزاد ان کے استاد اور حفیظ جالندھری ان کے شاگرد عزیز تھے۔ ایسی بے شمار شخصیتیں زمانے کے گرداب میں پھنس کر اساتذہ اور طلبا کی نظروں سے ایک عرصے تک روپوش رہی ہیں۔ جیسے جیسے تحقیق کرنے والوں کا قافلہ آگے بڑھتا رہا ان بزرگوں کی یاد تازہ ہوئی اور ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا جاتا رہا۔ فارسی شعرا کی خدمات اس لیے بھی نظروں سے اوجھل رہیں کہ ہمارے یہاں فارسی تعلیم کا چلن کم اور فارسی

ادب کا ذوق کم ہوتا چلا گیا۔ ایسے حالات میں کسی فارسی گو شاعر کے حالات و کوائف کو یکجا کرنا ایک مشکل مرحلہ ہو جاتا ہے ــــ یہ طارق کفایت کا اہم مقالہ ہے جس میں گرامی جالندھری کے حالاتِ زندگی شخصیت اور کلام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مقالہ نگار کے مطابق ان کی پیدائش ۱۸۵۶ء میں یا اس سے ایک دو سال قبل جالندھر میں ہوئی۔ سوال یہ ہے کہ ادب کا سنجیدہ قاری ان کی ولادت کے باب میں ۵۲ لکھے ۵۳ یا ۵۴۔ اس کی تمام تر ذمہ داری طارق کفایت پر عائد نہیں ہوتی۔ انھوں نے تو ہر ممکن کوشش کی ہوگی کہ گرامی مرحوم کی صحیح تاریخِ پیدائش معلوم ہونے پر تحریر کریں۔ قصور فارسی کے اساتذہ کا ہے جو ایسے شاعر کی تاریخِ ولادت کا تعین بھی نہیں کر سکے جس کے انتقال کے بعد یہاں فارسی شاعری کا چراغ گل ہو گیا۔ گرامی مرحوم کی تعلیم اورینٹل کالج میں ہوئی۔ یہاں سے انھوں نے منشی عالم اور منشی فاضل کے ساتھ قانون کی تعلیم بھی حاصل کی۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان کی اسناد میں تاریخِ پیدائش درج نہیں ہے ممکن ہے مقالہ نگار کی رسائی ان کے وارثین تک نہ ہوئی ہو۔ یا اسناد ہی غائب ہو گئی ہوں تعلیم حاصل کرنے کے بعد گرامی مرحوم پنجاب ہی میں مدرس کی خدمت پر مامور ہوئے پھر حیدر آباد میں ان کی شادی شیخ قمر الدین کی صاحبزادی نوراں سے ہوئی ۱۹۱۶ء میں وہ واپس پنجاب آگئے اور ہوشیار پور میں سکونت اختیار کرلی۔ یہاں کے نوجوان شعرا نے ان سے استفادے کے لیے ایک ادبی انجمن "بزمِ گرامی" کے نام سے قائم کی۔

گرامی خالص مشرقی تہذیب کے پروردہ تھے۔ فکرِ سخن کے علاوہ کوئی دوسرا ذوق نہیں رکھتے تھے۔ وضعداری اور سادگی جو اس عہد کی تہذیبی قدریں تھیں، ان کے دلدادہ تھے اور علامہ اقبال سے بہت بے تکلف تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۲۷ء میں ہوا۔ ۱۹۳۰ء کے بعد ان کے دو مجموعے "دیوانِ گرامی" اور "رباعیاتِ گرامی" کے نام سے شائع ہوئے۔ ۱۹۷۶ء میں لاہور سے عبداللطیف صاحب نے ان کے دونوں مجموعوں کو یکجا کرکے "کلیاتِ گرامی" کے نام سے شائع کیا۔ اس کتاب میں ان کے فارسی اشعار کا خلاصہ اردو میں پیش کیا گیا ہے۔ مقالہ نگار نے ان کے کلام کی خصوصیات بھی تحریر کی ہیں۔

ــــ مجیب الاسلام

تحقیقی اور تاثراتی مضامین

مصنف: ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن
صفحات: ۱۰۴
قیمت: ۷ روپے
ملنے کا پتا: بُک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۴

اس کتاب میں ۱۲ مضامین ہیں۔ کچھ مضامین نئے بھی ہیں اور معلوماتی بھی۔ مصنف نے دو قدیم مثنویوں کا شروع ہی میں ذکر کیا ہے۔ ان میں مولچند منشی کی "شاہنامہ اردو" بانصویر شامل ہے وہ لکھتے ہیں کہ ان کے پاس مطبع نول کشور کا جو نسخہ ہے اس کے ابتدائی اوراق غائب ہیں۔ اور یہ ممکن ہے کہ دوسری مثنویوں کی طرح اس کی ابتدا بھی حمد و نعت اور منقبت اور اس کے بعد آغاز داستان سے ہوئی ہو۔ انھوں نے کچھ اشعار سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مثنوی میں شعریت موجود نہیں محض برانگیختہ جذبات ہیں۔ آخر میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس مثنوی کا ذکر کسی محقق نے اپنی کسی تحقیقی تصنیف میں نہیں کیا۔

میرے سامنے اس مثنوی کی چار مختلف پریسوں میں چھپی بہت پرانی جلدیں پڑی ہیں:

۱۔ نول کشور پریس
۲۔ مطبع رضوی
۳۔ مطبع چشمۂ فیض۔ دوسری بار
۴۔ بمبئی پریس آگرہ

دو ایسے تذکرے ہیں جن میں اس مثنوی کا ذکر ہے۔ ان میں ایک تذکرہ ۱۸۸۵ء کا ہے۔

۱۔ تذکرہ آثار الشعرائے ہنود۔ از دیبی پرشاد
۲۔ اردو کے ہندو مثنوی نگار۔ از عطاء اللہ پالوی۔ پٹنہ۔

اس مثنوی کا یقیناً زیادہ ذکر نہیں ہوا اب ملتی بھی نہیں۔ لیکن چار پریسوں کا چھاپنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ مثنوی اپنے وقت میں بہت مشہور تھی۔ عطاء اللہ پالوی صاحب نے اس مثنوی پر ۱۴ صفحات لکھے ہیں اور اس کی خوبیوں کو گنوایا ہے۔ اردو میں شاہنامے کو منتقل کرنے کی نہ پہلے کسی نے کوشش کی اور نہ پھر منشی کے بعد کسی اور نے ہمت کی ہے۔ مصنف کا انتقال ۱۸۳۲ء میں ہوا تھا یہ مثنوی ۱۲۲۰ھ میں لکھی گئی۔

کہا قصۂ خسروانِ عجم = ۱۲۲۰

ابتدا: بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ پھر حمد، مناجات، نعت۔ در تعریف محمد اکبر شاہ۔ سبب تالیف کتاب وغیرہ "مسلم حکمرانوں کی سنسکرت دوستی" بہت مختصر مضمون ہے لیکن مصنف کے نظریۂ تحقیق کو ظاہر کرتا ہے۔ مصنف مبارکباد کے مستحق ہیں کہ نئی باتیں دی ہیں۔ کتاب قابل قدر ہے۔ طباعت۔ کتابت عمدہ قیمت واجبی ہے۔

داستانِ میسور

مصنف: اکرام کاوش
صفحات: ۲۰۶
قیمت: ۳۰ روپے
ملنے کا پتا: میر اکرام علی کاوش، بی۔ ایس۔ سی بی ایڈ نمبر ۱۴۱/۳۳، ۷ واں مین تلک نگر میسور (کرناٹک)

اس کتاب کا نام "داستانِ میسور" ہے مگر پوری کتاب میں محض مسلمانوں کی ادبی ثقافتی زندگی۔ تصنیفات۔ تالیفات۔ شاعری، نثر نگاری کا ہی ذکر ملتا ہے کھیلوں، اداروں، اسکولوں، کالجوں، پیروں، صوفیوں، فقیروں کا ذکر ہے تو وہ بھی سب مسلمانوں کا۔ مقامات کے ذکر میں بھی یہی نظریہ کارفرما ہے۔
دسہرہ کا تہوار میسور میں کس شان و شوکت سے منایا جاتا تھا اس کا ذکر سرسری ہوا ہے۔ ایک آدھ فقرہ اور بس۔
اتنے بڑے اور پر وقار شہر میں غیر مسلموں کا کوئی وجود ہی نہ ہو، یہ کیسے ممکن ہے۔ انھوں نے ایک مسلمان کے لکھے رامائن ناٹک کا ذکر کیا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں ہمارے   کی قدر تھی۔

یہ صحیح ہے کہ مختصر سی کتاب میں پورے شہر کا احاطہ نہیں ہو سکتا لیکن پھر اس کا نام بدل دینا چاہیے تھا۔ تذکرہ لکھنا آسان کام نہیں۔ مصنف نے بہت محنت کی ہے۔ ان کی کاوش قابل داد ہے۔ کچھ صفحات آگے پیچھے ہو گئے ہیں۔ کتابت، طباعت اچھی ہے۔ قیمت صحیح ہے۔

سلام مچھلی شہری: حیات اور شاعری

مؤلف: ڈاکٹر محمد اختر الحسن
صفحات: ۱۲۸
قیمت: ۲۵ روپے
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

کتاب زیر نظر میں ۴۸ صفحات پر سلام مچھلی شہری پر مضامین اور ۷۴ صفحات پر ان کے کلام کا انتخاب ہے۔ فاضل مصنف نے کچھ خود لکھا ہے کچھ دوسروں کا لکھا شامل کیا ہے۔
سلام کی زندگی، ان کی عادات، ان کی ذمہ داریوں۔ ان کی شراب نوشی، مشاعروں میں شرکت۔ ان کی علالت ان کی شاعری وغیرہ پر کافی کچھ لکھا گیا ہے۔ ان کے خطوط کا ذکر بھی ہوا ہے۔ ایسا منظوم کلام جو دوسروں نے سلام کی شاعری وغیرہ پر لکھا وہ بھی شامل ہے۔ غرض کہ سلام مچھلی شہری کو جاننے کے لیے بہت کچھ ہے۔
مرحوم کے بارے میں عموماً اچھی ہی باتیں کہی جاتی ہیں اور کہی جانی چاہئیں لیکن ہر شخص خوبیوں اور خامیوں کا مرقع ہوتا ہے۔ میں سلام صاحب سے کئی بار ملا ہوں۔ وہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے تھے۔ یقیناً وہ شاعر باکمال تھے۔

—— رام لعل نابھوی

سلگتے خواب

مصنف: ہیریسن قربان
صفحات: ۱۴۰
قیمت: ۲۰ روپے
ناشر: ہیریسن قربان، بی۔ ۷۷، اداس وکاس کالونی، سہارن پور ۲۴۷۰۰۱ (یو۔پی)۔
ملنے کا پتا: اردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی ۲

قربان صاحب شاعر بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ زیر نظر کتاب ان کے ۳۱ افسانوں پر مشتمل ہے جس میں سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں قسم کے افسانے شامل ہیں۔ ان کی تخلیقات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سنجیدہ سے سنجیدہ بات ہلکے پھلکے انداز میں کہہ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ جذبات انسانی کی صحیح عکاسی کا فن بھی انھیں خوب آتا ہے۔
"سلگتے خواب" میں ۱۹ سنجیدہ اور ۱۲ مزاحیہ افسانے شامل ہیں ان میں "ملنے کا سوٹ" (جذبات انسانی اور نفسیات پر مبنی۔ ایک بدکار عورت کا بچہ جو پراگندہ سماج کے ہاتھوں لقمۂ اجل بن جاتا ہے) "کلکٹر" (ایک شاگرد اور استاد کا رشتہ) "جواب دو" (جنگ وجدل پر گہرا اور تیکھا طنز) "معصومیت" (بچے کا والہانہ پیار) اور "بچوں کا کرسمس" (مذاہب کی باہمی رواداری) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان افسانوں میں مصنف نے بہت کم الفاظ میں بڑے پتے کی باتیں کہہ دی ہیں۔ مثلاً "بچے" کا

(بقیہ صفحہ ۴۳ پر)

ہم طرح اشعار

فروری ۹۰ء کے شمارے میں دیے جانے والے مصرعے پر ہمیں ہمیشہ کی طرح کافی تعداد میں شعر موصول ہوئے ان میں جو شعر صحیح بحر اور درست ردیف قافیے میں ہیں ان کا انتخاب درج ذیل ہے۔ گلدستہ ان حضرات کو ارسال کیا جائے گا جن کے بھیجے ہوئے اشعار چوکھٹے میں دیے جا رہے ہیں۔ بہتر ہو کہ اشعار پوسٹ کارڈ پر لکھ کر بھیجے جائیں۔ ایک پوسٹ کارڈ پر صرف ایک ہی شعر لکھیں۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے　(غالب)

بھیجنے والے: ایم سعید (راجوری، جموں و کشمیر) نظر حسین بابا (کلکتہ) شفیق احمد سیفی (سیوہارہ، بجنور) ممتاز علی (بھاگل پور) نسیم الہدیٰ خاں (مدھوبنی) مقصود حسن خاں (رائے بریلی) جویریہ فردوس نغزی (کلمب)

اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی
سایے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے　(غالب)

بھیجنے والے: ایس۔ ایف۔ رحمٰن نادر (کلمب، ایوت محل) نازنین (بھاگل پور)

معلوم ہوا حال شہیدانِ گذشتہ
تیغِ ستم آئینہ تصویر نما ہے　(غالب)

مرسلہ: روشن (بھاگل پور)

خو نے تیری افسردہ کیا وحشتِ دل کو
معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے　(غالب)

مرسلہ: انجم آرا چندہ (ہزاری باغ)

بیگانگیِ خلق سے بے دل نہ ہو غالب
کوئی نہیں تیرا، تو مری جان خدا ہے　(غالب)

مرسلہ: نعمان احمد قریشی (اورنگ آباد)

بس بس نہ کرو بات کہ یاد آئے ہے مجھ کو
ناصح سے جو کچھ بیخودیوں میں بھی سنا ہے　(مومن)

مرسلہ: جویریہ صدیقہ (گنگا کھیڑ، پربھنی)

چاہا کرے دل لاکھ نہ بولوں گا جو ہمدم
وہ میرے منانے کو رقیبوں سے خفا ہے　(مومن)

مرسلہ: نظیر سہروردی (گنگا کھیڑ، پربھنی)

ہے دل میں نہاں ایک شکایات کا طومار
اور لب پہ جو دیکھو تو نہ شکوہ نہ گلا ہے　(حالی)

مرسلہ: انصار احمد انصاری (جے۔ ۴۵/۵، اے، آزاد پارک، وارانسی، یو۔پی)

اک عمر سے ہوں ناصیہ فرسا ترے در پر
اتنا تو کبھی پوچھ کہ تو کون ہے کیا ہے　(فانی)

مرسلہ: نوید مرزا (مکان نمبر ۲۴۱-۶-۲۰، روپ لال بازار، شاہ علی بنڈہ، حیدرآباد، اے۔پی)

کہنے کو تو ظاہر میں خفا ہم بھی ہیں لیکن
کچھ دل کا عجب حال ہے جب سے وہ خفا ہے　(حسرت موہانی)

مرسلہ: محمد یٰسین احمد جمالی (مجاہد پور، ویسٹ، بھاگلپور ۸۱۲۰۰۲، بہار)

یہ جاتی ہوئی رات کا گاتا ہوا عالم
خاموش ہر اک چیز ہے دل بول رہا ہے　(سیماب اکبرآبادی)

مرسلہ: انور بھوپالی

شبنم کی نظر میں نہیں تخصیص کسی کی
سیراب ہر اک پھول، ہر اک خار ہوا ہے　(جگر)

مرسلہ: نوشابہ فردوس (منگرول پیر، آکولہ)

اس جذبۂ دل کی نہ سزا ہے نہ جزا ہے
مقصودِ رہِ شوق وفا ہے نہ جفا ہے　(فیض)

مرسلہ: غازی اسلام (کٹیہار)

تعزیر سیاست ہے، نہ غیروں کی خطا ہے
وہ ظلم جو ہم نے دلِ وحشی پہ کیا ہے　(فیض)

مرسلہ: ایم۔ ابرار تابندہ (مدھوپور، دیوگھر)

آندھی ہے ہر اک سمت سے الزام کی برسات
چھائی ہوئی ہر دانگ ملامت کی گھٹا ہے　(فیض)

مرسلہ: احسان اللہ عمیر (لہیریا سرائے، دربھنگہ)

ہر بھیگی ہوئی رات، تری زلف کی شبنم
ڈھلتا ہوا سورج، ترے ہونٹوں کی فضا ہے　(فیض)

مرسلہ: ایم۔ ارشد حبیب (مدھوپور، دیوگھر)

اس دور کا انسان بھی کس درجہ ہے مفلس
کشکول میں اس کے نہ خودی ہے نہ خدا ہے　(وفا ملک پوری)

مرسلہ: تبسم نقوی (پورنیہ)

کیا جانیے کیا شہر کی راتوں نے کہا ہے
تا صبح ہر اک زخم دیا بن کے جلا ہے　(حسنی سرور)

مرسلہ: محمد ہود (بمبئی)

بیمار سا ہے جسمِ سحر کانپ رہا ہے
یہ کس نے اُجالوں کا لہو چوس لیا ہے　(سلیمان خمار)

مرسلہ: شبانہ کوثر (بیجاپور)

اس دور میں سنسان سے ہیں بام و درِ زیست
نغموں نے خموشی کا کفن اوڑھ لیا ہے　(سلیمان خمار)

بھیجنے والے: سید احمد مکاندار (باگلکوٹ، بیجاپور) شعیب راجہ (دہلی)

روشن ہے بہت خاک ابھی دربدری کی
قدموں تلے صدیوں کا سفر چیخ رہا ہے (شاہد رضوی)
فرزانہ انجم (بھوپال)

اس جاتی ہوئی رات کے عالم میں کئی راز
مجھ پر دلِ بیدار مرا کھول رہا ہے
مرسل اور شاعر: مقبول نصیرآبادی (نصیرآباد)

مشکل ہے بہت ملنا یہاں پھر سے بچھڑ کر
رک جاؤ اگر کوئی تمھیں روک رہا ہے (ڈاکٹر رعنا ضیا)
مرسلہ: کماری رینا پانڈے (امراوتی)

میں وقت کے مقتل میں کھڑا سوچ رہا ہوں
کیوں تیرے لبوں پر مرے جینے کی دعا ہے (نذیر اختر)
مرسلہ: شبینہ پروین (بھاگلپور)

اب اگلی صدی آئے تو یہ بھی نہ چرالے
سر پر مری بہنوں کے ابھی تک تو ردا ہے (طبیب بدایونی)
مرسلہ: افتخار حسین (بدایوں)

رہتا ہے یوں خاموش ہی انور یہ سمندر
کشتی کو مری دیکھ کے طوفان اٹھا ہے
مرسل اور شاعر: انور بڑنگری (بڑنگر، اوجین)

جس پیڑ نے کانٹوں کی قبا اوڑھ رکھی ہے
خوشبو کے پرندوں نے وہی پیڑ چنا ہے (نامعلوم)
مرسلہ: محمد صدیق (جمال پور، علی گڑھ)

غم خوار مریضانِ محبت کو نہ سمجھائیں
دیکھیں تو دوا چھوڑ کے یہ بھی تو دوا ہے (شاد)
مرسلہ: محمد شہنشاہ عالم شہنشاہ (صاحب گنج)

گھبرا کے مٹایا تو کبھی چوم لیا ہے
کیا اس نے ہتھیلی پہ مرا نام لکھا ہے (ناصر بدایونی)
مرسلہ: مواہر حسین (بدایوں)

اب بھی نگہِ لطف کروگے کہ نہیں تم
پوری ہوئی یا اور تمنائے جفا ہے (تجمل جلالپوری)
مرسلہ: وسیم اصغر نالندوی (بہار شریف، نالندہ)

لرزی ہے زمیں چرخِ کہن کانپ رہا ہے
یہ قتل ہوا کس کا، لہو کس کا بہا ہے (انجم اعلیٰ پوری)
مرسلہ: ریاست علی (بدایوں)

تم لاکھ ستم مجھ پہ کرو ظلم بھی ڈھاؤ
اتنا بھی رہے یاد کہ میرا بھی خدا ہے (نامعلوم)
مرسلہ: سعید احمد قائد (دہلی)

جس خواب کی تعبیر ہے تدبیر کی محتاج
اب تک مری آنکھوں میں وہی خواب بسا ہے (ناظمہ پروین حنا)
مرسلہ: محمد عطا حسین انصاری (برہولیا، دربھنگہ)

اپنوں کی ہر اک بات اگر دل میں چبھی ہے
اغیار کی تنقید پہ وہ خوب ہنسا ہے (مختار ٹونکی)
مرسلہ: محمد اسمٰعیل خاں (ٹونک، راجستھان)

تاریخ نے ظالم کا یہ انجام لکھا ہے
ہر دور میں وہ اپنوں کے خنجر سے مرا ہے (شاہد رضا ساجد)
مرسلہ: معروف رضا (بھلائی نگر، درگ)

تنقید کی دیمک کہیں چاٹے نہ اسے بھی
وہ باب جو ماضی کی کتابوں میں بچا ہے (شان بھارتی)
مرسلہ: راشدہ رخسانہ (بھلائی نگر، درگ)

خوابوں کے حسیں شہر میں جو شخص بسا ہے
شعروں کو مرے اس نے نیا روپ دیا ہے (منظر)
مرسلہ: ابوذر ہاشمی (بھلائی نگر، درگ)

میخانے کو جاتا تھا چھپے چوری سے زاہد
للکار کے میں نے بھی کہا "دیکھ لیا ہے" (ولی محمد خاں)
مرسلہ: نورالدین محمد جہانگیر (بیاور، راجستھان)

دل جوئی کی امید رکھیں کس سے جہاں میں
ہر شخص کا غم آج یہاں حد سے سوا ہے (ربانی نعیم)
مرسلہ: ثریا جبیں (جالنہ)

مت کہہ مجھے آوارہ و بدنام زمانہ!
کچھ تیرے تعلق سے بھی دنیا نے کہا ہے (مظہر مجاہدی)
بھیجنے والے: نذیر اختر (مجاہد پور، بھاگلپور)
نسیم احمد (نئی دہلی)

اک پل بھی سکوں دل کو میسر نہیں ہوتا
میں سوچ رہا ہوں یہ کرم کس نے کیا ہے (زاہد وارثی)
مرسلہ: وقار انجم (برہانپور)

اک جھونکے میں اُڑ جائے گا کیا حیثیت اس کی
اک مشتِ غبار آدمی ہے اور یہ کیا ہے (حبیب اللہ غوری)
مرسلہ: محمد فیروز احمد رانچوی (رانچی)

اخلاق و محبت ہیں بڑی چیز جہاں میں
دنیا کے مذاہب نے یہ پیغام دیا ہے (شاداب ذکی)
مرسلہ: سنجر فریدی (بدایوں)

آئندہ مہینے کے لیے اس مصرعے پر
اپنی پسند کے شعر اس طرح ارسال کریں کہ
۱۲ مارچ ۹۰ء تک ہمیں مل جائیں۔
کر دیکھی تھی ادا تیری قضا نے
قافیہ ردیف

بقیہ:
نئی مطبوعات

دل گرمی کا ابر ہوتا ہے جو ذرا سا برس کر کھل جاتا ہے لیکن بڑوں کا دل برسات کا بادل ہے جو مشکل سے کھلتا ہے۔"

جہاں تک ان کے مزاحیہ افسانوں کا تعلق ہے وہ نہ صرف قاری کو ہنساتے ہیں بلکہ ان کے ذہن پر کہیں کہیں چوٹ بھی لگاتے ہیں۔ کتاب کا سرورق دل کش اور طباعت عمدہ ہے۔

—— دلیپ بادل

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے موصولہ عنوانات

فروری ۱۹۹۰ء کے "ایوانِ اُردو" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانوں میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوان ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں ——— "گلدستہ" ان حضرات کو ارسال کیا جائے گا جن کے بھیجے ہوئے عنوان چوکھٹے میں دیے جا رہے ہیں۔

شعری عنوانات

اشراف کو بناتی ہے اک آن میں حقیر
کیا کیا میں مفلسی کی خرابی کہوں نظیر (نظیر اکبر آبادی)

مرسلہ: قمر رضوی جامی (نوادہ)

توڑا کمرِ شاخ کو کثرت نے ثمر کی
دنیا میں گرا نباریِ اولاد غضب ہے (ذوق)

مرسلہ: مقبول نصیر آبادی (نصیر آباد)

قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے (غالب)

مرسلہ: ارشاد احمد گیاوی (نالندہ)

قدرِ نعمت ہے بہ قدرِ انتظار
حشر پر ٹھہری ہے مہمانی مری (حالی)

مرسلہ: خریدار نمبر ۱۹۵

غریبوں سے لپٹ جاتی ہے دُنیا فکرِ ناں ہو کر
امیروں کے مقابل ہوتی ہے حسنِ بتاں ہو کر (اکبر)

مرسلہ: محمد ریاض احمد (بھاگلپور)

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے (اصغر گونڈوی)

مرسلہ: عبدالواحد (بریلی)

اے مصیبت، یہ کمال، ایسا کمال، اتنا کمال
انتہائے بیکسی ہے اور دنِ آغاز کے (ناطق گلاوٹھوی)

مرسلہ: محمد حسن (مدھوبنی)

یہ ٹھیک ہے کہ ستاروں پہ گھوم آئے ہم
مگر کسے ہے سلیقہ زمیں پہ چلنے کا (جاں نثار اختر)

مرسلہ: محمد کاظم الدین (کارنجہ، اکولہ)

یہی جہاں ہے جہنم، یہی جہاں فردوس
بتاؤ عالمِ بالا کے سبز بینوں کو (مجروح)

مرسلہ: محمد مقصود جالب (سکندر آباد)

> افلاس نے بچوں کو بھی سنجیدگی دے دی
> سہمے ہوئے رہتے ہیں شرارت نہیں کرتے (نامعلوم)
>
> مرسلہ: اے۔ علی (بھارت ایچ۔ ڈبلو۔ اسٹور، منڈی بازار، برہانپور ۴۵۰۳۳۱، ایم۔ پی)

> آج بھی پھرتا ہوں اس کی جستجو میں ہر طرف
> کون سی بستی میں آخر میرا گھر رکھا گیا (رفیق الزماں)
>
> مرسلہ: غازی اسلام (معرفت سب ڈویژنل ایگریکلچر آفیسر جنرل آفیسرز کالونی، مراچائی باری، کٹیہار ۸۵۴۱۰۵)

تو، تو ہر چہرے کو آئینہ بنا دیتی ہے
اے غریبی ترا رکھے کوئی پردہ کیسے (نامعلوم)

مرسلہ: محمد صدیق، علی گڑھ

مجھ کو تھکنے نہیں دیتا یہ ضرورت کا پہاڑ
میرے بچے مجھے بوڑھا نہیں ہونے دیتے (معراج فیض آبادی)

بھیجنے والے: شبنم پروین (صاحب گنج)
نفیس شیراز (نئی دہلی) شادماں تبسم
(ٹونک) حشمت اللہ خاں (آکوٹ، اکولہ)

عذاب یہ بھی کسی اور پر نہیں آیا
کہ ایک عمر چلے اور گھر نہیں آیا (افتخار عارف)

مرسلہ: سعید احمد قائد (دہلی)

تمھارے شہر میں آئے تو گاؤں سے بھی گئے
مکاں کی چاہ میں پیڑوں کی چھاؤں سے بھی گئے (نامعلوم)

مرسلہ: سیّد افسر حسن (گیا)

اس درجہ مصائب کے جہنم میں جلا ہوں
اب کوئی بھی موسم ہو پسینہ نہیں آتا (منوّر رانا)

مرسلہ: معین الدین شمسی (گریڈیہہ)

جیسے انھیں دُعا کی ضرورت نہیں رہی
بچوں نے گھر بسائے ہیں ماں کے بغیر بھی (قمر اقبال)

مرسلہ: حامد مرزا (حیدر آباد)

یوں تو بہت جواز ہیں مرنے کے دوستو
کچھ ضد سی ہو گئی ہے کہ زندہ رہیں گے ہم (فرحت قمر)

مرسلہ: ایم۔ ایف۔ قریشی (نئی دہلی)

جھوٹے سچے خواب خریدے جاتے ہیں
پیڑھی پیڑھی قرض چکایا جاتا ہے (ظفر گورکھپوری)

مرسلہ: جویریہ صدیقہ (پربھنی)

ہم اپنے شہر میں محفوظ بھی ہیں خوش بھی ہیں
یہ سچ نہیں ہے مگر اعتبار کرنا ہے (راحت اندوری)

بھیجنے والے: ممتاز علی (بھاگلپور)
اکرم علی خاں (حسن پور، مراد آباد)

ہم لوگ تو آغوشِ مصائب میں پلے ہیں
ہم سے گلۂ گردشِ دوراں نہیں ہوتا (منیر قصوری)

مرسلہ: اُم ہانی ریاض الدین سیّد (بمبئی)

زل ملے ملے، نہ ملے اس کا غم نہیں
زل کی جستجو میں مرا کارواں تو ہے (نامعلوم)

مرسلہ: شیخ عبدالرشید (نصیر آباد)

نثری عنوانات

صویرِ درد" (علامہ اقبال کی نظم)
مرسلہ: ایچ۔ اے محبوب (محل، چتور)

فٹ پاتھ کے فرشتے" (کرشن چندر کا ناول)
مرسلہ: صابر عالم صابرؔ سلیمانی نوادوی (رانچی)

"تین چہرے تین آوازیں" (صالحہ عابد حسین کا ناول)
مرسلہ: غزنم نادر (کلمب، ایوت محل)

"تین چہرے ایک سوال" (کشمیری لال ذاکر کا ناول)
مرسلہ: معین الدین شمسی (اسلامیہ اسکول، گریڈیہہ ۸۱۵۳۰۱)

"دربدری" (رتن سنگھ
مرسلہ: تبسم رشید قریشی (نصیر آباد)

"پت جھڑ کے مسافر" (منصور سبزواری کا ناول)
مرسلہ: فیضان الرحمٰن فیضی (کلمب، ایوت محل)

"پیشہ" (عابد سرتی کا ناول)
مرسلہ: محمد صدیق (جمال پور، علی گڑھ)

"دھوپ کا سفر" (اظہار صہبائی کا افسانہ)
مرسلہ: نوشابہ پروین (بھیکن پور، بھاگلپور)

اِطلاع نامہ بابت "ایوانِ اُردو دہلی"

بموجب

فارم۔۴

مقام اشاعت: دفتر اُردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

وقفہ اشاعت: ایک ماہ

پرنٹر: ایس۔ایچ۔نقوی

قومیت: ہندوستانی

پتہ: اُردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پبلشر: ایس۔ایچ۔نقوی

قومیت: ہندوستانی

پتہ: اُردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ایڈیٹر: ایس۔ایچ۔نقوی

قومیت: ہندوستانی

پتہ: اُردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مالک: (کوئی حصہ دار یا شیئر ہولڈر نہیں) اُردو اکادمی (دہلی انتظامیہ) گھٹا مسجد روڈ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

میں ایس۔ایچ۔نقوی بہ قائمیِ ہوش و حواس اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق دُرست ہیں۔

دستخط
(ایس۔ایچ۔نقوی)

۱۶ر فروری ۱۹۹۰ء

اُردو خبر نامہ

مشاعرہ جشنِ جمہوریت

ہر سال کی طرح اس سال بھی لال قلعے کے سبزہ زار پر دہلی اُردو اکادمی اور ساہتیہ کلا پریشد کے اہتمام میں جشنِ جمہوریت کا کُل ہند مشاعرہ ۲۳ جنوری کی رات کو منعقد ہوا۔ مشاعرے کا افتتاح ٹھیک نو۹ بجے دہلی کے لیفٹننٹ گورنر جناب ارجن سنگھ نے کیا۔ اس سے پہلے اکادمی کے سیکریٹری جناب سید شریف الحسن نقوی نے اس مشاعرے کی قومی حیثیت کا ذکر کیا اور مشاعرہ کمیٹی کے چیئرمین کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ نے مشاعرے کی روایت اور اس کی تہذیبی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ مشاعرے کی صدارت بزرگ شاعر جناب غلام ربّانی تاباںؔ نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر بشیر بدرؔ نے انجام دیے۔ مشاعرے میں شعرا نے جو کلام پڑھا اس سے بخوبی یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اُردو شاعری روایتی مضامین کے حصار سے نکل چکی ہے اور اب اُردو شاعر عصری زندگی کے معاملات اور مسائل کی بھرپور ترجمانی کر رہے ہیں۔ بدامنی، فسادات، اور فرقہ وارانہ منافرت نے اس وقت ملک میں جو فضا پیدا کر دی ہے، اس کے مہلک اثرات کا ذکر اور اس فضا کو امن و اماں، صلح و آشتی اور بھائی چارے کے ماحول میں بدلنے کی خواہش کا اظہار کم و بیش ہر شاعر نے کیا۔ ان موضوعات پر نہ صرف نظمیں پڑھی گئیں بلکہ غزلوں کے اکثر اشعار بھی اسی پیام کے حامل تھے۔

مشاعرے کے دو۲ دَور ہوئے، پہلا



دہلی کے لیفٹننٹ گورنر جناب ارجن سنگھ نے شمع روشن کر کے مشاعرے کا افتتاح کیا



اسٹیج پر (دائیں سے) کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ، حاجی انیس دہلوی، لیفٹننٹ گورنر دہلی جناب ارجن سنگھ، جناب بیکلؔ اتساہی، جناب غلام ربّانی تاباں اور جناب تمار بارہ بنکوی



ڈاکٹر بشیر بدر جنھوں نے مشاعرے کی نظامت کی

(تصاویر: سید فدا علی)

دوَر ایک بجے اور دوسرا دوَر دو بجے ختم ہوا۔ شرکا میں ملک بھر کے ممتاز اُردو شاعروں کے علاوہ ہندی کے مقبول شاعر گوپال داس نیرج نے بھی شرکت کی اور یہ بھی اس مشاعرے کی ایک خصوصیت تھی۔ اگر اُردو شعرا کوی سمیلنوں میں اور ہندی کے شاعر مشاعروں میں شریک ہوتے رہیں تو اس سے لسانی ہم آہنگی بڑھے گی اور مُلک کی دو ایسی زبانیں جو اپنی بنیادی ساخت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے قریب ہیں اور زیادہ قریب آسکیں گی۔



پروفیسر جگن ناتھ آزاد کلام سُناتے ہوئے

مشرقی شعریات

شعبۂ اُردو بمبئی یونیورسٹی میں رشید حسن خاں کا اظہارِ خیال

گذشتہ دنوں شعبۂ اُردو بمبئی یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام "مشرقی شعریات" کے موضوع پر جناب رشید حسن خاں نے تین اہم توسیعی خطبات پیش کیے۔ انھوں نے اپنی طرزِ خطابت سے موضوع میں اتنی دلچسپی پیدا کر دی کہ اساتذہ اور طلبہ بیک وقت ہمہ تن گوش نظر آتے رہے۔ پہلے دن کے جلسے کی صدارت ماہرِ قدیم ادبیات جناب فرید شیخ نے کی۔

جناب رشید حسن خاں کا تعارف کرواتے ہوئے صدرِ شعبہ پروفیسر عبدالستّار دلوی نے کہا کہ اُردو ادبیات کی تحقیق و تنقید کے میدان میں ان کی بیش بہا خدمات ہی ان کا تعارف ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس طرح کے خطبات کے انعقاد کا مقصد نہ صرف فضلائے ادب کے خیالات سے استفادہ کرنا ہے بلکہ ایسی ہستیوں سے ذاتی طور پر متعارف ہونا بھی تعلیم کا ایک حصّہ ہے۔

مقرّر نے سب سے پہلے جس مسئلے کی طرف اشارہ کیا وہ اُردو زبان کی شناخت کا ہے چوں کہ رفتہ رفتہ اُردو زبان کی شناخت ہی گم ہوتی جارہی ہے لہٰذا اس میں مستعمل الفاظ، تراکیب اور اصطلاحات سے بھی نئی نسل نامانوس ہونے لگی ہے۔ اور زبان کے عرفان کے بغیر ادب کی تفہیم ممکن نہیں۔

موصوف نے کہا کہ اُردو میں فکشن کی تنقید کا ذخیرہ بھی ہے اور اس کی مختلف اصناف کو پرکھنے کا پیمانہ بھی ہمارے یہاں موجود ہے لیکن شاعری کی تنقید کا مربوط پیمانہ اب تک وضع نہیں کیا گیا ہے۔

انھوں نے کہا کہ روایتوں کے عرفان کے بغیر بھی شاعری کا عرفان ممکن نہیں۔ شاعری کی تفہیم کے لیے جن علوم سے واقفیت از حد ضروری ہے ان کا فقدان بھی مشرقی شاعری کی تفہیم میں آڑے آتا ہے۔ چوں کہ مشرقی شعریات کی بنیاد علمِ بلاغت پر قائم ہے لہٰذا شعری روایت کو سمجھنے کے لیے علمِ بلاغت کا ضروری حد تک مطالعہ کریں۔

انھوں نے زور دے کر کہا کہ ولی دکنی کے بعد اور میر تقی میر سے پہلے اُردو شاعری میں ایہام گوئی کی ایک طویل روایت رہی ہے لہٰذا اس روایت کی تفہیم کے بغیر اس پورے عہد کی شاعری کی تفہیم ہو ہی نہیں سکتی۔

انھوں نے بلاغت کے نمونے کے طور پر میر انیس کے مندرجۂ ذیل مسدّس کا خصوصی طور پر حوالہ دیا:

تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملا دوں
قطرے کو دوں گر آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرّے کی چمک مہرِ منوّر سے ملا دوں
خاروں کو نزاکت میں گلِ تر سے ملا دوں
گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

..... موصوف کے مطابق اس مسدّس میں بلاغت کے سارے عناصر موجود ہیں۔ تشبیہہ، استعارہ، کنایہ، مجازِ مرسل، لفظی اور معنوی نسبتیں مکمّل طور پر ایک دوسرے میں پیوست ہوگئی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میر انیس کا ۹۹٪ کلام ایسی ہی نسبتوں سے معمور ہے۔

انھوں نے لفظ و معانی پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ مشرقی شعریات میں لفظ کو فوقیت حاصل ہے۔ شعر کے معانی بیان کرنا اور شعری محاسن بیان کرنا دو مختلف چیزیں ہیں۔ ویسے بھی مشرقی شعریات کی تفہیم کے لیے علم اور ذہانت دونوں لازمی ہیں۔ لفظوں کی باطنی حیثیت کے عرفان کے لیے بھی علمِ بلاغت کا جاننا ضروری ہے۔

مشرقی شعریات کی بنیاد علمِ معانی، علمِ بیان اور علمِ بدیع پر ہے۔ تینوں میں علمِ بیان کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے یعنی بیان کی مجموعی حیثیت کی پرکھ سب سے پہلے کی جانی چاہیے۔ مشرقی شعریات میں یہ ذمّہ داری شاعر پر عائد ہوتی ہے قاری پر نہیں۔

موصوف نے کہا کہ اعلیٰ درجے کے کلام میں ایجاز و اختصار کی بڑی اہمیت ہے۔ یعنی کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ خیالات اور محسوسات کو یکجا کرنا لفظ اور معانی کی نسبت کا تناسب تو شاعر کا لاشعوری عمل ہے۔

فاضل مقرّر نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ علومِ بلاغت سے لاعلمی کے نتیجے میں ایک پوری نسل مشرقی شعریات کی تفہیم سے محروم ہوگئی ہے۔

مشہور افسانہ نگار انور خاں کے سوال پر کہ "_____ مشرقی شعریات کی تنقید کے پیمانے کا ترقی پسندی اور جدیدیت پر اطلاق ممکن ہے _____؟" موصوف نے کہا کہ ن۔م۔ راشد اور میراجی کی مثال

ے سامنے ہے۔ ان حضرات کا ذہن
ی ہے لیکن برتاؤ جدید ہے۔

انور ظہیر خاں کا سوال تھا کہ" ـــ مشرقی
یات پر جو تنقیدی سرمایہ ہمارے یہاں
ہے وہ سب آخر کیا ہے ــــ ؟" مقرر نے
حالی، شبلی اور امداد امام اثر کو چھوڑ کر
ے یہاں اس موضوع پر کوئی قابلِ ذکر
یہ نہیں۔ یہاں تک کہ نجم الغنی کی بحرالفصاحت
شرقی شعریات کے بنیادی مسائل سے بحث
کرتی۔

اصغر حسین قریشی کے سوال کے جواب
موصوف نے حالی اور شبلی کا موازنہ کرتے
ے کہا کہ شبلی کے یہاں جمالیاتی عرفان
رہ ہے۔

ڈاکٹر یونس اگاسکر نے سوال کیا کہ
ـــ مفرد لفظ کی بحث دوسری مناسبتوں
ساتھ ہی کیوں نہیں ہونی چاہیے ـــــ"
موصوف نے کہا کہ مشرقی اصول تنقید
سے بحث نہیں کرتا کہ کیا کہا گیا ہے بلکہ یہ
بہتر طریقے سے کہا گیا ہے یا نہیں۔

ڈاکٹر معین الدین جینا بڑے نے فوراً
چھا کہ" ـــــ مشرقی شعری تنقید جب کیسے
کیا کو کیا کہا گیا پر فوقیت دیتی ہے تو اس
پس پشت اس عہد کے سماجی اور معاشی
امل کا جائزہ کیوں نہیں لیتی ـــ؟" مقرر
جواب تھا کہ یہ صرف اس لیے کہ مشرقی شعری
ید لفظ کو معانی پر فوقیت دیتی ہے۔

دوسرے دن کے خطبے میں جناب رشید
سن خاں نے لفظ و معانی پر بحث کرتے
ے کہا کہ ـــــ لفظ اور معنی اکائی کی
ثیت رکھتے ہیں۔ بیان کی حد تک لفظ کا
درجہ بلند ہے۔ مشرقی شعریات کا مقصد اخلاقی، مذہبی، سماجی یا سیاسی اقدار کی دریافت نہیں، یعنی نظریے کی اہمیت بہت کم ہے۔

معنی آفرینی، مضمون آفرینی اور خیال بندی کے ضمن میں موصوف نے ایک شعر پیش کیا:

آتشِ رنگِ حنا سے شمع ہیں سب انگلیاں
دستِ جاناں میں مرا مکتوب پروانہ ہوا

... اور کہا کہ یہ شعر شعوری پیکر تراشی کا بہترین نمونہ ہوتے ہوئے جمالیاتی حسیات کا بھی اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ اس میں خیال بندی کے تمام عناصر موجود ہیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ خیال بندی اور معنی آفرینی دو الگ چیزیں ہیں:

مہندی سے ہے شعلہ قدم اس رشکِ پری کا
پاپوش نے سیکھا ہے چلن کبکِ دری کا

اس شعر میں معنی آفرینی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔

موصوف نے مزید کہا کہ لفظ کا تخلیقی استعمال معنی کی افراط کا تقاضہ کرتا ہے۔ یعنی لفظ میں معنی کی تہیں ہونی چاہئیں۔

مشرقی شعری روایت کے اصولوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس سلسلے میں مندرجۂ ذیل باتوں کا خیال رکھنا ازحد ضروری ہے:

ـــ خیال پوری طرح ادا ہوا کہ نہیں
ـــ کوئی لفظ محاورے اور روزمرہ کے خلاف نہ ہو
ـــ بندش چست ہو
ـــ تنافر نہ ہو یعنی شعر پڑھتے وقت آہنگ مجروح نہ ہوتا ہو

جس طرح استعمال سے پہلے مختلف سازوں کو کسا جاتا ہے اسی طرح الفاظ کو بھی چستی کے ساتھ استعمال کیا جانا چاہیے یعنی:

لفظ اس کی زبان سے نکلا
تیر گویا کمان سے نکلا

بیان ایسا ہو کہ مصرع مصرعے پر چسپاں لگے۔ انیس اور دبیر میں بنیادی فرق یہی ہے کہ انیس کے یہاں بیان کا توازن برقرار رہتا ہے۔ اگر بیان کی خوبی کو سامنے رکھیں تو غالب ذوق سے کمتر شاعر قرار پائیں گے۔

مشرقی شعریات میں وزن ضروری ہے۔ وزن سے مراد وزنِ عروضی ہے۔ چوں کہ ہندوستان میں موسیقی مذہب کا جزو رہی ہے ہزاروں برس کے اس مسلسل عمل نے ہمارے مزاج میں نغمگی کی جگہ بنا دی ہے۔ اسی لیے نثری نظم یہاں پروان نہیں چڑھ سکی۔

موصوف نے مشرقی شعریات کی تفہیم کے لیے صنعتوں سے واقفیت کو بھی لازمی قرار دیا۔ جب تک ہم شعری صنعتوں سے واقف نہیں ہوں گے مصرعے کی ساخت سمجھ میں نہیں آئے گی۔

الیاس شوقی نے جب ناسخ اور غالب کے درمیان بنیادی فرق دریافت کیا تو موصوف نے کہا کہ دونوں میں وہی فرق ہے جو شعر سازی اور شعر گوئی میں ہے۔

ڈاکٹر معین الدین جینا بڑے نے آمد اور آورد کی بات کی تو فاضل مقرر نے کہا کہ شاعری دراصل شعوری کوشش کا نتیجہ ہوتی ہے۔

مشہور افسانہ نگار انور قمر نے جب اجتہاد کا مسئلہ اٹھایا تو موصوف نے کہا کہ یہ کرشمہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے ورنہ بیشتر شعرا اپنے پیش رووں یا معاصرین کے اسلوب کو ہی اپنانے میں عافیت محسوس کرتے ہیں، لہٰذا صاحبِ طرز شاعر ہونے کا شرف بہت کم لوگوں کو حاصل

ہوتا ہے میر تقی میر واقعی صاحبِ طرز شاعر تھے۔

جب ڈاکٹر یونس اگاسکر نے نازک خیالی کی وضاحت چاہی تو موصوف نے کہا کہ "جس بیان سے شعر کا جمالیاتی حسن دو بالا ہو جائے۔"

محمد عالم ندوی نے حسان بن ثابت کا حوالہ دیتے ہوئے شاعری کی تعریف جاننی چاہی تو مقرر نے وہاں بھی شعور کو جذبات پر ترجیح دی۔

تیسرے دن کے خطبے میں موصوف نے شاعری میں تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور مجاز کی اہمیت کو اُجاگر کیا۔ انھوں نے کہا کہ استعارہ شاعری کی تہہ داری کا ضامن ہے۔ اگر استعارے کو نہیں سمجھیں گے تو شعر کے حسن اور اس کی تہہ داری کو نہیں سمجھ پائیں گے۔ استعارے کی تفہیم کے بغیر شعر کے محاسن، اس کی خوبی، اس کی کیفیت کسی چیز کا تعین ممکن نہیں۔ استعارے کا عمل احتیاط کا بھی طلب گار ہے۔

اعلیٰ درجے کی شاعری میں گہرائی ہوتی ہے وسعت نہیں نظیر اور غالب میں بنیادی فرق یہی ہے۔ غزل استعارے کی مرہون کم اور کنایے کی مرہون زیادہ ہے۔ اور شاید اسی لیے غزل سب سے زیادہ مقبول صنفِ سخن ہے۔ استعارے میں صرف مجازی معنی مراد لیے جاتے ہیں جب کہ کنایے میں حقیقی اور مجازی دونوں معنی کھلتے ہیں۔

اچھی تشبیہ کی خوبی یہ ہے کہ مادی وجود کو غیر مادی وجود یعنی حسی یا خیالی وجود کے مماثل رکھا جائے۔ اگر تشبیہ کے اس عمل پر نظر نہ ہو تو میر اور غالب کی تفہیم ممکن نہیں:

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اِک گلاب کی سی ہے

اسد اٹھنا قیامت قامتوں کا وقتِ آرائش
لباسِ نظم میں بالیدنِ مضمونِ عالی ہے

میر کے یہاں خارجی تشبیہہ ہے جب کہ غالب کے یہاں حسیاتی تشبیہات ہیں۔ فیض کی نظمیں اسی خوبی کی بنیاد پر اپیل کرتی ہیں۔ انیس تشبیہہ کا استعمال منظر کی تبدیلی کے لیے کرتے ہیں۔

اسی دوران صدر شعبہ پروفیسر عبدالستار دلوی نے اطلاع دی کہ جلد ہی شعبۂ اردو شاعری کی تفہیم پر ایک ورک شاپ کا انعقاد کرے گا۔

آخر میں ڈاکٹر یونس اگاسکر نے جناب رشید حسن خاں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ کلاسیکی اور جدید شاعری کے تعلق سے طلبہ و اساتذہ میں جو جذبہ پیدا ہوا ہے اس کے لیے ہم موصوف کے بے حد شکر گزار ہیں۔ (حسن امام)

کُل راجستھان اُردو مضمون نگاری کا نتیجہ

راجستھان اُردو اکادمی کے زیر اہتمام حسبِ ذیل موضوعات پر کُل راجستھان اُردو مضمون نگاری کا مقابلہ کرایا گیا۔

یونیورسٹیوں اور کالجوں کی سطح پر:

"جنگِ آزادی میں اُردو ادب کا حصّہ"

اس موضوع پر مندرجۂ ذیل طلبا/طالبات نے نمبروں کے مطابق پہلا، دوسرا اور تیسرا انعام حاصل کیا۔

اوّل: جناب رئیس احمد حافظ (ایم۔ اے۔ فائنل) راجستھان یونیورسٹی، جے پور

دوم: جناب محمد شعیب احمد (بی۔ اے۔ فائنل) گورنمنٹ کالج، ٹونک

سوم: دو امیدواروں کے نمبر برابر رہے لہٰذا دونوں کو انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔

۱۔ مس نسرین بانو عباسی (بی۔ اے۔ فائنل) جے۔ ڈی۔ بی۔ گرلز کالج، کوٹہ

۲۔ مس شبانہ چودھری (ایم۔ اے۔ فائنل) میرا گرلز کالج، اُودے پور

سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری سطح پر:

اُردو میں قومی اور وطنی شاعری کے موضوع پر مندرجۂ ذیل طلبا/طالبات نے پہلا، دوسرا اور تیسرا انعام حاصل کیا۔

اوّل: مس شاداب اختر (درجہ نہم) مہارانی گرلز سینیئر سیکنڈری اسکول، جے پور

دوم: مس اشفا عثمانی (درجہ یازدہم) گورنمنٹ کملا نہرو گرلز سینیئر سیکنڈری اسکول، جے پور

سوم: دو اُمیدواروں کے نمبر برابر رہے۔

۱۔ جناب رفیق احمد اجنبی (درجہ دوازدہم) گورنمنٹ سینیئر سیکنڈری اسکول، ٹونک

۲۔ مس ونیتا شرما (درجہ یازدہم) سیٹھ لکشمی ناتھ باکلا گرلز سینیئر سیکنڈری اسکول، چورو

پرائمری اور مڈل سطح پر:

مہاتما گاندھی پر مضامین لکھوائے گئے۔ مندرجۂ ذیل طلبا/طالبات نے پہلا، دوسرا اور تیسرا انعام حاصل کیا۔

اوّل: مس شبانہ بانو (درجہ ششم) گورنمنٹ مڈل اسکول، پرتاپ پورہ، جوار مائنس

دوم: محمد فیروز میواتی (درجہ ہفتم) گورنمنٹ مڈل اسکول، برج واس بھبلواڑہ

سوم: اسلم احمد (درجہ ہشتم) اے۔ سی۔ سی۔ مڈل اسکول، لاکھیری (بوندی)

OO

آپ کی رائے

" ایوانِ اُردو" کے جنوری ۱۹۹۰ء کے
ے میں کئی ایسے خطوط شامل ہیں جن میں
ر خیرآبادی کی لکھی ہوئی لیکن بہادر شاہ ظفر
م سے مشہور غزل " نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں
ں کے دِل کا قرار ہوں" کے انتساب کا معاملہ
بحث آیا ہے۔ ہم ہندوستانیوں کا سب سے
سئلہ یہ ہے کہ ہم ہر معاملے میں تقلید پرست
ہوئے ہیں چنانچہ اوّل تو ہم لوگ سُنی سنائی
ں سے اُوپر اُٹھ کر اصل حقائق کو جاننے کی
ش ہی نہیں کرتے اور اگر کسی اتفاق کی بنا
ئی حقیقت ہم پر خود بخود منکشف ہو جاتی
و ہمارے ذہن اسے قبول کرنے کے لیے
ہ نہیں ہوتے بلکہ ہماری کوشش یہ ہوتی
ہ ہم اب تک جو کچھ سُنتے اور پڑھتے آئے
کسی نہ کسی طرح اسے صحیح ثابت کر دِکھائیں۔
ہر یہ کہ لکیر کو پیٹتے رہنا ہماری فطرتِ ثانیہ
چکی ہے۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال اس غزل
معاملے میں بھی پیش آئی ہے۔ ۱۹۳۶ء
اب تک بار بار یہ بات کہی جاتی رہی ہے کہ
زل بہادر شاہ ظفر کی نہیں، مضطر خیرآبادی
ہے مگر بعض لوگوں کو اب بھی اصرار ہے کہ
یں صاحب! یہ غزل تو ظفر ہی کی ہے چنانچہ
ئی ظفر کے کلام کے کسی بازاری قسم کے
عے کو سندِ اعتبار عطا کرے، کوئی قوالوں اور
کوں کی روایت کا سہارا لے کر، کوئی کسی
ل یا غیر معتبر کتابوں کی شہادت کو کافی سمجھتے

ہوئے اور کوئی فلم اور ٹی۔وی کو معتبر ذرائع معلومات قرار دے کر یہ بات منوانے پر مُصر ہے کہ اسے بدستور ظفر کا کلام سمجھتے رہنا چاہیے۔ ان حضرات کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ظفر کا کلیات جس میں ان کے چار دیوان شامل ہیں، مطبوعہ صورت میں موجود ہے۔ اس کلیات میں نہ یہ غزل شامل ہے اور نہ اسی قسم کی ایک اور مشہور غزل " دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں" کا کوئی سراغ ملتا ہے۔ یہ غزلیں ظفر کے نام سے کیوں مشہور ہوگئیں اور ان میں ان کا تخلص کیسے داخل ہوگیا، یہ ایک علیحدہ موضوعِ بحث ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔

قارئین اس حقیقت سے یقیناً باخبر ہوں گے کہ افتخار الشعرا خان بہادر سیّد افتخار حسین مضطر خیرآبادی عصرِ حاضر کے معروف شاعر اور فلمی نغمہ نگار جاں نثار اختر مرحوم کے والد اور مشہور فلمی کہانی کار اور شاعر جاوید اختر کے دادا تھے۔ جہاں تک یاد آتا ہے، جاں نثار اختر مرحوم نے ۱۹۳۶ء میں یا اس کے آس پاس ماہنامہ "سہیل" میں پہلی بار یہ انکشاف کیا تھا کہ یہ غزل ظفر کی نہیں، اُن کے والد مضطر خیرآبادی کی ہے۔ (فی الوقت میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ جاں نثار اختر صاحب کی اس تحریر کی صحیح صحیح نشان دہی کر سکوں) اس کے بعد میں نے اپنے ایک مضمون " بعض اشعار کا غلط انتساب" میں جو ماہنامہ " نیا دَور" لکھنؤ کے ۱۹۵۸ء اور ۱۹۵۹ء کے کئی شماروں میں بالاقساط شائع ہوا تھا، دوبارہ اس طرف توجہ دِلائی کہ یہ غزل مضطر خیرآبادی کی تصنیف ہے۔

میرے محدود علم کے مطابق تیسری تحریر جس میں اس غزل کے ظفر سے انتساب کی مدلّل طور پر تردید کی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ یہ مضطر خیرآبادی کی تصنیف ہے، ڈاکٹر یونس حسنی صاحب کا مضمون ہے جو ساتویں دہائی کے ابتدائی برسوں میں " نگار" کے کسی شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت " نگار" کے فائل بھی دسترس میں نہیں، اس لیے صحیح شمارے کی نشان دہی نہیں کی جا سکتی۔ ڈاکٹر یونس حسنی آج کل کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں مزید تحقیق مقصود ہو تو ان سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

مضطر خیرآبادی کے بہت سے گیت اور اشعار زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ یہ تین مشہور اشعار بھی غالباً (اور یہ غالباً بہت اہم ہے) اُنھی کے ہیں:

اسیرِ پنجۂ عہدِ شباب کر کے مجھے
کہاں گیا مرا بچپن خراب کر کے مجھے

کسی کے دردِ محبت نے عمر بھر کے لیے
خدا سے مانگ لیا انتخاب کر کے مجھے

مرے گناہ زیادہ ہیں یا تری رحمت؟
مرے کریم! بتا دے حساب کر کے مجھے

مضطر مرحوم کا دیوان ان کے خاندان میں کسی نہ کسی کے پاس یقیناً محفوظ ہوگا۔ ضرورت ہے کہ اسے شائع کیا جائے اور اگر ضخامت زیادہ ہو تو اس کا ایک جامع انتخاب شائع کر دینا چاہیے۔

——— حنیف نقوی، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی

● جنوری ۱۹۹۰ء کے "ایوانِ اُردو" میں جناب راج نرائن راز کا مضمون "مولانا آزاد: کچھ شاعری کے حوالے سے" شائع ہوا ہے۔ اس مضمون کے ابتدائی حصّے میں راز صاحب نے جو بنیاد قائم کی ہے کہ "مولانا آزاد کی مادری زبان عربی تھی۔ وہ عمر کے ابتدائی دس برس مکّہ میں رہے تھے۔ ظاہر ہے' ان دس برسوں میں مولانا آزاد کی تقریر اور تحریر کی زبان عربی رہی ہوگی" وہ مولانا آزاد کی خود اپنی تحریر کی رو سے جو کہ محترمہ شائستہ خان (خدا بخش فیلو' پٹنہ) نے کتاب نما دہلی بابتہ ستمبر ۱۹۸۹ء میں شائع کروائی ہے' غلط ثابت ہو جاتی ہے۔ مولانا آزاد کی اس خود نوشت تحریر کے مطابق جب ان کے والد ہندوستان مراجعت کرکے کلکتے میں مقیم ہوگئے تو اس وقت مولانا آزاد کی عمر ایک سال تھی اور تقریباً دو سال کے تھے جب ۱۳۰۵ھ میں ان کی والدہ کا کلکتے ہی میں انتقال ہوگیا۔ اس طرح اب یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ مولانا کی مادری زبان عربی نہیں تھی جیسا کہ اب تک تمام مصنّفین نے تواتر سے لکھا ہے بلکہ ان کی مادری زبان اُردو ہی تھی اس لیے دس گیارہ سال کی عمر میں سترہ سے زیادہ اشعار کی غزل' مصرع طرح پر کہہ لینا مولانا آزاد جیسے غیر معمولی صلاحیت رکھنے والے شخص کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔

میرا خیال ہے کہ راج نرائن راز صاحب کا یہ مضمون ستمبر ۸۹ء سے پہلے لکھا گیا ہوگا مگر شائع جنوری ۱۹۹۰ء کے "ایوانِ اُردو" میں ہوا تاہم اس صورت میں بھی ستمبر کے بعد وہ اپنے مضمون کی تصحیح کرسکتے تھے اس لیے کہ وہ بھی دِلّی ہی میں رہتے ہیں اور "ایوانِ اُردو" بھی دِلّی ہی سے شائع ہوتا ہے۔

—— نامی انصاری' کانپور

● جنوری کے "حرفِ آغاز" کا بڑا حصّہ حقیقت پر مبنی ہے لیکن کچھ باتیں ایسی ہیں جن کی نشاندہی ضروری ہے۔ آپ کا یہ کہنا کہ "ہندوستان میں بے شمار مقامی تنظیمیں اُردو کی ترقّی و ترویج کے لیے کام کر رہی ہیں اور ان کی سرگرمیاں ادبی نشستوں اور مشاعروں وغیرہ کے انعقاد تک محدود ہیں' جو دور رس اور پائدار افادیت کے حامل نہیں" بالکل دُرست ہے۔ لیکن یہی الزام آپ (اُردو اکادمی) پر بھی عائد ہوتا ہے آپ بھی اُردو کی ترقّی و ترویج کے لیے کوشاں تو ہیں۔ لیکن آپ کی یہ کوشش اس کارِ خیر کے ایک بڑے حصّے کو جوں کا توں چھوڑ دیتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ آپ نے تحریر کیا ہے کہ "ممتاز ماہرینِ تعلیم یہ کہتے رہے ہیں کہ مادری زبان میں تعلیم پانے والا بچّہ ان بچّوں کے مقابلے میں زیادہ باصلاحیت ہوتا ہے جو غیر مادری زبان میں تعلیم حاصل کرتے ہیں"۔ غور کا مقام ہے۔ ہماری مادری زبان اُردو ہے اور ان ماہرینِ تعلیم کے مطابق ہم اسی زبان میں اپنی صلاحیت کو ابھار سکتے ہیں جو کہ حقیقت ہے۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ کسی بھی 'تقابلی امتحان' کی تیاری اُردو زبان میں نہیں ہوسکتی۔ I.A.S.' I.P.S' I.F.S اور I.R.S کا تو ذکر ہی کیا۔ کیوں کہ General Knowledge اور Essay on Bunning Topics ان سارے امتحانات کے لازمی جز ہیں۔ اب ذرا آپ ہی غور فرمائیں کہ اُردو میں اس طرح کے رسائل کتنے نکلتے ہیں جن سے ہماری تیاری ہو سکے۔ جب کہ دوسری طرف ہندی اور انگریزی میں لاتعداد ایسے رسائل و جرائد نکلتے ہیں جن سے مذکورہ بالا و دیگر تمام "مقابلاتی امتحانات" کی تیاری کے لیے مواد اور مضامین کی فراہمی آسانی سے ہو جاتی ہے۔ کیا اسے ہم اُردو کی کوتاہ دامنی نہیں کہیں گے؟ اگر ہاں! تو یہی کوتاہ دامنی اُردو سے انحراف کا سبب بنی ہوئی ہے۔

رہی اُردو اخبارات و رسائل کی مالی حالت تو اس کے جواب میں میں آپ کا ذہن اسی شمارے میں شایع شدہ رضا نقوی واہی کی نظم "یہ لفافے" کی طرف مبذول کراؤں گا۔ آج اُردو داں طبقہ جس رفتار سے صرف ادب کی طرف بڑھ رہا ہے وہ قابلِ افسوس ہے۔ کہنے کی بات نہیں کہ آج بھی اُردو میں شایع ہونے والے رسائل کی تعداد انگریزی اور ہندی سے زیادہ ہے۔ لیکن انگریزی اور ہندی رسائل جس قدر مختلف موضوعات کے مضامین کا احاطہ کرتے ہیں اُردو اس سے بے نیاز ہے۔ پھر آپ ہی بتائیے کہ ہم اپنے ماہانہ بجٹ سے کس طرح کا رسالہ خریدیں۔ صرف اُردو اخبارات و رسائل کی سرکولیشن بڑھائیں یا موجودہ تعلیمی' سیاسی' معاشی اور تہذیبی نظام سے آگاہ اور باخبر رہیں۔

—— ارشاد احمد' سیوان

● "حرفِ آغاز" میں آپ نے اُردو اور اُردو والوں سے متعلّق بالکل صحیح خیال کا اظہار کیا ہے' لیکن مشکل یہ ہے کہ اُردو

والے اپنا رویہ بدلتے نہیں۔ صوبۂ بہار میں جہاں اُردو مترجمین کی ہر بلاک اور ضلع میں تقرری ہوئی ہے، وہاں بھی اُردو مترجمین کی لاپروائی اور اُردو والوں کی غفلت کم نہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ ان حقائق کو سامنے لائیں۔

—— جوہر عبداللہ، علی گڑھ

● جنوری ۹۰ء کا شمارہ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ "حرفِ آغاز" حقیقت پر مبنی ہے۔ آج تقریباً ہر ریاست میں اُردو اکادمی کا قیام ہوگیا ہے لیکن جو نتیجہ برآمد ہونا چاہیے وہ نہیں ہو رہا ہے۔ ہر ریاست کی اُردو اکادمی کو اپنی ریاست کے کچھ مقامات پر فری اُردو کوچنگ سینٹرز کا قیام کرنا چاہیے اور کوچنگ کی میعاد ختم ہونے کے بعد ایک ٹیسٹ لے کر ان میں کامیاب ہونے والوں کو 'رفیقِ اُردو' یا 'ہمدردِ اُردو' کی اعزازی ڈگری سے نوازنا چاہیے۔ اس سے اُردو کی ترقی میں مدد ملے گی۔

—— محفوظ آمنی، گیا

● "ایوانِ اُردو" نئے سال کے ایک حسین تحفے کی صورت میں نظر نواز ہوا، سرورق نہایت دیدہ زیب، تزئین و ترتیب کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے، مگر قیمت میں اضافہ سے فکر لاحق ہے کیوں کہ اُردو پڑھنے والے قیمتی رسالہ خرید کر نہیں پڑھتے ہیں اس لیے "ایوانِ اُردو" کی مقبولیت میں کمی آنے کا اندیشہ ہے !! کیا قیمت کے ساتھ ساتھ صفحات میں بھی اضافہ کیا جائے گا؟

—— اظہر نیّر دربھنگوی، بھیلائی نگر

● "ایوانِ اُردو" تمام تر خوبیوں کے ساتھ اپنی رعنائیاں بکھیرتا ہوا جلوہ گر ہوا۔ ہر پہلو سے جائزہ لیا، ایک چیز جو گراں گزری، اس کی قیمت میں اضافہ، اگر قیمت میں اضافہ ناگزیر ہے، قارئین کے ذوقِ مطالعہ کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے چند صفحات کا اضافہ کر دیں عین نوازش ہوگی۔

جنوری کے شمارے میں مضامین افسانے پر حاوی رہے۔ پسند آنے والا افسانہ "خالی پیکٹ" ہے۔ جو گرچہ مختصر افسانہ ہے، لیکن فن کار نے جس خوش اسلوبی سے افسانے کو سنوارا ہے، وہ داد طلب ہے۔

پاندھی ننکانوی کا افسانہ "میں خوش نہیں ہوا" اس سے پہلے فروری ۱۹۸۹ء کے 'پاسبان' میں "میں خوش کیوں نہیں ہوا؟" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے پھر "ایوانِ اُردو" میں دیکھ کر حیرت ہوئی۔ تعجب ہے کہ ان افسانہ نویسوں کو ایک ہی افسانہ مختلف قسم کے رسالوں میں شائع کروا کر سستی شہرت حاصل کرنے کا خبط کیوں سوار رہتا ہے؟[۱]

—— طفیل احمد خاں، سمستی پور

(۱) اس سوال میں ہم بھی آپ کے شریک ہیں —— ادارہ

● جنوری کے شمارے میں جناب سیّد شریف الحسن نقوی کا قدرے طویل اداریہ جہاں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے وہیں مفید مشوروں سے بھرپور ہے۔ یہ اداریہ اس قدر اہم ہے کہ اس کو دیگر اخبارات اور رسائل "ایوانِ اُردو" کے حوالے سے اپنے پرچوں میں شائع کریں تو مدیران کا اُردو زبان و ادب پر ایک احسان ہوگا۔ اس مرتبہ آپ نے مختصر مگر انتہائی معیاری اور وقیع افسانے شائع کیے ہیں خصوصاً جناب شوکت حیات کا افسانہ "قرار داد" تو اپنے اندر بلا کی کشش رکھتا ہے اس افسانے کا اختتام قاری کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔

یہ جان کر ایک جھٹکا سا لگا کہ "ایوانِ اُردو" کی قیمت چار روپے ہو رہی ہے۔ قیمت کے اضافے کے ساتھ صفحات میں اضافہ بھی ہوگا تو مناسب رہے گا۔[۱]

—— منظور وقار، گلبرگہ شریف

(۱) اس مہینے سے سابقہ قیمت بحال کر دی گئی ہے —— ادارہ

● جنوری ۹۰ء کے شمارے میں شوکت حیات کی کہانی "قرار داد" ملازمت پیشہ افراد پر ہونے والی ناانصافیوں کو اُجاگر کرتی ہے۔ ایماندار اور محنتی کارکنوں کو ہر مرحلے پر مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے خواہ وہ مرحلہ دفتر کا ہو یا گھر کا۔ لیکن مسائل حل نہیں ہوتے اور سچا آدمی ان میں دب کر اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ کہانی محض ایک حادثاتی واقعہ یا اسٹیٹمینٹ نہ ہو کر موجودہ ناروا اور غیر تشفی بخش صورتِ حال کو ختم کیے جانے کے سلسلے میں ایک واضح رُخ اپنانے پر ایسے لوگوں کو مجبور کر دیتی ہے جو سرکاری/نیم سرکاری یا پرائیوٹ محکموں میں اعلیٰ عہدیدار بنے ہوتے ہیں اور اپنے غیر منصفانہ رویّے کے سبب احمد صاحب جیسے ایماندار کارکنوں کی موت کا بہانہ بن جاتے ہیں۔ افسانہ "میں خوش نہیں ہوا" میں پاندھی ننکانوی نے ایک نفسیاتی نکتے کو چھونے کی سعی کی ہے۔ انھوں نے سماجی رشتے، اس کی بندشیں اور انسان کی نفسانی خواہش کے مابین فرد کی اپنی ذات سے تصادم کی کیفیت کو فطری انداز میں سادگی سے واضح کیا ہے۔

—— رفیع حیدر انجم، آرہ

● نئے سال کے نئے شمارے میں سلامت علی

مہدی پر مضمون دیکھ کر کچھ نئے پن کا احساس ہوا۔ اس لیے نہیں کہ سلامت علی مہدی پر اس سے پہلے کوئی مضمون نہیں چھپا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ مضمون چھپ کر بھی اَن چھپا سا تھا۔ پروانہ ردولوی نے یہ مضمون کچھ اس طرح لکھا ہے جیسے سلامت علی مہدی نے خود لکھا ہو۔

پاندھی ننکانوی کا افسانہ "مگر میں تو اُداس ہو رہا تھا ـــــ" پر ہی مکمل ہو جاتا ہے۔ ویسے اس سے قطع نظر یہ اس شمارے کا سب سے اچھا افسانہ ہے۔ شوکت حیات بھی میرے اس خیال سے متفق ہوں گے۔

ـــــ خالد عبادی، علی گڑھ

● جنوری کے شمارے میں سلامت علی مہدی مرحوم پر پروانہ ردولوی صاحب کا مضمون بہت پسند آیا۔ سلامت صاحب اور اظہر صاحب کتابی دُنیا والے میرے پُرانے دوستوں میں تھے۔ سلامت صاحب شاہ خرچی کے ساتھ ساتھ غریب پرور بھی تھے ان کی شاہ خرچی اکثر اوقات تنگ دستی کا باعث بن جاتی۔ خدا مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان پر لکھنے والوں کے قلم میں زورِ قلم اور زیادہ۔

ـــــ محمد صادق تہذیب، دہلی

● جنوری ۹۰ء کے "ایوانِ اُردو" میں ملک خورشید کا افسانہ "خالی پیکٹ" موضوع اور پیش کش کے لحاظ سے ذرا بھی متاثر نہیں کرتا۔

تازہ شمارے میں شبیب احمد کا افسانہ "بازی" کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں کسی قومی یا سماجی مسئلے کی عدم موجودگی میں یہ افسانہ بالکل تفریحی ہو کر رہ گیا ہے۔ اس شمارے کا خاص اور قابلِ ذکر افسانہ "تب اور اب" ہے۔ یہ قومی یک جہتی کے موضوع پر رام لال کی ایک کامیاب کوشش ہے جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ـــــ عابد ضمیر، آسنسول

● جنوری کے شمارے میں راج نرائن راز اور ضیاء الرحمٰن صدیقی کے مضامین پسند آئے۔

ـــــ محمد عبدالرحمٰن عبد، دھنباد

● جنوری کا شمارہ پڑھا۔ "عہدِ جہانگیری کے سکّے" خاص طور سے معلوماتی رہا۔ امید ہے کہ اسی طرح کے موضوعات پر مضامین کے سلسلے کو آپ جاری رکھیں گے تاکہ ہماری زبان کے سرمایے میں اضافہ ہوتا رہے۔

ـــــ نذر عبّاس گوناپوری، سیوان

● جنوری کے شمارے میں جناب اختر حسین کی رائے پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کچھ لوگ ڈاکٹر بشیر بدر سے جلنے لگے ہیں۔ اختر صاحب نے یہ کہہ کر (چند شعرائے کرام کے اشعار کے حوالے کے ساتھ) کہ ڈاکٹر بشیر بدر کو ان سے اپنے تاریک پندار کے پہلو اُجاگر کرنا چاہیے گویا یہ کہا کہ ڈاکٹر بشیر بدر نیم معیاری یا سیدھے لفظوں میں فٹ پتھیا شاعر ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جدید غزل گو شعرا میں ڈاکٹر بشیر بدر کا نام سرِ فہرست ہے۔

ـــــ شائق دھنبادی، دھنباد

● جنوری ۹۰ء کا شمارہ پیشِ نگاہ ہے۔ جس میں مغربی چمپارن کے اختر حسین صاحب نے ڈاکٹر بشیر بدر کی شان میں گستاخی کی ہے۔ بشیر بدر صرف مشاعرے کے شاعر نہیں ہیں۔ ان کا کلام ریڈیو اور ٹی۔وی سے نشر ہوتا ہے۔ اور ہند و پاک کے موقر رسائل و جرائد میں شائع ہوتا ہے۔ جہاں تک خود کو میر و غالب کا حریف سمجھنے اور خود ستائیوں کا تعلق ہے تو اس کے ہم بھی قائل نہیں۔ بہر کیف بقول آپ کے اُن کی خود ستائیوں سے قطع نظر، انھیں جدید غزل کا ایک معتبر شاعر ماننے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے۔

ـــــ عبدالشکور شکور، کٹک

● اُردو ادب میں دلچسپی رکھنے والے تمام لوگ آپ کے قرض دار ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ لوگوں نے سرورق سے لے کر آخری ورق تک "ایوانِ اُردو" کو ادبی بنا دیا ہے۔ "ایوانِ اُردو" ہاتھ میں لیتے ہی آدمی اس کے سرورق میں کھو جاتا ہے۔ پھر 'حرفِ آغاز' سے لے کر 'آپ کی رائے' تک تمام ورق خالص ادبی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ 'سرودِ رفتہ' تو تعریف سے بالا ہے۔ اتنا معلوماتی آخری ورق آج تک کسی پرچے کا نظر سے نہیں گزرا۔

ـــــ فیاض رشک، مونگیر

● "آپ کی رائے" کے تحت گوپال گنج کے شوکت علی کا یہ مشورہ قابلِ غور ہے کہ اُردو میں Competative کتابیں شائع ہوں، اور دہلی اُردو اکادمی اس کمی کو پورا کر سکتی ہے۔

ـــــ مختار شمیم، اندور

● "ایوانِ اُردو" کے 'نہرو نمبر' کے لیے مبارکباد قبول فرمائیے۔ 'نہرو نمبر' تو دوسروں نے بھی نکالے مگر آپ سب پر بازی لے گئے۔ یہ کتابت، طباعت اور مضامین کی نیرنگی، ہر لحاظ سے بے مثال ہے۔ اور نہرو کی رنگا رنگ شخصیت کے تمام تر پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس نمبر میں مسز وجے لکشمی پنڈت کے تاثرات مجھے ملک کے بدلے ہوئے سیاسی پس منظر میں سب سے حقیقت افروز معلوم ہوئے۔ خدا کرے آپ خوبصورت نمبروں کی پیش کش کا یہ سلسلہ آگے بڑھاتے جائیں۔

ـــــ (ڈاکٹر) اعجاز علی ارشد، پٹنہ

[اردو] اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

فون نمبر: ۳۲۷۶۲۱۱، ۳۲۶۳۴۴۸

[ا]یوانِ اردو دہلی

ادارۂ تحریر:
سید شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی

[جل]د: ۳ ● شمارہ: ۱۲ ● فی کاپی ۵۰ر۲ روپے، سالانہ قیمت ۲۵ روپے ● اپریل ۱۹۹۰ء ●

ماہنامہ "ایوانِ اردو دہلی" میں شائع [ہو]نے والے افسانوں میں نام، مقام اور [واق]عات سب فرضی ہیں، کسی اتفاقیہ [مطا]بقت کے لیے ادارہ ذمہ دار نہیں۔ مضمون نگاروں کی آرا سے ادارے [کا م]تفق ہونا ضروری نہیں۔

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتا
ماہنامہ ایوانِ اردو دہلی
[ار]دو اکادمی، دہلی ــــ گھٹا مسجد روڈ،
دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سرورق: شاہی مسجد، لاہور
خوشنویس: تنویر احمد

سید شریف الحسن نقوی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے سیما آفسیٹ پریس، دہلی ۱۱۰۰۰۶ سے چھپوا کر اردو اکادمی، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا

حرفِ آغاز

یہ خبر خوش آئند ہے کہ حکومتِ ہند نے بالآخر گجرال کمیٹی کی سفارشات کو قبول کر لیا ہے اور ان کے عملی نفاذ پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی بھی قائم کر دی ہے جس میں اُردو دُنیا کی جانی پہچانی شخصیتیں شریک ہیں۔

گجرال کمیٹی کا قیام محترمہ اندرا گاندھی کی وزارتِ عظمیٰ کے زمانے میں انھی کے ایما پر عمل میں آیا تھا اور اس کے سربراہ ان کی کابینہ کے وزیر جناب اندر کمار گجرال تھے جنھیں موجودہ حکومت میں وزارتِ خارجہ کی ذمّہ داری سونپی گئی ہے۔ اس کمیٹی کے ارکان نے ملک بھر کا دورہ کرکے اُردو والوں کے مطالبات سُنے تھے اور کئی مہینے کی محنت اور غور و فکر کے بعد اپنی سفارشات مرتب کرکے حکومت کو پیش کر دی تھیں۔ گجرال صاحب خود اُردو کے ہمدرد اور بہی خواہ ہیں اور کمیٹی کے دیگر ارکان میں بھی وہی حضرات شامل تھے جو اُردو کے مسائل سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں اس لیے اُردو والوں کو اُمید تھی اور بے جا نہ تھی کہ کمیٹی نے جو تجاویز پیش کی ہیں اگر ان پر عمل کیا گیا تو اُردو کے تحفّظ و ترقّی کے کام میں خاطر خواہ پیش رفت ہو سکے گی۔ اندرا جی ان سفارشات کو عملی شکل دینے کے حق میں تھیں لیکن اپنی کابینہ کے بعض سینیئر وزرا بالخصوص بابو جگ جیون رام کی مخالفت کے نتیجے میں وہ ایسا نہ کر سکیں۔ ان سفارشات پر نہ صرف یہ کہ عمل نہیں ہوا بلکہ یہ منظرِ عام پر بھی نہیں لائی گئیں اور سرد خانے میں ڈال دی گئیں۔

اندرا جی اُردو کے لیے واقعی کچھ کرنا چاہتی تھیں۔ جب ان کے ایما پر قائم شدہ کمیٹی کی سفارشات پر عمل نہ ہو سکا تو اس کی تلافی انھوں نے مرکز میں ترقّیِ اُردو بورڈ اور مختلف صوبوں میں اُردو اکادمیاں قائم کرکے کی لیکن اُردو والے برابر یہ مطالبہ کرتے رہے کہ گجرال کمیٹی کی سفارشات منظرِ عام پر لائی جائیں اور ان پر عمل بھی ہو۔

اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ گجرال کمیٹی کی سفارشات کو منظور کرنے کا موجودہ حکومت کا فیصلہ اُردو والوں کے ایک دیرینہ مطالبے کی تکمیل ہے۔ اس کے لیے حکومت بھی شکریے کی مستحق ہے اور اُردو عوام بھی جنھوں نے اس مطالبے کو زندہ رکھا۔ اب ضرورت اس کی ہے کہ جو کمیٹی ان سفارشات پر عمل درآمد کے سلسلے میں ضروری تجاویز پیش کرنے کے لیے قائم کی گئی ہے وہ اپنے فرائض سے ذمّے داری کے ساتھ عہدہ برآ ہو، نیز اپنا کام بروقت مکمّل کر دے۔ اگر خدانخواستہ اس موقعے پر تساہل کو راہ دی گئی تو معاملہ ایک بار پھر گھٹائی میں پڑ سکتا ہے اور بیورو کریسی اسے پسِ پشت بھی ڈال سکتی ہے۔ اس سے اُردو کے مقدمے کو جو نقصان پہنچ سکتا ہے، شاید پھر کبھی اس کی تلافی نہ ہو سکے۔ ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ ہماری زبان کے ذمّہ دار حضرات ایسا ہونے نہ دیں گے۔

—— سیّد شریف الحسن نقوی

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

○

ۂِ عقبیٰ بھی نہیں ہے غمِ دُنیا بھی نہیں
ں سے تسکیں ہو میسّر مجھے، ایسا بھی نہیں

ئے وہ عالمِ بے کیف کہ جس عالم میں
م تماشا بھی نہیں، محوِ تماشا بھی نہیں

مِیِ اخفائے محبّت کی بھی حد ہوتی ہے
ں طرح بیٹھے ہیں جیسے مجھے دیکھا بھی نہیں

بجا ترکِ تمنّا سے سکوں ملتا ہے
ں قدر سہل مگر ترکِ تمنّا بھی نہیں

رِ خاطر ہیں تو محفل سے چلے جاتے ہیں
م تماشائی نہیں ہیں تو تماشا بھی نہیں

○

جستجو اُن کی درِ غیر پہ لے آئی ہے
اب خدا جانے کہاں تک مری رسوائی ہے
مست و دیوانہ و مجذوب پہ ہنسنے والو
تم تماشا جسے سمجھے ہو، تماشائی ہے
یہ بھی سچ ہے کہ تمنّا ہی ہے باعثِ غم کا
یہ بھی تسلیم کہ ہر شخص تمنّائی ہے
ہم قفس والوں کو اتنا تو بتا دے کوئی
کیا یہ سچ ہے کہ گلستاں میں بہار آئی ہے
ان سے ملتے ہی مرے دل نے کیا یہ محسوس
جیسے صدیوں سے مری ان سے شناسائی ہے
یہ بھی ممکن ہے کہ مجھ میں ہی کمی ہو لیکن
سامنے آئے، محبّت جسے راس آئی ہے

○

محبّت ابروِ خمدار بھی ہے
یہ اک چلتی ہوئی تلوار بھی ہے

محبّت ایک دریا، ایک منجدھار
جو راس آئے تو بیڑا پار بھی ہے

یہ مانا عشق اک جنسِ گراں ہے
اسی سے گرمیِ بازار بھی ہے

خوشا وہ وسعتِ قلبِ محبّت
کہ جس میں گوشۂ اغیار بھی ہے

سخی اتنا کہ دو عالم بھی دے دے
غنیمت ہے کہ دل نادار بھی ہے

اسی کو راس آتا ہے یہ جینا
جو مرنے کے لیے تیّار بھی ہے

عجب طرفہ تماشا ہے سحر بھی
وہ شاعر ہے مگر سردار بھی ہے



ڈبلیو۔۵۷، گریٹر کیلاشں، پارٹ۔۱، نئی دہلی

اکبر علی خان عرشی زادہ
پھلواڑی رام پور ۲۴۴۹۰۱

گلکرسٹ کے نظام املا کا نقشہ

ڈاکٹر جان گلکرسٹ کا نام اُردو زبان و ادب کے محسنین میں سرِفہرست آتا ہے۔ اُس نے نہ صرف اُردو نثر کی بنیادوں کو اپنی کاوشوں سے مضبوط کیا بلکہ اُردو املا اور حرکات و سکنات کے سلسلے میں بھی ایسی تجاویز مرتب اور رائج کیں جن کے بغیر غیر زبان والوں اور خو[د] اہل زبان مبتدیوں کے لیے بھی اس زبان کی تحریر کا صحیح پڑھنا دشوار تھا۔ گلکرسٹ کو املائی اصلاحات اور اس کے قواعد و ضوابط متعین کرنے میں اوّلیت کا درجہ حاصل ہے گلکرسٹ نے جو تجاویز پیش کیں اور ان پر خود عمل کر کے دکھایا اُن میں سے کچھ آج تک باقی ہیں گویا ان



امر ایڈ...

... اثرات اب بھی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ ... نظام املا کسی قدر مزید اصلاح کا محتاج تھا چنانچہ اس جانب پیش رفت کرنے والا پہلا شخص بھی ایک انگریز میجر بالرائڈ تھا جس کا تعلق پنجاب کے محکمۂ پبلک انسٹرکشن سے مدتوں رہا۔ اس کے نام سے بھی اُردو والے واقف ہیں۔

گلکرسٹ نے املا کے موضوع پر ایک مختصر رسالہ تیار کیا تھا جس کا عنوان تھا "رسالۂ رسم الخط و اعراب" بگمان غالب یہ شائع بھی ہوا تھا لیکن آج اس کا کہیں بھی کوئی سراغ نہیں ملتا۔ البتہ اس کتابچے کا ایک اختصار اور تجاویز پر مبنی حروف و حرکات کا نقشہ دست برد زمانہ سے محفوظ رہ گیا ہے۔ گلکرسٹ کی تجاویز اور اس کے تیار کردہ نظام املا کو سمجھنے کے لیے اب ہمارے پاس یہی دو چیزیں ہیں جو ۱۸۰۲ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھیں یعنی آج سے ایک سو چھیاسی سال قبل۔

جناب سلیم الدین قریشی صاحب کی عنایت سے میں ان دونوں کے عکس حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکا۔ آج کی صحبت میں حرکات و اعراب اور حروف تہجی پر مبنی نقشہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس نقشے میں جن تجاویز کو گلکرسٹ نے مرتب کر دیا ہے وہ سب کی سب اس کے زیر نگرانی طبع ہونے والی کتب میں پائی جاتی ہیں ان میں سے کچھ کتابیں خود میری نظر سے بھی گزر چکی ہیں۔

افسوس یہ ہے کہ اصل کے کاغذ کے میلا ہو جانے اور حروف کی دھندلی طباعت کے باعث بعض مقامات پر عکس بھی دھندلا ہی آیا ہے اس کے باوجود گلکرسٹ کی مجوزہ علامات سمجھ میں آجاتی ہیں۔ فی الوقت ایک نادر دستاویز کی حیثیت سے قارئین اس نقشے کے عکس کو قبول فرمائیں۔ آئندہ مختصر رسالہ رسم الخط و اعراب کا عکس اور اس سے متعلق مباحث بھی انشاء اللہ پیش کیے جائیں گے۔

اکبر علی خاں عرشی زادہ
پھلواڑ، رام پور ۲۴۴۹۰۱

گلکرسٹ کے نظام املا کا نقشہ

ڈاکٹر جان گلکرسٹ کا نام اُردو زبان و ادب کے محسنین میں سرِفہرست آتا ہے۔ اُس نے نہ صرف اُردو نثر کی بنیادوں کو اپنی کاوشوں سے مضبوط کیا بلکہ اُردو املا اور حرکات و سکنات کے سلسلے میں بھی ایسی تجاویز مرتب اور رائج کیں جن کے بغیر غیر زبان والوں اور خود اہل زبان مبتدیوں کے لیے بھی اس زبان کی تحریر کا صحیح پڑھنا دشوار تھا۔ گلکرسٹ کو املائی اصلاحات اور اس کے قواعد و ضوابط متعین کرنے میں اوّلیت کا درجہ حاصل ہے گلکرسٹ نے جو تجاویز پیش کیں اور ان پر خود عمل کرکے دکھایا اُن میں سے کچھ آج تک باقی ہیں گویا ان



کے اثرات اب بھی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ یہ نظامِ املا کسی قدر مزید اصلاح کا محتاج تھا چنانچہ اس جانب پیش رفت کرنے والا پہلا شخص بھی ایک انگریز میجر ہالرائڈ تھا جس کا تعلق پنجاب کے محکمۂ پبلک انسٹرکشن سے مدتوں رہا۔ اس کے نام سے بھی اردو والے واقف ہیں۔

گلکرسٹ نے املا کے موضوع پر ایک مختصر رسالہ تیار کیا تھا جس کا عنوان تھا "رسالۂ رسم الخط و اعراب"۔ بگمان غالب یہ شائع بھی ہوا تھا لیکن آج اس کا کہیں بھی کوئی سراغ نہیں ملتا۔ البتہ اس کتابچے کا ایک اختصار اور تجاویز پر مبنی حروف و حرکات کا نقشہ دستبردِ زمانہ سے محفوظ رہ گیا ہے۔ گلکرسٹ کی تجاویز اور اس کے تیار کردہ نظامِ املا کو سمجھنے کے لیے اب ہمارے پاس یہی دو چیزیں ہیں جو ۱۸۰۲ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھیں یعنی آج سے ایک سو چھیاسی سال قبل۔

جناب سلیم الدین قریشی صاحب کی عنایت سے میں ان دونوں کے عکس حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکا۔ آج کی صحبت میں حرکات و اعراب اور حروفِ تہجی پر مبنی نقشہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس نقشے میں جن تجاویز کو گلکرسٹ نے مرتب کر دیا ہے وہ سب کی سب اس کے زیرِ نگرانی طبع ہونے والی کتب میں پائی جاتی ہیں ان میں سے کچھ کتابیں خود میری نظر سے بھی گزر چکی ہیں۔

افسوس یہ ہے کہ اصل کے کاغذ کے میلا ہو جانے اور حروف کی دھندلی طباعت کے باعث بعض مقامات پر عکس بھی دھندلا ہی آیا ہے اس کے باوجود گلکرسٹ کی مجوزہ علامات سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ فی الوقت ایک نادر دستاویز کی حیثیت سے قارئین اس نقشے کے عکس کو قبول فرمائیں۔ آئندہ مختصر رسالہ رسم الخط و اعراب کا عکس اور اس سے متعلق مباحث بھی انشاء اللہ پیش کیے جائیں گے۔

○○

ہرہ زیدی

انتون چیخوف کی ایک غیر دلچسپ کہانی

شفقِ صبح کو دریا کا خرام آئینہ
نغمۂ شام کو خاموشیِ شام آئینہ
حسن آئینۂ حق اور دل آئینۂ حسن
دلِ انساں کو ترا حسنِ کلام آئینہ

یہ اشعار علامہ اقبال نے شیکسپیئر کے
. کہے تھے۔ شیکسپیئر کے علاوہ اگر کسی مصنف
پوری طرح ان کا اطلاق ہوسکتا ہے تو وہ
لیم روسی فنکار انتون چیخوف ہیں، جنھیں نہ
ف دنیا کا عظیم ترین افسانہ نگار مانا گیا ہے
ہ وہ جدید ڈرامے کا بھی ایک اہم ترین نام
، جس نے نہ صرف ڈرامے کے فن کو نکھارا،
نوارا اور اسے تصنّع اور روایتی تصوّرات
ے پاک کیا بلکہ اس میں انسانی ذہن کی پراسرار
ر داتوں، جذبات کے اتار چڑھاؤ، زندگی
ے نازک اور لطیف رنگوں، اور خوشی اور غم کی
ھوپ چھاؤں کو اس طرح فن کے شیشے میں
ناراکہ وہ زندگی کا ایک ایسا سچا اور دلآویز
رقّع بن گیا جو اپنی سادگی اور دروں بینی
کے باوصف تہ در تہ معنی کا آئینہ دار بھی ہے۔
چ تو یہ ہے کہ انتون چیخوف ڈرامے کے فن میں
یک ایسے خاموش انقلاب کے بانی ہیں جس
نے کئی نسلوں کو متاثر کیا، اور آج بھی صفِ اوّل
کے جدید ترین ڈرامہ نگار ان کو اپنا استاد اور
ہنما مانتے ہیں۔ چیخوف کی حقیقت نگاری اس
در لطیف، مترنم اور معنی آفریں ہے کہ اسے
کثر شاعرانہ حقیقت نگاری کا نام دیا گیا ہے۔

افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی بظاہر چیخوف کا فن بہت سیدھا سادا اور شفّاف ہے، جس پر یہ دھوکا بھی ہوسکتا ہے کہ انھوں نے بس عام زندگی کی ایک جھلک دکھادی ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ لیکن یہاں بھی چیخوف کا اختصار، تفصیلات کا معنی خیز انتخاب، دروں بینی اور مضبوط فنّی گرفت ان مرقعوں کی تہ داری اور معنی آفرینی کی ضامن ہے۔ ان کہانیوں کے کردار، عام قسم کے انسان یعنی کلرک چپراسی، کسان، دستکار، سرکاری ملازم، اسکول ماسٹر، فیشن زدہ خواتین اور سیدھی سادی عورتیں، طالب علم اور دانشور، ڈاکٹر اور پروفیسر، رئیس زادے اور نودو لیتے وغیرہ ہیں۔ اور ان سبھی کرداروں کو چیخوف نے بالکل قدرتی انداز میں لیکن دروں بینی کے ساتھ پیش کیا ہے اور ساتھ ساتھ ان کے ماحول، سماجی مظاہر اور عوامل کو بھی بڑی چابک دستی سے اجاگر کر دیا ہے۔ ان کرداروں کی طرف چیخوف کا رویّہ نہ مربّیانہ ہے، نہ جذباتی، نہ وہ کسی پر سخت نکتہ چینی کر کے آخری حکم صادر کرتے ہیں اور نہ اس کی وکالت اور قصیدہ خوانی کو اپنا شعار بناتے ہیں، بلکہ وہ ان کرداروں کو خود اپنی شخصیت کی نقاب کشائی اور انوکھی خصوصیات کے اظہار کا موقع دیتے ہیں لیکن یہ معروضی طرزِ نگارش نہ صرف گہرے مشاہدے اور انسانی فطرت کی نبض شناسی کا غمّاز ہے

بلکہ اس میں ایک متوازی نقطۂ نظر، گہری بصیرت اور قدروں کا عرفان بھی شامل ہے، انسانوں کے لیے، چیخوف کے دل میں ہمدردی کا بے پناہ جذبہ تھا، لیکن وہ ان سے خلوص، سچّائی، دیانت داری، دردمندی، ذہانت اور اخلاقی جرأت کا مطالبہ بھی کرتے تھے۔ اور خود غرضی، ریاکاری، تصنّع، تنگ نظری، کٹّرپن، بھونڈاپن، فراریت، خود ترسی اور غلامانہ ذہنیت اکثر ان کی ظریفانہ تنقید کا ہدف بنتی ہے، چیخوف کی کہانیوں اور ڈراموں میں سنجیدگی اور ظرافت، دردمندی اور طنز، مسرّت اور غم، اور المیہ وطربیہ عناصر کی دھوپ چھاؤں نے نہ صرف انھیں ایک انوکھی جاذبیت اور دلکشی عطا کی ہے بلکہ انھیں زیادہ معنی خیز، پہلودار اور ہمہ گیر بصیرت کا حامل بھی بنا دیا ہے۔

چیخوف نے جہاں بلند بانگ دعووں اور فلسفیانہ موشگافیوں سے دامن بچایا، وہاں طوالت اور مبالغہ آرائی سے بھی پرہیز کیا۔ اختصار اور رمزیّت، ان کی طبیعت ثانیہ بن گئے تھے، اور جب زیادہ پیچیدہ مسائل اور ہمہ گیر وژن کی ترسیل کے لیے انھوں نے ناول کی طرف رخ کیا تو اس صنف کو اپنی افتادِ طبع



پروفیسر آف انگلش، ۲۲- ذاکر باغ، اے. ایم. یو علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

کے مطابق نہ پا سکے طویل کہانیوں یا ناولٹ کا سہارا لیا" جن میں "گھاڑی میں" "وارڈ نمبر ۶" "دلھن" "بھونرا" "تول کا آدمی" اور "ایک غیر دلچسپ کہانی" وغیرہ شامل ہیں، اور ان کے چار شاہکار ڈراموں کے ساتھ ساتھ یہی طویل کہانیاں ان کے فن کا نقطۂ عروج ہیں۔ آج ہماری توجہ کا مرکز چیخوف کی "ایک غیر دلچسپ کہانی" اور اس کا مرکزی کردار پروفیسر نکولائی استپانووچ ہوں گے۔ اس عجیب وغریب اور پہلو دار کہانی کے اس مرکزی کردار کو چیخوف کی فنی بصیرت نے ایک ناقابلِ فراموش کردار بنا دیا ہے۔

پروفیسر استپانووچ میڈیکل سائنس کا پروفیسر ہے۔ وہ ایک مشہور شعلہ بیان اور کامیاب استاد ہونے کے علاوہ سائنس فیکلٹی کا ڈین اور مشیرِ سلطنت بھی ہے۔ وہ بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے اور اس کی علمیت اور قابلیت کا ڈنکا بجا ہوا ہے، لیکن ہم اس پروفیسر سے اس وقت روشناس ہوتے ہیں جب وہ کافی بوڑھا ہو چکا ہے باسٹھ تریسٹھ سال کا ہے۔ اور اس تعارف کا وسیلہ اس کے وہ تاثرات ہیں جو اس نے زوال کے اس دور میں قلم بند کیے ہیں۔ اس طرح نہ صرف ہم اس کی روزمرہ کی مصروفیات اور زندگی کے مختلف پہلوؤں سے روشناس ہوتے ہیں بلکہ اس کی ذہنی کیفیات، نفسیاتی الجھنوں، جسمانی تکالیف اور گوناگوں مسائل کا عرفان بھی حاصل کرتے ہیں، جن سے وہ دوچار ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان تاثرات میں سماج اور اس کی اقدار اور مظاہر کے واضح خدوخال بھی ابھرتے ہیں، اور یہ مختصر ناولٹ نظامِ تعلیم، سائنس، ادب، فنونِ لطیفہ اور تھیٹر سے لے کر انسانی زندگی کے نصب العین، آزادی، وابستگی اور ذمہ داری کے تصورات اور فلسفۂ موت وحیات تک کا احاطہ کیے ہوئے ہیں

پروفیسر استپانووچ یوں تو غیر معمولی شان اور شہرت کا مالک ہے لیکن اس کی نجی زندگی طرح طرح کی الجھنوں اور پریشانیوں سے گھری ہوئی ہے۔ وہ ہمیشہ مقروض رہتا ہے۔ اس کی صحت جواب دے رہی ہے۔ قویٰ مضمحل ہو چکے ہیں، لیکن اس کے پاس اپنے خلاف کے لیے بھی کافی سرمایہ نہیں ___ کلاس میں لکچر دینا جو اس کے لیے کبھی ایک ولولہ انگیز مشغلہ تھا بلکہ ایک نشہ سا تھا اب وبالِ جان بن چکا ہے۔ کبھی اس کا سانس اکھڑنے لگتا ہے کبھی بدن میں درد شروع ہو جاتا ہے اور طالب علموں سے اپنی حالت چھپانا اس کے لیے اور سوہانِ روح ہو جاتا ہے لیکن اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ اپنے اس عہدے سے دستبردار ہو جائے کیونکہ یہی علمی زندگی تو اس کی شناخت ہے اور وہ جانتا ہے کہ اس سے کٹ کر وہ زندہ درگور ہو جائے گا۔ اس کی نجی زندگی بھی اس کے لیے بے معنی سی ہو گئی ہے۔ اس کی بیوی جو کبھی اس کی نازک اندام معشوقہ تھی، اب انتہائی بھدی اور بے کیف ہو گئی ہے۔ اور پھر اوپر سے طرّہ یہ کہ اسے دیکھتے ہی وہ شکایت اور پریشانیوں کے دفتر کھول دیتی ہے۔ اس کی بیٹی جو کبھی اس کے ارمانوں کا مرکز تھی اب انتہائی فیشن زدہ، فضول خرچ اور پر تصنع ہو چکی ہے۔ اور اس کے بیٹے سے تو اب اس کا صرف ایک ہی تعلق رہ گیا ہے، یعنی وقتاً فوقتاً اس سے پیسے کا مطالبہ، اور ستم یہ کہ جب سے وہ فیکلٹی کا ڈین بنا ہے، اس کی بیوی نے ٹیپ ٹاپ اور تصنع کو کچھ اس طرح اپنا شعار بنا لیا ہے کہ اس کی نجی زندگی کی خوش باشی، بے ساختگی اور جذبہ رفاقت ہوا ہو گئے ہیں۔ اور پھر اوپر سے کھانے کی میز پر اس کے ہونے والے داماد کی موجودگی فضا کو اور بھی مکدر کر دیتی ہے۔ اس سطحی اور مکار نوجوان سے جس کی مونچھیں کیکڑے جیسی ہیں اور جس کے بدن سے پروفیسر کو کیکڑے کے شوربہ کی بو آتی ہے، اسے سخت نفرت ہے۔

اس کی زندگی میں بس ایک روشن نقطہ ہے ___ اس کی منہ بولی بیٹی کاتیا۔ جسے اس کے متموّل باپ نے مرتے وقت پروفیسر کی سرپرستی میں دے دیا تھا۔ کاتیا کو پروفیسر سے والہانہ عقیدت ہے اس کی نظر میں وہ علم اور انسانیت کا ساگر ہے۔ ایک مکمل انسان ہے جس سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی۔ خود کاتیا اپنی مختصر سی زندگی میں بہت سے سرد و گرم دیکھ چکی ہے۔ امید کے نخلستانوں اور ناامیدی کے صحراؤں سے گذر چکی ہے۔ اسے تھیٹر اور اداکاری سے والہانہ عشق تھا لیکن اس کے تلخ تجربات نے اس والہانہ جذبہ کو بیزاری میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس نے عشق کیا لیکن یہاں بھی اس کا مقدر تلخی اور ناکامی تھا۔ وہ بن بیاہی ماں بنی اور پھر اس نے بچے کی موت کا صدمہ سہا۔ اور اب وہ بے دلی اور شکست خوردگی کے عالم میں ایک بیکار اور بے معنی سی زندگی گذار رہی ہے۔ اس کے پاس پیسے کی کمی نہیں اور اس کا گھر آرٹ کے نمونوں سے بھرا پڑا ہے، لیکن یہ آرٹ جامد ہے، اور زندگی کے عرفان کے بجائے فرار کا وسیلہ بن گیا ہے۔

اپنی راتوں کی بے خوابی سے تنگ آ کر پروفیسر استپانووچ اکثر کاتیا کے گھر کا رخ

کرتا ہے، لیکن اسے ذہنی یا جذباتی طور پہ سہلا دینے کے بجائے وہاں جاکر اپنی ہی پریشانیوں اور الجھنوں کے دفتر کھول دیتا ہے۔ کاتیا کے گھر اکثر اس کی ٹکر کاتیا کے ایک عاشق میخائیل سے ہو جاتی ہے۔ یہ عجیب و غریب انسان جو ایک رئیس زادہ ہونے کے ساتھ ساتھ ماہرِ نفسیات بھی ہے، انتہائی باتونی ہے، لیکن بہت جلد اس کی خوش کلامی پھکڑپن اور ظرافت غیبت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور پروفیسر کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی لق و دق میدان میں مینڈکوں کی ٹرٹر سن رہا ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ وحشت پروفیسر کو اپنے نائب بیوتر سے ہوتی ہے جو اس کی نظر میں ایک پڑھا لکھا گاوْدی ہے، جو سائنس کی ہر دریافت، خاص طور سے، جرمنوں کے کارناموں کو آیت یا حدیث کا درجہ دیتا ہے۔ ور سائنس سے اس کی وابستگی وسیع النظری کا وسیلہ ہونے کے بجائے غلامانہ ذہنیت کی غماز ہے۔ یہ بدنصیب شخص اگر کبھی پروفیسر سے ملنے آتا ہے اور بڑی عقیدت سے مزاج پرسی کرکے گفتگو کا سلسلہ شروع کرتا ہے تو پروفیسر دل ہی دل میں اسے کوستا رہتا ہے کیونکہ یہ خیال وہ ایک لمحے کے لیے بھی دل سے نہیں نکال پاتا کہ یہ شخص اس کے مرنے کے بعد اس کی جگہ لے گا۔ لیکن اس کے جانے کے بعد پروفیسر کو اپنے غیر منصفانہ رویے پر احساسِ ندامت ہوتا ہے۔ اور اس کا دل چاہتا ہے کہ رو رو کے اس سیدھے سادے شخص سے معافی مانگے۔

خود پروفیسر کی معلومات کافی وسیع ہیں، اور اس کی ذہانت اور علمیت میں کلام نہیں۔ سائنس کے علاوہ وہ ادب، فلسفہ، فنونِ لطیفہ اور تھیٹر وغیرہ پر بھی عالمانہ گفتگو کرسکتا ہے۔ لیکن اس کا علم کتابی ہے۔ سائنس اس کا اوڑھنا بچھونا ضرور ہے، لیکن اس نے کبھی سائنس کو ایک وسیع تناظر میں دیکھنے اور سماجی اور انسانی مسائل سے اس کا رشتہ جوڑنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے کتابی علم اور سائنس سے اس قسم کی محدود وابستگی نے اس کے جذبات کے سوتوں کو خشک کر دیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اس کے لیے سائنس کا مقالہ لکھنا تو آسان ہے لیکن ایک سیدھا سادا نجی خط لکھنا ایک مرحلے سے کم نہیں۔ وہ کاتیا کو عالمانہ مشورے تو دے سکتا ہے لیکن اس کی دلجوئی کرنے سے قاصر ہے۔ اور جب کبھی وہ محبت، ہمدردی، رہنمائی اور مشورے کے لیے اس کے سامنے دامن پھیلاتی ہے، وہ خود کو بالکل بے بس اور مجبور پاتا ہے۔ جب وہ انتہائی خلوص کے ساتھ اس کے علاج کے لیے اپنے روپے کی پیش کش کرتی ہے تو وہ ایک بااصول انداز سے صاف انکار کر دیتا ہے۔ اور اس طرح اس کی دل شکنی کرتا ہے۔

پروفیسر اور کاتیا کے درمیان اس تعلّق کا نقطۂ عروج اس ناولٹ کا آخری سین ہے جو انتہائی دل شکن اور معنی خیز ہے۔ اس کا پس منظر خارکوف کا ایک سستا اور بوسیدہ ہوٹل ہے، جہاں پروفیسر اپنے ہونے والے داماد کے متعلّق معلومات حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ لیکن وہ سفر کی صعوبتوں اور دل میں امنڈتے ہوئے سینکڑوں وسوسوں سے اس قدر ہلکان ہو چکا ہے کہ اس میں کسی سے ملنے کی سکت نہیں، اور جب وہ مقامی اخبار میں اپنی آمد کی خبر پڑھتا ہے تو اسے یکایک احساس ہوتا ہے کہ وہ خود اور اس کا نام دو مختلف چیزیں ہیں، اس کا نام جسے شہرت [illegible] جو اس کی موت کے بعد [illegible] زندہ کیا جائے گا اور وہ خود جو پریشانیوں اور الجھنوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے اور اس کا لاغر اور بدہیئت جسم جس کا مقدر مٹی میں مل کر کیڑوں کی خوراک بننا ہے۔ اور پھر جب وہ خود میں ڈوب کر اپنی خواہشات، امیدوں اور اندیشوں کا محاسبہ کرتا ہے تو یکایک اس پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ ساری علمیت اور قابلیت کے باوجود اس کی زندگی کا کوئی ایسا نصب العین نہیں جو اسے بامعنی بنا سکے، کوئی ایسا فلسفۂ حیات یا مرکزی خیال نہیں جو اس کی زندگی کے مختلف اور منتشر عناصر کو ایک رشتے میں پرو سکے اور شاید اسی لیے وہ موت سے اس قدر خائف ہے۔

ٹھیک اسی وقت کاتیا نمودار ہوتی ہے جو غالباً اسی کی تلاش میں یہاں تک آگئی ہے۔ اس وقت وہ ہمیشہ سے زیادہ مایوس اور بے قرار ہے۔ اس کی بے کیف اور بے معنی زندگی اب اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو چکی ہے۔ وہ رو رو کر پروفیسر کے سامنے اعتراف کرتی ہے کہ اب وہ اور اس طرح زندہ نہیں رہ سکتی۔ اور اس سے گڑگڑا کر التجا کرتی ہے کہ وہ اس کی رہنمائی کرے، مشورہ دے اور بتائے کہ وہ کیا کرے، کس طرح زندگی گزارے۔ یکایک پروفیسر کو احساس ہوتا ہے کہ وہ کاتیا سے زیادہ خوش قسمت ہے۔ کیونکہ جس بات کا انکشاف اسے اپنے آخری وقت میں ہوا ہے، کاتیا اس کم عمری میں اس اذیت ناک احساس سے دوچار ہے اور اس کی ساری زندگی ایک لق و دق صحرا کی طرح اس کے سامنے پھیلی ہوئی ہے۔ اور جب کاتیا اس سے دوبارہ التجا کرتی

ہے کہ وہ اس کی رہنمائی کرے کیونکہ وہ عالم ہے، تجربہ کار ہے "ایک معزز استاد ہے تو پروفیسر بڑی بے بسی سے کہتا ہے کہ وہ کچھ نہیں بتا سکتا کیونکہ یہ بات وہ خود بھی نہیں جانتا۔ کاتیا خاموشی سے اپنی چیزیں سمیٹتی ہے اور ناامیدی اور خالی پن کے احساس کے ساتھ نظریں جھکائے واپس چلی جاتی ہے۔ وہ اس کی طرف مڑکر بھی نہیں دیکھتی اور پروفیسر کو معلوم ہے کہ اب وہ کبھی اس کی زندگی میں واپس نہیں آئے گی۔ اس طرح کاتیا کی آخری امید اور پروفیسر کا زندگی سے آخری رشتہ اس ایک لمحہ میں ٹوٹ جاتے ہیں، جس کا ارتعاش ہم اپنی ذات کے نہاں خانوں میں دور دور تک محسوس کر سکتے ہیں۔

اور اس طرح یہ کہانی نہ صرف ہمیں کاتیا اور پروفیسر استیپانووچ کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیات سے روشناس کراتی ہے بلکہ سائنس سے لے کے فلسفہ موت و حیات تک کئی داخلی اور خارجی مسائل کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنی پرتاثیر، دلچسپ اور نفسیاتی ابصیرت سے پُر کہانی کو چیخوف نے "ایک غیر دلچسپ کہانی" کے عنوان سے کیوں نوازا۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ اپنی تمام علمیّت، شہرت اور کامیابی کے باوجود پروفیسر کی زندگی اندر سے کھوکھلی اور بے معنی ہے کیونکہ اس کا کوئی بنیادی نصب العین نہیں۔ اسی طرح کاتیا کی زندگی بھی، جو پروفیسر کی طرح مالی اور جسمانی پریشانیوں سے بھی دوچار نہیں، بے معنی اور بے کیف ہے اور وہ اس سے لطف اندوز ہونے کے بجائے خود کو اس کے بوجھ تلے دبا محسوس کرتی ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس عنوان کے پردے میں چیخوف نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ انھوں نے اس میں غیر معمولی کرداروں یا کسی غیر معمولی صورتِ حال کو پیش نہیں کیا۔ بلکہ یہ ایک عام صورتِ حال ہے، جس میں بیشتر افراد گرفتار ہیں، گو یا کہ ان کو اس کا احساس نہیں۔ البتہ ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس عام یا معمولی صورتِ حال پر چیخوف نے ایک غیر معمولی نظر ڈالی ہے اور اس کو ایک گہری بصیرت اور فنّی چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

لیکن اس کہانی سے یہ نتیجہ نکالنا بالکل غلط ہوگا کہ چیخوف سائنس کے مخالف تھے۔ وہ سائنس کے بے حد قائل تھے، اور اسے انسانی زندگی کی فلاح و بہبود کے لیے ناگزیر تصور کرتے تھے لیکن سائنس کو مقصود بالذّات بنا لینے اور انسانی زندگی سے اس کا رشتہ توڑ دینے کے تباہ کن نتائج بھی ان کے سامنے تھے۔ چیخوف خود ڈاکٹر تھے اور ڈاکٹر کی حیثیت سے بھی انھوں نے انسانوں کی اہم خدمات انجام دیں۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ سائنس ان کی منکوحہ بیوی ہے اور ادب معشوقہ۔ اور گو کہ اس میں شک نہیں کہ وہ اس دلنواز معشوقہ کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو چکے تھے، لیکن میڈیکل سائنس سے بھی ان کا رشتہ کم و بیش استوار رہا، اور وہ اپنی سماجی اور اخلاقی ذمّے داریوں سے بھی غافل نہ تھے۔ اور اس وابستگی کا نقطۂ عروج ان کا سخلین جزائر کا سفر اور وہ کتاب تھی جو انھوں نے اپنے وہاں کے تجربات، مشاہدے اور سائنٹفک تحقیق کی بنیاد پر قلم بند کی۔

○○

اُردو اکادمی، دہلی کو اپنے کُتب خانے کے لیے
علمی اہمیت کی حامل قدیم کتابیں اور مخطوطے درکار ہیں۔
جو حضرات ایسی کُتب اکادمی کو دینا چاہیں وہ درج ذیل
پتے پر خط و کتابت کریں یا ملیں:
سیّد شریف الحسن نقوی، سیکریٹری اُردو اکادمی، گھٹا مسجد روڈ،
دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
فون نمبر: ۲۷۶۲۱۱

قریبِ شب طلوعِ موجِ بے شمار دیکھیے
فرازِ خوں کا ڈھلتی رات میں اتار دیکھیے

بگڑتے بنتے دائروں میں ختم ہوتے عکس کا
شکستہ پُل پہ نہر کے پھر انتظار دیکھیے

اذانِ خوشبوؤں کی جب بلند ہو طرف طرف
نمازِ کشتِ گُل قطار در قطار دیکھیے

سپاہِ آخری گزرنے پر بھی باقی ہے ابھی
اِک اور گردِ کارواں پسِ غبار دیکھیے

ہے اور کچھ وہ اصل میں دکھائی دے گا اور کچھ
بہ غور اسے کرن کرن بدن کے پار دیکھیے

درود خواں ہے آنکھ بھی نصیبِ چشم کھل گیا
نقاب ڈالے گرد پوش اِک سوار دیکھیے

اسی نے ہجرتیں کچھ اور بھی بتائی تھیں
وہ شخص جس کے لیے کشتیاں جلائی تھیں

ملا تھا کیا تمھیں بولو عظیم فنکارو
مرے قلم نے تو گمنامیاں کمائی تھیں

ابھی تو ہاتھ میں ہی سنگ ریزے تھے لیکن
سکوتِ آب پہ کتنی خراشیں آئی تھیں

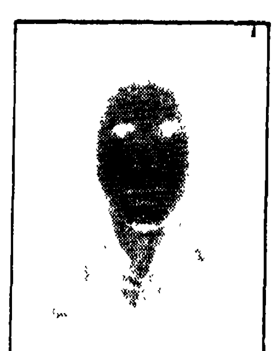
اُڑا کے برگِ خزاں دیدہ کی طرح اک دن
اُسی نے پوچھا تھا پھر آندھیاں کب آئی تھیں

کسی کو قصۂ پاکیِ چشم یاد نہیں
یہ آنکھیں کون سی برسات میں نہائی تھیں

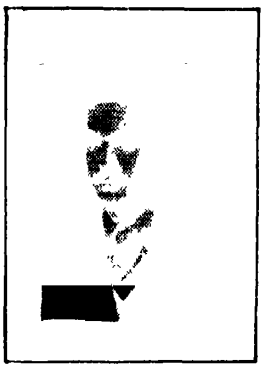
وہ ہمسفر تھا تو رستے میں سبز پیڑوں نے
ہماری سمت میں شاخیں بہت جھکائی تھیں

تعلقات میں سنجیدہ موڑ جب آئے
تو احتیاطیں بہت اس کی یاد آئی تھیں

مصوّر سبزواری



پوسٹ نوح، ضلع گڑگاؤں (ہریانہ)



اظہر عنایتی

ہٹ کر محاذِ جنگ سے وہ ڈر لگا اُسے
پتا کہیں جو کھڑکا تو لشکر لگا اُسے

مجھ سے بھی جب نہ اُس کے مسائل کا حل ہوا
پھر یہ ہوا کہ میں بھی ستم گر لگا اُسے

دیکھا تو کتنے ڈوبے ہوئے عکس یاد آئے
سوچا تو آئینہ بھی سمندر لگا اُسے

کہتا تھا جو کہ ساتھ جئیں گے، مریں گے ہم
میں مر گیا تو مجھ سے بڑا ڈر لگا اُسے

اظہر اب اتنا تنگ نظر ہوگیا ہے وہ
اُڑتا ہوا جہاز زمیں پر لگا اُسے

پھوٹا شیخ، رام پور ۲۴۴۹۰۱ (یو.پی)

شفق

زندانی

لاش کی آمد پڑوسیوں کے لیے افسوس، تعجّب اور قیاس آرائیوں کا باعث تھی۔

مگر نجمہ کے وجود پر بم گرا تھا، ایک زور دار دھماکہ ہوا تھا پھر کمرہ اور کمرے میں سجا جہیز کا سامان چتھڑا چتھڑا ہوکر فضا میں بکھر رہا تھا اس نے ایک چیخ ماری تھی جو لمبی ہوتے ہوتے فضا میں معدوم ہوگئی مگر اُس کے ہونٹ اُسی انداز میں کھلے رہے آنکھیں اُسی طرح پھٹی رہیں اور بظاہر آواز ختم ہوگئی تھی مگر اُس کا رواں رواں چیخ بن گیا تھا۔

کسی نے اس کی طرف توجّہ نہ دی، پڑوسیوں کے لیے ہمدردی کے زیادہ مستحق لڑکے کے والدین تھے جن کی اُمیدوں کا وہ واحد سہارا تھا، جس کے لیے انھوں نے راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کیا تھا۔ پڑوسیوں سے لڑے تھے جائز ناجائز جس طرح بھی ممکن ہوا روپیہ جمع کیا تھا اور چار برس پہلے اُس عمر میں اس کی شادی کر دی تھی جب اس کی مونچھوں کے روئیں سنہرے سے کالے بھی نہیں ہوتے تھے اور جو اب بھی محلّے کے بچّوں کے ساتھ گلی میں گُلی ڈنڈا کھیلتا اور پتنگ اُڑاتا مل جاتا تھا۔ پھر بھی نہ جانے کس نے اس کی چوڑیاں اس بے دردی سے توڑی تھیں کہ چوڑی کی کرچیوں نے اس کی گداز کلائیوں پر سُرخ موتی سجا دیے تھے۔

سب منع کر رہے تھے، شہر کے حالات ٹھیک نہیں، محلّے سے باہر نہ جاؤ مگر...

وہ ایک ضدّی بچّہ تھا اور اسی ضد نے اس کی جان لی۔

قصور اُس کی ضد کا بھی نہیں تھا، تیسرے نے مداخلت کی، دراصل اس کا وقت پورا ہوگیا تھا۔

اگر دیکھا جائے تو رحیم دادا نے ہر معاملے میں عجلت سے کام لیا۔ تعلیم ادھوری چھڑا کر ہومیو پیتھ کمپاؤنڈر پھر ڈاکٹر بنوا دیا پھر کمسنی میں شادی کر دی کہ پوتا کھلائیں گے، اتنی تیز دوڑ ہی اس المیے کا سبب بنی ہے۔

وہ تو ٹھیک ہے مگر اُن کی حالت دیکھی نہیں جاتی، اب وہ کس کے لیے جئیں گے؟

اور آپ نے سوچا کہ اُس کی بیوہ اپنی پہاڑ سی زندگی کیسے گزارے گی؟

اس پر سب خموش اور فکر مند ہوکر غسل کی کارروائی مکمّل ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

نجمہ نے شوہر کی لاش اُس وقت دیکھی تھی جب وہ گھر کے آنگن میں چارپائی پر ڈالی گئی تھی گھر سے باہر جاتے وقت بھی وہ نجمہ پر جھنجھلایا تھا کہ رومال دھلا ہوا نہیں ہے اور سیاہ پتلون بغیر دھوئی کھونٹی پر لٹک رہی ہے، تنہائی میں نجمہ جب بھی اس کا چہرہ یاد کرتی تو غصے سے تمتمایا ہوا چہرہ اس کے سامنے آجاتا۔ حاکمیت کا غرور لیے ہوئے۔

نجمہ شادی کے وقت عمر کی اُس منزل پر تھی جسے شباب کی سرحد کہا جا سکتا ہے، جسمانی ہی نہیں ذہنی اعتبار سے بھی، مگر شوہر کی محبّت بھری باتوں، والہانہ لگاؤ اور میٹھے بول کے لیے اس کے کان ترس گئے، وہ ہنستا تھا اور دوسروں کے ساتھ خوب ہنستا تھا مگر اُس کے پاس آتے ہی چہرے کی جلد کھنچ جاتی پیشانی پر شکنیں نمودار ہو جاتیں اور آواز میں حاکمیت آجاتی۔ اور جب سے ساس نے اُسے بانجھ کا طعنہ دے کر بیٹے کی دوسری شادی کر دینے کی دھمکی دینا شروع کیا تھا جیسے اُس کے پیروں کی زمین ہی سرکنے لگی تھی، اس لفظ بانجھ پر ایک گرم سی لہر اُس کے تلوؤں سے اُٹھ کر اُس کے وجود پر چھا جاتی۔

میں بانجھ نہیں، پیاسی دھرتی ہوں اُس کا رواں رواں چیخ اُٹھتا۔ مجھے یہ طعنہ مت دو، تم عورت ہوکر بھی عورت کے جذبات سے ناواقف ہو اسی لیے تم نے اپنے بیٹے کے لیے میرا انتخاب کیا، کیا میل تھا کیا جوڑ ہے ہمارا؟ اُس کی سہیلیوں نے مذاق اُڑایا تھا، پڑوسنوں نے کہا تھا۔ بُرا نہ ماننا تم دونوں شوہر بیوی نہیں، دیور بھابی نظر آتے ہو۔

مگر وہ کوئی جواب نہیں دے سکتی تھی کر

کبیر گنج، سہسرام (بہار)

شوہر کی زبان اور ہاتھ یکساں رفتار سے چلتے تھے اور یہ سب کچھ اس کے لیے نیا اور تکلیف دہ تھا وہ جس ماحول سے آئی تھی وہاں کا ماحول پھر یہ ماحول . . . لڑکی کی قسمت . . .

اور جب اُس نے لاش کے چہرے پر نظر ڈالی تھی، موت کی اذیت سے بگڑا ہوا چہرہ، ادھ کھلی آنکھیں اور دانتوں سے کچلی ہوئی زبان، دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تو نہ جانے کیوں اُسے وہ جوگی یاد آگیا تھا جسے قسمت کا حال جاننے کے لیے اُس کی ساس بلا لائی تھیں۔

تو بڑی بھاگ شالی ہے بیٹی، اُس نے ہاتھ دیکھتے ہی رٹا رٹایا جملہ دُہرانا شروع کیا۔ تیرا بچپن سُکھ سے بیتا ہے اور سُسرال میں بھی تیرا پتی . . . وہ رک گیا، سب اُوپر والے کی لیلا ہے، ہاں بیٹی تو بچپن میں ایک بار بہت بیمار پڑی تھی اور اب ایک گرہ اور . . .

سادھو جی، ساس نے ٹوک دیا۔ اس کے بچہ کب ہوگا؟

سنتان . . . ہاں سنتان . . . سادھو نے ٹھنڈی سانس لی، سب اُوپر والے کی لیلا ہے وہ جس کی گود دی چاہے بھر دے . . . پھر وہ چلا گیا، ساس کے روکنے کے باوجود بغیر کچھ لیے ہوئے۔

اور تب نجمہ نے سوچا تھا، کیا جوگی نے ہاتھ کی لکیریں پڑھ لیں کہ وہ پیاسی دھرتی ہے جو چھینٹوں سے نہیں موسلا دھار بارش سے سیراب ہوگی۔ وہ من ہی من شرما گئی تھی مگر آج جوگی کا ادھورا جملہ اور سُسرال میں بھی تیرا پتی . . . سب اوپر والے کی لیلا ہے، بار بار ذہن میں گونج رہا تھا۔

شام ہوتے ہوتے بھیڑ چھٹ گئی لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے کہ نہ کوئی کسی کا غم بانٹتا ہے نہ مرنے والے کے ساتھ جاتا ہے اور تب اُسے موت کے سناٹے کا احساس ہوا، کمرہ جیوں کا تیوں تھا وہی مسہری اور چادر، صوفہ سیٹ، سنگار میز اور کھونٹی پر ٹنگی ہوئی سیاہ پتلون، اُسے بار بار لگتا ابھی وہ آئے گا ہاتھ میں گندا رومال لیے تیوریاں چڑھائے اور پوچھے گا کہ سیاہ پتلون . . .

اور جب رات کے سناٹے میں سُسر اور ساس کے رونے کی آوازیں تیز ہو جاتیں تو اُسے اپنی کلائیوں میں کرچیوں کی چبھن کا احساس ہوتا۔

میں بیوہ ہوگئی ہوں ـــــ اُس کے اندر ہُوک سی اُٹھتی اور وہ پھپھک پھپھک کر رونے لگتی۔

وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اُسے کون سا غم زیادہ ہے شوہر کی موت کا یا اپنے بیوہ ہو جانے کا، اُس نے اب تک اس انتظار میں دُکھ جھیلے تھے کہ عمر کے بڑھتے ہوئے سائے اُس کے شوہر میں وہ ہُنر لے آئیں گے جس کی وہ متمنّی ہے ممکن ہے تب وہ خود شباب کی سرحد سے گزرنے لگے یا گزر چکے مگر جب قسمت میں یہی لکھا ہے تو وہ صبر کے سوا کیا کرسکتی ہے۔

تیسرے دن نجمہ کے ماں بھائی آگئے، ماں کو دیکھ کر نجمہ کے صبر وضبط کا باندھ ٹوٹ گیا اور وہ ماں کے سینے سے لپٹ کر ایسے روئی کہ ماں اُن آنسوؤں میں ڈوب سی گئی، ماں مجھے یہاں سے لے چلو۔

ماں تو خود ہی بیٹی کے اس سانحے پر حواس باختہ تھی اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہوگیا اور وہ بیٹی کو کیا کہہ کر تسلّی دے۔ بیٹی، شریف گھرانوں کی بیٹیاں جب ڈولی پر چڑھا دی جاتی ہیں تو پھر اُس گھر سے ان کا جنازہ ہی اُٹھتا ہے مگر میں تمھیں لے چلوں گی اتنے دن گزارے ہیں کچھ اور گزار لو جو کچھ ہوا بہت بُرا ہوا مگر اس میں بھی خدا کی کوئی مصلحت ہوگی۔

کیا خدا کی ساری مصلحتیں میرے لیے وقف ہوگئی ہیں، وہ چیخ پڑی، چار برس کیسے گزارے یہ میرا دل ہی جانتا ہے اور اس بربادی کے بعد بھی کیا بہتری کی اُمید ہے؟

صبر کرو بیٹی میں تمھاری ساس سے بات کروں گی۔

اُس سے بات کروگی جس نے ایک دن بھی چین کا سانس نہ لینے دیا اور جو مجھے بانجھ کہہ کر سوت لانے کی تیاری کر رہی تھی نہیں ماں مجھے لے چلو ورنہ میں جان دے دوں گی۔

اور جب نجمہ کے بھائی نے اُس کے سُسر سے بات کی تو وہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر گڑگڑانے لگا، نجمہ بیٹی کو لے جاکر ہمیں موت کے حوالے مت کرو، وہ نہیں رہا اُس کی نشانی سمجھ کر ہمارے پاس رہنے دو، پہلے بہو تھی اب بیٹی بن کر رہے گی۔

محترم آپ صرف اپنے متعلق سوچ رہے ہیں، نجمہ کے بارے میں سوچیے، پہاڑ سی زندگی ایسے نہیں کٹ سکتی، کل آپ لوگ نہ ہوں گے اور اُس کی عمر بھی ڈھل جائے گی پھر . . .

بیٹے مجھے معاف کردینا میں خود غرض ہوگیا تھا، تم بھائی ہو اور ہم تو اب نجمہ کے کچھ بھی نہیں رہے۔

ماں اور بھائی چلے گئے مگر اُسی رات نجمہ کے سسر پر دل کا دورہ پڑا اور وہ ساری رات موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا رہے، صبح اُمید کی کرن لے کر آئی مگر تناور درخت کی جڑیں بُری طرح ہل گئی تھیں اور ایک ہی رات میں وہ اپنی عمر کے دس مزید سال گزار گئے تھے۔

اور ایک ہفتہ بھی نہ ہوا تھا کہ ساس کو کھانسی کے ساتھ خون آیا، دق کا پُرانا مرض پھر تازہ ہو گیا تھا۔

نجمہ کو ایک مخصوص مدت تک اسی گھر میں رہنا تھا، شوہر کی موت کے دن سے ہی اُسے یہ گھر اجنبی لگنے لگا تھا، اُس کے پاس سوچنے کے لیے وقت ہی وقت تھا مگر وہ سوچتے ہوئے بھی گھبراتی تھی، جو گزر گیا اُسے سوچنے سے دُکھ ہوتا تھا اور آگے سوچتے ہوئے اُلجھن ہوتی تھی، کنواری لڑکیوں کو تو لڑکے ملتے نہیں، بیوہ کو کون قبول کرے گا، حالاں کہ وہ ٹیبل پر رکھی ایسی کتاب تھی جسے بچے نے کھول کر صرف تصویریں دیکھی تھیں کہ وہ پڑھنا نہیں جانتا تھا، بھلا دوسرے اس پر کیوں یقین کرنے لگے، اب تو اس کا مقدر باپ اور چچا کی عمر کا کوئی فرد ہو گا جسے اپنے بچوں اور گھر کی دیکھ بھال کے لیے گھر والی کی ضرورت ہو گی، کتنا فرق ہو گا دونوں حیثیتوں میں۔

دن تو گھر کے کام کاج میں گزر جاتا، رات آتی تو گھبراہٹ بڑھ جاتی، اکیلا کمرہ دیکھ کر خیالوں کا لشکر ٹوٹ پڑتا اور نیند کوسوں دُور کھڑی انگوٹھا دکھاتی، اُسے ساس سسر کے قرب سے وحشت ہوتی تھی پھر اُن کے قریب سونا، بار بار پانی پلانے کے لیے اُٹھنا، کھانسی سے بار بار نیند اُچٹ جاتی تھی مگر تنہائی کے آسیب سے بچنے کے لیے اُس نے اپنی چارپائی اُن کے قریب ڈال لی، کتنے دنوں کی اور اذیت ہے وہ انگلیوں پر شمار کرتی، دس دن... پندرہ دن...

سسر پر تو اُسے کبھی کبھی ترس بھی آتا کہ اُس نے اُسے کبھی کچھ نہ کہا تھا مگر ساس جو اُسے بانجھ کہتی اور بیٹے سے جھوٹی شکایتیں کر کے اسے اذیت دیتی تھی اب کیسی بستر پر پڑی بے بسی سے اُسے دیکھتی رہتی ہے، میں کھانا نہ بناؤں تو بھوکی رہے، دوا نہ پلاؤں تو کھانستے کھانستے مر جائے ڈائن...

اور پھر ___ مدت گزر گئی اور اُس کا بھائی اسے لینے آ گیا، اس نے ساری تیاریاں پہلے ہی کر لی تھیں اپنے کپڑے اور زیورات بکس میں رکھ دیے تھے، اُس نے بھائی سے کہا، جہیز کا سامان بھی باندھ لو، یہاں کچھ چھوڑنے کی ضرورت نہیں کہ تمھاری بہن نے زندگی کے چار بھیانک سال اس قید خانے میں گزارے ہیں، میں یہاں سے ساری نشانیاں مٹا دینا چاہتی ہوں، پھر ٹرین کا وقت ہوا اور بھائی سواری لے آیا۔

اس نے ایک بار گہری نظروں سے پورے گھر کو دیکھا، اُس گھر کو دیکھا جہاں وہ دلہن بن کر آئی تھی اور آج ہمیشہ کے لیے جا رہی تھی، کیسا بھرا ہوا گھر وہ تھا اور آج کیسا اُجاڑ لگ رہا ہے، اُس کا جی چاہا جاتے وقت وہ ساس سسر سے آخری بار مل لے، ساس کو اُن باتوں کا جواب دے دے جو شوہر کے خوف سے نہ دے سکی تھی، کوئی قرض کوئی بوجھ اپنے اُوپر نہ رکھے مگر بھائی سواری پر سامان رکھے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

اب چلو بھی، بہت دیر ہو گئی دو بج گئے، کہیں ٹرین نہ چھوٹ جائے۔

دو بج گئے ___ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے نجمہ کے قدم ٹھٹھک گئے، دو بجے تو مجھے اماں کو دوا پلانی تھی، اور آج تو میں نے انھیں کھانا بھی نہیں دیا، میں چلی جاؤں گی تو انھیں کون کھانا کھلائے گا، کون دوا پلائے گا، پھر اُس کے سامنے ساس اور سسر کے اُداس چہرے آ گئے، بے بس نگاہیں اُسے حسرت سے تک رہی تھیں۔

میں چلی گئی تو یہ مر جائیں گے بھیا وہ بھائی کے شانے پر سر رکھ کر رونے لگی، میں انھیں چھوڑ کر کیسے جاؤں، میرے سوا ان کا اور کون ہے، تم چلے جاؤ بھیا، ماں کو سلام کہہ دینا۔

مظہر امام

نصف صدی پہلے کا ایک نایاب ادبی جریدہ

اب تک کی تحقیق کے مطابق سرزمین متھلا یعنی شمالی بہار کے مشہور شہر دربھنگا سے اردو کا پہلا ادبی جریدہ "مسیحا" کے نام سے ۱۹۰۴ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس ماہ نامے کے مدیر حکیم ابوالحسنات ناصر دہلوی تھے (یہ انشائے لطیف اور ماہنامہ "صدائے عام" والے خان بہادر میر ناصر دہلوی نہیں ہیں) وہ ۱۹۰۱ء میں دربھنگا آئے اور ۱۹۱۶ء تک وہیں محلہ قلعہ گھاٹ میں اپنا مطب کرتے رہے۔ خود طبیب تھے مگر "مسیحا" کی مسیحائی دو سال سے زیادہ نہ کر سکے۔ اس دوران بھی اس رسالے کی صحت مشکوک رہی، کیونکہ یہ کبھی وقت پر شائع نہیں ہوا۔

قریباً چوبیس سال کے صحافتی تعطل کے بعد فروری ۱۹۲۸ء میں رضا منزل، محلہ شاہ سوپن، دربھنگا سے ماہ نامہ "پروانہ" جلوہ گر ہوا اور ۲۹ء تک شمعِ صحافت کا طواف کرتا رہا۔ اس کے بانی اور مالک سیّد محمد عبدالقیوم قتیل اور مدیر سیّد محمد طٰہٰ فکری الٰہی تھے، جو مدرسہ حمیدیہ قلعہ گھاٹ میں مدرس ہو کر نئے نئے دربھنگا آئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے ادارۂ تحریر سے کچھ دنوں کے لیے خیر بھوروی بھی وابستہ رہے۔ اس کے خاص لکھنے والوں میں مُلّا رموزی کا نام قابلِ ذکر ہے، جن کی "گلابی اردو" ان دنوں عنفوانِ شباب سے گزر رہی تھی۔ آخری دور میں اس جریدے کی عنانِ ادارت ابوالنجم محمد قمرالدّین قمر اعظمی نے سنبھالی تھی، اور شاید اسی وجہ سے ان دنوں اس پر مذہبی رنگ غالب آ گیا تھا۔

۲۹ء میں ہفتہ وار "البدر" طلوع ہوا اور کم و بیش ڈیڑھ سال تک اپنی کرنیں بکھیرتا رہا۔ اس نے "عید نمبر" اور "بدر نمبر" پیش کر کے اپنی صحافتی اہمیت کا احساس دلایا۔ اس کے مالک اور منیجر ایک مجنوں صفت اردو دوست محمد ہاشم تھے جنھوں نے اپنا ہاشمی پریس قائم کیا تھا۔ مدیرِ مسئول سیّد محمد طٰہٰ الٰہی فکری تھے۔ اس ہفتہ وار میں سیاسی، سماجی، ادبی اور مذہبی، مضامین کو جگہ دی جاتی تھی[1]۔

۲۹ء میں سیّد حفاظت علی فائق رزّاقی نے ملکی چک دربھنگا سے ایک ماہنامہ "بشریٰ" کا اجرا کیا، لیکن اس کا ایک ہی شمارہ اپنی بہارِ جاں فزا دکھا سکا۔ پھر اسی سال اسی جگہ سے سیّد حفاظت علی فائق رزاقی کی زیرِ ادارت اور حکیم علیم الدین سوزاں سہسرامی کی زیرِ نگرانی ایک دوسرا ماہنامہ "آفتاب" کے نام سے طلوع ہوا اور دو ماہ تک اپنی روشنی دکھا کر غروب ہو گیا۔

اس کے بعد پانچ سال تک دربھنگے کے افق سے کسی جریدے کی روشنی نہیں لہرائی۔ ۳۵ء میں دارالعلوم احمدیہ سلفیہ کا ماہوار رسالہ "مجلہ سلفیہ" لہریا سرائے دربھنگا سے شائع ہونا شروع ہوا۔ یہ ادبی کم، مذہبی زیادہ تھا۔ اس نے نسبتاً طویل عمر پائی۔ "ہمالہ" کی اشاعت کے وقت "مجلہ سلفیہ" زندہ تھا۔

دربھنگا کی ادبی صحافت کے ان ابتدائی نقوش میں ماہنامہ "ہمالہ" کا نقش شاید سب سے روشن ہے۔ اس کا اجرا ۱۹۴۱ء میں ہوا۔ اس کی مجلسِ ادارت تین افراد پر مشتمل تھی۔ رشتی مظفر پوری، سیّد حسنین جامعی بی۔ اے اور عبدالعلیم آسی۔ بعد کے شماروں میں سیّد حسنین جامعی کی جگہ حسنین سیّد جامعی شائع ہوا ہے۔ رشتی مظفر پوری ان دنوں ۲۲۔۲۳ سال کے نوجوان تھے، لیکن بحیثیت افسانہ نگار پہچانے جانے لگے تھے۔ ان دنوں ان کی بسیار نویسی عروج پر تھی۔ انھیں "ہمالہ" کی ادارت کے لیے بطورِ خاص ان کے گاؤں سے بلوایا گیا تھا۔ سیّد حسنین جامعی جو بعد میں جماعتِ اسلامی بہار کے قیّم بنائے گئے۔ جامعہ ملّیہ کے گریجویٹ تھے اور رسالہ "جامعہ" کا "اقبال نمبر" ایڈٹ کر کے نام کما چکے تھے۔ عبدالعلیم آسی مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے فارغ التحصیل تھے۔ عربی اور فارسی ادب سے شغف رکھتے تھے اور اقبال اور جوش کے رنگ میں شاعری کرتے تھے۔ خلوت میں ملحدانہ خیالات کا اظہار کرتے، جلوت میں سیرت النبی پر تقریر فرماتے۔ بائیں بازو کی سیاست سے وابستگی کا بھی اعلان کرتے۔

"ہمالہ" کا دفتر محلہ باقر گنج، لہریا سرائے میں تھا، جو شہر دربھنگا کا ہی ایک حصّہ ہے۔ اس

[1] "پروانہ" اور "البدر" کی بابت مضمون "صوبہ بہار کی اردو صحافت کے سو سال" از ڈاکٹر مظفر اقبال (سووینیر آل انڈیا ایڈیٹرس کانفرنس منعقدہ پٹنہ ۱۹۷۱ء)، مضمون "بہار میں اردو صحافت" از فرحت شاہین (آج کل صحافت نمبر ضمیمہ جنوری ۱۹۸۵ء)، متھلا یونی ورسٹی کے تحقیقی مقالہ "دربھنگہ میں اردو کی نشوونما" از ظہیر ناشاد دربھنگوی (۱۹۸۶ء غیر مطبوعہ)، مضمون "دربھنگہ میں اردو صحافت" از محسن رضا رضوی (روزانہ "قومی تنظیم" پٹنہ ۲۲، نومبر ۱۹۸۷ء) اور "تذکرہ بزم شمال" مولفہ شاداں فاروقی (۱۹۸۷ء) میں جو اطلاعات ملتی ہیں وہ غلط اور نادرست ہیں۔

۷۔ پرتاپ پارک فلیٹس، ریزیڈنسی روڈ، سری نگر (کشمیر)

رسالے کے مالک اعجاز بستوی تھے جنھیں شعر و ادب کا رچا ہوا ذوق تھا۔ عربی زبان و ادب سے اچھی واقفیت تھی۔ اردو میں ان کے لکھے ہوئے چھوٹے چھوٹے ادب پارے اور عربی افسانوں کے ترجمے "ادبی دنیا" (لاہور) میں شائع ہوئے۔

اپنے وقت کے لحاظ سے "ہمالہ" بڑی آب و تاب سے نکلا لیکن اس کی زندگی "چند روزہ" نہ سہی "چند ماہہ" ثابت ہوئی۔ اس کا پہلا شمارہ جون ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ دوسرا جولائی میں اور تیسرا اگست ستمبر کا مشترکہ شمارہ تھا۔ کل تین ہی شمارے منظرِ عام پر آئے۔ پہلے اور دوسرے شمارے میں ۴۸ اور تیسرے شمارے میں ۱۰۰ (سو) صفحات تھے۔

پہلے شمارے کے اداریے کا مندرجۂ ذیل اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

"یہاں سے کتنے ہی رسالے نکلے، لیکن ماحول کی شوریدگی نے انھیں پنپنے بھی نہیں دیا، چہ جائیکہ پھولنا اور پھلنا۔ صوبے کے دوسرے اضلاع کا کیا ذکر، خود اس شہر سے تین رسائل نکلے۔ جوانی کی بہار تو بڑی چیز تھی، بچپن کی شوخیاں بھی ناظرین نہ دیکھ سکے۔ "غریب" "پروانہ" کا کیا کہنا، وہ تو قتیلِ شمع تھا ہی، مگر "البدر" اور "آفتاب" بھی اپنی ضوفشانیوں سے پہلے ہی افق میں ڈوب کر رہ گئے۔ ایک "سلفیہ" ہے، جو کسی حال میں یادگارِ سلف بن کر زیبِ محفل ہے۔"

جیسا کہ ذکر کیا جا چکا "پروانہ" کے مالک عبدالقیوم قتیل تھے، اور اسی مناسبت سے "پروانہ" کو "قتیلِ شمع" کہا گیا ہے۔

اس اداریے کے مندرجۂ ذیل اقتباسات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ادارۂ "ہمالہ" اُس وقت کے کن کن ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات سے اپنے صفحات کی تزئین کرنا چاہتا تھا۔ ان میں سے دو کو چھوڑ کر سب کا تعلق صوبۂ بہار سے تھا۔

"... میرزا ادیب، عادل رشید منوی، افسر ماہ پوری، جمیل مظہری، پرویز شاہدی، سہیل عظیم آبادی، ڈاکٹر الیاس اسلام پوری، عاصم بریلی، ربط ہاشمی اور مسعود حسن صاحب دانا پوری جیسے مشہور اور مستند ادبا کے رشحاتِ گرامی کے جلد از جلد موصول ہونے کی پوری پوری توقع ہے۔"

"پروفیسر اختر اورینوی، پروفیسر شرف عالم آرزو جلیلی، جناب جمیل احمد کندھا پوری، حضرت مانپوری، بلبلِ بہار جناب سرپر کابری، شکیلہ اختر، محترمہ رضیہ رعنا اور آنسہ نسیمہ سوز کو بھی ہم "ہمالہ" کی طرف متوجہ کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔"

"ہمالہ" کے باقی دو شماروں میں جمیل مظہری اور نسیمہ سوز کے علاوہ ان "اکابرین" میں سے جن کے نام اداریہ میں لیے گئے ہیں، کسی کی کوئی تحریر نظر نہیں آئی۔

"ہمالہ" کے پہلے شمارے میں جوش ملیح آبادی، حسرت موہانی، آزاد سبحانی، پریم بہاری ناہر القادری، سلام مچھلی شہری، عروج قادری اور اختر عظیم آبادی کی منظومات، ش مظفر پوری، وحشی آروی، عارف شنسہاروی، چندر کمار ایم۔ اے مظفر پوری، اور بدر ہاشمی کے افسانے شامل ہیں۔ بدنام پریمی اور ملک فضل امام شید اکبوروی نے اس زمانے کی ایک مقبول صنف "ادبِ لطیف" میں طبع آزمائی کی ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے چندر کمار ایم۔ اے اور بدنام پریمی کے "پردۂ زرنگاری" میں ش مظفر پوری ہی تھے۔ پریم بہاری (عبدالحبیب شادانی) کی نظم "تمہاری برکھا" مئی ۱۹۴۶ء کے "معیار" (مرتب قاضی عبدالودود، معاون: آرزو جلیلی) سے بلا حوالہ نقل کی گئی ہے۔

پہلے شمارے میں صرف تین مضامین شامل ہیں: "ہندوستان کا قومی رسم الخط" (شافع ہاشمی)، "ترہت میں فارسی کے ہندو شعرا" (عبدالعلیم آسی) اور "فیشن اور عورت" (ش مظفر پوری)۔ ان میں شافع ہاشمی کا مضمون قابلِ توجہ ہے۔ اس مقالے میں علمی نقطۂ نظر سے عربی (جس سے فارسی اور اردو رسم خط کی تشکیل ہوئی)، رومن اور دیوناگری تینوں رسم الخط کی خوبیوں اور خامیوں سے بحث کی گئی ہے اور مشورہ دیا گیا ہے کہ ان "تینوں رسم الخطوں سے ایک مشترک رسم الخط" بنایا جائے۔ مضمون نگار نے "ہندوستان کے بہی خواہوں" سے خواہش کی ہے کہ "وہ اس مسئلے پر غور کریں اور صحیح راہِ عمل اختیار کریں۔"

عبدالعلیم آسی نے امیکا پرشاد شمس فارسی گو شاعر کا تعارف نہایت سرسری طور پر کرایا ہے۔ امیکا پرشاد ۱۸۳۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۸۹ء میں وفات پائی۔ وہ موضع نندا ضلع دربھنگا کے رہنے والے تھے۔ پہلے عشق تخلص کرتے تھے، پھر شمس کرنے لگے۔ اکثر خطوط، قطعات، غزلیں وغیرہ فارسی میں ہیں۔ عبدالعلیم آسی نے امیکا پرشاد شمس کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"کلام سلیس، شستہ، بلند اور صاف ہے۔ اگرچہ اس وقت کے بہتر فارسی گو شعرا میں ہندوستانی رنگ نمایاں ہو جاتا تھا مگر اس عیب سے شمس کا کلام پاک ہے۔ آپ کے کلام میں کہنہ مشقی، محاورات پر عبور، قادر الکلامی

اور سلاست پائی جاتی ہے۔"
نمونۂ کلام یہ ہے:

برائے دردِ من تدبیر نو کن
از ایں تدبیر خود تقدیر نو کن
اسیرِ حلقۂ گیسوئے خود ساز
برائے قیدِ من زنجیر نو کن
پریشاں گشتم از خوابِ پریشاں
اگر دانی مرا تعبیر نو کن

اندریں در گرنہ عابد و دیں دار کجاست
از گنہ گار مپرسید کہ پندار کجاست
ہر خردمند بہ اعمالِ بدِ خویش بخفت
مومن از خواب کند سینۂ بیدار کجاست

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ عبدالعلیم آسی نے امیکا پرشاد شمس کے حالات اور کلام کہاں سے حاصل کیے۔ "آئینۂ ترہت" مولفہ بہاری لال فطرت، مطبوعہ ۱۸۸۳ء (مطبع بہار کشمیر، لکھنؤ) اور "ریاض ترہت" مولفہ ایودھیا پرشاد بہار (ایڈیٹر اخبارالاخیار) مطبوعہ ۱۸۶۸ء (مطبع چشمۂ نور مظفرپور) دونوں تذکروں میں امیکا پرشاد نام کے کسی شاعر کا ذکر نہیں ہے۔ "موجِ سلطانی" "تاریخ خاندانِ مغلیہ" مولفہ شاہزادہ مرزا ظہیرالدین زبیر گورگانی مطبوعہ ۱۸۸۴ء (مطبع نولکشور، لکھنؤ) میں بھی دربھنگا کے کچھ شعرا کا ذکر ہے مگر اس میں بھی امیکا پرشاد کا نام نہیں ملتا۔ اس لحاظ سے عبدالعلیم آسی کی یہ "تحقیقی دریافت" اہم ہے۔

"فیشن اور عورت" میں شمس مظفرپوری نے یورپ کی تقلید میں بڑھتی ہوئی فیشن پرستی اور بے حیائی کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہ صحافیانہ نوعیت کا مضمون ہے اور ایک ادبی علمی رسالے میں غیر موزوں سا لگتا ہے۔

اس شمارے میں دو صفحات بچوں کے لیے بھی مخصوص کیے گئے ہیں۔ "تندرستی ہزار نعمت ہے" کے عنوان سے ایک مضمون ادارے کی جانب سے ہے اور ایک نظم "غریب بچہ" رسالہ "غنچہ" سے منقول ہے۔

رسالے کے آخری صفحات میں مولانا سید سلیمان ندوی کا مضمون "مسلمانوں کی آئندہ تعلیم" کی پہلی قسط شامل ہے۔ یہ وہی مقالہ ہے جسے موصوف نے اپریل ۳۳ء میں جامعہ ملیہ دہلی کے ایوان میں پڑھا تھا اور جو اسی سال جامعہ میں اور پھر "معارف" میں شائع ہوا۔ اس مقالے کو آٹھ سال بعد سہ بارہ شائع کرتے ہوئے ادارہ نے اپنے نوٹ میں لکھا ہے:

"اب ہم اس مقالے کو فائدہ کی تعمیم اور صحیح خیالات کی اشاعت کی غرض سے "ہمالہ" میں شائع کرتے ہیں۔"

یہ مقالہ صحیح معنوں میں عالمانہ ہے اور سچ پوچھا جائے تو اس شمارے کی سب سے بھاری بھرکم تحریر یہی ہے۔

دوسرا شمارہ جولائی ۴۱ء کا ہے۔ اس میں علامہ جمیل مظہری، شفیق قادری سونبرساوی، کنیز فاطمہ حیا لکھنوی، اخگر سیمابی اور وحشی آروی کی منظومات شامل ہیں۔ جمیل مظہری کی غزل میں مطلع نہیں ہے۔ چند اشعار یہ ہیں:

پلٹ دیا ہے حوادث نے رُخ زمانے کا
فلک فلک نہ رہا اور زمیں زمیں نہ رہی
اُتر بلندیٔ تخیل سے اُتر اے دوست
کہ اب جہاں میں نظر کوئی دوربیں نہ رہی
نیاز و ناز کی دنیا میں انقلاب آیا
صنم صنم نہ رہے اور جبیں جبیں نہ رہی
کھلا ہوا ہے ابھی میکدے کا در لیکن
کسی کے ساغرِ دل میں مئے یقیں نہ رہی
جہاں میں خشک ہے کشتِ حیات و مزرعِ عشق
کہ خونِ پاکِ مسلماں سے تر زمیں نہ رہی

جمیل مظہری کی یہ غزل ان کے کسی مجموعے میں نہیں ہے۔

اس شمارے میں افسانوں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے لیکن سارے افسانے طبع زاد نہیں ہیں۔ "سوغات" (شاہد نیازم) اور "البم" (قیصر عثمانی مہندی) سے اور "حسنِ اتفاق" (اظہر قادری سونبرساوی) انگریزی سے اخذ و ترجمہ ہیں۔ طبع زاد افسانے پانچ ہیں: "ایک رات اور ایک دن" (ولی الرحمٰن شیدا) "وہ کون تھی" (روپ کماری بی۔ اے آنرز) "جذامی" (بدر ہاشمی بی۔ اے آنرز) "ستی" (شہزادہ ایاز) "جھگڑا" (شمس مظفرپوری) اور "محبت کی پیاس" (حکیم شفا مظفرپوری) "جذامی" نصف صفحے کا ایک افسانچہ ہے، جسے موجودہ اصطلاح میں "منی کہانی" بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے برعکس "محبت کی پیاس" چودہ صفحات پر مشتمل ہے۔ "ایک رات اور ایک دن" میں صرف "ایک رات کی کہانی" پیش کی گئی ہے۔ باقی "ایک دن کی کہانی" آئندہ شمارے میں پیش کرنے کا اعلان ہے، لیکن تیسرے شمارے میں اس کا کہیں پتہ نہیں۔ ولی الرحمٰن شیدا تو خیر شمس مظفرپوری ہیں ہی، روپ کماری کے نام سے بھی شمس مظفرپوری نے ہی لکھا ہے۔

ٹیگوری انداز کے "ادبِ لطیف" کئی ہیں

"دولت" (ریاضی) "تاج محل" (رشید اکبر پوری) اور "آزادی" (آمنہ وسیم دربھنگوی) ان سب کو بہ آسانی آج کی نثری نظم کے کھاتے میں ڈالا جا سکتا ہے۔ "موسیقی" کے عنوان سے افتخار احمد دہر ناصری نے بعض اربابِ فکر کے اقوال پیش کیے ہیں۔

مضامین چار ہیں: "اقبال کا پیام" (حسنین سید جامعی) "مجرم کون ہے" (شش مظفر پوری) "بھینسا بازی" (شافع ہاشمی) اور "مسلمانوں کی آئندہ تعلیم" دوسری قسط (سید سلیمان ندوی)۔

حسنین سید جامعی نے اقبال کی شاعرانہ اور فنکارانہ عظمت کی بابت کچھ نہیں لکھا صرف ملتِ اسلامیہ کے لیے ان کے پیغام کو پیش کیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"وہ (اقبال) مسلمان تھے، اس لیے ملتِ اسلامیہ سے ان کا قریبی تعلق تھا، وہ ملت جس کی شورشِ قُم سے مردہ عالم زندہ ہوا، جس نے انسانوں کو ہر طرح کی غلامی اور توہمات کی بوجھل زنجیروں سے آزاد کرایا، جس ملت کا ظہور ایک جہانِ تازہ کا پیام تھا، جس کی ہیبت سے پُرجلال شہنشاہوں کے دل لرزتے تھے۔۔۔"

اس مضمون میں اقبال کی فکر سے زیادہ مذہبِ اسلام کی خصوصیات اور اوصاف پر گفتگو کی گئی ہے اور آخر میں لکھا گیا ہے:

"اقبال جب اسلام اور مسلمان کا نام لیتے ہیں، تو ان کے ذہن میں اسلام کا مذکورہ بالا مفہوم ہوتا ہے اور انھیں اوصاف اور خصوصیات کے حامل کو مسلمان کہتے ہیں۔ اقبال نے زندگی بھر اسی اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی اور ایسا ہی مسلمان پیدا کرنے کی کوشش کی۔۔۔"

اس مضمون کی حیثیت ایک مولویانہ تبلیغ سے زیادہ نہیں، اور اسے کسی نہج سے ادبی یا علمی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ اقبال سے محبت اور عقیدت کا اظہار بھی نہیں۔ اس ضمن میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ:

ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اس کا آسمان کیوں ہو!

شش مظفر پوری نے اپنے مضمون کی ابتدا ہی میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ مجرم کون ہے مرد یا عورت؟ اور اس کے بعد دلیلوں سے ثابت کیا ہے کہ دراصل گنہ گار مرد ہے، عورت کو غلط راستے پر ڈالنے کی ذمہ داری مرد کی ہی ہے۔

تیسرا شمارہ جو اگست اور ستمبر ۱۹۴۱ء کا مشترکہ شمارہ ہے "ہمالہ" کے سابقہ دونوں شماروں کی بہ نسبت بہتر مجموعی تاثر چھوڑتا ہے۔

اداریہ (عنوان: کہنے کی باتیں) میں رابندر ناتھ ٹیگور، آرزو جلیلی، فانی بدایونی، قمر بدایونی اور عظیم بیگ چغتائی کے انتقال کی خبر ہے۔ ہر ایک کی بابت مختصر تعزیتی نوٹ بھی ہے جواں مرگ آرزو کے بارے میں لکھا گیا ہے:

"مولوی شرف عالم آرزو جلیلی مرحوم جالہ (دربھنگہ) کے مشہور وکیل مولوی عبدالجلیل صاحب کے فرزند تھے۔ آپ پٹنہ یونیورسٹی کے مایۂ ناز طلبا میں تھے۔ ایم۔ ایس سی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد بی۔ این کالج پٹنہ میں پروفیسر ہو گئے۔ مرحوم ادیب، افسانہ نویس، شاعر، ماہر سائنس مترجم اور موسیقی کے استاد تھے۔"

اس شمارے کی مشتملات کی مجموعی تعداد ۱۹ ہے، اس میں منظومات سترہ ہیں، شاعروں کے نام یہ ہیں: مولانا سید محمد طٰہٰ الٰہی فکری، صدیق نیرنگ، ثاقب کانپوری، سید محمد کریم تمنا دربھنگوی، غوثی، اختر قادری، مائل، جلیل احمد قدوائی، ادیب مالیگانوی، مولوی محمد محسن، بابو لعل بہادر پرشاد گویا، عبدالخالق بہار کانپوری، اخگر سیمابی، سلام مچھلی شہری، نصیرہ راز، عبدالودود شمس بھسولوی، مظفر پوری شمسی، انسیمہ سوز۔

اختر قادری اُن دنوں چندر دھاری متھلا کالج دربھنگا میں اردو اور فارسی کے لکچرار تھے۔ بیس سال بعد جمیل مظہری سے ایک مذہبی مکالمہ کے سلسلے میں عرصے تک زیرِ بحث رہے۔ "ہمالہ" کے زیرِ نظر شمارے میں ان کی جو نظم شامل ہے، اس کا عنوان ہے "شیوۂ مردانہ گیر" اور اس پر شاعر کی جانب سے ایک مختصر نوٹ ہے: "دربھنگہ کی ایک بزمِ مشاعرہ کی شرکت کی دعوت کے جواب میں"۔ کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے:

بزمِ عشرت کی صلائے عام رہنے دیجیے
معاف کیجے، اپنا یہ پیغام رہنے دیجیے

کوندتی ہیں بجلیاں گھر کو جلانے کے لیے
آپ کہتے ہیں مجھے ملہار گانے کے لیے

چپّے چپّے میں بپا ہے شورِ گیر و دار کا
آپ ہی فرمائیے، یہ وقت ہے اشعار کا

اور آخر میں یہ پیغام ہے:

چھوڑ کلکِ نغمہ آرا، کام لے شمشیر سے
پھر ہلا دے اک جہاں کو نعرۂ تکبیر سے

ترقی پسندی اور اسلام پسندی کے امتزاج سے اس نظم کی تشکیل ہوئی ہے۔ اس کے برعکس "مولوی محمد محسن صاحب بی۔ اے" کی نظم "برسات میں بتیا کا تصور" زیادہ شخصی اور زیادہ ارضی ہے۔ اس کا بے تکلف طرزِ بیان

متاثر کرتا ہے۔ اس وقت کی عمومی شعرگوئی کے مزاج سے الگ اور اس زمانے میں مقبول ہوتی ہوئی نئی شاعری سے یہ نظم زیادہ قریب معلوم ہوتی ہے۔ یہ وہی محمد محسن ہیں، جن کی دو تین غزلیں محسن مظفرپوری کے نام سے چھپیں، اور پھر ان کے دو شعری مجموعے "تلخ و شیریں" اور "نغمہ و نالہ" محسن دربھنگوی کے نام سے شائع ہوئے۔ اب اسی نام سے متعارف ہیں۔ ان کی زیرِ تذکرہ نظم کے چند اشعار پیش ہیں:

(بتیا شہر دربھنگہ کا ایک مشہور محلہ اور سڑک ہے)،

وہی بتیا کی سڑک جس پہ چلا ہوں برسوں
گود میں جس کے نظاروں کی پلا ہوں برسوں
جس کے پتّوں کی زباں پر ہے کہانی میری
جس کی مٹی میں سموئی ہے جوانی میری
رنگ اور روپ کی وہ موہنی مایا دیکھوں
جل میں ہریالے گھنے پیڑوں کی چھایا دیکھوں

موڑ پر چھاؤں میں املی کے وہ پاسی خانہ
مست ہو ہو کے وہ رندوں کا ملہار سا گانا
آج املی کے تلے ہوگا یقیناً جمگھٹ
پاسی خانے میں نہیں بچنے کی ہرگز تلچھٹ
ان مناظر کا پھر اک بار تماشا کیجیے
یاد گذرے ہوئے ایام کی تازہ کیجیے
پھر کے گھر آئیے جب خوب اندھیرا ہوجائے
کم سے کم کوس سوا کوس کا پھیرا ہوجائے

"ہمالہ" کے اس شمارے میں قاضی نذرالاسلام کی ایک نظم کا ترجمہ بھی "مرتضیٰ مولیٰ از ہمہ اولیٰ" کے نام سے شامل ہے۔ مترجم "مولانا مظہر احمد صاحب ممتاز المحدثین" ہیں۔

طبع زاد افسانوں کی تعداد چار ہے۔ "رسموں کا مارا"، "شہنشاہ کی خودکشی"، "پناہ" اور "نقش بر آب"۔ افسانہ نگاروں کے نام بالترتیب یہ ہیں۔ فدا علی خنجر لکھنوی، شہزادہ ایاز، چندر کمار ایم۔ اے اور شش مظفرپوری۔ آخر الذکر کا افسانہ زبان و بیان اور تاثر کے لحاظ سے غنیمت ہے۔ چندر کمار ایم۔ اے کے نام سے بھی شش مظفرپوری نے ہی لکھا ہے۔ دوسرے افسانوں کی طرح یہ بھی معمولی ہے۔ ۱۹۴۱ء میں اردو افسانہ شباب کی سرحدوں میں داخل ہوچکا تھا لیکن "ہمالہ" کے افسانے عموماً اس دورِ بلوغت کا احساس نہیں دلاتے "سراج کا سہارنپور" کے نام سے صغیر احمد کا ترجمہ کردہ ایک ہندی افسانہ بھی شاملِ شمارہ ہے۔

مضامین کا حصہ بہتر ہے اور تنوّع کا احساس دلاتا ہے۔ عنوانات ملاحظہ ہوں: "ہندوستانی صحافت پر ایک نظر" (عبدالرشید ساغر مخدومی) "جمہوریہ لیبریا" (وسیم قادر بسنتی، دربھنگہ) "حالی بحیثیت سوانح نگار" (مولوی انوار الحق) "عورت اور مرد" (حور بانو دہلوی) "اسکندریہ کی قدیم یونیورسٹی" (وحشی آروی) "موسیقی" (مائل) اور "مسلمانوں کی آئندہ تعلیم" (سید سلیمان ندوی)۔ آخر الذکر مضمون کی تیسری قسط شاملِ اشاعت ہے۔ اس کے بعد رسالہ ہی بند ہوگیا اور اس میں مکمل مقالہ نقل نہ ہوسکا۔

نثر میں چھوٹے چھوٹے شعریت آمیز ٹکڑوں کا ان دنوں بہت چلن تھا۔ عموماً انھیں "ادبِ لطیف" یا "ادبی پارہ" کہا جاتا تھا۔ "ہمالہ" کے اس آخری شمارے میں بھی اس نوع کی کئی چیزیں ہیں۔ ایک تو "تنویر نا گہاں" کے عنوان سے ہندی کا ترجمہ ہے۔ مترجم کی حیثیت سے شیدا کیوروی کا نام ہے لیکن فہرستِ مضامین میں مترجم کا نام سعیدہ پیکر دیا ہوا ہے۔ سعیدہ پیکر، شیدا کیوروی (جو بعد میں شیدا امام کے نام سے پہچانے گئے) کی اہلیہ تھیں۔ پتہ نہیں ترجمہ کس نے کیا تھا۔

ٹیگور کے ایک ادب پارے کا ترجمہ بھی انگریزی سے "ماں ٹیگور" کے عنوان سے وسیم قادر بسنتی دربھنگوی نے کیا ہے۔ یہ ادب پارہ "وشوا بھارتی" کی اشاعت یکم جولائی ۱۹۴۱ء میں "ریوری" (Revenie) کے نام سے شائع ہوا تھا۔ ادبِ لطیف کے دوسرے نمونوں کے عنوانات اور مصنف کے نام اس طرح ہیں۔ کہاروں کا گیت (خالد مہدولوی) سفر (پیامی)، تو کون ہے (گم نام پریمی) اور آرزو (شیدا کیوروی)۔

حسن مرتضیٰ خالد شہر دربھنگا کے محلہ مہدولی کے رہنے والے تھے مشہور وکیل حسن جان صاحب کے بڑے بیٹے۔ پٹنہ میں ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ تقسیم ہند سے کچھ پہلے کراچی چلے گئے تھے مگر وہاں کی آب و ہوا راس نہ آئی، مختصر سی علالت کے بعد ۱۹۴۷ء میں ہی کراچی میں انتقال ہوگیا۔ شعر و ادب کا ستھرا ذوق تھا۔ تذکرہ "مسلم شعرائے بہار" مؤلفہ حکیم سید احمد اللہ ندوی (مطبوعہ نیشنل پریس، کراچی) میں انھیں خالد دربھنگوی کے نام سے متعارف کرایا گیا ہے۔ "ہمالہ" کے شمارہ ۳ (اگست ستمبر ۱۹۴۱ء) میں "کہاروں کا گیت" عنوان کے نیچے درج ہے۔

"اردو ادب میں بالکل نئی اور فطری چیز (ہمالہ کے لیے مخصوص)" اس سے قطع نظر، خالد مہدولوی کے اس "ادب پارے" میں جسے ادبِ لطیف، نثری نظم یا نثرِ لطیف کوئی بھی نام دیا جائے، ایک خاص کیفیت ہے۔ میں اسے من و عن نقل کر رہا ہوں:

(بقیہ صـ ۴۴ پر)



اختر بستوی

تذکرہ تھا غیر ضروری سی بات کا
ن بن گیا جو کئی سانحات کا

مکاں کی، قبر کے کتبے میں ڈھل گئی
سلہ بھی خوب ہے تشہیرِ ذات کا

ج کی آنکھ پاؤں تو شاید دکھائی دے
ابناک مجھ کو بھی چہرہ حیات کا

ہے اِک گھٹن سی خیالات کے لیے
ہو دِل پہ ابر اگر خواہشات کا

ہاں کی راہ میں وہ ہوگیا ہے گم
ں کو ملا ہے راستہ اپنی نجات کا

ر نہ ہوگا فن سے عیاں حسنِ معنوی
گے تم بھی کھیل جو مبہم نکات کا

شعبۂ اُردو، یونیورسٹی آف گورکھپور، گورکھپور

عجب اُڑان تھی ہم بھی کہاں نکل آئے
چھٹا غبار تو سات آسماں نکل آئے

بپا ہے شورِ مسلسل محاذِ باطل میں
کوئی تو صاحبِ تیر و کماں نکل آئے

کوئی تو خواب ٹھہر جائے اپنے منظر میں
کوئی نگارِ شبِ درمیاں نکل آئے

کبھی تو ٹوٹے سکوتِ سوادِ مجبوری
کہیں تو کوئی جوازِ فغاں نکل آئے

ابھی الجھنے نہ دینا خرد کے رشتوں کو
نہ جانے کب کوئی کارِ جہاں نکل آئے

نکل چلو کہ یہ صحرا ہے تپتے لمحوں کا
کہیں نہ ہونٹوں سے باہر زباں نکل آئے

نہ جینے دے گا مجھے رمزؔ شہرِ دلّی بھی
یہاں بھی اپنے کئی مہرباں نکل آئے

محمد احمد رمز

۲۵۷/۳۰، (ایکسٹینشن) ترلوک پوری، دہلی ۱۱۰۰۹۱



حیات لکھنوی

کیسے سمجھاؤں میں تجھ کو اے وفا نا آشنا
اپنی تاثیروں سے ہے تیری ادا نا آشنا

میں جہاں آواز دیتا ہوں کوئی سنتا نہیں
جیسے مجھ سے ہوگئی ساری فضا نا آشنا

کس طرف بارش ہوئی ہے کس طرف شعلے اُٹھے
اس حقیقت سے رہی موجِ ہوا نا آشنا

سلسلہ کوئی نہیں ہے عبد اور معبود میں
مدّعا سے ہوگیا دستِ دعا نا آشنا

قربتیں یوں دوریوں میں ہوگئیں اُوجھل حیاتؔ
ایک سے لگنے لگے سب آشنا نا آشنا

۵، امامیہ ہال، پنچکوئیاں روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

دوہے

دیکھا میں نے چمن چمن ، رائج یہی اصول
کانٹے میرے پاؤں میں ، اُن کے ہاتھ میں پھول

ادب ہو یا تہذیب ہو ، کاج ہو یا بیوہار
سب پر اپنی چھوڑ گیا ، چھاپ "سمندر پار"

دل ہے وہ آئینہ جو ، اپنی آپ مثال
دیکھا زد سے شبد کی ، پڑتے اس میں بال

شُکرِ خُدا ہے بیت گیا ، شک کا دورِ عذاب
جب سے دل بیدار ہے ، عقل ہے محوِ خواب

تیر چڑھی کمان کا ، دیتا ہے دل چیر
اُتری ہوئی کمان کی ، دیکھی ہے تاثیر؟

میں ہوں لوحِ وجود پر ، ایسا ایک سوال
چُپ ہیں مرے جواب میں ، دن ، مہینے ، سال

دھرے دھرے یا نہیں دھرے ، کوئی اپنے کان
بستی بستی گھوم کر ، دیتے رہو اذان

ناوک حمزہ پوری

پوسٹ آفس شیر گھاٹی ۸۲۴۲۱۱ ، ضلع گیا (بہار)

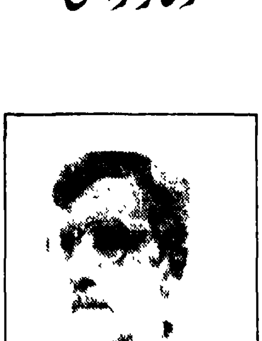
کہتی ہو بے چین دِل سپنوں سے بہلاؤں
ندیا بھی وہ لے گئے سپنے کہاں سے لاؤں

برہ کی راتوں میں کوئی ، میٹھی نیند رچائے
دوں گی اُسے شراب میں ، نیند کبھی نہ آئے

یہ ہے من کی کامنا ، آکر وہ سُلجھائے
اے ری سکھی میں کیا کروں ، جوڑا کُھل کُھل جائے

چندا اُن سے گر کہیں ، تیری نظر مل جائے
کہنا اب کے ورش تو ، آم بہت گدرائے

وقار واثقی



۱۵۲۵ ، رسول آباد ، احمد آباد ۲۸

جا بیٹھی اندھے کنوئیں ، پریوں کی بارات
راج محل پہچان بھی ، تو اپنی اوقات

شیامل کیش بکھیر کر سو گئی کالی رات
اور سپنے سہتے رہے پل پل بجر آگھات

کمرے میں جلتا رہا شعلوں کا اُتپات
اور چھت پر لیٹی رہی ٹھٹھرن اوڑھے رات

دِن دِن بڑھتی فائلیں ، کبڑی ہوتی میز
دُلہن میرے بھاگ کی لائی خوب جہیز

بہو رنگی چھتری تلے ، چھایا بنتی دھوپ
گھونگھٹ سے چھنتا ہوا جوں گوری کا روپ

ٹھور ٹھکانہ پائے کیا ، مانوتا کا مَرم
ہر رستے پر ذات ہے ہر نکڑ پر دھرم

ڈر پایا جاتا رہا ، من آیا سندیہہ
یوں بڑھتا پھلتا رہا ، بڑھتا ، پھلتا نیہہ

احترام اسلام

۵۴۷ ، اتر سوئیا ، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳

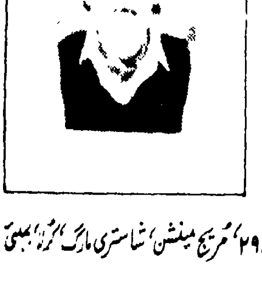
شتاق مومن

تازہ خون میں ملی ہوئی مٹی

اس نے سپاٹ نظروں سے نیچے
یکھا۔
کُہرے کا دبیز پردہ ہر شے کو
ی آغوش میں لینے لگا تھا' درختوں کے
نڈ ہیولے کی شکل میں سر اُٹھائے کھڑے
ے ۔ نیچے بہتی ہوئی ندی درختوں کے جھنڈ
ے گزرتی ہوئی کوڑیالے سانپ کی طرح لگ
ہی تھی اور دور کہیں کوئی جھیل چوّنی کی
رح چمک رہی تھی اور وہ بُت بنا اپنے
انوں سے دل کی دھڑکن سنتا رہا۔ یہ منظر
ور یہ آسودہ خامشی' اس کا جی چاہا یہیں
مر جائیے۔ اچانک ایک بہت بڑا پتھر جو مدّت
سے انسانی لمس سے نا آشنا تھا اپنی جگہ سے
اُکھڑا اور پُر شور آواز میں نیچے لڑھکتے ہوئے
ڈھلان کی رکاوٹ کو تہ و بالا کرتے ہوئے نیچے
گرنے لگا اور اس شور سے یک لخت پرندوں
کا آرکسٹرا شروع ہوگیا۔ اس نے اُوپر دیکھا
اس کے والد دونوں ہاتھ کمر پر رکھے خاموشی
کی زبان میں اس سے گویا تھے۔

. . . فضا پر سکون تھی اور درختوں
پر شام تھک کر بیٹھ گئی تھی سورج درختوں اور
جھاڑیوں میں کہیں روپوش تھا۔ شبّان
اپنے کاندھوں پر تھکی ہوئی بھیڑ کو اٹھائے
ہاتھ سر کہتے ہوئے گلّے کو ہانکتا چلا جا رہا تھا کہ
اچانک اُسے وہی آواز سُنائی دی جس کے
بارے میں اس نے بہت کچھ سُن رکھا تھا اس
کے کان کھڑے ہوگئے۔ اچانک چند لمحوں
بعد پھر وہی آواز آئی جیسے زندہ ہڈّیاں کڑکڑائی
ہوں اور دوسرے ہی لمحے شبّان نے پھرتی
سے تھکی ہوئی بھیڑ کو زمین پر اُتارا اور چوکنّا
ہوگیا پھر اسے لگا جیسے کسی نے پتھریلی زمین پر
کڑاک سے ناریل توڑا ہو' ہاں وہی ہے شبّان
اپنے آپ سے بولا شاید آج میری باری ہے
اس نے کمر سے کلہاڑی نکالی اور بے جگری سے
تیّار ہوگیا چند منٹ کی جان لیوا خاموشی پھر
اس کے بعد اگر بتی جیسی خوشبو تیز سے تیز تر
ہوتی گئی اور ایسی آہٹ ہونے لگی جیسے کوئی
وزنی سی شے گیلی زمین پر دبے قدموں چل
رہی ہو بھد' بھد' بھد معاً شبّان کو موقع
کی نزاکت کا احساس ہوا اس نے ایک
طویل جست لگائی اور بستی کی سمت بھاگنے
لگا۔ اس کے کانوں میں سائرن بجنے لگے
تھے . . .

اس نے سر اُٹھا کر دیکھا اس کے
والد اسی طرح کھڑے تھے "ابا ــــ ابا"
اس نے کہا اور بڑی بے دلی سے اُٹھ کر بھاری
قدموں سے اُوپر چڑھنے لگا' اوپر پہنچ کر اس
نے ایک نظر نیچے ڈالی اور سورج کو غروب
ہونے کا اشارہ کیا' سورج نے اس کے حکم
کی تعمیل کی اور کہیں اور اُجالا کرنے کے لیے
پہاڑ کی چوٹی پر ہاتھ رکھ کر نیچے اُتر گیا۔
اکثر ایسا ہوتا تھا کب سے' اسے ٹھیک
سے یاد نہیں جب کبھی اس کے والد قرآن پاک
کی تلاوت کرنے یا کبھی وظیفہ پڑھنے کے لیے
پہاڑ کی اس بلندی پر آتے تو اسے ضرور ساتھ
لاتے اس کے والد تو کتابِ مقدّس کے ساتھ
قریب کے ایک غار میں چلے جاتے اور وہ
ڈالفن کی طرح اُبھری ہوئی اِس چٹان پر
آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا اور نیچے بہت نیچے
اُس بستی کے منظر میں گُم ہو جاتا۔ وہ بستی جو
کبھی اس کے والد کا وطنِ مالوف تھی گھنٹوں
وہ بغیر پلک جھپکائے اسے دیکھتا رہتا اور
کبھی کبھی تو اسے احساس ہوتا جیسے وہ پیراشوٹ
باندھے آہستہ آہستہ نیچے وادی میں اُترتا جا رہا
ہے اور دھندلی دھندلی چیزیں دُھند کا
لبادہ اُتار اُتار کر اس کے سامنے واضح ہوتی
جا رہی ہیں گھر' مکانات' سڑکیں' میدان'
ندیاں' قلعے' تاریخی عمارات' اسلحہ ساز
فیکٹریاں اور نہ جانے کیا کیا۔ نیچے والوں کی
شکلیں واضح ہوتی جاتیں اسے ایسا بھی محسوس
ہوتا جیسے نیچے والے ہاتھ ہلا ہلا کر اسے بُلا
رہے ہوں یا کبھی ایسا بھی لگتا کہ لوگ سنگینیں
تھامے اس کے زمین پر اُترنے کا انتظار کر رہے
ہوں۔ اور اس سے پہلے کہ ان کی شکلیں واضح
ہوتیں ــــ ایک بڑا سا پتھر لڑھکتا اچانک



۲۹۸/۱۹، مرتیج مینشن، شاستری مارگ، کرلا، بمبئی . . .

پرندوں کا آرکسٹرا شروع ہو جاتا وہ سر اٹھا کر اوپر دیکھتا اس کے والد مخصوص انداز میں کھڑے ہوتے وہ سورج کو غروب ہونے کا اشارہ کرتا اور بھاری قدموں سے اوپر چڑھنے لگتا۔

ویسے تو وہ ایک فرماں بردار بیٹے کی طرح اپنے والد کو چاہتا تھا مگر ایک بات پر ان سے متفق نہیں تھا اور ہر روز کسی نہ کسی موضوع پر وہ بات ہوتی اور خاندان کے سبھی افراد جمع ہوتے تو وہ ایک بات کسی نہ کسی طرح ان کے بیچ آجاتی اور . . .

چاروں طرف کہرے کا غلاف تھا اور اس غلاف میں آسمان کی طرف سر اٹھائے مسجدوں کے مینار با ادب انداز میں کھڑے تھے اور ٹھیک ان کے اوپر وہ پرندے کی طرح فضا میں پرواز کر رہا تھا اس نے شپیرین کی طرح اپنے دونوں ہاتھوں کو ذرا سا نیچے کیا اور لہرا کر اور نیچے آ گیا تازہ ہوا سے اس کے نتھنے جلنے لگے تھے مگر اس طرح ہوا میں اُڑتے ہوئے اسے بہت بھلا لگ رہا تھا۔ ایک عجیب سی مستی، عجیب سی ترنگ اور عجیب سی سرشاری کی کیفیت سے وہ دو چار تھا نہ جانے وہ کب تک بے کراں فضاؤں میں اُڑتا رہا کہ اسے احساس ہی نہیں رہا کہ وہ بہت نیچے آچکا ہے چونکا تو وہ اس وقت جب اس نے دیکھا کہ نہ جانے کہاں سے ایک ترشول فضا میں بلند ہوا اور برق رفتاری سے اس کی سمت بڑھنے لگا اس نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے اوپر اٹھنا چاہا مگر اسے لگا جیسے اس کا پورا بدن سُن ہو گیا ہے اور وہ فضا میں معلق ہے اور ترشول پھلجھڑی کی طرح شور کرتا اور جگمگاتا اس کی سمت بڑھتا ہی چلا آرہا ہے اس سے بچنے کی خاطر اس نے ایک دل دوز چیخ ماری . . .

اور گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ باہر سے چیخنے اور چلّانے کی آوازیں آرہی تھیں اس نے دیکھا کہ اس کے والد دروازے سے کان لگائے باہر کی سن گن لے رہے ہیں، چیخوں کی آوازیں مسلسل آرہی ہیں اور ان سے تال میل ملاتی گولیوں کی آوازیں بھی آرہی ہیں پندرہ بیس منٹ تک یہ قیامت برپا رہی پھر سب کچھ شانت ہو گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو —— پہلے ایک سرگوشی، پھر قدموں کی ایک چاپ، کہیں کوئی کھڑکی وا ہوئی، کوئی دروازہ کھلا اور شور آہستہ آہستہ بڑھنے لگا اپنے والد کے ساتھ وہ بھی باہر نکلا اور اندھیرے میں اندھوں کی طرح گھورنے لگا۔ ہوا کے دوش پر سوار عورتوں کے بین کرنے کی آواز کہیں دُور سے آتی ہے اور پھر معدوم ہو جاتی ہے اچانک اس کی پھوپھی سینہ کوبی کرتے ہوئے باہر آتی ہے اور اپنے بیٹے چراغ دین کا نام لے لے کر دہائی دیتی ہے ٹھیک اسی لمحے اندھیرے کا سینہ چیر کر کوئی نمودار ہوتا ہے اور ہانپتے ہوتے کہتا ہے۔

آج پھر نقاب پوشوں نے حملہ کیا تھا چلو آپ لوگ اندر چلو ابھی کچھ دم میں پولیس آنے والی ہے۔

آنے والا کوئی اور نہیں میری پھوپھی کا لڑکا چراغ دین ہے اور اس کے ہاتھوں میں کلاشنکوف ہے۔

مسلسل سائرن اس کے کانوں میں بجتے رہے اور وہ مثلِ صبا اڑا جا رہا تھا مگر وہ آواز بتدریج قریب آتی جا رہی تھی عجیب سی آواز دھد، دھد، دھد جیسے کوئی وزنی سی شے گیلی مٹی پر تیزی سے دوڑ رہی ہو لمحہ لمحہ فاصلہ اس عفریت اور شبّان کے بیچ کم اور زیادہ ہوتا جا رہا تھا مگر اس عالم میں شبّان نے کلہاڑی نہیں چھوڑی تھی حالانکہ اس کے وزن کی وجہ سے اس کی رفتار میں فرق پڑنا شروع ہو گیا تھا مگر اگربتی جیسی وہ خوشبو اور رہ رہ کر آتی ہوئی وہ آواز جیسے کسی نے پتھریلی زمین پر ناریل توڑا ہو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تعاقب بدستور جاری ہے اور زندگی کسی بھی لمحے موت میں بدل سکتی ہے۔ بستی قریب آتی جا رہی تھی اور شبّان خود میں توانائی اور طاقت محسوس کرنے لگا تھا بس ایک دفعہ فصیل الانگ لوں پھر میں اور میرے ساتھی ہوں گے اور یہ عفریت۔ شبّان کی سوچ بھی تیزی سے دوڑ رہی تھی۔

ایک ہی جست میں شبّان نے فصیل الانگی اور جیسے ہی اس کے قدم زمین پر پڑے اس میں ایک نئی قوت جنم لینے لگی اس نے پھر بھاگنا شروع کیا ساتھ ہی وہ اپنے ہم سنوں اور ہم وطنوں کو آواز بھی دیتا جا رہا تھا، اس کے اپنے، اس کے ساتھی، پاس پڑوسی، بستی والے بستی روشن ضرور تھی مگر گھروں کے دروازے بند تھے، ہر گھر میں روشنی موجود تھی لیکن کہیں کوئی دروازہ کھلا ہوا نہیں تھا اور وہ مہلک اور وہ عجیب سی آواز جیسے کوئی گیلی مٹی پر دوڑ رہا ہو اور شبّان مسلسل آواز دے رہا تھا۔

پہلے مشرقی افق پر ایک باریک سی چاندی کی لکیر ابھری پھر آہستہ آہستہ بالکل غیر محسوس طریقے پر جیسے بچے بڑے ہوتے ہیں

پتا نہیں چلتا مشرقی سرے سے صبح کاذب
ر پھیلنا شروع ہوا تو آسمان پر چاند نے
وں سے رختِ سفر باندھنے کو کہا سر سو
ی خلاقی اور نقش گری کا جلوہ عام ہونے
جھاڑیوں میں کسی گل دم نے نند اسی آنکھیں
ولتے ہوئے دن کی پہلی چہکار بھری، دور کہیں
یوں کے جھنڈ میں بیٹھی ایک چڑیا نے یہ
کار سن کر اپنے پروں میں سے سر نکالا
ر ایک سریلی آواز کے ساتھ صبح کی بشارت
ی اور پھر ایک دم چڑیوں کی چہکار سے
ضا گونج اٹھی پھول اور پتے جلدی جلدی
بنم سے وضو کرنے لگے کہیں کوئی بیج زمین
یں کسمسایا اور بستی کے لوگ جاگ اٹھے تو
انھوں نے دیکھا کہ علی الصبح شبّان ہاتھوں
میں کلہاڑی تھامے دیوانگی کے عالم میں بستی
کے چکر لگا رہا ہے اس کے منہ سے جھاگ بہہ
رہا ہے، چہرے پر تناؤ ہے اور وہ بستی
والوں کو مسلسل آواز دیے جا رہا ہے پکار
رہا ہے۔ اے بستی والو ___ میری آواز سنو،
دروازہ کھولو ___ بستی کے اطراف اس کے
قدموں کے نشانات نے ایک حصار سا کھینچ
دیا ہے اور وہ ہاتھوں میں کلہاڑی تھامے
برابر پاگلوں کی طرح بستی کے اطراف چکر
لگا رہا ہے۔

وہ دن اور آج کا دن ___ اس میں
کئی نسلوں کا فاصلہ ہے مگر میں وہ رات کبھی
نہیں بھول سکتا جب بستی کے کسی باسی نے
میری پکار پر دروازہ نہیں کھولا تھا اس کے
والد جیسے اپنے آپ سے ہم کلام ہوئے تھے۔
پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھے شمع کی لو
تیز کی اور دروازے کی جھری میں سے باہر
دیکھنے لگے باہر پر ہول سناٹا چھایا ہوا تھا۔
نیند کی پریاں میٹھی میٹھی لوریاں سنا کر جاگنے
والوں کو سلا چکی تھیں۔

اس اندھی اندھیری رات میں کہیں کہیں
ویڈیو کے شور کو سن کر کون کہہ سکتا تھا کہ
ابھی ابھی کچھ دیر پہلے اس کالونی میں شورش و
ہنگامہ تھا اس نے دوسرے کمرے میں جھانک کر
دیکھا چراغ دین سو رہا تھا اور اس کے ہاتھ
کلاشنکوف کو تھامے ہوئے تھے۔

"سوؤ گے نہیں ___" شبّان اپنے
بیٹے سے مخاطب ہوئے تھے۔

"بجلی کب آئے گی ابّا حضور ___"
ابن شبّان بے خودی میں بولا تھا۔

"بجلی کا کیا ہے وہ تو آتی جاتی رہتی ہے،
لوگ تو عادی ہو چکے ہیں اس بات کے بسو جاؤ
بیٹے، مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔"

اس کے والد شبّان بولے تھے ضرور مگر
لہجے میں خلوص اور سچائی کا فقدان تھا۔

"بتی بجھا دوں" وہ پھر بولے۔

"ہاں" ابن شبّان نے کروٹ بدل کر
منہ اپنے والد کی طرف کر لیا۔

جٹ کی آواز سے بتی بجھی کچھ دیر کے لیے
کمرے میں اندھیرا چھا گیا مگر پھر روزنوں اور
جھریوں میں سے دودھیا روشنی کی کرنیں
کمرے میں در آئیں۔

"ابّا کیا سچ مچ وہ عفریت آپ کا
تعاقب کر رہا تھا؟"

"بیٹے پرانے زخموں کو چھیڑنے کی یہ عادت
تمھیں کب سے پڑ گئی ہے۔"

"نہیں ابّا میں جاننا چاہتا ہوں گزرے
ہوئے دن گزرے ہوئے واقعات ایک ایک
واردات۔"

"کیا کرو گے جان کر؟"

"ابّا جب تم بستی چھوڑ کر یہاں آئے
تھے تو میں تمھاری گود میں تھا۔ آج میں بڑا ہو گیا
ہوں اور جاننا چاہتا ہوں کہ کیا واقعی۔"

والد اس کی بات کاٹ کر اس سے
ہم کلام ہوئے۔

"سنو ___ میں نے چاہا، میرا دل
کھٹا ہو گیا اور وہ بستی میں نے چھوڑ دی اور
یہاں چلا آیا میرا یہ اقدام کتنا ضروری تھا
کتنا غیر ضروری کتنا صحیح تھا کتنا غلط آج
اس موضوع پر بحث کرنا فضول ہے۔"

"یہ بحث نہیں ہے۔ بل کہ ایک سوال
ہے، کل میں چھوٹا تھا نہیں پوچھ سکا مگر آج..."

"ہاں تم بھی پوچھنا چاہتے ہو نا کہ میں ___"
اس کے والد شبّان اٹھ کر بیٹھ گئے تھے ___
کہ میں جس کلچر اور جس تہذیب کو اپنے سینے
سے لگا کر یہاں آیا تھا اس کا کیا ہوا۔ اس
کے والد ہنس کر بولے تھے ایسی ہنسی جس میں
آنسو اور آہیں ہوتی ہیں۔

"اور اب میں یہاں کتنا مامون و
محفوظ ہوں کتنا خانماں برباد، ہے نا؟ تو
سنو اس کا جواب تم ہو صرف تم۔"

ابن شبّان نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"ابّا حضور آپ وہاں سے سب کچھ سمیٹ
لائے تھے یا کچھ بھول آئے تھے؟"

"سنو بیٹے۔ بحث کا یہ موقع نہیں
رات بہت ہو گئی ہے اب چپ چاپ سو جاؤ۔
اور ہاں سونے سے پہلے سورۃ الناس پڑھ کر
اپنے چاروں طرف پھونک لو ورنہ پھر
برے برے خواب آئیں گے۔"

نہ جانے وہ رات کا کون سا پہر تھا جب ایک بار پھر گولیوں کی تڑ تڑاہٹ سے ان سب کی آنکھیں کھل گئیں۔ ایک بار پھر صورِ اسرافیل پھونکا گیا اور افراتفری مچ گئی۔ اور شور بڑھنے لگا اس شور میں کہیں کہیں نعرے بھی بلند ہو رہے تھے:

شیشہ نہیں فولاد ہیں ہم
مہاجر کی اولاد ہیں ہم

موذّن مرحبا بروقت بولا' مگر پرشور آوازوں' چیخوں اور دل ہلا دینے والی آہوں میں اذان کی آواز بھی ڈوب گئی پندرہ بیس منٹ تک یہ افراتفری' نفسا نفسی کا عالم رہا اور جب صبح کے اجالے میں چیزیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ابن شبّان ایک پرانی مگر تیز اور چمکدار کلہاڑی سیدھے ہاتھ میں تھامے برق رفتاری سے کالونی کے چکّر لگا رہا ہے اس کے منہ سے کف بہہ رہا ہے' چہرے پر تناؤ ہے اور وہ یوں کالونی کے چکّر لگا رہا ہے جیسے کسی عفریت کا تعاقب کر رہا ہو یا جیسے کوئی عفریت اس کے پیچھے پڑا ہو۔

اور اس کے والد شبّان سوکھی اور جذبات سے عاری آنکھوں سے کبھی ابن شبّان کو دیکھتے ہیں جو جنونیوں کے انداز میں کالونی کے چکّر لگا رہا ہے اور کبھی اپنی ضعیف ماں کو جو اوندھے منہ گٹھری بنی پڑی ہے جیسے سجدہ کر رہی ہو' وضو کرنے کا مراد آبادی لوٹا الٹ گیا ہے اور وضو کرنے کا تازہ پانی' تازہ خون میں مل کر مٹی میں جذب ہو رہا ہے۔

OO

دو مختصر نظمیں

حساب

متحد + جمع
منتشر — تفریق
دوستی × ضرب
دشمنی ÷ تقسیم
زندگی کا حساب سیدھا سا

غریبی

غریبی جرم ہے
جس کی سزا ہے
شکستِ آرزو خونِ تمنّا

رحمت امروہوی
مرزا پور موڑ کاس واڑہ، نزد پرانا پاور ہاؤس، احمد آباد ۳۸۰۰۰۱

مُشک

یہ کیسا جادو
سارا جنگل مہکائے
آوارہ آہو

قیامت

زخمی پرچھائیں
سورج نیزے برسائے
گپ چپ ہے سائیں

قصاص

پیاسی ہیں روحیں
شعلہ شعلہ دریا ہے
جلتے جسموں ہیں

انتظار

پوچھے ہے کاجل
جانے اب وہ کب لوٹے
بھاری ہے پل پل

کشمکش

جل جاتا بستر
جسموں نے بجھا ڈالے
سب شعلے اندر

صابر زاہد
۱۸۰، بدکو کالونی، مالیگاؤں (ناسک)

ہائیکو نظمیں

(۱)

پتھریلا سا تل
برفیلی دہلیزوں پر
ہوتا ہے گھائل

(۲)

نابینا پاگل
کیوں لمحوں کی آنکھوں سے
لیتا ہے کاجل

(۳)

تجلیات
دکھی نظر کے لیے
حسیں حیات

(۴)

نازک سا نقطہ
لاکھوں رشتوں کا قاتل
پُر دہشت نقشہ

(۵)

شوریدہ منظر
بیٹھا ہے بوڑھا سورج
بادل کے رتھ پر

سیّد اولاد رسول قدسی
سیّد منزل، مرزا پور، پوسٹ آفس بھدرک ۵۶۱۰۰ (اڑیسہ)

بقیہ فرحت

لائن میں

(۱)

اکثر ہماری صبح دوپہر کو ہوا کرتی ہے۔
بھی قریب قریب یہی کیفیت تھی۔ سورج
فاسٹ ریل گاڑی کی رفتار سے دوڑتا
تا خاصی بلندی تک آگیا تھا۔
ویسے ہمارا خیال ہے کہ اس میں ہماری
ی سے زیادہ سورج کی برق رفتاری کا
ور ہے!
خیر خیر ___ تو دوپہر کا
انا وقت، نہا دھو کے، اخبار ہاتھ میں
کے ہم برآمدے کے مخصوص کونے میں
مخصوص میز پر مخصوص زاویے سے بیٹھ
۔ واضح ہو کہ اس زاویے سے عہدِ رفتہ
بڑا خوب صورت منظر دکھائی دیا کرتا تھا۔
آج اونچی بدشکل بدوضع بلڈنگ نے
دلفریب منظر پہ سنسر کی قینچی چلا دی۔
ہم عادت سے مجبور بیٹھتے وہیں ہیں۔
بیٹھتے ہی ہم نے اپنے پریر بچّہ COOK
ادر کی طرف چائے طلب نظروں سے دیکھا۔
اُس نے روز کی طرح خوشی سے
ائے شاب' کا نعرہ لگانے کے بجائے
زدہ ہوکر سر جھکا لیا۔
اتنے دنوں میں 'چائے شاب' کی
رت کا راز تو ہم جان گئے تھے کہ ہماری
ر چائے میں ان کا اپنا حصّہ بھی شامل تھا۔

کا مون سمجھ میں نہیں آیا۔
معاملات کو بغیر پیٹرول یعنی چائے کے سمجھایا نہیں جا سکتا تھا۔ اپنے ہی گھر میں مہمان کی طرح مُنہ پھوڑ کے کہنا ہی پڑا:
'بہادر چائے'۔
اب تو ان کی چشمِ نیم باز میں آنسوؤں کی نمی بھی تھی۔ ہم گھبرا گئے، پریشان ہوکر چاروں طرف دیکھا۔ گھر میں کسی حادثے کے آثار نظر نہیں آئے۔
پھر ___؟
ہم نے بصد اصرار ان سے اس پریشانی کا سبب پوچھا:
"بہادر ___ آخر بات کیا ہے"۔
وہ سِسک کے بولا "شاب چائے..."
"ارے تو بناؤ نا چائے۔ ابھی کا نو ہم گھنٹہ بھر سے انتظار کر رہے ہیں"۔
"شکر شاب ___؟"
"ہاں ___ ہاں ___ ڈالو۔ کوئی ہمیں شکر کی بیماری تو ہے نہیں جو شکر چھوڑ دیں"۔
"وہ تو آپ کو چھوڑنا پڑے گا شاب"۔
خیال ہوا ضرور کسی دوسرے بہادر یا تیسرے بہادر یا چوتھے بہادر نے اس کے کان بھرے ہیں۔ یا کسی بہادر کا سلسلۂ نسب کسی ڈاکٹر سے ملتا ہوگا۔
"بھئی کیوں چھوڑ دیں شکر ___" ہم نے

"شاب شکر کھلاس" انھوں نے گھن گرج کے ساتھ اطلاع دی۔
"رات کو تو ڈبے میں تھی" پولیس اور وکیل حضرات کے فیضِ صحبت اور اوٹ پٹانگ ٹی۔ وی سیریلز کی بنا پر ہم کچھ کچھ جاسوسی اور جرح کرنے لگے تھے۔
"وہ ہم پی گیا ___"
واضح ہو کر وہ چائے صرف شکر کی خاطر پیتے ہیں ___ یعنی کھڑا چمچہ ___!
پارہ ہمارا سورج کی طرح چڑھنے لگا۔
مگر غصّے کو ضبط کر کے کہ معاملہ نوکر کا تھا دھیمے بلکہ پیار بھرے لہجے میں کہا:
"تو دُکان سے لے آؤ ___"
اب ہمارے بجائے ان کا غصّہ بڑھنے لگا۔
"دُکان گیا ہے ___ چار ___ شکر نئیں ہے" ان کی زبان غالبؔ کے شعر سے کم نہیں لیکن پورے سال بھر کی ریاضت و محنت سے ہم اسے کسی قدر سمجھنے لگے تھے۔
تو مطلب ان کا یہ تھا کہ صبح سے چار دُکانوں میں گھوم آئے مگر شکر کہیں نہیں ملی۔
خیر ایک آدھ پیالی بغیر شکر کے ہم پی سکتے ہیں۔ کہ ابھی پچھلے دنوں آئے ہوئے امریکی رشتے داروں پہ رعب گانٹھنے کے لیے یہ ناٹک ہم کرچکے ہیں۔ لیکن اس سے آگے نہیں۔ سو اس کے لیے بہادر کی خوشامد ضروری تھی۔
"بہادر ___ کہیں تو مل رہی ہوگی؟"
"شہکاری بردار میں ہے" انھوں نے اکڑ کے اطلاع دی "وہیں سے لے آؤ"

"ہم گیا تھا ـــــ بولا ـــــ لین لگاؤ۔"

"تو لائن میں کھڑے ہو جاتے۔ واپس کیوں آ گئے؟"

" واپس نہیں آیا ـــــ" صوفیوں اور فلسفیوں کی طرح فرمایا۔

عجیب بے وقوف لڑکا ہے۔ گھر میں موجود ہے اور کہتا ہے۔ واپس نہیں آیا۔

"لین میں لگا ہوں۔ شاب"۔

" ابے تیرا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔ تو لائن میں لگا ہے"۔ ہمارا غصہ عروج پر پہنچ چکا تھا۔

" ہاں شاب۔ تنہکاری بر دار کی لین اپنے گھر تک آگئی ہے۔ شام تک لمبر لگ جائے گا۔ میں چلا اپنی جگہ پر ـــــ"

تیر کی طرح وہ دروازے کے باہر اور مُنہ پھر کے لائن میں لگ گئے۔

(۲)

دو نوجوان لڑکے جو کامرس گریجویٹ تھے (عہدِ رفتہ کے شبلی بی۔ کام کی طرح ـــ!) اور ملکِ عزیز و ملکِ عجیب و ملکِ غریب کے لاکھوں جوانوں کی طرح نوکری کی تلاش میں 'ٹاٹا' 'کرونا' اور لکھانی اینڈ لکھانی' قسم کی جوتا کمپنیوں کے بزنس میں اضافہ کر رہے تھے۔ صبح یا دوپہر۔ جو بھی آپ سمجھ لیں۔ کہ پھیر وقت کا نہیں زاویۂ نگاہ کا ہے۔ ہمارے پاس آئے۔

یہ وہی سہانی صبح ہے جس کا ذکر ابھی کیا جا چکا ہے۔ اور جو حالاتِ حاضرہ کی تلخی یعنی SUGAR LESS DAY کی بنا پر انتہائی بھیانک اور تکلیف دہ ہو چکی تھی۔ اُن کی آمد ہمارے لیے کبھی خوشی کا باعث نہیں ہوئی کہ وہ بیچارے حالات کے مارے' آتے تھے داستانِ غم سنانے۔ اور آج تو نیم چڑھا والا معاملہ ہو رہا تھا۔ خیر کرتے کیا۔ کہ نیم پر مزید چڑھنے کی گنجائش نہ تھی۔ نہ گھر چھوڑ کے بھاگنے کی سکت۔

آج خلاف معمول ان کے چہرے کھلے ہوئے تھے۔ مسرت اور مسکراہٹ تو متعدی امراض ہیں۔ اُڑ کے لگتے ہیں۔ سو ہم بھی مسکرا دیے کہ چارہ بھی اس کے سوا کچھ نہ تھا لیکن زیادہ دیر یہ سلسلہ قائم نہ رہ سکا مری ہوئی آواز میں پوچھا " آج تو بڑے خوش ہو میاں۔ شاید کوئی کام مل گیا ـــــ ؟"

دونوں بے حد ایکسائیٹڈ تھے۔ "جی ہاں۔ آپ کی دُعا سے لائن میں لگے ہیں۔"

" اچھا ـــــ کسی لائن میں لگ گئے۔ چلو ٹھیک ہے۔ لائن میں ہی لگے رہو۔ ایک نہ ایک دن موقع مل جائے گا۔ اِدھر اُدھر واہی تباہی پھرنے سے فائدہ ؟"

ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا لیکن کچھ بولے نہیں۔ اُن کی نگاہوں کی تیزی اور نظروں کے ترچھے تیوروں سے یہ اندازہ ہوا کہ ہماری عقل مندی اور سمجھداری پر انھیں زمانۂ ماضی کا سا اعتماد نہیں رہا۔ ٹالنے کی غرض سے ہم نے کہا ـــــ " مگر کچھ امید ہے ـــــ"

" امید کیا میڈم۔ اچھی خاصی آمدنی ہے۔" اور لفظ آمدنی کے ساتھ ایک چھوٹا سا خاکی پیکٹ جسے وہ اب تک چھپانے کی کوشش کر رہے تھے، سامنے کر دیا ہم سمجھ گئے کہ پہلی تنخواہ پر وہ ہمارے لیے تھوڑی سی مٹھائی لائے ہوں گے۔ مٹھائی کے نام پر ہمیں شکر کی یاد آگئی۔ ایک آہِ جگر سوز لبوں سے نکلی۔ یقین ہے کہ فلک میں شگاف کرتی ہوئی ساتویں آسمان تک پہنچی ہوگی۔ بھٹکتی روح کی طرح ہماری بھٹکتی نظریں پھر اسی خاکی پیکٹ سے جا ٹکرائیں ہوں گے اس میں لڈو، پیڑے، برفی ہمارے کس کام کے۔ اسے ہم چائے میں تو گھول کے پی نہیں سکتے۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ہم نے پھر بات میں بات نکالی۔

"کیا DAILY WAGES پہ ہو"

"یہی سمجھ لیجیے"۔

"کون سا ڈپارٹمنٹ ہے ـــــ"

"میڈم ...... وہ"

" ارے تو شرماتے کیوں ہو۔ کوئی بھی محکمہ ہو، تنخواہ ٹھیک ہے تو ڈٹے رہو۔"

"پیسہ تو اچھا خاصہ مل جاتا ہے۔ پر کام TEMPORARY ہے"۔ ان میں اب TEMPORARY سروس کی TEMPORARY ہمت پیدا ہو چلی تھی۔

"پرمننٹ بھی ہو جاؤ گے۔ لیکن ڈپارٹمنٹ تو بتاؤ۔ شاید کوئی پہچان کا نکل آئے"۔

ڈپارٹمنٹ کے نام سے دونوں بی۔ کام شرما کے بیا (B. A.) بن گئے۔ چھوٹے میاں ہکلا کے بولے:

"جی وہ لائن کا ڈپارٹمنٹ ہے"۔

" لائن کا ـــــ" اس نام کے کسی محکمے کی ہمیں خبر نہیں۔ کمبخت ہمارا امتحان

لے رہے ہیں ۔ مگر ہم ہار ماننے والے کب تھے ۔

" اچھا پولیس لائن میں ہو ــــ "

" نہیں میڈم ــــ "

" پھر ــــ "

" شکر کی لائن ــــ " اب کے سے شرمانے کی باری بڑے بی ۔ کام کی تھی ۔

" شکر کی لائن ــــ ؟ " ہمیں پھر مات ہونے لگی ۔" او ۔ ہو فوڈ ڈپارٹمنٹ ۔ ؟ یہ تو بہت ہی اچھا ہے ۔ یہاں تو جناب عبدالرزّاق کی حکومت ہوتی ہے ۔ انّا پورنا ۔ کھانے پینے کا کھاتہ بالکل الگ ــــ "

" ارے نہیں صاب ، وہ فوڈ نہیں ۔" چھٹکے اور بڑکے دونوں پہ گھڑوں پانی پڑگیا ۔

" پھر ــــ "

" شکر ۔" وہ ماتھے پر آئے پسینے کو پونچھ کے بولے ۔

" ارے بھئی ۔ شکر بھی تو فوڈ ڈپارٹمنٹ کے انڈر آئے گی ۔"

" نہیں میڈم ۔ آپ سمجھ نہیں رہیں ۔ شکر کھلے بازار میں کہاں مل رہی ہے گھنٹوں لائن میں لگو ۔ تب ملتی ہے ایک آدمی کو دو کلو ــــ "

" ہاں ــــ ہاں ــــ یہ تو ہے ۔ وہ ہمارا بہادر . . . "

ہماری اتنی اہم بات کو سنی اَن سنی کرتے ہوئے بڑکا بولا :

" تو میڈم گھنٹوں لگ جاتے ہیں لائن میں ۔ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ۔ ہم پیسہ لے کے دن بھر کسی نہ کسی کے لیے لائن میں لگے رہتے ہیں ۔"

" ابھی بھی لائن میں ہیں ــــ " چھٹکا چہکا ۔

بالکل پر یہ بچّہ ــــ والی بات ــــ

" لائن آپ کے گھر تک آگئی تھی ۔ ہم لائن میں لگے ہیں ۔ سوچا لائن میں لگے لگے آپ سے مل لیں اور آپ کو تھوڑی سی شکر بھی دے دیں ــــ " یہ کہہ کے انھوں نے وہ خاکی پیکٹ ہمارے ہاتھ میں پکڑا دیا ۔ اور یہ جا وہ جا ۔

چاے پیتے پیتے ہم نے سوچا شکر اسی طرح کھلے بازاروں سے غائب رہے تاکہ ایسے بہت سے بی ۔ اے ، بی ۔ کاموں کو روزگار ملتا رہے ۔

مگر سُنا ہے ۔ شکر کی حالت جلد ہی ٹھیک ہو جائے گی ــــ خیر کوئی بات نہیں کہ یہ بھی تو خبر گرم ہے کہ سویابین کا تیل آگیا ت اس میں جانے کا پروگرام بنا رہا ہے ۔

خدا سب کو رزق دینے والا ہے اور سرکار بڑی کارساز ہے ۔

نظیم اقبال

اُپج

اُس نے یہ کب سوچا تھا کہ یوں' بس دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ ہو جائے گا —— کتنوں سے' اُس نے سُنا تو بہت کچھ تھا' لیکن سُنی سُنائی باتیں جب تک دیکھ اور پرکھ نہ لی جائیں' اُن کا گمان تو ہوتا ہے' یقین نہیں ہوتا! ... لیکن اب' اُس کا گمان' یقین میں بدلنے لگا تھا۔

آئینے کے سامنے اُس نے اپنے سراپا کا جائزہ لیا —— اُسے تعجب تھا کہ اپنے ہی گالوں کی سُرخی یا اپنے ہی ہونٹوں کی چاشنی اب سے پہلے اُسے کبھی محسوس کیوں نہیں ہوئی تھی؟ اُس کی آنکھوں میں مستی بھی عجیب سی چھائی تھی! اُس نے ارادتاً ہی اپنا آنچل گرایا تھا اور اپنے ہی سڈول سینے کے اُبھاروں سے اُس کی آنکھیں خیرہ ہونے لگی تھیں! اُس کے نرم و نازک ہاتھ' گداز اُبھاروں سے پھسلتے ہوئے نشیب تک پہنچے تو وہ ہولے ہولے کانپنے لگی۔

اُس کا یہ رُوپ' اُس کے لیے' اب سے پہلے اجنبی بنا ہوا تھا۔ اُسے سب کچھ نیا نیا لگ رہا تھا۔ گویا خود سے اُس کی شناسائی اب سے پہلے ہوئی ہی نہ تھی! سچ! اب تک وہ ادھوری ہی تھی اور شاید اب وہ تکمیل کے مرحلے سے گزرنے والی تھی۔

اُس نے سوچا —— کپل اگر آجائے تو یونہی وہ اُسے یہ خبر نہ سنائے گی اُسے پہلے تھوڑا ستائے گی ... پھر' سنتے ہی وہ کھِل اُٹھے گا —— اُسے بانہوں میں بھر لے گا' بے اختیار کہے گا ——

"مندا! مجھے تو اس دن کا کب سے انتظار تھا!"

اُس کے گرد کستی ہوئی کپل کی بانہوں کے تصوّر سے وہ لجائی' شرمائی' سمٹی —— اپنے آپ میں سمٹتے ہوئے ہی اُسے خیال آیا کہ آج اگر ماں زندہ ہوتی تو منظر کچھ اور ہوتا! مائیں تو اس دن کے لیے پلکوں سے راہ دیکھتی آئی ہیں!

کہیں کچھ کمی تو تھی' لیکن اس کمی کے احساس نے مندا کے ذہن پر چھائی ہوئی نامانوس سی خوشی کی شدت کم نہ ہونے دی۔ وہ' جو اس کے بس میں نہ تھا' وہ جس پر وہ قادر نہ تھی' اُس کے بارے میں تردد کرنے سے فائدہ ہی کیا؟ —— یہ سوچیں ہی تو ہیں جو راتوں کی نیندیں اُڑا دیتی ہیں اور دنوں کے چین چھین لیتی ہیں! کپل نے اُسے سکھایا تھا کہ جو نہیں ہے' اُس کے بارے میں سوچو ہی نہیں ...

... لیکن وہ جو نہیں تھا' اب آ تو رہا تھا ... اس لیے مندا اُسے سوچنا چاہ رہی تھی —— اُس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں کیسی ہوں گی؟ ... اس کا ماتھا کیسا ہوگا؟ —— اُسی کی طرح کوتاہ؟ ... یا پھر کپل کی طرح —— کشادہ؟ اُس کے ہونٹ کیسے ہوں گے؟ اُس کی رنگت کیسی ہوگی؟

کہیں دُور سے آتی ہوئی اُس کی کلکاریاں بھی وہ سُن رہی تھی —— اُس کے کانوں میں مترنم سُروں میں —— گھنٹیاں سی بج اُٹھی تھیں —— اُس کے ننھے منّے قدموں کی چاپ بھی آہستہ آہستہ اُبھرنے لگی تھی ——

اُس نے سوچا' اُس کے آتے آتے تو سردیاں بھی آجائیں گی۔ کڑاکے کی ٹھنڈ سے اُسے بچانے کے جتن تو کرنے ہی ہوں گے۔ اُس کے لیے سوئٹر' ٹوپی' موزے' دستانے بُننے ہوں گے۔

لڑکا ہو یا لڑکی؟ اس بارے میں کپل کی اور خود مندا کی کوئی ترجیح نہیں تھی۔ بچّہ تو بس بچّہ ہی ہوتا ہے! اپنے ہی وجود کا ایک حصّہ! یہ تو مالک کی دین ہے ... اب وہ جو دے دے! دینے والے کو' ہر حال میں' دامن پھیلا کر' اُسے قبول کرنا چاہیے۔ حیل و حجت تو وہی کرتے ہیں' جو ناشکرے ہوتے ہیں!

پھر' جب مندا نے منّت سماجت کرکے کپل کی آنکھیں مُندوا لیں' اور جھک کر'

گنج —۱' بتیا ۸۴۵۴۳۸ (بہار)

لجاتے شرماتے، اُس کے کانوں میں سرگوشیوں میں ہولے ہولے سب کچھ بتانے لگی تو کپل نے زیادہ وارفتگی کا اظہار تو نہ کیا، تاہم اُس کے ہونٹوں پر ایک پُر اسرار سی مسکراہٹ رینگتی چلی گئی۔

منتظر رہ کر بھی، اپنے گرد اس کی لپٹتی بانہیں محسوس نہ کرکے مندا کو بے حد تعجب ہوا۔ کپل کی سردمہری کی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟ کپل نے اب تک اپنی مُندی ہوئی آنکھیں کھول دی تھیں۔ مندا نے سیدھے ہوکر اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ کیا تھا ان آنکھوں میں؟ کبھی کبھی آنکھوں کی زبان بھی تو سمجھ میں نہیں آتی!

کچھ یقین اور کچھ بے یقینی کا ملا جلا تاثر لیے مندا نے ایک لمحہ کے لیے کپل کو گھور کر دیکھا اور پھر جھک کر اُس کے ماتھے پر گھر آئے بالوں کی لٹیں سنوارتی ہوئی بولی:

"تمھیں خوشی نہیں ہوئی؟"

کپل کے ہونٹوں کی ہنسی کچھ اور بھی پُر اسرار ہوگئی اُس نے جان بوجھ کر ہی مندا سے آنکھ بچائی ہوگی ـــــ مندا نے دیکھا کہ بغل کی خالی کھڑکی جہاں بظاہر دیکھنے کی کوئی چیز نہیں تھی، وہیں کپل کی آنکھیں بار بار منڈلا رہی تھیں۔

کپل کی ایک ایک پل کی خاموشی مندا کے لیے سوہانِ روح بنی ہوئی تھی ـــــ اُس نے کپل کے ماتھے سے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ ہٹایا۔ اس بار اس کا لہجہ ذرا تیز تھا۔

"میں نے جو چاہا ہے، وہی کیا تمھاری چاہت بھی نہیں ہے؟"

مندا کو محسوس ہو رہا تھا کہ اب اُس کی آنکھیں چھلک پڑیں گی۔ پھر بھی اپنے اندر کے اُبال کو بس میں کرنے کے لیے اُس نے جی جان سے کوششیں جاری رکھیں۔

تبھی اُسے محسوس ہوا کہ کپل نے دھیرے سے اُس کا ہاتھ تھاما ہے اور آہستہ آہستہ اُس کی ہتھیلی کی گرمی مندا کی قدرے سرد سی ہتھیلی میں منتقل ہونے لگی ہے۔ اُسے جھُرجھُری سی آئی۔ کپل کی آنکھوں میں کچھ نامعلوم سے جذبوں کو دیکھ کر وہ تڑپ اُٹھی۔

"کیا بات ہے؟"

فوری طور پر پھر کپل میں کوئی ردِ عمل نہ دیکھ کر مندا نے اس بار ذرا نرمی سے کہا:

"تم کچھ بولتے کیوں نہیں؟"

بے اختیار مندا کو محسوس ہوا کہ کپل کسی کش مکش میں مبتلا ہے۔ اسے بہ یک وقت کچھ کھلنے کی چاہت بھی ہے اور کچھ سمٹنے کی جستجو بھی۔ آدمی کے چہرے پر آنکھیں اگر نہ ہوتیں تو اُس کے اندر اٹھنے والی لہریں کہاں منعکس ہوتیں؟

کچھ پل بعد کپل کی ہتھیلیاں اُس کے بالوں، اُس کے رُخساروں، اُس کی گردن سے پھسلتی ہوئی اُس کے بازوؤں پر آٹکی تھیں۔ کپل کے ہونٹ ہلے تو مندا نے نگاہیں اُٹھائیں۔

"تمھارے تن کی ڈالی پر لگی ہوئی کلی ابھی کھلی بھی نہیں کہ اس کی خوشبو کی لپٹیں اُٹھنے لگی ہیں۔۔۔! تمھارے جسم کی فصیلوں سے چلتی ہوئی پُروائیاں اس خوشبو کو ابھی سے اُڑائے پھر رہی ہیں۔۔۔!"

مندا کے مکھڑے پر چھائے ہوئے وسوسوں کے بادل خود بخود چھٹ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے چہرے کا سورج تابناک بن گیا۔

کپل کے ہاتھ اس کے بازوؤں پر کسنے لگے تھے۔ مندا کے دھیرے دھیرے کھُلتے ہوئے لبوں اور اُس کی آنکھوں کی بڑھتی ہوئی چمک نے کپل سے یقیناً کچھ کہا تھا ـــ پھر، اپنی مُرتعش آواز میں دفعتاً استحکام آجانے سے وہ جلد ہی اپنے مطلب کی بات پر آگیا۔

"پھول کو سجانے کے لیے گلدستے کی ضرورت بھی تو ہوتی ہے! ہم گلدستہ کہاں سے لائیں گے؟"

تب ایک بار پھر مندا کے چہرے کا سورج بجھ گیا، اُس کی آنکھوں میں گھُپ اندھیری رات اُبھر آئی اور سوالوں کے جگنو جگمگا اُٹھے۔

کپل کے لہجے کی استواری برقرار رہی ـــــ

"اپنے بچے کے لیے ہمارے پاس دھرا کیا ہے ـــ؟ ہم کیا دیں گے اُسے ـــ محرومیوں کی سوغات یا مایوسیوں کا تحفہ؟"

مندا کی ساکت پلکوں کے پیچھے اس کی آنکھوں کی ٹمٹماتی روشنی بتدریج مدھم ہوتی جارہی تھی ـــ کپل کی گویائی بحال رہی۔

"اپنے بچے کی آنکھوں میں سپنوں کی چِتا جلے گی تو تم سسک پڑوگی اور میں تڑپ اُٹھوں گا!"

پھر، اس سے پہلے کہ مندا کی آنکھیں یکسر ہی پتھرا جائیں، کپل نے اس کی پیشانی پر اپنے ہونٹوں کی حرارت ثبت کردی اور سرگوشیوں میں بولا:

"انتظار کرنا ہوگا ـــــ تمھیں بھی، مجھے بھی!"

منداکے اندر ہی اندر ہونے والا دھماکہ
ہت زوردار تھا، لیکن باہر تک پہنچنے
اس کی گونج نسبتاً کمزور تھی ——
"... اور اُسے، جو آنے والا ہے؟"
مندا کے چہرے پر اندیشوں کی دھند
ا گئی ——
کپل کے ہونٹوں کی ہنسی پھر پُراسرار
گئی ——

"آنے والے کو ہم آنے دیں گے لیکن...!"
مندا مجسّم سوال بنی ہوئی تھی ——
کپل نے اپنی باہنوں کا گھیرا مزید
کس دیا ——
"جُولی کے توسط سے جیکسن سے
رابطہ ہو گیا تو سب کچھ طے ہو جائے گا،
پیٹر بھی آمادہ ہو سکتا ہے۔ جس کی بولی
زیادہ ہوگی، اُسی کے حق میں ہمارا فیصلہ

بھی ہوگا —— فائدہ ہمیں بھی ہوگا اور
وہ، جو آنے والا ہے، اُسے بھی! ... یہاں
اُسے کیا ملے گا؟ ... اگر تمھارے جسم کی
دھرتی ہری بھری رہی تو اگلے سال ہی
پھر اُپج ہوگی! ... ہے نا؟"
مندا کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی ——

OO

شہباز ندیم ضیائی

گماں کی حد سے گزر کر یقین تک پہنچے
جو سیدھی راہ چلے علمِ دین تک پہنچے

وہ کند ذہن بھٹکتا رہا اندھیروں میں
بصیرتوں کے اُجالے ذہین تک پہنچے

تعلّقات میں ہے اُن کا تاجرانہ سلوک
یہ حق بیانی، مرے محسنین تک پہنچے

ہُوا ہے قتل کسی کی بھی آنکھ کا سپنا
لہُو کے چھینٹے مری آستین تک پہنچے

ہوا نے اپنا اچانک مزاج کیا بدلا
فلک مزاج پرندے زمین تک پہنچے

حفاظتوں سے بہت تھک گیا ہوں اے شہباز
امانتِ دل و جاں اب امین تک پہنچے

۱۸۲۰، کٹرہ شیخ چاند، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

سریندر شجر

لوگ کہتے ہیں لُٹا کچھ بھی نہ تھا
پر مرے گھر میں بچا کچھ بھی نہ تھا

وہ بلائیں تھیں سفینے میں مرے
منتظرِ موجِ بلا کچھ بھی نہ تھا

اس کے دامن میں بہت کچھ تھا مگر
اس کے ہاتھوں میں لکھا کچھ بھی نہ تھا

عمر بھر ہر آدمی کا مدّعا
زندگی تیرے سوا کچھ بھی نہ تھا

ہو سکا میرے نہ زخموں کا علاج
یوں جہاں میں لا دوا کچھ بھی نہ تھا

میکش اجمیری

منظر کوئی بھی دید کے قابل نہیں لگا
گلشن ہمیں بہار کا حامل نہیں لگا

پھیلا گیا ہے دستِ طلب میرے سامنے
وہ شخص جو لباس سے سائل نہیں لگا

ہم خانقاہِ عشق کے درویش بن گئے
دُنیا کی رونقوں میں کہیں دِل نہیں لگا

اسلوبِ نو نے توڑ دیں کہنہ روایتیں
محفل میں کوئی صاحبِ محفل نہیں لگا

کھویا تھا راستوں کے نشیب و فراز میں
رہبر تھا قافلے میں جو شامل نہیں لگا

تُو اپنا جانِ شاعری سمجھا کیا جسے
میکش وہ تیرے شعروں پہ مائل نہیں لگا

موتی بازار، نما ہیڑہ، راجستھان

حفیظ اللہ نیولپوری

اُڑیسہ میں اُردو — نشیب و فراز

اُڑیسہ میں اُردو زبان کی تاریخ پچھلی چار صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ سولھویں صدی کے اوائل میں بنگال کے حکمراں حسین شاہ کے سپہ سالار اسماعیل غازی نے اڑیسہ پر حملہ کیا۔ اس کے بعد متواتر افغان اور مغل فوجی اور صوفیائے کرام کا اڑیسہ میں ورود ہوتا رہا۔ اڑیسہ میں جو مسلمان آئے وہ ترک، مغل، تاتاری، افغانی، ماوراءالنہری اور ایرانی قوم اور قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی مشترکہ تہذیبی زبان فارسی تھی۔ فارسی سرکاری اور دفتری زبان کی حیثیت رکھتی تھی اس لیے یہاں کی مقامی زبان اُڑیا کو بھی متاثر کرتی رہی۔ جو لوگ فاتحوں کے ساتھ باہر سے اڑیسہ آئے ان میں سے اکثر نے اسے اپنا وطن بنالیا اس لیے لسانی اور تہذیبی سمجھوتہ عمل میں آیا۔ فارسی اگرچہ سرکاری اور دفتری زبان تھی لیکن اُردو ہی ایک ایسی زبان تھی جو فریقین کے درمیان رابطے کی زبان بنی اور رفتہ رفتہ قومی تہذیب کی ترجمان بھی۔

۱۵۹۲ء میں مغلوں نے شمالی اڑیسہ پر قبضہ کرلیا اور اسی دوران دکن کی جانب سے گولکنڈہ کے سلطان نے جنوبی اڑیسہ میں چلکا کے ساحل تک کا علاقہ اپنے قبضے میں کرلیا۔ بیک وقت شمال اور جنوب کی جانب سے دو مختلف سیاسی اقتدار کی توسیع نے اڑیسہ میں اُردو زبان کے ارتقا میں خاصا اہم رول ادا کیا۔ اڑیسہ کے ہندوؤں میں بھی جن کی مادری زبان اڑیا تھی اُردو اور فارسی مقبول ہوئیں جس کی بنا پر فقیر موہن سیناپتی اور رادھاناتھ رائے۔ نے اپنی اڑیا ادبی تخلیقات میں اردو الفاظ انتہائی بے تکلفی کے ساتھ استعمال کیے بعد میں تو اُردو فارسی الفاظ اڑیا زبان کا ایک حصہ بن گئے اور آج اُڑیا زبان میں دو ہزار سے زائد اُردو فارسی اور عربی الفاظ نے اپنا مستقل مقام بنالیا ہے۔ ان کے علاوہ آج تک اڑیسہ کی عدالتوں اور کچہریوں میں جو محرر استغاثے اور قبالے وغیرہ اُڑیا زبان میں لکھتے ہیں ان پر بھی اُردو فارسی اثرات حاوی ہیں۔

سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اڑیا رسم الخط میں کرنی طرز تحریر بھی فارسی کے خط شکستہ کے زیر اثر وجود میں آئی۔ حتیٰ کہ اڑیسہ کے رسم و رواج وضع قطع، ”خورو نوش اور طرز معیشت“ کی بات کی جائے تو قدم قدم پر اُردو کے اثرات پھیلے ہوئے ملتے ہیں۔

مغلیہ دورِ حکومت میں شہر کٹک کو خاصی اہمیت حاصل تھی اور یہی اڑیسہ کا دارالسلطنت تھا بیرونی علما و فضلا مسلسل یہاں آتے رہے۔ اڑیسہ کے مختلف علاقوں میں صوفیائے کرام کی خانقاہیں قائم ہوئیں جہاں ایک طرف دہلی، پنجاب، اتر پردیش، بہار اور بنگال سے معیاری اُردو زبان براہِ راست یہاں پہنچی، وہیں آندھرا کی طرف سے دکنی اُردو بھی یہاں آئی۔ اڑیسہ کے جنوبی علاقوں یعنی گنجام اور کورا پٹ ضلعوں میں اب بھی دکنی اُردو رائج ہے لیکن کٹک اور دیگر شہری اضلاع میں جو اُردو بولی جاتی ہے وہ معیاری اُردو اور دکنی اُردو کے امتزاج سے وجود میں آئی ہے لیکن رفتہ رفتہ دکنی زبان کے اثرات معیاری اُردو کے اثرات کے تحت دب کر رہ گئے ہیں۔ اڑیسہ میں اُردو زبان کی نشوونما کی مخصوص صورت حال کا تفصیلی جائزہ راقم الحروف نے اپنے تحقیقی مقالے میں پیش کیا ہے مختصراً یہ عرض کیا جاسکتا ہے کہ یہاں اُردو زبان کے اصل سرچشمے صوفیائے کرام کی تبلیغ، انتظامیہ میں اُردو کے استعمال اور اڑیسہ کے تعلیمی اداروں کے رول پر مشتمل ہیں۔ دورِ قدیم سے ہی اڑیسہ ایک دور افتادہ سیاسی، سماجی اور معاشی اعتبار سے زبوں حال صوبہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ انگریزوں کی حکومت سے قبل یہاں باقاعدہ تعلیم کا کوئی رواج نہیں تھا۔ عام طور پر اعلا خاندان کے لوگ تھوڑی بہت تعلیم حاصل کرتے تھے مگر وہ بھی مذہبیات تک محدود رہتی تھی۔ اس طرح یہاں تعلیم کا دائرہ محدود تھا۔ افغانوں اور مغلوں کے دور میں لوگوں نے کسب معاش کی خاطر تعلیم کی طرف توجہ دی اور بقدرِ ضرورت فارسی پڑھی۔

۱۸۳۶ء تک اڑیسہ میں تعلیم کی توسیع خاص طور پر قابلِ ذکر نہ تھی۔ لیکن ۱۸۴۵ء کے



مرزا پور، بھدرک ۷۵۶۱۰۰ (اُڑیسہ)

بعد یہاں کی تعلیمی صورت حال میں خاصی تبدیلی واقع ہوئی جب سر ہنری پونگر شعبۂ تعلیم کے سربراہ ہو کر آئے تو انھوں نے تعلیمی اداروں کی ترقی پر کافی توجہ دی۔ جنوبی اڑیسہ کے مقابلے میں شمالی اڑیسہ میں تعلیمی صورتِ حال کسی حد تک مختلف تھی۔ ۱۸۰۳ء میں اڑیسہ پر قابض ہونے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے پوری اور کٹک میں تعلیم کی توسیع کے لیے اقدامات کیے تھے۔ ان دنوں توسیع تعلیم کا کام مشنریوں کے ہاتھ میں تھا۔ ۵۹۔۱۸۵۸ء کے دوران شمالی اڑیسہ میں صرف ۳۰ اسکول تھے۔ ۱۸۶۸ء میں ان کی تعداد ۶۳ ہوئی اور دو سال بعد یہ تعداد بڑھ کر ۹۵ ہوگئی۔ اسی دوران کٹک، کندرا پاڑہ۔ پوری۔ بھدرک اور بالیسر کے ہائی اسکولوں میں اردو تعلیم کا آغاز ہوا۔

اگرچہ اڑیسہ میں اُردو بولنے والوں کی تعداد محض ۲ فیصد ہے لیکن تعلیم کے ضمن میں وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ پسماندہ نہیں ہیں۔ آبادی کے تناسب سے اسکولوں میں اُردو پڑھنے والے طلبا کی تعداد ہمیشہ بہتر رہی ہے۔ تحقیق کے مطابق ۱۸۸۵ء میں مجموعی طور پر اُردو خواں طلبا کی تعداد ۳۱۸۳۔ ۱۸۹۵ء میں ۳۲۳۹ اور ۱۹۰۵ء میں ۴۰۲۸ تھی۔

اڑیسہ میں اُردو ادب کا قابلِ اعتنا سرمایہ موجود ہے۔ نساخ۔ عشقی۔ شورش اور جاوید نہال نے اپنے تذکروں میں ہردے رام جودت کا ذکر کیا ہے جو اڑیسہ کا اولین شاعر گزرا ہے۔ ہردے رام جودت کا وطن کٹک تھا لیکن ان کا قیام زیادہ تر مرشد آباد میں رہا اور وہیں ان کا انتقال بھی ہوا۔ جودت فارسی کے جید عالم تھے۔ [illegible]

تفنن طبع کی خاطر کہہ لیا کرتے تھے۔

مولوی محمد سلطان راجی ایک صوفی بزرگ تھے۔ دکن سے شہر کٹک میں وارد ہوئے۔ بخشی بازار میں سلطانیہ مسجد تعمیر کروائی۔ عمر عزیز کا بیشتر حصہ مذہبی تبلیغ اور رشد و ہدایت میں صرف کیا۔ ان کی تصنیفات و تالیفات میں فصیح الحلال والحرام (۱۲۸۴ھ) مجموعہ خطبہائے دوازدہ ماہی' (۱۲۸۶ھ) معرفت خدا و رسول (۱۲۸۷ھ) اور مہتاب المجالس (۱۳۰۳ھ) اڑیسہ میں اُردو شعر و ادب کے ابتدائی رجحانات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

شیخ امین اللہ جرخی (متوفی ۱۸۷۹ء) اڑیسہ کے اولین صاحبِ دیوان شاعر گزرے ہیں۔ دیوانِ جرخی، ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا جس میں ۲۵۲۰ اشعار پر مشتمل، ۲۲ غزلیں شامل ہیں۔ جرخی ایک صوفی شاعر تھے اور وحدت الوجود کے فلسفے پر یقین رکھتے تھے۔ ان کے سوا اڑیسہ کے کسی اور شاعر کو خالصاً صوفی شاعر نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اُردو کی کلاسیکل شاعری کے بجائے فارسی کی صوفیانہ شاعری سے گہرا اثر قبول کیا تھا۔ ان کی شاعری کا موضوع تصوف ہے اور غزلوں کے لیے مشکل زمینیں منتخب کی ہیں۔

عبدالمجید بھونیاں حیا (ولادت ۱۸۴۰ء) : ۱۸۷۱ء میں حیا نے "دیوانِ مجید" ردیف وار مرتب کیا۔ اس کی ۱۲ جلدیں ہیں جو بارہ وفات کی مجالسِ میلاد کے لیے مختص ہیں۔ حیا نے اپنے تصور اور تخیل کے گرد عشقِ رسول کا ہالہ قائم کر رکھا ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں ترقی پذیر اُردو زبان کا نمونہ پیش کیا ہے جس سے اڑیسہ میں اُردو شاعری کے ارتقا کا پس منظر میں [illegible]

تہذیبی اعتبار سے ارتقا پذیر اُردو کا نقشہ واضح طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔

کٹک کے سابق ڈپٹی کلکٹر ایم۔ اے احمد مرحوم کی والدہ فیض النساء تسخیر (ولادت ۱۸۶۶ء) دورِ قدیم کی اُردو شاعری میں خاصی نمایاں رہی ہیں۔ تسخیر کے کلام میں جو پختگی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے عرصۂ دراز تک مشقِ سخن کی ہوگی۔ ان کے کلام میں مذہبی قنوطیت کے بجائے ایک نئی فکر کا احساس جھلکتا ہے۔ اگرچہ انھوں نے روایتی انداز سے اپنا رشتہ مستحکم کر رکھا تھا اس کے باوجود ان کے پیرایۂ اظہار میں ارتقا کا رجحان پایا جاتا ہے۔

محمد یوسف (ولادت ۱۸۷۴ء) غالباً اڑیسہ کے اولین شاعر گزرے ہیں جن کا کلام شمالی ہند کے معیاری رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے۔ موصوف اڑیسہ کے نامور شاعر امجد نجمی کے والد تھے۔ ان کی شاعری اپنے عہد کی حسیات کا مظہر تھی۔

معلّم سنبل پوری (متوفی ۱۹۲۴ء) اڑیسہ میں اُردو شاعری کے ارتقا میں معلّم کا نام خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ موصوف کو امیر مینائی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ ان کے والدِ محترم مجرم سنبل پوری بھی امیر مینائی کے شاگردوں میں سے تھے۔ معلّم سنبل پوری کا دیوان "کاخِ سخن" ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا۔ اس دیوان میں ان کی ۱۵۵ غزلیں ردیف وار مرتب ہیں۔ وہ ایک پُرگو شاعر تھے اور ان کے شاگردوں کا حلقہ وسیع تھا۔ انھوں نے سوز و گداز اور نغمگی میں ڈوبے ہوئے اشعار کہے ہیں اور صنائع و بدائع کا وافر استعمال کیا [illegible] اس دور کی اُردو

شاعری کے لیے باعث افتخار سمجھا جاتا تھا۔

سیّد عبدالستار عبّد (ولادت ۱۸۹۲ء) ۱۹۳۴ء میں موصوف کا مجموعۂ کلام "نغمۂ ستّار" کے نام سے شائع ہوا ہے جس میں ان کی چالیس نعتیہ غزلیں درج ہیں۔ انیسویں صدی میں اُڑیسہ میں اردو زبان و ادب کو خاصا فروغ حاصل ہو چکا تھا۔ لوگوں کے سوچنے کا انداز بدل رہا تھا۔ شعرا کے کلام میں مذہبی رچاؤ پر تغزل کا رنگ حاوی ہو رہا تھا جس کا مظاہرہ اشرف علی کٹکی، اظہار علی کٹکی اور اولاد مرتضیٰ کٹکی کی تخلیقات سے ہوتا ہے۔

جان محمد حازم (متوفی ۱۹۴۱ء) مولوی محمد سلطان راجی کے شاگرد تھے۔ ۱۹۲۰ء میں ان کا ایک مختصر سا شعری مجموعہ "گلدستۂ گلزار" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ حازم کی تخلیقات اُڑیسہ کی اردو پر دکنی اثرات کی نشان دہی کرتی ہیں اور اس میں مقامی اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔

محمد محسن (متوفی ۱۹۴۵ء) قصبہ معصوم پور سے تعلق رکھتے تھے۔ اڑیسہ کے ایک مقتدر شاعر تھے۔ اپنے شاعرانہ وجدان کی پہنائیوں میں مست اور تخیل کی وسعتوں میں گم رہا کرتے تھے۔ ان کے کلام میں تازگی اور شگفتگی کے ساتھ غزل کی جذباتی فضا قائم رہتی تھی۔ الہ آباد میں عرصۂ دراز تک ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز رہے۔ اس سے قبل راونشا کالج میں اردو کے لکچرار تھے۔ الہ آباد کی محافل شعر و سخن میں پابندی کے ساتھ شرکت کرتے تھے۔

ذ، علی، اذر (ولادت ۱۸۶۰ء) ان کا ایک شعری مجموعہ "چاند رمضان اور پیامِ عید" کے نام سے شائع ہوا تھا جس میں ان کے چند معاصرین شعرا رفیع الدین رفیع اور عبدالعزیز عاشق وغیرہ کی تخلیقات شریک اشاعت تھیں۔

مولا بخش مولاؔ (متوفی ۱۹۵۸ء) بھدرک کے ایک صوفی بزرگ شاعر تھے۔ رشد و ہدایت میں انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ صرف کیا۔ اردو زبان کی تبلیغ و اشاعت میں ان کے کارنامے لائق ستائش ہیں۔ ان کے چار مختصر شعری مجموعے شائع ہو کر منظر عام پر آئے ہیں۔

مولوی رحمت علی رحمتؔ (ولادت ۱۸۹۱ء وفات ۱۹۶۳ء) اڑیسہ کی اردو شاعری میں اپنی انفرادی شناخت رکھتے تھے۔ کلام میں طنز کی تیز دھار اور زیریں لہروں میں تصوف کی گہرائی ہوا کرتی تھی۔

اڑیسہ میں امجد نجمی کی شاعری سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ امجد نجمی کی ولادت ۱۸۹۹ء میں ہوئی اور وفات یکم فروری ۱۹۷۴ء کو۔ مالک رام نے لکھا ہے "نجمی کو اقبال سے بہت عقیدت تھی وہ چاہتے تھے کہ بذریعہ خط و کتابت ان سے اپنے کلام پر اصلاح لیں: لیکن اقبالؔ نے حسب معمول انھیں ٹال دیا۔ امجد نجمی اڑیسہ میں اردو تحریک کا سنگ میل سمجھے جاتے ہیں۔ وہ شاعر بھی تھے اور ادیب بھی۔ صحافی بھی تھے اور ڈرامہ نگار بھی۔ ہدایت کار بھی تھے اور اداکار بھی۔ وہ اڑیسہ میں اردو کے اولین ادیب تھے جنھیں وشو ملن میں پرجا تنترا ایوارڈ عطا کیا گیا تھا۔ ان کا مجموعۂ کلام "جوئے کہکشاں" اتکل یونیورسٹی کے ایم اے کے نصاب میں شامل ہے۔ ان کی حیات اور ادبی خدمات پر رانچی یونیورسٹی نے سیّد مسیح اللہ مرحوم کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی۔ ان کی یادگار کے طور پر نجمی لائبریری اور نجمی اکیڈمی قائم ہیں۔ ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر حکومت اڑیسہ سے ادبی وظیفہ پاتے رہے۔ اپنی تصنیفات پر ملک کی مختلف اکیڈمیوں سے انھیں ایوارڈز بھی حاصل ہوئے۔

مولوی سیّد برکت اللہ برکتؔ (ولادت ۱۹۰۵ء وفات ۱۷ دسمبر ۱۹۷۹ء) مولانا اردو اور فارسی کے ایک پرگو شاعر اور فقید المثال خطیب تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ہمیشہ قومی اور ملی مسائل کو پیش نظر رکھا اور اڑیسہ کے کہنہ مشق شعرا میں درجۂ امتیاز حاصل کیا۔ ان کے اردو اور فارسی کلام کا قابل اعتنا ذخیرہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے عرصۂ دراز تک مولانا بزم ادب کٹک کے صدر رہے ہیں۔ شہر کٹک میں موصوف کے تلامذہ وافر تعداد میں موجود ہیں۔

مولوی عبدالحلیم حلیمؔ (ولادت ۱۹۱۰ء) ان کے والد کا شمار بالوسبی کے رؤسا میں ہوتا تھا۔ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے فاضل کرنے کے بعد ۱۹۳۱ء میں مسلم سیمنری کٹک میں درس و تدریس سے عملی زندگی کا آغاز کیا اور اڑیسہ کی مختلف درسگاہوں میں تدریسی فرائض انجام دے کر ۱۹۶۸ء میں سبکدوش ہوئے۔ پٹنہ کے قیام کے دوران ۳۲ صفحات پر مشتمل ایک مختصر مجموعۂ کلام "موجِ نسیم" شائع کیا۔

عجیبہ خاتون عجیبؔ (ولادت ۱۹۰۸ء وفات ۱۸ نومبر ۱۹۸۳ء) اڑیسہ کی اردو

شاعری کا ناقابل فراموش نام ہے۔ سونگڑہ کے ایک علمی خاندان میں آنکھیں کھولیں۔ طبیعت میں شروع سے ہی شاعرانہ رچاؤ تھا۔ وسعت مطالعہ اور فطری مناسبت سے شعر کہنے لگیں۔ مشق سخن اور طبعی ذوق کی بنا پر کلام میں ایسی پختگی اور شائستگی آئی کہ اپنے معاصرین میں رشک کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔

حکیم عبدالرحیم راقم (ولادت ۱۹۱۲ء وفات...) ان کا کلام زبان و بیان کی سادگی و سلاست کا مظہر ہوا کرتا تھا۔ ان کے استعارے غیر مبہم اور معنوی اعتبار سے وسعت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے اشعار میں روزمرّہ کا استعمال بھی کیا ہے اور اڑیسہ میں مروج اردو محاوروں کا بھی۔

سید عبدالحلیم نقیب (ولادت ۱۹۱۲ء وفات...) سونگڑہ کے ایک علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ زمانۂ دراز تک بزم ادب کے سکریٹری رہے۔ طبعی رجحان شاعری کی طرف تھا۔ انھوں نے وافر تعداد میں غزلیں کہی ہیں۔ رنگ سخن روایتی ہونے کے باوجود اشعار میں تغزل اور اظہار میں جدت ہے۔ نثر میں ان کے روزنامچے ادبی حیثیت کے حامل ہیں۔

سید منظر حسن دسنوی (ولادت ۱۹۱۴ء) کی ولادت دسنہ ضلع نالندہ (بہار) میں ہوئی۔ ۱۹۴۷ء میں کٹک کے راونشا کالج میں اُردو کے لکچرار کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ ۱۹۶۹ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ کٹک میں اردو کے قافلے کی پیش رفت میں ناقابل فراموش کارنامے انجام دیے۔ ان کی تخلیقات ملک کے مقتدر جرائد میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہیں۔

مولوی عبداللطیف عارف (ولادت ۱۹۱۴ء وفات...) ۱۹۳۶ء سے ۱۹۸۲ء تک اردو کے ایک مثالی استاد کی حیثیت سے سید سیمنری کٹک میں تدریسی فرائض انجام دے کر سبکدوش ہوئے۔ علمی خدمات کے اعتراف میں اڑیسہ اردو اکیڈمی کی جانب سے اعزاز و اکرام کے ساتھ ساتھ حکومت اڑیسہ سے بقید حیات وظیفہ پاتے رہے۔ ان کا شعری سرمایہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ امجد نجمی کے نام ان کے بصیرت افروز علمی خطوط سلسلہ وار ماہنامہ شاخسار کٹک میں شائع ہوتے رہے تھے۔

اُڑیسہ میں شاعری کے مقابلے میں نثری تخلیقات کا سرمایہ نسبتاً کم ہے۔ سب سے قدیم نثری تصنیف مولوی محمد سلطان راجی کی ہے۔ ان کی نثری تخلیقات میں اس عہد کی ادبی زبان کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ مولوی غلام غوث راؤنرا پوری کی تصنیف بنی العربی کا ذکر بھی ضروری ہے۔ مولوی رحمت علی رحمت کی نثری تصنیف "رفیق العمل" اڑیسہ میں اردو نثر کے ارتقا کی ایک اہم کڑی ہے۔ محمد یوسف یوسفؔ کا نام اردو شاعری کے ساتھ ایک بلند پایہ ادیب کی حیثیت سے سامنے آتا ہے۔

مولوی عبدالرشید نقاد (۱۸۹۸ء) اردو نثر میں طنز و مزاح کی صنف اپنائی۔ انھوں نے حالات حاضرہ کی خامیوں کا جو عمیق مشاہدہ کیا اس کے اظہار کے لیے طنز و ظرافت کا انداز اپنایا۔ ایک بلند پایہ عالم دین و مفتیِ شرع متین ہونے کے ساتھ ساتھ اڑیسہ سے اردو ہفت روزہ دور جدید کا اجرا کر کے صحافت میں بھی شہرت حاصل کی۔ انھوں نے مرقع نگاری کے ایسے جوہر دکھائے ہیں کہ لوگوں کے ذہن میں آج تک ان کے خاکوں کے اثرات باقی ہیں ان کی طویل ترین علمی خدمات کی بنا پر اڑیسہ اردو اکیڈمی نے گذشتہ سال انعام و اکرام سے نوازا ہے اور حکومت اڑیسہ نے تاحیات علمی وظیفہ جاری کیا ہے۔

پنڈت لکشمی نرائن مصرا (۱۹۲۱ء) اسمبلی حلقۂ انتخاب سے اڑیسہ اسمبلی کے رکن تھے۔ اڑیا اور اردو کے معتبر ادیب سمجھے جاتے تھے انھوں نے جیل میں اردو سیکھی تھی۔ ان کی کتاب "بھگوت گیتا" انجمن ترقی اردو ہند (حیدرآباد) سے شائع ہوئی تھی۔ سادہ نثر سے لے کر علمی نثر تک اور علمی نثر سے لے کر مشکل اسلوب کے ساتھ لکھی جانے والی مذہبی نثر کے جو نمونے اس کتاب میں ملتے ہیں اڑیسہ میں اُردو نثر کی ارتقائی تاریخ کے تنقیدی مطالعے میں انھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

شیخ حبیب اللہ (۱۹۰۹ء) کو مضمون نگاری کا شوق قیام سمبل پور سے ہی شروع ہوا۔ زمانۂ طالب علمی میں ہی ان کے مضامین اڑیسہ کے اولین اُردو ماہنامہ "المنصور" میں شائع ہوا کرتے تھے۔ ان کی متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں "نجمہ" اور "عمر خیام" ناقابل فراموش ہیں۔ اقبالیات پر ان کے بیسیوں مضامین ملک کے مقتدر جرائد میں شائع ہوئے ہیں اور تقریباً پچاس علمی مضامین فروغ اردو لکھنؤ کی زینت بنے ہیں۔ اڑیسہ میں اردو نثر کے ارتقا میں شیخ حبیب اللہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ ایک صاحب طرز نثر نگار ہیں۔ انھوں نے افسانے لکھے ہیں اور ڈرامے بھی، ناولٹ لکھے ہیں اور تنقیدی مضامین بھی۔ اس کے علاوہ غیر ملکی ادب پاروں کے تراجم بھی شائع کیے ہیں۔

محمود بالیسری کا نام اڑیسہ کے اردو افسانے کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کا افسانوی مجموعہ "پتھروں کے گیت" اڑیسہ کا اولین افسانوی مجموعہ ہے جو بمبئی سے شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ پچھلی تین دہائی سے ملک کے مقتدر رسائل میں ان کے افسانے اور علمی و ادبی مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ ان کی کتاب "اڑیسہ کی لوک کہانیاں" اردو ادب کی تاریخ کی اہم کڑی ہے۔ ان کے علمی و ادبی کارناموں کے اعتراف میں اڑیسہ اردو اکیڈمی نے اکیڈمی کی رکنیت کے ساتھ ساتھ سال ۱۹۸۸ء کے ادبی ایوارڈ سے بھی نوازا ہے۔

کرامت علی کرامت کا نام اڑیسہ میں اردو کی آبرو سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے مضامین نظم و نثر کے ذریعے پوری اردو دنیا میں اپنی شناخت قائم کر لی ہے۔ انھوں نے اپنے تنقیدی مضامین کے ذریعے صالح اور صحت مند جدیدیت کے فروغ کے ضمن میں مدلل بحثیں کی ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے پیشِ نظر رانچی یونیورسٹی نے ان کی حیات اور ادبی کارناموں پر ڈاکٹر عزیز الرحمٰن کو پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی ہے۔ کرامت علی کرامت کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "اضافی تنقید" ایم اے اردو کے لیے داخل نصاب ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں اڑیسہ کے تمام اہل قلم حضرات کا فرداً فرداً تفصیلی مطالعہ ممکن نہیں ہے۔ جن حضرات کا تفصیلی ذکر نہیں ہو سکا ان کی ادبی اہمیت سے انکار بھی نہیں ہے۔ مختصر یہ ہے کہ اڑیسہ میں اردو کے کارواں کو آگے بڑھانے میں شاعروں ادیبوں اساتذہ اور صحافیوں کے ساتھ ساتھ ان حضرات کے ایثار بھی ناقابل فراموش ہیں جو تخلیقی فنکار نہ ہوتے ہوئے بھی مشاعروں، مذاکروں اور اردو کے جلسوں کو عام کرنے میں پیش پیش رہے ہیں۔ ان میں مولانا اطہر مرحوم ڈاکٹر سید مشتاق علی۔ ڈاکٹر سید سیف اللہ ایم اے احد۔ ڈی پی ایم غیاث انجم۔ محمد یوسف رحیم۔ ابوالبرکات تنویر۔ خواجہ نظام الدین وغیرہ پچاسوں نام ہمارے سامنے ہیں۔

دورِ قدیم سے لے کر دورِ جدید تک اڑیسہ میں اردو شعر و ادب کے سرمایے کو اپنی نگارشات سے مالا مال کرنے والے حضرات میں منشی عبدالرحیم احسن۔ خاتم بہراج پوری۔ مجرم سنبلپوری۔ کبیر الدین انشا۔ تراب علی اخگر۔ ظہور الحق ظہوری۔ شمس الحق شمس۔ رسول بخش کاشف۔ نور الہدیٰ تائد۔ فضل اللہ شریف افضل تلوکی۔ ناطق انجم۔ سیدہ مسلمت ابرزدی۔ قادر شریف رونق۔ ضمیر خاں ضمیر۔ شہید اکرامی۔ حیدر نایاب۔ روح اعظمی۔ اصغر علی بیدل۔ شمس مبنری۔ عبدالجلیل خنجر۔ جعفر رضا نقوی۔ فرحت زیدی۔ شجاع الدین ہمدانی۔ عبدالصمد واصف۔ سعید رحمانی۔ شکیل دسنوی۔ ساجد اشرف۔ یوسف جمال۔ خالد رحیم۔ اسماعیل آذر۔ بہاءالدین ریاض۔ عبدالمجید فیضی۔ الطاف حسین حسرت۔ جبار غنی۔ خان نیازی۔ امرد ہوی۔ محمد اسماعیل بجلی۔ قاسم خلش۔ نفیس۔ منظر حسن۔ حامد ندیم۔ غلام محی الدین سایر کٹکی۔ عبدالصمد پریمی۔ ظہیر اللہ نور۔ سید مسیح اللہ مسیح۔ رشمی کانت راہی۔ اطہر عزیز۔ اعظم علی جوکر۔ رفیق درد۔ نورالدین احمد نور۔ علی یوسف نیر۔ کامل صدیقی۔ قادر بخش سلیم۔ واحد علی وحدت۔ خلیل آرزو۔ راشد شبنم۔ زین العابدین۔ شہاب المتقین۔ عبدالمتین حاجی۔ نور الہی ناطق۔ شفیق الرحمٰن عاجز۔ فدائے غفار۔ پیغام۔ ایوب صابر۔ انوارالحق شیدا۔ اختر حسین شاقی۔ الیاس آباد۔ فیاض الدین فیاض۔ ناصر بلہوری۔ معین الدین زخمی۔ گھائل فریدی۔ ابرار احمد ابرار۔ رحمٰن کریم شاکر۔ عبدالحفیظ بسمل۔ شوکت خاں۔ ناظم قمر۔ شوکت رحیم۔ لطف صدیقی۔ نزران سیفی۔ اثر نظامی۔ ریاض تشنہ۔ مشتاق راز۔ نسیم خاں نسیم۔ عبدالحق بیتاب۔ یوسف پرویز۔ جلال الدین بدر۔ معشوق خاور۔ قطب کامران۔ نیر دانش۔ برکت علی بیباک۔ جنا جلیل۔ خالد فہمی۔ سعید اختر۔ قیوم قریشی۔ بیزخمار نظر۔ معزہ خاتون موزوں۔ شکیلہ ہدیٰ۔ صالحہ شبنم۔ نسیمہ بیگم شیریں۔ پروین۔ کشور جہاں جنیفہ۔ نادم علی۔ گل رعنا۔ علی احمد شیدا۔ ظفر عالم۔ مشرف خاں حیرت۔ معین الدین رشک۔ عبدالرشید شاہد۔ انعام رسول ظفر۔ راجکمار کشیپ۔ سید ظفر حسین سنی۔ سموئیل جبیت تمنائی۔ ظہیر سہارنی۔ معین الدین رونق۔ اطہر مشتاق۔ شمس الحق فاروقی۔ عباس نغوی۔ عمران المخی۔ عبدالحمید نشتر۔ حبیب اللہ بیکل۔ مولانا عبدالصمد نعمانی۔ افضال بیدار۔ ابوصالح۔ الطاف نادر۔ مظہر مجیدی۔ اولاد رسول قدسی۔ قمر اعظم۔ یوسف پرویز۔ شوکت زیبا۔ ماہر عزیزی۔ حافظ اختر۔ عبدالرزاق راہی۔ تحمل علی فہمی۔ خالد شفائی وغیرہ ناموں کا ایک ایسا لامتناہی سلسلہ ہے جس کی طنابیں ماضی بعید سے حال تک کھنچی ہوئی ہیں۔

جہاں تک اردو تصنیف و تالیف کا تعلق ہے درسی کتابوں کے علاوہ عرب شہزاد مولانا ابوالقاسم صدیقی متوطن بونت ضلع بالیسر کی تا دم تحریر ۱۳۶ مذہبی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ دورِ جدید میں لمحوں کی بازگشت (حیدر نایاب) شعاعوں کی صلیب (کرامت علی کرامت) عکس در عکس (خالد رحیم) زندگی اے زندگی (شکیل دسنوی) انسانی تعبیر (کرامت علی کرامت) لفظوں کا آسمان (کرامت علی کرامت) حرف مسنیب (رشمی کانت راہی) پتھروں کے گیت (محمود بالیسری) طلوعِ سحر (امجد نجمی) جوئے کہکشاں (امجد نجمی) آبِ خضر (کرامت علی کرامت) سنگ و سمن (خالد شفائی) نذرانۂ عقیدت

(عبدالمجید فیضی) انوار قدسی (اولاد رسول قدسی) گلہائے قدسی (اولاد رسول قدسی) کے علاوہ متعدد کتابچے اور کتابیں یہاں سے شائع ہو کر اڑیسہ کی اردو تاریخ کو منور کرتی ہیں۔

زمانۂ قدیم سے ہی یہاں مشاعروں کی روایت رہی ہے۔ مشاعرے اہل اڑیسہ میں اردو کی تہذیبی و ثقافتی زندگی کے ضامن سمجھے جاتے ہیں۔ راوڑکیلا کا سمبلپور، کٹک، بھدرک، کیندراپاڑہ، سونگڑہ، بھوبنیشور، برہم پور وغیرہ شہری اضلاع میں آئے دن مشاعرے ہوتے رہتے ہیں اور سال میں ایک دو بار کل ہند پیمانے پر مشاعروں کا اہتمام ہوتا رہتا ہے۔ پچھلے تین سال سے بالو بیسی میں بھی مشاعروں کی روایت چل نکلی ہے۔ مشاعروں کے بعد قوالی کے رواج نے بھی اڑیسہ میں اردو کے فروغ میں خاصا اہم رول ادا کیا ہے۔ مشاعرہ دانشوروں کی دلچسپی کا مرکز ہے تو قوالی عوامی دل بستگی کا سامان فراہم کرتی ہے۔

اڑیسہ میں اردو صحافت کی تاریخ کے ڈانڈے نصف صدی تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اڑیسہ کا اولین ماہنامہ المنصور تھا جو مولوی عمر کی ادارت میں شائع ہوا کرتا تھا ہفت روزہ مسلم گزٹ (۱۹۳۷ء) مولوی فضل الرحمٰن قاسمی کے زیر ادارت اشاعت پذیر ہوتا رہا۔ طویل مدت کے بعد مولوی عبدالرشید نقاد نے ہفت روزہ "دورِ جدید" کا اجرا کیا۔ محمد عبدالامان کی ادارت میں ہفت روزہ "بیداری" کے متعدد شمارے منظر عام پر آئے۔ ۱۹۶۵ء میں اڑیسہ میں اردو صحافت کا زریں عہد "شاخسار" کی اشاعت سے شروع ہوتا ہے۔ امجد نجمی کی ادارت اور کرامت علی کرامت کے ذاتی تصرف سے اڑیسہ کا یہ علمی اور ادبی جریدہ اواخر ۱۹۷۳ء تک برصغیر میں اپنی شناخت قائم کر گیا۔ ۱۹۸۲ء میں ایک ذولسانی ہفت روزہ "صدائے اڑیسہ" شیخ قریش کی ادارت میں شائع ہوا۔ اس اخبار کے زیر اہتمام ۱۹۸۳ء میں آل اڑیسہ مشاعرہ اور اردو کانفرنس کٹک میں منعقد ہوئی لیکن صحیح معنوں میں ہفت روزہ "سہارا" کے اجرا سے اڑیسہ میں اردو صحافت کے نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا۔ اس کے مدیر موسس اطہر عزیز تھے۔ ایسٹرن میڈیا لمیٹڈ نے چار سال تک فوٹو آفسٹ سے شائع کر کے اسے ہندوستان کے گوشے گوشے تک پہنچایا۔ اطہر عزیز کے مستعفی ہونے کے بعد سومیہ رنجن پٹنائک نے خود ادارت سنبھالی۔ ایک مخصوص دور تک رضیہ سلطانہ ایگزیکیٹو ایڈیٹر ہیں بعد میں راقم الحروف کے ساتھ فرحت بدری فرزان سیفی، سعید رحمانی، مجیب الرحمٰن میکش حفظ الرحمٰن وغیرہ ادارۂ تحریر سے وابستہ رہے لیکن اہل اردو کی غفلت شعاری سے ایسٹرن میڈیا کو لاکھوں کا نقصان اٹھا کر دسمبر ۸۸ء میں اخبار بند کر دینا پڑا۔

اس میں دو رائے نہیں ہے کہ اڑیسہ میں اردو زبان و ادب کی ترویج و بقا کے لیے اردو کے ادبی اور ثقافتی اداروں کا رول خاصا اہم ہے یہی ادارے اڑیسہ اور بیرون اڑیسہ کے ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کی آرا کو عوام تک پہنچانے میں کلیدی رول ادا کرتے ہیں اور مختلف فنکاروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے عوام کو استفادہ کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ اس نوعیت کے اداروں میں (خودرو پودوں کی طرح سیاسی ہوا سے لہلہاتے اور دیکھتے ہی دیکھتے مرجھا کر زمین بوس ہونے والے اداروں کے علاوہ) بزم ادب کٹک، بزم سخن کٹک، بزم ظرافت کٹک، MYCA اردو لائبریری آف اڑیسہ، نجمی اکیڈمی، گلشن ادب سونگڑہ، سنگم لٹریری سوسائٹی بھدرک، بھدرک غالب اکیڈمی، بزم اخلاق بالیسر، بزم ادب راوڑکیلا، اردو لائبریری راوڑکیلا وغیرہ کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں ناقابل فراموش ہیں۔ ادھر ۱۹۸۷ء سے سرکاری سطح پر اڑیسہ اُردو اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا ہے جس کے زیر اہتمام اعلا پیمانے پر اُردو کی ادبی اور ثقافتی تقریبات منعقد ہوتی رہی ہیں۔ اور اُردو ادیبوں اور شاعروں کو ان کی اعلا علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر ایوارڈ دیے جاتے ہیں۔

راوڑکیلا میں ۱۹۷۹ء میں مسلم فنڈ کا قیام عمل میں آیا ہے جس کا مقصد مسلم عوام کی اقتصادی سطح بلند کرنا ہے اس طرح کا مالی ادارہ چلانے کے لیے کارکنوں کو بے پناہ جدوجہد کرنی پڑتی ہے مسرّت کی بات ہے کہ اس ادارے کی مکمّل کارکردگی اردو زبان میں ہی کی جاتی ہے اس طرح یہ اڑیسہ کا واحد مسلم بینک ہے جو اردو کے علمی فروغ میں نمایاں رول ادا کر رہا ہے۔

نئی مطبوعات

حرفِ برہنہ

مُصنّف : پروفیسر عنوان چشتی
قیمت : ۱۰۰ روپے
ملنے کا پتا : اُردو سماج ، بی۔ ۱۱۷ ، جامعہ نگر ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

"حرفِ برہنہ" پروفیسر عنوان چشتی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں ۲۱ کتابوں کا تنقیدی جائزہ عروضی ، فنّی اور لسانی نقطۂ نظر سے لیا گیا ہے ۔ اس کتاب کے دو حصّے ہیں ۔ پہلے حصّے کا نام "مفصّل مفصّل" رکھا گیا ہے اور دوسرے کا نام "مختصر مختصر" ۔ پہلے حصّے میں شاعروں اور بعض تحقیقی کتابوں کے موضوعات و مواد پر تفصیلی بحث کی گئی ہے ۔ یعنی شعری مجموعوں اور تحقیقی مقالوں کا عروضی ، لسانی اور فنّی اعتبار سے مفصّل جائزہ لیا گیا ہے ۔ تمام جائزوں کا اندازِ نقد ایک ہی ہے ۔ ہر جائزے کے شروع میں کتاب کے موضوع اور مواد پر تبصرہ ہے جس میں نقاد نے تخلیق کار کے فکری پہلو کا جائزہ لیا ہے ، اور کتاب کی معنوی خوبیوں اور خامیوں کا احاطہ کیا ہے ۔ علم عروض ، ریاضی کی طرح سائنٹفک علم ہے ۔ اس علم کے اصول پختہ اور بے لچک ہیں ۔ مصرعوں کی ناپ تول کا مخصوص پیمانہ ہے ، اور پھر اس کی روشنی میں صحیح یا غلط رائے قائم کی جاتی ہے ۔ پروفیسر عنوان چشتی اس عہد کے ان عروضی نقادوں میں شامل ہیں جو اب خال خال نظر آتے ہیں ۔ ان کی تنقید کا ایک خاص انداز اور اصول ہے جس کو انھوں نے اپنے تنقیدی عمل میں اپنایا ہے ۔ اپنے نظریۂ تنقید پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے انھوں نے اس کتاب کے دیباچے (میزان) میں لکھا ہے :

"تنقید کے ایک طرف تنقیص اور دوسری طرف تحسین ہے ۔ تنقید ان دونوں کے درمیان دونوں میں شریک مگر دونوں سے الگ ہے ۔ یہاں تعصّب اور تاثّر کا گزر نہیں ۔ ۔ ۔ سچّی تنقید نفرت ہے نہ محبّت ، تعصّب ہے نہ تاثّر ، تردید ہے نہ تائید مگر ان سے یکسر ماورا بھی نہیں ۔ تنقید سچّائیوں کا زہر پی کر ادب اور فن کو نئی زندگی عطا کرتی ہے ۔"

[میزان (مقدمہ) ص۷]

پروفیسر عنوان چشتی نے اپنی تنقید میں اسی نقطۂ نظر کو اپنایا ہے ، اور ہر شاعر یا مُصنّف کے بارے میں لکھتے ہوئے مضمون کے آخری آدھے حصّے میں شاعر کے کلام یا مُصنّف کے عروضی بیانات کو عروض کی میزان پر رکھا ہے ۔ انھوں نے جس شاعر کے یہاں عروضی صحت پائی ہے اس کی تعریف بھی کی ہے مثلاً اختر الایمان کے مجموعۂ کلام "سروساماں" میں نئے تخلیقی تجربوں اور نئے عروضی اوزان کی نشاندہی کی ہے اور بعض جگہ ان کی شاعری کی عروضی خامیوں کی نشاندہی بھی کی ہے ۔ گویا جہاں تعریف کا محل نظر آیا ہے وہاں تعریف کی ہے لیکن جہاں اُن کو شاعر کے کلام میں لسانی ، فنّی یا وزن و بحر جیسی بنیادی خامیوں کے ساتھ دوسری خامیاں ملتی ہیں تو وہ ان کی بھی نشاندہی بے باکی سے کرتے ہیں ۔ مثلاً بشیر بدر کے مجموعۂ کلام "آمد" کا عروضی جائزہ ۔ پروفیسر عنوان چشتی نے "آمد" سے ایسے سینکڑوں اشعار نقل کیے ہیں جنھیں وہ بحر و وزن سے خارج قرار دیتے ہیں یا جن میں زبان فن اور بیان کے جھول ہیں ۔ "آمد" کی غزلوں میں تقریباً تمام شعری عیوب یعنی ایطا ، اجتماع ردیفین ، شکستِ ناروا ، شترگربہ ، سقوطِ حروفِ علت ، اُردو حروفِ علت کا خلافِ فصاحت سقوط اور الفاظ کا غیر موزوں اور غلط استعمال وغیرہ کی انھوں نے نشاندہی کی ہے ۔ اسی طرح مصوّر سبزواری کے مجموعۂ کلام "برگِ آتش سوار" کا بھرپور تجزیہ کیا ہے ، اور لسانی عروضی اور فنّی معائب اور اسقام کی نشاندہی کی ہے ۔

کتاب کے دوسرے حصّے یعنی "مختصر مختصر" میں مُصنّف کے وہ تبصرے شامل ہیں جو مختلف شعری مجموعوں پر وقتاً فوقتاً لکھے گئے ہیں ۔ یہ تبصرے بھی "مفصّل مفصّل" کے تجزیوں کی طرح شائع شدہ ہیں اور اب یکجا کر دیے گئے ہیں ان سے عام استفادے

کے ساتھ ساتھ مُصنّف کے تنقیدی نقطۂ نظر کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان سب تجزیوں اور تبصروں میں ایک ہی نقطۂ نظر کارفرما رہا ہے۔ اس کتاب کے ہر تجزیے اور تبصرے میں تجزیاتی اور تحقیقی طریقۂ کار اور تنقیدی انداز ملتا ہے۔

کتابت صاف ستھری نستعلیق ہے۔ کاغذ سفید چمکدار اور دبیز ہے۔ جلد مضبوط ہے اور نیلے اور سُرخ رنگ کے کپڑے سے منڈھی ہے۔ جس پر کتاب کا نام مُصنّف کا نام اور پتا وغیرہ سنہرے حرفوں میں چھپا ہے۔

——— (ڈاکٹر) توقیر احمد خاں

دوسرا چہرہ

مُصنّف: سراج انور
صفحات: ۳۱۹، سائز ۲۰×۳۰/۱۶
قیمت: ۶۰ روپے
ملنے کا پتا: طارق پبلیکیشنز، جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶

سراج انور اُردو کے معروف ناول نگار اور ڈراما نگار ہیں۔ وہ تقریباً چار دہائیوں سے اپنی تخلیقات سے گلشنِ اُردو کو نکھار اور سنوار رہے ہیں۔ تاہم اُن کی پہچان ایک ناول نگار کے طور پر سب سے زیادہ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اب تک دو درجن سے زیادہ ناول لکھ چکے ہیں۔ ان کے ناولوں کو موضوع کے اعتبار سے دو واضح حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک خالص رومانی اور دوسرے سماجی۔ اگرچہ انھوں نے اپنے ناولوں میں ان دونوں موضوعات سے انصاف کیا ہے لیکن اپنے سماجی ناولوں میں انھوں نے جس پختگی، فہم و ادراک اور وسعتِ نظر کا ثبوت دیا ہے وہ ہماری خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔

"دوسرا چہرہ" ہندو مسلم اتّحاد اور قومی یک جہتی کے موضوع پر شائع ہوئے اب تک کے تمام اُردو ناولوں میں ایک امتیازی حیثیت کا حامل ہے ——— عام طور پر اس موضوع پر لکھے ہوئے ناولوں میں یا تو تاثر اور فنّی پختگی کا فقدان ملتا ہے یا پھر سطحی احساس اور جذباتیت کی ایسی افراط ہوتی ہے جو پڑھنے والے پر کوئی تاثر نہیں چھوڑتی۔ سراج انور نے اس نازک مسئلے پر آج کے دَور میں جب کہ ملک کے متعدّد مقامات پر انسانی خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے، بڑی بے خوفی اور نہایت ذمّے داری سے قلم اٹھایا ہے اور متوازن اور مثبت خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ ایک آفاقی بھائی چارے اور انسانیت میں یقین رکھتے ہیں اور وہ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ مذہب کی بنا پر انسان اور انسان میں وہ تفریق پیدا ہو سکتی ہے جس کا نتیجہ خوں ریزی ہو۔ ان کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ ازلی طور پر کوئی بھی انسان بُرا نہیں ہوتا اور اگر گرد و پیش کا ماحول کسی انسان کو بُرا بنا بھی دیتا ہے تو بھی بُرے انسان کے دل میں بھی کبھی نہ کبھی خدا کی رحمت کا نور جھلکے گا اور وہ نیک کام کرے گا۔ "دوسرا چہرہ" انسان کی نیکی اور بدی کی یہی تصویر پیش کرتا ہے۔

یہ خیال کہ مقصدیت لازمی طور پر ادبی تخلیق کو فنّی طور پر کمزور کرتی ہے صحیح نہیں ہے اور یہ ناول اس کا ثبوت ہے۔ ناول کا پیراہن خاصہ وسیع ہے مگر اس میں کہیں بھی کوئی جھول اور شکن نظر نہیں آتی۔ اس میں کردار نگاری اپنے عروج پر ہے۔ واقعات کا تانا بانا، مختلف کرداروں کا عمل اور ردِعمل حقیقی زندگی اور اصلیت کے اتنا قریب ہے کہ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم اسی شہر اور اسی محلے میں رہتے ہیں جہاں یہ واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ تمام کردار اپنی عمومیت اور اصلیت سے اس عوامی بھیڑ کا حصّہ لگتے ہیں جس سے ہمارا سماجی ڈھانچہ بنتا ہے۔ کوئی بھی انسانی عمل غیر قدرتی نہیں ہے چاہے اس کی تحریک کمزور عقائد اور اشتعالِ جذبات ہی کیوں نہ ہو۔

ناول کا مرکزی کردار شرفو ہے جو دو تین سال کی عمر میں ہی یتیم ہو جاتا ہے۔ اس کو پالنے پوسنے کی ذمّے داری ایک ہندو بیوہ عورت شوبھا لے لیتی ہے۔ شوبھا اپنے رشتے داروں اور ہندو پڑوسیوں کی سخت مخالفت اور طعن و تشنیع کے باوجود شرفو کو نہیں چھوڑتی اور نہ اسے ہندو بناتی ہے۔ جس ماحول میں شرفو پلا اور بڑا ہوا اُس میں اس کا ایک برا آدمی بننا ناگزیر تھا۔ لوگوں کے کہنے سننے سے شوبھا اپنی کمسن بیٹی کو دوسرے شہر میں رہنے اور پڑھنے کے لیے اس کی موسی کے پاس بھیج دیتی ہے۔ شرفو اور شوبھا کا ماں بیٹے کا رشتہ قائم رہتا ہے۔ شرفو کو اپنی بہن یعنی شوبھا کی بیٹی ارچنا کا کوئی خیال نہیں آتا مگر جب وہ نوجوانی میں اپنی ماں کے پاس لوٹتی

ہے تو شرفو کو وہ بہت اچھی لگتی ہے اور شرفو اس سے شادی کرنے کی ٹھان لیتا ہے۔ اسے لاکھ سمجھایا جاتا ہے کہ ارچنا اس کی بہن ہے اور ہندو دھرم میں ایسے بیاہ کی اجازت نہیں مگر شرفو اپنی ضد پر اڑا رہتا ہے۔ اگرچہ اس کے مذہب میں یہ شادی جائز نہیں تھی مگر وہ یہ سوچتا ہے کہ رشتے ناطوں، شادی بیاہ اور میل ملاپ میں یہ مذہب کی دیوار کہاں سے آگئی۔ پھر شرفو کو ایک جرم میں جیل کی سزا ہو جاتی ہے۔ اس کے جیل سے چھٹنے سے پہلے ہی ارچنا کی شادی طے کر دی جاتی ہے مگر عین موقعے پر شرفو جیل سے چھٹ کر گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہ ایک بھائی کی حیثیت سے کنیا دان کرتا ہے اور لڑکے والوں کو ڈرا دھمکا کر مجبور کرتا ہے کہ شادی میں جہیز بالکل نہ لیں۔ حالات سے مجبور ہو کر شرفو شکورن سے شادی کر لیتا ہے جو اسے چاہتی تھی مگر جس کے ساتھ وہ بڑی بے اعتنائی سے پیش آتا تھا۔ ایک بھائی کی حیثیت سے ارچنا کی شادی کر کے وہ ایک خاص مسرت محسوس کرتا ہے اور کہتا ہے کہ بالآخر خدا نے اس سے ایک اچھا کام کروا ہی لیا!

ناول کے آخری حصے کو سراج انور صاحب نے عمدگی سے نبھایا ہے اور کہیں بھی اصلیت اور قدرتی پن کے دامن کو نہیں چھوڑا۔ اس ناول میں ہمیں انسانی سرشت، حالات کے نشیب و فراز، مذہب کے ٹھیکیداروں کی مذموم حرکات، فرقے وارانہ فسادات اور ان کے پسِ پشت بے ہودہ اور بے بنیاد وجوہ کی بڑی زندہ تصویریں ملتی ہیں۔ سراج انور صاحب ایک سادہ مگر طاقتور اسلوب کے مالک ہیں۔ انھوں نے ہر قسم کی مذہبی کجروی اور کور بینی کی مذمت کی ہے اور ان عناصر کا پردہ فاش کیا ہے جو ایسے فسادات کے لیے ذمّے دار ہیں۔ ناول میں جو دلچسپی شروع میں پیدا ہو جاتی ہے وہ آخر تک قائم رہتی ہے۔

اس قسم کا ناول لکھنا بڑا مشکل ہے۔ اس سے زیادہ مشکل مصنّف کا اپنی غیر جانب داری کو قائم رکھنا ہے۔ اگر مصنّف مسلمان ہے تو اس کی شاید کسی بات سے اس کے ہم مذہب سیخ پا ہو جائیں گے۔ اگر وہ ہندو ہے تو ہندو اسے موردِ الزام قرار دے سکتے ہیں کہ وہ مسلم نواز ہے۔ مگر سراج انور صاحب نے ایک سچے ادیب کے طور پر اپنی ذمّے داری نبھاتے ہوئے اس بات کی مطلق پروا نہیں کی۔ انھوں نے جو بات محسوس کی اسے بے خوفی سے کہہ دیا ہے چاہے وہ کچھ مسلمانوں کو بری لگی، چاہے کچھ ہندوؤں کو۔

"دوسرا چہرہ" جس کی اشاعت دہلی اُردو اکادمی کے تعاون سے عمل میں آئی ہے، موجودہ وقت کی ایک بہت اہم ضرورت کو پورا کرتا ہے اور ہر اعتبار سے ایک اچھا ناول ہے۔

—— م۔ م۔ راجندر

کوکن کے سپوت (جلد دوم)

مصنّف: انجم عبّاسی

صفحات: ۲۴۰، قیمت: ۶۰ روپے

ملنے کا پتا: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

کوکن مہاراشٹر کے تین اضلاع پر مشتمل حسین پہاڑیوں اور پُر جلال ساحل کے درمیان ایک ایسا مردم خیز خطہ ہے جس کے مکینوں نے زندگی کے بہت سے شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ سیاست ہو یا تعلیم، زبان ہو یا ثقافت۔ طب ہو یا ڈاکٹری باوجود معاشی پس ماندگی کے یہاں کے رہنے والوں میں خدمت کا جذبہ ایسا کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور ہے جس کو پڑھ کر آنے والی نسلیں زندگی کا چلن سیکھ سکتی ہیں۔ ہم بہت سی خصوصیات، دوسروں کی زندگی کو پڑھ کر خود میں پیدا کر سکتے ہیں اور احساس کمتری کے جال سے نکل کر زندگی کو خوشگوار بنا سکتے ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب بھی ایک ایسی ہی کتاب ہے جس کا مطالعہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اس کی پہلی جلد ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی افسوس کہ راقم نے نہیں پڑھی۔ دوسری جلد کو پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کوکن کا علاقہ علم و فن کا گہوارہ رہا ہے۔

جلد دوم اہلِ کوکن کے انٹرویوز، سوانح حیات اور مرحومین کی یادوں پر مشتمل ایک ایسی تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے جو اُردو دُنیا کو بہت سی شخصیتوں سے روشناس ہی نہیں کراتی بلکہ ان کی خدمات کے پیشِ نظر انھیں دریافت بھی کرتی ہے جس سے ان کا تشخص قائم رہے۔ کوکن کی ایسی تینتالیس ہستیوں کو بیک وقت پیش کرنے میں مصنّف کو بہت سے مراحل سے گزرنا پڑا ہوگا انھیں در در کی خاک چھاننی پڑی ہوگی۔ ادبا اور شعرا کے علاوہ ہر شعبۂ حیات کے

لوگوں کے دروازوں پر کنڈی کھٹکھٹانا ہر آدمی کے بس کی بات نہیں پھر بہت سے متکبّر جواب دینا تو درکنار آنکھ اُٹھا کر دیکھنا تک گوارا نہیں کرتے۔ ایسے حالات اور مصروف ترین زمانے میں اجمالی تاریخ مرتب کرنا مشکل ترین کام ہوجاتا ہے۔ جس میں تعلیم، سیاست، سماج، ادب، مذہب، انسانیت سے متعلق مسائل کا بھی ذکر ہو اور ان سے وابستہ افراد کی اعلیٰ خدمات کا بیان بھی۔ یہی نہیں ان کی نفسیات، جدوجہد شعور وآگہی کی ایسی باتیں جو انسان کو اعلیٰ اور ارفع منزل تک لے جاتی ہیں۔ انجم عبّاسی صاحب کے قلم میں روانی اور زبان میں دلکشی ہے۔

کوکن کی علمی، ادبی اور سماجی تاریخ مرتب کرنے والے اس کتاب سے کافی مواد حاصل کرسکتے ہیں۔

(ڈاکٹر) مجیب الاسلام

بقیہ:
نصف صدی پہلے کا ایک نایاب ادبی جریدہ

کہاروں کا گیت

بھائیو! آہستہ آہستہ چلو
کیونکہ ہم ایک نوعروس کو لیے جارہے ہیں
وہ اپنی زندگی کے سہانے اور رنگین خواب
دیکھ رہی ہے
اور اپنے ذہن میں ایک تابندہ مستقبل کا نقشہ
جما رہی ہے
کیا معلوم اس کے خوابوں کی تعبیر کیا ہو!
اس کو اپنے تخیّل کی ایک نئی دنیا تعمیر کرنے دو
کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ چونک پڑے
اور اس کے رنگین خوابہائے مسرّت منتشر
ہوجائیں

آہستہ آہستہ!
کیوں کہ ہم پردہ نشیں دوشیزہ کو لیے جارہے ہیں
کسی غیر محرم کی نگاہیں ان پُر اسرار جلووں کو نہیں
دیکھ سکتیں
جو آج اس کے معصوم چہرے پر کھیل رہے ہیں
کوئی انسان ان رازہائے سربستہ کو نہیں پڑھ سکتا
جو اس کی نگاہوں کی اتھاہ ٹھنڈی گہرائیوں میں
پوشیدہ ہیں
کوئی ان پُر اسرار حقیقتوں کو نہیں جان سکتا
جو اس کے دھڑکتے ہوئے قلب میں مستور ہیں

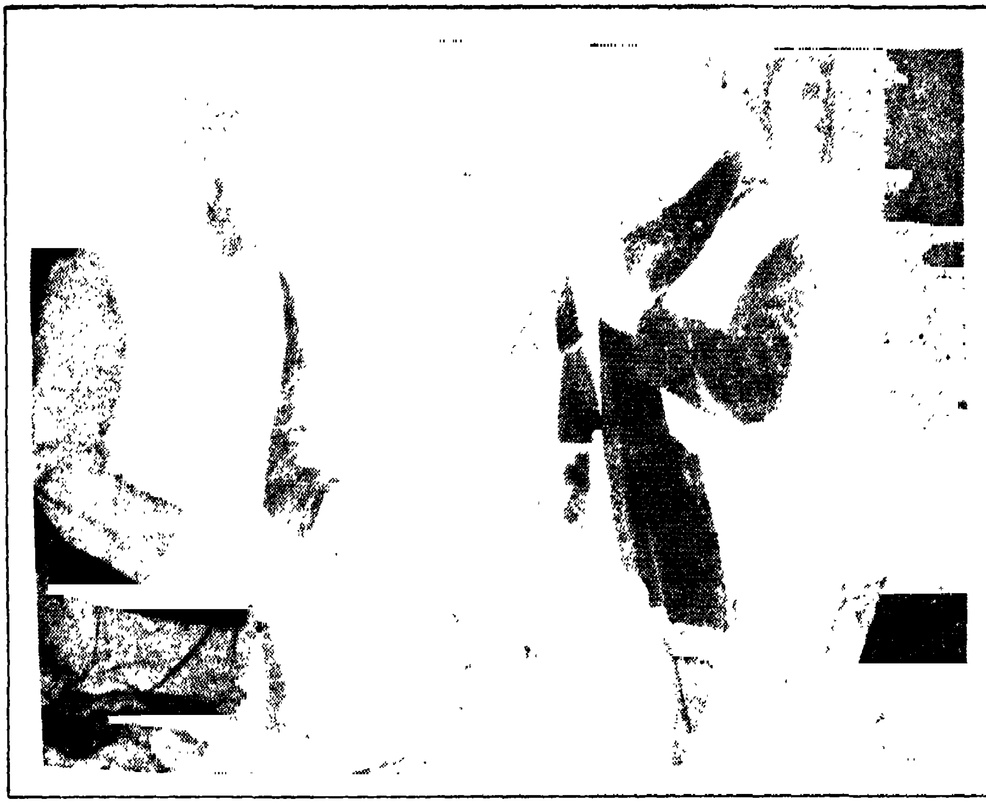
بھائیو! آہستہ آہستہ!
کیوں کہ ہم ایک دوشیزہ کو لیے جارہے ہیں!

اُردو خبرنامہ

ملکی اور غیر ملکی مہمان ادیبوں کا استقبال

اُردو اکادمی، دہلی نے انجمن ترقی پسند مصنّفین کی سہ روزہ کانفرنس اور ساہتیہ اکادمی کی ادبی تقریبات میں شرکت کے لیے دہلی آئے ہوئے ملکی اور غیر ملکی مہمانوں کے اعزاز میں ایک استقبالیہ محفل آراستہ کی — تصویر میں اکادمی کے سیکریٹری سیّد شریف الحسن نقوی مہمانوں کے سامنے خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے۔ اور پہلی صف میں دائیں سے لدمیلا وسالیوا (روس)، شمشیر سنگھ شیر (ڈنمارک)، کے۔ ایل۔ ساقی نارنگ، ڈاکٹر عالیہ امام (کراچی) اور کنور مہندر سنگھ بیدی سحر۔





اُردو اکادمی دہلی کی ایوارڈ کمیٹی کے چیئرمین کنور مہندر سنگھ بیدی سحر ___ سریندر پرکاش کا استقبال کرتے ہوئے، جنھیں اس سال ساہتیہ اکادمی ایوارڈ پیش کیا گیا ہے۔

(تصاویر: سیّد فدا علی)

اڑیسہ اُردو رائٹرس کانفرنس اور مشاعرہ

پچھلے دِنوں اُڑیسہ اُردو اکادمی کی جانب سے آل اُڑیسہ اُردو رائٹرس کانفرنس اور مشاعرہ، تقسیم اعزازات، رسم اجرا رسالہ "فروغ ادب" سوچنا بھون، بھونیشور میں منعقد ہوا۔

کانفرنس کے شرکا نے "اُڑیسہ میں اُردو شعرا و ادبا کے مسائل" اور "اڑیسہ میں اُردو کے تدریسی مسائل (ابتدائی سطح تک)" پر اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ مقالہ پیش کرنے والوں میں ڈاکٹر کرامت علی کرامت، ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری، جناب یوسف جمال اور دیگر حضرات شامل تھے۔

جلسہ تقسیم اعزازات میں اُڑیسہ کے تین شعرا و ادبا کو ان کی مجموعی ادبی خدمات پر دو ہزار روپے نقد پیش کیے گئے۔ اعزاز پانے والے حضرات (بالترتیب) جناب رشمی کانت پاریکھ راہی (کٹک) جناب مولانا سیّد محمّد نورالہدیٰ قائد (سونگڑہ) اور جناب محمود شیخ (بالیسر) تھے۔

اس کے بعد اُڑیسہ اُردو اکادمی کے رسالے "فروغ ادب" کے دو شماروں کے اجرا کی رسم ادا کی گئی۔ آخر میں مشاعرہ ہوا جس میں اُڑیسہ کے ممتاز شعرا نے شرکت کی۔

(محمد منظور احمد قاسمی، سیکریٹری)

ریڈیو اور ٹی۔وی کی زبان

کانپور کی ادبی تنظیم "لٹریرینس" نے گذشتہ دِنوں لکھنؤ میں آل انڈیا ریڈیو اور ٹیلی وژن مراکز کے سامنے زوردار مظاہرہ کیا اور مرکزی وزیرِ اطلاعات و نشریات کو چھ نکاتی محضر نامہ پیش کیا جس میں اناؤنسر، نیوز ریڈر اور نمائندوں کے تقرر کے لیے زبان کی بنیادی جانکاری اور درست تلفّظ کو "معیارِ اوّل" بنانے کے مطالبے کے علاوہ علاقائی اور قومی چینل پر اُردو میں خبریں شروع کرنے اور مذہبی جنون بڑھانے والے پروگرام بند کرنے کا مطالبہ بھی شامل ہے۔

"لٹریرینس" کے مذکورہ مظاہرے میں شاعروں، ادیبوں، افسانہ نگاروں، اساتذہ اور وکلا کے علاوہ اسٹیج کی دنیا سے وابستہ تقریباً دوسو دانشور شریک تھے۔ ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے پروگراموں میں ہونے والی زبان و بیان کی غلطیوں پر اُردو پڑھا لکھا عام آدمی بھی نہ صرف متوجّہ ہوچکا ہے بلکہ اب ریڈیو اور ٹی۔وی کو بڑی تعداد میں ایسی شکایتوں کے سیکڑوں خطوط بھی آئے دن موصول



دائیں سے: صدر جلسہ پیام فتحپوری، عارف محمود اور پروگرام کے کنوینر شفیق اللہ غازی کے علاوہ زبیر احمد فاروقی (مائک پر) نظر آرہے ہیں

(تصویر: خورشید مفتی)

ہونے لگے ہیں اور "الکٹرانک میڈیا" کے ذمّے داران ایسی غلطیوں کے ازالے کے لیے "سماچار سمیکشا" عنوان سے ایک پروگرام شروع کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

(شفیق اللہ غازی)

سریندر پرکاش کے اعزاز میں تہنیتی جلسہ

شعبۂ اُردو بمبئی یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام یونیورسٹی کے ودیانگری کامپلیکس میں مشہور افسانہ نگار جناب سریندر پرکاش کے اعزاز میں ایک تہنیتی جلسہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت سندھی کے ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ شاعر جناب ارجن میر چندانی شاد نے کی۔

ساہتیہ اکادمی یافتگان برائے سال ۱۹۸۹ء کی فہرست میں جناب سریندر پرکاش کے نام کی شمولیت پر اُردو دُنیا میں بالعموم اور بمبئی کے ادبی حلقوں میں بالخصوص مسرت و شادمانی کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس تہنیتی جلسے میں صدر شعبۂ اُردو پروفیسر عبدالستار دلوی نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں جناب سریندر پرکاش کو شعبۂ اُردو اور اُردو دُنیا کی طرف سے مبارک باد دیتے ہوئے سریندر پرکاش کو اُردو فکشن کا ایک اہم نام قرار دیا اور کہا کہ انھوں نے بمبئی میں فکشن کی اُس روایت کو جاری رکھا اور اسے استحکام بخشا جس کا آغاز کرشن چندر، منٹو اور بیدی نے کیا تھا۔

مشہور شاعر جناب حسن نعیم نے سریندر پرکاش کے ذاتی حالاتِ زندگی کے تناظر میں اُن کی فنی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کے موضوع پر سیر حاصل تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ سریندر پرکاش بے حد حسّاس آدمی ہیں اور اسی لیے وہ ایک اچھے فن کار ہیں۔

جدید افسانہ نگار جناب انور خاں نے سریندر پرکاش کے فن پر اجمالاً ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے دلّی کے کافی ہاؤس کی ادبی فضا سے سریندر پرکاش کی اثر پذیری کا ذکر کیا۔ مشہور محقق جناب رشید حسن خاں نے اپنی تقریر میں صاحب اعزاز کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ سریندر پرکاش کی شخصیت کی نمایاں صفت عدم مفاہمت ہے اور اسی نے انھیں منفرد فن کار بنایا ہے۔ جناب ارجن میر چندانی شاد نے اپنے صدارتی خطبے میں جناب سریندر پرکاش کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ اُردو اور سندھی دونوں اقلیتوں کی زبانیں ہیں اور دونوں کے بعض مسائل مشترک ہیں۔ انھوں نے اس کا خصوصی ذکر کیا کہ اُردو ادب نے ایک طویل مدّت تک سندھی ادب کو متاثر کیا ہے۔ اس موقع پر جناب سریندر پرکاش نے اپنی تازہ کہانی بھی سنائی ــــــ اس تہنیتی جلسے میں شعبے کے اساتذہ کے علاوہ شہر کی متعدد علمی و ادبی شخصیتوں نے شرکت کی۔

ایک اہم ادبی محفل

پچھلے دنوں مرکزی انجمن ترقی اُردو (ہند) کے صدر دفتر "اُردو گھر" نئی دہلی میں مخمور سعیدی کے مجموعۂ مضامین "بازدید" کی رونمائی کی تقریب منعقد ہوئی۔ اس تقریب کے داعی ڈاکٹر خلیق انجم تھے، صدارت انجمن کے صدر سید حامد صاحب نے فرمائی اور کتاب کی رونمائی کی رسم پنڈت آنند نرائن مُلّا نے انجام دی۔ جلسے کا آغاز ڈاکٹر خلیق انجم

ی خیر مقدمی تقریر سے ہوا۔ انھوں نے کہا کہ مخمور سعیدی کی پہلی پہچان شاعری ہے اور وہ ہمارے دَور کے صفِ اوّل کے شاعروں میں ہیں لیکن ان کی نثر بھی امتیازی خصوصیات رکھتی ہے۔ رشید حسن خاں نے کہا کہ بطور نثر نگار مخمور سعیدی کی اعلیٰ صلاحیتوں کا اندازہ آج سے بیس سال پہلے اس وقت ہو گیا تھا جب انھوں نے غالب کی مشکل ترین فارسی تصنیف "دستنبو" کو اس خوبی سے اُردو میں منتقل کیا تھا کہ صرف کتاب کا متن ہی نہیں اس کی انشا پردازانہ خصوصیات بھی اُردو میں جُوں کی توں آگئی تھیں۔ اس کتاب کے ترجمے کی ایک کوشش ان سے پہلے خواجہ حسن نظامی مرحوم نے کی تھی لیکن یہ ترجمہ سات آٹھ صفحے سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ پروفیسر تنویر احمد علوی نے کہا کہ مخمور سعیدی چونکہ صحافت کے پیشے میں ہیں اس لیے ان کے قلم سے ایسی بہت سی تحریریں بھی نکلی ہوں گی جو ان کے نام سے شائع نہیں ہوتیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ ان کی بھی نشاندہی کی جائے اور یہ کام ان کے مخصوص طرزِ تحریر کو سامنے رکھ کر کیا جا سکتا ہے۔ جناب ابوالفیض سحر نے کہا کہ مخمور سعیدی کے شعری اور ادبی کارناموں کے علاوہ ان کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے ادبی صحافت کو اس کے اعلیٰ مدارج تک لے جانے کی کامیاب کوشش کی ہے اور وہ جن رسائل سے وابستہ رہے انھوں نے برِصغیر کے ادبی منظر نامے کی تشکیل میں اہم حصّہ لیا۔ شجاع خاور نے زور دے کر یہ بات کہی کہ شاعری کی تفہیم و تنقید کا حق ایک شاعر ہی بہتر طور پر ادا کر سکتا ہے اس لیے مخمور سعیدی کے یہ مضامین خصوصی قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ان مضامین سے جہاں مخمور سعیدی کی تنقیدی بصیرت کا پتا چلتا ہے وہیں یہ ان کے اچھا انسان ہونے کی بھی گواہی دیتے ہیں کیوں کہ انھوں نے بعض ایسے شاعروں پر بھی لکھا ہے جن کے مقابلے میں وہ خود کہیں بہتر شاعر ہیں۔ سید شریف الحسن نقوی کا خیال تھا کہ مخمور سعیدی کی تنقیدی بصیرت انھیں ان کے پیشے کی دین ہے۔ ایک مُدیر کی حیثیت سے ہزاروں مضامین نظم و نثر ان کی نظر سے گزرے ہیں اور انھوں نے ان کے حسن و قبح کو پرکھا ہے اس لیے اب ان کی نظر خذف ریزوں اور جواہر پاروں کے فرق کو فوراً ہی پہچان لیتی ہے۔ سید ذہین نقوی نے کہا کہ مخمور سعیدی نے اپنے عہد کے اہم ادبی رسائل کے ادارتی عملے میں رہ کر نئے لکھنے والوں کے ذہن و ذوق کی تربیت کی ہے اور ان کی اس خدمت کا بھی کھلے دل سے اعتراف ہونا چاہیے۔

کتاب کا اجرا کرتے ہوئے پنڈت آنند نرائن مُلّا نے کہا کہ میں مخمور سعیدی کی شاعرانہ خوبیوں کا معترف رہا ہوں اور یہ اعتراف کئی بار کر چکا ہوں۔ اب ان کی نثر دیکھ کر اندازہ ہوا کہ وہ اس میدان کے بھی شہسوار ہیں۔ انھوں نے جوش اور جگر پر لکھے گئے مضامین کا خصوصیت سے ذکر کیا اور کہا کہ ان میں جو رائیں ظاہر کی گئی ہیں وہ بہت صائب ہیں اور میرے تاثرات بھی ان شعرا کے بارے میں تقریباً یہی ہیں البتہ بسمل سعیدی پر جو مضمون ہے اس میں میرے نزدیک مخمور صاحب نے حقِ نقد کم ادا کیا ہے اور حقِ شاگردی زیادہ۔ آخر میں اپنی صدارتی تقریر میں سید حامد صاحب نے کہا کہ ایسی بہت کم کتابیں ہیں جنھیں میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ لیا ہو۔ "بازدید" جب میرے ہاتھ میں آئی اور میں نے اسے پڑھنا شروع کیا تو آخری مضمون تک پڑھتا چلا گیا۔ تنقیدی مباحث میں ایسی شگفتہ نثر جو بظاہر سادہ نظر آتی ہے لیکن صنّاعانہ بھی ہے، کم دیکھنے میں آئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ میری نظر میں اس کتاب کا سب سے جامع و مانع مضمون ساحر لدھیانوی پر ہے۔ ساحر کی شخصیت اور شاعری کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس کا احاطہ نہ کر لیا گیا ہو۔ انھوں نے کہا کہ جوش ملیح آبادی کے بارے میں مخمور صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے تو اختلاف کی گنجائش نہیں لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ جوش کی شاعری کے کچھ اور پہلو بھی ہیں جو توجہ طلب ہیں۔

صدارتی تقریر سے پہلے جناب حیات لکھنوی نے ایک نظم سنائی جس میں مخمور سعیدی کی شاعری اور شخصیت کی بڑے فنکارانہ انداز میں عکاسی کی گئی تھی۔ نظم بہت پسند کی گئی۔ مخمور سعیدی نے داعیِ جلسہ، صدرِ جلسہ، مہمانانِ خصوصی اور تمام مقررین اور شرکا کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ جو کچھ کہا گیا وہ میری قدر افزائی ہے ورنہ من آنم کہ دانم۔ نظامت کا فریضہ ایم۔ حبیب خاں نے انجام دیا۔ شرکا میں دہلی کی ممتاز علمی ادبی اور سماجی شخصیتیں موجود تھیں۔

(رزّاق ارشد)

اُردو ہندی میں کوئی جھگڑا نہیں ہے

ہندوستان کے مقبول طنز نگار ایس۔ فضیلت کے نئے مزاحیہ ناول "اودیؔ اللہ" کی رسمِ اجرا سرسید ایجوکیشنل اینڈ کلچرل سوسائٹی کے زیرِ اہتمام منعقد ہوئی۔ اس ادبی تقریب کی صدارت محمد اعظم خاں وزیر محنت و مسلم اوقاف اُتر پردیش نے فرمائی اور اس میں رامپور کے علاوہ مرادآباد، علی گڑھ، لکھنؤ اور دہلی کے ادیبوں، صحافیوں اور دانشوروں نے شرکت کی۔

'اودیؔ اللہ' کے خالق ایس۔ فضیلت کے فن اور شخصیت پر مقالات پڑھے گئے جن میں ڈاکٹر ظہیر صدیقی، مرتضیٰ ساحل تسلیمی اور مولانا ابوالمجاہد زاہد کے مقالات خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

ادیبوں کے اس اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے جناب محمد اعظم خاں نے کہا کہ آج اُردو میں مزاح نگاروں کی تعداد بس اتنی ہی ہے کہ انھیں آسانی سے انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ ایسے دور میں "اودیؔ اللہ" جیسے ناول قابلِ قدر ہیں۔ اعظم خاں نے کہا کہ طنز نگاری ایک مشکل فن ہے اور ایس۔ فضیلت کے مزاحیہ ناولوں، خاکوں اور طنزیہ مضامین کا معیار دیکھنے کے بعد نہایت آسانی سے یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ وہ آج ہندوستان کے ایک اہم طنز نگار ہیں۔

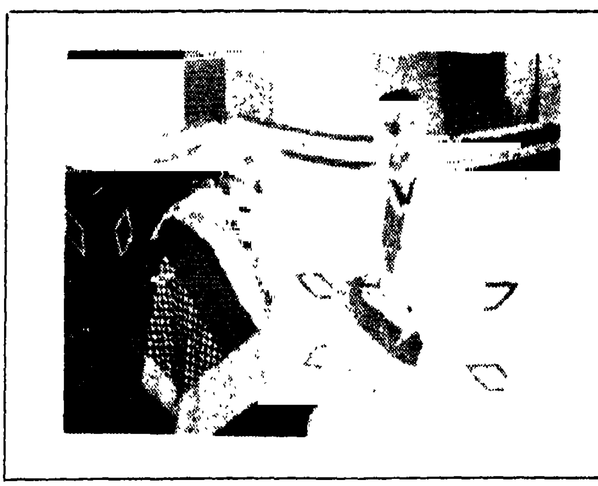
وزیرِ محنت نے مزید کہا کہ اُردو اور ہندی کا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ ہماری سرکار اُردو اور ہندی کے ساتھ سگی بہنوں جیسا سلوک کرنے کا تہیہ کر چکی ہے۔ ادیبوں کو چاہیے کہ وہ اپنی تحریروں سے ایک صاف ستھرے معاشرے کی تشکیل میں حکومت کے ساتھ تعاون کریں۔



۱۸ فروری ۹۰ء کو ماہنامہ 'انشاء' کلکتہ کی جانب سے غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں ایک ادبی تقریب ہوئی جس کے مہمانِ خصوصی لندن سے آئے ہوئے سید عاشور کاظمی تھے اس موقعے پر ماہنامہ 'انشاء' کے خصوصی شمارے "ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ" کا اجرا کرتے ہوئے (دائیں سے) ممبر پارلیمنٹ شکیل الرحمٰن، کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ، عاشور کاظمی، ڈاکٹر خلیق انجم اور ف۔س۔ اعجاز مدیر ماہنامہ انشاء نظر آرہے ہیں۔



بمبئی کی ایک ادبی محفل میں ظفر گورکھپوری کے تازہ شعری مجموعے "چراغِ چشمِ تر" کی رونمائی کے موقعے پر ـــــ دائیں سے : ڈاکٹر یونس اگاسکر، ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، ڈاکٹر اسحٰق جمخانہ والا، علی سردار جعفری اور ظفر گورکھپوری ۔



پچھلے دنوں سرونج میں سیفی سرونجی کی نئی کتاب "رنگوں کا امتزاج" کا اجرا کرتے ہوئے ایس۔ڈی۔او۔ سول سرونج ۔

بیرونی ادیبوں کا استقبال

شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی کی جانب سے پاکستان کے ممتاز نقاد پروفیسر عتیق احمد اور کینڈا سے آئے ہوئے جناب اشفاق حسین کو استقبالیہ دیا گیا۔ جلسے کی صدارت ـــــ پروفیسر فضل الحق صاحب نے کی۔ پروفیسر عتیق احمد نے پاکستان میں اُردو ادب کے موجودہ رجحانات پر گفتگو کی اور جناب اشفاق حسین نے اپنے کلام سے نوازا۔ جلسے میں پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر شارب ردولوی، ڈاکٹر شریف احمد، ڈاکٹر شمیم نکہت، ڈاکٹر صادق اور دیگر اساتذہ اور طلبا نے شرکت کی۔　　(شمع پروین)

نتیجہ کل ہند مضمون نویسی مقابلہ

"بزمِ علم و ادب" رائے بریلی کے زیرِ اہتمام "ہندوستان میں فرقہ پرستی کے اسباب اور اس کا حل" کے زیرِ عنوان منعقدہ کل ہند مضمون نویسی کے مقابلے میں ادارے کو پورے ملک سے کثیر تعداد میں مضامین موصول ہوئے۔ مندرجہ حضرات کے مضامین انعام کے مستحق قرار دیے گئے :

اول انعام (پانچ سو روپے) :

جناب حافظ ابوسفیان اصلاحی (ایم۔اے شعبۂ سیاسیات) جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ ۔

دوسرا انعام (دو سو پچاس روپے) :

جناب جان عالم رہبر، بھیونڈی، تھانے، (مہاراشٹر) ۔

تیسرا انعام (ایک سو پچاس روپے) :

جناب محمد ادریس فلاحی، ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ (یو۔پی)

خصوصی انعام (ایک سو روپے) :

محترمہ ششی ٹنڈن، آگرہ (یو۔پی)۔

(م۔ لئیق انصاری)

اہلِ ادب سے گزارش

میں سکندرآباد کے شعرائے کرام کا سو سالہ تذکرہ مرتب کر رہا ہوں۔ جو حضرات کسی بھی طرح اس اہم اور تاریخی کام میں میری مدد کریں گے میں ان کا ممنون رہوں گا۔ اپنے قیمتی مشورے درجِ ذیل پتے پر ارسال کریں :

محمد مقصود جالب،

۱۰۔ رسالداران، نزد شیشوں والی مسجد، سکندرآباد ۲۰۳۲۰۵ (یو۔پی)

سرورق کے اندرونی صفحے کے لیے

موصولہ عنوانات

مارچ ۱۹۹۰ء کے "ایوانِ اُردو" کے سرورق کے اندرونی صفحے پر جو تصویر چھاپی گئی تھی اس کے لیے موصول ہونے والے شعری اور نثری عنوانوں میں سے تصویر کی مناسبت سے موزوں سمجھے جانے والے چند عنوان ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں ——— "گلدستہ" ان حضرات کو ارسال کیا جائے گا جن کے بھیجے ہوئے عنوان چوکھٹے میں دیے جا رہے ہیں۔

شعری عنوانات

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن
(میرحسن)

مرسلہ: سعید احمد قائد، ۱۰۰۷، مدرسہ حسین بخش، بازار مٹیا محل، جامع مسجد ۱۱۰۰۰۶

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا
(غالب)

مرسلہ: قدیر بنارسی، بنارس

ہے جوانی خود جوانی کا سنگھار
سادگی گہنا ہے اس سن کے لیے
(امیر مینائی)

مرسلہ: محمد یوسف خاں، آگرہ

دیکھیے گا سنبھل کے آئینہ
سامنا آج ہے مقابل کا
(ریاض خیر آبادی)

مرسلہ: شعیب راجا، دہلی

مشکل بہت پڑے گی برابر کی چوٹ ہے
آئینہ دیکھیے گا ذرا دیکھ بھال کے
(نامعلوم)

مرسلہ: افسر علی خاں، حسن پور

کہاں پھر منہ چھپاؤ گے نہ دیکھو آئینہ، دیکھو
تمھاری جیسی صورت آئینہ میں ہو بہو ہوگی
(رسا دہلوی)

مرسلہ: حیدر علی، نئی دہلی

دل بہلنے کو بہل جائے گا یوں تو لیکن
زندگی کیسے کٹے گی تری تصویر کے ساتھ
(جگر مرادآبادی)

مرسلہ: محمد صدیق، علی گڑھ

سرِ آئینہ مرا عکس ہے پسِ آئینہ کوئی اور ہے
میں خیال ہوں کسی اور کا مجھے سوچتا کوئی اور ہے
(نامعلوم)

مرسلہ: احسان اللہ عمیر، دربھنگہ

کیا جانے وقت کون سا منظر دکھائے گا
چہرے بجھے بجھے سے ہیں آنکھیں دھواں دھواں
(امروز سکندرآبادی)

مرسلہ: کلیم احمد شبیر احمد، مالیگاؤں

ترا جو عکس اِن آنکھوں میں ہے وہ سچّا ہے
کہے جو تجھ سے ترا آئنہ نہ مان اُسے
(مخمور سعیدی)

مرسلہ: غازی اسلام کٹیہار

نثری عنوانات

"شہر اور سپنا" (خواجہ احمد عباس کا افسانہ)
مرسلہ: ضیاء الحق اسلم عزیز (معرفت ماسٹر اسلم، ۱۳۸، ظفر نگر، ایس. نمبر ۹۱، اسلام پورہ وارڈ، مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳)

"آئینہ" (حیرت بدایونی کا شعری مجموعہ)
مرسلہ: سعید احمد قائد، دہلی

"نقوشِ حُسن" (باوا کرشن گوپال مغموم کا مجموعۂ کلام)
مرسلہ: نسیم احمد، نئی دہلی

"کنوارے سپنے" (راے زادہ کا ناول)
مرسلہ: کامل خاں، رامپور

"درد کا رشتہ" (اختر الایمان کی نظم)
مرسلہ: انعام الحق (مالیگاؤں)

"کیچڑ کے کنول" (عارف مارہروی کی کہانی)
مرسلہ: ماسٹر اسلم عزیز (مالیگاؤں)

"یہ ہے میرا ہندوستان"
(مجیب خاں کا ڈراما)
مرسلہ: نسیم بانو (مالیگاؤں)

"تماشا درپن کا" (نیاز قومی کا افسانہ)
مرسلہ: محمد یٰسین احمد جمالی، بھاگلپور

ہم طرح اشعار

ہمیں افسوس ہے کہ اس مرتبہ "ہم طرح اشعار" کے لیے جو اشعار ہمیں موصول ہوئے ان میں سے ایک شعر بھی مطروحہ مصرعے کی زمین میں نہیں تھا۔ اگر ردیف قافیہ درست تھا تو بحر کوئی دوسری تھی اور اگر بحر صحیح تھی تو ردیف قافیہ بدلا ہوا تھا اس لیے کوئی شعر شاملِ مقابلہ نہ ہو سکا ——— ہم اسے قارئین کی عدم توجہی پر ہی محمول کر سکتے ہیں اور اسی کے پیشِ نظر اس مہینے سے یہ سلسلہ موقوف کیا جا رہا ہے۔

آپ کی رائے

○ مارچ ۹۰ء کے "حرفِ آغاز" میں آپ نے یہ بجا فرمایا ہے کہ "اُردو دھیرے دھیرے صرف ادب کی زبان بنتی جا رہی ہے اور ادب کے علاوہ دوسرے علوم و فنون سے اس کا رشتہ ٹوٹتا جا رہا ہے" ــــــ لیکن اسی کے ساتھ آپ کا یہ سوال کہ اُردو میں ایسے قارئین کتنے ہیں جو ادب کے علاوہ دوسرے موضوعات سے دلچسپی رکھتے ہیں، حقیقت پر مبنی نہیں۔

ادب کے علاوہ دوسرے موضوعات سے دلچسپی رکھنے والے اُردو کے حلقے میں اگر کثرت سے موجود نہ ہوتے تو یہ زبان کب کی ختم ہو چکی ہوتی، کیوں کہ صرف ادبی موضوعات سے دلچسپی رکھنے والوں کے سہارے کوئی بھی زبان زندہ نہیں رہ سکتی۔ جبکہ اُردو زبان کسی نہ کسی شکل میں آج بھی زندہ ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ جیسے ادارے (اُردو اکادمی) اور رسالے (ایوانِ اُردو) اُردو قارئین کے لیے ادبی موضوعات کے علاوہ دوسرے علوم و فنون پر بھی مواد فراہم کریں تاکہ روزمرّہ زندگی کے عملی تقاضوں کی تکمیل کے لیے انھیں دوسری زبانوں کا دست نگر بن کر نہ رہنا پڑے نیز اُردو ادب کے ساتھ اُردو زبان کی خدمت بھی ہوتی رہے۔

ــــــ ارشد لکھمنیاوی، نئی دہلی

○ شمارۂ فروری ۹۰ء کے "سرودِ رفتہ" میں پنڈت لبھورام جوش ملسیانی کی غزل اور تصویر چھپی ہے جو خوب ہے۔ جناب مولانا ماہر القادری مرحوم پاکستان سے ماہنامہ 'فاران' نکالا کرتے تھے جس میں وہ مستقلاً وفیات پر 'یادِ رفتگاں' کے عنوان سے لکھا کرتے تھے ان کے انتقال کے بعد یہ سارے مضامین یادِ رفتگاں ہی کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ پنڈت لبھورام جوش ملسیانی کی وفات پر بھی یادِ رفتگاں میں ایک مضمون ہے جس میں جوش ملسیانی کی عمر ۹۴ سال بتائی گئی ہے اور قطعہ تاریخ وفات بھی درج ہے۔

ولادت: یکم فروری ۱۸۸۲ء
وفات: ۲۷ جنوری ۱۹۷۶ء

چل بسے جوش ملسیانی بھی
آج رخصت ہوئی بہارِ داغ
ہائے افسوس صد ہزار افسوس
خاک ہو جسمِ یادگارِ داغ

دریافت طلب امر یہ ہے کہ آن کی ولادت کا سن آپ کی تحریر کے مطابق ۱۸۸۴ء ہے اور یادِ رفتگاں کے بموجب ۱۸۸۲ء قرار پاتا ہے ان میں صحیح سن ولادت کون سا ہے؟ آئندہ جوش ملسیانی پر کام کرنے والوں کو سہولت ہوگی۔[1]

ــــــ مولوی سید حمید اللہ بختیاری شاطر، چتور

(۱) جوش صاحب کے صاحبزادے پنڈت بال مکند عرش ملسیانی نے ان کا سالِ ولادت ۱۸۸۴ء ہی لکھا ہے اور جوش صاحب کے شاگردِ رشید جناب ساحر ہوشیارپوری کے نزدیک بھی ان کا سالِ ولادت یہی درست ہے۔ "سرودِ رفتہ" میں دی جانے والی غزل اور جوش صاحب کی تاریخ ولادت و وفات جو غزل کے ساتھ شائع ہوئی، ساحر صاحب ہی کی فراہم کردہ ہے۔ ــــــ ادارہ

○ "ایوانِ اُردو" واحد ادبی رسالہ ہے جس کا انتظار بے صبری سے رہتا ہے۔ فروری ۹۰ء کے شمارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا مضمون بطورِ خاص پسند آیا۔ البیلے شاعر میراجی پر اس سے قبل اتنا وقیع اور پُرمغز مقالہ نظر سے نہیں گزرا تھا۔

اس بار تینوں افسانے جاندار ہیں جناب رام پال اور سلطان سبحانی کے افسانوں نے خاصا متاثر کیا۔ افسانہ نویس اگر جدید تقاضوں کو برتتے ہوئے اپنی کہانیوں میں اسی طرح 'کہانی پن' کو قائم رکھے تو شاید ترسیل کا کوئی مسئلہ ہی باقی نہ رہے۔ ظفر اقبال، محمد شفیع عارف، ماجد دیوبندی، صہبا وحید اور عشرت دھولپوری کی غزلیں اچھی ہیں۔

جناب کرشن موہن کے شعری مجموعے "دنیا مرے آگے" پر جو تبصرہ شائع ہوا ہے اس کے دوسرے دوہے کے دوسرے مصرعے میں تین 'فعلن' اور ایک 'فعل' ہونا چاہیے۔ یعنی:
فعلن فعلن فاعلن، فعلن فعل فعول

ــــــ مناظر حسن شاہین، گیا

○ فروری کے شمارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا مضمون "میراجی: ایک مطالعہ" اچھا ہے۔ "پنڈت نہرو: ایک اشاریائی دستاویز" ایک دلچسپ سلسلہ ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو پر خواجہ عبدالغفور صاحب کا ایک مضمون "کتاب نما" اگست ۸۳ء کے میں شائع ہوا

تھا۔ جس میں پنڈت نہرو کی حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کے متعلق بہت دلچسپ واقعات ہیں۔ اس کا حوالہ مضمون نگار کی نظر نہ پڑنے سے رہ گیا۔

غزلوں میں عشرت دھولپوری، شجاع خاور، باقی غازی پوری کی غزلیں خاص طور سے پسند آئیں۔

—— روشن لال روشن بنارسی، وارانسی

○ فروری ۹۰ء کا شمارہ ملا —— ڈاکٹر جمیل جالبی کا مقالہ "میراجی: ایک مطالعہ" مرحوم محمد ثناء اللہ ڈار کی شخصیت پر ایک بے حد معلوماتی مضمون ہے۔ فیض احمد فیض، ن۔ م۔ راشد اور میراجی ان تینوں شخصیات کے مثلث میں میراجی مرحوم کا مقام بلند ہے۔ واقعی میراجی کو ہم جدیدیت کا باپ کہہ سکتے ہیں۔ مقالہ نگار نے پوری وسعت قلبی کے ساتھ لکھا ہے کہ "جو کام آگے پیچھے کی دو یا دو سے زیادہ نسلیں کرتی ہیں۔ میراجی نے ایک مختصر سی زندگی میں یہ سارا کام خود کر دکھایا۔" میراجی پر یوں تو کام ہوا ہے مگر ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایک مختصر سے مقالے میں شخصیت کو ستاروں سے آگے پہنچا دیا ہے۔ رام پال نے "تب اور اب" میں جن حالات کی عکاسی کی ہے اور جس حسین پیرائے میں کی ہے وہ قومی یک جہتی اور انتشار کے دو ادوار کی داستانِ حقیقت ہے۔

سلطان سبحانی کا سایہ حال اور ماضی کی ضیا پاشی اور تیرگی کو بڑے اچھوتے انداز میں اُجاگر کرتا ہے والدین کی حیات اور اُس کی قدردانی پر قابلِ تحسین مرقع ہے۔

شبیب احمد بازی ہار کر بھی اس بازی میں فتح یاب ہیں۔

—— ابن اسحٰق بنگلوری، تری کیرہ

○ "ایوانِ اُردو" (فروری ۹۰ء) میں "میراجی: ایک مطالعہ" بحیثیت مضمون ایک اچھا مضمون ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ایک ایسے مصور کا انداز اختیار کیا ہے جو اصل سے بہتر تصویر بنا دیتا ہے۔ مگر اس مضمون کے مطالعے سے، خاص کر میراجی کے طرزِ زندگی سے ایک الجھن ذہن میں پیدا ہوئی اور ایک سوال ذہن میں ابھرا کہ کیا اچھا ادب پیش کرنے کے لیے ایک ادیب کا اچھا ہونا لازمی ہے یا نہیں۔ میراجی جس گندگی کے ساتھ جیے وہ جس ذہنی اُلجھن کا شکار رہے اور جس جنسی آلودگی میں گزر بسر کرتے رہے، کیا ایسا شخص کوئی اچھا اور پائیدار ادب پیدا کرسکتا ہے؟

ادب، فن کا مظہر ہے۔ اچھے ادب کے لیے ایک اچھے فن کار کی ضرورت ہوتی ہے اچھے فن کار سے مراد ایک ایسا فن کار جو ژولیدہ ذہن نہ ہو، جس کے عادات و اطوار کم از کم اچھے انسانوں کی طرح ہوں نہ کہ جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزارتا ہو۔ ایک ایسا ادیب جو خود فرسٹریٹڈ ہو وہ کیا اپنے ادب سے کسی کی رہنمائی کرسکتا ہے۔ سماج سے بغاوت کرنا کوئی بڑا کارنامہ نہیں، سماج سے تو کوئی بھی شخص بغاوت کرسکتا ہے سماج کو کب اس کی پروا ہوتی ہے مگر سماج میں تبدیلی لانے کے لیے اپنی ہیئت کو مضحکہ خیز بنا دینے سے کیا حاصل؟ مجھے تو میراجی کے کردار میں کوئی ایسی خوبی نظر نہیں آئی جو ایک اچھے ادیب کے لیے ضروری ہے۔ بُرے کردار کے ساتھ اچھی بات کہنا بڑی بات نہیں، اچھی بات کہنے کے ساتھ اچھے کردار کا پیش کرنا بڑی بات ہے۔

زندگی کی کچھ بنیادی حقیقتیں ہیں جیسے پیدا ہونا اور مرنا اور اسی کے ساتھ کائنات کے کچھ معاملات ایسے ہیں جو صرف راز ہی راز ہیں۔ زندگی کے یہ سوالات اور کائنات کے یہ معاملات بہت سے ذہنوں کو پریشان کیے ہوئے ہیں یہ کوئی میراجی ہی کا معاملہ نہیں ہے جب سے دُنیا اور انسان وجود میں آئے ہیں لاکھوں نے سوچا ہے۔ لیکن کائنات نے اپنی روش نہیں بدلی۔ اگر میراجی بھی اپنے ذہن میں زندگی اور دُنیا کے نہ سمجھ میں آنے والے سوالات رکھتے تھے تو یہ کوئی اہم بات نہیں حیات و کائنات کا کیا مقصد ہے؟ یہ سوال کچھ حل بھی ہوا ہے اور کچھ ادھورا بھی ہے لیکن اس کے لیے اپنے آپ کو غلاظتوں میں ڈبو دینا۔ ڈیڑھ ڈیڑھ سال تک غسل نہ لینا، خالی پیٹ قرض لے کر شراب پینا اور بستر گیلا کرنا۔ یہ حرکتیں ایسی ہیں جو ایک اچھے ادیب ایک اچھے فن کار اور ایک اچھے انسان کو زیب نہیں دیتیں۔ دُنیا میں ہزاروں لوگ اس سے بھی بدتر حالت میں رہتے ہیں تو کیا وہ مرکز توجہ بن سکتے ہیں۔ دُنیا کے رموز و اسرار جاننے کے لیے بستر گیلا کرنے کی ضرورت نہیں اس کے لیے تو ریاضت درکار ہوتی ہے اور کردار کو استوار رکھنا پڑتا ہے۔ دُنیا کی چند بڑی ہستیاں مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں جنھوں نے کائنات کے رموز سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے کیا کیا ریاضتیں کی ہیں میں نہیں سمجھتا کہ میراجی نے

اُردو ادب کو اپنی تحریروں کا کوئی قیمتی خزانہ دیا ہے۔ اس کا کوئی خاص IMPACT بھی اُردو والوں پر نہیں پڑا۔ پورا مضمون پڑھنے کے بعد میرا جی ایک بیمار ذہن رکھنے والے نظر آئے۔ بیمار ذہن سے صحت مند خیالات کی توقع ہی فضول ہے۔

——— سیّد محی رضا، بمبئی

○ یوں تو آپ کے رسالے میں مضمون بہت ہی معیاری شائع ہوتے ہیں پھر اس پر بحث بھی خوب سے خوب تر ہوتی ہے۔ نومبر ۸۹ء کے شمارے میں ڈاکٹر سیّد حسین احمد کا مضمون بعنوان "کیا نعت ایک صنفِ سخن ہے" شائع ہوا۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ نعت کا پہلی مرتبہ ادبی جائزہ لیا گیا چوں کہ حسین احمد صاحب نے عام روش سے ہٹ کر بات کی ہے اس لیے اکثر لوگ چونک گئے اور جناب عارف حسن خاں صاحب (مراد آباد) نے ایک طویل مراسلہ نعت کے صنفِ سخن ہونے پر زور دیتے ہوئے لکھا اور آخر میں یہ فیصلہ صادر کیا۔

"نعت ایک موضوعاتی صنف ہے جس کے لیے کسی بھی ہیئت کی پابندی ضروری نہیں۔ اس کی شناخت اس کے موضوع کی بنا پر کی جاسکتی ہے۔"

اس سلسلے میں عرض ہے کہ اُردو اور فارسی شاعری کا بڑا حصّہ صوفیانہ اشعار پر مشتمل ہے تو کیا موضوع کی بنیاد پر آپ اسے صوفیانہ صنفِ سخن بھی قرار دیتے ہیں۔ صنف کا تعیّن ہیئت اور اجزا کی بنیاد پر ہی ہو گا اور نعت شریف کے لیے ابھی تک کوئی ہیئت اور اجزائے ترکیبی متعین نہیں

کہنا صحیح ہے کہ "نعت مضامینِ سخن میں ہے صنفِ سخن نہیں"۔

——— شگفتہ جمال، کلکتہ

○ نومبر ۸۹ء کے شمارہ میں سیّد حسین احمد صاحب کا مضمون "کیا نعت ایک صنفِ سخن ہے" پڑھا اور فروری کے شمارے میں عارف حسن خاں کا مضمون نما مراسلہ بھی دیکھا ——— اس سلسلے میں پہلے یہ عرض ہے کہ یہ اُسی سرزمین کی آواز ہے جہاں غزل کو نیم وحشی صنف کہا گیا اور اب نمبر نعت کا ہے اور پھر چونکا دینے والی بات کہی گئی ہے کہ نعت صنفِ سخن نہیں ہے۔

ہمارے سنجیدہ دانشوروں کو صحت مند طریقے پر اظہارِ خیال کرنا چاہیے کہ حقیقت میں نعت صنفِ سخن ہے کہ نہیں۔ جناب سیّد حسین احمد صاحب کی بات حرفِ آخر نہیں ہے اور عارف حسن خاں کا مراسلہ تشنہ ہے اس سے قاری کسی نکتے پر نہیں پہنچتا ہے۔

——— سہیل وانی، جموّں

○ "ایوانِ اُردو" مارچ ۹۰ء ملا۔ اس میں مولانا امتیاز علی عرشی مرحوم کا مضمون "اُردو کی تذکیر و تانیث پر پشتو کا اثر" کے بارے میں اکبر علی خاں عرشی زادہ کا تاثر ہے کہ ان کے علم کی حد تک کہیں شائع نہیں ہوا۔

فہارس اورینٹل کالج میگزین۔ ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین۔ مجلّہ انجمن عربی و فارسی دانش گاہ پنجاب، لاہور ۱۹۲۵ء ——— تا ۱۹۶۷ء ——— کے صفحہ ۴ پر درج ہے:

"امتیاز علی عرشی استدراکات نومبر ۱۹۳۴ء، ۱-۱۱-۴-۷۔ اُردو زبان، اس

عنوان میں فرق ہے۔

——— رام لعل نابھوی، نابھا

○ تقریباً ایک سال ہوتا ہے میں نے اپنے والد مرحوم کے مقالات کی دوسری جلد مرتب کرنے کی غرض سے ان کے مسوّدات کا جائزہ لینا شروع کیا تو اس میں اُردو پشتو تذکیر و تانیث کے متعلق ایک مضمون نکل آیا۔ میں نے اس کی دو کاپیاں کرائیں ایک آپ کو بھیج دی اور ایک پاکستان ارسال کر دی یہ سمجھ کر کہ یہ مضمون غیر مطبوعہ ہے۔ اسی دوران مجھے ہارٹ اٹیک ہوا اور میں دو ماہ گھر پر صاحبِ فراش رہ کر دہلی علاج کی غرض سے چلا گیا۔ تقریباً بیس روز ہونے میں دہلی سے واپس آگیا ہوں اور ۶ فروری سے لائبریری بھی آنے جانے لگا ہوں۔ غرض اس علالت کے باعث ترتیب مقالاتِ عرشی جلد دوم کا جو کام چھوٹ گیا تھا گذشتہ ہفتے سے میں نے ازسرِ نو اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ ترتیب کے اس کام میں تقابل کرنے سے معلوم ہوا کہ جو مضمون میں نے آپ کو ارسال کیا تھا وہ ایک مختلف عنوان سے پہلے شائع ہو چکا ہے اور اور اختلاف عنوان ہی کے باعث مجھے یہ غلط فہمی ہوگئی کہ یہ مضمون غیر مطبوعہ ہے۔ میں آپ کو مضمون ارسال کر کے قطعاً بھول گیا تھا۔ کل "ایوانِ اُردو" کا شمارہ مارچ پہنچا تو اپنے سہو پر متنبہ ہوا اور بطور معذرت نامہ یہ سطور ارسال خدمت ہیں۔ شرمندہ ہوں مگر اس کی تلافی جلد کردوں گا مطمئن رہیں۔

——— اکبر علی خاں عرشی زادہ، رامپور

○ "نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی

کے دل کا قرار ہوں" کے بارے میں مَیں اتنا مزید کہنا چاہوں گا کہ بمبئی سے شائع ہونے والے جریدے "فن اور شخصیت" کے غزل نمبر میں یہ غزل مضطر خیرآبادی کے کلام میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر خلیل اللہ خاں نے اپنی تصنیف مضطر خیرآبادی میں اسے مضطر ہی کی فکر کا نتیجہ بتایا ہے۔ اسلوب اور لفظیات پر غور کریں تو بات اور واضح ہو جاتی ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد حسن کا ایک مضمون جو ماہ نامہ 'آج کل' (غالباً اگست ۷۵ء) کی اشاعت میں شریک ہے، خاصے کی چیز ہے۔

بی۔ آر۔ چوپڑا کے ٹی وی سیریل 'بہادر شاہ ظفر' میں متعلقہ کلام کو مضطر خیرآبادی سے منسوب کیا گیا ہے۔ سیریل کا منظر نامہ ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے تحریر کیا ہے۔ ڈاکٹر کشور سلطان نے پی. ایچ. ڈی کے لیے لکھے گئے اپنے مقالے "جاں نثار اختر: فن اور شخصیت" میں یہی بات محقق کی ہے کہ یہ غزل ظفر کی نہیں مضطر کی ہے۔

اب اس کا کیا کیا جائے کہ مندرجۂ ذیل شعر بھی مضطر خیرآبادی کے قلم کی کاشت ہے۔ جسے شکیل بدایونی نے فلم 'دیدار' میں استعمال کر لیا ہے۔

اسیر پنجۂ عہدِ شباب کر کے مجھے
کہاں گیا مرا بچپن خراب کر کے مجھے

—— رفعت عزمی، ردولی (بارہ بنکی)

○ میں نے آپ کو ظفر کے نام سے مشہور غزل "نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں" کے سلسلے میں ایک خط لکھا تھا جو آپ نے شائع کر دیا۔ اس خط میں میں نے اپنے جس مضمون کا حوالہ دیا ہے، وہ اب سے تیس برس پہلے لکھا گیا تھا۔ آپ کو خط لکھنے کے بعد احساس ہوا کہ اب اس مضمون پر انحصار کافی نہیں چنانچہ اِدھر اُدھر تلاش و جستجو کی تو معلوم ہوا کہ اس مضمون میں اور اس کے حوالے سے اس خط میں ایک غلطی رہ گئی ہے۔ رفعت عزمی صاحب نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ ان کے پاس موجود مضطر کے کلام میں "ایوانِ اُردو" میں شائع شدہ پانچ اشعار کے علاوہ ایک اور شعر بھی ہے۔ یہ شعر درجِ ذیل ہے :

میں کہاں رہوں، میں کہاں بسوں، نہ یہ مجھ سے خوش، نہ وہ مجھ سے خوش
میں زمیں کی پیٹھ کا بوجھ ہوں، میں فلک کے دل کا غبار ہوں

جیسا کہ گذشتہ خط میں عرض کر چکا ہوں، یہ شعر "نیا دور" میں شائع شدہ میرے مضمون میں بھی شامل ہے۔ اس مضمون میں پانچ شعر جاں نثار اختر مرحوم کے خط سے نقل کیے گئے تھے اور یہ چھٹا شعر "اُردو کے چاند تارے" مرتبہ امیر حسن نورانی کے حوالے سے۔ نورانی صاحب نے باقی پانچ شعروں کے ساتھ یہ شعر بھی ظفر کے کلام میں نقل کیا ہے۔ میں نے یہ سوچ کر کہ پانچ شعر مضطر خیرآبادی کے ہیں تو یہ چھٹا شعر بھی انھی کا ہوگا، اسے کلامِ مضطر میں شامل کر لیا۔ اب تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اس شعر کے سلسلے میں یہ فیصلہ غلط تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ شعر آغا حشر کاشمیری کا ہے۔ اس زمین میں آغا صاحب کی مکمل غزل ان کے مشہور ڈرامے "سلور کنگ" میں شامل ہے۔ اور اسی ڈرامے کے حوالے سے ان کے مجموعۂ کلام "کلامِ حشر" مرتبہ خیال عبدالقدوس نیرنگ میں نقل کی گئی ہے۔ افادۂ عام کی غرض سے یہ پوری غزل سطورِ ذیل میں پیش کی جا رہی ہے :

جو خزاں ہوئی وہ بہار ہوں، جو اُتر گیا وہ خمار ہوں
جو بگڑ گیا وہ نصیب ہوں، جو اُجڑ گیا وہ سنگھار ہوں
مرا حال قابلِ دید ہے کہ نہ یاس ہے نہ امید ہے
نہ گلہ گزارِ خزاں ہوں میں، نہ سپاس سنجِ بہار ہوں
کوئی زندگی ہے یہ زندگی، نہ ہنسی رہی، نہ خوشی رہی
مری گھٹ کے حسرتیں مر گئیں، انھیں حسرتوں کا مزار ہوں
میں کہاں رہوں، میں کہاں بسوں، نہ یہ مجھ سے خوش، نہ وہ مجھ سے خوش
میں زمیں کی پیٹھ کا بوجھ ہوں، میں فلک کے دل کا غبار ہوں
وہ ہنسی کے دن، وہ خوشی کے دن گئے حشر یاد سی رہ گئی
کبھی جامِ بادۂ ناب تھا مگر اب تو اُس کا اُتار ہوں

—— حنیف نقوی، وارانسی

○ "نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں . . ." اس غزل کے علاوہ فلم "لال قلعہ" میں محمد رفیع نے ایک اور غزل بہادر شاہ ظفر کے نام سے گائی تھی۔ اسے بھی ریڈیو اور ٹی. وی دہراتے رہتے ہیں اس کا مطلع اور مقطع ہے :

لگتا نہیں ہے دل مرا اُجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

یہ غزل بھی میرے دیوانِ ظفر میں نہیں ہے۔ یہ بھی شاید ظفر کا کلام نہ ہو۔ قارئین اس پر بھی روشنی ڈالیں تو مہربانی ہوگی۔

—— بھولا ناتھ، دہلی

○ نومبر ۸۹ء کے شمارے میں داغ کے اہم تلامذہ کے بارے میں خط کی اشاعت کے لیے شکریہ۔ اُس خط میں مجھ سے ایک غلطی ہو گئی جس کے لیے میں "ایوانِ اُردو" کے قارئین سے معافی چاہتا ہوں۔ میں نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ حفیظ جالندھری نے بھی داغ سے اصلاح لی تھی اور 'ماہِ نو' (کراچی، ۱۹۵۸ء) کے سالنامے کا حوالہ دیا تھا۔ جنوری، فروری میں ناگپور اور

وہاں سے وطن جانا ہوا گھر میں مذکورہ سالنامے (مارچ ۱۹۵۸ء) کا دوبارہ مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ حفیظ جالندھری مرحوم نے مولانا غلام قادر گرامی سے اصلاح لی تھی جو اُن دنوں نظام حیدر آباد کے دربار سے وابستہ تھے۔ اور فارسی کے شاعر تھے۔ میں اپنی اِس غلطی کے لیے نادم ہوں اور ایک بار پھر معافی چاہتا ہوں۔

مولانا ناطق کے بارے میں' البتہ تفصیلات درست ہیں۔ نومبر ۸۹ء میں مجھے سرہنگ سے جناب منظور کشمیری صاحب کا ایک خط موصول ہوا جس میں انھوں نے داغ کے تلامذہ کے بارے میں منشی اکبر علی خاں افسوس شاہ جہاں پوری کی تصنیف (۱۹۰۶ء) نواب سائل دہلوی کی تصنیف (۱۹۱۹ء) اور طرفہ قریشی بھنڈاروی کی تصنیف "طورِ رخشاں" (۱۹۴۶ء) کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ ان تصانیف میں مولانا ناطق کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ میں خود حیران ہوں کہ افسوس شاہ جہاں پوری اور سائل دہلوی نے اپنی تصانیف میں مولانا ناطق کا ذکر کیوں نہیں کیا؛ جہاں تک طرفہ صاحب کی تصنیف کا تعلق ہے تو عرض ہے کہ "طورِ رخشاں" میں صرف (پُرانے) سی پی (اور موجودہ) ودربھ کے شعرا کا ذکر ہے جن میں زیادہ تر ناگپور اور کامٹی سے تعلق رکھتے تھے اور مولانا ناطق نے 'ساری زندگی ناگپور میں گزارنے کے باوجود' اپنے آپ کو گلاؤٹھی ہی سے وابستہ رکھا ظاہر ہے' ایسی صورت میں "طورِ رخشاں" میں ان کا ذکر کیوں ہوتا۔ پچھلے دنوں ناگپور میں قیام کے دوران' وہاں کے ممتاز شاعر پروفیسر سیّد یونس صاحب سے ملاقات ہوئی اور اُن سے معلوم ہوا کہ مسلم لائبریری صدر ناگپور میں دیوانِ ناطق کا ایک نسخہ موجود ہے جس کے دیباچے میں مولانا کے تلمذ کے بارے میں تفصیلات موجود ہیں۔ ناگپور میں میرا قیام مختصر رہا اور میں دیوانِ ناطق نہیں دیکھ سکا لیکن اگر کوئی صاحب چاہیں تو دیباچے کی فوٹو اسٹیٹ نقل' مسلم لائبریری صدر ناگپور سے معاوضہ دے کر منگوا سکتے ہیں۔ مولانا ناطق کا اچھا خاصا کلام' جو آج بھی غیر مطبوعہ ہے' مومن پورہ ناگپور ہی کے ایک صاحب' عبدالعلیم بابو کے پاس منتشر حالت میں موجود ہے۔

——— صہبا وحید' نئی دہلی

○ جنوری ۹۰ء کے شمارے میں "مولانا آزاد: کچھ شاعری کے حوالے سے" راج نرائن رازؔ نے واقعات بغیر حوالے کے نقل کر دیے ہیں۔ مولانا آزاد کی نادر شاہ خاں شوخی سے ملاقات کا واقعہ عتیق صدیقی کی کتاب "غالب اور ابوالکلام" مکتبہ شاہراہ' دہلی' ۱۹۶۹ء' صفحہ ۲۰۹-۱۱ سے ماخوذ ہے۔ نادر شاہ خاں شوخی کی وفات ۱۸۹۹ء ہے (بحوالہ 'ہماری زبان' ۱۵/ جنوری ۱۹۹۰ء)۔

مولوی محمد یوسف رنجور کا وطن عظیم آباد تھا۔ ان کی تاریخِ پیدائش ۱۸۶۲ء اور تاریخ وفات ۱۹۲۴ء ہے۔

شوق نیموی کی تاریخِ پیدائش ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۲ء اور تاریخ وفات ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء ہے۔

——— عظمت فاطمہ' گیا

○ جنوری ۹۰ء کے شمارے میں محترم رضا نقوی واہی صاحب کا مزاحیہ کلام "بے لفافے" کافی پُرانا ہے۔ اور اخبار اشارہ' پٹنہ نیز واہی صاحب کے مجموعے طنز و تبسم' صفحہ ۱۴۳ پر بھی اسی عنوان سے شائع ہوا ہے۔[1]

——— دلکش غازی پوری' وارانسی

(۱) واہی صاحب نے لکھا تھا کہ یہ ان کی تازہ نظم ہے ——— ادارہ

○ شمارہ فروری کی غزلوں کی بھیڑ میں شجاع خاور کی "ماں" نے اپنا اثر چھوڑا ہے لیکن اس ماہ سب سے زیادہ متاثر محمد علوی صاحب نے "شہر کا جادو" اور "میزبان ساحل" کے ذریعے کیا ہے۔

——— سیّد نذیر حسن' ٹونک

○ "ایوانِ اُردو" کا نہرو نمبر زیرِ مطالعہ ہے ایک نظر تو مکمل دیکھ لیا ہے اور اسی کی روشنی میں یہ خط لکھ رہا ہوں کچھ مضامین پڑھ بھی چکا ہوں تمام مضامین پڑھ کر خط دوبارہ لکھوں گا انشاء اللہ۔

اس نمبر میں سب سے بڑی بات یہ رہی کہ اس کو پڑھتے وقت نہرو کی شخصیت کے خدوخال گڈمڈ نہیں ہو جاتے (جیسا کہ اکثر ہمہ جہت شخصیات کے بارے میں ہوتا ہے) شروع سے آخر تک توازن برقرار رہا ہے اور آخر میں "میری کہانی" نے اس پورے کارواں کو اس نہر کے پاس لے جا کر چھوڑ دیا جہاں سے لقب نہرو چلا تھا۔

مگر کچھ باتیں کچھ دیر کے لیے بوجھ سا بھی بنیں' مثلاً بریم پال اشک کا مضمون "نہرو اور سنیما" کوئی خاص بات پیدا نہ کر سکا اسی طرح محترمہ وجے لکشمی پنڈت کا مضمون "نہرو خاندان کے افراد" جو اس سے پہلے بھی کئی ہندی انگریزی اخبارات میں چھپ چکا ہے ظاہر ہے کہ پُرانا سا لگا تاہم کچھ ایسے بھی تو ہوں گے جنھوں نے پہلی بار پڑھا ہوگا۔ پروفیسر عبدالمغنی صاحب نے اپنی وہی مولویانہ روش رکھی ہے جو کہ ان کا خاصہ بن کر رہ گئی ہے وہ جس پر قلم اٹھاتے ہیں جی چاہتا ہے کہ بیعت ہو جائیں! پھر بھی جس جذبے سے وہ اقبال یا مولانا ابوالکلام پر قلم اٹھاتے ہیں اس نمبر میں وہ سرد رہا۔ اس لیے یہ مضمون بہرحال بہت بُرا نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے علاوہ (جہاں تک میں نے مطالعہ کیا ہے) ایسا لگتا ہے کہ ہر مضمون نگار دوڑ رہا ہے اور ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتا ہے کیا ہی اچھا ہوتا اگر اس دوڑ میں بدرالدین طیب جی کو بھی شامل کر لیا جاتا ——— کیفی اعظمی صاحب کو اتنی مبارکباد اور سلام جتنا میں لکھ سکوں۔ ایسی نظم کہنا انھیں کا کام ہے۔

——— فرحت نسیم سہارنپوری' سہارنپور

اکادمی کے اغراض ومقاصد

(۱) دہلی کی لسانی تہذیب کے مشترکہ حصے کے طور پر اُردو زبان اور ادب کا تحفظ اور ارتقا۔
(۲) اُردو میں ادبی اور معیاری تصنیفات اور بچوں کی کتابوں کی اشاعت اور حوصلہ افزائی۔
(۳) اُردو میں ادبی اور سائنسی اور دوسرے موضوعات سے متعلق ایسی اہم کتابوں کے تراجم کا اہتمام کرنا جن کا ابھی تک اُردو زبان میں ترجمہ نہ ہوا ہو۔
(۴) اُردو میں حوالہ جاتی کتابوں کی تالیف واشاعت۔
(۵) قدیم اُردو ادب کی صحیح ترتیب وتدوین کے بعد اشاعت۔
(۶) اُردو کے غیر مطبوعہ معیاری ادب پاروں کی اشاعت۔
(۷) اُردو کے مستحق مصنفین کی غیر مطبوعہ تصنیفات کی اشاعت میں تعاون۔
(۸) گذشتہ ایک سال کے دوران مطبوعہ اُردو تصنیفات کے مصنفوں کو انعامات کی تقسیم۔
(۹) اُردو کے عمر رسیدہ اور مستحق مصنفین کی ماہانہ مالی اعانت۔
(۱۰) اُردو اسکالروں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک مقررہ مدت کے لیے مالی اعانت کے ساتھ دوسری سہولتیں بہم پہنچانا۔
(۱۱) مشہور اسکالروں اور دوسری اہم شخصیتوں کو جلسوں کو خطاب کرنے کے لیے دعوت دینا۔
(۱۲) ادبی موضوعات پر سیمینار، سمپوزیم، کانفرنس اور نشستیں منعقد کرنا جن میں عالمی ادبی رجحانات کے پس منظر میں اُردو کے مسائل پر بحث ومباحثہ ہو اسی کے ساتھ اُردو کی تدریس اور اس کے استعمال سے متعلق سرکاری احکامات کی تعمیل و تکمیل کا جائزہ اور ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے مختلف ایسی ادبی اور تہذیبی تنظیموں کو مالی اعانت دینا جو کہ اسی طرح کی نشستیں منعقد کرتی ہیں لیکن یہ مالی اعانت ایک معاملے میں پانچ سو روپے سے زیادہ نہیں ہوگی۔
(۱۳) اُردو میں اعلیٰ معیار کے رسالے، جریدے اور اسی طرح کی دوسری مطبوعات کی اشاعت۔
(۱۴) ان ضابطوں کے تحت مطبوعات کی فروخت کا اہتمام۔
(۱۵) اکادمی کے لیے منقولہ اور غیر منقولہ جائداد حاصل کرنا لیکن شرط یہ ہے کہ غیر منقولہ جائداد کے حصول سے پہلے دہلی انتظامیہ کی پیشگی منظوری ضروری ہوگی۔
(۱۶) اُردو کی تعلیم، اس کے استعمال اور سرکاری احکامات کی تکمیل میں حائل دشواریوں اور اُردو بولنے والوں کے مطالبوں کو دہلی انتظامیہ کے علم میں لانا۔
(۱۷) ایسے سبھی جائز اقدامات کرنا اور قانونی کارروائیاں کرنا جن سے مذکورہ مقاصد کے فروغ وتعمیل میں مدد مل سکتی ہو۔
(۱۸) سوسائٹی کی ساری آمدنی سوسائٹی کے اغراض ومقاصد کے حصول ہی کے لیے خرچ کی جائے گی۔

اُردو اکادمی، دہلی

گھٹا مسجد روڈ - دریا گنج - نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

۱۹۸۶ء کی مطبوعات

① مولانا ابوالکلام آزاد : شخصیت اور کارنامے - مرتّب : ڈاکٹر خلیق انجم - قیمت ۴۸ روپے - صفحات ۵۰۲ -
② بزمِ آخر - مصنف : منشی فیض الدین - مرتّب : ڈاکٹر کامل قریشی - قیمت ۲۱ روپے - صفحات ۱۲۴ -
③ دہلی کی آخری شمع - مصنف : مرزا فرحت اللہ بیگ - مرتّب : ڈاکٹر صلاح الدین - قیمت ۲۳ روپے - صفحات ۱۴۷ -
④ دہلی کا آخری دیدار - مصنف : سید وزیر حسن دہلوی - مرتّب : سید ضمیر حسن دہلوی - قیمت ۱۷ روپے - صفحات ۴۷ -
⑤ دِلّی والے (جلد اوّل) - مرتّب : ڈاکٹر صلاح الدین - قیمت ۳۶ روپے - صفحات ۳۵۷ -
⑥ قلعۂ معلّیٰ کی جھلکیاں - مصنّف : عرش تیموری - مرتّب : ڈاکٹر اسلم پرویز - قیمت ۱۷ روپے - صفحات ۷۲ -
⑦ رسومِ دہلی - مصنف : سید احمد دہلوی - مرتّب : ڈاکٹر خلیق انجم - قیمت ۲۸ روپے - صفحات ۲۰۸ -
⑧ داغ دہلوی ؛ حیات اور کارنامے - مرتّب : ڈاکٹر کامل قریشی - قیمت ۳۱ روپے - صفحات ۲۲۷ -

۱۹۸۷ء کی مطبوعات

⑨ عالم میں انتخاب : دِلّی - مصنّف : مہیشور دیال - قیمت ۵۳ روپے - صفحات ۵۲۱ -
⑩ سوانحِ دہلی - مصنّف : شاہزادہ مرزا احمد اختر گورگانی - مرتّب : مرغوب عابدی - قیمت ۱۷ روپے - صفحات ۶۴ -
⑪ خواجہ حسن نظامی : حیات اور کارنامے - مرتّب : خواجہ حسن ثانی نظامی - قیمت ۲۹ روپے - صفحات ۲۰۸ -
⑫ دیوانِ حالی - مصنّف : مولانا الطاف حسین حالی - مقدمہ : رشید حسن خاں - قیمت ۲۴ روپے - صفحات ۲۳۲ -
⑬ چراغِ دہلی - مصنّف : میرزا حیرت دہلوی - قیمت ۳۹ روپے - صفحات ۵۲۶ -
⑭ اُردو صحافت - مرتّب : انور علی دہلوی - قیمت ۳۲ روپے - صفحات ۳۳۲
⑮ دہلی کے اسکولوں میں اُردو نصاب کے مسائل - مرتّب : صدیق الرحمان قدوائی - قیمت ۲۳ روپے - صفحات ۱۸۷ -
⑯ نوبتِ پنج روزہ یعنی وداعِ ظفر - مصنّف : علامہ راشد الخیری - مرتّب : ڈاکٹر تنویر احمد علوی - قیمت ۲۲ روپے - صفحات ۱۵۸ -
⑰ دِلّی کی آخری بہار - مصنّف : علامہ راشد الخیری - مرتّب : سید ضمیر حسن دہلوی - قیمت ۲۰ روپے - صفحات ۱۲۷ -
⑱ اُردو غزل - مرتّب : ڈاکٹر کامل قریشی - قیمت ۳۱ روپے - صفحات ۳۵۹ -
⑲ اُردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب - مرتّب : ڈاکٹر کامل قریشی - قیمت ۳۹ روپے - صفحات ۴۵۹ -
⑳ لال قلعے کی ایک جھلک - مصنّف : حکیم خواجہ سید ناصر نذیر الدین فراق دہلوی - مرتّب : ڈاکٹر انتظار مرزا - قیمت ۱۹ روپے - صفحات ۱۰۹ -
㉑ دِلّی کی تہذیب - مرتّب : ڈاکٹر انتظار مرزا - قیمت ۱۷ روپے - صفحات ۸۴ -
㉒ ڈائرکٹری اُردو ناشرین و تاجرانِ کتب - مرتّب : انور علی دہلوی - قیمت ۵۰ روپے - صفحات ۶۸۰ -
㉓ مرزا محمود بیگ کے مضامین کا انتخاب - مرتّب : ڈاکٹر کامل قریشی - قیمت ۳۱ روپے - صفحات ۲۹۶ -

۱۹۸۸ء کی مطبوعات

㉔ نیا اُردو افسانہ ؛ تجزیہ اور مباحث - مرتّب : پروفیسر گوپی چند نارنگ - قیمت ۶۰ روپے - صفحات ۶۳۱ -
㉕ انتخابِ کلامِ داغ - مرتّبہ : بیگم ممتاز میرزا - قیمت ۳۴ روپے - صفحات ۲۴۹ -
㉖ دِلّی والے (جلد دوم) - مرتّب : ڈاکٹر صلاح الدین - قیمت ۵۶ روپے - صفحات ۵۰۶ -
㉗ دہلی اور اس کے اطراف - مرتّبہ : ڈاکٹر صادقہ ذکی - قیمت ۲۵ روپے - صفحات ۱۳۴ -
㉘ دہلی کے مشائخ کی ادبی خدمات - مصنّفہ : بیگم ریحانہ فاروقی - قیمت ۲۱ روپے - صفحات ۸۴ -
㉙ دِلّی کی درگاہ شاہِ مرداں - مصنّف : ڈاکٹر خلیق انجم - قیمت ۳۳ روپے - صفحات ۱۳۷ -
㉚ حواشی ابوالکلام آزاد - مرتّب : سید مسیح الحسن - قیمت ۶۲ روپے - صفحات ۵۷۹ -
㉛ اُردو میں بارہ ماسے کی روایت - مصنّف : ڈاکٹر تنویر احمد علوی - قیمت ۴۹ روپے - صفحات ۳۸۷ -
㉜ دِلّی کے آثارِ قدیمہ - مرتب و مترجم : ڈاکٹر خلیق انجم - قیمت ۴۸ روپے - صفحات ۲۹۶ -

○ اکادمی کی شائع کردہ کتابیں بذریعہ آفسیٹ طبع ہوتی ہیں۔
○ اکادمی کی سیل ڈپو کا کوئی سول ڈسٹری بیوٹر نہیں ہے۔
○ لائبریریوں کو ۱۵٪ کمیشن پر کتابیں فروخت کی جائیں گی۔
○ کتب فروشوں کو مبلغ پانچ سو روپے تک کی کتابوں پر ۳۳⅓٪ اور پانچ سو روپے سے زیادہ کی کتابوں پر ۴۰٪ کمیشن دیا جائے گا۔
○ کتابیں وی۔پی۔پی سے یا بینک کے ذریعے بھیجی جائیں گی۔

انچارج سیل ڈپو

سرود رفتہ

نہ میں سمجھا نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے

ٹپکتا ہے پسینہ اس جبیں سے
ستارے جھڑتے ہیں ماہِ مبیں سے

برنگِ بو ٹپکتے ہیں کرشمے
تمھاری نرگسِ سحر آفریں سے

میں اس برہم مزاجی کے تصدّق
اُلجھتے ہیں وہ زلفِ عنبریں سے

تمھیں ہمخوابِ دشمن دیکھتا ہوں
اٹھا پردہ یہ چاکِ آستیں سے

یہ پردے ہیں بقدرِ شوقِ دیدار
یہ ساری لن ترانی ہے ہمیں سے

وہاں عاشق کشی ہے عینِ ایماں
انھیں کیا بحث انورؔ کفرودیں سے

امراؤ مرزا انور دہلوی

ولادت : ۱۸۴۷ء
وفات : ۱۸۸۴ء
مرسلہ : مختار [illegible]